دار العلوم کراچی کا ترجمان

ماہنامہ

البلاغ

اشاعتِ خصوصی

بیادِ فقیہِ ملّت

مفتیٔ اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب قدس سرہ

مرتبہ

محمد تقی عثمانی

البلاغ

بیادِ فقیہِ ملت

حضرۃ مولانا مفتی محمد شفیع صاحب

مفتی اعظم پاکستان قدس اللہ سرہ

دار العلوم کراچی کی مسجد

دار القرآن دار العلوم کراچی

دار العلوم کراچی کے دار الافتاء و التصنیف میں حضرت مفتی اعظم قدس سرہٗ کی نشست گاہ

حضرت مفتی اعظم قدس سرہٗ کا مزار مبارک

دارالافتاء والتصنیف

دارالعلوم کراچی کی درسگاہیں

بسم الله الرحمن الرحیم

الحمد لله وکفیٰ وسلام علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ

نحمدہٗ ونستعینہٗ ونستغفرہٗ ونؤمن بہٖ ونتوکل علیہ

ونعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیّات اعمالنا

من یہدہ اللہ فلا مضل لہٗ ومن یضللہ فلا ہادی لہٗ

ونشہد ان لآ الٰہ الا اللہ وحدہٗ لا شریک لہٗ

ونشہد ان سیدنا ومولانا محمدًا عبدہٗ ورسولہٗ

صلی اللہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ آلہٖ واصحابہٖ اجمعین

حمدِ باری

ترا آئینہ عالمِ رنگ و بُو ہے ‏ جدھر دیکھتا ہوں اُدھر تُو ہی تو ہے

ہزاروں حجاب اور اس پر یہ عالم ‏ کہ چرچا ترا جا بہ جا، کُو بہ کُو ہے

ثنا خواں ترا دہر کا ذرہ ذرہ ‏ سبھی کی زباں پر تری گفتگو ہے

جمالِ ازل، قدرتِ مطلقہ کی ‏ شہادت سے معمور ہر چار سُو ہے

ترے فضل و رحمت نے بخشا ہے سب کچھ ‏ بس اب تو مری ایک ہی آرزو ہے

کہ کر دے مجھے ایسے بندوں میں شامل ‏ کہ اشکِ سحرگاہ جن کا وضو ہے

بجاہِ شفیعِ حبیبِ دو عالم ‏ کہ جو عالمِ کون کی آبرو ہے

شفیعِ گنہگار و خستہ بھی حاضر

بامیدِ عفو و کرم رُو برُو ہے

از کلام حضرت مفتیِ اعظم

نعتِ رسولِ عربی
صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم

پھر پیشِ نظر گنبدِ خضرا ہے حرم ہے — پھر نام خدا روضۂ جنت میں قدم ہے

پھر شکرِ خدا سامنے محرابِ نبیؐ ہے — پھر سر ہے مرا اور ترا نقشِ قدم ہے

محرابِ نبیؐ ہے کہ کوئی طورِ تجلّی — دل شوق سے لبریز ہے اور آنکھ بھی نم ہے

پھر منّتِ دربان کا اعزاز ملا ہے — اب ڈر ہے کسی کا، نہ کسی چیز کا غم ہے

پھر بارگہِ سیدِ کونینؐ میں پہنچا — یہ اُن کا کرم، اُن کا کرم، اُن کا کرم ہے

یہ ذرّۂ ناچیز ہے خورشید بداماں — دیکھو اُن کے غلاموں کا بھی کیا جاہ و حشم ہے

ہر موئے بدن بھی جو زباں بن کے کرے شکر — کم ہے بخدا اُن کی عنایات سے کم ہے

رگ رگ میں محبت ہو رسولِ عربیؐ کی — جنت کے عوض اُن کی یہی بیع سلم ہے

وہ رحمتِ عالم ہے شہِ اسود و احمر — وہ سیدِ کونین ہے آقائے اُمم ہے

وہ عالمِ توحید کا مظہر ہے کہ جس میں — مشرق ہے نہ مغرب ہے، عرب ہے نہ عجم ہے

دل نعتِ رسولِ عربیؐ کہنے کو بے چین
عالم ہے تحیُّر کا، زباں ہے نہ قلم ہے!

از کلام حضرت مفتی اعظم

إِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا

اللہ سے ڈرتے وُہی ہیں اُس کے بندوں میں، جن کو سمجھ ہے۔

ب

عکس مکتوب گرامی حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہ
جس میں آپ نے حضرت مفتی اعظم کو بیعت وارشاد کی اجازت عطا فرمائی

مخدومی مولانا محمد شفیع صاحب مدرس دار العلوم دیوبند السلام
علیکم ۔ بتقاضائے قلب ارادہ ہے کہ
آپکے دوستوں میں بعض احباب بیعت وتلقین کی
اجازت دیدوں پس توکلا علی اللہ [illegible]
عمل کرنا ہے؟ پھر الحمد للہ [illegible]
کہ اگر کوئی طالب حق آپ سے اسکی درخواست
کرے تو قبول کر لیجئے اس سے معمول کے ساتھ
معلوم کی نفع ہوتا ہے جس میں دعا کرتا ہوں
اور اپنے خاص متبعین پر اسکو ظاہر نہ کریں
بنظر احتیاط بدرنگ لفافہ بھیجتا ہوں والسلام
عبدک اشرف علی از تھانہ بھون ربیع الثانی ۱۳۴۹ھ

(۲۹) [illegible]

اجازت نامۂ سند حدیث جو حکیم الامت حضرت تھانوی قدس سرہٗ نے حضرت مفتی اعظم کو عطا فرمایا

بسم اللہ الرحمن الرحیم

وبعد الحمد والصلوٰۃ فان اخی فی اللہ اجبہ الشیخ المولوی الفاضل
محمد شفیع ادام اللہ تعالیٰ من کل خیر الی المقام الرفیع قد عرض
علی اطراف الصحاح والموطا بروایتی یحیی ومحمد لیفوز ببرکات
السند، وقد سمع منی الی الجامع فی رسالتی السبع السیارۃ
التی ہی احدی رسائل الطہارۃ ثم لما رأیتہ اہلا
لتقریر مبانی الاحادیث وہو فن التحدیث والروایۃ و
لتحریر معانیہا وہو فن الفقہ والدرایۃ اجزتہ لتدریس
تلک الصحف لیعم بحولہا من الطلبۃ من لم یطف
وادعو اللہ تعالی لی وللطلبۃ الحسنی والدعاء لہا ان یوفقنا
لخدمۃ الشریعۃ البیضاء الی ان یعترینا الفناء

دار العلوم کراچی کا ترجمان

ماہنامہ البلاغ کراچی پاکستان

اشاعت خصوصی

جمادی الثانیہ تا شعبان ۱۳۹۶ھ

بیاد فقیہ ملت

مفتی اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب قدس سرہ

المتوفی ۱۱ شوال المکرم ۱۳۹۶ھ

مرتبہ

محمد تقی عثمانی

جلد: ۱۳ شمارہ ۶-۷-۸

ترتیب

ذکر و فکر ---------- محمد تقی عثمانی ----------
حضرتِ والدؒ کی وفات پر (نظم) ---------- محمد تقی عثمانی ----------

قدرِ جوہر
(اکابرِ عصر کے تاثرات)

حضرت مفتی صاحبؒ کی کچھ باتیں ---------- شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحب مدظلہم ۱۷
دارالعلوم دیوبند کے ترجمان ---------- حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب صاحب مدظلہم ۲۹
دارالعلوم دیوبند کی آخری یادگار ---------- محدثِ عصر حضرت علامہ سید محمد یوسف بنوریؒ ۳۲
حضرت مفتی صاحبؒ کے ساتھ میرا تعلق ---------- عارف باللہ حضرت ڈاکٹر عبدالحی صاحب عارفی مدظلہم ۳۸
چند یادیں ---------- حضرت مولانا محمد منظور نعمانی صاحب مدظلہم ۵۲
پاکستان کے مفتیٔ اعظمؒ ---------- حضرت مولانا شمس الحق افغانی صاحب مدظلہم ۶۰

سیرت و سوانح

سوانح — تاریخی جملوں میں ---------- مولانا محمد ارسلان صاحب، چاٹگام ۶۴
حیاتِ مفتیٔ اعظم ---------- مولانا مفتی محمد رفیع صاحب عثمانی ۸۱

عرضِ حال ؛ ۸۲ — آباؤ اجداد ؛ ۸۵ — والدِ ماجد حضرت مولانا محمد یسین صاحبؒ ؛ ۸۸ — والدۂ ماجدہ ۹۳
ولادت ؛ ۹۴ — بچپن ؛ ۹۵ — ابتدائی تعلیم ؛ ۹۶ — درسِ نظامی اور آپ کے اساتذہ ؛ ۹۷ — طلبِ علم میں
انہماک ؛ ۹۹ — حضرت تھانویؒ سے پہلی ملاقات ؛ ۱۰۱ — حضرت شیخ الہندؒ سے اصلاحی تعلق ؛ ۱۰۹ — حضرت کشمیریؒ
سے استفادہ ؛ ۱۰۹ — فراغت اور تدریس ؛ ۱۱۱ — خطاطی و جلد سازی ؛ ۱۱۱ — طبِ یونانی ؛ ۱۱۲ — بیعت
اور عملی مشاغل ؛ ۱۱۲ — اصلاحِ باطن کی فکر ؛ ۱۱۳ — شیخ الہندؒ سے بیعت اور تحریکِ خلافت میں حصہ ؛ ۱۱۵
شیخ الہندؒ کی وفات ؛ ۱۱۶ — حکیم الامتؒ سے تعلق اور اس کے اثرات ؛ ۱۱۸ — خدمتِ خلق اور بے نفسی ۱۲۰

مکاتیب حکیم الامتؒ ۱۴۶ — اجازت بیعت ۱۴۳ — تدریسی کارنامے ۱۵۶ — درس کی خصوصیات ۱۶۰
بحیثیت صدر مفتی دارالعلوم دیوبند ۱۶۵ — ایک فتویٰ کے خلاف ملک گیر فتنہ ۱۶۲ — آپ کی حمایت میں
حکیم الامتؒ کا رسالہ ۱۶۹ — تدریس کی طرف منتقلی ۱۶۸ — آپ کے فتاویٰ حکیم الامتؒ کی نظر میں ۱۶۹ —
ماہنامہ المفتی ۱۸۰ — والد ماجدؒ کی وفات ۱۸۲ — منصب افتاء پر دوبارہ تقرر ۱۹۰ — تجارتی کتب خانہ
۱۹۱ — سیاست میں فکری و عملی حصہ ۱۹۴ — قیام پاکستان کی تحریک ۱۹۶ — دارالعلوم دیوبند سے استعفا
۱۹۷ — حکیم الامتؒ کی وفات ۲۰۰ — قیام پاکستان کے لیے جدوجہد ۲۰۲ — جمعیۃ علماء اسلام ۲۰۲ —
سلہٹ اور سرحد کا ریفرنڈم ۲۰۹ — ہجرت پاکستان ۲۱۴ — قرارداد مقاصد ۲۲۰ — ابتدائی ملک کے ٹیکس
۲۲۱ — بورڈ تعلیمات اسلام ۲۲۳ — لاء کمیشن ۲۲۶ — زکوٰۃ کمیٹی ۲۲۷ — دستور قرآنی ۲۲۸ —
مرکزی جمعیت علمائے اسلام کی قیادت ۲۲۹ — درس معارف القرآن ۲۳۱ — تاسیس دارالعلوم ۲۳۲ —
تعداد فتاویٰ ۲۳۳ — فہرست تصانیف ۲۳۴

حضرتؒ کے شیوخ و اکابر ------------ محمد تقی عثمانی ------------ ۲۴۱
حضرت شیخ الہندؒ ۲۴۲ — حکیم الامت حضرت تھانویؒ ۲۶۲ — حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ ۲۸۵
حضرت میاں صاحبؒ ۲۸۹ — حضرت مفتی عزیز الرحمٰن صاحبؒ ۲۹۹ — حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحبؒ
۳۰۴ — حضرت مولانا اعزاز علی صاحبؒ ۳۰۸ — علامہ شبیر احمد عثمانیؒ ۳۱۲ — حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ ۳۱۹
والد ماجدؒ کے آخری شب و روز ------------ محمد ولی رازی ------------ ۳۲۹
آخری سفر ------------ ڈاکٹر سید اسلم ------------ ۳۵۲
وصیت نامہ ------------ حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ ------------ ۳۵۹

مزاج و مذاق

میرے والدؒ میرے شیخؒ ------------ محمد تقی عثمانی ------------ ۳۶۴
علمی مذاق ۳۶۶ — شعر و ادب ۳۷۱ — معقولات ۳۸۷ — فقہ ۳۹۲ — فقہی مقام ۴۱۰
علامہ کوثریؒ کا مکتب ۴۱۲ — فتویٰ کا خصوصی مذاق ۴۱۸ — فتویٰ لکھنے سے پہلے ۴۲۲ —
فتویٰ نویسی کا انداز ۴۲۷ — فتویٰ کی عظمت ۴۳۰ — علم حدیث ۴۳۱ — علم تفسیر ۴۳۹ — چند
اہم تفسیری نکات ۴۴۱ — عملی مذاق ۴۵۱ — عبادات ۴۵۱ — دعوت و تبلیغ ۴۵۹ —

پیغمبرانہ دعوت کے اصول ؛ ۴۶۰ — دوسرے فرقوں کی تردید ؛ ۴۶۴ — تصلب اور عناد کا فرق ؛ ۴۶۸
احتیاط و تثبت ؛ ۴۶۹ — سیاست ؛ ۴۷۲ — علماء اور سیاست ؛ ۴۷۳ — حکمرانوں کے ساتھ
طرزِ عمل ؛ ۴۷۶ — اخلاق و عادات اور معاملات ؛ ۴۸۵ — حقیقتِ علم ؛ ۴۸۹ — اختلافِ رائے
کا انداز ؛ ۴۹۴ — غلطیوں پر ٹوکنے کا انداز ؛ ۴۹۳ — عقیدت کی حدود ؛ ۴۹۸ — حمایت و مخالفت
کی حدود ؛ ۵۰۲ — دین کی طلب ؛ ۵۰۴ — وقت کی قدرشناسی ؛ ۵۰۵ — طرزِ معیشت ؛ ۵۰۶ —
انفاق ؛ ۵۰۹ — معاملات کی صفائی ؛ ۵۱۲ — دوسروں کی رعایت ؛ ۵۱۳ — جھگڑوں سے اجتناب ؛
۵۱۶ — دارالعلوم کا خصوصی مزاج ؛ ۵۱۸ — تواضع و قناعت ؛ ۵۲۱ — خاتمہ ؛ ۵۲۹

مبشرات ------------ مولانا نعمت اللہ صاحب ---------- ۵۳۱

خدمات اور کارنامے

حکیم الامت کے علمی جانشین ------------ حضرت مولانا محمد اشرف خان صاحب ---- ۵۳۹
حضرت تھانویؒ ؛ ۵۴۰ — حضرت تھانویؒ کے خلفاء ؛ ۵۴۲ — حضرت تھانویؒ سے تعلقات ؛ ۵۴۸ —
تحفۂ ملت کی تصانیف احسن کا کمال ؛ ۵۵۳

حضرت کی اصلاحی تصانیف ---------- مولانا منیب احمد صاحب ---------- ۶۲۹
حضرت کی تفسیری خدمات ---------- مولانا عبدالشکور ترمذی ---------- ۶۶۵
مفتی اعظمؒ اور اُن کی تفسیر ---------- مولانا سلیم اللہ خان صاحب ---------- ۶۸۶
فقیہ دوراں ---------- حضرت مولانا محمد سرفراز صاحب صفدر ---- ۶۹۹
حضرت کی فقہی خدمات اور فتویٰ میں آپ کا مسلک و مشرب -- مولانا صبار دانش صاحب ---------- ۷۰۶
حضرت کا فقہی مقام ---------- مولانا مفتی جمیل احمد صاحب تھانوی ---- ۷۸۸
مفتی اعظمؒ اور تردیدِ قادیانیت ---------- مولانا محمد یوسف لدھیانوی ---------- ۷۹۳
مفتی اعظمؒ اور تحریکِ پاکستان ---------- جناب اکبر شاہ بخاری صاحب ---------- ۸۱۹
مفتی اعظمؒ اور دستوری جدوجہد ---------- جناب منشی عبدالرحمٰن خان صاحب ---------- ۸۲۵
ایک خاموش مجاہد ---------- علامہ خالد محمود صاحب (ہیڈ فورڈ) ---- ۸۳۳
دارالعلوم کراچی اور اس کی خدمات ---------- مولانا عزیز الرحمٰن سواتی ---------- ۸۴۱

دار العلوم کراچی (نظم) ـــــــــ حضرت زکی کیفیؒ ـــــــــ ۸۸۳

بانیٔ دار العلوم ـــــــــ حضرت مولانا سُبحان محمود صاحب ـــــــــ ۸۸۷

ہمارے حضرتؒ اور طلبائے دین ـــــــــ شیخ رحیم الدین دکنی ـــــــــ ۹۰۳

حضرتؒ کے معروف تلامذہ اور ان کی خدمات ـــــــــ مولانا رشید اشرف ـــــــــ ۹۱۵

اصلاح وارشاد

حضرت مفتی اعظمؒ کا اندازِ تربیت ـــــــــ مولانا مفتی عبد الحکیم صاحب ـــــــــ ۹۵۷

میرے حضرتؒ ـــــــــ مولانا مفتی عبد الرؤف صاحب ـــــــــ ۹۷۱

حضرتؒ کے بعض ملفوظات ـــــــــ مولانا محمد عاشق الٰہی بلند شہری ـــــــــ ۹۹۲

مُرشدی و سندیؒ ـــــــــ حکیم سید امداد اللہ احمد زکی ـــــــــ ۱۰۰۳

حضرتؒ کی اولاد اور خلفاء ـــــــــ مولانا قاری فیوض الرحمٰن ایم اے ـــــــــ ۱۰۱۵

نقوش وتأثرات

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب میری نظر میں ـــــــــ مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب (دہلی) ـــــــــ ۱۰۵۳

حضرت مفتی صاحبؒ کے چند واقعات اور خطوط ـــــــــ حضرت ماسٹر محمد شریف صاحب مدظلہم ـــــــــ ۱۰۵۸

ترجمانِ حکیم الامتؒ ـــــــــ شیخ القرآن مولانا غلام اللہ صاحب ـــــــــ ۱۰۶۲

آہ، فقیہِ ملت! ـــــــــ جناب ڈاکٹر تنزیل الرحمٰن صاحب ـــــــــ ۱۰۷۰

مولانا مفتی محمد شفیع عثمانی اعلی اللہ مقامہ ـــــــــ جناب ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب (پیرس) ـــــــــ ۱۰۸۰

عالمِ بالغ نظر ـــــــــ ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی صاحب ـــــــــ ۱۰۸۳

استاذِ محترم مفتیٔ عصر ـــــــــ مولانا عبد القدوس قاسمی صاحب ـــــــــ ۱۰۸۶

کچھ شگفتہ تذکرے ـــــــــ مولانا لطافت الرحمٰن سواتی ـــــــــ ۱۰۹۲

با اصُول زندگی ـــــــــ مولانا محمد متین الخطیب صاحب ـــــــــ ۱۰۹۷

نمونۂ اسلاف ـــــــــ مولانا شمس الحق صاحب ـــــــــ ۱۱۰۳

بھیاجی ـــــــــ محمد رضی عثمانی ـــــــــ ۱۱۲۱

میرے والد ماجدؒ ـــــــــ رقیبہ عفت صاحبہ ـــــــــ ۱۱۳۶

وہ والدِ شفیق ---------------- ام عطیہ عثمانی ---------- ۱۱۵۲
منارۂ عظمت، میرے مقدس ماموں ------- محمد فخر عالم صدیقی ------ ۱۱۵۹
باتیں اُن کی یاد رہیں گی ---------- مولانا عبدالقادر صاحب ------ ۱۱۶۷
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا --- جناب اعجاز احمد خان سنگھانوی ایم اے --- ۱۱۹۲
یادگار صحبتیں ---------------- مولانا مفتی بشیر احمد کشمیری -------- ۱۱۸۶

مکاتیب

معاصر علماء کے مکاتیب حضرتؒ کے نام ---------------- ۱۱۹۹
حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب ؛ ۱۱۹۹ — حضرت مولانا ظفر احمد عثمانیؒ ؛ ۱۲۱۳ — حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ، حضرت مولانا مفتی محمد حسن صاحبؒ ؛ ۱۲۲۱ — شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحب ۱۲۲۴ — مولانا بدر عالم صاحب میرٹھیؒ، مولانا مفتی عبدالکریم گمتھلویؒ ؛ ۱۲۲۹ — مولانا شبیر علی تھانوی ؛ ۱۲۴۵ — مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ، مولانا اطہر علی ؛ ۱۲۵۵ — مولانا شاہ وصی اللہ صاحبؒ ؛ ۱۲۵۸ — مولانا عبدالرشید محمود انصاریؒ ؛ ۱۲۵۹ — مولانا محمد منظور نعمانی ؛ ۱۲۶۰ — حضرت مولانا داؤد غزنویؒ ؛ ۱۲۶۳ — مولانا اسعد اللہ صاحبؒ ؛ ۱۲۶۴ —

حضرت مفتی محمد شفیع صاحب قدس سرہٗ

بڑے صاحبزادے کے نام سبق آموز مکاتیب ---------------- ۱۲۶۶

غیر مطبوعہ افادات

حضرت شیخ الہندؒ۔ ایک غیر مطبوعہ انٹرویو ---- حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب قدس سرہٗ -- ۱۳۰۵
شب قدر۔ آخری نشری تقریر -------- ″ ″ ″ ″ -- ۱۳۲۵
سفرنامۂ شام مکاتیب کے آئینے میں -------- ″ ″ ″ ″ -- ۱۳۳۰
حضرتؒ کے نادر عربی قصائد ---------- مرتبہ: مولانا قاری فیوض الرحمٰن صاحب --- ۱۳۳۹

حصہ نظم

قطعاتِ تاریخ ---------- رئیس امروہوی، محمد ولی رازی، صبا متھراوی -- ۱۳۵۱
حضرت مفتی اعظمؒ (نظم) ---------- حکیم امداد اللہ احمد ذکی -------- ۱۳۵۲
قطعۂ تاریخ ---------------- سلیم غازی -------- ۱۳۵۴

کلماتِ عقیدت ---------- جناب فضل انصاری ---------- ۱۳۵۵
مرثیہ و تاریخ وفات ---------- مولانا مفتی جمیل احمد تھانوی صاحب ---------- ۱۳۵۶
غم کی کہانی (نظم) ---------- محمد جنید شوق ---------- ۱۳۵۷
مرثیہ فارسی ---------- مولانا لطافت الرحمٰن سواتی ----------

عربی قصائد:
مولانا محمد موسیٰ روحانی بازی؛ ۱۳۵۸ مولانا مفتی جمیل احمد تھانوی؛ ۱۳۶۲ مولانا فضل محمد ۱۳۶۳
سواتی؛ مولانا رضا الحق مردانی؛ ۱۳۶۶ مولانا عبدالجمیل پشاوری؛ ۱۳۶۵ مولانا
لطافت الرحمٰن سواتی ۱۳۶۷

عکسِ جمیل

عکسِ مکتوب ---------- حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکیؒ ---------- الف
〃 〃 ---------- قطب الارشاد حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ ---------- الف
عکس اجازت نامۂ بیعت ---------- حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ ---------- ب
عکس اجازت نامۂ حدیث ---------- 〃 〃 〃 〃 〃 ج
عکس مسودۂ معارف القرآن ---------- حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب قدس سرہٗ د
عکس خاکہ قراردادِ مقاصد ---------- شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد صاحب عثمانی و حضرت مفتی اعظمؒ ۲۲۱
تصویر نشست گاہ ---------- حضرت مفتی اعظمؒ ---------- آرٹ پیپر ص ۷
تصویر مزار مبارک ---------- 〃 〃 〃 ---------- آرٹ پیپر ص ۸
تصاویر دارالعلوم کراچی ---------- ۱۳۶۹

○

ذکر و فکر

حمد و ستائش اُس ذات کے لیے جس نے کارخانۂ عالم کو وجود بخشا اور
درود و سلام اُس کے آخری پیغمبر پر جنھوں نے دُنیا میں حق کا بول بالا کیا

الحمد للہ، کہ ہمیں آج، البلاغ کی یہ خصوصی اشاعت قارئین کی خدمت میں پیش کرنے کی توفیق ہو رہی ہے جو اس کے بانی و سرپرست مفتیِ اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے تذکرے کے لیے مختص ہے۔ ہمیں ندامت کے ساتھ احساس ہے کہ اس اشاعت کے انتظار میں محترم قارئین کو بڑی زحمت اُٹھانا پڑی لیکن اب اس تاخیر کے اسباب کا تذکرہ اضاعتِ وقت کے سوا کچھ نہیں۔

بہرکیف! جس چیز کا ڈھائی سال سے انتظار تھا، بفضلہٖ تعالیٰ اب وہ آپ کے سامنے ہے، اور اللہ تعالیٰ کی رحمت سے پوری اُمید ہے کہ انشاء اللہ قارئین اسے "دیر آید درست آید" کا مصداق پائیں گے اور وہ تنوع کے لحاظ سے نہ صرف پسندِ خاطر ہوگی بلکہ اس سے گوناگوں علمی اور عملی فوائد کا ایک گنجِ گراں مایہ محفوظ ہو جائے گا۔

ہماری کوشش شروع ہی سے یہ رہی ہے کہ یہ خصوصی اشاعت ایک خشک تاریخ یا محض مناقب و فضائل کے بیان تک محدود نہ ہے بلکہ اس سے علم میں اضافہ، جذبۂ عمل میں ترقی اور زندگی کے عملی مسائل میں رہنمائی حاصل ہو سکے، یہ نمبر اسی نقطۂ نظر سے ترتیب دیا گیا ہے اور شاید یہ کہنا بے جا نہ ہو کہ انشاء اللہ اس کے مطالعے سے اُس حسین سیرت و کردار اور لطیف مزاج و مذاق کی ایک تصویر سامنے آسکے گی جو اکابر علمائے دیوبند کا طرۂ امتیاز رہا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی مقدس شخصیت اور آپ کے علمی و عملی کارناموں کے اتنے بے شمار پہلو ہیں کہ انھیں ایک جلد میں سمیٹنا سب سے بڑا مسئلہ تھا اور آج پونے چودہ سو صفحات کی یہ ضخیم جلد پیش کرنے کے باوجود ہمیں رہ رہ کر یہ احساس ہوتا ہے کہ اس عظیم شخصیت کے کتنے پہلو ایسے ہیں

جن کے لیے اتنے صفحات کی وسعت بھی ناکافی ہے لیکن اب اس نمبر کی ضخامت میں مزید اضافے کی گنجائش نہ تھی، اس لیے ان پہلوؤں کو اس مفصل سوانح پر چھوڑ دیا گیا ہے جس کے لیے یہ نمبر انشاء اللہ بہترین بنیاد ثابت ہوگا۔

اس قسم کے نمبروں میں عموماً ایک ہی بات کا بار بار تکرار ہوا ہی کرتا ہے لیکن ہم نے حتی الامکان اس تکرار کو کم سے کم کرنے کی پوری کوشش کی ہے، جو بات کسی ایک مضمون میں تفصیل سے آچکی ہو، اُسے دوسرے مضامین سے حذف کر دیا ہے، الّا یہ کہ کسی دوسری جگہ وہ کسی نئے فائدے کے ساتھ آئی ہو۔ اس کے باوجود بعض مضامین میں ایسا کرنا ممکن نہ تھا، اس لیے شاید چند مقامات پر اب بھی تکرار رہ گیا ہو جو ایک مجبوری تھی۔

جن مضامین کو اشاعت کے لیے منتخب کیا گیا تھا، اُن کے صفحات کی تعداد تقریباً ڈیڑھ ہزار ہو چکی تھی لیکن چونکہ یہ ضخامت ناقابلِ تحمل تھی اس لیے بہت سے مضامین روک لیے گئے اور بہت سے مضامین میں اختصار کیا گیا، ہم ان کے فاضل مضمون نگاروں سے معذرت خواہ ہیں لیکن اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہ تھا۔

آخر میں ادارۂ "البلاغ" اُن تمام حضرات کا تہِ دل سے شکر گزار ہے جنھوں نے اس نمبر کے لیے گرانقدر مضامین عنایت فرمائے یا اس کی اشاعت میں کسی بھی جہت سے حصّہ لیا۔ ادارۂ "البلاغ" محترم زرنگار حضرت سید انور حسین صاحب نفیس الحسینی دامت برکاتہم اور اُن کے رفقاء کا بطورِ خاص بے حد ممنون ہے جنھوں نے نمبر کی کتابت و تزئین کے لیے وقت اور محنت کی قربانی میں کوئی کسر اُٹھا نہیں رکھی۔ اُن کی پُرخلوص کوششیں ہر رسمی شکریے سے بالاتر ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان حضرات کی کوششوں کو دنیا و آخرت میں بار آور فرمائے، مسلمانوں کو اس اشاعت سے نفع پہنچائے اور اسے اپنی بارگاہ میں شرفِ قبولیت عطا فرمائے آمین یا ربّ العالمین۔ وما علینا الا البلاغ

محمد تقی عثمانی

دارالعلوم کراچی ۱۴

محمد تقی عثمانی

حضرتِ والدؒ کی وفات پر

کیوں تیرہ و تاریک ہے نظروں میں جہاں آج
کیوں چھائے ہیں ہر سمت یہ ظلمت کے نشاں آج
کیا نخلِ تمنا کو مرے آگ لگی ہے ؟
رہ رہ کے یہ سینے سے جو اٹھتا ہے دھواں آج
رفتارِ تنفس ہے کہ چلتے ہوئے آرے؟
کیوں جرعۂ زہراب ہے یہ شربتِ جاں آج
کیا حضرتِ والدؒ کو قضا لے کے چلی ہے؟
اِک قافلۂ نور ہے گردوں پہ رواں آج
ابا مرے جنت کے بسانے کو چلے ہیں
اے موت! ترا مرتبہ پہنچا ہے کہاں آج
یوں برق و شرر نے مرا پھونکا ہے نشیمن
باقی ہے کوئی شاخ، نہ تنکوں کا نشاں آج
اب زیست کا ہر مرحلہ نظروں میں کٹھن ہے
گرداب بلاخیز ہے یہ نہر رواں آج
کانٹوں کا بچھونا ہے ہر اک تختۂ گل بھی
چبھتی ہے مری روح میں خوشبوئے جناں آج

بازی کبھی ہم زیست میں ہارے نہ تھے کوئی
تُو جیت گئی ہم سے مگر فصلِ خزاں، آج

دل میں وہ تلاطم ہے کہ ہلچل سی مچی ہے
اور آنکھ ہے ظالم! کہ بس اِک خشک کنواں آج

وہ والدِ مُشفق، وہ مرے شیخ و مُربّی
کس دیس کی بستی میں ہیں آرام کُناں آج

کیا سچ ہے کہ اب اُن کو نہ میں دیکھ سکوں گا
یا دیکھ رہا ہوں میں کوئی خوابِ گراں آج

وہ چہرۂ پُر نور کی تابندہ ضیائیں
صد حیف! کہ ہیں خاک کے تودے میں نہاں آج

وہ پھول چُنا میرے گلستاں سے اجل نے
جس پھول کی خوشبو سے معطر ہے جہاں آج

وہ اُسوۂ اسلاف کی رخشندہ علامت
اے خاک بتا! تو نے چھپائی ہے کہاں آج

وہ عظمتِ اسلام کا تابندہ ستارہ
توصیف سے جس کی مری عاجز ہے زباں آج

وہ مشعلِ ایمان، کہ بھٹکے ہوئے راہی
پاتے ہیں جسے دیکھ کے منزل کا نشاں آج

وہ معرفت و علم کا مہتابِ فروزاں
ہے چشمِ فلک! کون سی بدلی میں نہاں آج

وہ گنجِ گراں مایہ علومِ نبوی کا
عالم میں اسی فیض کے دریا ہیں رواں آج
وہ مفتیٔ اعظم، وہ معارف کا خزینہ
وہ جس کے فتاویٰ سے منور ہے جہاں آج
کس شان سے قرآں کے بکھیرے ہیں معارف
دُنیا ہے کہ اِک سلسلۂ کاہکشاں آج
وہ اشرفؒ و محمودؒ کا اِک ذکرِ سراپا
وہ انورؒ و شبیرؒ کا اندازِ بیاں آج
وہ بیکس و مظلوم کی آہوں کا سہارا
کیا ہو گیا وُہ مرہمِ افسردہ دلاں آج
یہ مسندِ افتا ہے کہ ویران پڑی ہے
ہے دینی مدارس میں بس اِک ہُو کا سماں آج
اب کون بنے وارثِ غم ہائے زمانہ؟
کس کو ہے مسلماں کا غمِ سُود و زیاں آج
اب کون ہے دُنیا میں جو پُوچھے گا تقی کو
کس فکر میں ہے؟ کیوں نہیں آیا؟ ہے کہاں آج
دُنیا ہے مرے دوستو! مٹی کا گھروندا
اور زندگی اِک کارگہِ شیشہ گراں آج
باقی کوئی دُنیا میں رہا ہے، نہ رہے گا
جانا ہے اُسے کل، کہ جو آیا ہے یہاں آج

دیکھو تو ہر انساں کے تعاقب میں اجل ہے
سوچو تو لبِ گور ہے ہر پیر و جواں آج

جو مرکزِ اُلفت تھے، جو گلزارِ نظر تھے
ہیں خاک کا پیوند وہ اجسامِ بتاں آج

وہ دبدبہ جن کا تھا کبھی دشت و جبل میں
وہ تاج سکندر ہے، نہ وہ تختِ کیاں آج

وہ جن کے تہور سے دہلتی تھیں زمینیں
ڈھونڈے سے بھی اُن کا کہیں ملتا ہے نشاں آج؟

تھیں جن کی جھلا جھل سے چکا چوند نگاہیں
حسرت کے کھنڈر ہیں وہ محلاتِ شہاں آج

جن باغوں کی نکہت سے معنبر تھیں فضائیں
ہے مرثیہ خواں اُن پہ ببولوں کی زباں آج

دُنیا تو بس اِک مرحلہ ہے راہِ عدم کا
اور موت کے محمل میں ہے رختِ دل و جاں آج

ناگاہ کوئی دم میں یہ لد جائے گا ڈیرا
دھوکے ہیں یہ سب، جن پہ ہے منزل کا گماں آج

آسی یہ غنیمت ہیں تری عمر کے لمحے
وہ کام کر اب، تجھ کو جو کرنا ہے یہاں آج

قدرِ جوہر

اکابرِ عصر کے تأثرات

"میں خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ ہم اگر اپنی اصلاح کرلیں، تو تمام دُنیا سُدھر سکتی ہے اور بغیر کسی ظاہری تبلیغ کے بھی بہت کچھ سُدھر سکتی ہے۔ ہمارے اسلاف نے الفاظ سے زیادہ کردار سے اسلام کی تبلیغ کی ہے"

(حضرت مفتیٔ اعظمؒ: علماء و طلباء کے نام۔ ص ۲۰)

"دُنیا کا تجربہ اس بات کا گواہ ہے کہ نرا قانون کبھی کسی قوم کی اصلاح نہیں کرسکا اور جب تک قانون کی پُشت پر ایک "مضبوط رُوحانی عقیدہ" نہ ہو، ظلم و استحصال کو روکا نہیں جاسکتا"

(حضرت مفتیٔ اعظمؒ: اسلامی نظام میں معاشی اصلاحات۔ ص ۲۷)

شیخ الحدیث امام العصر حضرت مولانا محمد زکریا صاحب دہلوی
مدظلہم العالی

حضرت مفتی صاحبؒ کی کچھ باتیں

عزیزم مولوی محمد تقی سلمکم اللہ تعالیٰ وسلمکم بعد حمد تہ ودینہ

بعد سلام مسنون تمہارا خط پہنچا جس میں تم نے البلاغ کے مفتی اعظم نمبر کے لیے کچھ لکھنے کو فرمایا ہے تمہیں معلوم ہے کہ میں مریض اور معذور ہوں ضعف اس قدر ہے کہ اپنی ڈاک بھی خود نہیں لکھ سکتا۔ دوسرے افراد سے املا کراتا ہوں اور مضمون لکھنا تو مجھے آتا ہی نہیں پھر بہت پرانی پرانی یادداشتوں کو دماغ میں لانا اور صفحۂ قرطاس کے حوالے کرنا آج کل کے ضعف اور بڑھاپے کے زمانے میں بہت ہی مشکل ہے بہت سے حضرات نے اکابر پر رسالوں کے نمبر نکالے اور اس ناکارہ کو لکھنے کا حکم دیا مگر میں تعمیل حکم سے عاجز رہا لیکن تمہارا خط مجلس میں سنا گیا تو احباب نے کہا کہ کچھ نہ کچھ لکھوادیں اور میری ڈاک لکھنے والوں نے بتلایا کہ حضرت مفتی صاحب نور اللہ مرقدہٗ کا بہت سا تذکرہ آپ بیتی نمبر ۵ میں آگیا ہے جو ابھی تک غیر مطبوعہ ہے۔ اس میں مفتی صاحب سے جو بعض امور میں خط وکتابت ہوئی تھی وہ بھی آگئی ہے۔ اس ناکارہ نے اپنے حافظہ پر زور ڈال کر تھوڑا سا کچھ لکھوادیا اور باقی مضمون آپ بیتی نمبر ۵ سے اخذ کرلیا گیا اور اس طرح سے مسلسل ایک مضمون کی صورت بن گئی جو ارسال خدمت ہے۔

حضرت مفتی صاحبؒ سے میرے تعلقات اُس وقت سے تھے جب کہ میں اور وہ نئے نئے مدرس ہوئے تھے۔ وہ دارالعلوم دیوبند میں اور میں مظاہر علوم سہارنپور میں پڑھاتا تھا مگر صحیح ملاقات اور بے تکلفی اس وقت شروع ہوئی جب حضرت مفتی صاحب نے پیشوں کے متعلق ایک رسالہ لکھا تھا جس کا نام نہایات الارب فی غایات النسب تھا۔ اس رسالہ میں تفاخر بالانساب کی مذمت کی گئی

ہے اور کفاءت کی شرعی حیثیت بتائی اور مساوات کا شرعی مطلب سمجھایا ہے اور اسی ذیل میں کچھ پیشہ وروں کی مذمت بھی آگئی، مساوات اور شیوخ میں سے تو کسی نے بُرا نہ مانا، جن کے تفاخر کی وجہ سے مذمت کی گئی تھی لیکن پیشہ وروں نے اس کا بُرا اثر لیا۔ اس رسالہ کی وجہ سے غیر منقسم ہندوستان میں بڑا ہنگامہ مچا اور اخبارات میں بھی بہت سے دے ہوئی۔ دار العلوم سے مطالبہ کیا گیا کہ حضرت مفتی صاحبؒ کو افتاء سے ہٹا دیا جائے۔ اس وقت میری جوانی کا جوش تھا، قوت اور طاقت، مطالعہ کا شوق تھا، کتب حدیث دیکھنے کا اور تخریج روایات کا شغف تھا۔ میں نے ایک بہت طویل رسالہ لکھ کر حضرت مفتی صاحب کی خدمت میں بھیجا جس میں حضرت مفتی صاحبؒ کے رسالہ کی تائید کی اور ان روایات کی تخریج کے علاوہ جو انہوں نے اپنے اصل رسالہ میں درج کی تھیں اور بہت سی روایات جمع کیں اور ساتھ ہی یہ بھی لکھا تھا کہ حقیقت میں حضرت مفتی صاحبؒ کے رسالہ میں جو کچھ لکھا گیا ہے یہ پیشوں کی بُرائی نہیں ہے بلکہ ان عیوب کی بُرائی ہے جو ان پیشوں والوں میں ہوتے ہیں ان لوگوں کو ان عیوب سے بچنا چاہئیے۔ رسالہ میں جن کی نشاندہی کی گئی ہے۔ بُرا ماننے کی نہ کوئی ضرورت ہے نہ اس کا کوئی موقع ہے۔ اگر کسی عالم و مفتی نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے وہ ارشادات یکجا جمع کر دیے جن میں مختلف پیشہ وروں کے عادات و خصائل کی مذمت ہے تو اس میں ناراضگی کی کوئی وجہ نہیں ہے بلکہ جس شخص نے یہ روایات جمع کیں اس کا شکر گزار ہونا چاہئیے کہ اس نے حدیث کی روشنی میں ہمارے عیوب کی نشاندہی کی ہے۔ اگر کوئی شخص حدیث اکذب الناس الصواغون اپنے رسالہ میں نقل کر دے تو اس میں اس ناقل پر کیا الزام ہے۔ تجربہ شاہد ہے کہ حدیث میں جو کچھ فرمایا ہے بالکل صحیح ہے جس کسی نے شادی کے موقعہ پر سناروں سے زیور بنوائے ہوں اسے ان کے جھوٹے وعدوں کا پورا پورا تجربہ ہوا ہوگا۔ صواغین کو لازم ہے کہ صفت کذب کو چھوڑیں نہ یہ کہ حدیث نقل کرنے والے پر سب وشتم کی بوچھاڑ کر دیں اور اسے افتاء کی خدمت سے ہٹانے کی کوشش کریں۔ حدیث شریف میں ہے کہ سب سے پہلے جن لوگوں کے بارے میں فیصلہ ہوگا تین شخص ہوں گے۔ ایک عالم، دوسرا سخی، تیسرا شہید۔ اور ریاکاری کی وجہ سے ان کو دوزخ میں ڈال دیا جائے گا اور یہ سب سے پہلے وہ تین آدمی ہوں گے جن سے دوزخ کو مزید گرم کرنے کے لیے دہکایا جائے گا۔ ظاہر ہے کہ حدیث میں ریاکاری کی مذمت ہے، سخاوت اور علم اور جہاد کی مذمت نہیں ہے اسی طرح پیشہ وروں کی صفات ذمیمہ بیان کرنے سے پیشہ کی بُرائی بیان کرنا مقصود نہیں بلکہ ان عیوب

کی بُرائی ہے جو ان پیشہ وروں میں ہوتے ہیں۔

رسالہ شائع ہُوا تو نہ صرف پیشہ وروں کے عوام نے اُلٹا اثر لیا بلکہ ان کے رؤسا، کبرا اور کچھ پکے اہلِ علم بھی ان کی ہنگامہ آرائی میں شریک ہو گئے اور خود کو بدلنے کے بجائے دار العلوم دیو بند کے دار الافتا کا نظام بدلوانے کے درپے ہو گئے۔ اس سلسلہ کی سب سے زیادہ تکلیف دہ بات یہ ہے کہ ان لوگوں نے بڑا ظلم یہ کیا تھا کہ مفتی صاحب پر سب و شتم کے علاوہ ان کتابوں پر بھی بڑے زور و شور سے غم نش کیا تھا جن میں یہ حدیثیں موجود ہیں۔ مجھے بڑا غصہ اسی پر آیا تھا۔ اگر اسی طرح کے لوگوں کی ذرا سی بھی جنبانی کی جانے تو فتنۂ انکارِ حدیث کا دروازہ کھُل جائے گا اور کتبِ حدیث کی حیثیت اور وقعت ذہنوں سے کم ہوتی چلی جانے گی۔ آج کل بھی ایسے مصنفین پائے جاتے ہیں جنھیں کوئی روایت کسی کتاب میں اپنے کسی مخصوص مسلک کے خلاف نظر آجاتی ہے تو اوّل تو اس کتاب کے مصنفین ہی کی خبر لیتے ہیں پھر کتاب ہی کو یکسر غلط بنا دیتے ہیں اور ان سب روایات کو بھی مجروح قرار دینے کی کوشش کرتے ہیں جو اس کتاب میں موجود ہوں اگرچہ ان کی اسانید صحیح ہوں۔ ایسے ہی لوگوں کو سلف کی اصطلاح میں "اہلِ ہوٰی" کہا جاتا ہے جن کا مقصود قرآن اور حدیث پر چلنا نہیں بلکہ اپنا جو ایک مسلک طے کر لیا، اسی کے گرد گھومتے اور آیات اور احادیث کی تاویل اور تحریف کر کے اسی کے مطابق بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ معتزلہ، روافض، خوارج اور نئے دور کے معتزلہ مزاج منکرین اور مصلحین کا یہی حال ہے۔

جو مسودہ اس وقت میں نے لکھ کر بھیجا تھا وہ تو اس وقت سامنے نہیں جہاں تک یاد ہے حضرت مفتی صاحبؒ کے اصل رسالہ سے چوگنا تھا۔ حضرت مفتی صاحبؒ نے میرے مضمون کو بہت پسند کیا تھا اور بہت داد دی تھی مگر اس کو شائع کرنے کی نوبت نہیں آئی۔ مفتی صاحب نے تو اس لیے شائع نہیں کیا کہ ان کو اپنا اصل رسالہ بھی بھاری پڑ رہا تھا اور مختلف برادریوں کے عوام کا زور و شور دیکھ کر دار العلوم دیو بند کے اہلِ انتظام پریشان ہو رہے تھے اور میرا لنہ جاننا تبدیلی کی بنا پر تھا" "ترکی پہ تازی کا نیا" پرانی مثل ہے۔ دار العلوم تو نرغہ میں ہے ہی مظاہر علوم کو بھی کیوں جاہلوں کا نشانہ بنایا جائے دار العلوم والے تو بہ سے زیادہ مجبور ہیں وہی کچھ ذکر سکے تو ہم تبدیل کیا کر سکتے ہیں۔ اس کے بعد حضرت مفتی صاحب سے برابر تعلقات بڑھتے چلے گئے اور مفتی صاحب کے الطاف اور شفقتوں میں لورا بھی بے تکلفی میں اضافہ ہی ہوتا رہا۔ حضرت مفتی صاحب جب کبھی تھانہ بھون حاضری دینے کے لیے تشریف

لے جاتے تو ذرا بابا ایا خواہ تھوڑی دیر کو ہو اسٹیشن سہارنپور سے میل ڈیڑھ میل کا سفر کر کے اس ناکارہ کی ملاقات کے لیے ضرور تشریف لاتے تھے۔ جب پاکستان بن گیا اور اس کے ایک سال کے بعد حضرت مفتی صاحب کراچی تشریف لے گئے تو جب بھی کراچی سے دیوبند تشریف لاتے اس ناکارہ سے ملنے کے لیے سہارنپور ضرور تشریف لائے اور ایک شب قیام فرمایا۔ اس کے چند سال بعد اس ناکارہ کا حجاز مقدس آتے جاتے کراچی سے بارہا گزر ہوا اور تقریباً ہر مرتبہ دو تین روز کراچی میں قیام کرنے کا موقع ملا۔ اس موقع پر حضرت مفتی صاحب اپنے لڑکوں اور اپنے دار العلوم کے اساتذہ کے ساتھ بابر کی مسجد تشریف لا کر ملاقات فرماتے تھے اور میں بھی موقع نکال کر ضرور دار العلوم میں دو تین گھنٹے کے لیے جاتا تھا۔ اپنے ضعف اور معذوری کی وجہ سے گو یہ سفر لمبا ہو جاتا تھا کیونکہ مکی مسجد سے دار العلوم بارہ تیرہ میل کے لگ بھگ ہے لیکن میں حضرت مفتی صاحب کی شفقتوں کی وجہ سے ضرور حاضری دیتا تھا ۱۳۹۵ھ میں یہ ناکارہ جب سہارنپور سے براہ راست دہلی کراچی حجاز آرہا تھا تو کراچی کے دو تین روزہ زمانہ قیام میں اس ناکارہ نے دار العلوم کراچی میں بھی حسب عادت حاضری دی۔ حضرت مفتی صاحب اس وقت علیل تھے مجھے ان کی عیادت کے لیے جانا ضروری تھا ضعف کی حالت میں ایک چارپائی پر لیٹے ہوئے تھے۔ اس ناکارہ کو دیکھتے ہی بہت اظہار مسرت فرمایا اور ایک دوسری چارپائی اپنی چارپائی کے متصل اس ناکارہ کے لیے بچھوا دی۔ احباب تو ناشتہ وغیرہ کرتے رہے اور یہ ناکارہ حضرت مفتی صاحب کے پاس برابر کی چارپائی پر لیٹا رہا۔ میں اور مفتی صاحب اس طرح لیٹے تھے کہ ایک چارپائی پر یہ ناکارہ اور دوسری پر مفتی صاحب۔ سر دونوں کے آمنے سامنے اور پاؤں الگ الگ، مفتی صاحب نے اپنے مدرسہ کی بہت سی شکایات کیں۔ طلبا کی طرف سے حکومت کی طرف سے اور یہ کہ بعض طلبا کا مقصود پڑھنا نہیں ہوتا، غیروں کے تنخواہ دار محض فساد ڈالنے کے لیے ہمارے مدرسہ میں طالبعلم بن کر داخل ہوتے ہیں مفتی صاحب نے اس کی جزئیات بتائیں، زکریا نے بڑے اہتمام سے ساری گفتگو سنی اور کہا کہ یہ مشکلات آپ ہی کے یہاں نہیں ہم سب مدارس والوں کو پیش آتی ہیں صورت میں کچھ تھوڑا بہت فرق ہو جاتا ہے۔ ہمارے یہاں کے اسٹرائک ۱۳۹۲ھ میں اس کے بڑے تجربے ہوئے کہ مدارس بلکہ اسلام کے مخالفین نے لڑکوں کو تنخواہیں دے دے کر ہمارے یہاں اسٹرائک میں شریک کیا۔ میرے نزدیک تو ان سب کا واحد علاج ذکر اللہ کی کثرت ہے کہ جب کوئی بھی اللہ تعالیٰ کا نام لینے والا نہ ہوگا تو قیامت قائم ہو جائے گی

جب اللہ تعالیٰ شانہٗ کا پاک نام ساری دُنیا کو تھامے ہوئے ہے تو مدارس کے لیے بھی یہی بناء کی حیثیت ہے پھر مکہ مکرمہ پہنچنے کے بعد میں نے اس مضمون کو یاد دہانی کے طور پر مفتی صاحب کو اور مولانا بنوری نور اللہ مرقدہما الگ الگ لکھا خصوصی مضامین کے علاوہ مشترکہ مضمون دونوں میں یہ تھا۔

" مدارس کے روز افزوں فتن، طلباء کی دین سے بے رغبتی، بے توجہی اور لغویات میں اشتغال کے متعلق کئی سال سے میرے ذہن میں آرہا ہے کہ مدارس میں ذکر اللہ کی بہت کمی ہوتی جارہی ہے بلکہ معدوم بلکہ اس لائن سے تو بعض میں تنفر کی صورت دیکھتا ہُوں جو میرے نزدیک بہت خطرناک ہے ہندوستان کے مشہور مدارس دار العلوم، مظاہر علوم، شاہی مسجد مُراد آباد وغیرہ کی ابتدا جن اکابر نے کی تھی وہ سلوک میں بھی امام الائمہ تھے۔ ان ہی کی برکات سے یہ مدارس ساری مخالف ہواؤں کے باوجود اب تک چل رہے ہیں۔ مَیں اس مضمون کو کئی سال سے اہل مدارس منتظمین اور اکابر کی خدمت میں تحریراً و تقریراً لکھتا اور کہتا رہا ہُوں میرا خیال یہ ہے کہ آپ جیسے حضرات اس کی طرف توجہ فرمائیں تو مفید اور مؤثر زیادہ ہوں گے۔ مظاہر علوم میں تو میں کس درجہ میں اپنے ارادہ میں کامیاب ہوں اور دار العلوم کے متعلق جناب الحاج حضرت قاری محمد طیب صاحب سے بارہا تقریراً اور تحریراً عرض کر چکا ہوں اور بھی اپنے سے تعلق رکھنے والے اہل مدارس کو متوجہ کرتا رہتا ہُوں۔ مدارس کے روز افزوں فتنوں سے بہت ہی طبیعت کو کلفت پہنچتی رہتی ہے میرا خیال یہ ہے کہ فتنوں سے بچاؤ کی صورت صرف ذکر اللہ کی کثرت ہے جب اللہ کا نام لینے والا کوئی نہ رہے گا تو دُنیا ختم ہو جائے گی۔ جب اللہ تعالیٰ کے پاک نام کو اتنی قوت ہے کہ ساری دُنیا کا وجود اسی سے قائم ہے تو مدارس بے چارے دُنیا کے مقابلہ میں دریا کے مقابلہ میں قطرہ بھی نہیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے پاک نام کو ان کی بقاء اور تحفظ میں جتنا دخل ہوگا وہ ظاہر ہے اکابر کے زمانے میں ہمارے ان جملہ مدارس میں اصحاب نسبت و ذاکرین کی کثرت جتنی رہی ہے وہ آپ سے بھی مخفی نہیں ہے اور اب اس میں جتنی کمی ہو گئی ہے وہ بھی ظاہر ہے بلکہ اگر یُوں کہو کہ اس پاک نام کے مخالف حیلوں بہانوں سے مدارس میں داخل ہوتے جا رہے ہیں تو میرے تجربہ میں غلط نہیں اس لیے میری تمنا ہے کہ ہر مدرسہ میں کچھ ذاکرین کی تعداد ضرور ہُوا کرے۔ طلباء کے مستقل طور پر ذکر کرنے کے تو ہمارے اکابر بھی خلاف رہے ہیں اور میں بھی موافق نہیں۔ تصوف کے اذکار و اشغال میں مستقل لگنا تعلیم کے ساتھ جمع نہیں ہو سکتا لیکن منتہی طلباء یا فارغ التحصیل یا اپنے سے یا اکابر سے تعلق رکھنے والے ذاکرین کی کچھ

تعداد مدارس میں علی التبادل ضرور رہا کرے اور مدرسان کے قیام کا کوئی انتظام کر دیا کرے۔ مدرسہ پر طعام کا بار ڈالنا تو مجھے بھی گوارا نہیں کہ طعام کا انتظام تو مدرسہ کے اکابر میں سے کوئی شخص ایک یا دو اپنے ذمہ لے لے یا باہر سے مخلص دوستوں میں سے کسی کو متوجہ کر کے ایک ایک ذاکر کا کھانا اس کے حوالے کر دے جیسا کہ ابتدا میں مدارس کے طلبا کا انتظام اسی طرح ہوتا تھا البتہ اہل مدارس ان کے قیام کی کوئی صورت اپنے ذمہ لے لیں جو مدرسہ میں ہو اور ذکر کی کوئی ایسی مناسب تشکیل کریں کہ دوسرے طلبا کا کوئی حرج نہ ہو۔ نہ سونے والوں کا نہ مطالعہ کرنے والوں کا۔ جب تک اس ناکارہ کا قیام سہارنپور میں رہا تو ایسے لوگ بکثرت رہتے تھے جو میرے مہمان ہو کر ان کے کھانے پینے کا انتظام تو میرے ذمہ تھا لیکن قیام اہل مدرسہ کی جانب سے مدرسہ کے مہمان خانہ میں ہوتا تھا اور وہ بدلتے رہتے تھے۔ صبح کی نماز کے بعد میرے مکان پر ان کے ذکر کا سلسلہ ایک گھنٹہ تک ضرور رہتا تھا اور میری غیبت میں سُنتا ہوں کہ عزیز طلحہ[1] کی کوشش سے ذاکرین کی وہ تعداد اگرچہ نہ ہو مگر ۲۰، ۲۵ کی تعداد تو روزانہ ضرور ہو جاتی ہے میرے سہارنپور کے قیام کے زمانہ میں تو ۱۰۰، ۱۲۵ تک پہنچ جاتی ہے اور غیبت کے زمانہ میں بھی سنتا ہوں کہ ۴۰، ۴۵ کی تعداد عصر کے بعد جمعہ کے دن ہو جاتی ہے۔ ان میں باہر کے مہمان بھی ہوتے ہیں جو ۱۰، ۱۲ تک اکثر ہو جاتے ہیں۔ عزیز مولوی نصیر الدین سلمہ اللہ تعالیٰ اس کو بہت جزائے خیر دے ان کے کھانے کا انتظام میرے کتب خانہ سے کرتے رہتے ہیں۔ اسی طرح میری تمنا ہے کہ ہر مدرسہ میں دو چار ذاکرین مسلسل ضرور رہیں کہ داخلی اور خارجی فتنوں سے بہت امن کی اُمید ہے ورنہ مدارس میں جو داخلی اور خارجی فتنے بڑھتے جا رہے ہیں اکابر کے زمانہ سے جتنا بُعد ہوتا جائے گا اس میں اضافہ بھی ہوگا اس ناکارہ کو نہ تحریر کی عادت نہ تقریر کی۔ آپ جیسا کوئی شخص میرے اس مافی الضمیر کو زیادہ وضاحت سے لکھتا تو شاید اہل مدارس کے نزدیک اس مضمون کی اہمیت زیادہ ہو جاتی۔ اس ناکارہ کے رسالہ فضائل ذکر میں حافظ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب الوابل الصیب سے ذکر کے سو کے قریب فوائد نقل کیے گئے ہیں جن میں شیطان سے حفاظت کی بہت سی وجوہ ذکر کی گئی ہیں شیطان ہی سارے فتنے و فساد کی جڑ ہے۔ فضائل ذکر سے یہ مضمون بھی اگر جناب سُن لیں تو میرے مضمون بالا کی تقویت ہوگی۔ میرا

---

[1] حضرت شیخ الحدیث صاحب دامت برکاتہم کے صاحبزادے (رقاہ اللہ الی اوج الکمال) ۱۲

مضمون تو اس قابل نہیں جو اہلِ مدارس پر کچھ اثر انداز ہو سکے۔ آپ میری درخواست کو زوردار الفاظ میں نقل کرا کر اپنی یا میری طرف سے بھیج دیں تو شاید کسی پر اثر ہو جائے۔ دار العلوم، مظاہر علوم، شاہی مسجد کے ابتدائی حالات آپ کو مجھ سے بھی زیادہ معلوم ہیں کہ کن صاحب نسبت اصحاب ذکر کے ہاتھوں ان کی ابتداء ہوئی۔ ان ہی کی برکات سے یہ مدارس چل رہے ہیں۔ یہ ناکارہ دعاؤں کا بہت محتاج ہے۔ بالخصوص حسنِ خاتمہ کا کہ گور میں پاؤں لٹکائے بیٹھا ہے۔ فقط والسلام

حضرت شیخ الحدیث صاحب بقلم حبیب اللہ ۲۰ نومبر ۱۳۹۵ھ مکہ مکرمہ

میرے اس خط کے جواب میں مفتی صاحب محمد شفیع کا یہ جواب آیا:

"مخدومنا المحترم حضرت شیخ الحدیث صاحب متعنا اللہ تعالیٰ لطول حیاتہ بالعافیۃ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ آپ کا کرم نامہ اتنی جلد خلافِ وہم و گماں کے پہنچا اور مع تفصیل پہنچا کہ حیرت ہوگئی مگر حقیقت یہ ہے کہ عرصہ دراز سے آنمخدوم کے تمام ہی معاملات بالکل خرقِ عادت اور کرامت ہی کے قبیل سے نظر آتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اس کو افادۂ خلق اللہ کے لیے دائم و باقی رکھے۔ نظر اب لکھنے پڑھنے کے قابل نہیں رہی۔ گرامی نامہ بھی عزیزوں سے پڑھوا کر بار بار سنا۔ دل میں داعیہ پیدا ہوا کہ آپ کے ارشاداتِ عالیہ کو ذرا شرح و بسط کے ساتھ لکھ کر خوب شائع کیا جائے مگر ابھی تک طبیعت اس قابل بھی نہیں ہوئی کہ دوسروں کو املا کرا سکوں۔ خدا کرے کہ ذرا قوت و ہمت پیدا ہو جائے تو یہ کام پورا کروں۔ آپ کی شفقت و عنایات تو ہمیشہ سے ہیں، اس گرامی نامہ نے تو گویا مسحور ہی کر دیا متعنا اللہ تعالیٰ بافاداتکم فضائل ذکر کا مطالبہ حصہ احقر نے پورا سن لیا ہے اور ایک عنوان کے ساتھ اس کا مضمون بھی ذہن میں آ رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ آسان فرما دے تو تشریح کے ساتھ ورنہ پھر خود حضرت کا گرامی نامہ بعینہٖ شائع کر دینا بھی بہت مفید ہوگا۔ ایک امر عجیب ہے کہ اس مرتبہ جب مجھے دوسری مرتبہ دل کا دورہ پڑا اور ہسپتال میں دو ہفتے رہنا پڑا جب وہاں سے فراغت کے بعد گھر آیا تو انتہائی ضعف کے باوجود دو تین باتیں بڑی قوت سے دل میں وارد ہوئیں جن کا خیال عرصہ تین سال سے تقریباً لگا ہوا تھا۔ ربیع الثانی ۱۳۹۱ھ میں مجھے پہلا دل کا شدید دورہ پڑا ہوا تھا۔ اس سے شفا کے بعد بھی طبیعت میں زندگی سے ایک مایوسی تھی اور اس کی وجہ سے دار العلوم کے معاملات میں یہ خیال بار بار آتا تھا کہ جب کسی اصلاحی امر میں اقدام کی ضرورت ہوئی۔ تو نفس یہ کہتا تھا کہ تو تو اب مر رہا ہے۔ اب کوئی نیا کام کرنے کا وقت نہیں، تیرے بعد جو لوگ اس کے

مشکل ہوں گے وہ خود دیکھ لیں گے اور کرلیں گے۔ اس مایوسانہ خیال سے بہت سے کام رہ گئے مگر اب دوسرے دورے میں جب کہ سب ڈاکٹروں کو بھی مایوسی تھی پھر اللہ تعالیٰ نے حیات ثانیہ عطا فرمادی تو بڑی قوت سے یہ خیال آیا کہ دارالعلوم میں جو خرابیاں مجھے نظر آرہی ہیں آخر دم تک جتنی قوت اللہ تعالیٰ نے دی ہے اس کی اصلاح میں ضرور خرچ کرنا چاہیے۔ نتائج کی ذمہ داری بندہ پر نہیں۔ اپنا کام مقدور کی حد تک ضرور کرنا چاہیے اور دوسری بات یہ ذہن میں آئی کہ میں دیکھتا ہوں کہ دارالعلوم کے طلبار بلکہ اساتذہ اور تمام متعلقین میں نماز جماعت کی پابندی بہت کم ہوتی جارہی ہے۔ نماز کا اہتمام گویا ذہنوں سے جارہا ہے۔ اس لیے اب میں سب مدرسین کو جمع کرکے علیحدہ علیحدہ اور طلبار کو جمع کرکے علیحدہ اس کی پابندی کے لیے کہوں گا۔ اس کا پہلا قدم تو اپنے گھر سے شروع کر دیا کہ اس معاملہ میں سُست تھے۔ ان کو اور سب گھر والوں کو اس کا پابند کر دیا کہ اب سے اگر کسی کی کوئی نماز قضا ہوگئی تو ایک روپیہ صدقہ کرنا ہوگا اور جماعت قضا ہوگئی تو چار آنے کا۔ الحمد للہ یہ نسخہ گھر میں تو کامیاب ہوگیا مگر ابھی تک اتنی قوت نہیں آئی کہ طلبار و مدرسین کو جمع کرکے خطاب کروں۔ اُمید کر رہا ہوں کہ انشاراللہ چند روز میں یہ بھی ہوجائے گا اور حضرت کا گرامی نامہ وصول ہونے کے بعد سے کچھ ایسے ذاکر شاغل لوگ جن کا مجھ سے تعلق ہے اور پہلے سے یہ کہا کرتے تھے کہ ہم کچھ عرصہ دارالعلوم میں رہ کر ذکر شغل کریں۔ میں اپنی بیماری اور عدم فرصت کا عُذر کرکے دفع کر دیتا تھا۔ اب الحمد للہ تعالیٰ یہ کام شروع کر دیا ہے۔ دُعا فرمائیں اللہ تعالیٰ کامیابی عطا فرمائے۔ اپنے لڑکوں میں سے جو دو عالم ہیں ان دونوں کو احقر اصلاح ظاہر و باطن اور ذکر و شغل سکھانے کے لیے ڈاکٹر عبدالحی صاحب کے سپرد کیا ہے کیونکہ گھر کے اندر یہ کام ہونا مُشکل نظر آیا۔ یہ دونوں وہاں حاضری دیتے ہیں لیکن ابھی اتنا شغف نہیں جتنا ہونا چاہیے تاہم کچھ کام شروع کیا ہُوا ہے۔ آپ ان دونوں کے لیے خصوصی دُعا فرماویں کہ اللہ تعالیٰ ان کو اپنے بزرگوں کے نقشِ قدم پر چلنے کی مکمل توفیق عطا فرمائے۔ والسلام

بندہ محمد شفیع ۱۲ ذوالحجہ ۱۳۹۵ھ جمعرات

بندہ نے اس گرامی نامہ کا جواب یہ لکھا :

مکرم و محترم حضرت مفتی صاحب دامت معالیکم — بعد سلام مسنون

اس وقت شدید انتظار میں گرامی نامہ مورخہ ۱۲ ذوالحجہ مجازی ۲۴ ذوالحجہ کو پہنچا۔ مجھے شدت سے اپنے اس خط کے پہنچنے کا انتظار تھا۔ گرامی نامہ سے بہت ہی مسرت اور طمانیت ہوئی کہ جناب کو خود

بھی اس کا احساس ہُوا، اور میرا عریضہ محرک ہُوا۔ یہ ناکارہ تو معلوم کئی سال سے خط سُننے میں اور لکھوانے میں دُوسروں کا محتاج ہے۔

اس داعیہ سے کہ میرے خیالات کو آپ اپنے کلام میں شرح و بسط کے ساتھ تحریر فرمادیں گے بہت مسرت ہُوئی، یقیناً وہ زیادہ مفید ہوگی۔ میری تحریر تو بے ربط اور بے سروپا ہوتی ہے، تحریر کی مشق نہ تقریر کی، میں نے تو خود بھی درخواست یہی کی تھی کہ اس مضمون کی روشنی میں جناب خود تحریر فرمادیں تو زیادہ مفید ہوگا۔ اس ناکارہ کو اپنے اکابر کے حالات سُننے پڑھنے کا تو بچپن سے اشتیاق ہے، شاید پہلے بھی لکھا ہوگا کہ "اشرف السوانح"، "اسیر مالٹا"، حضرت میاں صاحبؒ کی تحریر فرمودہ "حیات شیخ الہند" جو چھپتی رہیں، ایک ایک رات میں دیکھتا رہا، جب صحت اور شباب تھا تو ساری رات جاگنا بہت آسان تھا۔ اب اپنی محتاجگی اور معذوری نے بہت پریشان کر رکھا ہے۔

فضائلِ ذکر کا مضمون آپ نے سُن لیا اور ایک عنوان کے ساتھ جناب کے ذہن میں مضمون بھی آ گیا اس سے بہت مسرت ہوئی، یہ زیادہ مفید ہوگا۔ جناب نے پہلے قلبی دورہ کے بعد جو مایوسانہ خیال لکھا ہیں تو اس میں آپ کے ہم خیال نہیں ہُوا۔ میرا تو خیال یہ ہے کہ اس ضعف و پیری اور مایوسی عن الحیات میں بھی جو نیک خیال دل میں آئے اس کو ضرور شائع کر دیا جائے کہ بعد والوں کے لیے اسوہ اور کام کرنے والوں کے لیے رہنمائی کا سبب ہے، میرا خیال یہ ہے اور بہت قوت سے ہے کہ اکابر کی آنکھیں جنھوں نے دیکھی ہیں یا صحبت اُٹھائی ہے ان کو بعد میں آنے والوں کے لیے جو اکابر کی نگاہوں سے بھی محروم رہیں جو ہو سکے تمن یا مستودہ کی طرح مزدور سامنے کر دینا چاہیے کہ کم سے کم ان کے لیے اس ماحول سے مناسبت تو رہے، میں تو جناب کے دوسرے دورہ کے بعد کے خیال کا ہمنوا ہُوں، ضرور جو امور خیر بڑوں سے حاصل کیے ہیں وہ ربط بے ربط بعد والوں کے لیے تحریراً یا تقریراً شروع کر جائیں۔ آپ نے نماز قضا ہونے پر صدقہ بعنوان جُرمانہ تجویز کیا، بہت مناسب ہے، اس کا شدت سے نفاذ کریں اور اس کا مطالبہ بھی فرمائیں کہ ادا کر دیا یا نہیں؟ آپ کے بعد بھی متعلقین اور آپ کے قائم مقام ہوں گے

اس مژدہ سے بہت ہی مسرت ہُوئی کہ آپ نے ذاکرین کے دارالعلوم میں اجتماع کا اہتمام شروع فرمادیا۔ اللہ مبارک کرے اور موجب خیر بنائے، آپ نے اپنے صاحبزادوں کو ڈاکٹر عبدالحی صاحب کے حوالے کر دیا بہت اچھا کیا، مگر شرط یہ ہے کہ ان کے دلوں میں ڈاکٹر صاحب کی محبت و وقعت پیدا

ہو اور آپ خود بھی بہت اہتمام سے اس کی نگرانی کیا کریں کہ وہ ڈاکٹر صاحب کے فرمودات پر اہتمام سے عمل بھی کریں اور وقعت بھی دیں۔ مولویوں میں ایک خاص مرض یہ ہوتا ہے کہ ان کے دلوں میں اپنی علمیت کے گھمنڈ میں اپنے سے جو اعلم نہ ہو اس کی وقعت کم ہوتی ہے۔ اس سلسلہ میں ان بچوں کو یہ مضمون ضرور سناتے رہیں کہ رشید و قاسمؒ نے حضرت حاجی صاحبؒ سے بیعت کی اور جب لوگوں نے دونوں سے الگ الگ اعتراض کیا تو جو ان کی شان تھی وہی جواب دیا، حضرت گنگوہیؒ نے فرمایا کہ ہم میں علم تو زیادہ تھا مگر آگ جو حضرت حاجی صاحبؒ میں تھی وہ ہم میں نہیں تھی، اور حضرت نانوتویؒ نے یہ فرمایا کہ وہ عالم تو نہیں مگر عالم گر تھے۔ (زکریا)

اس مضمون کو میں تو نہ لکھوا سکا ہوں مگر آپ خوب سمجھ گئے ہوں گے۔ یہ ناکارہ ان دونوں بچوں کے لیے دل سے دعا کرتا ہے مگر آپ کی دعائیں ان کے حق میں زیادہ قوی ہیں اور نگرانی اس سے بھی زیادہ قوی ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو صحت و قوت زیادہ سے زیادہ عطا فرمائے کہ آپ کے فیوض و برکات سے لوگوں کو بہت زیادہ نفع ہے، خدا کرے صاحبزادگان کو میری یہ تحریر گراں نہ ہو اور اس سے زیادہ سخت بات لکھوں جو میرے والد صاحب کا مشہور فقرہ ہے جو سینکڑوں دفعہ کا سنا ہوا ہے اور اپنے اوپر کا تجربہ کیا ہوا ہے، وہ فرمایا کرتے تھے کہ صاحبزادگی کا شور بہت دیر میں نکلتا ہے اور اس مصلحت سے وہ بے وجہ مجمع میں "ضرب بلاضرب" بھی مجھے کر دیتے تھے، اور میرے چچا جان کا معاملہ میرے ساتھ باوجود ان کے چچا اور استاد اور نائب شیخ ہونے کے ایسا رہتا تھا کہ میں اس سے خود شرمندہ ہو جاتا تھا۔ مگر اس سب کے ساتھ کبھی کبھی مجھے مجمع میں ڈانٹ بھی دیتے تھے، ایسے ہی موقع پر حضرت رائپوریؒ نے ان سے عرض کیا کہ حضرت آپ کی ناراضگی کی کوئی وجہ تو سمجھ میں آتی نہیں، بے تو گستاخی تو چچا جان نے فرمایا تھا، آخر میں چچا بھی تو ہوں، میں قصداً ایسا کرتا ہوں کہ کبھی اس کو اپنی حیثیت کی وجہ سے عجب نہ پیدا ہونے لگے۔ میرے اکابر نے تو میری اصلاح کی بہت کوشش فرمائی، مگر افسوس کہ کتے کی دُم بارہ برس نلکی میں رکھنے کے بعد نکالی تو ٹیڑھی ہی نکلی اور اس کے نظائر تو کتنی یاد آتے مگر دل و دماغ میں ان کے لکھوانے کی گنجائش نہیں، وقت نہیں۔ آپ بیتی میں پہلے بھی اس قسم کے واقعات بہت آ گئے ہیں۔

فقط والسلام

حضرت شیخ الحدیث صاحب بقلم حبیب اللہ ۲۶ دسمبر ۵، و مکہ مکرمہ

حضرت مفتی صاحبؒ کا اصل فن تو فقہ اور فتویٰ کا تھا لیکن اللہ تعالیٰ شانہ نے ان سے آخری عمر میں قرآن مجید کی تفسیر بھی لکھوادی۔ یہ عظیم الشان تفسیر ۸ جلدوں میں ان کی موجودگی ہی میں شائع ہو چکی ہے۔ میں تو آج کل مطالعہ کرنے کے قابل ہی نہیں رہا۔ احباب جنھوں نے اس کا مطالعہ کیا اور اس سے مستفید ہوتے رہے ہیں، انھوں نے بتایا کہ دورِ حاضر کے لیے یہ تفسیر بہت مفید ہے، زبان بھی سلیس اور ادبی ہے، فوائد و مسائل اور احکام کی تشریحات بھی نہایت عمدہ طریقہ پر کی گئی ہیں مسلک اہلسنت کی پوری رعایت رکھتے ہوئے نئی اُردو زبان میں واقعی تفسیر کی ضرورت تھی جو حضرت مفتی صاحبؒ کی معارف القرآن سے پوری ہو گئی۔

حضرت اقدس حکیم الامت تھانوی قدس سرہٗ نے تقریباً ۸۰ سال پہلے بیان القرآن لکھی تھی اور اس وقت اس کی شدید ضرورت تھی کیونکہ سرسید اور ان کے مزاج کے لوگوں نے ترجمہ تفسیر کے نام سے نام سے جو کاغذ کالے کیے تھے اور اپنی کتابوں میں طرح طرح کی غلط باتیں لکھ دی تھیں اور اہلسنت کے مسلک کو چھوڑ دیا تھا، اُن کے توڑ کے لیے ایک تفسیر لکھنا ضروری تھا، جیسا کہ حضرت اقدس تھانوی قدس سرہٗ نے بیان القرآن کے مقدمہ میں اس امر کا اظہار فرمایا ہے۔

آج کل بہت سے مفسرین و متکلمین پیدا ہو گئے ہیں جو بزعم خود مجتہد ہیں اور اہلسنت و جماعت کے مسلک سے آزاد ہو کر تفسیر کے نام سے کتابیں لکھ رہے ہیں چونکہ ان لوگوں کی زبان شستہ ہے اس لیے اس نئے زمانہ کے لوگ ان کی طرف لپکتے ہیں اور ان کی بڑی مدح سرائی کرتے ہیں اور جن اہلِ قلم لوگوں کا مزاج ایسے آزاد منش مزاج لوگوں سے جوڑ کھاتا ہے وہ ان پر تقریظیں لکھتے ہیں اور اخبارات میں تبصرے لکھ کران کی تعریفوں کے پُل باندھ دیتے ہیں۔ احباب نے بتایا کہ حضرت مفتی صاحبؒ کی تفسیر سے ان لوگوں کی نام نہاد تفسیروں کا بہت توڑ ہوا ہے، اور چونکہ جدید اُردو زبان میں تفسیر لکھی ہے اور ساتھ ہی اہلسنت و جماعت کے مسلک کی بھی پوری رعایت ہے، اس لیے ہر طبقہ کے لوگ اس کی طرف متوجہ ہو رہے ہیں۔ فالحمد للہ علی ذالک۔

پیارے تھے! کیا کیا لکھاؤں ؟ ہمارے اکابر جنھوں نے دارالعلوم و مظاہر علوم کی بنیاد رکھی تھی، ان کا اخلاص اور مکارمِ اخلاق اور محاسن افعال اور شریعت و طریقت کی جامعیت عجیب چیزیں تھیں۔ یہ حضرات ہر علم سے واقف معقولات اور منقولات کے سمندروں کے شناور اور ساتھ ہی بےنفسی،

تواضع اور فنائیت کے مجسمے تھے، سب کچھ ہوتے ہوئے اپنے نزدیک کچھ بھی نہ تھے، اہلسنت والجماعت کے مسلک سے یکسر شذوذ ان کو گوارا نہ تھا۔ فقہ حنفی کے مضبوطی سے مقلد تھے اور عدم تقلید کو گمراہی کا پیش خیمہ سمجھتے تھے۔ تمام ائمہ حدیث وائمہ فقہ کا پورا پورا اہتمام کرتے تھے۔ ان کے دل وزبان ہمیشہ ذکر اللہ سے معمور رہتے تھے۔ ایک وہ زمانہ تھا کہ دونوں مدرسوں میں دربان سے لے کر صدر مدرس اور مہتمم تک ہر شخص صاحب نسبت ہوتا تھا، آج میں اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں کہ وہ امتیازی شئون سب ہی ایسے جو اپنے اکابر کا طرۂ امتیاز تھیں۔ اکابر ایک ایک کر کے رخصت ہو چکے ہیں اور اصاغر ان کی جگہ تو لے رہے ہیں لیکن علوم واعمال اور اذکار میں ان کے قائم مقام نہیں بن رہے ہیں صرف رسمیہ الفاظ اور شاعرانہ قسم کے مضامین کی بہتات رہ گئی ہے۔ جن چیزوں کی ضرورت ہے وہ کمًا وکیفًا ختم ہو رہی ہیں، کسی کی وفات پر ماہناموں کے نمبر نکالنا یہ بھی ایک فیشن سا ہو گیا ہے۔ نمبر نکال دینے سے مرنے والے کا حق ادا نہیں ہو جاتا۔ جانے والے نے جو شریعت اور طریقت کی خدمت انجام دی اس کو آگے بڑھانا اور اس مزاج کے آدمی پیدا کرنا بہت زیادہ ضروری ہے۔

تم دونوں بھائیوں سے اور اپنے اکابر کی ہر اولاد سے درخواست کرتا ہوں کہ اپنے کو سدھاریں اور سنواریں اور اکابر دیوبند کے اخلاص، تقویٰ، انابت الی اللہ، خوف وخشیت، ذکر وفکر، علوم واعمال، ظاہری باطنی اصلاح کے طور طریق جو ان کی تالیفات اور ملفوظات میں محفوظ ہیں، اس کو ان کے مطابق آدمی ڈھالنے کی فکر کرے۔ ان حضرات کی صحیح یادگار یہی ہے۔ میں تو یہ دیکھ کر اور سن کر حیران رہ جاتا ہوں کہ ہمارے اکابر کی اولاد اسکول اور کالجوں کی زینت بنے اور بیاہ شادیوں میں دین کو دیکھنے کی بجائے انگریزی پڑھا لکھا ہونا دیکھا جاتا ہے۔ جن بزرگوں کی زندگی عداوت فرنگ میں گزر گئی آج ان ہی کی اولاد فرنگیوں کے طور طریق اختیار کرنے میں فخر محسوس کرتی ہے۔ فالی اللہ المشتکی۔ فقط والسلام

(شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد) زکریا (صاحب دامت برکاتہم)

از مدینہ منورہ ۹ شعبان ۹۸ھ مطابق ۱۴ جولائی

ناقل ڈاکٹر اسمٰعیل غفرلہٗ

دار العلوم دیوبند کے ترجمان

"حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب مدظلہم العالی مہتمم دار العلوم دیوبند
حضرت کے رفقاء درس میں سے ہیں لیکن البلاغ کی اس خصوصی اشاعت
کے لیے اپنی گوناگوں مصروفیات کے باعث خواہش اور کوشش کے باوجود
کچھ تحریر نہ فرما سکے، اس غیر کمی کی تلافی برادر محترم جناب اکبر شاہ بخاری صاحب
نے اس طرح کی ہے کہ حضرت مدظلہم کی کتاب "تاریخ دیوبند" اور حضرت کے
تعزیتی مکتوب کو ملا کر آپ کے تاثرات مربوط انداز میں مرتب کر دیئے ہیں وہ
ان کے شکریہ کے ساتھ ذیل میں پیش خدمت ہیں" (ادارہ)

مفتی اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ دار العلوم دیوبند کے ممتاز علماء
و فضلاء میں سے تھے۔ قوی الاستعداد اور استحضار علم کے ساتھ معروف فقہ و ادب میں خاص امتیاز
رکھتے تھے۔ میرا اور ان کا تعلق بھائیوں جیسا تھا اور تقریباً سارے ہی مبادیات تعلیم و تربیت میں ہم ساتھ
ہی رہے۔ درجہ فارسی سے لے کر دورہ حدیث اور کتب عالیہ تک میں رفاقت رہی تھی حتیٰ کہ سیر و تفریح
میں بھی رفاقت ہی رہتی تھی۔ حج وغیرہ میں بھی اکٹھے شرکت ہوتی تھی جب حضرت شیخ الہند اسارت مالٹا
سے رہا ہو کر وطن واپس تشریف لائے تو ہم اکٹھے ہی ان سے بیعت ہوئے اور پھر ان کے وصال
کے بعد احقر ہی کی معیت میں حضرت اقدس مولانا تھانوی کی طرف رجوع کیا اور حضرت مرشد تھانوی

سے خلافت حاصل کی۔ تعلیمی فراغت کے بعد دارالعلوم دیوبند کے اساتذہ اور ذمہ داروں نے آپ کے علم و استعداد پر اعتماد کرتے ہوئے آپ کو دارالعلوم کا ابتدائی درجہ کا مدرس بنایا پھر آپ جلد ہی اپنی علمی قابلیت و لیاقت سے اعلیٰ مدرسین میں شامل ہو گئے پھر آپ کی استعداد کی کمال کی بنا پر آپ کو دارالعلوم کا صدر مفتی قرار دے دیا گیا۔ گویا حضرت مفتی اعظم مولانا عزیز الرحمٰن صاحب عثمانیؒ کا قائم مقام بنایا گیا۔ یہ سب آپ کی لیاقت اور قوت علمی کے آثار تھے۔ آپ تعلیم ظاہر کے ساتھ تعلیم باطن میں بھی کمال کو پہنچے اور اسی لیے الحمدللہ آج آپ کے متوسلین بکثرت موجود ہیں اور مخلوق کو بہت فائدہ پہنچ رہا ہے۔ آپ کو تصنیف و تالیف کا ذوق بھی ابتدا سے تھا۔ فقہ و حدیث اور مناظرہ میں نہایت مفید تصانیف کا ایک عظیم ذخیرہ موجود ہے جو آپ کے قلم سے نکلا اور خواص و عوام کے لیے نہایت مفید ثابت ہوا ہے۔ شعر و شاعری کا ذوق بھی زمانہ طالب علمی سے تھا۔ عربی فارسی اور اردو میں نہایت عمدہ قصائد مراثی اور واقعاتی نظمیں لکھی ہیں جن کا مجموعہ شائع بھی ہو چکا ہے۔ آخری دور میں تفسیر معارف القرآن لکھی، جو علم تفسیر میں ان کا عظیم کارنامہ ہے۔ تقسیم ملک کے بعد جب آپ نے پاکستانی قومیت اختیار فرمائی اور یہاں سے ہجرت فرما کر پاکستان تشریف لے گئے تو میں کسی مرنے والے کے لیے بھی اتنا کبھی نہیں رویا تھا جتنا آپ کے فراق پر رویا تھا۔ یہ حالت دیکھ کر سب گھر والے پریشان ہو گئے تھے کہ آخر کیا حادثہ پیش آ گیا جو اتنا گریہ طاری ہے۔ یہ تعلق کی بنا پر تھا کہ ابتدائے عہد سے ہم رفیق رہے تھے۔ آپ کے سانحہ ارتحال کی خبر مشتہر ہوتے ہی پورے دارالعلوم میں صدمہ کی ایک لہر دوڑ گئی اور دارالعلوم کے علمی حلقہ میں رنج و غم کے گہرے بادل چھا گئے۔ سب جمع ہو گئے اور فوراً کلمہ طیبہ اور قرآن کریم کا ختم کرا کر ایصال ثواب کرایا گیا اور احقر نے ان کی صفات حمیدہ ظاہر کر کے غم میں ڈوبی ہوئی تقریر کی، پورا دارالعلوم تعزیت گاہ بن گیا تھا۔ پھر دارالعلوم کو دو دن کی تعطیل دی گئی تاکہ طلباء و اساتذہ ان ایام میں جس قدر بھی ممکن ہو ایصال ثواب میں مشغول رہیں۔

حضرت مفتی صاحب پاکستان میں مسلک دیوبند کے عظیم داعی اور ترجمان تھے۔ دارالعلوم دیوبند کے ایک قیمتی جوہر اور عظیم فرزند تھے اور اپنی ذاتی خوبیوں اور لیاقتوں کی بنا پر سارے ہی طبقہ اہل علم کے مقتدا و مسلّم تھے۔ ان کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ اسلاف کا ذوق ان میں پوری طرح رچا بسا تھا۔ اور وہ [illegible] بزرگوں کے اتباع کو ضروری سمجھتے تھے۔ حضرت مفتی صاحب اگرچہ [illegible] آپ

نہیں ہیں مگر ان کا علم اور ان کی دینی خدمات زندہ ہیں اور زندہ رہیں گی اور اس سے ان کی یاد ہمارے دلوں میں ہمیشہ تازہ رہے گی۔ آپ نے کراچی میں دارالعلوم کے نام سے علوم دینیہ کی ایک عظیم دینی درسگاہ بھی قائم فرمائی، جو آج پاکستان میں مرکزی حیثیت کی ایک ممتاز تعلیم گاہ ہے۔ گورنمنٹ پاکستان نے اسلامی قانون سازی کی تدوین کے لیے علماء کی ایک کمیٹی بنائی تھی، آپ اس کے بھی ممبر تھے۔ بہرحال آپ کی وفات کا صدمہ صرف ایک گھرانے کا نہیں بلکہ پورے دارالعلوم اور سارے علمی حلقے کا ہے۔ پھر بھی اس شدید غم میں وجہ تسلی یہ ہے کہ انھوں نے اپنے ترکہ میں جہاں ایک بڑا علم چھوڑا جو ان کی کثیر التصانیف میں محفوظ ہے وہیں الحمدللہ قابل اولاد بھی چھوڑی جس سے بجا طور پر توقع ہے کہ ان کے آثار اور باقیات الصالحات کو من وعن باقی رکھیں گے۔ بالخصوص عزیز محمد تقی سلمہ سے ہماری اُمیدیں زیادہ وابستہ ہیں۔ اب اُنھیں یہ سمجھ لینا چاہیے کہ وہ مفتی محمد شفیع ہیں۔ حق تعالیٰ ان آرزوؤں کو پورا فرمائے۔ حق تعالیٰ ان کو درجات عالیہ نصیب فرمائے۔ آمین۔

(ماخوذ ماہنامہ البلاغ، الحق، تاریخ دارالعلوم دیوبند)

○

اس وقت حضرت حکیم الامت قدس سرہٗ کے علمی و روحانی جانشینوں میں حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب کو مقام بہت بلند ہے وہ حقیقت میں اپنے شیخ کی پوری ترجمانی فرما رہے ہیں۔ انھوں نے حال ہی میں تفسیر معارف القرآن مکمل فرمائی ہے جو تحقیق علمی کا خزانہ ہے۔ اس تفسیر کو تصنیف فرما کر مفتی صاحب علماء کرام، مفسرین کرام اور پوری ملت اسلامیہ پر احسان عظیم فرمایا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی اس خدمت کو قبول فرمائے۔

(حضرت مولانا ظفر احمد عثمانیؒ البلاغ صفر ۱۳۹۵ھ)

دارالعلوم دیوبند کی آخری یادگار

محدث عصر حضرت علامہ سید محمد یوسف بنوری صاحب قدس سرہٗ کو حضرت والد صاحبؒ کے ساتھ نہایت گہرا تعلق تھا۔ اور جب احقر نے حضرت بنوری رحمۃ اللہ علیہ سے ذکر کیا کہ "البلاغ" کا ایک مفصل نمبر حضرتؒ کے تذکرے کے لیے نکالنے کا ارادہ ہے تو حضرت بنوری رحمۃ اللہ علیہ نے اس کے لیے ایک مفصل مضمون تحریر فرمانے کا وعدہ کرلیا تھا لیکن افسوس! کہ ابھی اس نمبر کی ترتیب کا آغاز بھی نہ ہو سکا تھا کہ حضرت بنوری رحمۃ اللہ علیہ بھی اللہ کو پیارے ہو گئے۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔

اب ان کا وہ اداریہ پیش خدمت ہے جو انھوں نے حضرت والدصاحبؒ کی وفات پر "بینات" میں تحریر فرمایا تھا۔ اس کا عنوان بھی خود حضرتؒ ہی کا تجویز کردہ ہے۔ ورنہ عموماً "بینات" کے اداریوں میں عنوان لگانے کا معمول نہ تھا۔" (م ت ع)

۱۱ رشوال سنہ ۱۳۹۶ھ (مطابق ۶ اکتوبر سنہ ۱۹۷۶ء) چہارشنبہ کو ایک بجے رات سرزمین پاکستان میں دارالعلوم دیوبند کی آخری یادگار حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب دنیائے فانی سے رخصت ہو گئے اناللہ وانا الیہ راجعون

مرحوم مختلف عوارض خصوصاً عارضۂ قلب میں کچھ عرصہ سے مبتلا ہو گئے تھے اور عوارض اور امراض و تکالیف کو قابل رشک صبر و تحمل سے برداشت کرتے رہے اور رضا بالقضاء کے اعلیٰ ترین مقام

کے حصول اور ترقی درجات سے مالامال ہوتے گئے اور کمال یہ ہے کہ بزرگوں کی صحبت و توجہات کی برکت سے طبیعت ایسی بن گئی تھی کہ آخر وقت تک علم و دین کے مشاغل سے وابستہ رہے، افتاء کی مجلسیں بھی ہوتی رہیں، تالیف و تصنیف کا سلسلہ بھی کسی نہ کسی صورت میں قائم رہا، علمی مشاورت اور دینی مسائل میں غور و خوض کا سلسلہ بدستور قائم رہا۔

امام العصر حضرت الاستاذ مولانا محمد انور شاہ رحمہ اللہ سے تلمذ و استفادے کے بعد حضرت مفتی صاحب کا ہمیشہ ظاہری و باطنی تعلق شاہ صاحبؒ سے قائم رہا۔ انقلاب کے زمانے میں جب کہ حضرت شاہ صاحبؒ دارالعلوم سے جدا ہو گئے تھے۔ اس وقت بھی آپ کا تعلق ایک لمحے کے لیے منقطع نہیں ہوا تھا۔ برابر حاضری ہوتی رہی۔ کیا مجال ہے کہ تعلق و عقیدت و ارادت میں ذرا بھی فرق آئے انہی دنوں میں جب کہ اختلاف و افتراق شباب پر تھا۔ حضرت مفتی صاحب حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ کی خدمت میں زیارت و عیادت کے لیے حاضر ہوئے اور دو روپے ہدیۂ عقیدت پیش کیا، حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ نے نہایت محبت و شفقت سے قبول فرمایا۔

حضرت مفتی صاحبؒ کی علمی زندگی میں حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ کی توجہات کا بہت بڑا دخل رہا، بالکل ابتدائی دور میں جب معارف اعظم گڑھ میں فوٹو کے جواز پر ایک مبسوط مقالہ آیا جو درحقیقت شیخ محمد بخیت مطیعی شیخ الازہر کے رسالہ اباحۃ الصور الفوتوغرافیہ کا چربہ تھا اور اچھا خاصہ محققانہ علمی انداز تھا، کیونکہ شیخ محمد بخیت اپنے دور میں مصر کے سب سے بڑے عالم و محقق سمجھے جاتے تھے اور مذاہب اُمت کے ادلّہ و تفصیلات میں بقول حضرت شیخ محمد زاہد الکوثریؒ آیۃ من آیات اللہ تھے[1] جب یہ مقالہ شائع ہوا تو حضرت مولانا انور شاہ صاحب رحمہ اللہ کو اس کی فکر ہوئی۔ اور اپنے حلقۂ تلامذہ میں سے حضرت مفتی صاحب کو بلایا اور فرمایا کہ اس کا جواب لکھیں چنانچہ حضرت مفتی

---

[1] قاہرہ میں، ۱۳۵۷ھ (۱۹۳۸ء) کی ایک مجلس میں راقم الحروف نے حضرت شیخ محمد زاہد الکوثری سے عرض کیا کہ آپ ان کے کمالات کے بیان میں اتنا غلو فرماتے ہیں کہ استحضار مذاہب ائمہ میں ان کو آیۃ من آیات اللہ فرماتے ہیں، حالانکہ فلاں فلاں مسائل و حوادث میں ان کی فقہی رائے بہت کمزور ہے۔ اس پر شیخ کوثریؒ نے فرمایا "نعم کان غیر موفق فی النوازل" یعنی "جی ہاں! جدید مسائل و حوادث میں صائب الرائے نہیں تھے۔"

صاحبؒ نے ان کی علمی راہنمائی میں الاستفتاء (ماہنامہ دارالعلوم دیوبند) میں اس پر ایک مفصل علمی و تحقیقی مضمون لکھا جو بعد میں التصویر لاحکام التصویر کے نام سے مستقل رسالہ کی شکل میں شائع ہوا حضرت شاہ صاحبؒ ہی کی راہنمائی میں آیت خاتم النبیین کی شرح تفسیر عمدہ ادیبانہ انداز سے عربی میں تالیف فرمائی جو ھدیۃ المھدیین کے نام سے شائع ہوئی۔ اس پر حضرت امام العصر رحمہ اللہ کی قابل رشک تقریظ ہے۔ اس کے چند جملے ملاحظہ ہوں :

اما بعد، فان صاحبنا الاحوذی المولوی محمد شفیع الدیوبندی وفقہ اللہ لما یحب ویرضا جمع باستدعائی رسالۃ ھدیۃ المھدیین فی آیۃ خاتم النبیین، جزاہ اللہ عنی وعن سائر المسلمین خیر الجزاء، وقد جزاہ، اسرد فیہ نحو مأتہ وخمسۃ وستین حدیثاً فی انقطاع النبوۃ بعد ما بعث اللہ نبیہ محمدا مصطفاہ۔ الی قولہ۔ وھاک رسالۃ تفسیریۃ حدیثیۃ کلامیۃ فقھیۃ وبعد ذالک کلہ ادبیۃ تسری الفاظھا کسرایۃ الروح فی البدن ویقع فی قلب المؤمن کحلاوۃ الایمان ویجری فی العروق کمحض اللبن ــ

ھلمّ یا صاح الی روضۃ یجلو بھا العانی صداھمہ
نسیمھا یعثر فی ذیلہ وزھرھا یضحک فی کمّہ

ترجمہ : "ہمارے رفیق دانشمند مولوی محمد شفیع دیوبندی نے۔ اللہ تعالیٰ انھیں اپنی مرضیات کی توفیق عطا فرمائے میری فرمائش پر رسالہ ھدیۃ المھدیین فی آیۃ خاتم النبیین جمع کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ انھیں میری طرف سے اور تمام مسلمانوں کی جانب سے جزائے خیر عطا فرمائیں، اس میں اس مضمون کی قریباً ۱۶۵ حدیثیں ذکر کی ہیں کہ بعثت محمدیہ کے بعد نبوت ختم ہو چکی ہے۔ یہ رسالہ تفسیری بھی ہے اور حدیثی بھی، کلامی بھی اور فقہی بھی، اور ان تمام امور کے ساتھ ساتھ ادبی بھی جس کے الفاظ روح کی طرح بدن میں سرایت کرتے ہیں، حلاوت ایمان کی طرح قلب مومن میں جاگزیں ہوتے ہیں اور خالص دودھ کی طرح رگ و پے میں گردش کرتے ہیں۔ "اے رفیق! اس گلشن کی سیر کرو۔

جس سے ایک غم زدہ شخص اپنے ہموم و افکار کا زنگ دُور کرتا ہے۔ اس کی بادِ صبا اس کے دامن سے اٹھکیلیاں کرتی ہے اور اس کی کلیاں اس کے دامن میں مسکراتی ہیں۔

حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ کے رسالہ "التصریح بما تواتر فی نزول المسیح" کو حضرت مفتی صاحبؒ نے مرتب فرمایا، اور اس پر ایک بہترین ادیبانہ اور فاضلانہ مقدمہ لکھا جو بجائے خود ایک مستقل رسالہ ہے[۱] اس طرح حضرت شیخ رحمہ اللہ کی توجہات سے ان کی علمی قابلیت اور ردِّ قادیانیت کے سلسلہ میں ان کی خدمات میں روز افزوں ترقی ہوتی گئی اور حضرت شیخ رحمہ اللہ سے نسبت میں قوت پیدا ہوتی چلی گئی۔

جس وقت میں نے اپنا رسالہ بغیۃ الاریب فی احکام القبلۃ والمحاریب مرتب کیا اور بعض مآخذ و مراجع دیکھنے کے لیے پشاور سے سفر کر کے دیوبند حاضر ہوا تھا اور یہ خیال ہوا کہ اکابر و اساتذہ کی کچھ تقریظیں بھی تبرّک کے لیے لکھواؤں، اس وقت حضرت مولانا محمد شفیع صاحب دار العلوم دیوبند کے منصب افتاء پر فائز تھے۔ جب رسالہ دیکھا بہت ہی خوش ہوئے اور بے حد متاثر ہوئے اور فرمایا کہ اس پر ایسی تقریظ لکھنے کو جی چاہتا ہے جس طرح حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ نے رسالہ "ھدیۃ المھدیین فی آیۃ خاتم النّبیین" پر تقریظ لکھی ہے۔ اسی رسالہ (ھدیۃ المھدیین) کے متن سے آئندہ ختم النبوۃ فی القرآن، ختم النبوۃ فی الاحادیث اور ختم النبوۃ فی الآثار تینوں رسالے بطورِ شرح مرتب ہوئے۔

مقدمۂ بہاول پور میں حضرت امام العصر شاہ صاحبؒ کے دستِ راست رہے اور آپ ہی کے قلم سے حضرت شیخ رحمہ اللہ کی دقیق و عمیق تعبیرات سہل اُردو میں مرتب ہوئیں جو مقدمۂ بہاول پور

---

[۱] رسالہ "التصریح بما تواتر فی نزول المسیح" کی روشنی میں حضرت مفتی صاحبؒ نے "مسیح موعود کی پہچان" کے نام سے ایک اور رسالہ لکھا، جس میں حضرت عیسٰی علیہ السلام کی ان تمام علامات کو جو قرآن و حدیث میں وارد ہیں، مرتب کر کے ثابت کیا کہ قادیان کے نام نہاد مسیح مرزا غلام احمد قادیانی میں ان میں سے ایک علامت بھی نہیں پائی جاتی ہے جس سے ہر ادنیٰ عقل و فہم کا آدمی بھی یہ نتیجہ اخذ کر سکتا ہے کہ مرزا قادیانی کا دعویٰ مسیحیت و مہدویت محض کذب و افترا ہے۔ یہ نفیس رسالہ بارہا چھپ چکا ہے۔

کے نام سے معروف ہے اور فرمایا کہ ایک رات اسی کام میں ایسی گذری کہ عشاء کے بعد صبح تک اس کی تکمیل میں مشغول رہا۔ اس طرح حضرت شیخ کی دعاؤں و توجہات کے مرکز بنے رہتے ہیں۔ ۱۹۷۴ء میں قادیانی مسئلہ کے سلسلہ میں جو محاذ قائم ہوا تھا اور حضرت شیخ کے جوتوں کے صدقے میں حق تعالے نے راقم الحروف سے کام لیا۔ اس کے لیے حضرت مفتی صاحب رحمہ اللہ کے صاحبزادے عزیز گرامی برادرم مولانا تقی صاحب کو میں نے راولپنڈی میں بلایا تھا۔ "مسئلہ قادیانیت میں امت اسلامیہ کے موقف" کی ترتیب و تالیف میں برادر موصوف نے ایک دفعہ پوری رات گذار دی۔ ایک لمحہ کے لیے بھی آرام نہ کر سکے۔ میں نے حضرت مفتی صاحب سے فون پر اور بعد میں زبانی یہ عرض کیا تھا کہ آپ کے مقدمہ بہاولپور اور حضرت شیخ کی خدمت و مساعدت سے پوری مشابہت اللہ تعالیٰ نے پیدا فرما دی۔ جس سے حضرت مفتی صاحب بہت خوش ہو گئے۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے برادر موصوف کو اپنے والد محترم کا صحیح خلف الرشید بنایا۔ فطوبیٰ لہٗ ھٰذہ السعادۃ وھنیئاً لہٗ بھذہ الخلافۃ۔

الغرض حضرت مفتی صاحب کی علمی طبیعت و مزاج میں حضرت شیخ رحمہ اللہ کی توجہات کو بڑا دخل ہے جس طرح حضرت حکیم الامت تھانوی قدس سرہ کی توجہات سے یہ مزاج بن گیا کہ وقت کی قدر ہو اور ضیاع وقت سے احتراز کیا جائے اور مفید عوام تالیفات سے دین کی خدمت کی جائے۔

حضرت مرحوم کی خصوصیات و تالیفات اور دارالعلوم کراچی کی تاسیس پر اور "ادارۃ المعارف" قائم کرنے پر لکھنے والے بہت کچھ لکھیں گے اور لکھتے رہیں گے مجھے تو صرف یہ لکھنا ہے کہ بیک وقت وہ دارالعلوم دیوبند اور تھانہ بھون دونوں کی جامع شخصیت تھی اور دونوں کے صحیح نمائندے تھے اور علم و فضل کے ساتھ مزاج میں بے حد سادگی تھی، نہایت متواضع تھے، اہل علم و فضل کے بڑے قدر دان تھے باوقار بردبار تھے، ۱۳۴۴ھ سے لے کر آج ۱۳۹۶ھ تک میرا ان کا تعلق رہا۔ ابتدا سے انتہا تک جو چیز نظر آئی وہ یہ ہے کہ علمی شغف، علمی قدر دانی، دیوبند اور تھانہ بھون کے صحیح مسلک و مشرب کی نمائندگی کا صحیح حق ادا کیا۔ حضرت مفتی صاحب کو حق تعالیٰ نے بہت سی نعمتوں سے نوازا۔ اور اولاد صالح کی نعمت سے مرحوم کی آنکھیں ٹھنڈی ہوئیں اور اپنی عمر کے آخری مراحل میں معارف القرآن جیسی تفسیر کے ذریعہ سے علمی و دینی خدمت انجام دے کر آخرت کے لیے بہت کچھ ذخیرہ جمع فرمایا۔

مجھے اس کا صدمہ ہے کہ جنازے کی شرکت سے محروم رہا۔ حضرت کے وصال سے ۱۱ گھنٹہ قبل

میں ایک ضروری کام سے سکھر پہنچ گیا تھا۔ وصال کی صبح کو اطلاع ملی۔ بہت کوشش کی کہ کسی طرح جنازے میں شامل ہو سکوں، موئن جو داڑو کے ایئر پورٹ تک، ۹۰ میل بذریعہ ٹیکسی سفر کیا کہ شاید ہوائی جہاز میں کوئی سیٹ مل جائے۔ اور اس طرح یہ آرزو پوری ہو جائے لیکن افسوس کہ بے نیل مرام واپس آیا۔ ۵ گھنٹہ کی تگ و دو سے ایک طرف شکستہ بدن اور مقصد میں ناکامی سے شکستہ خاطر واپس آیا اور حسرتوں کو دل میں لے کر آیا۔ حق تعالیٰ اس نحیف البدن خفیف الروح عالم باعمل کے درجات بلند فرمائے اور تمام زلات و سیئات معاف فرما کر رضوان و رحمت کے عالی مقامات پر پہنچائے، جنت الفردوس میں مقام نصیب فرمائے۔ آمین اور ان کی صحیح ذریت کو ان کے صحیح جانشین بنائے۔ مولانا محمد احمد تھانوی صاحب نے تاریخ وفات میں متعدد مواد نکالے ہیں۔ ایک ان میں سے "موت العالم الصالح موت العالم" ہے۔

○

"میرے والد ماجد مرحوم جو دار العلوم دیوبند کے ہم عمر تھے یعنی ان کا سن ولادت اور دار العلوم کا سن تعمیر ایک تھا۔ وہ فرمایا کرتے تھے کہ میں نے دار العلوم کا وہ وقت دیکھا ہے جبکہ اس کے دربان سے لے کر صدر مدرس اور مہتمم تک صاحب نسبت ولی اللہ تھا۔

احقر نے اسی مبارک سرزمین پر آنکھ کھولی۔

بلادٌ بها حلّ الشباب تميمتي

واول ارض مس جلدي ترابها

(یہ شہر ہے جس میں شباب نے میرے گلے کے تعویذ کھولے اور پہلی زمین ہے

جس کی مٹی میرے بدن کو لگی)

اسی میں بچپن سے پچپن تک کے تمام ادوار زندگی طے گئے، میرا وطن کہنے کو تو دیوبند تھا لیکن درحقیقت اس کا بھی ایک گوشہ یعنی دار العلوم تھا۔ اسی میں طفلانہ کھیل کود کا وقت گزرا۔ اسی میں سولہ سال تعلیم پائی۔ اسی میں چھبیس سال تعلیم اور فتوے کی خدمت انجام دی۔"

(حضرت مفتی اعظمؒ: نقوش و تاثرات۔ ص ۱۲

عارف باللہ حضرت ڈاکٹر عبدالحی صاحب عارفی مدظلہم العالی
خلیفہ مجاز حکیم الامت حضرت تھانویؒ و صدر دار العلوم کراچی

حضرت مُفتی صاحبؒ کے ساتھ میرا تعلُّق

مفتی اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب قدس سرہ کے بارے میں میں کیا عرض کروں؟ اُن کی خصوصیات، اوصاف و کمالات اور ظاہری و باطنی مناقب کا احاطہ کرنے کی تو مجھ میں قابلیت نہیں البتہ اُن سے میرا ایک خصوصی ذاتی تعلق تھا، اس ذاتی تعلق کے دوران کچھ ایسے واقعات پیش آئے اور ایسے تاثرات قائم ہوئے جن سے مجھے نفع پہنچا۔ اُن کو اس خیال سے بیان کیے دیتا ہوں کہ شاید وہ دوسروں کے لیے بھی مفید ہوں۔

اللہ تعالیٰ کا بے پایاں کرم ہے کہ اس نے مجھے حکیم الامت مجدد الملت سیدی و سندی حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہ سے وابستگی کی دولت عطا فرمائی اور سالہا سال حضرتؒ کی خدمت و صحبت سے مستفید ہونے کا موقع ملا۔ اس دوران بار بار خانقاہ تھانہ بھون میں حاضری ہوتی رہی وہاں حضرتؒ کے دوسرے منتسبین اور اکابر خلفاء تشریف لاتے ہی رہتے تھے جن میں حضرت مفتی صاحبؒ کی ذاتِ گرامی بھی شامل تھی لیکن وہاں کا حال یہ تھا کہ ہر شخص حضرتؒ ہی کے جلوۂ جہاں آرا میں محو رہتا تھا، اور حضرتؒ کو دیکھنے، حضرتؒ کی باتیں سُننے اور حضرتؒ کی ہدایات پر عمل پیرا ہونے کی کوشش سے فرصت نہ تھی اور ؎

بہشت آنجا کہ آزارے نہ باشد
کسے را با کسے کارے نہ باشد

کا سماں تھا، اس لیے وہاں کسی دوسرے شخص سے کسی خاص تعلق کے پیدا ہونے یا کثرت مجالست کا موقع نہ تھا، چنانچہ حضرت مفتی صاحب سے خانقاہ تھانہ بھون میں وقتاً فوقتاً ملاقات تو ہوتی رہی لیکن کسی تفصیلی تعارف یا کثرتِ مجالست کی نوبت نہیں آئی۔

ہاں با تعارف خاص اور خصوصی تعلق اس وقت پیدا ہوا جب میں ۱۹۵۰ء میں پاکستان آیا، اور مجھے معلوم ہوا کہ حضرت مفتی صاحب کراچی میں تشریف رکھتے ہیں، اس وقت پہلی بار میرے دل میں شدت کے ساتھ یہ داعیہ پیدا ہوا کہ حضرت مفتی صاحب کی ذات گرامی کو غنیمت سمجھنا چاہیے۔ وجہ یہ تھی کہ اگرچہ مجھے بحمداللہ حضرت حکیم الامتؒ سے عرصۂ دراز تک تعلق کا شرف حاصل رہا، لیکن مجھے کبھی اپنی حالت پر اطمینان نہیں ہوا، میں یہ سمجھتا تھا کہ میں نے کچھ حاصل نہ کیا، اس لیے مجھ میں ایک تشنگی اور تڑپ تھی، اور اپنی حالت کو معتبر اور مستند بنانے کا ہمیشہ دھیان رہتا تھا، اس لیے کراچی پہنچنے کے بعد میں نے حضرت مفتی صاحب قدس سرہٗ کی ذات کو اپنے لیے غنیمت سمجھ کر آپ سے تعلق قائم کیا۔

حضرت مفتی صاحبؒ نے مجھ پر پہلے ہی کرم فرمانا شروع کر دیا تھا، آپ مجھ سے بیگانہ نہیں تھے اور نہ صرف رسمی تعلق تھا، بلکہ ان کے دل پر بھی میرے بارے میں ایک تاثر تھا اور وہ بھی ایک بڑے عجیب و غریب واقعے کی بنا پر تھا جس سے حضرت مفتی صاحبؒ کا اپنے شیخ سے مضبوط تعلق واضح ہوتا ہے۔

واقعہ یہ ہوا کہ ایک مرتبہ میں تھانہ بھون میں اپنے اہل و عیال کے ساتھ مقیم تھا کہ میرا ایک بچہ جو مجھے بہت عزیز تھا وہیں اللہ کو پیارا ہو گیا، حضرت حکیم الامتؒ کی مجلس ظہر کے بعد ہوا کرتی تھی، میں اُس روز بچے کی تجہیز و تکفین میں مشغول ہونے کی بنا پر مجلس میں حاضر نہ ہو سکا، عصر کے قریب جب میں فارغ ہوا تو خانقاہ کے باہر ایک چارپائی پر بیٹھ گیا، اچانک حضرت مفتی محمد شفیع صاحبؒ تشریف لائے اور اسی چارپائی پر مجھ سے اس طرح لگ کر بیٹھ گئے کہ ان کا پہلو میرے پہلو کو چھونے لگا، میں ازراہِ ادب اپنی جگہ سے سرکا تاکہ مفتی صاحبؒ کو جگہ دوں، لیکن جونہی میرے اور ان کے درمیان خلا پیدا ہوا، وہ بھی فوراً آگے کو سرکے اور پھر میرے پہلو سے پہلو ملا لیا، یہ چونکہ ایک غیر معمولی بات تھی، اس لیے میں حیران ہوا، اور حضرت مفتی صاحبؒ نے میری حیرانی کو محسوس کر کے خود ہی فرمایا کہ "میں ذرا دیر آپ سے بالکل متصل ہو کر بیٹھنا چاہتا ہوں"۔ اور پھر خود ہی مجھے بہت مبارکباد دی اور وجہ یہ بتائی کہ آج حضرت حکیم الامت قدس سرہٗ ظہر کے بعد کی مجلس میں مسلسل آپ ہی کا ذکر فرماتے رہے جس سے صاف

واضح ہوتا تھا کہ حضرتؒ کو آپ سے بہت خصوصی تعلق ہے اور چونکہ آپ ہمارے شیخ کے محبوب ہیں اس لیے آپ سے متصل ہو کر بیٹھنے کو میں سعادت اور فالِ نیک سمجھتا ہوں۔

اللہ اکبر! یہ تھا حضرت مفتی صاحبؒ کا اپنے شیخ سے والہانہ تعلق کہ جس شخص کا حضرتؒ نے محبت سے تذکرہ کر دیا، اُس سے تعلق قائم کرنے کی بے اختیار تڑپ پیدا ہو گئی۔

غرض اس واقعہ کی بنا پر حضرت مفتی صاحبؒ کو بھی مجھ سے بڑا خصوصی لگاؤ تھا، چنانچہ کراچی آنے کے بعد حضرت مفتی صاحب نے میری طرف بڑی محبت و الفت کے ساتھ توجہ فرمائی۔ واقعہ یہ ہے کہ محبوب کی گلی کا کُتّا بھی عزیز ہوتا ہے، یہ مفتی صاحبؒ کا مرتبہ تھا کہ حضرت شیخ سے والہانہ محبت و عقیدت کی بنا پر ہر اس شخص سے انھیں محبت ہو گئی جسے حضرت شیخ سے کوئی تعلق ہو۔ میں نے ساری زندگی یہی دیکھا کہ انھوں نے حضرت تھانوی قدس سرہ سے تعلق رکھنے والوں کے ساتھ بڑا خصوصی تعلق رکھا۔

اب میں حضرت مفتی صاحب قدس سرہ کے کچھ واقعات عرض کرتا ہوں جن سے ان کے تعلق اور اپنے شیخ کے ساتھ خصوصی مناسبت پر روشنی پڑتی ہے:

(۱) میں نے ایک مجلس میں دیکھا کہ حضرت مفتی صاحبؒ دیوبند سے تھانہ بھون تشریف لائے، اور حضرتؒ سے عرض کرنے لگے کہ "حضرت! میں جب یہاں آتا ہوں تو میرے بعض رفقاء مجھ سے کہتے ہیں کہ تم تھانہ بھون بار بار کیوں جاتے ہو؟ یہاں اتنا عظیم الشان کتب خانہ ہے جس میں بڑے بڑے عُلما و فقہاء اور بزرگانِ دین کی کتابیں ہیں، ان کو پڑھو اور فائدہ اُٹھاؤ اور درس و فتویٰ جو ایک عظیم عبادت ہے اس میں مصروف رہو" حضرتؒ نے پُوچھا: "پھر آپ نے کیا جواب دیا؟" حضرت مفتی صاحبؒ نے فرمایا: "میں نے عرض کیا کہ تھانہ بھون جا کر جو رُوحانی سکون ملتا ہے وہ یہاں نہیں ملتا" حضرتؒ نے فرمایا: "یہ بتایئے کہ خانقاہ سے تعلق کے بعد آپ کو اپنے علمی کاموں، درس و تدریس، فتویٰ اور تصنیف میں بھی کوئی فرق محسوس ہوا یا نہیں؟" حضرت مفتی صاحبؒ نے جواب دیا: "جی ہاں زمین و آسمان کا فرق ہو گیا، علوم کے بہت سے دروازے تو یہیں پہنچ کر کھلے" حضرتؒ نے فرمایا "بس تو ایسے لوگوں کو یہی جواب دینا چاہیے کہ خانقاہ جا کر وہ نظر اور وہ بصیرت پیدا ہوتی ہے جس سے ان کتابوں کا صحیح فائدہ حاصل ہوتا ہے۔"

(۲) ایک اور واقعہ یاد آیا جس سے حضرت مفتی صاحبؒ کا حضرت حکیم الامت قدس سرہٗ سے

خصوصی تعلق واضح ہوتا ہے۔ حضرتؒ کے یہاں دو قسم کی مجلسیں ہوتی تھیں۔ ایک مجلس عام ہوتی تھی، ایک مجلس خاص، عام مجلس میں بھی حضرتؒ مخصوص حضرات کو اپنے بائیں جانب بٹھایا کرتے تھے۔ مفتی صاحبؒ بھی انہی حضرات کے ساتھ تشریف رکھتے تھے۔ ایک روز مفتی صاحبؒ کو آنے میں کچھ دیر ہوگئی اور جب وہ پہنچے تو مجلس بھر چکی تھی، آگے بیٹھنے کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ مفتی صاحبؒ پیچھے بیٹھ گئے۔ حضرتؒ نے اِدھر اُدھر دیکھا تو جگہ نہیں تھی، البتہ اپنے پاس کچھ تھوڑی سی جگہ تھی، چنانچہ مفتی صاحبؒ سے فرمایا:۔

"مولوی شفیع، یہاں آجاؤ" مفتی صاحبؒ نے اولاً عذر کیا کہ "حضرت! آرام سے بیٹھا ہوں" حضرتؒ اُس وقت خاموش ہوگئے۔ لیکن کچھ دیر بعد پھر بہت مسرت کے لہجے میں فرمایا: "مولوی شفیع! میرا جی چاہتا تھا کہ تم یہاں میرے پاس بیٹھو" چنانچہ جب مفتی صاحبؒ نے حضرتؒ کا اصرار دیکھا تو اُٹھ کر آگے تشریف لے گئے۔[1]

اس واقعے سے احقر نے دو نتیجے نکالے، ایک تو یہ کہ حضرت مفتی صاحبؒ کی طرف حضرتؒ کی کس قدر خصوصی توجہ تھی۔ گویا حضرتؒ اُس مجلس میں اصلی مخاطب مفتی صاحبؒ ہی کو سمجھتے تھے، اس لیے چاہتے تھے کہ وہ کسی طرح قریب آجائیں۔ دُوسری طرف اس سے حضرت مفتی صاحبؒ کی تواضع کا کمال ظاہر ہوتا ہے۔ انھیں اپنی تواضع کی بنا پر آگے بڑھتے ہوئے شرم آتی تھی کہ میری کیا خصوصیت ہے جو میں اتنے لوگوں سے آگے جا کر بیٹھوں۔ تمام عمر حضرت مفتی صاحبؒ کا یہی حال رہا کہ ظاہری و باطنی علوم و کمالات کے جامع ہونے کے باوجود تواضع اور سادگی کے پیکر بنے رہے۔

(۳) تھانہ بھون کا ایک اور واقعہ یاد آیا۔ حضرت مفتی صاحبؒ تھانہ بھون آئے ہوئے تھے۔ حضرت حکیم الامت قدس سرہٗ نے آپ کو کچھ فتوے لکھنے کے لیے دیے، چنانچہ وہ بیٹھے ہوئے فتوے لکھ رہے تھے۔ حضرت مولانا محمد الیاس صاحب قدس سرہٗ بانی تبلیغی جماعت بھی اُس روز وہاں موجود تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو تبلیغی جماعت کے کام کا تقاضہ غلبۂ حال کے درجے میں عطا فرمایا تھا۔ چنانچہ انھوں نے حضرت

---

[1] اسی قسم کا ایک اور واقعہ قدرے تفصیل کے ساتھ "حضرتؒ کے شیوخ و اکابرؒ" کے زیرِ عنوان احقر نے اپنے مضمون میں ذکر کیا ہے جو خود حضرت والد صاحبؒ ہی کے الفاظ میں ہے۔ معلوم نہیں کہ وہ اسی واقعے کی تفصیل ہے یا جداگانہ واقعہ ہے (م ت ع)

مفتی صاحبؒ کو دیکھ کر ان کو بھی تبلیغی جماعت میں نکلنے کی دعوت دی، حضرت مفتی صاحبؒ نے جواب دیا کہ: "حضرتؒ (یعنی حضرت تھانوی قدس سرہ) سے اجازت لے لیجیے" حضرت مولانا محمد الیاس صاحبؒ نے حضرت تھانوی قدس سرہ سے ذکر کیا تو حضرتؒ نے فرمایا: "مولانا! سارے ہندوستان میں سے ان جیسا کوئی آدمی ڈھونڈ کر لائیے جو اس وقت ایسی مستند تبلیغ کر رہا ہو جیسی یہ کر رہے ہیں، جو خدمت یہ انجام دے رہے ہیں وہ کوئی دوسرا انجام نہیں دے سکتا، تبلیغی گشت کے لیے بہت سے آدمی مل جائیں گے اس لیے آپ ان سے یہ کام نہ چھڑوائیں" حضرتؒ کی نظر قدر شناس میں حضرت مفتی صاحبؒ کے تبحر علم و تفقہ فی الدین کی کس قدر قدر و منزلت تھی۔

(۴) ایک اور بات یاد آئی، حضرت تھانوی قدس سرہ کے ذہن پر احکام القرآن کی تالیف کا بڑا تقاضا تھا، اور آپ نے اس کا ایک حصہ حضرت مفتی صاحبؒ کے، دوسرا حضرت مولانا ظفر احمد صاحب عثمانیؒ کے اور تیسرا حضرت مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلویؒ کے سپرد فرمایا تھا۔ مرض وفات کے زمانے میں حضرتؒ ایک روز آنکھیں بند کیے لیٹے تھے، اچانک فرمایا کہ: "کیا مفتی شفیع ہیں؟" مفتی صاحبؒ موجود تھے، فرمایا: "جی، میں حاضر ہوں" حضرتؒ نے فرمایا: "والمحصنٰت میں جو یہ آیت ہے، اس سے یہ مسئلہ مستنبط ہوتا ہے" یہ فرما کر آنکھیں پھر بند کر لیں۔ کافی دیر گزرنے کے بعد پھر آنکھیں کھولیں اور پوچھا "کیا مفتی شفیع ہیں؟" مفتی صاحبؒ نے پھر فرمایا: "جی میں حاضر ہوں" حضرتؒ نے فرمایا کہ "دیکھو فلاں آیت سے یہ مسئلہ مستنبط ہوتا ہے۔ اس کو ضبط کر لو"

میں اس واقعے سے یہ بتانا چاہتا ہوں کہ حضرتؒ کے آخری ایام ہیں، آپ صاحب فراش ہیں مگر پھر بھی حضرت مفتی صاحبؒ کی موجودگی میں ایک وجدانی کیفیت محسوس کرتے ہیں اور اس حالت میں صرف مفتی صاحبؒ کو یاد فرماتے ہیں۔ اسی طرح اکثر و بیشتر حضرتؒ مفتی صاحب کو متوجہ فرماتے رہتے تھے، جب بھی حضرت مفتی صاحبؒ شریک مجلس ہوتے تھے تو دیکھا گیا ہے کہ حضرت خاص طور پر قرآن و حدیث اور طریقت کے بڑے بڑے غامض مضامین اور حقائق و معارف کی شرح و توضیح فرماتے تھے اور خصوصیت کے ساتھ حضرت مفتی صاحبؒ کی طرف توجہ و مخاطبت رہتی تھی۔

(۵) ایک مرتبہ حضرت حکیم الامت قدس سرہ نے فرمایا کہ "مجھے اپنے مرنے کا کوئی ڈر نہیں، کیونکہ بحمد اللہ چند لوگ ایسے موجود ہیں جو میرے بعد میرے خدمت دین کے کام کو آگے بڑھائیں گے اس

کے بعد آپ نے دو چار حضرات کے نام لیے جن میں حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ کا نام منفرد تھا کیونکہ حضرت مولانا محمد عیسیٰ صاحبؒ اور بعض دوسرے علما کا تو حضرتؒ کے وصال کے بعد جلد ہی انتقال ہوگیا اور بحمداللہ حضرت مفتی صاحبؒ آپ کے بعد تقریباً چونتیس سال خدمت دین میں مشغول رہے اور اللہ تعالیٰ نے آپ سے عظیم الشان کام لیے۔

(۶) ہمارے حضرت تھانوی قدس سرہٗ فرمایا کرتے تھے کہ مجھے اپنا ذوق بہت عزیز ہے اور یہ ذوق سالہا سال کے بعد مرتب ہوا ہے اور میرے ذوق و مسلک پر مفتی محمد شفیعؒ پورے اترتے ہیں۔

میں کہتا ہوں کہ آج دنیا نے حضرت تھانوی قدس سرہٗ کو مجدد ملت تسلیم کرلیا ہے کیونکہ آپ نے جو عظیم الشان اصلاحی کارنامے سرانجام دیے وہ آپ کے مجدد ہونے کی دلیل ہیں۔ اتنے بڑے مجدد کا وارث ہونا کوئی معمولی بات نہ تھی۔ میں نے خود دیکھا ہے کہ حضرت مفتی صاحبؒ میں حضرت تھانویؒ کا رنگ بھرا ہوا تھا، یہاں تک کہ آپ کبھی کبھی جہری نمازوں میں جو قرأت فرماتے، اس میں بھی حضرتؒ کے پڑھنے کا انداز جھلکنے لگتا تھا اور انداز گفتگو میں بھی بعض وقت حضرتؒ کا لب و لہجہ آجاتا تھا۔

انہی وجوہ کی بنا پر میں نے حضرت مفتی صاحبؒ سے اپنا تعلق قائم کر رکھا تھا کیونکہ میں سمجھتا تھا کہ اس طرح میرا حضرت تھانوی قدس سرہٗ سے جو تعلق تھا وہ برقرار رہے گا۔ حضرت مفتی صاحبؒ بھی میرے حالات سے پوری طرح آگاہ رہتے تھے۔ میں جب بھی آپ کے پاس جاتا، آپ فرماتے: "اچھا کیا ڈاکٹر صاحب آپ تشریف لے آئے" اور ان کا چہرہ مسرت سے کھل اٹھتا تھا۔

میں اپنے دوستوں سے اپنے حضرت تھانوی قدس سرہٗ کی جو باتیں کیا کرتا ہوں اور ان باتوں کی جو تشریح کرتا ہوں، بارہا حضرت مفتی صاحبؒ نے انھیں سنا اور اس طرح مجھے سند مل گئی کہ میں جو تشریح کر رہا ہوں وہ صحیح ہے کیونکہ حضرت مفتی صاحبؒ ہمارے حضرتؒ کے مزاج و مشرب سے خوب واقف تھے اور ان کی تصدیق میرے لیے موجب صد اطمینان تھی۔

(۷) یاد آیا کہ ایک مرتبہ دارالعلوم میں ایک مجلس تھی، اساتذہ کرام اور طلبہ حاضر تھے۔ میں وہاں پہنچا تو حضرت مفتی صاحبؒ نے حاضرین سے فرمایا: "ڈاکٹر صاحب آپ سے کچھ باتیں فرمائیں گے۔ یہ اصطلاحی عالم تو نہیں مگر انشاء اللہ علما کے کام کی باتیں ارشاد فرمائیں گے۔" میں نے عرض کیا کہ "حضرت! ایک شرط ہے، اور وہ یہ ہے کہ آپ یہاں تشریف نہ رکھیں"۔ چنانچہ حضرت مفتی صاحب تشریف لے گئے، اور

میں نے حضرت تھانوی قدس سرہٗ کی باتیں شروع کر دیں، کیونکہ میرا مبلغ علم تو صرف اور صرف حضرت تھانوی قدس سرہٗ ہی کی باتیں ہیں ؎

موسم گل میں پوچھتے ہو کیا حال تم اس دیوانے کا
جس نے ایک ہی گل کے اندر سارا گلستاں دیکھا ہے

میں نے دیکھا کہ حضرت مفتی صاحبؒ بعد میں خاموشی کے ساتھ مجلس میں پیچھے آ کر بیٹھ گئے، مجھے ان کی اس تواضع پر بے حد شرمندگی محسوس ہوئی۔

(۸) میری مجلس میں ایک صاحب آیا کرتے تھے جن کا نام مسعود احسن تھا، اب وہ مرحوم ہو چکے ہیں، اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے اور ان کے درجات بلند کرے۔ وہ حضرت مولانا مسیح اللہ خان صاحب مدظلہم سے بیعت تھے، میں مجلس میں حضرت تھانوی قدس سرہٗ کی جو باتیں کیا کرتا ہوں، انھوں نے وہ نوٹ کر لیں، یہاں تک کہ ان کا اچھا خاصا ذخیرہ ان کے پاس جمع ہو گیا۔ اور ایک مرتبہ انھوں نے میری عدم موجودگی میں وہ بیانش حضرت مولانا سلیم اللہ صاحب مدظلہم کو دکھا کر اس کی کتابت بھی کروا لی، پھر مجھ سے اس کی طباعت کی اجازت مانگی، میں نے اجازت دینے سے انکار کر دیا، اور کہا کہ اس کی ایک ہی صورت ہے، اور وہ یہ کہ آپ یہ مجموعہ حضرت مفتی صاحبؒ کو دکھا دیں، اگر وہ اجازت دے دیں تو پھر آپ چھاپ سکتے ہیں، چنانچہ وہ حضرت مفتی صاحبؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور بیاض کے مختلف حصے حضرتؒ کو سنائے، حضرتؒ نے اس کو سن کر بہت پسند فرمایا اور اسی وقت مجھے فون کیا کہ مسعود حسن صاحب آئے ہوئے ہیں اور انھوں نے آپ کی جو مجالس قلمبند کی ہیں، مجھے سنا رہے ہیں، مجھے یہ باتیں بہت پسند آئی ہیں۔ اس کے بعد آپ نے ایک تقریظ بھی لکھ کر انھیں دی، چنانچہ یہ کتاب "مآثر حکیم الامت" کے نام سے شائع ہوئی اور حضرت مفتی صاحبؒ کی تقریظ اس کی زینت بنی۔ حضرت مفتی صاحبؒ کی یہ خصوصیت میرے لیے بڑا سرمایۂ تشکر و امتنان ہے۔

(۹) میں حتی الامکان اپنا کوئی اہم کام حضرت مفتی صاحبؒ سے مشورے کے بغیر نہیں کرتا تھا۔ میرے دل میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ احادیث جمع کرنے کا داعیہ پیدا ہوا جو زندگی کے ہر شعبے سے متعلق آپ کی سنتوں پر مشتمل ہوں، تاکہ ان کو یاد کر کے ان پر عمل کیا جائے۔ چنانچہ میں نے مختلف کتابوں سے احادیث کا ایک بڑا حصہ جمع کر لیا۔ میں اس کو حضرت مفتی صاحب قدس سرہٗ کی خدمت

میں لے گیا، حضرتؒ نے فرمایا کہ "بھائی میں تو علیل ہوں، البتہ میں اسے کسی عالم کو دکھا دوں گا" اس کے کچھ عرصہ کے بعد جب میں حاضر ہوا تو فرمانے لگے کہ میں نے اسے دکھا لیا ہے، مجموعہ تو بڑا اچھا اور مفید تیار ہو گیا ہے اور بحیثیت مجموعی احادیث معتبر بھی ہیں لیکن بہت سی احادیث ایسی کتابوں کے حوالہ سے بھی لے لی گئی ہیں جن کے مؤلفین غیر معتبر ہیں۔ اس کے بعد آپ نے سیرت و حدیث کی بعض مستند کتابوں کے نام بتلائے کہ اگر صرف ان کتابوں پر اکتفا کیا جاتا تو بہتر تھا، خدا معلوم مجھ پر کیا حالت طاری ہوئی کہ میں نے عرض کیا کہ میں اپنے اس تمام کام کو کالعدم سمجھ کر اسے از سر نو آپ کی ہدایت کے مطابق انجام دوں گا۔ چنانچہ میں اس کے بعد ڈھائی سال مسلسل اس کام میں لگا رہا اور اس کے بعد جو مجموعہ لے کر آیا اسے دیکھ کر آپ بہت خوش ہوئے، دعائیں دیں اور اس پر میرے کچھ کہے بغیر ایک مقدمہ بھی تحریر فرمایا اور کتاب کا نام بھی خود ہی "اسوۂ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم" تجویز فرمایا۔

جب کتاب شائع ہو گئی تو علماء نے اس میں بعض ایسے مقامات کی نشان دہی فرمائی کہ جن میں کوئی مسئلہ مذہب حنفی کے خلاف درج ہو گیا تھا۔ چنانچہ حضرت مفتی صاحب قدس سرہٗ نے اپنے بعض خدام سے ایسے مقامات متعین کروائے اور ان کو حذف کر کے صرف مستند مسائل کو باقی رکھا پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ دوسرے ایڈیشن کے لیے حضرت مفتی صاحبؒ نے میری جانب سے "عرض مؤلف" میرے کہے بغیر خود تحریر فرمایا۔ یہ مجھ پر حضرت مفتی صاحب قدس سرہٗ کی عنایات و شفقت کی انتہا تھی۔

(۱۰) حضرت مفتی صاحبؒ کو حضرت حکیم الامتؒ اور اپنے دوسرے اساتذہ و مشائخ سے نمود و نمائش کے بغیر خالصۃً لوجہ اللہ خدمتِ دین کا جذبہ وراثت میں ملا تھا، چنانچہ پاکستان آنے کے بعد آپ کے دل میں یہ جذبہ پیدا ہوا کہ یہ ملک نیا نیا بنا ہے، اس میں اللہ اور اس کے رسولؐ کی تعلیمات کو عام کرنے اور علوم اسلامی کی نشر و اشاعت کی ضرورت ہے، اس غرض کے لیے آپ نے دار العلوم کراچی قائم فرمایا۔

شروع میں یہ ادارہ نانک واڑہ کی مختصر عمارت میں تھا لیکن جب کام وسیع ہوا اور جگہ تنگ پڑ گئی تو وسیع جگہ کی ضرورت پڑی۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے ایک کشادہ جگہ کا بھی انتظام فرمایا، اور آجکل جس جگہ پر اسلامیہ کالج ہے، یہ جگہ جو اُس وقت خالی تھی، دار العلوم کے لیے الاٹ ہو گئی، جگہ کشادہ اور شہر کے بہترین حصے میں ہونے کے علاوہ شیخ الاسلام حضرت علامہ شبیر احمد صاحب عثمانی

قدس سرہ کے مزار سے بالکل متصل تھی، اس لیے دارالعلوم کے لیے بے حد موزوں تھی، چنانچہ حضرت مفتی صاحبؒ نے اس پر دارالعلوم کی تعمیر کا کام شروع کرنے کا ارادہ کیا اور سنگ بنیاد رکھنے کے لیے ملک کے متقدر علماء و صلحاء کو دعوت دی اور ایک جلسہ بھی منعقد فرمایا لیکن عین اس وقت جب اس زمین پر اس چشمۂ خیر کی بنیاد ڈالی جارہی تھی بعض اہل غرض نے حضرت علامہ عثمانیؒ کی محترم اہلیہ (رحمہا اللہ) کو کسی شدید غلط فہمی میں مبتلا کر دیا جس کی بنا پر انھوں نے اس منصوبے کی مخالفت شروع کر دی اور ایک مرتبہ خود مزار پر تشریف لا کر انھوں نے اس کی مخالفت کا اعلان کیا، شدید غلط فہمیوں کی بنا پر جب کوئی فہمائش کارگر نہ ہوئی تو لوگوں نے حضرت مفتی صاحبؒ سے یہی کہا کہ چونکہ مخالفت کی کوئی معقول وجہ نہیں ہے اس لیے آپ اپنا کام جاری رکھیں، تحفظ قانون کے اداروں نے بھی پورا یقین دلایا کہ آپ کسی تذبذب کے بغیر یہ کام شروع کر سکتے ہیں اور پولیس آپ کے ساتھ ہوگی لیکن حضرت مفتی صاحبؒ نے فرمایا کہ میں یہ کام نہیں کر سکتا، حضرت علامہ عثمانیؒ کی اہلیہ محترمہ اگرچہ شدید غلط فہمیوں کا شکار ہو گئی ہیں لیکن میرے لیے یہ ممکن نہیں ہے کہ میں اپنے استاذ محترم کی اہلیہ کے خلاف اس معاملے میں قوت استعمال کروں، اللہ تعالیٰ مدرسے کے لیے کوئی زمین اور دے دے گا۔

اللہ اکبر! استاذ کے احترام، ان کی اہلیہ کی عزت اور بے نفسی و توکل کا کیا مقام تھا کہ حق پر ہونے اور اس کو منوانے کی پوری طاقت کے باوجود اتنی بڑی زمین محض استاذ کی اہلیہ کی دلشکنی کے اندیشے سے چھوڑ بیٹھے، اس وقت دارالعلوم کے لیے کوئی متبادل جگہ سامنے نہ تھی لیکن آپ نے اس جگہ کو محض توکلاً علی اللہ خالی کر دیا، اللہ تعالیٰ اپنے نیک بندوں کی مدد فرماتا ہے، چنانچہ اس کے کچھ ہی عرصے کے بعد مدرسہ کے لیے شہر سے باہر اتنی وسیع و عریض جگہ مل گئی کہ اس کا خواب خیال بھی پہلے نہیں تھا، یہ جگہ شہر سے کافی دور تھی، کئی کئی میل تک آبادی نہ تھی، حضرت مفتی صاحبؒ نے اس جنگل کو منگل بنایا، دیکھتے ہی دیکھتے یہاں وسیع و عریض درسگاہیں، طلبا کا دارالاقامہ، دارالحدیث، دارالتفسیر، دارالافتاء اور تمام ضروری شعبے قائم ہو گئے اور پھر رفتہ رفتہ شہر کی آبادی بھی بالکل قریب تک پہنچ گئی اور تمام ضروریات فراہم ہونے لگیں۔

آپ نے دارالعلوم صرف دین کی نشر و اشاعت کے لیے قائم فرمایا تھا، اس سے آپ کا کوئی ذاتی مفاد وابستہ نہیں تھا، آپ نے اس کی بنیاد توکل پر رکھی، نہ پہلے کوئی اشتہار دیا، نہ فنڈ جمع

کرنے کی مہم شروع کی بلکہ توکلاً علی اللہ بیٹھ گئے اور یہ توکل انسان اسی وقت کرسکتا ہے جب اس کا ایمان کامل ہو۔

دارالعلوم کی بنیاد اخلاص اور اتباع سُنّت پر رکھی گئی چنانچہ یہاں کے در و دیوار میں جو روشنی ہے وہ حضرت مفتی صاحبؒ کی للّٰہیت کی نشانی ہے جس طرح حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی قدس سرہٗ نے دارالعلوم دیوبند کی بنیاد تقویٰ، طہارت اور للّٰہیت پر رکھی تھی۔ انہی کی اتباع کرتے ہوئے ان کے ایک نام لیوا نے اس دارالعلوم کی بنیاد رکھی چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اس مدرسے کو ملک بھر میں منفرد شان عطا فرمائی اور اس کا وقار علمی دلوں میں جاگزیں ہوگیا۔

حضرت مفتی صاحب قدس سرہٗ نے معارف القرآن تالیف فرمائی۔ اس کے بارے میں میرا تأثر یہ ہے کہ یہ کتاب حضرت مفتی صاحبؒ سے اللہ تعالیٰ نے غیر معمولی طور پر لکھوائی ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ اس تالیف پر مامور من اللہ تھے، یہی وجہ ہے کہ شدید علالت اور عوارض کے ہجوم میں بھی آپ کو ہر وقت اس تالیف کا دھیان رہتا تھا، مجھے یاد ہے کہ جب آپ کو پہلی بار دل کا دورہ ہوا اور آپ ہسپتال میں داخل ہوئے تو آپ کے ذہن پر سب سے زیادہ فکر معارف القرآن کی تھی۔ دل کا دورہ پڑا ہوا ہے ہسپتال میں داخل ہیں، اکثر اوقات غشی طاری رہتی ہے لیکن جب کبھی ہوش آتا ہے تو کہتے ہیں کہ:

"معارف القرآن کا ڈیڑھ پارہ باقی ہے"۔ آپ یہ بات بڑی حسرت سے فرماتے اور معلوم ہوتا تھا کہ کی یہ آرزو ہے کہ معارف القرآن کی تکمیل ہو جائے۔ کیا حضرتؒ کے اس مقام کا اندازہ کوئی کرسکتا ہے؟

حیات و موت کی کشمکش کے ایسے نازک لمحات میں تمام ماحول سے بے خبری اور بے نیازی کا یہ عالم ہے رضائے الٰہی کے حصول کا جو ذریعہ معارف القرآن کو بنا لیا ہے، اس کا کچھ حصہ باقی رہ جانے کی خلش روح میں متحرک ہے۔ اللہ اکبر! جن لوگوں کو قرب و معیت الٰہی میں فنائے تام حاصل ہو جاتی ہے، ان کے پیش نظر سوائے تصور ذات کے کوئی اور شے نہیں ہوتی، حضرت مفتی صاحبؒ اس وقت اسی مقام لا الٰہ الا اللہ میں غرق تھے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے آپ کی یہ آرزو پوری فرما دی۔

حکیم الامت حضرت تھانوی قدس سرہٗ کو اللہ تعالیٰ نے تفسیر قرآن میں ایک منفرد مقام عطا فرمایا تھا۔ آپ کی تفسیر بیان القرآن ایک یگانۂ روزگار تفسیر ہے جسے لکھنے کے لیے آپ نے بیسیوں تفسیریں سامنے رکھی ہیں اور قوسین کے درمیان چند مختصر لفظوں میں بڑے بڑے اشکالات کو پانی کر دیا ہے۔

ہمارے حضرت مفتی صاحبؒ کو چونکہ اپنے شیخؒ سے غیر معمولی مناسبت، محبت اور عقیدت تھی اسلئے اللہ تعالیٰ نے آپ کو بھی تفسیر میں منفرد مقام عطا فرمایا اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ علوم قرآنی جو حضرت شیخؒ کے سینۂ مبارک میں مخزون تھے، حضرتؒ کی توجہات خاص سے حضرت مفتی صاحبؒ کے سینہ مبارک میں منتقل ہوگئے اور ان کا ظہور معارف القرآن میں ہوا چنانچہ معارف القرآن اپنے عہد کی دوسری تمام کتابوں پر سبقت لے گئی۔

حضرت مفتی صاحب قدس سرہ کو اللہ تعالیٰ نے علوم ظاہری کے ساتھ علوم باطنی کی دولت بھی فراوانی کے ساتھ عطا فرمائی تھی، علوم باطن کے بغیر علوم ظاہر ایسے ہیں جیسے روح کے بغیر جسم۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت مفتی صاحبؒ کو جسم کے ساتھ اس کی روح بھی عنایت فرمائی تھی۔ آپ کی زندگی میں علم و عمل کے اعلیٰ معیار پر ہونے کے باوجود انتہائی سادگی تھی، آپ ہر کس و ناکس سے خندہ پیشانی کے ساتھ پیش آتے تھے، آپ کی بے تکلفی اور سادگی کا عالم یہ تھا کہ میں ایک روز آپ سے ملنے گیا تو دیکھا کہ حضرتؒ کمرے میں جھاڑو دے رہے ہیں، میں نے عرض کیا کہ حضرت! میں دے دوں؟ فرمایا نہیں! پورے کمرے کو جھاڑو دی، کچھ کچرا اٹھا کر پھینکا۔ پھر ہاتھ دھو کر مصافحہ کیا اور بے تکلفی سے باتیں شروع کر دیں۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت مفتی صاحبؒ کو باعتبار دین و دنیا بڑے مراتب عالیہ عطا فرمائے تھے مگر ان کا انداز زندگانی اسی طرح سادہ اور بے تکلف تھا اور کوئی امتیازی شان معلوم نہ ہوتی تھی۔ ان کی ساری زندگی اسوۂ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم میں ڈھلی ہوئی تھی یہی سبب تھا کہ ان کی ذات میں بڑی محبوبیت تھی۔ ظاہری اور باطنی کمالات کی وجہ سے لوگوں کو صرف عقیدت ہی نہیں بلکہ ایک درجہ کی محبت بھی تھی، ہر طبقہ کے لوگوں میں نہایت ہر دلعزیز تھے۔ تواضع و انکساری ان کی عادتِ ثانیہ تھی۔ لباس و پوشاک رہنے سہنے میں نہایت سادگی اور بے تکلفی تھی، میں نے ان کو کبھی قیمتی لباس پہنے نہیں دیکھا، عام طور پر چوگوشہ ٹوپی، کرتا، اس پر بعض وقت صدری اور شرعی پاجامہ البتہ جب کبھی کسی تقریب یا مجلس خاص میں جاتے تو عمامہ زیب سر اور عبا زیب تن فرما لیتے تھے، ایک رومال بھی ہاتھ میں رہتا تھا، روزمرہ کے استعمال کی ضروری اشیاء بھی نہایت سادہ اور معمولی حیثیت کی رہتی تھیں۔ اپنے ضروری کام خود اپنے ہاتھ سے انجام فرما لیتے تھے بقول کسی شاعر کے ؎

تکلف سے نہیں خالی کوئی بات ۔ مگر ہر بات میں اک سادگی ہے

ایک مرتبہ میں حضرتؒ کے ساتھ بیٹھا ہُوا تھا کہ گھر کے اندر سے بُلاوا آیا۔ حضرتؒ اندر نہیں گئے، پھر بُلاوا آیا تو فرمانے لگے کہ بھائی! ہمارے ناشتے کا وقت ہے، پھر ناشتہ وہیں منگوالیا، اور مجھ سے فرمایا کہ آپ بھی ہمارے ناشتے میں شامل ہوجائیے۔ ناشتہ آیا تو میں نے دیکھا کہ اس میں تین چار پھلکے تھے۔ ماش کی دال تھی، پاپے تھے اور چائے۔ آپ نے کوئی تکلف نہیں فرمایا اور یہی سادگی اور بے تکلفی آپ کے ہر انداز زندگی کی جان تھی۔

آپ کی نجی زندگی عام انسانوں کی طرح تھی لیکن اس میں استغنا کوٹ کوٹ کر بھرا ہُوا تھا، آپ نے کبھی کسی امیر یا عہدہ دار سے اس بنا پر تعلق قائم نہیں کیا کہ اس سے اپنی ذات کو بلکہ دارالعلوم کو کوئی فائدہ پہنچے۔ آپ نے کبھی کسی دولت مند سے دارالعلوم کے لیے چندے کی فرمائش نہیں کی۔ کوئی شخص اپنی بنرار سعادت سمجھ کر رقم لے آتا تو آپ قبول فرمالیتے لیکن چندے کی اپیلیں کرتے پھرنا آپ کے مزاج کے بالکل خلاف تھا بلکہ اگر کسی شخص کے چندے میں اس بات کا کوئی شائبہ بھی محسوس ہوتا کہ یہ صدق و اخلاص کے بجائے احسان جتانے کی غرض سے دے رہا ہے، آپ اُسے واپس فرمادیتے تھے۔

جب آپ دارالعلوم کی تعمیر سے فارغ ہوگئے تو میں نے عرض کیا کہ "حضرت! آپ ایک ہفتہ وار اصلاحی مجلس منعقد کیا کریں تاکہ اس سے اپنے بزرگوں کی مجالس کی جھلک لوگوں کے سامنے آجائے۔" حضرتؒ نے یہ سُن کر فرمایا کہ "اب میرا بھی یہی دل چاہتا ہے اور یہ آیت پیش نظر ہے کہ:

فَإِذَا فَرَغْتَ فَانْصَبْ وَإِلَىٰ رَبِّكَ فَارْغَبْ

جب تم فارغ ہوجاؤ تو اللہ کی عبادت میں محنت کرو اور اپنے پروردگار کی طرف رغبت اختیار کرو۔

فرمایا کہ "کبھی دل یہ چاہتا ہے کہ مکمل گوشہ نشینی اختیار کرلوں اور اللہ اللہ کرتا رہوں مگر پھر یہ سوچتا ہوں کہ اس میں نفع ذاتی ہے اور جو کام میں اب کر رہا ہوں اس میں نفع متعدی ہے، اس لیے اس میں لگا ہُوا ہوں۔" مفتی صاحبؒ کا یہ وجدانی مقام تھا کہ وہ کسی حال میں ہوں ان پر غلبۂ توحید کی کیفیت ضرور طاری رہتی تھی، اکثر دوران گفتگو محبت الٰہی میں ڈوبے ہوئے سوز و گداز کے الفاظ ضرور زبان پر بے ساختہ آجایا کرتے تھے خشیت الٰہی جو علمائے ربانی و حقانی کی خصوصیات میں سے ہے وہ اکثر و بیشتر حضرت مفتی صاحبؒ پر طاری ہوتے دیکھی ہے، جب کوئی اہم معاملہ دین و دنیا کا سامنے

آ تا تھا تو خصوصیت کے ساتھ اس جذبہ کا اظہار ہوتا تھا اور معاملہ کو حدود شریعت کے اندر ہی رکھتے تھے ایک دفعہ فرمانے لگے کہ "اب تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ میں تنہا رہ گیا ہوں"۔ میں نے عرض کیا کہ حضرت! آپ پر حضرت تھانویؒ کا رنگ پورا پورا غالب آتا جارہا ہے۔ ہمارے حضرت تھانوی قدس سرہٗ بھی آخری ایام میں یہی فرمایا کرتے تھے اور اکثر یہ شعر پڑھتے تھے کہ ؎

ہر تمنا دل سے رخصت ہوگئی
اب تو آجا، اب تو خلوت ہوگئی

یہ وہی حالت ہے جسے صوفیائے کرامؒ "باہمہ و بے ہمہ" سے تعبیر فرماتے ہیں، بقول حافظ شیرازیؒ

غلام ہمت آنم کہ زیر چرخ کبود
ہر کہ رنگ تعلق پذیرد آزاد است

جب آپ پر پہلا دل کا دورہ ہوا تو اس وقت میں حضرت الحکیم حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ عیادت کے لیے گیا، حضرت مفتی صاحبؒ ہم لوگوں کو دیکھ کر آبدیدہ ہوگئے اور نہایت نحیف اور لرزتی ہوئی آواز میں فرمانے لگے "میرے لیے دعا کرو کہ اللہ تعالیٰ میری مغفرت فرمادیں، میرے پاس کوئی سرمایۂ آخرت نہیں ہے، میں نے عمر بھر کچھ نہیں کیا، چند سیاہ لکیریں کھینچی ہیں، اللہ تعالیٰ انہی کو قبول فرمالیں تو ان کی رحمت ہے"۔ یہ بھی وہی غلبۂ توحید اور اپنی بے مائیگی کا احساس ہے جس کو مقام عبدیت اور فنا و الفنا سے تعبیر کرتے ہیں، ذالک فضل اللہ یؤتیہ من یشاء۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت مفتی صاحب قدس سرہٗ کو صبر کا بھی نہایت بلند مقام عطا فرمایا تھا جب حضرتؒ کے سب سے بڑے صاحبزادے مولوی محمد زکی صاحب مرحوم کا انتقال ہوا تو حضرت مفتی صاحبؒ شدید علالت کی وجہ سے صاحب فراش اور جسم پر آپریشن ہونے کی وجہ سے ناقابل بیان جسمانی کرب میں مبتلا تھے، اس حالت میں اپنے انتہائی ہونہار، سعادت مند، اور جوان بیٹے کا حادثۂ وفات کوئی معمولی بات نہ تھی، ہم سب یہ سوچ رہے تھے کہ کس عنوان سے اُن کو اس حادثے کی اطلاع کی جائے۔ ایسی ہی آزمائشوں کے وقت مقربین بارگاہ کی عالی ظرفی اور قوت ایمانیہ کا ظہور ہوتا ہے۔ حضرت مفتی صاحبؒ کی زندگی کا یہ منظر اپنی نوعیت میں بے مثال اور انتہائی ایمان افروز ہے، یہ جانکاہ خبر سُن کر حضرتؒ پر ایک خاص اضطراری کیفیت چند لمحوں کے لیے طاری ہوئی، آنکھوں میں آنسو بھر آئے، اللہ اللہ کے

الفاظ زبان پر جاری ہوگئے، بہت نقاہت کے ساتھ رُک رُک کر اپنے تاثراتِ قلبی کا اظہار فرمانے لگے اور سلسلۂ گفتگو دیر تک جاری رہا، حضرتؒ کی باتیں ہم سُن رہے تھے اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ہم لوگوں کو صبرِ جمیل کی تلقین فرما رہے ہیں۔ فرمانے لگے کہ اس صدمۂ جانگداز کے مقابلے میں تو جسمانی سوزش کی یہ اذیت بھی اللہ تعالیٰ کی بڑی نعمت محسوس ہوتی ہے۔ حضرت مفتی صاحبؒ اس وقت کچھ ایسے عالم میں تھے کہ مقامِ رضا بالقضا، مقامِ صبرِ جمیل، مقامِ معیتِ الٰہیہ، مقامِ عبدیتِ کاملہ، مقامِ فنا الفنا، مقامِ فنا فی اللہ، ان میں سے ہر مقام ان کا مقامِ تمکین معلوم ہوتا تھا۔

میں نے جس مقصد کے لیے حضرت مفتی صاحبؒ سے تعلق قائم کیا تھا، الحمد للہ وہ پورا ہُوا میرا مقصد یہ تھا کہ میرا تعلق ان کے واسطے سے اپنے شیخؒ کے ساتھ قائم اور مضبوط رہے، کیونکہ میں اپنے آپ کو ناقص سمجھتا تھا۔ بحمد اللہ حضرت مفتی صاحبؒ کے تعلق کے بعد وہ تعلق اور قوی اور مستحکم ہوگیا اور میں نے اپنا مقصد پا لیا۔ لیکن قدر مردم بعد مردم، حقیقت یہ ہے کہ اب میری تشنگی کا بڑا تحسر یہی ہے کہ مجھے حضرت مفتی صاحبؒ کی کما حقہ قدر و منزلت اور مقاماتِ باطنہ کے علو کا صحیح عرفان حاصل نہ ہُوا اور میں ان سے معتد بہ استفادہ نہ کر سکا، مگر یہ حقیقت بھی میرے لیے نہایت مغتنم ہے کہ مجھے ان سے والہانہ عقیدت اور محبت تھی اور انھوں نے بھی میرے ساتھ نہایت محبت و شفقت کا بے مثال تعلق رکھا، اللہ تعالیٰ کا یہ میرے اوپر عظیم احسان و انعام ہے اور انشاء اللہ میرے لیے سرمایۂ آخرت ہے۔

اللہ تعالیٰ حضرت مفتی صاحبؒ کو بلند سے بلند درجات عطا فرمائے اور ہم سب کو اُن کے نقشِ قدم پر چلنے کی توفیق مرحمت فرمائے۔ آمین

○

"یہ کہنا کہ عُلماء وقت کے تقاضوں سے بے خبر ہیں یا وہ ان تقاضوں کی طرف توجہ نہیں دینا چاہتے، محقق اور اہلِ بصیرت عُلماء امت کے حالات اور تصانیف سے بے خبری کا نتیجہ ہے، جس کا بڑا سبب بہت سی ادھوری تعلیم والوں کا اہلِ علم کے نام سے معروف ہوجانا اور ناواقف عوام کا دین کے تمام معاملات میں ان پر اعتماد کرلینا ہے۔" (ادارہ تحقیقات اسلامی، البلاغ اکتوبر ۱۹۶۰ء حکیم

مناظر سے حضرت مولانا محمد منظور نعمانی صاحب مدظلہ
لکھنؤ ۔ بھارت

چند یادیں

برصغیر میں علوم دینیہ کے سب سے بڑے مرکز دارالعلوم دیوبند میں ایک طالب علم کی حیثیت سے راقم سطور اب سے قریباً ستاون سال پہلے شوال ۱۳۴۵ھ میں داخل ہوا تھا ـــــ اس وقت ہمارے دینی مدارس میں منطق، فلسفہ اور علم کلام وغیرہ "معقولات" کا بہت زور تھا، میں ان فنون اور علوم عربیہ کی تعلیم و تحصیل سے فارغ ہو کر وہاں پہنچا تھا ـــــ میرا طالب علمانہ قیام دارالعلوم میں صرف دو سال رہا۔ پہلے سال مشکوٰۃ شریف اور ہدایہ اخیرین کی جماعت میں شرکت رہی اور دوسرے سال دورۂ حدیث میں ـــــ ان جماعتوں کے سارے اسباق اس دور کے دارالعلوم کے اکابر اساتذہ (امام العصر حضرت مولانا محمد انور شاہ کشمیری، حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمن عثمانی، حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی، حضرت مولانا سراج احمد رشیدی، حضرت مولانا رسول خاں ہزاروی، حضرت مولانا اعزاز علی امروہوی، حضرت مولانا محمد ابراہیم بلیاوی، رحمہم اللہ تعالیٰ) ہی پڑھاتے تھے اس لیے راقم سطور کو دارالعلوم کے صرف انھی اساتذۂ کبار کے تلمذ کا شرف حاصل ہو سکا۔

اپنی طالب علمی کے اس دور میں بھی کم آمیزی کا گویا مریض تھا (اب بھی یہی حال ہے جو میرے لیے یقیناً مفید سے زیادہ مُضر ہے) بہرحال کم آمیزی کی اسی عادت کی وجہ سے دارالعلوم کے اس دور کے ان حضرات اساتذہ سے کوئی خاص تعلق اور رابطہ نہیں رہا جن سے کوئی سبق پڑھنے کی سعادت حاصل نہیں ہوئی، ان اساتذہ میں حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب بھی تھے جو دارالعلوم کے کم عمر اساتذہ میں اپنے علم اور سیرت و صلاح کے لحاظ سے اس وقت بھی ممتاز سمجھے جاتے تھے۔

ان کا ایک امتیازی وصف جس کا اس زمانے میں بھی قلب پر خاص اثر تھا، تواضع کا غیرمعمولی رویہ تھا۔ جہاں تک یاد ہے، جب بھی ان کو دیکھا، نگاہ نیچی اور سر جھکا ہی دیکھا، جو طالب علم سامنے آتا، سلام میں سبقت فرماتے۔ اور اگر طالب علم سلام کرتا تو ازراہِ تواضع کسی قدر خمیدہ ہوکر، بڑی محبت سے سلام کا جواب دیتے۔ جب کسی سے مخاطب ہوتے یا کوئی آپ سے مخاطب ہوتا ہمیشہ حسین چہرے پر مسکراہٹ کھیلتی۔

دارالعلوم کی مسجد سے متصل ایک بالائی کمرے پر آپ کا تجارتی کتب خانہ تھا (جو غالباً اس زمانے میں استاذنا حضرت میاں سید اصغر حسین صاحبؒ کی شرکت میں تھا) جب کبھی اپنے لیے یا کسی دوسرے کے لیے کوئی کتاب خریدنے کے واسطے وہاں جانا ہوتا تو مفتی صاحبؒ (جو بہرحال دارالعلوم کے اساتذہ میں تھے) مجھ طالب علم سے اس طرح پیش آتے کہ مجھے بڑی ندامت اور شرمندگی ہوتی۔ غالباً ہر ایک کے ساتھ وہ اسی طرح پیش آتے ہوں گے۔

❊

یہ دَور جب کہ راقم سطور دارالعلوم کا طالب علم تھا وہ خاص دَور تھا جب کہ استاذنا حضرت کشمیری قدس سرہ پر قادیان کے متنبی کذّاب غلام احمد اور اس کی امت کے خلاف قلمی ولسانی جہاد کا جذبہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے کچھ اس طرح طاری کردیا گیا تھا جس طرح مسیلمہ کذّاب کے خلاف جہاد بالسیف کا جذبہ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ پر طاری کیا گیا تھا۔ حضرت استاذؒ اُردو میں لکھنے کے بالکل عادی نہیں تھے، خط وکتابت بھی عربی یا فارسی ہی میں فرماتے تھے اور عربی میں لکھنے کا انداز بھی متقدمین کا تھا جس کا ہمارے زمانے کے عام عربی دانوں کے لیے سمجھنا آسان نہ ہوتا تھا، اس لیے چاہتے تھے کہ آپ کے باصلاحیت تلامذہ قادیانی فتنہ پر اُردو میں لکھیں اور ان کے مافی الضمیر کی ترجمانی کریں۔ اس کام کے لیے حضرت استاذ نے جن چند حضرات کو خصوصیت سے منتخب کیا تھا ان میں حضرت مولانا محمد شفیع صاحب کا خاص مقام تھا ــــ ختمِ نبوت کے موضوع پر اردو زبان میں "ختم النبوۃ" کے تینوں حصے، اور عربی میں "ھدیۃ المھدیین" اس زمانے میں لکھی گئی تھیں۔ کہا جاسکتا ہے کہ مفتی صاحب کو اس خاص موضوع میں تخصص کا مقام حاصل تھا۔

دارالعلوم کی طالب علمی کا دور ختم کرنے کے کچھ ہی دن بعد یہ عاجز امروہہ (ضلع مراد آباد) کے مدرسہ عالیہ اسلامیہ میں مدرس مقرر ہوگیا تھا ۔ اس زمانے میں ملک کے طول و عرض میں قادیانی فتنے کا زور تھا، جا بجا مناظرے ہوتے تھے ــــ اسی طرح اُس زمانے میں حجازِ مقدس پر سلطان عبدالعزیز ابن سعود کی حکومت قائم ہوجانے کے بعد سے بریلوی مبتدعین نے بھی اودھم مچا رکھا تھا، راقم سطور کا تدریسی مشغلے کے ساتھ ان میدانوں سے بھی تعلق تھا اور اس سلسلے میں اللہ تعالیٰ کی خاص نصرت و تائید نصیب تھی، والحمدللہ علیٰ ذالک -

غالباً ۱۹۲۸ء کا کوئی مہینہ تھا کہ حضرت مولانا محمد عبدالشکور صاحب فاروقی لکھنوی اچانک بغیر کسی اطلاع کے امروہہ تشریف لائے۔ کسی نے مجھے اطلاع دی اور بتلایا کہ تم سے ابھی ملنا چاہتے ہیں، میں خود فوراً ہی حاضر خدمت ہوگیا۔ فرمایا کہ میں اس وقت صرف تم کو ساتھ لینے کے لیے راستے میں ٹرین سے اترا ہوں۔ ضلع میرٹھ میں کوئی قصبہ اینچولی ہے، وہاں قادیانیوں سے مناظرہ طے ہوگیا ہے، اس قصبے نے بڑی اہمیت حاصل کرلی ہے۔ معلوم ہوا ہے کہ کچھ لوگوں کے قادیانی ہوجانے کا خطرہ ہے ــــ ایک صاحب جو مولانا کے ساتھ تھے ان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ کل ہی مجھے لینے کے لیے اینچولی سے لکھنؤ پہنچے تھے، میری طبیعت کئی دن سے خراب چل رہی تھی، لیکن میں نے پہنچنا ضروری سمجھا اور یہ طے کرلیا کہ امروہہ سے تم کو ساتھ لے لوں گا، اب پہلی ٹرین سے تم کو میرے ساتھ میرٹھ چلنا ہے، ممکن ہے مناظرہ تم ہی کو کرنا ہو ــــ الغرض ہم لوگ میرٹھ کے لیے روانہ ہوگئے، وہاں سے رات کے وقت اینچولی پہنچے۔ معلوم ہوا کہ دیوبند سے حضرت مولانا سید مرتضیٰ حسن صاحبؒ اور مولانا محمد شفیع صاحبؒ اور کچھ اور حضرات بھی ہم سے پہلے تشریف لا چکے ہیں ــــ یہ بھی معلوم ہوا کہ مناظرہ تین دن ہوگا، پہلے دن مسئلہ ختم نبوت پر اور دوسرے تیسرے دن صدق و کذبِ مرزا پر۔ جس میں پہلے دن قادیانی مناظر مدعی ہوگا اور مرزا غلام احمد کے دعوائے نبوت و مسیحیت کی صداقت ثابت کرنے کی کوشش کرے گا اور دوسرے دن مسلمانوں کا نمائندہ مناظر مدعی ہوگا اور مرزا کا کذاب ہونا ثابت کرے گا ــــ معلوم ہوا کہ مناظرے کے یہ موضوعات اور یہ ترتیب فریقین کے مقامی لوگوں نے پہلے سے طے کر رکھی ہیں۔

مشورے سے طے ہوا کہ پہلے دن مسئلہ ختم نبوت پر مناظرہ مجھے کرنا ہوگا، دوسرے دن حضرت

مولانا لکھنوی اور آخری دن حضرت مولانا چاند پوری مناظرہ فرمائیں گے ـــــ چنانچہ ایسا ہی ہوا ـــــ مناظرے میں ایک ایسے معاون کا وجود بہت مفید ہوتا ہے جس کی زیر بحث مسئلے کے مالۂ وماعلیہ پر خود بھی پوری نظر ہو اور حسب ضرورت وموقع کتابوں کے حوالے نکال کر مناظر کو دیتا رہے اور خود مناظر کو کتابوں سے حوالے نکالنے کا کام نہ کرنا پڑے ـــــ اس مناظرے میں یہ مدد مجھے جیسی حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ سے ملی، کبھی کسی مناظرے میں، کسی سے ایسی مدد نہیں مل سکی۔ معلوم ہوتا تھا کہ ختم نبوت کے موضوع سے متعلق مجھے جن حوالوں کی ضرورت پڑسکتی تھی وہ مفتی صاحبؒ کو گویا حفظ تھے ـــــ اس مناظرے پر پچاس سال سے زیادہ کی مدت گزر چکی ہے۔ لیکن اس سلسلے کی ایک دو قابل ذکر باتیں اب تک یاد ہیں ـــــ میرے فریق مقابل قادیانی مناظر (عبدالرحمٰن خادم، مولوی فاضل، بی۔اے) نے قرآن پاک کے لفظ خَاتَمَ سے متعلق گفتگو کرتے ہوئے لُغتِ حدیث کی مشہور کتاب "مجمع بحارالانوار" کا حوالہ دیا اور کتاب ہاتھ میں لے کر عبارت پڑھی۔ مفتی صاحب نے فوراً "مجمع بحارالانوار" کا وہی مقام نکال کے مجھے دیا اور بتلایا کہ اس قادیانی نے عبارت پڑھنے میں خیانت کی ہے ـــــ اسی طرح جب اس نے شیخ اکبر ابن عربی کی "فتوحاتِ مکیہ" سے ایک عبارت پیش کی (جس سے مسئلہ ختم نبوت کے بارے میں ان لوگوں کو مغالطہ ہوسکتا ہے جنھوں نے خود "فتوحات" کا مطالعہ نہیں کیا ہے اور جو شیخ اکبر کی اصطلاحات سے واقف نہیں ہیں) تو فوراً مفتی صاحب نے فتوحات سے وہ ساری عبارتیں نکال کے میرے سامنے رکھ دیں جن سے شیخ اکبر کی اصطلاح کی وضاحت ہوجاتی ہے اور عقیدۂ ختم نبوت کے بارے میں شیخ کا مسلک وموقف غیر مشتبہ طور پر سامنے آجاتا ہے اور پھر کسی غلط فہمی کی بھی گنجائش نہیں رہتی ـــــ اس مناظرے میں مُناظر تو میں ہی تھا لیکن حضرت مفتی صاحب کو اللہ تعالیٰ نے میرے لیے گویا "رُوح القدس" بنادیا تھا ـــــ اس مناظرے کے سلسلے میں جو تین چار دن مفتی صاحب کے ساتھ نصیب ہوا تو اس سے وہ قرب وتعارف حاصل ہوا جو دارُالعلوم کے دو سالہ قیام میں حاصل نہیں ہوسکا تھا۔

❊

دارالعلوم کی رسمی طالب علمی کا دَور ختم ہونے کے بعد راقم سطور جہاں بھی رہا، سال میں ایک دو

دفعہ دیوبند حاضری کا برابر معمول رہا۔ ان حاضریوں میں بھی حتی الامکان حضرت مفتی صاحب سے ملاقات کا اہتمام کرتا۔ وہ ہمیشہ اس طرح پیش آتے کہ گویا میں ان کا چھوٹا نہیں ہوں، کم از کم اقران میں سے ہوں ان کے اس رویہ سے میں ہمیشہ شرمسار رہتا۔ دراصل یہ تواضع ہمارے اکابر و اسلاف کا خاص ورثہ تھا اور حضرت مفتی صاحب نے اس سے حصہ وافر پایا تھا ـــــ عارفین اور حکماء اخلاق کا مشہور مسلمہ ہے کہ تمام محاسن اخلاق کی اصل اور سرچشمہ "تواضع" ہے، جس طرح تمام مساوئ اخلاق کی جڑ اور بنیاد "کبر" ہے۔

❁

جیسا کہ ہونا چاہیے تھا، مفتی صاحب اپنی خداداد صلاحیتوں کی بنا پر تیزی سے ترقی کے درجات طے فرماتے رہے اور دارالعلوم کے اکابر اساتذہ کی صف میں آگئے، پھر جلد ہی وہ وقت آگیا کہ دارالعلوم کے دارالافتاء کی صدارت کے عظیم منصب پر فائز ہو گئے۔ اس کے بعد ہی سے "مفتی" گویا ان کے نام کا جزو بن گیا۔ اس سے پہلے ان کو صرف "مولانا محمد شفیع صاحب دیوبندی" کہا اور لکھا جاتا تھا۔

۱۳۶۳ھ (۱۹۴۴ء) میں یہ ناچیز دارالعلوم کی مجلس شوریٰ کا رکن منتخب کرلیا گیا (جس کا مجھے کبھی وہم وخیال بھی نہیں ہوا تھا) اس کے بعد مجلس شوریٰ کے جلسوں کی شرکت کے لیے سال میں کم از کم دو دفعہ دیوبند جانا گویا میرے لیے لازمی ہوگیا ـــــ لیکن اس سے کچھ ہی دن پہلے حضرت مفتی صاحبؒ دارالعلوم سے مستعفی ہو چکے تھے۔ تاہم اگر مجلس شوریٰ کے جلسوں کے ایام میں مفتی صاحب دیوبند تشریف رکھتے اور مجھے موقع ملتا تو ملاقات ہوتی۔

ایک دفعہ (غالباً ۱۳۶۵ھ میں) مجلس شوریٰ کا جلسہ تھا، مفتی صاحب سے ملاقات ہوئی۔ فرمایا "میں کچھ گفتگو کرنا چاہتا ہوں جس کے لیے زیادہ وقت کی ضرورت ہوگی۔ اس کی صورت یہی ہو سکتی ہے کہ ایک رات کو کھانا میرے ساتھ کھاؤ اور میرے ہی مکان پر قیام کرو!" ـــ میں نے منظور کرلیا اور مقررہ وقت پر مفتی صاحبؒ کے مکان پر پہنچ گیا ـــــ یہ وہ دَور تھا جب مسلم لیگ اور جمعیۃ علمائے ہند کا سیاسی اختلاف بلکہ کہنا چاہیے کہ سیاسی محاربہ نقطۂ عروج پر پہنچا ہوا تھا اور اس میں دین واخلاق اور شرافت کے حدود بڑی بے دردی اور انتہائی ناخدا ترسی کے ساتھ پامال کیے

جارہے تھے ـــــ اس وقت راقم سطور ان دونوں کیمپوں میں سے کسی کیمپ میں نہیں تھا لیکن اس اخلاق باختگی اور شرافت سوز غنڈہ گردی کے خلاف الفرقان کے ذریعہ مسلسل احتجاج اور درد دل کا اظہار کرتا رہتا تھا (اگرچہ اس وقت اس کی حیثیت نقار خانے میں طوطی کی صدا کی بھی نہیں تھی)۔ اسی سلسلے میں مفتی صاحب کو مجھ سے گفتگو فرمانی تھی۔ نماز عشاء اور کھانے سے فارغ ہو کر بات شروع ہوئی اور جہاں تک یاد ہے رات کے ایک یا دو بجے تک جاری رہی۔ مفتی صاحبؒ کے ساتھ راقم سطور کی زندگی کی یہ طویل ترین گفتگو تھی۔ جیسا کہ طے ہو گیا تھا۔ رات کا باقی حصہ بھی اس عاجز نے وہیں گزارا۔ اور اسی دن مفتی صاحب کا دولت کدہ پہلی دفعہ دیکھا۔ اس سے پہلے کبھی اتفاق نہیں ہوا تھا۔

❊

مُلک کی تقسیم کے فیصلے اور حضرت مفتی صاحب کے کراچی منتقل ہو جانے کے بعد راقم سطور نے کراچی کے صرف دو سفر ان کی حیات میں کیے۔ دونوں دفعہ حضرت مفتی صاحب کی بس زیارت اور ملاقات ہی ہو سکی۔

اس کے بعد ۱۹۶۳ء کے حج میں اور پھر اُس کے دو برس بعد ۱۹۶۵ء کے حج ہی کے موسم میں مکہ معظمہ میں اطمینان و تفصیل سے ملاقاتیں نصیب ہوئیں ـــــ اسلام کے آخری تکمیلی رکن حج بیت اللہ کے منافع و برکات میں سے یہ بھی عظیم ترین برکت اور منفعت ہے کہ مشرق و مغرب اور جنوب و شمال، غرض ساری دنیا کے وہ اہل محبت و تعلق جو اس دنیا میں ملاقات و مصاحبت کی بظاہر کوئی اُمید نہیں کر سکتے، حج اسی دنیا میں ان کو ان کے مقدس شہر اور کعبۃ اللہ کے صحن مسجد حرام میں اس طرح ملا دیتا ہے اور ایسی یکجائی نصیب فرما دیتا ہے جیسی ان شاء اللہ جنت میں نصیب ہوگی۔

❊

یاد نہیں کون سا سنہ تھا، (شاید ۷۳ یا ۱۹۷۴ء رہا ہو) حضرت مفتی صاحب کی سنگین اور خطرناک درجے کی علالت اور مستقل صاحب فراش ہونے کی خبر ملی، جس سے وہم ہونے لگا کہ شاید اب اس دُنیا میں زیارت و ملاقات نہ ہو سکے گی، لیکن اللہ تعالیٰ کی طرف سے مقدر تھی۔ رمضان المبارک ۱۳۹۵ھ (۱۹۷۵ء) میں رابطہ عالم اسلامی کی طرف سے رسالۃ المسجد کے عنوان سے ایک عالمی مؤتمر اسلامی مکہ مکرمہ میں منعقد کی گئی۔ اس مؤتمر میں حضرت مفتی صاحب بھی مدعو تھے اور اس عاجز کو "رابطہ" کے

مُستقل رکن کی حیثیت سے شرکت کرنی تھی ـــــ حُسنِ اتفاق کہ حضرت مفتی صاحب کو کراچی سے اور مجھے دلّی سے ایسے ہوائی جہازوں سے سفر کرنا پڑا جن کو دیر تک ریاض کے ہوائی اڈے پر ٹھیر کے جانا تھا۔ یہ عاجز جب ریاض کے ہوائی اڈے پر اُترا تو دیکھا کہ ایک مجمع کے ساتھ حضرت مفتی صاحبؒ تشریف فرما ہیں ـــــ چونکہ علالت کی غیر معمولی سنگینی کی خبریں کہ اس دنیا میں زیارت و ملاقات سے مایوسی سی ہوچکی تھی اس لیے جب حضرت ممدوح پر نظر پڑی تو قلب و دماغ پر مسرّت کی ایسی کیفیت طاری ہوئی جس کے اظہار کے لیے کم از کم راقم سطور کے پاس الفاظ نہیں ہیں ـــــ بڑھ کر سلام کے بعد مصافحہ و معانقہ کیا اور اللہ تعالیٰ کے اس انعام پر جو بالکل ہی غیر متوقع اور غیر مترقب تھا، اس کا شکر ادا کیا ـــــ مفتی صاحبؒ کے ایک صاحبزادے مولانا محمد تقی عثمانی سے ان کے زیر ادارت نکلنے والے ماہنامہ "البلاغ" کراچی کے ذریعہ غائبانہ واقفیت تھی اور دل میں ان کی بڑی قدر تھی، مفتی صاحبؒ نے ایک پتلے دُبلے کم عمر صاحبزادے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ "یہ محمد تقی ہیں"، ان کے بڑے بھائی مولانا محمد رفیع عثمانی بھی ساتھ تھے، میں ان کو بھی نہیں پہچانتا تھا بلکہ ان سے تو وہ غائبانہ واقفیت بھی نہیں تھی جو "البلاغ" کی وجہ سے مولانا محمد تقی عثمانی سے تھی) اُن کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مفتی صاحب نے فرمایا کہ یہ ان کے بڑے بھائی محمد رفیع ہیں ـــــ دونوں بھائیوں سے اس عاجز کی یہ پہلی ملاقات تھی، ان کو دیکھ کر اور مل کر بڑی خوشی ہوئی ـــــ عشاء کی نماز ہوائی اڈے ہی پر حضرت مفتی صاحب کی اقتدا میں ادا کی۔

پھر مکہ معظمہ میں مؤتمر کی مجالس میں اور کبھی کبھی حرم شریف میں بھی ملاقات ہوتی رہی۔ مؤتمر کے اختتام کے بعد یہ عاجز مدینہ منورہ چلا گیا، بعد میں حضرت مفتی صاحب بھی تشریف لے آئے۔ یہ رمضان مبارک کا عشرۂ اخیرہ تھا۔ حضرت مولانا محمد یوسف بنوری علیہ الرحمہ "باب مجیدیؔ" کے قریب مسجد نبوی کے ایک دالان میں معتکف تھے، اس عاجز کا قیام بھی وہیں اُن کے قریب ہی تھا ـــــ حضرت مفتی صاحب کو رمضان مبارک ختم ہونے سے پہلے ہی کراچی پہنچنا ضروری تھا، وہ مولانا بنوریؒ سے رخصتی ملاقات اور کچھ ضروری باتیں کرنے کے لیے تشریف لائے، میں بھی وہیں حاضر ہوگیا ـــــ اس صحبت میں ہم تینوں کے درمیان ایک خاص اور اہم موضوع پر گفتگو بھی ہوئی ـــــ اس کے بعد حضرت مفتی صاحب رخصت ہوگئے۔

اِس عاجز کی حضرت مفتی صاحب سے بس یہی آخری ملاقات تھی — اور یقیناً مبارک ترین جگہ (مسجدِ نبوی میں) اور مبارک ترین وقت (رمضان مبارک کے آخری عشرہ بلکہ آخری دنوں میں) بڑی ہی بابرکت ملاقات تھی۔ اس سے زیادہ برکت والی ملاقات بس جنت ہی میں تصور کی جاسکتی ہے ——— اور کوئی وجہ نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ کی اس صفت رحمت سے جو اُس کی کتاب پاک اور اس کے رسولِ امین صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ معلوم ہوتی ہے اس کی امید نہ رکھی جائے۔ **اللّٰھم صدق ظننا برحمتك ، انك انت ارحم الراحمين**

○

"دیوبند کیا ہے؟ ایک چھوٹا سا قصبہ، ضلع سہارنپور کا، جس کو نہ جغرافیائی اور عمرانی حیثیت سے کوئی خاص شہرت حاصل ہے نہ تجارتی یا صنعتی اعتبار سے، ہاں اس خوش نصیب خطۂ زمین میں علومِ اسلام کا عظیم الشان دار العلوم ہے جو ہندوستان میں اسلامی حکومت کے سقوط کے بعد علومِ اسلامیہ کو اپنی اصلی صورت میں باقی رکھنے کے لیے ایک گوشۂ خمول کی حیثیت میں قائم کیا گیا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اسے حُسنِ قبول عطا فرمایا اور مرکزِ علوم بنا دیا اور اس سے پیدا ہونے والے رجال اللہ اس آخری صدی کے مجدد ثابت ہوئے۔ اس طرح دیوبند اس دور انحطاط میں اسلام اور مسلمانوں کے لیے پناہ گاہ بن گیا۔" (نقوش و تأثرات در سفر تھانہ بھون و دیوبند، ص ۱)

○

"کراچی میں یہ تیرہ سالہ زندگی کن مشاغل میں گذری، اس کی داستان طویل ہے، یہ مختصر سفرنامہ اس کا محل نہیں لیکن اتنا اظہار ناگزیر ہے کہ یہاں پہنچنے کے بعد دو چیزیں مقصدِ زندگی بن گئیں۔ اوّل پاکستان میں اسلامی دستور قانون اور نظامِ اسلامی کے نفاذ کی کوشش، دُوسرے اس طرف علومِ دینیہ کا کوئی مدرسہ کراچی کے شایانِ شان نہ ہونے کے سبب یہاں کے مناسبِ حال ایک مدرسہ کا قیام اور تیسری چیز خدمتِ فتویٰ ہے جو ہر جگہ ساتھ لگی رہتی ہے جہاں بیٹھا ہوں وہیں ایک دار الافتاء ہو جاتا ہے۔" (حضرت مفتی اعظمؒ "نقوش و تأثرات" ص ۲)

حضرت مولانا شمس الحق صاحب افغانی مدظلہم
سابق وزیر معارف ، بلوچستان
وحال رکن اسلامی نظریاتی کونسل پاکستان

پاکستان کے مفتی اعظم

۱۳۲۹ھ سے حضرت مفتی صاحب مرحوم کے وصال تک جو کچھ مجھے آپ کی شخصیت کے متعلق معلوم ہوا ہے وہ مختصراً حسب ذیل شعبہ جات خدمت دین ہیں آپ کی خدمات ہیں جن کا مجموعہ کسی ایک شخصیت میں مجتمع ہونا کمیاب ہے۔

(۱) **شعبۂ افتاء** : افتاء خدمت دین کا ایک اہم ترین شعبہ ہے۔ یہ خدمت آپ نے دارالعلوم دیوبند میں طویل مدت تک اکابر دیوبند کی نگرانی میں اس خوبی سے انجام دی جس کی مقبولیت پر آپ کے مطبوعہ فتاویٰ اور فقہی تصانیف سے تصدیق کی جا سکتی ہے۔ تعمیر پاکستان سے کچھ قبل علماء کرام کے سیاسی مسالک کے اختلاف کی وجہ سے بعض حضرات کو حضرت مفتی صاحب مرحوم کے بعض فتاویٰ جو سیاسی امور سے متعلق تھے پر شبہ ہوا چنانچہ اس قسم کے فتاویٰ کی صحت کی جانچ کیلئے احقر کو نظر ثانی کے لیے مقرر کیا۔ احقر نے چند ایسے مسائل کو رجسٹر فتاویٰ میں ملاحظہ کیا اور غور سے دیکھا تو ان کو فقہی معیار پر صحیح اور درست پایا اور معاملہ رفع دفع ہوا۔ بعض اوقات غیر راسخین فی العلم سے تو سیاسی مصالح کی وجہ سے فقہی احکام میں کچھ تغیر و تبدل کا امکان ہے لیکن مولانا مرحوم کی شخصیت اس سے بالاتر تھی۔ حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ کی مجلس میں ذکر آیا کہ احکام شرعیہ میں سیاسی مصالح کا کیا مقام ہے تو حضرت نور اللہ مرقدہ نے فرمایا کہ احکام شرعیہ کے مصالح کے مقابلہ میں سیاسی مصالح کو مسالہ کی طرح پیسنا پڑتا ہے۔ اسی طرح یہی مقام حضرت مفتی صاحبؒ کے فتاویٰ کو حاصل تھا۔

۲۔ شعبۂ تدریس : حضرت مرحوم نے دارالعلوم دیوبند اور بیرون دارالعلوم میں کافی مدت تک تدریس علوم دینیہ کی خدمت انجام دی، درس آپ کا کامیاب رہا۔ فقہ تفسیر حدیث، علم کلام عربی ادب تصوّف کی حقائق میں بھی آپ کو ممتاز مقام حاصل تھا۔ آپ عربی ادب کے ماہر ادیب اور شاعر تھے ۔

۳۔ شعبۂ تصنیف : عصری ضروریات کے مطابق ضروری مسائل ردّ بدعت والشرک ردّ قادیانیت ردّ الحاد آئین اسلامی کے متعلق آپ کی تصانیف موجود ہیں جو سب مقبول ہیں، میرے خیال میں آپ کی تصانیف جو مسودہ کے درجہ میں تھیں۔ اور اب تک زیور طبع سے آراستہ نہیں ہوئی تھیں ۔ جب کراچی میں آپ کا مہمان رہا تو مجھے سنائیں۔ ایک معارف القرآن دوم احکام القرآن دونوں کو میں نے سب سے زیادہ پسند کیا۔ آپ کی مشہور تصنیف ختم النبوۃ فی القرآن، ختم النبوۃ فی الحدیث، ختم النبوۃ فی الآثار بے حد مقبول کتاب ہے اکابر دیوبند نے اس کے حوالے نقل کیے ہیں اور ردّ قادیانیت میں ختم نبوت کی یہ بے مثال مواد و دلائل کا مجموعہ ہے آپکی تصنیفات میں جب تک حضرت تھانوی رحمۃ اللہ حیات تھے تو آپ کا مشورہ شامل رہا، اس وجہ سے آپ کی تصنیفات مقبول ہوئیں ۔

۴۔ تقویٰ اور اتباع شریعت : آپ کی عملی زندگی اتباع شریعت تقویٰ کا مظہر تھی اور آپکی صحبت میں حضرت حکیم الامت کا رنگ موجود تھا، تحریر اور کلام میں اثر تقویٰ کا ثمرہ تھا، میرے نزدیک حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے خلفاء میں حضرت مولانا مفتی محمد حسن صاحب نور اللہ مرقدہ اور حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب نور اللہ مرقدہ دونوں حضرات پر اپنے مرشد کا رنگ غالب تھا بہرحال مولانا محمد شفیع کی شخصیت جن کمالات کا مجموعہ تھی وہ کمیاب ہیں ۔

"شریعتِ اسلام ان ایجادات و مصنوعات میں صرف یہ چاہتی ہے کہ انسان خدا کی ان نعمتوں سے اُسی کی دی ہُوئی عقل کے ذریعے نئی نئی ایجادیں کریں، معاشی آسانیاں حاصل کریں — مگر دو شرطوں کے ساتھ: ایک یہ کہ اُس کی عطا کردہ نعمتوں کو اُس کی نافرمانیوں میں استعمال نہ کریں، دُوسرے عطا کرنے والے مُنعمِ حقیقی کو نہ بھُولیں"

(حضرت مُفتیٔ اعظمؒ)

آلاتِ جدید ص۲

سیرت و سوانح

مولانا محمد ہارون صاحب
فاضل مدرسہ معین الاسلام ہاٹ ہزاری (چاٹگام)

تاریخی سوانح

مفتیٔ اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ

— جس کے ہر جملہ سے تاریخ برآمد ہوتی ہے —

تاریخ نگاری ایک دلچسپ فن ہے جس پر ہر دور کے اہل علم و قلم طبع آزمائی کرتے رہے ہیں۔ حال ہی میں مولانا محمد ہارون صاحب فاضل مدرسہ معین الاسلام ہاٹہزاری (چاٹگام) نے مفتیٔ اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی مختصر سوانح فارسی زبان میں اس طرح مرتب فرمائی ہے کہ اس کے ہر جملے سے متعلقہ واقعہ کی تاریخ برآمد ہوتی ہے۔ فاضل موصوف کی یہ کاوش تاریخ نگاری کے فن میں ایک اچھوتا اضافہ ہے۔ ذیل میں یہ مضمون ان کے شکریہ کے ساتھ بجنسہٖ پیش کیا جا رہا ہے — ادارہ

وَذِکْرٰی لِلذّٰکِرِیْنَ

۱۹۷۶

سوانح عمری مفتی اعظم رح

۱۹۷۶

مولانا مفتی محمد شفیع دیوبندی نور اللہ مرقدہٗ

۱۹۷۶

بسبیل اختصار

۱۳۹۶

ترتیب دادۂ محمد ہارون ساکن چاٹگام ۔ فاضل جامعہ عربیہ دینیہ

۱۳۹۶ ۱۹۷۶

مشہورۂ جہان بدار العلوم معین الاسلام ۔ آباد بہ ہاٹہزاری

۱۹۷۶

و مدرس مدرسہ حمایت اسلام کنیگرام چاٹگام

۱۹۷۶

باہتمام مولانا محمد تقی عثمانی زیدمجدہ ازمکتبہ دار العلوم واقع درشہر کراچی

۱۹۷۷ ۱۹۷۷

شائع گردیدہ مطبوع قلوب عالیان بشد

۱۳۹۷

بسم اللہ الرّحمٰن الرّحیم الرؤف الستار العلیم

۱۹۷۶

مولٰنا محمد یٰسین صاحب دیوبندی را کہ مدرس فارسی دارالعلوم دیوبند بود

۱۸۹۷

بشب بست ویکم از شعبان بسیزدہ صدوچہار دہ ہجری

۱۸۹۷

پسرے تولد شد ارجمند وبلند اقبال ونیکبخت طالع سعادت بالاے سراومی تافتے

۱۳۱۴ ۱۳۱۴ ۱۸۹۷

وآثار بزرگی بجبینش بہ تولد آں فرزند خوش نصیب کامراں بخت

۱۳۱۴ ۱۸۹۷ ۱۳۱۴

ولہاے ہمہ اہل خاندان شاد ومسرور گردید بنام محمد شفیع نامش کردند

۱۸۹۷ ۱۳۱۴

ودعاے طول حیات وصحت وعافیت اورا دادند

۱۸۹۷

و والد ماجد جناب مولانا محمد یٰسین میاںجی تحسین علی بن امام علی بن کریم اللہ بود

۱۸۹۷

وگویند کہ ایشان از دودمان عثمانؓ بن عفان اند

۱۳۱۴

پس ہرگہ کہ این طفل سعید دیدہ کشود علما وصلحا را دید بسوے او نگراں

۱۸۹۷

دست ایشان بجانب او کشادہ وگویاں نورچشم! باما آے بربا بنشین

۱۳۱۴ ۱۳۱۴

شوقِ علم و ادب با شیرِ مادر نوش کرد　　و اوراقِ کتب بہ چشمِ وی زیبا و نیکو نمود

۱۸۹۷　　۱۳۱۴

زمزمۂ علم و ادب از ہر طرف بگوش کرد و بہ شوقِ دل بر جانبِ آں دوید

۱۸۹۷

بہ عمرِ پنج سالگی سیپارہ بدست بدار العلوم برسید　　و بہ پیشِ حافظ

۱۸۹۷　　۱۳۱۴

میاں محمد عظیم صاحب　　کہ مدرس دیوبند بود زانو زدہ بنشست

۱۳۱۴　　۱۳۱۴

و کتابِ مجید خواندن گرفت　　ہمہ کتبِ مروجۂ فارسی بنزدِ والد ماجد بخواند

۱۸۹۷　　۱۸۹۷

و بعہدِ طفلی ریاضی و حساب　　از مولانا منظور احمد کہ عمِ او بودہ حاصل کرد

۱۳۱۴　　۱۸۹۷

و علمِ تجوید از جنابِ قاری محمد یُوسف گرفتہ　　ذہنِ او رسا فہمِ او روشن و طبعِ او نیک بود

۱۸۹۷　　۱۸۹۷

ہم در سایۂ الطافِ مربیانِ مشفق بسعیِ تمام　　بہ تحصیلِ علم پرداختہ

۱۸۹۷　　۱۸۹۷

در امتحانات بمرتبۂ اولیٰ کامیاب بودے　　و کامل ثابت شدے

۱۸۹۷　　۱۳۱۴

و وقتیکہ شانزدہ سالہ شد　　بہارستانِ گلہائے علوم دلِ او را بیخود بنمود

۱۳۱۴　　۱۸۹۷

و داخلِ درجۂ عربی دار العلوم دیوبند شد　　موردِ الطافِ ہمہ اساتذہ شدہ

۱۸۹۷　　۱۸۹۷

درمہد علم وفنون پرورده بشد   تا آنکہ بیک ہزار سہ صد وسی وپنج از سال ہجری

۱۳۱۴   ۱۳۳۵

سند تکمیل بہ ہمہ علوم عربیہ حاصل نمود   فرید دہر و یگانۂ روزگار بشد

۱۳۳۵   ۱۳۳۵

و عالم نحریر گشت   پس ہماں سال استاد دار العلوم گردید

۱۳۳۵   ۱۳۳۵

فیضہائے توجہ تاج العلماء   والمحدثین السید انور شاہ کشمیری

۱۸۹۷   ۱۸۹۷

و شیخ الادب والفقہ بدر العلماء علامہ اعزاز علے

۱۸۹۷

شیخ الاسلام امام اہل روزگار علامۂ بے عدیل

۱۸۹۷

مفسر بے بدیل مولنا شبیر احمد عثمانی دیوبندی

۱۸۹۷ھ

مفتی بے عدیل علامہ عزیز الرحمان عثمانی   قطب اولیائے زمان مولنا السید اصغر حسین

۱۸۹۷   ۱۸۹۷

استاد علوم نقلیہ ماہر فنون عقلیہ مولوے محمد ابراہیم

۱۸۹۷

حاوی اصول و فروع بو حنیفۂ زمان مولانا محمد رسول خان

۱۸۹۷

و علامۂ دین حضرت مولانا محمد احمد . بآغوش عنایات ومحبت درگرفتہ

۱۸۹۷   ۱۳۱۴   ۱۸۹۷

نورہائے علم حق و معرفت آلہیہ برو پاشید
۱۸۹۷

باانجم درخشاں ہمدوشش بگردانید
۱۸۹۷

پس آنکہ او در دارالعلوم مدرس کتب ابتدائی بود
۱۸۹۷

روز بروز آنجا ترقی نمودہ بدرجہ علیا رسید
۱۸۹۷

و تا سیزدہ صد و شصت و دو سنہ ہجریہ کہ
۱۳۶۲

آں بست و ہفت سال ہمی باشد بطریق احسن
۱۸۹۷

و باکمال خوبی درس جملہ علوم و فنون اسلامیہ می فرمود
۱۸۹۷

و دریں مدت کما بیش از سی ہزار طالبان علوم دینیہ را
۱۸۹۷

آب زلال علوم بہ نواخت و سیراب بہ فرمود
۱۸۹۷

درس ابی داؤد و مقامات او چناں می بودے کہ علماء و مدرسین ہم آں را
۱۸۹۷

بہ مثابہ سلک لآلی و درہائے گرانمایہ شمر دندے
۱۸۹۷

و پروانہ وار بحضور وی می رسیدندے
۱۸۹۷

و چوں شیخ الہند مولانا محمود الحسن از مالٹا
۱۹۲۰

در یک ہزار نہ صد و بست عیسویہ رہا شد و وطن واپس آمد
۱۹۲۰

بخدمت او رسید و بیعت نمود
۱۹۲۰

و بعد وفات شاں بحلقہ مریدان حکیم الامت
۱۹۲۰

مولانا اشرف علی تھانوی آمد
۱۳۴۶

طرق و منازل معرفت آلہیہ پیمود
۱۳۴۶

وبیک ہزار سہ صد چہل و نہ از ہجری از جانب حکیم الامۃ مجاز بیعت و ارشاد شد

۱۳۴۶ ۱۳۴۶

اما از اں کہ در راہ طلب مخلص بود و ہموارہ بہ لقائے پیر و مرشد با جان و دل ہمی دوید

۱۳۴۹ ۱۳۴۹

پیر و مرشد ہم نگہ بحال او بیش بہ نمود و توجہ خاص باو کردہ تربیت او فرمود

۱۳۴۹ ۱۳۴۹ ۱۳۴۹

و ہمچناں بر حسب ایمائے مولٰنا تھانوی صاحب و مولٰنا میاں صاحب

۱۳۴۹

صدر مفتی دار العلوم دیوبند نیز دریں سال شش مقرر نمودند کہ اعتماد خاص و عام

۱۳۴۹ ۱۳۴۹ ۱۳۴۹

بر صحت فکر و جواب او بیش بود و اما اولا معین مولانا مفتی عزیز الرحمٰن بود

۱۳۴۹ ۱۳۴۹

دُرہاے جوابہاے فتوٰی ہمی سفتے ہر روز آوازہ کارش بلند شد

۱۳۴۹ ۱۳۴۹

و در سواد ایشیائے کوچک بڑن آں نام او رسید و در سویدائے دلہائے عالمیاں روشن بگردید

۱۳۴۹ ۱۳۴۹

ہر کہ بدید تحسین و آفریں کرد بحدیکہ جواب باصواب او حکم قول فیصل می داشتے

۱۳۴۹ ۱۳۴۹

و باایں ہمہ ہرگاہ کہ اشکالے در پیش می آمد از پئے کمال تحقیق کہ شعار او بودہ

۱۳۴۹ ۱۳۴۹

بجناب مولانا اشرف علی تھانوی و دیگر اکابر دین مراجعت بہ نمود

۱۳۴۹ ۱۳۴۹

و بوقتے کہ تحریک آزادی ہند بہ کمال وعُرج رسیدہ بود

۱۹۴۵

و شیاطین ومکاران ہنود ہمی خواستند

۱۹۴۵

کہ مسلمانان را بعد حصول آزادی بہ انواع خداع مطیع ومحکوم نمایند

۱۹۴۵

تا کہ ولایت ہندانیان را بلاچون وچرا مسلّم گردد

۱۹۴۵

و اہل اسلام را بنا بر اقلیت رام بگردانند ویا نابود سازند

۱۹۴۵

و اصحاب رای از علماء دُور اندیش وپیش بینان ملّت

۱۹۴۵

بنور فراست ایمان ازیں حال وقوف یافتند　آنگہ آنجناب ہمدم مولانا شبیر احمد عثمانی شند

۱۹۴۵　۱۹۴۵

حسب ارشاد حکیم الامتہ مولانا اشرف علی　تھانوی صاحب پیر مُرشد خود

۱۹۴۵　۱۹۴۵

در یک ہزار نہ صد وچہل وپنج از سال میلادی جمعیت علماء اسلام قائم نمود

۱۹۴۶

و مسلمانان را بیش از بیش برائے مطالبۂ پاکستان　آمادہ نمود وجذبۂ ایمانی وقومی ایشان را پیدا کرد

۱۹۴۵　۱۹۴۸

ازان وجہ کہ استخلاص مسلمانان از دجل ہنود بے ازان ممکن نبود

۱۹۴۵

بالانشین صدارت جمعیت علمائے اسلام — شیخ الاسلام آں زمان علامہ شبیر احمد بود

۱۹۴۵ — ۱۹۴۵

وہمیں علامہ دوران اعنی مولانا مفتی محمد شفیع دیوبندی — رکن مجلس عاملہ منتخب شد

۱۹۴۵ — ۱۹۴۵

پس وی از خدمت دار العلوم علیحدہ بشد — تا ہنگامہ آفرینی بادیہ سیاست بدامان ادارہ علوم دین

۱۹۴۵ — ۱۹۴۵

خار پریشانی و یا طوفان بلائے نرساند — و ہیچ گونہ غبار ملال لتے نیندازد

۱۹۴۵ — ۱۹۴۵

ودریں اثنا آں امام العلماء و مرجع فتاوی — کتابے شرعی فیصلہ نام تالیف نمودہ

۱۹۴۵ — ۱۹۴۵

مصالح اقامت پاکستان و وجوب مطالبہ آں را با براہین بتیسنہ

۱۹۴۵

و دلائل واضحہ و قاطعہ روشن بفرمود — ازیں فتوی قلوب مسلماناں زیر و زبر شد کہ مدلل بود و لاجواب ہم

۱۹۴۵ — ۱۹۴۵

آں گاہ اکثرے حامی و جاں دادۂ مسلم لیگ گشتند

۱۹۴۵

بعد ازاں کہ بجمعیت علمائے ہند ہمدم بودہ بہ حمایت کانگریس آمادہ بودند

۱۹۴۵

ایں افکار در حلقہ انتخاب — لیاقت علی خان صاحب عجیب کارے بکرد

۱۹۴۵ — ۱۹۴۵

و بدیں وجہ در انتخاب سن یک ہزار نہ صد چہل و پنج

۱۹۴۵

مسلم لیگ را فتح و کامیابی بیش از قیاس حاصل بہ شدہ

۱۹۴۵

و نصرت ایزدِ ہم شامل حال گشت

۱۹۴۵

و ہمچنانکہ معلوم است بدیہی کہ مملکت پاکستان

۱۹۴۷

در نوزدہ صد و چہل و ہفت میلادی روز چار دہم اگست

۱۹۴۷

بحکم خداتعالیٰ آشکارا گردید

۱۹۴۷

و شیخ الاسلام جناب علامہ شبیر احمد صاحب

۱۹۴۷

مفتی اعظم را آنجا طلب بنمود

۱۹۴۷

کہ اہل ہمت را بزیر دستی ہنود بودن نمی شاید

۱۹۴۷

آنجناب از دیوبند کہ مسقط الرأس بود بہ آں دیار ہجرت بفرمود

۱۹۴۷

و ہماں جذبۂ عمل و جہاد پیہم بہ فکر و تدبر

۱۹۴۷

و کمال علم با جمال اخلاق و لباس تقویٰ بجامۂ زہد و بلندی عزم

۱۹۴۷

اعلائے کلمۃ اللہ و دعوت الی اللہ و رد بدعت

۱۹۴۷

علو شان لَا یَخَافُوْنَ فِی اللّٰہِ لَوْمَۃَ لَائِمٍ

۱۹۴۷

شمشیر زبان ہمیکان قلم، اخلاص باطن

۱۹۴۷

وانوار معرفت با ہمت پاک و دعائے بزرگاں

۱۹۴۷

وزاد توکل بتوفیق الٰہی باخود آوردہ — باز کوشش بے پایاں آغاز بکرد

۱۹۴۷ — ۱۹۴۷

تا دراں مملکت اسلامیہ خداداد — اقامت واشاعت دین اللہ واجرائے حدود اسلامیہ بنماید

۱۹۴۷ — ۱۹۴۷

وبعد از ارتحال شیخ الاسلام علامہ

۱۹۴۹

شبیر احمد عثمانی در سن نوزدہ صد وچہل و نہ مسیحی

۱۹۴۹

مزید کار ہائے بزرگ ہم بر ذمۂ آں جناب لازم بہ گردید

۱۹۴۹

پس او از سنہ نوزدہ صد وپنجاہ وستا بسنہ نوزدہ صد وپنجاہ وہشت

۱۹۵۸

صدر جمعیت ماند وکار ہائے آں را بطریق احسن انجام بہ داد

۱۹۵۸

چناں کہ بر دلہا ہویدا است کہ پیوستہ — از پی فروغ دین

۱۳۷۰ — ۱۳۷۰

والقا و ترویج سنت سنیہ — واحیاء اسلام جہد بلیغ ہمی بنمود

۱۳۷۰ — ۱۳۷۰

و باآں خو گرفتہ — بجانب زخارف دنیا میل نہ کرد

۱۳۷۰ — ۱۳۷۰

عجب باشد کہ آں وارث علم انبیاء — بے درس وتدریس نشیند

۱۳۷۰ — ۱۳۷۰

پس آنجناب به امداد آلٰہی در سیزده صد و هفتاد هجری

۱۳۷۰

در محلهٔ نانک واڑه کراچی مدرسه اسلامیه نهاد

۱۳۷۰

اولاً آنجا استادے بود و خانهٔ و چندے از طلبه — درانک مدت مرکز علم بگردید

۱۳۷۰ — ۱۳۷۰

الحال دارالعلوم شده بحدود کورنگی هم منزل بنمود

۱۳۷۰

که برآنجا عمارتهائے شاندار — و ابنیهٔ بالا و قصور مرتفعه پدید آمد

۱۳۷۰ — ۱۳۷۰

و صدها طالبان دین به تحصیل علوم مصروف

۱۳۷۰

باوجود چندیں مشاغل و هجوم امور سیاسی

۱۹۵۸

و درس و تدریس و فتوٰی و ارشاد — بمیدان تالیف نیز گوی سبقت بر علمائے زمان بربود

۱۹۵۸ — ۱۹۵۸

خزائن فقهیه و تصانیف رسائل مفیده رو

۱۹۵۸

از دو صد بیش اند و از اسرار و حقائق و نوادر علمیه معمور

۱۹۵۸

و ازاں همه تفسیر بیش بها معارف القرآن — هشت جلد از بزرگ ترین کارنامه

۱۹۵۸ — ۱۹۵۸

واحسان عظیم وی ست براہل زمان

۱۹۵۸

وشمار آں ہمہ فتاوی کہ وی نوشتہ بود

۱۹۵۸

بقدر دو صد ہزار باشد وآنچہ زبانی بداد آں ہم کمتر ازاں نہ بود

۱۹۵۸

اولیاء خدارا بشنیدہ ایم کہ گاہے بر ہوا طیران نمودند

۱۹۷۶

وگہی بر بالائے دریا گذشتند

۱۹۷۶

لیکن امواج دریا دامن اوشاں رانیز تر نکرد

۱۹۷۶

یکے ازانہا بازعظم رمیم رازندہ گردانیدہ

۱۹۷۶

ودیگرے ازاں میاں براہل قبور سخن گفتہ

۱۹۷۶

وعجائب دیگر کہ ازدست ایشاں صدور یافت

۱۹۷۶

ہمگی خارق عادت اند ومحیر عقول

۱۹۷۶

اما آنچہ کہ از دربار خداوندی بدیں عالم حقانی عطا شد

۱۹۷۶

وآں عجب کرامت کہ خط او گردیدہ

۱۹۷۶

اعنی حسن توفیق بہ چندیں فضل وکمال

۱۹۷۶

وتبحر علمی وی باستقامت فی الدین

۱۹۷۶

وچندیں خدمات ملک وملت کردی را

۱۹۷۶

ازسرآمد علمائے روزگار ساختہ بود

۱۹۷۶

اگر آں رابنظر انصاف بہ بینیم

۱۹۷۶

ازحیث یکے بردیگرے روشن نشود

۱۹۷۶

وغالب وبالا بودن ایں چنیں کرامت

۱۹۷۶

نزدیک اہل خرد واضح بگردد   وبگوید کہ مفتی محمد شفیع ولی بود صاحب کرامات

۱۹۷۶   ۱۹۷۶

وبزرگ خدارسیدہ ومؤید من عنداللہ تعالیٰ

۱۹۷۶

آہ درسن یک ہزار و نہ صد وہفتاد وشش عیسوی

۱۹۷۶

ہنگام نصف شب یازدہم ازماہ شوال مکرم   یکہزار سہ صد نود وشش سن ہجری

۱۳۹۶   ۱۳۹۶

چوں مدت عمر او سپری شد   و ملائکہ ربانی بر بالیں او آمدہ مژدۂ وصال گوش وی برخواندند

۱۳۹۶   ۱۹۷۶

آنجناب بہ تمام اشتیاق لبیک گفتہ   حضور حق رسید   ندائے غیبی شدہ

۱۹۷۶   ۱۳۹۶   ۱۳۹۶

اے خدمت گذار   کلام ربانی و احادیث رسول وعلوم دین   غَفَرَاللّٰهُ لَكَ

۱۹۷۶   ۱۳۹۶   ۱۳۹۶

فَسَيُعْطِيْكَ رَبُّكَ فَتَرْضٰى   ای شناور بحر حقیقت   تیز رشد و بدروایت

۱۹۷۶   ۱۳۹۶   ۱۳۹۶

لَكَ الْبُشْرٰى بِرَحِيْقٍ وَّرِضْوَانٍ   فَتُرْزَقُ فِيْ جَنَّةِ اللّٰهِ

۱۹۷۶   ۱۳۹۶

واے نقاد عقیان روایت امیر ملک درایت

۱۹۷۶

شاداش ونیکو کہ اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ

۱۹۷۶

آنگاه کہ طائر روح پاکش از ساحت عالم آب و گل پرواز کرد

١٩٧٦

آں خبر پر درد و جاں سوز

١٣٩٦

بر ریڈیو ٹیلی ویژن و ذرائع دیگر

١٩٧٦

در جملہ بلاد اسلامیہ بلکہ در سائر آفاقہا نشر بگردید

١٩٧٦

شور فریاد و زاری در نہاد عالیاں فتاد

١٩٧٦

وہر کہ بشنید اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَیْهِ رَاجِعُوْن گفت و نالہ بر کرد

١٩٧٦

بسیارے بہ غم واندہ

١٣٩٦

بیخود گشتند

١٣٩٦

و اقربہ و عزیزاں و عائر متوسلین و مریدین او باشتیاق دید

١٩٧٦

از راہ دور و قرب و جوار دیوانہ وار بسوے او بدوید ند

١٣٩٦

دلہا از تاب فراق بیتاب و پریشاں وہاے و ہو کناں

١٩٧٦

در آرزو و انتظار

١٩٧٦

آنکہ یک بار چہرۂ پر نورش ببینند

١٣٩٦

ہم بگاہ آں شب انبوہ خلائق بہ صحن دار العلوم ہجوم نمودند

١٩٧٦

گویا دریاے بود عظیم کہ بجوش آمد و امواجہاے ہولناک ہمی زند

١٩٧٦

مولنا متین الخطیب و اولاد امجاد و داماد او بطرق مسنون

١٩٧٦

به دیدہاے اشکبار غسلش بہ دادہ　　جانہ کفن پوشانیدہ تبرکات ہم بآں کردند

۱۹۷۶　　۱۹۷۶

وبعد از نماز ظہر در میدان عیدگاہ آوردند　　بآں جاے کشادہ جنازہ بروی خواندند

۱۹۷۶　　۱۳۹۶

جناب مولٰنا عبدالحی ادام اللہ ظلالہٗ　　کہ خلیفہ اجل جناب حکیم الامۃ و

۱۳۹۶　　۱۳۹۶

رفیق دیرینۂ او بود امامت بکرد　　وجسد پاک اورا بخاک لحد سپرد بنمودند

۱۳۹۶　　۱۳۹۶

آہ آں گنجینۂ علوم گراں بہا درعقب مسجد دارالعلوم مدفون بشد

۱۹۷۶

ہاے مولٰنا مفتی محمد شفیع صاحب روے از ما بپوشانید　　وجہان محروم فیض اوگشت

۱۹۷۶　　۱۹۷۶

آہ آفتاب ہدایت از جہاں پنہاں بشد　　مسند ارشاد خالی ماند

۱۳۹۶　　۱۳۹۶

جناب مفتی اعظم از دنیا بشد　　نَوَّرَ اللّٰهُ مَرْقَدَهٗ وَأَطَابَ ثَرَاهُ

۱۹۷۶　　۱۳۹۶

دریغاہ وحسرتاہ کہ آں　　ظل ہمایوں وسایۂ میمونے مفتی دین مبین

۱۹۷۶　　۱۹۷۶

نمونۂ سلف واسوۂ خلف علامۂ کامل　　خلیفۂ خاصے حکیم الامۃ

۱۳۹۶　　۱۹۷۶

فقیہ بے مثل ومفکر عالم اسلام　　استاذ علماء انام

۱۳۹۶　　۱۳۹۶

ومفتیٔ عظیم ومفسر اجلّ — و معدن شفقت و پیکر مرحمت

۱۹۷۶ — ۱۹۷۶

ومروج سنت غراے — سرور دو جہاں و رسول مقبول علیہ الف صلوات اللہ وسلامٗ

۱۹۷۶ — ۱۹۷۶

ازیں دار فانی ارتحال بہ فرمودہ — سایۂ خود باز گرفت

۱۳۹۶ — ۱۳۹۶

و مارا یتیم وار ساخت — و جہانے را غمگین

۱۹۷۶ — ۱۳۹۶

ای حیف الحال برائے فتاوٰی مُہمّہ بہ کجا خواہیم شد

۱۹۷۶

مرشدا کہ باشد و مقتدا کرا بہ گیریم — بجائے خالیش کہ نشیند

۱۹۷۶ — ۱۳۹۶

خدائے رحیم اورا بجنت عدن رساناد — و پس ماندگان را توفیق صبر بخوا زاد

۱۹۷۶ — ۱۳۹۶

آمین ثم آمین یامولی العٰلمین ومعطی السائلین

۱۳۹۶

بجاہ حبیبک شفیع المذنبین

۱۳۹۶

سید المرسلین محمد المصطفٰے النبی الامی الامین وآلہ

الطیبین الطاہرین وصحبہ الہادین المہدیینo

۱۹۷۶

بہ قلم محمد ہارون عفی اللہ عنہ، اٹہزاری چاٹگام

۱۹۷۶

مولانا مفتی محمد رفیع صاحب عثمانی
مہتمم دار العلوم

حیاتِ مفتیٔ اعظم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ وکفیٰ وسلام علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ

والد ماجد، سیدی و سندی، مفتیٔ اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی سوانح حیات لکھنے کا تقاضا دل میں عرصہ دراز سے تھا، حضرات اہلِ علم و قلم کا اصرار بھی مدت سے چل رہا تھا لیکن احقر اپنی نا اہلی اور عدمِ استعداد کی بنا پر اس کام سے پہلو تہی کرتا رہا، کیونکہ ایسی عظیم اور ہمہ گیر شخصیت کے حالاتِ زندگی لکھنے اور اس کے ہمہ پہلو کمالات اور گوناگوں کارناموں کو بیان کرنے کے لیے جس فہم و بصیرت، دقتِ نظر اور قدرتِ بیان کی ضرورت تھی۔ افسوس کہ احقر اس سے خالی ہے۔

دوسری وجہ یہ بھی تھی کہ حضرت والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ کے سامنے جب بھی کسی نے ان کے حالاتِ زندگی لکھنے کا ذکر کیا تو سخت ناپسندیدگی کا اظہار فرمایا۔

اللہ تعالیٰ نے ان کو ایسی قابلِ رشک تواضع و انکساری سے نوازا تھا کہ لاکھ یقین دلانے کے باوجود وہ یہ باور کرنے کو تیار نہ تھے کہ اُن کے حالاتِ زندگی واقعی قابلِ تذکرہ ہیں، اُن کا جواب ہمیشہ یہی ہوتا تھا کہ:

"ہماری مثال اُن حشرات الارض کی سی ہے جو روز پیدا ہوتے اور مرتے رہتے ہیں، کسی مکھی مچھر کی سوانح کون اور کیوں لکھے؟ ہم جیسے لوگوں کا تذکرہ اس سے

زیادہ ممتاز نہیں بلکہ بزرگانِ سلف کے سوانح اور تذکروں کی قدر کم کرنے کا سبب معلوم ہوتا ہے"[1]

۸۲ - ۱۳۸۲ھ کی بات ہے کہ حضرت والدِ ماجد رحمۃ اللہ علیہ نے احقر کو فتاویٰ دارالعلوم دیوبند کی تبویب کا حکم دیا، اس کتاب کی ایک جلد "امداد المفتین" حضرت والدِ ماجد رحمۃ اللہ علیہ کے فتاویٰ پر مشتمل ہے، احقر نے موقع غنیمت جان کر آپ کے مختصر حالاتِ زندگی بھی تحریر کر دیے تاکہ اس جلد کے مقدمہ کے طور پر شائع کر دیے جائیں، ابتداءً تو آپ نے اس کو بھی ناپسند فرمایا، پھر کچھ حضرات کے اصرار پر طبعی انقباض کے باوجود بہت سی قطع و برید کے بعد اجازت مرحمت فرما دی، مگر اس کے متعلق چند ارشادات بعنوان "عرضِ حال" تحریر فرما کر ساتھ شائع کرنے کا حکم دیا جو اس پیش لفظ کے بعد اب بھی شاملِ سوانح ہے، اس طرح آپ کے حالاتِ زندگی پہلی بار ۱۳۸۳ھ میں آپ کی حیات ہی میں شائع ہوئے۔

اس مضمون کی اشاعتِ اوّل کے تقریباً پندرہ سال بعد اب جبکہ "مفتی اعظم نمبر" کی تیاری شروع ہوئی تو اس موضوع پر تفصیل سے لکھنے کی نوبت آئی۔

مگر اب تو دُنیا بدل چکی ہے، میرے مُشفق والدِ ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب نور اللہ مرقدہ میرے صرف باپ ہی نہیں بلکہ میرے نکتہ رس مربّی، میرے عظیم اُستاذ، میرے باریک بین شیخ، اور میری زندگی کے ہر پہلو میں ہادی و رہنما تھے، اُن کی ذاتِ گرامی میں میرے لیے نہ جانے کتنے سائے تھے جو ایک دم سر سے اُٹھ گئے ہیں، ہر طرف دُھوپ ہی دُھوپ پھیلی نظر آتی ہے، زندگی میں پہلی بار محسوس ہوا کہ رنج و غم اور صدمہ کسے کہتے ہیں اور اللہ تعالیٰ نے صبر کا اتنا عظیم الشان اجر کیوں تقرر فرمایا ہے" ذمہ داریاں کا صحیح مفہوم بھی پہلی مرتبہ معلوم ہُوا جن کے عجیب و غریب بوجھ سے آج کاندھے جُھکے ہوئے سے محسوس ہو گئے ہیں، مسائل کے پہاڑ جو ان کی حیات میں ایک کھیل نظر آتے تھے آج انھیں دیکھ کر اعصاب کبھی ٹھٹھرنے لگتے اور کبھی ہل چل میں آ جاتے ہیں۔

ایسے میں کوئی بھی تحریری کام آسان نہیں، خصوصیت سے حضرت والدِ ماجد رحمۃ اللہ علیہ کے حالاتِ زندگی پر کچھ لکھنا پڑھنا ایسا کٹھن اور صبر آزما کام ہے کہ اس کے بیان کی بھی تاب نہیں۔ ادھر

[1] یہ والد صاحب کی تحریر عرضِ حال کا اقتباس ہے۔

وقت کا تقاضا یہ ہے کہ مبسوط سوانح حیات لکھی جائے جس میں اُن کے علمی، تحقیقی، تربیتی اور سیاسی کارناموں کا مفصل بیان ہو، سبق آموز اخلاقی و روحانی کمالات کو واضح کیا جائے اور واقعات کی روشنی میں تعلیم و تربیت افتاء و تصنیف اور ملکی و اجتماعی معاملات میں ان کے مشفقانہ، حکیمانہ، محققانہ اور معتدل مسلک و مزاج کی تشریح کی جائے۔

آپ کی وفات کے وقت ناچیز کی عمر کا اکتالیسواں سال چل رہا تھا۔ یہ پورا عرصہ اللہ تعالیٰ نے حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے زیر سایہ ہی نہیں بلکہ اُن کی مشفقانہ و مربیانہ آغوش میں بسر کرایا، سفر و حضر میں اللہ تعالیٰ نے ان کی صحبت و معیت نصیب فرمائی اور کبھی ایک ڈیڑھ مہینے سے زیادہ جدائی کی نوبت نہ آئی، بغدادی قاعدہ سے لے کر دورۂ حدیث تک بلکہ اس کے بعد تدریس و افتاء اور تمام علمی و دینی کاموں میں ان سے تلمذ و رہنمائی کا شرف حاصل رہا۔ ان کے تمام کاموں اور مصروفیات میں ساتھ لگے رہنے کی سعادت اللہ تعالیٰ نے کسی استحقاق اور اہلیت کے بغیر نصیب فرمائی، شادی کے بعد بھی احقر کو عیالداری کے باوجود ان کے ساتھ ایک ہی گھر میں رہنے کی دولت آخر تک حاصل رہی، اس لیے ان کی مقدس زندگی کا کوئی گوشہ بحمد اللہ نظر سے پوشیدہ نہیں جس پر اللہ تعالیٰ کا جتنا بھی شکر بجالاؤں کم ہے۔ ان کی جدوجہد سے بھرپور زندگی، متنوع اور ہمہ پہلو مصروفیات، ان کے شب و روز کے سبق آموز مشاغل، تفقہ و تدین اور تواضع و تقویٰ کے عظیم الشان کارنامے نظروں کے سامنے ہیں، تحریری یادداشتوں کا بھی بڑا ذخیرہ بحمد اللہ عرصہ سے جمع کرتا رہا ہوں مگر دماغ سُن، دل شکستہ اور زبان و قلم گنگ ہیں۔

ادھر "مفتی اعظم نمبر" جس کی تکمیل میں پہلے ہی بہت تاخیر ہو چکی ہے اب کتابت کے بالکل آخری مراحل میں ہے، اس پر خرابی صحت، دارالعلوم کی ذمہ داریاں اور ہجوم افکار مستزاد ہیں، ان حالات میں مفصل سوانح نگاری تو اللہ تعالیٰ ہی کو معلوم ہے، کب اور کس کے مقدر میں ہے تاہم مالا یدرك كلّه لا يترك كلّه کے پیش نظر جتنا کچھ اور جیسا کچھ ہو سکا ہدیۂ قارئین ہے۔ اس مضمون میں اُن حالات و واقعات کو زیادہ سے زیادہ سمونے کی کوشش کی ہے جو متفرق کاغذات اور یادداشتوں میں احقر کے پاس محفوظ تھے اور ابھی تک طبع نہیں ہوئے۔

امید ہے کہ اب یہ مضمون مفصل سوانح نگاری کے لیے کسی حد تک ٹھوس بنیاد فراہم کر سکے گا۔ اللہ تعالیٰ شرف قبول سے نوازے اور قارئین کے لیے نافع بنائے۔ آمین

عرضِ حال

—— جو حضرتؒ نے مقدمۂ امداد المفتین کے آغاز میں تحریر فرمایا ——

سلف صالحین کے عہد میں سوانح حیات صرف اُن قابلِ تقلید علماء صلحاء اور بزرگوں کی لکھی جاتی تھی جو علمی مہارت و رسوخ اور اصلاح و تقویٰ کی رُو سے اہلِ عصر میں ممتاز سمجھے جاتے تھے اور بجا طور پر یہ دین اور علمِ دین کی اہم خدمت تھی جس پر بہت سے فوائد و مصالح کا انحصار تھا۔

لیکن آج کل دوسرے معاملات کی طرح سوانح نگاری بھی ایک صحافیانہ کاروبار بن کر رہ گیا ہے ہر شخص جس نے کسی ذریعہ سے کوئی شہرت حاصل کر لی، اُس کی سوانح حیات لکھی جانے لگیں بلکہ خود اس کاروبار کو بھی ذریعۂ شہرت کے طور پر استعمال کیا جانے لگا جس میں کئی قسم کی خرابیاں ہیں۔

(۱) جو لوگ علم و عمل اور اخلاق و کردار میں کوئی حقیقی مقام نہیں رکھتے، ان کی سوانح دیکھ کر عام مسلمان ایک مغالطہ کے شکار ہوں گے۔

(۲) اور جب رُوحِ اخلاص اور ضرورتِ دین پیشِ نظر نہ رہی تو عموماً ان سوانح میں مبالغہ آمیزی اور غلط سلط روایات بھی ضرور ہوتی ہیں جو خود اپنے لیے گناہ اور عام لوگوں کے لیے مضر ہے۔

(۳) اور سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ موجودہ لوگوں کی سوانح حیات پڑھنے والے پچھلے بزرگوں کی سوانح حیات کو بھی اسی پر قیاس کر کے اُن کے فوائد و برکات سے محروم ہو جائیں گے۔ میرے لیے سخت حیرت و تعجب کی چیز ہے کہ بہت سے احباب اور کئی اداروں نے خود مجھ سے اس کی فرمائش کی، کہ اس سلسلہ میں کچھ لکھ کر دوں، بعض نے اس سے مایوس ہو کر چاہا کہ وہ کچھ سوالات مجھ سے کریں اور پھر اُن کے جوابات سے ایک سوانح تیار کریں مگر میرا جواب ان سب حضرات کے لیے یہ تھا کہ ہماری مثال اُن حشرات الارض کی سی ہے جو روز پیدا ہوتے اور مرتے رہتے ہیں، کسی کھی یا مچھر کی سوانح حیات کون اور کیوں لکھے۔ ہم جیسے لوگوں کا تذکرہ کچھ اس سے زیادہ ممتاز نہیں بلکہ بزرگانِ سلف کے سوانح اور تذکروں کی قدر کم کر دینے کا سبب معلوم ہوتا ہے۔ اس وقت برخوردار مولوی محمد رفیع نے جو اوراق ترجمۃ المصنف کے عنوان سے لکھے طبعی طور پر تو اس سے بھی شرم و ندامت محسوس کرتا ہوں مگر کچھ دوستوں کے اصرار پر اس میں آئے ہوئے کچھ بزرگوں کے مفید ارشادات اور علمی و اصلاحی فوائد کے پیشِ نظر اجازت اشاعت دے دی۔ واللہ تعالیٰ اسال العفو والعافیہ

(بندہ محمد شفیع عفی اللہ عنہ)
رمضان ۱۳۸۳ھ

حضرت مُفتیِ اعظمؒ کے آباء و اَجداد
اور
خاندان کے مختصر حالات

نحمدہٗ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم وعلیٰ اٰلہٖ وصحبہٖ ومن تبعھم اجمعین۔ اما بعد

خاندان

والد ماجد سیدی و سندی مفتی اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ قصبہ دیوبند ضلع سہارنپور یو۔پی کے مشہور عثمانی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں، آپ کی والدہ ماجدہ سادات میں سے تھیں اور آباؤ اجداد جو حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی اولاد میں ہیں۔ دیوبند کے ممتاز اہل علم تھے جو ہمیشہ علمی مشاغل میں مصروف اور اہل قصبہ ان کے معتقد رہے۔

سلسلۂ نسب اس طرح ہے، حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ بن حضرت مولانا محمد یٰسین صاحبؒ ابن خلیفہ تحسین علی صاحبؒ بن میاں جی امام علی صاحبؒ بن میاں جی حافظ کریم اللہ صاحبؒ ابن میاں جی خیر اللہؒ بن میاں جی شکر اللہ صاحبؒ[1] افسوس کہ ان سے اوپر کے بزرگوں کے حالات معلوم نہیں ہو سکے حضرت والد بزرگوار قدس اللہ سرہٗ اپنے خاندان کے بارے میں خود فرماتے ہیں کہ :

---

[1] مقدمہ امداد المفتین طبع اول کراچی ص۱۱

"مجھے اپنے خاندان کا کوئی مُوثّق اور باسند نسب نامہ ہاتھ نہیں آیا جس سے خاندان کے صحیح اور مُستند حالات معلوم ہوتے مگر شریعت نے ان معاملات میں "سند متصل" ہونے کی شرط نہیں رکھی بلکہ بڑے بُوڑھوں کی زبان پر عام شہرت کو کافی سمجھا ہے جس کو فقہاء کی اصطلاح میں "تسامع" کہا جاتا ہے۔ میں نے اپنے خاندان کے بزرگوں سے بتواتر یہ بات سُنی ہے کہ ہمارا خاندان حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی اولاد میں ہے۔" [1]

آباؤ اجداد کے جو حالات احقر کے حضرت والد بزرگوار رحمۃ اللہ علیہ سے سُنے یا جو انھوں نے اپنے رسالے "میرے والد ماجدؒ" میں بیان فرمائے ہیں یہاں ان کا خلاصہ ذکر کیا جاتا ہے

حافظ کریم اللہ صاحب

ہمارے خاندان کے جدِ امجد حافظ کریم اللہ صاحب کا اصل وطن قصبہ جوراس تھا جو قصبہ منگلور کے پاس دیوبند سے تقریباً تیس۳۰ میل کے فاصلہ پر ہے۔ مغلی سلطنت کے زوال اور طوائف الملوکی کے دور میں قصبہ جوراسی کے ہندوؤں نے مسلمانوں پر مظالم کیے۔ حافظ کریم اللہ صاحب یہاں کے مسلمانوں کی فریاد لے کر نجیب الدولہ کے پاس نجیب آباد پہنچے۔ ان کی ریاست کی طرف سے ایک کمک پہنچی جس سے فتنہ دب گیا مگر جدِ امجد حافظ کریم اللہ صاحب کا دل یہاں کی حکومت سے اُٹھ چکا تھا اس لیے مع اپنے خاندان کے دیوبند منتقل ہوگئے۔ دیوبند کے محلہ "شاہ رمز الدین" کی مسجد میں لگے ہوئے ایک قطعہ تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ ۱۱۸۳ھ میں یہ بزرگ دیوبند منتقل ہوچکے تھے کیونکہ یہ فارسی قطعہ جو پتھر پر کندہ ہے حافظ کریم اللہ صاحب ہی کا ہے۔ اس کے دوسرے مصرعہ میں "خانۂ حق، حق رمز الدین بود" سے انھوں نے تاریخ ۱۱۸۳ھ نکالی ہے۔ اس وقت تک دارالعلوم دیوبند قائم نہیں ہُوا تھا۔ اس کا قیام اس تاریخ کے ٹھیک ایک سو سال بعد ۱۲۸۳ھ میں عمل میں آیا۔

---

[1] دیکھئے حضرت رحمۃ اللہ علیہ کا رسالہ "میرے والد ماجدؒ" ص ۶۔ اس رسالہ میں حضرتؒ نے اپنے والد ماجد حضرت مولانا محمد یٰسین صاحب نور اللہ مرقدہٗ کے حالات و ملفوظات اور ان کے مجرب عملیات تحریر فرمائے ہیں۔ کراچی سے طبع ہوچکا ہے۔

غرض حافظ کریم اللہ صاحب ہمارے خاندان کے پہلے بزرگ ہیں جو دیوبند منتقل ہوئے یہاں ان کی نسل ان کے صاحبزادے میاں جی امام علی صاحب سے چلی۔

میاں جی امام علی صاحب

حضرت میاں جی امام علی صاحب زندگی بھر درس و تدریس میں مشغول رہے اللہ تعالیٰ نے انکی عمر اور تعلیم میں ایسی برکت عطا فرمائی کہ قصبہ دیوبند کا شاید ہی کوئی گھرانہ ہو جو ان کا شاگرد نہ ہو۔ اس لیے یہ بزرگ "میاں جی" کے لقب سے معروف ہوئے اور ان کی پہلی اولاد "خلیفہ" کے نام سے مشہور ہوئی۔

لفظ میاں جی : ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قصبات و دیہات میں پھیلے ہوئے عام مکاتب جن میں قرآن کریم کی تعلیم کے بعد اُردو، فارسی، حساب، ریاضی کی تعلیم کا عام رواج تھا جو آجکل کے پرائمری اسکول کی تعلیم سے زیادہ معیاری تعلیم تھی، اس کے ایسے اساتذہ "میاں جی" کے لقب سے معروف ہوتے تھے جو دینی تعلیم کے ساتھ عملی تقدس کے حامل ہوں جیسے حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی کے شیخ میاں جی نور محمد صاحب بھی لوہاری میں معروف ہوئے اور میاں جی منے شاہ صاحب دیوبند میں صاحب کشف و کرامات بزرگ ہوئے ہیں۔ حافظ کریم اللہ صاحب کی اولاد میں میاں جی امام علی صاحب کی بھی اسی طرح دیوبند میں عام شہرت ہوئی۔

میاں جی امام علی صاحب کے پانچ صاحبزادے تھے۔ جعفر علی، شجاعت علی، منیر علی، شبیر علی، تحسین علی۔

خلیفہ تحسین علی صاحب

میاں جی امام علی صاحب کو اللہ تعالیٰ نے دیوبند میں اچھی زمینداری عطا فرمائی تھی جو اُن کے صاحبزادوں میں تقسیم ہوئی۔ صاحبزادوں میں سے اکثر تو سرکاری عہدوں پر فائز ہوئے، خلیفہ تحسین علی صاحب آنکھوں سے معذور ہوجانے کے سبب کوئی ملازمت نہ کر سکے۔ زمین کا جو حصہ میراث میں ان کو ملا تھا اس پر تنگی کے ساتھ متوکلانہ گزارا تھا۔ بعد میں وقتی ضرورتوں سے مجبور ہوکر کچھ زمین بھی فروخت کرنا پڑی تو تنگدستی اور بڑھ گئی۔ آپ کے دو صاحبزادے تھے، حضرت مولانا محمد یٰسین صاحبؒ۔ اور منشی

منظور احمد صاحب۔

اولاد کو دینی تعلیم دلانے کا شوق بہت تھا۔ اپنے لائق فرزند حضرت مولانا محمد یٰسین صاحبؒ کو اوّل گھر ملو مکتب میں قرآن مجید حفظ کرایا، پھر اسی مکتب میں اُردو، فارسی، حساب، ریاضی کی مرّوجہ تعلیم دلائی اور اب وہ اس قابل سمجھے کہ اپنے معذور والد کا ہاتھ بٹا سکیں لیکن معذور باپ نے فقر و فاقہ کی زندگی اختیار کی اور ان کو دارالعلوم دیوبند میں اعلیٰ دینی عربی تعلیم کے لیے داخل کر دیا۔ سعادت مند بیٹے نے بھی تعمیلِ حکم میں اس فقر و فاقہ کی حالت میں تعلیم کا سلسلہ جاری رکھا۔

حضرت مفتی اعظمؒ کے والدِ ماجد حضرت مولانا محمد یٰسین صاحبؒ

حضرت مولانا محمد یٰسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ احقر راقم الحروف کے جدِ امجد (دادا) ہیں، آپ کے دو صاحبزادے ہُوئے۔ ایک احقر کے والد ماجد مفتی اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ اور دُوسرے جناب محمد رفیع صاحبؒ جن کا انتقال کم عمری ہی میں ہوگیا تھا۔ تین بیٹیاں تھیں مگر نرینہ اولاد میں حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ ہی اکلوتے رہ گئے تھے۔ جن کے متعلق دادا جان مرحوم فرمایا کرتے تھے کہ میرا ایک ہی بیٹا چار کے برابر ہے۔

حضرت مولانا محمد یٰسین صاحب نور اللہ مرقدہٗ دارالعلوم دیوبند کے ہم عصر تھے۔ ان کی ولادت ۱۲۸۲ھ میں ہوئی جوان کے تاریخی نام "افتخار" سے ظاہر ہے اور دارالعلوم دیوبند کا قیام ۱۲۸۳ھ میں ہُوا اس طرح ان کو دارالعلوم دیوبند کا قرنِ اوّل نصیب ہُوا۔ فارسی ادب کی اعلیٰ تعلیم مولانا منفعت علی صاحب مدرّس دارالعلوم دیوبند سے حاصل کی جو مشہور شاعر غالب کے شاگرد تھے، عربی درسِ نظامی کی تعلیم دارالعلوم دیوبند کے قرنِ اوّل کے اکابر علما سے حاصل کی جن میں حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتویؒ، مولانا سید احمد صاحب دہلویؒ، ملّا محمود صاحب دیوبندیؒ اور شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن صاحب دیوبندی قدس اللہ سرہٗ علیہم خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔ ان میں بھی حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ سے ان کو سب سے زیادہ مناسبت اور عقیدت و محبت تھی، استفادہ بھی سب سے زیادہ ان ہی سے کیا۔

زمانۂ طالب العلمی کا ایک واقعہ: حضرت مولانا محمد یٰسین صاحبؒ نے طالب علمی کا پُورا زمانہ

عسرت اور تنگدستی میں بسر کیا۔ ایک روز آپ گرمی کی دوپہر میں دارالعلوم کے اسباق سے تھک تھکا کر چھٹی کے وقت گھر پہنچے تو والدہ نے آبدیدہ ہو کر اپنے لائق فرزند سے کہا: "بیٹا آج تو گھر میں کھانے کے لیے کچھ نہیں ہے البتہ ہماری زمین میں گندم کی فصل تیار کھڑی ہے اگر تم اس میں سے کچھ گندم کاٹ لاؤ تو میں ان کو صاف کر کے آٹا پیس کر روٹی پکا دوں گی"۔ سعادت مند بیٹا محنت اور بھوک سے درماندہ اسی گرمی کی دوپہر میں اپنی زمین کی طرف چل دیا اور وہاں سے جس قدر بوجھ اُٹھا سکتا تھا اتنے گندم کاٹ کر لے آیا۔ والدہ نے ان کو کوٹ چھان پیس کر آٹا بنایا اور روٹی پکائی۔ اس طرح ظہر کے وقت تک بھوک کا کچھ سامان ہُوا، ظہر کے بعد اپنے اسباق کے لیے چلے گئے۔ ماں باپ اور بیٹے نے اسی فقر و فاقہ میں وقت گذارا مگر تعلیم میں فرق نہ آنے دیا۔

بالآخر ایک ایسا وقت بھی آیا کہ معذور والد بالکل ہی مجبور ہو گئے کہ اپنے ہونہار بیٹے کو کسی ملازمت پر لگا کر اپنی ضروریات حاصل کریں اور ایک جگہ جُز وقتی ملازمت دلوا دی اس کے نتیجے میں دارالعلوم کے اسباق کی حاضری میں کمی ہونا لازمی تھا۔

دارالعلوم دیوبند کے مہتمم اس زمانہ میں ایک متقدس ولی اللہ صاحب کشف و کرامات بزرگ حضرت مولانا رفیع الدین صاحبؒ تھے جن کو درویشانہ زندگی کے باوجود اللہ تعالیٰ نے دارالعلوم کے نظم و نسق کی بڑی صلاحیت عطا فرمائی تھی۔ حضرت والد صاحب کو چند روز تک دارالعلوم میں کم آتے دیکھا تو ایک روز بلا کر سبب پوچھا، سعادت مند طالب علم نے اپنی مجبوری اور ملازمت کا واقعہ بیان کیا۔ حضرت مہتمم صاحب نے فرمایا کہ زیادہ تو نہیں کچھ تھوڑا سا وظیفہ ہم تمہارے لیے جاری کر سکتے ہیں۔ اپنے والد صاحب سے پوچھو۔ اگر وہ اس پر قناعت کریں تو تمہاری تعلیم پوری ہو سکتی ہے۔

لائق بیٹے نے اپنے والد کو یہ پیغام دیا تو علم دین کے اس عاشق نے اسی قلیل وظیفہ پر فقر و فاقہ میں بسر کرنے کو ترجیح دے کر ملازمت چھوڑوا دی۔ حضرت مہتمم صاحب اس وقت سے ان پر خصوصی شفقت و عنایت فرمانے لگے۔ ایک مرتبہ حدیث شریف کی تین کتابیں، نسائی شریف، ترمذی شریف[1]

---

[1] یہ واقعہ حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ نے اپنے رسالہ "میرے والد ماجد" میں بیان فرمایا ہے نیز احقر نے زبانی بھی اُن سے کئی بار سُنا ہے (رفیع)

ابن ماجہ شریف آپ کو عطا فرمائیں۔ یہ تینوں مقدس کتابیں حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے فاتی کتب خانہ میں آج بھی محفوظ ہیں۔ ان میں سنن نسائی پر حضرت مولانا مملوک علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی مہر بھی ثبت ہے جس سے معلوم ہوا کہ یہ نسخہ ان کے زیر درس رہا ہے۔ حضرت مولانا محمد یٰسین صاحبؒ کے ہم درسوں میں حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ، حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحبؒ جو بعد میں دارالعلوم دیوبند کے مہتمم ہوئے اور حکیم عبدالوہاب صاحب جو حکیم نابینا کے لقب سے دہلی میں بہت مصروف و باکمال طبیب ہوئے ہیں بطور خاص قابل ذکر ہیں تعلیم سے غالباً ۱۳۰۱ھ میں فراغت کے بعد اساتذہ اور بزرگوں کے ایماء پر دارالعلوم دیوبند ہی میں باضابطہ تدریس کی خدمت میں مشغول ہو گئے۔

بیعت سلوک

حضرت مولانا محمد یٰسین صاحب کو زمانہ طالب علمی ہی سے فقیہ العصر حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ سے خاص محبت و عقیدت تھی۔ درس نظامی سے فراغت کے بعد ان کی خدمت میں حاضر ہو کر بیعت ہوئے اور سلوک کی منازل طے کرنے لگے۔ یہ احقر کے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ کی پیدائش سے تقریباً چودہ سال پہلے کا واقعہ ہے۔[1]

حضرت دادا جان مرحوم کو دارالعلوم دیوبند کا کیسا قابل رشک دور نصیب ہوا تھا، اس کا کچھ اندازہ ان کے اس ارشاد سے ہو گا جو میں نے اپنے والد ماجدؒ سے بارہا سنا ہے کہ:

"ہم نے دارالعلوم کا وہ وقت دیکھا ہے جس میں صدر مدرس سے لے کر ادنیٰ مدرس تک اور مہتمم سے لے کر دربان اور چپراسی تک سب کے سب صاحب نسبت بزرگ اور اولیاء اللہ تھے۔ دارالعلوم اس زمانہ میں دن کو دارالعلوم اور رات کو خانقاہ معلوم ہوتا تھا کہ اکثر حجروں سے آخر شب میں تلاوت اور ذکر کی آوازیں سنائی دیتی تھیں۔"[2]

---

[1] رسالہ "والد ماجدؒ" ص ۲۱

[2] رسالہ "میرے والد ماجدؒ" ص ۵۲۔ طبع کراچی

آپ کا درس اور تلامذہ

حضرت داداجانؒ دارالعلوم دیوبند کے شعبہ فارسی میں صدر مدرس تھے مگر خارج اوقات میں کچھ عربی کے اسباق بھی آخر حیات تک جاری رہے، فارسی درس کی انتہائی کتابیں نہایت شوق اور کامل تحقیق سے پڑھاتے تھے۔ ان کے یہ درس اتنے مقبول تھے کہ ان میں بعض فارغ التحصیل علما بھی شریک ہوتے تھے۔ آپ کے درس کی ایک نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ طالب علم کے قلب میں ابتدا ہی سے اللہ تعالیٰ اور اس کے مقدس انبیاء علیہم السلام کی محبت اور بزرگانِ دین کی عقیدت جاگزیں ہوجاتی تھی، تدریس کا یہ سلسلہ چالیس برس سے زیادہ جاری رہا، دیوبند میں تعلیم یافتہ حضرات میں ایسے بہت کم لوگ تھے جو آپ کے حلقۂ درس کے فیض یافتہ نہ ہوں اور بعض خاندانوں میں تو باپ بیٹا اور پوتا سب آپ کے شاگرد تھے۔ دُور دراز ممالک سے آنے والے بہت سے طالب علم بھی تعلیم فارسی یا عربی میں آپ کے تلامذہ میں داخل ہیں۔ آپ کے ممتاز شاگردوں میں صاحب کشف وکرامات ولی اللہ حضرت مولانا سید میاں اصغر حسین صاحبؒ، شیخ الاسلام حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ مولانا محمد یٰسین صاحب شیرکوٹی اور اہل حدیث کے مشہور عالم دین مولانا ثناء اللہ صاحب امرتسری خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔

تصانیف

تدریسی مصروفیات کے ساتھ آپ کو کتب بینی اور تصنیف وتالیف کا بھی کسی قدر شغل ضرور رہتا تھا، اُن اصلاحی ودینی مضامین کے علاوہ جو رسائل واخبارات میں شائع ہوتے رہے آپ کی مندرجہ ذیل تصانیف بھی کافی مقبول ہُوئیں۔

مفید نامہ جدید، جدید صفوۃ المصادر، مفید اصاغر واکابر، رسالۂ نادر، شرح صفوۃ المصادر، انشار فارغ، یہ سب کتابیں فارسی کے طلبار کے لیے نہایت مفید ہیں، بار بار طبع ہُوئیں اور دارالعلوم دیوبند سمیت متعدد مدارس میں داخلِ نصاب رہیں۔

ذوقِ عبادت اور مرضِ وفات

اَوراد و معمولات اور تکبیرِ اُولیٰ کے ساتھ نماز باجماعت آپ کا شعار تھا، آخر عُمر میں چند سال ضعفِ پیری کے ساتھ بہت سے امراض مسلسل لگے رہتے تھے، نشست و برخاست میں تکلف ہوتا تھا مگر جماعت کا وقت آتے ہی مسجد میں سب سے پہلے پہنچ جاتے تھے، مرضِ وفات میں دو ماہ تک ورمِ جگر اور کثرتِ اسہال کی شدید تکلیف اور بخار میں مبتلا رہے مگر لاٹھی کے سہارے مسجد میں پہنچتے رہے، جب اس کی بھی سکت نہ رہی تو مجبوراً ۵۶ دن کی نمازیں گھر ہی پر ادا کرنی پڑیں۔

اپنے لائق فرزند (حضرت مفتی صاحبؒ) سے ایک روز فرمانے لگے "شفیع" ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میں انہی دستوں میں ختم ہو جاؤں گا۔ مگر کچھ غم نہیں کیونکہ حدیث میں اس کو بھی شہادت فرمایا گیا ہے۔ شبِ جمعہ میں مغرب کے وقت حالت نازک اور بالکل نزع کا سا عالم تھا، ناچیز راقم الحروف کی محترمہ دادی جان نے والد ماجد سے فرمایا کہ اس وقت تم مسجد میں نہ جاؤ، نمازِ مغرب یہیں ادا کر لو مگر رحمت کے اس عاشق نے اسی نزع کی حالت میں فرمایا، نہیں مسجد حضرت والد ماجد نے حکم کی تعمیل کی، شبِ جمعہ کو صبح صادق کے وقت والد صاحب کو اُٹھایا کہ جلدی کرو میرے کپڑے اور بدن پاک کر دیں نماز قضا نہ ہو جائے، کپڑے اور بدن پاک ہونے کے بعد فرمایا "مجھے وضو کے لیے بٹھاؤ"۔ والد ماجد نے اُٹھایا تو معلوم ہُوا کہ عصار کی جان ختم ہو چکی ہے، اُٹھاتے ہی آنکھیں چڑھ گئیں حالت بدل گئی، لٹا دیا گیا پھر کچھ سکون ہُوا اور ذکر و توبہ و استغفار کرنے لگے پھر اچانک دادی جان سے فرمایا "رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم" اتنے الفاظ تو سُنے گئے، اس کے بعد کوئی کلمہ ایسا فرمایا کہ "تشریف لائے" یا اس کے ہم معنیٰ جو سمجھ میں نہیں آیا۔ نزع شروع ہو چکا تھا، کلمہ طیبہ پڑھتے رہے یہاں تک کہ آواز ختم ہو گئی مگر زبان کی حرکت باقی رہی، بالآخر چند منٹ میں ان سب حرکات کو ہمیشہ کے لیے سکون ہو گیا اور آپ کی اس دعا کی مقبولیت ظاہر ہو گئی جو اکثر پڑھا کرتے تھے کہ

جب دمِ واپسیں ہو یا اللہ — لب پہ ہو لآ اِلٰہ اِلّا اللہ

آپ کی وفات دیوبند میں ۹ صفر المظفر ۱۳۵۵ھ کی صبح کو بروز جمعہ ہوئی، کل عمر تہتر[۷۳] سال ہوئی افسوس کہ ناچیز راقم الحروف کو دادا جان مرحوم کی زیارت نصیب نہیں ہوئی، کیونکہ میری ولادت

ان کی وفات کے تقریباً پونے تین ماہ بعد جمادی الاولیٰ ۱۳۵۵ھ کی پہلی یا دوسری تاریخ کو ہوئی۔ وفات سے ایک دن پہلے احقر کے والد ماجدؒ سے فرمایا:

"شفیع بھول تو جایا ہی کرتے ہیں مگر اتنی بات کہتا ہوں کہ جلدی نہ بھول جانا۔"

والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ شدید تاثر کے ساتھ فرمایا کرتے تھے کہ "ان کا یہ جملہ لوحِ قلب پر ایسا کندہ ہوگیا کہ اب چالیس سال سے زائد ہوگئے ہیں، الحمدللہ کبھی فراموش نہیں ہوا۔" چنانچہ یہ ہمارے سامنے کی بات ہے کہ گھر پر ہوں یا حالتِ سفر میں بلاناغہ روزانہ تلاوت کرکے اور سال میں کئی بار فقراء و مساکین کو کھانا کھلا کر وہ اپنے والد بزرگوار کو ایصالِ ثواب فرماتے رہے۔ اس معمول میں کبھی فرق نہیں آیا۔

جدِّ امجد کی وفات پر حضرت والد صاحبؒ نے ایک مرثیہ عربی میں اور ایک اردو میں کہا تھا۔ جو کشکول میں شائع ہوچکا ہے اور برادرِ عزیز مولوی محمد تقی عثمانی سلمہٗ کے مضمون "میرے والد میرے شیخ" میں بھی اس کے منتخب اشعار موجود ہیں۔

مفتیٔ اعظمؒ کی والدہ ماجدہؒ

حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی والدہ محترمہ سادات میں سے تھیں اور غالباً وہ بھی حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت تھیں، بیوہ ہوجانے کے بعد تاحیات اپنے سعادت مند بیٹے کے ساتھ رہیں، لکھنا پڑھنا جانتی تھیں مگر نماز روزہ اور عبادت کا بڑا اہتمام فرماتی تھیں، ضروری کاموں سے فراغت کے بعد بیشتر وقت ذکر اور نماز میں یا نماز کے انتظار میں گزرتا تھا، سامنے گھڑی رکھی رہتی اور ان کی نظریں بار بار اسی کی طرف اٹھتی رہتی تھیں جب بینائی بہت کمزور ہوگئی تو ہم میں سے جو بھی سامنے سے گزرتا اس سے پوچھتی رہتیں "بیٹے کیا بجا ہے؟ اذان میں کتنی دیر ہے؟" کثرتِ ذکر کی وجہ سے آخر حیات میں یہ حال ہوگیا تھا کہ باتیں کررہی ہوں یا خاموش لیٹی ہوں، ہر سانس کے ساتھ اندر سے خود بخود "اللہ اللہ" کی آواز آتی رہتی تھی، جس کا احساس انھیں ہو یا نہ ہو، مگر ہم سب اہلِ خانہ ہمیشہ اس کا مشاہدہ کرتے تھے ہم سب بچوں کو بزرگوں کے واقعات بڑے دلچسپ انداز میں سنایا کرتی تھیں، پاکستان تشریف لانے کے بعد بھی تقریباً گیارہ سال حیات رہیں، ۱۳۷۸ھ میں انتقال ہوا۔ تاریخِ وفات "مادرِ علامہ مفتی شفیع" نکالی گئی اور دارالعلوم کراچی (کورنگی) کے قبرستان میں سب سے پہلی قبر انہی کی بنی۔

إنا لله وإنا إليه راجعون

مفتیٔ اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ

والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا آبائی وطن دیوبند ہے جو ضلع سہارنپور یوپی میں برصغیر کا مشہور ترین قصبہ ہے، یہیں آپ کی ولادت ۱۳۱۴ھ میں شعبان کی تقریباً بیس تاریخ کو ہوئی، شمسی حساب سے یہ جنوری ۱۸۹۷ء تھا [۱]

آپ کے دادا نے نام "محمد مبین" رکھا تھا لیکن آپ کے والد بزرگوار نے ولادت کی اطلاع کا خط اپنے شیخ حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کو لکھا، تو حضرت گنگوہیؒ نے جواب میں نام محمد شفیع تجویز فرمایا خط کے الفاظ یہ ہیں:

"تولّد فرزند سے مسرت ہوئی، نام اس کا محمد شفیع رکھنا" [۲]

دیوبند

دیوبند کیا ہے؟ اس کے متعلق خود حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ اپنے رسالہ "نقوش و تاثرات" [۳] میں فرماتے ہیں کہ:

"دیوبند کیا ہے؟ ایک چھوٹا سا قصبہ سہارنپور کا، جس کو نہ جغرافیائی اور عرانی حیثیت سے کوئی خاص شہرت حاصل ہے نہ تجارتی یا صنعتی اعتبار سے، ہاں اس خوش نصیب خطۂ زمین میں علوم اسلامیہ کا ایک عظیم دار العلوم ہے جو ہندوستان میں اسلامی حکومت کے سقوط کے بعد علوم اسلامیہ کو اپنی اصلی صورت میں باقی رکھنے کے لیے ایک گوشۂ خمول کی حیثیت میں قائم کیا گیا تھا، اللہ تعالیٰ نے اس کو حسنِ قبول عطا فرمایا اور مرکزِ علوم

---

[۱] رسالہ "میرے والد ماجدؒ" ص ۲۲ [۲] حوالۂ بالا

[۳] ص ۱۰۰۱۱۰ اس رسالہ میں آپ نے پاکستان سے دیوبند و تھانہ بھون کا سفرنامہ اور وہاں کے سبق آموز تاثرات دلنشین انداز میں بیان فرمائے ہیں، کئی بار شائع ہو چکا ہے۔

بنا دیا اور اس سے پیدا ہونے والے رجال اللہ اس آخری صدی کے مُجدّد ثابت ہُوئے اس طرح دیوبند اس دورِ انحطاط میں اسلام اور مسلمانوں کے لیے ایک پناہ گاہ بن گیا۔ دیوبند کا نام اسی دار العلوم سے چمکا اور دُنیا کے ہر گوشہ میں پہنچا۔ یہ ادارہ دن میں علوم سلامیہ کی ایک درسگاہ تھی، اور رات میں ذاکر و شاغل حضرات کی خانقاہ"

آگے فرماتے ہیں :

" احقر نے اسی مبارک سرزمین پر آنکھ کھولی۔

بِلادٌ بِھَا حَلّ الشَبابُ تَمِیمَتِیْ[1]

وَ اَوّلُ اَرْضٍ مَسَّ جِلْدِیْ تُرابُھَا

اسی میں بچپن سے پچپن تک کے تمام ادوارِ زندگی طے کئے، میرا وطن کہنے کو تو دیوبند تھا، لیکن درحقیقت اس کا بھی ایک گوشہ یعنی " دار العلوم " تھا، اسی میں طفلانہ کھیل کُود کا وقت گزرا، اسی میں چھتیس۳۶ سال تعلیم اور فتویٰ کی خدمت انجام دی "[2]

بچپن

حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے بزرگانِ دین کے ساتھ والہانہ عقیدت و محبت اپنے والد بزرگوار سے وراثت میں پائی تھی، کھیل کُود کی نوبت کم ہی آتی تھی، آپ کی عادت تھی کہ جب بھی موقع ملتا، اپنے والد بزرگوار کے ساتھ اکابر علماء و صلحا کی بابرکت مجلسوں میں جا بیٹھتے، شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن صاحبؒ کی مجلس میں حاضری اکثر ہُوا کرتی تھی۔

بچپن کا ایک واقعہ

والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے بچپن کا یہ واقعہ کئی بار مجلسوں اور مواعظ میں سُنایا کہ

---

[1] یہ وہ شہر ہے جس میں شباب نے میرے گلے کے تعویذ کھولے اور یہی وہ پہلی سرزمین ہے جس کی مٹی میرے بدن کو لگی۔ [2] نقوش و تاثرات ص ۱۱

ایک مرتبہ میں اور میرے رشتہ کے بھائی عاقل صاحب سرکنڈوں سے کھیل رہے تھے، بھائی عاقل مجھ سے بڑے تھے، انھوں نے میرے سارے سرکنڈے جیت لئے۔ مجھے اتنا شدید غم ہوا کہ آج تک یاد ہے، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مجھ سے زیادہ کوئی مظلوم نہیں، بلکہ لٹا گیا ہوں، پھر فرمایا کہ آج وہ واقعہ یاد کر کے ہنسی آتی ہے کہ سرکنڈے جیسی حقیر چیز کی کتنی وقعت و محبت دل میں تھی کہ سرکنڈے جیت لیے تو مالا مال ہار گئے تو گویا لٹ گئے پھر فرمایا کہ آخرت میں بھی ہمارا یہی حال ہوگا کہ جنت کی نعمتوں کے سامنے دُنیا کی بڑی سے بڑی نعمتیں ہیچ نظر آئیں گی اور ہم اپنی اس نادانی پر ہنسا کریں گے کہ بھلا دُنیا کی حکومت واقتدار، مال و دولت، جائداد اور ساز و سامان بھی اس قابل چیزیں تھیں کہ ہم ان کو دل میں ذرا بھی جگہ دیتے۔ ہم کیسے نادان تھے کہ ان کے لیے لڑتے جھگڑتے تھے۔

اِبتدائی تعلیم

پانچ سال کی عمر میں قرآن کریم ناظرہ کی تعلیم جناب حافظ محمد عظیم صاحب کے پاس دار العلوم دیوبند میں شروع فرمائی، حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی ننھیال پور قاضی ضلع مظفر نگر میں تھی، بچپن میں اپنی والدہ ماجدہ کے ساتھ وہاں بکثرت جانا ہوتا تھا، ایک مرتبہ جب آپ قرآن شریف غالباً ناظرہ ہی پڑھتے تھے وہاں کچھ زیادہ دنوں کے لیے جانا ہوا تو تعلیم کا سلسلہ جاری رکھنے کے لیے آپ کو وہیں کے ایک مکتب میں عارضی طور پر بٹھا دیا گیا، طبیعت میں لطافت بچپن سے تھی، دیہاتی مکتب کا ماحول اور اسی مزاج کے استاذ کا انداز تعلیم سخت اجنبی اور صبر آزما تھا، بچوں کو ڈانٹ ڈپٹ یہاں کی روزمرہ میں داخل تھی اور مارپٹائی صبح شام کا مشغلہ، آپ کو ایسے ہولناک مناظر سے کہاں واسطہ پڑا تھا، ایک روز استاذ نے کسی بچہ کو رسی سے باندھ کر ڈنڈے سے مارا تو آپ فرماتے تھے کہ مجھے صرف دیکھ کر ہی دہشت سے تیز بخار چڑھ گیا، جب والدہ کو معلوم ہوا تو مجھے اس مکتب سے اُٹھا لیا گیا۔ غرض قرآن شریف کی ناظرہ تعلیم بھی دار العلوم دیوبند ہی میں ہوئی۔

آپ کے والد بزرگوار کی خواہش تھی کہ آپ کو قرآن شریف حفظ کرائیں، کچھ پارے حفظ کر بھی لیے تھے مگر جسمانی طور پر بچپن ہی سے کمزور تھے، حفظ کی محنت برداشت نہ ہو سکی، مگر چند پارے جو اس وقت حفظ کر لیے تھے عمر بھر ان کو یاد رکھنے کا اہتمام فرماتے تھے۔ آپ یہ پارے اکثر نفلوں اور

تہجد میں پڑھا کرتے تھے۔ قرآن کریم کی تعلیم سے فراغت کے بعد دار العلوم ہی میں خط واملاء کی مشق اور فارسی کی تمام مروجہ کتابوں کی تعلیم اپنے والدِ محترم سے حاصل کی، حساب اور فنونِ ریاضی اقلیدس وغیرہ اپنے چچا جناب منشی منظور احمد صاحبؒ مدرس دار العلوم دیوبند سے پڑھے اور فنِ تجوید اپنے عربی علوم کے رفیقِ درس جناب قاری محمد یوسف صاحب میرٹھیؒ[1] سے (جو عرصۂ دراز تک آل انڈیا ریڈیو سے تلاوتِ قرآن فرماتے رہے) حاصل کیا۔

عربی نحو وصرف اور فقہ کی ابتدائی کتابیں بھی فصولِ اکبری، ہدایۃ النحو، اور مُنیۃ المصلی تک اپنے والدِ موصوف سے فارسی تعلیم کے ساتھ ہی پڑھ لی تھیں، اس طرح تعلیمِ قرآن کے بعد تقریباً پانچ سال فارسی، ریاضی وغیرہ کی پوری تعلیم اور عربی کی ابتدائی کتب میں صرف ہوئے۔

درسِ نظامی اور آپ کے اساتذہ

سنہ ۱۳۳۰ھ میں جب آپ کی عمر سولہ سال تھی، اصولِ فقہ اور ادب وغیرہ کی متوسط کتابیں دار العلوم کے درجۂ عربی میں باقاعدہ داخل ہو کر شروع فرمائیں۔

آپ نے جس ماحول میں آنکھ کھولی تھی اس میں ہر طرف علم وعرفان اور زُہد وتقویٰ کے وہ بے مثل پہاڑ تھے جن کی رگ رگ سے علوم ومعارف کے بے شمار چشمے نکل کر عالمِ اسلام کو سیراب کر رہے تھے اس رُوح افزا ماحول میں آپ نے جن یگانۂ روزگار اساتذہ سے استفادہ کیا، ان کو اللہ تعالیٰ نے اس زمانہ کا جُنید، کرخی، ابنِ حجر اور غزالی بنایا تھا۔ آپ اکثر فرمایا کرتے تھے کہ:

> "اگر ہم اپنے بزرگوں کے تبحرِ علمی اور باطنی کمالات کا اپنی آنکھوں سے مشاہدہ نہ کرتے تو ہمیں اپنے قدیم اسلاف، تابعین، تبع تابعین کے حیرت ناک دینی کمالات کا شاہداتی علم نہ ہو سکتا۔"

حقیقت یہ ہے کہ ان حضرات نے اپنے کمالِ علم اور پختگیٔ کردار سے قرونِ اولیٰ کی وہ داستانیں تازہ کر دی تھیں جن پر تاریخِ انسانی ہمیشہ فخر کرتی رہے گی۔ آپ کے اساتذۂ کرام میں یہ حضرات خصوصیت

---

[1] موصوف کا انتقال کراچی میں ۱۳۹۰ھ میں ہوا، دار العلوم کراچی کے قبرستان میں آپ کا مزار ہے۔

سے قابلِ ذکر ہیں۔

(۱) فخر المحدثین حضرت علامہ سید محمد انور شاہ کشمیری[1] رحمۃ اللہ علیہ

(۲) مفتی اعظم ہند[2] حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحب عثمانیؒ دیوبند (صاحبِ عزیز الفتاویٰ)

(۳) سابق مہتمم دار العلوم دیوبند حضرت مولانا محمد احمد صاحب ابن حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ۔

(۴) شیخ الاسلام حضرت علامہ شبیر احمد[3] صاحب عثمانی دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ

(۵) عارف باللہ حضرت مولانا سید میاں اصغر حسین[4] صاحب رحمۃ اللہ علیہ

(۶) شیخ الادب حضرت[5] مولانا اعزاز علی صاحب قدس اللہ سرہ

---

[1] ولادت ۲۷ شوال ۱۲۹۲ھ وفات ۲ صفر ۱۳۵۲ھ موصوف کی جامع تاریخ حیات "نفحۃ العنبر" بزبان عربی مجلس علمی ڈابھیل سے اور مختصر سوانح "حیاتِ انور" کے نام سے اُردو میں دیوبند سے شائع ہو چکی ہے۔ ۱۲ منہ

[2] تاریخی نام ظفر الدین ہے (ولادت ۱۲۷۵ھ وفات ۱۷ جمادی الثانیہ ۱۳۴۷ھ) مفصل تذکرہ فتاویٰ دار العلوم دیوبند کے طویل پیشِ لفظ میں خود حضرت والد ماجدؒ نے تحریر فرمایا ہے (رفیع)

[3] مختصر تذکرہ بنام "حیاتِ شیخ الاسلام" ادارہ سیرت پاکستان لاہور سے اور تفصیلی حالات بنام "تجلیاتِ عثمانی" ادارہ نشر المعارف چھلیک ملتان سے شائع ہو چکے ہیں۔ (ولادت عاشورہ محرم ۱۳۰۵ھ وفات ۱۳ دسمبر ۱۹۴۹ء پاکستان) ۱۲ منہ

[4] دار العلوم دیوبند کے مشہور محدث، تقویٰ و طہارت اور عبادت و تقدس کے پیکر، عربی و اردو کی نہایت مفید کتابوں کے مصنف (وفات ۱۳۶۴ھ مقام راندیر ضلع سورت) مختصر سوانح بنام "حیاتِ اصغر" دیوبند سے شائع ہو چکی ہے۔

[5] سوانح حیات بنام "تذکرہ اعزاز" دیوبند سے شائع ہوئی ہے۔ دیوبند کے اکابر اساتذہ میں ممتاز اور فقہ و ادب میں کئی درسی کتابوں اور بہت سے نہایت مفید اور وقیع حواشی کے مصنف ہیں۔ ۱۲ منہ

(۷) جامع المعقول والمنقول حضرت مولانا رسُول خانؒ صاحب رحمۃ اللہ علیہ

(۸) حضرت مولانا محمد ابراہیمؒ صاحب بلیاوی رحمۃ اللہ علیہ

افسوس کہ یہ سب حضرات دُنیا سے رخصت ہو چکے ہیں، اول الذکر تین بزرگوں کی زیارت احقر کو نصیب نہیں ہُوئی، البتہ باقی سب اساتذہ کی نہ صرف زیارت نصیب ہوئی بلکہ حضرت والدماجدؒ کے طفیل ان سب حضرات کی عنایات اور شفقتیں اللہ تعالیٰ نے عطا فرمائیں۔ فالحمد للہ علیٰ ذالک

حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے بزرگوں اور اساتذہ کو آپ سے کتنا تعلق تھا، اس کا کچھ اندازہ اس مضمون سے ہوگا جو برادرِ عزیز مولانا محمد تقی صاحب عثمانی (کثر اللہ امثالہ) نے حضرتؒ کے شیوخ و اکابر کے عنوان" سے البلاغ کے مفتئ اعظم نمبر کے لیے لکھا ہے۔

طلب علم میں انہماک

علمی ذوق آپ کی زندگی کے ہر شعبہ پر ہمیشہ غالب رہا، زمانہ طالب علمی میں آپ جس انہماک اور جانفشانی سے اپنے اسباق کی طرف ہمہ تن متوجہ رہے اس کی مثالیں دورِ حاضر میں نایاب ہیں، عربی تعلیم باقاعدہ شروع فرمانے کے وقت سے دارالعلوم ہی گویا آپ کا گھر تھا، اسباق سے فارغ ہو کر اپنے ہم سبقوں کو روزانہ کے اسباق کا اس طرح تکرار (اعادہ) کراتے تھے کہ استاذ کی تقریر کا پُورا چربہ اُتر جاتا تھا، آپ کا تکرار طلبہ میں بہت مقبول تھا، طلباء اتنی اہمیت سے اس تکرار میں شریک ہوتے تھے کہ مستقل ایک درس کی سی صورت بن جاتی، حضرتؒ نے ایک مرتبہ طلبۂ دارالعلوم کراچی کو جن میں راقم الحروف بھی موجود تھا، تکرار کی تاکید کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ :

"میں مقامات کے تکرار میں شیخ الادب حضرت مولانا اعزاز علی صاحبؒ کی پوری تقریر کا اعادہ اسی ترتیب سے کیا کرتا تھا جس طرح استاذ محترم نے بیان کی

لہ تقسیم ہند کے بعد بھی جامعہ اشرفیہ لاہور میں تاحیات آپ کا درس جاری رہا، یہیں وفات ہُوئی، آپ کا تذکرہ حال ہی میں قاری فیوض الرحمٰن صاحب (ایبٹ آباد) نے لکھا ہے۔

لہ تاحیات دارالعلوم دیوبند میں مدرس رہے، علوم عقلیہ میں امام سمجھے جاتے تھے۔

تھی۔ بعض اوقات استاذ محترم میری لاعلمی میں میرا تکرار سُنتے اور مجھے بعد میں پتہ چلتا کہ وہ سُن کر بہت خوش ہوئے ہیں۔

اکثر صبح کو دارالعلوم جا کر رات ہی کو واپسی ہوتی اور بعض اوقات رات کو بھی وہیں مولسری کے درخت کے نیچے کھلے فرش پر سو جاتے۔ تکرار عموماً رات کو ہوتا تھا اور جب گھر واپسی ہوتی تو کبھی رات کا ایک بج جاتا کبھی دو۔ حضرتؒ نے دارالعلوم کراچی کے طلبہ کو ایک مرتبہ نصیحت کرتے ہوئے فرمایا کہ:

"رات کو والدہ میرا انتظار کرتی تھیں کہ کھانا گرم کر کے دیں، ان کے انتظار میں مجھے تکلیف ہوتی تھی، بڑی منت سماجت سے اس پر راضی کیا کہ میرا کھانا ایک جگہ رکھ دیا کریں۔ سردیوں کی راتوں میں شوربہ اُوپر سے بالکل جم جاتا اور نیچے صرف پانی رہ جاتا، میں وہی کھا کر سو جایا کرتا۔"

دیوبند آپ کا وطن تھا اور تمام اعزہ و اقارب کے گھر یہیں تھے لیکن طالب علمی میں ان کے یہاں جانے کا وقت بھی نہ ملتا، نہ محلّے کے ہم عصر لڑکوں سے دوستانہ تعلقات کی نوبت آئی، حتیٰ کہ آپ کو دیوبند کے جو ایک چھوٹا سا قصبہ ہے تمام راستے بھی بخوبی معلوم نہ تھے تعلیمی انہماک کے باعث کسی اور کام کی فرصت ہی نہ تھی، جب کچھ وقت ملتا، حضرت شیخ الہندؒ کی خدمت میں جا بیٹھتے، آپ کی ذہانت علمی ذوق و شوق اور صلاح و تقویٰ کے باعث آپ کے اساتذہ کی مشفقانہ توجہ ہمیشہ آپ پر مرکوز رہی۔

ایک مرتبہ حضرت نانوتویؒ کے مخصوص شاگرد و مرید اور مدرسہ عبدالرب دہلی کے بانی حضرت مولانا عبدالعلی صاحب دارالعلوم تشریف لائے معزز مہمان اور دوسرے اساتذہ کرام کے ساتھ دارالعلوم کے اس وقت کے مہتمم حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحبؒ کھڑے تھے۔ قریب سے حضرت والد صاحب بغل میں کتابیں دبائے گذرنے لگے تو مہتمم صاحب نے بُلایا اور معزز مہمان سے فرمایا:

"یہ دارالعلوم کا ایسا طالب علم ہے کہ اسے اپنی کتابوں کے علاوہ کسی چیز کا ہوش نہیں، نہ اپنے کپڑوں کی خبر ہے نہ جان کی، کتاب کا کوئی سوال پوچھو تو محققانہ جواب دے گا۔"

مولانا عبدالعلی صاحبؒ نے دیکھتے ہی فرمایا کہ یہ تو مولوی محمد یٰسین صاحب کا لڑکا معلوم ہوتا ہے مولانا کا قیافہ مشہور تھا۔

ایک مرتبہ شرح جامی کا امتحان شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد صاحب عثمانیؒ کے پاس تھا۔ اس وقت تک آپ نے کوئی کتاب مولانا سے نہیں پڑھی تھی، تحریر سے نہ پہچان سکے، آپ کا نہایت ممتاز اور محققانہ پرچہ دیکھ کر حیرت و مسرت ضبط نہ کر سکے، پرچہ لے کر فوراً مہتمم صاحب کے پاس آئے اور پوچھا یہ کون طالب علم ہے اس نے تو اس کتاب کی شرح تصنیف کر دی ہے، یہ سنتے ہی مہتمم صاحب فرطِ مسرت سے امتحان گاہ تشریف لائے، حضرت والد صاحب اس وقت کسی اور امتحان کا پرچہ لکھ رہے تھے۔ آپ کو بلا کر تمام طلبہ کے سامنے کھڑا کیا اور آپ کے سر پر ہاتھ رکھ کر پرچہ کی غیر معمولی خوبی کا اعلان فرمایا۔

حکیم الامت حضرت تھانویؒ سے پہلی ملاقات

آپ کے والد بزرگوار حضرت مولانا محمد یٰسین صاحبؒ حضرت مولانا اشرف علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ہم سبق تھے لیکن حضرت گنگوہیؒ کی وفات کے بعد انہی کو اپنے شیخ کا قائم مقام سمجھتے اور ہر شعبان کے اواخر میں ان کی زیارت کے لیے تھانہ بھون تشریف لے جاتے تھے۔ ایک مرتبہ ۱۳۲۳ھ میں آپ کو بھی اپنے ساتھ لے گئے، یہ حضرت تھانویؒ سے آپ کی پہلی ملاقات تھی، جو نو سال کی عمر میں ہوئی۔

دوسری ملاقات اور یونانی فلسفہ پڑھنے کے لیے مشورہ

حضرت تھانویؒ کی خدمت میں آپ کی دوسری حاضری زمانہ طالب علمی میں ایک مشورہ کے لیے ہوئی جس کی تفصیل آپ نے "مجالسِ حکیم الامتؒ" میں خود ہی قلم بند فرمائی ہے، فرماتے ہیں کہ:

ؒ اس کتاب میں والد ماجدؒ نے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی مجلسوں کا حال اور چیدہ چیدہ ملفوظات نقل فرمائے ہیں جو آپ نے بروقت قلمبند فرمائے تھے، یہ کتاب بھی شائع ہو چکی ہے۔

"۱۳۳۲ھ میں جب احقر کی تعلیم میں یونانی فلسفہ کی کتاب میبذی کا نمبر آیا تو مجھے والد محترم سے سُنی ہوئی بات یاد آئی کہ حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کی رائے مدارس عربیہ میں یونانی فلسفہ کی تعلیم کے خلاف بھی اور غالباً کسی وقت اس کے درس کو دارالعلوم کے نصاب سے خارج کرنے کا مشورہ بھی دیا تھا، اس وقت مجھے بھی تردّد ہُوا کہ یہ فن پڑھوں یا نہیں"؟

والد محترم حالانکہ حضرت گنگوہیؒ سے والہانہ عقیدت رکھنے والے تھے مگر اس وقت ایک دانشمندانہ فیصلہ یہ فرمایا کہ حضرت گنگوہیؒ تو اس وقت دُنیا میں نہیں، ان کے بعد حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ کو آپ کا قائم مقام سمجھتا ہوں، اس لیے مناسب یہ ہے کہ تمہارے بارے میں ان کے مشورہ پر عمل کیا جائے، اسی مقصد سے مجھے ساتھ لے کر تھانہ بھون کا سفر کیا۔

میں اس طالب علمی کے دَور میں حضرت حکیم الامت سے مکمل اعتقاد کے باوجود وہاں کی حاضری سے اس لیے ڈرتا تھا کہ دُور دُور سے یہ سُنا کرتا تھا کہ حضرت کے یہاں بڑے قواعد وضوابط ہیں۔ خلاف ورزی پر ناراضی کا بھی خطرہ رہتا ہے، والد صاحبؒ کے حکم کی بنا پر ساتھ جانے کی ہمت کرلی"۔

آگے فرماتے ہیں:

"چونکہ والد صاحبؒ حضرتؒ کے ہم سبق تھے۔ بے تکلف ملاقات دیکھنے کے قابل تھی۔ والد صاحبؒ نے پہلی ہی ملاقات میں فرمایا کہ اس وقت میرے آنے کا سبب یہ لڑکا ہے، میں آگے بڑھا، حضرتؒ نے نہایت شفقت سے مجھے سینہ سے لگا کر سر پر ہاتھ رکھا۔ والد صاحبؒ نے یہ بھی کہہ دیا کہ یہ یہاں آتا ہُوا اس لیے ڈرتا تھا کہ یہاں بہت قواعد وضوابط ہیں ان کی پابندی کیسے ہوگی۔

حضرتؒ نے نہایت شفقت سے فرمایا کہ "بھائی مجھے تو خواہ مخواہ لوگوں نے بدنام کیا ہے میں از خود کوئی قاعدہ ضابطہ نہیں بنا۔ لوگوں کی غلط روش نے مجھے مجبور کر دیا کہ آنے والوں کو کسی وقت اور قاعدہ کا پابند کروں ورنہ یہ تو مجھے کسی

وقت ایک دفعہ اللہ کا نام بھی نہ لینے دیں۔ دُوسرے کام اور آرام کا تو ذکر کیا۔ پھر فرمایا کہ "تم تو میری اولاد کی جگہ ہو تمھیں کیا فکر ہے جب چاہو آیا کرو اور میرے یہاں جو قواعد و ضوابط ہیں ان سے مستثنیات اتنے ہیں کہ مستثنیٰ منہ سے بڑھ جاتے ہیں تم بے فکر رہو"

حضرت کی اس شفقت اور لطف و کرم نے پہلی ہی مرتبہ میرے دل میں ایسا گھر کرلیا کہ وہاں سے لوٹنے کا دل نہ چاہتا تھا، اس وقت تو نماز کا وقت تھا اور نماز ظہر کے بعد عام مجلس کا، اس میں اللہ تعالیٰ نے شرکت نصیب فرمائی، شام کو حضرت والا نے خصوصی ملاقات کا موقع عنایت فرمایا تو والد صاحبؒ نے میرے آنے کی غرض کا ذکر فرمایا

حضرت نے فرمایا ہاں مجھے معلوم ہے کہ اس معاملہ میں حضرت نانوتویؒ اور حضرت گنگوہیؒ کی رائے میں اختلاف تھا، حضرت نانوتویؒ یونانی فلسفہ پڑھنے پڑھانے کے اس لیے حامی تھے کہ اسلامی عقائد سے دفاع انہی اصول و قواعد کی رُو سے کیا جاسکے، جو یہ فلسفہ پیش کرتا ہے اور حضرت گنگوہیؒ کی نظر اس پر تھی کہ اس فلسفہ کے بہت سے نظریات اسلامی عقائد کے خلاف ہیں ان کو دینی مدارس میں درس کے طور پر پڑھنا دلوں میں شکوک و شبہات پیدا کرنے کا سبب ہو سکتا ہے۔

فلسفہ پڑھنے کی تلقین

پھر فرمایا کہ "دونوں بزرگ ہمارے مقتدا اور پیشوا ہیں، ان میں سے جس کی رائے پر بھی کوئی عمل کرلے خیر ہی خیر ہے لیکن تمھارے متعلق میرا مشورہ یہ ہے کہ تم ضرور اس فن کو پڑھو اور محنت سے پڑھو تاکہ اس کا بطلان تم پر خود واضح ہو جائے، مجھے امید ہے کہ انشاء اللہ تمھیں وہ ضرر نہ ہوگا جس کا خطرہ حضرت گنگوہیؒ کے پیش نظر تھا"

پھر فرمایا کہ "ایک مصلحت یہ بھی ہے کہ اس وقت تمام مدارس اسلامیہ میں اس فن کی تعلیم کا سلسلہ جاری ہے اگر تم نے یہ فن نہ پڑھا فلسفہ جاننے والے علماء کے سامنے ایک مرعوبیت کا اثر تم پر رہے گا اور سمجھ کر پڑھ لیا تو یہ مرعوبیت بھی نہ رہے گی۔ اور انشاء اللہ اس کے غلط نظریات کا بطلان تمھیں پوری طرح معلوم ہو جائے گا۔

عمر کی یہ پہلی تعلیم تھی جو حضرتؒ سے حاصل کی اور واپس آکر میبذی کا سبق شروع کیا۔ پھر صدرا، شمس بازغہ وغیرہ فلسفہ کی تمام درسی کتابیں پڑھیں۔"
(مجالس حکیم الامت ص ۱۳ تا ۱۵)

جدید فلسفہ

دارالعلوم دیوبند کے نصاب میں قدیم فلسفہ رائج تھا، جدید فلسفہ شامل نصاب نہ تھا۔ آپ کے استاذ محترم حضرت مولانا سید محمد انور شاہ صاحب کشمیری رحمۃ اللہ علیہ نے درس حدیث کے دوران کئی بار طلبہ سے فرمایا کہ پہلے زمانہ میں ہمارے اسلاف نے قدیم فلسفہ پڑھ کر اس کا رد کیا تھا، اُس وقت وہی رائج تھا لیکن آجکل قدیم کی جگہ جدید فلسفہ نے لے لی ہے۔ اب دُنیا میں یہی فلسفہ رائج ہے اس لیے جدید فلسفہ ضرور پڑھنا چاہیے تاکہ نئے فتنوں کا مقابلہ کیا جاسکے۔ چنانچہ حضرت والد ماجد اور دوسرے ممتاز طلبہ کی درخواست پر حضرت شاہ صاحبؒ نے جدید فلسفہ کی مشہور کتاب "الفلسفۃ العربیۃ" بھی خاص طور پر ان حضرات کو پڑھائی۔

حضرت والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ "مجھے فلسفہ کے کسی مسئلہ میں کبھی کوئی اشکال پیش نہیں آیا اور حضرت تھانویؒ کی پیشگوئی کے مطابق اس کے غلط نظریات کا بطلان روز روشن کی طرح واضح ہوتا چلا گیا۔

شعر وادب

شعر[لہ] و سخن کا آبائی ذوق وراثت میں ملا تھا، فارسی ادب کی پنج سالہ تعلیم وتربیت نے جو اپنے والد بزرگوار سے حاصل فرمائی تھی۔ اس فطری ذوق کو پروان چڑھایا، پھر خوش قسمتی سے عربی ادب کے تمام سبق

لہ اس سلسلہ کی بیشتر تفصیلات حضرت والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ کے عربی رسالہ نفحات (ص ۷۰) سے اور آپ کی مشہور تصنیف کشکول (ص ۲۲۷ تا ۲۲۸) سے ماخوذ ہیں، کچھ تفصیلات ایسی بھی درج کی جارہی ہیں جو ان کتابوں میں نہیں وہ احقر نے حضرتؒ سے براہ راست بارہا سنی ہیں۔

آپ کو شیخ الادب حضرت مولانا اعزاز علی صاحبؒ سے پڑھنے کا موقع ملا جو باذوق اور ذی استعداد طلبہ کے نہایت قدر شناس تھے اور ان سے پدرانہ شفقت فرماتے تھے، ان کی خصوصی توجہ اور تعلیم و تربیت نے سونے پر سہاگے کا کام کیا، عربی نظم و نثر کی مشق نہایت اہتمام سے کرائی، اُس زمانہ میں طلبہ اُردو زبان کے مشاعرے جمعہ کی فرصت میں منعقد کیا کرتے تھے، استاذِ محترم حضرت شیخ الادبؒ نے ملامت کی اگر شعر کہنا ہو تو عربی میں کہو جو تمہارے مقصدِ تعلیم میں معین ہو، چنانچہ استاذ محترم نے ایک ادبی مجلس "نادیۃ الادب" کے نام سے قائم فرمائی جس کے تحت ہفتہ وار مشاعرہ عربی زبان میں ہونے لگا، مشاعرے کی صدارت استاذ الاساتذہ حضرت مولانا سید محمد انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے، اکثر اوقات مصرع طرح دیا جاتا جس پر طلبہ کے علاوہ خود حضرات اساتذہ بھی اپنا اپنا کلام مشاعرے میں سناتے، داد و تنقید کا سلسلہ بھی ساتھ ساتھ جاری رہتا، ان مشاعروں میں آپ نے خوب بڑھ چڑھ کر حصہ لیا متعدد جاندار قصیدے، اثر انگیز مرثیے اور مختلف اشعار عربی میں کہے اور اساتذہ کرام سے خوب خوب داد لی۔

آپ نے شعر گوئی کی ابتداء عربی سے کی پھر فارسی زبان میں بھی کہنے لگے جس پر آپ کو پہلے سے مادری زبان کی طرح عبور حاصل تھا اور اس کے بعد اُردو میں اشعار کا سلسلہ شروع ہو گیا، ان تینوں زبانوں میں آپ بلند پایہ اشعار بے تکلف کہتے تھے، شعر و شاعری کو آپ نے کبھی بھی مشغلہ کے طور پر نہیں اپنایا آپ کی دلچسپیوں کا محور علمی و دینی مشاغل تھے جن سے آخر حیات تک فرصت نہ ملی مگر خداداد طبعی ذوق نے تینوں زبانوں میں جو کلام موزوں کرایا ہے وہ بھی قابلِ دید، برجستہ نہایت اثر انگیز اور مفید اصلاحی مضامین پر مشتمل ہے۔ اُردو و فارسی کلام تو آپ کی دلچسپ تالیف "کشکول" کے آخر میں عرصہ دراز سے بار بار شائع ہوتا رہا ہے۔ ۱۳۹۳ھ میں عربی کلام کا مجموعہ بھی کراچی سے بنام "نفحات" شائع ہو چکا ہے۔

بزرگوں سے عقیدت و محبت

حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے بزرگوں اور اولیاء اللہ کی گہری عقیدت و محبت اپنے والد ماجد سے وراثت میں پائی تھی جو بزرگوں کے شیدائی اور اُن کا زندہ تذکرہ تھے۔ مفتی صاحبؒ نے ایسے ماحول میں آنکھ کھولی کہ گھر میں بزرگوں ہی کے تذکرے تھے جب کوئی پریشانی کی بات ہوتی تو گنگوہ کو دُعا

کے لیے خط لکھا جاتا، حضرت گنگوہیؒ کے دُعائیہ کلمات جواب میں آتے تو گھر میں سنائے جاتے۔ مگر ابھی آپ کی عمر نو ہی سال تھی کہ ۱۳۲۳ھ میں حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ کی وفات ہوگئی اور آپ کو ان کی خدمت میں حاضری کا موقع نہ مل سکا۔

حضرت شیخ الہندؒ سے استفادہ اور اصلاحی تعلق

حضرت گنگوہیؒ کے بعد لوگوں کی عقیدت و محبت کا مرکز تین بزرگ تھے (۱) شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن صاحب نوراللہ مرقدہٗ (۲) شیخ العلماء حضرت مولانا شاہ عبدالرحیم صاحب رائپوری قدس سرہٗ (۳) حکیم الامت حضرت مولانا شاہ اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ۔ حضرت مفتی صاحبؒ کو تینوں بزرگوں سے یکساں عقیدت تھی۔ شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب نوراللہ مرقدہٗ کا وطن دیوبند تھا جنھیں قصبہ کے لوگ "بڑے مولوی صاحب" کہا کرتے تھے۔ شیخ الہند کا لقب اس وقت مشہور نہ ہُوا تھا۔ دارالعلوم دیوبند کے صدر مدرس تھے اور سب مدرسین اور منتظمین ان کے شاگرد یا معتقد۔

حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ بچپن ہی سے اپنے والد ماجد کے ساتھ اُن کی خدمت میں بڑے شوق و ذوق سے حاضر ہُوا کرتے تھے اور جب آپ دارالعلوم کے درجہ فارسی و ریاضی میں زیر تعلیم تھے اسی وقت سے آپ کا معمول تھا کہ ہر سال جب حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ بخاری شریف کے درس کا افتتاح فرماتے اور سب علماء و طلبہ اس میں تبرکاً شریک ہوتے، آپ بھی ضرور حاضر ہوتے، اسی طرح تعلیمی سال کے آخر میں جب بخاری شریف کا درس ختم ہوتا اس میں بھی شریک ہوتے اس طرح آپ کو ان سے کئی بار "اطراف بخاری" پڑھنے کا موقع ملا۔

حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے مکان پر ایک مجلس بعد عصر ہُوا کرتی تھی، آپ اس میں بھی اپنے والد ماجد کے ساتھ شریک ہوتے، جوں جوں حاضری بڑھتی گئی شوق روز افزوں ہوتا گیا۔ اور اس مجلس کا ایسا چسکا لگا کہ اب والد صاحب کے بغیر بھی بکثرت حاضری ہونے لگی، بعد عصر کی قید بھی

لہ مجالس حکیم الامت ص ۱۰   ٢ہ مکاتیب حکیم الامت ص ۲ (زیر طبع)

نہ رہی، جب اسباق سے ذرا فرصت ملتی حضرت کی خدمت میں حاضر ہو جاتے۔ آپ اپنی تصنیف "مجالس حکیم الامت" میں اس کے تاثرات بیان فرماتے ہیں کہ :

"اکابر علماء و صلحاء کا عجیب و غریب مجمع ہوتا تھا، ان (شیخ الہندؒ) کی باتیں تو کچھ پلے نہیں پڑتی تھیں مگر اس مجلس میں بیٹھنے کا ایک شوق بلا کسی سبب کے دل میں پیدا ہو گیا، اور اب والد صاحب کی سعیت اور بعد عصر کی قید بھی ختم ہو گئی جب منہ اٹھا وقت بے وقت حاضر ہو گیا۔ اکابر کی شفقت جو بچوں پر ہوا کرتی ہے مجھے بھی نصیب ہونے لگی۔ رمضان المبارک میں حضرت کا یہ معمول تھا کہ (اپنے مکان پر) تمام رات نوافل یا تراویح میں قرآن شریف سنتے تھے، دو سال حق تعالیٰ نے اسمیں بھی حاضری کی توفیق عطا فرمائی"[1]

آپ کی عربی تعلیم کا دور ۱۳۳۲ھ میں شروع ہوا، اس وقت دار العلوم دیوبند کے ناظم تعلیمات بھی حضرت شیخ ہی تھے، اس لیے تعلیمی معاملات میں بھی حضرت سے مراجعت کی نوبت آنے لگی۔

آپ کی درخواستِ بیعت اور شیخ الہندؒ کی خاص شفقت

حضرت شیخ الہندؒ کو بھی آپ پر بے حد شفقت تھی، اگر کسی روز حضرت نہ ہوتے تو دریافت فرماتے تھے۔ ایک مرتبہ آپ کو بخار ہوا، دو روز تک حاضر نہ ہو سکے، تیسرے روز جب پہنچے تو دیکھا کہ حضرت کہیں جانے کے لیے کھڑے ہیں، معلوم ہوا کہ آپ ہی کے گھر جانے کا قصد فرمایا تھا اس عرصہ میں آپ نے کئی مرتبہ عرض کیا کہ "حضرت مجھے بیعت فرمالیجئے" ہمیشہ یہی فرمایا کہ "طالبعلمی سے فارغ ہو جاؤ جب کریں گے"[2] حضرت کا اصول تھا کہ کسی طالبعلم کو بیعت نہ فرماتے تھے تاکہ طالبعلمی کے لیے جس یکسوئی کی ضرورت ہے اس میں خلل نہ آئے :

---

[1] مجالس حکیم الامت ص ۱۱

[2] حکایت حکیم الامت (مخطوطہ زیر طبع) ص ۳۰۲

مُلک کے سیاسی حالات کے باعث شیخ الہندؒ کی مصروفیات

سنہ ۱۳۳۲ھ میں جب آپ کی تعلیم متوسط کتابوں تک پہنچی، ہدایہ وغیرہ کے اسباق تھے اُسوقت پُورے ہندوستان میں ترکی خلافت پر اہلِ یورپ کی یورش کے قصے ہر وقت زبانوں پر تھے، حضرت شیخ الہندؒ کی مجلس کا رنگ بھی بدلا ہُوا تھا، اب ان کی توجہ دارالعلوم کی تعلیمی خدمات سے زیادہ ہندوستان کو انگریزی تسلط سے آزاد کرا کے اسلامی حکومت قائم کرنے کے جہاد پر لگ گئی، اور یہ راز بعد میں کھلا کہ اس سلسلہ میں ریشمی رومال کی مشہور تحریک کے قائد حضرت شیخ الہندؒ ہی تھے۔ خفیہ طور پر اسلامی ممالک کے سربراہوں خصوصاً ترکی حکومت سے رابطہ قائم تھا اور ہندوستان کے مختلف پوشیدہ مقامات پر اسلامی فوج انگریزی حکومت کے خلاف علمِ جہاد بلند کرنے کے لیئے تربیت حاصل کر رہی تھی، یہ سب کچھ حضرت شیخ الہندؒ کی قیادت و رہنمائی میں انتہائی رازداری کے ساتھ ہو رہا تھا۔

شیخ الہندؒ سے پڑھنے کی تمنا

حضرت والد صاحبؒ رحمۃ اللہ علیہ نے کوشش کر کے سنہ ۱۳۳۳ھ میں مشکوٰۃ و جلالین وغیرہ کے وہ اسباق پُورے کر لیے جن کے بعد دورۂ حدیث کا نمبر آتا ہے۔ تمنا یہ تھی کہ اگلے سال حضرت شیخ الہندؒ سے صحیح بخاری پڑھنے کا موقع مِل جائے مگر اسی سال رمضان سے یہ خبر سُنی جانے لگی، کہ حضرتؒ کا ارادہ سفرِ حج کا ہے۔ کوئی کہتا تھا کہ ہجرت کر کے جا رہے ہیں، کسی کا خیال تھا کہ ترکی حکومت کی امداد کے لیے سفر ہے۔ حضرت والد ماجد فرماتے ہیں کہ ہم بڑی حسرت کے ساتھ یہ مناظر دیکھتے رہتے بالآخر حضرتؒ حج کے لیے روانہ ہو گئے اور پہلی عالمگیر جنگِ عظیم چھڑ گئی۔

شیخ الہندؒ کی گرفتاری

سنہ ۱۳۳۴ھ پورا حضرت شیخ الہندؒ کا حجاز میں صرف ہُوا۔ حضرت والد صاحبؒ نے اس سال

لہ مجالس حکیم الامت ص ۱۲

اپنا دورۂ حدیث اس اُمید پر ملتوی کیا کہ حضرت شیخ واپس آجائیں گے تو دورۂ حدیث ان کے سامنے ہوگا، اس سال فنون کی باقی کتابیں لے لیں مگر بحکم قضاء وقدر ۱۳۳۵ھ میں حضرت شیخ الہند انگریزوں کے اسیر ہو کر مالٹا جیل بھیج دیے گئے اور حضرت والد صاحبؒ کی تمنا دل ہی دل میں رہ گئی اور پھر جو کچھ ہوا اس کی المناک تفصیل کا یہ موقع نہیں۔

حضرت انور شاہ کشمیریؒ سے استفادہ اور دورۂ حدیث

بالآخر ۱۳۳۵ھ میں آپ نے دورۂ حدیث حجۃ الاسلام حضرت مولانا سید انور شاہ صاحب کشمیریؒ کے سامنے کیا، فلسفہ کی بعض کتابیں بھی آپ نے حضرت شاہ صاحب سے پڑھیں، حضرت شاہ صاحبؒ کے علمی کمالات، باطنی تقدس، وقتِ نظر، وسعتِ مطالعہ اور خصوصیت سے قوتِ حافظہ علمی حلقوں میں ضرب المثل ہیں۔ علم حدیث میں تو ان کے تبحر اور حفظ و ایقان نے مشہور ائمہ حدیث ابن تیمیہؒ، ابن قیمؒ، اور حافظ ابن حجرؒ کی یادیں تازہ کر دی تھیں، اس تبحر علمی کے ساتھ طبیعت میں انتہا درجہ کی سادگی تھی، حضرت والد صاحبؒ آپ کی حیرتناک قوتِ حافظہ، علمی کارناموں اور دلکش سادگی کے دلچسپ اور سبق آموز واقعات اکثر سنایا کرتے تھے۔ حضرت والد صاحبؒ کی تصانیف میں علمی تحقیق اور وسعتِ مطالعہ کا جو رنگ نمایاں طور پر نظر آتا ہے اس میں بڑا دخل حضرت شاہ صاحبؒ کی تعلیم و تربیت کا ہے۔

طالب علمی کے بعد تدریس و تصنیف کے کاموں میں بھی حضرت شاہ صاحبؒ سے استفادہ کا سلسلہ نہ صرف جاری رہا بلکہ روز افزوں ہوتا گیا۔ مناظروں میں بھی ساتھ رہے، کئی مناظروں میں حضرت شاہ صاحبؒ خود تشریف نہ لے جاسکے تو آپ کو بھیجا۔

ردِ قادیانیت کا جو کام حضرت شاہ صاحبؒ نے نہایت اہتمام سے شروع فرمایا تھا، اس میں آپ نے خوب بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ اس موضوع پر کئی کتابیں ختم نبوت، ہدیۃ المہدیین (بزبان عربی) دعاوی مرزا، مسیح موعود کی پہچان، اور التصریح بما تواتر فی نزول المسیح، حضرت شاہ صاحب ہی کی رہنمائی میں تالیف فرمائیں، قادیانیوں کے خلاف مشہور مقدمہ بہاولپور جو بہاولپور کی عدالت میں دائر تھا اور جس میں مسلمانوں کو فتح مبین حاصل ہوئی اس میں حضرت شاہ صاحبؒ کی طرف سے جو

تحریری بیان عدالت میں پیش ہُوا، وہ بھی حضرت والد صاحب نے اسی رات جاگ کر مرتب کیا تھا غرض آپ نے حضرت شاہ صاحبؒ سے خوب خوب استفادہ کیا اور قدم قدم پر استاذ موصوف کی دُعاؤں سے مالا مال ہوتے رہے۔

دورۂ حدیث میں آپ کے اساتذہ

آپ کو دورۂ حدیث کی کتابیں اور پُورا فنِ حدیث جن عظیم القدر اساتذہ سے پڑھنے کا شرف حاصل ہُوا وہ سب ہی قدیم محدثین و فقہاء اور اکابر اولیاء اللہ کی زندہ یادگار تھے، ان سب کے علمی و عملی کمالات اور باطنی تقدس کا بیان مجھ جیسا بے بضاعت کرنا بھی چاہے تو کیسے کرے۔ یہاں ہر کتاب کے ساتھ ان مقدس بزرگوں کے صرف اسمائے گرامی ذکر کیے جاتے ہیں جن سے آپ نے یہ کتابیں درساً پڑھی ہیں۔

(۱) صحیح بخاری، جامع ترمذی اور شمائل ترمذی، حافظ عصر شیخ المشائخ حضرت مولانا سید محمد انور شاہ صاحب کشمیری رحمۃ اللہ علیہ سے۔

(۲) صحیح مسلم شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ سے۔

(۳) سُنن ابُو داوٗد، عارف باللہ محدث و فقیہ، حضرت مولانا سید اصغر حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے۔

(۴) سُنن ابن ماجہ، استاذ الاساتذہ حضرت مولانا غلام رسول ہزاروی صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے

(۵) مؤطا امام مالک، مؤطا امام محمد، اور شرح معانی الآثار طحاوی و حصن حصین، مفتی اعظم ہند حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے۔

والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ کو صحاح ستہ اور مؤطئین کی روایت و تدریس کی اجازت حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ سے بھی حاصل ہے جو حضرت نے ۱۳۴۸ھ میں تحریر فرمائی[1]۔ آپ نے علمِ حدیث میں استفادہ اگرچہ سب سے زیادہ حضرت شاہ صاحب

---

[1] سندِ اجازت کا پورا متن "مکاتیب حکیم الامت" (مخطوطہ زیر طبع ص ۲۷۱) میں محفوظ ہے۔

کشمیری رحمۃ اللہ علیہ سے کیا، اُن کے درس کی تقریر بھی بزبانِ عربی قلبند فرمائی اور حدیث کی کئی کتابیں ان کے زیرِ ہدایت تالیف فرمائیں مگر آپ نے حصنِ حصین جو مفتی اعظم ہند حضرت مولانا عزیز الرحمٰن صاحبؒ سے پڑھی اس کی سند سب سے عالی ہے کیونکہ اس میں حضرت مفتی عزیز الرحمٰن صاحب اور حضرت شاہ عبد العزیز صاحب دہلویؒ کے درمیان صرف ایک واسطہ حضرت مولانا شاہ فضل الرحمٰن صاحب گنج مراد آبادیؒ کا ہے برخلاف دوسری کتب حدیث کے کہ ان میں ایک سے زیادہ واسطے ہیںؑ۔

تحصیلِ علُوم سے فراغت اور مشغلۂ تدریس

۱۳۳۵ھ میں آپ نے دورۂ حدیث کیا۔ کچھ فنون کی کتابیں باقی تھیں جن کی تکمیل ۱۳۳۶ھ میں فرمائی، درس نظامی کی تکمیل تعلیم سے نہایت ممتاز حیثیت میں فارغ ہوئے اس وقت عمر بائیس ۲۲ سال تھی؛ اساتذہ کرام اور حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب مہتمم دارالعلوم کی نگاہِ انتخاب عرصہ سے آپ پر تھی اسی سال آپ کو کچھ اسباق پڑھانے کے لیے سپرد فرما دیے گئے اور غالباً اسی سال دیوبند کے ایک انصاری خاندان میں جناب کرم کریم صاحب کی نیک بخت صاحبزادی سے آپ کی شادی ہوئی۔

بلامعاوضہ خدمتِ دین کا ارادہ

زمانۂ طالب علمی سے آپ کا ارادہ تھا کہ خدمتِ دین بغیر کسی معاوضہ کے محض لوجہ اللہ کریں اور معاش کے لیے کوئی دُوسرا ذریعہ اختیار فرمائیں اس ارادہ کے پیشِ نظر زمانۂ طالب علمی میں کئی دوسرے فنون بھی آپ نے حاصل کر لیے تھے۔

خطاطی اور جلد سازی : چنانچہ خطاطی اور کاپی نویسی میں خوب مہارت تھی۔ بعض

---

[۱] تفصیلات کے لیے حضرت والد صاحبؒ کا عربی رسالہ "الازدیاد السنی علی الیانع الجنی" دیکھا جائے جس کا نیا ایڈیشن کراچی سے ۱۳۸۳ھ میں طبع ہُوا ہے اس میں آپ نے اپنے تمام اساتذہ کرام کی اسانید شرح وبسط سے بیان فرمائی ہیں۔

کتابیں آپ ہی کی کتابت سے طبع بھی ہوئیں، خطِ نسخ اور نستعلیق میں ماہرین فن آپ کے زورِ قلم کی تحسین کرتے تھے۔ اسی مخلصانہ جذبہ کے تحت جلد سازی میں بھی مہارت حاصل کی، اس زمانہ میں اپنی کتابوں کی جلد بندی عام طور پر خود ہی فرماتے تھے، راقم الحروف نے اپنے بچپن میں حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے پاس ایک مطبوعہ کتاب ایسی دیکھی تھی جس کے مصنف بھی آپ تھے، کتابت بھی خود کی تھی اور غالباً جلد سازی بھی خود فرمائی تھی، افسوس کہ اس کتاب کا نام یاد نہیں رہا۔

طبِ یُونانی

علمی خدمات کے معاوضہ سے مستغنی رہنے کے لیے دار العلوم میں آپ نے طبِ یونانی کے نصاب کی بھی تکمیل فرمائی۔ اس فن میں آپ کے رفیقِ درس جناب حکیم محفوظ الحق صاحب مشہور حاذق طبیب ہوئے جن کو ضلع سہارنپور اور اطراف میں نہایت کامیاب طبیب سمجھا جاتا تھا[1] ان دونوں حضرات نے نفیسی استاذ العلماء حضرت مولانا محمد انور شاہ کشمیری قدس اللہ سرہٗ سے اور شرح اسباب مولانا حکیم محمد حسن صاحب برادر شیخ الہندؒ سے پڑھی لیکن حضرت والد ماجدؒ فرمایا کرتے تھے کہ میرا یہ شوق باوجود کوشش کے پورا نہ ہو سکا کہ علمِ دین کی خدمت بغیر کسی معاوضہ کے انجام دُوں، اس لیے کہ جب تدریس و افتاء اور تصنیف و تبلیغ کا کام شروع کیا تو معلوم ہُوا کہ ان علمی مشاغل کے ساتھ کوئی دوسرا مستقل کام نہیں کیا جا سکتا، علمی مصروفیات اتنی ہمہ گیر تھیں کہ کسی اور کام کے لیے وقت نکالنا ممکن نہ رہا، یہی بات امام مالکؒ نے اپنے وسیع تجربہ کی بناء پر فرمائی تھی کہ "اَلْعِلْمُ لَا یُعْطِیْكَ بَعْضَہٗ حَتّٰی تُعْطِیَہٗ کُلَّكَ" یعنی علم تمہیں اپنا ذرا سا حصہ بھی اس وقت تک نہیں دے گا جب تک تم اپنا سب کچھ اس کو نہ دو۔

قناعت اور علمی مشاغل

آخر مجبور ہو کر ان تمام فنون کو جو ذریعۂ معاش کے لیے حاصل کیے تھے ترک کرنا پڑا اور یکسوئی

---

[1] وفات اواخر ۱۳۶۳ھ

کے ساتھ تدریس وافتار تصنیف وتالیف اور تبلیغی خدمات میں ہمہ تن مشغول ہوگئے۔ دارالعلوم میں مالی وسائل کی قلت تھی۔ اساتذہ کرام کی تنخواہیں نہایت قلیل ہوتی تھیں، قارئین کو حیرت ہوگی کہ ابتداً دارالعلوم میں آپ کو صرف "پانچ روپے ماہوار" وظیفہ ملتا تھا، اسی پر قناعت فرمائی پھر رفتہ رفتہ مشاہرہ میں تھوڑا تھوڑا اضافہ ہوا۔ جب آپ ۴۶ سال کی جلیل القدر خدمات کے بعد دارالعلوم دیوبند سے مستعفی ہوئے تو اس وقت بھی مشاہرہ صرف ۹۵ روپے تھا۔ اس عرصہ میں دوسرے مدارس سے بڑی بڑی تنخواہوں پر بلانے کی مسلسل کوشش ہوتی رہی، مدرسہ عالیہ کلکتہ سے سات سو روپے مشاہرہ کی پیشکش بار بار کی گئی جہاں کام بھی دیوبند سے بہت کم تھا مگر پیش نظر تنخواہ کبھی نہ تھی۔ دیوبند کے قلیل پر قناعت کی، مادرِ علمی کو چھوڑنا پسند نہ فرمایا۔

سلوک وتصوف اور اصلاح باطن کی فکر

تمام بزرگان سلف کی طرح یہ حقیقت آپ کے سامنے بھی تھی کہ کسی بزرگ کی خدمت وصحبت میں رہ کر تزکیۂ باطن اور ذکر اللہ کے بغیر کتابی علوم بے رُوح رہتے ہیں، یہی وہ احساس تھا جس نے آپ کو شیخ الہندؒ کا شیدائی بنا دیا تھا۔ حضرت شیخ الہند کی خصوصی تربیت اور شفقتوں نے سلوک وطریقت کی جس راہ پر گامزن کر دیا تھا اس کے اگلے مراحل طے کرنے کے لیے آپ درسیات سے فراغت کا انتظار فرما رہے تھے کیونکہ حضرتؒ نے وعدہ فرمایا تھا کہ بیعت طالب علمی سے فراغت کے بعد کریں گے۔

مگر ۱۳۳۶ھ میں درس نظامی کی تعلیم سے فراغت ہوئی تو حضرت شیخ الہندؒ مالٹا جیل میں تھے، اُن کی مفارقت آپ پر پہلے ہی بہت شاق تھی، اور اب تو یہ انتہائی صبر آزما بن گئی، حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوریؒ بھی اس وقت ہندوستان میں تشریف نہ رکھتے تھے۔

دو بزرگوں پر نظر جاتی تھی، ایک حضرت مولانا شاہ عبدالرحیم صاحب رائپوری رحمۃ اللہ علیہ دوسرے حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ۔ آپ کے والد ماجدؒ کی رائے میں ترجیح اس کو ہوئی کہ حضرت تھانویؒ کی طرف رجوع کیا جائے کیونکہ سابقہ حاضری اور تعلیم سے ایک مناسبت قائم ہو چکی ہے۔

تھانہ بھون میں تیسری حاضری

غالباً ۱۳۳۷ھ [1] تھا جس میں آپ اپنے والد ماجد کے ساتھ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ کی خدمت میں تھانہ بھون حاضر ہوئے۔ اس تیسری حاضری کا مقصد سلوک و طریقت کی تعلیم حاصل فرمانا تھا۔ آپ کو معلوم تھا کہ حضرت تھانوی قدس سرہٗ صاف اور سچی بات کو بہت پسند فرماتے ہیں۔ آپ نے صاف صاف عرض کر دیا کہ مجھے حق تعالیٰ نے کچھ عرصہ حضرت شیخ الہندؒ کی خدمت میں حاضری کی توفیق بخشی ہے، دل کی خواہش یہ تھی کہ اُن سے بیعت ہوں مگر حضرت اس وقت اسیر ہیں اور معلوم نہیں کب رہائی ہو، اب میں حضرت ہی سے مشورہ کا طالب ہوں مجھے کیا کرنا چاہئے۔

حضرت حکیم الامتؒ کی پہلی تعلیم

حضرت نے بڑی مسرت کا اظہار فرمایا اور فرمایا کہ "اس میں کیا اشکال ہے۔ تصوف و سلوک اعمالِ باطنہ کی اصلاح کا نام ہے جو ایسی ہی فرض ہے جیسے اعمالِ ظاہرہ کی اصلاح، اس کو مؤخر کرنا تو میرے نزدیک درست نہیں لیکن اس کے لیے بیعت ہونا کوئی شرط نہیں، بیعت کے لیے حضرت مولانا (شیخ الہندؒ) کا انتظار کریں اور حضرت کے واپس تشریف لانے تک میں خدمت کے لیے حاضر ہوں، میرے مشورے کے مطابق اصلاح کا کام شروع کر دیں، پھر فرمایا! آپ کے ذمہ دو کام ہوں گے، ایک اپنے حالات کی اطلاع، دوسرے اس پر جو میں مشورہ دوں اس کا اتباع، پھر حضرت نے کچھ تسبیحات اور معمولات کی تلقین فرمائی اور ضروری نصیحتوں کے بعد رخصت فرما دیا۔

دیوبند واپس آکر کچھ روز اس سلسلہ میں حضرت حکیم الامتؒ سے خط و کتابت رہی مگر بہت کمی کے ساتھ، کیونکہ حضرت والد صاحبؒ دارالعلوم دیوبند میں تدریسی خدمات شروع فرما چکے تھے، جس میں اوقات زیادہ مشغول ہو گئے، اِدھر آپ کو ملک کے سیاسی حالات نے بھی بہت کم مہلت دی۔

---

[1] مجالس حکیم الامت ص ۱۶۔ مگر مکاتیب حکیم الامت (قلمی ص ۲) میں ۱۳۳۶ھ تحریر ہے۔

اُس وقت کے سیاسی حالات

یہ وہ زمانہ تھا جس میں ۱۹۱۴ء کی پہلی جنگِ عظیم نے پورے عالم کو اپنی لپیٹ میں لیا ہوا تھا اہلِ یورپ کی متحدہ یورش اور سازشوں سے ترکی خلافت پارہ پارہ ہو چکی تھی۔ حضرت شیخ الہندؒ اسی سلسلہ میں جہاد کی کوششوں کی بنا پر مالٹا جیل میں نظر بندی کی زندگی گزار رہے تھے اور چونکہ خلافت کو پارہ پارہ کرنے میں انگریزوں کا بڑا ہاتھ تھا، اس لیے ہندوستان کے مسلمانوں میں انگریزی حکومت کے خلاف جذبات بھڑک اُٹھے۔ خلافت کمیٹی قائم ہوئی اور چند ہی روز میں پورے متحدہ ہندوستان میں پھیل گئی، ہندوستان کو انگریزی تسلط سے آزاد کرانے کی کوششیں تیز ہو گئیں۔ حضرت شیخ الہندؒ کو جیل سے رہا کرانے کی تحریک نے زور پکڑ لیا۔ ہندوستان کے تمام مسلمان اور خصوصاً علماء و صلحاء مدارس دینیہ سبھی اس تحریک سے متاثر ہوئے، تعلیم و تعلم کا سلسلہ جاری رکھنا بھی آسان نہ رہا، پورے ملک میں ہنگامے تھے۔

حضرت شیخ الہندؒ سے بیعتِ سلوک اور تحریکِ خلافت میں عملی حصّہ

بالآخر ۲۰ رمضان ۱۳۳۸ھ (مارچ ۱۹۲۰ء) میں حضرت شیخ الہند قدس سرہٗ مالٹا سے رہا ہو کر پانچ سال کے بعد دیوبند تشریف لائے تو تحریکِ خلافت اور آزادئ ہند کی قوت کہیں سے کہیں پہنچ گئی، حضرت کی زیارت و ملاقات کے لیے اطرافِ ملک سے انسانوں کا سیلاب اُمڈ آیا، حضرت شیخ الہندؒ اپنے ضعف و علالت کے باوجود انہی ہنگاموں میں مشغول و معروف رہے۔ حضرت والد صاحبؒ بیعت ہونے کے لیے موقع کی تلاش میں تھے، اسی حال میں ایک روز آپ نے اور آپ کے رفیقِ درس حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب مہتمم دار العلوم دیوبند اور چند حضرات نے موقع پا کر حضرت شیخ الہندؒ کے ہاتھ پر بیعتِ طریقت کی، چند تسبیحات کی تلقین حضرت نے فرمائی اس سے زائد اس طریق میں استفادہ کا موقع نہ تھا۔ آزادئ ہند کی تحریک زوروں پر تھی۔ حضرت شیخ الہندؒ کے ایما پر والد ماجدؒ بھی ان تحریکات میں مشغول[1] رہے۔

---

[1] مجالس حکیم الامت ص ۹۱

حضرت شیخ الہندؒ کی وفات

مالٹا سے رہائی کے بعد حضرت شیخ الہندؒ ایک سال چھ ماہ حیات رہے اور ۱۸ ربیع الاوّل ۱۳۳۹ھ کو دہلی میں وفات ہوگئی۔

حضرت والد صاحبؒ نے اگرچہ سالہا سال حضرت شیخ الہندؒ سے اس اہتمام سے استفادہ کیا تھا کہ اسباق سے فارغ اوقات بیشتر حضرت ہی کی خدمت وصحبت میں گزرتے تھے۔ بچپن سے یہ سلسلہ شروع ہوکر حضرتؒ کی وفات تک جاری رہا، صرف اسیری کا زمانہ اس سے مستثنیٰ تھا، اسلامی حکومت کے قیام کے لیے حضرتؒ کی سیاسی تحریکات میں بھی عملی حصہ لیتے رہے مگر حضرت شیخ الہندؒ کی پرفیض تربیت کا یہ اثر بھی تھا کہ جوں جوں استفادہ بڑھا تشنگی بڑھتی چلی گئی، حضرتؒ کے حادثۂ وفات پر آپ یُوں محسوس فرماتے تھے کہ مَیں نے حضرت سے کچھ بھی حاصل نہ کیا، اس وقت کے کچھ تأثرات آپ نے "مکاتیب حکیم الامتؒ" کے مقدمہ میں ظاہر کئے ہیں۔ فرماتے ہیں :

> "حضرت (شیخ الہندؒ) کی وفات کا جو غم ساری دُنیا کو تھا مجھ جیسے غلام کو زیادہ ہونا ناگزیر تھا، لیکن اس کے ساتھ ہی دُوسرا غم یہ تھا کہ مَیں استفادہ سے محروم رہا، وفات کے بعد ایک مدت تک تو طبیعت پر ایسی افسردگی رہی کہ کسی کام میں جی نہ لگتا تھا نہ کسی کام کی ہمت"۔

غرض! حضرت شیخ الہندؒ کی رہنمائی میں سلوک وتصوف کا جو سفر نئے ولولوں کے ساتھ شروع ہُوا تھا، راستہ ہی میں رُک گیا۔ کئی سال اسی عالم میں گزر گئے، اس عرصہ میں آپ کی دلچسپیاں تدریس و تصنیف تک محدود رہیں جن میں شب و روز کا انہماک تھا، ادھر حضرت شیخ الہندؒ کی وفات سے تقریباً دو سال قبل ہی آپ کی شادی ہوئی تھی، اب عیال بڑھ رہا تھا، تدریس و تصنیف سے جو وقت بچ جاتا وہ گھریلو ذمہ داریوں میں صرف ہونے لگا۔ اس عرصہ میں حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہٗ کی خدمت میں بھی نہ کوئی حاضری ہوسکی نہ خط و کتابت کا سلسلہ جو حضرت شیخ الہندؒ کی رہائی کے وقت سے منقطع تھا دوبارہ شروع ہوسکا۔

ل مجالس حکیم الامت۔ ص ۱۹

چوتھی حاضریِ تھانہ بھون اور زندگی کا نیا دور

بالآخر ۱۳۴۳ھ یا ۱۳۴۴ھ میں[1] پھر وہی تشنگی آپ کو تھانہ بھون لے گئی جو ۱۳۳۶ھ میں لے گئی تھی، اس وقت حضرت مولانا شاہ عبدالرحیم صاحب رائپوری کا بھی انتقال ہو چکا تھا، حکیم الامت حضرت تھانویؒ کی عظیم شخصیت ہی اس وقت امیدوں کا مرکز تھی۔ آٹھ سال سے حاضری اور خط و کتابت کا سلسلہ بند رہنے کے باعث حضرت والد صاحبؒ کو ایک قسم کی شرمندگی اس حاضری کے وقت دامنگیر تھی، مگر حکیم الامت حضرت تھانویؒ نے اُسی شفقت و محبت کا معاملہ فرمایا جس کا مشاہدہ پہلے ہو چکا تھا، اس عرصہ کی طویل بے تعلقی کا کوئی اثر آپ کی طبیعت پر نہ پایا۔

اس مرتبہ والد صاحبؒ نے کھُل کر اپنا حال عرض کیا کہ حضرت میری تمنّا تو بہت ہے کہ تصوف و سلوک کے مراحل طے کروں، مگر سُنتا ہُوں کہ بڑے مجاہدوں اور ریاضتوں اور محنت و فرصت کا کام ہے، میں پیدائشی طور پر ضعیف بھی ہُوں، زیادہ محنت برداشت کرنے کے قابل نہیں اور فرصت بھی کم ہے، وقت تمام درس و تدریس اور مطالعہ کے کاموں میں گذرتا ہے، کیا ان حالات میں بھی مجھے کوئی حصہ نصیب ہو سکتا ہے؟

حکیم الامتؒ کی حکیمانہ تعلیم

حضرت حکیم الامتؒ نے بڑی شفقت سے فرمایا کہ "یہ آپ نے کیا کہا، کیا اللہ کا راستہ صرف اقویا (قوی لوگوں) کے لیے ہے، ضعفاء (ضعیفوں) کے لیے نہیں؟ فارغ البال لوگوں

---

[1] مجالس حکیم الامت (۲۱) میں ۱۳۴۵ھ لکھا ہے اور "مکاتیب حکیم الامتؒ" کے مقدمہ میں تردد کے ساتھ "۱۳۴۲ھ یا ۱۳۴۳ھ" تحریر فرمایا ہے اور جو خط و کتابت "مکاتیب حکیم الامتؒ" میں محفوظ ہے وہ رمضان ۱۳۴۲ھ سے شروع ہو کر رجب ۱۳۶۲ھ تک مسلسل جاری رہی ہے، اس مجموعہ سے قرین قیاس یہی معلوم ہوتا ہے کہ تھانہ بھون میں یہ حاضری ۱۳۴۳ھ یا ۱۳۴۴ھ میں ہوئی ہے (رفیع)

کے لیے ہے کہ فرصت لوگوں کے لیے نہیں ؟ حقیقت یہ ہے کہ راستہ سب کے لیے کھلا ہوا ہے ہاں ہر ایک کے لیے عمل کا طریقہ مختلف ہے، ہم آپ کو ایسا طریق بتائیں گے جس میں نہ وقت کی ضرورت نہ فرصت کی، پھر فرمایا فرائض و واجبات اور سُنن وغیرہ جو سب مسلمان ادا کرتے ہیں وہ تو اپنی جگہ ہیں، آپ تین چیزوں کی اور پابندی کریں۔ انشاء اللہ سارا سلوک اسی سے طے ہو جائے گا۔

(۱) تقویٰ اختیار کریں۔ اس کا مفہوم آپ کو بتلانے کی ضرورت نہیں، البتہ تقویٰ صرف نماز، روزہ اور ظاہری معاملات کا نہیں باطنی میں بھی اتنا ہی ضروری ہے جتنا ظاہری میں۔

(۲) دوسرے لایعنی (بے فائدہ) کام، کلام، مجلس، ملاقات سے پرہیز کریں۔
لایعنی سے میری مراد وہ کام ہے جس میں نہ دین کا کوئی فائدہ ہو نہ دنیا کا۔

(۳) تیسرے بقدر ہمت و فرصت کچھ تلاوتِ قرآن روزانہ کیا کریں۔

آخر میں فرمایا کہ نسخہ تو آپ کے لیے اتنا ہی ہے اگر دل چاہے اور فرصت ہو تو صبح و شام "سبحان اللہ ۔ الحمد للہ ۔ لا الٰہ الا اللہ"، سو سو مرتبہ اور استغفار و درود شریف سو سو مرتبہ پڑھ لیا کریں اور نمازوں کے بعد "تسبیح فاطمہ" کا التزام کریں۔

حضرت والد صاحبؒ فرماتے ہیں کہ میں نے ایک دو روز تھانہ بھون میں قیام کیا، حضرت بڑی شفقت و محبت سے ہر وقت معاملہ فرماتے تھے، اس طرزِ تعلیم اور معاملۂ شفقت نے میرے قلب کے گوشہ گوشہ کو حضرت کی محبت سے بھر دیا۔ اس کے بعد مسلسل خط و کتابت اور آمد و رفت کا سلسلہ شروع ہو گیا جو تقریباً اٹھارہ انیس برس جاری رہ کر ۱۳۶۲ھ میں حضرت حکیم الامت قدس سرہٗ کی وفات پر منتہی ہوا۔

حکیم الامتؒ سے گہرا اور طویل تعلق اور اس کے ہمہ گیر اثرات

حکیم الامت حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں چوتھی حاضری جس کی کچھ تفصیل اُوپر بیان ہوئی، درحقیقت یہ حضرت والد صاحبؒ کی زندگی کے ایک نئے دور کا آغاز تھا، اس مرتبہ حضرت حکیم الامتؒ سے اصلاح و تربیت کا جو تعلق قائم ہوا تھا یہ اتنا گہرا، والہانہ، مستحکم اور ہمہ گیر تھا کہ جاننے والے جانتے ہیں کہ اس کے بعد سے حضرت والد صاحبؒ کی پوری زندگی حقیقت

اسی تعلق کی تفسیر اور اسی ربطِ پیہم کی داستان ہے، اس داستان کو اگر حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے حالاتِ زندگی سے الگ کر دیا جائے تو یہ ایک دیندار اور ذہین و جفاکش مدرس و مفتی کے حالاتِ زندگی تو ہوں گے مگر اس جلیل القدر ہستی کے حالات نہ ہوں گے جسے تھانہ بھون کی خانقاہ نے شیخ کامل، پیشوائے دین، صاحبِ مقامات ولی اللہ، توازن و اعتدال کا پیکر اور عظیم محقق و فقیہ بنا کر مفتیٔ اعظم کے مقام تک پہنچایا تھا۔ مجددِ ملت، حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی ہی کی صحبت و تربیت وہ کیمیا تھی جس نے اس جوہرِ خالص کو نکھار عطا کیا، اور سونے کو کندن بنا دیا۔

لیکن یہ داستان اتنی طویل، مسلسل اور پہلو دار ہے کہ زیرِ تحریر مضمون میں اس کے صرف اشارے ہی آسکیں گے کیونکہ اس داستان کو نہ ایک عنوان کے تحت سمیٹا جا سکتا ہے نہ پوری ایک تصنیف اس کے لیے کافی ہے، اس کے لیے تو مختلف موضوعات کی نہ جانے کتنی تصنیفوں کی ضرورت ہوگی۔ اس لیے کہ حضرت والد صاحبؒ کی زندگی کے کئی پہلو ایسے ہیں جن پر الگ الگ تصنیف کی ضرورت ہے اور چوتھی حاضریٔ تھانہ بھون کے بعد حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی کا کوئی ورق ایسا نہ تھا جس پر خانقاہ تھانہ بھون کی چھاپ موجود نہ ہو۔ کوئی دلچسپی ایسی نہ تھی جو مرشد تھانویؒ کے مذاق و مزاج میں ڈھلی ہوئی نہ ہو، کوئی مصروفیت ایسی نہ تھی جو خانقاہ تھانہ بھون سے ہم آہنگ نہ ہو۔ تصنیف و تالیف کے سلسلہ میں علمی تحقیقات ہوں یا فقہ و فتویٰ کی گتھیاں، باطن کی ریاضتیں ہوں یا ظاہر کی عبادتیں، آخرِ شب کی خلوتیں ہوں یا وعظ و درس کی جلوتیں، خانگی الجھنیں ہوں یا ملکی و سیاسی پیچیدگیاں، معاشی حالات ہوں یا اولاد اور ان کی شادی بیاہ کے معاملات، عزیزوں دوستوں کی مہربانیاں ہوں یا حاسدوں کی ریشہ دوانیاں، غم کا موقع ہو یا خوشی کا، ہر حال میں مرشد تھانویؒ سے گہرا رابطہ قائم تھا۔

مستقل قیام دیوبند میں تھا، مگر جب بھی دار العلوم کے مشاغل سے ذرا موقع ملتا، یا حضرت حکیم الامتؒ یاد فرماتے، تھانہ بھون حاضر ہو جاتے کبھی جمعہ کی چھٹی وہاں گزار کر سنیچر کی صبح تک دیوبند واپسی ہو جاتی، کبھی کئی کئی مہینے قیام رہتا، دار العلوم کی سالانہ تعطیلات میں رمضان کا اکثر و بیشتر پورا مہینہ مع اہل و عیال تھانہ بھون کی روح پرور فضا میں گزرتا جب اہل و عیال ساتھ ہوتے

تو سب کا قیام حضرت کے برابر والے مکان میں ہوتا تھا۔

ہم سب بھائیوں کے نام حضرت تھانویؒ نے ہی تجویز فرمائے تھے، احقر کے بڑے بہن بھائیوں کو وہاں کے بہت واقعات یاد ہیں، لیکن ناچیز کی عمر حضرت حکیم الامت کی وفات کے وقت صرف سات برس تھی، وفات کا حادثہ تو بخوبی یاد ہے، حضرت کو حیات میں دیکھا بھی ضرور ہوگا، مگر افسوس کہ نہ دیکھنا یاد رہا نہ شکل مبارک حافظہ میں ہے۔ یہ سوچ کر دل کو تسلی دے لیتا ہوں کہ ؎

ہے یہی کیا کم کہ تھا میں بھی حریم ناز میں
التفات حسن سے بے خود سہی، غافل سہی

اُس زمانہ کے کچھ دھندلے سے نقوش یاد رہ گئے ہیں مثلاً ایک مرتبہ حضرت کے برابر والے مکان میں مجھے کوئی جھول میں جھلا رہا تھا اور ایک مصرعہ جو غالباً مجھے والد صاحبؒ ہی نے یاد کرایا ہوگا میں وہ اکثر پڑھا کرتا تھا اس وقت بھی جھولتے ہوئے خوب مزے لے لے کر پڑھ رہا تھا، مصرعہ یہ تھا۔ ؎

اللہ اللہ کا مزا مُرشد کے مے خانے میں ہے

اس زمانے کے تمام حالات احقر کو حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے اور خاندان و خانقاہ تھانہ بھون کے دوسرے بزرگوں سے معلوم ہوئے ہیں۔

خدمتِ خلق اور بے نفسی کا ایک سبق آموز واقعہ

سردیوں کی ایک رات میں والد صاحبؒ بذریعہ ریل تھانہ بھون سٹیشن پر اُترے، برانچ لائن پر یہ ایک چھوٹا سا قصبہ ہے جس کا اسٹیشن بھی بہت چھوٹا اور آبادی سے کافی دور ہے۔ راستہ میں کھیت اور غیر آباد زمینیں ہیں وہاں اس زمانے میں بجلی تو تھی ہی نہیں، رات کے وقت قلی یا سواری ملنے کا بھی امکان نہ تھا کیونکہ اس وقت اکا دکا ہی کوئی مسافر آجاتا تھا، گاڑی دو تین منٹ رُک کر روانہ ہوگئی، اب اسٹیشن پر ہُو کا عالم تھا، ہر طرف جنگل، اندھیری رات اور سنّاٹا۔ اسٹیشن سے قیام گاہ تک آمد و رفت عموماً پیادہ پا ہوتی تھی، والد صاحبؒ تنہا تھے، سامان بھی ساتھ نہ تھا اس لیے کوئی فکر نہ تھی، اچانک آواز آئی "قلی، قلی"! یہ آواز بار بار آرہی تھی اور اب اس میں گھبراہٹ بھی شامل ہوگئی تھی، کوئی صاحب مع اہل و عیال اسی گاڑی سے اُترے تھے، قلی نہیں مل رہا تھا جو آبادی تک سامان

پہنچا دے، یہ والد صاحبؒ کے ایک واقف کار تھے اور عقیدت مند از جلتے تھے۔ والد صاحبؒ سے اپنا بوجھ اُٹھوانے پر ہرگز راضی نہ ہوتے یا عمر بھر ندامت کے بوجھ میں دبے رہتے۔

حضرت والد صاحبؒ فرماتے ہیں کہ میں نے جلدی سے سر پر رومال لپیٹ کر اوپر سے چادر ڈالی اور مزدورانہ ہیئت میں تیزی سے پہنچ کر کہا: سامان رکھواؤ کہاں جانا ہے؟ انھوں نے پتہ مختصراً بتاتے ہوئے میرے سر پر سامان لادنا شروع کر دیا، پہلا بکس ہی اتنا بھاری تھا کہ میں نے کبھی نہ اُٹھایا تھا، اس پر دوسرا بکس رکھا، تیسرا عدد میرے ہاتھ اور بغل میں تھانا چاہتے تھے، میں نے دونوں ہاتھوں سے بمشکل ان بکسوں کو سنبھالتے ہوئے کہا کہ حضور میں کمزور آدمی ہوں زیادہ نہیں اٹھا سکتا۔ یہ (تیسرا عدد) آپ سنبھال لیں۔

یہ مختصر قافلہ روانہ ہوا، بوجھ سے پاؤں ڈگمگا رہے تھے مگر میری اس کمزوری کو میری ٹارچ نے چھپا لیا تھا جو انھیں راستہ دکھا رہی تھی اور میری طرف متوجہ ہونے کا موقع نہ دیتی تھی، ان کی قیام گاہ پر سامان اُتارا، وہ یہ کہہ کر زرا اندر گئے کہ ابھی آکر پیسے دیتے ہیں، میں موقع پا کر وہاں سے غائب ہو گیا۔ اگلے دن وہ صاحب خانقاہ میں حسب سابق بڑی تعظیم سے ملے، مگر انھیں کیا معلوم وہ ایک "قلی" سے مل رہے ہیں۔

افشاء راز

یہ واقعہ والد صاحبؒ نے ہمیشہ راز میں رکھا، حتیٰ کہ جن صاحب کا سامان اُٹھایا تھا انھیں بھی عمر بھر معلوم نہ ہو سکا کہ وہ فرشتہ صفت "قلی" کون تھا؟ تقریباً بیس سال بعد ہم سب بھائیوں کے سامنے یہ راز اس طرح کھلا کہ کراچی میں جب احقر کی عمر تقریباً پندرہ سال تھی، اللہ تعالیٰ معاف فرمائے اس زمانہ میں ہماری والدہ صاحبہ مدظلہا کو ہم بھائیوں سے بار بار یہ شکایت پیش آئی کہ وہ گھر کا سودا سلف لانے کے لیے فرمائیں، ہم لڑکپن کی لاپروائی میں ایک دوسرے پر ٹال دیتے، والدہ ماجدہ کو اس سے جو تکلیف ہوتی ہوگی، اب اس کے تصور سے بھی ڈر لگتا ہے، انھوں نے کئی بار حضرت والد صاحبؒ کو بھی توجہ دلائی اور شکایت کی کہ یہ لوگ بازار سے سامان لانے میں عار سمجھتے ہیں، اس لیے ٹالتے ہیں، والد صاحبؒ چشم پوشی فرماتے رہے، مگر آپ کی عادت تھی کہ کسی غلطی پر بار بار نہیں

ٹوکتے تھے، فہمائش کے لیے زیادہ سے زیادہ موثر موقع کا انتظار فرماتے اور ایسے وقت تنبیہ فرماتے جب سب کو فراغت اور طبیعتوں میں نشاط ہو، ایک دن ہم سب حضرت والد صاحبؒ کی خدمت میں بیٹھے اِدھر اُدھر کی باتیں کر رہے تھے، ہماری کسی کسی بات میں وہ بھی دلچسپی لیتے رہے پھر اچانک سنجیدہ ہو گئے اور محترمہ والدہ صاحبہ کی مسلسل پریشانی کا ذکر فرما کر ہماری اس بے پروائی پر شرم دلائی پھر آہ سرد بھر کر فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ میرا ایک راز تھا جو میرے اور اس کے سوا کسی کو معلوم نہ تھا، تمہاری اصلاح کے لیے آج وہ راز کھولنے کی ضرورت پیش آگئی، پھر یہ واقعہ سُنایا، ہم سب پر اس کا بہت گہرا اثر ہوا اور بحمد اللہ اس گناہ سے توبہ کی توفیق ہوئی۔

ایسا ہی ایک اور واقعہ

اسی موقع پر ایک اور واقعہ بھی سُنایا کہ میں دیوبند میں ایک دن نماز فجر کے لیے جا رہا تھا، سامنے ایک بہت ہی ضعیف بڑی بی کو دیکھا جو پانی کا گھڑا کنوئیں سے بھر کر لا رہی تھیں مگر اُٹھا نا دو بھر ہو رہا تھا، بمشکل چند قدم چل کر زمین پر بیٹھ جاتی تھیں، مجھ سے دیکھا نہ گیا، پاس جا کر کہا "لاؤ اماں یہ گھڑا تمہارے گھر پہنچا دوں"۔ یہ کہہ کر میں نے گھڑا اُٹھا لیا، وہ جولاہوں کے محلہ میں رہتی اور اسی برادری سے تعلق رکھتی تھیں، جب میں گھڑا بڑی بی کے گھر میں رکھ کر باہر نکلا تو وہ نہایت لجاجت اور الحاح کے ساتھ دعائیں دینے لگیں جو مجھے کافی آگے تک سُنائی دیتی رہیں، اگلے دن پھر اسی وقت اور اسی حال میں ملیں، میں نے پھر گھڑا اُٹھا کر ان کے گھر پہنچا دیا، واپسی پر دور تک پھر ان کی دعائیں سُنتا رہا، میں نے یہ سوچ کر کہ یہ سودا تو بڑا سستا ہے کہ چند منٹ کی محنت پر اتنی دعائیں ملتی ہیں میں نے روز کا یہی معمول بنا لیا، بڑی بی بھی اس کی عادی ہو گئیں، اب میں کنوئیں پر ہی پہنچنے کی کوشش کرتا تھا تا کہ انھیں ڈول بھی کھینچنا نہ پڑے، بحمد اللہ یہ معمول عرصہ دراز تک جاری رہا، یہاں تک کہ بڑی بی نے ہی آنا چھوڑ دیا، شاید ان کا انتقال ہو گیا تھا" پھر فرمایا کہ یہ واقعہ بھی آج پہلی بار تم ہی کو بتا رہا ہوں تا کہ کچھ سبق حاصل کرو۔

حضرت والد صاحبؒ کی بے نفسی اور للّٰہیت، تواضع و مسکنت اور ایثار و فنائیت ہی وہ اصل دولت تھی جسے حضرت شیخ الہندؒ کی صحبتوں نے نکھارا تھا اور اب حکیم الامتؒ کی رہبری میں ان

کی عملی مشق ہو رہی تھی، حضرت تھانویؒ فرمایا کرتے تھے کہ:

"بزرگ بننا ہو، قطب بننا ہو، غوث بننا ہو تو کہیں اور جاؤ اور انسان بننا ہو ہو تو یہاں آؤ"۔ [1]

اس خانقاہ میں پہلا سبق ہی یہ دیا جاتا تھا کہ:

"پہلے آدمی بنو، کیا بزرگی اور ولایت ڈھونڈتے پھرتے ہو، آدمیت سیکھو، بزرگی بیچاری تو ایک دن میں ساتھ ہو لیتی ہے، مشکل چیز تو شرافت اور شعورِ انسانیت ہے"۔ [2]

کیفیات، مکاشفات، ذوقیات، کرامات اور تصرفات کو تو چھوڑیے ایک درجہ میں حضرت تھانویؒ ان کو تو اہمیت دینے کے مخالف ہی رہے مگر معمولات یومیہ مثلاً تہجد، نوافل، ذکر و اذکار، اور اوراد و وظائف جو مستحبات کے قبیل سے ہیں اُن کے چھوٹ جانے پر بھی کسی سالک پر کبھی چیں بہ جبیں نہ ہوتے تھے، کسی عذرِ شرعی سے معمولات چھوٹ جانے پر کبھی مواخذہ نہ فرماتے تھے لیکن اگر کوئی بے اصولی بات کرتا یا بے فکری کا ثبوت دیتا جو حقوقِ شریعت نے واجب کئے ہیں ان کا تارک ہوتا، معاملات میں بدانتظامی برتتا، یا سلیقہ اور ڈھنگ سے کام نہ لیتا یا ناحق کسی کی ناگواری کا باعث ہوتا تو حضرت فوراً

---

[1] مآثر حکیم الامتؒ ص ۱۲۶ (طبع سوم) یہ کتاب حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے خلیفہ، مجاز اور حضرت کے شیخ و مربی، سیدی و سندی حضرت مولانا ڈاکٹر عبدالحی صاحب عارفی مدظلہم کی ایک انوکھی تالیف ہے، جس کی نمایاں ترین خصوصیت یہ ہے کہ یہ دوسری سوانح کی طرح حضرت حکیم الامت تھانویؒ کے تاریخی حالات پر نہیں بلکہ آپ کے مزاج و مذاق، مسلک و مشرب، شانِ تربیت اور اندازِ زندگی کی نہایت جامع اور دلکش تصویر ہے شاید ہی کسی نے باریک باریک جزئیات کی تصویر کشی ایسے دلنشیں انداز میں کسی کی سوانح میں کی ہو جیسی اس میں کی گئی ہے، اندازِ بیان ایسی محویت پیدا کرتا ہے کہ کتاب شروع کر کے ختم کیے بغیر چین نہیں آتا اور ختم کتاب کے بعد اطمینان اور تڑپ کی جو متضاد کیفیات دل میں پیدا ہوتی ہیں وہی حاصل کتاب اور مقصود زندگی ہے اطمینان اس بات کا کہ راہِ مستقیم مل گئی اور تڑپ اس راہِ مستقیم پر چلنے کی جو زندگی کو لازوال زندگی عطا کرتی ہے۔

[2] حوالۂ بالا

تیور بدل لیتے، سخت اور تیز لہجہ بنا لیتے اور فوراً اصلاح فرماتے۔ تمام اہلِ مجلس کو عموماً اور سالکین کو خصوصاً اس کی طرف توجہ دلاتے کہ:

"یہ تمام چیزیں، دُوسروں کی اذیت کا سبب بنتی ہیں اور اذیت نہ پہنچانا واجب ہے اور تم سب اس کے مکلف ہو۔"[1]

حقوق العباد اور آدابِ معاشرت کی اہمیت جو لوگوں نے فراموش کر دی تھی اس کی تلقین و تاکید میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ فرماتے تھے۔ آپ کی تعلیم و تربیت کا یہ انداز ہر مجلس اور ہر تحریر و تقریر میں رچا بسا تھا۔

بھائی جان کے نام حکیم الامتؒ کا گرامی نامہ

اس کی ایک ہلکی سی جھلک اس نامۂ مبارک میں بھی دیکھی جا سکتی ہے جو احقر کے بھائی جان (جناب مولانا محمد زکی صاحب مرحوم) کے ایک خط کے جواب میں آپ نے تحریر فرمایا ہے۔ ہم سب بھائیوں میں وہی سب سے بڑے تھے، اور حضرت حکیم الامتؒ کی خدمت میں رہنے کا سب سے زیادہ موقع انہی کو میسر ہُوا، بچپن ہی سے والدِ ماجد کے ساتھ تھانہ بھون جا کر طویل طویل قیام فرماتے تھے۔ حضرت تھانویؒ سے انھوں نے "پندنامہ" پڑھنے کی سعادت حاصل کی تھی اور بیعت بھی ہوئے تھے۔ بچپن میں جب لکھنا بھی پوری طرح نہ سیکھا تھا حضرت کو دیوبند سے ایک خط لکھا جو شاید ان کی زندگی کا پہلا ہی خط ہوگا۔ حضرت حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ نے جو جواب تحریر فرمایا یہاں بعینہٖ نقل کیا جاتا ہے:

"برخوردار سلمہٗ   السلام علیکم مع الدعاء

تمھارے حروف دیکھ کر دل خوش ہُوا، تمھارے لیے علمی و عملی ترقی کی دُعا کرتا ہوں، خط ذرا اور صاف کر لو اس سے مکتوب الیہ کو بھی سہولت و راحت ہوتی ہے۔ اس نیت سے ثواب بھی ملتا ہے۔ دیکھو میں تم کو بچپن ہی سے صوفی بنا رہا ہوں درد سر کا یہ تعویذ سر میں باندھ لو سب گھر والوں کو سلام و دُعا۔[2] ـــ اشرف علی"

---

[1] حوالۂ بالا ص ۱۲۷   [2] مکاتیب حکیم الامتؒ (قلمی غیر مطبوعہ) ص ۲۴۱

حضرت حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ کے یہاں تصوف وسلوک کا حاصل ہی یہ تھا کہ :

" فرائض وواجبات ادا ہوجائیں، احکامِ الٰہیہ کی تعمیل ہوجائے، حقوق العباد کی اہمیت واضح ہوجائے۔ بس۔ اگر درویشی کا حاصل یہ ہے تو سب کچھ ہے ورنہ کچھ نہیں۔[1]

حضرتؒ فرماتے تھے کہ :

" ہم لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے اپنے تعلق اور بندگی کا یہ راز بتایا تھا کہ دیکھو اپنی روزمرہ کی زندگی میں یہ کرنا اور یہ نہ کرنا، یہ بات ہم کو پسند ہے اور یہ ناپسند، یہ چیز حلال ہے اور یہ حرام، یہ چیز پاک ہے اور یہ ناپاک۔ دیکھو اگر تم یہ چاہتے ہو کہ ہم سے صحیح تعلق پیدا کرو، ہماری معرفت حاصل کرو اور ہماری محبت سے سرشار ہو تو پھر ہمارے محبوب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کامل کرو، پھر تو ہم خود ہی تم سے محبت کرنے لگیں گے، بتاؤ اس سے زیادہ بڑی نعمت ودولت تم اور کیا چاہتے ہو۔"[2]

فرماتے تھے کہ :

" دینِ متین ہی کے ظاہر وباطن کا نام شریعت وطریقت ہے جس طرح ظاہری اعمال کے لیے احکام الٰہیہ فرائض وواجبات ہیں، اسی طرح باطنی اعمال کے لیے بھی ہیں اور ہم دونوں کے ادا کرنے کے مکلف ہیں۔"[3]

مجالسِ حکیم الامتؒ

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے یہاں جو مجلس روزانہ ہوا کرتی تھی، ظاہر وباطن کی اصلاح میں اس کی تاثیر معروف ومشہور ہے۔ جب حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا قیام تھانہ بھون میں ہوتا تو مجلس خاص اور مجلس عام دونوں میں نہایت اہتمام سے شریک ہوتے، حاضرین مجلس میں متعدد حضرات حکیم الامتؒ کے ملفوظات بر وقت قلمبند کرلیا کرتے تھے جو حضرتؒ کے ملاحظہ کے بعد شائع بھی

---

[1] مآثر حکیم الامتؒ ص ۱۲۹ [2] مآثر حکیم الامتؒ ص ۱۲۸

[3] حوالۂ بالا، ص ۱۲۸ تا ص ۱۲۹ (طبع سوم)

ہوتے رہتے تھے۔

میرے استاذ محترم حضرت مولانا اکبر علی صاحب[1] رحمۃ اللہ علیہ جن کو ان مجالس میں حاضری کے بہت مواقع ملے تھے انھوں نے حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے انتقال کے بعد ایک روز بتایا کہ حکیم الامتؒ مجلس میں حضرت مفتی صاحبؒ کو اپنے قریب بٹھایا کرتے تھے اور جب حضرت کچھ بیان فرما رہے ہوتے تو مفتی صاحب کی محویت کا عالم قابلِ دید ہوتا تھا، وہ دُنیا و مافیہا سے بے خبر ہمہ تن صرف حضرتؒ کی طرف متوجہ رہتے، اور حضرت کے ہر لفظ اور آواز کے ہر اُتار چڑھاؤ پر مفتی صاحب کے چہرے اور جسم پر تأثرات ظاہر ہوتے، بے تاب ہو کر بار بار پہلو بدلتے اور کبھی کبھی اس عالمِ محویت میں سرشار ہو جاتے، ایسا معلوم ہوتا کہ حضرتؒ کے ایک ایک لفظ، اُس کے لہجہ اور اس کی کیفیت اور معنویت کو لوحِ قلب پر کندہ ہی نہیں کر رہے بلکہ اپنے رگ و پے میں سمو دینے کے لیے بیتاب ہیں۔

یہی محویت تھی جس کے باعث حضرت والد صاحبؒ نے ان ملفوظات کو قلمبند کرنے کا خصوصی اہتمام نہیں فرمایا، جہاں ایک ایک لفظ کو لوحِ قلب پر کندہ اور رگ رگ میں اس طرح جذب کیا جا رہا ہو وہاں کاغذ اور قلم کا گذر ہو تو کیسے ہو؟ اور جو ملفوظات اس کے باوجود قلمبند کر لیے تعجب ہوتا ہے کہ کیسے کر لیے اور کتنے ضروری سمجھ کر کئے ہوں گے۔ چنانچہ حضرت والد صاحبؒ نے اپنی کتاب مجالس حکیم الامتؒ کے مقدمہ میں اتنا تو خود بھی لکھ دیا ہے کہ:

"اس ناکارہ کو اس کی ہمت بہت کم ہوتی تھی کہ مجلس میں بیٹھ کر لکھنے کی طرف توجہ دے، اس لیے اس کا اہتمام تو نہیں تھا مگر خاص خاص باتیں اپنی یادداشت کے لیے لکھ بھی لیتا تھا، اس طرح لکھا ہوا بھی ایک اچھا خاصہ ذخیرہ جمع ہو گیا تھا۔"

پھر جب یہی گرانبہا ذخیرہ سنہ ۱۹۶۷ء میں کراچی سے شائع ہوا تو یہ بھی تین سو پچپن صفحات پر مشتمل تھا۔ علوم و معارف، اشعار و لطائف، حقائق و مسائل، حکایات و روایات، فقر و تصوف اور آدابِ زندگی کا ایسا رنگ برنگ مہکتا ہوا گلشن ہے کہ ؎

زفرق تا بہ قدم ہر کجا کہ می نگرم کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا ایں جاست

---

[1] حضرت مولانا کی وفات شوال سنہ ۱۳۹۶ھ میں ہوئی، دارالعلوم کراچی کے قبرستان میں مزار ہے۔

مکاتیبِ حکیم الاُمّتؒ

پیچھے عرض ہو چکا ہے کہ چوتھی حاضری تھانہ بھون کے بعد سے حضرت حکیم الاُمّتؒ کی ذاتِ گرامی ہی والد ماجدؒ کے تمام مشاغل اور دلچسپیوں کا مرکز بن گئی تھی، جو زمانہ دیوبند میں گذرتا، اور وہاں جو جو حالات پیش آتے اُن سب میں بذریعہ خط و کتابت تھانہ بھون سے رابطہ قائم رہتا، اپنے ایک ایک حال کی اطلاع لکھ کر مرشد تھانویؒ سے ہدایات حاصل کی جاتیں، چار پانچ روز میں جواب آجاتا تھا۔ اصلاحی تعلق رکھنے والے حضرات کے لیے خانقاہِ تھانہ بھون کا اصل ہی "اطلاع اور اتباع" تھا۔ یعنی وہ اپنے احوال کی اطلاع حضرتؒ کو دیں اور حضرتؒ جو ہدایات ارشاد فرمائیں ان کے مطابق عمل کیا جائے۔ اس اصول کی کم و بیش سب ہی پابندی فرماتے تھے، حتیٰ کہ بعض اوقات صرف اتنا ہی لکھ بھیجتے کہ کوئی خاص بات قابلِ ذکر نہیں ہے مثلاً والد ماجدؒ نے ۱۰ محرم سنہ ۴۲ھ کو خط لکھا کہ :

"اکثر طبیعت چاہتی ہے کہ کوئی عریضہ ارسالِ خدمت کروں لیکن پھر سوچتا ہوں کہ کیا لکھوں ؟ کیونکہ کوئی حال ہو تو لکھا جائے لیکن بالآخر یہ خیال ہوتا ہے کہ اس "بے حالی" ہی کی اطلاع دُوں ":

جواب آیا کہ :

"یہی چاہیے، انشاء اللہ تعالیٰ نفع سے خالی نہیں"

اس طریقِ کار کا نتیجہ یہ تھا کہ حضرت حکیم الاُمّتؒ کے پاس روزانہ ڈاک کا اچھا خاصا انبار پہنچتا تھا جس میں پیچیدہ فقہی سوالات، باطنی اصلاح کے متعلق نازک مسائل، روزمرہ کے معاملاتِ زندگی میں مشورے اور ملکی و اجتماعی مہمات میں تبادلۂ خیالات، سب ہی کچھ ہوتا تھا، عجیب بات یہ ہے کہ حضرت حکیم الاُمّتؒ اپنے ہمہ گیر مشاغل کے باوجود ڈاک کا جواب روز کے روز بھیج دیا کرتے تھے خط روانہ کرنے کے بعد طالبین یقین سے بتا سکتے تھے کہ فلاں دن جواب آجائے گا اور ایسا ہی ہوتا تھا۔

طریقۂ خط و کتابت کا یہ تھا کہ کاغذ میں دو کالم مقرر کر کے طالبین ایک کالم میں خط لکھتے تھے، اور دُوسرا کالم جو اُسی کے مقابل ہوتا تھا حضرت حکیم الاُمّتؒ کے جواب کے لیے سادہ چھوڑ دیا جاتا تھا، حضرت جس جُملہ کا جواب دینا مناسب سمجھتے اسی کے سامنے سادہ کالم میں لکھ دیتے کبھی جواب میں

طویل مضمون لکھنا ہوتا تو آخر میں یا الگ کاغذ پر بھی تحریر فرما دیتے پھر اصل خط مع جواب کے صاحب خط کے پاس واپس بھیج دیا جاتا تھا۔ اس طرح طالبین کے پاس اپنا خط اور حضرتؒ کا جواب دونوں محفوظ ہو جاتے تھے۔

والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ کی خط و کتابت حضرت حکیم الامتؒ سے اگرچہ ۱۳۳۰ھ میں شروع ہو گئی تھی لیکن اس میں تسلسل اس وقت قائم رہ سکا نہ وہ محفوظ رکھی جا سکی سوائے ایک کارڈ کے جو ۱۳۳۸ھ کا ہے لیکن چوتھی حاضری تھانہ بھون کے بعد ۲۰ رمضان ۱۳۴۴ھ سے پوری خط و کتابت کو والد صاحبؒ نے نہایت اہتمام سے محفوظ رکھا جو ۱۳۶۲ھ میں حضرت حکیم الامتؒ کی وفات تک برابر جاری رہی۔ اس پوری خط و کتابت کو والد ماجدؒ نے فل اسکیپ سائز کے ایک ضخیم رجسٹر میں جو ۲۲۶ صفحات پر مشتمل ہے، ترتیب سے نقل کرا لیا تھا، یہ صرف اپنی یادداشت کے لیے تھا، اشاعت کا مقصد نہ تھا، چنانچہ ۱۳۵۸ھ میں یہ وصیت بھی تحریر فرما دی تھی کہ "اسے کوئی شائع نہ کرے" اور اس کی "اصل اور بڑی وجہ یہ تحریر فرمائی تھی کہ:

"ان (خطوط) کا تعلق احقر کے شخصی حالات سے ہے، میں کیا اور میرے حالات کیا جن سے کسی کو کوئی فائدہ پہنچے اور جواب کا سوال پر مرتب ہونا ظاہر ہے، اس کے علاوہ کچھ اور وجوہ بھی اشاعت سے مانع محسوس ہوتی تھیں" [1]

مگر یہ والد صاحبؒ کی محض تواضع تھی ورنہ واقعہ یہ ہے کہ یہ خط و کتابت نہ صرف والد صاحبؒ کے ہر شعبۂ زندگی کی جیتی جاگتی تصویر ہے بلکہ اصول دین، شریعت و طریقت، حقوق العباد، اور آداب زندگی کا گراں بہا نادر ہدایت نامہ اور حکیم الامتؒ کے برسہا برس کے تجربات کا نچوڑ ہے، ساتھ ہی سوز و عشق اور شعر و ادب کی چاشنی نے اس کے کیف کو دوبالا کر دیا ہے۔ مجھ جیسا کور ذوق بھی ان خطوط کو پڑھ کر یہ سوچنے لگتا ہے کہ ؎

ساقی ترا مستی سے کیا حال ہُوا ہوگا
جب تو نے یہ مئے ظالم شیشے میں بھری ہوگی

---

[1] مقدمہ مکاتیب حکیم الامتؒ ص ۵ (قلمی غیر مطبوعہ)

مسلمانوں کے لیے اس کی عظیم افادیت کے پیشِ نظر متعدد مخلصین نے حضرت والد صاحب کو بمشکل اس کی اشاعت پر آمادہ کیا تو ۱۳۹۳ھ میں آپ نے اس پر انتخاب و تلخیص کے لیے نظرِ ثانی فرمائی اور کل ۵۰۷ خطوط میں سے تقریباً نصف پر نشان لگا دیا کہ یہ شائع نہ کئے جائیں باقی ۲۴۸ خطوط کو اشاعت کے لئے منتخب فرما کر شروع میں ایک مقدمہ تحریر فرمایا اور کتاب کا نام "مکاتیب حکیم الامتؒ" تجویز فرما دیا۔ افسوس کہ اپنی حیات میں شائع نہ فرما سکے۔ انشاء اللہ العزیز اب عنقریب اس کی اشاعت کا بندوبست کیا جائے گا۔

یہاں بطورِ نمونہ چند خطوط کسی خاص ترتیب کے بغیر ہدیۂ ناظرین ہیں:

رسالہ سیرت خاتم الانبیاءؐ کے متعلق

مکتوب ——— ۲۰ رمضان ۱۳۴۴ھ

مکتوب: "رسالہ ہذا (یعنی اوجز السیر لخیر البشر[1]) جو حال میں احقر نے سیرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق مختصر انداز میں لکھا ہے ارسالِ خدمت ہے، امید ہے کہ ملاحظہ فرما کر قابلِ اصلاح امور سے احقر کو مطلع فرمائیں گے تاکہ آئندہ طباعت میں تصحیح کر دی جائے نیز اگر حضرت مناسب خیال فرمائیں تو چند سطریں بطورِ تقریظ تحریر فرما دیں۔"

جواب: از احقر اردر الخلائق اشرف علی عفی عنہ السلام علیکم

جواب میں دیر اس لئے ہوئی کہ شروع کر کے چھوڑنے کو جی نہ چاہا اور فرصت ہوتی نہیں، اس لیے جب سب دیکھ لیا اس وقت جواب لکھا، آپ کے جواب کے لیے کچھ کا متعلق انتظار نہ تھا، رسالہ دیکھ کر جیسی خوشی ہوئی ہے اس کی حد تو کیا بیان کروں، بجائے حد بیان کرنے کے یہ دعا دیتا ہوں کہ خدا تعالے ایسی ہی خوشی اس کی جزاء سے آپ کو دے، میں نے جو کچھ اس

---

[1] یہ رسالہ کا عربی نام ہے، اب سالہا سال سے اس کا نام "سیرت خاتم الانبیاء" مشہور ہو گیا ہے اور اسی نام سے طبع ہوتا ہے (رفیع)

کے متعلق لکھا ہے[1]۔ اس میں ایک حرف تکلف سے نہیں لکھا گیا، اس سے زائد میرے مذاق کے خلاف ہے، اگر پسند ہو شائع کرنے کی اجازت ہے۔ اشرف علی

حضرت حکیم الامتؒ نے اس خط کے علاوہ تقریظ بھی الگ لکھ کر روانہ فرمائی جس میں اپنی مسرت اور غیر معمولی پسندیدگی کا اظہار فرمایا اور اس کے آخر میں یہ بھی تحریر فرمایا کہ:

"بہر حال رسالہ ہر پہلو سے محبوب و دلکش اور اپنے مؤلف کے کمالات کا روشن آئینہ ہے اب اس کو ختم کر کے جازم رائے دیتا ہوں کہ اس کے درس سے کسی کو خالی نہ چھوڑا جائے اور میرے مشورہ سے جو اس رائے کو قبول کریں گے، ان سب سے پہلے مؤلف سلمہ سے درخواست کرتا ہوں کہ اس کی دس جلدوں کا ویلو (وی پی) میرے نام کر دیں جن میں ایک تو آچکا ہے نو اور بھیج دیں تاکہ میں اپنے خاندان کے بچوں اور عورتوں کو پڑھنے کے لیے دوں۔ والسلام"

از تھانہ بھون ۲۰ ر رمضان المبارک ۱۳۴۲ھ

حضرت والد صاحبؒ نے کتاب کے دس نسخے حسب الحکم روانہ کیے تو سخت فکر ہوئی کہ حکم تو ویلو (وی پی) کرنے کا ہے، دل یہ چاہتا تھا کہ بطور ہدیہ پیش کریں، جب کچھ سمجھ میں نہ آیا تو بغیر ویلو کے کتابوں کا پارسل بھیج دیا اور اپنی حیرانی علیحدہ خط میں لکھ دی[2] جس کے جواب میں حضرت اقدس نے کتابوں کی نصف قیمت کا منی آرڈر فرمایا، کوپن میں یہ مضمون تحریر تھا:

"مشفقم جامع الکمالات، زید فضلہ السلام علیکم

پارسل دس نسخہ کا مع محبت نامہ پہنچا، جیسے آپ فکر میں رہے کہ قیمت لوں یا نہ لوں میں آپ کی تحریر دیکھ کر فکر میں پڑ گیا کہ قیمت دوں یا نہ دوں؟ اور کئی روز اسی سوچ میں لگ گئے، بالآخر دونوں جہت یعنی ہدیہ و بیع کا لحاظ کر کے نصف

---

[1] تقریظ الگ لکھ کر اسی لفافہ میں ارسال فرمائی تھی، یہ اسی کے متعلق ارشاد ہے، یہ تقریظ رسالہ ختم الانبیاء کے ساتھ طبع ہو چکی ہے (رفیع)

[2] مکاتیب حکیم الامتؒ ص، (قلمی)

قیمت بھیجنا اعدل الطرق معلوم ہوا۔ امید ہے کہ بے تکلف قبول فرمائیں گے جب کہ میں نے نصف بے تکلف لے لیا۔ اشرف علی تھانہ بھون۔"

دارالعلوم دیوبند میں تعلیمی سال کے آغاز پر

مکتوب ۲۴ شوال ۱۳۴۴ھ

مکتوب: "اسباق[1] شروع کرنے سے پہلے حضرت سے استدعا ہے کہ برکت فی العلم والعمل اور حقوق کتاب اور طلبا کے کما حقہ ادا ہونے کے لیے دعا سے سرفراز فرمائیں گے۔"

جواب: "دل سے دعا کرتا ہوں اور کیوں نہ کرتا جب دل اندر سے خوش ہو۔ اللہ تعالیٰ برکات اضعافاً مضاعفۃ فرماوے۔"

مکتوب: اب اس سال میں نظام الاوقات اس طرح رکھنے کا خیال ہے یا جس طرح حضرت فرمائیں اس کی تعمیل کروں، ہدایہ چونکہ عموماً گھنٹہ کے سبق میں ناتمام رہ جاتی ہے، اس لیے خیال ہے کہ بعد نمازِ صبح گھنٹہ سے پہلے ہدایہ کتاب النکاح سے اور گھنٹہ میں ابتدا سے پڑھاؤں، پہلے گھنٹہ میں ہدایہ دوسرے میں مطالعہ ہدایہ اور تیسرے میں مشق تحریر عربی اور چوتھے میں مقامات، اس کے بعد دوپہر کو ڈیڑھ دو گھنٹہ اپنا تجارتی[2] کام اور ایک گھنٹہ قیلولہ اور بعد نمازِ ظہر تلاوت ایک پارہ قرآن مجید اس کے بعد ایک گھنٹہ تک کوئی رسالہ یا مضمون لکھنا، پھر ایک گھنٹہ سبق حماسہ، نمازِ عصر کے بعد بطور تفریح باہر جانا، بعد المغرب حسب الارشاد ذکر اسم ذات جو اب بارہ تسبیح تک التزاماً ہو جاتا ہے اور کبھی کچھ زائد بھی، بعد نمازِ عشاء مطالعہ کتب۔

اس میں جو حذف و ازدیاد حضرت مناسب سمجھیں، انشاء اللہ اس کی تعمیل کروں گا۔"

---

[1] دارالعلوم کا تعلیمی سال شوال سے شروع ہوتا ہے اور اسباق کا آغاز حسب معمول اواخر شوال میں ہوتا تھا وہ مراد ہے (رفیع)

[2] ایک تجارتی کتب خانہ بنام دارالاشاعت اس زمانہ میں آپ نے قائم کیا ہوا تھا، اس کا سب کام اوّل سے آخر تک آپ خود ہی انجام دیتے، انشاء اللہ آگے کسی موقع پر اس کا بیان ہوگا۔ (رفیع)

جواب: "ان امور میں حسب اصل امام ہمام رائے مبتلیٰ بہ ہی اصل ہے کہ چار روز میں تجربہ سے تقلیل یا تغیر کا فیصلہ ہوجائے گا۔"

مکتوب: "طبیعت چاہتی ہے کہ شیئٌ مِنَ الدُّلجة" (تھوڑا سا وقت آخر شب کا) بھی نصیب ہو لیکن آنکھ نہیں کھلتی، اگر کبھی کھل جاتی ہے تو کسل اتنا غالب کہ اُٹھنا بھی بے سود معلوم ہوتا ہے۔ اس لیے اس وقت تک چار رکعت بہ نیت تہجد مابین سنت عشار اور وتر کے پڑھ لیتا ہوں لیکن طبیعت یہی چاہتی ہے کہ آخر رات کا کوئی حصہ مل جائے۔"

جواب: "تہجد تو بعد نماز عشا ہی پڑھ لیا کیجئے لیکن اگر آخر میں آنکھ کھل جاوے تو بستر پر بیٹھ کر کچھ اسم ذات جب تک بیٹھنے کی ہمت ہو پڑھ لیا کیجئے۔ انشاء اللہ تعالیٰ اس سے راہ نکلے گی"

سب سے پہلے صاحبزادے کا انتقال اور ایک خواب

مکتوب ــــــ ، صفر ۴۵ھ

مکتوب: "انہی ایام میں احقر کا بڑا لڑکا محمد شفیع نامی جو عرصہ سے بیمار تھا، انتقال کر گیا، میرے ساتھ خصوصاً زیادہ مانوس تھا، اس لیے زیادہ پریشانی کا باعث ہوا۔"

جواب: إنا للہ۔ اللہ تعالیٰ صبر و اجر و نعم البدل عطا فرمائے۔

مکتوب: انہی ایام میں احقر نے دو خواب[1] دیکھے تھے۔ امید ہے کہ ان کی تعبیر سے مطلع فرمایا جائے گا۔

ایک رات میں نے دیکھا کہ میں کسی باغ میں ہوں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے کسی جہاد سے واپسی ہوئی ہے اور میں ایک طرف جا کر باغ کے کنارہ پر دم لینے کے لیے بیٹھ گیا ہوں، اسی عرصہ میں سامنے سے ایک شخص پہنچتا ہے جو ارباب، مدرسہ اور بالخصوص مولانا حبیب[2] الرحمٰن صاحب کا

---

[1] یہاں صرف ایک خواب ذکر کیا جا رہا ہے۔ دوسرا خواب برادر عزیز مولانا محمد تقی صاحب نے البلاغ کے مفتی اعظم نمبر میں اپنے ایک مضمون میں نقل کر دیا ہے (رفیع)

[2] جو اس وقت دارالعلوم دیوبند کے مہتمم تھے۔

بھیجا ہُوا ہے کہ چلو حضور صلی اللہ علیہ وسلّم جو اس میدان میں تشریف فرما ہیں تمھیں طلب فرماتے ہیں اور راستہ ہی میں یہ بھی معلوم ہُوا کہ کسی اور جہاد کی تیاری ہے اور مجھے بھی اسی لیے طلب فرمایا گیا ہے اور کچھ لوگ میرے عمل کی تحسین بھی کر رہے ہیں کہ ابھی تو ایک جہاد سے فارغ ہُوا تھا اور ابھی دُوسرے کے لیے مستعد ہو گیا میں راستہ ہی میں تھا کہ میری آنکھ کھُل گئی اور زیارت سے مشرف نہ ہونے کا سخت افسوس رہا۔

جواب: "انشاء اللہ تعالیٰ آپ کو دینی خدمات کی توفیق عطا ہو گی اور وہ نافع بھی ہو گی۔"

رسالہ ختمِ نبوّت کے متعلق

مکتوب ——— ۱۰ محرم ۱۳۴۶ھ

مکتوب: احقر کے رسالہ ختمِ نبوّت کا تیسرا حصہ چھپنے سے باقی تھا۔ حال میں تیار ہو کر آیا ہے جس کا ایک نسخہ بذریعۂ ڈاک ارسالِ خدمت کیا ہے امید ہے کہ ملاحظہ سے مشرف فرمایا جائیگا نیز جو بات قابلِ اصلاح نظر آئے، اُس پر نشان فرمایا جائے گا۔

جواب: ؎ دوست نہ بیند بجز آں یک ہُنر

مجھ کو تو سب خوبیاں ہی نظر آئیں۔

مکتوب: نیز اگر بارِ خاطر نہ ہو اور وقت میں گنجائش ہو تو چند سطریں بطور تقریظ بھی تحریر فرما دی جائیں تو میرے لیے تبرک اور رسالہ کے فوائد میں تضاعف کا سبب ہو گا۔

جواب: بلا شائبہ تکلف کہتا ہوں کہ ارادہ یہ تھا کہ اوّل سے تھوڑا سا حصہ دیکھ کر باقی کو اُس پر قیاس کر کے کچھ لکھ دُوں گا مگر دیکھنا جو شروع کیا تو حظ پر حظ بڑھتا گیا جس نے رسالہ ختم ہی کرا کے چھوڑا، ماشاء اللہ ہر پہلو سے کافی ہے خصوص جہاد وسیلہ سے جو استدلال کی تقریر کی ہے عجیب اور بے نظیر ہے کہ طالبِ حق کے لیے تو سب دلائل سے مغنی ہے پھر مرزا کے شبہات کا جواب دیکھ کر تو علومِ سلف کا لُطف آ گیا کہ قوت کے ساتھ سادگی اور بے تکلفی کو جمع کر دیا جزاکم اللہ تعالیٰ، اس طرز کو دیکھ کر اللہ تعالیٰ سے اُمید ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کی عُمر دراز کرے۔ آپ سے مسلمانوں کو انشاء اللہ تعالیٰ بہت نفع ہو گا یہی سچی عبارت کافی تقریظ ہے۔" اشرف علی ۱۵ محرم ۴۶ھ

عُجب اور ریاء ؟

مکتوب ——— ۹ جمادی الثانیہ سنہ ۶۴ھ

مکتوب : "یہ ناکارہ خادم خدمتِ اقدس سے رُخصت ہو کر دیوبند پہنچا"۔

جواب : الحمد للہ

مکتوب : اذکار و اشغال و نماز وغیرہ میں دل نہ لگنے کی جو شکایت بوقتِ حاضری حضرت سے کی تھی وہ الحمد للہ کہ حضرت کے فیضِ صحبت سے تقریباً رفع ہو گئی ہے

شکرِ فیضِ تو چمن چوں کند اے ابرِ بہار
کہ اگر خار و گر گل ہمہ پروردہ تست

بحمد اللہ اب نماز و ذکر میں طبیعت لگتی ہے آخر شب میں بھی گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ طمانیت نصیب ہو جاتی ہے۔

جواب : مبارک ہو

مکتوب : لیکن دن بھر ایک کیفیت مسرت کی سی رہتی ہے جس میں مجھے تمیز نہیں ہوتی کہ یہ "اعجاب[1] بالعبادۃ" ہے یا طاعات کے لازمی آثار میں سے ہے ؟

جواب : تلك عاجل بشرٰی المؤمن[2]۔ اعجاب امر اختیاری ہے اور یہ غیر اختیاری ہے، سُورِ اعجاب ہونے کا احتمال بھی نہیں۔

مکتوب : نیز آثارِ عبادت کے ظہور سے دل خوش ہوتا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ریا ہے؟

جواب : اس میں بھی وہی فیصلہ ہے۔

والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ کا قیام جب تھانہ بھون میں ہوتا وہاں بھی اپنے حالات خط میں لکھ کر حضرت کی خدمت میں پیش فرماتے اور حضرت اس کا جواب تحریر فرماتے، آنے والے وہ خط بھی

---

[1] عبادت کی وجہ سے خود پسندی، جو شرعاً مذموم ہے۔

[2] یہ جملہ حدیث شریف کا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ یہ تو مومن کے لیے نقد بشارت ہے۔

تھانہ بھون کے دورانِ قیام لکھے گئے ہیں۔

معمولاتِ رمضان وحاشیہ نفحۃ الیمن

مکتوب ——— رمضان ۴۶ھ

مکتوب: بفضل احقر کا وظیفہ حسب ذیل ہے۔ آخر شب میں چار رکعت یا آٹھ رکعتیں تہجد اور اس کے بعد ذکر اسم ذات بضرب وجہر خفیف بارہ سو مرتبہ پھر بعد نماز صبح تسبیح، تحمید، تکبیر، تہلیل، استغفار، صلوٰۃ، ہر ایک صد بار طلوع آفتاب تک پڑھنے کے بعد چار رکعت ضحیٰ، اور پھر ایک پارہ تلاوت قرآن مجید اس کے بعد تحشیہ[1] نفحۃ الیمن، اس کے بعد قیلولہ، اور پھر نماز ظہر اور تا عصر حاضری خدمت عالی، عصر کے بعد الحزب الاعظم، پھر مغرب کے بعد ایک ہزار مرتبہ ذکر اسم ذات بہ ضرب وجہر خفیف، پھر نماز عشاء اور اس کے بعد سونا،

اس میں حضرت جو ترمیم فرمائیں اس کی تعمیل انشاء اللہ بدل وجان کروں گا۔ وبیدہ التوفیق وعلیہ التکلان۔

جواب: سب کافی وافی ہے، صرف دو امر قابل توجہ ہیں، ایک چلتے پھرتے کوئی ذکر دافضلہ لا الٰہ الا اللہ۔ دوسرے تلاوت میں بقدر امکان کچھ بیشی کہ رمضان میں خصوصاً زیادہ موجب برکت ہے۔

شب و روز کے معمولات قارئین کے سامنے ہیں کہ کوئی وقت ذکر وعبادت اور تصنیف تعلّم سے خالی نہیں اور محض اسی دھن میں گھر کا آرام وراحت چھوڑ کر رمضان خانقاہ تھانہ بھون میں گزار رہے ہیں مگر اس پر بھی دل کی حسرت قابل دید ہے، ملاحظہ ہو اگلا مکتوب

مکتوب ——— رمضان

مکتوب: اہل ذکر عموماً اپنے احوال کی اطلاع حضرت کو دیتے رہتے ہیں۔ یہ ناکارہ خلائق

---

[1] یعنی حاشیہ لکھنا، نفحۃ الیمن عربی ادب کی مشہور درسی کتاب ہے جس پر عربی حاشیہ والد ماجد نے اُسی زمانے میں تحریر فرمایا تھا جو بارہا شائع ہُوا (رفیع)

اپنی بے حسی اور بے حالی کے باعث اس سے بھی محروم ہے۔ کل حضرت کی تقریر میں یہ معلوم ہُوا کہ اگر کوئی حال نہ ہو تو اس کی اطلاع دینی چاہیے اس لیے گزارش ہے کہ میرا حال زار یہ ہے کہ

شعبان بگذشت و ایں دل زار ہماں
رمضان بگذشت و ایں دل زار ہماں

نہ گلم نہ یاسمینم نہ درخت سایہ دارم — در حیرتم کہ دہقاں بچہ کار کشت مارا؟

البتہ حضرت کی عنایات سے اتنی بات محسوس ہوتی ہے کہ روز بروز دُنیوی جھگڑوں سے طبیعت متنفر ہوتی جاتی ہے اور اکثر خلوت میں طبیعت لگتی ہے اور میں بیقین جانتا ہوں کہ یہ محض حضرت کی توجہ و ہمت کا ثمرہ ہے۔

جواب : یہ تو جڑ ہے تمام دولتوں کی۔ انشاء اللہ تعالیٰ حرماں نہ ہوگا۔

مکتوب : میرے سارے علم و عمل اور حال و قال کا خلاصہ تو صرف یہ ہے کہ حضرت کی محبت اپنے دل میں پاتا ہوں اور اس پر خدا تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہوں ؎

شب بنمودند بمن نامہ اعمال مرا — صبح دیدم کہ بدستم سر گیسوئے تو بود

حضرت کی عنایات سے کیا بعید ہے کہ اس بے حسی سے نجات ملے، وما ذالک علی اللہ بعزیز۔

جواب : اللہ تعالیٰ سے سب امیدیں رکھنا چاہیے۔

پہلا سفرِ حج

حکیم الامتؒ سے مشورہ کے بعد والد ماجدؒ نے شوال ۱۳۳۶ھ میں سفرِ حج کا ارادہ فرمایا یہ زندگی کا پہلا حج تھا، والد صاحبؒ کے بچپن کے دوست اور رفیق درس حضرت مولانا محمد طیب صاحب مدظلہم (حال مہتمم دارالعلوم دیوبند)[1] کی معیت میں سفر مبارک طے ہُوا، دیوبند سے روانگی کے وقت مرشد تھانویؒ کی خدمت میں مندرجہ ذیل خط لکھا :

---

[1] موصوف اُس وقت مہتمم نہ تھے (رفیع)

دیوبند سے روانگی کے وقت

مکتوب ـــــ شوال ۱۳۴۶ھ

مکتوب: الحمد للہ احقر کا انتظام ہوگیا اور آج پانچ بجے شام کو انشاء اللہ تعالیٰ یہاں سے بمبئی کو روانہ ہونے کا ارادہ ہے، دل چاہتا ہے کہ سب سے آخر میں حضرت کی بارگاہ عالی سے رخصت ہوں لیکن مولوی محمد طیب صاحب روانہ ہو چکے ہیں اور بمبئی میں میرے منتظر ہیں۔ نیز جہاز کی تاریخ روانگی میں مہلت نہیں اس لیے اپنی یہ تمنا پوری نہیں کرسکتا۔

جواب: الخیر فیما وقع۔ تمام مقاصد کے لیے دعا کرتا ہوں۔ اشرف علی

مکتوب ـــــ ۱۸ شوال از بمبئی

مکتوب: کل حضرت کا والا نامہ بمبئی میں وصول ہوا، نہایت مسرت و طمانیت کا باعث ہوا، آج بنام خدا جہاز پر سامان بھیجا جاتا ہے، کل بروز بدھ ۱۹ شوال ۱۳۴۶ھ انشاء اللہ ۸ بجے صبح کو جہاز بمبئی سے روانہ ہو جائے گا، جہاز کا نام "دارا" ہے مگر ہمارے لیے تو عالم اسباب میں صرف حضرت کی ہمت و دعا کا سہارا ہے یہی ہمارا دارا ہے یہی سکندر ہے

از ما بجز حکایت مہر و وفا مپرس
ما قصۂ سکندر و دارا نخواندہ ایم

اس وقت ہندوستان سے ناکارہ خادم کا یہ آخری عریضہ ہے، اگر حق تعالیٰ نے خیریت سے پہنچا دیا تو انشاء اللہ تعالیٰ اس کے بعد مکہ معظمہ سے یہ شرف حاصل کروں گا۔ دعا کی ضرورت تو ہر وقت ہے اور اس وقت بہت زیادہ ہے۔ وَاُفَوِّضُ اَمْرِیْ اِلَی اللّٰہِ اِنَّ اللّٰہَ بَصِیْرٌ بِالْعِبَادِ

بنام کنندہ چند نکو نامے — احقر محمد شفیع از بمبئی ۱۸ شوال ۱۳۴۶ھ

جواب: مشفقم السلام علیکم

بسفر رفتنت مبارک باد
بسلامت روی و باز آئی

انشاءاللہ تعالیٰ دُعا سے نہ بھولوں گا۔ اپنے لیے بھی ایک درخواست ہے جو عزیزم محترم صاحبزادہ سے آپ کو معلوم ہوگی۔ اشرف علی

دارالعلوم دیوبند میں طلبہ کی ایک جماعت نے منتظمین دارالعلوم کے خلاف اسٹرائک کی حکیم الامت حضرت تھانویؒ نے جو دارالعلوم کے سرپرست تھے اسٹرائک کے خلاف فتویٰ جاری فرمایا، مگر مفسد طلبہ اپنے ساتھ بعض اکابر اساتذہ کرام کو ملوث کرنے میں کامیاب ہوگئے۔ اس موقع پر حضرت والد صاحبؒ نے مندرجۂ ذیل خط لکھا:

اساتذہ کے ساتھ اختلافِ رائے کی حدود

مکتوب ——— ۱۶ رجب ۱۳۴۶ھ

مکتوب: آج اس عریضہ کا داعیہ ایک قلبی اضطراب ہے جو چند روز سے موجودہ فتن اور اپنے اساتذہ و اکابر میں فسادِ ذات البین کو دیکھ کر روز افزوں ہے، جانبین کے روزانہ جلسے ساجد میں ہو رہے ہیں بالخصوص "لجنۃ الاتحاد" کے جلسے تو دن میں کئی کئی دفعہ ہوتے ہیں تمام شہر میں شورِ محشر برپا ہے، اہلِ شہر میں جو لوگ فریقین میں سے کسی جماعت سے تعلق رکھتے ہیں وہ تو ان کی طرف ہیں اور جو لوگ کسی جانب میں نہیں وہ دونوں کو بُرا کہتے ہیں۔

ادھر میرا نام نہاد علم اور اس کے جو حروف مجھے آتے ہیں وہ زیادہ تر حضرت شاہ صاحب مدظلہم العالی اور پھر حضرت مفتی صاحب مدظلہم کا طفیل ہے میں ہر چند کہ کوئی لفظ کبھی ایسا میری زبان سے نہیں نکالا جو ان حضرات اساتذہ کے لیے باعث گرانی ہو لیکن اب نوبت یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ اس جانب کی نفس شرکت بھی فریق ثانی اپنے لیے توہین سمجھتا ہے۔

جواب: اس کا تو علاج ہی نہیں اور نہ ضروری ہے۔

مکتوب: مجھے الحمدللہ اس کا تو یقین ہے کہ بزرگوں کے رستے پر وہی جماعت ہے جس کا[1]

---

[1] بہ ظاہر حضرت مولانا محمد طیب صاحب مدظلہم (حال مہتمم دارالعلوم دیوبند) مراد ہیں جن کے ساتھ یہ سفر ہوا تھا (حاشیہ مکاتیب حکیم الامت ص ۲۱)

میں تبع ہوں لیکن ہر وقت یہ خطرہ لگا رہتا ہے کہ لوگ میری طرف سے رنگ آمیزیاں کرکے مختلف باتیں ان حضرات کو پہنچاتے ہیں، مبادا اس سے ان کو گرانی پیش آکر میرے علم و عمل کے لیے مضر ثابت ہو۔

جواب: ایسی صورت ارزاں نہیں ہے ناحق کی کدورت ذرا بھی مُضر نہیں اطمینان فرماویں البتہ اپنی طرف سے کوئی بات حدود سے باہر نہ ہونا چاہیئے۔

مکتوب: اس لیے ایک گذارش تو یہ ہے کہ موجودہ فتنہ میں میرے لیے کیا طریقہ رکھنا مناسب ہے، دُوسرے اس دُعا کی درخواست ہے کہ حق تعالیٰ ان فتن کے شر سے نجات عطا فرماوے اور اس طرح گزارے کہ کسی استاد کو مجھ سے رنج نہ پہنچے۔

جواب: دل سے دُعا ہے۔

مکتوب: تیسرے اگر کوئی ورد بھی فتن سے محفوظ رہنے کے لیے تحریر فرمائیں تو انشاءاللہ تعالیٰ اس پر عمل کروں گا۔

جواب: اَللّٰهُمَّ إِنَّا نَعُوْذُ بِكَ مِنَ الْفِتَنِ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ۔

مکتوب: نیز موجودہ فتنہ روزانہ ترقی پر نظر آرہا ہے، طلبہ بھی اکثر اسٹرائک میں شریک ہو گئے ہیں اور جو باقی ہیں وہ برابر ٹوٹ کر اس طرف جارہے ہیں، سخت پریشانی ہے، اُمید ہے کہ جناب کے ارشادات باعث طمانیت ہوں گے۔

جواب: مولانا دوسرے کے افعال پر نظر ہی نہ چاہیے۔ "اَلْقَادِرُ بِقُدْرَةِ الْغَيْرِ لَيْسَ بِقَادِرٍ"۔ اپنے افعال درست کرکے بے فکر ہو جانا چاہیے۔

حکیم الامت[1] کے خلیفہ مجاز اور احقر ناکارہ کے شیخ و مربی سیدی وسندی عارف باللہ حضرت ڈاکٹر عبدالحی صاحب عارفی دامت فیوضہم اپنے مخصوص بے ساختہ انداز میں ہم خدام سے بکثرت فرمایا کرتے ہیں کہ "ارے آپ لوگ مفتی صاحب کو نہیں جانتے وہ ہمارے حضرت کے علوم ظاہری، علوم باطنی اور مزاج و مذاق کے پورے پورے وارث تھے، حضرت کے علوم اور مزاج و مذاق کو جتنا مفتی صاحب نے جذب کیا کسی نے نہیں کیا" مفتی صاحب کی ہر ادا حکیم الامت مجدد ملت کے

---

[1] یعنی حکیم الامت حضرت تھانوی قدس سرہٗ

مزاج و مذاق میں ڈھلی ہوئی تھی، حضرت عارفی مدظلہم کے اس ارشاد کی ایک جھلک اگلے خط میں نظر آئیگی۔

باطنی حالات میں حضرت مُرشدؒ سے بے نظیر مطابقت

مکتوب —— ۸ رمضان ۱۳۴۸ھ

مکتوب : "یہ ناکارہ بدنام کنندہ چند نکونامے اکثر جب اپنا کوئی حال لکھنے بیٹھتا ہے، تو نفس پر اعتماد نہیں ہوتا کہ جس حال کو میں اس وقت محسوس کر رہا ہوں یہ واقعی میرا حال ہے یا کسی سُنی یا دیکھی ہوئی بات کا تخیل؟ اس لیے ڈرتا ہُوں کہ خلافِ واقع بیان نہ ہو جائے"۔

جواب : "الحمد للہ بہت مدتوں میں اپنے ایک دوست کی یہ حالت دریافت ہوئی، جو بعینہٖ میری بھی حالت ہے، خواہ کیسی ہی ہو مگر میرے ساتھ توافق کی تو ضرور دلیل ہے۔ خیر دو تو • ایک حالت میں شریک ہوئے"۔

مکتوب : "اور اُسی بنا پر اکثر بہت سے وقتی احوال پیش کرنے میں کھٹک رہتی ہے جب تک کہ اس پر کسی حد تک استمرار نہ ہو، اب معلوم نہیں کہ میرا یہ عمل صحیح ہے یا غلط"؟

جواب : "اگر میری بھی یہ حالت نہ ہوتی تو شاید جواب دے سکتا، اب بجز اس کے کیا کہوں کہ اس کو میری سی حالت سمجھ کر صحیح سمجھیے اور میں آپ کی سی حالت سمجھ کر صحیح سمجھوں۔ اگر صحیح بھی نہ ہو اے اللہ! اس کو صحیح کر دیجیے"۔

مکتوب : "آخر شب کے نوافل میں بحمد اللہ اکثر شوق و رغبت اور سکون و طمانیت نصیب ہوتا ہے اور بعض اوقات کیفیت گریہ حالت اضطرار کو پہنچ جاتی تھی لیکن چونکہ یہ حالت مستمر نہ رہتی تھی، اس لیے میں اس کو "خمود" ہی سے تعبیر کرتا تھا، آج دفعۃً خیال ہُوا کہ مبادا یہ ناشکری میں داخل ہو، اس لیے اصل حقیقت عرض کر دی، آخر شب میں طولِ قیام اور طولِ سجود میں ایک خاص لذت پاتا ہُوں اور جس رُکن کو شروع کرتا ہوں جب تک تھک نہ جاؤں اس سے منتقل ہونے کو جی نہیں چاہتا"۔

جواب : "مبارک ہو، میرے لیے بھی اس کی دُعا کیجیے"۔

مکتوب : "نیز چند روز سے بہ نظر کیمیا اثر یہ بھی دیکھتا ہُوں کہ اختلاط سے وحشت اور خلوت میں اُنس ہوتا ہے، جب چند آدمیوں میں جمع ہو جاتا ہُوں تو طبعی تقاضا ہوتا ہے کہ کسی طرح

جلد یہ لوگ چلے جائیں یا میں خود چلا جاؤں، حضرت والا کی مجلس میں بھی دل طبعاً اس طرف مائل ہوتا ہے کہ گم صُم بیٹھا رہوں مگر لذتِ خطاب اس پر غالب آجاتی ہے نیز یہ محسوس کرتا ہوں کہ حضرت والا سے جتنا قریب ہوتا ہوں اتنا ہی انوار و برکات قلب میں سکون و طمانیت کے رنگ میں پائے جاتے ہیں، گھر سے زیادہ خانقاہ میں اور پھر خانقاہ کے اور اطراف سے حضرت کی مجلس میں اور پھر اطراف مجلس میں سے حضرت کے قریب میں متفاوت درجات متفعات معلوم ہوتے ہیں یہ تو وہ الطاف ہیں جو یقیناً اس ناکارہ کے کسی عمل کا ثمرہ نہیں بلکہ حضرت والا کی عنایات کے نتائج ہیں لیکن اپنی عملی حالت دیکھتا ہوں تو کٹتے ہوئے شرم آتی ہے کہ مجھ سے اتنا کام بھی نہیں ہوتا جتنا عام بازاری لوگ کرتے ہیں صبح کو نیند کا غلبہ اس قدر ہوتا ہے کہ صبح کی نماز میں بھی اُونگھتا ہوں اور بعد نماز تو بالکل کوئی کام نہیں ہوتا، مجبور ہو کر سو رہتا ہوں اور کئی گھنٹے اس نیند میں ضائع ہو جاتے ہیں اس لیے جو وردِ قرآن مجید کا مقرر ہے اکثر وہ بھی پورا نہیں ہوتا، رات کو پورا کرتا ہوں، اس کے ساتھ جب اس پر نظر پڑتی ہے کہ دیوبند سے سفر کرنا ایک گونہ مجاہدہ و عمل کا ادعا ہے اور لوگ یہی سمجھتے ہیں تو بے حد افسوس ہوتا ہے کہ میری مثال ایسی ہو گئی کہ "دھوبی کا کتا نہ گھر کا نہ گھاٹ کا"۔

جواب: مطمئن رہیے یہ بھی اسی کُلی کی ایک جزئی ہے جس کو آپ نے اُوپر کی سطروں میں "الطاف و نتائج" سے تعبیر کیا ہے بلکہ اس کے افراد میں سب سے اولیٰ اور اوّل ہے۔ اَللّٰهُمَّ زِدْ فِيهِ جس کی حقیقت انکسار و افتقار و اضطرار و فیہ قیل ؎

جُز خُضوع و بندگی و اضطرار
اندریں حضرت ندارد اعتبار

ایسا ہی ایک اور مکتوب

۲۱ رمضان ۱۳۴۸ھ

مکتوب: حال اس ناکارہ کا یہ ہے کہ اگر کہیں کسی وقت خوابِ غفلت اور خمودِ فطنت سے نجات ملتی ہے اور اپنی حقیقت پر نظر پڑتی ہے اور پھر حضرت حق جل وعلا کی عظمت کا تصور ہوتا ہے تو ایک عجیب حیرت کا عالم سامنے آجاتا ہے اور اپنے نفس کو محض مجبور پاتا ہے، اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ

گویا سمندر کی موجوں میں ایک تنکا ہے جو
می بُرد ہر جا کہ خاطر خواہِ اوست

کا منظر بنا ہوا ہے اپنا کوئی قول و فعل اپنا نظر نہیں آتا، اس حالت میں اگر قرآن مجید پڑھتا ہوں تو فضائل کی ترغیب اور رذائل کی ترہیب پر یہ سوچتا ہوں کہ یا اللہ ایسی کچھ بھی میرے بس میں نہیں "اِلَّا اَنْ یَّشَآءَ اللہ" اور ایسے وقت اکثر یہ دُعا کرتا ہوں "اَللّٰھُمَّ اِنَّ قُلُوْبَنَا وَنَوَاصِیْنَا بِیَدِکَ لَمْ تُمَلِّکْنَا مِنْھَا شَیْئًا فَاِذَا فَعَلْتَ ھٰذَا فَکُنْ اَنْتَ وَلِیَّنَا" اور کبھی "اَللّٰھُمَّ وَاقِیَۃً کَوَاقِیَۃِ الْوَلِیْدِ" زبان پر آتا ہے۔

البتہ یہ عجیب تر ہے کہ عین اس حالت میں بھی جبرِ محض کا عقیدہ نہیں ہوتا۔ اس انکشاف مجبوریت و مقهوریت کو وجدانی طور پر مسئلہ اختیار کا مزاحم نہیں سمجھتا۔ ایک روز غلبہ عظمت و ہیبت میں اپنے کو "بُلبُل ہوں پر شکستہ فتادہ چمن سے دُور" کا مصداق پاتا تھا اور بار بار یہ شعر زبان پر آتا تھا ؎

کیف الوصول الی سعاد و دونها
قلل الجبال و دونهن حیوف

یہاں تک کہ غلبہ یاس ہونے لگا، مگر الحمد للہ معاً رحمتِ الٰہیہ کی وسعت سامنے آگئی، اور ذہن اس طرف متوجہ ہو گیا کہ اپنی طاقت اور قوت نے نہ اس حد تک پہنچایا ہے اور نہ آگے اس کی رسائی کی توقع ہے جس رحمت نے یہاں دروازہ پر لا ڈالا ہے وہی کسی روز مدد کرے گی تو سب کچھ ہو رہے گا ؎

طاعت و توفیقِ طاعت ہم ز تو ہم دُعا از تو اجابت ہم ز تو

یہ جو لکھا ہے اگرچہ سوچ سوچ کر لکھا ہے کہ شاعرانہ تخیل نہ ہو جائے مگر چونکہ یہ حالت مستمر نہیں ڈرتا ہوں کہ اس کو اپنا حال کہنا بھی جائز ہے یا نہیں؟ مگر اتنی بات بتکرار محسوس کی ہے کہ جب کبھی حضورِ قلب نصیب ہوتا ہے تو یہی حالت محسوس ہوتی ہے؟

جواب: "الحمد للہ دریا میں خوض عطا ہوا، یہ اس کی موجیں ہیں جو زیر و زبر کر رہی ہیں، اگر اس میں غرق ہو گئے یونس علیہ السلام کی سنت نصیب ہوئی اور اگر پار ہو گئے تو موسیٰ علیہ السلام کی سنت نصیب ہوگی، دونوں حالتیں مبارک ہیں۔ میں تو بہت خوش ہوا اپنے احباب کے لیے ایسی ہی

حالتوں کے معلوم کرنے کا مشتاق رہتا ہوں"۔

ایک مختصر اور جامع نصیحت

ایسا ہی ایک اور مکتوب — ۲۸ رمضان ۱۳۴۷ھ

مکتوب: "تہجد کے بارے میں احقر کی عادت یہ تھی کہ کم از کم نصف پارہ اور زیادہ سے زیادہ ایک پارہ آٹھ رکعتوں میں پڑھتا تھا پھر اکثر نشاط نصیب ہوتا تو سجود و رکوع میں بھی دیر لگتی۔ اسی لیے اکثر وقت اسی میں خرچ ہو جاتا تھا اور ذکر کی تعداد اس لیے بہت کم ہوتی تھی۔ پرسوں ترسوں حضرت والا سے یہ سنا کہ مبتدی کے لیے کثرتِ ذکر زیادہ نافع ہے اور اسی لیے بعض مشائخ نے تہجد میں صرف سورۂ اخلاص پر اکتفا کرنے کا مشورہ دیا ہے، اس وقت سے یہ خیال ہے کہ اس کا پابند ہو جاؤں کیونکہ ذکر اسمِ ذات جو قصد السبیل میں عام مشغول کے لیے بارہ ہزار مرتبہ تجویز فرمایا گیا ہے، احقر سے ایک دن بھی بارہ ہزار پورا نہیں ہو سکا کسی دن بہت ہمت کی تو چھ ہزار تک پہنچا جس کی وجہ اکثر قلت وقت اور کبھی ضعفِ دماغ ہوتی تھی لیکن ضعف کا تدارک تو دو مجلسوں میں کرنے سے ہو سکتا ہے اور قلت وقت کا اختصار فی التہجد سے، مگر چونکہ حضرت نے یہ بات عام بیان فرمائی تھی، احقر کے لیے تجویز جزئی نہ تھی، اس لیے استصواب کی ضرورت ہے"۔

جواب: "اس احتمال کا خطور نہایت نافع اور ضروری تھا چنانچہ واقعی وہ عام قاعدہ آپ کی حالت کے مناسب نہیں، آپ تہجد میں اختصار نہ کریں، گو ذکر میں اختصار ہو جائے، اکثارِ ذکر سے جو مقصود ہے وہ بفضلہ تعالیٰ آپ کو تقلیل میں بھی حاصل ہے"۔

مکتوب: آخر میں یہ گذارش ہے کہ یہ ناکارہ و آوارہ بدنام کنندۂ نکو ناماں بارگاہ عالی سے رخصت ہونے پر مجبور ہے، مگر حضرت کے الطاف و ہمت و دُعا کا ہر وقت محتاج اور طالب ہے

وَاِنِّیْ عَنْكَ یَا مَوْلَایَ غَادٍ
وَقَلْبِیْ عَنْ فِنَائِكَ غَیْرُ غَادِیْ

"دستِ شیخ از غائباں کوتاہ نیست" جس تفسیر کے ساتھ بھی ہو شکستہ دلوں کا سہارا ہے۔ ایک عرض یہ ہے کہ اگر بلا تکلف و تأمل ممکن ہو تو احقر کے لیے کوئی مختصر جامع نصیحت کا جملہ تحریر

فرما دیا جائے جو اس طریق میں احقر کی مدد کرے۔"

جواب: "میرے تجربے سے جو چیز سب سے زیادہ نافع ہے وہ یہ ہے کہ دُنیا میں ایک گھڑی رہنے کا بھی بھروسہ نہیں، وہاں کے لیے تیار رہنا چاہیے۔

وَهُوَ[1] الَّذِى أُمِرَ بِهٖ فِى الحديث "إِذَا أَصْبَحْتَ فَلَا تُحَدِّثْ نَفْسَكَ بِالْمَسَاءِ وَإِذَا أَمْسَيْتَ فَلَا تُحَدِّثْ نَفْسَكَ بِالصَّبَاحِ وَعُدَّ نَفْسَكَ مِنْ أَصْحَابِ الْقُبُورِ"۔

اجازتِ بیعت اور خلافت سے سرفرازی

تھانہ بھون میں چوتھی حاضری ۱۳۴۳ھ یا ۱۳۴۴ھ میں ہوئی تھی اور اب ۱۳۴۹ھ چل رہا تھا، سلوک و تصوف اور عشق و معرفت کی پُرپیچ راہوں سے گذرتے گذرتے اب وہ مقام آ گیا تھا جہاں حکیم الامت مجدد ملت حضرت تھانوی جیسا رہبر و رہنما ہر طرح امتحان کرنے کے بعد مطمئن تھا کہ جس مسافرِ طریقت نے ان کی اُنگلی پکڑ کر اپنے سفر کا آغاز کیا تھا۔ اب وہ راہ کے تمام نشیب و فراز اور پیچ و خم سے نہ صرف پوری طرح باخبر ہے بلکہ ناواقفوں کی رہبری کے لیے بھی اس پر پورا اعتماد کیا جا سکتا ہے۔

ربیع الثانی ۱۳۴۹ھ میں اچانک حضرت حکیم الامتؒ کا مکتوب گرامی دیوبند پہنچا جس میں والد ماجدؒ کو تلقین و بیعت کی اجازت تحریر تھی وہ مکتوب گرامی یہاں بعینہٖ نقل کیا جاتا ہے۔

حکیم الامتؒ کا گرامی نامہ

ربیع الثانی ــــــ ۱۳۴۹ھ

"مشفقی مولوی محمد شفیع صاحب مدرس دارالعلوم دیوبند سلمہ اللہ

---

[1] ترجمہ: اور یہ وہی بات ہے جس کا حکم حدیث میں دیا گیا ہے کہ "جب تو صبح کرے تو اپنے نفس سے شام کی بات نہ کر اور جب تو شام کرے تو اپنے نفس سے صبح کی بات نہ کر، اور اپنے آپ کو اہلِ قبور میں شمار کر۔ (رفیع)

السلام علیکم

" بے ساختہ قلب پر وارد ہوا کہ آپ کو مع دوسرے احباب کے بیعت و تلقین کی اجازت ہو لیس توکلاً علی اللہ اس وارد پر عمل کرنے کے لیے آپ کو اطلاع دیتا ہوں کہ اگر کوئی طالب حق آپ سے اسکی درخواست کرے تو قبول کرلیں اس سے متعلم کے ساتھ معلم کو بھی نفع ہوتا ہے، میں بھی دعا کرتا ہوں اور اپنے خاص محبین پر اس کو ظاہر بھی کر دیجئے۔

بنظر احتیاط بیرنگ لفافہ بھیجتا ہوں   والسلام

بندہ اشرف علی از تھانہ بھون ربیع الثانی ۱۳۴۹ھ "

حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو اللہ جل شانہ نے حقیقی تواضع و انکسار سے نوازا تھا، ان کے وہم و خیال میں بھی نہ تھا کہ کبھی یہ نوبت بھی آنے والی ہے کہ حکیم الامتؒ اپنی خلافت سے سرفراز فرمائیں اچانک یہ گرامی نامہ ملا تو حیرت میں رہ گئے اور مرشد تھانویؒ کو اسی عالم حیرت میں یہ خط لکھا :

حیرت و فنائیت

مکتوب ——— ۴ جمادی الاولیٰ ۱۳۴۹ھ

مکتوب : والا نامہ گرامی صادر ہوا، دیکھ کر حیرت میں رہ گیا کہ ناکارہ و آوارہ شفیع اور بیعت و تلقین کی اجازت !

صلاح کار کجا و من خراب کجا

میں تو واللہ باللہ کسی بزرگ سے بیعت ہونے کا بھی سلیقہ نہیں رکھتا، سلوک کے ابتدائی مراحل سے بھی روشناس نہیں، کسی دوسرے کو کیا تلقین کروں گا اور پھر ایسا کون بیوقوف ہوگا جو مجھ سے درخواست بیعت کرے گا، بار بار والا نامہ کو دیکھتا اور اپنی سیہ کاری پر نظر کرتا ہوں تو حیرت کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آتا اور یوں معلوم ہوتا ہے کہ مجھ جیسے غفلت شعار سیہ کار کو اتنے بڑے منصب سے نوازا کہیں اس منصب کی بدنامی کا سبب نہ ہو، اس خیال سے یوں جی چاہتا ہے کہ اس کی اشاعت نہ ہو تو اچھا ہے۔

جواب : "یہی تو بنا ہے اس اجازت کی کہ آپ اپنے کو ایسا سمجھتے ہیں"

مکتوب : "اس والا نامہ کے بعد سے ہر قدم پر اپنی ناکارگی کا مزید احساس ہونے لگا"

جواب : "انشاء اللہ تعالیٰ بہت نفع ہوگا"
مکتوب : "دعا و ہمت سے دستگیری کی احتیاج بھی اور زیادہ محسوس ہونے لگی"
جواب : "میں حاضر ہوں"
مکتوب : "یہاں تو ہنوز روزِ اول ہے"
جواب : "نہایت کی تفسیر عود الی البدایہ ہے، انشاء اللہ تعالیٰ یہ "روزِ اول" وہی نہایت ہے"

اسی سلسلہ کا ایک اور مکتوب

—— یکم جمادی الثانیہ سنہ ۱۳۴۹ھ ——

مکتوب : "جب سے حضرت والا نے خطاب خاص سے معزز فرمایا ہے میری شکستہ اور کمزور طبیعت کے لیے ایک ایک تازیانہ ہوگیا ہے کسی وقت اس کا تصور ذہن سے نہیں جاتا، کہ مجھ جیسا ناکارہ و آوارہ، طریق سے ناآشنا اور بزرگوں کی یہ عنایات کہیں مجھ پر حجت نہ ہوں بالخصوص جب سے دیوبند میں غیر اختیاری طور پر اس کا چرچا ہوا ہے، ہر وقت اس سے ڈرتا ہوں کہ لوگ مجھے کچھ کر میرے بزرگوں کو بدنام کریں گے۔ اس کا الحمد للہ اتنا فائدہ بھی ہوا کہ گناہوں سے بچنے کی کچھ ہمت بڑھ گئی اور نماز میں کچھ من جانب اللہ تعالیٰ حضور کی ایک کیفیت پیدا ہونے لگی جو پہلے نہیں تھی بلکہ پہلے یہ کیفیت گاہ گاہ ہوتی تھی اور اب الحمد للہ اکثر رہنے لگی"

جواب : "مجھ کو یہی امید تھی"

مکتوب —— ۹ رمضان المبارک سنہ ۱۳۵۰ھ

مکتوب : "بارگاہِ سامی میں حاضر ہو کر حضرت کی جوتیوں کے طفیل سے الحمد للہ یہ تو ہوا، کہ عزد سے ایک گونہ نجات ہوئی اور اپنے کچھ معائب گویا متمثل ہو کر ؎

شرمندہ مثل زنگی آئینہ دیدہ ہوں

کی کیفیت پیدا ہوگئی اور یہ اچھی طرح واضح ہوگیا کہ تمام اہل خانقاہ میں سب سے زیادہ ناکارہ و آوارہ بدنام کنندۂ خانقاہ میں ہی ہوں گئی روز سے حزن کی کیفیت اور حسرت بڑھ رہی ہے کہ جب ایسا"

ہدایت کے مواجہ میں بھی میری تاریکی کا یہ حال ہے تو آئندہ کیا ہوگا"۔

جواب : یہ استدلال متکلم فیہ ہے، یہ ایسا استدلال ہے کہ ستارہ کہے کہ جب آفتاب کے سامنے بے نور ہوں تو شب کو کس قدر بے نور ہوں گا، بعض اوقات بعض احوال کا ظہور قرب میں نہیں ہوتا بُعد میں ہوتا ہے اور سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ ان فکروں ہی میں نہ پڑنا چاہیے جو ہوسکے کرتا رہے نہ ہوسکے نادم رہے

مکتوب : شراب لعل وجائے امن و یار مہرباں ساقی
دلا کے بہ شود کارت اگر اکنوں نخواہد شد

حضرت کے سب خدام اپنے اپنے کام میں ہیں اور رفیع حالات ہیں۔ اور اس ناکارہ کا کام صرف یہ ہے کہ کام کرنے والوں کو دیکھتا اور غبطہ کرتا ہے۔ وقت کچھ ایسا تنگ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی کام نہیں ہوتا اور ایام عمر گزرتے جاتے ہیں، نیند کی کثرت نے اور بھی تباہ کر دیا۔ اب بجز اس کے کہ حضرت والا سے استغاثہ کروں عالم اسباب میں کیا چارہ ہے"۔

جواب : "سب کا جواب معروض ہو چکا ہے"۔

مکتوب : ازاں رحمت کہ وقف عام کردی
جہاں را دعوت انعام کردی
نمی دانم چرا محروم ماندم رہین ایں چنیں مقسوم ماندم

جواب : جب "نمی دانم" ہے پھر فکر ہی نہیں مصیبت تو "می دانم" میں ہے۔

مکتوب : "امید ہے کہ اس نالائق خادم کی خاص طور سے دستگیری فرمائی جائیگی کہ مستحق کرامت گنہگار انند"

جواب : "مطمئن رہنا چاہیے کہ بعض ترقی اطمینان ہی پر موقوف ہے"

تھانہ بھون میں قیام کے دوران بھی طالبین اپنے اپنے حالات خط میں لکھتے اور لفافہ میں بند کر کے ایک بکس میں ڈال دیتے تھے جو خانقاہ کی سہ دری میں دیوار پر آویزاں تھا۔ حضرت حکیم الامت[1]

---

[1] آثار حکیم الامت ص ۱۴۰۔ طبع سوم

روزانہ نماز فجر سے قبل ان خطوط کو نکلاتے اور بعد نماز اُن کا جواب تحریر فرما کر مسجد کے منبر پر رکھ دیتے تھے۔ ہر شخص اپنا اپنا لفافہ وہاں سے اُٹھا لیتا۔ پچھلا مکتوب والد ماجدؒ نے ۹ رمضان کو بکس میں ڈالا، دس رمضان کی صبح کو جب حکیم الامتؒ خطوط کا جواب لکھ رہے تھے اُس وقت والد ماجدؒ کو ایک خاص حالت پیش آئی جو اگلے خط میں مذکور ہے ۔

بشارت

مکتوب ــــــ ۱۰ رمضان سنہ ۱۳۵۰ھ

مکتوب : " عریضہ منسلکہ کل احقر نے بکس میں ڈالا تھا اور صبح کی نماز کے وقت جب اغلباً حضرت والا نے اس کو ملاحظہ فرمایا، تقریباً اُسی وقت احقر مسجد میں بیٹھا ہوا ذکر بارہ تسبیح میں مشغول تھا۔ آخری تسبیح پڑھتے ہوئے بغیر کسی قسم کی نوم کے آنکھیں بند تھیں، ایک عبارت دوہرے حروف میں لکھی ہوئی سامنے آئی[1] جس میں صرف یہ لفظ احقر نے پڑھا اور اس کی ہیئت بھی پوری طرح یاد رہی کُنۡتَ اس کے بعد پھر ایک عبارت سامنے آئی جو پڑھی نہیں گئی۔ اس سے فارغ ہو کر حضرت والا کا جواب منبر پر سے اُٹھا کر پڑھا تو "ثلج صدر" ہو گیا اور حضرت نے جو امر اطمینان فرمایا تھا گویا عین اطمینان ہو گیا، اللہ تعالیٰ اس دولت کو تا دیر خیر و عافیت کے ساتھ ہمارے لیے قائم و دائم رکھے آمین

جواب : آپ کی خوشی سے خوشی ہوئی۔ اَدَامَهَا[2] اللّٰهُ تَعَالٰى لِكُلِّنَا۔ اور گو اس "کنت" کا سیاق و سباق معلوم نہیں لیکن کُنۡتَ کا مدلول اکثر وہ حالت ہے جو پہلے تھی۔ اب

---

[1] والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ کو ذکر کے دوران بحالت بیداری ایسے واقعات بکثرت پیش آتے تھے، جن کو صوفیائے کرام کی اصطلاح میں "کشف" کہا جاتا ہے اور اپنے بہت سے خطوط میں ان کی اطلاع بھی اپنے مرشد کو دی اور بسا اوقات حکیم الامتؒ نے ان کی تعبیر بھی بیان فرمائی جیسا کہ اس واقعہ میں ہوا، مگر والد ماجدؒ دوسروں پر ان کا اظہار نہ فرماتے تھے۔ خود احقر کو بھی ان کی زبانی صرف دو تین ہی واقعات معلوم ہوئے جو کسی خاص ضرورت سے ظاہر فرما دیے تھے۔ باقی تمام واقعات "مکاتیب حکیم الامتؒ" کے مطالعہ سے علم میں آئے (رفیع)

[2] یعنی اللہ تعالیٰ اس خوشی کو ہم سب کے لیے دائمی بنا دے۔

بدل گئی اور آپ کا حاصل مضمون[1] یہ تھا کہ "تاریکی نہیں گئی" اور میرے جواب کا حاصل یہ ہے کہ "جاتی رہی" گو ظہور مؤخر ہو، توان قرائن سے ظاہراً "کُنتَ" اپنے مدلول مذکور کے اعتبار سے میرے جواب کی تائید ہے کہ "کُنتَ مُظلِمًا فِیمَا سَبَقَ وَلَمْ تَبْقَ کَذَالِکَ الْاٰنَ"[2] واللہ اعلم

تصانیف کے لیے معلومات کا تبادلہ

حکیم الامت حضرت تھانوی قدس اللہ سرہٗ کے یہاں ایک ایک وقت میں کئی کئی کتابیں زیر تالیف رہتی تھیں، آپ کے خلفاء میں یہ ذوق اور ملکہ بھی سب سے زیادہ والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ ہی کو نصیب ہوا، مرشد و مرید ایک دوسرے کی زیر تالیف کتابوں اور ان کے مختلف مراحل سے باخبر رہتے، علمی تحقیقات کا باہم تبادلہ بھی جاری رہتا، حضرت حکیم الامتؒ کو کوئی مواد ایسا ملتا جو والد صاحبؒ کی زیر تصنیف کتاب میں معاون ہو تو اس کی نشاندہی فرماتے، ادھر والد صاحبؒ کو جو مواد حضرتؒ کی زیر تالیف کتاب کے لیے مناسب نظر آتا یا حضرتؒ طلب فرماتے کتابوں سے نقل کر کے ارسال فرماتے۔
کئی کتابیں تو دونوں حضرات کی مشترکہ تالیف ہیں۔ "مکاتیب حکیم الامتؒ" میں کم خطوط ایسے ہیں جن میں تصانیف یا فتاویٰ کے سلسلے میں مشورہ یا تبادلۂ خیالات نہ ہوا ہو، احقر نے ایسے خطوط قصداً یہاں نقل نہیں کیے، کیونکہ ان سے دلچسپی صرف اہل علم کو ہو سکتی ہے۔
کتاب "حیلۂ ناجزہ" جس میں مظلوم و بےکس عورتوں کی ازدواجی الجھنوں اور مظالم کا فقہی حل تجویز کیا گیا ہے، اس کی تالیف درحقیقت حکیم الامت تھانویؒ، والد ماجدؒ اور حضرت مولانا مفتی عبدالکریم صاحبؒ کا مشترک کارنامہ ہے۔ حضرت حکیم الامتؒ کو اس کتاب کی تکمیل کا شدت سے انتظار تھا۔ مسائل نہایت پیچیدہ اور قدم قدم پر مشکلات تھیں۔ اس لیے ملک اور بیرون ملک کے بہت سے علماء و فقہاء سے مشورہ کا سلسلہ کئی سال جاری رہا اور کام پایۂ تکمیل تک پہنچنے میں تاخیر در تاخیر ہوتی چلی گئی، مندرجہ ذیل معذرت نامہ اسی موقع کا ہے۔

---

[1] یعنی پچھلے خط میں
[2] یعنی تم پہلے تاریک تھے اب ایسے نہیں رہے۔

زیرِ تالیف کتاب "حیلۂ ناجزہ" کے متعلق

مکتوب ـــــ ۲۱ محرم ـــــ

مکتوب : " حضرت میاں صاحب[1] مدظلہم اور مولانا حسین احمد صاحب دونوں سفر میں گئے ہوئے ہیں، ان کے واپس آنے پر مولوی عبدالکریم صاحب کی خدمت میں دیوبند آنے[2] کے لیے اطلاع دوں گا "

مکتوب : " حیلۂ ناجزہ کی تعلیق در تعلیق سے افسردگی سی پیدا ہوتی ہے "

جواب : " میں اس سے بہت خوش ہُوا، مولوی عبدالکریم صاحب پر بھی یہی اثر ہے مقبولین کی افسردگی کو اللہ تعالیٰ رفع فرماویں گے "

درسِ ابُوداؤد، بعض تصانیف اور معمولات کے متعلق

مکتوب ـــــ ۲۴ ذی قعدہ ۱۳۵۴ھ ـــــ

مکتوب : " (دارالعلوم میں اسباق کی) جماعتیں ڈیڑھ سو دو سو آدمیوں پر مشتمل ہونے کی وجہ سے آواز پہنچانے میں تکلیف ہوتی ہے بمشکل وقت پُورا کرتا ہوں "

جواب : " ذمّہ دار سے اطلاع ضروری ہے "

مکتوب : " حضرت میاں صاحب مدظلہٗ نے طویل رخصت لے لی ہے اور امسال کام کرنے کا قصد معلوم نہیں ہوتا، ان کی رائے میری مصلحت سے یہ ہے کہ ان کا (درس) ابُوداؤد میں پڑھاؤں، میرا بھی دل چاہتا ہے کہ حدیث کا مشغلہ حاصل ہو جائے اس لیے بنام خدا تعالیٰ ان کی کتاب کا بھی سبق شروع کر دیا ہے حضرت بھی دعا فرماویں کہ حق تعالیٰ ظاہری اور باطنی امداد فرماویں "

---

[1] والدِ ماجد کے استاذِ محترم حضرت مولانا سید میاں اصغر حسین صاحبؒ (رفیع)

[2] یعنی حیلۂ ناجزہ کے بعض مسائل پر سب سے مشورہ کرنے کے لیے (رفیع)

جواب : "دل سے دُعا ہے کہ حق وا ذوی وا خلاص وا دوی عطا ہو"

مکتوب : "دلائل القرآن[1] کے لیے بھی ایک وقت متعین کرلیا ہے، الحمدللہ تھوڑا تھوڑا روزانہ ہوجاتا ہے۔"

جواب : اللہ تعالیٰ مدد فرماوے اور تکمیل فرماوے۔

مکتوب : "ایک باب سجود لغیر اللہ کے متعلق کسی قدر مفصل ہوگیا ہے اس کو ملاحظہ کیلیے علیحدہ بھیجتا ہوں، برائے کرم اصلاح فرماکر واپس فرما دیا جائے۔"

جواب : "دیکھا، دل خوش ہوا، کہیں کہیں پنسل سے نشان بنایا ہے، وہاں نظرثانی کرلیجئے"

مکتوب : "اگر حضرت کے نزدیک مناسب و مفید ہو تو اس کو علیحدہ بھی بشکل رسالہ مع ترجمہ شائع کردیا جاوے۔؟"

جواب : "واقعی ضرورت ہے"۔

مکتوب : "اس صورت میں کوئی نام بھی تجویز فرما دیا جاوے"

جواب : پیشانی پر لکھ دیا ہے (المقالۃ المرضیۃ فی حکم سجدۃ التحیۃ)

مکتوب : "ان کاموں کے مشغلہ اور پھر ضعف کی وجہ سے تہجد اور ذکر تقریباً ڈیڑھ ماہ سے بالکل متروک ہو رہا ہے، جس کی وجہ سے فکر رہتی ہے، کوشش بھی کرتا ہوں مگر پھر ناکام رہتا ہوں، حضرت والا کی دعاء و توجہ سے حق تعالیٰ ہی امداد فرماویں تو کچھ ہوسکتا ہے"۔

جواب : "اگر حضرت محبوب سکین محبّ کے نقص ہی میں حکمت و مصلحت رکھ دیں تو وہ نقص بھی بحکم کمال ہی ہے۔"

مکتوب : "شروع سال سے احقر نے اپنا طرز عمل یہ کر رکھا ہے کہ نہ کسی مجلس میں جاتا ہوں، نہ کسی سے بلا ضرورت شدیدہ ملتا ہوں، یہاں تک کہ مولوی طیب صاحب اور مولوی طاہر صاحب کے یہاں کا جانا بھی متروک ہے، دوسرے مدرسین وغیرہم سے تو مہینوں مواجہہ کی بھی نوبت نہیں آتی، مدرسہ کی مجلس مشاورت کے اجتماع سے بھی "تا بقدر در جان بچانے کی کوشش کرتا ہوں"۔

---

[1] "احکام القرآن" عربی کی تصنیف کے سلسلے میں

جواب : "بس امن و عافیت انشاء اللہ تعالیٰ اسی میں ہے"۔
"اگر خواہی سلامت بر کنار است"

مکتوب : "اس میں دشمنوں کی سازشوں اور افترائات کے لیے تو میدان وسیع ہوتا ہے، مگر اپنے قلب میں ایک سکون محسوس ہوتا ہے"۔

جواب : "معیتِ حق کے ساتھ کوئی چیز مُضر نہ ہوگی، انشاء اللہ تعالیٰ"

مکتوب : "اگر حضرت کے نزدیک یہی مناسب ہو تو اس پر قائم رہوں ورنہ جیسا ارشاد ہو اس کی تعمیل کروں"؟

جواب : "مناسب کیا، میں تو واجب سمجھتا ہوں"۔

"قطع طریق نہیں قطع مسافت"

(مکتوب اواخر ذی الحجہ ۱۳۵۴ھ)

مکتوب : "ناکارہ غلام کو خدمتِ اقدس سے واپس آنے کے بعد پھر مرضِ سابق کی زیادتی اور بے حد ضعف ہوگیا تھا، اب الحمد للہ تین چار روز سے عافیت ہے، ضعف بھی کم ہے، حضرت کی دُعا سے توقع ہے کہ اب مرض و ضعف جلد ختم ہو جائے گا لیکن میری عملی حالت ایک مدت سے بہت خراب ہوتی جارہی ہے، مولوی کہلاتا ہوں اور خدمتِ اقدس کی حاضری کی وجہ سے لوگ کچھ اور بھی سمجھتے ہیں لیکن میری عملی حالت ایسی سقیم ہے کہ ہر عامی سے عامی آدمی مجھ سے بہتر ہے، نماز اور جماعت تک ٹھکانے سے ادا نہیں ہوتی۔ اوراد و اشغال اور قیام لیل کا تو پوچھنا کیا۔ تمنا ہوتی ہے کہ کاش حضرت کی طرف احقر کی نسبت مشہور نہ ہوتی اور بالکل عامیانہ حالت میں بسر ہوتی کہ کم بس گناہ سے تو محفوظ رہتا"۔

یہ معلوم ہے کہ یہ سب عملی خرابیاں اختیاری ہیں اور اس لیے جب اس کا دھیان ہوتا ہے تو ہمت بھی کرتا ہوں، کوشش بھی کرتا ہوں مگر نفس و شیطان اس درجہ پیچھے پڑے ہوئے ہیں کہ اکثر کوشش بھی ناکام بلکہ بعض دفعہ اُلٹی پڑتی ہے۔

حضرت کی خدمت کی حاضری اور مکاتیب سے بھی دل شرماتا ہے کہ لوگ اپنے اپنے حالات

رفیعہ لے کر حاضر ہوتے ہیں یا بذریعہ مکاتیب پیش کرتے ہیں اور یہ ناکارہ و آوارہ حاضر بھی ہوتا ہے، تو بجز دنیوی پریشانیوں کے تذکرہ اور اس کی تدبیر کے سوال کے اور کسی چیز کی توفیق نہیں ہوتی۔ حضرتؒ کے اوقات عزیز بھی ضائع کرتا ہوں۔ فاللہ المستعان ولاحول ولا قوۃ الا باللہ۔ آج طبیعت زیادہ پریشان ہوئی تو عاجز ہو کر اس کے سوا کوئی چارہ کار نظر نہ آیا کہ حضرت والا سے دعا و توجہ کی درخواست کروں۔

جواب: "السلام علیکم۔ طُرُقُ الوُصولِ اِلَی اللہِ بِعَدَدِ اَنْفَاسِ الْخَلَائِق"
ان طرق میں ایک طریق بلکہ اقرب طرق یہ ناکارگی، بیچارگی، پریشانی، پشیمانی بھی ہے مگر طبعی اثر کے اعتبار سے عقرب نہیں ہے۔ مریض کو رائے قائم کرنے کا حق نہیں جس شخص کو طبیب سمجھا جاوے اس کی تشخیص پر اعتماد ضروری ہے، بس بالکل بے فکر رہیے، قطع مسافت ہو رہی ہے اس کو "قطع طریق" نہ سمجھا جاوے۔ واللہ الہادی"

خانگی امور میں خط و کتابت

حکیم الامتؒ سے والد صاحبؒ کی خط و کتابت درحقیقت بیس سالہ قدر کی نہایت مفصل سوانح حیات ہے کیونکہ کوئی شعبۂ زندگی ایسا نہیں جس میں قدم قدم پر حکیم الامتؒ سے ہدایات اور دعائیں طلب نہ کی گئی ہوں، خالص نجی اور خانگی امور سے متعلق بھی بہت سے خطوط "مکاتیب حکیم الامتؒ" میں درج ہیں، یہاں ایسے چند خطوط کے اقتباسات بھی نقل کیے جاتے ہیں۔

احقر کی ولادت پر

مکتوب ـــــ ۳ رجمادی الاولیٰ ۱۳۵۵ھ

مکتوب: "حضرتؒ کے والا نامے مع یکصد روپے و مسودۂ امثال اقوال[1] وصول ہو کر باعث اطمینان و مسرت ہوئے۔

---

[1] یہ کتاب اس وقت زیر تالیف تھی۔

جواب : اللہ تعالیٰ ہمیشہ مطمئن و مسرور رکھے۔ الحمدللہ" اٰثل الاقوال" ختم ہوئی۔ اب تک سب تألیفات کے مسودات مدرسہ میں بہت سی مصلحتوں سے محفوظ رہتے ہیں، اگر بعد نقل یہ مسودہ بھی بھیج دیا جاوے تو مدرسہ میں داخل کر دیا جاوے"۔[1]

مکتوب : احقر کا ارادہ تھا کہ جمعہ کی صبح کو دہلی چلا جاؤں تاکہ جمعہ کی تعطیل اس کام میں لگ جائے اور روپیہ کے لیے یہ انتظام کر لیا تھا کہ صرف ایک روز کے وعدہ پر ایک صاحب سے قرض لینے کو کہہ دیا تھا، مگر اتفاق یہ ہوا کہ شبِ جمعہ میں احقر کے گھر میں لڑکا پیدا ہو گیا"۔

جواب : "مبارک ہو"۔

مکتوب : "حضرتؒ کی دعا سے حق تعالیٰ نے فضل فرمایا، بچہ اور ان کی ماں بحمداللہ تعالیٰ دونوں خیریت سے ہیں"۔

جواب : "الحمدللہ"

مکتوب : "بچہ کے لیے حضرت والا کوئی نام تجویز فرمائیں، اس کے تین بھائیوں کے نام محمد زکی و رضی و ولی ہیں"۔

جواب : یہ سب نام مناسب ہیں، حفی، صفی، وفی، نقی، تقی اور آپ کے نام کے مناسب محمد رفیع، عبدالسمیع۔ "محمد رفیع" کا ایک سجع بے ساختہ ذہن میں آ گیا۔ ؎[2]

ز جملہ خلائق محمد رفیع"

احقر کے بھائی جان جناب مولانا محمد زکی صاحب کیفی مرحوم[3] جو ہم بھائیوں میں سب سے بڑے تھے اور بچپن ہی میں حضرت حکیم الامتؒ سے بیعت ہو گئے تھے، اُن پر حضرت حکیم الامتؒ کی خصوصی توجہ تھی، بہت سے خطوط میں ان کا ذکر ہے۔ ایک خط اس سلسلہ کا بھی ملاحظہ ہو۔

---

[1] الحمدللہ اب حضرت حکیم الامتؒ کی تمام مطبوعہ و غیر مطبوعہ تصانیف کے مسودات دارالعلوم کراچی (کورنگی) میں محفوظ ہیں۔

[2] اس جگہ حضرت والد صاحب نے حاشیہ پر تحریر فرمایا ہے کہ "یعنی محمد رفیع سلمہ۔" ۱۲ش

[3] ۱۰ / ۱۱ محرم ۱۳۹۵ھ کی درمیانی شب میں عمر پچاس سال لاہور میں انتقال ہوا۔ رحمۃ اللہ

بھائی جان کے متعلق

حکیم الامتؒ کا گرامی نامہ بنام والد صاحبؒ۔ ۱۰ رمضان ۱۳۶۰ھ

"از اشرف علی، السلام علیکم، میں نے جو منی آرڈر اہلیہ شاہ صاحب مرحوم کو دینے کے لیے ایک پچاس روپے کا، دوسرا اسّی روپے کا جو وضع فیس کے بعد ۸۰، اور عہ (یعنی آٹھ آنے اور ایک پیسہ) کم ہوگیا بھیجے ہیں۔ آپ کے نام پر فارم رسید کا زکی[1] کے دستخط سے آیا اور دوسرے کی رسید اب تک نہیں آئی، یہ دونوں موجب تردد ہیں بوجہ آپ کے دستخط نہ ہونے کے۔ پھر حکیم شریف صاحب[2] آپ کا خط دستی لائے، اس میں بھی کوئی اطلاع نہ تھی، جس سے تردد بڑھ گیا۔ اس لیے یہ خط بھیج رہا ہوں کہ ان کے وصول اور مستحق کے پاس ایصال سے بہت جلد رفع تردد کیا جاوے، باقی خیریت الحمد للہ میری صحت بڑھ رہی ہے۔

والد صاحبؒ کا جواب اور بھائی جان کی حالت پر اظہارِ مسرت

مکتوب ــــــ ۱۱ رمضان ۱۳۶۰ھ

"بعد سلام مسنون نیاز مشحون عرض ہے کہ کل حضرت والا کا مرسلہ منی آرڈر ننانوے روپے کا آج ایک کارڈ وصول ہوا۔ اس سے پہلے لعہ للعہ (انچاس روپے آٹھ آنے) بھی وصول ہوچکے جس کے فارم کو محمود زکی نے اپنے دستخط سے وصول کیا تھا جس کی رسید بھی اگلے روز لفافہ میں روانہ کر دی تھی"

وہ لفافہ ڈاک میں ضائع ہوگیا تھا، آگے اُس رسید اور لفافہ کی تفصیلات درج کی ہیں، اس کے بعد لکھا ہے کہ :

"میاں زکی سلمہ پر بحمد اللہ کافی اطمینان ہونے کی وجہ سے میں نے چٹھی رساں (ڈاکیہ) سے یہ کہہ رکھا ہے کہ میں کسی وقت گھر میں نہ ملوں تو زکی سلمہ کو دے دے

---

[1] اس وقت بھائی جان کی عمر سولہ سال تھی (رفیع)

[2] احقر کے سب سے بڑے بہنوئی حکیم سید شریف حسین حسنی صاحب مدظلہم ہیں (رفیع)

اس روز بھی ایسا ہی ہوا۔ محمد زکی سلمہٗ سلام عرض کرتا ہے :

جواب : " السلام علیکم۔ اطمینان ہوگیا، جزاکم اللہ تعالیٰ، محمد زکی کی حالت معلوم کرکے بہت مسرت ہوئی۔ دوسرا پرچہ شاہ صاحب کے گھر میں دے دیا جائے "

مرید و مرشد کے درمیان خط و کتابت کا یہ سلسلہ اتنا سبق آموز، دلچسپ، اور علمی و تاریخی معلومات سے پُر ہے کہ کسی خط کو چھوڑنے پر دل آمادہ نہیں ہوتا، اس لیے انتخاب میں بڑی دشواری پیش آئی۔ احقر نے اس انتخاب میں کوشش کی ہے کہ ہر دَور اور ہر قسم کی خط و کتابت کی جھلکیاں صرف ایک ایک دو دو خطوط کی صورت میں پیش کر دی جائیں۔ کہیں کہیں اختصار کے لیے صرف اقتباسات لیے ہیں اس کے باوجود یہ بیان خاصا طویل ہوگیا۔

خانقاہِ تھانہ بھون میں آپ کی خصوصیت

حضرت تھانویؒ کو اللہ جل شانہٗ نے حکیم الامت بنایا تھا۔ آپ اپنے مریدین اور خلفاء کی استعداد کا جائزہ لے کر ہر ایک کو اس کے مناسب ریاضت یا دوسرے دینی امور تفویض فرمایا کرتے تھے۔ والد ماجد مدظلہم نے جس ماحول میں آنکھ کھولی تھی وہ علم و تقویٰ کا بے نظیر ماحول تھا جس کا اثر آپ کی زندگی کے ہر پہلو پر بچپن ہی سے نمایاں تھا، طبیعت سلیم پائی تھی، اس لیے حکیم وقت حضرت تھانویؒ نے آپ کو اوراد و وظائف اور ریاضت و مجاہدہ میں زیادہ لگانے کی ضرورت محسوس نہیں فرمائی، بلکہ آپ کی دینی فراست، ٹھوس علمی استعداد اور منجھے ہوئے علمی ذوق کے پیش نظر آپ کو اکثر و بیشتر تصنیف و تالیف، علمی تحقیقات اور فتویٰ وغیرہ کا کام سپرد فرمایا۔ اسی لیے خود حضرتؒ کی تصانیف، فتاویٰ اور دوسری علمی تحقیقات میں ہاتھ بٹانے کا آپ کو خوب موقع ملا۔ حضرت تھانویؒ ہر مشورہ طلب تحقیقی کام میں آپ سے مشورہ لیتے، کبھی تھانہ بھون بلا کر، کبھی خط و کتابت کے ذریعہ، اس دَور کی تقریباً تمام علمی تحقیقات میں آپ اپنے پیر و مرشد کے ساتھ شریک رہے۔ بارہا ایسا ہوتا، کہ حضرت تھانویؒ کو کسی تصنیف کی ضرورت محسوس ہوتی اور مشاغل یا ضعف کے باعث اس کا موقع نہ ہوتا تو یہ کام حضرت والد ماجد کے سپرد کر دیا جاتا، آپ کی متعدد وقیع تصانیف اسی طرح وجود میں آئیں، مثلاً حیلۂ ناجزہ اور احکام القرآن عربی ان دونوں تصانیف کا ذکر آخر میں قدرے تفصیل سے آئے گا۔

حضرت تھانویؒ کے تمام ہی خلفاء علم و عمل، اور دیانت و تقویٰ اور اصلاح و ارشاد کے درخشاں مینار ہیں، لیکن یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اپنے پیرو مرشد کے علمی مزاج کو سب سے زیادہ حضرت مفتی صاحب نے اپنایا تھا۔ حضرتؒ کو فتاویٰ کے بارے میں سب سے زیادہ اعتماد حضرت مفتی صاحبؒ کی تحقیقات پر ہوتا تھا۔ بارہا کسی علمی تحقیق پر اپنے کئی خلفاء کو مامور فرمایا کہ ہر ایک اپنی اپنی تحریر پیش کرے۔ حضرت مفتی صاحبؒ بھی ان میں شامل ہوئے اور اکثر و بیشتر آپ ہی کی تحریر کو پیرو مرشد نے سب سے زیادہ پسند فرما کر دعائیں دیں۔

اب ہم حضرت والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ کی سوانح حیات کے دوسرے پہلوؤں کا تذکرہ کریں گے، لیکن درحقیقت وہ سب پہلو بھی خانقاہ تھانہ بھون سے تعلق ہی کی تفسیر ہوں گے کیونکہ والد ماجد قدس سرہٗ کی زندگی کا ہر گوشہ حضرت حکیم الامت حضرت تھانویؒ سے مربوط، انہی کی ہدایات سے مزین، انہی کے مزاج و مذاق کے سانچے میں ڈھلا ہوا اور انہی کے رنگ میں ڈوبا ہوا تھا۔

صِبْغَةَ اللّٰهِ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً

تدریسی کارنامے

دارالعلوم دیوبند میں

حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے تدریس کا سلسلہ دارالعلوم دیوبند میں ابتدائی کتابوں سے شروع فرمایا، پھر سالہا سال اوپر کے سب درجات میں تمام علوم و فنون اپنے باکمال اساتذہ کے زیر سایہ پڑھائے۔ حضرت والد صاحبؒ فرمایا کرتے تھے کہ:

"دارالعلوم کی طرف سے تو صرف چھ گھنٹے کی پابندی تھی مگر میں روزانہ اٹھارہ گھنٹے کام کرتا تھا۔"

درسِ حدیث

بالآخر بزرگوں کی خواہش وایما پر آپ کو درجۂ علیا (دورۂ حدیث) کے اساتذہ میں شامل

کر لیا گیا جس کا واقعہ یہ ہوا کہ حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی رحمۃ اللہ علیہ جب سلہٹ میں تشریف فرما تھے وہاں حدیث پڑھانے کے لیے ایک مدرس کی ضرورت پیش آئی جس کے لیے حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ نے آپ کو بذریعہ خط دعوت دی، آپ نے عذر کیا کہ" اس وقت تک دارالعلوم میں مجھے کبھی حدیث پڑھانے کا اتفاق نہیں ہوا میرا شغلہ زیادہ تر ادب اور دوسرے فنون رہتے۔ اس پر تقاضے کا خط آیا کہ ایسا کیوں کیا ؟ حدیث کی تعلیم کو ضروری سمجھو، پھر دیو بند تشریف آوری کے وقت دوبارہ تقاضا فرمایا، آپ نے عرض کیا" جہاں استاذ محترم حضرت شاہ صاحب درس حدیث دیتے ہوں وہاں ایسا احمق کون ہوگا جو مجھ سے حدیث پڑھنے کو گوارا کرلے"۔ فرمایا نہیں کوئی نہ کوئی کتاب حدیث کی ضرور پڑھایا کرو"۔ بار بار تقاضا فرمایا۔ بالآخر دارالعلوم کی طرف سے سب سے پہلے موطا امام مالک کا درس آپ کے سپرد ہوا اور اس کے بعد دورۂ حدیث کی دوسری کئی کتابیں پڑھانے کی نوبت آئی۔

درس ابوداؤد

سنن ابوداؤد آپ کے استاذ مہربان ولی زاہد حضرت مولانا سید میاں اصغر حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ پڑھاتے تھے ۱۳۵۴ھ میں انھیں دوران سال سفر پیش آیا تو ابوداؤد کا درس آپ کے سپرد فرما کر تشریف لے گئے۔ پھر استاذ موصوف کی خواہش پر مستقل طور سے یہ درس آپ ہی کی طرف منتقل ہو گیا اور سالہا سال جاری رہا۔

یوں تو ہر علم وفن میں آپ کا درس بہت مقبول رہا۔ علوم عقلیہ منطق فلسفہ وغیرہ کی نہایت کتابوں میں آپ کا درس بہت ممتاز سمجھا جاتا تھا۔ لیکن آپ کے دو درس خصوصیت سے بہت مشہور ہوئے۔ ایک دورۂ حدیث کی مشہور کتاب سنن ابوداؤد شریف کا اور دوسرا عربی ادب کی مشہور کتاب مقامات حریری کا۔ ان کتابوں کے درس میں شرکت کو مختلف ممالک کے نہ صرف طلبہ بلکہ علمائے کرام بھی اپنی سعادت شمار کرتے تھے۔

جامعہ اسلامیہ ڈابھیل میں : ۲۶ سالہ خدمات کے بعد دارالعلوم دیو بند سے

لہ نقوش و تاثرات (سفرنامہ تھانہ بھون و دیو بند) ص ۳۲، ۳۳

مستعفی ہو کر بھی آپ نے درسِ حدیث کا سلسلہ بالکلیہ ترک نہیں فرمایا۔ آپ کے استاذ محترم شیخ الاسلام حضرت علامہ شبیر احمد صاحب عثمانیؒ جو دارالعلوم دیوبند سے مستعفی ہونے کے بعد جامعہ اسلامیہ ڈابھیل ضلع سورت میں درسِ بخاری دیتے تھے، سخت علیل ہو کر دیوبند تشریف لے آئے تو غالباً تعلیمی سال کے اختتام میں تین ماہ باقی تھے۔ اس وقت جامعہ کے مہتمم صاحب ان کی جگہ آپ کو لینے کے لیے دیوبند تشریف لائے۔ ان کے اصرار اور شیخ الاسلام کے ارشاد پر آپ نے تین ماہ جامعہ اسلامیہ ڈابھیل میں بخاری شریف کا درس دیا۔

پاکستان تشریف لائے تو کراچی میں کوئی دینی مدرسہ ایسا نہ تھا جہاں یہ سلسلہ جاری کیا جاتا ـــــ مگر کچھ منتہی طلبہ یہاں بھی آ گئے۔ ان کو آپ نے اور حضرت مولانا شاہ بدر عالم صاحب مہاجر مدنی رحمۃ اللہ علیہ نے جامع مسجد جیکب لائن میں بعض اسباق پڑھائے۔ ان طلبہ میں حضرت مولانا بدر عالم صاحب کے صاحبزادے مولانا آفتاب عالم صاحب بھی شامل تھے۔

دارالعلوم کراچی میں

پھر شوال ۱۳۷۰ھ میں آپ نے دارالعلوم کراچی کی تاسیس فرمائی تو اس میں بھی کئی سال بخاری شریف کے درس سے طلبہ کو مشرف فرمایا۔ جب قوٰی میں انحطاط اور علمی مصروفیات میں اضافہ ہوا تو کئی سال بخاری شریف کا درس اس طرح جاری رکھا کہ بخاری کتاب الوضو تک آپ پڑھاتے اور باقی کتاب دارالعلوم کے دوسرے اساتذہ پڑھاتے تھے۔ زندگی کے آخری چار سال جن میں آپ صاحب فراش رہے، ان میں یہ سلسلہ تو جاری نہ رہ سکا مگر طلبہ و اساتذۂ دارالعلوم کے اصرار پر ہر سال بخاری شریف کا پہلا اور صحاح ستہ کا آخری درس آپ ہی دیا کرتے تھے۔ دارالعلوم کراچی میں بخاری شریف کے علاوہ مؤطا امام مالک اور شمائل ترمذی کا درس بھی کئی سال جاری رہا۔ خوش قسمتی سے احقر راقم الحروف کو اور برادرِ عزیز مولانا تقی سلمہٗ کو بھی حضرت والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ سے کئی کتابیں پڑھنے کی سعادت نصیب ہوئی۔ احقر نے بچپن میں قاعدہ بغدادی بھی حضرت والد ماجد سے پڑھا تھا۔ اس وقت آپ دارالعلوم دیوبند میں صدر مفتی اور استاذِ حدیث تھے۔ مجھے اپنے ساتھ دارالافتاء لے جاتے اور وہیں قاعدہ بغدادی پڑھایا کرتے تھے۔ روزانہ سبق کے بعد پیسے دیتے اور جب دیکھتے

کہ میرا دل پڑھنے میں نہیں لگ رہا ہے یا ذہن بوجھل ہوگئے لگا ہے تو کھیلنے کے لیے چھوڑ دیتے۔ میں وہیں مولسری کے نیچے کھیل کود کر تازہ دم ہوکر واپس آتا تو سبق پڑھاتے کبھی یاد نہیں کہ میرے ذہن پر بوجھ ڈالا ہو پورا قاعدہ کھیل کھیل میں پڑھا دیا تھا۔ پھر کچھ عرصہ بعد رات کو مجھے اور برادر بزرگوار جناب محمد ولی رازی صاحب کو انبیاء کرام علیہم السلام اور بزرگان دین کے واقعات نہایت دلنشین انداز میں سنایا کرتے تھے۔ جو بحمد اللہ لوح قلب پر آج تک کندہ ہیں۔ یہ واقعات بعد میں بار ہا کتابوں میں پڑھنے پڑھانے کی نوبت آئی مگر اب بھی جب ان کی تفصیلات یاد آتی ہیں تو کتابوں کے بجائے آپ ہی کی سنائی ہوئی تفصیلات ایسی سامنے آجاتی ہیں گویا اب سن رہے ہوں۔ اس کے بعد آپ نے ایک چہل حدیث جو آپ ہی کی تالیف تھی، اس کی پوری چالیس حدیثیں مع ترجمہ احقر کو یاد کرادی تھیں جب دارالعلوم کراچی میں ناچیز کا اور برادر عزیز مولانا محمد تقی صاحب عثمانی کا دورۂ حدیث شروع ہوا تو دیگر طلبہ کے ساتھ ہم دونوں بھائیوں کو بھی آپ سے مؤطا امام مالکؒ اور شمائل ترمذی پڑھنے کی سعادت نصیب ہوئی۔ دورۂ حدیث سے فراغت کے بعد آپ نے ہمیں شرح عقود رسم المفتی اور مقدمۂ درمختار مع حاشیہ شامی اور الاشباہ والنظائر بھی جو فتوی کی بنیادی کتابیں ہیں خصوصی اہتمام سے پڑھائیں اور کئی سال فتوی نویسی کی مشق بھی آپ ہی نے کرائی۔ فللہ الحمد اولاً وآخراً

آپ کے درس کی خصوصیات

ناچیز راقم الحروف میں یہ اہلیت تو نہیں کہ حضرت والد ماجدؒ کے درس مبارک کی خصوصیات احاطۂ تحریر میں لاسکوں، تاہم جس حد تک فہم ناقص کی رسائی ہوئی عرض کرتا ہوں۔

(۱) آپ کے درس کی ایک نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ سبق کے دوران طالب علم کے ذہن کو کبھی بوجھل نہ ہونے دیتے تھے، مشکل سے مشکل بحث ایسی سادگی اور سہولت سے مختصر وقت میں ذہن نشین کرادیتے کہ طلبہ کو اس کے مشکل ہونے کا احساس ہی نہ ہوتا تھا۔ بسا اوقات پورا درس دوران درس ہی خوب یاد ہو جاتا تھا۔

(۲) غیر ضروری اور غیر متعلق مباحث اور نکات کے بیان سے اجتناب فرماتے۔ حل کتاب پر پوری توجہ دیتے اور اصل توجہ مضامین مقصودہ کی طرف رہتی، طلبہ کو بھی اسی طرف متوجہ رکھتے۔

(۳) کوئی ضروری بحث یا مسئلہ مناسب تفصیل کے ساتھ ذہن نشین کرائے بغیر آگے نہ بڑھتے تھے۔
(۴) آپ کے درس سے طلبہ کو صرف کتاب یا حواشی سے نہیں بلکہ فن سے مناسبت پیدا ہوجاتی تھی۔
(۵) درس کی رفتار ہمیشہ معتدل ہوتی اور کتاب کے اول سے آخر تک یکساں رہتی تھی۔
(۶) آپ کا درس رسمی مباحث کا پابند نہ تھا بلکہ جس زمانہ میں جن مباحث کی زیادہ ضرورت محسوس فرماتے ان پر زیادہ زور دیتے تھے۔
(۷) جن مسائل کا تعلق زندگی کے جیتے جاگتے مسائل سے ہوتا یا جن سے عصر حاضر کی مشکلات کے حل میں مدد ملنے کی امید ہوتی ان کو آپ خصوصیت سے زیر بحث لاتے۔
(۸) طلبہ کو درس کے مباحث اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں متحرک، زندہ اور رچے بسے نظر آتے۔ وہ زندگی سے اپنی درسیات کا ربط نمایاں طور پر محسوس کرتے اور درس کی اہمیت گہرائی، اور وسعت کا کھلی آنکھوں مشاہدہ کرتے جو ان پر مطالعہ کے ذوق وشوق اور محنت وکامیابی کے دروازے کھول دیتا تھا۔
(۹) آپ کے درس کا ایک خاص اثر یہ تھا کہ طلبہ کے دلوں میں انبیاء کرام علیہم السلام، صحابہ کرام، ائمہ مجتہدین اور بزرگان سلف کی عقیدت ومحبت جاگزیں ہوجاتی تھی۔
(۱۰) دوران درس جن کتابوں کے حوالے آتے بسا اوقات ان کا اور ان کے مصنفین کا مختصر تعارف بھی کرا دیتے تاکہ طلبہ میں ان کے مطالعہ کی بھی رغبت پیدا ہو۔
(۱۱) کوئی طالب علم سوال کرتا تو اس کا سوال پوری توجہ سے سنتے اور اس کی ہمت افزائی فرماتے کوئی معقول اعتراض کرتا تو اپنی بات کی پچ کبھی نہ بہرتے، اعتراض کو قبول فرما لیتے کسی سوال کا جواب فوراً مستحضر نہ ہوتا تو فرماتے کہ تحقیق کرکے اس کا جواب دوں گا۔
(۱۲) درس حدیث میں تفقہ کا رنگ غالب رہتا تھا۔

آپ کے تلامذہ

آپ کے براہ راست شاگردوں کی تعداد یقین سے نہیں کہا جاسکتا کتنے ہزار ہوگی۔ برصغیر

ھند و پاکستان کے تمام صوبوں اور ریاستوں کے علاوہ چین، انڈونیشیا، ملایا، برما، سیلون، افغانستان، ایران، ترکستان، بخارا، سمرقند اور افریقہ وغیرہ کے بھی ہزارہا طلبہ نے آپ سے شرف تلمذ حاصل کیا ہے جن میں محدثین و مفسرین بھی ہیں، فقہاء و متکلمین بھی، صوفیاء کرام بھی ہیں، مبلغین و واعظین بھی، قاضی اور مفتیانِ کرام بھی ہیں اور دینی اداروں کے بانی و منتظمین بھی، سیاسی زعماء بھی ہیں اور مدرسین و مصنفین بھی، غرض دین کے ہر شعبہ میں آپ سے استفادہ کرنے والے جلیل القدر علماء دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں جہاں ان کی دینی خدمات مختلف شعبوں میں جاری ہیں۔ اب آپ کے براہِ راست شاگرد تو ایک ایک کرکے اٹھتے جارہے ہیں لیکن شاگردوں کے شاگرد اور ان کے شاگردوں کی تعداد روز افزوں ہے جو انشاء اللہ تعالیٰ بڑھتی ہی جائے گی۔

آپ کے مشہور تلامذہ کا مختصر مگر جامع تعارف حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے منظورِ نظر نواسے برخوردار عزیز مولوی رشید اشرف سلمہٗ مدرس دار العلوم کراچی نے اپنے ایک تحقیقی مقالہ میں کرایا ہے جو ماہنامہ البلاغ کے "مفتی اعظم نمبر" میں شائع ہو رہا ہے۔ یہاں آپ کے مشہور تلامذہ میں سے چند حضرات کے صرف اسماء گرامی لکھے جاتے ہیں۔

مشہور تلامذہ کے اسماءِ گرامی

۱۔ شیخ الحدیث علامہ سید محمد یوسف بنوری صاحب رحمۃ اللہ علیہ، بانی جامعۃ العلوم الاسلامیہ بنوری ٹاؤن کراچی و سابق امیر مجلس تحفظِ ختمِ نبوت و رکن اسلامی نظریاتی کونسل و صدر وفاق المدارس العربیہ پاکستان۔

۲۔ حضرت مولانا مسیح اللہ خاں صاحب مدظلہم خلیفۂ مجاز حضرت تھانویؒ و سربراہ مدرسہ مفتاح العلوم جلال آباد، ضلع مظفر نگر (بھارت)

۳۔ حضرت مولانا سید محمد میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ سابق ناظم اعلیٰ جمعیۃ علماء ہند۔

۴۔ شیخ الحدیث حضرت مولانا عبد الحق صاحب مدظلہم بانی و مہتمم دار العلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک (پشاور) و سابق رکن قومی اسمبلی پاکستان۔

۵۔ عالم محقق حضرت مولانا محمد سرفراز خاں صاحب صفدر، شیخ الحدیث نصرۃ العلوم گوجرانوالہ۔

۶۔ خطیب پاکستان حضرت مولانا احتشام الحق صاحب تھانوی مد ظلہم، بانی و مہتمم دار العلوم الاسلامیہ ٹنڈو الٰہ یار، سابق قائد مرکزی جمعیۃ علماء اسلام و سابق رکن اسلامی نظریاتی کونسل پاکستان۔

۷۔ شیخ القراء حضرت مولانا قاری فتح محمد صاحب پانی پتی، دام ظلہ، صدر شعبۂ حفظ و تجوید۔ دار العلوم کراچی، مقیم حال مکہ مکرمہ۔

۸۔ مولانا محمد انوار الحسن صاحب انور، شیرکوٹی، سابق صدر شعبۂ فارسی اسلامیہ کالج فیصل آباد (پنجاب)

۹۔ حضرت مولانا سید حسن صاحب دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ، مجازِ صحبت حضرت حکیم الامت تھانویؒ و سابق استاذ حدیث و تفسیر دار العلوم دیوبند۔

۱۰۔ حضرت مولانا مفتی رشید احمد صاحب لدھیانوی، بانی و مہتمم اشرف المدارس ناظم آباد کراچی۔

۱۱۔ حضرت مولانا مفتی سیاح الدین صاحب مد ظلہم، رکن اسلامی نظریاتی کونسل پاکستان۔

۱۲۔ حضرت مولانا سید بادشاہ گل صاحب مد ظلہم، مہتمم جامعہ اسلامیہ اکوڑہ خٹک۔ پشاور

۱۳۔ حضرت مولانا سید نور الحسن بخاری مد ظلہم، فاضل دیوبند و سرپرست تنظیم اہلسنت پاکستان۔

۱۴۔ حضرت مولانا عرض محمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ، بانی مدرسہ مطلع العلوم بروری روڈ، کوئٹہ بلوچستان۔

۱۵۔ حضرت مولانا قاری رعایت اللہ صاحب مد ظلہم۔ استاذ حدیث و سابق ناظم اعلیٰ دار العلوم کراچی۔

۱۶۔ حضرت مولانا سبحان محمود صاحب مد ظلہم استاذ حدیث و تفسیر و ناظم دار العلوم کراچی۔

۱۷۔ حضرت مولانا غلام محمد صاحب دامت برکاتہم۔ استاذ حدیث و تفسیر دار العلوم کراچی۔

۱۸۔ برادرِ عزیز مولانا محمد تقی صاحب عثمانی۔ استاذ حدیث و مدیر ماہنامہ البلاغ و نائب مہتمم دار العلوم کراچی و رکن اسلامی نظریاتی کونسل پاکستان۔

۱۹۔ حضرت مولانا قاضی عبد الکریم صاحب، صدر مدرس نجم المدارس کلاچی ڈیرہ اسمٰعیل خاں۔

۲۰۔ حضرت مولانا قاری عبد العزیز شوقی صاحب انبالوی سابق صدر مدرس دار العلوم الاسلامیہ۔ لاہور

۲۱۔ حضرت مولانا مفتی عبد الحکیم صاحب مفتی و استاذ حدیث مدرسہ اشرفیہ سکھر و رکن مجلس منتظمہ دار العلوم کراچی و خلیفہ مجاز حضرت مفتی اعظم رحمۃ اللہ علیہ

۲۲۔ حضرت مولانا صدیق احمد صاحب، صدر نظام اسلام پارٹی و شیخ الحدیث جامعہ اسلامیہ

پٹیہ چاٹگام بنگلہ دیش ۔
۲۳ ۔ حضرت مولانا مصلح الدین صاحب کشور گنج ضلع میمن سنگھ ۔ بنگلہ دیش ۔
۲۴ ۔ حضرت مولانا مفتی محی الدین صاحب خلیفہ مجاز حضرت مفتی اعظمؒ و مفتی و استاذ حدیث مدرسہ اشرف العلوم بڑا کٹرہ ۔ ڈھاکہ ۔
۲۵ ۔ مولانا عبدالقدوس صاحب ، صدر شعبہ عربی ۔ پشاور یونیورسٹی
۲۶ ۔ قاضی زین العابدین صاحب میرٹھی (مؤلف بیان اللسان)
۲۷ ۔ حضرت مولانا امیر الزماں کشمیری صاحب مہتمم مدرسہ عربیہ قاسم العلوم نعمان پورہ باغ پونچھ آزاد کشمیر ۔
۲۸ ۔ حضرت مولانا محمد یوسف صاحب مہتمم و شیخ الحدیث دار العلوم پلندری آزاد کشمیر
۲۹ ۔ مولانا عبدالصمد صارم صاحب (کئی مفید کتابوں کے مصنف ہیں)
۳۰ ۔ مولانا محمد آفتاب عالم صاحب مہاجر مدنی ۔ فرزند رشید حضرت مولانا بدر عالم صاحب رحمۃ اللہ علیہ

فتویٰ کی ذمہ داریاں

افتاء کا منصب علمی سلسلوں میں سب سے زیادہ اہم مشکل اور نازک ترین سمجھا گیا ہے فقہ کے لاکھوں ملتے جلتے مسائل کا تھوڑے تھوڑے سے فرق سے حکم بدل جاتا ہے ، بہت سے احکام زمانہ اور حالات کے تغیر سے بھی بدلتے ہیں جنھیں محسوس کرنا معاملہ فہمی ، عمیق علم اور وسعت معلومات کو چاہتا ہے ، مفتی میں جب تک فقہ سے کامل مناسبت ، ذہن و ذکاء میں خاص قسم کی صلاحیت ایک گونہ قوت اجتہاد ، حالات زمانہ پر گہری نظر ، کامل درجہ کی احتیاط کے ساتھ وسعت نظر ، صلاح و تقویٰ ، بردباری اور تواضع کی شانیں نہ ہوں اس منصب کا حق ادا نہیں ہو سکتا ۔

جب حضرت والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ نے دار العلوم دیوبند میں تدریس کا آغاز فرمایا ، اسوقت دار العلوم کے صدر مفتی حضرت مولانا عزیز الرحمٰن صاحب عثمانی تھے جو مذکورہ بالا صفات کے جامع ہی نہیں بلکہ مفتیانِ ہند کے استاد و مربی سمجھے جاتے تھے ، حضرت والد ماجدؒ نے ان سے مشکوٰۃ ، جلالین اور موطا وغیرہ کتابیں پڑھی تھیں ۔ آپ پر خصوصی شفقت فرماتے تھے ۔ دار العلوم دیوبند میں آنے

ہوئے سوالات گاہے گاہے والد صاحبؒ کو عنایت فرمادیتے۔ آپ جواب لکھ کر پیش کرتے، جو اصلاح و تصدیق کے بعد دارالافتاء سے جاری کر دیے جاتے مگر والد ماجدؒ کے تدریسی مشاغل کے سبب یہ سلسلہ کچھ زیادہ نہ رہ سکا اور سنہ ۱۳۵۰ھ تک تقریباً پندرہ سال آپ کے فرائض منصبی تدریس ہی تک محدود رہے۔

دارالعلوم دیوبند میں منصب افتاء کی پیشکش

۱۳۴۴ھ میں مفتی اعظم ہند حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحبؒ دارالعلوم سے مستعفی ہوگئے تو اس منصب کے لیے موزوں شخصیت کے انتخاب کا مشکل مرحلہ ذمہ داران دارالعلوم کے سامنے آیا۔ ضرورت ایسی جامع شخصیت کی تھی جو اس خلاء کو دارالعلوم دیوبند کے اعلیٰ تحقیقی معیار کے مطابق پُر کر سکے۔ چند سال تک دارالافتاء کا کام مختلف صورتوں سے جاری رہا۔ بالآخر اساتذہ، بزرگوں اور ذمہ داران دارالعلوم کی نگاہ انتخاب حضرت والد ماجدؒ پر آکر رکی۔

اس وقت آپ کی عمر ۳۵ سال تھی، ہر علم و فن کے اسباق متواتر پندرہ سال پڑھا چکے تھے، علمی تبحر سب کے نزدیک مسلّم مگر تواضع کی یہ شان اللہ تعالیٰ نے عطا فرمائی تھی کہ خود کو کسی طرح بھی اس منصب کا اہل نہ سمجھتے تھے۔ دارالعلوم کی طرف سے اس کی پیشکش ہوئی تو قبول کرنے میں آپ کو بہت پس و پیش ہوا۔

حکیم الامتؒ سے مشورہ

بالآخر حکیم الامتؒ حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہٗ جو والد ماجدؒ کے مرشد و مربی تو تھے ہی اس وقت دارالعلوم دیوبند کے بھی باضابطہ سرپرست تھے ان کی خدمت میں مشورہ کے لیے یہ خط لکھا۔

مکتوب ——— ۲۱ محرم سنہ ۱۳۵۰ھ

ایک ضروری عرض اس وقت یہ ہے کہ مدرسہ (دارالعلوم دیوبند) میں موجودہ مفتی صاحب

کے متعلق ارباب حل وعقد کو عام شکایت ہے۔ اس لیے وہ تبدیل کرنا چاہتے ہیں۔ پہلے بھی اس سلسلے میں ایک مرتبہ میرا نام لیا گیا تھا مگر نامکمل بات ہو کر رہ گئی تھی۔ اس مرتبہ پھر یہ سلسلہ اٹھا ہے اور بیان اکثر حضرات مجھے اس کام کے لیے مقرر کرنا چاہتے ہیں۔

کام فی نفسہٖ سخت ہے اور پھر مجھ جیسے ناکارہ و نااہل کے لیے جس کو اس کام کی اب تک کچھ زیادہ نوبت بھی نہیں آئی۔ گو یہ تجویز ہوا ہے کہ مولانا سید اصغر حسین صاحب یا مولانا اعزاز علی صاحب کے ملاحظہ کے بعد فتاوی روانہ کیے جائیں گے۔ تاہم ابتدائی کام تو مجھے ہی کرنا پڑے گا۔

البتہ یہ نفع بھی اس میں معلوم ہوتا ہے کہ اگر کام قابو میں آگیا تو دینی نفع بھی بہت بڑا ہے اور درس و تدریس میں جو دماغی تکلیف میری وسعت سے زائد ہو رہی تھی اس میں تخفیف ہو جائے گی۔[1] ایسی حالت میں مجھے کیا کرنا چاہیے؟ اس کا حل حضرت ہی کی زبان فیض ترجمان سے چاہتا ہوں۔

حضرت مرشد تھانویؒ نے جواب میں تحریر فرمایا کہ:

"قبول کر لینا چاہیے۔ حدیث "اِنْ اُکْرِهْتَ عَلَیْهَا اُعِنْتَ عَلَیْهَا"[2] میں وعدہ ہے۔

بحیثیت صدر مُفتی دارالعلوم دیوبند

مختصر یہ کہ ۲۸ ربیع الاول سنہ ۱۳۵۰ھ میں آپ کو دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ[3] نے منصب افتاء پر بحیثیت صدر مُفتی فائز کر دیا۔

آپ حسب عادت پوری جانفشانی کے ساتھ اس مشکل ترین علمی کام میں منہمک ہو گئے۔ درس کا

---

[1] اس زمانہ میں والد صاحبؒ کے ذمہ اوپر کے درجات کے چھ اسباق تھے۔ ترجمہ قرآن کا درس ان کے علاوہ تھا۔ ہر درس میں تقریباً ڈیڑھ سو طلبہ شریک ہوتے تھے جن تک آواز پہنچانا ہی سخت محنت کا کام تھا۔

(مکاتیب حکیم الامت ص ۹۸،۹۷، ۱۵۰ مخطوطہ) [2] آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ: اگر تمھیں کسی منصب کے لیے مجبور کیا جائے تو قبول کر لینے میں مضائقہ نہیں۔ اس میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے تمھاری مدد کی جائیگی" رفیع

[3] مراسلہ ۱۱۷ از دفتر اہتمام (دارالعلوم دیوبند، قلمی) مؤرخہ ۲ ربیع الثانی سنہ ۱۳۵۰ھ نیز مقدمہ فتاویٰ دارالعلوم دیوبند (ص ۱۰۹، مطبوعہ کراچی)

سلسلہ بھی جزوی طور پر جاری رہا۔ اس وقت آپ کا مشاہرہ پینتالیس ۴۵ روپے مقرر کیا گیا۔

آپ کے فتاویٰ پر نظر کرنے کے لیے آپ ہی کی خواہش پر آپ کے استاذ محترم حضرت مولانا سید میاں اصغر حسین صاحبؒ کو مامور کر دیا گیا تھا۔ اہم اور مشکل فتاویٰ میں حکیم الامت حضرت تھانویؒ سے مشوروں کا سلسلہ زبانی اور بذریعہ خط و کتابت جاری رہتا تھا مگر اس زمانے کے کاغذات جو حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے پاس محفوظ تھے اور اب احقر کے سامنے ہیں، ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے نظر فرمانے کا سلسلہ کچھ زیادہ عرصہ تک باقاعدگی سے جاری نہیں رہا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بہت جلد ہی آپ کے فتاویٰ پر بزرگوں کو اتنا اعتماد ہو گیا تھا کہ آگے اس کی ضرورت نہ سمجھی گئی، البتہ حضرت والد صاحبؒ کو جب ذرا موقع ملتا یا کسی فتویٰ میں ادنیٰ تردد ہوتا تو ان بزرگوں سے پورے اہتمام کے ساتھ استفادہ فرماتے رہتے

اس ذمہ داری کے متعلق آپ کے تاثرات اور طریق کار

ان نئی ذمہ داریوں کے متعلق آپ کا تاثر اور طریق کار اس مکتوب گرامی سے واضح ہوتا ہے جو آپ نے حکیم الامت حضرت تھانویؒ کی خدمت میں ۲۴ صفر سنہ ۱۳۵۰ھ کو تحریر فرمایا۔ اس خط پر پڑی ہوئی تاریخ ہی سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ دارالعلوم کی مجلس شوریٰ نے آپ کے دارالافتاء میں تبادلہ کا باضابطہ فیصلہ اگرچہ ربیع الاول سنہ ۱۳۵۰ھ میں کیا مگر عملاً یہ ذمہ داریاں آپ صفر سنہ ۱۳۵۰ھ ہی میں سنبھال چکے تھے۔ خط میں تحریر فرماتے ہیں[1] کہ :

> "فتویٰ کا کام فی نفسہ سخت مشکل ہے، بالخصوص مدرسہ دیوبند میں کہ یہاں فتاویٰ کی کثرت بھی ہے اور لوگ اہم فتاویٰ کو یہاں بھیجتے ہیں پھر یہاں فتاویٰ لکھنے کا ایک خاص طرز بنا ہوا ہے۔ اس میں مفتی پر کام بہت بڑھ جاتا ہے۔ بایں وجوہ ابتداء میں طبیعت گھبراتی تھی، مگر تھانہ بھون سے واپسی کے بعد ہی سے حضرت والا کی عنایات اور توجہ کا نتیجہ اس صورت میں ظاہر ہو رہا ہے کہ الحمد للہ زیادہ الجھن نہیں ہوتی جس مسئلہ کی تلاش ہوتی ہے وہ آسانی سے مل جاتا ہے اور جس میں شفا نہیں ہوتی اکابر دارالعلوم

---

[1] مکاتیب حکیم الامت ص ۹۸ (مخطوطہ)

سے تحقیق کر لیتا ہوں۔ بہر حال یہ جو کچھ ہوا حضرت کی دُعا و توجہ کا نتیجہ ہے اور آگے بھی اسی کا محتاج ہوں"۔

حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو ہر کام نہایت مستعدی، احساس ذمہ داری، احتیاط اور پھرتی سے نمٹانے کی عادت تھی۔ دارالعلوم دیوبند کے دارالافتاء سے جو فتاویٰ جاری ہوتے تھے۔ آپ کے دارالافتاء میں منتقل ہوتے ہی ان کی تعداد اور کیفیت وضخامت میں نمایاں اضافہ ہوا جس کا اندازہ ان اعداد و شمار سے ہوتا ہے جو ۱۵ شوال ۱۳۵۰ھ میں دفتر اہتمام کی ہدایت پر تیار کیے گئے تھے [1] ان اعداد و شمار سے پتہ چلتا ہے کہ ہر سال فتاویٰ کی تعداد میں بھی اضافہ ہوا اور فتاویٰ زیادہ محققانہ اور مفصل بھی ہونے لگے۔ ۱۳۴۸ھ میں (یعنی یکم شوال ۱۳۴۸ھ سے ۳۰ رمضان ۱۳۴۹ھ تک ایک سال میں) دارالعلوم دیوبند کے دارالافتاء سے کل ۲۸۷۵ فتویٰ جاری کیے گئے جو نقل فتاویٰ کے رجسٹر میں ۴۰۴ صفحات پر مشتمل تھے لیکن اگلے سال [2] کے وسط میں جب فتویٰ کا کام حضرت والد صاحب کے سپرد کیا گیا تو اس سال صرف چھ ماہ میں فتاویٰ کی تعداد میں ۶۶۱ کا اور رجسٹر کے صفحات میں نو سے کا اضافہ ہوا، پھر یہ اضافہ روز افزوں ہوتا گیا۔ ۱۳۵۲ھ میں فتاویٰ کی تعداد ۴۶۰۵ (چار ہزار چھ سو پانچ) اور صفحات رجسٹر کی تعداد ۷۶۸ ہو گئی جو ۴۸ھ کے مقابلے میں تقریباً دو چند ہے۔

اعداد و شمار سے واضح ہوتا ہے کہ آپ نے صرف چار سال کے عرصہ میں بارہ ہزار "۱۲۰۰۰" سے زیادہ فتاویٰ تحریر فرمائے جن میں سے صرف ایک ہزار "امداد المفتین" کے نام سے شائع ہوئے، باقی دارالعلوم دیوبند کے رجسٹروں میں محفوظ ہیں۔ ان میں سے تقریباً اڑتیس فتاویٰ اتنے مفصل اور تحقیقی انداز میں لکھے گئے ہیں کہ وہ مستقل رسالے بن کر کچھ "امداد المفتین" میں، کچھ جواہر الفقہ [3] میں اور کچھ الگ مستقل کتابچوں کی صورت میں شائع ہوئے۔ دارالافتاء میں دُنیا بھر کے ممالک سے فقہی سوالات کا تانتا بندھا

---

[1] ان کی ایک نقل حضرت والد صاحبؒ کے کاغذات میں محفوظ تھی جو اس وقت احقر کے سامنے ہے۔ رفیع

[2] دارالعلوم کا تعلیمی سال مراد ہے جو یکم شوال سے شروع ہوتا ہے۔

[3] یہ کتاب حضرت والد صاحبؒ کے چالیس فقہی رسائل کا مجموعہ ہے۔ دو جلدوں میں مکتبہ دارالعلوم کراچی سے شائع ہوئی ہے۔ رفیع

رہتا تھا خصوصاً جن پیچیدہ مسائل میں علما کا باہمی اختلافِ رائے ہوتا وہ بھی فیصلہ کے لیے میں آتے تھے حضرت والد صاحب فریقین کے آرا اور دلائل و تحقیقات کا تنقیدی جائزہ لے کر اپنی تحقیق اور فیصلہ تحریر فرماتے۔ فتاویٰ کی مذکورہ بالا تعداد میں ایسے فتاویٰ بھی بکثرت ہیں۔

استغفار کی خواہش اور خشیت و تواضع

آپ کے فتاویٰ اور فقہی تحقیقات کو اس زمانہ کے فقہاء، اربابِ فتویٰ اور آپ کے بزرگوں نے جس انداز میں سراہا اور دل کھول کر داد اور دُعائیں دیں اس کی تفصیلات بہت ہیں جن کا یہ موقع نہیں مگر حضرت والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ کی خشیت اور تواضع کا یہ عالم تھا کہ ہر وقت اس فکر سے پریشان رہتے کہ کسی فتوے میں غلطی نہ ہو جائے چنانچہ حکیم الامت حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے نام ایک خط (مورخہ ۱۴ رمضان ۱۳۵۰ھ) میں تحریر فرماتے ہیں کہ :

"اس وقت فتویٰ لکھنا ایک پہاڑ معلوم ہوتا ہے اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ کام میرے بس کا نہیں، اس لیے حیران ہوں کہ کیا کروں ؟ کیا یہ درخواست کروں، کہ مدرسہ والے مجھے اس سے معافی دیں اور پھر درس میں لے لیا جائے ؟ کیونکہ وہاں طلباء چل نہیں سکیں شاید وہاں میرے لیے بہ نسبت اس کام کے وہ کام زیادہ اچھا ہو ؟"

مُرشد تھانویؒ نے تسلی دی کہ :

"جب اللہ تعالیٰ نے خشیت کا یہ غلبہ دیا ہے تو اعانت بھی ہوگی جیسا احادیث میں وعدہ ہے۔ اگر مدت معتد بہا کے بعد اس کی ضرورت محسوس ہوگی۔ بعد میں مشورہ ہر وقت ممکن ہے"[1]

اپنے مرشد اور بزرگوں کی ایسی ہی تسلیوں اور ہدایات کی بنا پر آپ اس کام میں جانفشانی سے لگے رہے مگر یہ سمجھنے کے لیے آپ کسی طرح تیار نہ تھے کہ اس کام کی اہلیت بھی میرے اندر ہے۔ اسی خشیت و تواضع کا غلبہ تھا جس نے مقدمہ[2] امداد المفتین میں آپ سے یہ لکھوایا ہے کہ :

---

[1] مکاتیب حکیم الامت ص ۷۷ (مخطوطہ)

[2] مقدمہ فتاویٰ دارالعلوم دیوبند (امداد المفتین) ص ۱۱، ۱۲

"میں اپنی علمی بے بضاعتی سے بے خبر تو نہ تھا مگر یہ حقیقت ہے کہ اس کام کے لیے علم کے جس پایہ و منزلت کی ضرورت تھی اس سے پورا واقف بھی نہ تھا، تعلیمی خدمتوں کی طرح حضرات اساتذہ اور بالخصوص سیّدی و استاذی حکیم الامت مجدّد الملت حضرت تھانوی قدس سرہٗ کی امداد و اعانت کے بھروسہ اس بار کو سر پر اٹھا لیا کئی سال تک کام کرنے کے بعد اس علم تک رسائی ہوئی کہ یہ کام مجھ جیسے بے بضاعت و بے لیاقت لوگوں کا نہیں"

سمجھے اتنا کہ کچھ نہ سمجھے ہائے
سو بھی ایک عمر میں ہُوا معلوم

تحقیق و تنقید اور اختلافِ رائے کا اسلوب

فتوٰی کی ذمہ داری آجانے کے بعد حضرت حکیم الامتؒ سے خط و کتابت کا رنگ بھی خاصا بدل گیا تھا۔ ان خطوط میں اب بڑا حصہ پیچیدہ فقہی تحقیقات نے لے لیا تھا بعض اوقات کسی مسئلہ کی تحقیق میں مُرشد و مُرید کا اختلاف بھی ہوجاتا۔ صفحے کے صفحے اپنے اپنے دلائل اور اشکالات کے جواب میں ذریعہ خطوط لکھے جاتے، کبھی مُرید اپنے مُرشد کی تحقیق کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیتا، کبھی مُرشد مُرید کی تحقیق کو ترجیح دے کر اپنی رائے سے رجوع کر لیتا اور اگر کبھی ایک دُوسرے کے دلائل میں پورے غور و فکر اور باہمی مشوروں کے باوجود اختلاف رائے باقی رہتا تو مسئلہ دریافت کرنے والے پر اختلاف کا اظہار کر دیا جاتا تاکہ اُسے جس کے فتوٰی پر زیادہ اطمینان ہو اس کے مطابق عمل کرے۔

حضرت حکیم الامتؒ کے کسی فتوٰی پر اگر والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو کوئی اشکال ہوتا تو اسے طالبعلمانہ اسلوب میں نہایت ادب و احترام کے ساتھ مگر خوب مُدلّل انداز میں پیش فرماتے، اشکالات پیش کرنے کا انداز ایسا متواضعانہ اور مُدلّل ہوتا کہ جواب میں مُرشد کے قلم سے بے ساختہ دُعائیں نکلتیں حُسنِ نظر کی بھی داد ملتی، حُسنِ بیان اور حُسنِ ادب کی بھی۔

اس سلسلہ کی جو خط و کتابت "مکاتیب حکیم الامتؒ" میں محفوظ ہے وہ تحقیق و تنقید، بے نفسی، اور حق پرستی کا ایسا جیتا جاگتا نمونہ ہے کہ آج کل کی دُنیا میں اس کی مثالیں نایاب ہیں۔ آج کل تو

دعووں اور اظہارِ برتری کا نام علمی تحقیق رکھ دیا گیا اور جملہ بازی اور دُوسرے کی تنقیص و تذلیل کو "تنقید" کا مقدس نام دے دیا گیا ہے، کسی سے عقیدت ہو تو "اٰمنّا و صدّقنا" کی صدائیں بلند ہونے لگتی ہیں عقیدت نہ ہو تو اس کی ہر دلیل صدا بصحرا ثابت ہوتی ہے، جو بات ایک مرتبہ زبان یا قلم سے نکل گئی، پتھر کی لکیر بن کر وقار کا مسئلہ بن جاتی ہے لیکن یہ سب باتیں نفسانیت کی پیداوار ہیں اور جہاں فریقین کا مقصود ہی حق کی تلاش ہو وہاں یہ سوال پیدا نہیں ہوتا کہ کہنے والا میری رائے کے موافق کہہ رہا ہے یا مخالف وہاں نظر اس پر رہتی ہے کہ کیا کہہ رہا ہے، کس دلیل سے کہہ رہا ہے چنانچہ حضرت حکیم الامتؒ کے یہاں جو فتاویٰ کا سلسلہ جاری تھا ان میں آپ نے ایک مستقل باب "ترجیح الراجح" مقرر کیا تھا، اس باب میں وہ فتاویٰ درج کیے جاتے تھے جن سے حضرت نے کسی کی توجہ دلانے سے یا خود ہی تحقیق بدل جانے کے باعث رجوع کر لیا ہو۔ اسی طرح حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے مجموعہ فتاویٰ میں ایک مستقل باب "اختیار الصواب" کے نام سے اس غرض کے لیے مقرر کیا ہوا تھا، اگر دُوسرے کی تحقیق پر دیانت دارانہ طور پر دل مطمئن ہو جائے تو ان حضرات کو اپنی سابقہ رائے سے رجُوع کرنے میں کوئی دشواری تو کیا محسوس ہوتی والہانہ طور پر احسان مند ہوتے تھے۔ جیسے پیاسے کو پانی مل گیا ہو، احقر نے حضرت والد صاحبؒ کا ہمیشہ یہی رنگ دیکھا ہے، سلف صالحین، صحابہ و تابعین اور ائمہ مجتہدین کا یہی رنگ تھا اور اسی کی تعلیم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دی تھی، واقعہ یہ ہے کہ جب تک ان حضرات کی تحقیق و تنقید کا نمونہ سامنے نہ ہو دل میں تحقیق و تنقید کا تقدس پیدا ہونا ہی مشکل ہے۔

خود رائی اور خود بینی سے والد صاحبؒ کو سخت نفرت تھی، روز مرہ کے عام معاملات میں بھی اپنے چھوٹوں تک سے مشورہ لینے کے عادی تھے بالخصوص فتویٰ جو دُنیا و آخرت کی نازک ذمہ داری تھی اس میں تو سب ہی بزرگوں سے اور خصوصاً حضرت حکیم الامتؒ سے استفادہ کرنے کا کوئی موقع فروگذاشت نہ فرماتے تھے، یہ استفادہ بیس سال جاری رہا۔ اپنے اساتذہ اور بزرگوں کی عظمت و عقیدت آپ کی رگ رگ میں سمائی ہوئی تھی لیکن یہ بھی ایک واقعہ ہے کہ آپ نے کبھی اس عقیدت کو مسائل کی تحقیق و تنقید میں حائل نہیں ہونے دیا اور نہ کبھی اپنی تنقید سے کسی کی عظمت و عقیدت پر حرف آنے دیا۔ آج کسی سے عقیدت اور اسی پر علمی تنقید کو اگرچہ باہم متعارض سمجھا جاتا ہو لیکن حضرت والد صاحب قدس سرہٗ ان دونوں متعارض باتوں کو ہمیشہ ساتھ لے کر چلنے کے عادی رہے۔ ایسا کرنا مشکل ضرور ہے لیکن اس مشکل کو آپ نے جس

خوش اسلوبی سے انجام دیا وہ اہلِ علم کے لیے قابلِ تقلید نمونہ ہے۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ آپ کے سب بزرگوں کو آپ کی علمی تحقیقات پر اعتماد اور آپ کی ذات سے محبت اور شفقت میں اضافہ ہوتا گیا۔

آپ نے فتویٰ کا کام اس جانفشانی کے ساتھ جاری رکھا کہ دار العلوم کی طرف سے تو صرف چھ گھنٹہ کی پابندی تھی مگر آپ روزانہ دس بارہ گھنٹے اس میں لگاتے تھے[1] تصنیف و تدریس کا سلسلہ بھی ساتھ جاری تھا۔

ایک خواب

اسی زمانہ میں رام پور کے ایک عالم دین حضرت مولانا محمود صاحب نے خواب دیکھا کہ دار الافتا میں جہاں حضرت والد صاحب بیٹھتے ہیں وہاں حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ آرام فرما رہے ہیں[2]۔ یہ معلوم ہی ہے کہ حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ فقہ اور فتویٰ میں تمام علماء دیوبند کے امام سمجھے جاتے تھے، اور اسی لیے ان کو اپنے زمانے کا ابُوحنیفہؒ کہا جاتا ہے۔

ایک فتویٰ کے خلاف مُلک گیر فتنہ

اسی زمانہ میں ایک فتنہ یہ پیش آیا کہ دار العلوم دیوبند کے دار الافتا میں ایسے سوالات کی کثرت ہوگئی جن میں نسب کے متعلق عوام کی بے اعتدالیوں اور افراط و تفریط کے متعلق شرعی احکام دریافت کیے جاتے تھے۔ اس سلسلہ میں بنیادی طور پر تین قسم کی بے اعتدالیاں سامنے آئیں جو مسلم معاشرے میں پھیلی ہوئی تھیں (۱) بعض لوگ جن کو اللہ تعالیٰ نے خاندانی شرافت عطا فرمائی تھی، اپنے نسب پر بے جا فخر و غرور اور دوسروں کی تحقیر کرنے لگے اور اپنے اعمال و اخلاق سے بے پروا ہو کر صرف اس پر مطمئن ہو کر بیٹھ گئے کہ ہم فلاں بزرگ یا فلاں بادشاہ کی اولاد میں ہیں (۲) ان کے مقابلے میں بعض دوسری برادریاں اس کے درپے ہوگئیں کہ اپنے آپ کو اصلی نسب کے بجائے کسی اونچے نسب کی طرف منسوب کرنے لگیں۔ اسلام میں یہ دونوں باتیں مذموم ہیں۔ بعض مسائل میں شریعت نے انساب کے تفاوت کا اعتبار ایک حد تک

---

[1] مکاتیب حکیم الامتؒ ص ۸۴ (مخطوطہ)۔ [2] مکاتیب حکیم الامتؒ ص ۸۰ (مخطوطہ)

ضرور کیا ہے مگر اصل کرامت و فضیلت کا مدار تقویٰ اور پرہیزگاری پر رکھا ہے۔ اُدھر اپنے اصلی نسب پر پردہ ڈال کر خود کو کسی دوسرے نسب کی طرف منسوب کرنا بھی حرام ہے۔ احادیث میں اس پر سخت وعیدیں آئی ہیں۔

ان دونوں کے مقابلے میں ایک تیسری جماعت نے انساب اور پیشوں کے باہمی تفاوت کا نکاح وغیرہ کے ان مسائل میں بھی سرے سے انکار شروع کر دیا جن میں شریعت نے اسے معتبر مانا ہے۔ ان لوگوں نے اسلامی مساوات کا یہ مفہوم تراشا کہ نکاح میں کفاءت کا اعتبار غیر ضروری ہے۔ ہر مرد ہر عورت کے لیے کفو ہے خواہ دونوں کے نسب اور خاندانی پیشوں میں زمین و آسمان کا تفاوت ہو۔ یہ بات بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صریح ارشادات اور شرعی احکام کے خلاف تھی۔

جب دارالافتاء میں ان بے اعتدالیوں کے متعلق سوالات کی کثرت ہوئی تو حضرت والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ نے اس وقت کے دارالعلوم کے سرپرست حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے مشورہ سے ایک رسالہ تالیف فرمایا جس کا عربی نام "نہایات الأرب فی غایات النسب" اور اُردو نام "اسلام اور نسبی امتیازات" ہے۔ پورا رسالہ شگفتہ اُردو میں ہے۔ ۸، رجب ۱۳۵۱ھ کو اس کی تالیف مکمل ہوئی اور اسی سال شائع ہو گیا۔ اس رسالہ میں آپ نے مندرجہ ذیل مسائل کی تشریح اپنے مخصوص معتدل فقہی انداز میں فرمائی۔

۱۔ اسلام اور نسبی امتیازات
۲۔ اسلامی مساوات کی حقیقت
۳۔ اللہ تعالیٰ کے نزدیک فضیلت کا مدار تقویٰ پر ہے۔
۴۔ معاملات نکاح میں نسب اور پیشوں کا تفاوت ہے۔
۵۔ غیر کفو میں نکاح کی شرعی حیثیت۔
۶۔ اُونچے نسب پر فخر و غرور کی حرمت۔
۷۔ خود کو اپنے اصلی نسب کے بجائے کسی دوسرے نسب سے منسوب کرنا حرام ہے۔

اس موضوع پر اُردو میں یہ پہلا جامع اور تحقیقی رسالہ تھا علمی حلقوں میں بہت پسند کیا گیا۔ آپ کے اساتذہ اور اکابر علماء نے اس پر تقریظیں لکھیں، حکیم الامت حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے تو

اس پر گیارہ صفحات کی اتنی مفصل تقریظ تحریر فرمائی کہ وہ خود ایک رسالہ کی صورت اختیار کر گئی، جو "وصل السبب فی فصل النسب" کے نام سے اسی رسالہ کے ساتھ شائع ہوئی۔

ایک سازش

لیکن شخصیت جتنی باکمال ہوتی ہے اس کے حاسد بھی ہوتے ہیں۔ حضرت والد صاحبؒ کو بھی حاسدوں کی ریشہ دوانیوں سے بہت ایذائیں پہنچیں اور آخر حیات تک پہنچتی رہیں۔ آپ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہر علمی میدان میں جو تیز گام مقبولیت حاصل ہو رہی تھی حاسدوں کے لیے ناقابل برداشت تھی انھوں نے رسالہ "اسلام اور نسبی امتیازات" کی تالیفات سے پہلے بھی آپ کو ایک فتویٰ کے سلسلے میں بدنام کرنے کے لیے سازش کا جال تیار کیا تھا جس کا تانا بانا مسلسل تین ماہ کی جدوجہد سے بُنا گیا تھا مگر حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدنی رحمۃ اللہ علیہ کو بروقت علم ہوگیا اور انھوں نے دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ کے رُوبرُو اس ناپاک سازش کی تفصیلات بتاکر اس کا تار و پود بکھیر دیا۔ والد صاحبؒ کو اس سازش کا علم بعد میں ہوا۔[۱]

رسالہ "اسلام اور نسبی امتیازات" شائع ہوا تو حاسدوں کی کینہ پرور صلاحیتیں پھر حرکت میں آئیں۔ اس مرتبہ ان کو کچھ سیاسی لوگوں کا تعاون بھی حاصل ہوگیا تھا۔ نیز آریوں اور عیسائی پادریوں نے بھی اس فتنہ کو ہوا دی۔[۲] صنعت پیشہ برادریوں کو بہکایا گیا کہ مفتی صاحب نے تم سب کے دوزخی ہونے کا فتویٰ دے دیا ہے۔ ان سادہ دل عوام کو رسالہ کی بعض عبارتیں سیاق و سباق سے کاٹ کر سُنائی گئیں اور بعض عبارتیں خود ایجاد کر کے والد صاحب کی طرف منسوب کر دی گئیں یہ کام دیوبند میں بھی ہوا اور دیوبند سے باہر بھی۔

ایک لطیفہ

فتنہ پردازوں نے کتنی کاوش سے کام لیا تھا اس کا اندازہ اس واقعہ بلکہ لطیفہ سے ہوگا

---

[۱] مکاتیب حکیم الامتؒ ص ۲۰۹ (مخطوطہ)۔ [۲] مکاتیب حکیم الامتؒ ص ۱۷۱ (قلمی)

کہ اس رسالہ کی طباعت کے وقت پریس کی غلطی سے بعض فرمے غلط چھپ گئے۔ اُن کی کوٹ غلط ہو جانے کے باعث ایک صفحہ پر جو مضمون تھا وہی اگلے صفحے پر مکرر چھپ گیا۔ مجبوراً دو دو ورق باہم چپکا کر ایک ورق بنایا گیا۔ بعض لوگوں نے اس میں یہ نکتہ پیدا کیا کہ ان چپکے ہوئے صفحات میں صنعت پیشہ برادریوں کے خلاف گالیاں لکھی ہوں گی، اسی لیے انھیں چپکایا گیا ہے کہ ہر ایک نہ پڑھ سکے۔ یہ سُن کر بعض لوگ اس دردِ سری میں مُبتلا ہو گئے کہ اس رسالہ کے نسخے خرید کر چپکے ہوئے صفحات ایک دُوسرے سے بمشکل چھڑاتے اور اندر کا مضمون پڑھنے کی کوشش کرتے تھے۔

خلاصہ یہ کہ منظم سازش کامیاب ہُوئی اور ملک کے کتنے ہی علاقوں سے مخالفانہ قرار دادیں پاس ہو کر دیوبند آنے لگیں۔ نئے نئے اخبارات غم و غصہ کے اظہار کے لیے جاری ہوئے۔ جلسے، جلوس، دھمکیاں اور قتل کے منصوبے روز روز کا معمول بن گئے۔ یہ سلسلہ ۱۳۵۳ھ کے اوائل سے ۱۳۵۴ھ کے اواخر تک جاری رہا ——— اس رسالہ پر جو بُہتان لگائے گئے تھے چونکہ صرف عناد اُن کا محرک تھا اس لیے حضرت تھانویؒ نے والد صاحبؒ کو خط میں لکھا کہ:

"کسی بات کا جواب نہ دیا جائے۔ انشاءاللہ۔ فَجَعَلْنٰهُمُ الْاَخْسَرِيْنَ۔ فَجَعَلْنٰهُمُ الْاَسْفَلِيْنَ کا ظہور ہوگا۔ بچوں کو لے کر سلام و دُعا۔" [1]

بے نفسی اور غم خواری

مگر جب یہ محسوس ہُوا کہ بے چارے سادہ دل عوام کو رسالہ کے اصل مضمون کی خبر نہیں صرف افواہوں سے متاثر ہو کر اس رنج و غم میں مُبتلا ہوئے ہیں کہ ہمارے پیشہ کے خلاف لکھا گیا ہے، تو والد ماجدؒ نے حکیم الامت حضرت تھانویؒ، حضرت مولانا سید اصغر حسین صاحبؒ اور حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی صاحبؒ کے مشورہ سے ایک تسلی آمیز مضمون شائع کر کے حقیقت حال کو واضح کیا اور مطبوعہ رسالہ کی اشاعت بالکل روک دی۔ ناشر چونکہ خود والد صاحبؒ تھے۔ اس کا مالی نقصان بھی آپ پر پڑا مگر عوام کی دلجوئی کے لیے اسے برداشت فرمایا۔ دوسرا کام یہ کیا کہ مخالفین نے جن

---

[1] مکاتیب حکیم الامت ص۱۱۵۔ مورخہ ۱۴ جمادی الاولیٰ ۱۳۵۳ھ

عبارتوں سے عوام کو دھوکہ دے کر فتنہ پھیلایا تھا ان میں ترمیم کر کے رسالہ دوبارہ شائع کیا تاکہ اب کسی لفظ سے عوام کو غلط فہمی میں مبتلا نہ کیا جا سکے۔[1]

مگر جن لوگوں نے اس رسالہ کا پہلا ایڈیشن تعصب کے بغیر پڑھا تھا وہ پہلے بھی شاکی ہونے کی بجائے اس رسالہ کے مداح تھے حتیٰ کہ جن برادریوں میں غم و غصہ پھیلایا گیا تھا انہی برادریوں کے لوگوں نے اس رسالہ کی حمایت میں مضامین[2] شائع کیے لیکن بعضوں نے دوسرا ایڈیشن بھی فساد انگیزی ہی کی نیت سے پڑھا یا پڑھے بغیر محض افواہوں پر اعتماد کر بیٹھے ان کی فتنہ سامانیوں میں فرق نہ آیا۔

آپ کی طرف سے اکابر علماء کی مدافعت

یہ تو ہمیشہ ہوتا آیا ہے کہ کسی مصنف پر مخالفین نے ناحق اعتراضات کیے تو اس کے شاگردوں یا بعد کے علماء نے اس کا علمی دفاع کیا اور مدافعت میں کتابیں تصنیف کیں لیکن ایسی شاذ ہی شکل سے ملیں گی کہ مصنف کے اساتذہ اور بزرگوں نے اس کی مدافعت میں تصنیفیں لکھی اور مناظرے کیے ہوں۔ حضرت والد صاحبؒ کے ساتھ یہ دوسری ہی صورت پیش آئی جس کی کچھ تفصیل یہ ہے۔

آپ کی حمایت میں حکیم الامتؒ کا رسالہ

فتنہ حد سے بڑھا تو حکیم الامت حضرت تھانویؒ نے علاوہ اُس محققانہ تقریظ کے جو رسالہ کے پہلے ہی ایڈیشن میں چھپ چکی تھی، رجب ۱۳۵۳ھ میں ایک مستقل رسالہ بنام "رفع الغلط لدفع الشطط" تصنیف[3] فرمایا جس میں والد صاحب کی عبارات نقل کر کے واضح فرمایا کہ بعض برادریوں کے متعلق جو بات مفتی صاحب کی طرف منسوب کی گئی ہے سراسر بہتان ہے کوئی شخص اس گھڑے ہوئے مضمون کو پورے رسالہ میں نہیں دکھلا سکتا اور جو بات مفتی صاحب نے لکھی ہے وہ احادیث نبویہ اور تصریحات فقہاء کے عین مطابق

---

[1] مکاتیب حکیم الامت ص۱۲۷ (مخطوطہ)

[2] مکاتیب حکیم الامت ص۱۲۱ مورخہ ۱۹ جمادی الثانیہ ۱۳۵۳ھ (مخطوطہ) [3] یہ رسالہ حضرت والد صاحبؒ کے رسالہ "اسلام اور نسبی امتیازات" کے ساتھ جواہر الفقہ جلد دوم میں بھی طبع ہو گیا ہے۔

ہے۔ ان سے کسی قوم یا برادری کی دل آزاری کا جو افسانہ گھڑا گیا ہے اس کی حقیقت افسانہ سے زیادہ کچھ نہیں۔

حضرت مولانا اصغر حسین صاحبؒ کی تالیف

والد صاحبؒ کے استاذ محترم حضرت مولانا سید میاں اصغر حسین صاحبؒ نے بھی ایک رسالہ تالیف فرمایا جس میں[1] اپنے مضامین کے علاوہ کچھ دوسرے علماء کرام کے مضامین بھی جمع فرما دیئے جو والد صاحبؒ کے رسالہ کی تائید میں لکھے گئے تھے۔

حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدنیؒ کی تقریر اور مخالفین سے مناظرہ

دیوبند میں ان تمام برادریوں کا ایک عظیم الشان جلسہ منعقد ہوا جن کو والد صاحبؒ کے خلاف مشتعل کیا گیا تھا اس جلسہ میں حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنیؒ کی تقریر کا انتظام بعض سیاسی عناصر نے اس مقصد سے کیا تھا کہ اپنے مفید طلب کوئی بات کہلوا سکیں مگر حضرت مدنیؒ نے اپنی تقریر میں والد صاحب کے رسالہ کی اوّل سے آخر تک ایسی تائید و حمایت فرمائی کہ والد صاحب فرماتے ہیں کہ میں خود بھی ایسی نہ کر سکتا۔ تقریباً چار گھنٹے تقریر اور ایک گھنٹہ مسلسل لوگوں کے سوال و جواب کا سلسلہ رہا حضرت مدنیؒ سب کا جواب اسی رسالہ کی عبارات پڑھ پڑھ کر دیتے رہے[2]

مخلصین کی جانثاری

اس پُرآشوب دور میں ہر وقت آپ کی جان کو خطرہ لاحق تھا۔ قتل کے منصوبے آئے دن کا معمول بنے ہوئے تھے، اعزہ و احباب فکرمند اور آپ کے ضعیف والد صاحب سخت بے چین تھے، جو اپنے قابلِ فخر اکلوتے بیٹے ہی کو زندگی کی کمائی سمجھتے تھے۔

گھر سے دارالعلوم کے راستہ میں ایک ایسی برادری کا محلہ بھی آتا تھا جو آپ کے خلاف سرگرمیوں

---

[1] مکاتیب حکیم الامتؒ ص ۱۲۷ مورخہ ۲ رمضان ۱۳۵۳ھ (مخطوطہ) [2] مکاتیب ص ۱۲۲ (مخطوطہ)

کا مرکز بنی ہوئی تھی۔ مگر حضرت والد صاحبؒ نے راستہ تبدیل کرنا دینی غیرت کے خلاف سمجھا۔ تن تنہا بے خطر آتے جاتے رہے۔ دیوبند کی بھاری اکثریت آپ سے عقیدت و محبت رکھتی تھی۔ مخلصین و متوسلین کی ایک جماعت ہر وقت جانثاری کے لیے تیار تھی۔ ان میں والد صاحب کے شاگرد رشید حضرت مولانا عرض محمد صاحب (بانی و مہتمم مدرسہ مطلع العلوم کوئٹہ) جو اُس وقت دارالعلوم دیوبند میں زیر تعلیم تھے خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ انھوں نے والد صاحبؒ کو بتائے بغیر یہ معمول بنا لیا تھا کہ جہاں والد صاحبؒ جاتے کچھ فاصلے سے یہ بھی ہاتھ میں لٹھ لیے پیچھے پیچھے ہو لیتے۔ والد صاحب کو کئی دن بعد اس کا علم ہوا[1]

ان کے علاوہ دارالعلوم دیوبند کے شعبۂ فارسی و ریاضی کے صدر مدرس جناب خلیفہ محمد عاقل صاحب مرحوم اور ناچیز راقم الحروف کے تین ماموں (۱) جناب فضل کریم انصاری صاحب (۲) جناب احمد کریم صاحب انصاری (۳) اور جناب مولانا انوار کریم صاحب انصاری، اُن جانثاروں میں سے ہیں جنھوں نے اس زمانہ میں سارے مشاغل چھوڑ کر والد صاحب کی حفاظت کو مقصدِ حیات بنا لیا تھا۔

فتویٰ سے تدریس کی طرف منتقلی

پیچھے تفصیل بیان ہو چکی ہے کہ جب دارالعلوم کے ارباب انتظام کی طرف سے فتویٰ کی ذمہ داریاں پیش کی گئیں تو عرصہ تک آپ کو خرابی صحت وغیرہ کے باعث تردد رہا، لیکن بزرگوں کے حکم پر قبول فرما لیا تھا۔ پھر بعد میں بھی حضرت حکیم الامتؒ سے اجازت طلب فرمائی کہ ان ذمہ داریوں سے سبکدوش ہو کر تدریس میں واپس چلے جائیں، مگر اجازت نہ ملی۔

جب سے یہ فتنہ اُٹھا تھا اُس وقت سے تو آپ مسلسل ہی اس کی کوشش فرماتے رہے مگر اکابر دارالعلوم نے ایسا کرنے سے باز رکھا۔ آپ کے ایک خط کے جواب میں حکیم الامت حضرت تھانویؒ نے جو اس وقت دارالعلوم کے باضابطہ سرپرست تھے، تحریر فرمایا کہ[2]:

---

[1] احقر تو اس وقت پیدا بھی نہ ہوا تھا۔ ایک مرتبہ مولانا موصوف کراچی تشریف لائے تو والد صاحبؒ نے ان کا تعارف کراتے ہوئے یہ واقعہ سنایا (رفیع)

[2] مکاتیب حکیم الامتؒ ص ۱۴۵ (مخطوطہ)

"آخر میں پھر اُسی جملہ کا اعادہ کرتا ہوں کہ آپ حق پر ہیں، آپ کو پریشان نہ ہونا چاہیئے۔ اَللّٰهُ مَعَكُمْ اَيْنَمَا كُنْتُمْ"

یہ فتنہ درحقیقت دارالعلوم دیوبند کے خلاف تھا، والد صاحبؒ کی ذات کو محض بہانے کے طور پر ہدف بنایا گیا تھا، چنانچہ اب مخالفین کھُل کر دارالعلوم کے خلاف کارروائیاں کرنے لگے تھے۔ والد صاحب کو یہ صورتِ حال کیسے برداشت ہوتی، آپ نے پھر اصرار فرمایا۔ بالآخر تقریباً شعبان ۱۳۵۴ھ میں دارالعلوم کی مجلس شوریٰ نے یہ شکل فیصلہ بھی کر دیا کہ آپ کو فتویٰ سے تدریس کی طرف منتقل کر دیا جائے۔[1]

یہ فیصلہ شکل اس لیے تھا کہ دارالعلوم دیوبند کے فتاویٰ کا جو اعلیٰ معیار بزرگوں سے چلا آرہا تھا اور جس کی تجدید والد صاحبؒ نے فرمائی تھی، اب اس کا متبادل انتظام سامنے نہ تھا، مجبوراً فتاویٰ کا کام کچھ عرصہ نائب مفتی صاحب ہی چلاتے رہے، اہم اور مشکل فتاویٰ میں حضرت والد صاحبؒ سے مراجعت فرمالیتے تھے مگر چند سال گزر جانے کے باوجود جب دارالافتاء کا کوئی مستقل اطمینان بخش نظام نہ ہو سکا تو فتویٰ کی ذمہ داریاں آپ کو دوبارہ سونپ دی گئیں جس کی کچھ تفصیل چند اوراق کے بعد آئے گی۔

عارضی طور پر تدریس میں منتقلی کے باوجود آپ کے شغلِ افتاء کا تسلسل برابر جاری رہا، آپ کی ذاتی ڈاک میں جو سوالات آتے، ان کا جواب بہرحال لکھنا ہی پڑتا تھا، حکیم الامت حضرت تھانویؒ کا بھی یہ معمول جاری تھا کہ ان کے پاس جو زیادہ تحقیق طلب سوالات آتے وہ جواب کے لیے والد صاحبؒ کے پاس دیوبند بھیجتے تھے۔ اپنے ذاتی معاملات اور خاص اعزہ و احباب کے معاملات میں بھی عموماً فتویٰ حضرت والد صاحبؒ سے طلب فرماتے تھے۔

آپ کے فتاویٰ حکیم الامتؒ کی نظر میں

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کو آپ کے فتاویٰ پر کتنا اعتماد تھا، اس کا اندازہ اُن خطوط سے

---

[1] مکاتیب حکیم الامتؒ ص ۱۴۶ (مخطوطہ) [2] مکاتیب حکیم الامتؒ ص ۱۴۳ (غیر مطبوعہ)

ہوتا ہے جو مکاتیب حکیم الامت میں محفوظ ہیں، ایک مثال ملاحظہ ہو۔

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے ایک استفتار کا جواب والد صاحبؒ نے لکھ کر بھیجا۔ اور خط میں لکھا کہ :

" جس سوال کی تحقیق مطلوب تھی، اُسی روز اُسے کچھ دیکھا، مگر پُورا نہ ہُوا تھا کہ مجھے ایک ضروری سفر پیش آگیا، دو تین روز اس میں صرف ہوگئے۔ آج جو کچھ سمجھ میں آسکا پیش کرتا ہوں۔ امید ہے کہ اس کے خطا و صواب سے مطلع فرمایا جائیگا، اور اگر کوئی جزو اور قابلِ تحقیق باقی رہ گیا ہو تو اس پر متنبہ فرمایا جائے گا "

حضرت حکیم الامتؒ نے جواب میں تحریر فرمایا کہ :

" دو مسرتیں ہُوئیں اور دونوں بالغہ سابغہ، ایک شبہ کا ازالہ، دُوسرے اپنی آنکھ سے دین کی صحیح خدمت کرنے والے کا مشاہدہ، جس سے اُمید بندھ گئی کہ انشاء اللہ تعالیٰ اُمت کے دستگیر ابھی باقی رہیں گے، دل سے دعا رِ برکتِ ظاہرہ و باطنہ کی کرتا ہوں "

برخوردار[1] کی صحتِ کاملہ کے لیے دُعار کرتا ہوں، باقی الحمد للہ یہاں بھی خیریت ہے۔ میں نے ایک رسالہ حصص کمپنی کے احکام میں لکھا ہے۔ آپ کا جواب اس کا ایک جزء ہو کر (ماہنامہ) "النور" میں جلدی چھپے گا "[2]

ماہنامہ "المفتی"

تدریس و افتار اور تصنیف و تالیف کی مصروفیات کے ساتھ آپ نے ایک علمی ماہنامہ "المفتی" بھی محرم ۱۳۵۴ھ میں جاری فرمایا، آپ اس کے مالک و مدیر تو تھے ہی، ناظم و ناشر بلکہ محرر و

---

[1] احقر کے بھائی جان جناب محمد زکی کیفی صاحب مراد ہیں جن کی عمر اس وقت تقریباً پندرہ سال تھی اس زمانہ میں بیمار تھے۔ رحمۃ اللہ علیہ (رفیع)

[2] مکاتیب حکیم الامتؒ ص ۳۱۲ (قلمی)

چپراسی کا کام بھی خود کرنا پڑتا تھا، کوئی ہاتھ بٹانے والا نہ تھا، اتنی مالی گنجائش نہ تھی کہ کوئی ملازم رکھ سکیں۔

اس زمانہ میں علماء دیوبند کے فتاوٰی اور علمی تحقیقات شائع کرنے والا کوئی پرچہ دیوبند میں جاری نہ تھا۔ دارالعلوم دیوبند کا دارالافتاء پوری دُنیا میں فتوٰی کا مرکز سمجھا جاتا تھا مگر یہاں سے جاری ہونے والے فتاوٰی سے صرف وہی شخص استفادہ کرسکتا تھا جس نے یہ فتوٰی طلب کیا ہو کیونکہ دارالافتاء کے رجسٹروں میں فتاوٰی کی نقل تو محفوظ رکھی جاتی تھی مگر ان کی اشاعت کا انتظام نہ تھا۔

حضرت والد صاحبؒ کے پیشِ نظر اس رسالہ کا بڑا مقصد یہ تھا کہ اس میں ان فتاوٰی کو ترتیب و تبویب کے ساتھ شائع کیا جائے۔ اسی لیے اس کا نام "المفتی" رکھا گیا، چنانچہ رسالہ المفتی میں آٹھ صفحے ان فتاوٰی کے لیے رکھے گئے جو مفتی اعظم ہند حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحب نے اپنے دور میں تحریر فرمائے تھے اور ان کا نام "عزیز الفتاوٰی" رکھا گیا اور آٹھ صفحے ان فتاوٰی کے لیے رکھے گئے جو حضرت والد صاحبؒ کے تحریر فرمودہ تھے اور اس کا نام حضرت تھانویؒ نے "امداد المفتین" تجویز فرمایا۔

یہ رسالہ سخت مالی مشکلات کے باوجود آٹھ سال تک جاری رہا اور علمی حلقوں میں بہت مقبول ہوا، اس میں فتاوٰی کے یہ دونوں سلسلے باقاعدگی سے شائع ہوتے رہے پھر المفتی میں شائع ہونے والے یہی فتاوٰی کتابی شکل میں "فتاوٰی دارالعلوم دیوبند" کے نام سے دو ضخیم جلدوں میں شائع ہوئے جلد اوّل میں "عزیز الفتاوٰی" ہے اور جلد دوم میں "امداد المفتین" اس وقت یہ کتاب صرف عوام ہی کے لیے نہیں بلکہ مفتیان کرام کے لیے بھی ناگزیر سمجھی جاتی ہے، کوئی مفتی اس سے مستغنی نہیں۔

"المفتی" میں فتاوٰی کے علاوہ حضرت والد صاحبؒ کے دیگر علمی، ادبی، تاریخی و اصلاحی مضامین کا بھی نہایت گراں قدر علمی سرمایہ شائع ہوا جس میں اُردو، فارسی، عربی تینوں ہی زبانوں کے علمی جواہر پارے موجود ہیں، کہیں نظم کی صورت میں کہیں نثر کی صورت میں۔

آٹھ سال کے ان تمام پرچوں میں حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے جتنے اُردو کے متفرق مضامین نظمیں اور اشعار شائع ہوئے، بحمد اللہ وہ تمام بلکہ کچھ اضافوں کے ساتھ اب ایک کتابی صورت میں "کشکول" کے نام سے شائع ہوگئے ہیں، یہ کتاب واقعی کشکول ہے۔ اس میں پہلا حصہ نثر کا اور دُوسرا

نظم کا ہے، نثر میں کہیں تاریخ کے دلچسپ و عبرتناک واقعات ہیں، کہیں خاص علمی تحقیقات، کہیں بزرگوں کے ایمان افروز ملفوظات۔ اس کا ہر مضمون دُوسرے سے الگ ہے۔ قاری جہاں سے کھول کر پڑھنا شروع کر دے محظوظ و مستفید ہوتا ہے، حصّہ نظم میں قصیدے، مرثیے، قطعات، غزلیں وغیرہ ہیں، یہ حصّہ دیکھ کر قاری کو پہلی بار پتہ چلتا ہے کہ حضرت مدظلہم نے شعر و سخن کا بھی تنا منجھا ہُوا ستھرا ذوق پایا تھا۔

المفتی میں حکیم الامت حضرت تھانویؒ اور عالم ربانی حضرت مولانا سید میاں اصغر حسین صاحبؒ اور دیگر اکابر عُلماء دیوبند کے بھی نہایت گراں بہا مضامین شائع ہوتے تھے مگر اس کا علمی، انتظامی اور مالی بوجھ تنہا والد صاحبؒ پر تھا، رسالہ خسارہ۱ ہی میں چلتا رہا، بالآخر ۱۳۶۱ھ میں بند کرنا پڑا۔ اب تو یہ دیکھ کر حیرت ہی ہوتی ہے کہ پرچہ کی قیمت دُو آنے اور سالانہ چندہ ایک روپیہ چار آنے تھا اور طلباء سے تو سالانہ صرف ایک ہی روپیہ لیا جاتا تھا، کوئی پرچہ ۲۴ صفحات سے کم نہیں، عموماً ۳۲ صفحات یا اس سے بھی زائد ہوتے تھے۔ احقر یہ سمجھنے سے قاصر ہے کہ آپ کو دارالعلوم سے جو قلیل تنخواہ ملتی تھی، اُس میں سے اس رسالہ کا خسارہ جو ہر ماہ پیش آتا تھا کس طرح برداشت ہوتا تھا اور بیماریوں، اہل و عیال، ضعیف والدین کی خدمت، بیوہ بہن اور ان کے سات بچوں کی دیکھ بھال، تدریس و افتاء، خدمتِ شیخ، تصنیف و تالیف اور تجارت کُتب کے ساتھ ایسا معیاری رسالہ آٹھ سال تک آپ نے کس طرح جاری رکھا، مجھے تو یہ سب باتیں کرامت معلوم ہوتی ہیں۔

آپ کے والد ماجدؒ کی وفات

آپ کے والد ماجد حضرت مولانا محمد یٰسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا مفصل تذکرہ اس مقالہ کے شروع میں آچکا ہے۔ اپنے والد کی خدمت و اطاعت کی دولت سے بھی آپ خُوب مالا مال ہُوئے اپنے تمام مشاغل کے ہجوم میں یہ معمول کبھی ترک نہ ہُوا کہ جب صبح کو دارالعلوم تشریف لے جاتے، تو اپنے والد ماجد کی خدمت میں حاضر ہو کر سلام عرض کرتے اور اجازت طلب فرماتے، دوپہر کو واپسی

---

۱ ڈیڑھ سو دو سو روپے کا خسارہ ہر سال ہو جاتا تھا۔ مکاتیب حکیم الامت ص ۲۲ (قلمی)

پر سب سے پہلے ان کی خدمت میں حاضری دیتے۔ اس کے بعد دُوسرے کاموں میں لگتے تھے بعد ظہر پھر دارالعلوم جاتے وقت والد بزرگوار کی خدمت میں حاضری دیتے اور عصر کے قریب واپسی پر بھی سب سے پہلے انہی کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے، عصر سے مغرب تک عموماً پورا وقت اپنے ضعیف والد کی خدمت میں گزرتا تھا۔

جب اُن کا مرض وفات شروع ہُوا تو دُوسری تمام مصروفیات ثانوی درجہ میں رہ گئیں تھانہ بھون بھی عرصہ تک حاضری نہ ہو سکی۔ شب و روز اپنے والد کی خدمت میں لگے رہے اور دُعائیں لیتے رہے۔ بالآخر ۹ صفر ۱۳۵۵ھ کو بروز جُمعہ آپ کے والد صاحب نور اللہ مرقدہ کی وفات ہو گئی،

اِنّا للہ واِنّا الیہ راجعُون۔

اسی روز آپ نے حضرت حکیم الامتؒ کی خدمت میں مندرجہ ذیل خط روانہ کیا:

اِس حادثہ پر حکیم الامتؒ کے نام خط اور اُس کا جواب[1]

مؤرخہ —— ۹ صفر ۱۳۵۵ھ

مکتوب: "والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ کی حالت تو کئی روز سے نازک تھی، آج بروز جُمعہ صبح ساڑھے سات بجے رحلت فرما گئے، اِنّا للہ واِنّا الیہ راجعون"۔

جواب: "اِنّا للہ"

مکتوب: "یہ دن شُدنی تھا، ہو گیا۔ والد کی جو شفقت اولاد پر ہوتی ہے وہ معلوم مگر والد مرحوم کی میرے ساتھ کچھ ایسی خصوصیت تھی کہ ان کی شفقت مجھ پر والدہ کی طرح تھی۔ ہر وقت ان کی خدمت میں رہنے کا عادی تھا۔ طبیعت بے چین ہے"۔

جواب: "ہونا چاہیئے"

---

[1] دیکھئے "مکاتیب حکیم الامتؒ" کے بیان میں عرض کیا جا چکا ہے کہ حکیم الامتؒ کے پاس جو خط جاتا تھا، اس کے ہر حصّہ کا جواب وہ اسی خط کے حاشیہ پر لکھ کر واپس فرمایا کرتے تھے یہاں لفظ مکتوب کے سامنے والد صاحب کی اور لفظ جواب کے سامنے حکیم الامتؒ کی عبارت درج کی جا رہی ہے۔

مکتوب : "مگرالحمدللہ صبر کرتا ہوں"

جواب : " وَفقکُمُ اللہ "

مکتوب : " لیکن والدِ مرحوم کی طرف سے اس کی بے چینی ہے کہ دیکھیے اُن کے ساتھ کیا معاملہ ہوتا ہے "

جواب : " یہ بے چینی تو اُن کے اور آپ کے حق میں رحمت ہے ورنہ دُعا، مغفرت و ایصالِ ثواب کا اہتمام کیسے ہوتا۔ جب اہتمام نہ ہوتا تو اس اہتمام کا ثواب کیسے ملتا ؟"

مکتوب : " الحمدُللہ ظاہری حالات نہایت امید افزا ہیں کہ خاص ذکر اللہ پر خاتمہ ہُوا"

جواب : " سُبحان اللہ "

مکتوب : " صُبح کی نماز کے لیے وضو کو بٹھانے کے لیے فرمایا۔ احقر نے بٹھایا تو طاقت نہ تھی، نزع کی کیفیت طاری ہوگئی، لٹا دیا گیا، پھر کچھ دیر کے لیے ہوش سا آگیا، مگر نا تمام۔ اس حالت میں توبہ استغفار کرتے رہے، پھر بالکل آخری کلام "اللہ اللہ" تھا کہ ختم ہوگئے "

جواب : " انشاء اللہ تعالیٰ امید قریب بیقین ہونا چاہیے، کہ فضل و رحمت ہو گا "

مکتوب : " حضرت سے بصد نیاز التجا ہے کہ والدِ مرحوم کی مغفرت اور معاملۂ رحمت کے لیے خاص طور پر دُعا فرماویں "

جواب : " دُعا کی بھی ہے اور کروں گا بھی۔ ان کا تعلق میرے ساتھ مِنْ وَجْہٍ آپ سے بھی زیادہ ہے "ؔ

مکتوب : " میرا قلب زیادہ تر اس طرف لگا ہوا ہے کہ کسی طرح حق تعالیٰ اس سے اطمینان فرماویں"

جواب : " یہ بھی ہو رہے گا، باقی اس (اطمینان) میں جتنی دیر ہوگی وہ بھی رحمت ہے۔ کَمَا سَبَقَ "

مکتوب : " حق تعالیٰ حضرت والا کے سایہ کو عافیت و خیر کے ساتھ احقر کے سر پر

ؔ دادا جان مرحوم حضرت حکیم الامتؒ کے رفیقِ درس تھے (رفیع)

سلامت رکھے کہ میں بالکل اب بھی ایسا ہی اپنے کو پا آ ہوں جیسے والد کے زیر سایہ "
جواب : "مجھ کو بھی کچھ تعلق بڑھ گیا "

آپ پر اس حادثہ کے اثرات

جب احقر کے داداجان کا انتقال ہوا تو والد صاحبؒ کی عمر کا اکتالیسواں سال چل رہا تھا صحت پہلے ہی ٹھیک نہ تھی، حضرت والد صاحبؒ فرمایا کرتے تھے کہ "میں نوعمری ہی سے طرح طرح کی بیماریوں میں مبتلا رہا، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مجھ پر بچپن کے بعد، جوانی کی بجائے بڑھاپا آ گیا تھا "
ہجوم افکار مسلسل علمی و جسمانی محنت اور اس پر حاسدوں کی ریشہ دوانیاں مستزاد تھیں، قلیل آمدنی اور نو افراد کا کنبہ پہلے ہی تھا، اب والد کا سایہ سر سے اُٹھ جانے کے بعد اپنی بیوہ والدہ، بڑی بیوہ بہن اور ان کے سات بچوں کی کفالت کی ذمہ داریاں بھی آپ پر آ گئیں، کُل اٹھارہ افراد کی مکمل کفالت آپ کو تنہا کرنی تھی۔ آپ کا کوئی بھائی نہ تھا۔ احقر تو داداجان کی وفات کے تین ماہ بعد پیدا ہوا، احقر کے سب سے بڑے بھائی اور بہنیں بھی اس وقت چھوٹے تھے۔ غرض عالم اسباب میں کوئی نہ تھا جو ان ذمہ داریوں اور پریشانیوں میں ہاتھ بٹا سکے۔

ادھر علمی مشاغل کا وہی حال تھا کہ دارالعلوم میں درجۂ علیا کی کتابیں آپ کے زیر تدریس تھیں جن کی محنت و مشقت کا اندازہ اس درجہ کے مدرسین ہی کر سکتے ہیں، یہی کام اتنی محنت کا ہے کہ اس کے ساتھ کسی مستقل مشغلہ کی گنجائش نہیں رہتی مگر آپ کے مستقل مشاغل میں تصنیفات کا سلسلہ برابر جاری تھا۔ فتاویٰ کا کام بھی ساتھ تھا، ماہنامہ "المفتی" جس کے مالک و مدیر اور ناشر بھی آپ تھے اُس کے بیشتر مضامین بھی آپ ہی تحریر فرماتے اور جملہ انتظام اور کاروبار خود ہی انجام دیتے تھے۔ اس کے علاوہ ایک تجارتی کتب خانہ "دارالاشاعت" جو آپ کی ملکیت تھا وہ بھی آپ ہی کے زیر انتظام تھا، کتابوں کی طباعت و اشاعت، خرید و فروخت اور ترسیل ڈاک وغیرہ کا سب کام آپ کو خود ہی کرنا پڑتا تھا، کبھی کبھی جزوی طور پر کوئی ملازم بھی رکھ لیا جاتا تھا۔

ان حالات میں والد کا سایہ سر سے اُٹھ جانا سخت کڑی آزمائش تھی۔ چنانچہ حضرت والد صاحبؒ سخت بیمار ہو گئے، آپ فرمایا کرتے تھے کہ "میں اس زمانہ میں یوں محسوس کرتا تھا کہ والد صاحبؒ

کے غم اور اپنی بیماریوں سے جانبر نہ ہو سکوں گا۔
اِن حالات کو سامنے رکھ کر وہ دردناک اور سبق آموز مرثیہ دیکھا جائے جو آپ نے شفیق والد کی وفات پر کہا ہے تو کئی اشعار کی معنویت جب ہی سمجھ میں آئے گی۔

آپ کے منظوم تاثرات اپنے والد ماجدؒ کی وفات پر

یارب یہ کیا فضا ہے یہ کیسا سماں ہے آج — مشغول گریہ صبح سے کیوں آسماں ہے آج
کون اُٹھ رہا ہے آج جہاں سے کہ یک بیک — تیرہ مری نگہ میں زمین و زماں ہے آج
کیوں رو رہا ہے آج ہر ایک خورد اور بزرگ — تھمتا کسی طرح نہیں اشکِ رواں ہے آج
اسلاف کے چمن کی رہی تھی جو یادگار — وا حسرتا وہ پھول بھی وقفِ خزاں ہے آج
یعقوب اور رفیع و رشید، ہمام کا — یہ آخری نشان بھی لو بے نشاں ہے آج
وہ حضرتِ رشید کا ایک زندہ تذکرہ — وہ گلِ سلف کی یاد کہاں گلفشاں ہے آج
بالیں پہ آج حضرتِ یٰسین کے کیوں عزیز — یٰسین پڑھ رہے ہیں یہ کیسا سماں ہے آج
وُہ والدِ شفیق وہ اُستاذ مہرباں — وُہ مرشدِ طریق عزیزو کہاں ہے آج
یارب کہاں وہ ذکر و مناجاتِ صُبح دم — وُہ گریۂ سحر ہے نہ آہ و فغاں ہے آج
کیوں آج ذکرِ نیم شبی کی صدا نہیں — کیوں آہ وقتِ صبح بھی خوابِ گراں ہے آج
وُہ صُبحدم نماز کو "اُٹھو نماز کو"[1] — کہہ کر جگانے والا الٰہی کہاں ہے آج
کیوں آج پُوچھتا نہیں کوئی شفیعؔ کو — کس حال میں ہے کیوں نہیں آیا کہاں ہے آج
کل تک اُداس دیکھ نہ سکتے تھے جس کو آپ — وُہ وقفِ رنج و نالۂ درد و فغاں ہے آج
دُنیا بھی ایک تماشۂ عبرت ہے غافلو — باقی نہ کل رہے گا جو دورِ زماں ہے آج
اس گھر کا تجھ سے پہلے کوئی اور تھا مکیں — گہوارہ عشرتوں کا جو تیرا مکاں ہے آج

---

[1] دادا جان رحمۃ اللہ علیہ کا معمول تھا کہ نماز فجر کو جاتے ہوئے راستہ میں یہ آواز لگاتے جاتے تھے کہ "اٹھو نماز کو، اٹھو نماز کو" ۔ رفیع ۔

جانا ہے سب کو ایک ہی منزل پہ ایک دن — ہاں اتنی بات ہے کہ فلاں کل، فلاں ہے آج
عالم میں جن کی شانِ جلالت کی دھوم تھی — وہ قصرِ قیصری ہے نہ تخت کیاں ہے آج
اُجڑے ہُوئے دیار میں اور مقبروں میں بھی — اُن کا بٹا ہُوا سا کہیں کچھ نشاں ہے آج
دہلی و آگرہ کے وہ ایوان اور محل — بس حسرتوں کی درد بھری داستاں ہے آج
دربارِ عام و خاص ہے پامالِ خاص و عام — وہ شوکت و جلال و حشمت کہاں ہے آج
کل گونجتے تھے جن کی صداؤں سے آسماں — وہ قصرِ خاص دیکھ کہ ہُو کا مکاں ہے آج
بیدار مر کے ہوتے ہیں سچ ہے کسی کا قول — اور زندگی مُرادف خوابِ گراں ہے آج
آنکھیں کُھلی ہوئی تھیں تو حاجب تھے سیکڑوں — جب آنکھ بند کی تو عیاں ہر نہاں ہے آج

کہو آج تو نہ بہرِ خُدا کل کی فکر میں
غافل سمجھ لے اب بھی کہ تیرا جہاں ہے آج

اَمراض کا ہجُوم اور زندگی سے مایُوسی

اس زمانہ میں آپ پر جو کیفیت گزر رہی تھی اُس کی کچھ تفصیل آپ کے مندرجہ ذیل خط سے واضح ہوتی ہے جو اس حادثہ کے تقریباً دو ماہ بعد حکیم الامتؒ کے نام لکھا گیا ہے۔

مکتوب بنام حکیم الامتؒ

مؤرخہ ــــــ ۵ ربیع الثانی ۱۳۵۵ھ

مکتوب: "ناکارہ خادم تقریباً ایک ماہ سے بیمار ہے، رخصت لے کر گھر پڑا ہُوا ہے۔ آج آخری رخصت بھی ختم ہوگئی اور امراض میں دو تین دن تک افاقہ رہنے کے بعد پرسوں شام سے داڑھ میں شدید درد ہُوا جس نے رہی سہی رُوح تحلیل کر دی، ساتھ ہی بخار میں شدت ہوگئی، کل شام تک ہوش نہ لینے دیا۔ اب الحمدللہ اس کو سکون ہے مگر ضعف اس قدر ہوگیا کہ نشست و برخاست مشکل ہوگئی۔ اب کام کرنے کی تو قدرت نہیں اور مدرسہ سے جس قدر استحقاقِ رخصت بلا وضع تنخواہ تھا وہ پُورا ہوچکا، ضروریات متعلقہ تنخواہ میں بھی پوری نہیں ہوتیں، وضع تنخواہ کے ساتھ کیسے گذر ہو؟ ان پریشانیوں نے اور زیادہ مضمحل کر دیا۔ ناچار ایک ہفتہ کی رخصت اور لی ہے۔

جواب : " اللہ کرے اور رُخصت نہ لینا پڑے، اس رُخصت میں طبیعت میں صحت اور کافی قوت عطا ہو جائے۔"

مکتوب : " میرے قویٰ تقریباً ساقط ہوتے جا رہے ہیں، حالت روز بروز گرتی جاتی ہے"

جواب : " یہ اوہام ہیں اِن شاء اللہ تعالیٰ صحت کے ساتھ ہی یہ وہم غلط ثابت ہوگا۔"

مکتوب : " اس وقت سب سے بڑی پریشانی تو یہ ہے کہ سراسر گناہوں میں غرق ہوں اعمال کی تو کبھی ہمت ہی نہیں ہوئی۔ قلب کی حالت بھی جو کبھی پہلے محسوس ہوتی تھی، اب اس میں بھی بہت تکدّر معلوم ہوتا ہے ضُعف کے ساتھ کسل بھی مل گیا ہے کہ جس قدر عمل کی قوت ہے وہ بھی پورا نہیں ہوتا۔"

جواب : " کیا ان فوائت کا کوئی بدل نہیں ؟ یہی پریشانی اور شکستگی بدل اور نعم البدل ہے، بالکل اس کا یقین رکھیں۔"

مکتوب : " اِدھر سب بچے چھوٹے چھوٹے ہیں، ان کا خیال بار بار آتا ہے۔"

جواب : " یہ بھی ایک عمل فاضل[1] ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تو خود ازواج مطہرات سے فرمایا کہ اپنے بعد مجھ کو تمہاری فکر ہے۔"

مکتوب : " کبھی کبھی اپنے نفس کو ملامت کرتا ہوں کہ اس حالت میں ایسے خیالات نہیں چاہییے مگر یہ خیالات پیچھا نہیں چھوڑتے۔"

جواب : " عبادت کا پیچھا نہ چھوڑنا تو رحمت ہے، جب طاعت ہے تو کیا اس کو اہتمام آخرت کی محرومی نہ کہیں گے ؟"

مکتوب : " افسوس ہوتا ہے کہ ساری عُمر تو دُنیا کے جھگڑوں میں گزار دی، اب یہ وقت جو عُمر کا آخری حصّہ معلوم ہوتا ہے یہ بھی انہی جھگڑوں میں گزرتا ہے، آخرت کا اہتمام جتنا ہونا چاہیئے اس کا کوئی حصّہ بھی نصیب نہیں، اس وقت بجز حضرت والا کی دُعا و ہمت کے اس غریق کے لیے کوئی سہارا نہیں، اس لیے درخواست ہے کہ اس ناکارہ و نالائق خادم کی دستگیری فرمادیں۔"

---

[1] یعنی فضیلت والا عمل۔

جواب : " دل سے دُعا ہے اور تنبیہ بالاعلیٰ دستگیری ہے "

مکتوب : " معمولات کو کبھی کچھ تھے ہی نہیں بیماری میں رہے سہے بھی ختم ہو گئے، ایسی حالت میں کوئی مختصر سہل ذکر کی تلقین فرمائی جاوے تو انشاء اللہ تعالیٰ اس کا التزام کروں گا "

جواب : " لَآ اِلٰـہَ اِلَّا اللہ " لسان سے یا خیال سے اور کبھی استغفار "

مکتوب : " تمنا ہے کہ ایک مرتبہ پھر حضرت کی زیارت نصیب ہو جائے "

جواب : " ایک کا معنیٰ ؟ ہاں اگر ایک " اعتباری ہو تو متعدد بھی واحد میں داخل ہے "

مکتوب : " اس ہفتہ میں اگر کچھ بھی اطمینان نصیب ہُوا تو حاضری کا قصد ہے "

جواب : " بشرطیکہ سہولت سے تحمل ہو اور کوئی ساتھ ہو، اگر اُشتید آسکیں تو ان کا کرایہ میں پیش کر دوں گا "

مکتوب : " مرض بظاہر کوئی ایسا شدید نہیں ہے جس کو دیکھ کر طبیب ناامید ہو "

جواب : " بس معلوم ہُوا کہ وہم ہے "

مکتوب : " مگر ضعف و اضمحلال اس قدر بڑھتا جا رہا ہے کہ یہی ایک مستقل مرض ہے "

جواب : " صحیح ہے مگر قلیل الضرر "

مکتوب : " حضرت میاں صاحب مدظلہم نے اپنے قاعدہ کے موافق میری حالت کو دیکھا تو فرمایا کہ سحر کے آثار بالکل نمایاں ہیں اور تمام اعضاء بدن میں اس کا اثر ہو چکا ہے۔ اسوقت زیادہ اہتمام سے ان کا علاج کر رہا ہوں، ڈیڑھ ماہ تک مختلف طبیبوں کا اہتمام سے علاج کرتا رہا، ذرہ برابر فائدہ محسوس نہ ہُوا۔ حضرت والا بھی اگر کوئی تعویذ دفع سحر کے لیے عطا فرماویں تو انشاء اللہ تعالیٰ باعث برکات عظیمہ ہوگا "

جواب : " ملفوف ہے، پاس رکھیے، اور بعد نماز فجر اگر کوئی مُحب چینی کی تشتری پر سورۂ فاتحہ اور یہ دُعا لکھ کر دھو کر پلا دیا کرے تو زیادہ بہتر ہے "

لہ حضرت والا صاحبؒ کے بھانجے مولانا سید حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ سابق استاذ حدیث و تفسیر دارالعلوم دیوبند جو اس وقت کم عمر تھے اور یتیم ہونے کے باعث والد صاحبؒ کے زیر تربیت تھے (رفیع)

"یَا حَیُّ حِیْنَ لَاحَیَّ فِیْ دَیْمُوْمَةِ مُلْکِهٖ وَبَقَآئِهٖ یَاحَیُّ"

منصبِ افتاء پر دوبارہ تقرر

دارالافتاء سے تدریس میں منتقلی کو تقریباً ساڑھے چار سال گذر چکے تھے، اس عرصہ میں دو اکابر[1] علماء یکے بعد دیگرے اس منصب پر فائز کیے گئے۔ بالآخر ۲۵ صفر ۱۳۵۹ھ کو دوبارہ آپ ہی کو صدر مفتی دارالعلوم کے منصبِ جلیل پر فائز کیا گیا[2]، اور تقریباً سوا تین سال بعد ۱۲ ربیع الاول ۱۳۶۲ھ کو جب آپ دارالعلوم دیوبند کی ملازمت سے مستعفی ہوئے اس وقت تک اسی منصب پر فائز رہے، اس مدت میں دارالافتاء سے ۱۲،۶۸۴[3] فتاوٰی جاری کیے گئے۔

فتوٰی کے معاملہ میں جس احتیاط کے آپ ہمیشہ عادی رہے اس کے پیشِ نظر اس مرتبہ آپ نے یہ ذمہ داری دو شرطوں کے ساتھ قبول فرمائی تھی۔

۱ —— ایک یہ کہ جن مسائل میں اپنے غور و فکر کے بعد مجھے شرحِ صدر نہ ہو ان کو مشورہ کیلیے دارالعلوم کی مجلسِ علمی میں رکھا جائے۔

۲ —— دُوسری یہ کہ مندرجہ ذیل قسم کے فتاوٰی کا جواب میری شخصی تحقیق یا رائے پر نہ ہو بلکہ دارالعلوم کے مشورہ سے دیا جائے۔

(الف) وہ فتاوٰی جو علماءِ محققین نے اپنے باہمی اختلاف کی وجہ سے دارالافتاء میں محاکمہ کیلیے بھیجے ہوں۔

(ب) وہ فتاوٰی جن کا تعلق عامۂ اہلِ اسلام سے یا کسی ملک و قوم سے ہو۔

(ج) وہ فتاوٰی جن کا تعلق سیاسیاتِ حاضرہ سے ہو۔

---

[1] تاریخ دارالعلوم دیوبند۔ ص ۱۰۰

[2] مراسلہ حضرت مہتمم صاحب دارالعلوم مؤرخہ ۲۵ صفر ۱۳۵۹ھ۔ مندرجہ رجسٹر احکامات دارالافتاء۔ یہ اصل مراسلہ احقر کے پاس محفوظ ہے۔ (رفیع)

[3] تاریخ دارالعلوم دیوبند ص ۱۰۰

ان دونوں شرطوں پر کچھ عرصہ تک عمل بھی ہوا[1] لیکن اکابر علماء دیوبند کو آپ کے فتاویٰ پر اتنا اعتماد تھا کہ حضرت والد صاحب کے بار بار تقاضوں کے باوجود اس پابندی کی ضرورت نہ سمجھی گئی اور بہت سے فتاویٰ میں آپ ہی کی تحقیق کو کافی سمجھا گیا۔ مگر آپ نے شدتِ احتیاط کا دامن کبھی ہاتھ سے نہ چھوڑا ایسے اہم فتاویٰ میں زندگی بھر یہ معمول رہا کہ جب تک آپ کے بزرگ حیات رہے اُن سے مشورہ فرمایا کرتے تھے۔

تجارتی کُتب خانہ

۱۳۳۲ھ میں جب آپ درجۂ وسطیٰ کی کتابیں پڑھاتے ہوں گے، آپ نے دینی کتابوں کی ایک چھوٹی سی تجارت اپنے استاذِ مہربان عالمِ ربانی حضرت مولانا سید میاں اصغر حسین صاحب کی شرکت میں شروع کی تھی، اس کا اصل محرک یہ تھا کہ کتب بینی کا شوق بہت تھا، مگر عیال کی کثرت اور تنخواہ کی قلت کے باعث کتابیں خریدنے کی گنجائش نہ تھی، اس تجارت کو آپ نے کتابوں کے حصول کا ذریعہ بنایا۔ حضرت میاں صاحب ممدوح کو ایک چھوٹا سا کمرہ دار العلوم میں آرام اور مطالعۂ کُتب کے لیے ملا ہوا تھا۔ درس سے فارغ اوقات میں جو طلبہ اپنے شوق سے کوئی کتاب پڑھنا چاہتے اسی میں دونوں حضرات ان کو پڑھاتے تھے اور اسی میں یہ کتب خانہ بھی قائم تھا، رفتہ رفتہ اس کتب خانہ سے چھوٹے چھوٹے کتابچے بھی شائع ہونے لگے اور اس کا نام "دار التدریس والاشاعۃ" رکھ دیا گیا۔

۱۴ ۱۲ روپے کا رأس المال حضرت میاں صاحب موصوف نے اور ۲۱۳ روپے کا رأس المال حضرت والد صاحب نے لگا کر اس مشترک کاروبار کا آغاز کیا اور کام چونکہ سب والد صاحب کے ذمہ تھا اس لیے نفع مساوی طے ہوا۔[2]

تقریباً ۱۳۵۰ھ میں یا اس کے کچھ بعد جب کام بڑھا تو یہ کتب خانہ حضرت والد صاحب نے اپنے نئے تعمیر شدہ مکان کے مردانہ کمرے میں منتقل فرما لیا۔ پھر ۱۳۵۸ھ میں حضرت میاں صاحب نے اپنا حصہ بھی والد صاحب کے ہاتھ فروخت کر دیا اور اس کتب خانہ کا نام "دار الاشاعت" رکھ دیا گیا

---

[1] تاریخ دار العلوم دیوبند ص ۱۰۰ [2] شرکت کی یہ تفصیلات اس شراکت نامہ سے ماخوذ ہیں، جو اس وقت لکھا گیا تھا۔ یہ تحریر برادر بزرگوار جناب محمد رضی صاحب کے پاس بعینہٖ محفوظ ہے۔

دارالاشاعت کا سب کام آپ دوپہر کے فارغ وقت میں انجام دیتے تھے۔ کتابوں کی ترتیب، بل بنانا، بنڈل باندھ کر اُن پر پتے لکھ کر ڈاک سے روانہ کرنا، تجارتی خطوط، کتابوں کی کتابت وطباعت، خرید وفروخت اور حساب کتاب غرض اوّل سے آخر تک سب کام تقریباً اٹھارہ سال تک اکیلے ہی انجام دیتے رہے۔ تجارتی کاموں سے دہلی اور سہارنپور کا سفر بھی بکثرت پیش آتا تھا جو عموماً جمعہ، یا دارالعلوم کی دیگر تعطیلات میں ہوتا تھا۔

جب کتب خانہ کا کام زیادہ بڑھا تو جزوی طور پر ایک ملازم رکھ لیا گیا۔ ادھر سنہ ۱۳۶۰ھ کے لگ بھگ جب ہمارے بھائی جان (جناب مولانا محمد زکی کیفی صاحب مرحوم) بھی کچھ بڑے ہوگئے تو اس کام میں والد صاحبؒ کا ہاتھ بٹانے لگے۔ والد صاحبؒ نے اس کام کی انھیں خصوصی تربیت دی حتیٰ کہ ہجرت پاکستان سے تقریباً تین سال پہلے تو بھائی جان نے یہ کاروبار پوری طرح سنبھال کر والد صاحب کو ملک وملت کی خدمات کے لیے قریب قریب فارغ ہی کردیا۔

اِس تجارت میں جو والد صاحبؒ نے صرف ۲۱۳ روپے سے شروع کی تھی، اللہ تعالیٰ نے جو حیرتناک برکتیں عطا فرمائیں ان کا کچھ اندازہ مندرجہ ذیل تفصیل سے ہوگا۔

۱۔ ماہنامہ "المفتی" جو آٹھ سال تک دینی حلقوں سے خراج تحسین لیتا رہا، وہ اسی کتب خانہ سے نکلتا تھا۔

۲۔ حضرت والد صاحبؒ کا ذاتی کتب خانہ، جس میں آپ نے محض اپنے مطالعہ کے لیے ہزاروں نہایت قیمتی، ضخیم اور نادر کتابیں جمع فرمائی تھیں وہ بھی اسی کتب خانہ "دارالاشاعت" کی تجارت سے حاصل ہوئیں۔ اب ان بیش بہا کتابوں سے بحمد اللہ دارالعلوم کراچی کے اساتذہ اور طلبہ استفادہ کر رہے ہیں۔

۳۔ حضرت والد صاحبؒ کی تقریباً تمام تصانیف اور دوسرے بزرگوں کی بھی بہت سی کتابیں اسی کتب خانہ سے شائع ہوئیں۔

۴۔ دارالعلوم دیوبند سے مستعفی ہونے کے بعد کوئی ذریعہ معاش سوائے اس تجارت کے نہیں تھا کئی سال تمام خانگی مصارف کا مدار بھی اسی تجارت پر رہا۔ ویسے بھی تنخواہ کافی نہ ہوتی تھی، آڑے وقت میں اسی سے مدد لی جاتی تھی۔

۵۔ والد صاحبؒ نے جنوبی افریقہ کے ایک دیرینہ دوست مولانا محمد سلیمان اسمٰعیل صاحب کے تعاون سے اسی کتب خانہ میں ایک خاص شعبہ حکیم الامت حضرت تھانویؒ کی تصانیف شائع کرنے کے لیے بنام اشرف العلوم قائم فرمایا تھا جو آخر حیات میں دارالعلوم کراچی کے نام وقف کر دیا، اب وہ دارالعلوم کراچی کا ایک بڑا نشر یاتی شعبہ بن کر مکتبہ دارالعلوم کے نام سے مصروفِ کار ہے۔ اور خود کفیل ہے۔

۶۔ ہجرتِ پاکستان کے بعد جب حضرت والد صاحبؒ نے کتب خانہ دارالاشاعت کو ہم پانچوں بھائیوں میں تقسیم فرمایا تو اس سے تین بڑے بڑے تجارتی کتب خانے وجود میں آئے۔ (۱) لاہور میں "ادارۂ اسلامیات" جو بھائی جان کے حصہ میں آیا (۲) کراچی میں "دارالاشاعت" جو ہمارے برادر بزرگوار جناب محمد رضی صاحب عثمانی کے حصہ میں آیا (۳) "ادارۃ المعارف" کراچی (کورنگی) جو برادرِ عزیز مولانا محمد تقی صاحب عثمانی اور احقر کو مشترک طور پر ملا۔ برادر بزرگوار جناب محمد ولی رازی صاحب نے اپنا حصہ کاروبار میں نہیں لگایا ورنہ ایک کتب خانہ اُن کا ہوتا۔

اس وقت یہ سب کتب خانے بحمداللہ ملک کے مشہور دینی کتب خانوں میں شمار ہوتے ہیں اور دینی کتابوں کی اشاعت میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہے ہیں۔ اُردو، عربی، فارسی کی ہزار سے زیادہ کتابیں شائع کر چکے ہیں۔

اِس برکت کا راز

حضرت والد صاحبؒ کے ہر کام میں آئے دن اسی قسم کی برکات کا مشاہدہ ہوتا تھا، آپ کی اصل دولت قناعت و استغنا تھی، اہل خانہ، رشتہ داروں اور حاجتمندوں پر خرچ کرنے میں بہت فیاض تھے لیکن آپ کا کوئی پیسہ، کوئی وقت فضول خرچ ہوتے ہم نے نہیں دیکھا، اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی بہت قدر فرماتے۔ ہر چیز نہایت سلیقہ اور انتظام سے استعمال فرماتے تھے۔ چھوٹی چھوٹی چیزیں جن کی طرف عام طور سے دھیان نہیں جاتا اُن کا بھی آپ کے یہاں ایک مصرف مقرر تھا، کتب خانہ میں باہر سے کتابوں کے بنڈل اور پیکٹ بہت آتے تھے، آپ کی عادت تھی کہ ان کی سُتلی کھول کر گولے کی شکل میں محفوظ فرماتے تاکہ دوبارہ استعمال میں آسکے۔

ایک لطیفہ، ایک سبق

بھائی جان کے لڑکپن کا یہ واقعہ حضرت والد صاحبؒ نے کئی بار سُنایا کہ میں نے ایک بنڈل میاں زکی کو کھولنے کے لیے دیا، انھوں نے قینچی سے سُتلی جگہ جگہ سے کاٹ کر بنڈل کھول دیا، میں نے ایک طمانچہ رسید کیا کہ یہ کیا طریقہ ہے تم نے ساری سُتلی ضائع کر دی اور آئندہ کے لیے طریقہ بتایا ـــ بھائی جان اپنا یہ واقعہ بڑے مزے لے لے کر ہمیں سُنایا کرتے تھے اور فرماتے تھے کہ اس طمانچہ نے مجھے پُوری تجارتی زندگی میں فائدہ پہنچایا، خاص طور سے سُتلی تو مجھے اتنے بڑے کاروبار میں کبھی خریدنی ہی نہیں پڑی۔

سیاسیات میں فکری و عملی حصّہ

آپ طبعاً ہنگاموں، سیاسی جلسوں اور جلوسوں سے الگ رہنا پسند فرماتے تھے، لیکن جب بھی اسلام اور مسلمانوں کی کسی اہم دینی ضرورت نے سیاست میں عملی حصّہ لینے کا تقاضا کیا۔ آپ اس میں بھی سرگرمی سے بقدرِ ضرورت شریک ہوئے۔

پہلی جنگِ عظیم کے اواخر میں جب مجاہدینِ بلقان ہر طرف سے کفر و الحاد کے زغہ میں تھے، اُس کی نزاکت اکابر علمائے دیوبند نے پوری شدت سے محسوس کی، حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحبؒ نے اپنے تلامذہ اور مریدین کے ذریعہ مجاہدینِ بلقان کے لیے چندہ جمع کرنے کی مہم چلائی۔ یہ وقت حضرت مفتی صاحب مدظلہم کی نوعمری اور طالب علمی کا تھا، آپ نے اس پُرخلوص مہم میں نہایت سرگرمی سے رضا کارانہ حصّہ لیا۔ سخت بارش کے زمانہ میں پیدل گاؤں گاؤں پھر کر چندہ جمع فرمایا۔

قائدِ اعظم سے پہلی ملاقات[1]

زعمائے مسلم لیگ میں دین سے عام بے رغبتی اور مغربیت کے رُجحان سے ہر مسلمان کے دل میں خلجان ہوتا تھا، علمائے کرام کی خواہش یہ تھی کہ زعمائے لیگ اسلامی شعائر کی پابندی اور تقویٰ و طہارت کے اوصاف سے بھی آراستہ ہوں، اکابر علماء کی جانب سے اس سلسلہ میں بھی ہر ممکن سعی کی گئی

---

[1] قائدِ اعظم سے ملاقاتوں کا حال احقر نے حضرت والد صاحبؒ سے کئی بار سُنا لیکن سب تفصیلات یاد نہیں، یہاں سب تفصیلات جناب منشی عبدالرحمن صاحب کی کتاب "تعمیرِ پاکستان اور علمائے ربانی" سے لی گئی ہیں۔

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہٗ جوان علمائے کرام کے سرپرست تھے، آپ نے قائدِ اعظم اور دوسرے زعمائے مسلم لیگ کو دسمبر ۱۹۳۸ء (تقریباً ۱۳۵۷ھ) سے برابر تبلیغی خطوط اور وفود بھیجنے کا سلسلہ جاری رکھا، ہر اہم دینی ضرورت کے موقع پر آپ کی طرف سے کوئی وفد یا ایلچی قائدِ اعظم کے پاس پہنچتا تھا، ان کو حضرت سے گہری عقیدت تھی اور وہ بھی آپ کی خدمت میں نامہ وپیام بھیجتے رہتے تھے۔ انھوں نے حضرت کے بھیجے ہوئے ایک وفد ہی کی حکیمانہ تبلیغ پر یہ کہا تھا کہ:

"میں گنہگار ہوں، خطا وار ہوں، آپ کو حق ہے کہ مجھے کہیں، میرا فرض ہے کہ اس کو سُنوں، میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ آیندہ نماز پڑھا کروں گا۔"[۱]

والد صاحب نے قائدِ اعظم سے دو مرتبہ ملاقات فرمائی۔ دوسری ملاقات کا بیان تو آگے آئے گا جو جون ۱۹۴۷ء میں ہوئی تھی۔

پہلی ملاقات کی تفصیل یہ ہے کہ دسمبر ۱۹۳۹ء کے بعد قائدِ اعظم محمد علی جناح کی بعض تقاریر پڑھ کر حضرت تھانویؒ نے محسوس فرمایا کہ قائدِ اعظم سیاست کو دین سے الگ سمجھتے ہیں۔ اس نظریہ کی اصلاح کے لیے علماء کا ایک وفد قائدِ اعظم سے ملنے کے لیے دہلی روانہ فرمایا جو حضرت والد صاحبؒ، حضرت مولانا ظفر احمد عثمانی اور حضرت مولانا شبیر علی صاحب تھانویؒ، مہتمم خانقاہ تھانہ بھون پر مشتمل تھا، تین حضرات کا یہ وفد ۱۲، فروری ۱۹۳۹ء کو دہلی پہنچا، شام کے سات بجے کا وقت ملاقات کے لیے طے ہوا، حضرت مولانا ظفر احمد صاحب عثمانیؒ کا بیان ہے کہ:

"وفد نے قائدِ اعظم سے کہا کہ مسلمان کسی تحریک میں اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتے جب تک کہ اس تحریک کو شریعت کے مطابق نہ چلائیں، اس تحریک کے چلانے والے خود کو احکامِ اسلام کا نمونہ نہ بنائیں اور اُن کے پیرو، شعائرِ اسلام کی پابندی نہ کریں کیونکہ جب یہ سب خود کو احکامِ دین کا پابند بنالیں گے تو اس کی برکت سے نصرت وکامیابی خود بخود ان کے قدم چومے گی اور انشاء اللہ بہت جلد کامیابی نصیب ہوگی، وفد نے مزید کہا کہ مسلمانوں کی سیاست کبھی مذہب سے الگ نہیں ہوئی

---

[۱] ان سب واقعات کی با حوالہ مفصل روئداد کے لیے "تعمیرِ پاکستان اور علمائے ربانی" کا مطالعہ فرمایا جائے۔

مسلمانوں کے بڑے بڑے قائد مسجدوں کے امام بھی تھے اور میدان کے جرنیل بھی خلفائے راشدینؓ، حضرت خالد بن الولیدؓ، حضرت ابو عبیدہ بن جراحؓ، حضرت عمرو ابن عاصؓ وغیرہم سب مذہب و سیاست کے جامع تھے، قائد اعظم نے فرمایا کہ "میرا تو خیال یہ ہے کہ مذہب کو سیاست سے الگ رکھنا چاہئیے" وفد نے کہا کہ "پھر اس طرح کامیابی کی توقع نہیں"۔

غرض اس موضوع اور بعض دوسرے اہم دینی مسائل پر تقریباً ڈھائی گھنٹہ گفتگو ہوتی رہی۔ بالآخر قائد اعظم کے اس اعتراف پر مجلس ختم ہوئی کہ:

"دُنیا کے کسی مذہب میں سیاست مذہب سے الگ ہو یا نہ ہو میری سمجھ میں اب خوب آگیا کہ اسلام میں سیاست مذہب سے الگ نہیں بلکہ مذہب کے تابع ہے"۔ (روئداد ص ۔) (ماخوذ از تعمیر پاکستان و علمائے ربانی ص ۵۱ تا ص ۵۷)

قیام پاکستان کی تحریک

جس زمانہ میں آپ دارالعلوم دیوبند کے صدر مفتی اور تدریس کے منصب جلیل پر فائز تھے، اسی زمانہ میں مسلم لیگ نے کانگریس کے علی الرغم مسلمانان برصغیر کے لیے ایک آزاد و خود مختار وطن پاکستان کا مطالبہ کیا، اس موقعہ پر اکابر علماء دیوبند اپنی دیانت دارانہ رائے کی بنا پر دو مختلف گروہوں میں منقسم ہوگئے، ایک گروہ جمعیۃ علمائے ہند کے سرکردہ زعماء کا تھا جو کانگریس کے ہم آواز ہوکر متحدہ قومیت کا حامی اور تقسیم ہند کے خلاف ——— اور مطالبۂ پاکستان کو مسلمانوں کے لیے مُضر سمجھتا تھا دُوسرا گروہ شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد صاحب عثمانیؒ اور حضرت والد صاحب وغیرہم پر مشتمل تھا، جو حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ کی رائے کے مطابق مسلمانانِ ہند کو کافروں کی غلامی سے نجات دلانے کے لیے قیام پاکستان کو وقت کی سب سے بڑی ضرورت سمجھتا تھا اور جس طرح کانگریس اب بعض مسلم جماعتیں کانگریس کے ساتھ کرنے لگی تھیں اُسے درست نہ سمجھتا تھا۔

شروع میں یہ اختلاف آپس کے تبادلۂ خیالات، علمی مباحثوں اور دارالعلوم کی چہار دیواری

تک محدود رہا۔ لیکن پاکستان کے لیے ہونے والا الیکشن جُوں جُوں قریب آرہا تھا مخالفین کا یہ پروپیگنڈہ زور پکڑتا جا رہا تھا کہ مسلم لیگ بے دین اُمرار کی نمائندہ ہے، اسے علماء کی تائید حاصل نہیں۔ ادھر اربابِ مسلم لیگ بھی محسوس کر رہے تھے کہ جب تک ہر محاذ پر علمارِ کرام بھرپور تعاون نہ فرمائیں پاکستان کا قیام ممکن نہیں۔

تحریکِ پاکستان کی خاطر دارالعلوم دیوبند سے استعفا

اب وقت آگیا تھا کہ مسئلہ کا ہر پہلو کھول کر عوام کے سامنے لایا جائے اور پاکستان کا مطالبہ سیاسی وشرعی حیثیت سے جیسا کہ برحق بجانب، بروقت اور ضروری ہے، اس کا صرف اظہار ہی نہیں بلکہ ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں اس کی آواز پُوری قوت سے پہنچائی جائے۔ دارالعلوم دیوبند میں رہتے ہُوئے اس اختلاف کا مسلسل اظہار نظمِ دارالعلوم کے لیے مناسب نہ تھا۔ اس لیے حضرت تھانویؒ کے مشورہ سے دارالعلوم سے علیحدگی کا فیصلہ فرمایا۔

یہ فیصلہ ان حضرات کے لیے جتنا صبر آزما تھا، اس کا اندازہ ہر ایک کو نہیں ہوسکتا، ان حضرات نے اپنے بچپن، جوانی اور کہولت کے شب و روز اسی کی چہار دیواری میں گذارے تھے، زندگی کی ولولہ انگیز توانائیاں اسی کی تعمیر میں صرف کی تھیں، ان حضرات کے لیے یہ صرف ایک درس گاہ نہیں بلکہ دنیا و آخرت کی اُمیدوں کا مرکز تھا، دارالعلوم ان کا وطن بھی تھا، آغوشِ مادر بھی۔ لیکن ملک و ملت کی خاطر اب اس آغوشِ مادر سے ضابطہ کا تعلق باقی رکھنا ممکن نہ تھا۔ بالآخر ۱۲ ربیع الاوّل ۱۳۶۲ھ کا وہ دن آپہنچا، جب شیخ الاسلام حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانیؒ کی معیت میں حضرت مولانا محمد ابراہیم صاحب بلیاویؒ، حضرت والد صاحب، آپ کے برادرِ عم زاد حضرت مولانا ظہور احمد صاحبؒ، جناب خلیفہ محمد عاقل صاحبؒ اور دیگر دو علمائے کرام جن کے اسمائے گرامی اس وقت یاد نہیں۔ دارالعلوم کی خدمات سے مستعفی ہوگئے۔

استعفا کے بعد آپ تھانہ بھون حاضر ہُوئے تو حضرت تھانویؒ نے دیکھتے ہی دیوانِ حماسہ کا ایک مصرعہ کچھ تصرف کر کے اس طرح پڑھا۔

لہ مکاتیب حکیم الامت ص ۲۲۳ (مخطوطہ)

"اَضَاعُوْکَا وَاَیَّ فَتًی اَضَاعُوْا"

(لوگوں نے تجھے اپنے ہاتھ سے کھو دیا اور وہ کیسے عظیم انسان کو کھو بیٹھے)

۱۳۲۵ھ سے ۱۳۶۲ھ تک تدریس و افتار کی ۲۷ سالہ خدمات کے بعد جب والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ دار العلوم دیوبند سے مستعفی ہوئے تو مشاہرہ ۶۵ روپے تھا۔[1]

مسلم لیگ کی تحریک جو دو قومی نظریہ پر مبنی تھی، حکیم الامت حضرت تھانویؒ اس کی حمایت ۱۳۵۶ھ (تقریباً ۱۹۳۷ء) ہی سے اپنی تحریروں کے ذریعہ فرما رہے تھے۔[2] تحریک پاکستان میں والد صاحبؒ کا حصہ بھی شروع میں محض علمی خدمات تک محدود رہا، دار العلوم سے استعفا کے بعد آپ نے پوری طرح کھل کر اس موضوع پر لکھنا شروع کیا اور کچھ عرصہ بعد تو قیام پاکستان کی جدوجہد ہی شب و روز کا مشغلہ بن گئی تھی جس کی تفصیل ذرا آگے بیان ہوگی۔

تھانہ بھون میں تصنیف و افتار

یہ زمانہ حکیم الامت حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی حیات کا آخری دور تھا۔ مرض وفات شروع ہو چکا تھا اور ضعف روز بروز بڑھتا جا رہا تھا۔ تصنیف اور افتار کا جو کام آپ کی ذات گرامی سے وابستہ تھا، اُسے سنبھالنے کے لیے آپ نے والد صاحبؒ کو تھانہ بھون بلا لیا، مرشد کی خواہش کے مطابق مستقل قیام کے لیے والد صاحب ۱۵ جمادی الاولیٰ ۱۳۶۲ھ کو تھانہ بھون پہنچے اور ۱۷ جمادی الاولیٰ[3] سے یہ دونوں خدمات شروع کر دیں، صبح ساڑھے پانچ بجے سے ساڑھے نو بجے تک چار گھنٹے تصنیف کے کام میں مشغولیت رہتی، اس کے بعد اگر حکیم الامتؒ کی مجلس ہوتی تو اس میں شریک ہوتے اور بعد ظہر بھی حضرت ہی کی مجلس میں حاضری رہتی۔ دوپہر اور رات کا وقت فتاویٰ کے کام میں صرف ہوتا تھا

احکام القرآن کی تصنیف

تصنیف میں اس وقت عظیم ترین کام احکام القرآن (عربی) کا پیش نظر تھا جو حکیم الامت نے اپنے

---

[1] مکاتیب حکیم الامت ص ۲۲۴ [2] حوالہ بالا ص ۱۹۷ [3] مکاتیب حکیم الامت ص ۲۳۶ تا ۲۳۷

ضعف و علالت کے باعث خود انجام نہ دے سکے تو کافی عرصہ قبل یہ کام چار علمائے کرام پر تقسیم فرما دیا تھا دو جلدیں خامس و سادس (سورۃ الشعراء سے سورۃ الحجرات کے ختم تک) والد صاحبؒ کو لکھنی تھیں۔

یہ کام اگرچہ والد صاحبؒ ۱۳۶۱ھ میں ہی شروع فرما چکے تھے مگر اس ٹھوس علمی و تحقیقی کام کے لیے جس فراغتِ وقت کی ضرورت تھی وہ دارالعلوم دیوبند کی ذمہ داریوں کے ساتھ ممکن نہ تھی، لہٰذا اس کام میں تسلسل برقرار نہ رہ سکا تھا۔ ماہنامہ المفتی کئی سال پہلے بند ہو چکا تھا اور تجارتی کتب خانہ دارالاشاعت بڑی حد تک بھائی جان نے سنبھال لیا تھا، اس سے بھی ذہن فارغ تھا۔ اس لیے اب تھانہ بھون میں پوری یکسوئی کے ساتھ آپ اس خدمت میں منہمک ہو گئے۔

مگر تجارتی کتب خانہ ابھی تک اس قابل نہ تھا کہ خانگی مصارف کا تمام تر بوجھ اس پر ڈالا جا سکے، اس لیے حکیم الامتؒ والد صاحب کا مشاہرہ مقرر فرمانا چاہتے تھے مگر والد صاحب کی خواہش تھی کہ بلامعاوضہ خدمت انجام دیں۔ آخر کار حکیم الامتؒ نے فرمایا کہ آپ کی طرف سے تو کسی معاوضہ یا تنخواہ کی شرط نہیں مگر ہم جب کبھی کچھ دیں تو وہ لے لیا کریں[1]۔ پونے دو ماہ تک تصنیف و فتویٰ کی ان خدمات کا سلسلہ باقاعدگی سے جاری رہا۔

قضا و قدر کے فیصلے

مگر قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا، واقعہ یہ پیش آیا کہ دیوبند میں والد صاحب نے کچھ عرصہ قبل اپنے باغ سے ملحق ایک چھوٹی سی زمین خریدی تھی، جس کا بیعنامہ بھی ہو چکا تھا، ایک شخص جو اس میں جزوی طور پر شریک تھا، اس نے بھی بار بار علانیہ طور پر اس بیع کی اجازت دے دی تھی مگر اب اچانک اس نے شفعہ کا دعویٰ دائر کر دیا۔ والد صاحبؒ کو حکیم الامتؒ سے اجازت لے کر ۶ رجب ۱۳۶۲ھ کو مجبوراً دیوبند آنا پڑا اور یہاں سے ۸ رجب کو حضرت کی مزاج پرسی کے لیے خط روانہ کیا۔ ۱۰ رجب کو حضرت ہی کے قلم کا لکھا ہوا جواب موصول ہو گیا جس میں کسی غیر معمولی تکلیف کا اظہار نہ تھا۔ کسے خبر تھی کہ یہ حضرت حکیم الامتؒ کا آخری خط ثابت ہو گا[2]۔ تاہم والد صاحبؒ کی طبیعت حضرت کی طرف

---

[1] مکاتیب حکیم الامتؒ ص ۹۲ [2] حوالہ بالا ص ۲۳۷

سے بے چین تھی اس لیے اپنا حق چھوڑ کر تدعی کا دعویٰ تسلیم کرلیا تاکہ مقدمہ ختم کر کے صلح ہوجائے اور جلد از جلد تھانہ بھون پہنچ سکیں۔ ۱۵ رجب کو ایک خط میں یہ سب تفصیل لکھ کر حضرتؒ کی خدمت میں روانہ کی اور لکھا کہ ان دھندوں سے فارغ ہو کر جمعہ ۱۹ رجب کو تھانہ بھون حاضر ہوجاؤں گا مگر یہ پہلا موقع تھا کہ خط جواب کے بغیر واپس آگیا۔[1] قدرت بے نیاز نے فیصلہ ہی کچھ اور کر دیا تھا۔

حکیم الامتؒ کی وفات

یہ جگر خراش حادثہ مجھے بھی یاد ہے۔ بدھ ۱۷ رجب ۱۳۶۲ھ کو صبح تقریباً نو دس بجے کا وقت تھا۔ حضرت والد صاحب شاید عدالت جانے کی تیاری کر رہے تھے، بھائی جان جو کسی کام سے سہارنپور گئے ہوئے تھے، اچانک یہ المناک خبر لائے کہ حضرتؒ کا انتقال ہوگیا۔

سنتے ہی والد صاحبؒ کا حال ناقابل بیان ہوگیا، ابتداء سکتہ سا ہوا، چہرے کی رنگت بدل گئی پھر بے تابانہ ٹہلنے جاتے اور "اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْن" پڑھتے جاتے تھے، استغراق کا سا عالم تھا ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سمجھ میں نہیں آرہا کیا کریں، دیکھتے ہی دیکھتے گھر میں ہجوم ہوگیا، پورے دیوبند میں ہلچل مچ گئی، جس کو جو سواری ملی تھانہ بھون روانہ ہوگیا، جسے کچھ نہ مل سکا بائیسکل ہی پر دوڑ پڑا۔ ایک ایک سائیکل پر کئی کئی سوار تھے، بہت سے لوگ پیدل ہی چل پڑے۔ والد صاحبؒ بھی چلے گئے۔ تھوڑی ہی دیر میں دیوبند پر سناٹا چھا گیا، تمام مرد نماز جنازہ میں شرکت اور آخری دیدار کیلئے تھانہ بھون جاچکے تھے۔ والد صاحبؒ کو یہ قلق ہمیشہ رہا کہ عین آخر وقت میں مجھے تھانہ بھون سے دیوبند آنا پڑ گیا اور آخری لمحات میں حضرتؒ کی نظروں کے سامنے نہ رہ سکا۔ چنانچہ مکاتیب حکیم الامتؒ میں جہاں حضرتؒ کے نام اپنا آخری خط نقل کیا ہے، اس کے حاشیہ پر یہ پورا واقعہ نقل کر کے بڑی حسرت سے یہ شعر لکھا ہے کہ:

رفتم کہ خار از پا کشم محمل نہاں شد از نظر
یک لحظہ غافل گشتم و صد سالہ راہم دور شد

---

[1] مکاتیب حکیم الامتؒ، سب سے آخری خط مورخہ ۵ رجب ۱۳۶۲ھ۔ ص ۲۳۸ (مخطوطہ)

آپ کا اُردو اور فارسی کلام عشقِ مُرشد میں ڈوبا ہُوا ہے، جذباتِ عقیدت نے کہیں غزل کا رُوپ دھارا ہے کہیں نظموں اور قطعات کا، یہ سب کلام "کشکول" میں چھپ چکا ہے ــــ اس حادثہ پر آپ نے ایک مرثیہ فارسی میں اور ایک اُردو میں کہا ہے، اُردو کا مختصر ہے۔

اِس حادثہ پر آپ کے منظوم تأثرات[1]

وہ حکیمِ اُمّت خیر الورٰی قُطبِ ہُدٰی — وہ دَوا اُمّت کے ہر بیمار کی، ناشاد کی
صدقِ صدّیقی تھا جس میں حزمِ فارُوقی کے ساتھ — ایک درخشاں یادگارِ سلاف اور امجاد کی
مشعلِ راہِ ھُدٰی، نورِ محمّد کی ضیا — آہ وہ زندہ نشانی حضرتِ امداد کی
حضرتِ اشرف علی تھانوی روحی فداہ — جن سے قائم تھیں ہزاروں مسندیں ارشاد کی
ہیں سبھی اہلِ کمال و اہلِ دل مصروفِ کار — دیکھ لو خالی پڑی ہے ہر جگہ اُستاد کی
کیوں نہ ہوں چشمِ فلک سے خون کے آنسو رواں — کیوں نہ ہو روئے زمیں صفِ ماتم و فریاد کی
خستہ حالوں کے لیے اب ہے نہیں جائے پناہ — آسماں تانبے کا ہے آج اور زمیں فولاد کی
وائے ناکامی کہ ہم جیسے تباہ و خستہ دل — اور چھائی ہیں گھٹائیں ہر طرف الحاد کی
ناخُدا گم کردہ ہے کشتی اُمّت اے کریم — ہے زبوں حالت ہمارے مجمع و افراد کی

المدد بہرِ حبیب خُود الٰہی المدد
اُمّتِ مرحُوم پھر محتاج ہے امداد کی

حکیم الاُمّتؒ کے بعد

اس حادثہ کے بعد صحیح مدّت تو یاد نہیں مگر اتنا یاد ہے کہ والد صاحبؒ کافی عرصہ تھانہ بھون میں مقیم رہے۔ ناچیز راقم الحروف کی عُمر اس وقت سات سال اور برادرِ بزرگوار جناب محمد ولی صاحب رازی کی عمر نو سال تھی، ہماری والدہ محترمہ اور ہم دونوں بھی اس قیام میں ساتھ تھے۔ مہینوں تک ملک کے اطراف سے تعزیت کے لیے آنے والوں کا تانتا بندھا رہا۔ فتاویٰ اور احکام القرآن کی تصنیف کا

---

[1] کشکول ص ۱۷۱

جو کام حضرتؒ کے سامنے جاری تھا والد صاحبؒ نے اُسے جاری رکھا۔

خانقاہِ تھانہ بھون میں خدمتِ دین کے چار بنیادی سلسلے حضرت حکیم الامتؒ کی ذاتِ گرامی سے وابستہ تھے۔ (۱) تصنیف و تالیف (۲) فتاویٰ (۳) اصلاح و ارشاد (۴) وعظ و تذکیر —
حکیم الامتؒ کے اکابر خلفاء نے تھانہ بھون میں مشورہ کے بعد یہ طے کیا کہ والد صاحب دیوبند سے ترکِ سکونت کر کے مستقل قیام یہیں فرمائیں اور خانقاہ میں ان چاروں سلسلوں کو جاری رکھیں — مگر والد صاحبؒ نے فیصلہ اپنی ضعیف والدہ پر چھوڑا جو دیوبند ہی میں تھیں، انھوں نے اپنے اکلوتے بیٹے کو جو ظاہر اسباب میں ان کی زندگی کا واحد سہارا تھا، اس کی اجازت نہ دی۔ بالآخر والد صاحب ہم سب کو لے کر دیوبند واپس آگئے۔

تصنیف اور فتاویٰ کا کام یہاں بھی جاری رہا، بلکہ یہ مصروفیت تو زندگی کے آخری لمحات تک برابر چلتی رہی لیکن احکام القرآن کا کام زیادہ تیز رفتاری سے نہ چل سکا۔ اب کیونکہ ملک کے سیاسی حالات نے دینی جد و جہد کا ایک نیا میدان کھول دیا تھا جس کی طرف رہنمائی حکیم الامت فرما چکے تھے۔ والد صاحب کی مصروفیات اب اس میدان میں بڑھ رہی تھیں، احکام القرآن کی تکمیل پاکستان آنے کے بھی بہت عرصہ بعد، ۱۰ رمضان ۱۳۸۸ھ کو ہوئی۔ بحمد اللہ اب یہ کتاب شائع بھی ہو گئی ہے۔

قیامِ پاکستان کیلئے سرگرم جدّوجُہد

کانگریسی نظریہ کی تردید اور پاکستان کی حمایت میں تصانیف

اس مسئلہ میں عام فتاویٰ اور متفرق مضامین کے علاوہ آپ نے ۱۳۶۴ھ مطابق ۱۹۴۵ء میں ایک مستقل رسالہ "کانگریس اور مسلم لیگ کے متعلق شرعی فیصلہ" تصنیف فرمایا، جس میں اس مسئلہ کی شرعی حیثیت کو نہایت تفصیل سے واضح فرمایا، اس موضوع پر یہ پہلی علمی کتاب تھی جس میں غیر مسلموں سے مسلمانوں کی موالات، مصالحت اور استعانت کی تمام صورتوں کے علیحدہ علیحدہ شرعی احکام اپنی خوبی اور تفصیل سے جمع کیے گئے، دلائل میں حضرت والد صاحبؒ نے اپنی عادت کے مطابق قرآن و سنّت اور فقہی عبارات کے نہایت معتمد شواہد پیش کیے اور عقل و سیاست کے ہر پہلو سے یہ ثابت کیا کہ موجودہ

حالات میں کانگریس کی حمایت سے در اصل کفر کی حمایت لازم آئے گی اور اس میں حصہ لینا قرآن و سنت کی رو سے کسی طرح جائز نہیں۔ یہ رسالہ اُسی وقت بڑی تعداد میں شائع ہُوا [1]

علاوہ ازیں اپنے مرشد حکیم الامت حضرت تھانوی کے دس رسائل، متفرق مضامین اور ملفوظات و مکتوبات کا ایک مجموعہ مرتب کر کے کتابی شکل میں "افاداتِ اشرفیہ در مسائلِ سیاسیہ" کے نام سے شائع فرمایا۔ یہ مجموعہ بھی اس موضوع پر بہت مؤثر ثابت ہُوا۔

بروقت ایک اہم فتویٰ

۲۷ر نومبر ۱۹۴۵ء کے انتخابات تحریکِ پاکستان کے لیے بڑی اہمیت رکھتے تھے، سہارنپور اور مظفر نگر وغیرہ کے حلقۂ انتخاب سے کانگریس کے مقابلہ میں مسلم لیگ کی جانب سے قائدِ ملت لیاقت علی خاں مرحوم کھڑے ہُوئے جو بعد میں پاکستان کے پہلے وزیرِ اعظم بنے۔ یہاں مسلم لیگ کی کامیابی سب ہی کو مشکل نظر آ رہی تھی مگر حضرت والد صاحبؒ کے ایک فتوے نے فضا یکسر بدل دی۔ مجھے یاد ہے کہ یہ فتویٰ پوسٹروں کی شکل میں پُورے حلقۂ انتخاب میں چسپاں کیا گیا جس کا بڑا عنوان یہ تھا — "کانگریس کی حمایت کُفر کی حمایت ہے"۔ یہ پوسٹر احقر کے پھوپھی زاد بھائی جناب مولانا حامد حسن انصاری صاحب (فاضل دار العلوم دیوبند) سہارنپور سے دیوبند بھی لائے اور پولنگ سے ایک روز قبل راتوں رات دیوبند میں چسپاں کیے گئے۔

جناب خواجہ آشکار حسین صاحب نے جو مسلم لیگ کی ہائی کمان کی جانب سے اس حلقہ کا جائزہ لینے پر مامور تھے، ماہنامہ نُقاد میں یہ واقعہ قدرے تفصیل سے تحریر کیا ہے۔ اس کے چند اقتباسات یہ ہیں:

"سب سے سخت مقابلہ خود لیاقت علی خاں کے حلقۂ انتخاب میں تھا۔"

آگے فرماتے ہیں کہ:

---

[1] یہ رسالہ اب "جواہر الفقہ" کا جزو بن کر شائع ہُوا ہے۔ اس کا نیا نام "سیاست میں غیر مسلموں کے ساتھ اشتراکِ عمل کی حُدود و شرعیہ" ہے۔ رفیع ۱۳ ھ

" ہم سہارنپور پہنچے، وہاں حامیانِ لیگ نے کہا کہ یہاں مفتی محمد شفیع کے فتوے کے بغیر کام نہ چلے گا، میں نے دیوبند جاکر موصوف کا فتویٰ بھی حاصل کیا اور سہارنپور پہنچ کر اس کی طباعت کے انتظامات کرائے۔ ۲۷ نومبر کو پولنگ ہونے والا تھا۔ ۲۴ نومبر کو لیاقت علی خاں سہارنپور پہنچے۔"

فاضل مضمون نگار آگے فرماتے ہیں:

" میں فوراً ڈاک بنگلہ پہنچا۔ لیاقت صاحب بڑے جوش سے بغل گیر ہوئے اور فتوے کی کامیابی پر مبارکباد دی، میں نے فوراً مفتی صاحب کا فتویٰ پیش کر دیا۔ دیکھ کر اُچھل پڑے پھر حالات کے متعلق استفسار کرنے لگے۔"

(ماہنامہ نقاد کراچی اکتوبر ۱۹۵۳ء ص ۷۰)

جمعیۃ علماءِ اسلام کا قیام

دارالعلوم دیوبند سے الگ ہو جانے کے بعد نومبر ۱۹۴۵ء (تقریباً ۱۳۶۴ھ) میں کلکتہ میں جمعیۃ علماءِ اسلام کی بُنیاد ڈالی گئی جس کے مقاصد میں سرِ فہرست یہ تھا کہ مطالبۂ پاکستان کے لیے مؤثر جدوجُہد کی جائے اور جو مسلمان مطالبۂ پاکستان سے منحرف یا تردُّد کی حالت میں کھڑے ہیں انھیں قیامِ پاکستان کی مجاہدانہ جدوجُہد میں شریک کیا جائے۔ اس جمعیت کے سب سے پہلے صدر غائبانہ طور پر شیخ الاسلام حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی چُنے گئے۔

حضرت مولانا عبدالرؤف صاحب دانا پوری نے والد ماجد کو اس جمعیت میں شرکت کی دعوت دی تو آپ نے یہ جواب دیا کہ ہنوز میرا اس پر شرح صدر نہیں۔ خوف یہ ہے کہ علماء کے ایک طبقہ سے کانگریس غلط فائدہ اُٹھا رہی ہے، باقی طبقہ علماء کو لیگ غلط طور پر آلہ کار بنا لے۔ اس طرح کہیں علماءِ دین کی آزادئ ضمیر دوسروں کی دست نگر ہو کر نہ رہ جائے۔ اسی تردد کی بناء پر تحریکِ پاکستان کی مکمل حمایت کے باوجود آپ ایک عرصہ تک اس جمعیت کے باضابطہ رُکن نہیں بنے۔

مگر تحریکِ پاکستان کی روز افزوں ضرورت نے اس حالت پر دیر تک قائم رہنے نہ دیا۔ اور جو خدشات آپ کے دل میں تھے، شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد صاحب عثمانی جیسی عظیم شخصیت کی

قیادت کی موجودگی میں ان کی بھی کوئی وجہ باقی نہ رہی چنانچہ جمعیت کے اجلاس کانپور میں جمعیت کی باضابطہ رکنیت اختیار فرمائی اور ساتھ ہی آپ کو عاملہ کا رُکن بھی نامزد کر دیا گیا۔

تقسیم سے قبل دورۂ سندھ

یکم ربیع الاول ۱۳۶۶ھ مطابق ۲۴ جنوری ۱۹۴۷ء میں جمعیۃ علماء اسلام کی ایک عظیم الشان کانفرنس حیدر آباد سندھ میں منعقد ہوئی۔ اس کی صدارت شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی کو کرنا تھی مگر بروقت ان کو شدید علالت پیش آگئی تو حضرت والد صاحبؒ کو اس کانفرنس کی صدارت کے لیے سندھ روانہ کیا۔ بھائی جان اس دورہ میں بھی دیوبند سے ساتھ آئے تھے۔

یہاں کے علماء و عوام کے عظیم الشان تاریخی اجتماع میں آپ نے جو خطبۂ صدارت پڑھا، سیاست کے اسلامی اصولوں کا بے نظیر مرقع ہے، اس میں آپ نے سیاسی قیادت کے شرعی اصول اور غیر صالح امیر کی اطاعت کے شرعی حدود پر سیر حاصل بحث فرمانے کے بعد معترضین کے جوابات اور علماء و عوام کے فرائض دلنشین انداز میں بیان فرمائے۔ یہ خطبۂ صدارت اُس زمانہ میں ہزارہا کی تعداد میں طبع ہوا لیکن پاکستان بن جانے کے بعد اس کی دوبارہ اشاعت نہ ہو سکی۔

قائد اعظم کی قیادت پر ایک اعتراض اور اُس کا جواب

کانگریسی خیال رکھنے والے مسلمان جو گاندھی جی، پنڈت نہرو اور سردار پٹیل کی قیادت کو شرعاً جائز قرار دے رہے تھے، اُن کا ایک بڑا اعتراض مسلم لیگ پر یہ تھا کہ اس کے لیڈر علم دین سے بے بہرہ اور اسلامی شعائر سے بے پرواہ ہیں، اس لیے مسلمانوں کو مسلم لیگ کی بجائے کانگریس کی حمایت کرنا چاہیے۔

حضرت والد صاحبؒ نے اپنے خطبۂ صدارت میں اس اعتراض کا جواب قرآن و سنت کی روشنی میں نہایت بسط کے ساتھ دیا ہے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس بحث کا مختصر اقتباس یہاں پیش کر دیا جائے۔

—

مسئلۂ قیادت

* اس جگہ سب سے پہلے یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ کسی جماعت یا انجمن کا صدر و قائد ہونا اور چیز ہے اور امارت شرعیہ اور چیز ہے۔ بہت سے شبہات صرف یہاں سے پیدا ہوتے ہیں کہ ایک جماعت کے قائد کو اصطلاحی شرعی امیر قرار دے کر اُس کے احکام اُس پر جاری کیے جاتے ہیں اور اس کی تمام شرائط و صفات اس میں ڈھونڈی جاتی ہیں۔

مسلمانوں نے مسٹر محمد علی جناح کو موجودہ جنگ آزادی کا ایک ماہر فن جرنیل ہونے کی حیثیت سے قائد اعظم قرار دیا ہے۔ نہ اس حیثیت سے کہ وہ کوئی مفتی ہیں، اُن سے حلال و حرام کے احکام میں فتویٰ لیا جائے گا یا اس حیثیت سے کہ وہ کوئی شیخ مرشد ہیں، ان سے اصلاح اعمال کا کام لیا جائے گا۔ میرے خیال میں شاید ایک مسلمان بھی یہ خیال لے کر اُن کو قائد نہیں کہتا، ان کی قیادت ہندوستان کی مسلم جمہوریت نے صرف اس لیے تسلیم کی ہے کہ انگریز اور ہندو دونوں اسلام اور مسلمانوں کے دشمن ہیں اور انگریز اس وقت خواہ بین الاقوامی مقتضیات سے یا اندرونی چیخ و پکار سے متاثر ہو کر جس قسم کی بھی آزادی ہندوستان کو دینا چاہتا ہے، ہندو اپنی عددی اکثریت، مستحکم تنظیم اور بے حد و شمار سرمایہ کے بل بوتہ پر اُس کا تنہا مالک بننا چاہتا ہے، اُس کا کھلا ہوا منصوبہ یہ ہے کہ مسلمانوں کی مستقل قوم اور ہندوستان کی عام اقلیتوں کو اپنا غلام بنائے رکھے، اس کے لیے اس وقت جنگ جاری ہے اور ظاہر ہے کہ یہ جنگ توپ تفنگ کی نہیں محض آئین اور قانون کی ہے۔

اور ادھر باتفاق موافق و مخالف یہ امر مسلم ہے کہ اس جنگ کے لیے مسٹر محمد علی جناح سے بہتر جرنیل نہ صرف یہ کہ مسلمانوں میں نہیں بلکہ کسی دوسری قوم میں بھی نہیں۔ کس قدر بدنصیبی ہے اُس قوم کی جو اپنے اندر ایسا جرنیل رکھتے ہوئے اس کو میدان عمل میں بڑھانے یا اس کے جھنڈے کے نیچے جنگ آزادی لڑنے میں اس لیے تامل کرے کہ وہ اپنے جرنیل میں تقویٰ و طہارت کے خاص اوصاف نہیں پاتی۔ ریل موٹر، جہاز کا ڈرائیور اور کپتان مقرر کرنے کے وقت بڑے سے بڑا متقی، دین دار اور دانشمند صرف اس کا اطمینان کر لینا ضرور سمجھتا ہے کہ وہ ڈرائیوری کے فن میں ماہر اور مکمل ہے یا نہیں، اس میں اعتماد ہو جانے کے بعد اُس کے ذاتی اعمال و افعال کا اچھا ہونا نہ عقلاً اس کی گاڑی میں سوار ہونے سے مانع ہو سکتا

ہے نہ شرعاً۔

اس پر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ان کاموں کے لیے مسلمان ہونا بھی شرط نہیں تو اس سے گاندھی اور نہرو کی قیادت کا جواز بھی نکل آیا کیونکہ ہندوؤں کی مسلم دشمنی کے مشاہدہ ہو جانے کے بعد ان کی مثال اس ڈرائیور کی سی ہے جس کے متعلق ہمیں معلوم ہے کہ وہ ہمارے خون کا پیاسا ہے۔ اُس نے موقع پایا تو ہلاک کیے بغیر نہ چھوڑے گا۔ ایسی حالت میں ظاہر ہے کہ اس کی گاڑی میں سوار ہو کر اپنی جان اس کے سپرد کر دینا نہ عقلاً جائز ہو سکتا ہے نہ شرعاً۔

اس میں شبہ نہیں کہ تقویٰ و طہارت اسلام کا مقصودِ عظیم ہیں اور مسلمانوں کے ہر کام کو چلانے والے اگر متقی پارسا آدمی میسر آجائیں تو بلاشبہ سعادت کبریٰ اور موجب برکات ہے لیکن جو کام لینا ہے اُس کا ماہر اگر کوئی متقی موجود نہ ہو، یا وہ کام کرنے کے لیے آمادہ نہ ہو یا اس کو اسباب میسر نہ ہو تو غیر متقی ماہر فن سے وہ کام لے لینا آج اس شر القرون اور فسق و فجور کے زمانہ میں نہیں بلکہ خیر القرون میں بھی جرم نہیں سمجھا گیا۔

شرعی دلائل

حافظ ابن تیمیہ نے اپنی کتاب السیاسۃ الشرعیہ میں نقل کیا ہے کہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ (جو جلیل القدر تابعی اور حضرت عمر فاروقؓ کے نقش قدم پر امور خلافت کو انجام دینے کے سبب عمر ثانی کہلاتے تھے) آپ کے کسی صوبہ دار حاکم نے آپ سے یہ سوال کیا کہ میں ایک فوجی عہدہ کسی شخص کے سپرد کرنا چاہتا ہوں اور دو آدمی میری نظر میں ہیں۔ ایک تو نہایت قوی اور فنون حرب سے واقف ہے مگر متقی پابند شرع نہیں اور دوسرا نہایت متقی پارسا ہے مگر قوی اور ماہر فن نہیں۔ آپ فیصلہ فرمائیں کہ ان دونوں میں سے کس کو یہ منصب سپرد کروں؟

آپ نے جواب دیا کہ:

"قوی کی قوت تو مسلمانوں کے کام آوے گی اور اس کے بُرے اعمال کی خرابی اس کی ذات کو پہنچے گی، اور متقی کا تقویٰ اس کی ذات کے لیے اور اس کے ضعف یا ناواقفیت سے جو نقصان ہوگا وہ سب مسلمانوں کو بھگتنا پڑے گا۔ اس لیے اس کام کے واسطے قوی غیر متقی کا انتخاب کرنا چاہیئے۔"

آگے حضرت والد صاحبؒ نے قرآن و سُنّت اور تاریخ کے جو ٹھوس دلائل اس مسئلہ پر ذکر کیے ہیں، قابلِ دید ہیں۔

غرض شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد صاحب عثمانی کی قیادت میں ان حضرات نے انتھک جدوجہد اور مجاہدانہ سرگرمی سے کام لے کر قرآن و سُنّت کے دو اٹل قانون مسلمانوں کے دلوں میں راسخ کر دیے۔

(۱) ایک یہ کہ دُنیا کے تمام مسلمان ایک ملّت ہیں اور کافر بالکل دُوسری ملّت، یہ دو متضاد ملّتیں "بھائی بھائی" نہیں ہو سکتیں، وطن کی بُنیاد پر انہیں ایک قوم یا ایک برادری نہیں کہا جا سکتا۔

(۲) دُوسرا یہ کہ مسلمان دینی اعتبار سے کتنا بھی گیا گزرا ہو مگر کافر و مشرک سے بہر حال بہتر ہے، ہندو اکثریت کی حکومت کو اپنے اُوپر اپنے اختیار سے مسلّط کرنا مسلمانوں کے لیے کسی حال جائز نہیں۔

ان اکابر علماء کی تصانیف، فتاویٰ اور تحریروں تقریروں سے مسلمانوں پر جب یہ بات ثابت ہوگئی، کہ قیامِ پاکستان کا مطالبہ درحقیقت قرآن و سُنّت کے اصولوں پر مبنی ہے اور کانگریس کا پھیلایا ہُوا کافرانہ جال مسلمانوں کو انگریزوں کی غلامی سے نکال کر ہندوؤں کی بدترین غلامی میں پھانسنے کے لیے بُنا گیا ہے تو وہ جوق در جوق مسلم لیگ کے جھنڈے تلے جمع ہوگئے۔

مسلمانوں کو ایک مغالطہ یہ دیا جاتا تھا کہ حضرت شیخ الہندؒ نے بھی تو ہندوؤں کے ساتھ اشتراکِ عمل کیا تھا، اگر وہ جائز تھا تو اب کانگریس کے ساتھ اشتراکِ عمل کیوں جائز نہیں؟

حضرت والد صاحبؒ نے اپنے رسالہ "مسلم لیگ اور کانگریس کے متعلق شرعی فیصلہ" میں اس کا نہایت مفصل جواب دیا کہ حضرت شیخ الہندؒ نے ہندوؤں کے ساتھ اشتراکِ عمل کو اس لیے گوارا کیا تھا کہ اس وقت قیادت مسلمانوں کے ہاتھ میں تھی، ہندو اس قیادت کے پیچھے چل رہے تھے، چنانچہ اگر ہندوستان اُس وقت آزاد ہُوا ہوتا تو حکومت مسلمانوں کی ہوتی؛ ظاہر ہے کہ اسلامی حکومت کے قیام میں کافروں سے جُزوی طور پر مدد لینا فی نفسہٖ کوئی ناجائز کام نہیں اور اب معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے کہ کانگریس کی قیادت ہندوؤں کے ہاتھ میں ہے۔ اگر پورے ہندوستان کا مرکزی اقتدار کانگریس کو ملا تو پُورے ملک پر ہندو اکثریت کی حکومت قائم ہو جائے گی اور اپنے اختیار سے کسی کافر حکومت کو اپنے اوپر مسلّط کرنے کی اسلام کسی حال اجازت نہیں دیتا۔ حضرت شیخ الہندؒ نے بھی اسے کبھی جائز قرار نہیں دیا۔

قیامِ پاکستان کا فیصلہ

چنانچہ ۲۷ نومبر ۱۹۴۵ء کے انتخابات جو متحدہ ہندوستان کی مرکزی اسمبلی کے لیے ہوئے تھے، انہیں تمام مسلم نشستیں مسلم لیگ کو ملیں۔ یہ سو فیصد کامیابی قیامِ پاکستان کے لیے سنگِ میل ثابت ہوئی، کیونکہ اسی اسمبلی کو ہندوستان کا آئین بنانا تھا اور ہندوستان کے مستقبل کا فیصلہ بھی بڑی حد تک اسی کو کرنا تھا۔

اس کے بعد ۱۹۴۶ء کے صوبائی انتخابات میں بھی مسلم لیگ نے دو قومی نظریہ کا لوہا منوالیا۔ اور ثابت کر دیا کہ مسلمان ہندوؤں کی غلامی کے لیے تیار نہیں۔ بالآخر انگریز، ہندو، سکھ تینوں قوموں کو مطالبۂ پاکستان کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنا پڑا، اور تقسیمِ ہند کے لیے ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کی تاریخ طے ہو گئی۔

قیامِ پاکستان اور تقسیمِ ہند کا جو نقشہ تجویز کیا گیا تھا اس پر غور کرنے کے لیے ۹ جون ۱۹۴۷ء کو قائدِ اعظم نے مرکزی اسمبلی کے تمام مسلم ارکان کا اجلاس دہلی میں طلب کیا۔ اگرچہ شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد صاحب عثمانیؒ اور حضرت والد ماجدؒ اسمبلی کے رکن نہ تھے، مگر خصوصی دعوت پر یہ دونوں حضرات بھی اس کانفرنس میں شریک ہوئے، اجلاس نے متفقہ طور پر قیامِ پاکستان کا مجوزہ نقشہ منظور کر لیا۔

سلہٹ اور صوبہ سرحد کا ریفرنڈم

مگر ہندو انگریز گٹھ جوڑ نے قیامِ پاکستان کے فیصلہ میں ایک شق یہ بڑھا دی تھی کہ سلہٹ اور صوبہ سرحد پاکستان میں شامل ہوں یا بھارت میں اس کا فیصلہ وہاں کے عوام سے بذریعہ ریفرنڈم کرایا جائے گا، حالانکہ ۱۹۴۵ء کے انتخابات میں یہاں کے مسلمان بھی اپنا ووٹ پاکستان کے حق میں دے چکے تھے، مگر یہ شق پنڈت نہرو نے اس وجہ سے رکھوائی تھی کہ صوبہ سرحد میں اس وقت کانگریسی وزارت قائم تھی جو خان برادران چلا رہے تھے، اس کانگریسی وزارت نے بھی گاندھی اور نہرو کے عزائم کے لیے فضا خوب بنائی تھی اور پاکستان کے حامی سیکڑوں علماء کرام کو جیلوں میں بند کر دیا گیا تھا۔[1]

---

[1] تحریکِ پاکستان اور علماء ربانی، ص ۱۷۲ (بحوالہ خطبۂ صدارت شیخ الاسلام فروری ۱۹۴۹ء ڈھاکہ)

اسی لیے اکثر مسلمانوں کو سلہٹ اور صوبہ سرحد کے ریفرنڈم کی بڑی فکر تھی۔
یہ تھے وہ حالات جن میں متحدہ ہندوستان کی مرکزی اسمبلی کے مسلم ارکان کی یہ کانفرنس منعقد ہوئی تھی۔

قائدِ اعظم سے دوسری[1] ملاقات

اس کانفرنس سے فارغ ہو کر شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد صاحب عثمانیؒ، حضرت مولانا ظفر احمد صاحب عثمانیؒ، اور حضرت والد صاحبؒ نے ۱۱ جون ۱۹۴۷ء کو قائدِ اعظم سے دہلی میں ان کی قیام گاہ پر ملاقات فرمائی۔ قائدِ اعظم نے کھڑے ہو کر پُرجوش خیر مقدم کیا، شیخ الاسلام نے قائدِ اعظم کو حصولِ پاکستان پر مبارکباد پیش کی تو انھوں نے کہا:

"مولانا اس مبارکباد کے مستحق تو آپ ہیں کہ آپ ہی کی کوششوں سے یہ کامیابی ہوئی ہے۔"

اس کے بعد قائدِ اعظم نے کہا کہ اس وقت سب سے اہم مسئلہ سلہٹ اور صوبہ سرحد کے ریفرنڈم کا ہے، اگر پاکستان اس ریفرنڈم میں ناکام رہا تو بہت بڑا نقصان ہوگا۔
ان حضرات نے فرمایا کہ انشاء اللہ پاکستان اس میں کامیاب ہوگا بشرطیکہ آپ اعلان کریں کہ پاکستان میں اسلامی نظام جاری ہوگا۔
اس پر قائدِ اعظم نے کہا کہ:

"میں پاکستان کے مقدمہ میں مسلمانوں کا وکیل تھا، اللہ تعالیٰ نے ان کو اس مقدمہ میں کامیاب کیا، پاکستان ان کو مل گیا۔ اب میرا کام ختم ہوا، اب مسلمانوں کو اختیار حاصل ہے کہ جس طرح کا چاہیں نظام قائم کریں اور چونکہ پاکستان میں اکثریت مسلمانوں کی ہے

---

[1] والد صاحبؒ کی پہلی ملاقات ۱۹۳۹ء میں ہوئی تھی جس کی کچھ تفصیل بہت پیچھے بیان ہو چکی ہے ان دونوں ملاقاتوں کا حال احقر نے والد صاحبؒ سے خود سُنا ہے مگر جو تفصیلات یاد نہ تھیں وہ کتاب "تحریکِ پاکستان اور علماءِ ربانی" سے لی گئی ہیں۔

تو اس کے سوا کوئی دُوسری صورت ہو ہی نہیں سکتی کہ یہاں اسلامی نظام اور اسلامی ریاست قائم ہو"

اسی ملاقات میں یہ طے ہُوا کہ سلہٹ کا دورہ حضرت مولانا ظفر احمد صاحب عثمانیؒ فرمائیں اور صوبہ سرحد کا دورہ شیخ الاسلام اور حضرت والد صاحب فرمائیں گے۔

پختونستان کی سازش

جب تک قیام پاکستان کا فیصلہ نہ ہُوا تھا، کانگریس کی طرف سے ایک ہی رٹ لگائی جا رہی تھی کہ ہندوستان میں بسنے والی تمام قومیں ہندو، مسلم، سکھ وغیرہ خواہ وہ کسی صوبے کے باشندے ہوں، سب مل کر ایک قوم ہیں، ان کا وطن بھی ایک ہوا ہے لہٰذا مسلمانوں کی الگ حکومت پاکستان میں قائم کرنے کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ اس پورے عرصہ میں کسی نے پختونستان کا نعرہ بلند نہیں کیا، حالانکہ ہندوستان جو چودہ، پندرہ صوبوں کا ملک تھا اُس میں صوبۂ سرحد کی حیثیت ایک چھوٹے سے صوبے کی ہوتی اور متحدہ ہندوستان کی مرکزی حکومت میں اقتدار ہمیشہ ہندوؤں کے ہاتھ میں ہوتا۔

سرحدی گاندھی اور اُن کے ساتھیوں کو اس پر کوئی اعتراض نہ تھا کہ ہندوستان متحد رہے، مرکز میں ہندوؤں کا اقتدار ہو، اور صوبۂ سرحد کے غیور مسلمان ہندوؤں کے زیر نگین ہوں لیکن جب انگریز اور ہندوؤں نے پاکستان کا مطالبہ مان لیا تو پاکستان کا ہر صوبہ اُنھیں الگ قوم نظر آنے لگا اور صوبائی قومیت کی بنیاد پر اُنھوں نے شیخ الاسلام علامہ عثمانی اور حضرت والد صاحب کے دورۂ سرحد سے پہلے ہی یہاں پختونستان کا نعرہ بلند کر دیا۔ چنانچہ

"سرحد کی کانگریس پارٹی، خدائی خدمت گار، اور زلمی پختون کی ایک مشترکہ نشست منعقد ہوئی جس میں ریزولیشن پاس کیا گیا کہ تمام پختونوں کی ایک آزاد ریاست کا اعلان کیا جائے گا۔ یہ جلسہ سوکڑی ضلع بنوں میں منعقد ہُوا تھا"[1] (۱-ب)

درحقیقت یہ پاکستان کو لنگڑا لُولا کرنے کے لیے کانگریس کی ایک چال تھی جس نے ریفرنڈم

---

[1] تحریک پاکستان اور علمائے ربانی۔ ص ۱۵۷، بحوالہ روزنامہ آزاد لاہور، و انصاری دہلی مورخہ ۲۵ جون ۱۹۴۷ء

شرط تو رکھوادی تھی مگر ساتھ ہی وہ یہ بھی دیکھ کر پریشان تھی کہ قیام پاکستان کے لیے سرحد کے غیور مسلمانوں کا جوش و خروش دوسرے صوبوں سے کم نہیں اور اس کی امید بہت کم تھی کہ کوئی بھی غیرتمند مسلمان صوبہ سرحد کا الحاق پاکستان کی بجائے بھارت کی کافرانہ حکومت کے ساتھ پسند کرے گا اس لیے کانگریس نے مسلمانوں میں صوبہ وارانہ تعصب کی آگ بھڑکا کر یہ چاہا تھا کہ اگر صوبہ سرحد بھارت کو نہ مل سکے تو یہ فائدہ بھی کم نہیں کہ وہ پاکستان سے بھی الگ ایک مستقل ریاست بنے جس کے دو فائدے ہوں گے، ایک یہ کہ پاکستان کمزور ہوگا دوسرا یہ کہ پختونستان بھارت کے لیے ایسا نوالہ تر ہوگا کہ اسے ہڑپ کرجانا اُس کے لیے ہر وقت ممکن ہوگا، اسی مستقل ریاست کا نام پختونستان رکھا گیا تھا اور یہ نعرہ چونکہ صوبائی تعصب پر مبنی تھا اس لیے اس کے چل جانے کی امید تھی جس کے لیے کانگریس کے پورے وسائل حرکت میں آچکے تھے۔

سرحد کے دیندار اور غیور مسلمان پختونستان کی شدت سے مخالفت کر رہے تھے جن میں وہاں کے اُس وقت کے مشہور مشائخ پیر مانکی شریف اور پیر زکوڑی شریف بطور خاص قابل ذکر ہیں مگر یہ سب حضرات اس کی ضرورت شدت سے محسوس کر رہے تھے کہ دیوبند کے اکابر علماء یہاں آکر عوام کو صحیح دینی صورتحال سے آگاہ فرمائیں، یہاں کے عوام دینی امور میں علماء دیوبند کے علاوہ کسی کی بات پر بھروسہ نہ کرتے تھے۔

یہ تھے وہ نازک حالات جن میں آپ نے شیخ الاسلام کی معیت میں صوبہ سرحد کا دورہ کیا اور بظاہر حالات اسی کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ نے صوبہ سرحد کے غیور مسلمانوں کو ہندو کی غلامی سے بچایا۔

ریفرنڈم کے موقع پر صوبہ سرحد کا تاریخی دورہ

یُوں تو قیام پاکستان کی جدوجہد میں حضرت والد صاحبؒ نے پورے ہندوستان کے طول و عرض کے دورے کیے اور جگہ جگہ عام و خاص جلسوں سے خطاب فرمایا، آپ کا مدراس و دکن کا دورہ بھی بہت کامیاب دورہ تھا لیکن ریفرنڈم کے نازک موقع پر صوبہ سرحد کا یہ دورہ تاریخی اور انقلابی اہمیت رکھتا ہے کیونکہ کانگریس نے "پختونستان" کے پردے میں سرحد کے غیور مسلمانوں کو غلام بنانے اور پاکستان کو لنگڑا لولا کرنے کے لیے جو خطرناک جال پھیلایا تھا وہ اسی دورے سے تار تار ہوا، پیر صاحب مانکی شریفؒ

اور پیر زکوڑی شریف نے اس دورے کا انتظام کیا تھا وہ خود بھی ان حضرات کے ساتھ مجاہدانہ سرگرمی سے شریک رہے۔

یہ سخت گرمی کا زمانہ تھا مگر یہ حضرات صوبہ بھر میں شہر شہر گاؤں گاؤں پھر کر کلمۂ حق پہنچاتے رہے۔

فتح مُبین

اللہ تعالیٰ نے ان مخلصانہ کوششوں کو ایسا شرفِ قبول عطا فرمایا کہ دیکھتے ہی دیکھتے پوری فضا پاکستان کے حق میں جوش و خروش سے بھر گئی اور جب ریفرنڈم ہوا تو اس میں سرحد کے غیور مسلمانوں نے اپنا قطعی فیصلہ دے دیا کہ صوبۂ سرحد اور پاکستان ایک ہیں اور ایک رہیں گے۔

سیاسی مبصرین کی یہ قطعی رائے ہے کہ اگر اس نازک وقت میں شیخ الاسلام علامہ عثمانیؒ اور حضرت والد صاحبؒ سرحد کا دورہ نہ فرماتے اور پیر مانکی شریف و پیر زکوڑی شریف کے اپنے اثرات پوری طرح کام نہ کرتے تو ریفرنڈم میں پاکستان کی کامیابی ممکن نہ تھی۔

حضرت والد صاحبؒ نے اس سفر سے دیو بند واپسی پر وہاں کے بہت سے ایمان افروز واقعات اور پاکستان کے لیے مسلمانانِ سرحد کے اس ایمانی جوش و خروش کی ولولہ انگیز تفصیلات سنائی تھیں، جن کا جگہ جگہ مشاہدہ ہوا۔ بھائی جان اس سفر میں بھی حضرت والد صاحبؒ کے ساتھ تھے، ہم کبھی اُن سے اور کبھی والد صاحبؒ سے وہاں کے دلچسپ واقعات سنا کرتے تھے۔ افسوس کہ طوالت کا خوف اُن کے بیان سے مانع ہے۔

ریفرنڈم کا جو نتیجہ صوبۂ سرحد میں سامنے آیا سلہٹ کا نتیجہ بھی اس سے مختلف نہ تھا، اس محاذ کو حضرت مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی نے سر کیا تھا۔

مضبوط پاکستان کے قیام میں یہی ریفرنڈم کا مرحلہ باقی تھا جس میں اللہ تعالیٰ نے اپنے ان بوریہ نشین علماءِ حق کے ذریعہ تمام مسلمانوں کو سُرخروئی عطا فرمائی۔

پہلے جشنِ آزادی پر پاکستان میں پرچم کشائی

۲۷، رمضان المبارک ۱۳۶۶ھ کی شب میں گویا نزولِ قرآن کی سالگرہ کے وقت ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء

کو پاکستان کا اقتدار اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے ہاتھ میں دے دیا اور پاکستان سب سے بڑی اسلامی مملکت بن کر دُنیا کے نقشہ پر نمودار ہُوا۔ اس روز پاکستان میں جو سب سے پہلا جشن آزادی منایا جانے والا تھا، اس میں شرکت کے لیے دیوبند سے شیخ الاسلام علامہ عثمانیؒ اور حضرت والدصاحبؒ کو بھی مدعو کیا گیا لیکن حضرت والدصاحبؒ شدید علالت کے باعث سفر نہ فرما سکے۔ حضرت شیخ الاسلام کراچی تشریف لائے اور قائدِ اعظم کی خواہش پر اس تقریب میں پاکستان کا سبز ہلالی پرچم آپ ہی نے اپنے دستِ مبارک سے بلند فرمایا۔ اُدھر مشرقی پاکستان ڈھاکہ میں پرچم کشائی کی رسم حضرت مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی نے انجام دی۔

زندگی کا تیسرا دور، ہجرتِ پاکستان

قیامِ پاکستان مسلمانوں کی جدوجُہد کا پہلا مرحلہ تھا جس میں اللہ تعالیٰ نے انھیں خصوصی نصرت و حمایت سے نوازا تھا۔ اب دُوسرا مرحلہ یہاں اسلامی نظامِ حیات قائم کرنے کا تھا جو والدصاحبؒ کی نظر میں پہلے سے زیادہ صبر آزما اور کٹھن مرحلہ تھا، اس میدان میں جدوجُہد کے لیے حضرت والدصاحبؒ جلد از جلد پاکستان آنا چاہتے تھے مگر قیامِ پاکستان کے فوراً بعد ہندوؤں کی سوچی سمجھی اسکیم کے مطابق دہلی، مشرقی پنجاب اور ہندوستان کے دُوسرے علاقوں میں مسلمانوں کا قتلِ عام شروع ہو گیا، تمام راستے مسدود تھے، کچھ طبعی اور خانگی مسائل بھی آڑے آئے۔ اس لیے پاکستان بن جانے کے ساڑھے آٹھ ماہ بعد تک آپ اپنے آبائی وطن دیوبند ہی میں مقیم رہے۔

قیامِ پاکستان کے وقت احقر راقم الحروف کی عُمر کا بارھواں سال چل رہا تھا، مسلم لیگ اور کانگریس کی سیاسی جنگ کا پُرجوش حصّہ آنکھوں کے سامنے گذرا تھا، اس جنگ کے یہ نعرے کہ:

"بٹ کے رہے گا ہندوستان ، بن کے رہے گا پاکستان
لے کے رہیں گے پاکستان ، دینا پڑے گا پاکستان
اپنا سر کٹائیں گے ، پاکستان بنائیں گے
خون کی ندیاں بہائیں گے ، پاکستان بنائیں گے"

جو ہم نے بھی بچوں کے جلسوں اور جلوسوں میں کئی سال لگائے تھے، اُن کی گونج اب تک کانوں میں

موجود تھی، پاکستان دُنیا کی عظیم ترین اسلامی مملکت جو صرف اسلام کے لیے بڑی قربانیاں دیکر حاصل کی گئی تھی، گویا ہمارے خیالوں کی جنّت تھی، سوتے میں خواب بھی وہیں کے نظر آتے اور جب ہندوؤں کے طرح طرح کے طعنے کانوں میں پڑتے تو پاکستان جانے کے لیے جذبات میں ہلچل سی مچ جاتی تھی، اِدھر اللہ کے راستہ میں ہجرت کا ثواب جو حضرت والد صاحبؒ سے سُنا تھا، اُس کے شوق میں ایک ایک دن کاٹنا مشکل ہو رہا تھا، یہ ساڑھے آٹھ ماہ کی مدت جو برسوں میں پھیلی ہوئی محسوس ہوتی تھی اسی بے تابی کے عالم میں بسر ہُوئی۔

اُدھر شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد صاحب عثمانیؒ نے پاکستان میں اسلامی دستور کی جد و جُہد کا آغاز فرمایا تھا لیکن پہلے ہی قدم پر ضرورت محسوس ہوئی کہ اسلامی دستور کا ایک اجمالی خاکہ مرتب کیا جائے تاکہ حکومت کے سامنے مطالبہ قدرے وضاحت کے ساتھ پیش کیا جا سکے۔ یہ خاکہ مرتب کرنے کے لیے آپ نے مندرجہ ذیل اکابر علمارِ کرام کو پاکستان آنے کی دعوت دی۔

۱۔ حضرت مولانا سید سلیمان صاحب ندوی رحمۃ اللہ علیہ
۲۔ حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ
۳۔ جناب حضرت مولانا مناظر احسن گیلانی صاحبؒ
۴۔ جناب ڈاکٹر حمید اللہ صاحب (دکن)

ان حضرات کو مع اہل و عیال پاکستان لانے اور ان کے سفر کا کل انتظام شیخ الاسلامؒ نے نجی طور پر بعض حضرات کے تعاون سے کیا تھا۔

ہجرت پاکستان ہمارے لیے تو محض ایک شوق تھا مگر حضرت والد صاحبؒ کے لیے یہ بہت بڑا مسئلہ اور زندگی کا بہت بڑا انقلاب تھا جسے برداشت کرنے کے لیے خود کو آپ کافی عرصہ سے تیار فرما رہے تھے، بالآخر حضرت شیخ الاسلام کی دعوت اور مقصد کی اہمیت کے پیش نظر آپ نے وطن مالوف سے ہجرت کا قطعی فیصلہ فرمالیا اور ۱۰ جمادی الثانیہ ۱۳۶۷ھ یکم مئی ۱۹۴۸ء کو اپنے قدیم وطن دیوبند کو خیرباد کہہ کر کراچی کے لیے روانہ ہوگئے۔

اسی سال میں ہمارے مکان کی توسیع و تعمیر مکمل ہوئی تھی، مکان کی تعمیر کے دوران ہی شاید ہجرت کا خیال والد صاحب کے ذہن میں تھا ورنہ سفرِ آخرت تو ہر وقت پیشِ نظر رہتا ہی تھا چنانچہ

جب تعمیر مکمل ہونے لگی تو آپ نے مکان کے صحن کی اونچی دیوار پر سیمنٹ کے ایک بڑے چوکھٹے میں یہ شعر جلی حروف میں کندہ کرا دیا تھا۔

دُنیا کا کچھ قیام نہ سمجھو کرو خیال
اس گھر میں تم سے پہلے بھی کوئی مقیم تھا

اب اس مکان میں ہندو رہتے ہیں اور یہ شعر اب بھی اسی طرح کندہ ہے۔

غرض دیوبند سے روانگی کے بعد ہم نے ایک روز دہلی میں قیام کیا، پھر ایک روز جودھ پور میں، اور ایک روز حیدرآباد سندھ میں قیام کرتے ہوئے ۲۹ر جمادی الثانیہ ۱۳۶۷ھ مطابق ۱ر مئی ۱۹۴۸ء کو پاکستان کے دارالحکومت کراچی پہنچ گئے۔

اس ہجرت کا مختصر واقعہ حضرت والد صاحبؒ نے اپنے رسالہ "نقوش و تاثرات"[1] کے مقدمہ میں بیان فرمایا ہے وہ یہاں حضرت والد صاحبؒ ہی کے الفاظ میں نقل کیا جاتا ہے، کہیں کہیں قوسین میں عبارت کا اضافہ احقر کی طرف سے ہوگا۔

ہجرت پاکستان کی کہانی والد ماجد کی زبانی

فرماتے ہیں کہ:

"پاکستان وجود میں آیا تو اس کی محبت اور اس میں پیش آنے والی دینی اور علمی ضرورتوں کے تصور نے ترکِ وطن کے جذبات دل میں پیدا کرنے شروع کر دیئے۔ دیوبند۔ جو میرے لیے صرف وطن جسمانی نہیں بلکہ مدینہ طیبہ سے لائے ہوئے علوم

---

[1] یہ رسالہ ہجرت کے تیرہ سال بعد اس وقت تحریر فرمایا تھا جب آپ اعزہ واحباب سے ملاقات کیلئے پاکستان سے دیوبند، تھانہ بھون اور دہلی تشریف لے گئے۔ یہ رسالہ وہیں کا سفرنامہ مع نصائح اور عبرتوں کا دلکش مرقع ہے۔ جگہ جگہ دیوبند و تھانہ بھون کے بصیرت افروز واقعات نے اسے اور بھی دلچسپ و مفید بنا دیا ہے۔ اسی کے مقدمہ میں اپنی ہجرت پاکستان کا واقعہ بھی تحریر فرمایا ہے جو یہاں نقل کیا جا رہا ہے۔

کے ایک مرکز کی حیثیت سے وطنِ ایمانی بھی تھا۔ عمرِ عزیز کے تریپن سال اسی کی سرزمین میں گزرے اسی میں بال سفید ہوئے۔ کبھی ایک مہینہ سے زائد اس سے غیر حاضر نہ رہا۔ صرف ۱۳۴۶ھ کے پہلے حج میں ڈھائی ماہ دیوبند سے باہر رہنے کی نوبت آئی تھی اور وہ بھی میرے لیے انتہائی مجاہدہ تھا۔ اس کی فطری محبت کا یہ عالم کہ جب کبھی وطن سے سفر ہوتا تو مڑ مڑ کر دیکھا جاتا تھا۔

تَلَفَّتُّ نَحْوَ الحَيِّ حَتَّىٰ وَجَدْتُنِي

وَجِعْتُ مِنَ الإِصْغَاءِ لِيتًا وأخْدَعا

"میں نے وطن کی طرف مڑ مڑ کر اتنا دیکھا کہ میری گردن کی رگیں دُکھنے لگیں"۔

ایک طرف وطنِ مالوف کی محبت کا گہرا نقش، عیال کی کثرت، مالی وسائل کا فقدان زنجیر پا بنے ہوئے چلنے کی اجازت نہیں دیتے، دوسری طرف یہ نیا ملک پاکستان جو مدتوں کی تمنا اور ہزاروں کوششوں اور محنتوں کے بعد وجود میں آیا، اس کی طرف جانے اور وہاں اس ملک کو صحیح معنی میں اسلامی ملک بنانے کے لیے جد و جہد کا جذبہ ترکِ وطن پر مجبور کر رہا تھا۔

دیوبند کا مکان اور باغ

ایک اور عجوبۂ قدرت یہ تھا کہ میں نے اپنی عمر کا بہترین حصہ اپنے جدی مکان کے ایک چھوٹے سے کمرے میں اپنے پانچ بچوں کے ساتھ نہایت تنگی سے گزارا تھا۔ اس دورِ انقلاب سے چند سال پہلے (۱۳۵۰ھ میں) حق تعالیٰ نے ایسے اسباب جمع فرما دیے کہ جدی مکان کے عقب میں ایک اُفتادہ زمین خرید کر اپنا نیا مکان دو منزلہ اپنی مرضی اور ضروریات کے مطابق بنا لینے میں کامیابی حاصل ہوگئی۔ ساتھ ہی فارغ اوقات یکسوئی سے گزارنے کے لیے شہر کے قریب ایک باغیچہ اپنے ہاتھ سے لگایا۔ عجیب اتفاق تھا کہ جس سال میں مکان کی تعمیر (میں توسیع) مکمل ہوئی، اسی سال میں باغ پر پہلا پھل نمودار ہوا۔ اور یہی وہ وقت تھا جب ترکِ وطن کا جذبہ دل میں اُبھر رہا تھا اور بالآخر اللہ تعالیٰ کے نام پر اس دار و دیار اور گھر اور باغ کو چھوڑ کر پاکستان جانے کا فیصلہ جمادی الثانیہ ۱۳۶۷ھ اپریل ۱۹۴۸ء میں کر لیا گیا۔

روانگی اپنے ساتھ صرف غیر شادی شدہ بچے اور ان کی والدہ تھی اور گھریلو سامان میں

سے صرف بدن کے کپڑے اور علمی سامان میں سے صرف اپنے مسودات۔ باقی سب عیال اور سامان
کتب خانہ دیوبند میں چھوڑ کر ۱۰ جمادی الثانیہ ۱۳۶۷ھ یکم مئی ۱۹۴۸ء کو دہلی کے لیے روانہ ہوگیا۔ وہاں
سے براہ جودھ پور، کھوکھراپار کراچی پاکستان میں منتقل ہوگیا۔

کراچی میں

پاکستان میں ایسے مقامات بھی تھے جو اپنے وطن سے قریب ہوا فضا کے اعتبار سے ملتے جلتے
تھے مگر تقدیر ازلی میں ہماری جگہ اس مقام میں لکھی تھی جو وطن کے اعتبار سے پاکستان کا سب سے بعید
علاقہ تھا، وطن سے نکلے بھی تو کہاں پہنچے ؟ مجھ جیسے کم ہمت مبتلائے حُبِّ وطن کے لیے جس کا جی
ابھی مرضی کے مطابق گھر نصیب ہُوا اور اپنے لگائے ہوئے باغ کا پہلا پھل اپنی ابتدائی حالت میں نمودار
ہُوا۔ یہ وقت بہت ہی صبر آزما تھا اور کسی طرح اندازہ نہ تھا کہ اس عظیم انقلاب کو برداشت کر سکوں گا
لیکن اللہ تعالیٰ کے انعامات کا شکر کس زبان سے ادا ہو کہ اس نے اسی وقت میرے قلب کو ان سب
چیزوں سے ایسا بے نیاز بنا دیا کہ حیرت ہوگئی جس وقت میں نے مکان سے قدم نکالا، مکان میرے
دل سے نکل گیا۔

حُسنِ اتفاق

حُسنِ اتفاق سے یہ ہجرت اس وقت ہُوئی جب کہ میری عمر تریپن ۵۳ سال کی تھی جس سے اللہ تعالیٰ
نے ہجرت نبوی کی سُنّت کا اتباع نصیب فرمایا کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا سن شریف بھی بوقت
ہجرت تریپن ۵۳ ہی سال کا تھا۔

زندگی کا نیا دَور

نقل وطن کے بعد ایک نئے ملک، نئے ماحول، وطن اصلی سے بہت دُور اس کی آب ہوا سے
بے حد مختلف شہر کراچی میں ایک ایسے مکان میں (جو عبداللہ ہارون روڈ پر گنگس کورٹ نامی بلڈنگ
میں فلیٹ ۵ تھا) قیام کیا جہاں آسمان صرف دریچہ سے نظر آسکتا تھا اور وہ بھی ایک مہربان نے

رہنے کے لیے دے دیا تھا جس کے ہر وقت ہاتھ سے نکل جانے کا خطرہ لگا ہوا تھا۔ جاننے پہچاننے والے گنے چُنے چند نفوس تھے، ہر وقت بیگانگی ہی بیگانگی کا دَور دَورہ تھا، جو بچے ساتھ تھے وہ اتنے چھوٹے کہ بازار کی ضروریات بھی اُن کے سپرد نہ کر سکتا تھا۔ راستے معلوم نہیں، بازار کا اندازہ نہیں، گھر میں کوئی سامان نہیں، ہر چیز خریدنے بنانے کی ضرورت سامنے۔ باقی ماندہ عیال اور ضعیف بیوہ والدہ ماجدہ کی مفارقت سے دل زخمی۔

مگر شکر ادا نہیں ہو سکتا اپنے مالک کا کہ اُس نے ہر قدم پر دستگیری فرمائی اور ان حالات میں بھی عیال اور والدہ ماجدہ کی فکر تو ہوئی مگر مکان، باغ، جائداد کبھی بھول کر بھی یاد نہیں آئے۔ اللہ تعالیٰ نے چھ ماہ کے اندر یہ مشکل بھی حل کر دی کہ والدہ ماجدہ اور باقی عیال بھی کراچی پہنچ گئے پھر آہستہ آہستہ دُوسرے اعزہ و احباب بھی کراچی پہنچنے لگے اور کراچی نے وطنِ اصلی کی جگہ لے لی۔ سات سال مختلف کرایہ کے مکانوں میں (جیکب لائنز کے کوارٹر ۱۰۵ و ۱۰۶ ایف میں اور اس کے بعد برنس روڈ کے قریب اقبال منزل میں) کہیں راحت سے کہیں تکلیف سے گزر گئے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ایک وسیع جگہ لسبیلہ ہاؤس پر مکان بنانے کے لیے عطا فرما دی اور وطن کے چھوڑے ہوئے مکان سے اور اپنے ارادہ اور خیال سے کہیں بہتر اور وسیع مکان بن گیا! وَمَنْ يُّهَاجِرْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ يَجِدْ فِي الْاَرْضِ مُرٰغَمًا كَثِيْرًا وَّسَعَةً [1]" اور مہاجرین کے لیے قرآنی وعدہ ایک زندہ حقیقت بن کر سامنے آگیا اور دُوسری جگہ ارشاد ہے۔ لَنُبَوِّئَنَّهُمْ فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً [2]"

یہ تو وطن اور مکان کا افسانہ تھا جس کے لیے انسان اپنی توانائی اور ساری فکر خرچ کرتا ہے اور اچھے بُرے معاملات کو اختیار کرتا ہے، نیرنگ تقدیر نے آنکھوں سے دکھا دیا کہ یہ سب چیزیں خواب و خیال ہو گئیں اور عقل و شرع نے ہدایت فرمائی کہ جس ماحول میں اب نئی زندگی گزر رہی ہے۔ اس کی بھی اس سے زیادہ کوئی حقیقت نہیں کہ چند روز کے بعد یہ بھی خواب و خیال ہو جانے والی ہے

کراچی میں یہ تیرہ [۱۳] سالہ [3] زندگی کن مشاغل میں گزری، اس کی داستان طویل ہے، یہ مختصر سفرنامہ اس کا

---

[1] جو شخص اللہ کی راہ میں ہجرت کریگا وہ زمین میں وسعت اور فراخی پائے گا۔ ۱۲ منہ

[2] ہم مہاجرین کو دُنیا میں (بھی) اچھا ٹھکانہ دیں گے۔ ۱۲ منہ

[3] یہ سفرنامہ حضرتؒ نے ۱۵ جمادی الثانیہ سنہ ۱۳۸۰ھ مطابق ۵ دسمبر سنہ ۱۹۶۰ء کو تحریر فرمایا تھا (رفیع)

محل نہیں لیکن اتنا اظہار ناگزیر ہے کہ یہاں پہنچنے کے بعد دو چیزیں مقصدِ زندگی بن گئیں، اول پاکستان میں اسلامی دستور قانون اور نظامِ اسلامی کے نفاذ کی کوشش، دوسرے اس طرف علومِ دینیہ کا کوئی مدرسہ کراچی کے شایانِ شان نہ ہونے کے سبب یہاں کے مناسب حال ایک مدرسہ کا قیام اور تیسری چیز خدمتِ فتویٰ ہے جو ہر جگہ ساتھ لگی ہی رہتی ہے۔ (نقوش و تاثرات از ص۱۲ تا ص۱۹)

تاریخی کارنامہ "قراردادِ مقاصد"

قراردادِ مقاصد جو پاکستان کے ہر آئین میں بطور دیباچہ شامل چلی آرہی ہے اور ۱۹۷۳ء کے موجودہ آئین میں بھی شامل ہے یہ وہ اہم قومی دستاویز ہے جس میں مملکت خداداد پاکستان کے مقاصد اور قومی جہد و عمل کی سمت، قرآن و سنت کی روشنی میں متعین کی گئی ہے، اور ان بنیادی حدود کا تعین کیا گیا ہے جن پر دستور سازی کے تمام مراحل انجام پانے تھے اور جن کی پابندی دستور ساز اسمبلی کو اور پاکستان کے ہر آئین کو کرنی تھی، یہ تاریخی دستاویز پاکستان میں اسلامی نظام کے نفاذ کے لیے سب سے پہلا ٹھوس قدم تھا، اب تک پاکستان کے دستور و قانون میں جو جو اسلامی دفعات شامل ہوئیں یا آئندہ شامل ہوں گی وہ سب درحقیقت اسی قراردادِ مقاصد کی مرہونِ منت ہیں۔

قراردادِ مقاصد اگرچہ دستور ساز اسمبلی میں اُس وقت کے وزیرِ اعظم شہیدِ ملت خان لیاقت علیخان مرحوم نے پیش کی تھی مگر اس کا مسودہ شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد صاحب عثمانی اور حضرت والد صاحبؒ نے طویل غور و خوض کے بعد مرتب فرمایا تھا، اس کی تیاری اور اس کے بعد اسے پاکستان کی دستور ساز اسمبلی سے منظور کرانے میں شیخ الاسلامؒ کو طویل علمی اور سیاسی جد و جہد کرنی پڑی، برسرِ اقتدار طبقہ کا ایک گروہ اس راہ میں مسلسل رکاوٹیں کھڑی کر رہا تھا، قائدِ ملت لیاقت علی خان مرحوم نے اس گروہ کے علی الرغم شیخ الاسلام کی حمایت کی اور اسمبلی میں ۱۲ مارچ ۱۹۴۹ء کو قراردادِ مقاصد خود پیش کر کے اُسے منظور کرایا، حضرت والد صاحبؒ ان تمام مہمات میں شیخ الاسلام کے ساتھ برابر شریک رہے۔

قراردادِ مقاصد کا بالکل ابتدائی کچا خاکہ جو صرف عنوانات اور یادداشتوں پر مشتمل ہے اس کا اصل مسودہ احقر کے پاس عرصۂ دراز سے محفوظ ہے، یہ صرف ایک ورق ہے جس کے ایک صفحہ پر حضرت شیخ الاسلامؒ کی اور دوسرے صفحہ پر حضرت والد ماجدؒ کی تحریر ہے۔ اس غرض سے کہ یہ متبرک یادگار محفوظ ہو جائے

بے سرو سامانی

پاکستان کے دستور کا ابتدائی خاکہ جسے تیار کرنے کے لیے والد صاحبؒ پاکستان تشریف لائے تھے پھر قرار دادِ مقاصد کی تیاری اور اسمبلی سے اسے منظور کرانے کے تمام مراحل اس بے سرو سامانی میں انجام پا رہے تھے کہ ضرورت کی کتابیں تک نہ شیخ الاسلام کے پاس تھیں نہ والد صاحبؒ کے پاس، دونوں کے کتب خانے دیوبند میں رہ گئے تھے جو کئی سال کی مسلسل کوشش کے بعد رفتہ رفتہ یہاں پہنچے، کراچی میں اس زمانہ میں دینی کتابیں نایاب تھیں، صرف ایک لائبریری مجلسِ علمی میری ویدر ٹاور کے پاس تھی، کتابوں سے استفادہ کے لیے دونوں حضرات کو بکثرت وہیں جانا پڑتا تھا۔

اُس زمانہ میں معاشی حالات

حضرت والد صاحبؒ کی حیاتِ مبارک کے مختلف مراحل میں معاشی تنگی اور مالی مشکلات بکثرت پیش آئی ہیں مگر ہمیں کبھی بھی یہ تنگی محسوس نہ ہونے دی، وہ ہمارے سامنے مالی مشکلات کا ذکر نہ فرماتے تھے، ہمارے کسی شوق کو یہ کہہ کر نہ روکتے تھے کہ پیسہ کی کمی ہے اس لیے ہم بچپن ہی سے خود کو مالدار باپ کا بیٹا سمجھتے رہے۔

ہجرتِ پاکستان کے تین ماہ بعد والد صاحبؒ کے پاس کوئی ذریعۂ معاش نہ تھا، مکان بھی کرایہ کا تھا جس کے ہر وقت ہاتھ سے نکل جانے کا اندیشہ ہوا تھا، ہم چار بھائی جو پاکستان ساتھ آئے سب کے سب بچے تھے، ہماری دو بہنیں غیر شادی شدہ اور محترمہ والدہ صاحبہ ساتھ تھیں بھائی جان ہنوز دیوبند میں تھے۔ یہاں کوئی بھی ایسا نہ تھا جو والد صاحبؒ کے کاموں یا کسبِ معاش میں مدد دے سکے، خود والد صاحبؒ شب و روز قرار دادِ مقاصد اور اسلامی دستور کی جد و جہد میں مشغول تھے۔ دادا جان رحمۃ اللہ علیہ کے خاص شاگرد اور حضرت والد صاحبؒ کے جانثار دوست جناب خلیفہ محمد عاقل صاحب کی راشن کی دوکان کراچی میں تھی، راشن والد صاحبؒ کے فرمانے پر ہم لوگ وہاں سے خود جا کر لے آیا کرتے تھے۔ یہ بعد میں معلوم ہوا کہ یہ سب راشن قرض آتا تھا جو والد صاحبؒ نے بعد میں ادا کیا، مگر

ہمیں والد صاحبؒ نے اُس زمانہ میں بھی اپنی تنگ دستی کی ہوا نہ لگنے دی۔

ایک واقعہ

رفتہ رفتہ بھائی جان نے دیوبند سے تجارتی کتب خانہ دارالاشاعت کی کچھ کتابیں بذریعہ ہوائی ڈاک یہاں منگوانی شروع کیں، سب سے پہلے دو کتابوں معلم الحجاج اور زبدۃ المناسک کے کچھ نسخے آئے یہ دونوں کتابیں کے احکام حج سے متعلق ہیں، صرف حاجی ہی خرید سکتے تھے حُسنِ اتفاق سے زمانہ حج کا تھا اور کراچی کے حاجی کیمپ میں حاجی حضرات ٹھہرے ہوئے تھے، والد صاحبؒ کی خواہش تھی کہ یہ کتابیں کوئی وہاں جاکر فروخت کر آئے مگر ہمیں دلشکنی سے بچانے کے لیے یہ احساس بھی دلانا چاہتے تھے کہ کوئی مالی تنگی اس کا سبب ہے، باتوں باتوں میں ایک روز مجھ سے اور بزرگوار جناب محمد ولی رازی صاحب سے فرمانے لگے کہ کراچی میں دینی کتابیں ملتی نہیں حاجیوں کو تکلیف ہوتی ہوگی، تم دونوں اگر یہ کتابیں حاجی کیمپ میں فروخت کر آؤ تو ایک روپے کی فروخت پر چار آنے انعام ملیں گے، ہم بڑی خوشی سے فوراً جانے کے لیے تیار ہوگئے تو والد صاحبؒ نے ہمیں طریقہ بتلایا کہ خیموں کے پاس جاکر کس طرح آواز لگائیں، اس زمانہ میں حاجی کیمپ کراچی سنٹرل جیل کے پاس تقریباً اُس جگہ لگتا تھا جہاں اب جمشید آباد کالونی ہے۔ دو سائیکلوں پر کئی گھنٹے وہاں آواز لگا لگا کر گشت کیا، بھائی صاحب نے ساڑھے سات روپے کی کتابیں فروخت کیں، میں چھوٹا تھا اور آواز لگانے میں شرم کی وجہ سے اتنی بھی ہمت نہ ہوئی کوئی کتاب فروخت نہ کر سکا مگر والد صاحبؒ نے چار آنے فی روپیہ کے حساب سے جتنا انعام بھائی صاحب کو دیا اتنا ہی مجھے بھی عطا فرمایا۔

ایک اور واقعہ

غرض ان تمام حالات میں بھی ہمیں مالی تنگی کا کبھی احساس نہ ہونے دیا، صرف ایک واقعہ سے اس کا پہلی بار اندازہ ہوا۔

گھر میں تقریباً ایک ہفتے سے خلافِ معمول دونوں وقت دال پک رہی تھی، برادرِ بزرگوار جناب محمد ولی رازی صاحب ان دنوں جیکب لائن کے مکتب میں قرآن شریف حفظ کرتے تھے۔

دوپہر کے وقفے میں کھانا کھانے گھر آئے تو اس وقت بھی دال تھی، ہم نے والدہ صاحبہ سے شکایت کی کہ" آپ روز ہی دال پکالیتی ہیں ہم سے کھائی نہیں جاتی" اس پر اپانک والدہ صاحبہ نے قدرتے ناگواری کے ساتھ فرمایا" گھر کا خرچ کس طرح چل رہا ہے تمھیں اس کی بھی کچھ خبر ہے، تم یہ نہیں سوچتے کہ تمھارے والد کا عرصہ سے کوئی ذریعہ آمدنی نہیں ہے۔ یہ سُن کر بچپن کے دل کو دھچکا سا لگا اور مالداری کے پندار نے دم توڑ دیا۔ پھر عرصۂ دراز تک والد صاحب سے کوئی فرمائش کرنے کی ہمت نہ ہوئی۔

اس زمانہ میں برادرِ بزرگوار جناب محمد رضی صاحب عثمانی کی عمر تقریباً سترہ سال تھی اور یہاں ہم چاروں بھائیوں میں وہ سب سے بڑے تھے انھیں والد صاحبؒ نے مجبوراً مختلف چھوٹی چھوٹی تجارتوں میں لگایا مگر ہر تجارت کے لیے سرمایہ کی ضرورت تھی، کسی تجارت میں کامیابی نہ ہوئی، بعض میں تو نقصان اٹھانا پڑا۔

اس وقت کے وزیرِ اعظم خان لیاقت علی خاں مرحوم اور کابینہ کے بیشتر وزراء سے بڑی حد تک بے تکلفانہ مراسم تھے، قراردادِ مقاصد اور اسلامی دستور کے سلسلہ میں آئے دن ملاقاتوں اور دعوتوں کا سلسلہ رہتا تھا مگر انھیں بھی کبھی کانوں کان اپنے معاشی حالات کی خبر نہ ہونے دی۔

یہ تھے وہ حالات جن میں پاکستان میں اسلامی نظام کی بنیاد رکھی جا رہی تھی اور قراردادِ مقاصد کا تاریخی کارنامہ انجام پا رہا تھا۔

بورڈ آف تعلیماتِ اسلام کی رُکنیت

پھر جب ۱۹۴۹ء میں دستور ساز اسمبلی نے باقاعدہ آئین سازی کا کام شروع کیا تو قائدِ ملّت لیاقت علی خاں مرحوم نے ایک" اسلامی مشاورتی بورڈ" بنایا جس کا مقصد یہ تھا کہ وہ اسلامی دستور کا خاکہ تیار کر کے پیش کرے اور اس کی روشنی میں دستور ساز اسمبلی پاکستان کا آئین تیار کرے۔ یہ بورڈ مندرجہ ذیل چھ حضرات پر مشتمل تھا۔

۱۔ حضرت علامہ سید سلیمان صاحب ندوی رحمۃ اللہ علیہ — صدر
۲۔ حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ — رُکن
۳۔ جناب ڈاکٹر حمید اللہ صاحب (سابق استاذ جامعہ عثمانیہ دکن جو اب پیرس میں مقیم ہیں) رُکن

۴۔ جناب پروفیسر عبدالخالق صاحب (از مشرقی پاکستان) رکن

۵۔ مولانا جعفر حسین صاحب مجتہد (شیعہ عالم) "

۶۔ جناب ظفر احمد صاحب انصاری سیکرٹری

مگر علامہ سید سلیمان صاحب ندوی اُس وقت تک ہندوستان میں تھے۔ پھر پاکستان تشریف لانے کے بھی کافی عرصہ بعد ۱۹۵۲ء میں آپ نے عہدۂ صدارت سنبھالا۔ اس وقت تک یہ بورڈ صدر کے بغیر ہی اپنے فرائض انجام دیتا رہا۔

یہ بورڈ ۹ اگست ۱۹۴۹ء سے اپریل ۱۹۵۴ء تک تقریباً ساڑھے چار سال قائم رہا، اور حضرت والد صاحبؒ شروع سے آخر تک اس کے ممتاز رکن رہے۔ اس بورڈ نے نہایت عرق ریزی کے بعد دستورِ پاکستان کے لیے جو سفارشات پیش کی تھیں، اگرچہ ۵۶ء و ۱۹۶۲ء کے دستوروں میں ان کی جھلک کسی حد تک موجود تھی، لیکن افسوس کہ اس بورڈ کی تمام سفارشات کسی بھی دور کے آئین میں نہ تو تمام کی تمام رُوبہ عمل لائی گئیں، نہ انھیں اربابِ حل و عقد نے شائع کیا۔

استغنا اور بے باکی

اس بورڈ کے ممبران کو ایک ہزار روپے ماہوار اعزازی الاؤنس ملتا تھا جسے حضرت والد صاحبؒ نے اس شرط کے ساتھ قبول فرمایا تھا کہ ہم وہ پابندیاں قبول نہ کریں گے، جو سرکاری ملازمین کی ہوتی ہیں یہ پیش بندی اس لیے فرمائی تھی کہ کلمۂ حق کے اظہار میں ادنیٰ رکاوٹ پیش نہ آسکے۔

چنانچہ ایک موقع پر جب اس بورڈ کی سفارشات کو بالکلیہ نظر انداز کر کے خالص مغربی طرز کے دستور کا مسودہ حکومت نے شائع کیا اور دو مرکزی وزیروں نے اپنے اخباری بیان میں اس مسودہ کو "بالکل اسلامی" قرار دیا تو حضرت والد صاحبؒ اور دیگر بعض ارکان نے ایک مشترکہ بیان شائع کیا۔ جس میں واضح کیا گیا کہ اس مسودۂ دستور کو ہماری سفارشات سے دُور کا بھی واسطہ نہیں ہے، اور جن وزیروں نے اسے "اسلامی" قرار دیا تھا بیان میں ان کی بھی خبر لی گئی۔

اُس وقت جو صاحب اسمبلی کے سیکرٹری تھے، انھوں نے کسی زمانہ میں والد صاحبؒ سے کچھ دن عربی زبان سیکھی تھی۔ تعلقات میں قدرے بے تکلفی کے باعث انھوں نے حضرت والد صاحبؒ سے

کہا کہ آپ کو حکومت کے اندر رہتے ہوئے ایسا بیان جاری کرنا مناسب نہ تھا۔ حضرت والد صاحبؒ نے فرمایا کہ جب سے میں نے بورڈ کی رکنیت قبول کی تھی، میں اسی دن سے جیب میں استعفا لیے پھرتا ہوں اور وجہ یہ ہے کہ آپ کو اپنے سوٹ کی شان و شوکت برقرار رکھنے کے لیے سرکاری تنخواہ کی ضرورت ہے، میرے سر سے لے کر پاؤں تک کا لباس صرف بیس روپے میں بن جاتا ہے۔ اس کے لیے مجھے ایک ہزار روپے کی کبھی ضرورت نہیں ہوئی۔ میں آئندہ بھی جب جو بات مناسب سمجھوں گا بلا روک ٹوک شائع کروں گا ورنہ میرا استعفا ارباب حل وعقد تک پہنچا دیا جائے۔ سیکرٹری صاحب نے معذرت کی اور آئندہ کسی کو ایسے اعتراض کی جرأت نہ ہوئی۔

لاء کمیشن کی رکنیت

بورڈ آف تعلیمات اسلام کا تعلق تو صرف دستور کی حد تک تھا، پاکستان کے موجودہ قوانین سے اس کا تعلق نہ تھا۔ موجودہ قوانین کو اسلامی سانچہ میں ڈھالنے کے لیے علامہ سید سلیمان صاحب ندوی نے حکومت پر زور دیا تو سنہ ۱۹۵۰ء کے اواخر میں ایک لاء کمیشن بنایا گیا جس میں علماء کرام کی جانب سے ابتداءً صرف علامہ سید سلیمان صاحب ندویؒ کو ممبر بنایا گیا۔ جسٹس رشید اور جسٹس میمن ماہر قانون کی حیثیت سے شریک کیے گئے تھے، یہ وہ وقت تھا جبکہ شیخ الاسلام علامہ عثمانیؒ کی وفات کئی ماہ قبل ہو چکی تھی جو حضرت والد صاحبؒ کے استاد بھی تھے اور پھوپھی زاد بھائی بھی۔

حضرت سید صاحبؒ نے محسوس فرمایا کہ اسلامی قانون کے ماہر کی حیثیت سے لاء کمیشن میں حضرت مفتی صاحبؒ کی شرکت ناگزیر ہے چنانچہ انھوں نے لاء کمیشن میں اپنی شرکت باقی رکھنے کے لیے حکومت کے سامنے یہ شرط رکھ دی کہ مفتی صاحبؒ کو بھی کمیشن کا رکن بنایا جائے۔ بالآخر آپ کو اس کی بھی رکنیت قبول کرنی پڑی۔

یہ کمیشن دو سال تک قائم رہا لیکن وزارتوں کے تغیر اور برسر اقتدار طبقہ میں کئی ایسے افراد کی طرف سے مسلسل رکاوٹوں کے باعث جو اس ملک میں اسلامی نظام دیکھنے کے روادار نہ تھے۔ اس

لہ تمہید تفسیر معارف القرآن ص ۶۲ ج اول

کمیشن کی مساعی کوئی نتیجہ پیدا نہ کر سکیں۔

ایک موقع پر اس کمیشن کی ایک میٹنگ میں حضرت والد صاحبؒ نے کمیشن کے چیئرمین کو جو ایک جسٹس تھے مخاطب کر کے فرمایا کہ قانون سازی کے کام کو اسلام کے رُخ پر آپ چلنے نہیں دیتے اور غلط پر میں نہیں چلنے دوں گا، نتیجہ یہ ہوگا کہ گاڑی یہیں کھڑی رہے گی۔ چنانچہ یہی ہُوا، گاڑی کھڑی رہی"

زکوٰۃ کمیٹی میں شرکت

تقریباً اُسی زمانہ کی بات ہے کہ حکومتِ پاکستان نے زکوٰۃ کی وصولیابی اور اس کے مصارف وغیرہ کے اسلامی قوانین مُدوّن کرنے کے لیے "زکوٰۃ کمیٹی" قائم کی تھی۔

حضرت والد صاحبؒ اس کے بھی اوّل سے آخر تک رُکن رہے لیکن اس میں بھی صورتِ حال وہی پیش آئی جو لاء کمیشن میں پیش آئی تھی۔

دینی غیرت وحمیت

ایک مرکزی وزیر نے جن کا انتقال ہو چکا ہے، اسی کمیٹی کے سلسلہ میں شریعت کے کسی قطعی حکم کے متعلق کچھ توہین آمیز باتیں کہیں، جس پر حضرت والد صاحبؒ کی ان سے شدید جھڑپ ہو گئی، اس کے بعد والد صاحبؒ نے طے کر لیا تھا کہ آئندہ اس شخص کا منہ نہ دیکھوں گا۔ چنانچہ جب وزیرِ موصوف پاکستان کے گورنر جنرل بن گئے تو والد صاحبؒ دُعا فرمایا کرتے تھے اور کوشش کرتے تھے کہ کہیں آشنا سامنا نہ ہو۔ چنانچہ ایسا ہی ہُوا۔

درسِ قرآنِ حکیم

۱۳۷۰ھ سنہ ۱۹۵۰ء میں جبکہ رہائش آرام باغ کے پاس اقبال منزل میں تھی، حضرت والد صاحبؒ نے مسجد باب الاسلام میں عام فہم درسِ قرآنِ کریم کا سلسلہ شروع فرمایا جو روزانہ بعد نمازِ فجر ایک گھنٹہ کے عمل سے سات سال میں پورا ہُوا۔ ابھی پورے قرآن شریف کا درس مکمل نہ ہُوا تھا کہ آپ اپنے ذاتی مکان "اشرف منزل متصل سبیلہ چوک" میں منتقل ہو گئے اور ضعف کے باوجود دو سال

تک وہیں سے روزانہ مسجد باب الاسلام آکر پابندی سے درس دیتے رہے۔ بیشتر آمد و رفت بس کے ہوا کرتی تھی۔

اللہ تعالیٰ نے اس درس کو ایسی مقبولیت عطا فرمائی کہ لوگ دس دس میل سے آکر پابندی سے شریک ہوتے تھے۔ اس درس نے شہر کا پر اتنا گہرا اثر ڈالا کہ ان کی زندگیوں میں خوشگوار دینی انقلاب کا راقم نے خود مشاہدہ کیا۔

چیلنج کا جواب ۔ دستور قرآنی

جب درس قرآن کا یہ سلسلہ جاری تھا اور آپ بورڈ آف تعلیمات اسلام کے رکن بھی تھے اس زمانہ میں ایک مشہور ماہر قانون نے جو بعد میں کئی بار مرکزی وزیر بنے اپنے ایک اخباری بیان میں یہ دعویٰ کیا کہ علماء خواہ مخواہ اسلامی دستور کا مطالبہ کرتے ہیں، حالانکہ قرآن میں دستور کی ایک دفعہ بھی موجود نہیں اور علماء دین دستور کی ایک دفعہ بھی قرآن سے ثابت کر دیں تو میں اُن کو اتنا انعام پیش کروں گا۔

اللہ تعالیٰ نے اس دعوے کی رسوائی کا یہ انتظام فرمایا کہ انہی دنوں (یعنی ۱۰ر شوال ۱۳۷۲ھ ۔ ۲۱ جولائی ۱۹۵۳ء) کے درس قرآن میں سورۂ نساء کی یہ آیت آگئی۔ إِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تُؤَدُّوا الْأَمَانَاتِ إِلَىٰ أَهْلِهَا وَإِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ أَنْ تَحْكُمُوا بِالْعَدْلِ۔ جس کا اسلامی دستور سے گہرا تعلق ہے۔ حضرت والد صاحبؒ نے اس روز کے درس قرآن میں اس آیت کے علاوہ مزید اٹھائیس آیات کی تفسیر بھی بیان فرمائی جن سے دستوری مسائل نکلتے ہیں۔

اس درس میں آپ نے "إِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُكُمْ" الخ کی ایک آیت کے صرف نصف حصہ سے اسلامی مملکت کی ۷ دستوری دفعات ثابت کیں اور کل ۲۹ آیات کے مجموعہ سے ۱۸ دفعات کا استنباط فرمایا۔ اس روز کے درس کا پہلے سے اخبار میں اعلان کیا گیا تھا جس کے باعث اجتماع بہت بڑا ہوگیا خصوصاً علماء کرام اور وکلاء کی بہت بڑی تعداد شریک درس تھی۔

اہل علم کی فرمائش پر یہ تقریر کتابی شکل میں "دستور قرآنی" کے نام سے شائع ہوئی پھر اس کا انگریزی ترجمہ بھی شائع ہوا اس کتاب نے قرآن میں دستور کی نفی کرنے والوں کا منہ ہمیشہ کے لیے بند کردیا اور ثابت کر دیا کہ جس دستور اسلامی کا مطالبہ مسلمانوں کی طرف سے کیا جا رہا ہے وہ صرف علماء فقہا

کے اجتہاد و قیاس پر مبنی نہیں بلکہ قرآن حکیم میں موجود ہے۔

سرکاری "دارالعلوم کمیٹی" کی رُکنیت

حکومتِ پاکستان نے قائدِ اعظم مرحوم کی تین یادگاریں قائم کرنے کا پروگرام بنایا تھا (۱) اُن کا مزار (۲)، ایک جامع مسجد (۳) ایک دینی دارالعلوم۔ دارالعلوم قائم کرنے کے لیے جو کمیٹی سردار عبدالرب نشتر صاحب گورنر پنجاب کی قیادت میں بنی تھی، اس کے بھی آپ اول سے آخر تک اس اُمید پر رُکن رہے کہ شاید پاکستان میں اسلامی نظامِ تعلیم کے لیے ایک نمونہ کی درسگاہ بنایا جا سکے نصاب میں بڑی عرق ریزی سے موجودہ زمانے کی ضروریات کو سمویا گیا، اس کے لیے جگہ کا انتخاب بھی کر لیا گیا تھا، مگر دُوسرے بہت سے دینی منصوبوں کی طرح یہ منصوبہ بھی بعد کی حکومتوں کے بار بار انقلاب کی نذر ہو گیا۔

مرکزی جمعیۃ عُلمائے اسلام کی قیادت

۱۳ دسمبر ۱۹۴۹ء کو شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد صاحب عثمانی نور اللہ مرقدہٗ کی وفات کے بعد حضرت علامہ سید سُلیمان ندوی صاحب قدس سرہٗ جمعیۃ علمائے اسلام کے صدر منتخب ہوئے لیکن ۲۲ نومبر ۱۹۵۳ء میں حضرت سید صاحبؒ کی وفات کے بعد جہاں دستوری مساعی کی دُوسری ذمہ داریاں والد صاحبؒ کے کاندھوں پر آ پڑیں اسی کے ساتھ جمعیۃ علمائے اسلام کی صدارت بھی آپ کو سونپ دی گئی لیکن یہ وُہ وقت تھا جب مغربی پاکستان میں ایک اور جمعیت اسی نام سے قائم ہو چکی تھی جس کا مرکزی جمعیۃ سے کوئی رابطہ نہ تھا، حضرت والد صاحبؒ نے اسلامی دستور کی جدّ و جہد کے ساتھ ہی شب و روز کی مساعی سے ان منتشر جماعتوں کو مرکز سے مربوط کیا اور حکیم الامت حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے خلیفۂ خاص حضرت مفتی محمد حسن صاحبؒ (بانی جامعہ اشرفیہ لاہور) نے اس شرط پر صدارت قبول فرمائی کہ جمعیۃ کی ذمہ داری کا تمام کام حضرت مفتی محمد شفیع صاحب انجام دیں اور اس مقصد کے لیے والد صاحبؒ کو جمعیۃ کا قائم مقام صدر بنا دیا گیا۔

جتنے سرکاری اداروں میں آپ بحیثیت ممبر شریک ہوئے ان سب میں آپ نے اپنی شرکت کی

یہ شرط ارباب حل وعقد سے ہمیشہ منوائی کہ ہم پر عوامی تقریر وتحریر کی وہ پابندیاں عائد نہیں ہوں گی جو سرکاری ملازمین پر ہوتی ہیں چنانچہ صدارت جمعیۃ علمائے اسلام سے پہلے اور بعد میں آپ نے جمعیۃ کی جانب سے تحریک دستور اسلامی کے لیے مشرقی ومغربی پاکستان کے طول وعرض کے بار بار دورے کیے اور ضلع ضلع میں پہنچ کر اسلامی دستور کے لیے عوامی شعور کو بیدار کیا۔ مغربی پاکستان کا ایک دورہ جو ۱۸ دسمبر سنہ ۱۹۵۵ء سے ۳ جنوری سنہ ۱۹۵۶ء تک جاری رہا، اس میں ناچیز راقم الحروف اور برادر عزیز مولانا محمد تقی صاحب عثمانی کو بھی شرف ہمرکابی حاصل ہوا۔

قائم مقام صدر جمعیۃ علمائے اسلام کی حیثیت سے آپ نے تقریباً ۴ سال تک جمعیۃ کی خدمات انجام دیں۔ آپ کی مساعی جاری تھیں کہ ملک میں انقلاب آیا اور جنرل محمد ایوب خاں مرحوم نے مارشل لاء لگا کر تمام جماعتوں کو کالعدم قرار دے دیا، دوران مارشل لاء میں حضرت مفتی محمد حسن صاحبؒ صدر جمعیۃ علماء اسلام بھی رحلت فرما گئے۔

پھر جب مارشل لا اٹھا اور جماعتیں دوبارہ منظم ہوئیں تو "جمعیۃ علماء اسلام" کے نام سے بعض علماء کرام نے ایک نئی تنظیم قائم فرمائی، اس لیے حضرت والد صاحبؒ اصل "جمعیۃ علماء اسلام" کی تنظیم جدید کرنے سے باز رہے تاکہ علماء کرام کے مابین تفرقہ پیدا نہ ہو اور پاکستان میں اسلامی نظام کے لیے انفرادی طور پر علمی وعملی میدانوں میں کوشش فرماتے رہے جس کی تفصیل بہت زیادہ ہے اس مقالہ میں اس کی گنجائش نہیں۔

مگر سنہ ۱۹۷۰ء کے انتخابات سے کچھ پہلے سیاسی ہنگاموں کا ایک طوفان اٹھ کھڑا ہوا۔ پاکستان میں خالص اسلامی حکومت کے بجائے کمیونزم اور سوشلزم پھیل جانے کے خطرات قوی ہو گئے اور سوشلزم کو عین اسلام باور کرانے کے لیے پروپیگنڈا اور جلسے جلوس عام ہو گئے تو اس مسئلہ کی نزاکت نے پھر آپ کو "جمعیۃ علماء اسلام" کے احیاء پر مجبور کر دیا۔ کیونکہ ضابطہ میں قائم مقام صدر آپ ہی تھے۔

چنانچہ مغربی ومشرقی پاکستان کے تمام ارکان جمعیت کا اجلاس بلا کر جمعیت کی صدارت تو حضرت مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی کی طرف منتقل فرما دی اور خود کسی عہدے کے بغیر مرکزی جمعیت علماء اسلام کے جلسوں میں شریک ہوتے رہے۔ اسلام اور سوشلزم کے درمیان جو بنیادی خلیج حائل ہے اسے تحریر و تقریر کے ذریعہ واضح فرمایا۔ آپ نے ایک رسالہ "اسلام کا نظام تقسیم دولت" اور دوسرا رسالہ "اسلامی نظام میں معاشی اصلاحات کیا ہوں گی" اسی دور میں تصنیف فرمائے جو کثیر تعداد میں شائع ہوئے۔

تقریباً ایک سال اس جدوجہد میں صرف ہُوا جس سے مسئلہ کی وضاحت تو بحمداللہ پوری طرح ہوگئی مگر سیاست کے میدان میں مسائل اور حقائق سے زیادہ، زور و زر کام کرتے ہیں، انتخابات کا نتیجہ بالکل عکس نکلا اور اس کے اثر سے پاکستان پر جو زوال آنا تھا، آ گیا۔

ریڈیو سے درسِ معارف القرآن

۱۹۵۴ء میں ریڈیو پاکستان کے ڈائریکٹر جنرل جناب ذوالفقار علی بخاری نے حضرت والد صاحبؒ سے اصرار درخواست کی کہ ریڈیو پاکستان سے قومی پروگرام میں جو درس قرآن روزانہ نشر ہوتا ہے وہ آپ دیا کریں مگر آپ نے یہ درخواست چند اعذار کی بنا پر قبول نہ فرمائی، پھر انھوں نے ایک دوسری تجویز پیش کی کہ یومیہ درس کے سلسلہ سے الگ ایک ہفتہ واری درس بنام "معارف القرآن" جاری کیا جائے جس میں پورے قرآن کی تفسیر پیش نظر نہ ہو بلکہ عام مسلمانوں کی موجودہ ضروریات کے لحاظ سے خاص آیات کا انتخاب کر کے اُن کی تفسیر اور متعلقہ احکام بیان کیے جائیں۔ والد صاحبؒ نے یہ تجویز اس شرط کے ساتھ قبول فرمائی کہ درس کا کوئی معاوضہ نہ لُوں گا اور کسی ایسی پابندی کو بھی قبول نہ کروں گا جو میرے نزدیک درس قرآن کے مناسب نہ ہو، یہ شرط منظور کر لی گئی۔

۳ر شوال ۱۳۷۳ھ ۔ ۲ر جولائی ۱۹۵۴ء سے درس معارف القرآن شروع ہُوا اور قومی پروگرام میں تقریباً گیارہ سال پابندی سے نشر ہوتا رہا۔ جب یہ درس شروع ہُوا تو پاکستان کے سب علاقوں سے اور ان سے بھی زیادہ بیرونی ممالک افریقہ و یورپ وغیرہ میں بسنے والے مسلمانوں کی طرف سے بے شمار خطوط ریڈیو پاکستان کو اور خود والد صاحبؒ کو وصول ہوئے جن سے معلوم ہُوا کہ بے شمار دین دار اور تعلیم یافتہ مسلمان اس درس کو نہایت اہتمام سے سُنتے ہیں، افریقہ میں چونکہ یہ درس آخر شب یا بالکل صبح صادق کے وقت سُنا جاتا تھا وہاں کے لوگوں نے اس کو ٹیپ ریکارڈر کے ذریعہ محفوظ کر کے بعد میں سب کو بار بار سُنانے کا انتظام کر لیا تھا[1]۔ درس کی اسی مقبولیت کے پیش نظر پاکستان کے دُوسرے ریڈیو اسٹیشن کوئٹہ وغیرہ والے دُوسرے اوقات میں بھی نشر کرتے تھے اور کچھ عرصہ بعد اس کا

---

[1] یہ بات احقر کو ٹانگانیکا کے ایک مسلم افریقی باشندے نے بھی بتائی تھی (رفیع)

سندھی ترجمہ بھی حیدرآباد سے نشر کیا جانے لگا۔

ریڈیو کے ضابطے کے مطابق اُس زمانہ میں ایک درس کا معاوضہ تیس روپے مقرر تھا جس کی گیارہ سال کی مجموعی رقم اس زمانہ کے تقریباً سولہ ہزار روپے ہوتی ہے لیکن آپ نے بااختیار افسران کے اصرار کے باوجود اس میں سے ایک پیسہ بھی کبھی قبول نہیں فرمایا، محض لوجہ اللہ یہ خدمت جاری رکھی، یہاں تک کہ جب یہ درس تیرہویں پارے اور سورۂ ابراہیم تک پہنچا تو ریڈیو پاکستان کی نئی پالیسی کے تحت اسے بند کر دیا گیا۔

یہی وہ بابرکت درسِ معارف القرآن ہے جو حضرت والد صاحبؒ کی شہرہ آفاق تفسیر — معارف القرآن کی بُنیاد بنا۔

عظیم پائیدار کارنامہ — تأسیس دار العُلوم کراچی

ہجرتِ پاکستان کے بعد حضرت والد صاحبؒ نے دو کاموں کو اپنا مقصدِ زندگی بنا لیا تھا، ایک پاکستان میں اسلامی نظام کے نفاذ کے لیے جدّوجُہد، دوسرے کراچی میں یہاں کے شایانِ شان دار العلوم کا قیام۔

ابتدائی دو سال تو قراردادِ مقاصد اور اسلامی دستور کی جدوجُہد جو انتہائی بے سروسامانی میں ہو رہی تھی اُسی کی مشغولیت اتنی رہی کہ دار العلوم کے قیام میں کامیابی نہ ہو سکی۔

فتاویٰ کا مشغلہ دار العلوم دیوبند سے مُستعفی ہونے کے بعد بھی آپ کا جزوِ زندگی بنا رہا مگر اس عرصہ میں جو فتاویٰ لکھے گئے وہ کسی رجسٹر میں نقل کیے بغیر ہی روانہ کر دیئے جاتے تھے، نقل کا کوئی انتظام نہ تھا، البتہ نہایت اہم اور منتخب فتاویٰ آپ خود ہی ایک رجسٹر میں نقل فرما لیا کرتے تھے۔

جیکب لائن سے آپ کی رہائش آرام باغ کے قریب ایک کرایہ کے مکان میں منتقل ہُوئی تو مسجد باب الاسلام کے احاطہ میں دروازہ کے اُوپر آپ نے ایک کمرہ دار الافتاء کا تعمیر کرایا، تاکہ فتویٰ حاصل کرنے والوں کو سہولت ہو، نقلِ فتاویٰ اور دار الافتاء کے انتظام کے لیے ایک صاحب کو تنخواہ پر رکھ لیا اور فارسی و عربی کی ابتدائی کتابیں پڑھانے کے لیے احقر کے استاذِ محترم حضرت مولانا فضل محمد صاحب سواتی اور حضرت مولانا امیر الزماں صاحب کشمیری کو مقرر فرمایا، یہ دونوں حضرات والد ماجدؒ کے شاگرد

ہیں، اسی سال احقر کے حفظ قرآن کی تکمیل ہوئی تھی، دوسرے چند طلبہ کے ساتھ برادر عزیز مولانا محمد تقی صاحب عثمانی اور ناچیز راقم الحروف نے فارسی کی ابتدائی کتابیں یہیں پڑھنی شروع کیں۔

پھر اللہ تعالیٰ نے ایسے اسباب پیدا فرمائے کہ محلہ نانک واڑہ میں سکھوں کے زمانے کے ایک اسکول کی خالی عمارت دارالعلوم کے لیے عطا فرمادی، حضرت والد صاحبؒ نے ہمارے بہنوئی جناب مولانا نور احمد صاحب کو ساتھ لے کر چندے کی اپیل یا ساز و سامان کے بغیر نہایت سادگی سے اس عمارت میں مدرسہ قائم فرما دیا، ایک استاذ اور چند طلبہ سے اس مدرسہ کا محض اللہ کے بھروسہ پر آغاز ہوا۔ اُس وقت تک کراچی میں مدرسہ مظہر العلوم کھڈہ کے سوا کوئی مدرسہ نہ تھا، بلکہ پورے پاکستان میں گنے چنے ہی مدارس تھے، علوم دینیہ کے طلبہ پریشان تھے، یہ مدرسہ کھلا تو ملک کے اطراف واکناف سے طلبہ آنے شروع ہو گئے اور چند مہینے کے اندر اندر یہی مدرسہ "دارالعلوم کراچی" بن گیا۔ اب دارالافتاء بھی یہیں منتقل ہو گیا۔ حضرت والد صاحبؒ کا جو وقت دستوری جدوجہد سے بچتا تھا وہ درس و فتویٰ اور دارالعلوم کی انتظامی نگرانی میں یہیں صرف فرمانے لگے۔ حضرت والد صاحبؒ دارالعلوم کے صدر تھے اور آخر تک صدر رہے۔ جناب مولانا نور احمد صاحب دارالعلوم کے سب سے پہلے ناظم تھے جن کو اللہ تعالیٰ نے غیر معمولی صلاحیتیں عطا فرمائی ہیں وہ نہایت جانفشانی سے دارالعلوم کا انتظام کئی سال تک چلاتے رہے۔

دارالعلوم کے ہر شعبہ میں کام جس تیز رفتاری سے بڑھ رہا تھا، اس کے سامنے موجودہ عمارت بہت تنگ محسوس ہونے لگی، ادھر شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد صاحب عثمانی کی وفات کے بعد حضرت والد صاحبؒ کی دلی تمنا تھی کہ ان کی یادگار کے طور پر ان کے شایان شان دارالعلوم قائم ہو، اس کے لیے وہ علاقہ جس میں شیخ الاسلامؒ کا مزار ہے، شب و روز کی قدوجہد سے باضابطہ حاصل فرمایا اور دارالعلوم کو وہیں منتقل کرنے کے خیال سے نقشہ منظور کرا کے تعمیر کا کام شروع کرا دیا، مگر بعض لوگوں کی مزاحمت کے باعث کھدی ہوئی بنیادیں اسی حال میں محض جھگڑا ختم کرنے کے لیے چھوڑ کر نانک واڑہ تشریف لے آئے۔ حکومت نے اور رفقاء کار نے بہت زور دیا کہ تعمیر جاری رکھی جائے مگر حضرت والد صاحبؒ نے فرمایا کہ:

"دارالعلوم بنانا فرض کفایہ اور مسلمانوں کو جھگڑے سے بچانا فرض عین ہے، فرض عین کو چھوڑ کر فرض کفایہ میں لگنا دین کی صحیح خدمت نہیں، میں جھگڑے اور اصول سے کر یہاں ہرگز دارالعلوم نہ بناؤں گا۔"

تھوڑے ہی عرصہ بعد اللہ تعالیٰ نے کورنگی میں والد صاحبؒ کو چھتیس ایکڑ زمین دارالعلوم کے لیے عطا فرمادی تو جدید تعمیرات بقدرِ ضرورت مکمل ہوجانے کے بعد دارالعلوم یہاں منتقل فرمایا اور نانک واڑہ کی عمارت میں دارالعلوم کے چند شعبے رہ گئے۔

بورڈ آف تعلیمات اسلام کی رکنیت سے فارغ ہوجانے کے بعد آپ کی مصروفیات دارالعلوم میں بڑھتی چلی گئیں، پھر جب جنرل محمد ایوب خاں کی حکومت آئی اور عوامی سطح پر اسلامی دستور و قانون کے لیے جدو جہد کے راستے مسدود ہوگئے تو آپ کی تمام تر توجہات کا مرکز یہی دارالعلوم بن گیا، اور لسبیلہ چوک کے پاس اپنا ذاتی کشادہ مکان جو نہایت شوق و محنت سے کتنی ہی تکلیفیں جھیل کراپنی ضرورت کے مطابق تعمیر کیا تھا اسے چھوڑ کر مستقل رہائش دارالعلوم کے احاطہ کورنگی ہی میں اختیار فرمایا اور یہاں کئی سال تک کھپریل کی چھت کے صرف دو کمروں میں گذارا فرمایا، زندگی کے آخری چار سال جو سخت علالت میں گذرے، پختہ چھت کے چار کمروں میں بسر ہوئے۔ زندگی کے آخری لمحات تک درس و فتویٰ اصلاح و ارشاد اور انتظام دارالعلوم میں مشغولیت رہی، احاطہ دارالعلوم کے اسی مکان میں وفات پائی اور احاطہ دارالعلوم ہی کے قبرستان میں اب محوِ آرام ہیں۔ ناریل کے اُن درختوں کے سایہ تلے جو پندرہ سال قبل خود کھڑے ہو کر لگائے تھے۔

دارالعلوم کی ان تمام خدمات کا ابتدائی چار سال تک تو آپ نے کوئی معاوضہ لیا ہی نہیں، پھر جب بورڈ آف تعلیمات اسلام کی رکنیت ختم ہوگئی، کوئی ذریعہ معاش نہ تھا اور دارالعلوم کی خدمات شب روز کا مشغلہ زندگی بنی ہوئی تھیں تو جمادی الاولیٰ ۱۳۷۴ھ ۲۷، دسمبر ۱۹۵۴ء سے مجلس منتظمہ کی درخواست پر پانچ سو روپے مشاہرہ لینا منظور فرمالیا مگر شعبان ۱۳۷۷ھ سے اس مشاہرہ میں از خود کمی کر کے صرف تین سو روپے ماہوار باقی رکھے جس کا اکثر حصہ دارالعلوم ہی کی ضروریات ٹیلیفون، آمد و رفت، اور مہمانداری میں خرچ ہو جاتا تھا پھر ۱۳۸۴ھ سے یہ تین سو روپے لینا بھی ترک فرمادیا۔

اس عرصہ میں جتنی رقم دارالعلوم سے بطور مشاہرہ وصول کی تھی، والد صاحبؒ کی خواہش تھی کہ اس کو بتدریج واپس فرمادیں، چنانچہ متفرق اوقات میں مختلف عنوانات سے تقریباً ساڑھے باون ہزار روپے دارالعلوم میں داخل فرمائے جس کی تفصیل درج ذیل ہے[1]

---

[1] یہ تفصیل حضرت والد صاحبؒ کی ذاتی قلمی بیاض ۴ کتاب المتن والمحن ص ۲۰۰ سے لی گئی ہے۔

۱۔ دارالعلوم کی جامع مسجد (کورنگی) میں توسیع کے لیے	۵۰۰۰/-
۲۔ ایک ٹرک کتابیں اور دیگر سامان دارالعلوم کو دیا جس کی مالیت پانچ ہزار تھی۔	۵۰۰۰/-
۳۔ تاریخ مذکور تک مختلف اوقات میں مزید نقد دیئے تقریباً	۴۰۰۰/-
۴۔ فتاویٰ دارالعلوم دیوبند کے پانچ سو نسخے دارالعلوم کو نصف قیمت پر عنایت فرمائے نصف قیمت خود برداشت کی جو دس ہزار روپے تھی	۱۰۰۰۰/-
۵۔ تقریباً ۱۳۹۳ھ میں باقاعدہ رسید لے کر دارالعلوم کو نقد دیئے	۵۰۰۰/-
۶۔ ۱۳۹۴ھ میں دارالعلوم کورنگی کی جامع مسجد کے مصارف کے لیے دو کمرے احاطۂ دارالعلوم میں اپنے خرچ پر تعمیر کرا کے وقف فرمائے، جس پر کل خرچ آیا۔	۱۲۲۸۵/۹۴
میزان	۴۲۲۸۵/۹۴

حضرت والدصاحبؒ کی اسی للّٰہیت کا یہ ثمرہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس دارالعلوم کو دنیا کے عظیم دینی مدارس کی صف میں لا کھڑا کیا اور پاکستان کے عظیم ترین دینی اداروں میں اسے ممتاز مقام حاصل ہے دارالعلوم اور دین کے مختلف شعبوں میں اس کی عظیم الشان خدمات حضرت والدصاحبؒ کا ایسا صدقۂ جاریہ ہے جو انشاءاللہ صدیوں باقی رہے گا۔

دارالعلوم کی مفصل تاریخ، اس کی خدمات کا جائزہ اور اس کے مختلف شعبوں کا تعارف اتنا بڑا کام ہے کہ اس کے لیے مستقل تصنیف کی ضرورت ہے، یہ مقالہ اس کا متحمل نہیں ہوسکتا۔

اس دور میں خدمت فتویٰ

فتویٰ کی عظیم ذمہ داریاں جو ۲۵ سال کی عمر سے جزو زندگی بنی ہوئی تھیں، اس آخری دور میں اور زیادہ ہمہ گیر ہوگئیں، دنیا بھر کے ممالک سے فقہی سوالات کا تانتا بندھا رہتا تھا جن مسائل میں علماء محققین کا اختلاف ہوتا وہ بھی محاکمہ کے لیے والدصاحبؒ ہی کے پاس آتے تھے روزانہ کی ڈاک میں فتاویٰ کے علاوہ آپ کے مریدین و خلفاء، اعزہ و احباب اور ملکی و غیر ملکی زعماء کے خطوط بھی بکثرت

ہوتے تھے، آپ پوری ڈاک کا جواب روز کے روز لکھنے کے عادی تھے۔ البتہ بعض مسائل میں کتابوں کی مراجعت یا دوسرے علماء سے مشورے کے باعث کچھ تاخیر بھی ہو جاتی تھی۔

والد صاحبؒ کے لکھنے کی رفتار بہت تیز تھی، تصنیف ہو یا فتویٰ، مجھے کبھی یاد نہیں کہ ہاتھ میں قلم لیے سوچ رہے ہوں، شروع میں چند لمحے غور فرماتے پھر تیز رفتاری سے رُکے بغیر لکھتے جاتے تھے۔ تیز چلتی ہوئی گاڑی میں بھی فتاویٰ وغیرہ بے تکلف تحریر فرماتے رہتے۔ ریل کے بڑے بڑے سفر اسی مشغلہ میں طے ہوتے تھے۔

تعدادِ فتاویٰ

دارالعلوم دیوبند کے دارالافتاء سے آپ کے زمانہ میں چھتیس ہزار باسی فتاویٰ [۳۶۰۸۲] جاری ہوئے تھے (تاریخ دارالعلوم دیوبند ص ۹۹ تا ۱۰۰) اس کے بعد دارالعلوم کراچی کے قیام تک ہزاروں فتاویٰ تحریر فرمائے جن کی نقل محفوظ نہ کی جا سکی۔ صرف ۱۰۴ منتخب فتاویٰ آپ نے خود نقل فرمائے تھے جو اب امداد المفتین کا جزء بنا دیے گئے ہیں۔ دارالعلوم کراچی میں ۱۸ شعبان ۱۳۸۰ھ سے آپ کی وفات تک کل ۴۰،۹۵۸ فتاویٰ کی نقل محفوظ کی گئی جو بیشتر آپ ہی کے تحریر فرمودہ ہیں اور جو فتاویٰ نائب مفتی صاحبان نے لکھے اُن میں سے بھی اکثر پر آپ کے تصدیقی دستخط ہیں۔ اس طرح آپ کے جن فتاویٰ کی نقلیں دیوبند اور کراچی میں محفوظ ہیں، صرف ان کی تعداد ستتر ہزار ایک سو چوالیس [۷۷۱۴۴] ہے۔ پھر یہ تفصیل صرف تحریری فتاویٰ کی ہے، زبانی فتاویٰ کی تعداد یقیناً تحریری فتاویٰ سے کئی گنا زیادہ ہوگی کیونکہ ان کا سلسلہ تو ہر وقت ہی ملاقاتوں میں اور فون پر جاری رہتا تھا۔ سخت بیماری میں بلکہ رات کے ایک دو بجے بھی کوئی مسئلہ دریافت کرتا تو بے وقت پوچھنے پر کبھی نرمی سے تنبیہ تو فرما دیتے مگر جواب مستحضر ہوتا تو اگلے وقت پر نہ ٹالتے تھے۔

تربیتِ افتاء

۱۳۷۹ھ میں ناچیز راقم الحروف اور برادرِ عزیز مولانا محمد تقی صاحب عثمانی دارالعلوم کراچی میں درسِ نظامی سے فارغ ہوئے تو حضرت والد صاحبؒ نے دارالعلوم میں فتویٰ نویسی کی باقاعدہ تربیت دینے کا بھی ایک شعبہ "تخصص فی الافتاء" کے نام سے قائم فرمایا جو اب بھی قائم ہے۔ اس میں تربیت کا سب کام آپ خود ہی انجام دیتے تھے۔ نصاب دو سال تھا۔ بہت سے علماء کرام کے علاوہ بحمد اللہ ہم دونوں بھائیوں کو بھی اس شعبہ میں دو سال زیرِ تربیت رہنے کی سعادت نصیب ہوئی۔ اس کے بعد بھی وقتاً فوقتاً کچھ فتاویٰ ہم دونوں کو عنایت فرما دیتے

تھے، تاآخر مشق کا سلسلہ جاری رہے۔

دیوبند اور کراچی میں کم از کم ایک نائب مفتی ہمیشہ آپ کے زیرِ تربیت رہے جن کے لکھے ہوئے فتاویٰ آپ کی اصلاح و تصدیق کے بعد روانہ کیے جاتے تھے۔ آپ فرمایا کرتے تھے کہ "فتویٰ کا خاص ذوق اور ملکہ ہوتا ہے جو مفتی میں ہونا ضروری ہے اور وہ کتنی ہی کتابیں پڑھنے کے باوجود اُس وقت تک حاصل نہیں ہوتا جب تک برسہا برس کسی ماہر مفتی کے زیرِ ہدایت فتویٰ لکھنے کا کام نہ کیا ہو۔" وفات سے سات سال قبل ۱۳۹۰ھ میں آپ نے برادرِ عزیز مولانا محمد تقی صاحب کو تصنیف و تالیف کی خدمت پر مامور فرمایا جن کا شگفتہ قلم ماشاء اللہ والد صاحبؒ کے علوم کا بہترین ترجمان ثابت ہوا اور احقر کو فتویٰ کی خدمات پر بحیثیت نائب مفتی مقرر فرمایا۔ اپنی نااہلی کے باوجود بحمداللہ سات سال والد صاحبؒ کی تربیت اور دعاؤں کے سایہ میں اس خدمت میں لگے رہنے کا موقع نصیب ہوا، یہ اور بات ہے، کہ احقر اپنی شامتِ اعمال کے باعث کچھ حاصل نہ کر سکا۔

زندگی کے آخری چار سال میں طرح طرح کے شدید امراض کے باعث آپ بیشتر فتاویٰ حضرت مولانا عاشق الٰہی صاحب مدظلہم اور احقر سے لکھوایا کرتے تھے مگر بہت سے فتاویٰ روزانہ خود بھی لکھتے یا املاء کراتے رہے —— یہاں تک کہ ۱۰ شوال سنہ ۱۳۹۶ھ سنہ ۱۹۷۶ء کے دن قلب کے جس دورہ میں آپ کی وفات ہوئی، اس خوفناک دورہ سے ۱۵ منٹ قبل بھی ایک فتویٰ املاء کرا کے اس پر دستخط فرمائے جس کا سلسلہ نمبر یہاں کے رجسٹر ۲۷ (ھ) میں ۲۰۹۵۸ ہے۔ یہی وہ فتویٰ تھا جس پر والد صاحبؒ کی علمی مصروفیات کا سلسلہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

آپ کی تصانیف ایک نظر میں

حضرت والد صاحبؒ کی تصانیف اکثر اردو میں اور کئی عربی زبان میں ہیں۔ تصانیف کی کل تعداد ایک سو باسٹھ (۱۶۲) ہے۔ صرف فقہی موضوعات پر آپ کی پچانوے تصانیف ہیں، بہت سی تصانیف کا مفصل تعارف خدمات اور کارنامے والے حصے میں متعدد اہلِ علم نے کرا دیا ہے لیکن بہت سی تصانیف کا ذکر وہاں بھی نہیں آیا، لہٰذا سب تصانیف کی ایک مکمل فہرست یہاں مضمون وار پیش خدمت ہے، تاکہ ایک نظر میں کم از کم اُن کے ناموں سے واقفیت حاصل کی جا سکے۔

تفسیر

(۱) تفسیر معارف القرآن کامل۔ ۸ جلدوں میں جو ۷،۱۷،۵ صفحات پر مشتمل ہے (۲) احکام القرآن (عربی) دو جلدوں میں از سورۂ شعراء تا سورۂ حجرات جو باریک قلم کے ۵۲۸ صفحات پر مشتمل ہے۔

حدیث

(۳) تقریر ترمذی۔ جو حضرت انور شاہ کشمیریؒ کے درس میں قلمبند فرمائی (غیر مطبوعہ) (۴) الازدیاد السنی علی الیانع الجنی (عربی) اکابر علماء دیوبند کا سلسلۂ اسنادِ حدیث۔ (۵) مختصر چہل حدیث مترجم متعلقہ اخلاق و آداب (۶) چہل حدیث متعلقہ اسلامی معاشیات (غیر مطبوعہ) (۷) چرخے کی فضیلت متعلقہ احادیث کا مجموعہ۔

فقہ

(۸) فتاویٰ دارالعلوم دیوبند (امداد المفتین) جو ۱۰۸۶ صفحات پر مشتمل ہے (۹) اسلام کا نظامِ اراضی (۱۰) آلاتِ جدیدہ، نئی ایجادات کے شرعی احکام (۱۱) مسئلہ سُود (۱۲) آداب المساجد (۱۳) رفیقِ سفر۔ سفر سے متعلق شرعی احکام و آداب (۱۴) مسجد کے حدود کار اور آداب یہ رسالہ مستقل تصنیف فرمایا تھا، بعد میں اسے معارف القرآن کا جزء بنا دیا (۱۵) شب برأت (۱۶) احکام القمار (۱۷) تصویر کے شرعی احکام (۱۸) بیمۂ زندگی (۱۹) حیلۂ ناجزہ۔ یہ حکیم الامت حضرت تھانویؒ اور والد ماجدؒ کی مشترک تصنیف ہے (۲۰) نکاح و طلاق۔ یہ بھی آپ نے بعد میں معارف القرآن کا جزء بنا دیا (۲۱) اعضاءِ انسانی کی پیوند کاری (۲۲) پراویڈنٹ فنڈ پر زکوٰۃ اور سُود (۲۳) ضبطِ ولادت کی شرعی حیثیت (۲۴) احکامِ حج (۲۵) قرآن میں نظامِ زکوٰۃ (۲۶) احکامِ دُعا (۲۷ تا ۷۱) جواہر الفقہ۔ دو جلدوں میں جو آپ کے پینتالیس فقہی رسائل پر مشتمل ہے جن کا تعارف حضرت مولانا محمد اشرف خاں صاحب نے اپنے مقالے "حکیم الامتؒ کے علمی جانشین" میں کرا دیا ہے۔ (۷۲ تا ۸۹) وہ اٹھارہ رسائل جو فتاویٰ دارالعلوم "امداد المفتین" کا جزء بن کر شائع ہوئے ہیں، ان کا تعارف بھی موصوف کے مقالے میں موجود ہے۔ (۹۰ تا ۹۶) وہ سات فقہی رسائل جو عربی زبان میں احکام القرآن کا جزء بن کر شائع ہو چکے ہیں، ان کا تعارف بھی موصوف نے اپنے مقالے میں کرایا ہے۔

عقائد و کلام

(۹۷) ایمان و کفر قرآن کی روشنی میں (۹۸) مقامِ صحابہ (۹۹) صحابۂ کرام میں افضل کون ہے؟ (۱۰۰) ختمِ نبوت کامل (۱۰۱) التصریح بما تواتر فی نزول المسیح (عربی) یہ کتاب حضرت مولانا سید انور شاہ کشمیریؒ اور والد ماجدؒ کی مشترک تالیف ہے۔

(۱۰۲) ہدیۃ المہدیین فی آیات خاتم النبیین (عربی) (۱۰۳) مسیح موعود کی پہچان (۱۰۴) دعاوی مرزا (۱۰۵) ممالکِ اسلامیہ سے قادیانیوں کی غداری (۱۰۶) مشرقی اور اسلام (۱۰۷) سنت و بدعت

معیشت و سیاست

(۱۰۸) اسلام کا نظامِ تقسیمِ دولت (۱۰۹) اسلامی نظام میں معاشی اصلاحات کیا ہوں گی؟ (۱۱۰) دستورِ قرآنی (۱۱۱) اسلامی ریاست میں غیر مسلموں کے حقوق (۱۱۲) ووٹ اور ووٹر کی شرعی حیثیت (۱۱۳) سرمایہ داری، سوشلزم اور اسلام (۱۱۴) خطبۂ صدارت کل ہند جمعیت علمارِ اسلام کانفرنس منعقدہ حیدرآباد سندھ جنوری سنہ ۱۹۴۷ء (۱۱۵) افاداتِ اشرفیہ در مسائل سیاسیہ (۱۱۶) جہادِ پاکستان سنہ ۱۹۶۵ء (۱۱۷) حالیہ جنگ نے ہمیں کیا سبق دیئے (۱۱۸) وحدتِ امت (۱۱۹) اختلافٌ أم شقاق؟ (عربی) (۱۲۰) اسلام میں مشورے کی اہمیت (نامکمل)

سیرت و تاریخ

(۱۲۱) سیرت خاتم الانبیار (۱۲۲) آداب النبی (۱۲۳) شہادتِ کائنات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کی شہادتیں کائنات میں (۱۲۴) فتوح الہند (۱۲۵) شہیدِ کربلا (۱۲۶) ذوالنون مصری (۱۲۷) دو شہید (۱۲۸) درسِ عبرت۔

اصلاح و ارشاد

(۱۲۹) گناہِ بے لذت (۱۳۰) گناہوں کا کفارہ (۱۳۱) بسم اللہ کے فضائل و مسائل (۱۳۲) روحِ تصوف (۱۳۳) دافع الافلاس (۱۳۴) مصیبت کے بعد راحت (۱۳۵) کید الشیطان۔ موت کے وقت مکرِ شیطانی اور بچاؤ کی تدبیریں (۱۳۶) رجوع الی اللہ (۱۳۷) ذکر اللہ اور درود و سلام کے فضائل (۱۳۸) آداب الشیخ والمرید (۱۳۹) خلاصہ و تسہیل قصد السبیل (۱۴۰) دل کی دنیا (۱۴۱) ملفوظاتِ امام مالکؒ (۱۴۲) ملفوظات امام احمد بن حنبلؒ۔ (۱۴۳) پیغمبرِ امن و سلامتؐ (۱۴۴) مقدمہ حیوٰۃ المسلمین۔

تعلیم و تبلیغ

(۱۴۵) امر بالمعروف اور نہی عن المنکر۔ یہ کتاب ماہنامہ "القاسم" دیوبند میں قسط وار شائع ہوئی (۱۴۶) قرونِ اولیٰ میں مسلمانوں کا نظامِ تعلیم (۱۴۷) طلبہ کے نام دو اہم پیغام (۱۴۸) وصیت نامہ۔

زبان و ادب

(۱۴۹) اصول اللغۃ۔ مقدمہ المنجد اردو (۱۵۰) کشکول۔ اردو و فارسی کلام نظم و نثر (۱۵۱) نفحات۔ عربی نظم و نثر کا مجموعہ (۱۵۲) تحفۃ الوطن

شرح نفحۃ الیمن (عربی)

متفرقات (۱۵۳) اسلام میں نظامِ مساجد (۱۵۴) میرے والد ماجد اور ان کے مجرب عملیات (۱۵۵) نقوش و تأثرات۔ سفرنامۂ دیوبند و تھانہ بھون (۱۵۶) مجالسِ حکیم الامت (۱۵۷) حضرت تھانویؒ کے آخر عمر کے ملفوظات جو خاتمۃ السوانح میں شائع ہوئے۔ (۱۵۸) مکاتیبِ حکیم الامت۔ غیر مطبوعہ (۱۵۹) دار العلوم دیوبند اور اس کا مزاج و مذاق (۱۶۰) تاریخ قرآنی (۱۶۱) مقدمہ امداد الفتاویٰ (۱۶۲) مقدمہ فتاویٰ دار العلوم دیوبند (عزیز الفتاویٰ)

اِعتذار

حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ جیسی عظیم جامع شخصیت کی سوانح اتنا بڑا موضوع ہے کہ اس کیلئے کئی مستقل ضخیم تصانیف کی ضرورت ہے۔ کسی رسالہ کے ایک مضمون میں اس کو سمونا ممکن نہیں۔ حضرت کی زندگی کا کوئی پہلو بھی تو ایسا نظر نہیں آتا جو اپنے دامن میں عبرتوں اور ہدایتوں کے خزانے نہ رکھتا ہو مگر مجبوراً بیشمار حالات و واقعات بلکہ کئی مستقل موضوعات کو چھوڑتا ہوا یہاں تک پہنچا ہوں۔

سنہ ۱۳۶۲ھ (تقریباً سنہ ۱۹۴۳ء) میں احقر کی عمر سات سال ہو چکی تھی، اُس وقت سے آپ کی وفات تک کے حالات تو چشم دید ہی ہیں، اللہ تعالیٰ نے اندرون ملک کے سفروں کے علاوہ دُوسرے ممالک سعودی عرب، یمن، مشرقی افریقہ، جنوبی افریقہ، بھارت اور مشرقی پاکستان کے دوروں میں بھی حضرت والد صاحبؒ کی خدمت وصحبت کی دولت نصیب فرمائی، مگر افسوس کہ سوانح کا یہ حصہ صرف چار دن میں لکھنا پڑا۔ لہٰذا اس دور کے حالات تو بہت ہی کم لکھے جا سکے، تاہم البلاغ کی اسی اشاعت میں اس دور کے بہت سے حالات پر متعدد اہلِ قلم نے ماشاء اللہ خاصی تفصیل سے لکھا ہے لہٰذا طوالت کے خوف سے یہ سطور یہیں ختم کرتا ہوں۔

قارئین کرام سے درخواست ہے کہ براہِ کرم حضرت والد ماجدؒ کی بلندیٔ درجات کے لئے خصوصی دُعا فرمائیں اور یہ کہ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اُن کے نقشِ قدم پر چلنے کی توفیق کامل عطا فرمائے۔ آمین وہو المستعان۔

محمد رفیع عثمانی عفا اللہ عنہ
خادم دار العلوم کراچی۔ ۱۵، رجب سنہ ۱۳۹۶ھ

محمد تقی عثمانی

حضرتؒ کے شیوخ واکابر

الحمد للہ وکفی وسلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ ط

والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو اللہ تعالیٰ نے جن علمی اور عملی خصوصیات سے نوازا تھا اور جو کمالات عطا فرمائے تھے وہ درحقیقت ان بزرگوں کی خدمت وصحبت کا نتیجہ تھا جن کی آغوش شفقت آپ کو میسر ہوئی۔ حضرتؒ کی زندگی اپنے انہی اکابر کا ایک خوبصورت عکس تھی۔ اور آپ جس والہانہ انداز میں اپنے اساتذہ ومشائخ اور بزرگوں کا تذکرہ فرماتے تھے اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ آپ کو ان سے اور ان کو آپ سے کس درجہ تعلق خاطر تھا۔ حضرتؒ کی زندگی انتہائی مصروف زندگی تھی۔ لیکن جب کبھی آپ کو فراغت کے کچھ لمحات میسر آتے آپ اپنے اکابر میں سے کسی نہ کسی کا ذکر چھیڑ دیتے۔ اور جب اس قسم کا کوئی تذکرہ چھڑ جاتا تو وہ دیر تک جاری رہتا تھا جب تک آپ کے اکابر زندہ تھے اس وقت تک آپ کی بہترین تفریح یہ تھی کہ فارغ اوقات میں ان کی مجلس میں جا بیٹھتے اور ان کی خدمت وصحبت سے مستفید ہوتے۔ اور جب اکابر وفات پا چکے تو آپ کی تفریح یہ تھی کہ ان کے ایمان افروز واقعات حاضرین کو سناتے۔ اور ان تذکروں کے درمیان ایک عجیب قسم کی وارفتگی اور بے خودی آپ پر طاری ہو جاتی تھی۔ زیر نظر مضمون میں آپ کے انہی بزرگوں کا مختصر تذکرہ مقصود ہے۔

حضرتؒ نے جن اکابر علماء اور اولیاء سے کسب فیض کیا ان کی فہرست یوں تو بہت طویل ہے لیکن یہاں صرف ان حضرات کا تذکرہ پیش نظر ہے جن سے آپ کو خصوصی تعلق رہا ہے۔ اور ان حضرات

کے تذکرے میں بھی ان کے سوانحی پہلو کے بجائے زیادہ ان کی وہ خصوصیات اور ان کے وہ
حالات ومقالات قلم بند کرنے مقصود ہیں جو احقر نے حضرت رحمۃ اللہ علیہ سے سنے ہیں۔ یا جن
سے حضرت والد صاحب رحؒ کے ساتھ ان کے خصوصی تعلق پر روشنی پڑتی ہے۔ امید ہے کہ وہ واقعات
ناظرین کے لئے دلچسپ بھی ہوں گے اور موجب بصیرت بھی۔

حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب قدس سرہٗ

حضرت والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ کو جن بزرگوں سے خصوصی تعلق رہا۔ ان میں حضرت شیخ الہندؒ
کا اسم گرامی سرفہرست ہے۔ دیوبند اور تھانہ بھون کے سفرنامے میں حضرت والد صاحبؒ نے
حضرت شیخ الہندؒ کے ساتھ اپنے تعلق کا تذکرہ ان الفاظ میں فرمایا ہے۔

"احقر نے حضرت (شیخ الہندؒ) کا زمانہ پایا مگر ضابطے کا تلمذ اس لئے نہیں ہو سکا
کہ میں اس وقت متوسط کتابیں پڑھتا تھا۔ مگر حضرت قدس سرہ کے ساتھ قلبی عظمت
ومحبت مجھے اکثر ان کے درس بخاری میں لے جایا کرتی تھی۔ قید مالٹا سے
پہلے دو سال تک رمضان المبارک میں حضرت ممدوح کے ساتھ رات بھر کی تراویح
میں شرکت کا شرف حق تعالیٰ نے عطا فرمایا۔ مالٹا سے واپسی کے بعد حضرت رحؒ ہی سے
بیعت سلوک کا شرف حاصل ہوا جب کہ احقر دارالعلوم میں ابتدائی مدرس کی حیثیت
سے خدمت تعلیم میں مشغول تھا۔ مزار مبارک کی حاضری کے وقت حضرت قدس سرہٗ کی
شفقتوں اور عنایتوں کا ایک وسیع میدان سامنے آگیا"

(نقوش وتاثرات ص۳)

ضابطے کا تلمذ اگرچہ حاصل نہ ہو سکا۔ لیکن اول تو جب بھی موقع ملا آپؒ حضرتؒ کے درس
بخاری میں جا بیٹھتے، اور یہ جا بیٹھنا محض رسمی عقیدت کا اظہار ہی نہ تھا بلکہ آپ کو حضرت شیخ الہندؒ
کے درس بخاری کی بہت سی باتیں اسی وقت سے یاد تھیں جو اکثر اپنے شاگردوں اور خدام کے
سامنے بیان فرمایا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ عصر کے بعد جب دوسرے طلباء اپنے اپنے
درس سے فارغ ہو کر کھیل کود یا تفریح کا اہتمام کرتے تھے آپ حضرت شیخ الہند رحؒ کی مجلس

کارخ کرتے اور روزانہ مغرب تک اس بابرکت مجلس سے فیض یاب ہوتے تھے۔
نیز جنگِ بلقان اور طرابلس کے موقع پر حضرت شیخ الہند رحمہ کے ایما سے دارالعلوم دیوبند کی طویل چھٹی کی گئی۔ اور اساتذہ وطلبہ اس جنگ کے لئے چندہ جمع کرنے میں مشغول ہو گئے۔ اس موقع پر حضرت شیخ الہند رحمہ کے زیر ہدایت حضرت والد صاحب رحمہ نے بھی گاؤں گاؤں پھر کر چندہ جمع کیا۔ حضرت شیخ الہند رحمہ کے ان دروس اور مجلسوں میں حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے جو باتیں سنیں وہ موقع بموقع سناتے رہتے تھے۔ ان باتوں میں سے چند احقر کو اس وقت بھی یاد آگئیں۔

وضو کا بچا ہوا پانی

۱: حدیث کی تقریباً تمام کتابوں میں مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم وضو سے فارغ ہونے کے بعد وضو کا بچا ہوا پانی نوش فرمالیتے تھے۔ نیز یہ بھی روایت ہے کہ آپ وضو کے بعد اپنے تہبند کے رومال پر پانی کے چھینٹے دے لیتے تھے۔ علمائے حدیث نے ان دونوں سنتوں کی حکمت بیان کرتے ہوئے مختلف توجیہات ذکر فرمائی ہیں۔ لیکن حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ ان روایات کی جو توجیہہ انھوں نے حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ سے سنی ہے وہ ذوقی اعتبار سے سب سے زیادہ لطیف ہے۔ اس توجیہہ کا خلاصہ یہ ہے کہ وضو، اعضاء ظاہری کی طہارت و نظافت حاصل کرنے کا ایک عمل ہے اور جس طرح طہارت ظاہری مطلوب ہے اسی طرح بلکہ اس سے زیادہ اہمیت کے ساتھ باطن کی صفائی اور طہارت بھی مطلوب ہے۔ چنانچہ وضو سے فراغت کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دو عمل مسنون قرار دیئے جن سے طہارت باطنی کی طرف اشارہ مقصود ہے اور ان دو اعمال سے طہارتِ باطنی کا تعلق یہ ہے کہ تمام باطنی رذائل اور معصیتوں کا سرچشمہ انسان کے دو اعضاء ہیں۔ ایک منہ یا زبان اور دوسرے شرمگاہ۔ جیسا کہ ایک حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ:

من یضمن لی مابین لحییہ وما بین رجلیہ أضمن لہ الجنۃ

جو شخص میرے سامنے اپنی دو چیزوں (کو معصیت سے محفوظ رکھنے) کی ضمانت دے دے میں اس کے لئے جنت کی ضمانت دیتا ہوں۔ ایک وہ چیز جو

اس کے جبڑوں کے درمیان ہے (یعنی زبان) اور دوسرے وہ چیز جو اس
کی ٹانگوں کے درمیان ہے۔ (یعنی شرمگاہ)۔
چنانچہ وضو کے بعد بچا ہوا پانی پی کر اور زیر جامہ چھینٹے مار کر معصیت کے ان ہی سرچشم
کی طہارت کی طرف متوجہ کرنا مقصود ہے۔

یوم الشک کا روزہ ۲ : ۲۹ شعبان کو اگر چاند نظر نہ آئے تو ۳۰ شعبان کا دن فقہا
کی اصطلاح میں "یوم الشک" کہلاتا ہے۔ فقہاء حنفیہؒ کا مسلک یہ
کہ "یوم الشک" میں روزہ رکھنا عوام کے لئے مکروہ ہے البتہ وہ خواص اہل علم جو محض نفل
کی نیت سے روزہ رکھیں اور ان کے دل میں احتیاط رمضان کا شبہ نہ ہو ان کے لئے یوم الشک
کا روزہ رکھنے کی بھی اجازت ہے۔ حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے واقعہ سنایا کہ ایک مرتبہ
یوم الشک تھا اور اس میں حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ باہر مجلس میں تشریف لائے تو آپ
پان کھایا ہوا تھا۔ حاضرین میں سے کسی نے پوچھا کہ "حضرت! آج یوم الشک ہے اور اس
میں خواص کو تو روزہ رکھنے میں کچھ حرج نہیں" حضرت شیخ الہندؒ نے جواب میں اول تو فرما
کہ "ہاں! یہ حکم خواص کے لئے ہے لیکن ہم خواص کے شمار میں کہاں ہیں"؛ اور پھر تھوڑی
دیر میں خود ہی ارشاد فرمایا کہ "حدیث کے الفاظ فقد عصی أبا القاسم صلی اللہ
علیہ وسلم سے ڈر لگتا ہے"۔ اشارہ اس طرف تھا کہ حدیث میں حضرت عمار بن یاسر
رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ۔

من صام یوم الشک فقد عصی أبا القاسم صلی اللہ علیہ وسلم
جس شخص نے یوم الشک میں روزہ رکھا اس نے ابوالقاسم (آنحضرت صلی اللہ
علیہ وسلم کی نافرمانی کی"

مقصد یہ تھا کہ اگرچہ علمائے حنفیہؒ نے اس حدیث کو عوام کے حق میں قرار دیا ہے
اور خواص کو اس سے مستثنیٰ رکھا ہے لیکن حدیث کے ظاہری الفاظ عام ہیں۔ اور ان کی
مخالفت سے ڈر لگتا ہے۔

حضرت عمرؓ اور شیطان

۳ : فرمایا کہ ایک مرتبہ کسی شخص نے حضرت شیخ الہندؒ سے سوال کیا کہ حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ جس گلی سے حضرت عمرؓ گزرتے ہیں شیطان وہاں سے نہیں گزرتا لیکن یہ بات خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بارے میں مروی نہیں ہے کہ شیطان ان کے راستے سے نہیں گزرتا، تو سوال یہ ہے کہ شیطان حضرت عمرؓ ہی سے کیوں ڈرتا تھا ؛ جب کہ یقیناً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ ان سے افضل تھے ان سے تو بطریق اولیٰ ڈرنا چاہئے تھا ؛

حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ حضرت شیخ الہندؒ کا معمول یہ تھا کہ جب کوئی شخص آپ سے کوئی علمی سوال کرتا تو پہلی بار تو اسے ظریفانہ انداز سے الزامی قسم کا جواب دیتے تھے۔ اس کے بعد تحقیقی جواب دیا کرتے تھے۔ چنانچہ اس سوال کے جواب میں آپ نے پہلے تو یہ فرمایا کہ "یہ شیطان کی حماقت ہے اسی سے پوچھو کہ وہ حضرت عمرؓ سے اتنا کیوں ڈرتا تھا اور حضور اقدسؐ یا صدیق اکبرؓ سے اتنا کیوں نہ ڈرتا تھا"

پھر تحقیقی جواب دیا کہ ، درحقیقت کسی شخص کا افضل ہونا اور چیز ہے اور دلوں پر اس کا رعب ہونا دوسری بات ہے۔ ضروری نہیں کہ جو شخص سب سے زیادہ افضل ہو اس کا رعب بھی دوسرے ہر فرد سے زیادہ ہو۔ واقعہ یہ ہے کہ حضرت عمرؓ پر شان جلال غالب تھی اس لئے دلوں پر ان کا رعب بیٹھا ہوا تھا۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صدیق اکبرؓ پر شان جمال غالب تھی۔ اس لئے اگر کسی شخص کو حضرت عمرؓ سے زیادہ ڈر لگے تو کوئی تعجب کی بات نہیں "

وزن اعمال

۴ : امام بخاریؒ نے اپنی صحیح کا آخری باب اس عنوان سے قائم فرمایا ہے کہ ، " باب ونضع الموازین القسط لیوم القیامۃ وان أعمال بنی آدم توزن " جس کا خلاصہ یہ ہے کہ قیامت میں میزان عدل قائم ہوگی، اور انسانوں کے تمام اعمال کا وزن ہوگا۔ یہاں یہ مشہور کلامی بحث چھڑ گئی ہے کہ اعمال تو اعراض ہیں اور وزن صرف جواہر واجسام کا ہو سکتا ہے اعمال کا وزن کیسے ہوگا ؟ اس کے جواب میں مختلف علماء نے مختلف توجیہات اختیار کی ہیں۔ کسی نے کہا کہ اعمال ناموں کا وزن ہوگا کسی نے کہا کہ

اعمال کی کیفیت جانچنے کو مجازاً وزن سے تعبیر کر دیا گیا ہے۔ اور کسی نے کہا کہ اعمال بشکل جواہر آئیں گے اور انہیں تولا جائے گا۔

حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ بخاری شریف کے ختم کے موقع پر بیان فرمایا کرتے تھے کہ دیوبند میں ہر سال جب حضرت شیخ الہند رحمہ بخاری شریف کا ختم کراتے تو میں اس درس میں شامل ہوا کرتا تھا۔ حضرت اس سوال کے جواب میں جو کچھ فرماتے وہ سب سے زیادہ اطمینان بخش توجیہ تھی۔ حضرت شیخ الہند رحمہ فرماتے کہ یہ سوال پرانے زمانے میں تو کسی درجہ میں قابل اعتناء تھا۔ لیکن ہمارے زمانے میں تو اس سوال کی گنجائش نہیں۔ آج کے دور میں صرف جواہر و اجسام ہی کا نہیں بلکہ اعراض کا بھی وزن کیا جاتا ہے اور ہر چیز کے لئے الگ پیمانے مقرر ہیں۔ مثلاً حرارت کی تھرمامیٹر کے ذریعے پیمائش کی جاتی ہے۔ ہوا میں رطوبت کا تناسب ناپا جاتا ہے۔ لہٰذا اگر انسان اپنی محدود عقل کے ذریعے ان اعراض کی پیمائش کر سکتا ہے تو مالک الملک والملکوت نے اگر اعمال کے وزن کے لئے کوئی مخصوص میزان عدل مقرر فرمادی ہو تو اس میں تعجب اور استبعاد کی کیا بات ہے؟

حدیث مصرّاۃ کی توجیہ

۵: فقہ اور حدیث کے معرکۃ الآراء مسائل میں سے ایک مشہور مسئلہ "شاۃ مصراۃ" کا ہے۔ جس کی تفصیلات سے اہل علم بخوبی واقف ہیں۔ اس لئے یہاں انہیں بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس مسئلے میں حنفیہ کا مسلک بظاہر حدیث سے مطابقت نہیں رکھتا۔ لیکن حدیث میں "شاۃ مصراۃ" کو واپس کرنے کے ساتھ ایک صاع کھجور واپس کرنے کا جو حکم دیا گیا ہے وہ قرآن و حدیث ہی کے بیان کردہ دوسرے اصول سے بظاہر مطابقت نہیں رکھتا۔ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ اس حدیث کی توجیہ میں جو تقریر فرمایا کرتے تھے حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اس کا بھی باربار ذکر فرمایا۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیثیت جہاں شارع اور قاضی کی تھی وہاں آپ کی حیثیت مربی و شیخ اور مرشد و مشیر کی بھی تھی اس حیثیت میں آپ قانونی فیصلوں سے ہٹ کر مسلمانوں کے درمیان صلح بھی فرمادیا کرتے تھے۔ حدیث مصراۃ میں "فلیردھا ولیرد معھا صاعا من تمر" کا حکم

قانونی طور پر نہیں بلکہ اسی حیثیت میں دیا گیا ہے۔

حدیث فہمی کا ایک اصول

۹: حضرت والد صاحب رحمہ اللہ حضرت شیخ الہند رحمہ سے سنا ہوا ایک اور زریں اصول بھی بیان فرماتے تھے۔ جس سے احقر کو بہت سے مسائل میں بہت فائدہ پہنچا۔ اور وہ یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے جو مختلف اعمال منقول ہیں وہ دو قسم کے ہیں۔ بعض اعمال تو ایسے ہیں جن کے بارے میں روایات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے ان کو معمول بنا لیا تھا۔ یا آپ سے وہ اعمال کثرت کے ساتھ ثابت ہیں۔ یا آپ نے ان کو کرنے کا حکم دیا ہے۔ لیکن بعض اعمال ایسے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اکّا دکّا مواقع پر ثابت تو ہیں لیکن ان کو معمول بنالینا یا ان کا التزام کرنا یا دوسروں کو ان کی ترغیب دینا ثابت نہیں ہے۔ ان قسموں میں سے ہر ایک کو اپنے مقام پر رکھنا چاہئے۔ پہلی قسم کے اعمال کی پابندی کا اہتمام درست اور موافق سنت ہے۔ لیکن دوسری قسم کے اعمال کو ان کے مقام پر رکھنے کا تقاضا یہ ہے کہ ان کو اسی طرح کبھی کبھار کر لیا جائے جیسا آپ نے کیا۔ لیکن ان کا مستقل معمول بنالینا مطلوب نہیں۔

حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی مثال یہ بیان فرمائی کہ رکوع سے اٹھتے وقت ربنا لک الحمد کہنا آپ سے مروی اور مسنون ہے۔ لیکن حدیث میں آتا ہے کہ ایک مرتبہ آپ امامت فرما رہے تھے جب آپ نے رکوع سے اٹھتے وقت سَمِعَ اللّٰہُ لِمَن حَمِدَہٗ فرمایا تو کسی صحابی رض نے قدرے بلند آواز سے کہا: ربنا لک الحمد حمدا کثیرا طیبا مبارکا فیہ مبارکا علیہ کما یحب ربنا ویرضیٰ" نماز ختم ہونے کے بعد آپ نے پوچھا کہ یہ کلمہ کس نے کہا تھا؟ اور جب وہ صحابی رض حاضر ہوئے تو آپ نے فرمایا کہ تمہارا یہ کلمہ فرشتوں کو اس قدر پسند آیا کہ اس کو آسمان پر لے جانے کے لئے ستر سے زیادہ فرشتے لپکے تھے"

حضرت شیخ الہند رح فرماتے ہیں کہ اگرچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کلمے کی اتنی فضیلت بیان فرمائی لیکن روایات میں یہ کہیں مروی نہیں ہے کہ اس کے بعد آپ نے یا دوسرے صحابۂ کرام علیہم الرضوان نے ربنا لک الحمد کے ساتھ ان کلمات کے اضافے کو معمول بنا

لیا ہو۔ اس سے معلوم ہوا کہ آپ کا مقصد اس کلمے کی نفس فضیلت بیان فرمانا تھا۔ یہ مقصد نہ تھا کہ نماز میں اس کلمے کا التزام کیا جائے۔ البتہ چونکہ آپ نے ان صحابی رض کو اس عمل پر نکیر بھی نہیں فرمائی۔ اس لئے اگر کوئی شخص کبھی کبھار یہ کلمہ کہہ لے تو جائز ہے۔ لیکن اس واقعے کی بنا پر اس کلمے کو نماز کا مستقل جزء بنا لینا درست نہیں۔

حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ حضرت شیخ الہند رہ کے بیان فرمودہ اس اصول کو اور بھی متعدد مقامات پر منطبق فرمایا کرتے تھے۔ مثلاً شب برأت کے موقع پر حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی مشہور حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا بقیع تشریف لے جاکر مُردوں کے حق میں دعا کرنا ثابت ہے۔ اس حدیث کی بنیاد پر عام طور سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ شب برأت میں قبرستان جانا مسنون ہے۔ لیکن اس بارے میں حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا مذاق یہ تھا کہ شب برأت میں قبرستان جانے کا التزام سنت نہیں۔ (اگر چہ جائز ہے، البتہ کبھی کبھار چلے جانا سنت ہے۔ وجہ یہی ہے کہ پورے ذخیرۂ حدیث میں صرف ایک موقع پر آپ کا قبرستان جانا ثابت ہے۔ یہ ثابت نہیں کہ آپ نے اس کو مستقل معمول بنا لیا ہو۔ اسی طرح صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم سے بھی اس کا التزام منقول نہیں۔ اور ہر عمل کو اس کے مقام پر رکھنا چاہیئے۔

اسی طرح حدیث میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دو قبروں پر گزرتے ہوئے فرمایا کہ ان کو عذاب ہو رہا ہے۔ اور پھر ایک ایک شاخ دونوں قبروں پر گاڑ کر فرمایا کہ شاید اللہ تعالیٰ ان شاخوں کے خشک ہونے تک ان کے عذاب میں تخفیف فرما دے "

اس حدیث کے تحت یہ مسئلہ علماء کے درمیان زیر بحث رہا ہے کہ آیا ان شاخوں کے گاڑنے سے عذاب میں تخفیف کی امید آپ کے ساتھ مخصوص تھی یا دوسرے بھی ایسا کر سکتے ہیں ؟

اس بارے میں ایک مرتبہ احقر نے حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے سوال کیا تو آپ نے یہی جواب دیا کہ یہ پورے ذخیرۂ حدیث میں ایک ہی واقعہ ہے۔ اس کے بعد یا اس سے پہلے نہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ عمل منقول ہے۔ نہ صحابۂ کرام رض سے مروی

ہے۔ کہ وہ اس کا اہتمام کرتے ہوں۔ اگر یہ کوئی دائمی حکم ہوتا تو صحابۂ کرام ہر مسلمان کی قبر پر شاخ گاڑنے کا التزام فرماتے۔ لیکن اس قسم کے اکا دکا واقعات کے سوا اس قسم کا کوئی عام معمول صحابۂ کرام سے کبھی ثابت نہیں۔ اور جو ایک واقعہ آپ سے ثابت ہے اس میں بھی خصوصیت کا احتمال ہے۔ لہٰذا اس عمل کو معمول بنالینا اور اسے تخفیف عذاب میں دائماً مؤثر سمجھنا درست نہیں۔ ہاں اگر کوئی شخص اس کو معمول بنائے بغیر اسی درجے میں اس پر عمل کرے جس درجے میں وہ ثابت ہے۔ یعنی کسی ایک آدھ موقع پر اس نیت سے شاخ گاڑ دے کہ آپ کی اقتداء کی برکت سے شاید اللہ تعالیٰ مُردے کے عذاب میں تخفیف کردے تو وہ بھی قابلِ ملامت نہیں۔

اسبابِ زوالِ امت : حضرت شیخ الہندؒ کا ایک ملفوظ حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ بار بار نقل فرمایا کرتے تھے۔ اور اسے آپ نے اپنی متعدد تحریروں میں بھی نقل کیا ہے۔ وہ میں حضرت والد صاحبؒ ہی کے الفاظ میں نقل کرتا ہوں۔

> "شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن صاحب قدس اللہ سرہ مالٹا کی جیل سے رہائی کے بعد دارالعلوم دیوبند میں تشریف لائے۔ تو علماء کے ایک مجمع کے سامنے آپ نے ایک اہم بات ارشاد فرمائی۔
>
> جو لوگ حضرت رحمۃ اللہ علیہ سے واقف ہیں وہ اس سے بھی بے خبر نہیں ہیں کہ ان کی یہ قید و بند عام سیاسی لیڈروں کی قید نہ تھی۔ جنگ آزادی میں اس درویش کی ساری تحریکات صرف رضائے حق سبحانہٗ وتعالیٰ کے لئے امت کی صلاح و فلاح کے گرد گھومتی تھیں۔ مسافرت اور انتہائی بے کسی کے عالم میں گرفتاری کے وقت جو جملہ ان کی زبان مبارک پر آیا تھا ان کے عزم اور مقصد کا پتہ دیتا ہے۔ " الحمد للہ بمصیبتے گرفتارم نہ بمعصیتے "۔ جیل کی تنہائیوں میں ایک روز بہت مغموم دیکھ کر بعض رفقاء نے کچھ تسلی کے الفاظ کہنا چاہے تو فرمایا۔ " اس تکلیف کا کیا غم ہے جو ایک دن ختم ہو جانے والی ہے

غم اس کا ہے کہ یہ تکلیف ومحنت اللہ تعالیٰ کے نزدیک قبول ہے یا نہیں؟"

مالٹا کی قید سے واپس آنے کے بعد ایک رات بعد عشاء دارالعلوم میں تشریف فرما تھے۔ علماء کا بڑا مجمع سامنے تھا اس وقت فرمایا کہ "ہم نے تو مالٹا کی زندگی میں دو سبق سیکھے ہیں۔" یہ الفاظ سن کر سارا مجمع ہمہ تن گوش ہوگیا کہ اس استاذ العلماء درویش نے اسی سال علماء کو درس دینے کے بعد آخر عمر میں جو سبق سیکھے ہیں وہ کیا ہیں؟ فرمایا کہ :

"میں نے جہاں تک جیل کی تنہائیوں میں اس پر غور کیا کہ پوری دنیا میں مسلمان دینی اور دنیوی ہر حیثیت سے کیوں تباہ ہو رہے ہیں" تو اس کے دو سبب معلوم ہوتے۔ ایک ان کا قرآن کو چھوڑ دینا۔ دوسرے آپس کے اختلافات اور خانہ جنگی، اس لئے میں وہیں سے یہ عزم لے کر آیا ہوں کہ اپنی باقی زندگی اس کام میں صرف کروں۔ کہ قرآن کریم کو لفظاً اور معناً عام کیا جائے۔ بچوں کے لئے لفظی تعلیم کے مکاتب بستی بستی قائم کئے جائیں۔ بڑوں کو عوامی درس کی صورت میں اس کے معانی سے روشناس کرایا جائے۔ اور قرآنی تعلیم پر عمل کے لئے آمادہ کیا جائے۔ اور مسلمانوں کے باہمی جنگ وجدال کو کسی قیمت پر برداشت نہ کیا جائے۔"

حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ آگے تحریر فرماتے ہیں :

"نباض امت نے ملت مرحومہ کے مرض کی جو تشخیص اور تجویز فرمائی تھی، باقی ایام زندگی میں ضعف وعلالت اور ہجوم مشاغل کے باوجود اس کے لئے سعی پیہم فرمائی بذات خود درس قرآن شروع کرایا جس میں تمام علمائے شہر اور حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رہ اور حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی رہ جیسے علماء بھی شریک ہوتے تھے اور عوام بھی۔ اس ناکارہ کو اس درس میں شرکت کا شرف حاصل رہا ہے مگر اس واقعے کے بعد حضرت رہ کی عمر ہی گنتی کے چند ایام تھے۔ ع
آں قدح بشکست وآں ساقی نماند

(وحدت امت ص ۵۰ و ۱۵ مطبوعہ مکتبۃ المیزان لاہور)

قرأت خلف الامام

۸ : فرمایا کہ ایک مرتبہ حضرت شیخ الہند قدس سرہ نے صحیح بخاری کے درس میں قرأت فاتحہ خلف الامام کے مسئلے پر نہایت شرح و بسط سے تقریر فرمائی۔ اور امام ابوحنیفہؒ کے مسلک کے دلائل اس قوت اور وضاحت کے ساتھ بیان فرمائے کہ تمام سامعین نہال ہوگئے۔ درس کے بعد ایک طالب علم نے حضرتؒ سے کہا کہ "حضرت! آج تو آپ نے اس مسئلے پر ایسی مدلل تقریر فرمائی ہے کہ اگر امام شافعیؒ تشریف فرما ہوتے تو شاید اپنے مسلک سے رجوع فرمالیتے"۔

حضرتؒ کو یہ جملہ سن کر غصہ آگیا، آپ نے فرمایا کہ "امام شافعیؒ کو تم کیا سمجھتے ہو؟ اگر امام صاحبؒ زندہ ہوتے تو شاید میرے لئے ان کی تقلید کے سوا چارہ نہ ہوتا"۔

انگریز سے نفرت

۹ : حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ حضرت شیخ الہندؒ کو انگریزوں کے مظالم اور سیہ کاریوں کی بنا پر جس قدر نفرت تھی، شاید کسی اور سے نہ ہو۔ ایک مرتبہ کسی صاحب نے حضرتؒ سے کہا کہ "حضرت! آپ ہمیشہ انگریزوں کی برائیاں ہی بیان فرماتے ہیں آخر ان میں کوئی بات اچھی بھی تو ہوگی"۔

حضرتؒ نے برجستہ ظریفانہ جواب دیا۔ "ہاں ان کے کباب بڑے لذیذ ہوں گے"۔

شوق جہاد

۱۰ : حضرت شیخ الہند قدس سرہ کو اللہ تعالیٰ نے جو جذبۂ جہاد عطا فرمایا تھا۔ اس کے بارے میں حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے بارہا یہ واقعہ آبدیدہ ہو کر بھرائی ہوئی آواز میں سنایا۔ کہ ایک مرتبہ مرض وفات میں حضرتؒ کے خدام میں سے کسی نے آپ کو مغموم دیکھا تو وہ یہ سمجھے کہ زندگی سے مایوسی کی بنا پر پریشان ہیں۔ چنانچہ انہوں نے کچھ تسلی کے الفاظ کہنے شروع کئے۔ اس پر حضرتؒ نے فرمایا۔

"ارے مرنے کا کیا غم ہے؟ غم تو اس بات کا ہے کہ بستر پر مر رہا ہوں، تمنا تو یہ تھی کہ کسی میدان جہاد میں مارا جاتا، سر کہیں ہوتا اور ہاتھ پاؤں کہیں ہوتے"۔

تحریک خلافت کے چند واقعات

۱۱ : حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ اکثر فرمایا کرتے تھے کہ تحریک خلافت میں عوامی

جوش و خروش کے جو مناظر ہم نے دیکھے ہیں وہ بعد میں کسی بھی تحریک میں نظر نہیں آئے حضرت شیخ الہند رح اس تحریک کی روح رواں تھے۔ آپ کی للّٰہیت، اخلاص اور جہد و عمل کی برکت سے یہ تحریک ہندوستان کے کوچے کوچے میں پھیل گئی تھی۔ اور اس تحریک کے علمبردار اگرچہ مسلمان ہی تھے لیکن انگریز کے مظالم سے تنگ آئے ہوئے ہندو بھی اس میں مسلمانوں کے پیچھے پیچھے لگ گئے تھے۔ اور چونکہ تحریک میں غالب عنصر چونکہ مسلمانوں ہی کا تھا اس لئے حضرت شیخ الہند قدس سرہٗ نے ہندوؤں کے ساتھ اس اشتراک عمل کو گوارا فرمالیا۔ لیکن حضرت کو ہر آن یہ فکر دامنگیر رہتی تھی کہ ہندوؤں کے ساتھ یہ اشتراک عمل کہیں مسلمانوں کے اپنے طرز زندگی اور اسلامی شعائر پر اثر انداز نہ ہو۔ اسی دوران کسی جگہ مسلمانوں اور ہندوؤں کے مشترک اجتماع میں یہ تجویز منظور کی گئی کہ مسلمان ہندوؤں کے ساتھ خیر سگالی کے اظہار کے طور پر اس عید الاضحٰی کے موقع پر گائے کی قربانی نہیں کریں گے۔ حضرت شیخ الہند قدس سرہٗ کو یہ خبر پہنچی تو آپ بے چین ہو گئے۔ اور اس تجویز کی زبانی مخالفت ہی نہیں فرمائی بلکہ عمل سے اس کی کھلم کھلا تردید کی، اور وہ اس طرح کہ حضرت رح عام حالات میں بکرے کی قربانی کیا کرتے تھے لیکن اس سال آپ نے گائے منگوانے کا اہتمام کیا۔ اور برسرعام گائے کی قربانی کی۔

تحریک خلافت کے معاملے میں حضرت شیخ الہند قدس سرہٗ اور آپ کے مایۂ ناز شاگرد حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے درمیان رائے کا جو اختلاف تھا وہ معروف و مشہور ہے۔ حضرت تھانوی رح اس قسم کی تحریکات کو چونکہ مسلمانوں کے لئے مفید نہ سمجھتے تھے اس لئے اس سے علیحدہ رہے۔ لیکن استاذ و شاگرد دونوں کو اپنے اپنے موقف پر پوری طرح ثابت قدم ہونے کے باوجود اس بات کا پورا یقین تھا کہ یہ رائے کا دیانت دارانہ اختلاف ہے چنانچہ ایک مرتبہ تحریک کے بعض کارکنوں نے تھانہ بھون میں جلسہ کرنے کا ارادہ کیا۔ اور حضرت شیخ الہند رح سے اس کی صدارت کی درخواست کی۔ حضرت والد صاحب رح فرماتے ہیں کہ جب حضرت شیخ الہند رح کے سامنے یہ تجویز ذکر کی گئی تو حضرت رح نے سختی سے انکار کیا۔ اور فرمایا کہ یہ مجھ سے نہیں ہو سکتا۔ اگر میں تھانہ بھون میں جلسہ کروں گا تو مولوی اشرف علی

کے لئے بڑی تکلیف کا سامان ہوگا۔ ان کو یہ بھی گوارا نہ ہوگا کہ میں تھانہ بھون میں کوئی خطاب کروں اور وہ اس میں موجود نہ ہوں۔ اور اگر شرکت کریں گے تو یہ ان کے دیانتدارانہ موقف کے خلاف ہوگا۔ اس لئے یہ کام نہیں کروں گا۔"

چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ حضرت رہ تحریک کے سلسلے میں ہندوستان کے مختلف خطوں میں تشریف لے گئے۔ لیکن تھانہ بھون میں جلسہ نہیں کیا۔

للٰہیت کا بے مثال واقعہ

۱۲ : حضرت والد صاحب رہ نے فرمایا کہ حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رہ جب کانپور میں مدرس تھے انہوں نے مدرسہ کے جلسہ کے موقع پر اپنے استاذ حضرت شیخ الہند رہ کو بھی مدعو کیا۔ کانپور میں بعض اہل علم معقولات کی مہارت میں معروف تھے اور کچھ بدعات کی طرف بھی مائل تھے۔ ادھر علمائے دیوبند کی توجہ چونکہ خالص دینی علوم کی طرف رہتی تھی اس لئے یہ حضرات یوں سمجھتے تھے کہ علمائے دیوبند کو معقولات میں کوئی درک نہیں حضرت تھانوی رہ اس وقت نوجوان تھے اور ان کے دل میں حضرت شیخ الہند رہ کو مدعو کرنے کا ایک داعیہ یہ بھی تھا کہ یہاں حضرت رہ کی تقریر ہوگی تو کانپور کے علما رکو پتہ چلے گا کہ علماء دیوبند کا علمی مقام کیا ہے؟ اور وہ منقولات و معقولات دونوں میں کیسی کامل دستگاہ رکھتے ہیں چنانچہ جلسہ منعقد ہوا اور حضرت شیخ الہند رہ کی تقریر شروع ہوئی۔ حسن اتفاق سے تقریر کے دوران کوئی معقولی مسئلہ زیر بحث آگیا۔ اس وقت تک وہ علماء جن کو حضرت تھانوی رہ حضرت شیخ الہند رہ کی تقریر سنانا چاہتے تھے جلسہ میں نہیں آئے تھے۔ جب حضرت رہ کی تقریر شباب پر پہنچی اور معقولی مسئلہ کا انتہائی فاضلانہ بیان ہونے لگا تو وہ علماء تشریف لائے جن کا حضرت تھانوی رہ کو انتظار تھا۔ حضرت تھانوی رہ اس موقع پر بہت مسرور ہوئے کہ اب ان حضرات کو حضرت شیخ الہند رہ کے علمی مقام کا اندازہ ہوگا لیکن ہوا یہ کہ جونہی حضرت شیخ الہند رہ نے ان علماء کو دیکھا تقریر کو مختصر کر کے فوراً ختم کر دیا اور بیٹھ گئے۔ حضرت مولانا فخر الحسن صاحب گنگوہی رہ موجود تھے انہوں نے یہ دیکھا تو تعجب سے پوچھا کہ۔

"حضرت! اب تو تقریر کا اصل وقت آیا تھا آپ بیٹھ کیوں گئے؟" شیخ الہند رہ

نے جواب دیا۔ "ہاں! دراصل یہی خیال مجھے بھی آگیا تھا"۔
مطلب یہی تھا کہ اب تک تو تقریر نیک نیتی سے خالص اللہ تعالیٰ کے لئے ہو رہی تھی لیکن یہ خیال آنے کے بعد اپنا علم جتانے کے لئے ہوتی۔ اس لئے اسے روک دیا۔

تواضع کی انتہا

۱۱۴ مدرسہ معینیہ اجمیر کے معروف عالم حضرت مولانا معین الدین صاحبؒ معقولات کے مسلّم عالم تھے۔ انہوں نے شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن صاحب قدس سرہٗ کی شہرت سن رکھی تھی۔ ملاقات کا اشتیاق پیدا ہوا تو ایک مرتبہ دیوبند تشریف لائے اور حضرت شیخ الہندؒ کے مکان پر پہنچ گئے۔ گرمی کا موسم تھا وہاں ایک صاحب سے ملاقات ہوئی جو صرف بنیان اور تہبند پہنے ہوئے تھے۔ مولانا معین الدین صاحبؒ نے ان سے اپنا تعارف کرایا اور کہا کہ "مجھے حضرت مولانا محمود الحسن صاحب سے ملنا ہے"۔ وہ صاحب بڑے تپاک سے مولانا اجمیری صاحبؒ کو اندر لے گئے۔ آرام سے بٹھایا اور کہا کہ "ابھی ملاقات ہو جاتی ہے"۔
مولانا اجمیریؒ منتظر رہے اتنے میں وہ شربت لے آئے اور مولانا کو پلایا۔ اس کے بعد مولانا اجمیریؒ نے کہا کہ "حضرت مولانا محمود الحسن صاحب کو اطلاع دیجئے"۔ ان صاحب نے فرمایا "آپ بے فکر رہیں اور آرام سے تشریف رکھیں"۔ تھوڑی دیر بعد وہ صاحب کھانا لے آئے اور کھانے پر اصرار کیا۔ مولانا اجمیریؒ نے کہا کہ "میں مولانا محمود الحسن صاحب سے ملنے آیا ہوں آپ انہیں اطلاع کر دیجئے"۔ ان صاحب نے فرمایا۔ "انہیں اطلاع ہو گئی ہے آپ کھانا تناول فرمائیں ابھی ملاقات ہو جاتی ہے"۔ مولانا اجمیریؒ نے کھانا کھا لیا تو ان صاحب نے انہیں پنکھا جھلنا شروع کر دیا۔ جب دیر گزر گئی تو مولانا اجمیریؒ برہم ہو گئے اور فرمایا "آپ میرا وقت ضائع کر رہے ہیں میں مولانا سے ملنے آیا تھا اور اتنی دیر ہو چکی ہے ابھی تک آپ نے ان سے ملاقات نہیں کرائی"۔ اس پر وہ صاحب بولے کہ۔
"دراصل بات یہ ہے کہ یہاں مولانا تو کوئی نہیں البتہ محمود خاکسار ہی کا نام ہے"۔
مولانا معین الدین صاحبؒ یہ سن کر ہکا بکا رہ گئے۔ اور پتہ چل گیا کہ حضرت شیخ الہندؒ کیا چیز ہیں۔

چھوٹوں کی رعایت

۱۴ : حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب مدظلہم مہتمم دارالعلوم دیوبند کے خسر محترم جناب مولانا محمود صاحب رامپوری۔ رام پور کے ایسے خاندان سے تعلق رکھتے تھے جو اپنے دینی شغف اور دنیوی وجاہت وریاست دونوں کے اعتبار سے ممتاز تھے اور تمام اکابر دیوبند سے ان کے تعلقات تھے۔ جب یہ تعلیم حاصل کرنے دیوبند آئے تو ان کا قیام دیوبند کی ایک چھوٹی سی مسجد کے حجرے میں ہوا۔ جو "چھوٹی مسجد" کے نام سے معروف تھی۔ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ دارالعلوم سے آتے جاتے ادھر ہی سے گزرا کرتے تھے۔ ایک روز وہاں سے گزرتے ہوئے دیکھا کہ وہاں مولانا محمود صاحب رام پوری کھڑے ہیں۔ حضرت شیخ الہند رہ کو ان کے دیوبند آنے کا حال معلوم نہ تھا۔ اس لئے ان سے پوچھا کیسے آئے؟

انہوں نے تفصیل بیان کی اور بتایا کہ اسی مسجد کے حجرے میں مقیم ہوں۔ حضرت حجرے کے اندر تشریف لے گئے۔ اور ان کے رہنے کی جگہ دیکھی۔ وہاں ان کے سونے کے لئے ایک بستر فرش ہی پر بچھا ہوا تھا۔ اس وقت تو حضرت یہ دیکھ کر تشریف لے آئے۔ لیکن یہ خیال رہا کہ مولانا محمود صاحب رام پور کے رئیس زادے ہیں۔ انہیں زمین پر سونے کی عادت نہیں ہوگی اور یہاں تکلیف اٹھاتے ہوں گے۔ چنانچہ گھر جاکر ایک چارپائی خود اٹھائی اور اسے لے کر چھوٹی مسجد کی طرف چلے۔ وہاں سے فاصلہ کافی تھا لیکن حضرت اسی حالت میں گلیوں اور بازاروں سے گزرتے ہوئے چھوٹی مسجد پہنچ گئے۔ اس وقت مولانا محمود صاحب مسجد سے نکل رہے تھے یہاں پہنچ کر حضرت شیخ الہند رہ کو خیال آیا کہ یہ مجھے چارپائی اٹھائے ہوئے دیکھیں گے تو انہیں ندامت ہوگی کہ میری خاطر شیخ الہند رہ نے اتنی تکلیف اٹھائی۔ چنانچہ انہیں دیکھتے ہی چارپائی نیچے رکھ دی اور فرمایا۔

"لو میاں یہ اپنی چارپائی خود اندر لے جاؤ میں بھی شیخ زادہ ہوں کسی کا نوکر نہیں"

مخالفین کے بارے میں احتیاط

۱۵ : احقر نے اپنے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے سنا ہے کہ حضرت شیخ الہند کے متعلقین میں سے کسی صاحب نے اہل بدعت کی تردید میں ایک رسالہ لکھا تھا۔ اہل بدعت

نے اس کا جور دکھا ۔ اس میں انہیں کا فر قرار دیا ۔ اس عمل کے جواب میں ان صاحب نے دو شعر کہے ؎

مرا کافر اگر گفتی غمے نیست — چراغ کذب را نبود فروغے
مسلمانت بخوانم در جوابش — دروغے را جزا باشد دروغے

انہوں نے حضرت شیخ الہندرہ کو یہ شعر سنائے تو آپ نے شعر کی لطافت کی تو تعریف فرمائی لیکن ساتھ ہی ارشاد ہوا کہ : تم نے ان کو لطافت کے ساتھ ہی سہی کافر تو کہہ دیا حالانکہ فتوے کی رو سے وہ کافر نہیں ہیں اس لئے ان اشعار میں اس طرح ترمیم کر لو ؎

مرا کافر اگر گفتی غمے نیست — چراغ کذب را نبود فروغے
مسلمانت بخوانم در جوابش — دہم شکر بجائے تلخ دوغے
اگر تو مومنی فبہا و الّا — دروغے را جزا باشد دروغے

معاصرین کا ادب

۱۷ : حضرت والد صاحب رہ نے ہی یہ واقعہ بھی سنایا تھا کہ دیوبند میں کسی صاحب کے یہاں شادی کی کوئی بڑی تقریب ہوئی جس میں دارالعلوم کے اساتذہ کو بھی مدعو کیا گیا ۔ حضرت شیخ الہندرہ بھی تشریف لے گئے اور دارالعلوم کے مہتمم حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ بھی ۔ حضرت شیخ الہندرہ حسب معمول عام آدمیوں کی صف میں سے جلے بیٹھے تھے ۔ اتفاق سے اس تقریب میں کچھ منکرات سامنے آئے ۔ دارالعلوم کے بعض اساتذہ نے آکر حضرت شیخ الہندرہ سے عرض کیا کہ "حضرت ! آپ صاحب خانہ کو سمجھا ئیں کہ وہ ان منکرات سے پرہیز کریں ۔"

حضرت شیخ الہندرہ نے بے ساختہ بڑے تعجب سے حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی طرف اشارہ کر کے فرمایا "بھلا اکابر کے ہوتے ہوئے آپ لوگ میرے پاس آئے ہیں ، ان کی موجودگی میں میرا کچھ کہنا بے ادبی ہے ؟"

حضرت والد صاحب رہ نے فرمایا کہ حضرت حافظ محمد احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ حضرت شیخ الہندرہ کے تقریباً معاصر تھے ۔ لیکن حضرت شیخ الہندرہ کو اللہ تعالے نے حقیقی تواضع کا جو مقام بلند عطا فرمایا تھا اس کی بنا پر وہ اپنے مقام سے واقف ہی نہ تھے اور اپنے

معاصرین کو بھی اپنے سے بڑا سمجھتے تھے۔

بڑے مولوی صاحب

۱۷ : حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے بارہا فرمایا کہ ہم نے جس ماحول میں آنکھ کھولی اس میں حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی علمی و عملی عظمت کا سکہ دلوں پر بیٹھا ہوا تھا۔ لیکن اس کے باوجود اس دور میں، لمبے چوڑے تعظیمی القاب کا رواج نہیں تھا۔ "شیخ الہند" کا لقب بھی بعد میں مشہور ہوا۔ اس وقت تو حضرت کو عام طور پر لوگ "بڑے مولوی صاحب" کہتے تھے۔ اور حضرت رحؒ کی سادگی اور تواضع کا عالم یہ تھا کہ وہ اپنے انداز و ادا سے گویا یہ چاہتے تھے کہ انہیں اس نام سے بھی نہ پکارا جائے۔

حضرت والد صاحب رحؒ نے فرمایا کہ میرے والد ماجد (حضرت مولانا محمد یٰسین صاحبؒ) حضرت شیخ الہند رحؒ کے شاگرد تھے۔ لیکن حضرت کو جب کوئی ادنیٰ ضرورت ہوتی تو خود ہمارے گھر پر تشریف لے آتے۔ دروازے پر دستک دیتے۔ اندر سے سوال ہوتا کہ کون ہے؟ تو جواب میں فرماتے کہ "بندہ محمود آیا ہے"۔

مدرسے سے تعلق

۱۸ : حضرت شیخ الہند رحؒ نے دارالعلوم دیوبند کی چٹائیوں پر بیٹھ کر ریشمی رومال کی جو عالمگیر تحریک چلائی وہ معروف و مشہور ہے۔ لیکن اس تحریک کے بارے میں دارالعلوم دیوبند کے اکابر کے درمیان نقطۂ نظر کا تھوڑا سا اختلاف تھا حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت مولانا حبیب الرحمن صاحبؒ رحمۃ اللہ علیہ جو دارالعلوم کے انتظام کے ذمہ دار تھے۔ ان کا ذاتی نقطۂ نظر یہ تھا کہ دارالعلوم ایک ایسی خاموش دینی خدمت انجام دے رہا ہے جس کی اس وقت امتِ مسلمہ کو شدید ضرورت ہے۔ لہٰذا دارالعلوم کے احاطے میں کوئی ایسا اقدام شاید مناسب نہ ہو جس سے امتِ مسلمہ کے اس عظیم دینی مرکز کو کوئی نقصان پہنچنے کا خطرہ ہو۔

دوسری طرف حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ پر جذبۂ جہاد اور آزادئ ہند کی فکر ہر وقت غالب تھی۔ چنانچہ ان اکابر کے درمیان تنہائی میں اس مسئلہ پر بحث و مباحثہ بھی ہوتا تھا۔ حضرت والد صاحب رحؒ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ ان حضرات نے ایک کمرے میں خفیہ مشورہ

طے کیا۔ اور اس وقت کسی کو اندر آنے کی اجازت نہ تھی۔ لیکن میں چونکہ اس وقت کمسن تھا۔ اس لئے نہ جانے کس طرح اندر پہنچ گیا۔ اور میری کمسنی کی وجہ سے کسی نے میرے آنے کو محسوس بھی نہ کیا۔ وہاں میں نے دیکھا ان بزرگوں کے درمیان بڑے زور و شور سے کسی بات پر بحث ہو رہی تھی۔ بچپن کی وجہ سے مجھے یہ تو پوری طرح یاد نہیں رہا کہ باتیں کیا تھیں لیکن اتنا تاثر اسی وقت سے ذہن پر ہے کہ بحث کا موضوع یہ تھا کہ مدرسہ کو کس حد تک آزادی کی کسی تحریک میں شامل کیا جائے۔ کافی دیر بعد یہ بزرگ باہر نکلے۔

نقطۂ نظر کے اس فرق کے باوجود مہتمم صاحبان حضرت شیخ الہند رہ کے ساتھ پورا تعاون کرتے تھے اور حضرت شیخ الہند رہ قدم قدم پر ان کا خیال رکھتے تھے۔ لیکن جب حضرت سفرِ حج پر تشریف لے گئے اور پھر بالآخر مالٹا میں اسیر ہوئے تو بعض بدخواہوں نے اس قسم کی افواہیں اڑا دیں کہ حضرت نے مدرسے سے قطع تعلق کر لیا ہے۔ اور مہتمم صاحبان اور حضرت رہ کے درمیان اختلافات سنگین ہو گئے ہیں۔

مالٹا سے رہائی کے بعد جب حضرت شیخ الہند رہ کو علم ہوا کہ اس قسم کی افواہیں اڑائی گئی ہیں تو حضرت رہ کو نہایت اذیت ہوئی۔ جب آپ دیوبند تشریف لائے تو صرف دارالعلوم دیوبند کے لوگ ہی نہیں، آدھا شہر حضرت رہ کے استقبال کے اسٹیشن پہنچا، چونکہ معمول کے مطابق خیال یہی تھا کہ حضرت سیدھے اپنے گھر تشریف لے جائیں گے۔ اس لئے تمام انتظامات اسی کے مطابق کئے گئے تھے۔ لیکن جب حضرت اسٹیشن پر اترے تو حضرت نے فرمایا کہ "میں گھر نہیں سیدھا مدرسے جاؤں گا اور وہیں پر لوگوں سے ملاقات کروں گا" چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ اور حضرت کے اس عمل سے وہ افواہیں خاک میں مل گئیں۔

کالج کی ملازمت اور دینی خدمات

۱۹ : حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ دارالعلوم دیوبند کے ایک انتہائی ممتاز مدرس جو حضرت شیخ الہند رہ کے شاگرد بھی تھے ان کو کسی کالج کی طرف سے اچھی تنخواہ پر مدرسی کی پیشکش ہوئی۔ انہوں نے حضرت شیخ الہند رہ سے ذکر کیا اور کہا کہ حضرت! ہم یہاں دارالعلوم میں آٹھ آٹھ دس دس گھنٹے پڑھاتے ہیں باقی وقت مطالعہ میں گزر جاتا ہے۔ اور

تصنیف وتالیف یا وعظ وخطابت کے لئے بہت کم وقت ملتا ہے۔ خیال یہ ہے کہ کالج میں تدریس کا وقت بہت کم ہوگا اور باقی فارغ وقت میں تصنیف وتالیف اور دوسری دینی خدمات کا زیادہ موقع ملے گا۔ اس لئے رجحان یہ ہے کہ اس پیشکش کو قبول کرلوں "

حضرت شیخ الہند نے اس رائے کی مخالفت کی اور فرمایا "مولوی صاحب! مجھے امید نہیں ہے کہ وہاں جاکر آپ اتنی دینی خدمات بھی فارغ اوقات میں انجام دے سکیں جتنی یہاں ہوجاتی ہیں "

لیکن یہ بات ان کی سمجھ میں نہ آئی کہ زیادہ فرصت اور فراغت کے باوجود کام زیادہ کیوں نہ ہوسکے گا؟ حضرت کی رائے تو یہ تھی لیکن ان کی شدید خواہش دیکھ کر اجازت دے دی اور وہ کالج میں چلے گئے۔ تقریباً ایک سال بعد چھٹیوں میں وہ دیوبند آئے اور حضرت کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ حضرت نے سلام اور دریافت خیریت کے بعد پوچھا۔

"کیوں مولوی صاحب! اس عرصے میں آپ نے کتنی تصنیف کی؟ کتنے فتوے لکھے؟ کتنے وعظ کہے؟"

یہ سوال سن کر وہ صاحب رو پڑے۔ اور کہا کہ حضرت! حساب وکتاب کے لفظ نظر سے تو آپ کی بات سمجھ میں نہ آئی تھی، لیکن تجربے سے سمجھ میں آگئی۔ واقعہ یہ ہے کہ جتنا کام دارالعلوم میں عدیم الفرصتی کے باوجود ہوجاتا تھا وہاں فرصت کے باوجود اتنا بھی نہ ہوا۔

رڑکی گودام ۲۰: مندرجہ بالا واقعہ سُنا کر حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ حضرت گنگوہی قدس سرہ کا ایک ملفوظ سنایا کرتے تھے۔ فرمایا کہ: اس زمانے میں رڑکی میں کوئی کارخانہ قائم ہوا تھا۔ اس وقت مشینری چونکہ عام نہ ہوئی تھی۔ اس لئے اس کارخانے کی بڑی شہرت تھی اور اسے عام طور سے "رڑکی گودام" کہا جاتا تھا۔ حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک مرتبہ اساتذۂ دارالعلوم سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ:

"ہماری مثال رڑکی گودام کے کل پرزوں کی سی ہے۔ جب تک کوئی پرزہ مشین میں فٹ ہے اس وقت تک وہ کارآمد بھی ہے قیمتی بھی ہے اور مفید بھی۔ لیکن جب مشین سے الگ ہوگیا تو نہ اس کی کوئی قیمت ہے نہ افادیت "

تدریس اور ثواب

۲۱ : حضرت مولانا محمد سہول صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ حضرت شیخ الہند رہ کے ممتاز شاگردوں اور دارالعلوم دیوبند کے ان مقبول اساتذہ میں سے تھے جن کو بیک وقت حدیث اور فقہ دونوں میں اللہ تعالیٰ نے کمال عطا فرمایا تھا۔ حضرت والد صاحب رہ فرماتے تھے کہ ایک مرتبہ انہوں نے حضرت شیخ الہند رہ سے سوال کیا کہ "حضرت ! ہم دینی علوم پڑھاتے ہیں اور ان پر تنخواہ بھی لیتے ہیں تو کیا ایسی تدریس پر کچھ ثواب بھی ملے گا ؟

حضرت شیخ الہند رہ نے فرمایا "مولوی صاحب ! ثواب کی بات کرتے ہو؟ اس تدریس میں جو کچھ کوتاہیاں ہم سے ہوتی ہیں اگر ان پر مواخذہ نہ ہو تو اسی کو غنیمت سمجھو"

حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ یہ واقعہ نقل کرنے کے بعد تشریحاً فرمایا کرتے تھے کہ حضرت رہ کا مقصد یہ نہیں تھا کہ تنخواہ لینے کے بعد ثواب کی کوئی امید نہیں، کیونکہ اگر نیت بخیر ہو تو انشاء اللہ تعالیٰ اس میں بھی ثواب کی امید ہے۔ لیکن یہ اس وقت ہے جب کہ تنخواہ کا حق پورا پورا ادا کیا ہو۔ اور اگر مقررہ وقت سے کم پڑھایا، غیر حاضریاں کیں اور پڑھانے کے لئے جس محنت اور مطالعے کی ضرورت ہے اس میں کوتاہی کی تو تنخواہ کا حلال ہونا بھی مشکوک ہے۔ حضرت شیخ الہند رہ نے اسی کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔

فریضۂ تبلیغ اور عہد حاضر

۲۲ : ایک معروف حدیث میں سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جب چار علامتیں پائی جائیں تو اپنے نفس کی اصلاح کی فکر کرو اور عوام کی اصلاح کی فکر چھوڑ دو۔ اور وہ چار علامتیں یہ ہیں۔

اذا رأیت شحا مطاعا وھوی متبعا و دنیا مؤثرۃ
واعجاب کل ذی رأی برأیہ ۔

جب دیکھو کہ جذبۂ بخل کی اطاعت کی جارہی ہے، خواہشات نفس کی پیروی ہورہی ہے، دنیا کو آخرت پر ترجیح دی جارہی ہے، اور ہر صاحب رائے اپنی رائے پر مگن ہے۔

حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے سُنایا کہ کسی نے حضرت شیخ الہند قدس سرہٗ

سے سوال کیا تھا کہ "حضرت ! ہمارے زمانے میں بظاہر یہ چاروں علامتیں بہ تمام و کمال پائی جارہی ہیں تو کیا اس دور میں فریضۂ تبلیغ ساقط ہوگیا ہے ؟"

حضرت رہ نے جواب دیا "نہیں ! ابھی وہ وقت نہیں آیا "

حضرت والد صاحب رہ حضرت شیخ الہند رہ کا صرف اتنا جواب نقل فرماتے تھے اور اس جواب کی کوئی تفصیل یا اس کی کوئی دلیل نقل نہیں فرماتے تھے۔ غالباً اس وقت حضرت نے ہی کوئی تفصیل بیان نہیں فرمائی۔ البتہ احقر نے حضرت والد صاحب رہ سے پوچھا کہ بظاہر تو چاروں شرطیں موجود ہیں حضرت شیخ الہند رہ کے دور میں نہ ہوں تو ہمارے دور میں، موجود ہیں پھر فریضۂ تبلیغ ساقط نہ ہونے کی کیا وجہ ہے ؟

احقر کے اس سوال کے جواب میں حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے پہلے تو فرمایا کہ "یہ فیصلہ کرنے کے لئے کہ وہ وقت آگیا ہے یا نہیں، درحقیقت ایک مجتہد کی بصیرت کی ضرورت ہے ہم یہ فیصلہ کیسے کریں ! "

اس کے بعد احقر کے اصرار پر حضرت والد صاحب رہ نے اس بارے میں اپنی رائے بیان فرمائی جو ان کے الفاظ میں بالتفصیل تو یاد نہیں رہی البتہ اس کا جو تأثر ذہن پر باقی رہ گیا وہ یہ ہے کہ ان چاروں شرطوں کا خلاصہ اتنا ہے کہ ایسا وقت آجائے جس میں تبلیغ کا کوئی اثر ظاہر نہ ہو، اور عوام کی اصلاح کی فکر میں انسان کو اپنی دینی حالت کے خراب ہو جانے کا خطرہ ہو اور بفضلہ تعالیٰ ابھی حالات اتنے خراب نہیں ہوئے بلکہ اگر خلوص دردمندی اور صحیح طریقے سے تبلیغ کی جائے تو وہ اب بھی مؤثر ہوتی ہے۔ ہمیں جو حالات خراب نظر آرہے ہیں ایسا نہیں ہے کہ وہ تبلیغ کا فریضہ کما حقہ انجام دینے کے باوجود خراب ہوں بلکہ ان کی خرابی کی وجہ ہی یہ ہے کہ ہم نے فریضۂ تبلیغ کو یا تو چھوڑ رکھا ہے یا اس کے صحیح طریقے پر کاربند نہیں رہے۔ اور اگر ہم اپنے اس فریضے کو صحیح طور پر بجا لائیں تو اصلاح حال کی امید ابھی بالکل ختم نہیں ہوئی۔

(۲) حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ

حضرت شیخ الہند قدس سرہٗ کی وفات کے بعد حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ حضرت تھانوی قدس سرہٗ سے بیعت ہوئے۔ اور آپ کو حضرت حکیم الامت رہ سے جس قدر محبت و عقیدت تھی اور جتنا استفادہ آپ نے حضرت رہ سے کیا اس کو الفاظ میں بیان کرنا ممکن نہیں۔ حضرت تھانوی رہ کا اسم گرامی آتے ہی حضرت والد صاحب رہ پر جو عجیب والہیت طاری ہو جاتی تھی وہ اپنی مثال آپ ہی تھی۔ حضرت والد صاحب رہ کے حضرت تھانوی رہ سے تعلق کے واقعات اگر جمع کئے جائیں تو اتنے بے شمار ہیں کہ ان سے بلا مبالغہ ایک پوری کتاب تیار ہو سکتی ہے۔ حضرت سے سنے ہوئے منتخب ملفوظات حضرت والد صاحب نے اپنی کتاب "مجالس حکیم الامت رہ" میں بھی جمع فرما دیئے ہیں۔ نیز "خاتمۃ السوانح" کے آخر میں حضرت والد صاحب رہ ہی نے حضرت تھانوی رہ کے مرض وفات کے کچھ مزید ملفوظات بھی قلم بند فرمائے ہیں۔ اس لئے یہاں زیادہ تفصیل کی ضرورت نہیں۔ البتہ حضرت رہ سے تعلق کے بارے میں چند خاص خاص باتیں قابل ذکر ہیں۔

۱: احقر کے استاذ حضرت مولانا اکبر علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ حضرت والد صاحب کی وفات کے بعد ایک مرتبہ تشریف لائے تو احقر سے فرمایا کہ "آج میں خاص طور پر تمہیں ایک بات بتانے آیا ہوں۔ تاکہ تم کبھی حضرت مفتی صاحب رہ کی سوانح مرتب کرو تو اس کا جز بناسکو۔ اور وہ بات یہ ہے کہ مجھے بحمد اللہ حضرت تھانوی رہ کی مجلسوں میں بکثرت حاضر ہونے کا شرف ملا۔ وہاں حضرت رہ کے بہت سے خلفاء کو بھی دیکھا لیکن اپنے شیخ کے ساتھ والہیت کا جو تعلق میں نے حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رہ میں دیکھا، وہ حضرت مجذوب صاحب رہ کے سوا کسی اور میں نظر نہیں آیا"

احقر مولانا رہ کی اس بات پر چونکا، اور عرض کیا کہ "اب تک تو احقر کے ذہن پر یہ تأثر تھا کہ والہیت کا یہ انداز حضرت رہ کے خلفاء میں حضرت مجذوب صاحب رہ کے علاوہ، حضرت مولانا مفتی محمد حسن صاحب رہ میں سب سے زیادہ تھا"

اس پر مولانا اکبر علی صاحب رہ نے فرمایا کہ " میں جو کچھ عرض کر رہا ہوں وہ اپنے مشاہدے کی بنا پر پورے وثوق اور احتیاط کے ساتھ عرض کر رہا ہوں، اور اگر مبالغہ آمیزی مقصود ہوتی میں حضرت مجذوب صاحب رہ کا استثناء کرتا "

اس کے بعد مولانا رہ نے نقل اتار کر بتایا کہ حضرت مفتی صاحب رہ حضرت تھانوی رہ کی مجلس میں کس طرح بیٹھتے تھے، اور فرمایا کہ حضرت کے بیان کے دوران حضرت مفتی صاحبؒ مسلسل حضرت رہ کو تکتے رہتے تھے اور ان کی ادا ادا سے مشاہدہ ہوتا تھا کہ وہ اس وقت دنیا و مافیہا سے بے خبر ہیں۔ اور جب حضرت رہ کوئی خاص بات ارشاد فرماتے تو بعض اوقات بے خودی کے عالم میں اپنی جگہ سے اچھل اٹھتے تھے۔

حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ حضرت تھانوی رہ کی خدمت میں کس طرح پہنچے ؟ یہ واقعہ خود آپ نے اپنی کتاب " مجالس حکیم الامت رہ " کے آغاز میں تفصیل کے ساتھ بیان فرما دیا ہے اور غالباً اس نمبر کے ہی بعض دوسرے مضامین میں بھی آگیا ہے اس لئے یہاں اس کے اعادے کا ارادہ نہیں۔ البستہ چند ایسی چیزیں مزید ذکر کرنا چاہتا ہوں جن سے حضرت کے ساتھ والد صاحب رہ کے خصوصی تعلق پر روشنی پڑتی ہے۔ ان میں سے بیشتر وہ چند مدیں جملے ہیں جو حضرت حکیم الامت رہ نے والد صاحب رہ کے خطوط کے جواب میں تحریر فرمائے۔

حضرت تھانویؒ کے چند جملے

حضرت والد صاحب رہ نے حضرت تھانوی رہ کے ساتھ اپنی تمام مراسلت ایک رجسٹر میں "اشرف المکاتیب" کے نام سے جمع کر رکھی ہے جس کا کچھ ماہنامہ "البلاغ" میں شائع بھی ہوتا رہا ہے اور باقی تشنۂ طباعت ہے۔ ان خطوط کے چند جملے ذیل میں نقل کرتا ہوں جن سے حضرت والد صاحب رہ پر شیخ کی خصوصی توجہ کا پتہ چلتا ہے۔

ایک مرتبہ حضرت والد صاحب رہ نے تھانہ بھون سے دیوبند پہنچ کر حضرت رہ کو خط لکھا کہ:

یہ ناکارہ خادم حضرت والا سے رخصت ہو کر دیوبند پہنچا، اور پھر انہی ہموم و

مشاغل میں گرفتار ہوگیا جن سے مقامات محبوں کے قیام میں نجات مل کر ایسا
معلوم ہوتا تھا کہ جنت میں ہوں ..... الخ

حضرت رحمہ نے جواباً تحریر فرمایا۔

"اے غائب از نظر بجدا می سپارمت، دل سے دعا میں مشغول ہوں کہ حالت
محمود و موافق ہو۔ والسلام۔ اشرف علی"

۲ : ایک مکتوب میں والد صاحب رحمہ نے حضرت رحمہ کو لکھا۔

حضرت کی دعاو ہمت کی سخت ضرورت ہے، کوئی عمل و قابلیت تو ایسی نہیں
جو جالب عنایات و توجہ ہو، البتہ دعا و عنایت کی طرف احوج الخدام ہوں، اور
ہر کجا رنجے شفا آنجا رود کے مصداق کا متوقع "

حضرت رحمہ نے جواب میں صرف ایک مصرعہ لکھا جس میں شفقت و عنایت اور توجہ والتفات
کی ایک کائنات پوشیدہ ہے۔ فرمایا

"من غم تو می خورم تو غم مخور"

۳ : ۲۹ جمادی الثانیہ ۱۳۵۲ھ کے ایک مکتوب میں والد صاحب رحمہ نے لکھا۔

"زیادہ افسوس اس کا ہے کہ جس راستے میں حضرت رحمہ کے زیر نظر قدم رکھا تھا
اس میں کوئی قدم نہ چل سکا، کچھ تو مشاغل ایسے ہیں کہ فرصت نہیں ملتی، کچھ
ضعف طبیعت اور مزید اس پر غفلت، غرض کچھ کام نہ کبھی ہوا اور نہ ہوتا نظر
آتا ہے، اس لئے ناکارہ غلام زیادہ محتاج دعا و توجہ ہے کہ ایسی حالت
میں یہی سرمایہ نجات نظر آتا ہے"

حضرت رحمہ نے اس کے جواب میں کیسا عجیب جملہ تحریر فرمایا۔

"ان شاء اللہ تعالیٰ حرمان نہ ہوگا، اگر سیر سے قطع نہ ہوگا، اللہ تعالیٰ
طیر سے قطع فرمادیں گے"

اس خط کے بعد والد صاحب رحمہ نے لکھا:۔

"حضرت کا گرامی نامہ باعث ہزاراں مسرت ہوا، درماندہ سیر کے لئے طیر کے

احتمال نے مردہ تن میں روح کا کام کر دیا "

حضرت رہ نے فرمایا ۔

" انشاء اللہ تعالے اس کو عنقریب دیکھ لیا جاوے گا "

۴ : ایک مرتبہ حضرت والد صاحب رہ نے تحریر فرمایا۔

" نماز میں بالخصوص آخر شب میں ایک حظ عجیب ہوتا ہے ، اور کبھی کبھی گریہ طاری ہوتا ہے ۔ جو رکن صلاۃ شروع کرتا ہوں اس کو چھوڑنے کو اس وقت تک دل نہیں چاہتا جب تک بدن تھک نہ جائے ، بالخصوص سجدے میں زیادہ ٹھہرنے کو دل چاہتا ہے " (مکتوب ۲۰ رمضان ۱۳۴۲ھ)

حضرت رہ نے جواب دیا ۔

" یہ تو بعض دفعہ بڑوں کو بھی نصیب نہیں ہوتا اور کیا چاہیئے "

۵ : رمضان ۱۳۴۳ھ میں حضرت والد صاحب رہ نے لکھا ۔

" اگر کبھی کسی وقت خواب غفلت اور غمود فطنت سے نجات ملتی ہے اور اپنی حقیقت پر نظر پڑتی ہے ۔ اور پھر حضرت حق جل وعلا کی عظمت کا تصور ہوتا ہے تو ایک عجیب حیرت کا عالم سامنے آجاتا ہے ۔ اپنے نفس کو محض مجبور پاتا ہوں اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ گویا سمندر کی موجوں میں ایک تنکا ہے جو " دے برد ہر جا کہ خاطر خواہ اوست " کا منظر بنا ہوا ہے ، اپنا کوئی قول وفعل اپنا نظر نہیں آتا ۔ البتہ یہ عجیب تر ہے کہ عین اس حالت میں بھی جبر محض کا عقیدہ نہیں ہوتا ۔ اس انکشاف مجبوریت ومقہوریت کو وجدانی طور پر مسئلہ اختیار کا مزاحم نہیں سمجھتا ، ایک روز غلبہ عظمت وہیبت میں اپنے کو " وہ طبل ہوں پر شکستہ فنا وہ چمن سے دور " کا مصداق پاتا تھا ۔ اور بار بار یہ شعر زبان پر آتا تھا کہ ؎

کیف الوصول الی سعاد و دونها

قلل الجبال و دونهن حیوف!

یہاں تک کہ غلبۂ یاس ہونے لگا۔ مگر الحمدللہ معاً رحمت الٰہیہ کی وسعت سامنے آگئی اور ذہن اس طرف متوجہ ہوگیا کہ اپنی طاقت و قوت سے نہ اس حد تک پہنچا یا ہے اور نہ آگے، اس کی رسائی کی توقع ہے جس رحمت نے یہاں دروازے پر لا ڈالا ہے وہی کسی روز مدد کرے گی تو سب کچھ ہو رہے گا۔

یہ جو کچھ لکھا ہے، اگرچہ سوچ سوچ کر لکھا ہے کہ شاعرانہ تخیل نہ ہو جائے، مگر چونکہ یہ حالت مستمر نہیں، ڈرتا ہوں کہ اس کو اپنا حال کہنا بھی جائز ہے یا نہیں، مگر اتنی بات بہ تکرار محسوس کی ہے کہ جب کبھی حضور قلب نصیب ہوا تو یہی حالت محسوس ہوتی ہے۔"

حضرت رہ نے جواب دیا۔

"الحمد للہ! دریا میں غوص عطا ہوا، یہ اسی کی موجیں ہیں جو زیر و زبر کر رہی ہیں۔ اگر اس میں غرق ہوگئے یونس علیہ السلام کی سنت نصیب ہوئی۔ اور اگر پار ہوگئے موسیٰ علیہ السلام کی سنت نصیب ہوگی، دونوں حالتیں مبارک ہیں، میں تو بہت خوش ہوا اپنے احباب کے لئے انہی حالتوں کے معلوم کرنے کا مشتاق رہتا ہوں۔"

اس سے اگلے مکتوب میں بھی کچھ اسی قسم کے احوال ہیں، ان کے جواب میں حضرت رح نے انتہائی پر کیف جملہ تحریر فرمایا ہے۔

" اول مکتوب سے آخر تک یہی امارات ہیں قطع مسافت کے جس پر وصول مرتب ہے، انشاء اللہ تعالیٰ۔ بجوشید و نوشید و مستی کنید۔"

۲۔ شوال ۸۹ھ کے ایک مکتوب میں حضرت والد صاحب رح نے لکھا۔

" یہ بات جو کبھی دلائل سے سمجھ میں نہیں آتی تھی اب تقریباً بدیہی ہوگئی کہ ہم اور ہمارا عمل کوئی چیز نہیں بلکہ کریشۃ بارض فلاۃ تقلبھا الریاح کیف تشاء۔ گویا بالکل مشاہدہ ہے۔"

حضرت رہ نے جواب دیا۔

" هنیئاً لکم العلم "

۷: ذی الحجہ ۱۳۶۸ھ میں والد صاحب رہ نے لکھا۔

" کل آخر شب میں جو بیدار ہوا، تو ایک خواب دیکھ رہا تھا کہ میں اپنے مکان کی چھت پر ہوں اور وقت بین العشائین کا سا معلوم ہوتا ہے، میں نماز عشاء کے لئے اٹھا تو دیکھتا ہوں کہ ہمارے مکان سے شرقی جانب میں آسمان پر نہایت جلی قلم سنہری حرفوں میں یا اللہ لکھا ہوا ہے۔ اسی کے قریب دو تختیاں سنہری معلق ہیں۔ جن پر کچھ تحریر لکھی ہے مگر وہ پڑھی نہیں جاتی۔ اور کچھ اور کلمات تختیوں سے علیحدہ بھی بخط طغرا مختلف شکلوں میں لکھے ہوئے ہیں۔ میں یہ تماشہ دیکھ ہی رہا تھا کہ ان تختیوں میں سے ایک اپنی جگہ سے علیحدہ ہوئی اور میرے پاس مکان کی چھت پر آکر رکھی گئی۔ میں دوڑ اکر اٹھاؤں، لیکن دل میں یہ یقین ہے کہ اس لوح کا احترام ایسا ہی فرض ہے جیسے قرآن مجید کا۔ اور یہ بھی خیال ہے کہ مجھے اس وقت وضو نہیں، اس لئے ایک رومال سے پکڑ کر میں نے اس سنہری لوح کو اٹھایا اول نظر میں چند کلمات نظر پڑے جن میں اللوح المحفوظ بھی ہیں۔ میں یہ خیال کرتا ہوں کہ یہ دولت تو حق تعالیٰ نے عطا فرما ہی دی ہے۔ میں اس کو اطمینان سے بعد نماز پڑھوں گا تاکہ جماعت عشاء نہ جاتی رہے۔ اس لئے اس لوح کو اپنے نمازکے تخت پر احتیاط سے رکھ کر میں نماز عشاء کو چلا گیا، پھر آنکھ کھل گئی، اگر تعبیر بیان فرما دی جاوے تو قضاء تعجب ہو کر باعث طمانیت ہوگا۔ اور اگر حضرت کے مذاق کے خلاف ہو تو اتباعِ مذاقِ حضرت والا سب سے مقدم ہے "

حضرت رہ نے جواب دیا۔

میرے خیال میں تو یہ قلب ہے جس پر اللہ تعالیٰ کی معرفت و محبت کا نقش ثبت

کر دیا گیا، مبارک ہو "

۸ ، صفر ۱۳۴۵ھ میں والد صاحب رہ نے لکھا۔

ایک رات میں نے دیکھا کہ میں کسی باغ میں ہوں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے کسی جہاد سے واپسی ہوئی ہے۔ اور میں ایک طرف جاکر باغ کے کنارے دم لینے کے لئے بیٹھ گیا ہوں۔ اس عرصے میں سامنے سے ایک شخص پہنچتا ہے جو ارباب مدرسہ بالخصوص مولانا حبیب الرحمٰن صاحب رہ کا بھیجا ہوا ہے۔ کہ چلو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم جو اس میدان میں تشریف فرما ہیں تمہیں طلب فرماتے ہیں، میں فوراً خوش خوش ان کے ساتھ ہولیا۔ سامنے ڈیرے پڑے ہوئے نظر آئے۔ مجھے بتلایا گیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یہیں تشریف فرما ہیں۔ اور راستے ہی میں یہ بھی معلوم ہوا کہ کسی اور جہاد کی تیاری ہے اور مجھے بھی اسی لئے طلب فرمایا گیا ہے ..... الخ

حضرت رہ نے جواباً تحریر فرمایا۔

انشاء اللہ آپ کو دینی خدمات کی توفیق عطا ہوگی اور وہ نافع بھی ہوگی "

اسی خط میں حضرت والد صاحب رہ نے آگے لکھا تھا۔

" دوسرا خواب اس کے چند روز بعد دیکھا۔ کہ حجر اسود مکہ معظمہ سے ہمارے گھر میں کچھ لوگ اپنے سر پر لائے ہیں۔ جب گھر میں پہنچے تو میری اہلیہ آگے بڑھی کہ اس کو لے لے مگر بوجھل ہونے کی وجہ سے ان سے سنبھل نہ سکا اور زمین پر گر گیا۔ میں یہ سارا واقعہ اپنے کوٹھے پر دیکھ رہا تھا۔ رکن کو گرتے ہوئے دیکھ کر دوڑا اور ٹوٹنے کا اندیشہ ہوا مگر جب پاس آیا تو دیکھا کہ بحمد اللہ اس میں کوئی شکست نہیں آئی "

حضرت رہ نے جواب میں لکھا۔

کسی وقت آپ کو ایک گونہ مرکزیت خدمات دینیہ کی عطا ہوگی "

۹ ، حضرت والد صاحب کی عادت تھی کہ زندگی کا کوئی معاملہ جو فی الجملہ اہم ہو اپنے شیخ سے

استصواب اور مشورے کے بغیر نہ کرتے تھے۔ چنانچہ خطوط میں لیسا اوقات اپنے گھریلو معاملات اور مدرسے کے حالات وغیرہ بھی لکھتے رہتے تھے۔ ایک مکتوب میں اسی قسم کے کچھ حالات تحریر فرمائے۔ اور آخر میں لکھا کہ۔

"یہاں تک لکھنے کے بعد خیال آیا کہ افسوس حضرت رہ کے تمام منتسبین حضرت والا کی خدمت میں اپنے اپنے حالات رفیعہ لکھتے ہیں اور تعلیمات سامیہ سے بہرہ اندوز ہوتے ہیں، اور ایک میں نالائق و ناکارہ ہوں کہ حضرت کی خدمت میں بھی عریضہ لکھتا ہوں تو دنیا کے جھگڑے جن میں خود مبتلا ہوں"

حضرت رہ نے اس کے جواب میں جو جملہ لکھا وہ ایک شیخ کامل اپنے صرف ایسے ہی مسترشد کو لکھ سکتا ہے جس کی زندگی کا ہر گوشہ اس کے سامنے الم نشرح ہو۔ اور جسے اپنے مرید کی وسعت ظرف پر پورا اعتماد ہو کہ اس پر اس جملے کا کوئی غلط اثر نہیں ہوگا فرمایا کہ۔

"لیکن دوسرے کی دنیا آپ کا تو دین ہی ہے" (مکتوب ۳۰ ربیع الاول ۱۳۵۲ھ)

۱۰ : اپنے شیخ کے ساتھ مناسبت، محبت اور عقیدت کے تعلق کا یہ عالم تھا کہ ایک خط میں حضرت کو تحریر فرماتے ہیں۔

ایک اور حال یہ ہے کہ ایک مدت سے حضرت والا کی توجہات وعنایات کو ایک شعاع نوری کی شکل میں مشکل اس طرح کا محسوس پاتا ہوں کہ حضرت کی سمت سے نکلتی ہے اور اس نالائق خادم کے قلب پر پہنچتی ہے اور اسی رشتے کی وجہ سے میں کسی شہر میں کسی جگہ ہوں، حضرت کی جائے اقامت کی سمت کو بغیر کسی غور و فکر کے محسوس کرتا ہوں اور ایک ایسا جاذبہ پاتا ہوں جیسے قطب نما کو جانب قطب۔ اور بعض اوقات تو اس کا اس قدر غلبہ ہوتا ہے کہ شام کو جنگل کی طرف نکلتا ہوں تو لوں جی چاہتا ہے کہ تھانہ بھون کی سمت اختیار کروں، تاکہ جس قدر بھی قرب ہو اور بعد کم ہو، غنیمت سمجھوں"

حضرت حکیم الامت رہ نے جواب دیا کہ۔

"یہ مناسبت تامہ کا اثر ہے"

۱۱ ؛ حضرت والدصاحب رحمۃ اللہ علیہ کا تو یہ معمول تھا ہی کہ اپنے ہر قابل ذکر معاملے کا تذکرہ حضرتؒ سے کرتے تھے۔ لیکن حضرتؒ کا معاملہ بھی یہ تھا کہ تصنیف و تالیف اور تبلیغ و فتوے سے لے کر اپنے خانگی امور تک میں حضرت والدصاحبؒ کو شریک رکھتے اور ان سے بے تکلفی کے ساتھ کام لیتے رہتے تھے۔ اور چونکہ حضرت والدصاحبؒ عموماً حضرتؒ کے منشا اور مزاج و مذاق کے مطابق خدمت انجام دیتے تھے۔ اس لئے حضرتؒ بڑے خوش ہو کر دعائیں دیتے تھے۔ ایک ایسے ہی موقع پر جب کہ حضرتؒ کے ذہن پر ایک کام کا تقاضا تھا اور بعض دوسرے حضرات نے اس میں دیر کر دی تھی۔ بالآخر حضرت والدصاحبؒ کو وہ کام تفویض فرمایا۔ اور جب والدصاحب نے اس کے ابتدائی مراحل کی اطلاع دی تو حضرتؒ نے لکھا۔

"میرا امر فطری ہے کہ جو کام آپ کے ہاتھ آ جاتا ہے اس سے سکون ہو جاتا ہے، نہ کہ تکمیل کے یقین کی بنا پر کہ یہ تو غیب ہے، بلکہ تیقن اہتمام کی بنا پر کہ مشاہد ہے۔" (۲ رجب ۱۳۵۱ھ)

۱۲ ؛ ایک مرتبہ ایک فقہی مسئلے میں کافی دن تک خط و کتابت رہی۔ حضرت والدصاحبؒ کو حضرت حکیم الامتؒ کے موقف پر کچھ اشکالات تھے۔ جن میں سوال و جواب کا سلسلہ جاری رہا۔ آخر میں حضرت والدصاحبؒ نے لکھا۔

والا نامہ سامی صادر ہو کر باعث شفاء صدر ہوا۔ الحمد للہ کہ مسئلہ زیر بحث میں بجمیع تفاصیلہا شفاء کلی ہو گئی۔ فللّٰہ المنۃ والشکر۔ (۱۰ رمضان ۴۷ھ)

حضرتؒ نے جواب میں تحریر فرمایا۔

"مشفقی زاد اللہ تعالیٰ کما لاتہم، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ۔
لے وقت تو خوش کہ وقت ما خوش کر دی"

۱۳ ؛ "الحیلۃ الناجزۃ" حضرت تھانوی قدس سرہٗ کی وہ تصنیف ہے جس کی جلد از جلد تکمیل کا حضرتؒ کے ذہن پر بہت تقاضا تھا۔ اور اس کی ابتدائی تسوید کا کام حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ ہی کے سپرد فرمایا تھا۔ جب یہ مسودہ مکمل ہوا تو والدصاحبؒ نے

حضرت رح کو بھیجا اور لکھا کہ۔

آج اس جزو کو تمام کرکے ارسالِ خدمت کرتا ہوں، خدا کرے کہ پسند خاطر عاطر ہو۔ (۱۱ جمادی الثانیہ ۵۱ ھ)

حضرت رح نے جواب دیا۔

بحمداللہ تعالیٰ پسند آیا اور خوب پسند آیا۔ اور تفصیلی مطالعہ کے بعد انشاءاللہ تعالیٰ زیادہ پسند آوے گا۔

اجازتِ بیعت

۱۴۱ حضرت حکیم الامت قدس سرہ نے والد صاحب رح کو اجازتِ بیعت کے لئے جو مکتوب تحریر فرمایا وہ بھی یہاں نقل کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے:

مشفقی مولوی محمد شفیع صاحب مدرس دارالعلوم دیوبند سلمہ اللہ تعالیٰ۔

السلام علیکم۔ بے ساختہ قلب پر وارد ہوا کہ آپ کو مع دوسرے بعض احباب کے بیعت و تلقین کی اجازت دوں۔ پس توکلاً علی اللہ تعالیٰ اس وارد پر عمل کرنے کے لئے آپ کو اطلاع دیتا ہوں کہ اگر کوئی طالبِ حق آپ سے اس کی درخواست کرے تو قبول کرلیں۔ اس سے متعلم کے ساتھ معلم کو بھی نفع ہوتا ہے۔ میں بھی دعا کرتا ہوں اور اپنے خاص محبین پر اس کو ظاہر بھی کردیجئے۔ بنظر احتیاط بیرنگ لفافہ بھیجتا ہوں۔ والسلام

عبدہ اشرف علی از تھانہ بھون۔ ربیع الثانی ۱۳۴۹ھ

اس مکتوب کے پہنچنے پر والد صاحب رح نے حضرت رح کو لکھا۔

والانامۂ گرامی صادر ہوا۔ دیکھ کر حیرت میں رہ گیا کہ ناکارہ و آوارہ شفیع اور بیعت و تلقین کی اجازت؟ ع صلاح کار کجا و من خراب کجا

میں تو واللہ باللہ کسی بزرگ سے بیعت ہونے کا بھی سلیقہ نہیں رکھتا۔ سلوک کے ابتدائی مراحل سے بھی روشناس نہیں، کسی دوسرے کو کیا تلقین کروں گا۔ اور پھر ایسا کون بے وقوف ہوگا جو مجھ سے درخواست بیعت کرے گا؟ بار بار

والا نامے کو دیکھتا اور اپنی سیہ کاری پر نظر کرتا ہوں تو حیرت کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آتا۔ اور یوں معلوم ہوتا ہے کہ مجھ جیسے غفلت شعار سیہ کار کو اتنے بڑے منصب سے نوازنا کہیں اس منصب کی بدنامی کا سبب نہ ہو۔ اس خیال سے یوں جی چاہتا ہے کہ اس کی اشاعت نہ ہو تو اچھا ہے۔

حضرتؒ نے جواباً تحریر فرمایا۔

یہی تو بنا ہے اس اجازت کی کہ آپ اپنے کو ایسا سمجھتے ہیں "

آگے والد صاحب رہ نے لکھا تھا۔

اس والا نامے کے بعد سے ہر قدم پر اپنی ناکارگی کا مزید احساس ہونے لگا"

حضرتؒ نے فرمایا۔

انشاء اللہ تعالے بہت نفع ہوگا "

۱۵ ا حکیم الامت حضرت تھانوی قدس سرہٗ کو حضرت والد صاحب رہ سے جو خصوصی محبت کا تعلق تھا اور آپ کی خداداد صلاحیتوں کی جو قدر دانی حضرت رہ نے فرمائی اس کے چند واقعات بھی ذکر کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی عمر کا بیشتر حصہ دارالعلوم دیوبند کے عالم میں گزارا۔ لیکن ۱۳۶۲ھ میں جب علماتے دیو بند کے درمیان آزادئ ہند کے طریق کار کے مسئلے میں اختلاف رائے پیدا ہوا اور یہ اندیشہ لاحق ہوا کہ اس اختلاف کی وجہ سے یہ مقدس ادارہ متأثر نہ ہو۔ تو حضرت علامہ شبیر احمد صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ بھی دارالعلوم سے مستعفی ہوگئے۔ ان کے علاوہ حضرت مولانا محمد ابراہیم صاحب بلیاوی رہ اور حضرت مولانا ظہور احمد صاحب رہ وغیرہ نے بھی استعفا دیا تھا۔

اور یہ اقدام حضرت تھانوی قدس سرہٗ کے مشورے ہی سے ہوا تھا۔

استعفاء کے بعد حضرت قدس سرہٗ نے حضرت والد صاحب رہ کو پیشکش فرمائی کہ خانقاہ تھانہ بھون آکر حضرت رہ کے زیر ہدایت تصنیف و تالیف کے کام میں مشغول ہو جائیں یہ بات حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی تو عین مراد تھی۔ چنانچہ آپ نے اسے بصد مسرت

وافتخار قبول فرمایا - اس موقع پر جب حضرت والد صاحب رہ تھانہ بھون پہنچے اور حضرت رہ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو حضرت رہ نے والد صاحب رہ کو دیکھتے ہی سلام ودعا کے بعد یہ مصرعہ پڑھا کہ ع

اضاعوۂ وای فتی اضاعوا

لوگ اسے کھو بیٹھے ، اور کیسے جوان کو کھو بیٹھے ؟

۱۷ : ایک واقعہ احقر نے کئی بار حضرت والد صاحب رہ سے سنا اور بعد میں آپ کی ایک بیاض میں بھی لکھا ہوا دیکھا ۔ اسے حضرت والد صاحب رہ کی بیاض سے آپ ہی کے الفاظ میں نقل کرتا ہوں ۔

تقریباً ۱۳۵۰ھ یا ۱۳۵۱ھ کا واقعہ ہے کہ دارالعلوم دیوبند کے چند اکابر جن میں سیدی واستاذی حضرت مولانا سید اصغر حسین صاحب رہ کا ہونا یقین سے یاد ہے ، اور بعض دوسرے حضرات بھی تھے ان کا نام یاد نہیں ، احقر بطور خادم ساتھ تھا ۔ بعض مہمات امور میں مشورہ کے لئے تھانہ بھون حاضر ہوئے ۔ حضرت قدس سرہ نے صبح کو اشراق کے بعد کا وقت مقرر کیا ۔ اور حاضرین خانقاہ علماء کو بھی شریک مشورہ فرمایا جن کے اسماء یاد نہیں ۔

مقررہ وقت پر حضرت قدس سرہ حوض کے کنارے پر اپنے مصلے پر تشریف فرما تھے ۔ دوسرے حضرات کے لئے سامنے ایک چٹائی ڈال دی گئی مجھے وضو وغیرہ میں کچھ دیر لگی ۔ جب سب حضرات کے جمع ہونے کے بعد میں پہنچا تو سامنے کی چٹائی جس پر سب حضرات علماء تھے اس پر جگہ نہ تھی مجھے دیکھ کر حضرت رہ نے اپنے پاس مصلے پر بلایا ۔ میں نے بوجہ ادب کے معذرت چاہی کہ یہیں چٹائی کے قریب بیٹھ جاؤں گا ۔

حضرت رہ نے فرمایا کہ نہیں ! تم یہیں آجاؤ اور گھبراؤ نہیں ، ایک قصہ سناؤں گا ۔ احقر نے تعمیل حکم کی ۔ پھر حضرت رہ نے عالمگیر رہ اور دارا شکوہ کا قصہ سنایا جس میں ان بزرگ نے دونوں شہزادوں کو اپنے پاس تخت پر بلایا

داراشکوہ نے عذر کیا مگر عالمگیرؒ نے تعمیل حکم کی ۔ اور تخت پر بیٹھ گئے
تو ان بزرگ نے فرمایا کہ ہمارے بادشاہ تو داراشکوہ کو چاہتے ہیں مگر
اللہ تعالیٰ عالمگیر ہی کو تخت دینا چاہتے ہیں ۔ پھر ایسا ہی واقعہ ہوا ۔
یہ واقعہ سن کر سب حضرات خصوصاً حضرت میاں صاحب مولانا سید
اصغر حسین صاحبؒ نے مجھے فرمایا کہ فال نیک مبارک ہو "
حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے یہ واقعہ وفات سے تین روز پہلے اتوار کی مجلس
میں بھی بیان فرمایا تھا۔

۱۷ : حضرت والد صاحب رہ سے بارہا سنا کہ ایک مرتبہ حکیم الامت حضرت تھانوی
قدس سرہ نے اپنے خلیفۂ مجاز حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا تذکرہ فرماتے
ہوئے حضرت والد صاحب رہ سے پوچھا کہ ان کے ساتھ آپ کے تعلقات کیسے ہیں ؟
حضرت مولانا وصی اللہ صاحب رہ والد ماجد کے (غالباً کافیہ وغیرہ میں) ہم سبق رہے
تھے۔ چنانچہ والد صاحب رہ نے جواب میں یہ شعر پڑھ دیا کہ ۔

ما و مجنوں ہم سبق بودیم در دیوان عشق
او بصحرا رفت و ما در کوچہ ہا رسوا شدیم

حضرت تھانوی قدس سرہٗ نے جواب میں فرمایا ۔ جی ہاں ! یہ تو قدرت کی تقسیم ہے
کسی کو صحرا دیا جاتا ہے اور کسی کو سہرا دیا جاتا ہے "

۱۸ : برادر مکرم جناب مولانا محب الله صاحب ترمذی راوی ہیں کہ جب حضرت والد
صاحب رہ اور حضرت مولانا مفتی عبد الکریم صاحب گمتھلوی رحمۃ اللہ علیہ نے " الحیلۃ الناجزۃ "
کی تالیف مکمل کر لی تو حضرت تھانوی قدس سرہٗ نے دونوں سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا۔
آپ دونوں میری آنکھیں ہیں ۔ ایک کے نام کے شروع میں عین ہے ،
(یعنی عبد الکریم) اور دوسرے کے نام کے آخر میں عین ہے (یعنی محمد شفیع)۔

۱۹ : احقر نے اپنے مرشد و مربی حضرت قبلہ ڈاکٹر عبد الحی صاحب عارفی مدظلہم سے
بارہا سنا کہ حضرت تھانوی قدس سرہٗ نے آخر عمر میں ایک مرتبہ ارشاد فرمایا کہ " بحمد اللہ !

سے مجھے اطمینان ہے کہ میرے بعد کام کرنے والے باقی رہیں گے اور اس کے بعد کچھ حضرات علماء کے نام لئے جن میں حضرت والد صاحب رہ کا اسم گرامی بھی شامل تھا۔

۳۔ امام العصر حضرت علامہ سید انور شاہ صاحب کشمیری قدس سرہٗ

امام العصر حضرت علامہ سید انور شاہ صاحب کشمیری رحمۃ اللہ علیہ حضرت والد صاحبؒ کے ان اساتذہ میں سے تھے جن کا آپ کی علمی تربیت اور تحقیقی مذاق کی آبیاری میں شاید سب سے زیادہ حصہ ہے۔ والد صاحب نے حضرت شاہ صاحب رہ سے صحیح بخاریؒ اور جامع ترمذی کے علاوہ فلسفۂ جدیدہ اور طب وغیرہ کی کتابیں بھی پڑھی تھیں۔ اور تدریس کے دوران بھی استفادے کا سلسلہ طویل عرصے تک جاری رہا۔ حضرت شاہ صاحبؒ کا نام لیتے ہی والد صاحب رہ کے چہرے پر عجیب قسم کی بشاشت آجاتی تھی۔ اور ان کا تذکرہ بڑی عقیدت ومحبت کے ساتھ فرمایا کرتے تھے۔ حضرت شاہ صاحب رہ کے بارے میں والد صاحب رہ سے سنے ہوئے چند واقعات اس وقت بھی یاد آگئے۔

۱۔ حضرت شاہ صاحب قدس سرہٗ کو اللہ تعالےٰ نے جو غیر معمولی حافظہ اور علوم کا حیرت انگیز استحضار عطا فرمایا تھا وہ محتاج بیان نہیں۔ حضرت والد صاحب فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ دارالعلوم دیوبند میں منطق کی مشہور کتاب " ملاحسن " کا درس میرے سپرد تھا۔ مجھے مطالعے کے دوران اس کے ایک مقام پر اشکال پیدا ہوا۔ اور جب کوئی علمی اشکال پیدا ہوتا تو حضرت شاہ صاحب رہ کی ذات ہماری پناہ گاہ تھی۔ چنانچہ میں ان کے پاس پہنچ گیا۔ حضرت شاہ صاحب رہ اس وقت کتب خانے کی بالائی گیلری میں بیٹھے مطالعے میں مشغول تھے، اوپر ہی سے مجھے آتے ہوئے دیکھا تو سلام کے بعد پوچھا کہ کیسے آنا ہوا؟

میں نے عرض کیا کہ " ملاحسن " کے ایک مقام پر اشکال پیش آگیا ہے وہ حل کرنا تھا۔ خیال تھا کہ جواب میں حضرت شاہ صاحب رہ مجھے اوپر بلالیں گے، لیکن حضرت رہ نے بلانے کے بجائے وہیں بیٹھے بیٹھے فرمایا۔ کون سا مقام ہے، عبارت پڑھئے! میں نے

عبارت پڑھی اور ابھی اپنے اشکال کی وضاحت بھی نہ کی تھی کہ حضرت شاہ صاحبؒ نے وہیں سے فرمایا۔ اچھا تمہیں یہاں یہ اشکال ہوا ہوگا۔ اور پھر اشکال کی تقریر بھی خود ہی فرمائی۔ اور جواب بھی وہیں بیٹھے بیٹھے اس طرح دے دیا کہ مجھے مسئلے میں مکمل اطمینان ہوگیا۔

حضرت والد صاحبؒ یہ حیرت انگیز واقعہ سنا کر فرمایا کرتے تھے کہ اگر کوئی تفسیر حدیث یا فقہ کی کتاب ہوتی تو مجھے اتنا تعجب نہ ہوتا، لیکن حیرت اس بات کی تھی کہ منطق کی اس کتاب کے بارے میں پوچھنے گیا تھا جسے پڑھے پڑھائے ہوئے حضرت شاہ صاحب کو لیتیس سال سال گزر چکے تھے۔ لیکن اس سوال و جواب سے اندازہ ہوا کہ یہ کتاب بھی حافظے میں پوری طرح محفوظ ہے۔

۲ ؛ فرمایا کہ ایک روز صحیح بخاری کے درس میں کسی مسئلے پر بحث کرتے ہوئے، حضرت شاہ صاحب رہ نے فتح القدیر کی ایک طویل عبارت اس طرح زبانی پڑھی جیسے کتاب دیکھ کر پڑھ رہے ہوں۔ جب عبارت ختم ہوئی تو طلبا حضرت رہ کو حیرت سے تک رہے تھے۔ طلبا کو متحیر دیکھا تو حضرت شاہ صاحب رہ نے فرمایا۔

"جانتے ہو! کیا یہ سمجھتے ہو کہ اس عبارت کا رات مطالعہ کر کے آیا ہوں؟ واقعہ یہ ہے کہ آج سے کئی سال پہلے (غالباً) ٹونک کے کتب خانے میں فتح القدیر کا باستیعاب مطالعہ کیا تھا۔ یہ عبارت اس وقت کی یاد ہے۔"

۳ ؛ فرمایا کہ ایک مرتبہ حضرت شاہ صاحب رہ سخت بیمار تھے اور علالت طول پکڑ گئی تھی۔ ایک صبح فجر کے وقت یہ افواہ مشہور ہوگئی کہ حضرت رہ کا وصال ہوگیا۔ خدام پر بجلی سی گرگئی اور نماز فجر کے فوراً بعد ہم سب حضرت رہ کے مکان کی طرف لپکے۔ حضرت علامہ شبیر احمد عثمانیؒ بھی ساتھ تھے۔ گھر پہنچ کر معلوم ہوا کہ بحمد اللہ خبر غلط تھی۔ البتہ تکلیف کی شدت برقرار ہے۔ ہم سب لوگ حضرت کی عیادت کے لئے کمرے میں پہنچے تو دیکھا کہ حضرت رہ نماز کی چوکی پر بیٹھے ہیں۔ سامنے تکیے پر ایک کتاب رکھی ہے۔ اور اندھیرے کی وجہ سے حضرت رہ جھک کر اس کا مطالعہ کر رہے ہیں۔ خدام کو یہ منظر دیکھ کر حیرت کے ساتھ تشویش بھی ہوئی کہ

ایسی علالت میں مطالعے کے لئے اتنی محنت برداشت کرنا مرض میں مزید اضافے کا موجب ہو گا۔ چنانچہ حضرت علامہ شبیر احمد صاحب عثمانی رح نے ہمت کر کے ناز کے ساتھ عرض کیا کہ :

" حضرت ! یہ بات سمجھ میں نہیں آئی کہ اول تو وہ کون سی بحث رہ گئی ہے جو حضرت کے مطالعے میں نہ آچکی ہو۔ اور اگر بالفرض کوئی بحث ایسی ہو تو اس کی فوری ضرورت کیا پیش آگئی ہے کہ اسے چند روز مؤخر نہیں کیا جا سکتا۔ اور اگر بالفرض کوئی فوری ضرورت کا مسئلہ ہے تو ہم خدام کہاں مر گئے ہیں ؟ آپ کسی بھی شخص کو حکم فرما دیتے وہ مسئلہ دیکھ کر عرض کر دیتا، لیکن اس اندھیرے میں ایسے وقت آپ جو محنت اٹھا رہے ہیں وہ ہم خدام کے لئے ناقابل برداشت ہے "

والد صاحب رح فرماتے ہیں کہ اس کے جواب میں حضرت شاہ صاحب رح کچھ دیر تو انتہائی معصومیت اور بے چارگی کے انداز میں مولانا شبیر احمد صاحب رح کی طرف دیکھتے رہے۔ پھر فرمایا۔

"بھائی ٹھیک کہتے ہو، لیکن یہ کتاب بھی تو ایک روگ ہے اس روگ کا کیا کروں ؟"

۴ : فرمایا کہ حضرت شاہ صاحب رح دن رات مطالعے اور علمی مشاغل میں اس درجہ منہمک رہتے تھے کہ دنیا آپ کو چھو کر بھی نہ گزری تھی۔ دنیوی بکھیڑوں میں الجھنا حضرت شاہ صاحب کی استطاعت سے باہر تھا۔ اور دارالعلوم کے اصحاب انتظام اور شاگردوں کو چونکہ اس بات کا علم تھا اس لئے وہ حضرت کے گھریلو کام دھندوں کو خود ہی نمٹانے کی کوشش کیا کرتے تھے۔

والد صاحب رح فرماتے ہیں کہ ایک روز حضرت رح مسجد میں بیٹھے ہوئے تھے کہ کسی شخص نے آکر اطلاع دی کہ "حضرت ! آپ کے کمرے کی چھت گر پڑی ہے " اطلاع دینے والے نے اس انداز سے خبر دی تھی کہ حضرت شاہ صاحب رح اس خبر کو سنتے ہی اچھل پڑیں گے۔ لیکن حضرت رح اطمینان سے بیٹھے رہے۔ پھر انتہائی معصومیت کے ساتھ فرمایا۔

" تو بھائی میں کیا کروں ؟ جا کر کہو مولانا حبیب صاحب (مہتمم دارالعلوم) سے۔"

چنانچہ حضرت مولانا حبیب اللہ صاحب کو اطلاع دی گئی، اور انہوں نے کمرے کی مرمت وغیرہ

گرامی۔

۵ ؛ حضرت والدصاحب رحمۃ اللہ علیہ نے بارہا ذکر فرمایا کہ حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ اپنی مجلس میں کسی کی غیبت کو کسی حال برداشت نہیں فرماتے تھے۔ جب کبھی کوئی شخص کسی دوسرے کا تذکرہ شروع کرتا اور نوبت غیبت کے قریب پہنچنے لگتی تو حضرتؒ ہاتھ اٹھا کر فرماتے "بس! اس کی حاجت نہیں" اور غیبت کا فتنہ وہیں مرجاتا۔

۶ ؛ حضرت والد صاحب رہ اکثر فرماتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت شاہ صاحبؒ کو ہر علم و فن میں کمال عطا فرمایا تھا۔ اور آپ فرمایا کرتے تھے کہ اگر میں چاہوں تو اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے حریری جیسے ادبار کا معارضہ آسانی سے کرسکتا ہوں۔ اور زمخشریؒ اور جرجانیؒ سے بہتر نثر لکھ سکتا ہوں۔ لیکن دو کتابیں ایسی ہیں جن کی نقل اتارنا بھی میرے لئے مشکل ہے۔ ایک ہدایہ، دوسری گلستان"

۷ ؛ حضرت شاہ صاحب رہ فرمایا کرتے تھے کہ دو لنگڑے بزرگوں (زمخشریؒ اور جرجانیؒ) نے علم بلاغت کا ٹھیکہ لے رکھا ہے۔ حالانکہ بلاغت کے بہت سے ابواب ایسے ہیں جن کی طرف ان کی نگاہ بھی نہیں گئی۔

۸ ؛ فرمایا کہ حضرت شاہ صاحب رہ اپنے درس میں صرف علمی تحقیقات بیان فرمانے پر اکتفاء نہیں کرتے تھے بلکہ ساتھ ساتھ طلباء کو اعمال و اخلاق کی اصلاح کی طرف بھی متوجہ فرماتے رہتے تھے۔ اسی طرح ایک روز طلباء سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ۔

"ہمارے اس علم میں دنیا تو کبھی تھی ہی نہیں، ہاں اس کے ذریعے دین ملا کرتا تھا۔ افسوس کہ وہ تم نے نہ لیا۔ خسر الدنیا والآخرۃ"

۹ ؛ فرمایا کہ حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ امام رازی رہ کی تفسیر کبیر کے بارے میں فرمایا کرتے تھے کہ وہ نظم قرآن کے سلسلے میں بھی بہترین تفسیر ہے۔ اس میں شک نہیں کہ امام رازی رہ پر معقولات کا غلبہ تھا۔ اور اسی وجہ سے کہنے والوں نے تفسیر کبیر کے بارے میں یہاں تک کہہ دیا کہ فیہ کل شیء الا التفسیر، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اگر انصاف کے ساتھ ان کی تفسیر کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ انہوں نے نظم قرآن کے سلسلے میں

غیر معمولی تدبر سے کام لیا ہے اور اس کی تحقیق میں خوب محنت کی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ان کی بعض باتوں سے اختلاف ہو، لیکن بحیثیت مجموعی ان کی تفسیر بحیثیت تفسیر بھی خوب ہے اس کے علاوہ وہ بکثرت ایسی صحیح احادیث بھی تفسیر میں لے آتے ہیں جو متداول کتب حدیث میں نہیں ملتیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی نظر حدیث میں بھی وسیع ہے۔

۱۱: حضرت والد صاحب رح نے حضرت شاہ صاحب رح کا یہ مقولہ نقل فرمایا ہے کہ "چاروں فقہی مذاہب حنفی، شافعی، مالکی، اور حنبلی کے برحق ہونے کے یہ معنے ہیں کہ ان میں سے ہر ایک کا اجتہاد ماجور ہے اور معتقدین کے لئے اس کی، تقلید جائز ہے۔ لیکن جہاں تک "حق نفس الامری" کا تعلق ہے وہ واحد ہی ہے لیکن اس واحد کی تعیین کا کوئی راستہ نہیں۔ دنیا میں تو اس کی وجہ ظاہر ہے کہ سلسلۂ نبوت منقطع ہو چکا، البتہ آخرت میں اس بات کا امکان تھا کہ وہاں اس حقیقت کو کھول دیا جائے۔ لیکن حضرت شاہ صاحب رح نے فرمایا کہ میرا خیال یہ ہے کہ اللہ تعالےٰ وہاں بھی اس مسئلے کو نہیں کھولیں گے۔ اس لئے کہ اللہ تعالےٰ کی رحمت سے یہ بات بعید معلوم ہوتی ہے کہ جن فقہائے امتؒ نے اخلاص اور للّٰہیت کے ساتھ اجتہاد کر کے دین کی خدمت کی ان میں سے کسی کی تغلیط فرما کر اللہ تعالےٰ اس کو حشر میں رسوا کرے۔ اس لئے ظاہر یہی ہے کہ اس حق نفس الامری کی تعیین آخرت میں بھی نہیں ہوگی"۔

۱۱: آخر عمر میں حضرت شاہ صاحب رح کو اللہ تعالےٰ نے مرزائیت کی تردید کے لئے گویا چن لیا تھا۔ مرزائیت کے بڑھتے ہوئے فتنے کی فکر ہر وقت آپ کے دل و دماغ پر چھائی ہوئی تھی۔ چنانچہ اس فتنے کی سرکوبی میں اللہ تعالےٰ نے حضرت شاہ صاحب رح سے بہت کام لیا۔ اس کام کے لئے حضرت رح نے اپنے تلامذہ کی ایک جماعت کو اپنے ساتھ لگایا تھا جو تحریر و تقریر کے ذریعے ملک بھر میں رد قادیانیت کی خدمات انجام دے رہی تھی۔ اس جماعت میں حضرت والد صاحب رح حضرت مولانا

بدر عالم صاحب مہاجر مدنی رہ اور حضرت مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلوی رہ وغیرہ بطور خاص قابل ذکر ہیں ۔

حضرت شاہ صاحب رہ اور آپ کے ان تلامذہ نے اس سلسلے میں کیا کارنامے انجام دیئے ؟ اس کی تفصیل آپ کو اسی نمبر میں برادر مکرم جناب مولانا محمد یوسف صاحب لدھیانوی کے مقالے میں ملے گی ۔ یہاں اس سلسلے کے چند واقعات ذکر کرنے ہیں ۔

حضرت والد صاحب رہ نے بارہا سنایا کہ حضرت شاہ صاحب رہ کی مساعی جمیلہ کے نتیجے میں ہر سال قادیان میں مسلمانوں کا ایک جلسہ ہونے لگا تھا ۔ ایک مرتبہ ہم حضرت شاہ صاحب رہ کے ساتھ اس جلسے میں شرکت کے لئے گئے ہوئے تھے ایک روز وہیں نماز فجر کے بعد حضرت رہ کو دیکھا کہ مغموم بیٹھے ہیں ۔ احقر نے مزاج دریافت کیا تو فرمایا کہ "طبیعت تو ٹھیک ہے لیکن آج کل ہر وقت دل و دماغ پر یہ فکر مسلط ہے کہ ہم لوگ اپنے درس اور تقریر و تحریر میں حنفیت کی ترجیح پر زور دینے میں لگے رہے اور قادیانیت اور الحاد و بے دینی کے یہ فتنے کہاں سے کہاں پہنچ گئے ؛ حالانکہ حنفیت اور شافعیت کا اختلاف تو زیادہ سے زیادہ راجح و مرجوح کا اختلاف ہے ۔ جس کا فیصلہ حشر میں بھی نہیں ہوگا ۔ اور ان فتنوں سے دین و ایمان پر ضرب لگ رہی ہے ۔ اس بنا پر مغموم بیٹھا ہوں" [1]

---

[1] حضرت والد صاحب رہ نے یہ واقعہ اپنی ایک تقریر میں ذکر فرمایا تھا ۔ جو "وحدت امت" کے نام سے شائع ہوئی ہے ۔ اس کے صفحہ ۱۸ تا ۲۰ پر اسکی تفصیل دیکھی جاسکتی ہے ۔ اور تقریباً یہی مضمون حضرت مولانا محمد منظور نعمانی صاحب ظلہم نے بھی "حیات انور" میں صفحہ ۱۴۱ تا ۱۴۳ پر ذکر فرمایا ہے ۔

حضرت شاہ صاحب رہ نے یہ بات جس مومنانہ جذبے کے ساتھ فرمائی تھی وہ بالکل واضح ہے ۔ لیکن افسوس اور افسوس کے ساتھ حیرت ہے کہ بعض حضرات نے

۱۱ : مقدمہ بہاولپور : وہ پہلا مقدمہ تھا جس میں قادیانیوں کو عدالتی سطح پر غیر مسلم قرار دیا گیا۔ چنانچہ اس مقدمے کا فیصلہ اپنے حق میں کرانے کے لئے قادیانیوں نے اپنا سارا زور صرف کر دیا تھا۔

ادھر جب حضرت شاہ صاحب رح کو اس کی اطلاع ہوئی کہ ایسا مقدمہ زیر سماعت ہے تو آپ نے بنفس نفیس وہاں تشریف لے جانے کا ارادہ فرما لیا۔ اور اس غرض کے لئے آپ نے جو رفقاء منتخب فرمائے ان میں حضرت والد صاحب رح بھی شامل تھے۔ اتفاق سے ان دنوں حضرت والد صاحب رح اپنے والد ماجد حضرت مولانا محمد یٰسین صاحبؒ کی علالت کی وجہ سے ذہنی طور پر تشویش اور فکر مند تھے۔ لیکن جب حضرت شاہ صاحبؒ نے بہاولپور جانے کے لئے فرمایا تو تیار ہو گئے۔ لیکن قیام بہاولپور کے زمانے ہی میں اچانک والد صاحب رح کے پاس دیوبند سے تار آیا کہ "آپ کے والد کی طبیعت زیادہ خراب ہے جلدی واپس آجائیں"۔

حضرت والد صاحب رح یہ تار حضرت شاہ صاحب رح کے پاس لے گئے۔ حضرت والد صاحب رح فرمایا کرتے تھے کہ اس وقت میں سخت تردد کی حالت میں تھا۔ ایک طرف والدؒ

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) اس جذبے کی قدر کرنے کے بجائے اسے انہی متعصب اور فرقہ وارانہ مباحث کے لئے استعمال کرنا شروع کر دیا۔ جن کے خلاف یہ بات کہی گئی تھی۔ حد یہ ہے کہ بعض حضرات نے اسے یہ معنے پہنائے کہ حضرت شاہ صاحب رح نے آخر میں حنفی مسلک سے رجوع کر لیا تھا۔ فانا للہ وانا الیہ راجعون۔ حالانکہ حضرت شاہ صاحب رح کا منشاء بالکل واضح ہے کہ جب تک امت کو کھلے کفر و الحاد کا سامنا ہو تو اس وقت زیادہ توجہ اس کے دفعیہ کی طرف کرنی چاہئے اور فروعی اختلافات کو بحث و مناظرہ کا موضوع بنا کر اپنے بیشتر اوقات اس میں صرف کرنا صحیح طرز عمل نہیں۔ اس سے یہ نتیجہ نکالنا کہ حضرت شاہ صاحب رح نے حنفیت سے رجوع فرما لیا تھا یا! درس و افتاء کے حلقوں میں بھی عملی طور پر حنفی مسلک کی تائید سے دستبردار ہو گئے حضرت شاہ صاحبؒ پر ان کے اس قابل قدر جذبے پر اور حق و انصاف پر ناقابل برداشت ظلم ہے۔ (م، ت، ع)

کی صحت کی طرف سے سخت پریشانی تھی ، اوراس تار کا تقاضا یہ تھا کہ ایک لمحے کی تاخیر کے بغیر واپس چلا جاؤں ۔

دوسری طرف ایسے اہم کام میں حضرت شاہ صاحب رہ کی رفاقت کی جو سعادت اللہ تعالیٰ نے عطا فرمائی تھی اسے چھوڑتے ہوئے دل کٹ رہا تھا ۔ اور خیال یہی تھا کہ حضرت شاہ صاحب رہ اس تار کو دیکھ کر واپسی کی اجازت دے دیں گے ۔ کیوں کہ ہمارے اکابر عام طور سے ان باتوں کی بہت رعایت فرماتے ہیں ۔ لیکن اس روز حضرت شاہ صاحب رہ کی کرامت ظاہر ہوئی ۔ حضرت رہ نے تار کا مضمون سننے کے بعد بڑے اعتماد کے ساتھ فرمایا ۔

" ہم آپ کے والد صاحب رہ کے لئے دعا کریں گے ، انشاء اللہ وہ تندرست ہو جائیں گے ، آپ بے فکر ہو کر یہاں اپنا کام کریں "

حضرت والد صاحب رہ فرماتے ہیں کہ حضرت شاہ صاحب رہ کی زبان سے یہ جملہ سن کر میرے دل میں ٹھنڈک پڑ گئی ۔ اور ساری تشویش اور پریشانی کافور ہو گئی ۔ پھر حضرت رہ نے خود والد صاحب رہ کے نام اس مضمون کا تار روانہ کیا کہ ۔

" مولوی محمد شفیع صاحب کی یہاں ضرورت ہے میں نے انہیں روک لیا ہے ہم سب آپ کی صحت کے لئے دعا کر رہے ہیں "

اور پھر اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے والد صاحب کی طبیعت بھی بہتر ہو گئی ۔

۱۳ ۔ اسی مقدمہ بہاول پور میں حضرت شاہ صاحب رہ کا جو بیان ہوا اس میں آپ نے علوم و معارف کے دریا بہا دیئے ۔ حضرت والد صاحب رہ فرماتے تھے کہ اس بیان کے دوران حاضرین پر تو سکتہ طاری تھا ہی ، جج صاحب کی کیفیت بھی یہ تھی کہ وہ عالم حیرت میں حضرت کے چہرے کو تک رہے تھے ۔ عدالت کی طرف سے بیان قلم بند کرنے والے لوگوں نے کچھ دیر تو حضرت رہ کا ساتھ دیا ۔ لیکن تھوڑی ہی دیر کے بعد جب حضرت شاہ صاحب رہ اپنے اصلی رنگ پر آئے تو انہوں نے بھی قلم رکھ کر چہرے کو تکنا شروع کر دیا ۔ بیان ختم ہونے کے بعد جج صاحب نے کہا کہ بیان چونکہ قلم بند نہیں ہو سکا اس لئے کل یہ بیان تحریری طور پر پیش کیا جائے ۔

عدالت سے واپس ہونے کے بعد قیام گاہ پر یہ مسئلہ حضرت شاہ صاحب رح حضرت مولانا مرتضیٰ حسن صاحب رح اور دوسرے بزرگوں کے سامنے آیا۔ سوال یہ تھا کہ حضرت شاہ صاحب رح کی طرف سے یہ بیان کون لکھے؟

بالآخر قرعۂ فال حضرت والد صاحب رح کے نام نکلا۔ خود حضرت شاہ صاحب رح نے آپ کو مامور فرمایا کہ بیان آپ لکھئے۔ حضرت والد صاحب رح نے جواب میں عرض کیا کہ:

"حضرت! آپ کی طرف سے آپ کے شایانِ شان بیان لکھنا تو میرے بس کا نہیں، البتہ ضرورت پوری کرنے کے لئے تعمیل حکم کر دوں گا۔"

حضرت رح نے فرمایا کہ "ہم دعا کریں گے۔ آپ اللہ کا نام لے کر شروع کر دیجئے۔"

حضرت والد صاحب رح فرماتے ہیں کہ دن میں تو لکھنے کا موقع نہ ملا۔ رات کے وقت میں اپنے کمرے میں لکھنے کے لئے بیٹھا۔ اور ساری رات یہ بیان لکھتا رہا۔ فجر کی اذان ہو رہی تھی تو میں آخری سطور لکھ رہا تھا۔ عین اسی وقت برابر سے حضرت شاہ صاحب رح کے کمرے کا دروازہ کھلا۔ آپ اندر تشریف لائے اور پوچھا کہ "کام کہاں تک پہنچا ہے"؟

احقر نے جواباً عرض کیا کہ "بحمد اللہ ابھی ابھی پورا ہو گیا ہے" اور جب حضرت رح نے بیان دیکھا، اور آپ کو یہ بھی معلوم ہوا کہ اس کے لئے میں تمام رات جاگتا رہا ہوں، تو حضرت رح نے صمیم قلب سے اتنی دعائیں مجھے دیں کہ ان کی حلاوت آج تک محسوس ہوتی ہے اور یہی دعائیں میرا سب سے بڑا سرمایہ ہیں[۱]۔

---

[۱] اس مقدس واقعے کے ساتھ اپنے کسی قصے کا ذکر کرنا مخمل میں ٹاٹ کا پیوند لگانے اور "خاک" اور "عالمِ پاک" میں رشتہ جوڑنے کے مرادف ہے، لیکن "بلبل ہمیں کہ قافیہ گل شود بس است" کے پیش نظر عرض ہے کہ:

۱۹۷۴ء کی تحریک ختم نبوت میں جس کی قیادت حضرت شاہ صاحب رح کے شاگرد رشید محدث عصر حضرت علامہ سید محمد یوسف بنوری قدس سرہ کر رہے تھے۔ جب نیشنل قومی اسمبلی میں پیش ہوا اور مرزا ناصر وغیرہ نے اپنے بیانات داخل کئے تو اسی قسم کے ایک بیان کی ترتیب

۱۴ ؎ حضرت والد صاحب قدس سرہ نے بارہا یہ واقعہ سُنایا کہ (غالباً فتنۂ قادیانیت ہی کے سلسلے میں) حضرت شاہ صاحب رہ لاہور تشریف لائے۔ حضرت علامہ شبیر احمد صاحب عثمانی رہ بھی ہمراہ تھے اور میں بھی ساتھ تھا۔ اس زمانے میں مہر اور سالک (مرحوم) پنجاب کے مشہور صحافی اور اہل قلم مانے جاتے تھے۔ ان حضرات نے حضرت شاہ صاحب رہ اور علامہ عثمانی رہ کی تشریف آوری پر اخبارات میں یہ سرخی لگائی کہ "لاہور میں علم و عرفان کی بارش" اور پھر ملاقات کے لئے حاضر ہوتے۔

اثنائے گفتگو میں سود کا مسئلہ چل نکلا۔ مولانا سالک مرحوم نے حضرت علامہ عثمانی رہ سے یہ سوال کیا کہ موجودہ بینک انٹرسٹ کو سود قرار دینے کی کیا وجہ ہے؟ علامہ عثمانی رہ نے ان کو جواب دیا مگر انہوں نے پھر کوئی سوال کر لیا۔ اس طرح سوال

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) کے لئے حضرت بنوری قدس سرہ نے احقر کو راولپنڈی بلایا۔ اس وقت حضرت والد صاحب رہ علالت کی بنا پر صاحب فراش تھے۔ اور عموماً ہمارے لئے سفر کو پسند نہیں فرماتے تھے۔ لیکن اس کام کے لئے انہوں نے نہایت خوشی کے ساتھ اجازت دی۔ احقر چند گھنٹوں میں راولپنڈی پہنچا۔ اور حضرت بنوری قدس سرہ کے زیر ہدایت کام شروع کیا۔ بیان کا ایک حصہ احقر کو اور دوسرا حصہ حضرت مولانا سمیع الحق صاحب کو مرتب کرنا تھا۔ وقت چونکہ بہت کم تھا اور بیان مفصل تیار کرنا تھا۔ اس لئے اس ایک ہفتے میں ہم لوگ دن رات کام میں لگے رہے۔ اور اتفاق سے ایک رات میں پل بھر کے لئے نہیں سویا۔ حضرت بنوری قدس سرہٗ کو اس کا علم ہوا تو احقر کو بہت دعائیں دیں۔ اور اگلے روز حضرت مولانا بنوری صاحب رہ کو فون کر کے فرمایا کہ "حضرت! مقدمۂ بہاولپور کی یاد تازہ ہو رہی ہے حضرت شاہ صاحب نے آپ کو بلایا تھا اور میں نے تقی میاں کو بلایا ہے آپ ایک رات بیان کی ترتیب میں جاگتے رہے تھے، آج رات یہ بھی مطلق نہیں سوئے" اس صوری مشابہت پر میں اللہ تعالیٰ کا جتنا شکر ادا کروں، کم ہے۔ اللہ تعالیٰ ان بزرگوں کی برکت سے اس مشابہت کو حقیقی بنا دے۔ اور اپنی بارگاہ میں قبول فرمائے۔ آمین ثم آمین۔ (م، ت، ع)۔

و جواب کا یہ سلسلہ کچھ دراز ہو گیا۔ علامہ عثمانی قدس سرہٗ ہر بار مفصل جواب دیتے مگر وہ پھر کوئی اعتراض کر دیتے۔ وہ اپنی گفتگو میں ان لوگوں کی وکالت کر رہے تھے جو یہ کہتے ہیں کہ اگر بنکوں کے سود کو علماء جائز قرار دے دیں تو مسلمانوں کے حق میں شاید مفید ہو۔ حضرت شاہ صاحب رحمہ مجلس میں تشریف فرما تھے۔ حضرت رحمہ کی عادت چونکہ یہ تھی کہ شدید ضرورت کے بغیر نہیں بولتے تھے۔ نہ اپنا علم جتانے کا معمول تھا۔ اس لئے علامہ عثمانی رحمہ کی گفتگو کو کافی سمجھ کر خاموش بیٹھے تھے۔ لیکن جب یہ بحث لمبی ہونے لگی تو حضرت رحمہ نے مداخلت کی اور بے تکلفی سے فرمایا۔

"دیکھو بھائی سالک ! تم ہو سالک، میں ہوں مجذوب، میری بات کا برا نہ ماننا۔ بات یہ ہے کہ اللہ تعالٰے کا بنایا ہوا جہنم بہت وسیع ہے، اگر کسی شخص کا وہاں جانے کا ارادہ ہو تو اس میں کوئی تنگی نہیں ہے۔ ہم اس کو روکنے والے کون ؛ ہاں البتہ اگر کوئی شخص ہماری گردن پر پاؤں رکھ کر جہنم میں جانا چاہے گا تو ہم اس کی ٹانگ پکڑ لیں گے ؟"

۱۵ ؛ قادیانیت کے موضوع پر حضرت شاہ صاحب رحمہ کے حکم سے حضرت والد صاحب رحمہ نے کئی کتابیں عربی اور اردو میں تحریر فرمائی ہیں۔ جن کی تفصیل حضرت مولانا محمد اشرف خان صاحب اور مولانا محمد یوسف صاحب لدھیانوی کے مضامین میں دیکھی جا سکتی ہے۔ انہی میں سے ایک عربی تالیف "التصریح بما تواتر فی نزول المسیح" بھی ہے۔ اس کتاب کا واقعہ یہ ہے کہ حضرت شاہ صاحب رحمہ ان متواتر المعنی احادیث کا ایک مجموعہ تیار فرمانا چاہتے تھے۔ جن سے نزول مسیح علیہ السلام کا عقیدہ ثابت ہوتا ہے۔ اس غرض کے لئے حضرت رحمہ نے ابتدائی مواد بھی جمع فرما لیا تھا۔ اور اس کی یاد داشتیں آپ کے پاس محفوظ تھیں۔ لیکن مصروفیات کی بنا پر انہیں مرتب کر کے کتابی شکل دینے کی نوبت نہ آئی تھی۔ بالآخر آپ نے یہ یاد داشتیں حضرت والد صاحب رحمہ کو عنایت فرمائیں۔ اور حکم دیا کہ ان کی بنیاد پر ایک کتاب عربی زبان میں لکھ دیں۔ حضرت والد صاحب رحمہ نے انتہائی تن دہی کے ساتھ اس

حکم کی تعمیل فرمائی ۔ اور دن رات لگ کر چند ہی دنوں میں یہ کتاب تیار فرمادی۔

حضرت والد صاحب رہ فرمایا کرتے تھے کہ جب اس کتاب کی تالیف کے دوران میں کتب خانے سے کتابوں کے انبار اٹھا اٹھا کر اپنی جگہ لایا کرتا اور حضرت شاہ صاحب کے کمرے کے سامنے سے گزرتا تو حضرت بہت مسرور ہوا کرتے تھے۔ بالآخر جب میں کتاب مکمل کر کے اس کا مسودہ حضرت رہ کی خدمت میں لے گیا تو بہت دعائیں دیں۔ اور حاضرین مجلس سے فرمایا۔

"دیکھو بھائی محنت تو ہم کرتے ہیں اور ثواب یہ صاحب لے اڑتا ہے"

۱۶ : حضرت والد صاحب رہ نے فرمایا کہ حضرت شاہ صاحب رہ کی مادری زبان اگرچہ اردو نہ تھی لیکن اردو زبان کے محاورے بڑے برمحل استعمال فرماتے تھے۔ اور درس میں منتخب اردو اشعار سناتے رہتے تھے۔ اور جب کوئی ادب یا بلاغت کا مسئلہ بیان ہوتا تو فرماتے کہ "یہ معاملہ ہے ذوق کا، اور ذوق مر گیا دلی میں"

ایک مرتبہ فرمایا کہ ایک ہندوستانی شاعر نے بڑے سہل ممتنع انداز میں حضرت علی رضہ کے زمانے کے مشاجرات کا سبب نظم میں بیان کیا ہے۔ ؎

اک روز مرتضیٰ رضہ سے کسی نے یہ عرض کی	اے نائب رسول امین م ! دام ظلکم
بوبکر رضہ اور عمر رضہ کے زمانے میں چین تھا	عثمان رضہ کے بھی عہد میں لبریز تھا یہ خم
کیوں آپ ہی کے عہد میں جھگڑے پڑ گئے	اپنی تو عقل ہو گئی اس مسئلے میں گم
کہنے لگے یہ بات کوئی پوچھنے کی ہے	ان کے مشیر ہم تھے ہمارے مشیر تم ۱؎

۱۷ : ایک مرتبہ حضرت شاہ صاحب رہ نے واقعہ سنایا کہ اورنگ زیب عالمگیر رہ کا ایک ہندو منشی تھا جس نے کسی وقت لالچ میں آکر غبن کا ارتکاب کیا۔ بادشاہ نے اس کی سزا میں اس کی آنکھیں نکلوا دیں۔ اس موقع پر اس ہندو منشی نے جو فارسی قطعہ کہا ہے وہ ادبی شاہکار کی حیثیت رکھتا ہے۔ قطعہ یہ ہے ؎

بسیار گفتم نفس دنی را	ناکردہ باید ناکردنی را
نشنید از من ایں نفس کافر	نادیدہ آخر نادیدنی را

۱؎ حضرت علی کا یہ جواب احقر نے مقدمہ ابن خلدون میں کسی جگہ دیکھا تھا مگر پھر سرسری تلاش سے ملا نہیں۔ (م ۔ ت ع)

۱۸ : حضرت شاہ صاحب رح کے حوالے سے والد صاحب رح کا سنایا ہوا ایک اور غزل کا شعر یاد آگیا ہے

راستی فتنہ انگیز است سرو قد دوست
ہستی ما جز دروغ مصلحت آمیز نیست

۱۹ : حضرت والد صاحب رح فرمایا کرتے تھے کہ حضرت شاہ صاحب رح کے فیض صحبت کی بنا پر ہم لوگوں کو بھی مطالعہ کتب کی ایک دھن سی لگ گئی تھی - فراغت کے بعد تقریباً ایک سال تو میں نے اس طرح گزارا کہ چند اسباق پڑھانے کے بعد کتب بینی کے سوا کوئی کام نہ تھا - دوپہر کو دارالعلوم دیوبند کے کتب خانے میں داخل ہوتا ناظم کتب خانہ بعض اوقات باہر سے تالا لگا کر چلے جاتے اور میں اندر کتابوں کا مطالعہ کرتا رہتا تھا -

۲۰ : محدث عصر حضرت مولانا علامہ سید محمد یوسف بنوری صاحب قدس سرہٗ فرمایا کرتے تھے کہ حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رح حضرت شاہ صاحب رح کے ان شاگردوں میں سے ہیں جن سے حضرت ہمیشہ خوش رہے - اور کبھی کوئی تکدر کا شائبہ پیدا نہیں ہوا - حالانکہ دارالعلوم دیوبند میں ایک فتنہ ایسا اٹھا تھا جس میں دارالعلوم کے اساتذہ دو گروہوں میں تقسیم ہو گئے تھے - اور بالآخر یہ ہنگامہ حضرت شاہ صاحب رح کے استعفیٰ پر منتج ہوا - اس دوران حضرت مفتی صاحب رح حضرت شاہ صاحب رح کے بجائے حضرت تھانوی رح ، حضرت میاں صاحب رح ، اور حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب رح کے ساتھ تھے - لیکن رائے کے اس اختلاف کے باوجود حضرت شاہ صاحب رح کے پاس مفتی صاحب رح کی نیاز مندانہ آمد و رفت جاری رہی - حضرت شاہ صاحب رح بھی نہایت محبت و شفقت سے پیش آتے رہے -

حضرت مولانا بنوری قدس سرہٗ نے فرمایا کہ مجھے خوب یاد ہے کہ اس دور میں ایک مرتبہ حضرت مفتی صاحب رح حضرت شاہ صاحب رح کی خدمت میں ایک ہدیہ لے کر حاضر ہوئے اور حضرت شاہ صاحب رح نے اسے بڑی شفقت کے ساتھ قبول فرمایا -

۲۱ ۔ حضرت والد صاحب رہ نے بار ہا سنایا کہ دارالعلوم کے اساتذہ وطلبہ نے حضرت شاہ صاحب رہ کی سرپرستی میں عربی نظم و نثر کی مشق کے لئے ایک " نادیۃ الادب " قائم کی تھی۔ ہر جمعرات کو اس کا جلسہ ہوتا۔ جس کی صدارت حضرت شاہ صاحب رہ فرماتے تھے۔ اور طریق کار یہ تھا کہ ہر ہفتہ ایک مصرعہ طرح دے دیا جاتا تھا اور اساتذہ و طلبہ کو اس پر قصائد کہنے کی دعوت دی جاتی تھی۔ ایک مرتبہ مصرعہ طرح یہ تھا کہ ؎

تعزّ فان الصبر بالحرّ أجمل

اتفاق سے اس ہفتے مجھے شعر کہنے کا موقع نہ ملا۔ اور وقت پر میں نے عجلت میں صرف سات، آٹھ شعر کہے جن میں سے چند اشعار یہ ہیں ؎

ترحّل عنّی الصبر یوم ترحّلوا — فبتّ بقلب فی الحشا یتململ

یقول نصیحی فی ھواہ توجعا — تعز فان الصبر بالحرّ اجمل

یصبرنی ؛ والصبر عین شکیتی — وما غالنی فی الحب الا التجمل

بکینا فابکینا ولا مثل ناقف — لحنظلة فی الحیّ یوم تحملوا[1]

لیکن چونکہ اس غزل کے اشعار کم تھے۔ اس لئے میں نے مقطع میں یہ معذرت کی کہ ؎

أتیت بہ فی ضیق الوقت مسرعًا

فدونک عذری، وللمعاذیر تقبلُ

حضرت شاہ صاحب رہ نے ان اشعار پر بہت داد دی۔ اور آخری شعر پر فرمایا۔

---

[1] یہ امرؤ القیس کے مشہور شعر پر تعریض ہے۔ جس میں اس نے کہا ہے کہ ؎

کانّی غداۃ البین یوم تحملوا

لدی سمرات الحیّ ناقف حنظل

عجلت میں کہے گئے ان شعروں ہی سے آپ حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی قدرتِ کلام کا اندازہ کر سکتے ہیں۔ خاص طور سے ان اشعار میں سے تیسرا شعر تو ایسا ہے کہ اہل زبان بھی مشکل ہی سے ایسا شعر کہہ سکتے ہیں۔

قد قبلنا عذرك یا شیخ السروج
شیخ سروج ! ہم نے آپ کا عذر قبول کیا ۱؎

۴۔ حضرت مولانا سید اصغر حسین صاحب قدس سرہٗ

حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی تربیت میں جن بزرگوں نے حصہ لیا ان میں حضرت مولانا سید اصغر حسین صاحب قدس سرہٗ کا اسم گرامی بھی سرفہرست ہے۔ آپ دیوبند میں "حضرت میاں صاحب" کے لقب سے معروف تھے۔ اور ہمارے دادا حضرت مولانا محمد یٰسین صاحب قدس سرہٗ جو حضرت میاں صاحب کے استاذ تھے فرمایا کرتے تھے کہ وہ مادر زاد ولی ہیں بچپن میں بھی انہوں نے کبھی جھوٹ نہیں بولا۔ بچے درس گاہ میں طرح طرح کی شرارتیں کرتے۔ لیکن میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ ان سے الگ رہتے اور کبھی کوئی غلطی ہو جاتی تو کسی تاویل یا انکار کے بجائے صاف لفظوں میں اعتراف کر لیتے تھے۔

حضرت میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے استاذ بھی تھے۔ پھر کتب خانہ دارالاشاعت میں دونوں شریک تجارت بھی رہے۔ اور بچپن سے لے کر بڑھاپے تک حضرت میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ حضرت والد صاحب کے اہم گھریلو معاملات میں بھی دخیل رہے اس لئے حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ ان کے ایسے عجیب و غریب واقعات سنایا کرتے تھے کہ جن کی نظیر اس دور میں ملنی مشکل ہے اور جن کا جاننے والا بھی شاید حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے سوا کوئی نہ ہو۔

۱؎ اشارہ ہے ابو زید سروجی کی طرف جو مقامات حریری کا مرکزی کردار ہے۔ اور نظم ونثر دونوں پر اس کو جو قدرت کلام حاصل تھی۔ خاص طور پر بدیہہ گوئی میں اسے جو ملکہ تھا اس کی وجہ سے وہ ادب و بلاغت میں ضرب المثل ہے۔

ایک مرتبہ احقر نے اپنے مرحوم بڑے بھائی مولانا ذکی کیفی صاحب سے درخواست کی تھی کہ حضرت میاں صاحب رحمہ پر ایک مضمون تحریر فرما دیں جو اسی قسم کے واقعات پر مشتمل ہو۔ چنانچہ بھائی جان مرحوم نے ایک مضمون تحریر فرمایا تھا جو ماہنامہ "البلاغ" (ربیع الاول ۱۳۸۸ھ کے شمارے) میں شائع ہوا تھا۔ ذیل میں پہلے اسی مضمون کے کچھ اقتباسات پیش کرتا ہوں اس کے بعد چند واقعات عرض کروں گا جو اس مضمون میں نہیں آسکے۔

۱ ؛ بھائی جان مرحوم لکھتے ہیں۔

ایک روز والد صاحب مدظلہم (حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ) اور یہ ناکارہ بعد مغرب در دولت پر حاضر ہوئے۔ فرمانے لگے، آم چوسو گے ؛ والد صاحب نے عرض کیا کہ آم اور پھر حضرت کے عطا فرمودہ، نورٌ علیٰ نور۔ ضرور عطا ہوں۔ میاں صاحب اٹھے۔ ایک ٹوکری میں آم لاکر رکھے۔ اور ایک خالی ٹوکری گٹھلی اور چھلکوں کے لئے سامنے لاکر رکھ دی۔ ہم آم چوس کر فارغ ہوئے تو والد صاحب گٹھلی اور چھلکوں سے بھری ہوئی ٹوکری اٹھا کر باہر پھینکنے کے لئے چلے۔ پوچھا یہ ٹوکری کہاں لے کر چلے؛ عرض کیا چھلکے باہر پھینکنے کے لئے جا رہا ہوں۔ ارشاد ہوا کہ پھینکنے آتے ہیں یا نہیں ؛ والد صاحب نے فرمایا کہ حضرت ! یہ چھلکے پھینکنا کون سا خصوصی فن ہے جس کو سیکھنا ضروری ہے ؛

فرمایا ہاں ! تم اس فن سے واقف نہیں، لاؤ مجھے دو۔ خود ٹوکری اٹھا کر پہلے گٹھلی چھلکوں سے علیحدہ کئے اس کے بعد باہر تشریف لائے اور سڑک کے کنارے تھوڑے تھوڑے فاصلے متعین جگہوں پر چھلکے رکھ دیئے۔ اور ایک خاص جگہ گٹھلیاں ڈال دیں۔ والد صاحب کے استفسار پر ارشاد ہوا کہ۔ ہمارے مکان کے قرب وجوار میں تمام غرباء ومساکین رہتے ہیں۔ زیادہ تر وہی لوگ ہیں جن کو نان جویں بھی بمشکل ہی میسر آتی ہے اگر وہ پھلوں کے یکجائی چھلکے دیکھیں گے تو ان کو اپنی غریبی کا شدت سے احساس ہوگا۔ اور بے مائگی کی وجہ سے حسرت ہوگی۔ اور اس ایذا دہی کا باعث میں بنوں گا۔ اس لئے متفرق کرکے ڈالتا ہوں اور وہ بھی ایسے مقامات پر جہاں جانوروں کے گلے

گرتے ہیں یہ چھلکے ان کے کام آجاتے ہیں ۔ اور گٹھلیاں ایسی جگہ رکھی ہیں جہاں بچے کھیلنے کودتے ہیں بچے ان کو بھون کر کھا لیتے ہیں ۔ یہ چھلکے اور گٹھلیاں بھی بہرحال ایک نعمت ہے ان کو بھی ضائع کرنا مناسب نہیں ۔

یہاں یہ بات بھی پیش نظر رہنے کی ہے کہ میاں صاحب بہ خود توشاید ہی کوئی آم چکھ لیتے ہوں عموماً مہمانوں ہی کے لئے ہوتے تھے اور محلے کے غریب بچوں کو بلا بلا کر کھلانے میں استعمال ہوتے تھے اس کے باوجود چھلکے اور گٹھلیوں کو یکجا ڈھیر کر دینے سے گریز فرماتے تھے کہ غریبوں کی حسرت کا سبب نہ بن جائیں ۔ بعض فقہا نے بازار کے کھانے سے اس لئے پرہیز فرمایا ہے کہ ان غریبوں کی نظریں پڑتی ہیں اور ناداری کے سبب وہ ان کی حسرت کا سبب بنتی ہے ۔

دیکھئے ان اللہ والوں کی نظر دنیا کے کاموں میں کیسی دقیق ہوتی ہے ۔ اور ہر چیز کا حق کس کس طرح ادا کرتے ہیں ۔

۲ : حضرت میاں صاحب رح کے لئے جو کھانا گھر سے آتا تھا خود تو بہت کم کھاتے تھے اہل محلے کے بچوں کو بلا کر کھلاتے تھے جو بوٹی بچ جاے اس کو بلی کے لئے دیوار پر رکھ دیتے اور جو ٹکڑے بچ جاتے اس کو چھوٹا چھوٹا کر کے چڑیوں کے لئے اور دسترخوان کے ریزوں کو بھی ایسی جگہ جھاڑتے تھے جہاں چیونٹیوں کا بل ہے ۔ حق تعالیٰ کی نعمتوں کی قدر پہچاننا ان کو ٹھکانے لگانا انہیں صاحب بصیرت بزرگوں کا حصہ تھا۔ آج تو ہر گھر میں بچا ہوا کھانا سڑتا ہے اور نالیوں میں جاتا ہے ۔ جس کا اگر اہتمام کیا جاتا تو بہت سے غریبوں کا پیٹ بھرتا ۔

۳ : اعزا و اقربا، احباب، اہل محلہ کے حقوق و جذبات کی جس قدر رعایت کرتے ہوئے اس مرد باخدا کو دیکھا اس کی مثال ملنی مشکل ہے ۔ میاں صاحب رح کا مکان کچا تھا جس پر ہر سال کہگل ہونا ضروری تھی، اگر نہ کی جاتی تو مکان منہدم ہونے کا خطرہ تھا۔ ہر سال برسات سے پہلے اس پر کہگل کرانے کا معمول تھا اور اس وقت گھر کا سارا سامان باہر نکالنا پڑتا تھا۔ ایسے ہی ایک موقع پر والد صاحب نے عرض کیا کہ ۔ حضرت !

ہر سال آپ کو یہ تکلیف ہوتی ہے، اور ہر سال کا خرچ بھی جو اس پر ہوتا ہے وہ جوڑا جائے تو پانچ سات سال میں اتنا ہو جائے گا کہ اس سے پختہ اینٹوں کا مکان بن جائے۔
اخلاق کریمانہ سے کسی کی بات کاٹنے کی وہاں دستور ہی نہ تھا۔ بڑی دل داری اور حوصلہ افزائی کے ساتھ فرمایا۔ ماشاء اللہ آپ نے کیسی عقل کی بات فرمائی۔ میرا بھی اندازہ یہی ہے۔ پانچ سال میں جتنا خرچ اس پر ہو جاتا ہے اتنے خرچ سے پختہ مکان بنا کر اس غم سے نجات ہو سکتی ہے۔ ہم بڑھے ہوگئے اتنی عقل نہ آئی کہ ایک دفعہ ایسا کر لیتے۔ یہ کہہ کر خاموش ہوگئے۔ اس کی جو اصل حقیقت تھی اس کا اظہار یوں فرمایا کہ۔
میرے پڑوس میں جتنے مکان ہیں سب غریبوں کے ہیں اور کچے ہیں۔ ایسی حالت میں میاں صاحب یہ کیا اچھا لگتا کہ اپنا مکان پختہ بنا کر بیٹھ جاتا، پڑوسیوں کو حسرت ہوتی۔
اس وقت یہ راز کھلا کہ یہ حضرت کس مقام بلند پر ہیں۔ ان کے اعمال و افعال کا اندازہ لگانا دشوار ہے کہ ان میں کیسے کیسے اسرار پوشیدہ ہیں۔ پڑوسیوں اور غریبوں کی رعایت ان کی خدمت جو حضرت میاں صاحب رح کی فطرت بن ہوئی تھی دوسروں کا اس کی طرف دھیان جانا بھی آسان نہ تھا۔ ؎

در نیابد حال پختہ ہیچ خام
پس سخن کوتاہ باید والسلام

میں نے دیکھا کہ اس کے بعد بھی ہمیشہ سالانہ یہ تکلیف برداشت کرنے کا سلسلہ جاری رہا۔ یہاں کے پڑوسیوں نے اپنے مکانات پختہ بنائے تب حضرت میاں صاحبؒ نے بھی اپنے مکان کو پختہ بنوایا۔
یہ حضرت ہیں جن کو سلف کا نمونہ کہا جا سکتا ہے۔ حضرت فاروق اعظم رضہ کے عہد خلافت میں ایک مرتبہ مدینہ طیبہ میں گھی گراں ہوگیا۔ تو حضرت امیر المؤمنین سیدنا فاروق اعظمؓ نے گھی کھانا ترک کر دیا۔ اور فرمایا میں اس وقت گھی کھاؤں گا جب مدینہ کے عوام گھی کھانے لگیں۔
یہ واقعہ تاریخ میں پڑھا اور سنا تھا مگر ایثار، ہمدردی اور اخوت کے اس مقام

بلند ہستی جاگتی تصویر حضرت میاں صاحب رہ ہی کی زندگی میں نظر آئی۔

۴ ؛ ایک مشہور عالم دین بزرگ سے بعض سیاسی مسائل میں حضرت میاں صاحبؒ کو شدید اختلاف تھا جس کا اظہار ہمیشہ برملا فرماتے رہے۔ لیکن اس کے باوجود ان کی شان میں اگر کسی سے کبھی کوئی نامناسب کلمہ نکل بھی جاتا تو بڑی سختی کے ساتھ متنبہ فرماتے۔ اختلاف بھی۔ "اختلاف امتی رحمۃ" کی تشریح پر تھا۔ اختلاف کی حدود سے سر مو تجاوز ان کی فطرت ہی نہیں تھی۔

انہی مختلف الخیال بزرگ نے ایک دفعہ امساک باراں کی شدت دیکھ کر نماز استسقار پڑھنے کا اعلان کیا۔ میاں صاحب رہ کو غالباً کشف کے ذریعے معلوم ہو چکا تھا کہ ان ایام میں بارش نہیں ہوگی۔ لیکن اس کے باوجود والد صاحب رہ سے فرمایا کہ میاں بارش تو ہوئی نہیں۔ البتہ نماز کا ثواب حاصل کرنے کے لئے چلنا ضروری ہے۔

چنانچہ والد صاحب نے ان کی معیت میں نماز استسقار ادا کی۔ بارش کو نہ ہونا تھا نہ ہوئی۔ ان بزرگ نے دوسرے روز کے لئے بھی نماز کا اعلان فرما دیا۔ تو اس دن بھی وہی پہلے دن والی بات فرما کر نماز ادا کرنے پہنچ گئے۔ اور بغیر بارش ہوئے واپس آ گئے۔ تیسرے روز کے لئے پھر نماز کا اعلان ہوا۔ تو میاں صاحب تیسرے دن بھی نماز کے لئے میدان میں پہنچ گئے۔ اور خود ان بزرگ سے کہا کہ اگر آپ اجازت دیں تو آج نماز میں پڑھا دوں۔

ہر شخص حیرت سے دیکھ رہا تھا کہ میاں صاحب رہ تو کبھی پنج وقتہ نماز لوگوں کے اصرار پر بھی نہیں پڑھاتے آج انہوں نے خود نماز پڑھانے کی پیشکش کیسے کی؟

بہرکیف نماز استسقار میاں صاحب کی امامت میں شروع ہوئی۔ میاں صاحب کے عقیدت مندوں کے دل میں بار بار یہ خیال پیدا ہو رہا تھا کہ آج بارش ضرور ہو جائے گی۔ شاید میاں صاحبؒ نے کشف کے ذریعے معلوم کر کے یہ تبدیلی کی ہوگی لیکن آج بھی دھوپ اسی شدت کے ساتھ چمکتی رہی اور بادل کا دور دور بھی نام ونشان نہ تھا۔ مجبور ہو کر پورا مجمع شکستہ دل اور مغموم واپس ہوا۔

والد صاحب نے اس خلاف عادت عمل پر استفسار کیا کہ۔ آپ تو کبھی نماز پنج گانہ میں بھی امامت نہیں فرماتے آج یہ کیا ماجرا تھا؟

تو فرمایا کہ میرا مقصد اس کے سوا کچھ نہیں تھا کہ۔ جو عالم دین دو روزے نماز پڑھا رہے ہیں لوگوں کو ان پر ہی بدگمانی نہ ہو، میں بھی اس میں شریک ہو جاؤں۔ کیوں کہ مجھے اندازہ تھا کہ بارش اس وقت ہونا مقدر نہیں، کسی عالم یا مقدس ہستی کا اس میں کیا قصور ہے۔ اب اگر بدنامی ہوتی ہے تو تنہا ایک عالم کی نہ ہو۔

۵ ؛ حضرت میاں صاحب رح کو روز مرہ کے واقعات سے عبرت آموزی کا خاص انداز تھا۔ آنے والے ہر واقعہ سے کوئی عبرت نصیحت حاصل کرتے تھے۔ آپ کا مکان دارالعلوم سے کافی فاصلہ پر محلہ قلعہ میں ہے۔ شہر سے باہر باہر آنے کا دستور تھا۔ راستہ میں کچھ جنگل بھی پڑتا تھا۔

دارالعلوم میں تشریف لانے کے بعد معمول یہ تھا کہ ایک کمرہ جس میں حضرت موصوف کی تصانیف کی اشاعت کا سلسلہ بھی تھا۔ "دارالتدریس والاشاعت" کے نام سے موسوم تھا۔ میرے والد ماجد مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رح بھی درس سے فارغ اوقات میں یہاں بیٹھتے تھے۔ اور حضرت میاں صاحب رح بھی سبق پڑھانے سے پہلے اور بعد کچھ دیر یہاں تشریف رکھتے تھے۔

ایک روز مکان سے تشریف لائے تو والد صاحب کو مخاطب کرکے فرمایا کہ آج ہم ایک عجیب تماشا دیکھ کر آئے ہیں۔ والد صاحب اس تماشے کی حقیقت سننے کے لئے ہمہ تن گوش ہو گئے۔

فرمایا کہ محلہ کوٹلہ سے باہر جنگل میں چند چھوٹی چھوٹی لڑکیاں بیٹھی ہوئی آپس میں لڑ رہی تھیں ایک دوسرے کو مار رہی تھیں۔ ہم قریب پہنچے تو معلوم ہوا کہ یہ سب مل کر جنگل سے گوبر چن کر لائی ہیں اور ایک جگہ ڈھیر کر دیا ہے اب اس کی تقسیم کا مسئلہ زیر نزاع ہے۔ حصوں کی کمی بیشی پر لڑنے مارنے پر تلی ہوئی ہیں۔ اول نظر میں مجھے ہنسی آئی کہ یہ کس گندی اور ناپاک چیز پر لڑ رہی ہیں۔ ہم ان کی کم عقلی اور بچکانہ ذہنیت پر ہنستے ہوئے

ان کی لڑائی بند کرانے کی کوشش میں لگے ہوئے تھے ۔ کہ قدرت نے دل میں ڈالا کہ ان کی بے وقوفی پر ہنسنے والے جو دنیا کے مال و دولت اور جاہ و منصب پر لڑتے ہیں اگر ان کو چشم حقیقت بین نصیب ہوجاتے تو وہ یقین کریں گے کہ ان عقلاء زمان اور حکماء وقت کی سب لڑائیاں بھی ان بچوں کی جنگ سے کچھ زیادہ ممتاز نہیں ۔ فنا ہو جانے والی ۔ اور چند روز میں اپنے قبضہ سے نکل جانے والی یہ سب چیزیں بھی آخرت کی نعمتوں کے مقابلے میں ایک گھر سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتیں۔

حدیث شریف میں رسول کریم صلی اللہ علیہ سلم نے اس مضمون کے لئے ارشاد فرمایا الدنیا جیفۃ و طالبوھا کلاب ۔ دنیا ایک مردار جانور ہے اور اس سے چمٹنے والے کتے ہیں ۔

غور کیجئے ! اس طرح کے سینکڑوں واقعات سب کی نظروں سے گزرتے ہیں مگر کہاں ہے وہ نظر و فکر جو ان سے عبرت حاصل کرے ؟

۹ ۔ ایک روز والد صاحب حسب معمول مغرب کے بعد حاضر خدمت ہوئے عموماً مغرب سے عشاء تک یہ مجلس رہا کرتی تھی ۔ آج خلاف عادت فرمایا کہ آج ہماری گفتگو عربی میں ہوگی ۔ سبب پوچھنے کی جرأت تو نہ ہوئی ۔ خود ہی گفتگو کی ابتداء عربی میں فرمادی۔ پھر والد صاحب نے جو کچھ کہا عربی ہی میں کہا ۔ لیکن طرفین کو عربی میں مکالمہ کی عادت تو تھی نہیں ۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سوچ سوچ کر صرف ضروری باتیں کہی اور سنی گئیں ۔ اپنی زبان میں جس بسط و تفصیل سے کلام ہوا کرتا تھا اور ایک منٹ کی بات میں پانچ منٹ خرچ ہو جایا کرتے تھے ۔ اس کا ایسا انسداد ہوا کہ وقت سے پہلے ہی مجلس ختم ہوگئی ۔

اس وقت فرمایا کہ زندگی کا ایک ایک منٹ بڑا قیمتی بلکہ بے بہا جواہرات ہیں ان کو فضول کام یا کلام میں صرف کرنا بڑی بے عقلی ہے ۔ میں جانتا تھا کہ گفتگو عربی میں کریں گے تو صرف ضروری کلام ہی ہوگا اس لئے یہ کہا تھا ۔

اور فرمایا " ہماری مثال اس دولت مند انسان کی سی ہے ۔ جس کے خزانے میں بیشمار گنیاں بھری ہوئی ہیں ۔ اور وہ بے دریغ خرچ کر رہا ہے ۔ مگر اسی طرح ایک ایسا وقت

آگیا۔ جب خزانہ خالی ہونے کے قریب آیا۔ اور چند گنی چنی گنیاں رہ گئیں تو اب وہ بہت دیکھ بھال کر خرچ کرتا ہے۔ ہاتھ روکتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے ہمیں عمر کے بے شمار جواہرات عطا فرمائے تھے جن کو ہم بے دریغ خرچ کر چکے۔ اب عمر آخر ہے۔ خزانہ خالی ہونے کو ہے اس لئے ایک ایک منٹ دیکھ بھال کر خرچ کرنا چاہئے۔"

یہ واقعات تو بھائی جان مرحوم نے اپنے مضمون میں ذکر فرمائے ہیں۔ اب حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے سنے ہوئے چند مزید واقعات پیش خدمت ہیں۔

؎ ، حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے دارالعلوم دیوبند میں تدریس کے ساتھ ساتھ ایک چھوٹا سا تجارتی کتب خانہ بھی قائم فرمایا تھا۔ اس میں جہاں کثرت عیال کے ساتھ مدرسہ کی تنخواہ کے ناکافی ہونے کو دخل تھا، وہاں ایک مقصد یہ بھی تھا کہ اپنے لکھے ہوئے رسائل کی اشاعت آسان ہو جائے۔ لیکن تجارت ایک مستقل فن ہے۔ ابتداء میں حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو اس کا تجربہ نہیں تھا۔

چنانچہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں دہلی گیا تو وہاں کسی کتب خانے میں ایک نئی حمائل شریف شائع ہوئی تھی۔ میں اس کے نسخے بڑی تعداد میں خرید کر دیو بند لے آیا خیال یہ تھا کہ یہ نسخے مجھے خاصے کم ہدیہ پر مل گئے ہیں۔ اور تجارتی اعتبار سے یہ میں نے اچھا معاملہ کیا ہے۔ چنانچہ دیو بند پہنچ کر میں نے سب سے پہلے حضرت میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے اس معاملے کا ذکر کیا۔ حضرت میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے سن کر احقر کی بہت تعریف کی۔ اور ساتھ ہی فرمائش کی کہ یہ تمام نسخے کچھ نفع رکھ کر مجھے ہدیہ کر دو۔ چنانچہ میں نے حضرت میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے حکم کی تعمیل کی۔ اور تمام نسخے ان کو دے دیئے۔ اور حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے ان کا ہدیہ بھی احقر کو جلد ہی عطا فرما دیا۔

میں مطمئن تھا کہ میں نے بہت اچھا معاملہ کیا ہے جسے حضرت میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ جیسے پختہ کار بزرگ نے بھی پسند فرمایا ہے۔ بات آئی گئی ہوگئی۔ لیکن عرصہ دراز کے بعد ایک روز میں حضرت میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے کتب خانے میں پہنچا۔ تو دیکھا کہ اسی حمائل شریف

کے تمام نسخے ایک جگہ جوں کے توں رکھے ہیں اور ایسا معلوم ہوا کہ شاید ان میں سے کوئی ایک نسخہ بھی فروخت نہیں ہوا۔ مجھے بڑا تعجب ہوا اور میں نے حضرت میاں صاحب سے ان کے بارے میں پوچھا تو اس وقت راز کھلا کہ حضرت میاں صاحب رہ کس مقام سے سوچتے ہیں۔

فرمایا کہ "آج آپ کو بتاتا ہوں کہ جو حمائل شریف آپ خرید لائے تھے اس میں اغلاط بہت زیادہ تھیں۔ اور آپ نے اس کے دام بھی زیادہ دے دیئے تھے۔ مجھے معلوم تھا کہ ان کا تجارتی بنیاد پر نکلنا مشکل ہوگا۔ لیکن اگر میں اس وقت آپ سے اس کا ذکر کرتا تو آپ کی بہت شکنی ہوتی۔ میں نے وہ تمام نسخے اس لئے آپ سے خرید لئے تھے۔"

۸ ؛ جب احقر کے برادر مرحوم مولانا محمد زکی کیفی رہ نے احقر کی فرمائش پر حضرت میاں صاحب رہ کے بارے میں مضمون لکھا۔ اور وہ البلاغ میں شائع ہونے کیلئے آیا تو حضرت والد صاحب رہ نے اسے پڑھ کر اس پر چند سطریں خود تحریر فرمائیں۔ جو ذیل میں پیش خدمت ہیں۔

> "برخوردار عزیز مولوی محمد زکی سلمہ نے حضرت میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے کچھ حالات و مقالات مجھ سے ہی سنے ہوئے لکھ دیئے۔ اس سے تو خوشی ہوئی کہ انہوں نے ان کلمات کی قدر پہچانی۔ اور یاد رکھا لیکن اس یگانۂ روزگار ہستی کے علمی و عملی کمالات اور مخصوص طرز زندگی کی کوئی جھلک بھی ان چند کلمات کے ذریعہ نہیں دیکھی جاسکتی۔
>
> برخوردار نے یہ چند سطور لکھ کر ماضی کی ایک بھولی ہوئی مجلس کا نقشہ آنکھوں کے سامنے کر کے تڑپا ہی دیا۔ حضرت میاں صاحب رہ کا نورانی چہرہ گویا سامنے آگیا۔ آپ کے کلمات دل نواز کانوں میں گونجنے لگے، کبھی کبھی کے واقعات یاد آنے لگے۔ مگر ان کو ضبط تحریر میں لانے کی طاقت فرصت کہاں سے لاؤں ؟ صرف ایک خط کے الفاظ اس وقت بے ساختہ قلب و زبان پر آگئے۔ جو حضرت میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی شگفتہ

اور معنی خیز تحریر کا ایک نمونہ ہے، اس جگہ لکھنے پر اکتفا کرتا ہوں۔

حضرت میاں صاحب رحمہ نے اپنا تجارتی کتب خانہ آخر میں تھوڑی سی قیمت لگا کر مجھے عطا فرما دیا تھا۔ اور اس کی قیمت بھی بہت کم مقدار کی ماہوار قسطوں میں ادا کرنا طے ہوا تھا۔ آخر عمر میں ایک مرتبہ بطور علاج آپ "کوہ کسولی" پر گئے ہوئے تھے۔ یہ مہینے کی قسط میں نے بذریعہ منی آرڈر وہیں بھیج دی۔ اس کے جواب میں والا نامہ صادر ہوا جس کے یہ کچھ الفاظ یاد ہیں۔

"آپ کا مرسلہ علیہ احب الاشیاء و ابغضہا وصول ہوا
روز بروز کے احسانات کا شکریہ کہاں تک؟ بس
دعا کرتا ہوں اور آپ سے بھی حیاً و میتاً دعا کا
امیدوار ہوں"

دو سطر کا خط ہے۔ مگر ذرا دیکھئے اس میں سموئے ہوئے مضامین! ایک قرض کو قسطوں میں وصول کرنے کا جو احسان مجھ پر فرمایا تھا۔ اس کو میرا احسان قرار دیتے ہیں، اس کا نام تحفہ رکھتے ہیں۔ اس کے ساتھ مال دنیا کی حقیقت اس عربی جملے میں کیسی واضح فرمائی کہ شاید اس سے زیادہ تصور نہیں کی جا سکتی کہ مال ایسی چیز ہے کہ ایک طرف اس کے برابر کوئی چیز محبوب نہیں۔ کیوں کہ وہ ساری محبوب چیزوں کے حصول کا ذریعہ ہے۔ دوسری طرف وہ ایک ایسی چیز ہے کہ اس کے برابر دنیا کی کوئی چیز مبغوض نہیں ہو سکتی کہ باپ کو بیٹے سے، بیٹے کو باپ سے، شوہر کو بیوی سے، بیوی کو شوہر سے لڑا دیتی ہے، انسان ایک دوسرا کا گلا کاٹنے کو تیار ہو جاتا ہے۔ آخری جملے میں ہر وقت موت کے استحضار کو واضح کرتے ہوئے دعا کی ترغیب فرمائی۔ فللّٰہ درّہ و علیہ اجرہٗ"

(ماخوذ از ماہنامہ البلاغ ربیع الثانی ۱۳۸۸ھ)

۹ : حضرت والد صاحب رہ کی کتاب "سیرۃ خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم"

حضرت میاں صاحب قدس سرہٗ نے جو تقریظ لکھی ہے۔ اس کے چند جملے درج ذیل ہیں۔

دارالعلوم دیوبند کے نوجوان مدرس وعالم مولوی محمد شفیع صاحب میرے سامنے کے بچے ہیں۔ مگر ان کا علم وفضل مجھے ان کو مولانا محمد شفیع کہنے پر مجبور کرتا ہے ان کی عربی و اردو تصانیف کی تعداد ایسی تیزی سے بڑھ رہی ہے کہ مجھ جیسے ضعفاء و پا بہ رکاب بوڑھوں کو رشک آنے تو بجا ہے۔ دونوں بازوں میں سلاست زبان اور حسن بیان حق تعالیٰ نے ان کو عطا فرمایا ہے۔ پھر بڑی خوبی یہ ہے کہ سلف صالحین اور اپنے اساتذہ اور بزرگوں کے طریقے کو سنبھالے رہتے ہیں۔ نئی روشنی اور جدید تمدن کے اثر نے جو جا بجا نظر فریب مگر مہلک غار ڈال دیئے ہیں لوگوں کو ان سے بچانے کی فکر کرتے ہیں اور کامیاب ہوتے ہیں۔ ان کی ہر تصنیف و تالیف کو دیکھ کر دل سے دعا نکلتی ہے "

۵۔ حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ

حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے اساتذہ اور مربیوں میں ایک اہم نام حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا ہے۔ تلمذ کے علاوہ حضرت والد صاحب کو آپ سے دور کی رشتہ داری کا بھی تعلق تھا۔ آپ حضرت شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی رہ اور حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ مہتمم دارالعلوم دیوبند کے بھائی تھے۔ طریقت میں حضرت مولانا رفیع الدین صاحب قدس سرہٗ کے خلیفہ تھے۔ ۱۲۹۵ھ میں دارالعلوم دیوبند سے فارغ ہوئے اور حضرت گنگوہی رہ اور دیگر اکابر کے ہاتھوں آپ کو سند اور دستار فضیلت دی گئی۔ ۱۲۹۹ھ میں آپ نے دارالعلوم دیوبند میں بلاتنخواہ تعلیم وتدریس کی خدمت شروع کی۔ اور ۱۳۱۰ھ میں جب دارالعلوم دیوبند میں "دارالافتاء" ایک مستقل شعبے کی حیثیت سے قائم ہوا، تو آپ کو مفتی مقرر کیا گیا۔

چنانچہ اس کے بعد ۳۵ سال مسلسل دارالعلوم دیوبند جیسے علمی مرکز میں فتوے کی اہم خدمت آپ ہی کے سپرد رہی۔

۱ ، حضرت والد صاحب رحمہ نے حضرت مفتی صاحب قدس سرہٗ سے مشکوٰۃ ، اور جلالین شریف درساً پڑھی تھی۔ اس کے بعد جب آپ کو بھی فتوے کی خدمت تفویض کی گئی تو عرصۂ دراز تک آپ حضرت مفتی عزیز الرحمن صاحب قدس سرہٗ کے زیر نگرانی فتاوے تحریر فرماتے رہے۔ اس طرح فتاوے کی تربیت آپ نے بنیادی طور پر حضرت مفتی صاحب رحمہ ہی سے حاصل فرمائی۔ اس کے علاوہ حضرت مفتی صاحب قدس سرہٗ کو حصن حصین کی اجازت حضرت شاہ فضل رحمٰن صاحب گنج مراد آبادی رحمہ سے حاصل تھی۔ جس کی وجہ سے آپ کی سند حدیث نہایت عالی تھی۔

حضرت والد صاحب رحمہ نے حصن حصین کو حرفاً حرفاً حضرت مفتی صاحب رحمہ سے پڑھ کر اس سند کی اجازت کا شرف بھی حاصل فرمایا تھا۔ حضرت مفتی صاحب رحمہ کی سند یہ ہے۔

" حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحب رحمہ از حضرت مولانا فضل رحمٰن صاحب رحمہ گنج مراد آبادی از حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب رحمہ و حضرت شاہ محمد اسحاق صاحب رحمہ عن والدہ الشیخ ولی اللہ عن الشیخ ابی طاھر المدنی عن والدہ الشیخ إبراھیم الکردی عن الشیخ احمد القشاشی عن الشیخ ابی المواھب احمد بن عبد القدوس الشناولسی عن الشیخ شمس الدین محمد بن احمد الرملی عن الشیخ زکریا الانصاری عن الحافظ تقی الدین محمد بن احمد الھاشمی المکی عن مؤلفہ شیخ الاسلام محمد بن محمد الجزری الشافعی رحمہ "

(دیکھئے مقدمہ فتاویٰ دارالعلوم دیوبند ص ۴۶ ج ۱)

۲ ، حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحب قدس سرہٗ کے علمی مقام بلند کا اندازہ تنہا اسی بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ آپ اس دور میں دارالعلوم دیوبند کے صدر مفتی تھے جب کہ وہاں آسمان علم کے آفتاب و ماہتاب معروف مدرس تھے لیکن تواضع اور سادگی

کا عالم یہ تھا کہ حضرت والدصاحب رحمہ تحریر فرماتے ہیں ۔

" حضرت مفتی صاحب قدس سرہٗ کو حق تعالےٰ نے جو کمالات علمی اور عملی، ظاہری اور باطنی عطا فرمائے تھے، حقیقت یہ ہے کہ ہر ایک شخص کے لئے ان کا ادراک بھی آسان نہ تھا۔ اور کوئی کیسے سمجھے کہ یہ کوئی بڑے عالم یا صاحب کرامات صوفی اور صاحب نسبت شیخ ہیں۔ جب کہ غایت تواضع کا یہ عالم ہو کہ بازار کا سودا سلف نہ صرف اپنے گھر کا، بلکہ محلے کی بیواؤں اور ضرورت مندوں کا بھی خود لاتے۔ بوجھ زیادہ ہوجاتا تو تھیلی میں گٹھڑی وغیرہ باندھ لیتے۔ اور پھر ہر ایک کے گھر کا سودا مع حساب کے اس کو پہنچاتے " (مقدمہ فتاویٰ دارالعلوم ص ۲۰، ج ۱)

اور احقر نے حضرت والدصاحب رحمہ سے بارہا زبانی سنا کر بسا اوقات ایسا بھی ہوتا تھا کہ جب حضرت مفتی صاحب رحمہ کسی عورت کو سودا دینے کے لئے جاتے تو وہ دیکھ کر کہتی " مولوی صاحب! یہ تو آپ غلط لے آئے ہیں، میں نے یہ چیز اتنی نہیں، اتنی منگائی تھی " چنانچہ یہ فرشتہ صفت بزرگ دوبارہ بازار جاتے اور اس عورت کی شکایت دور کرتے۔

یہاں یہ بھی عرض کرتا چلوں کہ تواضع اور سادگی کا یہ وصف اللہ تعالےٰ نے حضرت مفتی عزیزالرحمٰن صاحب قدس سرہٗ کے جانشین یعنی حضرت والدصاحبؒ کو بھی خوب عطا فرمایا تھا۔ آپ بھی اپنے علمی و عملی مقام بلند کے باوصف نہ صرف اپنا بلکہ محلے کے بے سہارا افراد اور عزیزوں رشتہ داروں کا کام بھی خود کیا کرتے تھے اور آپ کو کسی کام سے عار نہ تھی۔ یہاں تک کہ ایک مرتبہ شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی قدس سرہٗ نے غایت شفقت کی بنا پر آپ سے فرمایا۔

" بھئی مولوی صاحب! اب آپ دارالعلوم دیوبند کے مفتی ہوگئے ہیں، اس منصب کا بھی کچھ خیال کیا کریں۔ اب آپ کو تھیلی ہاتھ میں لے کر بازار میں نہیں پھرنا چاہئے "

حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ " حضرت مدنی قدس سرہ کی اس تنبیہ پر مجھے خیال ہوا کہ میں واقعۃً اس منصب کی حق تلفی تو نہیں کر رہا۔ لیکن میرے اساتذہ ہی میں سے کسی نے حضرت مدنی رحمہ سے فرمایا کہ " پہلے مفتی صاحب ، (یعنی مفتی عزیز الرحمٰن صاحب) کا حال بھی تو یہی تھا "

اس پر حضرت مدنی قدس سرہ نے تبسم فرمایا۔ گویا فرما رہے ہوں کہ سادگی اور تواضع کی یہ ادا محبوب تو بہت ہے۔ البتہ اب لوگوں کے مزاج چونکہ بگڑ گئے ہیں۔ اس لئے قدرے احتیاط کی ضرورت ہے۔

۳ : حضرت والد صاحب قدس سرہ نے " فتاویٰ دارالعلوم دیوبند " کے شروع میں حضرت مفتی صاحب قدس سرہ کے کچھ حالات تحریر فرمائے ہیں۔ اس میں آپ لکھتے ہیں۔

قریباً ۱۳۲۵ھ میں جب احقر نے درجۂ فارسی میں تعلیمی داخلہ لیا۔ اس وقت سے حضرت مفتی صاحب قدس سرہ کو دور اور نزدیک سے دیکھنے کا مسلسل اتفاق ہوتا رہا۔ اس طرح بیس سال تک حضرت ممدوح سے متعارف ہونے پھر خدمت میں رہنے کی سعادت نصیب ہوئی۔ اس طویل مدت میں میں نے کبھی ایک دفعہ بھی یہ نہیں دیکھا کہ حضرت ممدوح کو کسی پر غصہ آ رہا ہے۔ اس کے متعلق ڈانٹ اور تنبیہ کے معمولی الفاظ بھی کہہ رہے ہیں۔ حلم و کرم اور حیاء و مروت کا مجسمہ تھے۔ بڑے بڑے زبان دراز دشمنوں سے بھی سابقے پڑے مگر اس مرد خدا کی زبان پر ادب و تعظیم کے سوا کوئی دوسرا لفظ چلتا ہی نہ تھا۔

مجھے کبھی یاد نہیں کہ ان کی مجلس میں کسی بڑے سے بڑے آدمی کی برائی کا بھی ذکر ہوتا ہو اور کسی کی غیبت کا تو تصور کیا ہو سکتا ہے۔

ان کے مواجہ میں اگر کوئی شخص کسی معاملے میں کوئی غلط بات بھی کہتا تو غایت حیاء و مروت سے یہ کبھی نہ فرماتے تھے کہ تم یہ بات غلط کہہ رہے ہو۔ بلکہ اس کی بات کا صحیح محمل تلاش کر کے یوں فرماتے تھے : گویا آپ کا مطلب

یہ ہے " اس طرح اس کی غلطی کی اصلاح بھی فرما دیتے اور تنقید و تردید کے الفاظ سے بچ جاتے تھے۔

علوم دینیہ کی انتہائی مہارت کے ساتھ تواضع اور احتیاط و تقویٰ کا یہ عالم تھا کہ مشکوٰۃ شریف کے درس میں اس کی شرح مرقاۃ کو سامنے رکھتے۔ جب کوئی طالب علم سوال کرتا تو مرقاۃ ہی کی عبارت پڑھ کر جواب دے دیتے تاکہ کسی کو یہ بھی احساس نہ ہو کہ یہ جواب ان کو پہلے سے معلوم تھا۔ تقریر اتنی سادہ کہ سننے والوں کو یہ بھی احساس نہ ہو کہ کوئی بڑا عالم تقریر کر رہا ہے "

(ص ۴۳ و ۴۴)

۴ : حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے پینتیس (۳۵) سال کے عرصہ میں ہزارہا فتاوے تحریر فرمائے اور بعید نہیں کہ ان کی تعداد لاکھوں تک پہنچتی ہو۔ لیکن اس کا کوئی مجموعہ شائع نہیں ہوا تھا۔ سب سے پہلے حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے دارالعلوم دیوبند کے فتاوے کے رجسٹروں سے انتخاب فرما کر حضرت مفتی صاحب رہ کے فتاویٰ کو۔ " عزیز الفتاوے " کے نام سے ترتیب دیا۔ یہ فتاوے پہلے ماہنامہ " المفتی " میں شائع ہوتے رہے جو حضرت والد صاحب رہ کی زیر ادارت دیوبند سے نکلتا تھا۔ اس کے بعد چار حصوں میں یہ جداگانہ شائع ہوا۔ اب اسے ایک ہی جلد میں مجلد کر دیا گیا ہے اس کے بعد کچھ عرصہ پہلے دارالعلوم دیوبند میں فتاوے کی ترتیب و تبویب کا کام۔ " فتاوے دارالعلوم دیوبند " کے نام سے شروع ہوا۔ اس میں سب سے پہلے حضرت مفتی صاحب رہ ہی کے فتاویٰ جمع ہو رہے ہیں۔ اب تک اس کی نو جلدیں شائع ہو چکی ہیں۔ اور غالباً یہ سلسلہ ابھی تک صرف کتاب الطلاق تک پہنچا ہے۔ حضرت مولانا ظفیر الدین صاحب مدظلہم نے اس کی ترتیب و تبویب میں بڑی محنت اور عرق ریزی سے کام کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ یہ عظیم کارنامہ ان کے ہاتھوں بطریق احسن پایۂ تکمیل تک پہنچائے۔ انشاء اللہ یہ آنے والی نسلوں کے لئے فقہی رہنمائی کا عظیم ترین ذخیرہ ہوگا۔

فتوے سے حضرت رہ کے شغف کا یہ عالم تھا کہ حضرت والد صاحب رہ تحریر فرماتے ہیں۔

"بعض دوستوں نے مجھے بتلایا کہ وفات سے پہلے بھی ایک فتویٰ ہاتھ میں تھا جس کو موت ہی نے ہاتھ سے چھڑا کر سینہ پر ڈال دیا تھا۔ فجزاہ اللہ تعالیٰ عنا وعن جمیع المسلمین خیر الجزاء۔"

(مقدمہ فتاویٰ دارالعلوم ص ۴۹ - ۵۰)

۵ : حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ حضرت والد صاحب پر بے حد شفقت فرماتے اور آپ کی علمی وعملی صلاحیتوں کی نہایت قدر کرتے تھے۔ چنانچہ "سیرت خاتم الانبیاء" کی تقریظ میں حضرت مفتی صاحب تحریر فرماتے ہیں۔

" بندہ نے کتاب مستطاب سیرت سید البشر موسوم اوجز السیر لخیر البشر مؤلفہ عالم ذکی تقی ونقی مولوی محمد شفیع صاحب دیوبندی کو من اولہ الیٰ آخرہ نہایت شوق ومحبت سے دیکھا اور اس کے مطالعہ سے محظوظ ومسرور ہوا۔ حق یہ ہے کہ اس موضوع میں یہ کتاب لاجواب ہے۔

مؤلف سلمہ اللہ تعالیٰ وادام الیٰ ماتمنیٰ نے نہایت بلاغت وفصاحت وایجاز محمود وسادگی وبے تکلفی کے ساتھ صحیح حالات و وقائع کو جمع کر دیا ہے۔ حق تعالیٰ اپنے فضل ولطف سے مؤلف سلمہ کو جزائے خیر دارین میں عطا فرماوے۔ اور اس کتاب کو مقبول فرماوے۔ اور بندگان خاص کو اس سے نفع پہنچاوے۔ آمین۔

" کتبہ احقر عزیز الرحمٰن الدیوبندی العثمانی "

۶۔ حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند

حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ اپنے جن بزرگوں کا تذکرہ بکثرت فرماتے تھے ان میں حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب قدس سرہ کا اسم گرامی بھی بہت نمایاں ہے۔ آپ دارالعلوم دیوبند کے مہتمم تھے۔ اور والد صاحب فرمایا کرتے تھے کہ انتظامی مصروفیت کی بنا پر آپ کا علمی اور عملی مقام لوگوں پر واضح نہ ہو سکا۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ علمی اور

عملی دونوں حیثیتوں سے اللہ تعالیٰ نے آپ کو عجیب کمالات عطا فرمائے تھے ۔

۱ ؛ حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب قدس سرہٗ کو عربی ادب کا بڑا ستھرا ذوق تھا ۔ اور آپ کی عربی تحریریں بڑی چست اور ادیبانہ ہوتی تھیں ۔ آج کل دارالعلوم دیوبند کے فضلاء کو جو سند دی جاتی ہے اس کا پورا مضمون حضرت مولانا ہی کا مرتب فرمایا ہوا ہے ۔ اور جب ہم لوگوں نے حضرت شاہ صاحب رح کی سرپرستی میں عربی نظم ونثر کی مشق کے لئے « نادیۃ الادب » قائم کی تو حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب قدس سرہٗ اس میں بڑی دلچسپی کے ساتھ حصہ لیا کرتے تھے ۔

۲ ؛ فرمایا کہ سب سے تصنیف وتالیف اور مضمون نگاری کی طرف متوجہ کرنے میں حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا بڑا حصہ ہے ۔ مولانا کی عادت یہ تھی کہ وہ انتظامی کاموں میں مصروف رہنے کے باوجود دارالعلوم کے طلباء پر خاص نظر رکھتے تھے ۔ اور جس طالب علم میں کوئی صلاحیت دیکھتے اس کی ہمت افزائی فرما کر اس کی صلاحیتوں کو اجاگر کرنے کی کوشش فرماتے ۔

میں ابھی دارالعلوم میں پڑھتا ہی تھا کہ مولانا کی خاص نظر عنایت مجھ پر مبذول ہو گئی ۔ بار ہا ایسا ہوا کہ جب میں امتحان گاہ میں بیٹھا پرچہ لکھ رہا ہوتا تو حضرت مولانا میرے پاس تشریف لا کر میرے لکھے ہوئے جوابات دیکھتے ۔ اور بعض اوقات اتنے مسرور ہوتے کہ دوسرے اساتذہ کو جاکر اطلاع دیتے تھے ۔

ایک مرتبہ کسی اخبار یا رسالے میں کوئی مضمون شائع ہوا جس میں امت کے کسی اجماعی مسئلے کے خلاف رائے ظاہر کی گئی تھی ۔ حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب رح نے احقر کو حکم دیا کہ اس کا جواب لکھو ۔ میں نے تعمیل حکم کی ۔ اور یہ میرا پہلا مضمون تھا ۔ میں نے جب یہ مضمون لکھ کر حضرت مہتمم صاحب رح کو دکھایا تو وہ خوشی سے پھولے نہیں سمائے ۔ اور اسی وقت مجھے حضرت شاہ صاحب رح ، شیخ الادب حضرت مولانا اعزاز علی صاحب رح اور دوسرے اساتذہ کے پاس لے گئے ۔ اور ان کو میرا لکھا ہوا یہ مضمون دکھایا ۔

حضرت والد صاحب رح فرماتے ہیں کہ وہ میرا پڑھنے کا زمانہ تھا اور میں نے پہلا مضمون

لکھا تھا۔ اس لئے اس میں یقیناً بہت سی خامیاں ہوں گی۔ لیکن حضرت مولانا نے جو معاملہ میرے ساتھ فرمایا۔ اس نے میری ایسی ہمت افزائی کی کہ تحریری کام کا ایک شوق پیدا ہو گیا۔ اس کے بعد " القاسم " کے نام سے دارالعلوم دیوبند کا جو رسالہ حضرت مولانا کی ادارت میں نکلتا تھا میں نے اس میں مضامین لکھنے شروع کر دیئے۔

فراغت کے بعد کچھ عرصہ حالات ایسے رہے کہ مجھے تصنیف و تالیف کی طرف توجہ دینے کا موقع نہ مل سکا۔ اس لئے حضرت مولانا کو اس زمانے میں مجھ سے کچھ شاکی رہے۔ اس کے بعد جب میں نے دو تین رسالے لکھ کر انہیں دکھائے تو وہ کھل اٹھے اور فرمایا۔

" میں تو وہ کام ہے جس میں تمہیں مشغول دیکھنا چاہتا ہوں "

۳ : حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب قدس سرہ کو انتظامی صلاحیت اور سیاسی سوجھ بوجھ اس قدر غیر معمولی عطا فرمائی تھی کہ درحقیقت وہ وزیر بننے کے لائق انسان تھے۔ دارالعلوم دیوبند پر سخت سے سخت وقت آئے۔ بڑی بڑی شورشیں اٹھیں۔ لیکن میں نے اس بندۂ خدا کو کبھی ہراساں یا پریشان نہیں دیکھا سنگین سے سنگین حالات میں بھی ان کے اطمینان اور خود اعتمادی میں کبھی فرق نہیں آتا دیکھا۔

انہوں نے دارالعلوم میں خلاف اصول باتوں کو کبھی برداشت نہیں کیا۔ اور اپنے حسن تدبیر سے مدرسے کو بڑے بڑے فتنوں سے محفوظ رکھنے کی پوری کوشش کی جس کا ایک واقعہ یاد آیا ہے۔

۴ : فرمایا کہ حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب رح کو اللہ تعالیٰ نے مثالی ضبط و تحمل عطا فرمایا تھا۔ دارالعلوم دیوبند کی زمین سے متصل کسی دیوبند کے رئیس کی زمین تھی اس کا کچھ حصہ دارالعلوم کے لئے خرید لیا گیا تھا۔ اس رئیس کے انتقال کے بعد اس کے ایک وارث نے ایک روز دارالعلوم کے صحن میں پہنچ کر اس زمین کی حق داری کا دعویٰ کیا اور حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب رح کو مخاطب کر کے آواز بلند بہت برا بھلا کہنا شروع کر دیا۔

اس کا انداز گفتگو اس قدر اشتعال انگیز تھا کہ مولاناؒ کے بعض خدام کو بھی فطری طور پر اشتعال ہوا۔ اور انہوں نے بھی اس کو اسی کی زبان میں جواب دینے کا ارادہ کیا۔ لیکن مولاناؒ نے ان کو روکا۔ اور ان صاحب سے فرمایا کہ "شیخ صاحب! آپ فضول ناراض ہو گئے، ذرا اندر تشریف لائیے، اطمینان سے بات کریں گے"۔ مگر وہ صاحب بدستور غیظ و غضب کا اظہار کرتے رہے۔

مولاناؒ نے کچھ دیر بعد پھر فرمایا۔ "اندر چل کر بیٹھئے تو سہی، وہاں بات کریں گے"۔ اور پھر انہیں زبردستی دفتر اہتمام میں لے گئے۔ ان کی خاطر تواضع کی، اور جب وہ ذرا ٹھنڈے ہو گئے تو مولاناؒ اطمینان کے ساتھ اپنی جگہ سے اٹھے، ایک الماری کھولی، اس میں سے کچھ کاغذات لے کر آئے اور ان صاحب کے سامنے پھیلا دیئے کہ۔ "دیکھئے یہ زمین آپ کے مورث نے فلاں تاریخ کو دارالعلوم کے ہاتھ فروخت کر دی تھی اور اس کی رجسٹری بھی ہو چکی ہے"

ان صاحب نے کاغذات دیکھے تو بے حد شرمندہ ہوئے اور مولاناؒ نے جس صبر و ضبط اور تحمل کا مظاہرہ فرمایا اس سے بے حد متاثر ہو کر گئے۔

۵: حضرت والد صاحبؒ نے فرمایا کہ حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحبؒ کے زمانے میں دارالعلوم دیوبند کا کام بہت پھیل گیا تھا۔ بہت سے شعبے قائم ہو چکے تھے اور سینکڑوں طلباء دارالاقامہ میں رہتے تھے۔ اس لئے مولاناؒ شب و روز انتظامی کاموں میں مصروف رہتے تھے۔ اس کے باوجود ان کی نوافل اور تلاوت وغیرہ کے علاوہ روزانہ سوا لاکھ مرتبہ ذکر اسم ذات کا معمول کبھی قضا نہیں ہوا۔

۶: ایک مرتبہ دارالعلوم دیوبند کی انتظامیہ کے خلاف ایک شدید طوفان کھڑا ہوا جس میں بعض لوگ حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحبؒ کی جان تک کے دشمن ہو گئے۔ ان حالات میں بھی مولانا کھلی چھت پر تن تنہا سوتے تھے۔

حضرت والد صاحبؒ فرماتے ہیں کہ میں نے ایک مرتبہ عرض کیا کہ۔ حضرت! ایسے حالات میں آپ کا اس طرح سونا مناسب معلوم نہیں ہوتا۔ آپ کم از کم کمرے کے اندر ہی

سو جایا کریں ؟ لیکن مولانا نے بڑی بے نیازی کے ساتھ ہنس کر فرمایا ۔
" لئے میاں ! میں تو اس باپ (یعنی سیدنا حضرت عثمان غنی رض) کا بیٹا ہوں جس کے جنازے کو چار اٹھانے والے بھی میسر نہ آئے ۔ اور جسے رات کے اندھیرے میں بقیع کی نذر کیا گیا ۔ لہٰذا مجھے موت کی کیا پرواہ ہو سکتی ہے " ؟

۷۔ شیخ الادب حضرت مولانا اعزاز علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ

شیخ الادب حضرت مولانا اعزاز علی صاحب قدس سرہٗ دارالعلوم دیوبند کے ان مقبول عام اساتذہ میں سے تھے کہ جس شخص نے ان سے چند اسباق پڑھ لئے ۔ ان کا گرویدہ ہو گیا ۔ حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے عربی صرف و نحو اور ادب کی تقریباً تمام کتابیں ان ہی سے پڑھی تھیں ۔

والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ جس سال ہم نے باقاعدہ عربی پڑھنی شروع کی ۔ اسی سال حضرت شیخ الادب نے تدریس کا آغاز فرمایا ۔ پھر جوں جوں ہم آگے بڑھتے گئے ۔ حضرت مولانا کی تدریس میں آگے بڑھتے رہے ۔ اس طرح کئی سال تک مسلسل آپ ہی کے تلمذ کا شرف حاصل رہا ۔

والد صاحب رح فرماتے تھے کہ فارسی کے آخری سال ہی میں ہم نے عربی کی ابتدائی کتب میزان الصرف اور نحو میر پڑھ لی تھیں ۔ لیکن ان میں پختگی پیدا نہیں ہوئی تھی اگلے سال جب ہمارے اسباق حضرت شیخ الادب صاحب کے پاس پہنچے تو انہوں نے " مفید الطالبین " پڑھانی شروع کی ۔ اور اس کے پہلے ہی سبق میں ساری صرف و نحو کا اجراء کرانا شروع کر دیا ۔ وہ ہر ہر لفظ کے بارے میں سوالات کرتے کہ یہ اسم ہے یا فعل ، یا حرف ؟ اسم ہے تو متمکن ہے یا غیر متمکن ؟ متمکن ہے تو اس کی کون سی قسم ؟ اس کی اعرابی حالتیں کیا ہیں ؟

غرض یہ کہ ہر ہر لفظ میں پوری میزان اور نحو میر کا اجراء کرا دیا ۔ اس طرح صرف ایک

سفحے میں ہم کو ایک مہینے سے زیادہ لگ گیا۔ لیکن جب وہ صفحہ ختم ہوا تو ہمیں صرف و نحو کے بنیادی قواعد ازبر ہو گئے تھے۔

۲ ؛ حضرت والد صاحب رہ فرماتے تھے کہ مولانا رہ کے طرز تدریس کا نتیجہ یہ تھا کہ عربی کے پہلے ہی سال میں ہم عربی زبان میں مختصر مضامین لکھنے لگے تھے۔ ایک مرتبہ مولانا رہ نے ہمیں گھر پر کرنے کے لئے جو کام دیا تھا میں کسی عذر کی بنا پر وہ پورا نہ کرسکا، اور جتنا آدھا تہائی کیا تھا اس کے ساتھ ہی معذرت کے چند جملے لکھ دیئے۔ اس کے جواب میں اسی کاپی پر حضرت مولانا رہ نے یہ شعر لکھ دیا ؎

بقدر الکدّ تکتسب المعالی

ومن طلب العُلا سہر اللیالی

"جتنی محنت کی جائے اتنی ہی بلندیاں حاصل ہوتی ہیں، اور جو شخص بلندی کی جستجو میں ہو وہ راتوں کو جاگتا ہے"!

حضرت والد صاحب رہ فرماتے ہیں کہ۔ اس کے بعد میں نے کبھی گھر کے تحریری کام میں کوتاہی نہیں کی۔

۳ ؛ فرمایا کہ جب ہم حضرت مولانا اعزاز علی صاحب رہ کے پاس نفحۃ الیمن پڑھ رہے تھے تو حضرت استاذ رہ کے فیضان توجہ سے عربی میں شعر کہنے لگے تھے۔ اس کا واقعہ یہ ہوا کہ ایک مرتبہ میں نے اردو میں دو چار شعر کہے۔ کسی نے حضرت مولانا اعزاز علی، صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو اس کی اطلاع کر دی۔

مولانا رہ نے فرمایا۔ " اردو میں شعر کہے تو کیا کہے! کہنا ہو تو عربی میں کہو۔ اور اس کے ساتھ مصرعہ طرح بھی دے دیا۔ چنانچہ ہم نے اسی وقت سے عربی میں شعر کہنے کی کوشش شروع کر دی تھی۔

۴ ؛ فرمایا کہ جس سال حضرت مولانا اعزاز علی صاحب رہ کو پہلی بار "مقامات حریری" پڑھانے کے لئے دی گئی، اس سال ہم نے ان سے "مقامات" پڑھی۔ ہم دیکھتے تھے کہ مولانا رہ اس کے لئے رات بھر مطالعے میں مصروف رہتے تھے۔ اور درس اس قدر محققانہ

ہوتا تھا کہ طلبا نہال ہو جاتے تھے ۔ اسی کے ساتھ کچھ عرصے کے بعد مولانا رہ نے "حریری" کے طرز پر طلبا سے مقامے لکھوانے شروع کئے ۔ چنانچہ میں نے اسی انداز پر متعدد مقامے لکھے تھے ۔ جو عرصۂ دراز تک میرے پاس محفوظ رہے بعد میں کہیں ضائع ہو گئے ۔

۵ : مولانا رہ کے درس میں برکت کا ذکر کرتے ہوئے حضرت والد صاحب رہ فرماتے تھے کہ ہم نے ایک ہی سال میں مقامات حریری کے تیس مقامے الیسی تحقیق ، اور تمرین کے ساتھ ان سے پڑھے کہ اس کے بعد دیوان متنبی ، قافیۃ را تک اسی سال پڑھا اور یہ سب کچھ ایک ہی گھنٹے میں ہو گیا ۔ خارج میں کوئی وقت دینے کی نوبت نہیں آئی ۔

۶ : جب حضرت والد صاحب رہ نے تدریس شروع کی تو ابتدا میں خاص طور پر ادب عربی کی تدریس میں آپ کی شہرت زیادہ ہوئی ۔ "مقامات حریری" کا درس سالہا سال آپ کے پاس رہا ۔ آپ کے اس درس کی بڑی شہرت تھی ۔ اور اسے حضرت والد صاحب رہ سے پڑھنے کے لئے فارغ التحصیل علما بھی اہتمام کر کے آیا کرتے تھے ۔ حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ یہ سب کچھ حضرت شیخ الادب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی خصوصی عنایات کا نتیجہ ہے ۔

۷ : حضرت والد صاحب رہ نے بارہا ذکر فرمایا کہ حضرت شیخ الادب صاحب رہ کی یہ ادا سارے مدرسے میں مشہور تھی کہ وہ ہر کس و ناکس کو ہمیشہ ابتدا بالسلام کرنے کا اہتمام فرماتے تھے ۔ اور کوئی دوسرا شخص عام طور سے انہیں سلام کرنے کی ابتدا نہیں کر پاتا تھا ۔ بعض اوقات طلبا پہلے سے طے کر کر کے کوشش کرتے کہ آج ہم مولانا رہ کو پہلے سلام کریں گے ۔ لیکن اس کوشش میں کامیاب نہ ہوتے ۔

۸ : حضرت والد صاحب رہ نے سنایا کہ ایک مرتبہ کچھ لوگ حضرت مولانا اعزاز علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ کسی سفر پر روانہ ہوئے ۔ میں بھی ان کے ساتھ تھا ۔ سفر کے آغاز میں حضرت مولانا رہ نے فرمایا ۔ "اپنے میں سے کسی کو امیر سفر بنا لو" ہم نے عرض کیا "حضرت ! امیر تو متعین ہیں" ۔ فرمانے لگے ۔ "اگر مجھے امیر بنانا چاہتے ہو تو

پھر میری مکمل اطاعت کرنی ہوگی :

ہم نے کہا "انشاءاللہ ضرور"۔ لیکن اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب سامان اٹھانے کا مرحلہ آتا تو مولانا خود آگے بڑھ کر نہ صرف اپنا بلکہ دوسروں کا بھی، سامان اٹھا لیتے۔ ہم لوگ سامان اٹھانے پر اصرار کرتے تو مولانا فرماتے "میں امیر ہوں، میرے حکم کی اطاعت ضروری ہے"۔

اس کے بعد سارے سفر میں یہی معمول رہا، کہ جب کوئی مشقت کا کام ہوتا تو مولانا آگے بڑھتے اور ہم مداخلت کرتے تو اطاعتِ امیر کا حکم سنا کر خاموش کر دیتے۔

۹ : پاکستان آنے کے بعد بھی حضرت شیخ الادب صاحب رح سے حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی خط و کتابت جاری رہی۔ راقم کو یہ خطوط پڑھنے کی سعادت حاصل ہوئی ہے۔ حضرت مولانا رح کی تواضع کا عالم یہ تھا کہ حضرت والد صاحب کو (جو مولانا کے تلمذ کو اپنے لئے مایۂ افتخار سمجھتے تھے)، اس انداز سے خط لکھتے تھے جیسے کوئی چھوٹا اپنے بڑے کو لکھتا ہے۔

آخر عمر میں حضرت شیخ الادب صاحب رح کے ذہن میں پاکستان آنے کا رجحان پیدا ہوگیا تھا۔ اور جب حضرت والد صاحب رح کو اس کا علم ہوا تو حضرت رح سے درخواست کی تھی کہ جب بھی پاکستان تشریف لائیں۔ دارالعلوم کراچی کو اپنا مرکزِ فیض رسانی قرار دیں۔ اور حضرت شیخ الادب صاحب رح نے اس کا وعدہ بھی فرما لیا تھا۔ لیکن اس کے بعد ان کی عمر نے وفا نہ کی۔ اور وہ دیوبند ہی میں اپنے مالکِ حقیقی سے جا ملے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

۱۰ : حضرت والد صاحب رح نے آلہ مکبر الصوت کے مسئلے پر جو رسالہ لکھا، اس کے بارے میں حضرت شیخ الادب صاحب رح نے تحریر فرمایا۔

"لاؤڈ اسپیکر کا استعمال موجودہ زمانے میں اہم مسائل میں سے ہوگیا ہے اور اس کے متعلق علمائے زمانہ کی مختلف آراء شائع ہوتی رہتی ہیں اور چونکہ اس کا زیادہ تعلق نماز سے ہے اس لئے یہ اختلاف مسلمانوں کے

سلئے زیادہ موجب تشویش ہے ۔ جناب محترم مولانا مفتی محمد شفیع صاحب
نے اس کے متعلق مفصل اور مفید رسالہ لکھا ہے ۔ میں نے اس کو من اولہ
الی آخرہ سنا اور مجیب لبیب کو صمیم قلب سے دعائیں دیں ۔ خدا کرے کہ
مصنف علامہ کے اور رسائل کی طرح یہ رسالہ بھی خواص و عوام دونوں کے
لئے مفید اور عند اللہ مقبول ہو۔ آمین ۔ محمد اعزاز علی امروہوی ؒ
(آلات جدیدہ ص۵)

شیخ الاسلام حضرت علامہ شبیر احمد صاحب عثمانی ؒ

حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے جن اکابر کی صحبت اٹھائی ۔ اور جن سے آخر
وقت تک خصوصی تعلق رہا ۔ ان میں شیخ الاسلام حضرت علامہ شبیر احمد صاحب عثمانی رہ
بھی شامل ہیں ۔ آپ کا اسم گرامی کسی تعارف کا محتاج نہیں ۔ آپ کی علمی اور سیاسی زندگی
کے بارے میں مفصل کتابیں شائع ہو چکی ہیں ۔

حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ہدایہ کا کچھ حصہ اور صحیح مسلم ؒ حضرت مولانا ؒ
ہی سے پڑھی تھی ۔ اور جب مولانا ڈابھیل میں صحیح بخاری کا درس دیتے تھے تو ایک
مرتبہ بیماری کی بنا پر تدریس سے معذور ہو گئے ۔ اس موقع پر مولانا رہ نے اپنی جگہ صحیح بخاری
کا درس دینے کے لئے حضرت والد صاحب رہ کو نامزد فرمایا ۔ حضرت والد صاحب اس
وقت دارالعلوم دیوبند سے مستعفی ہو چکے تھے ۔ مولانا کی فرمائش پر ڈابھیل تشریف
لے گئے اور چند ماہ وہاں مولانا رہ کی جگہ صحیح بخاری کا درس دیا ۔

پھر جب قیام پاکستان کے لئے حضرت علامہ شبیر احمد صاحب عثمانی قدس سرہ
نے ملک گیر جد وجہد شروع کی اور اس غرض کے لئے جمعیۃ علمائے اسلام کا قیام
عمل میں آیا تو حضرت والد صاحب رہ اس پوری جد وجہد میں مولانا رہ کے دست و بازو
بنے رہے ۔ اور اس غرض کے لئے ملک کے طول و عرض میں دورے کئے ۔ متعدد

مقامات پر جہاں مولانا تشریف نہیں لے جا سکتے تھے۔ حضرت والد صاحب رہ کو اپنی جگہ بھیجا۔ اور سرحد ریفرنڈم کے موقع پر پورے صوبہ سرحد کا دورہ کرتے ہوئے والد صاحب رہ کو اپنے ساتھ رکھا۔

پاکستان بننے کے بعد جب یہاں اسلامی دستور کی جدوجہد کا آغاز ہوا۔ تو شیخ الاسلام حضرت علامہ شبیر احمد صاحب عثمانی رہ ہی کی دعوت پر حضرت والد صاحب رہ پاکستان تشریف لائے۔ انہی کی ہدایت پر تعلیمات اسلامی بورڈ میں شامل ہوئے۔ جو اسلامی دستور کا خاکہ مرتب کرنے کے لئے بنایا گیا تھا۔ پھر مولانا کی وفات تک ہر اہم معاملے میں ان کے شریک کار رہے۔ اور حضرت مولانا کی نماز جنازہ پڑھانے کی سعادت بھی آپ ہی کو حاصل ہوئی۔

حضرت علامہ شبیر احمد صاحب عثمانی قدس سرہٗ پاکستان کے صف اول کے معماروں میں شامل تھے۔ قائداعظم اور نواب زادہ لیاقت علی خان مرحوم تقسیم ملک کے وقت آپ کو اپنے ساتھ پاکستان لے آئے تھے اور مغربی پاکستان میں پاکستان کا پرچم، سب سے پہلے مولانا ہی نے لہرایا۔

اگر آپ چاہتے تو یہاں اپنے لئے بہت کچھ دنیوی ساز و سامان اور عہدہ ومنصب حاصل کر سکتے تھے۔ لیکن مولانا رہ نے آخر وقت تک درویشانہ زندگی گزاری۔ اپنے لئے کوئی ایک مکان بھی حاصل نہ کیا۔ بلکہ وفات کے وقت تک دو مستعار لئے ہوئے کمروں میں مقیم رہے۔ اور اس حالت میں دنیا سے تشریف لے گئے۔ کہ نہ آپ کا کوئی بنک بیلنس تھا، نہ ذاتی مکان تھا، نہ ساز و سامان۔

۱۹۴۸ء میں جب حضرت والد صاحب رہ پاکستان تشریف لائے تو روزانہ شام کے وقت حضرت علامہ رہ کے پاس جانے کا معمول تھا۔ راقم الحروف اس وقت بہت کمسن تھا اور اکثر حضرت والد صاحب رہ کے ساتھ مولانا کی خدمت میں چلا جایا کرتا تھا۔ اس زمانے میں کراچی میں کوئی معیاری علمی مرکز نہیں تھا۔ کوئی علمی کتب خانہ بھی نہ تھا۔ لہذا جب کسی علمی مسئلے کی تحقیق مقصود ہوتی تو مولانا رہ حضرت والد صاحب رہ کے پاس تشریف لے

آتے۔ کیوں کہ والدصاحب رہ اپنے ساتھ اپنی ذاتی کتابوں کا ذخیرہ لے آئے تھے۔ چنانچہ ہمارے مکان پر علمی اور فقہی مجلسیں رہتیں۔ اور مولانا اپنے ضعف و علالت کے باوجود علمی پیاس بجھانے کے لئے تین منزلہ مکان کی سیڑھیاں طے کر کے پہنچ جایا کرتے تھے۔ اللہ تعالے نے حضرت علامہ شبیر احمد صاحب عثمانی رہ کو تحریر اور تقریر دونوں کا منفرد ملکہ عنایت فرمایا تھا۔ خاص طور سے آپ کی خطابت انتہائی مؤثر اور دلنشین ہوتی تھی۔ اور آپ مختلف جملوں کے ذریعے اپنی بات دلوں میں اتار دیتے تھے۔ حضرت والد صاحبؒ سے سنے ہوئے حضرت علامہ عثمانی رہ کے چند جملے اس وقت یاد آگئے۔

۱ : فرمایا کہ "حق بات اگر حق نیت سے اور حق طریقے سے کہی جائے تو کبھی رائیگاں نہیں جاتی۔ اس کا کچھ نہ کچھ اثر ضرور ہوتا ہے۔ بات جب بھی بے اثر ہوگی تو یا تو وہ خود حق بات نہ ہوگی یا بات حق ہوگی مگر کہنے والے کی نیت حق نہ ہوگی، یا بات بھی حق ہوگی، نیت بھی حق ہوگی لیکن کہنے کا طریقہ صحیح نہیں ہوگا۔ لیکن اگر یہ تینوں شرائط موجود ہیں تو بات کے غیر مؤثر ہونے کا کوئی سوال ہی نہیں"

۲ : فرمایا کہ "دنیا کی جنت یہ ہے کہ زوجین ایک موں اور نیک "

۳ : حضرت علامہ عثمانی رہ پاکستان کی پہلی دستور ساز اسمبلی کے رکن تھے اور وہاں شب و روز اسلامی دستور کے سلسلے میں دوسرے ارکان سے بحث و مباحثہ رہتا تھا۔ ایک مرتبہ مولانا کی کسی تجویز پر غالباً (سابق گورنر جنرل) غلام محمد صاحب نے یہ طعنہ دیا کہ "مولانا یہ امور مملکت ہیں، علماء کو ان باتوں کی کیا خبر؟ لہٰذا ان معاملات میں علماء کو دخل اندازی نہ کرنی چاہیئے "

اس موقع پر حضرت علامہ رہ نے جو تقریر فرمائی اس کا ایک بلیغ جملہ یہ تھا۔

"ہمارے اور آپ کے درمیان صرف لے (بی، اے، ڈی کے پردے حائل ہیں، ان مصنوعی پردوں کو اٹھا کر دیکھئے تو پتہ چلیگا کہ علم کس کے پاس ہے اور جاہل کون ہے ؟ "

۴ : بعض لوگوں کو اسلامی دستور یا اسلامی قانون کا تصور آتے ہی یہ خطرہ دامنگیر

ہو جاتا ہے کہ اسلامی دستور و قانون کے نفاذ سے ملک میں تھیوکریسی قائم ہو جانے گی۔ ایک مرتبہ اسی قسم کا کوئی معاملہ اسمبلی میں زیر بحث تھا۔ اس موقع پر حضرت علامہؒ نے ارشاد فرمایا۔

"آپ کو ملّا سے یہ خطرہ ہے کہ وہ کہیں اقتدار پر قابض نہ ہو جائے لیکن خوب اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ ملّا کا ایسا کوئی ارادہ نہیں ملّا اقتدار پر قبضہ کرنا نہیں چاہتا، البتہ اصحاب اقتدار کو تھوڑا سا ملّا ضرور بنانا چاہتا ہے [1]"

۵ : وطن کے سلسلے میں حضرت علامہ عثمانی ؒ کا ایک ارشاد حضرت والد صاحب بکثرت نقل فرماتے تھے۔ اور اسے اپنے "سفرنامہ دیوبند و تھانہ بھون" میں بھی تحریر فرمایا ہے۔

"یاد آیا کہ میرے استاذ محترم اور برادر مکرم شیخ الاسلام حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک روز " وطن " پر تقریر کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ ہر شخص کے تین وطن ہیں۔ ایک جسمانی، دوسرا ایمانی، تیسرا روحانی۔ وطن جسمانی وہ جگہ ہے جہاں وہ پیدا ہوا۔ وطن ایمانی مومن کا مدینہ طیبہ ہے جہاں اس کو نور ایمان ملا، اور وطن روحانی جنت ہے جہاں عالم ارواح میں اس کا اصلی مستقر تھا۔ اور پھر پھرا کر پھر وہیں جانا ہے" (نقوش و تاثرات ص

---

[1] علما کی اصل پالیسی شروع سے یہی تھی کہ نہ الیکشن میں حصہ لیں، نہ اقتدار میں آئیں، اور اگر ارباب اقتدار اسلامی دستور و قانون کے نفاذ کے سلسلے میں ملک بھر کا مطالبہ تسلیم کر لیتے تو کسی اہل علم کو الیکشن کی سیاست میں حصہ لینے کی ضرورت نہ ہوتی۔ لیکن افسوس ہے کہ ایسا نہ ہوا۔ اور اس کے بعد بعض علمائے کرام مجبور ہو کر الیکشن کی سیاست میں داخل ہو گئے۔

۴ ؛ حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ حضرت علامہ عثمانی ؒ علم و فضل کے پہاڑ تھے اور اللہ تعالےٰ نے حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی قدس سرہٗ بانی دارالعلوم دیوبند کو جو علوم وہبی عطا فرمائے تھے خاص طور سے فلسفہ و کلام اور حکمت دین کے بارے میں حضرت نانوتوی رہ کو جو دقیق معارف عطا ہوئے تھے وہ اچھے اچھے علماء کی سمجھ میں نہیں آتے ۔ لیکن علمائے دیوبند کی جماعت میں دو بزرگ ایسے ہیں جنہوں نے حکمت قاسمی کی شرح و توضیح اور اسے اقرب الی الفہم بنانے میں نمایاں خدمات انجام دی ہیں ۔ ایک حضرت علامہ شبیر احمد صاحب عثمانی ؒ اور دوسرے حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب مدظلہم العالی ۔

۷ ؛ حضرت والد صاحب ؒ ہی سے سنا کہ جب حضرت علامہ عثمانی ؒ نے صحیح مسلم پر اپنی شہرۂ آفاق شرح " فتح الملہم " تالیف فرمائی تو اس کا مسودہ حرمین شریفین لے کر گئے تھے ۔ وہاں روضۂ اقدس کے سامنے بیٹھ کر اس کی ورق گردانی کی ۔ اور پھر روضۂ اقدس پر بھی ، اور حرم مکہ میں ملتزم پر بھی مسودہ سر پر رکھ کر دعا کی تھی کہ ۔

" یہ مسودہ احقر نے بے سرو سامانی کے عالم میں مرتب کیا ہے ،
یا اللہ ! اس کو قبول فرما لیجئے ۔ اور اس کی اشاعت کا انتظام
فرما دیجئے " ۔

اس کے بعد جب حرمین شریفین سے واپس آئے تو نظام حیدر آباد کی طرف سے پیشکش کی گئی کہ ہم اس کتاب کو اپنے اہتمام سے شائع کرائیں گے ۔ چنانچہ وہ نظام حیدر آباد ہی کے مصارف پر بڑی آب و تاب کے ساتھ شائع ہوئی اور اس نے پوری علمی دنیا سے اپنا لوہا منوالیا ۔

۸ ؛ حضرت والد صاحب ؒ حضرت علامہ عثمانی ؒ کی اردو تصانیف میں تفسیر عثمانی ؒ کے علاوہ " اسلام " " العقل والنقل " اور " اعجاز قرآن " کی بہت تعریف فرمایا کرتے تھے ۔ اور کئی مرتبہ اپنی اس خواہش کا اظہار فرمایا کہ ان کتابوں کا انگریزی میں ترجمہ ہو جائے ۔ اپنے بعض انگریزی داں متعلقین کو اس طرف متوجہ بھی فرمایا ۔ لیکن افسوس ہے

کہ یہ کام حضرت والد صاحب رہ کی حیات میں انجام نہ پا سکا۔ ولعل اللہ یحدث بعد ذالک امرًا۔

۹۱ حضرت والد صاحب رہ فرمایا کرتے تھے کہ اللہ تعالٰی نے حضرت علامہ عثمانی رہ کو خطابت کا غیر معمولی کمال عطا فرمایا تھا۔ لیکن ساتھ ہی طبیعت میں نزاکت اور نفاست بھی بہت تھی۔ چنانچہ جب طبیعت میں ادنیٰ تکدر ہوتا۔ تو وعظ و تقریر پر آمادگی ختم ہو جاتی تھی۔

فیروز پور میں جب قادیانیوں کے ساتھ ہمارا مناظرہ ختم ہوا۔ تو اہل شہر نے رات کے وقت ایک بڑے جلسہ عام کا اہتمام کیا۔ خیال یہ تھا کہ اس وقت فیروز پور میں اکابر علمائے دیوبند جمع ہیں۔ جن میں حضرت شاہ صاحب رہ۔ حضرت مولانا مرتضٰے حسن خان صاحب رہ حضرت علامہ شبیر احمد صاحب عثمانی رہ وغیرہ جیسے آفتاب و ماہتاب شامل ہیں۔ اس لئے اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اہل شہر کو ان سے مستفید کیا جائے۔ یوں تو یہ تمام ہی حضرات علم و فضل میں اپنی نظیر آپ تھے۔ لیکن جہاں تک خطابت کا تعلق ہے سب کی نظریں علامہ عثمانی پر لگی ہوئی تھیں۔ کیونکہ ان کی تقریر عالمانہ ہونے کے ساتھ عام فہم بھی ہوتی تھی۔ اور عام لوگ اس کا اثر زیادہ قبول کرتے تھے۔ چنانچہ جلسے کے پروگرام میں آپ کی تقریر کا بھی اعلان کر دیا گیا۔

لیکن جب جلسے کا وقت قریب آیا تو حضرت علامہ عثمانی رہ کی طبیعت کچھ ناساز ہو گئی تقریر کے لئے انشراح باقی نہ رہا۔ اور مولانا نے تقریر سے عذر کر دیا۔ جتنے علماء اس وقت موجود تھے ان سب نے مولانا کو آمادہ کرنا چاہا، مگر مولانا آمادہ نہ ہوتے بلکہ حضرت مولانا مرتضٰے حسن خان صاحب رہ مولانا پر ناراض بھی ہوئے۔

لیکن میں جانتا تھا کہ مولانا اس معاملے میں معذور ہیں۔ اور جب تک از خود آمادگی پیدا نہ ہو، وہ تقریر نہیں فرما سکتے، اس لئے میں خاموش رہا۔ یہاں تک کہ جب تمام حضرات جلسے میں جانے لگے تو میں نے ان سے عرض کیا کہ آپ حضرات تشریف لے جائیں میں بعد میں آؤں گا۔ اب قیام گاہ پر صرف میں حضرت علامہ عثمانی رہ کے ساتھ رہ گیا۔ جب کچھ دیر

گزری تو میں نے عرض کیا۔

"حضرت! آپ کی طبیعت میں کچھ انقباض ہے یہاں قیام گاہ پر تنہا رہنے سے یہ انقباض اور بڑھے گا اگر آپ جلسے میں صرف تشریف لے جائیں اور بیان نہ کریں تو شاید کچھ طبیعت بہل جائے"

فرمانے لگے کہ "لوگ مجھے خطاب پر مجبور کریں گے" میں نے عرض کیا کہ وہ اس کا میں ذمہ لیتا ہوں۔ کہ آپ کی رضامندی اور خوش دلی کے خلاف کوئی آپ سے اصرار نہ کرے گا۔ مولانا رح اس بات پر راضی ہو گئے۔ اور تھوڑی دیر بعد ہم جلسہ گاہ پہنچ گئے۔ وہاں پر دوسرے علمائے کرام تقریر کرتے رہے۔ یہاں تک کہ مجمع کا ذوق و شوق دیکھ کر حضرت علامہ عثمانی رح کے دل میں خود بخود آمادگی پیدا ہوگئی۔ اور پھر خود ہی اسٹیج سیکرٹری سے کہا کہ "میں بھی کچھ کہوں گا" اس کے بعد تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ مولانا کی تقریر ہوئی۔ جس نے حاضرین کو سیراب کر دیا۔

۱۰: حضرت والد صاحب رح فرمایا کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت علامہ عثمانی رح کو تحریر کا بھی خاص ملکہ عطا فرمایا تھا۔ اور جب حضرت شیخ الہند قدس سرہ نے آزادئ ہند کی جد وجہد کے لئے جمعیۃ علماء ہند قائم فرمائی اور اس غرض کے لئے دہلی میں ایک عظیم الشان اجلاس طلب فرمایا تو اس کا خطبہ صدارت حضرت شیخ الہند رح کو دینا تھا۔ حضرت رح کو خود لکھنے کا موقع نہ تھا۔ اس لئے اپنے تلامذہ میں سے متعدد حضرات کو یہ خطبہ لکھنے پر مامور فرمایا۔

آپ کے متعدد تلامذہ نے اپنے اپنے انداز میں یہ خطبہ لکھا لیکن بالآخر حضرت نے جس خطبے کو پسند اور منظور فرمایا۔ وہ حضرت علامہ عثمانی رح کا تحریر فرمودہ تھا چنانچہ حضرت نے وہی خطبہ پڑھا اور وہی شائع بھی ہوا۔

لہ حاشیہ صفحہ گزشتہ: اس مناظرے کی تفصیل خود حضرت والد صاحب کے قلم سے مولانا محمد یوسف لدھیانوی صاحب نے اپنے مقالے "مفتی اعظم اور رد مرزائیت" میں بیان فرمائی ہے یہ مقالہ اسی نمبر میں دوسری جگہ شائع ہو رہا ہے"

۱۱۔ حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ حضرت علامہ عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کا رشتہ داری کا بھی تعلق تھا اور حضرت والد صاحب آپ کے شاگرد بھی تھے اور پھر تحریک پاکستان کی جد وجہد میں آپ کے دست و بازو بھی بنے رہے، ان تمام رشتوں کے نتیجے میں حضرت علامہ عثمانی، والد صاحب سے بہت محبت فرماتے تھے۔ اور آپ کی علمی وعملی صلاحیتوں کے معترف تھے۔ دو قومی نظریے کے بارے میں حضرت والد صاحب نے ایک استفسار کے جواب میں جو مفصل رسالہ لکھا اس پر بطور تقریظ علامہ عثمانی نے تحریر فرمایا۔

"میں نے اس فتوے کا بالاستیعاب مطالعہ کیا، ماشاء اللہ مسئلہ کو بالکل صاف کر دیا ہے اہل علم و نظر کے لئے گنجائش نہیں چھوڑی۔ سب اطراف وجوانب واضح ہو کر سامنے آ گئے ہیں حق تعالی سبحانہٗ مفتی صاحب کو جزائے خیر دے"

شبیر احمد عثمانی دیوبند،
۱۱ ذی الحجہ ۱۳۶۳ھ (جواہر الفقہ ص ۲۸۸ ج ۲)

اور حضرت والد صاحب کے رسالہ " نیل المآرب فی المسح علی الجوارب " پر تحریر فرماتے ہیں۔

میں نے مسح علی الجوربین کی بحث پڑھی، حق تعالی مفتی صاحب کے اعمال اور علوم میں برکت دے، نہایت تحقیق وتفتیش سے جواب لکھا ہے۔ بہر حال میرے نزدیک مفتی صاحب کی تحقیق صحیح ہے۔ (فتاویٰ دار العلوم دیوبند ص ۲۹۸ و ۲۹۹ ج ۲)

شیخ الاسلام حضرت مولانا
سید حسین احمد مدنی قدس سرہٗ

حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی قدس سرہٗ کی ذات کسی تعارف کی محتاج

نہیں ہے۔ حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اگرچہ کوئی کتاب حضرت مدنی رح سے
نہیں پڑھی لیکن ہمیشہ آپ کو اپنے اساتذہ ہی کے درجے میں سمجھا اور آپ کے ساتھ استاذ
ہی کا معاملہ فرمایا۔ جس زمانے میں حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو دارالعلوم دیوبند میں
فتوے کی خدمت سپرد کی گئی اس دور میں حضرت مدنی رح مدرسہ کے صدر مدرس اور شیخ الحدیث
تھے۔ اس لئے ان سے علمی مسائل میں استفادہ اور مشورہ کا سلسلہ بکثرت رہتا تھا۔

آزادیٔ ہند کے طریق کار کے مسئلے میں علمائے دیوبند کے درمیان جو اختلاف رونما
ہوا وہ ہر پڑھے لکھے شخص کو معلوم ہے۔ حکیم الامت حضرت تھانوی رح اور حضرت
علامہ شبیر احمد صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ مسلمانوں کے لئے ایک
الگ مملکت ہونی چاہئے تاکہ وہاں مسلمان کسی غیر مسلم اکثریت کے اشتراک کے
بغیر حکمرانی کر سکیں۔ اور وہاں پر اسلامی شریعت نافذ ہونے کے امکانات پیدا ہوں۔
دوسری طرف حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ اور بعض دوسرے علمائے دیوبند برصغیر کی
تقسیم کو مسلمانوں کے لئے، خاص طور سے اقلیتی صوبوں کے مسلمانوں کے لئے مضر
سمجھتے تھے۔ اس لئے وہ تقسیم ملک کے خلاف تھے۔

قیام پاکستان سے ذرا پہلے دونوں نقطہ ہائے نظر کا اختلاف اپنے عروج پر
تھا، لیکن یہ بھی ایک مثالی اختلاف تھا۔ دونوں فریق دیانت داری سے جس موقف کو
اسلام اور مسلمانوں کے حق میں مفید سمجھتے تھے اس پر نہ صرف مضبوطی سے قائم بلکہ
اس کی کامیابی کے لئے عملاً کوشاں تھے۔ اور اس مسئلے میں چونکہ حضرت والد صاحب
رحمۃ اللہ علیہ کا موقف حضرت تھانوی رح اور حضرت علامہ عثمانی قدس سرہٗ کے موقف
کے مطابق تھا اس لئے حضرت مدنی قدس سرہٗ سے رائے کا یہ اختلاف ناگزیر تھا۔
لیکن دونوں فریقوں میں سے ہر ایک کا موقف چونکہ خلوص و للہیت اور مسلمانوں کی خیر خواہی
پر مبنی تھا اس لئے ان بزرگوں نے اختلاف کو اس کی حدود میں رکھنے کی وہ مثالیں قائم کی
ہیں جو آنے والی نسلوں کے لئے مشعل راہ بنی رہیں گی۔

حضرت مدنی قدس سرہٗ سے اس مسئلے میں اختلاف کے باوجود حضرت والد صاحب

قدس سرہ جس عظمت اور اجلال و اکرام کے ساتھ حضرت مدنی رہ کا تذکرہ فرمایا کرتے تھے وہ قابل دید تھا۔ احقر کو کبھی یاد نہیں ہے کہ حضرت والد صاحب رہ نے کبھی حضرت مدنی رہ سے اختلاف رائے کا ذکر فرمایا ہو۔ اور اسی کے ساتھ آپ کے علمی و عملی کمالات کا اہتمام کے ساتھ تذکرہ نہ فرمایا ہو۔ چنانچہ حضرت مدنی قدس سرہ سے متعلق حضرت والد صاحب سے سنی ہوئی چند باتیں ذیل میں پیش خدمت ہیں۔

۱ : فرمایا کہ جب حضرت مدنی قدس سرہٗ حدیث کا درس دینے کے لئے دارالعلوم دیوبند تشریف لانے تو آپ نے دارالعلوم کے اساتذہ پر مشتمل ایک "مجلس علمی" قائم فرمائی۔ اس مجلس کا مقصد یہ تھا کہ اساتذہ باہم بیٹھ کر علمی مذاکرات کریں۔ اور جس استاذ کو کوئی علمی اشکال پیش آیا ہو وہ سب کے سامنے رکھے۔ اور اس پر تبادلۂ خیال ہو۔ چنانچہ معمول یہ تھا کہ ہر جمعرات کو تمام اساتذہ اپنے اپنے گھروں سے کھانا منگوا لیتے، اجتماعی طور سے کھانا بھی ہوتا اور علمی مسائل بھی زیر بحث رہتے تھے۔ یہ بڑی دل چسپ مجلس ہوتی تھی، جس میں اساتذہ کو ایک دوسرے کی معلومات سے استفادے کا موقع ملتا تھا۔ اور حضرت مدنیؒ اس مجلس کی روح رواں ہوتے تھے۔

۲ : حضرت والد صاحب رہ فرمایا کرتے تھے کہ حضرت مدنی قدس سرہٗ کا یہ عظیم احسان میں کبھی نہیں بھول سکتا کہ انہوں نے مجھے علم حدیث کی طرف متوجہ فرمایا۔ اور اصرار کر کے مجھے حدیث کی تدریس پر آمادہ کیا۔ اس سے پہلے میں علوم آلیہ سے لے کر تفسیر اور فقہ تک ہر علم و فن کی کتابیں دارالعلوم میں پڑھا چکا تھا۔ لیکن حدیث پڑھانے کا موقع نہیں ملا تھا۔ اس کا واقعہ بیان کرتے ہوئے حضرت والد صاحب رہ خود تحریر فرماتے ہیں۔

> "جب آپ سلہٹ میں تشریف رکھتے تھے تو وہاں حدیث پڑھانے کے لئے ایک مدرس کی ضرورت پیش آئی، مجھے والا نامہ تحریر فرما کر بلایا۔ میں نے عذر کیا کہ اس وقت تک دارالعلوم میں مجھے کبھی حدیث پڑھانے کا اتفاق نہیں ہوا۔
>
> اس پر تقاضا کا خط آیا کہ ایسا کیوں کیا؟ حدیث کی تعلیم کو ضروری سمجھو!

پھر دیوبند تشریف آوری کے وقت دوبارہ حکم دیا۔ میں نے عرض کیا کہ حضرت! جہاں استاذ محترم حضرت شاہ صاحب درس حدیث دیتے ہوں، وہاں ایسا احمق کون ہوگا جو مجھ سے حدیث پڑھنے کو گوارا کرے گا؟
فرمایا نہیں، کوئی نہ کوئی کتاب حدیث کی ضرور پڑھایا کرو! اور پھر بار بار اس کا تقاضا فرمایا، بالآخر دارالعلوم کی طرف سے سب سے پہلے مؤطا امام مالکؒ کا درس میرے سپرد ہوا۔ اور اس کے بعد دورۂ حدیث کی دوسری کتابیں پڑھانے کی نوبت آئی"

(نقوش و تاثرات ص ۲۳)

۳ : حضرت والد صاحب رہ اکثر فرمایا کرتے تھے کہ عام طور سے لوگوں نے حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ کی صرف سیاسی جدوجہد کو ان کا اصل کمال سمجھ لیا، حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں سالہاسال حضرت شیخ الہند قدس سرہٗ کی خدمت وصحبت میں رہنے کی جو توفیق عطا فرمائی۔ انہوں نے اپنے شیخ رہ کی خدمت اور عقیدت ومحبت میں اپنے آپ کو جس طرح فنا کیا اور اپنی عام زندگی میں اپنے شیخ کے اوصاف وکمالات کو جس طرح منعکس کرنے کی کوشش کی۔ حضرت مدنی رہ کی عظمت کے اس پہلو کو اتنا اجاگر نہیں کیا گیا جتنا اس کا حق تھا۔

۴ : فرمایا کہ اگرچہ حضرت مدنی رہ کو حضرت تھانوی رہ کے سیاسی مسلک سے اختلاف تھا لیکن ان کے قلب میں نہ صرف یہ کہ حضرت تھانوی رہ کی قدر ومنزلت کم نہ تھی بلکہ وہ حضرت تھانوی رہ کے ساتھ اپنے بڑوں جیسا معاملہ ہی فرماتے تھے۔ چنانچہ مجھے یاد ہے کہ عین اُس زمانے میں جب کہ حضرت تھانوی رہ اور حضرت مدنی رہ کا سیاسی اختلاف الم نشرح ہوچکا تھا۔ ایک مرتبہ حضرت مدنی رہ نے دیوبند کے بعض اساتذہ سے کہا کہ۔
"عرصہ ہوا ہمارا تھانہ بھون جانا نہیں ہوا، اور حضرت تھانوی رہ کی زیارت کو دل چاہتا ہے" چنانچہ حضرت مدنی رہ اور دارالعلوم کے بعض دوسرے اساتذہ (جن میں شیخ الادب حضرت مولانا اعزاز علی صاحب رہ کا اسم گرامی احقر کو یقینی طور سے یاد ہے، باقی

کانہیں ، تھانہ بھون روانہ ہوئے ۔ اتفاق سے گاڑی رات گئے تھانہ بھون پہنچی ۔ اور یہ حضرات ایسے وقت خانقاہ کے دروازے پر پہنچے کہ خانقاہ بند ہو چکی تھی ۔ ان حضرات کو یہ معلوم تھا کہ خانقاہ کا نظام الاوقات مقرر ہے ۔ اس لئے اُس نظام کی خلاف ورزی مناسب سمجھی ۔ اور نہ حضرت تھانوی رح کو رات گئے تکلیف دینا پسند آیا ۔ اللہ تعالےٰ نے حضرت مدنی قدس سرہ کو بڑا جفاکش اور مجاہدانہ زندگی کا عادی بنایا تھا ۔ چنانچہ آپ نے اپنے رفقاء سمیت خانقاہ کے دروازے کے سامنے چبوترے ہی پر لیٹ کر سو گئے ۔

حضرت تھانوی قدس سرہ فجر کی اذان کے وقت جب اپنے مکان سے خانقاہ کی طرف تشریف لائے تو دیکھا کہ کچھ لوگ باہر چبوترے پر لیٹے ہیں ۔ اندھیرے میں صورتیں نظر آئیں ، چوکیدار سے پوچھا تو اس نے بھی لاعلمی کا اظہار کیا ۔ قریب پہنچ کر دیکھا تو حضرت مدنیؒ اور حضرت مولانا اعزاز علی صاحب رح جیسے حضرات تھے ۔

حضرت تھانوی رح نے اچانک انہیں دیکھا تو مسرور بھی ہوئے اور اس بات کا صدمہ بھی ہوا کہ یہاں پہنچ کر اس حالت میں انہوں نے رات گزاری ۔ چنانچہ ان سے پوچھا کہ "حضرت ! آپ یہاں کیوں سو گئے" ؟

حضرت مدنی رح نے فرمایا کہ "ہمیں معلوم تھا کہ آپ کے یہاں ہر چیز کا نظم مقرر ہے خانقاہ اپنے مخصوص وقت پر بند ہو جاتی ہے اور پھر نہیں کھلتی" ۔ حضرت تھانوی رح نے فرمایا ۔ "خانقاہ کا تو نظم بلاشبہ یہی ہے ، لیکن غریب خانہ تو حاضر تھا ۔ اور اس پر تو آپ جیسے حضرات کے لئے کوئی پابندی نہ تھی" ۔ حضرت مدنی رح نے فرمایا کہ "ہم نے رات گئے آپ کو تکلیف دینا مناسب نہ سمجھا" ۔

غرض اس طرح یہ حضرات تھانہ بھون گئے ۔ اور ایک دو روز رہ کر واپس تشریف لے آئے ۔

حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ یہ واقعہ سنانے کے بعد فرمایا کرتے تھے کہ کوئی شخص اس للّٰہیت اور اس تواضع و مسکنت کی مثال پیش کر کے دکھائے کہ

عین اختلافات کے عالم میں بھی یہ حضرات کیسی سادگی، اور کیسی بے تکلفی، اور کیسی بے نفسی کے ساتھ ایک دوسرے سے پیش آتے تھے۔ اللہ اکبر!

۳۔ کپڑے کے وہ باریک موزے جو ثخین نہ ہوں، لیکن ان کے تلے پر چمڑا چڑھا ہوا ہو۔ جنہیں فقہاء رقیق منعل کہتے ہیں۔ ان پر مسح کے جواز میں فقہائے حنفیہ کا کچھ اختلاف رہا ہے۔ اس مسئلے میں حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا فتویٰ یہ تھا کہ ان پر مسح جائز نہیں (جس کے تفصیلی دلائل کے لئے حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ایک مستقل رسالہ تحریر فرمایا ہے جو فتاویٰ دارالعلوم دیوبند میں شائع ہو چکا ہے) لیکن حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ کا رجحان جواز کی طرف تھا۔ اس مسئلے پر زبانی گفتگو تو کئی بار ہوئی لیکن کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ ایک دن حضرت مدنی قدس سرہ نے فرمایا کہ اس مسئلے کی تحقیق کے لئے میں کچھ وقت فارغ کر کے دارالافتاء میں آؤں گا۔ چنانچہ ایک دن حضرت تشریف لائے اور کتابوں کی مراجعت کر کے گفتگو ہوتی رہی۔ حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ اپنے دلائل بیان فرماتے۔ اور میں اپنے شبہات پیش کرتا رہا۔ یہاں تک کہ یہ گفتگو تین روز کے قریب چلی۔ اور آخر میں حضرت مدنی قدس سرہ نے فرمایا کہ۔ بات آپ کی بھی بے وزن نہیں ہے لیکن میرا اس پر انشراح نہیں ہوتا۔ اور آپ کو میرے دلائل پر اطمینان نہیں ہو رہا۔ اس لئے آپ اپنے موقف پر رہیں اور میں اپنے موقف پر۔"

حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ۔ اس واقعے کے کچھ عرصے کے بعد ایک مرتبہ حضرت مدنی قدس سرہ میرے بہنوئی حضرت مولانا نبیہ حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے مکان پر تشریف لائے میں بھی حاضر تھا۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے اس وقت ایسے ہی موزے (یعنی رقیق منعل) پہنے ہوتے تھے۔ مغرب کی نماز کا وقت ہوا تو حضرت مدنی قدس سرہ نے ان موزوں پر مسح فرمایا۔ اور ارشاد فرمایا کہ "مفتی صاحب! آپ کے نزدیک تو یہ مسح درست نہیں ہوا، اس لئے میرے پیچھے آپ کی نماز بھی نہ ہو گی۔ اب آپ ہی امامت فرمائیں۔" حضرت کے ارشاد پر میں نے بھی تکلف نہیں کیا اور اس روز خود امامت کی۔

حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ یہ واقعہ نقل کرنے کے بعد ارشاد فرمایا کرتے تھے کہ ان حضرات نے اختلاف کرنے کا طریقہ بھی اپنے عمل سے سکھا یا ہے

۴ : حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے جب " سیرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم " تالیف فرمائی۔ تو حضرت والد صاحب رہ نے حضرت مدنی رہ کی خدمت میں پیش کی۔ اس کے بعد جب دوسرا ایڈیشن طبع ہونے لگا تو حضرت مدنی رہ اس وقت سلہٹ میں مقیم تھے۔ حضرت والد صاحب رہ نے دوبارہ کتاب کا ایک نسخہ ان کی خدمت میں ارسال فرمایا ، حضرت مدنی قدس سرہ نے اس پر ایک مکتوب میں بطور تقریظ ارشاد فرمایا کہ :-

"میں آپ کے رسالے کے پہلے ہی ایڈیشن کو حرفاً حرفاً دیکھ چکا ہوں اور نہایت موزوں پاکر نصاب میں داخل کر چکا ہوں۔ عنقریب اس کے متعلق ایک جلسہ کرلا۔ میں منعقد ہوگا۔ اور یہ نصاب انشاء اللہ تمام صوبہ بنگال و آسام کے قومی مدارس کے لئے معمول بہ ہوگا۔ بقیہ حصص جلد تکمیل کے درجے کو پہنچنے چاہئیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جناب مولانا تھانوی دامت برکاتہم اور دیگر بزرگوں کی تحریرات کے بعد ہم جیسے ناکاروں کا کچھ بھی لکھنا منہ چڑانا اور سخت بے ادبی ہے "

○

" تجربہ شاہد ہے جب تقویٰ اور خوفِ خدا و آخرت غالب ہوتا ہے تو بڑے بڑے جھگڑے منٹوں میں ختم ہو جاتے ہیں، باہمی منافرت کے پہاڑ گرد بن کر اڑ جاتے ہیں۔

یعنی ان لوگوں کو کسی جنگ و جدل اور جھگڑے سے تو کیا دلچسپی ہوتی، ان کو تو خلائق کی صلح اور دوستی کے لیے بھی فرصت نہیں ملتی کیونکہ جس کا قلب اللہ تعالیٰ کی محبت و خوف اور یاد میں مشغول ہو اس کو دوسروں سے تعلقات بڑھانے کی کہاں فرصت ہے "

(حضرت مفتی اعظم ، معارف القرآن ص ۱۰۷ ج ۴)

محمد ولی رازی ایم۔اے

والد ماجدؒ کے آخری شب و روز

مجسّم شفقت و رحمت، حضرت والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ کے نام مبارک کے ساتھ آج "مدظلہم" کی بجائے "رحمۃ اللہ علیہ" کے الفاظ لکھتے ہوئے دل و دماغ رنج و الم، اور حسرت و محرومی کی جس کیفیت سے دوچار ہیں، ان کے اظہار کی نہ احقر کے بس کی بات ہے، اور نہ الفاظ میں وہ وسعت و گنجائش ہے جو اس کیفیت کو بیان کر سکیں، آج ۲۲ دن کے بعد بھی قلب کو پوری طرح یہ یقین دلانے سے احقر قاصر رہا ہے کہ حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا سایۂ شفقت و رحمت، جو نہ صرف ہم تمام اہل خاندان کیلئے بلکہ تمام مسلمانوں کیلئے اللہ جل شانہ کی ایک عظیم نعمت تھا ہمارے سروں سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اُٹھ گیا ہے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّآ اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔ یہ کیفیت صرف احقر ہی کی نہیں بلکہ خاندان کے تمام افراد اور شاید مسلمانوں میں سے ہزاروں افراد آج اسی کیفیت سے دوچار ہیں، لیکن مشیت الٰہی کے سامنے بلا چون و چرا سر جھکا دینا ہی ہر مومن کا فرض ہے، اور حق تعالیٰ کی حاکمیت اور انکی حکمتوں کے استحضار ہی میں ہمارے تمام غموں اور مصیبتوں کا علاج پوشیدہ ہے اللہ تعالیٰ ہم سب کے زخموں کے لئے صبر جمیل کا شافی مرہم عطا فرمائے اور ہمیں اپنی مرضیات۔ اور حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی ہدایات و تعلیمات پر عمل کرنے کی ہمت اور توفیق عطا فرمائے۔ آمین اللّٰھم آمین۔

گھریلو طرز زندگی زیر نظر مضمون کا اصل مقصد تو حضرت والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی کے آخری چند ایام کے خاص خاص واقعات و حالات بیان کرنا ہے، لیکن بہت سی اہم باتیں ایسی ہیں جن کو کما حقہٗ اسوقت تک سمجھنا دشوار ہوگا جب تک کہ حضرت والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ کی گھریلو زندگی کے بعض خاص خاص معاملات اور معمولات کو قارئین کے سامنے پیش نہ کیا جائے، ان کی علمی، دینی، اصلاحی، سیاسی اور تبلیغی خدمات اور ان کے طریق کار سے تو اکثر حضرات انکی تصانیف و تقاریر وغیرہ کے ذریعے واقف ہونگے۔ لیکن گھر والوں کے ساتھ ان کے معاملات کیسے تھے، وہ کس طرح زندگی بسر فرماتے تھے، کون سی چیزیں انہیں پسند یا ناپسند تھیں، یہ اور ایسی ہی دوسری باتیں ایسی ہیں جو انکی تصانیف اور تحریروں سے معلوم نہیں ہو سکتیں، اگرچہ حقیقت یہ ہے کہ حضرت والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ کی حیرت انگیز اور قابل تقلید زندگی کا

بردن، حلم، حمی، شفقت و محبت، اتباعِ سنت، علم و تقویٰ، خوش معاملگی، دوسروں کی خدمت اور خوش خلقی اور خوش گفتاری کی بے مثال داستانیں لئے ہوئے تھا، اُنکی صرف گھریلو زندگی کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کرنا نہ صرف یہ کہ سخت دشوار ہے بلکہ اس کے لئے ایک طویل ضخامت کی ضرورت ہے، اور یہ مضمون اس کا متحمل نہیں ہو سکتا، اس لئے مجبوراً احقر اُن کی روزمرہ گھریلو زندگی کی خاص خاص باتیں بطور نمونہ عرض کرتا ہے۔

نظم و ضبط کی پابندی جس دن والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کا یہ حادثۂ جانکاہ پیش آیا یعنی ۱۱ر شوال المکرم ۹۶ ۱۳ھ اسی دن اتفاق سے احقر نے اپنی زندگی کے ۴۳ سال مکمل کئے تھے، گویا تقریباً ۳۶ سال حضرت والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ کے زیر سایۂ شفقت شعور کے ساتھ گذارنے کی سعادت نصیب ہوئی، الحمد للہ۔ اس پوری شعوری زندگی میں حضرت والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی کے تقریباً ہر لمحے کو ایک مضبوط نظم و ضبط کے تحت کسی نہ کسی کام میں مصروف ہی پایا، اپنی تمام علمی اور دینی مصروفیات سے ہٹ کر روزانہ بہت سا وقت گھر والوں کے لئے اہتماماً نکالتے اس میں تمام گھر کے ضروری مسائل بھی حل ہوتے۔ دوسروں کی دلداری بھی فرماتے گھر کے کاموں میں گھر والوں کا ہاتھ بٹاتے، خوش طبعی اور ظرافت سے گفتگو بھی کرتے، عزیزوں اور رشتہ داروں سے ملاقاتیں بھی ہوتیں، ان کے مسائل میں نہایت خفیہ انداز میں اُنکی مالی اور غیر مالی مدد بھی فرماتے، کبھی کبھی سیر و تفریح کے عنوان سے گھر والوں کو کہیں لے بھی جاتے، اُنکی کوتاہیوں اور غیر شرعی عادات و اطوار پر ذہانت حکمت اور حلم و بردباری کے ساتھ دلسوزی اور ہمدردی کے لہجے میں اُنہیں متنبہ بھی فرماتے ـــــــ اُنکی دعوتیں بھی کرتے، اُنکی مہمان نوازی پوری تندہی کے ساتھ فرماتے، اُنکی بے شمار غلطیوں پر چشم پوشی فرماتے۔ غرض گھر میں ہوتے تو یوں معلوم ہوتا جیسے یہ خالص گھریلو ایک مشفق باپ ہیں اور بس، ہر کام کے لئے ایک وقت معین تھا، فتاویٰ کے کام کا وقت الگ تھا، تصانیف کے لئے الگ وقت، لوگوں سے ملاقات کا الگ وقت، وقت کو خود کبھی ضائع فرماتے اور ہم لوگوں کو اکثر یہ کہہ فرماتے کہ وقت کو کبھی نہ کسی کام میں لگاؤ خواہ وہ کام دنیا کا ہو یا دین کا۔ چنانچہ اکثر ایسا ہوتا کہ ہم سب بھائی جب جمع ہو جاتے تو رات کو عشاء کے بعد ایک مجلس سی منعقد ہوتی اس میں مختلف موضوعات پر گفتگو کا سلسلہ چل نکلتا، احقر نے ہمیشہ یہ محسوس کیا کہ والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ ہماری ان مجلسوں کو ناپسند فرماتے تھے، واللہ تعالیٰ ہماری کوتاہیوں کو معاف فرمائے ہم بہن بھائی کبھی نہ کبھی جمع ہو جاتے تو اکثر رات کو دیر تک یہ مجلس گرم رہتی، ہم کوشش یہ کرتے کہ کسی ایسی جگہ بیٹھیں جہاں سے ہماری باتوں اور قہقہوں وغیرہ کی آواز ان کے کانوں تک نہ پہنچے۔ لیکن انہیں سب معلوم ہوتا اگلی صبح کو نہایت شفقت اور دلسوزی کے ساتھ نرم لہجے میں فرما دیتے کہ "بیکار باتوں میں رات کیوں کالی کرتے ہو" اب سوچتا ہوں تو اس خیال سے کانپ اٹھتا ہوں کہ انہیں ہمیں وقت کو ضائع کرتا دیکھ کر کسقدر اذیت ہوتی ہوگی۔

نعمتوں کی قدر ایک بہت ہی نمایاں خصوصیت والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ کی جو ہم سب لوگ محسوس کرتے۔ یہ تھی

کہ چھوٹی چھوٹی بظاہر بے قیمت اور ناکارہ چیزوں کی بہت قدر فرماتے تھے، ہر شے کا ایک الگ مصرف متعین تھا، کسی چیز کو بے کار نہ جانے دیتے اور کوشش فرماتے کہ اس کو کسی مصرف میں لگا دیں، مثلاً جو رسالے یا دوسرے بنڈل ڈاک وغیرہ سے وصول ہوتے۔ ان پر جو سُتلی بندھی ہوئی ہوتی اس کو حتی الامکان قینچی سے نہ کاٹتے بلکہ گرہ کھول کر سالم سُتلی نکالنے کی کوشش فرماتے، اور سان ستلی کے ٹکڑوں کو کمرے میں ایک متعین جگہ پر جمع فرماتے رہتے، اگر کبھی ہم سے کسی بنڈل کو کھولنے کا حکم فرماتے اور ہم ستلی کو کاٹ کر الگ کرتے تو اکثر یہ کہکر تنبیہ فرماتے کہ "تم بھی اناڑی ہو، تمہیں بنڈل بھی کھولنا نہیں آتا" اور یا تو خود گرہ کھول دیتے یا پھر گرہ کھولنے کا حکم فرماتے، اسی طرح کاغذ کے تھیلے اور تھیلیاں جن میں گھر کی مختلف اشیاء آتیں انہیں ایک جگہ جمع فرماتے بہت سے خطوط ایسے آتے جن پر بہت سا سادہ کاغذ بچ رہتا انہیں پھاڑ کر ایک کاغذ کے ٹکڑوں کا ایک پیڈ سا بنا کر کلپ میں لگا کر اپنے پلنگ کی ساتھ والی دیوار میں لٹکایا ہوا تھا، اسی انتظام کا نتیجہ تھا کہ ان کے کمرے میں ضرورت کی تقریباً ہر شے محفوظ رہتی، کسی کو کچھ لکھنے کے لئے کاغذ کی ضرورت ہوتی، کاغذ مل جاتا۔ تھیلیوں کی اکثر ضرورت پیش آتی رہتی، جو عام طور پر ضرورت کے وقت تلاش کرنے سے بھی نہیں ملتیں، سب گھر والوں کو معلوم تھا کہ ضرورت کے وقت یہ چیزیں کہاں سے ملیں گی، ہر چیز بظاہر یہ چھوٹا سا عمل اپنے نتائج اور مصرف کے اعتبار سے کتنے منافع اپنے اندر رکھتا ہے، ایک طرف تو بے حقیقت نعمتوں کو ایک مفید مصرف عطا ہوا۔ دوسری طرف ضرورت کے وقت لوگوں کو پریشانی اور تکلیف سے نجات ملی، جب یہ چیزیں کسی مصرف میں استعمال ہوتیں اور کسی کے کام میں آجاتیں تو حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے چہرے پر مسرت کے آثار کو نمایاں دیکھا جا سکتا تھا ـــــ آہ! اُنکی کس کس برکت، کس کس ادا کا ذکر کروں، اب وہ برکتوں کا منبع، شفقتوں کا مرکز، محبت کا پیکر، حلم و بردباری کا نمونہ، دوسروں کو تکلیفوں سے تڑپ جانیوالا وجود، کمالات کا حیرت انگیز مجموعہ، ہم کہاں سے لائیں گے، ان کے ایک بابرکت وجود کی وہ رونقیں جن کے دم سے یہ گھر ہمیشہ جگمگاتا رہا، خود نحیف و کمزور اور بیمار و ناتواں ہونے کے باوجود اپنی زندگی کے آخری لمحوں تک ہماری ناز برداریوں میں مصروف رہنے والا مشفق باپ، حلیم و حکیم مربی، ہم سے جدا ہو گیا۔ یا الٰہ العالمین ہم سے جو اُنکی خدمت و اطاعت میں کوتاہیاں ہوئیں ان کی وجہ سے ہم پر عتاب نہ فرمائیے۔ اے رب العالمین! ہمیں توفیق اور ہمت عطا فرما کہ ہم اُنکی وصیتوں پر عمل کر کے اُن کی روح کو خوش کرنے کا سبب بن سکیں۔ اے حکیم مطلق! اے رب کریم! ہمیں اور ہمارے تمام اقوال و افعال کو اُن کے لئے صدقۂ جاریہ بنا دے۔ آمین۔

قارئین کرام تحریر کی بے ربطی کو معاف فرمائیں، ان کی ایک ایک بات، ایک ایک ادا اُنکے عقل میں نہ آنے والے کمالات اور ان کے اخلاق بے شمار واقعات، اقوال، اور حالات کا ہجوم اس وقت ذہن میں اس طرح گڈمڈ ہو کر رہ گیا ہے کہ انہیں کسی ترتیب میں لا کر ان میں سے انتخاب کرنے کے لئے جس جمعیتِ خاطر کی ضرورت ہے۔ اس

سے احقر محروم ہے۔ اللہ تعالیٰ مبالغہ سے بچائے۔ حال یہ ہے کہ یہ سطور لکھتے وقت بھی آنکھوں کے سامنے آنسوؤں کی ایک دھندلی سی لکیر ہے، یوں محسوس ہو رہا ہے کہ وہ سامنے موجود ہیں، انکی ہمہ گیر شخصیت جس طرح انکی زندگی میں دل و دماغ پر طاری اور محیط ہو جاتی تھی، اس وقت بھی دل و دماغ پر طاری اور محیط ہے، آخر ایسے مجموعۂ کمالات اور ہمہ گیر شخصیت کے حالات کا احاطہ یہ قلم اور الفاظ کیسے کر سکتے ہیں؟ خلاصہ یہ ہے کہ اُن کے صبح سے شام تک کے تمام معمولات کو اگر بعینہٖ ترتیب وار لکھا جا سکے تو اخلاقِ نبوی اور تعلیمات اشرفیہ کی ایک طویل فہرست تیار ہو جائے گی۔

دلکش اور بارعب شخصیت | یوں تو حضرت والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ کا ظاہری وجود بہت مختصر سا تھا، لیکن اللہ نے انکی شخصیت میں عجیب و غریب اضداد جمع کر دیں تھیں۔ جاننے والے جانتے ہیں، کہ حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے اخلاق میں عجز و انکساری اور تواضع و فروتنی بے حد نمایاں نظر آتے تھے، اپنے چھوٹوں کے سامنے بھی تواضع اور انکساری کا بے احتیاط اظہار ہوتا، لیکن ساتھ ہی احقر نے یہ بھی دیکھا کہ اللہ نے ان کو وہ علمی جلال عطا کیا تھا کہ بڑے بڑے وزیر افسر اور مالدار علماء و صلحاء ان کے سامنے رعب سے بات کرتے ہوئے ہکلاتے۔ بیٹوں کی حیثیت سے ہماری تو ساری زندگی ان کے ساتھ ہی گذری، لیکن خود ہم لوگوں کا یہ عالم تھا کہ ان کے کمرے کے سامنے سے گذرتے ہوئے بے اختیار رفتار سست پڑ جاتی قدموں کی آہٹ مدہم ہو جاتی، اور ان کے کمرے میں داخل ہوتے وقت تو جیسے کسی غیبی قوت کے زیر اثر قدم ٹھٹک کر رہ جاتے اور خود کو حاضری کے لئے باقاعدہ تیار کرنا پڑتا۔ حالانکہ گھر والوں سے خصوصاً اور عام مسلمانوں سے عموماً والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ ہمیشہ بے تکلفی سے پیش آتے تھے، خود ساختہ رکھ رکھاؤ کا نام و نشان نہیں تھا۔ اس کے علاوہ شخصیت میں اللہ نے دلکشی بھی غیر معمولی عطا فرمائی تھی۔ جہاں بیٹھ جاتے لوگ پروانہ وار چاروں طرف سے آکر انہیں گھیر لیتے۔

آخری ایام | عام حالات کا بہت ہی مختصر سا حصہ عرض کر پایا ہوں اور مضمون طویل ہوتا جا رہا ہے، ان کے تمام اخلاق و عادات کا احاطہ تو خیر میرے بس کی بات ہی نہیں ہے۔ البتہ اور بھی بہت سی قابل ذکر باتیں ایسی تھیں جن کو دل چاہتا تھا کہ قارئین کے سامنے پیش کر دوں لیکن طوالت کے خوف سے مجبوراً ان کے عام حالاتِ زندگی کو چھوڑ کر آپکی زندگی کے آخری لمحات کی طرف آتا ہوں۔

یوں تو اُن کے آخری ایام کی ابتداء بہت پہلے اب سے تقریباً ۵ سال پہلے سے ہوتی ہے، جب انہیں دل کا پہلا شدید دورہ ہوا تھا۔ اور وہ ہسپتال میں ایک ماہ سے زائد زیر علاج رہے تھے۔ لیکن آخری تین سال تو والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے بالکل اس مسافر کی طرح گذارے جو اپنا اسباب و سامان باندھ کر وطن عزیز کو جانیوالی ٹرین کے انتظار میں بیٹھا ہو، اور ہر لمحے گاڑی کے آنے کا احتمال ہو۔ تفسیر معارف القرآن کی تکمیل جب تک نہ ہوئی تھی تو اس میں زندگی کے ساتھ ایک تعلق تھا، تمنا تھی کہ تفسیر کا کام مکمل ہو جائے، چنانچہ پہلے دورے کے وقت بھی سخت اضطراب کے عالم میں ان کے پاس ہسپتال میں معروف رہتے، اس وقت تفسیر کا کام نامکمل تھا۔ انکی زندگی سے تقریباً ناامیدی کی کیفیت اُس

وقت بھی ہوگئی تھی، لیکن احقر کے برادرِ بزرگ محترم مولانا محمد زکی مرحوم جو اس وقت حیات تھے، اور لاہور سے بذریعہ ہوائی جہاز والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی بیماری کا حال سُنکر کراچی آگئے تھے، انہوں نے ہمیں پریشان دیکھ کر عجیب انداز سے تسلی دی، فرمایا کہ میرا تجربہ ہے کہ والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی خواہش کو کبھی حق تعالٰی نے ادھورا نہیں چھوڑا اور اللہ تعالٰی جل شانہٗ اُن سے تفسیر معارف القرآن کی عظیم خدمت لے رہا ہے، جو ابھی مکمل نہیں ہے، اور اسکی تکمیل کی تمنا بھی والد صاحب کے دل میں شدّت کے ساتھ موجود ہے لہٰذا یہ ساری باتیں انشاء اللہ اس بات کی علامت ہیں کہ والد صاحب صحتیاب ہونگے۔ اور تفسیر کا کام مکمل ہوگا۔ احقر کو تو اس خیال سے فوراً ہی اطمینان ہوگیا تھا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا ـــــ اللہ نے تفسیر کا کام اُن ہی کے ہاتھوں سے مکمل کرا دیا۔ الحمد للہ حمداً کثیراً طیباً مبارکاً فیہ۔

تفسیر کی تکمیل کے بعد سے والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے گویا عملاً خود کو سفرِ آخرت کے لئے تیار کر لیا تھا، زندگی سے ان کا تعلق محض ادائے حقوق اور انتظار کی حد تک رہ گیا تھا، رفتہ رفتہ اپنی تمام تر علمی ذمہ داریاں برادرِ عزیز مولوی محمد تقی سلّمہٗ، اور مدرسہ سے متعلق انتظامی ذمہ داریاں برادرِ عزیز مولوی محمد رفیع سلّمہٗ اور دوسرے متعلقہ لوگوں کے سپرد کر کے مطمئن ہو چکے تھے بظاہر کوئی اہم خواہش بھی دل میں باقی نہ تھی، ہم سب بھائی آپس میں اکثر ایک دوسرے سے پوچھا کرتے کہ والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو اب کوئی خواہش یا کسی کام کا ارادہ ہے یا نہیں۔ ہماری خواہش گویا یہ ہوتی کہ کسی نہ کسی کام کی آرزو ان کے دل میں زندہ رہے۔ احقر کو وسوسہ کی طرح یہ خیال گذرتا کہ والد صاحب کا علمی مصروفیتوں سے فارغ ہو جانا انکی جدائی کی علامت نہ بن جائے۔

آخری سفر (حرمین شریفین) | ایک دن حسبِ معمول شنبہ کو کورنگی میں حاضر ہوا تو والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی زبان سے یہ سنکر بہت خوشی اور اطمینان ہوا کہ وہ عمرے کے سفر کا ارادہ رکھتے ہیں چنانچہ احقر نے ارشاد فرمایا، یوں دل چاہتا ہے کہ اللہ تعالٰی آخری بار حرمین شریفین کا سفر اور نصیب فرما دے"۔ بعد میں معلوم ہوا کہ عمرہ کے سفر کے لئے باقاعدہ ایک مدسفرِ خرچ کا بنایا ہوا ہے۔ احقر کو غالب یقین ہوگیا کہ انشاء اللہ والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو عمرہ کا سفر ضرور پیش آئے گا۔

احقر کو عرصہ دراز سے تمنا تھی کہ ایک سفر حرمین شریفین کا والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی معیّت میں نصیب ہو جائے۔ اسکی بظاہر حالات کوئی توقع نہیں تھی، لیکن احقر خود بھی اکثر دعا کرتا رہتا تھا اور اپنی اس خواہش کا اظہار غالباً ایک بار حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے بھی کیا تھا غالباً آپ نے اسی وقت کچھ دعائیہ کلمات بھی ارشاد فرمائے تھے۔

ماہ رمضان المبارک ۱۳۹۵ھ یعنی تقریباً ایک سال قبل پھر حسبِ معمول حاضر ہوا تو اچانک احقر سے ارشاد فرمایا، "ہاں بھائی۔ ولی صاحب! عمرہ کرو گے؟" عرض کیا کہ یہ تو احقر کی تمنا ہے، پھر پوچھا کہ تمہیں اسکول سے چھٹی مل جائے گی؟ (احقر کراچی کے ایک اسکول میں معلّم کے فرائض انجام دیتا ہے)۔ عرض کیا، جی ہاں! انشاء اللہ چھٹی مل جائے گی۔ بعد میں تفصیل معلوم کرنے پر پتہ چلا کہ رابطہ عالمِ اسلامی مکہ المکرمہ کی جانب سے رسالۃ المسجد کانفرنس میں شرکت

کے لئے دعوت نامہ آیا ہوا ہے۔ اور ایک مرافق بھی ساتھ جا سکتا ہے۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے احقر کو بھی حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی دعاؤں کی برکت سے اُنکی معیت میں یہ یادگار سفر نصیب فرما دیا۔ اللّٰہم لک الحمد ولک الشکر۔ اس سفر میں اتفاق سے برادرِ عزیز مولوی محمد رفیع و مولوی محمد تقی سلّمہما اور احقر کے بھانجے حکیم مشرف حسین اور ہمارے ایک مشترک رفیق اور دوست کلیم صاحب نے بھی سفر کا ارادہ کر لیا۔ یہ والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا آخری سفر تھا۔ اس سفر کے حالات خود ایک مستقل باب کی حیثیت رکھتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے اگر توفیق دی تو کسی وقت کوشش کروں گا کہ یہ حالات بھی قارئین کرام کی خدمت میں پیش کروں۔ یہاں ایک مختصر سا واقعہ ذکر کرتا چلوں جیسا احقر نے پہلے عرض کیا والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ حق تعالیٰ کا واضح اور کھلا ہوا معاملہ یہ تھا کہ اُن کو جو کوئی ضرورت پیش آئی یا خواہش دل میں پیدا ہوئی اُدھر حق تعالیٰ نے اُسکے اسباب غیب سے پیدا فرما دیئے۔ مدینہ منورہ میں تراویح کے بعد علماء و صلحاء والد صاحبؒ سے ملاقات کے لئے آتے رہتے تھے، ایک روز آپ نے ایک صاحب سے فرمایا کہ ہمیں کراچی جانے کے لئے کچھ ٹوپیاں چاہیئے ذرا بازار سے لاکر دکھا دو۔ ان صاحب نے ٹوپیاں لاکر والد صاحب کو دکھائیں، آپ نے ان ٹوپیوں کا ڈیزائن پسند کر کے فرمایا کہ ۱۰ عدد ٹوپیاں چاہئیں غالباً اسی دن رات کو مدینہ منورہ کے درویش صفت بزرگ قاری عباس صاحب تشریف لائے۔ کچھ دیر بیٹھے، اور جاتے وقت ایک بنڈل والد صاحب کی خدمت میں پیش کیا کہ آپ کے لئے ہدیہ ہے۔ بعد میں بنڈل کھولا تو ۱۰ عدد ٹوپیاں اسی پسندیدہ ڈیزائن اور سائز کی اس میں موجود تھیں۔ یہ بطور نمونہ ایک واقعہ ذکر کیا۔ والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ یہ معاملہ اللہ جل شانہٗ کا ہمیشہ رہا۔ اور بے شمار واقعات اس پر شاہد ہیں،

عزیزوں سے آخری ملاقاتیں رمضان المبارک سے قبل برادرِ محترم مولانا محمد زکی مرحوم کے بچوں کو لاہور فون کئے اور خطوط لکھ کر اصرار کر کے انھیں کراچی آنے کے لئے لکھا، برادرِ محترم مرحوم کی وفات کے بعد سے اُنکی اہلیہ اور بچے کراچی نہیں آسکے تھے، شدید اصرار کر کے، جو حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی عادت اور مزاج کے بالکل خلاف تھا، اس مرتبہ انھیں اصرار کر کے کراچی بلایا۔ اور تقریباً ایک ماہ انھیں اپنے پاس رکھا۔ احقر اور برادرِ بزرگ جناب مولوی محمد رضی عثمانی صاحب چونکہ شہر میں رہتے ہیں، اسلئے دستور یہ تھا کہ لاہور سے آنے والے لوگ کچھ روز والد صاحبؒ کے پاس کورنگی میں قیام فرماتے۔ اور کچھ روز شہر میں ہم لوگوں کے پاس۔ اس بار خلافِ عادت انھیں شہر آنے کی اجازت نہ دیتے تھے، ہم لوگوں کے اصرار پر بمشکل ایک دو وقت کے لئے انہیں شہر آنے کی اجازت ملی، یہ طرز بھی چونکہ والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے مزاج کے مطابق نہیں تھا اسلئے ہم سب کو اس پر حیرت تھی۔

پھر رمضان کے آخر میں عزیزم حافظ مولوی محمود اشرف سلّمہٗ، مولانا محمد زکی مرحوم کے بڑے صاحبزادے جو اس وقت اپنی والدہ اور بہن بھائیوں کے ساتھ کراچی نہ آسکے تھے انہیں فون کیا کہ تم عید کے فوراً بعد کراچی کے لئے روانہ

ہو جاؤ۔ چنانچہ وہ بلا تاخیر عید کے فوراً بعد کراچی پہونچ گئے اور والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں وقت گذارنے لگے، اور اللہ تعالیٰ نے انہیں آخری دنوں میں آخری دم تک انکی خدمت میں رہنے کی سعادت نصیب فرمائی، یوں معلوم ہوتا ہے جیسے وہ جلدی جلدی سب سے مل کر اپنے قلب کو سفر آخرت کے لئے فارغ کر رہے ہوں۔

آخری عید ہر عید پر معمول تھا کہ تمام بہنوں اور بھائیوں کو انکی اولاد سمیت اپنے مکان پر جمع فرماتے۔ اور پھر سب کے اصرار پر سب کے درمیان بیٹھ کر "عیدی" تقسیم فرماتے، اس مجلس میں عیدی کے نرخ پر سب بھائی ان سے جھگڑتے۔ اور وہ خوش ہو کر عیدی تقسیم کرتے، عیدی کی تقسیم کے بعد معمول تھا کہ سب کو بڑے اہتمام سے یکجا جمع کرتے اور کچھ وعظ و نصیحت فرماتے، خصوصاً ایسی باتوں کی طرف توجہ دلاتے جو خاندان میں خلافِ شرع، یا آپکے مزاج کے نامناسب چیزیں آپ کو نظر آئیں جس میں شرعی پردے کے انتظام اور نئی تہذیب کے فیشن وغیرہ سے اجتناب پر ہمیشہ زور دیتے۔

پچھلے سال عید پر ایسی ہی مجلس میں عیدی دیتے وقت ارشاد فرمایا کہ "لو بھئی غالباً یہ ہماری آخری عیدی ہے آئندہ عید تک تو پتہ نہیں ہم کہاں ہوں گے" اس پر احقر کی ہمشیرہ نے فرمایا کہ نہیں ابا جی! ابھی تو انشاء اللہ آپ سے بہت سی عیدیاں لینی ہیں، اللہ تعالیٰ آپ کے سائے کو ہمارے سروں پر تادیر قائم رکھے۔ اس جملے کو سنکر چہرے پر حسرت کے سے آثار نمایاں ہوئے اور فرمایا کہ "تم لوگ کب تک اس بڈھے کو دعائیں مانگ مانگ کر زندہ رکھوگے" جیسا کہ احقر نے پہلے عرض کیا کہ وہ اس طرح موت کے انتظار میں گھڑیاں گن رہے تھے جیسے کوئی مسافر تمام اسباب و سامان باندھ کر گاڑی کے آنے کا بے چینی سے انتظار کرتا ہو، یہ تو خیر پچھلے سال کی بات تھی، اس مرتبہ احقر غالباً ۲۸ رمضان المبارک کو حاضر ہوا تو تکلیف میں پایا۔ ۷ رمضان المبارک سے مسلسل مختلف قسم کی تکلیفوں میں مبتلا تھے، دل کا دورہ بھی اچھا خاصا ہو چکا تھا، نقرس کے درد کی تکلیف بھی رہ چکی تھی، اور نواسیر کے پھوڑے کی اذیت ناک تکلیف بھی اٹھا چکے تھے، غرض کمزوری بے حد بڑھ گئی تھی، رمضان المبارک میں کئی بار حاضری کا اتفاق ہوا۔ ہر مرتبہ قرآن کریم کی تلاوت میں مشغول پایا، روزے نہ رکھ سکنے کی حسرت کا اظہار بڑے دردناک انداز میں فرماتے، غرض ۲۸ ویں روزے کو حاضر ہوا تو احقر نے پوچھا کہ اس مرتبہ عید کے دن ہی ہم بہن بھائی جمع ہو جائیں یا عید کے اگلے دن۔ فرمایا عید کے اگلے دن ہی آنا مناسب ہوگا۔ احقر نے اس خیال سے کہ سب لوگوں کے کھانے کے اہتمام سے والد صاحبؒ کے دماغ پر بوجھ نہ ہو، عرض کیا کہ اس مرتبہ کھانے کا اہتمام نہ فرمائیں تو بہتر ہے، اس دن اسی تجویز کو پسند کیا، لیکن بعد میں رائے تبدیل فرمادی اور سبکو کھانے کی دعوت دے کر بلایا، چنانچہ تمام لوگ حسب معمول جمع ہوئے۔ اپنی اولاد کو ایک جگہ جمع دیکھ کر ہمیشہ مسرور ہوتے تھے۔ اور آخر آٹھ دس سال سے تو اولاد کے ساتھ تعلق اس قدر بڑھ گیا تھا کہ انکی ادنیٰ سی تکلیف بھی برداشت نہ ہوتی تھی، خود بھی فرماتے تھے کہ: اللہ تعالیٰ نے میرے قلب کو مال و دولت

کی محبت سے پاک رکھا ہے، لیکن اولاد کی محبت بڑھتی جاتی ہے، جب کبھی ہم تمام بھائیوں اور بہنوں کو یکجا ہنستا مسکراتا دیکھتے تو قرآن کریم کی سورۃ مدثر کی آیت وَبَنِیْنَ شُھُوْدًا (اولاد حاضر اور موجود) کو بار بار تلاوت کر کے فرماتے کہ اولاد کا اپنے پاس حاضر اور موجود ہونا اللہ کی ایک مستقل نعمت ہے، جبھی تو ولید بن مغیرہ پر جہاں اور انعامات کا ذکر قرآن نے کیا وہیں بَنِیْنَ شُھُوْدًا کو مستقل ایک نعمت کے طور پر بیان فرمایا۔ اس لئے اس نعمت پر بھی اللہ تعالےٰ کا شکر بجا لانا چاہیئے۔

غرض اسی مجلس میں کھانے کے بعد سب کے درمیان والدہ محترمہ کے کمرے میں تشریف لائے، جہاں ہم سب بہن بھائی جمع تھے اور والدہ محترمہ (جو عرصہ سے صاحب فراش ہیں) کے پلنگ پر پائنتی کی طرف آکر بیٹھ گئے اور فرمایا کہ بھائی اس سال تمھاری عیدی کا کیا ریٹ ہے، اس پر ہم لوگوں نے عرض کیا کہ مہنگائی کا زمانہ ہے اس لئے عیدی میں اضافہ ہونا چاہیئے، پھر پوچھا کہ پچھلے سال کتنی کتنی عیدی دی گئی تھی، معلوم ہوا کہ ہر بیٹے اور بیٹی کو پچھلے سال ۲۵ روپے دیئے گئے تھے ہمارے اصرار پر ۵ روپے کا اضافہ منظور کیا اور ترتیب وار بڑوں سے شروع کر کے سبکو ۳۰ روپے عیدی کے تقسیم فرمائے۔ عیدی دیتے وقت ارشاد فرمایا کہ پچھلے سال بھی ہم نے آخری عیدی سمجھ کر عیدی دی تھی اور اس مرتبہ تو خیر ظاہر ہی ہے۔ پھر ہم کہاں بیٹھے رہیں گے۔ اس کے بعد سب کو اہتمام کے ساتھ بلایا اور کہا کہ اچھا بھائی تم نے عیدی لے لی۔ اب ہماری دو تین باتیں سن لو۔

آخری وصیت | فرمایا کہ لمبی چوڑی باتیں کرنے کی نہ طاقت ہے اور نہ وقت، مختصر سی ایک دو باتیں غور سے سن لو، اور اسکے بعد فرمایا کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک پر وفات کے وقت جو الفاظ جاری تھے اور جسکے بعد آپ خالق حقیقی سے جا ملے۔ وہ یہ تھے۔

« الصّلوٰۃ الصّلوٰۃ اِتقوا اللّٰہ وما ملکت ایمانکم »

ترجمہ:۔ نماز کا خیال رکھو، نماز کا خیال رکھو، اپنے زیردستوں کے معاملے میں اللہ سے ڈرو

اس کے بعد نہایت مختصر الفاظ میں نماز کی اہمیت اور دوسروں کے حقوق کے بارے میں نہایت مؤثر نصیحتیں فرمائیں۔ فرمایا کہ آدمی اس وقت تک نمازی نہیں ہو سکتا جب تک جماعت کا پابند نہ ہو جائے" اور جو جماعت کا پابند نہ ہو، وہ اپنے آپ کو دھوکا دیتا ہے کہ نمازی ہے۔ نمازی تو جماعت کی پابندی سے بنتا ہے۔ اس کے بعد فرمایا کہ اپنی نمازوں اور عبادتوں پر نظر نہیں رکھنی چاہیئے، یاد رکھو کہ جو آدمی نماز روزہ کر کے خود کو نیک اور صالح سمجھنے لگے، اس سے زیادہ کوئی خسارے میں نہیں ہے۔ ساری نمازیں منہ پر مار دی جائیں گی،

تیسری بات پردے کی شرعی پابندی کی بابت فرمائی کہ پردے کا اپنے خاندان میں پورا اہتمام کرو۔ اور نئی تہذیب کی لعنت کو اپنے گھر میں نہ گھسنے دو۔ فرمایا کہ بس میری یہی وصیت ہے، اسکو پلے باندھ لو۔ اللہ تعالےٰ

ہم سب کو اس وصیت پر پوری عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

سبحان اللہ! اللہ تعالیٰ نے اُنکی زندگی کو کس طرح اتباعِ سنّت کے سانچے میں ڈھال دیا تھا کہ ہر ادا سے سنّت و شریعت کا اہتمام نمایاں نظر آتا تھا، یہاں تک کہ آخری وصیت کے طور پر بھی وہی کلمات مبارک زبان پر آئے جو سرورِ کائنات صلے اللہ علیہ وسلم کی زبانِ مبارک پر آخری وقت تھے۔ آہ! یہ کیسے معلوم تھا کہ ہم اس پیکرِ رحمت و شفقت سے آخری بار یہ وصیت سُن رہے ہیں! اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ۔

عمر کا آخری دن

آہ! ۱۰ شوال المکرم ۱۳۹۶ھ کا دن یوں تو بظاہر حسبِ معمول طلوع ہوا، لیکن یہ دن اپنی آغوش میں کتنی قیامتیں اور کتنے ہنگامے لیکر طلوع ہو رہا تھا، اللہ علیم و خبیر کے علاوہ یہ کون جان سکتا تھا۔ دور دور تک کوئی ایسی علامت موجود نہ تھی جس سے یہ وہم بھی کیا جا سکتا کہ آج کا آفتاب غروب ہوتے وقت اپنے ساتھ جہانِ علم و عمل کے اس آفتاب کو بھی ساتھ لیجایا جائے گا جس کے دم سے عالمِ اسلام میں علم و فقہ کی روشنی، اور سالکین کے قلوب میں نور کی موجیں فروزاں ہیں۔

یہ ۱۰ شوال ٹھیک وہی تاریخ ہے، جب آج سے ٹھیک ایک سال پہلے حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو شدید دل کا دورہ ہوا تھا، اور آپ ہسپتال میں زیرِ علاج رہے تھے، یہی ۱۰ شوال احقر کی عمر کا ۳۳واں سال پورا کر رہا تھا۔ اور یہی ۱۰ شوال والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی عمر کا آخری دن مقرر تھا۔

والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ ہمیشہ اذانِ فجر سے کافی پہلے بیدار ہو جایا کرتے تھے، اس دن بھی حسبِ معمول بیدار ہوئے آخری ایک دو سال سے دارالعلوم کے ایک صالح طالب عزیزی مولوی نعمت اللہ صاحب کو اللہ نے یہ سعادت نصیب فرمائی تھی کہ وہ رات کو عشاء کے بعد سے فجر کے بعد تک حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں رہتے، اور اس دوران تمام ضروریات میں اُنکی خدمت بالکل بیٹوں کی طرح بڑی تندہی سے کرتے رہتے۔ اس دن بھی اُنہوں نے نمازِ فجر سے پہلے وضو وغیرہ کروایا، اور حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نمازِ فجر سے فارغ ہو کر حسبِ معمول اپنی چارپائی پر تکیے سے ٹیک لگا کر ذکر میں مشغول ہو گئے۔ عزیزم مولوی محمد تقی سلّمہٗ معمولاً نمازِ فجر کے بعد کمرے میں داخل ہوئے تو فرمایا "آج رات تین بجے کون مہمان آیا تھا؟ مولوی نعمت اللہ نے بتایا ہے کہ مہمان کے کہنے پر انہوں نے رفیع میاں کو بیدار کیا تھا، رفیع میاں ہی نے ان کے قیام کا انتظام کیا ہوگا؟" مولوی محمد تقی سلّمہٗ کو چونکہ اس کا کچھ علم نہیں تھا وہ اسکی تصدیق کے لئے مولوی محمد رفیع سلّمہٗ کے برابر کمرے میں گئے تو دیکھا کہ والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ایک قدیم دوست کے صاحبزادے حافظ سعید سلیمان صاحب جو افریقہ میں رہتے ہیں اور والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے خصوصی تعلق رکھتے ہیں کمرے میں سو رہے ہیں واپس آکر والد صاحبؒ سے عرض کیا کہ افریقہ سے حافظ سعید سلیمان

صاحب اپنی والدہ سمیت آئے ہیں" یہ سن کر بیحد خوشی کا اظہار کیا، اور فرمایا کہ "مجھے ان کا انتظار تھا ـــــــ رفیع میاں سو گئے ہوں تو مت جگانا وہ رات مہمانوں کی وجہ سے نہیں سو سکے"

اسکے بعد حسب معمول ناشتہ سے فارغ ہوئے۔ ناشتہ کے فوراً بعد معمول تھا کہ اصلاح و استرشاد کی غرض سے کچھ لوگ آجاتے تھے۔ وہ تشریف لے آئے۔ ان دنوں پنجاب سے مولانا عبدالرزاق صاحب اسی غرض سے یہاں مقیم تھے۔ جو اکثر سلوک و تصوف کے بارے میں ضروری اور کام کے سوالات کرتے تو ان کو نہایت انشراح کے ساتھ جوابات دیتے۔ اس دن بھی ان کے ایک سوال کے جواب میں کافی طویل تقریر فرمائی۔ تقریباً ۹ بجے یہ حضرات رخصت ہو گئے، تو آپؒ حسب معمول لیٹ گئے۔ اور غالباً آنکھ لگ گئی۔ تقریباً ۱/۲ ۸ بجے بیداری کے بعد مولوی تقی سلمہٗ سے فرمایا کہ افریقہ کے مہمان مولانا سید سلیمان اگر جاگ گئے ہوں تو ان کو بلا لیا جائے۔ مولوی محمد تقی سلمہٗ نے اس خیال سے کہ والد صاحبؒ ابھی اجابت سے فارغ نہیں ہوئے ہیں۔ اور عام طور پر اجابت کے بعد دل کی تکلیف دا شنا سا، ہو جایا کرتی تھی عرض کیا کہ۔ ابھی کوئی جلدی نہیں ہے۔ آپ ضروریات سے فارغ ہو لیں۔ کیونکہ پھر آپ کو فرصت نہ مل سکے گی۔ اس پر آپ نے فرمایا۔ "نہیں انہیں بلا ہی لو۔ چنانچہ وہ کمرے میں تشریف لائے۔ اور انہوں نے بہت ہی تپاک کے ساتھ والد صاحبؒ سے چارپائی پر بیٹھ کر معانقہ کیا۔ اسکے بعد دیر تک پورے انشراح کے ساتھ ان سے گفتگو ہوتی رہی۔ اور اسی دوران دوسرے چھوٹے چھوٹے کام بھی نمٹاتے رہے۔ تقریباً ۱۲ بجے دوپہر مہمان موصوف اٹھ گئے۔ انہیں شہر میں کچھ ضروری کام تھے۔ اس کے لئے وہ چاہتے تھے کہ مولوی تقی سلمہٗ کو ساتھ لیجائیں لیکن والد صاحبؒ کی خواہش تھی کہ ان کے ساتھ کوئی اور چلا جائے۔ لیکن ان کے کہنے پر انکی دلداری کے لئے مولوی تقی صاحب کو جانے کی اجازت دے دی۔ وہ ۱۲ بجے کے بعد شہر روانہ ہو گئے۔ اس کے بعد فتاوٰی کے جوابات لکھوائے۔

آخری تحریر اور فتوٰی

تقریباً سوا بجے زندگی کے آخری فتوے پر جواب لکھوا کر دستخط فرمائے جو مسجد میں گمشدہ اشیاء کے اعلان کے متعلق تھا اور اس کے بعد دارالعلوم میں طلبہ کے داخلے جو لگے روز شروع ہونے والے تھے، اسکے متعلق ایک تحریر کی منظوری تحریر فرما کر مولوی محمد رفیع سلمہٗ کو بھجوائی۔ اس وقت دن کا ڈیڑھ بجا تھا۔ طبیعت بالکل معمول پر تھی، کسی قسم کی کوئی تکلیف نہیں تھی، کسی کے وہم و گمان میں بھی نہیں آسکتا تھا کہ اس وقت وہ اپنی عمر کا آخری فتوٰی اور آخری تحریر لکھ چکے ہیں، اور چند ہی منٹوں کے بعد وہ سفر آخرت کے دشوار ترین مراحل سے دوچار ہو جائیں گے۔

چند آخری اعمال

اس تحریر کے بعد اپنے کمرے سے نکل کر اندر گھر میں تشریف لے گئے اور مولوی محمد تقی سلمہٗ کی اہلیہ سے ــــ کہ افریقہ کی جو مہمان آئی ہوئی ہیں۔ ان کا خاص خیال رکھیں، اور کھانے میں بھی کچھ اہتمام کے لئے فرمایا۔ پھر واپس

تشریف لائے۔ اور کسی نے فرمایا کہ مولوی سید سلیمان کی والدہ کو بھی برابر کے کمرے میں بلا لو، چنانچہ اُن سے بھی دوسرے ہی کمرے میں سے مختصر بات فرمائی اور کچھ کتابیں بغرضِ مطالعہ عنایت فرمائیں۔ گویا ان کا بھی حق ادا فرما دیا۔

صبح چونکہ اجابت نہیں ہوسکی تھی اس لئے ظہر کی نماز سے قبل ملحقہ بیت الخلاء میں تشریف لے گئے۔ کچھ دیر بعد وہاں سے واپس آئے تو چہرے پر تکلیف، تعب اور تکان کے اثرات تھے۔ برادر زادہ عزیزم مولوی محمود اشرف سلمۂ کمرے میں موجود تھے۔ والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ سیدھے چارپائی کی طرف گئے، اور نڈھال سے ہوکر چارپائی کے کنارے ہی لیٹ گئے۔ منہ میں ڈالنے کی گولیاں منہ میں ڈالیں، تکلیف بڑھ رہی تھی، باوجود ضبط و تحمل کی غیر معمولی قوت کے چہرہ تکلیف کی غمازی کر رہا تھا۔ ایک اور دوا جو سینہ کے درد کے لئے تھی، اور جسکو طبعاً پسند نہ فرماتے تھے خود نکال کر کھائی عزیزم مولوی محمود اشرف اپنی سی تدابیر کرتے رہے۔

عزیزم مولوی محمد رفیع سلمۂ کو دو ایک روز سے کمر میں اُنکی پرانی تکلیف تھی جسکے زیر اثر چلنا پھرنا، اور بعض اوقات حرکت بھی دشوار ہوتی ہے، اُن کو والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ نے سخت تاکید فرما رکھی تھی کہ ایک دو روز آرام کریں اپنے کمرے ہی میں بیٹھے دار العلوم کے کام انجام دیتے رہیں۔ اور چلنے پھرنے سے جہاں تک ممکن ہو پرہیز کریں۔ اس وقت عجب کہ وہ جانکنی کے سخت کرب میں مبتلا تھے، اور اولاد کی ایک لمحہ کی دُوری بھی اُنہیں گوارا نہیں تھی، دیر تک اس کوشش میں رہے کہ مولوی محمد رفیع سلمۂ کو تکلیف کی اطلاع نہ دینی پڑے۔ جب تکلیف خود اُنکی نظر میں تشویشناک ہوگئی تو فرمایا کہ مولوی رفیع کو بلالو۔ چنانچہ محمود اشرف سلمۂ نے اُنہیں اطلاع کی تو وہ فوراً ہی بے چین ہوکر کمرے میں پہونچے، اور چہرے پر سخت کرب و تکلیف کا احساس کر کے، محمود اشرف سلمۂ سے پوچھا کہ "سینہ میں تو درد نہیں؟" اس پر اُن سے مخاطب ہوکر ایک مختصر اور جامع جملہ فرمایا "بیٹھ جاؤ سب کچھ ہے" پھر ایک وقفہ کے بعد کچھ تفصیلی حال بتایا ـــــــ مولوی رفیع سلمۂ کو یہ اضطراب کہ کسی طرح ڈاکٹر سید اسلم صاحب کو فون کردیں مگر والد صاحب کا یہ حکم کہ کہیں نہ جائیں پاس بیٹھے رہیں۔ ڈاکٹر سید اسلم امراضِ قلب کے خصوصی ماہر اور پاکستان کے مشہور ترین امراضِ قلب کے ہسپتال کے بڑے ڈاکٹر ہیں، چار سال سے قلب کی تکلیف میں والد صاحبؒ اُنہی کے زیر علاج تھے، ہمارے پورے خاندان کے بڑے محسن، اور والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے دوست، اپنی غیر معمولی طبی مصروفیات کے باوجود مطالعے کے بیحد شوقین، اور علم دوست انسان ہیں ـــــــ مگر شدید ضرورت کے بغیر ان کو بھی تکلیف دینا گوارا نہ فرماتے تھے۔ چنانچہ کسی نہ کسی طرح والد صاحبؒ کی اجازت سے فون کرنے کے لئے ملحقہ کمرے میں آئے۔ اسی وقت مولوی محمد تقی سلمۂ بھی شہر سے واپس پہونچ گئے۔ ان کو حال بتایا گیا۔ والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی حالت خود دیکھی اور واپس آکر اُنہوں نے ڈاکٹر سید اسلم صاحب کو فون کیا مولوی رفیع سلمۂ والد صاحبؒ کے پاس واپس آگئے، ڈاکٹر صاحب نے حال سُنکر فرمایا کہ فوراً پیتھوڈین کا انجکشن کسی قریبی ڈاکٹر کو بلاکر لگوا دیا جائے۔ اور فرمایا کہ میں خود بھی پہونچنے کی کوشش کرتا ہوں۔ یہ انجکشن

سکون دینے کے لئے ہوتا ہے اور عموماً اس سے گہری نیند آجاتی ہے جب والد صاحبؒ کو یہ اطلاع دی گئی تو پوچھا "انجکشن کون لگائے گا؟ اسپیشلسٹ سے لگوانا چاہیئے" عرض کیا گیا کہ ڈاکٹر اسلم نے اجازت دی ہے کہ ان سے فون پر ہدایات لیکر قریبی ڈاکٹر سے انجکشن لگوا لیا جائے ـــــــ اب کرب کی شدت میں معمولی سا افاقہ معلوم ہوا، ہاشم ڈاکٹر کو بلانے کے لئے گاڑی جا چکی تھی، اسی عالم میں فرمایا کہ "مہمان کہاں ہیں؟ انہیں کھانا کھلوا دیا؟"

اللہ اکبر! زندگی کی شدید ترین تکلیف سے دوچار ہیں اس عالم میں بھی دوسروں ہی کی تکلیف کا احساس ہے۔ یہاں تک کہ جب عزیزم مولوی تقی سلمہٗ کے آنے سے قبل تکلیف اپنے عروج پر تھی، تو مولوی رفیع کو فون کرنے کی اجازت یہ کہکر دی کہ رضی کی دوکان پر بھی فون کردو۔ ممکن ہے تقی وہاں پہونچیں تو انہیں اطلاع ہو جائے گی، اور منشا یہ ہوگا کہ برادر محترم رضی صاحب کو بھی اس طرح اطلاع ہو جائے اور وہ اگر آنا چاہیں تو آجائیں پوری زندگی ہم لوگوں کے ساتھ یہ معاملہ رہا کہ اگر کسی ضرورت سے بھی بلانا ہوتا تو صرف بلانے کا اختیار نہ فرماتے بلکہ اس طرح فرماتے کہ آنیوالے کو گنجائش رہے کہ اس سے زیادہ ضروری کام میں مصروف ہو تو نہ آنے پر تنگی محسوس نہ کرے۔

چند آخری ہدایات

عزیزم مولوی محمد رفیع سلمہٗ جب اپنے کمرے سے والد صاحبؒ کے بلانے پر اُن کے قریب پہونچے تو وہ شاید زندگی کی شدید ترین تکلیف سے دوچار تھے، اور اُنہیں بستر کے قریب سے ہٹنے نہ دینے کا منشا یہ تھا کہ چند ضروری باتیں وہ کسی طرح کہہ دینا چاہتے تھے۔ چنانچہ پوری توانائی صرف کر کے فرمایا، "احتیاطاً ایک مہینے کی نمازوں کا فدیہ دے دینا۔ اور یہ فرماکر خاموش ہوگئے، اور رقت طاری ہوئی، پھر وقفے کے بعد فرمایا، مجھے ہسپتال نہ لے جانا" پھر کچھ وقفے کے بعد اُسی دن کی لکھی ہوئی ایک نجی تحریر میں ایک لفظ کے بارے میں فرمایا کہ "وہاں فلاں لفظ لکھا گیا ہے۔ اسکی جگہ دوسرا ـــــ ایک لفظ ارشاد فرمایا کہ یہ لفظ پڑھا جائے۔ بعد میں دیکھا گیا تو معلوم ہوا کہ اگر یہ ترمیم آپؒ نہ فرماتے تو سابقہ لفظ کی وجہ سے بڑی شرعی اُلجھنیں پیدا ہو جاتیں۔

ظہر کی نماز کے لئے مولوی تقی سلمہٗ سے فرمایا کہ مجھے نماز پڑھوا دو، اس پر اُنہوں نے عرض کیا کہ ابھی کچھ وقت باقی ہے۔ اور کچھ افاقہ ہو جاتے تو ادا فرما لیجئے گا۔ فرمایا! ہاں! اس وقت تو زبان سے الفاظ ادا کرنے کی بھی ہمت نہیں۔

اسی اثناء میں ڈاکٹر شجاع ندیم جو کورنگی ہی میں مطب کرتے ہیں تشریف لے آئے تھے بازار سے مجوزہ انجکشن بھی منگوالیا گیا تھا۔ اگرچہ والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی خواہش تھی کہ یہ انجکشن وہ ڈاکٹر سید اسلم صاحب ہی سے لگوائیں لیکن بعد میں ڈاکٹر چاندنہ ہی سے لگوانے پر رضامند ہوگئے۔ ڈاکٹر صاحب کو یہ خیال ہوا کہ انجکشن لگوانے میں کسی شرعی مصلحت سے تذبذب ہے، اس کا اظہار اُنہوں نے کیا تو والد صاحبؒ نے فرمایا کہ نہیں اس میں کوئی شرعی قباحت نہیں ہے"۔

"خدا کے سپرد" ـــــــــ اس کے بعد انجکشن لگایا جانے لگا تو فرمایا: "اچھا بھائی! خدا کے سپرد"

اور انجکشن لگا دیا گیا، اس وقت ۵ بج چکے تھے اور عصر کی اذان ہو رہی تھی، احقر کو یاد ہے کہ جب پہلی بار تقریباً ۴ سال قبل ہسپتال میں یہی انجکشن ڈاکٹر سید اسلم نے آپ کو دیا تھا تو چند ہی لمحوں میں گہری نیند آگئی تھی اور تقریباً ۴،۴ گھنٹے اس نیند کا اثر غالب رہا تھا۔ لیکن آج یوں معلوم ہوتا تھا کہ انجکشن کی دوا آپ کی مضبوط قوت ارادی کے سامنے ہتھیار ڈال چکی تھی۔

آخری نماز

وجہ شاید یہ تھی کہ عصر کی اذان ہو چکی تھی مگر دل کے شدید تقاضے کے باوجود اب تک ظہر کی نماز بھی نہ پڑھ سکے تھے، نظریں بار بار دیوار پر لگے ہوئے گھنٹے کی طرف اٹھتیں اور بے بسی و اضطراب کے ساتھ واپس آجاتیں، بالآخر ہمت کر کے فرمایا "مجھے ظہر کی نماز پڑھوا دو"۔ تیمم کے لئے پاک مٹی کپڑے کی تھیلی میں بھر وا رکھی تھی جس کا طول و عرض اتنا تھا کہ دونوں ہاتھ اس پر مارے جا سکیں، یہ تھیلی ایک ڈبے میں رکھی رہتی، شدید ضرورت کے مواقع پر اس سے تیمم فرمایا کرتے تھے، وہ پیش کی گئی لیٹے لیٹے خود ہی تیمم فرمایا اور قبلہ کی طرف کروٹ لیکر اشارہ سے بمشکل نماز پڑھی۔

سلام پھیرا تو مولوی رفیع سلّمہ نے جو قریب ہی بیٹھے تھے عرض کیا کہ عصر کا وقت بھی ہو چکا ہے ممکن ہو تو عصر کی نماز سے بھی فارغ ہو لیں؛ پیش نظر یہ تھا کہ جب تک عصر کی نماز نہ پڑھ لیں گے حضرت والد صاحبؒ فکر مند رہیں گے اور آرام نہ ملے گا، لیکن تکلیف اور نقاہت اس حد کو پہنچ چکی تھی کہ رفیع میاں کی طرف کروٹ لی اور نڈھال ہو کر بڑی حسرت سے فرمایا "ابھی ہمت نہیں" مضطرب نظریں اب بھی بار بار گھنٹے کی طرف اٹھتیں اور چہرے پر بے بسی و اضطراب کے آثار چھا جاتے، بالآخر گھنٹہ دیکھ کر پوچھا "پانچ بجکر کتنے منٹ ہوئے ہیں؟" مولوی رفیع نے عرض کیا "گیارہ منٹ ہوئے ہیں" قبلہ کی طرف کروٹ لیتے ہوئے فرمایا "اب عصر کی نماز پڑھ لوں" اشاروں سے بمشکل نماز ادا فرمائی تو بالکل نڈھال ہو چکے تھے مگر چہرے پر سکون اور اطمینان چھا گیا، یہ نماز حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی آخری نماز تھی۔

احقر شہر میں والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے بنائے ہوئے ذاتی مکان اشرف منزل میں رہتا ہے۔ احقر حسب معمول دوپہر کو سوا بجے اپنے اسکول سے فارغ ہوا۔ اور نماز اور کھانے کے بعد تقریباً دو بجے لیٹ گیا تھا، دیر تک لیٹے رہنے کے بعد غنودگی سے بیدار ہوا تو محترم بھائی رضی صاحب کی بچی نے آکر اطلاع دی کہ کورنگی سے مولوی محمد تقی سلّمہ کا فون ہے، دل دھک سے ہو کر رہ گیا، کیونکہ اس وقت فون کا آنا خلاف معمول تھا، یہ وقت ان لوگوں کے بھی آرام کا وقت تھا اور احقر کا بھی۔ فون تک پہونچا، مولوی تقی سلّمہ نے مختصراً تکلیف کا حال بغیر کسی تشویش کے لہجے کے احقر کو بتانا شروع کیا۔ ابھی بات ادھوری ہی تھی کہ انہوں نے یہ کہکر فون کا سلسلہ منقطع کر دیا کہ "دوسرے فون پر ڈاکٹر سید اسلم صاحب کا فون ہے، میں آپ کو دوبارہ فون کروں گا۔" دوران گفتگو وہ یہ بتا چکے تھے کہ ڈاکٹر سید اسلم صاحب نے پیتھوڈین کا انجکشن لگانے کی ہدایت کی ہے، اور محترم بھائی رضی صاحب انجکشن اُن کے مکان سے لیکر کورنگی پہونچنے والے ہیں ——— پیتھوڈین کا نام سنکر احقر کو تشویش ہو گئی تھی اسلئے احقر نے اُن کے دوسرے فون کا

انتظار کئے بغیر اپنی موٹر سائیکل اسٹارٹ کی (حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کبھی کبھی ازراہِ مذاق اس موٹر سائیکل کو انگریزی گدھا فرمایا کرتے تھے) احقر چونکہ اسی کے ذریعے ہر ہفتے والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر ہوتا تھا ——— جب تک احقر پہونچ نہ جاتا، بلے چینی سے انتظار فرماتے اور دعائیں کرتے رہتے تھے۔ احقر کو پہونچنے کی جلدی تھی پورا راستہ یہ دعائیں کرتا ہوا گذرا کہ "یا اللہ! بے ہوشی سے قبل مجھے ان کی خدمت میں پہونچا دیجئے

چند آخری کلمات

احقر اللہ تعالیٰ کے اس انعام و احسان کا شکریہ ادا کرنے سے قاصر و عاجز ہے کہ جب احقر دبے پاؤں داخل ہوا، اور سرگوشی میں مولوی محمد رفیع سے حال دریافت کرنے لگا تو، والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے آنکھیں کھولیں، غالباً میرا آنا غیر متوقع تھا۔ چہرے پر انبساط کی نمایاں کیفیت ایک لمحے کے لئے پیدا ہوئی اور غائب ہوگئی۔ ارشاد فرمایا "اکیلے آئے ہو؟" عرض کیا۔ جی ہاں! اکیلا ہی حاضر ہوا ہوں، کچھ وقفے کے بعد پھر فرمایا "اسکوٹر سے آئے ہو؟" عرض کیا۔ جی ہاں! پھر کچھ دیر بعد خاموشی اور وقفے کے بعد فرمایا "فرید کی طبیعت کیسی ہے!" (فرید اشرف احقر کا بڑا لڑکا جو چند روز سے کمر کے پٹھے کی درد میں مبتلا تھا۔ اور صرف دو روز قبل احقر نے حضرت والد صاحبؒ کو فون پر اسکی اطلاع دی تھی) عرض کیا۔ "الحمد للہ! اب ٹھیک ہے، آپ ذرا خاموشی سے لیٹ جائیں۔ انشاء اللہ آپ کی طبیعت بہتر ہوگی۔ یہ سنکر آنکھیں بند کر لیں، اللہ اکبر! اسقدر رعایت دوسروں کی فرماتے تھے۔ خود تکلیف کے جس عالم سے دوچار ہیں، اس کا ہم تصور بھی نہیں کر سکتے۔ آنے والے سے دو باتیں کرنے کا حق ادا فرمایا، پھر اپنے پوتے کی عیادت کا حق ادا کیا ——— اور اپنی تکلیف کا نہ زبان سے کوئی اظہار اور اپنے کسی عمل سے۔ اس وقت انجکشن لگے ہوئے تقریباً چالیس منٹ گذر چکے تھے۔

تقریباً شام کے چھ بجنے والے تھے۔ بے ہوشی کا کچھ کچھ اثر ہونے لگا تھا۔ مغرب سے چند منٹ قبل ڈاکٹر سید اسلم صاحب کو لے کر محترم بھائی رضی صاحب تشریف لا چکے تھے۔ بھائی رضی صاحب والد صاحب کی پائینی آکر کھڑے ہوگئے تھے آنکھ کھولی انہیں دیکھا تو اپنے داہنے ہاتھ کو آدھا اٹھا کر اشارہ فرمایا، گویا فرما رہے ہوں "اچھے تو ہو" بولنے کی طاقت جواب دے رہی تھی۔ بے ہوشی کا غلبہ ہو رہا تھا، لیکن ہاتھ کے اشارے سے ان کے آنے کا بھی حق ادا فرمایا۔

ڈاکٹر سید اسلم نے بلڈ پریشر چیک کیا تو وہ کچھ گھبرا سے گئے۔ کارڈیوگرام لیا، اور پے در پے تین چار انجکشن لگائے۔ اسی دوران اُن سے بھی کچھ فرمایا، اور چہرے کی خفیف مسکراہٹ سے ان کا استقبال کیا۔ ڈاکٹر صاحب فارغ ہوئے تو ہم سب بھائی ان کے گرد جمع ہو گئے۔ اُنہوں نے فرمایا۔ حالت نازک ہے۔ یہاں جو تدابیر ممکن تھیں کی جا چکی ہیں۔ انہیں ہسپتال لیجانا پڑے گا۔ لیکن مجھے یہ بھی پوری توقع نہیں کہ ہسپتال تک بھی بحفاظت

پہونچ سکیں گے! ہم سب ایک دوسرے کو تک رہے تھے۔ ہونٹوں کی جنبش بتا رہی تھی کہ دواؤں کا وقت گذر چکا ہے دُعاؤں کا وقت ابھی باقی ہے ــــــ اُسی لمحے پھر حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے آنکھ کھولی، احقر دوڑ کر ان کے بستر پر سامنے جا بیٹھا۔ فرمایا: "یہ انجائنا کی تکلیف ہے۔ یا اٹیک ہے؟" احقر نے عرض کیا۔ "ابا جی! یہ انجائنا نہیں بلکہ باقاعدہ دل کا اٹیک ہے ــــــ!" آفتاب غروب ہو چکا تھا، لیکن اُفق پر جاتی ہوئی روشنی کے آثار باقی تھے۔

تذبذب پیش آیا کہ ہسپتال لیجایا جائے یا نہیں۔ لیکن ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ نہ لے جانے کے معنی یہ ہونگے کہ ہم ابھی سے مایوس ہو گئے۔ ہسپتال لے جانے کی رائے ٹھہری۔ ایمبولینس کو فون کیا جا چکا تھا۔ ہم بھائیوں نے ایک ایک کر کے مغرب کی نماز ادا کی، اور نماز کے بعد والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی ضروری اشیاء کو ایک گٹھڑی میں جمع کیا جانے لگا۔ محترمہ والدہ ماجدہ مدظلہا جو ایک طویل عرصے سے صاحب فراش ہیں، اور جنہیں رمضان سے کچھ روز قبل ہی اچانک بائیں جانب فالج کا اثر ہو گیا تھا معذور حالت میں دوسرے کمرے کے اندر لیٹی ہوئی تھیں۔ انہیں پہیئے والی کرسی پر بٹھا کر والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے کمرے میں لایا گیا، والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ اب بے ہوش تھے، والدہ ماجدہ مدظلہا کو آخری دیدار کرا کے لے جایا جا چکا تھا۔ ایمبولینس دروازے پر کھڑی تھی، اس موقع پر ڈاکٹر صاحب نے اصرار سے ہسپتال لیجانے کے لئے فرمایا تو ایک لمحہ تذبذب کے بعد راضی ہو گئے، والد صاحب کو اسٹریچر پر لٹانے ہی والے تھے کہ دارالعلوم کی بجلی فیل ہو گئی ــــــ چاروں طرف بیز اندھیرا چھا گیا تھا، گہرا وحشت ناک اندھیرا۔ لالٹین کی روشنی میں غرض انہیں ایمبولینس میں لٹا دیا گیا۔ کچھ لوگ ایمبولینس میں اور کچھ محترم بھائی رضی صاحب کی گاڑی میں اُن کے ہمراہ روانہ ہو چکے تھے۔ احقر اس خیال سے گاڑی میں نہیں بیٹھا کہ موٹر سائیکل کی شاید ہسپتال میں ضرورت پڑے اس لئے احقر نے اپنے "انگریزی گدھے" پر سوار ہو کر اُسکو اسٹارٹ کیا! لیکن عجیب صورت سامنے آئی۔

موٹر سائیکل کی اگلی اور پچھلی بتیاں خراب تھیں، بظاہر کوئی سبب نہیں تھا، لیکن حقیقتاً معاملہ کچھ اور تھا۔ جب روشنی کا منبع دور ہونے لگے تو اندھیروں کی جرأت بڑھ ہی جاتی ہے، مہیب اندھیروں نے چاروں طرف سے جیسے سازش کر کے گھیر لیا ہو۔ آج اس "انگریزی گدھے" کے ساتھ دعاؤں کا پہرہ نہ تھا۔ !آخر نجانے کس طرح ٹوٹی پھوٹی سڑک پر اندھیرے میں چلتے چلتے یہ ۱½ میل کا فاصلہ طے کیا۔

آخری لمحے تقریباً ۸ بجے والد صاحب کو ہسپتال لایا گیا، اور انہیں اُس اسپیشل کمرے میں رکھا گیا جو اس مرض کے سلسلے میں سائنس کی فراہم کردہ تمام ممکن سہولتوں سے آراستہ ہے۔ دیواروں پر ٹیلی ویژن کی طرح اسکرینیں نصب ہیں، جو دل کی دھڑکنوں اور دیگر کیفیات و تغیرات کو منتقل کر کے دیکھنے کے قابل بنا دیتی ہیں۔ ڈاکٹر سید اسلم

اوراں کا عملہ پوری تندہی سے اپنے اپنے کام میں معروف تھا، ہم بے بسی کی حالت میں کبھی ڈاکٹر صاحب، کبھی والد صاحبؒ اور کبھی اسکرین کو تک رہے تھے ـــــــ کمرے سے باہر اعزا و اقربا، دارالعلوم کے اساتذہ، اور دیگر حضرات کا اجتماع ہو رہا تھا، دو تین گھنٹوں کا یہ وقت کن کیفیات میں گذرا اسکو بیان کرنے کے لئے احقر کے پاس الفاظ نہیں۔

تقریباً ½۱۱ بجے والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے جسم کو حرکت ہوئی، اور بے چینی سی محسوس ہوئی ڈاکٹر صاحب نے بتایا کہ بے ہوشی کا اثر کم ہونے پر تکلیف کے احساس سے یہ بے چینی ہے دونوں ہاتھوں میں گلوکوز اور دیگر ادویہ کے ڈرپ کی سوئیاں لگی ہوئی تھیں۔ احقر نے محسوس کیا کہ بائیں ہاتھ کی ڈرپ جو قطرہ قطرہ کرکے ایک نلکی کے ذریعے بدن میں پہونچ رہی تھی اس سے قطرے گرنا بند ہوگئے، ڈاکٹر صاحبان نے دوسری نس تلاش کرکے اس میں ڈرپ لگائی۔

عالمِ نزع

غالباً یہی وقت تھا جب اس دارِ فانی سے روح کے رشتے ایک ایک کرکے ٹوٹ رہے تھے اور روح دارِ خلد سے اپنا رشتہ قائم کر رہی تھی ـــــــ پھر ایک بار غالباً ۱۲ بجنے سے چند منٹ پہلے بے چینی ہوئی اور آپ نے بھرائی ہوئی آواز میں فرمایا "میرا ہاتھ چھوڑ دو" چہرے پہ کرب و تکلیف کی کوئی علامت نہیں تھی۔ بلکہ اطمینان اور سکون پورے چہرے پر نمایاں تھا۔ چت لیٹے ہوئے تھے۔ اسی عالم میں آپؒ نے کروٹ لینے کی کوشش کی، پہلے تو ڈاکٹرؒ نے انہیں روکا، لیکن آپؒ نے قبلہ کی طرف کروٹ لے لی ـــــــ اسی دوران کسی لمحے ڈاکٹر سید اسلم صاحب نے پوچھا، "مفتی صاحب! کیا حال ہے؟" انہیں آنکھ کھول کر دیکھا۔ اور فرمایا "اب کچھ پتہ نہیں" اور یہی حضرت والد صاحبؒ، رحمۃ اللہ علیہ کا آخری کلمہ تھا جو زبانِ مبارک سے عالمِ نزع میں ادا ہوا۔

تقریباً ۱۲ بجکر ۱۹ منٹ پر ڈاکٹر سید اسلم نے مولوی تقی سلّمہٗ سے فرمایا، "جسکو بلانا چاہیں بلالیں، مفتی صاحب کا آخری سانس ہے۔ احقر نے بڑھ کر سینے پر ہاتھ رکھا، سینہ بالکل ساکت تھا ـــــــ احقر نے بآوازِ بلند سورۂ یٰسین پڑھنا شروع کی، لیکن اندر سے دل نے کہا کہ اب روح اور جسم کا رشتہ ٹوٹ چکا ہے، یہ خیال آتے ہی آواز بھرّا گئی، اور سورۂ یٰسین کا پورا کرنا ممکن نہ رہا۔ دل نے غلط نہیں کہا تھا، والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی روح ۸۳ سال کا طویل، اور جہد و عمل کی مشقتوں سے پُر سفر ختم کرکے منزلِ اصلی کی جانب جاچکی تھی جہاں اُسے

يَا أَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِي إِلَىٰ رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً

ترجمہ:۔ اے اطمینان والی روح! اپنے پروردگار کی طرف چل، اس طرح کہ تو اس سے خوش اور وہ تجھ سے خوش۔ پس میرے خاص بندوں میں شامل ہو جا اور میری جنت میں داخل ہو جا۔"

کا

ان کا سرور وکیف سے لبریز نغمہ سنایا جا رہا ہوگا (انشاءاللہ العزیز الحکیم) آمین۔

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی قدس اللہ سرّہٗ کا ایک زندہ اور چلتا پھرتا نمونہ، ایک بے مثال فقیہ اور مفکر، عالم اسلام کا ایک درخشندہ ستارہ، بے سہاروں اور ضرورت مندوں کا سہارا، طریقت کے اسرار و حکم کا بے مثل خزانہ، سالکین کا ایک مشفق مربی، عزیز و اقارب کے سروں کا سایۂ شفقت و رحمت، طالبانِ علم کا ایک مشفق استاد اور ہمارا ایک عدیم النظیر مشفق و مربی باپ سب کو یتیم کر کے آخر اپنے مالکِ حقیقی سے جا ملا۔ إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ۔

رات کو تقریباً ایک بجے ہسپتال سے انہیں دارالعلوم کورنگی واپس لایا گیا۔ انہیں کے کمرے میں، اسی چارپائی پر جس پر سے اٹھا کر لے جائے گئے تھے انہیں لٹا دیا گیا۔ گرمی کے پیشِ نظر چاروں طرف برف کی سلیں لگا دی گئیں۔

احقر نے چہرۂ مبارک کو کھولا، تو اب اس پر نہ نقاہت کے آثار تھے، نہ کرب و اذیت کا کوئی نشان۔ ایک لازوال سکون و اطمینان، دیکھنے والوں کی آنکھوں کو ٹھنڈا کر دینے والی ایک عجیب کیفیت۔ ؎

اب نہ کلفت ہے، نہ شکوے ہیں نہ گویائی ہے
آج بیمارِ محبت نے شفا پائی ہے

تجہیز و تکفین احقر کی ہمشیرہ اور بہنوئی جناب حافظ شفقت صاحب اور برادرِ بزرگ مولانا محمد زکی مرحوم کے تمام گھر والے لاہور میں تھے، انہیں شدید دورے کی اطلاع پیر شام ہی دے دی گئی تھی۔ وہ فون سے مسلسل رابطہ قائم کئے ہوئے تھے اور کوشش میں تھے کہ ہوائی جہاز سے سیٹ مل جائے تو فوراً کراچی پہنچیں، آخر انہیں آخری اطلاع بھی دے دی گئی۔

تجہیز و تکفین اور تدفین میں زیادہ تاخیر مناسب نہیں تھی لیکن ان حضرات کا انتظار بھی ضروری تھا، چنانچہ معلوم ہوا کہ بدھ ۱۱ر شوال المکرم کو ایک بجے دن جہاز کراچی پہونچے گا اس لئے مجبوراً فیصلہ کیا گیا کہ بعد نمازِ ظہر تدفین کی جائے۔

ریڈیو، ٹیلی ویژن اور اخباری نمائندوں نے بھی ٹیلی فون کے ذریعے رابطہ قائم کیا ہوا تھا۔ رات کو ایک بجے ریڈیو کی عالمی سروس نے خبروں میں اس خبر کو نشر کیا، جس سے بیرونِ ملک اکثر لوگوں کو فوری اطلاع ہو گئی، صبح ہونے سے قبل ہی یہ خبر کافی مشتہر ہو چکی تھی اور صبح ہونے کے بعد تو تمام اخبارات اور ریڈیو کے خبرنامے اس خبر کی تفصیلات سے بھرے ہوئے تھے۔

غسل و تکفین صبح فجر کے بعد ہی لوگوں کے غول کے غول آنا شروع ہو گئے تھے، دور دور سے لوگ پیدل، بسوں، رکشاؤں

اور گاڑیوں سے دارالعلوم پہونچ رہے تھے، بعض اخبارات نے ۱۱ بجے نماز جنازہ کے ہونے کا اعلان کر دیا تھا، اس لئے لوگوں کی قطاریں اور دور سے صبح ہی سے دارالعلوم کی طرف آتی ہوئی نظر آنے لگیں. کراچی شہر کے صدر بازار سے کورنگی کے لئے چلنے والی بسیں، اور منی ٹیکسیوں کے اسٹاپ پر ہزاروں لوگوں کا اجتماع قابو سے باہر ہونے لگا تو مجبوراً انہیں بسوں پر تختیاں لکھ کر لگانی پڑیں کہ صرف دارالعلوم جانے والوں کے لئے. ریڈیو کراچی وقفے وقفے سے نماز جنازہ کے وقت کا اعلان برابر کر رہا تھا۔۔۔۔۔۔ لوگوں کے اس بے پناہ ہجوم کو دیکھ کر خیال ہوا کہ غسل و تکفین کے کام میں تاخیر کرنا مناسب نہ ہوگا تاکہ دور دراز سے آنے والے لوگوں کو آخری بار چہرہ مبارک کے دیدار کا موقع مل سکے. چنانچہ تقریباً ½ ۹ بجے غسل کی تیاری مکمل کر کے حضرت مولانا ڈاکٹر عبدالحئی صاحب، مدظلہ، جو حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس اللہ سرہٗ کے خلیفۂ خاص اور والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے دیرینہ رفیق اور مہربان و بے تکلف دوست ہیں، اُنکی نگرانی میں ہم سب بھائیوں اور مولانا متین خطیب، مولانا نور احمد صاحب، اور مولانا جمیل صاحب برمی نے مسنون طریقے پر غسل دیا. اُس وقت خیال آیا کہ حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے مصنوعی دانت منہ ہی میں رہ گئے ہیں، نکالنے کی کوشش کی، لیکن بدن سخت ہو چکا تھا ان کا اس وقت نکالنے کی کوئی صورت نہیں تھی، اس لئے ناچار اُسکو منہ ہی میں رہنے دیا گیا۔۔۔۔۔۔ وصیت کے مطابق مسنون طریقہ سے کفن دیا گیا، اور تبرکات کفن میں حسب ہدایت شامل کئے گئے.

آخری دیدار غسل سے فارغ ہو کر احقر باہر نکلا، تو دارالعلوم کے کشادہ اور وسیع میدانوں میں انسانوں کا ایک عظیم الشان مجمع نظر آیا. عجیب منظر تھا. لوگ اس گرمی اور دھوپ میں شہر کے دور دراز علاقوں سے شدید دقتوں کا سامنا کر کے، تمام تکلیفوں سے بے پرواہ فقیہہ وقت کے آخری دیدار کی ایک جھلک دیکھنے کے لئے گھنٹوں پہلے جمع ہوگئے تھے، اور شہر سے آنے والی سڑکوں پر انسانوں کے قافلے رواں دواں نظر آرہے تھے ان میں بوڑھے ضعیف و ناتواں سفید ریش بزرگوں کی تعداد زیادہ تھی، ہر طبقہ کے افراد موجود تھے. شیعہ، اہل حدیث، بریلوی حضرات، سرکاری ملازمین، وکلاء، علماء، صلحاء، مزدور پیشہ، تاجر، صنعت کار، غرض شاید ہی کوئی طبقہ ایسا ہوگا جسکے افراد اپنے دفتروں، دکانوں، اور کارخانوں سے چھٹی کر کے پندرہ اور بیس میل کا سفر طے کر کے وہاں نہ پہونچ رہے ہوں. حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو اللہ تعالیٰ نے پاکستان کی واحد ایسی شخصیت بنایا تھا، جس پر ہر طبقے، ہر نظریہ و خیال، ہر فرقے اور گروہ کے لوگ مکمل اعتماد رکھتے تھے. یہ فی الحقیقت حضرت والد صاحبؒ کی حق گوئی، میانہ روی اور اختلاف و تنقید کے معاملے میں، دلسوزی اور ہمدردی کے ساتھ کسی کی ذات کو ہدف بنائے بغیر حق بات کہنے کی مسنون حکمت پر عمل کرنے کا نتیجہ تھا. یہی وجہ تھی کہ ان سے علمی مذہبی، فکری اور سیاسی اختلاف رکھنے والے افراد اور گروہ بھی ان کی بات کا وزن محسوس کرتے اور ان پر مکمل اعتماد رکھتے تھے. زیر نظر مضمون احقر کی توقع سے کہیں زیادہ طویل ہوگیا ہے، جب کہ اللہ تعالیٰ شاہد ہیں کہ احقر نے خود کو بمشکل تمام اختصار کے ساتھ محض نمونتاً آپکی ہمہ گیر شخصیت کے بعض پہلوؤں کو لیا ہے. معلوم نہیں کتنے بے شمار

حالات اور واقعات، اتباعِ سنّت کے نادر نمونے، حسنِ خلق اور مسنون معاملات کے عدیم المثال برتاؤ، ذہن کے پردے پر قطار بنائے اسکے منتظر ہیں کہ انھیں بھی اس مضمون میں جگہ مل جائے۔ بادلِ ناخواستہ اُنھیں نظرانداز کرکے۔ اصل تفصیلات کی طرف آتا ہوں۔

آخری دیدار کے سلسلے میں ایک اہم مسئلہ یہ درپیش تھا کہ دور دراز سے آنے والے اس ہجوم کو جو کڑی دھوپ میں صرف ایک جھلک دیکھنے کے اشتیاق میں پسینہ پسینہ ہو رہا تھا، کس طرح اُنکو زیارت کا موقع فراہم کیا جائے چنانچہ سب کی رائے یہ ہوئی کہ اسی کمرے میں لوگوں کو ایک قطار کی شکل میں ایک دروازے سے داخل کیا جائے اور چارپائی کی داہنی جانب سے قطار کو گذار کر دوسرے دروازے سے باہر لے جایا جائے، چنانچہ تقریباً گیارہ بجے یہ سلسلہ شروع کیا گیا۔
حیرت انگیز بات یہ ہے کہ اتنا بڑا مجمع جو بعض اخباروں کی رائے کے مطابق تقریباً ایک لاکھ تھا، اسکو کسی نظم کا پابند کرنے کے لئے تجربہ یہ ہے کہ بڑی پولس فورس اور فوج بھی ناکافی ہوتی ہے، دیکھنے میں یہ آیا کہ جب لوگوں کو معلوم ہوا کہ قطار کی صورت میں اندر جاکر زیارت کا موقع ملے گا تو خود ہی پورے نظم وضبط، اور سکون وصبر کے ساتھ قطار قائم کرلی۔ دیکھنے والوں نے بتایا کہ تقریباً ایک میل سے زائد لمبی قطار تھی جو والدصاحب رحمۃ اللہ علیہ کے دروازے سے شروع ہوکر پیچ وخم کھاتی ہوئی دارالعلوم کی سینکڑوں ایکڑ وسیع زمین پر بیرونی دروازوں سے نکل کر سڑک تک جا پہونچی تھی۔

احقر اور دوسرے بھائی اور اعزاء کمرے ہی میں والدصاحب رحمۃ اللہ علیہ کی چارپائی کے گرد کھڑے تھے، احقر دیکھ رہا تھا کہ ستر اسّی سال کے ضعیف بوڑھے اور ناتواں بزرگ لائن میں لگے ہوئے آتے جاتے ہیں، آنکھوں سے بہتے ہوئے آنسو اور چہروں پر پسینے کے قطرے، اُن کے جذبۂ دینی، اور اللہ کے بندوں سے خالصاً لِلّٰہ محبت کی گواہی دے رہے تھے، کوئی بیساکھیوں کا سہارا لے کر تقریباً لڑکھڑاتا ہوا اس طویل قطار میں لگ کر ایک جھلک دیکھ لینے پر اپنی محبت کے اس ثمرہ پر خوش نظر آتا تھا، بہت سے لوگ جو معذور تھے پہیّوں والی کرسی ہی پر بیٹھ کر حقِ محبت ادا کرنے چلے آئے تھے شاید۔۔۔۔ نہیں بلکہ یقیناً بڑے بڑے بادشاہوں، مالداروں اور سیاسی لیڈروں کو بھی یہ عزّت حاصل نہ ہوتی ہوگی جو اللہ تعالیٰ نے اپنے ایک مخلص بندے کو عطا فرمائی تھی

والدصاحب رحمۃ اللہ علیہ کا کھلا ہوا پرسکون چہرہ بزبانِ حال کہہ رہا تھا کہ، لوگو! اگر دنیا میں عزّت وشہرت کی انتہائی بلندیوں کو چھونا ہے تو اپنے مالکِ حقیقی کے سامنے ناک اور پیشانی رگڑو، دنیا والوں کے دلوں پر حکومت کرنی ہے تو حاکمِ مطلق کے سچّے غلام بن جاؤ، دین ودنیا میں اعلیٰ وارفع مقام حاصل کرنا چاہتے ہو تو عاجزی وانکساری اختیار کرلو مخلوق کی نظروں میں محبوب بننا چاہتے ہو تو اپنے مفادات کو اللہ کے بندوں کے لئے قربان کردو، بے رنج وخوف کی پرسکون اور اطمینان کی زندگی گذارنا چاہتے ہو تو سنّتِ نبوی صلے اللہ علیہ وسلم کا اتباع کرو۔

یہ نہ ختم ہونے والی قطار یوں ہی ایک دروازے کی طرف بڑھتی رہی، تقریباً تین گھنٹے بعد جب ڈیڑھ بجے کے

قریب لاہور سے ہمشیرہ اور بھائی صاحب مرحوم کے گھر والے پہونچے تو احقر یہ دیکھنے کے لئے باہر نکلا کہ باقی کتنے لوگ ہیں جو ابھی تک دیدار نہیں کر سکے۔ احقر کی نظروں نے جہاں تک کام کیا، قطار لگی نظر آئی۔ ظہر کی نماز میں تاخیر کی گنجائش نہ تھی آخر مجبور ہو کر زیارت اور دیدار کا یہ سلسلہ بند کرنا پڑا۔ کیونکہ اگر اسکو جاری رکھا جاتا تو یقیناً رات تک بھی یہ سلسلہ ختم نہ ہو پاتا۔

یہاں احقر اپنے تمام گھر والوں، بہنوں بھائیوں اور تمام اعزّہ و اقربا کی جانب سے ان تمام حضرات سے دست بستہ معذرت کرتا ہے جنہیں شرعی مصلحتوں اور انتظامی تقاضوں کے تحت ہم زیارت کا موقع نہ دے سکے، مجھے یقین ہے کہ اللہ رب العالمین کی درگاہ میں انکی محنتیں ضائع نہیں جائیں گی، بلکہ انشاء اللہ ان لوگوں کو زیادہ اجر و ثواب ملے گا جو زیارت کی حسرت سے کر محنت اُٹھا کر واپس چلے گئے۔

ظہر کی نماز تیار تھی ——— مولانا احتشام الحق تھانوی مدظلہ نے نماز ظہر کی امامت فرمائی اور جماعت سے قبل مختصر تقریر میں حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی وفات پر اظہارِ غم کے بعد صبر کی تلقین فرمائی۔

جنازہ | لاہور سے آنے والوں کو آخری دیدار کرانے کے بعد آخر جنازہ تیار کیا گیا اب ایک اہم مسئلہ یہ تھا کہ اتنے بڑے ہجوم کو قابو میں کیسے رکھا جائے، ہر فرد کندھا دینے کا مشتاق تھا، ایک اہتمام تو یہ کیا گیا کہ جنازہ کے ساتھ لمبے بانس باندھ دیئے گئے تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگ ایک وقت میں کندھا دینے کی سعادت حاصل کر سکیں ———

جنازہ باہر لایا گیا، دروازے کے سامنے انسانوں کے ٹھٹھ لگے تھے۔ دروازہ سے باہر جنازہ نکلنے بھی نہ پایا تھا کہ لوگ تمام نظم و ضبط کی پابندیوں کو توڑ کر پروانہ وار آگے بڑھے۔ اور جنازہ کاندھوں پر نہیں بلکہ لوگوں نے ہاتھوں کو سر بلند کر کے ہتھیلیوں پر رکھ لیا، اور اسی طرح تمام راستے دارالعلوم ہی کے احاطے میں عیدگاہ میدان تک پہونچا۔ یوں تو عیدگاہ کا میدان ایک فرلانگ کے فاصلے پر تھا، لیکن جنازہ کو ایک طویل چکر دے کر عیدگاہ تک لاتا تھا تاکہ سب لوگوں کو کندھا دینے کا موقع مل جائے ——— وہ منظر بھی عجیب تھا ——— علماء و صلحاء بوڑھے اور ضعیف لوگ کاندھا دینے کے اشتیاق میں ہجوم کے اندر گھستے، اور لوگوں کے دھکے کھاتے ہوئے ہجوم کے درمیان پستے ہوئے بانس تک پہونچتے اور کاندھا دینے کی کوشش کرتے۔ توانا و تندرست، اور جوان لوگ بوڑھوں کو پیچھے چھوڑ کر آگے جا پہونچتے

احقر نے اہل علم اور لوگوں کو زار زار روتے دیکھا ——— میرے ایک واقف جو ایک ورکشاپ کے مالک اور میکانک ہیں۔ بعد میں بتایا کہ وہ کاندھا دے کر ہجوم سے باہر نکلے تو ایک سفید ریش بزرگ کو روتے ہوئے یہ کہتے سُنا کہ افسوس! ہم بوڑھوں کے نصیب میں مفتی صاحب کو کاندھا دینا بھی نہیں ہے۔ یہ سعادت بھی جوانوں ہی کے حصے میں آئی، ان صاحب کو غیرت آئی۔ انہوں نے اپنے ساتھیوں کو ساتھ لے کر پکارا! آئیے بڑے صاحب! ہم آپ کو کندھا دلائیں گے چنانچہ انہوں نے ان کے گرد گھیرا ڈال کر انہیں اپنی حفاظت میں لے کر ہجوم کے اندر گھسے۔ اور انہیں کاندھا دلا کر واپس آئے

——— وہ کہتے تھے کہ اگلے دن تک سر اور کنپٹیوں میں دھکوں اور کہنیوں کی چوٹ کی دکھن محسوس ہوتی رہی۔
غرض جنازہ ایک طویل سفر کاٹ کر عیدگاہ میں لاکر رکھ دیا گیا، مومنین کا یہ عظیم اجتماع صفیں باندھ کر کھڑا ہوگیا۔ حضرت ڈاکٹر عبدالحیٔ مدظلہم نے نماز جنازہ کی امامت فرمائی ———

تدفین | دارالعلوم کی مسجد کے عقب میں مغربی سمت پر واقع ایک قطعۂ زمین کو والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے قبرستان کے لئے وقف فرمادیا تھا، جس کو چاروں طرف دیوار سے گھیر دیا گیا ہے۔ خود والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی کوششوں سے اس قبرستان میں مختلف اقسام کے درخت لگائے گئے جو آپ ماشاء اللہ سب تناور درخت ہیں، اور جنہوں نے پورے قبرستان پر سایہ کیا ہوا ہے۔ اس میں بہت علماء و صلحاء اور اہل اللہ آرام فرما ہیں۔ والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی والدہ محترمہ اور احقر کی دادی کا مزار بھی یہیں ہے۔ اُنہی کے قریب والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے لئے لحد تیار کی گئی اس سے پہلے جس وقت احقر غسل و تکفین سے فارغ ہو کر باہر آیا تھا تو احقر کے ایک دیرینہ رفیق ملے اور انہوں نے کہا کہ میں ابھی قبر دیکھ کر آرہا ہوں۔ ماشاء اللہ بڑی منور قبر ہے ——— اب نماز سے فارغ ہو کر احقر قبرستان کی طرف بھاگا تاکہ مجمع کے یہاں پہونچنے سے قبل لحد تک پہونچ جائے۔ لیکن مجمع یہاں قبرستان کے دروازے پر جمع ہو چکا تھا بمشکل راستہ نکالکر لحد تک پہونچا لحد پر نظر پڑی تو احقر کو اپنے ان رفیق کا جملہ یاد آیا، احقر کسی مبالغہ کے بغیر عرض کرتا ہے کہ زندگی میں احقر نے بہت قبریں دیکھیں، لیکن اس قدر شاداب، ٹھنڈی، روشن اور خوبصورت قبر اس سے پہلے کبھی نظر سے نہیں گذری تھی، اللہ تعالےٰ ان کی قبر مبارک کو ہمیشہ ہمیشہ منور اور ٹھنڈا رکھے۔ آمین۔

غرض جنازہ لوگوں کے سروں سے اونچا ہاتھوں پر رکھا ہوا آہستہ آہستہ قبرستان کی طرف بڑھا، معلوم نہیں کتنے افراد کاندھا دینے کی حسرت لئے واپس ہوگئے ہوں گے۔

احقر اور احقر کے پھوپی زاد بھائی جناب فخر عالم صاحب قبر میں اترے۔ دوسرے بھائی اور اعزا قبر کے اطراف میں جمع تھے۔ انہوں نے جسد مبارک کو ہاتھوں پر اٹھا کر آہستہ آہستہ لحد میں اتارا۔ آخری بار چہرہ مبارک کو کھولا گیا، جو ابدی سکون سے معمور چہرہ گویا زبان حال سے کہہ رہا ہو "لوگو! جلد یا بدیر سبکو اسی آخری گھر میں آنا ہے، زندگی اللہ کی عظیم نعمت ہے، اسکے ایک ایک لمحے کو سونا سمجھ کر، اس آخری منزل کی تیاری میں صرف کرو"

آہ! اسطرح یہ جہد و عمل، اور علم و تقویٰ کا پہاڑ، اسلاف اور اپنے اکابر کا سچا نمونہ علم و فقہ کے آسمان کا جگمگاتا ہوا سورج موت کے اُفق کے پار غروب ہوگیا، زمین کی امانت زمین کو سونپ دی گئی، اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن ط۔

دارالعلوم کے احاطہ سے رفتہ رفتہ لوگ اپنی اپنی منزلوں کو رخصت ہوگئے، اور آخر دارالعلوم کی فضاؤں پر ایک وحشت ناک سناٹا چھا گیا۔ اللہ تعالےٰ اُن کے لگائے ہوئے علم دین کے اس درخت کو ہمیشہ شاداب اور پھلتا پھولتا

رکھے، اور اسکے ذریعہ اپنے ایسے بندے پیدا کرے جو نیابت رسول کے منصب کے صحیح حقدار ہوں، اور اللہ کے دین کی اشاعت اور حفاظت کا مقدس فریضہ انجام دیں۔ آمین

وصیت نامہ:

حضرت والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ کی عادت تھی کہ اپنا وصیت نامہ ہمیشہ لکھ کر تیار رکھتے تھے، اس مقصد کے لئے والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ایک رجسٹر بنایا ہوا تھا، جس میں حالات کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ وصیت میں تبدیلی فرماتے رہتے۔ ہندوستان سے ہجرت سے قبل کی وصیتیں بھی اس میں درج ہیں، اُنہیں ہجرت کے بعد منسوخ کر کے نئی وصیتیں تحریر کی گئیں۔

حضرت والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ نے دو وصیت نامے چھوڑے۔ ایک وصیت نامہ عام مسلمانوں اور اہل خاندان کے لئے، ان میں چند قیمتی نصائح کے علاوہ تمام لوگوں سے بڑی عاجزانہ درخواست کی تھی کہ اگر کسی کا کوئی مالی یا غیر مالی حق رہ گیا ہو تو وہ والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے بات کر کے وصول کر لے یا معاف کر دے۔ یہ وصیت نامہ آپ نے ۲۷، ربیع الثانی ۱۳۹۵ھ کو یعنی پچھلے سال عمرے کے سفر سے قبل تحریر فرمایا تھا، جو والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ ہی کے حکم سے شعبان ۱۳۹۵ھ کے البلاغ میں بھی شائع کر دیا گیا تھا، اور اس کو ایک کتابچے کی صورت میں بھی شائع کر کے تقسیم فرما دیا تھا۔

دوسرا وصیت نامہ خاص ان اولاد کے لئے تحریر فرمایا تھا، اشرف منزل جو ذاتی مکان آپ نے بنوایا تھا، اسکی تقسیم تو خود ہی اپنی زندگی میں فرما دی تھی، اس وصیت نامے میں زیادہ تر اولاد کے لئے قیمتی نصیحتیں تحریر فرمائی تھیں جن میں اپنے گھروں میں پردے کی شرعی پابندی، مغربی تہذیب کے اثرات سے اپنے اہل و عیال اور گھروں کو محفوظ رکھنا اور کسی متبع سنت بزرگ کی صحبت کا اہتمام کرنے کی نصیحتیں، قابل ذکر ہیں، اپنے بارے میں تحریر فرمایا کہ اگر ہو سکے تو روزانہ سورۃ یٰسین پڑھ کر ورنہ تین بار سورۃ اخلاص (قل ھو اللہ احد) پڑھ کر ایصال ثواب کر دیا کریں، مالی ایصال ثواب کے بارے میں تاکید فرمائی کہ وہ مکمل اخفاء کے ساتھ کیا جائے، اور رسمی اجتماع وغیرہ سے پرہیز کیا جائے احقر قارئین کرام سے التجا کرتا ہے کہ وہ دعا فرمائیں اللہ تعالیٰ ہمیں والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے منشاء کے مطابق ان کی وصیتوں پر عمل کرنے کی توفیق اور حوصلہ عطا فرمائے۔ آمین۔

یہاں ایک بات اور قابل ذکر یاد آئی، والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی یوں تو عادت تھی کہ کوئی چیز بھی بے جگہ نہ خود رکھتے اور نہ دوسروں کو رکھنے دیتے، کمرے کی ہر شے کی ایک جگہ متعین تھی وہ شے استعمال کے بعد ٹھیک اسی جگہ رکھ دی جاتی لیکن تقریباً ایک ڈیڑھ سال سے احقر محسوس کرتا تھا کہ والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے کمرے میں اگر کوئی شے گھر کے استعمال کی ان کے پاس لائی جاتی تو استعمال کے بعد تمام کام چھوڑ کر خود یا دوسروں کے ذریعے فوراً اس شے کو واپس گھر

میں بھجوا دیتے۔ مثلاً اگر کوئی پیالی، یا چمچہ چائے وغیرہ کے لئے آجاتا تو ہم لوگ اگر کوئی ضروری کام یا بات کر رہے ہوتے تو اُن کو نا تمام چھڑوا کر وہ شئے واپس بھجوا دیتے۔ احقر کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اس معاملے میں والد صاحبؒ کسی تاخیر کو کیوں گوارا نہیں فرماتے۔ یہ راز اس وقت کھلا جب وصیت نامہ پڑھا گیا۔ اس میں تحریر تھا کہ احقر کے کمرے کی تمام اشیاء احقر کی ذاتی ملکیت ہیں، اور اہلیہ کے کمرے کی تمام اشیاء انہی کی ملکیت ہیں احقر اس بات کا اہتمام کرتا ہے کہ دوسری ملک کی اشیاء اس کمرے میں نہ رہنے پائیں ۔

صدری کی اشیاء

والد صاحب رحمہ اللہ علیہ کی صدری کی جیبوں سے بہت سے کاغذات، یادداشتیں، اور کچھ نقد رقم کے علاوہ ایک بٹوے کے خانے میں کچھ بیرونی ممالک کے استعمال شدہ ڈاک کے ٹکٹ بھی ملے۔ حضرت والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ کو معلوم تھا کہ بعض بچے بیرونی ملکوں کے ٹکٹ جمع کرتے ہیں، اور انہیں پاکر بہت خوش ہوتے ہیں۔ ان بچوں میں احقر اور برادر محترم مولانا محمد رضی صاحب کے بچے بھی شامل ہیں۔ عادت تھی کہ باہر کے ملکوں سے آئے ہوئے خطوط سے خود ہی ٹکٹوں کو احتیاط سے الگ کرتے اور انہیں محفوظ رکھتے تھے جب کبھی ان بچوں میں سے کوئی حاضر ہوتا تو ٹکٹ ان کو دیتے، اور انکو خوش ہوتا دیکھ کر خوش ہوتے ـــــــ جیسا پہلے عرض کیا گیا کہ معمولی اور بظاہر بے کار اور بے قدر اشیاء کا وہ ایسا مصرف تلاش کرتے جس سے دوسروں کا فائدہ اور اُس نعمت کا صحیح استعمال ہو جائے، صدری کی اوپر والی چھوٹی جیب سے دو تعویز بھی نکلے جو بظاہر دل کی تقویت کے لئے رکھے ہوئے تھے ۔

بعض بشارتیں

حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے وصال کے بعد بعض حضرات نے خواب میں حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی زیارت کی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان میں سے چند بشارتیں یہاں نقل کر دی جائیں۔

حضرت ڈاکٹر عبدالحیٔ صاحب مدظلہم، جو حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس اللہ سرہٗ کے قدیم مجاز بیعت، اور احقر کے مشفق و مربی، اور عزیزان مولوی محمد تقی اور مولوی محمد رفیع سلمہما کے شیخ و مرشد ہیں اور اب والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے بعد کراچی میں حکیم الامت قدس اللہ سرہٗ کی آخری یادگار ہیں۔ اُنہیں غالباً ہسپتال ہی سے اس حادثہ کی اطلاع تقریباً ۱۲½ بجے دی گئی تھی۔ اس خبر سے پہلے اگرچہ حضرت مدظلہم کو دورے وغیرہ کی کوئی اطلاع نہیں تھی فرماتے ہیں کہ نیند بار بار ٹوٹ جاتی تھی، اور ایک طرح کی بے چینی سی تھی، اس اطلاع کے بعد حضرت مدظلہم لیٹ گئے، تو خواب میں دیکھا کہ ایک کچا بنا ہوا مکان ہے۔ ایک برآمدہ سا بنا ہوا ہے، اور اسکے بعد ایک کچا کمرہ ہے، کمرے کے فرش پر حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ صرف پاجامہ پہنے ہوئے ننگے بدن زمین پر لیٹے ہوئے ہیں۔ حضرت مدظلہم آگے بڑھے اور فرمایا حضرت! میں نے تو سنا تھا کہ آپ کا انتقال ہو گیا ہے؟ کچھ مسکراہٹ کے بعد فرمایا کہ ہاں انتقال تو ہو گیا

ہے، اور سر کو او حر او حر گھما کر دیکھ رہے ہیں"۔ ـــــــ حضرت مدظلہم فرماتے ہیں کہ جس وقت آنکھ کھلی تو بغیر کسی غور و فکر کے خواب کی تعبیر بھی فوراً ہی ذہن میں آگئی، حضرت مدظلہم نے تعبیر میں تین باتیں ارشاد فرمائیں، فرمایا کہ ننگے بدن لیٹنے سے اس طرف اشارہ ہے کہ حضرت مفتی صاحبؒ علائق دنیوی سے پاک تھے۔ اورؔ کچے فرش پر لیٹنے سے ان کے مقام عبدیت اور مقام فنا کی طرف اشارہ ہے، اورؔ مسکرا رہے ہیں اس سے مقام شہادت کی طرف اشارہ ہے۔

یٹوی میں ایک صاحب جو والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے دینی اور اصلاحی تعلق رکھتے ہیں۔ انہوں نے فون پر بتایا کہ ان کے کوئی واقف کار ہیں، ان کے ایک دوست جو خود بھی ماشاء اللہ نیک اور صالح آدمی ہیں، انہوں نے والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو کچھ ایصال کیا، اس کے بعد سوئے تو خواب میں دیکھا کہ والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرما رہے ہیں کہ تمہارا تحفہ مجھے مل گیا۔ اللہ تعالیٰ نے میری قبر کو نور سے منور کر دیا، اور مجھے حق تعالیٰ شانہٗ نے "مقام معیت" عطا فرمایا ہے۔

احقر نے خواب میں دیکھا کہ اشرف منزل کی شمالی سڑک مستقل روڈ پر اشرف منزل کے مقابل مکان کی دیوار کے ساتھ مٹی کا ایک بڑا ڈھیر اور تودا ہے۔ جو ڈھلوان شکل میں ہے، اسی مٹی کے ڈھیر پر والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ مغرب کی سمت سر کئے ہوئے لیٹے ہوئے ہیں، اور قدموں کی جانب برادر بزرگ جناب محمد رضی عثمانی صاحب بیٹھے ہوئے ہیں، احقر کہیں سے آیا ہے، اور دل کو یہ یقین سا ہے کہ والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا یہ آخری وقت ہے اور ابھی کچھ دیر بعد وفات ہونے والی ہے، احقر کو رشک سا ہو رہا ہے کہ برادر محترم کی طرح احقر بھی پہلے سے آجاتا تو مزید باتیں سننے کا موقع مل جاتا۔ احقر قریب آیا تو والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے احقر کو اپنے جوڑ چپوری جوتے کی ایک جوڑی عنایت فرمائی، جس پر احقر بے حد مسرور ہے، پھر گویا جمعہ کی نماز کا وقت ہے اور احقر ان ہی جوتوں کو پہنکر جمعہ کی نماز ادا کر کے واپس آیا ہے۔ اور گویا والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا انتقال ہو چکا ہے، اور احقر دل میں ان جوتوں کی وجہ سے ایک خوشی محسوس کر رہا ہے۔

احقر نے یہ خواب حضرت ڈاکٹر عبدالحیٔ صاحب مدظلہم کو سنایا تو فرمایا کہ مٹی کے ڈھیر پر لیٹنا تو وہی مقام عبدیت ہے اور اپنے ہی مکان کے سامنے مٹی کے ڈھیر پر لیٹے ہیں، یہ دنیوی علائق سے پاک ہونے کی علامت ہے۔ اور جوتوں کی جوڑی عنایت فرمانے سے انشاءاللہ یہ مراد ہے کہ تمہیں ان کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق ہوگی۔ اللہ تعالیٰ اس تعبیر کو حقیقت میں تبدیل فرمائے اور احقر کو حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین اللّٰہم آمین۔

اور بھی کئی ایسے خواب دیکھے گئے جن میں مٹی یا کچے مکان وغیرہ کا دیکھنا سب میں مشترک ہے۔ جو انشاء اللہ حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے مقام عبدیت اور مقام فنا کی دلیل ہے۔

تواریخ وفات

حضرت والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ کی تاریخ پیدائش «غُفِرَ لَهٗ» (۱۳۱۵ھ ہے)

یہ معلوم نہیں کہ یہ تاریخ خود حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ ہی نے اخراج کی تھی یا کسی اور کی نکالی ہوئی تھی۔ احقر کے دادا حضرت مولانا محمد یٰسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی تاریخ وفات خود والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے "غُفِرَ لَہُمْ" ۱۳۵۵ھ تخریج فرمائی تھی ——— احقر نے اسی بارے میں غور کیا تو "اَللّٰھُمَّ اغْفِرْ لِیْ" (۱۳۹۶ھ) تاریخ نکلی۔

قرآن کریم کی ایک آیت میں غور کیا تو ذیل کی تاریخ نکلی۔

قَالَ اللّٰہُ الْحَیُّ الْقَیُّوْمُ ۔ سَلٰمٌ عَلَیْہِ یَوْمَ وُلِدَ وَیَوْمَ یَمُوْتُ وَیَوْمَ یُبْعَثُ حَیًّا

ترجمہ:۔ اللہ تعالیٰ حی و قیوم نے فرمایا: "اور ان کو اللہ تعالیٰ کا سلام پہونچے، جس دن کہ وہ پیدا ہوئے، اور جس دن کہ وہ انتقال کریں گے، اور جس دن (قیامت میں) زندہ ہوکر اٹھائے جائیں گے۔"

اس کے علاوہ احقر کے درج ذیل قطعہ کے آخری مصرعہ سے بھی تاریخ نکلتی ہے۔ اس طرح کہ خط کشیدہ الفاظ کے شروع اور آخر کے حروف (سر اور پاؤں) کو حذف کر دیں تو بقیہ حروف کے اعداد کا مجموعہ (۱۳۹۶ھ) بنتا ہے۔

قطعۂ تاریخ

اللہ کے قابو میں ہے، موت و حیاتِ ہر بشر
تاریخ رحلت کے لئے یوں غیب سے آئی خبر
رخصت ہوئے مفتی شفیع تو ہوگئے بے پاؤ سر
فقہ و نظر، خلق و ورع، قول و عمل، علم و بصر

علم و بصر		قول و عمل		خلق و ورع		فقہ و نظر	
۴۰	۲۰	۳۱	۶	۳۰	۳۰	۹۰۰	۱۰۰

——— ۱۳۹۶ھ ———

قارئین سے ضروری گذارش! ——— مضمون غیر معمولی طور پر طویل ہوگیا ہے، قارئینِ کرام سے ایک التماس اور گذارش کرنا چاہتا ہوں، اور وہ یہ کہ بزرگوں کے واقعات اور حالات قصہ کہانی کی طرح سرسری طور پر پڑھ کر گزر جانے کے لئے نہیں ہوتے، بلکہ ان کو پڑھنے کا مقصد یہ ہونا چاہیئے کہ ان حالات اور واقعات کی روشنی میں ہم اپنی کوتاہیوں کو دیکھ کر آئندہ ان سے بچنے کی فکر کریں، حق تعالیٰ شانہٗ نے قرآن کریم میں سابقہ اقوام اور گذشتہ افراد کے واقعات بھی محض قصہ گوئی کے لئے بیان نہیں فرمائے بلکہ اقوام اور افراد کے سے ان میں عبرت کے نادر اسباق بیان ہوئے ہیں، جن پر عمل کر کے مقصودِ اصلی یعنی رضائے الٰہی کو حاصل کیا جاسکتا ہے۔ احقر دعا کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں اور اس مضمون کے تمام قارئین کو اُن کے نقشِ قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

آخر میں حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے دو ملفوظ نقل کر کے اس مضمون کو ختم کرتا ہوں۔

فرمایا،

• میں اپنی اولاد، اہل وعیال، احباب واصحاب، اور تمام مسلمانوں کو وصیت کرتا ہوں کہ اس زندگی کا ایک ایک لمحہ گوہر نایاب ہے جس کی قیمت ساری دنیا ومافیہا نہیں ہو سکتی، اس سے اللہ تعالیٰ کی رضا اور جنت کی دائمی نعمتیں خریدی جا سکتی ہیں، اللہ تعالیٰ کی اس بھاری نعمت کو اس کی نافرمانیوں میں صرف کرنے سے بچیں عمر کی جو مہلت اللہ تعالیٰ نے دے رکھی ہے اُس کے ایک ایک منٹ کی قدر کریں۔

اکثر فرمایا کرتے تھے۔

"ہماری مثال اس برف کے تاجر کی سی ہے جو بازار میں برف بیچنے کے لئے بیٹھا ہو، ہر لمحے اس کا سرمایہ پگھل کر پانی کی صورت میں ضائع ہو رہا ہے، جتنی جلدی وہ اس کو فروخت کر دے اتنا ہی اس کا فائدہ ہے ——— زندگی کی اس برف کو پگھلنے سے پہلے اللہ تعالیٰ کے ہاتھ فروخت کر دینی چاہئے"

• اللہ تعالیٰ احقر کو، تمام قارئین کو، اور تمام مسلمانوں کو زندگی کی اس مہلت کو اپنی مرضیات میں صرف کرنے کی توفیق عطا فرمائے آمین۔ وما توفیقی إلا باللہ۔ احقر محمد ولی رازی ۳۰ اکتوبر ۱۹۷۶ء

○

"وہ ڈاکٹر اپنے فن کا ماہر نہیں ہو سکتا جو صرف مرہم لگانا جانتا ہے مگر سڑے ہوئے فاسد شدہ اعضاء کا آپریشن کرنا نہیں جانتا۔ سمجھو اور خوب سمجھو کہ جب عالم کے جسم میں شرک کے زہریلے جراثیم پیدا ہو گئے اور وہ ایک مریض جسم کی طرح ہو گیا تو رحمت خداوندی نے اس کے لیے ایک مصلح اور مشفق طبیب (آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم) کو بھیجا جس نے تریپن سال تک متواتر اس کے ہر عضو اور ہر رگ و ریشہ کی اصلاح کی فکر کی جس سے قابل اصلاح اعضاء تندرست ہو گئے مگر بعض اعضاء جو بالکل سڑ چکے تھے، ان کی اصلاح کی کوئی صورت نہ رہی بلکہ خطرہ لاحق ہو گیا، کہ ان کی سمیت تمام بدن میں سرایت کر جائے، اس لیے حکیمانہ اصول کے موافق عین رحمت و حکمت کا اقتضاء یہی تھا کہ آپریشن کر کے ان اعضاء کو کاٹ دیا جائے۔ یہی جہاد کی حقیقت ہے، اور یہی تمام جارحانہ اور مدافعانہ غزوات کا مقصد ہے۔"

(حضرت مفتی اعظمؒ: سیرت خاتم الانبیاء، ص ۹۹)

ڈاکٹر سید اسلم صاحب

آخری سفر

حضرت مفتی اعظمؒ کے خصوصی معالج قلب جناب ڈاکٹر سید اسلم صاحب. وہ قابل رشک ڈاکٹر ہیں جنہوں نے گذشتہ چار سال میں حضرت مفتی اعظمؒ کی طبیعت کے ہر اتار چڑھاؤ کی نگرانی کی، اور اپنی مصروفیات کے باوجود حضرتؒ کی صحت کے امکانی تحفظ میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا، وہ اپنے تاثرات ذیل میں پیش کر رہے ہیں ——————— ادارہ

ایمبولینس برق رفتاری سے رواں تھی، کورنگی سے کراچی کی طرف، جگہ جگہ سے ٹوٹی ہوئی سڑک نے اس سفر کو سفر بنا دیا تھا، سامنے مفتی صاحب دراز تھے، منحنی اور نزار لیکن پرسکون، جن کے دل کی دھڑکن، ایمبولینس کے ہچکولوں کے ساتھ کبھی کبھی ڈوبتی ہوئی معلوم ہوتی تھی اور اس خیال سے مرے اپنے دل کی دھڑکن بھی تیز ہو جاتی تھی کہ کہیں یہ آفتاب غروب ہی نہ ہو جائے، مرے داہنی جانب تقی عثمانی تھے جن کے حد سے زیادہ ضبط نے اندرونی طغیانِ غم کو چھپا رکھا تھا، مفتی صاحب کے سرہانے رفیع عثمانی تھے جن کو باوجود کوشش کے یارائے ضبط نہیں رہا تھا، وہ اندھیری رات کا سفر ابھی تک یاد ہے۔

آج سے پچیس سال پہلے کا ذکر ہے کہ مرے ہم درس اور آج کے تحریک رجوع القرآن کے قائد ڈاکٹر اسرار احمد نے میری توجہ مفتی صاحب کی ایک تحریر کی طرف دلائی جس میں پوتے کی وراثت سے متعلق رسالہ طلوع اسلام کی ایک اشاعت کا ذکر کرتے ہوئے مفتی صاحب نے لکھا تھا کہ "ایک نیا اسلام جواب کراچی سے طلوع ہو رہا ہے ......" ہم دونوں مفتی صاحب کی تحریر کی شگفتگی اور رعایت لفظی سے محظوظ ہوئے یہ میرا مفتی صاحب سے پہلا غائبانہ تعارف تھا۔

پھر ایک زمانہ گزر گیا اور میرا مفتی صاحب سے کبھی بھی ملنا نہیں ہو سکا اس زمانے میں خود میں وطن سے باہر رہا یہاں تک کہ ۱۹۷۰ء کے ہنگامہ خیز دنوں میں مفتی صاحب کی ایک تقریر اخبارات میں پڑھی، جس سے میں نے یہ مطلب اخذ کیا کہ مفتی صاحب طب جدید کی طرف ہمدردانہ رویہ نہیں رکھتے مفتی صاحب کی بات بے شمار لوگوں کے لئے حرف آخر تھی اس وجہ سے میں نے چاہا کہ میں بھی کچھ لکھوں اور لکھا بھی لیکن پھر یہ سوچکر کہ مفتی صاحب کے سامنے منہ کھولنا خسر الدنیا والآخرہ کے مصداق ہے میں نے سکوت اختیار کیا، لیکن دل میں خیال بلکہ ملال رہا اور مفتی صاحب کی طرف سے ایک دل گرفتگی رہی۔

اس کے کچھ دنوں بعد دلی والے ڈاکٹر صغیر احمد ہاشمی صاحب کے توسط سے مفتی صاحب ہسپتال میں داخل ہوئے اور یہ پہلا موقع تھا کہ مفتی صاحب سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا اور پھر ایک تعلق خاطر قائم ہوا جو آخری دن تک استوار رہا۔ پہلے پہلے جب تقی عثمانی صاحب نے مجھ سے فرمائش کی کہ میں اپنے تاثرات مفتی صاحب کے متعلق لکھوں تو میں کچھ زیادہ خواہشمند نہیں تھا، معالج اور بیمار کا رشتہ نازک رشتہ ہے اور درمیان میں اعتماد کا وہ آبگینہ ہے جسکو ٹھیس نہیں لگنی چاہیئے اس سے قبل بھی مشہور ہستیوں سے ان کے آخری دنوں میں میرا تعلق رہا ہے اور ان کے متعلق میں نے لکھنے سے گریز کیا ہے اور اگر لکھا بھی ہے تو شائع نہیں کیا اس سلسلے میں میرا طرز عمل چرچل کے معالج سوانح نگار سے مختلف رہا ہے لیکن پھر یہ سوچکر کہ مجھے اس شخص کے متعلق لکھنا ہے جسکی ساری زندگی عبادت ہے قرآن وسنت کی عملی تفسیر اور جسکی زندگی میں کوئی ایسی بات مجھے معلوم نہیں ہو سکی جس کو عام نہیں کیا جاسکے میں نے حامی بھر لی اور یہ طویل تمہید اس لئے باندھی ہے کہ پہلی دفعہ ملاقات کے وقت خوش عقیدگی کو سایہ نہ تھا بلکہ بے اعتمادی کی غبار آلود فضا تھی اور جو انسانی خوبیاں ان میں مجھے نظر آئیں ہیں وہ پہلے سے مانی ہوئی نہ تھیں بلکہ منوائی گئی ہیں۔

مفتی صاحب کی شخصیت ایک ہمہ گیر شخصیت تھی اور میرا نہ یہ منصب ہے اور نہ مقام اور نہ ارادہ کہ انکی صفات پر کچھ لکھوں وقیع کام اور لوگ انجام دے رہے ہیں اور دیں گے، میں صرف ان خوبیوں کی طرف اشارہ کروں گا جو کسی بھی انسان کے لئے عظیم ہیں اور جو ایک معالج کی نظر معروضی طور پر دیکھ رہی ہے۔

جب پہلی دفعہ مفتی صاحب ہسپتال میں داخل ہوئے اور انکی طبیعت بگڑی تو انکی خواہش تھی کہ اگر کچھ علاج ہوسکتا ہے تو بہتر ہے اور اگر مرض لا علاج ہو گیا تو گھر بھیج دیا جائے، یہ بات انہوں نے اسی آسانی اور آسان سے کہی کہ جس میں موت سے ڈرنے کا شائبہ بھی نہیں تھا، ورنہ ایسے وقت میں عام تجربہ یہ ہے کہ موت سے سب کو دہشت ہوتی ہے اور معالج سے مسیحائی متوقع ہوتی ہے اور اگر آخر وقت آجاتا ہے تو لواحقین موت کے برحق ہونے کے بجائے معالج اور ہسپتال کو ذمہ دار ٹھہراتے ہیں، اور یہ رجحان طبع اُن کا ہمیشہ رہا، یہاں تک کہ جس روز اُن کا انتقال ہوا ہے اور جیسے ہی میں ان کی قیام گاہ پر پہنچا ہوں انہوں نے یہ کہنے کے بعد کہ اب میں بہتر ہوں، اپنی مرض کی نوعیت پوچھی اور کہا کہ میں یہ چاہوں گا

کہ میرا علاج اس دفعہ گھر پر ہی ہو، معالج کی بات پر اُن کو ہمیشہ پورا اعتماد رہا، اکثر ایسا ہوا ہے کہ مفتی صاحب رمضان میں روزے رکھنا چاہتے ہیں، اب گھر میں کسی کی اس قدر ہمت نہیں ہے کہ ان کو منع کرے، تقی عثمانی صاحب مجھے سحری کے وقت ٹیلیفون کرتے ہیں کہ مفتی صاحب روزے رکھنے پر مصر ہیں اور میرے منع کرنے پر فوراً مان جاتے ہیں یہی حال دوسرے فرائض اور وظائف کے متعلق تھا یعنی تیمم، غسل، نماز، وضو، وغیرہ کے متعلق میں نے جو ہدایات دیں ان پر پورا عمل کرتے تھے، جس شخص کا فتویٰ پر لوگوں کی گردنیں جھک جاتی تھیں وہ بظاہر ایک غیر مذہبی معالج کے مشوروں کو ایسے انشراحِ صدر سے قبول کرتے تھے کہ مجھے خود حیرت ہوتی تھی، وہ میرے مشوروں کو بھی فتویٰ کہا کرتے تھے، اور یہ اس معاشرہ میں ہیں جہاں کسی کو کوئی پرہیز یا مشورہ دیا جائے تو عموماً کوئی اثر نہیں ہوتا اور جب زیادہ اصرار کیا جائے تو یہ جواب ہوتا ہے کہ صاحب موت کا تو وقت لکھا ہوا ہے آپ کی ہدایت سے کیا موت ٹل جائے گی اور آپ کے کہنے سے ہم اپنے مذہبی معمولات پر کیوں تبدیلی کریں، لیکن اس بارے میں مفتی صاحب نے اپنی عقل کو کبھی اوہام کے تابع نہیں کیا، یہاں تک کہ آخری، جب اُن کی حالت انتہائی نازک ہوگئی تھی اور میں نے ان کے صاحبزادوں کو بتلا دیا تھا کہ بظاہر بچنے کی کوئی اُمید نظر نہیں آتی اور میں اُن کو یہاں گھر پر چھوڑ بھی نہیں سکتا اور ان کو ہسپتال لے جانا چاہیئے تو مفتی صاحب سے اس کا اشارۃً بھی ذکر محال تھا، کیونکہ انہوں نے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ وہ اس دفعہ ہسپتال جانا نہیں چاہتے، جب ایمبولینس آنے والی تھی تو ان کے صاحبزادوں نے پوچھا کہ اگر مفتی صاحب نہیں مانے تو کیا ہوگا لیکن مجھے یقین تھا کہ مفتی صاحب مان جائیں گے، اور یہی ہوا جب میں نے مفتی صاحب سے عرض کیا تو ایک لمحہ کے تأمل کے بعد راضی ہوگئے، اور یہ رجحان طبع اُن کی مروت اور اخلاق کے علاوہ سلامت ذہنی کی دلیل تھا کہ جو بات عقلاً درست ہو اس کو بغیر کسی قوی دلیل کے رد نہیں کرنا چاہیئے۔

مفتی صاحب کا قیام دار العلوم میں تھا جو کورنگی میں واقع ہے، کراچی سے کورنگی تک کا راستہ طویل اور سخت ہے اور ایک ناگوار صعوبت ہے، لیکن جیسے ہی دار العلوم کے احاطہ میں داخل ہوں دونوں طرف سرسبز کھیت ہیں اور آگے چل کر درختوں کا جھنڈ ہے، جہاں داہنی طرف کتب خانہ اور بائیں طرف مفتی صاحب کی قیامگاہ، جہاں پہلا کمرہ تقی عثمانی صاحب کا دفتر ہے، اس کے عقب میں مفتی صاحب کا کمرہ اور اس سے ملا ہوا بغل میں اندر کا مکان، اُن کا کمرہ ایک سیدھا سادا کمرہ، معمولی سی چارپائی، سامنے چوکیوں کا فرش اور دو چار کرسیاں، اس صعوبت آمیز سفر کے بعد اس سرسبز جگہ پہونچ کر ایک خنکی کا احساس ہوتا تھا جس کے پس منظر میں مفتی صاحب کی بشاش شخصیت تھی ان کے چہرے کے آثار چڑھاؤ، بات چیت اور مسکراہٹ میں اس قدر بے ساختگی تھی کہ معلوم ہوتا تھا کہ یہاں کوئی بات راز نہیں، اور جس طرح ایک بچے کے چہرہ پر شگفتگی کھیلتی تھی کمرہ کی فضا نرم نرم، جس میں بیٹھ کر خود ساختہ تقدس کی گھٹن نہیں ہوتی تھی، اور مفتی صاحب کی باتیں بظاہر عام اور سہل ہوتی تھیں نہ گراں گذرتی تھیں اور نہ اجنبی، لیکن ان ہی باتوں میں نہ جانے کتنے عقدے حل ہو جاتے تھے، میرے ایک دوست جو ایک دفعہ میرے ساتھ گئے تھے اس فضا اور ماحول کے متعلق

کہنے لگے کہ یہاں جمال ہی جمال ہے، جلال نہیں،

قوت ارادی بڑی مستحکم تھی اور اس کا ثبوت انہوں نے تقریباً پچپن سال کی تمباکو کھانے کی راسخ عادت کو چھوڑ کر دیا، غذا بہت قلیل اور نوجوان بہتے ٹیسن کے مطابق تھی آپکی زندگی ایک طویل زمانہ پر محیط تھی اور تقریباً ایک صدی کا اتار چڑھاؤ ان کی نظروں میں تھا، میں نے کئی مرتبہ اشارۃً اُن کی توجہ اس طرف راغب کرنے کی کوشش کی کہ اپنے زمانہ کے حالات قلم بند کرادیں، کچھ غالباً کئے بھی لیکن پھر صحت نے اجازت نہیں دی، وہ تمام کامل مشرقی تعلیم کے پروردہ تھے لیکن اس نظام کی سختی کے باوجود ان کا دل و دماغ نئی باتوں کی طرف سے بند نہ تھا اور طب جدیدہ کی طرف رغبت ان کے عمل سے ظاہر تھی حکیم نابینا صاحب غالباً ان کے والد کے ہم سبق یا دوست تھے ان کی باتیں اکثر سناتے تھے کہ علم میں جمود نہیں ہونا چاہیئے اور خصوصاً طب کو آگے بڑھتے رہنا چاہیئے۔

پچھلی جولائی میں اُنکی صحت بظاہر بڑی اچھی ہوگئی تھی یہاں تک کہ میں نے یہ مشورہ بھی دے دیا تھا کہ وہ انگلستان چلے جائیں جہاں کے لئے اُن کے مدت سے بلاوے آرہے تھے اور ان پر اصرار کیا جا رہا تھا، لیکن مفتی صاحب نے آخر میں انکار کر دیا اور وجہ یہی تھی کہ جانا ہے تو وہاں پر ملاقاتیں عام ہونا چاہئیں لوگ دور دور سے آئیں گے اور اگر ان ملاقاتوں پر بھی رکاوٹیں عائد کر دی گئیں تو اس سے نہ جانا ہی بہتر ہے کہ بلاوجہ لوگوں کے لئے باعث زحمت ہوگا، اور نتیجہ بے مصرف اور غالباً نقصان دہ ان کا خیال تھا کہ یورپ میں جواب مذہب کی طرف طلب اور خواہش ہے اگر اس وقت ہوتی جب قوٰی میں انحطاط نہیں ہوا تھا تو سب کچھ چھوڑ کر وہیں جا بیٹھتا اور صرف تبلیغ کے کام میں لگ جاتا، اب جب کہ صحت اس قابل نہیں تو جانے سے دوسروں کے لئے مشکلیں پیدا کرنا ہے، اس سلسلہ میں ڈاکٹر حمید اللہ حیدر آباد والے، مساعی تبلیغ کے معترف اور مداح تھے ابھی کچھ عرصہ پہلے ان کے جوان العمر صاحبزادے نے لاہور میں عارضۂ قلب میں رحلت کی، مفتی صاحب خود اس وقت کراچی میں تھے، اس واقعہ کے فوراً بعد مجھے مفتی صاحب کو دیکھنے کا اتفاق ہوا، صدمہ کا اثر دل و دماغ پر تھا، لیکن بظاہر صبر و ضبط اور شکر کی تصویر اور راضی برضا تھے، اس تمام عرصے میں جب سے کہ میرا اُن سے واسطہ رہا ہے کسی مرحلے پر بھی احساس نہیں ہونے دیا کہ وہ کسی بھی لحاظ سے افضل ہیں، طبیعت میں عاجزی اور فروتنی تھی اور اس میں کوئی تصنع نہیں پایا جاتا تھا جیسا کہ ذیل کے خط سے ظاہر ہے۔

میرے محسن و محترم جناب ڈاکٹر سید اسلم صاحب

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ۔ آپ کے احسانات مجھ پر بے شمار ہیں، ان کا صلہ تو مجھے توی اُمید ہے کہ اللہ تعالےٰ ہی آپ کو دین و دنیا میں عطا فرمائیں گے کئی ہفتہ پہلے سے میرا دل چاہتا تھا کہ کچھ حقیر سا ہدیہ پیش خدمت کروں۔ بہت ہی حقیر چیز ہے میری خاطر سے قبول فرمالیں، رد نہ فرمائیں۔ بڑا کرم ہوگا۔ بندہ محمد شفیع ۲ شوال ۹۳ھ

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ
مفتی اعظم پاکستان

وصیت نامہ

> میرے وصیت نامے کے دو جز تھے ایک وہ جس میں اپنی اولاد و احباب کے ساتھ عام مسلمانوں کے لئے بھی وصیت ہے، دوسرے وہ جس کا تعلق اپنی ذاتی املاک اور خاص وارثوں سے ہے۔ اس دوسرے جز کی اشاعت کی ضرورت نہیں تھی صرف پہلے جز کو شائع کیا جاتا ہے۔

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ نحمدہٗ
اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ وَکَفٰی وَسَلَامٌ عَلٰی عِبَادِہِ الَّذِیْنَ اصْطَفٰی، امّا بعد

بندۂ ناکارہ و آوارہ، سراپا تقصیر و خطا، سراسر جرم و گناہ محمد شفیع بن مولانا محمد یٰسین صاحب مرحوم سابق مدرس دارالعلوم عفا اللہ عنہما و عاملہما اللہ بلطفہ و کرمہ مظہر ہے عاجب کہ حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔

مَنْ مَّاتَ عَلٰی وَصِیَّۃٍ مَاتَ عَلٰی سَبِیْلٍ وَّسُنَّۃٍ وَّمَاتَ عَلٰی تُقًی وَّشَہَادَۃٍ وَّمَاتَ مَغْفُوْرًا لَّہٗ۔
(مشکوٰۃ بحوالہ سنن ابن ماجہ)

یعنی جو شخص وصیت کر کے مرے وہ سیدھے راستے اور سنت پر مرا، اور تقویٰ اور شہادت پر اس کی موت ہوئی اور گناہوں کی بخشش کے ساتھ مرا۔

اور ایک دوسری حدیث میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی روایت صحیحین میں ہے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

مَا حَقُّ امْرِءٍ مُسْلِمٍ لَهُ شَيْءٌ يُوصِي فِيهِ يَبِيتُ لَيْلَتَيْنِ إِلَّا وَصِيَّتُهُ مَكْتُوبَةٌ عِنْدَهُ ۔

(رواہ البخاری والمسلم)

یعنی جس شخص کے ذمہ کوئی واجب ادا کرنا ہو جس کی وصیت کرنا اس کے لئے ضروری ہے اس کو حق نہیں کہ دو راتیں بھی اس طرح گذارے کہ اسکی وصیت لکھی ہوئی اس کے پاس نہ ہو۔

ان روایات سے حقوق واجبہ کی وصیت کا وجوب اور غیر واجبہ کا استحباب ثابت ہوتا ہے۔ بناءً علیہ احقر نے سنہ ۱۳۴۳ھ میں اپنا ایک وصیت نامہ لکھا تھا، جس کے بعد اپنے وطن اصلی دیوبند ضلع سہارن پور (بھارت) سے ہجرت کرکے سنہ ۱۳۶۷ھ سنہ ۱۹۴۸ء میں پاکستان کراچی منتقل ہونے کی نوبت آئی اور اکثر وصیتیں جو وطن اصلی کے مکانات وغیرہ کے متعلق تھیں منسوخ کرنا پڑیں، پاکستان آنے کے بعد بھی عرصہ دراز تک کوئی استقرار نہ تھا تو بار بار وصیتوں میں تبدیلیاں کرنا پڑیں جمادی الاولیٰ ۹۲ ۱۳ھ اکتوبر ۱۹۷۲ء میں اتفاقاً احقر کو ایک شدید قلبی دورہ پڑا جس نے موت کا نقشہ آنکھوں کے سامنے کر دیا۔ دو ماہ شدید علالت میں گذرے اس وقت اس کی ضرورت محسوس ہوئی کہ اب وصیت نامہ از سر نو مرتب کیا جائے۔ فوری طور پر اسی سابق وصیت نامے میں کچھ ترمیمیں کردی تھیں، اب کہ اللہ تعالیٰ نے صحت عطا فرماکر زندگی کو کچھ اور مہلت عنایت فرمادی ہے از سر نو وصیت کو مرتب کرتا ہوں۔ اور پہلے وصیت نامے کو ختم کرتا ہوں۔

آج شعبان سنہ ۱۳۹۲ھ کی بیسویں تاریخ اور جنوری سنہ ۱۹۷۳ء کی ۲۰ تاریخ ہے۔ بحساب قمری اسلامی احقر کی عمر اٹھتر منزلیں ختم ہو کر اناسی واں سال شروع ہو رہا ہے، جب اس طرف دھیان گیا کہ رب العزت نے کتنی بڑی مہلت و فرصت اس ناکارہ گناہ گار کو اپنی اصلاح اور تلافی مافات کے لئے عطا فرمائی، اٹھتر سال کے ۹۳۶ نوسو چھتیس مہینے اور ان کے تقریباً ساڑھے ستائیس ہزار ۲۷۵۰۰ لیل و نہار ملے۔ جن میں اللہ تعالیٰ کی بے شمار غیر محدود نعمتیں بارش سے زیادہ برستی رہیں، اس طویل مہلت اور اس میں اللہ تعالیٰ جل شانہٗ کی نعمتوں کا شکر کیا ادا کیا اور آخرت کے لئے کتنا سامان کیا تو حیرت اور حسرت کے سمندر میں ڈوب جاتا ہوں کہ زاد آخرت کا صفر اور گناہوں کے انبار نظر آتے ہیں اور اِنَّہٗ لَا مَلْجَأَ مِنَ اللّٰهِ إِلَّا إِلَيْهِ ۔ اور فضل و کرم کے سوا کوئی سہارا نظر نہیں آتا۔ وہی رحیم الرحماء ہیں کہ سیئات کو بھی حسنات سے بدل دیتے ہیں، اسی کے لطف و کرم سے مغفرت کی امید بندھتی ہے۔ یَا رَبِّ عَامِلْنِي بِمَا أَنْتَ أَهْلُهٗ وَلَا تُعَامِلْنِي بِمَا أَنَا أَهْلُهٗ ۔

۱۔ میں اپنی اولاد، اہل و عیال، احباب و اصحاب اور تمام مسلمانوں کو وصیت کرتا ہوں کہ اس زندگی کا ایک ایک لمحہ وہ گوہر نایاب ہے جس کی قیمت ساری دنیا و مافیہا نہیں ہوسکتی، اس سے اللہ تعالیٰ کی رضا جنت کی دائمی نعمتیں خریدی جاسکتی ہیں اللہ تعالیٰ کی اس بھاری نعمت کو اسکی نافرمانیوں میں صرف کرنے سے بچیں اور اس میں اپنی پوری کوشش صرف کریں، کسی نفسانی غرض اور دنیوی راحت و نفع کو اس پر غالب نہ ہونے دیں، عمر کی جو مہلت اللہ تعالیٰ نے دے رکھی

ہے اسکے ایک ایک منٹ کی قدر کریں۔ گذشتہ کا کفارہ توبہ واستغفار سے اور آئندہ کی اصلاح عزم مصمم سے کرتے رہیں۔ فضول اور لایعنی کلام، کام اور مجلسوں سے کلی احتراز کریں ؎ من تکرم شما حذر بکنید۔ عمر کے اوقات کو تول تول کر صحیح کاموں میں صرف کرنے کی کوشش کریں۔ ہر کام سے پہلے سوچیں کہ جس طرف قدم یا قلم اٹھ رہا ہے وہ اللہ جل شانہٗ کی مرضی کے خلاف تو نہیں، خلاف نظر آئے تو سارے مصالح کو قربان کر کے پوری ہمت کے ساتھ اس سے بچنے کی کوشش کریں۔

(۲) علم دین کی تحصیل کو عمر کا اہم مقصد بنائیں، میری اولاد میں جنہوں نے علم دین کو باقاعدہ حاصل کیا ہے وہ بھی اس کا مشغلہ کسی وقت نہ چھوڑیں اور ہمیشہ اپنے آپ کو طالب علم سمجھ کر جہاں سے کوئی صحیح علم حاصل کیا جا سکتا ہو، اس کو نہ چھوڑیں، اور جنہوں نے باقاعدہ علوم دینیہ کی تکمیل نہیں کی وہ بھی اپنے آپ کو اس مشغلہ سے یہ سمجھ کر فارغ نہ سمجھیں کہ علماء کی ذمہ داری ان پر نہیں ہے بلکہ حضرت سیدی حکیم الامت قدس سرہٗ اور دوسرے اکابر علماء کی تصانیف کا مطالعہ ایک معمول بنا کر روزانہ کرتے رہیں بلکہ سب گھر والوں کو جمع کر کے سنایا کریں تاکہ سب پر اثر پڑے اور اپنا ماحول دینی ہو جائے ورنہ تجربہ یہ ہے کہ جب کسی کا ماحول و سوسائٹی دینی نہ ہو تو اس کو دین پر قائم رہنا مشکل ہوتا ہے۔ اور جس قدر دینی امور کا خود کو علم ہو وہ دوسروں تک پہنچانے کی کوشش کریں خواہ خود عالم کامل نہ ہوں۔

(۳) ایسے علماء کی صحبت کو کیمیا اور غنیمت کبریٰ سمجھیں جو علمی تحقیق میں شاہ ولی اللہی یا بالعنوان دیگر علماء دیوبند کے مسلک پر ہوں، اور صرف کتابی علم کے حامل نہ ہوں بلکہ تمام معاملات میں خدا ترسی اور خوف آخرت اور تعلق مع اللہ ان کی زندگی میں نمایاں ہو۔ اور بہتر یہ ہے کہ کسی ایسے بزرگ سے باقاعدہ بیعت ہو جائیں جو کسی متبع سنت بزرگ کا خلیفہ مجاز ہو، خصوصاً سیدی حکیم الامت تھانوی قدس سرہ کے خلفاء میں سے کسی بزرگ سے مناسبت ہو تو وہ زیادہ بہتر ہے۔

(۴) بچوں کو جب تک قرآن کریم ناظرہ مکمل اور دین کی ضروری معلومات سے پوری طرح واقفیت نہ ہو جائے کسی دوسرے کام میں نہ لگائیں۔ بچوں کی تربیت میں اس کا خاص اہتمام کریں کہ ان کے اعمال و اخلاق شریعت کے مطابق ہوں، جھوٹ، فریب، بدمعاملگی سے بچنے کی پوری کوشش کریں اور فرائض و واجبات اور سنن کی ادائیگی میں کوتاہی نہ کریں۔

(۵) ایسے لوگوں کی صحبت اور زیادہ میل جول سے کلی احتراز کریں جو نماز روزہ حلال و حرام اور دینی معاشرت سے غافل ہوں۔ اگر وہ رشتہ دار یا قدیم دوست ہیں تو صرف ادائیگی حقوق تک ان سے ملیں۔ دوستانہ تعلقات اور خصوصی محبت صرف ایسے لوگوں کے ساتھ ہو جو دین میں تمہارے لئے معین ثابت ہوں۔ اگر ایسے لوگوں میں کسی سے قلبی تعلق زیادہ ہے تو اس کو اپنے رنگ پر لانے کے لئے پوری کوشش کریں۔ اسلام نے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ سب مسلمانوں پر عائد کیا ہے۔ اس میں ایک بڑی حکمت یہ بھی ہے کہ ہر انسان کا اپنا ماحول دینی ہو جائے اور

دینی معاملات میں یہ صحبتیں رکاوٹ بننے کی بجائے معین ومددگار بنیں بچوں کو بھی ابتدا ہی سے ایسی آزاد صحبتوں سے بچایا جائے۔

(۶) اس زمانے کی سب سے بڑی افتاد جو شریف اور دینی گھرانوں کو بھی اپنی لپیٹ میں لے چکی ہے وہ عورتوں میں بے پردگی کے رجحانات، لڑکیوں میں جدید قسم کے نیم عریاں ملبوسات ہیں۔ جن گھروں میں پردے کا نام باقی بھی ہے وہاں بھی وہ شدت واحتیاط باقی نہیں جو ان کے بڑوں میں تھی۔ عزیزوں میں غیر محرم لڑکے لڑکیاں حدود شریعت کے پابند نہیں رہے۔ بے تکلف ایک دوسرے سے اختلاط رکھتے ہیں، جو کسی طرح جائز نہیں اور اس کے نتائج پورے خاندان کے لئے نہایت خطرناک ہیں۔

(۷) عورتوں میں یہ غیر شرعی رجحانات بھی زیادہ تر ایسی آزاد عورتوں کے اختلاط سے بڑھتے جاتے ہیں جو شرعی پردہ اور عبادات ومعاملات میں شرعی حدود کی پابند نہیں، ایسی عورتوں سے زیادہ اختلاط کو زہر قاتل سمجھیں، جن سے تعلقات رکھتا ہوں ان کو کوشش کر کے اپنی راہ اور اپنے دینی رنگ پر لائیں ورنہ یکسوئی اختیار کریں۔

(۸) ایسی کتابیں دیکھنے سے مرد و عورت ہر شخص اجتناب کرے جن میں خلاف شرع امور کا بار بار تذکرہ ہو کہ قلب ودماغ پر اس کا اثر ناگزیر ہے۔ عموماً ناول، افسانے اور ایسی تصنیفات جو اس طرح کی چیزوں سے لبریز ہوتی ہیں ان کا داخلہ گھروں میں ممنوع ہونا چاہیئے، دینی کتابوں میں صرف محقق اور باخدا علماء کی تصانیف کا مطالعہ کیا جائے جن کے علم صحیح اور دیانت وتقویٰ پر مکمل اعتماد ہو جب تک مصنف پر اتنا اعتماد نہ ہو اس کی کتاب نہ دیکھی جائے البتہ صرف اہل علم ہر کتاب دیکھ سکتے ہیں وہ بھی بقدر ضرورت۔ کیونکہ اہل فسق وفجور واہل فساد والحاد کی تصانیف بھی انسان پر ان کی بری صحبت کی طرح غیر شعوری طور پر اثر انداز ہوتی ہیں اس لئے بلا ضرورت شرعیہ ان سے اجتناب کرنا چاہیئے۔

(۹) اپنے سب محبین ومتعلقین اصاغر واکابر سے عاجزانہ درخواست ہے کہ میری باقی زندگی میں بھی اور میرے بعد بھی جس وقت کبھی ناکارہ کا خیال آجائے، میرے لئے دعائے مغفرت فرمادیں۔

(۱۰) اپنے اقارب اور خاص احباب سے درخواست ہے کہ روزانہ اگر ہو سکے سورہ یٰسین شریف ایک مرتبہ ورنہ تین مرتبہ سورۂ اخلاص (قُلْ هُوَ اللّٰهُ) پڑھ کر ایصال ثواب کر دیا کریں، جس سے ان شاء اللہ تعالیٰ وہ خود بھی اجر عظیم کے مستحق ہوں گے، باقی مالی صدقات کا ایصالِ ثواب طعام ولباس ودیگر ضروریات فقراء میں جس قدر ہمت ہو اخفاء کے ساتھ خالصاً لوجہ اللہ کر دیا کریں، نام ونمود اور رسمی دعوتوں سے ہمیشہ احتراز کریں کہ اس کا نہ میت کو کوئی فائدہ پہونچتا ہے نہ خرچ کرنے والے کو۔

(۱۱) میرے سب متعلقین اس بات کا خاص طور پر خیال رکھیں کہ اپنے ہر کام میں اتباع سنت کو مضبوطی

سے پکڑیں، بدعات اور رسوم جاہلیت سے کلی اجتناب کریں، آخرت کی فکر کو دنیا کی فکروں پر غالب رکھنے کی کوشش سے کبھی غافل نہ ہوں، متبعِ سنت علماء اور بزرگوں سے تعلق، ان کی محبت و خدمت کو سرمایۂ سعادت سمجھیں، جن علماء و مشائخ سے عقیدت و مناسبت ہو ان سے استفادہ کریں اور جن سے مناسبت نہ ہو ان کے بارے میں بھی بدگمانی اور بدزبانی کو زہرِ قاتل سمجھیں خصوصاً وہ حضرات جو عبادات یا خدمتِ دین میں مشغول ہوں۔

(۱۲) اس وقت ہمارا پورا معاشرہ جس تیزی کے ساتھ دین سے منحرف اور سنت سے بیگانہ ہوتا جا رہا ہے اسکی نظیر پچھلے کسی دور میں نہیں ملتی، معاشرے اور ماحول کی خرابی کا یہ لازمی اثر ہے کہ کوئی شخص اگر اپنی طبیعت سے عمل صالح اور سنت پر قائم رہنا بھی چاہیئے تو گرد و پیش کے عوامل اور احباب و اخوان اسے سیدھے راستے پر نہیں رہنے دیتے، اس لئے اسلامی تعلیمات میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو بنیادی اصول کی حیثیت دی گئی ہے، خصوصاً اپنے ماحول کے لوگوں کی اصلاح کی فکر کا فریضہ ہر انسان پر اہمیت کے ساتھ عائد کیا گیا ہے۔ وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ اور قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا وغیرہ ارشادات میں اسی کی تلقین کی گئی ہے۔

اس زمانے میں جب کہ مغربی دہریت اور اباحیت کا طوفان پوری دنیائے اسلام پر چھایا چلا جا رہا ہے۔ اپنے ایمان کی بھی اس وقت تک خیر نہیں جب تک اپنے ماحول اور معاشرے کی اصلاح پر پوری توجہ نہ دی جائے۔

بے پردگی، عریانی اور بے حیائی کے رجحانات نوجوان لڑکوں لڑکیوں میں اس درجہ عام ہو چکے ہیں کہ کسی شریف نیک لڑکے کو اس کے مناسب لڑکی اور نیک صالح لڑکی کے لئے اس کے مناسب لڑکا ملنا انتہائی دشوار ہو گیا ہے۔ بڑے سے بڑے دیندار گھرانے مجبور ہو کر رشتہ نکاح میں صرف مادی منافع کو دیکھنے لگے اور دینی اور اخلاقی اقدار کو نظرانداز کر دینے پر اپنے آپ کو مجبور پاتے ہیں، اس لئے میری آخری اور سب سے اہم وصیت اپنے عزیزوں کو خصوصاً اور عام مسلمانوں کو عموماً یہ ہے کہ اپنے ماحول کو دینی بنانے کی انتہائی فکر اور پورا اہتمام کریں۔

بہت سے گھرانوں میں ماں باپ دیندار ہیں مگر اولاد کی راہ دوسری ہے شوہر کا ایک طرز ہے، بیوی اس سے متفق نہیں ہے۔ بعض جگہ بیوی دیندار ہے شوہر اس سے مختلف ہے، یہ بلا عام ہے اور اس وجہ سے پہلی نحوست تو عام حالات زندگی میں اختلاف رائے اور نفرت و بغض ہوتا ہے جس کا اثر نسلوں میں چلتا ہے، دوسری مصیبت یہ ہوتی ہے کہ جو شخص دین اور سنت پر قائم رہنا چاہیئے اسکی زندگی وبال ہو جاتی ہے اور قدم قدم پر اس کے لئے مشکلات حائل ہوتی ہیں، اور اگر کسی طرح وہ سب مشکلوں کو عبور کر کے اپنا عمل درست بھی کر لے تو دوسرو

پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوتا بلکہ دشمنی اور بغاوت کے جذبات اُبھرتے ہیں۔

اس معاملے میں اعزا ز و احباب کو بہت تنگ پکڑنا بھی مناسب نہیں کہ وہ چل نہیں سکتا، میرے اس خیال میں اگر مندرجہ ذیل چیزوں کو اپنے خاندان کی ایسی خصوصیت بنالیا جائے کہ جو عزیز یا دوست اس سے منحرف ہو، پورا خاندان اس سے منحرف ہو جائے۔ مگر تشدد کا طرز ہرگز اختیار نہ کیا جائے کہ وہ مضر ہی مضر ہے بلکہ نہائش اور خیر خواہی اور ہمدردی کے لہجے میں اس کو اپنے حول میں لانے کی مسلسل کوشش کرتے رہے تو امید ہے کہ وہ معاشرہ کے بگاڑ کو کسی حد تک روک دے گا۔ وہ امور یہ ہیں :

(الف) خود اور اپنی اولاد و احباب کو نماز با جماعت کا پابند بنائیں۔ عورتیں اول وقت گھروں میں نماز ادا کرنے کی عادی نہیں۔ اذان ہوتے ہی سب کام موقوف کر کے نماز میں مشغول ہوں، خانگی نظام الاوقات میں پہلے سے اس کا خیال رکھا جائے۔

(ب) صبح کو نماز کے بعد جب تک ہر بچہ اور بڑا، مرد اور عورت کچھ تلاوت قرآن ذکر نہ کرے کسی کام میں نہ لگے

(ج) بے پردگی اور عریانی کو اپنے معاشرے میں کسی حال میں برداشت نہ کیا جائے۔ رشتہ منگنی کرتے وقت ان چیزوں کی پوری دیکھ بھال کی جائے۔

(د) فیشن پرستی اور مغربی طرز زندگی کو ایک لعنت اور سم قاتل سمجھ کر پورے معاشرے کو سادہ زندگی اور بے تکلف ملاقاتوں کا عادی بنایا جائے۔

(ھ) شریعت کے کھلے ہوئے محرمات، سود، شراب، ناچنے گانے کی محفلوں سے خود اپنے آپ کو اور اپنی اولاد کو ایسا بچایا جائے جیسے زہر سے بچایا جاتا ہے۔

یہ چند امور ہیں جن کا ہر خاندان کے افراد کو آپس میں معاہدہ کر لینا چاہیئے اور اُنکی خلاف ورزی کو ایک جماعتی اور خاندانی عہد شکنی قرار دے کر نرم تدبیروں کے ساتھ اسکی اصلاح کی فکر کو لازم سمجھا جائے۔ بائیکاٹ اور قطع تعلق کے طریقوں سے قطعی اجتناب کیا جائے کہ اس کا نتیجہ تجربۃً اچھا نہیں ہوتا اگر کوشش مسلسل جاری رکھی جائے۔ واللہ الموفق والمعین

وصیت متعلقہ اجازت بیعت و تلقین

احقر آوارہ ناکارہ اپنی حالت سے الحمد للہ بے خبر نہیں ہے کہ سراپا عیوب و ذنوب ہے جو خود اپنی اصلاح نہ کر سکا ہو وہ دوسرے کی اصلاح کیا کرے لیکن سیدی حکیم الامت حضرت مولینا اشرف علی تھانوی قدس سرہ نے

اس ناکارہ کو بیعت و تلقین کی اجازت دیکر ایک بھاری ذمہ داری مجھ ضعیف پر عائد فرمادی جس کو آئندہ کے لئے فال نیک سمجھ کر احقر نے اختیار کیا۔ اور بہت سے حضرات اہل دین کو تربیت کے متعلق مشورے دیتا رہا۔ ان میں سے چند حضرات کے متعلق اس کا اندازہ ہوا کہ بحمد اللہ یہ دوسروں کو تربیت و اصلاح کی خدمت انجام دے سکتے ہیں، ان کو بنام خدا تعالیٰ بیعت و تلقین کی اجازت دے دی۔ مندرجہ ذیل فہرست میں ان کے نام اور پتے اس دینی مصلحت سے شائع کئے جارہے ہیں کہ طالبین حق اپنی اپنی مناسبت طبع کے اعتبار سے ان میں سے کسی کو اختیار کرکے ان سے اصلاح و تربیت کا تعلق قائم کریں۔ نیز اس سے بھی غلط انتساب سے حفاظت ہوسکے۔ سیدی حکیم الامت قدس سرہ نے بھی اسی مصلحت سے اپنے مجازین کی فہرست خود شائع فرمادی تھی۔

میری طرف سے جن حضرات کو اجازت دی گئی اُن کی فہرست یہ ہے:-

(۱) میر امام الدین صاحب، حیدرآباد دکن، ان کا عرصہ ہوا انتقال ہوچکا ہے:-

(۲) مولوی محمود حسن صاحب، پرنام بٹ مدراس (ہندوستان)

(۳) مولوی سید محمود حسن صاحب۔ ۲۷، مکتبۂ اشرفیہ، متصل جامع مسجد اظہر گومبر روڈ حیدرآباد کراچی ۱۸۔

(۴) مولوی عبد الحکیم صاحب مدرس و مفتی مدرسہ اشرفیہ کوئنس روڈ سکھر۔

(۵) مولوی محمد طفیل صاحب، مقیم پیپلز کالونی لائل پور۔

(۶) مولوی عبد الرؤف صاحب، معین مدرس و معین مفتی دار العلوم کراچی ۱۴۔

(۷) حکیم امداد اللہ صاحب۔ ۲۱۲ حیدرآباد کالونی بہادر یار جنگ روڈ کراچی ۵۔

(۸) شاہ سلیمان صاحب ۲۹۹ فردان آباد۔ ۳۶ بی لانڈھی کراچی ۳۰۔

(۹) حاجی غلام قادر صاحب، سابق کمپاؤنڈر نبوی ہسپتال کراچی۔ حال مساعد عملیات مستشفیٰ عنیزہ، سعودی عرب۔

(۱۰) حاجی محمد عثمان صاحب میمن، لیاقت آباد ۱۸۰ کراچی ۱۹

۲۰، ربیع الثانی ۱۳۹۵ھ کو مزید تین حضرات کو اجازت دیگئی جو پہلے سے دوسرے بزرگوں کے زیر تعلیم تھے۔

(۱۱) مولوی محمد وجیہ صاحب مفتی و مدرس دار العلوم الاسلامیہ، ٹنڈو اللہ یار ضلع حیدرآباد سندھ۔

(۱۲) مولوی عبد الشکور صاحب ترمذی، مدرس و مہتمم مدرسہ حقانیہ مقام ساہیوال ضلع سرگودھا۔

(۱۳) ماسٹر محمد اقبال صاحب قریشی، ہارون آباد ضلع بہاولنگر۔ معرفت دکان مستری نظام الدین۔ متصل ڈاکخانہ، ہارون آباد۔

نوٹ: بعد وفات سے چند روز پہلے حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے مدرسہ اشرف العلوم ڈھاکہ کے مولانا مفتی محی الدین صاحب کے نام کا بھی اضافہ فرمایا جن کا پتہ حسب ذیل ہے:-

(۱۴) مولانا مفتی محی الدین صاحب ۲۴/۳ بڑاکٹرہ لین. پوسٹ چوک بازار ڈھاکہ۔

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

۱۱ ربیع الاول ۱۳۹۵ھ / ۲۶ ربیع الثانی ۱۳۹۵ھ

ضروری نوٹ : حضرتؒ نے اپنے آخری ایام حیات میں جن خلفاء و مجازین کی فہرست شائع فرمائی وہ تو یہی ہیں البتہ بعد میں معلوم ہوا کہ حضرتؒ نے مورخہ ۲۸ شعبان ۱۳۹۶ھ کو جناب محمد احمد صاحب ۴۲، ۷، ایچ شمالی ناظم آباد کراچی ۳۳ کے نام ایک خط میں ان کو بھی بیعت کی اجازت عطا فرمائی تھی، یہ خط جب عارف باللہ حضرت مولانا ڈاکٹر عبدالحی صاحب برد مظلہم نے ملاحظہ فرمایا تو احقر کو ہدایت فرمائی کہ حضرتؒ کے مجازین میں ان کو بھی شامل سمجھا جائے اور مفتی اعظم نمبر میں اس کا بھی اظہار کر دیا جائے۔ ا م ت ع

دوست اور دشمن کے ساتھ معاملہ یکساں نہیں ہوا کرتا۔ دوست کو قدم قدم اور بات بات پر ٹوکا جاتا ہے، اولاد اور شاگرد کو ذرا ذرا سی بات پر سزا دی جاتی ہے، لیکن دشمن کے ساتھ یہ سلوک نہیں ہوتا، اس کو ڈھیل دی جاتی ہے، اور وقت آنے پر دفعتہً پکڑ لیا جاتا ہے۔

مسلمان جب تک ایمان و اسلام کا نام لیتا ہے اور اللہ کی عظمت و محبت کا دم بھرتا ہے وہ دوستوں کی فہرست میں داخل ہے، اس کے برے اعمال کی سزا دنیا میں دے دی جاتی ہے تاکہ آخرت کا بار ہلکا ہو جائے، بخلاف کافر کے کہ اس پر باغیوں اور دشمنوں کا قانون جاری ہے، دنیا کی ہلکی ہلکی سزاؤں سے ان کا بار عذاب ہلکا نہیں کیا جاتا، ان کو یک لخت عذاب میں پکڑ لیا جائے گا۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد گرامی کا یہی مطلب ہے کہ دنیا مومن کے لیے قید خانہ اور کافر کے لیے جنت ہے۔

(حضرت مفتی اعظمؒ "معارف القرآن" ص ۲۳۰ ج ۷)

محمد تقی عثمانی
دارالعلوم کراچی

میرے والد — میرے شیخ

اور ان کا مزاج و مذاق

ذرا چشمِ تصور سے کام لوں تو یہ کل کی بات معلوم ہوتی ہے کہ حضرت والد ماجد حیات تھے۔ آپ کے جلوۂ جہاں آرا کی زیارت ہر وقت میسر تھی اور ان کی دلآویز شخصیت میں ہر مشکل کا حل، ہر پریشانی کا علاج، اور ہر غم و فکر کا مداوا موجود تھا، ہزار ذہنی الجھنوں کے عین درمیان جب قدم ان کے سادہ مگر باوقار گھر کی طرف بڑھتے تو ان کی شفقتوں کی ٹھنڈی چھاؤں میں ہر الجھن کافور ہوجاتی اور ایسا محسوس ہوتا، جیسے کائنات کا سارا روحانی سکون و اطمینان سمٹ کر اس کمرے میں جمع ہوگیا ہے۔

حادثۂ وفات کو دو سال گزر چکے لیکن اب بھی یوں معلوم ہوتا ہے جیسے وہ ہماری ہر ہر نقل و حرکت میں شریک اور ہر ہر قدم پر ساتھ ہیں۔ کوئی نیا واقعہ پیش آتا ہے تو اچانک تصور کو ان کی آواز سنائی دیتی ہے، اور کبھی کبھی تو اس آواز کا لہجہ ہی نہیں، اندازِ تخاطب بھی ایک پیکرِ محسوس میں تبدیل ہو کر دل کی دنیا میں ہلچل پیدا کر دیتا ہے۔

تصور کی دنیا میں حضرت والد صاحبؒ سے ہر وقت اس قدر قریب ہونے کے باوجود جب کبھی عالمِ واقعات میں اپنے گرد و پیش کو دیکھتا ہوں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ کی زندگی کے زمانے کو

صرف دو سال نہیں گزرے بلکہ صدیاں بیت گئی ہیں، وہ کائنات کچھ اور تھی یہ کچھ اور ہے، اور دونوں کے درمیان وہی نسبت ہے جو بہار اور خزاں اور آبادی اور ویرانے کے درمیان ہو سکتی ہے۔

اس دوران بارہا ارادہ کیا کہ اپنی اس محبوب ترین ہستی کے بارے میں کچھ لکھوں جس میں اللہ تعالیٰ نے میرے لیے ایک شفیق ترین باپ کی مٹھاس، ایک بالغ نظر استاد کی توجہ، ایک باریک بین شیخ و مربی کی عنایتیں اور ایک مونس و غمگسار کی ہمدردیاں بیک وقت جمع فرما دی تھیں لیکن ہزار کوشش کے باوجود میں حضرت والد صاحبؒ کی وفات پر آنا بھی نہ لکھ سکا جتنا میں نے اپنے بعض دوسرے بزرگوں کے بارے میں لکھ دیا تھا۔ اس موضوع پر میں نے ہمیشہ اپنی زبان کو گنگ اور قلم کو ناکارہ پایا ہے، اور آج بھی جب میں یہ صبر آزما فریضہ انجام دینے بیٹھا ہوں تو ذہن کی مثال اُس چھوٹے سے سوراخ کی ہے جو مشکوں پانی کے دباؤ سے بند ہو گیا ہو۔ تیس سال کی لذیذ و خوشگوار یادیں بیک وقت اس طرح قلب و دماغ پر چھائی ہوئی ہیں کہ اُن کا سرا تلاش کرنا مشکل ہی نہیں ناممکن ہے۔

ان یادوں کو بے کم و کاست کاغذ پر منتقل کرنا تو اب بھی میرے بس کی بات نہیں لیکن ایک چیز ہے جسے میں اپنے پاس پوری اُمت کی امانت سمجھتا ہوں اور جسے دوسروں تک پہنچانا میرا فرض ہے اور وہ ہے حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا وہ مذاقِ زندگی جو انھوں نے اپنے قابلِ رشک اکابر سے ورثے میں پایا تھا اور جس میں ان کی زندگی کا ایک ایک لمحہ پوری طرح ڈھلا ہوا تھا۔ میرے لیے یہ دعوے بھی چھوٹا منہ بڑی بات ہوگی کہ میں اس مذاقِ زندگی کو سمجھ چکا ہوں، اور اگر بالفرض کوئی سمجھ بھی چکا ہو تو مزاج و مذاق کوئی ریاضی کا فارمولا نہیں ہوتا جسے دو اور دو چار کر کے بتا دیا جائے، وہ کوئی منطقی تعریف نہیں ہوتی جس کی تشریح پورے فوائد قیود کے ساتھ کر دی جائے، وہ تو ایک خوشبو ہوتی ہے جو جہد و عمل کی دنیا میں کسی عظیم انسان کی اداؤں سے پھوٹتی ہے، ہر شخص اپنے اپنے ظرف کے مطابق اُس سے شام جاں کو معطر تو کر سکتا ہے لیکن لفظ و بیان کے ذریعے اس کی جامع و مانع تعریف انسانی قدرت سے باہر ہے، اس لیے اس مذاقِ زندگی کو بھی کما حقہٗ الفاظ میں ڈھالنا ممکن نہیں، البتہ میں اس بات پر اللہ تعالیٰ کا جتنا شکر ادا کروں، کم ہے کہ اس نے مجھے تیس سال سے زائد اُن کی آغوشِ شفقت میں گزارنے کی توفیق عطا فرمائی، اس دوران مجھے اُن کے اندازِ زندگی کی ایک ایک ادا کو دیکھنے کا شرف حاصل ہوا، سفر و حضر، غیاب و حضور، رنج و مسرت، تنگدستی و خوشحالی، قدر دانی و مخالفت، غرض ہر قسم کے سرد و گرم حالات

میں ان کے طرزِ عمل کا مشاہدہ اپنے کسی استحقاق یا کوشش کے بغیر ہوتا رہا اور اس دوران ایسے ایسے واقعات نظروں کے سامنے سے گذرے جن سے حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا مخصوص مزاج و مذاق از خود جھلکتا تھا لہٰذا اگر میں اس مذاق زندگانی کو الفاظ میں بیان کرنے پر قادر نہیں تو کم از کم وہ واقعات ضرور بیان کر سکتا ہوں جو اس مذاق کے آئینہ دار ہیں، اگرچہ مجھے حسرت ہے کہ میں اپنی زندگی میں ان واقعات سے کوئی عملی سبق نہ لے سکا لیکن شاید انھیں بیان کرنے کی برکت سے اس سبق کا کوئی حصہ کبھی نصیب ہو جائے اور کیا بعید ہے کہ قارئین ان سے وہ فائدہ حاصل کریں جو میں حاصل نہیں کر سکا۔ فربّ حامل فقہ غیر فقیہ و ربّ حامل فقہ إلی من هو أفقه منه ۔

علمی مذاق

سب سے پہلے میں وہ باتیں ذکر کرنا چاہتا ہوں جو حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے علمی مذاق سے تعلق رکھتی ہیں۔

حضرت والد صاحبؒ نے جس ماحول میں آنکھ کھولی وہ ایک ٹھیٹھ علمی و دینی ماحول تھا، ہمارے دادا حضرت مولانا محمد یٰسین صاحب قدس سرہٗ دیوبند کے قرنِ اول کے طلبا میں سے تھے، اور فرمایا کرتے تھے کہ میں نے دار العلوم دیوبند کا وہ زمانہ دیکھا ہے جب وہاں کے شیخ الحدیث سے لے کر ایک ادنیٰ چپراسی تک ہر شخص صاحب نسبت ولی اللہ تھا، ہمارے دادا حضرت شیخ الہندؒ کے شاگرد اور حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہٗ کے ہم سبق تھے، فراغت کے بعد آپ کا تقرر دار العلوم دیوبند میں فارسی و ریاضی کے استاذ کی حیثیت سے کیا گیا، اور وفات تک مسلسل یہ خدمت انجام دیتے رہے۔ یہاں تک کہ وہ دیوبند کے ان اساتذہ میں سے تھے جن سے تین تین پشتوں نے یکے بعد دیگرے درس لیا تھا۔ دیوبند کے نہ جانے کتنے خاندان ایسے ہیں کہ دادا سے لے کر پوتے تک گھر کا ہر فرد ان کا شاگرد ہے۔ آپ حضرت گنگوہی قدس سرہٗ سے صرف بیعت ہی نہ تھے بلکہ ان کے عاشقِ زار تھے۔ حضرت والد صاحبؒ نے ان کا تذکرہ اپنے رسالہ "میرے والد ماجد" میں قدرے تفصیل سے فرمایا ہے۔

ادھر میں اپنے دوسرے مضمون "حضرتؒ کے شیوخ و اکابر" میں لکھ چکا ہوں کہ حضرت والد صاحبؒ

کو بچپن ہی سے کبھی کھیل کود کا زیادہ شوق نہیں ہُوا، اس کی بجائے عصر کے بعد جب دوسرے بچے کھیل کود یا سیر و تفریح میں لگتے، والد صاحبؒ حضرت شیخ الہندؒ یا اپنے کسی دوسرے استاد کی مجلس میں جا بیٹھتے تھے۔ پھر جب والد صاحب کا رشتہ تلمذ حضرت علامہ انور شاہ صاحب کشمیریؒ کے ساتھ قائم ہُوا، تو جو علمی مذاق گھٹی میں پڑا ہُوا تھا اُسے اور جلا ملی اور وسعت مطالعہ، تحقیق و تدقیق اور کُتب بینی کا صرف ذوق ہی نہیں بلکہ اس کی نہ بُجھنے والی پیاس پیدا ہُوئی۔

مطالعے کا ذوق

حضرت والد صاحب فرمایا کرتے تھے کہ دوپہر کو جب مدرسے میں کھانے اور آرام کا وقفہ ہوتا تو میں اکثر دارالعلوم کے کتب خانے میں چلا جاتا تھا۔ وہ وقت ناظم کتب خانہ کے بھی آرام کا ہوتا تھا، اس لیے اُن کے لیے یہ ممکن نہ تھا کہ وہ میری وجہ سے چھٹی کے بعد بھی کتب خانے میں بیٹھے رہیں چنانچہ میں نے اُنھیں باصرار اس بات پر آمادہ کر لیا تھا کہ دوپہر کے وقفے میں جب وہ گھر جانے لگیں تو مجھے کتب خانے کے اندر چھوڑ کر باہر سے تالا لگا جائیں، چنانچہ وہ ایسا ہی کرتے اور میں ساری دوپہر علم کے اس رنگا رنگ باغ کی سیر کرتا رہتا تھا۔

فرماتے تھے کہ دارالعلوم دیوبند کے کتب خانے کی کوئی کتاب ایسی نہیں تھی جو میری نظر سے نہ گزری ہو، اگر کسی کتاب کو میں نے پورا نہیں پڑھا تو کم از کم اس کی ورق گردانی ضرور کرلی تھی، یہاں تک کہ جب تمام علوم و فنون کی الماریاں ختم ہوگئیں تو میں نے اُن الماریوں کا رُخ کیا جنھیں کبھی کوئی شخص ہاتھ نہیں لگاتا تھا۔ یہ "اشتات" (متفرقات) کی الماریاں تھیں اور جن کتابوں کو کسی خاص علم و فن سے وابستہ کرنا ناظم کتب خانہ کو مشکل معلوم ہوتا تھا، وہ ان الماریوں میں رکھ دی جاتی تھیں۔ ان کتابوں میں چونکہ موضوع کے لحاظ سے کوئی ترتیب نہ تھی، اس لیے اس جنگل میں داخل ہونا لوگ بے سُود سمجھتے تھے کہ یہاں سے کوئی گوہرِ مطلوب حاصل کرنا تریاق از عراق سے کم نہ تھا لیکن جب ساری الماریاں ختم ہوگئیں تو میں نے اشتات کے اس جنگل کو بھی کھنگالا، اور اس کے نتیجے میں ایسی ایسی کتابوں تک میری رسائی ہُوئی جو گوشۂ گمنامی میں ہونے کی بنا پر قابلِ استفادہ نہ رہی تھیں۔
کتب خانے کے اس سروے کا نتیجہ یہ ہُوا کہ اتنے وسیع و عریض کتب خانے میں مجھے بحمد اللہ

یہ معلوم رہتا تھا کہ کون سی کتاب کس موضوع پر ہے اور کہاں رکھی ہے ؟ چنانچہ بسا اوقات جب ناظم کتب خانہ کسی کتاب کی تلاش سے مایوس ہو جاتے تو مجھ سے پوچھا کرتے تھے کہ فلاں کتاب کہاں ملے گی ؟

فرماتے تھے کہ حضرت شاہ صاحبؒ نے ہمیں دورۂ حدیث ہی کے سال میں اس بات کی تاکید فرمائی تھی کہ فارغ التحصیل ہو جانے کو کبھی منتہائے مقصود نہ سمجھنا، فراغت کا حاصل صرف اتنا ہے کہ اس کے بعد انسان میں قوت مطالعہ پیدا ہو جاتی ہے اور علم کا دروازہ کھل جاتا ہے، اب یہ فارغ ہونے والے کا کام ہے کہ وہ علم کی چند کلیوں پر قناعت کرنے کے بجائے اس دروازے میں داخل ہو اور اس قوت مطالعہ کو کام میں لاکر علم میں وسعت و گہرائی پیدا کرے۔ چنانچہ فراغت کے بعد حضرت شاہ صاحبؒ کے زیر ہدایت ہم نے کامل دو سال کتب بینی میں صرف کئے۔

کتاب سے والد صاحبؒ کے عشق کا عالم یہ تھا کہ دارالعلوم دیوبند میں جب بحیثیت مدرس آپ کا تقرر ہوا تو ابتدائی تنخواہ پندرہ روپیہ ماہانہ مقرر ہوئی اور جب ۱۳۶۲ھ میں آپ نے دارالعلوم سے استعفیٰ دیا تو اس وقت ترقی ہوتے ہوتے پینسٹھ روپیہ ماہانہ تک پہنچے تھے، اس تنخواہ کے ساتھ آپ نے اپنا جو ذاتی کتب خانہ جمع کیا وہ تقریباً بارہ طویل و عریض الماریوں میں سماتا ہے، چنانچہ ایک عالم دین کو تصنیف اور فتویٰ کے لیے جن بنیادی کتابوں کی ضرورت ہوتی ہے وہ حضرت والد صاحبؒ کی اپنی ملکیت میں موجود تھیں اور جب ۱۳۶۷ھ میں آپ دیوبند سے ہجرت کرکے پاکستان تشریف لائے تو گھر کی بیشتر ضروریات وہیں چھوڑ آئے تھے لیکن وہ کتابیں جو عمر بھر کے سرمائے کی حیثیت رکھتی تھیں جس قدر ممکن ہوا ساتھ لے کر آئے اور بعد میں جو کتابیں رہ گئی تھیں سب سے زیادہ اہتمام اُن کے منگوانے کا کیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شروع میں جب کہ کراچی شہر علمی اعتبار سے انتہائی نادار شہر تھا، اور یہاں کوئی بھی اچھا کتب خانہ موجود نہ تھا، والد صاحبؒ کا ذاتی کتب خانہ صرف اپنی ہی نہیں بلکہ دوسرے اہل علم کی بھی علمی پیاس بجھایا کرتا تھا۔ یہاں تک کہ شیخ الاسلام حضرت علامہ شبیر احمد صاحب عثمانیؒ کو جب کسی مسئلے کی تحقیق کرنی ہوتی تو وہ ہمارے مکان پر تشریف لے آتے اور گھنٹوں کتابوں کی ورق گردانی کا سلسلہ رہتا تھا۔

میں نے ہمیشہ دیکھا کہ جب کبھی حضرت والد صاحبؒ کسی جگہ تشریف لے جاتے اور وہاں کچھ

کتابیں نظر پڑ جاتیں تو یہ ممکن ہی نہ تھا کہ آپ ان پر ایک نظر ڈالے بغیر گزر جائیں اور کوئی کتاب پہلے ہی سے دیکھی ہوئی ہوتی تو خیر ورنہ کتنی ہی جلدی کا وقت ہو، اُسے الٹ پلٹ کر دیکھنا لازمی تھا۔ آخر عمر میں جب عارضۂ قلب کے ساتھ ساتھ بینائی بھی کمزور ہوگئی تو بڑی حسرت کے ساتھ فرمایا کرتے تھے کہ میرے سالہا سال اس طرح گزرے ہیں کہ مطالعے کے لیے کوشش کے باوجود وقت نہیں نکلتا تھا اور اب بیماری کی وجہ سے مصروفیات سمٹی ہیں تو آنکھوں میں مطالعے کی طاقت نہیں رہی لیکن مجھے خوب یاد ہے کہ ایسی حالت میں بھی جب کبھی میں یا کوئی اور ہاتھ میں کوئی کتاب لے کر پہنچ جاتا تو یہ پوچھتے ضرور تھے کہ "یہ کون سی کتاب ہے"؟ اور کوئی نئی کتاب ہوتی تو اس کی تفصیلات ضرور معلوم فرماتے تھے۔

والد صاحبؒ دارالعلوم کے اخراجات کے معاملے میں بہت محتاط تھے اور اگر ہم لوگ مدرسے میں کسی نئی ضرورت کے لیے کچھ خرچ کرنے کی فرمائش کرتے تو کافی سوچ بچار کے بعد اس کی منظوری دیتے تھے لیکن کتابوں کا معاملہ اس سے مختلف تھا۔ مجھے یاد نہیں کہ کبھی میں نے یا کسی اور استاد نے مدرسے کے لیے کوئی کتاب خریدنے کی فرمائش کی ہو اور حضرت والد صاحبؒ نے اس کے معاملے میں غور فرمایا ہو، یہ تو فرما دیتے تھے کہ اس کی قیمت کے بارے میں تحقیق کر لو کہ کہاں سے سستی ملے گی لیکن انکار کبھی نہیں فرمایا۔ صرف ایک کتاب ایسی تھی جسے خریدنے سے والد صاحبؒ نے مجھے منع فرمایا، اور وہ تھی ابوالفرجِ اصفہانی کی کتاب الاغانی؛ مجھے اس کتاب کے مطالعے کا شوق تھا، ۱۳۸۲ھ میں جب حضرت والد صاحبؒ کے ساتھ ہم لوگ حج کے لیے گئے تو وہاں میں نے ایک کتب خانے میں "الاغانی" رکھی ہوئی دیکھی اور آکر والد صاحبؒ سے ذکر کیا اور ساتھ ہی اپنے شوق کا بھی اظہار کیا لیکن والد صاحبؒ نے اپنی عام عادت کے خلاف صاف انکار کر دیا، اور فرمایا کہ: "اتنی قیمت میں یہ کتاب مدرسے کے لیے خریدنا بیکار ہے"۔ وجہ تو والد صاحبؒ نے نہیں بتائی، لیکن میں اس سے یہ سمجھا کہ یہ کتاب مدرسے کے مقاصد کیلیے اتنی ضروری نہیں، اور محض ذاتی شوق کی بنا پر مدرسے کے لیے کوئی کتاب خریدنا اصول کے خلاف ہے۔

اور یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ اس کے کچھ عرصے کے بعد حضرت مولانا سید محمد یوسف بنوری صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے احقر کو اپنا واقعہ سنایا کہ مجھے کتاب الاغانی کے مطالعے کا شوق تو تھا، لیکن میں نے یہ طے کیا ہوا تھا کہ مدرسے کے پیسے سے یہ کتاب نہیں خریدوں گا۔ بالآخر اللہ تعالیٰ کا کرنا ایسا ہوا کہ ایک صاحب نے الاغانی کا خلاصہ مدرسہ کو ہدیۃً دے دیا اور اس طرح میرا شوق بھی پورا ہوگیا۔ اور

عہد کبھی نہیں ٹوٹا۔

جب کوئی نئی کتاب آتی تو والد صاحبؒ اُسے چند روز اپنے قریب رکھتے تھے اور خواہ کتنی مصروفیت میں اُلجھے ہوئے ہوں اس کے معتد بہ مطالعے کے لیے ضرور وقت نکال لیتے تھے، آخر عمر میں "صحیح ابن خزیمہ" کی پہلی جلد شائع ہوئی، اور میں نے اجازت لے کر مدرسے کے لیے منگوالی جب میں اسے لیکر والد صاحبؒ کے پاس گیا تو والد صاحبؒ کو خوشی تو بہت ہوئی کہ وہ کتاب نگاہوں کے سامنے تھی جو صدیوں سے نایاب چلی آرہی تھی لیکن ساتھ ہی آپ نے ایک ٹھنڈی آہ بھری اور فرمایا کہ یہ نعمت اس وقت میسّر آئی ہے جب بینائی جواب دینے لگی ہے" اور پھر واقعہ سُنایا کہ حضرت گنگوہی قدس سرہ کے پاس سنن بیہقیؒ کا نسخہ اس وقت پہنچا تھا جب حضرتؒ کی بینائی جاتی رہی تھی، چنانچہ حضرتؒ نے اس کا کچھ حصّہ تو پڑھوا کر سُنا اور باقی کتاب پر صرف ہاتھ پھیر پھیر کر اپنے ذوق کی تسکین فرمائی۔ میں بھی اس وقت حضرت گنگوہیؒ کے اس عمل کی تقلید کے سوا کچھ نہیں کرسکتا۔

دارالعلوم دیوبند سے فارغ ہوتے ہی حضرت والد صاحبؒ کو آپ کے اساتذہ نے معین مدرّس مقرر کردیا تھا اور آپ کئی سال تک اسی حیثیت میں متوسط درجے کی کتب پڑھاتے رہے، اس کے بعد آپکو باقاعدہ مدرس بنایا گیا، آپ آخر عمر میں فرمایا کرتے تھے کہ مختلف علوم و فنون سے میری دلچسپی کے مختلف ادوار گزرے ہیں، جب میں نے شروع میں دارالعلوم دیوبند میں تدریس شروع کی تو مجھے سب سے زیادہ دلچسپی ادب سے رہی اور میں طلبا کے درمیان اسی حیثیت سے مشہور ہُوا۔ پھر کچھ عرصے کے بعد مجھے معقولات (منطق، فلسفہ اور کلام وہیئت) کا شوق پیدا ہُوا، اس کی بھی اونچے درجے کی کتب پڑھائیں، اور وہ میرا خصوصی موضوع بن گیا، اس کے بعد جب فتویٰ کی خدمت میرے سپرد ہُوئی تو سب سے زیادہ شغف فقہ و فتویٰ سے رہا اور فقہ کے ساتھ یہ خصوصی تعلق اتنا دیرپا ثابت ہُوا کہ اب تک لوگ اسی حیثیت سے پہچانتے ہیں لیکن آخر عمر میں والد صاحبؒ کو سب سے زیادہ ذوق اور سب سے زیادہ شغف علم تفسیر کے ساتھ ہوگیا تھا اور فرمایا کرتے تھے کہ دل یوں چاہتا ہے کہ اسی ذوق میں عمر تمام ہوجائے، اللہ تعالیٰ نے ان کی یہ آرزو پوری فرمائی اور قرآن کریم ہی آپ کا آخری محورِ فکر ثابت ہُوا۔

اب مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان تمام علوم و فنون کے بارے میں حضرت والد صاحبؒ کے خصوصی مذاق اور ان سے متعلق جو اصولی ہدایات آپ سے سُنیں یا آپ کے طرزِ عمل میں دیکھی ہیں، ان کے بارے

میں کچھ عرض کروں۔

اَدب

جیسا کہ میں نے عرض کیا، ادب پہلا وہ موضوع تھا جس سے حضرت والد صاحبؒ کو خصوصی دلچسپی پیدا ہوئی، اس کی بڑی وجہ غالباً یہ تھی کہ آپ کی عربی تعلیم کا آغاز شیخ الادب حضرت مولانا اعزاز علی صاحب قدس سرہ کے ہاتھوں ہوا، اور ان کے حُسنِ تعلیم و تربیت نے آپ کو مختصر سی مدت میں اس حیرت انگیز مقام تک پہنچا دیا کہ نفحۃ الیمن پڑھنے کے دوران آپ نے عربی میں اشعار کہنے شروع کر دیے تھے، اُدھر دارالعلوم دیوبند کے مہتمم حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب عثمانیؒ جو عربی کے بلند پایہ ادیب تھے، آپ پر بہت مہربان تھے۔ اور پڑھنے ہی کے زمانے میں وہ آپ کے ادبی مذاق کو ترقی دینے کی کوشش کرتے رہتے تھے کبھی آپ سے کوئی مضمون لکھوا لیا، کبھی کسی جلسے میں آپ کو سپاسنامہ لکھنے یا خیر مقدمی نظم کہنے کا حکم دیا، اس طرح آپ کی مشقِ سخن میں اضافہ ہوتا چلا گیا، پھر حضرت شاہ صاحبؒ کے زیرِ صدارت "ادبیۃ الادب" کا جو ہفتہ وار اجتماع ہوتا اس میں والد صاحبؒ سرگرمی سے حصہ لیتے رہے۔

آپ کی تدریس کی ابتدا بھی عربی صرف و نحو اور ادب سے ہوئی، اسی دوران آپ نے نفحۃ الیمن کا حاشیہ بھی تحریر فرمایا جو شائع ہو چکا ہے، سالہا سال آپ نے مقاماتِ حریری دیوانِ متنبی، حماسہ اور سبعہ معلقہ کا درس دیا۔ خاص طور سے آپ کا مقاماتِ حریری کا درس اتنا مشہور ہوا کہ دوسرے مدارس سے مدرسین اس درس میں شرکت کے لیے آیا کرتے تھے۔

اس کے علاوہ حضرت والد صاحبؒ کا معمول یہ تھا کہ جو کتاب بھی آپ پڑھاتے تھے مطالعے کے دوران صرف اسی کے حواشی و شروح پر اکتفا نہیں کرتے تھے بلکہ اس علم و فن کی غیر درسی کتابوں کا مطالعہ کرکے اس علم کے مزاج کو پہچاننے کی کوشش کرتے تھے، چنانچہ مذکورہ کتب کی تدریس کے دوران آپ نے مختلف شعراء کے دواوین، ادبِ عربی کی تاریخ اور ادب کی بنیادی کتابوں کو مطالعے میں رکھا، جس کی وجہ سے آپ میں عربی ادب بالخصوص عربی شاعری کا بڑا ستھرا مذاق پیدا ہو گیا تھا۔

والد صاحبؒ کو مختلف شعرائے عرب کے اتنے اشعار یاد تھے کہ انہیں سُن کر حیرت ہو جاتی تھی، عربی سے واقفیت کے بعد احقر کو تقریباً بیس سال حضرت والد صاحبؒ کی آغوشِ شفقت میں میسر آئے

اور مختلف مواقع پر آپ سے بیشمار عربی اشعار سُنے، اس کے باوجود آخر عمر میں آپ کی زبان سے بسا اوقات ایسے اشعار سُننے میں آتے تھے جو پہلے کبھی آپ سے نہیں سُنے تھے۔ شعرائے جاہلیت میں خاص طور سے امرؤالقیس، زہیر اور اعشٰی کے شعرائے اسلامیین میں حضرت حسانؓ، کعب بن زہیرؓ ذوالرمّہ فرزدق اور حماسیین کے اور شعرائے مولّدین میں متنبّی، ابوتمام اور ابوالعتاہیہ کے اشعار آپ سے بکثرت سُنے جن سے ان شعراء کے ساتھ خصوصی مناسبت کا اندازہ ہوتا تھا۔

احقر نے اندازہ لگایا کہ حضرت والد صاحبؒ کو تین قسم کے اشعار خاص طور پر زیادہ پسند آتے تھے سب سے زیادہ تو وہ اشعار جن میں کوئی حکمت کی بات خوبصورتی سے کہی گئی ہو، مثلاً متنبّی کی مبالغہ آرائی اور اس کا اندازِ تشبیب ومدح سرائی والد صاحبؒ کو پسند نہ تھا لیکن چونکہ اس کے یہاں حکمت بہت زیادہ ملتی ہے، اس لیے اُس کے بہت سے اشعار آپ کی نوکِ زبان پر رہتے تھے۔ آپ سے بارہا سُنے ہوئے متنبّی کے چند اشعار اس وقت بھی آپ کے لہجے کے ساتھ یاد آگئے۔ ؎

ومن نكد الدّنيا على الحرّ ان يرىٰ
عدوًّا لـه ما من صداقتـه بُـدٌّ

ومن صحب الدنيا طويلاتقلّبت
على عينه حتى يرى صدقهاكذبا

الأمـر لله ربّ مجتهـد
ما خاب الّا لأنّه جاهـد

ومتّـق والسهام مرسـلةٌ
يحيـد من حابض الى صارد

اذا رأيت نيوب الليث بارزة
فلا تظنّنّ ان الليث يبتسم

دُوسرے وہ اشعار والد صاحبؒ عام طور پر پسند کرتے تھے جن میں سوزوگداز پایا جاتا ہو،

شلاً تنہائی کے دوران میں نے بارہا والد صاحبؒ کو یہ اشعار نہ صرف پڑھتے بلکہ پُرسوز ترنم سے پڑھتے سنا ہے

فليست عشيات الحمى بر واجع[1]

عليك ، ولكن خل عينيك تدمعا

تلفت نحو الحي حتى وجدتني

وجعت من الإصغاء ليتا وأخدعا

تنہائی میں ان اشعار کو پڑھنے کا انداز یہ بتاتا تھا کہ یہ شعر محض برائے شاعری نہیں پڑھے جارہے، بلکہ ان کے پس منظر میں یادوں کا ایک جہان خوابیدہ ہے اور اب میں سوچتا ہوں کہ دیوبند اور تھانہ بھون کے مناظر کی نہ جانے کتنی پُرسوز یادیں تھیں جو آپؒ کے لبوں پر یہ اشعار لے آیا کرتی تھیں۔

پُرسوز اشعار کا اثر بھی والد صاحبؒ کے دل پر بہت ہوتا تھا، آج سے تقریباً ساڑھے تین سال پہلے ہی کی بات ہے کہ جب والد صاحبؒ نے آخری عمرہ کیا تو برادران گرامی مولانا محمد رفیع صاحب عثمانی اور جناب محمد ولی رازی صاحب کے علاوہ احقر بھی ساتھ تھا، مدینہ طیبہ جاتے ہوئے ہم نے مکہ مکرمہ کی شارع الحجون پر افطار کیا، میں نے شارع الحجون کا بورڈ دیکھا تو والد صاحبؒ سے عرض کیا کہ یہ وہی حجون معلوم ہوتا ہے جس کے بارے میں شاعر نے کہا ہے کہ ؎

كأن لم يكن بين الحجون الى الصفا

انيس ولم يسمر بمكة سامرُ

والد صاحبؒ نے اس کی تصدیق کی اور بتایا کہ حجون دراصل ایک پہاڑ کا نام ہے جو کسی زمانے میں مکہ مکرمہ کا آخری سرا سمجھا جاتا تھا، مکہ مکرمہ کے ایک طرف کوہ صفا تھا اور دوسری طرف کوہ حجون۔ بات آئی گئی ہوگئی، عمرہ و زیارت کے بعد والد صاحبؒ اور دونوں بھائی صاحبان تو واپس کراچی چلے آئے لیکن مجھے چونکہ حضرت مولانا سید محمد یوسف بنوری صاحب قدس سرہٗ کے ساتھ افریقہ جانا تھا، اس لیے میں وہیں رُک گیا، والد صاحبؒ کو جدہ ایئرپورٹ پر رخصت کرنے کے بعد میری جو حالت

---

[1] "اس حسین چراگاہ کی شامیں تو اب تیرے پاس لوٹ کر آنیوالی نہیں بس اب تو اپنی آنکھوں کو آنسو بہانے کیلئے چھوڑ دے ۔ اور میں نے قبیلے کی طرف مڑ مڑ کر دیکھا ہی تھا، یہانتک کہ میری گردن کی رگیں درد کرنے لگیں۔"

ہوئی اُسے الفاظ میں بیان کرنا مشکل ہے۔ اس وقت مجھ سے چوبیس گھنٹے کے لیے بھی والد صاحبؒ کی
جدائی برداشت نہیں ہوتی تھی، پھر اتفاق سے رخصت کے وقت ان کی طبیعت بھی ناساز تھی، اسلیے
دل کسی وقت ان کے دھیان سے خالی نہ تھا، مکہ مکرمہ واپس آیا تو حرم شریف کے سوا کہیں سکون نہ ملتا
تھا، جو وقت حرم شریف میں گزر جاتا وہ تو پُر سکون گزرتا لیکن باہر آنے کے بعد والد صاحبؒ کی یاد اور انکی
ناسازیٔ طبع کے خیال سے سخت بے چینی رہتی، اس حالت میں میں نے والد صاحبؒ کو جو خط لکھا، اس میں
اپنی حماقت سے دو شعر بھی لکھ دیے، میں نے لکھا کہ آپ کو ہوائی اڈے پر رخصت کرنے کے بعد
اس شعر کا صحیح مطلب سمجھ میں آیا کہ ؎

هواي مع الركب اليمانين مصعدٌ
جنيب وجثماني بمكة موثقٌ

اور حجون میں جس شعر کا ذکر آیا تھا، خدا جانے شاعر نے کس سیاق میں کہا ہوگا، لیکن مجھے تو اپنی
حالت کی تصویر معلوم ہوتا ہے کہ ؎

كأن لم يكن بين الحجون الى الصفا[1]
انيس ولم يسمر بمكة سامر

میں اعتراف کرتا ہوں کہ والد صاحبؒ کو یہ اشعار لکھ کر میں نے چند در چند وجوہ کی بنا پر حماقت
کی تھی لیکن وہ وارفتگی کا ایسا عالم تھا کہ اس کے حماقت ہونے کا احساس نہ ہو سکا، چنانچہ جب نیروبی
میں مجھے اطلاع ملی کہ والد صاحبؒ دل کے شدید دورے کی بنا پر ہسپتال میں داخل ہو گئے ہیں، اور
میں بھاگ دوڑ کر کراچی پہنچا تو ایک دن اباجیؒ نے فرمایا کہ "تم نے خط میں دو شعر ایسے لکھ دیے تھے
جیسے وہ اسی موقع کے لیے کہے گئے ہوں"۔ یہ فرما کر اباؒ کی آنکھوں میں خفیف سے آنسو آ گئے اور آواز
بھرا سی گئی، لیکن اللہ رے رعایتِ حقوق کہ ساتھ ہی فرمایا "مگر مکہ مکرمہ کے لحاظ سے وہ موزوں نہ تھے"۔
اب میں اُس زمانے کے بارے میں سوچتا ہوں تو حیرت ہوتی ہے کہ جس شخص کی زندگی صرف پندرہ

---

[1] ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حجون سے لے کر صفا تک نہ میرا کوئی غمگسار کبھی موجود تھا، اور نہ مکہ کی چاندنی راتوں
میں میرے ساتھ کسی نے کبھی باتیں کی تھیں۔

دن کے لیے پٹنے والد سے جدا ہونے کے بعد اتنی اجیرن ہو جاتی تھی، آج دو سال سے زیادہ جُدا رہنے کے بعد وہ کس طرح زندہ ہے؟ — لیکن یہ تو اللہ تعالیٰ کا بنایا ہوا بڑا اسرار نظام ہے، وہ جب کوئی غم دیتا ہے تو اُسے برداشت کرنے کی قوت بھی عطا فرماتا ہے۔ اس رُوئے زمین پر یقیناً سرکارِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال سے بڑا کوئی حادثہ رونما ہُوا ہے اور نہ اس سے بڑا کوئی صدمہ کسی کو پیش آسکتا ہے لیکن وہی صدیق اکبرؓ، عمر فاروقؓ، عثمان غنیؓ اور علی مرتضیٰؓ، جو آپ کی حیاتِ طیبہ کے صرف ایک سانس کے بدلے ہزاروں زندگیاں نچھاور کر سکتے تھے، اس پہاڑ جیسے صدمے کے باوجود زندہ رہے۔ یہ تو اُس حیّ و قیوم کا بنایا ہُوا نظام ہے، اگر یہ نہ ہوتا تو دُنیا کبھی کی ویران ہو چکی ہوتی۔

بات خدا جانے کہاں سے کہاں نکل گئی، کہہ یہ رہا تھا کہ والد صاحبؒ کے شعری مذاق کو سوز و گداز والے اشعار زیادہ پسند آتے تھے اور اُن سے آپ کو تاثر بھی ہوتا تھا۔

والد صاحبؒ کے مذاقِ شعر میں تیسری پسندیدہ چیز سادگی، بے تکلفی، برجستگی، اور کسی شعر کا سہل ممتنع ہونا تھا، شاعرِ عرب کے چند اشعار جو والد صاحبؒ کو بے حد پسند تھے اور جب کبھی شاعری میں حسنِ ادا کی بات چلتی تو عام طور سے انھیں لطف لے کر سنایا کرتے تھے، اس وقت یاد آ گئے۔

جعفر بن علبہ حارثی کے بارے میں والد صاحبؒ فرمایا کرتے تھے کہ اس کا کمال یہ ہے کہ اُس نے رزم کو بے ساختہ گفتگو کی زبان میں اس طرح پیش کیا ہے کہ اس میں برجستگی، روانی اور بے تکلفی کے باوجود رزمیہ شاعری کی پُوری شوکت بھی برقرار ہے۔ ایک مرتبہ اس کے دشمن نے اُسے پوری طرح گھیرے میں لے کر ہتھیار ڈالنے پر آمادہ کرنا چاہا تھا، یہ واقعہ بیان کرتے ہوئے اُس نے کہا ہے سہ

فقالوا لنا ثنتان لابدّ منهما	صدور رماح اشرعت أو سلاسل
فقلنا لهم تلكم اذاً بعد كرّة	تغادر صرعیٰ نوءها متخاذل
و لم ندر ان جضنا من الموت جيضة	كم العمر باقٍ والمدى متطاول
اذا ما ابتدرنا مأزقاً فرجت لنا	بأيماننا بيض جلتها الصياقل

والد صاحبؒ فرماتے تھے کہ ایک طرف تو ان اشعار کی برجستگی کا عالم یہ ہے کہ ان کی نثر کرنا مشکل ہے اور دوسری طرف ان میں رزمیہ شاعری کا پورا زور موجود ہے۔

اسی طرح حماسہ کے باب المراثی میں ایک ایسے باپ کے کچھ اشعار آتے ہیں جس کی بیوی ایک

چھوٹا سا بچہ چھوڑ کر مرگئی تھی، یہ بے چارہ بڑی شفقت کے ساتھ اُسے پالتا رہا، یہاں تک کہ ایک روز وہ بچے کو گھر چھوڑ کر کہیں باہر گیا، واپس آکر دیکھا تو وہ بھی ایک بالاخانے سے گر کر مرچکا تھا، اس پر اس نے مرثیے کے چند اشعار کہے ہیں جو والد صاحبؒ کو بہت پسند تھے اور چونکہ ان اشعار میں سوز و گداز اور برجستگی و بے تکلفی دونوں اپنی انتہا پر ہیں، اس لیے والد صاحبؒ ان کی بے حد تعریف کرتے تھے، وہ کہتا ہے:

هوى ابنی من علا شرفٍ   یهول عقابهٔ صعدهٔ
هوى من رأس مرقبةٍ   فزلّت رجله و یدهٔ
هوى عن صخرة صلدٍ   ففرّت تحتها کبدهٔ
فلا امٌّ فتبکیه   ولا اختٌ فتفتقدهٔ
ألامُ علی تبکّیه   وألمسه فلا اجدهٔ
وکیف یلام محزون   کبیرٌ فاتهٔ ولدهٔ

فارسی میں حضرت والد صاحبؒ کو سعدیؒ، حافظ شیرازیؒ، مولانا جامیؒ، مولانا رومیؒ اور عرفیؔ و نظیریؔ کے اشعار کافی یاد تھے اور خاص طور پر مولانا جامیؒ اور مولانا رومیؒ سے بڑی مناسبت تھی، مثنوی تو آپ کو اتنی زیادہ یاد تھی کہ عام طور سے تقریروں میں بھی اور گفتگو میں بھی موقع کی مناسبت سے اس کے طویل طویل اقتباسات سُناتے چلے جاتے تھے۔ والد صاحبؒ کے ذاتی کتب خانے میں کلیاتِ جامیؒ موجود ہے اور اسے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے شاید اس کا باستیعاب مطالعہ کیا ہے اور اپنے پسندیدہ اشعار پر نشان لگا دیئے ہیں، ان میں سے چند اشعار آپ بھی ملاحظہ فرمایئے، جن سے والد صاحبؒ کے بلند پایہ مذاق کا اندازہ ہوگا ؎

ہر سجدہ کہ در عُمرِ خود آرد ہمہ سہو است   عابد کہ جُز ابروئے تو محراب گرفتست

چُو در نظارۂ آں روئے می تواں مردن   مرا ہزار شکایت ز جانِ خویشتن است

اے فلک اندوہِ شیریں بار بر دل خسروم نہ   کایں بضاعت را خریدارے بہ از فرہاد نیست

شد از حقائق عرفاں دلم خزینۂ راز | گز اوفِ فلسفیاں کے بہ نیم فلس خرم

یک طرف بانگ حسی یک جانب آواز دلے | از گراں جانی بود آنرا کہ ماند دل بجائے

تجد می گویم و زاں قصدم زمین شیرب است | کافتاب جود و خورشید کرم را مغرب است

اُردو شاعری سے اگرچہ حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا ربط نسبتۃً کم رہا لیکن حسنِ ذوق کسی زبان کے ساتھ خاص نہیں ہُوا کرتا، اس لیے آپ نے اُردو اشعار کا بھی مطالعہ فرمایا، اور اُردو شعراء میں خاص طور پر اصغرؔ گونڈوی، جگرؔ مراد آبادی، حضرت مجذوبؔ، اکبرؔ الٰہ آبادی اور اقبالؔ آپ کو پسند تھے، اور ان کے بہت سے اشعار آپ کو یاد بھی تھے، بالخصوص اکبرؔ الٰہ آبادی کی تو شاید پُوری کلیات کا آپ نے مطالعہ فرمایا تھا چنانچہ ان کے صرف طنزیہ اشعار ہی نہیں بلکہ ان کی غزلیات کے چیدہ اشعار بھی مختلف تقریروں میں آپ کی زبان پر آجاتے تھے۔ حضرت والد صاحبؒ کی ذاتی بیاض میں ایک حصہ "حکمۃ الاشعار" کے نام سے ہے جس میں اپنے پسندیدہ اشعار درج فرمائے ہیں، اس کا کچھ حصہ حضرت والد صاحبؒ کی کتاب "کشکول" میں بھی شائع ہو چکا ہے۔

حضرت والد صاحبؒ نے شعر و شاعری کو اپنا باقاعدہ مشغلہ کبھی نہیں بنایا لیکن چونکہ ذوقِ شعر ایک فطری وصف کے طور پر آپ کو عطا ہُوا تھا، اس لیے کبھی فرصت کے اوقات میں بے ساختہ کچھ اشعار موزوں ہو جاتے تھے جنھوں نے رفتہ رفتہ ایک مکمل بیاض کی صورت اختیار کر لی۔ اکابر علماء دیوبند میں سے بیشتر حضرات کا یہی حال تھا کہ اگرچہ انھوں نے شعر و ادب کو اپنا باقاعدہ موضوع کبھی قرار نہیں دیا، لیکن فطری طور پر شعر گوئی کے مذاق سے حضرت مولانا نانوتوی رحمۃ اللہ سے لے کر حضرت تھانویؒ تک تقریباً بھی کو حصۂ وافر ملا تھا۔

حضرت والد صاحبؒ نے اپنے فارسی اور اُردو اشعار اپنی کتاب "کشکول" کے دُوسرے حصے میں شامل فرما دیے ہیں اور ان کے پیش لفظ میں جو ایک صفحہ لکھا ہے وہ شعر و شاعری کی حقیقت واضح کرنے کے لیے طویل مقالوں پر بھاری ہے، فرماتے ہیں :

"شعر ہر سلیم الطبع انسان کا فطری ذوق ہوتا ہے، اس سے بہت سے اچھے

کام بھی نکلتے ہیں جو نثر عبارت سے حاصل نہیں ہو سکتے۔ انسان کی طبیعت کو کسی خاص چیز پر آمادہ کرنے کے لیے شعر بڑا کام کرتا ہے، مگر وہ دو دھاری تلوار ہے، اپنی حفاظت کا سامان بھی بن سکتی ہے اور ہلاکت کا بھی۔

دُنیا میں تمام معاملات کی طرح اس میں بھی بڑی افراط و تفریط ہوتی چلی آئی ہے بہت سے وہ لوگ ہیں جنہوں نے سارا علم و ہنر شعر و سخن ہی کو قرار دے کر اپنی زندگی اس کے لیے وقف کر چھوڑی اور پھر اس دریا میں ایسے غرق ہوئے کہ حلال و حرام اور نیک و بد کا بھی امتیاز نہ رہا، اور بہت سے ایسے لوگ بھی ہیں جو اس کو ایک شجرۂ ممنوعہ سمجھتے ہیں۔

صحیح اور معتدل تعلیم وہ ہے جو اس کے متعلق حکیم الحکماء امام الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے قول و عمل سے دی ہے کہ شعر اپنی ذات میں نہ اچھا ہے نہ بُرا، بلکہ نثر کلام کی طرح اپنے مضمون اور مقصود کے اعتبار سے اچھا بھی ہو سکتا ہے بُرا بھی۔

احقر ناکارہ نے کبھی شعر و سخن کو اپنا مشغلہ نہیں بنایا، نہ اس کو باقاعدہ سیکھنے کی کبھی کوشش کی اور نہ کبھی ضروری مشاغل نے اتنی فرصت دی کہ اس کام میں دخل دیا جائے، قدرتی اور فطری ذوق نے مختلف حالات و واقعات میں کبھی کبھی کوئی کلام موزوں کر دیا ہے۔ میرے نظم لکھنے کی ابتدا عربی ادب کے سلسلے میں استاذ محترم حضرت مولانا اعزاز علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ارشاد کی بنا پر ہوئی، جب کہ دارالعلوم کے طلباء کچھ اُردو زبان کے مشاعرے جمعہ کی فرصت میں منعقد کیا کرتے تھے تو استاذ محترم نے ہم چند طلباء کو غیرت دلائی کہ اگر شعر کہنا ہے تو عربی میں کہو جو تمہارے مقصد تعلیم میں معین ہو۔ اس وقت سے عربی میں مختلف قسم کے اشعار و قصائد لکھنے کی نوبت آئی، اور پھر جب یہ ذوق کچھ آگے بڑھا تو ترقی معکوس یہ ہوئی کہ فارسی زبان میں اور پھر اُردو زبان میں کچھ اشعار، قطعات، غزل، قصیدے لکھنے کی نوبت آئی۔"

حضرت والد صاحبؒ کے اشعار میں کمیت اور کیفیت کے لحاظ سے بھی ترتیب کچھ اسی طرح معلوم ہوتی ہے کہ عربی اشعار پہلے نمبر پر ہیں، پھر فارسی اور پھر اُردو کا نمبر آتا ہے۔ میرے لیے حضرت

والد صاحبؒ کے اشعار کی تعریف کرتے ہوئے ہمیشہ حافظ ابن حجرؒ کا ایک مقولہ رکاوٹ بنتا ہے جو خود والد صاحبؒ ہی سے بارہا سُنا تھا کہ :

من مُدح بغير فنه فقد وُقص

کسی شخص کی تعریف اس کے اصلی فن کے علاوہ کسی اور چیز میں کرنا گویا اس کی گردن توڑ دینا ہے۔

حضرت والد صاحبؒ کا اصلی فن دینی علوم تھے، اس لیے ڈر رہتا ہے کہ شعر و شاعری میں ان کی مدح سرائی کہیں اس مقولے کی زد میں نہ آجائے، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اس مقولے کا صحیح مصداق وہ صورت ہے جس میں کسی کی تعریف اس کے اپنے فن میں تو کی نہ جائے اور صرف کسی دوسرے معاملے میں کی جائے اور میں نے جس ترتیب کے ساتھ یہ تذکرہ شروع کیا ہے، وہ میں شروع میں عرض کر چکا ہوں کہ چونکہ ابتدا میں آپ کو خصوصی دلچسپی ادب سے رہی ہے اس لیے علمی مذاق کا آغاز اسی سے کیا ہے ورنہ درحقیقت آپ کے اصل موضوعات کا بیان آگے آنے والا ہے لہٰذا اگر ایک اضافی خصوصیت کے لحاظ سے آپ کے اشعار کی کوئی خوبی بیان کردی جائے تو غالباً مذکورہ مقولہ اس پر صادق نہیں آئے گا۔

والد صاحبؒ کے عربی اشعار کا ایک مجموعہ "نفحات" کے نام سے شائع ہو چکا ہے، والد صاحبؒ نے عربی زبان میں کئی کتابیں بھی تصنیف فرمائی ہیں، مضامین بھی لکھے ہیں اور شعر بھی کہے ہیں، اگرچہ آپ نہ صرف عربی تحریریں بے تکلف لکھا کرتے تھے بلکہ اس معاملے میں اپنے معاصر علما کے درمیان ممتاز سمجھے جاتے تھے، اس کے باوجود اگر میں آپ کی عربی نثر کی زیادہ تعریف کروں تو اس میں مبالغے کا اندیشہ ہے لیکن آپ کے عربی اشعار کے بارے میں کسی خوف کے بغیر میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ ان میں بہت سے اشعار ایسے ہیں کہ اگر کہنے والے کا نام لیے بغیر انھیں کسی صاحب ذوق کے سامنے رکھا جائے تو وہ بلا تأمل یہ فیصلہ کرے گا کہ یہ اشعار اسلامیین یا مولدین میں سے کسی عرب شاعر کے ہیں، مثلاً "ادبیۃ الادب" کے ایک طرحی مشاعرے میں والد صاحبؒ نے جو اشعار پڑھے، ان کے یہ تیور ملاحظہ فرمائیے :

ترحل عني الصبر يوم ترحلوا	فبت بقلب في الحشا يتململ
يقول نصيحي في هواه توجعا	"تعز فإن الصبر بالحر اجمل"
يصبرني ، والصبر عين شكيتي	وما غالني في الحب الا التحمل

ان اشعار کو، اور بالخصوص آخری شعر کو پڑھ کر کون اندازہ کر سکتا ہے کہ یہ کسی عجمی شاعر کا شعر ہوگا؛
اسی قصیدے کا ایک اور شعر یاد آیا :

بکینا فأبکینا ولا مثل ناقف
لحنظلة فی الحی یوم تحملوا

اس شعر میں والد صاحبؒ نے امرؤالقیس کے اس شعر پر لطیف چوٹ کی ہے جس میں وہ کہتا ہے کہ :

کأنی غداة البین یوم تحملوا
لدی سمرات الحی ناقف حنظل

لیکن خود والد صاحبؒ فرمایا کرتے تھے کہ میں نے امرؤالقیس کے اس شعر پر تعریض تو کر دی ہے
مگر سوز و گداز اور لطافت و نزاکت کے اعتبار سے شعر امرؤالقیس ہی کا بہت بھاری ہے اور میری تعریض
کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے سوداؔ نے میرؔ پر تعریض کی تھی، میرؔ کا شعر تھا ؎

سرہانے میرؔ کے آہستہ بولو
ابھی ٹک روتے روتے سو گیا ہے

سوداؔ کو یہ شعر سنایا گیا تو اُس نے کہا کہ "یہ کیا زنانہ قسم کا شعر ہے" اور پھر اس
مضمون کو خود اس طرح ادا کیا کہ ؎

سوداؔ کی جو بالیں پہ ہُوا شورِ قیامت
خُدامِ ادب بولے، ابھی آنکھ لگی ہے

اسی طرح ایک اور طرحی قصیدے کے یہ اشعار ملاحظہ ہوں ؎

شیم اللیالی أن تریبی بدرها — والعین غیر بدورها یرتاد
لعب النسیم ببانة فتشابها — قد الحبیب وغصنها المیاد
أعیی سقیمهم الرقاة وعنده — مرض الطبیب وعیدت العواد

اور ایک نعتیہ قصیدے کے یہ اشعار ؎

من ذکر طیبة مغداها فمساها — جرت شئونی، بسم الله مجراها

أتى فردّ قلوبًا عن غوايتها ... غلفًا عن الحق، غين الكفر غشاها

نادى، فسمع آذانًا بها صمم ... جلى، فأعين عمى الخلق جلاها

واهًا لطيبة لا زالت منورة ... طابت مشارقها من طيب ريّاها

من للشفيع بأسحار بها سلفت ... وعيشة فی حواليها تملاها

اور ایک عارفانہ غزل کے چند اشعار ؎

أشاقك من ليلاك طيف خيالها ... وقد حالت الأجبال دون وصالها

مهامه تنضى الخيل دون هضابها ... مقابر للآمال دون طلالها

مداولة الأيام فی الناس دائب ... فأبصر مآل الكائنات بحالها

وهاتف حق كل كون وكائن ... بأعلى نداء إن صغيت لقالها

ظهور رجال الحق أورثه الخفا ... به ضلت الأقوام، يا لضلالها

اور عمر رفتہ کا ایک مرثیہ ؎

دعینی عنك يا سعدى دعینی ... وبينی عن فؤادی ثم بينی

وما شغرت يداى بجيد خود ... وما دلّ الخرائد يوّ دعينی

أبان الشيب، رب، سواد شعری ... فهل لسواد وجهی من مبین

يا ويح نفسی فی الأهواء أهوی بی ... ولو صبرت لكان الصبر أولى بی

يا رب فاكف همومًا لی أكابدها ... واجعل لنفسك تطوافی وتطلابی

أنت الولی إذا ولّى الولاء عندا ... وأسلمت جدى للترب أترابی

فإن طردت، وذاك العدل، يا صمدی ... فما لعبدك فيما بعد من باب

اور علامہ شبیر احمد صاحب عثمانیؒ کے مرثیے میں یہ شعر ؎

أی الخطوب من الأيام أبكيه ... والدهر ذو واحن لا يأتلی فيه

كتمت دائی حتى عيل مصطبری ... وليس منكتمًا ما الله مبديه

جرت بسری أقلام الجفون على ... صفيحة الوجه والأحزان تمليه

یہ اور اس نوع کے بہت سے اشعار بلاشبہ ایسے ہیں کہ ان کے مضامین سے لے کر اُن کے اسلوب بیان اور ان کی زبان تک کہیں عجمیت کی کوئی بُو محسوس نہیں ہوتی، یہی وجہ ہے کہ ایک مرتبہ مِصر کے کسی ادیب نے حضرت والد صاحبؒ کا کوئی قصیدہ کسی رسالے میں دیکھا تو وہ بے ساختہ یہ سمجھا کہ یہ کسی پختہ مشق عربی شاعر کا قصیدہ ہے لیکن جب اُسے یہ معلوم ہوا کہ یہ اشعار ایک ہندوستانی عالم کے ہیں تو اس کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی، اس نے والد صاحبؒ کو خط لکھا اور پھر ملاقات کے لیے سفر کر کے پہنچا۔

فارسی اشعار

والد صاحبؒ نے فارسی زبان میں بھی شعر کہے ہیں جو کشکول میں شائع ہو چکے ہیں اور اُن کا نمونہ دیکھنا ہو تو یہ اشعار ملاحظہ فرمایئے:

تا بکے شکوۂ ایں گردشِ ایّام کُنی ——— واندریں فکر بسر کے سحر و شام کُنی
اے دل آں بہ کہ نظر باز بر انجام کُنی ——— رُوز دُنیائے دنی سوئے دلآرام کُنی
گوش بر چنگ نہی، نغمۂ مطرب شنوی ——— خاک بر گردشِ دہر و غمِ ایّام کُنی
حکم عقل است کہ چوں بر سرِ خرمن گزری ——— پیش از دانہ نظر بر طرفِ دام کُنی
نیک نامی زعزیزانِ جہاں نیست بعید ——— بہ کہ بیرون ز سرت ایں ہوسِ خام کُنی

دیوانہ خوشتر است نہ فرزانہ خوشتر است ——— کانرا کہ خواست جلوۂ جانانہ خوشتر است
دیدی کہ رنج ہائے جہاں را کنارہ نیست ——— پس با مئے بگوشۂ میخانہ خوشتر است
تنگ آمدم ز صحبتِ یاران ایں زماں ——— بس مونسم صراحی و پیمانہ خوشتر است
خوش درسِ علم و شغلِ فتاوٰی بدیوبند ——— لیکن شبے بہ خانقہ تھانہ خوشتر است

بگفتہ زمن کہ حالتِ زارم نہ دیدہ بہ ——— بگذار حالِ من کہ ہمیں ناشنیدہ بہ
ناکندنی ست در رہِ محبوب خار پا ——— کیں خارِ عشق در رگِ جانم خلیدہ بہ
چشمم اگر بصبح نہ بیند جمالِ دوست ——— گویم کہ صبح تا بہ ابدا دمیدہ بہ

اے چارہ گر بخیر! کہ بیمارِ عشق را   جاں سوختہ، طپیدہ و نا آرمیدہ بہ
ہم بخیہ سازیے نہ سزد مہر دانشش   کیں گل سدا بہار گریباں دریدہ بہ

مجھے یاد ہے کہ دارالعلوم جب ابتداءً میں شرافی گوٹھ کے قریب (جہاں اب کورنگی کالونی آباد ہوگئی ہے) قائم کیا گیا تو ایک مرتبہ جناب جگر مرادآبادی مرحوم، ادیب سہارنپوری مرحوم، جناب ماہر القادری مرحوم دارالعلوم تشریف لائے، رات کے وقت شعر و سخن کی محفل منعقد ہوئی، اس محفل میں برادرِ محترم جناب مولانا محمد زکی کیفی صاحب مرحوم نے حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے فارسی کلام میں سے مؤخر الذکر دو غزلیں ان حضرات کو سنائیں، جناب جگر مرحوم ان غزلوں کو سن کر ایک ایک شعر پر وجد کے ساتھ حیرت کا اظہار کر رہے تھے کہ ایک بوریہ نشین عالمِ دین نے جس کی ساری عمر قرآن و حدیث اور فقہ و فتویٰ کی خدمت میں بسر ہوئی اور جس نے کبھی شعر و سخن کو اپنا باقاعدہ مشغلہ نہیں بنایا، ایسے پختہ اور دلکش اشعار کیسے کہے ہیں؟

اُردو اشعار

والد صاحبؒ کے اُردو اشعار بھی کشکول میں شائع ہو چکے ہیں، ان میں زیادہ تر نظمیں، اور قطعات ہیں اور چند غزلیں بھی، غزل کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:-

وہ بزم اب کہاں وہ طرب کا سماں کہاں   ساقی کہاں وہ جام مئے ارغواں کہاں
ڈھونڈیں ہم اب نقوشِ سبک رفتگاں کہاں   اب گردِ کارواں بھی نہیں کارواں کہاں

اور ایک تمام غزل کے یہ شعر جو طبع نہیں ہو سکے، کس قیامت کے اشعار ہیں:

لب پر دمِ اخیر ترا نام آ گیا   رکتا ہوا یہ سانس بہت کام آ گیا
بیمارِ عشق لے کے ترا نام سو گیا   مدت کے بے قرار کو آرام آ گیا
آثار سارے صبحِ قیامت کے ہو گئے   محفل میں آج کون سرِ شام آ گیا

دل میں کِس کی بزمِ عشرت کا سماں رکھتا ہُوں مَیں — اپنی نظروں میں جمالِ دو جہاں رکھتا ہُوں مَیں
دل میں حسرت ہے، جگر میں درد، پہلو میں شرر — شامِ تنہائی میں سازِ کارواں رکھتا ہُوں مَیں
کہہ نہیں سکتا زباں سے، دیکھتی ہے جس کو آنکھ — چشمِ نرگس کی تو سوسن کی زباں رکھتا ہُوں مَیں
کنجِ تنہائی کی مونس، شامِ غربت کی رفیق — ایک تصویرِ خیالی حسنِ جاں رکھتا ہُوں مَیں
کچھ جنوں میں میرے آمیزش ہے دانائی کی کیا — جیب و داماں کی ابھی کچھ دھجیاں رکھتا ہُوں مَیں

اس قدر ہو گیا ہے خوگرِ غم — دل میں کوئی خوشی نہیں آتی
گدگدائے کوئی ہزار مگر — اب لبوں پر ہنسی نہیں آتی
تم بدلتے ہو روز قول و قرار — مجھ کو یہ دل لگی نہیں آتی
عُمرِ رفتہ کا مرثیہ پڑھ لوں — اس سے بہتر خُدی نہیں آتی

کس قدر تھا لذیذ خوابِ عدم — پُرسکوں تھا جہانِ بے خبری
رنج و راحت کی فکر تھی کس کو — کِس کو سود و زیاں کی دردِ سری
آہ کِس کشمکش میں ڈال دیا — تُو نے اے ذوقِ علم و دیدہ وری
جیب و داماں ہیں تار تار کبھی — اور کبھی سازگار بخیہ گری

رازِ ہستی جو پا گیا ہُوں مَیں — سارے عالم پہ چھا گیا ہُوں مَیں
تھا جس کا راز پا نہ سکے — اُس حقیقت کی ابتدا ہُوں مَیں
میری ہستی کو سرسری مت جان — دُور ابھی سے ہے اور سِرا ہُوں مَیں
آئینہ ہوں جمالِ مطلق کا — ایک جامِ جہاں نما ہُوں مَیں

ان کے علاوہ بیشتر نظمیں اور قطعات حکمت و نصیحت کے مضامین پر مشتمل ہیں مثلاً ؎

یہ دُنیا اے عزیزو ایک جھُولے کی سواری ہے — اُترنا اور چڑھنا سب کا اس میں باری باری ہے
یہاں کی ہر خوشی ہر غم ہر اک آفت ہر اک راحت — بصیرت سے اگر دیکھو تو نا اعتباری ہے

حقیقت حق نے ہر اک آنکھ والے کو دکھا دی ہے کبھی کا غم کسی کے واسطے پیغام شادی ہے

حضرت علی کرم اللہ وجہٗ کے کلام سے اخذ کر کے حضرت والد صاحبؒ نے "مقبرے کی آواز" کے نام سے ایک انتہائی موثر نظم کہی ہے جو اس طرح شروع ہوتی ہے ؎

مقبرے میں اُترنے والے سُن ٹھہر، ہم پہ گزرنے والے سُن
ہم بھی اِک دن زمیں پہ چلتے تھے باتوں باتوں میں ہم مچلتے تھے

اس نظم کا یہ ٹکڑا ملاحظہ فرمائیے ؎

جن کو مر مر کے مَیں نے پالا تھا جن کے گھر کا مَیں اِک اُجالا تھا
جن کے ہر کام کا مدار تھا مَیں جن کی بگڑی کا سازگار تھا مَیں
دین و دُنیا کی ساری مکروہات جن کی خاطر تھی میرے سر دن رات
ہے کہاں آج وہ مری اولاد جو نہیں کرتی بھُول کر بھی یاد
جس پہ تھا کل مدار راحت کا جس کو دعویٰ تھا کل محبت کا
جس کی اُلفت کا دل میں تھا اِک داغ کیا کسی گھر کا بن گئی وہ چراغ
آج وہ زینتِ حرم ہیں کہاں مہبطِ اُلفت و کرم ہیں کہاں
کون آباد ہے مرے گھر میں ملک کس کی ہے نقد و زیور میں

کوئی کرتا نہیں ہے یاد مجھے
سب نے چھوڑا ہے نامراد مجھے

ہم ہر اک رہگذر کو تکتے ہیں فاتحہ کے لیے ترستے ہیں
اے زمیں پر مچلنے والے دیکھ کبر و نخوت سے چلنے والے دیکھ
وعظ ہے، قبر کا نشاں میری گرچہ خاموش ہے زباں میری
دل کے کانوں سے سُن فغاں میری درسِ عبرت ہے داستاں میری

جانے والے تو جا کے پھیلا دے
میری آواز سب کو پہنچا دے

حضرت والد صاحبؒ کے ایک عزیز حضرت مولانا محمد نعیم صاحب دیوبندیؒ بڑے پایے کے بزرگ تھے، نزع کے وقت ان کا شیطان سے مناظرہ ہوا تھا جس سے متاثر ہو کر حضرت والد صاحبؒ نے اپنا رسالہ "موت کے وقت" تحریر فرمایا ہے۔ ان کی وفات پر جو مرثیہ آپ نے کہا ہے، اس کے کچھ بند بھی پیش خدمت ہیں۔ اس مرثیے کی ابتدا اس طرح ہوئی ہے ؎

کون اُٹھتا ہے آج عالم سے؟ پارہ پارہ ہے کیوں جگر غم سے
خون روتا ہے کیوں اُفق سرِ شام؟ سینہ شق ہے یہ کس کے ماتم سے

حادثہ یہ کوئی عظیم نہ ہو!
یہ کہیں رحلتِ نعیم نہ ہو!

پھر اظہار رنج کے کچھ اشعار کے بعد حسب معمول حکمت و موعظت کی طرف گریز ہے ؎

اِک کتابِ عبر یہ عالم ہے سبق آموزِ ابنِ آدمؑ ہے
کہیں جشنِ طرب کے ہنگامے کہیں بزمِ عزا و ماتم ہے

ہر تغیر ہے غیب کی آواز
ہر تجدد میں ہیں ہزاروں راز

عبرتوں کے سبق ہیں لیل و نہار اور شام و پگاہ کی تکرار
کہیں تاراج کُن ہے فصلِ خزاں کہیں رعنائیوں پہ فصلِ بہار

ہر تغیر میں عین حکمت ہے
اس میں مستور دستِ قدرت ہے

کل جہاں جشن تھا، تماشا تھا شورِ رقص و سرود برپا تھا
آج ملتا نہیں نشاں اُتنا کون تھا؟ کس جگہ تھا؟ اور کیا تھا

ذرّے ذرّے میں ہے جہاں کے عیاں
آیت کل من علیها فان

کوئی حاکم ہے اور کوئی محکوم کوئی ظالم ہے اور کوئی مظلوم
مال و دولت میں کوئی ہے مخمور کوئی نانِ جویں سے بھی محروم

کوئی آقا ہے اور کوئی مزدور
کوئی گمنام ، اور کوئی مشہور
کہیں زینت میں مست ہے دلہن — کہیں میت کا سِل رہا ہے کفن
ہے کہیں محفل سرود و طرب — کہیں مصروفِ غم ہیں مردو زن
یہ تغیر ، یہ سارے شادی وغم
زُلفِ محبوب کے ہیں پیچ وخم
ہے کوئی تخت کے بہانے میں — کوئی تختے پہ ہے نہانے میں
کوئی لہو ولعب میں ہے مخمور — کوئی رونے میں اور رُلانے میں
تجھ کو معلوم ہے، یہ سب کیا ہیں
ان میں مخفی پیامِ رب کیا ہیں

معقولات

ادب کے علاوہ والد صاحبؒ کو دارالعلوم دیوبند میں معقولات یعنی منطق، فلسفہ، کلام ہیئت اور ریاضی بھی پڑھانے کا موقع ملا، اور چونکہ آپ نے یہ علوم ایسے اساتذہ سے پڑھے تھے جو اپنے وقت میں معقولات کے امام سمجھے جاتے تھے، مثلاً حضرت مولانا غلام رسول صاحب ہزارویؒ، حضرت مولانا رسول خاں صاحب ہزارویؒ اور حضرت مولانا محمد ابراہیم صاحب بلیاویؒ، اس لیے اللہ تعالیٰ نے آپ کو ان علوم میں بھی راسخ استعداد عطا فرمائی تھی، چنانچہ ایک زمانہ ایسا گزرا ہے جب دارالعلوم دیوبند کے طلباء میں آپ معقولات کے ماہر کی حیثیت سے معروف ہوئے لیکن ساتھ ہی بزرگوں کی تعلیم و تربیت اور ان کی صحبت کے اثر سے یہ حقیقت آپ کے ذہن و قلب میں پیوست تھی کہ یہ علوم ایک طرف تو مقصود بالذات نہیں بلکہ محض آلے اور وسیلے کی حیثیت رکھتے ہیں اور دوسری طرف ان علوم میں اجتہاد کا باب وسیع ہے، اور ان میں فلاسفہ کے فتووں کی تقلید ضروری نہیں، چنانچہ آپ ان علوم کی تدریس کے دوران صرف کتاب کو سمجھانے پر ہی اکتفا نہیں فرماتے تھے، بلکہ اکثر زیر بحث مسائل میں اپنی تحقیق بھی بیان فرماتے تھے۔

ایک مرتبہ دارالعلوم دیوبند میں منطق کی مشہور کتاب "میر زاہد رسالہ" کا درس ایک اُستاذ کے سپرد ہُوا، اور طلباء کی جماعت ایسی آگئی جس نے قدم قدم پر سوالات کی بھرمار کر کے استاذ کو زچ کر دیا، بسا اوقات استاذ ان غیر متوقع سوالات کے لیے تیار نہ ہونے کے سبب اطمینان بخش جواب نہ دے پاتے اور طلباء کا اطمینان نہ ہوتا، اس طرح بحث و مباحثہ کی فضا میں درس کی رفتار بھی سُست ہوگئی، اور استاذ کا وقار بھی خطرے میں پڑنے لگا، اُس وقت حضرت علامہ انور شاہ کشمیری صاحبؒ ناظم تعلیمات تھے، جب انھیں اس صورتِ حال کی اطلاع ہوئی تو انھوں نے اساتذہ کو جمع کر کے اس بارے میں مشورہ کیا، اور رائے یہ ہُوئی کہ اس کتاب کا درس کسی اور استاذ کے پاس بھیج دیا جائے، اس سلسلے میں مختلف تجویزیں زیرِ بحث آئیں، آخر میں حضرت شاہ صاحبؒ نے والد صاحبؒ سے خطاب کر کے ارشاد فرمایا کہ یہ درس آپ اپنے ذمّے لے لیں، حضرت والد صاحبؒ نے جواب دیا کہ:

"حضرت! اگر آپ مجھ سے پُوچھیں تو درحقیقت میں میزان الصرف پڑھانے کا بھی لائق نہیں لیکن اگر آپ اپنی سرپرستی میں پڑھوانا چاہیں تو مجھے بخاری شریف بھی دے دیں گے تو مجھے کوئی عُذر نہ ہوگا اور اللہ کے بھروسے پر وہ بھی پڑھاؤں گا۔"

چنانچہ وہ کتاب حضرت والد صاحبؒ کے سپُرد کر دی گئی، والد صاحبؒ فرماتے ہیں کہ جب مَیں پہلے دن درس دینے کے لیے پہنچا تو مَیں نے طلباء سے خطاب کر کے کہا کہ: "مجھے یہ اطلاع ملی ہے کہ آپ حضرات کو معقولات میں بہت ملکہ ہے اور اس سلسلے میں آپ کے دل میں سوالات بہت پیدا ہوتے ہیں، اس لیے مَیں نے یہ طے کیا ہے کہ شروع میں ایک ہفتہ صرف سوال و جواب اور مذاکرے کے لیے رکھوں گا، اس ہفتے میں جس کسی کے دل میں کوئی سوال ہو وہ بلا تکلف بیان کر دے۔ اور جب تک اطمینان نہ ہو جائے، آگے نہ بڑھے، البتہ گفتگو کے دوران یہ بات ذہن میں رکھے کہ موضوع بحث معقولات ہیں لہٰذا گفتگو کی بنیاد خالص عقلی دلائل پر ہوگی، اور محض اس بات کو دلیل نہیں سمجھا جائے گا کہ فلاں منطقی یا فلاں فلسفی نے یہ بات لکھی ہے بلکہ جوابات کہی جائے گی وہ عقلی دلائل کی بنیاد پر کہی جائے گی۔

حضرت والد صاحبؒ فرماتے ہیں کہ اس کے بعد سوال و جواب کا سلسلہ شروع ہُوا، لیکن میں نے جو قید لگا دی تھی کہ کسی منطقی یا فلسفی کے قول کو حجت کے طور پر پیش نہ کیا جائے، اس کی بنا پر طلباء

کی ترکی جلد ہی تمام ہوگئی اور ایک ہفتہ تو درکنار، ایک دو دن ہی میں سارے سوالات ختم ہوگئے
اس کے بعد میں نے حسبِ معمول درس شروع کیا اور بفضلہ تعالیٰ طلباء مطمئن ہوگئے۔

معقولات کی تدریس میں جب انہماک زیادہ ہو جائے تو بعض اوقات یہ حقیقت نظروں سے
اوجھل ہو جاتی ہے کہ ان کو پڑھنا پڑھانا بذاتِ خود مقصود نہیں بلکہ منطق تو محض آلہ ہے اور فلسفہ اس لیے
پڑھایا جاتا ہے کہ ایک عالمِ دین کو اُن نظریات کا صحیح علم ہو جو دین کے خلاف استعمال کئے جاتے ہیں،
اور پھر وہ ان کی مؤثر تردید کر سکے لیکن حضرت والد صاحب قدس سرہٗ نے جب بھی منطق یا فلسفہ کا درس
دیا، یہ حقیقت طلباء کے ذہن نشین کرادی کہ ان عقلیات میں بذاتِ خود کچھ نہیں رکھا ہے، اور اگر انسان
کو وحیِ الٰہی کا نورِ ہدایت حاصل ہو تو وہ ان عقلی گھوڑوں سے کبھی مرعوب نہیں ہو سکتا۔

حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو اس بات کا بھی احساس تھا کہ جس طرح ہمارے قدیم متکلمین
نے یونانی فلسفے میں مہارت حاصل کر کے اس کی تردید فلسفیانہ زبان ہی میں کی تھی، اسی طرح موجودہ
دور کے علماء کو جدید فلسفے میں مہارت حاصل کر کے وہی کام از سرِ نو انجام دینا چاہیے، اس غرض کے لیے
آپ نے حضرت علامہ انور شاہ صاحب کشمیری رحمۃ اللہ علیہ سے جدید فلسفے کا بھی درس لیا تھا۔ لیکن چونکہ
اس کے بعد آپ کی خصوصی مصروفیات کا محور فقہ اور تفسیر وغیرہ رہے، اس لیے اس میدان میں آپ کو
خود کوئی نمایاں کام کرنے کا موقع نہیں ملا، البتہ آپ کی خواہش یہ ضرور تھی کہ ایسے لوگ مسلمانوں میں
پیدا ہوں جو جدید فلسفے پر مکمل دسترس حاصل کر کے عہدِ جدید کا نیا "تہافت الفلاسفۃ" تصنیف کر سکیں اور
اسی مقصد سے آپ نے دار العلوم کے نصابِ تعلیم میں جدید علمِ کلام کی بعض کتب کا اضافہ فرمایا تھا۔

حضرت والد صاحب فرمایا کرتے تھے کہ بزرگانِ دیوبند نے اپنی زیادہ تر توجہ تفسیر، حدیث اور
فقہ جیسے ٹھیٹھ دینی علوم کی طرف رکھی ہے کیونکہ یہی علوم مقصود بالذات ہیں اور انہی سے دُنیا و
آخرت سے متعلق حقیقی عملی رہنمائی حاصل ہوتی ہے، معقولات کا چونکہ یہ مقام نہیں ہے، اس لیے اس
کو خصوصی توجہ کا مرکز نہیں بنایا، اس طرزِ عمل کی بناء پر ہندوستان کے بعض وہ علمی حلقے جو معقولات
ہی کی مہارت میں مشہور تھے، مثلاً رامپور وغیرہ، اُن میں یہ غلط فہمی پائی جاتی تھی کہ شاید علماءِ دیوبند
معقولات میں دسترس نہیں رکھتے، حالانکہ واقعہ اس کے بالکل برخلاف تھا، درحقیقت اللہ تعالیٰ نے
ان حضرات کو عقلی علوم میں بھی ملکۂ راسخہ عطا فرمایا تھا اور جب اس کے اظہار کا موقع آیا تو لوگ حیران

رہ جاتے تھے۔

اس سلسلے میں ایک عجیب واقعہ حضرت والد صاحبؒ سے بارہا سنا، فرماتے تھے کہ حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتوی صاحب قدس سرہٗ دارالعلوم دیوبند کے صدر مدرس تھے اور جامع ترمذیؒ کا درس آپ کے سپرد تھا۔ دوسری طرف حضرت مولانا غلام رسول صاحب ہزارویؒ معقولات کے اُستاذ تھے اور صدرا، شمس بازغہ جیسے فلسفے کے اسباق وہ پڑھایا کرتے تھے، ایک مرتبہ تقسیم اسباق کے وقت حضرت مولانا غلام رسول صاحبؒ نے فرمایا کہ میں سالہا سال سے منطق فلسفہ پڑھا رہا ہوں اور کبھی خیال ہوتا ہے کہ اس گندگی کو پڑھانے کے لیے میں ہی رہ گیا ہوں، اب اس سال میں معقولات کے بجائے حدیث کا کوئی سبق پڑھاؤں گا، حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی قدس سرہٗ نے یہ سُنا تو فرمایا: "ٹھیک ہے، پھر آپ حدیث پڑھائیں، میں اس سال فلسفہ پڑھاؤں گا"۔ چنانچہ اس تجویز کے مطابق جامع ترمذیؒ حضرت مولانا غلام رسول صاحبؒ کے سپرد ہوگئی اور صدرا حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ کے پاس آگیا۔

اب ہُوا یہ کہ حضرت مولانا غلام رسول صاحبؒ نے ترمذی کا درس شروع کیا تو اس شان سے کہ اس میں ایک ایک لفظ اور ایک ایک راوی کی تحقیق میں کئی کئی دن لگا دیے اور درس کی رفتار بہت سُست ہوگئی اور دوسری طرف حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی قدس سرہٗ نے صدرا کا درس شروع کیا تو اس طرح کہ طالب علم جب کتاب کی عبارت پڑھ کر فارغ ہوتا تو مولانا ضبط پر قادر نہ ہوتے اور قبل اس کے کہ طلبا اس کا مطلب سمجھ سکیں، حضرت نانوتویؒ فرماتے کہ "یہ جو کچھ لکھا ہے سب بکواس ہے"۔ اور اس کے بعد فلاسفہ کے اُن نظریات کی تردید کرتے ہوئے عقلی دلائل کے انبار لگا دیتے نتیجہ یہ ہُوا کہ مولانا کا درس طلبا کی دسترس سے کہیں باہر ہوگیا اور آخر کار منتظمین بھی اس فیصلے پر مجبور ہُوئے کہ "ہر کسے را بہر کارے ساختند" پر عمل کرنے کے سوا چارۂ کار نہیں۔

فلسفہ اور عقلیات کی حقیقت اور اس کے "پائے چوبیں" کی ناپائیداری حضرت والد صاحبؒ پر روزِ روشن کی طرح واضح تھی لیکن جب کبھی آپ کے سامنے یہ تجویز پیش ہوتی کہ معقولات کو درسِ نظامی سے نکال دیا جائے تو حضرت والد صاحبؒ اس کی سخت مخالفت فرماتے تھے اور اس کی وجہ یہ تھی کہ تفسیر، حدیث، فقہ، اصولِ فقہ اور عقائد پر لکھی ہوئی متقدمین کی کتابیں معقولات کی اصطلاحوں سے

بھری ہوئی ہیں، اور اگر قدیم منطق وفلسفہ کو بالکل دیس نکالا دے دیا جائے تو اسلاف کی ان کتابوں سے خاطر خواہ استفادے کی راہ مسدود ہو جاتی ہے جو ہمارا گرانقدر علمی سرمایہ ہیں۔ اس کے علاوہ منطق وفلسفہ کی تعلیم سے ذہن وفکر کو جلا ملتی ہے اور ذہن مسائل کو مرتب طریقے سے سوچنے کا عادی بن جاتا ہے، اور اس طرح یہ علوم تفسیر وحدیث، فقہ اور اصولِ فقہ کے مسائل کو سمجھنے میں معاون ہوتے ہیں حضرت والد صاحبؒ فرمایا کرتے تھے کہ اگر ان علوم کی اصل حقیقت کو ذہن نشین کر کے کوئی شخص اس نیت سے ان علوم کو پڑھے پڑھائے کہ ان سے دینی علوم کی تحصیل میں مدد ملے گی تو ان علوم کی تحصیل بھی عبادت بن جائے گی اور درسِ نظامی کے مرتبین نے اسی وجہ سے ان کو داخلِ درس کیا تھا اور حضرت شیخ الہندؒ فرمایا کرتے تھے کہ اگر نیت بخیر ہو تو ہمارے نزدیک بخاری پڑھانے والے اور قطبی پڑھانے والے میں کوئی فرق نہیں، دونوں اپنی اپنی جگہ خدمت انجام دے رہے ہیں اور دونوں کی خدمت موجبِ اجر و ثواب ہے۔

یُوں تو معقولات کے بارے میں حضرت والد صاحبؒ سے بہت سی باتیں سُنی ہوں گی لیکن ان میں سے چند جو اس وقت یاد آگئیں، پیشِ خدمت ہیں:

(۱) فرمایا کہ حضرت شاہ صاحبؒ (حضرت علامہ انور شاہ صاحب کشمیریؒ) فرمایا کرتے تھے کہ مُلا حسنؒ کو منطق میں "یدِطولیٰ" حاصل تھا یعنی بعض اوقات دُور کی باتوں تک تو ان کی رسائی ہوجاتی تھی لیکن قریب کی باتیں گرفت میں نہیں آتی تھیں۔

(۲) فرمایا کہ وحی الٰہی کی رہنمائی کے بغیر جب انسان نری عقل کی بُنیاد پر ہر مسئلے کا حل تلاش کرنے کی کوشش کرتا ہے تو بسا اوقات حیرانی وسرگردانی کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آتا، اور بعض بالکل بدیہی باتیں بھی نظری بن جاتی ہیں مثلاً یہ سوال کہ مُرغی پہلے پیدا ہوئی یا انڈا؟ اگر اس کو خالص عقل اور فلسفے کی بنیاد پر حل کرنا چاہیں تو اس کا شافی جواب ملنا ناممکن ہے لیکن جو شخص اللہ تعالیٰ کی قدرت اور صفتِ تخلیق پر ایمان رکھتا ہو اس کے لیے یہ بالکل بدیہی مسئلہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پہلے اپنی قدرت سے انڈے کے واسطے کے بغیر مرغی پیدا فرمادی، اس کے بعد انڈا پیدا ہُوا۔

(۳) فرمایا کہ فلاسفہ نے بہت سی چیزوں کو جولازمِ ذات یا لازمِ ماہیت قرار دیا ہے۔ یہ واقعے کے بالکل خلاف ہے حقیقت میں مخلوقات کی کوئی صفت لازمِ ذات ہوتی ہے نہ لازمِ ماہیت،

اور جس چیز کو فلاسفہ لازم ذات یا لازم ماہیت قرار دیتے ہیں وہ درحقیقت اس ذات یا ماہیت کی وہ صفات عارضہ ہوتی ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ اُس ذات یا اس ماہیت کے ساتھ اکثر پیدا فرماتے ہیں، ان کے وجود و عدم میں نہ اس ذات یا ماہیت کا کوئی دخل ہوتا ہے اور نہ وہ اس کے لیے ایسی لازم ہوتی ہیں کہ ان کا انفکاک اس ذات یا ماہیت سے ممکن نہ ہو چنانچہ یہ کہنا تو درست ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آگ میں احراق کی خاصیت پیدا فرما دی ہے لیکن احراق کو آگ کا لازم ماہیت قرار دینا درست نہیں، چنانچہ اگر کسی آگ میں اللہ تعالیٰ احراق کی تخلیق نہ فرمائیں تو آگ کا بغیر احراق کے پایا جانا ممکن ہے جیسا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے واقعے میں ہُوا، اگر یہ بات ذہن میں رہے تو معجزات میں جو عقلی استبعاد نظر آتا ہے وہ ہمیشہ کے لیے دُور ہو جائے۔

یہ بات احقر نے حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے مختلف عنوانات اور مختلف اسالیب کے ساتھ اتنی مرتبہ سُنی کہ دل پر نقش ہو گئی۔ اس کے بعد ایک مرتبہ میں عہد حاضر کے معروف مفکر سر جیمس جینز کی ایک کتاب پڑھ رہا تھا، اس میں اس نے اسی نظریے کو بڑے شرح و بسط کے ساتھ ثابت کیا ہے اور لکھا ہے کہ آئن سٹائن کے نظریۂ اضافت کے بعد سے کائنات کی میکانکی تعبیر اور نیچر کے نظریات قطعی طور پر غلط ثابت ہو گئے ہیں اور جدید تحقیقات کی رُو سے اشیاء کی ایسی خاصیت کا کوئی وجود نہیں ہے جسے اس کا لازم ذات یا لازم ماہیت کہا جا سکے۔

فقہ

علوم متداولہ میں جس علم سے حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو سب سے زیادہ شغف رہا اور جس میں اللہ تعالیٰ نے اُن سے دین کی عظیم خدمت لی، وہ علم فقہ ہے۔ چنانچہ آپ کی یہی حیثیت دنیا میں زیادہ معروف بھی ہوئی، اور اسی بنا پر آپ کا لقب "مفتی اعظم" زبان زد عام ہو گیا۔ میں نے کئی بار تحقیق کرنی چاہی کہ سب سے پہلے کن صاحب نے حضرت والد صاحبؒ کے لیے "مفتی اعظم" کا لقب استعمال کیا تھا۔ لیکن مجھے یہ معلوم نہیں ہو سکا۔ البتہ اتنا یاد ہے کہ جب سے میں اُردو تحریر پڑھنے کے قابل ہوا اُس وقت سے حضرت والد صاحبؒ کے نام آنے والے خطوط میں والد صاحبؒ کے اسم گرامی کے ساتھ "مفتی اعظم پاکستان" نے

الفاظ دیکھنے میں آتے ہیں۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ کسی لقب یا خطاب کے منجانب اللہ ہونے کی علامت غالباً یہی ہوتی ہے کہ وہ لوگوں کی زبان پر اس طرح چڑھ جاتا ہے کہ یہ پتہ نہیں چلتا کہ اس کی ابتدائی تجویز کس نے کی؟ حضرت والد صاحبؒ کو میں نے دیکھا کہ انہوں نے اپنے بے تکلف لوگوں کو یہ الفاظ لکھنے سے بعض اوقات منع کیا، لیکن اس کے باوجود یہ لقب پھیلتا ہی چلا گیا۔

یوں تو دارالعلوم دیوبند میں حضرت والد صاحبؒ نے فقہ کی متعدد کتابیں بار بار پڑھائیں لیکن فقہ کے ساتھ خصوصی مناسبت اور اس سے غیر معمولی شغف اُس وقت پیدا ہوا جب فتویٰ کی خدمت آپ کے سپرد ہوئی۔ حضرت والد صاحبؒ فرمایا کرتے تھے کہ فتویٰ کے کام کا ابتداءً مجھ پر بہت بوجھ تھا، اور ہر وقت یہ ڈر لگا رہتا تھا کہ کہیں کوئی غلطی نہ ہو جائے، اس لیے شروع شروع میں جب مجھے کسی سوال کا جواب لکھنا ہوتا تو خواہ سوال کتنا واضح کیوں نہ ہو جب تک میں اُسے کئی کئی کتابوں میں دیکھ کر اطمینان نہ کر لیتا، اُس وقت تک چین نہ آتا۔ میں محض یادداشت کے بھروسے پر یا صرف اصول و قواعد کی روشنی میں جواب لکھنے سے حتی الوسع گریز کرتا تھا اور جب تک کسی فقہ کی کتاب میں کوئی صریح جزئیہ نہ مل جاتے، جواب نہ لکھتا تھا اس وجہ سے بعض اوقات ایک ایک مسئلے کے جواب کے لیے مجھے دس دس کتابوں کے متعلقہ حصوں کو بہ نظر غائر دیکھنے کی نوبت آجاتی تھی اور اس کا فائدہ یہ ہوتا تھا کہ ایک مسئلے کی تلاش میں دسیوں دوسرے مسائل نظر سے گزر جاتے تھے۔

یہ تو عام قسم کے فتاویٰ کا حال تھا اور جن فتاویٰ میں کوئی خاص تحقیق پیش نظر ہوتی اُن میں تو متعلقہ موضوع سے متعلق جتنی کتابیں میسر ہوتیں، والد صاحبؒ ان سب کی مراجعت فرماتے، اور بہت سی وہ کتابیں بھی دیکھتے جو اگرچہ متعلقہ موضوع پر نہ ہوتیں لیکن اُن میں زیر بحث مسئلے کے کسی پہلو کے ملنے کا امکان ہوتا۔ اس طرح ایک ایک مسئلے کی تحقیق پر بڑے مفصل رسالے تیار ہو گئے جن میں سے ایک بڑا حصہ تو شائع ہو چکا ہے اور باقی دارالعلوم دیوبند کے فتاویٰ کے رجسٹروں میں محفوظ ہیں۔

مجھ جیسے بے علم شخص کے لیے حضرت والد صاحبؒ کے فقہی کارناموں اور فتویٰ کی

خصوصیات پر لب کشائی کرنا چھوٹا منہ بڑی بات کا مصداق معلوم ہوتا ہے۔ اور البلاغ کے اسی نمبر میں دوسرے ایسے اہلِ علم نے اس موضوع پر مضامین لکھے ہیں جو اس کے واقعی اہل ہیں۔ لیکن طالب علمانہ حیثیت سے جو چند باتیں اپنی بساط کے مطابق میں سمجھ سکا ہوں انہیں یہاں ذکر کرنا چاہتا ہوں:۔

(۱) حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے افتاء کا منصب ایک ایسے زمانے میں سنبھالا جو فتویٰ کی ذمہ داری محسوس کرنے والے کسی بھی شخص کے لیے انتہائی نازک، مشکل اور محنت طلب دَور تھا۔ یہ ٹھیک وہ زمانہ ہے جب کہ مغرب کے سیاسی اور فکری غلبے کے زیرِ اثر دنیا بھر کے اندازِ زندگی میں انقلابی تبدیلیاں آ رہی تھیں، نت نئی ایجادات کا ایک سیلاب پھوٹ رہا تھا۔ تجارت و معیشت میں نئے نئے معاملات وجود میں آ رہے تھے۔ طرزِ معاشرت اور رہن سہن کے طریقوں میں انقلاب آ رہا تھا، اور ان تمام تبدیلیوں کے نتیجے میں ہر صبح ایک ایسا نیا فقہی مسئلہ لے کر نمودار ہوتی تھی جس کا صریح جواب فقہ کی قدیم کتابوں میں ملنا مشکل تھا، اور فتویٰ کے کام کے لیے والد صاحبؒ کو دارالعلوم دیوبند کی اس مرکزی مسند کی ذمہ داری سپرد ہوئی تھی جو نہ صرف ہندوستان، بلکہ پوری دنیائے اسلام میں فتویٰ کا سب سے بڑا مرجع سمجھی جاتی تھی، اس لیے فقہی اعتبار سے اٹھنے والا کوئی سوال اور اہلِ علم و دانش کے درمیان پیش آنے والا کوئی مباحثہ ایسا نہیں تھا جو قولِ فیصل یا محاکمے کے لیے وہاں نہ بھیجا جاتا ہو۔

پھر آج تو ہر مفتی کے سامنے رہنمائی کے لیے ماضیٔ قریب کے اکابر کے لکھے ہوئے ضخیم فتاویٰ موجود ہیں، لیکن جس زمانے میں حضرت والد صاحبؒ کو یہ خدمت سونپی گئی ہے اُس وقت ان فتاویٰ کے مجموعوں میں سے کوئی موجود نہ تھا، اس لیے جو کچھ لکھنا تھا، براہِ راست اصلی مآخذ سے مستنبط کر کے لکھنا تھا اور خود اپنی ذمہ داری پر لکھنا تھا۔ غرض ایک طرف نت نئے مسائل کا انبار تھا، اور دوسری طرف ایسے مآخذ مفقود تھے جن سے عہدِ حاضر کے مسائل کا کوئی صریح جواب مل سکتا ہو۔

اس پر مستزاد یہ کہ اگر حکومت اسلامی ہو، مسلمان غیر ملکی تسلط سے آزاد ہوں، اور

اسلامی علوم اور اسلامی تہذیب اپنے فطری ارتقاء کی منازل طے کر رہی ہو، تو نئے پیدا ہونے والے مسائل کا حل آسان ہوتا ہے۔ مثلاً یہ کہ ایک عادل اسلامی حکومت کو شریعت نے مباحات کے دائرے میں بڑے وسیع اختیارات دیئے ہیں، اور حکومت ان اختیارات کو کام میں لاکر بہت سے مسائل حل کر سکتی ہے، اس کے علاوہ اگر اسلامی علوم کو حکومت کی سرپرستی حاصل ہو تو ایک محقق کو حکومت کی طرف سے بہت سے وسائل فراوانی کے ساتھ میسر آجاتے ہیں۔ لیکن جس دور میں حضرت والد صاحب نے فتویٰ کی ذمہ داری سنبھالی ہے وہ انگریزی استعمار کا تاریک دور تھا۔ اسلام اور مسلمانوں کے وجود و بقا کے بارے میں حکومت کی نیت خراب تھی، اور ایک مفتی کو قدم قدم پر اس بات کا خیال رکھنا پڑتا تھا کہ اس کا کوئی فتویٰ غلط استعمال نہ ہو سکے۔ اُدھر یہ ایک فطری بات ہے کہ ایک ایسی مغربی طاقت کے زیر نگیں رہتے ہوئے جو اپنا ایک مخصوص فکری نظام رکھتی تھی، اگر اجتہاد کا دروازہ کھول دیا جاتا تو یقیناً مسلمانوں کے اجتہادات اپنی حقیقی ضروریات کو پورا کرنے کے بجائے اُس مغربی طاقت کی مرعوبیت اور اس کی تقلید کے آئینہ دار ہوتے، جس سے اسلام کی شکل وصورت ہی مسخ ہو جاتی۔ چنانچہ جن لوگوں نے اس دور میں تجدد اور اجتہاد کا پرچم اُٹھایا اُن کے "اجتہادات" میں یہ فکری مرعوبیت ناقابل انکار طریقے پر نمایاں ہے اور شاید اقبال مرحوم نے اسی حقیقت کی طرف ان الفاظ میں اشارہ کیا ہے کہ ؎

لیکن مجھے ڈر ہے کہ یہ آوازۂ تجدید
مشرق میں ہے تقلیدِ فرنگی کا بہانہ

لہٰذا اس وقت فتویٰ کے معاملے میں ذراسی ڈھیل مسلمانوں کے لیے گوناگوں فتنے کھڑی کر سکتی تھی، اور اسلام کی ٹھیک ٹھیک حفاظت اس کے بغیر ممکن نہ تھی کہ علماء دین کے معاملے میں نہ صرف کامل تصلّب، بلکہ تقلیدِ اسلاف میں کسی قدر جمود کا مظاہرہ کریں۔ کیونکہ اسلام کا حلیہ بگاڑنے کے لیے تجدد کی جو تحریکیں ساری دنیائے اسلام میں سر اُٹھا رہی تھیں، اُن کو اگر علماء کی طرف سے ذرا چھوٹ ملتی تو آج دین اپنی صحیح شکل وصورت میں محفوظ نہ رہتا۔

ان تمام وجوہ کی بنا پر علماء نے عین حکمت کے تقاضے سے حتی الامکان تقلیدِ شخصی

ی بالکل لفظ بہ لفظ پابندی ہی میں عافیت سمجھی اور حضراتِ اہلِ فتویٰ نے وہ اختیارات بھی کم سے کم استعمال کیے جو اجتہاد فی المسائل کے دائرے میں ایک متبحر مفتی کو حاصل ہو سکتے ہیں۔

ایسے اوقات میں ایک مفتی کا فریضہ انتہائی نازک ہو جاتا ہے۔ ایک طرف اُسے مسلمانوں کی اجتماعی مصلحتوں کا بھی خیال ہوتا ہے۔ دوسری طرف یہ بات بھی مدِنظر رکھنی پڑتی ہے کہ مسلمانوں پر کوئی ناقابلِ برداشت تنگی پیش نہ آئے اور تیسری طرف اس کا بھی خیال رکھنا ہوتا ہے کہ اُس آزاد طرزِ فکر کو سہارا نہ ملے جو اجتہاد کے نام پر دین کی ایک ایک چُول ہلانے کی فکر میں ہے۔ ایسے دَور میں خدا کا خوف رکھنے والے مفتی کو ان تینوں باتوں کی رعایت کے ساتھ ایک انتہائی باریک پُل صراط پر چل کر نئے مسائل کا جواب دینا پڑتا ہے اور احقر کی ناقص سمجھ میں حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے یہ نازک فریضہ اللہ کی توفیق سے جس حسن و خوبی کے ساتھ انجام دیا ہے وہ آپ کی زندگی کا سب سے بڑا کارنامہ ہے۔

فقہی تصانیف

(۲) یوں تو حضرت والد صاحبؒ کے لکھے ہوئے فتاویٰ کی تعداد تقریباً ڈیڑھ لاکھ ہے جن میں ہر طرح کے سوالات کے جواب موجود ہیں، لیکن خاص طور سے عہدِ حاضر کے نئے فقہی مسائل پر آپ نے جو مستقل فتاویٰ یا رسائل تحریر فرمائے ان کی فہرست سے اندازہ ہوگا کہ اس پہلو سے حضرت والد صاحبؒ کا کام کتنا وسیع، ہمہ گیر، ٹھوس اور مثبت ہے، ایمان اور طہارت سے لے کر میراث تک تقریباً ہر باب میں نئے مسائل پر آپ کے مستقل رسائل یا فتاویٰ موجود ہیں، احقر کے شمار کے مطابق ان کی تعداد اکیانوے ہے اور ان کی فہرست حضرت مولانا مفتی محمد رفیع صاحب عثمانی اور حضرت مولانا محمد اشرف صاحب کے مضامین میں آگئی ہے۔

یہ وہ فقہی رسائل ہیں جو فتاویٰ دار العلوم، جواہر الفقہ، آلاتِ جدیدہ یا احکام القرآن میں یا علیحدہ کتابی شکل میں شائع ہو چکے ہیں۔ اور جو بہت سے رسائل دار العلوم دیوبند کے فتاویٰ کے رجسٹروں میں رہ گئے اور نقل یا شائع نہ ہو سکے۔ وہ ان کے علاوہ ہیں۔ ان میں سے بعض رسائل صرف چند صفحوں کے بھی ہیں اور بعض سینکڑوں صفحات پر مشتمل ہیں۔ اس اجمالی فہرست ہی پر اگر ایک سرسری نظر ڈال لی جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت والد صاحب

قدس سرہٗ سے خاص طور پر فقہ و فتویٰ کے باب میں اس دَور کا کتنا عظیم الشان کام لیا ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ حکیم الامت حضرت تھانوی قدس سرہٗ کے بعد اتنی متنوع اور کثیر فقہی تصانیف میں کوئی اُن کا ہمسر نظر نہیں آتا۔ ان رسائل کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ عوام سے زیادہ اہلِ علم کی رہنمائی کرتی ہیں، اور ان کا فائدہ صرف اتنا ہی نہیں ہے کہ جس موضوع پر وہ لکھے ہیں اُس میں شریعت کا حکم اپنے دلائل کے ساتھ واضح ہو جاتے، بلکہ ان کے مطالعے سے نت نئے مسائل کا جواب تلاش کرنے کے لیے مستقل اصولِ استدلال و استنباط معلوم ہوتے ہیں جن کی روشنی میں اس دَور کے مفتی کے لیے بہترین راہِ عمل سامنے آجاتی ہے۔

(۳) یوں تو آپ کے فتاویٰ کے مجموعے، فتاویٰ دارالعلوم دیوبند ہیں، اور خاص طور پر مذکورہ بالا فقہی رسائل میں سے ہر ایک میں، اہلِ علم کے لیے ساری باتیں کار آمد ہی ہیں لیکن آپ کی بعض تصانیف ایسی ہیں جن سے جب کبھی استفادے کی نوبت آتی ہے تو مجھے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنے کے لیے کوئی اسلوب کافی معلوم نہیں ہوتا کہ اللہ تعالیٰ نے ان مسائل کی تحقیق حضرت والد صاحب قدس سرہٗ کے ذریعے قلمبند اور شائع کرا دی، ورنہ اگر آپ وہ کام کر کے نہ جاتے تو بظاہر آج کسی کے بس میں نہ تھا کہ ان مسائل پر تحقیق کا وہ حق ادا کرتا، اور اس اطمینان بخش طریقے پر ان مسائل کا حل تلاش کرتا۔ اور جب میں یہ تصور کرتا ہوں کہ ان مسائل کی تحقیق میں حضرت والد صاحبؒ نے کتنی اولوالعزمی اور استقامت کے ساتھ کتنی محنتِ شاقہ برداشت کی ہے تو عقل حیران رہ جاتی ہے۔ یہاں میں دو مثالیں پیش کرنا مناسب سمجھتا ہوں:۔

یہ سوال عرصے سے اہلِ علم کے درمیان زیرِ بحث تھا کہ برِ صغیر کی اراضی کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ یعنی اُن پر جو مالکان صدیوں سے متصرف چلے آ رہے ہیں۔ اُن کا قبضہ شرعاً مالکانہ ہے یا نہیں؟ کیونکہ بہت سی زمینوں میں ایسا ہوا ہے کہ وہ حکومت کی ملکیت تھیں، اور جاگیرداروں کو حکومت کی طرف سے صرف لگان وصول کرنے کا اختیار دیا گیا تھا۔ لیکن طوائف الملوکی کے زمانے میں یہ زمیندار خود مالک بن بیٹھے اور ان جاگیروں پر مالکانہ تصرف شروع کر دیا، شرعاً زمینیں اس طرح اُن کی ملکیت میں داخل نہیں ہوتیں، لیکن یہ معاملہ

تمام زمینوں کا نہیں تھا، بلکہ بہت سے زمیندار واقعۃً مالک بھی تھے، اس لیے مسئلہ یہ تھا کہ ان زمینداروں کو مالک سمجھا جائے یا نہیں؟ اس کے علاوہ اگر زمینیں واقعۃً کسی کی ملکیت میں ہوں تو یہ سوال تھا کہ وہ زمینیں عشری ہیں یا خراجی؟ ان تمام مسائل کی تحقیق اس بات پر موقوف تھی کہ ہندوستان کے مختلف خطّے جس وقت مسلمانوں کے ہاتھوں فتح ہوئے، اُس وقت مسلمان حکّام نے اُن کی زمینوں کے ساتھ کیا معاملہ کیا؟ اور بعد میں اُن کے ساتھ معاملے میں کوئی تبدیلی ہوئی یا نہیں؟ یہ تحقیق اس لیے انتہائی پیچیدہ اور دشوار تھی کہ محمد بن قاسمؒ کے وقت سے لے کر عہدِ حاضر تک برِّصغیر پر سینکڑوں انقلابات آتے رہے، اور یہ سارا خطّہ کسی ایک وقت میں کسی ایک فاتح کے ہاتھوں فتح نہیں ہوا، بلکہ کوئی حصّہ کسی نے فتح کیا ہے اور کوئی کسی نے، اب ان تمام خطّوں کے بارے میں یہ معلوم کرنا کہ ابتداءً وہ کب فتح ہوئے تھے؟ اور اُن کے فاتحین نے زمینوں کے مالکان سے کیا معاملہ کیا تھا؟ وہ اپنی ملکیت پر برقرار رکھے گئے تھے؟ یا ان کی اراضی بیت المال میں داخل کرلی گئی تھیں؟ انہیں مجاہدین کے درمیان تقسیم کیا گیا تھا یا نہیں؟ ایک ایسی مشکل تحقیق ہے کہ اس کے تصور ہی سے پتہ پانی ہوتا ہے۔

لیکن حضرت والد صاحب قدس سرہٗ نے اپنی کتاب "اسلام کا نظامِ اراضی" میں ان سنگلاخ مباحث کو نہ صرف چھیڑا ہے، بلکہ ان کی تحقیق کا حق ادا کردیا ہے۔ اس غرض کے لیے آپ نے ہندوستان کی فتوحات کی تاریخ کا باستیعاب مطالعہ کیا، اور اس مطالعے کے نتائج کو "فتوح الہند" نامی کتاب میں سمیٹ کر اُسے "اسلام کا نظامِ اراضی" کا جزء بنادیا۔ اُس کے بعد مختلف نادر و نایاب دستاویزات کے ذریعہ اس بات کی تحقیق فرمائی کہ کون سے فاتح نے اراضی کے ساتھ کیا معاملہ کیا؟ اور اگر کسی کو جاگیر دی تو وہ کس قسم کی دی؟ پھر اراضی کی ملکیت اور ان کے عشری یا خراجی ہونے کی تحقیق کے لیے فقہ اور حدیث کی تمام متعلقہ کتب کو کھنگالا، اور انتہائی دیدہ ریزی اور ژرف نگاہی سے اُن فقہی اصولوں کو ہندوستان کے حالات پر منطبق کیا۔ یہ تمام محنت آپ قیامِ پاکستان سے پہلے اُٹھا چکے تھے، لیکن ابھی کتاب شائع نہیں ہوئی تھی کہ ہندوستان کی تقسیم عمل میں آگئی، اور دو مستقل ملکوں کے قیام اور تبادلۂ آبادی نے اراضی کی صورتِ حال میں انقلاب پیدا کردیا۔ متروکہ اراضی پر نئے مالکوں کے قبضے اور دونوں ملکوں کے درمیان

جائیدادوں کے سلسلے میں نئے نئے معاہدے عمل میں آئے، اور ان معاہدوں کی روشنی میں ان اراضی کی شرعی حیثیت کا از سرِ نو جائزہ لینا ضروری ہوگیا، چنانچہ آپ نے قیامِ پاکستان کے بعد اس کتاب میں مزید دو ابواب کا اضافہ فرماکر ان دقیق اور پیچیدہ مسائل کو از سرِ نو حل فرمایا، اور ان سنگلاخ مسائل کو پوری طرح منقح فرماکر اس طرح اس کتاب میں جمع کردیا کہ آنے والے مفتیوں کو ان مسائل میں تحقیق و کاوش کی ضرورت نہیں رہی، لیکن آنے والوں کے واسطے علم و تحقیق کا یہ مغز نکال کر رکھنے کے لیے حضرت والد صاحب قدس سرہٗ نے کس قدر محنت برداشت کی، کتنی راتوں کو جاگے، کتنی کتابوں کی ورق گردانی کی، اور کن کن مراحل سے گزرے، اس کا اندازہ ہر ایک کو نہیں ہو سکتا۔

اسی طرح "اوزانِ شرعیہ" کہنے کو تو چھوٹا سا رسالہ ہے جو کُل ۳۲ صفحات پر مشتمل ہے، لیکن ان بتیس صفحات نے عہدِ حاضر کے اہلِ علم، اور خاص طور پر اہلِ فتویٰ کے لیے جو سہولت میسر کردی ہے وہ بسا اوقات ضخیم تصانیف سے بھی حاصل نہیں ہوتی۔ اس رسالے کا موضوع یہ ہے کہ شریعت میں بہت سے احکام کا مدار خاص اوزان اور پیمانوں پر ہے، لیکن عہدِ صحابہؓ میں اور اس کے بعد فقہاء کے زمانے میں جو اوزان اور پیمانے صاع، مد، اوقیہ، رطل وغیرہ کے نام سے رائج تھے، وہ آج کے پیمانوں سے یکسر مختلف تھے۔ ان پیمانوں کا موجودہ دور کے اوزان سے مقابلہ کرکے یہ بتانا ضروری تھا کہ صاع کتنے سیر کا ہوتا ہے اور موجودہ دور میں، یا اوقیہ یا مثقال کا وزن کیا ہوگا؟ اگرچہ اس سے پہلے بھی ہندوستان کے متعدد فقہاء نے اس بارے میں اپنی اپنی تحقیقات مرتب فرمائی تھیں، لیکن ان تحقیقات میں اختلاف چلا آتا تھا، خاص طور پر فرنگی محل کے علماء کی رائے دوسرے اہلِ علم سے مختلف تھی، اور اس کی بنیاد حضرت مولانا عبدالحی صاحب لکھنوی قدس سرہٗ جیسے وسیع النظر عالم کے فتاویٰ پر تھی۔ اب اس اختلاف پر محاکمہ بڑا پیچیدہ اور مشکل کام تھا۔ حضرت والد صاحب قدس سرہٗ نے اس مشکل کو حل کرنے کے لیے انتہائی محنت اُٹھائی، ایک ایک پیمانے کا خود وزن کیا۔ فقہاء نے درہم وغیرہ کا وزن جَو کے دانوں سے مقرر کیا ہے، اور اس کی خاص صفات تحریر کی ہیں، ان خاص صفات کے دانوں کو تلاش کرکے ان کا موجودہ اوزان کے ذریعہ وزن کیا۔ اس کے لیے خود جنگل جا جاکر اصلی رتیاں

توڑیں، اور ان سے حساب لگایا، یہاں تک کہ اختلاف کا اصل منشا پالیا جو حضرتؒ ہی کے الفاظ میں یہ ہے :

"اب اس پر حیرت ہوئی کہ مولانا عبدالحی صاحب جیسے محقق اور ماہر عالم کے حساب میں اتنا عظیم الشان فرق کیسے آیا؟ سو غور کرنے سے خیال آیا کہ شاید موصوف نے صرف چار جَو اور ایک رتی کا باہم وزن فرمایا ہے اُس میں تفاوت نامعلوم ہونے کی بنا پر محسوس نہ ہوا۔ پھر اُسی پر ستّر اور سَو جو کا حساب لگا کر درہم و مثقال کے وزن قائم فرما دیے۔ ستّر جَو اور سَو جو کو مجموعی طور پر وزن نہیں فرمایا، ورنہ یہ مغالطہ ہرگز نہ رہتا، چنانچہ اس خیال کے امتحان کے لیے چار جو اور ایک رتی کا وزن کیا تو اس خیال کی پوری تصدیق ہوگئی.... الخ

(اوزانِ شرعیہ ص ۸)

غرض اس مختصر رسالے کی تالیف میں آپ نے فقہ، طب اور لغت کی نادر و نایاب کتب سے بھی مدد لی اور ہر ایک وزن اور پیمانے کا بذاتِ خود عملی تجربہ بھی کیا، اور تحقیق و تدقیق کا یہ بار خود برداشت کر کے آنے والوں کے لیے مسئلہ بالکل واضح کر گئے، اب جہاں کوئی پُرانا وزن یا پیمانہ نظر پڑے، اس کا محقق ہندوستانی وزن اس رسالے سے معلوم ہو جاتا ہے۔ عام لوگوں کو تو اس تالیف کی قدر ہو ہی نہیں سکتی، لیکن اہلِ علم نے اس کی قدر پہچانی ہے۔ شیخ الاسلام حضرت علامہ شبیر احمد صاحب عثمانی قدس سرہٗ نے اس کا مطالعہ کر کے تحریر فرمایا :

"اس قدر تحقیق و کاوش آپ ہی کا حصہ تھا، حق تعالیٰ جزائے خیر دے، مجھے اس کے مضمون سے اتفاق ہے۔"

حضرت مولانا عبدالرحمٰن صاحب کیمبلپوری قدس سرہٗ محدث مظاہر العلوم سہارنپور نے لکھا :

"حضرت مؤلف دام مجدہٗ نے تحقیق و تدقیق محنت و تفتیش کے ساتھ اس رسالے کی تصنیف سے مسلمانوں کی شدید ضرورت کو پورا کیا۔"

حضرت علامہ سید سلیمان صاحب ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے تحریر فرمایا۔
"بڑی ضروری تحقیق فرمائی، آپ اجازت دیں تو اس کی تلخیص معارف میں شائع کر دوں، میں خود اس میں بہت متردد تھا، مگر چونکہ حساب سے مجھے فطرۃً لگاؤ نہیں اس لیے کبھی ادھر کبھی اُدھر میلان ہوتا تھا..... اللہ تعالیٰ آپ کو جزاء خیر دے"۔
اور حضرت مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی قدس سرہٗ جیسے بالغ نظر محقق عالم نے لکھا:

"فسررت بها مسرة من رأى هلال العيد ووجدت بها وجد من ادراك الفقيد. فلله دره من محقق قد أتى بما لا يحتمل المزيد من تحقيق انيق ومن مصيب قد وفق لاستخراج الدرر من لجة بحر عميق"۔
مجھے یہ رسالہ پڑھ کر ایسی مسرت ہوئی جیسے ہلال عید دیکھ کر ہوتی ہے اور ایسا لطف آیا۔ جیسے کوئی گمشدہ دولت مل جانے سے آتا ہے۔ قابلِ صد تعریف ہے وہ محقق جس نے ایسی نادر تحقیق کی جس پر اضافہ ممکن نہیں، اور جسے گہرے سمندر کی موجوں سے موتی نکال لانے کی توفیق عطا ہوئی"۔
اور مولانا عبدالماجد دریابادی مرحوم نے صدق جدید لکھنؤ میں لکھا:
"اور حق یہ ہے کہ سعی و کاوش کا حق ادا کر دیا ہے۔ ان کی تحقیق کی تصدیق پر تو حضرت مولانا تھانویؒ اور مولانا شبیر احمد عثمانیؒ جیسے جید علماء کی مُہریں ثبت ہیں، باقی جہاں تک تدقیق و موشگافی کا تعلق ہے اس کا اندازہ تو ہم عامیوں کو بھی ہو سکتا ہے اور اس کی داد دل سے بیساختہ نکلتی ہے۔ رشک کے ساتھ حیرت ہوتی ہے کہ اس دَور میں بھی ایسے ایسے عنوانات پر اس درجہ تحقیق کر ڈالنے والے موجود ہیں"۔
یہ دو مثالیں احقر نے صرف یہ دکھانے کے لیے پیش کی ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت والد صاحب قدس سرہٗ کو اس دَور کی دینی اور خاص طور پر فقہی ضروریات پوری کرنے کے لیے پیدا فرمایا تھا، چنانچہ انہوں نے اپنے اس منصب کا حق ادا کرنے میں کسی سخت سے سخت محنت سے بھی دریغ نہیں فرمایا، اور بہت سے سنگلاخ مسائل میں خود اپنا لہو پانی کر کے دوسروں کے لیے راہِ عمل واضح فرما گئے۔ رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃً واسعۃً!

(۴) احقر نے حضرت والد صاحب قدس سرہٗ سے خود سُنا ہے کہ فقہ کے جو ابواب مجھے جتنے زیادہ مشکل معلوم ہوتے، بیشتر اُن کی تحصیل میں اتنی ہی زیادہ کاوش کی، چنانچہ فرماتے تھے کہ مجھے شروع میں وقف کے مسائل سے زیادہ مناسبت نہیں تھی، اور جب کبھی وقف کا کوئی سوال آتا تو مجھے اس سے گھبراہٹ ہوتی تھی۔ اس کا علاج میں نے اس طرح کیا کہ وقف کے بارے میں جتنی کتابیں مجھے میسر آئیں اُن کا باستیعاب مطالعہ کر لیا، فقہ کی متداول کُتب کے علاوہ امام خصافؒ کی کتاب الوقف اور الاسعاف فی حکم الاوقاف کا بھی مطالعہ کیا، یہاں تک کہ میری عدم مناسبت انشراح میں تبدیل ہو گئی، اور اللہ تعالیٰ نے جن ابواب سے مجھے خصوصی مناسبت عطا فرمائی اُن میں وقف بھی شامل ہے۔ اسی ذیل میں یہ بھی فرمایا کرتے تھے کہ حنفیہ کی کتابوں میں سے جس کتاب نے وقف کے مسائل کو سب سے زیادہ شرح و بسط اور انضباط کے ساتھ بیان کیا ہے وہ "فتاویٰ مہدویہ" ہے۔

آج کل سہولت پسندی کی وجہ سے حال عام طور سے یہ ہو گیا ہے کہ فتویٰ نویسی کے لیے عموماً انہی مسائل کی تحقیق کی جاتی ہے جن کا سوال باقاعدہ آتا ہے، لیکن حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی تحقیق و کاوش صرف انہی مسائل کی حد تک محدود نہ تھی جو آپ سے باقاعدہ پوچھے جاتے، اس کے بجائے آپ کے ذہن میں ہر وقت تحقیق طلب مسائل کی ایک فہرست رہتی تھی، اور جب کبھی موقع ملتا، آپ اُن میں سے کسی کی تحقیق کر لیتے تھے، خواہ اس کے لیے آپ سے سوال نہ پوچھا گیا ہو۔

یہی وجہ ہے کہ آپ کا مطالعہ صرف شامی، عالمگیری یا اسی طرح کی معروف و متداول کتب تک محدود نہیں تھا، بلکہ آپ نے وہ کتابیں باقاعدہ پڑھی تھیں جنہیں آج کل کے اہلِ علم کو چھونے کی بھی نوبت نہیں آتی۔ مثلاً امام سرخسی رحمۃ اللہ علیہ کی "شرح السیر الکبیر" وہ کتاب ہے جو باقاعدہ فقہی ابواب پر مرتب نہیں ہے۔ اس کا اصل موضوع جنگ و صلح، جہاد، غیر مسلموں کے ساتھ تعلقات وغیرہ ہے، لیکن ضمناً اس میں بہت سے اہم مسائل دوسرے ابواب سے متعلق بھی آگئے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت والد صاحبؒ نے اس کا مکمل طور پر یا اس کے بہت بڑے حصہ کا مطالعہ فرمایا تھا، چنانچہ بہت سے بظاہر

غیر متعلق مسائل اُس کے حوالے سے ذکر فرمایا کرتے تھے۔ "شرح السیر الکبیر" کے اس نسخے پر جو آپ کے مطالعے میں تھا، جا بجا آپ کے قلم سے نوٹ لکھے ہوئے ملتے ہیں۔

فقہ و فتویٰ کی عام کتابوں کے علاوہ آپ کو اُن کتب اور رسائل سے بھی شغف تھا جو کسی خاص مسئلے کی تحقیق کے لیے لکھے گئے ہوں، چنانچہ آپ علامہ ابنِ نجیمؒ کے رسائل زینیہ، علامہ شامیؒ کے رسائل ابن عابدین، حضرت مولانا عبدالحی صاحب لکھنویؒ، حضرت علامہ ظہیر احسن نیمویؒ اور دوسرے علماء کے مجموعہ ہائے رسائل بڑی احتیاط کے ساتھ رکھتے اور ان سے فائدہ اٹھاتے تھے، چنانچہ آپ کی فقہ کی الماری میں کئی خانے اسی قسم کے رسائل سے بھرے ہوئے ہیں۔ اور ان پر آپ کے قلم کی لکھی ہوئی یادداشتوں اور نشانات سے پتہ چلتا ہے کہ وہ محض الماری کی زینت ہی نہیں ہیں، بلکہ آپ کے مطالعے میں رہے ہیں۔ گفتگو کے دوران بارہا ایسا ہوتا کہ کسی موضوع پر بات چھڑتی تو آپ فرماتے کہ فلاں عالم نے اس موضوع پر مستقل رسالہ لکھا ہے۔

اس قسم کے رسائل عام طور سے کبھی کبھار چھپتے ہیں، اور ایڈیشن ختم ہونے پر نایاب ہو جاتے ہیں۔ اس لیے حضرت والد صاحب قدس سرہ کو جہاں کہیں اس طرح کا کوئی رسالہ ملتا، آپ اُسے غنیمت سمجھ کر خرید رکھتے تھے، اور اگر خریدنا ممکن نہ ہوتا تو اسے نقل کرانے کا اہتمام کرتے تھے، چنانچہ آپ کے پاس متعدد رسائل ایسے ہیں جنہیں خود آپ نے مصروفیات کے غیر معمولی ہجوم کے باوجود خود اپنے قلم سے نقل فرمایا ہے۔ مثلاً ذی الحجہ ۱۳۴۲ھ میں آپ کا لاہور جانا ہوا، وہاں حضرت مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ کے پاس علامہ قاسم حنفی رحمۃ اللہ علیہ کا رسالہ "ردّ القول الخائب فی القضاء علی الغائب" آپ کی نظر سے گذرا۔ جو اس مسئلے پر لکھا گیا ہے کہ اگر مدعا علیہ غائب ہو تو قاضی کو اس کے خلاف فیصلہ کرنے کا حق ہے یا نہیں؟ یہ رسالہ بمبئی میں چھپا تھا، اور اب اس کے ملنے کا کوئی امکان نہ تھا، چنانچہ آپ نے اُسی سفر میں یہ رسالہ خود اپنے قلم سے نقل فرما لیا جو آپ کی کتابوں میں محفوظ ہے، یہ بڑے پاکیزہ اور خوشنما عربی خط میں لکھا ہوا ہے، اور حیرت اس بات پر ہوتی ہے کہ ۱۳۴۲ھ آپ کی مصروفیات کے شباب کا زمانہ ہے جس میں آپ ملک کی

دینی، سیاسی اور تعلیمی سرگرمیوں میں بھرپور حصہ لے رہے تھے، اور غالباً ایسے ہی کسی کام کے لیے لاہور تشریف لے گئے ہوں گے، ایسی مصروفیات کے عین درمیان ایک ایسے رسالے کو نقل کرنا جو ایک جزوی مسئلے کی تحقیق میں ہے اور جس کی کوئی فوری ضرورت بھی نہیں ہے، ایک ایسا اقدام ہے جو صرف طلب علم کا جذبۂ بیتاب ہی کرا سکتا ہے۔

اسی طرح محرم ۱۳۸۲ھ میں آپ عمرہ کی غرض سے حجاز تشریف لے گئے، وہاں مدینہ منورہ میں کسی عالم کے پاس حضرت علامہ محمد عابد سندھیؒ کا ایک قلمی رسالہ "الکرامتہ والتقبیل" آپ کی نظر سے گزرا جس میں دو مسئلوں کی تحقیق تھی، ایک یہ کہ اولیاء کرامؒ کی کرامات کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ اور دوسرے یہ کہ کسی بزرگ کے ہاتھ پاؤں چومنے کا شرعاً کیا حکم ہے؟ علامہ سندھیؒ کا یہ رسالہ علامہ موسیٰ جار اللہ کے قلم سے لکھا ہوا تھا، چونکہ کہیں اور اس رسالے کے ملنے کا امکان نہ تھا، اس لیے آپ نے وہیں پر خود اسے نقل کرنا شروع فرما دیا، یہاں تک کہ جب اس کے چودہ صفحات نقل فرما چکے تو مدینہ طیبہ کے معروف ترکی عالم شیخ محمود الطرازی مدظلہم نے دیکھ لیا اور پیش کش کی کہ میں کسی اور سے آپ کے لیے نقل کرا دوں گا، چنانچہ باقی رسالہ انہوں نے نقل کروا کے دیا اور حضرت والد صاحبؒ نے اُسے مجلد کرا کر محفوظ فرما دیا۔

علامہ جمال الدین قاسمی رحمۃ اللہ علیہ (صاحب تفسیر القاسمی) کا ایک رسالہ "الفتویٰ فی الاسلام" آپ کی نظر سے گزرا جو فتویٰ کے اصول اور تاریخ پر بہترین رسالہ ہے، اُس وقت خود نقل کرنا ممکن نہ تھا، چنانچہ آپ نے اُسے مولانا مظہر بقا صاحب سے نقل کرایا۔

حضرت مخدوم محمد ہاشم ٹھٹوی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب "حیات القلوب" فارسی زبان میں حج کے مسائل پر بے نظیر کتاب ہے۔ یہ کتاب دار العلوم دیوبند کے کتب خانے میں والد صاحبؒ کی نظر سے گزری تھی، لیکن نایاب ہو چکی تھی۔ اس کا ایک نسخہ مدینہ طیبہ میں امام المناسک حضرت مولانا شیر محمد صاحب سندھیؒ کے پاس تھا جو مدینہ طیبہ میں مقیم تھے، حضرت والد صاحب قدس سرہٗ اس کتاب کو نقل کرنا چاہتے تھے، کتاب خاصی ضخیم تھی، اور فوٹو اسٹیٹ کی موجودہ سہولیات میسر نہ تھیں، آپ نے حضرت مولانا شیر محمد صاحبؒ

ہی سے فرمائش کی کہ نقل کا کوئی انتظام فرما دیں۔ حضرت مولانا شیر محمد صاحبؒ کو اللہ تعالیٰ نے مسائل حج کا امام بنایا تھا، اور انہی مسائل کی نشر و اشاعت کو انہوں نے اپنی زندگی کا مقصد بنایا ہوا تھا، چنانچہ انہوں نے حضرت والد صاحبؒ کی فرمائش کو اس شرط پر قبول فرما لیا کہ آپ اس کی اشاعت کا انتظام فرمائیں۔ یہ والد صاحبؒ کی عین مراد تھی، چنانچہ آپ نے وعدہ کر لیا اور حضرت مولانا شیر محمد صاحبؒ نے خود اپنے قلم سے اس کی نقل ایک بڑے رجسٹر میں کر کے حضرت والد صاحبؒ کے پاس بھیج دی۔ آپ مسلسل اس کی طباعت کی فکر میں رہے، یہاں تک کہ ۱۳۹۱ھ میں بڑی محنت شاقہ اٹھا کر اُسے خود اپنی نگرانی میں شائع کرایا۔

ان چند مثالوں سے یہ بتانا مقصود تھا کہ فقہ و فتویٰ میں حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا مذاق محض وقتی ضروریات اور متداول کتابوں تک محدود نہ تھا، بلکہ علم کی ایک نہ بجھنے والی پیاس تھی جو آپ کو وقتاً فوقتاً گوناگوں مسائل پر غور اور اس کے لیے نادر و نایاب کتب کی تلاش اور مطالعے پر مجبور کرتی رہتی تھی، اور آپ اس بارے میں سخت سے سخت محنت اُٹھانے سے بھی دریغ نہیں فرماتے تھے۔

(۵) فتویٰ کے کام میں یہ صورت حال اکثر پیش آتی ہے کہ انسان کسی ایک مسئلے کی تلاش میں کتابوں کی ورق گردانی کرتا ہے، اور مطلوب مسئلہ ملنے سے پہلے اُس میں بہت سے دوسرے کارآمد مسائل نظر آجاتے ہیں، لیکن چونکہ اُس وقت اُن کی ضرورت نہیں ہوتی، اس لیے ان کی طرف توجہ نہیں ہو پاتی، اور مطلوبہ مسئلے کی تلاش میں انہیں نظر انداز کر کے گزر جاتا ہے۔ بعد میں جب کبھی اُن مسائل کی ضرورت پیش آتی ہے تو یاد آتا ہے کہ یہ مسئلہ کہیں دیکھا تھا، لیکن کیا اور کہاں؟ یہ یاد نہیں آتا۔

حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اس غرض کے لیے ایک ضخیم بیاض بنائی ہوئی تھی، اور اس کو فقہی ابواب پر مرتب کر کے ہر باب کے عنوان کے تحت کئی کئی صفحات سادے چھوڑ دیے تھے، اور طریق کار یہ تھا کہ جب کبھی مطالعے کے دوران کوئی اہم مسئلہ یا علمی تحقیق نظر پڑتی تو اس کا خلاصہ یا کم از کم حوالہ اس بیاض میں متعلقہ باب کے تحت

نوٹ کر لیتے تھے۔ حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ میں ہمیشہ اس کی پابندی تو نہ کر سکا کہ جب بھی کبھی کوئی اہم مسئلہ یا تحقیق کہیں نظر پڑے تو اس کا حوالہ ضرور اس بیاض میں درج کر لیا کروں، لیکن ایک زمانے تک اکثر و بیشتر اس پر عمل کرتا رہا۔ اس طرح آپ کے پاس نادر یادداشتوں اور حوالوں کا بڑا گرانقدر ذخیرہ جمع ہو گیا تھا، اور ضرورت کے وقت اس میں بہت سی کام کی باتیں یا مفید حوالے مل جاتے تھے۔

جب ہم لوگوں نے فراغت کے بعد حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں فتویٰ نویسی کی تربیت لینی شروع کی تو حضرتؒ نے ہمیں بھی یہ نصیحت فرمائی تھی کہ اپنے پاس ایک ایسی بیاض بنا کر رکھیں، چنانچہ ہم نے بھی اس پر عمل کیا، اور باوجودیکہ اس میں اندراجات کا التزام نہ ہو سکا، لیکن جتنا کچھ ہوا اُس کے فوائد محسوس کئے۔

(۷) حضرت والد صاحبؒ فرمایا کرتے تھے کہ فتویٰ کی اہلیت محض فقہی مسائل کو یاد کرنے یا فقہی کتابوں میں استعداد پیدا کر لینے سے حاصل نہیں ہوتی، بلکہ یہ ایک مستقل فن ہے جس کے لیے کسی ماہر مفتی کی صحبت میں رہ کر باقاعدہ تربیت لینے کی ضرورت ہے، اور جب تک کسی نے اس طرح فتویٰ کی تربیت حاصل نہ کی ہو، اُس وقت تک وہ خواہ دسیوں بار ہدایہ وغیرہ کا درس دے چکا ہو، فتویٰ دینے کا اہل نہیں بنتا۔ علامہ ابن عابدین شامی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی لکھا ہے کہ کسی ماہر مفتی سے تربیت لیے بغیر فتویٰ دینا مستند عالم کے لیے بھی جائز نہیں ہے۔ چنانچہ حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے مستقل مفتی بننے سے پہلے حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحب قدس سرہ سے فتویٰ کی تربیت لی تھی، اور آپ کی وفات کے بعد بھی جب فتویٰ کی تمام تر ذمہ داری حضرت والد صاحب پر آگئی تو ایک مدت تک کوئی فتویٰ صرف اپنے دستخط سے روانہ نہیں کیا، بلکہ حضرت مولانا سید اصغر حسین صاحبؒ، شیخ الادب حضرت مولانا اعزاز علی صاحبؒ یا حضرت علامہ سید انور شاہ صاحب کشمیریؒ یا شیخ الاسلام حضرت علامہ شبیر احمد صاحب عثمانی میں سے کسی نہ کسی سے تصدیق و توثیق ضرور کراتے تھے۔

چنانچہ اگر کسی شخص کے بارے میں والد صاحبؒ کو اطلاع ملتی کہ اس نے کسی

شیخ سے تربیت لیے بغیر خود بخود فتویٰ کا کام شروع کر دیا ہے، تو حضرت والد صاحبؒ کو اُن سے فتویٰ کے معاملے میں کبھی مناسبت نہ ہوتی، اور اُن کی طرف سے افراط و تفریط کا ہمیشہ اندیشہ رہتا تھا۔

اس ضمن میں اپنی ایک حماقت یاد آئی۔ حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے پاس جہاں روزانہ ڈاک میں دسیوں استفتاء آیا کرتے تھے۔ وہاں صبح و شام ٹیلی فون پر مسائل معلوم کرنے کا سلسلہ بھی رہتا تھا، اور سوال کرنے والے وقت بے وقت فون کرتے رہتے تھے، مجھے یاد ہے کہ جب ہم لوگ مدرسے میں پڑھتے تھے تو اُس زمانے میں جب کسی مستفتی کا فون آتا تو حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ بذاتِ خود اُس سے بات کرتے تھے، اور اگر کبھی ہم نے فون پر سوال معلوم کر کے حضرتؒ کے سامنے نقل کر دیا تو ہمارے ذریعے جواب دلوانے کے بجائے خود فون لے کر سوال دوبارہ سُنتے اور بذاتِ خود جواب دیتے تھے، مبادا کہ ہم سے سوال سمجھنے میں کوئی غلطی ہو گئی ہو یا جواب نقل کرنے میں کوئی بے احتیاطی ہو جائے۔ اُس کے بعد جب حضرتؒ کو اس بات کا اطمینان ہو گیا کہ ہم سوال کو ٹھیک سمجھ کر صحیح صحیح نقل کر دیتے ہیں، اور جواب میں بھی کوئی تصرف نہیں کرتے تو معمول یہ ہو گیا کہ اگر ہم نے ٹیلیفون اُٹھایا تو سوال معلوم کر کے حضرتؒ سے ذکر کر دیا۔ آپ نے جواب دیا، اور ہم نے اسے فون پر بتا دیا۔ عرصہ دراز تک یہ سلسلہ اسی طرح چلتا رہا، ایک مرتبہ کسی صاحب کا ٹیلی فون آیا اور اُنہوں نے کوئی ایسی بات پوچھی جس کا جواب بالکل واضح تھا۔ میں نے سوچا کہ اس سوال کا جواب بہت آسان ہے اور اس کے لیے حضرت والد صاحبؒ کو زحمت دینے کی ضرورت نہیں، ہو سکتا ہے کہ اس میں اپنی آسانی کو بھی دخل ہو، اور شاید نئے نئے فارغ التحصیل ہونے کی بنا پر علمیت کا گھمنڈ بھی اس کا سبب بنا ہو کہ میں نے حضرت والد صاحبؒ سے پوچھنے کے بجائے خود ہی ان کو جواب دے کر فارغ کر دیا، اور جب والد صاحبؒ نے فون کے بارے میں پوچھا تو میں نے سوال و جواب دونوں نقل کر دیے۔ حضرت والد صاحبؒ نے چند لمحے توقف کے بعد فرمایا: "خیر! جواب تو تم نے ٹھیک

دے دیا، لیکن آئندہ ایسا نہ کرنا" اُس وقت مجھے اپنی حماقت کا شرمندگی کے ساتھ احساس ہوا اور آئندہ کسی کو از خود جواب دینے سے توبہ کر لی، چنانچہ اس کے بعد کسی نے خواہ کتنی بدیہی بات پوچھی ہو والد صاحبؒ سے پوچھے بغیر اس کو جواب نہ دیتا۔

اس کے کافی عرصے کے بعد وہ وقت بھی آیا کہ ایک مرتبہ میں نے کسی ٹیلی فون کا سوال جا کر نقل کیا تو فرمایا: "اب اس قسم کے سوالات کا جواب خود دے دیا کرو" لیکن سابقہ تنبیہ دل پر کچھ ایسی نقش ہو گئی تھی کہ یہ اجازت ملنے کے بعد بھی اکثر و بیشتر خود جواب دینے کا حوصلہ نہ ہوتا، اور بالکل بدیہی سوالات کا جواب دینے کی جرأت بھی خاصہ دراز کے بعد پیدا ہوئی، اور یہ بات تو آخر وقت تک رہی کہ اگر جواب میں کوئی خفیف سا شبہ بھی ہوتا تو پوچھے بغیر جواب دینے کا سوال ہی نہیں تھا۔ ٹیلی فون اب بھی آتے ہیں، لیکن اب اگر کوئی شبہ ہوتا ہے تو سوائے اس کے کوئی حل نہیں کہ سوال کرنے والے صاحب کو کوئی دوسرا وقت بتا کر یا کتاب دیکھی جاتے، یا اپنے کسی استاذ سے رجوع کیا جائے مگر اس تمام کاوش کے بعد بھی اطمینان قلب کی وہ دولت کوئی کہاں سے لاتے جو پہلے چند لمحوں میں والد صاحبؒ سے سوال کر کے حاصل ہو جایا کرتی تھی۔

(۷) حضرت والد صاحبؒ کو خود رائی سے نفرت تھی، وہ حکیم الامت حضرت تھانوی قدس سرہٗ کی یہ گرانقدر نصیحت بار بار سنایا کرتے تھے کہ "جب تک تمہارے ضابطے کے بڑے موجود ہوں۔ اُن سے استصواب کئے بغیر کبھی کوئی اہم کام نہ کرو، اور جب ضابطے کے بڑے نہ رہیں تو اپنے معاصرین اور برابر کے لوگوں سے مشورہ کرو، اور وہ بھی نہ رہیں تو اپنے چھوٹوں سے مشورہ کرو" چنانچہ ساری عمر والد صاحبؒ کا عمل اسی کے مطابق رہا اور ہم نے تو اُن کا وہی زمانہ پایا جس میں اُن کے بڑے تقریباً رخصت ہو چکے تھے۔

---

[۱] اس کے ساتھ ہی حضرت والد صاحبؒ حضرت تھانویؒ کا یہ ارشاد بھی نقل فرماتے تھے کہ میں نے "ضابطے کے بڑے" اس لیے کہا ہے کہ یہ بات تو اللہ ہی کو معلوم ہے کہ اس کے نزدیک کون بڑا اور کون چھوٹا ہے؟

معاصرین بھی کم تھے اور زیادہ تر چھوٹے ہی تھے، لیکن آپ ہر اہم فیصلے سے پہلے جو چھوٹے بڑے میسر ہوں اُن سے مشورہ ضرور فرماتے تھے۔

یہ معمول دوسرے معاملات میں تو تھا ہی، لیکن کسی نئے فقہی مسئلے کی تحقیق کرنی ہو تو اس میں اس بات کا ہمیشہ بہت لحاظ رکھتے تھے، چنانچہ فتاویٰ دار العلوم اور جواہر الفقہ میں مختلف فقہی مسائل پر جو مستقل رسالے موجود ہیں، اُن میں سے اکثر ایسے ہیں کہ اُن کے آخر میں اُس زمانے کے معروف اہلِ فتویٰ اور اہلِ علم کی تصدیقات ساتھ لگی ہوئی ہیں جس سے واضح ہے کہ آپ نے حتی الامکان کوئی نئی تحقیق دوسرے اہلِ علم سے مشورے کے بغیر شائع نہیں فرمائی۔ اور آخری سالوں میں تو آپ نے شیخ الحدیث حضرت علامہ سید محمد یوسف بنوری صاحب قدس سرہ کے ساتھ اس غرض کے لیے کراچی کے اہلِ علم کی ایک باقاعدہ مجلس قائم فرمادی تھی جس کا نام "مجلس تحقیقِ مسائلِ حاضرہ" تھا، اور اُس کا کام ہی یہ تھا کہ وہ نو پیش آمدہ مسائل کی اجتماعی طور پر تحقیق کرے۔ اس مجلس کا اجلاس عموماً ہر مہینے ایک مرتبہ ہوتا تھا، کبھی دار العلوم میں اور کبھی جامعہ اسلامیہ نیوٹاؤن میں۔ اس اجلاس میں ان دونوں بزرگوں کے علاوہ حضرت مولانا مفتی رشید احمد صاحب مہتمم اشرف المدارس ناظم آباد اور دار العلوم اور نیوٹاؤن کے خاص خاص اساتذہ شریک ہوتے تھے۔ ہم خدام بھی حاضر رہتے اور ان بزرگوں کی شفقت وعنایت کی انتہا تھی کہ ہمیں بھی کُھل کر اپنے اشکالات وشبہات پیش کرنے کا موقع دیتے اور ہر بات پر پوری سنجیدگی اور اہمیت کے ساتھ غور فرماتے تھے۔ اور غالباً یہ حضرت تھانوی قدس سرہٗ کی مذکورہ بالا وصیت ہی کا اثر تھا کہ جب کوئی تحریر تیار ہوتی تو اس پر ہم جیسے خدام کے بھی دستخط کرائے جاتے تھے، حضرت والد صاحبؒ کے تحریر فرمودہ فتوے پر ہم جیسوں کا "الجواب صحیح" لکھنا بڑا مضحکہ خیز معلوم ہوتا تھا۔ لیکن یہ اُنؒ کا حکم تھا جس کی تعمیل کی جاتی تھی۔

ظاہر ہے کہ فقہی معاملات میں اس قدر احتیاط جس شخص کا مذاق زندگی بن چکی ہو، وہ خود رائی وخود بینی سے کس درجہ دُور ہوگا؟ چنانچہ آپ کو "تفرّد" (دوسرے علماء سے ہٹ کر کوئی ذاتی موقف اختیار کرنے) سے نفرت تھی اور فرمایا کرتے تھے کہ فقہاء کرامؒ نے محقق

ابن ہمامؒ اور شاہ ولی اللہ جیسے اصحاب اجتہاد کے تفردات کو قبول نہیں کیا تو بعد کے علماء کا معاملہ تو ان کے مقابلے میں بہت ادنیٰ ہے۔ چنانچہ اگر کبھی آپ کا ذہن کسی ایسی رائے کی طرف مائل ہوتا جو معروف نقطۂ نظر سے مختلف ہوتی تو آپ اس تلاش میں رہتے کہ یا تو فقہاء متقدمین میں سے کسی کا قول اُس کے موافق مل جائے، یا معاصر علماء اُس رائے پر مطمئن ہو جائیں اور جب تک یہ نہ ہوتا اُس وقت تک آپ عموماً اُس رائے کے مطابق فتویٰ نہ دیتے تھے۔

اس احتیاط کی ایک واضح مثال یہ ہے کہ "الحیلۃ الناجزۃ" وہ کتاب ہے جو حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہٗ نے مصیبت زدہ عورتوں کی مشکلات کے حل کے لیے مرتب کروائی تھی، اور اس میں بہت سے مسائل میں مالکی مذہب کے مطابق مصیبت زدہ عورتوں کے لیے خلاصی کی راہ نکالی گئی ہے۔ اس کتاب کی تالیف حضرت تھانوی قدس سرہٗ نے ابتداءً جن دو بزرگوں کے سپرد کی تھی اُن میں سے ایک حضرت والد صاحبؒ تھے، اور دوسرے حضرت مولانا مفتی عبدالکریم صاحب گمتھلوی رحمۃ اللہ علیہ۔ لہٰذا حضرت والد صاحبؒ اس کتاب کی تالیف میں شروع سے آخر تک براہِ راست شریک رہے ہیں۔ اس سلسلے میں حجاز کے علمائے مالکیہ سے جو خط و کتابت کی گئی اُس سے بھی اور اُس کے علاوہ جتنے مراحل تالیف کے دوران پیش آئے، اُن سب سے بھی حضرت والد صاحبؒ پوری طرح باخبر رہے، لیکن حضرت تھانوی قدس سرہٗ اور حضرت مولانا مفتی عبدالکریم صاحبؒ کی وفات کے بعد جب حضرت والد صاحبؒ کو اس کتاب کے بعض مقامات میں اجمال محسوس ہوا اور اُن کی وضاحت کی ضرورت محسوس ہوئی تو باوجودیکہ حضرت والد صاحبؒ بذاتِ خود اس وضاحت پر مطمئن تھے، اور اس کا پورا پس منظر بھی آپ کے سامنے تھا، اور اُس وقت دنیا بھر میں "الحیلۃ الناجزۃ" کے مسائل کے پورے پس منظر سے آپ سے زیادہ کوئی واقف نہ تھا۔ لیکن آپ نے یہ گوارا نہیں فرمایا کہ محض اپنی رائے سے اس وضاحت کے مطابق فتویٰ دے دیں، بلکہ پہلے اُس وقت کے اہلِ فتویٰ حضرات سے استصواب کیا، اور اُس کے بعد اپنی رائے ظاہر فرمائی۔

حضرتؒ کا فقہی مقام

(۸) مذکورہ بالا گزارشات کا حاصل یہ ہے کہ کوئی بڑا آدمی یونہی آسانی سے بڑا نہیں بن جاتا، بلکہ کسی بھی علم وفن میں کوئی اعلیٰ مقام حاصل کرنے اور اُس مقام کو خدمتِ دین اور خدمتِ خلق کے نقطہ نظر سے مفید بنانے کے لیے بڑے بڑے مراحل سے گزرنا ہوتا ہے۔ حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو اللہ تعالیٰ نے علومِ دین اور بالخصوص فقہ وفتویٰ میں جو مقام بلند عطا فرمایا وہ اللہ تعالیٰ کی عطائے خاص کے علاوہ ظاہری اسباب میں اُس طرزِ عمل کا نتیجہ ہے جو آپ نے اس سلسلے میں اختیار فرمایا، اور اس طرزِ عمل کا خلاصہ احقر کی ناچیز رائے میں چار چیزیں ہیں۔ پیہم محنت، للہیت، بزرگوں کی صحبت اور اُن سے تربیت حاصل کرنے کا اہتمام اور غایت تقویٰ۔ ان چار باتوں کے مکمل اہتمام کے نتیجے میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے آپ کو فقہ اور فتویٰ میں وہ مقام بخشا جو اُن کے اہلِ عصر میں سب سے زیادہ منفرد اور ممتاز تھا۔

"فقیہ النفس" فقہاء کی ایک اصطلاح ہے، اور اس سے مراد وہ شخص ہوتا ہے جسے اللہ تعالیٰ نے فقہ میں کثرتِ ممارست کے بعد ایک ایسا ذوقِ سلیم عطا فرمادیا ہو، جس کی روشنی میں وہ کتابوں کی مراجعت کے بغیر بھی صحیح نتیجے تک پہنچ سکتا ہو۔

مجھ جیسے بے علم وعمل شخص کا یہ منصب نہیں ہے کہ وہ کسی کے بارے میں فقیہ النفس ہونے کا فیصلہ کرے، کیونکہ فقیہ النفس کی پہچان بھی اُنہی لوگوں کا حصہ ہے جنہیں اللہ تعالیٰ نے تبحرِ علمی سے نوازا ہو، چنانچہ اس پہچان کے لیے بھی حضرت علامہ انور شاہ صاحب کشمیریؒ جیسے انسان کی ضرورت ہے جنہوں نے علامہ ابن عابدین شامیؒ جیسے وسیع العلم انسان کو بھی "فقیہ النفس" تسلیم کرنے سے انکار کیا، اور فرمایا کہ یہ لفظ علامہ ابن نجیمؒ جیسے حضرات پر راست آتا ہے، اور ساتھ ہی اپنے دور میں حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی قدس سرہ کے بارے میں اعتراف فرمایا کہ وہ فقیہ النفس تھے۔

لہٰذا میری یہ مجال نہیں ہے کہ میں حضرت والد صاحبؒ کے فقیہ النفس ہونے یا نہ ہونے پر کوئی تبصرہ کر سکوں، البتہ یہاں دو باتیں ضرور عرض کرنا چاہوں گا، ایک تو یہ کہ مصر کے معروف اور محقق عالم شیخ الاسلام علامہ زاہد الکوثری رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت والد صاحبؒ کو فقیہ النفس کا خطاب دیا تھا۔ علامہ زاہد الکوثریؒ وہ بزرگ ہیں جن کو اُن کے تبحرِ علمی اور وسعتِ

معلومات کی بنا پر اگر مصر کے علامہ انور شاہ کشمیریؒ کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔ ایک مرتبہ حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ایک فقہی مسئلے کی تحقیق میں اُن کو خط لکھا تھا، اس خط کا جو جواب آیا اس کا کچھ حصہ والد صاحبؒ نے اپنے رسالے "آلۃ کبر الصوت" میں شامل فرمایا ہے، لیکن غالباً تواضع کی بنا پر پورا خط نقل نہیں فرمایا، بحمد اللہ یہ مکتوب حضرت والد صاحبؒ کے مسودات میں بعینہٖ محفوظ ہے۔ یہاں میں وہ پورا مکتوب نقل کرتا ہوں:۔

علامہ زاہد کوثریؒ کا مکتوب

إلى حضرة أخينا في الله العلامة المحدث الفقيه المفتي محمد شفيع الديوبندي حفظه الله ورعاه وعليكم سلام الله ورحمته وبركاته. أما بعد فقد تلقيت كتابكم الكريم في ١٥ صفر ١٣٦٩ھ وتأخر وصوله جد التأخر بسبب الخطأ في العنوان. وسررت كل السرور بتفضلكم بإرسال خطابكم، فحمدت الله سبحانه على عافيتكم وتوليكم شئون الدين مع زملائكم الافاضل تحت رئاسة شيخ الإسلام وعلم الأعلام مولانا شبير أحمد العثماني أطال الله بقاءه في خير وعافية. ووفقكم جميعا لإنهاض العلوم الإسلامية وترسيخ أسس الشرع الإلهي في تلك الدولة الفتية الإسلامية التي نعقد بها آمالا كبيرة. ورجائي أن تبلغوا أخلص تحياتي وأصدق احتراماتي لذلك النحرير الفذ محقق العصر مولانا العلامة العثماني شفاه الله الشافي مما ألم به شفاء لا يغادر سقما، مع انتظار البيانات العلمية في الأقطار فارغ الصبر إلى بذل بعض همته العلية لإكمال نشرها في شرحه العظيم من كل ناحية.

ومن مدة بعيدة كنت متشوقا إلى ذاتكم الكريمة، حيث كنت رأيت بعض آثاركم الممتعة وانتفعت بها، وكان الأستاذان البنوري والبجنوري يعطران مجالسنا بثنائكم العاطر، ولذا تضاعفت سروري بتوليكم عضوية المجلس الذي يرؤسه مولانا المجتهد الفرد العثماني، وكلما تكم ناشئة عن تواضعكم البالغ، وإلا فبليغ علو منزلتكم في العلوم تحت اعتراف الجميع قربا وبعدا، فمما

الدعوات الصادقة لكم جميعا للنجاح الكامل في مهمتكم محفوظين من شرور الإسماعيلية والقاديانية ومن لف لفهم في الداخل والخارج۔

وأما الاستفتاء فأنت ابن بجدة الفتوى، وقد طالت ممارستكم حتى أصبحت فقيه النفس بالمعنى الصحيح، وملاحظاتكم المرقمة في غاية الوجاهة ... إلا أني لا أتقدم بتوقيع فتوى وأرى ان هذا يكون اجترا، إزاء براعتكم الفقهية، فأدعو الله عزوجل أن يوفقني وإياكم لما فيه رضاه، وبطيل بقاؤكم في خير وعافية. و مؤلف فهارس البخاري ستسر سرورا عظيما من تقدير شكلكم لكتابه، ويشكركم شكرا جامع التحية الزاكية. وأرجو أن لا تضنوني من صالح دعواتكم في مظان الإجابة

المخلص

محمد زاهد الكوثري

بشارع العباسية رقم ۱۰۴

بالقاهرة

مکتوب کا اُردو ترجمہ درج ذیل ہے:۔

اخی فی اللہ علامہ محدث وفقیہ حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب دیوبندی حفظہ اللہ۔

وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، مجھے آپ کا گرامی نامہ ۱۵ صفر ۱۳۶۹ھ کو ملا، اور اس خط کے ملنے میں بہت تاخیر اس لیے ہوئی کہ اس پر پتہ غلط درج تھا۔ بہرحال آپ نے یہ مکتوب بھیج کر مجھ پر جو کرم فرمایا اس کی بنا پر مجھے بیحد مسرت ہوئی، اور اس بات پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا کہ آپ خیریت سے ہیں اور شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد صاحب عثمانی کی سربراہی میں اپنے فاضل رفقاء کے ساتھ دینی خدمات میں مصروف ہیں، اللہ تعالیٰ مولانا عثمانی کی عمر دراز فرمائے، اور آپ سب کو توفیق عطا فرمائے کہ اُس نوخیز اسلامی مملکت میں جس کے ساتھ ہماری بڑی اُمیدیں وابستہ ہیں، اسلامی علوم کو فروغ دیں اور شریعتِ الٰہیہ کی بنیادیں قائم فرمادیں۔

مجھے اُمید ہے کہ آپ میرا پُرخلوص سلام اور اعزاز واحترام کے دلی جذبات

محقق العصر علامہ عثمانی تک پہنچا دیں گے جو اس وقت تبحرِ علمی میں منفرد مقام رکھتے ہیں میری دُعا ہے کہ جو علالت انہیں لاحق ہے، اللہ تعالیٰ اس سے ان کو شفاءِ کامل عطا فرمائے ساتھ ہی ان کو یہ پیغام بھی پہنچا دیجئے کہ دنیا بھر کے علمی حلقے نہایت بے چینی سے اس بات کے منتظر ہیں کہ وہ اپنی ہمّتِ عالیہ کا کچھ حصّہ اپنی اُس شرح کی تکمیل پر بھی خرچ فرمائیں جو ہر پہلو سے ایک عظیم شرح ہے[1]۔

میں مدّتِ دراز سے آپ کی مبارک ذات سے متعارف ہونے کا مشتاق تھا، اس لیے کہ میں نے آپ کی بعض یادگار اور مفید تصانیف نہ صرف دیکھی ہیں، بلکہ ان سے استفادہ کیا ہے اور استاذ بنوری اور استاذ بجنوری[2] اکثر ہماری مجلسوں کو آپ کے خوشگوار ذکرِ خیر سے معطر رکھتے ہیں۔ چنانچہ مجھے یہ سُن کر بیحد مسرت ہوئی کہ آپ نے اُس مجلس کی رکنیت سنبھال لی ہے جو حضرت علامہ عثمانی کی سربراہی میں قائم ہوئی تھی[3]۔ اور آپ نے جو باتیں لکھی ہیں وہ درحقیقت آپ کی انتہائی تواضع کا نتیجہ ہیں، ورنہ علومِ اسلامیہ میں آپ کے مقامِ بلند کو تمام اہلِ علم پہچانتے ہیں، خواہ وہ آپ سے قریب ہوں یا دور ہوں۔ اور ہم سب دعا گو ہیں کہ اللہ تعالیٰ آپ کو اپنے مشن میں مکمل کامیابی عطا فرمائے، اور آپ، اسماعیلیوں، قادیانیوں اور ان جیسے دوسرے اندرونی و بیرونی فتنوں سے محفوظ رہیں۔

جہاں تک استفسار کا تعلق ہے تو فتویٰ کے ماہر و محقق تو آپ خود ہیں۔ اور اس سلسلے میں آپ کے طویل تجربے نے آپ کو اس مقام تک پہنچا دیا ہے جو صحیح معنی میں فقیہ النفس کا مقام ہے اور آپ نے اپنے مکتوب میں جو نکات اٹھائے ہیں، وہ نہایت دقیق ہیں.....

---

[1] صحیح مسلم کی شرح "فتح الملہم" مراد ہے جو علامہ عثمانیؒ کی تالیف ہے اور جس کی صرف تین جلدیں شائع ہو سکی ہیں۔

[2] حضرت علامہ سید محمد یوسف بنوری صاحبؒ اور حضرت مولانا احمد رضا صاحب بجنوری مراد ہیں جو اُس وقت مصر میں تھے۔

[3] تعلیمات اسلامی بورڈ مراد ہے جو قیامِ پاکستان کے بعد اسلامی دستور کی ترتیب کے لیے حکومت کی طرف سے قائم کیا گیا تھا۔

واس کے بعد اس مسئلے کے بارے میں اپنی رائے تحریر کرکے لکھا ہے کہ) ... لیکن میں فتویٰ پر دستخط کرنے کی جرأت نہیں کروں گا، کیونکہ یہ آپ کی فقہی مہارت کے آگے ایک جسارت کے مترادف ہوگا۔ بس میں دُعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ مجھے اور آپ کو اپنی رضا کے مطابق کام کرنے کی توفیق عطا فرمائے، اور آپ کو تادیر خیر و عافیت کے ساتھ سلامت رکھے۔

فہارس البخاری کے مؤلف اس بات پر بہت مسرور ہیں کہ آپ جیسی شخصیت نے ان کی کتاب کی قدردانی کی[۱]۔ وہ سلام خلوص کے ساتھ آپ کے انتہائی شکرگزار ہیں، اور میں بھی امیدوار ہوں کہ قبولیت کے خاص مواقع پر اپنی دعاؤں میں مجھے فراموش نہیں فرمائیں گے۔ والسلام

محمد زاہد الکوثری

۱۲ صفر ۱۳۶۹ھ

شارع العباسیۃ نمبر ۱۰۴
قاہرہ

اس مکتوب میں علامہ کوثری رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت والد صاحبؒ کے علم و فضل کی محض رسمی تعریف نہیں کی، بلکہ باقاعدہ آپ کو صحیح معنیٰ میں فقیہ النفس کا خطاب دیا ہے، اور جو لوگ علامہ زاہد کوثریؒ کے تبحرِ علمی سے واقف ہیں، انہیں اندازہ ہوگا کہ ان کے الفاظ کو کسی تصنع یا مبالغے پر محمول نہیں کیا جاسکتا۔

حضرت والد صاحبؒ کو اصطلاحاً "فقیہ النفس" کہنا تو علامہ کوثریؒ یا انہی کے پائے کے کسی عالم کا مقام تھا، لیکن اتنی بات کا مشاہدہ ہم خدام نے بھی کیا ہے کہ عمر کے آخری سالوں میں ضعف اور علالت کی بنا پر بار بار کتابوں کی مراجعت حضرتؒ کے لیے ممکن نہیں رہی تھی، چنانچہ اکثر و بیشتر آپ زبانی یا تحریری سوالات کے جواب مراجعتِ کتب کے بغیر ہی دیا کرتے تھے۔ بارہا یہ منظر بچشم خود دیکھا کہ فتاویٰ کی ڈاک کا ایک ڈھیر سامنے ہے اور جب جواب لکھنا شروع کیا تو لکھتے چلے گئے، اور کسی بھی مسئلے میں مراجعتِ کتب کی ضرورت پیش نہیں آئی، البتہ جہاں ضرورت پیش آئی تو اس خاص فتوے کو الگ کرلیتے اور آپ کے

---

[۱] فہارس البخاری کے مؤلف علامہ کوثریؒ کے شاگرد ہیں، انہوں نے یہ کتاب بغرض تبصرہ والد صاحبؒ کو بھیجی تھی، اور حضرت والد صاحبؒ نے اس پر تقریظ تحریر فرمائی تھی جو شائع ہوچکی ہے۔

دستی بیگ میں ایک بڑا لفافہ عموماً رکھا رہتا تھا جس پر "غور طلب فتاویٰ" کا عنوان درج تھا جب کبھی کسی مسئلے میں شبہ ہوتا تو وہ اس لفافے میں چلا جاتا، پھر کسی فرصت کے وقت خود یا کسی اور کے ذریعے متعلقہ کتب کی مراجعت کے بعد اس کا جواب دیتے تھے۔

انہی غور طلب فتاویٰ کے سلسلے میں اس بات کا بارہا مشاہدہ ہوا کہ کتابوں کی مراجعت سے پہلے آپ ابتداءً اپنا جو خیال ظاہر فرماتے، کتابوں کی طویل ورق گردانی کے بعد اُس خیال ہی کی تائید ہوتی تھی اور اُس وقت اندازہ ہوتا کہ اس سوال کو محض احتیاط کی خاطر رکھا گیا تھا، ورنہ اس کا صحیح جواب اُس مذاقِ سلیم کے پاس پہلے سے موجود تھا جو اللہ تعالیٰ نے کثرتِ ممارست سے وہبی طور پر پیدا فرما دیا تھا۔

جیسا کہ احقر نے پہلے عرض کیا، مہینے میں ایک مرتبہ دارالعلوم کراچی، جامعہ اسلامیہ نیوٹاؤن اور اشرف المدارس کے حضراتِ اہلِ فتویٰ کی مجلس ہوا کرتی تھی جس میں مختلف غور طلب فقہی مسائل پر مشورہ ہوا کرتا تھا۔ اس مجلس میں کئی بار اس کا تجربہ ہوا کہ حضرت والد صاحب جو موقف اختیار فرماتے، وہ کتبِ فقہ کے ظاہر کے خلاف معلوم ہوتا تھا، چنانچہ ہم جیسے اہلِ ظاہر اس پر اپنے اشکالات پیش کرتے رہتے، لیکن آخر میں کسی واضح دلیل سے ثابت ہو جاتا کہ بات وہی صحیح تھی جو حضرتؒ نے ابتدا میں ارشاد فرما دی تھی۔

ایک مرتبہ حضرتؒ علیل تھے، مجلس کا دن آ گیا، اور شرکاء مجلس دارالعلوم تشریف لے آئے، حضرت والد صاحبؒ نے بذاتِ خود شرکت سے معذرت فرمائی، لیکن ہم لوگوں سے فرمایا کہ کام ملتوی نہ کریں، چنانچہ ہم سب کام میں لگ گئے، اتفاق سے مسئلہ کوئی پیچیدہ قسم کا تھا، اور صبح سے شام تک کا پورا وقت اسی ایک مسئلے کی تحقیق اور اس پر بحث و مباحثہ میں گزر گیا۔ اس دوران تمام حاضرین نے فقہ و فتویٰ کی تمام متعلقہ کتابیں بھی دیکھیں، شروحِ حدیث کی طرف بھی رجوع کیا، اور بالآخر شام کو تمام حضرات ایک فیصلے پر متفق ہو گئے اور اس کی تائید میں کتبِ فقہ کی عبارتیں نقل کر لیں، البتہ پوری بحث کو قلمبند کرنے کا کام مؤخر کر دیا گیا۔ عصر کے بعد جب حضرتؒ کی خدمت میں حاضری ہوئی تو آپ نے دن بھر کی کارروائی کا خلاصہ معلوم فرمایا، ہم جس نتیجے پر پہنچے تھے، ہم نے وہ عرض کر دیا، حضرتؒ نے سن کر فرمایا: "نہیں، یہ بات دل کو نہیں لگتی" عرض کیا کہ تمام فقہی کتب سے اسی کی تائید

ہوتی ہے۔" فرمایا: "دوبارہ غور کرنا چاہیے یہ بات صحیح معلوم نہیں ہو رہی۔ اُس وقت چونکہ حضرتؒ کی طبیعت ناساز تھی، اور طویل گفتگو مناسب نہ تھی، اس لیے ہم نے سوچا کہ کسی اور موقع پر عرض کریں گے، چنانچہ ایک روز جب کہ طبیعت نسبتاً بہتر تھی، ہم نے اُن تمام کتابوں کے حوالے سے بات کرنی چاہی تو آپ نے وہ حوالے دیکھے بغیر فرمایا کہ "نہیں بھئی۔ وہ بات بالکل غلط ہے، پھر سے دیکھو۔" ہمیں خیال ہوا کہ آپ نے وہ حوالے دیکھے بغیر فیصلہ کیسے فرما دیا؟ چنانچہ ہم نے مکرر عرض کیا کہ کتبِ فقہ کی یہ عبارتیں آپ ملاحظہ فرمائیں، ان سے تو یہی نتیجہ نکلتا ہے۔" اس مرتبہ آپ نے قدرے تکدر کے ساتھ فرمایا: "نہیں بھئی، یہ بات بالکل غلط ہے، اور اگر تم لوگ اس پر متفق ہو چکے ہو تو کم از کم میں اس پر دستخط نہیں کروں گا۔" بات بظاہر بڑی عجیب تھی کہ نہ آپ وہ حوالے دیکھنے پر آمادہ تھے، اور نہ اپنے موقف کے لیے کوئی دلیل بیان فرما رہے تھے۔ لیکن اُس موقف پر خلافِ معمول جزم اتنا تھا کہ اُس سے سرِ مُو ہٹنے کے لیے تیار نہ تھے۔ آپ کا عام معمول یہ تھا کہ اگر ہم جیسے طفلِ مکتب بھی کوئی معقول بات کہہ دیتے تو اُسے فوراً قبول فرما لیتے تھے، اور دلیل کے مقابلے میں اپنی کسی رائے پر جمنے کا تو وہاں سوال ہی نہ تھا، لہٰذا یہ طرزِ عمل ہمارے لیے عجیب اور حیران کن ضرور تھا، لیکن ساتھ ہی اس بات پر بھی یقین تھا کہ یہ جزم بلاوجہ نہیں ہے۔ چنانچہ جب آئندہ مجلس میں تمام ارکان نے مسئلے پر مکرر غور کیا، اور دوبارہ کتابیں دیکھنی شروع کیں تو آخر میں نتیجہ وہی نکلا جو حضرت والد صاحبؒ کا موقف تھا، اور اُس وقت اندازہ ہوا کہ اگر ہم اپنے سابقہ موقف پر قائم رہتے تو یہ کتنی سنگین غلطی ہوتی۔

بات یہ نہیں تھی کہ فقہاء کی جو عبارتیں بعد میں ہمارے سامنے آئیں، وہ پہلے سے حضرت والد صاحبؒ کی نگاہ میں تھیں، بلکہ بات دراصل یہ تھی کہ ہمارے سابقہ فیصلے کو حضرت والد صاحبؒ کے مذاقِ سلیم نے قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ اور اللہ تعالیٰ محنت للّٰہیت اور بزرگوں کی صحبت و تربیت کے نتیجے میں اپنے خاص بندوں کے قلب کو وہ کسوٹی عطا فرما دیتا ہے جو صحیح و غلط کو پرکھنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔

فتویٰ کے معاملے میں خصوصی مذاق کی چند باتیں

(۹) اب میں حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے مذاقِ فتویٰ کے بارے میں آپ ہی سے سُنی ہوئی چند متفرق باتیں عرض کرنا چاہتا ہوں۔

حضرت والد صاحبؒ اکثر فرمایا کرتے تھے کہ محض فقہی کتابوں کے جزئیات یاد کرلینے سے انسان فقیہ یا مفتی نہیں بنتا، مَیں نے ایسے بہت سے حضرات دیکھے ہیں جنہیں فقہی جزئیات ہی نہیں، اُن کی عبارتیں بھی ازبر تھیں، لیکن ان میں فتویٰ کی مناسبت نظر نہیں آئی۔ وجہ یہ ہے کہ درحقیقت "فقہ" کے معنی "سمجھ" کے ہیں، اور فقیہ وہ شخص ہے جسے اللہ تعالیٰ نے دین کی سمجھ عطا فرمادی ہو، اور یہ سمجھ محض وسعتِ مطالعہ یا فقہی جزئیات یاد کرنے سے پیدا نہیں ہوتی، بلکہ اس کے لیے کسی ماہر فقیہ کی صحبت اور اس سے تربیت لینے کی ضرورت ہے۔

یہ بات احقر نے حضرت والد صاحبؒ سے بارہا سُنی، اور ایک آدھ مرتبہ اُس کی تشریح وتفصیل بھی سمجھنی چاہی کہ وہ کیا باتیں ہیں جو محض مطالعے یا فقہی جزئیات یاد کرنے سے حاصل نہیں ہوتیں۔ لیکن حضرت والد صاحبؒ نے اس سوال کا جو جواب دیا اس کا خلاصہ یہ تھا کہ اگر وہ باتیں بیان میں آسکتیں تو پھر انہیں سیکھنے کے لیے کسی سے تربیت لینے کی ضرورت نہ ہوتی۔ ان کی نوعیت ہی کچھ ایسی ہے کہ انہیں منضبط شکل میں مدون نہیں کیا جاسکتا، اور نہ متعین الفاظ میں اُن کی تعبیر وتشریح ممکن ہے، گویا ؎

بسیار شیوہ ہاست بتاں راکہ نام نیست

ان باتوں کے حصول کا طریقہ ہی یہ ہے کہ کسی ماہر فقیہ کے ساتھ رہ کر اس کے اندازِ فکر ونظر کا مشاہدہ کیا جائے، اس طرح مدت کے تجربے اور مشاہدے سے وہ اندازِ فکر خود بخود زیرِ تربیت شخص کی طرف منتقل ہوجاتا ہے۔ بشرطیکہ جانبین میں مناسبت ہو، اور سیکھنے والا شخص باصلاحیت ہونے کے ساتھ ساتھ واقعی سیکھنا چاہتا ہو۔

(۱۰) حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ اکابر دیوبند کے مسلک کے مطابق تقلیدِ شخصی

کے نہ صرف قائل تھے، بلکہ اس دور ہوا و ہوس میں اسی کو سلامتی کا راستہ سمجھتے تھے، البتہ جب کبھی ائمہ اربعہ کے درمیان دلائل کے محاکمے کا سوال آتا تو فرمایا کرتے تھے کہ یہ ہمارا منصب نہیں ہے، کیونکہ محاکمہ کرنے والے کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ جانبین کے علمی مقام سے اگر بلند تر نہ ہو تو کم از کم اُن کے مساوی تو ہو، اور آج اس مساوات کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا۔

البتہ ساتھ ہی حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کا یہ مقولہ سنایا کرتے تھے کہ "تقلید شخصی کوئی شرعی حکم نہیں ہے۔ بلکہ ایک انتظامی فتویٰ[1] ہے" جس کا حاصل یہ ہے کہ چاروں، ائمہ مجتہدین برحق ہیں، اور ہر ایک کے پاس اپنے موقف کے لیے وزنی دلائل موجود ہیں، لیکن اگر ہر شخص کو یہ کھلی چھٹی دے دی جائے کہ وہ جب جس امام کے مسلک کو چاہے، اختیار کرے تو ہر شخص اپنی آسانی کی خاطر آج ایک مسلک پر عمل کرے گا، کل دوسرے مسلک پر اور اس طرح اتباعِ خداوندی کے بجائے اتباعِ نفس کا دروازہ کھل جائے گا۔

لیکن چونکہ چاروں مذاہب بلا شبہ برحق ہیں، اور ہر ایک کے پاس دلائل موجود ہیں، اس لیے اگر مسلمانوں کی کوئی شدید اجتماعی ضرورت داعی ہو تو اس موقع پر کسی دوسرے مجتہد کے مسلک پر فتویٰ دینے میں کوئی مضائقہ نہیں، حضرت والد صاحبؒ فرمایا کرتے تھے کہ حضرت گنگوہیؒ قدس سرہ نے حضرت تھانویؒ کو یہ وصیت کی تھی اور حضرت تھانویؒ نے ہم سے فرمایا کہ آجکل معاملات پیچیدہ ہو گئے ہیں اور اس کی وجہ سے دیندار مسلمان تنگی کا شکار ہیں، اس لیے خاص طور سے بیع و شراء اور شرکت وغیرہ کے معاملات میں جہاں بلویٰ عام ہو، وہاں ائمہ اربعہ میں سے جس امام کے مذاہب میں عام لوگوں کے لیے گنجائش کا پہلو ہو اُس کو فتویٰ کے لیے اختیار کر لیا جائے۔

لیکن حضرت والد صاحبؒ فرمایا کرتے تھے کہ کسی دوسرے امام کا قول اختیار کرنے کے لیے چند باتوں کا اطمینان کر لینا ضروری ہے۔ سب سے پہلے تو یہ کہ واقعۃً مسلمانوں

---

[1] اس جملے کی تشریح کے لیے ملاحظہ ہو جواہر الفقہ میں حضرت والد صاحبؒ کا رسالہ "تقلید شخصی" اور احقر کا کتابچہ "تقلید کی شرعی حیثیت"۔

کی اجتماعی ضرورت متحقق ہے یا نہیں، ایسا نہ ہو کہ محض تن آسانی کی بنیاد پر یہ فیصلہ کر لیا جائے" اور حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک اس اطمینان کا طریقہ یہ ہے کہ کوئی ایک مفتی خود رائی کے ساتھ یہ فیصلہ نہ کرے، بلکہ دوسرے اہلِ فتویٰ حضرات سے مشورہ کرے، اگر وہ بھی متفق ہوں تو اتفاقِ رائے کے ساتھ ایسا فتویٰ دیا جائے۔

دوسری بات یہ ہے کہ جس امام کا قول اختیار کیا جا رہا ہے اس کی پوری تفصیلات براہِ راست اُس مذہب کے اہلِ فتویٰ علماء سے معلوم کی جائیں، محض کتابوں میں دیکھنے پر اکتفا نہ کیا جائے، کیونکہ بسا اوقات اُس قول کی بعض ضروری تفصیلات عام کتابوں میں مذکور نہیں ہوتیں اور ان کے نظر انداز کر دینے سے تلفیق کا اندیشہ رہتا ہے۔

تیسری بات یہ ہے کہ ائمہ اربعہ سے خروج نہ کیا جائے، کیونکہ ان حضرات کے علاوہ کسی بھی مجتہد کا مذہب مدون شکل میں ہم تک نہیں پہنچا اور نہ ان کے متبعین اتنے ہوتے ہیں کہ ان کا کوئی قول استفاضہ یا تواتر کی حد تک پہنچ جائے۔ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے "عقد الجید" میں ائمہ اربعہ سے باہر جانے کے مفاسد تفصیل کے ساتھ بیان فرماتے ہیں۔

چنانچہ بعض مصیبت زدہ خواتین کے لیے حکیم الامت حضرت تھانوی قدس سرہ نے مالکی مذہب پر فتویٰ دینے کا ارادہ کیا تو ان تمام باتوں کو پوری احتیاط کے ساتھ مدِ نظر رکھا اور براہِ راست مالکی علماء سے خط و کتابت کے ذریعے مذہب کی تفصیلات معلوم کیں اور تمام علمائے ہند سے استصواب کے بعد فتویٰ شائع فرمایا:

(۱) حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ علامہ ابن عابدین شامیؒ انتہائی وسیع المطالعہ ہونے کے باوجود اس قدر تقویٰ شعار اور محتاط بزرگ ہیں کہ عام طور سے اپنی ذمہ داری پر کوئی مسئلہ بیان نہیں کرتے، بلکہ جہاں تک ممکن ہوتا ہے، اپنے سے پہلے کی کتابوں میں سے کسی نہ کسی کے حوالے سے بیان فرماتے ہیں، اگر ان اقوال میں بظاہر تعارض ہو تو ان کو رفع کرنے کے لیے بھی حتی الامکان کسی دوسرے فقیہ کے قول کا سہارا لیتے ہیں، اور جب تک بالکل مجبوری نہ ہو جائے خود اپنی رائے ظاہر نہیں فرماتے۔

اور جہاں ظاہر فرماتے ہیں وہاں بھی بالعموم آخر میں "تامل" یا "تدبر" کہہ کر خود بری ہو جاتے ہیں، اور ذمہ داری پڑھنے والے پر ڈال دیتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ بسا اوقات الجھے ہوئے مسائل میں ہم جیسے لوگوں کو ان کی کتاب سے مکمل شفا نہیں ہوتی۔

لیکن فرمایا کرتے تھے کہ یہ طریقہ ردالمحتار میں تو رہا ہے، مگر چونکہ علامہ شامیؒ نے البحرالرائق کا حاشیہ منحۃ الخالق اور تنقیح الحامدیہ بعد میں لکھا ہے، اس لیے ان کتابوں میں مسائل زیادہ منقح انداز میں آتے ہیں جنہیں پڑھ کر فیصلہ کن بات معلوم ہو جاتی ہے۔

(۱۲) فقہاء کرامؒ نے فقہ کے جو متون مرتب فرمائے ہیں ان کی عبارتیں انتہائی جامع ومانع اور حشو و زوائد سے پاک ہوتی ہیں، چنانچہ ان متون میں کسی مسئلے کو بیان کرنے کے لیے اتنے ہی الفاظ استعمال کیے جاتے ہیں جتنے ناگزیر ہوں، اُن کا کوئی لفظ زائد نہیں ہوتا، بلکہ اس سے مسئلے کی کسی نہ کسی شرط کی طرف اشارہ ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ فقہاء حنفیہؒ قرآن وسنت کی نصوص میں تو مفہوم مخالف کو حجت نہیں مانتے، کیونکہ قرآن وسنت کا اسلوب احکام کے بیان کے ساتھ ساتھ وعظ وتذکیر کے پہلو کو بھی ساتھ لیے ہوئے ہے اور اس میں بعض الفاظ اسی نقطۂ نظر سے بڑھائے جاتے ہیں، لیکن فقہاء کی عبارتیں صرف قانونی انداز کی عبارتیں ہیں، اس لیے ان عبارتوں میں مفہوم مخالف کا معتبر ہونا خود فقہاء حنفیہؒ نے تسلیم کیا ہے۔

خلاصہ یہ کہ فقہاء کے کلام کو سمجھنے کے لیے بیحد ضروری ہے کہ اس کے ایک ایک لفظ کے قانونی مقتضیات پر غور کر کے کوئی نتیجہ نکالا جائے، لیکن ان الفاظ کے قانونی مقتضیات کو متعین کرنے میں بعض اوقات کئی احتمال ہوتے ہیں۔ ان میں سے کسی ایک احتمال کو اختیار کرنے میں ایک فقیہ اور مفتی کو اپنی بصیرت سے کام لینا پڑتا ہے۔ بعض حضرات کسی لفظ کے قانونی مقتضیات کو متعین کرتے میں اُس کے لغوی مفہوم اور ٹھیٹھ منطقی نتائج کو اتنی اہمیت دیتے ہیں کہ اس سے مسئلے کی علت اور اُس کا صحیح سیاق پس پشت چلا جاتا ہے، اور بعض حضرات اُس لفظ کے ٹھیٹھ منطقی نتائج پر زور دینے کے بجائے اُس سیاق کو مدنظر رکھتے ہیں جن میں وہ بولا گیا ہے، خواہ اُس سے لفظ کے منطقی نتائج

پورے نہ ہوتے ہوں۔ ان دونوں میں سے حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا مذاق دوسرے طرز عمل کے مطابق تھا۔

ایک مثال سے یہ بات واضح ہو سکے گی۔ فقہاء حنفیہ کے یہاں یہ مسئلہ مشہور ہے کہ اگر نابالغ کا نکاح اُس کے باپ یا دادا نے کیا ہو تو اُسے خیارِ بلوغ حاصل نہیں ہوتا، البتہ اس کے ساتھ ہی درمختار وغیرہ میں ایک استثنا مذکور ہے کہ الّا اذا کان الأب معروفاً بسوء اختیاره مجانةً وفسقاً (یعنی جب باپ فسق و فجور اور لالچ کی وجہ سے اولاد کی بدخواہی میں معروف ہو تو یہ حکم نہیں ہوگا، بلکہ اس صورت میں اولاد کو خیارِ بلوغ حاصل ہوگا)

یہاں فقہاءؒ نے صرف اتنا نہیں فرمایا کہ باپ اولاد کا بدخواہ ہو، بلکہ یہ ضروری قرار دیا ہے کہ وہ اس بدخواہی میں معروف ہو، لہٰذا لفظ "معروف" کے قانونی مقتضیات پر عمل تو ضروری ہے، لیکن جو حضرات ان قانونی مقتضیات کو متعین کرنے میں لفظ کے ٹھیٹھ منطقی لوازم پر زور دیتے ہیں، انہوں نے اس لفظ سے یہ نتیجہ نکالا کہ کسی شخص کو "معروف بسوء الاختیار" (اولاد کی بدخواہی میں معروف) اسی وقت کہا جائے گا جب اُس نے کم از کم ایک مرتبہ اپنی کسی اولاد کا نکاح بدخواہی سے صرف لالچ کی بنا پر کر دیا ہو۔ اور جس شخص نے اب تک اپنی کسی لڑکی کا نکاح اس طرح نہ کیا ہو وہ "معروف بسوء الاختیار" نہیں کہلا سکتا، لہٰذا اگر کوئی باپ پہلی بار اپنی لڑکی کا نکاح لالچ سے کر رہا ہو تو وہ "سیئ الاختیار" تو ہے لیکن "معروف بسوء الاختیار" نہیں ہے، اس لیے اس کی لڑکی کو خیارِ بلوغ حاصل نہیں ہوگا، ہاں اگر وہ اس کے بعد دوسری لڑکی کا نکاح اسی طرح کرے تو چونکہ اب وہ معروف بسوء الاختیار بن گیا ہے، اس لیے دوسری لڑکی کو خیارِ بلوغ مل جائے گا۔

لیکن حضرت والد صاحبؒ نے جواہر الفقہ کے ایک رسالے میں اس نقطۂ نظر سے اختلاف فرمایا ہے، اُن کا موقف یہ ہے کہ "معروف بسوء الاختیار" کی یہ منطقی تعبیر کہ جب تک کسی لڑکی کی کم از کم ایک بہن باپ کی بدخواہی کی بھینٹ نہ چڑھ چکی ہو، اُس وقت تک اُسے خیارِ بلوغ حاصل نہ ہو، اُس سیاق کے بالکل خلاف ہے جس میں یہ لفظ استعمال

ہوا ہے، سیاق یہ ہے کہ اولاد کا خیار بلوغ باپ کی مظنونہ شفقت کے مدِ نظر ساقط کیا گیا تھا، لیکن جب سوءِ اختیار سے اس شفقت کا فقدان ثابت ہو گیا تو خیار بلوغ لوٹ آئے گا۔ اس موقع پر فقہاءؒ نے "معروف بسوء الاختیار" کا لفظ اس لیے استعمال کیا ہے کہ سوءِ اختیار کا فیصلہ محض کسی کی شخصی رائے سے نہیں ہونا چاہیے، بلکہ باپ کی بدخواہی اتنی واضح ہونی چاہیے کہ وہ لوگوں میں اس حیثیت سے معروف ہو۔

(۱۳) حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ شریعت اسلامی چونکہ صرف شہریوں اور پڑھے لکھے افراد کے لیے نہیں ہے، بلکہ ہر اَن پڑھ، دیہاتی اور دور دراز علاقے کا رہنے والا بھی اس کا اتنا ہی مخاطب ہے جتنا ایک تعلیم یافتہ انسان۔ اس لیے شریعت کے احکام میں اس بات کا لحاظ رکھا گیا ہے کہ اُس کے احکام پر عمل کرنے کے لیے لمبے چوڑے حساب و کتاب، ریاضی کے باریک فارمولوں اور فلسفیانہ تدقیقات کی ضرورت پیش نہ آئے۔ حضرت والد صاحبؒ نے یہ بات اپنے مضامین میں بھی تحریر فرمائی ہے، چنانچہ رسالہ "سمتِ قبلہ" میں لکھتے ہیں :

> "شریعتِ محمدیہ علی صاحبہا الصلاۃ والسلام کے تمام احکام کی بنیاد یُسر و سہولت اور سادگی و بے تکلفی پر ہے، فلسفیانہ تدقیقات پر نہیں، کیونکہ دائرہ حکومت اس شریعت کا تمام عالم کے بحر و بر، اسود و احمر، شہری و دیہاتی آبادیوں اور ان کے مکان پر حاوی ہے۔ اسلامی فرائض نماز و روزہ وغیرہ جس طرح شہریوں اور تعلیم یافتہ طبقات پر عائد ہیں، اسی طرح دیہاتیوں اور پہاڑ کے دَرّوں اور جزائر کے رہنے والے ناخواندہ و ناواقف لوگوں پر بھی عائد ہیں۔ اور جو احکام اس درجہ عام ہوں، اُن میں مقتضائے عقل و حکمت و رحمت کا یہی ہے کہ اُن کو تدقیقات اور قواعد رصدیہ یا آلاتِ رصدیہ پر موقوف نہ رکھا جائے۔ تاکہ ہر خاص و عام، خواندہ و ناخواندہ بآسانی اپنے فرائض انجام دے سکے۔۔۔ روزہ رمضان کا مدار چاند دیکھنے پر رکھا گیا ہے، حساباتِ ریاضیہ پر نہیں، مہینے قمری رکھے گئے ہیں جن کا مدار رویتِ ہلال پر ہے۔ شمسی مہینے جن کا مدار خاص حساباتِ ریاضیہ پر ہے،

عام احکام شرعیہ میں اُن کو نہیں لیا گیا، اسی طرح احکام اسلامیہ کے تتبع سے بکثرت اس کے نظائر معلوم کیے جا سکتے ہیں۔ (جواہر الفقہ ج ۱ ص ۲۵۸)

فتویٰ لکھنے سے پہلے

(۱۴۱) حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ جس طرح کسی مسئلے کا حکم معلوم کرنا ایک اہم کام ہے، اُسی طرح فتویٰ نویسی ایک مستقل فن ہے جس طرح مفتی کو بہت سی باتوں کی رعایت رکھنی پڑتی ہے۔ مثلاً سب سے پہلے مفتی کو یہ دیکھنا پڑتا ہے کہ مستفتی کا سوال قابلِ جواب ہے یا نہیں۔ اور بعض اوقات سوال کے انداز سے یہ بات معلوم ہو جاتی ہے کہ اُس کا مقصد عمل کرنا یا علم میں اضافہ کرنا نہیں، بلکہ اپنے کسی مخالف کو زیر کرنا ہے، یا حالات ایسے ہیں کہ اس سوال کے جواب سے فتنہ پیدا ہو سکتا ہے۔ ایسی صورت میں استفتا کے جواب سے گریز کرنا مناسب ہوتا ہے۔ مثلاً ایک مرتبہ سوال آیا کہ ہماری مسجد کے امام صاحب فلاں فلاں آداب کا خیال نہیں رکھتے، آیا انہیں ایسا کرنا چاہیے یا نہیں؟ سوال کسی مقتدی کی طرف سے تھا اور اس کے انداز سے حضرت والد صاحبؒ کو یہ غالب گمان ہوگیا کہ اس استفتا کا مقصد امام صاحب کو حق کی دعوت دینا یا فہمائش کرنا نہیں، بلکہ اُن کی تحقیر اور ان کے بعض خلافِ احتیاط امور کی تشہیر ہے۔ چنانچہ حضرت والد صاحبؒ نے اس کے جواب میں تحریر فرمایا: "یہ سوال تو خود امام صاحب کے پوچھنے کے ہیں، اُن سے لیجیے کہ وہ تحریراً یا زبانی معلوم فرمائیں اور اس طرح یہ ممکنہ فتنہ فرو ہوگیا۔

اسی طرح حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو اس بات کا بڑا اہتمام تھا کہ جن سوالات پر دنیا و آخرت کا کوئی عملی فائدہ مرتب نہ ہو، اُن کی ہمت شکنی کی جائے، کیونکہ ایک عرصے سے لوگوں میں یہ مزاج اُبھرا ہے کہ دین کے وہ عملی مسائل جن پر زندگی کی درستی اور آخرت کی نجات موقوف ہے، اُن سے تو غافل اور بے خبر رہتے ہیں، اور بے فائدہ نظریاتی بحثوں میں نہ صرف وقت ضائع کرتے ہیں، بلکہ اُن کی بنیاد پر باقاعدہ محاذ آرائی شروع کر دیتے ہیں جس سے ملت میں انتشار پیدا ہوتا ہے۔ حضرت والد صاحبؒ ایسے سوالات کے جواب

میں فتویٰ لکھنے کے بجائے ایسی نصیحت فرماتے تھے جس سے عمل کا دھیان اور آخرت کی فکر پیدا ہو۔ مثلاً ایک مرتبہ کسی نے سوال کیا کہ "زید کی مغفرت ہوگی یا نہیں"؟ آپ نے جواب دیا "زید سے پہلے اپنی مغفرت کی فکر کرنی چاہیئے"۔ ایک صاحب نے ایک مشہور شخصیت کی کچھ باتیں لکھ کر سوال کیا کہ کیا وہ ان امور کی وجہ سے فاسق ہو گئے"؟ آپ نے فرمایا: "مجھے ابھی تک اپنے فسق کی طرف سے اطمینان نہیں ہوا، میں کسی دوسرے کے بارے میں کیا فیصلہ کروں"؟ غرض اگر عوام کی طرف سے اس قسم کے سوالات آتے کہ عرش افضل ہے یا روضۂ اقدس؟ حضرت خضر علیہ السلام زندہ ہیں یا وفات پا گئے؟ زلیخا سے حضرت یوسف علیہ السلام کا نکاح ہوا تھا یا نہیں؟ اصحاب کہف کی صحیح تعداد کیا تھی؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے والدین مؤمن تھے یا نہیں؟ آپ کے فضلات طاہر تھے یا نہیں؟ اور والد صاحبؒ کو اندازہ ہوتا کہ یہ سوالات بلاضرورت محض بحث و مباحثے کی خاطر پوچھے جا رہے ہیں تو عموماً آپ اُن کا جواب دینے کے بجائے یہ تحریر فرماتے کہ: "ان باتوں کے معلوم ہونے پر ایمان و عمل کا کوئی مسئلہ موقوف نہیں، ان مسائل پر بحث و مباحثے میں وقت خرچ کرنے کے بجائے وہ کام کیجئے جو آخرت میں کام آئے" اور بعض اوقات صرف اتنے جواب پر اکتفا فرماتے کہ "نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ "من حسن اسلام المرء ترکہ مالا یعنیہ"۔ یعنی انسان کے اچھا مسلمان بننے کا ایک جزء یہ بھی ہے کہ وہ لایعنی باتوں کو چھوڑ دے"۔

ایک مرتبہ ملک میں "حیاتُ النبی صلی اللہ علیہ وسلم" کے مسئلے پر بحث و مباحثہ کی ایسی گرم بازاری ہوئی کہ بستی بستی مناظرے منعقد ہونے لگے، اور فریقین کی طرف سے مناظرانہ کتابوں کا ایک انبار تیار ہو گیا، حضرت والد صاحبؒ کے پاس اس مسئلے پر سوالات کی بھرمار ہوئی تو اُس زمانے میں آپ کا طرزِ عمل یہ تھا کہ اگر سوال کسی ذی علم شخص کی طرف سے آیا ہے اور اندازہ یہ ہے کہ اُس کا مقصد اپنے کسی شبہے کو دُور کرنا یا واقعۃً علمی تحقیق کرنا ہے تو آپ اُس کا جواب حسب ضرورت اجمال یا تفصیل کے ساتھ دے دیتے، لیکن عموماً جو سوالات عوام کی طرف سے آتے تھے اُن کا جواب یہ دیتے کہ حیات النبیؐ کے مسئلے کی تفصیلات کا جاننا آخرت کی نجات کے لیے کوئی ضروری نہیں ہے، لہٰذا اس بحث میں پڑنے کے

بجائے شریعت کے عملی احکام کا علم حاصل کرنے میں وقت صرف کیجئے۔ من حسن اسلام المرإ ترکہ مالا یعنیہ۔

(۱۵) اسی طرح آپ نے بارہا فرمایا کہ مفتی کو یہ بھی دیکھنا چاہیئے کہ اُس کے فتوے کا اثر اور نتیجہ کیا ہوگا، چنانچہ بعض اوقات کسی مسئلے کا ٹھیٹھ فقہی حکم بیان کرنے سے مفاسد کا اندیشہ ہوتا ہے۔ مثلاً ایک چیز فی نفسہ مباح ہے، لیکن اس کی کھلی چھوٹ دے دینے سے اندیشہ یہ ہے کہ بات معصیت تک پہنچے گی، اور لوگ اپنی حدود پر قائم نہیں رہیں گے ایسے موقع پر مفتی کو یہ بھی مدِ نظر رکھنا پڑتا ہے کہ اس کام کی حوصلہ افزائی نہ ہو، اور دوسری طرف فقہی حکم میں تصرف بھی نہیں کیا جاسکتا۔ حضرت والد صاحبؒ فرماتے تھے کہ ایسے موقع پر مفتی کو اپنا جواب فتوے کے بجائے مشورے کے طور پر لکھنا چاہیئے۔ ایسے مواقع پر اس قسم کے الفاظ استعمال کیے جاتے ہیں کہ "فلاں عمل مناسب نہیں" یا "درست نہیں" یا "اُس سے پرہیز کرنا چاہیئے"۔

اسی ذیل میں ایک مرتبہ فرمایا کہ اس قسم کے فتوے بعض اوقات زمانوں کے اختلاف سے بالکل بدل جاتے ہیں، اس کی بنا پر بعض لوگ یہ سمجھنے لگے ہیں کہ علماء اپنی مرضی سے احکامِ شریعت میں ردّ و بدل کرتے رہتے ہیں، حالانکہ درحقیقت وہ شرعی احکام کی تبدیلی نہیں ہوتی، بلکہ حالات کے لحاظ سے نسخے اور تدبیر کی تبدیلی ہوتی ہے۔ چنانچہ ایک مرتبہ شیخ الاسلام حضرت علامہ شبیر احمد صاحب عثمانی قدس سرہٗ سے کسی نے کہا کہ "حضرت! یہ کیا بات ہے کہ جب ہندوستان میں انگریزی تعلیم کا آغاز ہوا تو علماء نے انگریزی تعلیم حاصل کرنے کی ممانعت کے فتوے دیئے، لیکن اب آپ حضرات یہ کہتے ہیں کہ مفاسد سے اجتناب کے ساتھ انگریزی تعلیم حاصل کرنے میں کچھ حرج نہیں۔ اس کے جواب میں حضرت علامہ عثمانیؒ نے جو بات ارشاد فرمائی وہ لوحِ دل پر نقش کرنے کے لائق ہے۔ فرمایا کہ یہ شرعی حکم کی تبدیلی نہ تھی، بلکہ بات یہ ہے کہ جب کسی علاقے پر کسی وبا کے مسلط ہونے کا اندیشہ ہوتا ہے تو اطباء ایسی تدبیریں بتاتے ہیں جن سے اس وبا کو روکا جاسکے، لیکن جب وبا آجاتی ہے تو پھر معالجوں کی تدبیر بدل جاتی ہے، اور اس وقت ایسے نسخے بتاتے جاتے ہیں جن کے ذریعے

وہ بیماری آنے کے بعد شفا حاصل ہو، بالکل یہی معاملہ یہاں بھی ہوا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ جدید علوم وفنون یا کسی زبان کی تحصیل کو بذاتِ خود کبھی کسی نے حرام نہیں کہا، لیکن اُس وقت چونکہ علما کھلی آنکھوں دیکھ رہے تھے کہ یہ علوم وفنون یا انگریزی زبان تنہا نہیں آئیں گے بلکہ ملحدانہ عقائد ونظریات اور دین بیزاری کی وبا ساتھ لائیں گے جس کا مشاہدہ بعد میں سب کو ہوگیا، اس لیے شروع میں انہوں نے اس وبا کو روکنے کی تدبیر کی اور بہت سے مسلمانوں کا ایمان بچا لیا، لیکن جب یہ وبا عالمگیر ہوگئی تو پھر تدبیر بدل گئی، اور وہ یہ کہ ان علوم وفنون یا اس زبان کو حتی الوسع اُن بیماریوں سے پاک کرکے حاصل کرنے کی کوشش کی جائے۔ غرض یہ مختلف حالات کی مختلف تدبیریں تھیں، ٹھیٹھ معنی میں شرعی حکم کی تبدیلی نہیں۔

فتویٰ نویسی میں آپ کا خصوصی انداز

(۱۶) حضرت والد صاحب قدس سرہٗ نے فتویٰ نویسی کے انداز میں بھی عام روش سے ہٹ کر اپنے زمانے کے حالات کے لحاظ سے اہم تبدیلیاں فرمائی ہیں، آپ فرمایا کرتے تھے کہ مفتی کو یہ بات بھی مدِنظر رکھنی چاہیے کہ اُس کے فتوے کو مستفتی ٹھیک ٹھیک سمجھ لے، اور نتیجے تک پہنچنے میں کوئی دشواری نہ ہو، پہلے زمانے میں چونکہ علمِ دین کا چرچا تھا اور علماء کی کثرت تھی، اس لیے لوگ علمی وفقہی اصطلاح واسلوب سے اتنے نامانوس نہ تھے، چنانچہ مفتی حضرات اپنے جوابات میں بلاتکلف فقہی اصطلاحات استعمال کر لیتے تھے، مستفتی خواہ عالم نہ ہو مگر ان اصطلاحات سے مانوس ہوتا تھا، اس لیے بحیثیت مجموعی مفتی کی مراد ٹھیک ٹھیک سمجھ لیتا تھا، اور اگر کوئی بات خود نہ سمجھتا تو ہر بستی میں ایسے لوگ موجود تھے جو اُسے فتویٰ کا مطلب سمجھا سکیں۔ اب ہماری شامتِ اعمال سے حالت یہ ہوگئی ہے کہ علمِ دین اور فقہ سے مناسبت باقی نہیں رہی، اور اہلِ علم کی تعداد بھی کم ہوگئی ہے، اس لیے اب اگر سوال کرنے والا کوئی عام آدمی ہو تو جواب کی عبارت اُس کی مناسبت سے عام فہم ہونی چاہیے۔

مثلاً میراث کے مسائل کا جواب دیتے ہوئے عام طور سے مفتی حضرات یہ جملہ لکھتے رہے ہیں کہ "مرحوم کا جملہ ترکہ بعد تقدیم حقوق متقدمہ علی الارث حسب ذیل طریقے پر تقسیم

ہوگا؟" اس فارمولے کا مطلب پہلے ہر پڑھے لکھے شخص کو معلوم ہوتا تھا، لیکن اب اگر یہ جملہ کسی گریجویٹ بلکہ پی ایچ ڈی کے سامنے بھی آجائے تو وہ اس کے تقاضے پورے نہیں کر سکتا، اور اس سے میراث کی شرعی تقسیم میں خلل واقع ہو سکتا ہے۔ اول تو آج لوگوں کو یہی احساس نہیں رہا کہ میت کے ترکے میں کیا کیا چیزیں شامل ہوتی ہیں؟ چنانچہ عام طور سے میت کے ذاتی استعمال کی چھوٹی موٹی چیزوں بلکہ بعض اوقات گھر کے ساز و سامان تک کو ترکے کی تقسیم میں شامل نہیں کیا جاتا۔ پھر نہ لوگوں کو "حقوق متقدمہ علی الارث" کا مطلب معلوم ہے، اور نہ اُن کے مصداق کا پتہ ہے، اس لیے حضرت والد صاحبؒ نے میراث کے مسائل میں اس جملے کے بجائے حسب ذیل طویل عبارت لکھوانی شروع کی کہ:

"صورت مسئولہ میں مرحوم نے جو کچھ نقدی، زیور، جائیداد یا چھوٹا بڑا سامان چھوڑا ہو اس میں سے پہلے مرحوم کی تجہیز و تکفین کے متوسط اخراجات نکالے جائیں، پھر اگر مرحوم کے ذمے کچھ قرض ہو تو وہ ادا کیا جائے، اور بیوی کا مہر اگر ابھی تک ادا نہیں کیا تو وہ بھی دَین میں شامل ہے، اس کو ادا کیا جائے۔ پھر اگر مرحوم نے کوئی جائز وصیت کسی غیر وارث کے حق میں کی ہو تو ۱/۳ کی حد تک اس کے مطابق عمل کیا جائے، اس کے بعد جو ترکہ بچے اُسے حسب ذیل تفصیل کے مطابق تقسیم کیا جائے الخ"

یہ تو ایک مثال تھی، ورنہ حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فتویٰ نویسی کے پورے اسلوب میں عام روش سے ہٹ کر ایسا طریقہ اختیار کیا ہے جس سے ایک طرف فتویٰ کی شوکت اور فقہی بانکپن برقرار رہیں اور دوسری طرف اس کی عبارت میں سلاست اور عام فہمی پیدا ہو جائے۔ چنانچہ جو حضرات آپ سے فتویٰ کی تربیت لیتے اُن کو بھی آپ اس بات کی تاکید فرماتے، اس کی باقاعدہ مشق کراتے اور ان کی عبارت کی اصلاح پر کافی وقت خرچ کرتے تھے۔

(۷) مفصل فتووں میں بعض اوقات مسئلے کے احکام اس کے دلائل اور شبہات کے جواب اس طرح گڈمڈ ہو جاتے ہیں کہ عام پڑھنے والے کا ذہن اُلجھ جاتا ہے اور سوال کا جواب

معلوم کرنے کے لیے نہ صرف پورا فتویٰ پڑھنا پڑتا ہے، بلکہ بعض اوقات پورے فتوے کو پڑھ کر بھی بآسانی جواب کا خلاصہ ذہن میں نہیں بیٹھتا۔ حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا انداز فتویٰ تحریر جس کی آپ دوسروں کو بھی تاکید فرماتے تھے۔ اس سے مختلف تھا۔ آپ فرماتے تھے کہ فتویٰ میں مسئلے کا مختصر حکم اور اس کے مفصل دلائل بالکل ممتاز ہونے چاہئیں، تاکہ جو شخص صرف حکم معلوم کرنا چاہتا ہو وہ بآسانی حکم معلوم کرلے، اور جس شخص کو دلائل سے دلچسپی ہو وہ دلائل بھی پڑھے۔ فتوے میں عام آدمی کے لیے تو صرف حکم ہی ہوتا ہے، اور دلائل اہل علم کیلئے ہوتے ہیں۔ اس لیے ایک عام آدمی کو فتوے کے شروع ہی میں مختصراً یہ بات واضح طور پر معلوم ہو جانی چاہیے کہ جس چیز کے بارے میں سوال کیا گیا ہے اس کا مختصر جواب کیا ہے؟ اس جواب کے بعد اہل علم کے لیے دلائل کی تفصیل، حوالے اور شبہات کے جواب جتنی تفصیل سے چاہیں دے دیے جائیں۔

چنانچہ حضرت والد صاحبؒ کے فتووں میں یہ بات واضح طور پر نظر آتی ہے کہ فتوے کے شروع یا آخر میں بالکل نمایاں اور ممتاز طریقے پر مسئلے کا واضح جواب لکھ دیتے ہیں اور زیادہ تر یہ جواب شروع میں ہوتا ہے۔

حضرت والد صاحبؒ فرماتے تھے کہ قدیم فقہاء اور مفتی حضرات کا طریقہ یہی تھا اور ایک روز احقر کو غالباً حضرت شاہ جلال صاحب تھانیسریؒ کے بعض فتاویٰ دکھائے جو اپنے موضوع پر مفصل فتاویٰ تھے، لیکن ان کا طریقہ یہ تھا کہ سائل نے کسی چیز کے بارے میں یہ پوچھا تھا کہ حل یجوز؟ اس پر حضرت شاہ جلال صاحبؒ نے شروع میں لکھا تھا: الجواب: نعم، یجوز، اور اس کے بعد دلائل کی مفصل بحث فرمائی تھی، حضرت والد صاحبؒ نے اس کو بطور مثال پیش کر کے فرمایا کہ یہ فتویٰ نویسی کا بہترین اسلوب ہے کہ پڑھنے والے کو سوال کا جواب تو پہلے ایک ہی لفظ سے مل گیا۔ اب اگر کوئی دلائل پڑھنا چاہتا ہے تو پڑھے اور نہیں پڑھنا چاہتا تو چھوڑ دے۔ نرا حکم معلوم کرنے کے لیے پورا مفصل فتویٰ پڑھنے کی ضرورت نہیں۔

(۱۰) اسی طرح سوال بعض اوقات تہ در تہ ہوتا ہے، اور سوال کرنے والا تمام باتوں

کو گڈ مڈ کر کے پوچھتا ہے، ایسے مواقع پر حضرت والد صاحبؒ کا طریقہ یہ تھا کہ جواب میں پہلے سوال کا تجزیہ خود فرماتے اور یہ تنقیح فرما دیتے کہ اس مسئلے میں فلاں فلاں باتیں قابلِ غور ہیں۔ پھر ان میں سے ہر ایک پر نمبروار بحث فرماتے تھے، اس طرح مسئلے کے تمام گوشے پوری طرح واضح ہو کر سامنے آجاتے تھے، اور مسئلے کی تفہیم میں کوئی پیچیدگی باقی نہ رہتی تھی۔

فتویٰ کے کام کی عظمت و اہمیت

حضرت والد صاحب قدس سرہٗ سے اللہ تعالیٰ نے یوں تو دین کی بے شمار خدمتیں لیں جن میں تدریس، تصنیف، وعظ، اصلاح و ارشاد، اقامتِ دین اور اعلاء کلمۃ الحق کے لیے سیاسی جدوجہد وغیرہ۔ لیکن ان تمام خدمات میں سے وہ خدمت جو آپ کی زندگی کا جزء بن گئی تھی، فتویٰ کی خدمت تھی جو مفتی کے منصب پر فائز ہونے کے بعد شاید ایک دن کے لیے بھی نہیں چھوٹی، یہاں تک کہ زندگی کا آخری کام جو وفات سے چند گھنٹے پہلے انجام دیا، وہ بھی ایک استفتاء کا جواب تھا، دوسری خدمات اپنے اپنے وقت کے ساتھ مخصوص رہیں اور ان کی انجام دہی میں وقفے آتے رہے، لیکن فتویٰ کا کام سفر و حضر، صحت و علالت، مصروفیت و فراغت، تنگدستی و خوشحالی کسی بھی حالت میں نہیں چھوٹا، آپ سفر میں جاتے تو ڈاک کا ایک ضخیم پیکٹ ساتھ ہوتا اور چلتی ہوئی ریل میں بھی، جب کہ عام آدمیوں کے لیے لکھنا ممکن نہیں ہوتا، ڈاک کا جواب برابر جاری رہتا تھا۔

ایک روز آپ نے فتویٰ کے ساتھ اس قدر شغف اور انہماک کا سبب خود بیان فرمایا جس سے اس طرزِ عمل کی حقیقت واضح ہوتی۔ فرمایا کہ دینی خدمت کے جتنے شعبے ہیں ان میں سے فتویٰ وہ شعبہ ہے جس کا فائدہ نقد ظاہر ہو جاتا ہے، انسان تصنیف کرتا ہے تو اُسے معلوم نہیں ہوتا کہ اسے کتنے لوگ پڑھیں گے؟ اور جو لوگ پڑھیں گے وہ اس پر عمل کریں گے یا نہیں؟ اسی طرح وعظ و تقریر کرنے والے کو یہ اندازہ نہیں ہوتا کہ

اس کے بیان سے کوئی متاثر ہوکر اس کی بتائی ہوئی بات پر عمل کرے گا یا نہیں، یہی حال تدریس کا ہے کہ طلبہ میں سے کتنے لوگ اس سے حقیقی فائدہ اٹھائیں گے، یہ معلوم نہیں ہوتا، اس کے برخلاف مفتی کے پاس عموماً وہی شخص سوال بھیجتا ہے جسے دین کی طلب ہوتی ہے اور جو مفتی کے فتوے کے مطابق عمل کرنا چاہتا ہے، اور عام طور سے اس پر عمل کر بھی لیتا ہے، اس لیے اس کا دائرہ اگرچہ بظاہر محدود ہے، لیکن نقد اور متعین ہے، اس کے علاوہ اس خدمت میں شہرت طلبی وغیرہ کے مکائد نفس دوسری خدمات کے مقابلے میں کم ہیں، اس لیے اس میں اجر و ثواب کی امید زیادہ ہے۔

یوں تو نقد و فتویٰ کے بارے میں حضرت والد صاحبؒ کا مزاج و مذاق اور اس شعبے میں آپ کی خدمت ایک وسیع موضوع ہے جس کا احاطہ مجھ جیسے کم سواد اور نااہل کے لیے ممکن ہے اور نہ کسی مختصر مقالے میں اس کا حق ادا ہوسکتا ہے، لیکن چند موٹی موٹی باتیں جو اس وقت یاد آگئیں، انہیں بے ربط سے انداز میں پیش کر دیا ہے اور فی الوقت اس سلسلے میں اسی پر اکتفا کرتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ اس کو میرے اور پڑھنے والے حضرات کے لیے نافع و مفید بنائے۔ آمین۔

علمِ حدیث

علمِ حدیث وہ علم ہے جس کے بارے میں حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ بڑی حسرت کے ساتھ فرمایا کرتے تھے کہ اس سے میرا اشتغال بہت کم رہا۔ لیکن حضرتؒ کی یہ حسرت اُن کے اپنے مقام کے اعتبار سے تھی، ورنہ اس علم میں بھی آپ سے ایسی باتیں سننے میں آتی تھیں کہ ہم جیسے طالب علموں کو حیرت ہو جاتی تھی۔

سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ آپ نے علمِ حدیث حضرت علامہ انور شاہ صاحب کشمیریؒ سے حاصل کیا جن کو اپنے زمانے کا حافظ ابن حجرؒ کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔ آپ نے حضرت شاہ صاحبؒ سے دورۂ حدیث بڑے ذوق و شوق اور اہتمام کے ساتھ پڑھا، اور حضرت شاہ صاحبؒ کی تقریر بخاریؒ اور تقریر ترمذیؒ درس کے دوران ہی عربی زبان

میں قلمبند فرمائی۔ حضرت شاہ صاحبؒ کو بھی حضرت والد صاحبؒ سے بڑی محبت تھی، اور درس کے دوران آپ سے خصوصی خطاب فرمایا کرتے تھے۔ والد صاحبؒ نے بارہا سنایا کہ ایک مرتبہ درس کے آغاز میں میں نے کسی حدیث پر بحث کے دوران یہ سوال کیا کہ: "حضرت! یہ تو ثقہ کی زیادتی ہے، اس لیے مقبول ہونی چاہیے"۔ حضرت شاہ صاحبؒ نے اس پر مفصل تقریر فرمائی اور بتایا کہ زیادۃ الثقۃ مقبولۃ کا قاعدہ اتنا عام نہیں ہے جتنا اسے سمجھا جاتا ہے، اور حافظ زیلعیؒ نے نصب الرایہ میں اس پر مفصل بحث کی ہے اور اس کے اصول بتائے ہیں۔ والد صاحبؒ فرماتے ہیں کہ احقر کو اطمینان ہو گیا لیکن اس کے بعد پورے سال یہ معمول رہا کہ جہاں کسی ثقہ کی زیادتی پر کوئی جرح ہوتی، حضرت شاہ صاحبؒ مجھے خطاب کر کے فرماتے: "کہاں گیا وہ ثقہ کی زیادتی والا؟"

حضرت شاہ صاحبؒ کی تقریر بخاری جو والد صاحبؒ نے ضبط فرمائی تھی وہ کسی صاحب ذوق کی بد مذاقی کی نذر ہو گئی۔ البتہ تقریر ترمذی محفوظ رہی۔ بعد میں جب العرف الشذی اور الکوکب الدری چھپ کر آئیں تو حضرت والد صاحبؒ نے احقر کے عم محترم حضرت مولانا ظہور احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ سابق استاذ حدیث دارالعلوم دیوبند سے اس کو صاف نقل کرایا، اور اس کے حواشی پر العرف الشذی اور الکوکب الدری کی زائد باتیں نقل کرائیں اس طرح یہ ایک بڑا مفید مجموعہ ہو گیا ہے، اور حضرت مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلوی قدس سرہٗ نے ایک مرتبہ اسے خصوصی فرمائش کر کے منگوایا، اور اس سے استفادہ فرمایا۔ احقر نے حضرت والد صاحبؒ سے اسے شائع کرنے کی درخواست کی تو فرمایا کہ اس پر نظر ثانی کر کے یہ دیکھنا ہے کہ العرف الشذی، الکوکب الدری اور معارف السنن کے منظر عام پر آجانے کے بعد اس کی اشاعت مفید بھی ہو گی یا نہیں۔ لیکن پھر اس کی نوبت نہ آسکی۔

دارالعلوم دیوبند سے فراغت کے بعد کافی عرصے تک حضرت والد صاحب قدس سرہٗ کو حدیث کی تدریس کی نوبت نہیں آئی اور پھر شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی قدس سرہٗ کی تحریک پر آپ نے دارالعلوم دیوبند میں درس حدیث شروع فرمایا جس

کا واقعہ میں اپنے دوسرے مضمون "حضرتؒ کے شیوخ و اکابرؒ" میں لکھ چکا ہوں۔ چنانچہ یہاں آپ نے شروع میں موطأ امام مالکؒ، موطأ امام محمدؒ، سنن نسائیؒ اور طحاوی شریف کا درس دیا۔ اُس زمانے میں ابوداؤد کا درس حضرت میاں صاحب مولانا سید اصغر حسین صاحب قدس سرہٗ کے سپرد تھا۔ ایک مرتبہ آپ علیل ہو گئے تو اُن کی جگہ آپ نے ابوداؤد کا درس دیا۔ اس کے بعد کئی سال تک یہ سلسلہ رہا کہ ابوداؤد کا آغاز حضرت میاں صاحبؒ فرماتے اور ابتدائی چند ابواب کے بعد اس کی تکمیل حضرت والد صاحبؒ فرمایا کرتے تھے، یہاں تک کہ عملاً یہ درس بھی سالہا سال آپ کے پاس رہا۔

دارالعلوم دیوبند سے مستعفی ہونے کے بعد ایک مرتبہ شیخ الاسلام حضرت علامہ شبیر احمد صاحب عثمانی قدس سرہٗ (جو اُس وقت ڈابھیل میں صحیح بخاریؒ کا درس دیتے تھے) علیل ہو گئے تو آپ نے اپنی جگہ صحیح بخاری کی تدریس کے لیے حضرت والد صاحبؒ کا انتخاب فرمایا، چنانچہ آپ ڈابھیل تشریف لے گئے اور حضرت علامہ عثمانیؒ کے قائم مقام کی حیثیت سے وہاں چند ماہ صحیح بخاریؒ کا درس دیا۔

پاکستان بننے کے بعد جب آپ نے دارالعلوم کراچی کی بنیاد ڈالی تو یہاں اپنی گوناگوں مصروفیات کے باوجود ہر سال حدیث کا کوئی نہ کوئی سبق آپ نے اپنے پاس رکھا۔ دارالعلوم کے سب سے پہلے سال یہاں دورۂ حدیث کا انتظام نہ تھا، اُس سال مشکوٰۃ شریف آپ ہی نے پڑھائی، اور اس کے بعد جب دورۂ حدیث کا آغاز ہوا تو اپنی ہمہ جہتی مصروفیات کے سبب بخاری شریف کی تدریس آپ کے لیے ممکن نہ تھی۔ اس لیے عموماً موطأ امام مالکؒ آپ پڑھاتے رہے۔ لیکن جب دارالعلوم کورنگی میں منتقل ہوا اور آپ ملکی مصروفیات سے کنارہ کش ہو گئے تو پھر صحیح بخاریؒ کا درس کئی سال تک آپ کے پاس رہا۔

جس سال احقر اور برادرِ مکرم حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب مدظلہم نے دورۂ حدیث کیا۔ اُس سال آپ چونکہ شہر میں مقیم تھے۔ اس لیے موطأ امام مالکؒ اور شمائل ترمذیؒ کا درس آپ نے اپنے ذمے لیا تھا۔ چنانچہ یہ دونوں کتابیں ہمیں آپ ہی سے پڑھنے کی سعادت حاصل ہوئی۔ آپ کے درس کی چند خصوصیات یہ تھیں:-

(۱) چونکہ حدیث میں آپ حضرت علامہ انور شاہ صاحب کشمیری قدس سرہٗ کے شاگرد رشید تھے، اس لیے درسِ حدیث میں تحقیقی مذاق آپ کو اپنے شیخ سے ورثے میں ملا تھا۔ لیکن آج کل ایسا بکثرت ہونے لگا ہے کہ تحقیقی مباحث کے پھیلاؤ میں حدیث کا متن، اس کے معانی و مطالب، اس کا اصل پیغام اور اس سے حاصل ہونے والے عملی فوائد پس پشت چلے جاتے ہیں اور استاذ و طالب علم کی تمام تر توجہ فقہی اختلافات، سند کی بحثوں اور رواۃ کی جرح و تعدیل پر مرکوز ہو جاتی ہے۔ حضرت والد صاحب قدس سرہٗ اس رُجحان کے سخت خلاف تھے، اور فرمایا کرتے تھے کہ اس طرزِ عمل کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے کچھ لوگ آم کے درخت کے نیچے جمع ہو کر آم کی تاریخ اُس کی مختلف قسموں اور اس کے رنگ و بُو پر بحث کر کے اُٹھ جائیں اور انہیں عمر بھر آم کھانے کی توفیق نہ ہو۔ چنانچہ اس طرزِ عمل کا نتیجہ بسا اوقات یہ ہوتا ہے کہ طالب علم کو حدیث کے متعلقہ مشہور فقہی اور اسنادی مباحث تو یاد ہو جاتے ہیں، لیکن متنِ حدیث یاد نہیں ہوتا، اور بعض اوقات نہ اُس کا صحیح ترجمہ کرنے کی اہلیت پیدا ہوتی ہے، اور نہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ زندگی کے عملی مسائل میں اس حدیث سے کیا رہنمائی ملتی ہے؟ حالانکہ حدیث کو پڑھنے پڑھانے کا اصل مقصد یہی تھا، اور باقی تمام مباحث اضافی حیثیت رکھتے ہیں۔ چنانچہ حضرت والد صاحب قدس سرہٗ درس میں تحقیقی مباحث کے ساتھ ساتھ اس پہلو پر بھی پوری اہمیت کے ساتھ زور دیتے تھے۔

(۲) اللہ تبارک و تعالیٰ نے حضرتؒ کو فقہی مزاج عطا فرمایا تھا، اس لیے احادیث سے زندگی کے عام مسائل کے بارے میں جو ہدایات ملتی ہیں اُن کے استنباط کا آپ کو خصوصی ذوق تھا، اور آپ کے درس میں بیٹھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ جن احادیث کو ہم روزمرّہ پڑھتے ہیں۔ اور اُن کو محض کسی مشہور فقہی مسئلے سے متعلق سمجھ کر گزر جاتے تھے، اُن میں دوسری ضمنی ہدایات کا کیا جہان پوشیدہ ہے؟ حضرت والد صاحب قدس سرہٗ فرمایا کرتے تھے کہ حافظ ابن حجرؒ نے فتح الباری میں اور علامہ نوویؒ نے شرح مسلم میں شرح حدیث کے اس پہلو کا بھی حق ادا کیا ہے، وہ جہاں حدیث کے مرکزی موضوع پر مفصل بحث کرتے ہیں، وہاں اُن سے حاصل ہونے والی دوسری ہدایات پر بھی "وفیہ... وفیہ" کہہ کر متنبہ فرماتے

جاتے ہیں۔

مثلاً حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی معروف حدیث صحاح میں موجود ہے کہ کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یسمر مع ابی بکر فی امر من امور المسلمین وانا معھما یعنی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت صدیق اکبرؓ سے عشا کے بعد مسلمانوں کے کسی معاملے میں گفتگو فرمایا کرتے تھے، اور میں بھی ان دونوں حضرات کے ساتھ ہوتا تھا۔ اس حدیث کا اصل موضوع یہ بتانا ہے کہ اگر کوئی دینی ضرورت درپیش ہو تو عشا کے بعد گفتگو کرنا جائز ہے۔ چنانچہ یہ حدیث عموماً "سمر بعد العشاء" (عشاء کے بعد باتیں کرنے) کے باب میں ذکر ہوتی ہے، اور یہی مسئلہ اس میں زیر بحث آتا ہے، لیکن اس مسئلے کی توضیح کے بعد حضرت والد صاحب قدس سرہٗ فرماتے کہ یہاں یہ بات بطور خاص دیکھنے کی ہے کہ حضرت عمرؓ نے یوں نہیں فرمایا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مجھ سے اور صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے گفتگو فرماتے تھے، بلکہ یہ فرمایا کہ حضرت ابوبکرؓ سے گفتگو فرماتے تھے اور میں بھی اُن کے ساتھ ہوتا تھا۔ اس طرح حضرت فاروق اعظمؓ نے یہ ادب سکھایا کہ جب کسی ایسے کام کا تذکرہ کرنا ہو جو تم نے اپنے کسی بڑے کے ساتھ مل کر کیا ہو تو یوں نہ کہو کہ یہ کام میں نے اور میرے فلاں بزرگ نے مل کر انجام دیا، کیونکہ اس میں دونوں کی برابری کا شبہ ہوتا ہے، اس کے بجائے ادب کا تقاضا یہ ہے کہ یوں کہا جائے کہ فلاں بزرگ نے یہ کام کیا اور میں بھی ان کے ساتھ تھا۔ فرمایا کہ آج لوگوں کا حال یہ ہے کہ اگر ذرا کسی کام سے کسی کا دامن چھوجائے تو اُسے بلاشرکت غیرے اپنی طرف منسوب کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور حضرات صحابہ کرامؓ کا حال یہ تھا کہ کوئی کام واقعۃً خود کیا ہو تب بھی اُسے اپنے بجائے اپنے کسی بڑے کے کھاتے میں ڈالنے کی کوشش فرماتے تھے۔

غرض اس طرح حضرت والد صاحب قدس سرہٗ کو احادیث سے اس قسم کے فوائد مستنبط فرمانے کا خاص ذوق تھا، اور یہ اُن کے درس حدیث کی وہ خصوصیت تھی جو دوسری جگہ کم نظر آتی ہے۔ چنانچہ آپ کے درس حدیث سے جہاں تحقیقی معلومات کا ایک ذخیرہ طالب علم کو حاصل ہوتا تھا، وہاں تواضع، ایثار، خشیت و للہیت اور

دوسرے اسلامی اخلاق وآداب کی تعلیم بھی ساتھ ساتھ حاصل ہوتی رہتی تھی۔

(۳) آجکل اکثر وبیشتر مدارس میں درسِ حدیث کا یہ طریقہ عام ہوگیا ہے کہ حدیث کے جو ابواب مفصّل فقہی اور اختلافی مباحث پر مشتمل ہوتے ہیں اُن میں تو تقریر بڑے زور وشور سے ہوتی ہے۔ لیکن اُن مخصوص ابواب کے بعد درس اتنی تیزی سے چلتا ہے کہ طلبہ حدیث کے مفہوم سے بھی بےخبر رہتے ہیں، چنانچہ فضائل ومناقب، آداب واخلاق، سیر ومغازی، فتن اور اشراط ساعة اور تفسیر جیسے ابواب عموماً اس طرح گزر جاتے ہیں کہ طالب علم استاذ کے سامنے احادیث کی ضروری تلاوت کر لیتا ہے، اور بس! حضرت والدصاحب قدس سرہٗ اس طرزِ عمل کے سخت مخالف تھے۔ وہ فرمایا کرتے تھے کہ درسِ حدیث میں روایۃً اور درایۃً کی تفریق عہدِ حاضر کی بدعت ہے۔ اسلاف میں اس کا کوئی نشان نہیں ملتا کہ بعض ابواب پر بحث کے دوران انتہا درجے کی تحقیق کا مظاہرہ کیا جائے، اور بعض کو تشریح مفہوم کے قابل بھی نہ سمجھا جائے۔ اس کے بجائے درسِ حدیث شروع سال سے اس معتدل انداز پر ہونا چاہیے کہ تمام ابواب کے تحت ضروری معلومات طالب علم کے سامنے آجائیں اور درسِ حدیث کا اصل فائدہ حاصل ہو۔

(۴) حضرت والدصاحبؒ فرمایا کرتے تھے کہ درسِ حدیث میں جو فقہی اختلافات اور اُن کے مفصل دلائل بیان کیے جاتے ہیں، اُن کا مقصد جہاں اپنے مسلک کے دلائل کی وضاحت اور شبہات کا ازالہ ہوتا ہے، وہاں اصل مقصد طالب علم میں تحقیق ونظر کی صلاحیت پیدا کرنا ہے تاکہ اس پر یہ بات واضح ہوجائے کہ حدیث سے مسائل واحکام کا استخراج، متعارض احادیث میں تطبیق اور احادیث میں صحیح وسقم کی تحقیق کن اصولوں کے تحت کس طرح کی جاتی ہے؛ چنانچہ جب سال بھر تک اس قسم کے مباحث طالب علم کے سامنے آتے رہتے ہیں تو اس سے ایک مزاج پیدا ہوجاتا ہے جس کے ذریعے وہ آئندہ اپنی بساط کے مطابق تحقیقی کام کر سکتا ہے۔ لہذا ان مباحث کے دوران اُستاذ کو چاہیے کہ وہ یہ دیکھتا رہے کہ طالب علم میں یہ مزاج پیدا ہوا یا نہیں، اُستاذ کی تقریر کے ایک ایک لفظ کو یاد رکھنا طالب علم کی کامیابی کے لیے ضروری نہیں۔ لیکن جن اصولوں کے تحت یہ مباحث

ہوتے ہیں اُن کا محفوظ ہوجانا ضروری ہے۔

(۵) اور چونکہ ان مباحث کا مقصد وہ ہے جو اُوپر بیان ہوا، اس لیے ان مباحث میں جو مسائل ائمہ مجتہدین کے باہمی اختلافات سے متعلق ہیں۔ اُن کو بیان کرتے وقت یہ انداز اختیار نہیں کرنا چاہیئے جیسے حق و باطل کے درمیان معرکہ درپیش ہے۔ یہ اختلافات مکمل طور سے اخلاص اور علمی دیانتداری پر مبنی ہیں۔ اور ان کا حاصل زیادہ سے زیادہ یہ ہے کہ اپنے مسلک کو "صواب محتمل الخطاء" اور دوسرے کے مسلک کو "خطاء محتمل الصواب" قرار دیا جاتے، لہٰذا ان مسائل پر گفتگو کے دوران فریق ثانی کے احترام کو پوری طرح محفوظ رکھنا لازمی ہے، اور اس سلسلے میں مناظرانہ انداز سے مکمل اجتناب کرنا چاہیئے۔ جو حضرات جوش تقریر میں امام بخاریؒ، امام دارقطنیؒ، امام بیہقیؒ یا حافظ ابن حجرؒ کی تردید کرتے ہوئے ان کے بارے میں ایسے کلمات کہہ دیتے ہیں جو ان حضرات کے شایان شان نہیں ہوتے۔ حضرت والد صاحبؒ ان پر سخت نکیر فرمایا کرتے تھے، اور اپنے استاذ حضرت علامہ انور شاہ صاحب کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کا یہ ارشاد نقل فرمایا کرتے تھے کہ "حافظ ابن حجرؒ ہوں یا علامہ عینیؒ، یہ سب حضرات صدیوں پہلے جنت میں اپنے خیمے گاڑ چکے ہیں، اُن کی شان میں کوئی نامناسب بات کہہ کر اپنی عاقبت خراب نہ کرو"

(۶) اسی طرح حضرت والد صاحب قدس سرہٗ اس طرز عمل کے بھی سخت مخالف تھے کہ کسی خاص مسلک کے دفاع کرتے ہوئے کسی حدیث کو زبردستی کھینچ تان کر اُس مسلک پر فٹ کرنے کی کوشش کی جائے اور اس کے لیے دور از کار تاویلات کا راستہ اختیار کیا جائے۔ اس کے بجائے آپ کا طرز عمل یہ تھا کہ اگر قرآن و سنّت کے دوسرے دلائل کی روشنی میں حدیث کی کوئی بے تکلف توجیہ ہوسکتی ہو تو اسے اختیار کیا جائے، اور اگر ایسا ممکن نہ ہو تو واضح طور پر یہ اعتراف کرلیا جائے کہ اس سے فلاں مجتہد کا مسلک ثابت ہوتا ہے، البتہ اُس کے مقابلے میں اپنے امام کی دلیل اور ان کے قول کا ماخذ بھی بیان کردیا جائے، اور اس کی جو بے تکلف وجوہ ترجیح موجود ہوں انہیں واضح کردیا جائے۔ حضرتؒ فرمایا کرتے تھے کہ ائمہ مجتہدین کا اختلاف تو پیدا ہی اس مقام پر ہے جہاں دلائل کی رُو سے دونوں پہلو

کی گنجائش موجود تھی، لہٰذا یہ ثابت کرنے کی فکر کہ دوسرا مسلک بلا دلیل ہے، بڑی نادانی کی بات ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ دلائل دونوں طرف موجود ہیں، اور کسی ایک مجتہد کی تقلید تو کی ہی اس مقام پر جاتی ہے جہاں دلائل متعارض ہوں، اس لیے اگر کسی حدیث کے بارے میں یہ مان لیا جائے کہ یہ شافعیہ، یا حنابلہ، یا مالکیہ کے مسلک پر دلالت کرتی ہے تو یہ واقع کے عین مطابق ہوگا، کیونکہ اگر اس مسلک پر کوئی دلیل نہ ہوتی تو یہ حضرات اسے اختیار ہی کیوں فرماتے۔

اسی ضمن میں حضرت والد صاحبؒ نے فرمایا کہ میں نے ۱۳۴۵ھ میں جو پہلا حج کیا تو وہاں حرم مکہ میں حدیث کے مختلف درس ہوا کرتے تھے، ان میں شرکت کی تو ان کا طریقہ بہت پسند آیا کہ وہ حدیث میں تاویلات کرنے کے بجائے ایک ہی باب کی مختلف احادیث آئیں تو حدیث کے تحت فرماتے فیہ حجۃ ساداتنا المالکیۃ پھر اس کے مخالف دوسری حدیث آتی ہو تو فرماتے: فیہ حجۃ ساداتنا الحنفیۃ۔

علمِ حدیث سے متعلق تصانیف

جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا، خود حضرت والد صاحبؒ کے بقول، علمِ حدیث آپ کا خصوصی موضوع نہیں رہا، لیکن ضرورت کے مطابق اس علم میں بھی آپ کی متعدد تصانیف موجود ہیں:

ان میں سے ایک نمایاں کتاب "التصریح بما تواتر فی نزول المسیح" ہے جو عقیدۂ نزولِ مسیح سے متعلق احادیث کا جامع ترین ذخیرہ ہے۔ اس کتاب کا ابتدائی مواد حضرت علامہ سید انور شاہ صاحب کشمیری قدس سرہ نے جمع فرمایا تھا، پھر اس کی تالیف و ترتیب حضرت والد صاحبؒ کے سپرد فرمادی۔ چنانچہ جب آپ نے اسے مرتب فرما کر حضرت شاہ صاحبؒ کی خدمت میں پیش کیا تو حضرت شاہ صاحبؒ نے بہت دعائیں دیں اور حاضرین مجلس سے مخاطب ہو کر فرمایا: "دیکھو بھائی، محنت تو ہم کرتے ہیں، اور ثواب یہ صاحب لے اڑتا ہے۔" اس کتاب کا مفصل تعارف حضرت مولانا محمد اشرف صاحب مدظلہم نے اپنے مقالے

"حکیم الامتؒ کے علمی جانشین" میں کرادیا ہے جو اسی نمبر میں شامل ہے۔ اس کتاب کا اردو ترجمہ مع تحقیق وتشریح برادرِ مکرم حضرت مولانا مفتی محمد رفیع صاحب عثمانی مدظلہم نے کیا ہے جو "علاماتِ قیامت اور نزولِ مسیحؑ" کے نام سے شائع ہوچکا ہے۔

دوسری کتاب "الازدیاد السنی علی الیانع الجنی" ہے۔ حضرت شاہ عبدالغنی صاحب محدث دہلوی قدس سرہٗ کی اسانیدِ کتبِ حدیث کے مؤلفین تک "الیانع الجنی" میں موجود ہیں۔ حضرت والد صاحبؒ نے اس رسالے میں تمام اکابر علمائے دیوبند کی اسانیدِ حدیث حضرت شاہ عبدالغنی صاحب قدس سرہٗ تک جمع فرمائی ہیں۔ اس طرح یہ کتاب تمام بزرگانِ دیوبند کا ثبت ہے جس میں ان حضرات کے مختصر حالات بھی موجود ہیں۔

تیسری کتاب "ختم النبوۃ فی الحدیث" ہے جو ختمِ نبوت پر دلالت کرنے والی احادیث کا جامع ترین ذخیرہ ہے، اور "ختمِ نبوت کامل" کا ایک جزء ہے۔

چوتھا رسالہ "جوامع الکلم" ہے جو درحقیقت اخلاق وآداب سے متعلق ایک چہل حدیث ہے اور "سیرتِ خاتم الانبیاءؐ" کے آخر میں شائع ہوگیا ہے۔

پانچواں رسالہ "آداب النبیؐ" ہے جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے شمائل و اخلاق جمع فرمائے گئے ہیں۔

چھٹا رسالہ "المأمول المقبول فی ظل الرسولؐ" ہے جو "سایۂ رسولؐ" کے نام سے طبع ہوا ہے اور اس میں خصائص کبریٰ کی اس روایت کی مکمل تحقیق ہے جس میں یہ مذکور ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا سایہ نہیں پڑتا تھا۔

اس کے علاوہ ایک چہل حدیث حرمتِ سود سے متعلق "مسئلہ سود" میں شائع ہوئی ہے۔ ایک حرمتِ غناء سے متعلق "احکام القرآن" میں شامل ہے، اور ایک معاشی مسائل سے متعلق چہل حدیث غیر مطبوعہ ہے۔ نیز بعض دوسرے چھوٹے چھوٹے رسائل بھی ایسے ہیں جنہیں علمِ حدیث سے متعلق کہا جاسکتا ہے۔

علمِ تفسیر

عمر کے آخری سالوں میں حضرت والد صاحبؒ فرمایا کرتے تھے کہ مجھے ابتداء میں علم تفسیر کے ساتھ کوئی خصوصی شغف نہیں رہا، لیکن اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے اب سب سے زیادہ دلچسپی مناسبت اور شغف علم تفسیر کے ساتھ معلوم ہوتا ہے اور دُعا ہے کہ اسی پر میرا خاتمہ ہو۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے آپ کی یہ دُعا قبول فرمائی، اور جس علم کے ساتھ آپ کو سب سے زیادہ دلچسپی آخر وقت تک قائم رہی، وہ علمِ تفسیر ہی تھا۔

یوں تو دارالعلوم دیوبند میں تدریس کے علاوہ آپ کو تفسیر جلالین اور بیضاوی پڑھانے کی نوبت آئی، اور ایک عرصے تک دورۂ تفسیر کے بعض اسباق تفسیر ابن کثیر وغیرہ بھی آپ کے ذمے رہے۔ لیکن اُس زمانے میں خصوصی شغف علمِ فقہ اور فتویٰ کے ساتھ تھا، پھر جب دارالعلوم دیوبند سے مستعفی ہونے کے بعد حکیم الامت حضرت تھانوی قدس سرہٗ نے "احکام القرآن" کا کام آپ کے سپرد فرمایا تو اُس زمانے میں تفسیر سے خصوصی اشتغال کی نوبت آئی۔ پھر ہجرتِ پاکستان کے بعد بھی مسجد باب الاسلام کراچی میں روزانہ اور ریڈیو پر ہفتہ وار درسِ قرآن کا سلسلہ رہا جو بالآخر "معارف القرآن" جیسی عظیم تفسیر کی شکل میں منظرِ عام پر آیا۔ اس پورے زمانے میں قرآن کریم ہی آپ کی دلچسپیوں اور غور و تدبر کا محور رہا۔

حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو تلاوتِ قرآن کا خاص ذوق تھا۔ خاص طور پر عمر کے آخری پندرہ بیس سالوں میں آپ گوناگوں مصروفیات کے باوجود بڑے اہتمام کے ساتھ کئی کئی پارے روزانہ تلاوت کے لیے وقت نکالتے تھے، ایک چھوٹی سی حمائل ہمیشہ آپ کے دستی بیگ میں ساتھ رہتی تھی، اور جب کبھی ذرا موقع ملتا، آپ اس میں تلاوت شروع فرمادیتے، خاص طور سے جب آپ کو کہیں جانا ہوتا تو کار میں سفر کے دوران بیشتر وقت آپ تلاوت میں صرف فرماتے، اس کے علاوہ گھر میں نمازِ فجر اور نمازِ عصر کے بعد آپ کی تلاوت کے خاص اوقات تھے۔

آپ کی یہ تلاوت محض برائے تلاوت ہی نہیں ہوتی تھی، بلکہ اس دوران آپ قرآنِ کریم میں تدبر فرماتے تھے، احقر نے بارہا دیکھا کہ تلاوت کے دوران آپ اچانک رُک گئے ہیں، اور دیر تک ایک ہی آیت کو بار بار پڑھ کر اس پر غور فرما رہے ہیں۔ اس تدبر کے دوران

اللہ تعالیٰ آپ پر قرآن کریم کے حقائق ومعارف سے متعلق عجیب وغریب نکات منکشف فرماتے تھے۔ جب کبھی تلاوت کے وقت ہم لوگ آپ کے پاس بیٹھے ہوتے تو اکثر یہ نوادر نکات ہمیں بھی بتلادیا کرتے تھے، اور بسا اوقات ایسا بھی ہوتا کہ تلاوت کرتے ہوتے آپ احقر کو یا برادر مکرم حضرت مولانا مفتی محمد رفیع صاحب عثمانی مدظلہ کو باقاعدہ متوجہ فرماتے، اور ہم سے سوال کرتے کہ دیکھو، اس آیت میں یہ لفظ استعمال ہوا ہے۔ حالانکہ بات دوسرے لفظ سے بھی واضح ہوسکتی تھی، خاص طور پر اس لفظ کے انتخاب میں کیا حکمت ہے۔ اور جب ہم عام طور سے جواب نہ دے پاتے تو پھر خود ہی کوئی لطیف نکتہ بیان فرماتے جس سے مشامِ روح معطر ہوجاتا۔

جہاں تک حضرت والد صاحبؒ کی تفسیری خدمات کا تعلق ہے، اُن کا مفصل تذکرہ اسی نمبر میں حضرت مولانا عبدالشکور ترمذی، حضرت مولانا محمد اشرف خان صاحب اور مولانا حسین احمد نجیب کے مضامین میں آگیا ہے۔ یہاں اعادہ کی ضرورت نہیں۔ البتہ متفرق اوقات میں آپ سے جو تفسیری فوائد سُنے اُن میں سے چند ذکر کرنے کو دل چاہتا ہے۔

چند اہم تفسیری نکات

(۱) فرمایا کہ قرآن کریم کی آیت ہے کہ: وَلَقَدْ عَلِمُوْا لَمَنِ اشْتَرٰىهُ مَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ وَلَبِئْسَ مَا شَرَوْا بِهٖٓ اَنْفُسَهُمْ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ (البقرۃ ۲: ۱۰۲)

اور بلاشبہ انہیں اس بات کا علم ہے کہ جو لوگ یہ (جادو) مول لیں گے اُن کو آخرت میں کچھ نہ ملے گا اور جس چیز کے بدلے انہوں نے اپنے آپ کو بیچا ہے وہ بہت بُری ہے۔ کاش وہ جانتے!

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے کچھ لوگوں کے لیے بیک وقت علم کا اثبات بھی فرمایا ہے، اور نفی بھی فرمائی ہے۔ یعنی پہلے تو یہ فرمایا کہ "انہیں اس بات کا علم ہے" اور پھر آخر میں فرمایا کہ "کاش وہ جانتے" جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ نہیں جانتے۔ بظاہر تو آیت

کے اول وآخر میں تضاد محسوس ہوتا ہے۔ لیکن درحقیقت اشارہ اس طرف فرمایا گیا ہے کہ لغوی مفہوم کے لحاظ سے تو انہیں علم حاصل ہے، مگر علم کی حقیقت حاصل نہیں، کیونکہ اگر حقیقتِ علم حاصل ہوتی تو علم کے تقاضے پر عمل بھی کرتے، معلوم ہوا کہ حقیقی علم وہی ہے جس پر عمل کیا جائے اور جس علم کے تقاضوں پر عمل نہ ہو وہ کالعدم ہے، اور اس کا کوئی فائدہ نہیں۔

اسی ضمن میں حضرت والا صاحبؒ فرمایا کرتے تھے کہ لغوی اعتبار سے تو موجودہ مخلوقات میں سب سے بڑا عالم شیطان ہے، لہٰذا اگر محض کسی بات کا جاننا انسان کی فضیلت کے لیے کافی ہوتا تو شیطان سب سے افضل ہوتا۔ لیکن کوئی ادنیٰ فہم رکھنے والا شخص بھی اسے افضل قرار نہیں دے سکتا۔ معلوم ہوا کہ فضیلت کی چیز صرف وہ علم ہے جس پر انسان عمل پیرا بھی ہو، ورنہ وہ وبال ہے۔

(۲) فرمایا کہ سورۂ فاتحہ کو قرآن کریم کا خلاصہ کہا گیا ہے، اور علماء نے فرمایا ہے کہ سورۂ فاتحہ کا خلاصہ اھدنا الصراط المستقیم میں ہے، ادھر اللہ تبارک وتعالیٰ نے "الصراط المستقیم" کی تشریح سورۂ فاتحہ کی دو آیتوں میں فرمائی ہے۔ صراطِ مستقیم کی تشریح اس طرح بھی کی جا سکتی تھی کہ وہ قرآن کریم کا بتایا ہوا راستہ ہے لیکن اللہ تبارک وتعالیٰ نے یہاں صراط القرآن کہنے کے بجائے ارشاد فرمایا:۔ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ

راستہ اُن لوگوں کا جن پر آپ نے اپنا انعام فرمایا، نہ کہ ان لوگوں کا جن پر آپ کا غضب نازل ہوا اور نہ گمراہوں کا۔

اسلوبِ بیان سے اس طرف اشارہ ہے کہ "صراطِ مستقیم" محض کتابوں کے پڑھنے پڑھانے سے حاصل نہیں ہوتی، بلکہ اس کے لیے ایسے حضرات سے عملی ہدایات لینے کی ضرورت ہے جن پر اللہ تعالیٰ نے انعام نازل فرمایا، اور ایسے حضرات کی تفصیل قرآن کریم نے دوسری جگہ بیان فرمائی ہے:۔

اولٰئك مع الذين انعم الله عليهم من النبيين
والصديقين والشهداء والصالحين

یہ اُن حضرات کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ نے اپنا انعام فرمایا، یعنی انبیاء، صدیقین، شہدا ، اور صالحین۔

حضرت والد صاحبؒ نے فرمایا کہ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کی ہدایت کے لیے دو سلسلے قائم فرمائے ہیں۔ ایک کتاب اللہ کا سلسلہ، دوسرا رجال اللہ کا۔ اور ہدایت ان دونوں سلسلوں سے وابستہ رہ کر ہی حاصل ہوسکتی ہے۔ لہٰذا جو لوگ سلفِ صالحین کی اتباع کے بغیر صرف کتابوں کے ذریعے ہدایت کے طلب گار ہوں وہ قرآن کریم کے بیان فرمائے ہوئے طریقے سے رُوگردانی کرتے ہیں۔ سورۂ فاتحہ کی مذکورہ آیت کے علاوہ کئی دوسری آیات میں بھی اللہ تعالیٰ نے ہدایت کے حصول کے لیے صلحاء و اولیاء کی صحبت و اتباع کا حکم دیا ہے، چنانچہ ارشاد ہے:۔

وَاتَّبِعْ سَبِيلَ مَنْ أَنَابَ إِلَيَّ

اور پیروی کرو اُن لوگوں کی جو میری طرف رجوع کرتے ہیں۔

ایک اور جگہ ارشاد ہے:۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَكُونُوا مَعَ الصَّادِقِينَ

اے ایمان والو! تقویٰ اختیار کرو، اور صادقین کے ساتھی بن جاؤ۔

اس میں اشارہ فرمایا گیا کہ تقویٰ محض نظریاتی طور پر کچھ باتیں معلوم کر لینے سے نہیں، بلکہ "صادقین" کی صحبت سے حاصل ہوتا ہے، اور "صادقین" کون لوگ ہیں؟ اس کا جواب ایک دوسری آیت میں ہے کہ:۔

لَيْسَ الْبِرَّ أَنْ تُوَلُّوا وُجُوهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ الخ

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے ایمان اور عمل صالح کے بہت سے شعبے بیان فرمائے ہیں، اور ان کے آخر میں ارشاد فرمایا ہے:۔

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ صَدَقُوا وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُتَّقُونَ

یہی لوگ ہیں جنہوں نے صدق اختیار کیا، اور یہی لوگ متقی ہیں۔

(۴) فرمایا کہ قرآن کریم نے حضور سرورِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کے مقاصدِ بعثت اور آپؐ

کے فرائضِ منصبی اس طرح بیان فرماتے ہیں:

لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ (آل عمران: ۱۶۴)

اس آیت میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے تلاوتِ آیات کو ایک مستقل فریضہ قرار دیا ہے، اور تعلیم کتاب کو علیحدہ ذکر فرمایا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ جس طرح قرآن کریم کے معانی و مطالب کی تشریح ضروری ہے، اسی طرح الفاظِ قرآن کی تلاوت مستقل مقصد ہے۔ اس سے اُن لوگوں کی تردید ہو جاتی ہے جو قرآن کریم کی تلاوت کو (معاذ اللہ) بیکار قرار دیتے ہیں۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے "تعلیم کتاب و حکمت" کو الگ ذکر فرمایا ہے اور "تزکیہ" کو علیحدہ۔ اس سے معلوم ہوا کہ محض نظریاتی طور پر تعلیم دے دینے سے اصلاح نہیں ہوا کرتی، بلکہ اُس تعلیم کے مطابق عمل کرانے کے لیے جداگانہ تربیت کی ضرورت ہے اور اس کا ذریعہ صحبت ہے۔ اس سے اُن لوگوں کی تردید ہو گئی جو صرف کتابیں پڑھ لینے کو اصلاح کے لیے کافی سمجھتے ہیں۔

(۵) اللہ تعالیٰ نے میاں بیوی کے تعلقات کو اپنی آیاتِ قدرت میں شمار کر کے ارشاد فرمایا ہے کہ:

وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّرَحْمَةً

اور اللہ نے تمہارے درمیان محبت اور رحمت پیدا فرمائی۔

حضرت والد صاحبؒ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے یہاں دو لفظ استعمال فرمائے، ایک مودّت، اور ایک رحمت اور خیال یہ ہوتا ہے۔ واللہ اعلم۔ کہ جوانی میں باہم محبت و مودّت کا غلبہ ہوتا ہے، اور بڑھاپے میں یہ محبت رحمت میں تبدیل ہو جاتی ہے۔

(۶) قرآن کریم کی آیت ہے:

اِنَّمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَّلَهْوٌ وَّزِيْنَةٌ وَّتَفَاخُرٌۢ بَيْنَكُمْ وَتَكَاثُرٌ فِي الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِ

بلاشبہ دنیوی زندگی کھیل کود ہے، اور زینت ہے، اور باہم مفاخرت کا جذبہ ہے

اور مال و اولاد کی کثرت میں ایک دوسرے سے مقابلہ ہے۔
حضرت والد صاحبؒ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں انسانی زندگی کے مختلف ادوار کی امتیازی خصوصیات بیان فرمادی ہیں، کیونکہ بچپن کا زمانہ کھیل کود کا دور ہے۔ پھر جوانی میں انسان کی زیادہ تر دلچسپیاں زینت و آرائش سے متعلق ہوتی ہیں اور جسم و لباس کی زینت سے لے کر مکان تک کی زینت اس کی سوچ کا محور بن جاتی ہے۔ پھر ادھیڑ عمر میں مفاخر کا دور آتا ہے اور آخر میں ساری دلچسپیاں اس پر صرف ہوجاتی ہیں کہ میں مال و اولاد کے اعتبار سے دوسروں کے مقابلے میں زیادہ نظر آؤں۔ اس طرح یہ آیت بچپن سے بڑھاپے تک کی پوری داستان ہے۔

(۷) فرمایا کہ حضرت میاں صاحب (حضرت مولانا سید اصغر حسین صاحبؒ) نے ایک دن ہم سے فرمایا کہ قرآن کریم میں ریل گاڑی کا ذکر آیا ہے۔ ہم حیران ہوئے تو فرمایا کہ وہ ذکر اس آیت میں ہے:

وَالْخَيْلَ وَالْبِغَالَ وَالْحَمِيرَ لِتَرْكَبُوهَا وَزِينَةً وَيَخْلُقُ مَا لَا تَعْلَمُونَ ٥

اور اللہ نے گھوڑے، خچر اور گدھے پیدا کیے تاکہ تم ان پر سواری کرو، اور وہ تمہارے لیے باعث زینت ہوں، اور اللہ ایسی چیزیں پیدا فرماتے ہیں جنہیں تم نہیں جانتے۔

فرمایا کہ اس آیت میں اُن تمام سواریوں کا ذکر آگیا ہے جو قیامت تک ایجاد ہوں گی۔

(۸) ایک دن حضرت والد صاحبؒ نے فرمایا کہ اجمالی طور پر تمام سواریوں کا ذکر تو مذکورہ بالا آیت میں ہے، لیکن ایک آیت میں خاص طور پر ہوائی جہاز کی طرف اشارہ معلوم ہوتا ہے سورۂ یٰسٓ میں ارشاد ہے:

وَآيَةٌ لَهُمْ أَنَّا حَمَلْنَا ذُرِّيَّتَهُمْ فِي الْفُلْكِ الْمَشْحُونِ وَخَلَقْنَا لَهُمْ مِنْ مِثْلِهِ مَا يَرْكَبُونَ ٥

اور ان کے لیے ایک نشانی یہ ہے کہ ہم نے ان کی ذریت کو بھری ہوئی کشتی میں سوار کیا اور ہم نے اُن کے لیے اُس کشتی جیسی ایسی چیزیں پیدا کی

ہیں جن پر وہ سواری کریں۔

اس آیت کا ایک ترجمہ یوں بھی ہو سکتا ہے کہ "کشتی جیسی ایسی چیزیں بنا دی ہیں جن پر وہ آئندہ سواری کریں گے۔" والد صاحبؒ نے فرمایا کہ اس کا مصداق ہوائی جہاز ہو سکتا ہے۔ کیونکہ ایسی سواری جو کشتی نہ ہو لیکن کشتی جیسی ہو، ہوائی جہاز ہو سکتی ہے۔

(۹) فرمایا کہ قرآن کریم کا ارشاد ہے

وَمِنْ كُلِّ شَيْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَيْنِ

اور ہم نے ہر چیز کے جوڑے پیدا کیے ہیں۔

اس میں صرف حیوانات اور نباتات نہیں، بلکہ ہر چیز کے بارے میں یہ کہا گیا ہے کہ اس کے جوڑے پیدا کیے گئے ہیں۔ آج سائنس کی تحقیق بھی یہی ہے اور بجلی کے دو عنصر مثبت (POSITIVE) اور منفی (NEGATIVE) بھی اس زوجین کا مصداق بن سکتے ہیں۔

(۱۰) فرمایا کہ حرم شریف کے بارے میں قرآن کریم کا ارشاد ہے:

يُجْبَىٰ إِلَيْهِ ثَمَرَاتُ كُلِّ شَيْءٍ

اس کی طرف ہر چیز کے ثمرات پہنچائے جاتے ہیں۔

یہاں اللہ تعالیٰ نے صرف "ثمرات" یا "ثمرات کل شجر" کہنے کے بجائے "ثمرات کل شیء" فرمایا ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ وہاں صرف درختوں کے نہیں بلکہ ہر چیز کے پھل پہنچتے ہیں، اور اس عموم میں فیکٹریوں کی مصنوعات بھی شامل ہو جاتی ہیں جن کی آج حرم شریف میں ریل پیل نظر آتی ہے۔

(۱۱) قرآن کریم کی آیت ہے:

فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَائِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوا
فِي الدِّينِ وَلِيُنذِرُوا قَوْمَهُمْ إِذَا رَجَعُوا إِلَيْهِمْ

تو کیوں نہ نکل پڑی ان کی ہر بڑی جماعت میں سے ایک چھوٹی جماعت تاکہ وہ دین میں سمجھ پیدا کرے اور اپنی قوم کے پاس واپس جا کر انہیں ڈرائے۔

اس آیت کی تفسیر حضرت والدصاحب رحمۃ اللہ علیہ نے دارالعلوم میں ایک مفصل خطاب فرمایا تھا جو کئی روز میں مکمل ہوا، اس خطاب میں آپ نے آیت کے مختلف پہلوؤں پر بڑی شرح و بسط سے روشنی ڈالی، اور اس ذیل میں عجیب و غریب تفسیری نکات بیان فرمائے۔ اس خطاب کے اہم نکات "معارف القرآن" میں مذکورہ آیت کے تحت شامل ہو گئے ہیں۔ ان میں سے چند مختصر باتیں درج ذیل ہیں:۔

فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے یہاں لفظ "نفر" استعمال فرمایا ہے۔ حالانکہ مفہوم لفظ خَرَجَ سے بھی ادا ہو سکتا تھا۔ اس میں حکمت یہ معلوم ہوتی ہے کہ "نفر منہ الیہ" کے معنی میں یہ مفہوم شامل ہے کہ ایک شخص کسی چیز سے نفرت یا اعراض کر کے دوسری چیز کی طرف مکمل یکسوئی کے ساتھ متوجہ ہو۔ لہٰذا اس لفظ سے اس طرف اشارہ ملتا ہے کہ علم کی تحصیل صحیح طور پر اسی وقت ممکن ہے جب انسان ہر دوسری مصروفیت سے یکسو ہو کر پورے انہماک کے ساتھ علم کی تحصیل میں مشغول ہو جائے۔

اسی طرح آیت میں تحصیلِ علم کے لیے "لیتعلموا الدین" کے بجائے اللہ تعالیٰ نے "لیتفقہوا فی الدین" کے الفاظ استعمال فرماتے ہیں۔ اس میں پہلا نکتہ تو یہ ہے کہ عربی زبان میں باب تفعّل کی ایک خاصیت تکلف بھی ہے جس میں محنت و مشقت کا مفہوم بھی شامل ہے۔ اور اس سے اس طرف اشارہ ملتا ہے کہ تحصیلِ علم کے لیے محنت و مشقت کی ضرورت ہے، اور دوسرے اس بات کی وضاحت مقصود ہے کہ علم دین کی تحصیل میں مقصد محض علم برائے علم نہیں ہونا چاہیئے، بلکہ اس کا مقصد دین کی صحیح فہم اور سمجھ پیدا کرنا ہونا چاہیے، لہٰذا صرف کتابیں پڑھنے یا اصطلاحات یاد کر لینے سے علم دین کا مقصد پورا نہیں ہوتا، بلکہ ہر وہ طریقہ اختیار کرنے کی ضرورت ہے جس سے دین کا صحیح مزاج و مذاق اور اس کی سمجھ پیدا ہو۔ جس میں صحبت و تربیت بھی داخل ہے۔

آگے علمِ دین کی تحصیل کا مقصد دعوت و تبلیغ کو قرار دیا گیا ہے، اور اس کے لیے قرآن کریم نے لفظ "انذار" استعمال فرمایا ہے۔ "انذار" کے لغوی معنی ہیں ڈرانا، لیکن یہ لفظ "تخویف" کے ہم معنیٰ نہیں ہے۔ بلکہ "انذار" صرف اُس ڈرانے کو کہتے ہیں جس کا

محرک مخاطب پر شفقت ہو قرآن کریم نے بیشتر مقامات پر تبلیغ و دعوت کے لیے یہی لفظ اختیار فرمایا ہے جس سے اس بات کی طرف اشارہ مقصود ہے کہ تبلیغ و دعوت مخالف کی ہمدردی، دلسوزی اور شفقت کے جذبات کے ساتھ ہونی چاہیے۔ اور جس تبلیغ میں ان جذبات کے بجائے مخاطب پر غصہ، اس سے نفرت یا اس کی تحقیر کے جذبات شامل ہوں وہ اللہ تعالیٰ کو مطلوب نہیں ہے۔

(۱۲) فرمایا کہ جب حضرت یوسف علیہ السلام کی اپنے والدین سے دوبارہ ملاقات ہوئی ہے اس وقت انہوں نے جو کلمات ارشاد فرمائے ہیں وہ بڑے سبق آموز ہیں۔ کوئی دوسرا شخص ہوتا تو یا کہ اپنا دکھڑا روتا کہ جدائی کے بعد کیا کیا مصائب مجھ پر پیش آئے کتنے سالوں قید خانے میں رہا اور کتنی مدت تکلیفیں اٹھائیں، لیکن حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے والدین کو دیکھتے ہی جو بات ارشاد فرمائی وہ یہ تھی:۔

وَقَدْ اَحْسَنَ بِيْۤ اِذْ اَخْرَجَنِيْ مِنَ السِّجْنِ وَجَآءَ بِكُمْ مِّنَ الْبَدْوِ
مِنْۢ بَعْدِ اَنْ نَّزَغَ الشَّيْطٰنُ بَيْنِيْ وَبَيْنَ اِخْوَتِيْ

اور بلاشبہ اللہ نے مجھ پر احسان فرمایا کہ مجھے قید خانے سے نکالا، اور آپ کو دیہات سے لے آیا، بعد اس کے کہ شیطان نے میرے اور میرے بھائیوں کے درمیان وسوسے ڈال دیے تھے۔

یہاں حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے مصائب و آلام کا ذکر فرمانے کے بجائے گفتگو کا آغاز ہی اللہ تعالیٰ کے شکر سے فرمایا، اور قید خانے میں جانے اور وہاں مصائب برداشت کرنے کا ذکر نہیں فرمایا، بلکہ وہاں سے نکلنے کا ذکر فرمایا، اسی طرح والدین کی جدائی کا شکوہ کرنے کے بجائے دوبارہ مل جانے پر شکر ادا کیا، اور بھائیوں سے جو غلطی سرزد ہوئی تھی، اس پر اپنے جذبات کے اظہار کے بجائے اسے شیطان کے سر ڈال دیا۔

فرمایا کہ درحقیقت شکر گزار بندوں کا شیوہ یہی ہے کہ وہ تکلیفوں کا شکوہ کرنے کے بجائے ان سینکڑوں انعاماتِ خداوندی پر نظر رکھتے ہیں جو عین تکالیف کے دوران یا ان کے بعد اللہ تعالیٰ کی طرف سے انسان پر مبذول رہتے ہیں۔ اور اگر انسان ان انعامات

کا استحضار پیدا کرلے تو اُسے دنیا کی کوئی تکلیف ناقابلِ برداشت محسوس نہ ہو، بلکہ تکلیف بھی راحت نظر آنے لگے

(۱۳) فرمایا کہ جس وقت زلیخا نے دروازوں کو مقفل کرکے حضرت یوسف علیہ السلام کو دعوتِ گناہ دی، اُس وقت حضرت یوسف علیہ السلام کو معلوم تھا کہ دروازے مقفل ہیں اور باہر نکلنے کا کوئی راستہ نہیں ہے، لیکن اس کے باوجود آپ دروازے کی طرف دوڑے، اس سے معلوم ہوا کہ جتنی کوشش انسان کے بس میں ہو اُس سے دریغ نہ کرنا چاہیے، خواہ آگے راستہ بند نظر آتا ہو، کیونکہ بعض اوقات وہ تھوڑی سی کوشش جو بظاہر بے فائدہ نظر آ رہی تھی، اللہ تعالیٰ اُس کی برکت سے راستہ کھول دیتے ہیں، چنانچہ حضرت یوسف علیہ السلام کے ساتھ یہی ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے اُن کے لیے دروازہ کھلنے کا سامان پیدا فرما دیا، اسی کو حضرت مولانا رومیؒ نے ارشاد فرمایا ہے ؎

گرچہ رخنہ نیست عالم را پدید
خیرہ یوسفؑ وار می باید دوید

(۱۴) قرآنِ کریم کا ارشاد ہے:-

اور دو اُن کو اللہ کے اُس مال میں سے جو اللہ نے تمہیں عطا فرمایا ہے۔

حضرت والا صاحبؒ نے فرمایا کہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اسلام کے فلسفۂ ملکیت کی طرف واضح اشارہ فرما دیا ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ دنیوی مال و دولت پر اصلی اور حقیقی ملکیت تو اللہ تعالیٰ کی ہے، اسی لیے اس کو "مال اللہ" سے تعبیر فرمایا ہے، البتہ اللہ تعالیٰ نے وہ مال تمہیں عطا فرما دیا ہے، لہٰذا عطاءِ خداوندی سے اس پر تمہیں بھی حقوقِ ملکیت حاصل ہو گئے ہیں، لیکن چونکہ اصل ملکیت اللہ کی ہے اس لیے وہ جس جگہ مال خرچ کرنے کا حکم دے دے اس کا حق ہے اور تم پر اس کی تعمیل واجب ہے۔ انسان کو مال خرچ کرنے میں رکاوٹ اسی بنا پر پیدا ہوتی ہے کہ وہ اس پر اپنی حقیقی ملکیت سمجھتا ہے۔ چنانچہ شعیب علیہ السلام کی قوم نے اُن سے یہی کہا تھا کہ:-

کیا تمہاری نماز تمہیں اس بات کا حکم دیتی ہے کہ ہم اپنے باپ دادوں کے معبودوں کی عبادت چھوڑ دیں، یا یہ کہ اپنے مال میں اپنی مرضی کے مطابق کام نہ کریں؟

قرآن کریم نے اس سرمایہ دارانہ ذہنیت کے مقابلے میں اس ذہن کی تعمیر کی ہے جو ہر قسم کے مال و دولت کو اللہ کی ملکیت قرار دے، اور اس ذہن کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ اسے اللہ کے حکم کے مطابق دوسروں پر خرچ کرنے سے کبھی انکار ممکن نہیں ہوتا۔

یہ حضرت والد صاحبؒ کے تفسیری استنباطات کی چند مثالیں تھیں، اس قسم کے تفسیری فوائد حضرت والد صاحب قدس سرہٗ کی حیات میں وقتاً فوقتاً فردوس گوش ہوتے رہتے تھے، اور اگر ئیں آپ سے سُنے ہوئے ان تفسیری فوائد کو جمع کروں تو ایک مستقل کتاب تیار ہو سکتی ہے، لیکن یہاں اس سلسلے کو دراز کرنے کی ضرورت اس لیے معلوم نہیں ہوتی کہ اس قسم کے بیشتر فوائد "معارف القرآن" میں آ چکے ہیں، یہاں تو آپ کے تدبر و فہم قرآن کی ایک جھلک دکھانی مقصود تھی، اس لیے ان چند مثالوں پر اکتفا کرتا ہوں۔

ان چند مثالوں ہی سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ قرآن کریم اور اس کے حقائق و معارف سے آپ کو کس قدر گہری مناسبت تھی، آپ ہم خدام سے بھی فرمایا کرتے تھے کہ قرآن کریم کی محض تلاوت بھی بلاشبہ بہت موجب اجر ہے لیکن ایک عالم کو چاہیے کہ وہ کچھ وقت تدبر قرآن کے لئے بھی نکالا کرے۔ قرآن کریم کا کوئی لفظ حشو یا زائد نہیں ہے، لہٰذا اگر غور کیا جائے تو اس کے ہر لفظ سے کسی نئے فائدے کی طرف رہنمائی مل سکتی ہے۔ اس سلسلے میں آپ کو قاضی ابوالسعودؒ کی تفسیر اور علامہ قرطبیؒ کی احکام القرآن خاص طور پر بہت پسند تھیں، کہ ان میں قرآن کریم کی بلاغت کے نکات اور اس سے مستنبط ہونے والے فوائد بکثرت ملتے اس کے علاوہ علامہ ابوحیان اندلسیؒ کی تفسیر "البحر المحیط" کے بارے میں آپ فرماتے تھے کہ اس میں نحوی ترکیبوں اور اختلاف قراءت پر جو بحثیں ہوتی ہیں ان سے بھی اس قسم کے نادر نکات کا دروازہ کھل جاتا ہے۔

عملی مذاق

اب تک جو باتیں بیان ہوئیں وہ حضرت والد صاحبؒ کے علمی مذاق سے متعلق تھیں۔ آپ کے مزاج و مذاق کا دوسرا حصہ آپ کی عملی زندگی سے متعلق ہے۔ یہ حصہ اور زیادہ لطیف اور نازک ہے اور اس کو الفاظ میں منتقل کرنا پہلے حصے سے زیادہ مشکل ہے۔ تاہم جو باتیں احقر کے فہم و ادراک میں آسکیں انھیں اپنی بساط کی حد تک بیان کرنے کی کوشش کرتا ہوں، واللہ الموفق والمعین۔

حضرت والد صاحبؒ کی عملی زندگی کو عبادات، دعوت و تبلیغ، سیاست اور معاشرت و معاملات کے مختلف شعبوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ اسی ترتیب سے چند باتیں پیش خدمت ہیں۔

عبادات

(۱) اللہ تعالیٰ نے حضرت والد صاحب قدس سرہ کو عبادت کا خاص ذوق عطا فرمایا تھا اور عبادت کے ہر شعبے میں قابلِ صد رشک نقوش چھوڑنے کے باوجود ہم نے ہمیشہ آپ کو اس بات پر حسرت ہی کا اظہار کرتے پایا کہ مجھ سے عبادت نہیں بن پڑتی۔ اگرچہ آپ کی ساری زندگی ایسی ہنگامی اور تلاطم خیز تھی کہ صبح سے شام تک کے تمام اوقات مختلف شعبوں میں بٹے ہوئے تھے، سیاست، انتظامی بکھیڑے، وعظ و تقریر، تدریس اور فتویٰ، تصنیف و تالیف، خدمتِ خلق، غرض دینی خدمات کا کوئی شعبہ ایسا نہیں تھا جس میں آپ کا مؤثر حصہ نہ ہو اور ان میں سے ہر شعبہ شب و روز کے تمام اوقات اسی پر وقف کر دینے کا متقاضی تھا، آپ فجر کے بعد سے جوں کام میں لگتے تو رات کے بارہ بارہ بلکہ ایک ایک بجے تک اسی کام میں مصروف رہتے تھے، عصر کے بعد جب دوسرے لوگ ذہنی سکون کی خاطر کسی تفریح میں لگتے یا گھر ہی میں فراغت کے ساتھ بیٹھتے تو آپ کا قلم اس وقت بھی چلتا رہتا، کبھی ڈاک لکھی جارہی ہے، کبھی فتووں کا جواب دیا جارہا ہے، کبھی امانتوں کا حساب و کتاب درپیش ہے، غرض جب آپ سونے کے لیے لیٹتے تو جسم تھکن سے چور اور ذہن منتشر افکار کی آماجگاہ ہوتا تھا۔ اس لیے اس ذہنی انتشار کی حالت میں یکسوئی کے ساتھ عبادت کا موقع نہیں ملتا تھا۔ اس کے باوجود تہجد، اشراق، چاشت، صلاۃ الاوابین، تلاوتِ قرآن،

مُناجات مقبول اور کم از کم ایک گھنٹے کے اوراد و وظائف کا معمول التزاماً پُورا فرمایا کرتے تھے دیوبند کے مکان میں ایک چھوٹا سا کمرہ حضرت والد صاحبؒ نے عبادت ہی کے لیے مختص فرمایا ہُوا تھا۔ جسے سب اہلِ خانہ حجرہ کہتے تھے اور آخر شب میں وہاں تہجد کے بعد دیر تک ذکر کا معمول تھا۔ اس کے علاوہ جب کبھی اشغال نسبتہً کم ہوتے تو ان معمولات میں اضافہ ہو جاتا اور چلتے پھرتے، اُٹھتے بیٹھتے ذکر اس کے علاوہ تھا۔

ان تمام باتوں کے باوجود ہمیشہ آپ کو اپنی عبادت کی کمی پر حسرت ہی کرتے دیکھا۔ حکیم الامت حضرت تھانوی قدس اللہ سرہٗ کے نام آپ جو مکاتیب اپنے حالات کے سلسلے میں تحریر فرماتے، اُن میں بھی بار بار اس حسرت کا اظہار ہے کہ مجھے دوسرے مشاغل کی بنا پر اکثار ذکر و عبادت کا موقع نہیں ملتا۔ یہاں تک کہ حضرت حکیم الامت رحمہ اللہ نے ایک اسی قسم کے مکتوب کے جواب میں تحریر فرمایا:

"اکثار ذکر سے جو مقصود ہے وہ بفضلہٖ تعالیٰ آپ کو تعلیل میں بھی حاصل ہے۔"

(مکتوب ۲۲؎ مورخہ ۲۸ رمضان ۱۳۴۸ھ)

اللہ اکبر! حکیم الامت حضرت تھانوی قدس سرہٗ نے آپ کو یہ کتنی بڑی سند عطا فرمادی تھی، کوئی ہم جیسا کم ظرف ہوتا تو اتنے بڑے باریک بین شیخ سے یہ سند پانے کے بعد اس جانب سے بے فکر ہو بیٹھتا، لیکن آپ کی یہ فکر آخر دم تک زائل نہیں ہُوئی۔ عُمر کے آخری حصے میں جب ضعف انتہا کو پہنچ چکا تھا اور بینائی جواب دے گئی تھی تو دوسرے مشاغل سے یکسو ہو کر ذکر میں مشغول رہنے کی آرزو اللہ تعالیٰ نے پُوری فرمادی تھی۔ چنانچہ ان دنوں آپ کا بیشتر وقت ذکر اللہ ہی میں صرف ہوتا تھا، لیکن مجھے یاد ہے کہ ایک روز حضرت والد صاحبؒ نے اپنے مُعالج ڈاکٹر صغیر احمد ہاشمی صاحب سے فرمایا:

"ڈاکٹر صاحب! اس ضعف کی بنا پر دوسرے مشاغل سے تو بیکار ہو ہی گیا تھا، البتہ ذکر و تسبیح کا موقع مل جاتا تھا، مگر کچھ روز سے ضعف ایسا ہے کہ زبان کی حرکت سے بھی ضعف بڑھ جاتا ہے، اس کا بڑا افسوس ہے۔"

ڈاکٹر صاحب نے کہا: "حضرت! آپ کو زبان کی حرکت کی ضرورت ہی کیا ہے، آپ قلب سے ذکر فرمالیا کریں۔"

اس پر حضرت والد صاحبؒ نے فرمایا:

"بحمداللہ اس کی تو توفیق ہو جاتی ہے، مگر ذکر لسانی کو کبھی تو دل چاہتا ہے"۔

اندازہ فرمائیے کہ جس شخص کی ساری عمر خدمت دین کے عظیم کارناموں میں صرف ہوئی ہو، جسے اُس کا شیخ کامل — اور حضرت تھانویؒ جیسا شیخ کامل — یہ شہادت دے چکا ہو کہ آپ کو ذکر قلیل سے بھی وہی مقصود حاصل ہے جو دوسروں کو ذکر کثیر سے حاصل ہوتا ہے، اس کو ضعف و نقاہت کے اس عالم میں بھی قلتِ ذکر کی تشویش اور اس کی حسرت لگی ہوئی ہے

(۲) نماز سے حضرت والد صاحبؒ قدس سرہٗ کو خاص شغف تھا، اور جن لوگوں نے آپ کو نماز پڑھتے ہوئے دیکھا ہے اُنھیں یاد ہوگا کہ نماز کے دوران آپ پر عجز و نیاز، خضوع و خشوع اور خشیت و انابت کی ایسی عجیب کیفیت طاری رہتی تھی جو شاذ و نادر ہی کہیں دیکھنے میں آتی ہے۔ ہم جیسے کور ذوق اور حواس باختہ لوگوں کو تو اُس کیفیت کا ادنیٰ ادراک بھی مشکل ہے۔ آپ نے خود اپنے شیخؒ کو ایک مکتوب میں تحریر فرمایا :

"آخر شب کے نوافل میں بحمداللہ اکثر شوق و رغبت اور سکون و طمانیت نصیب ہوتا ہے اور بعض اوقات کیفیت گریہ حالت اضطرار کو پہنچ جاتی تھی لیکن چونکہ یہ حالت مستمر نہ رہتی تھی، اس لیے میں اُس کو خود ہی سے تعبیر کرتا تھا، آج دفعتہً خیال ہوا کہ مبادا یہ ناشکری میں داخل ہو، اس لیے اصل حقیقت عرض کردی۔ آخر شب میں طول قیام اور طول سجود میں ایک خاص لذت پاتا ہوں اور جس رکن کو شروع کرتا ہوں، جب تک تھک نہ جاؤں اس سے منتقل ہونے کو جی نہیں چاہتا" (مکتوب ۲۱)

نماز سے اس خصوصی تعلق کا اندازہ حضرتؒ کے ایک لطیف ارشاد سے کیجیے، ہم لوگوں کی عادت تھی کہ اگر جب کوئی اہم کام سامنے ہوتا تو یہ جملہ کہہ دیتے تھے کہ "ذرا نماز سے فارغ ہو جائیں تو پھر وہ کام کریں گے"۔ ایک روز حضرت والد صاحبؒ نے یہ جملہ سنا تو فرمایا :

" ارے بھائی، نماز فارغ ہونے کی چیز نہیں ہے، اس سے فراغت حاصل کرنے کی فکر نہیں چاہیے بلکہ دوسرے کاموں سے فارغ ہو کر نماز کی طرف متوجہ ہونا چاہیے"

اس کے بعد آپ نے قرآن کریم کی اس آیت کی طرف متوجہ فرمایا جو ہم شب و روز پڑھتے رہتے ہیں لیکن اس کی حقیقت کی طرف کبھی دھیان نہیں ہوتا، فرمایا کہ قرآن کریم نے حضور سرور

دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے خطاب کرتے ہُوئے ارشاد فرمایا ہے کہ :

فَإِذَا فَرَغْتَ فَانْصَبْ وَإِلَىٰ رَبِّكَ فَارْغَبْ

پس جب تم فارغ ہو جاؤ تو (اللہ کی عبادت میں) تھکو، اور اپنے پروردگار کی طرف رغبت کا اظہار کرو۔

فرمایا کہ اس آیت میں حضورؐ سے خطاب ہو رہا ہے کہ آپ دوسرے کاموں سے فارغ ہو کر عبادتِ الٰہی میں اپنے آپ کو تھکائیں، اس سے معلوم ہُوا کہ مقصودِ اصلی یہ عبادت ہے اور اس سے جلد از جلد فارغ ہو کر دوسرے کاموں میں لگنے کی نیت ٹھیک نہیں، اس کے بجائے نیت یہ ہونی چاہیے کہ دُوسرے کاموں سے جلد از جلد فارغ ہو کر نماز اور عبادت کی طرف متوجہ ہوں۔

ساتھ ہی حضرت والد صاحبؒ نے فرمایا کہ یہاں خاص طور پر اہلِ علم اور دینی خدمات انجام دینے والوں کو اس بات پر غور کرنا چاہیے کہ یہ خطاب حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کو ہو رہا ہے کہ فارغ ہونے پر آپ عبادتِ الٰہی میں اپنے آپ کو تھکائیں۔ سوال یہ ہے کہ کس چیز سے فارغ ہونے پر ؟ ظاہر ہے کہ عبادات کے علاوہ آپ کی جتنی مصروفیات تھیں وہ تمام تر دینی خدمات ہی سے متعلق تھیں، کبھی جہاد ہے، کبھی تعلیم و تبلیغ ہے، کبھی انتظامِ حکومت ہے، کبھی اصلاحِ خلق ہے، یہاں تک کہ آپ کی گھریلو زندگی بھی تعلیم ہونے کی بنا پر دینی خدمات ہی میں داخل تھی، اور آپ کی زندگی کا کوئی لمحہ ایسا نہیں تھا جو کسی نہ کسی ثواب کے کام میں خرچ نہ ہو رہا ہو۔ اس کے باوجود آپ کو یہ حکم ہو رہا ہے، کہ جب آپ اپنی دُوسری دینی مصروفیات سے فارغ ہوں تو خالص عبادتوں کی طرف متوجہ ہوں۔ اس سے معلوم ہُوا کہ جو لوگ دینی، تبلیغی یا اجتماعی خدمات میں مصروف ہوں انھیں یہ نہیں سمجھنا چاہیئے، کہ ہم چونکہ شب و روز اللہ تعالیٰ کے دین ہی کے کام میں لگے ہوئے ہیں، اس لیے ہمیں (معاذ اللہ) نفلی عبادتوں اور مستحبات و مندوبات کی ضرورت نہیں، کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ کون دینی خدمات انجام دے گا ؟ جب اس کے باوجود آپ کو نفلی عبادات کا حکم دیا جا رہا ہے اور اس کی تعمیل میں رات کے وقت آپ کے پاؤں پر ورم آجاتا ہے تو ہم کس شمار قطار میں ہیں ؟

دوسرے اس سے یہ بھی معلوم ہُوا کہ جہاد، تعلیم و تبلیغ، اجتماعی خدمات اور دین کے لیے سیاست کی مصروفیات اگر صحیح نیت سے ہوں تو اگرچہ وہ سب کارِ ثواب ہیں اور بعض اوقات اُن کا ثواب

نفلی عبادات سے بھی بڑھ جاتا ہے۔ لیکن اُن کو دین کا مقصودِ اصلی سمجھنا درست نہیں، اس کے بجائے مقصودِ اصلی وہی خالص عبادتیں ہیں جن میں بندہ براہِ راست اپنے معبود سے رابطہ قائم کرکے اس کی طرف رجوع و انابت کی دولت حاصل کرتا ہے۔ اسی لیے یُوں نہیں کہا گیا کہ نماز سے فارغ ہو کر جہاد یا تعلیم و تبلیغ کے کام میں لگو۔ بلکہ فرمایا یوں گیا کہ جب جہاد اور تعلیم و تبلیغ وغیرہ کے کام سے فارغ ہو تو اپنے اصل مقصدِ تخلیق یعنی عبادتِ رب کی طرف آ جاؤ۔

یہی وہ بنیادی نکتہ ہے جسے فراموش کرکے ہمارے بہت سے معاصر اہلِ قلم نے نظریاتی طور پر اور بہت سے رہنماؤں نے عملی طور پر دین کی تعبیر کو اُلٹ دیا ہے اور جو چیز مقصودِ اصلی تھی، اُسے ذریعہ اور جو ذریعہ تھا اُسے مقصودِ اصلی قرار دے دیا ہے۔ اُن کا کہنا یہ ہے کہ دین کا اصل مقصد جہاد و دعوت کے ذریعے اسلامی حکومت کا قیام ہے اور نماز روزے سمیت تمام عبادتیں اسی مقصد کی ٹریننگ دینے کے لیے وضع کی گئی ہیں، حالانکہ اصل حقیقت یہ ہے کہ دین کا اصل مقصد بندوں کا تعلق اپنے خالق و مالک سے جوڑ کر اُن میں عجز و نیاز، انابت و خشیت اور عبدیت کی صفات پیدا کرنا ہے اور جہاد اور تعلیم و تبلیغ وغیرہ اس مقصد کے حصول کے ذرائع ہیں۔ لہٰذا ان دینی خدمات میں مشغولیت اگرچہ بڑی فضیلت کی بات ہے۔ یہ خدمات فرضِ کفایہ ہیں اور بعض مواقع پر فرضِ عین بھی ہو جاتی ہیں؛ لیکن یہ فراموش نہ کرنا چاہیے کہ وہ نفلی عبادتیں جن میں براہِ راست بندہ اللہ تعالیٰ سے تعلق قائم کرکے اس کے سامنے اپنی بندگی اور عجز و نیاز کی پُونجی نچھاور کرتا ہے۔ ان کی اہمیت اور مقصودیت میں فرق نہ واقع ہونے پائے اور جب کبھی انسان کو مہلت ملے وہ ان عبادتوں کے ذریعے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں حاضری کو غنیمتِ کبریٰ اور اپنا منتہائے مقصود قرار دے، حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اسی فکر کو اپنے ایک شعر میں بیان فرمایا ہے ؎

خوش درسِ علم و شغلِ فتاویٰ بہ دیوبند
لیکن شبے بہ خانقہ تھانہ خوشتر است

اور حقیقت یہ ہے کہ اس اہم اور بُنیادی نکتے کو فراموش کرکے ہم دین کے صحیح مزاج و مذاق اور اس کے حقیقی فوائد و ثمرات سے دُور ہوتے جا رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس حقیقت کی صحیح فہم اور اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

(۳) عبادت کی اصل رُوح تعلق مع اللہ اور انابت الی اللہ ہے، صوفیائے کرامؒ کے یہاں جتنے مجاہدات ریاضتیں یا اذکار و اشغال کا معمول ہے، اُن سب کا حاصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی یاد دل میں بس جائے اور دل کسی وقت اس کے دھیان سے خالی نہ رہے۔ "دست بکار و دل بیارؒ" کی اس کیفیت کا ہم جیسوں کو تو ادراک بھی مشکل ہے، لیکن اس کیفیت کا اگر کوئی عملی پیکر ان بے حس نگاہوں نے بھی دیکھا تو وہ حضرت والد صاحب قدس سرہٗ کی شخصیت تھی، سینکڑوں طرح کی ہمہ وقتی مصروفیت کے باوجود ایسا معلوم ہوتا تھا کہ آپ کے قلب کا رابطہ مسلسل اپنے مالک و معبود سے قائم ہے، یہ کیفیت اصل میں تو نہاں خانۂ قلب کی وہ مخفیہ کیفیت ہے جسے عام حالات میں محسوس نہیں کیا جاسکتا، لیکن کبھی کبھی اس کا اظہار بھی ہو جاتا ہے۔

احقر کے شیخ و مربی عارف باللہ حضرت ڈاکٹر عبدالحی صاحب عارفی مدظلہم العالی نے بارہا اپنی مجلسوں میں بھی یہ بات بیان فرمائی ہے اور اپنی گرانقدر اور دریا بکوزہ کتاب "معمولاتِ یومیہ" میں بھی تحریر فرمایا ہے کہ قلب کے چار اعمال ایسے ہیں کہ اگر انسان ان کی عادت ڈال لے تو اُسے تعلق مع اللہ کی ثمر دولت حاصل ہو سکتی ہے۔ یہ چار اعمال ہیں۔ استغفار، صبر، شکر اور استعاذہ۔ حضرت مدظلہم نے فرمایا کہ انسان کو اپنی زندگی میں تین زمانوں سے سابقہ پیش آتا ہے، ماضی، حال اور مستقبل۔ انسان کو ماضی میں کیے ہوئے افعال پر ندامت ہوتی ہے تو اس کے لیے اسلام نے استغفار تجویز فرمایا ہے حال میں انسان کو یا تکلیف پیش آتی ہے یا راحت اور خوشی، پہلی صورت میں اس کا ردِ عمل صبر ہے، اور دوسری صورت میں شکر، اور مستقبل کے لیے انسان کو طرح طرح کے اندیشے ہوتے ہیں، ان کا علاج استعاذہ ہے۔ اگر انسان ماضی پر استغفار، حال پر صبر یا شکر اور مستقبل پر استعاذہ کی عادت ڈال لے تو اس کا ہر لمحہ عبادت بن سکتا ہے۔ عادت ڈال لینے کے بعد ان اعمالِ باطنہ میں کوئی وقت صرف نہیں ہوتا، بلکہ دوسرے کاموں میں مشغول رہتے ہوئے بھی کوئی اضافی محنت یا وقت خرچ کیے بغیر انسان مسلسل ان عبادتوں میں مصروف رہ سکتا ہے۔

جن لوگوں نے حضرت والد صاحب قدس سرہٗ کو قریب سے دیکھا ہے وہ اس بات کی گواہی دیں گے کہ ان چار عبادتوں نے آپ کی پوری زندگی کا احاطہ کیا ہوا تھا، اور ذرا ذرا سی باتوں پر استغفار، شکر اور استعاذہ کے کلمات آپ کے وردِ زبان رہتے تھے، خاص طور سے جب ادائے شکر کی

نوبت آتی تو ایسا معلوم ہوتا جیسے اللہ تعالیٰ کے انعامات کے تصور سے آپ پر بیخودی سی طاری ہوگئی ہے اور آپ کا پورا وجود عجز و نیاز کے ساتھ ادائے شکر میں مصروف ہے۔ آپ ناگوار واقعات میں بھی قابلِ شکر پہلوؤں کو مستحضر رکھنے بلکہ ان کے کثرت سے ذکر کے عادی تھے۔ تکلیف دہ واقعات کی شکایت کا تو دستور ہی نہ تھا۔

جب کبھی آپ کو کسی معاملے میں تردد ہوتا اور یہ فیصلہ کرنے کا مرحلہ آتا کہ دو راستوں میں سے کون سا راستہ اختیار کیا جائے تو چند لمحوں کے لیے آنکھیں بند کر کے گرد و پیش سے بے خبر ہو جاتے اور اللہ تعالیٰ سے دعا کر کے ہدایت طلب فرماتے، اس کے بعد کوئی فیصلہ کرتے تھے اور چھوٹے چھوٹے معاملات میں بھی اللہ تعالیٰ سے دعا کرنے اور کرتے رہنے کا معمول تھا۔

عبادات میں آپ کو اس بات کا خاص اہتمام تھا کہ اپنی کسی عبادت کی وجہ سے دوسروں کو کوئی ادنیٰ تکلیف نہ پہنچے، خاص طور سے غیر واجب عبادات میں اس بات کا پورا لحاظ رکھتے تھے اور فرماتے تھے کہ یہ عبادت واجب نہیں لیکن کسی مسلمان کو ایذا سے بچانا فرض ہے لہٰذا ایک غیر واجب کی ادائیگی کے لیے فرض کو کیسے چھوڑا جا سکتا ہے، چنانچہ آپ تہجد کے لیے بیدار ہوتے تو اس بات کا اہتمام کرتے کہ کسی دوسرے کی نیند خراب نہ ہو، عموماً قرارت بھی آہستہ فرماتے۔ البتہ رمضان المبارک کی راتوں میں سحری سے پہلے جو نفلیں پڑھتے ان میں عموماً بلند آواز سے قرارت کا معمول تھا اور اب خیال ہوتا ہے کہ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ رمضان کے عشرۂ اخیر میں آپ اپنے گھر والوں کو بھی جگانے کا اہتمام فرماتے تھے۔ واللہ سبحانہٗ اعلم۔

آپ اس بات سے بھی حتی الوسع پرہیز فرماتے تھے کہ آپ کی وجہ سے کسی مسجد میں نماز کو اپنے مقررہ وقت سے مؤخر کیا جائے۔ بارہا ایسا ہوا کہ اہلِ مسجد کی طرف سے آپ کو یہ پیشکش کی گئی مگر آپ نے اسے کبھی پسند نہیں فرمایا، اور اگر مقررہ وقت پر مسجد پہنچنے میں کوئی عذر ہوا تو مسجد کے بجائے اپنی جماعت الگ کر لینے کو ترجیح دی۔

دارالعلوم کی مسجد میں نمازِ ظہر کا جو وقت مقرر تھا وہ آپ کے معمولات کے لحاظ سے مناسب نہ تھا۔ آپ عموماً ایک بجے تک دارالعلوم کے دفتر میں بیٹھے کام کرتے رہتے تھے اور اس سے پہلے اٹھنا آپ کے لیے ممکن نہ تھا اور ایک بجے کے بعد تھکن اتنی ہو جاتی تھی کہ مزید بیٹھنا مشکل ہوتا تھا۔

چنانچہ آپ ایک اور ڈیڑھ بجے کے درمیان اُٹھتے تھے اور نماز کا وقت عموماً دو یا ڈھائی بجے مقرر ہوتا تھا۔ اب ڈیڑھ بجے سے دو یا ڈھائی بجے تک نماز کا انتظار آپ کے لیے بہت دُشوار ہوتا تھا اور اس دوران اگر کھانا کھالیں تو کھانے کے بعد نماز کا اہتمام مُعالجین کی ہدایت کے مطابق آپ کے لیے مُضرِ صحت تھا۔ اس بنا پر ہم لوگوں نے بھی اور دارالعلوم کے دُوسرے اساتذہ و منتظمین نے بھی بارہا عرض کیا کہ نماز کا وقت مقدم کر کے ڈیڑھ بجے کر دیا جائے، تاکہ آپ دفتر سے اُٹھتے ہی نماز پڑھ سکیں۔ یہ صورت آپ کے لیے بے حد سہولت کا باعث ہوتی لیکن آپ نے کبھی اس کو منظور نہیں فرمایا۔ اور ہمیشہ اس بنا پر انکار فرما دیا کہ عام اساتذہ و طلبہ کی سہولت کا وقت وُہی ہے کیونکہ وہ بارہ بجے چھٹی ہونے پر کھانا کھا کر کچھ آرام کرتے ہیں اور اُٹھ کر نماز پڑھتے ہیں، نماز کو مقدم کرنے سے ان کے آرام میں خلل واقع ہوگا۔ چنانچہ سالہا سال آپ نے اس مشقت کو برداشت کیا کہ دو ڈھائی بجے تک نماز کا انتظار کر کے نماز کے بعد کھانا کھاتے اور آخر عُمر میں جب دل کی تکلیف کی وجہ سے اس مشقت کو برداشت کرنا ممکن ہی نہ رہا تو آپ نے عُذر کی بنا پر انفراداً نماز پڑھنے کو ترجیح دی اور وقت بلا کسی قیمت پر گوارا نہ فرمایا اور وقت بدلنے کی پیشکش کو ہمیشہ یہ کہہ کر رد فرما دیا کہ "محض اپنے عمل العزیمۃ کی خاطر میں پُورے مدرسے کو تکلیف میں نہیں ڈال سکتا، میں کمزور ہُوں اور اللہ تعالیٰ نے جو رخصت عطا فرمائی ہے اس پر عمل کرنا میرے لیے اہون ہے"۔

عزیمت و رُخصت کے باب میں بھی حضرت والد صاحبؒ کا مذاق یہ تھا کہ اس بات کی تو پُوری تحقیق اور اطمینان فرمالیتے تھے کہ اس حالت میں شرعاً رخصت حاصل ہے یا نہیں؟ —— لیکن جب کسی وقت رخصت کا اطمینان ہو جاتا تو رخصت پر بھی اُسی انشراح کے ساتھ عمل فرماتے۔ جس انشراح کے ساتھ عزیمت پر عمل فرماتے تھے۔ حدیث نبوی ہے کہ اِنّ اللہ یحب أن تؤتیٰ رُخصہ کما یحب ان تؤتیٰ عزائمہ (اللہ تعالیٰ کو رخصتوں پر عمل بھی اسی طرح پسند ہے جس طرح عزیمت پر) اس حدیث پر آپ کا پُورا عمل تھا۔ اور دُوسروں کو نصیحت فرماتے ہُوئے آپ حضرت مولانا رومیؒ کا یہ شعر بکثرت پڑھا کرتے تھے ؎

چوں کہ بر میخت ببندد، بستہ باش
چوں کشاید، چابک و برجستہ باش

لیکن اس بات کا اطمینان کرتے وقت کہ شرعاً رخصت حاصل ہے یا نہیں؛ آپ انتہائی باریک بینی سے کام لیتے اور جب تک آپ کو مکمل اطمینان نہ ہو جاتا، رخصت پر عمل نہ فرماتے بیماری کے دوران اگر ذرا بھی شبہ ہوتا کہ تیمم جائز ہے یا نہیں؛ آپ وضو ہی فرماتے، خواہ اس کے لیے کتنی مشقت اُٹھانی پڑے۔ آخر عمر میں معالجین اس بات پر متفق تھے کہ روزہ رکھنا آپ کے لیے مضر ہے لیکن ہر رمضان میں آپ اس بات پر اصرار فرماتے کہ میں کم از کم ایک روزہ رکھ کر دیکھنا چاہتا ہوں کہ اس سے مرض میں کوئی اشتداد پیدا ہوتا ہے یا نہیں؛ اس غرض کے لیے آپ نے ایک روز چپکے چپکے سحری بھی کھالی، جب ہمیں علم ہوا اور ہم نے احتجاج کیا تو فرمایا کہ "مجھے روزہ رکھ کر دیکھنے تو دو" ہم نے عرض کیا کہ آپ تو دوسروں کو اِنَّ اللهَ يُحِبُّ أَنْ تُؤْتىٰ رُخْصَه" والی حدیث اکثر سنایا کرتے ہیں، آپ نے فرمایا کہ میں اسی بات کا تو اطمینان کرنا چاہتا ہوں کہ رخصت واقعۃً حاصل ہے یا نہیں؛ جب یہ اطمینان ہو جائے گا تو وعدہ کرتا ہوں کہ پھر روزہ رکھنے پر اصرار نہیں کروں گا، چنانچہ سحری ہی میں ڈاکٹر صاحب کو فون کیا گیا، اُن سے بھی والد صاحب نے وہی بات فرمائی کہ میں تجربۃً روزہ رکھ کر دیکھنا چاہتا ہوں لیکن جب ڈاکٹر صاحب نے تاکید کے ساتھ فرمایا کہ یہ تجربہ آپ کے لیے سخت مضر ہو سکتا ہے، اور اگر خدانخواستہ کوئی مضرت پہنچ گئی تو پھر اس کو سنبھالنا مشکل ہوگا۔ ڈاکٹر صاحب سے یہ بات سننے کے بعد آپ نے ہتھیار ڈال دیے اور پھر اصرار نہیں فرمایا۔

دعوت و تبلیغ

حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی عملی زندگی کے بیشتر شعبے دین کی دعوت و تبلیغ اور نشر و اشاعت ہی سے متعلق تھے جن میں عوام و خواص دونوں کو تبلیغ حق کے کام شامل تھے۔ اور تبلیغ و دعوت کے اصولوں کے بارے میں آپ کا ایک سوچا سمجھا نظریہ تھا جسے آپ اکثر اہل علم کی مجلسوں میں بیان فرمایا کرتے تھے۔

اس نظریے کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دعوت و تذکیر کی خاصیت یہ رکھی ہے کہ اُس سے فائدہ ضرور پہنچتا ہے، چنانچہ قرآن کریم کا ارشاد ہے:

وَذَكِّرْ فَإِنَّ الذِّكْرَىٰ تَنفَعُ الْمُؤْمِنِينَ

اور آپ نصیحت کیجئے، اس لیے کہ نصیحت مسلمانوں کو فائدہ پہنچاتی ہے۔

لیکن اگر ہم لوگوں کو اپنی دعوت و تبلیغ کا کوئی کام بے اثر یا غیر مفید معلوم ہوتا ہے تو اس کی واحد وجہ یہ ہے کہ ہم نے دعوت کے پیغمبرانہ اسلوب کو چھوڑ دیا ہے۔ دعوت درحقیقت انبیاء علیہم السلام کا کام ہے اور جب تک اُسے انہی طریقوں کے مطابق انجام نہیں دیا جائے گا جس طرح انبیاء علیہم السلام نے انجام دیا، اُس وقت تک مؤثر نہیں ہوسکتا۔

پیغمبرانہ دعوت کے چند اصول

حضرت والد صاحب قدس سرہٗ فرمایا کرتے تھے کہ پیغمبرانہ دعوت کے چند امتیازی خصائص یہ ہیں:

(۱) اُمت کی فکر: انبیاء علیہم السلام کی سب سے پہلی خصوصیت یہ ہے کہ اُن کو اپنی اُمت کی اصلاح کی فکر اس قدر شدت کے ساتھ لگ جاتی ہے کہ وہ طبعی تقاضوں سے بھی آگے بڑھ جاتی ہے، یہاں تک کہ جب پیغمبر اس فکر میں گھُلنے لگتے ہیں تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے تسلی کا سامان کیا جاتا ہے اور ارشاد ہوتا ہے:

لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ اَلَّا يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ

شاید آپ اس غم میں اپنی جان کو ہلاک کرنے والے ہیں کہ یہ لوگ مومن کیوں نہیں بنتے۔

لہٰذا داعیٔ اسلام کی سب سے پہلی خصوصیت یہ ہونی چاہیے کہ اس کو اس پیغمبرانہ فکر کا کوئی حصہ نصیب ہو۔ چنانچہ اسلافِ اُمت میں سے جن جن کو اس فکر کا جتنا حصہ ملا، اللہ تعالیٰ نے ان کی دعوت میں اتنی ہی برکت عطا فرمائی اور اُتنے ہی بہتر ثمرات پیدا فرمائے۔ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہٗ فرمایا کرتے تھے کہ حضرت مولانا شاہ محمد اسماعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ کو دعوت و تبلیغ کا ایسا تقاضا ہوتا تھا جیسا بھوک کے وقت کھانے اور پیاس کے وقت پینے کا تقاضا ہوتا ہے، جس طرح انسان ان طبعی تقاضوں سے صبر نہیں کرسکتا، اسی طرح وہ دعوت کے مواقع پر دعوت سے صبر نہیں کرسکتے تھے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اُن کی دعوت

میں تاثیر بھی ایسی عطا فرمائی کہ ان کے ایک ایک وعظ سے سینکڑوں انسان بیک وقت تائب ہوتے تھے۔

(۲) دعوت کی لگن: انبیاء علیہم السلام کی دعوت کا دُوسرا اہم امتیاز یہ ہے کہ وہ نتائج سے بے پروا ہو کر دعوت میں لگاتار مشغول رہتے ہیں اور حوصلہ شکن حالات میں بھی اپنی بات متواتر کہے چلے جاتے ہیں، جہاں اور جس موقع پر کسی شخص کو اچھی بات پہنچانے کا کوئی موقع مل جائے وہ اُسے غنیمت سمجھ کر اپنی بات پہنچا ہی دیتے ہیں۔

حضرت والد صاحبؒ اس کی مثال میں فرمایا کرتے تھے کہ حضرت یُوسف علیہ السلام کو دیکھیے کہ وہ مدت سے عزیزِ مصر کی قید میں محبوس ہیں، گرد وپیش میں کوئی ہم نوا نہیں، اس حالت میں جیل کے دو ساتھی خواب کی تعبیر پُوچھنے کے لیے آتے ہیں، سوال کا کوئی تعلق دین و مذہب سے نہیں ہے لیکن ان کے جواب میں پہلے تو انھیں مطمئن فرما دیتے ہیں کہ تمھارے خواب کی تعبیر مجھے معلوم ہے اور میں تمھیں بتا بھی دُوں گا مگر پہلے ایک بظاہر قطعی غیر متعلق بات شروع کر دیتے ہیں، اور وہ یہ کہ :

إِنِّي تَرَكْتُ مِلَّةَ قَوْمٍ لَّا يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ
وَاتَّبَعْتُ مِلَّةَ آبَائِي إِبْرَاهِيمَ وَإِسْمَاعِيلَ وَإِسْحٰقَ

بلاشبہ میں نے ان لوگوں کے دین کو چھوڑ دیا ہے جو اللہ اور یومِ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے اور اپنے آباء و اجداد میں سے حضرت ابراہیم، حضرت اسماعیل اور حضرت اسحاق (علیہم السلام) کے دین کی پیروی کی ہے۔

اور :- يٰصَاحِبَيِ السِّجْنِ ءَأَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُونَ خَيْرٌ أَمِ اللَّهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ

اے قید خانے کے ساتھیو! کیا متفرق پروردگار (ماننا) بہتر ہیں یا وُہ اللہ جو ایک اور قہّار ہے۔

اور اس طرح خواب کی تعبیر بتانے سے پہلے اپنا پیغام اُنھیں پہنچا دیا۔

دعوت کی اس لگن کا حاصل یہ ہے کہ انسان بات پہنچانے کے مواقع کی تلاش میں رہے جب جتنا موقع مل جائے اُس سے فائدہ اُٹھائے اور دعوت سے کسی مرحلے پر تھکنے یا اُکتانے کا نام نہ

لے لیکن ساتھ ہی یہ بھی ضروری ہے کہ لوگوں کا دار وغہ بن کر اُن کے پیچھے نہ پڑے، بلکہ اپنی بات مؤثر سے مؤثر انداز میں کہہ کر فارغ ہو جائے، پھر جب دیکھے کہ اس پر عمل نہیں ہُوا تو موقع دیکھ کر پھر کہہ دے لیکن مسلط ہونے کا طریقہ اختیار کرے اور نہ مایوس ہو کر بیٹھے۔

(۳) مخاطب کی شفقت: پیغمبرانہ دعوت کا تیسرا اہم عنصر مخاطب کی شفقت ہے انبیاء علیہم السلام کی دعوت کا داعیہ شفقت کے سوا کچھ نہیں ہوتا، اپنی برتری جتلانے یا دُوسرے کی تحقیر کا ان کے یہاں شائبہ نہیں، حضرت والد صاحبؒ فرمایا کرتے تھے کہ قرآن کریم نے بیشتر مواقع پر تبلیغ و دعوت کو لفظ "اِنذار" سے تعبیر فرمایا ہے جس کا لفظی ترجمہ لوگ صرف "ڈرانا" کرتے ہیں لیکن درحقیقت عربی زبان میں "اِنذار" اُس ڈرانے کو کہتے ہیں جس کا محرک دوسرے پر شفقت ہو، جیسے باپ بیٹے کو آگ سے ڈراتا ہے۔ چنانچہ اگر ایک ظالم حکمران اپنے کسی محکوم کو کسی سزا سے ڈرائے تو اس کو "اِنذار" نہیں کہا جائے گا۔ لہٰذا اس لفظ کے انتخاب سے اسی طرف متوجہ کرنا ہے کہ داعئ حق جن کو نصیحت کرتا ہے، اُن سے نفرت یا اُن کی حقارت اس کے دل میں نہیں ہوتی بلکہ اس کا محرک شفقت ہی شفقت ہوتا ہے جس طرح ایک طبیب کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ کسی بیمار سے نفرت کرے اور جو طبیب نفرت کا مرتکب ہو وہ کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا، اسی طرح داعی کو بھی بدتر سے بدتر کافر یا فاسق و فاجر سے نفرت نہیں ہونی چاہیے، بلکہ اس کے افعال سے نفرت کرکے اُس پر رحم کھانا چاہیے اور اس کی دعوت میں اس رحم اور شفقت کی جھلک محسوس ہونی چاہیے

(۴) حکمت: پیغمبرانہ دعوت کی چوتھی اہم خصوصیت یہ ہے کہ وہ اپنی بات کہنے کے لیے ایسا موقع اور ایسا ماحول تلاش کرتے ہیں جس سے ان کی بات زیادہ سے زیادہ مؤثر ہو سکے۔ حضرت والد صاحب قدس سرہٗ اس کی بہت سی مثالیں دیا کرتے تھے۔ فرمایا کہ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے ایک بے تکلف دوست تھے جو آزاد منش واقع ہوئے تھے۔ وضع قطع میں کسی طرح حضرت مولانا کے دوست قرار پانے کے اہل معلوم نہیں ہوتے تھے، اُسی زمانے میں ڈاڑھی چُھٹانے کا فیشن تھا، وہ اس فیشن پر بھی عمل کرنے کے عادی تھے اور کپڑے بھی علماء وصلحاء کی وضع کے خلاف پہنتے تھے، بعض لوگ حضرت نانوتویؒ پر تعجب بھی کرتے تھے کہ ایسے صاحب کو حضرتؒ نے دوست کیسے بنا لیا؟ اور کبھی لوگ پوچھتے بھی تھے کہ آپ ان کو سمجھاتے کیوں نہیں؟ لیکن حضرت نانوتویؒ

ہمیشہ طرح دے جاتے اور اُن کے ساتھ اُسی طرح دوستانہ بے تکلفی سے پیش آتے۔ اسی طرح بہت دن گزر گئے۔ ایک روز وہ صاحب آئے ہوئے تھے، حضرت نانوتویؒ نے ان سے فرمایا: "بھائی ہمیں بھی اپنے جیسے کپڑے سلوا دو۔" انھوں نے پوچھا: "کیوں؟" فرمایا: "ہمارا جی چاہتا ہے کہ آپ ہی جیسا لباس پہنا کریں، دوستوں کے درمیان لباس کی مغایرت اچھی معلوم نہیں ہوتی، اور یہ لو، میری ڈاڑھی موجود ہے، اس کو اپنی ڈاڑھی کی طرح چڑھا دو۔" یہ سُن کر وہ صاحب پانی پانی ہو گئے، اور عرض کیا کہ: "حضرت! آپ کو اپنی وضع بدلنے کی ضرورت نہیں، آج سے انشاء اللہ میرا لباس اور تراش خراش آپ کے طرز کے مطابق ہوگی۔"

حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ اس واقعے کو نقل کر کے فرمایا کرتے تھے کہ جب داعیِ حق کے دل میں جذبہ، لگن اور للّٰہیت ہوتی ہے تو پھر اللہ تعالیٰ اس کے قلب پر حکمت کا القاء فرماتے ہیں، اور اسے یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ کون سی بات کہنے کے لیے کون سا موقع مناسب ہوگا؟

(۵) موعظۂ حسنہ: پیغمبرانہ دعوت کا پانچواں اہم اصول یہ ہے کہ وہ دعوت کے لیے انداز بیان اور اسلوب ایسا اختیار فرماتے ہیں جو نرمی، ہمدردی اور دلسوزی کا آئینہ دار ہو۔ حضرت والد صاحبؒ فرمایا کرتے تھے کہ حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام کو فرعون کے پاس بھیجتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے انھیں یہ ہدایت فرمائی کہ:

قُولاَ لَهُ قَوْلاً لَيِّنًا

تم دونوں اُس سے نرم بات کہنا

اب کوئی شخص فرعون سے بڑا گمراہ نہیں ہو سکتا، اور حضرت موسیٰ علیہ السلام سے بڑا مُصلح اور داعی نہیں ہو سکتا، جب حضرت موسیٰ علیہ السلام جیسے داعی کو فرعون جیسے گمراہ سے بھی نرم بات کہنے کا حکم دیا جا رہا ہے تو ہم شما کی کیا حقیقت ہے؟

حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا اندازِ دعوت و تبلیغ حتی الامکان انہی اصولوں کے مطابق ہوتا تھا۔ ایک مرتبہ حضرت والد صاحب قدس سرہٗ کسی سفر پر ریل میں جا رہے تھے، ساتھ ایک اینگلو انڈین قسم کے افسر بھی سفر کر رہے تھے، شروع میں وہ اجنبیت کی بنا پر کھنچے کھنچے سے رہے لیکن تھوڑی ہی دیر میں مانوس ہو کر گفتگو کرنے لگے، مختلف موضوعات پر بات ہوتی رہی۔ حضرت

والد صاحبؒ سفر میں اپنے رفقاء کو راحت پہنچانے کے لیے ایثار و خدمت کے عادی تھے چنانچہ اُن کے ساتھ بھی ایسا ہی معاملہ فرمایا، یہاں تک کہ کسی نماز کا وقت آگیا، حضرت والد صاحبؒ اس موقع پر چپکے سے اُٹھے اور نماز پڑھ کر آگئے۔ اس وقت اُن صاحب نے کہا: "مولانا! جب آپ نماز کے لیے اُٹھنے والے تھے تو مجھے یہ خیال ہو رہا تھا کہ آپ شاید مجھے بھی نماز کے لیے کہیں گے لیکن چونکہ میں ذہنی طور پر تیار نہیں تھا، اس لیے اگر آپ اس بارے میں کچھ فرماتے تو مجھ پر بار بھی ہوتا اور شاید میں عذر بھی کر دیتا، لیکن آپ کے اس طرزِ عمل نے مجھے اتنا متاثر کیا کہ اب میں ذہنی طور پر بالکل تیار ہوں اور آئندہ آپ کے ساتھ میں بھی نماز پڑھا کروں گا"

دُوسرے فِرقوں کی تردید

حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے زمانے کے تقریباً تمام فرقوں کی تردید میں کتابیں یا مقالے تحریر فرمائے اور ابتدائی زمانے میں متعدد معرکے کے مناظرے بھی کیے لیکن اس بارے میں بھی حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا مذاق یہ تھا کہ یہ تردید و تنقید قرآن کریم کی اصطلاح میں مجادلہ بالّتی ھی أحسن کی حدود سے متجاوز نہ ہو۔

حضرت والد صاحب قدس سرہٗ فرمایا کرتے تھے کہ باطل فرقوں کی تردید بھی درحقیقت دعوت و تبلیغ ہی کی ایک قسم ہے، لہٰذا اُس میں بھی حکمت، موعظۂ حسنہ اور مُجادلہ بالّتی ہی احسن کے اصُولوں پر عمل ضروری ہے، آج کل دُوسروں کی تردید میں طعن و تشنیع، طنز و تعریض اور فقرے کسنے کا جو انداز عام ہو گیا ہے، حضرت والد صاحبؒ اس کے سخت مخالف تھے اور فرماتے تھے کہ اس سے اپنے ہمخیال لوگوں سے داد تو وصول ہو جاتی ہے لیکن اس سے مخالفین کے دل میں ضد اور عناد پیدا ہو جاتا ہے اور کسی کا ذہن بدلنے میں مدد نہیں ملتی۔

تردید میں طعن و تشنیع کا انداز

حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ میں آغازِ شباب میں دوسروں کی تردید کے لیے بڑی شوخ اور چُلبلی تحریر لکھنے کا عادی تھا اور تحریری مناظروں میں میرا طرزِ تحریر طنز و تعریض سے

بھرپور ہوتا تھا، اور "ختم نبوت" میں نے اسی زمانے میں لکھی تھی، لیکن اس کے شائع ہونے کے بعد ایک واقعہ ایسا پیش آیا جس نے میرے انداز تحریر کا رُخ بدل دیا اور وہ یہ کہ میرے پاس ایک قادیانی کا خط آیا جس میں اس نے لکھا تھا کہ آپ نے اپنی کتاب "ختم نبوت" میں جو دلائل پیش کیے ہیں بنظر انصاف پڑھنے کے بعد وہ مجھے بہت مضبوط معلوم ہوتے ہیں، اس کا تقاضا یہ تھا کہ میں مرزا صاحب کی اتباع سے تائب ہو جاؤں لیکن آپ نے اس کتاب میں جو اسلوب بیان اختیار کیا ہے وہ مجھے اس اقدام سے روکتا ہے، میں سوچتا ہوں کہ جو لوگ حق پر ہوتے ہیں وہ دلائل پر اکتفا کرتے ہیں، طعن و تشنیع سے کام نہیں لیتے، اس لیے میں اب تک اپنے مذہب پر قائم ہوں اور آپ کے طعن و تشنیع نے دل میں کچھ ضد بھی پیدا کر دی ہے۔

حضرت والد صاحبؒ فرماتے تھے کہ یہ تو معلوم نہیں کہ اُن صاحب نے یہ بات کہاں تک درست لکھی تھی، لیکن اس واقعے سے مجھے یہ تنبہ ضرور ہوا کہ طعن و تشنیع کا یہ انداز مُفید کم ہے اور مُضر زیادہ، چنانچہ اس کے بعد میں نے "ختم نبوت" پر اسی نقطۂ نظر سے نظرثانی کی، اور اس میں ایسے حصّے حذف کر دیے جن کا مصرف دلآزاری کے سوا کچھ نہ تھا اور اس کے بعد کی تحریروں میں دلآزار اسلوب سے مکمل پرہیز شروع کر دیا۔

فرماتے تھے کہ ہمیں انبیاء علیہم السلام کے طریق کار سے سبق لینا چاہیے کہ وہ ہمیشہ گالیوں اور طعنوں کے جواب میں پھول برساتے رہے ہیں، انھوں نے کبھی کسی کی سخت کلامی کا جواب بھی نہیں دیا۔ مثلاً حضرت ہُود علیہ السلام سے اُن کی قوم کہتی ہے کہ:

إِنَّا لَنَرَاكَ فِي سَفَاهَةٍ وَإِنَّا لَنَظُنُّكَ مِنَ الْكَاذِبِينَ

بلاشبہ ہم آپ کو بے وقوفی میں مُبتلا پاتے ہیں اور آپ کو جھوٹا سمجھتے ہیں

اس فقرے میں اُنھوں نے بیک وقت جھوٹا ہونے اور بے وقوف ہونے کا طعنہ دیا ہے، والد صاحبؒ فرماتے تھے کہ اگر آج کا کوئی مُناظر ہوتا تو جواب میں اُن کے باپ دادا کی بھی خبر لاتا لیکن سُنیے کہ اللہ کا پیغمبر کیا جواب دیتا ہے:

يَا قَوْمِ لَيْسَ بِي سَفَاهَةٌ وَلَٰكِنِّي رَسُولٌ مِّن رَّبِّ الْعَالَمِينَ

اے قوم! میں بے وقوفی میں مبتلا نہیں ہوں، بلکہ میں تو پروردگار عالمین

کی طرف سے پیغمبر بن کر آیا ہوں۔

دعوت کا کام انبیاء علیہم السلام کی وراثت ہے، اس لیے اس میں غصّہ نکالنے، طنز کے تیر و نشتر چلانے یا فقرے کس کر چٹخارے لینے کا کوئی موقع محل نہیں، اس کام میں تو نفسانیت کو کچلنا پڑتا ہے اور اس کے لیے دوسروں کی گالیاں کھا کر بھی دُعائیں دینے کا حوصلہ چاہیے۔

اسی ضمن میں حضرت والد صاحب قدس سرہٗ سنایا کرتے تھے کہ ایک مرتبہ حضرت شاہ محمد اسمٰعیل شہید صاحب قدس سرہٗ وعظ کہنے کے بعد جامع مسجد کی سیڑھیوں سے اُتر رہے تھے، کہ اتنے میں مخالفین میں سے کوئی شخص سامنے آگیا اور اُس نے مولٰنا کی تحقیر و تذلیل کی غرض سے کہا:

"مولانا! میں نے سنا ہے کہ آپ حرام زادے ہیں"؟

تصور تو فرمائیے کہ یہ بات اُس شخص سے کہی جارہی ہے جو ایک طرف علم و فضل کا دریائے بیکراں اور دوسری طرف خاندانی طور پر مسلّم شہزادہ اور جس نے دین کی خاطر اپنے سارے شاہی ٹھاٹھ باٹھ کو تج کر رکھ دیا، اور پھر یہ بات اُس وقت کہی جارہی ہے جب وہ وعظ کہہ کر اُتر رہے ہیں اور ظاہر ہے کہ اس وقت ان کے کچھ نہ کچھ معتقدین یا ہم خیال حضرات بھی ساتھ ہوں گے، آج اگر کسی واعظ سے ایسے ماحول میں یہ بات کہی جائے تو واعظ صاحب برافروختہ ہو کر اُس کے حسب و نسب کو معرضِ بحث میں لے آئیں گے اور اُن کے رفقاء یقیناً ایسے شخص کو سلامت نہ جانے دیں گے لیکن بے نفسی کی انتہا دیکھیے کہ حضرت شاہ صاحبؒ نے جواب میں فرمایا:

"جناب! آپ کو کسی نے غلط خبر پہنچائی، میری والدہ کے نکاح کے گواہ تو اب تک دہلی میں موجود ہیں"۔

اور اس طرح حضرتؒ نے معترض کے اس فقرے کو جو صرف گالی دینے کے لیے بولا گیا تھا ایک مسئلہ بنا کر سنجیدگی سے جواب دے دیا، یہی وہ طرزِ عمل تھا جس نے سنگدل سے سنگدل انسانوں کو موم کیا اور جس کی بنا پر دعوتِ حق کی فضا ہموار ہوتی۔

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہٗ کا یہ واقعہ بھی حضرت والد صاحبؒ بار بار سنایا کرتے تھے کہ ایک سفر میں وعظ سے پہلے انھیں کسی کا ایک خط موصول ہُوا جس میں لکھا تھا کہ "ہم نے سُنا ہے کہ آپ کافر ہیں اور جولاہے ہیں" اور یہ کہ "اگر آپ نے یہاں وعظ میں تبلیغی

مسائل چھیڑے تو آپ کی خیر نہیں" حضرت حکیم الامت قدس سرہٗ نے اس خط پر مشتعل ہونے کے بجائے وعظ کے آغاز میں لوگوں کو وہ خط پڑھ کر سنایا، اور اس کے بعد فرمایا :

" اس خط میں تین باتیں لکھی گئی ہیں، پہلی بات تو یہ کہ میں کافر ہوں، اس کا جواب تو یہ ہے کہ میں آپ کے سامنے کلمہ پڑھتا ہوں۔ أشهد أن لا اله الا الله وأشهد أن محمدا رسول الله. اب اس بحث میں پڑنے کی ضرورت نہیں کہ میں کافر ہوں یا نہیں؟ آپ کو معلوم ہے کہ اس کلمے کی بدولت ستر برس کا کافر بھی مسلمان ہو جاتا ہے، لہٰذا اگر بالفرض عند اللہ خواستہ میں کبھی کافر تھا بھی تو اس کلمے کے بعد مسلمان ہو گیا، لہٰذا اس بحث کی ضرورت نہیں۔

دوسری بات یہ کہی گئی ہے کہ میں جُلاہا ہوں، اس کا جواب یہ ہے کہ میں یہاں کوئی نکاح کا پیغام لے کر نہیں آیا جس کے لیے اس تحقیق کی ضرورت ہو، اگر بالفرض میں جُلاہا ہوں مگر دین کی کوئی صحیح بات بتاتا ہوں تو محض جُلاہا ہونے کی بنا پر اسے رد نہیں کرنا چاہیے، ویسے اگر کسی کو واقعی میرے نسب کی تحقیق مقصود ہو تو تھانہ بھون کے لوگوں سے خط لکھ کر تحقیق کر لے۔

تیسری بات یہ کہی گئی ہے کہ میں وعظ میں کوئی اختلافی مسئلہ بیان نہ کروں، سو اس کا جواب یہ ہے کہ میں یہاں وعظ کہنے کے لیے خود نہیں آیا، مجھے اس مقصد کے لیے بلایا گیا ہے، اگر اس مجمع میں سے کوئی ایک صاحب بھی اُٹھ کر مجھے وعظ کہنے سے منع فرما دیں گے تو میں وعظ نہیں کہوں گا اور وعظ میں میری عادت اختلافی مسائل کو موضوع بنانے کی نہیں ہے، لیکن اگر اثنائے وعظ میں کوئی اختلافی مسئلہ آ جاتا ہے اور اس کی وضاحت ضروری ہوتی ہے تو پھر اس کے بیان سے میں رُکتا بھی نہیں یہی عمل اس وقت بھی ہو گا، اب اگر آپ بات سننا چاہیں تو میں شروع کروں، ورنہ رُک جاؤں۔"

اس انداز کلام کا نتیجہ یہ نکلا کہ کسی ایک شخص نے بھی وعظ میں رکاوٹ نہ ڈالی، اور پھر جب وعظ شروع ہوا تو اس میں اتفاق سے بہت سے اختلافی مسائل بھی وضاحت کے ساتھ بیان

ہوئے اور بہت سے مخالفین اتنے متاثر ہوئے کہ ہم خیال بن گئے۔

اکبرالٰہ آبادی اور اقبال مرحوم

حضرت والد صاحبؒ فرمایا کرتے تھے کہ اُردو زبان میں دو شاعر ایسے ہیں جنہوں نے اپنی شاعری سے دین کی خدمت کی ہے اور اس سے دینی فکر کی اشاعت کا کام لیا ہے، ایک اکبرالٰہ آبادی مرحوم ہیں اور دُوسرے ڈاکٹر اقبال مرحوم۔ ان دونوں میں سے اکبرالٰہ آبادی مرحوم کے یہاں فکری سلامتی اقبال مرحوم کی بہ نسبت کہیں زیادہ ہے۔ اکبر مرحوم کی فکر ٹھیٹھ دینی فکر ہے اور اُن کے یہاں حکمت کی بھی فراوانی ہے، اقبال مرحوم کی فکر بھی اگرچہ مجموعی اعتبار سے دینی فکر ہے مگر اس میں اُس درجہ سلامتی نہیں، اس کے باوجود یہ بات واضح طور سے نظر آتی ہے کہ اقبال کی شاعری جتنی مؤثر ہوئی اور اس سے جتنا فائدہ پہنچا، اکبر مرحوم کی شاعری اس درجہ مؤثر نہیں ہوئی میرے نزدیک اس کا سبب یہ ہے کہ اکبر مرحوم نے اپنے خیالات کے اظہار کے لیے طنز و تعریض کا طریقہ اختیار کیا اور طنز کی خاصیت یہ ہے کہ اس سے ہم خیال لوگ لُطف تو محسوس کرتے ہیں لیکن اُس سے کوئی مؤثر اصلاحی کام نہیں ہوتا بلکہ بعض اوقات مخالفین میں ضد پیدا ہو جاتی ہے۔

تصلّب اور عناد کا فرق

خلاصہ یہ کہ مثبت دعوت و تبلیغ ہو یا کسی باطل نظریئے کی تردید، حضرت والد صاحب قدس سرہٗ کا مذاق دونوں میں یہ تھا کہ اپنے موقف پر مضبوطی سے قائم رہنے کے باوجود طعن و تشنیع اور دلآزار اسلوب بیان سے مکمل پرہیز کیا جائے اور اس کے بجائے ہمدردی و دلسوزی اور نرمی و شفقت سے کام لے کر ذہنوں کو بدلنے کی کوشش کی جائے۔

لیکن اس نرمی کا یہ مطلب نہیں کہ حق کو حق یا باطل کو باطل کہنے میں مداہنت سے کام لیا جائے کیونکہ کفر کو کفر تو کہنا ہی پڑے گا، لیکن مطلب یہ ہے کہ حقیقت کے ضروری اظہار کے بعد محض اپنی نفسانیت کی تسکین کے لیے فقرہ بازیاں نہ کی جائیں، حضرت والد صاحبؒ فرماتے تھے کہ داعیٔ حق کی مثال ریشم جیسی ہونی چاہیے کہ اُس کو چھُو کر دیکھو تو اتنا نرم و ملائم کہ ہاتھوں کو حظ نصیب ہو

لیکن اگر کوئی اُسے توڑنا چاہے تو اتنا سخت کہ تیز دھار بھی اس پر پھسل کر رہ جائے۔
چنانچہ مباحثہ تحریری ہو یا زبانی، حضرت والد صاحبؒ حق کے معاملے میں ادنیٰ لچک کے روادار نہیں تھے، لیکن بات کہنے کا طریقہ ہمیشہ ایسا ہوتا جس سے عناد کے بجائے دلسوزی، حق پرستی اور للّٰہیت مترشح ہوتی تھی۔ چنانچہ جس شخص سے کبھی قلمی مباحثہ رہا ہو، وہ اگر کبھی سامنے آجائے تو نہ آپ کے اندازِ گفتگو اور اندازِ تحریر میں کوئی فرق ہوتا تھا، اور نہ آپ کو کبھی اس بنا پر شرمندگی اٹھانی پڑتی تھی کہ جس شخص کے بارے میں حد سے گذرے ہوئے الفاظ لکھ چکا ہوں، اُس کا سامنا کیسے کروں؟
آپ مخالف نقطۂ نظر والوں کو زبانی گفتگو میں بھی حق کے معاملے میں سخت سے سخت بات کہہ دیتے لیکن وہ کبھی یہ تأثر لے کر نہیں اُٹھتا تھا کہ اس سختی کا سبب کوئی عناد ہے۔ ایسی بے شمار مثالیں مجھے یاد ہیں جن میں آپ نے بڑے بڑے ذی اثر لوگوں کو خوب کھری کھری سنائیں لیکن ایسا ایک واقعہ یاد نہیں کہ اُن کی بنا پر کوئی عناد کا تأثر لے کر گیا ہو۔

احتیاط و تثبت

دُوسرے نظریات کی تردید میں حضرت والد صاحب قدس سرہٗ کا ایک اصول یہ تھا کہ جس شخص یا گروہ پر تنقید کی جارہی ہے، پہلے اس کے نظریات و افکار اور اس کے منشاء و مُراد کی اچھی طرح تحقیق کرلی جائے اور اس کی طرف کوئی ایسی بات منسوب نہ کی جائے جو اس نے نہیں کہی یا جو اس کی عبارتوں کے منشاء و مُراد کے خلاف ہو۔
آج کل بحث و مباحثہ اور مناظروں کی گرم بازاری میں احتیاط و تثبت کے اس پہلو کی رعایت بہت کم کی جاتی ہے اور دوسرے کی تردید کے جوش میں اُس کی غلطی کو بڑھا چڑھا کر پیش کرنے کی کوشش کی جاتی ہے اور اس طرح بعض ایسی باتیں مخالف کی طرف منسوب کر دی جاتی ہیں جو اس نے نہیں کہی ہوتیں۔ یہ طرزِ عمل اوّل تو انصاف کے خلاف ہے، دوسرے اس سے تردید کا فائدہ بھی حاصل نہیں ہوتا اور بسا اوقات اس کے نتیجے میں بحث و مباحثہ کا ایک غیر متناہی سلسلہ شروع ہو جاتا ہے جو افتراق و انتشار پر منتج ہوتا ہے۔
اس سلسلے میں حضرت والد صاحب قدس سرہٗ نے احقر کو اس زریں اصول کی تلقین فرمائی تھی کہ

یُوں تو انسان کو اپنے ہر قول و فعل میں محتاط ہونا چاہیے لیکن خاص طور پر جب دوسروں پر تنقید کا موقع ہو تو ایک ایک لفظ یہ سوچ کر لکھو کہ اسے عدالت میں ثابت کرنا پڑے گا اور کوئی ایسا دعویٰ جزم کے ساتھ نہ کرو جسے شرعی اصولوں کے مطابق ثابت کرنے کے لیے کافی مواد موجود نہ ہو۔ حضرت والد ماجد قدس سرہ کی اس نصیحت نے احقر کو جس قدر فائدہ پہنچایا اور اس کے جن بہتر ثمرات کا کھلی آنکھوں مشاہدہ ہُوا انھیں الفاظ میں بیان کرنا مشکل ہے۔

خود حضرت والد صاحبؒ کی تحریروں میں احتیاط کا یہ پہلو جس قدر نمایاں ہے اور اسکے پیشِ نظر آپ کی عبارت میں جو قیود و شرائط ملتی ہیں اُن کی مثالیں دینا چاہُوں تو ایک پورا مقالہ اس کے لیے چاہیے لیکن یہاں ایک واضح مثال پر اکتفا کرتا ہوں۔

خاکسار تحریک کے بانی عنایت اللہ مشرقی صاحب نے ایک زمانے میں ہندوستانی مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد کو متاثر کیا۔ ان کے عقائد و نظریات جمہورِ امت سے بہت سے معاملات میں مختلف تھے، اور بعض نظریات تو ایسے تھے کہ دائرۂ اسلام میں ان کی کوئی گنجائش نظر نہیں آتی تھی۔ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہ کے ایماء پر حضرت والد صاحبؒ نے اُن کے نظریات کی تردید میں ایک رسالہ تحریر فرمایا جو "مشرقی اور اسلام" کے نام سے شائع ہُوا ہے۔ رسالہ تو مختصر سا ہے لیکن حضرت والد صاحبؒ فرمایا کرتے تھے کہ میں نے اس کی ترتیب میں بڑی محنت اٹھائی، اوّل تو مشرقی صاحب کی تمام معروف تصانیف کا بہ نظر غائر مطالعہ کیا۔ پھر ان کے جن مقامات پہ جمہورِ امت سے ناقابلِ برداشت انحراف نظر آیا، اُن کو قلمبند کیا، اور پھر مزید احتیاط یہ کی کہ ان عبارتوں کو جمع کر کے مشرقی صاحب کے پاس بھیجا کہ ان عبارتوں سے آپ کی مُراد وہی ہے جو ان سے ظاہر ہوتی ہے یا آپ کچھ اور کہنا چاہتے ہیں؟ اُن کی طرف سے کوئی واضح جواب نہ آیا تو انھیں دوبارہ خط لکھا، اور یہ خط و کتابت کافی عرصے تک جاری رہی؛ یہاں تک کہ جب اس خط و کتابت کے نتیجے میں یقین ہوگیا کہ مُراد وہی ہے جو ان کی عبارتوں سے ظاہر ہے تو پھر اس پر تردید تحریر فرمائی۔ یہ رسالہ پہلے مستقل شائع ہُوا تھا اور اب "جواہر الفقہ" میں شامل ہے۔

جماعت اسلامی اور مولانا مودودی صاحب کے بارے میں بھی حضرت والد صاحب قدس سرہ نے ایک زمانے تک کسی واضح اور حتمی تحریر کی اشاعت سے گریز فرمایا لیکن درحقیقت آپ کے اس

طرزِ عمل کی پہلی وجہ تو یہ تھی کہ آپ کا سوچا سمجھا موقف یہ تھا کہ اس نازک دور میں جبکہ اسلام کی بنیادوں
پر کھلے کفر و الحاد کی یورش انتہا کو پہنچی ہوئی ہے، مسلمانوں کے باہمی اختلافات کو باقاعدہ محاذِ جنگ
اور معرکۂ کارزار بنانا اسلام کے مقاصد کے لیے مضر ہوگا، اس لیے آپ اس دور میں علمی طور پر اپنے
مسلک و موقف کی وضاحت اور دوسرے موقف پر تنقید کو بھی ضروری سمجھتے تھے لیکن اس علمی تنقید
کے لیے وہی احتیاط و تثبت اور تحقیق لازمی تھی، حضرت والد صاحبؒ کو اس ضرورت کا ہمیشہ احساس
رہا کہ مولانا مودودی صاحب سے جن مسائل و نظریات میں جس درجے کا اختلاف ہے، اُسے یا تو
افہام و تفہیم کے ذریعے ختم یا کم کرنے کی کوشش کی جائے اور اگر یہ ممکن نہ ہو تو اس اختلاف کی
وضاحت کرکے اس پر علمی تنقید و تردید کی جائے لیکن آپ کی مصروفیات اس قدر گوناگوں تھیں کہ
آپ کو مدت تک اس بات کا موقع نہیں مل سکا کہ مولانا مودودی صاحب کی کتابوں کا خود مطالعہ
کرسکیں اور سُنی سُنائی باتوں یا دوسروں کے دیے ہوئے اقتباسات کی بنیاد پر کچھ لکھنا آپ کے
مزاج کے بالکل خلاف تھا، اس لیے عرصۂ دراز تک اس سلسلے میں آپ نے کوئی تحریر شائع نہیں فرمائی
اور نجی سوالات کے موقع پر اجمالی جوابات دیتے رہے۔ یہاں تک کہ وفات سے چند سال پہلے آپ
نے مودودی صاحب کی کچھ کتابوں کا خود مطالعہ فرمایا اور اس موقع پر اُن کے بارے میں اپنی جچی تُلی
رائے ایک استفتاء کے جواب میں تحریر فرمادی، اور اُسے جواہر الفقہ کا جزء بنا دیا۔ اور حقیقت یہ ہے
کہ جو احتیاط و تثبت، عدل و انصاف، توازن و اعتدال اور ہمدردی و دلسوزی حضرت والد صاحب
رحمۃ اللہ علیہ کی تنقیدی یا تردیدی تحریروں میں نظر آتی ہے، اُس کا اصل سبب وہ للّٰہیت بےنفسی
اور خداترسی ہے جو آپ کی گھٹی میں پڑی ہوئی تھی اور اس کا لازمی ثمرہ یہ ہوتا ہے کہ حق پسند طبیعتیں
بات کو قبول کرتی ہیں، اور اگر کوئی قبول بھی نہ کرے، تو اس سے مسلمانوں کے درمیان افتراق و انتشار
کا دروازہ نہیں کھلتا۔ چنانچہ حضرت والد صاحب قدس سرہٗ کو جتنے مکاتبِ فکر سے اختلاف تھا، اُن
میں سے غالباً ہر ایک کے بارے میں تنقیدی مضامین یا رسالے آپ نے تحریر فرمائے ہیں، شیعہ صاحبان
سے لے کر اہلِ حدیث حضرات تک کوئی بھی مکتبِ فکر ایسا نہیں ہے جس کے بارے میں آپ کی
کوئی تنقیدی تحریر موجود نہ ہو، لیکن یہ اسی للّٰہیت کا ثمرہ تھا کہ کسی بھی مکتبِ فکر سے مخاصمت کی فضا
پیدا نہیں ہوئی، بلکہ ملت کے کسی اجتماعی کام میں جب مختلف مکاتبِ فکر کی مشترک جدوجہد کی ضرورت

پیش آئی تو حضرت والد صاحبؒ اُن حضرات میں سے تھے جن کی طرف اس بارے میں سب سے پہلے نگاہیں اُٹھتی تھیں اور مخالف فرقے بھی عموماً اس بات کے معترف تھے کہ آپ نے جو کچھ کہا، اور لکھا ہے اس کا منشاء للّہیت کے سوا کچھ نہیں۔

اگر آج مسلمانوں کے تمام گروہ اور جماعتیں اس طریق کار کو اپنا لیں تو اُمت کو افتراق اور انتشار کے اُس عذاب سے نجات مل جائے جو اس کی اجتماعی فلاح کے راستے میں بہت بڑی رکاوٹ ہے۔

سیاست

حضرت والد صاحب قدس سرہٗ کا مزاج طبعی طور پر سیاسی نہیں تھا، اور نہ انہوں نے کبھی سیاست کو اپنا محورِ عمل بنایا، لیکن سیاست بھی دین کا ایک اہم شعبہ ہے، اور اس شعبے میں بھی مسلمانوں کی اجتماعی بہبود کی فکر ایک عالم دین اور داعیٔ حق کے فرائض میں شامل ہے، اس لئے جب کبھی مسلمانوں کی کوئی شدید اجتماعی ضرورت داعی ہوئی تو آپ نے محدود مقاصد کے تحت اس شعبے میں بھی عظیم خدمات انجام دیں، لیکن اس انداز کے ساتھ کہ ان خدمات کے معروف ہونے کے باوجود آپ کبھی سیاسی شخصیت کی حیثیت سے معروف نہیں ہوئے۔

آپ کی زندگی میں چار مواقع ایسے آئے جب آپ نے سیاست میں سرگرمی سے حصہ لیا، سب سے پہلے تحریک خلافت کے زمانے میں، دوسرے تحریک قیام پاکستان میں، تیسرے پاکستان کے قیام کے بعد یہاں اسلامی دستور نافذ کرنے کی جدوجہد میں، اور چوتھے ۱۹۷۰ء کے الیکشن سے پہلے سوشلزم کی تردید میں۔

جہاں تک تحریکِ خلافت کا تعلق ہے، یہ آپ کی نوعمری کا زمانہ تھا، اور چونکہ آپ کو حضرت شیخ الہند قدس سرہٗ سے خصوصی تعلق تھا، اس لئے انہی کی سرپرستی میں انہی کے ایک معتقد و منتسب کی حیثیت سے آپ نے اس تحریک میں کام کیا، لیکن یہ کام بہت محدود بھی تھا اور نوعمری کی بناء پر اس دور کے تفصیلی حالات محفوظ نہیں رہ سکے۔

البتہ جب قیام پاکستان کے لئے ملک گیر تحریک شروع ہوئی تو یہ آپ کا عہدِ شباب تھا، اور حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی اور شیخ الاسلام حضرت علامہ شبیر احمد صاحب

عثمانیؒ کی سرپرستی میں انہی کے ایماء کے مطابق آپ نے اس تحریک میں بھرپور حصہ لیا جس کے قدرے مفصل حالات برادر کرم و محترم حضرت مولانا مفتی محمد رفیع صاحب عثمانی مدظلہم اور جناب منشی عبدالرحمن خاں صاحب کے مضامین میں مذکور ہیں۔

نیز قیام پاکستان کے بعد آپ آخر وقت تک یہاں اسلامی دستور و قانون کے نفاذ کی عملی جدوجہد میں حصہ لیتے رہے، شروع کے تقریباً دس سال تو شب و روز اسی کوشش میں گزرے، البعد میں زیادہ توجہ تعلیمی اور تصنیفی مشاغل کی طرف ہوگئی اور عملی سیاست سے کنارہ کش ہوگئے، لیکن نفاذ اسلام کی کوششیں سیاست سے علیحدہ رہ کر بھی جاری رہیں، سیاست میں حضرت والد صاحبؒ کے مذاق کی جو خاص خاص باتیں احقر کی سمجھ میں آسکیں وہ مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔ علماء اور سیاست

علماء کے لئے سیاست میں حصہ لینے کو حضرت والد صاحبؒ اس حد تک تو بہتر سمجھتے تھے کہ ملک میں اسلامی قوانین کے لئے حتی جدوجہد ضروری ہو وہ کی جائے، لیکن اس سلسلے میں آپ دو باتوں پر بہت زور دیتے تھے:۔

۱۔ سب سے پہلی بات یہ کہ دینی تعلیمی اداروں کو سیاست سے بالکل الگ رکھا جائے، ان اداروں کے اساتذہ و طلباء کو ملک کے سیاسی حالات سے نظری طور پر واقف تو رہنا چاہیے، لیکن عملی سیاست میں حصہ نہیں لینا چاہیے۔ اور جب کبھی کسی تعلیمی ادارے سے تعلق رکھنے والا کوئی عالم یہ محسوس کرے کہ اس کا عملی سیاست میں حصہ لینا ضروری ہے تو بہتر یہ ہے کہ وہ پہلے اس ادارے سے مستعفی ہو جائے، اور پھر سیاسی خدمات انجام دے۔

حضرت والد صاحب قدس سرہ فرمایا کرتے تھے کہ اکابر علماء دیوبند کا طریقہ یہی رہا ہے کہ دارالعلوم دیوبند سے وابستہ رہنے کی حالت میں انہوں نے عملی سیاست میں کوئی نمایاں حصہ نہیں لیا، لیکن جب حضرت شیخ الہندؒ آزادی ہند کے سلسلے میں تحریکات خلافت میں مؤثر حصہ لینے لگے تو دارالعلوم دیوبند سے الگ ہوگئے۔ خود حضرت والد صاحبؒ اور شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد صاحب عثمانیؒ نے بھی جب تحریک قیام پاکستان میں سرگرمی سے عملی حصہ لینا شروع کیا تو پہلے دارالعلوم دیوبند سے

مستعفی ہوئے، اس کے بعد عملی جدوجہد شروع کی۔

اس طرزِ عمل کی وجوہ بہت سی ہیں، سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ جب کوئی تعلیمی ادارہ خود یا اس کے اساتذہ وطلبہ عملی سیاست میں مشغول ہو جاتے ہیں تو وہ علمی انہماک مفقود ہو جاتا ہے جو تحصیل علم کے لئے ناگزیر ہے اور اس کی وجہ سے تعلیم و تعلّم کا معیار گر جاتا ہے اور استعدادیں کمزور پڑ جاتی ہیں۔ علم یکسوئی چاہتا ہے اور سیاسی مشاغل کو یکسوئی سے بیر ہے، چنانچہ جو لوگ زمانہ طالب علمی کے دوران عملی سیاست میں لگ جاتے ہیں عموماً ان کی استعداد ناقص رہ جاتی ہے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ علم وعمل کا صحیح مذاق پیدا کئے بغیر جب ناپختہ ذہن طلباء سیاست میں حصہ لیتے ہیں تو وہ حدود قائم نہیں رکھ پاتے جو اسلام نے سیاسی جدوجہد کے لئے مقرر کی ہیں، اور حدود کی مسلسل پامالی سے بالآخر دینی حلقوں کی سیاست بھی لادینی سیاست کے رخ پر پڑ جانے کا اندیشہ رہتا ہے۔ نیز پختہ دینی تربیت کے بغیر جب انسان سیاست کے خارزار میں داخل ہوتا ہے تو پندار و تعلی، نام و نمود حب جاہ و منصب اور اسی طرح کی دوسری باطنی بیماریوں سے حفاظت بہت مشکل ہو جاتی ہے۔

تیسرے تقسیم کار کے اصول کا تقاضا بھی یہ ہے کہ تمام اہل علم سیاست ہی کے نہ ہو رہیں، بلکہ کچھ لوگ تعلیم و تعلّم اور خالص دعوت وارشاد کے کام سے بھی وابستہ رہیں، تاکہ دینی ضرورت کے تمام کام توازن کے ساتھ چلتے رہیں، اور کسی شعبے میں کوئی خلا پیدا نہ ہو۔

چوتھے دینی مدارس کی صلاح وفلاح اس میں ہے کہ وہ نہ تو حکومت کے اتنے قریب ہوں کہ اس کے دست نگر ہو کر رہ جائیں، اور نہ حکومت سے ایسی مخاصمت قائم کریں کہ ان کے کام میں رکاوٹ پڑنے لگے، حکومتیں آئے دن بدلتی رہتی ہیں، لیکن ان اداروں کا کام ٹھوس، مثبت اور متواتر ہے اس لئے حکومتوں کے قرب و بعد سے اس پر برا اثر نہ پڑنا چاہیے۔ ان کو ہر حالت میں اپنے دور رس تعمیری کام میں مشغول رہنا چاہیے۔ اور یہ ادارے عملی سیاست میں داخل ہوں تو ان کی یہ حیثیت خطرے میں پڑ سکتی ہے۔

۲۔ پھر جو اہل علم تعلیمی اداروں سے وابستہ نہ ہوں ان کے سیاست میں حصہ لینے کے بارے میں بھی حضرت والد صاحب قدس سرہٗ کا رجحان اس طرف تھا کہ شدید ضرورت کے بغیر وہ الیکشن میں حصہ نہ لیں تو بہتر ہے، شیخ الاسلام حضرت علامہ شبیر احمد صاحب عثمانی قدس سرہٗ نے ایک مرتبہ اسمبلی میں

تقریر کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ "ارباب اقتدار اس غلط فہمی کو ذہن سے نکال دیں کہ مُلا اقتدار چاہتا ہے، میں واضح الفاظ میں کہہ دینا چاہتا ہوں کہ ہم کبھی اقتدار میں آنا نہیں چاہتے، لیکن اربابِ اقتدار کو "تھوڑا سا مُلا" بنانا ضرور چاہتے ہیں۔"

حضرت علامہ عثمانیؒ اور حضرت والد صاحبؒ کے ذہن میں علماء کے سیاست میں حصہ لینے کا جو نقشہ تھا وہ یہ کہ ایک طرف تمام مکاتبِ فکر کے علماء متحد ہو کر ملک میں اسلامی شریعت کے نفاذ کے لئے رائے عامہ کو ہموار کریں، اس کے لئے تقریر و تحریر اور علم و تحقیق کے جس کام کی ضرورت ہو اسے انجام دیں، یہاں تک کہ یہ عوامی مطالبہ ــــ محض ایک نعرے کی شکل میں نہیں، بلکہ ایک ٹھوس اور مثبت پروگرام کی شکل میں ــــ اتنی قوت اختیار کر جائے کہ کسی بھی حکومت کو اس سے سرتابی کی جرأت نہ ہو، اور دوسری طرف وہ دیندار، سلیم الفکر اور مخلص افراد کی ایسی ٹیم تیار کریں جو الیکشن میں حصہ لے کر حکومت کے ایوانوں تک پہنچے اور اس عوامی مطالبے کو علماء کے زیرِ ہدایت عملی جامہ پہنانے کی کوشش کرے، چنانچہ جس زمانے میں "جمعیۃ علماء اسلام" کی ذمہ داری حضرت مولانا مفتی محمد حسن صاحب قدس سرہٗ اور حضرت والد صاحبؒ وغیرہ کے پاس تھی، اس دور میں "نظامِ اسلام پارٹی" جمعیت ہی کی طرف سے اسی مقصد کے لئے قائم کی گئی تھی۔

بعض حضرات کا خیال یہ ہے کہ یہ سیاسی حکمتِ عملی جو ان حضرات نے اختیار فرمائی تھی، کامیاب نہیں ہو سکی، اور اس سے مطلوبہ نتائج حاصل نہیں ہوئے، لیکن احقر کی ناقص رائے میں اس کی وجہ یہ نہیں کہ یہ حکمتِ عملی غلط تھی، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ چند در چند وجوہ کی بنا پر سیاسی جدّوجہد کا یہ نقشہ بروئے کار آ ہی نہیں سکا، ورنہ اگر یہ نقشہ اپنی تمام تفصیلات کے ساتھ بروئے کار آتا تو غالباً اس کے نتائج آج کے مقابلے میں کہیں بہتر ہوتے۔

بہرکیف! یہ الگ موضوع ہے کہ سیاسی جدّوجہد کا یہ طریقہ صحیح اور مناسب تھا یا نہیں، لیکن یہاں صرف یہ بتانا مقصود تھا کہ حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا سیاسی مذاق کیا تھا اور وہ علماء کے لئے کس قسم کی سیاسی جدّوجہد کو مفید اور مناسب خیال فرماتے تھے، حضرتؒ کو اپنی کسی بھی رائے پر جمود کبھی نہیں ہوا، خاص طور پر سیاست کے بارے میں یہ فرمایا کرتے تھے کہ مجھے طبعاً اس سے مناسبت نہیں، اس لئے بعض اوقات اپنے دوسرے اہل الرائے رفقاء کے احترام میں انہوں نے اپنی ذاتی رائے کو قربان بھی کر دیا، لیکن ان کا اصلی

مذاق وہی تھا جو اوپر عرض کیا گیا۔

۲۔ حکمرانوں کے ساتھ طرزِ عمل

حضرت والد صاحبؒ کے سیاسی مذاق کا دوسرا اہم جزو یہ تھا کہ علماء کو حکومت اور حکمرانوں کے ساتھ کس قسم کا طرزِ عمل اختیار کرنا چاہیے۔ اس سلسلے میں آپ کی سوچی سمجھی رائے یہ تھی کہ علماء کو نہ تو حکمرانوں سے اتنا قرب اختیار کرنا چاہیے جس سے ان کے علمی وقار و استغناء پر آنچ آئے، یا حق گوئی میں رکاوٹ پیدا ہو اور نہ ایسا بُعد رکھنا چاہیے کہ وہ ذاتی یا سیاسی خصومت کی شکل اختیار کر جائے، بلکہ علماء کا منصب ایک ایسے آزاد و مستغنی، مگر خیرخواہ ادارے کا ہونا چاہیے جو حکومت کے اچھے کاموں میں اس کے ساتھ تعاون بھی کرے، اور اس کے غلط کاموں پر ہمدردی و خیرخواہی اور حکمت و دل سوزی کے ساتھ تنقید و احتساب کا فریضہ بھی انجام دے۔

برصغیر میں انگریز کے دوسو سالہ عہدِ اقتدار کے دوران چونکہ مخلص اور باضمیر مسلمان ہمیشہ انگریز حکومت سے بیزار اور آزادیٔ ہند کے لئے کوشاں رہے ہیں، اس لئے مسلمانوں کے سیاسی مزاج میں دوسو سال تک حکومت کی مخالفت کا رجحان غالب رہا، اور ہر اس تحریک کو قبولِ عام حاصل ہوا جو حکومت کی مخالفت میں اٹھی ہو، یہاں تک کہ دوسری جنگِ عظیم کے موقع پر حریت پسند مسلمانوں کی ہمدردیاں جرمنی اور ہٹلر تک سے وابستہ ہوگئیں، کیونکہ اس کی طاقت اور فتوحات کے بڑھتے ہوئے سیلاب سے یہ توقع کی جاسکتی تھی کہ وہ انگریز کی شوکت توڑنے اور اس کے جمے ہوئے اقتدار کو ڈھانے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

شاید اسی دوسو سالہ سیاسی مزاج کے باقی ماندہ اثرات ہیں کہ قیامِ پاکستان کے بعد یہاں بھی منفی اندازِ سیاست پروان چڑھا، اور تقسیم سے پہلے کی طرح اب بھی حکومت کی ہر مخالفت نہ صرف قابلِ تعریف بلکہ بذاتِ خود مقصد بن کر رہ گئی، اور جو شخص حکومت کے مقابلے میں جتنے زور اور جتنے تشدد سے سامنے آتا عوام میں اسے اتنی ہی مقبولیت حاصل ہوتی۔ اس رجحان کو حکمرانوں کے اس طرزِ عمل سے بھی تقویت ملی جو واقعۃً قابلِ مخالفت تھا، لیکن بہرحال، واقعہ یہی ہوا کہ ہماری سیاست میں منفی اندازِ فکر ترقی کرتا چلا گیا۔

حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ تقسیمِ ہند کے بعد ہماری سیاسی حکمتِ عملی بھی تبدیلی کی محتاج تھی، اب انگریزی دور کی طرح حکومت کی مخالفت بذاتِ خود مقصد نہ بننی چاہیے تھی، بلکہ ہر مرحلے پر ٹھنڈے دل و دماغ سے یہ سوچنے کی ضرورت تھی کہ ملک و ملت کے استحکام اور اسلامی طرزِ حیات کے فروغ کے لئے کونسا

طرزِ عمل مفید ہوگا؟ اس طرزِ فکر کے نتیجے میں جہاں بعض مواقع پر حکومت کے مقابلے میں ڈٹ جانا مفید ہوتا، وہاں بعض مواقع پر اس کی حوصلہ افزائی اور اس کے قریب پہنچنا بھی زیادہ سودمند ثابت ہوتا۔ چنانچہ ملکی سیاست میں کئی مراحل ایسے بھی آئے کہ جن میں حکومت سے سیاسی مخاصمت کی فضا پیدا کرنے کے بجائے اس کے ساتھ باوقار تعاون اور اسے دور دور سے برا کہنے کے بجائے قریب جاکر اصلاح کی فکر شاید ملک و ملت کے لئے زیادہ مفید ثابت ہوتی۔

شیخ الاسلام حضرت علامہ شبیر احمد صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ نے اسی مخلصانہ فکر کے ساتھ ملکی سیاست میں حصہ لیا تھا، چنانچہ پاکستان میں ان کی مختصر سی سیاسی زندگی میں حکومت کے ساتھ تعاون اور اس کی مخالفت دونوں کی متوازن مثالیں موجود ہیں لیکن اس دور میں جو جماعتیں ملک کے سیاسی منظر پر زیادہ نمایاں تھیں وہ بدستور "اقتدار چھوڑ دو" کی اسی سیاست پر عمل پیرا رہیں جو تقسیم ہند سے پہلے کی سیاست تھی۔ بلکہ بعض حضرات کی طرف سے حضرت علامہ عثمانیؒ اور ان کے رفقاء کے طرزِ عمل پر یہ اعتراضات بھی ہوتے کہ وہ جرأت و عزیمت اور بے باکی و شجاعت سے محروم ہے اور حضرت والد صاحبؒ سنایا کرتے تھے کہ ایک ایسے ہی اعتراض کے جواب میں حضرت علامہ عثمانی قدس سرہٗ نے فرمایا تھا: "اگر دل میں اخلاص ہو تو بعض اوقات حکومت کے قید خانے برداشت کرنے کے مقابلے میں عوام کی کالی جھنڈیوں کو برداشت کرنا زیادہ جرأت و عزیمت چاہتا ہے، اور جس طرح قید و بند سے ڈر کر اپنے صحیح طرزِ عمل کو بدل لینا بزدلی اور مداہنت ہے اسی طرح کالی جھنڈیوں سے ڈر کر اپنے ضمیر کی آواز کو دبا لینا بھی بدترین مداہنت ہے۔ اس میں اگر حکومت کی خوشامد یا رضا مطلوب ہے تو اس میں عوام کو خوش کر کے ہیرو بننا مقصود ہے، اور اللہ کو راضی کرنے کی فکر دونوں میں نہیں۔"

البتہ اس طرزِ عمل کا لازمی جزء یہ ہے کہ حکومت کے قرب کو ایک تو سہل انگاری یا عافیت کوشی کی بنا پر نہیں بلکہ دینی ضرورت کے تحت اختیار کیا جائے، چنانچہ جہاں ضرورت داعی ہو وہاں حق گوئی سے ادنیٰ باک نہ ہو اور دوسری طرف اس قرب کو خالصۃً لوجہ اللہ اختیار کیا جائے اور اس میں ذاتی مفادات کا شائبہ بھی پیدا نہ ہو کیونکہ وہ دنیا و آخرت دونوں کی تباہی ہے، اور ایسے قرب سے بُعد ہزار درجہ بہتر ہے۔

حضرت والد صاحب قدس سرہٗ کا حکمرانوں کے ساتھ جو طرزِ عمل رہا وہ ان تمام حدود کی رعایت سے عبارت تھا۔ آپ نے کبھی کسی حکمران کے سامنے مداہنت سے کام نہیں لیا، اور ضرورت کے مواقع پر سخت سے سخت بات کہنے سے بھی دریغ نہیں کیا، لیکن ساتھ ہی آپ نے مخالفت برائے مخالفت کے بجائے

ضرورت کے وقت حکومت سے تعاون اور اچھے کاموں میں اس کی حوصلہ افزائی میں بھی بخل کا مظاہرہ نہیں فرمایا۔ آپ دینی مقاصد کے تحت متعدد حکمرانوں سے قریب بھی رہے، اور اسی مقصد کے تحت آپ کو بعض حکومتوں کے زیر عتاب بھی رہنا پڑا۔ ایک طرف آپ کے وقار و استغناء اور دوسری طرف للہیت اور ہمدردی و خلوص کی وجہ سے حکمرانوں پر یہ بات واضح رہی کہ آپ کو نہ خریدا جا سکتا ہے، نہ ضمیر کے خلاف کسی قول و فعل پر آمادہ کیا جا سکتا ہے، اور نہ کسی معاملے میں آپ کی حمایت کو تملق یا مخالفت کو عناد پر محمول کیا جا سکتا ہے۔

جس زمانے میں آپ بورڈ تعلیمات اسلام کے رکن تھے اس دور میں آپ نے ایک دینی ضرورت کے تحت حکومت کے خلاف ایک اخباری بیان دے دیا، اس پر ایک اعلیٰ سرکاری عہدہ دار نے آپ سے کہا کہ "مفتی صاحب! آپ نے بورڈ کا ممبر ہوتے ہوئے ایسا بیان دیا، حالانکہ یہ بورڈ حکومت ہی کا قائم کردہ ہے" اس پر حضرت والد صاحبؒ نے فرمایا، "اول تو بورڈ کے ارکان حکومت کے ملازم نہیں اور اگر ملازم بھی ہوں تو یہ ملازمت شاید ان حضرات کے لئے تو حق گوئی میں رکاوٹ بن سکتی ہو جن کا ایک سوٹ کم از کم دو سو روپے میں بنتا ہے، اور جوتے ٹوپی پر مزید سو روپے خرچ ہوتے ہیں، اس کے برخلاف میرا معاملہ یہ ہے کہ بحمداللہ سر سے لے کر پاؤں تک میرے لباس کی تیاری پر بمشکل پندرہ بیس روپے خرچ ہوتے ہیں، اس لئے کوئی ملازمت میرے لئے رکاوٹ نہیں بن سکتی۔ رہا بورڈ کی رکنیت کا معاملہ تو شاید آپ کو معلوم نہیں کہ میں بفضلہ تعالیٰ اس عہدے سے استعفاء جیب میں لئے پھرتا ہوں، جب یہ رکنیت کسی دینی ضرورت کی انجام دہی میں رکاوٹ ثابت ہوگی تو ان شاء اللہ استعفاء دینے کے لئے چند منٹ بھی درکار نہیں ہوں گے"

حکمرانوں سے ملاقات یا ان سے میل جول بڑھانے کی باقاعدہ کوشش کرنا آپ کو بالطبع ناپسند تھا، جہاں کوئی دینی فائدہ نظر آتا وہاں بقدر ضرورت ملاقاتیں کرتے، لیکن جہاں ان ملاقاتوں سے کوئی دینی فائدہ متصور نہ ہوتا وہاں حتی الامکان اس سے پرہیز ہی فرماتے۔ ایک مرتبہ مشرقی پاکستان کے ایک بڑے دینی مدرسے کا جلسہ تھا جس کے مہتمم صاحب سے حضرت والد صاحبؒ کے دیرینہ دوستانہ مراسم تھے، اس جلسے میں انہوں نے اس وقت کے صدر مملکت کو بھی مدعو کیا تھا، اتفاق سے اس وقت کے سربراہ مملکت ایک ایسے صاحب تھے جن سے حضرت والد صاحبؒ کو دینی معاملات میں کسی خیر کی توقع نہ تھی، اس لئے آپ نے یہ طے کیا ہوا تھا کہ مجھے ان صاحب سے کبھی ملاقات نہیں کرنی، جب

جلسے کا دن آیا اور صدر صاحب کی آمد آمد ہوئی تو حضرت والد صاحبؒ نے مدرسے کے مہتمم صاحب سے فرمایا کہ وہ میں ان صاحب سے نہ ملنا چاہتا ہوں، نہ یہ پسند کرتا ہوں کہ ان سے میرا سامنا ہو اس لئے آپ مجھے کوئی ایسا کمرہ بتا دیجئے جہاں میں سو جاؤں۔“ انہوں نے ایک کمرہ حضرت والد صاحبؒ کے لئے مخصوص کر دیا، اور آپ وہاں سو گئے۔ جب صدر صاحب تشریف لائے اور انہیں مدرسے کا معائنہ کرایا گیا تو معائنے کے دوران مہتمم صاحب انہیں اس کمرے پر بھی لائے، اور اندر اشارہ کر کے فرمایا:
”اس میں مفتی محمد شفیع صاحب سو رہے ہیں۔“

صدر صاحب کے جانے کے بعد جب مہتمم صاحب نے حضرت والد صاحبؒ سے اس واقعے کا تذکرہ فرمایا تو آپ نے کہا: ”اگرچہ میں نے آپ سے یہ درخواست نہیں کی تھی کہ آپ انہیں میری اس انداز سے موجودگی بتائیں، لیکن یہ اچھا ہوا، انہیں معلوم تو ہو کہ ملک میں ایسے ”کج دماغ لوگ“ بھی موجود ہیں۔“

حکمرانوں سے اس استغناء کے اس انداز کے باوجود ہر حکومت کے ساتھ آپ کا طرزِ عمل یہ رہا کہ آپ نے اس کی غلطیوں پر تنقید کے ساتھ ساتھ اس کے صحیح اور اچھے کاموں پر حوصلہ افزائی میں کبھی اپنی انا کو آڑے نہیں بننے دیا، ان کے اچھے کاموں کی کھلے دل سے تعریف کی، اور جن حکمرانوں سے خیر کی توقع تھی ان سے ملاقاتیں کر کر کے ان سے ایسے کام کرائے جو ملک و ملت کے لئے مفید تھے، البتہ ان تعلقات میں اس بات کا پورا پورا لحاظ رکھا کہ وہ کسی ذاتی مفاد کے حصول کا ذریعہ نہ بنیں۔ چنانچہ متعدد مواقع پر آپ کو اعلیٰ سرکاری حکام کی طرف سے ذاتی مفاد کی پیشکش ہوئی، لیکن آپ نے اسے خوبصورتی کے ساتھ رد فرما دیا۔

آپ کی اسی للّٰہیت، اخلاص اور سلامتِ فکر کا ثمرہ تھا کہ سرکاری حکام اس بات کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے کہ آپ سے زور و زر کے ذریعے کوئی ناجائز مطلب برآری کی جا سکتی ہے۔ ایک مرتبہ کراچی میں علماء کا ایک اجتماع ہونے والا تھا جو حکومت کے منشاء کے خلاف تھا، چنانچہ ایک سرکاری عہدیدار نے کراچی کے علماء کو فرداً فرداً بلا کر اس اجتماع میں رکاوٹ ڈالنے کی کوشش کی، بعض علماء سے ان کی جو گفتگو ہوئی اس کا علم حضرت والد صاحبؒ کو بھی ہو چکا تھا۔ اسی دوران انہوں نے آپ کو بھی ملاقات کے لئے بلایا۔ والد صاحبؒ اسی خیال سے تشریف لے گئے تھے کہ اسی موضوع پر بات چیت ہوگی، لیکن

جب آپ وہاں جاکر بیٹھے تو انہوں نے اِدھر اُدھر کی باتیں شروع کر دیں، والد صاحبؒ نے پوچھا بھی کہ بلانے کا مقصد کیا تھا؟ لیکن انہوں نے کہا کہ "جی ہاں! ابھی عرض کروں گا" اور پھر کوئی دوسری غیر متعلق بات شروع کر دی، والد صاحبؒ نے پھر پوچھا کہ بات کیا تھی؟ انہوں نے پھر ٹلا دیا اور اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے، آخر جب تیسری بار والد صاحب نے اصرار فرمایا تو اتنا بول سکے:۔

"یہ فرمائیے کہ شہر کا کیا حال ہے؟"

حضرت والد صاحب نے برجستہ فرمایا:

"بہت بُرا حال ہے"

"کیوں؟" انہوں نے پوچھا

حضرت والد صاحبؒ نے فرمایا: "اس لئے کہ جس ملک کے عوام کو حکومت پر اعتماد نہ ہو اس ملک کا حال کبھی اچھا نہیں ہوسکتا اور پھر اس عدم اعتماد کی وجوہ بیان فرمائیں۔

غرض ان صاحب کو آخر تک اصل مطلب کی بات کہنے کی جرأت نہ ہو سکی یہاں تک کہ چلتے وقت والد صاحبؒ نے پھر پوچھا کہ "مجھے ابھی تک اپنے یہاں آنے کا مقصد معلوم نہیں ہو سکا" اس پر انہوں نے فرمایا "دیر کافی ہو گئی ہے، انشاء اللہ پھر کبھی آپ سے عرض کروں گا" اس سارے مکالمے اور پوری ملاقات کو "خُضُوعُ بِالرُّعْبِ" کی کرامت کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے؟ جو انبیاء علیہم السلام کے صدقے میں دائمانِ نبیؐ کو بھی عطا ہوتی ہے۔

حکومت کے حلقوں سے میل جول کے دوران حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ اپنے طرز اور وضع پر مضبوطی سے قائم رہے، اور یہ انضباط معمولی معمولی باتوں میں بھی آپ کے طرز میں ادنیٰ تبدیلی پیدا نہ کرسکا، سرکاری اجتماعات اور تقریبات میں گروپ فوٹو اجتماعات کا لازمی عنصر بن کر رہ گیا ہے لیکن حضرت والد صاحبؒ ہمیشہ ایسے موقع پر الگ ہو جاتے، شروع شروع میں بعض ناواقف لوگوں نے شمولیت پر اصرار بھی کیا، لیکن جب حضرت والد صاحبؒ نے فرمادیا کہ "میں اسے شرعاً ناجائز سمجھتا ہوں" تو پھر لوگوں نے کہنا ہی چھوڑ دیا، بلکہ بعض مزاج شناس حکام آپ کی موجودگی میں گروپ فوٹو کھنچوانے سے کترانے لگے۔

سرکاری تقریبات میں کھڑے ہو کر کھانے کی بدمذاقی شروع سے جاری ہے، حضرت والد صاحبؒ

ایسی تقریبات میں ہمیشہ اپنا مختصر سا کھانا پلیٹ میں نکال کر دور کسی جگہ جا بیٹھتے، اور وہاں بیٹھ کر تناول فرماتے۔ ایک مرتبہ شہید ملت لیاقت علی خاں صاحب مرحوم کی طرف سے دعوت تھی اور وہاں کھڑے ہو کر کھانے کا انتظام تھا جسے حضرت والد صاحبؒ "گھوڑا کھیل" فرمایا کرتے تھے، حضرت والد صاحبؒ حسب معمول اپنا کھانا لے کر کہیں جا بیٹھے، آپ کو دیکھ کر بعض دوسرے حضرات بھی وہیں آ گئے، یہاں تک کہ وہ ایک محفل سی بن گئی، لیاقت علی خاں صاحب مرحوم دعوت میں عام مہمانوں کے ساتھ مصروف تھے، کھانے کے اختتام پر وہ حضرت والد صاحبؒ کے پاس آئے، اور کہنے لگے:

"مفتی صاحب! کھایا تو آپ نے ہے، ہم نے تو چرا ہے"۔

۱۹۵۸ء تک تو حضرت والد صاحبؒ ملکی معاملات میں سرگرم دلچسپی لیتے رہے، اور دینی ضرورت کے مطابق سیاسی دوروں، تقریروں، اخباری بیانات اور حکام سے ملاقاتوں کا سلسلہ جاری رہا، اس زمانے تک آپ ان تمام سیاسی معاملات پر نظر رکھتے جو ملک کے دینی مستقبل پر اثر انداز ہو سکتے تھے، اور پھر ان کے بارے میں مختلف زاویوں سے کوشش بھی فرماتے لیکن ۱۹۵۸ء کے مارشل لاء کے بعد سے آپ نے اپنی سیاسی جدوجہد کو بہت مختصر کر کے زیادہ توجہ تعلیمی اور تصنیفی کاموں پر صرف کرنی شروع کر دی، اور ملک کے سیاسی مسائل میں صرف اس وقت کوئی عملی حصہ لیا جب دینی اعتبار سے وہ ناگزیر ہو گیا۔

صدر ایوب خاں مرحوم کے زمانے میں تجدد کی جو تحریکیں سرکاری سرپرستی میں پروان چڑھیں اور "ادارہ تحقیقات اسلامی" کی طرف سے، اسلام پر جو مشق ستم ہوئی اس سے حضرت والد صاحبؒ سخت نالاں تھے، اور وقتاً فوقتاً اپنے مضامین، مقالات، اخباری بیانات اور خطوط کے ذریعے اس کی مؤثر تردید بھی فرماتے رہے۔ ان میں سے بہت سی تحریریں متعلقہ مسائل پر بیش قیمت علمی سرمایہ بن کر آج تک محفوظ ہیں۔ "عائلی قوانین پر تبصرہ" "ضبط ولادت" "رؤیت ہلال" "اسلامی ذبیحہ" "مسئلہ سود" "قرآن میں نظام زکوٰۃ" "اسلام کا نظام تقسیم دولت" اور "تمیر زندگی" وغیرہ اسی زمانے کی یادگاریں ہیں جو اپنے اپنے موضوع پر بعد کے مصنفین کے لئے ماخذ کی حیثیت اختیار کر گئی ہیں۔

البتہ علمی کاموں کے علاوہ دو کام ایسے تھے جو آپ نے اس دور میں بھی اہتمام کے ساتھ جاری رکھے، ایک یہ کہ جو دینی جماعتیں میدان سیاست میں سرگرم ہیں ان کو متحد کرنے کی کوشش، اور دوسرے

وقتاً فوقتاً دینی معاملات میں حکام وقت کو تبلیغ و نصیحت۔ اس زمانے میں جب کوئی شخص آپ سے دوبارہ سرگرم
سیاسی جد و جہد کا مطالبہ کرتا تو آپ یہ فرماتے کہ "اب میری عمر کا آخری زمانہ ہے، قویٰ مضمحل ہو چلے ہیں
اور علالت کا سلسلہ چلتا رہتا ہے، میں عمر کے قیمتی دس سال ملکی معاملات کے لئے خرچ کر چکا ہوں۔ اب
ان بکھیڑوں میں پڑنے کے بجائے صرف وہ کام کرنا چاہتا ہوں جن کا دینی فائدہ واضح اور یقینی ہو۔ اس
لیے اب تعلیم و تصنیف کی راہ سے دین کی جو خدمت بن پڑے گی انجام دوں گا، اور سیاسی جد و جہد میں
دوبارہ حصہ صرف اس وقت لے سکتا ہوں جب سیاسی جماعتیں مل کر براہ راست اسلام کے نفاذ کے
لئے کوئی مؤثر تحریک شروع کریں، جمہوریت اور دوسرے سیاسی مسائل کے جھنجھٹ میں مبتلا ہونے کے لئے
میں اپنی یہ مصروفیات نہیں چھوڑ سکتا۔

چنانچہ جب سابق وزیر اعظم پاکستان حسین شہید سہروردی مرحوم نے فیلڈ مارشل ایوب خاں صاحب
مرحوم کے خلاف تحریک جمہوریت کا آغاز کیا اور اس غرض کے لئے تمام پرانے سیاست دانوں کو
اکٹھا کرنا شروع کیا تو ایک روز حضرت والد صاحب قدس سرہٗ کو فون کیا اور کہا: "مفتی صاحب! پچھلے سالوں
میں بہت سے مسائل میں ہمارا آپ کا اختلاف رہا، لیکن اب میں جمہوریت کی بحالی کے لئے ملک گیر
تحریک اٹھا رہا ہوں، ظاہر ہے کہ بحالی جمہوریت کے مقصد سے تو آپ کو بھی اتفاق ہوگا، اس لئے اس
کام میں آپ بھی ہمارے ساتھ تعاون فرمائیں۔"

والد صاحبؒ نے فرمایا: "سہروردی صاحب! بات یہ ہے کہ میں مُلّا آدمی ہوں، اور جمہوریت وغیرہ
کو کچھ نہیں جانتا، میں صرف اسلام کو جانتا ہوں۔"

سہروردی صاحب نے کہا: "مگر اسلام نے بھی تو جمہوریت کی تعلیم دی ہے۔"

والد صاحبؒ نے فرمایا: "بات یہ ہے کہ اسلام کے بغیر میں کسی جمہوریت کا قائل نہیں، اور حقیقی جمہوریت
اسلام میں ہے، وہ اسلام کے ضمن میں خود بخود آ جائے گی، اس لئے جمہوریت کے نام پر کسی تحریک میں
شمولیت میرے لئے ممکن نہیں، ہاں اگر آپ اسلام کے نفاذ کے لئے صدق دل سے کوئی تحریک چلائیں
تو اس میں آپ کا ساتھ دوں گا۔"

اس جواب پر سہروردی صاحب خاموش ہو گئے، اور رسمی گفتگو کے بعد فون بند کر دیا۔

حضرت والد صاحبؒ نے سہروردی صاحب کو جو جواب دیا وہ آپ کا سوچا سمجھا نظریہ تھا، آپ یہ

سمجھتے تھے کہ اسلام کے نفاذ کے لئے جمہوریت کو زینہ بنانے کا تصور ہی سرے سے غلط ہے، اول تو مغربی طرز کی جمہوریت بذات خود اسلام کے خلاف ہے، دوسرے "پہلے جمہوریت پھر اسلام" کے نسخے سے سب سے زیادہ نقصان اسلام کو پہنچے گا، کیونکہ موجودہ سیاسی شعور کے ساتھ صحیح صحیح جمہوریت قائم ہونے کے لئے عرصہ چاہییں، اور اگر اس وقت تک اسلام کو روبکار لانے کے لئے کوئی مؤثر اقدام نہ کیا گیا تو وہ لادینی طاقتیں جو مسلسل دلوں سے اسلام کو کھرچنے میں مصروف ہیں اس وقت تک ایسی فضا تیار کردیں گی کہ اس میں اسلام کا نفاذ ناممکن نہیں تو سخت مشکل ضرور ہو کر رہ جائے، اور کچھ بعید نہیں ہے کہ "جمہور" کو آزادیٔ تحریر و تقریر اور آزادیٔ انتخاب ملنے تک "جمہور" کی ذہنیت اس درجہ مسخ ہو چکی ہو کہ وہ خود نفاذِ اسلام کے نام ہی سے کترانے لگیں۔ اس لئے حضرت والد صاحبؒ کا خیال تھا کہ "پہلے جمہوریت پھر اسلام" کے نعرے کا نتیجہ اسلام سے دست برداری کے سوا کچھ نہیں۔

یہی وجہ ہے کہ حضرت والد صاحبؒ تبدیلیٔ اقتدار اور بحالیٔ جمہوریت وغیرہ کی تحریکوں کے بجائے اس بات کے خواہاں رہے کہ کوئی مؤثر تحریک صرف اسلام کے نام پر چلے اور اس میں اسلام کے نام کو محض تبدیلیٔ اقتدار کے بہانے کے طور پر استعمال نہ کیا جائے، بلکہ اس کا اول و آخر مقصد نفاذِ اسلام ہو اور وہ حکمرانوں کو اس مقصد کے لئے عملی اقدامات پر مجبور کر دے۔ چنانچہ جب صدر ایوب خاں صاحب مرحوم کے آخری دورِ حکومت میں ان کے خلاف تحریک چلی تو حضرت والد صاحبؒ کو اس بات کا صدمہ تھا کہ اس کا براہِ راست مقصد سوائے تبدیلیٔ اقتدار اور "بحالیٔ جمہوریت" کے کچھ نہیں ہے اور آپ کا اندازہ یہ تھا کہ اس کے نتیجے میں شاید تبدیلیٔ اقتدار تو عمل میں آجائے، لیکن "بحالیٔ جمہوریت" کی جس منزل کا ملکی سیاست میں چرچا ہے، نہ وہ حاصل ہو سکے گی اور نہ نفاذِ اسلام کی کوشش کا نمبر آ سکے گا، اس لئے اس وقت بھی آپ کی رائے یہی تھی کہ تبدیلیٔ اقتدار کو مقصد بنانے کے بجائے نفاذِ اسلام اور استحکامِ ملک سے متعلق کچھ معین مطالبات کو مقصد بنایا جائے، چنانچہ آپ نے اس بارے میں متعدد سیاسی رہنماؤں سے گفتگو بھی فرمائی، انہیں خطوط بھی لکھے اور برادرِ مکرم جناب مولانا مفتی محمد رفیع صاحب عثمانی مدظلہم کو اپنا پیغام دے کر مختلف سیاسی جماعتوں کے پاس بھی بھیجا اور مجھے یاد ہے کہ حضرت والد صاحبؒ اس دوران بستر علالت پر تھے تو ملک کی ایک سیاسی جماعت کے سربراہ ملاقات کے لئے تشریف لائے تھے، آپ نے ان سے فرمایا:

"موجودہ تحریک کے نتیجے میں آپ اقتدار کی تبدیلی میں تو کامیاب ہو جائیں گے، لیکن کیا کوئی ایسا متبادل اقتدار آپ کے پاس موجود ہے جو دینی اعتبار سے بہتر ہو؟"

انہوں نے جواب میں فرمایا: "اس وقت تو سب سے بڑا مسئلہ اس آمرانہ اقتدار کا بت توڑنا ہے، جب ہم یہ مقصد حاصل کریں گے تو کوئی نہ کوئی بہتر صورت نکلے گی۔"

اگرچہ ان کے پاس اس سوال کا کوئی مثبت جواب نہیں تھا، لیکن اس وقت ملک کی سیاسی فضا ایسی بن چکی تھی کہ تبدیلیٔ اقتدار بذاتِ خود ایک مقدس مقصد بن گیا تھا، اور تحریک کا رخ کسی مثبت مقصد کی طرف موڑنے کی گنجائش نہ تھی، چنانچہ وہی ہوا جس کا والد صاحب کو خطرہ تھا کہ اقتدار تو تبدیل ہو گیا، مگر دبجائے جمہوریت کی مزعومہ منزل حاصل ہوئی، نہ اسلامی نقطۂ نظر سے کوئی بہتری پیدا ہوئی، بلکہ ملک اپنی سالمیت اور استحکام کے اعتبار سے نہ صرف برسوں پیچھے چلا گیا، بلکہ بالآخر دو نیم ہو کر رہا۔

بہرکیف! کہنا یہ تھا کہ اس دور میں حضرت والد صاحبؒ سرگرم سیاسی جدوجہد سے کنارہ کش ہو چلے تھے، لیکن ناگزیر مواقع پر حکومت اور سیاسی جماعتوں دونوں کو ملک و ملت سے متعلق اپنے نقطۂ نظر سے آگاہ ضرور فرماتے رہتے۔

حضرت والد صاحبؒ کا معمول تھا کہ جن حکمرانوں کے بارے میں آپ کو یہ اندازہ ہوا کہ وہ اپنی بعض عملی اور فکری غلطیوں کے باوجود اسلام دشمن نہیں ہیں، ان کو خاص خاص مواقع پر دینی معاملات سے متعلق خطوط تحریر فرما دیتے تھے، یہ خطوط عموماً تبلیغی انداز کے ہوتے، اور ان میں آپ نہایت شائستگی کے ساتھ مخاطب حکمران کی بنیادی فکری اور عملی غلطیاں واضح فرما دیتے تھے، اور فرمایا کرتے تھے کہ یہ لوگ چونکہ اپنی زندگی میں دین اور اہلِ دین سے دور رہے ہیں، اس لئے ہمارا فرض ہے کہ دین کی ضروری باتیں تبلیغی انداز میں ان تک پہنچائیں۔

حضرت والد صاحبؒ کا یہ معمول درحقیقت حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہٗ کی ایک ہدایت کے مطابق تھا، جب حضرت تھانوی قدس سرہٗ نے تحریک پاکستان میں مسلم لیگ کی حمایت کا فیصلہ فرمایا تو اس فیصلے کے ساتھ ساتھ علماء کو یہ ہدایت دی تھی کہ وہ باقاعدہ مقصد بنا کر مسلم لیگ کے رہنماؤں سے تبلیغی ملاقاتیں کرتے رہیں، اور انہیں دینی تقاضوں کے مطابق عمل کی تلقین جاری رکھیں، چنانچہ حضرت تھانوی قدس سرہٗ نے اس کے لئے قائداعظم محمد علی جناح صاحب کے پاس

علماء کے کئی وفود روانہ فرمائے جن میں سے ایک میں حضرت والد صاحب قدس سرہٗ بھی شامل تھے۔ آپ اپنے شیخ کی اس ہدایت پر آخر تک کاربند رہے، ۱۹۵۸ء کے بعد چونکہ آپ کی مصروفیات دارالعلوم اور اس کے ذریعے مختلف تعلیمی تبلیغی امور کی انجام دہی میں سمٹ گئی تھیں، اور دارالحکومت اسلام آباد منتقل ہوجانے کی بنا پر آپ کے لئے ملاقاتوں کا اہتمام ممکن نہ رہا تھا، اس لئے ملاقاتوں کے بجائے آپ نے ضرورت کے مواقع پر خطوط لکھ کر اس ہدایت کی تعمیل فرمائی۔ ان میں سے ایک مکتوب جو عائلی قوانین سے متعلق صدر ایوب صاحب کو لکھا گیا تھا، آپ کی کتاب "عائلی قوانین پر مختصر تبصرہ" میں شائع بھی ہوچکا ہے۔

ان خطوط کا کوئی فوری فائدہ ظاہر ہو یا نہ ہو لیکن حضرت والد صاحبؒ فرمایا کرتے تھے کہ داعی کا کام بات پہنچانا ہے، اور اگر صحیح بات صحیح نیت اور صحیح طریقے سے پہنچائی جائے تو کسی نہ کسی صورت میں وہ مؤثر ضرور ہوتی ہے، اور اس کا ادنیٰ فائدہ یہ ہے کہ اپنا ایک دینی فریضہ ادا ہوجاتا ہے تبلیغی ملاقاتیں ہوں یا خطوط، یہ حکومت کی تنظیموں کی اصلاح کے لئے دوسرے طریقے اختیار کرنے کے منافی نہیں، بلکہ ایک راستہ یہ بھی ہے جسے غیر اہم سمجھ کر نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔

حضرت والد صاحبؒ کے تبلیغی خطوط کا سلسلہ صرف پاکستان تک محدود نہیں رہا، بلکہ ۱۹۶۴ء میں جب آپ حج کے لئے تشریف لے گئے، برادر محترم جناب مولانا محمد رفیع صاحب عثمانی مدظلہم اور یہ ناکارہ بھی ہمسفر تھے، تو وہاں بہت سے ایسے منکرات سامنے آئے جنہیں دیکھ کر آپ کا دل دکھا، اس موقع پر آپ نے ایک مفصل یادداشت شاہ فیصل مرحوم اور وہاں کے دیگر ذمہ داروں کو پیش کی جو بعد میں شائع بھی ہوئی۔

اخلاق و عادات اور معاملات

حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے مزاج و مذاق کے بیان میں اخلاق و عادات اور معاملات و معاشرت ایسے موضوع ہیں جن پر کچھ لکھنا مجھے ہمیشہ بہت مشکل نظر آیا ہے، اصل سچی بات یہ ہے کہ اس بارے میں آپ کے مزاج و مذاق کو کما حقہٗ بیان کرنے سے میں اپنے آپ کو بالکل عاجز پاتا ہوں، یہاں "معاملات" سے میری مراد صرف بیع و شراء وغیرہ کے معاملات یا مالی امور نہیں ہیں، بلکہ ہر وہ کام ہے جس میں انسان کو کسی دوسرے سے واسطہ پڑتا ہو، حقوق العباد کی ادائیگی، دوست دشمن کے ساتھ تعلقات کی نوعیت،

مخالفت وحمایت کی حدود، مسلمانوں کے اجتماعی معاملات میں طرزِ عمل، نرمی وسختی کے مواقع، مختلف حقوق و
فرائض میں توازن اور ان کی حدود کی رعایت، یہ سارے باتیں "معاملات" میں داخل ہیں، اس وسیع مفہوم کے
تحت خوش اخلاقی "معاملات کی سلامتی" اور "معاشرت کی خوبی" کہنے کو تو بہت مختصر اور آسان الفاظ ہیں
لیکن جب انسان فکر وبصیرت کے ساتھ ان الفاظ کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے عالم تعلقات میں داخل
ہوتا ہے اور اس کے جزوی واقعات سامنے آکر متعارض تقاضے ابھرتے ہیں تو جگر خون اور پتہ پانی ہوتا
ہے۔ اور واقعہ یہ ہے کہ زندگی کے اس پہلو کی مشکلات کا اندازہ بھی اسی کو ہو سکتا ہے جس نے اس نقطۂ نظر
سے اپنی زندگی کو متوازن بنانے کی کوشش کی ہو۔ معاملات اور معاشرت کی درستی کے لئے نہ تنہا کوئی کتاب
انسان کی مدد کر سکتی ہے، نہ کوئی نظری فلسفہ معاون ہو سکتا ہے، اس کا تو ظاہری اسباب میں ایک ہی
طریقہ ہے اور وہ یہ کہ انسان عرصۂ دراز تک کسی متبع سنت اور صاحب بصیرت شیخ کامل کی صحبت میں
رہ کر ان معاملات کی تربیت لے۔ اور حضرت والد صاحبؒ فرمایا کرتے تھے کہ صرف ایسے شیخ کامل کی صحبت
میں جا بیٹھنا، اس کے ملفوظات ومواعظ سن لینا اور اس کے بتائے ہوئے اوراد واشغال پر عمل
کر لینا بھی اس کے لئے کافی نہیں، بلکہ اس کے لئے ضروری ہے کہ انسان طرزِ معاشرت اور درستی معاملات کا
انداز سیکھنے کی نیت سے اپنے شیخ کے طرزِ عمل کا بغور مشاہدہ کرے، اور خود اپنی زندگی کے معاملات اس
کے سامنے پیش کر کر کے اس سے ہدایات حاصل کرے۔ تب جا کر اس معاملے میں ایسا مذاق پیدا ہوتا
ہے جو زندگی کے ہر موڑ پر انسان کی صحیح رہنمائی کر سکے۔

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہٗ نے سلوک وطریقت میں جو تجدیدی
کارنامہ انجام دیا، اس کا ایک اہم حصہ معاملات اور معاشرت کی تعلیم وتربیت تھی۔ اس حقیقت سے تو
کسی بھی شخص کو انکار نہیں ہو سکتا کہ معاملات اور معاشرت دین کا اہم جزء ہیں، چنانچہ حضور سرورِ کائنات
صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرامؓ کی جو تربیت فرمائی اس میں عقائد، عبادات اور اخلاق وغیرہ کے علاوہ
معاملات ومعاشرت کی مفصل تربیت بھی شامل ہے۔ چنانچہ تاریخِ اسلام کے ابتدائی دور میں اور اس کے
بعد بھی بیعت وارشاد کے سلسلے میں صرف اوراد واشغال کی تعلیم نہیں دی جاتی تھی، بلکہ زندگی کے ہر شعبے میں
مسترشد کو اتباعِ سنت کی تربیت کا اہتمام ہوتا تھا جس میں معاملات ومعاشرت کی تربیت بھی داخل
تھی، لیکن پھر رفتہ رفتہ اس پہلو پر زور کم ہوتا گیا، یہاں تک کہ لوگ دین کو صرف عبادات اور تصوف کو صرف

اوراد و اشغال میں منحصر سمجھنے لگے، اور آخر زمانے میں تو یہ حالت ہوگئی کہ مسترشد کو ذکر و شغل کے چند مراحل طے کرانے اور مصنوعی ذرائع سے قلب و نظر میں کچھ کیفیات پیدا کرانے کے بعد یہ باور کرایا جانے لگا کہ سلوک و طریقت کا مقصد حاصل ہوگیا، خواہ اس کے معاملات کتنے فاسد، اخلاق کتنے خراب اور معاشرت کتنی مردم آزار ہو۔

حکیم الامت حضرت تھانوی قدس سرہٗ نے اس طریق میں یہ تجدیدی کارنامہ انجام دیا کہ جو لوگ آپ سے اصلاح کا تعلق قائم کرتے انہیں دین کے تمام شعبوں کی متوازن تربیت دیتے، اور چونکہ معاملات و معاشرت کو لوگوں نے دین سے بالکل ہی خارج سمجھ لیا تھا اس لئے ان کی اصلاح پر زیادہ توجہ مرکوز فرماتے تھے۔ چنانچہ حضرتؒ کے متوسلین میں معاملات کی صفائی اور حسنِ معاشرت کا وصف ممتاز اور نمایاں نظر آتا ہے۔

یوں تو جتنے حضرات خانقاہِ تھانہ بھون سے فیض یاب ہوتے ان سب نے اپنے شیخؒ کا یہ رنگ اپنے اپنے ظرف کے مطابق اپنایا، لیکن اس سلسلے میں حضرت والد صاحب قدس سرہٗ کی خصوصیت یہ تھی کہ اول تو آپ کو حضرتؒ کے ساتھ معاملات بہت پیش آتے تھے، جو ہر شناس شیخؒ نے اپنے اس گوہرِ قابل کو ہر لحاظ سے جلا بخشنے کے لئے اس سے ہر طرح کے کام لئے، اور اپنی گوناں گوں مصروفیات میں سے تقریباً ہر ایک میں شریک یا کم از کم اس سے باخبر رکھا، مسلمانوں کے اجتماعی مسائل ہوں یا مخالفین کے ساتھ برتاؤ، حکومت و سیاست سے متعلق معاملات ہوں، یا کتابوں کی نشر و اشاعت وغیرہ کے قضیے، علمی مسائل کی تحقیق ہو یا تصنیف و تالیف، گھریلو معاملات ہوں یا رشتہ داروں اور دوستوں کے ساتھ تعلق کے مسائل، حضرت حکیم الامت قدس سرہٗ نے ان تمام چیزوں میں آپ کو اپنے مشوروں میں شریک رکھا جس کا اصل مقصد ان تمام معاملات کی تربیت تھی۔

دوسری طرف حضرت والد صاحبؒ نے اپنے شیخؒ کو جو مکاتیب لکھے ہیں، ان کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ والد صاحبؒ کی زندگی کا کوئی قابلِ ذکر معاملہ ایسا نہیں تھا جو آپ نے حضرتؒ کی خدمت میں پیش کر کے آپ سے ہدایت طلب نہ فرمائی ہو، بلکہ ان مکاتیب میں اذکار و اشغال کی تلقین اور باطنی کیفیات کے مقابلے میں معاملات و معاشرت سے متعلق سوالات کہیں زیادہ ہیں، اور ان سوالات کے جواب میں حضرتؒ کی طرف سے مفصل ہدایات موجود ہیں۔ "اشرف المکاتیب" یا "مکاتیب حکیم الامت"

کے نام سے جو خطوط البلاغ میں سلسلہ وار شائع ہو رہے ہیں، وہ اصل مکاتیب کا نصف سے بھی کم حصہ ہیں، اور وجہ یہی ہے کہ نصف سے زائد مکاتیب گھریلو معاملات، مختلف اشخاص کے ساتھ طرزِ عمل اور اس قسم کے نجی امور پر مشتمل ہیں جن کی اشاعت مناسب نہ تھی۔ یہ غیر شائع شدہ خطوط زیادہ تر معاملات ہی سے متعلق ہیں۔

تیسرے خود حضرت والد صاحبؒ کو اس طرف خصوصی توجہ تھی کہ مسلمانوں کے اجتماعی، سیاسی اور معاشرتی معاملات، دوست دشمن کے ساتھ برتاؤ، تنازعات کے تصفیے، میل جول کے انداز، مخالفت و موافقت کی حدود، نرمی و سختی کے مواقع اور ان جیسے دوسرے امور میں اپنے شیخؒ کے طرزِ فکر و عمل کا بغور مشاہدہ کر کے اس سے اپنی زندگی میں سبق لیں۔ حضرت والد صاحبؒ خود تواضعاً فرمایا کرتے تھے کہ میں تھانہ بھون میں کثرتِ عبادات اور ذکر و شغل کی اس نعمت سے تو خاطر خواہ حصہ نہ لے سکا جس سے دوسرے حضرات فیض یاب ہوئے، لیکن بفضلہ تعالیٰ حضرتؒ کے اندازِ معاملات و معاشرت کو اس طرح بغور پڑھنے کا موقع ملا ہے کہ وہ انداز دل و نگاہ میں سما گیا ہے۔"

ان تمام باتوں کا نتیجہ تھا کہ حکیم الامت حضرت تھانوی قدس سرہٗ کے خصوصی مشرب و مذاق کے اس پہلو کو آپ نے جس طرح جذب فرمایا وہ حضرت حکیم الامتؒ کے خلفاء میں آپ کا ایک انفرادی امتیاز ہے۔

جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں، مزاج و مذاق کے اس پہلو کو الفاظ میں بیان کیا ہی نہیں جا سکتا اور یہ بھی ظاہر ہے کہ جس وصف کو حاصل کرنے کے لئے مفتی محمد شفیعؒ جیسی شخصیت نے حکیم الامت تھانویؒ جیسی شخصیت کے سامنے مدتوں ریاضت کی ہو، اس کا ہم جیسے لوگوں کو ادراک ہی مشکل ہے، چہ جائیکہ ہم اسے الفاظ کے سانچے میں ڈھال سکیں۔ اس وصف کی اگر کوئی نامکمل سی تعبیر ہو سکتی ہے تو وہ صرف یہ کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو ہر معاملے میں اعتدال، توازن اور رعایتِ حدود کی وہ دولت عطا فرمائی تھی جو آپ کی ایک ایک نقل و حرکت میں خوشبو کی طرح بسی ہوئی تھی۔ اس سلسلے کے چند متفرق واقعات اور آپ سے سنی ہوئی چند باتیں ذیل میں پیشِ خدمت کر رہا ہوں شاید ان سے اس وصف کا کچھ اندازہ ہو سکے، مگر ان واقعات کو سوچ سوچ کر استیعاب اور ترتیب کے ساتھ بیان کرنا چاہوں تو ایک مبسوط کتاب تیار ہو جائے، اور اس کی تکمیل میں شاید مہینے لگ جائیں، لیکن اس کی نہ اس وقت فرصت ہے نہ موقع، زندگی رہی اور اللہ تعالیٰ نے توفیق عطا فرمائی تو ان شاء اللہ پھر کبھی یہ قرض اتارنے کی کوشش

کروں گا اس وقت تو کسی خاص اہتمام کے بغیر جو واقعات جس ترتیب سے ذہن میں آرہے ہیں انہیں جلد کاغذ پیش خدمت کر رہا ہوں۔ اور یہ بھی حضرت والد صاحبؒ ہی سے سنے ہوئے ایک مقولے پر عمل ہے جو آپ بکثرت سنایا کرتے تھے کہ:

الاستقصاء شوم

ہر کام کو انتہا تک پہنچانے کی فکر میں نحوست ہوتی ہے

یعنی بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ انسان کسی کام کا آغاز کرنے کے بعد اس فکر میں رہتا ہے کہ اسے کمیت اور کیفیت کے اعتبار سے ایسا مکمل اور جامع بنا دوں کہ اس میں کسی ترمیم و اضافہ کی گنجائش باقی نہ رہے۔ اس فکر کا نتیجہ بسا اوقات یہ ہوتا ہے کہ وہ کام بالکل نہیں ہو پاتا۔ اس کے بجائے اگر انسان اس قاعدے پر عمل کرے جسے عربی میں "مالا یدرک کلہ لا یترک کلہ" سے تعبیر کرتے ہیں، اور اردو والوں نے اس بات کو ان الفاظ میں کہا ہے کہ "کچھ نہ کرنے سے کچھ کرنا بہتر ہے" تو قطرہ قطرہ ہو کر بہت سا کام ہو جاتا ہے۔ حضرت والد صاحب قدس سرہٗ فرمایا کرتے تھے کہ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہٗ سے اللہ تعالیٰ نے تصنیف و تالیف کا جو غیر معمولی کام لیا، ظاہری اسباب میں اس کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ آپ نے استقصاء کی فکر کرنے کے بجائے جتنی مفید بات جس وقت زیر قلم آگئی، اسے مزید کے انتظار میں نہیں ٹلایا، بلکہ اسے لکھ کر شائع فرما دیا۔ تکمیل اور اضافے بعد میں بھی ہو سکتے ہیں، لیکن جو بات مفید ہو اسے استقصاء کے انتظار میں ٹلانے سے ضروری بات بھی رہ جاتی ہے۔

لہٰذا اس نصیحت پر عمل کرتے ہوئے احقر پیش خدمت ہے۔ تفصیل و ترتیب بعد میں بھی ہو سکتی ہے:

حقیقتِ علم

اگرچہ گذشتہ صفحات میں حضرت والد صاحبؒ کے علمی مذاق اور علم و درس کے بارے میں بہت سی باتیں تفصیل سے لکھ چکا ہوں جن سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ آپ کی شخصیت بنیادی طور پر ایک علمی شخصیت تھی، آپ کی ساری عمر درس و تدریس اور تصنیف و افتاء جیسے کاموں میں بسر ہوئی —

کتب بینی کے شوق اور ذوقِ مطالعہ کے بارے میں بھی پیچھے لکھ چکا ہوں کہ اس دور میں اس کی نظیریں کم ہی ملیں گی، لیکن اس زبردست علمی انہماک کے باوجود یہ حقیقت ہر آن آپ کے ذہن میں متحضر رہتی تھی کہ یہ کتابی علم اور وسعتِ مطالعہ محض ایک خول ہی خول ہے، اور جب تک اس میں عمل اور خشیت اللہ کی روح پیدا نہ ہو اس وقت تک انسان خواہ کتنا بڑا عالم اور محقق بن جائے اس کی ساری علمی تحقیقات بے وزن اور بے جان رہتی ہیں، حضرتؒ فرمایا کرتے تھے کہ اگر صرف علم کسی شخص کی عظمت کے لئے کافی ہوتا تو شیطان بھی بہت بڑا عالم ہے، اور وہ مستشرقین جو دن رات علمی تحقیقات میں مصروف رہتے ہیں وہ بھی بہت سے مسلمان اہل علم سے زیادہ معلومات رکھتے ہیں لیکن ظاہر ہے کہ ایسے علم کی کیا قدر و قیمت ہو سکتی ہے جو انسان کو ایمان کی دولت نہ بخش سکے، اسی طرح جو علم انسان کی عملی زندگی پر اثر انداز نہ ہو وہ بے کار ہے۔

کہنے کو تو یہ بات سبھی کہتے ہیں کہ عمل کے بغیر علم بیکار ہے لیکن ایسے لوگ کم ہوتے ہیں جن کی زندگی میں یہ بات پیوست ہو چکی ہو، حضرت والد صاحبؒ کی ادا ادا میں یہ حقیقت جلوہ گر نظر آتی تھی، علم و تحقیق کے کام سے اس درجہ وابستگی کے باوجود آپ کو اس علم و تحقیق سے نفرت تھی جو انانیت اور خود بینی پیدا کرے، آپ اکثر فرمایا کرتے تھے کہ لوگ مدرسیں پڑھانے کے لئے مشاہیر محققین تلاش کرتے ہیں لیکن مجھے ایسے متواضع اللہ والے چاہئیں جو علمی تکبر، خود رائی اور خود پسندی سے پاک ہوں اور اپنے شاگردوں کو مسلمان بنا سکیں، خواہ علم و تحقیق میں ان کا پایہ کسی قدر کم کیوں نہ ہو۔

خود آپ کا یہ حال تھا کہ علم و تحقیق کے اس مقامِ بلند کے باوجود جو اس دور میں خال خال ہی کسی کو حاصل ہوا ہے آپ کو اپنے کسی علمی کارنامے پر کوئی ناز پیدا ہونے کا تو سوال ہی نہیں تھا، اپنی بڑی سے بڑی خدمت کو ہیچ سمجھتے رہے، انسان کو عام طور سے اپنی تحریروں اور اپنے لکھے ہوئے مضامین سے ایک انس پیدا ہو جاتا ہے، چنانچہ مصنفین میں عام طور سے یہ شوق پایا جاتا ہے کہ ان کی تالیفات کا تذکرہ کیا جاتے، انہیں سراہا جائے، بہت سے مصنفین کی محفلیں اپنی تصانیف ہی کے ذکر اور ان کی تعریفوں سے لبریز ہوتی ہیں، بعض لوگ جابجا اپنی تالیفات کے حوالے دے کر ان کے اقتباسات لوگوں کو سناتے رہتے ہیں، کبھی کسی میں یہ خیال پیدا ہو جاتا ہے کہ کرنے کا اصل کام وہی تھا جو اس نے انجام دے دیا، حضرت والد صاحب قدس سرہٗ کے یہاں اس قسم کی باتوں کا

نہ صرف یہ کہ کوئی سوال نہیں تھا، بلکہ آپ کو اس قسم کے ہر طرزِ عمل سے سخت کراہیت تھی۔ آپ بڑے سے بڑا علمی کام کر گزرنے کے باوجود اسی فکر میں رہتے کہ نہ جانے اس کا حق ادا ہوا یا نہیں؟ محض لوگوں کی تعریف سے آپ کو خوشی حاصل نہ ہوتی، ہاں! اگر کسی جگہ سے یہ اطلاع ملتی کہ فلاں کتاب سے فلاں شخص کو کوئی عملی فائدہ پہنچا ہے، اس کی زندگی میں تبدیلی آئی ہے، یا اس کے نظریات بدلے ہیں تو آپ بہت خوش ہوتے، اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے، اور اس خدمت کے لیے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں قبولیت کی دعا فرماتے۔ آپ اکثر فرمایا کرتے تھے کہ اگر ہم خیال لوگوں سے کچھ داد وصول ہوگئی تو کیا فائدہ؟ اصل دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ جس مقصد کے لئے کتاب لکھی گئی تھی اسے فائدہ پہنچا یا نہیں؟

"تفسیر معارف القرآن" کی شکل میں آپ نے جو عظیم علمی کارنامہ انجام دیا آج بفضلہ تعالیٰ وہ ایک دنیا کو سیراب کر رہا ہے، اور عام مسلمانوں سے لے کر علماء تک سب اس سے فیض یاب ہو رہے ہیں، لیکن جب کوئی شخص آپ کے سامنے اس تفسیر کی تعریف کرتا تو یہی فرمایا کرتے کہ "تفسیر لکھنے کا تو میں تصور بھی نہیں کر سکتا تھا، البتہ میں نے حکیم الامت حضرت تھانوی قدس سرہٗ کی بیان القرآن کو نسبۃً آسان انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے، علماء کرام کے لئے تو شاید اس میں فائدے کی چیزیں زیادہ نہ ہوں، البتہ میں نے عام مسلمانوں کے لئے یہ کتاب لکھی ہے، خدا کرے کہ اس سے کچھ فائدہ پہنچ جائے" یہ لوگ تو عام طور پر دوسروں سے اخذ کی ہوئی باتیں اپنی طرف منسوب کرنے کی کوشش میں رہتے ہیں، حضرت والد صاحبؒ کا معاملہ یہ تھا کہ باوجودیکہ "معارف القرآن" میں وقت کی ضرورت کے بے شمار ایسے مسائل و مباحث موجود ہیں جو "بیان القرآن" اور دوسری تفسیروں کے مباحث سے زائد ہیں، لیکن وہ ہمیشہ یہی فرمایا کرتے کہ اس کتاب میں میں نے کام کیا ہے؟ بس "بیان القرآن" اور بعض دیگر تفاسیر کی تسہیل کر کے انہیں نسبۃً عام فہم انداز میں بیان کر دیا ہے۔

اور یہ محض زبانی باتیں نہ تھیں، بلکہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو علم کا حقیقی ثمر یعنی تواضع کا وہ مقام بلند عطا فرمایا تھا کہ اپنے نفس یا اپنے کسی کام پر آپ کی تعریفی نگاہ پڑتی ہی نہیں تھی، علم و بڑے سے بڑا کارنامہ انجام دینے کے بعد خود پسندی کا کوئی شائبہ پیدا ہونے کے بجائے آپ کی بے نفسی میں اور اضافہ ہو جاتا تھا۔

بعض علماء اور مصنفین کو تفرد کا شوق ہوتا ہے، اور جو کوئی تحقیق یا علمی نکتہ از خود ان کے ذہن میں آگیا ہو، اسے وہ اپنی طرف منسوب کرنے میں فخر محسوس کرتے ہیں، اور اسے بیان کرتے وقت یہ کہنے میں لطف آتا ہے کہ "یہ بات مجھے کہیں بھی نہیں ملی" لیکن حضرتؒ کا معمول اس کے برعکس یہ تھا کہ اگر از خود کوئی تحقیق یا نکتہ ذہن میں آتا تو اس تلاش میں رہتے کہ علماء متقدمین میں سے کسی کے یہاں وہ منقول مل جائے، اور اگر وہ منقول مل جاتا تو بے حد مسرور ہوتے، اور اسے اپنی طرف منسوب کرنے کے بجائے اسی کی کتاب یا عالم کی طرف منسوب فرماتے جن کے کلام میں وہ ملا ہو، اور فرمایا کرتے تھے کہ "تفرد سے مجھے بڑا ڈر لگتا ہے" اگر کوئی شخص آپ کی کسی تحریر و تقریر کے بارے میں آپ کو متنبہ کرتا کہ اس میں فلاں بات غلط یا نامناسب درج ہوگئی ہے، تو قطع نظر اس سے کہ وہ چھوٹا ہے یا بڑا، اس کے ممنون ہوتے، اور بات سمجھ میں آجاتی تو فوراً بلا تامل اس میں تبدیلی فرما دیتے، بلکہ انداز سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ آپ کی کوشش یہی ہوتی ہے کہ کسی کے اعتراض کو بالکلیہ رد نہ کرنا پڑے، اسی غرض کے لئے آپ نے حکیم الامت حضرت تھانوی قدس سرہٗ کی اتباع میں اپنے رسالہ ماہنامہ "المفتی" میں ایک مستقل سلسلہ "اختیار الصواب" کے نام سے جاری فرمایا ہوا تھا۔

پھر اگر آپ اپنے کسی کام یا تالیف و تصنیف کے علمی معیار کے بارے میں مطمئن بھی ہو جاتے تو یہ حقیقت ہر آن مستحضر رہتی کہ اس کام کی اچھائی برائی کا اصل مدار اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں قبول ہونے پر ہے، اگر یہ اس بارگاہ میں قبول ہے تو سب کچھ ہے، اور اگر خدانخواستہ قبول نہ ہو تو یہ ساری علمی محنت اور تحقیقی کاوش دو کوڑی کی نہیں ہے۔

آخری عمر میں آپ اکثر فرمایا کرتے تھے کہ "میری ساری عمر کاغذ کالے کرنے میں گزر گئی، تھانہ بھون حاضری ہوئی تو شیخ نے وہاں بھی کاغذ کالے کرنے ہی کے کام میں لگا دیا، اگر اس میں کوئی حرف اللہ تعالیٰ کے یہاں قبول ہو جائے تو بیڑا پار ہے، ورنہ اپنے سارے اعمال ہیچ در ہیچ معلوم ہوتے ہیں" اور یہ فرما کر آپ اکثر بڑے سوز کے ساتھ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی قدس سرہٗ کا یہ شعر پڑھا کرتے تھے کہ ؎

بس ہے اپنا ایک ہی نالہ اگر پہنچے وہاں
یوں تو کرتے ہیں بہت سے نالہ و فریاد ہم

قرآن کریم کا ارشاد ہے :

اِنَّمَا یَخْشَی اللّٰہَ مِنْ عِبَادِہِ الْعُلَمٰٓؤُا

اللہ تعالیٰ کے بندوں میں سے عالم لوگ ہی اللہ تعالیٰ سے ڈرتے ہیں

اس آیت میں یہ واضح فرمایا گیا ہے کہ علم کا ثمرہ اور اس کی حقیقی علامت اللہ تعالیٰ کی خشیت ہے اور حضرت والد صاحبؒ اکثر ہم طالب علموں سے خطاب کرکے فرمایا کرتے تھے کہ جب علم حقیقی کی علامت خشیت اللہ ہے تو ہر عالم یا طالب علم کو بار بار اپنا جائزہ لینا چاہیے کہ یہ علامت اس میں پیدا ہوئی یا نہیں، اور مثال دے کر فرماتے کہ جب کوئی مسافر ریل گاڑی میں سوار ہوکر کسی منزل کی طرف روانہ ہوتا ہے تو وہ بار بار کھڑکی سے منہ نکال کر دیکھتا ہے کہ اب کونسا اسٹیشن آیا ہے؟ اگر وہی اسٹیشن راستے میں پڑ رہے ہیں جو منزل مقصود کے راستے میں آیا کرتے ہیں تو مطمئن ہو جاتا ہے، اور انہی اسٹیشنوں سے یہ اندازہ لگاتا ہے کہ منزل کتنی دور ہے؟ اور اگر اسٹیشن ایسے نامانوس آنے لگیں جو اس منزل کے راستے میں نہیں پڑتے تو سمجھ جاتا ہے کہ گاڑی کسی اور رخ پر جا رہی ہے، اور گھبرا کر گاڑی بدلنے کی فکر کرتا ہے۔ اسی طرح علم کے مسافر کو بار بار اپنے دل کی کھڑکی میں جھانک کر دیکھنا چاہیے کہ "خشیت اللہ" کا اسٹیشن آیا یا نہیں؟ اگر اس اسٹیشن کے کچھ آثار معلوم ہوتے ہیں تو سفر صحیح سمت میں ہو رہا ہے، لیکن اگر خشیت، تواضع، انابت الی اللہ اور اتباع سنت کے بجائے بے فکری، تکبر، انانیت، حبِ جاہ و مال اور نفس پرستی کے اسٹیشن آرہے ہیں تو سمجھ لینا چاہیے کہ انسان کسی غلط گاڑی میں سوار ہے، اور یہ گاڑی اسے علم کی اس منزل تک نہیں پہنچا سکتی جو اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو مطلوب ہے۔

اس مؤثر تمثیل کے بعد آپ حضرت مولانا رومیؒ کا یہ شعر پڑھا کرتے تھے کہ ؎

خشیت اللہ را نشانِ علم داں
آیت یخشی اللہ در قرآں بخواں

غرض خشیت، تواضع اور انابت الی اللہ کا یہ استحضار حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے علم کا وہ جزو لاینفک تھا جو آپ کی ہر تحریر و تقریر میں جلوہ گر ہے، اور جس نے آپ کے علمی افادات کو چار چاند لگا دیئے تھے۔

اختلافِ رائے کا انداز

۲۔ علم وتحقیق کے سفر میں ایسے مراحل بھی آتے ہیں جہاں ایک طالب علم کو کسی دوسرے عالم سے اختلاف کرنا پڑتا ہے، اور بعض مقامات پر اپنے بڑوں سے بھی اختلاف کرنا پڑتا ہے۔ اس سلسلے میں حضرت والد صاحبؒ کا طرزِ عمل یہ تھا کہ نہ تو کسی کا ادب واحترام اس سے اختلاف رائے کے اظہار میں مانع ہوا، اور نہ کبھی اختلاف رائے نے ادب واحترام میں ادنیٰ رخنہ اندازی کی۔ آپ نے بعض مسائل میں بڑے بڑے علماء سے بھی اختلاف کیا، بلکہ اپنے شیخ ومربی حکیم الامت حضرت تھانوی قدس سرہٗ سے بھی چند فقہی مسائل میں اختلافِ رائے رہا، اور خود حضرتؒ نے آپ سے یہ فرمایا کہ تمہارے دلائل پر مجھے شرح صدر نہیں ہوتا، اور میرے دلائل پر تمہیں شرح صدر نہیں، اس لئے دونوں اپنے اپنے مؤقف پر رہیں تو کچھ حرج نہیں، لیکن ایسے مواقع پر حضرت والد صاحبؒ کا عام معمول یہ تھا کہ جن صاحب سے اختلافِ رائے ہوا ہے، نہ صرف یہ کہ ان کے ادب واحترام میں ادنیٰ فرق نہ آنے دیتے، بلکہ ان کے کلام کا کوئی صحیح محمل بھی تلاش کر کے لکھ دیتے۔ مثلاً اوزانِ شرعیہ میں رائج الوقت اوزان کے لحاظ سے "درہم" کی مقدار مقرر کرنے میں آپ نے حضرت مولانا عبدالحی صاحب لکھنوی رحمۃ اللہ علیہ جیسے بڑے محقق عالم سے اختلاف فرمایا، لیکن اس کے لیے صرف اپنے دلائل اور حضرت مولاناؒ کے دلائل کی تردید پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ جستجو کر کے وہ وجہ بھی بیان فرمادی جس سے حضرت مولاناؒ کا عذر واضح ہوجاتا ہے۔

بڑوں کے علاوہ جب کبھی اپنے کسی معاصر عالم سے بھی کسی مجتہد فیہ مسئلے میں کوئی اختلاف ہوتا تو آپ اس کے ادب واحترام کو پوری طرح ملحوظ رکھتے اور کوئی ایسا اقدام نہ فرماتے جس سے اس کے علمی مقام کو ٹھیس پہنچے، یا عوام میں اس کا اعتماد مجروح ہو۔

غلطیوں پر ٹوکنے کا انداز

۳۔ "امر بالمعروف" کی طرح "نہی عن المنکر" بھی اہم شرعی فریضہ ہے، لیکن اس فریضے کی ادائیگی بڑی حکمت اور بصیرت چاہتی ہے، اور جب تک اللہ تعالیٰ کی توفیق شاملِ حال نہ ہو،

اس نازک فریضے کی ادائیگی میں اعتدال وتوازن کی حدود پر قائم رہنا بہت مشکل ہوجاتا ہے۔ اس سلسلے میں حضرت والد صاحبؒ کا جو طرز عمل دیکھا اور رعایت حدود کی جو عجیب وغریب باتیں دیکھنے سننے میں آئیں ان میں سے چند ذیل میں پیش کرتا ہوں۔

حضرت والد صاحبؒ فرمایا کرتے تھے کہ نکیر (علامت ہمیشہ منکر (بری یا ناجائز بات) پر ہونی چاہیے اور غیر منکر پر نکیر کرنا خود منکر ہے۔ لہٰذا بعض لوگ جو مباحات پر یا بعض آداب ومستحبات کے ترک پر نکیر کرنا شروع کر دیتے ہیں، ان کا طرز عمل درست نہیں ہے۔ آداب ومستحبات کی تعلیم وتبلیغ تو کرنی چاہیے اور ان کی ترغیب بھی دینی چاہیے اگر کوئی شخص کسی مستحب کو چھوڑ دے تو اسے تنہائی میں نرمی سے متوجہ کرنے میں بھی مضائقہ نہیں، لیکن اس پر نکیر وملامت کرنا کسی طرح جائز نہیں۔

حضرت والد صاحبؒ فرمایا کرتے تھے کہ جو حضرات محض کسی ترک مستحب پر مجمع عام میں روک ٹوک یا ناراضگی کا اظہار شروع کر دیتے ہیں ان کے طرز عمل میں دو غلطیاں ہوتی ہیں، ایک تو غیر منکر پر نکیر کرنا، دوسرے جس شخص پر روک ٹوک کی جارہی ہے اسے مجمع عام میں رسوا کرنے کا انداز اختیار کرنا اور اللہ بچائے بعض اوقات اس تمام نکیر وملامت کے پس پشت عجب وپندار اور نفسانیت بھی کارفرما ہوتی ہے جو ایک مستقل گناہ ہے۔ آپ فرمایا کرتے تھے کہ جو حضرات اس طرز عمل پر کاربند ہوتے ہیں عام طور سے دیکھا یہ ہے کہ دین کے اہم معاملات سے ان کی نگاہیں اوجھل رہتی ہیں۔ آداب ومستحبات بڑے محبوب اعمال ہیں، ان پر حتی الوسع خود عمل کرنا چاہیے اور دوسروں کو پیار ومحبت سے ان کی ترغیب بھی دینی چاہیے، لیکن ان کے ترک پر نکیر وملامت کا انداز اختیار کرنا درست نہیں۔

۴۔ حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا ایک معمول یہ بھی تھا کہ اگر کسی عالم یا دینی مقتدا کے حلقۂ اثر میں آپ کا جانا ہوتا، اور وہاں کے عوام میں آپ کوئی ایسی عام غلطی دیکھتے جو اس عالم یا مقتدا کے علم میں رہی ہو تو اس غلطی پر خود عوام کو نہیں ٹوکتے تھے، بلکہ اس عالم یا مقتدا کو تنہائی میں متوجہ فرما دیتے تھے کہ وہ لوگوں کو اپنی طرف سے مسئلہ بتا کر ان کے عمل کی اصلاح کر دیں، اور اس کی وجہ یہ بیان فرماتے تھے کہ اگر میں براہ راست لوگوں کو مسئلہ بتا دوں تو لوگ شاید میرے علم وفضل کے تو قائل ہوجائیں، لیکن جس عالم یا دینی رہنما سے ان کا دن رات کا سابقہ ہے اس کی طرف سے دل میں یہ بدگمانی پیدا ہوگی کہ ہم اتنے دن سے ان صاحب کے ساتھ رہتے ہیں، مگر انہوں نے ہمیں کبھی اس غلطی پر متوجہ نہیں کیا، نتیجہ یہ ہوگا کہ

جس شخص سے انہیں دینی فائدہ پہنچ رہا تھا اس پر اعتماد میں کمی آجائے گی جو ان کے دین کے لئے نقصان دہ ہوگی۔

ایک مرتبہ ایک ایسے ہی موقع پر حضرت والد صاحبؒ نے بتایا کہ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہ تو اس معاملے میں اس حد تک احتیاط فرماتے تھے کہ جب کبھی کسی دوسرے شہر میں جانا ہوتا، اور کوئی شخص مسئلہ پوچھنے کے لئے آتا تو عام طور سے خود بتانے کے بجائے اس شہر کے مفتی کا پتہ بتاتے کہ ان سے جا کر معلوم کر لو، اور اپنے رفقاء سے فرماتے کہ اگر میں اس شخص کو مسئلہ بتا دوں، اور مقامی علماء یا مفتی حضرات کے بتاتے ہوئے مسئلے سے کچھ فرق ہو جائے تو میں تو کل یہاں سے چلا جاؤں گا، اور یہ لوگ مقامی علماء سے بدگمان ہو کر آئندہ مسائل میں ان کی طرف رجوع کرتے وقت جھجک محسوس کریں گے۔

اللہ اکبر! اندازہ لگائیے ان حضرات کی حکیمانہ اور دور رس نگاہ کا، کہ دینی ضرورتوں کے معاملے میں کہاں تک نظر پہنچتی ہے، اور یہ سب کچھ درحقیقت ثمرہ ہے اس اخلاص اور للّٰہیت کا جس کے پیش نظر اپنی بات اونچی کرنا یا اپنی علمیت جتانا نہیں، بلکہ صحیح معنیٰ میں دین کی خدمت اور عوام کو فائدہ پہنچانا ہوتا ہے۔

۵۔ مجمع عام میں کسی شخص کو رسوا کن انداز میں ٹوکنے کا تو آپ کے یہاں سوال ہی نہ تھا، عام طور سے تنہائی میں فہمائش فرمایا کرتے تھے، لیکن اس میں بھی طریقہ یہ تھا کہ بات بات پر تنبیہ فرمانے کے بجائے ایک مرتبہ اطمینان سے بٹھا کر تمام ضروری باتوں پر متنبہ فرما دیتے تھے، جس وقت کوئی شخص جذبات سے مغلوب ہو اس وقت کبھی اسے نہیں سمجھاتے تھے، بلکہ ایسا طریقہ اختیار فرماتے جس سے اس کے جذبات پہلے ٹھنڈے ہو جائیں، اور جذبات کے معتدل ہو جانے پر فہمائش کرتے تھے۔

اسی طرح جب آپ اپنی اولاد، شاگردوں، ماتحتوں یا متوسلین میں سے کسی کو سختی کے ساتھ تنبیہ کی ضرورت فرماتے تو عام طور سے ایسی حالت میں اسے نہیں ڈانٹتے تھے جب خود طبعی طور پر غصہ آ رہا ہو، اس کے بجائے ایسے وقت کا انتظار فرماتے تھے جب اپنے جذبات معتدل ہو جائیں، چنانچہ جب طبعی غصہ ٹھنڈا ہوتا اور طبیعت پر نشاط ہوتا تو اس وقت اسے بلوا کر تنبیہ کرتے، اور ضرورت ہوتی تو غصے کا اظہار بھی فرماتے، سخت سے سخت بات بھی کہہ دیتے، لیکن یہ سب کچھ

خالص تادیب کے لئے ہوتا تھا۔ وجہ یہ تھی کہ طبعی غصے کی حالت میں تنبیہ کرتے ہوئے اعتدال پر قائم رہنا بہت مشکل ہوتا ہے، اور اس میں اس بات کا فوری خطرہ ہوتا ہے کہ تادیب کے بجائے طبعی جذبات گفتگو میں شامل ہو جائیں اور جتنی سختی کی فی الواقعہ ضرورت ہے، اس سے زیادہ سختی ہو جائے جو انصاف کے بھی خلاف ہو اور مقصد کے لئے بھی مضر ہو۔

فرمایا کہ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہٗ کی نصیحت یہی تھی کہ جب کبھی بچوں کو ڈانٹنے یا سزا دینے کی ضرورت ہو تو غصے کی حالت میں کبھی نہ دو، معتدل حالت میں جتنی سختی ضروری ہو اتنی کرو، خواہ اس کے لئے مصنوعی غصہ پیدا کرنا پڑے، اور طبعی غصے میں جو تنبیہ ہوتی ہے اس میں تادیب کا پہلو پیچھے چلا جاتا ہے، اور محض غصہ نکالنا رہ جاتا ہے۔

۹۔ پھر حضرت والد صاحبؒ کا معمول یہ بھی تھا کہ جب کبھی اپنے کسی چھوٹے یا ماتحت پر غصہ کا اظہار فرماتے یا ضرورۃً اس پر سختی فرماتے تو کسی دوسرے وقت اس کی اس طرح دلداری بھی ضرور فرما دیتے تھے جس سے دل شکنی کا اثر تو زائل ہو جائے، لیکن تادیب کا اثر زائل نہ ہو، کبھی اس کی کوئی مالی مدد فرما دی، کبھی اس کے کسی اچھے کام پر انعام دے دیا، کبھی مجمع عام میں اس کی کسی خوبی کی تعریف فرما دی، غرض کسی مناسب طریقے سے اس کی ہمت افزائی کا سامان بھی فرما دیتے تھے۔

۱۰۔ حضرت والد صاحبؒ کے عمل میں بارہا اس بات کا مشاہدہ ہوا کہ عین غصے کی حالت میں جب آپ کسی کو ڈانٹ رہے ہوں، اگر خود یا کسی کے متوجہ کرنے سے اپنی کسی غلطی کا احساس ہو جاتا تو عین غصے میں بھی اس کا اعتراف فرما لیتے، اور اس پر استغفار بھی فرماتے۔

یہ بات کہنے میں جتنی آسان ہے، عمل میں اتنی ہی مشکل ہے، اور جب تک کوئی نفس نے اپنے نفس کو قابو میں رکھنے کے لئے برسوں کسی شیخ کامل کی زیر نگرانی ریاضت نہ کی ہو اس پر عمل بے حد دشوار ہوتا ہے۔ حضرت والد صاحبؒ کا یہ طرز عمل درحقیقت اپنے شیخ کے عمل سے مستنیر تھا۔ حکیم الامت حضرت تھانوی قدس سرہٗ کا یہ واقعہ احقر نے حضرت والد صاحبؒ سے بار بار سنا، اور پھر احقر کے شیخ و مربی سیدی و سندی حضرت ڈاکٹر عبدالحی صاحب عارفی مدظلہم العالی نے بھی سنایا کہ حضرتؒ کے ایک خادم نیاز صاحب تھے، ایک مرتبہ کچھ لوگوں نے حضرتؒ کی خدمت میں ان کی یہ شکایت کی کہ انہوں نے بلا وجہ کچھ لوگوں سے تلخ کلامی کی ہے، تھوڑی ہی دیر میں نیاز صاحب آگئے تو حضرتؒ نے ان سے قدرے

تلخ لہجے میں کہا،

"کیوں نیاز میاں! تم ہر وقت لوگوں سے کیوں لڑتے پھرتے ہو؟"

اس کے جواب میں نیاز صاحب کے منہ سے نکل گیا،

"حضرت! اللہ سے ڈرو، جھوٹ نہ بولو۔"[1]

اندازہ لگائیے کہ اگر آج کسی بڑے سے بڑے با اخلاق شخص یا عالم کے سامنے اس کا کوئی ملازم یہ جملہ کہے تو اس کا غصہ کس انتہا پر پہنچے گا، لیکن یہ حکیم الامت حضرت تھانوی قدس اللہ سرہ تھے کہ اپنے ملازم کی زبان سے "اللہ سے ڈرو" کا جملہ سنتے ہی سارا غصہ کافور ہو گیا۔ اور فوراً گردن جھکا کر "استغفر اللہ، استغفر اللہ" کہتے ہوئے دوسری طرف تشریف لے گئے۔ در حقیقت عین غصے کی حالت میں ملازم سے یہ جملہ سن کر حضرت کو تنبہ ہوا کہ میں نے صرف ایک طرف کی بات سن کر ملازم کو ڈانٹنا شروع کر دیا ہے، حالانکہ پہلے اس کی بات بھی سننی چاہیے تھی، اس تنبہ کے ساتھ ہی آپ کا طرز عمل بدل گیا۔ کسی صاحب نے حضرت فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بارے میں کہا ہے کہ:

كان وقافاً عند حدود الله

وہ اللہ کی حدود کے آگے رک جانے والے تھے

حضرت والد صاحبؒ یہ مقولہ سنا کر فرمایا کرتے تھے کہ حضرت فاروق اعظمؓ کی اس صفت کا جتنا مظاہرہ حضرت حکیم الامتؒ کے معاملات زندگی میں دیکھا، اتنا کہیں دیکھنے میں نہیں آیا، اور کیوں نہ ہوتا، حضرت تھانوی قدس سرہٗ حضرت فاروق اعظمؓ کے نسبی اور معنوی دونوں اعتبار سے وارث تھے۔

عقیدت کی حدود: انبیاء علیہم السلام، صحابہ کرام رضوان اور بزرگان سلف کی عقیدت و

---

[1] احقر کے شیخ و مربی حضرت ڈاکٹر عبدالحی صاحب عارفی مدظلہم العالی نے فرمایا کہ نیاز صاحب ویسے بڑے با ادب تھے، اور حضرتؒ سے بے پناہ عقیدت و محبت کا تعلق رکھتے تھے، اور ان سے ایسی بے ادبی کا جملہ جان بوجھ کر نہیں نکلا تھا بلکہ غالباً کہنا وہ یہ چاہتے تھے کہ جن لوگوں نے آپ سے یہ شکایت کی ہے وہ اللہ سے ڈریں، جھوٹ نہ بولیں، لیکن شدت جذبات کی بدحواسی میں ان کے منہ سے یہ جملہ حضرتؒ ہی کے لئے نکل گیا۔

محبت چونکہ دنیا میں اللہ تعالیٰ کی محبت کا مظہر ہوتی ہے، اس لئے ایک حیثیت سے وہ جزو ایمان ہے اور یہی "حب فی اللہ" ہے جسے حدیث میں کمالِ ایمان کی شرط قرار دیا گیا ہے، لیکن اس عقیدت و محبت کی بھی حدود ہیں، اگر اس میں کمی ہو تو انسان کے دین میں نقص بنتا ہے، اور حد سے زیادتی ہو جائے تو وہی بدعت، بلکہ بعض صورتوں میں شرک بن جاتی ہے۔

حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو بھی بزرگانِ دین سے بہت عقیدت و محبت تھی، جب آپ بزرگوں کا تذکرہ فرماتے تو آپ پر ایک عجیب محویت سی طاری ہو جاتی، کوئی اور آپ کے سامنے بزرگانِ دین کا ذکر کرتا تو شوق سے سنتے، اور قدرتی بات ہے کہ جن بزرگوں کے ساتھ انسان کو رہنے کا موقع ملا ہو ان سے مناسبت بھی زیادہ ہوتی ہے، اس لئے اپنے اساتذہ و مشائخ اور اکابر علمائے دیوبند کے تذکرے میں تو آپ بے خود سے ہو جاتے تھے، لیکن اس تمام عقیدت و محبت کے باوجود آپ حدود کی ایسی نازک رعایتیں فرماتے تھے کہ ان کی نظیر ملنا مشکل ہے۔

آپ کو اپنی زندگی میں جس قدر عقیدت و محبت حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہٗ سے تھی، روئے زمین پر اتنی عقیدت و محبت کسی سے نہیں ہوئی، حضرتؒ کا اسم گرامی زبان پر آتے ہی آپ کے چہرے پر عجیب بشاشت پیدا ہو جاتی اور بار بار اس قسم کے جملے ارشاد فرماتے کہ: "ہمارے حضرتؒ کا معاملہ عجیب تھا، ہمارے حضرتؒ کے یہاں تو ہر چیز عجیب تھی، حضرت کی تو شان ہی عجیب تھی"، اس کے باوجود ان کے ساتھ اظہارِ عقیدت میں حدود کی جو رعایت دیکھنے میں آئی، اگر کم احقر نے اس کی نظیر نہیں دیکھی۔ دو واقعات سے اس کا کچھ اندازہ ہوگا۔

۱۳۹۲ھ میں جب حضرت والد صاحبؒ کو پہلی بار دل کا شدید دورہ ہوا، اور اس کی وجہ سے آپ تین ہفتے ہسپتال میں رہے تو آپ نے اپنے شیخؒ کے طرزِ عمل کے مطابق ایک مضمون شائع کرایا جس میں اپنے احباب اور ملنے جلنے والوں سے یہ درخواست کی گئی تھی کہ اگر انہیں آپ سے کوئی تکلیف پہنچی ہو تو اسے لوجہ اللہ معاف فرما دیں، اور اگر کوئی مالی حق کسی کے ذمے رہ گیا ہو تو وہ وصول کر لیں، یہ مضمون "کچھ تلافی مافات" کے نام سے شائع ہوا تھا۔

جب حضرت والد صاحبؒ کے دل میں اس مضمون کی اشاعت کا خیال پیدا ہوا تو آپ نے احقر کو اس کا مفہوم بتلا کر اسے تحریری شکل میں مرتب کرنے کا حکم دیا، اور یہ ہدایت فرمائی کہ پہلے حضرت

تھانوی قدس سرہٗ کے رسالے "العذر والنذر" کو پڑھ لینا اور مضمون کی تمہید میں حضرتؒ کے اس رسالے کا تعارف کرانے کے بعد اسی کے طرز پر اسے بھی مرتب کر دینا۔

احقر کو جب کبھی حضرت والد صاحبؒ کی طرف سے کوئی تحریر لکھنی ہوتی تھی تو اس کا بڑا بوجھ ہوتا تھا اور یہ اللہ تعالیٰ کا محض کرم تھا کہ کئی مرتبہ آپ کی مختلف تنبیہات سے سرفراز ہونے کے بعد احقر کی تحریر والد صاحبؒ کے لئے قابل برداشت ہوگئی تھی، اور آپ کبھی ہمت افزائی کے لئے یہ بھی فرما دیتے تھے کہ "بحمداللہ، اب مجھے تمہاری تحریر میں عموماً قلم لگانا نہیں پڑتا"

اس کے باوجود اس تحریر کا مجھ پر بہت بوجھ تھا، معاملہ بھی نازک سا تھا، جس میں بہت سے پہلوؤں کی رعایت کرنی تھی، اور سب سے بڑھ کر ایک جذباتی رکاوٹ تھی، اور وہ یہ کہ والد صاحبؒ اس مضمون کے آغاز میں اس مفہوم کے جملے لکھوانا چاہتے تھے کہ "اب میرا وقت قریب معلوم ہوتا ہے کسی بھی وقت بلاوا آسکتا ہے" وغیرہ، اور یہ جاننے کے باوجود کہ یہ باتیں حقیقت ہیں مجھے اس ماحول میں اپنے قلم سے اس قسم کے جملے لکھنا اپنی موت کے پروانے پر دستخط کرنے سے زیادہ صبر آزما معلوم ہوتا تھا۔ ادھر اس زمانے میں اباجیؒ کی طبیعت بہت کمزور، نازک اور حساس ہوگئی تھی، امزاج کے خلاف ذرا سی بات سے طبیعت میں تغیر پیدا ہو جاتا جو بعض اوقات صحت کے لئے سخت مضر ہوتا تھا، اس کے علاوہ طبعی پریشانی، ہسپتال کے انتظامات اور وہاں کے ماحول کی وجہ سے کسی تحریری کام کے لئے ذہنی یکسوئی بھی میسر نہ تھی، اس لئے یہ چار صفحات کی تحریر میرے لئے ایک پہاڑ بن گئی۔

بہرکیف! اللہ تعالیٰ سے دعا کی، خدا جانے کس طرح میں نے یہ چار صفحے لکھے، اور حضرت والد صاحبؒ کو سنانے شروع کئے، یہ تو انہی کی دعا و توجہ کی برکت تھی کہ بالآخر انہوں نے اسے پسند فرمالیا لیکن ابتدا میں جب میں نے لرزتی ہوئی آواز میں یہ مضمون سنانا شروع کیا اور اس میں اس قسم کا جملہ آیا کہ "حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ نے اس مقصد کے لئے ایک رسالہ شائع فرمایا تھا" تو میں نے دیکھا کہ حضرتؒ کے چہرے پر قدرے تکدر کے سے آثار نمودار ہوتے اور فرمایا:

"جاؤ میاں! تمہیں اب تک حضرتؒ کا نام بھی لکھنا نہ آیا، اور حضرتؒ کا تذکرہ اس طرح کر دیا جیسے کسی اجنبی عالم کا ذکر کر دیا جاتا ہے، خدا کے بندے! تم یہ تحریر میری طرف سے لکھ رہے ہو، اور اس حالت میں لکھ رہے ہو کہ حضرتؒ کے ساتھ میرے تعلق کو بھی تو ملحوظ رکھو، وہ امت کے تو حکیم تھے اگر یہ بھی تو بتاؤ

کہ میرے کیا تھے؟ تمہیں الفاظ کا تحمل بھی یہ ہی کرتا تھا ارسے یوں لکھو کہ میرے شیخ و مرشد میرے آقا اور مربی سیدی و سندی مولائی و مرشدی...... الخ" اور ان آخری الفاظ پر آپ کی آواز بھرا گئی، آنکھوں میں آنسو چھلک آئے، اور شدت جذبات میں سر نیچے پر ڈھلک گیا

ایک طرف اس واقعے سے حضرتؒ کے ساتھ آپ کے اس جذباتی تعلق کا اندازہ لگائیے اور دوسری طرف ایک اور واقعہ سنئے

غالباً حضرت والد صاحبؒ کے ہسپتال سے واپس گھر تشریف لانے کے بعد ایک مرتبہ مجھے ایک اور تحریر لکھنی تھی، اور اس میں حضرت حکیم الامت قدس سرہٗ کا ذکر بھی تھا، اس میں احقر نے حضرتؒ کے لئے کچھ اس قسم کے الفاظ لکھے تھے کہ "اس چودھویں صدی کے مجدد دین حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ"

میں کوشش یہی کرتا تھا کہ اپنی کوئی تحریر حضرت والد صاحبؒ کو سنائے یا دکھائے بغیر شائع نہ کروں، چنانچہ میں نے یہ تحریر بھی آپ کی خدمت میں بغرض ملاحظہ پیش کی، آپ نے جب وہ تحریر مجھے واپس کی تو میں نے دیکھا کہ اس میں "چودھویں صدی کے مجدد دین" کے الفاظ کاٹ کر آپ نے ان کی جگہ "مجدد ملت" کے الفاظ تحریر فرما دیئے تھے، میں اس اصلاح پر ابھی غور بھی نہ کر پایا تھا اور چہرہ سوالیہ نشان ہی بنا ہوا تھا کہ آپ نے خود فرمایا:

" سمجھے! یہ الفاظ میں نے کیوں بدلے ہیں؟"

احقر نے عرض کیا: "نہیں آپ ہی بیان فرمادیں"

فرمایا کہ: "دراصل مجدد دین کوئی ایسا معین منصب نہیں ہوتا جیسے نبی اور رسول ایک متعین منصب ہے، حدیث کے انداز میں جس مجدد کی خبر دی گئی ہے وہ فرد واحد بھی ہو سکتا ہے اور افراد کا ایک طائفہ بھی ہو سکتا ہے اور مجدد کے لئے یہ بھی ضروری نہیں ہے کہ اسے اپنے مجدد ہونے کا علم الیقین ہو، اور نہ کسی دوسرے شخص کے پاس کوئی ایسا یقینی ذریعہ ہوتا ہے جس سے وہ کسی فرد کو معین اور قطعی طور پر اس صدی کا مجدد قرار دے سکے، چنانچہ اس کی تعیین میں رائیں مختلف بھی ہو سکتی ہیں، اس ذیل میں زیادہ سے زیادہ جو بات کہی جا سکتی ہے وہ یہ کہ فلاں صاحب کے بارے میں غالب گمان یہ ہے کہ اس صدی کے مجدد تھے، حضرت حکیم الامت قدس سرہٗ کے بارے میں ہمارا گمان غالب یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے

نہیں اس صدی کا مجدد تھا یا نہیں، لیکن بالکل حتمی، یقینی اور قطعی طور پر یہ بات کہنا درست نہیں، کیونکہ اس معاملے میں حتم ویقین کی کوئی شرعی حجت ہوتی ہی نہیں، ہاں! اس بات کا یقین بلکہ عین الیقین ہے کہ حضرتؒ نے جو کارنامہ انجام دیا وہ تجدیدی کارنامہ ہے اور آپ سے اللہ تعالیٰ نے ملت کی تجدید احیا کا عظیم کام لیا ہے، اس لئے "مجدد ملت" کے الفاظ زیادہ محتاط اور قرین صواب ہیں"

اندازہ لگائیے کہ کس باریک نکتے کی طرف نظر گئی اور جس ذات کے ساتھ تعظیمی الفاظ کی کمی سے آپ کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے اسی کی تعریف و توصیف میں ایک حد سے ذرا نکلا ہوا لفظ برداشت نہ ہوسکا، ہر چیز کو اس کی صحیح حد میں رکھنے کے لئے عدل وانصاف کی یہ ترازو اللہ تعالیٰ انہی لوگوں کو عطا فرماتا ہے، جن کی عقیدت ومحبت خالص اللہ ہی کے لئے ہوتی ہے۔

حمایت ومخالفت کی حدود

کسی شخص یا جماعت کی حمایت ومخالفت میں جب نفسانیت شامل ہوجاتی ہے تو نہ حمایت اپنی حدود پر قائم رہتی ہے نہ مخالفت، بلکہ ہوتا یہ ہے کہ جس شخص کی حمایت کرنی ہو اسے سراپا بے داغ اور جس کی مخالفت کرنی ہو اسے سراپا سیاہ ثابت کرنے سے کم پر بات نہیں ہوتی، آجکل حمایت ومخالفت میں اس قسم کے مظاہرے عام ہوچکے ہیں، بلکہ بسا اوقات یہ بھی ہوتا ہے کہ ایک شخص جس زمانے میں منظور نظر ہوا تو اس کی ساری غلطیوں پر پردہ ڈال کر اسے تعریف وتوصیف کے بانس پر چڑھا دیا گیا، اور جب وہی شخص کسی وجہ سے زیر عتاب آگیا تو اس کی ساری خوبیاں ملیامیٹ ہوگئیں، اور اس میں ناقابل اصلاح کیڑے پڑ گئے۔

حضرت والد صاحب اس طرز فکر کے سخت مخالف تھے، اور فرمایا کرتے تھے کہ اول تو یہ طریقہ حق وانصاف کے خلاف ہے، اس کے علاوہ اس حد سے گزری ہوئی حمایت ومخالفت کے نتیجے میں بسا اوقات انسان کو دنیا ہی میں شرمندگی اٹھانی پڑتی ہے، اور اس سلسلے میں آپ ایک حدیث کا حوالہ بھی دیا کرتے تھے ____________ جو آپ سے اتنی بار سنی ہے کہ اس کے الفاظ آپ ہی کے لہجے میں یاد ہوگئے ہیں:

اَحْبِبْ حَبِیْبَکَ ھَوْنًا مَّا، عَسٰی اَنْ یَّکُوْنَ بَغِیْضَکَ یَوْمًا مَّا

وَاَبْغِضْ بَغِيْضَكَ هَوْنًا مَا، عَسٰى اَنْ يَكُوْنَ حَبِيْبَكَ يَوْمًا مَا (ترمذی، ابواب البر والصلۃ، باب الاقتصاد فی الحب والبغض)

اپنے محبوب سے اعتدال کے ساتھ محبت کرو، ہو سکتا ہے کہ کسی دن وہ تمہارا مبغوض بن جائے، اور جو شخص تمہیں ناپسند ہو اس کے ساتھ ناپسندیدگی کا اظہار بھی اعتدال کے ساتھ کرو، ہو سکتا ہے کہ کسی دن وہ تمہارا محبوب بن جائے۔

دوسروں کی حمایت و مخالفت کے بارے میں حضرت والد صاحب قدس سرہٗ کا عمر بھر کا طرزِ عمل اس روایت کی عملی تشریح کی حیثیت رکھتا تھا، آپ کی نگاہ دشمنوں اور مخالفین میں بھی اچھائیوں کو تلاش کر لیتی تھی، اور ان کی خوبیوں کے برملا اظہار میں بھی آپ کو کبھی باک نہیں ہوا۔

بعض اوقات جب عام فضا کسی شخص یا جماعت کے خلاف ہو جاتی ہے تو اس کے بارے میں الزام تراشی اور افسانہ طرازی کو عموماً عیب نہیں سمجھا جاتا، بلکہ ڈھونڈ ڈھونڈ کر اس کے عیوب کی خبریں لانے میں لطف محسوس کیا جاتا ہے، اور اس میں تحقیق کی بھی ضرورت نہیں سمجھی جاتی، حضرت والد صاحبؒ ایسے مواقع پر اپنے متعلقین کو اس طرزِ عمل سے سختی کے ساتھ روکتے، اور فرماتے کہ اگر ایک شخص کسی جہت سے برا ہے تو اس کا یہ مطلب کہاں سے نکل آیا کہ اس کی تمام جہات لازماً بری ہی ہوں گی اور اب اس کی بے ضرورت غیبت اور اس کے خلاف بہتان تراشی جائز ہو گئی ہے، قرآن کریم کی اس آیت کو تم کیوں بھول جاتے ہو کہ

لَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ اَلَّا تَعْدِلُوْا

کسی قوم کی دشمنی تمہیں اس کے خلاف بے انصافی کے ارتکاب پر ہرگز آمادہ نہ کرے۔

اسی ذیل میں حضرت والد صاحبؒ نے یہ واقعہ سنایا کہ ایک مرتبہ کسی شخص نے ایک صحابی (غالباً حضرت عبداللہ بن عمرؓ) کے سامنے حجاج بن یوسف پر کوئی غلط الزام لگایا، اس پر انہوں نے فرمایا کہ یہ مت سمجھو کہ اگر حجاج بن یوسف ظالم ہے تو اس کی آبرو تمہارے لئے حلال ہو گئی ہے، یاد رکھو کہ اگر اللہ تعالیٰ حشر کے دن حجاج بن یوسف سے اس کے مظالم کا حساب لے گا تو تم سے اس ناجائز بہتان کا بھی حساب لے گا جو تم نے اس کے خلاف لگایا۔

دین کی طلب کا حیرت انگیز مقام

(۴) حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے طلبِ دین کا عالم یہ تھا کہ علم و فضل میں مرجع خلائق ہونے کے باوجود دین کی کوئی بات جہاں سے ملتی، اسے ذوق و شوق کے ساتھ حاصل کرنے کی فکر میں رہتے، آپ کو اپنے معاصرین، بلکہ چھوٹوں سے بھی استفادے میں نہ صرف یہ کہ کبھی عار محسوس نہیں ہوتی، بلکہ بعض اوقات دوسروں پر اس کا اظہار بھی فرما دیتے تھے کہ یہ بات مجھے فلاں شخص سے معلوم ہوئی۔

اللہ تعالیٰ جنہیں دین کی تڑپ اور طلبِ علم کا ذوق عطا فرماتا ہے، وہ ہر اس ذریعے کی تلاش میں رہتے ہیں جس سے دین کی کوئی بات معلوم ہو جائے۔ لیکن اس معاملے میں حضرت والد صاحبؒ کے مقامِ بلند کا اندازہ آپ کے ایک عظیم ارشاد سے ہوگا۔ ایک دفعہ آپ نے بر سبیلِ تذکرہ ارشاد فرمایا کہ جب بھی کوئی واعظ کسی جگہ وعظ کہتا ہوا نظر آتا ہے، اور میرے پاس وقت ہوتا ہے تو میں وقت اور موقع کے لحاظ سے کچھ نہ کچھ دیر کے لئے وعظ ضرور سنتا ہوں، خواہ واعظ میرا چھوٹا ہی کیوں نہ ہو، اور خواہ میں اسے پہچانتا ہوں یا نہ پہچانتا ہوں، چنانچہ اگر راستے پر جاتے ہوئے مجھے کوئی مجلسِ وعظ نظر آتی ہے تو کچھ دیر رک کر اس کی بات ضرور سن لیتا ہوں۔ اس لئے کہ بعض اوقات تو کوئی نئی بات معلوم ہو جاتی ہے، اور اگر پرانی ہی بات ہو تو بعض اوقات کہنے والے کا انداز ایسا ہوتا ہے کہ وہ دل پر اثر کر جاتا ہے، اور اس سے بعض ایسی باتوں کی طرف عملاً توجہ ہو جاتی ہے جو پہلے معلوم تو تھیں، مگر عمل میں نہ آئی تھیں، اور اس سے ہمہ دانی کا پندار بھی ٹوٹتا ہے۔

اللہ اکبر! اندازہ لگائیے اس پیکرِ علم و فضل کی تواضع، بے نفسی اور للٰہیت کا، کہ جس کی زبان سے چند جملے سننے کے لئے لوگ دور دور سے سفر کر کے آتے تھے، وہ خود چھوٹے چھوٹے واعظوں سے دین کی باتیں سننے کے لئے کتنے اشتیاق کا مظاہرہ کرتا تھا! آج کوئی طالبِ علمِ دین اور تواضع و للٰہیت کے اس مقام کی نظیر تو پیش کر کے دکھائے۔ ہمارا حال یہ ہے کہ اگر کسی جلسے میں تقریر کرنے کے لئے مدعو ہوں تو چند منٹ کسی دوسرے کی تقریر سننا بھاری معلوم ہوتا ہے، اور اگر سنتے بھی ہیں تو استفادے کی غرض سے سننا کسرِ شان سمجھتے ہیں، اور استفادے کی بجائے تنقید کی نیت سے سنتے ہیں، اور اگر استفادہ کرنا ہی ہو تو ہمارا استفادہ مقرر کے اسلوبِ بیان یا زیادہ سے زیادہ کسی نئی بات کے معلوم

ہونے تک محدود رہتا ہے، لیکن یہ نیت کہ شاید اس کی کسی بات سے اپنے عمل کی اصلاح ہو جائے؟ ہم اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر سوچیں کہ اس نیت کا دور دور کوئی شائبہ بھی کبھی ہوتا ہے؟

وقت کی قدر شناسی

۱۱۔ حضرت والد صاحبؒ کو وقت کی قدر و قیمت کا بڑا احساس تھا اور آپ ہر وقت اپنے آپ کو کسی نہ کسی کام میں مشغول رکھتے تھے، اور حتی الامکان کوئی لمحہ فضول جانے نہیں دیتے تھے۔ آپ کے لئے سب سے زیادہ تکلیف کی بات یہ تھی کہ آپ کے وقت کا کوئی حصہ ضائع چلا جائے۔ آپ سنت کے مطابق گھر والوں کے ساتھ ضروری، اور بسا اوقات تفریحی گفتگو کے لئے بھی وقت نکالتے تھے لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے آپ کے دل میں کوئی الارم لگا ہوا ہے جو ایک مخصوص حد تک پہنچنے کے بعد آپ کو کسی اور کام کی طرف متوجہ کر دیتا ہے، چنانچہ گھر والوں کے حقوق ادا کرنے کے بعد آپ اپنے کام میں مشغول ہو جاتے۔ سفر ہو یا حضر، آپ کا قلم چلتا ہی رہتا، ریل گاڑی میں تو آپ ایسی روانی سے لکھتے تھے جیسے ہوا زمین پر بیٹھے ہوں، اور تحریر میں کوئی خاص بگاڑ بھی عموماً پیدا نہیں ہوتا تھا، حد یہ ہے کہ احقر نے آپ کو موٹر کار، بلکہ موٹر رکشا تک میں بیٹھ کر لکھتے ہوئے دیکھا ہے، حالانکہ کار اور رکشہ کے جھٹکوں میں کچھ لکھنا انتہائی دشوار ہوتا ہے۔ مگر آپ ہلکے پھلکے خطوط اس میں بھی لکھ لیتے تھے، یہاں تحریر کے طرز میں کچھ تبدیلی پیدا ہوتی لیکن خط پھر بھی آرام سے پڑھ لیا جاتا تھا۔

آپ اوقات کی وسعت کے لحاظ سے مختلف کاموں کی ایک ترتیب ہمیشہ ذہن میں رکھتے، اور جتنا وقت ملتا اس کے لحاظ سے وہ کام کر لیتے جو اتنے وقت میں ممکن ہو، مثلاً اگر گھر میں آنے کے بعد کھانے کے انتظار میں چند منٹ مل گئے ہیں تو ان میں ایک خط لکھ لیا، یا کسی سے فون پر کوئی ضروریات کرنی ہیں تو وہ کر لی، گھر کی کوئی چیز بے ترتیب یا بے جگہ ہے تو اسے صحیح جگہ رکھ دیا، کوئی مختصر سی چیز مرمت طلب پڑی ہے، تو اپنے ہاتھ سے اس کی مرمت کر لی، الغرض جہاں آپ کو طویل کاموں کے درمیان کوئی مختصر وقفہ ملا، آپ نے پہلے سے سوچے ہوئے مختصر کاموں میں سے کوئی کام انجام دے لیا۔

ایک روز ہم لوگوں کو وقت کی قدر پہچاننے کی نصیحت کرتے ہوئے فرمانے لگے کہ بے تو ظاہر

ناقابلِ ذکر سی بات، لیکن تمہیں نصیحت دلانے کے لئے کہتا ہوں کہ مجھے بے کار وقت گزارنا انتہائی شاق معلوم ہوتا ہے، انتہا یہ ہے کہ جب میں قضاءِ حاجت کے لئے بیت الخلا جاتا ہوں تو وہاں بھی خالی وقت گزارنا مشکل ہوتا ہے، چنانچہ جتنی دیر بیٹھنا ہوتا ہے اتنے اور کوئی کام تو ہو نہیں سکتا، اگر لوٹا میلا کچیلا ہو تو اسے دھولیتا ہوں۔

مجھے یاد ہے کہ جب حضرت والد صاحبؒ نے مجھے پہلے پہل ہاتھ کی گھڑی حجاز سے لاکر دی تو ساتھ ہی فرمایا کہ: "یہ گھڑی اس نیت سے اپنے پاس رکھو کہ اس کے ذریعے اوقاتِ نماز کی پابندی کر سکو گے، اور وقت کی قدر و قیمت پہچان سکو گے، میں بھی گھڑی اس لئے اپنے پاس رکھتا ہوں کہ وقت کو تول تول کر خرچ کر سکوں"۔ اللہ تعالیٰ انہیں قربِ خاص کے مقامات میں ابدی راحتیں عطا فرمائے، وہ اسی طرح زندگی کے چھوٹے چھوٹے معاملات میں زاویۂ نظر درست فرما کر انہیں عبادت بنا دینے کی فکر میں رہتے تھے۔

طرزِ معیشت

۱۲۔ حضرت والد صاحبؒ کا طرزِ معیشت ہمیشہ انتہائی سادہ رہا، ساری عمر ایک ہی سا لباس اور ایک ہی سی وضع قطع کے پابند رہے، طرزِ بود و ماند میں ہمیشہ تواضع، سادگی اور مسکنت کی جھلک نمایاں رہی، آمدنی کے لحاظ سے آپ پر مختلف قسم کے دور گزرے، دار العلوم دیوبند میں پندرہ روپے سے لے کر پینسٹھ روپے ماہانہ تک آپ کی تنخواہ رہی، اس کے بعد مدت تک کوئی مستقل ذریعۂ آمدنی نہیں تھا، پاکستان آنے کے بعد ابتدائی زمانہ بہت عسرت میں بسر ہوا، پھر وہ دور بھی آیا کہ بورڈ تعلیماتِ اسلام کی رکنیت کے زمانے میں ایک ہزار روپے ماہانہ الاؤنس ملنے لگا، لیکن اس تمام اتار چڑھاؤ کے مختلف زمانوں میں آپ کا طرزِ معیشت یکساں ہی رہا، نہ عسرت کے زمانے میں کبھی بخل سے کام لیا، نہ فراخی کے دور میں کبھی اسراف سے، البتہ آمد و خرچ ہمیشہ انتظام کے ساتھ فرماتے، ہر قسم کے اخراجات کی الگ الگ مدیں مقرر تھیں، جتنی آمدنی ہوتی ضرورت کے لحاظ سے مختلف مدوں میں تقسیم ہو جاتی، اور جس مد میں جتنے پیسے ہوتے اسی کے لحاظ سے خرچ بھی فرماتے، زمانۂ دراز تک یہ معمول رہا کہ ماہانہ اخراجات کا تحریری حساب رکھتے، وہ کاپیاں اب تک محفوظ ہیں جن میں آپ نے چھوٹے چھوٹے اخراجات بھی لکھ کر رکھے ہوئے ہیں اور اکثر فرمایا کرتے تھے کہ تھوڑی آمدنی میں کام چلانے کے لئے

بخل کی نہیں، انتظام اور قناعت کی ضرورت ہے، اگر انسان اپنی آمدنی کو انتظام کے ساتھ خرچ کرے تو تھوڑی رقم میں بھی کام بن جاتا ہے اور بدنظمی سے کرے تو قارون کا خزانہ بھی کافی نہ ہو۔
مزید فرماتے کہ لوگ معاشی تنگی کو دور کرنے کے لئے آمدنی بڑھانے کی فکر میں رہتے ہیں، حالانکہ آمدنی کا بڑھنا غیر اختیاری ہے، اور جو کام اپنے اختیار میں ہے اسے پہلے کرنا چاہیے، یعنی یہ کہ اخراجات کم کئے جائیں، اور قناعت اختیار کی جائے، جتنی آمدنی جائز ذرائع سے بس میں ہو، اخراجات کا معیار اسی کے مطابق رکھا جائے۔

بورڈ تعلیمات اسلام کا الاؤنس بھی صرف چند سال جاری رہا، اور وہ بھی اس شان استغناء سے جس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے کہ اپنی زندگی کے کسی کام کا مدار اس پر نہیں رکھا تاکہ دینی ضرورت داعی ہو تو استعفا دینے میں کوئی معاشی مسئلہ کبھی رکاوٹ نہ بن سکے۔ اس کے بعد پھر وہی کیفیت تھی کہ کوئی مستقل ذریعہ آمدنی نہ تھا، دارالعلوم کراچی کی بنیاد پڑ چکی تھی، مگر اس سے آپ نے تنخواہ لینا پسند نہیں فرمایا۔
جب تنگی زیادہ ہوئی اور قرضوں کا بار بڑھ گیا تو دارالعلوم کی مجلس منتظمہ کی درخواست پر پانچ سو روپے ماہوار لینا منظور فرما لیا، لیکن اس شرط کے ساتھ کہ جب اللہ تعالیٰ فراخی عطا فرمائیں گے تو یہ رقم واپس کر دی جائے گی، کچھ دنوں کے بعد ترقی معکوس فرمائی، اور پانچ سو کے بجائے تین سو روپے ماہانہ لینے شروع کر دیئے، اور پھر کچھ دنوں کے بعد کچھ لینے کا سلسلہ بالکل بند کر دیا، جتنی رقم اس وقت تک دارالعلوم سے لی تھی، اس کا پورا حساب اپنے پاس محفوظ رکھا، اور اس کی واپسی کی فکر میں رہے، یہاں تک کہ پھر وہ وقت بھی آیا کہ جتنی تنخواہ اس عبوری دور میں دارالعلوم سے لی تھی، اس کی پائی پائی واپس کر دی۔
جس زمانے میں معاشی طور پر آپ کا ہاتھ تنگ رہا، اس دور میں بھی یہ بات اولاد تک پر ظاہر نہیں ہونے دی، ہم لوگوں کی صرف ضروریات ہی نہیں، جائز اور معتدل شوق بھی پورے فرماتے رہے، لیکن ساتھ ہی فضول خرچی سے اجتناب کی بھی عادت ڈالی، اور اس بات پر ہمیشہ نگاہ رکھی کہ دنیا طلبی ہی زندگی کا مقصد ہو کر نہ رہ جائے۔ اپنی اولاد سے خطاب کرتے ہوئے بارہا ارشاد فرمایا کہ "میں تم لوگوں کے لئے ہمیشہ یہ دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ معاشی پریشانی و بدحالی سے تو محفوظ رکھے، لیکن بہت زیادہ مالدار بھی نہ بنائے، کیونکہ یہ بہت بڑا فتنہ ہے"
"بزرگوں سے سنا ہے کہ اللہ والے دنیا کے تمام کاروبار عام انسانوں کی طرح انجام دیتے ہیں،

لیکن دنیا کی محبت ان کے دل میں نہیں ہوتی، اس جملے کی مکمل عملی تفسیر ہم نے اپنے والد ماجدؒ کی زندگی میں دیکھی، آپ کو اللہ تعالیٰ نے کسب معاش کے لئے تجارت، زراعت اور اجارہ تینوں سنتوں پر عمل کی توفیق بخشی، تجارت اس طرح کی کہ صرف پانچ روپے کے سرمائے سے دارالاشاعت کا کام شروع کیا، جو بالآخر کتابوں کی نشر و اشاعت کی شکل اختیار کر گیا، زراعت اس طرح فرمائی کہ دیوبند میں باغ لگایا، اس کے علاوہ کتابت اور جلد سازی کا بھی کام کیا، اور تنگ دستی سے لے کر وسعت و فراخی تک ہر قسم کے سرد و گرم چکھے، لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دنیا کی محبت آپ کو چھو کر بھی نہیں گئی جس کی واضح مثال یہ ہے کہ دیوبند میں عمر کا بیشتر حصہ آپ نے ایک تنگ کرے میں گذارا، آخر زمانے میں اللہ تعالیٰ نے وسعت دی تو خود اپنے شوق سے ایک کشادہ مکان بنوایا، اس کی ایک ایک اینٹ پر محنت خرچ کی، یہاں تک کہ وہ آپ کی راحت کا بہترین سامان بن گیا، آپ کو شجر کاری کا بھی شوق تھا، اور فرمایا کرتے تھے کہ اگر نیت صحیح ہو تو درخت لگانا بھی ایک صدقہ جاریہ ہے، جب تک وہ درخت قائم رہے گا، اس سے جتنے آدمی فائدہ اٹھائیں گے، درخت لگانے والے کو ثواب ملے گا، چنانچہ دیوبند ہی میں ایک باغ لگایا جس میں بڑے شوق اور محنت سے مختلف پھلوں، بالخصوص آم کے درخت جمع کئے، لیکن اس اثناء میں پاکستان بن گیا، اور ہجرت کا مرحلہ اس وقت آیا جب اس باغ پر پہلا پہلا پھل آرہا تھا، آپ یہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر چلے آئے، اور اکثر تحدیث نعمت کے طور پر فرمایا کرتے تھے کہ: "بفضلہ تعالیٰ جس روز میں نے اس گھر اور اس باغ سے قدم نکالا ہے، وہ گھر اور باغ میرے دل سے نکل گئے اور اب مجھے بعض اوقات سوچ کر بھی اس گھر کے بعض حصوں کا نقشہ یاد نہیں آتا" چنانچہ ساری عمر کبھی ایک مرتبہ آپ کو اس گھر یا باغ کا حسرت سے تذکرہ کرتے نہیں دیکھا۔

اسی طرح کراچی آنے کے سات سال بعد اللہ تعالیٰ نے لسبیلہ ہاؤس میں وسیع اور آرام دہ مکان عطا فرمایا لیکن چند سال اس میں مقیم رہنے کے بعد دارالعلوم کی ضرورت داعی ہوئی کہ اپنا قیام یہاں منتقل فرمالیں، چنانچہ اس کشادہ اور آرام دہ مکان کو چھوڑ کر یہاں تشریف لے آئے، اور ایک ایسے تنگ مکان میں سال ۲ سال گذارہ کیا جس کی چھتیں ناپختہ تھیں، اور برسات کے موسم میں کمرہ بری طرح ٹپکتا تھا، لیکن یہاں آنے کے بعد لسبیلہ کے مکان کے راحت و آرام کو یاد کرتے کبھی نہیں دیکھا۔

غرض دنیا کی کسی بڑی سی بڑی منفعت کے ہاتھ سے نکل جانے پر کبھی حسرت کرتے آپ کو نہیں

پایا، اور بہادر شاہ ظفر مرحوم کا یہ شعر جو آپ ایسے مواقع پر اکثر پڑھا کرتے تھے، آپ کے قلب کی کیفیت کی تصویر تھا ۔

یہ کہاں کا فسانۂ سود و زیاں، جو گیا سو گیا، جو ملا سو ملا
کہو دل سے کہ فرصتِ عمر ہے کم، جو دلا تو خدا ہی کی یاد دلا

۱۵۔ ایک طرف دنیا کی بے تعلقی کا یہ استحضار تھا، لیکن دوسری طرف یہ پہلو کبھی نظر سے اوجھل نہیں ہوا کہ دنیا میں جو چیز جائز اور حلال طریقے سے میسر آجاتی ہے، وہ اللہ تعالیٰ کی عطا ہے، اور اس کا یہ حق ہے کہ اس کی ناقدری نہ کی جائے، چنانچہ آپ اپنی مملوک اشیاء کو حفاظت کے ساتھ رکھتے اور اس بات کی کوشش کرتے کہ کوئی چیز ضائع نہ ہونے پائے، بلکہ کسی نہ کسی کے کام آجائے۔ کاغذ کے جو ٹکڑے بے تحریر سے بچ رہتے، انہیں احتیاط سے جمع کرتے رہتے، ان کی ایک جگہ مقرر تھی، اور گھر میں جب کبھی کسی کو کوئی مختصر پرچہ لکھنا ہوتا، وہاں پہنچ جاتا، وہاں ہر سائز کے کاغذ کے پرزے مل جاتے تھے، جو پیکٹ ڈاک میں آتے ان کی ستلی کو ضائع کرنے کے بجائے ایک مخصوص جگہ پر رکھوا دیتے، اور گھر کا ہر فرد ضرورت کے وقت وہاں سے ستلی لے کر استعمال کرتا۔ دعوتوں کے جو کارڈ آیا کرتے، کبھی ان کی پشت پر کوئی کلمۂ حکمت اور کبھی کوئی شعر وغیرہ لکھ کر اسے کہیں ٹکا دیتے، یا کسی کو دے دیتے۔ اگر کوئی چیز کبھی گم ہو جاتی تو اسے اجمالی طور پر تلاش ضرور کرتے، خواہ وہ ایک پائی ہی کیوں نہ ہو، اور فرماتے تھے کہ یہ بڑی ناقدری کی بات ہے کہ آدمی اللہ تعالیٰ کی اس عطا سے اپنے آپ کو مستغنی سمجھ کر اسے تلاش ہی نہ کرے ۔

انفاق فی سبیل اللہ

۱۶۔ حضرت والد صاحبؒ کو اللہ تعالیٰ کے راستے میں خرچ کرنے کا بڑا ذوق تھا، اور آپ مصارفِ خیر میں حصہ لینے کی تلاش میں رہتے تھے، چنانچہ مصارفِ خیر کی جتنی صورتیں عام طور سے ہوتی ہیں، ان میں شاید ہی کوئی صورت ایسی بچی ہو جس پر آپ نے عمل نہ فرمایا ہو، انفاق کا یہ معمول تنگی و فراخی ہر حالت میں جاری رہا، اور اس کے لئے جو طریق کار اختیار فرمایا ہوا تھا، وہ بڑا سبق آموز اور لائقِ تقلید ہے۔ آپ کا معمول یہ تھا کہ زکوٰۃ ادا کرنے کے علاوہ آپ کے پاس جب بھی کوئی رقم آتی تو اس کا ایک

معین حصہ فوراً مصارفِ خیر میں خرچ کرنے کے لئے علیحدہ فرما لیتے تھے، اور طے یہ کیا ہوا تھا کہ آمدنی اگر محنت سے حاصل ہوئی ہے تو اس کا بیسواں حصہ (پانچ فی صد) اور اگر کسی محنت کے بغیر حاصل ہوئی ہے (مثلاً انعام، ہدیہ، تحفہ وغیرہ) تو اس کا دسواں حصہ فوراً علیحدہ نکال لیا جائے۔

جیسا کہ پہلے عرض کر چکا ہوں، آپ کے پاس ہمیشہ ہر قسم کے اخراجات کی الگ الگ مدیں مقرر تھیں، ایک صندوقچی میں مختلف تھیلے یا لفافے رکھے رہتے تھے، جن پر اس مد کا نام درج ہوتا تھا مثلاً "خانگی اخراجات"، "آمد و رفت کے اخراجات" وغیرہ، اسی صندوقچی میں ایک تھیلا آپ کے پاس ہمیشہ رہتا تھا جس پر "صدقات و مبرّات" لکھا رہتا تھا، تنگ دستی کا زمانہ ہو یا فراخی کا آمدنی کا مذکورہ حصہ آپ فوراً اس تھیلے میں رکھ دیتے تھے اور جب تک یہ حصہ "صدقات و مبرّات" کے تھیلے میں نہ چلا جاتا، اس وقت تک اس آمدنی کو استعمال نہیں فرماتے تھے۔ اگر دس روپے بھی کہیں سے آتے ہیں تو فوراً اس کے چھوٹے نوٹ بدلوا کر ایک روپیہ اس تھیلے میں رکھنے کا اہتمام فرماتے تھے۔

فرمایا کرتے تھے کہ اس طریقِ کار کی برکت یہ ہوتی ہے کہ جب کوئی خیرات کا مصرف سامنے آتا ہے تو اس وقت سوچنا نہیں پڑتا کہ اس میں رقم کہاں سے دی جائے؟ بلکہ یہ صدقات و مبرات کا تھیلا ہر وقت یاد دہانی کراتا رہتا ہے کہ اس کا کوئی مصرف تلاش کیا جائے۔

دوسری طرف آپ ایسے لوگوں کی تلاش میں رہتے تھے جو کسی کے سامنے دستِ سوال دراز نہیں کرتے، لیکن ضرورت مند ہیں، اور اس قسم کے افراد کی ایک فہرست ہمیشہ نظر میں رکھتے تھے۔ آمدنی کا دسواں اور بیسواں حصہ تو ایک متعین مقدار تھی، اس کے علاوہ بھی جب موقع ملتا اس تھیلے میں مزید رقمیں شامل فرما دیتے، اس طرح ہم نے کبھی اس تھیلے کو خالی نہیں دیکھا، اس کے ذریعے کتنے انسانوں کی حاجت روائی ہوئی؟ اور کتنے مصارفِ خیر جاری ہوئے، یہ اللہ تعالیٰ ہی کو معلوم ہے، نہ جانے کتنوں کا ماہانہ وظیفہ مقرر تھا، کتنے افراد کو کوئی چھوٹا موٹا کاروبار کرا کر معاشی ترقی کے راستے پر لگا دیا، کتنے افراد کی رہائش کا انتظام فرما دیا اور کتنے افراد کی کسی دوسری طرح ضروریات پوری کرنے میں مدد دی۔

روپیہ خرچ کر دینا تو پھر بھی نسبۃً آسان ہوتا ہے، لیکن ایسے مصروف انسان کے لئے یہ بات بے حد مشکل ہوتی ہے کہ خود جا جا کر لوگوں کی براہِ راست خبر گیری کرے، اور اپنی نگرانی میں ان سے کام کرائے، حضرت والد صاحبؒ کا معمول یہی تھا کہ وہ اپنے متعلقین اور رشتہ داروں میں خود جا کر

ان کی ضرورتیں معلوم فرماتے اور ان کی ضروریات پوری کرنے میں روپے کے علاوہ وقت اور محنت بھی صرف فرماتے تھے، اور اس معاملے میں قریب اور دور کی رشتہ داری کے درمیان کوئی امتیاز نہ تھا ہندوستان کے دور دراز کے گاؤں میں کوئی دور پرے کا رشتہ دار آباد ہے تو اس کے حالات سے بھی باخبر رہتے۔ ایک ایسے ہی گاؤں میں ایک بیوہ خاتون تھیں، آپ کو پتہ چلا کہ ان کا مکان برسات میں ٹوٹ پھوٹ گیا ہے۔ اس زمانے میں ایک تو ہندوستان روپیہ بھیجنا کارے دارد تھا، دوسرے حسب عادت صرف روپیہ بھیجنے سے حضرت کی تسلی نہ ہوئی، کیونکہ خاتون کے لئے خود مکان کی مرمت کرانا دشوار تھا، لیکن آپ نے نہ جانے کس کس طرح دوسرے ملکوں کی معرفت روپیہ ایک دوسرے صاحب کو بھجوایا، اور ان کے ذریعے مکان کی مرمت کرائی۔

۱۷۔ حضرت والد صاحبؒ فرمایا کرتے تھے کہ زکوٰۃ کی ادائیگی کے لئے یہی کافی نہیں ہے کہ روپیہ اپنے پاس سے نکال دیا جائے، بلکہ اس کو صحیح مصرف تک پہنچانا بھی انسان کی اپنی ذمہ داری ہے اسی لئے حکم یہ نہیں ہے کہ "زکوٰۃ نکالو" بلکہ حکم یہ ہے کہ "زکوٰۃ ادا کرو"۔ لہٰذا لوگوں نے جو طریقہ اختیار کیا ہوا ہے کہ زکوٰۃ نکال کر جس کو چاہا پکڑا دی، اس سے ذمہ داری پوری نہیں ہوتی، بلکہ ہر انسان کا فرض ہے کہ وہ ایسے مستحقین کی ایک فہرست نگاہ میں رکھے جو کسی سے مانگتے نہیں لیکن ضرورت مند ہیں۔

۱۸۔ بازاروں میں جو بھکاری عام طور پر مانگتے پھرتے ہیں، ان کے ساتھ بھی والد صاحبؒ کا عجیب طرز عمل تھا۔ عام طور سے جو کوئی سائل آتا، آپ اسے کچھ نہ کچھ دے دیتے تھے۔ ایک مرتبہ احقر موٹر میں آپ کے ساتھ تھا، کسی جگہ گاڑی رکی، اور ایک سائل آدھمکا، آپ نے اپنی جیب میں سے کچھ نکال کر اسے دے دیا، احقر نے پوچھا کہ "اباجی! اس قسم کے سائل عام طور سے مستحق تو ہوتے نہیں، ان کو دینا چاہیے یا نہیں؟" اس کا جو عجیب و غریب جواب آپ نے دیا، وہ آج تک لوح دل پر نقش ہے، فرمایا! "ہاں میاں، بات تو ٹھیک ہے، لیکن یہ سوچو کہ اگر ہمیں بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہمارے استحقاق ہی کی بنیاد پر ملنے لگے تو ہمارا کیا بنے گا؟"

حضرتؒ کے اس جواب سے واقعۃً دنگ ہوکر رہ گئے، اور اندازہ ہوا کہ اللہ والوں کی نظریں کہاں پہنچتی ہیں، مگر ساتھ ہی یہ شبہ رہا کہ جس شخص کے لئے سوال کرنا حلال نہیں فقہاء کرامؒ

نے اسے دینے کو بھی منع کیا ہے؟ چنانچہ کچھ وقفے کے بعد احقر نے فقہاؒ کے اس قول کے حوالے سے دوبارہ مسئلہ پوچھا تو اس پر فرمایا:

"جس شخص کے بارے میں یقین سے معلوم ہو جائے کہ اس کے پاس اتنے پیسے موجود ہیں کہ اس کے لئے سوال کرنا حلال نہیں، یہ حکم اس کے لئے ہے کہ اسے نہ دیا جائے، اور یہ حکم بھی اس لئے نہیں کہ وہ مستحق نہیں ہے، بلکہ اس لئے ہے کہ اس کی عادت خراب ہوگی، لیکن بشر پر جو اجنبی سائل سامنے آجاتے ہیں، ان کے بارے میں یقین سے یہ بات کہاں معلوم ہوتی ہے؟ اور محض بدگمانی کی بنا پر کسی سائل کو رد کرنا ٹھیک نہیں، ہاں جس جگہ یقین سے معلوم ہو جائے کہ یہ دھوکہ کر رہا ہے اور اس کے لئے مانگنا جائز نہیں تو وہاں بے شک نہیں دینا چاہیے۔"

حضرت والد صاحبؒ کے اس جواب سے ایک بہت بڑی الجھن رفع ہوگئی، اور راہِ عمل واضح ہوگئی۔

۱۹۔ غرباء کی امداد کے علاوہ آپ کو صدقۂ جاریہ کا خاص ذوق تھا، جب کسی مسجد کی تعمیر کی خبر سنتے تو اس میں کچھ نہ کچھ حصہ لینے کی کوشش فرماتے۔ دارالعلوم میں دو کمرے اس مقصد کے لئے اپنے خرچ سے تعمیر کرائے، اور انہیں مسجد پر وقف کر دیا، اپنے والدین کے لئے متعدد صدقاتِ جاریہ میں رقمیں لگائیں، دارالعلوم کے کتب خانے میں بہت سی کتابیں وقف فرمائیں، یہاں تک کہ اپنا ذاتی کتب خانہ بھی وقف فرما گئے، جو کم از کم ایک لاکھ روپے کی مالیت کی کتابوں پر مشتمل ہوگا۔

معاملات کی صفائی

۲۰۔ حضرت والد صاحبؒ کو معاملات کی صفائی کا بے حد اہتمام تھا، آپ فرمایا کرتے تھے کہ بددیانتی سے کسی کے حق کو غصب کر لینا تو گناہِ عظیم ہے ہی، حسابات و معاملات کو مجمل، مبہم یا مشتبہ رکھنا بھی بہت خطرناک غلطی ہے جس کا نتیجہ بعض اوقات بددیانتی ہی کی شکل میں نکلتا ہے۔ بعض لوگوں کی نیت بددیانتی کی نہیں ہوتی، لیکن معاملات کے گڈمڈ ہونے کی وجہ سے بہت سے گناہوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ خاص طور پر باپ بیٹوں، بہن بھائیوں، استاذ و شاگرد، شیخ و مرید اور بے تکلف تعلقات میں اس قسم کی صورتیں بکثرت پیش آتی ہیں، مثلاً باپ بیٹوں نے مل جل کر ایک مکان بنوالیا،

اور حساب کچھ نہ رکھا کہ کس نے کتنی رقم خرچ کی ہے، اور یہ بات بھی واضح نہ کی کہ مکان کس کی ملکیت ہوگا اور اس طرح معاملات کو مبہم رکھ کر مکان میں رہتے بستے رہے، شروع میں تو بظاہر اس سے کوئی خرابی پیدا نہیں ہوتی، لیکن آگے چل کر جب مکان کی تقسیم یا وراثت کا سوال آتا ہے تو آپس میں شدید جھگڑے اٹھتے ہیں اور مقدمہ بازی تک نوبت پہنچتی ہے۔

حضرت والد صاحبؒ کا معمول ساری عمر یہ رہا کہ معاملہ بیٹے سے ہو یا بھائی سے، دوست سے ہو یا رشتہ دار سے، شاگرد سے ہو یا مرید سے، ہمیشہ واضح، غیر مشتبہ اور عموماً تحریری شکل میں فرماتے تھے، اور آخر تک کی بات پہلے ہی طے فرما لیتے تھے، حد یہ ہے کہ اگر اپنے بیٹوں سے کوئی لین دین ہوتا تو اس کی حیثیت بھی عام طور سے لکھ کر متعین فرما دیتے، ایک مرتبہ آپ نے کچھ کتابیں ہمارے مرحوم بھائی مولانا محمد زکی کیفی صاحب مرحوم کو فروخت کیں، انہوں نے رقم بھیجی جو شاید چند سو روپے تھی تو آپ نے باقاعدہ اس کی تحریری رسید الگ کاغذ پر بنا کر بھیجی کہ اتنے روپے فلاں فلاں کتابوں کے عوض میں مولوی محمد زکی سلمہ سے وصول پائے، غرض حدیث میں جو ارشاد ہے کہ:

تعاشروا كالإخوان وتعاملوا كالأجانب

"رہو بھائیوں کی طرح، مگر معاملات اجنبیوں کی طرح کرو"

اس ارشادِ گرامی پر جس اہتمام کے ساتھ حضرت والد صاحبؒ کو عمل کرتے دیکھا اس کی نظیر کہیں اور دیکھنے میں نہیں آئی۔

آپ اپنے روپے پیسے کے حسابات ہر وقت بالکل مکمل اور تازہ ترین صورتِ حال کے مطابق رکھتے تھے، آپ کی صندوقچی میں بہت سی امانتیں رہتی تھیں، اور ذاتی رقوم کے بھی مختلف مدات تھے، لیکن ہر مد بالکل واضح اور اس پر لکھی ہوئی ہدایات قطعی طور پر غیر مشتبہ ہوتی تھیں، آپ فرمایا کرتے تھے کہ بحمداللہ میرے تمام معاملات ہر وقت اتنے واضح رہتے ہیں کہ اگر ابھی دنیا سے اٹھ جاؤں تو کسی ایسے معاملے کا دل پر بوجھ نہیں ہوگا جو لکھا ہوا نہ ہو، اور کسی بھی شخص کو اس کے سمجھنے میں دشواری پیش نہیں آئے گی، چنانچہ یہی ہوا بھی کہ آپ کی وفات کے بعد صندوقچی میں نہ جانے کس قسم کی مدات، امانتیں اور حسابات برآمد ہوئے، لیکن ہر ایک اتنا واضح کہ ہم لوگوں کو انہیں حقداروں تک پہنچانے میں ادنیٰ دشواری نہیں ہوئی۔

آپ نے اپنا وصیت نامہ اس وقت سے لکھنا شروع کر دیا تھا جب آپ کی عمر کل تیس سال تھی، اور اس میں اپنی تمام املاک اور امانتوں کے بارے میں وضاحت کے ساتھ پوری تفصیل درج فرمادی تھی، اور پھر جوں جوں املاک اور امانتوں میں تغیر آتا رہتا، اس وصیت نامے کو بدلتے رہتے یہاں تک کہ وہ ایک ضخیم رجسٹر بن گیا، اور آخر عمر میں سالقہ تمام وصیت ناموں کو منسوخ فرما کر نیا وصیت نامہ تحریر فرمایا جس میں اپنی ایک ایک ملکیت کی پوری حقیقت واضح فرمادی، آپ نے جو ذاتی مکان تعمیر فرمایا تھا، اسے تو خود اپنی زندگی ہی میں اپنے ہونے والے ورثاء کے درمیان تقسیم کر کے ہر ایک کے نام ہبہ نامے الگ الگ رجسٹرڈ کرا دیئے تھے، اور ہر ایک کو اس کا حصہ حوالہ کر کے فارغ ہو گئے تھے، لیکن دوسری چیزوں کے بارے میں بھی ہر بات وصیت نامے میں واضح فرمادی تھی، اور اس میں یہاں تک تحریر فرمادیا تھا کہ گھر کے سامان میں کتنا حصہ ان کی ملکیت ہے جو ترکے میں شامل ہو کر تقسیم ہوگا، اور کتنا والدہ صاحبہ مدظلہا کی ملکیت ہے جو ان کے تصرف میں رہے گا۔

آخر عمر میں آپ صاحب فراش ہو گئے تھے تو دارالعلوم کے انتظامی امور بھی چارپائی پر ہی انجام دیتے تھے، لیکن اس بات کا اہتمام فرماتے تھے کہ دارالعلوم کی کوئی چیز گھر میں نہ رہنے پائے، فرنیچر اور برتنوں سے لے کر قلم دوات کاغذ اور بال پن تک کوئی مدرسے کی چیز گھر میں نہ آنے دیتے، اور اگر کبھی کوئی چیز آ جاتی تو فوراً اسے واپس بھیجنے کا انتظام فرماتے۔ وجہ یہ تھی کہ وصیت نامے میں آپ نے لکھوا دیا تھا کہ اس کمرے کا جملہ سامان جو ہے وہ میری ملکیت ہے، ادھر ہر وقت آپ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بلاوے کے منتظر رہتے تھے۔ اس لئے یہ خطرہ تھا کہ اگر انتقال کے وقت مدرسے کی کوئی چیز کمرے میں پڑی رہ گئی تو اسے ذاتی ملکیت سمجھ کر ترکے میں شامل نہ کر دیا جائے بلکہ اس بات کا اہتمام بھی فرماتے تھے کہ والدہ صاحبہ مدظلہا یا ہمارے گھروں میں سے کسی کی کوئی چیز وہاں نہ پڑی رہے جو چیز وقتی طور پر آتی اسے فوراً واپس بھیج دیتے، شاید اس کی وجہ بھی یہی ہو کہ وصیت نامے کے مطابق صرف آپ کے دو کمروں کا سامان آپ کی ملکیت میں تھا، باقی گھریلو سامان آپ والدہ صاحبہ کو ہبہ فرما چکے تھے۔

دوسروں کے جذبات کی رعایت

(۲۰) اللہ تعالیٰ نے آپ کو دوسروں کے

جذبات کی رعایت کا خصوصی ملکہ عطا فرمایا تھا ہر شخص سے اس کے مزاج و مذاق اور اس کی ضروریات کے مطابق معاملہ فرماتے تھے اور اپنی ہر نقل و حرکت میں اس بات کا خیال رکھتے کہ کسی دوسرے کو آپ کی ذات سے تکلیف نہ پہنچے۔ کسی کے یہاں جانا ہوتا تو پہلے سے معلوم فرماتے کہ کون سے وقت اس کے لئے ملاقات آسان ہوگی۔ اگر کھانے کا وقت قریب ہوتا اور وہاں کھانے کا ارادہ نہ ہوتا تو جاتے ہی مناسب انداز میں اس پر یہ واضح فرما دیتے کہ اس کے یہاں کھانے کا ارادہ نہیں ہے۔ ایسا نہ ہو کہ وہ کھانے کا انتظام کرلے اور بعد میں تکلیف ہو کسی کے یہاں کھانے کا ارادہ ہوتا تو اتنا پہلے اسے باخبر فرماتے کہ وہ بآسانی انتظام کرسکے کسی کو ٹیلیفون کرتے وقت اس بات کی رعایت فرماتے کہ اس کے لئے اس وقت فون پر آنا مشکل نہ ہو۔

کسی شخص پر اس کے مزاج کے خلاف اصرار کرنے یا دباؤ ڈالنے کا تو دستور ہی نہ تھا کسی کی سفارش کرنے سے پہلے بار بار سوچتے تھے کہ جس شخص سے سفارش کی جارہی ہے اس کی طبیعت پر بار تو نہیں ہوگا، اور سفارش کرتے وقت بھی اس پر دباؤ ڈالنے کے بجائے یہ فرماتے کہ اگر قواعد وضوابط میں گنجائش ہو اور آپ کی وسعت میں ہو تو فلاں کام کر دیجئے۔ فرمایا کرتے تھے کہ کسی ایک شخص کی حاجت برآری کے لئے دوسرے شخص کو ناجائز کام پر آمادہ کرنا یا اس کو اصول توڑنے پر مجبور کرنا یا اس کی طبیعت پر ناقابل برداشت بوجھ ڈالنا مجھے گوارا نہیں۔

جتنا کام آپ کے لئے اپنے ہاتھ سے کرنا ممکن ہوتا عموماً اس کے لئے دوسرے شخص کو تکلیف نہیں دیتے تھے، بارہا اپنے کمرے کی خود جھاڑو دے لیتے، کبھی کبھی کپڑے بھی خود دھو لیتے، درختوں کو اپنے ہاتھ سے پانی دے لیتے، مہمانوں کے لئے خود دسترخوان بچھا کر خود کھانا لے آتے، غرض اپنے کسی کام سے نہ صرف یہ کہ کوئی اعراض نہیں تھا، بلکہ اتباع سنت کی نیت سے اس قسم کے کاموں کا شوق تھا، اور جب تک صحت رہی معمول یہی رہا کہ اگر ہم لوگوں کو کسی اور کام میں مشغول دیکھا تو ہمیں بلانے کے بجائے خود اپنے ہاتھ سے یہ کام انجام دے لئے۔

یہ عادت اس قدر راسخ ہو چکی تھی کہ مرض وفات میں شدید بیماری کے دوران بھی جتنا کام خود کرنا بس میں ہوتا رہتا تھا، بارہا التجاؤں کے باوجود خود ہی کرتے تھے۔

آپ کی تمام ضروریات کی ایک جگہ مقرر تھی، اور کسی چیز کی ضرورت پڑتی تو جگہ مقرر ہونے کی بنا

پروہ اندھیرے میں بھی مل جاتی۔ جب کبھی کوئی چیز اس کی جگہ سے اٹھائی ضرورت پوری ہونے کے بعد فوراً وہیں رکھ دی، اس عادت میں کبھی تخلف نہیں ہوتا تھا، ہم لوگ اپنی بدنظمی سے حضرتؒ کو بڑی تکلیف پہنچاتے تھے کہ کوئی چیز اس کی جگہ سے اٹھائی، اور دوسری جگہ رکھ دی، اس پر کئی بار ہمیں تنبیہ فرمائی، اور ایک دن فرمایا کہ لوگوں نے ان آداب معاشرت کو دین سے خارج ہی سمجھ لیا ہے، اور ان باتوں کی پروا نہیں کرتے، حالانکہ مشترک استعمال کی چیزوں کی جو جگہ مقرر ہو اسے وہاں سے بے جگہ لے جانا صرف مروت اور اخلاق ہی کے خلاف نہیں، اس لحاظ سے بڑا گناہ بھی ہے کہ ضرورت کے وقت چیز اپنی جگہ پر نہیں ملتی تو اس سے دوسرے کو تکلیف پہنچتی ہے، اور کسی مسلمان کو ایذا پہنچانا بہت بڑا گناہ ہے۔"

ملازموں سے کام لینے میں بھی اس بات کا ہمیشہ لحاظ رکھتے کہ وہ ان کے لئے زیادہ مشقت کا موجب نہ ہو، ان کے آرام کے اوقات میں کام بتانے سے پرہیز فرماتے، کسی جگہ رات کو جانا ہوتا تو اس بنا پر جلدی واپس لوٹنے کی کوشش فرماتے کہ ڈرائیور کو رات کے وقت زیادہ جاگنا نہ پڑے، ایک ساتھ بہت سے کام بتلا کر ملازم کے ذہن پر بار نہ ڈالتے، بلکہ جب وہ ایک کام سے فارغ ہو جاتا تو دوسرا بتاتے، غرض آپ کی پوری زندگی اس شعر کی عملی تشریح تھی جو آپ اکثر پڑھا کرتے تھے کہ:-

تمام عمر اسی احتیاط میں گذری
کہ آشیاں کسی شاخ چمن پہ بار نہ ہو

اور اس فکر کی انتہا یہ ہے کہ وفات سے دس روز پہلے جو رمضان کا مہینہ ختم ہوا، اس میں وقتاً فوقتاً آپ کی طبیعت بگڑنے لگتی تھی، دل کی تکلیف بار بار ہونے لگی تھی، جب یہ رمضان مبارک ختم ہو گیا تو ایک دن حسرت کے ساتھ فرمانے لگے کہ:

"اس رمضان میں جب میری طبیعت بار بار خراب ہوتی تو بعض اوقات یہ خیال ہوتا تھا کہ شاید اللہ تعالیٰ مجھے اس مبارک مہینے کی موت کی سعادت عطا فرما دیں، لیکن میرا بھی عجیب حال ہے، اس خیال کے باوجود میں اس بات کی تمنا اور دعا نہ کر سکا کہ میرا انتقال رمضان میں ہو، کیونکہ مجھے خیال یہ تھا کہ اگر یہ واقعہ رمضان میں پیش آیا تو

"اوپر والوں کو" (یعنی تجہیز و تکفین کے منتظمین اور اس میں شرکت کرنے والوں کو)
بہت تکلیف ہوگی"

میں حضرتؒ کی زبان سے یہ جملے سن رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ ان کی پرواز فکر ہمارے تخیل و تصور کی ہر سرحد سے کتنی بلند ہے ــــ اللہ اکبر!

اسی مرضِ وفات کے دوران چونکہ طبیعت بے حد کمزور ہوگئی تھی، اس لئے ذرا مزاج کے خلاف کوئی بات ہوتی تو طبیعت میں تغیر آجاتا تھا، ادھر غنودگی لانے والی دواؤں کی بنا پر بعض اوقات سوچنے کا انداز اپنی طبعی حالت پر نہیں رہتا تھا، اس لئے اپنی عام عادت کے خلاف لہجے میں تلخی جلد آنے لگی تھی، ایک دن آپ نے احقر سے فرمایا:

"بعض اوقات میں تم لوگوں کو ایسی بات پر تنبیہ کرتا ہوں جو واقعۃً قابلِ تنبیہ ہوتی ہے لیکن بعض اوقات لہجے میں تلخی کی وجہ ضعف اور علالت بھی ہوتی ہے، تم لوگوں کو ان دونوں میں امتیاز کرنا چاہیے اور اس بات پر رنجیدہ نہ ہونا چاہیے کہ لہجے کی تلخی بڑھتی جارہی ہے۔"

کیا ٹھکانا ہے اعتدالِ فکر و مزاج اور دوسروں کی رعایت کا! ایسی حالت میں بھی جبکہ طبیعت کا غیر طبعی حالت پر ہونا ہر کس و ناکس پر عیاں ہے، خود اپنے اندازِ گفتگو کا تجزیہ جاری ہے اور دوسروں کی رنجیدگی کا خیال اس حالت میں بھی ساتھ نہیں چھوڑتا۔ اعتدال و توازن میں ڈھلی ہوئی اس زندگی کی مثال اب نگاہوں کو کہاں نصیب ہوگی؟ یہی تو وہ باتیں ہیں جنہیں یاد کر کے بے ساختہ یہ شعر زبان پر آتا ہے۔ ؎

ہمہ شہر پُر ز خوباں، منم و خیال ماہے
چہ کنم کہ چشم خوش بیں نہ کند بکس نگاہے

جھگڑوں سے اجتناب

۴۱۔ حضرت والد صاحبؒ کو جھگڑوں، تنازعات اور نزاع و جدال سے طبعاً نفرت تھی، اور جب تک کوئی واقعی دینی ضرورت داعی نہ ہو آپ اپنے حق کے لئے بھی کبھی جھگڑوں میں پڑنا پسند

نہیں فرماتے تھے، نہ جانے زندگی میں کتنے مواقع ایسے آئے کہ آپ نے تنازعات سے بچنے کے لئے اپنا جائز اور قیمتی سے قیمتی حق چھوڑ دیا۔ اس سلسلے میں آپ ایک حدیث اکثر سنایا کرتے تھے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

أنا زعيمٌ ببيت فی وسط الجنة لمن ترك المراء وهو محقٌّ (او کما قال)

"میں اس شخص کے لئے جنت کے بیچوں بیچ گھر دلوانے کی ضمانت لیتا ہوں جو حق پر ہونے کے باوجود جھگڑا چھوڑ دے۔"

اس حدیث پر عمل کی حیرت انگیز مثال یہ واقعہ ہے کہ حضرت علامہ شبیر احمد صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کے مزار کے قریب (جہاں آج کل اسلامیہ کالج ہے) آپ کو دارالعلوم کے لئے ایک وسیع قطعہ زمین مل چکا تھا، لیکن آپ نے جھگڑے سے بچنے کے لئے اسے چھوڑ دیا۔ اس واقعہ کی تفصیل احقر کے شیخ ومربی حضرت ڈاکٹر عبدالحی صاحب عارفی مدظلہم العالی کے مضمون میں آ چکی ہے۔

اس کے علاوہ آپ کے ذاتی معاملات میں نہ جانے کتنے لوگوں نے آپ کو دھوکے دیئے، کتنوں نے آپ پر مقدمات قائم کرنے چاہے، کتنوں نے بدنام کرنے کے لئے اخبار واشتہار کا سہارا لیا، لیکن آپ نے ان تمام باتوں کا وہ جواب نہیں دیا جو آج کی دنیا دیتی ہے، بلکہ اکثر اپنا حق چھوڑ کر الگ ہو گئے۔

علمی اختلاف ہو یا دوسرے مکاتب فکر سے بحث ومباحثہ، آپ اسے نزاع وجدال کی حد تک پہنچانے سے حتی الوسع روکتے تھے، اور کسی بزرگ (شاید امام زہریؒ) کا یہ مقولہ سنایا کرتے تھے "المراء یذھب بنور العلم" یعنی "جھگڑوں سے علم کا نور جاتا رہتا ہے۔"

دارالعلوم کا خصوصی مزاج

۲۲- آپ نے دارالعلوم کراچی قائم فرمایا تو اسے شروع ہی سے ایک خاص مزاج میں ڈھالنے کے لئے غیر معمولی ذہنی اور علمی محنت اٹھائی۔ آپ کی تمام کوششوں کا محور یہ تھا کہ یہ ادارہ ان اکابر دیوبند کے اصلی مزاج ومذاق کی تصویر ہو جنہوں نے آخری دور میں صدق واخلاص، تواضع وللہیت اور توسط واعتدال کی انمٹ مثالیں قائم فرمائی ہیں۔ آپ یہ چاہتے تھے کہ یہ ادارہ نمود ونمائش کے

رسمی مظاہروں اور شور و شر سے الگ رہ کر خاموشی سے دین کے مخلص خادم پیدا کرنے میں لگا رہے، یہاں ایسے اللہ والے جمع ہوں جو اخلاص اور سلامت فکر کے ساتھ دین کی صحیح خدمت کا جذبہ رکھتے ہوں۔

چونکہ آپ کو مدارس کی زندگی کا طویل تجربہ تھا، اس لئے آپ نے یہاں کے نظم و نسق میں بہت سے ایسے اصول مقرر فرمائے جو دوسرے مدارس کے مقابلے میں بعض اوقات اجنبی سے معلوم ہوتے ہیں، لیکن ان کی افادیت روز بروز واضح ہوتی جاتی ہے۔ مثلاً یہ کہ آپ نے یہاں "صدر مدرس" یا "شیخ الحدیث" کا کوئی منصب نہیں رکھا، بلکہ تمام اساتذہ مل جل کر کام کرتے ہیں، اسی طرح آپ نے یہاں شروع سے یہ پروا ڈالا ہے کہ کوئی شخص انفرادی طور پر کوئی شکایت یا مطالبہ پیش کرے تو اس پر فوراً ہمدردی سے غور کر کے شکایت کا ازالہ کرنے کی کوشش کی جائے، لیکن اجتماعی طور پر کوئی مطالبہ کرنے یا جتھے بنا کر شکایات پیش کرنے کی ہمیشہ ہمت شکنی فرمائی۔ نیز آپ نے محض طلباء کی تعداد بڑھانے کے لئے کوئی اقدام کبھی نہیں کیا، بلکہ جو اقدام کیا دیانت داری سے یہ دیکھ کر کیا کہ وہ مدرسہ کے مقاصد سے کس حد تک ہم آہنگ ہے اس لئے جن مشہور مدرسین کی شہرت طلباء کے لئے باعث کشش ہو سکتی ہے، ان کو جمع کرنے کے لئے کبھی اصولِ صحیحہ کو قربان نہیں کیا، آپ فرمایا کرتے تھے کہ جو استاذ کسی مدرسے میں پڑھا رہا ہے، اسے وہاں پڑھانے کے دوران اپنے مدرسے میں آنے کی دعوت دینا اصول کے خلاف ہے، اول تو اس میں "سوم علی سوم اخیہ" کا گناہ ہے، دوسرے ایک مدرسے کو اجاڑ کر دوسرا مدرسہ آباد کرنا دین کی کوئی خدمت نہیں۔ ہاں اگر یہ معلوم ہو جاتا کہ کوئی صاحب اس مدرسے سے الگ ہو گئے ہیں یا الگ ہونے کا ارادہ ہے تو ان سے زیادہ سے زیادہ جو بات فرماتے وہ یہ تھی کہ "اگر آپ اس مدرسے کو خود چھوڑنے کا فیصلہ کر چکے ہوں تو دارالعلوم حاضر ہے۔"

دارالعلوم کے چندے کے لئے آپ عمر بھر کبھی کسی کے پاس تشریف نہیں لے گئے، کم آمدنی والے حضرات کے چندے کی آپ زیادہ قدر فرماتے، اور اسے باعثِ برکت قرار دیتے، جو تاجر حضرات اخلاص کے ساتھ خدمتِ دین کی نیت سے دارالعلوم کی اعانت میں حصہ لیتے ان کی ہمت افزائی فرماتے، لیکن جن صاحب کے چندے میں احسان جتلانے کا کوئی شائبہ نظر آتا ان کا چندہ قبول کرنے سے خوش اخلاقی کے ساتھ معذرت فرما لیتے، اور اگر کسی صاحب کے بارے میں کبھی یہ معلوم

ہو جاتا کہ انہوں نے اپنے چندے کے زعم میں دارالعلوم کے کسی فرد کے ساتھ کوئی اہانت آمیز رویہ اختیار کیا ہے تو یہ بات آپ کے لئے قطعاً قابل برداشت نہ ہوتی، اور موقع ملنے پر ان صاحب کا ٹھیک ٹھیک علاج فرما دیتے، اور اس معاملے میں کبھی کسی بڑے سے بڑے ذی وجاہت شخص کو بھی خاطر میں نہ لاتے تھے۔

اللہ تعالیٰ نے آپ کو استغناء کی دولت سے نوازا تھا، لیکن یہ استغناء کبھی بداخلاقی کی حدود میں داخل نہیں ہوا، چنانچہ آپ ہر شخص کا مناسب اکرام بھی فرماتے، اور جن صاحب کا چندہ آپ کو مدرسے کے لئے مناسب معلوم نہ ہوتا اسے ایسی طرح رد فرماتے کہ جس سے ان کی بلاوجہ دلشکنی بھی نہ ہو۔ جن بے تکلف اور مخلص احباب کے بارے میں اندازہ ہوتا کہ وہ دارالعلوم کی کسی خدمت کو اپنی سعادت سمجھتے ہیں، انہیں مدرسے کی کسی ضرورت کی طرف اس طرح متوجہ بھی فرما دیتے کہ اگر ان کی وسعت میں ہو تو اس کام میں حصہ لے سکیں، لیکن طبیعت پر کوئی بار بھی نہ ہو، اور جن حضرات کے چندے میں خدشہ نظر آتا ان کے پوچھنے پر بھی مدرسے کی کسی ضرورت کا اظہار نہ فرماتے۔

مجھے یاد ہے کہ ایک مرتبہ جبکہ دارالعلوم کا تعمیری کام جاری تھا اور اس کے لئے رقم کی ضرورت تھی، ملک کے ایک مشہور سرمایہ دار والد صاحبؒ کے پاس تشریف لاتے، اور پہلے کچھ رقم بطور ہدیہ دینے کی پیش کش کی جس سے آپ نے خوبصورتی کے ساتھ معذرت فرمائی، اس کے بعد انہوں نے دارالعلوم کی تعمیرات میں مؤثر حصہ لینے کی خواہش ظاہر کی، اور وہ اس مالی حیثیت کے آدمی تھے کہ دارالعلوم کے اس وقت کے تمام تعمیری منصوبے پورے کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے، لیکن حضرت والد صاحبؒ کو اپنی فراست سے اندازہ ہو گیا کہ ان کی یہ اچانک آمد اور پیش کش بلاوجہ نہیں ہیں، چنانچہ آپ نے اس پیش کش سے بھی یہ کہہ کر معذرت فرمائی کہ بحمد اللہ فی الحال تو مدرسے کا کام چل رہا ہے، آپ تکلیف نہ فرمائیں، چنانچہ وہ صاحب ناکام تشریف لے گئے، اور بعد میں معلوم ہوا کہ حضرت والد صاحبؒ کا یہ فیصلہ کتنا صحیح تھا۔

آپ افریقہ تشریف لے گئے، وہاں لوگوں نے مختلف ہدیئے تحفے بھی لانے شروع کئے اور دارالعلوم کے چندے کی بھی پیش کش کی، لیکن آپ نے یہ عام اعلان فرما دیا کہ میں یہاں دین کی کچھ باتیں سنانے کے لئے آیا ہوں، سب حضرات اس سننے کی طرف متوجہ ہوں، کوئی صاحب نہ مجھے ذاتی

طور پر کوئی ہدیہ پیش کریں اور نہ دارالعلوم کے لئے یہاں چندہ دیں، جو صاحب دارالعلوم کی اعانت کرنا چاہتے ہوں، وہ براہِ راست اپنی رقم دارالعلوم کراچی کے پتے پر ارسال فرمادیں، چنانچہ تقریباً دو ماہ کے اس سفر میں آپ نے ان باتوں پر سختی کے ساتھ عمل فرمایا، اور چند انتہائی بے تکلف حضرات کے سوا، جن سے آپ کے دیرینہ مراسم تھے، نہ کسی سے کوئی ہدیہ قبول کیا، اور نہ دارالعلوم کے لئے چندہ وصول فرمایا۔

اس اخلاص اور للّٰہیت کا ثمرہ یہ تھا کہ دو ماہ کے اس دورے نے نہ جانے کتنے انسانوں کی زندگی میں انقلاب برپا کر دیا، بے نمازی لوگ نمازی بن گئے، بعض عادی قسم کے لوگوں نے تمام الخبائث سے توبہ کر لی، نوجوانوں نے دین سیکھنا شروع کر دیا، اور وہاں کے حضرات اب تک اس دورے کی حسین یادیں محسوس نہیں پاتے۔ غرض حضرت والد صاحبؒ فرمایا کرتے تھے کہ حضرت نانوتوی قدس سرہٗ کی وصیت کے مطابق جب تک دینی مدارس توکل، استغناء اور للّٰہیت پر کاربند رہیں گے ان کا کام ان شاء اللہ بابرکت ہوگا، اور اہلِ علم سے دنیا کو فائدہ پہنچے گا، لیکن جب اہلِ علم بھی توکل اور استغناء سے محروم ہو جائیں، اور اہلِ ثروت کی ثروت پر ان کی نگاہ جانے لگے تو ان کی تعلیم و تبلیغ بھی انوار و برکات سے خالی ہو جاتی ہے گی۔

مذکورہ بالا اصولوں کے بارے میں حضرت والد صاحبؒ نے تمام منتظمین کو یہ وصیت فرمائی تھی کہ: "ہم نے دارالعلوم کی شکل میں کوئی دکان نہیں کھولی، بلکہ خدمتِ دین کا ایک ادارہ قائم کیا ہے، جب تک آپ حضرات اس ادارے کو صحیح اصولوں پر اور اللہ تعالیٰ کی رضا کے مطابق چلا سکیں، چلائیں، اور اگر خدانخواستہ کوئی ایسا وقت آجائے کہ اسے صحیح اصولوں پر چلانا ممکن نہ رہے تو میرے نزدیک اسے بند کر دینا بہتر ہے، بہ نسبت اس کے کہ اسے غلط اصولوں پر چلایا جائے۔"

تواضع و فنائیت

۲۴۔ حضرت والد صاحب قدس سرہٗ کو اللہ تعالیٰ نے تواضع اور فنائیت کا جو مقام عطا فرمایا تھا، وہ آپ کے اوصافِ کمال میں سب سے زیادہ نمایاں وصف تھا، جس شخص نے آپ کو

ایک نظر بھی دیکھیا، وہ آپ کے اس وصف کا معترف ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ "البلاغ" کی اس خصوصی اشاعت میں بھی جن حضرات نے آپکے بارے میں اپنے تاثرات بیان فرمائے ہیں، ان میں سے اکثر حضرات نے اس صفت کا تذکرہ ضرور کیا ہے، اس لیے یہاں اس وصف کے کسی تفصیلی بیان کی ضرورت نہیں، البتہ جو بات یہاں قابلِ ذکر ہے وہ یہ کہ جیسا کہ حکیم الامت حضرت تھانوی قدس سرہٗ نے فرمایا ہے، تواضع اور چیز ہے، اور تواضع کا مظاہرہ بالکل دوسری چیز۔ تواضع کا مظاہرہ تو ہر شخص اپنی جبلت کے مطابق کچھ نہ کچھ کر ہی لیتا ہے، لیکن محض اپنے آپ کو خاکسار، نیاز مند، ناچیز، ناکارہ وغیرہ کہہ دینے سے تواضع کی حقیقت حاصل نہیں ہوتی، بلکہ بقول حضرت حکیم الامتؒ،

"تواضع کی حقیقت یہ ہے کہ حقیقت میں اپنے آپ کو لاشئے سمجھے، اور یہی سمجھ کر تواضع کرے، اپنے کو رفعت کا اہل نہ سمجھے اور سچ مچ اپنے کو مٹانے کا قصد کرے"

(بصائرِ حکیم الامتؒ ص۲۵۵)

اللہ تعالیٰ نے حضرت والد صاحبؒ کو تواضع کا جو کمال عطا فرمایا تھا، وہ یہی تھا کہ علم و فضل کے دریا سینے میں جذب کر لینے کے باوجود انہیں اس بات کا ہر وقت یقین اور استحضار رہتا کہ میں کسی رفعت و تعظیم کا ہرگز اہل نہیں۔

صرف ایک واقعہ مثالاً پیش کرتا ہوں۔ ساری عمر آپ کا معاملہ یہ رہا کہ ملاقاتیوں کے لئے کوئی خاص وقت مقرر نہیں فرمایا، بلکہ جب کوئی آگیا، خواہ کتنے ضروری کام میں مشغول ہوں، اس سے ملاقات فرمائی، اس طرزِ عمل کے نتیجے میں آپ کو سخت دشواری اٹھانی پڑتی تھی، بعض اوقات تصنیف و تالیف کے وقت لوگ پہنچ جاتے اور کام میں رکاوٹ پڑ جاتی، اور بعض مرتبہ کسی دوسرے اہم کام میں مشغول ہوتے اور کوئی شخص اپنی معمولی سی ضرورت لے کر آجاتا تو اس کی ضرورت پوری فرمانے کی وجہ سے وہ اہم کام رک جاتا، ہم لوگوں نے بارہا عرض کیا کہ ملاقات کے لئے ایک وقت مخصوص فرما دیں، تاکہ جس کسی کو ملنا ہو وہ اسی وقت میں آکر مل لیا کرے، اور بے وقت پریشانی نہ ہو، لیکن آپ ہمیشہ اس بات کو ٹال جاتے تھے، جب ہمارا اصرار بہت بڑھا تو ملاقات کا وقت تو مقرر فرما دیا، لیکن اگر کوئی شخص دوسرے وقت آجاتا تو ملاقات سے انکار پھر بھی نہ فرماتے، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وقت کا وہ تعین نتیجہ خیز نہ ہوسکا، جب لوگوں کے بے وقت آنے کا سلسلہ بڑھتا ہی چلا گیا تو ہم نے پھر کہنا شروع کیا کہ جب تک آپ کچھ لوگوں کو بے وقت

ملاقات سے انکار نہ فرمائیں گے، اس وقت تک تعیینِ وقت کا خاطر خواہ نتیجہ ظاہر نہیں ہوگا، ہماری اس بات کے جواب میں آپ ہمیشہ طرح دے جاتے، اور اپنے اس طرزِ عمل کی کوئی خاص وجہ بھی بیان نہ فرماتے۔

آخر ایک روز میں نے اپنی حماقت سے یہ عرض کر دیا کہ "اباجی! حضرت تھانوی قدس سرہٗ کے یہاں تو ہر چیز کا نظام الاوقات مقرر تھا اور کسی کو اس کی مخالفت کی اجازت نہ تھی"

احقر کی اس بات پر حضرت والد صاحبؒ اس روز پہلی بار کھلے، اور فرمایا:

"ارے بھائی! میں حضرتؒ کے مقام و منصب کی ہوس کروں تو مجھ سے زیادہ احمق کون ہوگا؟ حضرتؒ کو اللہ تعالیٰ نے جو مقام عطا فرمایا تھا اس کی بنا پر انہیں حق پہنچتا تھا کہ وہ لوگوں کو اپنے نظام الاوقات کا تابع بنائیں، انہیں جن عظیم دینی کاموں کے لئے اللہ نے پیدا فرمایا تھا، وہ اس کے بغیر کیسے انجام پا سکتے تھے، اس کے علاوہ لوگوں کو ان سے انمول فائدہ پہنچتا تھا، اس لئے اگر اس فائدے کے حصول کے لئے انہیں کچھ مشقت اٹھانی پڑے تو کچھ حرج نہ تھا، لیکن میں کیا ہوں؟ اور میرا مقام کیا ہے؟ میں خلقِ خدا کو کس بنیاد پر آنے سے روکوں؟ میں نے وقت تو تمہارے کہنے سے مقرر کر دیا ہے، تاکہ لوگوں کو سہولت ہو جائے، لیکن جو شخص محنت اٹھا کر پہنچ ہی گیا، اسے واپس کرنے کا نہ مجھے حق ہے، نہ میرے بس کی بات ہے"

اس روز پہلی بار اس طرزِ عمل کی اصل وجہ معلوم ہوئی، اور اندازہ ہوا کہ وہ اپنے آپ کو کیا سمجھتے ہیں؟ میری عقل حیران تھی کہ جس شخص نے خدمتِ دین کا اتنا ہمہ گیر کام انجام دیا ہو، اور جس کا صبح و شام لوگوں کو فائدہ پہنچانے کے سوا کوئی دوسرا مشغلہ نہ ہو، اسے یہ معلوم ہے کہ وہ کیا ہے؟ اور نہ اس بات کا اندازہ ہے کہ اس کی ذات سے خلقِ خدا کو کیا فائدہ پہنچ رہا ہے؟ آپ کے ان جملوں کو محض زبانی بات بھی نہیں کہا جا سکتا، کیونکہ اول تو وہاں غلط بیانی کا شائبہ بھی امکان سے باہر تھا، دوسرے یہ بات تنہائی میں اپنے بیٹے سے کہی جا رہی ہے جہاں تواضع کے رسمی اظہار کا کوئی سوال نہیں ——— لہٰذا سوائے اس کے کیا کہا جا سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اللّٰھمّ اجعلنی فی عینی صغیرا و فی اعین الناس کبیرا اور من تواضع للّٰہ رفعہ اللّٰہ کا شان مظہر بنا دیا تھا

صبر و شکر

۲۳- اللہ تعالیٰ نے حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو "صبر و شکر" کا بھی عجیب و غریب مقام عطا فرمایا تھا، آپ کی زبان اکثر اوقات اللہ تعالیٰ کے شکر سے تر و تازہ رہتی، معمولی معمولی باتوں پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنا جزو زندگی بن چکا تھا، کوئی ایسی ملی جلی خبر ملتی جس میں غم اور خوشی دونوں کے پہلو ہوتے تو خوشی کے پہلو پر زور دیتے، اور پہلے اس پر شکر ادا فرما لیتے، اور غم کے پہلو کا یا تو ذکر ہی نہ فرماتے یا شکر کے بعد غیر اہم انداز میں اس کا تذکرہ کرتے۔

اللہ تعالیٰ کے خاص بندوں پر آزمائشیں ان کے مقام کے لحاظ سے آتی ہیں، چنانچہ زندگی میں آپ کو بڑے بڑے کٹھن حادثات سے بھی دوچار ہونا پڑا، بیماریاں بھی ایسی تکلیف دہ آئیں کہ ان کے تصور ہی سے رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں، عین عالم شباب ہی سے آپ کو طرح طرح کے عوارض لگ گئے تھے، اور عمر کے آخری آٹھ دس سال تو پیہم مختلف قسم کی بیماریوں کا بار بار حملہ ہوتا رہا، لیکن سخت سے سخت حادثے اور بڑی سے بڑی بیماری پر بھی آپ کو بے صبری کا مظاہرہ کرتے کبھی نہیں دیکھا گیا، اس کے برعکس عادت یہ تھی کہ ہر حادثے اور ہر تکلیف میں قابل شکر پہلوؤں پر غور فرما کر ان پر شکر ادا کرتے تھے۔

محرم ۱۳۹۵ھ میں احقر کے سب سے بڑے بھائی مولانا محمد زکی کیفی مرحوم نے اچانک داغِ مفارقت دیا، والد صاحبؒ کو ان سے بے پناہ تعلق تھا، اور نرینہ اولاد میں وہ چونکہ سب سے بڑے تھے، اس لئے زندگی کے ہر مرحلے میں آپ کو ان سے راحت بھی سب سے زیادہ پہنچی، ان کی وفات ایک ایسی رات میں ہوئی جب آپ خود مختلف قسم کی بیماریوں کی بنا پر صاحب فراش تھے، اور ٹانگوں میں ہر تیز کی اتنی اذیت ناک سوزش تھی کہ عمر بھر ایسی اذیت آپ کو کبھی یاد نہیں تھی، اس حالت میں آپ کو ایسے جوان بیٹے کی وفات کا صدمہ پہنچا[1]، ہمارے لئے یہ بات ناقابلِ تصور تھی کہ اس عالم میں آپ ایسے جانکاہ صدمے کو کیسے برداشت کریں گے؟ لیکن اس پیکرِ تسلیم و رضا نے اس روح فرسا حادثے پر جو تبصرہ فرمایا

---

[1] بھائی جان مرحوم سے آپ کے تعلق کا کچھ اندازہ ان مکاتیب سے ہو سکتا ہے جو آپ نے ان کے نام تحریر فرمائے ہیں، اور جن کا کچھ حصہ اسی اشاعت کے حصہ مکاتیب میں شائع ہو رہا ہے۔

وہ بھائی جان مرحوم کے بچوں کے نام ایک خط سے واضح ہوگا۔ اس خط کا یہ اقتباس ملاحظہ فرمائیے اس سے اندازہ ہوگا کہ اللہ والے کس انداز پر سوچتے ہیں، اور ان کی پرواز فکر کے آگے دنیا کے بڑے سے بڑے حوادث کیا حیثیت رکھتے ہیں۔

"میرے عزیز بچو! یہ واقعہ جیسا کرب انگیز، حسرت ناک و جانکاہ ہے اس کا اثر مرحوم ہو جانے والے نوجوانِ صالح کے ماں باپ، بچوں اور بیوی اور بھائی بہنوں پر جو کچھ ہونا تھا وہ ایک طبعی اور فطری امر ہے، اور جب تک حدود سے متجاوز نہ ہو شرعاً مذموم بھی نہیں، لیکن یہ سب کرب انگیزی اور غم و صدمہ کا یک طرفہ پہلو صرف اس بنیاد پر ہے کہ ہم واقعات کو الٹا پڑھتے ہیں، اور یہاں سے شروع کرتے ہیں کہ ایک پچاس سالہ نوجوان جس کے ساتھ ایک عزیز کی ہزاروں امیدیں وابستہ تھیں دیکا یک ہم سے رخصت ہو گیا۔ اس کا اثر ظاہر ہے کہ بے چینی اور شدید ترین صدمہ ہی ہو سکتا ہے۔

آؤ، اب واقعات کو ذرا سیدھا پڑھو کہ صبر آ جائے، بلکہ شکر کا موقع ملے۔ ذرا سمجھو کہ ہر مومن کا عقیدہ ہے کہ ہر پیدا ہونے والے انسان کی عمر کی گھڑیاں اور سانس اس کے پیدا ہونے سے پہلے ہی اللہ کے دفتر میں لکھے ہوتے ہیں، جانے والا لختِ جگر پچاس سال سترہ دن کی زندگی لے کر اس دنیا میں آیا تھا، زمین و آسمان اپنی جگہ سے ٹل سکتے تھے، قضا و قدر کے اس فیصلے میں ایک منٹ، ایک سیکنڈ کا فرق نہیں آ سکتا تھا ..... لیکن ذرا یہ سوچو کہ اس حادثۂ جانکاہ کو ہم سب پر آسان کرنے کے لئے حق تعالیٰ جل شانہ نے کیسے کیسے انعامات فرمائے۔ سب سے پہلی بات تو یہ کہ الحمد للہ اپنی تمام ہی اولاد کو وہ اس حالت میں چھوڑ گئے جبکہ وہ کسی کے محتاج نہ تھے..... ذرا سوچو کہ اگر معاملہ اس کے خلاف ہوتا تو یہی ایک مصیبت دس گنی بن جاتی۔

دوسری بات یہ دیکھو کہ مرحوم کو جس قدر گہرا تعلق اپنی بیوی اور اولاد سے تھا، ماں باپ اور بہن بھائیوں سے بھی اس سے کچھ کم نہ تھا..... اس سال جب حق تعالیٰ جل شانہ کو اس دنیا سے ان کی جدائی ہمیشہ کے لئے منظور ہوئی تو غیر شعوری طور پر چار مرتبہ ایسے حالات پیدا فرما دیئے کہ ان کو بار بار کراچی آنا پڑا اور ایک مرتبہ سب بچوں کے ساتھ آئے

واقعہ بھی مل گیا۔ یہ کس کو معلوم تھا کہ یہ بار بار کی ملاقات اللہ تعالیٰ کے انعامات اور آئندہ پیش آنے والے صدمے پر تسلی کے سامان تھے۔

تیسری بات یہ دیکھو کہ سب سے جدا ہونہار بیٹا مولوی محمود سلمہٗ تین ماہ پہلے ان سے جدا ہو چکا تھا جس سے ملنے کی اس حادثہ جانکاہ سے پہلے بظاہر کوئی امید نہ تھی، قدرت نے غیبی سامان فرما دیا، امسال ان کے لئے حج کا سامان ہو گیا، اور اس طرح حج و زیارت کے فرائض اور حرمین شریفین کے برکات سے بھی بہرہ ور ہوئے، اور سعادتمند بیٹے کو بھی اٹھارہ دن ان کی مکمل خدمت کا موقع مل گیا۔

پھر یہ بھی سوچو کہ عادۃً حج و زیارت میں مہینہ ڈیڑھ مہینہ تو لگ ہی جاتا ہے! اللہ تعالیٰ نے اس خوش نصیب بندے کو صرف اٹھارہ دنوں میں حج و زیارت کے تمام مراحل سے گزار کر ایسے وقت کراچی پہنچا دیا جبکہ ان کی وفات میں صرف ستّو دن باقی تھے۔ اگر مواصلاتی نظام میں ذرا بھی تاخیر ہوتی تو مرحوم اپنے بیوی بچوں، ماں باپ، بہن بھائیوں سے جدا رہتے ہوئے بحالتِ غربت اس دنیا سے سفر کرتے۔ ذرا یہ سوچو کہ اس وقت ماں باپ اور اولاد اور بیوی پر کیا گذرتی۔

اور ان تمام انعامات سے بڑھ کر سب سے بڑا انعام یہ کہ آخری عمر میں ان کو حج و زیارت سے مشرف فرما کر گناہوں سے پاک فرما دیا، اور پاک و صاف اپنی بارگاہ میں بلا لیا۔

اب غور کرو اگر جانے والے مرحوم کو سال بھر پہلے یہ قطعی اطلاع ہو جاتی کہ عاشورہ محرم ۱۳۹۵ھ ان کی عمر کا آخری دن ہے، اور وہ خود اپنے مرنے کا سامان کرتے تو اس سے بہتر اور مرنے کا کیا سامان ہوتا؟

اس مکتوب میں حضرت والد صاحبؒ کا یہ مزاج پوری طرح جلوہ فگن ہے کہ وہ سخت سے سخت حادثے میں بھی اس کے قابلِ شکر پہلوؤں کا استحضار فرماتے، ان پر اللہ تعالیٰ کے شکر گزار ہوتے، اور مصائب و آلام کے شکوے کے بجائے راضی برضا رہنے کو آسان بنا دیتے تھے۔

ایک اور واقعہ یاد آیا، احقر کی بڑی ہمشیرہ کے دانت خراب ہو گئے تھے، اور یکے بعد دیگرے

انہیں کئی دانت نکلوانے پڑے جس میں انہوں نے کافی تکلیف اٹھائی۔ ایک مرتبہ وہ دانت نکلوا کر حضرت والد صاحبؒ کی خدمت میں حاضر ہوئیں، آپ نے ان کا حال پوچھا تو اپنا حال بتاتے ہوئے ان کے منہ سے یہ بات بھی نکل گئی کہ "اباجی! یہ دانتوں کا معاملہ بھی عجیب ہے، یہ جب بچپن میں نکلتے ہیں تو اس وقت بھی تکلیف دیتے ہیں، اور جب ٹوٹنے پر آتے ہیں تو اس وقت بھی تکلیف دیتے ہیں"

حضرت والد صاحبؒ نے یہ بات سنی تو قدرے ناگواری کے ساتھ فرمایا: بیٹی! تمہیں ان دانتوں کی بس یہ دو باتیں یاد رہیں کہ انہوں نے آتے وقت بھی تکلیف دی تھی اور جاتے وقت بھی تکلیف دے رہے ہیں، اور ان دونوں واقعات کے درمیان ساٹھ سال تک تم نے اس خدائی مشین کو استعمال کر کے جو لذت و راحت حاصل کی، اس کی طرف کوئی دھیان نہیں"؟

اس طرح حضرت والد صاحبؒ باتوں باتوں میں اپنے متعلقین کو بھی اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کے استحضار اور ان پر ادائے شکر کی تلقین فرماتے رہتے تھے، چنانچہ ہمشیرہ محترمہ نے اس پر فوراً استغفار کیا، اور فرماتی ہیں کہ بحمد اللہ اس کے بعد ایسا سبق مل گیا کہ اب ایسے کلمات زبان پر نہیں آتے جن سے ناشکری مترشح ہوتی ہو۔

کشف و کرامات

۴۴۔ کشف و کرامات کے بارے میں حضرت والد صاحب قدس سرہٗ کا مذاق وہی تھا جس پر حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہٗ نے جا بجا زور دیا ہے کہ یہ دین میں مقصود نہیں، اور ان کے حصول کے پیچھے پڑنے کے بجائے انسان کو اتباع سنت کی کوشش میں لگنا چاہئے لیکن بہر حال اس سے کسی اہل حق کو انکار نہیں ہے کہ یہ کمالات اگر اتباع سنت کے ساتھ اور ان کی حقیقت سمجھتے ہوئے کسی کو حاصل ہوں تو اللہ تعالیٰ کی نعمت اور عطا ہیں ——— حضرت والد صاحب کو بھی اللہ تعالیٰ نے بعض خاص مواقع پر اس حیثیت سے نوازا، تھانہ بھون میں رہتے ہوئے آپ کو متعدد مکاشفات ہوئے جن کا تذکرہ حضرت حکیم الامتؒ کے نام آپ کے خطوط میں موجود ہے، اور اس کے بعد بھی کئی مواقع پر آپ کو اس نعمت سے سرفراز فرمایا گیا، لیکن آپ عموماً اس کا تذکرہ نہیں فرمایا کرتے تھے، اس سلسلے کی جو باتیں ہم میں سے بعض لوگوں کو معلوم ہو گئیں وہ بھی آپ

نہ کسی ضرورت سے بیان فرمادی تھیں، ورنہ آپ ان کے ذکر سے احتراز ہی فرماتے تھے۔

اگرچہ اس موضوع کا خاصا مواد موجود ہے، بلکہ ایک رفیق کار نے اسی موضوع پر ایک مستقل مضمون لکھ کر دیا تھا، لیکن حضرت والد صاحبؒ کے مذاق و طرز عمل کے احترام میں اس موضوع کو احقر طول دینا نہیں چاہتا، البتہ صرف ایک واقعہ صرف اس لئے ذکر کرنا چاہتا ہوں کہ اس میں پوری امت کیلئے ایک عملی پیغام ہے جس کی زیادہ سے زیادہ اشاعت ہونی چاہیے۔

حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا جب مدینہ طیبہ جانا ہوتا، اور روضۂ اقدس پر سلام عرض کرنے کے لئے حاضری ہوتی تو عام معمول یہ تھا کہ مواجہہ شریف کی جالیوں سے کافی فاصلے پر ایک ستون کے قریب سراپا ادب بن کر سر جھکائے کھڑے رہتے، اور اس سے آگے نہیں بڑھتے تھے، فرماتے ہیں کہ ایک روز میں اسی ستون کے قریب کھڑا تھا، دل میں شوق پیدا ہوا کہ آگے بڑھ کر مقدس جالیوں کے قریب تک پہنچ جاؤں، لیکن ہمت نہ ہوئی، اس پر حسرت سی ہونے لگی کہ لوگ آگے تک چلے جاتے ہیں، اور میں دور کھڑا ہوں، اسی دوران یہ محسوس ہوا کہ روضۂ اقدس سے یہ آواز آ رہی ہے "کہ وہ کہ جو شخص ہماری سنتوں کا اتباع کرتا ہے، وہ ہم سے قریب ہے، خواہ بظاہر کتنا دور ہو، اور جو شخص ہماری سنت کا متبع نہیں، وہ ہم سے دور ہے، خواہ وہ ہماری جالیوں سے چمٹ کر کھڑا ہو۔"[1]

حضرت والد صاحبؒ نے اپنا یہ واقعہ اپنا کہہ کر تو گنے چنے چند حضرات ہی کو سنایا، اور خوش قسمتی سے احقر نے بھی آپ سے براہ راست سنا، لیکن یہ بات بہت سی تقریروں میں بھی یہ کہہ کر سنائی کہ ایک زائر کے ساتھ یہ واقعہ پیش آیا، اور اسے روضۂ اقدس سے یہ ہدایت ملی۔

یہاں بھی حضرت والد صاحبؒ نے تمام حدود کو محفوظ رکھا، چونکہ جو آواز محسوس ہوئی تھی اس میں الفاظ یہ تھے کہ "کہہ دو" جس کا مطلب بظاہر یہی تھا کہ یہ بات دوسروں تک بھی پہنچاؤ، اس لئے آپ نے تقریروں اور عام جلسوں میں یہ بات اہتمام کے ساتھ پہنچائی، لیکن چونکہ اسے اپنی طرف منسوب کر کے سنانے میں تواضع اور حجاب مانع رہا، اس لئے اپنی طرف صراحۃً منسوب نہیں فرمایا، اور ساتھ ہی کوئی

---

[1] اس عبارت کے اکثر الفاظ حضرت والد صاحب ہی سے سنے ہوئے ہیں، لیکن بعض لفظوں میں معمولی فرق ممکن ہے البتہ مفہوم قطعی یہی تھا۔

غلط بیانی بھی نہیں فرمائی، بلکہ اسے "ایک زائر" کی طرف منسوب فرمادیا جس سے مراد خود آپ ہی تھے۔
جہاں تک کرامات کا تعلق ہے، سچ پوچھئے تو مجموعی طور سے ان کا پورا اندازِ زندگی مستقل کرامت
ہی تھا، حدود کی رعایت میں یہ باریک بینی، متعارض حقوق میں یہ توازن، طرزِ معیشت میں یہ متوکلانہ
انداز، دنیا میں رہ کر اور دنیا سے بھرپور طریقے سے برت کر بھی قلب و روح کا یہ زہد، دسیوں طرح کی شدید
مصروفیات کے عین درمیان اللہ تعالیٰ سے یہ پیہم تعلق و رابطہ، تصنیف و تالیف اور فتویٰ نویسی کی
یہ حیرت انگیز رفتار، اتنے مختلف النوع کاموں کی بیک وقت انجام دہی، اور اس کے باوجود چہرے
سے لے کر قلب و روح تک چھایا ہوا یہ سکون، غور سے دیکھئے تو ان میں سے ہر ہر بات ایک کرامت
تھی، ایسی کرامت جو ہوا میں اڑنے اور پانی میں تیرنے سے کہیں زیادہ مطلوب و محمود اور لائق رشک و
تقلید ہے۔

خاتمہ

حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے تذکرے میں یہ چند بے ربط سی باتیں جب شروع میں
لکھنے بیٹھا تو یہ بھی اندازہ نہ تھا کہ چند صفحات بھی لکھ سکوں گا، لیکن تقریباً پونے دو سو صفحات سیاہ
کرنے کے بعد بھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابھی مضمون کا آغاز ہی ہے، بے شمار یادوں کا ایک طوفان ہے
جو مسلسل ذہن میں امڈ رہا ہے، اور زندگی کے نہ جانے کتنے پہلو ہیں، جن کی طرف اشارہ بھی نہیں
ہو سکا، لیکن خیال یہ ہوتا ہے کہ ؎

نہ حسنش غایتے دارد، نہ سعدیؔ را سخن پایاں
بمیرد تشنہ مستسقی و دریا ہم چناں باقی

البلاغ کی یہ خصوصی اشاعت ان شاء اللہ ایک مفصل اور مربوط و مرتب سوانح کی بنیاد بنے
گی۔ اللہ تعالیٰ نے توفیق عطا فرمائی تو باقی ماندہ باتوں کی تکمیل پھر بھی ہو سکتی ہے، فی الحال اس
مضمون کو یہیں ختم کرتا ہوں۔
البتہ آخر میں قارئین سے گزارش یہ ہے کہ اس مقالے میں احقر نے حضرت والد صاحبؒ کے
مزاج و مذاق سے متعلق بہت سی نازک باتیں بھی بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن اول تو مجھے یہ

دعویٰ نہیں ہے کہ میں حضرت کے مزاج و مذاق کو پوری طرح سمجھ چکا ہوں، اور دوسرے مزاج و مذاق کو الفاظ کے سانچے میں ڈھالنا فی نفسہٖ بڑا مشکل کام ہے، تیسرے اس کام کے لئے جس ذہنی یکسوئی کی ضرورت ہوتی ہے وہ اس مقالے کی تحریر کے دوران مفقود رہی۔ اس مقالے کا بیشتر حصہ مختلف سفروں کے درمیان لکھا گیا اور شاید کراچی میں لکھا ہوا حصہ سفروں میں لکھے ہوئے حصے کے مقابلے میں کم ہی ہوگا، اس لئے ہو سکتا ہے کہ کسی بات کی تعبیر میں کوئی غلطی یا کوتاہی رہ گئی ہو، اگر کہیں ایسا ہو تو اس کی ذمہ داری مجھ ناکارہ پر عائد ہوتی ہے، صاحبِ سوانحؒ اس سے بری ہیں، اور اگر کوئی اہلِ علم ایسی کسی غلطی کی نشان دہی فرمائیں گے تو احقر ازبس ممنون ہوگا۔

○

"روشن خیال دُنیا مُن لے کہ سائنس کی حیرت انگیز ترقیوں سے وہ آسمان کی طرف چڑھ سکتے ہیں، سیاروں پر جا سکتے ہیں، سمندر میں جا سکتے ہیں، لیکن امن و امان اور سکون و اطمینان جو ان سارے سامانوں اور سارے کارخانوں کا اصل مقصد ہے وہ نہ ان کو کسی سیارے میں ہاتھ آئیگا نہ کسی نئی ایجاد میں۔ وہ ملے گا تو پیغمبرِ عربی روحی فداہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیغام اور ان کی تعلیمات میں، خدا تعالیٰ کو ماننے اور آخرت کے حساب پر عقیدہ رکھنے میں اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ۔ سائنس کے حیرت انگیز انکشافات روز بروز خدا تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ اور اس کی بے مثال صنعت کاری کو اور زیادہ روشن کرتے جاتے ہیں، جن کے سامنے ہر انسانی ترقی اپنے عجز و درماندگی کا اعتراف کر کے رہ جاتی ہے، مگر ؎

"چہ سود چوں دلِ دانا و چشمِ بینا نیست"

قرآنِ حکیم نے ایک طرف تو دُنیا کے سارے نظام کا منشا ہی قیامِ عدل و انصاف بتلایا، دوسری اس کا ایک بے مثال انتظام ایسا عجیب و غریب فرمایا کہ اگر اس کے پورے نظام کو اپنایا جائے اور اس پر عمل کیا جائے تو یہی خونخوار اور بدکار دُنیا ایک ایسے صالح معاشرے میں تبدیل ہو جائے جو آخرت کی جنت سے پہلے نقد جنت ہو۔"

(حضرت مفتی اعظمؒ، معارف القرآن، ص ۵۷۵ ج ۲)

مولانا نعمت اللہ صاحب
معین مدرس دارالعلوم کراچی

مُبشّرات

ہمارے حضرت والا مفتی اعظم پاکستان مولانا مفتی محمد شفیع صاحب قدس سرہ کے بارے میں حضرتؒ کی حیات ہی میں بہت سے لوگوں کو خواب میں بشارتیں ہوئیں۔ خواب اگرچہ شرعی حجت نہیں ہوتے، لیکن رویائے صالحہ بعض اوقات کسی بندے کی مقبولیت عنداللہ کی علامت ہوتی ہے، بالخصوص جبکہ اس کے دیکھنے والے علماء، صلحاء اور مختلف اطراف کے لوگ ہوں۔ چنانچہ ہمارے حضرت کے بارے میں کوئی اپنا خواب سناتا یا لکھ کر پیش کرتا تو حضرتؒ اسے اپنی ایک بیاض میں نقل کروا لیتے تھے۔ اس بیاض کے شروع میں خود حضرتؒ نے اپنے قلم سے ایک عبارت لکھی ہوئی ہے، جس سے ان خوابوں کا شرعی مقام بھی معلوم ہو جاتا ہے۔ لکھا ہے کہ:

"وہ خوابیں جو مختلف اوقات میں خود یا دوسرے حضرات نے احقر کے متعلق دیکھیں ان کو یادداشت کے لئے یہاں لکھا گیا ہے۔ درجہ ان کا وہی ہے جو امام ابن سیرینؒ نے فرمایا "الرؤیا تسر ولا تغر" یعنی خوابوں سے ایک طبعی مسرت حاصل ہو تو درست ہے، مگر ان پر مغرور ہونا درست نہیں کہ اصل مدار مقبولیت عنداللہ کا بیداری کے اعمال و احوال ہیں۔" رزقنا اللہ تعالیٰ صلاحہا "محمد شفیع"

خواب برخوردار محمد زکی سلمہٗ

برخوردار محمد زکی سلمہٗ نے لاہور سے خط میں لکھ کر خواب میں دیکھا کہ بہت بڑی مسجد ہے اس میں آپ اور حضرت تھانویؒ تشریف فرما ہیں، آپ نے خود ہی حضرتؒ کی کوئی خدمت اپنے ذمہ لگا رکھی ہے جو روزانہ

انجام دیتے ہیں۔ نماز کا وقت ہوا تو آپ اور حضرت تھانویؒ دونوں جماعت کے لئے آگے بڑھے حضرتؒ کا اصرار ہے کہ نماز آپ پڑھائیں لیکن آپ فرما رہے ہیں کہ مجھ میں یہ ہمت نہیں۔ یہ یاد نہیں رہا کہ پھر نماز کس نے پڑھائی؟ اس کے بعد دیکھا کہ آپ ایک مختصر سی چادر شال نما کشمش یا کستی رنگ کی اپنے سر پر ڈالے ہوئے ہیں۔ اس چادر میں ایک طرف کپڑے کے ڈنگ کے اثرات ہیں اور چھوٹے چھوٹے کئی سوراخ ہیں اور دوسری طرف ایک پیوند بڑا سا کسی اور کپڑے کا لگا ہوا ہے۔ یہ یاد نہیں کہ مجھے کس نے کہا یا خود سرور دو جہاں صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت ہوئی اور یہ کہا گیا کہ یہ شال محمد شفیع کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا عطیہ ہے۔ ~~~

محمد زکی سے ڈاکٹر عبدالحی صاحب نے جب یہ خواب سنا تو اپنا ایک شعر سنایا اور فرمایا کہ اس کو بھی خواب کے ساتھ شامل کر لو۔ ~~

اے زہے جذب محبت من فدائے خویشتن
حسن انگندہ است بر عشقم ردائے خویشتن

۲۔ خواب محمد شفیع

ذیقعدہ ۱۳۶۹ھ میں جب کہ احقر دارالعلوم شرافی میں مستقل قیام کے لئے مع اہل و عیال دارالعلوم پہنچا۔ دوپہر کو قیلولہ کیا۔ خواب میں دیکھا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا روضۂ اقدس ہے۔ اس کے نیچے ایک سڑک پر میں گذر رہا ہوں۔ اس سڑک پر ایک دریچہ روضۂ اقدس کا کھلا ہوا ہے جس میں دو پٹھان چوکیدار بیٹھے ہیں مگر آپس میں لڑ رہے ہیں۔ میں نے ان دونوں کو زور سے ڈانٹا کر بڑے بے ادب ہو روضۂ اقدس میں بیٹھ کر لڑتے ہو۔ ان دونوں کے ہاتھ میں چھریاں تھیں۔ میری آواز سن کر دونوں نے چھریاں سڑک پر ڈال دیں یا خود ان کے ہاتھ سے چھوٹ گئیں۔ اس وقت میں اپنے دل میں محسوس کر رہا ہوں کہ روضۂ اقدس کا انتظام میرے سپرد ہے اور میں نے اس کام کے لیے ایک ناظم مقرر کیا ہوا ہے اس وقت ایک آدمی میرے ساتھ ہے میں نے اس کو ناظم کے پاس بھیجا کہ ان دونوں پٹھانوں کو فوراً یہاں سے نکال دو۔ پھر میں دروازہ سے روضۂ اقدس کی طرف گیا تو دیکھا کہ یہ دونوں پٹھان وہاں موجود ہیں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سامنے تشریف فرما ہیں۔ میں نے ان دونوں کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے تنبیہ بھی کی اور یہ محسوس کیا کہ میری اس تنبیہ کو آنحضرت نے پسند فرمایا۔ پھر ان میں سے ایک نے

آگے بڑھ کر آنحضرت سے معافی مانگی اور معاف کر دیا گیا، دوسرا کہیں چلا گیا۔

اس کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس وقت دل میں محسوس کر رہا ہوں کہ میں مسلمانوں کی کسی جماعت کا فرستادہ وکیل ہوں کہ ان کی طرف سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں کوئی درخواست کرتا ہے۔ میں نے حاضر ہو کر درخواست پیش کی، مضمون درخواست کا یاد نہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم درخواست سن کر کھڑے ہو گئے اور نماز کی نیت باندھ لی اور کچھ جواب نہیں دیا۔ نماز میں قرأت کے کچھ کچھ کلمات مسموع ہوتے ہیں مگر میں ذرا فاصلے پر ہوں اس لئے پوری طرح سن نہیں رہا اس واسطے میں پشت مبارک کی طرف جاکر قریب کھڑا ہو کر سننے لگا۔ جملہ آیات کا کوئی یاد نہیں، پھر خیال آیا کہ میں بہت قریب کھڑا ہو گیا ہوں، ادب کے خلاف ہے اس لئے ذرا پیچھے ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔ اسی عرصہ میں دروازے سے کوئی آدمی آیا جو اسی جماعت کا فرستادہ تھا جس کی درخواست میں لے کر آیا تھا اور وہ مجھے بلانے آیا۔ میں اس کے ساتھ چل کر ایک مکان میں پہنچا، جہاں وہ جماعت موجود ہے۔ جماعت کے افراد یاد نہیں۔ اتنا یاد ہے کہ مسلمانوں کے کچھ ذمہ دار علماء و صلحاء ہیں۔ انہوں نے درخواست کا پوچھا کہ کیا ہوا؟ میں نے جواب دیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں تو پیش کر دی۔ مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے رعب و جمال کا اثر میرے قلب پر ایسا ہے کہ اب تک دل نہیں ٹھہرا۔ میں کچھ بولنے پر قدرت نہیں رکھتا، صرف اتنا بتاتا ہوں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے درخواست سن کر نماز شروع فرما دی۔ اس کے بعد آنکھ کھل گئی۔ اللّٰھم صلّ علی محمد و آلہ و اصحابہ اجمعین۔

۳- حضرت مولانا عبدالاحد صاحب مدرس دارالعلوم کراچی

اتوار کی رات بعد از نماز عشاء قصص القرآن مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کا مطالعہ کر کے باوضو سو گیا۔ دیکھا کہ حضرت اقدس حضرت مفتی صاحب دفتر میں تشریف فرما ہیں، کام میں مصروف ہیں۔ باہر دفتر کے بعض طلباء سے سُنا کہ حضور سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے ہیں۔ جلدی دفتر حاضر ہوا۔ چند آدمی اور بھی ہیں۔ بندہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے محاذات میں بیٹھ گیا۔ (مولانا موصوف نے دارالعلوم کراچی کے اس کمرہ میں جہاں میری نشست اس وقت تھی وہ مقام بھی مجھے بتلایا جہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما تھے یہ کمرہ آجکل دارالتصنیف اور مہمان خانہ کے درمیان دفتری ضرورتوں میں استعمال ہوتا ہے از شفیع) حضرت مدظلہ نے حضور سے فرمایا کہ حضرت کام میں مصروفیت بہت ہے، حاضری میں کوتاہی یا تقصیر ہو رہی ہے۔

الفاظ مبارک کے تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا خیر! ہم ملنے کے لئے آتے رہیں گے۔ رخصت ہوتے وقت فرمایا کہ کراچی والے یہاں آکر ملیں۔ یا یہ فرمایا کہ کراچی والوں کو کہہ دو کہ مجھ سے (حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے) ملنے کے لئے یہاں (دفتر حضرت مفتی محمد شفیع صاحب) آئیں۔

مولانا عبدالاحد صاحب مدرس دارالعلوم کراچی نے یہ خواب دیکھا اور لکھ کر دیا۔)

۴۔ خواب مولانا مجید الدین صاحب رئیس سلہٹ

خواب میں دیکھا کہ حضرت (مفتی محمد شفیع صاحب) کے دائیں یا بائیں میں اور ایک بزرگ جس کو میں پہچانتا نہیں ہوں، کھڑے ہیں۔ سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ بشاشت وبشاشت سے چہرہ مبارک چمک رہا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے تم لوگوں کو درجہ صحابیت عطا فرمایا ہے۔ اس سے متاثر ہو کر نیند ٹوٹ گئی خواب سے بیدار ہو کر پورا مضمون ذہن میں حاضر تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی جائے نشست اور ہیئت نشست اب تک ذہن میں ہے۔

(نوٹ: اس خواب کے بعد انہوں نے مجھے سلہٹ بلانے کا اصرار جاری رکھا اور بالآخر ۱۳۸۱ھ میں احقر پہلی بار سلہٹ حاضر ہوا۔ (محمد شفیع)

۵۔ خواب حافظ عبدالولی صاحب مجاز صحبت حضرت حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ

مولانا عبدالحق صاحب ناظم کتب دارالعلوم کراچی کے والد صاحب نے مولوی محمد علی طالبعلم سے یہ فرمایا کہ ایک آدمی نے مسجد میں بیٹھے بیٹھے یہ خواب دیکھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور سیدالطائفہ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب اور حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی اور حضرت مفتی محمد شفیع صاحب مسجد کی محراب میں سے نکل رہے ہیں۔ محمد علی نے پوچھا کہ دیکھنے والے کون صاحب ہیں؟ فرمایا کہ نام بتانے سے منع کیا ہے۔ ۲۲ محرم ۱۳۸۴ھ۔

۶۔ خواب مولوی محمد فاضل صاحب۔ دارالعلوم کراچی۔

جمعرات کو بعد از نماز عشاء مطالعہ کرتا رہا حسب نیند کا غلبہ ہوا۔ دوگانہ بہ نیت استخارہ ادا کر کے سو گیا۔ خواب میں دیکھا کہ مسجد دارالعلوم میں جنوبی جانب ایک بہت بڑا مجمع موجود ہے اور حلقہ بنائے ہوئے بیٹھے ہیں۔ میں نے پوچھا کہ کون بزرگ ہے؟ جن کی خاطر اتنا بڑا مجمع حلقہ بنائے ہوئے بیٹھا ہے، تو ایک صاحب

نے کہا کہ یہ حضرت ابوبکر الصدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہیں۔ ان کی زیارت کرنے آئے ہوئے ہیں۔ میں نے خوش ہو کر مصافحہ کیا اور سامنے دوزانو بیٹھ گیا۔ حضرت ابوبکر الصدیق رضؓ نے فرمایا کہ تم یہاں کیسے آگئے؟ عرض کیا حضرت کے پاس۔ ارشاد ہوا کہ آپ صدیق کے پاس جائیں۔ میں نے عرض کیا۔ حضرت صدیق اکبر تو آپ ہی ہیں تو حضرت ابوبکر الصدیق نے مجھے انگلی کے اشارے سے مجھے شمالی جانب متوجہ کیا کہ دیکھو صدیق اصغر آرہے ہیں۔ جب میں نے دیکھا تو آپ (حضرت مفتی صاحب) ایک جماعت کثیرہ کے ساتھ حضرت ابوبکر الصدیق رضؓ کی جانب تشریف لارہے ہیں تو میں فوراً آیا اور مصافحہ کیا اور بائیں جانب آپ کے ساتھ جانے لگا۔ باقی حصہ خواب کا یاد نہیں۔

۷۔ خواب مولوی شرف الدین صاحب کراچی

مولوی شرف الدین نے کراچی میں دارالعلوم قائم ہونے سے پہلے حضرت حاجی امداد اللہ قدس سرہٗ کو خواب میں اس طرح دیکھا کہ وہ تشریف فرما ہیں اور حضرت مفتی صاحب ان کے سامنے بیٹھے ہیں اور شرف الدین صاحب ان کے ایک بازو میں ہیں۔

۸۔ نقل خواب بعض حضرات بذریعہ حضرت مفتی رشید احمد صاحب

مولانا مفتی رشید احمد صاحب سابق مدرس دارالعلوم فرماتے ہیں کہ حضرت تھانوی کی وفات کے کچھ ہی عرصہ بعد تھانہ بھون گیا تو وہاں حضرت مجذوب صاحب نے ذکر فرمایا کہ یہاں ایک شخص نے خواب میں دیکھا کہ کوئی چار فوٹو لئے ہوئے ہیں اور کہہ رہا ہے کہ یہ حضرت تھانویؒ کے عناصر اربعہ ہیں۔ خواب دیکھنے والے نے کہا کہ میں تین صاحب کو تو پہچانتا نہ تھا۔ البتہ ان میں سے ایک مجذوب صاحب تھے۔ مولانا رشید احمد صاحب نے اس خواب کا تذکرہ مولانا اعزاز علی سے کیا۔ آپ نے یہ سن کر پوچھا کہ وہ شخص مفتی محمد شفیع صاحب کو جانتا ہے یا نہیں۔ مولانا نے جواب دیا کہ یہ تو مجھے معلوم نہیں۔ اس پر مولانا اعزاز علی رح صاحب نے فرمایا کہ اگر وہ شخص حضرت مفتی صاحب کو جانتا ہے تو علیحدہ بات ہے ورنہ اگر جانتا نہیں تو یقیناً ان میں سے ایک مفتی صاحب ہوں گے۔ ۵۹ھ ہجری

۹۔ والدہ نواب قیصر صاحب کا خواب

نواب قیصر کی والدہ، نواب جمشید علی خان کی بھاوج، جو عابدہ، زاہدہ عورت ہیں، جب وہ کراچی آئی ہوئی تھیں حضرت حکیم الامت کو خواب میں دیکھا۔ پوچھا کہ آپ کہاں رہتے ہیں؟ ایک طرف کو اشارہ کرکے فرمایا

کر میں شفیع کے پاس رہتا ہوں۔ خواب دیکھنے والی خاتون کا خیال ہے کہ اشارہ اس مکان کی طرف تھا جو اشرف منزل کے نام سے موسوم ہے اور سپیلہ چوک پر واقع ہے۔ خواب دیکھنے کے وقت یہ مکان مکمل نہیں ہوا تھا اور میرا (شفیع) قیام نہیاں نہ تھا۔

۱۰۔ خواب قاری محمد یعقوب امام مسجد طیبہ متصل دارالعلوم نانکواڑہ

قاری محمد یعقوب صاحب امام مسجد طیبہ نے خواب میں دیکھا کہ حضرت حکیم الامت قدس سرہٗ محمد شفیع کے نئے مکان اشرف منزل میں تشریف لائے اور کچھ دیر آرام فرمایا۔ قاری محمد یعقوب بھی حاضر تھے۔ پھر مجھ سے (محمد شفیع) سے کہا کہ چلو قاری صاحب کے ہاں چلیں اور فرمایا کہ محمد رفیع، محمد تقی کو بھی ساتھ لے چلو۔ محمد تقی سلمہٗ کے سر پر ہاتھ رکھا اور بہت پیار فرمایا کہ یہ پیار کے قابل ہیں۔ اس کے بعد قاری صاحب کی مسجد میں تشریف لائے۔ کچھ دیر ان کے پاس آرام فرمایا۔ پھر نماز کا وقت ہو گیا، تو ان سے فرمایا کہ تم نماز پڑھاؤ اور انہوں نے انکار کیا۔ مگر حضرت نے انہیں امامت کا حکم دیا، اسی پر آنکھ کھل گئی۔ ۱۳۷۶ھ

۱۱۔ خواب مولانا قاضی زاہد الحسینی۔ ایبٹ آباد

رات کو حضرت حاجی صاحب کی کتاب پڑھ کر سو گیا تھا۔ دیکھا کہ میں ایک جگہ جا رہا ہوں اور میرے آگے ایک پستہ قد بزرگ جا رہے ہیں میں نے ان سے مسئلہ پوچھا تو فرمایا کہ جب مولانا تھانوی کے پاس جا رہے ہیں، تو ان سے دریافت کر لیں گے۔ چنانچہ ہم دونوں ایک مکان میں بیٹھے تو حضرت الاستاذ مفتی محمد شفیع صاحب رو بقبلہ بیٹھے وظیفہ پڑھ رہے ہیں اور مکان کے مشرقی جانب میں ایک چبوترہ ہے جس پر خاندار ریشمی بستر بچھائے ہوئے ہیں۔ میں اس پر چڑھ گیا۔ مگر جب دیکھا کہ آپ سب حضرات نیچے تشریف فرما ہیں تو اتر کر آپ کے پیچھے بیٹھ گیا۔ حضرت تھانویؒ نے میرے ساتھ تو بات نہیں فرمائی مگر بڑے خوش ہیں اور پنجابی زبان میں کہتے ہیں محمد حسن لالہ آیا ہے۔ محمد شفیع لالہ آیا ہے۔ مگر آپ حضرات خاموش ہیں۔

ں

آج کا انسان دنیا کے ہوشیار ترین جانور سے زیادہ کچھ نہیں رہا۔ اس کو احسان و انعام صرف وہ چیز نظر آتی ہے جو اس کے پیٹ اور نفسانی خواہشات کا سامان مہیا کرے اس کے وجود کی اصل حقیقت جو اس کی روح ہے اس کی خوبی اور خرابی سے وہ یکسر غافل ہو گیا ہے۔ (مفتی اعظمؒ "معارف القرآن" ص ۲۲۴ ج ۲)

خدمات اور کارنامے

" عالم جو صحیح معنی میں عالم ہو اگر تنہا بھی ہو تو دُنیا کو نوُر سے بھر دیتا ہے۔ بقول حضرت حکیم الامت تھانویؒ ایک ٹمٹماتا ہُوا دیا خواہ کتنا چھوٹا ہو، ظلمت سے مغلوب نہیں ہوتا، چمکتا ہی ہے ، ہاں اگر نوُر ہی نہ ہو بلکہ نوُر کا فریب ہو تو بلا شُبہ ظلمت اس پر غالب آسکتی ہے "

(حضرت مفتی اعظمؒ)

(عُلمار و طلبار کے نام دو اہم پیغام۔ ص ۱۰)

منجانب

مشتاق ٹیکسٹائل ملز

مولانا محمد اشرف خان صاحب

حکیم الامت تھانوی کے علمی جانشین

۱۸۵۷ء کے جہاد و معرکۂ حریت سے لے کر استقلال و آزادی برصغیر تک کا عہد مسلمانانِ ہند و پاک کی دینی و فکری تاریخ کا اس لحاظ سے ایک نہایت ہی اہم، تابناک اور درخشندہ باب ہے کہ اس دور میں برکوچک خصوصاً دہلی و دوآبہ (گنگ وجمن) اور خاص کر سرزمین دیوبند۔ دارالعلوم دیوبند سے دین و دانش علم وعمل، اخلاص، تقویٰ، زہد و ورع، دعوت و ارشاد، سلوک و تصوف، جہاد و جانسپاری کی وہ بے مثال نابغۂ روزگار اور جہاں تاب ہستیاں پیدا ہوئیں جن کی نظیر قرون متاخرہ میں شاذ ہے۔ ان ائمہ و اکابر کے ممتاز خصائص و مزایا میں ان کی جامعیت، علوم منقولہ کی وسعت و گہرائی، علوم معقولہ کی مہارت اور گہرائی، علوم قرآنی میں بصیرت، علوم حدیث کا شغف اور بے نظیر تدریسی و تصنیفی خدمات، فقہ (حنفی) کا اشتغال اور فتاویٰ نویسی میں حقیقت بینی و دقیقہ رسی حوادث، مسائل و ضروریات جدیدہ کے شرعی حل کی عظیم الشان کاوشیں فتنۂ منکرو الحاد و زندقہ کا کامیاب تعاقب و مقابلہ، طریق باطن کی علمی تجدیدی، تجدیدی و عملی بے مثال مساعی اور شریعت و طریقت کی وحدت کا برملا اعلان و عملی ثبوت و تظاہر، بدعات و رسوم باطلہ سے واضح برات و مجادلہ، احقاق حق و ابطال باطل کے لئے پیہم جہد و کوشش، اسلام کی سرفرازی، اعلائے کلمۃ اللہ

۱؎ حضرت فقیہ الملۃ مفتی اعظم علامہ محمد شفیع دیوبندی قدس سرہٗ۔

۲؎ حضرت مجدد الملۃ حکیم الامۃ حضرت اشرف علی تھانوی نور اللہ مرقدہٗ۔

مسلمانوں کی بقا و حفاظت اور ملک و ملت کی آزادی کے لیے جہادِ مسلسل کے ساتھ ساتھ للّٰہیت وخشیت، محبت الٰہی، طہارت وتقویٰ، زہد وورع، عشقِ نبوت و اتباعِ سنت (صلی اللہ علیہ وسلم)، خلق سے استغنا و بے خوفی، لومۃ لائم کی مدح و ذم سے بے نیازی، ہمت وجرأت، تدبر وذہانت، قربانی وفدائیت، فتوۃ وبطالت ایسے بدیہی کمالات ہیں۔ جن کا انکار کوئی ذی ہوش اور منصف مزاج شخص نہیں کرسکتا کہ

آفتاب آمد دلیلِ آفتاب   گر دلیلت باید ازوے رو متاب

أولئك آبائي فجئني بمثلهم   اذا جمعتنا يا جرير المجامع

حکیم الامت حضرت تھانوی: ان علمائے ربانیین، وائمۂ ہدایت وبلا نوشانِ محبت کے قافلہ کے ایک فردِ فرید گوہرِ یگانہ سیدی ومولائی شیخ الکل حکیم الامۃ مجدد الملۃ حضرت اشرف علی تھانوی نور اللہ مرقدہٗ ہیں۔ جن کے بارے میں فرید العصر سندی ومطاعی حضرت الشیخ سید الملۃ سید سلیمان ندوی قدس سرہٗ ارقام فرماتے ہیں۔

"حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی رحمۃ اللہ علیہ کے علمی ودینی فیوض وبرکات اس قدر مختلف الانواع ہیں کہ ان سب کا احاطہ ایک مختصر سے مضمون میں نہیں ہو سکتا۔ اور یہی ان کی جامعیت ہے۔ جو ان کے اوصاف ومحامد میں سب سے اول نظر آتی ہے۔ وہ قرآن پاک کے مترجم ہیں۔ مجدد ہیں۔ مفسر ہیں، اس کے علوم وحِکم کے شارح ہیں، اس کے شکوک وشبہات کے جواب دینے والے ہیں۔ وہ محدث ہیں، احادیث کے اسرار ونکات کے ظاہر کرنے والے ہیں، وہ فقیہ ہیں، ہزاروں فقہی مسائل کے جوابات لکھے ہیں نئے سوالوں کو حل کیا ہے، نئی چیزوں کے متعلق نہایت احتیاط کے ساتھ فتوے دیے ہیں، وہ خطیب تھے، خطبہ ماثورہ کو یکجا کیا ہے، وہ واعظ تھے ان کے سینکڑوں وعظ چھپ کر عام ہو چکے ہیں، وہ صوفی تھے، تصوف کے اسرار وغوامض کو فاش کیا ہے، شریعت وطریقت کی ایک مدت کی جنگ کا خاتمہ کر کے دونوں کو ایک دوسرے سے ہم آغوش کیا ہے۔ ان کی مجلسوں میں علم ومعرفت اور دین وحکمت کے موتی بکھیرے جاتے تھے، اور یہ موتی جن گنجینوں میں محفوظ ہیں وہ ملفوظات ہیں، جن کی تعداد بیسیوں تک پہنچتی ہے۔ وہ ایک مرشد کامل تھے۔ ہزاروں مسترشد ومستفید ان کے سامنے اپنے احوال و واردات پیش کرتے تھے جن کا مجموعہ تربیت السالک ہے۔ انھوں نے بزرگوں کے احوال وکمالات کو یکجا کیا اور اس ذخیرہ سب کو آشنا کیا انھوں نے حضراتِ چشت کے احوال و اقوال میں سے بظاہر اعتراض

کے قابل باتوں کی حقیقت ظاہر کی، اور اس کی تاویلات کیں، ان کی کتابوں کے خلاصے، اقتباسات اور تسہیلات ان سے الگ کی ہیں۔ جن کی ترتیب ان کے مسترشدین نے دی ہے۔ وہ مصلح اُمت تھے، اُمت کے سینکڑوں مصائب کی اصلاح کی، رسوم وبدعات کی تردید، اصلاح رسوم اور انقلاب حال پر متعدد تصانیف کیں، وہ حکیم الامت تھے، مسلمانوں کے علاج اور نشاۃ و احیاء پر حیوۃ المسلمین وغیرہ رسائل تالیف فرمائے۔ غرض ان کی زندگی میں مسلمانوں کی کم کوئی ایسی مذہبی ضرورت ہوگی جس کا مداوا اس حکیم الامت نے اپنی زبان اور قلم سے نہیں فرمایا اور جس کی وسعت کا اندازہ تحقیق اور مطالعہ کے بعد ہی نظر میں آسکتا ہے۔ ان کی تصنیفات ہندوستان کے پورے طول وعرض میں پھیلیں اور ہزاروں مسلمانوں کی فلاح وبہبود کا باعث ہوئیں، اردو اور عربی کے علاوہ، مسلمانوں نے اپنے ذوق سے ان کی متعدد تصانیف کا ترجمہ غیر زبانوں میں بھی کیا۔ چنانچہ ان کی متعدد کتابوں کے ترجمے انگریزی، بنگالی، گجراتی، اور سندھی میں شائع ہوئے۔ ان کی تصانیف کی تعداد جن میں چھوٹے بڑے رسائل اور ضخیم تصانیف سب داخل ہیں، آٹھ سو کے قریب ہے۔

علمائے اسلام میں ایسے بزرگوں کی کمی نہیں، جن کی تصانیف کے اوراق اگر ان کی زندگی کے ایام پر بانٹ دیئے جائیں، تو اوراق کی تعداد زندگی کے ایام پر فوقیت لے جائے...... اس سلسلہ کا آخیر نام حضرت مولانا تھانوی ؒ کا ہے۔ تصانیف کا بیشتر حصہ اصلاحی اور فقہی ہے اور کم تر کتب درس کے متعلق، تاہم دو چار درسی کتابوں پر بھی رسائل ہیں، مذہبی تصانیف میں علوم القرآن، علوم الحدیث، کلام وعقائد، فقہ وفتاویٰ اور سلوک وتصوف اور مواعظ اکثر ہیں۔ اسلام میں علم کا سب سے پہلا سفینہ خود اسلام کا صحیفہ ہے۔ یعنی قرآن پاک، مولانا نے اس کی خدمت کی سعادت جس جس نوع سے حاصل فرمائی۔ وہ بجائے خود ان کی ایک علمی کرامت ہے۔ کانپور کے زمانۂ قیام میں مطبع انتظامی میں تشریف رکھتے تھے۔ وہاں حبر امت اولیں مفسر قرآن حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کو خواب میں دیکھا۔ جن کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اَللّٰھُمَّ عَلِّمْہُ الْکِتَابَ کی دعا دی تھی، اور بشارت سنائی تھی، مولانا فرماتے تھے۔ کہ اس رویا کے بعد سے میری مناسبت قرآنی بہت بڑھ گئی تھی اور یہ رویا اسی کی طرف اشارہ تھا۔

قرآن پاک کی خدمت کی یہ سعادت نہ صرف معنوی حیثیت سے حاصل فرمائی بلکہ لفظاً بھی

دونوں حیثیتوں سے ۔

(معارف اعظم گڑھ ج ۵۲ نمبر ۱ ص ۸۵تا۸۹)

حضرت تھانویؒ کے خلفاء :

حضرت تھانوی نور اللہ مرقدہ کے ان علوم بے کراں و فیوض حق رساں سے لاکھوں افراد بطور مندرجہ ذیل فیضیاب، سینکڑوں باکمال بن کر نکلے۔ سو سے اوپر وہ خوش نصیب ہیں جو قبائے خلافت سے سرفراز ہوئے بارگاہ اشرفیہ کے یہ مہر و ماہ اور تارے ایک سے بڑھ کر ایک درخشندہ و روشن ہیں۔ ہر ایک اپنی شان علمی و عرفانی، مجبولی و دستانی اور ظاہری و باطنی تابانی میں اپنی مثال آپ ہے۔ ان کی علمی و ذہنی، اخلاقی و قلبی رفعتوں اور بلندیوں تک اس شکستہ بال و کوتاہ نظر کے خیال و ادراک کے پر پرواز کی رسائی بھی ممکن نہیں ان میں سے ہر ایک ہر رخ سے عربی کے اس شعر کا مصداق ہے۔

یزیدک وجہہ حسنا   اذا ما زدتہ نظرا

اس بزم کے بیسیوں باکمال ایسے ہیں جو اپنی ذات میں دائرۂ علم، جامع فنون، مرکز فضیلت، منبع معارف و برکات، علوم عقلیہ و نقلیہ کے بیک وقت امام، ظاہر و باطن کے مجمع البحرین، تقویٰ و ورع کے آفتاب، مجمع الفضائل اور قدوۂ عالم ہیں۔ جن کے بارے میں برملا کہا جا سکتا ہے۔

ع   لیس علی اللہ بمستنکر   ان یجمع العالم فی واحد

اسی لیے ان میں سے کسی ایک کا حکیم الامت قدس سرہ کی علمی جانشینی کی طرف انتساب و انتخاب ایک ذوقی معاملہ ہے۔ جس سے آسمان ولایت اشرفیہ کے کواکب نیرہ میں باہمی تفاضل و ترجیح مقصود نہیں صرف علمی آثار و خدمات کی بنا پر ایک کودک نادان کی رائے کا اظہار ہے جس سے ہر اہل علم کو اختلاف کا حق و گنجائش ہے۔ کہ

وللناس فیما یعشقون مذاہب

چنانچہ کتابوں کی کثرت، تصانیف کے تنوع، موضوعات و مضامین کی مماثلت ذوق علمی کی ہم رنگی، میدان تحریر کی وحدت، مذاق و فکر کی طبعی مناسبت بعض تالیفات میں اشتراک و تدوین نو کی خدمت، بعض میں ایسی تصنیفی نیابت کہ بے رملا کہا جا سکے۔

در پس آئینہ طوطی صفتم داشتہ اند   آنچہ استاد ازل گفت ہماں می گویم

نور سہ

من تو شدم تو من شدی من تن شدم تو جان شدی
تا کس نگوید بعد ازیں من دیگرم تو دیگری

اس وجہ سے اس کم سواد و ہیچمداں کی نگاہ میں حضرت تھانوی نور اللہ مرقدہٗ کی علمی جانشینی کی سعادت فقیہ الامت مفتی اعظم حضرت علامہ مفتی محمد شفیع دیوبندی قدس سرہٗ کے حصہ میں آئی ہے۔ اس شرف یابی و سعادت اندوزی کے سمجھنے کے لیے جو سراسر موہبت الٰہی و عطیہ ربانی ہے۔ حضرت مفتی رحمہ اللہ تعالیٰ کا علمی پس منظر و ماحول، فکری نشوونما حضرت تھانوی قدس سرہٗ کے تعلقات وغیرہ کا جاننا ضروری ہے۔ اس لیے آپ کی کتابوں پر گفتگو کرنے سے پیشتر اس سلسلہ میں کچھ عرض کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

<u>ابتدائی ماحول اور دینی نشوونما و تعلیم</u> :۔ دنیا میں کم ایسے خوش نصیب ہوتے ہیں۔ جنھیں ماں کی گود لیے بچپن میں ایسا پاک ماحول مل جائے جیسا حضرت مفتی صاحب قدس سرہٗ کو میسر آیا۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ حضرت رحمہ اللہ تعالیٰ کے اپنے الفاظ میں ہی اسے نقل کر دیا جائے ارقام فرماتے ہیں۔

"اسلام کے قرن اوّل سے لے کر آج تک ہر زمانے میں خلق اللہ کی تعلیم و تربیت اور اصلاح اعمال و اخلاق کے لیے علماء و صلحاء اور اولیاء اللہ کی مجلسیں نسخہ اکسیر ثابت ہوئی ہیں، احقر ناکارہ کو حق تعالیٰ نے ایک ایسے ماحول میں پیدا فرمایا جہاں شروع ہی سے ان مجالس کے تذکرے سُنے، والد ماجد حضرت مولانا محمد یسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ قطب عالم حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی قدس سرہٗ کے مرید خاص حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب کے شاگرد اور سبھی اکابر دیوبند کی خدمت سے فیض یافتہ اور ان بزرگوں کا "زندہ تذکرہ" تھے۔

اسی ماحول میں آنکھ کھولی حضرت گنگوہی قدس سرہٗ کے تذکرے سُنے اور بچپن کے لاشعوری دور کی یہ باتیں بھی یاد ہیں کہ جب گھر میں کوئی فکر و پریشانی کی بات ہوئی تو گنگوہ کو دعا کیلیے خط لکھا جا رہا ہے۔ حضرت کے دعائیہ کلمات جواب میں آئے۔ تو سنائے جا رہے ہیں۔ یہ بھی سنا تھا کہ میرا نام محمد شفیع بھی حضرت ہی کا تجویز فرمایا ہوا ہے۔ اور جب قرآن مجید پڑھنے کے لیے مجھے مکتب میں بٹھایا گیا تو حضرت کو دعا کے لیے خط لکھا گیا اس وقت حضرت گنگوہی قدس سرہٗ کی مجالس مرجع خلائق تھیں۔ مگر ان میں حاضری کا کوئی موقع ہی نہیں تھا۔ میری عمر آٹھ نو سال کی ہو گی جب ۱۳۲۳ھ میں حضرت گنگوہی قدس سرہٗ کی وفات ہو گئی۔

بچپن دار العلوم دیوبند کے ماحول میں گزرا جہاں ہر چھوٹے بڑے کی زبان پر ہے "بڑے مولوی صاحب"

کا نام سنا کرتا تھا۔

اس وقت حضرت اور مولانا کے پُر تکلف الفاظ کا کہیں رواج نہ تھا۔ بزرگوں کی عظمت و محبت جان نثاری کی حد تک پہنچی ہوئی تھی۔ مگر شیخ الحدیث شیخ الکل حضرت شیخ وغیرہ القاب کا زبانی جمع خرچ جو بزرگوں کی عظمت و محبت کم ہونے کے زمانے میں شروع ہوا۔ اس وقت اس کا کہیں نام نہ تھا۔ بس ساری عقیدتمندی کے صلہ میں ان کو "بڑے مولوی صاحب" کہا جاتا تھا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ ان کا اسم گرامی حضرت مولانا محمود حسن ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے کچھ عرصہ کے بعد شیخ الہند کا لقب معروف ہو گیا۔

ایک روز سنا کہ آج بڑے مولوی صاحب کے ہاں بخاری شریف کا درس شروع ہو رہا ہے۔ تبرکاً سب علماء و طلباء اس میں شرکت کے لیے جا رہے ہیں۔ ہم بھی ساتھ لگ لئے اور بخاری شریف کا باب بدء الوحی اور پہلی حدیث کا بیان سنا۔ اسی طرح ختم بخاری پہ اجتماع ہوا۔ تو آخری حدیث کا بیان سنا اور اب یہ چسکا لگ گیا کہ ہر سال بخاری شریف کے شروع اور ختم پہ درس میں حاضری نصیب ہوتی۔ بچپن کا حافظہ تھا آج تک بعض بعض کلمات یاد ہیں۔ حالانکہ اس وقت حدیث تو کیا کسی بھی فن کا شعور نہیں تھا۔ فارسی اُردو حساب ریاضی کی کتابیں پڑھا کرتا تھا۔ رفتہ رفتہ ان بڑے مولوی صاحب کی مجلس میں جو بعد عصر اپنے مکان پر ہوا کرتی تھی کبھی کبھی حضرت والد صاحب کے ساتھ حاضری ہونے لگی۔ اکابر علماء و صلحاء کا عجیب و غریب مجمع ہوتا تھا۔ ان کی باتیں تو کچھ پلے نہیں پڑتی تھیں مگر اس مجلس میں بیٹھنے کا ایک شوق بلا کسی سبب کے دل میں پیدا ہو گیا۔ اور اب والد صاحب کی معیت اور بعد عصر کی قید بھی رخصت ہو گئی جب سنا ٹھا وقت بے وقت حاضر ہو گیا اکابر کی شفقت جو بچوں پر ہوا کرتی ہے۔ مجھے بھی نصیب ہونے لگی۔ اور طالب علمی کے ابتدائی دور میں فارغ اوقات کھیل

ؔ ایک دوسری جگہ حضرت مفتی صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ تحریر فرماتے ہیں۔

میرے والد محترم حضرت مولانا محمد یٰسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ چونکہ دارالعلوم کے مدرس تھے میں نے جب سے ہوش سنبھالا۔ والد صاحب مجھے مدرسہ لے جاتے تھے۔ اس طرح کھیل کود کا زمانہ بھی دارالعلوم ہی کے صحن میں گذرا ہے۔ (مقدمہ فتاویٰ دارالعلوم دیوبند) پیش یہ اس دارالعلوم دیوبند کا صحن تھا۔ جس کے بارے میں ایک بار خود راقم نے حضرت مفتی صاحب سے سنا کہ ہمیں دارالعلوم کا وہ زمانہ یاد ہے جب مہتمم سے لے کر ادنیٰ چپراسی تک سب نسبت بزرگی ہوا کرتا تھا۔

اور تفریح کے بجائے حضرت کی مجلس میں گذرنے لگے۔ رمضان المبارک میں حضرت کا یہ معمول تھا کہ تمام رات نوافل یا تراویح میں قرآن شریف سنتے تھے۔ دو سال حق تعالیٰ نے اس میں بھی حاضری کی توفیق عطا فرمائی۔
میری عربی تعلیم کا ابتدائی دور جو ۱۳۳۰ھ میں شروع ہوا اس وقت دارالعلوم کے ناظم تعلیمات بھی حضرت ہی تھے اس لئے تعلیمی معاملات میں بھی آپ سے ہی مراجعت کی نوبت آنے لگی، اور حضرت کی شفقت و توجہ اور بڑھ گئی۔ ۱۳۳۲ھ میں میری تعلیم متوسط درجہ تک پہنچی تھی ہدایہ وغیرہ کے اسباق تھے۔

۱۳۳۳ھ میں میں نے کوشش کر کے مشکوٰۃ و جلالین وغیرہ کے وہ اسباق پورے کر لیے۔ جن کے بعد دورۂ حدیث کا نمبر آتا ہے۔ تمنا یہ تھی کہ اگلے سال حضرت شیخ کی قربت میں صحیح بخاری پڑھنے کا موقع مل جائے گا۔ مگر اسی سال رمضان سے یہ خبر گشت کرنے لگی کہ حضرت کا ارادہ سفرِ حج کا ہے۔ رفتہ رفتہ اس کی تیاریاں سامنے آگئیں، کوئی کہتا تھا کہ ہجرت کر کے جا رہے ہیں۔ کسی کا خیال تھا کہ ترکی حکومت کی امداد کے لیے سفر ہے ہم بڑی حسرت کے ساتھ یہ منظر دیکھتے رہے۔ بالآخر حضرتؒ حج کے لیے روانہ ہوئے اور عالمگیر جنگِ عظیم چھڑ گئی۔ ۱۳۳۴ھ پورا حضرتؒ کا حجاز میں صرف ہوا۔ احقر نے اس سال اپنا دورۂ حدیث اس امید پر ملتوی کیا کہ حضرت واپس آجائیں گے تو دورۂ حدیث ان کے سامنے ہوگا اس سال فنون کی بقیہ کتابیں لے لیں۔ مگر بحکم قضا و قدر وہ ۱۳۳۵ھ میں اسیر ہو کر مالٹا جیل بھیج دیئے گئے اور ساری امید دل پر پانی پھر گیا۔ ۱۳۳۵ھ میں احقر کا دورۂ حدیث حجۃ الاسلام حضرت مولانا سید محمد انور شاہ صاحبؒ کے سامنے ہوا۔ ۱۳۳۵ھ میں احقر کا دورۂ حدیث ہو کر تقریباً درس نظامی پورا ہو گیا۔ چند فنون کی کتابیں باقی تھیں جو ۱۳۳۶ھ میں پوری ہو گئیں۔

دورۂ حدیث سے فراغت کے بعد تعلیم و تدریس، علمی تحقیقات کا شوق، کتب بینی سے دلچسپی بحث و مباحثے سب کچھ تھے۔ مگر نظریں اس مجلس کو ڈھونڈتی تھیں۔ جہاں دل کو سکون و اطمینان ملتا ہے جس کا ذوق حضرت شیخ الہندؒ کی خدمت میں چند روزہ حاضری سے پیدا ہو گیا تھا۔ اس وقت تھانہ بھون میں حکیم الامت مجدد الملت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی مجلس مرجع خلائق ہو گئی تھی۔

حضرتؒ کے علمی کمالات تصانیف کے ذریعہ اپنے علمی حوصلے کے مطابق کچھ معلوم تھے۔ ہمارے گھر بہشتی زیور سب لڑکیاں پڑھ سکتی تھیں خانقاہ تھانہ بھون اور وہاں کی مجالس کا حال والد محترم سے سنا کرتا تھا۔ حضرتؒ کے دیوبند تشریف لانے کے وقت مجالس وعظ میں بھی بڑی رغبت و اعتقاد سے شریک ہوتا تھا والد صاحبؒ نے ایک مرتبہ ہمارے گھر میں بھی آپ کا وعظ کرایا تھا جس کے بعض کلمات ہمیشہ یاد رہتے

ہیں۔ والد صاحب اگرچہ حضرتؒ کے ہمعصر اور ہم سبق تھے۔ مگر آپؒ کی بندگی اور تقدس و تقویٰ کے بہت معتقد تھے۔ والد ماجد دار العلوم دیوبند میں مدرس تھے۔ شعبان کے آخر میں آٹھ دس دن کی تعطیل ہوتی تھی۔ ان کا معمول یہ تھا کہ یہ تعطیل حضرت گنگوہیؒ کی خدمت میں گزارتے تھے۔

۱۳۲۳ھ میں ان کی وفات کے بعد بھی معمول یہ رہا کہ گنگوہ میں مزار پر حاضری اور پھر زندہ بزرگوں کی زیارت کے لیے رائپور تھانہ بھون وغیرہ کا سفر کرتے تھے۔ ایک مرتبہ دونوں جگہ مجھے بھی اپنے ساتھ لے گئے۔ رائپور میں حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب رائپوری قدس سرہٗ کی پہلی زیارت حضرت والد صاحبؒ ہی کی معیت میں ہوئی۔ اسی طرح ایک مرتبہ تھانہ بھون کی پہلی حاضری اس لاشعوری دور میں والد صاحب کی معیت میں ہوئی۔ اس حاضری میں حضرت کی زیارت اور بچوں پر شفقت کا دھندلا سا نقشہ نظروں میں ہے۔ مگر اس وقت کی نہ کوئی بات یاد ہے نہ سنہ اور تاریخ: (مقدمہ مجالس حکیم الامت)

ظاہر ہے کہ حضرت مفتی صاحب نور اللہ مرقدہٗ جیسے ذہین اور سلیم الطبع بچہ نے ان نورانی مجالس اقطابِ زمانہ، اولیاء اور ائمہ وقت علماء کے فیضان سے کیا کچھ نہیں اخذ کیا ہوگا۔ جب کہ بزرگ ہمہ تن شفقت تھے اور کھیل کود کے فطری تقاضہ کو بھی چھوڑ کر انہیں کی مجالس کو اپنا ٹھکانا بنائے ہوئے تھا۔ وہ پاکیزہ اور پُرانوار اثرات حضرت مفتی صاحبؒ کے دل و دماغ میں رچ بس گئے اور وہی نقوش ان کے روحانی قلبی اور علمی صفحۂ ہستی صیوانی پر مرتسم ہوگئے۔ جس نے ان کی ذاتی زندگی کو تقوی و طہارت، اخلاص و بے نفسی اور علم و عمل کا قابلِ تقلید نمونہ بنا دیا۔ اس دینی اور روحانی ماحول میں آنکھیں کھولنے کے بعد جب تعلیمی سلسلہ شروع ہوا تو علم و فن کی ان نادرۂ روزگار ہستیوں سے شرفِ تلمذ نصیب ہوا جن کی شاگردی ہر باکمال اور زہد و درعِ شخص کے لیے بھی قابلِ فخر سرمایہ ہو سکتی ہے۔ جو نہ صرف اپنے علم و فن میں امام تھے بلکہ ظاہر و باطن کے جامع اور مجموعہ فضائل و کمالات تھے۔ جن فضلائے زمانہ اساتذہ سے حضرت مفتی صاحب قدس سرہٗ نے اکتساب و استفادہ علوم و فیوض فرمایا ان میں امام العصر رأس المحدثین حضرت علامہ سید محمد انور شاہ صاحبؒ کشمیری، مفتی اعظم حضرت مولانا عزیز الرحمٰن صاحب عثمانیؒ حضرت شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانیؒ، حضرت مولانا سید اصغر حسین صاحبؒ، شیخ الادب حضرت مولانا اعزاز علی صاحبؒ، سابق مہتمم حضرت مولانا محمد احمد صاحب ابن حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ، حضرت علامہ رسول خان صاحبؒ، حضرت مولانا محمد یسین صاحبؒ دیوبندی، حضرت مولانا محمد ابراہیم صاحب بلیاوی رحمہم اللہ تعالیٰ جیسی عظیم المرتبت اور پاکیزہ شخصیتیں شامل ہیں۔

حضرت مفتی صاحبؒ نے ابتدائی عربی صرف و نحو اور فارسی کی تمام مروجہ کتابیں اپنے والد محترم حضرت مولانا محمد یٰسین صاحب دیوبندیؒ سے قرآن شریف، حافظ محمد عظیم صاحبؒ سے فن تجوید کے قواعد ضروریہ قاری محمد یوسف صاحب میرٹھیؒ سے، حساب و فنون ریاضی اپنے چچا جناب مولانا منظور احمد صاحب سے دارالعلوم میں حاصل کیے تھے۔ سولہ سال کی عمر میں دارالعلوم دیوبند کے درجہ عربی میں باقاعدہ داخلہ لیا اور ان علماء سے جملہ علوم و فنون میں سند فراغ حاصل کی جن کا تذکرہ کر چکا ہوں۔ حضرت مفتی صاحبؒ نے اپنے حدیث کے اساتذہ اور ان کی سندات کا مفصل تذکرہ اپنی عربی تصنیف "الازدیاد السنی علی الیانع الجنی" میں کیا ہے (ص ۳۴ تا ۳۸)

حضرت مفتی صاحبؒ نے اطراف سنا کر حضرت حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ سے بھی صحاح ستہ اور مؤطا میں سند حدیث لی ہے۔

حضرت مفتی صاحب نور اللہ مرقدہٗ کے اساتذہ جس مقام کے تھے اور ان کے ساتھ جو تعلقات تھے اس کا اندازہ ذیل کے ایک اقتباس سے ہو جائے گا۔ حضرت مفتی صاحبؒ، حضرت مولانا غلام رسول خان صاحبؒ پر ایک مضمون کے ضمن میں تحریر فرماتے ہیں۔

> احقر ناکارہ محمد شفیع نے عربی صرف و نحو کی ابتدائی کتابیں اپنے والد ماجد حضرت مولانا محمد یٰسین صاحبؒ سے پڑھنے کے بعد ۱۳۳۱ھ میں دارالعلوم دیوبند کے درجہ عربی میں باقاعدہ داخلہ لیا، تو جن اساتذہ کرام سے استفادہ کا شرف حق تعالیٰ نے عطا فرمایا، ان کی علمی قدر و منزلت سے تو بہت بعد میں واقفیت ہوئی مگر ان میں سے ہر ایک اپنے اپنے فن کا امام تھا۔ انہیں بزرگوں میں حضرت الاستاذ العلام مولانا رسول خان صاحب بھی ہیں جن کی خدمت میں حاضری اور مختلف فنون کی بہت سی کتابوں میں تلمذ و استفادہ کا شرف حق تعالیٰ نے عطا فرمایا۔ سلم العلوم، میرزاہد رسالہ مع غلام یحییٰ اور حمد اللہ شرح سلم منطق میں اور میبذی فلسفہ میں آپ ہی سے سبقاً سبقاً پڑھیں حمد اللہ کا ابتدائی کچھ حصہ شیخ الاسلام حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی قدس سرہٗ سے پڑھا تھا پھر بقیہ حضرت علامہ سے حاصل کیا۔ ہدایہ اولین کا سبق شروع میں حضرت قاسم العلوم والخیرات کے صاحبزادے اور دارالعلوم کے صدر مہتمم حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحبؒ کی خدمت میں شروع ہوا تھا، پھر ان کو حیدرآباد کا سفر پیش آ گیا، تو کچھ حصہ کتاب الحج کا حضرت شیخ الاسلام مولانا عثمانی قدس سرہٗ سے پڑھا۔ پھر ان کو دوسرے مشاغل نے فرصت نہ دی تو بقیہ ہدایہ اولین بھی حضرت مولانا رسول خان صاحبؒ سے پڑھی، اصول فقہ میں

حسامی احقر نے خصوصیت کے ساتھ مدرسہ کے اسباق کے علاوہ حضرت علامہؒ سے ان کے مکان پر علیحدہ حاضری دے کر پڑھی، حضرت علامہ کو اس ناچیز شاگرد پر بے حد شفقت و عنایت تھی۔ ضابطہ کی طالب علمی سے فارغ ہونے کے بعد انہیں اکابر اساتذہ کے آغوش میں بیٹھنے سے کچھ اسباق تعلیم کے لیے احقر کے سپرد ہو گئے۔ انہیں کی شفقتوں و عنایتوں کے زیر سایہ درس و تدریس میں حق تعالیٰ نے ترقی عطا فرمائی۔ حضرت علامہ رسول خاں صاحبؒ کو حق تعالیٰ نے ہر فن میں ایسا کمال عطا فرمایا کہ ان کے درس سے انسان فن کی حقیقت کو سمجھتا تھا۔ اس کے علاوہ ہر علم و فن کی کتابیں گویا ازبر یاد تھیں جب کسی کتاب کے کسی مسئلے میں آپ سے پوچھا گیا۔ تو اس کا علم مستحضر اور جواب شافی پایا گیا۔ ان تمام کمالات کے باوجود متواضع شہرت سے بیگانہ گوشہ نشینی کے عادی اور تواضع کے پیکر تھے۔

(سوانح حضرت مولانا رسول خان ہزاروی رحمۃ اللہ علیہ)

حضرت مفتی صاحبؒ کی طبعی ذہانت، مسلسل محنت، تعلیم کے انہماک نے ان کو اپنے ان بے مثل اساتذہ کی توجہ کا مرکز بنا دیا تھا۔ ان کی شفقت و محبت خاص تھی۔ ۱۳۳۵ھ میں فارغ التحصیل ہوئے تو حضرت مولانا حبیب الرحمٰن نے جو اس زمانہ میں دارالعلوم کے مہتمم تھے، انہیں ابتدائی تعلیم کے لیے استاد مقرر کیا۔ پھر بتدریج اعلیٰ درجہ علیا کے استاد ہوئے۔ تقریباً ہر علم و فن کی کتابوں اور بیا عنوان کو پڑھایا دارالعلوم میں تدریس کا یہ سلسلہ ۱۳۶۲ھ تک رہا۔ اس عرصہ میں ہزاروں اشخاص ان سے مستفید ہوئے۔

<u>حضرت تھانوی نور اللہ مرقدہ سے تعلقات</u>: حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ نے حضرت شیخ الہند قدس سرہٗ کی وفات کے بعد حضرت تھانویؒ قدس سرہٗ کی طرف رجوع کیا اور آپ کے دست مبارک پر تجدید بیعت کی اس کا تذکرہ خود آپ کی اپنی زبانی سنیئے۔

"یوں تو احقر کو حکیم الامت سیدی مولانا اشرف علی صاحب قدس سرہٗ سے عقیدت و محبت کا تعلق اس وقت سے ہے جب کہ احقر نے پوری طرح ہوش بھی نہ سنبھالا تھا، طفولیت کے لہو و لعب مرسمی مقاصد بنے ہوئے تھے، کیونکہ میرے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے مخصوص مرید اور تمام موجودہ بزرگوں کے بے حد معتقد تھے، بچپن ہی سے بزرگوں کے حالات اکثر سنایا کرتے تھے۔ جس نے دل میں بزرگوں کی عظمت و محبت کا نقش غیر محسوس طور پر کندہ کر دیا تھا۔ بالخصوص سیدی حضرت حکیم الامت قدس سرہٗ کے ساتھ چونکہ حضرت والد ماجد رحمہ اللہ شریک درس اور ہم سبق

رہتے تھے۔ اور بے تکلف تعلقات نو عمری کے زمانے سے تھے ان کے حالات و فضائل و مناقب اکثر بیان فرمایا کرتے تھے.....

الغرض بچپن ہی سے حضرت کے حالات و فضائل سن کر دل میں عظمت و محبت بحمد اللہ تعالیٰ قائم تھی۔ پھر کچھ ہوش سنبھالا تو گھر میں "بہشتی زیور"، "اصلاح الرسوم" وغیرہ حضرت کی تصانیف پڑھیں اور دیکھیں ان سے اور بھی زیادہ عقیدت پیدا ہوگئی۔

احقر کی درسیات ۱۳۲۵ھ میں پوری ہوگئیں۔ درسیات سے فراغت کے بعد اب پھر یہ داعیہ دل میں تازہ ہوا کہ کسی شیخ سے تعلق قائم کرنا چاہیئے۔ حضرت اقدس شیخ الہند کی اسارت و مفارقت اس وقت اور بھی زیادہ شاق و شدید محسوس ہوئی مگر کوئی امر اختیار میں نہ تھا۔ اوقات خالی ضائع ہو رہے تھے۔ حضرت والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ نے مشورہ دیا کہ بالفعل تم اس سلسلے میں حضرت اقدس حکیم الامت قدس سرہٗ سے تربیت و تعلیم حاصل کرو پھر بیعت اپنی خواہش کے مطابق شیخ الہند کی واپسی کے بعد ان سے کر لینا۔

یہی قصد کر کے احقر سب سے پہلے بسلسلۂ تربیت ۱۳۲۹ھ میں تھانہ بھون میں حاضر ہوا اور بے کم و کاست یہی مضمون عرض کیا کہ میں نے حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ تعالیٰ سے بیعت کی درخواست کی تھی۔ حضرت نے فراغت از طالب علمی کے بعد وعدہ فرمایا مگر اب مالٹا میں تشریف رکھتے ہیں اور وقت خالی گذر رہا ہے۔ آپ سے اصلاح و تربیت چاہتا ہوں اس میں اگر بیعت ہونا ضروری ہو تو مجھے بیعت فرمالیں ورنہ جیسی رائے ہو۔ حضرت نے ارشاد فرمایا کہ نہیں بیعت تو حضرت کی واپسی پر انہیں سے کرنا البتہ اصلاح واجبات میں سے ہے اس میں دیر نہ کرو مجھ سے جو کام ہو سکتا ہے میں اس کے لیے حاضر ہوں۔ پھر فرمایا۔ اب میں بتلاتا ہوں کہ اس سلسلہ میں تمہارے ذمہ کیا کام ہوگا اور میرے ذمہ کیا۔ تمہارے دو کام ہیں ایک اپنے حالات کی اطلاع دوسرے اس پر جو میں مشورہ دوں اس کا اتباع۔ اور میرا کام یہ ہوگا کہ حالات کے مناسب جو عمل تمہارے لیے سمجھ میں آئے اس کا مشورہ دے دوں۔ پس خلاصہ تمہارے عمل کا دو لفظ ہیں "اطلاع و اتباع" پھر حضرت اقدس نے کچھ تسبیحات اور معمولات کی تلقین فرمائی۔ اور ضروری نصائح کے بعد رخصت فرمایا۔ واپس آکر کچھ روز اسی سلسلہ میں حضرت اقدس رحمۃ اللہ علیہ سے خط و کتابت رہی مگر بیعت کی سکے

ساتھ کہ اس وقت تک اس طرز سے کچھ دلچسپی کم تھی۔ کچھ تعلیم کا سلسلہ مدرسہ میں شروع کر دینے کے سبب اوقات زیادہ مشغول ہو گئے۔ اس کے بعد تھوڑے عرصہ میں حضرت شیخ الہند قدس سرہ تعالیٰ مالٹا سے رہا ہو کر تشریف لائے۔ اب تو اپنی خواہش اور حضرت والا کی تجویز کے موافق حضرت کی خدمت میں رہنے لگ گیا۔ بیعت کے لیے درخواست کی تو فرمایا کیا جلدی ہے کریں گے پھر ایک روز چند حضرات کی بیعت حضرت نے منظور فرمالی تھی۔ اور بعد مغرب اُن کو وقت دیا تھا مجھے اطلاع ہو گئی میں بھی اس وقت پہنچ گیا۔ مسکرا کر فرمایا۔ تم بھی آگئے۔ بہت اچھا اور ناکارہ کو شرف بیعت سے مشرف فرمایا......

یہاں تک رمضان ۱۳۳۹ھ میں حضرت اقدس (شیخ الہند) نور اللہ مرقدہٗ اس عالم ہی سے رحلت فرما گئے۔ حضرت کی وفات کا جو غم ساری دنیا کو تھا مجھ جیسے غلام کو زیادہ ہونا ناگزیر تھا لیکن اس کے ساتھ ہی ایک دوسرا غم یہ تھا کہ میں استفادہ سے محروم رہا۔ وفات کے بعد ایک مدت تک طبیعت پہ ایسی افسردگی رہی کہ کام میں جی تھا نہ کسی کام کی ہمت اس کے بعد جب یہ حالت کچھ کم ہوئی تو اپنی فکر دامن گیر ہوئی۔ اور اب پھر تھانہ بھون کا عزم کیا حضرت والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ سے عرض کیا کہ آپ میرے ساتھ چلیں اور حضرت حکیم الامت قدس سرہٗ سے میرے بارے میں توجہ فرمانے کی سفارش کر دیں والد صاحب کے ساتھ تھانہ بھون حاضر ہوا اور عرض کیا کہ حضرت مجھے تصوف کا شوق تو مثل طبعی کے ہے لیکن کام کرنے کی فرصت نہ قوت۔ کیونکہ کچھ تو خلقۃً ضعیف ہوں کچھ کثرت مشاغل تعلیم وغیرہ سے گھرا ہوا ہوں اس لیے میں اپنے سے مایوس ہوں کہ اس طریق میں کوئی قدم رکھ سکوں حضرت والا نے بڑی شفقت سے فرمایا کہ تم سے یہ کس نے کہہ دیا کہ اللہ تعالیٰ کا راستہ صرف اقویاء کے لیے ہے۔ ضعفاء کے لیے نہیں پھر فرمایا کہ بزرگوں کا مقولہ ہے۔ طرق الوصول إلى الله تعالى بعدد انفاس الخلائق۔ اور یہ بھی فرمایا کہ بحمد اللہ کسی عطائی کی دکان نہیں کہ ایک ہی دوا سب کو دے ہم تم کو ایسی چیز بتلا دیں گے جس میں نہ فرصت کی ضرورت نہ قوت کی۔ وہ صرف دو چیزیں ہیں۔ ایک تقویٰ کی پابندی، دوسرے لایعنی سے بچنا خواہ لایعنی کام ہو یا کلام یا کوئی مجلس وغیرہ پھر فرمایا۔ بتاؤ اس میں کون سا وقت خرچ ہوگا۔ بلکہ میرا مشاہدہ اور تجربہ یہ ہے کہ بہت سا وقت بچ جائے گا اور کچھ قوت کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ فرائض و واجبات تو کوئی مشکل کام نہیں۔

نوافل تم پر میں لازم نہیں کرتا البتہ معاصی سے بچنا لازم ہے سو اس میں کچھ مکان نہیں ہوتی اور نہ
کسی فرصت کی اس میں ضرورت ہے۔ ایک دو روز احقر نے قیام کیا، بڑی شفقت و محبت کا
معاملہ فرماتے تھے۔ اس طرزِ تعلیم و معاملہ شفقت نے میرے قلب کے گوشہ گوشہ کو حضرتؒ کی محبت
سے بھر دیا۔ یہ واقعہ غالباً ۱۳۴۲ھ یا ۱۳۴۳ھ ہجری کا ہے اس کے بعد مسلسل خط و کتابت اور آمد و رفت
کا سلسلہ شروع ہو گیا اور تقریباً بیس سال حضرتِ اقدس کی خدمت میں حاضری اور صحبت میں بیٹھنے
کی دولت حق تعالیٰ نے عطا فرمائی۔ مگر حسرت افسوس ہے کہ اپنی مثال وہی ہو گئی کہ بارہ برس دکھلیں
برس) دلی میں رہے بھاڑ ہی جھونکا حضرت کے کمال اور اس پر کمال شفقت میں کوئی تردد نہیں ہو سکتا
لیکن اس کو کیا کیجئے کہ ؎

ما نداریم مشامے کہ توانست شنید
ورنہ ہر دم وزد از گلشن وصلت نفحات

(بزم اشرف کے چراغ ص۹۴۔۹۵)

حضرت مفتی صاحب قدس سرہٗ نے حضرت تھانوی نور اللہ مرقدہٗ سے اپنے تعلقات کے بارے میں جو
کچھ مجالس حکیم الامت کے مقدمہ میں لکھا ہے۔ وہ بھی قابلِ دید ہے۔ لیکن اس کی تفصیل مولانا مفتی محمد رفیع صاحب
نے اپنے مقالے میں اس نمبر کے صفحہ ۱۰۱ سے صفحہ ۱۱۰ تک بیان فرما دی ہے اس کے اعادے کی یہاں ضرورت نہیں۔

حضرت مفتی صاحبؒ نے "احکام القرآن حزب الخامس" کے ابتدائیہ میں لکھا ہے۔ کہ احکام القرآن
کا حصہ سورۃ الشعراء سے سورۃ حجرات تک میرے حصہ میں آیا۔ کہ حضرت تھانوی نور اللہ مرقدہٗ کی خواہش کے
مطابق قرآن کریم سے مذہب حنفیہ کے مسائل اجتہادیہ کے دلائل کو جمع کر دوں "احکام القرآن ج۵ ص۲" (افتتاحیہ ملخصاً)
حضرت مرشدی و مولائی سید الملۃ نور اللہ مرقدہٗ احکام القرآن (دلائل القرآن علی مسائل النعمان) کے بارے میں
تحریر فرماتے ہیں۔

"مولانا (تھانویؒ) رحمہ اللہ تعالیٰ کو حضرت امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کی فقہ سے جو شدید شغف تھا
وہ ظاہر ہے ان کا مدت سے خیال تھا۔ کہ احکام القرآن جصاص رازی اور تفسیرات احمدیہ ملا جیون کی طرح
خاص اپنی تحقیقات اور ذوقِ قرآنی سے اُن آیات اور ان کے متعلق مباحث و دلائل کو یکجا کر دیں۔

جو سے فقہ حنفی کے کسی مسئلہ کا استنباط و اخراج ہو، لیکن یہ کام انجام نہ پاسکا آخر میں یہ خدمت[1] انہوں نے اپنے مسترشد خاص مولانا محمد شفیع صاحب دیوبندی کو سپرد فرمائی کہ وہ ان کی ہدایت کے مطابق اس کو تالیف فرمائیں، چنانچہ مفتی صاحب اس کام میں مصروف ہو گئے۔ ابھی حال ہی میں جب وہ مدرسہ سے الگ ہوئے تو خانقاہ امدادیہ میں جاکر خاص اس کام کی تکمیل میں لگ گئے۔ مولانا روزانہ کی مجلس میں اس کے متعلق جو نکتے ان کو یاد آجاتے تھے، بیان فرماتے اور جناب مفتی صاحب اس کو اپنے مقام پر آکر قلم بند فرما لیتے مولانا عبدالباری صاحب ندوی۔۔۔۔ مفتی صاحب موصوف کے حافظہ کی تعریف کرتے تھے کہ مولانا سے سن کر اپنے مستقر پر پہنچ کر اسی طرح قلمبند کر لیتے تھے۔ جس طرح مولاناؒ نے اس کی تقریر فرمائی تھی:

(معارف اعظم گڑھ نمبر ۲ جلد ۵۲ ص ۹۷-۹۲)

قرآنی علوم میں حضرت اقدس مولانا تھانویؒ سے استفادہ کے بارے میں مثلاً یہ اقتباس نقل کر دیا گیا حدیث کی سند، ۲۷ ذی قعدہ ۱۳۴۸ھ کو حضرت حکیم الامت رحمہ اللہ تعالیٰ سے اطراف صحاح و مؤطا رسالہ کر حاصل کی۔ حضرت نور اللہ مرقدہٗ کی سند کے الفاظ تبرکاً نقل کرتا ہوں۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم و بعد الحمد والصلوٰۃ فإنّ اخی فی اللہ البصیر السمیع المولی الفاضل محمد شفیع اوصله اللہ من كل خیر الی المقام الرفیع، قد عرض علی أطراف الصحاح والموطا بروایۃ یحیٰی و روایۃ محمد لیفوز ببرکات السند، وهو مفصل منّی الی الجامعین فی رسالتی السبع السیارۃ التی هی احدی رسائل الطیارۃ، ثم لما رأیتہ اهلًا لتقریر مبانی الأحادیث وهو فن التحدیث والروایۃ و لتحریر معانیها وهو فن الفقه الدرایۃ اجزته لتدریس تلك الصحف، لیعوم به حولها من الطلبة من لم یطف وادعوا اللہ له و أطلب منه الدعاء ان یوفقنا لخدمة الشریعة البیضاء الی ان یعترینا الفناء وكان هذا السبع وعشرین من ذی القعدۃ سنة ۱۳۴۸ من هجرۃ سیّد الانام صلی اللہ تعالیٰ علیه وعلی اله الكریم واصحابه العظام، مادامت اللیالی و الأیّام وأنا احقر عباد اللہ العلام اشرف علی التھانوی الحنفی حطّ عنه الآثام۔

---

[1] سورۂ شعراء سے سورۂ حجرات تک (ناشر)

حضرت فقیہ الملتؒ کی تصنیفات انکے فتاویٰ اور ان کا فنی کمال

حضرت مفتی محمد شفیع صاحب قدس سرہٗ کی تصنیفات و تالیفات کی تعداد دو سو سے متجاوز ہے جو تفسیر و حدیث، فقہ و تصوف، ادب و کلام، اصلاح معاشرت وغیرہ مختلف علوم پر مشتمل ہیں بعض کتابیں ہزارہا ہزار صفحات پر محیط ہیں اور بعض چند صفحات کی ہیں جنہیں موجودہ اصطلاح میں مقالہ یا مضمون کہا جا سکتا ہے۔ ہر کتاب مصنف کے عمق علم، معلومات کی وسعت، علمی دیانت و ثقاہت و احتیاط کا نمونہ ہے۔

حضرت مفتی صاحبؒ کا قلم متین و سنجیدہ ہونے کے باوجود سبک رو، شگفتہ، سہل اور علمی گیرائی و گہرائی اور معلومات کا گنجینہ ہے۔ جس سے ہر سلیم الطبع قاری اپنے ذوق کی آبیاری کر سکتا ہے حضرت مفتی صاحب کی تحریر میں نہ تو تھکا دینے والا اطناب پایا جاتا ہے، نہ تشنگی باقی رکھنے والا ایجاز، آپ کا کلک محتاط موضوع کے دائرے میں رہتے ہوئے ہر ممکن مواد کو سمیٹتا ہوا علم و حکمت کا نور بکھیرتا چلا جاتا ہے۔ آپ الفاظ کی شان و شوکت مرصع و مسجع عبارت کے قائل نہیں لیکن جو کہنا چاہتے ہیں سلجھی اور نکھری ہوئی پاکیزہ معیاری اور سہل زبان میں کہتے چلے جاتے ہیں، قاری اکتانے نہیں پاتا اور مصنف کا حسن اخلاص، مضمون سے لگن، موضوع سے وفاداری علم کا گہراؤ، پیشکش کا سلیقہ اور وسعت مطالعہ اس کے دل و دماغ کو متاثر کرتا چلا جاتا ہے آپ کی نگارشات سادہ اور سہل ہونے کے باوجود ادبی چاشنی سے خالی نہیں۔ اور بعض مقامات پر سہل ممتنع کا حکم رکھتی ہیں۔

حضرت مفتی صاحب نور اللہ مرقدہٗ فطرتاً فقیہ النفس تھے، اس پر حضرت مفتی عزیز الرحمٰن صاحب قدس سرہٗ اور مجدد الملت حضرت تھانوی اعلی اللہ مقامہ جیسے نادر روزگار اور فقید المثال فقہا اور صاحب فتویٰ بزرگوں کی صحبت و تعلیم و تربیت نے سونے پر سہاگہ کا کام کیا تھا۔

اس وجہ سے دیگر جملہ علوم متداولہ پر عبور اور تبحر رکھنے کے باوجود آپ کے اصل جواہر اور کمالات فقہ و فتاویٰ کی صدر نشینی میں کھلے اور ساتھ نام کا سابقہ لقب بھی تقدیر الٰہی اور زبان خلق نے "مفتی اعظم" بنا دیا۔ جو اس فقیہ کبیر و جلیل کے لیے عین حقیقت تھا۔ فقاہت دینی کے لیے جس وسعت علم (کتب فقہ کے جزئیات تک پر گہری نگاہ)، دقت نظر، سلامتی ذہن، اصابت رائے، احتیاط و تیقظ، اساتذہ فن کی صحبت و تربیت، تقویٰ و طہارت، اخلاص و بے نفسی، عدل و انصاف، راست گوئی و حق کوشی،

غیر جذباتی ٹھنڈی طبیعت ، مسکر کے مالہ و ماعلیہ سے واقفیت ، ضروریات زمانہ اور احوال متعلقہ سے باخبری کی ضرورت ہے ۔ وہ حضرت مفتی صاحب نور اللہ مرقدہ میں بدرجۂ اتم موجود تھیں " فتویٰ نویسی " کہنے کو ایک فن ہے ۔ لیکن یہ فتویٰ نویسی بغیر فقاہت کے ممکن نہیں اور فقاہت میں مہارت جملہ علوم پر گہری نگاہ اور تمام علوم دینیہ پر عبور کے بغیر ممکن نہیں ۔ مشہور فقیہ علامہ ابن نجیم حنفی بحر الرائق کے مقدمہ میں قدسی کی الحاوی سے نقل کرتے ہیں ۔

اعلم ان معنی الفقه فی اللغة الوقوف والاطلاع ، وفی الشریعة ۔ الوقوف الخاص ، وهو الوقوف علی معانی النصوص واشاراتها و دلالاتها و مضمراتها ومقتضیاتها والفقیه اسم للواقف علیه (بحر الرائق ص مقدمہ)

ترجمہ ۔ جاننا چاہیے کہ لغت میں فقہ کے معنی واقف ہونے اور اطلاع پانے کے ہیں اور شریعت میں وہ ایک خاص واقفیت ہے ، جس سے نصوص شرعی کے معنی اس کے اشاروں ، جن باتوں پر وہ دلالت کرتے ہوں اس کے مضمرات اور جو ان کا اقتضا ہو ، ان سب سے واقف ہو ، پر فقہ کہلاتا ہے اور ان جملہ امور سے جو واقف ہو اسی کا نام فقیہ ہے ۔ گویا " فقاہت " نصوص شریعت یعنی قرآن کریم جس کے بارے میں ارشاد نبوی ہے " لا تنقضی عجائبه " (اس کے عجائبات ختم نہیں ہوتے) اور کنوز حدیث جن کے بارے میں دہان نبوت گویا ہے " بعثت بجوامع الکلم " (مجھے جامع کلمات کے ساتھ مبعوث کیا گیا) کے نہ صرف ظاہری معنی پر وقوف ضروری ہے بلکہ اس کے اشارات ، دلالات ، مضمرات اور مقتضیات کا بھی گہرا اور وسیع علم ضروری ہے ۔ نصوص شرعیہ سے استنباط اور مسائل کا استخراج ہر کہ ومہ کا کام اور ہمہ شما کی وسعت و دسترس میں نہیں ۔ علوم قرآنیہ ، علوم حدیث اور ان کے متعلقہ جملہ علوم کا گہرا علم ضروری ہے جس میں ادب و بلاغت اور جملہ علوم آلیہ آجاتے ہیں کہ اس کے بغیر تو قرآن و حدیث کے ظاہری معنی بھی کسی کے بس کی بات نہیں ۔ پس مفتی کے لیے فقیہ ہونا ضروری ہے اور فقیہ کامل کے لیے علوم اسلامیہ کی وسعتوں اور گہرائیوں کو سمجھنا ضروری ہے ۔ حدیث شریف میں آ چکا ہے ۔

لا یقوم بدین الله الا من حاطه   دین کو وہی شخص (کما حقہ) قائم رکھ سکتا ہے جو اس کے

من جمیع جوانبہ رکنز العمال میں ہے کہ ابو نعیم عن علیؓ　　تمام جوانب کا احاطہ کئے ہوئے ہو۔

پس فقیہ کامل کے لیے مفسر و محدث اور جملہ علوم اسلامیہ کا ماہر ہونا اور فقہ، اصول فقہ اور اس کے محتویات و جزئیات کا اعلم رکھنا ضروری ہے۔ ورنہ ہر قدم پر لغزش پا کا اندیشہ ہے۔ یا یوں کہیئے کہ علوم قرآن و حدیث و فقہ توأمین ہیں ایک کے بغیر دوسرے کا عبور ناممکن ہے۔ اور ایک میں بصیرت کے بغیر دوسرے میں حذاقت مشکل، قرآن و حدیث　اصول و منابع ہیں اور فقہ ان کے ثمرات و نتائج بلکہ قرون متاخرہ میں تو فقہ کے بغیر حدیث　کا سمجھنا مشکل ہے۔ اور حدیث میں مہارت کے بغیر قرآن دانی واہمہ ہے۔ اور ان علوم تک رسائی کے لیے دیگر متعلقہ علوم (ادب و بلاغت و کلام وغیرہ) کی ضرورت ہے غرض فتویٰ نویسی و فقاہت کے لیے ایک کامل مفتی اور ماہر فقیہ کو جملہ علوم اسلامیہ پر عبور کی ضرورت ہے۔

مزید برآں موجودہ دور میں جب کہ نئے نئے مسئلے نئے نئے سوال سامنے آ رہے ہیں بقول حضرت سید الملت نور اللہ مرقدہ " مغربی تمدنی قوانین اور اسلامی فقہ اور احکام کے درمیان تطبیق اگر ممکن ہو اور قانون اسلامی کی ترجیح اگر تطبیق ناممکن ہو صد درجہ نازک لیکن ساتھ ہی صد درجہ ضروری کام ہے" اس کے لیے ایسے وسیع النظر اور محتاط مفتی اور دیندار علماء کی ضرورت ہے جو اس جوئے شیر کا حصول ممکن کر دیں اور اسلامی قانون کی فوقیت، اہمیت، وسعت و آفاقیت کا دنیا سے اقرار کروا لیں۔ خیر یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا۔ جو طویل ہو گیا۔ عرض کر رہا تھا کہ حضرت مفتی صاحب نور اللہ مرقدہ میں " فقاہت " اور فتویٰ نویسی کی صلاحیتیں کما حقہ موجود تھیں اللہ تعالیٰ نے حضرت موصوف سے فقہ اور فتاویٰ کی جو محیر العقول خدمت لی اس کا اندازہ اس سے بخوبی ہو سکتا ہے کہ دیوبندی مدرسۂ فکر کے فتاویٰ کا جو عظیم الشان[1] ذخیرہ منصۂ شہود پر آیا۔ اس کے دو بڑے جلیل القدر فتویٰ نگاروں یعنی حضرت حکیم الامت تھانوی قدس سرہ اور مولانا عزیز الرحمٰن رحمۃ اللہ علیہ کے فتاویٰ کی تبویب و ترتیب نو اور تدوین جدید حضرت موصوف رحمۃ اللہ تعالیٰ کے ذریعہ

---

[1] کاش یہ عظیم حنفی فتاویٰ کا عظیم ذخیرہ عربی میں منتقل ہو جاتا تو فتاویٰ عالمگیریہ کی طرح عالم اسلام بھی اس سے مستفید ہوتا۔ حضرت مفتی صاحبؒ کے جانشینوں کے مقاصد میں یہ بات بھی آ جائے تو ان کا کارنامہ ہوگا۔

(اشرف)

[2] مذکورہ کے عام فتاویٰ کا انحصار ان کتب فقہ و فتاویٰ پر ہے۔ عامی مفتی کے لیے وہ کفایت کر سکتا ہے لیکن ایک ماہر و حاذق و کامل مفتی و فقیہ کے لیے فقیر نے جو باتیں عرض کی ضروری ہیں۔　(اشرف)

ہوئی۔ دوسری طرف فتاویٰ کا ایک عظیم ذخیرہ جو دو لاکھ فتووں سے متجاوز ہے حضرت کے قلم کا رہینِ منت ہے۔ اس میں بعض فقہی مسائل مستقل کتابچوں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ جس کا مجموعہ جواہر الفقہ کے نام سے دو جلدوں میں شائع ہوگیا ہے۔[1] حوادثات و نوازل و مسائل پر جس اصابت رائے علمی دیانت فقہی دقیقہ رسی حالات حاضرہ سے باخبری طریق سلف اور بزرگوں کی روش کی پیروی کا نمونہ پیش کیا ہے۔ اور نصوص دینی اور شرعی تقاضوں کی حرمت کا پاس رکھتے ہوئے وقتی مصلحتوں پر ترجیح دی ہے۔ وہ سلف کی یاد تازہ کرتی ہے۔ حضرت مفتی صاحبؒ نے حضرت تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ کے جن فتاویٰ کو تبویب و ترتیب جدید کے ساتھ شائع فرمایا ہے وہ امداد الفتاویٰ کے نام سے تین ہزار چار سو پینتالیس ۳۴۴۵ صفحات پر مشتمل چھ ۶ ضخیم جلدوں میں شائع ہوئے ہیں۔ حضرت مفتی عزیز الرحمٰن صاحب قدس سرہٗ کے فتاویٰ (عزیز الفتاویٰ) ترتیب جدید کے ساتھ مبوب فتاویٰ دیوبند کی پہلی دو جلدوں پر محیط ہیں اور صفحات کی تعداد آٹھ سو سولہ ۸۱۶ ہے فتاویٰ دیوبند کی دو آخری جلدیں (امداد المفتین) حضرت مفتی صاحبؒ کے ان فتاویٰ کے ایک حصے پر مشتمل ہیں جو انہوں نے ۱۳۴۹ھ سے ۱۳۶۲ھ تک تیرہ سال میں دار العلوم دیوبند کے صدر مفتی کی حیثیت سے دیے (کل فتاویٰ تقریباً چالیس ہزار تھے)، یہ فتاویٰ آٹھ سو پچیس ۸۲۵ صفحات پر مشتمل ہیں۔

برادر مکرم جناب مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب دام ظلہ امداد المفتین (فتاویٰ دار العلوم دار العلوم دیوبند آخرین) کے ان فتاویٰ کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں۔

یہ آپ (حضرت مفتی محمد شفیع صاحب) کے قلم سے نکلے ہوئے قدیم و جدید تقریباً ایک لاکھ فتاویٰ میں سے تقریباً ایک ہزار کا مجموعہ ہے۔ جو منظر عام پر آیا ہے باقی بہت بڑا ذخیرہ دار العلوم دیوبند کے دفاتر میں، اسی طرح ایک عظیم ذخیرہ دار العلوم کراچی کی تئیس جلدوں میں محفوظ ہے۔ ان فتاویٰ کی حیثیت کے بارے میں تو کیا عرض کرسکتا ہوں صرف اتنا لکھنا کافی سمجھتا ہوں کہ اکابر علماء دیوبند اور حضرت حکیم الامت تھانویؒ نے ان پر اعتماد فرمایا ہے۔ اور ان فتاویٰ کی اشاعت سے پہلے حضرت مفتی صاحب نے اپنی تواضع

---

[1] کاش جناب مفتی محمد رفیع صاحب عثمانی ان کو نئے مخفیہ کو مبوب اور کتابی صورت میں شائع فرمادیتے تو حضرت مفتی صاحب نور اللہ مرقدہ کے باقیات صالحات میں اضافہ ہوتا اور ان کے لیے صدقۂ جاریہ ہوتا اور برادر موصوف کی بھی ایک بڑی دینی خدمت ہوتی۔ (اشرف)

اور احتیاط کے پیشِ نظر حضرت مولانا مفتی سعید احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ سابق مفتی سہارنپور اور بعض دیگر علماء سے بھی نظرِ ثانی کرائی اور ان کے مشوروں سے بعض اصلاحات بھی فرمائی ہیں۔

(فتاویٰ دارالعلوم دیوبند ترجمۃ المصنف ص۴۱)

آگے بڑھنے سے پیشتر حضرت مفتی صاحب قدس سرہٗ کے قلم ہی سے پہلے عزیز الفتاویٰ اور پھر امداد المفتیین کی تدوین کے متعلق کچھ سن لیجئے۔ ارقام فرماتے ہیں۔

یہ کتاب عزیز الفتاویٰ اس ذخیرہ فتاویٰ کی پہلی قسط ہے جو دارالعلوم دیوبند کے سب سے پہلے مفتی استاذ العلماء عمدۃ الاولیاء استاذ محترم حضرت مولانا عزیز الرحمٰن صاحب عثمانی دیوبندی قدس سرہٗ کے قلم سے نکلے اور دارالعلوم کے رجسٹروں کی چودہ ضخیم جلدوں میں مدون ہوئے جن میں سے دو جلدوں کے فتاویٰ بحذف مکررات اس مجموعہ میں آگئے ہیں۔ یہ فتاویٰ پہلی دفعہ ماہنامہ المفتی دیوبند میں ۱۳۵۲ھ سے ۱۳۶۱ھ تک قسط وار آٹھ جلدوں میں شائع ہوئے۔ احقر ہی نے اس کی ترتیب واشاعت کا اہتمام کیا تھا۔۔۔

(حضرت مفتی عزیز الرحمٰن کے قلم سے) ۱۳۱۰ھ سے ۱۳۴۵ھ تک پینتیس سال کی طویل مدت میں ہر باب کے متعلق تمام ضروریات اسلامیہ پر مشتمل ہزارہا فتاویٰ تحریر میں آئے۔ دارالعلوم دیوبند کی مرکزیت شہرت کی وجہ سے مہمات ومشکلات کا رجوع اس طرف ہوا۔ اور جن مسائل کو علماء وارباب فتویٰ لاینحل سمجھتے یا باہمی اختلاف کی بناء پر طے نہ ہوسکتے وہ یہاں بھیجے جاتے۔ اور حضرت مفتی صاحب قدس سرہٗ کا ہر جواب خداداد علمی قابلیت اور تفقہ فی الدین کا ایک خاص مظہر ہوتا تھا۔ اس لیے یہ مجموعہ فتاویٰ نہ صرف عوام کے لیے بلکہ علماء وارباب فتویٰ کے لیے بھی ایک نہایت مکمل رہبر ورہنما ہے۔ جو دارالافتاء کی تیرہ چودہ ضخیم جلدوں میں محفوظ ومدون ہے۔ لیکن چونکہ اندراج فتاویٰ کا حسب ترتیب سوال کیا جاتا ہے اور ابواب وفصول کی ترتیب اس میں قائم نہیں کی جاسکتی۔ اس لیے کسی خاص فتویٰ کا اس عظیم الشان ذخیرہ سے نکالنا اور اس سے فائدہ اٹھانا متعذر ہوگیا تھا اور اسی بناء پر یہ علمی جواہرات کا دفینہ تقریباً بیکار رکھا ہوا تھا اور ضرورت تھی کہ اس کی ابواب فقہی پر ترتیب دی جائے۔ تاکہ بوقت ضرورت ہر مسئلہ کا استخراج آسان ہوسکے۔

نیز کثرت مشاغل کی بناء پر اس نقل کی مطابقت اصل کے ساتھ نہ ہوسکنے کی وجہ سے تمام فتاویٰ اغلاط کتابت سے لبریز ہیں، ضرورت ہے کہ اس پر نظرِ ثانی کرکے تصحیح کی جاوے۔ اس

ناکارۂ خلائق کو مدت سے یہ خیال تھا کہ استاذ رحمۃ اللہ علیہ کی یہ عمر بھر کی کمائی جو گرانقدر علمی ذخائر پر مشتمل ہے اگر اس طرح مبوّب اور منصب ہو کر شائع ہو جاوے۔ تو اکابر دارالعلوم کی تجویز مطبوعہ روئداد ۱۳۰۴ھ کے مطابق عام اہل اسلام اور علماء و اہل فتویٰ کے لیے ایک نہایت بیش بہا مفید ذخیرہ ہو جاوے۔ اور حضرت ممدوح کا یہ صدقۂ جاریہ کام میں لگ جاوے۔ اس کام کی اہمیت و کثرت اور اوھر اپنی علمی بے بضاعتی اور ہجوم مشاغل ہمیشہ اس پر اقدام کرنے سے روکتے تھے۔ تاآنکہ حق تعالیٰ نے المفتی کے نام سے ایک ماہوار رسالہ کے اجراء کی صورت بعض اکابر اور بہت سے احباب کے دل میں ڈالی۔ جس میں کام کی تدریج پر نظر کر کے ہمت بڑھی۔ تو بنام خدا تعالیٰ اس کام کو شروع کیا۔ اور اس اشاعت میں جو امور بطور اصول موضوعہ زیر نظر ہے۔ وہ یہ ہیں۔

(۱) جس قدر جلدیں موجود ہیں۔ ان کو ابتداء سے بترتیب سنین شروع کیا۔

(۲) ترتیب الواب فقہیہ پر رکھی جس کی فہرست ہر جلد کے شروع میں لگا دی گئی۔

(۳) بالفعل ہر جلد کی ترتیب جدا جدا رکھی گئی۔ مثلاً ایسا نہیں کیا گیا کہ ابتداء سے ۱۳۴۵ھ تک کے تمام رجسٹروں سے کتاب الطہارت کے مسائل کا انتخاب کر کے ایک جگہ لکھا جائے۔ پھر اسی طرح کتاب صلوٰۃ و زکوٰۃ وغیرہ کا کیونکہ اس صورت میں طول بہت ہے۔ بلکہ ایک جلد سے طہارت کے مسائل کا انتخاب کر کے لکھ دیا گیا۔ پھر اسی جلد کے مسائل صلوٰۃ و زکوٰۃ وغیرہ لکھ کر مکمل کر دیا گیا۔ اس کی تکمیل کے بعد دوسرے رجسٹر کو اسی طرح مرتب کیا گیا۔

(۴) ایک ہی مسئلہ اگر مکرر کہیں جگہ آیا ہے تو مکررات کو حذف کر دیا گیا۔

(۵) اغلاط کاتب کی اصلاح اگر بسہولت بدرجۂ یقین ہو سکی تو تصحیح کر کے شائع کر دیا گیا اور جس مسئلہ میں صحت مشکل ہوئی اسے ترک کر دیا گیا۔

(۶) بعض جگہ حسب ضرورت فوائد و حواشی کا اضافہ بھی احقر کی طرف سے ہوا۔

(۷) اگر کسی مسئلہ میں احقر کو علمی طور پر کوئی شبہ ہوا تو دوسرے اکابر کے مشورے کے بعد اس کی اشاعت یا عدم اشاعت کا فیصلہ کیا گیا۔

اصول مذکورہ کے تحت صرف دو رجسٹروں کے فتاویٰ ماہنامہ المفتی دیوبند کی آٹھ جلدوں میں شائع ہوئے تھے مگر ان میں تبویب و ترتیب کا پورا اہتمام نہ ہو سکا۔ اور قلت وسائل کے سبب

تصحیح بھی پوری نہ ہو سکی۔ اغلاط کتابت سب رہ گئے۔ اب جمادی الاولیٰ ۱۳۸۲ھ میں اس کی طبع ثانی کے وقت برخوردار عزیز مولوی محمد رفیع سلمہ مدرس دارالعلوم کراچی سے اس کی مکرر تصحیح کرادی گئی۔ وہ اس طرح کہ المفتی کی پوری آٹھ جلدوں کے سب فتاویٰ کو ابواب فقہیہ پر یکجا مرتب کر دیا گیا۔ اور کہیں کہیں حواشی کا اضافہ بھی کیا گیا ہے۔

الغرض جب مفتی صاحبؒ کے فتاویٰ کی اشاعت کا خیال آیا۔ حضرت سیدی حکیم الامت قدس سرہٗ سے بطور مشورہ عرض کیا۔ حضرتؒ نے بہت پسند فرمایا اور اشاعت کی ترغیب دی۔ ساتھ ہی یہ مشورہ دیا کہ اپنے فتاویٰ کا ایک سلسلہ اس کے ساتھ شائع ہوتا ہے تو بہتر ہے۔ اور میرے تحریر کردہ فتاویٰ کا نام بھی حضرت قدس سرہٗ نے امداد المفتیین تجویز فرمایا۔ کیونکہ خود حضرتؒ کے فتاویٰ کا نام امداد الفتاویٰ رکھا جا چکا تھا۔ اور پھر خانقاہ تھانہ بھون میں جب فتاویٰ کا کام حضرت مولانا ظفر احمد مدظلہم کے سپرد ہوا تو ان کے فتاویٰ کا نام حضرتؒ نے امداد الاحکام تجویز فرمایا۔ پھر مولانا عبدالکریم صاحب گمتھلی نے جب خانقاہ میں فتاویٰ کا کام شروع کیا۔ تو ان کے سلسلہ فتاویٰ کا نام امداد المسائل رکھا۔ اسی سلسلہ امدادیہ کے تفاول کے ساتھ احقر کے محررہ مسائل کا نام امداد المفتیین رکھا گیا۔ اور ۱۳۵۲ھ میں بنام خدا تعالیٰ فتاویٰ کے دونوں سلسلوں کی اشاعت شروع ہوگئی۔ حضرت الاستاذ مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحبؒ کے فتاویٰ بنام عزیز الفتاویٰ اور احقر کے محررہ مسائل بنام امداد المفتیین شائع ہونے لگے۔ آٹھ سال بحمد اللہ یہ سلسلہ جاری رہا۔ اور دونوں سلسلوں کی آٹھ آٹھ جلدیں تیار ہوگئیں۔ اس تمام سعی میں عزیز الفتاویٰ کی اشاعت تو اصل مقصود تھی۔ اور اپنی فتاویٰ کو شائع کرنے سے یہ مقصود یہ تھا۔ کہ اہل علم کی نظر سے گزریں گے تو اصلاح ہو جائے گی۔ چنانچہ اب جلد اول و دوم کی طبع ثانی کے وقت یہ دونوں جلدیں حضرت مولانا عبدالکریم گمتھلی مفتی تھانہ بھون اور مولانا محمد سعید صاحب مدظلہم مفتی مظاہر العلوم سہارنپور کے لیے پیش کیں حضرت مولانا محمد سعید صاحب مدظلہم نے کرم فرما کر بالاستیعاب ملاحظہ فرمایا۔ اور چند مواقع میں اصلاحی مشورے بھی تحریر فرمائے۔

جو اپنی اپنی جگہ بطور حواشی کے ثبت کر دیے گئے۔ اور بعض مواقع میں ان کے مشوروں کے موافق اصل کتاب میں ترمیم کر دی گئی۔ اور یہ پہلے معلوم ہو چکا ہے کہ احقر کے کثیر التعداد فتاویٰ پر حضرت (میاں جی) مولانا اصغر حسین محدث دارالعلوم بھی نظر فرماتے رہے اور اہم فتاویٰ میں سیدی حکیم الامت قدس سرہٗ کی نظر و اصلاح کا بھی شرف حاصل ہوا۔ مگر افسوس کہ کام کرنے کے وقت اس کا اہتمام نہ ہو سکا کہ ایسے سب

فتاویٰ پر ان حضرات کے دستخط یا کم از کم ان کی نظر سے گزرنے کی کیفیت لکھ دی جاتی۔ بعض پر لکھی گئی بعض پر نہیں۔ بہر حال اب ان حضرات اکابر کی نظر و اصلاح کے بعد امید ہو گئی کہ یہ مجموعہ بھی ایک مفید مجموعہ ہو جاوے گا۔

وماذٰلک علی اللّٰہ بعزیز"

حضرت مفتی صاحب قدس سرہٗ کی خدمات و تعداد فتویٰ کی کثرت کے بارے میں مفتی محمد شفیع عثمانی صاحب کی یہ تحریر بہت اہم ہے۔

"آپ کے فتاویٰ کی جو چار جلدیں شائع ہوئی ہیں وہ بارہ سال (جب کہ آپ صدر مفتی دارالعلوم دیوبند تھے) کے مجموعی فتاویٰ کا پندرہواں حصہ بھی نہیں۔ اگر وہ سب فتاویٰ شائع کئے جائیں جو آپ نے اس تیرہ سالہ دور میں تحریر فرمائے تو وہ ساٹھ ضخیم جلدوں میں سما سکیں گے اور جو فتاویٰ اس زمانہ میں درج رجسٹر نہیں ہوئے (جن کی تعداد بہت ہے) وہ ان کے علاوہ ہیں۔ یہ سب اعداد و شمار تو صرف ان فتاویٰ کے ہیں جو آپ نے صدر مفتی دارالعلوم دیوبند کی حیثیت سے تحریر فرمائے ہیں پھر اس کے بعد ۱۳۶۲ھ میں جب آپ دارالعلوم دیوبند سے مستعفی ہو گئے۔ تو عوام و خواص کے بکثرت رجوع کے باعث اور حضرت تھانویؒ کی ہدایت کی بنا پر افتاء کا سلسلہ اب بھی برابر جاری رہا۔ تحریری بھی اور زبانی بھی۔

"افسوس ہے کہ ۱۳۶۲ھ سے ۱۳۷۱ھ تک (نو سال کے عرصہ میں) جو فتاویٰ جاری کئے گئے ان کی نقل رجسٹروں میں باقاعدہ محفوظ کی جا سکی نہ ان کی تعداد کا صحیح اندازہ لگایا جا سکتا ہے:

۱۹۵۲ء سے ۱۹۵۹ء تک آٹھ سال کی مدت میں دارالعلوم کراچی کے دارالافتاء سے (حضرت مفتی صاحب مدظلہم کے قلم سے) ستر ہزار نو سو بارہ فتوے جاری ہوئے ان کے علاوہ مجلسی فیصلوں اور زبانی فتووں کی تعداد بے شمار ہے۔

(بحوالہ جائزہ مدارس عربیہ مغربی پاکستان) (فتاویٰ دیوبند ج۱ ص۱۳)

اس سے پہلے نو سال اور بعد کے سترہ سال کے فتاویٰ کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ کہ وصال سے چند گھنٹے پیشتر تک یہ عالی خدمت جاری تھی۔ رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃً واسعۃً۔

مفتی صاحبؒ کے فتاویٰ کی اہمیت و قدر اکابر کی نظر میں:۔ حضرت مجدد الملت نور اللہ مرقدہ اس زمانے کے رئیس الفقہاء اور امام المتقین تھے۔ جس پر آپ کی فقہی کتابیں شاہد عدل ہیں۔ حضرت مفتی محمد شفیع

رحمۃ اللہ علیہ کو فتاویٰ کے بارے میں حضرت تھانوی قدس سرہٗ کا اعتماد حضرت مفتی صاحبؒ کے فتاویٰ
کے لیے اس دور میں سب سے بڑی سند ہے۔ بارہا آپ نے متعدد خلفاء کی فقہی تحریر دل اور فتاویٰ میں سب سے
زیادہ پسند حضرت مفتی صاحب کی علمی تحقیق کو فرمایا۔ کئی بار اپنے ذاتی معاملات میں ان سے استفتاء
فرمایا اور اس پر عمل فرمایا ایک بار اس قسم کے ایک ذاتی معاملہ کے استفتار کے جواب میں حضرت
مفتی صاحبؒ کے فتویٰ ملنے پر اپنے خط میں ارقام فرمایا "آپ کا فتویٰ ملا، اللہ تعالیٰ آپ کی عمر
دراز کرے پڑھ کر دو خوشیاں ہوئیں۔ ایک تو اس کی کہ علم حاصل ہوا دوسری اس بات کی کہ اللہ تعالیٰ
کا شکر ہے کہ میرے بعد بھی کام کرنے والے موجود ہیں" حضرت تھانوی نور اللہ مرقدہٗ کو حضرت مفتی صاحبؒ
کے فتاویٰ اور فقہی رسائل پر تصویب اور تعریف کی عبارت کئی مقام پر ملتی ہیں۔ تطویل کا اندیشہ ہے
اس لیے مختصر تین عبارتیں نقل کرتا ہوں۔ حضرت مفتی صاحبؒ کے رسالہ نہایات الارب فی غایات
النسب پر مستقلاً تقریظ وصل السبب فی فصل النسب کے نام سے تحریر فرمائی اس کے صرف چند جملے
مزد مباہات کے لیے کافی ہیں ارشاد ہے "چنانچہ مولوی صاحب نے یہ رسالہ لکھ کر میرے پاس
بھیج دیا۔ مطالعہ سے اس کی نافعیت کا مشاہدہ کر کے بے حد مسرت ہوئی اور دعادی دی۔ ہر چند کہ رسالہ
کے کافی وافی ہونے کے بعد کچھ لکھنے کی حاجت نہ تھی مگر چونکہ عنوان کے تفاوت سے بھی بعض اوقات
نفع میں اضافہ ہوتا ہے اس لیے چند سطریں بصورت فوائد متفرقہ کے لکھ کر اس وعدہ کو پورا کرتا ہوں
کہ آپ رسالہ کو پورا کرلیں پھر میں اس کا تتمہ لکھ دوں گا (جواہر الفقہ، ج ۲ ص ۱۹)
سمت قبلہ کے بارے میں حضرت مفتی صاحبؒ کے ایک فتویٰ کی تصدیق و تصویب پر یہ الفاظ
رقم فرمائے "بعد الحمد والصلوٰۃ۔ میں نے اس فتویٰ کو دیکھا مسئلہ زیر بحث میں کافی و وافی پایا جس سے
میں حرفاً حرفاً متفق ہوں اور سہولت تعبیر کے لیئے اس کو تنقیح المقال فی تصحیح الاستقبال ملقب کرتا ہوں
ہوں آپ کے رسالہ "وصل الافکار الی وصول الاکفار" پر حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ ارقام فرماتے
ہیں "مولوی محمد شفیع صاحب نے اصول تکفیر میں ایک مختصر اور جامع و مانع و نافع رسالہ لکھا بعض اجزاء
میں میں بھی الجھا تھا مگر ان کی تقریر و تحریر سے قریب مسئلہ صاف ہوگیا وہ عنقریب چھپ جائے گا میں
نے اس کا نام رکھا ہے "وصول الافکار الی وصول الاکفار"
حضرت مفتی صاحبؒ کی اس فقہی بصیرت اور فتاویٰ پر اعتماد کی وجہ سے حضرت تھانوی قدس سرہٗ

نے طلبا کی تصنیف کی ضرورت محسوس فرمائی اور مشاغل یا ضعف کی وجہ سے یہ کام نہ کر سکے تو اس تصنیف کا کام حضرت مفتی صاحبؒ کے سپرد فرمایا مثلاً نہایات الارب، آثار المصوت اور حیلۂ ناجزہ وغیرہ۔ اسی طرح احکام القرآن کا کام بھی دیگر علماء کے ساتھ حضرت مفتی صاحبؒ کے حوالے فرمایا اور تھانہ بھون میں بلا کر اپنے پاس رکھا اور اپنی نگرانی میں یہ کام شروع کروایا اسی طرح اپنی بعض دیگر تصانیف میں ان کو کسی درجہ میں شریک فرمایا۔ شیخ الاسلام حضرت علامہ شبیر احمد عثمانی نور اللہ مرقدہٗ کی جلالت شان اور علمی مقام سے کون ناواقف ہے باوجود حضرت مفتی صاحبؒ کے استاذ ہونے کے فتاوٰی کے بارے میں ان پر بھروسہ کرتے اور اس کام کو ان کے سپرد کرتے تھے۔ چنانچہ حضرت مفتی صاحبؒ ایک مقام پر تحریر فرماتے ہیں۔

"حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ اگرچہ احقر کے استاد اور مربی تھے مگر غایت تواضع سے فتوٰی کا کام احقر کے سپرد فرماتے تھے۔ اوزان شرعیہ پر آپ کا رسالہ شائع ہوا تو حضرت علامہ عثمانیؒ نے تقریظ تصدیق فرماتے ہوئے ارقام فرمایا" برادر محترم جناب مولانا مفتی محمد شفیع صاحب کا یہ رسالہ میں نے پڑھا بے حد محظوظ و مستفید ہوا اس قدر تحقیق و کاوش آپ ہی کا حصہ تھا، حق تعالیٰ جزائے خیر دے مجھے اس کے مضمون سے اتفاق ہے۔ سیدی و سندی حضرت سید الملت علامہ سید سلیمان ندوی نور اللہ مرقدہٗ اتفاقی سفر سے پاکستان تشریف لائے قیام پاکستان کے سلسلہ میں کوئی فیصلہ نہیں ہو رہا تھا دونوں ملکوں کے عمائد اور مسلمان اپنے ملک میں اس متاع گرانمایہ کو رکھنا چاہتے تھے اس کشاکش اور کشمکش کا فیصلہ اس طرح ہوا کہ ایک دن فقیر اپنے حضرت والا قدس سرہٗ کی خدمت میں حاضر تھا حضرت مفتی صاحبؒ تشریف لائے باتوں میں آپ کی ہجرت اور ہندوستان واپسی کا تذکرہ چل نکلا۔ حضرت مفتی صاحبؒ نے فرمایا دار الاسلام آ کر پھر ہندوستان جانا سمجھ میں نہیں آتا۔ حضرت مفتی صاحب کی اتنی سی بات پر آپ کو پاکستان میں مستقل قیام اور ہجرت کے بارے میں شرح صدر ہوگیا اور پاکستان میں مستقلاً ٹھہرنے کا ارادہ فرمالیا۔ حضرت سید والا قدس سرہٗ کی نظر میں حضرت مفتی صاحبؒ کی فقہی رائے کی جو قدر تھی اس کا اندازہ صرف اس ایک واقعہ سے ہی ہو سکتا ہے۔ اس طرح بندہ کی موجودگی میں حضرت مفتی صاحبؒ نے حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ سے جمعیت علماء اسلام کی صدارت قبول کرنے کے لیے فرمایا۔ حضرت والا رحمہ اللہ تعالیٰ نے اولاً انکار فرمایا۔ حضرت موصوفؒ کے اصرار پر فرمایا کہ جمعیت فلاں شخص کی ہر رائے کو خواہ صواب ہو یا خطا (اس کے اثر کی وجہ سے) قبول کرے گی

اس لیے صدارت قبول کرنا مشکل ہے۔ حضرت مفتی صاحبؒ نے فرمایا ہمارے اکابر کا مسلک یہ ہے کہ حق بات قبول کریں اور غلط کو رد" اس پر حضرت والا رحمہ اللہ تعالیٰ خاموش ہو گئے گویا صدارت قبول فرمالی۔ رسالہ "اوزان شرعیہ" کی تقریظ و تصدیق کے سلسلہ میں رقم فرمایا۔

" رسالہ مقادیر شرعیہ نظر سے گذرا بڑی ضروری تحقیق فرمائی۔ آپ اجازت دیں تو اس کی تلخیص معارف میں شائع کر دوں میں خود اس میں بہت متردد تھا مگر چونکہ حساب سے مجھے فطرۃً لگاؤ نہیں اس لئے کبھی ادھر کبھی اُدھر میلان ہوتا تھا مولانا سجاد صاحب مرحوم کی بھی تحقیق مولانا عبدالحی صاحب فرنگی محلی سے مختلف تھی اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر دے"

حضرت تھانویؒ کے علاوہ دو بزرگوں کی رائے نمونۃً لکھ دی ورنہ اس دور کے جملہ اساطین فقہاء اور مفتیان عظام حضرت مفتی صاحب موصوفؒ کی فقاہت اور فتاویٰ نویسی کی مہارت و کمال پر متفق تھے وذالِکَ فضل اللہ یُؤتیہ من یشاء۔ غرض فقہ و فتاویٰ میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی حضرت مفتی صاحبؒ کیلئے جانشینی میں تو کسی کو کلام نہیں ہو سکتا۔

چونکہ بات چل پڑی ہے اس لیے فقہ و فتاویٰ نویسی کے بارے میں حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی بعض اہم اور ضروری تصانیف و رسائل کا تذکرہ کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت مفتی صاحبؒ کو اس فن شریف کی جس قدر خدمت کی توفیق عطا فرمائی تھی اس کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ عصر حاضر کے ایسے مسائل جو موجودہ معاشرتی۔ نظریاتی، تمدنی، سیاسی و اقتصادی وغیرہ ضرورتیات نے پیدا کر دیئے اور جن کی تفصیلات کتب سلف میں نہیں ملتیں ان پر آپنے خامہ فرسائی فرمائی ہے اور بعض مضامین پر بار بار لکھا ہے اگر نئی تحقیق سامنے آئی یا علماء نے توجہ دلائی تو علمائے ربانیین کی طرح اپنی رائے سے رجوع فرمایا۔ اس سلسلہ میں آپ کے بے شمار فتاویٰ کے علاوہ آپ کی مستقل تصانیف تحقیقی مقالات اور رسائل ہیں صرف فقہ پر آپ کی تصانیف ایک سو کے قریب ہیں۔ جن میں سے بعض چند صفحات پر مشتمل ہیں تو بعض سینکڑوں صفحات سے متجاوز ہیں۔ شاذ ہی زمانہ حاضرہ کا کوئی مسئلہ ہو جس پر فقیہ الملت رحمہ اللہ تعالیٰ نے اپنی بصیرت کے مطابق اپنی رائے کا اظہار فرما کر دینی اور فقہی رہنمائی نہ فرمائی ہو۔ حق یہ ہے کہ بڑی بڑی اکادمیاں اس کام کے کرنے سے قاصر ہیں جو اس بوریہ نشین درویش بے گلیم نے اکیلے کر کے دکھا دیا۔ ذالک من فضل اللہ علینا وعلی الناس ولکنّ اکثر الناس لا یشکرون (یوسف - ۳۸) کاش امت مسلمہ کے تمام طبقات اور خصوصاً دینیہ

طبقہ ان جواہر پاروں کو جانتا اور قدر کرتا۔ تو آج بعض نام نہاد زعماء اور زائغین کی کتابوں کی ملمع نہیں حق صریح سے دور نہ کر دیتی۔ و الی اللہ المشتکی وھو المستعان۔

یوں تو حضرت مفتی صاحبؒ کی فقیہانہ افتاد طبیعت کی بنا پر ان کی اکثر کتابوں میں ان کا یہ رنگ جھلک پڑتا ہے لیکن جو کتابیں اور رسائل فتاویٰ دیوبند (امداد المفتین) کے علاوہ اہم ہیں ان کا اجمالی تذکرہ کرتا ہوں تاکہ معلوم ہو سکے کہ اس بوریا نشین فقیر نے امت کے خزائن علمی و فقہی کو کتنا گراں بار کیا۔

۲۔ احکام القرآن عربی۔ حضرت تھانوی نور اللہ مرقدہٗ کو مذہب حنفی سے جو شغف و اشتغال تھا اس کا تقاضا تھا جیسے بعض ابنائے زمانہ کے حنفی مسلک کے بارے میں بے جا اعتراضات نے شدید کر دیا تھا کہ فقہ و مسلک حنفی کے ادلہ کو قرآن و حدیث سے مزید مدلل اور منقح کیا جائے اس کے لیے حضرت نور اللہ مرقدہ نے علمائے کرام کی ایک جماعت کو مقرر فرمایا۔ حضرت مفتی صاحبؒ کی تخصیص یہ تھی کہ اُنہیں اپنے ہاں بلوالیا اور سورۃ الشعراء سے سورۃ الحجرات تک کام سپرد کیا اور مسائل کے دلائل وغیرہ خود بھی بیان فرماتے تھے اور حضرت مفتی صاحبؒ اپنی جگہ پر آکر انہیں ہو بہو قلمبند کر لیتے تھے۔ (کما قال مُرشدی رحمہ اللہ تعالیٰ) مزید برآں اپنی تحقیقات کے ساتھ انہیں ہر آیت کے ذیل میں جمع کرتے جاتے تھے۔ اس سے احکام القرآن کا وہ کارنامہ انجام پایا جس کو دیکھ کر انسان استعجاب و حیرت و مسرت کے جذبات میں گم ہو جاتا ہے۔ بعض آیات کے ذیل میں تحقیق کا استیفاء و استیعاب، مراجع کی کثرت مصنف کی احتیاط و انصاف فقیہانہ ژرف نگاہی و دقیقہ رسی مواد کو سمیٹتے ہوئے مستقل رسائل کی صورت اختیار کر لیتی ہے جس کی داد وہی لوگ دے سکتے ہیں جن کا ان مباحث میں وقت گذرا ہو۔ مثلاً وَمِنَ النَّاسِ مَن يَشْتَرِي لَهْوَ الْحَدِيثِ کی تفسیر السعی الحثیث و تفسیر لہو الحدیث کے عنوان سے ۸۴ صفحات پر دو مختلف فصلوں میں کی گئی ہے پہلی فصل کا نام النائی عن الملاہی اور دوسری فصل کا نام کشف الغبار عن وصف الغنا رکھا۔ ان فصلوں کی وسعت و عمق مذاہب اربعہ کے اقوال کا استیفاء اور قول فیصل مصنف کے علم و وقوف و فقاہت کے بارے میں قاری کو مسرت آمیز حیرت میں ڈال دیتا ہے اور بے اختیار پکار اٹھتا ہے کہ شاید اب کوئی مصنف اس پر اضافہ نہیں کر سکے گا۔ یہ علمی معجزہ پورے سو گھنٹے میں مکمل ہوا (احکام القرآن ص ۱۹۳ جز ۵ حاشیہ)

طوالت کا خوف قلم کو روکتا ہے ورنہ اس عجیب کتاب کے بعض "روائع" کو نقل کرنے کو بے اختیار

۱؎ فقہی کتابوں میں پہلا نمبر فتاویٰ دیوبند (امداد المفتین) کو دیا ہے۔

بھی چاہتا ہے احکام القرآن جلد خامس وسادس (سورۂ شعراء سے سورۂ حجرات تک) میں تقریباً چار سو عنوانات کے تحت علوم و معارف کا خزانہ جمع کر دیا گیا ہے جس کا اندازہ کتاب کے پڑھنے ہی سے ہوتا ہے مثلاً سلیمان علیہ السلام کے بلقیس کو خط بھیجنے کی آیتوں کے تحت جن فوائد کی سرخیاں قائم کی ہیں ان سے کتاب کے مباحث کا اندازہ ہو سکتا ہے۔
ملاحظہ فرمایئے۔ ۱۔ الخط معتبر فی الدیانات۔ ۲۔ جواز ارسال الکتب الی المشرکین۔ ۳۔ رعایۃ الادب مع الملوک مندوب۔ ۴۔ من ادب الکتاب ان یختم اویطبع فی لفافۃ۔ ۵۔ فائدۃ فی ان کتاب سلیمان فی ای لسان کان وفی ای خط۔ ۶۔ من السنۃ تقدیم اسم الکاتب علی اسم المکتوب الیہ فی الکتاب ۷۔ السنۃ تقدیم بسملۃ علی مضمون الکتاب۔ ۸۔ یجوز وضع کتاب فیہ بعض آیات القرآن الی المشرک۔
(احکام القرآن ج ۵ ص ۲۰۱۹)

حقیقت ہے کہ یہ کتاب اسلام کے فقہی و علمی خزانہ کا ایک بیش بہا موتی ہے۔

۳۔ جواہر الفقہ:۔ دو جلدوں میں ایک ہزار صفحات پر مشتمل ہے اور اسم بامسمیٰ ہے اس میں حضرت مفتی صاحبؒ کے چالیس نادر فقہی رسائل کو جمع کر دیا گیا ہے جو وقت کے اہم مسائل کے بارے میں عجیب و غریب محققانہ فقہی مباحث اور ان کے دینی احکام پر مشتمل ہے۔ یہ مجموعہ حضرت مفتی صاحب کی فقہی بصیرت و دقیق رسی، علمی عمق اور وسعت فنی فوق و سمجھ پر دلیل قاطع و شاہد ساطع ہے ہر رسالہ میں مسئلہ کو دلائل قویہ سے منقح و مدلل فرما کر اس کے شرعی حکم کو انتہائی وضوح کے ساتھ بیان فرمایا شواہد اتنے واضح اور زبان اتنی شگفتہ ہے کہ قاری کے سامنے سے شک و ریب اور اشکالات کے پردے اٹھ جاتے ہیں اور مسئلہ اپنی حقیقت کے ساتھ اپنے اصلی حکم میں جلوہ گر ہو کر تسلی و تشفی کر دیتا ہے اور دل گواہی دیتا ہے۔ ادھر وہ کہتا گیا ادھر آ گیا دل میں

اثر یہ ہو نہیں سکتا کبھی دعوئے باطل میں

طوالت کا اندیشہ ہے ورنہ ایک ایک موضوع پر تفصیل بات کر کے اس کے عزایا کو بتایا جاتا، مجبوراً عنوانات اور مختصر تعارف پر اکتفا کرتا ہوں۔ قارئین عنوانات کے تنوع اور بوقلمونی ہی سے مجموعہ کی اہمیت اور وسعت و رنگارنگی اور مصنف کی جامعیت و علم و فن پر عبور کا اندازہ کر لیں گے

۱۔ رسالہ وصول الافکار فی اصول الاکفار۔ یعنی تکفیر کے اصول۔

اس رسالہ میں افراط و تفریط سے بچ کر کفر و اسلام کا معیار بتایا گیا ہے اور اس بات کی وضاحت

کی گئی ہے کہ کیا کسی مسلمان کہلائے جانے والے شخص کو مرتد یا خارج از اسلام کہا جا سکتا ہے؟ اور وہ کونسی گمراہیاں ہیں جو انسان کو کفر تک پہنچا دیتی ہیں۔ مزید برآں اس ضمن میں چکڑالوی، مرزائی اور آغاخانی فرقوں کی صحیح دینی حیثیت بتائی گئی ہے۔ فقیر کے نزدیک امام العصر حضرت الشیخ علامہ انور شاہ کشمیری قدس سرہٗ کی اکفار الملحدین کے بعد اپنے موضوع پر دورِ حاضر کا انتہائی جامع مانع اور نافع بصیرت افزا رسالہ ہے جسے قدیم کے علاوہ جدید طبقے کے ہر اس شخص کو پڑھنا چاہیئے جو کفر و اسلام کی حدود اور تکفیر کا مسئلہ سمجھنا چاہتا ہے۔

۲۔ تحذیر الامام عن تغییر رسم النظام مصحف الامام یعنی قرآن کا رسم الخط اور اس کے احکام۔
اس رسالہ میں مصحف عثمانی کے اتباع کے متعلق تمام ضروری احکام جمع کر دیئے گئے ہیں مزید برآں موجودہ دور میں مغربیت کے زیر اثر یا مقامی ان بولیوں کی وجہ سے جو ادھر ہیں طرف سے کہی جاتی ہیں ان سوالات کے جوابات بھی آگئے ہیں۔ کیا متن عربی جو مصحف عثمانی کے مطابق ہے اسے اور کسی زبان کے رسم الخط میں وہ شامل ہو یا ہندی رومن ہو یا کوئی اور لکھا جا سکتا ہے یا نہیں؟ اور کیا ایک صفحہ یا ایک کالم پر عربی متن قرآن کریم اور بالمقابل ترجمہ لکھا جا سکتا ہے یا نہیں؟ ان امور میں یہ رسالہ موجودہ دور کے جملہ اشکالات کا شافی جواب ہے۔

۳۔ صیانۃ القرآن عن تغییر الرسم واللسان کیا قرآن مجید کا صرف ترجمہ شائع کیا جا سکتا ہے؟
اس مسئلہ کے بارے میں جو غیروں کی تقلید سے بعض مسلمانوں کے ذہن و عمل میں آنے لگا ہے ائمہ اربعہ کے مذاہب کی روشنی میں وافی کلام کیا گیا ہے۔ رسالہ اپنے موضوع پر قابل دید ہے آخر میں و تنبیہ کے عنوان سے مضمون کا عطر و مغز پیش کر دیا ہے اور متجددین کے لیے سرمۂ بینش اور آیۂ عبرت ہے۔

۴۔ مسئلہ تقلید شخصی:۔ گذشتہ سو ڈیڑھ سو سال سے یہ مسئلہ مقلدین اور غیر مقلدین میں معرکۃ الآراء حیثیت اختیار کئے ہوئے ہے سلف سے اس کے بارے میں مستقل رسائل لکھے جانے کا اہتمام رہا ہے۔ اپنے استاذ حضرت مفتی عزیز الرحمٰن رحمہ اللہ تعالیٰ کے تقلید کے بارے میں چند پیش کردہ سوالات کا جواب حضرت مفتی صاحبؒ نے اپنے زمانۂ طالب علمی میں دیا تھا۔ طالب علمی کی یہ تحریر حضرت مفتی صاحبؒ کی "استاذی اور "پختہ کاری" کی دلیل یا ہدایت "نہایت" کی طرف مشیر ہونے کا واضح ثبوت ہے چند بعد کی تحریریں اور حضرت قطب الارشاد مولانا رشید احمد گنگوہی نور اللہ مرقدہٗ کا ایک خط اور حضرت شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کے چند افادات علمیہ بھی شامل کر دیئے گئے ہیں

رسالہ بڑا دلچسپ اور بصیرت افزا اور تقلید کی اہمیت پر برہان ساطع ہے۔

۵ ۔ اتمام الخیر فی الافتاء بمذہب الغیر ۔ دوسرے مذہب پر فتویٰ دینے کے حدود اصل میں اہل علم اور اہل فتویٰ کی رہنمائی کے لیے اس موضوع پر عربی میں ایک یادداشت ہے جس کے آخر میں مراجع کے حوالے دے دیے گئے ہیں کہ اگر کوئی متدین اور راسخ العلم عالم اس نہایت نازک اور اہم موضوع پر کہنا چاہے ۔ تو حدود و قیود کی رعایت کے ساتھ وہ اس مسئلہ کی شرح کو واضح کر سکے ۔ اہل علم کے یہ یادداشت بہت کار آمد ہے ۔ کاش اہل علم میں سے کوئی شخص اس کام کو سنبھالے اور آگے بڑھائے بانی اوّل کے لیے صدقہ جاریہ کے ثواب کے ساتھ ، نوازل و حوادث کے اس دور میں امت کی صحیح رہنمائی کرے ۔

۶ ۔ فتویٰ جماعت اسلامی ۔ جناب مودودی صاحب اور ان کی جماعت کے بارے میں حضرت مفتی صاحبؒ کا آخری فتویٰ ہے ۔ مودودی صاحب کے عقائد اور کتب پر پچھلے چالیس سال سے مختلف علمائے محققین نے لکھا ہے ۔ مودودی صاحب نے انبیاء علیہم السلام ، صحابہ کرام اور سلف صالحین کو جس طرح اپنی تنقید کا نشانہ بنایا ہے ۔ وہ ہر درد مند مسلمان کا سینہ چھلنی کرنے کے لیے کافی ہے ۔ ہمارے حضرت الاستاذ علامہ سید محمد یوسف البنوری نور اللہ مرقدہ کے آخری عمر کے رسائل الاستاذ المودودی اس بارے میں حرف آخر ہیں ، حضرت مفتی صاحبؒ اپنے انتہائی نرم و مصالحانہ مزاج و محتاط رویہ کے باوجود اپنے قلبی کرب کو روک نہیں سکے اور اپنی آخری فقہی رائے کا اس فتویٰ میں اظہار فرما دیا ۔ کاش مودودی صاحب عمر کے اس آخری دور میں کسی ناصح مشفق کی آواز پر لبیک کہ کر اپنی غلطیوں کا اعتراف اور اعلان حق کر دیتے کہ وَالْحَقُّ اَحَقُّ اَنْ یُتَّبَعَ ۔

۷ ۔ پیر و مرشد کا فقہی اختلاف ۔ یہ ایک خط اور اس کا دیباچہ ہے جس میں حضرت تھانوی نور اللہ مرقدہٗ اور حضرت مفتی صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کی ایک مسئلہ کے بارے میں ایک دوسرے کی رائے سے علمی وجوہ کی بنا پر شرح صدر نہ ہونے حضرت تھانویؒ کی بے نفسی اور حضرت مفتی صاحبؒ کا شیخ کے آداب کی رعایت کے ساتھ مسئلہ میں اختلاف کا تذکرہ ہے جو آج کل کے زائغین اور ناقدین کے لیے سرمہ بصیرت ہے اس سے واضح ہوتا ہے کہ ادب و احترام کی جملہ حدود و قیود کو باقی رکھتے ہوئے بھی اہل علم کے درمیان اختلاف ہو سکتا ہے ۔

۸ ۔ تعدیل الھادی فی تفضیل الایادی :۔ دست بوسی اور قدم بوسی (محررہ ۱۳۲۴)

اس رسالہ میں پہلے حضرت شیخ محمد عابد سندھی کے ایک مقالہ جو اس عنوان پر ہے کی تلخیص کی گئی

ہے۔ پھر نصوص اور اقوالِ فقہاء سے اس بارے میں اقتباسات جمع فرما کر بے نظیر تحقیق کی گئی ہے رسالہ کا سببِ کتابت بھی عجیب ہے۔ اور رسالہ بھی عجیب وغریب اور مسئلہ میں قول آخر و احوط۔

۹۔ مروجہ سیرت کمیٹی اور اس کی شرعی حیثیت:۔ موجودہ دور میں عید میلاد النبی صلی اللہ علیہ وسلم اور "سیرت" کے نام پر بدعات کا جو شیوع ہو رہا ہے۔ اس بارہ میں قابلِ دید رسالہ ہے۔

۱۰۔ مروجہ صلوٰۃ وسلام کی شرعی حیثیت:۔ یہ ایک استفتاء کا جواب ہے جس میں بعض طبقات کے گھڑے ہوئے درود وسلام کے طریقوں کی نکیر اور اس بارے میں صحیح عقیدہ اور طریقہ بتایا گیا ہے بڑا مفید رسالہ ہے۔

۱۱۔ مساجد کی نئی تشکیلیں اور ان کے مفاسد:۔ اس رسالہ میں ایک استفتاء کا جواب ہے جس میں مساجد کی اسلامی ہیئت کے باقی رکھنے اور یہود ونصاریٰ کے معابد اور دیگر ایسی ہیئتوں سے روکا گیا ہے جو مفاسد پیدا کرنے والی ہوں۔

۱۲۔ تنقیح المقال فی تصحیح الاستقبال۔ سمت قبلہ
سمت قبلہ کی شرعی حیثیت اور سمت معلوم کرنے کے طریقے کے بارے میں ایک معرکۃ الآراء مقالہ ہے جن کے ساتھ بعض دیگر حضرات کی تحریریں بھی شامل ہیں مشرقی صاحب کے قبلہ کے بارے میں مغالطوں کا بھی خوب ردّ آگیا ہے۔ حضرت مفتی صاحبؒ کی ریاضی وہیئت دانی کا بھی بہترین نمونہ ہے ضمیموں کے ساتھ اسی صفحات پر مشتمل ہے۔

۱۳۔ رفع الملامۃ عن القیام عند اول القیامۃ:۔ اقامت کے وقت مقتدی کب کھڑے ہوں اقامت نماز کے وقت امام اور مقتدی شروع اقامت کے وقت کھڑے ہوں یا بعد میں مؤذن کے کے کس کلمہ پر ایک فروعی مسئلہ ہے دونوں طریقے شرعاً جائز ہیں افضل اور اولیٰ ہونے میں اختلاف ہے بعض حلقوں نے اس مسئلہ کو بھی ما بہا النزاع بنا لیا۔ حضرت مفتی صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے اول تا آخر حدیث وفقہ سے اس کا محققانہ ومنصفانہ اور مصلحانہ فقہی فیصلہ لکھا ہے۔ جو ہر طبقہ کے دیکھنے اور عمل کرنے کے لائق ہے

۱۴۔ رفع التضاد عن احکام الضاد۔ حرف ضاد کا صحیح مخرج اور اس کے احکام حرف الضاد کا صحیح مخرج کیا ہے ظاء کے مشابہ ہے یا "دال" کے اہل عجم کے لیے چونکہ اس کا تلفظ خاصا مشکل ہے اس لیے یہ مسئلہ صدیوں سے بحث کا موضوع بنا رہا ہے کہ کیا اہل عجم اگر صحیح تلفظ نہ کر سکیں یا نہ کر سکیں۔ تو اس کا کیا حکم ہے اور کیا صحیح مخرج کے ادا نہ کرنے سے نماز ہوگی یا نہیں۔ حضرت مفتی صاحب قدس سرہٗ نے علامہ آلوسی کا روح المعانی سے ایک فتویٰ نقل کرنے کے بعد اپنے معلوم تفقہ اور ژرف

نگاہی سے اس پر سیر حاصل اور مدلل بحث کی ہے اور آخر میں خلاصۂ فتویٰ نقل کر دیا ہے۔ چونکہ ہر نماز میں ضاد کا تلفظ ہوتا ہے اور اس کی ضرورت شدیدہ ہے اس لیے اسے نقل کئے دیتا ہوں تحریر فرماتے ہیں۔

" خلاصۂ فتویٰ۔ الغرض حرف ضاد اپنے مخرج و صفات کے اعتبار سے ظاء خالص اور دال پُر دونوں سے بالکل جدا اور ایک مستقل حرف ہے اس کو جس طرح دال سے بدل کر (عوام کی طرح) پڑھنا غلطی ہے اسی طرح ظاء خالص سے بدل کر (بعض قراء زمانہ کی طرح) پڑھنا بھی غلطی صریح ہے لیکن فساد نماز کے بارے میں فتویٰ اس پر ہے کہ اگر جان بوجھ کر یا بے پروائی سے باوجود قادر بالفعل ہونے کے ایسا تغیر کرے کہ ضاد کی جگہ دال، ظاء خالص پڑھے تو نماز فاسد ہو جائے گی اور اگر بوجہ ناواقفیت اور تمیز ایسا سرزد ہو جائے اور وہ اپنے نزدیک یہی سمجھے کہ میں نے حرف ضاد پڑھا تو نماز صحیح ہو جائے گی جس کا حاصل یہ ہوا کہ عوام کی نماز تو بلا کسی تفصیل و تنقیح کے بہر حال صحیح ہو جاتی ہے خواہ ظا پڑھیں یا دال زاء وغیرہ۔ کیونکہ وہ قادر بھی نہیں اور سمجھتے بھی یہی ہیں کہ ہم نے اصلی حرف ادا کیا ہے اور قراء مجودین اور علماء کی نماز کے جواز میں تفصیل مذکور ہے کہ اگر غلطی قصداً یا بے پروائی سے ہو تو نماز فاسد ہے اور سبقت لسانی یا عدم تمیز کی وجہ سے ہو تو جائز و صحیح ہے (تنبیہ) لیکن نماز کے جواز و عدم فساد سے یہ ثابت نہیں ہوا کہ بے فکر ہو کر ہمیشہ غلط پڑھتے رہنا جائز ہو گیا اور پڑھنے والا گناہگار بھی نہ رہے گا۔ بلکہ اپنی قدرت و گنجائش کے موافق صحیح حروف پڑھنے کی مشق کرنا اور کوشش کرتے رہنا ضروری ہے ورنہ گناہگار ہو گا۔ اگرچہ نماز فاسد نہ ہو (جواہر الفقہ ص ۲۳۸، ۲۳۹ ج ۱) یہ رسالہ دیگر علماء کے فتاویٰ کے ساتھ ۸ صفحہ پر مشتمل ہے۔

۱۵۔ الاجوبۃ فی عربیۃ خطبۃ العروبۃ۔ خطبہ جمعہ عربی زبان میں کیوں ہے۔ (صفحات ۲۲)

جدید طبقے کے ژولیدہ دماغ کی ایک سوچ یہ بھی ہے کہ خطبہ جمعہ ملکی زبان میں ہونا چاہیئے اس رسالہ میں اس کا کافی و شافی جواب ہے۔ رسالہ کی اہمیت کے لیے حضرت حکیم الامت نور اللہ مرقدہ کی تقریظ الفاظ کافی ہیں " بعد الحمد والصلوٰۃ میں نے رسالہ مؤلفہ جامع کمالات مسلیہ مولانا محمد شفیع صاحب مدرس و مفتی مدرسہ دارالعلوم دیوبند دام فیضہ، نہایت شوق و رغبت سے دیکھا بیحد پسند کیا بلا تکلف کہہ سکتا ہوں کہ اس موضوع پر بے نظیر ہے اللہ تعالیٰ اس کو نافع اور شبہات کا دافع فرمائے ۔۔۔۔۔۔ "

۱۶۔ قنوت نازلہ۔ دعا کا طریقہ اور متعلقہ مسائل۔

۱۷ - احکام رمضان المبارک و مسائل زکوٰۃ مختصر رسالہ دس صفحات پر مشتمل ہے اور عامۃ الناس کے فائدہ کے لیے لکھا گیا ہے۔

۱۸ - حکم الاسقاط فی حیلۃ الاسقاط (سات صفحات)۔ میت کی فوت شدہ نماز۔ روزہ و حج۔ زکوٰۃ۔ اور دوسرے واجبات کی ادائیگی یا کفارہ کس طرح ادا کیا جاسکتا ہے۔ جس سے وہ گناہ سے سبکدوش ہو جائے اس سلسلہ میں بعض علاقوں میں مروجہ حیلہ اسقاط کا مدلل شرعی رد کیا گیا ہے اور فدیۂ نماز و روزہ وغیرہ کے صحیح مسائل و احکام درج کیے گئے ہیں۔ صوبہ سرحد کے دیہی علاقوں میں اس رسالہ کی اشاعت کی بہت ضرورت ہے۔

۱۹ - رویت ہلال کے شرعی احکام - ۸ صفحات ۔ یہ مختصر رسالہ حضرت مولانا ظفر احمد عثمانی، علامہ محمد یوسف بنوری رحمہما اللہ تعالیٰ اور مفتی رشید احمد صاحب کے اشتراک سے امت کو اس مسئلہ کے بارے میں انتشار سے بچانے کے لیے لکھا گیا حکومت اور عامۃ الناس سب کے لیے اس کا مطالعہ مفید ہے

۲۰ - اَسْرَجُ الأَقَاوِیلِ فِی المَوَازِینِ وَ المَکَائِیلِ - اوزان شرعیہ

۳۸ صفحات کا یہ مقالہ حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی علمی کاوش، تحقیق و فقاہت کا ایک عظیم و اہم اور قابلِ فخر شاہپارہ ہے جس کی داد اساطین علم نے دی ہے ۔ اس مقالہ میں درہم و دینار، صاع مد، فراع، میل وغیرہ کی مکمل تحقیق اور مروجہ اوزان و پیمانوں کے مطابق ان کی تشریح و توضیح کی گئی ہے ہمارے جدید ریاضی دان کاش ہمارے ان بوریا نشین فضلاء کی ان محنتوں کو جانتے اور قدر کرتے ۔

۲۱ - احکام عیدالاضحیٰ و قربانی ۔ یہ مختصر سا رسالہ ہے جو عوام الناس کے فائدے کے لیے عشرۂ ذی الحجۃ کے فضائل، تکبیر تشریق، نماز عید، قربانی کے وجوب و احکام وغیرہ پر لکھا گیا ہے ۔

۲۲ - رفع التلاحی عن جلود الأضاحی - چرم قربانی کے احکام اور بعض بریلوی علماء کے اس فتوے کے جواب میں ہے کہ چرم قربانی فروخت کرنے کے بعد بھی اغنیاء کو دینا جائز ہے ۔ دلائل قویّہ سے ثابت کیا ہے کہ چرم قربانی فروخت کرنے سے پہلے تو خود بھی استعمال کر سکتا ہے اور اغنیاء کو ہدیہ بھی دے سکتا ہے اور فقراء و مساکین پر صدقہ بھی کر سکتا ہے لیکن اگر روپیہ پیسوں کے عوض فروخت کر دیا تو خواہ کسی نیت سے فروخت کیا ہو اس کو صدقہ کر دینا واجب ہو جاتا ہے اور اس کا مصرف صرف فقراء و مساکین ہیں اغنیاء کو دینا یا ملازمین و مدرسین کی تنخواہوں میں دینا جائز نہیں ۔ جمادی ۱۳۶۵ھ ۔

*

۲۳ - الیواقیت فی أحکام المواقیت - یعنی مواقیت احرام اور ان کے مسائل (صفحات ۲۸)

اس رسالہ میں مواقیت کے بارے میں علمی و فقہی دلائل کے ساتھ حدودِ حرم میں داخل ہونے والوں کے لیے احرام باندھنے کے مقام کے بارے میں بحث کی گئی ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ مشرق (ہندوپاک) سے ہوائی جہاز میں آنے والوں کو تو جہاز پر سوار ہوتے ہی احرام باندھ لینا چاہیے۔ بحری جہاز والے اگر یلملم کے محاذات سے باندھ لیں تو بہتر ہے حضرت الاستاذ علامہ بنوری نور اللہ مرقدہٗ کی بھی یہی رائے ہے اور حضرت مفتی صاحبؒ کے نزدیک بھی احتیاط اسی میں ہے تفصیلات رسالہ میں دیکھی جا سکتی ہیں رسالہ اپنے موضوع پر خوب ہے۔

۲۴ - منہج الخیر فی الحج عن الغیر - حج بدل اور اس کے احکام۔ (۲۴ صفحات)

اس رسالہ کا اصل موضوع یہ ہے کہ حج بدل کرنے والا قران یا تمتع کر سکتا ہے یا نہیں ذیل میں دوسرے مسائل بھی جمع کر دیئے گئے ہیں۔ حاصل فتویٰ یہ ہے جہاں تک ممکن ہو حج بدل میں افراد یا قران کیا جائے۔ بعض مجبوریوں میں تمتع کی بھی گنجائش ہو سکتی ہے۔

۲۵ - عائلی قوانین پر تبصرہ - (صفحات ۴۸)

یہ رسالہ صدر ایوب مرحوم کے دورِ اقتدار میں نافذ ہونے والے ان غیر شرعی عائلی قوانین پر دینی اور فقہی لحاظ سے ہمہ دانہ گرفت ہے جس میں یتیم پوتے کی میراث، تعدادِ ازدواج، طلاق، صغر سنی کا نکاح، نکاح کا رجسٹریشن وغیرہ پر بڑی علمی فقہی اور عقلی بحثیں آگئی ہیں اور ان رسوائے زمانہ قوانین کی شناعت واضح ہو گئی ہے اور پھر متبادل تجاویز پیش کی گئی ہیں۔ کاش اہل حکومت علمائے ربانیین کی اپنی مخلصانہ سفارشات کو مان کر امت کو غیر دینی قوانین کے ظلم سے بچاتی۔ رسالہ ہر قانون دان اور موضوع سے دلچسپی رکھنے والے کے لیے پڑھنے کے لائق ہے۔

۲۶ - نابالغہ کے نکاح میں سوء اختیار - (صفحات ۱۸)

یہ فتویٰ اس مسئلہ کے بارے میں ہے۔ باپ نے بچی کے مصالح کا خیال رکھے بغیر نکاح کر دیا ہو تو اس کے فسخ کی کیا صورت ہے۔

۲۷ - نہایات الارب فی غایات النسب۔ اسلام اور نسبی امتیازات (صفحات ۶۲)

یہ نسبی احکام کے بارے میں ایک اہم رسالہ ہے جس میں تین عنوانات پر علمی اور دینی بحث کی گئی

ہے (۱) نبأ مساوات اسلام کی حقیقت اور انساب اور پیشوں میں تفاضل۔ (۲) نسب پر تفاخر۔ (۳) دوسرے انساب کی طرف جھوٹی نسبت کرنا۔ رسالہ موضوع پر عجیب و مفید معلومات کا ذخیرہ ہے بعض کم فہموں نے رسالہ کے بعض عبارات کو نہ سمجھ کر شکایت کی تھی۔ اس کا جواب حضرت حکیم الامت نور اللہ مرقدہٗ نے "رافع الغلط لدفع الشطط" کے نام سے لکھا وہ رسالہ کے ضمیمہ کے طور پر ملحق کر دیا گیا ہے۔

۲۸۔ حکم الازدواج مع اختلاف دین الأزواج۔ مختلف المذہب زوجین کے احکام۔ (صفحات ۲۱)
یہ مقالہ حضرت تھانوی کی تالیف "الحیلۃ الناجزۃ" کا ضمیمہ ہے جو ان کے ارشاد پر لکھا گیا زوجین اگر مختلف المذہب ہوں یا اُن میں کوئی مرتد ہو جائے۔ ان کی مختلف صورتوں کے احکام بتائے گئے ہیں۔

۲۹۔ إعلام السئول عن أعلام الرسول۔ علم نبوی کی تحقیق۔ (صفحات ۵)
حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے جھنڈے کے بارے میں بعض عصری سوالات کا جواب اور جھنڈے کی تحقیق ہے۔

۳۰۔ طریق السداد فی عقوبۃ الارتداد۔ مرتد کی سزا اسلام میں۔ (صفحات ۱۵)
اس محققانہ رسالہ میں حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے قادیانیوں کے اس غلط دعویٰ کی تردید کی ہے کہ اسلام میں مرتد کی سزا قتل نہیں ہے۔

۳۱۔ شریعت اسلام میں غیر مسلموں کے ساتھ معاملات۔ (صفحات ۱۵)
اس رسالہ میں متحدہ ہندوستان کے حالات کے پیش نظر غیر مسلموں کے ساتھ معاملات کی شرعی نوعیت اور حدود و قیود بتائے گئے ہیں۔ رسالہ بہت نافع و جامع ہے۔

۳۲۔ وقایۃ المسلمین عن ولایۃ المشرکین۔ ملکی سیاست میں غیر مسلموں کے ساتھ اشتراک عمل کی حدود شرعیہ۔ (صفحات ۵۴)
یہ رسالہ تحریک پاکستان کے زمانہ میں لکھا گیا لیکن غیر مسلموں کے ساتھ مسلمانوں کے سیاسی تعلقات میں جن فقہی مباحث پر مشتمل ہے اور جس تحقیق سے لکھا گیا۔ اس بنا پر دائمی اہمیت کا حامل ہے۔ حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی فقہی عظمت کے علاوہ ان کی سیاسی بصیرت کا بین ثبوت ہے۔

۳۳۔ نور السراج فی أحکام العشر والخراج۔ عشر و خراج کے احکام۔ (صفحات ۲۰)

یہ حضرت مفتی صاحب نور اللہ مرقدہٗ کی کتاب "اسلام کا نظام اراضی" کا چھٹا باب ہے لیکن عشر و خراج کی حقیقت و مسائل کے بارے میں مستقل حیثیت رکھتا ہے اپنی نوعیت میں خاصہ کی چیز ہے۔ اور اس عنوان پر اسلامی اقتصادیات سے ہر دلچسپی رکھنے والے کے مطالعہ کے قابل ہے۔

۳۴۔ انتخابات میں ووٹ، ووٹر اور امیدوار کی شرعی حیثیت۔ (صفحات ۷)

اپنے موضوع پر جامع، نافع اور نہایت مفید مباحث اور احکام پر مشتمل قابلِ دید مضمون ہے۔

۳۵۔ قانونِ اسلامی بابت پٹہ دوامی صفحات ۱۲)

دوامی اجارہ کے بارے میں علامہ شامی اور دیگر فقہاء کی عبارتوں جو کہ اکثر مضطرب ہیں کے مطابق کلام و تحقیق کرنے کے بعد اس مسئلہ کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار فرمایا ہے موروثی زمینداریوں اور پٹہ دوامی کے بارے میں خوب رسالہ ہے۔

۳۶۔ زمینداره بل۔ ۲۰ صفحات

غیر منقسم ہندوستان میں حکومت برطانیہ کی طرف سے زمینوں کی شخصی ملکیت کے خلاف ایک بل پیش ہوا تھا۔ اس پر تنقید کے لیے یہ مقالہ لکھا گیا اس میں شخصی ملکیت کے بارے میں اسلام کے موقف کو واضح کیا گیا تھا دیگر علماء کے فتاوی بھی ضمیمہ میں شامل ہیں، حضرت مفتی صاحب قدس سرہٗ کے یہ مختصر الفاظ آج بھی ہر مسلمان کے لیے اشتراکیت کے لیے سُرمۂ بصیرت ہیں

"افسوس اس کا ہے کہ مسلمان جن کے ہاتھ میں قرآن مبین کا وہ روشن نظام ہے کہ بلا خوف و تردد کہا جا سکتا ہے کہ دنیا کا امن چین اور ہر باشندۂ ملک کا اطمینان اگر ہو سکتا ہے تو صرف اسی کے ماتحت ہو سکتا ہے وہ بھی اس رو میں بہہ گئے ہیں اور نہیں سمجھتے کہ اشتراکیت کا اصول قرآن عزیز اور تعلیمات نبی کریم سے کھلی بغاوت ہے جب شخصی ملکیت ہی کو جرم کہہ دیا تو پھر زکوٰۃ و صدقات اور حج و اوقاف جن کا مدار ہی شخصی ملکیت پر ہے اور جن سے قرآن و حدیث بھرا پڑا ہے ان کا قصہ ہی ختم ہو جاتا ہے۔ عباداتِ مالیہ کا سوال ہی پیدا نہیں رہتا۔ اس اصول کی حمایت خدا تعالیٰ اور اس کے رسول سے کھلی بغاوت ہے۔

۳۷۔ إباحة التقطيف من شراة الصنعة والتأليف۔ حق تصنیف اور حق ایجاد کی شرعی حیثیت (صفحات ۴)

اس مختصر رسالہ میں یہ ثابت کیا گیا ہے کہ اپنی کسی تصنیف یا ایجاد کو کسی سے رجسٹرڈ کرا کے دوسروں کو اس کی اشاعت یا صنعت سے روکنا جائز نہیں۔ ضمناً سرمایہ دارانہ نظام اور اشتراکیت پر بھی مختصر مفید تنقید آ گئی ہے۔ ۱۳۶۴ھ کی تحریر ہے۔

۳۸ ۔ أحکام القمار۔ (صفحات ۲۰۰)

موجودہ دور میں معاملات میں طرح طرح کا جوا اور قمار کی صورتیں رواج پا گئی ہیں۔ اس رسالہ میں ان کی تشریح و توضیح اور کتاب وسنت وفقہ کے مطابق اُن کے شرعی أحکام بیان کئے گئے ہیں گھوڑ دوڑ وغیرہ کے بارے میں بھی فتویٰ آ گیا ہے۔

۳۹ ۔ تفصیل الأحکام للاسباب الفاسدة والمال الحرام ۔ ناجائز معاملات پر تصنیف کا ایک خاکہ صفحہ ۷ ۔

حضرت مفتی صاحب کے دردمند دل نے مسلمانوں کی معاملات میں خلافِ شرع کوتاہیوں اور اسلامی قانون کے بارے میں غفلت کوشیوں کو دیکھتے ہوئے ایک نہایت مفید کتاب لکھنے کا ارادہ فرمایا تھا جو اعذار کی وجہ سے مکمل نہ ہو سکا۔ مجوزہ کتاب کے عنوانات بہت اہم ہیں کاش کوئی اہل علم اس خاکہ میں رنگ بھر سکے اور سب سے أحق حضرت مفتی صاحب کے لائق صاحبزادے جناب محمد رفیع عثمانی صاحب ہیں

۴۰ ۔ اسلامی ذبیحہ۔ (صفحات ۵۶)

اسلامی ذبیحہ اور اُس کے احکام کے بارے میں ایک نہایت ہی مفید، جامع ونافع مقالہ ہے جو موجودہ دور کے اسلامی ذبیحہ کے بارے میں اٹھائے ہوئے سوالات کا شافی جواب ہے۔

۴۱ ۔ أحکام الحطاب فی بعض أحکام اللحی والخضاب :۔ داڑھی کے خضاب اور کترانے وغیرہ کے احکام (صفحات ۱۵)

داڑھی کے رکھنے، کترانے، اُس کی مقدار اور مختلف رنگ کے خضاب کے بارے میں ایک شافع ونافع رسالہ ہے جو کہ ہر ایک کے دیکھنے کے قابل ہے۔

۴۲ تفصیل الکلام فی مسألة الإعانة علی الحرام (عربی صفحات ۱۷)

حضرت مفتی صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے احکام القرآن (جلد خامس وسادس) کے ذیل میں آیت

قرآنی مع قال رب بما انعمت علیّ فلن أکون ظهیراً للمجرمین کے تحت ظلم و معصیت کی اعانت اور اس اقتباس سے معاملات میں فقہا کے بارے میں فقہا کے تفصیلی احکام اس نام سے جمع کئے تھے۔ بعد میں اس کا خلاصہ « الاستبانۃ بمعنی التسبب والاعانۃ » تو احکام القرآن میں شائع ہو گیا۔ لیکن اصل رسالہ شائع نہ ہوا اس کی اہمیت کے پیش نظر اسے شائع کر دیا گیا ہے۔

۴۳ - ناجائز کاموں میں تعاون کی شرعی حیثیت۔ (صفحات ۶)

مذکورۃ الصدر عربی رسالہ کا اردو خلاصہ ضرورت کی وجہ سے شائع فرمایا ہے۔ بڑی مفید تحقیقات اور خیال افزا باتوں پر مشتمل ہے۔

۴۴ - آداب الأخبار - اخبارات و جرائد کی مذہبی ضرورت، اسلامی اخباروں کے لیے شرعی دستور العمل - (صفحات ۱۵)

موجودہ دور میں اخبار بینی جس طرح گھر گھر عام ہو گئی ہے اور اس کے مفاسد ہر جگہ پھیل گئے۔ حضرت حکیم الامت نور اللہ مرقدہٗ نے اخبارات کی خرابیوں پر، اخبار بینی کے نام ان مفاسد کی نشان دہی فرمائی تھی اور صحیح اخبار نویسی کے اصول و ضوابط بتائے تھے۔ حضرت مفتی صاحب نے اپنی عبارت میں ان کو دوبارہ مرتب کیا اور حضرت تھانویؒ سے نظر ثانی کروائی، اور دس زرین اصول بیان فرمائے۔ بڑا مفید رسالہ ہے۔ کاش ہمارے اخبارات ان آداب کی کچھ رعایت کر لیتے۔

۴۵ - القول السدید فی تحقیق میراث الحفید المتلقب بارغام العنید - پوتے کی میراث صفحات ۱۲)

موجودہ دور کے متجددین نے اسلام کے متفقہ قوانین میراث کے خلاف ورزی کرتے ہوئے نام نہاد ہمدردی کے نام پر یتیم پوتے کی میراث کا فتنہ اٹھایا، حضرت مفتی صاحب نے ان تمام غلط دعاوی اور مغالطوں کا دینی اور فقہی اور عقلی لحاظ سے مسکت اور شافی جواب لکھا ہے۔ آخر میں دیگر علماء کی تصدیقات شامل کر دی گئی ہیں۔

حضرت مفتی صاحب نور اللہ مرقدہٗ کی فقہی تصانیف کا ایک تعارف نامہ جناب برادر مکرم مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب نے جواہر الفقہ کے آخر میں شائع فرمایا ہے۔ موضوع کی مناسبت اور افادیت کی وجہ سے اپنے مضمون میں شامل کرتا ہوں۔ گر اس کچھ پچ رقم کی تحریر کے ساتھ اس کی تحویلیت ثابت کے

ساتھ ریشم کا پیوند ہی ہوگا۔ پہلی تین کتابوں میں سے «فتاویٰ دارالعلوم دیوبند اور احکام القرآن عربی کا تذکرہ گذر چکا ہے تیسری کتاب «اسلام کا نظام اراضی» کا ذکر مستقلاً آرہا ہے اس لیے مفتی رفیع عثمانی صاحب مدظلہ کی فہرست میں سے چوتھی کتاب سے ہی شروع کر رہا ہوں اور ترتیب کی سہولت کی وجہ سے وہی نمبر برقرار رکھا ہے۔ حضرت مولانا مفتی رفیع عثمانی صاحب کا عنوان ہے «حضرت مفتی صاحبؒ کی فقہی تصانیف جو الگ کتابی شکل میں شائع ہو چکی ہیں پھر ۱۔ فتاویٰ دارالعلوم دیوبند۔ ۲۔ احکام القرآن عربی۔ ۳۔ اسلام کا نظام اراضی کا ذکر ہے پھر تعارف حسب ذیل ہے۔

۴۔ آلاتِ جدیدہ۔ اس میں لاؤڈ اسپیکر، گراموفون، فوٹوگرافی، ہوائی جہاز، ریڈیو، ایکسرے، انجکشن وغیرہ آلاتِ جدیدہ سے متعلق پیدا ہونے والے جدید مسائل کا شرعی، نیز مریض کے بدن میں خون پہنچانے کا مسئلہ بیان کیا گیا ہے۔

۵۔ آلۂ مکبر الصوت۔ لاوڈ سپیکر کو اذان خطبہ اور نماز میں استعمال کرنے کے متعلق شرعی احکام، علمائے دیوبند، تھانہ بھون، سہارن پور اور دہلی وغیرہ کی قدیم و جدید تحقیقات کا خلاصہ اور آخری فیصلہ پہلے یہ رسالہ الگ شائع ہوا تھا اب حالاتِ جدیدہ کا جزو بن کر شائع ہوا ہے۔

۶۔ رویتِ ہلال۔ پاکستان اور دوسرے ممالک میں یہ مسئلہ عرصہ سے معرکۃ الآراء بنا ہوا ہے، حضرت مفتی صاحبؒ نے اس مسئلہ کی پوری تفصیل شرعی اصول کے مطابق لکھی ہے۔ چاند کے معاملے میں شرعی حیثیت اور متعلقہ شرعی احکام کی تفصیل بیان فرمائی ہے۔

۷۔ مسئلہ سود۔ سود کی شرعی تعریف، قدیم طرز کے مہاجنی سود اور جدید قسم کے تجارتی بنکوں کے سود کی مفصل تحقیق اور عام شبہات کا جواب، قرآن مجید کے اندر سات آیتیں جو سود کے متعلق آئی ہیں اُن کی مفصل تفسیر اور حرمت سود کے متعلق ۴۰ احادیث، سود کی دینی و دنیاوی خرابی و بربادی کا مفصل بیان، اس موضوع پر نہایت شافی و کافی تصنیف ہے۔

۸۔ بیمۂ زندگی۔ اس مسئلہ کی مکمل تحقیق شرعی اصول پر کی گئی ہے آخر میں دیگر علماء کرام کی تصدیقات ہیں۔

۹۔ پراویڈنٹ فنڈ۔ پراویڈنٹ فنڈ پر زکوٰۃ واجب ہونے یا نہ ہونے کی تحقیق اور اس فنڈ پر سود کے نام سے ملنے والی رقم کی شرعی حیثیت واضح کی گئی ہے۔

۱۰۔ اسلام کا نظامِ تقسیمِ دولت۔ سرمایہ داری اور کمیونزم کے درمیان اسلامی نظام کا اعلیٰ و بہتر ہونا اور

دونوں نظاموں پر نئی حیثیت سے بحث ۔ اس موضوع پر بہترین مقالہ ہے۔

۱۱۔ اسلامی نظام میں معاشی اصلاحات کیا ہوں گی؟۔ اسلام کا معاشی نظام کیا ہے۔ اور اس سے موجودہ معاشی مسائل کیوں کر حل ہو جائیں گے؟ حضرت مفتی صاحب مدظلہم نے اس سوال کا سادہ، عام فہم اور دلنشین جواب اس رسالہ میں دیا ہے اس کے مطالعہ سے عام پڑھا لکھا انسان ایک نظر میں یہ جان سکتا ہے کہ اسلام موجودہ نظام معیشت میں کیا بنیادی تبدیلیاں لائے گا۔ اور سوشلزم کے برخلاف اُن کے ذریعہ سرمایہ داری کی خرابیوں کا انسداد کس طرح ہو سکے گا؟

۱۲۔ قرآن میں نظام زکوٰۃ ۔ زکوٰۃ کے متعلق آیاتِ قرآنی کی تفسیر ازکوٰۃ کن اُصول پر قائم ہے اور اس کے نصاب اور مصارف کا تعیین اور شبہات کا جواب۔ اس کتاب کے دوسرے حصہ میں حضرت محمد رفیع عثمانی نے زکوٰۃ کے مفصل احکام درج کئے ہیں۔

۱۳۔ اعضائے انسانی کی پیوندکاری۔ سرجری کے ذریعہ ایک انسان کا عضو دوسرے انسان کے جسم میں لگانے کی شرعی حیثیت کی مفصل اور مدلل تحقیق۔

۱۴۔ ضبط ولادت ۔ اس کی شرعی حیثیت اور مروجہ خاندانی منصوبہ بندی پر شرعی اور اقتصادی حیثیت سے مکمل بحث ہے۔

۱۵۔ تصویر کے شرعی احکام۔ تصویر کشی اور استعمال تصاویر سے متعلق قرآن و حدیث کے ارشادات اور مفصل احکام، فوٹو کی تصویر اور چھوٹی چھوٹی تصویروں اور آدھے دھڑ کی تصویروں کے احکام مع جواب شبہات۔

۱۶۔ ایمان اور کفر قرآن کی روشنی میں ۔ کفر اور اسلام اور مسلم و کافر کی شرعی تعریف ، کسی مسلمان کو اسلام سے خارج کہنے میں کیا احتیاط لازم ہے۔ اور اس کے کیا اصول ہیں؟ اہل قبلہ کو کافر کہنے کی مکمل تشریح اور اہل قبلہ کے معنی، قرآن و حدیث کے دلائل اور صحابہ و تابعین اور ائمہ دین کی تصریحات نہایت تفصیل سے لکھی گئی ہیں۔ یہ کتاب درحقیقت حضرت العلامہ سید محمد انور شاہ صاحب قدس سرہٗ سابق صدر مدرس دارالعلوم دیوبند کی ضخیم کتاب اکفار الملحدین کا اُردو میں خلاصہ ہے۔

۱۷۔ آداب سفر مع احکام سفر۔ سفر شرعی کی تعریف، مسافر اور سفر کے احکام، آداب اور دعائیں جو احادیث اور کتب فقہ سے جمع کی گئی ہیں۔

۱۸۔ آدابِ مساجد۔ اس میں مساجد کے فضائل وآداب، احکام اور اُن کاموں کا مفصل بیان ہے جو مسجد میں ناجائز و مکروہ ہیں۔

۱۹۔ احکامِ دُعا۔ حضرت حکیم الامت قدس سرہٗ کی عربی تصنیف یعنی "استحباب الدعوات" کا اُردو ترجمہ جس میں نمازوں کے بعد دُعا مانگنے کا مسنون طریقہ احادیثِ صحیحہ سے ثابت کیا گیا ہے۔ حضرت مفتی صاحب مدظلہم نے اس میں مزید اضافے بھی فرماتے ہیں۔

۲۰۔ شبِ برأت۔ اس میں شبِ برأت کے فضائل و برکات اور احکام کا مفصل بیان اور غلط رسموں کی تردید ہے۔

۲۱۔ احکامِ حج۔ تمام ضروری احکامِ حج مختصر اور آسان طرز میں لکھے گئے ہیں نہایت مفید اور کارآمد رسالہ ہے۔

۲۲۔ تاریخِ قربانی:۔ اس میں قربانی کی مکمل تاریخ آدم علیہ السلام سے لے کر خاتم الانبیا صلی اللہ علیہ وسلم کے عہدِ مبارک تک ہر دَور میں اس کی مختلف صُورتیں اور اسلام میں واجب ہونے کی اور اس کے بدلے میں قیمت کا صدقہ کافی نہ ہونے کی مفصل تحقیق قرآن وسنت کے دلائل سے بیان کی گئی ہے۔ نیز متجددین کے اعتراضات کا کافی جواب دیا گیا ہے۔

۲۳۔ جہادِ پاکستان ۱۹۶۵ء:۔ اس میں جہاد کے فضائل اور مفصل احکام بیان کئے گئے ہیں۔

۲۴۔ بسم اللہ:۔ کے فضائل و برکات اور مسائل، اور آخر میں اس کے خواص اور اس کے ذریعہ دینی و دنیوی فوائد، بیماریوں اور پریشانیوں کا علاج لکھا گیا ہے۔

۲۵۔ گناہِ بے لذت۔ اس رسالے میں ایسے گناہوں کا بیان ہے جن میں نہ کوئی ظاہری لذت ہے نہ کوئی معاشی مجبوری، محض غفلت و بے پروائی سے لوگ ان میں مبتلا ہیں۔ اگر ذرا بھی فکر کریں تو ان گناہوں کو فوراً چھوڑ سکتے ہیں اس رسالے میں قرآن و حدیث سے ان گناہوں کے سخت عذاب و وبال کو بھی بیان کر دیا گیا ہے۔ اور آخر میں ایک دوسرا رسالہ صغائر گناہوں کی فہرست کا لگا دیا گیا ہے۔

---

(۵) فقہی رسائل جو فتاویٰ دارالعلوم دیوبند کا جزو بن کر شائع ہوئے ہیں۔

فتاویٰ دارالعلوم دیوبند طبع جدید چار جلدوں پر مشتمل ہے پہلی دو جلدوں کا نام "عزیز الفتاویٰ" اور آخری دو جلدوں

کا نام "امداد المفتین" ہے۔ حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب دامت برکاتہم کے مندرجہ ذیل رسائل امداد المفتین کا جزو بن کر شائع ہوئے ہیں۔

۲۶/۱ ۔ الافصاح عن تصرفات الجن والأرواح۔
جنات اور ارواح کے تصرفات کے متعلق تحقیق (امداد المفتین کتاب الایمان والعقائد)

۲۷/۲ ۔ رفع الناس عن محدثات الأعراس۔ مروجہ عرس مزارات کے شرعی احکام امداد المفتین۔
کتاب الایمان والعقائد، مقدمہ عاشقم

۲۸/۳ ما معل القبول فی ظل الرسول؟ ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا سایہ پڑتا تھا یا نہیں اس کی تحقیق (امداد المفتین کتاب السیر والمناقب)

۲۹/۴ موزوں پر مسح ۔ یعنی رسالہ نیل المآرب فی المسح علی الجوارب ۔ جس میں کپڑے کے موزوں پر چڑھا کر مسح کرنے کے متعلق مفصل تحقیق ہے کہ کس صورت میں مسح جائز ہے کس صورت میں جائز نہیں۔ (امداد المفتین ۔ کتاب الطہارۃ)

۳۰/۵ احکام الإعلام بالتکبیر والاعلام ۔ جھنڈوں، ترانوں اور نعرہ وغیرہ کے ذریعہ لوگوں کو نماز کے لیے اٹھانا۔ اس کے متعلق حکم شرعی۔ (امداد المفتین ۔ کتاب الصلوٰۃ)

۳۱/۶ ۔ تنقیح المقال فی تصحیح الاستقبال۔ اس میں سمت قبلہ سے متعلق علامہ مشرقی کی پیدا کردہ تشکیکات کا واضح جواب بھی ہے اور اس مسئلہ کی مثبت انداز میں مکمل تحقیق بھی۔ فتاویٰ دارالعلوم میں اس کا صرف وہ حصہ درج ہے جو حضرت مفتی صاحب مدظلہم کا تحریر فرمودہ ہے اور جواہر الفقہ میں اس حصہ کے علاوہ بعض دیگر علماء کے مقالات بھی اسی کے ساتھ شامل کئے گئے ہیں۔

۳۲/۷ القول القریب فی إجابة الأذان بین یدی الخطیب۔
جمعہ کی اذان کا جواب دینا اور بعد کی دعا پڑھنی چاہیئے یا نہیں؟ اس مسئلہ کی مفصل تحقیق۔
(امداد المفتین ۔ باب الجمعۃ والعیدین)

۳۳/۸ اماطة التشکیک فی إناطة الزکوٰة بالتملیک ۔ رفاہی کاموں میں زکوٰۃ کی رقم تملیک کے بغیر خرچ کرنے سے زکوٰۃ ادا نہیں ہوتی۔ اور ادائے زکوٰۃ کے لیے تملیک ضروری ہے اس مسئلہ کی مفصل اور مدلل بحث اس رسالہ میں بیان کی گئی ہے، اور شبہات کا جواب دیا گیا ہے (امداد المفتین کتاب الزکوٰۃ

۹/۴۴ انجکشن سے روزہ فاسد نہ ہونے کی تحقیق۔ اس مسئلہ پر سیر حاصل مکمل بحث ہے۔
(امداد المفتیین۔ کتاب الصوم)

۱۰/۴۵۔ خیر الأمور فی قدر المہور۔ عورتوں کے مہر کی مقدار سے متعلق مکمل تحقیق۔
(امداد المفتیین کتاب النکاح باب الجہاز والمہر)

۱۱/۴۶ اقامۃ العرف مقام الثبوت فی سقوط بعض الحقوق بالسکوت۔ عورت کے سکوت سے مہر معاف ہوگا کہ نہیں؟ اس مسئلہ کی تحقیق کے ضمن میں یہ بحث بھی آگئی ہے کہ دَین کی معافی کے لیے دائن کا سکوت بیان کے قائم مقام کب ہوگا کب نہیں۔
(امداد المفتیین۔ کتاب النکاح باب الجہاز والمہر)

۱۲/۴۷۔ رفع الجبور فی حکم یمین الموقتہ والفور۔ اگر طلاق کو کسی کام کے نہ کرنے پر معلق کیا تو کب تک نہ کرنے سے طلاق واقع ہوگی۔ اس مسئلہ کی مکمل تحقیق۔
(امداد المفتیین، کتاب الطلاق)

۱۳/۴۸ حکم الإنصاف فی الطلاق الغیر المضاف۔ شوہر نے جس طلاق کی اضافت بیوی کی بجائے اپنی طرف کی ہو، وہ واقع ہوگی کہ نہیں؟ اس کا مفصّل و مدلّل حکم، یہ رسالہ درحقیقت حضرت مولانا انور شاہ کشمیریؒ کی تصنیف ہے حضرت مفتی صاحب مدظلہم نے اُسے تبرک و افادہ کے لیے امداد المفتیین کا جزو بنایا ہے (امداد المفتیین۔ کتاب الطلاق)

۱۴/۴۹ نیل المرام فی حکم المسجد المبنیٰ بالمال الحرام۔ مالِ حرام مسجد کی تعمیر میں لگانے کی مختلف صورتیں اور اُن کا حکم۔ (امداد المفتیین۔ کتاب الوقف)

۱۵/۵۰۔ الأحری بالقبول فی وقف العمارۃ علی ارض المنقول۔ لاوارث زمین پر حکومت قبضہ کرکے کسی کو دیدے اس کو وقف کرنے کے احکام (امداد المفتیین۔ کتاب الوقف)

۱۶/۵۱ توضیح کلام اهل اللہ فی ما أهل بہ لغیر اللہ۔ بتوں یا قبروں کے نام پر چھوڑے ہوئے جانوروں کے متعلق شرعی احکام۔ (امداد المفتیین۔ کتاب الصید والذبائح)

۱۷/۵۲ سجدۂ تعظیم یعنی "المقالۃ المرضیۃ فی سجدۃ التحیۃ" سجدۂ تعظیمی کے متعلق مفصل بحث و تحقیق۔
(امداد المفتیین۔ کتاب الحظر والاباحۃ)

۴۳/۱ ۔ اشباع الکلام فی مصرف الصدقۃ من المال الحرام ۔ مال حرام کو صدقہ کرنے کے متعلق مفصل تحقیق۔

وامداد المفتیین ۔ باب اُربابِ فاسدہ و باطل حرام۔

وہ فقہی رسائل جو اُحکام القرآن عربی کا جزو بن کر شائع ہوئے ہیں

یہ رسائل عربی زبان میں ہیں ان کا ترجمہ اگر اُردو میں ہو جائے تو انشاء اللہ افادیت کا دائرہ اور وسیع ہو جائیگا

۴۴/۱ تفصیل الخطاب فی تفسیر آیات الحجاب ۔ عورتوں کے پردے سے متعلق جتنی آتیں قرآن کریم میں آئی ہیں۔ اُن سب کی تفسیر اس رسالے میں یکجا کر دی گئی ہے اور پردۂ شرعی سے متعلق چالیس سے زیادہ روایات حدیث اور صحابہ و تابعین اور ائمہ دین کے ارشادات جمع کر کے پردے کے احکام مدلل و مفصل بیان کئے گئے ہیں اور مخالفین کے شبہات کا شافی جواب دیا گیا ہے۔

۴۵/۲ ۔ السعی الحثیث فی تفسیر لھو الحدیث ۔ آیت قرآنی " مِنَ النَّاسِ من یشتری لھو الحدیث " کی مبسوط تفسیر ہے ۔ جس میں گانے بجانے اور سماع کی مفصل بحث ہے ۔

۴۶/۲ ۔ کشف الریب عن علم الغیب ۔ یہ علم غیب کے مسئلہ پر آیاتِ قرآنی ، ارشاداتِ نبوی اور ائمہ فقہاء و صوفیاء کی تحقیقات کا بہترین مجموعہ ہے ۔

۴۷/۲ ۔ تکمیل الحبور بسماع اھل القبور ۔ اس میں سماع موتیٰ کے معرکۃ الآراء مسئلہ پر قرآن و سنت اور ائمہ دین کے ارشادات کی روشنی میں تحقیقی بحث کی گئی ہے ۔

۴۸/۲ ۔ کشف العنار عن وصف الغناء ۔ اس میں غناء و مزامیر اور موسیقی کے بارے میں قرآنی آیات کی تفسیر اور احادیث کی تشریح کر کے مسئلہ کو مدلل کیا گیا ہے ۔

۴۹/۲ إماطة الشغب فی کراھۃ اللھو واللعب ۔ اس میں مختلف کھیلوں کے احکام قرآن و سنت کی روشنی میں جمع کئے گئے ہیں ۔

۵۰/۲ ۔ تنقیح الکلام فی احکام الصلوٰۃ والسلام ۔ یہ رسالہ آیت " انّ اللہ وملٰئکتہ یصلّون علی النبیؐ " کی مبسوط تفسیر ہے ۔ جس میں درود و سلام کے احکام تفصیل سے بیان کئے گئے ہیں ۔

یہ کل پچاس فقہی تصانیف ہیں علاوہ ازیں چھیالیس فقہی رسالے " جواہر الفقہ " میں آگئے ہیں ، اس طرح صرف فقہی موضوعات پر حضرت مفتی صاحب مدظلہم کی تصانیف کی کل تعداد چھیانوے ہو گئی ، اور یہ بھی موجودہ تلاش و جستجو کا نتیجہ ہے ہو سکتا ہے کچھ اور رسائل بعد میں مل جائیں جن تک اس وقت احقر کی

نظر نہ گئی ہو۔

یہ سب تصانیف حضرت والد ماجد مدظلہم کی فقیہانہ بصیرت کا ناقابل فراموش کارنامہ اور اس صدی کا عظیم علمی سرمایہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ طالبان علم وعمل کو ان سے بیش از بیش استفادہ کی توفیق بخشے اور احقر کو بھی ان طالبان علم وعمل میں شامل فرمالے، وما ذلک علی اللہ بعزیز۔

اسلام کا نظام اراضی مع فتوح الہند و احکام اراضی پاکستان و ہندوستان

حضرت مفتی صاحب نوّر اللہ مرقدہٗ کی عظیم کتابوں میں اس کا شمار کیا جاسکتا ہے۔ خود ایک بار فقیر سے فرمایا تھا کہ اس کتاب پر مجھے بہت زیادہ محنت کرنی پڑی ہے مسلمانوں کے عہد کی ہندوستان کی پوری تاریخ، مسلمان فرمانرواؤں کے فرامین وغیرہ تلاش کرنے اور پڑھنے پڑے؛ اور حقیقت یہ ہے کہ کوئی ایک فاضل محقق بھی ایسی کتاب پر فخر کرسکتا ہے۔ علامہ مناظر احسن گیلانیؒ کے یہ الفاظ اس کتاب کی فضیلت و افادیت کے لیے کافی ہیں۔ کہ اراضی کے متعلق اسلامی وثائق میں جو منتشر معلومات پائے جاتے ہیں مولانا نے دین اور علم دونوں کی بڑی خدمت ان معلومات کو اس کتاب میں جمع کر کے انجام دی، جہاں تک خاکسار کی رسائی ہے اس کی بنیاد پر کہہ سکتا ہے۔ کہ اس مسئلہ کے متعلق جو ہری معلومات تقریباً اس کتاب میں سمٹ گئے ہیں مجھے اس کی بھی خوشی ہوئی کہ قرآن وسنت اور فقہی کتابوں کے ساتھ ساتھ مولانا نے تاریخ اور معاشیات کی کتابوں کی معلومات سے مسائل کے حل کرنے میں بجائے احتراز کے کافی فائدہ اٹھایا ہے۔

حضرت مفتی صاحبؒ نے اس کتاب میں اراضی کے متعلق جس استیعاب واختوار سے کام لیا ہے وہ انہی کا حصہ ہے کتاب کا پہلا حصہ چھ ابواب پر مشتمل ہے جس میں تقریباً ڈیڑھ سو کے قریب ذیلی سرخیاں ہیں۔ ابواب یہ ہیں۔

باب اوّل :۔ تمام دنیا کے لیے اسلام کا قانون اراضی۔

باب دوم :۔ مشترکہ ہندوستان کے اراضی و احکام۔

باب سوم :۔ انگریزی عہد میں اراضی ہند ملکیت وغیرہ سے متعلقہ احکام۔

باب چہارم :۔ تقسیم ہند کے بعد اراضی پاک وہند کے احکام۔

باب پنجم :۔ اراضی اوقاف

باب ششم :۔ عشر و خراج کے احکام۔

دوسرا حصہ فتوح الہند پر مشتمل ہے اصل کتاب " احکام اراضی " کے لکھنے کے سلسلے میں حضرت مفتی صاحب کو جن تاریخی کتب کے ذخیرہ کو کھنگالنا پڑا، اور اسلامی دور کی فتوحات کی تاریخ سامنے آئی اسے مفتی صاحب کے قلم فیض رقم نے " فتوح الہند " کے نام سے جمع فرما دیا ہے۔ کتاب کا یہ حصہ بھی مفید و عجیب و دلچسپ معلومات پر مشتمل ہے۔

گو حضرت مفتی صاحبؒ کا مقصود تاریخ نگاری نہ تھا، لیکن فتوحاتِ اسلامی کے سلسلہ میں ایسی نایاب تفصیلات آگئی ہیں۔ جن سے معاصر تاریخیں خالی ہیں۔

اسلام کا نظامِ اراضی ہماری فقہ و قانون کے جاننے والوں، تاریخ دان طبقہ اور اقتصادی ماہرین کے لیے بھی معلوماتِ علمی اور فوائد متفرقہ کا ذخیرہ ہے۔ کم فقہی کتابیں اسی قدر دلچسپ ہوں گی۔

حضرت مفتی صاحبؒ کی دیگر اہم تصنیفات :- حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ کی دیگر سواسو سے زائد تصنیفات میں چند اہم تصنیفات کا تذکرہ کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔

<u>تفسیر بیان القرآن</u> :- حضرت تھانوی نور اللہ مرقدہٗ کو اللہ تعالیٰ نے " جامع العلوم " اور " مجمع المعارف والفضائل " بنایا تھا، آپ ہر دینی علم و فن سے فطری مناسبت اور اس میں مہارت و کمال کا درجہ رکھتے تھے۔ تاہم آپ کو جن علوم میں خاص الخاص بورع و فضیلت حاصل تھی۔ وہ فقہ و تفسیر اور حدیث و تصوف تھا آپ کا تفسیر کا ملکہ اللہ تعالیٰ کی خاص موہبت اور عطا تھی، آپ کے چار ہزار سے زیادہ مواعظ اور ملفوظات کے بے پایاں دفاتر، تفسیری فوائد کے بیش بہا جواہر سے مالا مال ہیں اور ان میں بعض ایسے قیمتی اور نایاب افادات ہیں۔ جن سے بڑی بڑی ضخیم تفاسیر خالی ہیں۔ آپ کے بعض مستفیدین اور ان کے تلامذہ نے ان میں سے بعض " افاضات " کو مستقلاً جمع بھی کیا ہے۔ لیکن ہنوز وہ کام تشنۂ تکمیل ہے اس سلسلہ میں آپ کا بڑا کارنامہ اُردو کی اشرف التفاسیر " تفسیر بیان القرآن " ہے جو بارہ مجلدات پر مشتمل ہے اُردو ترجمہ و تفسیر کے علاوہ " حل اللغات " کے نام سے اہل علم کے لیے فصاحت و بلاغت و اعجاز وغیرہ کے نکات مستقلاً شامل ہیں۔ اس تفسیر کی تعریف امام العصر حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ اور حضرت سید الملۃ علامہ سید سلیمان ندویؒ جیسے اساطین کر چکے ہیں۔ لیکن یہ تفسیر اپنی بلندی پرواز کی وجہ سے عامۃ الناس کے استفادہ سے اونچی ہے علماء کو اس کی افادیت خاصہ کو عام کرنے کا خیال رہا، فقیر کے مربی اول اور شیخ ثانی حضرت سید الملۃ ندوی نور اللہ مرقدہٗ نے بندہ کی آخری حاضری کے اگست ۱۹۵۳ء میں فرمایا تھا۔

کہ اگر کوئی اسسٹنٹ میسر آجائے تو جی چاہتا ہے کہ "بیان القرآن" کو عام لوگوں کے افادہ کے لیے آسان زبان میں املا کرادوں، اور اس کا نام "تسہیل البیان" رکھوں فقیر نے آمادگی کو سعادت سمجھا اور عرض کیا کہ اگلے سال ایم۔ اے سے فارغ ہو کر حاضر ہو جاؤں گا لیکن تقدیر الٰہی کو منظور نہ تھا حضرت کے وصال نے اس منصوبہ کو پورا ہونے نہ دیا، لیکن کارکنانِ قضاء و قدر کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ اور اس عظیم کام کے لیے اللہ تعالیٰ نے حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ کے ایک دوسرے خواجہ تاش حضرت مفتی محمد شفیع قدس سرہ کو منتخب فرمالیا تھا جن سے قدرت نے بغیر کسی پہلے طے کردہ منصوبہ کے یہ کام لے لیا اور ظاہری صورت یہ پیش آئی کہ ریڈیو پاکستان والوں نے جمعہ ۳ شوال ۱۳۷۳ھ مطابق ۲ جولائی ۱۹۵۴ء کو حضرت مفتی صاحبؒ سے التماس کی کہ وہ ہر جمعہ کو ریڈیو پاکستان پر قرآن کریم کی خاص خاص آیات کی تفسیر معارف القرآن کے نام سے کردیا کریں، یہ سلسلہ شروع ہوا اور تقریباً دس سال تک جاری رہا، اور اللہ تعالیٰ نے اسی کو حضرت مفتی صاحبؒ کی اس عظیم الشان اور شہرۂ آفاق تفسیر کی تمہید و پیش خیمہ بنا دیا ہے، جو اب اردو کی احسن التفاسیر "تسہیل بیان القرآن" ہونے کے علاوہ بے شمار ایسے مستند فقہی مسائل القرآن پر مشتمل ہے۔ جن کی نظیر دوسری متداول تفاسیر میں نہیں ملتی۔

بحمد اللہ تعالیٰ! اللہ تعالیٰ نے مفسر علامؒ کی بابرکت زندگی میں ہی اس تفسیر کی تکمیل آٹھ ضخیم مجلدات میں کرادی جو ۷۲۰۰ صفحات پر مشتمل ہے اور اللہ تعالیٰ نے حضرت مفتی صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کی حیات ہی میں اُسے خواص و عوام میں قبولیت بخشی۔ نمونہ کے لیے صرف اخص الخواص میں سے ایک شخص کی رائے پیش کرتا ہوں ہمارے اُستاذ نابغۃ الدہر محدث العصر سید محمد یوسف البنوری نور اللہ مرقدہٗ " یتیمۃ البیان فی شئ من علوم القرآن کے جدید ایڈیشن میں نئی تفاسیر پر تبصرہ کرتے ہوئے معارف القرآن کے بارے میں ارقام فرماتے ہیں۔

الاول: معارف القرآن للأستاذ الكبير المفتي الأعظم مولانا الشيخ مفتي محمد شفيع الديوبندي طالت حياته المباركة في عافية في ثماني مجلدات ضخام،

پہلی تفسیر ان جدید تفاسیر میں استاذ کبیر مفتی اعظم مولانا شیخ محمد شفیع دیوبندی کی آٹھ جلدوں میں ہے جس کا ماخذ حکیم الامت شیخ مولانا تھانویؒ کی تفسیر بیان القرآن ہے جسے حضرت مفتی صاحبؒ نے

تبیان القرآن للحکیم الأمة الشیخ التھانوی رحمہ
فلخصتہ فی عبارۃ واضحۃ و زاد علیہا مسائل
وأبحاثاً یحتاج إلیہا العصر الحاضر، ولنا نحتاج
الثناء علی الکتاب، فأصبح خیر تفسیر
یستفید منہ، عالم وغیر عالم

واضح عبارت میں ملخص کر دیا ہے۔ اور اس میں ان
مباحث اور مسائل کا اضافہ کر دیا ہے جس کی عصر حاضر
کو ضرورت ہے اور یہ کتاب ہماری تعریف کی محتاج
نہیں، اب یہ بہترین تفسیر ہے جس سے عالم اور غیر عالم
استفادہ کر سکتا ہے۔

(یتیمۃ البیان ص۱۱)

اس ہیچمدان اُبجد خوان کے نزدیک تفسیر معارف القرآن کئی اعتبار سے مفید ترین تفسیر ہے۔ جس کے مطالعہ کی سفارش بے خوف و خطر ہر جدید و قدیم، عامی و عالم سے کی جا سکتی ہے۔ ہماری موجودہ فضاء میں جب کہ اُردو داں طبقہ کو "تفہیم و تدبّر" کے نام پر قرآن پاک کے لئے بیشمار مہلک عقائد اور اغلاط میں پھنسایا جا رہا ہے۔ یہ تفسیر تریاق کا حکم رکھتی ہے۔ اپنی سہولت اور وضوحِ بیان کی وجہ سے گنجلک سے گنجلک اور عمیق سے عمیق مسئلہ آسانی سے سمجھا جا سکتا ہے۔ وہ مسائل جنہیں دورِ حاضر کے ملاحدہ، زائغین اور اباحت مزاج زنادقہ نیز مغرب زدہ دینی علوم سے بے بہرہ نام نہاد تعلیم یافتہ طبقہ نے اُلجھا دیا ہے ان کا شافی و وافی، سہل و سادہ جامع و مانع اطمینان بخش جواب اس تفسیر میں مل جاتا ہے۔ سود، حجاب، تعدد ازدواج وغیرہ بے شمار ایسے مسائل ہیں جن کی تسلی بخش توضیح کر دی گئی ہے طوالت دامن گیر ہے ورنہ قلبی تقاضا یہی تھا کہ چند نمونے پیش کئے جاتے۔ اس تفسیر کا وہ حصہ جو معارف و مسائل کے نام سے ہے۔ اگر اکٹھا کر کے علیحدہ کتابی شکل میں شائع کر دیا جاتا تو یہ بھی ایک مفید دینی خدمت ہوتی۔ حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے شیخ اول حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب نور اللہ مرقدہٗ کے محاورات ترجمہ کو اپنی تفسیر میں ترجمہ قرآنی کے طور پر لے کر اپنے شیخ اول سے جہاں اپنی عقیدت کا حق ادا کیا ہے۔ وہاں اس ترجمہ کی مستقل افادیت کا اظہار اور اس کی تعلیم کا سامان مہیا کیا ہے۔ اپنے مربی و شیخ ثانی کی تفسیر "بیان القرآن" کی تسہیل و تلخیص اس تفسیر کا دوسرا کارنامہ ہے۔ معارف و مسائل کے عنوان سے کتاسیر ماقبل کا راجح قول، نادر افادات اور ضروری معلومات نقل کر دی ہیں۔ حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ

کی فقاہت اور دینی مسائل سے شغف ہر جگہ ان کا ساتھ دیتا ہے۔ جس کا بین ثبوت اس تفسیر کے
وہ بیان کردہ مسائل ہیں جو ہر آیت کے ذیل میں مندرج ہیں۔ غالباً حضرت مفتی صاحب نور اللہ مرقدہٗ کی یہ
دینی و قرآنی خدمت جس کے لیے مرض الوفات کے زمانے میں جو افاقوں کے ساتھ کئی سالوں پر ممتد (!)
تکمیل کی مہلت طلب فرماتے رہے۔ انشاء اللہ تعالیٰ ان کی مقبول و مبارک زندگی کے عظیم ترین کاموں میں
شمار ہوگی اور شاید ان کی تصنیفات میں سے اُمت کو سب سے زیادہ نفع اور دائمی فائدہ اسی تصنیف سے پہنچے
اللہ تعالیٰ حضرت مفتی صاحب نور اللہ مرقدہٗ کے اس کارنامہ کو اُن کے درجات کی بلندی کا
سبب اور اَبد الآباد تک صدقۂ جاریہ فرمائے۔ اور اس سے استفادہ کی اُمت کو توفیق دے۔ اُردو کا
دینی کتب خانہ اس عظیم و مفید اور سہل و مفید تفسیر سے مالا مال اور ایک بے بہا کتاب سے گرانبار ہوگیا ہے۔
التصریح بما تواتر فی نزول المسیح۔ برطانوی استعمار کے مبعوث و پروردہ، متنبّی و مسیلمۂ کذاب مرزا
غلام احمد قادیانی کے بلند بانگ دعاوی باطلہ، دجل و تلبیس، احقاقِ باطل و ابطالِ حق اور تحریفات نے
علمائے امت اور دردمندانِ ملت کے قلوب کو بے چین اور بے قرار کر دیا تھا۔ مختلف اوقات میں اس
کے مختلف دعوے، کبھی ظلّی نبوت کبھی بروزی نبوت کبھی نبوت کاملہ کبھی نبی مرسل، کبھی افضل الرسل کبھی
مسیح موعود، کبھی مہدی معہود غرض مرزا صاحب کے متلوّن مزاج کی رنگا رنگی ان کے دعووں سے ظاہر ہوتی
جاتی تھی۔ اور ساتھ ہی وہ امت کو مسلّمہ عقائد، ختمِ نبوت، نزولِ مسیح، ظہورِ مہدی کا انکار اور اس پر دلائل
فاسدہ کا طومار جمع کرتے جاتے تھے مرزا صاحب کے ان غلط اور جھوٹے دعوے جن کی حقیقت علمی سطح پر ہذیانات و
ہذیان سے زیادہ نہ تھی۔ انگریز کی سرپرستی میں جاہل اور دنیا پرست اشخاص کی گمراہی کا سبب بننے لگی اور یہ
تلبیس و دجل بہت سے سادہ لوح انسانوں کی گمراہی کا سبب بن گیا۔ ان حالات میں امت کا جو طبقہ مقابلہ کے
لیے علماً و عملاً میدان میں آیا اور "مرزائی طلسم" کے "تارِ عنکبوت" کو پارہ پارہ کر کے رکھ دیا اس کی صفِ اوّل کے
زعماء میں امام العصر محدث جلیل علامہ سید انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ بھی تھے۔ جنہوں نے کئی کتابیں قادیانیت
کی ردّ میں لکھیں۔ مرزا صاحب کا یہ دعوےٰ کہ حضرت عیسیٰ ابن مریم علیٰ نبیّنا و علیہ الصلوٰۃ والسّلام وفات پا
چکے ہیں۔ اور ان کا نزول دوبارہ نہیں ہوگا۔ اس بارے میں حضرت کشمیری نور اللہ مرقدہٗ نے پہلے ایک کتاب
"عقیدۃ الاسلام فی حیاۃ عیسیٰ علیہ السلام" رمضان المبارک ۱۳۴۲ھ میں لکھی اس کتاب میں انہوں نے

حیاتِ مسیح علیہ السلام اور ان کے نزول کے بارے میں قرآن کریم کی آیات اور اُن سے استنباط اور اشارات قرآنیہ پر گفتگو فرمائی۔ احادیث کا استیعاب نہیں کیا گیا۔ نہ انہیں بنیاد بنایا گیا۔ استطراداً احادیث مبارکہ ذیلی طور پر آگئیں اسکے ساتھ آپ نے ایک دوسری کتاب کا ارادہ کیا جس کے متعلق ارشاد فرمایا۔
وأفردت جزءً آخر لسرد الأخبار والآثار مستوعبة محصاة " (نفحة العنبر جبید ص۱۸)
اس رسالہ کا نام " التصریح بما تواتر فی نزول المسیح " رکھا اس کے بارہ میں حضرت الأستاذ علامہ محمد یوسف البنوری نور اللہ مرقدہ ارقام فرماتے ہیں:۔

"التصریح بما تواتر فی نزول المسیح" رسالة لطيفة كملت فی ۱۲۷ صحفة جمع الشيخ احاديث نزول عيسٰى عليه السّلام من جميع المظان من كتب الحديث مما انتهى إليه نظره الوسيع وفكره الغائر، وطالع لتخريجها مجلدات كثيرة من المسانيد والجوامع والصحاح والمعاجم مستوعبة حتى جمع سبعين حديثاً فی هذا الباب بين الصحاح وحسان وقد زاد قدراً كثيراً على من سلف من الأئمة من الائمة ممن حاولوا فيه التأليف، حتى إنّ القاضي الشوكاني لم يقدر فی رسالته التوضيح فيما تواتر فی المنتظر والمهدی والمسيح بأن يجمع اكثر من تسعة وعشرين حديثاً مع سعة إطلاعه وكثرة الذخائر القيمة من كتب الحديث فی بلاده وضمّ إليها من آثار الصحابة رضی الله عنهم فی هذا الباب

" التصریح بما تواتر فی نزول المسیح " ایک لطیف رسالہ ہے جو ۱۲۷ صفحات میں مکمل ہوا ہے۔ جس میں علامہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ نے نزول عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں حدیث کی کتابوں سے ہر گوشہ و سمت سے وہ تمام احادیث جمع فرما دی ہیں جن تک ان کی وسیع نظر اور گہرا فکر پہنچا ہے اور اس کی تخریج کے لیے انہوں نے مسانید و جوامع اور صحاح و معاجم کی کثیر مجلدات کا بھرپور اور استیعاب کے ساتھ مطالعہ فرمایا اور اس باب میں صحاح حسان ستر حدیثیں جمع کر دیں۔ آپ نے پہلے اُمت کے جو بزرگ اس عنوان پر جو احادیث جمع کر چکے تھے، اُس پر مزید ایک کثیر تعداد کا اضافہ فرما دیا۔ یہاں تک کہ قاضی شوکانی اپنی وسعت اطلاع اور کتب حدیث کے مستند ذخائر کی اُن کے ہاں موجودگی کے باوجود اس بارے میں اُنتیس ۲۹ احادیث سے زیادہ جمع نہ کر سکے تھے۔ علامہ کشمیریؒ نے ان احادیث کے ساتھ ان تیس آثار صحابہ رضی اللہ عنہم کو بھی جمع فرما دیا تھا جس پر

ما أطلع عليها وهي نحو ثلاثين أثراً فجاءت
رسالة ملية حافلة في بابها يتيمة بين
أترابها رتبها أحد أصحابه مفتي دار العلوم
الديوبندية محترمنا ومولانا محمد
شفيع الديوبندي دام فضلها
(نفحة العنبر ص ۱۱۲ طبع جديد)

وہ مطلع ہو سکے پس اب یہ رسالہ سو نصوص حدیث
و آثار پر مبنی سب سے پہلے باب میں کافی ووافی اور اپنے
جیسے رسائل میں بہترین ، اس کی ترتیب ان کے
ساتھیوں میں سے ایک ہمارے بزرگ مولانا مفتی محمد
شفیع الدیوبندی مفتی جن کو دام فضلہ دار العلوم دیوبند
نے دیا ہے۔

حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ "التصریح" کے مقدمے میں علامہ کشمیری کی کتاب
"عقیدۃ الاسلام فی حیاۃ عیسٰی علیہ السلام" کا تذکرہ فرماتے ہوئے ارقام فرماتے ہیں۔

إلا أنه لم يسرد فيه أحاديث الباب بأسرها
روماً للاختصار وتخفيفاً على النظّار —
ولما كان في جمع هذه الأحاديث فائدة
جسيمة، ومنفعة للناس عظيمة ، جعلها
جزءاً برأسه جمع جميع ما انتهى إليه
النظر في الكتب الحديثية التي يمكن
الاطلاع عليها واستوعب سائر المجلّدات
مسند أحمد في المطالعة لتخريج هذا الباب
فجاء بحمد الله منها عدد لم يطلع عليه
كثير من العلماء المتقدمين فضلاً عن الأقران
والأقراب حتى أن القاضي الشوكاني —
من علماء القرن الثاني عشر. لما صنف
في هذا الباب رسالة سماها التوضيح فيما
تواتر في المنتظر والدجال والمسيح لم يتيسر له

لیکن علامہ قدس سرہ نے اس کتاب (عقیدۃ الاسلام)
میں اختصار کو ملحوظ رکھتے ہوئے اور پڑھنے والوں پر بوجھ
ہلکا کرنے کی غرض سے اس "عنوان" کے بارے میں احادیث
کا تذکرہ مقصوداً نہیں کیا لیکن چونکہ اس سلسلے کی احادیث
کو اکٹھا کرنا ایک بڑا فائدہ اور لوگوں کے لیے عظیم نفعت
رکھتا ہے۔ اس لیے ایسے موصوف نے ایک مستقل
رسالہ بنا دیا اور ان تمام احادیث کو جمع فرما دیا جن تک
اُن کی نظر جملہ کتب حدیث میں پہنچنی ممکن تھی۔ اور
اس بارے میں مسند احمد کی جملہ مجلّدات کا استیعاب
مطالعہ فرمایا تاکہ اس باب کی احادیث کی تخریج کر سکیں
اور اس میں بحمد اللہ تعالیٰ اتنی کثیر تعداد میں احادیث کو
جمع فرمایا کہ متقدمین علماء میں سے بھی بہت سے اس
سے آگاہ نہ ہو سکے تھے۔ ہم عصروں اور ہم عمروں کی
تو بات ہی نہیں یہاں تک کہ قاضی شوکانی جو بارھویں

إلا تسعة وعشرين حديثاً مع كثرة إطلاعه

ويعينه تحقيقه من لعدد على بعد ألمحدثة فيها بعصرها

في الباب، وقالى الله سبحانه المتوكل واليه

مآب. (التصريح ص۵۵)

(اور ہی حضرت نجم عالم ہیں جب احمدی نے اسی عنوان "التوضیح فی تواتر فی المنتظر والمسیح" پر رسالہ لکھا تو انتیس حدیثوں سے زیادہ جمع نہ کر سکے۔ باوجودیکہ وہ احادیث پر بڑی واقفیت رکھتے تھے اور ان کے زمانے میں کتب حدیث بھی زیادہ ملتی تھیں۔ پس یہ رسالہ جو ستر صریح و واضح احادیث پر مشتمل ہے اس باب میں پیش کیا جا رہا ہے۔

مشہور شامی عالم علامہ عبدالفتاح ابوغدہ نے اس کتاب کے بارے میں لکھا ہے کہ:

أنّ هذا الكتاب فريد في موضوعه

وقد ألف الإمام الكشميري هذا الكتاب

«التصريح» للناهضة من العلماء الباحثين

ليكون بيدهم سيفاً باتراً للقاديانية

وضلالتها۔ (التصريح ص۱۷)

یہ کتاب اپنے موضوع پر منفرد ہے۔ امام کشمیری نے یہ کتاب "التصریح" مناظر علماء کے لیے خاص کر تالیف فرمائی تھی تاکہ ان کے ہاتھ میں ہلاک کن تلوار قادیانیوں اور ان کی گمراہیوں کے مقابلے میں آجائے۔

اس کتاب کا مواد گو حضرت علامہ کشمیری کی محنت کا رہین منت ہے لیکن اس کی ترتیب انہیں کے ارشاد پر حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ نے فرمائی ہے۔ کتاب جہاں نزولِ عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں احادیث اور آثارِ صحابہ کا سب سے کثیر ذخیرہ مہیا کرتی ہے، اور وہاں اپنی ترتیب اور مختلف تنبیہات میں اپنے موضوع پر حرفِ آخر، برہانِ قاطع اور دلیلِ ساطع ہے اور حضرت مفتی صاحب نور اللہ مرقدہٗ است مرزائیہ جو تحدی فرمائی ہے وہ قادیانیوں کے لیے دائمی چیلنج ہے جس کا جواب انشاء اللہ وہ تا قیامِ قیامت نہیں لاسکیں گے مقدمہ کے آخر میں حضرت لکھتے ہیں۔

«والآن ننادي بعون الله القوي العزيز

بأعلى نداء، أن الخصم الشقي إن ادّعى

خلاف هذا فليأت بشيء من الآيات

اللہ تعالیٰ کی توفیق سے ہم اب بانگِ دہل اعلان کرتے ہیں کہ اگر کم بخت دشمن (مرزا غلام احمد اور اس کے حواری) اس سے خلاف دعوے

القرآنیه مع تفسیرها بمثل هذه الأحادیث لا برأیه السخیف والتصحیف والتحریف ! ولن یأتوا منه نقیراً ولا قطمیراً ولوکان بعضهم لبعض ظهیراً

ص ۸۷

کرتا ہے تو قرآنی آیات میں سے کوئی آیت مع اُس کی ایسی تفسیر کے جو ایسی احادیث سے جو ہم نے پیش کی ہیں لائے۔ وہ اپنی گھٹیا رائے پیش نہ کرے نہ قرآن وسنت تصحیف وتحریف کے ساتھ مقابل میں لائے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ وہ اس کا ادنی ترین جزو بھی پیش نہیں کر سکے گا۔ گو وہ سب اس کام کے لیے ایک دوسرے کے مددگار بھی بن جائیں۔

حضرت مفتی صاحب نے کتاب مذکور (طبع حلب ص۸۹) پر فائدہ جلیلہ کے تحت ایک عجیب اور قادیانی دعاوی کے خلاف ایک مسکت بات لکھی ہے، جس کا افادۂ عامہ کے لیے نقل کرنا ضروری سمجھتا ہوں،

اس (مقدمہ) میں کچھ پہلے کہا جا چکا ہے۔ اُس سے آپ نے یہ جان لیا ہوگا کہ تقدیر الٰہی نے اس امت میں کسی جدید نبی کی بعثت کو قطعاً طے نہیں فرمایا بلکہ نبوت کے نام سے جو چیز بھی موسوم ہو سکے سید الرسل خاتم الانبیاء محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر کلیتاً ختم فرما دیا گیا۔ اور اس کی سب سے بڑی دلیل بداہۃً یہ ہے کہ اگر کسی نئے نبی کا آنا مقدر ہوتا تو قرآن کریم اور نبی الامین صلی اللہ علیہ وسلم نے اُسے نہایت بلیغ اور انتہائی واضح الفاظ میں اس سے بڑھ کر بیان فرمایا ہوتا جیسا کہ قرآن وحدیث نے سیرۃ مسیح علیہ السلام کو بیان کیا ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام تو لوگوں میں اسلام سے پہلے اور اسلام میں زیادہ معروف شخصیت تھی۔ بخلاف المتنبی الجدید مرزا غلام احمد قادیانی کے کہ مرزا صاحب ایک غیر معروف شخصیت ہے۔ پس لہٰذا اس کی احتیاج اور ضرورت تھی۔ کہ اس کا نام اُس کے والدین کا نام اس کی پیدائش، بوقت پیدائش اس کی عمر، اس کا حلیہ وہیئت، مارنگ اور اس کے افعال واخلاق اور اس کے زمانے میں لوگوں کے احوال اس کا وقت وفات اور جائے مدفن وغیرہ کو سیرۃ المسیح علیہ السلام کے ذکر سے زیادہ شد ومد کے ساتھ بیان کیا جاتا۔ پھر جب ان میں سے کوئی چیز بیان نہیں کی گئی بلکہ اس کا اشارہ تک نہیں کیا گیا۔ بلکہ اس کے خلاف

نصوص کثرت و تواتر سے وارد ہوئے۔ اور نبوت و رسالت کے قطعی انقطاع اور نبوت و رسالت کے مدعی کے کفر پر آیات قرآنیہ اور احادیث متواترہ نے ہمیشہ کے لیے فیصلہ کر دیا۔ اور باوجود اس کے کہ نصوص قرآن و سنت نے ان تمام امور جن کی امت قیامت تک (شرعاً) محتاج ہوگی کا احاطہ کر لیا ہے۔ اور مجملہ امتوں کی فلاح کی قیامت کفیل ہوگئی ہے (تاہم کسی نبی جدید کے آنے کا کوئی معمولی اشارہ یا ادنیٰ نشان تک نہیں بتایا اس وجہ سے ہمیں یقین کامل کے ساتھ معلوم ہوگیا کہ حضور انورؐ کے بعد کوئی نیا نبی اصلاً آہی نہیں سکتا۔
کتاب کے فوائد جلیلہ کا صرف اس مختصر اقتباس سے اندازہ ہو سکتا ہے۔ یہ کتاب صرف نزول حضرت

علیہ السلام کے بارے میں ہی تحقیقات نادرہ اور معلومات وقیعہ اور نصوص ساطعہ پر مشتمل نہیں بلکہ قیامت کی دس بڑی علامات کے بارے میں بھی مصدقہ و مستند معلومات کا گنجینہ ہے۔ جدید ایڈیشن جسے علامہ عبدالفتاح ابوغدہ نے بہترین حواشی و تعلیقات اور اصلاح کے ساتھ اور طباعت کی خوبیوں کے ساتھ شائع کیا ہے جو ۳۵۵ صفحات پر مشتمل ہے۔ ہر لائبریری میں پہنچنے کے قابل ہے۔ کتاب کے آخر میں حضرت مفتی صاحب کے نہایت مفید اردو رسالہ مسیح موعود کی پہچان کا عربی میں ترجمہ برادر عزیز و محترم مولانا محمد تقی عثمانی زادت معالیہ کے قلم سے "جدول کاشیت بالقرآن والسنۃ من امارات المسیح الموعود عیسیٰ علیہ السلام" جو بیس صفحات پر مشتمل ہے ضمیمہ کے طور پر لگا دیا گیا ہے جس کی طرح عیسیٰ علیہ السلام اور المتنبی الکذاب مسیلمہ پنجاب مرزا غلام احمد لعنۃ اللہ کا امتیاز و تضاد بعد روشن کی طرح نمایاں ہو جاتا ہے۔
کاش تحفظ ختم نبوت پاکستان اس عظیم کتاب کا اردو میں بھی ترجمہ کر لیتی تو اس کی خدمات عظیمہ میں اضافہ ہو جاتا۔

ختم نبوت کامل

جیسا کہ پہلے گزر چکا مرزا غلام احمد کے بے سروپا دعاوی اور اس کے باطل دلائل اور دین اسلام میں رخنہ اندازی کی مکروہ کوششوں نے علماء حق کو عقیدۂ ختم نبوت اور دیگر مسلم دینی عقائد کی علمی و عملی حفاظت کے

لیے مجبور کر دیا۔ عقائد اسلامیہ اور نظریہ ختم نبوت کی حفاظت کا کام اللہ تعالیٰ نے جن عظیم و پاک ہستیوں سے لیا، ان میں ہمارے حضرت مفتی صاحب نور اللہ مرقدہ بھی ہیں۔

ایک بار تحفظ ختم نبوت کے امیر کارواں حضرت علامہ محمد یوسف صاحب بنوری رحمہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ حضرت مفتی صاحب کی عیادت کے لیے حاضری ہوئی۔ حضرت مفتی صاحب عارضہ قلب میں مبتلا تھے۔ قادیانیت کے خلاف اس وقت کی کوششوں میں عدم شرکت پر تحسر و افسوس کا اظہار فرمایا۔ ہمارے علامہ بنوری صاحب نور اللہ مرقدہ نے جواباً کہا "آپ حضرت شاہ صاحب علامہ کشمیری رحمہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ اس راہ میں جو کچھ کر چکے ہیں ہمیں وہ سعادت اب کیسے حاصل ہو سکتی ہے"۔ او کما قال۔

ردّ قادیانیت اور تحفظ ختم نبوت کے سلسلے میں آپ کی جو کتابیں ہیں اس میں ایک بے نظیر کتاب ختم نبوت کامل ہے۔ فقیر سمجھتا ہے کہ جو بھی سلیم الطبع قاری اس کتاب کا مطالعہ کرے گا، اسے مرزا غلام احمد اور مرزائیت کے دعاوی کے جھوٹ ہونے میں ادنیٰ شک بھی نہیں رہے گا اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا ہر اعتبار سے خاتم النبیین ہونا اظہر من الشمس ہو جائے گا۔

ختم نبوت کا مسئلہ اتنا بدیہی اور اجماعی ہے کہ بقول حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ "اس پر دلائل جمع کرنا اور اس کا ثبوت پیش کرنا ایک بدیہی کو نظری اور کھلی ہوئی حقیقت کو پیچیدہ بنانے کے مترادف معلوم ہوتا ہے۔ بلکہ اس مسئلہ کا ثبوت پیش کرنا ایسا ہی ہے، جیسا کوئی شخص مسلمانوں کے سامنے لا الٰہ الا اللہ کا ثبوت پیش کرے"۔ (ختم نبوت ص۵)

تاہم مرزا غلام احمد قادیانی اور ان کے متبعین نے اس قطعی اور اجماعی مسئلہ میں خلاف و شقاق کا دروازہ کھولا اور عوام کی جہالت اور مغربی تعلیم سے متاثر دینی تعلیم سے بیگانہ افراد کی ناواقفیت سے ناجائز فائدہ اٹھایا اور اس مسئلہ میں ان میں سے بعض کے دلوں میں طرح طرح کے اوہام و شکوک پیدا کر دیے۔ اور ان کی نظر میں اس بدیہی مسئلہ کو نظری بنا دیا۔ اس لیے اہل علم و اہل دین کو اس طرف متوجہ ہونا پڑا کہ ان کے شبہات و شکوک دور کیے جائیں اور قرآن و حدیث کی صحیح روشنی ان کے سامنے لائی جائے۔ اسی وجہ سے حضرت مفتی صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کو یہ کتاب لکھنی پڑی۔ چونکہ تصنیف کتاب کا سبب مرزا غلام احمد قادیانی کا دعویٰ اور اس کے مختلف ادوار کے متضاد اقوال ہیں۔ اس لیے کتاب کے شروع میں مرزا غلام احمد قادیانی کے تینوں

ادوار کے مختلف دعاوی کو پیش کیا گیا ہے۔ پہلا دور وہ جس میں وہ ختم نبوت کے عقیدہ میں جمہور مسلمانوں کے ساتھ متفق تھے۔ دوسرا دور جبکہ انہوں نے ختم نبوت کے معنی میں تحریفات شروع کیں اور اپنے مزعومہ اقسام نبوت سے بعض کا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد جاری ہونا بتلایا اور اس جاری رہنے والی نبوت کے مدعی بن گئے۔ تیسرا دور جبکہ وہ کھلے بندوں تشریعی اور غیر تشریعی نبوت کے سلسلے کو جاری قرار دینے لگے اور خود کو صاحب شریعت نبی تبلایا۔ اس کے بعد حضرت مفتی صاحب نے تین عنوانات کے تحت میں دلائل تو یہ پیش کیے۔

۱۔ ختم النبوۃ فی القرآن حصہ اول صفحہ (۱۹۷)

اس حصہ کے شروع میں پہلے تفسیر قرآن کے صحیح معیار اور اس کے صحیح طریق پر کلام کیا ہے۔ پھر ننانویں آیت کریمہ سے "ختم نبوت" کے ہر پہلو کو ثابت فرمایا ہے۔ صرف پہلی آیت:

ما کان محمدٌ ابا احدٍ من رجالکم ولکن رسول اللہ وخاتم النبیّٖن و کانَ اللہ بکلِّ شیٍٔ علیماہ	نہیں ہیں محمد صلی اللہ علیہ وسلم تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ لیکن آپ اللہ کے رسول اور تمام انبیا کے ختم کرنے والے ہیں اور ہے اللہ تعالے ہر چیز کا جاننے والا۔

پر دلائل وشواہد کا جو عظیم ذخیرہ جمع فرمایا ہے وہ ہر منصف مزاج کے لیے اس موضوع کے بارے میں کفایت کرتا ہے۔

حضرت مفتی صاحب نے اس آیت کی تفسیر خود قرآن کریم سے اور احادیث مبارکہ و آثار صحابہ و تابعین سے اور پھر ائمہ مفسرین کے اقوال سے کی ہے۔

ایک جگہ خاتم النبیین میں جمہور کے بیان کردہ معنی کی تائید میں متعدد صحابہ کا نام لکھنے کے بعد تحریر فرماتے ہیں، چونسٹھ حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین سے بھی ختم نبوت کے وہی معنی بالفاظ مختلفہ منقول اور ثابت ہیں جو مکرر عرض کئے گئے یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم آخری نبی ہیں۔ آپ کے بعد کسی قسم کا کوئی نبی پیدا نہیں ہوسکتا۔ اگر قلب میں کوئی احساس اور دماغ میں سمجھنے کا کچھ مادہ ہے کہ کوئی مسلمان بلکہ کوئی منصف مزاج کافر بھی ان چونسٹھ حضرات صحابہ کی شہادتوں کے بعد ہمارے دعویٰ کے ثبوت میں کسی قسم کا شک و شبہ

نہیں کر سکتا۔ ورنہ پھر ہدایت وضلالت کسی بشر کے قبضہ میں نہیں :

بَلِ الْاَمْرُ بِيَدِ اللّٰهِ يُصَرِّفُ كَيْفَ يَشَآءُ ص۱۹۷

حضرت مفتی صاحبؒ نے ائمہ تفسیر کے ایسے جامع مسکت اور شافی وافی تفسیری کلمات نقل فرما دیئے ہیں، جسے اگر کافر معاند بھی نظر انصاف سے دیکھے تو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی اس آیت سے آخری نبی ہونے اور نئے نبی کے نہ آنے کے بارے میں کوئی شبہ نہیں کرے گا۔ حضرت مفتی صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کا ہر نقل کردہ اقتباس دیکھنے کے قابل ہے۔ جس کی جامعیت وخوبی کا اندازہ کتاب کے پڑھنے سے ہو سکتا ہے۔

اس کے آخر میں قادیانی شبہات کا مفصل جواب دینے کے بعد انہیں چیلنج کیا ہے کہ اے مرزائی جماعت اور اس کے معتمد ارکان! اگر تمہارے دعویٰ میں کوئی صداقت کی بو اور قلوب میں کوئی غیرت ہے تو اپنی ایجاد کردہ تفسیر کا کوئی شاہد پیش کرو۔ اور اگر ساری جماعت مل کر قرآن کے تیس پاروں میں سے کسی ایک آیت میں، احادیث کے غیر محصور دفتر میں کوئی ایک حدیث میں، اگرچہ ضعیف ہی ہو صحابہ وتابعین کے بے شمار آثار میں سے کسی ایک قول میں یہ دکھلا دے کہ خاتم النبیین کے معنی یہ ہیں کہ آپ کی مہر سے انبیاء بنتے ہیں . . . . لیکن میں بحول اللہ وقوتہ اعلاناً کہہ سکتا ہوں کہ اگر مرزا صاحب اور ان کی ساری امت مل کر ایڑی چوٹی کا زور لگائیں، تب بھی ان میں سے کوئی ایک چیز پیش نہ کر سکیں گے۔

ولو كان بعضهم لبعض ظهيراً۔

اس حصہ میں حضرت مفتی صاحب نے کل ۹۹ آیتیں تفسیر کے ساتھ ختم نبوت کی دلیل میں پیش کی ہیں اور پھر ارشاد فرمایا ہے "مسئلہ ختم نبوت کا ہر پہلو قرآن مجید کی روشنی میں واضح ہو چکا۔ اس کی ننانوے آیتوں نے ہر سوتے ہوئے کو بیدار اور بیدار کو ہوشیار کر کے خدا کی حجت اہل عالم پر تمام کر دی۔ اس کے بعد بھی اگر کوئی ختم نبوت پر ایمان نہ لاتے تو اس کی قسمت ہ فبای حدیث بعده یومنون اس کے بعد وہ کون سی بات پر ایمان لائیں گے۔"

دوسرا حصہ ختم النبوۃ فی الحدیث ہے۔ اس حصہ میں مفتی صاحبؒ نے دو سو دس احادیث کو پیش

کیا ہے اور آپ کی ختم نبوت کو ثابت کیا۔ اس حصہ کے شروع میں یہ ثابت کیا ہے کہ "احادیث ختم نبوت کے متواتر ہونے میں کوئی شبہ نہیں" بلکہ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس کا تواتر بھی اس درجہ کا تواتر ہے جس درجہ کا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات اور قرآن مجید کا تواتر ہے۔ (ص۲۲۳)

اس کے بعد حضرت مفتی صاحب نے احادیث صحیحہ سے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ہر قسم کی ظلی، بروزی، تشریعی، غیر تشریعی، لفظی یا معنوی نبوت کا ابطال کیا ہے۔ دلائل کا یہ عجیب ذخیرہ دیکھنے کے قابل ہے۔

اس کتاب کا تیسرا حصہ "ختم النبوۃ فی الآثار" ہے۔ یہ حصہ بھی حضرت مفتی صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کے وفور علمی وسعت مطالعہ اور دقت نظر کا نمونہ ہے جس میں اجماع صحابہ، اجماع اُمت سے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ہر قسم کی نئی نبوت کے اجرا کا ابطال کیا ہے۔ سب سے پہلے اجماع کی حقیقت بیان فرمانے کے بعد لکھا ہے کہ اجماع میں سب سے مقدم اور سب سے زیادہ قطعی اجماع صحابہ ہے۔ ص۳۲۵۔

پھر یہ ثابت کیا ہے کہ صحابہ کرام کا سب سے پہلا اجماع مسئلہ ختم نبوت پر اور اس کے منکر کے مرتد و واجب القتل ہونے پر ہوا ہے۔ ص۳۲۶۔ اس کے علاوہ حضرت مفتی صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے ان اسی جلیل القدر صحابہ کے اسمائے گرامی نقل کئے ہیں، جو ختم نبوت کے شاہد ہیں۔ اجماع صحابہ کے بعد محدثین کرام، مفسرین عظام، فقہائے علام، صوفیائے اعلام، متکلمین فخام کے اقوال اور شہادتوں سے پوری اُمت کا روز اول سے آج تک اس متفقہ اور مسلم عقیدہ پر مجتمع ہونا ثابت کیا ہے۔ حضرت مفتی صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کی یہ کاوش حیرت انگیز علمی اور دینی خدمت ہے، جس کے بعد کوئی منصف مزاج شخص ختم نبوت کا انکار نہیں کر سکتا۔

اُمت کے اس عظیم دینی، علمی دلائل کے ذخیرہ کے پیش کر دینے کے بعد کتب قدیمہ تورات و انجیل وغیرہ سے ختم نبوت کو ثبوت پیش کئے ہیں۔ ان جملہ منقولی دلائل کے بعد عقلی دلائل سے مرزا کے اکاذیب و

دعاوی کا قلع قمع اور ختم نبوت کا اثبات کیا ہے۔ کتاب کے آخر میں مرزائیوں سے دردمندانہ اپیل ہے کہ ان
آفتاب کی طرح روشن بینات ونصوص اور براہین واضح کو بغیر تعصب اور خودغرضی کے دیکھیں تاکہ ان پر واضح
ہو جائے کہ اسلامی روایات کے عظیم ذخائر میں کسی بھی غیر تشریعی یا ظلی یا بروزی یا لغوی یا مجازی یا جزوی یا
غیر مستقل نبوت کا قطعاً کوئی ثبوت نہیں ملتا ہے۔ اور نبوت کی ہر قسم کا کلی انقطاع آفتاب کی طرح واضح ہے۔
چار سو صفحات کی اس کتاب کے مندرجات کو ہم خاطی وقاصر رقم کیسے سمیٹے۔ چند لفظوں میں اتنا
کہا جاسکتا ہے کہ ردِ قادیانیت اور اثباتِ ختم نبوت پر اردو میں ایک نہایت ہی قابلِ قدر، عظیم و مستند
لائق ستائش ومطالعہ کتاب ہے، جو مصنف علاّم کی فضیلت کی "آیات بینات" میں شمار کی جاسکتی ہے۔

ھدیۃ المھدیین فی آیۃ خاتم النبیین

یہ کتاب حضرت مفتی صاحب نور اللہ مرقدہ کا جوانی کی عمر کا ۱۱۵ صفحات کا ردِ قادیانیت میں وہ لاجواب رسالہ
ہے جو امام العصر حضرت محمد انور شاہ کشمیری قدس سرہ کے ارشاد پر لکھا گیا اور جسے نابغۃ الدہر حضرت علامہ محمد یوسف
بنوری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی آخری عمر میں ایک لاکھ چھپوا کر ممالک عربیہ میں تقسیم کرنے کا منصوبہ بنایا اور جس پر
حضرت انور شاہ کشمیریؒ، حضرت مفتی عزیز الرحمانؒ، حضرت مولانا حبیب الرحمان عثمانیؒ، حضرت مولانا اعزاز علیؒ
مولانا محمد رحیم اللہ بجنوریؒ جیسے اساطین علم وفضل کی ستائش سے پر تقاریظ موجود ہیں۔ حضرت کشمیری قدس سرہٗ
انقطاع نبوت اور ابطال قادیانیت کے بارے میں کتاب کے فوائد کا تذکرہ کرنے کے بعد اپنی تقریظ کے
آخر میں لکھتے ہیں۔

وھاک رسالۃ تفسیریۃ حدیثیۃ	آپ کے سامنے یہ ایک رسالہ پیش ہے (جو انقطاع نبوت
کلامیۃ فقہیۃ وعین ذٰلک	اور ردِ قادیانیت) کی تفسیری، حدیثی، کلامی دلائل پر مشتمل
کلہ ادبیۃ یسری الفاظھا	ہے۔ مزید برآں یہ رسالہ ادبی ہے، اس کے الفاظ دل و
سرایۃ الروح فی البدن وبقیع	دماغ میں ایسے سرایت کر جاتے ہیں جیسے بدن میں روح

---

[۱] کتاب کے شروع میں حضرت مولانا حبیب الرحمن عثمانی کے ارشاد پر مرزا صاحب کے دعاوی باطلہ بھی نقل کردیے ہیں۔

فی قلب المومن کحلاوۃ الایمان	اور ایمان والے کے دل میں اس کا مزہ ایمان کی حلاوت
ویجری فی العروق کمحض اللبن	کی طرح محسوس ہوتا ہے اور اس کے اثرات رگوں میں
(ص۱۱۶)	خالص دودھ کی طرح دوڑنے لگتے ہیں۔

ان بزرگوں کی ان بیش بہا تقاریظ کے بعد اس کتاب کے بارے میں اس ناکارہ کا کچھ لکھنا جسارت سے تحصیل حاصل ہے۔ تاہم تعارف کے طور پر چند باتیں عرض کئے دیتا ہوں۔

۱۔ ابتدا میں مرزا صاحب کی کتابوں سے اس کے نبوت وغیرہ کے دعوؤں کا اتنا تذکرہ اجمالاً کر دیا گیا ہے کہ جو اس متنبی کبیر کے دجل و دعاوی باطلہ اور تلبیح و فریب سے قاری کو معتدبہ حد تک آگاہ کر دیتا ہے۔

۲۔ پہلے باب میں ختم نبوت کا اثبات قرآن عظیم کی آیات کریمہ سے ہے تینتیس آئتیں نقل کر کے ان کی شرح کی گئی ہے جس میں آیت ما کان محمد ابا احد من رجالکم ولکن رسول اللہ وخاتم النبیین کی تفسیر سب سے زیادہ شرح و بسط سے ہے جو کتاب کے چالیس صفحات پر پھیلی ہوئی ہے اور جس میں قرآن کی صحیح تفسیر کا معیار بیان کرنے کے بعد آیت کی تفسیر (۱) لغت عرب (۲) قرآن مجید (۳) احادیث مبارکہ (۴) آثار صحابہ و تابعین (۵) اقوال ائمہ مفسرین سے کی گئی ہے۔ اور آخر میں ازالۃ الشبہات کے عنوان سے مرزائیوں کے شبہات باطلہ و تحریفات واہیہ کا مثبت و مسکت جواب دیا ہے۔

۳۔ دوسرا باب ختم نبوت کا اثبات احادیث مبارکہ سے ہے اور پھر ان احادیث کی شرح اور فوائد متعلقہ لکھے گئے ہیں۔ اس باب کی تمہید ان الفاظ سے شروع ہوتی ہے۔

لا یخفی علی المتدرب ان الاحادیث	کسی اہر شمس و مشتاق فن شخص پر یہ بات مخفی نہیں
الواردۃ فی ھذا الباب اکثر من ان	ہے کہ ختم نبوت کے باب میں احادیث اس کثرت سے
تحصیٰ لاشک فی تواترھا المعنوی	وارد ہوئی ہیں کہ شمار سے زیادہ ہیں۔ اور اس میں

ؔ حضرت قاسم العلوم والخیرات مولانا قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے تحذیر الاخوان میں بھی ص۵ پر حدیث لا نبی بعدی کو معنوی لحاظ سے متواتر کہا ہے اور اس کے منکر کو کافر قرار دیا ہے۔ خیال رہے کہ جاہل قادیان و ربوہ حضرت موصوف کی اس کتاب کی بعض عبارتوں کو سیاق و سباق سے کاٹ کر یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ العیاذ باللہ حضرت مولانا موصوف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اجرائے نبوت کے قائل تھے۔ فلعنۃ اللہ علی الکاذبین۔

بل بعضها كاد تبلغ مبلغ التواتر اللفظي ايضاً حتى قال ابن حزم الاندلسي ان تواترها كتواتر القرآن العظيم ونبوة عليه الصلوٰة والتسليم حيث صرح في الملل ص۷۷ ج ۱، وقد صرح عن رسول الله عليه وسلم بنقل الكواف التي نقلت نبوته واعلامه وكتابه انه اخبر انه لا نبي بعدي الخ وقال ابن كثير ما مر تفصيله هذا بعض الفاظه وبذلك وردت الاحاديث المتواترة عن رسول الله صلى الله عليه وسلم من حديث جماعة من الصحابة رضي الله تعالى عنهم فهذه اعلام الحديث وحفاظه فاق صرحوا بكونها متواترة يجب الايمان

کوئی شک نہیں کہ یہ احادیث معنوی تواتر تک پہنچی ہوئی ہیں۔ بلکہ ان میں سے بعض تواتر لفظی تک پہنچ چکی ہیں۔ یہاں تک کہ علامہ ابن حزم الاندلسی نے کہا کہ ان کا تواتر ایسا ہی واضح اور روشن ہے جیسا کہ قرآن عظیم اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا۔ جیسا کہ انہوں نے ملل ص۷۷ ج۱ پر تصریح کی ہے کہ یہ صراحت حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کثیر التعداد حضرات نے نقل کی ہے جن کثیر التعداد حضرات نے آپ کی نبوت، معجزات اور کتاب کو نقل کیا ہے۔ انہوں نے آپ کا یہ ارشاد بھی نقل کیا ہے کہ آپ کے بعد کوئی نبی نہیں ہوگا۔ اور ابن کثیر نے جو کہا ہے، اس کی تفصیل گزر چکی ہے۔ اس کے بعض الفاظ یہ ہیں "آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے خاتم النبیین ہونے کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے احادیث متواترہ وارد ہیں، جو صحابہ کی ایک بڑی جماعت سے نقل کی گئی ہیں۔ پس مذکورہ بالا علم حدیث کے وہ اعلام و حفاظ ہیں، جنہوں نے ختم نبوت کی احادیث کے متواتر ہونے کی صراحت کی ہے۔ جس پر ایمان لانا واجب ہے۔ اس سے ختم نبوت کے منکر کو کافر کہا جائے گا۔ جیسا علامہ سید آلوسیؒ

.....آپ کی عبارت کا متعلقہ حصہ درج ذیل ہے۔ سو اگر (لفظ آیت وخاتم النبیین میں) اطلاق اور عموم ہے تب تو خاتمیت زمانی ظاہر ہے ورنہ تسلیم لزوم خاتمیت زمانی بدلالت التزامی ضرور ثابت ہے اور تصریحات نبوی مثل انت منی بمنزلة هارون من موسٰی الا انه لا نبی بعدی (اوکما قال) جو بظاہر بطرز مذکور اسی لفظ خاتم النبیین سے ماخوذ ہے۔ اس باب میں کافی ہے۔ کیونکہ یہ مضمون تواتر تک پہنچ چکا ہے۔ پھر اس پر اجماع منعقد ہو گیا۔ گو الفاظ مذکور بسند تواتر منقول نہ ہوں۔ سو یہ عدم تواتر باوجود تواتر معنوی ایسا ہی ہوگا جیسا تواتر اعداد رکعات فرائض و تر وغیرہ۔ باوجودیکہ الفاظ تعداد رکعات متواتر نہیں جیسا اس کا منکر کافر ہے ایسا ہی حدیث لا نبی بعدی کا منکر بھی کافر ہے۔
(تحذیر الناس ص۹)

به ولذا اکفر وا منکرہ فقد قال السیّد الالوسی ما نصہ وکونہ صلی اللہ علیہ وسلم خاتم النبیین مما نطقت بہ الکتاب وصدعت بہ السنۃ واجمعت علیہ الامۃ فیکفر مدعی خلافہ ویقتل ان اصرّ (روح المعانی ج ۲۲ ص ۳۹ سورۂ احزاب)

نے کہا ہے جس کی عبارت یہ ہے: "حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا خاتم النبیین ہونا ایسی بدیہی بات ہے جس کے بارے میں قرآن مجید نے تصریح فرمائی اور احادیث نبویہ نے صاف طور سے ان کو بیان فرمایا۔ اور اس پر تمام امت کا اجماع ہے۔ اس لیے اس کے منکر کو کافر سمجھا جائے گا۔ اور اگر اصرار کرے تو قتل کر دیا جائے گا۔"

اس کے بعد ستر ہ احادیث صحیحین سے، ۱۱ ثلثہ باقی صحاح ستہ سے اور ۱۱۴ دیگر حدیث کی کتب معتبرہ سے کل ۱۴۲ احادیث نقل کی ہیں۔ جن میں سے ۹۹ احادیث ایسی ہیں جن سے ختم نبوت کے معنی متعین ہوتے ہیں۔

۴: تیسرا باب: ختم نبوت کا اثبات اجماع امت سے ثابت کیا ہے۔ اس باب کے شروع میں حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ لرقام فرماتے ہیں۔

فاعلموا ان الامۃ الامیۃ من لدن عہد النبی الکریم صلی اللہ علیہ وسلم الی یومنا ھذا قد اجمعت علی ان کل نبوۃ بعد نبینا صلی اللہ علیہ وسلم مختتمۃ ومنقطعۃ وکل من ادعی ذلک کافر دجال باجماعہم اجمعین وقد مضت الدھور وانقضت القرون وھو علی ذلک ملنا

جان لو کہ امت امیہ: محمدیہ مرحومہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد سے آج دن تک اس بات پر متفق و مجتمع ہے کہ نبوت کی ہر قسم ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد قطعاً ختم اور کلیۃً منقطع ہے اور جس نے بھی (کسی قسم کی) نبوت کا دعویٰ کیا۔ وہ ان سب کے اجماع کے مطابق کافر دجال ہے۔ اور اسی متفقہ عقیدہ پر زمانے اور صدیاں گزر گئیں گروہ قائم دائم اور متفق ہیں۔

حضرت مفتی صاحب نور اللہ مرقدہ نے اس کے بعد شواہد مبینہ سے صحابہ کا اجماع مدعی نبوت کے ارتداد و قتال پر نقل کیا۔ یہ پوری تمہید قابل مطالعہ ہے، جس کے آخری الفاظ یہ ہیں۔

فعلم من امر المسیلمۃ ومقاتلۃ الصحابۃ علی ان دعوی النبوۃ ولو من غیر کتاب وشریعۃ مع تسلیم نبوۃ خاتم الانبیاء علیہ الصلوٰۃ والسلام

مسیلمہ کے واقعہ سے اور صحابہ رضی اللہ عنہم کے اس سے قتال اور اس کے قتل کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر نبوت کا دعویٰ بغیر کتاب و شریعت کے خاتم الانبیاء علیہم السلام کی نبوت کے ماننے کے ساتھ بھی کیا

ارتداد کفر یقتل مدعیہ — جائے، تو یہ دعویٰ ارتداد و کفر ہے اور اس کا مدعی قتل کیا جائے گا۔ ۸۷

اس تمہید کے بعد چودہ اعیان و کبار صحابہؓ کے اسمائے گرامی نقل کئے گئے ہیں۔ جنہوں نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم پر اختتام نبوت کی تصریح فرمائی ہے۔ اور نبوت کے نام کا اطلاق جس بات پر بھی ہو سکے انقطاع قطعی کو بیان فرمایا ہے۔ اس کے بعد اعیان امت و اکابر علماء و فقہاء مفسرین اور صوفیہ کے اقوال اس کی تائید میں نقل کئے ہیں۔ جو ہر انصاف پسند شخص کے لیے حجت قاطع، برہان ساطع ہیں اور اس کی تسلی و تشفی کا سامان ہیں۔ آخر میں کتب امم سابقہ سے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے خاتم الانبیاء ہونے کو ثابت کیا ہے۔ کتاب ۱۳۴۲ھ میں تصنیف ہونے کے باوجود اپنے موضوع پر منفرد، مفید، نافع اور پڑھنے پڑھانے کے لائق ہے۔ اس ایک سو پندرہ صفحات کی کتاب میں حضرت مفتی صاحب نور اللہ مرقدہ نے اس عنوان پر قرآن و سنت اور اسفار و کتب ائمہ امت کا عطر و خلاصہ پیش کیا ہے۔ بندہ سمجھتا ہے کہ جو شخص بھی خلوص ذہن اور حق کوشی کی نیت سے اس رسالہ کو پڑھے گا اس کیلئے یہ کافی و وافی ثابت ہوگا۔ والہدایۃ بید اللہ۔

مقامِ صحابہؓ

حضرت صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کی پاک ہستیاں انبیاء علیہم السلام کے بعد انسانیت کا خلاصہ و سرِ امتیاز، رشد و ہدایت کا مینار اور خاتم الانبیاء حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تربیت یافتہ نگاہِ کرم کی پروردہ اور آپ کی زندگی کا کارنامہ ہیں۔ یہی قدسیوں کی جماعت آپ کے علم و عمل کی حامل و امین و داعی اور ان کی زندگی کی شاہد و گواہ ہے۔ نصوص دینیہ قرآن کریم و احادیث نبویہ کے پہلے راوی صحابہ کرام ہی ہیں۔ اگر ان کی دیانت و ثقاہت کو مجروح کر دیا جائے تو اسلام اور پیغمبر اسلام علیہ الف الف تحیہ و سلام پر سے (العیاذ باللہ) اعتبار کا سب سے محکم ذریعہ ساقط ہو جاتا ہے۔ اور دین قویم کی عظیم ترین سند ہاتھ سے جاتی رہتی ہے۔ اس لیے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ذوات عالیہ نری تاریخی شخصیات نہیں۔ بلکہ ان کی حیثیت "دینی" ہے اور دین کی اسناد کی سب سے مضبوط اور سنہری کڑی وہی ہے۔ امت کے نزدیک یہ مسلمہ اور متفقہ امر ہے کہ اسنادِ دین ہیں۔ اس لیے

صحابہ نہ صرف دین کے راوی ہیں۔ بلکہ خود دین اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے مثنی اور نظیر ہیں اور حقیقتاً اسلام کی برتری و حقانیت کا ثبوت ہیں جن کی فضیلت پر نصوص قرآنیہ اور ارشادات نبویہ کافی ہیں۔ یہی تو قدسیوں کی وہ جماعت ہے جن کا تذکرہ امم سالقہ کے صحف کی زینت بنا۔ جو کبھی فاران کی چوٹیوں سے اتری اور کبھی تورات و انجیل کے اوراق کی زینت بنی۔ اس لیے ان کی زندگی کو امت نے ہر دور میں اجماعی طور پر تنقید سے بالا سمجھ کر انہیں "عدول اور ثقات" قرار دیا۔ اور ان کے اسوہ اور نمونہ کا اپنے کو محتاج سمجھا اور ان کی زندگیوں کے نقش و نگار کو ان کی مجموعی زندگی کے حسین چوکھٹے میں اس طرح سجایا کہ ان کی ہر ادائے دلبرانہ پر دل لے مرحبا کہا۔ ان کے اجتہادی "مشاجرات" کو اخلاص و نیک نیتی پر محمول گردان کر اسے حوالہ خدا کیا۔ سکوت اور حسن ظن کو اپنا شیوہ بنایا اور ان کی مشاجرات میں بھی راہنمائی کے ایسے نمونے تلاش کیے جس کے پیش کرنے سے باقی لوگ قاصر ہیں۔ ان کی زندگیوں کو صرف تاریخی روایات کے رطب و یابس سے نہیں پرکھا گیا بلکہ انہیں قدوہ، اسوہ اور ائمہ ہدیٰ سمجھ کر ان کی زندگیوں اور ان کے نقوش قدم کی جستجو دیانت محدثانہ انداز سے کی گئی۔ اہل سنت والجماعۃ کا ہمیشہ یہ مسلک رہا کہ انہوں نے زائغین، روافض و ناصبیہ اور فرق ضالہ بلکہ تاریخ تک کی عام مجروح، غیر معتدل، موضوع و باطل روایات سے صحبت خیر الانبیا صلی اللہ علیہ وسلم کے حاملین صحابہ کے اس مجتبیٰ و مختار طبقہ پر کوئی آنچ نہیں آنے دی۔ اور ان کے متعلق ہر بات کامل احتیاط سے کہی اور ہر قدم پھونک پھونک کر رکھا اور معرفت صحابہ کو ایک خاص علم قرار دے کر اس پر لے شمار بیش بہا کتابیں لکھیں اور حقیقت یہ ہے کہ سید الانبیا حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل شدہ کتاب قرآن کریم اور آپ کی احادیث مبارکہ کا تقاضا بھی یہی تھا کہ آپ کے تربیت یافتہ جنہیں کتاب اللہ نے «والذین معہ» کے الفاظ سے نواز کر تورات و انجیل میں بھی سراپا ستائش قرار دیا ہے۔ صحابہ کے بارے میں انتہائی حزم و احتیاط کی جائے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے تنبیہ فرمائی تھی۔

اللہ اللہ فی اصحابی لاتتخذوھم	اللہ سے ڈرو۔ اللہ سے ڈرو۔ میرے صحابہ کے بارے
غرضاً من بعدی فمن احبھم	میں خبردار رہو۔ میرے بعد انہیں اپنے طعن و تشنیع
فبحبی احبھم ومن ابغضھم	ملامت و تنقید کا نشانہ نہ بناؤ کہ اصل بات یہ ہے
فببغضی ابغضھم ومن اٰذاھم	کہ جس نے ان سے محبت کی تو میری محبت کی وجہ سے
فقد اٰذانی ومن اٰذانی فقد	ان سے محبت کی اور جس نے ان سے بغض رکھا تو

اذی اللہ فیوشک ان یاخذہ

(جمع الفوائد ص۲۹۱ ج ۲)

(بحوالہ ترمذی عبد اللہ ابن مغفل)

تو دراصل) میرے بغض کے سبب سے ہی ان سے بغض رکھا اور جس نے ان کو ایذا دی۔ اس نے مجھے ایذا پہنچائی۔ اور جس نے مجھے ایذا دی اس نے اللہ تعالیٰ کو ایذا پہنچائی اور جو اللہ تعالیٰ کو ایذا پہنچانا چاہیے تو قریب ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو عذاب میں پکڑ لے۔

حضرت صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بارے میں حضرت الاستاذنا لبخو الدہر علامہ محمد یوسف البنوری نور اللہ مرقدہٗ نے عقبات کے مقدمہ میں خوب لکھا ہے۔

اذا قلنا لرجل انه صحابی او انه صحب رسول الله صلی الله علیه وسلم فناديك به مزية وفضيلة فی قوة ایمانه شدة یقینه وکمال اخلاصه وعمق علمه حسن عمله وجهاده فی سبیله ایثارلما عند الله وزهده فی الدنیا تکاننا اثبتنا له کل کمال وجمال وکل فضل ونبل فاذن ذلک ابلغ تعبیرا واوجزه لاثبات فضل وکمال قال سیدنا عبد الله بن مسعود رضی الله عنه ذلک الصحابی الجلیل الذی قال فیه سیدنا الفاروق رضی الله عنه "کنیف ملئ علما وفقها" فی اصحاب سیدنا الرسول الله صلی الله علیه وسلم۔ اولئک اصحاب محمد صلی الله علیه وسلم

جب ہم کسی شخص کے بارے میں یہ کہتے ہیں کہ وہ صحابی ہے یا اس نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت اٹھائی ہے تو صحابہ کی قوت ایمان، شدت یقین کمال اخلاص، علمی گہرائی، حسن عمل جہاد اور اللہ تعالیٰ کی مرغوبہ چیزوں کی ترجیح اور دنیا سے بے رغبتی میں فضیلت وکمال سمجھنے کے لیے یہ لفظ (صحابی) ہی سے لیے کافی ہے۔ گویا (جب ہم کسی شخص کو صحابی یا اس کے لیے صحبت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا تذکرہ کرتے ہیں، تو اس شخص کے لیے ہم ہر کمال وحسن، فضیلت و شرافت کو ثابت کر دیتے ہیں۔ (کہ لفظ صحابی میں یہ سب کچھ موجود ہے۔) اس طرح صحابی کے لفظ کا استعمال فضل وکمال ثابت کرنے کے لیے بلیغ ترین اور مختصر ترین تعبیر ہے۔ صحابی جلیل سیدنا عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ (جن کے بارے میں سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے کہ علم وفقہ سے بھرپور تھیلی ہیں ان) ابن مسعودؓ کا ارشاد ہے وہ اصحاب

كانوا افضل هٰذه الامة ابرها قلبًا واعمقها علمًا واقلها تكلفًا اختارهم الله لصحبة نبيه صلى الله عليه وسلم ولاقامة دينه فاعرفوا لهم فضلهم واتبعوهم على اثرهم وتمسكوا بما استطعتم من اخلاقهم وسيرهم فانهم كانوا على الهدى المستقيم ؎

(صبقات)

محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس اُمّت میں سب سے افضل تھے جن کے دل سب سے پاکیزہ جن کا علم سب سے گہرا ہے جو سب سے کم تکلف کرنے والے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت کے لیے چنا تھا تاکہ وہ ان کے دین کو قائم کریں پس ان کی فضیلت کو پہچانو ان کے نقش قدم پر چلو اور جس قدر ممکن ہو ان کے اخلاق اور سیرت کو مضبوطی سے پکڑو کہ وہ سیدھے راستے پر تھے۔

"صحابہ کا مقام" کوئی کیا بیان کرے۔ خلاصہ یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے بعد سرتاج خلائق زبدۂ کائنات اور ذروۂ فضائل بشریت تھے۔ زمانے کا کلیجہ نہ تھا کہ ان قدسی ہستیوں کو ایک قرن سے زیادہ سنبھال سکتا ؎

آئے عشاق گئے وعدہ فردا لے کر۔ اب انہیں ڈھونڈ چراغ رُخ زیبا لیکر

اُمّت ہمیشہ اس سرجلوہ خیرالاُمم طبقہ کی انتہائی قدر و منزلت کرتی رہی اور ہمیشہ اسے ایک "مقام خاص" کا حامل سمجھ کر ان نجوم ہدایت سے فیض پاتی رہی اور اپنی "زبان و قلم" کی تنقید و اعتراض سے ہمیشہ اسے بالا سمجھا۔ اور اہل سنت والجماعت کا ایک خصوصی امتیاز ہی یہ سمجھا گیا کہ وہ حاملان صحبت نبوتؐ اور "والذین معہٗ" کے اس زمرۂ مقربین کو قدوہ و رہنما سمجھتی ہے۔ ان سے راہ پاتی ہے۔ اور اپنے کو "راہ بین" جان کر ان نفوس قدسیہ کی جانچ و تنقید اپنے "ذہنی و خود ساختہ" پیمانوں سے نہیں کرتی۔ اور نہ ہی تاریخی روایات و حکایات کے "رطب و یابس" کو معیار بنا کر ان خاصان خدا کو ہدف جرح بناتی ہے۔ "مشاجرات صحابہؓ" کے بارے میں ان کا عمل رئیس التابعین حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ تعالیٰ کے اس زرین ارشاد پر کف لسان اور سکوت ہے۔

وقد سئل الحسن البصرى عن قتالهم فقال قتال شهده اصحاب محمد صلى

حضرت حسن بصریؒ سے صحابہ کے باہمی قتال کے بارے میں پوچھا گیا تو جواباً ارشاد فرمایا اس قتال میں اصحاب محمد صلی اللہ علیہ وسلم حاضر تھے۔ اس لیے وقت کی ضرورت

؎ حضرت بنوری نور اللہ مرقدہ نے عبارت تکلفًا تک نقل کر کے آگے اشارہ کر دیا۔ راقم نے باقی عبارت جمع الفوائد سے جرأت سے نقل کر دی۔

اللہ علیہ وسلم وغبنا وعلموا	دینی سے واقف تھے، اور ہم غائب تھے۔ اس لیے
وجهلنا واجتمعوا فاتبعنا	حقیقت حال کو پورا نہیں جانتے۔ اس لیے جس چیز پر
واختلفوا فوقفنا	ان کا اتفاق ہوا۔ اس میں ہم نے ان کی پیروی کی اور
(تفسیر قرطبی سورہ حجرات)	جس چیز میں ان کا اختلاف ہوا اس میں ہم نے توقف اور
	سکوت اختیار کیا۔

کیا قیامت ہے کہ اہل سنت والجماعت اور جمہور علمائے امت کے متفقہ مسلک کے خلاف اس دور کے بعض "اہل قلم و زعما" نے جو "تجدید ملت" اور "اصلاح امت" کے داعی ہیں اور طریقہ سلف اور اہل سنت والجماعت کے زمرہ میں اپنے کو شمار کرتے ہیں۔ خیر القرون کے ان خیار امت اور "السابقون الاولون من المهاجرین والانصار" کے بعض ممتاز افراد اور خصوصاً اور باقی اصحاب کو عموماً اپنی تنقید کا تختہ مشق بنایا ہے اور ان کا العیاذ باللہ "محاسبہ" عام اعیان اور رجال تاریخ کی طرح عمومی معیار تاریخ پر کیا ہے اور اسے عصر حاضر کی ایک اہم ضرورت قرار دے کر اپنے ایک دینی فریضہ کی ادائیگی قرار دیا ہے۔ گویا ان کے نزدیک صحابہؓ بھی تاریخ انسانی کے عمومی رجال منصب وجاہ تھے، جن کا کوئی دینی مقام خاص نہ تھا اور نہ ہی "اسلامی جرح و تعدیل" کی حدود و قیود اور "مشاجرات صحابہؓ" کے بارے میں کف لسان کی پابندیاں کوئی اہمیت رکھتی تھی۔ کاش شیخ شیرازیؒ کا یہ حکیمانہ قول ان کے سامنے ہوتا ؎

نہ ہر جائے مرکب تواں تاختن — کہ جاہا سپر باید انداختن

تو وہ صحبت نبوت کے ان تاجداروں اور خدائی مغفرت و غفران اور رضائے حق کا صلہ پانے والے اس مرحوم و مغفور گروہ پر اپنی زبان دراز نہ کرتا۔ اور نہ ہی صحابہؓ کے بارے میں جمہور امت کے چودہ سو سالہ کف لسان کے زرین اصول کو توڑتا۔ امت کے اساطین علماء و فقہاء مفسرین اور متکلمین "فیما شجر بینہم" کے بارے میں دفاع کے جن اصولوں کی پیروی کرتے رہے ہیں۔ روافض و ناصبین اور ہر دور کے ملاحدہ کو شافی و کافی جواب دیتے رہے ہیں۔ وہ بھی امت کے مسلم عقیدہ، جمہور امت کے دینی جذبات کا لحاظ کرتے ہوئے وہ طرز اختیار کرتے۔ لیکن واحسرتا! ؎

تکیہ جن پتوں پہ تھا وہی ہوا دینے لگے

اس کے سوا کیا کہا جائے۔

غنی روزِ سیاہ پیرِ کنعان را تماشا کن
کہ نورِ دیدہ اش روشن کند چشمِ زلیخا را

قرآنِ کریم کی یہ آیتیں کاش مشعلِ راہ ہوتیں۔

تلك امة قد خلت لها ما كسبت ولكم	وہ ایک جماعت تھی جو گزر چکی۔ ان کے واسطے ہے
ما كسبتم ولا تسئلون عما كانوا	جو انہوں نے کیا۔ اور تمہارے واسطے ہے جو تم نے
يعملون (۱۴۳۔ البقرة)	کیا اور تم سے پوچھ نہیں ان کے کاموں کی۔

حضرت مفتی محمد شفیع صاحب دیوبندی نور اللہ مرقدہ کی کتاب "مقامِ صحابہ" اپنوں کے ہاتھ بکتے ہوئے اس فتنۂ معضلہ پر ایک دردمند دل کی کربناک پکار ہے جسے حضرت مفتی صاحب نے مسئلہ کی انتہائی اہمیت و نزاکت کے پیشِ نظر اپنی عمر کے آخری دور میں بیماری کی حالت میں لکھا۔

چنانچہ اپنی اس وقیع کتاب کی تمہید میں ارقام فرماتے ہیں

" زیرِ نظر مقالہ کا نام "مقامِ صحابہ" رکھا ہے۔ تاکہ پہلے ہی معلوم ہو جائے کہ یہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کے فضائل و مناقب کی کتاب نہیں۔ اس موضوع پر سینکڑوں کتابیں بحمد اللہ ہر زبان میں ہو چکی ہیں اور تمام کتب حدیث میں اس کے ایک نہیں بہت سے ابواب موجود ہیں۔ اسی طرح ...... یہ کوئی تاریخ کی کتاب بھی نہیں جس میں افراد و رجال کے اچھے برے حالات درج ہوتے ہیں۔

"مقامِ صحابہ" میں مجھے یہ دکھلانا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھی صحابہ کرامؓ اس معاملے میں تمام دنیا کے افراد و رجال کی طرح نہیں کہ ان کے مقام کا فیصلہ نری تاریخ اور اس کے بیان کردہ حالات کے تابع کیا جائے بلکہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین ایک ایسے مقدس گروہ کا نام ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور عام اُمت کے درمیان اللہ تعالیٰ کا عطا کیا ہوا ایک واسطہ ہے۔ اس واسطے بغیر نہ امت کو قرآن ہاتھ آ سکتا ہے، نہ قرآن کے وہ مضامین جن کو قرآن نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بیان پر چھوڑا ہے۔ "تبين للناس ما نزل اليهم" نہ رسالت اور اس کی تعلیمات کا کسی کو اس واسطے کے بغیر علم ہو سکتا ہے۔ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زندگی کے ساتھی آپ کی تعلیمات کو تمام دنیا اور اپنے زن و فرزند اور اپنی جان سے زیادہ عزیز رکھنے والے آپ کے پیغام

کو اپنی جانیں قربان کر کے دنیا کے گوشہ گوشہ میں پھیلانے والے ہیں۔ ان کو سیرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کا ایک جزء ہے۔ یہ عام دنیا کی طرح صرف کتب تاریخ سے نہیں پہچانے جاتے بلکہ نصوص قرآن وحدیث اور سیرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جانے پہچانے جاتے ہیں۔ ان کا اسلام اور شریعت اسلام میں ایک خاص مقام ہے۔ میں اس مقالہ میں اس مقام کو "مقام صحابہؓ" کے عنوان سے پیش کرنا چاہتا ہوں۔

اس کی ضرورت واہمیت تو بہت زمانہ سے پیش نظر تھی۔ مگر اس کے لکھنے کا ایسا قوی داعیہ جو دوسرے کاموں کو موخر کر کے اس میں لگا دے۔ اس وقت جبکہ یہ ناکارہ اپنی عمر کا چھترویں منزل سے گزر رہا ہے قویٰ جواب دے چکے ہیں، مختلف قسم کے امراض کا غیر منقطع سلسلہ ہے ..... ان حالات میں یہ داعیہ قوی ہونے کا سبب موجودہ زمانے کے کچھ حوادث ہیں۔ یہ تو سب کو معلوم ہے کہ امت کے گمراہ فرقوں میں سے ایک فرقہ جو عہد صحابہ ہی میں پیدا ہو گیا تھا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کی شان میں گستاخی سے پیش آتا ہے اور اسی بناء پر عام امت محمدیہ اس سے منقطع ہے۔ مگر امت کے عام فرقے خصوصاً جمہور امت جن کو اہل السنۃ والجماعت کے لقب سے ذکر کیا جاتا ہے۔ وہ سب کے سب صحابہ کرام کے خاص مقام اور ادب واحترام پر متفق اور ان کی عظیم شخصیتوں کو اپنی تنقیدات کا نشانہ بنانے سے گریز کرتے رہے اور اس کو بڑی بے ادبی سمجھتے رہے مسائل میں اختلاف صحابہ کے وقت دو متضاد چیزوں پر ظاہر ہے عمل نہیں ہو سکتا۔ ان میں سے ایک کو اجتہاد شرعی کے ساتھ اختیار کر لینا اور بات ہے۔ وہ کسی شخصیت کو ہدف تنقید بنانے سے مختلف چیز ہے۔

لیکن اس زمانے میں یورپ سے جو اچھی بری چیزیں اسلامی ملکوں میں درآمد کر لی گئی ہیں۔ ان میں ہر چیز کی تحقیق وتنقید (ریسرچ) بھی ہے تحقیق وتنقید فی نفسہ کوئی بری چیز نہیں ..... لیکن اسلام نے ہر چیز اور ہر کام کے کچھ حدود مقرر کئے ہیں۔ ان کے دائرے میں رہ کر جو کام کیا جاتا ہے وہ مقبول ومفید سمجھا جاتا ہے۔ حدود واصول کو توڑ کر جو کام کیا جائے وہ فساد قرار دیا جاتا ہے۔

لیکن یورپ سے درآمد کی ہوئی ریسرچ تحقیق نام ہی بے قید وآزاد تنقید کا ہے۔ ادب واحترام اور حدود کی رعایت اس میں ایک بے معنی چیز ہے۔

افسوس ہے کہ اس زمانے کے بہت سے اہلِ علم بھی اس نئے طرزِ تنقید سے متاثر ہوئے بغیر کسی دینی و دنیوی ضرورت کے بڑی بڑی شخصیتوں کو آزاد جرح و تنقید کا ہدف بنالینا ایک علمی خدمت اور محقق ہونے کی علامت سمجھی جانے لگی۔ اسلافِ امت اور آئمہ دین پر تو یہ مشقِ ستم بہت زمانے سے جاری تھی۔ اب بڑھتے بڑھتے صحابۂ کرام تک بھی پہنچ گئی۔ اپنے آپ کو اہل السنۃ والجماعت کہنے والے بہت سے اہلِ قلم نے اپنی ریسرچ و تحقیق و علمی توانائی کا بہترین مصرف اسی کو قرار دے دیا کہ صحابہ کرام کی عظیم شخصیتوں پر جرح و تنقید کی مشق کی جائے۔

بعض حضرات نے ایک طرف حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور ان کے بیٹے یزید کی تائید و حمایت کا نام لے کر حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ اور ان کی اولاد بلکہ پورے بنی ہاشم کو ہدفِ تنقید بناڈالا اور اس میں ادب و احترام تو کیا اسلام کے عادلانہ اور حکیمانہ ضابطۂ تنقید کی بھی ساری قیود و حدود کو توڑ ڈالا۔ اس کے بالمقابل دوسرے بعض حضرات نے قلم اٹھایا تو حضرت معاویہؓ اور عثمان غنیؓ اور ان کے ساتھیوں پر اس طرح کی جرح و تنقید سے کام لیا۔ نئی تعلیم پانے والے نوجوان جو علوم دین اور آداب دین سے ناواقف۔ یورپ سے درآمد کی ہوئی نئی تہذیب کے دلدادہ ہیں۔ وہ ان دونوں سے متاثر ہوتے اور ان حلقوں میں صحابہ کرامؓ پر زبان لعن دراز ہونے لگی اور صحابہ کرامؓ جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور امتِ مسلمہ کے درمیانی واسطہ ہیں، ان کو دنیا کے عام سیاسی لیڈروں کی صف میں دکھایا جانے لگا جو اقتدار کی جنگ کرتے ہیں اور اپنے اقتدار کے لیے قوموں کو گمراہ اور تباہ کرتے ہیں۔ صحابہ کرام پر تبرا کرنے والا گمراہ فرقہ تو ایک خاص فرقہ کی حیثیت سے جانا پہچانا جاتا ہے۔ عام مسلمان ان کی باتوں سے متاثر نہیں ہوتے، بلکہ نفرت کرتے ہیں۔ مگر اب یہ فتنہ خود اہلِ سنّت والجماعت کہلانے والے مسلمانوں میں پھوٹ پڑا۔ اور یہ ظاہر ہے کہ خدانخواستہ اگر مسلمان صحابہ کرام ہی کے اعتماد کو کھو بیٹھے تو پھر نہ قرآن پر اعتماد رہتا ہے نہ حدیث پر، نہ دینِ اسلام کے کسی اصول پر اس کا نتیجہ کھلی بے دینی کے سوا کیا ہوسکتا ہے۔

یہ سبب ہوا جس نے ان حالات میں اس موضوع پر قلم اٹھانے کے لیے مجبور کردیا۔
انہ المستعان وعلیہ التکلان۔

اسی قسم کے خیالات کا اظہار کتاب کے اختتام پر ایک دردمندانہ گذارش کے نام سے

کیا ہے۔ (دیکھیے صفحہ ۱۴۹ تا ۱۴۴) اس گزارش کی ابتدا میں یہ شعر بھی نقل کئے ہیں۔

گریۂ شام سے بھی کچھ نہ ہوا ان تک اب نالۂ سحر جائے
دل مجروح کی صدا ہے یہ کاش دل میں ترے اتر جائے

"مقامِ صحابہ" ۱۴۴ صفحات پر مشتمل ہے۔ جس میں پچیس عنوانات کے تحت "مقامِ صحابہ" کے بارے میں جملہ و بنیادی مسائل پر مؤثر سیر حاصل بحث ہے۔ اہم عنوانات ہیں صحابہ اور مشاجرات صحابہ کا مسئلہ۔ صحابہ کرام کی چند خصوصیات، نصوص قرآن کریم، صحابہ کرام کا خصوصی مقام احادیث نبویہ میں، قرآن و سنت میں مقام صحابہ کا خلاصہ، اس پر امت کا اجماع، الصحابۃ کلھم عدول کا مفہوم، مشاجرات صحابہ کے معاملہ میں امت کا عقیدہ اور عمل کہ صحابہ کرام معصوم نہیں بلکہ مغفور و مقبول ہیں، مستشرقین اور ملحدین کے اعتراضات کا جواب، مشاجرات صحابہ اور کتب تاریخ..... یہ حق و انصاف کا فیصلہ ہے یا تحقیق حق سے فرار۔

کتاب میں پہلے یہ بتایا گیا ہے کہ مقامِ صحابہ کے بارے میں اس مہلک غلط فہمی کا بڑا سبب حضرات صحابہ کو عام رجال اُمت کی طرح صرف تاریخی صحیح و سقیم روایات کے آئینہ میں دیکھنا ہے اور قرآن و سنت کی نصوص اور اُمت کے اجتماعی عقیدہ نے جو امتیاز صحابۂ کرام کو عطا کیا ہے وہ نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ وہ امتیازی خصوصیات حضرات صحابہ کی یہ ہے کہ قرآن کریم نے ان سب کے بارے میں رضی اللہ عنہم و رضوا عنہ کہا اور ان کا مقام جنت ہونے کا اعلان کر دیا اور جمہور امت نے ان کی ذات و شخصیات کو اپنی جرح و تنقید سے بالاتر سمجھا۔

حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ نے اسلامی تاریخ کی اہمیت کی وضاحت فرمانے کے باوجود یہ ثابت کیا ہے کہ قرآن و حدیث کے مقابلہ میں روایات تاریخی خواہ کہیں بھی ہوں فروتر ہیں۔ اس نئے دین اور شخصیات صحابہ جو کہ "دین ہیں" ان کی بنیاد ری تاریخ پر رکھی نہیں جا سکتی۔ اس بارے میں عجیب مباحث آگئے ہیں۔ تاریخ رواۃ تاریخ، حدیث و رواۃ حدیث پر مباحث قابل دید ہیں۔ صحابہ اور مشاجرات صحابہؓ کے مسئلہ کے بارے میں حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ تحریر فرماتے ہیں :

"پوری اُمت کا اس پر اتفاق ہے کہ صحابہ کرام کی معرفت ان کے درجات اور ان میں

پیش آنے والے باہمی اختلافات کا فیصلہ کوئی عام تاریخی مسئلہ نہیں بلکہ معرفت صحابہ تو علم حدیث کا اہم جزء ہے۔ جیسا کہ مقدمہ اصابہ میں حافظ ابن حجر اور مقدمہ استیعاب میں حافظ ابن عبدالبر نے وضاحت سے بیان فرمایا ہے۔ اور صحابہ کرام کے مقام اور باہمی تفاضل و درجات اور ان کے درمیان پیش آنے والے اختلافات کے فیصلہ کو علمائے امت نے عقیدہ کا مسئلہ قرار دیا اور تمام کتب عقائد اسلامیہ میں اسے ایک مستقل باب کی حیثیت کے لکھا ہے ایسا مسئلہ جو عقائد اسلامیہ سے متعلق ہے اور اس مسئلہ کی بنیاد پر بہت سے اسلامی فرقوں کی تقسیم ہوئی۔ اس کے فیصلے کے لیے بھی ظاہر ہے کہ قرآن و سُنّت کی نصوص اور اجماع امت جیسی شرعی حجت درکار ہے۔ اس کے متعلق اگر کسی روایت سے استدلال کرنا ہے تو اس کو محدثانہ اصول تنقید پر پرکھ کر لینا واجب ہے۔ اس کو تاریخی روایتوں میں ڈھونڈنا اور ان پر اعتماد کرنا اصولی اور بنیادی غلطی ہے۔ وہ تاریخیں کتنے ہی بڑے ثقہ اور معتمد علماء حدیث ہی کی لکھی ہوئی کیوں نہ ہوں۔ ان کی فنی حیثیت ہی تاریخی ہے، جس میں صحیح و سقیم روایات جمع کر دینے کا عام دستور ہے۔

صحابہ کی معرفت کی اس بحث میں اختصار و اجمال کو پیش نظر رکھتے ہوئے تو قرآنی آیتوں سے صحابہ کرام کی بین اور ممتاز خصوصیتیں بیان فرمائی ہیں اور ان کے ذیل میں اعیان مفسرین و علمائے امت کے اقوال سے ان کے اس خصوصی امتیاز و فضیلت کو مبرہن کیا ہے۔ پھر تو احادیث نقل کر کے ان سے صحابہ کے مقتدا مختار و مجتبیٰ اور افضل الناس بعد الانبیاء علیہم السلام، وغیرہ ہونے کو مستنبط فرمایا ہے۔ اور دلائل واضحہ سے انہیں مدلل فرمایا ہے۔ حضرت مفتی صاحب لکھتے ہیں۔

مذکورالصدر آیات قرآنی اور روایات حدیث میں یہی نہیں کہ اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح و ثنا اور ان کو رضوان الٰہی اور جنت کی بشارت دی گئی۔ بلکہ اُمت کو ان کے ادب و احترام اور ان کی اقتدا کا حکم بھی دیا گیا ہے۔ بلکہ اُمت کو ان کے ادب و احترام اور ان کی اقتدا کا حکم بھی دیا گیا ہے۔ ان میں سے کسی کو برا کہنے پر سخت وعید فرمائی ہے ان کی محبت کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت ان سے بغض کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بغض قرار دیا گیا ہے۔ صحابہ کرام کا یہی وہ درجہ اور منصب ہے جس کو زیر نظر مقالہ "مقام صحابہ" میں پیش کرنا ہے۔ ایک دو گمراہ فرقوں کو چھوڑ کر باقی اُمت محمدیہ کا ہمیشہ سے صحابہ کرام کے بارے میں اسی اصول پر اجماع و اتفاق رہا ہے، جو او پر کتاب و سُنّت سے ثابت کیا گیا ہے۔

...... اس اجماع کا عنوان عام طور پر کتب حدیث اور کتب عقائد میں یہ ہے کہ "الصحابۃ کلھم عدول" حاصل مفہوم اس جملہ کا وہی ہے جو اوپر کتاب و سنت کے حوالوں سے صحابہ کرام کے درجہ و مقام کے بارے میں لکھا گیا ہے۔ صد ۲۱-۳

"الصحابۃ کلھم عدول" کے عنوان کی تحت میں نہایت شرح و بسط سے اساطین علمائے امت کے نہایت عمدہ دل نشین، مدلل اقوال کا حوالہ دے کر صحابہ کی "عدالت" "مغفوریت" "مقبولیت" کو ثابت کیا ہے۔ عجیب قابل دید و لائق داد مباحث ہیں۔

اس کے بعد صحابہ کے باہمی جنگوں کو ان کا "اجتہاد" قرار دے کر ایک گروہ کے عمل کو صواب اور دوسرے کے عمل کو خطاء اجتہادی قرار دیا ہے اور اس بارے کف لسان" اور سکوت کو ہی اسلم قرار دیا ہے۔" اس کے بعد علامہ قرطبی کی تفسیر سے ایک عبارت نقل کی ہے جس میں سلف صالحین کے اقوال سے مشاجرات صحابہ پر بہترین تحقیق کی گئی ہے۔ بعد ازاں دیگر ائمہ سلف کی کتابوں سے اس بحث میں نہایت مفید عبارات نقل کی ہیں۔ جن کا خلاصہ یہ ہے کہ تمام صحابہ کرام کے عدل و ثقہ ہونے پر اجماع و اتفاق ہے اور اس پر بھی کہ ان کے درمیان پیش آنے والے مشاجرات میں خوض نہ کیا جائے یا سکوت اختیار کیا جائے یا پھر ان کی شان میں ایسی بات کہنے سے گریز کریں جس سے ان میں سے کسی کی تنقیص ہوتی ہو۔ حضرت مفتی صاحب نے علامہ سفارینی کی کتاب سے دو اچھے شعر نقل کئے ہیں۔

واحذر من الخوض الذی قد یزری   بفضلھم مما جری لو تدری

فانہ عن اجتھاد قد صدر   فاسلم اذل اللہ من لھم ھجر

ترجمہ: اور پرہیز کرو صحابہ کرام میں پیش آنے والے جھگڑوں میں دخل سے جس میں ان میں سے کسی کی تحقیر ہو۔

کیوں کہ ان کا جو عمل بھی ہوا۔ اپنے شرعی اجتہاد کی بنا پر ہوا ہے۔ تو سلامتی اختیار کرو۔ اللہ ذلیل کرے اس شخص کو جو ان کی بدگوئی کرے۔

اس کے بعد حضرت مفتی صاحب نور اللہ مرقدہ نے صحابہ کرام معصوم نہیں مگر مغفور و مقبول ہیں کے عنوان کی تحت میں صحابہ کرام کے سات خصوصی امتیازات نقل کی ہیں۔ جن کی وجہ سے

ان کے بارے میں اُمت کا یہ عقیدہ قرار پایا کہ ان کی طرف کسی عیب و گناہ کی نسبت نہ کریں ان کی تنقیص
و توہین کے شائبہ سے بھی گریز کریں کہ سلف صالحین نے عموماً ان معاملات (مشاجرات صحابہ) میں کف
لسان اور سکوت کو ایمان کا ذریعہ قرار دیا ہے۔ ص ۱۱۲-۱۱۴

کتاب کے خاتمہ سے پہلے اس سلسلے میں مستشرقین اور ملحدین کے مسکت اور مدلل جواب دیئے گئے
ہیں۔ مقام صحابہؓ لکھ کر حضرت مفتی صاحب نوراللہ مرقدہ نے وقت کی ایک اہم ضرورت کو پورا کیا
اور ایک ایسے فتنہ کی بیخ کنی کا علمی سامان بہم پہنچایا جس کے شروع سے پوری دینی عمارت العیاذ باللہ
منہدم ہو سکتی ہے۔

فجزاہ اللہ تعالیٰ عنا وعن سائر امتہ خیرا لجزاء

سیرت خاتم الانبیاءؐ صلی اللہ علیہ وسلم

مسلمانوں کے علوم خاصہ میں "سیرت" کو ایک خاص مقام حاصل ہے۔ اس امت کا "دین"
حضور انور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ کے نقوش ظاہری و باطنی اور آپ کا اسوۂ کاملہ
ہے جو قرآن عظیم کی مجسم و مجسّد تصویر اور نبوت کبریٰ کی جہاں تاب تمثال اور کاشانۂ عالم کا سراج منیر
ہے جس کی ہر کرن دلوں کا نور، جس کی ہر شعاع چراغ طور اور جس کا ہر عمل جاذب رحمت، ہر خلق
آیت قرآنی، ہر گفتہ دلیل فرقانی، ہر قدم دستور نجات انسانی اور ہر طریقہ کاشف رضائے ربانی اور ہر ادا

لہ۔ راقم نے یہ سیرت سب سے پہلے "اوجز السیر" کے نام سے اپنے لڑکپن میں جب بندہ نویں جماعت میں تھا
انجمن اسلامیہ شملہ کے بنا کردہ اسلامیہ ہائی سکول کے نصاب میں پڑھی تھی۔ اس کے دھندلے نقوش اور تعداد
ازواج اور جہاد پر مؤثر تحریر کا ہلکا خاکہ دماغ میں اب بھی کچھ تھا۔ کتاب تقسیم ہند کی وجہ سے شملہ رہ گئی تھی۔
اس وقت جو کتاب ہاتھ آئی وہ کتب خانہ مدرسہ رفیع الاسلام بھانہ ماڑی پشاور کی مملوکہ تھی۔ جواب پشاور
یونیورسٹی لائبریری کا حصہ ہے۔ اس کتاب مطبوعہ ۱۳۵۰ھ کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ حضرت الاستاد علامہ محمد یوسف
بنوری نوراللہ مرقدہ کے مطالعہ میں رہی ہے۔ ایک جگہ ص۳ کے حاشیہ پر رسالہ التاریخ فی علم التاریخ پر یہ الفاظ لکھے ہیں۔
فاطلب ان ایتح التشماریخ فی علم التاریخ (سید محمد یوسف بنوری م-ا)

موجبِ حبِ صمدانی ہے۔ دانائے شیراز نے خوب کہا ہے۔

کریم السجایا جمیل الشیم	نبی البرایا شفیع الامم
امام رسل پیشوائے سبیل	امین خدا مہبط جبرئیل
شفیع الوریٰ خواجہ بعث و نشر	امام الھدیٰ صدرِ دیوانِ حشر
کلیمے کہ چرخ فلک طورِ اوست	ھمہ نورہا پرتو نورِ اوست
شفیع مطاع نبی کریم	قسیم جسیم نسیم وسیم
یتیمے کہ ناکردہ قرآں درست	کتب خانہ چند ملت بشست

حضورِ انور سید ہر عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت اور دینی ضرورت و اہمیت کے پیشِ نظر اُمّت نے ہر دور اور ہر ملک میں سیرتِ پاک سے اشتغال رکھا اور الحمدللہ محقق و محتاط سیرت نگاروں نے اس فریضہ کو کمال خوبی سے ادا کیا اور ہر زبان میں سیرت پر بڑی چھوٹی اور معمولی کتابیں مہیا فرما کر نبی الانبیا سید الرسل صلی اللہ علیہ وسلم کے جمال جہان آرا سے عالم کو روشنی بخشی۔ اردو میں بھی سیرت النبی (شبلیؒ و سلیمان ندویؒ) رحمۃ للعالمینؒ (سلیمان منصور پوری) وغیرہ کی ضخیم مجلدات سے لے کر اوسط کتابوں اور دو چار صفحات کے رسائل تک ایک بڑا ذخیرہ سیرتِ پاک پر مہیا ہو چکا ہے۔ خوش نصیب و سعادت مند ہیں وہ حضرات جو اس قدسی الصفات ذاتِ گرامی صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت نگاری کے شرف سے ممتاز ہوئے۔ انہیں خوش بخت مصنفین میں ہمارے ممدوح حضرت مفتی محمد شفیع صاحب نور اللہ مرقدہ ہیں جن کی مختصر سیرت اوجز السیر یا سیرتِ خاتم الانبیاؐ ہے۔ حضرت مفتی صاحب رحمہ اللہ کتاب کے مقدمہ میں سیرت کی اہمیت اور اس کی کتابوں کی ہر زبان میں کثرت پر ارقام فرمانے کے بعد لکھتے ہیں۔

"اردو زبان میں بھی قدیم و جدید بہت سی سیرتیں موجود ہیں جو اہل ہند کی طرف سے اس فریضہ کو ادا کر چکی ہیں۔ لیکن میری نگاہ عرصہ سے ایسی مختصر سیرت کو ڈھونڈ رہی تھی، جس کو ہر کاروباری مسلمان مرد و عورت دو تین مجلسوں میں ختم کر کے اپنا ایمان تازہ کر سکے اور اسوۂ نبویہ کو اپنا رہنما بنا سکے اور جو اسلامی انجمنوں اور مدارس کے ابتدائی نصاب میں درج ہو سکے اور جس میں اختصار کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ کا اجمالی نقشہ مکمل طور سے پیش کر دیا گیا ہو۔ مگر ایسا کوئی رسالہ اردو زبان میں میری نظر سے نہ گزرا اسی عرصہ میں بعض احباب شملہ نے اپنی اسلامی انجمن کے لیے ایسے رسالہ کی ضرورت محسوس کر کے احقر سے

فرائش کی۔ تو باوجود اپنی کم علمی اور بے سروسامانی کے ساتھ مشاغل تعلیم و تعلم کے اس خیال سے قلم اٹھایا کہ جس وقت سید الکونین صلی اللہ علیہ وسلم کے سیرت نگاروں کے نام پیش ہوں تو شاید کسی گوشہ میں اس سیہ کار کا نام بھی آجائے۔ ع

بلبل ہمیں کہ قافیہ گل شود بس ست

اس لیے بنام خدا قلم اٹھایا اور امور ذیل کا التزام کرتے ہوئے سیرت کی معتبر کتابوں کا لب لباب اس رسالہ میں پیش کر دیا۔

۱: اس کا خاص طور سے لحاظ رکھا گیا کہ رسالہ طویل نہ ہو جائے اور اسی وجہ سے ملک عرب کے بعض جغرافیائی حالات اور عرب و عجم کی حالت قبل از اسلام وغیرہ جو سیرت کا جز سمجھے جاتے ہیں اور ایک حد تک مفید بھی ہیں، ان سے قطع نظر کر کے صرف ان حالات پر اکتفا کرنا پڑا جو خاص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس سے متعلق ہیں اور اسی اختصار کی وجہ سے پہلی طباعت میں اس کا نام اوجز السیر لخیر البشر رکھا تھا یعنی نہایت مختصر سوانح عمری۔ لیکن چونکہ یہ نام عام فہم نہ تھا اور کتاب عوام ہی کیلئے لکھی گئی ہے اس لیے طبع ثانی میں اصلی نام کو برقرار رکھتے ہوئے عام شہرت کے لیے سیرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم نام رکھا گیا۔

۲۔ اختصار کے ساتھ اس کا بھی خیال رکھا گیا کہ جامعیت ہاتھ سے نہ جائے اور بحمد اللہ تمام ضروری واقعات تقریباً اس رسالہ میں لے لئے گئے ہیں۔

۳۔ مسائل جہاد، تعداد ازواج وغیرہ پر جو مخالفین کے اوہام ہیں ان کے بھی موٹے موٹے مگر شافی جوابات درج کئے گئے ہیں۔

۴۔ رسالہ کا ماخذ کل معتبر اور مستند کتابیں ہیں۔ جن کے حوالے بھی ہر موقع پر بقید صفحات لکھ دیئے گئے ہیں۔ . . . . . خدا تعالیٰ کا ہزاروں ہزار شکر کہ اس نے اس ناچیز کو قبولیت عطا فرمائی اور سب سے پہلے حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی دامت برکاتہم نے اس کو پسند فرما کر خانقاہ امدادیہ کے نصاب درس میں داخل فرمایا اور خانقاہ کے ماہوار رسالہ النور بابت ماہ شوال ۱۳۴۴ھ میں بعنوان وصیت اس کا اعلان فرماتے ہوئے دوسروں کو بھی اس کی طرف رغبت دلائی اور بہت جلد طبع ثانی کی نوبت آئی۔ والحمد للہ اولہ وآخرہ ۔۔ بندہ محمد شفیع عفا عنہ ۱۰ ذی الحجہ ۱۳۴۴ھ

حضرت مفتی صاحب نوراللہ مرقدہ نے کتاب کے تقریباً تمام خصائص اپنے قلم سے لکھ دیئے ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ اردو کی مختصر سیرت کی کتابوں میں یہ کتاب اپنا ایک خاص مقام رکھتی ہے۔ سہولت اختصار و ایجاز کے ساتھ جامعیت کا اچھوتا نمونہ ہے۔ ضرورت ہے کہ ہمارے سکول و مدارس ہر کو مسرکی رطب و یابس سے بھری ہوئی عام کتابوں کی بجائے اسے اپنے نصاب میں داخل کرائیں۔

کتاب کے مضامین کے تنوع و جامعیت کا سرسری اندازہ عنوانات پر ایک نگاہ ڈالنے سے ہو جاتا ہے۔ چنانچہ تعارف کے لیے عنوانات نقل کرتا ہوں۔

۱۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا نسب شریف۔
۲۔ ولادت سے پہلے آپ کی برکات کا ظہور۔
۳۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت باسعادت۔
۴۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے والد ماجد کی وفات۔
۵۔ رضاعت و زمانہ طفولیت۔
۶۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی والدہ ماجدہ کی وفات۔
۷۔ عبدالمطلب کی وفات ۸۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا سفر شام۔
۹۔ دوبارہ سفر شام بغرض تجارت ۱۰۔ حضرت خدیجہؓ سے نکاح۔
۱۱۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اولاد حضرت خدیجہ کے بطن سے۔
۱۲۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی چاروں صاحبزادیاں۔
۱۳۔ باقی ازواج مطہرات ۱۴۔ تعدادِ ازواج[1] کے متعلق ضروری تنبیہ۔
۱۵۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا اور پھوپھیاں۔
۱۶۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے موالی۔ ۱۷۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پہرہ داری کرنے والے۔
۱۸۔ بناء کعبہ اور قریش کا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو باتفاق امین تسلیم کرنا۔
۱۹۔ عطاء نبوت ۲۰۔ دنیا میں اشاعت اسلام
۲۱۔ اعلانِ دعوت اسلام

---

[1] حضرت مفتی صاحب نوراللہ مرقدہٗ نے تعداد ازواج پر اس مختصر مضمون میں معترضین کے اعتراضات

۲۲ - تمام عرب کی مخالفت وعداوت اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی استقامت ۔

۲۳ - تمام قبائل عرب کے مقابلہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا جواب ۔

۲۴ - کفار کا لوگوں میں نفرت پھیلانا اور اس کا الٹا نتیجہ ۔

۲۵ - قریش کا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہر قسم کی طمع دینا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا جواب ۔

۲۶ - قریش کی ایذا رسانی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی استقامت ۔

۲۷ - آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل کا ارادہ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا بین معجزہ ۔

۲۸ - صحابہ کے لیے ہجرت حبشہ کا حکم

۲۹ - طفیل بن عمرو دوسی کا مشرف باسلام ہونا ۔

۳۰ - ابو طالب کی وفات

۳۱ - ہجرت طائف ۔

۳۲ - اسراء و معراج ۔

۳۳ - اسرار نبوی پر عینی شہادتیں ۔

۳۴ - خود کفار قریش کی چشم دید شہادتیں

۳۵ - مدینہ طیبہ میں اسلام ۔

۳۶ - سب سے پہلا مدرسہ مدینہ طیبہ میں

۳۷ - ہجرت کی ابتدا ۔

۳۸ - نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت مدینہ

۳۹ - غار ثور کا قیام ۔

۴۰ - غار ثور سے مدینہ کی طرف روانگی

۴۱ - رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا معجزہ ۔

۴۲ - ام معبد اور ان کے خاوند کا اسلام ۔

۴۳ - سراقہ بن مالک کا راستہ میں پہنچنا اور اس کے گھوڑے کا زمین میں دھنسنا ۔

بقیہ صفحہ کے نہایت جامع ، شافی و مؤثر جوابات دے دیئے ہیں جن کی تاثیر کا یہ عالم ہے کہ چالیس سال پہلے لڑکپن میں پڑھے ہوئے یہ دلائل اب تک ذہن کی تشفی کا سامان ہیں ۔ حضرتؒ نے خود لکھا ہے ۔ اس مختصر رسالہ میں تفصیل کی گنجائش نہیں ورنہ دکھلایا جاتا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ متعدد نکاح کس قدر اسلامی اور شرعی ضرورتوں پر مبنی تھے ۔ نیز اگر یہ نہ ہوتے تو بہت سے احکام جو عورتوں ہی کے ذریعہ سے امت کو پہنچ سکتے تھے وہ مخفی رہ جاتے کس قدر بے حیائی اور حق کشی ہے کہ حضرت رسالت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس تعدد ازواج کو نفسانی خواہشوں پر محمول کیا جائے ۔ اگر باطل پرستی نے عقل و حواس کو نہیں کھالیا تو کوئی کافر بھی ایسا نہیں کر سکتا ۔

۴۴ - سراقہ کی زبان سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا اعتراف۔

۴۵ - نزولِ قبا

۴۶ - حضرت علی کی ہجرت اور قبا میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملنا۔

۴۷ - اسلامی تاریخ کی ابتدار۔ ۴۸ - مدینہ طیبہ میں داخل ہونا۔

۴۹ - مسجد نبوی کی تعمیر سلہ ۵۰ - مشروعیت جہاد شہ

۵۱ - سریہ حمزہ اور سریہ عبیدہ۔ ۵۲ - اسلام اپنی اشاعت میں تلوار کا محتاج نہیں۔

۵۳ - وہ مذہب بھی کامل نہیں جس میں سیاست نہ ہو۔ وہ سیاست بھی مکمل نہیں جس کے ساتھ تلوار نہ ہو۔ سلہ

۵۴ - نقشہ غزوات وسرایا۔ ۵۵ - اہم غزوات وسرایا اور واقعات متفرقہ سلہ

۵۶ - تحویل قبلہ۔ ۵۷ - غزوہ بدر۔ ۵۸ - سریہ عبداللہ بن جحش۔

۵۹ - غزوہ بدر کے واقعات متفرقہ۔

۶۰ - اسیرانِ جنگِ بدر کے ساتھ مسلمانوں کا سلوک تہذیب کے مدعی یورپینوں کے لیے سبق۔

۶۱ - اسلامی مساوات ۶۲ - ابوالعاص کا اسلام

سلہ - اس عنوان کے تحت جہاد کی حکمت و اہمیت پر عمدہ بحث ہے اور یہ ثابت کیا ہے کہ اسلام تلوار سے نہیں پھیلا۔ اکبر نے خوب کہا ہے۔

یہی فرماتے رہے تیغ سے پھیلا اسلام
یہ نہ ارشاد ہوا توپ سے کیا پھیلا ہے

سلہ - بقول اقبال ؎

رشی کے روزوں سے ٹوٹا نہ برہمن کا طلسم
عصا نہ ہو تو کلیمی ہے کارِ بے بنیاد

حضرت مفتی صاحب نور اللہ مرقدہ نے جہادِ اسلامی کے بارے میں جو کلام فرمایا ہے۔ یوں تو سب قابلِ مطالعہ ہے تاہم نمونہ چند جملے نقل کرتا ہوں ؛ اسلام میں جس طرح بغرض تحفظ مدافعانہ جہاد کو فرض کیا گیا ہے۔ اسی طرح حفظ ماتقدم اور موانع تبلیغ کو راستہ سے ہٹانے کے لیے جارحانہ جہاد بھی قیامت تک کیلئے ضروری کیا گیا ہے۔

۶۳ - اسلامی سیاست اور ترقی تعلیم۔

۶۴ - غزوہ غطفان اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلق عظیم کا معجزہ۔

۶۵ - حضرت حفصہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا اور حضرت زینب رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے نکاح۔

۶۶ - غزوہ احد (واقعات متفرقہ) ۶۷ - سکۃ سریہ منذر بجانب بیر معونہ۔

۶۸ - قریش اور یہود کی متفقہ سازش اور غزوہ احزاب۔

۶۹ - غزوہ احزاب اور واقعہ خندق ۷۰ - واقعات متفرقہ۔

۷۱ - سنۃ صلح حدیبیہ۔ بیعت رضوان ۷۲ - سلاطین دنیا کو دعوتی خطوط

۷۳ - حضرت خالد ابن ولید اور عمرو ابن عاص کا اسلام۔

۷۴ - سنۃ غزوہ خیبر فتح فدک ۷۵ - عمرۂ قضا۔

۷۶ - سریہ موتہ ۷۷ - فتح مکہ معظمہ۔

۷۸ - فتح مکہ کے بعد قریش کے ساتھ مسلمانوں کا حسن سلوک

۷۹ - نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا خلق عظیم اور ابوسفیان کا اسلام۔

۸۰ - غزوہ حنین ۸۱ - غزوہ طائف ۸۲ - عمرہ جعرانہ

۸۳ - غزوہ تبوک اور اسلام میں چندہ کا رواج۔

۸۴ - چند معجزات ۸۵ - مسجد ضرار کو آگ لگانا۔

۸۶ - وفود کی آمد اور جوق در جوق اسلام میں داخلہ۔

۸۷ - صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا امیر حج ہونا۔

۸۸ - حجۃ الاسلام ۸۹ - خطبہ عرفات ۹۰ - سریہ اسامہ

۹۱ - مرض وفات ۹۲ - صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ ، کی امامت

۹۳ - آخر الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کا آخری خطبہ۔ ۹۴ - آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے آخری کلمات۔

۹۵ - آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق وخصائل ومعجزات۔

ان ۱۱۲ صفحات میں اتنے عنوانات کو سمونا اور ضروری معلومات مؤثر و دل نشین زبان میں پیش کرنا حضرت مفتی صاحب نور اللہ مرقدہ کا کارنامہ ہے۔ آخر میں مبتدیوں کے لیے جوامع الکلم کے نام سے چہل حدیث

جمع فرمادی ہے جو مختصر احادیث کے جملوں پر مشتمل ہیں۔

حضرت مفتی صاحب نور اللہ مرقدہ کی اس مختصر و جامع سیرت کا تعارف کم از کم یہ بے بصر کیا کرے گا نیز کے نزدیک حضرت حکیم الامت مجدد تھانوی قدس سرہٗ کا مکتوب گرامی اس کتاب کی وقعت و اہمیت کیلئے سب سے بڑی ممکن شہادت ہے۔ اس لئے اس اثر مبارک کو نقل کرتا ہوں۔

از اشرف علی عفی عنہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

القاب اس لئے نہیں لکھا کر سمجھ میں نہیں آیا۔ آپ کے والد و جد صاحب کے تعلقات اخوت پر نظر کر کے تو عزیزم لکھنے کو دل چاہتا تھا۔ مگر آپ کے کمالات دیکھ کر اس لکھنے کو بے ادبی سمجھا اور اگر کمالات پر نظر کر کے اس سے بڑھا کر لکھوں تو حضرت استاذی مولانا محمد یعقوب صاحبؒ کا ملفوظ مبارک اس سے روکتا تھا۔ ارشاد فرمایا کہ زیادہ تعظیمی الفاظ اپنے مخصوصین کو لکھنا موہم اجنبیت ہے۔ اس کو بھی دل گوارا نہ کرتا تھا۔ آخر سلام ہی کو القاب سے مغنی سمجھا۔ اب اصل مدعا عرض کرتا ہوں۔

آپ کا رسالہ[1] مع محبت نامہ پہنچا۔ جس میں دو درخواستیں ہیں۔ ایک اصلاح۔ یہ درخواست تو ایسی ہے جیسے اعرج سے مشی کو کہا جائے۔ نظر و حافظہ پہلے بھی برائے نام تھا اور اب تو وہ بھی رخصت ہو گیا۔ البتہ بعض جگہ تو سہو کاتب نظر آیا۔ مثلاً ابو طلحہ ہی باپ کا نام اور ابو طلحہ ہی بیٹے کا نام نظر آیا۔ بعض جگہ روایات[2] میں ایسا یاد پڑتا ہے کہ راجح کو کسی اتفاق سے چھوڑ دیا گیا ہے۔ مگر یہ احکام نہیں تھے۔ جن میں ایسا کرنا مضر ہو۔ پھر آپ کی ادنیٰ توجہ سے ان کا تدارک ہو سکتا ہے۔ دوسری درخواست تقریظ کی علی سبیل التنجز ہے۔ میں دیکھتا ہوں کہ حقیقی تقریظ میں تو خود مقرظ کی مہارت فی الفن شرط ہے جس کا فقدان مجھ میں بین ہے اور عرفی تقریظ رسم پرستی اور محض دل جوئی ہے مستدعی کی جو طبعاً پسند نہیں۔ اس لیے بجائے تقریظ کے ان واقعات کا ذکر کر دوں جو رسالہ کے مطالعہ تفصیلیہ کے وقت پیش آئے جو بالکل سچے اور سادے ہیں۔ اشتراک اثر یا غرض

---

[1] اوجز السیر... (اشرف صاحب)۔

[2] اس مرتبہ طبع ثانی میں، حضرت نے مکرر نظر فرما کر ان سب امور کی اصلاح فرمادی ہے اور اس کے مطابق طبع کیا گیا ہے۔

کے اعتبار سے خواہ کسی کو تقریظاً خیال فرمایا جائے اور نہ پریشان خیالات کو کمالات کے بدبرلیش خاوند کی فہرست میں داخل کر کے نظرانداز کر دیا جائے ۔ وہی بندہ ۔ اور بھی بہت سے وجدانی امور ذوق مطالعہ سے پیدا ہوئے ۔ جن میں سے بعضے اس وقت مستحضر نہیں رہے اور بعض کی تعبیر میں تکلف ہوتا ہے ۔
ہاں ایک بات اور یاد آگئی کہ مولف سلمہ سے محبت بڑھ گئی اور ایسے نظر آنے لگے کہ پہلے سے ایسا نہیں سمجھتا تھا ۔ خصوصی عبارات کا انداز جس سے واقعات اصلی حالات پر جاندار نظر آنے لگے ۔ نہ ایسا پرانا کہ جس کو اس وقت چھوڑنے کی رائے دی جاتی ہے ۔ نہ ایسا نیا جو حقیقت کو ملتبس کر دیتا ہے ۔
بہر حال رسالہ ہر پہلو سے محبوب اور دل کش اور اپنے مؤلف کے کمالات کا آئینہ ہے ۔ اس کو ختم کر کے جازم رائے دیتا ہوں کہ اس کے درس سے کسی کو خالی نہ چھوڑا جائے اور میرے مشورہ سے جو اس رائے کو قبول کریں گے ۔ اس سب سے پہلے میں مؤلف سلمہ سے درخواست کرتا ہوں کہ اس کی دس جلدوں کا دیلو میرے نام کر دیں تاکہ میں اپنے خاندان کے بچوں اور عورتوں کو پڑھنے کے لیے دوں ۔ والسلام ۔ اس کے ساتھ ہی علیحدہ پرچہ پر حضرت تھانوی رحمۃ اللہ تعالیٰ نے تحریر فرمایا کہ ،
جواب میں دیر اس لیے ہوئی کہ شروع کر کے چھوڑنے کو جی نہ چاہا اور فرصت ہوئی نہیں ۔ اس لیے جب سب دیکھ لیا ۔ اس وقت جواب لکھا ۔ رسالہ دیکھ کر جیسی خوشی ہوئی ہے اس کی حد تو کیا بیان کروں ۔ بجائے حد بیان کرنے کے یہ دعا دیتا ہوں کہ خدائے تعالیٰ ایسی ہی خوشی اس کی جزا سے آپ کو دے ۔ میں نے جو کچھ اس کے متعلق لکھا ۔ اس میں ایک حرف تکلف سے نہیں لکھا ۔ اس سے زائد میرے مذاق کے خلاف ہے ۔ اگر پسند ہو شائع کرنے کی اجازت ہے اور پھر اپنی خانقاہ کے ماہواری رسالہ النور بابت ماہ شوال ۱۳۴۴ھ بضمن تتمہ وصیت اعلان فرمایا کہ اوجز السیر لخیر البشر مصنفہ مولوی محمد شفیع صاحب دیوبندی خانقاہ کے ابتدائی نصاب میں درج کر لی گئی اور دوسروں کو بھی یہی رائے دیتا ہوں ۔

از تھانہ بھون ۔ ۲۰ ، رمضان المبارک ۱۳۴۴ھ

سیرت خاتم الانبیاء ص ۱۱۹،۱۱۸ مطبوعہ ۱۳۴۵ھ

اللہ تعالیٰ حضرت مفتی صاحب نور اللہ مرقدہ کو اس سعی مشکور کی جزائے خیر دے اور اللہ ہم سب کو اس کتاب مستطاب سے مستفید فرمائے ۔ آمین ۔

ثمرات الاوراق یا کشکول

ہمارے بہت سے قدیم علماء کا دستور تھا کہ دوران مطالعہ جو مفید بات نگاہ سے گزرتی اسے اپنے استفادہ یا عمومی افادہ کے لیے بلا ترتیب مضامین اپنے پاس نقل کر لیتے تھے۔ جو اجزاء یا کاپی پر یہ "نوادرات" اور "قیمتی جواہرات" لکھے جاتے تھے اسے "بیاض" کہتے تھے۔ ایسے مجموعوں میں بڑے کام کی باتیں مل جاتی تھیں۔ جو ان حضرات کے ہزارہا ہزار صفحات کے مطالعہ کا حاصل اور ثمرہ ہوتی تھیں۔ اس قسم کا ایک مجموعہ ہمارے ممدوح حضرت مفتی صاحب نور اللہ مرقدہٗ کی کتاب "ثمرات الاوراق یا کشکول" ہے۔ جس میں مفید دلچسپ علمی، فقہی، تاریخی، ادبی، اصلاحی فوائد مضامین اور جواہر پارے کتابوں سے جمع کر دیے گئے ہیں۔ یہ "کشکول" نثر و نظم کے جن کار آمد حکیمانہ پر لطف مضامین و عبارات پر مشتمل ہے اس سے ہر ذوق کا قاری اپنے مذاق کے مطابق متمتع اور مستفید ہو سکتا ہے۔ یہ کتاب ۲۹۲ صفحات پر پھیلی ہوئی ہے۔ ۲۴۲ صفحات نثر کے باقی نظم کے ہیں۔ شعر و سخن کا حصہ حضرت مفتی صاحبؒ کے پاکیزہ ذوق شعری کا نمونہ ہے۔ اس میں حضرتؒ کے اردو، فارسی اشعار بھی شائع فرما دیے گئے ہیں۔ حضرت مفتی صاحب کے اشعار کا ہلکا سا نمونہ ذیل کے اشعار سے لگایا جا سکتا ہے۔

فارسی - مناجات

آمد بدر تو روسیا ہے نگذاشتہ در جہان گنا ہے
گر عفو کنی و گر بگیری کس نیست بجز درت پنا ہے
جان فدیۂ ان نگاہ لطفت یکبار دگر بمن نگا ہے

ہر کجا باشی و باہر کہ نشینی ہمہ وقت
غنچۂ چشم و دلِ خود سوئے دل آرام کنی

خوش درس علم و شغل فتاوی دیو بند
لیکن شبے بخانقہ تھانہ خوشتر است

مصلحت دید نست ارشاد شیخ تھانوی
زیں ہمہ زیں ہر دو غم آزاد باید زیستن

نمونہ اردو

یہ زمین میرے لیے ہے آسمان میرے لیے
اور ہے مصروف خدمت کل جہان میرے لیے
میری ہستی میں ہے مضمر ہستی عالم کا راز
ہے یہ سب ایجاد و شور کن فکان میرے لیے
کیوں نہ ہو روز اوّل میں ہو چکی تقسیم کار
میں ہوں مالک کے لئے اور کل جہان میرے لیے
یہ راز عشق دیکھ آئے چشم تر افشا نہ ہو جائے
ذرا تھم جا کہیں یہ پارسا رسوا نہ ہو جائے

دل میں اُلفت کا داغ رکھتے ہیں ظلمتوں میں چراغ رکھتے ہیں
شکر صد شکر ہم بفیض جنون اُلجھنوں سے فراغ رکھتے ہیں

تم بدلتے ہو روز قول و قرار مجھ کو یہ دل لگی نہیں آتی
لوگ دل دادہ ہیں بہت لیکن تم کو خود دلبری نہیں آتی
ہو چکی ہے جو غفلتوں میں بسر پھر کے وہ زندگی نہیں آتی
عمر رفتہ کا مرثیہ پڑھ لوں اس سے بہتر صدی نہیں آتی

دارِ احزان ہے یہ دنیا سب اس میں ممکن نہیں غموں سے نجات
وقت رحلت قریب ہے غافل گن غنیمت یہ عمر کے لمحات
ورد تو یہ کھلا ہے غفلت کیش اب بھی کر لے تلافی مافات

یاد رکھ قول سرورِ دوعالم
اکثر وا ذکر ہاذم اللذات

حضرت مفتی صاحب نوراللہ مرقدہٗ کے اشعار کے بعد فارسی، اردو قدیم وجدید شعراء کے کلام کا انتخاب حکمت الاشعار کے نام سے ہے ۔ یہ انتخاب بقولِ مرتب موصوف علم وحکمت، وعظ یا بلاغت کے اعتبار سے کیا گیا ہے ۔ خوب ہے ۔

حصہ نثر میں تقریباً ڈھائی سو عنوانات کے تحت عجیب وغریب پراثر وپرحکمت مضامین نقل کیے ۔ ایک مختصر اقتباس نمونہ نقل کرتا ہوں ۔

"کثرت وقلت" . . . . آجکل دنیا میں کثرت رائے کی حکومت ہے لوگوں نے دنیوی امور سے گزر کر دینیات میں بھی یہی اصول بنالیا ہے ۔ مگر اسلافِ امت اس کے متعلق کیا رائے رکھتے ہیں ۔

وہ اس جملہ سے بوضاحت معلوم ہوجاتی ہے حضرت فضیل بن عیاض فرماتے ہیں ۔

اتبع طرق الھدی	تم راہِ ہدایت کا اتباع کرو
ولا یضرك قلة السالکین و	اگر اس پر چلنے والے کم ہوں تو وہ تمہارے
ایاك وطرق الضلالة و	لیے مضر نہیں اور گمراہی کے راستے سے بچو اور ہلاکت
لا تغتر بکثرة الھالکین	میں پڑنے والوں کی کثرت سے دھوکہ مت کھاؤ ۔

اور علامہ شاطبی فرماتے ہیں ۔

وھذہ سنة اللہ فی الخلق ان	اور اللہ تعالیٰ کی اپنی مخلوق کے بارے میں یہی سنت
اھل الحق فی جنب اھل الباطل	ہے (عادت جاریہ) کہ اہلِ حق (ہمیشہ) بمقابلہ اہلِ باطل
قلیل لقولہ تعالیٰ "وما اکثر الناس	کے تعداد میں کم رہتے ہیں ۔ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے اور اکثر
ولو حرصت بمؤمنین" وقولہ	لوگ ایمان لانے والے نہیں ۔ اگرچہ آپ اس پر حریص ہوں
"وقلیل من عبادی الشکور"	اور ارشاد ہے ۔ اور میرے بندوں میں شکر گزار بہت
(الاعتصام ج۱ ص۱۱)	کم ہیں ۔

اور سفیان ثوری فرماتے ہیں ۔

اسلکو سبیل الحق ولاتستوحشوا — تم حق کے راستے پر چلو اور اس سے نگھبراؤ کہ اہل
من قلۃ اھلہ — حق تعداد میں کم ہیں۔
(اعتصام جلد ۲) — کشکول ص ۴۳-۴۴

یہ کشکول اس قسم کے علمی جواہرات کا خزینہ اور نہایت قیمتی اقتباسات کا مرقع ہے۔ جو اپنی افادیت کے ساتھ دلچسپ اور پرلطف بھی ہے۔ مزید برآں بہت سی ایسی کتابوں سے بھی استفادہ کیا گیا ہے۔ جو عام علماء کی دسترس اور مطالعہ میں نہیں ہیں۔ اس لیے یہ کتاب عامی اور عالم ہر ایک کے فائدہ کی ہے۔ بصائر اور عبر کا اچھا ذخیرہ ہے۔

اسلام کا نظام تقسیم دولت

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے " فتنۃ امتی المال " میری امت کا فتنہ مال ہے۔ یوں تو ہر زمانہ میں اس ارشاد نبوی کی تصدیق کرتا رہا۔ تاہم موجودہ دور میں امت اجابت ہو یا امت دعوت اس مالی فتنہ کی لپیٹ میں کچھ ایسی آئی ہے کہ زمن سابقہ میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ مغرب کے ہاتھ میں اس وقت اقوام عالم کی ذہنی قیادت ہے اور اس کے مالی نظام ہی پورے عالم کو اپنے پنجۂ استبداد میں جکڑے ہوتے ہے۔ ایک طرف یہودیت کے اصلی مزاج واشربوا فی قلوبھم العجل . . . بقرہ ان کے دلوں میں سونے کے بچھڑے کی محبت پلادی گئی ہے، کا ظہور سرمایہ داری (قارونیت) کے ظالمانہ نظام کی صورت میں ہوا۔ اور دوسری طرف اس نظام کا ردعمل یہودی ذہن ہی سے اشتراکیت و اشتمالیت کے غیر فطری نظام کی صورت میں ہوا اور حقیقت یہ ہے کہ افراط و تفریط، عمل و ردعمل کے ان دونوں ظالمانہ نظاموں کا مبنیٰ اور منشا اصلاً حب مال ہی ہے اور اس وقت پورا عالم ان دونوں ہی نظاموں کی لپیٹ میں ہے۔ جس نے انسانی جواہر کو ختم کر کے مالی استحصال اور ظلم و عدوان کا بازار گرم کر رکھا ہے۔ ان دونوں نظاموں کے درمیان اعتدال کی راہ جو اسلام نے بتائی تھی۔ اپنے اور بیگانے سب کی نگاہ سے اوجھل ہو چکی ہے۔ اس وقت دنیا اس معاشی مسئلہ کا حل چاہتی ہے اور اس رہنمائی کی طالب ہے جس میں مال کا کسب نہ صرف ملکیت و انتفاع حدود الٰہی کا پابند ہو کر افراط و تفریط کے ان دونوں ظالمانہ نظاموں سے بنی آدم کو نجات بخشے جس نے انسانیت کو طبقاتی جنگ اور زیادتی و ظلم کا جہنم بنا رکھا ہے۔ حضرت مفتی محمد شفیع نور اللہ مرقدہ نے اپنے رسالہ " اسلام کا

نظام تقسیم دولت میں اس عادلانہ نظام کے خط و خال کی کامیاب اور موجز نشان دہی فرمائی ہے۔ یہ مقالہ سہولت فہم اور مقصود کی رہنمائی میں اپنی مثال آپ ہے۔ گو فن کی اصطلاحات کا استعمال نہیں تاہم اسلامی معاشیات کا قابلِ اور مستند خاکہ پیش کر دیا۔

بقول حضرت مولانا عبدالماجد دریابادی رحمۃ اللہ تعالیٰ:

"طریق تفہیم بالکل علامہ تھانویؒ کے رنگ کا سادہ و سلیس عبارت میں بغیر مصطلحات فن کے بوجھل کئے ہوئے اسلامی معاشیات کو پانی کی طرح حل کر دیا ہے۔"

رسالہ کی افادیت اور دلچسپی کا اندازہ اس سے کیجئے کہ ہماری جامعہ پشاور کے اس وقت کے رئیس شعبۂ معاشیات رجو امیہ فرقہ سے تعلق رکھتے ہیں، بندہ سے اس رسالہ کی تقریباً تین سو کے قریب اردو و انگریزی کے نسخے منگوا کر طلبہ اور معاشیات سے تعلق رکھنے والوں میں تقسیم کرائے۔

یہ رسالہ اصلاً حضرت مفتی صاحبؒ کا وہ مقالہ ہے جو انہوں نے فروری ۱۹۶۸ء میں بین الاقوامی اسلامی کانفرنس راولپنڈی میں پڑھا تھا۔ اور جس میں مراکش سے لے کر انڈونیشیا تک پورے عالم اسلام کے بہت سے علماء و مفکرین جمع تھے اور اس منتخب مجلس میں یہ مقالہ دلچسپی سے سنا گیا اور پسند کیا گیا۔ مقالہ کے ذیلی عنوانات سے اس کی محتویات اور فکر انگیزی اور جامعیت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ گویا دریا بحباب اندر اور بقامت کمتر بقیمت بہتر کا مصداق ہے۔ تمہید میں اسلامی معاشی نظریہ اور دیگر نظریات کا بین فرق نمایاں کر دیا گیا ہے پھر عنوانات کی ایک لمبی فہرست کی تحت میں اختصار سے مہم مسائل کو لیا گیا ہے۔ عنوانات یہ ہیں۔

۲۔ معاشی مسئلہ کا مقام ۳۔ حق کا حقدار کو پہنچانا ۴۔ دولت و ملکیت کی حقیقت۔
۵۔ تقسیم دولت کے اسلامی مقاصد۔ ۶۔ ایک قابلِ عمل نظام معیشت کا قیام
۷۔ ارتکاز دولت کی بیخ کنی۔ ۸۔ تقسیم دولت کا اسلامی نظام۔
۹۔ تقسیم دولت کا سرمایہ دارانہ نظام ۱۰۔ تقسیم دولت کا اسلامی نظریہ۔
۱۱۔ دولت کے اولین مستحق۔ ۱۲۔ اشتراکیت اور اسلام۔ ۱۳۔ سرمایہ داری اور اسلام۔
۱۴۔ آجر سرمایہ اور محنت سے الگ نہیں۔ ۱۵۔ انفرادی کاروبار۔
۱۶۔ شرکت ۱۷۔ مضاربت۔ ۱۸۔ سود کا کاروبار
۱۹۔ کرایہ اور سود کا فرق ۲۰۔ حرمت سود کا اثر تقسیم دولت پر۔

۲۱۔ایک شبہ اور اس کا ازالہ۔ ۲۲۔اجرتوں کا مسئلہ۔ ۲۳۔تقسیم دولت کے ثانوی مدات۔

۲۴۔زکوٰۃ ۲۵۔عشر ۲۶۔کفارات

۲۷۔صدقۂ فطر ۲۸۔نفقات ۲۹۔وراثت

۳۰۔خراج و جزیہ ۳۱۔پیشہ ورانہ گداگری کا انسداد

آج جب کہ معاشی مسئلہ کا حل وقت کی سب سے اہم ضرورت ہے۔ یہ مختصر مقالہ اہلِ فکر علماء اور معاشیین کے لیے مشعلِ راہ ثابت ہو سکتا ہے۔

حضرت فقیہ الملۃ نور اللہ مرقدہٗ کی دو سو کے قریب کتابوں میں سے یہ بے بصیرت چند کے بارے میں اپنی کم سوادی کو پیش کر سکا مضمون طویل سے طویل تر ہو گیا۔ نہ ان تمام کتابوں کی کماحقہٗ نقاب کشائی ہو سکی نہ دیگر کتابوں پر لکھنے کا موقع باقی رہا۔ اس سے اندازہ ہوگا کہ معدن کتنا قیمتی، زمین کتنی زرخیز، منبع کس قدر صافی و پُرآب تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ حضرت حکیم الامۃ قدس سرہٗ کے اس علمی جانشینِ صادق نے دینی اعتبار سے شاید ہی کوئی ایسا مسئلہ جس پر اپنا گوہر بار قلم نہ اٹھایا ہو۔ یہ حقیقت اسوقت تک معلوم نہیں ہوگی، جب تک حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ کے علمی آثار پر گہری نظر نہ ڈالی جائے۔ کاش ہم اس خزانۂ عامرہ و ثمینہ کی کماحقہٗ قدر دانی کر پائیں[1]۔

کتابوں کی کثرت، مضامین کے تنوع، عنوانات کے انتخاب سے حضرت مفتی صاحب قدس سرہٗ کے وفورِ علمی، سیلانِ قلم، جودتِ طبع اور سلامتی فکر کا اندازہ ہوتا ہے۔ مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر کتاب، رسالہ و مقالہ بلکہ چند صفحات کا مجالہ بھی گہرے علم، وسعتِ نظر، دقیقہ رسی، نکتہ سنجی اور اصابتِ رائے کا نمونہ ہے۔

حضرت حکیم الامۃ تھانوی نور اللہ مرقدہٗ اس دور کے أعظم المصنفین تھے جن کا دائرۂ تحریر دینی علوم کی ہر صنف پر محیط تھا اور ہر علم میں آپ سند اور حجت و امامت کا مقام رکھتے تھے۔ ظاہری علوم میں آپ کے علوم خاصہ، تفسیر، فقہ و فتاویٰ تھے جن سے آپ کی فطری مناسبت تھی اور ان سے خاص شغف تھا۔ اردو کی اشرف التفاسیر، تفسیر بیان القرآن اور ہر وعظ و مجلس میں تفسیری مضامین اور نکات اس

---

[1] آج جدید طبقے کے لئے ضرورت ہے کہ علمائے حق کی کتابوں کی تشہیر و اشاعت بغیر کسی گروہی تعصب کے کی جائے۔ پتا اندازہ ہے کہ شاید ہی کوئی ایسا جدید موضوع ہو جس پر ہمارے بزرگوں نے نہ لکھا ہو۔ لیکن عدم واقفیت کی بنا پر دنیا ان علمی جواہر کے استفادہ سے محروم ہے۔ م۔ ا

بات پر شاہد عادل ہیں۔ فقہ و فتاویٰ سے اشتغال پر آپ کی فقہی کتابیں اور فتاویٰ کا دفتر دلیل قاطع و برہان ساطع ہے۔ ہمارے حضرت مفتی صاحب نور اللہ مرقدہٗ کی تفسیر معارف القرآن اگر ایک طرف اشرفی تفسیری علوم کی صحیح جانشینی کی دلیل ہے تو حضرت مفتی صاحب کے فقہی اسفار اور فتاویٰ کے ذخائر فیض اشرفی و نیابت کا زندہ ثبوت ہے۔

سیرت میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ تعالیٰ کی نشر الطیب رسالت کی عطر بیزیوں سے مشام جان کو اگر معطر کر رہی ہے تو حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ کی خاتم الانبیاء علیہ الصلوٰۃ والسلام سیرت پاک کا موثر، اچھوتا، مستند اور اوجز مجموعہ ہے۔ سلوک میں حضرت تھانویؒ کی بعض کتابوں کی تسہیل مجالس اشرفؒ وغیرہ خلافت اشرفی کا حق ادا کر رہی ہے۔ غرض مختلف حیثیتوں سے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ تعالیٰ کے علمی جانشینی کا جو حق حضرت مفتی صاحب قدس سرہٗ کے آثار علمیہ میں نظر آتا ہے۔ اس کوتاہ نظر کے نزدیک علم و تقویٰ کے اس صدر نشین کے لئے مسند تھانویؒ کی علمی نیابت کی صداقت کو ثابت کر دیتا ہے۔

جیسا پہلے عرض کیا گیا۔ یہ فقیر کی رائے ہے جس سے اختلاف کی گنجائش ہر ذی علم کو حاصل ہے۔

ع   وللناس فیما یعشقون مذاھب

یہ کوتاہ نظر اپنی ناکارگی اور ہجوم مشاغل کی وجہ سے مضمون کو جیسا چاہتا تھا نہ لکھ سکا تاہم ماہنامہ البلاغ کے "مفتی اعظم نمبر" میں شرکت کی سعادت بندہ کے لئے حضرت نور اللہ مرقدہٗ کی شفقتوں کی یادیں طمانیت و مسرت کا سبب ہے۔ یہ شفقتیں بندہ پر تقریباً تیس سال رہیں۔

حضرت مفتی صاحبؒ سے بندہ کی پہلی ملاقات ۱۹۴۷ء میں اس وقت ہوئی تھی جب آپ تقسیم برکوچک سے پیشتر سرحد میں ریفرنڈم کے سلسلہ میں حضرت شیخ الاسلام حضرت علامہ شبیر احمد عثمانی قدس سرہٗ کی معیت میں تشریف لائے۔ اور فقیر کے بہنوئی جناب عنایت اللہ جان صاحب مرحوم کے مکان پران مقدس مجاہدین کا قافلہ فروکش ہوا۔ بندہ اس وقت مسلم لیگ پشاور کا سیکرٹری تھا۔ کئی مناسبتوں اور منصبی فرائض کی بنا پران بزرگوں کی خدمت میں حاضری رہی اور معلوم ہوا کہ خاصان خدا کی سیاست بھی کس قدر پاک، کتنی بے لوث اور کتنی اخلاص دینی ہمدردی، ملی درد و فکر اور بےنفسی پر مبنی ہوتی ہے[1]۔ حضرت مفتی صاحب نور اللہ مرقدہٗ کا متین و پُر وقار چہرہ، تقویٰ و دیانت، علمی

[1] یہاں ایک بات برسبیل تذکرہ یاد آ گئی ہے کہ علماء دیوبند کا ایک کثیر طبقہ اگر حضرت شیخ الاسلام شبیر احمد عثمانی صاحب (بقیہ برصفحہ)

متانت، درویشانہ تواضع و مسکنت و مومنانہ فراست سے چمکتا ہوا آج بھی آنکھوں میں پھر رہا ہے۔ یہ پہلی ملاقات تھی جس میں حضرت مفتی صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کی شفقت و محبت نے نوازا اور تادمِ آخر اس میں کمی نہ آئی۔ اس سفر میں بندہ کو دو رسالے مرحمت فرمائے جو مسلم لیگ اور اسلامی سیاست کے بارے میں تھے۔ پھر تو کوئی کتاب حضرت نور اللہ مرقدہٗ کی شاید ہی چھپی ہو جو بندہ کو ہدیۃً مرحمت نہ فرمائی ہو۔ ایک بار معارف القرآن کی پہلی جلد بازار سے خریدی۔ کراچی کی حاضری کے وقت تذکرہ آیا تو فرمایا۔ آپ نے بازار سے کیوں خریدی۔ آپ پر جرمانہ ہوگیا۔ اور پھر دوسری جلد منگوا کر اپنے دستخط فرما کر ہدیۃً عنایت فرمائی۔ آج وہ عنایتیں اور شفقتیں یاد آتی ہیں تو کلیجہ منہ کو آتا ہے اور آنکھیں پُرنم ہو جاتی ہیں۔ ایسی فرشتہ صفت اور شفیق شخصیتیں اب کہاں سے میسر آئیں گی۔ جب تک صحت تھی جب کبھی کراچی حاضری ہوتی۔ یہ بندہ ابھی خدمت میں پہنچنے کے لیے کار سے اترتا نہ تھا کہ مفتی صاحب نور اللہ مرقدہٗ مسند سے اُٹھ کر ننگے پاؤں سڑک پر تشریف لے آتے اور محبت و شفقت کے وہ کلمات فرماتے جو اس ہیچمیرز کے لیے یہاں سرمایہ سعادت اور انشاء اللہ آخرت میں ذریعۂ نجات ہوں گے۔

ایک بار گھر پر حاضری ہوئی۔ کوئی خادم موجود نہ تھا۔ پلنگ سے خود اُٹھے مٹھائی اور کیلے الماری سے نکال کر لائے اور بندہ کے سامنے رکھ دیئے جسے بندہ نے کمال ندامت سے سعادت سمجھ کر کھایا اور اس تکلیف فرمائی پر معذرت کا اظہار کیا تو فرمایا اس میں کوئی ایسی بات نہیں، آپ تو بڑے دُور کے پیارے مہمان ہیں۔ ہر مہمان کا حق ہوتا ہے۔ آپ خجالت محسوس نہ کریں (او کما قال) ان واقعات سے حضرتؒ کی کمال بےنفسی اور تواضع رعایت حقوق اور پابندی شریعت کا اندازہ ہوتا ہے۔ ان پُرکیف و پُرقیمت ملاقاتوں کے واقعات و کوائف بہت ہیں۔ اس دلکش و دلنشیں داستان

(بقیہ حاشیہ ص ۔۔۔) اور حضرت مولانا ظفر احمد عثمانیؒ اور حضرت مفتی صاحب کی قیادت میں اگر مسلم لیگ اور تحریک پاکستان کی حمایت نہ کرتا تو شاید ہی یہ تحریک کامیاب ہوتی۔ خصوصاً صوبہ سرحد کے ریفرنڈم کا فقیر خود عینی و شاہد و شریک سفر کی حیثیت سے گواہ ہے۔ اسی دیوبندی قافلہ جہاد حریت اور پیر صاحب مانکی صاحب مرحوم ہی نے سرحد میں عبدالغفار خاں صاحب کی قیادت اور کانگریس کے طلسم کو توڑا۔ آج ان بندگانِ خدا کو کون جانتا ہے۔ و الی اللہ المشتکی۔

کے لیے مستقل مضمون چاہیے۔ اپنی بات اپنی آخری حاضری کے ایک واقعہ پر ختم کرتا ہوں۔ بندہ جولائی ۱۹۷۶ء میں آخری بار حاضر ہوا۔ حضرت مفتی صاحب نوراللہ مرقدہٗ قدیم عارضہ قلبی میں صاحب فراش تھے۔ بندہ کو دیکھتے ہی اُٹھ بیٹھے۔ فرمایا، آپ کو دیکھتے ہی جان پڑ جاتی ہے۔ تھوڑی سی مٹھائی ہدیۃً پیش کی۔ فرمایا آپ خود مٹھائی ہیں، مٹھائی لانے کی کیا ضرورت تھی۔ بندہ کے ساتھ عزیز گرامی قدر سید محمد صاحب بنوری سلمہٗ صاحبزادہ حضرت علامہ محمد یوسف بنوری نوراللہ مرقدہٗ، تھے۔ ان کے لیے عرض کیا کہ دعا فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ انہیں اپنے والد محترم کی میراث ظاہری، باطنی، علمی وعرفانی کا وارث بنائے۔ رقت سے دُعا فرمائی۔ اس ضمن میں بندہ نے جب برادر گرامی جناب مولانا تقی عثمانی سلمہٗ اور جناب مفتی محمد رفیع عثمانی مدظلہٗ کی دینی وعلمی خدمات کا تذکرہ کیا تو تحدیث نعمت کے طور پر فرمایا کہ بحمد اللہ تعالیٰ اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ بندہ کی زندگی ہی میں ان دونوں نے میرے کاموں کو سنبھال لیا۔ مولوی محمد رفیع صاحب نے فتویٰ و فقہ کا کام لے لیا ہے اور دیگر کاموں کو مولوی تقی سلمہٗ کر رہے ہیں۔ پھر فرمایا یوں تو میرے چاروں بیٹے ماشاءاللہ خوب ہیں۔ لیکن میرے علمی کام سنبھالنے کے اعتبار سے یہ دونوں بیٹے خاص ہیں۔ اور سب بیٹوں کے لیے دعا فرمائی۔ آخری مجلس میں باوجود ضعف ونقاہت کے ڈیڑھ گھنٹے تک تھم تھم کر ارشادات عالیہ سے نوازتے رہے۔ یہاں تک کہ نڈھال ہو گئے۔ برادرم مولوی تقی میاں نے دوائی کی گولی دی۔ تو لیٹ گئے۔ بندہ نے رخصت چاہی تو انتہائی پُرتاثیر الفاظ میں دعائیہ کلمات ارشاد فرمائے اور مصافحہ۔ نگاہِ شفقت اس آخری ملاقات کی پُرتاثیر رخصتی تھی، جو شاید مرتے دم تک نہ بھولے گی فرحمه الله تعالیٰ رحمةً واسعة

علوٌ في الحياة وفي الممات　　لحقٌ انت إحدى المعجزات
عليه تحية الرحمات تسری　　برحماتٍ غوادٍ رائحات

دل گرفتۂ ہیچ میرزو ہیچداں
محمد اشرف
صدر شعبہ عربی پشاور یونیورسٹی
۲۰ ذی قعدہ ۱۳۹۶ھ

مولانا خیب احمد صاحب
استاذ دارالعلوم، کراچی

حضرت مُفتیِ اعظمؒ کی اصلاحی تصانیف

فقیہہ ملت مفتی اعظم حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب نور اللہ مرقدہٗ کو جہاں اللہ تعالیٰ نے تفقہ فی الدین کی دولتِ عظمیٰ سے مالا مال فرمایا تھا وہاں اصلاح قوم کے جذبۂ خیر سے بھی سرشار فرمایا گیا تھا۔ حضرت تھانویؒ کو قوم کی زبوں حالی اور پُر مصائب زندگی کی اصلاح کی جو فکر لاحق رہتی تھی جس کا بین ثبوت ان کی وہ سینکڑوں تصانیف ہیں جو انہوں نے اس امتِ مرحومہ کی اصلاح کی خاطر تصنیف فرمائیں۔ اسی فکر و جذبہ کا ایک بڑا حصہ حضرت مفتی صاحبؒ کو اپنے شیخ کی میراث میں ملا تھا، یہی وہ جذبہ تھا جس نے حضرت مفتی صاحبؒ کو بھی بیسیوں ایسی کتابیں لکھنے پر مجبور کر دیا جن کی عام مسلمانوں کو انتہائی شدید ضرورت تھی اور جو انشاء اللہ ایک طویل مدت تک اس قوم کو راہ ہدایت پر چلتے رہنے میں ممد و معاون ثابت ہوتی رہیں گی۔

حضرت مفتی صاحبؒ کو ہمیشہ اس بات کی فکر دامن گیر رہتی کہ کسی نہ کسی طرح دین کی باتیں عام مسلمانوں تک اس طرح پہنچ جائیں کہ وہ آسانی کے ساتھ سمجھ کر ان پر عمل کر سکیں۔ اگرچہ حضرتؒ کی بیشتر کتابیں بحیثیت فقیہہ و مفتی اعظم کے محض محققانہ اور خالصتاً معرکۃ الآراء مباحث پر مشتمل ہیں، لیکن طبعی طور پر آپ بحیثیت مرشدِ کامل کے ایسی کتابوں کو پسند فرماتے تھے جن سے عامۃ الناس کو نفع پہنچے۔ آپ کا مزاج اس سلسلہ میں موجودہ زمانہ کے عام مصنفین سے بالکل ہٹ کر تھا، چنانچہ آپ ہمیشہ اس بات کی کوشش فرماتے تھے کہ مضامین کو انتہائی سہل انداز سے آسان اور سلیس زبان میں بیان کر دیا جائے تاکہ اس سے کم تعلیمیافتہ لوگ اور گھریلو عورتیں زیادہ سے زیادہ فائدہ حاصل کر سکیں، اور یہ وصف

آپ کی تقاریر و مواعظ میں بھی اور تحریرات و تصانیف میں بھی یکساں طور پر بدرجۂ اتم پایا جاتا ہے۔ نیز آپ دوسرے مصنفین کی ان کتابوں کو بھی نظر تحسین دیکھتے تھے جن میں یہی جذبہ کارفرما ہو۔ چنانچہ آپ کی معرکۃ الآراء تصنیف تفسیر معارف القرآن میں جو غالباً اس وقت اردو کی تفاسیر میں سب سے زیادہ مفصل اور سب سے زیادہ مقبول ہے اسی بات کو مدنظر رکھا گیا ہے کہ کیسے ہی غامض اور مشکل ترین تفسیری مباحث کیوں نہ ہوں ان کو اس طرح بیان کر دیا جائے کہ تھوڑی بہت اردو جاننے والا شخص بھی ان کو باسانی سمجھ سکے، اور غالباً یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس تفسیر کو اس قدر شہرت اور مقبولیت عطا فرمائی ہے کہ ہر خاص و عام اسی کا طالب و متمنی نظر آتا ہے۔

حضرت مفتی صاحبؒ کے خلف الرشید حضرت مولانا محمد تقی عثمانی مدظلہم نے احقر سے حضرتؒ کا ایک واقعہ نقل فرمایا کہ ایک مرتبہ ایک رسالہ کے مدیر نے جو حضرتؒ کے مزاج اور آپ کی تحقیقی تصانیف سے قطعی بے خبر تھا حضرتؒ کے چند ایسے رسائل کو دیکھ کر جو عامۃ الناس کی اصلاح کے لیے آسان زبان میں لکھے گئے تھے اپنے اداریہ میں یہ تبصرہ کیا، کہ حضرت مفتی صاحب کی تصانیف کا رنگ محققانہ کم اور واعظانہ و ناصحانہ زیادہ ہے، اور یہ تبصرہ اس انداز سے کیا کہ گویا حضرتؒ کے علمی مقام اور مرتبہ کی تنقیص مقصود ہو۔ ناقل واقعہ فرماتے ہیں کہ مجھے یہ اداریہ پڑھ کر بہت افسوس ہوا اور میں نے حضرت والد صاحبؒ سے عرض کیا تو فرمایا کہ اس نے ایک لحاظ سے صحیح تبصرہ کیا ہے اور فرمایا کہ آج کل بہت سے مصنفین کا یہ مزاج ہو گیا ہے کہ وہ کتابیں اس نیت سے نہیں لکھتے کہ وہ سہل اور آسان ہوں جن کو پڑھ کر عامۃ الناس دین پر عمل کر سکیں بلکہ اس بات کی کوشش کرتے ہیں کہ خالص عالمانہ اور محققانہ مباحث ہوں تاکہ علماء اور خواص ان کو پڑھیں اور لکھنے والوں کو داد تحسین پیش کریں، اسی نظریہ اور ذہنیت سے تبصرہ نگار نے میری کتابوں پر تبصرہ کیا ہے حالانکہ میرے نزدیک آج امت کو تحقیق کی کم اور عمل کی زیادہ ضرورت ہے، اور ایسی کتابوں کے مقابلہ میں جو تحقیق کے درجے میں بہت اعلیٰ ہوں مگر عملی اعتبار سے ان سے صرف ایک مخصوص طبقہ کو فائدہ پہنچتا ہو ایسی کتابیں زیادہ مفید ہیں جو خلوص کے ساتھ عامۃ الناس کے مفاد کو پیش نظر رکھ کر سہل اور سادہ زبان میں لکھی گئی ہوں۔

زیر نظر مقالہ میں حضرت مفتی صاحبؒ کی ان تصانیف میں سے چند کا مختصر تعارف کرانا مقصود ہے جو بنیادی طور پر اصلاحی تصانیف کی فہرست میں آتی ہیں۔

جامعیت کے ساتھ بیان کر دیا ہے کہ اگر کوئی مناظرانہ اور مجادلانہ ذہنیت سے علٰیحدہ ہو کر قبول حق کی نیت سے پڑھے تو یہ مختصر رسالہ اس کے تمام اوہام و اشکالات اور شکوک شبہات کو رفع کرنے کے لیے کافی و شافی ہوگا۔

تعدد ازدواج کے سلسلہ میں مخالفین کے شبہات کا رد کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں کہ۔

"اگر کوئی شپرہ چشم آفتاب نبوت کی عظمت و جلال کو بھی نہ دیکھ سکے اور آپ کے اخلاق، اعمال، تقویٰ، طہارت، زہد و ریاضت اور مقدس زندگی کے تمام گرد و پیش کے حالات سے بھی آنکھ چرائے تو خود ان متعدد نکاحوں کے اوقات ہی اس کو یہ کہنے پر مجبور کر دیں گے کہ تعدد ازدواج یقیناً کوئی نفسانی خواہش پر مبنی نہ تھا اور نہ ساری عمر ایک سن رسیدہ عورت کے ساتھ گزار دینا پچپن سالہ کو اس کام کے لیے تجویز کرنا کسی انسان کی عقل تسلیم نہیں کر سکتی؛ خصوصاً جب کہ کفار عرب اور رؤسا قریش آپ کے ایک اشارہ پر اپنا منتخب حسن و جمال آپ کے قدموں پر نثار کر دینے کے لیے بھی تیار تھے۔ جیسا کہ تاریخ و سیر کی معتبر کتابیں اس کی شاہد ہیں، اور اس سے قطع نظر کی جائے تو خود مسلمانوں کی جمعیت بھی اس عرصہ میں لاکھوں کی تعداد تک پہنچ چکی تھی جن کی ہر عورت آپ کے عقد میں داخل ہونے کو بجا طور پر فلاح دارین سمجھتی تھی، یہ سب کچھ تھا مگر حضرت نبوت کے عقد میں پچاس سال تک صرف ایک حضرت خدیجہؓ تھیں جن کی عمر بوقت نکاح چالیس سال تھی، پھر ان کے بعد بھی جن خواتین کا نکاح کے لیے انتخاب کیا جاتا ہے وہ ایک کے سوا سب کی سب بیوہ اور صاحب اولاد تھیں، امت کی بے شمار کنواری لڑکیاں اس وقت بھی انتخاب میں نہیں آئیں، اس مختصر رسالہ میں تفصیل کی گنجائش نہیں ورنہ دکھلایا جاتا کہ آپ کے یہ متعدد نکاح کس قدر اسلامی اور شرعی ضرورتوں پر مبنی تھے، نیز اگر نہ ہوتے تو بہت سے وہ احکام جو عورتوں ہی کے ذریعہ سے امت کو پہنچ سکتے تھے وہ سب مخفی رہ جاتے۔

اس پروپیگنڈے کے جواب میں کہ اسلام بزور شمشیر پھیلایا گیا ہے ایک جگہ تحریر فرماتے ہیں کہ

"جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ اسلام بزور شمشیر پھیلایا گیا ہے کیا وہ اس کا کوئی جواب دے سکتے ہیں کہ ان تلوار چلانے والوں پر کس نے تلوار چلائی تھی جو نہ صرف مسلمان بنے بلکہ اسلام کی

(۱) سیرت خاتم الانبیاء

تعارف :۔ سرورِ کائنات فخرِ موجودات سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ طیبہ پڑھنے پڑھانے کی ضرورت سے ہر شخص واقف ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب سے تصنیف و تالیف کا سلسلہ شروع ہوا ہے ہر زمانہ ہر دور اور ہر زبان میں حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت لکھی جاتی رہی اور یہ بات بلاخوف و تردید کہی جاسکتی ہے کہ آپ ہی کی وہ ذاتِ بابرکات ہے جس کی سیرت نگاری کا اتنا اہتمام کیا گیا ہے کہ کسی دوسرے کا نہیں کیا گیا۔

اُردو زبان میں بھی بہت سی سیرت کی کتابیں موجود ہیں اور اہلِ اُردو کی طرف سے اس فریضے کی ادائیگی ہو چکی ہے مگر اُردو زبان میں ایک عرصہ سے ایک ایسی مختصر سیرت کی تلاش تھی کہ جس کو ہر کاروباری مسلمان مرد و عورت ، بچہ بڑا چند مجالس میں پڑھ کر حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے پورے اسوۂ حسنہ سے واقف ہو کر اپنا ایمان تازہ کرے اور اس کو اپنا راہ نما بنا کر اس پر عمل کر سکے ۔

حضرت مفتی صاحبؒ سے بعض احباب نے اسلامی انجمن کے لیے سیرت پر ایک رسالہ تصنیف فرمانے کی درخواست کی جس میں اختصار کے ساتھ آسان زبان میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ کا ایک اجمالی نقشہ مکمل طور پر روایات میں احتیاط کو مدِ نظر رکھ کر کھینچا گیا ہو۔ مفتی صاحبؒ نے اس درخواست کو قبول فرمایا اور ۱۳۴۶ھ میں ایک انتہائی مختصر مگر جامع کتاب جو تمام ضروری اور اہم واقعات کے ساتھ بہت سے معرکۃ الآراء مسائل مثلاً تعددِ ازواج ، جہاد اور واقعہ معراج وغیرہ پر مخالفین کے اوہام و اشکالات کے موٹے موٹے مگر شافی جوابات پر مشتمل ہے تحریر فرمائی ۔

مفتی صاحبؒ نے اپنے مخصوص مزاج کے مطابق اس میں ایک تو اس بات کا اہتمام فرمایا ہے کہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی مکمل سیرت انتہائی سہل اور سادہ زبان میں عوام الناس کے سامنے آجائے جس کو ہر آدمی ایک مجلس اور بچے چند مجالس میں سبقاً سبقاً پڑھ کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پر عمل پیرا ہو سکیں ، اسی اختصار کی بناء پر اس رسالہ کا نام "اوجز السیر لخیر البشر" بھی تجویز فرمایا اور ساتھ ہی اس بات کا بھی پورا اہتمام فرمایا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری زندگی کا نقشہ معتبر کُتبِ تاریخ و حدیث کے حوالے سے سامنے آئے چنانچہ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش سے لے کر وصال تک کے تمام واقعات اس رسالہ میں سما گئے ہیں اور ساتھ ہی بعض اہم مباحث کو سہل کر کے اختصار

حمایت میں تلوار اٹھانے اور اپنی جانوں کو خطرہ میں ڈالنے پر راضی ہوگئے کیا وہ بتلا سکتے ہیں کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ، فاروق اعظمؓ عثمان غنیؓ اور علی مرتضیٰؓ پر کس نے تلوار چلائی، قبیلہ بنی الاشہل کو کس نے دبایا تھا اور تمام انصار مدینہ پر کس کا زور تھا، بریدہ اسلمی کو کس نے مجبور کیا کہ ستر آدمیوں کی جماعت لے کر مدینہ کے راستہ میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور برضا و رغبت مسلمان ہوگئے، نجاشی بادشاہ حبشہ پر کون سی تلوار چلی تھی کہ باوجود اپنی شوکت و سلطنت کے قبل از ہجرت مسلمان ہوگئے۔

بہرحال اللہ تعالیٰ نے اس کتاب کو اس قدر قبولیت عام عطا فرمائی کہ تقریباً ڈھائی لاکھ کے قریب اس کے نسخے کئی مرتبہ شائع ہوکر عوام و خواص میں پھیل چکے ہیں، ہندوستان کے بہت سے سکولوں اور دینی مدارس میں نیز پاکستان کے اکثر دینی مدارس میں یہ کتاب داخل نصاب ہے۔

(۲) نجات المسلمین یعنی گناہوں کا کفارہ

مسلمان موجودہ دور میں جس زبوں حالی اور مصائب و مشکلات کا شکار ہیں وہ کسی صاحب عقل و فہم سے مخفی نہیں۔ ان مسائل کا اصل سبب تو ہمارے گناہ ہیں جیسا کہ قرآن و حدیث کی سینکڑوں نصوص سے ثابت ہے، اور ان کا اصل علاج تو اپنے گناہوں سے توبہ اور استغفار ہی ہے۔

مگر گمراہیوں کے اس طوفان اور گناہوں کے اس بھنور میں جس طرح مسلمان چاروں طرف سے گھرے ہوئے ہیں ان سے بچنے اور نکلنے میں بھی خاصا وقت درکار ہے۔ ان تمام باتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے حضرت مفتی صاحبؒ نے ایک رسالہ تحریر فرمایا جس میں بہت سے ایسے اعمال ذکر کر دیے ہیں جن کے متعلق معتبر احادیث میں گناہوں کا کفارہ ہونا مذکور ہے۔ اور وہ اعمال نہایت آسانی سے فرائض کئے جاسکتے ہیں۔

کتاب کا سبب تالیف خود صاحب کتاب کی زبانی سنیئے۔

آج کل مسلمانوں کی کشتی جن مصائب کے طوفان میں زیر و زبر ہوتی چل رہی ہے وہ کسی ذی ہوش سے مخفی نہیں، ان حالات و آفات کی وجہ سے دل میں آیا کہ مسلمانوں کو ان کے مصائب کے اصلی اور بے خطر علاج کی طرف پھر توجہ دلائی جائے جس کا مفید اور مؤثر ہونا یقینی اور ہزاروں مرتبہ کا تجربہ

کیا ہوا ہے۔

یوں تو اس موضوع پر بہت سے علماء سلف وخلف نے قلم اٹھایا ہے۔ مثلاً حافظ ابن حجر عسقلانی، حافظ زکی الدین عبدالعظیم منذری، شیخ ابوبکر مروزی، شیخ ابوزید ابن خلیل اوزاعی، اور شیخ محمد بن حطاب شامل ہیں۔ مگر یہ ساری کتابیں اور رسائل عربی میں ہیں جن سے عربی دان یا اہل علم ہی فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

حضرت مفتی صاحب نے ان میں سے دو رسائل حافظ ابن حجر کا رسالہ "الخصال المکفرۃ عن الذنوب المتقدمہ والمتاخرہ" اور شیخ محمد بن حطاب کا رسالہ "بشارۃ المحبوب بتکفیر الذنوب" کو پیش نظر رکھ کر اُردو زبان میں یہ رسالہ تحریر فرمایا ہے تاکہ ہندو پاکستان کے عام مسلمان بھی ان اعمال کو اختیار کر کے اپنے گناہوں کی معافی کا سامان کر سکیں۔

ابتداء میں تو اگلے پچھلے گناہوں کی معافی پر جو شبہات لوگوں کے دلوں میں پیدا ہوتے ہیں ان کا جواب دیا گیا ہے پھر وہ اعمال لکھے گئے ہیں جو کفر ذنوب میں اور ان کو عام محدثین نے خصال اور خصلت سے تعبیر فرمایا ہے اس لیے حضرت نے بھی یہی عنوان اختیار فرمایا۔ چنانچہ پورا رسالہ تیئس خصلتوں پر مشتمل ہے جن میں سے بعض خصائل یہ ہیں۔

پہلی خصلت وضو کی پوری تکمیل، چوتھی خصلت نماز ضحیٰ، پانچویں خصلت صلوٰۃ التسبیح، آٹھویں خصلت، قیام شب قدر، چودھویں خصلت سورۃ حشر کی تلاوت، پندرھویں خصلت اپنی اولاد کو قرآن کی تعلیم دلانا، اکیسویں خصلت کھانے پینے کے بعد ایک دعا، تیئیسویں خصلت نوّے سال کی عمر کو پہنچنا،

کتاب کے آخیر میں ایک ضمیمۃ "فائدہ مہمہ" کے نام سے شامل ہے جو اعمال مجربہ برائے رفع بلاء ومصائب پر مشتمل ہے۔ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو یہ کتاب پڑھنے اور اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

(۳) ذکر اللہ اور فضائل ومسائل درود وسلام

مسلمان اپنے مزاج ایمانی کے لحاظ سے دوسری اقوام اور ملتوں سے بالکل جُدا واقع ہوا ہے، اور دوسری

کے لیے جو تریاق ہے اس کے لیے وہ سم قاتل ہے، دوسری قومیں خدا کو بھلا کر اس سے اپنا رشتہ توڑ کر دنیا کی ظاہری زندگی میں بظاہر خوش و خرم رہ سکتی ہیں لیکن اگر مسلمان دنیا و آخرت کی فلاح چاہے تو اس کا ایک ہی علاج ہے کہ اپنا ظاہری اور باطنی تعلق اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے مضبوطی سے قائم رکھے، اور اپنے دن رات اللہ تعالیٰ کی یاد اور ذکر میں اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم پر درود و سلام میں گزارے۔

زیر نظر کتاب حضرت مفتی صاحبؒ نے بعض احباب کے مشورہ اور اصرار پر ۱۳۸۶ھ میں مسلمانوں کی زبوں حالی سے متاثر ہو کر بطور علاج تالیف فرمائی۔

اس کتاب کی تالیف کا محرک بھی حضرت مفتی صاحبؒ کا وہی جذبۂ خیر ہے کہ کسی طرح مسلمان اپنی ظاہری و باطنی حالت سنوار لیں اور دین پر عمل کر کے اپنی نجات کا سامان پیدا کر لیں چنانچہ مقدمہ میں تحریر فرماتے ہیں کہ

"درحقیقت یہ رسالہ تصنیف و تالیف کے طور پر نہیں، بلکہ رغبت و شوق دلا کر اپنے آپ کو اور دوسرے مسلمان بھائیوں کو عمل پر ڈالنے کی غرض سے چند اوراق لکھے گئے ہیں۔"

یوں تو ذکر اللہ کے اقسام اور دن رات کی مسنون دعاؤں کا ایک طویل سلسلہ ہے جو حدیث کی کتب میں مذکور ہے مگر یہاں پر حضرت مفتی صاحبؒ نے خصوصیت کے ساتھ وہ اذکار اور دعائیں جمع فرمائی ہیں جو کم فرصت آدمی بھی آسانی کے ساتھ پڑھ سکے اور جن کے وصائف و برکات بے شمار ہیں۔

ابتداء میں ذکر اللہ کے معنی، طریقہ، اور فضائل، احادیث نبویہ (علیہ افضل الصلوٰۃ والتسلیم) کی روشنی میں بیان فرمائے ہیں۔

ایک عنوان "ہر نیک کام ذکر اللہ میں داخل ہے" کے تحت امام تفسیر حضرت عطاءؒ کا قول نقل کیا ہے کہ جن علمی مجلسوں میں احکام شرعیہ حلال و حرام اور جائز و ناجائز کی بحث، تحقیق اور تعلیم ہو وہ بھی مجالس ذکر ہیں، اس کے بعد آداب، ذکر اور آداب تلاوت مختصر انداز میں بیان فرمائے ہیں۔

آگے چل کر بعض انتہائی مختصر معمولات جو نافع دین و دنیا ہیں تحریر کئے گئے ہیں کہ اگر انسان تھوڑی سی توجہ دے تو ان کو یاد کر کے ان کی پابندی کر لینا کچھ دشوار نہیں، خصوصاً ان کے ثمرات و برکات

کے مقابلہ میں یہ تھوڑی سی محنت کچھ حیثیت نہیں رکھتی۔

کتاب کے دوسرے حصہ میں درود شریف کے مسائل و فضائل بیان کئے ہیں کہ درود شریف کس وقت فرض و واجب ہوتا ہے کن اوقات میں مستحب ہے اور درود شریف کے الفاظ کون سے منتخب کرنا چاہئیں۔

اسی ضمن میں ایک جگہ تحریر فرماتے ہیں۔

بعض روایات میں ہے کہ درود بھیجنے والے کا نام مع ولدیت آپ کے پاس پہنچایا جاتا ہے کہ فلاں ابن فلاں آپ پر درود بھیج رہا ہے، اور دوسری احادیث سے یہ بھی ثابت ہے کہ آپ ہر ایک کے سلام کا جواب دیتے ہیں۔ ایک مسلمان کے لیے اس سے زیادہ کون سی عزت و عظمت ہو سکتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کے سلام کا جواب دیں۔

ایک واقعہ: فرماتے ہیں بعض بزرگوں کے واقعات میں تو یہ بھی منقول ہے کہ اپنے سلام کا جواب انہوں نے خود سُنا ہے۔ علاقہ کابل کے ایک بزرگ بنا پاکستان کی ابتدا میں کراچی تشریف لائے، انہوں نے مجھ سے ذکر کیا کہ ایک مرتبہ میں مسجد نبوی میں معتکف تھا، میں نے دیکھا کہ نصف شب کے بعد ایک شخص آئے اور روضہ اقدس کے سامنے پہنچ کر سلام عرض کیا۔ تو روضہ اقدس کے اندر سے جواب سلام کی آواز آئی، جس کو میں نے اپنے کانوں سے سُنا اور ہر رات یہی سلسلہ دیکھتا رہا۔

اخیر میں درود شریف کے بعض خواص کے عنوان سے حکیم الامت مولانا تھانوی قدس سرہٗ کی کتاب زادالسعید سے درود شریف کی چند خصوصیات جو مستند احادیث سے ثابت ہیں ذکر فرمائی ہیں۔

مثلاً قبولیت دعا، مال میں برکت و زیادتی، پاؤں سو جانے کا علاج، بھولی ہوئی چیز یاد آجانا، خواب میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت، عالم بیداری میں زیارت۔

ذکر اللہ اور دعا میں جتنا حضور قلب اور دلجمعی ہو اتنا ہی اجر و ثواب اور خیر و برکت کا باعث ہے اور اشعار و نظم میں یہ خاصیت ہے کہ قلب میں رقت اور یکسوئی پیدا ہو جاتی ہے۔ اس لیے حضرت والا نے چند بزرگوں کے کچھ اشعار بھی اس کتاب میں نقل فرمائے ہیں، مثلاً حضرت شیخ عطارؒ کی مشہور مناجات

بادشاہا جرم ما را در گذار ما گنہگاریم و تو آمرزگار

حضرت خواجہ عزیز الحسن مجذوبؒ کی مسدس کے چند اشعار ؎

تیرے سوا معبود حقیقی کوئی نہیں ہے کوئی نہیں
تیرے سوا مقصود حقیقی کوئی نہیں ہے کوئی نہیں

اور خود حضرتؒ کے چند اشعار جو اپنے ایک دوست مولانا عبد العزیز صاحب سورتی کے ایک مصرع " یہ ان کا کرم ان کا کرم ہے " پر روضہ اقدس پر حاضری کے وقت موزوں ہوگئے۔

پھر پیش نظر گنبد خضرا ہے حرم ہے پھر نام خدا روضۂ جنت میں قدم ہے
پھر شکر خدا سامنے محراب نبی ہے پھر سر ہے مرا اور ترا نقش قدم ہے
رگ رگ میں محبت ہو رسول عربیؐ کی جنت کے خزائن کی یہی بیع سلم ہے

کتاب کے اخیر میں چند انتہائی مختصر اذکار مسنونہ جو بہت کم فرصت اور وقت چاہتے ہیں ذکر فرمائے ہیں، کہ اگر کوئی اس کی پابندی کرے تو انشاء اللہ یہی کافی ہیں۔

۱ - قرآن پاک کی تلاوت جس قدر ممکن ہو روزانہ صبح کا معمول بنالیں۔
۲ - ایک منزل مناجات مقبول جب فرصت ملے پڑھ لیں۔
۳ - تسبیح فاطمی۔ کہ عمل بہت مختصر ہے اور فوائد بے شمار۔
۴ - سو مرتبہ کلمہ سوم، سو مرتبہ استغفار، سو مرتبہ درود شریف۔

خصوصیات :۔ ۱ - ذکر اللہ کے فضائل اور حقیقت کا صحیح اندازہ ہوتا ہے۔
۲ - درود شریف کی اہمیت اور مقام واضح ہوتا ہے،
۳ - ذکر اللہ کرنے اور درود شریف پڑھنے کا ذوق و شوق اور اسکی طرف رغبت پیدا ہوتی ہے۔
۴ - تھوڑے سے وقت میں زیادہ سے زیادہ ثواب حاصل کرنے کا بہترین نسخہ ہے۔
۵ - ہر بات مدلل اور مبرہن ہے، اور حوالے کے ساتھ کہی گئی ہے۔
۶ - حسب ضرورت فقہی جزئیات و مسائل بیان کئے گئے ہیں۔

(۴) گناہ بے لذت

تعارف :- آج کل قربِ قیامت کی بنا پر کفر و الحاد، بے دینی اور بے عملی کا دور دورہ ہے اور دین پر عمل کرنا مطابق حدیث ایسا مشکل ہو گیا جیسے انگارے کو ہاتھ میں تھامنا، مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد کو تو اس بات کی فکر ہی نہیں رہی کہ جو کام وہ کر رہے ہیں حلال ہے یا حرام، ثواب ہے یا گناہ، اگر کوئی مسلمان انفرادی طور پر گناہوں سے جان بچانا بھی لے تو دنیا کی فضا اتنی تنگ ہو گئی ہے کہ اجتماعی گناہ زراعت، تجارت، ملازمت اور معاش کے تمام شعبوں پر چھائے ہوئے ہیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ سب کچھ ہماری عدم توجہ، بے پروائی، غفلت اور کم علمی کا نتیجہ ہے یہی وجہ ہے کہ بہت سے لوگ آجکل شریعت پر عمل کرنے کو سخت دشوار سمجھنے لگے ہیں، حالانکہ شریعت میں کوئی دشواری نہیں حدیث میں ہے "الدین یسر" دشواری اس لیے محسوس ہوتی ہے کہ جب کسی چیز پر عمل کرنے والے کم ہو جائیں اور اس کا رواج نہ رہے تو آسان چیز بھی مشکل ہو جاتی ہے۔

بہرحال گناہوں کے طوفان امڈ رہے ہیں اور انہی اعمال بد کے نتائج قحط و زلازل، وباء، قتل و غارتگری، اور ذلت کی صورت میں مسلمانوں پر مسلط ہیں، مگر ان میں بہت سے ایسے گناہ ہیں جن میں ہم محض غفلت اور جہالت سے مبتلا ہیں ان سے نہ کوئی دنیوی مفاد متعلق ہے اور نہ چھوڑنے میں کوئی ادنی تکلیف و مشقت ہے۔

مسلمانوں کی اس زبوں حالی اور ذلت کو دیکھ کر حضرت مفتی صاحبؒ کی اصلاحی طبیعت نے ان کو مجبور کیا کہ مسلمانوں کی اصلاح کے لیے ایک ایسا رسالہ تحریر کیا جائے جس میں ان گناہوں کی تفصیل قرآن و حدیث کی روشنی میں آجائے تاکہ مسلمانوں کو اس کے گناہ ہونے کا علم ہو جائے اور اس کے چھوڑنے کا ارادہ کر لیں، اسی مناسبت سے رسالہ کو "گناہ بے لذت" کے نام سے موسوم فرمایا۔ خود فرماتے ہیں کہ :-

"بے لذت گناہوں کی ایک فہرست مع ان کے وبال عظیم اور وعید شدید کے اس رسالہ میں لکھی جاتی ہے جن کے کرنے میں نہ کوئی دنیوی نفع اور لذت ہے اور نہ ترک کرنے میں کوئی مشقت تاکہ مسلمان کم از

کم ان گناہوں سے تو بچ جائیں سب گناہوں سے نجات نہ ہو تو کم از کم تقلیل تو ہو جائے اور یہ بھی بعید نہیں کہ ان گناہوں کے چھوڑنے کی برکت سے دوسرے گناہوں کے چھوڑنے کی بھی ہمت ہو جائے ۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ جو شخص ہمارے دین کی پیروی کی کچھ بھی کوشش کرتا ہے تو ہم اس کے لیے باقی دین کے راستے آسان کر دیتے ہیں۔

حضرت مفتی صاحبؒ نے زیر نظر رسالہ میں دو قسم کے گناہوں کی فہرست جمع کرنے کا اہتمام کیا ہے ایک تو وہ گناہ جن میں کسی بے حس بد مذاق کو بھی کوئی حظ اور لذّت نہیں، دوسرے وہ جس میں حقیقتاً کوئی لذت نہیں مگر بعض لوگ اپنی بداخلاقی اور بے حسی کے سبب ان میں کوئی حظ محسوس کرتے ہیں لیکن اگر ان کو چھوڑ دیں تو دنیا کی ادنیٰ ضرورت و خواہش میں کوئی فرق نہیں آتا۔

ہر گناہ کو ذکر کرنے کے بعد اس پر جو وبال عظیم اور شدید وعیدیں آئیں ہیں ان کو احادیث کی مستند کتابوں سے نقل کیا ہے، حسب ضرورت فقہی مسائل اور اہم نکات بیان فرمائے ہیں۔ عام مسلمانوں کو دعوتِ فکر دی ہے اور اس انداز سے سمجھایا ہے جیسے ایک مشفق باپ اپنی اولاد کو یا ایک مرشد کامل اپنے مرید کو انتہائی خلوص لگن اور محبت سے گمراہیوں سے نکال کر راہ ہدایت پر چلانے کی فکر کرتا ہے ۔

ذیل میں چند اہم عنوانات ذکر کئے جاتے ہیں تاکہ اندازہ ہو کہ کتنے ایسے گناہ ہیں جو ہم سے دن رات سرزد ہوتے ہیں اور ہمیں اپنی لاپروائی اور غفلت کی بنا پر ان کا احساس تک نہیں ہوتا۔ مثلاً۔ کسی مسلمان کے ساتھ استہزاء و تمسخر، کسی انسان یا جانور پر لعنت کرنا، چغل خوری اور نامی بُرے القاب سے کسی کا ذکر کرنا، عیب جوئی، نکتہ چینی اور تفضیح، چھپ کر کسی کی باتیں سننا، بلا اجازت کسی کے مکان میں جھانکنا یا داخل ہونا، نسب کی وجہ سے کسی کو طعنہ دینا، اپنے اصل نسب کو چھوڑ کر دوسرا نسب ظاہر کرنا، گالی گلوچ اور فحش کلامی، علماء اور اولیاء اللہ کی بے ادبی، لوگوں کے راستہ یا بیٹھنے لیٹنے کی جگہ غلاظت و نجاست ڈالنا، پیشاب کی چھینٹوں اور قطرات سے نہ بچنا، بے ضرورت ستر کھولنا، پائجامہ، تہبند وغیرہ ٹخنوں سے نیچے پہننا، کسی جانور کو آگ میں جلانا، جھوٹی گواہی دینا، غیر اللہ کی قسم کھانا، جھوٹ بولنا یا جھوٹی قسم کھانا، بیک وقت ایک سے زائد طلاق دینا، ناپ تول میں کمی کرنا"

جاندار کی تصویر بنانا یا اس کو استعمال کرنا، بلاضرورت کتا پالنا، سود اور رشوت لینا، مسجد میں دنیا کی باتیں کرنا، وغیرہ۔

آپ غور کیجئے آج کل کتنے مسلمان ہیں جو ان گناہوں اور آفات عظیمہ سے بچنے بچانے کی کوشش کرتے ہیں، آج کل یہ گناہ وباء کی طرح عام ہوگئے ہیں عوام و خواص سب اور خصوصاً عورتیں ان میں کثرت سے مبتلا ہیں، یہ وہ گناہ ہیں جن سے ہم بلاوجہ اپنی آخرت برباد کر رہے ہیں، نہ ان میں کوئی فائدہ ہے نہ ہماری کوئی حاجت ان پر موقوف ہے، صرف شیطان کی تلبیس اور غفلت ولاپرواہی ہے اللہ تعالیٰ ہم سب کو ان سے بچائیں۔ واللہ الموفق وھو یھدی السبیل۔

اس کتاب کے اخیر میں حضرت مفتی صاحبؒ نے علامہ زین العابدین ابن نجیم مصری حنفی صاحب تصانیف مشہورہ جن میں الاشباہ والنظائر بھی شامل ہے۔ ایک رسالہ (جو ان کے مجموعہ رسائل زینیہ میں چونتیسواں رسالہ ہے اور الاشباہ والنظائر مصری کے آخر میں لگا ہوا ہے) کو اردو زبان میں منتقل کرکے مستقل رسالہ کی صورت میں مذکورہ کتاب کا ضمیمہ بنا دیا ہے اور اس کا نام "انذار العشائر من الصغائر والکبائر" تجویز فرمایا ہے۔

اس رسالہ میں پہلے صغیرہ و کبیرہ گناہوں کی تعریف پر مختصر کلام ہے اور مختلف اقوال ذکر کرنے کے بعد اس سلسلہ میں جو قول راجح ہے اس کو ذکر کیا گیا ہے اس کے بعد سب کبیرہ گناہوں کی اور پھر صغیرہ گناہوں کی فہرست دی گئی ہے، تاکہ ایک نظر میں عام مسلمان اس کو دیکھ کر اپنے اعمال و افعال کا جائزہ لے سکیں یا کم از کم اس کو دیکھ کر علم تو درست ہوجائے کہ فلاں کام گناہ ہے جس کا ثمرہ یہ ہے کہ گناہوں پر ندامت اور افسوس ہو جو کہ توبہ کا اعلیٰ رکن ہے اور جب یہ رکن پالیا جائے گا تو انشاء اللہ کسی نہ کسی وقت توبہ اور اجتناب کی توفیق ہوجائے گی۔

ذیل میں صغائر اور کبائر کی فہرست میں سے (جو ۴۰۲ کبائر اور ۱۲۸ صغائر پر مشتمل ہے) چند ایسے گناہ بطور نمونہ ذکر کئے جاتے ہیں جن کو عام طور پر گناہ ہی نہیں سمجھا جاتا۔ اللہ تعالیٰ تمام مسلمانوں کو اس سے بچنے کی توفیق عطاء فرمائے۔ آمین۔

چند کبائر:- ۱۔ شہادت کو چھپانا جبکہ اس کے سوا کوئی اور شاہد نہ ہو، (۲) جھوٹی گواہی دینا۔

(۳) ماں باپ کی نافرمانی کرنا۔ (۴) ناپ تول میں کمی کرنا، کسی فرض نماز کو اپنے وقت سے مقدم یا موخر کرنا۔ (۵) حج فرض ادا کئے بغیر مرجانا۔ ۶۔ کسی جاندار کو آگ میں جلانا۔ ۷۔ اللہ کی رحمت سے مایوس ہونا۔ ۸۔ اللہ تعالیٰ کے عذاب سے بے خوف ہونا۔ ۹۔ کسی مسلمان یا غیر مسلم کی غیبت کرنا۔ ۱۰۔ مال میں اسراف (مصلحت اور ضرورت سے زائد خرچ کرنا) ۱۱۔ عورت کا گانا۔ ۱۲۔ لوگوں کے سامنے ستر کھولنا۔ ۱۳۔ تہبند یا پائجامہ کو ٹخنوں سے نیچے لٹکانا۔ ۱۴۔ چوسر کھیلنا یا طبلہ سارنگی وغیرہ بجانا۔ ۱۵۔ کسی گمراہی کی طرف لوگوں کو بلانا یا بری رسم نکالنا۔

چند صغائر: ۱۔ وہ جھوٹ جس میں کسی کو کوئی نقصان نہ ہو۔ ۲۔ مرد کو ریشمی لباس پہننا۔ ۳۔ کسی فاسق کے پاس بیٹھنا اٹھنا۔ ۴۔ عورت کا بغیر محرم کے سفر کرنا۔ ۵۔ جمعہ کی اذان کے بعد بیع و شرا کرنا۔ ۶۔ کھڑے ہو کر پیشاب کرنا۔ ۷۔ مسجد میں دنیا کی باتیں کرنا۔ ۸۔ سودے کے عیب کو اس کی بیع کے وقت چھپانا۔ ۹۔ زوجہ کو بلا ضرورت طلاق بائن دینا۔ ۱۰۔ بحالت حیض طلاق دینا۔ ۱۱۔ جنازہ کی نماز مسجد کے اندر پڑھنا۔ ۱۲۔ کافر کو بلا ضرورت ابتداءً سلام کرنا۔ ۱۳۔ اپناوں بہلانے کے لیے گانا۔ ۱۴۔ بے فائدہ کلام کرنا۔ ۱۵۔ ہنسی دل لگی میں افراط کرنا۔

یہ اور اس جیسے سینکڑوں گناہ ہیں جو ہم رات دن امر مباح کی طرح کرتے ہیں اور ہمارے وہم و گمان میں بھی نہیں آتا کہ یہ کوئی ناجائز کام ہے اللہ تعالیٰ ہماری حفاظت فرمائے۔ آمین۔

خصوصیات: ۱۔ نہایت ہمدردی اور شفقت سے لوگوں کو گناہوں کے ترک کی ترغیب دی گئی ہے۔

۲۔ ایسے گناہوں کو بطور خاص ذکر کیا گیا ہے جن کو آج کل غفلت یا جہالت کی بنا پر گناہ نہیں سمجھا جاتا۔

۳۔ اُردو زبان میں صغائر و کبائر کی سب سے طویل فہرست ہے۔

۴۔ جگہ جگہ ضرورت کے مطابق فقہی جزئیات ذکر کئے گئے ہیں۔

---

(۵) مصیبت کے بعد راحت
مع
دفع الافلاس

یہ فانی اور بے ثبات دنیا تغیرات اور تبدیلیوں کی آماجگاہ ہے کبھی ایک حالت پر برقرار نہیں رہتی، ایک ہی شخص کی زندگی میں جس قدر انقلابات اور تغیرات پیدا ہوتے ہیں وہ بھی بے حد و حساب ہیں، ہر شخص کی عمر میں ایک وقت ایسا آتا ہے کہ اس کی مسرت و انبساط کی کوئی انتہا نہیں ہوتی، اور اسی طرح کیسا ہی صاحب حشمت و جلال اور صاحب دولت و اموال کیوں نہ ہو اس پر بھی ایسا وقت ضرور آتا ہے کہ وہ ساری مسرتیں اور راحتیں فراموش کر بیٹھتا ہے اور ایسی پریشانی اور مصیبت میں گرفتار ہوتا ہے کہ اس کے دل سے یہ بات بھی نکل جاتی ہے کہ وہ اس کی مصیبت سے چھٹکارا بھی حاصل کر سکتا ہے۔

الغرض یہ آلام و مصائب اور آفات و حوادث اور انقلابات زمانہ صرف غریب اور مسکین لوگوں کے ساتھ خاص نہیں ہیں بلکہ اس میں ہر وہ شخص جو اس فانی دنیا میں آتا ہے گرفتار ہوتا ہے۔ انسان کو ان حوادث کے وقوع سے قبل اور بعد میں کیا کرنا چاہئے یہی وہ موضوع ہے جو اس کتاب کی تالیف کا سبب بنا۔

حضرت مفتی صاحبؒ نے مسلمانوں کی یہ خستہ اور ناگفتہ بہ حالت دیکھ کر کہ تمام مسلمان مصائب اور پریشانیوں میں مبتلا ہیں اور اس سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے علاج اور تدبیریں بھی اپنے خیال کے مطابق کرتے ہیں مگر ان امراض میں کمی ہونے کی بجائے اور اضافہ ہو رہا ہے مسلمانوں کو اس کتاب کے ذریعہ ایک ایسا مؤثر اور مجرب نسخہ دیا ہے جو ان مصائب و آلام کو دور کرنے کی پوری صلاحیت رکھتا ہے اور درحقیقت یہ نسخہ حکیم الحکماء رحیم امت حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم تجویز فرما گئے ہیں۔

یہ رسالہ درحقیقت امام حدیث شیخ ابوبکر عبداللہ بن ابی الدنیا متوفی ۲۸۲ھ کی ایک کتاب "الفرج بعد الشدۃ" کا اردو ترجمہ اور تشریح ہے۔

یہ رسالہ حضرت مفتی صاحبؒ نے ۱۳۵۸ھ میں تالیف فرمایا اور اس میں تقریباً بیاسی روایات حدیث

اور مستند واقعات وارشادات مذکور ہیں جن میں یہ بتایا گیا ہے کہ ان اعمال و اوراد و وظائف کے ذریعہ مسلمانوں نے بڑی سے بڑی پریشانی اور مصیبت سے چھٹکارا حاصل کر لیا۔
مثلاً سند صحیح کے ساتھ ایک حدیث نقل فرمائی ہے کہ۔
حضرت عبداللہ ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ مصائب سے نجات دلانے والے کلمات یہ ہیں۔
لا اِلٰہ الا اللّٰہ الحکیم الکریم لا الٰہ الا اللّٰہ العلی العظیم لا الٰہ الا اللّٰہ رب السمٰوٰت و رب العرش العظیم۔
ایک اور جگہ نقل فرمایا ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کوئی رنج و غم یا فکر و تکلیف پیش آتی تو آپ یہ کلمات پڑھا کرتے تھے۔ یاحی یاقیوم برحمتك استغیث۔
نقل کیا ہے کہ حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ لاحول ولاقوۃ الا باللہ ننانوے بیماریوں کا علاج ہے جن میں سب سے کم غم و فکر ہے۔
خلاصہ یہ ہے کہ عام حوادث و مصائب سے نجات کے لیے یہ رسالہ پڑھنے اور عمل کرنے سے تعلق رکھتا ہے۔
اس کتاب کا دوسرا حصہ ایک اور مستقل رسالہ پر مشتمل ہے جو " دفع الافلاس " کے نام سے موسوم ہے۔ اس رسالہ میں حضرت مفتی صاحبؒ نے افلاس و تنگ دستی اور فقر و فاقہ کے دفع کرنے کے لیے کچھ تدابیر اور ادعیہ و اعمال جمع فرمائے ہیں کہ اگر مسلمان ان پر عمل کریں تو کشائش رزق اور فراخی روزگار کے لیے انتہائی مجرب اور آزمودہ ہیں۔
یہ رسالہ بھی درحقیقت نویں صدی ہجری کے معروف امام حدیث و تفسیر شیخ السنۃ علامہ جلال الدین سیوطیؒ کے رسالہ " اصول الرفق فی الحصول " کا اردو ترجمہ اور تشریح ہے۔ حضرت مفتی صاحبؒ مقدمہ میں تحریر فرماتے ہیں کہ بجائے اس کے کہ خود روایاتِ حدیث اور آثار و اقوال جمع کرتا اس رسالہ کا سلیس اردو ترجمہ کر دینا مناسب سمجھا جو اس باب میں کافی شافی ہے۔
اس رسالہ میں دو فصلیں ہیں پہلی فصل میں کشائش رزق اور دفع افلاس سے متعلق روایات جمع کی گئی ہیں اور دوسری فصل میں وہ افعال و اعمال جو کشائش رزق کا سبب بنتے ہیں نقل کئے

گئے ہیں۔

چند روایات بطور نمونہ نقل کی جاتی ہیں۔

۱۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص ہر رات کو سورۃ واقعہ پڑھ لیا کرے وہ محتاجی اور فقر و فاقہ میں مبتلا نہ ہوگا۔

۲۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ ہی سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جو شخص اپنے گھر میں داخل ہونے کے وقت سورۂ اخلاص پڑھ لیا کرے تو یہ سورۃ اس کے گھر والوں کے اور اس کے پڑوسیوں کے فقر و فاقہ کو دور کردے گی۔

۳۔ ام المومنین حضرت ام سلمہؓ فرماتی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نماز صبح کے بعد یہ دعا پڑھا کرتے تھے۔ اللّٰھم انی اسألك رزقا طیبا و علما نافعا عملا متقبلا۔ وہ اعمال و افعال جو فقر و فاقہ کو رفع کرنے کا سبب بنتے ہیں جو دوسری فصل میں بیان کئے گئے ہیں ان میں صلہ رحمی، نماز کی پابندی، تقوی وغیرہ شامل ہیں۔

الغرض مقصد تالیف اس رسالہ کا جو حضرت مفتی صاحبؒ نے کئی جگہ بیان فرمایا ہے کہ مسلمان مرقومہ اذکار و وظائف و اوراد اور اعمال و افعال کو اختیار کرکے ہر قسم کے مصائب و آلام و حوادثات اور تنگ دستی و فقر و فاقہ سے نجات حاصل کرسکتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو ان اعمال و اذکار پہ دوامًا عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے اور حضرت مفتی صاحب کی ان مساعی جمیلہ کو شرف قبولیت عطا فرمائے اور اس کے نفع کو عام فرمائے۔ آمین۔

(۶) وحدت امت

تعارف:۔ اہل فکر و نظر سے یہ بات مخفی نہیں کہ اس وقت دنیا کے ہر خطہ اور ہر ملک میں مسلمان جن مصائب اور آفات میں مبتلا ہیں ان کا سب سے بڑا سبب آپس کا تفرقہ اور خانہ جنگی ہے ورنہ عددی اکثریت اور مادی اسباب میں ترقی کے اعتبار سے پوری تاریخ اسلام میں کسی وقت بھی مسلمانوں کو اتنی عظیم طاقت حاصل نہیں تھی جتنی آج ہے۔

لیکن افسوس ہے کہ ہمارے معاشرے میں کبھی سیاسی اقتدار اور عہدوں کے حصول کی کش مکش

باہمی تصادم کی صورت میں اتحاد کو پارہ پارہ کرتی ہے تو کبھی مذہبی اور دینی نظریات کی آڑ لے کر مختلف نظاموں کے روپ میں ایک دوسرے کی اہانت اور استہزاء کے ذریعہ اتحاد کی دھجیاں بکھیری جاتی ہیں۔ زیر نظر کتاب دراصل حضرت مفتی صاحبؒ کا ایک خطاب ہے جو آپ نے ذوالقعدہ ۱۳۸۵ھ میں جامعہ تعلیمات اسلامیہ لائلپور کے ایک جلسہ میں فرمایا جو بعض حضرات نے ٹیپ کر لیا تھا اور ریکارڈ کی بعینہٖ نقل اخبار المنیر لائلپور سے شائع ہوئی۔ بعد میں بعض احباب کے اصرار اور اس کے انتہائی مفید اور اہم ہونے کی بنا پر عوام کے فائدہ کے لیے اس پر نظر ثانی کر کے کتابی شکل میں شائع کیا گیا۔

اس کتاب میں حضرت مفتی صاحبؒ نے ٹھوس دلائل اور مستند واقعات سے یہ ثابت فرمایا ہے کہ اختلافِ رائے اور چیز ہے جو بسا اوقات محمود اور ضروری ہے اور افتراق و انتشار دوسری چیز ہے جو ہر حال میں قبیح اور واجب الترک ہے۔

کتاب کا پہلا عنوان "اسباب مرض اور علاج" ہے اور اس کے ضمن میں صحابہ کرام اور تابعین میں اختلاف رائے اور اس کا درجہ، سلف صالحین میں اختلاف ہو تو کیا کرنا چاہئے۔ اور اس بات کو واضح کیا گیا ہے کہ سنت و بدعت کی کشمکش میں صحیح طرز عمل کیا ہونا چاہیے، چنانچہ ایک جگہ اہل علم اور علماء کو دعوتِ فکر دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ۔

"کیا ہم پر واجب نہیں کہ ہم غور و فکر سے کام لیں اور سوچیں کہ اس وقت ہمارے آقا رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا مطالبہ اور توقع اہل علم سے کیا ہوگی۔

اور اگر روز حشر میں آپ نے سوال کر لیا کہ میرے دین اور شریعت پر طرح طرح کے حملے ہو رہے تھے، میری امت بد حالی میں مبتلا تھی، تم وراثت نبوت کے دعویدار کہاں تھے؟ تم نے اس وراثت کا کیا حق ادا کیا؟ تو کیا ہمارا یہ جواب کافی ہو جائے گا کہ ہم نے رفع یدین کے مسئلہ پر کتاب لکھی تھی، یا کچھ طلباء کو شرح جامی کی بحث حاصل و محصول خوب اچھی طرح سمجھائی تھی، یا حدیث میں آنے والے اجتہادی مسائل پر بڑی دلچسپ تقریریں کی تھیں یا صحافیانہ زورِ قلم اور فقرہ بازی کے ذریعہ دوسرے علماء اور فضلاء کو خوب ذلیل کیا تھا۔

پھر آگے چل کر پیغمبرانہ دعوت، انبیاء علیہم السلام کا اسوۂ حسنہ اور طریق نبوت پر مفصل بحث فرما کر ہمارے موجودہ طرز عمل سے موازنہ کیا ہے اور پھر انتہائی دردمندی اور شفقت کے ساتھ چند

گزارشات کی گئی ہیں اور اس ابتر حالت سے نکلنے کے لیے راہ عمل متعین فرمایا گیا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ اس کتاب میں عامۃ الناس کو عموماً اور اہل علم کو خصوصاً اس بات کی طرف دعوت دی گئی ہے کہ وہ اپنے اختلاف رائے کو برقرار رکھتے ہوئے افتراق و انتشار کی پالیسی سے اجتناب کریں اور اتحاد کی فضا قائم کریں۔ کتاب کا اختتام ایک آیت پر کیا ہے جو حضرت کے اصلاحی جذبہ کی پوری ترجمانی کر رہی ہے ان ارید الا الاصلاح ما استطعت وما توفیقی الا باللہ علیہ توکلت والیہ أنیب

اس کتاب کے ساتھ بھی ایک بہت ہی اہم رسالہ "اختلاف امت اور ان کا حل" بطور تکملہ شامل ہے یہ بھی ایک تقریر ہے جو شام ہمدرد میں ۳ اکتوبر ۱۹۶۳ء میں بمقام لاہور کی گئی بعد میں ترمیم و اضافہ کرکے کتابی شکل میں دی گئی۔ اختصار مضمون تفصیلی تعارف کے لیے مانع ہے چند اہم عنوانات نقل کیے جاتے ہیں تاکہ اجمالی نقشہ سامنے آجائے۔

اختلاف رائے کی حدود، صلح اور جنگ کس سے، اختلاف رائے اور جھگڑے فساد میں فرق، اختلافات کی خرابیوں کا وقتی علاج، صحیح اور غلط طرز عمل، عام سیاسی اور شخصی جھگڑوں کا علاج۔ مذکورہ عنوانات سے کتاب کی اہمیت کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

(۷) آداب النبی (صلی اللہ علیہ وسلم)

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق و شمائل اور حلیہ شریفہ و معجزات کو اس رسالہ میں اختصار کے ساتھ جمع فرمایا گیا ہے۔ ۱۳۴۶ھ میں حضرت مفتی صاحبؒ نے ایک مختصر رسالہ "سیرت خاتم الانبیاءؐ" لکھا تھا جس کا تفصیلی تعارف ماقبل میں گذر چکا ہے۔ اس کے کچھ ہی عرصہ بعد زیر نظر رسالہ کی اشاعت ایک ماہوار رسالہ میں شروع ہوئی لیکن بعض اسباب کی وجہ سے یہ رسالہ بند ہوگیا اور اشاعت کا سلسلہ بھی بند ہوگیا، بیس سال بعد حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے دل میں اس کی تکمیل کا تقاضہ پیدا ہوا اور چند ایام میں اس کی تکمیل فرما دی۔

اس رسالہ کی بنیاد دراصل حجۃ الاسلام حضرت امام غزالیؒ کا ایک رسالہ "آداب النبی" ہے حضرت مفتی صاحبؒ نے اس رسالہ کا سلیس ترجمہ اور ضروری تشریح فرمائی ہے اور ہر بات کا حوالہ کتب حدیث سے نقل فرمایا ہے۔ رسالہ بہت مختصر اور جامع ہے اس کو پڑھ کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عادات

خصائل، آپ کا حلیہ مبارک اور آپ کے معجزات کے متعلق صحیح معلومات حاصل ہوتی ہیں اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت میں اضافہ ہوتا ہے۔

(۸) آداب الشیخ والمرید

تعارف :- حضرت مفتی صاحبؒ کو تصوف اور طریقت میں جو مرتبہ اور کمال حاصل تھا وہ محتاج بیان نہیں، آپ نے خالص تصوف کے موضوع پر کئی کتابیں لکھی ہیں جن میں زیر تبصرہ رسالہ بھی شامل ہے۔

اس رسالہ میں حضرت موصوف نے طریقت وسلوک کے وہ آداب اور اصول صحیح جمع فرمائے ہیں جو شیخ اور مرید دونوں کے لیے مشعل راہ ہیں۔

یہ رسالہ دراصل قدوۃ الاکابر اسوۃ الاصاغر شیخ اکبر محی الدین ابن عربیؒ کی تصنیف ہے حضرت مفتی صاحبؒ نے اس کا سلیس اردو ترجمہ فرما کر اپنے مربی و مرشد حضرت تھانویؒ کی خدمت میں پیش کیا آپ نے اس کو بہت پسند فرمایا اور اپنے دست مبارک سے اس پر ضروری اضافات وحواشی تحریر فرمائے۔

مقدمہ میں حضرت مفتی صاحبؒ تحریر فرماتے ہیں کہ۔

"میں ذاتی طور پر الحمدللہ ہمیشہ ان اداب طریقت کو ضروری سمجھتا تھا لیکن مجموعی حیثیت سے اُن کی کوئی نقل سامنے نہیں آئی تھی اتفاقاً شیخ اکبر محی الدین ابن عربیؒ کا رسالہ مذکورہ نظر سے گذرا تو ایک امام فن سے اپنی اصول کو منقول دیکھ کر مسرت ہوئی تھانہ بھون حاضر ہوا تو حضرت اقدس قدس سرہٗ کی خدمت میں پیش کیا، حضرت بھی اس وجہ سے مسرور ہوئے کہ جو اصول طبعی طور پر مقرر فرماتے تھے وہ سب ایک امام فن کے قلم سے ظاہر ہو گئے تھے، حضرت تھانویؒ نے اس کا عربی نام القول المضبوط تجویز فرمایا۔

رسالہ کے چند اہم عنوانات حسب ذیل ہیں۔

طریقت ہی صراط مستقیم ہے، طریقت میں شیخ کی ضرورت، آداب شیخ، شیخ کے لیے انبیاء کے دین، اطباء کی تدبیر اور بادشاہوں کی سیاست کی ضرورت ہے۔ شیخ کے لیے تین مجلسیں ہونی چاہئیں وغیرہ۔

رسالہ کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ جہاں شیخ اکبر کی کسی عبارت پر کوئی شبہ ہو تو اس کا

بھی کافی وشافی جواب بین السطور میں دے دیا گیا ہے۔ اور جس عبارت سے کوئی واضح حقیقت سامنے آتی ہے، اس کی طرف بھی نشاندہی فرما دی گئی ہے۔ چنانچہ شیخ اکبر کی ایک عبارت ہے و اعلم ان مقام الدعوة الی الله وهو مقام النبوة والوراثة الکاملة والحاصل فیه یقال له النبی فی زمان النبوة ویقال له الشیخ والوارث والاستاذ فی حق العطار بالله من غیران یکون نبیا الا اس عبارت کی تشریح میں حضرت مفتی صاحبؒ تحریر فرماتے ہیں کہ:

"شیخ کی اس عبارت سے صاف معلوم ہو گیا کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی قسم کی نبوت باقی و جاری نہیں مانتے اس لیے فتوحات کی وہ عبارت جس سے شبہ پڑتا ہے یا ان کی عبارت نہیں جیسا کہ شعرانی نے یواقیت میں لکھا ہے یا ماؤل ہے۔ یہ رسالہ ۱۲ ذی الحجہ ۱۳۴۹ھ یوم الجمعہ تکمیل کو پہنچا۔ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو اس سے پورا پورا فائدہ اٹھانے کی توفیق عطا فرمائے

(۹) خلاصہ وتسہیل قصد السبیل

تصوف اور طریقت جو درحقیقت شریعت پر عمل کرنے کا دوسرا نام ہے اس میں بہت سے ناواقف لوگوں کو کچھ غلط فہمیاں پیدا ہو گئی ہیں، اور بہت سے لوگ بزرگوں کے غیر اختیاری احوال اور وجدی کیفیات کو تصوف سمجھ بیٹھے، اسی طرح بعض لوگ طریقت کو نہایت مشکل اور ناقابل عمل سمجھتے ہیں جب کہ بعض نادان باوجود غیر شرعی امور کے ارتکاب کے چند اچھے خواب اور حالات دیکھ کر نفس کی اصلاح اور اعمال کے اہتمام سے بے فکر ہو جاتے ہیں حضرت تھانویؒ نے تصوف کے صحیح خدوخال اور اس کی حقیقت اور اصل مقصود کو واضح کرنے کے لیے ایک رسالہ تحریر فرمایا تھا بنام "قصد السبیل" یہ رسالہ ۱۳۵۰ھ میں شائع ہوا۔

مگر اس رسالہ کی زبان علمی تھی اس لیے عام لوگوں کو اس سے استفادہ میں دشواری پیش آتی تھی، حضرت تھانویؒ کے ایک قدیم خلیفہ مولانا شاہ لطف رسول صاحب نے حضرتؒ کی اجازت سے اس رسالہ کی تسہیل آسان زبان میں لکھی جو تسہیل قصد السبیل کے نام سے شائع ہوئی اور اس کے ساتھ چند اہم مضامین بطور ضمیمہ شامل ہوئے، مگر آج کل لوگوں کی تساہل پسندی، کسل اور علمی استعداد کی کمی کو دیکھ کر حضرت مفتی صاحبؒ نے اس رسالہ کے مضامین کا خلاصہ اس طرح تحریر فرمایا کہ ضمائم کو

اصل کے ساتھ شامل فرمادیا اور جہاں اجمال تھا اس کی مختصر مگر واضح تشریح بھی فرمادی اس رسالہ کی اہمیت کا اندازہ حضرت مفتی صاحبؒ کے ان چند جملوں سے لگایا جاسکتا ہے جو آپ نے مقدمہ میں تحریر فرمائے ہیں کہ

یہ مختصر رسالہ چونکہ احقر کی نظر میں تصوف اور طریقت کی حقیقت کو واضح کرنے اور اس کے مقصود و غیر مقصود میں امتیاز کرنے اور اس طریق کو آسان کرنے میں دریا بکوزہ کا مصداق ہے جس میں اس طریق کے مبتدی سے لے کر منتہی تک سب کے لیے اہم ہدایات ہیں، اس لیے احقر نے ضرورت محسوس کی کہ مبتدی لوگوں کے لیے اس رسالہ کے مضامین کا خلاصہ لکھ دیا جائے۔

رسالہ کے چند اہم عنوانات ذکر کیے جاتے ہیں تاکہ مضامین کا اجمالی نقشہ سامنے آجائے۔

پہلی ہدایت شریعت وطریقت کے بیان میں، دوسری ہدایت توبہ کے بیان میں جس میں توبہ کی حقیقت اس کا طریقہ حقوق کی اقسام اور ان کی ادائیگی کا طریقہ واضح کیا گیا ہے۔ چوتھی ہدایت مرشد کی ضرورت اور اس کی پہچان جس میں پیر کامل کے لیے دس علامتیں ذکر کی گئی ہیں، پانچویں ہدایت پیری مریدی کا مقصد جس میں بیعت اور پیری مریدی کی حقیقت واضح کی گئی ہے۔ چھٹی ہدایت مرید کے لیے دستور العمل جس میں مختلف درجات اور مراتب رکھنے والے مریدین کے لیے الگ الگ دستور العمل ذکر کیا گیا ہے، ساتویں ہدایت دلجمعی کے بیان میں ہے آٹھویں ہدایت اختیاری اور غیر اختیاری اعمال کے متعلق ہے، نویں ہدایت میں رسوم مشائخ کا تذکرہ ہے، آخر میں ذکر و شغل کرنے والوں اور عورتوں کو بطور خاص کچھ نصیحتیں کی گئی ہیں۔

اس رسالہ کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ انتہائی مختصر ہونے کے باوجود تصوف کے صحیح خدوخال اور اس کی حقیقت پوری طرح واضح کر دیتا ہے یہی وجہ ہے کہ اکثر مشائخ سب سے پہلے مریدین کو اس رسالہ کے مطالعہ کا حکم دیتے ہیں، اور بہت سے مشائخ تو بیعت سے پہلے مبتدی کو کئی مرتبہ اس کو پڑھواتے ہیں، تب جاکر بیعت فرماتے ہیں۔ یہ رسالہ طریقت کی حقیقت سمجھنے کے لیے سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔

---

(۱) مقالات صوفیہ

بزرگانِ سلف کے مقالات وملفوظات اور معمولات بلاشبہ علم وعمل کی روح ہیں اور دنیا و آخرت کی رہبری اور رہنمائی کا ذریعہ ہیں، ان کا مطالعہ ایمان میں قوت اور یقین میں پختگی پیدا کرتا ہے۔

زیرِ نظر رسالہ تصوف و تاریخ کی مستند کتب رسالہ قشیریہ اور طبقاتِ امام شعرانیؒ کا بہترین انتخاب ہے جس میں بزرگانِ سلف کے چیدہ چیدہ حالات ومقالاتِ حکمت درج کئے گئے ہیں جس کے مطالعہ سے حقیقی اور جاہلانہ تصوف کا فرق واضح ہوتا ہے۔

یہ رسالہ بھی درحقیقت حضرت تھانویؒ کی ایک سعی مبارک کا تکملہ ہے حضرت تھانویؒ نے یہ مقالات وملفوظات عربی زبان میں جمع فرماکر حضرت مفتی صاحبؒ کے سپرد فرمایئے کہ اس کا اُردو ترجمہ کرکے شائع کرادو۔ حضرت مفتی صاحبؒ نے ترجمہ میں افادۂ عوام کی غرض سے تحت اللفظ ترجمہ کے بجائے لازمی ترجمہ یا خلاصۂ مطلب پر اکتفا کیا ہے اور حسبِ ضرورت مشکل مقامات کی شرح بھی فرمادی گویا یہ رسالہ حضرت تھانویؒ کے عربی رسالہ کی بہترین اُردو شرح ہے۔ اس رسالہ میں مشائخ و مشاہیر صوفیا کے جو ملفوظات جمع کئے گئے وہ دین و دنیا کی فلاح کا ذریعہ ہیں، ان میں سے چند اہم ملفوظات بطورِ نمونہ نقل کئے جاتے ہیں۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اے آدمی تو صرف بدن سے دنیا کے ساتھ رہ اور دل سے اس سے علیحدہ رہ۔

حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں کہ مرض ایک ایسی چیز ہے کہ اس میں ریا و شہرت کا دخل نہیں ہوسکتا، بلکہ وہ تو ثواب محض ہے۔

حضرت امام ابوحنیفہؒ سے سوال کیا گیا کہ حضرت علقمہؒ اور حضرت اسودؒ میں سے کون افضل ہے فرمایا کہ بخدا ہم تو ان لوگوں کے نام لینے کے بھی قابل نہیں ان میں تفضل تو ہم کیا کرسکتے ہیں۔

حضرت جنیدؒ فرماتے ہیں کہ زہد کی حقیقت یہ ہے کہ جس چیز سے آدمی کا ہاتھ خالی ہو اس سے اس کا دل بھی خالی ہو۔

حضرت شیخ شاذمیؒ فرماتے ہیں کہ درویش اگر پانچ وقت کی نماز باجماعت میں مداومت

نہ کرے تو اس کا کچھ اعتبار نہ کرو۔

اس رسالہ کی تکمیل حضرت مفتی صاحبؒ نے ۱۶؍شعبان ۱۳۵۹ھ کو فرمائی جب کہ آپ کی عمر کا پنتالیسواں سال قریب الختم تھا اور یہ آپ کی تالیفات کا بھی پنتالیسواں عدد ہے۔ اس مناسبت سے حضرت نے اپنے ان اشعار پر اس رسالہ کو ختم کیا ہے۔

اے کہ پنج و چہل بنادانی　　داد در غفلت و ہوس رانی

شکر نعمت بمعصیت داری　　عذر تقصیر ہیچ نہ نہاری

پنج باقی مگر نگہ داری　　توبہ از کردہ ہاکہ کردہ داری

(۱۱) ملفوظات امام مالکؒ

امام دارالہجرت حضرت مالک بن انس قدس سرہٗ کی شخصیت محتاج تعارف نہیں کسی عالم و جاہل کی گردن آپ کے احسانات سے آزاد نہیں، حضرت مفتی صاحبؒ کو امام مالکؒ سے عشق کی حد تک محبت اور تعلق تھا اور یقیناً آپ ہی حضرت امام مالکؒ کے مقام بلند کو کماحقہ پہچان سکتے تھے۔

مفتی صاحبؒ کی شاید ہی کوئی مجلس امام مالکؒ کے مناقب و ملفوظات سے خالی ہوئی ہو، مؤطا امام مالک کے درس میں حضرتؒ کا عجیب رنگ ہوتا، احقر راقم الحروف کو بھی یہ کتاب حضرت مفتی صاحبؒ سے درساً پڑھنے کا شرف حاصل ہے اسی درس کی برکت سے احقر کو بھی امام مالکؒ سے ایک قلبی لگاؤ اور تعلق پیدا ہو گیا۔ فللّٰہ الحمد والشکر۔

اس مختصر رسالہ میں امام مالکؒ کے زریں ملفوظات جمع کئے گئے ہیں۔ حضرت مفتی صاحبؒ تحریر فرماتے ہیں کہ مسلمانوں کے لیے بڑی ناشکری اور ناقدر شناسی ہے کہ اُن کے حالات و ملفوظات، سے ناواقف رہیں۔ آپ کے یہ ملفوظات طیبہ عام مسلمانوں کی حیات دین و دنیا و آخرت کے لیے مشعل راہ علماء کے لیے عالم متبحر صوفیا کے لیے مرشد کامل زعماء امت کے لیے فوز و فلاح کا دستور اساسی ہے۔

امام مالکؒ کے چند ارشادات جو آب زر سے لکھنے کے قابل ہیں۔

ارشاد فرمایا کہ کوئی شخص علم دین میں اپنے مقصد پر اس وقت تک نہیں پہنچ سکتا جب تک کہ اس کو فقر و فاقہ نہ پیش آئے، اور پھر بھی وہ علم کو دنیا پر ترجیح دے۔

ارشاد فرمایا کہ میں نے اس وقت تک فتویٰ دینا شروع نہیں کیا جب تک کہ مستند مشائخ اور علماء نے میرے لیے اس کی شہادت نہیں دی کہ میں اس کا اہل ہوں۔

ارشاد فرمایا کہ چار آدمیوں سے علم حاصل نہ کرنا چاہیئے، ان کے ماسوا جن سے چاہیں کریں۔ ایک متبدع جو اپنی بدعت کی تبلیغ اور لوگوں کو اسکی طرف دعوت دیتا ہو۔ دوسرے بے وقوف کم فہم جس کی کم فہمی مشہور ہو۔ تیسرے وہ شخص جو باہمی معاملات میں جھوٹ بولتا ہو اگرچہ حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں جھوٹ نہ بولتا ہو۔ چوتھے وہ شخص جو فن حدیث سے باضابطہ و با اصول واقف نہ ہو۔

ارشاد فرمایا کہ میرے نزدیک بہتر یہ ہے کہ صاحب نعمت کے بدن پر نعمت کے آثار ظاہر ہوں اور خصوصاً اہل علم کے لیے تو یہی مناسب ہے کہ اپنی ہیئت اور لباس کو اچھا بنالیں کہ اس میں علم کی عظمت ہے۔

اس رسالہ کے آخر میں حضرت مفتی صاحبؒ نے امام المسلمین احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کے بعض ملفوظات نقل فرمائے ہیں، آپ ان چار اماموں میں سے ایک ہیں جن کی تقلید پر اللہ تعالیٰ نے تقریباً تمام امت محمدیہ (علی صاحبہا افضل الصلوٰۃ والتسلیم) کو جمع فرمادیا ہے آپ کی سوانح عمری اور مناقب و فضائل پر بہت ائمہ امت نے کتابیں لکھی ہیں، مثلاً ابن حجر، بیہقی، شیخ الاسلام زکریا انصاری، ابن جوزی، ابن ناصر وغیرہم۔

آپ کے چند اہم ملفوظات بھی حصول برکت کی نیت سے نقل کئے جاتے ہیں فرمایا کرتے تھے کہ جس کی عقل بڑھائی جاتی ہے اس کا رزق کم کر دیا جاتا ہے۔

فرمایا کہ اگر علم تمہیں نفع نہ پہنچائے تو وہ تمہیں ضرر پہنچائے گا۔

فرمایا کہ قرن اول میں جو لوگ اشرار سمجھے جاتے تھے وہ اس زمانہ کے صلحاء و اتقیاء سے بہتر ہیں۔

اس رسالہ کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس کے مطالعہ سے علم کا مرتبہ و مقام اس کی اہمیت و حقیقت، اس کے حصول کے طریقے، اس پر عمل پیرا ہونے کے ثمرات اور عمل نہ کرنے کی مضرتیں اور نقصانات واضح ہوتے ہیں۔

---

(۱۴) درسِ عبرت

تاریخ عالم عبرتوں کا آئینہ ہے، دنیا کا عروج و زوال، قوموں کی ترقی و تنزلی امتوں کے واقعات ایک صاحبِ نظر کے لیے اپنے اندر ہزاروں عبرتیں لیے ہوئے ہے۔

زیرِ نظر رسالہ اندلس کے ایک مشہور بزرگ کا ایک نصرانی لڑکی کے عشق میں مبتلا ہونے اور پھر راہِ راست پر آنے کا نہایت عبرت انگیز اور سبق آموز واقعہ ہے جس کا ماخذ علامہ دمیری کی کتاب "حیات الحیوان" ہے، حضرت مفتی صاحبؒ نے اس کا اردو میں انتہائی دلچسپ ترجمہ فرمایا ہے تاکہ عام مسلمان اس کو پڑھ کر عبرت حاصل کر سکیں۔

دوسری صدی ہجری کے آخیر کے ایک بزرگ ابوعبداللہ اندلسی مشہور ہیں جو اکثر اہلِ عراق کے پیرو مرشد اور استاد و محدث ہیں آپ کے مریدوں کی تعداد بارہ ہزار تک پہنچ چکی ہے جس میں حضرت جنید بغدادیؒ اور حضرت شبلیؒ جیسے اولیاء اللہ بھی شامل ہیں۔ ایک سفر میں آپ کی نظر ایک نصاری سردار کی لڑکی پر پڑ جاتی ہے۔ آپ اس لڑکی کے عشق میں اس حد تک گرفتار ہوتے ہیں کہ آپ کے اعضاء و جوارح پر اس کا تسلط ہو جاتا ہے اور اس کی سرزمین کو چھوڑنے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔ اور لڑکی سے اس شرط پر شادی ہوتی ہے کہ جنگل میں خنزیر چرائیں گے۔ ایک سال بعد ان کے ساتھی انہیں اس حالت میں دیکھتے ہیں کہ شیخ کے سر پر نصرانی ٹوپی ہے کمر میں زنار بندھی ہوئی ہے اور اس عصا پر ٹیک لگائے ہوئے خنزیروں کے سامنے کھڑے ہیں جیسے واعظ و خطبہ کے وقت سہارا لگایا کرتے تھے۔

بہر حال پھر اللہ تعالیٰ نے ان کو توبہ کی توفیق عطا فرمائی اور دوبارہ پہلی حالت لوٹ آئی، بعد میں شیخ کے مریدین نے شیخ سے اس ابتلاء کا سبب پوچھا، شیخ کا جواب اس واقعہ کی روح ہے وہ بعینہٖ نقل کیا جاتا ہے۔

شیخ! جب ہم گاؤں میں اترے اور بت خانوں اور گرجا گھروں پر ہمارا گذر ہوا آتش پرستوں اور صلیب پرستوں کو غیر اللہ کی عبادت میں مشغول دیکھ کر میرے دل میں تکبر اور بڑھائی پیدا ہوگئی کہ ہم مومن موحد اور یہ کمبخت کیسے جاہل احمق ہیں کہ بے حس اور بے شعور چیزوں کی پرستش

کرتے ہیں۔ مجھے اسی وقت ایک غیبی آواز دی گئی کہ یہ ایمان و توحید کچھ تمہارا ذاتی کمال نہیں بلکہ سب ہماری توفیق سے ہے اور اگر تم چاہو تو ہم تمہیں ابھی بتلا دیں، اور مجھے اسی وقت احساس ہوا کہ گویا کوئی جانور میرے قلب سے نکل کر اڑ گیا ہے، جو درحقیقت ایمان تھا۔

اس رسالہ کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس کو پڑھ کر غرور و تکبر کی شناعت و قباحت واضح ہوتی ہے اور قاری اس مہلک مرض سے محفوظ رہنے کی کوشش کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس واقعہ سے عبرت حاصل کرنے اور اس مرض سے بچنے کی توفیق کاملہ نصیب فرمائے۔ آمین۔

(۱۳) ذوالنّون مصری

اسلام کا یہ طرۂ امتیاز ہے کہ اس کی حقانیت کے روشن دلائل قدم قدم پر نظر آتے ہیں، علماء سلف کا ہر فرد حقانیتِ اسلام کی زندہ جاوید دلیل ہے، جن کو دیکھ کر خدا یاد آتا ہے اور اعمال و اخلاق معاشرت و معاملات کے لیے نمونۂ عمل سامنے آتا ہے، علماء سلف کی تاریخ کا ایک ایک ورق امت کے لیے راہنمائی کا خزینہ ہے۔

زیرِ نظر رسالہ بھی تاریخ کے انہی اوراق کا حصہ ہے، حضرت ثوبان ذوالنون مصریؒ دوسری اور تیسری صدی کے معروف و مشہور، عابد و زاہد ولی اللہ ہیں آپ کے حالات سے عربی تواریخ تو بھری پڑی ہیں مگر اردو میں کچھ نہ لکھا گیا تھا۔ حضرت مفتی صاحبؒ نے اس رسالہ میں آپکے سبق آموز حالات، حکیمانہ ملفوظات اور والہانہ اشعار کو عام فہم اردو زبان میں جمع فرمایا ہے تاکہ عام مسلمان اس کو پڑھ کر طاعت و عبادت کے شوق اور نورِ ایمانی میں اضافہ کر سکیں، اس رسالہ کا مدار حافظ حدیث ابن عساکرؒ کی مشہور تاریخ ہے۔

شروع میں حضرت ذوالنون مصریؒ کے مختصر حالاتِ زندگی انتہائی دلکش انداز میں بیان کئے گئے ہیں، اس کے بعد آپکے چند ملفوظاتِ طیبہ ذکر کئے گئے ہیں، یوں تو آپکے سارے ملفوظات لوحِ قلب پر لکھنے کے قابل ہیں یہاں پر صرف تین ملفوظات بطور تبرک نقل کئے جاتے ہیں۔

فرمایا کہ عقلمند کی تین علامتیں ہیں، دین کے معاملہ میں جدال اور نزاع کو ترک کرنا، تھوڑے سے علم کے ساتھ عمل پر متوجہ ہونا، لوگوں کے عیوب کو نظر انداز کر کے اپنے عیوب کی اصلاح میں

مشغول ہونا۔
فرمایا کہ ہم نشین کا حق تو یہ ہے کہ تم اس کو خوش کرو، اگر خوش نہ کر سکو تو کم از کم رنجیدہ تو مت کرو۔
فرمایا کہ حق تعالیٰ نے اپنے کسی بندے کو عقل سے بہتر کوئی خلعت عطا نہیں فرمائی۔ اور ان سب چیزوں کا کمال تقویٰ پر موقوف ہے۔ اخیر میں حضرت ذوالنون مصریؒ کے چند والہانہ اشعار سلیس اُردو ترجمہ کے ساتھ نقل فرمائے ہیں۔
اللہ تعالیٰ ہمیں بزرگوں کے حالات طیبہ سے حظ وافر عطا فرمائے اور ان کے زمرہ میں داخل فرمائے۔ آمین۔

(۳) دو شہید

زندگی کی راہیں بہت پُر پیچ ہیں، یہاں قدم قدم پر نئے نئے راستے اور شاخیں پھوٹ رہی ہیں، چنانچہ تاریخ ہمیں ایسے اشخاص و افراد کا پتہ بھی دیتی ہے جو ساز و سامان کے غرور میں بے سوچے سمجھے جس راستے پر جا چل کھڑے ہوئے اور ایسی خوفناک دلدل میں جا پھنسے کہ وہاں سے نکلنا نصیب نہیں ہوا۔ اور تاریخ کے انہی اوراق پر ایسے بہت سے بے سر و سامان فقرا بھی نظر آتے ہیں جنہیں رستہ کی پُر پیچ شاخیں اور بھول بھلیاں فریب نہ دے سکیں اور وہ تمام خار زاروں اور دلدلوں سے دامن بچا کر سیدھے منزل پر جا پہنچے، چنانچہ تاریخ بے شمار افراد و اقوام کے حالات ہمارے سامنے رکھ دیتی ہے جنہیں دیکھ کر زندگی کے نئے مسافروں کے لیے یہ فیصلہ کرنا آسان ہو جاتا ہے کہ کون سا راستہ اختیار کریں۔ ہماری آنکھیں ایسے افراد کو دیکھ تو نہیں سکتیں البتہ ان کے احوال و واقعات کو سُننا سُنانا بسا اوقات وہی کام دے جاتا ہے جو ان کی زیارت سے حاصل ہوتا ہے۔
اسی مقصد کو پیش نظر رکھ کر حضرت مفتی صاحبؒ نے زیر نظر رسالہ تحریر فرمایا جس میں تابعین میں سے دو جلیل القدر بزرگوں کی سبق آموز زندگی اور دین پر ثابت قدمی اور راہ خدا میں قربان ہو جانے کا مختصر حال بیان کیا گیا ہے۔
پہلے حضرت سعید ابن جبیرؒ کا تذکرہ ہے جو ۴۶ھ میں پیدا ہوئے اور بڑے بڑے صحابہ کرام سے علم حاصل کر کے علم و عمل کی اس منزل پر پہنچ گئے کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ جیسے جلیل القدر صحابی

سے جب کوئی مسئلہ پوچھتا تو فرماتے کہ سعید ابن جبیرؓ کے پاس جاؤ وہ مجھ سے زیادہ عالم ہیں۔ زہد و عبادت کا یہ عالم تھا کہ رات کو اتنے روتے کہ آپ کی آنکھیں چندھیا گئی تھیں۔ دین پر استقامت کا یہ حال تھا کہ حجاج ابن یوسف جیسے ظالم و جابر شخص کے سامنے بھی کلمۂ حق کہنے سے باز نہیں رہے جس کے ظلم کا خلاصہ حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ نے ان کلمات میں بیان فرمایا ہے کہ اگر ساری امتیں اپنے مظالم جمع کر لائیں اور ہم سب کے جواب میں صرف حجاج کو پیش کریں تو ہمارا پلّہ بھاری رہے گا۔

آخر کار حجاج ہی کے ہاتھوں ظلماً شہید ہوئے۔ ان کا اور حجاج کا مکالمہ جو حضرت مفتی صاحبؒ نے اس رسالہ میں نقل فرمایا ہے پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔

دوسرے بزرگ جن کا تذکرہ اس رسالہ میں کیا گیا ہے حضرت سعید ابن مسیبؒ ہیں، آپ کی ولادت کا سن دورِ فاروقی کا دوسرا سال ہے۔ آپ کی جلالتِ شان کے لیے حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ جیسے صحابی کا یہ فرمان کافی ہے کہ میں نے سعید ابن مسیب سے زیادہ عالم دنیا میں نہیں دیکھا، زہد و عبادت کا عالم یہ ہے کہ خود فرماتے ہیں کہ بحمدللہ پچاس سال سے میری تکبیرِ اولیٰ قضا نہیں ہوئی، آپ نے پچاس سال کامل عشاء کی وضو سے صبح کی نماز پڑھی، آپ کی استقامت اور حق گوئی کی بنا پر خلیفہ عبدالملک نے آپ کو قتل کرانے کے سارے جتن کر ڈالے مگر اللہ تعالیٰ نے اس کی اس سازش کو ہمیشہ ناکام کیا۔

اس رسالہ کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس کو پڑھ کر قلب میں سکون و اطمینان اور طاعت و عبادت کا شوق پیدا ہوتا ہے، دنیا کی حقیقت سامنے آجاتی ہے اور اس کا رنج و راحت اور مصیبت و عیش نظروں میں ہیچ ہو جاتا ہے۔ اور ظالم و جابر حکمرانوں کے سامنے کلمۃ اللہ کو بلند کرنے کی ہمت پیدا ہو جاتی ہے۔

(۱۵) میرے والد ماجدؒ

اور اُن کے مجرّب عملیات

حضرت مفتی صاحبؒ کے والد ماجد حضرت مولانا محمد یٰسین صاحبؒ علماء دیوبند کے اکابر اور سلفِ صالحین کا آخری نمونہ تھے، آپ علماء دیوبند کے ان اکابر کے علوم و معارف اور احوال و ملفوظات کے امین تھے جن کے فیوض و برکات سے دارالعلوم کی روح ترقی کر رہی تھی۔

اس رسالہ میں حضرت مفتی صاحبؒ نے اپنے والد محترم کی مختصر سوانح تحریر فرمانے کے بعد آپ سے سُنے ہوئے بزرگانِ دیوبند کے حالات ملفوظات تعلیمات و ہدایات مع عملیاتِ مجربہ جمع فرمائی ہیں۔

رسالہ کی ابتداء میں حضرت مولانا محمد لیٰسین صاحبؒ کے مختصر حالات زندگی آپ کی تعلیم دارالعلوم دیوبند میں بحیثیت مدرّس تقرری اور بزرگانِ دیوبند کے ساتھ خصوصی تعلقات کے احوال بیان کئے گئے ہیں۔

آپ کو حضرت گنگوہیؒ سے خاص عقیدت ومحبت اور نہایت قریبی تعلق تھا گویا عشق کا درجہ حاصل تھا، آپ کی حضرت گنگوہیؒ سے ایک طویل عرصہ تک خط وکتابت رہی، حضرت مفتی صاحبؒ نے ان خطوط میں سے ایک معتدبہ حصہ عوام وخواص کے فائدے کے لیے نقل فرمایا ہے۔ یہ خطوط تزکیہ نفس صفاء قلب شریعت کی پابندی، سنت کے اتباع، اللہ کے خوف، مخلوق کی خیرخواہی، کفایت شعاری اور تمام اخلاق حسنہ کی تعلیم کا بہترین خزانہ ہیں جو پڑھنے سے ہی تعلق رکھتے ہیں۔

آگے چل کر والد ماجدؒ کے اساتذہ اور ان کے ملفوظات ذکر کئے گئے ہیں جن میں شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن صاحبؒ، ملّا محمود صاحبؒ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ اور حضرت مولانا رفیع الدین صاحب مہتممؒ شامل ہیں۔

کتاب کے آخر میں اکابر دیوبند کے چند انتہائی سہل اور مجرب عملیات اپنے والد ماجد کے قلمی بیاض سے نقل فرمائے ہیں مثلاً برائے کشائش رزق، برائے دفع آسیب از مکان، زہر خوردہ کا علاج، برائے درد نیم سر، برائے انعقاد حمل، اس کے علاوہ اور بہت سی چیزوں کے لیے مجرب عملیات ذکر کئے گئے ہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ اس کتاب کو طب روحانی وجسمانی کا خلاصہ کہا جائے، تو بیجا نہ ہوگا۔

(۱۶) شہادت کائنات

حق تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت ورسالت اور اس کی حقانیت کی شہادتیں فقط عقلاء اور افراد انسانی پر منحصر نہیں کیں بلکہ بہت سی ایسی چیزوں سے اس کی شہادتیں عالم انسان پر واضح فرمادیں جن کو انسان غیر ذی شعور اور غیر عاقل کہتا ہے۔ اور محض عقلی دلائل وبراہین پر اکتفا کرنے کے بجائے حقانیتِ رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کو بدیہیات سے

سے بھی واضح فرمادیا تاکہ شیرہ چشم مخالفین یہ نہ کہہ دیں کہ یہ رائے کی غلطی ہے۔

زیر نظر رسالہ میں حضرت مفتی صاحبؒ نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت وحقانیت کی وہ شہادتیں جمع فرمائی ہیں جو غیر شعوری چیزوں کے ذریعہ خرق عادات کے طور پر اللہ تعالیٰ نے مختلف زمانوں اور مختلف جگہوں پر ظاہر فرمائی ہیں اس میں ایسے ایسے عجیب واقعات ہیں کہ ایک وقت کو تو ضعیف العقیدہ مسلمان اور مادیت و تہذیب مغرب سے متاثر انسان کی عقل ان کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتی مگر حضرت مفتی صاحبؒ نے کتاب کے شروع میں تنبیہ فرمادی ہے کہ:۔

یہ واقعات تاریخ وسیر کی معتبر کتابوں سے منقول ہیں اخباری افسانے نہیں۔ ایسے ثقہ لوگوں کی روایات ہیں کہ اس کا اعتبار نہ کیا جاوے تو گذشتہ زمانہ کی تاریخ اور واقعات ماضیہ کے صحیح ماننے کا پھر کوئی ذریعہ باقی نہیں رہتا۔

ذیل میں کتاب کے تین واقعات تمہیداً ذکر کیے جاتے ہیں۔

قبیلہ خثعم کا ایک بت:۔ حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ قبیلہ خثعم کے لوگ اپنے بت کے پاس پرستش میں مشغول تھے کہ اس کے اندر سے آواز سنی جس میں چند اشعار میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور اسلام کی طرف متوجہ کیا گیا تھا (اشعار بوجہ اختصار اس جگہ نقل نہیں کیے) یہ لوگ حیرت میں ہیں کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کون ہیں۔ دو تین روز کے بعد ہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات اور دعوت کی کیفیت آنے والوں سے پہنچی، یہ لوگ ابتداءً اس واقعہ کو محض وہم وگمان خیال کرتے تھے مگر پیہم یہی آوازیں اپنے بتوں سے سنتے رہے بالآخر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر سارا قبیلہ یک وقت داخل اسلام ہو گیا۔

اسی طرح حضور اقدس کے وقت بنی عذرہ کے بت خمار نے اپنے خاص پجاری طارق نامی کو خطاب کر کے بولنا شروع کیا کہ

اے قبیلہ بنی قہد بن حرام! حق ظاہر ہو گیا اور خمار ہلاک ہو گیا اور اسلام نے شرک کو مٹا دیا۔ اس حیرت انگیز آواز کو ابتداً ان لوگوں نے بھی محض وہم خیال کیا مگر پھر ایک روز اس میں آواز پیدا ہوئی اور کہا۔

اے طارق اے طارق! سچے نبی وحی ناطق کے ساتھ پیدا ہو گئے ہیں اور مکہ مکرمہ کی زمین میں مبعوث

عام وری ہے، اب اُمتی کے مددگاروں کے لیے سلامتی ہے اور ان سے علیحدہ رہنے والوں کی بربادی ہے، بس اب قیامت تک کے لیے میں تم سے رخصت ہوتا ہوں، یہ کلام کہتے ہی سر کے بل گر پڑا۔

حضرت ابوبکر صدیقؓ سے سوال کیا گیا کہ کیا اسلام لانے سے پہلے آپ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت و رسالت کا کوئی مشاہدہ کیا، فرمایا کہ ہاں میں ایک روز ایک درخت کے سائے میں بیٹھا تھا کہ اچانک اس کی ایک شاخ نیچے جھکی اور میرے سر سے مل گئی میں نے تعجب سے اُس کو دیکھا تو اس میں سے ایک آواز آئی۔

هذا النبي يخرج في وقت كذا وكذا انك انت من اسعد الناس به۔

اس کتاب کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس کتاب کے مطالعہ سے سائنٹفک دور کے نوجوان اور عام ضعیف العقیدہ مسلمانوں کے عقائد میں پختگی اور ایمان میں قوت پیدا ہوتی ہے، اور اسلام کی عظمت ان کے دلوں میں جاگزیں ہوتی ہے۔

(۱۷) مجالس حکیم الامت

حکیم الامت حضرت تھانویؒ کو اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کی دینی تربیت و اصلاح و اخلاق کے لیے چن لیا تھا، آپ کی مجالس علم و معرفت سے بھرپور اور ظاہر و باطن کی اصلاح کے لیے نسخۂ اکسیر کی حیثیت رکھتی تھیں۔

زیر نظر کتاب میں مفتی صاحبؒ نے حضرت تھانوی قدس سرہ کی چند مجالس کے خاص خاص اور اہم نکات جمع فرمائے ہیں۔ یہ کتاب علم و معارف اور تصوف و سلوک کے مسائل کا ایک بیش بہا خزینہ ہے اور دریا بکوزہ کا مصداق ہے۔ ان مختصر صفحات میں اس کا مختصر تعارف بھی کا حقہ پیش نہیں کیا جا سکتا اس کے ایک ایک صفحہ میں اور مختصر الفاظ و جملوں میں ایسے ایسے دقیق مباحث و مضامین اور معرکۃ الآراء مسائل کا حل موجود ہے۔ جو بڑے بڑے رسائل میں بھی نامکمل رہتے ہیں۔

مفتی صاحبؒ نے ابتداء کتاب میں حضرت تھانویؒ سے اپنے تعلق اور ابتدائی چار حاضریوں کا مختصر حال انتہائی دلکش انداز میں تحریر فرمایا ہے۔

مقدمہ کتاب میں حضرت مفتی صاحبؒ تحریر فرماتے ہیں کہ :۔

"حاضرین مجلس میں بہت سے حضرات ملفوظات لکھنے کا اہتمام فرماتے تھے، اس ناکارہ کو اس کی ہمت بہت کم ہوتی تھی کہ مجلس میں بیٹھ کر لکھنے کی طرف توجہ دے اس لیے اس کا اہتمام تو نہیں تھا، البتہ بعض خاص خاص باتیں اپنی یادداشت کے لیے لکھ بھی لیتا تھا اس طرح لکھا ہوا بھی ایک اچھا خاصہ ذخیرہ جمع ہوگیا"

حضرت تھانویؒ کی ہدایت یہ تھی کہ آپ کے ملفوظات جمع کرنے والے جب تک لکھ کر آپکے ملاحظہ میں لاکر اجازت حاصل نہ کرلیں اس کی اشاعت ممنوع تھی، اور اپنے وصیت نامہ میں بھی چند مخصوص خلفاء کے نام درج فرماکر یہ ہدایت کی تھی کہ میرے بعد اگر کوئی وعظ یا ملفوظات وغیرہ کسی کے پاس غیر مطبوعہ ہوں اور وہ ان کو شائع کرنا چاہئے تو وہ ان حضرات کو دکھا لے ان میں حضرت مولانا ظفر احمد عثمانیؒ کا نام بھی درج تھا چنانچہ وصیت کے مطابق مفتی صاحبؒ نے "مجالس حکیم الامت" کا مسودہ حضرت مولانا کی خدمت میں پیش کرنیکی اجازت چاہی تو مولاناؒ نے جواب میں تحریر فرمایا۔

"حضرتؒ نے اپنے مواعظ و ملفوظات کی اشاعت کے لیے اپنے بعد جن حضرات کے دیکھنے کی شرط بیان فرمائی ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ ضبط کرنے والا ان حضرات سے علم و معرفت میں کم ہو جن کا نام شرط میں ہے۔ اور اگر ضابطہ ان حضرات سے علم و معرفت میں زیادہ ہو تو ظاہر ہے وہ اس شرط سے مستثنیٰ ہوگا، میں آپ کے ضبط کردہ مجالس حکیم الامت پر کسی نظر کی ضرورت نہیں سمجھتا"

مگر بعد میں مفتی صاحبؒ کے اصرار پر حضرت مولانا کے مسودہ ملاحظہ فرماکر اشاعت کی اجازت مرحمت فرمادی۔

احقر کی ناقص رائے میں یہ کتاب تصوف کی روح ہے اور اس کا مطالعہ ہر اس شخص کو تصوف کی صحیح حقیقت سے روشناس کراسکتا ہے جو یا تو آجکل کی نام نہاد پیری مریدی کو دیکھ کر اس سے بدظن ہوگیا ہو یا پھر مغربیت اور مادہ پرستی کے رجحانات سے متاثر ہوکر تصوف کو غیر اہم اور غیر ضروری سمجھ بیٹھا ہو۔

تبرک کے طور پر چند ملفوظات نقل کیے جاتے ہیں۔

مسئلہ جبر و قدر پر ایک مختصر جامع تقریر۔ ارشاد فرمایا کہ دنیا میں کوئی بھی اختیاری کام دو مشیتوں کے بغیر وقوع میں نہیں آتا۔ ایک مشیت الٰہیہ دوسری مشیت عبدیہ جن لوگوں نے صرف مشیت قریبہ یعنی مشیت عبدیہ پر نظر کی وہ قدری ہو گئے۔ اور جنہوں نے صرف مشیت بعیدہ یعنی مشیت الٰہیہ پر نظر کی وہ جبری ہو گئے اور جنہوں نے دونوں مشیتوں پر نظر کی وہ اہل سنت ہے ہے۔

ارشاد فرمایا کہ اکثر دیکھا جاتا ہے کہ شبہات تو عوام بھی اکثر سمجھ لیتے ہیں مگر جواب کا سمجھنا انہیں مشکل ہوتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ شبہات کا منشا جہل ہے، جہل کی بات عوام کی سمجھ میں جلد تر آجاتی ہے اور جواب کا منشا علم ہوتا ہے وہ ہر شخص کے بس میں نہیں آتا۔

بزرگان دیوبند کا اصل امتیاز۔ ارشاد فرمایا کہ میں جو اپنے بزرگوں کا معتقد ہوں اس کی بنا یہ نہیں کہ یہ دنیا میں سب سے بڑے عالم ہیں کیونکہ مجھے یہ احتمال ضرور ہے کہ زمانہ میں کچھ علماء ان سے بھی بڑے موجود ہوں اگرچہ ہمیں معلوم نہ ہوں بلکہ میرے اعتقاد کی بنیاد اس پر ہے کہ یہ لوگ اللہ والے تھے۔ دنیادار نہیں تھے دنیا میں بستے مگر حقیقتِ دنیا کی ان کو ہوا بھی نہیں لگی۔ ان کا جو کام تھا دینی داعیہ سے تھا۔ خواہ اس میں اپنی تمام مصالح برباد ہو جائیں۔

(۱۸) شب برأت کے فضائل و احکام

شریعت کی نظر میں جس طرح بعض مقامات اپنی بعض خصوصیات کی بنا پر نہایت اہمیت کے حامل ہیں اور ان میں ایک ایک عبادت کا ثواب دوسرے مقامات کے مقابلہ میں کئی ہزار گنا زیادہ ملتا ہے، بالکل اسی طرح بعض ایام کو بھی دوسرے ایام کے مقابلہ میں خصوصیت حاصل ہے۔

جس طرح یہ دستور چلا آ رہا ہے کہ شہروں اور قصبوں میں تجارت کے خاص خاص اوقات میں پینٹھ لگائے جاتے ہیں، اسی طرح شریعت کی نظر میں انسان بھی ایک تاجر ہے، دنیوی تجارت گاہیں اگر ابغض البقاع ہیں تو اُخروی تجارت گاہیں احب البقاع ہیں (کما فی الحدیث) اس غیر محسوس تجارت کے لیے بھی ماہانہ سالانہ اور ہفتہ وار نمائشیں لگتی ہیں جن میں رمضان شریف، لیلۃ القدر وغیرہ ہیں انہیں میں سے ایک شب برأت ہے۔ احادیث میں اس کے بھی بہت فضائل و برکات آئے ہیں۔

زیر نظر رسالہ میں حضرت مفتی صاحبؒ نے شب برأت کی وجہ تسمیہ، اس کی تعیین اور اس کے

فضائل و برکات احادیث صحیحہ کی روشنی میں بیان فرماتے ہیں۔ اور اس رات میں جو اعمال مسنون ہیں ان کی فہرست بھی تحریر کی ہے تاکہ عام مسلمان اُس رات کے بیش بہا فضائل و برکات سے بہرہ اندوز ہو سکیں مگر افسوس ہے کہ بہت سے لوگ غفلت و جہالت سے اس کے ثواب و برکات کو عذاب و نقصانات سے بدل لیتے ہیں اور اپنی شومئ اعمال سے طرح طرح کی بدعتیں اور قبیح رسمیں ایجاد کر کے ہر ایک برکت کو اپنے لیے مصیبت بنا لیتے ہیں۔ اس رسالہ میں ان خرافات اور لغویات کی بھی نشاندہی کی گئی ہے مثلاً رسم آتشبازی جس میں لاکھوں روپیہ اور کئی جانوں کا نقصان ہو جاتا ہے، رسم حلوہ، چراغاں کی رسم، مسجدوں میں اجماع اور شور و شغب وغیرہ۔

کتاب کے آخر میں حضرت مفتی صاحبؒ نہایت دردمندی سے مسلمانوں سے یہ گذارش کرتے ہیں کہ مسلمان ان اُخروی نمائشوں کو غنیمت سمجھ کر ان سے نفع اٹھائیں اور اس مبارک رات میں اعمال مسنونہ کے ساتھ جاگ کر قبر میں آرام سے سونے کا سامان کر لیں، اور اگر یہ نہ ہو سکے تو کم از کم اپنے آپ اور اپنے اہل و اعیال کو ان گناہوں سے تو بچا لیں جو اس مبارک رات میں ثواب سمجھ کر کئے جاتے ہیں۔

یہ کتاب آخرت کا توشہ جمع کرنے کے لیے ایک مؤثر ذریعہ ہے بشرطیکہ مسلمان اس کو پڑھ کر اس پر عامل ہو جائیں۔

(۱۹) بسم اللہ (فضائل و احکام)

• بسم اللہ الرحمٰن الرحیم • ایک ایسا مختصر جملہ ہے جس کے پڑھنے میں نہ کوئی محنت و مشقت ہے نہ کوئی وقت صرف ہوتا ہے مگر اس کے آثار و برکات نہایت دور رس اور عظیم الشان دینی و دنیوی فوائد پر مشتمل ہیں۔

اس مختصر رسالہ میں حضرت مفتی صاحبؒ نے بسم اللہ کے شرعی احکام و خواص بسم اللہ کا قدر تفصیلی ذکر فرمایا ہے، آپ تحریر فرماتے ہیں کہ اس مختصر رسالہ کی اصل مسلمانوں کو اسی غفلت پر تنبیہ کرنا ہے کہ اور کچھ نہیں ہوتا تو اس بے محنت کام سے تو دم نہ چرائیں اور اس کے فضائل و برکات کو بلا وجہ ضائع نہ کریں۔

کتاب کے ابتدائی حصہ میں احادیث کی روشنی میں ان مقامات کا ذکر کیا گیا ہے جہاں بسم اللہ پڑھنا مسنون ہے اور اس کی تاکید آئی ہے، پھر اس کے کچھ احکام و مسائل بیان کئے گئے ہیں اور

آخر میں بسم کے بعض خواص مجربہ بیان کئے گئے ہیں مثلاً چوری اور شیطانی اثرات سے حفاظت، ظالم پر غلبہ، ذہن اور حافظہ کے لیے، حب کے لیے حفاظت اولاد کا نسخہ تسخیر قلب کا نسخہ، حکام کے لیے، درد سر کے لیے، ان تمام مقاصد کے لیے مختلف تعداد ہے جو اس کتاب میں دیکھی جا سکتی ہے۔

الغرض عمل بہت ہی قلیل ہے اور برکات و ثمرات بہت کثیر اس لیے لوگوں کو اسکا اہتمام کرنا چاہیئے۔

(۲) جہاد، فوائد، مسائل، دعائیں

جہاد اسلام کے فرائض میں نماز روزہ کی طرح اسلام کا پانچواں فرض ہے، اور یہ قیامت تک جاری ہے کا حدیث شریف میں ہے الجہاد ماض الی یوم القیامۃ۔

ہندوستان پر انگریزی تسلط کے بعد سے وہاں کے مسلمانوں کو کھلے طور پر کفار کے ساتھ جہاد و قتال کے مواقع نہ رہے اور رفتہ رفتہ عام مسلمانوں کے ذہن سے اس کی ضرورت و فضائل و مسائل بھی غائب ہونے لگے، اور اسلامی مملکت پاکستان کے قیام کے بعد اس طرف کوئی توجہ نہ دی گئی اور اس فریضہ کو اسی طرح نسیان میں ڈالے رکھا گیا۔

حالانکہ قرآن و سنت کے نصوص اور اسلامی تاریخ شاہد ہے کہ جب بھی مسلمان جہاد چھوڑتے ہیں دوسری قومیں ان پر غالب آجاتی ہیں، اور مسلمانوں کے دلوں میں مرعوبیت اور آپس میں پھوٹ پڑ جاتی ہے۔

حضرت مفتی صاحبؒ نے ۱۹۶۵ء میں پاکستان پر بھارت کے اچانک حملے کے وقت یہ مفصل رسالہ تحریر فرمایا جس میں جہاد کی تعریف، اس کے احکام و فضائل اور برکات کا مفصل تذکرہ فرمایا ہے۔

رسالہ کے چند اہم عنوانات درج ذیل ہیں۔

مؤمن کا جہاد وطن کے لیے نہیں اسلام کے لیے ہے، ہمارا وطن اسلام ہے، اسلامی جہاد کا ناقابل تسخیر سامان صبر اور تقویٰ ہے، جہاد کی تیاری اور سامان جنگ کی فراہمی بھی فرض ہے، صحابہ کرام نے سامان جنگ کی صنعت سیکھنے کے لیے دوسرے ملکوں کا سفر کیا، عہد رسالت میں بلیک آؤٹ کی ایک نظیر، جہاد کب فرض عین ہو جاتا ہے؟

آگے چل کر مختلف کتب فقہ اور فتاوٰی کے حوالوں سے بہت سے مسائل متعلق جہاد بیان کئے گئے ہیں۔

آخر میں جہاد سے متعلق چالیس حدیثیں ترجمہ اور نہایت بہترین شرح کے ساتھ ذکر کی گئی ہیں اور ان کے لیے نہایت دل نشین عنوانات قائم کئے گئے ہیں اور پھر مومن کا موثر ترین ہتھیار یعنی دعا، جنگ کی دعائیں ذکر کی گئی ہیں۔

چند خصوصیات: ۱۔ اردو میں جہاد کے تمام شعبوں پر حاوی بہت ہی مستند اور آسان فہم رسالہ ہے۔
۲۔ اس کو پڑھ کر مسلمان کے دل میں شوق جہاد اور میدان جنگ میں جانے کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔
۳۔ جہاد کی اہمیت اور اس کے فضائل کا اندازہ ہوتا ہے۔

حرف آخر: یہاں پر صرف بیس کتابوں کے مختصر تعارف پر اکتفا کیا جارہا ہے۔ حضرت مفتی صاحبؒ کی اس کے علاوہ بھی کئی خالص اصلاحی تصانیف ہیں جن میں سے اکثر طبع ہو چکی ہیں اور چند ایک زیر طبع ہیں مگر مقالہ کے طویل تر ہو جانے کے خوف سے ان سے صرف نظر کیا جاتا ہے۔

حضرت مفتی صاحب قدس سرہٗ کی اصلاحی تصانیف کے اس تعارفی مقالہ کے دو بنیادی اور اہم مقاصد پیش نظر تھے۔

ایک یہ کہ عامۃ الناس میں اس مقالہ کے مطالعہ سے دین کی صحیح معلومات حاصل کرنے کا شوق اور رغبت پیدا ہو اور وہ ان کتابوں کو پڑھ کر ان پر عمل کر کے اپنی دنیا و آخرت کو سنواریں، جو ان کتابوں کی تحریر کا بنیادی اور اصل مقصد ہے۔

دوسرے یہ کہ اہل علم ان کتابوں کو پڑھ کر اپنی تصانیف اور تالیفات میں اس بات کو مدنظر رکھیں کہ ان کی تحریروں میں بھی عامۃ الناس کے افادہ اور اصلاحی پہلو کو بطور خاص پیش نظر رکھا گیا ہو۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ہمیں حضرت مفتی صاحبؒ کے علوم و معارف کے ان بیش بہا خزانوں سے استفادہ کی توفیق کامل نصیب فرمائے۔ اور ان تصانیف کے ایک ایک حرف کے بدلہ میں حضرت مفتی صاحبؒ کے درجات کو بلند فرمائے آمین ثم آمین۔

واخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین اللّٰھم تقبل منّا انک انت سمیع العلیم۔

مولانا عبدالشکور ترمذی
دارالعلوم حقانیہ ۔ ساہیوال

حضرت مُفتی اعظمؒ کی تفسیری خِدمات

باز گو از نجد و از یاران نجد
تا در و دیوار را آری بوجد
گز برائے صحبت حق سالہا
باز گو رمزے ازاں خوشحالہا

صاحبزادہ عزیز محترم مولانا محمد تقی صاحب سلمہ اللہ وزادہ اللہ علماً وتقوٰی نے البلاغ کے مفتی اعظم نمبر کے لئے اس ناکارہ کو بھی ازراہ حسن ظن یاد کیا، اپنی نااہلیت اور عدم قابلیت کے پیش نظر تو یہی مناسب تھا کہ اس کام سے عذر کر دیا جائے مگر عزیز موصوف کی دلجوئی اور تطییب قلب نیز حضرت مفتی صاحب قدس سرہٗ کے ساتھ حقیر کے انتساب وتعلق اور سب سے بڑھ کر حضرت ممدوح کے محبوب اور تذکرہ نگاروں میں شمار کئے جانے کی طمع نے باوجود گوناگوں اعذار اور موانعات کے طبیعت کو اس کارِ خیر میں شرکت پر آمادہ کر دیا اور عزیز کا اشارہ پاکر حضرت مفتی صاحبؒ کی چند در چند گراں قدر دینی خدمات میں سے "علم تفسیر میں خدمت جلیلہ" کے عنوان پر اپنی ناقص معلومات کو مرتب کر کے پیش کرنے کا ارادہ کر لیا ہے واللہ الموفق والمعین!

اس موضوع کے اختیار کرنے اور حضرت ممدوحؒ کی تفسیری خدمات کے تعارف کا مقصد ناظرین پر ان خدماتِ جلیلہ کی اہمیت و نافعیت کے واضح کرنے کے علاوہ ان سے استفادہ کرنے کی ضرورت کا احساس اور جذبہ پیدا کرنا ہے۔ توقع کی جاتی ہے کہ احقر کی معروضات کو اسی مقصد کے پیش نظر ملاحظہ فرمایا جائے گا۔

تفسیر بالرّائے کا فتنۂ کبریٰ:۔

اس دور میں الحاد میں دین کی قیود و حدود سے آزاد صاحب زبان وقلم لوگوں نے تفسیر بالرائے کرنے اور سلف صالحین کی تفسیروں سے بے نیاز ہو کر قرآن کریم کے معنی اور اس کے مقصد میں تحریف وتبدیل کرنے کا فتنہ برپا کیا ہوا ہے جس کو فتنۂ کبریٰ کہنا بجا ہو گا ان لوگوں نے قرآن کریم کے چودہ سو سالہ متفقہ معنی اور مقصد کو تبدیل کر کے پیش کرنا اپنا مقصد اور مطمح نظر بنایا ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی سنت قدیمہ ہے کہ ہر فتنہ کے مقابلہ اور اصلاح کے لئے اس وقت کے

اکابر علماء و خدام کو خصوصی طور پر چن لیا جاتا ہے اور ان کے قلب و دماغ میں اس کام کی اہمیت کا جذبہ اور داعیہ پیدا کر دیا جاتا ہے اس عادت جاریہ کے مطابق اس زمانہ میں اللہ تعالیٰ نے تحریف قرآن اور تفسیر بالرائے کے اس فتنہ کبریٰ کے استیصال و اصلاح کے لئے جس جماعت کو مخصوص و موفق فرمایا وہ علماء دیوبند کی جماعت ہے اس جماعت کی دینی خدمات سے واضح ہے کہ زمانۂ حاضرہ میں اس سے جس طرح عمومی طور پر دین کے پورے تحفظ و احیاء اور اس کے ہر شعبہ میں تجدید و اصلاح کا بڑا ہی قابل قدر اور ناقابل فراموش کام لیا گیا ہے اسی طرح خصوصیت کے ساتھ تفسیر بالرائے کے فتنۂ کبریٰ کے استیصال اور تحریف قرآن کے مقابلہ میں بھی اس جماعت نے گرانقدر خدمات انجام دی ہیں۔ اکابر علماء دیوبند میں سے حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب محدث دارالعلوم دیوبند قدس سرہ العزیز اور حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ نے تقاضائے وقت کے مطابق اس اہم قرآنی خدمت کی طرف خصوصیت سے توجہ فرمائی حضرت شیخ الہند نے حضرت شاہ عبدالقادر دہلوی رحمہ کے اردو ترجمہ کو بامحاورہ بنانے اور ان پر ضروری فوائد ارقام فرمانے کی خدمت انجام دیکر امت پر احسان عظیم فرمایا اور حضرت حکیم الامت تھانوی رحمہ نے بعض معاصرین کے ترجموں اور تفسیر کے اغلاط کی اصلاح کا فرض انجام دینے کے ساتھ ساتھ سلف صالحین کے عین موافق ایک بلند پایہ علمی تفسیر بیان القرآن مع اردو ترجمہ لکھ کر قرآن کریم کے صحیح مقاصد و مطلب کی وضاحت و بیان اور ترجمانی کا حق ادا کر دیا۔ تفسیر بیان القرآن کی زبان اور اس کا اسلوب بیان خالص علمی اور اصطلاحی ہے مگر اپنی جامعیت مضامین اور طرز استدلال کی نفاست و معقولیت کے لحاظ سے زمانہ حاضرہ کی تفاسیر میں اشرف التفاسیر کہلانے کی مستحق ہے قرآن کریم کے اسرار و حکم اور حقائق و معارف کے بیان پر مشتمل اس تفسیر کے بارہ میں اس ضرورت کا احساس کیا جا رہا تھا کہ اس کے مضامین کو عام فہم اور آسان زبان میں منتقل کر دیا جائے تاکہ اسکی افادیت کا دائرہ زیادہ سے زیادہ عام ہو سکے اللہ تعالیٰ نے غیب سے ایسے اسباب پیدا فرما دیئے کہ حضرت مفتی صاحب رح نے اپنی تفسیری خدمات کے لئے بیان القرآن کو منتخب فرمایا اور اس کے مضامین اور مشکل مقامات کا حل آسان زبان اور سہل انداز میں فرما کر اس کے نفع کو عام اور سہل الحصول بنا دیا جس کی تفصیل آگے آ رہی ہے۔

تفسیر سے مناسبت :۔

حضرت مفتی صاحب رح پر منجملہ انعامات الٰہیہ کے ایک خصوصی انعام یہ تھا کہ آں ممدوح کو علوم و قرآن کا خصوصی ذوق عطا فرمایا گیا تھا اور علم تفسیر سے ایک خاص مناسبت آں موصوف کے حصہ میں آئی تھی پھر چونکہ حضرت موصوف کو ایک عرصہ تک اپنے مرشد و مربی حضرت حکیم الامت تھانوی رح کی صحبت بابرکت سے فیضیاب ہونے اور حضرت والا رح کی زیر ہدایات تفسیری خدمات انجام دینے کا شرف بھی حاصل رہا ہے اس لیے حکیم الامت تھانوی رح کے تفسیری ذوق کا بھی وافر حصہ آپ کو میسر آگیا تھا اور لوں بھی آپ کو حضرت تھانوی رح کے ذوق تفسیری کا بجا طور پر وارث و جانشین سمجھا جاتا تھا۔

تفسیر قرآن کے مراحل

حضرت مفتی صاحبؒ نے قرآن کریم کی تفسیری خدمات کو کئی مرحلوں میں انجام دیا ہے تحریری طور پر قلم کے ذریعہ بھی یہ خدمت انجام دی ہے اور تقریری زبان و بیان سے بھی اس کو ادا کیا ہے مرحلہ وار تفصیل ذیل میں ملاحظہ فرمائی جائے۔

مرحلہ اول درس قرآن کریم

حضرت مفتی صاحبؒ جب دیوبند سے ہجرت کرکے کراچی تشریف لائے تو عمومی اصلاح اور نفع عام کے لئے آرام باغ کے قریب مسجد باب الاسلام میں قرآن کریم کا درس دیا کرتے تھے نماز فجر کے بعد ہر روز ایک گھنٹہ یہ درس ہوا کرتا تھا اس درس میں مختلف ذہن و فکر اور ہر قسم کی استعداد و قابلیت والے شریک ہوکر اپنے اپنے حوصلہ کے موافق نفع مند ہوتے تھے۔ سات سال کے عرصہ میں یہ درس قرآن مکمل ہوا اور تقریری طور پر بصورت درس تفسیر قرآن کی خدمت کا ایک مرحلہ تکمیل کو پہونچا۔

دوسرا مرحلہ ریڈیو پر درس قرآن

ریڈیو پاکستان کے ذمہ داروں کے اصرار پر حضرت مفتی صاحبؒ نے ہفتہ میں ایک روز جمعہ کے دن قرآن کریم کی تفسیر کا نشر ہونا منظور فرما لیا تھا اور یہ درس "بنام معارف القرآن" ۳ر شوال ۱۳۷۳ھ مطابق ۲ر جولائی ۱۹۵۴ء سے شروع ہوکر جون ۱۹۶۴ء تک ریڈیو پاکستان پر مسلسل نشر ہوتا رہا مگر اس نشری درس میں پورے قرآن کریم کی تفسیر پیش نظر نہیں تھی بلکہ عام مسلمانوں کی وقتی ضروریات کے پیش نظر خاص خاص منتخب آیات کی تفسیر اور اس سے متعلقہ احکام و مسائل کا بیان مقصود تھا۔ یہ تفسیر اسی صورت میں دس سال تک ریڈیو پر نشر ہوتی رہی اور سورہ ابراہیم کے ختم تک یہ سلسلہ پہونچ گیا۔ عام مسلمان خصوصاً تعلیم یافتہ حضرات مختلف طریقوں پر اس سے کافی فائدہ اٹھاتے رہے بعض حضرات نے اس کے نوٹ قلمبند کئے اور بعض جگہ ٹیپ ریکارڈ پر اس کو محفوظ کرکے ریڈیو کے وقت کے علاوہ بھی دوسرے وقت میں لوگوں کو سنوانے کا اہتمام کیا گیا اسطرح اس درس کا نفع صرف ملک کے اندر ہی محدود نہیں رہا بلکہ پاکستان اور مسلم ممالک کے علاوہ افریقہ اور یورپ کے بھی بہت سے ملکوں کے مسلمانوں تک غیر معمولی طور پر پہونچا۔ تقریر اور تحریر کے طور پر تفسیری خدمات کا یہ مرحلہ پہلے مرحلہ سے اپنی جامعیت اور پائیداری کے لحاظ سے زیادہ عام اور مفید ثابت ہوا۔

تیسرا مرحلہ معارف القرآن کتابی صورت میں:-

ریڈیو پر درس قرآن کی نافعیت اور افادیت کا احساس عام طور پر کیا جا رہا تھا اور بے شمار تقاضے اس تفسیر کو کتابی صورت میں شائع کرنے کے ہو رہے تھے تعلیم یافتہ طبقہ اور عوام کے علاوہ جب بہت سے ماہر اور مستند علماء نے بھی اس کے مفید ہونے کی شہادت دی تو حضرت مفتی صاحبؒ نے تفسیر کی تکمیل کا کام اس طرح شروع فرمایا کہ ریڈیو پر درس قرآن میں جو آیات قرآنیہ درمیان میں رہ گئی تھیں ان کی تشریح و تفسیر کو بھی اس میں شامل فرمایا اس کے علاوہ مختلف قسم کی دوسری

ترمیمات واصلاحات کے ذریعہ اس درس قرآن کو کتابی صورت میں مستقل مکمل تفسیر بنادیا گیا۔

زمانۂ تصنیف

کتابی صورت میں لانے کے لئے اس تفسیر پر نظرثانی اور رہی ہوئی آیات کی تفسیر کا کام ۱۶ صفر ۱۳۸۳ھ کو شروع کیا گیا تھا مگر ہجوم مشاغل اور گوناگوں امراض کی شدت کی وجہ سے اس کام کی رفتار کی تیزروی اور تسلسل کے مقابلہ میں کچھ سست رہی اور ۱۳۸۸ھ تک صرف سورہ البقرہ ہی کی تکمیل ہوسکی اور اس کو کتابت کے لئے دیدیا گیا اس کے بعد شوال ۱۳۹۰ھ میں قواس تیز رفتاری اور تسلسل کے ساتھ اس کام کا دوبارہ آغاز ہوا کہ ۱۳۹۲ھ میں یعنی صرف چار سال کے قلیل عرصہ میں ہی اتنا عظیم الشان کارنامہ اور عظیم تفسیری شاہکار اتمام پا گیا مختلف اعذار وافکار اور مشاغل کے ہجوم میں اس بابرکت کام کی تکمیل کی ہمت وتوفیق کا عطا فرمایا جانا یقیناً قرآن کریم کا اعجاز اور حضرت مفتی صاحبؒ کی کرامت کہلانے کا مستحق ہے۔

تفصیلی تعارف

حضرت مفتی صاحبؒ نے امت پر احسان عظیم فرمایا کہ اپنی پیرانہ سالی اور انحطاط قویٰ کے زمانہ میں باسقدر جانفشانی اور محنت سے کام لیکر ۵۶۶۲ صفحات پر مشتمل بڑی تقطیع کی ۸ جلدوں میں معارف القرآن کے نام سے تفسیر تیار فرما دی، جزاہم اللہ خیرالجزاء عنا وعن سائر المسلمین۔

ترتیب

حضرت شیخ الہندؒ اور حضرت حکیم الامت تھانوی رحؒ کے جن دو مستند ومعتبر ترجموں کا تذکرہ اوپر آیا ہے حضرت مفتی صاحبؒ نے ان دونوں ترجموں کو اپنی تفسیر میں شامل فرمالیا ہے اس کے بعد بیان القرآن کا خلاصہ تفسیر لکھا پھر معارف القرآن کا عنوان قائم فرما کر اس کے تحت مضمرات ومجملات قرآنی اور مرادات وارشادات ربانی کی ایضاح وتفصیل فرمائی ہے۔ طرز بیان اور اسلوب نگارش نہایت شگفتہ سلیس اور سہل ہے مطالب قرآن کے بیان میں سلامت زبان اور حلاوت بیان قابل دید اور وجد آفریں ہے۔

مختصر یہ کہ حضرت مفتی صاحبؒ نے قرآن کریم کے حقائق اور معارف کا بیان اور مسائل حاضرہ ضروریہ کا حل اسقدر سلیس زبان اور شگفتہ انداز میں فرمادیا ہے کہ معمولی تعلیم یافتہ شخص کے لئے بھی اس سے استفادہ کرکے مطالب قرآنی کو سمجھنا آسان ہوگیا بخصوصیت کیساتھ تعلیم یافتہ طبقہ کے لئے بیش بہا معلومات کا ذخیرہ اور نعمت عظمیٰ ہے اسکے ساتھ ہی حضرت حکیم الامت رحؒ کی تفسیر بیان القرآن کے مضامین مشکلہ اور مبہمات مسائل کا تسہیل وتشریح کے ساتھ تفصیلی بیان بھی فرمادیا گیا اور ضمن تفسیر وتشریح میں تقاضائے وقت اور ضروریات زمانہ کے موافق جابجا مسائل حاضرہ کے بارہ میں اتنا تفصیلی مواد جمع فرمادیا گیا کہ بعض بعض موضوعات پر تو مستقل رسالہ مرتب ہوگیا ہے۔ حضرت مفتی صاحبؒ

کی تالیفات کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہے کہ حضرت مفتی صاحبؒ نے تالیف و تصنیف کے مشغلہ کو بطور پیشہ کے کبھی اختیار نہیں فرمایا بلکہ عصری ایجادات اور حوادثات زمانہ میں سے جن امور کے بارہ میں شرعی رہنمائی کی ضرورت پیش آئی تھی حضرت مفتی صاحبؒ اس پر وقت و محنت صرف فرما کر مسلمانوں کی رہنمائی کا فرض انجام دیتے تھے، یہی اللہ تعالیٰ کا خاص فضل و احسان تھا کہ امت مسلمہ کی پیش آمدہ وقتی ضروریات کے بارہ میں حکم شرعی کی تحقیق و تفصیل کے لئے مفتی صاحبؒ کو ایک خاص ملکہ اور ذوق عطا فرمایا گیا تھا چنانچہ اس پوری تفسیر میں حضرت مفتی صاحبؒ کا یہی ذوق تحقیق کار فرما نظر آتا ہے تفسیر میں جگہ جگہ مسائل حاضرہ سے متعلق تحقیقات عجیبہ کا بیش بہا ذخیرہ اس پر گواہ ہے۔

خصوصی تحقیقات

تفسیر کی خصوصی تحقیقات جن کو اس کی خصوصیات کہا جاتا ہے اور ان پر خصوصی توجہ اور نظر رکھنا تفسیر کے مطالعہ کرنے والوں کو زمانہ حاضرہ کے تقاضوں اور ضروریات میں رہنمائی کے لئے بھی مفید اور کارآمد ہے ان کی ایک فہرست ذیل میں درج کی جاتی ہے:۔

تفسیر کے بعض خصوصی موضوعات

۱:۔ بندوق کی گولی سے شکار کے مسائل ۲:۔ مریض کو دوسرے کا خون دینے کا مسئلہ ۳:۔ انگریزی دوا اور علاج کا حکم ۴:۔ اسلامی سیاست اور عام ملکی سیاستوں کا فرق عظیم ۵:۔ اسلام میں عورتوں کا موقف ۶:۔ نظام الطلاق فی الاسلام ۷:۔ سود اور ربا کی اسلامی تعریف اور اس کے حرام ہونے کی حکمت اور موجودہ زمانہ میں اس سے نجات کی صورت سود اور ربا کی معاشی خرابیاں ۸:۔ حرمت شراب اور اس کے متعلقہ احکام ۹: حرمت قمار ۱۰:۔ بعض معاصرین کی غلط فہمی کا ازالہ ۱۱:۔ اسلام میں غلامی کی بحث ۱۲:۔ اکتناز دولت پر اسلامی قوانین کی ضرب کاری ۱۳:۔ وطنی یا نسبی قومیت کفر و جاہلیت کا نعرہ ہے ۱۴:۔ دو قومی نظریہ ۱۵:۔ زکوٰۃ میں کسی ہیئتی کا کسی زمانہ میں اختیار نہیں ۱۶:۔ سائنس کی تعلیم بھی عطاء حق تعالیٰ ہے ۱۷:۔ اسلامی سزاؤں پر اعتراضات کا جواب ۱۸:۔ زکوٰۃ حکومت کا ٹیکس نہیں بلکہ عبادت ہے ۱۹:۔ حضرت یونس علیہ السلام کے واقعہ میں بعض معاصرین کی غلطی اور اس کی تحقیق ۲۰:۔ حکومت کا غذائی کنٹرول ۲۱:۔ معاش میں اختلاف ۲۲:۔ ارتکاز دولت کے انسداد کا قرآنی نظام ائمہ مجتہدین کی تقلید غیر مجتہد پر واجب ہے ۲۳:۔ انسداد فواحش اور حفاظت عصمت کا ایک اہم باب پردہ نسواں ۲۴:۔ تفسیر قرآن میں فلسفی نظریات کی موافقت یا مخالفت کا صحیح معیار ۲۵:۔ تقسیم معیشت کا قدرتی نظام، معاشی مساوات کی حقیقت، اسلامی مساوات کا مطلب۔

معارف القرآن کے خصوصی التزامات:۔ اس تفسیر معارف القرآن میں چونکہ حضرت مؤلفؒ کے

پیش نظر یہ رہا ہے کہ ایسے غیر عربی دان مسلمانوں کو جو علمی اصطلاحات سے واقف نہیں ہوتے اور دقیق و مشکل مضامین کی قوت برداشت سے باہر ہوتے ہیں، ان کے حوصلہ کے مطابق مضامین اور تعلیمات قرآن کریم سے واقف اور متعارف کرایا جائے اس لئے علم تفسیر سے متعلقہ علوم میں سے علم اختلاف قرأت اور صرف و نحو اور معانی و بلاغت کی خالص علمی اور تفصیلی بحثوں سے احتراز کیا گیا ہے مگر پھر بھی اجمالی طور پر ان علوم کو بھی بیان کیا گیا ہے اور اس کا لحاظ کیا گیا ہے کہ عوام کی ذہنی سطح سے بلند خاص علمی اصطلاحات اور غیر معروف اور مشکل الفاظ نہ آنے پائیں۔

اب معارف القرآن کے خصوصی التزامات پر نظر ڈالیئے جو یہ ہیں

۱:- متن قرآن کریم کے ترجمہ میں حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی رح اور شیخ العرب والعجم حضرت مولانا محمود الحسن صاحب دیوبندی رح کے ترجموں پر اعتماد کیا گیا ہے بہت کم کہیں ایسا ہوا ہے کہ کوئی لفظ زیادہ واضح اور آسان سمجھ کر کسی دوسرے ترجمہ سے لیا گیا ہو۔

۲:- ترجمہ کے بعد مکمل تفسیر اور تفصیل و تشریح سے پہلے آیات کا خلاصہ مضمون لکھ دیا گیا ہے جو بجائے خود ایک مختصر تفسیر کا کام دیتا ہے اور مشاغل میں مصروف آدمی کے لئے قرآن پاک کے سمجھنے کے لئے ایک حد تک کافی ہے یہ حصہ در حقیقت حضرت حکیم الامت تھانوی رح کی تفسیر بیان القرآن کا خلاصہ ہے مگر اس کو آسان اور سہل کر کے پیش کیا گیا ہے۔

۳:- البتہ خاص خاص لغات و مفردات کا حل اور انکی تشریح لغت اور تفسیر کی معتبر کتابوں کے حوالے سے نقل کر دی گئی ہے۔

۴:- اصل تفسیر میں اصول تفسیر کی مطابقت کا پورا پورا لحاظ رکھتے ہوئے سلف صالحین کی تفسیروں پر اعتماد کیا گیا ہے جو صحابہؓ و تابعین رح سے منقول و ماثور اور مستند کتب حدیث و تفسیر میں موجود ہیں اور ہر موقع پر جہاں سے وہ تفسیر لی گئی ہے اس کتاب کا حوالہ بھی دے دیا گیا ہے۔

۵:- لطائف و معارف کے درجہ میں متاخرین میں سے مستند اہل تفسیر کے مضامین بھی لئے گئے ہیں اور مضامین کو خصوصیت سے اہمیت دی گئی ہے جو انسان کے دل میں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت و محبت کو بڑھائیں اور قرآن پر عمل کرنے اور اپنے اعمال کی اصلاح کی طرف مائل کریں۔

۶:- اس کے بعد آیات مندرجہ سے متعلق احکام و مسائل لکھے گئے ہیں اس میں اس بات کا التزام کیا گیا ہے کہ صرف ایسے احکام و مسائل کو لیا جائے جن پر الفاظ قرآن کی دلالت قواعد و اصول کے تحت واضح ہے۔ ایسے احکام و مسائل کا بڑا حصہ تفسیر قرطبی، احکام القرآن جصاص، احکام القرآن ابن عربی، تفسیرات احمدیہ، بحر محیط ابن حیان، روح المعانی، روح البیان، بیان القرآن حکیم الامت تھانوی رح اور تفسیر مظہری سے لیا گیا ہے احکام

ومسائل کے تحت جس طرح ہر زمانہ کے مفسرین نے اپنے اپنے زمانہ کے فرقوں اور ان کے مباحث کو اہمیت دی ہے اسی طرح اس تفسیر میں زمانہ حاضرہ کے اہم مسائل کو موضوع بحث بنا کر اہمیت دی گئی ہے۔ چنانچہ موجودہ دور کے سیاسی معاشی معاشرتی اور تمدنی مسائل پر قرآن کریم اور سنت کی روشنی میں تفصیلی تبصرے کئے گئے ہیں اور تجدد پسند لوگوں کی طرف سے ان مسائل میں جو شکوک و شبہات پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے ایسے تمام شکوک و شبہات کا ازالہ تعلیمات اسلام میں کسی ادنیٰ ترمیم کے بغیر تسلی بخش طور پر کیا گیا ہے۔

۷۔ اس زمانہ کے بعض مصنفین نے قرآن کریم کی تفسیر میں جو غلطیاں کی ہیں موقع بموقع ان غلطیوں کی پر زور اور منصفانہ انداز میں تفصیلی نشاندہی اور اصلاح کی گئی ہے۔ واضح رہے کہ اس تفسیر میں زیادہ زور ان تعلیمات پر دیا گیا ہے جو زندگی کے ہر شعبہ میں انسان کی رہنمائی کرتی ہیں اور یہ بتلایا گیا ہے کہ قرآن کریم محض اعتقادی اور نظریاتی کتاب نہیں ہے بلکہ اسکی ہدایات انسانی زندگی کے ہر شعبہ پر حاوی اور مشتمل ہیں اور یہ ایک مکمل ضابطہ حیات ہے، اس لئے جابجا قرآن کریم سے روزمرہ کے مسائل زندگی کی طرف توجہ دلائی گئی ہے اس سلسلہ میں جو تعلیمات اخذ کی گئی ہیں ان کا طریقہ استنباط اس قدر لطیف اور وجد آفریں ہے کہ اسکی صحیح قدر و قیمت کا اندازہ اہل علم اور اہل ذوق ہی کر سکتے ہیں۔

آداب معاشرت کے بارہ میں قرآنی ہدایات

قرآن کریم نے زندگی گذارنے کے جن آداب اور معاشرت کے جن اصولوں کی تعلیم دی ہے اکثر ان کے نہ جاننے کی وجہ سے ہمارا طرز معاشرت ان قرآنی آداب اور اسلامی اصول سے تقریباً بیگانہ اور نا آشنا ہے بلکہ اکثر و بیشتر اور عام طور پر آداب معاشرت کو دین کا شعبہ اور جزو ہی نہیں سمجھا جاتا اور اسکی تعلیم و تلقین کی طرف بھی اتنی توجہ نہیں دی جاتی جتنی توجہ کا یہ شعبہ مستحق ہے حالانکہ عقائد و عبادات اور اخلاق و معاملات کے ساتھ آداب معاشرت بھی دین میں داخل اور اس کا ایک اہم شعبہ ہے۔ زمانہ حاضرہ میں حضرت حکیم الامت تھانوی رح سے اللہ تعالیٰ نے یوں تو دین کے ہر شعبہ میں اصلاح و تجدید کی بڑی گرانقدر خدمت لی ہے مگر حضرت ممدوح کی تجدیدی خدمات میں اصلاح معاشرت اور آداب معاشرت کی تعلیم و تلقین کو امتیازی مقام حاصل تھا۔

حضرت تھانوی رح کے فیض صحبت کے اثر سے حضرت مفتی صاحبؒ میں بھی اصلاح معاشرت کا یہی رنگ نمایاں طور پر نمودار ہوا۔ اور حضرت مفتی صاحبؒ نے تفسیر قرآن میں جابجا آداب معاشرت اور روزمرہ زندگی کے قرآنی آداب و اصول کی طرف ناظرین کی توجہ مبذول کرنے کی سعی بلیغ فرمائی ہے ایسے بعض آداب معاشرت بطور نمونہ کے ذیل میں ملاحظہ ہوں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس فرشتوں کا بطور مہمان آنے کے واقعہ کے تحت حسب ذیل احکام کا تذکرہ فرمایا گیا ہے۔

مہمانی اور مہمان داری کے چند اصول :-

(۱) مسلمانوں کے لئے سنت ہے کہ جب آپس میں ملیں تو سلام کریں مہمان کو اس میں پیش قدمی کرنا چاہیئے اور دوسرں کو جواب دینا چاہیئے، عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ شاید لفظ سلام سے ہی سلام کی سنت پوری ادا ہو جاتی ہے اس غلطی کی اصلاح کرتے ہوئے سنت کی روشنی میں ہدایت فرمائی ہے کہ جب تک ابتداء کرنیوالا پورا کلمہ مسنونہ السلام علیکم اور جواب دینے والا وعلیکم السلام نہ کہے اس وقت تک سنت ادا نہیں ہوتی (۲) مہمان نوازی کے آداب میں سے یہ ہے کہ مہمان کے آتے ہی جو کچھ کھانے پینے کی چیز میسر ہو اور جلدی سے مہیا ہو سکے وہ لا رکھے پھر اگر صاحب وسعت ہے تو مزید مہمانی کا انتظام بعد میں کرے (قرطبی) (۳) آنے والوں کی مہمانی کرنا آداب اسلام اور مکارم اخلاق میں سے انبیاء وصلحاء کی عادت ہے (۴) کھانا لانے کے بعد مہمانوں کو اسکی تکلیف نہیں دی کہ کھانے کی طرف بلاتے بلکہ جہاں وہ بیٹھے تھے وہیں لا کر ان کے سامنے پیش کر دیا پھر اس کے ساتھ ہی مہمان کی اسقدر رعایت ملحوظ ہے کہ مہمانی پیش کرتے وقت انداز گفتگو میں کھانے پر اصرار نہ تھا بلکہ فرمایا الا تا کلون (کیا آپ کھائیں گے نہیں) اشارہ اس طرف ہوا کہ اگرچہ آپ کو حاجت کھانے کی نہ ہو مگر ہماری خاطر سے کچھ کھایئے جس طرح میزبان کے آداب کی تعلیم دی گئی ہے اسی طرح مہمان کو بھی کچھ آداب بتلائے گئے ہیں حضرت مفتی صاحب نے مہمان کے آداب میں سے اس ادب کا استنباط فرمایا ہے کہ مہمان کے سامنے جو چیز پیش کی جائے اسکو قبول کر لے (کھانے کو دل نہ چاہے یا مضر سمجھیں تو معمولی سی شرکت دلجوئی کے لئے کر لیں) اس کے علاوہ میزبانی کے لئے اس جملہ سے ایک اور عجیب وغریب ادب کا استنباط فرمایا گیا ہے کہ میزبان کو چاہیئے کہ صرف کھانا سامنے رکھ کر فارغ نہ ہو جائے بلکہ اس پر نظر رکھے کہ مہمان کھا رہا ہے یا نہیں پھر یہ نظر رکھنا اس طرح سے نہیں کہ مہمان کے کھانے کو تکتا رہے سرسری نظر سے دیکھے کیونکہ مہمان کے لقموں کو دیکھنا آداب ضیافت کے خلاف اور مدعو کے لئے باعث شرمندگی ہوتا ہے اس تعلیم میں کیسا اعتدال سے کام لیا گیا ہے کہ مہمان کی طرف سے بے اعتنائی اور بے پروائی سے بھی روکا گیا جیسا کہ اکثر لاابالی پن سے عادت ہوگئی ہے کہ مہمان کے سامنے کھانا رکھا اور خود اپنے کسی کام میں مشغول ہو گئے اب میزبان کو کچھ خبر نہیں کہ ماحضر کو کھا بھی رہا ہے، اور مہمان پر مسلط ہو جانے اور اس کے لقمے شماری سے بھی باز رہنے کی تاکید فرمادی گئی کہ اس سے مہمان کو شرم وحیا کی وجہ سے کھانا ہی دوبھر ہو جاتا ہے (۵) یہ ہے کہ (کسی کے مکان میں) بغیر اجازت داخل نہ ہو (۶) جب داخل ہونے کی اجازت بلکہ کھانے کی دعوت بھی ہو تو وقت سے پہلے اگر کھانا تیار ہونے کے انتظار میں نہ بیٹھ جاؤ، جسکا مطلب یہ ہوا کہ نہ بلا اجازت داخل ہو اور نہ وقت سے پہلے اگر کھانا کھانے کا انتظار کرو بلکہ جس وقت پر بلایا جائے اس وقت مکان میں داخل نہ ہو (۷) کھانے سے فارغ ہو جاؤ تو اپنے اپنے کاموں میں منتشر ہو جاؤ دعوت کے گھر میں باہم باتیں کرنے کے لئے جم کر نہ بیٹھو۔

ہمارے ناظرین کو شاید خلجان ہو رہا ہوگا کہ آجکل کی ٹی پارٹیوں اور دعوتوں میں تو اس کے برعکس عمل کا رواج ہو رہا ہے
ایسی دعوتوں میں اس پر کیسے عمل کیا جائے گا۔ حضرت مفتی صاحبؒ کو اللہ تعالیٰ نے زمانہ حاضرہ کی ضروریات اور تقاضوں
پر بڑی ہی گہری نظر عطا فرمائی تھی حضرت مفتی صاحبؒ نے علت حکم کے پیش نظر دعوتوں وغیرہ میں مروجہ معمول کا
مستثنیٰ ہونا ظاہر فرماتے ہوئے طرز استدلال کے علاوہ دین اسلام کی عطا کردہ سہولتوں سے بہرہ مند ہونے
کے جواز کی طرف بھی اشارہ فرمایا ہے :۔ اس طریق استنباط کو بغور ملاحظہ فرمایا جائے ۔ اور حضرت رحمۃ اللہ علیہ کا ارشاد
ہے "یہ عام حالت میں ہے جہاں عادۃً مہمانوں کا کھانے کے بعد دیر تک بیٹھے رہنا میزبان کے لئے باعث کلفت
ہو ۔۔۔ اور جہاں حالات اور علامت سے یہ معلوم ہو کہ کھانے کے بعد مہمانوں کا دیر تک باہمی باتوں میں مشغول رہنا
میزبان کے لئے باعث کلفت نہیں وہ اس سے مستثنیٰ ہوگا جیسا کہ آجکل پارٹیوں اور دعوتوں میں رواج ہو گیا ہے
دلیل اسکی آیت کا اگلا جملہ ہے جس میں ارشاد ہے ان ذالکم کان یوذی النبی (الآیۃ) "

مسئلہ استیذان :۔

قرآنی آداب معاشرت کا یہ ایک اہم اصول ہے کہ پہلے اجازت حاصل کئے بغیر کسی کے گھر میں داخل
نہیں ہونا چاہیئے۔ اس میں انسداد فواحش وغیرہ بہت سے مصالح اور حکمتوں کے علاوہ ایک بہت بڑی مصلحت
لوگوں کو ایذا رسانی سے بچانا بھی پیش نظر ہے اسلام میں کسی کو بھی ناحق ایذا دینا اور تکلیف پہونچانا ناجائز اور حرام
قرار دیا گیا ہے۔ جب کوئی شخص بغیر اجازت حاصل کئے وحشیانہ طرز سے اسپر مسلط ہوگا تو اس سے دوسرے شخص کو
یقیناً ایذا اور تکلیف ہوگی حضرت مفتی صاحبؒ نے اس مسئلہ کی تفصیل و تشریح فرماتے ہوئے عام طور پر جو غلطیاں جاے
معاشرہ میں جڑ پکڑے ہوئے ہیں اسپر بڑی برمحل اصلاحات ارقام فرمائی ہیں ۔ مثلاً عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ اس مسئلہ
استیذان کا تعلق صرف دوسرے شخص کے گھر کے ساتھ ہے یا صرف مردوں کے لئے یہ حکم ہے اپنے گھر یا عورتوں
سے اس کا تعلق نہیں ہے حالانکہ یہ بات قابل اصلاح ہے حضرت مفتی صاحبؒ ارشاد فرماتے ہیں۔ استیذان واجب
اس آیت کے عموم سے معلوم ہوا کہ کسی دوسرے شخص کے گھر جانے سے پہلے استیذان کا حکم عام ہے مرد و عورت
محرم غیر محرم سب کو شامل ہے ۔ عورت کسی عورت کے پاس جائے یا مرد مرد کے پاس جائے سب کو استیذان
کرنا واجب ہے ۔ اسی طرح ایک شخص اگر اپنی ماں اور بہن یا دوسری محرم عورتوں کے پاس جائے تو بھی استیذان
کرنا چاہیئے ۔

استیذان سنت :۔

البتہ جس گھر میں صرف اپنی بیوی رہتی ہو اس میں داخل ہونے کے لئے اگرچہ استیذان واجب نہیں مگر مستحب
اور طریق سنت یہ ہے کہ وہاں بھی اچانک بغیر کسی اطلاع کے اندر نہ جائے بلکہ داخل ہونے سے پہلے اپنے پاؤں

کی آہٹ سے یا کھنکار سے کسی طرح پہلے باخبر کرکے پھر داخل ہو۔ ایک غلطی یہ ہو رہی ہے کہ اپنا نام بتلائے بغیر اجازت
مانگنے کو کافی سمجھا جاتا ہے اور پوچھنے پر یا تو جواب میں صرف "میں ہوں" کہہ دیا جاتا ہے یا بالکل خاموش کھڑے رہتے ہیں بس
پر بھی حضرت مفتی صاحبؒ نے تنبیہ فرمائی ہے فرماتے ہیں "اس معاملہ میں سب سے برا وہ طریقہ ہے جو بعض لوگ کرتے
ہیں کہ باہر سے اندر داخل ہونے کی اجازت مانگی اپنا نام ظاہر نہ کیا اندر سے مخاطب نے پوچھا کون صاحب ہیں تو جواب
میں کہہ دیا "میں ہوں" یعنی کہ یہ مخاطب کی بات کا جواب نہیں جس نے اول آواز سے نہیں پہچانا وہ "میں" کے لفظ سے
کیا پہچانے گا اس سے بھی زیادہ برا طریقہ یہ ہے جو آجکل بہت سے لکھے پڑھے لوگ بھی استعمال کرتے ہیں کہ دروازہ
پر دستک دی جب اندر سے پوچھا گیا کہ کون صاحب ہیں تو خاموش کھڑے ہیں کوئی جواب ہی نہیں دیتے۔ یہ مخاطب
کو تشویش میں ڈالنے اور ایذا پہنچانے کا بدترین طریقہ ہے جس سے استیذان کی مصلحت ہی فوت ہو جاتی ہے اس جگہ یہ
بات بڑی قابل غور ہے کہ اس استیذان کے حاصل کرنے میں بعض دشواریاں پیش آ رہی ہیں کہ عموماً مخاطب جس سے اجازت
مطلوب ہوتی ہے وہ دروازہ سے بہت دور ہوتا ہے وہاں تک آواز پہونچانا مشکل ہے۔ اس مشکل کا حل بھی ایسے
جو حضرت مفتی صاحبؒ نے اپنی فقہی بصیرت سے پیش فرمایا ہے۔ "یہ سمجھ لینا چاہئے کہ اصل واجب یہ بات ہے کہ
بغیر اجازت کے گھر میں داخل نہ ہو۔ اجازت کے طریقے ہر زمانہ اور ہر ملک میں مختلف ہو سکتے ہیں۔ ان میں سے ایک طریقہ
تو دروازہ پر دستک دینے کا تو خود روایات حدیث سے ثابت ہے اسی طرح جو لوگ اپنے دروازہ پر گھنٹی لگا لیتے ہیں
اس گھنٹی کا بجا دینا بھی بہ واجب استیذان کی ادائیگی کے لئے کافی ہے بشرطیکہ اپنا نام بھی ایسی آواز سے ظاہر کر دے جس کو
مخاطب سن لے اس کے علاوہ اور کوئی طریقہ جو کسی جگہ رائج ہو اس کا استعمال کر لینا بھی جائز ہے آجکل جو شناختی کارڈ کا رواج
یورپ سے چلا ہے یہ رسم اگرچہ اہل یورپ نے جاری کی مگر مقصود استیذان اس میں بہت اچھی طرح پورا ہو جاتا ہے کہ اجازت
دینے والے کو اجازت لینے والے کا نام و پتہ اپنی جگہ بیٹھے ہوئے بغیر کسی تکلیف کے معلوم ہو جاتا ہے اس لئے اسکو
اختیار کر لینے میں کوئی مضائقہ نہیں"

ایک وضاحت:-

یہاں شناختی کارڈ سے حضرت مفتی صاحبؒ کی مراد یورپ کا مروجہ ملاقاتی کارڈ تھا اس سے بعض ناظرین کو یورپ کے
مروجہ ملاقاتی کارڈ کی حقیقت سے ناواقفیت کی وجہ سے آجکل کے مروجہ شناختی کارڈ کے جواز کا شبہ ہوا تو اس احقر کم فہم
نے حضرت مفتی صاحبؒ کی خدمت بابرکت میں عبارت بالا نقل کرکے دریافت کیا کہ کیا اس عبارت میں آجکل کے شناختی
کارڈ کا جواز بھی شامل ہے جس میں فوٹو بھی شامل ہوتا ہے۔ یا یہ کوئی ایسی صورت شناختی کارڈ کی ہے جس میں فوٹو ہوتا ہو اس
کی وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے تو حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے اسکی وضاحت میں ارقام فرمایا: جس وقت یہ لکھا گیا تھا اس
وقت مروجہ شناختی کارڈ کا رواج ہی نہ تھا میری مراد اس سے ملاقاتی کارڈ ہے جس کو انگریزی میں وزیٹنگ کارڈ کہتے

ہیں اس میں تصویر نہیں ہوتی اس لئے مناسب یہ ہے کہ شناختی کی بجائے ملاقاتی کارڈ بنا دیا جائے ۔ والسلام ٦ محرم ۹۶ھ
اس پر حضرت نے پھر عرض کیا کہ " ملاقاتی کارڈ کی بجائے بغیر تصویر کے ملاقاتی کارڈ کا اعلان فرما دیا جائے تو زیادہ وضاحت ہو
جائے گی چنانچہ صفر ۹۶ھ کے البلاغ میں الفاظ ذیل کے ساتھ وضاحت کا اعلان فرما دیا گیا ۔ یہاں شناختی کارڈ سے
مراد ملاقاتی کارڈ ہے جس میں تصویر نہیں ہوتی حکومت کا رائج کردہ شناختی کارڈ مراد نہیں ہے "

حضرت مفتی صاحبؒ نے استیذان کے مسئلہ کی تفصیل فرماتے ہوئے بعض ایسی باتوں کی طرف بھی توجہ دلائی ہے
جن کے بارہ میں عام طور پر ذہن ہی میں نہیں آتا کہ ان میں شرعی مسئلہ استیذان کی خلاف ورزی ہو رہی ہے مثلاً

رفاہ عام کے اداروں میں جس مقام پر اس کے مالکان یا متولیان کی طرف سے داخلہ کے لئے کچھ شرائط
اور پابندیاں ہوں اسکی پابندی شرعاً واجب ہے مثلاً ریلوے اسٹیشن پر اگر بغیر پلیٹ فارم کے جانے
کی اجازت نہیں ہے تو پلیٹ فارم حاصل کرنا ضروری ہے اسکی خلاف ورزی ناجائز ہے ایئرڈروم
(ہوائی اڈے) کے جس حصہ میں جانے کی محکمہ کی طرف سے اجازت نہ ہو وہاں بغیر اجازت جانا شرعاً
جائز نہیں اسی طرح مساجد، مدارس، خانقاہوں، ہسپتالوں وغیرہ میں جو کمرے وہاں کے منتظمین
یا دوسرے لوگوں کی رہائش کے لئے مخصوص ہوں جیسے مدارس اور خانقاہوں کے خاص حجرے یا
ریلوے کے ایرڈروم اور ہسپتالوں کے دفاتر اور مخصوص کمرے جو مریضوں یا دوسرے لوگوں کی رہائشگاہ
ہیں وہ بصورت غیر مسکونہ کے حکم میں نہیں بلکہ مسکونہ کے حکم میں ہیں ان میں بغیر اجازت جانا شرعاً
ممنوع اور گناہ ہے ۔ (ص ۲۸۲ ج ٦)

ٹیلیفون :-

آجکل کی نو ایجاد چیزوں میں سے ٹیلیفون اب اتنا عام ہو گیا ہے کہ شہروں میں تو اس کا خانگی ضروریات میں
شمار ہونے لگا ہے مگر اس پر گفتگو کرنے کے شرعی آداب اور طریقوں سے غفلت ہی برتی جا رہی ہے
حضرت مفتی صاحبؒ نے ٹیلیفون پر بات چیت کرنے والوں کو درج ذیل آداب کی رعایت رکھنے
کی ہدایت فرمائی ہے ۔ کسی شخص کو ایسے وقت ٹیلیفون پر مخاطب کرنا جو عادةً اس کے سونے
یا دوسری ضروریات میں یا نماز میں مشغول ہونے کا وقت ہو بلا ضرورت شدیدہ جائز نہیں کیونکہ اس
میں بھی وہی ایذارسانی ہے جو کسی کے گھر میں بغیر اجازت داخل ہونے اور اسکی آزادی میں خلل ڈالنے
سے ہوتی ہے ۔ ٹیلیفون پر اگر کوئی طویل بات کرنا ہو تو پہلے مخاطب سے دریافت کر لیا جائے کہ آپ
کو ذرا سی فرصت ہو تو میں اپنی بات عرض کر دوں بعض لوگ ٹیلیفون کی گھنٹی بجتی رہتی ہے اور کوئی
پروا نہیں کرتے نہ پوچھتے ہیں کہ کون ہے اور کیا کہنا چاہتا ہے یہ اسلامی اخلاق کے خلاف اور بات

کرنے والے کی حق تلفی ہے جیسے حدیث میں آیا ہے "ان لزورك عليك حقاً" یعنی جو شخص آپ کی ملاقات کو آئے اس کا تم پر حق ہے کہ اس سے بات کرو اور بلاضرورت ملاقات سے انکار نہ کرو اسی طرح جو آدمی ٹیلیفون پر آپ سے بات کرنا چاہتا ہے اس کا حق ہے کہ آپ اس کو جواب دیں۔ (ص ۳۸۲ ج ۹)

خط نویسی کے چند آداب :

انسان کی زندگی کا کوئی پہلو ایسا نہیں ہے جس پر قرآن کریم سے ہدایات نہ حاصل کی جاسکتی ہوں خط و کتابت اور مراسلت کے ذریعہ باہمی گفت و شنید بھی انسان کی اہم ضروریات میں داخل ہے اس کے بارہ میں بھی تفسیر قرطبی سے حضرت مفتی صاحبؒ نے اہم اور ضروری ہدایات کو نقل فرمایا ہے، جس شخص کے پاس کسی کا خط آئے اس کے لئے مناسب ہے کہ اس کا جواب دے کیونکہ غائب کا خط حاضر کے سلام کے قائم مقام ہے، خط کا جواب دینا سنت انبیاء علیہم السلام ہے۔ خط نویسی کی اصل سنت یہی ہے کہ خط کے شروع میں بسم اللہ لکھی جائے لیکن قرآن و سنت کے ارشادات حضرات فقہاء نے یہ کلیہ لکھا ہے کہ جس میں بسم اللہ یا اللہ تعالیٰ کا کوئی نام لکھا جاتا ہے اگر اسکو اس کاغذ کی بے ادبی سے محفوظ رکھنے کا کوئی اہتمام نہیں بلکہ وہ پڑھ کر ڈال دیا جاتا ہے تو ایسے خطوط اور چیزیں میں بسم اللہ یا اللہ تعالیٰ کا کوئی نام لکھنا جائز نہیں کہ وہ اس طرح اس بے ادبی کے گناہ کا شریک ہو جائے گا۔ آجکل جو عموماً ایک دوسرے کو خط لکھے جاتے ہیں ان کا حال سب جانتے ہیں کہ نالیوں اور گندگیوں میں پڑے نظر آتے ہیں اس لئے مناسب یہ ہے کہ ادائے سنت کے لئے زبان سے بسم اللہ کہہ لے تحریر میں نہ لکھے۔ "مکتوب الیہ کا نام .... خط لکھنے والے کیلئے سنت انبیاء یہ ہے کہ سب سے پہلے اپنا نام لکھے جس میں بہت سے فوائد ہیں مثلاً خط پڑھنے سے پہلے ہی مکتوب الیہ کے علم میں آجائے کہ میں کس کا خط پڑھ رہا ہوں تاکہ وہ اسی ماحول میں خط کے مضمون کو پڑھے۔

امتحانات کے نمبر اور ووٹ وغیرہ سب شہادت کے حکم میں داخل ہیں !

آجکل امتحانات کے نمبر سند اور سارٹیفکیٹ کے بارہ میں شاید ہی یہ بات کسی کے ذہن میں آتی ہو کہ یہ بھی شہادت میں داخل ہے اور سچی اور جھوٹی جیسی شہادت ہوگی اس پر ثواب یا مواخذہ ہوگا۔ حضرت مفتی صاحبؒ نے اسکی طرف بھی توجہ دلائی ہے کہ شہادت اور گواہی کا جو مفہوم آجکل عرف میں مشہور ہو گیا ہے وہ تو صرف مقدمات و خصومات میں کسی حاکم کے سامنے گواہی دینے کے لئے مخصوص سمجھا جاتا ہے مگر قرآن و سنت کی اصطلاح میں لفظ شہادت اس سے وسیع مفہوم رکھتا ہے مثلاً کسی بیمار کو ڈاکٹری سارٹیفکیٹ دینا کہ یہ ڈیوٹی ادا کرنے کے قابل نہیں یا نوکری کرنے کے قابل نہیں یہ بھی ایک شہادت ہے اگر اس میں واقعہ کے خلاف لکھ دیا گیا تو وہ جھوٹی شہادت ہو کر گناہ کبیرہ ہو گیا اسی طرح امتحانات میں طلبہ کے پرچوں پر نمبر لگانا بھی ایک شہادت ہے۔ اگر جان بوجھ کر یا بے پروائی سے نمبروں میں کمی بیشی کردی تو وہ بھی جھوٹی شہادت ہے۔ حرام اور سخت گناہ ہے۔ کامیاب ہونے والے فارغ التحصیل طلبہ کو سند

یا سارٹیفکیٹ دینا اس کی شہادت ہے کہ وہ متعلقہ کام کی اہلیت وصلاحیت رکھتا ہے اگر وہ شخص واقعۃً میں ایسا نہیں ہے تو اس سارٹیفکیٹ یا سند پر دستخط کرنے والے سب کے سب شہادت کاذبہ کے مجرم ہیں۔ اسی طرح اسمبلیوں اور کونسلوں وغیرہ کے انتخاب میں کسی امیدوار کو ووٹ دینا بھی ایک شہادت ہے جس میں ووٹ دہندہ کی طرف سے اس کی گواہی ہے کہ ہمارے نزدیک یہ شخص اپنی استعداد اور قابلیت کے اعتبار سے بھی اور دیانت وامانت کے اعتبار سے بھی قومی نمائندہ بننے کے قابل ہے۔۔۔۔ ہمارے عوام ہیں کہ انھوں نے اس کو محض ہار جیت کا کھیل سمجھ رکھا ہے۔

اپنی مقررہ ڈیوٹی اور خدمت میں کوتاہی کرنا بھی ناپ تول میں کمی کرنے کے حکم میں ہے؛

یاد رہے کہ ناپ تول کی کمی جس کو قرآن میں تطفیف کہا گیا ہے صرف ڈنڈی مارنے اور کم ناپنے کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ کسی سے وصول کرکے دوسرے کا جو حق ہے اس میں کمی کرنا بھی تطفیف میں داخل ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ جو ملازم اپنی ڈیوٹی پوری نہیں کرتا وقت چراتا ہے یا کام میں کوتاہی کرتا ہے۔ وہ کوئی وزیر وامیر ہو یا معمولی ملازم اور وہ کوئی دفتری کام کرنیوالا ہو یا علمی اور دینی خدمت جو حق اسکے ذمہ ہے اس میں کوتاہی کرے وہ بھی اسمیں داخل ہے۔

ایسی ہی گوناگوں خصوصیات اور جامعیت کی وجہ سے اس تفسیر کو بہت ہی قبول عام عطا ہوا ہے وبلند پایہ اہل علم سے لیکر معمولی لکھے پڑھے افراد تک اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں اور بحمد اللہ اس کے ذریعہ قرآنی تعلیمات ایسے طبقہ تک بھی پہونچ رہی ہیں جو قرآن کریم کی روشنی سے اپنی کم استعدادی کی وجہ سے محروم تھا دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کے فائدہ کو زیادہ سے زیادہ عام فرمائیں اور اس صدقہ جاریہ اور باقیہ صالحہ کے ذریعہ حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے حسنات میں تا قیامت اضافہ ہوتا رہے آمین۔

معارف القرآن کا انگریزی ترجمہ:

اس تفسیر کا فیض عام ملک اور بیرون ملک میں انگریزی دانوں کے حلقوں تک بھی پہونچ رہا ہے اور ہر طرف سے اس کا انگریزی ترجمہ شائع کرنے کی فرمائش کی جارہی تھی بڑی خوشی کی بات ہے کہ وسائل کی کمی اور رجال کار کے فقدان کے باوجود دارالعلوم کراچی کے دارالتصنیف نے اللہ تعالیٰ کے نام پر اس عظیم کام کی ابتدا کردی اور ملک کے ممتاز ادیب ونقاد اور انگریزی وفرانسیسی کے معروف ماہر جناب پروفیسر محمد حسن عسکری صاحب نے جو اسلامی علوم سے بھی ضروری شغف رکھتے ہیں ترجمہ کی یہ عظیم الشان خدمت اعزازی طور پر اپنے ذمہ لیکر آغاز بھی کردیا ہے اور شعبان المعظم ١٣٩٥ھ سے یہ انگریزی ترجمہ البلاغ میں قسط وار شائع ہورہا ہے امید ہے کہ انگریزی دان حلقوں میں اس خدمت کا پُرتپاک خیر مقدم کیا جائے گا اور یہ خدمت ان حلقوں کے لئے بہت مفید ثابت ہوگی۔

(٣) احکام القرآن (عربی)

حضرت مفتی صاحبؒ کی یہ وہ بلند پایہ اہم علمی تصنیف ہے جس کی نظیر سابقہ زمانہ میں بھی بہت کمیاب ہے۔

حضرت امام ابوبکر جصاص المتوفی سنہ ۳۷۰ھ کے بعد سے مسلک احناف کے اصول و فروع پر قرآن کریم کی آیات سے استدلالات اور اختلافی مسائل میں دوسرے ائمہ کرام کے دلائل کے جوابات کو کتابی صورت میں جمع کرنے کی ضرورت محسوس کی جا رہی تھی اس اہم دینی ضرورت کو احکام القرآن کے ذریعہ بطریق احسن پورا کر دیا گیا ہے۔

آغاز اور سبب تالیف:

سنہ ۱۳۵۱ھ میں جب دارالعلوم دیوبند میں دورہ حدیث شریف کے بعد دورہ تفسیر قرآن کریم بھی پڑھانے کی تجویز ہوئی اور اس دورہ تفسیر کے افتتاح کی درخواست کے لئے اکابر علماء کے ایک وفد کے ساتھ حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدنی رحمۃ اللہ علیہ تھانہ بھون تشریف لاتے اس وقت دورہ تفسیر کے نصاب میں تفسیر ابن کثیر اور تفسیر بیضاوی کامل کے ساتھ مسلک احناف کی تائید کے لئے تفسیر مدارک رکھنے کا تذکرہ بھی آیا حضرت تھانوی رح نے تفسیر مدارک کی بجائے ان آیات کا کے انتخاب کا مشورہ دیا جن سے حنفی مسلک کی تائید ہوتی ہے اور اس مجوزہ تصنیف کا نام بھی حضرت تھانوی قدس سرہٗ نے اُسی وقت دلائل القرآن علی مسائل النعمان تجویز فرما دیا۔ اس کے بعد غالباً سنہ ۱۳۵۴ھ میں حضرت تھانوی رح نے اس کام کو حضرت مفتی صاحبؒ کے سپرد فرما دیا اور حضرت مفتی صاحبؒ نے اسی وقت کام بھی شروع فرما دیا تھا لیکن چونکہ حضرت موصوفؒ اس وقت دارالعلوم دیوبند کے عہدۂ صدارت افتاء پر مامور اور بہت زیادہ مشغول تھے اس لئے اس کام کے لئے جسقدر فرصت درکار تھی وہ میسر نہیں آسکی ادھر اس زمانہ میں حضرت مولانا ظفر احمد عثمانی قدس سرہٗ اعلاء السنن کی تصنیف سے فارغ ہو گئے تو حضرت تھانوی رح نے اس خیال سے کہ حضرت مولانا موصوف دلائل القرآن کا کام جلد پورا کر دیں گے اس کی تالیف کا کام حضرت مولانا موصوف کے سپرد فرما دیا مگر حضرت مولانا عثمانی رح کے ڈھاکہ یونیورسٹی تشریف لیجانے کے بعد یہ کام پھر تعویق میں پڑ گیا۔ پھر سنہ ۱۳۶۱ھ میں حضرت تھانوی قدس سرہٗ نے اس کام کی طرف خصوصی توجہ فرمائی اور یہ چاہا کہ کوئی عالم فارغ ہو کر صرف اس کام میں لگ جائیں تاکہ اس کی جلدی تکمیل ہو جائے مگر ایسی صورت نہ نکل سکی تو اس کے چند حصے کر کے ان حصوں کو حضرات اہل علم پر تقسیم کر دینے کا فیصلہ فرمایا اس تقسیم میں قرآن کریم کی پانچویں اور چھٹی دو منزلیں سورۃ الشعراء سے سورہ حجرات تک حضرت مفتی صاحبؒ کے سپرد فرمائی گئیں۔

ربیع الثانی سنہ ۱۳۶۲ھ میں بعض حوادث کی بناء پر جب حضرت مفتی صاحبؒ دارالعلوم دیوبند کے رسمی تعلق سے مستعفی ہو کر ۱۶ جمادی الثانیہ کو آستانہ عالیہ خانقاہ امدادیہ اشرفیہ تھانہ بھون حاضر ہوئے تو حضرت اقدس سرہ تھانویؒ نے احکام القرآن کی خدمت انجام دینے پر مامور فرما دیا۔

حضرت حکیم الامت تھانوی کے افادات اور آپ کا علمی شغف:

یہ وہ زمانہ تھا کہ گو شدت ضعف اور ہجوم امراض کے باعث حضرت اقدس تھانوی رح کا خانقاہ تشریف لیجانا

بھی متروک ہوگیا تھا لیکن حضرت والا کو دینی خدمات کیساتھ شغف اور تعلق کا یہ حال تھا کہ سب چیزوں پر یہی غالب رہتا تھا چنانچہ حضرت مفتی صاحبؒ نے خانقاہ اشرفیہ تھانہ بھون میں جب دلائل القرآن کی تصنیف کا کام شروع فرمایا تو جو سورت لکھنا شروع کرتے اس کو پہلے حضرت اقدس تھانوی خود بار بار تلاوت فرماتے اور اس میں جس مقام سے کوئی حکم مستنبط ہوتا نظر آتا اس کی تقریر بھی حضرت مفتی صاحبؒ کے سامنے فرماتے مگر اس کے ساتھ ہی غایت احتیاط کی بنا پر یہ ہدایت بھی فرماتے کہ اس کو کتب تفسیر وغیرہ میں تلاش کر لیا جائے اگر کہیں مل جائے تو اس کے حوالہ سے ورنہ جو مناسب ہو ان کے حوالے سے لکھ دیا جائے۔ اس کے علاوہ حضرت اقدس تھانوی اس تصنیف کے طرز اور اس میں کس چیز کو لیا جائے اور کس کو ترک کیا جائے تمام امور کے بارہ میں مفصل ہدایت اور رہنمائی فرماتے اور آیت زیر بحث کے بارہ میں بھی مضامین عالیہ اور علوم غامضہ کے افادات سے سرفراز فرماتے تھے حضرت مفتی صاحبؒ کا حافظہ بحمداللہ اسقدر قوی تھا کہ حضرت حکیم الامتؒ کے افادات کو مجلس مبارک میں سنکر ان کو اپنے حافظے میں محفوظ فرمالیتے اور اپنی قیام گاہ پر پہنچ کر ان کو بعینہ ضبط تحریر میں لے آتے تھے اس طریقے پر سورۂ شعراء سے سورۂ قصص کے اول تک یہ تفسیری کام حضرت تھانویؒ کی زیر سرپرستی اور ہدایات کے مطابق ہوتا رہا۔

حکیم الامت تھانویؒ کا آخری تفسیری افادہ!

حضرت مفتی صاحبؒ جب سورۂ قصص کی اس آیت پر پہونچے جس میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قبطی کو مکا مارنے اور استغفار فرمانے کا ذکر ہے اس کے بارہ میں حضرت حکیم الامتؒ نے ایک عجیب و غریب تحقیق اور خاص تفسیری افادہ فرمایا جو اس سلسلہ کا آخری افادہ ثابت ہوا، حضرت حکیم الامتؒ کے اس افادہ کا خلاصہ اپنے لفظوں میں خاتمۃ السوانح سے ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔ حضرت تھانویؒ نے فرمایا قبطی کافر حربی تھا جس کا خون حسب قواعد شرعیہ مباح ہوتا ہے پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس سے استغفار کیوں فرمایا اور حق تعالیٰ کی طرف سے بھی مغفرت کا ذکر فرما کر اسکی تقریر فرمادی گئی کہ یہ قتل مناسب نہ تھا۔ اب سوال یہ ہے کہ اس کا سبب کیا ہے۔ پھر فرمایا کہ میرا مدت سے یہ خیال ہے کہ کفار سے جیسے باقاعدہ زبانی یا تحریری معاہدہ ہوجاتا ہے تو اسکی پابندی مسلمانوں پر لازم ہوجاتی ہے اسی طرح بعض اوقات باہمی معاملات لین دین وغیرہ جاری ہونے اور فریقین کے ایک دوسرے سے مامون وبے خطر ہونے سے بھی ایک نوع کا عملی عہد سمجھا جاتا ہے اس لئے اسکی بھی رعایت رکھنا ضروری ہوتی ہے کہ اگر ایسے لوگوں پر کسی وقت حملہ کرنا ہو تو قاعدہ کے مطابق پہلے ان کو نبذ عہد کی اطلاع کر دینی چاہیئے اور بغیر اس نبذ عہد کے حملہ کرنا ایک قسم کا غدر ہے جو شریعت اسلامیہ میں کسی حال کسی کافر سے بھی جائز نہیں قبطی کا مذکورہ واقعہ بھی اسی طرح کا تھا کیونکہ موسیٰ علیہ السلام مع اپنے متعلقین بنی اسرائیل کے اور قبطی کفار دونوں فرعونی سلطنت کے باشندے تھے اور ایک دوسرے سے عملی طور پر مامون تھے اس حالت میں قبطی کا اچانک قتل ہوجانا عہد عملی کے خلاف تھا اس لئے اس پر

استغفار و مغفرت کی نوبت آئی اب رہا یہ سوال کہ جب قبطی کا قتل بحکم عذر او معصیت تھا تو حضرت موسیٰ علیہ السلام جو اولوالعزم رسول اور معصوم ہیں ان سے کیسے صادر ہوا؟ اسکا جواب ظاہر ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے قصداً قتل نہیں کیا انھوں نے معمولی ضرب (صرف ایک مکہ) قبطی کو ہٹانے کے لئے لگایا تھا اتفاقاً وہ مرگیا اس لئے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کسی نوع معصیت کا صدور ہرگز نہیں ہوا نہ صغیرہ کا نہ کبیرہ کا تاہم صورت لیکا ہر دیکھنے میں معصیت ہی کی سی تھی اسوجہ سے پیغمبر خدا نے اپنے منصب جلیل کے لحاظ سے اسکو بھی اپنے حق میں معصیت ہی کے برابر سمجھ کر استغفار فرمایا کہ مقربان را بیش بود حیرانی۔ تلاش کے بعد حضرت مفتی صاحبؒ کو صحیح بخاری کی ایک حدیث بروایت مغیرہ بن شعبہ میں اس کا ثبوت اور قسطلانی وغیرہ شروح بخاری میں اسکی تصریح مل گئی۔ فللہ در حکیم الامت التھانوی قدس اللہ سرہٗ السامی۔

دائرہ کار میں وسعت :

احکام القرآن کی تصنیف میں تو دورہ تفسیر کے طلبہ کے لئے قرآن کریم سے صرف دلائل حنفیہ فقہیہ کا استنباط ہی پیش نظر تھا مگر کام شروع ہونے کے بعد حضرت تھانوی رو کی رائے گرامی اس تالیف کے موضوع کو عام اور وسیع کرنے کے بارہ میں ہوئی اور صرف دلائل حنفیہ فقہیہ ہی نہیں بلکہ مطلقاً احکام خواہ احکام فقہیہ ہوں یا عقائد و تصوف اور اخلاق و تمدن اور نئی تعلیم کے اثر سے پیدا ہونے والے شکوک و شبہات ہوں سب کا استنباط موضوع بحث بنا لیا گیا پھر اس کا نام بھی وسعت موضوع کے لحاظ سے دلائل القرآن کے بجائے احکام القرآن تجویز فرمادیا گیا غرضکہ علم تفسیر کی یہ وہ محققانہ اور بلند پایہ علمی کتاب ہے جس کی تصنیف و تالیف کے لئے حضرت حکیم الامت تھانویؒ کی نظر انتخاب حضرت مفتی صاحبؒ پر پڑی اور حضرت تھانوی نے آں موصوف کو اس خدمت کے انجام دینے کے لئے مامور و منتخب فرمایا تھا۔ یہ کتاب حضرت مفتی صاحبؒ کے تفقہ اور استنباط مسائل وسعت نظر کا آئینہ اور حضرت موصوف کی وسعت معلومات کا گنجینہ ہے حضرت مفتی صاحبؒ نے اس کتاب کی تالیف میں انتہائی دیدہ ریزی اور محنت اور بڑی تحقیق و تدقیق کے ساتھ فقہ اور عقائد نیز معاشی اور معاشرتی مسائل کا بہت بڑا گرانقدر ذخیرہ جمع فرمادیا ہے خاص طور سے ایسے مسائل کی توضیح و تفصیل پر زیادہ زور دیا ہے جو عہد حاضر میں خصوصیت کیساتھ قابل لحاظ ہیں۔ اور ان کے بارہ میں پہلے علماء کی کتابوں میں ایک جگہ تفصیلی بحث دستیاب نہیں ہوتی۔ بعض مسائل پر مبسوط و مفصل بحثوں نے مستقل رسالوں کی شکل اختیار کر لی ہے جن کو احکام القرآن کا جزء بنادیا گیا ہے۔ افادہ عام کے لئے ایسے رسائل کا تعارف مختصر طور پر ذیل میں درج کیا جارہا ہے ان رسائل کے تعارف سے احکام القرآن کے موضوعات بحث کا بھی کسی قدر ناظرین کو اندازہ ہوگا۔

(۱) تفصیل الخطاب فی تفسیر آیات الحجاب :۔ عورتوں کے پردہ سے متعلق جتنی آیات قرآن کریم

کرکے کیا گیا ہے اس کے بعد عذاب قبر پر اہل السنۃ والجماعت کے اجماع کا ذکر فرما کر منکرین عذاب قبر معتزلہ اور ملحدین کے شبہات کے جوابات ارقام فرمائے گئے ہیں۔

(۹) موقف اہل الانابہ فی مشاجرات الصحابہؓ

اس رسالہ میں مشاجرات صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کے بارہ میں اہل سنت والجماعت کے موقف کا ثبوت کتاب وسنت اور اقوال سلف کی روشنی میں پانچ آیات کریمہ اور دس احادیث نبویہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والتحیۃ سے پیش کیا گیا ہے کہ صحابہ کی جماعت قطعی جنتی اور مغفور ہے۔

زمانہ تصنیف :

حضرت حکیم الامت تھانویؒ کے بتائے ہوئے طریقوں اور تعلیم فرمودہ اصولوں کی روشنی میں حضرت مفتی صاحبؒ نے اس تصنیف کے کام کو جاری رکھا اور بڑی محنت ومشقت سے اس مفوضہ تفسیری خدمت کو دو جلدوں میں پایۂ تکمیل تک پہونچا دیا ایک جلد (جو اصل کتاب کی جلدوں کے اعتبار سے پانچویں جلد ہے) سورۂ شعراء سے سورۂ یٰسین کے ختم تک قرآن کریم کی پانچویں منزل کے احکام ومسائل پر مشتمل ہے اس کے ۳۶۷ صفحات ہیں ربیع الثانی ۱۳۶۲ھ سے شروع ہو کر دوسرے وقتی ضروری کاموں کے ساتھ ساتھ ۴ ذوالحجہ ۱۳۶۲ھ تک مکمل ہوئی دوسری جلد جو شمار میں چھٹی جلد ہے، قرآن کریم کی چھٹی منزل سورہ والصّٰفّٰت سے شروع ہو کر سورہ حجرات کے ختم تک کے احکام ومسائل کی جامع ہے اس کی ضخامت ۲۰۸ صفحات ہے اسکی تصنیف کا کام اگرچہ ذوالحجہ ۱۳۶۳ھ میں ہی شروع ہو چکا تھا اور ذوالقعدہ ۱۳۶۴ھ میں سورہ فصلت کے آخر تک لکھا جا چکا تھا مگر تحریک پاکستان اور تقسیم ملک کے بعد کے ضروری اہم مشاغل میں مصروفیت نے تقریباً ۲۴ سال کے عرصہ دراز تک اس کام کی طرف متوجہ ہونے کی فرصت نہیں دی عرصہ کے بعد اللہ تعالیٰ نے عظیم احسان فرمایا اور اس اہم علمی خدمت کی تکمیل کا موقع حضرت مفتی صاحبؒ کو عطا فرمایا گیا چنانچہ محرم ۱۳۸۸ھ سے یہ کام پھر تسلسل کے ساتھ شروع ہوا اور سورہ شوریٰ سے سورہ حجرات کے آخر تک کا کام کسی وقفہ کے بغیر مسلسل ہوتا چلا گیا بالآخر ماہ رمضان المبارک ۱۳۸۹ھ کی اُنیسویں تاریخ کی نیک ساعت میں یہ بابرکت خدمت تفسیر قرآن اختتام کو پہونچی۔ نفعنا اللہ بہا وجمیع المسلمین اٰمین۔ یہ کتاب احکام القرآن علماء وطلباء علوم عربیہ کے لئے اس صدی کا قابل قدر اور عظیم علمی تفسیری سرمایہ ہے اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس سے زیادہ سے زیادہ استفادہ کی توفیق بخشیں اٰمین۔ احکام القرآن عربی اور اس کے ملحقہ رسائل مذکورہ کے علاوہ اور بھی بعض دوسرے رسائل علم تفسیر سے متعلق حضرت مفتی صاحبؒ کی تالیفات میں بڑے قابل اعتماد اور لائق استفادہ ہیں ان کا بھی مختصر تعارف ذیل میں دیکھئے۔

(۳) دستور قرآنی مع ضمیمہ غیر مسلموں کے حقوق :

زیر عنوان رسالہ بڑے سائز پر ۳۴ صفحات کا ہے یہ بھی حضرت مفتی صاحبؒ کی تفسیری خدمات جلیلہ میں سے تقاضہ وقت کے مطابق بڑی ہی اہم اور اپنی نوعیت کی خصوصی خدمت ہے۔ جن دنوں مسجد باب الاسلام متصل آرام باغ کراچی میں حضرت مفتی صاحبؒ کا درس قرآن جاری تھا اسی درس قرآن کی ایک تقریر کو ضبط تحریر میں لا کر سے دوسری چند اہم مضامین اور ایسی آیات کے اضافہ کے ساتھ جن میں اسلامی مملکت کے دستوری مسائل مذکور ہیں اور حضرت موصوفؒ کے ملاحظہ اور نظر اصلاحی کے بعد یہ بات واضح کرنے کے لئے شائع کیا گیا تھا کہ اسلامی دستور جس کا مطالبہ قیام پاکستان کے وقت سے ہی تمام مسلمانوں کی طرف سے کیا جا رہا ہے وہ صرف اجتہادات اور قیاسات پر مبنی نہیں ہے بلکہ دستور اسلامی کی اہم دفعات منصوص اور براہ راست قرآن سے بھی ثابت ہیں اس وقت پاکستان کو دنیا کی سب سے بڑی اسلامی سلطنت کی حیثیت سے قائم ہوئے سات سال کا طویل عرصہ گذر چکا تھا اور مسلمانوں کا یہ مطالبہ پورے زور سے ہو رہا تھا کہ اس اسلامی سلطنت کا دستور اور قانون خالص اسلامی ہونا چاہیئے مگر اس وقت کا حکمران طبقہ مختلف حیلے بہانوں کے ذریعہ اس مطالبہ کو ٹال مٹول سے پیچھے دھکیلتا جا رہا تھا اور اس کا سامنے کرنے سے جان چرا رہا تھا ایسی صورت حال میں وقت کا یہ اہم تقاضا تھا اور اس بات کی سخت ضرورت تھی کہ حضرات علماء کرام اپنی تحریر و تقریر کے ذریعہ حکمران طبقہ کے ساتھ تمام مسلمانوں کو بھی قیام پاکستان کے اس مقصد کے حاصل کرنے کی طرف متوجہ فرماتے رہیں جس کے لئے کروڑوں مسلمانوں نے بے مثال قربانیاں دی تھیں۔

زیر نظر رسالہ میں حضرت مفتی صاحبؒ نے اس فرض کی انجام دہی کے لئے قرآن شریف کی ان آیات کی تفسیر و تشریح کے ضمن میں جن سے اسلامی مملکت کی اہم دفعات کا استنباط کیا جا سکتا ہے اسلامی قوانین کو مروجہ طریقہ تدوین قانون کے مطابق دفعات کی شکل میں مرتب فرما کر اسلامی حکومت کا دستوری خاکہ ہاتھوں میں (دیدیا ہے) مثلاً اسلامی حکومت کی غرض اصلی کا مقصد کیا ہے اسلامی حکومت کا طرز اور طریقہ کیا ہے؟ اس کے فرائض کیا ہیں؟ صدر مملکت کو کن اوصاف سے متصف ہونا چاہیئے؟ قومیتوں کی تقسیم اور امتیاز؟ معاشی نظام، معاشرہ کی اخلاقی تربیت کا مقام اسلامی حکومت میں غیر مسلموں کے حقوق کیا ہیں؟

غرضیکہ ایسے ہی بہت سے عنوانات پر حضرت مفتی صاحبؒ نے بصیرت افروز کلام فرما کر منکرین اور معاندین اور مغربیت سے مرعوب طبقہ کے اس اعتراض کا کافی شافی جواب مہیا فرما دیا کہ اسلام کے پاس عدل و انصاف کے لئے کوئی قانون اور ملک کے انتظام و انصرام کے لئے کوئی دستور نہیں ہے۔

اس رسالہ پر علامہ سید سلیمان ندوی رحمہ اللہ و حضرت مولانا مفتی محمد حسن صاحبؒ و حضرت مولانا محمد ادریس رحمہ کاندھلوی وغیرہ اکابر عصر کی تقریظات ثبت ہیں بحمد اللہ یہ رسالہ اس قدر مقبول عام اور مفید ثابت ہوا کہ اس کا ترجمہ

انگریزی ترجمہ میں بھی شائع کیا گیا اور بارہ ہزار کا پیاں اس کی مفت تقسیم کی گئیں۔

(۵) قرآن میں نظام زکوٰۃ :

۴۲ صفحات کا یہ رسالہ زکوٰۃ اور متعلقات زکوٰۃ کے موضوع پر نہایت جامع اور تفصیلی ہے یہ رسالہ بھی حضرت مفتی صاحبؒ کے ان ہی چھ درسوں کا مجموعہ اور علم تفسیر میں خدمات جلیلہ کا ایک حصہ ہے جو سورہ توبہ کی دو آیتوں کے متعلق ہفتہ وار جمعہ کے روز ریڈیو پاکستان سے نشر ہوتے تھے یہ دونوں آیتیں سورہ توبہ کی ہیں ایک آیت میں مصارف زکوٰۃ کا بیان ہے کہ کس جگہ زکوٰۃ کا خرچ کرنا شرعاً جائز ہے اور دوسری میں نظام زکوٰۃ کے اسلامی حکومت کے فرائض میں داخل ہونے کا ذکر ہے اس کے ضمن میں زکوٰۃ کی حقیقت اور اس کی تاریخ کا بیان بھی عمدہ پیرایہ میں آگیا ہے ان درسوں کی افادیت کے پیش نظر جب ان کو مستقل طور پر رسالہ کی شکل میں شائع کرنے کی فرمائش کی گئی تو حضرت مفتی صاحبؒ نے ان پر از سر نو نظر ثانی فرمائی اور کہیں کہیں ترمیم و اضافہ بھی فرمایا اس کے بعد ان کو رسالہ کی شکل میں شائع کیا گیا ہے اہل علم دین اور جدید تعلیم یافتہ دونوں طبقوں کے لئے یہ رسالہ تحقیق اور نظر و فکر کے اعتبار سے بہت ہی جامع اور بڑا ہی مفید اور کارآمد ہے اس میں زکوٰۃ کے متعلق تمام اہم مباحث اور موضوعات مثلاً زکوٰۃ کی حقیقت۔ اس کی تاریخ، اہمیت و فرضیت۔ زکوٰۃ کس مال میں واجب ہے کس میں نہیں نصاب زکوٰۃ، مقدار زکوٰۃ، نظام زکوٰۃ، اموال باطنہ کی زکوٰۃ، مصارف زکوٰۃ، عاملین زکوٰۃ، مؤلفۃ القلوب اور فی سبیل اللہ سے کیا مراد ہے تملیک کی شرط جن کاموں میں زکوٰۃ صرف نہیں ہوسکتی، زکوٰۃ حکومت کا ٹیکس نہیں بلکہ عبادت ہے، بیت المال کی مدات کے اقسام اور ان کے احکام، غرضیکہ زکوٰۃ اور متعلقات زکوٰۃ پر سیر حاصل بحث فرما کر مسئلہ نظام زکوٰۃ کی تفصیل اور وضاحت فرمائی گئی ہے اور اس سلسلہ کے تمام شکوک و شبہات کا ازالہ فرما کر مسئلہ کو خوب اچھی طرح صاف کر دیا ہے۔

(۶) ایمان و کفر قرآن کی روشنی میں :

حضرت مفتی صاحبؒ نے بڑے سائز کے ۴۸ صفحات پر مشتمل اس تفصیلی رسالہ میں کفر و ایمان اور اسلام و مسلمان کی تعریف اور اس سے متعلقہ تمام مباحث کو جس طرح حدیث شریف اور اقوال ائمہ دین سے نہایت وضاحت و تفصیل کے ساتھ پیش فرمایا ہے اس کے ساتھ ہی اس اہم معرکۃ الآرا مسئلہ ایمان و کفر کی تعریف کے لئے بنیادی طور پر قرآن کریم سے ہی روشنی حاصل کی گئی ہے اور آیات قرآنیہ کو اس کی بنیاد بنادیا گیا ہے اس سلسلہ میں سورۃ بقرہ کی ابتدائی چند آیتوں کی تفصیلی تفسیر اور چند دوسری آیات کے مضامین پر اجمالی تبصرہ فرما کر ایمان و کفر کی تعریف کو ایسے انداز سے واضح فرما دیا گیا ہے کہ اس وضاحت کے بعد اس اختلافی اور نزاعی بحث کا ہمیشہ کے لئے فیصلہ اور خاتمہ ہوگیا جس کو تجدد پسند لوگوں نے لاینحل سمجھ کر پیش کیا تھا اور پنجاب کی تحقیقاتی عدالت میں بھی ایسے ہی طبقہ کی طرف سے یہ سوال بار بار اٹھایا جارہا تھا بحمد اللہ یہ مسئلہ ایسا صاف اور بے غبار کر دیا گیا کہ اس کے بعد کسی شک و شبہ کی گنجائش باقی نہیں رہی۔

علم تفسیر میں حضرت مفتی صاحبؒ کی یہ خدمت بھی بڑی رفیع اور نہایت درجہ ہے اور اس لحاظ سے قابل قدر ہے کہ اس کے ذریعہ ایمان وکفر کی تعریف جیسے بنیادی مسئلہ کا حل قرآن کریم کی روشنی میں کر دیا گیا ہے۔

(۷) ختم النبوۃ فی القرآن :

۰۰ ۲ صفحات پر مشتمل یہ ضخیم رسالہ حضرت مفتی صاحبؒ کی عظیم الشان تصنیف ختم نبوت کامل (دو سرے حصص) کا پہلا حصہ ہے اس میں تقریباً ایک سو آیات قرآنیہ کی تفسیر وتشریح کر کے مسئلہ ختم نبوت کے ہر پہلو کو واضح فرمایا گیا ہے زمانہ حاضرہ میں جھوٹی نبوت کے مدعی گروہ نے ختم نبوت کے متواتر و اجماعی عقیدے سے عام مسلمانوں کو برگشتہ کرنے اور اپنے دام تزویر میں پھنسا کر گمراہ کرنے کے لئے جہاں اور طرح طرح کی تلبیسات سے کام لیا گیا ہے وہاں قرآن کریم کی آیات بینات کو بھی اپنی تحریفات کا تختہ مشق بنانے سے درگذر نہیں کیا حضرت مفتی صاحبؒ نے اس رسالہ میں اس گروہ کی تمام تحریفات وتلبیسات کا پردہ چاک فرما کر شکوک وشبہات کا ازالہ فرمادیا ہے۔ حضرت مفتی صاحبؒ کا روئے سخن چونکہ ایک ایسے فرقہ کی طرف تھا جو قرآن کریم کے ماننے کا دعوی کرتا ہے اور وہ اپنے دعوئے باطلہ کے اثبات میں قرآنی آیات کو ان میں معنوی تحریف وتبدیل کر کے پیش کر رہا تھا اس لئے مسئلہ زیر بحث کو قرآن کریم کی آیات سے مدلل کر کے پیش کرنا ضروری تھا تاکہ مسئلہ کا قطعی اور واضح ثبوت قرآنی آیات سے ہی سامنے آ کر منکر کے لئے انکار کی کسی پہلو سے بھی گنجائش باقی نہ رہے اور اس پر اچھی طرح اتمام حجت ہو جائے۔ پھر چونکہ قرآن مجید ذو وجوہ ہے اور اس کلام بلاغت نظام میں بحیثیت زبان ولغت مختلف معانی کا احتمال ممکن ہے اس لئے احتمالات ممکنہ میں سے احتمال صحیح کی تعیین اور اس کی پہچان کے لئے کسی معیار کی ضرورت تھی ورنہ ہر شخص جس معنی کو چاہے گا اختیار کرے گا صحیح احتمال کی تعیین اور اختلافی بحثوں میں فیصلہ کی کوئی صورت ممکن ہی نہ رہے گی۔ اس لئے ختم نبوت کے ثبوت میں قرآن مجید کی آیات کو پیش کرنے کے ساتھ حضرت مفتی صاحبؒ نے قطع نزاع کے لئے تفسیر قرآنی کی صحت کا صحیح معیار بھی ارقام فرمادیا ہے، اس صحیح معیار کے نظر انداز کر دینے کی وجہ سے زمانہ حاضرہ میں اکثر تفسیر لکھنے والوں نے تفسیر بالرای کر کے دین میں تحریف والحاد کا دروازہ کھول دیا ہے اور چونکہ اکثر اہل قلم اور آزاد مصنفین اس غلط روش پر چل رہے ہیں اس لئے افادہ عام کے لئے صحیح تفسیر کے معیار کا حاصل ذیل میں نقل کیا جاتا ہے۔ حضرت مفتی صاحبؒ ارقام فرماتے ہیں "آج جو شخص کسی آیت کی تفسیر معلوم کرنا چاہے اس کے لئے نہایت سہل اور سلامتی کا راستہ یہ ہے کہ وہ سلف صالحین صحابہؓ وتابعین کی تفاسیر کو اپنا قدوہ بنا کر انکی اختیار کردہ تفسیر کو قرآن کی مراد سمجھے، اور جو کوئی معنی جمہور صحابہؓ وتابعین واسلاف امت کے خلاف سمجھ میں آئیں ان کو اپنی غلط فہمی اور قصور علم کا نتیجہ سمجھے" ص ۵۸،۵۷ صحیح تفسیر کے اس معیار کو پیش نظر رکھتے ہوئے حضرت مفتی صاحبؒ نے ننانوے آیات قرآنیہ سے واضح طور پر ثابت فرمادیا

ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ہر قسم کی نبوت کا خاتمہ ہو چکا ہے آپ کے بعد تو اب کوئی تشریعی نبی پیدا ہو سکتا ہے اور نہ ہی غیر تشریعی ظلی بروزی وغیرہ۔

غرضیکہ حضرت مفتی صاحبؒ نے قرآن مجید کی روشنی میں عقیدہ ختم نبوت کے ہر پہلو پر بڑی جامعیت اور تفصیل کے ساتھ قادیانی فرقے کے دجل و تلبیسات اور اس کی تحریفات و تشکیکات کا ازالہ فرما کر منکرین ختم نبوت پر خدا تعالیٰ کی حجت پوری فرما دی۔ اب بھی اگر کوئی شخص ختم نبوت پر ایمان نہ لائے تو اس کی قسمت۔ فَبِأَيِّ حَدِيثٍ بَعْدَهُ يُؤْمِنُونَ۔

(۸) ہدیۃ المہدیین فی آیات خاتم النبیین:

حضرت مفتی صاحبؒ کی یہ تالیف بھی عربی زبان میں اسی عقیدہ ختم نبوت کے سلسلہ کی تفسیری خدمت ہے عربی ممالک کے ناواقف مسلمانوں میں اس طائفہ ضالہ اور شرذمہ قلیلہ کے دجل و تلبیسات کی وجہ سے عقیدہ ختم نبوت میں شکوک و شبہات پیدا ہونے کا اندیشہ تھا۔ اس رسالہ سے ان کا ازالہ مقصود ہے یہ رسالہ نہایت جامع اور عربی ممالک کے مسلمانوں کے لئے نہایت نافع ہے۔ عربی دانوں کے شبہات کے ازالہ کیلئے آیت خاتم النبیین کی یہ تفسیر عربی زبان میں رقم فرمائی گئی ہے۔ اب محرر دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہم سب کو حضرت مفتی صاحبؒ کی تفسیری خدمات جلیلہ سے زیادہ سے زیادہ استفادہ کرنے کی توفیق عنایت فرمائیں آمین ؎

حکایت لذیذ تر بود دراز کردم۔ فقط

احقر الخدام

عبدالشکور ترمذی عفی عنہ

مدرسہ عربیہ حقانیہ ساہیوال ضلع سرگودھا

○

"آزادیٔ رائے" یا "ریسرچ" اور تحقیق کے حسین عنوانات کے فریب میں آکر اگر ہم نے اسلاف کے اعتماد اور عظمت و محبت کو ضائع کر دیا تو یقین کیجئے کہ یہ ہمارے لیے بڑا مہنگا سودا ہوگا۔ تحقیق ہمارے ہاتھ نہ آئے گی اور اسلاف کی ڈگر ہم سے چھوٹ جائے گی"

(مفتی اعظمؒ: طلبا کے نام۔ ص ۱۳)

مولانا سلیم اللہ خان صاحب
مہتمم جامعہ فاروقیہ کراچی

حضرت مفتی اعظم رحمۃ اللہ علیہ اور اُن کی تفسیر

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو فتوی کے باب میں اللہ تعالیٰ نے جو شہرت عطا فرمائی وہ ہر صاحب علم وفضل پر ظاہر ہے دارالعلوم دیوبند میں ایک دراز مدت تک اس خدمت پر فائز رہنا اصحاب علم وبصیرت کے نزدیک لائق صد رشک اعزاز ہے پھر حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے تلمذ اور استفادہ اور حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی علمی، فقہی، اخلاقی اور روحانی تربیت وہ قیمتی اور نادرِ روزگار نعمت تھی کہ جس کو یہ نعمت مل گئی وہ پھر جہاں بھی رہا ہمیشہ اپنے اقران وامثال میں ممتاز اور یگانۂ روزگار ہی ثابت ہوا ہم جب عام افراد و اشخاص میں یہ انفرادیت برملا دیکھتے ہیں تو حضرت مفتی صاحبؒ تو پھر دارالعلوم دیوبند کے ایک ہونہار اور لائق فرزند تھے اور حضرت الشیخؒ نے جن عنایات خسروانہ اور الطاف کریمانہ کے ساتھ ان پر توجہ مبذول فرمائی تھی اس کا لازمی نتیجہ وہی کچھ ہونا تھا جس کو ہم نے حضرت مفتی صاحبؒ کی شخصیت میں متشکل پایا ہے دیگر اہل کمال اور ماہر اساتذہ کرام کے ساتھ حضرت العلامہ بحر العلوم فنون نقلیہ وعقلیہ کے امام برحق قرآن وسنت کے علوم کے بے مثال اور بے نظیر فاضل حضرت مولانا محمد انور شاہ کشمیریؒ سے تلمذ کی نسبت نے بھی اس در بے بہا کو آب وتاب عطا کرنے میں بڑی سخاوت سے کام لیا تھا۔ اسی لئے جہاں ایک طرف برصغیر کے سب سے بڑے اور مبارک علمی، دینی، روحانی اور فکری مرکز دارالعلوم دیوبند میں حدیث و فقہ اور دیگر علوم کی تدریس کا شرف من جانب اللہ عطا کیا گیا وہیں صدر دارالافتاء کے منصب جلیل پر بھی حق تعالیٰ نے آپ کو فائز فرمایا اور طویل مدت تک اس منصب پر رہ کر آپ نے سینکڑوں اور ہزاروں علمی اور فقہی مسائل اور نکات کا استخراج فرما کر خلق خدا کی رہنمائی کی پھر پاکستان تشریف لانے کے بعد دستور اسلامی کی

تدوین میں برسہا برس اپنی خداداد حذاقت ومہارت کو صرف فرمایا! افسوس ہے کہ یہاں کے عاقبت نااندیش اور ناخداترس حکمرانوں نے اس کی قدر نہ کی جا اسی کے ساتھ فتویٰ کا کام بھی جاری رہا اور پاکستان، ہندوستان اور دیگر ممالک سے برابر استفتاء آتے رہے اور حضرت مفتی صاحبؒ بلاتفریق تمام اہل اسلام کی خدمت کرتے رہے اور پاکستان اور ہندوستان کے جائز درجہ مفتی اعظم قرار پائے۔

لیکن اہل علم اور اصحاب فضل وکمال کے علاوہ کون جانتا تھا کہ یہ مفتی اعظم مولانا مفتی محمد شفیع صاحب جس طرح مفتی اعظم ہیں اسی طرح مفسر اعظم بھی ہو سکتے ہیں۔ ریڈیو پاکستان پر درس قرآن حکیم کا سلسلہ شروع ہوا اس کی افادیت کو دیکھکر اپنوں اور غیروں نے اس کو مرتب کر لینے کی فرمائش اور درخواست کی حضرت مفتی صاحبؒ نے جب اس کو مرتب فرمایا تو واقعہ یہ ہے کہ اکثر وبیشتر حصہ وہ ہے جو بستر علالت پر مرتب ہوا تندرستی اور قوت کے زمانہ کو لوگ غفلت اور لایعنی میں اس طرح گذار دیتے ہیں کہ وقت گذرنے کا احساس تک نہیں ہوتا مگر ان حضرات کا ہی یہ کمال دیکھا کہ وقت کی صحیح قدر وقیمت کا ان کو شدید احساس رہتا ہے اور اگر یہ کہا جائے کہ لمحہ دو لمحہ بھی ان کے یہاں ضائع نہیں ہونے پاتا تو شاید یہ مبالغہ نہ ہوگا۔ اس حقیقت کا زندۂ جاوید ثبوت تفسیر معارف القرآن ہے جو زیادہ تر مرض وضعف اور عمر کے ان آخری ایام میں لکھی گئی ہے جب کہ انسان تفریحی مشاغل سے بھی لطف اندوز ہونے کے قابل نہیں رہتا۔

تفسیر کا مختصر تعارف: معارف القرآن میں جلد نمبرا میں آیات لکھنے کے بعد ترجمہ کا عنوان دے کر اور بعد کی، جلدوں میں بین السطور جو ترجمہ دیا گیا ہے وہ حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن دیوبندی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا ترجمہ ہے جو دراصل شاہ عبدالقادر صاحب دہلویؒ کا ترجمہ ہے اس کے بعد اکثر وبیشتر ربط آیات کی سرخی قائم کی گئی ہے جس میں زیادہ تر تفسیر بیان القرآن مؤلفہ حکیم الامت حضرت تھانویؒ سے استفادہ کیا گیا ہے۔ اس کے بعد خلاصہ تفسیر کا عنوان آتا ہے اس عنوان کے تحت بیان القرآن مذکور کے خلاصہ تفسیر کو نقل کیا گیا ہے جس میں حضرت تھانویؒ کا ترجمہ اور مختصر تفسیر دونوں موجود ہیں کہیں مشکل الفاظ آگئے ہیں تو ان کی تشریح کا اضافہ کر دیا گیا ہے اس طرح حضرت حکیم الامتؒ کی تفسیر سے کما حقہ استفادہ کیا گیا ہے۔ حضرت حکیم الامت کا ترجمہ بھی معارف القرآن کا جزو بن گیا اور ان کی تفسیر بھی معارف القرآن میں شامل ہوگئی اور اس طریقہ سے بیان القرآن کی عظمت وافادیت کو چار چاند لگانے میں حضرت مفتی صاحبؒ نے بے مثال کردار ادا کیا اس کے بعد معارف ومسائل کا عنوان قائم کیا گیا ہے یہی عنوان تفسیر معارف القرآن

کی جان اور اس تفسیر کا طرۂ امتیاز ہے۔ حضرت مفتی صاحبؒ کے فقہی ذوق اور فتویٰ میں ان کی مہارت و حذاقت اور علم و کمال میں ان کا امتیاز ان کے مزاج کی اعتدال پسندی اور میانہ روی عامۃ الناس کی ضروریات پر ان کی نظر دقیق و رقیق مسائل کو سہل سے سہل عنوان کے ساتھ ادا کرنے پر ان کی قدرت عصر حاضر کے مزاج اور تقاضوں پر ان کی مضبوط گرفت وغیرہ وغیرہ کمالات کا یہ عنوان جیتا جاگتا مرقع ہے بے شک حضرت مفتی صاحبؒ نے اس عنوان کے تحت جس قدر معارف و مسائل تفصیل کے ساتھ ذکر فرمائے ہیں ان میں ان کی فقہی مہارت کا بڑا دخل ہے لیکن راقم الحروف کا خیال ہے کہ ان مباحث میں فقہ کے علاوہ تصوف کے مسائل اور لطائف پر خاصی بحثیں آگئی ہیں تاریخی مباحث سے بھی کماحقہ اعتناء کیا گیا ہے کلامی مباحث کو بھی تشنہ نہیں چھوڑا گیا استنباط احکام کے سلسلہ میں علم حدیث سے جس قدر اعتناء کی ضرورت تھی اس کو پورے طور پر ملحوظ خاطر رکھ کر احکام درج کئے گئے ہیں عصری ضروریات اور زمانۂ حال کے تقاضوں کو پیش نظر رکھ کر قرآن کریم کا پیغام امت کے سامنے رکھ دیا گیا ہے تاکہ کوئی یہ کہہ کر چھٹی نہ پاسکے کہ چودہ سو سال پہلے نازل شدہ قرآن آج کے درد کا مداوی پیش نہیں کرسکتا مستدمین، زائغین اور ملحدین کے شکوک اور اعتراضات کا کافی شافی طریقہ پر ازالہ کیا گیا ہے۔ معارف و مسائل کی تقریر اور شکوک و شبہات کے ازالہ کے لیے مثالوں کو اس خوبصورتی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے کہ معمولی سمجھ کا آدمی بھی آسانی سے مدعا کو سمجھ سکتا ہے۔

اب ہم معارف القرآن کے چند اقتباسات پیش کرتے ہیں جن سے ہمارے دعوے کی آپ تصدیق کرسکیں گے۔

"روز جزا کی حقیقت اور عقلاً اس کی ضرورت" کا عنوان قائم فرما کر پہلی بات کی وضاحت یوں کی گئی ہے کہ روز جزا اس دن کا نام ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے نیک و بد اعمال کا بدلہ دینے کے لیے مقرر فرمایا ہے لفظ "روز جزاء" سے ایک عظیم الشان فائدہ یہ حاصل ہوا کہ دنیا نیک و بد اعمال کی جزاء و سزا کی جگہ نہیں بلکہ ایک دار العمل فرض ادا کرنے کا دفتر ہے تنخواہ یا صلہ وصول کرنے کی جگہ نہیں اس سے معلوم ہوگیا کہ دنیا میں کسی کو عیش و عشرت دولت و راحت سے مالا مال دیکھ کر یہ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ اللہ کے نزدیک مقبول و محبوب ہے یا کسی کو رنج و مصیبت میں مبتلا پاکر یہ نہیں قرار دیا جاسکتا کہ وہ اللہ کے نزدیک معتوب و مبغوض ہیں جس طرح دنیا کے دفتروں میں اور کارخانوں میں کسی کو اپنا فرض ادا کرلے

میں مصروف محنت، دیکھا جائے تو کوئی عقلمند اس کو مصیبت زدہ نہیں کہتا اور نہ وہ خود اپنی مشقت کے باوجود اپنے آپ کو گرفتار مصیبت سمجھتا ہے بلکہ وہ اس محنت و مشقت کو اپنی سب سے بڑی کامیابی تصور کرتا ہے اور کوئی مہربان اس کو اس مشقت سے سبکدوش کرنا چاہے تو وہ اس کو اپنا بدترین دشمن خیال کرتا ہے کیونکہ وہ اس تیس روزہ محنت کے پس پردہ اس راحت کو دیکھ رہا ہے جو اس کو تنخواہ کی شکل میں ملنے والی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اس دنیا میں انبیاء علیہم السلام اور ان کے بعد اولیاء اللہ سب سے زیادہ مصیبت و بلا میں مبتلا ہوتے ہیں اور وہ اپنی اس حالت پر نہایت مطمئن اور بسا اوقات مسرور نظر آتے ہیں۔ الخ

سورۂ فاتحہ ص ۲۵ ج ما

اس مثال میں اللہ کے نیک بندوں کے لیے جو ابتلاءات دنیا میں بکثرت پیش آتے ہیں اور ان کی زندگی بظاہر رنج و محن کا مجموعہ نظر آتی ہے اس کو کس خوبی کے ساتھ سمجھا کر شکوک و شبہات کا قلع قمع کر دیا گیا ہے۔

اسی سورۂ فاتحہ میں صراط الذین انعمت علیہم کے ذیل میں کتاب اللہ کے ساتھ رجال اللہ کی ضرورت پر گفتگو کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں، اور یہ ایک ایسی حقیقت ہے کہ جو دنیا کے تمام کاروبار میں مشاہد ہے کہ محض کتابی تعلیم سے نہ کوئی کپڑا سینا سیکھ سکتا ہے نہ کھانا پکانا نہ ڈاکٹری کی کتاب پڑھ کر کوئی ڈاکٹر بن سکتا ہے نہ انجینئری کی کتابوں کے محض مطالعے سے کوئی انجینئر بنتا ہے اسی طرح قرآن و حدیث کا محض مطالعہ انسان کی تعلیم اور اخلاقی تربیت کے لیے ہرگز کافی نہیں ہو سکتا جب تک اس کو کسی محقق ماہر سے باقاعدہ حاصل نہ کیا جائے قرآن و حدیث کے معاملے میں بہت سے لکھے پڑھے آدمی اس مغالطے میں مبتلا ہیں کہ محض ترجمے یا تفسیر دیکھ کر وہ قرآن کے ماہر ہو سکتے ہیں یہ بالکل فطرت کے خلاف تصور ہے اگر محض کتاب کافی ہوتی تو رسولوں کے بھیجنے کی ضرورت نہ تھی کتاب کے ساتھ رسول کو معلم بنا کر بھیجا اور صراط مستقیم کو متعین کرنے کے لیے اپنے مقبول بندوں کی فہرست دینا اس کی دلیل ہے کہ محض کتاب کا مطالعہ تعلیم و تربیت کے لیے کافی نہیں بلکہ کسی ماہر سے سیکھنے کی ضرورت ہے۔

معلوم ہوا کہ انسان کی صلاح و فلاح کے لیے دو چیزیں ضروری ہیں ایک کتاب اللہ جس میں انسانی زندگی کے ہر شعبہ سے متعلقہ احکام موجود ہیں دوسرے رجال اللہ یعنی اللہ والے ان سے استفادے

کی صورت یہ ہے کہ کتاب اللہ کے معروف اصول پر رجال اللہ کو پرکھا جائے جو اس معیار پر نہ اتریں ان کو رجال اللہ ہی نہ سمجھا جائے اور جب رجال اللہ صحیح معنی میں حاصل ہو جائیں تو ان سے کتاب اللہ کا مفہوم سیکھنے اور عمل کرنے کا کام لیا جائے۔" سورۃ فاتحہ ص ۳۰ جلد نمبرا۔

میاں کتاب اللہ کے ساتھ رجال اللہ کی ضرورت کو جس مثال سے ذہن نشین کرایا گیا ہے کیا اس کے بعد بھی کسی منصف مزاج کے انکار کی گنجائش ہے۔ زائغین کے شبہ کا اس مثال سے کس قدر خوبصورت طریقہ پر ازالہ کیا گیا ہے۔

آلہ مکبر الصوت کی آواز پر نماز میں نقل وحرکت کے مفسد نماز نہ ہونے پر استدلال کے زیر عنوان تحریر ہے۔ صحیح بخاری باب ماجاء فی القبلہ میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی حدیث جو قبا میں تحویل قبلہ کا حکم پہنچنے اور ان لوگوں کے بحالت نماز بیت اللہ کی طرف پھر جانے کا واقعہ ذکر کیا، اس پر علامہ عینی حنفیؒ نے تحریر فرمایا ہے :-

فیہ جواز تعلیم من لیس فی الصلوٰۃ من ھو فیھا۔ (عمدۃ القاری ص ۱۴۹ ج ۴)	یعنی اس حدیث سے ثابت ہوا کہ جو شخص نماز میں شریک نہیں وہ کسی نماز پڑھنے والے کو تعلیم و تلقین کر سکتا ہے۔

نیز علامہ عینی نے دوسری جگہ اس حدیث کے ذیل میں یہ الفاظ لکھے ہیں، وفیہ استماع المصلی لکلام من لیس فی الصلوٰۃ فلا یضر صلوتہ (الی) ھکذا استنبط الطحاوی۔ (عمدۃ القاری ص ۲۴۲ ج ۱)

اور عام فقہاء حنفیہ نے جو خارج صلوٰۃ کسی شخص کی اقتداء اور اتباع کو مفسد نماز کہا ہے جو عام متون و شروح حنفیہ میں منقول ہے اس کا منشاء یہ ہے کہ نماز میں غیر اللہ کے امر کا اتباع موجب فساد نماز ہے لیکن اگر کوئی شخص اتباع امر الٰہی کا کرے مگر اس اتباع میں کوئی دوسرا شخص واسطہ بن جائے وہ موجب فساد نہیں۔

فقہاء نے جہاں یہ مسئلہ لکھا ہے کہ کوئی شخص جماعت میں شریک ہونے کے لیے ایسے وقت پہنچے کہ اگلی صف پوری ہو چکی ہوں اب پچھلی صف میں تنہا رہ جاتا ہے تو اس کو چاہیئے کہ اگلی صف میں سے کسی آدمی کو پیچھے کھینچ کر اپنے ساتھ ملالے اس میں بھی یہی سوال آتا ہے کہ اس کے کہنے سے جو پیچھے آجائے گا وہ نماز میں اتباع امر غیر اللہ کا کرے گا اس لیے اس کی نماز فاسد ہو جانی چاہیئے لیکن در مختار

باب الامامۃ میں اس مسئلہ کے متعلق تحریر فرمایا ثم نقل تصحیح عدم الفساد فی مسئلۃ من جذب من الصف فتأخر فهل ثم فرق فلیحرر، اس پر علامہ طحطاوی نے تحریر فرمایا لانه امتثل امر اللہ یعنی اس صورت میں نماز فاسد نہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ درحقیقت اس شخص نے آنے والے کے حکم کا اتباع نہیں کیا بلکہ امر الٰہی کا اتباع کیا ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ اس کو پہنچا ہے کہ جب ایسی صورت پیش آئے تو اگلی صف والے کو پیچھے آجانا چاہیئے۔

اسی طرح شرنبلالی نے شرح وہبانیہ میں اس مسئلہ کا ذکر کر کے پہلے فساد نماز کا قول نقل کیا پھر اس کی تردید کی اس کے الفاظ یہ ہیں:۔ اذا قیل لمصل تقدم فتقدم (الی) فسدت صلوته لانه امتثل امر غیر اللہ فی الصلوۃ ...... انما هو لامر رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم فلا یضر اھ

ان تمام روایات سے ثابت ہوا کہ اگر کوئی نمازی کی آواز پر عمل کرے تو اس کی دو صورتیں ہیں، ایک یہ کہ خود اس شخص کی دلداری اور اتباع مقصود ہو یہ تو مفسد نماز ہے، لیکن اگر اس نے کوئی حکم شرعی بتلایا اور اس کا اتباع نمازی نے کر لیا تو وہ درحقیقت امر الٰہی کا اتباع ہے اس لیے مفسد نماز نہیں ہوگا اسلئے طحطاوی نے فیصلہ یہی کیا ہے کہ اقول لوقیل بالتفصیل بین کونه امتثل امر الشارع فلا تفسد و بین کونه امتثل امر الداخل مراعاۃ لخاطره من غیر نظر لامر الشارع فتفسد لکان حسنا - (طحطاوی علی الشرح ۲۴۲ ج ۲)

اب مسئلہ زیر بحث یعنی آلہ مکبر الصوت کا فیصلہ کر لینا آسان ہو گیا کیونکہ وہاں اس آلے کے اتباع کا دور دور بھی وہم نہیں ہو سکتا ظاہر ہے کہ اتباع رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس حکم کا ہوتا ہے کہ جب امام رکوع کرے تو رکوع کرو جب وہ سجدہ کرے تو تم بھی سجدہ کرو اس آلہ سے صرف یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ اب امام رکوع میں گیا یا سجدہ میں جا رہا ہے اس علم کے بعد اتباع امام کا کرتا ہے نہ کہ اس آلے کے حکم کا اور اتباع امام ایک حکم الٰہی ہے۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔ سورۃ بقرۃ ص ۲۲۱ ج ۱۔ سورۃ بقرہ کی آیت ۴۳ کے تحت احکام و مسائل کے زیر عنوان عبداللہ بن عمرؓ کی جس روایت کا اقتباس مندرجہ بالا میں حوالہ گذرا ہے قرآن و حدیث کا ہر طالب علم جانتا ہے کہ اس گفتگو میں اس کا ذکر ناگزیر ہے لو یہیں پہ خبر واحد کی حجیت اور لائق استناد ہونے کی بحث بھی سامنے آتی ہے خبر واحد سے کسی حکم قطعی کے

منسوخ قرار دیے جانے یا غیر منسوخ قرار دیے جانے کا ضابطہ بھی زیر غور آ آیا ہے حضرت مفتی صاحبؒ نے ان تمام مسائل سے فارغ ہوکر آلۂ مکبر الصوت کے لیے جو استنباط اس حدیث سے فرمایا ہے اس کو آپ نے ملاحظہ فرمایا اس میں جہاں زمانۂ حال کی ایک ضرورت پر فقیہانہ انداز میں استدلال کیا گیا ہے، وہیں یہ کتنی بڑی بات ہے کہ حدیث سے استدلال کے لیے اس اصول کو نظر انداز نہیں ہونے دیا گیا جو پہلے سے مسلسل چلا آ رہا ہے نئی پیش آنے والی صورت حال کے لیے سابقہ اصول کو کارآمد دکھایا گیا ہے اور اس کی پوری پوری رعایت کرتے ہوئے جدید حکم کا استخراج فرمایا ہے عصری ضرورت کے لحاظ استنباط حکم میں حدیث رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اعتناء، اور علمی و فقہی شبہات کے ازالہ کی یہ اقتباس کتنی اچھی مثال ہے حضرت مفتی صاحبؒ کے طرز استدلال نے علماء و فقہا اور فضلاء و سائنس کی اس بحث کا سرے ہی سے خاتمہ کر دیا کہ اسپیکر کی آواز متکلم کی اصل آواز ہے یا پھر صدائے بازگشت ہے اگر وہ متکلم کی اصل آواز نہیں بھی ہے تب بھی اس کا استعمال اتباع امام میں مخل نہیں سبحان اللہ یوتی الحکمۃ من اناب ویذلل الصعاب لمن اصاب سورۂ آل عمران کی آیت ۱۰۲، ۱۰۳ کی تفسیر کے بعد معارف و مسائل کے زیر عنوان "مسلمانوں کی اجتماعی قوت کے دو اصول، تقویٰ اور باہمی اتفاق" کی سرخی لگا کر تقویٰ کی حقیقت بیان کی گئی ہے، تقویٰ کے تین درجات ذکر کیے گئے ہیں پھر "حق تقویٰ کیا ہے؟" کے عنوان کے تحت آئمہ تفسیر کے اقوال پیش کیے گئے ہیں اس کے بعد "مسلمانوں کی اجتماعی قوت" کا دوسرا اصول باہمی اتفاق" کو نمایاں لکھ کر باہمی اتفاق و ارتباط کا نسخۂ اکسیر درج کیا گیا ہے اور اس کی نہایت حسین تشریح فرمائی ہے۔ آگے چل کر سرخی ہے "پوری مسلم قوم کا اتفاق صرف اسلام ہی کی بنیاد پر ہو سکتا ہے نسبی اور وطنی وحدت سے یہ کام نہیں ہو سکتا" اس عنوان کے تحت رقم ہے" یہاں سب سے پہلے یہ جاننا لازمی ہے کہ وحدت و اتفاق کے لیے ضروری ہے کہ اس وحدت کا کوئی خاص مرکز ہو پھر مرکز وحدت کے بارے میں اقوام عالم کی راہیں مختلف ہیں کہیں نسلی اور نسبی رشتوں کو مرکز وحدت سمجھا گیا جیسے قبائل عرب کی وحدت تھی کہ قریش ایک قوم اور بنو تمیم دوسری قوم سمجھی جاتی تھی اور کہیں رنگ کا امتیاز اس وحدت کا مرکز بن رہا تھا کہ کالے لوگ ایک قوم اور گورے دوسری قوم سمجھے جاتے کہیں وطنی اور لسانی وحدت کو مرکز اتحاد بنایا ہوا تھا کہ ہندی ایک قوم اور عربی ایک، کہیں آبائی رسوم و رواج کو مرکز وحدت بنایا گیا تھا کہ جو ان رسوم کے پابند ہیں وہ ایک قوم اور جو ان کے پابند نہیں

وہ دوسری قوم جیسے ہندوستان کے ہندو اور آریہ سماج وغیرہ۔

قرآن کریم نے ان سب کو چھوڑ کر مرکز وحدت حبل اللہ قرآن کریم کو یعنی اللہ تعالیٰ کے بھیجے ہوئے نظام محکم کو قرار دیا اور دو ٹوک فیصلہ کر دیا کہ مومن ایک قوم ہے جو حبل اللہ سے وابستہ ہے اور کافر دوسری قوم جو اس حبل متین سے وابستہ نہیں خلقکم فمنکم کافر و منکم مومن کا یہی مطلب ہے۔ جغرافیائی وحدتیں ہرگز اس قابل نہیں کہ ان کو مرکز وحدت بنایا جائے چونکہ وہ وحدتیں عموماً غیر اختیاری امور ہیں جن کو کوئی انسان اپنے سعی و عمل سے حاصل نہیں کر سکتا جو کالا ہے وہ گورا نہیں ہو سکتا، جو قریشی ہے وہ تمیمی نہیں بن سکتا جو ہندی ہے وہ عربی نہیں بن سکتا اس لیے ایسی وحدتیں بہت ہی محدود دائرے میں ہو سکتی ہیں ان کا دائرہ کبھی اور کہیں پوری انسانیت کو اپنی وسعت میں لے کر پوری دنیا کو ایک وحدت میں جمع کرنے کا دعوے کر ہی نہیں سکتا اس لیے قرآن کریم نے مرکز وحدت حبل اللہ یعنی قرآن اور خدا تعالیٰ کے بھیجے ہوئے نظام حیات کو بنایا جس کا اختیار کرنا امر اختیاری ہے کوئی مشرق کا بسنے والا ہو یا مغرب کا، گورا ہو یا کالا، عربی زبان بولتا ہو یا سندی و انگریزی کسی قبیلہ کسی خاندان کا ہو ہر شخص اس معقول اور صحیح مرکز وحدت کو اختیار کر سکتا ہے اور دنیا بھر کے پورے انسان اس مرکز وحدت پر جمع ہو کر بھائی بھائی بن سکتے ہیں اور اگر وہ آبائی رسم و رواج سے ذرا بلند ہو کر غور کریں تو ان کو اس کے سوا کوئی معقول اور صحیح راہ ہی نہ ملے گی کہ خدا تعالیٰ کے بھیجے ہوئے نظام کو پہچانیں اور اس کا اتباع کر کے حبل اللہ کو مضبوطی سے تھام لیں جس کا نتیجہ ایک طرف یہ ہوگا کہ پوری انسانیت ایک مضبوط و مستحکم وحدت سے مربوط ہو جائے گی۔

دوسرا یہ کہ اس وحدت کا ہر فرد اللہ تعالیٰ کے بھیجے ہوئے نظام کے مطابق اپنے اعمال و اخلاق کی اصلاح کر کے اپنی دنیوی اور دینی زندگی کو درست کر لے گا یہ وہ حکیمانہ اصول ہے جس کو لے کر ایک مسلمان ساری دنیا کی اقوام کو للکار سکتا ہے کہ یہی صحیح راستہ ہے اس طرف آؤ اور مسلمان اس پر جتنا بھی فخر کریں بجا ہے لیکن افسوس ہے کہ یورپ والوں کی گہری سازش جو اسلامی وحدت کو پارہ پارہ کرنے کے لیے صدیوں سے چل رہی ہے وہ خود اسلام کے دعوے داروں میں کامیاب ہو گئی اب امت اسلامیہ کی وحدت عربی، مصری، ہندی، سندھی میں بٹ کر پارہ پارہ ہو گئی قرآن کریم کی یہ آیت ہر وقت اور ہر جگہ ان سب کو باآواز بلند یہ دعوت دے رہی ہے کہ یہ جاہلانہ امتیازات درحقیقت امتیازات

ہیں اور نہ ان کی بنیاد پر قائم ہونے والی وحدت کوئی معقول وحدت ہے اس لیے اعتصام بحبل اللہ کی راہ
اختیار کریں جس نے ان کو پہلے بھی ساری دنیا میں غالب اور فائق اور سربلند بنایا اور اگر پھر ان کی قسمت میں
کوئی خیر مقدر ہے تو وہ اسی راستے سے مل سکتی ہے۔" الخ (سورۂ آل عمران ص۱۲۹ جلد ۲)

اس اقتباس میں دور حاضر کے تازہ خداؤں کا کس قدر مؤثر تعاقب کیا گیا ہے اور اسلامی نقطۂ نظر
کتنے اعتماد و یقین کے ساتھ پیش کیا گیا ہے وہ محتاج وضاحت نہیں۔

سورۂ نساء کی تفسیر میراث کے مسائل و معارف کلالہ و پوتے کی میراث وغیرہ کے احکام خوب
بسط و تفصیل اور دلائل و حوالجات کے ساتھ لکھے گئے ہیں۔ اسی صورت میں آیت نمبر ۲۲ تا ۲۴ کے
ذیل میں محرمات کی تفصیلات اور متعلقہ مسائل کو جس جامع انداز میں پیش کیا گیا ہے وہ شاید اسی تفسیر
کی خصوصیت ہے البتہ متعہ کی بحث میں تشنگی بھی محسوس ہوئی اور تحقیق پر بھی نظرثانی کی ضرورت معلوم
ہوتی ہے۔

سورۂ مائدہ کی آیت نمبر ۳۳ و ۳۴ کے تحت شرعی سزاؤں کی اقسام ثلٰثہ حدود، قصاص اور تعزیرات
کے باہمی فرق کو واضح کیا گیا ہے اور اسلامی سزاؤں کی حکمت بیان کی گئی ہے اور ان کے احکام بتائے
گئے ہیں اسی کے ساتھ "قرآنی قوانین کا عجیب و غریب انقلابی اسلوب" کی سرخی لگا کر تحریر فرمایا
ہے "پہلی آیتوں میں ہابیل کا واقعہ قتل اور اس کے جرم عظیم ہونا مذکور تھا مذکورہ آیات میں اور ان
کے بعد قتل و غارت گری ڈاکہ زنی اور چوری کی شرعی سزاؤں کا بیان ہے ڈاکہ اور چوری کی سزاؤں کے
درمیان خوف خدا اور بذریعہ اعمال صالحات اس کا قرب حاصل کرنے کی تلقین ہے قرآن کریم کا یہ اسلوب نہایت
لطیف طریقہ پر ذہنی انقلاب پیدا کرنے والا ہے کہ وہ دنیا کی تعزیرات کی کتابوں کی طرح صرف جرم و سزا
کے بیان پر کفایت نہیں کرتا بلکہ ہر جرم و سزا کے ساتھ خوف خدا و آخرت مستحضر کر کے انسان کا رخ ایک
ایسے عالم کی طرف موڑ دیتا ہے جس کا تصور اس کو ہر عیب و گناہ سے پاک کر دیتا ہے اور اگر حالات و
واقعات پر غور کیا جائے تو ثابت ہوگا کہ خوف خدا و آخرت کے بغیر دنیا کا کوئی قانون پولیس اور فوج
دنیا میں انسداد جرائم کی ضمانت نہیں دے سکتی قرآن کا یہی اسلوب حکیمانہ اور مربیانہ طرز ہے جس نے
دنیا میں انقلاب برپا کیا اور ایسے انسانوں کا ایک معاشرہ پیدا کیا جو اپنے تقدس میں فرشتوں سے بھی
اونچا مقام رکھتے ہیں۔" سورۂ مائدہ ص۱۲۳ جلد نمبر ۳۔

کیسی صحیح حقیقت کو واشگاف کیا گیا ہے کس طرح قرآنی اسلوب کی دلنشین تشریح کی جا رہی ہے اور زمانہ حال کے اصحاب غفلت کو کس طرح جھنجھوڑا گیا ہے غور فرمائیں۔

"معارف القرآن" میں معاصر تفسیروں کی اغلاط پر بھی گرفت کی گئی ہے، سورۂ یونس کی آیات ۹۲ تا ۹۸ کے نیچے معارف و مسائل کے عنوان میں ایک معاصر کے یہ الفاظ نقل فرمائے ہیں۔

"قرآن کے اشارات اور صحیفہ یونس کی تفصیلات پر غور کرنے سے اتنی بات صاف معلوم ہو جاتی ہے کہ حضرت یونس علیہ السلام سے فریضۂ رسالت ادا کرنے میں کچھ کوتاہیاں ہو گئیں تھیں اور غالباً انہوں نے بے صبر ہو کر قبل از وقت اپنا مستقر چھوڑ دیا تھا اس لیے جب آثار عذاب دیکھ کر آشوریوں نے توبہ و استغفار کی تو اللہ تعالیٰ نے انہیں معاف کر دیا قرآن میں خدائی دستور کے جو اصول و کلیات بیان کئے گئے ہیں ان میں ایک مستقل دفعہ یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی قوم کو اس وقت تک عذاب نہیں دیتا جب تک اس پر اپنی حجت پوری نہیں کر دیتا پس جب نبی ادائے رسالت میں کوتاہی کر گیا اور اللہ کے مقرر کردہ وقت سے پہلے خود ہی اپنی جگہ سے ہٹ گیا تو اللہ تعالیٰ کے انصاف نے اس قوم کو عذاب دینا گوارا نہ کیا۔" (تفہیم القرآن مولانا مودودی ص۳۱۲ ج۲)

اس کے بعد عصمت انبیاء کی مختصر تفصیل بیان فرما کر مفتی صاحب ارشاد فرماتے ہیں، "لیکن اس میں کسی فرقہ کسی شخص کا اختلاف نہیں ہے کہ انبیاء علیہم السلام سب کے سب ادائے رسالت کے فریضہ میں کبھی کوتاہی نہیں کر سکتے کیونکہ انبیاء کے لیے اس سے بڑا کوئی گناہ نہیں ہو سکتا کہ جس منصب کے لیے اللہ تعالیٰ نے ان کا انتخاب فرمایا ہے خود اسی میں کوتاہی کر بیٹھیں یہ تو فرض منصبی میں کھلی ہوئی خیانت ہے جو عام شریف انسانوں سے بھی بعید ہے اس کوتاہی سے بھی اگر پیغمبر معصوم نہ ہوا تو پھر دوسرے گناہوں سے عصمت بے فائدہ ہے۔ قرآن و سنت کے مسلمہ اصول اور اجماعی عقیدہ عصمت انبیاء کے بظاہر خلاف اگر کسی جگہ قرآن و حدیث میں بھی کوئی بات نظر آتی تو اصول مسلمہ کی رو سے ضروری تھا کہ اس کی تفسیر و معنی کی ایسی توجیہ تلاش کی جاتی جس سے وہ قرآن و حدیث کے قطعی الثبوت اصول سے متصادم و مختلف نہ رہے۔

مگر یہاں تو عجیب بات یہ ہے کہ مصنف موصوف نے جس بات کو قرآنی اشارات اور صحیفہ یونس کی تفصیلات کے حوالہ سے پیش کیا ہے۔ وہ صحیفۂ یونس میں ہو تو ہو جس کا اہل اسلام میں کوئی

اعتبار نہیں۔ قرآنی اشارہ تو ایک بھی نہیں بلکہ ہوا یہ کہ کئی مقدمے جوڑ کر یہ نتیجہ زبردستی نکالا گیا ہے ۔ پہلے تو یہ فرض کر لیا گیا کہ قوم یونسؑ سے عذاب کا ٹل جانا خدائی دستور کے خلاف واقع ہوا ہے جو خود اسی آیت کے سیاق و سباق کے بھی بالکل خلاف ہے اور اہل تحقیق ائمہ تفسیر کی تصریحات کے بھی خلاف ہے اس کے ساتھ یہ فرض کر لیا گیا کہ خدائی قانون کو اس موقع پر اس لیے توڑا گیا تھا کہ خود پیغمبر سے فریضۂ رسالت کی ادائیگی میں کوتاہیاں ہو گئی تھیں ، اس کے ساتھ یہ بھی فرض کر لیا کہ پیغمبر کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی خاص وقت نکلنے کا مقرر کر دیا گیا تھا وہ اس وقت مقرر سے پہلے فریضۂ دعوت کو چھوڑ کر بھاگ کھڑے ہوئے اگر ذرا بھی غور و انصاف سے کام لیا جائے تو ثابت ہو جائے گا کہ قرآن و حدیث کا کوئی اشارہ ان فرضی مقدمات کی طرف نہیں پایا جاتا۔ (سورہ یونس ص ۵۶/۴)

اس کے بعد تفصیل سے آیت کے مفہوم و مضمون پر گفتگو ہے اور ثابت کیا گیا ہے کہ معاصر موصوف نے خوامخواہ قرآنی اشاروں کا سہارا لے کر ایک غلط بات اپنی تفسیر میں داخل کر دی ہے ۔ واللہ تعالیٰ جہل مرکب کے شر سے امت مسلمہ کی حفاظت فرمائے آمین ۔

سورۂ یٰسین کی آیت نمبر ۳۸ ص ۳۸۵ ج ۷ پر معارف و مسائل کے زیر عنوان گفتگو کرتے ہوئے آفتاب کے زیر عرش سجدہ کرنے کی تحقیق انیق ایسے انداز میں قلم بند ہوئی ہے کہ ایک طرف تو ان تمام اشکالات کا رد ہو گیا ہے جو از روئے مشاہدہ و نفس الامر حدیث ابوذرؓ پر وارد ہوتے تھے یا ہیئت اور فلکیات کے اصول کی بنیاد پر حدیث مذکور کے مضمون کو مشکل قرار دیتے تھے دوسرے بطلیموسی نظریہ کی تردید بھی اس ضمن میں آ گئی ہے کہ سورج چوتھے آسمان میں مرکوز ہے تیسرے مستقر کی تشریح مستقر مکانی سے کی گئی ہے جیسا کہ احادیث سے یہی متبادر ہے پھر آفتاب کے زیر عرش سجدہ وغیرہ کرنے کے سلسلہ میں دوسرے جواب کے علاوہ حضرت العلامہ مولانا شبیر احمد صاحب عثمانیؒ کا ان کے مقالہ "سجود الشمس" والا جواب اس عمدہ طریقہ پر بیان فرمایا ہے کہ فلکیات کے اس دقیق مسئلہ کو سمجھنے کے لیے ایک عامی انسان بھی ذرا غور و فکر سے کام لے تو صحیح بات اس کی سمجھ میں آ سکتی ہے ساتھ ہی قرآنی اسلوب کی اس ضمن میں واضح تشریح تحریر میں آ گئی ہے ۔

سورۂ کہف کی تفسیر کے ضمن میں آیت نمبر ۷۹ سے نمبر ۸۲ تک کے ذیل میں حیات خضر اور وفات خضر کے مسئلہ پر گفتگو کی گئی ہے آیت نمبر ۸۳ سے نمبر ۸۸ کے ذیل میں ذوالقرنین کی شخصیت اور ذوالقرنین

کی وجہ تسمیہ اور ان کے زمانے اور ان کے ملک کے بارے میں کہ وہ کس ملک کے بادشاہ تھے تفصیلی کلام کیا گیا ہے۔ ابن کثیر کی البدایہ والنہایہ ابو ریحان بیرونی کی کتاب الآثار الباقیہ عن القرون الخالیہ ابوحیان کی البحر المحیط اور مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی (جن کو مفتی صاحب ایک جگہ اپنا خواجہ طاس کہتے ہیں) کی قصص القرآن سے ذوالقرنین کی شخصیت کے بارے میں مختلف اقوال اور ان حضرات کی آراء نقل فرمائی ہیں اور بغیر ترجیح دیئے کہ قرآن کا مقصد ذوالقرنین کی شخصیت وغیرہ کی تعیین کے بغیر بھی پورا ہو رہا ہے آگے گذر گئے ہیں۔ آگے چل کر آیت نمبر ۹۲ سے نمبر ۹۸ تک کے معارف و مسائل میں "یاجوج ماجوج کون ہیں اور کہاں ہیں سد ذوالقرنین کس جگہ ہے" کا عنوان لگا کر نہایت مفصل اور واضح بحث فرمائی ہے جو معارف القرآن کے ۱۶ صفحات پر پھیلی ہوئی ہے پوری بحث لائق مطالعہ اور سینکڑوں صفحات کا نچوڑ ہے۔

اس مختصر فرصت میں معارف القرآن کی تمام خوبیوں پر کلام ممکن نہیں اس لیے جستہ جستہ کچھ مباحث تو بقدر ضرورت اور کچھ محض اشارات میں پیش کرنے پر اکتفا کی گئی ہے۔ اس تفسیر کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ ہر چیز آپ کو با حوالہ ملے گی سوائے اس حصہ کے جو حضرت مفتی صاحبؒ کا اپنا نقطہ نظر ہے کہیں حوالہ نظر انداز نہیں کیا گیا۔

باوجود اس کے کہ یہ تصنیف عوام کے لیے پیغام قرآنی کو عام کرنے کے لیے لکھی گئی ہے۔ لیکن علمی دقیق مسائل سے اس کا دامن معمور ہے اور اسلوب بیان واقعی ایسا ہے کہ ہر شخص اپنی استعداد کے مطابق دامن مراد کو بھر سکتا ہے۔ ہلکے پھلکے انداز میں لغات کی تشریح کا بھی اہتمام کیا گیا ہے اصل تفسیر میں اصول کے مطابق صحابہ و تابعین سے منقول ماثور تفسیر اور مستند کتب حدیث و تفسیر میں موجود مواد کو شامل معارف کیا گیا ہے۔

لطائف و معارف کے درجہ میں متاخرین مستند اہل تفسیر کے مضامین بھی لے گئے ہیں اور ایسے مضامین کو اہمیت دی گئی ہے جو انسان کے دل میں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت و محبت کو بڑھائیں اور قرآن پر عمل اور اصلاح اعمال پر مائل کریں۔

آخر میں یہ بات ضرور کہنی ہے کہ درس نظامی پر اعتراض کرنے والے غور کریں کہ جس شخص کی پوری عمر فتویٰ نویسی میں بسر ہوئی کبھی تفسیر کو بطور موضوع اس نے اختیار نہیں کیا جب وہ تفسیر

لکھنے بیٹھا تو ایسی تفسیر اس نے لکھی کہ معلوم ہوتا ہے جیسے ساری عمر کا مشغلہ ہی اس کا یہی تھا آج آنکھ کا ڈاکٹر کان کے علاج سے نابلد ہوتا ہے دل کے امراض کا ماہر آنکھ کو دیکھنے تک کے لیے روادار نہیں انجینئر صاحب وکالت سے بے بہرہ ہیں اور وکیل صاحب کو معاشیات کی کچھ خبر نہیں لیکن ہر شخص اپنی جگہ مطمئن ہے اور کبھی اس کو یا کسی دوسرے کو یہ خیال نہیں گذرتا کہ انجینئر ڈاکٹر کیوں نہیں اور ڈاکٹر وکیل کیوں نہیں مگر درس نظامی کے فضلاء کو کوئی سائنس پڑھنے کا مشورہ دیتا ہے کوئی صنعت و حرفت سیکھنے کی تلقین کرتا ہے حالانکہ یہ مختصر مدت میں جتنے علوم پر ماہرانہ انداز میں دسترس حاصل کرتے ہیں ان میں حدیث تفسیر، فقہ، ان کے اصول، ادب، (عربی لٹریچر) صرف و نحو، معانی و بیان، منطق، فلسفہ، ہیئت و ریاضی وغیرہ بہت سے علوم ہیں جس لائن کو وہ چاہیں اس میں تحقیقی کام کرنے کی عمدہ صلاحیت ان میں ہوتی ہے لیکن حوصلہ افزائی نہ ہونے کی بنا پر بہت سے اچھے باصلاحیت افراد ضائع ہو جاتے ہیں اور دوسروں کے لیے ترغیب کا کوئی سامان فراہم نہیں ہوتا اس لیے ذہین اور حوصلہ مند افراد کا رجوع کم ہوتا ہے اللہ کا دین قیامت تک رہے گا اس لیے وہ ابناء زمانہ کی سرد مہری کے باوجود رجال کار بہر صورت فراہم فرمائیں گے اللہ تعالیٰ حضرت مفتی صاحب عبد اللہ مضجعہ وجعل الجنۃ مثواہ کے لیے اس تفسیر کو ذخیرہ آخرت کے طور پر قبول فرمائیں اور ان کے اخلاف کو ان کے طرز عمل پر چلنے کی توفیق ارزانی فرمائیں امت مسلمہ کو اس نعمت عظمیٰ سے زیادہ سے زیادہ استفادہ کرنے کی توفیق عطا فرمائیں۔ آمین۔

بدعات و محدثات کے ایجاد کرنے والے اور ان پر عمل کرنے والے عموماً حضرات صوفیاء کرام اور مشائخ طریقت کی پناہ لیتے ہیں اور انہی کی طرف منسوب کرتے ہیں، یہاں تک کہ بہت سے عوام اس خیال میں ہیں کہ "شریعت اور طریقت دو متضاد چیزیں ہیں بہت سے احکام جو شریعت میں ناجائز ہیں اہل طریقت ان کو جائز قرار دیتے ہیں" اور یہ ایک خطرناک غلطی ہے کہ اس میں مبتلا ہونے کے بعد دین و ایمان کی خیر نہیں کیونکہ انسان کو تمام گمراہیوں سے بچانے والی صرف شریعت ہے، جب اس کی مخالفت کو جائز سمجھ لیا گیا تو پھر ہر گمراہی کا شکار ہو جانا سہل ہے۔ (حضرت مفتی اعظم، سنت و بدعت، ص ۲۹)

مولانا ابو الزاہد محمد سرفراز صاحب صفدر
شیخ الحدیث مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ

فقیہِ دوراں

باسمہ سبحانہ وتعالیٰ

منجانب ابی الزاہد

الیٰ محترم المقام حضرت العلام مولانا .... صاحب عثمانی دامت برکاتہم

وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ   مزاج سامی؟

آپ کا گرامی نامہ تو کافی دنوں سے موصول ہو چکا ہے مگر راقم اثیم اس انتظار میں رہا کہ قدرے فرصت ہے تو استاد محترم حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کے بارے ایک مختصر تحریر لکھا جائے کہ ایک طرف تو آنجناب کے وقیع حکم کی تعمیل ہو جائے اور دوسری طرف حضرت رحمہ اللہ تعالیٰ سے اپنی عقیدت کا اظہار بھی ہو جائے لیکن افسوس کہ فرصت نہ مل سکی۔ ع ما کل ما یتمنی المرء یدرکہ۔

بے حد مصروف ہونے کی وجہ سے قلم ہاتھ میں نہ پکڑ سکا آج ہی خدا خدا کر کے تھوڑا سا وقت نکالا اور ناچار چند غیر مربوط جملے ارسال کئے جا رہے ہیں۔ فرصت ہوتی تو تسلی اور اطمینان سے کچھ عرض کیا جاتا مگر مجبوری ہے اور ویسے بھی یہ حقیر کب اس قابل ہے کہ بزرگوں کی توصیف کے بارے میں کچھ لکھ اور عرض کر سکے۔ ولنعم ماقیل ؎

نغمہ کجا و من کجا ساز سخن بہانہ ایست   سوئے قطارمے کشم ناقۂ بے زمام را

اگر یہ غیر مربوط جملے رسالہ البلاغ میں درج ہونے کے قابل ہوں تو درج فرما دیں۔ ع

گر قبول افتد زہے عز و شرف

اور اگر حذف و اضافہ و ترمیم کے بعد یا ناقص جملے اندراج کے قابل ہوں تب بھی آپ کو کلی اختیار ہے

ع رموز مملکت خویش خسرواں دانند

دعوات صالحات و مستجابات میں فراموش نہ فرمائیں بفضلہ تعالیٰ یہ راقم اثیم سراپا تقصیر بھی ہمہ وقت عاجز ہونے کے ساتھ ساتھ دعاگو بھی رہتا ہے۔ حاضرین مجلس سے سلام مسنون ارشاد فرمائیں۔ والسلام

۱۵ جمادی الاولیٰ ۱۳۹۸ھ   احقر ابوالزاہد محمد سرفراز از گکھڑ ضلع گوجرانوالہ

۲۴ اپریل ۱۹۷۸ء بعد از مغرب۔   (پاکستان)

فقیہ دوراں حضرت مولانا مفتی محمد شفیعؒ :۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم حضرت مرحوم کے ضروری حالات سے قبل ان کی اس فقہی خوبی اور کمال کو چند حوالوں سے اجاگر کریں جس کی وجہ سے ان کو دور حاضر میں نمایاں شرف حاصل ہوا۔ اس وقت دنیا میں جتنے مذاہب و ادیان موجود ہیں ان تمام مذاہب و ادیان میں صرف اسلام ہی سچا اور برحق مذہب ہے۔ اور اب اخروی نجات صرف اسی میں منحصر ہے۔ اس برحق مذہب کے اہم اور بنیادی ستون قرآن کریم، حدیث شریف اجماع امت اور فقہ و قیاس ہیں پہلے تین ستون تو اتنے واضح اور بین ہیں کہ ان کے اثبات کے لیے کسی برہان و حجت کی کوئی ضرورت نہیں کیونکہ آفتاب آمد دلیل آفتاب ہاں البتہ چوتھا ستون معرض خفا ہو سکتا ہے لیکن دلائل کے لحاظ سے اس میں بھی کوئی خفا نہیں حقیقت یہ ہے کہ فقاہت فی الدین کے بغیر دین کی تہ تک پہنچنا بہت ہی مشکل امر ہے قرآن و حدیث میں تفقہ فی الدین کی نہ صرف یہ کہ مدح ہی بیان کی گئی ہے بلکہ اس کی ترغیب بھی دی گئی ہے ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے۔ فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآئِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ الآية۔ سو کیوں نہ نکلا ہر فرقہ میں سے اُن کا ایک حصہ تاکہ سمجھ پیدا کریں دین میں۔ اس سے معلوم ہوا کہ تفقہ فی الدین شرعی طور پر ایک مطلوب و محبوب چیز ہے۔ جس کی ترغیب اللہ تعالیٰ نے اسی آیت کریمہ میں دی ہے اور جو لوگ دین کی فقاہت، سمجھ فہم و بصیرت سے محروم ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی مذمت بیان فرمائی ہے۔ چنانچہ ایک مقام پر ارشاد ہوتا ہے۔ لَا يَكَادُوْنَ يَفْقَهُوْنَ حَدِيْثًا۔ قریب نہیں کہ سمجھیں کوئی بات۔ معلوم ہوا کہ دینی باتوں کو نہ سمجھنا ایک مذموم صفت ہے۔ اللہ تعالیٰ سب مسلمانوں کو اس سے محفوظ رکھے۔ حضرت امیر معاویہؓ کی روایت میں ہے وہ فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ من یرد اللہ بہ خیرا یفقھہ فی الدین (الحدیث) (بخاری ج ۱ ص ۱۶) جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ خیر کا ارادہ فرماتا ہے اس کو دین کی سمجھ عطا فرما دیتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ جس کو دین کی سمجھ مل جائے وہ اللہ تعالیٰ کا مقبول اور پیارا بندہ ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ اس کو دین کی وافر دولت سے نوازتا ہے اور ان کی ایک روایت میں یوں آیا ہے کہ۔

اذا اراد الله بعبد خیراً جعل الله فیہ ثلاث خلال فقهہ فی الدین و زهده فی الدنیا و بصره عیوبہ
(جامع بیان العلم ج ۱ ص ۲۰)

جب اللہ تعالیٰ کسی بندہ کے بارے خیر کا ارادہ فرماتا ہے تو اس کو تین خوبیاں عطا فرماتا ہے، اسؔ کو دین کی فقاہت عطا کرتا ہے، اسؔ کو دنیا میں زاہد بنا دیتا ہے اوؔر اس کو اس کے عیوب پر آگاہ کر دیتا ہے۔

اس سے واضح ہوا کہ جس کو دین کی فقاہت و بصیرت حاصل ہو جائے اور دنیا کی بے ثباتی اور ناپائداری اس کے پیش نظر ہو اور ہمہ وقت اس کا اپنے عیوب کی طرف دھیان ہو کہ انسان ہو کر میں نے کیا کیا؟ اور کیا کر رہا ہوں؟ اور آئندہ مجھے کیا کرنا چاہیئے اور جب اللہ تعالیٰ کی سچی عدالت میں میری حاضری ہوگی تو میری وہاں اور حالت کیا ہوگی اور میں اللہ تعالیٰ کی سچی عدالت میں اپنی مستعار اور فانی زندگی کے بارے میں کیا عرض کروں گا کہ میں نے یہ زندگی کہاں صرف کی؟ جس شخص کے سامنے یہ نقشہ ہو یقیناً وہ شخص اللہ تعالیٰ کی خصوصی توجہ اس کی رضا اور اس کی رحمت کا مورد ہے۔

حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ:۔

خیر دینکم الیسرہ وخیر العبادۃ الفقہ۔
(جامع بیان العلم ج ۱ ص ۲۱)

تمہارا بہترین دین وہ ہے جو آسان ہو اور بہترین عبادت فقہ ہے۔

یعنی جس طرح عزیمت پر عمل کرنا دین کا ایک بلکہ اہم حصہ ہے اسی طرح رخصت پر عمل کرنا بھی دین ہی کا حصہ ہے اور بعض حالات میں عمل کرنے والوں کے حق میں آسان ہونے کی وجہ سے یہی پہلو خیریت سے متصف ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ رخصت پر عمل کرنا اللہ تعالیٰ کو پسند ہے حدیث شریف میں آیا ہے۔

ان اللہ یحب ان یؤخذ برخصتہ کما یکرہ ان تؤتی بمعصیتہ رواہ احمد وابن خزیمۃ
(فتاویٰ ابن تیمیہؒ ج ۱ ص ۱۵۰)

تحقیق سے اللہ تعالیٰ اس کو پسند کرتا ہے کہ اس کی رخصتوں پر عمل کیا جائے جیسا کہ وہ اس کو ناپسند کرتا ہے کہ اس کی نافرمانی کی جائے۔

یہ روایت مسند احمد ج ۲ ص ۱۰۸ اور موارد الظمآن ص ۲۲۸ اور ص ۱۴۵ میں حضرت ابن عمرؓ سے اور ص ۲۲۳ میں حضرت ابن عباسؓ سے مرفوعاً مروی ہے جس طرح رخصت پر عمل کرنا خیر دینکم کا مصداق ہے اسی طرح بہترین عبادت وہ ہے جو فقاہت فی الدین کی ترازو پر پوری اُترے کہ نہ تو اس میں افراط ہو اور نہ تفریط ایمان واخلاص واتباع سنت کی کسوٹی پہ پرکھنے کے بعد اس میں سر مو تفاوت نہ ہو اگر صحیح معنی میں

دین کی فقاہت سے کوئی شخص محروم ہو تو وہ ایسے امور اور کاموں کو دین سمجھ کر کرنے لگے گا جو ہوں گے تو بدعات سیئہ اور دین سے قطعاً ان کا کوئی واسطہ نہ ہوگا لیکن وہ اپنی کم علمی اور عدم بصیرت کی وجہ سے ان کاموں کو دین اور دین کے امور سمجھے گا اور جوں جوں قیامت قریب آتی رہیگی ایسے بدعی امور عام ہوتے رہیں گے چنانچہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ۔

ما اتیٰ علی الناس عام الّا احدثوا فیہ بدعۃ واماتوا فیہ سنۃ حتّٰی تحیا البدع وتموت السنن

(مجمع الزوائد ج ۱ ص ۱۸۸ ورجالہ موثقون)

جو سال بھی لوگوں پر آئیگا اس میں وہ بدعت گھڑتے رہیں گے اور سنت کو ترک کرتے جائیں گے یہاں تک کہ بدعتیں زندہ ہو جائیں گی اور سنتیں مٹتی چلی جائیں گی۔

حضرت ابن عباسؓ نے جو کچھ ارشاد فرمایا وہ بالکل بجا فرمایا ہے۔ آج وہ دور ہے کہ اگر اس میں کوئی سنت ترک ہو جائے تو اکثر مسلمانوں کے ماتھے پر شکن بھی نہیں پڑتے اور اگر کوئی مروجہ بدعت چھوٹ جائے تو خاندانوں اور برادریوں میں ہلچل مچ جاتی ہے اور ایک دوسرے کے خلاف نفرت اور حقارت کے جذبات نمایاں ہو جاتے ہیں اور ایسے ہی ماحول میں گندم نما جو فروش عوام الناس کی جہالت سے غلط فائدہ اٹھا کر تحزّب و تعصب کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنی جھوٹی سیادت کو سہارا دیتے ہیں اور لوگوں کے ایمان اور جیب پر ڈاکہ ڈالتے ہیں حضرت عبداللہ بن عمروؓ فرماتے ہیں کہ میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا آپ نے فرمایا کہ۔

ان اللہ لا یقبض العلم انتزاعاً ینتزعہ من العباد ولکن یقبض العلم بقبض العلماء حتّٰی اذا لم یبق عالما اتخذ الناس رؤسا جہالا فسئلوا فافتوا بغیر علم فضلّوا واضلّوا۔

(بخاری ج ۱ ص ۲۰)

بلاشبہ اللہ تعالیٰ علم کو یوں نہیں اٹھائیگا کہ بندوں سے علم نکال لے لیکن وہ علم کو علماء کے اٹھا لینے سے قبض کرتا ہے حتیٰ کہ جب کوئی عالم نہ رہے گا تو لوگ جاہلوں کو اپنا پیشوا بنا لیں گے ان سے مسائل پوچھے جائیں گے تو وہ بغیر علم کے فتویٰ دینگے نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ خود بھی گمراہ ہونگے اور لوگوں کو بھی گمراہ کریں گے۔

اور اس کی ایک وجہ تو ان برائے نام علماء اور مفتیوں کی جہالت ہوگی اور دوسری ان کی دنیا و دنی کی لالچ میں قلبی ہوائی انفرادی رائے ہوگی جس کی بناء پر وہ گمراہی کے عمیق گڑھے میں اوندھے ہو کر جا پڑیں گے کہ ان کا وہاں سے باوجود احساس کے ہزار جہاں لگا کر نکلنا بھی محال ہوگا اور ایسی ہی غیر معصوم آراء اور خواہشات نفسانی انسان کو عذاب خداوندی کی طرف کشاں کشاں لے جاتی ہیں۔ حالانکہ ایسے موقع پر حکم شرعی

وہ ہے جو حضرت علیؓ سے مروی ہے وہ فرماتے ہیں۔

قلت یا رسول اللہ ان نزل بنا امر لیس فیہ بیان امر ولا نہی فما تأمرنی قال شاوروا فیہ الفقہاء والعابدین ولا تمضوا فیہ رأی خاصۃ

(مجمع الزوائد ج ۱ ص ۱۷۸ ورجالہ موثقون)

میں نے دریافت کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اگر ہمارے سامنے کوئی ایسا معاملہ درپیش ہو جس میں ذکر امر ہو اور نہ نہی تو آپ کا کیا ارشاد ہے ہم کیا کریں؟ آپ نے فرمایا کہ اس میں فقہاء اور عابدین سے مشورہ کرو اور انفرادی رائے پہ نہ چلو۔

جس زمانہ میں جہالت اور خود غرضی عام ہو مادیت اور دنیا کی محبت رگ و ریشے میں سرایت کئے ہوئے ہو۔ ایسے زمانہ میں علم دین اور فقہ کی نشر و اشاعت بڑا جہاد ہے حضرت ازدیؓ فرماتے ہیں میں نے حضرت ابن عباسؓ سے جہاد کے بارے سوال کیا تو انہوں نے فرمایا کہ۔

الا ادلک علی خیر من الجہاد فقلت بلی قال تبنی مسجداً و تعلم فیہ الفرائض والفقہ فی الدین - (جامع بیان العلم ج ۱ ص ۲۱)

کیا میں تجھے جہاد سے بہتر چیز نہ بتاؤں؟ میں نے کہا ضرور بتائیں انہوں نے فرمایا کہ مسجد تعمیر کر دو اور اس میں فرائض سنت اور فقہ فی الدین کی تعلیم دو۔

غرضیکہ فقہ دین کا ایک اہم ستون ہے اور پیش آمدہ باریک اور دقیق مسائل کی گتھیاں فقیہ ہی سلجھا سکتا ہے۔ جس کو اللہ تعالیٰ نے فقاہت فی الدین کی بے پایاں دولت اور نعمت سے بہرہ ور کیا ہوتا ہے حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ۔

لکل شیٔ عماد و عماد ھذا الدین الفقہ وما عبد اللہ بشیٔ افضل من فقہ فی الدین ولفقیہ واحد اشد علی الشیطان من الف عابد (جامع بیان العلم ج ۱ ص ۲۶)

ہر چیز کا ایک ستون اور سہارا ہوتا ہے جس پر وہ قائم رہتی ہے اور اس دین حق کا ستون فقہ ہے اور فقاہت فی الدین کے بغیر اللہ تعالیٰ کی بہتر عبادت اور کسی طریقہ سے نہیں ہو سکتی اور البتہ ایک فقیہ شیطان پر ہزار عابد سے زیادہ وزنی ہے۔

چونکہ عابد خواہ کتنا ہی نیک اور متبع سنت ہو اور اخلاص سے عبادت کرتا ہو لیکن اس سے صرف یہی ہوگا کہ وہ اپنے درجات بلند کرنے کی فکر میں ہوگا اور اپنی ہی نجات اُخروی کے درپے ہوگا اور فقیہ اپنے علمی کمال اور فقہی بصیرت سے بے شمار لوگوں کی اصلاح کرے گا اور ان کو راہ راست پہ لانے کی کوشش اور کاوش کرے گا۔ اس لیے وہ اکیلا شیطان پر ہزار عابد سے بھاری ہے اور ایسے ایک عالم ربانی کا دنیا سے رخصت

ہوجاتا ہزاروں حق پرستوں کی پریشانی کا موجب ہے۔ اور ایسے ہی مقام پر موت العالِم موت العالَم کا محاورہ چلا آرہا ہے۔ سچ ہے ؎

اکیلا کون کہتا ہے لحد میں نعشِ حاتم کو ہزاروں حسرتیں مدفون ہیں دریا کے پہلو میں

دورِ حاضر کے فقیہ:- ہمارے استادِ محترم مفتی اعظم اور سابق مفتی دارالعلوم دیوبند حضرت مولانا مفتی محمد شفیع رحمہ اللہ (المتوفی ۱۳۹۶ھ) دورِ حاضر کی ان بلند شخصیتوں میں سے ایک تھے جن کی ساری زندگی علمِ دین اور فقہ اسلامی کی نشر و اشاعت میں گزری ہے۔ جنہوں نے تدریس و تالیف اور تقریر و تزکیۂ نفوس کے ذریعہ اُس صحیح دین کو عوام الناس کیا بلکہ خواص تک پہنچایا جو امانت کے طور پر حضرات سلف صالحینؒ نے آنے والی نسلوں تک پہنچانے کی ان تھک سعی فرمائی اور بحمد اللہ تعالیٰ ان کی نیک سعی بار آور بھی ہوئی اللہ تعالیٰ نے حضرت مفتی صاحب مرحوم کو نہایت ٹھنڈی، سلجھی ہوئی اور سنجیدہ طبیعت عطا فرمائی تھی کہ اپنے ہم عصروں میں وہ بالکل نمایاں تھے۔

ہم نے ۱۳۶۰ھ میں جب دارالعلوم دیوبند میں دورۂ حدیث شریف کے لیے داخلہ لیا تو حضرت مفتی صاحب مرحوم کے پاس ہمارے اسباق میں سے طحاوی شریف تھی علماء کرام بخوبی جانتے ہیں کہ امام طحاوی رحمہ اللہ تعالیٰ (المتوفی ۳۲۱ھ) کی شرح معانی الآثار مختلف احادیث کی جمع و تطبیق کے سلسلہ میں کتنی دقیق کتاب ہے اور اس میں النظر فرما کر عقلی اور فقہی و قیاسی دلیل سے جس طرح وہ راجح حدیث کو عیاں کرتے ہیں وہ کتنی اَدق ہے حضرت مفتی صاحب مرحوم ٹھہر ٹھہر کر دھیرے دھیرے انداز سے کتاب کو اس انداز سے پڑھاتے کہ بحمد اللہ تعالیٰ ہمیں آج تک انکی بعض تقریریں اور پیارے کلمات یاد ہیں تقریباً نصف صدی تک حضرت نے پاک و ہند اور دیگر اسلامی اور غیر اسلامی ممالک میں رہنے والے مسلمانوں کی جس طرح دینی رہنمائی فرمائی ہے۔ اور ہزارہا ٹھوس باحوالہ اور مدلل فتوے صادر فرما کر اسلام کا صحیح پہلو ان کے سامنے اجاگر کیا ہے وہ ایک ناقابل فراموش ذخیرہ ہے اور سب سے بڑی خوبی حضرت کی یہ ہے کہ بالکل جدید اور مادی دور کی پیدا کی ہوئی وہ سنگین الجھنیں جن کو حل کرنے کے لیے صریح جزئیات کی شکل میں مدون کتب فقہ و فتاویٰ بالکل عاری ہیں ایسے ہی مسائل جدیدہ کے سلسلہ میں قرآن و سنت اور کتب فقہ کی روشنی میں اپنی دینی بصیرت سے ایسے معلومات افزا اور تسلی بخش ذرائع مفیدہ مرتب فرما کر امت مرحومہ پر احسانِ عظیم فرمایا ہے۔ اور اسی طرح اسلام و کفر کی جامع تعریف جس سے کوئی مسلمان فرقہ خارج نہ ہو اور باطل فرقہ داخل نہ ہو۔ ٹھوس حوالوں سے مدون فرما کر علماء کے ہاتھ میں ایک ایسا عروۂ وثقیٰ پکڑایا ہے جس کے پڑھنے سے وہ تمام علمی اشکالات بفضل اللہ تعالیٰ بالکل رفع

ہوجاتے ہیں جو کسی وسیع النظر اور ذہین سے ذہین آدمی کو اپنی علمی خامی کی وجہ سے پیش آتے اور آسکتے ہیں اسی طرح بے شمار اختلافی مسائل پر چھوٹی بڑی کتابیں اور ان کے تراجم کرکے اور بعض کو حرفی کا جامہ پہنا کر اس انداز سے مرتب کیا ہے کہ عوام الناس بھی بڑی آسانی سے ان سے استفادہ کرسکتے ہیں اور عربی دان ان کی عربی عبارات سے لطف اندوز ہوسکتے ہیں اور تفسیر معارف القرآن تو ان کا ایسا صدقہ جاریہ ہے جس نے دورِ جدید میں اردو زبان میں تفسیریں لکھنے والوں کے طلسم کو توڑ کر رکھدیا ہے۔ جن کو اپنی تفاسیر پر بڑا ہی ناز ہے اس تفسیر میں فن تفسیر کی ضروری اور صحیح باحوالہ تشریحات کے علاوہ جس طرح فقہی مسائل بیان کئے گئے ہیں وہ صرف اردو زبان میں اسی تفسیر کا طرۂ امتیاز ہے جس سے عموماً ہر مکتب فکر کے حضرات اور خصوصاً جدید تعلیم یافتہ حضرات صرف استفادہ ہی نہیں کرتے بلکہ ان کی ہر طرح سے تسلی بھی ہوجاتی ہے اور ہم نے بہت اونچے طبقے کے لوگوں سے اس تفسیر کے بارے بڑے ذوق و شوق کے جذبات سُنے اور ملاحظہ کئے ہیں اور دارالعلوم کا دینی مدرسہ جس سے دور دراز کے لوگ علمی پیاس بجھاتے ہیں ان کا ایک مستقل صدقہ جاریہ ہے اور حضرت مرحوم کے سب فرزند جو اپنی جگہ جید علماء کرام میں شمار ہوتے ہیں علی الخصوص حضرت مولانا محمد تقی صاحب عثمانی دام مجدہم ان کی باقیات صالحات میں ہیں اللہ تعالیٰ حضرت مرحوم کے جنت الفردوس میں درجے بلند کرے اور ان کی دینی خدمات کو قبول فرمائے اور ہمیں ان کے نقش قدم پہ چلنے کی توفیق بخشے آمین ثم آمین۔

"نئی تعلیم نے "آزادی رائے" کا خوبصورت عنوان دے کر ہماری جس متاع گرانمایہ پر پہلی ضرب لگائی۔ وہ اسلاف کی عظمت اور ان پر اعتماد ہے جس کے نتیجے میں دین کے مسلمات اور مجمع علیہ مسائل بھی تشکیکات کا کھلونا بن گئے۔ ہم ریسرچ اور تحقیق کے نام پر ان بزرگوں کا اعتماد کھو کر شکوک و اوہام کی راہوں میں بھٹکنے لگے جن مسائل میں اسلاف اُمت کا خود اختلاف ہے، ان میں آپ جس کو علم و تقوٰی کی رُو سے زیادہ افضل سمجھیں، اس کے قول و عمل کو اختیار کرسکتے ہیں مگر پھر بھی اس سے مختلف رائے رکھنے والے بزرگوں کی شان میں ادنیٰ سے ادنیٰ بے ادبی کبھی بدبختی کی علامت ہے"

(مفتی اعظمؒ : ایک اہم پیغام پاکستان کے نوجوان طلباء کے نام ۔ ص ۱۲)

مولانا ضیاء دانش صاحب
فاضل تخصص دارالعلوم، کراچی

حضرت مفتی اعظمؒ کی فقہی خدمات

اور فتویٰ میں آپ کا مسلک و مشرب

اللہ تعالیٰ نے مفتیٔ اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب قدس سرہٗ سے دین کی جو بیشمار خدمتیں لیں، ان میں آپ کی فقہی خدمات ممتاز مقام کی حامل ہیں۔ زیرِ نظر مقالے میں انہی خدمات کا تذکرہ مقصود ہے۔

دارالعلوم دیوبند میں خدمتِ افتاء

حضرت مفتی صاحب قدس سرہٗ اپنی افتادِ طبع اور شوق و ذوق کی بناء پر طالب علمی سے اپنے استادِ محترم امام الفقہاء حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحبؒ کی خدمت میں فتویٰ نویسی کی مشق کے لیے تشریف لے جایا کرتے تھے۔ اور استاد موصوف آپ کو اپنے پاس آئے ہوئے کچھ فقہی سوالات اور استفتاء دے دیا کرتے، ان کا آپ جواب لکھ کر پیش کر دیتے۔ اسی دور کا ایک استفتاء جو تقلید سے متعلق ہے، آپ کے استادِ محترمؒ نے آپ کو جواب لکھنے کے لیے عنایت فرمایا۔ آپ نے اس کا جواب بہت مفصل و مدلل تقریباً چونتیس صفحات پر تحریر فرمایا، جسے مبسوط اور جامع ہونے کی بناء پر دارالعلوم دیوبند کے ماہنامہ المفتی میں شائع کر دیا گیا۔ حضرت مفتی محمد شفیع صاحبؒ خود رقم طراز ہیں۔

> "مسئلۂ تقلید پر چند سوالات وجوابات : یہ سوالات میرے استادِ محترم مفتی اعظم ہند اور دارالعلوم دیوبند کے سب سے پہلے مستقل مفتی حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحبؒ کا عطیہ ہیں، وہ بزمانہ طالب علمی ۱۳۳۵ھ میں جب کہ احقر

دارالعلوم دیوبند میں دورۂ حدیث کا ایک طالب علم تھا، حضرت ممدوحؒ نے جواب لکھنے کے لیے عطا فرمائے تھے، جواب کچھ مفصل ہوگیا تھا، اس وجہ سے اس کو دارالعلوم دیوبند کے ایک ماہنامہ میں شائع کردیا گیا تھا، وہاں سے نقل کیا جاتاہے واللہ الموفق والمعین۔" (ان سوالات وجوابات کی تفصیلات جواہر الفقہ جلد ا صفحہ ۱۲۱ پر دیکھی جاسکتی ہیں)

نیز فرماتے ہیں کہ

"صفوۃ العلماء مفتی اعظم، استاذِ محترم حضرت مولانا عزیزالرحمٰن صاحبؒ کی خدمت میں احقر کو مشکوٰۃ اور جلالین شریف وغیرہ پڑھنے کا شرف حاصل تھا اور حضرت ممدوح بغایت عنایت فرماتے تھے۔ اس عرصے میں گاہ گاہ کچھ سوالات عطا فرمادیتے اور احقر جواب لکھ کر پیش کردیتا جو اصلاح وتصدیق کے بعد روانہ کیے جاتے تھے۔[1]

مزید تحریر فرماتے ہیں کہ

۱۳۴۴ھ میں بہ نیرنگ تقدیر کچھ ایسے اسباب پیش آئے کہ حضرت مفتی (عزیزالرحمٰن صاحب) قدس سرہٗ دارالعلوم سے مستعفی ہوگئے اور اس وقت سے ۱۳۵۵ھ تک نائب مفتی مولانا مسعود صاحب دیوبندی داماد حضرت شیخ الہندؒ جو زمانۂ دراز سے حضرت مفتی (عزیزالرحمٰن) صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی نیابت میں یہ کام کررہے تھے، اب بطور قائم مقام مفتی اس خدمت کو انجام دیتے رہے۔ ۱۳۵۵ھ میں ہجوم فتاویٰ اور ضروریات پر نظر کرکے ارباب دارالعلوم نے حضرت مولانا ریاض الدین صاحب کو مدرسہ عالیہ میرٹھ سے طلب کرکے یہ منصب سپرد کیا۔ موصوف نے محرم ۱۳۵۹ھ تک خدمت انجام دی۔ لیکن پھر بمصالح مدرسہ موصوف کو تعلیم کی طرف منتقل کرکے اس ناکارۂ خلائق کو اس خدمت کے لیے مامور کیا گیا۔ صفر

---

[1] مقدمہ فتاویٰ دارالعلوم دیوبند۔ مطبوعہ کراچی۔ جلد ۱ صفحہ ۱۱۔

۱۳۵۹ھ سے ۱۳۶۴ھ تک پانچ سال حسب استطاعت احقر نے یہ خدمت انجام دی۔ وسط ۱۳۶۴ھ میں بعض مصالح مدرسہ کی بناء پر احقر کو تعلیم تدریس کے لیے مامور کیا گیا، اور حضرت مولانا سہول صاحب بہاری سابق پروفیسر یونیورسٹی پٹنہ بہار کو اس منصب کے لیے لایا گیا۔ مگر موصوف اپنی ذاتی ضروریات کی بناء پر یہاں زیادہ قیام نہ فرما سکے، بلکہ ۱۳۶۵ھ سے ۱۳۶۶ھ تک اس خدمت کو انجام دینے کے بعد پھر اپنی سابقہ ملازمت پر پٹنہ، بہار تشریف لے گئے، وسط ۱۳۶۶ھ سے آپ کی جگہ مولانا حافظ کفایت اللہ صاحب میرٹھیؒ کو لایا گیا، مگر موصوف بھی اس جگہ زیادہ قیام نہ فرما سکے، آخر ۱۳۶۷ھ میں اس جگہ سے منتقل ہو گئے۔ ۱۳۶۸ھ میں پھر قرعۂ فال اس ناکارہ کے نام پر نکلا اور بجائے تدریس کے پھر اس خدمت افتاء پر مامور کیا گیا۔ ۱۳۷۲ھ تک دوبارہ پانچ سال پھر اپنی قدرت واستطاعت کے موافق اس سلسلے میں کاغذ سیاہ کیے، مگر بہ نیرنگ تقدیر ۱۳۷۲ھ میں کچھ ایسے اسباب پیدا ہو گئے کہ ۵ ربیع الاول ۱۳۷۲ھ کو احقر نے دارالعلوم کی ضابطہ کی خدمت سے استعفاء پیش کر دیا اور ملازمت سے یکسو ہو گیا، گو اصل خدمت فتاویٰ جو بہر حال مارسٹی کا فیض اور اسی کی خدمت ہے، بحمداللہ جاری ہے۔" [1]

غرضیکہ حضرت مفتی صاحبؒ نے بارہ سال تک دارالعلوم دیوبند میں اپنے اکابر علمائے امت کے زیر سایہ افتاء کی خدمات بحسن وخوبی انجام دیں۔ آپ کے فتاویٰ کی جو چار ضخیم جلدیں شائع ہوئی ہیں، وہ بارہ سال کے مجموعی فتاویٰ کا پندرھواں حصہ بھی نہیں۔ اگر وہ سب فتاویٰ شائع کیے جائیں جو آپ نے اس تیرہ سالہ دور میں تحریر فرمائے، تو وہ ساٹھ ضخیم جلدوں میں سما سکیں گے اور جو فتاویٰ اس زمانے میں درج رجسٹر نہیں ہوئے (جن کی تعداد بہت ہے) وہ ان کے علاوہ ہیں۔ یہ سب اعداد وشمار تو صرف ان فتاویٰ کے ہیں جو آپ نے صدر مفتی دارالعلوم دیوبند کی حیثیت سے

---

[1] از مقدمہ مذکور، صفحہ ۸

تحریر فرمائے ہیں۔

پھر اس کے بعد ۱۳۶۲ھ میں جب آپ دارالعلوم دیوبند سے مستعفی ہوگئے تو عوام و خواص کے بکثرت رجوع کے باعث اور حضرت تھانوی علیہ الرحمہ کی ہدایت کی بناء پر افتاء کا سلسلہ اب بھی برابر جاری رہا، تحریری بھی اور زبانی بھی[1] اسی طرح قیام پاکستان کے بعد حضرت مفتی صاحب موصوف بناء دارالعلوم کراچی سے پہلے بھی کراچی میں جس جگہ رہے، آپ کا مکان ہمیشہ ایک دارالافتاء بنا رہتا تھا، پھر آپ نے باقاعدہ دارالافتاء نانک واڑہ کراچی کی ایک بلڈنگ کے چھوٹے سے کمرے میں قائم فرمایا جو تاریک اور بہت ہی مختصر اور خام چھت کا تھا: بناء دارالعلوم کراچی کے بعد آپ نے وہاں تشریف لے جاکر موجودہ شعبہ دارالافتاء قائم فرمایا، جس میں الحمدللہ آج تک بحسن و خوبی افتاء کا کام جاری ہے[2]

افسوس ہے کہ ۱۳۶۲ھ سے ۱۳۷۱ھ تک (نو سال کے عرصہ میں) جو فتاویٰ جاری کیے گئے ان کی نقل رجسٹروں میں باقاعدہ محفوظ نہ کی جاسکی، نہ ان کی صحیح تعداد کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے کاش اس گراں قدر علمی سرمائے کی حفاظت کا اس وقت کچھ انتظام ہوجاتا تو آج وہ علمی نوادر طبع ہوکر علماء وعوام کے سامنے ہوتے[3]

وطن مالوف سے ہجرت کے بعد پاکستان کے کافی عرصہ کے بعد ۱۳۷۱ھ مطابق ۱۹۵۲ء میں دارالعلوم کراچی کے شعبۂ دارالافتاء میں خوش نصیبی سے دوبارہ آپ کے فتاویٰ کی نقول محفوظ رکھنے کا انتظام ہوگیا ہے اور بحمداللہ آج تک یہ انتظام موجود ہے۔ اس کے لیے "جائزہ مدارس پاکستان" (مرتبہ حافظ نذر احمد) کا مندرجۂ ذیل اقتباس لائق ملاحظہ ہے :-

"دارالعلوم کراچی کے صدر خود شیخ الجامعہ (حضرت مفتی صاحبؒ) ہیں۔ آپ مدت العمر دارالعلوم دیوبند کے صدر مفتی کے منصب جلیلہ پر فائز رہے۔ آپ نے

---

[1] مقدمہ مذکور صفحہ ۳۴ تا ۳۵

[2] ملخص سالانہ روئداد دارالعلوم کراچی۔ صفحہ ۱۶-۱۷

[3] مقدمہ مذکور صفحہ ۳۵

اپنے پیر و مرشد حضرت مولانا اشرف علی تھانوی مرحوم کے ساتھ بھی کچھ عرصہ افتاء کا کام کیا۔ آپ اپنے دارالعلوم کراچی کے منتہی طلبہ کو باقاعدہ افتاء کی عملی تربیت دیتے ہیں۔ آپ کے نائب مفتی مولانا صابر علی صاحبؒ فاضل امروہہ خلیفۂ مجاز حضرت تھانوی مرحوم ہیں۔ ۱۹۵۲ء سے ۱۹۵۹ء تک آٹھ سال کی مدت میں دارالعلوم کراچی کے دارالافتاء سے (حضرت مفتی صاحب رحمہ اللہ کے قلم سے) ستر ہزار نو سو بارہ فتوے جاری ہوئے۔ ان کے علاوہ مجلسی فیصلوں اور زبانی فتووں کی تعداد بے شمار ہے۔ اکثر ضرورت مند اور اہل تنازعہ خود حاضر ہو کر اپنے مقدمات اور مسائل کے فیصلے کراتے۔ دارالعلوم کراچی سے پاکستان کے علاوہ ہندوستان، اسکاٹ لینڈ، فلپائن، امریکہ، کویت، حجاز، ایران، افغانستان، برما، سنگاپور، افریقہ اور آسٹریلیا وغیرہ بھی فتوے جاتے ہیں۔" (صفحہ ۲۹۵)

مذکورہ بالا اعداد و شمار پاکستان تشریف لانے کے بعد بھی صرف ۱۹۵۲ء سے ۱۹۵۹ء تک کے ہیں۔ اس سے پہلے نو سال اور بعد کے اب تک کے فتاوٰی ان کے علاوہ ہیں، جن کا نہ ٹھنے والا سلسلہ، تحریر کے علاوہ زبانی اور ٹیلیفون پر صبح و شام ہر وقت جاری ہے۔ سخت بیماری کی حالت میں، عین آرام کے وقت، حتیٰ کہ رات کے ایک دو بجے بھی اگر کوئی اہل حاجت آجائے تو آپ دوسرے وقت پر نہیں ٹالتے۔ سفر کی حالت میں بھی یہ سلسلہ برابر جاری رہتا ہے۔ آپ کو ہر وقت لکھتے رہنے کی خوب مشق ہے۔ تیز رفتار گاڑیوں میں خواہ وہ کتنی ہی تیز رفتاری سے دوڑ رہی ہوں، آپ فتاوٰی کی جوابی ڈاک بے تکلف تحریر فرماتے۔ بڑے بڑے سفر اسی مشغلے میں طے ہوجاتے۔[1]

شانِ تحقیق و احتیاط

افتاء کا منصب علمی سلسلوں میں سب سے زیادہ مشکل، دقیق اور اہم ترین سمجھا گیا ہے، فقہ کی متماثل جزئیات اور ان کے متعلقہ احکام میں تھوڑے تھوڑے فرق سے حکم کا تفاوت محسوس کرنا

---

[1] مقدمۂ مذکور صفحہ ۲۵ تا ۴۲

عیق علم کو چاہتا ہے جو کہ ہر عالم و مدرس کے بس کی بات نہیں، جب تک فقہ سے کامل مناسبت، ذہن و ذکاء میں خاص قسم کی صلاحیت اور قلب میں مادۂ تفقہ نہ ہو۔ اس لیے مدارسِ دینیہ میں افتاء کے لیے کسی شخصیت کا انتخاب کرنا نہایت پیچیدہ مسئلہ سمجھا گیا ہے، جو کافی غور و فکر اور سوچ وچار کے بعد حل ہوتا ہے اور پھر بھی تجربات کا محتاج رہتا ہے۔[1]

چنانچہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے ابتداءً ہی ۱۳۴۹ھ میں جب آپ کو صدر مفتی کے عظیم منصب پر فائز کیا گیا تو آپ نے اس کی بھاری ذمہ داری کے باعث ارادہ فرمایا تھا کہ اس منصبِ جلیل اور عظیم ذمہ داری سے استعفیٰ دے دوں۔ خود تحریر فرماتے ہیں کہ

"میں اپنی علمی بے بضاعتی سے بے خبر تو نہ تھا، مگر یہ حقیقت ہے کہ اس کام کے لیے علم کے جس پایہ و منزلت کی ضرورت تھی، اس سے پورا واقف بھی نہ تھا۔ تعلیمی خدمتوں کی طرح اساتذہ اور بالخصوص سیدی واستاذی حضرت مولانا سید اصغر حسینؒ محدث دارالعلوم اور سیدی و مرشدی وسندی حضرت حکیم الامت مجدد الملت حضرت مولانا تھانوی قدس سرہٗ کی امداد و اعانت کے بھروسہ پر اس بار کو بھی سر پر اٹھا لیا۔ کئی سال تک کام کرنے کے بعد اس علم تک رسائی ہوئی کہ یہ کام مجھ جیسے بے بضاعت و بے لیاقت لوگوں کا نہیں ؎

سمجھے اتنا کہ کچھ نہ سمجھ پائے

سو یہ بھی ایک عمر میں ہوا علم

ارادہ ہوا کہ اس خدمت سے استعفیٰ پیش کردوں۔ سیدی حضرت حکیم الامت قدس سرہ سے اس ارادے کا ذکر کیا، حضرت ممدوحؒ نے اس کی اجازت نہ دی اور کام میں پورا غور و فکر کرنے کی ہدایت کے ساتھ چند اصول بھی ارشاد فرمائے جس سے یہ کام سہل ہوگیا۔ دوسری طرف سیدی حضرت میاں صاحبؒ و مولانا سید اصغر حسین صاحبؒ کو منجانب دارالعلوم باضابطہ احقر کے فتاویٰ پر نظر و اصلاح

---

[1] مقدمہ مذکور صفحہ ۱۵

کرنے کے لیے مامور کردیا گیا تھا اور اہم ومشکلات الفتاوٰی میں اکثر وبیشتر، سیدی حضرت حکیم الامت قدس سرہٗ سے مراجعت رہتی تھی ۔ ان اکابر کی خاص توجہ اور برکات ظاہرہ و باطنہ کے سبب اس کام میں لگا رہا [۱]

حضرت ممدوحؒ مجالس حکیم الامتؒ میں اپنے پیرو مرشد حضرت مولانا تھانوی علیہ الرحمہ کا ایک ملفوظ نقل فرماتے ہیں :-

"ارشاد فرمایا کہ مجھے تو تمام علوم وفنون میں فقہ سب سے زیادہ مشکل معلوم ہوتا ہے ۔ اور تواضعاً یہ بھی فرمایا کہ مجھے تو اس فن سے مناسبت نہیں، بالکل عاجز ہو جاتا ہوں " [۲]

یہی وجہ ہے کہ حضرت مفتی صاحبؒ مکمل تحقیق کے باوجود استفتاء کے جوابات تحریر فرمانے میں غایت احتیاط سے کام لیا کرتے تھے ۔ چنانچہ ایک سوال جس میں حضرت والا سے یہ دریافت کیا گیا تھا کہ "چھپکلی" حدیث قتل وزغ (گرگٹ) میں داخل ہے یا نہیں ؟ اگر ہے تو کوئی اور صریح حدیث یا روایت فقہی اس جانور کے مارنے کے متعلق وارد ہے یا نہیں ؟ اگر داخل نہیں تو اقتلوا الوزغة ولو فی جوف الکعبة سے کیا مراد ہے ؟

مذکورہ سوال کی پوری تحقیق کے باوجود غایۃ احتیاط سے حضرت مفتی صاحبؒ فرماتے ہیں کہ "تمام لغت عربی وفارسی وہندی کی عبارتوں سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ عربی میں "وزغ" اور فارسی میں "چلپاسہ" لفظ عام ہے ، دونوں قسم پر صادق آتا ہے ، یعنی گرگٹ اور چھپکلی دونوں پر ۔ اور عربی میں "سام ابرص" اور فارسی میں "کرپا" اور "کرپش" وغیرہ گرگٹ کو کہا جاتا ہے ۔ حدیث میں قتل کا حکم لفظ "وزغ" کے ساتھ ارشاد ہوا ہے ، اس لیے دونوں قسموں کو شامل معلوم ہوتا ہے [۳]

نیز حضرت مفتی صاحبؒ جب تک مسئلے کی پوری تحقیق نہ فرما لیتے اور اس تحقیق پر مکمل شرح صدر

---

[۱] مقدمہ مذکور صفحہ ۴۴

[۲] صفحہ ۳۱۲ ۔ ضبط وتحریر حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ ۔ مطبوعہ کراچی ۔

[۳] تفصیل کے لیے فتاوٰی دارالعلوم دیوبند ۔ جلد ۲ ۔ صفحہ ۱۳۹ ملاحظہ ہو ۔

نہ ہوجاتا، فتویٰ صادر نہ فرماتے تھے۔ اور جہاں ضرورت ہوتی، احتیاط سے کام لیتے ہوئے کسی چیز سے اجتناب کا حکم صادر فرماتے۔ چنانچہ حضرت والا خود جَوَاهِرُ الفقه جلد ۲ صفحہ ۴۲۱ پر مشینی ذبیحہ کے ایک مسئلے کے سلسلے میں رقمطراز ہیں :

"اب مشینی ذبیحہ کی جو بحثیں رسائل و اخبارات میں آئی ہیں، وہ صحیح صورتِ حال سے پہلے محض مفروضہ صورتوں سے متعلق رہیں۔ مجھ سے بھی یہ سوال کیا گیا تھا کہ بہت سے جانوروں کو مشین کے نیچے کھڑا کر کے یک وقت سب کی گردنیں مشین کی چھری سے کاٹ کر جدا کر دی جاتی ہیں، لیکن اس عرصہ میں کچھ دیکھنے والوں کے بیانات سے کچھ اخباری مقالات سے یہ معلوم ہوا کہ مشینوں کے ذریعہ ذبح کرنے کا معین طریقہ نہیں ہے، بلکہ مختلف ملکوں اور شہروں میں اس کی مختلف صورتیں رائج ہیں، جن میں ایک صورت وہ بھی ہے جس کو اسلامی ذبیحہ کا نام دیا جاتا ہے۔"

آگے تحریر فرماتے ہیں :

"اِن حالات میں کسی مفروضے پر بحث فضول ہے جب تک کہ درآمد کی ہوئی مشین کی صحیح صورتِ حال معلوم نہ ہو کوئی فتویٰ نہیں دیا جاسکتا۔"

اور اس بحث کے آخر میں لکھتے ہیں :

"جب تک صحیح صورتِ حال معلوم نہ ہو اس وقت تک مشینی ذبیحہ کے گوشت سے احتیاط کرنا واجب ہے۔"

اسی طرح موصوفؒ نے "آلہ مکبر الصوت" کے استعمال کے بارے میں ابتداءً ممانعت کے ساتھ یہ تحریر فرمایا تھا کہ جو نماز اس کی مدد سے ادا کی جائے وہ نماز فاسد ہے۔ اس وقت چونکہ اس کی پوری حقیقت کا انکشاف نہیں ہوا تھا اور حکم فساد میں احتیاط کا پہلو تھا، اس لیے مذکورہ حکم آپ نے صادر فرمایا تھا، لیکن بعد میں بحث و نظر اور از سرِ نو تحقیق کے بعد حضرت والاؒ نے اس پر ادا کی جانے والی نماز کے عدمِ فساد کا فتویٰ صادر فرمایا[1]

---

[1] تفصیل کے لیے دیکھیے آلاتِ جدیدہ کے احکام۔

حضرت رحمۃ اللہ علیہ ایسے مسائل جن کی اجازت سے فتنہ وفساد کا اندیشہ ہوتا، تحریری جواب دینے سے بھی بڑی احتیاط فرماتے تھے۔ سائل کو زبانی دریافت کرنے کا مشورہ دیتے، یا تحریر فرماتے کہ کسی عالم سے زبانی معلوم کرلیں۔ ایک سوال مع جواب اسی نوعیت کا "فتاویٰ دارالعلوم دیوبند"[۱] سے نقل کیا جاتا ہے:

سوال:۔ غیر مسلم قوم (مثل یہود، نصاریٰ یا اہل ہنود) کی جماعت کا کوئی فرد مذہب اسلام کی توہین کرتا ہے، پیغمبر اسلام کی شان میں گستاخانہ کلمات کہتا ہے، مسلمانوں کی دل آزاری کرتا ہے اور اپنی جماعت کو مسلمانوں کے خلاف بھڑکاتا ہے۔ زید جو مسلمانوں کی جماعت کا ایک معمولی شخص ہے اس غیر مسلم کو بلا اتمام حجت دھوکہ سے قتل کرنا چاہتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ زید کا یہ ارادہ اور یہ فعل از روئے شرع شریف جائز ہوگا؟ یا ناجائز؟ اور قتل کرنے کے بعد قاتل گرفتار ہوجائے اور اس کو پھانسی دے دی جائے تو قاتل کو درجۂ شہادت ملے گا یا نہیں؟ کیا اسلام نے اس قسم کی تعلیم دی ہے کہ غیر مسلموں کو دھوکہ سے قتل کردیا جائے۔ مع حوالۂ کتب تحریر کیا جائے۔

الجواب:۔ کسی عالم سے زبانی دریافت کرلیا جائے۔ فقط

حضرت والاؒ جس طرح خود غایت درجہ احتیاط فرماتے تھے۔ اسی طرح بعض مسائل میں سائل کو بھی اصل حکم سے آگاہ فرماکر تحریر فرمادیا کرتے تھے کہ اس میں احتیاط بہتر ہے۔ چنانچہ ایک سوال مع جواب اس نوعیت کا نقل کیا جاتا ہے:۔

"کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلے میں کچے اور پکے رنگ سے عورت کے لیے کپڑا رنگنا جائز ہے یا نہیں؟ کیونکہ اس میں شراب پڑتی ہے"

الجواب:۔ کچا پکا رنگ عورت کے لیے جائز ہے۔ فتویٰ اسی پر ہے۔ اس میں وہم نہ کرنا چاہیے لیکن نماز میں احتیاط کی جائے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم[۲]

نیز حضرت مفتی صاحبؒ اپنی مکمل تحقیق کے باوجود بربنائے احتیاط دیگر علمائے کرام سے

---

[۱] مطبوعہ کراچی۔ جلد ۲۔ صفحہ ۱۸۴

[۲] امداد المفتین۔ صفحہ ۲۵۹۔ مطبوعہ دارالاشاعت کراچی

بھی تصدیق کرایا کرتے تھے، جس کی نظیریں "امداد المفتین"، "جواہر الفقہ" اور حضرت والا کے دیگر فقہی رسائل میں بکثرت موجود ہیں۔ اور حضرات علماء کرام حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے فتویٰ کی نہ صرف تصدیق فرماتے بلکہ آپ کو زبردست الفاظ میں خراج تحسین پیش کرتے، جن میں آپ کے اساتذۂ کرام بھی داخل ہیں۔ تمثیلاً ذیل میں کچھ تصدیقات درج کی جاتی ہیں:۔

مفتی عبدالکریم صاحب گمتھلوی تحریر فرماتے ہیں:

"عورت کے مرتد ہونے سے فسخ نکاح نہ ہونے پر جناب مفتی صاحب مدظلہم نے جو تحریر فرمایا ہے، وہ بالکل درست ہے۔ اس تحقیق انیق کی خاص جامعیت اور ضرورت کو دیکھ کر بے ساختہ دل سے نکلتا ہے: للہ در المجیب حیث اجاد واصاب فیما افاد واجاب"

اسی مذکورہ مسئلہ کی تصدیق فرماتے ہوئے حضرت مولانا ظفر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

"طالعت هذه الضميمة الفخيمة وتشرفت بتوسم هذه الدرة اليتيمة فلله در من اخرجها من الصدف الانيق واستخرجها من البحر العميق وانا موافق لجميع ما في الباب ومسرور بضم هذه الضميمة بأصل الكتاب والله اعلم بالصواب" [1]

آپ کے استاد محترم حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ، مسئلہ ملکی سیاست میں غیر مسلموں کے ساتھ اشتراک عمل کی حدود شرعیہ پر جو اس سے قبل مسلم لیگ اور کانگریس کی شرعی حیثیت کے نام سے شائع ہوا تھا، حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی تحقیق انیق پر فرماتے ہیں:

"میں نے اس فتویٰ کا بالاستیعاب مطالعہ کیا، ماشاء اللہ مسئلے کو بالکل

---

[1] جواہر الفقہ۔ جلد ۲ صفحہ ۱۴۹۔

صاف کر دیا ہے۔ اہل علم ونظر کے لیے گنجائش نہیں چھوڑی۔ سب اطراف وجوانب واضح ہو کر سامنے آگئے۔ حق تعالیٰ شانہٗ مفتی صاحب کو جزائے خیر دے۔"

۱۸ ذی الحجہ ۱۳۶۴ھ — شبیر احمد عثمانی دیوبند

اور اسی مسئلے کی تصدیق فرماتے ہوئے حضرت مولانا ظفر احمد عثمانیؒ رقمطراز ہیں:

بعد الحمد والصلوٰۃ۔ اس احقر نے بھی فتویٰ مذکورہ کا حرفاً حرفاً مطالعہ کیا۔ اللہ تعالیٰ مولانا مفتی محمد شفیع صاحب مدظلہٗ کو جزائے خیر عطا فرمائیں کہ سیاست حاضرہ کا شرعی حکم اچھی طرح واضح فرما دیا اور بڑی محنت سے قرآن وحدیث وفقہ سے جزئیاتِ احکام کو تلاش کر کے جمع فرما دیا۔ امید ہے کہ اس کے بعد مسائل حاضرہ میں کسی اور فتویٰ کی حاجت باقی نہیں رہے گی۔ هكذا تكون همة الرجال وعزيمة الابطال كثرالله فينا امثالهم۔ والسلام

ظفر احمد تھانوی عفا اللہ عنہ ۱۳ محرم ۱۳۶۵ھ[1]

یتیم پوتے کی میراث کے سلسلے میں حضرت مولانا محمد ادریس صاحبؒ تحریر فرماتے ہیں:۔

الجواب صواب۔ ولله در المجيب فقد اجاد واصاب فيما اجاب۔ اس تحریر دلپذیر کو پڑھا، جس کا ہر ہر لفظ عقل ونقل کی ترازو میں تلا ہوا ہے اور عقلی ونقلی دلائل سے مدلل اور مبرہن اور قانونی نظائر سے روشن اور مزین ہے۔ امید ہے کہ اہل اسلام کے لیے عموماً اور ارکانِ اسمبلی کے لیے خصوصاً یہ تحریر شب تاریک میں شمع کا کام دے گی۔ والسلام

محمد ادریس غفراللہ لہٗ

شیخ الحدیث جامعہ اشرفیہ نیلا گنبد۔ لاہور[2]

---

[1] جواہر الفقہ۔ جلد ۲ صفحہ ۲۴۳ مطبوعہ کراچی [2] ایضاً۔ صفحہ ۲۹۲

اسی طرح حضرت رحمۃ اللہ علیہ پوری تحقیق و جستجو کے باوجود احتیاطاً دُوسرے عالم کو بھی مسئلہ کی تحقیق کے لیے مقرر فرماتے۔ چنانچہ آپ نے آلہ مکبر الصوت کی تحقیق کے سلسلے میں اپنی تحریر اور اس پر حضرت مولانا قاضی شمس الدین صاحب کی تنقید پر محاکمہ کے لیے حضرت مفتی رشید احمد صاحب مدظلہم کو مقرر فرمایا۔ رقمطراز ہیں :-

"بہرحال نفس مسئلہ میں اب بھی میری رائے نہیں بدلی۔ مزید احتیاط کے لیے احقر نے اپنی تحریر اور مولانا موصوف کی تمام تنقیدات اپنے دارالعلوم کراچی کے ایک ماہر فن محقق مدرس مولانا مفتی رشید احمد صاحب (مدظلہم) کے سپرد کردی کہ سب پر غور کرکے مجھے رائے دیں۔ مولانا رشید احمد صاحب نے بھی چند جگہ لفظی تنقیدات تو تحریر فرمائیں، جن کی اصلاح کردی گئی۔ مگر اصل مسئلے میں ان کی رائے بھی احقر سے متفق اور وہی رہی جو رسالہ مذکورہ میں شائع کی گئی تھی۔"

تفصیلات اصل کتاب میں دیکھی جاسکتی ہیں [1]

نیز اسی آلہ مکبر الصوت کے سلسلے میں صفحہ ۳۴ پر تحریر فرماتے ہیں کہ

"احقر نے حسب ایماء شیخ الاسلام حضرت مولانا عثمانیؒ اس مسئلے کی تحقیق کے لیے ایک طرف تو فنی طور پر محکمہ ریڈیو اور محکمہ صوت کے اعلیٰ ماہرین سے اس کی تحقیقات شروع کی اور مکرر سہ مکرر مراسلت کی، دوسری جانب علماء اہل عصر ارباب فتویٰ سے گفتگو اور مراسلت کا سلسلہ جاری رہا۔ خود حضرت مولانا مرحوم سے مسئلہ کے مختلف پہلوؤں پر کئی کئی گھنٹے بحث و تحقیق کا سلسلہ جاری رہا۔ یہ سلسلہ ہنوز مکمل نہ ہوا تھا کہ علمائے سلف کی یہ آخری یادگار بھی اچانک حملۂ مرض سے ۲۱ صفر ۱۳۶۹ھ میں دنیا سے رخصت ہوگئی۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔ مسئلہ ہنوز تشنۂ تکمیل تھا۔ اس حادثہ نے اور بھی ہمت توڑ دی۔ ایک مدت تک پھر التواء میں پڑا رہا۔ اہل عصر ارباب فتویٰ کی کچھ تحقیقات و جوابات اس عرصے میں موصول ہوئے اور

---

[1] آلات جدیدہ کے شرعی احکام از حضرت مفتی محمد شفیع صاحبؒ ۔ صفحہ ۳۔ مطبوعہ کراچی

بتقاضائے ضرورت پھر اس مسئلے پر لکھنے کے لیے احباب کا تقاضا ہوا۔ اس لیے اس کی پوری تاریخ بتلانے کے بعد اس مکرر تحقیق اور چند سالہ غور و فکر اور اکابر علماء سے بحث و تمحیص کے بعد جس نتیجہ پر احقر ناکارہ پہنچا ہے، توکلاً علی اللہ عرض کرتا ہے۔ اس پر بھی اس وقت اقدام کیا، جب اکابر علماء، اہل تحقیق و ارباب فتویٰ سے زبانی بحث و تمحیص میں اس کی موافقت معلوم ہوئی۔ مثلاً مولانا ظفر احمد عثمانی، حضرت مولانا محمد حسن مہتمم جامعہ اشرفیہ لاہور، حضرت مولانا محمد ادریس صاحب شیخ الحدیث مدرسۂ مذکور، حضرت مولانا خیر محمد صاحب مہتمم مدرسہ خیر المدارس ملتان، حضرت مولانا اطہر علی صاحب صدر جمعیۃ علماء اسلام مشرقی پاکستان اور علامہ زاہد کوثری از اکابر علماء مصر و مفتی اعظم فلسطین، مفتی دیارِ مصریہ و شیخ امجد زہاوی قاضی عراق و ترکستان۔"

اسی طرح حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی تحریرات میں اکابر علماء و مشائخ کے فقہی اختلاف میں کسی کو ترجیح دینے میں بڑی عرق ریزی کے باوجود محتاط پہلو نمایاں نظر آتا ہے۔ چنانچہ آپ ایک مسئلے میں جس میں علامہ شامی اور شارح منیہ جواز کے قائل اور دوسرے عامہ مشائخ ناجائز فرماتے ہیں، وجوہ ترجیح بیان کرنے کے بعد اپنی محتاط رائے کا اظہار فرمادیا ہے:۔

"مسئلہ یہ ہے کہ اگر دبیز اور اونی جرابوں کو منعل کرلیا جائے یعنی تلے یا نیچے اور ایڑھی پر بھی چمڑا چڑھا دیا جائے تو اس پر مسح کرنا شامی اور شارح منیہ جائز مگر خلاف تقویٰ قرار دیتے ہیں۔ اور دوسرے عامہ مشائخ ناجائز فرماتے ہیں۔ اور ایسے اکابر علماء و مشائخ کے اختلاف میں کسی جانب کو ترجیح دینا گو ہم جیسوں کا کام نہیں۔ لیکن بضرورت دینیہ اس سے چارہ بھی نہیں۔"

آخر میں حضرت تحریر فرماتے ہیں:

"اس لیے خیال احقر کا یہ ہے کہ اس قسم کی جرابوں پر بھی مسح کی اجازت نہ دی جائے۔ واللہ تعالیٰ المسئول للسدید وھو من فضلہ وکرمہ غیر بعید۔" (فتاویٰ دارالعلوم دیوبند مطبوعہ کراچی ج ۲ ص ۲)

بعض مرتبہ حضرت مفتی صاحبؒ اکابرین کے مسئلہ میں اختلاف ہوجانے کی صورت میں سائلین کو بھی احتیاط پر عمل کرنے کی تلقین فرماتے۔ چنانچہ ایک جگہ ہند و پاک سے جانے والے عازمین حج کیلئے مواقیت سے احرام کے سلسلے میں تحریر فرماتے ہیں کہ

"ایسے حالات میں کہ اس مسئلے میں علماء کا اختلاف رائے ہے، احتیاط اسی میں ہے کہ بحری جہاز میں یلملم ہی سے احرام باندھ لیں۔ یا ساحل جدہ پر اُترنے سے پہلے احرام باندھ لیں، کیونکہ حسب تصریح فقہاء محل اختلاف میں احتیاط کا پہلو اختیار کرنا بہتر ہے، تاکہ عبادت کے جواز میں کسی کا اختلاف نہ رہے۔" [1]

اسی طرح حضرت رحمۃ اللہ علیہ کو کسی سوال کا جواب تحریر فرمانے کے بعد اس میں شبہ ہوجاتا تو آپ احتیاط کی بناء پر برملا اس کا اظہار فرمادیتے اور سائل کو دوسرے علماء سے تحقیق کرنے کا حکم صادر فرماتے۔ اسی نوعیت کے ایک سوال کا جواب فتاویٰ دارالعلوم دیوبند جلد ۲ صفحہ ۱۳۳ پر درج ہے۔ آپ کو اس پر شبہ ہوگیا، آپ نے حاشیہ دے کر ایک نوٹ تحریر فرمایا۔ اس نوٹ سے آپ کے وصف احتیاط کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ لکھتے ہیں :

"نظر ثانی کے وقت مجھے اس طلاق کے رجعی ہونے میں شبہ ہوگیا۔ کیونکہ اس کے الفاظ "وہ میری ماں ہیں" اگرچہ مستقلاً بحکم طلاق نہیں، لیکن اگر اس نے ان الفاظ سے نیت حرمت کی کرلی ہے، جیسا کہ ظاہر یہی ہے تو معنیٔ طلاق میں ایک شدت کا اضافہ ان لفظوں سے ہوجاتا ہے، جس کا مقتضا یہ ہے کہ طلاق بائن ہوجائے، جیسے فقہاء نے اشد الطلاق یا اطول الطلاق وغیرہ کے الفاظ میں بینونت کا حکم کیا ہے، اس لیے ناظرین دوسرے علماء سے تحقیق فرماکر عمل کریں۔"

حضرت رحمۃ اللہ علیہ کسی سوال کا جواب جزئیہ نہ ملنے کی وجہ سے اصول و قواعد سے تحریر فرمادیتے تب بھی سائل کو دوسرے علماء سے تحقیق کرنے کا مشورہ تحریر فرمادیتے۔ چنانچہ ایک سوال

---

[1] جواہر الفقہ۔ جلد ۱ صفحہ ۳۸۹۔

کے جواب میں فرماتے ہیں :

"آلہ مذکورہ کی شکل دیکھنے سے، نیز اُس حال سے جو سوال میں درج ہے معلوم ہوتا ہے کہ یہ آلہ تیر کی طرح زخم کھولتا ہے۔ بندوق کی عام گولی اور چھرّوں کی طرح جسم کو کوٹتا نہیں، لہٰذا اس کا حکم تیر ہی کا حکم ہے، یعنی اگر بسم اللہ کہہ کر چھوڑا جائے اور جانور اس کے ذریعہ مرجائے تو حلال ہوگا، کما هو حكم السهم فی عامة کتب الفقه، لیکن یہ مسئلہ چونکہ محض قواعد سے لکھا گیا ہے۔ کوئی صریح جزئیہ نظر سے نہیں گزرا، اس لیے دوسرے علماء سے بھی تحقیق کرلینا چاہیے۔ فقط۔ واللہ تعالیٰ اعلم"[1]

حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی شانِ تحقیق وتفقاہت آپ کی تصانیف سے نمایاں ہے۔ احقر کے خیال میں آپ کی شانِ تحقیق وفقاہت کے لیے صرف جواہر الفقہ دیکھ لینا کافی ہوگا۔ تاہم تمثیلاً حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی عشر وخراج کے احکام کی تحقیق مختصر طریق سے بیان کی جاتی ہے جس سے آپ کی شانِ تحقیق کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ آپ نے عشر وخراج کے احکام کی تحقیق جواہر الفقہ جلد۲ صفحہ ۲۵۱ پر تقریباً پچیس صفحات پر مفصل طریق سے فرمائی ہے۔ یہ مقالہ دراصل حضرت مفتی صاحبؒ کی کتاب "اسلام کا نظامِ اراضی" کا چھٹا باب ہے۔ اس کتاب کا تعارف کراتے ہوئے استاذ المکرم حضرت مولانا مفتی محمد رفیع صاحب مدظلہم تحریر فرماتے ہیں کہ

"یہ کتاب اپنے موضوع پر بالکل منفرد اور بہت سے دقیق اور ضروری مسائل کی تحقیق میں بے نظیر ہے، ہر ملک کے شرعی احکام، زمینوں کے بارے میں اسلامی حکومت کے اختیارات وغیرہ شرعی دلائل سے واضح کیے گئے ہیں۔ پہلے باب میں اسلام کے عام احکامِ اراضی بلاتخصیص کسی ملک اور خطے کے بیان کیے گئے ہیں۔ دوسرے باب میں قبل از تقسیم مشترکہ ہندوستان کی زمینوں کے شرعی احکام شاہانِ اسلام کے فرامین اور ان کے تعامل کی روشنی میں ہندوستان کے ہر صوبے کے متعلق جداجدا

---

[1] جواہر الفقہ۔ جلد۱ صفحہ ۶۷۱

احکام جمع کیے گئے ہیں۔ پھر انگریزی عہد کے تغیرات اور ان کا جو اثر زمینوں کے احکام پر پڑا، اس کا بیان ہے۔ تیسرے باب میں تقسیم ہند اور بنائے پاکستان کی مختصر تاریخ اور وہ دستاویزی معاہدہ جس کی رُو سے ہندوستان دو ملکوں میں تقسیم ہوا، جس پر دونوں ملکوں کی زمینوں کے احکام کا مدار ہے۔ ان معاملات کی روشنی میں دونوں ملکوں کی زمینوں کے احکام شرعی میں کیا فرق آیا؟ اور دونوں طرف سے ترک وطن کرنے والوں کی متروکہ زمینوں کے کیا احکام ہیں؟ ان سب امور کا مفصل بیان۔ چوتھے باب میں دونوں ملکوں کے اوقاف کے متعلق احکام ہیں۔ پانچویں باب میں دونوں ملکوں کی اراضی کے عشر و خراج کی تحقیق اور مسائل درج ہیں۔ مقصد کے لحاظ سے یہ کتاب فقہی احکام کی حیثیت رکھتی ہے، لیکن اس کے ضمن میں تقریباً اکثر فتوحاتِ اسلامیہ خصوصاً فتوحاتِ ہندوستان اور شاہانِ ہند کے فرامین وغیرہ کا ایک اہم تاریخی حصہ بھی آگیا ہے۔[۱]

ذیل میں چھٹے باب کی تفصیلات مختصراً بیان کی جاتی ہیں۔

آپ نے ابتداءً عشر و خراج کی تعریف دلائل سے واضح فرمائی ہے، بعدہٗ موصوفؒ لکھتے ہیں کہ مذکورہ تفصیلات سے معلوم ہوا کہ خاص خاص حالات و صفات کے اعتبار سے زمینوں کی دو قسمیں ہیں، کچھ عشری کچھ خراجی۔ اس باب میں اصل مقصود اسی کا بیان اور تعین ہے کہ کونسی زمین عشری ہے اور کونسی خراجی۔ چنانچہ آپ نے اس کی مکمل تحقیق تحریر فرماتے ہوئے مسئلہ کی وضاحت کے لیے عہد رسالت و خلفائے راشدین کے فیصلے زمینوں کے عشری یا خراجی ہونے کے سلسلے میں نقل فرمائے ہیں۔ اس کے بعد بحث کی ہے کہ اراضی پاکستان پر عشر واجب ہے یا خراج، اس سلسلے میں آپ اپنے اکابرین اور علمائے سندھ کی تحقیق اور دیگر فقہی کتابوں کے محاکمے کے بعد صفحہ ۲۶۷ پر پوری تفصیلی بحث کا خلاصہ تحریر فرماتے ہیں:

"خلاصہ یہ ہے کہ حکومت برطانیہ کے زمانہ میں مشترکہ ہندوستان کی زمینیں

---

[۱] جواہر الفقہ۔ جلد ۲۔ صفحہ ۲۹۸

کے جو احکام عشری یا خراجی ہونے کے متعلق مذکورالصدر تحقیق اور حضرت حکیم الامت تھانوی قدس سرہ کے فتویٰ سے ثابت ہوئے ہیں۔ بناء پاکستان کے بعد پاکستان کی بعض اراضی میں وہ احکام بدلے ہیں، جن کا ذکر اوپر کیا گیا ہے کہ غیر مسلموں کی متروکہ زمینیں جو حکومت پاکستان نے مسلمانوں میں تقسیم کیں، وہ سب عشری ہوگئیں، خواہ پہلے وہ خراجی ہوں۔ اسی طرح وہ زمینیں جن کو حکومت پاکستان نے آباد کر کے مسلمانوں میں تقسیم کیا وہ بھی عشری ہوگئیں، اگرچہ اس سے پہلے نہ وہ عشری تھیں نہ خراجی۔ ان دونوں قسموں کے علاوہ باقی اقسام اراضی کے وہی احکام باقی رہے جو عہد برطانیہ اور اس سے پہلے اسلامی حکومت کے زمانہ میں چلے آتے ہیں جن کی تفصیل حکیم الامت قدس سرہ اور فتاویٰ دارالعلوم کے حوالہ سے بیان ہو چکی ہے۔"

اس کے بعد آپ کے ہندوستان کی اراضی کے عشری یا خراجی ہونے کی تحقیق فرمائی ہے اور اس سلسلے میں بعض علمائے کرام کے فتووں سے پیدا ہونے والے شبہات کو بڑے عمدہ اور دلنشین انداز سے دور فرمایا ہے۔ اپنی اس تحقیق کے آخر میں بطور تائید حضرت تھانوی علیہ الرحمہ کی تحقیق گوش گزار کی ہے بعدہٗ آپ نے پوری تحقیق ازیں کا خلاصہ تحریر فرمایا ہے اور پھر عشر و خراج کے احکام و مسائل بیان فرمائے ہیں۔ مزید آگے آپ نے ادائے خراج پاکستان و ہندوستان کی صورت کو منقح کیا ہے اور آخر میں اس پوری بحث کا خلاصہ تحریر فرمایا ہے کہ

"خلاصہ کلام یہ ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو اپنی خراجی زمینوں کا خراج بطور خود نکال کر مصارف خراج، مدارس اسلامیہ اور علماء و طلباء پر صرف کرنا چاہیے اور یہ خراج موظف ہوگا جس کی تفصیل ابھی گزری ہے اور توظیف عمری کے نام سے تمام حدیث و فقہ کی کتابوں میں موجود ہے۔ اور پاکستان کے مسلمان اپنی خراجی زمینوں کا خراج حکومت پاکستان کی مالگزاری میں دے کر سبکدوش ہو سکتے ہیں بشرطیکہ مقدار خراج یعنی پیداوار کا پانچواں حصہ پورا سرکاری مال گزاری میں آجاتا ہو۔ اور اگر سرکاری مال گزاری میں اس مقدار سے کم ہو تو بقدر کمی کے پاکستانی مسلمانوں پر بھی بطور خود

باقی ماندہ خراج کی ادائیگی اور مصارف خراج میں خرچ کرنا ہوگا[1] واللہ تعالیٰ اعلم

وسعتِ قلب و نظر

حضرت مفتی صاحب قدس سرہٗ کو اللہ جل شانہٗ نے بڑا وسیع القلب اور وسیع النظر بنایا تھا۔ آپ اپنی تحقیق کے ساتھ دوسرے اکابرین اور ہمعصر علماء کی تحقیق کو نقل کرنا اپنی سعادت سمجھتے تھے اور انھیں اسی طرح شائع بھی فرمادیا کرتے تھے (تفصیلات کے لیے دیکھیے جواہر الفقہ) اگر آپ کے فتوے سے کسی عالم کو اختلاف ہوتا تو آپ بڑی سنجیدگی کے ساتھ اس پر غور فرماتے اور بعض مرتبہ اس اختلاف کا ذکر بھی فرماتے، بلکہ ان کی مفصل تحریر اپنے فتوے کے ساتھ منسلک فرماکر شائع کردیا کرتے تھے چنانچہ آپ آلہ مکبر الصوت کے سلسلے میں فرماتے ہیں۔

> "احقر نے ان نئی تحقیقات اور دوسری وجوہ فقہیہ کے ساتھ اپنے رسالے کو دوبارہ ترتیب دیا اور اس کا مسودہ دارالعلوم دیوبند، مظاہر العلوم سہارن پور، خیر المدارس ملتان وغیرہ اہم مدارس اسلامیہ میں حضرات علماء کے غور و فکر اور استصواب رائے کے لیے بھیج دیا۔ ان سب حضرات نے جزوی اختلافات کے ساتھ اصل مسئلہ عدم فساد نماز میں اتفاق ظاہر فرمایا تو بنام خدا تعالیٰ یہ رسالہ ۱۳۷۱ھ میں شائع کردیا گیا، (اور تمام اکابرین علماء کی آراء کو اسی رسالے کے ساتھ شائع کردیا گیا)
>
> اس کی اشاعت کے بعد ہندوستان و پاکستان سے بعض علماء کی ایسی تحریریں وصول ہوئیں جن میں مکبر الصوت کی آواز کو متکلم کی آواز سے غیر ایک مصنوعی آواز ثابت کیا گیا تھا۔ میرے رسالے میں عدم فساد کا حکم اگرچہ اس پر موقوف نہ تھا بلکہ دوسری وجوہ فقہیہ بھی لکھی تھیں، جن کی رو سے غیر آواز متکلم ہونے کی صورت میں بھی فساد نماز کا حکم نہیں ہونا چاہیے، لیکن اس وقت حکم فساد کی بنیاد ہی منہدم سمجھ کر اُن وجوہ فقہیہ پر تفصیلی بحث کی ضرورت نہ سمجھی گئی تھی، اب جب کہ بعض علماء نے

---

[1] جواہر الفقہ۔ جلد ۲۔ صفحہ ۲۹۴

اختلاف کا اظہار فرمایا، خصوصاً حضرت مولانا قاضی شمس الدین صاحب نے ہری پور ہزارہ سے خاص ماہرین صوتیات کی ایک مفصل تحریر ارسال فرمائی جس میں اس کا مصنوعی آواز ہونا ثابت کیا گیا ہے، جس کو آخر رسالہ ضمیمہ ثانیہ میں پورا نقل کر دیا گیا ہے۔ نیز احقر کی لکھی ہوئی وجوہِ فقہیہ پر تنقید فرمائی، اس لیے ضرورت پیش آئی کہ ان جزئیات پر تفصیلی بحث کی جائے۔ احقر نے اپنی ناچیز تحقیق و بصیرت کی حد تک اس کی تفصیل لکھ کر مولانا موصوف کے پاس بھیج دی۔ اس پر مولانا موصوف نے استدراک تحریر فرمایا۔ احقر نے مولانا کی تنقیدات سابقہ اور استدراک لاحق کا بغور مطالعہ کیا جس سے کئی جگہ اپنی فروگذاشت یا غلطی کا علم ہوا اور کہیں کہیں عبارت کے اجمال و ابہام سے شبہات پیدا ہوئے تھے۔ احقر نے مولانا موصوف کے شکریے کے ساتھ ان اغلاط و اجمال کی اصلاح اصل رسالے میں کر دی، مگر ان میں سے اکثر لفظی یا جزوی مناقشات تھے جن کا اثر اصل مسئلے پر کچھ نہ تھا۔"

آخر میں حضرت مفتی صاحبؒ نے قاضی صاحب سے اختلاف کے باوجود ان کا شکریہ ادا کیا۔ اور ان کی مُراسلہ تحقیق کو شائع فرمایا۔ تحریر فرماتے ہیں:

"قاضی شمس الدین صاحب کا شکرگزار ہوں کہ اپنی بصیرت افروز تحریرات سے بہت سی مفید معلومات عطا فرمائیں۔ آپ کی مُراسلہ تحقیق متعلقہ آواز مکبر الصوت کو ضمیمہ ثانیہ کا جزء بنا کر مکمل شائع کیا جاتا ہے۔ ....." [1]

اگر حضرت مفتی صاحب رحمہ اللہ کے فتوٰی سے کسی کو اختلاف ہوتا اور وہ آپ کے فتوے کے خلاف عمل کرتا تو آپ اس سے بالکل ناگواری کا اظہار نہ فرماتے۔ بلکہ بعض جگہ خود موصوفؒ اپنی تحقیق انیق کے بعد تحریر فرما دیا کرتے کہ کسی کو اسؒ سے اختلاف ہو تو دوسرے علماء سے تحقیق کرکے اس پر عمل کریں چنانچہ آپ نماز میں آلہ مکبر الصوت کے استعمال پر عدم فساد کی مکمل تحقیق کے بعد رقمطراز ہیں۔

"آخر میں یہ عرض ہے کہ اس میں جو کچھ لکھا گیا ہے، اپنی ناقص تحقیق اور ناقص

---

[1] آلاتِ جدیدہ کے شرعی احکام صفحہ ۳۔

فہم پر اس کا مدار ہے۔ اگر کسی صاحب کو اس کے خلاف کوئی دوسری صورت راجح معلوم ہو، وہ دُوسرے عُلماء سے تحقیق کر کے عمل کریں " لہ

اسی طرح تحقیق متعلقہ پراویڈنٹ فنڈ کے بعد آخر میں تنبیہ کے زیرِ عنوان تحریر فرماتے ہیں کہ

"روایاتِ فقہیہ کو دیکھنے اور غور کرنے سے احقر کو یہی صحیح معلوم ہوتا ہے کہ اس فنڈ کی رقم پر ایامِ ماضیہ کی زکوٰۃ واجب نہیں۔ احتیاطاً دوسرے علماء سے بھی تحقیق کرلینا مناسب ہے "

اگر حضرت مفتی صاحبؒ کو کسی مسئلے میں تردد یا شبہ ہو جاتا تو سائلین کو دوسرے ائمۂ فقہ کی طرف رجوع کرنے اور ان سے مسئلہ دریافت کر کے عمل کرنے کی ترغیب فرماتے۔ چنانچہ آپ ناجائز کاموں میں تعاون کے سلسلے میں تحریر فرماتے ہیں :

"البتہ کراہت تحریم و تنزیہہ کا فیصلہ اس بارے میں محل غور ہے۔ اگر یہ دیکھا جائے کہ بنانے والے نے بنک کی مناسبت سے کمرے بنوائے ہیں، تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ کراہت تحریم ہے۔ اور یہ سمجھا جائے کہ ایسے کمرے صرف بنک ہی کے لیے نہیں بلکہ دوسرے کاموں اور دفاتر کے لیے بھی بنتے ہیں تو کراہتِ تنزیہہ کہا جاسکتا ہے۔ اس میں مجھے ہنوز تردد ہے کہ اس کو مکروہ تحریمی کہا جائے یا تنزیہی، دُوسرے علماء سے استصواب فرمالیں " ۲ہ

نیز آپ وقف کے ایک مسئلے میں تردد کے باعث تحریر فرماتے ہیں :-

"نظرِ ثانی کے وقت احقر کو اس مسئلے میں تردد ہوگیا۔ سرسری تلاش میں کوئی صریح جزئیہ اس مسئلہ کا نہیں ملا۔ یاد پڑتا ہے کہ شرح کبیر میں ایک جزئیہ لفظاً شیئاً کے ساتھ ہے اور اس میں حکم تنصیف کا نہیں ہے، مگر وہ بھی اس وقت نہیں ملا۔ اس لیے دُوسرے علماء سے تحقیق کر کے عمل کیا جاوے " ۳ہ

لہ آلاتِ جدیدہ کے شرعی احکام۔ صفحہ ۳۹

۲ہ جواہر الفقہ۔ جلد ۲۔ صفحہ ۳۶۲   ۳ہ امداد المفتین۔ صفحہ ۵۷۳۔ کتاب الوقف۔

اسی طرح ایک استفتاء کا جواب امداد المفتین میں مرقوم ہے جس پر حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدنیؒ، حضرت مولانا اصغر حسین صاحبؒ، حضرت مولانا اعزاز علی صاحبؒ اور حضرت مولانا محمد ابراہیم صاحبؒ کی تصحیح و تصدیق موجود ہے۔ لیکن نظر ثانی کے وقت تردد ہو جانے کے سبب تحریر فرماتے ہیں:-

"یہ فتویٰ شعبان ۱۳۵۱ھ میں لکھا گیا تھا، نظر ثانی کے وقت مجھے اس میں تردد ہو گیا کہ یہ کلام یمین فور ہے یا نہیں، لیکن چونکہ مدار جواب یمین فور ہونے پر نہیں اس لیے پوری تقریر کو بطور بحث کے رکھا گیا۔" ؎۱

اگر حضرت مفتی صاحبؒ کو اپنے فتوے اور اکابرین کے فتاویٰ میں اختلاف ہو جاتا تو اپنے فتویٰ کو ترجیح دینے کے بجائے لکھ دیتے کہ سائل کو اختیار ہے، جس کے فتویٰ پر دیانۃً اعتماد ہو اس پر عمل کرلے یا مزید تحقیق کرکے جو راجح ہو اس پر عمل کرے۔ چنانچہ فتاویٰ دارالعلوم دیوبند میں مرقوم ایک فتویٰ کے سلسلے میں ذیلی حاشیہ دے کر لکھتے ہیں کہ

"فارسی میں لفظ "گذاشتم" اور اُردو میں "چھوڑ دیا" جب کہ بیوی کے متعلق استعمال کیے جاویں، اس مسئلہ میں فتاویٰ علماءِ عصر کے مختلف ہیں۔ عزیز الفتاویٰ جلد ۲ صفحہ ۵۰، میں اس کو کنایہ قرار دے کر محتاج نیت فرمایا ہے اور بشرط نیت وقوع بائن کا حکم دیا ہے اور بعض احباب نے حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی قدس سرہٗ سے بھی یہی حکم نقل کیا ہے۔ اور مولانا عبدالحی لکھنویؒ نیز حضرت حکیم الامت تھانویؒ ان الفاظ کو بوجہ عرف عام کے صریح قرار دیتے ہیں۔ حکم اس کا یہی ہے کہ ایک طلاق رجعی ہوگی خواہ نیت ہو یا نہ ہو۔ احقر کے خیال میں بھی اسی کو ترجیح ہے۔ غرض اس میں علماء کا اختلاف ہے، سائل کو دیانۃً جس پر زیادہ اعتماد ہو اس کے فتوے کو اختیار کرنا چاہیے۔" ؎۲

اسی طرح حضرت مفتی صاحبؒ امداد المفتین کے مقدمے میں صفحہ ۱ پر اپنے استاذ محترم حضرت

؎۱ امداد المفتین۔ صفحہ ۴۹۴

؎۲ جلد ۲ ۔ صفحہ ۳۴۷

مولانا مفتی عزیزالرحمٰن صاحبؒ کے فتاوٰی بنام عزیزالفتاوٰی کی جمع وترتیب اور اس کی تصحیح کے سلسلے میں تحریر فرماتے ہیں :

"احقر نے اس سلسلے میں اپنا یہ معمول قرار دیا کہ جس جگہ یقینی طور پر کتابت کی غلطی ثابت ہوئی، وہاں تو تصحیح کردی اور جس جگہ شبہ رہا، وہاں ترمیم نہ کی بلکہ حاشیہ میں متنبہ کردیا۔ اسی طرح جن مسائل کے احکام حالات بدل جانے کے سبب بدل گئے، وہاں بھی حاشیہ میں تنبیہ کردی۔ معدودے چند مقامات ایسے بھی آئے ہیں جن میں حضرت مفتی صاحبؒ کے فتاوٰی پر احقر کو شرح صدر نہیں ہوا اور میرا اپنا فتوٰی اس کے مطابق نہیں ہوسکا اور عزیزالفتاوٰی و امدادالمفتین میں فتاوٰی کا اختلاف رہا، ایسے مواقع میں بھی حاشیہ پر تنبیہ کردی گئی۔ ان مسائل میں اہلِ بصیرت اپنی بصیرت پر اور عوام دوسرے علماء کی طرف مراجعت کرکے جس پر اطمینان ہو اس پر عمل کریں۔"

اور ایک جگہ پٹہ دوامی کے سلسلے میں لکھتے ہیں کہ

"پٹہ دوامی کا معاملہ اگر حکومت موجودہ سے کیا گیا ہے یا کسی وقف زمین کے متعلق ہے تو اس میں جواز اس معاملہ کا خصاف اور قنیہ کے موافق شامی اور بحر وغیرہ میں منقول ومصرح ہے، اس میں تو احقر کے نزدیک کوئی شبہ نہیں لیکن جو زمین کسی زمیندار کی ملکِ خاص ہو اس کے بارے میں چونکہ فقہاء متاخرین کے کلام بھی مختلف ہیں، اس لیے بہتر یہ ہے کہ دوسرے علماء سے بھی اس کی تحقیق کرلی جائے۔ واللہ سبحانہٗ وتعالٰی اعلم" [1]

نیز حضرت والاؒ بعض علماء سے فقہی اختلاف کے باوجود ان کی کتب وفتاوی کے حوالے اپنے فتاوٰی کی تائید میں پیش فرمادیا کرتے تھے۔ اسی طرح کا ایک سوال مع جواب امدادالمفتین سے نقل کیا جاتا ہے، جس میں آپ نے جواب تحریر کرنے کے بعد اپنے فتوے کی تائید میں مولانا عبدالحی لکھنوی" کے

---

[1] جواہرالفقہ۔ جلد ۲ صفحہ ۳۱۴

مجموعۃ الفتاویٰ کا حوالہ دیا ہے۔ جب کہ آپ کا مولانا عبدالحی لکھنویؒ سے سونے چاندی کے نصاب اور اوزانِ شرعیہ میں شدید اختلاف ہے۔ اختلاف کی تفصیلات اوزانِ شرعیہ میں دیکھی جاسکتی ہیں۔

سوال (۱۵۶) تمباکو کھانا جائز ہے یا حرام؟ پان منہ میں ہوتے ہوئے درود شریف پڑھنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: تمباکو کھانا بلا تأمل جائز ہے اور تمباکو منہ میں ہوتے ہوئے درود شریف اور قرآن مجید وغیرہ پڑھنا بھی جائز ہے۔ کذا قال مولانا المحقق عبدالحی لکھنویؒ فی مجموعۃ الفتاویٰ جلد دوم صفحہ ۳۹۵ [۱]

آپ خود بھی بعض مسائل میں دوسرے علماء سے استفادہ فرمایا کرتے تھے، خصوصاً اپنے ذاتی مسائل میں تو اکثر رجوع فرمایا کرتے تھے۔ چنانچہ آپ نے ایک مرتبہ جب کہ آپ شدید تکلیف میں مبتلا تھے، استاذِ مکرم حضرت مولانا عاشق الٰہی صاحب مدنی مدظلہم سے دریافت فرمایا کہ تیمم کی گنجائش ہے؟ علامہ موصوف فرماتے ہیں کہ میرے نزدیک گنجائش نہ تھی لیکن تکلیف اس قدر شدید تھی کہ میں یہ کہنے کی ہمت نہ کرسکا کہ وضو کرنا لازم ہے۔ تھوڑی دیر خاموش بیٹھ کر چلا آیا۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے محسوس فرمالیا کہ وضو کے بغیر چارہ نہیں، چنانچہ وضو فرما کر نماز ادا فرمائی اور مسجد میں مجھ سے فرمایا کہ میں نے وضو کرلیا تھا۔ [۲]

اسی طرح حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے ایک سوال کے جواب میں بالتفصیل تحریر فرمایا کہ تقرب الی غیر اللہ کے لیے کسی جاندار کو نامزد کرنے کی تین صورتیں ہیں۔ اور آخر میں تینوں صورتوں کی پوری بحث کا خلاصہ تحریر کرنے کے بعد رقمطراز ہیں کہ

> "اس مسئلے میں تیسری صورت چونکہ احقر نے محض قواعد سے لکھی تھی اس لیے اس پر اطمینان نہ تھا، بناءً علیہ حضرت ممدوحؒ (مولانا تھانویؒ) کی خدمت میں عریضہ لکھ کر استصواب کیا۔ یہ خط مع جواب امداد المفتین، کتاب الصید والذبائح صفحہ ۶۲۹ پر مرقوم ہے۔"

---

[۱] امداد المفتین صفحہ ۱۵۷، کتاب الاکل والشرب [۲] البلاغ۔ ربیع الاول ۱۳۹۶ھ

فقہی اختلافات میں اعتدال پسندی

اللہ جل شانہ نے حضرت مفتی صاحب نوراللہ مرقدہ کو بہت سی صفاتِ جمیلہ سے نوازا تھا، جن میں سے ان کی ایک خاص صفت طبیعت کا اعتدال ہے، جس کا ایک نتیجہ یہ بھی تھا کہ ہر مکتب فکر کے لوگ آپ کی خدمت میں حاضر ہوتے اور آپ ان سے بڑی خندہ پیشانی اور بشاشت سے ملتے اور ان کی عزت و احترام فرماتے اور کبھی کسی کے آنے پر ناگواری یا بدخلقی کا مظاہرہ نہ فرماتے۔ چنانچہ آپ کی وفات پر سب ہی مکتب فکر کے لوگ آپ کے جنازے میں شریک تھے اور سب ہی کو آپ کی مفارقت کا غم تھا۔ اس سلسلے میں یہ امر بھی قابلِ ذکر ہے کہ آپ نے حالات کے پیشِ نظر ۱۹۷۰ء میں بریلوی مکتب فکر کے مولانا محمد حسن حقانی کو ووٹ دینے کی اپیل کی تھی جو آپ کے حلقہ سے صوبائی انتخاب کے لیے کھڑے ہوئے تھے اور وہ اس حلقہ سے کامیاب ہوئے حالانکہ ان سے آپ کا مسلکاً شدید اختلاف ہے۔ یہ اعلان اخبار جنگ میں شائع ہو چکا ہے۔

جواہر الفقہ جلد ۲ صفحہ ۳۰۷ پر آپ اعتدال پسندی کی اہمیت پر خود تحریر فرماتے ہیں کہ

> دُنیا کے مسلمات اور علومِ متعارفہ میں سے ہے کہ کوئی چیز خواہ کتنی ہی محبوب اور بہتر ہو، جب وہ اپنی حُدود سے تجاوز کرتی ہے تو مُضر اور ایک آفت ہو جاتی ہے۔ پانی اور ہُوا انسان کے لیے مدارِ حیات ہیں لیکن ذرا اعتدال سے زائد ہو جاتی ہیں تو یہی چیزیں مہلک ہو جاتی ہیں۔ اگر غور کیا جائے تو دین و دنیا کی تمام خرابیاں، جرائم اور معاصی، بداعمالی اور بدخلقی، سب ایک لفظ بے اعتدالی کی شرح اور اس کے مختلف شعبے ہیں اور ہر زمانے میں اصلاح کرنے والوں کا کام اسی بے اعتدالی کا علاج کرنا رہا ہے۔ جس طرح طبِ جسمانی میں بے اعتدالی کا نام مرض ہے اور مزاج کے اعتدال کی اصلاح و علاج ہے، ٹھیک اسی طرح طبِ روحانی (دین و شریعت) میں بھی یہی اصول رائج ہے۔

آپ کی تصانیف و تحریرات کے مطالعے سے اس بات کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ آپ نے مسائل کے اختلاف میں کبھی سخت اور متعصبانہ الفاظ استعمال نہیں کیے۔ ذاتیات سے ہمیشہ دامن

بجا یا اور کبھی ایسا انداز بیان اختیار نہیں فرمایا، جس سے دُوسرے عالم کی توہین و تذلیل ہو۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ اختلافات میں آپ بہت محتاط الفاظ استعمال فرماتے تھے اور وہ اختلاف صرف مسئلے کی حد تک ہوتا تھا، تلخیٔ کلام تک نوبت نہیں آتی تھی اور اختلاف رائے پر کبھی غصہ یا ناگواری کا اظہار نہ فرماتے تھے، اگرچہ اختلاف کرنے والا آپ کا شاگرد ہی کیوں نہ ہو۔ حضرت مولانا عاشق الٰہی صاحب مدظلہم جو کئی سال تک حضرت کے زیر سایہ فتاویٰ کے جوابات دیتے رہے۔ فرماتے ہیں:۔

"احقر کو بہت سی جگہ اختلاف رائے بھی ہوتا، بندہ عرض کر دیتا کہ یہ جواب آپ کی رائے کے مطابق لکھ دیا ہے، آپ دستخط فرمادیں، میں دستخط نہیں کروں گا۔ میری گزارش بشاشت سے قبول فرماتے اور دستخط فرمادیتے۔ مجھ جیسے ایک معمولی طالب علم کے اختلاف کرنے میں کبھی تکدر یا ناگواری کا ظہور نہیں ہُوا تکدر کیا ہوتا، اختلاف سے خوش ہوتے تھے۔"[1]

اور اگر آپ کو کسی عالم کے کسی مسئلے میں مغالطے کے بارے میں شبہ ہوجاتا تو اس شبہ کی وجہ بھی بیان فرمادیا کرتے تھے کہ ممکن ہے اس کا اعتبار کرتے ہوئے مذکورہ عالم نے مسئلہ بیان کیا ہو۔ چنانچہ مولانا عبدالحی لکھنویؒ سے اوزان شرعیہ میں اختلاف فرماتے ہوئے فرماتے ہیں کہ

"مولانا لکھنویؒ نے جو وزن صاع کا ایک سیر پندرہ تولے قرار دیا ہے جہاں تک احقر نے تفتیش کی وہ کسی حساب سے درست نہیں نکلا۔ اور وجہ اس مغالطے کی وہی معلوم ہوتی ہے جو وزن درہم کی تحقیق میں عرض کی گئی ہے کہ صرف ایک رتی کو جو کے ساتھ تولا گیا اس میں خفیف سا فرق محسوس نہ ہوا۔"

آپ حاشیہ پر تحریر فرماتے ہیں کہ

"یہ بھی ممکن ہے کہ مولانا نے دوسرے ائمہ کے موافق صاع عراقی کے بجائے صاع حجازی اختیار فرمایا ہو، جو آٹھ کے بجائے پانچ رطل سے کچھ زائد ہوتا ہے، مگر جمہور حنفیہ نے چونکہ صاع عراقی کو ہی ان معاملات میں اختیار کیا ہے اس لیے

---

[1] البلاغ ربیع الاول ۱۳۹۶ھ

ہم نے اسی کا حساب لگایا ہے۔ واللہ اعلم۔"

مولانا لکھنویؒ سے اس شدید اختلاف کے باوجود آپ اپنے فتاویٰ کی تائید میں ان کے اقوال اور ان کی تصانیف کی عبارتیں پیش فرماتے ہیں اور مولانا لکھنویؒ کے لیے بڑے بڑے عمدہ الفاظ تحریر کیے ہیں۔ ملاحظہ ہو امداد المفتین کتاب الاکل والمشرب صفحہ ۱۰۵۲ سوال مع جواب نمبر ۱۵۶۱ لکھنے کے بعد تحریر فرماتے ہیں: کذا قال مولانا المحقق عبد الحی لکھنوی فی مجموعۃ الفتاوی (جلد دوم صفحہ ۱۹۵)

دوسری جگہ حضرت مفتی صاحبؒ کتاب الطلاق صفحہ ۶۰۹ پر رقمطراز ہیں:۔

وصرح به مولانا عبد الحی لکھنوی رحمۃ اللہ علیه فی مجموعة الفتاوٰی (جلد اول)

اسی طرح حضرت مفتی صاحبؒ کا مولانا بنوریؒ اور مفتی رشید احمد صاحب مدظلہم سے اس مسئلہ کی تحقیق میں کہ ہندوپاک سے جانیوالے عازمین حج کو کس جگہ سے احرام باندھنا چاہیے اور کیا ان کے لیے جدہ داخل میقات ہے؟ اختلاف ہے۔ آپ دونوں حضرات کی مکمل تحقیق نقل فرمانے کے بعد تحریر فرماتے ہیں، جب کہ دونوں حضرات آپ کے ہمعصر ہیں۔ جس سے آپ کا وصف اعتدال واضح اور روز روشن کی طرح نمایاں ہوجاتا ہے اور یہیں سے یہ بات بھی ثابت ہوجاتی ہے کہ آپ معاصر فہماء کا کس درجہ احترام فرمایا کرتے تھے، حالانکہ مشہور ہے، معاصرت بہت بڑی ابتلاء ہے، اس فتنہ سے اچھے اچھے اور بڑے بڑے علماء نہ بچ سکے۔ فرماتے ہیں کہ

"مذکورہ بالا دونوں بزرگوں کے علمی اور عملی کمالات مجھ پا بر کاب ضعیف کے لیے قابل غبطہ ہیں زادھم اللہ تعالیٰ علما نافعا وعملا متقبلا زیادات لا تتناھی۔ لیکن جن وجوہ کی بناء پر ان حضرات نے بحری مسافروں کے لیے جدہ سے احرام باندھنے کو ناجائز، موجب دم قرار دیا ہے، ان پر احقر کا قلب منشرح نہیں۔ احقر نے جہاں تک غور کیا، ترجیح اسی کو معلوم ہوئی کہ بحری مسافروں کے لیے جدہ تک احرام مؤخر کرنا اور جدہ سے باندھنا نہ کوئی گناہ ہے، نہ اس سے دم لازم آتا ہے۔" (جواہر الفقہ جلد ا صفحہ ۸۰۲ مواقیت حرام)

اسی طرح حضرت مفتی صاحبؒ کے پاس آئے ہوئے ایک سوال پر جس میں سائل نے یہ دریافت کیا تھا کہ نابالغ لڑکی کا نکاح باپ کردے تو کس صورت میں اس کو خیار فسخ ملے گا؟ اور باپ کو کب سیئ الاختیار قرار دیا جائے گا؟ نیز اس نکاح کو فسخ کرنے کی شرعی صورت کیا ہوگی؟ ایک جواب مدرسہ خیرالمدارس ملتان کے نائب مفتی مولانا محمد اسحاق صاحب کا مرقوم ہے اور اس جواب پر مولانا خیر محمد صاحب رحمہ اللہ کی تصدیق و تصحیح ہے۔ اور دوسرا جواب جامعہ اشرفیہ لاہور کے مفتی مولانا جمیل احمد تھانوی مدظلہ کا ہے۔ حضرت مفتی صاحبؒ اس سوال کا محققانہ جواب تحریر فرمانے کے بعد لکھتے ہیں کہ

> اس تفصیل سے واضح ہوگیا کہ لاہور کا فتویٰ مرجوح ہے۔ اسی طرح ملتان کے فتویٰ میں بھی جو یہ لکھا گیا ہے کہ نکاح منعقد ہی نہیں ہوا، لڑکی آزاد ہے، جہاں چاہے نکاح کرے۔ یہ بھی صحیح نہیں، جیسا کہ فتاویٰ خیریہ کی تصریح سے معلوم ہوا کہ جس کسی نے اس کو نکاح کہا ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ عدالت کے ذریعہ فسخ کراکر باطل ہوسکتا ہے۔[1]

جب کہ حضرت مفتی صاحبؒ، مولانا خیر محمد صاحبؒ اور مفتی جمیل احمد صاحب مدظلہ ہم مسلک ہونے کے ساتھ ساتھ ایک شیخ کے تربیت یافتہ ہیں۔ اور یہ بھی معلوم ہے کہ یہ حضرات جب آپس میں ملتے تھے تو ایک دوسرے کا احترام و اکرام فرمایا کرتے تھے۔

مصر کے مفتی عبدہٗ ان تجدد پسند علماء میں سے تھے جنھوں نے بہت سے مسائل میں جمہور امت سے الگ راہ اختیار کی ہے اور ان کے اس شذوذ نے عالم اسلام کو بڑا نقصان پہنچایا چنانچہ انھوں نے پوری امت اسلامیہ اور ائمہ اربعہ کے خلاف، یورپ میں ہونے والے سب ذبائح کے حلال ہونے کا فتویٰ دے دیا تھا۔ ہمارے حضرتؒ نے ان کی تحقیق نقل فرماکر اس کی سخت تردید فرمائی ہے۔ صفحہ ۴۱۵ پر رقمطراز ہیں کہ

> مفتی عبدہٗ نے ذبیحہ پر اللہ کا نام لینے کی ضرورت کا پہلے ہی انکار کردیا تھا، حلقوم کی رگیں کاٹنے کی ضرورت کا بھی صاف انکار آگیا، گلا گھونٹ کر بالقصد مارے

---

[1] جواہر الفقہ۔ جلد ۲ صفحہ ۶۷

ہوئے جانور بھی حلال ہو گئے تو اب ان کی تحقیق کی رُو سے حرام صرف وہ جانور رہ گیا جو اپنی موت مرگیا ہو یا کسی انسان کے قصد و اختیار کے بغیر کسی ٹکر سے یا اونچی جگہ سے گر کر یا خود بخود گلا گھونٹ کر مرگیا ہو۔ اور جس کو کسی انسان نے کھانے کی نیت سے بالقصد مارا ہو، وہ سب حلال ہے، کوئی مارے، کسی طرح مارے، اللہ کا نام لے یا نہ لے، ذبح کرنے والا مسلمان ہو یا کافر، حلقوم کی رگیں کاٹے یا نہ کاٹے۔ خصوصاً اہل کتاب کے معاملے میں تو ان کی تحقیق یہ ہے کہ طعام اہل کتاب بغیر کسی قید و شرط کے سب جائز ہے، خواہ اہل کتاب نے گلا مروڑ کر مارا ہو یا جھٹکے سے قتل کیا ہو یا کسی اور صورت سے۔ (تفسیر المنار صفحہ ۲۰۰۔ جلد ۲)

آگے تحریر فرماتے ہیں ۔

"اس کے بعد واضح لفظوں میں یہ بھی کہہ دیا کہ جانور کا گوشت کھانا، امور طبعیہ عادیہ میں سے ہے مذہب و ملت سے اس کا کوئی تعلق نہیں، شرعی پابندیاں صرف عبادات میں ہوا کرتی ہیں۔"

مزید آگے حضرت رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں جو آپ کے وصف اعتدال کی مبین دلیل ہے کہ

"مفتی عبدہٗ اور علامہ رشید رضا مصری سے یہ لغزش ہوئی اور بڑی سخت ہوئی، مگر اُن کی علمی خدمات اور سوابق سے اور اللہ تعالیٰ کی رحمت واسعہ سے دُعا اور امید مغفرت ہے۔" [۱]

اپنے شیخ سے فقہی اختلاف

نیز آپ نے بعض مسائل میں اپنے شیخ و مربی حکیم الامت مجدد الملت حضرت تھانوی قدس سرہٗ سے بھی اختلاف فرمایا جس سے یہ بات بھی بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ شیخ سے فقہی اختلاف اپنے نفس کی اصلاح میں مانع نہیں۔ اور شیخ کو بھی مرید کے فقہی اختلاف سے اظہار ناراضگی یا انقباض نہ ہونا چاہیے

---

[۱] جواہر الفقہ۔ جلد ۲۔ صفحہ ۴۱۳ تا ۴۱۶

بلکہ شیخ کی اپنی غلطی ہو تو اس سے رجوع ہوجانا چاہیے۔ جیساکہ ہم ذیل میں مولانا تھانویؒ اور حضرت مفتی صاحبؒ کی ایسی نظیریں پیش کریں گے۔

موصوفؒ جواہرالفقہ جلد ا صفحہ ۵۰۲ پر پیرومرشد کے فقہی اختلاف کے زیرِ عنوان تحریر فرماتے ہیں :۔

"جس زمانے میں مرحوم مولانا حافظ جلیل احمد صاحبؒ حضرت حکیم الامت تھانویؒ کے مخصوص اور ممتاز خلیفہ اپنے اہل وعیال کے ساتھ تھانہ بھون میں مقیم تھے آپ نے اپنی اہلیہ محترمہ کی وقف کردہ جائداد کے متعلق کچھ سوالات حضرت حکیم الامت قدس سرہٗ کی خدمت میں پیش کیے، جن کا جواب اس وقت کے مفتی خانقاہ نے تحریر فرمایا، مگر حضرت رحمۃ اللہ علیہ کو اس جواب پر اطمینان نہ ہوا اور اس پر کچھ اشکالات تحریر فرماکر اپنا جواب لکھا اور ارشاد فرمایا کہ اب یہ مجموعہ محمد شفیع کے پاس دیوبند بھیج دیا جائے کہ وہ جواب لکھے۔ میں نے مسئلے میں جتنا غور و فکر کیا تو مجھے حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی تحریر پر اطمینان اور شرح صدر نہ ہوا، بلکہ کچھ شبہات واشکالات پیش آئے جن کو تحریر کرکے حضرتؒ کی خدمت میں بھیج دیا اور میرا جواب حضرتؒ کے جواب سے مختلف ہوگیا اور معاملہ اور زیادہ اُلجھ گیا تو حضرتؒ نے مولانا حافظ محمد جلیل صاحب سے فرمادیا کہ خط وکتابت میں طول ہوگا، محمد شفیع کے تھانہ بھون آنے کا انتظار کرو، زبانی گفتگو سے بات طے کرلی جائے گی۔

جب احقر تھانہ بھون حاضر ہوا تو حضرتؒ نے اس مسئلے پر گفتگو کے لیے ایک وقت مقرر فرمایا اور کافی دیر تک مسئلے کے مختلف پہلوؤں پر بحث وگفتگو ہوتی رہی، مگر عجب اتفاق یہ پیش آیا کہ اس زبانی گفتگو میں بھی کسی ایک صورت پر رائیں متفق نہ ہوئیں۔ حضرت کے سامنے مجھ بےعلم وعمل کی رائے ہی کیا تھی؛ مگر حکم یہی تھا کہ جو کچھ رائے ہو اس کو پوری صفائی سے پیش کرو، اس میں ادب مانع نہ ہونا چاہیے، اس لیے اظہار رائے پر مجبور تھا۔ کچھ دیر کے بعد مجلس اس بات پر ختم ہوئی کہ دیر کافی ہوگئی ہے، اب پھر کسی روز اس مسئلے پر غور کریں گے۔

اب حافظہ رخصت ہوچکا ہے پوری بات یاد نہیں۔ اتنا یاد ہے کہ اس کے بعد پھر تحریری سلسلہ شروع ہوا۔ حضرتؒ نے میرے شبہات واشکالات کا جواب تحریر فرمایا، مگر احقر کو اس جواب پر اطمینان نہ ہوا تو مزید سوالات لکھ کر بھیجے۔ اس طرح ایک عرصے تک پھر یہ زیر بحث مسئلہ ملتوی رہا۔ اور آخر میں جب احقر تھانہ بھون حاضر ہوا تو مزید غور وفکر کے لیے ایک مجلس منعقد ہوئی۔ اس میں بھی صورت حال یہی رہی کہ نہ حضرتؒ کی رائے بدلی نہ میری۔ حضرتؒ نے فرمایا کہ میں تمہارے جواب کو اصول و قواعد کی رو سے غلط نہیں کہتا، مگر اس پر میرا شرح صدر نہیں اس لیے اختیار نہیں کرتا۔ احقر نے بھی عرض کیا کہ حضرتؒ کی تحقیق کے بعد غالب یہی معلوم ہوتا ہے کہ میری رائے ہی غلط ہوگی، مگر کیا عرض کروں؟ اس کا غلط ہونا مجھ پر واضح نہیں۔ اس پر حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے یہ فیصلہ فرمایا کہ اچھا بس آپ اپنی رائے اور فتوی پر رہو، میں اپنی رائے اور فتوی پر ہوں۔ مستفتی کو ہم اس کی اطلاع کردیں گے کہ اس مسئلے میں ہم اور ان میں اختلاف ہے اور کسی جانب کو بالیقین غلط بھی نہیں کہہ سکتے، اس لیے تمہیں اختیار ہے، جس پر چاہو عمل کرو۔

عجب اتفاق ہے کہ مستفتی جو حضرتؒ کے مرید اور خاص خلیفہ تھے۔ ان کو جب اختیار ملا تو انھوں نے عرض کیا کہ اگر مجھے اختیار ہے تو بندہ، محمد شفیع کے فتوی کو اختیار کرتا ہے۔ حضرتؒ نے بڑی خوشی کے ساتھ اس کو قبول کیا۔ یہ واقعہ حضرت حکیم الامتؒ کی وفات سے چھ سال پہلے یعنی ۱۳۵۶ھ کا ہے۔" (مزید تفصیلات جواہر الفقہ جلد ا صفحہ ۷۵ پر ملاحظہ فرمائیں)

اسی طرح ایک سوال فتاوی دارالعلوم دیوبند[1] میں مرقوم ہے جس کا ایک جواب حضرت تھانویؒ کی جانب سے دیا گیا تھا اور دوسرا جواب مدرسہ مظاہر العلوم سہارن پور سے دیا گیا تھا۔ آخر میں حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے اس کا محقق ومدلل جواب تحریر فرمایا ہے جو تقریباً چار صفحات پر مشتمل ہے

---

[1] جلد ۲ صفحہ ۴۰۹۔ مطبوعہ کراچی

جس میں آپ نے مذکورہ دونوں فتووں کے خلاف وقوعِ طلاق کا فتوٰی صادر فرمایا۔ (تفصیلات کتاب مذکور میں دیکھی جاسکتی ہیں)

اسی طرح حضرت تھانوی نے حضرت مفتی محمد شفیع صاحبؒ کی تحقیق متعلقہ زکوٰۃ پراویڈنٹ فنڈ جو موصوف نے دارالعلوم دیوبند میں ۱۲ صفر ۱۳۶۲ھ میں کی تھی۔ اس پر جواب تحریر فرمایا۔

الجواب : آپ صاحبوں کی تحقیق صحیح ہے، لہٰذا میں بھی اسی کو اختیار کرتا ہوں اور اس کے خلاف سے رجوع کرتا ہوں"

اشرف علی ـــــ ۱۳ صفر ۱۳۶۲ھ

معاصر جماعتوں اور فرقوں پر فقہی اظہار خیال میں احتیاط وانصاف

"احتیاط" کے معنی عدمِ انصاف، تلبیس حق وباطل اور مداہنت فی الدین نہیں ہے جیسا کہ بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ "اتحادِ ملی" کے لیے علمی طور پر بھی کسی قسم کا اختلافی اظہار خیال نہ چاہیے اور باہمی اتفاق کے لیے کسی ماہر علم وفن کو بھی اپنی تحقیق اور اپنا تحقیقی مسلک واضح نہ کرنا چاہیے۔ اتحادِ ملت اور ملّی یک جہتی واقعی ایک عظیم دینی مقصد اور مقصود ملّت ہے اور اس باب میں دل آزار اسلوب، مناظرہ بازی، کج بحثی اور عوامی سطح پر اختلافی اور فروعی مسائل واحکام پر ہنگامہ آرائی اور تنظیم سازی نہایت قابلِ نفرت اور ملّی انتشار وزوالِ امت کا باعث ہیں۔

اختلاف اور اس کے حدود وشرائط وآداب کے سلسلے میں بھی حضرت مفتی صاحب موصوفؒ کا رویہ افراط وتفریط سے پاک، حزم واحتیاط اور عدل وانصاف پر مبنی ہے، جس کا لبِ لباب درج ذیل ہے :-

(۱)— مسلمانوں کے وہ تمام فرقے اور جماعتیں جن کے درمیان دین کے بنیادی اور جوہری اصول میں اختلاف نہیں ہے، زبانی اور قلمی مناظروں سے مکمل پرہیز کریں۔

(۲)— ہر فرقہ اپنے تدریس، تصنیف اور فتوی کے حلقوں میں اپنا مسلک ضرور واضح کرے، لیکن اس میں دوسرے پر طعن وتشنیع، فقرہ بازی اور ملامت وتعریض کے دل آزار

اُسلوب کو قطعی طور پر ترک کیا جائے۔

(۳)۔۔۔ اِن اختلافات کو عوامی جلسوں اور اخبارات و رسائل کا بنیادی موضوع نہ بنایا جائے کسی جگہ ضمناً ان کا ذکر ضروری معلوم ہو تو اس میں نرم لب ولہجہ کے ساتھ مسئلہ کی وضاحت کردی جائے۔

(۴)۔۔۔ تمام مسلمان اپنی توانائیاں بے دینی کے اس سیلاب پر بند باندھنے میں صَرف کریں جس نے ہمارے پورے معاشرے کو اپنی لپیٹ میں لیا ہوا ہے۔

(۵)۔۔۔ ہر جماعت کے اہل علم وقت کے ان علمی فتنوں کا سنجیدگی کے ساتھ مطالعہ فرمائیں، جو اشتراکیت، عیسائیت، دہریت، قادیانیت، انکار حدیث اور تجدد و تحریف دین کی شکل میں براہ راست دین کی بنیادوں پر حملہ آور ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ اگر ہمارے اہل علم وفکر حضرات ان نظریات کا کماحقہ مطالعہ کرکے ان کی فتنہ سامانیوں سے پوری طرح آگاہ ہوں گے تو انھیں آپس کے اختلافات ہیچ نظر آئیں گے اور فروعی مسائل پر بحث ومباحثہ کی یہ گرم بازاری انھیں گناہ محسوس ہوگی۔ [1]

حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے بہت سی ایسی جماعتوں اور فرقوں پر بھی فقہی اظہار خیال فرمایا ہے جن کے بارے میں آپ سے استفسار کیا گیا۔ آپ نے ان کے بارے میں سوالات کے جوابات اگرچہ بڑی جرأت اور بلاخوف لومۃ لائم دیئے ہیں۔ لیکن ان میں بھی بڑی محتاط روش اختیار فرمائی ہے۔

کانگریس اور مسلم لیگ

آپ نے کانگریس اور مسلم لیگ کے متعلق فتویٰ صادر فرمایا، جو تقریباً پچاس صفحات پر مشتمل ہے آپ نے بڑی محنت سے قرآن وحدیث وفقہ سے جزئیات احکام کو تلاش کرکے کانگریس اور مسلم لیگ کی شرعی حیثیت کے علاوہ اس میں کافروں کے ساتھ مسلمانوں کے سیاسی تعلقات کے موضوع پر خالص فقہی حیثیت سے اصولی بحث فرمائی ہے اور اس موضوع کے تمام متعلقات پر سیر حاصل

---

[1] از ماہنامہ البلاغ۔ اداریہ صفحہ ۴۔ محرم ۱۳۸۸ھ

تحقیقی مواد کے ذریعہ مسئلے کے ہر پہلو کو خوب واضح اور مدلل فرمایا ہے۔ یہ فتویٰ ہندستان ہی میں دو مرتبہ "کانگریس اور مسلم لیگ کے متعلق شرعی فیصلہ" کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ چونکہ اس رسالہ کی حیثیت محض ایک وقتی مسئلے کی نہیں بلکہ یہ غیر مسلموں کے ساتھ مسلمانوں کی داخلہ و خارجہ پالیسی کے لیے اہم شرعی دستور العمل ہے۔ اس لیے اس کا نام "ملکی سیاست میں غیر مسلموں کے ساتھ اشتراکِ عمل کی حدود شرعیہ" سے بدل کر تیسری مرتبہ جواہر الفقہ جلد ۲ کا جزء بنا کر شائع کیا گیا ہے۔ فتویٰ کا خلاصہ ذیل میں پیش کیا جاتا ہے، جو دراصل ایک استفتاء کا جواب ہے جس میں اراکین مجلس دعوۃ الحق بمبئی کی جانب سے تین سوال کیے گئے تھے :-

ان حالات میں کہ کانگریس میں غلبہ ہندؤں کا ہے اور مسلمانوں کی اکثریت کسی حال متوقع نہیں، مسلمانوں کا بلا شرط اس میں داخل ہو کر حصولِ آزادی کی کوشش کرنا اور ان سے مدد لینا، جائز ہے یا نہیں ؟

بحالتِ مذکورۃ الصدر مسلم لیگ کی حمایت و شرکت اور اس کے زیر علم آزادی کی کوشش جائز ہے یا نہیں ؟

مسلم لیگ کا مطالبۂ پاکستان یعنی مسلم اکثریت کے صوبوں میں ان کی آزاد و خود مختار حکومت، اس کی شرعی حیثیت کیا ہے ؟ بیّنوا، توجروا!

درج ذیل جواب سے حضرتِ والا کی ژرف نگاہی، جرأت اور توازن و احتیاط کے جملہ پہلو واضح ہیں۔ جواب کے آغاز میں حضرت مفتی صاحب موصوف فرماتے ہیں کہ

"ہندوستان کی سیاسی کشمکش اور اس کے طوفانی مدوجزر نے ایک زمانے سے مسلمانوں میں مختلف قسم کے سیاسی اور مذہبی سوالات پیدا کر رکھے ہیں۔ اہل فہم پر مخفی نہیں کہ معمولی امور یا جزوی اختلاف کو فتووں کا رنگ دے کر ان کو سیاسی اکھاڑوں کا کھیل بنانا کسی طرح زیبا نہیں کہ اس کی وجہ سے قسم قسم کی افراط و تفریط اور حدود شرعیہ سے تجاوز و غلو کے علاوہ خود فتوے کے اعتماد و احترام میں سخت خلل پڑتا ہے۔ لیکن پیش کردہ سوالات ایک حد تک اصول کی حیثیت رکھتے ہیں جن پر مسلمانوں کی ملکی و سیاسی مساعی کی بنیاد رکھی جاسکتی ہے اور جس کے صحیح

یا غلط ہونے کا اثر ان کے تمام شعبہ ہائے زندگی تک پہنچنے والا ہے۔ بالخصوص مذہب اور شعائرِ مذہب پر اس کا اثر سب سے زیادہ ہے۔ ادھر دین دار مسلمانوں کے سوالات اور استفتاء اطراف واکناف سے بکثرت آرہے ہیں، سب کا شافی جواب علیحدہ علیحدہ لکھنا دشوار ہو رہا ہے، اس لیے مناسب معلوم ہوا کہ ان مسائل پر کسی قدر مفصل بحث کر کے ایک منقح امر پیش کر دیا جائے جس میں عامۃ الورود سوالات کا بھی جواب ہو جاوے۔

پہلے سوال میں غیر مسلموں کے ساتھ سیاسی تعلق کی تینؔ صورتیں بڑے دل نشین انداز میں دلائل و نظائر کے ساتھ بیان فرمائی ہیں۔ آخر میں اس بحث کا خلاصہ تحریر فرماتے ہیں:

خُلاصہ یہ ہے کہ کفار کے ساتھ مسلمانوں کے وفاق کی صرف دو صورتیں جائز ہیں، ایک محض مصالحت و موادعت بلا اشتراکِ عمل، یہ جائز ہے، بشرطیکہ اس میں مصلحتِ مسلمین ملحوظ ہو اور شرائطِ صلح میں کوئی شرط خلافِ شرع نہ ہو —— دُوسرے استعانت اور مشارکتِ عمل، یہ اس شرط سے جائز ہے کہ غلبہ حکمِ اسلام کا ہو، کفار محض تابع ہو کر ساتھ لگے ہوں۔ ان دُو صورتوں کے علاوہ کسی غیر مسلم قوم کے ساتھ اختلاط اور جماعتی اشتراک کی کوئی صورت جائز نہیں، خواہ وہ صورت متابعت و مشابہت کہلائے یا موالات و مودّت نام رکھی جائے یا کچھ اور۔"

اس کے بعد حضرت والاؒ نے یہ ثابت فرمایا ہے کہ جس وقت حضرت شیخ الہندؒ نے کانگریس کے ساتھ اشتراکِ عمل فرمایا تھا اس وقت پہلی صورت تھی، لیکن آپ کے بعد وہ باقی نہیں رہی بلکہ جھنڈا غیر مسلموں کے ہاتھ میں آگیا، اس لیے اب اشتراک کا مطلب مغلوبیت و متابعت ہوگا جو ناجائز ہے۔ چنانچہ تحریر فرماتے ہیں:۔

کُفار کے ساتھ اتفاق کی تین قسمیں جو اوپر مفصل ذکر کی گئی ہیں، ان میں معلوم ہو چکا ہے کہ جب غلبۂ اسلام کا نہ ہو تو کفار سے استعانت بھی جائز نہیں، چہ جائیکہ کہ بلا شرط انفرادی طور پر کفار کی جماعت میں شامل ہو جانا اور پھر شعائرِ کفر کے

اظہار اور شعائرِ اسلام کے مٹانے والی تجاویز نافذ کرنے کے باوجود اس میں شامل رہنا جو تیسری قسم کی بھی بدترین فرد ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ اس وقت مسلمانوں کی شرکتِ کانگریس بلاشبہ ناجائز ہے، بچند وجوہ (۱) اس لیے کہ کانگریس میں ہندو غالب اور مسلمان مغلوب ہیں اور ایسی حالت میں اگر ہندو بالفرض رواداری سے بھی کام کریں اور اسلام کے خلاف تجاویز نافذ نہ کریں، جب بھی حسبِ تصریحاتِ مذکورہ ان سے اشتراکِ عمل جائز نہیں۔ (۲) اس لیے کہ صورتِ موجودہ میں مسلمانوں کو طوعاً یا کرہاً ہندوؤں کی متابعت کرنا پڑتی ہے (۳) اس لیے کہ ایسی متابعت و مشارکت حسبِ تصریح جمہور مفسرین و فقہاء و حضرت شیخ الہند نور اللہ مرقدہٗ موالاتِ کفر کی حدود میں داخل ہو جاتی ہے، جیسا کہ خطبۂ صدارت جلسۂ جمعیۃ العلمائے دہلی کے حوالے سے اوپر آچکا"

آخر میں تیسرے سوال کا جواب تحریر فرمایا ہے یعنی مطالبۂ پاکستان کی شرعی حیثیت پر موصوف رقمطراز ہیں:-

"ظاہر بات ہے کہ اگر ہندوستان کا ایک مرکز رہے تو ہندو اکثریت کے سبب پورے ہندوستان پر ہندوؤں کی حکومت ہوگی، گو اس میں بڑی جدوجہد کے بعد کسی حد تک مسلمانوں کے حقوق کا تحفظ بھی کر لیا جاوے (جس کی حالاتِ موجودہ و سابقہ کی بناء پر کوئی توقع نہیں) اور یہ امر مسلّم ہے کہ اپنے اختیار سے اپنے اوپر غیر مسلم حکومت مسلط کرنے کا مطالبہ کرنا یا اس کا قبول کرنا کسی طرح جائز نہیں ہو سکتا۔ اور دو مرکز مُسلم و غیر مُسلم ہو جانے کی صورت میں مسلم مرکز میں حکومت مسلمانوں کی ہوگی، جس کے سبب اپنی حدود میں اسلامی احکام کے موافق دستور اور نظام جاری کرنے پر قدرت حاصل ہوگی، نیز یہ اقتدارِ حکومت دوسرے صوبوں میں مُسلمانوں کے حقوق کو پوری حفاظت و نگرانی کر سکے گی جو مسلمانوں کی اقلیت زدہ منتشر قوت کے ذریعہ کسی حال متصور نہیں۔

لہٰذا مسلمانوں کے لیے دو مطالبے ضروری ہیں، ایک اپنے لیے مستقل مرکز کا

قیام، جس کو پاکستان سے تعبیر کیا جاتا ہے، دُوسرے مسلم اقلیتوں کے صوبے میں مسلمانوں کے حقوق کی حفاظت کا غیر مبہم الفاظ میں مکمل معاہدہ، جس کی نگرانی اسلامی مرکز کے فرائض و اختیارات میں داخل ہو۔" (مزید تفصیلات کے لیے دیکھیے، جواہر الفقہ جلد ۲ صفحہ ۱۹۵)

جماعت اسلامی

حضرت مفتی صاحب موصوفؒ جماعت اسلامی پر فقہی محاکمے کے بعد تحریر فرماتے ہیں جو آپ کے احتیاط و انصاف کا واضح اور مبین ثبوت ہے۔ رقمطراز ہیں:-

"یہ میری ذاتی رائے ہے جو اپنی حد تک غور و فکر کے بعد فیما بینی وبین اللہ قائم ہے، میں کسی مسلمان کے بارے میں بلا بدگمانی اور بے احتیاطی سے بھی اللہ کی پناہ مانگتا ہوں اور دین کے معاملہ میں مداہنت سے بھی۔ جن حضرات کو میری اس رائے سے اتفاق نہ ہو، وہ اپنے عمل کے مختار ہیں، مجھے ان سے کوئی مباحثہ کرنا نہیں، نہ میرے قویٰ اور مصروفیات اس کے متحمل ہیں۔ اور اگر کوئی صاحب اس کو شائع کرنا چاہیں تو ان سے میری درخواست ہے کہ اس کو پورا شائع کریں، ادھورا یا کوئی ٹکڑا شائع کر کے خیانت کے مرتکب نہ ہوں۔"

مندرجہ بالا عنوان کی رعایت سے یہ فتویٰ بلاکم و کاست درج ذیل ہے۔ جواب ہی سے سوال کا مدعا بھی ظاہر ہے اور تجزیہ و تزم و احتیاط بھی ہے۔

الجواب :- مولانا مودودی صاحب اور جماعت اسلامی کے بارے میں میرے پاس سالہاسال سے سوالات آتے رہے ہیں جن کا جواب میں اس وقت کے حالات اور ان کے بارے میں اپنی اس وقت کی معلومات کے مطابق لکھتا رہا ہوں، ان میں بعض تحریریں شائع بھی ہوئی ہیں اور بعض نجی مکاتیب کے جواب میں لکھی گئی ہیں۔ اس وقت ان تمام تحریروں کو سامنے رکھنا ممکن نہیں، البتہ اس عرصے میں، احقر کو کچھ ان کی مزید تحریرات کے مطالعہ کا موقع ملا۔ کچھ ان کی نئی تالیفات سامنے آئیں اور کچھ ان کے لٹریچر کے عام اثرات اور ان کی جماعت کے حالات کو مزید دیکھنے کا موقع ملا، اس مجموعے سے اب ان

کے بارے میں جو میری رائے ہے وہ بے کم و کاست ذیل میں لکھ رہا ہوں۔

میری سابقہ تحریرات اگر اس تازہ تحریر کے موافق ہوں تو فبہا، اور اگر سابقہ تحریرات میں کوئی چیز اس کے خلاف محسوس ہو تو اسے منسوخ سمجھا جائے، اور اب میری رائے کے حوالے کے لیے صرف ذیل کی تحریر پر اعتماد کیا جائے۔

احقر کے نزدیک مولانا مودودی صاحب کی بنیادی غلطی یہ ہے کہ وہ عقائد اور احکام میں ذاتی اجتہاد کی پیروی کرتے ہیں، خواہ ان کا اجتہاد جمہور علمائے سلف کے خلاف ہو، حالانکہ احقر کے نزدیک منصب اجتہاد کے شرائط ان میں موجود نہیں۔ اس بنیادی غلطی کی بنا پر ان کے لٹریچر میں بہت سی باتیں غلط اور جمہور علمائے اہل سنت کے خلاف ہیں۔ اس کے علاوہ انھوں نے اپنی تحریر میں علمائے سلف یہاں تک کہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم پر تنقید کا جو انداز اختیار کیا ہے، وہ انتہائی غلط ہے۔ خاص طور سے "خلافت و ملوکیت" میں بعض صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو جس طرح صرف تنقید ہی نہیں بلکہ ملامت کا ہدف بنایا ہے، اور اس پر مختلف حلقوں کی طرف سے توجہ دلانے کے باوجود اصرار کی جو روش اختیار کی گئی ہے، وہ جمہور علمائے اہل سنت کے طرز کے بالکل خلاف ہے۔

نیز ان کے عام لٹریچر کا مجموعی اثر بھی اس کے پڑھنے والوں پر بکثرت یہ محسوس ہوتا ہے کہ سلف صالحین پر مطلوب اعتماد نہیں رہتا اور ہمارے نزدیک یہ اعتماد ہی دین کی حفاظت کا بڑا حصار ہے، اس سے نکل جانے کے بعد پوری نیک نیتی اور اخلاص کے ساتھ بھی انسان نہایت غلط اور گمراہ کن راستوں پر پڑ سکتا ہے۔ ہاں یہ صحیح ہے کہ ان کو منکرین حدیث، قادیانیوں یا اباحیت پسند لوگوں کی صف میں کھڑا کرنا میرے نزدیک درست نہیں، جنھوں نے سود، شراب، قمار اور اسلام کے کھلے محرمات کو حلال کرنے کے لیے قرآن و سنت میں تحریفات کی ہیں...... بلکہ ایسے لوگوں کی تردید میں ان کی تحریریں ایک خاص سطح تک نوتعلیم یافتہ حلقوں میں مؤثر اور مفید ثابت ہوتی ہیں۔ یہ بات میں ہمیشہ کہتا آیا ہوں، لیکن اگر کوئی شخص میری اس بات کو بنیاد بنا کر یہ کہے کہ میں مودودی صاحب کے نظریات سے متفق ہوں جو انھوں نے جمہور علماء کے خلاف اختیار کیے ہیں تو یہ بالکل غلط اور خلاف واقعہ بات ہے۔

اگرچہ جماعت کے قانون میں مولانا مودودی صاحب اور جماعت اسلامی الگ الگ حیثیت

رکھتے ہیں۔ اور اصولاً جو بات مولانا مودودی صاحب کے بارے میں درست ہو، ضروری نہیں کہ وہ جماعت اسلامی کے بارے میں بھی درست ہو۔ لیکن عملی طور سے جماعت اسلامی نے مولانا مودودی صاحب کے لٹریچر کو نہ صرف جماعت کا علمی سرمایہ اور اپنے عمل کا محور بنایا ہوا ہے، بلکہ اس کی طرف سے زبانی اور تحریری مدافعت کا عام طرز عمل ہر جگہ مشاہدے میں آتا ہے، جو اس بات کی دلیل ہے کہ جماعت کے افراد بھی ان نظریات اور تحریروں سے متفق ہیں۔ البتہ اگر کچھ مستثنیٰ حضرات ایسے ہوں جو مذکورہ بالا امور میں مولانا مودودی سے اختلاف رکھتے ہوں اور جمہور علمائے اہل سنت کے مسلک کو اس کے مقابلے میں درست سمجھتے ہوں تو ان پر اس رائے کا اطلاق نہیں ہوگا۔

نماز کے بارے میں مسئلہ یہ ہے کہ امام اس شخص کو بنانا چاہیے جو جمہور اہل سنت کے مسلک کا پابند ہو۔ لہٰذا جو لوگ مودودی صاحب سے مذکورہ بالا امور میں متفق ہوں انھیں باختیار خود امام بنانا درست نہیں، البتہ اگر کوئی نماز ان کے پیچھے پڑھ لی گئی تو نماز ہوگئی۔" [1]

غیر مقلدین

اسی طرح حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے غیر مقلدین کے بارے میں فقہی اظہار خیال فرمایا ہے جس کی نظیریں امداد المفتین وغیرہ میں دیکھی جاسکتی ہیں۔ تمثیلاً ذیل میں چند فتاویٰ مع سوالات درج کیے جاتے ہیں۔ غیر مقلد حضرات کے بارے میں حقیقت حال تو حضرتؒ کے مندرجہ ذیل فتویٰ سے واضح ہے :-

سوال :- جو لوگ آمین بالجہر کہتے ہیں، ان کے پیچھے نماز درست ہے یا نہیں ؟

الجواب :- آمین بالجہر کہنے والے جو ہمارے دیار میں عام طور پر غیر مقلد ہیں، ان کے پیچھے بلا ضرورت نماز نہ پڑھنی چاہیے، کیونکہ وہ وضو و طہارت میں قواعد کے پابند اور محتاط نہیں۔ لیکن اگر اتفاقاً اُن کی مسجد یا جماعت میں پہنچ جائے اور جماعت شروع ہو جائے تو شریک ہو جانا چاہیے، نماز ہو جائے گی بشرطیکہ ان سے صراحۃً کوئی ایسی چیز صادر نہ ہو جو ہمارے نزدیک مفسد نماز ہے۔ کذا قال

---

[1] جواہر الفقہ جلد ۱ صفحہ ۱۷۰

الشامی فی باب الامامة - (امداد المفتین صفحہ ۳۱۸)

لیکن ان میں سے جو حضرات متعصب ہیں اور مقلدین کو کافر و مشرک قرار دیتے ہیں ان کے بارے میں تحریر فرمایا :-

سوال (۱۰۵) : جو غیر مقلدین کی امامت کے متعلق ایک مفصل فتویٰ ہے :-

کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلے میں کہ غیر مقلد کے عقائد عملیات یہ ہیں کہ تقلید کو شرک بتاتے ہیں اور حنفی مذہب والے کو کافر و مشرک اور بدعتی کہتے ہیں اور اپنے مذہب میں داخل کرنے کے لیے کہتے ہیں کہ مسلمان ہو جاؤ۔ اگر کوئی حنفی مذہب کا ان پڑھ اس مذہب میں ہو بھی جاتا ہے تو کہتے ہیں کہ ہم نے فلاں شخص کو مسلمان کیا ہے، چنانچہ یہاں پر کئی موقعے گزر چکے ہیں۔ ہم حلفیہ تحریر کرتے ہیں کہ اس میں بالکل جھوٹ نہیں ہے۔ غیر مقلدین جو نماز پڑھتے ہیں وہ اس طریقے سے ہاتھ سینے پر باندھتے ہیں اور رفع یدین کرتے ہیں، پیروں کے اندر کا فاصلہ بہت ہوتا ہے۔ اور جب امام قرات شروع کرتا ہے تو سورۂ فاتحہ سے پیشتر بسم اللہ قرات سے پڑھتا ہے اور سورۂ فاتحہ کے بعد جو سورت پڑھتا ہے تو اس کے شروع میں بسم اللہ قرات سے پڑھتا ہے۔ اور پھر سورت ختم کرنے کے بعد بسم اللہ قرات سے پڑھتا ہے، سورۂ اخلاص شروع کرتا ہے۔ وہ سورۂ اخلاص کو دعا مانتے ہیں بعض موقع ایسا ہوتا ہے کہ قرات میں اُلٹی ترتیب سے سورۃ پڑھتے ہیں، جیسے پہلی رکعت میں سورۂ فلق اور سورۂ اخلاص پڑھا اور دوسری میں سورۂ ناس پڑھا اور پھر سورۂ اخلاص پڑھا۔ اور آمین بہت زور سے پڑھتے ہیں، یہاں تک کہ آواز مسجد سے دو چار قدم باہر پہنچتی ہے، ان سے اس کے متعلق دریافت کیا گیا کہ تم اس طرح قرات کیوں پڑھتے ہو اور آمین زور سے کیوں پڑھتے ہو؟ تو انھوں نے جواب دیا کہ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے آخر عمر تک کیا ہے۔ اور یہ کہتے ہیں کہ جو شخص امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ نہیں پڑھتا اس کی نماز نہیں ہوتی۔

الجواب :- ایسے غیر مقلدوں کے پیچھے نماز حنفیوں کی مکروہ تحریمی ہے بشرطیکہ امام سے کوئی فعل ایسا سرزد نہ ہو جس سے حنفیوں کی نماز فاسد ہو جاتی ہے۔ مثلاً خون زخم کے سر سے نکل کر بہہ گیا اور اس نے وضو دوبارہ نہ کیا اور رعایت مواضع خلاف کی نہ کرے۔ اگر امام مواضع خلاف کی رعایت نہیں کرتا ہے تو پھر اس کے پیچھے نماز حنفیوں کی جائز اور صحیح نہیں ہے۔ بہرحال آج کل کے ان

غیر مقلدوں کو امام حنفیہ کا ہرگز نہ بنانا چاہیے ۔ کذا فی الشامی، باب الامامۃ مطلب فی اقتداء الشافعی" ۔ [1] فقط واللہ تعالیٰ اعلم

بریلوی مکتب فکر

اسی طرح حضرت مفتی صاحبؒ نے بریلوی مکتب فکر پر اعتدال و توازن کے ساتھ فقیہانہ محاکمہ فرمایا ہے ۔ اپنی تالیف "سنت و بدعت" میں "بدعت و سنت کی جنگ میں لمحۂ فکریہ" کے تحت تحریر فرماتے ہیں کہ

> "تشدد، طعنہ زنی، الزام تراشی کے طریقوں سے کلی طور پر اجتناب کیا جائے کہ ان سے کبھی کسی کی اصلاح نہیں ہوتی ۔ "بدعتی اور "وہابی" کے طعن آمیز خطابات سے پرہیز کیا جائے ۔ کسی کے کلام کو توڑ مروڑ کر اس کے منشا و مقصد کے خلاف اس پر غلط الزام لگانا کھلا بہتان ہے جس کے حرام ہونے میں کسی کو کسی تردد کی گنجائش نہیں ۔ آخرت کے حساب کو سامنے رکھتے ہوئے، ان حرکات سے باز رہا جائے"

اس کے بعد موصوفؒ نے بدعت کے تمام مالہا وعلیہا پر روشنی ڈالی ہے اور حضرات صوفیاء کے اقوال بھی بدعات و محدثات کے بارے میں نقل فرمائے ہیں ۔ قابل ملاحظہ ہیں ۔ "صلوٰۃ وسلام" کے مروجہ طریقے کے متعلق ایک استفتاء کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں جس میں سائل نے یہ دریافت کیا تھا کہ

> "بعض مساجد میں کچھ لوگ ایسا کرتے ہیں کہ جمعہ کی نماز یا دوسری نمازوں کے بعد التزام کے ساتھ جماعت بنا کر اور کھڑے ہو کر بآواز بلند بالفاظ ذیل سلام پڑھتے ہیں ۔
>
> یارسول سلام علیک   یا نبی سلام علیک الخ
>
> ان میں بہت سے لوگوں کا یہ عقیدہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس مجلس میں

---

[1] امداد المفتین ۔ جلد ۱ ۔ صفحہ ۳۱۴

تشریف لاتے ہیں یا ہر جگہ حاضر و ناظر ہیں، اس لیے یہ سلام خود سنتے ہیں اور جواب دیتے ہیں۔ جو لوگ ان کے اس عمل میں شریک نہیں ہوتے، ان کو مطعون کرتے اور طرح طرح سے بدنام کرتے ہیں جس کے نتیجے میں عموماً مسجدوں میں نزاع اور جھگڑے پیدا ہوتے ہیں۔ دریافت طلب یہ ہے کہ کیا اس طرح کا سلام پڑھنا مسجدوں میں جائز ہے اور متولیانِ مساجد کو اس کی اجازت دینا چاہیے یا نہیں؟

الجواب: جس ہیئت سے مساجد میں بطرزِ مذکور اجتماع اور التزام کے ساتھ درود و سلام کے نام پر ہنگامہ آرائی ہوتی ہے، اس کو درود و سلام کی نمائش تو کہا جاسکتا ہے، درود و سلام کہنا اس کو صحیح نہیں، کیونکہ وہ بہت سے مفاسد کا مجموعہ ہونے کی وجہ سے ناجائز ہے۔"[1]

بعدہٗ حضرت مفتی صاحبؒ نے اس کے عدمِ جواز کے وجوہ اور دلائل بالتفصیل بیان فرمائے ہیں[2] اور آخر میں "ہمدردانہ مشورہ" کے زیرِ عنوان رقمطراز ہیں کہ

ہر شخص کو اپنی قبر میں سونا ہے اور اپنے اعمال کا جواب دینا ہے۔ ان معاملات میں جتھہ بندی اور قدیم آبائی رسوم پر ضد اور ہٹ دھرمی کو چھوڑ کر سنجیدگی کے ساتھ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کو سمجھنا چاہیے۔ اور یہ غور کرنا چاہیے کہ دنیا کے تو تمام معاملات میں ہمارے جھگڑے چلتے رہتے ہیں کم از کم اللہ کے گھر اور عبادتِ نماز ہی کو ہر طرح کے جھگڑے فساد سے محفوظ رکھا جائے۔[3]

اسی طرح آپ سے ایک سائل نے دریافت کیا کہ

ایک اشتہار جس کا خلاصہ یہ ہے کہ علمائے دیوبند کافر ہیں، نظر سے گزرا جس پر علمائے حرمین شریفین مکہ معظمہ کے بھی دستخط ہیں اور اس میں عبارت تحذیرُ الناس اور حفظ الایمان و براہینِ قاطعہ کی گڑبڑ کر کے فتویٰ لیا گیا ہے اور جس کا

---

[1] سنت و بدعت از صفحہ ۴۸ تا ۵۰۔ [2] صفحہ ۵۱ [3] صفحہ ۵۷

جواب انھوں نے یہ دیا ہے کہ عیاذ باللہ کافر ہیں - مولوی حشمت علی رضوی، اس کو بڑے شد ومد سے بیان کرتے ہیں اور پُرزور لفظوں میں علمائے دیوبند کو کافر کہتے ہیں اور یہاں تک کہتے ہیں کہ ان کے جنازے کی نماز میں شرکت یا ان کے پیچھے نماز ادا کرنا، ان سے بیاہ شادی وغیرہ یا ان کو مسلمانوں کے قبرستان میں دفن کرنا، ان کی موت وزندگی میں ان سے مسلمانوں کا سا برتاؤ کرنا سب حرام حرام حرام وزہر تباہ کن اسلام ہے - اہلِ اسلام بھائی ان فتاوٰی کو حاصل کریں اور بے دینوں کے منہ میں قہرِ الٰہی کا پتھر ٹھونسیں کہ یہ صرف بریلوی اور دیوبندی کا جھگڑا نہیں بلکہ کفر واسلام کا جھگڑا ہے - غرضیکہ ایسی باتیں کہتے ہیں عوام لوگ کی روک تھام کے لیے جواب سے جلد مطلع فرمائیں -

بیّنوا توجروا

الجواب :- اِس اشتہار میں علمائے دیوبند کی متبرک ومقبول جماعت کو کافر و مرتد وغیرہ لکھنے والے نے اپنے دل کی بھڑاس نکالی ہے اس کا جواب تو صرف یہ ہے، فَصَبْرٌ جَمِيْلٌ وَاللهُ الْمُسْتَعَانُ عَلٰى مَا تَصِفُوْنَ — وَسَيَعْلَمُ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اَيَّ مُنْقَلَبٍ يَّنْقَلِبُوْنَ - اور اگر کسی کو ان کی خاص عبارت کے بارے میں شبہ ہے یا ان لوگوں کے ورغلانے سے پیدا ہو جائے تو اس کا مفصل جواب رسائل ذیل میں مذکور ہے - ان کو دیکھا جاوے تو انشاء اللہ تعالیٰ آفتاب کی طرح روشن ہو جائے گا کہ ان حضرات پر جو کچھ الزامات لگائے ہیں، وہ سب بدفہمی کا نتیجہ ہیں یا افترا اور بہتان ہیں - عبارت کو کتر بیونت کرکے خیانت کے ساتھ لوگوں کے سامنے پیش کیا جو کفری مضامین پر ان کی تحریف سے مشتمل ہو گئیں - لوگوں نے تکفیر کی - رسائل یہ ہیں :- السحاب المدرار، تزکیۃ الخواطر، تغییر العنوان، بسط البنان - فقط واللہ تعالیٰ اعلم[1]

---

[1] امداد المفتیین - باب ردّ بدعات - صفحہ ۹۰

ایک اور سوال کے جواب میں جس میں سائل نے مولوی حشمت علی رضوی کی نسبت دریافت کیا کہ انھوں نے مجمع عام میں اکابر علمائے دیوبند کو اور ان کے متعلقین کو کافر کہا۔ اور جو ان کے کفر میں شک کرے وہ بھی کافر ہے۔ کیا واقعی بقول حشمت علی رضوی کے اکابر علمائے دیوبند کافر ہیں؟ حضرت موصوفؒ اس کا تحقیقی جواب تحریر فرمانے کے بعد آخر میں خلاصہ لکھتے ہیں کہ

"کسی ادنیٰ سے ادنیٰ فاسق سے فاسق مسلمان کو بھی ایسے اتہامات کی بناء پر کافر کہنا حرام ہے، جن اتہامات کو ان حضرات مکفرین نے اس جماعتِ صُلحاء پر عائد کیا ہے۔ اور پھر یہ حضرات تو علم و عمل، حبِ خُدا اور حبِ رسولؐ میں اپنی نظیر آپ ہیں۔ بڑا ظالم ہے جو ان حضرات پر ایسے الفاظ استعمال کرتا ہے۔ والی اللہ المشتکیٰ ولہ الحمد اوّلہ وأخرہ۔ ولاحول ولا قوۃ الّا باللہ" [1]

اور مولوی احمد رضا خان بریلوی صاحب کے متعلقین کے بارے میں ایک سوال کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں کہ

"مولوی احمد رضا خان صاحب بریلوی کے متعلقین کو کافر کہنا صحیح نہیں ہے بلکہ ان کے کلام میں تاویل ہو سکتی ہے اور تکفیر مسلم میں فقہاء رحمہم اللہ تعالیٰ نے بہت احتیاط فرمائی ہے اور یہ لکھا ہے کہ اگر کسی شخص کے کلام میں ننانوے وجوہ کفر کے ہوں اور ایک وجہ ضعیف اسلام کی ہو تو مفتی کو اس ضعیف وجہ کی بناء پر فتویٰ دینا چاہیے۔ یعنی اس کو مسلمان کہنا چاہیے۔ اگر وہ فی الواقع عقیدہ کے اعتبار سے مسلمان ہے تو فبہا، ورنہ مفتی کا فتویٰ اس کو کچھ نفع نہیں دے گا۔ درمختار میں ہے واعلم انہ لایفتی بکفر مسلم امکن حمل کلامہ علی محمل حسن اوکان فی کفرہ خلاف ولوکان ذلک روایۃ ضعیفۃ، کماحررہ فی البحر وغیرہ وفی الاشباہ الی الصغری و فی الدرر وغیرہا

---

[1] امداد المفتیین۔ کتاب الایمان و"العقائد" صفحہ ۵۰

اذا کان فی المسٔلة وجوہ توجب الکفر و واحد یمنعه فعلی المفتی المیل لمایمنعه ثم لو نیته ذٰلك فعلم والا لم ینفعه حمل المفتی علی خلافه الخ بنابریں علیہ تکفیر کرنا اپنے داماد کی صحیح نہیں، بلکہ وہ مسلمان ہے، لیکن فاسق وفاجر ہے کیونکہ اس کے عقائد مذکورہ سراسر خلافِ شرع ہیں۔ اور وہ ایک ایسے شخص کا مرید اور معتقد ہے جو ہرگز مقتدا بنانے کے لائق نہیں ہے الخ[1]

فرقۂ روافض وشیعہ

فرقۂ روافض وشیعہ کے بارے میں حضرت مفتی صاحبؒ جواہر الفقہ[2] میں تحریر فرماتے ہیں، جس میں آپ سے دریافت کیا گیا تھا کہ روافض واہل تشیع میں بہت سے مختلف العقائد فرقے ہیں اور ہر فرقے کے عقائد کو جداجدا منضبط کرنا بھی دشوار ہے۔ ایک دوسری شکل یہ ہے کہ کسی فرقے کی کتابوں میں ان کے بعض عقائد معلوم ہوتے ہیں مگر جب وہ عقیدہ ان کی طرف منسوب کیا جاتا ہے تو وہ اس کا انکار کرتے ہیں۔ مثلاً کتب شیعہ میں جابجا اس قسم کی عبارتیں ملتی ہیں، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ موجودہ قرآن کو محرف و ناقابل اعتبار سمجھتے ہیں۔ مگر جب کہا جاتا ہے کہ تم موجودہ قرآن پر یقین نہیں رکھتے تو وہ شدت کے ساتھ اس سے تبرّی کرتے ہیں۔ ایک شکل یہ ہے کہ ہندوستان میں عوام روافض کے متعلق یہ فیصلہ بھی دشوار ہے کہ وہ کس فرقے میں درج ہے۔ اب دریافت طلب یہ ہے کہ ایسی حالت میں ہم روافض کے ساتھ کیا معاملہ کریں؟ ان کو مسلمان سمجھیں یا کافر؟ اس کے بعد سائل نے ان کے کچھ عقائد لکھے ہیں۔ لائق دید ہیں۔

الجواب: مختصر اور محقق وجامع کلام روافض کے بارے میں یہ ہے کہ بلحاظ احکام رفض کی تین صورتیں ہیں:۔

اوّل یہ کہ ان میں سے کسی شخص یا فرقے کے متعلق یقینی طور سے یہ بات ثابت ہوجائے کہ

---

[1] فتاویٰ دارالعلوم دیوبند۔ جلد ۲۔ صفحہ ۵۴

[2] جلد ۱۔ صفحہ ۵۹ (ملخص)

وہ ضروریات دین میں سے کسی چیز کا منکر ہے۔ اگرچہ انکار میں تاویل بھی کرتا ہو اور صاف انکار سے تبری کرتا ہو، اس تبری کا کوئی اعتبار نہیں، بلکہ وہ باتفاق و باجماع کافر مرتد ہے۔ اس کے ساتھ کسی قسم کا اسلامی معاملہ رکھنا جائز نہیں۔

دوم صورت یہ ہے کہ کسی شخص یا فرقے کے متعلق یقینی طور پر یہ معلوم ہو جائے کہ وہ ضروریات دین میں سے کسی چیز کا منکر نہیں، مگر صرف اس میں اختلاف رکھتا ہے کہ جمہور امت کے خلاف حضرت علی کرم اللہ وجہہ، کو افضل الصحابہ اور خلیفۂ اول سمجھتا ہے تو وہ فاسق و گمراہ ہے مگر کافر و مرتد نہیں۔ اس کے ساتھ وہ اسلامی معاملات جائز ہیں جو کسی فاسق و گمراہ کے ساتھ کیے جا سکتے ہیں۔ مثلاً ذبیحہ اس کا حلال ہے۔ اس کے جنازہ پر نماز جائز ہے، نکاح کے معاملہ میں اس سے بھی اجتناب کرنا بہتر ہے۔

سوم صورت یہ ہے کہ یقینی طور سے کسی امر کا ثبوت نہ ملے یعنی نہ اس کا یقین ہے کہ وہ ضروریات دین میں سے کسی چیز کا منکر ہے اور نہ اس کا کہ منکر نہیں۔ بلکہ ایک مشتبہ حالت ہے ..... اس میں سب سے احوط و اسلم وہ حکم ہے جو فقیہ العصر امام وقت مجدد الملت حکیم الامت سیدنا و سندنا حضرت مولانا اشرف علی صاحب دامت برکاتہم نے امداد الفتاوی میں تحریر فرمایا ہے کہ اسلم یہ ہے کہ نہ کفر کا حکم کیا جائے نہ اسلام کا۔ یعنی نہ اس سے عقد مناکحت کی اجازت دیں گے اور نہ اس کی قتداء کریں گے۔ (ملخص)

فرقۂ چکڑالویہ (منکرین حدیث)

فرقۂ چکڑالویہ جو پنجاب میں ایک فرقہ ہے اور اپنے کو اہل قرآن کہتا ہے۔ اس کا بانی عبداللہ چکڑالوی ہے اور اسی کی طرف نسبت ہے۔ اس فرقے کے عقائد کا نمونہ خود بانیٔ فرقہ عبداللہ چکڑالوی کی کتاب (برہان الفرقان علی صلوٰۃ القرآن) سے بحوالہ کتاب سائل نے لکھ کر حضرت مفتی صاحبؒ سے ان کے متعلق حکم شرعی دریافت فرمایا۔ ان کے عقائد جواہر الفقہ جلد ۲ صفحہ ۳۹ پر مرقوم ہیں۔
حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے قرآن کریم کی آیات اور ان کی تفاسیر سے فرقۂ چکڑالوی کے عقائد پر دلنشین و مثبت انداز میں روشنی ڈالی ہے۔ موصوف آخر میں رقمطراز ہیں:۔

"الغرض آیات وعبارات مذکورہ سے واضح ہوا کہ جو شخص وہ عقائد رکھے جو فرقۂ چکڑالوی کی کتابوں سے سوال میں ظاہر کیے گئے ہیں۔ وہ بلاشبہ زندیق اور کافر خارج از اسلام ہے، کیونکہ وہ بہت سی ضروریاتِ دین کا منکر ہے جیسا کہ عقائد مذکورہ کے دیکھنے والے پر مخفی نہیں رہ سکتا۔ عقائد مذکورہ کا ضروریاتِ دین کے خلاف ہونا چونکہ بالکل بدیہی اور آفتاب کی طرح روشن ہے، اس لیے ضرورت نہیں کہ ہر عقیدے کے متعلق جُدا جُدا کچھ لکھا جاوے۔" [1]

آج کل غلام احمد پرویز بٹالوی، نگران "طلوعِ اسلام" نے اس فرقۂ چکڑالوی کی تولیت اور باگ ڈور سنبھالی ہوئی ہے۔ چونکہ یہ بھی ضروریاتِ دین کا منکر ہے اس لیے اس کے کفر میں بھی کوئی شبہ نہیں۔ چنانچہ ایک مفصل و مدلّل فتویٰ بنام "پرویز کے بارے میں علماء کا متفقہ فتویٰ" شعبۂ تصنیف مدرسہ عربیہ اسلامیہ نیوٹاؤن سے شائع ہوا ہے جس میں پرویز کے مفصل عقائد اس کی تصنیفات اور رسائل کے حوالے سے لکھ کر قرآن و حدیث کی روشنی میں کافی و شافی جواب دیا گیا ہے۔ عالمِ اسلام کے جن مشاہیر علماء کے اس فتوے پر دستخط ہیں ان میں سب سے اول حضرت مفتی صاحب قدس سرہٗ کے دستخط ہیں۔

فرقۂ مرزائیہ

فرقۂ مرزائیہ جس کا بانی مرزا غلام احمد ساکن قادیان ضلع گورداس پور پنجاب ہے۔ اور اس وقت اس فرقہ کی تین پارٹیاں ہیں۔ ایک ظہیرالدین اروپی کی متبع اور دوسری مرزا محمود کی متبع جس کو قادیانی پارٹی کہا جاتا ہے، تیسرے مسٹر محمد علی لاہوری کی متبع جس کو لاہوری پارٹی کہا جاتا ہے۔ حضرت مفتی صاحب نوراللہ مرقدہٗ ان کے عقائد فاسدہ و باطلہ اور ضروریاتِ دین کے خلاف ہونے کی وجہ سے فرماتے ہیں کہ مرزا غلام احمد اور اس کی متبعین تینوں پارٹیوں کے کفر میں کوئی شُبہ نہیں۔ رقمطراز ہیں،

---

[1] جواہر الفقہ۔ جلد ۱۔ صفحہ ۴۷

[2] کتاب مذکورہ۔ صفحہ ۴۰،۴۱

ان تینوں پارٹیوں میں چند وجوہ کفر تو مشترک ہیں اور بعض خاص خاص پارٹیوں کے ساتھ مخصوص ہیں۔ اس جگہ مشترک وجوہ میں سے چند وجوہ پر اکتفا کیا جاتا ہے، وہ یہ ہیں:۔

(۱) مرزا کو باوجود ایسے صاف دعویٰ نبوت کے جس میں کسی تاویل کی ہرگز گنجائش نہیں، مسلمان بلکہ مہدی و مسیح سمجھنا۔

(۲) ختم نبوت کے مسئلے میں جو کہ ضروریاتِ دین میں سے ہے، تاویل فاسد کرنا اور اس کے اجماعی مفہوم کو بدلنا

(۳) مرزا کو باوجود کھلی ہوئی توہین انبیاء کے مسلمان سمجھنا۔

یہ وجوہ کفر ایسی ہیں جو تینوں پارٹیوں میں مشترک ہیں اور ان کے کفر کے لیے کافی ہیں، ان کے علاوہ دوسری بہت سی وجوہ اور بھی ہیں، جن کے استیعاب کی اس جگہ ضرورت نہیں۔ اور وجوہِ مذکورہ بالا کے کفر ہونے کا ثبوت تمام کتب مذہب میں موجود ہے۔" [۱]

بعدہٗ موصوفؒ نے فقہی عبارات اور دلائل پیش فرمائے ہیں۔

فرقۂ آغاخانیہ

آپ نے ایک سائل کے جواب میں کہ فرقۂ آغاخانیہ (خوجہ جماعت) مسلمان ہیں یا کافر؟ تحریر فرمایا کہ صحیح اور مکمل جواب تو فرقۂ آغاخانیہ کے مخصوص عقائد معلوم ہونے پر ہو سکتا ہے۔ اجمالاً یہ ہے کہ اگر یہ فرقہ ضروریاتِ دین اور اسلام کے مسائل قطعیہ کا منکر ہے تو یہ بالاتفاق کافر ہے۔ مثلاً حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا پر تہمت کا قائل ہو۔ یا قرآن کے بارے میں حضرت جبرئیل علیہ السلام کی غلطی کرنے کا قائل ہو۔ یا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے صحابی ہونے کا منکر ہو۔ و امثال ذٰلک۔ تو یہ شخص بلاشبہ کافر ہے۔ اور مسلمان عورت کا نکاح کافر سے منعقد نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا یہ نکاح باطل ہے۔ اور جو اولاد پیدا ہوئی وہ

---

[۱] ملاحظہ ہو جواہر الفقہ جلد ۱ صفحہ ۵۰۔

اپنی والدہ کے حوالہ کردی جائے گی۔ اور زوجین میں تفریق کردینا ضروری ہے۔ اگر اس فرقے کے عقائد میں کوئی چیز قطعیات اسلامیہ کے خلاف نہیں تو نکاح درست و صحیح ہوگیا۔ اب بجز طلاق کے کوئی مخلص نہیں۔

لما فی الشامی، نعم لاشك فی تكفير من قذف السيدة عائشة رضی الله عنها وانكر صحبة الصديق رضی الله عنه او اعتقد الالوهية فی علی او ان جبريل غلط فی الوحی او نحو ذلك من الكفر الصريح الخ - شامی - باب المرتدین صفحہ ۳۲۰ - جلد ۲

جواب مذکور کے بعد حضرت مفتی صاحب نوٹ لکھ کر تحریر فرماتے ہیں کہ

"بعد میں آغاخانیہ کے عقائد ان کی کتابوں سے بعض لوگوں نے نقل کرکے بھیجے جس میں ایسے صریح عقائد کفریہ بھرے ہوئے ہیں کہ کسی تاویل کی گنجائش نہیں اس لیے یہ لوگ بلاشبہ کافر ہیں حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی دامت برکاتہم نے ان کے متعلق اپنے رسالہ "القول المحقانی فی الحروب الآغاخانی" میں یہی تحقیق فرمائی ہے۔ یہ رسالہ احقر کے رسالہ "وصول الافکار الی اصول الاکفار" کا ضمیمہ ہو کر شائع ہوا ہے[۱] واللہ تعالیٰ اعلم

بندہ محمد شفیع غفرلہ ربیع الثانی ۱۳۵۷ھ

تکفیر میں احتیاط و اعتدال

حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا وصف احتیاط و اعتدال تکفیر کے باب میں بھی نمایاں نظر آتا ہے۔ آپ تحریر فرماتے ہیں کہ

"کسی مسلمان کو کافر کہنے کے معاملے میں آج کل ایک عجیب افراط و تفریط رونما ہے۔ ایک جماعت ہے کہ جس نے مشغلہ یہی اختیار کرلیا ہے کہ ادنیٰ معاملات میں مسلمانوں پر تکفیر کا حکم لگا دیتے ہیں اور جہاں ذرا سی کوئی خلاف شرع حرکت کسی سے دیکھتے

---

[۱] فتاویٰ دارالعلوم دیوبند - جلد ۲ - صفحہ ۵۲

ہیں تو اسلام سے خارج کہنے لگتے ہیں۔ اور دوسری طرف نو تعلیم یافتہ آزاد خیال جماعت ہے، جس کے نزدیک کوئی قول و فعل خواہ کتنا ہی شدید اور عقائد اسلامیہ کا صریح مقابل ہو کفر کہلانے کا مستحق نہیں۔ وہ ہر مدعی اسلام کو مسلمان کہنا فرض سمجھتے ہیں، اگرچہ اس کا کوئی عقیدہ اور عمل اسلام کے موافق نہ ہو اور ضروریات دین کا انکار کرتا ہو۔ اور جس طرح کسی مسلمان کو کافر کہنا ایک سخت پر خطر معاملہ ہے اسی طرح کافر کو مسلمان کہنا بھی اس سے کم نہیں۔ کیونکہ حدود کفر و اسلام میں التباس بہر دو صورت لازم آتا ہے، اس لیے علماء امت نے ہمیشہ ان دونوں معاملوں میں نہایت احتیاط سے کام لیا ہے۔"

آگے تحریر فرماتے ہیں :-

اس لیے تکفیر مسلم کے بارے میں ضابطہ شرعیہ یہ ہو گیا کہ جب تک کسی شخص کے کلام میں تاویل صحیح کی گنجائش ہو اور اس کے خلاف کی تصریح متکلم کے کلام میں نہ ہو یا اس عقیدے کے کفر ہونے میں ادنیٰ سے ادنیٰ اختلاف ائمہ اجتہاد میں واقع ہو، اس وقت تک اس کے کہنے والے کو کافر نہ کہا جائے لیکن اگر کوئی شخص ضروریات دین میں سے کسی چیز کا انکار کرے یا کوئی ایسی ہی تاویل و تحریف کرے جو اس کے اجماعی معانی کے خلاف معنی پیدا کر دے تو اس شخص کے کفر میں تامل نہ کیا جائے۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم [۱]

چنانچہ اکابر علماء امت کے اس تکفیر مسلم کے ضابطہ شرعیہ پر حضرت مفتی صاحبؒ بڑی سختی سے کاربند رہتے تھے۔ اس کی مثالیں امداد المفتین، کتاب الایمان والعقائد اور جواہر الفقہ جلد ا میں اور وصول الافکار الی اصول الاکفار میں دیکھی جا سکتی ہیں۔ ذیل میں چند بطور نمونہ پیش کی جاتی ہیں

ایک سوال کے جواب میں موصوف لکھتے ہیں :-

"یہ اشعار ایسے ہیں کہ اگر تاویل نہ کی جاوے تو ظاہر ان کا شرک ہے، اس لیے

---

[۱] جواہر الفقہ۔ جلد ا۔ صفحہ ۳۶

بوجہ احتیاط قائل کی تکفیر نہ کی جاوے۔ مگر ان اشعار کا پڑھنا سننا سب گناہ اور
خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نافرمانی ہے۔ آپ نے فرمایا لا تطرونی (الحدیث)
یعنی میری مدح میں غلو نہ کرو، جیسا کہ نصاریٰ نے حضرت مسیحؑ کی مدح میں غلو
کیا۔ فقط [۱]

ایک اور سوال کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں کہ

اس شعر کا مطلب اور مضمون بالکل کفر ہی ہے اور شرک پر دلالت کرتا
ہے۔ اس کا پڑھنا بالکل حرام ہے۔ بالخصوص جائز سمجھ کر پڑھنا دوہرا گناہ ہے لیکن
چونکہ ضعیف سی تاویل وحدۃ الوجود کے قاعدے پر ہو سکتی ہے، اس لیے احتیاطاً
کہنے والے پر کفر کا فتویٰ نہ دیا جائے گا، جب تک اس کی زبان یا عبارت سے صراحۃً
یہ معلوم ہو کہ یہ شخص بلاکسی تاویل کے اس شعر کو اپنے ظاہری معنی میں استعمال کرتا ہے
اور اعتقاد رکھتا ہے۔ یہ شخص شرعاً بدعتی اور فاسق ہے اور بادشاہِ اسلام پر اس کی تعزیر
ضروری ہے۔ ایسے شخص کی امامت درست نہیں۔ لما فی الدر المختار وخلف
فاسق والمبتدع ۔ واللہ اعلم [۲]

اسی طرح ایک اور سوال کے جواب میں رقمطراز ہیں کہ

الفاظ مندرجۂ سوال "مسجد کے گولی مارو" توہینِ مسجد پر مشتمل ہے اور کلمۂ کفر
ہے۔ لیکن کسی جملہ کا کفر ہونا اور چیز ہے، اس کے کہنے والے کو کافر قرار دینا اور چیز۔
اس لیے محض کلمۂ کفر زبان سے نکلتے ہی کسی مسلمان پر کفر وارتداد کا حکم لگانا سخت
غلطی ہے۔ بلکہ مفتی کا فرض ہے کہ یہ دیکھے کہ اس کلام میں کوئی قوی یا ضعیف سا
احتمال ایسا بھی نکل سکتا ہے، جس کی بناء پر یہ شخص کفر سے بچ جائے۔ اگر نکلے تو
اس پر واجب ہے کہ اسی پر فتویٰ دے اور اس شخص کو مسلمان کہے، کیونکہ مسلمان

---

[۱] فتاویٰ دارالعلوم دیوبند۔ جلد ۲۔ صفحہ ۲۹

[۲] امداد المفتین۔ کتاب الایمان والعقائد۔ صفحہ ۵۲۔

کوکافر کہنا وبالِ عظیم ہے۔ اس لیے صاحب بحرالرائق نے باب المرتدین میں تصریح فرمائی ہے کہ میں نے قسم کھائی ہے کہ کلماتِ کفریہ جاری کرنے کی وجہ سے کسی کو کافر نہ کہوں گا۔ اور یہی مضمون شامی نے باب مذکور میں درج فرمایا ہے۔ اور جامع الفصولین باب کلمات الکفر میں بھی اسی کی تائید کی گئی ہے۔ الغرض محض ان الفاظ مذکورہ کے کہہ دینے سے کفر وارتداد کے احکام جاری کرنا صحیح نہیں، بالخصوص جب کہ کہنے والے کا تکیہ کلام یہی الفاظ ہر جگہ ہوں۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم [1]

نیز آپ نے اس موضوع پر ایک کتاب "ایمان اور کفر قرآن کی روشنی میں" اور ایک رسالہ "تکفیر کے اصول" مرتب فرمائی ہے جو بڑے جامع اور مدلل بلکہ اپنی مثال آپ ہیں۔ حضرت مفتی صاحبؒ "ایمان اور کفر قرآن کی روشنی میں" کے بارے میں خود رقمطراز ہیں :-

"الحمد للہ، یہ کتاب مسئلہ کفر واسلام کی تمام ضروری مباحث پر حاوی ہے اور ازالۂ شبہات کے لیے کافی ہے۔" [2]

اور رسالہ "تکفیر کے اصول" جواہر الفقہ جلد ۱ کا جزء بن کر شائع ہوا ہے۔ اس رسالے کے بارے میں حکیم الامت مجدد الملت حضرت تھانوی علیہ الرحمہ تحریر فرماتے ہیں :

"مولوی محمد شفیع صاحب نے اصولِ تکفیر میں ایک مختصر اور جامع مانع اور نافع رسالہ لکھا ہے۔ بعض اجزاء میں، میں بھی اُلجھا تھا مگر ان کی تحریر وتقریر سے، قریب قریب مسئلہ صاف ہوگیا۔" [3]

جدید مسائل پر محاکمہ

اللہ تعالیٰ نے حضرت مفتی صاحبؒ کو بڑی صلاحیتوں اور خوبیوں سے نوازا تھا۔ آپ جدید

---

[1] فتاویٰ دارالعلوم دیوبند۔ جلد ۲۔ صفحہ ۴۰۵

[2] کتاب مذکورہ۔ صفحہ ۲

[3] جواہر الفقہ۔ جلد ۱۔ صفحہ ۱۹

مسائل کا قرآن وحدیث اور جمہور فقہاء کے اقوال کی روشنی میں محاکمہ فرماتے اور اس شرعی محاکمے سے قبل موصوفؒ جدید مسائل کی ان کے ماہرین سے پوری تحقیق بڑی کدو کاوش کے ساتھ فرماتے اور جب تک ماہرین کی تحقیقات پر اطمینان نہ ہو جاتا، فتویٰ صادر نہ فرماتے بلکہ مزید تحقیق فرماتے۔ چنانچہ آپ مشینی ذبیحے کے متعلق فرماتے ہیں: "جب تک ان مشینوں کی صحیح صورتِ حال معلوم نہ ہو کوئی جواب دینا بیکار ہے۔" آگے موصوفؒ رقمطراز ہیں: "ان حالات میں کسی مفروضہ صورت پر بحث فضول ہے جب تک کہ درآمدگی ہوئی مشین کی صحیح صورتِ حال معلوم نہ ہو کوئی فتویٰ نہیں دیا جا سکتا۔" لہ

اسی طرح آپ نے آلۂ مکبر الصوت کے سلسلے میں فتویٰ صادر فرمانے سے پہلے کس قدر محنت اور جانفشانی کے ساتھ اس آلے کی تحقیق فرمائی۔ اس کی ایک جھلک آپ کو پچھلے صفحات میں نظر آئے گی۔ (پوری بحث ملاحظہ ہو "آلاتِ جدیدہ کے شرعی احکام")

نیز حضرت مفتی صاحبؒ نے فونوگراف کے متعلق شرعی احکام تحریر فرمائے۔ حکمِ شرعی لکھنے سے قبل حضرتؒ نے تحقیق فرمائی کہ گراموفون کب ایجاد ہوا اور کس نے ایجاد کیا؟ اور فونوگراف میں حامل صوت ہوا بھری ہوتی ہے یا وہ از خود کلمات قطع کرتا ہے؟ اور فونوگراف آلاتِ طرب و مزامیر میں سے ہے یا نہیں؟ آلاتِ طرب ومزامیر میں سے ہونے کے وجوہ اور فونوگراف کے بعض آلۂ حاکیہ ہونے کے تحریر فرمانے کے بعد رقمطراز ہیں کہ دونوں جانب کے یہ وجوہ ہیں جن کی وجہ سے بحث کا فیصلہ غور طلب ہو جاتا ہے۔ لیکن مجدد الملت سیدی ومسندی حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ دامت برکاتہم نے مسئلہ زیرِ بحث کا جو فیصلہ احقر کے ایک عریضے کے جواب میں ارشاد فرمایا ہے، وہی احق بالقبول ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ مزامیر اور آلاتِ طرب میں خود ان آلات کی آوازیں بھی مقصود ہوتی ہیں، اگرچہ ان کے ذریعے سے کسی خاص کلام کی بھی نقل اُتار لی جائے۔ اور گراموفون کی آواز خود مقصود نہیں ہوتی بلکہ اصل ہی کا سماع مقصود ہوتا ہے، اس لیے اس آلہ کو ملاہی محرمہ اور مزامیر میں داخل نہیں کیا جا سکتا۔ (تفصیلات کے لیے دیکھیے "فونوگراف کے شرعی احکام")

لہ جواہر الفقہ۔ جلد ۲ صفحہ ۳۲۱ - ۳۲۲ - اسلامی ذبیحہ

اس پوری کدوکاوش کے بعد حضرت مفتی صاحبؒ نے فونوگراف کے متعلق پیش آنے والے حسب ذیل سات سوال قائم فرماکر ان کے دل نشین جوابات تحریر فرمائے ہیں :-

(۱) گراموفون میں عام راگ و مزامیر اور عورتوں کا نا وغیرہ سُننا شرعاً کیسا ہے ؟

(۲) کوئی مباح نظم یا نثر اس آلے کے ذریعے تفریحاً سننا شرعاً کیا حکم رکھتا ہے ؟

(۳) کسی ضروری اور مفید کلام کو اس آلے کے ذریعے سے ضبط کرلینا اور پھر سنانا جائز ہے یا نہیں ؟

(۴) گراموفون میں قرآن مجید سننا اور سنانا جائز ہے یا نہیں ؟

(۵) اس میں جو قرآن مجید پڑھا جاتا ہے اس کے وہی احکام ہیں جو عام تلاوتِ قرآن کے ہیں، یا کچھ اور ؟

(۶) اس میں اگر کوئی آیت سجدہ تلاوت کردی جائے تو سننے والوں پر سجدہ لازم ہوگا یا نہیں ؟[1]

(۷) اس کے جس پلیٹ (ریکارڈ) میں قرآن مجید کی کوئی سورت محفوظ ہو اس کو بلاوضو چھونا جائز ہے یا نہیں ؟

آپ نے ٹیپ ریکارڈر کے شرعی احکام پر گراموفون کے بعض احکام سے اس کے مختلف ہونے کی وجہ سے ایک مستقل بحث فرمائی ہے مفتی صاحبؒ لکھتے ہیں کہ "ٹیپ ریکارڈ مشین جو حال میں عام ہوئی ہے اس کے ذریعہ ہر متکلم کی آواز کا ریکارڈ ایک ربل "ٹیپ" پر محفوظ کرلیا جاتا ہے ، پھر یہ ٹیپ ریکارڈ جب چاہیں مشین پر پڑھا کر وہی آواز سنی جاسکتی ہے جیسے گراموفون کے کے ریکارڈوں سے سنی جاتی ہے ۔" گراموفون کی طرح یہاں بھی چند سوالات پیدا ہوتے ہیں جن کے جواب میں آپ تحریر فرماتے ہیں کہ "یہ مشین اپنی وضع اور عام استعمال میں کچھ گراموفون سے مختلف ہے کہ گراموفون کا استعمال عام طور پر لہو ولعب اور طرب کی مجلسوں میں تفریح طبع کے لیے ہوتا ہے ، اس کی مشین کا یہ حال نہیں ، بلکہ عموماً اس کو مفید کاموں میں استعمال کیا جاتا ہے ۔ کوئی شخص اپنی بدمذاقی سے گانے بجانے میں استعمال کرلیتا ہو تو اس کی وجہ سے اس مشین کو آلہ لہو ولعب کے حکم میں نہیں رکھا

---

[1] جوابات کے لیے دیکھیے فونوگراف کے شرعی احکام صفحہ ۹، ملحق آلات جدیدہ کے شرعی احکام

جاسکتا۔جیسے گراموفون کہ عموماً لہو ولعب میں استعمال ہونے کے سبب اس کو آلاتِ لہو کے حکم میں سمجھا گیا ہے اس لیے اس مشین پر تلاوتِ قرآن اور دوسرے مفید مضامین کا پڑھنا اور اس میں محفوظ کرانا جائز ہے۔نیز ٹیپ ریکارڈر کے ذریعہ جو آیت سجدہ سنی جائے اس کے سننے سے سجدۂ تلاوت واجب نہیں اور اس ٹیپ کا بلا وضو چھونا بھی جائز ہے۔ [۱]

اسی طرح آپ کے فوٹوگرافی کے شرعی احکام پر مستقل کتاب تحریر کی ہے۔جس میں آپ نے جاندار و بے جان کی تصویر کشی کے تمام پہلوؤں کو قرآن وحدیث، تعامل صحابہ وتابعین اور اقوال ائمہ مجتہدین کی روشنی میں اجاگر فرمایا ہے۔اس کا ایک جزء آلاتِ جدیدہ کے شرعی احکام کے تحت بھی شائع ہوا ہے۔اس میں آپ نے اصل مسئلے پر بحث فرماتے ہوئے تجدد پسندوں کے فوٹوگرافی کے جواز کے دلائل نقل کرنے کے بعد ہر دلیل کا الگ الگ جواب تحریر فرمایا ہے۔پوری بحث کے اختتام پر لکھتے ہیں:

"میری اتنی گزارش سے واضح ہو گیا کہ جن وجوہ کی بنا پر فوٹوگرافی اور فوٹو کو حلال اور جائز سمجھا جاسکتا تھا، ان میں سے ایک بھی قابلِ استدلال نہیں اور اس ضعیف بنیاد پر ایک حرام صریح کو حلال کر دینا، اتنی بڑی جسارت اور دلیری ہے کہ کسی خدا ترس مسلمان سے ممکن نہیں۔بلکہ بلاشبہ اسی مضمون کی نظیر ہے جو بحوالہ حدیث اوپر گزر چکا ہے کہ "اس امت پر کچھ لوگ نام بدل کر شراب پئیں گے" بلاشبہ یہ بھی اسی طرح کی تصویر کا نام بدل کر اس کو حلال کرنا ہے۔حق تعالیٰ مسلمانوں کو اس بلائے عظیم سے بچائے"۔ [۲]

اسی طرح آپ نے روزے میں انجکشن کا شرعی حکم تحریر فرمانے سے قبل ڈاکٹروں سے اس کی تحقیق کے بعد دلائل فقہیہ کی روشنی میں اس پر فتویٰ صادر فرمایا۔آپ اسی کے متعلق ایک سوال کے جواب میں رقمطراز ہیں جس سے آپ کے ماہرین سے تحقیق اور اس پر شرعی دلائل کی روشنی میں محاکمہ کے جملہ پہلو نمایاں ہیں۔فرماتے ہیں کہ

ڈاکٹروں سے تحقیق کرنے سے نیز تجربے سے یہ بات ثابت ہوئی کہ انجکشن

---

[۱] ملخص از آلاتِ جدیدہ کے شرعی احکام صفحہ ۱۴۴ - [۲] آلاتِ جدیدہ۔صفحہ ۹۶

کے ذریعہ دوا جوفِ عروق میں پہنچائی جاتی ہے اور خون کے ساتھ شرائیں (شریانوں) یا اوردہ (وریدوں) میں اس کا سریان ہوتا ہے۔ جوفِ دماغ یا جوفِ بطن میں دوا نہیں پہنچتی۔ اور فسادِ صوم کے لیے مفطر کا جوفِ دماغ یا جوفِ بطن میں بذریعہ منفذِ اصلی پہنچنا ضروری ہے، مطلقاً کسی عضو کے جوف میں یا عروق (شرائین و اوردہ) کے جوف میں پہنچنا مفسدِ صوم نہیں۔ فقہاء کی عبارتیں دو طرح پر تقریباً بلکہ حقیقۃً اس دعوے کی تصریح کرتی ہیں۔ اول تو یہ کہ فقہاء نے زخم پر دوا ڈالنے کو مطلقاً مفسد نہیں فرمایا، بلکہ جائفہ یا آمّہ کی قید لگائی ہے کیونکہ انھیں دو قسموں کے زخموں سے دوا جوفِ دماغ یا جوفِ بطن کے اندر پہنچتی ہے ورنہ جوفِ عروق کے اندر تو دوسری قسم کے زخموں سے بھی دوا پہنچ جاتی ہے۔ دوسرے بہت سی جزئیاتِ فقہیہ مسلّماتِ فقہاء میں سے ایسی ہیں جن میں دوا وغیرہ مطلقاً جوفِ بدن میں تو پہنچ گئی لیکن چونکہ جوفِ دماغ یا جوفِ بطن میں نہیں پہنچی، اس لیے اس کا مفطر و مفسدِ صوم ہونا نہیں قرار دیا جیسے مرد کے پیشاب گاہ میں دوا یا تیل وغیرہ پڑھانے سے باتفاقِ ائمۂ ثلاثہ روزہ فاسد نہیں ہوتا۔

اس کے بعد حضرتؒ نے کتبِ فقہ کی عبارتیں بڑی بسط و تفصیل سے پیش کی ہیں۔ [1]

آلاتِ جدیدہ کے شرعی احکام میں حضرت مفتی صاحبؒ نے انجکشن کی ایک واضح نظیر بھی تحریر کی ہے جو مسئلہ مذکورہ کے سمجھنے میں بڑی ممد و معاون ہے اور ایک کم عقل شخص بھی پڑھ کر صورتِ مذکورہ کو بڑی آسانی سے سمجھ سکتا ہے۔ رقمطراز ہیں:

"یہ ظاہر ہے کہ انجکشن کا طریقہ نہ عہدِ رسالتؐ میں موجود تھا نہ ائمۂ مجتہدین کے زمانے میں، اس لیے اس کا کوئی صریح حکم نہ تو کسی حدیث میں مل سکتا ہے نہ ائمۂ دین کے کلام میں۔ البتہ فقہی اُصول و قواعد اور نظائر پر قیاس کر کے اس کا

---

[1] امداد المفتین۔ کتاب الصوم۔ صفحہ ۳۴۳

حکمِ شرعی معلوم کیا جاسکتا ہے۔ سو اس کی واضح مثال یہ ہے کہ اگر کسی کو بچھو یا سانپ کاٹ لے تو یہ مشاہدہ ہے کہ زہر بدن کے اندر جاتا ہے، سانپ کا زہر تو اکثر دماغ ہی پر اثر انداز ہوتا ہے۔ اور بعض جانوروں کے کاٹنے سے بدن پھول جاتا ہے جس سے زہر کا بدن کے اندر جانا یقینی ہو جاتا ہے، مگر دُنیا کے کسی فقیہ عالم نے اس کو مفسدِ صوم نہیں قرار دیا۔ یہ انجکشن کی ایک واضح مثال ہے۔ بلکہ سُنا یہ گیا ہے کہ انجکشن کی ایجاد ہی اس طرح ہوئی ہے کہ زہریلے جانوروں کے کاٹنے کا تجربہ کرتے کرتے اسی نتیجے پر پہنچا گیا ہے کہ دُوا کا فوری اثر اس طرح بدن میں پہنچایا جاسکتا ہے "۔ ؎

اسی طرح آپ نے ریڈیو پر تلاوتِ قرآن کریم سے متعلق احکام شرعیہ تحریر فرمائے ہیں۔ جوابات سے قبل آپ لکھتے ہیں کہ "ریڈیو عصرِ حاضر کی ایک ایسی ایجاد ہے جس کو اگر صحیح استعمال کیا جائے تو پُوری دنیا کے لیے بڑی نعمت اور علمی، عملی، اخلاقی تربیت کے لیے بہترین ذریعہ ہے۔ لیکن افسوس کہ جن ہاتھوں میں اس کا انتظام ہے انھوں نے اس کو مفیدِ خلق بنانے کے بجائے خالص تجارتی اغراض پر مقبولِ عوام بنانے کو ترجیح دی اور اسی لیے ہر اچھے بُرے مذاق کی تسکین کو اس میں ضروری سمجھ کر اس میں رقص و سرود اور فلمی گیت تک داخل کر دیئے، دین دار مسلمانوں کی ترغیب کے لیے اس میں تلاوتِ قرآن اور مختلف مضامین پر تقریریں، وغیرہ بھی شامل کر دیں "۔ اس تمہید کے بعد موصوف نے عام طور پر پیش آنے والے سوالات کے جوابات تحریر کیے ہیں، جن کا خلاصہ ذیل میں پیش کیا جاتا ہے:۔

(۱) ریڈیو پر تلاوتِ قرآن فی نفسہٖ جائز ہے، لیکن تلاوت کرنے والے کے پیشِ نظر وہ لوگ ہونے چاہئیں جو آدابِ تلاوت کی رعایت کرتے ہوں اور ریڈیو پر تلاوت کا معاوضہ لینا حرام ہے۔ البتہ اگر تلاوت کے ساتھ اس کا اُردو ترجمہ اور تفسیر بھی ہو تو پھر وہ تلاوتِ مجردہ نہ رہے گی، تعلیم کی حیثیت اختیار کرے گی، اس کا معاوضہ لینا جائز ہوگا۔ یا ریڈیو کی ملازمت اختیار کرے،

؎ صفحہ ۱۰۴

وہاں آنے جانے اور وقت کی پابندی وغیرہ کی تنخواہ لے اور تلاوت کو ثواب سمجھ کر کیا کرے۔
(۲) ریڈیو سے تلاوتِ قرآن سننا بھی جائز ہے بشرطیکہ آدابِ قرآن کی پوری پابندی کا اہتمام ہو
(۳) تیسرا سوال یہ ہے کہ قاری نے ریڈیو پر کوئی آیتِ سجدہ پڑھی تو سننے والوں پر سجدۂ تلاوت واجب ہوگا یا نہیں ؟

جواب میں حضرتؒ تحریر فرماتے ہیں کہ "ظاہر ہے کہ یہ آلہ حال میں ایجاد ہوا ہے اس کا حکم صریح الفاظ میں تو کتبِ فقہ یا نصوص کتاب و سنت میں ہو نہیں سکتا، قواعد و اصول و امثال و نظائر ہی سے اس کا حکم دریافت کیا جاسکتا ہے" آگے حضرتؒ کتبِ فقہ سے نظائر تحریر فرمانے کے بعد لکھتے ہیں کہ

"فقہاء کی مذکورہ بالا تصریحات سننے کے بعد مسئلہ زیرِ بحث پر غور کیا جائے تو نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ریڈیو یا آلہ مکبر الصوت کی آواز بھی اگر مصنوعی آواز مثل صوت صدی کے قرار دیا جائے تو اس کے ذریعہ آیت سننے والوں پر سجدۂ تلاوت واجب نہ ہو۔ اور اگر اس کو متکلم کی اصل آواز قرار دیا جائے تو سجدۂ تلاوت واجب ہو۔ اب یہ بات کہ آواز اصلی ہے یا مصنوعی اس معاملے میں سائنس جدید کے ماہرین کے اقوال خود مختلف ہیں۔ بعض اس کو اصلی آواز قرار دیتے ہیں اور بعض مصنوعی کہتے ہیں، جس کی مکمل تحقیق رسالہ مکبر الصوت میں مذکور ہے۔ اس لیے سجدۂ تلاوت کے باب میں احتیاط اسی میں ہے کہ سجدہ واجب قرار دیا جائے"

(۴) کسی نے ریڈیو پر السلام علیکم کہہ دیا تو بمقتضائے قواعد یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس واجب کی ادائیگی اس طرح کہ سلام کرنے والے کو اس کا جواب معلوم ہو جائے، سننے والے کی قدرت میں نہیں، اس لیے وجوبِ جواب تو ساقط ہو جانا چاہیے، البتہ احتیاطاً جوابِ سلام دے دیں تو بہتر ہے کیونکہ یہ ایک کلمہ دعا کا ہے اور دعا غائبانہ بھی ہو سکتی ہے۔ تاہم ریڈیو پر سلام کرنے سے اجتناب کیا جائے۔[1]

اسی طرح حضرت مفتی صاحبؒ نے "ہوائی رؤیتِ ہلال" کی شرعی حیثیت پر فقہی دلائل اور

---

[1] آلاتِ جدیدہ صفحہ ۱۰۵

جدید ماہرین کی تحقیقات کی روشنی میں فتویٰ صادر فرمایا جس کا واقعہ یہ ہے کہ کراچی میں ہلال رمضان پر بعض لوگوں نے ہوائی جہاز میں پرواز کر کے (چاند) دیکھنے کا اہتمام کیا اور اس رؤیت کی بناء پر کراچی میں روزہ کا اعلان ہوا۔ اس پر اطرافِ پاکستان اور ہندوستان وغیرہ سے مختلف قسم کے سوالات آئے اور اہلِ علم نے اس پر اشکالات کا اظہار کیا۔ اس لیے مناسب معلوم ہوا کہ ہوائی رؤیتِ ہلال کی شرعی حیثیت کو واضح کر دیا جائے۔ اس کے علاوہ آلاتِ جدیدہ یعنی ریڈیو، ٹیلی فون، ٹیلی ویژن لاسلکی، وائرلیس، ٹیلی گرام وغیرہ کے ذریعہ آنے والی خبروں کا درجہ اور مقام کی شرعی حیثیت اور مریض کے بدن میں انسانی خون کا استعمال اور اس سے متعلقہ مسائل نیز پائپ سسٹم ٹینکوں کے پاک ناپاک ہونے کے احکام جدید تحقیقات کی روشنی میں بیان فرمائے ہیں جن کی تفصیلات طوالت کے باعث نقل نہیں کی گئیں جو آلاتِ جدیدہ کے شرعی احکام میں دیکھی جاسکتی ہیں۔

فقہی کتب کی مزاولت اور ان پر عبور

حضرت مفتی صاحب نور اللہ مرقدہ کو کتب فقہ و فتاویٰ بار بار دیکھنے کی وجہ سے ان پر اس قدر عبور ہوگیا تھا کہ آپ اپنے عمر کے آخری ایام میں کتب فقہ کی مراجعت کے بغیر مشکل سے مشکل فتاویٰ کے جوابات تحریر فرما دیا کرتے تھے اور علالت کے زمانہ میں حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے سامنے سوال پڑھ کر سنایا جاتا، آپ فوراً برجستہ اس کا جواب تحریر کرا دیتے۔ استاذنا المکرم حضرت مولانا عاشق الٰہی صاحب مدظلہم فرماتے ہیں کہ

> اُلجھے ہوئے مسائل میں اکثر مُراجعت کی ضرورت پڑتی تھی، احقر متعدد لفافے لے کر حاضر ہوتا، سوال کا خلاصہ سناتا، ادھر سے جواب مل جاتا، تھوڑی سی دیر میں بہت سے مسائل حل ہو جاتے۔ آپ کو "لفافے تو جوابِ ہر سوال" کا مصداق پایا۔[۱]

آپ سے علماء مشکل اور لاینحل مسائل میں رجوع کرتے، آپ ان کی اُلجھی ہوئی گتھیاں سلجھاتے

---

[۱] ماہنامہ البلاغ۔ ربیع الاول ۱۳۹۶ھ

یہی وجہ ہے کہ آپ کو فقہی کتب پر عبور ہونے کی بنا پر فقہی اصول مستحضر ہو گئے تھے اور بعض مرتبہ انھی اصول کی روشنی میں جواب تحریر فرما دیتے۔

حضرت رحمۃ اللہ علیہ احکام القمار کے مقدمہ میں تحریر کرتے ہیں جس سے آپ کے فقہی کتب کی مزاولت اور ان پر عبور کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ آپ نے اس رسالے کو صرف ایک دن میں اور وہ سفر میں مکمل فرمایا۔ فرماتے ہیں:۔

یُوں تو ہمارے سارے معاملات کی کثرت ہو گئی ہے اور ہوتی جاتی ہے جن میں قمار (جُوا) شامل ہے جس کو قرآن میں ایک حیثیت سے بُت پرستی کے برابر قرار دیا ہے۔ اس لیے دل میں تھا کہ قمار کے متعلق قرآن و حدیث کی وعیدیں اور اس کے مروجہ احکام رسالے کی صورت میں جمع کر دیئے جائیں۔ اتفاقاً شعبان ۱۳۷۰ھ میں مجھے کراچی سے لاہور کا سفر کرنا ہوا۔ اور یہاں اتفاقی طور پر چند روز قیام کرنا پڑا۔ اسی فرصت میں اس مسئلے کا خیال آیا اور برخوردار عزیز مولوی محمد زکی سلمہٗ ناظم ادارہ اسلامیات لاہور سے اس کا ذکر آیا۔ انھوں نے اصرار کیا کہ اس فرصت کو غنیمت سمجھ کر اس وقت یہ رسالہ لکھ دیا جائے۔ بنام خدائے تعالیٰ قلم اٹھایا اور بعونہٖ تعالیٰ یکم شعبان روز سہ شنبہ کو ایک ہی دن میں یہ رسالہ مکمل ہو گیا۔ اللہ اس کو ہم سب مسلمانوں کے لیے نافع و مفید بنا دیں۔ آمین [1]

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ یکم شعبان ۱۳۷۰ھ

اسی طرح آپ نے اپنی تالیف "سنت و بدعت" صرف دو دن میں مکمل فرمائی۔ آپ اسی کتاب کے مقدمے میں تحریر فرماتے ہیں کہ

"بنام خدائے تعالیٰ (اس کو) شروع کیا تو دو روز میں بعونہٖ تعالیٰ یہ زیرِ نظر رسالہ تیار ہو گیا۔" [2]

---

[1] احکام القمار صفحہ ۲ مطبوعہ کراچی

[2] سُنّت و بدعت صفحہ ۸ مطبوعہ کراچی

"نیز تنقیح المقال فی تصحیح الاستقبال" جس میں سمتِ قبلہ سے متعلق علامہ مشرقی کی پیدا کردہ تشکیکات کا واضح جواب اور اس مسئلے کی مثبت انداز میں مکمل تحقیق ہے، جو آپ نے چند گھنٹوں میں تحریر فرمایا۔ یہ رسالہ مخدومی جناب سید مقبول حسین صاحب بلگرامی، جہانگیر آباد کے استفتاء متعلق سمتِ قبلہ کا جواب ہے۔ اس رسالے کے بارے میں حضرت مفتی صاحبؒ فرماتے ہیں کہ

"اس کا جواب اتفاقاً کسی قدر مفصل لکھا گیا۔ موصوف (بلگرامی صاحب) نے یہ جواب سیدی و مرشدی حضرت حکیم الامت دامت برکاتہم کی خدمت میں پیش کر دیا۔ حضرتِ والا دامت فضائلہم و فواضلہم نے اس کو پسند فرما کر اس کا نام بھی تنقیح المقال فی تصحیح الاستقبال تجویز فرما دیا۔ یہ محض حق تعالیٰ کا فضل تھا کہ ایک بے مایہ طالب علم کی عجلت کے ساتھ چند گھنٹوں میں لکھی ہوئی تحریر کو شرفِ قبولیت عطا فرمایا۔" [۱]

رسالے کے بارے میں حکیم الامت مجدد الملت حضرت تھانوی علیہ الرحمۃ کی تحریر ملاحظہ ہو :-

بعد الحمد والصلوٰۃ، میں نے اس فتوے کو دیکھا۔ مسئلہ زیرِ بحث میں کافی و وافی پایا جس سے حرفاً حرفاً متفق ہوں اور سہولتِ تعبیر کے لیے اس کو تنقیح المقال فی تصحیح الاستقبال سے ملقب کرتا ہوں۔"

کتبہ اشرف علی عفی عنہ ۴ ربیع الاول ۱۳۵۰ھ

آپ کی کتب فقہ میں مہارتِ تامہ اور کامل عبور کی بناء پر دیگر جید علماء کے علاوہ آپ کے شیخ و مرشد مجدد الملت حکیم الامت حضرت تھانویؒ بھی آپ سے مشکل اور دقیق مسائل میں مراجعت فرماتے تھے۔ حضرت مفتی صاحبؒ اسی نوعیت کے ایک سوال و جواب پر جو دراہم و دنانیر کے وقف کے متعلق ہے، ذیل میں حاشیہ دے کر تحریر فرماتے ہیں :-

یہ سوال حضرت مجدد الملت حکیم الامت سیدی و سندی حضرت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہ العزیز کا ہے جس پر لکھنے کی جرأت بھی اپنی بیمائیگی کے

---

[۱] امداد المفتین، کتاب الصلوٰۃ، صفحہ ۲۶۳

باوجود حضرت ہی کے الطاف و مکارم کی بناء پر ہوسکی، ورنہ

کہاں میں اور کہاں یہ نکہت گل !

حضرت والاقدس سرہٗ نے اس جواب پر تصدیق بھی بالفاظِ ذیل تحریر فرماکر اس ناکارے کی حوصلہ افزائی فرمائی۔ میں ان کلمات کو آئندہ کے لیے فالِ نیک اور باعثِ برکات سمجھ کر نقل کرتا ہوں۔ ورنہ اس کی نقل بھی دشوار ہے:-

"السلام علیکم۔ دو مسرتیں ہوئیں اور دونوں بالغہ سابغہ، ایک شبہ کا ازالہ، دوسرے اپنی آنکھ سے دین کی صحیح خدمت کرنے والے کا مشاہدہ، جس سے امید بندھ گئی کہ انشاء اللہ امت کے دست گیر ابھی باقی رہیں گے۔ دل سے دُعاء برکتِ ظاہرہ و باطنہ کی کرتا ہوں۔"

اشرف علی از تھانہ بھون [۱]

امت کے لیے رخصت وسہولت کا خیال

یہ عظیم ہستی، اکابرین واسلاف کی آخری یادگار، جس نے کرب و بے چینی کے عالم میں بھی عزیمت پر عمل کیا اور سخت ترین بیماری کی حالت میں بھی اکثر وبیشتر نمازیں باوضو ادا فرمائیں۔ استاذِ محترم مولانا عاشق الٰہی صاحب مدظلہم کی یہ بات ہم گزشتہ صفحات میں بھی لکھ چکے ہیں کہ ایک مرتبہ حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ سخت تکلیف میں مبتلا تھے۔ مولانا موصوف رقمطراز ہیں کہ مجھ سے دریافت فرمایا کہ تیمم کرنے کی گنجائش ہے؟ میرے نزدیک نہ تھی لیکن تکلیف اس قدر شدید تھی کہ میں یہ کہنے کی ہمت نہ کرسکا کہ وضو کرنا لازم ہے۔ تھوڑی دیر خاموش بیٹھ کر میں چلا آیا۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے محسوس فرمالیا کہ وضو کے بغیر چارہ نہیں، چنانچہ وضو کرکے نماز ادا فرمائی اور مسجد میں مجھ سے فرمایا کہ میں نے وضو کرلیا تھا۔

اس کے برخلاف دوسروں کے لیے تسہیل کا یہ عالم ہے کہ اگر مسئلے میں جواز کی کوئی گنجائش

---

[۱] فتاویٰ دارالعلوم دیوبند صفحہ ۶۰۱۔ جلد ۲

نہیں ہے تو آپ امت کی سہولت کی خاطر اصل مسئلے کا جواب لکھنے کے بعد اس کا کوئی حیلہ جواز تحریر فرمادیتے، تاکہ لوگ تنگی اور پریشانی میں مبتلا نہ ہوں - اسی نوعیت کے ایک سوال کے جواب میں جو ہبہ مشاع سے متعلق ہے آپ تحریر فرماتے ہیں :-

"الجواب : قال فی الدر المختار، ولذا یشترط فیہا (ای فی عوض الھبۃ) شرائط الھبۃ کقبض وافراز وعدم شیوع ولو العوض مجانسا او یسیرا (شامی باب الرجوع فی الہبہ، صفحہ ۸۱، جلد ۴) وفی البحر الرائق من الرجوع فی الھبۃ ص ۲۹۲ ج ۷ - واشار بقولہ فقبضہ الی انہ یشترط فی العوض شرائط الھبۃ من القبض والافراز - عباراتِ مذکورہ سے معلوم ہوا کہ ہبہ بالعوض میں بھی شیوع مانع ہے - لہذا صورت ہبہ مندرجہ سوال جائز نہیں - البتہ ایک حیلے سے جائز ہو سکتا ہے - وہ یہ ہے کہ جائداد مشترکہ موہوب لہا کے ہاتھ فروخت کردی جائے اور جب بیع تام ہو جائے تو پھر ان کو اس کی قیمت سے بری کردیا جائے - کذا ذکرہ الشامی فی کتاب الھبۃ - فقط" [۱]

مواقیتِ احرام کے سلسلے میں ہندوپاکستان سے جانے والے بحری عازمین حج کے لیے علماء عصر نے جدہ سے احرام باندھنے کو ناجائز موجب دم قرار دیا - اس کے برخلاف حضرت مفتی صاحبؒ نے بحری مسافروں کے لیے اس کو ترجیح دی کہ جدہ تک احرام کو مؤخر کرنا اور جدہ سے باندھنا نہ کوئی گناہ ہے نہ اس سے دم لازم آتا ہے - جو تسہیل امت کی مبین دلیل ہے - [۲]

اسی طرح آپ نے حج بدل کرنے والے کے لیے ملا علی قاریؒ اور حضرت گنگوہیؒ کے فتوی کے خلاف تمتع کرنے کی گنجائش دی ہے - تحریر فرماتے ہیں کہ

"اگرچہ من حیث الدلیل رجحان اس کا معلوم ہوتا ہے کہ حج بدل میں آمر کی اجازت سے قران اور تمتع دونوں جائز ہوں اور فقہاء متأخرین میں صاحب لباب اس کے حاشیہ حباب وغیرہ میں اسی کو اختیار بھی کیا گیا ہے - مگر ملا علی قاریؒ اور اور حضرت گنگوہی قدس اللہ سرہٗ کا فتویٰ اس سے مختلف ہے، وہ تمتع کو باذن آمر

---

[۱] امداد المفتین - جلد ۲ - صفحہ ۶۵۴ - کتاب الھبۃ والصدقۃ

[۲] جواہر الفقہ - جلد ۱ - صفحہ ۴۸۶ - مواقیتِ احرام

بھی جائز قرار نہیں دیتے۔ معاملہ ادائے فرض کا نازک ہے اس لیے احتیاط لازم ہے۔ جہاں تک ممکن ہو حج بدل میں افراد یا قران کیا جائے، تمتع نہ کریں۔ لیکن اس زمانے میں حج و عمرہ کرنے میں عام آدمی آزاد نہیں کہ جب اور جس وقت چاہیں جا سکیں اور طول احرام سے بچنے کے لیے ایام حج کے بالکل قریب سفر کریں۔ ہر طرف حکومتوں کی پابندیاں شدید ہیں اس لیے اگر کسی حج بدل کرنے والے کو وقت سے زیادہ پہلے چلے جانے کی مجبوری ہو اور احرام طویل میں واجبات احرام کی پابندی مشکل نظر آئے تو اس کے لیے تمتع کر لینے کی بھی گنجائش ہے[۵۱]۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

نیز حج بدل کے ایک اور مسئلے میں جس میں علماء کا اختلاف ہے، آپ نے اس میں سے اہون واسہل کو اختیار فرمایا۔ مسئلہ یہ ہے کہ "جس شخص پر پہلے سے حج فرض نہیں تھا، اگر یہ کسی دوسرے کی طرف سے حج بدل پر چلا گیا اور اسی کی طرف سے احرام باندھ کر مکہ معظمہ میں داخل ہوا تو بیت اللہ کے پاس پہنچنے سے اس کے ذمے اپنا حج فرض نہیں ہوگا کیونکہ وہ اس حالت میں مکہ مکرمہ پہنچا ہے کہ دوسرے کی طرف سے احرام باندھنے کی بناء پر اپنا حج کرنے پر اس کو قدرت نہیں۔ اور واپسی کے بعد غریب ہونے کی بناء دوبارہ جانے کی قدرت نہیں۔ اور بعض حضرات نے فرمایا ہے کہ اگرچہ اس کے ذمہ پہلے سے حج فرض نہیں تھا مگر بیت اللہ کو دیکھنے سے اس پر حج فرض ہوگیا اس لیے اس پر لازم ہے کہ سال بھر وہیں ٹھہرے اور اگلے سال اپنا حج کر کے واپس آئے۔ (غنیہ)

آج کل چونکہ نہ قیام طویل اختیار میں ہے، نہ اس کے وسائل اختیار میں، اس لیے پہلے قول پر عمل کیا جاسکتا ہے، بحیثیت دلیل بھی وہی راجح معلوم ہوتا ہے[۵۲]۔

اسی طرح حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے امت کی رخصت و سہولت کے لیے بضرورت مذہب حنفیہ کے علاوہ دوسرے مذاہب پر فتوے صادر فرمائے تاکہ لوگ تنگی اور بدحالی میں مبتلا ہو کر کہیں دین سے بیزار نہ ہو جائیں۔ حیلۂ ناجزہ اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے جس میں آپ نے اپنے شیخ و مربی مجدد الملت حضرت حکیم الامت مولانا تھانوی علیہ الرحمہ کے ساتھ مل کر کام کیا اور اس کی تحقیق وسعی فرمائی تفصیلات

---

[۵۱] جواہر الفقہ جلد ا صفحہ ۵۱۶ - حج بدل۔ [۵۲] ایضاً صفحہ ۵۰۶

حیلۂ ناجزہ، میں دیکھی جاسکتی ہیں)

نیز آپ نے علماء کی تسہیل کے لیے دوسرے مذاہب پر فتوٰی دینے کے حدود کے موضوع پر ایک رسالہ لکھنے کا ارادہ فرمایا تھا، اس کی ابتدائی تمہید بھی لکھ دی تھی اور اس کے لیے مختلف کتب سے آپ نے اس موضوع سے متعلق عبارات کے حوالے بھی جمع فرمائے تھے، افسوس کہ موصوف اس کی تکمیل نہ فرما سکے" ۔[1]

اسی طرح حضرت والا سائل کی سہولت کے پیش نظر، عربی سوال کا جواب عربی میں اور فارسی سوال کا جواب فارسی زبان ہی میں تحریر فرمادیتے، تاکہ سائل کو دشواری و پریشانی نہ ہو، جن کی بے شمار مثالیں نظائر امداد المفتین اور جواہر الفقہ میں دیکھی جاسکتی ہیں۔

فقہی مشاورت کا قیام اور اس میں شرکت

حضرت مفتی صاحب قدس سرہٗ اپنے رسالہ اعضاء انسانی کی پیوندکاری" کے مقدمہ میں تحریر فرماتے ہیں کہ "فقہی مسائل میں اجتماعی غور و فکر کا سلسلہ قرونِ اُولیٰ سے چلا آتا ہے جن مسائل میں قرآن وسنت کے اندر کوئی نص صریح نہیں ہے، ان میں قرآن وسنت ہی کے بتائے ہوئے اُصولوں کے مطابق احکام شرعیہ معلوم کرنے کے لیے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک زرّین ہدایت نامہ دیا ہے۔ حضرت علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہٗ فرماتے ہیں کہ میں نے عرض کیا، یا رسول اللہ! اگر ہمیں کوئی ایسا معاملہ پیش آجائے جس کا حکم قرآن وسنت میں مذکور نہیں تو اس میں ہمارے لیے کیا ارشاد ہے؟ آپؐ نے فرمایا،

شاوروا الفقهاء والعابدين ولا تمضوا فيه رأيا خاصة . (رواه الطبراني فى الاوسط ورجاله موثقون من اهل الصحيح، كذا فى مجمع الزوائد للهيثمى) $\frac{۱۷۸}{۱ع}$	اِس میں فقہاء اور عابدین سے مشورہ کرکے کوئی رائے قائم کرو، انفرادی رائے کو نافذ نہ کرو۔ (یہ حدیث طبرانی نے معجم اوسط میں روایت کی ہے۔ امام حدیث حافظ ہیثمی نے فرمایا کہ اس حدیث کے سب راوی معتمد اور صحیح کے رجال ہیں۔

---

[1] جواہر الفقہ۔ جلد ا صفحہ ۱۵۰ دوسرے مذہب پر فتوٰی دینے کے حدود۔

اِس حدیث کے مقتضیات پر عمل کرتے ہوئے مختلف زمانوں میں علماء امت کا یہ طریقہ رہا ہے کہ وہ نئے پیش آنے والے احکام دینیہ خصوصاً اجتماعی نوعیت کے مسائل میں باہمی غور و فکر، مشورہ اور بحث و تمحیص کے بعد کوئی فتوٰی دیتے تھے۔ حضرت امام ابوحنیفہؒ کا عمل بھی اسی پر تھا۔ فقہی مسائل کی تحقیق کے لیے انھوں نے ماہر فقہاء عابدین کی جو مجلس بنائی ہوئی تھی اس کا مقصد بھی یہی تھا۔ مغلیہ حکومت کے دَور میں "فتاوٰی عالمگیریہ" جیسی عظیم الشان کتاب بھی اسی طرح مرتب ہوئی۔ آخر دَور میں حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہٗ کا طریق کار بھی یہ تھا کہ نئے پیش آمدہ مسائل میں، بالخصوص ان مسائل میں جو عالمگیر اور اجتماعی اہمیت کے حامل ہوں، محض اپنی انفرادی رائے پر اعتماد فرمانے کے بجائے وقت کے ماہر "فقہاء عابدین" سے مشورہ فرماتے تھے اور موافق و مخالف تمام پہلو سامنے آنے کے بعد کوئی فتوٰی دیتے تھے۔ نئے فقہی مسائل کی تحقیقات کے لیے آپ نے حوادث الفتاوٰی کے نام سے ایک مستقل سلسلہ شروع کر رکھا تھا اور ان میں سے بیشتر مسائل میں آپ کا طریق کار یہی تھا۔ عورتوں کے مصائب و مشکلات کو دور کرنے کے لیے الحیلۃ الناجزہ بھی اسی طرح تصنیف ہوئی جو حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے تفقہ اور دینی بصیرت کا نتیجہ ہے۔

یوں تو زندگی "ہر دم رواں پیہم رواں" ہے اور ہر نیا زمانہ اپنے ساتھ نئے مسائل اور نئے حالات لے کر آتا ہے لیکن خاص طور سے مشین کی ایجاد کے بعد سے حالات نے جو پلٹا کھایا ہے اس سے زندگی کا کوئی گوشہ متأثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکا۔ اس نے انسانی زندگی کے ہر ہر شعبے میں انقلابی تبدیلیاں پیدا کی ہیں اور ہر علم و فن میں نئے مسائل پیدا کر کے تحقیق و تفتیش کے نئے میدان کھولے ہیں۔ اسی ضمن میں ایسے بیشمار فقہی مسائل بھی پیدا ہو گئے ہیں جن کا صریح حکم قرآن و سنت یا فقہائے امت کے کلام میں موجود نہیں اور ان کا حل تلاش کرنے کے لیے فقہ اور اصول فقہ کی روشنی میں تحقیق و نظر کی ضرورت ہے اسی وجہ سے آج "شاوروا الفقہاء والعابدین" کے ارشاد حدیث پر عمل کرنے کی ضرورت شاید پچھلے تمام زمانوں سے زیادہ محسوس کی جا رہی ہے۔ ضرورت تو اس بات کی تھی کہ عالَم اسلام کے چیدہ چیدہ "فقہاء عابدین" جن کی فقہی بصیرت، علم و عمل، تدیّن و تقوٰی اور معاملہ فہمی پر پوری امت اسلامیہ کو اعتماد ہو، مشترک طور سے ان مسائل پر غور و فکر کریں، لیکن آج پورا عالم اسلام جن سیاسی اور معاشرتی الجھنوں میں گرفتار ہے، ان کے پیش نظر، یہ بات ممکن نظر نہیں آتی۔ بحالاتِ موجودہ علماء کے ہاتھ میں

اتنے وسائل بھی نہیں ہیں کہ وہ ایک ہی ملک کے "فقہاءِ عابدین" کو جمع کر کے یہ کام انجام دے سکیں۔
لیکن مالا یدرک کلہ لا یترک کلہ کے پیش نظر صرف کراچی کے علماء نے اس کام کے لیے ایک غیر رسمی جماعت بنائی ہوئی ہے، جس میں کراچی کے تین ممتاز دینی درس گاہوں دارالعلوم کراچی مدرسہ عربیہ اسلامیہ نیوٹاؤن اور اشرف المدارس ناظم آباد کراچی کے ماہر اہلِ فتویٰ شریک ہیں۔ یہ جماعت ابھی تک عام جماعتوں کی رسمی پابندیوں اور عہدہ و منصب کے ضابطوں سے بے نیاز نہایت سادگی کے ساتھ اپنا کام انجام دے رہی ہے۔ تینوں اداروں کے اہلِ علم و فتویٰ وقتاً فوقتاً مل کر بیٹھتے ہیں نئے مسائل پر غور و فکر اور بحث و تمحیص کرتے ہیں، مسئلے کے تمام گوشوں کا غیر جانبداری کے ساتھ مطالعہ ہوتا ہے اور ہر شخص خوب کھل کر اپنی رائے پیش کرتا ہے اور جب کوئی مسئلہ طے ہو جاتا ہے تو اُس کو دلائل کے ساتھ لکھ لیا جاتا ہے۔

اس طرح یہ مجلس کئی فقہی مسائل طے کر چکی ہے، جو انشاء اللہ رفتہ رفتہ شائع کیے جائیں گے۔ فی الحال "مریض کو خون دینے اور تبادلۂ اعضاء انسانی" کا مسئلہ شائع کیا جا رہا ہے، جس کے لیے مُلک و بیرونِ ملک کے اہلِ فتویٰ کے پاس سوالنامہ بھیج کر ان کی تحقیقات بھی جمع کی گئی اور باہم بحث و تمحیص کے بعد اسے احقر نے مرتب کیا ہے۔ دُوسرے طے شدہ مسائل میں بیمۂ زندگی، بے سُود کی بنکاری، پراویڈنٹ فنڈ اور اس کے سود کے احکام، مواقیتِ حج، مشینی ذبیحہ وغیرہ شامل ہیں۔ ان کو بھی اسی طرح شائع کیا جائے گا اور ملک و بیرون ملک کے اہلِ فتویٰ کے پاس بالخصوص بھیجا جائے گا۔ اگر کسی طرف سے کوئی مؤثر تحقیق ان کے خلاف میں آئی تو اس پر فکر و غور کے بعد بطور ضمیمہ شائع کر دیا جائے گا۔

اللہ تعالیٰ اس سلسلے کو مفید اور نافع بنائے اور اپنے اُن بندوں کو راہِ صواب کی ہدایت فرمائے جو اس کی مرضیات کی تلاش و جستجو کرنا چاہتے ہیں۔ ھوحسبی ونعم الوکیل

اب تقریباً تمام مذکورہ مسائل شائع ہو چکے ہیں۔ جن میں سے بعض مستقل طور پر شائع ہوئے ہیں اور بعض کو جواہر الفقہ کا جزو بنا کر شائع کیا گیا ہے۔ الحمدللہ یہ حضرت مفتی صاحبؒ کی قائم کردہ مجلسِ مشاورت اب تک قائم ہے اور اسی طرح یہ غیر رسمی جماعت نہایت سادگی اور حسن و خوبی کے ساتھ اپنا کام انجام دے رہی ہے!

فللہ الحمد ولہ الشکر

دارُالعلوم کراچی میں دارالافتاء کا قیام اور تخصص فی الفقہ کے شعبہ کا اجراء

شعبان ۱۳۷۰ھ میں نہایت بے سروسامانی کے عالم میں صرف ایک استاذ اور چند طلباء سے محلہ نانک واڑہ کی ایک عمارت میں مدرسہ اسلامیہ قائم ہوا جس کو دارالعلوم کراچی کہا جاتا ہے۔ اس کا مرکزی مقام کورنگی ٹاؤن ہے۔ اور قیام دارالعلوم کے ساتھ شعبۂ افتاء بھی قائم کیا گیا، جو دارالعلوم کا ایک نہایت اہم شعبہ ہے جس سے سالانہ ہزاروں فتاویٰ پاکستان، ہندوستان، افغانستان، ایران عرب، افریقہ، برما، سنگاپور اور دوسرے ممالک میں جاتے ہیں۔ اور خود شہر کراچی میں زبانی اور تحریری سوالات کی تعداد اتنی ہے کہ شب و روز اس کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔

دارالعلوم کا تعلیمی فائدہ تو صرف ان لوگوں کو پہنچتا ہے جو دارالعلوم میں حاضر ہو کر تعلیم حاصل کریں، لیکن اس شعبے کا فیض ہر ملک کے ہر مسلمان حاضر و غائب کے لیے عام ہے اور دارالعلوم کی خداداد مقبولیت کے سبب عام مسلمانوں کا اس طرف رجوع ہے جس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ اس شعبے کی پوری ذمہ داری باوجود شبانہ روز مشغلہ کے براہ راست صدر و بانی دارالعلوم مفتی اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب نے لی ہوئی ہے جن کو دنیائے اسلام کے واحد مرکز دارالعلوم دیوبند میں پندرہ سال تک اکابر علمائے امت کے زیر سایہ ذمہ دارانہ طور پر فتاویٰ کی خدمت کرنے اور تقریباً تیس چالیس ہزار فتاویٰ اس زمانے میں اپنے ہاتھ سے لکھنے کی وجہ سے ایک عالمگیر شہرت اور خداداد مقبولیت حاصل ہے۔ مفتی صاحب موصوف دارالعلوم سے پہلے بھی کراچی میں جس جگہ رہے آپ کا مکان ہمیشہ ایک دارالافتاء بنا رہتا تھا۔ مگر افسوس ہے کہ اس زمانے کے فتاویٰ کی نقل رکھنے کا کوئی اہتمام نہ ہو سکا۔ قیام دارالعلوم کے بعد بحمداللہ اس کو ایک مستقل شعبے کی حیثیت دے کر نقل فتاویٰ کا انتظام کیا گیا، ایک مستقل نائب مفتی رکھے گئے۔ یہ نقل شدہ فتاویٰ کسی وقت ایک بہت بڑا علمی سرمایہ ہو جائے گا۔ اختتام سال لہٰذا تک جو فتاویٰ درج رجسٹر ہوئے، ان کی تعداد بے شمار ہے زبانی فتاویٰ اس کے علاوہ ہیں جن کی تعداد اس سے کم نہیں ہوگی۔ کیونکہ اس کا سلسلہ دن رات ٹیلی فون کے ذریعہ بھی جاری رہتا ہے۔ طریقۂ کار یہ ہے کہ خود مقامی حضرات زبانی یا تحریری طور پر مسائل

دریافت کرتے ہیں انھیں زبانی یا تحریری جواب دے دیا جاتا ہے اور جو بیرونی حضرات جوابی کارڈ یا لفافہ ارسال کرتے ہیں انھیں بذریعہ ڈاک جواب دے دیا جاتا ہے۔ یہ شعبۂ دار الافتاء ابتداءً نانک واڑہ کی عمارت کے ایک چھوٹے سے کمرہ میں قائم کیا گیا تھا، اس کے بعد مرکزی مقام کورنگی میں حضرت مفتی صاحبؒ کے منتقل ہوجانے کے بعد آپ کے ساتھ شعبہ دار الافتاء کو بھی وہاں منتقل کردیا گیا اور نانک واڑہ میں آپ کے زیر نگرانی ایک نائب مفتی مقرر کردیا گیا۔ [۱]

تخصص فی الفقہ

اہل علم سے مخفی نہیں کہ فتویٰ نویسی ایک مستقل فن ہے۔ صرف کتب متداولہ پڑھ لینے سے یا کسی درسگاہ سے فارغ ہوجانے سے یہ فن حاصل نہیں ہوتا، بلکہ فراغت کے بعد اس کی ضرورت ہوتی ہے کہ کسی ماہر مفتی کی سرپرستی میں فتویٰ نویسی کے اصول اور اس کا تجربہ حاصل کیا جائے۔[۲] اسی غرض سے شوال ۱۳۸۵ھ سے دار العلوم کراچی میں "شعبۂ تخصص فی الفقہ والافتاء" کا باقاعدہ آغاز کیا گیا اگرچہ اس سے قبل بھی دار العلوم میں "تمرین افتاء" کا کام کسی خاص اہتمام کے بغیر کرایا جاتا رہا ہے، جس کی تفصیل درج ذیل ہے۔ شعبۂ تخصص میں طلباء کے کام کی مدت دو سال ہے۔ پہلے سال چھ پرچے پڑھائے جاتے ہیں اور دوسرے سال سات پرچے۔

سال اول

پہلا پرچہ ——— اُصول فقہ

کتب درسی :- الاحکام فی اصول الاحکام للآمدیؒ (القسم الثالث فی المبادی الفقہیۃ والاحکام الشرعیۃ۔ از صفحہ ۱۴۱ تا ۱۸۰۔ جلد اول)

کتب مطالعہ :- (۱) شرح جمع الجوامع للسبکیؒ (مبحث الاحکام)۔ (۲) الاحکام فی اصول الاحکام (ماسوائے قسم ثالث ومباحث فتاویٰ) (۳) الموافقات للشاطبیؒ (اولین)

دوسرا پرچہ ——— اُصول فتویٰ

---

[۱] و [۲] ملخص از سالانہ روئداد دار العلوم کراچی۔ شعبان ۱۳۸۸ھ

کتب درسی :- مقدمۃ الدر المختار باعانتِ شامیؒ (۲) شرح عقود رسم المفتی، لابن عابدینؒ۔
(۳) الاحکام فی اصول الاحکام للآمدی (القاعدۃ الثالثۃ فی المجتہدین واحوال المفتین والمستفتین از صفحہ ۱۳۹ جلد سوم تا آخر کتاب)

کتبِ مطالعہ :- الفتوٰی فی الاسلام للشیخ جمال الدین القاسمیؒ (۲) معین القضاۃ والمفتین (۳) نشر العرف لابن عابدینؒ۔

تیسرا پرچہ ——— فقہ و فتوٰی

کتب مطالعہ :- (۱) الفتاوی الخیریہ یا تنقیح الحامدیہ (۲) امداد الفتاوٰی (کامل) (۳) فتاوٰی دار العلوم (کامل) (۴) فتاوٰی رشیدیہ (کامل)

چوتھا پرچہ ——— تاریخ فقہ

کتب مطالعہ :- (۱) مقدمہ ابن خلدون (مباحث متعلقہ تفسیر، حدیث، فقہ و اصول) (۲) مقدمہ نصب الرایہ للشیخ الکوثریؒ (۳) الفوائد البہیۃ للشیخ عبدالحیؒ

پانچواں پرچہ ——— تمرین افتاء

فتوٰی نویسی اور اس دوران تمام کتبِ فقہ و حدیث سے حسب ضرورت استفادہ۔

چھٹا پرچہ ——— معاشیات

عہدِ حاضر کے "معاملات" اور "حوادث الفتاوٰی" سے واقفیت کے لیے "معاشیات" کا وہ حصہ درساً (بطور تقاریر) پڑھایا جائے گا، جو "فقہ" سے متعلق ہے۔ عنوانات درج ذیل ہیں :-
دولت، اس کی پیدائش۔ تقسیم اور مبادلہ۔ نظامِ زر۔ بنکاری۔ افراط و تفریط۔ مالیاتِ عامہ۔ بین الاقوامی تجارت۔ قانونِ معاہدہ۔ شرکت۔ کمپنی۔ دستاویزات قابلِ انتقال۔

سالِ دوم

پہلا پرچہ ——— اُصولِ فقہ

کتبِ تدریس :- الاشباہ والنظائر (الفن الاول فی القواعد) باعانتِ حمویؒ

کتبِ مطالعہ :- (۱) مجلۃ الاحکام العدلیۃ (حصۃ القواعد) (۲) تلخیص الاعتصام للشاطبیؒ (بنام

الابداع فی مضار الابتداع)

دُوسرا پرچہ ———— فقہ وفتاوٰی

کتب مطالعہ :- الاشباہ والنظائر (از فن ثانی تا آخر) باعانتِ حمویؒ (۲) مجلۃ الاحکام العدلیہ (حصۂ قوانین)

تیسرا پرچہ ———— تقابلِ فقہ وقانونِ جدید

کتب مطالعہ :- المقارنات التشریعیۃ (۲) التشریع الجنائی الاسلامی

چوتھا پرچہ ———— تمرین افتاء

حسبِ سابق

پانچواں پرچہ ———— فقہی مقالہ

فقہ یا اُصولِ فقہ کے کسی موضوع پر ایک تحقیقی مقالہ - یا فتاوٰی کے کسی مجموعے کی ترتیب، تبویب، تجرید یا تہذیب -

چھٹا پرچہ ———— قانون

درس بشکل تقاریر :- (۱) اصولِ قانونِ جدید مع نصفت - (۲) قانونِ شہادت - (۳) قانون انتقالِ جائداد -

---

مطالعہ :- قانون بیع مال (۲) قانونِ امانت (۳) قانون دادرسیٔ خاص (۴) قانونِ ٹارٹ -
اِس کے علاوہ سالِ دوم میں ایک تحریری امتحان بھی ہوگا، جس میں "حوادث الفتاوٰی" کی معلومات کی بطور خاص جانچ کی جائے گی -

اساتذہ

یہ شعبہ براہِ راست حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب کی نگرانی میں ہے جو بعض اہم اسباق خود پڑھانے کے علاوہ تمرین افتاء کا کام بھی خود ہی کراتے ہیں - آپ کے علاوہ دارالعلوم کے بعض ماہر اُساتذہ اپنے زیادہ اوقات اسی شعبے میں صرف کرتے ہیں اور تدریس کے علاوہ طلباء کے مطالعہ کی نگرانی، ان کی مشکلات کے حل اور فتوٰی نویسی و مقالہ نگاری میں ان کی مکمل رہنمائی کریں گے -

شرائطِ داخلہ

(۱) اس شعبے کے لیے صرف وہ طلباء اپنی درخواستیں پیش کریں جو :-

(الف) کسی معروف دینی درس گاہ سے اعلیٰ درجے میں فارغ التحصیل ہوں -

(ب) اُردو تحریر و انشاء کی اچھی صلاحیت کے حامل ہوں -

(ج) فقہ اور اصولِ فقہ میں خصوصی استعداد و مناسبت رکھتے ہوں -

(۲) تقریری امتحان داخلہ مندرجۂ ذیل کتابوں میں لیا جائے گا :-

بیضاوی یا جلالین - صحیح بخاری - ہدایہ کامل - شرح عقائد - مختصر المعانی -

مقامات حریری - سلم العلوم اور میبذی -

اِس کے علاوہ اردو تحریر و انشاء کی صلاحیت کا بھی امتحان کیا جائے گا -

وظیفہ

جو طلباء امتحانِ داخلہ میں کامیاب ہوکر اس شعبے میں داخل ہوں گے انھیں فراغت تک پچاس روپے ماہانہ وظیفہ دیا جائے گا - [1]

مذکورہ بالا نصابِ تخصص میں سنہ ۱۳۹۰ھ میں ترمیم و اضافہ کیا گیا - ترمیم شدہ نصاب حسبِ ذیل ہے، جسے شوال سنہ ۹۱-۱۳۹۰ھ سے جاری کیا گیا - جو آب تک جاری ہے :-

سالِ اول

پہلی سہ ماہی :- مطالعۂ (۱) امداد الفتاوٰی کامل (۲) فتاوٰی رشیدیہ کامل

دوسری سہ ماہی :- مطالعۂ (۱) مقدمۃ الدر المختار و ردّ المحتار - (۲) شرح عقود رسم المفتی - (۳) الاحکام فی اصول الاحکام (القاعدۃ الثالثۃ فی المجتہدین واحوال المفتین والمستفتین از صفحہ ۱۳۹ جلد سوم تا آخر کتاب) - (۴) الفتوٰی فی الاسلام (للشیخ جمال الدین قاسمی (۵) الفتاوی الخیریہ - ...

تیسری سہ ماہی :- مطالعۂ (۱) امداد المفتین کامل (۲) رسائل فقہیہ (فہرست مشورے سے تیار کی

---

[1] ماخوذ از ماہنامہ البلاغ شعبان سنہ ۱۹۶۸ء

جائے گی)۔(۳) مقدمہ نصب الرایہ (للشیخ الکوثری) ۔(۴) سراجی مع التمرین وتمرین افتاء (درساً)۔
نوٹ:۔ تصوف کی ایک کتاب دونوں سالوں میں جاری رہے گی جو حضرت مفتی صاحب درساً پڑھائیں گے۔ علاوہ ازیں قصد السبیل اور تعلیم الدین کا مطالعہ خود کریں گے۔

سالِ دوم

پہلی سہ ماہی :۔ (۱) تاسیس النظر (مطالعہ)۔(۲) تلخیص الاعتصام للشاطبی (الابداع فی مضار الابتداع) (مطالعہ)۔(۳) معین الاحکام (مطالعہ)۔(۴) فتویٰ نویسی۔
دوسری سہ ماہی :۔ (۱) الاشباہ والنظائر (از فن ثانی تا آخر)۔(۲) مشق فتویٰ نویسی۔
تیسری سہ ماہی :۔ (۱) فقہی مقالہ مع فتویٰ نویسی۔

تخصص فی الفقہ سے مستفید ہونے والے طلباء

حسبِ ذیل طلباء نے اس شعبے سے استفادہ کیا، جن میں سے بعض طلباء نے مذکورہ دو سالہ نصاب کی تکمیل سے قبل ہی اپنے بعض اعذار کی بناء پر دارالعلوم کراچی سے چلے گئے اور بعض نے بڑی دلجمعی کے ساتھ اس شعبے میں کام کیا اور پورے دو سالہ نصاب کی تکمیل کی۔

۱۳۸۰ھ

(۱) مولوی محمد یوسف چاٹگامی
(۲) " احرار الزمان
(۳) " محمد امین کوٹوی
(۴) " عبداللہ ارکانی
(۵) مولوی محبت اللہ ارکانی
(۶) " محمد رفیع عثمانی
(۷) " محمد تقی عثمانی
(۸) " جمال الدین سندھی

۱۳۸۱ھ

(۱) مولوی عبداللطیف ڈیروی
(۲) " بحرالعلوم
(۳) " محمد حسین
(۴) " احرار الزمان
(۵) مولوی پہرہ خان
(۶) " محمد مدثر
(۷) " منیر احمد
(۸) " اکبر علی

۱۳۸۲ھ

(۱) مولوی منیر احمد

۱۳۸۴ھ

(۱) مولوی عبدالباقی
(۲) " عبدالعزیز
(۳) " حبیب الرحمٰن
(۵) مولوی عبدالقادر ہزاروی
(۶) " محمد عبدالقادر
(۷) " نور حسن

۱۳۸۶ھ

(۱) مولوی حبیب الرحمٰن ہزاروی
(۲) مولوی عبدالصمد ہزاروی

۱۳۸۷ھ

(۱) مولوی شہنواز بن عبدالرحمٰن کوٹٹوی
(۲) مولوی محمد حبیب اللہ جھنگوی

۱۳۸۹ھ

(۱) مولوی عبدالظاہر افغانی
(۲) " جلال الدین ایرانی
(۳) " خان محمد سراوانی
(۴) مولوی محمد عبدالحمید ڈھاکوی
(۵) " عبدالرشید سراوانی
(۶) " محمد عبدالمنان فرید پوری

۱۳۹۰،۹۱ھ

(۱) مولوی امان اللہ سواتی
(۲) " محمد رفیق ڈھاکوی
(۳) " سراج الدین اکیابی
(۴) " محمد صادق الاسلام کملائی
(۵) " محمود اشرف عثمانی۔
(۶) مولوی محمد جعفر احمد کملائی
(۷) " عبدالغنی ایرانی
(۸) " عبدالرؤف سکھروی
(۹) " غلام محمد قندھاری

۱۳۹۲،۹۳ھ

(۱) مولوی عبدالملک کراچوی
(۲) " محمد عبدالغفار ارکانی
(۳) مولوی عبدالغفور کراچوی
(۴) " محمد طاہر شاہ چترالی

(۵) مولوی رحمت کریم سرحدی
(۶) 〃 رفیق احمد کراچوی
(۷) مولوی شفیق احمد کراچوی
(۸) 〃 سراج الدین کراچوی

۱۳۹۴ھ

(۱) مولوی امین اشرف کراچوی
(۲) مولوی صبار دانشس حیدرآبادی

۱۳۹۵ھ

(۱) مولوی منیب احمد کراچوی

۱۳۹۶ھ

(۱) مولوی منعمت اللہ چترالی
(۲) 〃 انصار رضا
(۳) مولوی محمد اسلم

۱۳۹۷ھ

(۱) مولوی شیخ رحیم الدین دکنی

۱۳۹۸ھ

(۱) مولوی عبداللہ کراچوی
(۲) 〃 محمد مصطفیٰ کراچوی
(۳) 〃 محمد عبدالشکور صاحب
(۴) مولوی انور شاہ بخاری
(۵) 〃 عبدالمنان سلہٹی

جُرأت مندی و بے باکی

حضرت مفتی صاحب موصوف قدس سرہ کی جرأت مندی و بے باکی کا اندازہ "معاصر جماعتوں اور فرقوں پر اظہارِ خیال" سے کیا جاسکتا ہے۔ ملاحظہ ہو صفحہ ۳۹، جس میں آپ نے سیاسی جماعتوں اور فرقوں خصوصاً کانگریس اور سیرت کمیٹی کے خلاف ایسے وقت فتویٰ صادر فرمایا، جب کہ وہ پُورے شباب اور بامِ عروج پر تھیں اور ظاہر ہے کہ ایسے وقت ان کے خلاف فتویٰ دینا اپنی موت کو دعوت دینا تھا لیکن پھر بھی آپ نے بلاخوفِ لومۃ لائم تمام فقہی جزئیات کا محاکمہ کرکے بالدلائل فتویٰ صادر فرمایا، اور اس قسم کے ایک دو نہیں سینکڑوں فتوے آپ نے صادر فرمائے جس کی پاداش میں

آپ پر طعن و تشنیع کی گئی اور آپ کو ان کی وجہ سے تکالیف کا سامنا کرنا پڑا۔ لیکن آپ اپنے مشن کی راہ میں کسی کی پرواہ کیے بغیر اسے پورے انہماک اور حسن و خوبی سے آخری ایام تک انجام دیتے رہے ذیل میں تمثیلاً مزید چند نظائر پیش کی جاتی ہیں۔

فیلڈ مارشل محمد ایوب خان سابق صدر اسلامی جمہوریہ پاکستان، کے دورِ حکومت میں جب خلاف شریعت عائلی قوانین نافذ کیے جانے والے تھے، ۱۹۶۱ء میں، حضرت مفتی صاحبؒ نے ایک ناصحانہ خط صدرِ پاکستان کو لکھا اور ساتھ ہی ان قوانین پر دلائل شرعیہ کی روشنی میں تبصرہ اور متبادل تجاویز تحریر فرمائیں۔ حضرت مفتی صاحبؒ خود رقمطراز ہیں کہ

"مقصد کی اہمیت اور معاملے کی نزاکت کے پیش نظر احقر نے یہ صورت اختیار کی کہ مطالبہ و احتجاج کی راہ چھوڑ کر جناب صدر مملکت کی خدمت میں ایک ہمدردانہ مشورے کی صورت میں ایک معروضہ پیش کیا، جس کے ساتھ اس قانون کے خلاف قرآن و سنت ہونے کو اختصار کے ساتھ ظاہر کر کے عرض کیا کہ بطور نمونہ کے چند دلائل قرآن و سنت سے لکھے گئے ہیں۔ اگر مزید تحقیق کی ضرورت ہوگی تو وہ بھی پیش کی جائے گی۔" (مزید تفصیلات جواہر الفقہ جلد ۲ صفحہ ۱۵ تا صفحہ ۶۰ دیکھی جا سکتی ہیں)

اِس سے قبل غیر منقسم ہندوستان میں حکومت برطانیہ کی طرف سے زمینوں کی شخصی ملکیت کے خلاف ایک بل پیش ہوا تھا، اس زمینداری بل پر حضرت مفتی صاحبؒ نے ایک تنقیدی مقالہ تحریر فرمایا، جو اخبار صدق لکھنؤ، تنویر لکھنؤ، احسان لاہور وغیرہ میں شائع ہوا تھا۔ آپ تحریر فرماتے ہیں کہ

"حال میں یوپی گورنمنٹ نے زمینداری ختم کرنے اور زمینوں کو ملکیت شخصیہ سے نکالنے کا جو قانون پاس کیا ہے اور سُنا جاتا ہے کہ بنگال میں بھی یہ قانون زیر تجویز ہے۔ یہ اسی اُصولِ اشتراکیت کی ایک قسط ہے جو قرآن و حدیث کی تعلیمات کے بالکل مخالف اور مالکان اراضی پر ظالمانہ دستبرد ہے۔ مسلمانوں کو اس کی حمایت کسی طرح کسی حال روا نہیں۔ یہ بات اگرچہ بالکل واضح اور قرآن و حدیث پر ادنیٰ نظر رکھنے والے کے لیے بالکل جلی ہے۔ اس پر کسی برہان و بیّنہ یا فتویٰ اور دلیل

کی ضرورت نہیں۔ ؎۵۱

آپ آگے صفحہ ۳۲۱ پر سوال ۱۲ کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں کہ

"بیشک مسلمانوں پر لازم اور واجب ہے کہ اس لوٹ اور غصب کے خلاف مقدور بھر پوری کوشش کریں۔ کیوں کہ اس کا پس منظر اگر غور سے دیکھا جائے تو فقط زمینوں کی لوٹ نہیں، بلکہ مطلقاً مذہب اور تمام مذہبی شعائر کا ہدم ہے کیوں کہ یہ قانون جس نظریے کی پہلی قسط ہے وہ سوشل ازم کا نظریہ ہے جس میں کسی چیز پر کسی شخص کی شخصی ملکیت نہیں رہتی۔ اگر خدا نخواستہ یہ راستہ کھلا تو کوئی شخص کسی چیز کا مالک نہیں رہتا اور جب مالک نہیں رہتا تو عباداتِ مالیہ زکوٰۃ و صدقات، حج اور اوقاف سرے سے ختم ہوتے جاتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ جس ناپاک سرزمین سے اس نظریے کی ابتدا ہوئی اس میں سب سے پہلے مطلقاً مذہب اور خدا پرستی کے خلاف کھلی جنگ کی گئی۔ خدا پرستی اور مذہبیت کو سب سے بڑا جرم قرار دیا گیا۔ اس لیے مسلمانوں پر فرض ہے کہ وہ اس قانون کے منسوخ کرانے میں اپنی طاقت و قدرت کے موافق پوری کوشش کریں۔"

اسی طرح حضرت نوّر اللہ مرقدہٗ نے حقِ تصنیف اور حقِ ایجاد کی شرعی حیثیت پر ایک مقالہ تحریر فرمایا جس میں موصوفؒ نے حکومت کے اس حقِ تصنیف و ایجاد کو ناحق اور ظلم قرار دیا۔ اس پوری بحث کا آخر میں آپ خلاصہ لکھتے ہیں کہ

"خلاصہ یہ کہ درحقیقت حقِ تصنیف و ایجاد کوئی ایسی چیز نہیں جو مملوک ملکِ خاص ہو سکے۔ ایک شخص ایک کتاب یا کوئی نئی ایجاد دیکھ کر اپنی ملک اور اپنی محنت سے اس کی نقل اتار لے تو اس کو روکنا ایک امرِ مباح کو روکنا ہے جس کا وہ شخص حق دار ہے۔ اور ظاہر ہے کہ یہ روکنا ظلم ناروا ہے۔" ؎۵۲

اسی طرح بعض اہلِ تجدد نے پنجاب اسمبلی میں ایک بل برائے منظوری پیش کیا تھا جس کا

؎۵۱ جواہر الفقہ۔ جلد ۲ صفحہ ۳۱۸۔ ؎۵۲ ایضاً۔ صفحہ ۳۳۸۔

حاصل یہ تھا کہ بیٹے کی موجودگی میں یتیم پوتے کو میراث نہ ملنا اسلامی تعلیمات اور انصاف کے خلاف ہے، لہٰذا اسے بھی میراث دلائی جائے۔ حضرت قدس سرہٗ نے بلا خوف لومۃ لائم اس کا شرعی اور عقلی دلائل سے جواب دے کر ہر اشکال کو دور فرمادیا ہے۔ سید داؤد غزنوی مہتمم مدرسہ دارالعلوم تقویۃ الایمان، لاہور وممبر پنجاب اسمبلی فرماتے ہیں کہ

"حضرت مفتی صاحبؒ نے پوتے پوتی کے وارث ہونے کے مسئلے پر جو آج کل پنجاب اسمبلی میں پیش ہے جو جواب تحریر فرمایا ہے وہ باوجود مختصر ہونے کے جامع، مدلّل اور مسکت ہے۔ جَزَاہُ اللّٰہُ خَیْرَ الْجَزَاءِ"

اور حضرت مفتی صاحبؒ نے صرف تردید کرنے پر اکتفا نہیں فرمایا، بلکہ آخر میں انھیں متنبہ فرمایا کہ

"ہمارا مشورہ پنجاب قانون ساز اسمبلی کو یہ ہے کہ وہ اس قانون شریعت میں جو باجماع امت ثابت ہے، ترمیم کا خطرناک اقدام ہرگز نہ کرے کہ اولاً یہ خود اس کی اپنی اسلامی حیثیت کے منافی ہے، ثانیاً عوام میں بلا وجہ ایک نیا اضطراب پیدا کرنے کا موجب ہے۔ اس مسئلے میں مسلمانوں کی تمام جماعتیں حنفی، شافعی، حنبلی، مالکی اور اہل حدیث وغیرہ سب ہی متفق ہیں۔ صرف وہ چند لوگ اس مسئلے میں اختلاف رکھتے ہیں جو قرآن کو تعلیمات رسولؐ سے علیحدہ کر کے اپنی ہواء وخیالات کا تابع بنانا چاہتے ہیں، جن کی مسلمانوں میں نہ کوئی تعداد ہے، نہ کوئی علمی یا عملی حیثیت۔ وماعلینا الا البلاغ"[1]

اسی طرح حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے غیر منقسم ہندوستان میں ایک سوال کے جواب میں جس میں آپ سے دریافت کیا گیا تھا کہ "اسکول میں مسلمان لڑکوں کا ہندو لڑکوں کے ساتھ ان کی مخصوص دعا میں شریک ہونا کیسا ہے؟" آپ نے جواب میں تحریر فرمایا کہ

"مسلمان لڑکوں کو اس پراتھنا میں شریک ہونا ہرگز جائز نہیں اگرچہ ہندی کلمات بھی ہوں اور اگرچہ دعا میں کوئی چیز اسلامی عقائد کے خلاف بھی نہ ہو کیونکہ

---

[1] جواہر الفقہ۔ جلد ۲ صفحہ ۲۸۰

تعلیماتِ اسلامیہ کا ایک اہم جزو یہ ہے کہ اپنی وضع قطع اور طرزِ معاشرت میں، اور بالخصوص عبادات میں دُوسری قوموں سے اپنا امتیازِ مذہبی قائم رکھیں اور اس کے خلاف کرنے کی شریعت میں ممانعت ہے [1]

نیز ایک سوال کے جواب میں جس میں آپ سے دریافت کیا گیا تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ کے حالاتِ طیبہ بطرزِ ناول لکھنا کیسا ہے؟ سائل نے اسی قسم کے ایک ناول کے بعض اقتباسات بھی تحریر کیے تھے۔ آپ جواباً لکھتے ہیں، جس کا حاصل یہ ہے کہ

"یہ ناول سخت بے باکی و گستاخی سے لکھا گیا ہے اور بہت سے گناہوں کا مجموعہ ہے ...... لہٰذا اس کی اشاعت اور دیکھنا پڑھنا سُننا وغیرہ سب ناجائز ہیں۔ مسلمانوں کو چاہیے کہ ایسے رسائل کی اشاعت بند کرنے کی کوشش کریں۔ واللہ سبحانہٗ وتعالیٰ اعلم [2]

لغزشیں اور ان کا تدارک

حضرت مفتی صاحب قدس سرہ العزیز اوصافِ کمالیہ کے باوجود جو بات معلوم نہیں ہوتی، آپ اس کا صریح الفاظ میں اعتراف فرما لیتے تھے۔ آپ نے ایک سائل کے سوال کے جواب میں تحریر فرمایا کہ کوئی صریح روایت تخبیراً اس میں نظر سے نہیں گزری لیکن حدیث میں ہے کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ یکبر عند کل خفض و رفع اور شرح منیہ وغیرہ میں اس تکبیر کی یہ صورت لکھی ہے کہ حرکت انتقال کے ساتھ شروع ہو اور ختم حرکت پر ہو۔ حیث قال بان یکون ابتداء التکبیر عند ابتداء الخرور وانتہائہ عند انتہائہ (کبیری صفحہ ۳۱۲) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حرکت انتقال سے پہلے تکبیر ختم کر چکا تو کھڑے ہونے کے وقت دوبارہ تکبیر کہنا چاہیے۔ [3]

اسی طرح حضرت رحمۃ اللہ علیہ کسی سائل کے مطلع کر دینے سے یا از خود کسی سوال کے جواب دینے

---

[1] امداد المفتین۔ کتاب الذکر والدعاء۔ صفحہ ۳۰۴، پر تفصیل دیکھئے۔ [2] ایضاً۔ صفحہ ۳۰۷۔

[3] فتاویٰ دارالعلوم دیوبند۔ جلد ۲ صفحہ ۲۳۵

کے بعد اس جواب میں کسی غلطی یا تسامح پر اطلاع ہوتی تو آپ بلا کسی جھجک اور بلا خوفِ لومۃ لائم اس سے رجوع فرمالیا کرتے تھے۔ چنانچہ خود رقمطراز ہیں:۔

"حضرات علماء اور ارباب فتویٰ سے باادب درخواست ہے کہ ان فتاویٰ میں جس جگہ کوئی غلطی یا خامی محسوس فرمادیں، میری زندگی میں تو مجھے مطلع فرما کر ممنون فرمادیں کیونکہ احقر نے اپنے فتاویٰ اور جملہ تصانیف کے متعلق سیدی حضرت حکیم الامت قدس سرہٗ کے مشورے اور تجویز کے موافق آپ کی تصنیف ترجیح الراجح کی طرح ایک مستقل سلسلہ بنام "اختیار الصواب فی جمیع الابواب" شروع کردیا ہے جو امداد المفتین کا ضمیمہ ہوگا۔ اس میں اپنے فتاویٰ اور تصانیف میں جس جگہ کوئی ترمیم و اصلاح خود اپنی نظر ثانی سے یا کسی بزرگ کے ارشاد سے سمجھ میں آوے گی وہ درج کردی جائے گی تاکہ اس کی طبع جدید کے وقت اصلاح میں آسانی ہو۔ اور میرے انتقال کے بعد جب تک مکتبہ دارالاشاعت جاری رہے اس کے ناظم کو مطلع فرمائیں کہ وہ علماء کے مشوروں کو بصورت حاشیہ ان کے مواقع میں ثبت فرمادیں واللہ سبحانہ وتعالیٰ اسئل الوقایۃ عن الغوایۃ وان لا یجعلنی من الذین ضل سعیھم فی الحیوٰۃ الدنیا وھم یحسبون انھم یحسنون صُنعا ؎

نہ بحرفے ساختہ سرخوشم، نہ بنقش بستہ مشوشم
نفسے بیاد تو می زنم، چہ عبارت و چہ معانیم

واللہ ولی التوفیق، وھو بہ حقیق، ونعم الرفیق فی کل طریق[1]

چنانچہ آپ اسی عنوان "اختیار الصواب فی مختلف الابواب" کے تحت ایک سوال کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں کہ

"جناب کا سوال اور امداد الفتاویٰ اور فتاویٰ رشیدیہ کے جوابات اور مولانا ظفر احمد صاحب کا جواب دیکھا، ان سب کو دیکھ کر اب یہی صواب معلوم ہوتا ہے کہ نماز جنازہ

---

[1] مقدمہ امداد المفتین صفحہ ۱۳۔

قبور کے درمیان بھی جائز ہے اور کراہتِ صلوٰۃ بین المقابر صلوٰۃِ حقیقیہ کے
ساتھ مخصوص ہے۔ صلوٰۃِ جنازہ عام صلوٰۃ کے مفہوم میں درحقیقت داخل نہیں۔
اس کے لیے مستقل دلیل کی ضرورت ہے اور مستقل دلیل اس کی کراہت بین القبور
پر کوئی نہیں ہے بلکہ صلوٰۃ علی القبر کا جواز اس کے جواز کی دلیل ہے، اس لیے
پہلے جواب سے رجوع کرتا ہوں۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم وجزاکم
اللہ تعالیٰ علی ما نبھتمونی [1]

اسی طرح آپ نے ایک سوال کا جواب تحریر فرمایا جو حضرت مفتی کفایت اللہ صاحبؒ اور حضرت حکیم الامت مولانا تھانوی علیہ الرحمہ کے جواب سے مختلف تھا، جس کا حاصل یہ ہے کہ "غیر اللہ کی تعظیم وتقرب کے لیے کسی جانور وغیرہ کو نامزد کرنے کی تینوں صورتیں اصل فعل کے اعتبار سے تو بالاتفاق حرام وناجائز ہیں۔ اور اس جانور کے حرام ہونے میں تفصیل یہ ہے کہ پہلی دونوں صورتیں جن میں غیر اللہ کے لیے خون بہانا مقصود ہے، ان میں یہ جانور بھی بالاتفاق حرام ہے۔ اور تیسری صورت جس میں غیر اللہ کے لیے جان لینا مقصود نہیں بلکہ صرف ان کے نام پر چھوڑنا مقصود ہے جیسے اکثر ہندو اپنے بتوں یا گنگا وغیرہ کے نام پر چھوڑتے ہیں۔ یا بعض مسلمان اولیاء اللہ کی قبروں پر نذر مان کر چھوڑ دیتے ہیں جیسے شیخ سدو کا بکرا وغیرہ۔ اس کے متعلق صراحۃً فقہاء حنفیہ کے کلام میں کوئی تصریح نظر سے نہیں گزری، اسی لیے علماء کا اس میں اختلاف ہے۔ بعض حضرات اس کو اپنی اصل پر رکھ جائز قرار دیتے ہیں اور جواز کے لیے صرف اجازتِ مالک کو کافی سمجھتے ہیں۔ اور بعض حضرات اس کو بھی نذر لغیر اللہ کے ساتھ ملحق سمجھ کر حرام قرار دیتے ہیں اور بحیثیتِ دلیل یہی راجح معلوم ہوتا ہے کیونکہ منذور لغیر اللہ اور سائبہ وغیرہ میں کوئی وجہ فرق کی معلوم نہیں ہوتی۔ اس لیے اس بارے میں احتیاط ہی لازم ہے [2]

بعد میں جب صحیح صورتِ حال سامنے آئی تو آپ نے اپنے اس مذکورہ بالا فتوی سے رجوع فرمایا۔ رقمطراز ہیں :-

---

[1] امداد المفتین۔ جلد ۲۔ صفحہ ۷۵۔ کتاب المتفرقات

[2] " " " صفحہ ۶۷۸۔ کتاب الصید والذبائح

الغرض اب مختار احقر کے نزدیک بھی وہی فتویٰ ہے جو مفتی کفایت اللہ صاحب دہلویؒ اور حضرت مولانا تھانوی دامت برکاتہم کا سوال میں نقل کیا گیا ہے یعنی تیسری صورت میں اجازتِ مالک جواز کیلئے کافی ہے۔ اس لئے صورت مندرجہ سوال میں جو جانور کان کاٹ کر مالک نے ملازمانِ راج یا مندر میں رہنے والے خادموں کے حوالے کر دیئے وہ اسی تیسری صورت میں داخل ہیں، ان کا فروخت کرنا اور خریدنا پھر ذبح کر کے کھانا، سب جائز ہے۔ واللہ المستعان وعلیہ التکلان وبیدہ العصمۃ والصواب وھو اعلم بالحق فی کل باب۔ ؁ [1]

اسی طرح حضرت مفتی صاحبؒ نے آلۂ مکبر الصوت کے نماز میں استعمال پر ابتداءً فسادِ نماز کا حکم تحریر فرمایا تھا، لیکن ابتلاء عام اور حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کے حکم فساد سے اختلاف کی بناء پر از سر نو تحقیق اور غور و خوض کے بعد آپ نے حکم فسادِ نماز سے رجوع فرمایا۔ موصوف تحریر فرماتے ہیں کہ

"۱۳۴۹ھ میں دارالعلوم دیوبند کی خدمتِ فتویٰ اس ناکارۂ خلائق کے سپرد کی گئی، اس وقت اس آلہ کا استعمال اور زیادہ عام ہو چکا تھا۔ اطراف ملک سے آئے دن اس کے متعلق سوالات آتے رہتے تھے، اس لیے اس کی ضرورت محسوس ہوئی کہ اس موضوع پر ایک مستقل رسالہ لکھا جائے، جس میں دیوبند کے سابق فتویٰ اور حکیم الامت حضرت تھانوی قدس سرہٗ کی تائید و تصویب کو مزید شرح و تائید کے ساتھ ضبط کر لیا گیا اور یہ رسالہ مستقل صورت میں شائع ہو گیا۔ دیوبند، سہارنپور تھانہ بھون کے علماء نے عام طور پر اس کی موافقت فرمائی لیکن میرا یہ رسالہ جب حضرت الاستاذ شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کے پاس پہنچا (جب کہ وہ ڈابھیل ضلع سورت کے جامعہ اسلامیہ میں صدر مدرس کے فرائض انجام دے رہے تھے)، آپ نے رسالہ پڑھ کر احقر کو ایک والا نامہ تحریر فرمایا جس میں فسادِ نماز کے حکم سے

---

[1] امداد المفتین جلد ۲ صفحہ ۶۸۱۔ [2] والا نامہ مذکورہ کتاب کے صفحہ ۲۹ پر بلفظہٖ مرقوم ہے۔

اختلاف کا اظہار فرمایا۔"

جدید تحقیق کے بعد حضرت والاؒ "نماز میں آلہ مکبرالصوت کے استعمال پر احقر کی آخری رائے" کے تحت تحریر فرماتے ہیں کہ

"اس مسئلے دو جزء ہیں، ایک یہ کہ نماز میں آلہ مکبرالصوت کا استعمال کیسا ہے؟ اس کا جواب اسی رسالے میں اُوپر لکھ چکا ہوں کہ اس کے مفاسد اس کی مصلحت سے بہت زیادہ ہیں اِثْمُھُمَآ اَکْبَرُ مِنْ نَّفْعِھِمَا کا مصداق ہے۔ اس کے استعمال پر پانچ مفاسد شدیدہ کی تفصیل گزر چکی ہے۔ اس لیے نماز میں اس سے اجتناب کرنا چاہیے اور ترک و منع ہی کا فتوٰی دینا چاہیے۔ دوسرا جزء یہ ہے کہ اگر کسی نے کسی ضرورت یا مجبوری سے یا اپنی رائے سے اس آلے کی آواز پر نماز پڑھلی تو اس کی نماز ہو گئی یا فاسد واجب الاعادہ ہے؟ اس معاملے میں کافی غور و تفتیش و تحقیق اور علماء سے مراسلت و مراجعت کے بعد رائے احقر کی یہ ہے کہ نماز فاسد نہیں ہوتی۔ اعادہ لازم نہیں۔"

اس کے بعد حضرت مفتی صاحبؒ نے اس کے وجوہ بیان فرمائے ہیں۔

نیز حضرت مفتی صاحبؒ نے ۱۹۵۰ء میں مولانا مودودی صاحب اور جماعت اسلامی پر فقہی اظہار خیال فرمایا اور ان کے متعلق اس سے قبل کی تمام تحریرات کو، جو اس کے موافق نہیں، منسوخ قرار دیا اور ان سے رجوع فرمایا۔ لکھتے ہیں کہ

"میری سابقہ تحریرات اگر اس تازہ تحریر کے موافق ہوں تو فبہا اور اگر سابقہ تحریرات میں کوئی چیز اس کے خلاف محسوس ہو تو اسے منسوخ سمجھا جائے۔ اور اب میری رائے کے حوالے کے لیے صرف ذیل کی تحریر پر اعتماد کیا جائے!"

(نوٹ :۔ اس کے بعد فاضل مقالہ نگار نے حضرتؒ کی فقہی تصانیف کا مختصر تعارف درج کیا تھا، لیکن چونکہ ان تصانیف کا تذکرہ حضرت مولانا محمد اشرف خان صاحب کے مقالے "حکیم الامتؒ کے علمی جانشین"، مولانا عبدالشکور ترمذی صاحب کے مقالے "مفتی اعظم کی تفسیری خدمات" اور مدیر البلاغ کے مضمون "میرے والدؒ، میرے شیخؒ" میں تفصیل سے آچکا ہے، اس لیے اس حصے کو حذف کیا جاتا ہے!)

مولانا مفتی جمیل احمد صاحب تھانوی

حضرتؒ کا فقہی مقام

الحمد للہ وکفیٰ وسلام علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ اما بعد

۱۳۶۲ھ میں جب حضرت حکیم الامت مجدد الملۃ مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانویؒ کی وفات ہوئی تو مولانا عبدالکریم صاحب سابق مفتی خانقاہ اشرفیہ مولانا شبیر علی صاحب مہتمم احقر اور بعض حاضرباش اہل خانقاہ میں یہ ذکر ہوا کہ جو خلائے عظیم ہو گیا ہے کل نہیں تو کچھ تو اس کے پُر کرنے کی تدبیر ہونی چاہیئے۔ احقر نے عرض کیا کہ خانقاہ اشرفیہ میں چار کام انتہائی پیمانہ پر ہوتے ہیں ۱ تربیت و اصلاح ۲ فتاویٰ ۳ تصانیف ۴ وعظ و ملفوظات ان چاروں کے ذرا اعلیٰ پیمانہ پر انجام دینے کے لیے ماہر دو ہی بزرگ سمجھ میں آتے ہیں حضرت مولانا ظفر احمد صاحب اور حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب۔ حضرت مولانا ظفر احمد صاحب کا قیام بعض موانع کی وجہ سے دشوار ہے حضرت مفتی صاحب پر زور دیا جائے کہ قیام فرمائیں تو یہ چاروں کام اسی شان کے قریب کے ہو سکتے ہیں یہ بات سب نے پسند فرمائی اور چونکہ مفتی صاحب کے تشریف لانے کی خبر تھی سخت انتظار ہونے لگا۔ تشریف لائے تو سب نے یہ پیش کش کی یعنی سب کا اتفاق تھا کہ ان چاروں شعبوں میں شیخ کا جانشین یہی ایک ہستی ہے مگر مفتی صاحبؒ ایک شرط سے اسے منظور کیا کہ والدہ صاحبہ دیوبند چھوڑنے کی اجازت

ویں پھر اجازت نہ ملنے سے یہ کام رہ گیا۔ پانچویں ایک کام کی اور تجویز تھی جو وقتاً فوقتاً حضرت کے یہاں ہوتا رہا ہے کہ پورے ملک میں جو کوئی بات کسی اخبار رسالہ پمفلٹ اشتہار میں اسلام مذہب یا مسلک کے خلاف شائع ہو فوراً اس کی تحقیق یہاں سے شائع کر دی جائے۔ مگر سب کام رہ گیا گو خود برابر یہ کام انجام دیتے رہے - ہندوستان ہے یا پاکستان، چھٹی بات ہر فن کی مشکل سے مشکل کتابوں کا درس اور پھر دار العلوم دیوبند کا درس تھا۔

۲ - ۰ ۵ھ میں احقر نے خانقاہ شریف میں افتاء کا کام شروع کیا تھا، ایک دفعہ تشریف آوری پر فرمایا مجھے تمہارے متعلق دوبار تعجب ہوا ایک اس پر کہ خانقاہ شریف کے فتاویٰ کا کام جو تمام ملک میں فتاویٰ کا ہیڈکوارٹر ہے حضرت نے ایک ایسے شخص کے متعلق کیسے کر دیا جس نے گو عرصہ تک مدرسی کی ہے مگر یہ کام کبھی نہیں کیا تھا لیکن حضرت اقدس کی تجویز تھی خاموش رہا۔ دوسری بار اس پر تعجب ہوا کہ کبھی یہ کام نہ کرنے کے باوجود تم نے اس خیال سے اسے کیونکر انجام دیا مفتیوں میں ایک کا فتویٰ دوسرے کے پاس آ جاتا ہی رہتا ہے جب دیکھا تو بہت تعجب ہوا۔

(۳) "احکام القرآن" یعنی قرآن شریف سے حنفی مسائل کا اثبات حضرت قدس سرہٗ نے تجویز فرمایا تھا حضرت مولانا ظفر احمد صاحب نے اس کو شروع کیا پھر ڈھاکہ قیام کر لینے سے وہ رہ گیا تو حضرت اقدس نے اس کی تقسیم یہ کر دی منزل ۱و۲ حضرت مولانا ظفر احمد کی منزل ۳و۴ احقر کے متعلق منزل ۵و۶ حضرت مفتی محمد شفیع صاحب کے اور منزل ۷ حضرت مولانا محمد ادریس صاحب کے متعلق فرما دی۔ بیماری کے زمانہ میں حضرت مفتی صاحب حضرت اقدس کی خدمت میں آئے تو بعض اور مسائل عقائد و آداب کے متعلق بھی پیش کئے تو فرمایا جو مسئلہ بھی جس آیت سے نکل سکے لکھا جاتے۔ احقر کو حضرت کی بیماری میں فرصت کم کم ہوتی تھی خود حضرت اقدس نے بھی کچھ آیات سے ماخوذ مسائل کے اشارے لکھوائے تھے اور صرف فقہی مسائل پر لکھنا شروع کیا تھا بعد وفات فرصت زیادہ ملی تو جدید ارشاد پر ہر قسم کے مسائل لکھنے شروع کر دیئے۔ حضرت مفتی صاحب ایک دفعہ تشریف لائے تو مولانا شبیر علی صاحب نے میرا مسودہ دیکھنے کے لیے فرمایا، دیکھا اور فرمایا کتاب کا حق تو یہی ہے جیسے تم نے لکھا ہے مگر اور سب نے فقط فقہی مسائل لیے ہوئے میں بڑا فرق پڑ جائیگا تم بھی صرف فقہی مسائل لکھو۔ تو میں نے دوسرے مسائل مسودہ میں سے کاٹ دیئے اور آئندہ صرف فقہی لکھنے شروع کئے ایک منزل ۳ پوری ہوئی تھی کہ آنکھوں میں موتیا اتر آیا اور وہ کتاب رہ گئی وہ منزل بھی طبع نہیں ہو سکی منزل نمبر ۱، ۲، ۵، ۶، ۷، طبع ہو کر شائع ہو گئیں۔

(۴) اسی درمیان میں ایکدن فرمایا کہ بیس سال سے عالم دین پیدا ہوتے بند ہو گئے ہیں لیڈر مقرر واعظ

مضمون نگار پیدا ہو رہے ہیں عالم دین نہیں ملتا۔ خیال ہوتا ہے کہ ہم لوگ جو محنت کر رہے ہیں یعنی احکام القرآن عربی میں لکھ رہے ہیں آئندہ زمانوں میں اس کے سمجھ سکنے والے بھی ہوں گے یا نہیں۔ اب کہ اس واقعہ کو تیس سال سے زائد ہو گئے ہیں گویا پچاس سال سے عالم دین پیدا ہونا بند ہو گیا بڑی حیرت اور افسوس کا مقام ہے کہ اب اسلام کی کس مپرسی اور مسلمانوں کے اسلام سے دیوالیہ ہونے کا کیا علاج ہوگا۔ حضرت مفتی صاحب کا اندازہ حرف حرف پورا ہوتا نظر آرہا ہے۔ کم علموں یا دوسرے ماحول کے لوگوں نے اسلام و اسلامیات کی تحریف کا بیڑا اٹھا رکھا ہے اور بچے کچھے علماء دین فرہنی کس مپرسی میں رہ گئے۔

(۵) آنکھوں میں موتیا اور اپریشن کے بعد میری طبیعت پر بہت اثر رہا کہ سارا کام آنکھوں سے ہی تھا اب کیا کروں گا سوچ سوچ کر یہ طے کیا کہ اب علمی لائن کو خیرباد کہوں اور کوئی کام گذر اوقات کے لیے اور تجویز کروں احادیث میں تاجر صادق کا بڑا درجہ پڑھا تھا تجارت کا خیال جم گیا مگر سرمایہ نہ ہونے سے یہ خیال عملی صورت نہ اختیار کر سکا تو شکر کے ڈپو کی درخواست دی۔ ابھی صرف درخواست ہی دی تھی کہ حضرت مفتی صاحب پھر تھانہ بھون تشریف لائے باتوں میں اس کا ذکر ہوا بڑے دردانگیز لہجے میں فرمایا کہ نہیں نہیں ہرگز یہ لائن نہ چھوڑنا عرض کیا کہ مطالعہ کے قابل نہیں رہا حافظہ کام کا نہیں اس لیے مجبوری ہے فرمایا نہیں جو سبق بلا مطالعہ پڑھا سکتے ہو صرف وہی پڑھا لیا کرو آخر نور الایضاح تو پڑھا لوگے مگر یہ کام ہرگز نہ چھوڑنا۔ صاحب نسبت بزرگوں کی بات دل میں اتر جایا کرتی ہے وہ رائے بدل لی اور پھر مظاہر العلوم جا کر اسباق کا کام لے لیا اب معلوم ہوتا ہے اگر اس وقت حضرت مفتی صاحب دستگیری نہ کرتے تو خدا جانے کس قعر مذلت میں پہنچ گیا ہوتا رونگٹے رونگٹے سے ان کے لیے دعائیں نکلتی ہیں۔

(۶) ایک دفعہ تھانہ بھون کے قیام کے زمانہ میں فرمایا کہ پھلوں کے بیچ پر تم ایک رسالہ لکھو دو میں نے عرض کیا میں کیا اور میرا لکھنا کیا یہ کام تو آپ جیسے بزرگوں کا ہے فرمایا نہیں تمہاری اس پر بہت نظر ہے عرض کیا یہ کیسے ہو سکتا ہے جو نظر آپ کی ہوگی وہ مجھ جیسے کو کہاں میسر۔ فرمایا فلاں وکیل صاحب سے تمہاری اس مسئلہ پر طویل خط و کتابت جو ہوئی ہے اس سے اندازہ ہوا عرض کیا جی ہاں مراسلت تو ہوئی مگر میں تو ان کا ہی معتقد ہو گیا مرے ہر جواب پر جو ان کی تحریر آتی تھی اس سے معلوم ہوتا تھا کہ حقہ پر ان کی نظر مجھ سے کہیں زائد ہے گو میں جس کو حق سمجھتا تھا عرض کر دیتا تھا۔ فرمایا کہ مجھ سے بھی خط و کتابت رہی وہ تمہاری بات نقل کر کے بجائے اپنے نام بھیجے اور میری تمہیں اپنے نام سے بھیجتے تھے پھر ظاہر کر دیا تھا کہ تمہاری باتیں تھیں اسی سے اندازہ ہوا ہے

(۷) بعض دفعہ کسی مسئلہ میں جواب لکھا مگر دل مطمئن نہ ہوا تو لکھدیا کہ اس فن کے ماہر ہمارے ملک کے دو بزرگ ہیں حضرت مولانا ظفر احمد صاحب اور حضرت مفتی صاحب وہاں مزید تحقیق کریں اور جو جواب آئے اسے حق سمجھیں اور مجھے بھی مطلع کر دیں کئی بار ایسا ہوا مگر اب کیا کروں حیران و پریشان ہوں حضرت مفتی صاحب کی وفات سے اصل تو اس کام میں لگے ہونے کا شدید نقصان ہو رہا ہے اس کی کوئی تلافی نظر نہیں آتی۔ عام لوگوں کو تو مسئلے بتانے والے بہت سے مفتی اور علماء موجود ہیں مگر خود ان کی مشکلات کا حل کون کرے اللہ تعالیٰ ہی بدل عطا فرما سکتے ہیں۔

(۸) ایک دفعہ ایک عورت کا خط تھانہ بھون میں آیا اپنی مشکل کے حل کا مسئلہ پوچھا میری سمجھ میں حل نہ آیا حضرت قدس سرہٗ حیات تھے عرض کیا، فرمایا ہاں ہے بہت پیچیدہ اسے مولوی شفیع کو بھیجدو وہاں سے جواب آجائے گا ایسا ہی کیا جواب آیا پیش کیا تو بہت پسند فرمایا اور دعا دی اس وقت معلوم ہوا کہ اس فن میں حضرت مفتی صاحب کا کیا درجہ تھا۔ فن والے کا درجہ ماہر فن ہی جانتا ہے۔

(۹) عربی مدرسوں میں ہمیشہ تنخواہیں کم اور کام زیادہ ہوتا ہے خیر کام تو سب انجام دیتے ہیں مگر جن کے اہل و عیال متعلقین کافی ہوں یا ان کا ماحول بھی فراغت کی زندگی کا ہو وہ مجبور ہوتے ہیں کہ کوئی اور بھی کام ساتھ لگا لیں تاکہ تنگی ترشی سے سابقہ نہ پڑے۔ جب ہم تن ایک کام میں آدمی نہ لگا ہوگا تو ظاہر ہے کہ اس کی علمی ترقی میں کچھ خلل ضرور آئے گا میرا ذاتی تجربہ ہے کہ میں اس وجہ سے ہمعصر ساتھیوں سے پیچھے رہ گیا مگر جس قدر غور کرتا ہوں حیرت ہوتی ہے کہ حضرت مفتی صاحب تجارت کتب کی مشغولی کے ساتھ علم و فضل میں ہمعصروں سے کیسے سبقت لے گئے اللہ تعالیٰ نے ان کے اوقات اور دل و دماغ میں عجیب برکت عطا فرمائی تھی کہ دونوں کام نہایت عمدہ پیمانہ پر ساری عمر کرگئے۔ ایں سعادت بزور بازو نیست ۔ تا نہ بخشد خدائے بخشندہ۔ پھر اس علم و فضل کے ساتھ باطن میں بھی اعلیٰ درجہ پر فائز تھے یہ ایک زندہ کرامت کے سوا اور کیا کہی جا سکتی ہے۔

(۱۰) علم دین کے موقوف علیہ اور معین و مددگار علوم و فنون اور پھر درس وعظ تصنیف و تالیف وغیرہ سب علمائے دین حسب قوت و ہمت کرتے رہتے ہیں مگر بعض کو کسی سے ایک طبعی لگاؤ ہوتا اور وہ اس فن میں جلد اور سب سے فوق ترقی کر جاتا ہے۔

دارالعلوم دیوبند جو ایشیا بلکہ کل دنیا میں دین و علم کا مرجع ہے اس کے فتاویٰ کا کام معمولی کام نہیں مگر حضرت والا کی طبعی مناسبت نے افتا میں بہت جلد اور انتہائی درجہ حاصل کر لیا کہ بعض آپ کے ساتھی بلکہ بعض پہلے کے معین مفتی معین ہی رہ گئے تکمیل کو نہ پہنچ سکے۔ بلکہ اگر ارباب دارالعلوم برا نہ مانیں تو صحیح بات

یہی ہے ۔ کہ حضرت مفتی صاحب کے بعد دارالعلوم کے شعبۂ افتاء میں جو خلا اور انحطاط ہوا تھا وہ آجتک جیسا کہ چاہیئے تھا پورا نہ ہو سکا ۔ چونکہ مفتیوں کے ساتھ ایک دوسرے کے جوابات سائلین بھیجتے رہتے ہیں یہ حالات کام کرنے والوں کو ہی معلوم ہوتے ہیں ۔ یہ دولت پاکستان کے حصّے میں آگئی تھی اور عوام نے بالکل بجا لقب "مفتی اعظم" دیا تھا اب پاکستان بھی اس سے محروم ہوگیا ۔ اللہ تعالیٰ کو بڑی قدرت ہے وہ پھر کوئی ایسا پیدا کرسکتے ہیں ۔

(۱۱) باطن کے علاج کا پتہ تو اسی درجہ کے بزرگوں کو ہو سکتا ہے " ولی را ولی می شناسد " لیکن ہمارے پاس ایک معیار آسان ترین یہ ہے کہ مُسلّم بزرگوں نے ان کو کیا درجہ دیا تو حضرت تھانوی قدس سرہٗ کا خلعت خلافت سے نوازدینا سب سے بڑی شہادت ہے اور خلفاء میں سے اس انتخاب میں ان کا آجانا جن کو اصلاح کے لیے منتخب کرکے اعلان فرمایا تھا سونے پر سہاگہ ہے اسی سے درجہ کا اندازہ کیا جاسکتا ہے ۔

(۱۲) شعر کہنا کوئی علم اور فضیلت کی چیز نہیں صرف مشاقی ہے مگر اُردو فارسی اور بلیغ عربی کی نظمیں بھی وقتاً وقتاً آپکے قلم سے نکلی ہوئی ہیں جو قواعد و ماعیہ کے اعلیٰ سطح پر ہونیکی دلیل ہے اور شعر کے شوقین طبقہ کی اصلاح بھی ہے دینا کہ بتانا ہے کہ شعر صحیح و نیک کیا ہے غلط اور بد کیا ہے جیسے حدیث شریف میں ہے ۔ الشعر کلام حسنہ حسن و قبیحہ قبیح (شعر ایک کلام ہے اس کا نیک اچھا ہے اور بد برا ہے) بد اشعار کی برائیاں حدیث و قرآن میں موجود ہیں اور نیک کی بھلائی بھی ہے حضرات صحابہ کے اشعار کلام الملوک کتاب میں سب جمع ہیں ۔ اس کی ضرورت اس لیے اور بھی زیادہ ہے کہ بعض شاعر خصوصاً اُردو کے بہت شاعر بڑی سخت سخت کفریات اور غلطیوں میں مبتلا ہوکر دنیا کو گمراہ کر رہے ہیں اور شعروں کے دلدادہ ان سے تباہ ہو رہے ہیں ۔

(۱۳) بیع صرف یعنی سونے چاندی کی باہم یا روپیہ سے فروخت کے خاص مسائل تھے نوٹ سے خرید کرنا جائز نہ تھا کہ نوٹ سکہ نہیں رسید تھی چاندی کے سکہ کی تو ادھار پیہ بیع درست نہ تھی اب کہ روپیہ چاندی کا نہیں رہا مثل رہ گیا ہے نوٹ سے خرید و فروخت بھی درست اور دوسرے ممالک کے سکوں یا نوٹوں سے خرید و فروخت اپنے سکہ کی کم و بیش بھی درست ہوئی ضروری مگر جب تک حضرت مفتی صاحب نے تصدیق نہ کرائی ظاہر کرنے کی ہمت نہ ہوتی تھی ۔ اب ایسا کوئی واقعہ پیش آتا ہے تو پریشانی کا سامنا ہوتا ہے ۔

خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را

مولانا محمد یوسف لدھیانوی
مدیر "بینات" کراچی

مفتی اعظم اور تردیدِ قادیانیت

حق تعالیٰ کی حکمت بالغہ نے اس کائنات میں خیر و شر اور حق و باطل کا سلسلہ ابتدائے تخلیق سے جاری فرمایا، اور یہی دنیا تک جاری رہے گا، اس کی ابتداء اگر ابلیس و آدم کی آویزش سے ہوئی ہے تو اس کی انتہا دجّال و مسیح پر ہوگی۔

اس سنت الٰہیہ کے مطابق جب کسی شر کی قوت نے سر اٹھایا اس کا سر کچلنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے رجال خیر کو کھڑا کر دیا، اس صدی (چودھویں صدی ہجری) کا سب سے بڑا شر، سب سے بڑا فتنہ، سب سے بڑی گمراہی اور سب سے بڑا دجل و فریب لعین بن لعین اللعین قادیان کا دعوائے نبوت و مسیحیت تھا۔ جس نے گذشتہ صدیوں کے سارے کفر و الحاد کا تعفن اپنے اندر سمیٹ لیا تھا۔

یہ فتنہ چونکہ دجل و فریب کی بیساکھیوں کے سہارے چل رہا تھا اس لیے شروع شروع میں تو بہت سے لوگ اس کی حقیقت ہی نہ سمجھے، اور جن حضرات کو اصل حقیقت تک رسائی ہوتی انہوں نے اس کو دیوانے کی بڑ اور "گند شتر" تصور کرتے ہوئے اسے لائقِ التفات ہی نہ سمجھا، ادھر انگریزی کی عیاری و مکاری، اس کی اعانت و نصرت اور تائید و حمایت نے اس فتنہ کو کم فہم انگریزی خواندہ نوجوانوں اور سرکاری ملازموں میں پہنچنے کا موقع دیا، تاآنکہ رفتہ رفتہ قادیانیت کی رگوں میں دجل و فریب کے علاوہ کبر و نخوت اور شیخی و تعلی کا خون بھی دوڑنے لگا۔ وہ ہر رلو چلتے کا بازو پکڑ کر اسے حیات مسیح پر بحث کرنے کی دعوت دینے لگے، اور انہوں نے گلی کوچوں میں مناظروں اور مباحثوں کی فضا پیدا کر دی۔ وہ ہر داڑھی والے کو دیکھ کر اس پر پھبتیاں کسنے اور اسلامی عقائد کو چیلنج کرنے لگے۔

یہ وہ صورت حال تھی جس نے امام العصر حضرت مولانا محمد انور شاہ کشمیریؒ کو پریشان کر دیا تھا۔ اور آپ کی راتوں کی نیند حرام کر دی تھی، خطرہ ہو چلا تھا کہ اگر اس ملعون فتنہ کو لگام نہ دی گئی تو یہ نہ صرف مسلمانوں کی گمراہی کا ذریعہ بن جائے گا، بلکہ دین محمدی (علی صاحبہ الصلوٰۃ والسلام) کے کم از کم ہندوستان سے خاتمہ کا سبب ہوگا۔ علمائے امت بحمد اللہ اس فتنہ کی سرکوبی پہلے سے کرتے آ رہے تھے مگر حضرت امام العصرؒ کے پیش نظر اس فتنہ کے قلع قمع کے لیے چند اہم اقدامات تھے۔

اوّل :- اس فتنہ کی ملعونیت و خباثت اس طرح اجاگر کی جائے کہ قادیانیت و مرزائیت کا لفظ بجائے خود گالی بن جائے۔ حتیٰ کہ خود قادیانی بھی اپنے آپ مرزائی، یا قادیانی کہلانا عار اور شرم کا موجب سمجھیں۔

دوم :- اہل علم کی ایک باتوفیق جماعت تیار کی جائے جو قادیانیوں کی تلبیسات کا پردہ چاک کرے، اور ان تمام علمی مباحث کو نہایت صاف اور منقح کر دے جو اسلام اور قادیانیت کے درمیان زیر بحث آتے ہیں۔

سوم :- دعوت و تبلیغ اور مباحثہ و مناظرہ کے میدان میں ایسی پیشقدمی کی جائے کہ حریف پسپا ہونے پر مجبور ہو جائے۔ اور اسے ہر گلی کوچے میں مسلمانوں کو للکارنے کی جرأت نہ ہو۔

چہارم :- ردّ قادیانیت اور تحفظ ختم نبوت مسلمانوں کا ایک مستقل مشن بن جائے۔ تاکہ جہاں کہیں قادیانیت کے طاعونی جراثیم پائے جائیں وہاں ختم نبوت کا تریاق مہیا کیا جاسکے۔

حضرت شاہ صاحب نور اللہ مرقدہٗ کے علمی تفوق اور روحانی توجہ نے پورے دارالعلوم دیوبند کو اس محاذ پر لگا دیا، آپ کے زیر اشراف جو جماعت قادیانیت کے استیصال کے لیے تیار ہوئی ان میں حضرت اقدس مفتی اعظم مولانا محمد شفیع دیوبندی قدس سرہٗ کی شخصیت بالآخر اپنے دور کی نمایاں ترین شخصیت بن گئی۔

حضرت مفتی اعظمؒ نے ردّ قادیانیت پر جو کام کیا اُسے آسانی کے لیے تین حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے

اوّل :- دعوت و تبلیغ کے ذریعہ نیز مباحثہ و مناظرہ کے میدان میں اور عدالت کے کٹہرے میں قادیانیت کا مقابلہ۔

دوم :- تصنیف و تالیف کے ذریعہ ردّ قادیانیت کی خدمت۔

تیسرے :۔ دارالعلوم دیوبند کی مسند دارالافتاء سے قادیانیوں کی دینی حیثیت کی تشخیص۔ اور ان کے شبہات کا ازالہ۔

اوّل الذکر دونوں چیزوں کا مختصر سا خاکہ خود مفتی صاحبؒ کے اس مقالہ میں آجاتا ہے، جو "حیاتِ انور" میں شامل ہے ۔ اور جو ہمارے پاس سب سے مستند ذریعہ معلومات ہے اس لیے اس مقالہ کا ضروری حصہ یہاں نقل کیا جاتا ہے۔ جس سے اس دور کے بعض اہم واقعات بھی معلوم ہونگے حضرت شاہ صاحبؒ کے ردِ قادیانیت کے لیے اہتمام اور اپنے تلامذہ کی تربیت پر روشنی پڑے گی اور حضرت مفتی صاحب رحمہ اللہ کی خدمات کا اجمالی تعارف بھی ہوگا۔ حضرت مفتی صاحب لکھتے ہیں۔

فتنۂ مرزائیت کی شدت اور اس کے بعض اسباب :۔ تقریباً ۱۳۴۴ھ کا واقعہ ہے کہ فتنۂ قادیانیت پورے ہندوستان کے اطراف وجوانب میں اور خصوصاً پنجاب میں ایک طوفانی صورت سے اٹھا۔ اس کا سبب خواہ یہ ہو کہ ۱۹۱۹ء کی جنگِ عظیم میں قادیانی مسیح کی اُمت نے مسلمانوں کے مقابلہ میں عیسائیوں (انگریزوں) کو کافی مدد بہم پہنچائی جس کا اعتراف خود قادیانیوں نے اپنے اخبارات میں کیا ہے۔ اور یہی وجہ تھی کہ جب بغداد سات سو سال کے بعد مسلمانوں کے قبضہ سے نکل کر انگریزوں کے تسلط میں داخل ہوا تو جہاں محمد مصطفٰے صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری اُمت ان کے رنج وغم میں مبتلا تھی وہیں قادیانی مرزا کی اُمت قادیان میں چراغاں کر رہی تھی۔ (الفضل قادیان)

اس جنگ میں امداد دینے اور مسلمانوں کے مقابلہ میں انگریزوں کو کامیاب بنانے کے صلہ میں انگریزوں کی حمایت (بقول مرزا صاحب) اپنے اس خود کاشتہ پودے کو زیادہ حاصل ہوگئی۔ اور اس کا یہ حوصلہ ہوگیا کہ وہ کھل کر مسلمانوں کے مقابلے میں آجائے اور ممکن ہے کہ کچھ اور بھی اسباب ہوں۔

یہ زمانہ دارالعلوم دیوبند میں میرے درس وتدریس کا ابتدائی دور تھا۔ اور میں اس بسم اللہ کے گنبد میں اپنی کتاب اور سبق پڑھانے کے سوا کچھ نہ جانتا تھا کہ دنیا میں کیا ہو رہا ہے۔

لیکن ہمارے بزرگ جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنے دین کے فروغ اور اسلام کی خدمت ہی کے لیے پیدا فرمایا تھا قادیانیت کے اس بڑھتے ہوئے طوفان سے سخت تشویش واضطراب محسوس فرمائے تھے اور تبلیغ واشاعت کے ذریعہ اس کے مقابلے کی فکر کر رہے تھے۔ بالخصوص حضرت شاہ صاحب قدس سرہٗ پر اس فتنہ کا بہت اثر تھا ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے اس فتنہ کے مقابلہ کے لیے ان کو چن لیا ہے۔

جیسا ہر زمانہ میں عادۃ اللہ یہ رہی ہے کہ ہر فتنہ کے مقابلہ کے لیے اس وقت کے علماء دین سے کسی کو منتخب کر لیا گیا اور اس کے قلب میں اس کی اہمیت ڈالدی گئی۔ فتنۂ قادیانیت کے استیصال میں حضرت ممدوح کی شبانہ روز جد وجہد اور فکر وعمل سے دیکھنے والے کو یقین ہوجاتا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے اس خدمت کے لیے آپ کو چن لیا ہے۔

مصر وعراق وغیرہ ممالک اسلامیہ میں فتنۂ قادیانیت کا انسداد

میں حسب عادت ایک روز استاذِ محترم حضرت شاہ صاحب قدس سرہٗ کی خدمت میں حاضر ہوا تو ان کی دائمی عادت کے خلاف یہ دیکھا کہ ان کے سامنے کوئی کتاب زیر مطالعہ نہیں خالی بیٹھے ہوئے ہیں اور چہرے پر فکر کے آثار نمایاں ہیں۔ میں نے عرض کیا کہ کیسا مزاج ہے؟ فرمایا کہ بھائی مزاج کو کیا پوچھتے ہو، قادیانیت کا ارتداد اور کفر کا سیلاب امڈتا نظر آتا ہے۔ صرف ہندوستان میں نہیں عراق و بغداد میں ان کا فتنہ سخت ہوتا جاتا ہے اور ہمارے علماء وعوام کو اس طرف توجہ نہیں۔ ہم نے اس کے مقابلہ کے لیے جمعیۃ علماء ہند میں یہ تجویز پاس کرائی تھی کہ دس رسالے مختلف موضوعات متعلقہ قادیانیت پر عربی زبان میں لکھے جائیں اور ان کو طبع کرا کر ان بلاد اسلامیہ میں بھیجا جائے مگر اب کوئی کام کرنے والا نہیں ملتا۔ اس کام کی اہمیت لوگوں کے خیال میں نہیں میں نے عرض کیا کہ اپنی استعداد پر تو بھروسہ نہیں، لیکن حکم ہو تو کچھ لکھ کر پیش کردوں۔ ملاحظہ کے بعد کچھ مفید معلوم ہو تو شائع کیا جائے۔ ورنہ بیکار ہونا ظاہر ہی ہے۔

ارشاد ہوا کہ مسئلہ ختم نبوت پر لکھو۔ احقر نے استاذِ محترم کی تعمیل ارشاد کو سرمایۂ سعادت سمجھ کر چند روز میں تقریباً ایک سو صفحات کا ایک رسالہ عربی زبان میں لکھ کر آپ کی خدمت میں پیش کیا۔ حضرت ممدوح رسالہ دیکھتے جاتے تھے اور بار بار دعائیہ کلمات زبان پر تھے۔ مجھے کوئی تصور نہ تھا کہ اس ناچیز خدمت کی اتنی قدر افزائی کی جائے گی پھر خود ہی حضرت ممدوح نے اس رسالہ کا نام ”ھدیۃ المھدیین فی آیۃ خاتم النبیین“ تجویز فرما کر اس کے آخر میں ایک صفحہ بطور تقریظ تحریر فرمایا۔ اور اپنے اہتمام سے اس کو طبع کرایا، مصر، شام، عراق، مختلف مقامات پر اس کے نسخے روانہ کیے۔

خاص قادیان میں پہونچ کر اعلان حق اور ردِ مرزائیت

اسی زمانہ میں حضرت ممدوح کے ایماء پر امرتسر و پٹیالہ ولدھیانہ کے چند علماء نے یہ تجویز کیا کہ اس فتنہ کے استیصال کے لیے خاص قادیان میں ایک تبلیغی جلسہ سالانہ منعقد کیا جائے تاکہ قضیۂ زمین برسر زمین طے ہوسکے۔

یہ عوام کو فریب میں ڈالنے والے مناظرے اور مباہلے کے چیلنج جو اکثر اس فرقہ کی طرف سے چھپتے رہتے ہیں ان کی حقیقت لوگوں پر واضح ہو جاتے۔ چنانچہ چند سال مسلسل یہ جلسے قادیان میں ہوتے تھے اور حضرت ممدوح اکثر بذاتِ خود ایک جماعت علماء دیوبند کے ساتھ اس میں شرکت فرماتے تھے۔ احقر ناکارہ بھی اکثر ان میں حاضر رہا ہے۔

قادیانی گروہ نے اپنے آقاؤں (انگریزوں) کے ذریعہ ہر طرح اس کی کوشش کی کہ یہ جلسے قادیان میں نہ ہو سکیں۔ لیکن کوئی قانونی وجہ نہ تھی جس سے جلسے روک دیئے جاویں کیونکہ ان جلسوں میں عالمانہ بیانات تہذیب و متانت کے ساتھ ہوتے اور کسی نقصِ امن کے خطرہ کو موقع نہ دیتے تھے۔ جب قادیانی گروہ اس میں کامیاب نہ ہوا تو خود تشدد پہ اُتر آیا۔ حضرت شاہ صاحب قدس سرہٗ اور ان کے رفقاء کو قادیان جانے سے پہلے اکثر ایسے خطوط گمنام ملا کرتے تھے کہ اگر قادیان میں قدم رکھا تو زندہ واپس نہ جا سکو گے۔ اور یہ صرف دھمکی ہی نہ تھی۔ بلکہ عملاً بھی اکثر اس قسم کی حرکتیں ہوتی تھیں کہ باہر سے جانے والے علماء و مسلمانوں پر حملے کئے جاتے تھے ایک مرتبہ آگ بھی لگائی گئی۔

لیکن حق کا چراغ کبھی پھونکوں سے بجھایا نہیں گیا اُس وقت بھی اُن کے اخلاق باختہ پر حملے مسلمانوں کو ان جلسوں سے نہ روک سکے۔

مرزائیت میں تصانیف کا سلسلہ: ایک مرتبہ کا واقعہ ہے کہ ہم چند خدام جلسۂ قادیان میں حضرت ممدوح کے ساتھ حاضر تھے۔ صبح کی نماز کے بعد حضرت شاہ صاحب قدس سرہٗ نے اپنے مخصوص تلامذہ حاضرین کو خطاب کر کے فرمایا کہ زمانہ کو الحاد کے فتنوں نے گھیر لیا اور قادیانی دجّال کا فتنہ ان سب میں زیادہ شدت اختیار کرتا جاتا ہے۔ اب ہمیں افسوس ہوتا ہے کہ ہم نے اپنی عمر و توانائی کا بڑا حصہ اور درس حدیث کا اہم موضوع حنفیت و شافعیت کو بنائے رکھا۔ ملحدین زمانہ کے وساوس کی طرف توجہ نہ دی۔ حالانکہ ان کا فتنہ مسئلہ حنفیت و شافعیت سے کہیں زیادہ اہم تھا۔ اب قادیانی فتنہ کی شدت نے ہمیں اس طرف متوجہ کیا تو میں نے اس کے متعلقہ مسائل کا کچھ مواد جمع کیا ہے اگر اس کو میں خود تصنیف کی صورت سے مدون کروں تو میرا طرز ایک خالص علمی اصطلاحی رنگ ہے اور زمانہ قحط الرجال کا ہے اس قسم کی تحریر کو نہ صرف یہ کہ پسند نہیں کیا جاتا، بلکہ اس کا فائدہ بھی بہت محدود رہ جاتا ہے۔ میں نے مسئلہ قراۃ فاتحہ خلف الامام پر ایک رسالہ "فصل الخطاب" بزبان عربی تحریر کیا۔ اہل علم اور طلباء میں عموماً مفت تقسیم

کیا لیکن اکثر لوگوں کو یہی شکایت کرتے سُنا کہ پوری طرح سمجھ میں نہیں آتا۔ اس لیے اگر آپ لوگ کچھ ہمت کریں تو یہ مواد میں آپ کو دے دوں۔ اس وقت حاضرین میں چار آدمی تھے۔ احقر ناکارہ اور حضرت مولانا سید مرتضیٰ حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ سابق ناظم شعبہ تعلیم و تبلیغ دارالعلوم دیوبند اور حضرت مولانا بدرعالم صاحب سابق مدرس دارالعلوم دیوبند و جامعہ اسلامیہ ڈابھیل سورت و دارالعلوم ٹنڈو الہیار سندھ و حال مہاجر مدینہ طیبہ اور حضرت مولانا محمد ادریس صاحب سابق مدرس دارالعلوم دیوبند و شیخ الجامعہ بہاولپور و حال شیخ الحدیث جامعہ اشرفیہ لاہور ادام اللہ تعالیٰ فیوضہم۔ ہم چاروں نے عرض کیا کہ جو حکم ہو ہم امتثال امر کو سعادت کبریٰ سمجھتے ہیں۔

اسی وقت فرمایا کہ اس فتنہ کے استیصال کے لیے علمی طور پر تین کام کرنے ہیں اوّل مسئلہ ختم نبوت پر ایک محققانہ مکمل تصنیف جس میں مرزائیوں کے شبہات و اوہام کا ازالہ بھی ہو۔

دوسرے حیات عیسیٰ علیہ السلام کے مسئلہ کی مکمل تحقیق قرآن و حدیث اور آثار سلف سے مع ازالہ شبہات ملحدین۔

تیسرے خود مرزا کی زندگی، اس کے گرے ہوئے اخلاق اور متعارض و متہافت اقوال اور انبیاء و اولیاء و علماء کی شان میں اس کی گستاخیاں اور گندی گالیاں، اس کا دعوےٰ نبوت و وحی اور متضاد قسم کے دعوے۔ ان سب چیزوں کو نہایت احتیاط کے ساتھ اس کی کتابوں سے مع حوالہ جمع کرنا جس سے مسلمانوں کو اس فرقہ کی حقیقت معلوم ہو اور اصل یہ ہے کہ اس فتنہ کی مدافعت کے لیے یہی چیز اہم اور کافی ہے مگر چونکہ مرزائیوں نے مسلمانوں کو فریب میں ڈالنے کے لیے خواہ مخواہ کچھ علمی مسائل میں علم کو الجھا دیا ہے اس لیے ان سے بھی اغماض نہیں کیا جا سکتا۔ پھر فرمایا کہ مسئلہ ختم نبوت کے متعلق تو یہ صاحب (احقر کی طرف اشارہ کر کے فرمایا) ایک جامع رسالہ عربی زبان میں لکھ چکے ہیں اور اُردو میں لکھ رہے ہیں اور آخر الذکر معاملہ کے متعلق مواد فراہم کر کے مدون کرنے کا سب سے بہتر کام حضرت مولانا سید مرتضیٰ حسن صاحب (رحمۃ اللہ علیہ) کر سکیں گے کہ اس معاملہ میں ان کی معلومات بھی کافی ہیں اور مرزائی کتابوں کا پورا ذخیرہ بھی ان کے پاس ہے وہ اس کام کو اپنے ذمہ لے کر جلد سے جلد پورا کریں۔

اب مسئلہ رفع حیات عیسیٰ علیہ السلام رہ جاتا ہے اس کے متعلق میرے پاس کافی مواد جمع ہے آپ تینوں صاحب دیوبند پہنچ کر مجھ سے لے لیں اور اپنی اپنی طرز پر لکھیں۔

یہ مجلس ختم ہوگئی مگر حضرت شاہ صاحب قدس سرہٗ کے قلبی تاثرات اپنا ایک گہرا نقش ہمارے دلوں پر چھوڑ گئے۔ دیوبند واپس آتے ہی ہم تینوں حضرت شاہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے اور مسئلہ حیات عیسیٰ سے متعلقہ مواد حاصل کیا۔

حضرت مولانا بدر عالم صاحب دامت برکاتہم نے اِنِّی مُتَوَفِّیْکَ وَرَافِعُکَ اِلَیَّ کی تفسیر سے متعلقہ مواد لے کر اس پر ایک مستقل رسالہ اُردو میں بنام الجواب الفصیح حیات المسیح تحریر فرمایا جو علمی رنگ میں لاجواب سمجھا گیا اور حضرت شاہ صاحب قدس سرہٗ نے پسند فرما کر اس پر تقریظ تحریر فرمائی یہ رسالہ ۱۳۴۲ھ میں شعبہ تبلیغ دارالعلوم دیوبند سے شائع ہوا۔

حضرت مولانا محمد ادریس صاحب دامت فیوضہم نے اپنے مخصوص انداز میں اسی مسئلہ پر اُردو زبان میں ایک جامع اور محققانہ رسالہ بنام کلمۃ اللہ فی حیوٰۃ روح اللہ تصنیف فرما کر حضرت شاہ صاحب قدس سرہٗ کی خدمت میں پیش کیا۔ حضرت ممدوح نے بے حد پسند فرما کر تقریظ تحریر فرمائی اور ۱۳۴۲ھ میں دارالعلوم دیوبند سے شائع ہو کر مقبول و مفید خلائق ہوا۔

احقر ناکارہ کے متعلق یہ خدمت کی گئی کہ جتنی مستند و معتبر روایات حدیث حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی حیات یا نزول فی آخر الزمان کے متعلق وارد ہوئی ہیں ان سب کو ایک رسالہ میں جمع کر دے۔ احقر نے تعمیل حکم کے لیے رسالہ التصریح بما تواتر فی نزول المسیح بزبان عربی لکھا اور حضرت ممدوح کی بے حد پسندیدگی کے بعد اسی سال شائع ہوا۔

اس کے بعد حسب ارشاد ممدوح مسئلہ ختم نبوت پر ایک مستقل کتاب اُردو زبان میں تین حصوں میں لکھی:-

پہلا حصہ ختم النبوۃ فی القرآن جس میں ایک سو آیات قرآنی سے اس مسئلہ کا مکمل ثبوت اور ملحدوں کے شبہات کا جواب لکھا گیا ہے

دوسرا ختم النبوۃ فی الحدیث جس میں دو سو دس احادیث معتبرہ سے اس مضمون کا ثبوت اور منکرین کا جواب پیش کیا گیا ہے۔

تیسرا ختم النبوۃ فی الآثار جس میں سینکڑوں اقوال صحابہ و تابعین اور ائمہ دین اس کے ثبوت اور منکرین اور ان کی تاویلات باطلہ پر رد کے متعلق نہایت صاف و صریح نقل کئے گئے ہیں یہ تینوں رسالے

پہلی مرتبہ ۱۳۴۳ھ سے ۱۳۴۵ھ تک شائع ہوئے۔ اسی کے ساتھ مختصر رسالہ دعاوی مرزا اور مسیح موعود کی پہچان اُردو زبان میں احقر نے لکھ کر پیش کیے۔ ان رسائل کا جو کچھ نفع مسلمانوں کی اصلاح وہدایت اور ملحدین منکرین پر اتمام حجت کے سلسلہ میں ہوا یا ہوگا اس کا علم تو اللہ ہی کو ہے مجھے تو اپنی محنت کا نقد صلہ حضرت شاہ صاحب قدس سرہٗ کی مسرت وخوشنودی اور بے شمار دعاؤں سے اسی وقت مل گیا اور جوں جوں ان رسائل کی اشاعت سے مسلمانوں کی ہدایت بلکہ بہت سے قادیانی خاندانوں کی توبہ ورجوع الی الاسلام کے متعلق حضرت کو معلوم ہوئے اسی طرح اظہار مسرت اور دعا کے الفاظ سے نوازا۔

مخدومنا حضرت مولانا سید مرتضیٰ حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ جو عمر اور طبقہ کے اعتبار سے حضرت شاہ صاحب قدس سرہٗ سے مقدم تھے لیکن حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے محیر العقول علم کے بے حد معتقد اور آپ کے ساتھ معاملہ بزرگوں کا سا کرتے تھے جو خدمت اس سلسلہ کی ان کے سپرد فرمائی تھی اس کو آپ نے بڑی سعی بلیغ کے ساتھ انجام دینا شروع کیا اور مرزا قادیانی کی پوری زندگی اس کے اخلاق و اعمال اور عقائد و خیالات، دعوائے نبوت و رسالت اور تکفیر عام اہلِ اسلام، گستاخی در شان انبیاء و اولیاء کو مرزا کی اپنی کتابوں سے بحوالہ صفحہ سطر نہایت انصاف اور احتیاط کے ساتھ نقل کر کے بہت سے رسائل تصنیف فرمائے اور حضرت شاہ صاحب قدس سرہٗ کے سامنے پیش فرما کر ان کی مراد پوری فرمائی ان رسائل میں سے چند کے نام حسب ذیل ہیں۔

قادیان میں قیامت خیز بھونچال۔ اشد العذاب علی مسیلمۃ البنجاب۔ فتح قادیان۔ مرزائیوں کی تمام جماعت کو چیلنج۔ مرزائیت کا خاتمہ۔ مرزائیت کا جنازہ بے گور و کفن۔ ہندوستان کے تمام مرزائیوں کو چیلنج۔ مرزا اور مرزائیوں کو دربار نبوت سے چیلنج۔ یہ سب رسائل ۱۳۴۲ھ سے ۱۳۴۴ھ تک شائع ہوئے۔

فیروز پور پنجاب میں تاریخی مناظرہ اسی زمانہ میں چھاؤنی فیروز پور پنجاب میں قادیانیوں کا ایک خاصا جتھا جمع ہوگیا تھا۔ یہ لوگ وہاں کے مسلمانوں سے چھیڑ چھاڑ کرتے رہتے تھے اور اپنے دستور کے موافق عوام مسلمانوں کو مناظرہ مباحثہ کا یہ چیلنج کیا کرتے اور جب کسی عالم سے مقابلہ کی نوبت آتی تو راہ گریز اختیار کرتے اسی زمانہ میں ضلع سہارنپور کے بسنے والے کچھ مسلمان جو فیروز پور میں بسلسلۂ ملازمت مقیم تھے ان لوگوں نے روز روز کی جھک جھک کو ختم کرنے کے لیے خود قادیانیوں کو دعوت مناظرہ دیدی۔

قادیانیوں نے سادہ لوح عوام سے معاملہ دیکھ کر بڑی دلیری اور چالاکی کے ساتھ دعوت مناظرہ قبول

کرنے بجائے اس کے کہ مناظرہ کرنے والے علماء سے شرائط مناظرہ طے کرتے انھیں عوام سے ایسی شرائط مناظرہ پر دستخط لے لیے جن کی رو سے فتح بہر حال قادیانی گروہ کی ہو۔ اور اہلِ اسلام کو مقررہ شرائط کی پابندی کی وجہ سے ہر قدم پر مشکلات درپیش ہوں۔

ان عوام مسلمین نے مناظرہ اور شرائط مناظرہ طے کرنے کے بعد دارالعلوم دیوبند سے چند علماء کو دعوت دی جو قادیانیوں سے مناظرہ کریں۔

مہتمم دارالعلوم حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے مشورہ سے اس کام کے لیے حضرت مولانا سید مرتضیٰ حسن صاحبؒ۔ حضرت مولانا بدر عالم صاحب حضرت مولانا محمد ادریس صاحب اور احقر تجویز ہوئے۔ ادھر قادیانیوں نے یہ دیکھ کر کہ ہم نے اپنی من مانی شرائط میں مسلم مناظرین کو جکڑ لیا ہے اپنی قوت محسوس کی اور قادیان کی پوری طاقت فیروز پور میں لا ڈالی۔ ان کے سب سے بڑے عالم اس وقت سرور شاہ کشمیری اور سب سے بڑے مناظر حافظ روشن علی اور عبدالرحمٰن مصری وغیرہ تھے یہ سب اس مناظرہ کے لیے فیروز پور پہنچ گئے۔

ہم چار افراد حسب الحکم دیوبند سے فیروز پور پہنچے تو یہاں پہنچ کر چھپا ہوا پروگرام مناظرہ اور شرائط مناظرہ کا نظر سے گذرا۔ شرائط مناظرہ پر نظر ڈالی تو معلوم ہوا کہ ان میں ہر حیثیت سے قادیانی گروہ کے لیے آسانیاں اور اہلِ اسلام کے لیے ہر طرح کی بے جا پابندیاں عوام نے اپنی ناواقفیت کی بنا پر تسلیم کی ہوئی ہیں اب ہمارے لیے دو ہی راستے تھے کہ یا ان مسلمہ فریقین شرائط مناظرہ کے ماتحت مناظرہ کریں جو ہر حیثیت سے ہمارے لیے مضر تھیں یا پھر مناظرہ سے انکار کر دیں کہ ہم ان شرائط کے ذمہ دار نہیں ہو سکتے جو بغیر ہماری شرکت کے طے کر لی گئی ہیں۔ لیکن دوسری شق پر مقامی مسلمانوں کی بڑی خفت اور سبکی تھی اور قادیانیوں کو اس پروپیگنڈے کا موقع ملتا کہ علماء نے مناظرہ سے فرار کیا اس لیے ہم سب نے مشورہ کر کے مناظرہ کرنے کا تو فیصلہ کر لیا اور بذریعہ تار صورت حال کی اطلاع حضرت شاہ صاحب قدس سرہٗ کو دے دی۔

اگلے روز مقررہ وقت پر مناظرہ شروع ہو گیا۔ ابھی شروع ہی تھا عین مجلسِ مناظرہ میں نظر پڑی کہ حضرت شاہ صاحب اور حضرت مولانا شبیر احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہما مع چند دیگر علماء کے تشریف لا رہے ہیں۔ ان کی آمد پر ہم نے کچھ دیر کے لیے مجلسِ مناظرہ ملتوی کی اور ان حضرات کو صورتِ حال بتلائی حضرت شاہ صاحب قدس سرہٗ نے فرمایا کہ جائیے ان لوگوں سے کہہ دیجیے کہ تم نے جتنی شرطیں اپنی پسند کے موافق

عوام سے ملے کرائی ہیں اتنی ہی اور لگالو ہماری طرف سے کوئی شرط نہیں۔ تم چوروں کی طرح عام ناواقف مسلمانوں کے دین و ایمان پر ڈاکہ ڈالنے کے عادی ہو۔ کسی شرط اور کسی طریق پر ایک مرتبہ سامنے آکر اپنے دلائل بیان کرو اور ہمارا جواب سنو پھر خدا کی قدرت کا تماشہ دیکھو۔

حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے ارشاد کے موافق اسی کا اعلان کر دیا گیا اور مناظرہ جاری ہوا۔ ان اکابر کو مناظرہ کے لیے پیش کرنا ہماری غیرت کے خلاف تھا۔ اس لیے پہلے دن مناظرہ مسئلہ ختم نبوت پر احقر نے کیا۔ دوسرے تیسرے دن حضرت مولانا بدر عالم اور مولانا محمد ادریس صاحب نے دوسرے مسائل پر مناظرہ کیا۔ یوں تو مناظرہ کے بعد ہر فریق اپنی اپنی کہا ہی کرتا ہے لیکن اس مناظرہ میں چونکہ عموماً تعلیم یافتہ طبقہ شریک تھا اس لیے کسی فریق کو دھاندلی کا موقع نہ تھا۔ پھر اس مناظرہ کا کیا اثر ہوا۔ اس کا جواب فیروزپور کے ہر گلی کوچے سے دریافت کیا جاسکتا ہے کہ قادیانی گروہ کو کس قدر رسوا ہو کر وہاں سے بھاگنا پڑا۔ خود اس گروہ کے تعلیم یافتہ و سنجیدہ طبقہ نے اس کا اقرار کیا کہ قادیانی گروہ اپنے کسی دعوے کو ثابت نہیں کر سکا اور اس کے خلاف دوسرے فریق نے جو بات کہی قوی دلیل کے ساتھ کہی۔

مناظرہ کے بعد شہر میں ایک جلسۂ عام ہوا جس میں حضرت شاہ صاحب اور حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہما کی تقریریں قادیانی مسئلہ کے متعلق ہوئیں۔ یہ تقریریں فیروزپور کی تاریخ میں ایک یادگار خاص کی نوعیت رکھتی ہیں۔ بہت سے وہ لوگ جو قادیانی دجل کے شکار ہو چکے تھے اس مناظرہ اور تقریروں کے بعد اسلام پر لوٹ آئے۔

حضرت شاہ صاحب کا دورۂ پنجاب :۔ ۱۳۴۳ھ میں جب کہ حضرت شاہ صاحب قدس سرہٗ کی کوشش سے بذریعہ تصنیف و تحریر قادیانی دجل و فریب کا پردہ پوری طرح چاک کر دیا گیا اور قادیانیت سے متعلق ہر مسئلہ پر مختلف طرز و انداز کے بیسیوں رسائل شائع ہو چکے تو آپ نے اس کی بھی ضرورت محسوس فرمائی کہ ناخواندہ عوام کا طبقہ جو زیادہ کتابیں نہیں پڑھتا اور قادیانی مبلغین چل پھر کر ان میں اپنا دجل پھیلاتے ہیں ان لوگوں کی حفاظت کے لیے پنجاب کے مختلف شہروں کا ایک تبلیغی دورہ کیا جائے۔

پنجاب و سرحد کے دورہ کا پروگرام بنا۔ علماء دیوبند کی ایک جماعت ہمرکاب ہوئی۔ اس جماعت میں حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ اکابرین سے حضرت شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ حضرت مولانا سید مرتضیٰ حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ شریک تھے اور حضرت مولانا محمد طیب صاحب مہتمم

دارالعلوم دیوبند، حضرت مولانا بدر عالم صاحب، حضرت مولانا محمد ادریس صاحب اور مولانا محمد نعیم صاحب لدھیانوی اور احقر ناکارہ شامل تھے۔ یہ علم کے پہاڑ اور تقوے کے پیکر پنجاب کے ہر بڑے شہر میں پہونچے اور مرزائیت کے متعلق اعلانِ حق کیا، منکرین کو رفع شبہات کی دعوت دی، لدھیانہ، امرتسر، لاہور، گوجرانوالہ، گجرات، راولپنڈی، ایبٹ آباد، مانسہرہ ہزارہ، کھوڑ وغیرہ میں ان حضرات کی بصیرت افروز عالمانہ تقریریں ہوئیں۔ مرزائی دجّال جو آئے دن مناظرہ و مباہلہ کے چیلنج عوام کو دکھانے کے لیے لئے پھرتے تھے ان میں سے ایک سامنے نہ آیا معلوم ہوتا تھا کہ وہ اس جہان میں نہیں ہیں۔

اس پورے سفر میں عام مسلمانوں نے جاء الحق وزھق الباطل کا منظر گویا آنکھوں سے دیکھ لیا۔

مرزائیوں کے مقابلہ میں بہاولپور کا تاریخی مقدمہ: حضرت شاہ صاحب اور دیگر اکابر علماء کے بیانات، مرزائیوں کے مرتد ہونے کا فیصلہ: ۱۹۲۶ء میں احمد پور شرقیہ ریاست بہاولپور کی ایک مسلمان عورت کا دعویٰ اپنے شوہر کے مرزائی ہوجانے کی وجہ سے نکاح فسخ ہونے کے متعلق بہاولپور کی عدالت میں دائر ہوا اور سات سال تک یہ مقدمہ بہاولپور کی ادنیٰ اعلیٰ عدالتوں میں دائر ہتے ہوئے آخر میں دربار معلی بہاولپور میں پہنچا۔ ۱۹۳۲ء میں دربار معلی نے پھر عدالت میں یہ لکھ کر واپس کیا کہ ہمارے خیال میں اس مسئلہ کی پوری تحقیق و تنقیح کرنا ضروری ہے۔ دونوں فریق کو موقع دیا جائے کہ وہ اپنے اپنے مذہب کے علماء کی شہادتیں پیش کریں اور دونوں طرف کے مکمل بیانات سننے کے بعد اس مسئلہ کا کوئی آخری فیصلہ کیا جائے۔

اب مدعیٰ علیہ مرزائی نے اپنی حمایت کے لیے قادیان کی طرف رجوع کیا، قادیان کا بیت المال اور اس کے رجال کار مقدمہ کی پیروی کے لیے وقف ہوگئے۔ ادھر مدعیہ بیچاری ایک غریب گھرانے کی لڑکی نہایت کس مپرسی میں وقت گذار رہی تھی، اس کی قدرت سے قطعاً خارج تھا کہ ملک کے مشاہیر علماء کو جمع کرکے اپنی شہادت میں پیش کرسکے یا اس مقدمہ کی پیروی کرسکے۔ مگر الحمد للہ بہاولپور کے غیور مسلمانوں کی انجمن مؤیدالاسلام نے زیرِ سرپرستی حضرت مولانا محمد حسین صاحب شیخ الجامعہ بہاولپور اس کام کو اپنے ہاتھ میں لیا اور مقدمہ کی پیروی کا انتظام کیا، اور ملک کے مشاہیر علماء کو خطوط لکھکر اس مقدمہ کی پیروی اور شہادت کے لیے طلب کیا۔ حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ اس وقت جامعہ اسلامیہ ڈابھیل میں صدر مدرسی کے فرائض انجام دے رہے تھے اور کچھ عرصہ سے علالت کے سبب رخصت پر دیوبند تشریف لائے ہوئے تھے۔ طول علالت سے نقاہت بے حد ہوچکی تھی۔

لیکن جس وقت یہ معاملہ آپ کے سامنے آیا تو مسئلہ کی نزاکت اور اہمیت کے قوی احساس نے آپ کو اس کے لیے مجبور کر دیا کہ اپنی صحت اور دوسری ضرورتوں کا خیال کیے بغیر وہ بہاولپور کا سفر کریں آپ نے نہ صرف اپنے آپ کو شہادت کے لیے پیش فرمایا۔ بلکہ ملک کے دوسرے علماء کو بھی ترغیب دے کر شہادت کے لیے جمع فرمایا۔

یہ واقعہ تقریباً ۱۳۵۰ھ کا ہے جب کہ احقر ناکارہ بحیثیت مفتی دارالعلوم دیوبند فتوے نویسی کی خدمت انجام دے رہا تھا۔

انجمن مؤید الاسلام بہاولپور کی دعوت کے علاوہ استاذِ محترم حضرت شاہ صاحب قدس سرہٗ کا ایماء بھی میری حاضری کے متعلق معلوم ہوا۔ احقر نے حاضری کا قصد کر لیا۔

لیکن حضرت الاستاذ شاہ صاحب قدس سرہٗ کو جو خداداد شغف دینی ضرورتوں کے ساتھ تھا اور آپ کو بےچین کیے رکھتا تھا اس کی وجہ سے آپ نے تاریخ مقدمہ سے کافی روز پہلے بہاولپور پہنچ کر اس کام کو پوری توجہ کے ساتھ انجام دینے کا فیصلہ فرما کر سب بیانات کے اختتام تک تقریباً بیس پچیس روز بہاولپور میں قیام فرمایا۔

حضرت شاہ صاحبؒ کا پُرشوکت عالمانہ بیان جو کمرۂ عدالت میں ہوا اس کی اصل کیفیت تو صرف انہی لوگوں سے پوچھیے جنہوں نے یہ منظر دیکھا ہے۔ اس کو بیان نہیں کیا جا سکتا۔ مختصر یہ کہ اس وقت کمرۂ عدالت دارالعلوم دیوبند کا دارالحدیث نظر آتا تھا۔ عدالت اور حاضرین پر ایک سکتہ کا عالم تھا۔ علوم ربانی کے حقائق و معارف کا دریا تھا جو اُمڈا چلا جاتا تھا۔

تین روز مسلسل بیان ہوا۔ تقریباً ساٹھ صفحات پر قلم بند ہوا۔ یہ بیان اور دوسرے حضرات کے بیانات ایک مستقل جلد میں طبع ہوئے۔

اس مقدمہ میں کیا ہوا؟ اس کی پوری تفصیل تو اس مفصّل فیصلہ سے معلوم ہو سکتی ہے جو عدالت کی طرف سے ۷ رفروری ۱۹۳۵ء مطابق ۳ ر ذیقعدہ ۱۳۵۳ھ کو دیا گیا۔ اور جو اسی وقت بزبان اُردو ایک سو باون صفحات پر شائع ہو چکا تھا۔ اس کی اشاعت کا اہتمام حضرت مولانا محمد صادق صاحب استاذ جامعہ عباسیہ بہاولپور و حال ناظم امور مذہبیہ بہاولپور کے دست مبارک سے ہوا۔ اس مقدمہ کی پیروی علماء کے اجتماع اور ان کی ضروریات کا انتظام بھی مولانا موصوف ہی کے ہاتھوں انجام پایا تھا اور

مولانا سے میرا پہلا تعلق اسی سلسلہ میں پیدا ہوا۔ آپ نے اس فیصلہ کے شروع میں ایک مختصر تمہید لکھی ہے۔ اس کے چند جملے نقل کر دینے سے کسی قدر حقیقت پر روشنی پڑ سکتی ہے وہ یہ ہیں:۔

"مدعیہ کی طرف سے شہادت کے لیے حضرت شیخ الاسلام مولانا سید محمد انور شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ، حضرت مولانا سید مرتضیٰ حسن صاحب چاندپوری، حضرت مولانا محمد نجم الدین صاحب پروفیسر اورینٹیل کالج لاہور و مولانا محمد شفیع صاحب مفتی دارالعلوم دیوبند پیش ہوئے۔ حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی تشریف آوری نے تمام ہندوستان کی توجہ کے لیے جذب مقناطیسی کا کام کیا۔ اسلامی ہند میں اس مقدمہ کو غیر فانی شہرت حاصل ہو گئی۔ حضرات علمائے کرام نے اپنی اپنی شہادتوں میں علم و عرفان کے دریا بہا دیئے اور فرقہ ضالہ مرزائیہ کا کفر وارتداد روز روشن کی طرح ظاہر کر دیا اور فریق مخالف کی جرح کے نہایت مسکت جواب دیئے۔ خصوصاً حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ایمان، کفر، نفاق، زندقہ، ارتداد، ختم نبوت، اجماع، تواتر، متواترات کے اقسام، وحی، کشف اور الہام کی تعریفات اور ایسے اصول و قواعد بیان فرمائے جن کے مطالعہ سے ہر ایک انسان علیٰ وجہ البصیرت بطلان مرزائیت کا یقین کامل حاصل کر سکتا ہے، پھر فریق ثانی کی شہادت شروع ہوئی، مقدمہ کی پیروکاری اور شہادت پر جرح کرنے اور قادیانی دجل و تزویر کو آشکارا کرنے کے لیے شہرۂ آفاق مناظر حضرت مولانا ابوالوفاء صاحب نعمانی شاہجہانپوری تشریف لائے، مولانا موصوف مختار مدعیہ ہو کر تقریباً ڈیڑھ سال مقدمہ کی پیروکاری فرماتے رہے۔ فریق ثانی کی شہادت پر ایسی باطل شکن جرح فرمائی جس نے مرزائیت کی بنیادوں کو کھوکھلا اور مرزائی دجل و فریب کے تمام پردوں کو پارہ پارہ کر کے فرقہ مرزائیہ ضالہ کا ارتداد آشکارا عالم کر دیا۔ فریقین کی شہادت ختم ہونے کے بعد مولانا موصوف نے مقدمہ پر بحث پیش کی اور فریق ثانی کی تحریری بحث کا تحریری جواب الجواب نہایت مفصل اور جامع پیش کیا بکامل دو سال کی تحقیق و تنقیح کے بعد عالی جناب ڈسٹرکٹ جج صاحب بہادر نے اس تاریخی مقدمہ کا بصیرت افروز فیصلہ ۷ر فروری ۱۹۳۵ء بحق مدعیہ سنایا۔ یہ فیصلہ اپنی جامعیت اور قوت استدلال کے لحاظ سے یقیناً بے نظیر و بے عدیل ہے۔ مسلمانان ہند کی بہرہ اندوزی کی خاطر اس فیصلہ کو ایک کتابی صورت میں شائع کیا جا رہا ہے ۔۔۔ حقیقت یہ مواد مقدمہ کی تیسری جلد ہے اس سے پہلے دو جلدیں اور ہوں گی۔

جلد اول میں حضرات علمائے کرام کی مکمل شہادتیں اور جلد ثانی میں حضرت مولانا ابوالوفاء صاحب شاہجہانپوری کی بحث اور جواب الجواب شائع کیا جائے گا۔ باقی رہا یہ سوال کہ یہ دونوں جلدیں کب شائع ہوں گی۔ اس کا جواب

مسلمانانِ ہند کی ہمت افزائی پر موقوف ہے۔ یہ تیسری جلد جتنی جلدی فروخت ہوگی اسی انداز سے پہلی دو جلدوں کی اشاعت میں آسانی ہوگی۔ حضرات علمائے کرام کے بیانات اور بحث اور جواب الجواب تردید مرزائیت کا بے نظیر ذخیرہ ہے۔ اگر خدا تعالیٰ کے فضل وکرم سے یہ تینوں جلدیں شائع ہوگئیں تو تردید مرزائیت میں کسی دوسری تصنیف کی قطعاً حاجت نہ رہے گی۔

اس مقدمہ میں حضرت شاہ صاحب قدس سرہٗ کے حکم کی بنا پر پہلا بیان اس احقر کا ہوا۔ تین روز بیان اور ایک دو روز جرح ہو کر تقریباً ساٹھ صفحات پر بیان مرتب ہوا۔

پہلا پہلا بیان تھا۔ ابھی لوگوں نے اکابر کے بیان سُنے نہ تھے۔ سب نے بیحد پسند کیا مجھے یاد ہے کہ دورانِ بیان میں بھی اور مکان پر آنے کے بعد بھی حضرت شاہ صاحب قدس سرہٗ دل سے نکلی ہوئی دعاؤں کے ساتھ اپنی مسرت کا اظہار فرماتے تھے اور اس ناکارہ وآوارہ کے پاس دین و دنیا کا صرف یہی سرمایہ ہے کہ اللہ والوں کی رضا، رضائے حق کی علامت ہے۔ واللہ تعالیٰ امثال ان یلحقنی بالصالحین۔

<u>فتنۂ قادیانیت پر حضرت مفتی صاحبؒ کی تصنیفات</u>: ردِ قادیانیت کے سلسلہ میں حضرت مفتی اعظمؒ کی اہم ترین خدمت ان کی وہ گرانقدر تصنیفات ہیں جو آپ نے اسلام اور قادیانیت کے درمیان زیر بحث مسائل پر مرتب فرمائیں، ان میں اکثر کا ذکر اوپر کی تحریر میں آچکا ہے، مگر مناسب ہوگا کہ ان کا مختصر سا تعارف یہاں پیش کر دیا جائے۔

حضرت مفتی صاحبؒ کی تمام تالیفات میں چند خصوصیات ایسی ہیں جو صرف ان کی تحریر کا مخصوص رنگ کہلا سکتی ہیں، اور جن کی وجہ سے ان کی تالیفات مفید خاص و عام ہیں۔

پہلی خصوصیت ان کی زبان کی بے ساختگی اور سلاست ہے۔ حضرت مفتی صاحب کسی مسئلہ پر قلم اٹھاتے ہیں تو اسے ایسے عام فہم انداز میں صاف صاف بیان کرتے ہیں کہ متوسط استعداد کا آدمی بھی اس سے بھرپور استفادہ کر سکتا ہے، عبارت میں بے جا طول اور مطالب میں پیچیدگی سے ان کی تحریر مبرا ہوتی ہے۔

دوسری خصوصیت ان کے لب ولہجہ میں متانت اور سنجیدگی ہے وہ کٹر سے کٹر مخالف کے مقابلہ میں تحمل اور متانت سے بات کرتے ہیں، اور تلخی واکتاہٹ سے ہمیشہ دامن کشاں رہتے ہیں۔ ان کی تحریر میں آپ کو فقرے بازی کا کوئی نشان نہیں ملے گا۔

تیسری خصوصیت یہ ہے کہ وہ جس موضوع کو لیتے ہیں اس کے ساتھ پوری وفاداری کرتے ہیں۔ اور

موضوع کا کوئی گوشہ تشنہ نہیں رہنے دیتے۔

چوتھی خصوصیت ان کا تفقہ انکتہ سنجی اور استدلال کی قوت ہے جو ان کی ہر تصنیف میں نمایاں ہے۔ وہ فقیہ النفس ہیں اور ان کی ہر عبارت تفقہ کی آئینہ دار ہے۔

پانچویں خصوصیت مطالب کی تہذیب اور مضامین کی ترتیب کا خداداد سلیقہ ہے

ان تمام خصوصیات کے بعد اب ان کی رد قادیانیت کے موضوع پر تصانیف کا مختصر تعارف پیش کیا جاتا ہے

(۱) ہدیۃ المہدیین فی آیۃ خاتم النبیین :۔ آپ نے یہ رسالہ حضرت شاہ صاحبؒ کے حکم پر عربی میں تالیف فرمایا، اس کے مقدمہ میں فتنۂ قادیانیت کی شدت اور مرزا غلام احمد قادیانی کے دعاوی باطلہ کا خلاصہ ذکر کرنے کے بعد تحریر فرماتے ہیں۔

" وانا سمعنا انها (ای الفتنة القادیانیة) تجاوزت حدود الهند وكادت تشیع فی ارض العراق وقاها الله و بلاد المسلمین كلها عن فتنتهم وفتنه المسیح الدجال، ولهذا اشار الی من اشارته حکم و اطاعته عنه اعنی قدوة المحدثین والمفسرین فی اوانه و زبدة العلماء والفقهاء المتقین فی زمانه شیخنا الاکبر محمد انور الکشمیری صدر المدرسین بدار العلوم الدیوبندیة - متعنا الله تعالی بطول بقائه - ان اکتب فی هذا الباب رسالة وجیزة اجمع فیها ماورد فی مسئلة ختم النبوة من نصوص قاطعة واضحة، واحادیث متواترة بینة، ومن اجماع الامة و اقوال السلف الصالحین علی ان دعوی النبوة کیفما کان بعد نبینا صلی الله علیه وسلم کفر بواح " (ص۲)

اس رسالہ میں نہایت اختصار کے ساتھ مسئلہ ختم نبوت پر قرآن کریم کی ۳۳ آیات اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ۱۶۴ احادیث طیبہ جمع کی گئی ہیں، ۶ صحابہ کرامؓ اور بے شمار اکابر سلف کی تصریح ذکر کی گئی ہے۔ اور آخر کتب سابقہ سے مسئلہ ختم نبوت پر نقول پیش کی گئی ہیں۔

یہ رسالہ ۱۳۴۲ھ میں دیوبند سے شائع ہوا اس پر حضرت مولانا محمد انور شاہ کشمیری، مفتی عزیز الرحمن دیوبندی، مولانا حبیب الرحمن عثمانی، مولانا اعزاز علی اور مولانا محمد رحیم اللہ بجنوری کی تقریظات ثبت ہیں۔

حضرت مفتی صاحبؒ کے وصال کے بعد مجلس تحفظ ختم نبوت پاکستان کی جانب سے یہ رسالہ دو مرتبہ شائع ہوا۔

ختم نبوت کامل :۔ متوسط تقطیع پر چار سو صفحے کی یہ ضخیم کتاب گویا مدینۃ المسلمین کا اردو ایڈیشن ہے اس میں حضرت مفتی صاحبؒ نے مسئلہ ختم نبوت پر قرآن کریم، حدیث نبوی، اجماع امت اور کتب سابقہ کی نقول کا ذخیرہ پوری شرح و تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ اور اسے تین حصوں پر تقسیم فرمایا ہے۔

(۱) ختم النبوۃ فی القرآن ۔ ۲۔ ختم النبوۃ فی الحدیث ۔ ۳۔ ختم النبوۃ فی الآثار ۔ ختم النبوۃ فی القرآن میں قرآن کریم کی ۹۹ آیات مع تشریح و تفسیر کے درج کی گئی ہیں۔ ختم النبوۃ فی الحدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے (۲۱۰) ارشادات نقل کئے گئے ہیں۔ اور ختم النبوۃ فی الآثار میں صحابہ، تابعین، ائمہ مجتہدین، فقہاء، محدثین، مفسرین، صوفیاء، متکلمین، الغرض امت کے تمام طبقات کے اکابر کی تصریحات جمع کی گئی ہیں۔ اسی کے ساتھ انبیاء سابقین کے ارشادات اور کتب سابقہ کی نقول کا ایک بڑا ذخیرہ جمع کر دیا گیا ہے۔

قادیانیت کی طرف سے آیات و احادیث کی جو تحریفات کی جاتی ہیں ان کا بھی نہایت شافی اور مدلل جواب دیا گیا ہے۔ یہ کتاب حضرت مصنفؒ کے ان محاسن میں سے ہے کہ اگر فتنۂ قادیانیت کے رد میں اس کے سوا ان کی اور کوئی تحریر نہ ہوتی تب بھی ان کی دنیوی و اُخروی سعادت کے لیے کافی تھی۔ یہ کتاب تقسیم سے قبل دیوبند سے شائع ہوتی رہی، اور پاکستان میں بھی حضرت مفتی صاحب کے ادارے سے بارہا شائع ہوئی۔

التصریح بما تواتر فی نزول المسیح :۔ قادیانیت کا سب سے بڑا مسئلہ حیات مسیح ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے لے کر آج تک پوری امت کا عقیدہ یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ابھی تک انتقال نہیں ہوا وہ زندہ ہیں، قیامت سے پہلے ان کا نزول ہوگا۔ اور تمام اہل کتاب جو اس وقت موجود ہوں گے ان پر ایمان لائیں گے، آپؑ دین اسلام کی دعوت دیں گے، اور پوری دنیا میں صرف ایک ہی دین ہوگا۔

حضرت امام العصر مولانا محمد انور شاہ کشمیریؒ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نزول کے متعلق تمام احادیث کو ذخیرہ حدیث سے تلاش کر کے جمع فرمایا اور حضرت مفتی صاحبؒ کو ان کے مرتب کرنے کا حکم فرمایا۔ آپ نے ان احادیث کو التصریح کے نام سے مرتب کیا اور اس کے لیے ایک طویل اور پُرمغز مقدمہ

تحریر فرمایا۔ یہ عظیم الشان کتاب نہ صرف اپنے موضوع پر اپنی نوعیت کی بے مثل کتاب ہے، بلکہ ذخیرۂ حدیث میں اپنی نوعیت کی منفرد کتاب ہے جس میں علامات قیامت، خصوصاً ظہور مہدی، خروج دجال، نزول عیسیٰ بن مریم، خروج یاجوج ماجوج، خروج دابۃ الارض کے بارے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی لسان وحی ترجمان کے لعل وجواہر جمع کر دیئے گئے ہیں۔

یہ کتاب پہلے دیوبند سے شائع ہوئی، پاکستان میں مجلس تحفظ ختم نبوت کراچی نے اسے شائع کیا اور چند سال پہلے الشیخ عبدالفتاح ابوغدہ مدظلہ العالی کی تحقیق وتعلیق کے ساتھ حلب سے اس کا جامع ترین ایڈیشن نکلا، جو ۳۰۵ صفحات پر مشتمل ہے، حال ہی میں مجلس تحفظ ختم نبوت پاکستان کے اہتمام سے اس کا عکس شائع کیا گیا ہے۔

مسیح موعود کی پہچان :۔ یہ مختصر سا رسالہ "التصریح" کا گویا اشاریہ یا خلاصہ ہے۔ قرآن کریم اور احادیث شریفہ میں سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کی جتنی صفات، حالات اور علامات آئی ہیں حضرت مفتی صاحب نے ان کو مرتب کر کے مرزا قادیانی کا ان سے مقابلہ کر کے دکھایا ہے کہ ان صفات میں سے کوئی صفت بھی مرزا قادیانی کو نصیب نہیں۔ لہٰذا جس مسیح کے آنے کا وعدہ دیا گیا ہے وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں نہ کہ مرزا قادیانی۔ التصریح کے حلبی ایڈیشن میں اس رسالہ کا عربی ترجمہ برادرم مولانا محمد تقی عثمانی کے قلم سے شائع کر دیا گیا ہے۔

نزول مسیح اور علامات قیامت :۔ یہ التصریح بما تواتر فی نزول المسیح کا اردو ترجمہ ہے، جو مولانا محمد رفیع عثمانی کے قلم سے ہے اس کے ساتھ موصوف نے علامات قیامت کا ایک جدول مرتب کر دیا ہے جس سے واقعات کی ترتیب ذہن نشین ہو جاتی ہے۔

وصول الافکار الی اصول الاکفار :۔ کسی مسلمان کو کافر کہنا بھی بڑا سخت گناہ ہے۔ اور کسی کافر کو مسلمان ثابت کرنا بھی فساد عظیم کا موجب ہے، کیونکہ اس سے اسلام اور کفر کی حدود مٹ جاتی ہیں۔ اس لیے ضرورت تھی کہ اسلام اور کفر کے مسئلہ کو منقح کیا جائے۔ حضرت امام العصر مولانا محمد انور کشمیری نے اپنے مخصوص انداز میں اس موضوع پر "اکفار الملحدین" تالیف فرمائی، جسے حرف آخر کہا جا سکتا ہے مگر وہ عام فہم نہیں تھی، اس لیے حضرت مفتی صاحب نے خالص فقہی انداز میں اس پر قلم اٹھایا، اور اسلام اور کفر کے معیار کو بالکل منقح کر کے رکھ دیا۔ حضرت حکیم الامت تھانوی قدس سرہٗ نے اپنے ایک گرامی

نامہ میں۔ جو عبدالماجد دریاآبادی کے نام ۷ شعبان ۱۳۵۱ھ کو تحریر فرمایا اور ماہنامہ "النور" تھانہ بھون ربیع الثانی ۱۳۵۲ھ میں شائع ہوا۔ اس رسالے کے بارے میں تحریر فرمایا:۔

"مولوی محمد شفیع صاحب نے اصول تکفیر میں ایک مختصر اور جامع مانع اور نافع رسالہ لکھا ہے۔ بعض اجزاء میں میں بھی الجھا تھا، مگر ان کی تحریر و تقریر سے قریب قریب مسئلہ صاف ہوگیا۔ وہ عنقریب چھپ جاوے گا۔ میں نے اس کا نام رکھا ہے "وصول الافکار الی اصول الکفار"۔ ۷ شعبان ۱۳۵۱ھ"

یہ رسالہ الگ بھی کئی بار طبع ہوا، اور اب اسے "جواہر الفقہ" میں، جو حضرت مفتی صاحب کے فقہی رسائل کا مجموعہ ہے۔ شامل کر دیا گیا ہے۔

مرتد کی سزا:۔ کابل میں نعمت اللہ قادیانی کو سزائے ارتداد سنگسار کیا گیا تو قادیانی اس سے آتش زیر پا ہوئے، اور اسلام کے اس قطعی مسئلہ کا کہ "مرتد کی سزا قتل ہے" انکار کر دیا۔ اس رسالہ میں حضرت مفتی صاحبؒ نے قرآن کریم، احادیث نبوی، تعامل صحابہ اور اجماع امت سے زیر بحث مسئلہ کو ثابت کرنے کے بعد فرمایا ہے کہ عقل صریح کا تقاضا بھی یہی ہے۔ یہ رسالہ بھی "جواہر الفقہ" میں شامل ہے۔

البیان الرفیع:۔ اس کا تذکرہ حضرت مفتی صاحبؒ کے مضمون میں بھی جو حیات انور سے نقل کیا جا چکا ہے، آیا ہے۔ بہاول پور کے مشہور تاریخی مقدمہ میں وکیل مدعیہ کی طرف سے جو بیان حضرت مفتی صاحب نے دیا تھا اسے "البیان الرفیع" کے نام سے "بیانات علمائے ربانی" میں شائع کیا گیا ہے۔ اس میں آپ نے قادیانیوں کے دعاوی، ان کی حیثیت، اور ان کے بارے شرعی حکم کی وضاحت فرمائی۔

یہ آٹھ رسائل راقم الحروف کے مطالعہ سے گذرے ہیں۔ ان کے علاوہ حضرت مفتی صاحبؒ نے اپنی مفید ترین تفسیر "معارف القرآن" میں اور عربی تفسیر "احکام القرآن" قادیانیت سے متعلقہ مباحث پر جو گرانقدر علمی ذخیرہ سپرد قلم فرمایا ہے اگر اسے یکجا کر دیا جائے تو ایک ضخیم اور جامع کتاب مرتب ہو سکتی ہے۔

قادیانیت کے بارے میں فتاوی:۔ حضرت مفتی صاحب رحمہ اللہ کی یہ سعادت تھی کہ انہوں نے اکابر مشائخ کی نگرانی میں فتویٰ نویسی میں کمال حاصل کیا، اور پھر ایک وقت آیا کہ ایشیا کی سب سے بڑی یونیورسٹی دارالعلوم دیوبند میں انہیں صدارت افتاء کی مسند تفویض ہوئی جس کی بدولت انہیں

"مفتی اعظم" کا خطاب بجا طور پر حاصل ہوا۔ اس دوران آپ نے قادیانیت کے بارہ میں بھی بہت سے فتوے جاری فرمائے، جن میں سے بعض میں قادیانیوں کی شرعی حیثیت کو واضح فرمایا گیا، اور بعض میں ان کے شبہات کا قلع قمع کیا گیا۔ یہاں چند فتووں کو نقل کر دینا خالی از فائدہ نہ ہوگا۔

۱۔ پہلا فتویٰ :- سوال ، لا تکفروا اھل قبلتك حدیث ہے یا نہیں اور اس کا کیا مطلب ہے؟

الجواب :- حدیث لا تکفروا اھل قبلتك کے متعلق جواباً عرض ہے کہ ان لفظوں کے ساتھ یہ جملہ کسی حدیث کی کتاب میں نظر سے نہیں گزرا لیکن اس مضمون کے جملے بعض احادیث میں وارد ہیں مگر قادیانی مبلغ جو ان الفاظ کو ناتمام نقل کر کے اپنے کفر کو چھپانا چاہتا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ اس کی حیثیت اس سے زیادہ نہیں جیسے قرآن سے کوئی شخص لا تقربوا الصلوٰۃ نقل کرے کیونکہ جن احادیث میں اس قسم کے لفظ واقع ہیں ان کے ساتھ ایک قید بھی مذکور ہے یعنی بذنب اور بعمل وغیرہ جس کی غرض یہ ہے کہ کسی گناہ و معصیت کی وجہ سے کسی اہل قبلہ کو یعنی مسلم مسلمان کو کافر مت کہو چنانچہ بعض روایت میں اس کے بعد ہی یہ لفظ بھی مذکور ہے الا ان تروا کفراً بواحا یعنی جب تک کفر صریح نہ دیکھو کافر مت کہو خواہ گناہ کتنا بھی سخت کرے۔

یہ روایت ابوداؤد کتاب الجہاد میں حضرت انسؓ سے بطور موقوف مروی ہے الکف عمن قال لا الٰہ الا اللہ ولا تکفروہ بذنب ولا تخرجہ من الاسلام بعمل نیز بخاری نے حضرت انسؓ سے روایت کیا ہے مرفوعاً من شہد ان لا الٰہ الا اللہ واستقبل قبلتنا وصلی صلاتنا واکل ذبیحتنا فھو المسلم اہل قبلہ سے مراد باجماع امت وہ لوگ ہیں جو تمام ضروریات دین کو مانتے ہیں نہ کہ یہ قبلہ کی طرف نماز پڑھ لیں چاہے ضروریات اسلامیہ کا انکار کرتے رہیں کما فی شرح المقاصد الجلد الثانی من صفحہ ۲۶۸ الی صفحۃ ۲۷۰ قال المبحث السابع فی حکم مخالف الحق من اھل القبلۃ لیس بکافر مالم یخالف ما ھو من ضروریات الدین الی قولہ والا فلا نزاع فی کفر اھل القبلۃ المواظب طول العمر علی الطاعات باعتقاد قدم العالم ونفی الحشر ونفی العلم بالجزئیات وکذا بصدور شیٔ من موجبات الکفر الخ وفی شرح الفقہ الاکبر وان غلا فیہ حتی وجب اکفارہ لا یعتبر خلافہ ووفاقہ ایضاً الی قولہ وان صلی الی القبلۃ واعتقد نفسہ مسلماً لان الامۃ لیست عبارۃ عن المصلین الی القبلۃ بل عن المومنین

ونحوه فی الکشف البزدوی صفحہ ۲۳۹/۲ وفی الشامی صفحہ ۳۳۲/۱ باب الامامۃ الاختلاف فی کفر المخالف فی ضروریات الاسلام وان کان من اھل القبلۃ المواظب طول عمرہ علی الطاعات وقال الشامی ایضا اھل القبلۃ فی اصطلاح المتکلمین من یصدق بضروریات الدین ای الامور التی علم ثبوتھا فی الشرع واشتھر ومن انکر شیئا من الضروریات کحدوث العالم وحشر الاجساد وعلم اللہ سبحانہ بالجزئیات وفرضیۃ الصلوٰۃ والصوم لم یکن من اھل القبلۃ ولو کان مجاھدا بالطاعات الی قولہ ومعنی عدم تکفیر اھل القبلۃ ان لا یکفر بارتکاب المعاصی ولا بانکار الامور الخفیۃ غیر المشھورۃ ھذا ماحققہ المحققون فاحفظہ ومثلہ قال المحقق ابن امیر الحاج فی شرح التحریر لابن ھمام والنھی عن تکفیر اھل القبلۃ ھو الموافق علی ماھو من ضروریات الاسلام ھذہ جملۃ قلیلۃ من اقوال العلماء نقلتھا واکتفیت بھا لقلۃ الفراغۃ وتفصیل ھذہ المسئلۃ فی رسالۃ اکفار الملحدین فی شئ من ضروریات الدین لشیخنا و مولانا الکشمیری مدظلہ واللہ اعلم۔ (فتاوی دارالعلوم دیوبند ص ۱۱۱ تا ۱۱۳ ج ۲)

دوسرا فتویٰ: سوال (۲۶) کلمہ گو اور اہل قبلہ کی شرعاً کیا تعریف ہے قادیانی مرزائی، لاہوری مرزائی احمدی اہل قبلہ و کلمہ گو مسلمان ہیں یا نہیں اگر نہیں تو کس وجہ سے؟

الجواب: کلمہ گو اور اہل قبلہ ایک خاص اصطلاح ہے اسلام اور مسلمانوں کی جس کا یہ مطلب کسی کے نزدیک نہیں کہ جو کلمہ پڑھے خواہ کسی طرح پڑھے وہ مسلمان ہے یا جو قبلہ کی طرف منہ کرے وہ مسلمان ہے بلکہ یہ لفظ اصطلاحی نام ہے اس شخص کا جو تمام احکام اسلامیہ کا پابند ہو جیسے کہا جاتا ہے کہ فلاں شخص ایم اے پاس ہے تو ایم اے ایک اصطلاحی نام ہے ان تمام علوم کا جو اس درجہ میں سکھائے جاتے ہیں نہ یہ کہ جو ایم اے کے الفاظ میں پاس ہوتا ہے اور یاد رکھتا ہو اس طرح اہل قبلہ کے معنی بھی باتفاق امت یہی ہیں کہ جو تمام احکام اسلامیہ کا پابند ہو کما صرح بہ فی عامۃ کتب الکلام اور اس کی مفصل بحث رسالہ اکفار الملحدین مصنفہ حضرت مولانا انور شاہ صاحب میں موجود ہے ضرورت ہو تو ملاحظہ فرمایا جاوے مگر رسالہ عربی زبان میں ہے (اُردو زبان میں بھی اس مضمون کا ایک رسالہ احقر کا ہے جس کا نام "دسول اللہ کا" ہے) واللہ تعالیٰ اعلم۔ (فتاوی دارالعلوم دیوبند ص ۱۱۳ ج ۲)

<u>تیسرا فتوی</u> (۲۳) ۔۱۔ لوکان موسیٰ و عیسیٰ حیین لما وسعهما الا اتباعی ابن کثیر برحاشیہ فتح البیان ص۲۴۶ الیواقیت الجواہر جلد ۲ صفحہ ۲۴ شرح فقہ اکبر ص۱۰۱ میں بھی یہی مضمون ہے ۔

۲ ۔ ان عیسٰی ابن مریم عاش عشرین ومائة سنة الحدیث کنز العمال صفحہ ۱۲۵ جلد ۶ جلالین مجتبائی ص۵۴ اس حدیث سے وفات ثابت ہوتی ہے ۔ ۳ ۔ خلاصہ سوال یہ ہے کہ ہمارے حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کیوں ہوئی حضرت عیسٰی کی طرح آسمان پر کیوں نہ اٹھائے گئے ؟

۴ ۔ ما المسیح بن مریم الا رسول قد خلت من قبله الرسل سورہ آل عمران ۔ اس آیت سے وفات مسیح علیہ السلام پر استدلال کرنا کیسا ہے ۔ ۵ ۔ اموات غیر احیاء الآیۃ سے وفات عیسٰی علیہ السلام ثابت ہوتی ہے ۔ ۶ ۔ شیخ محی الدین ابن عربیؒ فرماتے ہیں لانبی بعدی کے یہ معنی ہیں کہ تشریعی نبوت ختم ہوچکی ہے ۔ لیکن غیر تشریعی نبوت ختم نہیں کیا یہ صحیح ہے ؟

الجواب ۔ (۱) حدیث لوکان موسیٰ وعیسیٰ حیین ۔ دو تین کتابوں میں مذکور ہے مگر سب میں بلا سند لکھی ہے اور جب تک سند معلوم نہ ہو کیسے یقین کرلیا جائے کہ یہ حدیث صحیح قابل عمل ہے اگر اسی طرح بلا سند روایات پر عمل کریں تو سارا دین برباد ہوجائے اسی لیے بعض اکابر محدثین نے (غالباً عبداللہ ابن مبارک نے) فرمایا ہے لولا الاسناد لقال من شاء ماشاء دوسرے اگر بالفرض سند موجود بھی ہو اور مان لو کہ صحیح بھی ہے تو غایت یہ ہے کہ یہ حدیث دوسری احادیث سے جو حضرت عیسٰی علیہ السلام کے رفع آسمانی پر صریح ہیں اور درجہ تواتر کو پہنچ گئی ہیں ان کی معارض ہوگی اور تعارض کے وقت شرعی اور عقلی قاعدہ یہی ہے کہ اقوی کو ترجیح ہوتی ہے اور ظاہر ہے کہ ایک غیر معروف حدیث ان تمام صحیح اور قوی متواتر روایات حدیث پر راجح نہیں ہوسکتی یہ قادیانی ہی مذہب کی خصوصیت ہے کہ مطلب کے موافق نہ ہو تو صحیح بخاری ومسلم کی حدیث کو معاذ اللہ ردی کی ٹوکری میں ڈالنے کے لیے تیار ہوجائیں اور مطلب کی بزعم خود موافق ہو تو ضعیف روایات کو ایسا اہم بنائیں کہ صحیح اور متواتر روایات پر ترجیح دیں کوئی مسلمان ایسا نہیں کرسکتا اس حدیث کی تحقیق پر مولانا سید مرتضیٰ حسن صاحب مدظلہم ناظم تبلیغ دارالعلوم نے ایک مستقل رسالہ بھی لکھا ہے جو عنقریب طبع ہوکر شائع ہونے والا ہے ۔

۲ ۔ اس حدیث سے وفات کا ثبوت کرنا قادیانی فراست ہی کی خصوصیات سے ہے اولاً اسلئے

کہ حدیث خود متکلم فیہ ہے بعض محدثین نے اس کو قابل اعتماد نہیں مانا، ثانیاً اگر حدیث ثابت بھی ہو جائے تو صحاح ستہ میں جو قوی اور صریح روایات حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے رفع آسمانی اور نزول فی آخر الزمان کے متعلق وارد ہیں یہ حدیث ان کا معارضہ عقلاً و اصولاً نہیں کر سکتی۔

ثالثاً حدیث کی مراد صاف یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام زمین پر ایک سو بیس سال زندہ رہے آسمان پر زندہ رہنا چونکہ معجزہ ہے اس لیے اس حیات کو حیات دنیوی میں شمار نہ کرنا چاہیئے تھا اور نہ کیا گیا اور اس حدیث میں زمین اور اس عالم عناصر کی حیات کا ذکر ہے بطور اعجاز جو حیات کسی کے لیے ثابت ہو اس کا اس میں شمار کرنا اور داخل سمجھنا عقل و نقل کے خلاف ہے۔

(۳) حق تعالیٰ کے معاملات ہر شخص کے ساتھ جداجدا ہیں کسی کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ اللہ تعالیٰ سے یہ سوال کرے کہ جو معاملہ نوح علیہ السلام کے ساتھ کیا وہی موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ کیوں نہ کیا اور جو ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ کیا وہی ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کیوں نہ کیا۔ اور نہ صرف ان معاملات و واقعات سے ایک نبی کو دوسرے نبی پر کوئی ترجیح و تفضیل دی جا سکتی ہے جب تک دوسری صحیح و صریح روایات تفضیل پر دلالت نہ کریں انبیاء علیہم السلام کی تاریخ پڑھنے والوں پر مخفی نہیں کہ بعض انبیاء کو آروں کے ذریعہ دو ٹکڑے کر دیا گیا اور بعض کو آگ میں ڈال دیا گیا اور بعض کو خندق وغیرہ میں پھر کسی پر یہ آفات و مصائب اول جاری کیے پھر آخر الامر بچا لیا اور کسی کو اول ہی سے محفوظ رکھا اب یہ سوال کرنا کہ جیسے عیسیٰ علیہ السلام کو آسمان پر اٹھا کر زندہ رکھا گیا ہے ایسے ہی حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ معاملہ کیوں نہ کیا گیا یہ تو ایسا ہی سوال ہے جیسے کوئی یوں کہے کہ جو معاملہ موسیٰ علیہ السلام اور لشکر فرعون کے ساتھ بنص قرآن کیا گیا وہی معاملہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور کفار مکہ کے ساتھ کیوں نہ ہوا کہ جنگ احد میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا دندان مبارک شہید ہونے چہرۂ انور زخمی ہونے کی نوبت آئی آپ کو ہجرت کر کے وطن اور مکہ چھوڑنا پڑا غار میں چھپنا پڑا۔ سب کفار قریش پر ایک دفعہ ہی آسمانی بجلی کیوں نہ آگئی یا دریا میں غرق کیوں نہ ہو گئے جیسے یہ سوال حق تعالیٰ کے معاملات میں بے جا ہیں ایسے ہی یہ بھی بالکل بے جا اور نامعقول سوال ہے کہ جیسے عیسیٰ علیہ السلام کو زندہ رکھا آپ کو بھی زندہ آسمان پر رکھنا چاہیئے تھا۔ کیونکہ زیادہ دنوں تک زندہ رہنا یا آسمان پر رہنا ان سے کوئی فضیلت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر ثابت نہیں ہوتی کیونکہ زیادتی عمر فضیلت ہوتی تو بہت سے

صحابہ کرام اور عوام امت کی عمریں آپ سے زُرگنی چوگنی ہوئی ہیں ان کو بھی افضل کہہ سکیں گے اور اسی طرح اگر آسمان پر رہنا یا چڑھنا ہی مدارِ فضیلت ہو تو فرشتوں کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے افضل ماننا لازم آئے گا جو نصوص شرعیہ اور اجماعِ امت کے خلاف ہے۔

۴۔ قد خلت من قبلہ الرسل سے عیسیٰ علیہ السلام کی وفات پر استدلال کرنا انہیں لوگوں کا کام ہے جنہیں عربی عبارت سمجھنے سے کوئی علاقہ نہیں اور جو محاورات زبان سے بالکل واقف نہیں کیونکہ اول تو اس جیسے عمومات سے کسی خاص واقعہ مشہورہ پر کوئی اثر محاورات کے اعتبار سے نہیں پڑتا بلکہ اس کی ایسی مثال ہے جیسے کوئی بیمار طبیب سے پوچھے کہ پرہیز کس چیز کا ہے وہ کہہ دے کہ ترشی اور تیل مت کھاؤ۔ ترشی اور تیل کے سوا ساری چیزیں کھاؤ مضر نہیں۔ اب اگر یہ بیوقوف جا کر پتھر یا لوہا کھائے یا سنکھیا کھائے اور استدلال میں قادیانی مجتہدین کا سا استدلال پیش کرے کہ حکیم صاحب نے کہا تھا کہ ترشی اور تیل مت کھاؤ۔ ترشی اور تیل کے سوا ساری چیزیں کھاؤ کوئی مضر نہیں اور ساری چیزوں میں پتھر لوہا اور سنکھیہ (زہر) بھی داخل ہے لہذا میں جو کچھ کھاتا ہوں حکیم صاحب کے فرمانے سے کھاتا ہوں۔ انصاف کیجئے کہ کوئی عقلمند اس کو صحیح العقل سمجھے گا اور پھر یہ بھی انصاف کیجئے کہ اس قادیانی استدلال میں اور اس میں کوئی فرق ہے یا نہیں ذرا غور سے معلوم ہو جائے گا کہ اگر بالفرض خلت کے معنی موت ہی ہوں تو بھی اس سے ان انبیاء کی موت ثابت نہیں ہو سکتی جن کے قرآن و حدیث کی دوسری نصوص حیات ثابت کرتی ہیں جیسے سب چیز کھاؤ کے قول سے پتھر اور زہر کا کھانا مراد نہیں۔ اس کے علاوہ خلت کے معنی لغت میں موت کے نہیں بلکہ گذر جانے کے ہیں خواہ مر کر خواہ کسی دوسرے طریقہ سے جیسے عیسیٰ علیہ السلام کے لیے ہوا۔

امام راغب اصفہانی مفردات القرآن میں اس لفظ کے یہی معنی لکھتے ہیں۔

والخلو یستعمل فی الزمان والمکان لکن لما تصور فی الزمان المضی فسر اهل اللغة خلا الزمان بقولهم مضی الزمان وذهب قال تعالیٰ وما محمد الا رسول قد خلت من قبله الرسل انتهیٰ یہ لفظ صریح ہیں کہ خلت کے معنی قرآن شریف میں چلے جانے اور گذر جانے کے جس میں عیسیٰ علیہ السلام اور دوسرے انبیاء بلاشبہ برابر ہو گئے تعجب ہے کہ قادیانی خانہ ساز پیغمبر کے صحابی اتنی سی بات کو کیوں نہیں سمجھتے اور اگر حق تعالیٰ ان کو چشم بصیرت

عطا فرمائے اور وہ اب بھی غور کریں تو سمجھیں گے کہ یہ آیت بجائے وفات عیسیٰ پر دلیل ہونے کے حیاتِ عیسیٰ کی طرف مشیر ہے کیونکہ صریح لفظ ماتت وغیرہ کو چھوڑ کر خلت شاید خدا تعالیٰ نے اسی لیے اختیار فرمایا ہے کہ کسی بیوقوف کو موت عیسیٰ کا شبہ نہ ہو جائے اگرچہ محاورہ شناس کو تو پھر بھی شبہ کی گنجائش نہ تھی۔

۵ - اموات غیر احیاء کی تفسیر باعتبار لغت بھی اور جو کچھ مفسرین نے تحریر فرمایا ہے اس کے اعتبار سے بھی یہی ہے کہ یہ سب حضرات ایک معین مدّت کے بعد مرنے والے ہیں نہ یہ کہ بالفعل مر چکے ہیں۔ اور یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے فرمایا گیا ہے انک میت وانھم میتون تو کیا اس کا یہ مطلب تھا کہ معاذ اللہ آپ اس وقت وفات پا چکے ہیں بلکہ بالاتفاق وہی معنی مذکورہ مراد ہیں کہ ایک وقت معین میں وفات پانے والے ہیں یہ بھی جھوٹی نبوت کی نحوست ہے کہ اتنی سی بات سمجھ میں نہ آئی۔

۶ - شیخ محی الدین ابن عربی کا قول استدلال میں پیش کرنا اول تو اصولاً غلطی ہے کیونکہ مسئلہ ختم نبوت عقیدہ کا مسئلہ ہے جو باجماع امت بغیر دلیل قطعی کے کسی چیز سے ثابت نہیں ہو سکتا اور دلیل قطعی قرآن کریم اور حدیث متواتر اور اجماع امت کے سوا کوئی نہیں۔ ابن عربی کا قول ان میں سے فرمایئے کس میں داخل ہے اس لیے اس کا استدلال میں پیش کرنا ہی اصولی غلطی ہے۔

ثانیاً خود ابن عربی اپنی اسی کتاب فتوحات میں نیز فصوص میں اس کی تصریح کرتے ہیں کہ نبوت شرعی ہر قسم کی ختم ہو چکی ہے ابن عربی اور دوسرے حضرات کی عبارتیں صریح اور صاف رسائل ذیل میں مذکور ہیں۔ عقیدۃ الاسلام فی حیاۃ عیسیٰ علیہ السلام۔ التنبیہ الطربی فی الذب عن ابن عربی وغیرہ ۔

اسی طرح صاحب مجمع البحار اور ملا علی قاری بھی اپنی دوسری تصانیف میں اس کی تصریح کرتے ہیں جو جمہور کا مذہب ہے یعنی ہر قسم کی نبوت ختم ہو چکی ہے آئندہ یہ عہدہ کسی کو نہ ملے گا۔

چوتھا فتویٰ :- سوال (۲۳) لوکان موسیٰ وعیسیٰ حیین کیا یہ حدیث کسی حدیث کی کتاب میں موجود ہے یا کہ نہ بیہقی کا حوالہ دیا جاتا ہے اس میں ہے یا نہیں ؟

الجواب :- حدیث لوکان موسیٰ وعیسیٰ حیین کسی کی معتبر کتاب میں موجود نہیں البتہ تفسیر ابن کثیر میں ضمناً یہ الفاظ لکھے ہیں اور اسی طرح اور بعض کتب تصوف میں نقل کر دیا ہے مگر سب جگہ

بلاسند نقل کیا ہے اس لیے یہ حدیث بچند وجوہ احادیث مشہورہ کے معارض نہیں ہو سکتی اولاً معارضہ کے لیے مساوات فی القوۃ شرط ہے اور اس حدیث کا کہیں پتہ نہیں چہ جائیکہ یہ ہے تو وہ با سند ہے اور یہ قول آئمہ حدیث کا مقبول و مشہور ہے۔ لولا الاسناد لقال من شاء ما شاء

ثانیاً اگر بالفرض یہ حدیث معتبر بھی ہو تو احادیث متواترہ درباره حیات و نزول عیسی علیہ السلام کے معارض ہوگی اور ترجیح کی نوبت آئے گی تو ظاہر ہے کہ احادیث کثیرہ متواترۃ المعنی کو اس کے مقابلہ میں ترجیح ہوگی نہ کہ اس حدیث کو جس کا حدیث ہونا بھی ہنوز متعین نہیں۔

ثالثاً:۔ اگر ان الفاظ کو صحیح و ثابت بھی مان لیا جائے تب بھی اس سے وفات عیسی علیہ السلام ثابت نہیں ہوتی بلکہ اس کے معنی صاف یہ ہوتے ہیں کہ عالم زمین پر زندہ ہوتے کیونکہ حدیث میں اتباع نبوت کا ذکر ہے اور یہ اتباع اس عالم کے ساتھ تعلق رکھتا ہے سو یہ صحیح ہے کہ اگر اس عالم میں زندہ ہوتے تو آپ کا اتباع کرتے اب چونکہ — دوسرے عالم میں زندہ ہیں اس لیے اتباع ان پر فرض نہ رہا سمجھنے کے لیے اتنا ہی کافی ہے اور اگر اس مضمون کو مبسوط دیکھنا چاہیں تو مولانا سید مرتضیٰ حسن صاحب نے اس مضمون پر مستقل رسالہ لکھا ہے وہ ملاحظہ فرمایئے۔

<u>پانچواں فتویٰ</u>:۔ سوال: (۲۵) شیخ محی الدین ابن عربی فرماتے ہیں کہ لا نبی بعدی کے یہ معنی ہیں کہ تشریعی نبوت ختم ہو چکی ہے لہٰذا غیر تشریعی نبوت ختم نہیں ہوئی یہ صحیح ہے یا نہیں؟

الجواب:۔ شیخ محی الدین ابن عربی کا قول استدلال میں پیش کرنا اوّل تو اصولاً غلط ہے کیونکہ مسئلہ ختم نبوت عقیدہ کا مسئلہ ہے جو باجماع امت بغیر دلیل قطعی کے کسی چیز سے ثابت نہیں ہو سکتا اور دلیل قطعی قرآن کریم، حدیث متواتر اور اجماع امت کے سوا کوئی نہیں۔

ابن عربی کا قول ان میں سے فرمایئے کس میں داخل ہے اس لیے اس کا استدلال میں پیش کرنا ہی اصولی غلطی ہے ثانیاً خود ابن عربی اپنی اسی کتاب فتوحات میں نیز فصوص میں اس کی تصریح کرتے ہیں کہ نبوت شرعی ہر قسم کی ختم ہو چکی ہے اور جس عبارت کو سوال میں پیش کیا ہے اس کا صحیح مطلب خود فتوحات کی تصریح سے یہ ہے کہ نبوت غیر تشریعی ایک خاص اصطلاح شیخ اکبر کی ہے جو مرادف ولایت ہے نہ وہ نبوت جو مصطلح شرع ہے کیونکہ جمیع اقسام نبوت کے انقطاع پر خود فتوحات کی بے شمار عبارتیں شاہد ہیں۔ ابن عربی اور دوسرے حضرات کی عبارتیں صریح اور صاف منقول

مذکرۃ الصدد میں کچھ مذکور ہیں اور قلمی احقر کے پاس منقول لیکن سب کے نقل کرنے کی فرصت اور ضرورت نہیں۔

اسی طرح صاحب مجمع البحار اور ملا علی قاری بھی اپنی دوسری تصانیف میں اس کی تصریح کرتے ہیں جو جمہور کا مذہب ہے یعنی ہر قسم کی نبوت ختم ہو چکی ہے آئندہ یہ عہدہ کسی کو نہ ملے گا۔

واللہ تعالیٰ اعلم

فتاویٰ دارالعلوم دیوبند ص ۱۲۹ تا ۱۳۴ ج ۲

یہ چند فتاویٰ جیسا کہ آپ دیکھ رہے ہیں، قادیانیوں کے بڑے بڑے شبہات کے جواب پر مشتمل ہیں اس لیے ان فتاویٰ کو حضرت مفتی اعظم رحمہ اللہ کے مآثر میں شمار کیا جائے گا۔ حق تعالیٰ انہیں اپنے دین مبین کی حفاظت کا بہترین اجر عطا فرمائے اور امت محمدیہ کو ان کے علوم و انفاس سے مستفید فرمائے۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

" حب اہل بیت اظہار جزو ایمان ہے، ان پر وحشیانہ مظالم کی داستان بھلانے کے قابل نہیں۔ حضرت حسین اور ان کے رفقا کی مظلومانہ اور دردانگیز شہادت کا واقعہ جس کے دل میں رنج و غم اور درد پیدا نہ کرے وہ مسلمان کیا انسان بھی نہیں لیکن ان کی سچی اور حقیقی محبت و عظمت اور ان کے مصائب سے حقیقی تأثر، یہ نہیں کہ سارے سال خوش و خرم پھریں، کبھی ان کا خیال بھی نہ آئے اور صرف عشرہ محرم میں واقعہ شہادت سُن کر رو لیں، یا ماتم برپا کرلیں، یا تعزیہ داری کا کھیل تماشہ بنائیں، سارے سال گرمی کی شدت کے زمانہ میں کسی کی پیاس کا خیال نہ آئے اور محرم کی پہلی تاریخ کو اگرچہ سردی پڑ رہی ہو کسی کو ٹھنڈے پانی کی ضرورت نہ ہو، شہدائے کربلا کے نام سے سبیل کا ڈھونگ بنایا جائے، بلکہ حقیقی ہمدردی اور محبت یہ ہے کہ جس مقصد عظیم کے لیے انھوں نے قربانی دی، اس مقصد کو پورا کرنے کے لیے اپنی ہمت کے مطابق ایثار و قربانی پیش کریں۔ ان کے اخلاق و اعمال کی پیروی کو سعادت دُنیا و آخرت سمجھیں۔"

(حضرت مفتی اعظمؒ : شہید کربلا ص ۱۰۸)

جناب حافظ محمد اکبر شاہ بخاری
ناظم جامعہ عثمانیہ ۔ جامپور

مفتیٔ اعظم اور تحریکِ پاکستان

تحریک پاکستان میں علماء کرام نے جو کردار ادا کیا وہ ہماری تاریخ میں سنہری حروف سے لکھے جانے کے قابل ہے۔ عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ علماء نے پاکستان کی مخالفت کی، کیونکہ علماء کی ایک جماعت جمعیت علماءِ ہند نے کھلم کھلا کانگریس کی حمایت اور پاکستان کی مخالفت میں سرگرم رہی تھی، حالانکہ اس کے برعکس علماء کی ایک بڑی جماعت "جمعیت علماءِ اسلام" کے نام سے تحریکِ پاکستان میں زبردست عملی حصہ لیتی رہی، اور سلہٹ اور سرحد ریفرنڈم میں مسلم لیگ کی کامیابی اسی "جمعیت علماءِ اسلام" کے اکابرین کی کوششوں کا نتیجہ تھی، دارالعلوم دیوبند جیسے شہرۂ آفاق مرکزِ علومِ اسلامیہ کے سرپرست اعلیٰ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ ان علماء کرام کے سرپرست اور مربی تھے جو مسلمانوں کی الگ تنظیم اور حصولِ آزادی کے لئے جدوجہد کو ناگزیر سمجھتے تھے، وہ مسلم لیگ اور قائدِ اعظم محمد علی جناح کے زبردست حامی تھے، اور انھوں نے مسلمانوں کی طرف سے مطالبۂ پاکستان کی حمایت فرماتے ہوئے سب سے پہلے ایک اسلامی ریاست کے قیام کا تصور پیش کیا، فرمایا کہ :-

"جی یوں چاہتا ہے کہ ایک خطہ پر اسلامی حکومت ہو، سارے قوانین تعزیرات وغیرہ کا اجراء احکامِ شریعت کے مطابق ہو، بیت المال ہو، نظامِ زکوٰۃ رائج ہو، شرعی عدالتیں قائم ہوں، اور آزادی سے ربّ العزت کی عبادت کی جائے، اور اس مقصد کے لئے صرف مسلمانوں کی جماعت ہونی چاہئے جو اس نظریہ کو لے کر ایک الگ اسلامی مملکت کے قیام کی جدوجہد کرے"

(تعمیرِ پاکستان و علماءِ ربانی)

اسی نظریہ کے تحت انھوں نے اپنے متوسلین ومتبعین میں سے جن جید علماء کرام کو ہدایت فرمائی

کہ وہ اپنی پوری طاقت سے قائدِ اعظم اور مسلم لیگ کا ساتھ دیں، ان میں شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانیؒ
مولانا ظفر احمد عثمانیؒ، مفتی عبدالکریم گمتھلویؒ، مولانا مرتضیٰ حسن چاندپوریؒ، مفتی محمد حسن امرتسریؒ،
مولانا قاری محمد طیب قاسمی، مولانا اطہر علی سلہٹیؒ، مفتی جمیل احمد تھانوی اور مفتی اعظم مولانا مفتی محمد شفیع
صاحب دیوبندیؒ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

حضرت مفتی اعظم رحمۃ اللہ علیہ کو سیاسی ہنگاموں سے طبعاً دلچسپی نہ تھی، مگر ملکی و قومی اشد ضرورت
کے موقع پر خدمتِ دینی کے جذبہ سے شریک ہوتے تھے، چنانچہ آپ کی سیاسی زندگی کا آغاز تیسری
جنگِ عظیم کے بعد چندۂ بلقان سے ہوا جس کے لئے شیخ الہند مولانا محمود الحسن دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ کی
معیت میں دورے کرتے رہے، اور بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔

اس کے بعد جب "تحریکِ پاکستان" کے زمانہ میں دارالعلوم دیوبند دو حصوں میں تقسیم ہو چکا تھا،
دارالعلوم کا ایک حصہ کانگریس کے ساتھ شریکِ عمل تھا اور دوسرا گروپ جو دارالعلوم کے بڑے بڑے
عہدیداروں یعنی سرپرست حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ، صدر مہتمم علامہ شبیر احمد عثمانیؒ، مہتمم
مولانا قاری محمد طیب صاحب قاسمی اور صدر مفتی مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ کے حامیوں پر مشتمل تھا،
کانگریس کا سخت مخالف تھا، حکیم الامت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہٗ نے جب یہ
محسوس کیا کہ دارالعلوم دیوبند میں رہ کر اگر اختلافات بڑھ گئے تو یہ دارالعلوم کے لئے نقصان دہ
ثابت ہوگا چنانچہ حضرت تھانویؒ کے مشورہ سے، ربیع الاول ۱۳۶۲ھ میں شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد
عثمانیؒ، مولانا محمد ابراہیم بلیاویؒ، مولانا ظہور احمد دیوبندی اور مفتی اعظم حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب
دیوبندیؒ اور دیگر علماء دارالعلوم دیوبند سے مستعفی ہو کر الگ ہو گئے، اور ان سب علماء نے خود کو تحریک
پاکستان کے لئے وقف کر دیا۔

علامہ شبیر احمد صاحب عثمانیؒ اور حضرت مفتی صاحبؒ نے دارالعلوم دیوبند سے علیحدگی کے بعد
۱۹۴۵ء میں "جمعیت علماء اسلام" کی بنیاد رکھی، تاکہ قیامِ پاکستان کے لئے مؤثر جدوجہد کی جائے اور
"جمعیت علماء ہند" کے اثرات کے باعث جو اکثر مسلمان مطالبۂ پاکستان سے منحرف تھے یا جو تردّد کی حالت
میں کھڑے تھے، انھیں قیامِ پاکستان کی جدوجہد میں شریک کیا جائے، اس جمعیت کے پہلے صدر علامہ
شبیر احمد صاحب عثمانیؒ، نائب صدر شیخ الحدیث مولانا ظفر احمد صاحب عثمانیؒ منتخب ہوئے، حضرت
مفتی صاحبؒ اس جمعیت کے کانپور کے اجلاس میں باقاعدہ رکن بنے، پھر مجلسِ عاملہ کے ممبر منتخب ہوئے
اور سرگرمی سے میدان میں آگئے، اس زمانہ میں آپ نے کانگریس اور مسلم لیگ کے متعلق "شرعی فیصلہ"

کے عنوان سے ایک کتاب تالیف کی، جس میں مطالبۂ پاکستان کے سیاسی مصالح اور اس مطالبہ کی شرعی حیثیت قرآن و سنت کی روشنی میں مستحکم دلائل سے پیش کئے، اور ثابت کیا کہ ان حالات میں کانگریس کی حمایت کفر کی حمایت ہے، جس میں حصہ لینا قرآن و سنت کی رُو سے ناجائز ہے، اس فتویٰ کی جید علماء وقت نے تائید کی، علامہ شبیر احمد عثمانیؒ نے فرمایا:

"میں نے اس فتویٰ کا تفصیلی مطالعہ کیا، ماشاء اللہ مفتی صاحب نے مسئلہ کو بالکل صاف کردیا ہے، اہلِ علم و نظر کے لئے کوئی گنجائش نہیں چھوڑی، سب اطراف و جوانب واضح ہوکر سامنے آگئے ہیں"

مولانا ظفر احمد صاحب عثمانیؒ فرماتے ہیں:۔

"احقر نے بھی فتویٰ مذکورہ حرفاً حرفاً مطالعہ کیا، اللہ تعالیٰ مفتی محمد شفیع صاحب کو جزائے خیر عطا فرمادیں کہ سیاست حاضرہ کا شرعی حکم اچھی طرح دیا، اور بڑی محنت سے قرآن و حدیث اور فقہ سے جزئیات احکام کو تلاش کرکے جمع فرمایا، امید ہے کہ اس کے بعد مسائلِ حاضرہ میں کسی اور فتویٰ کی حاجت باقی نہ رہے گی"

علامہ سید سلیمان ندویؒ نے فرمایا کہ:۔

"اعانت و استعانت بالکفار کے مراتب سہ گانہ کے متعلق حضرت مفتی صاحب نے جو تفصیلات حسب تصریح فقہاء رحمہ اللہ تعالیٰ لکھی ہیں بالکل صحیح ہیں"

مولانا مفتی جمیل احمد صاحب تھانوی نے فرمایا کہ:۔

"احقر کے نزدیک یہ مضمون بالکل صحیح ہے، اور گویا حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہ کے ارشادات کی توضیح و تشریح ہے، اللہ تعالیٰ حضرت مفتی صاحب کو جزائے خیر عطا فرمائے اور ان کے فیوض میں برکت عطا فرمائے"

(حصول پاکستان، از پروفیسر احمد سعید ایم اے)

نومبر ۱۹۴۵ء کے انتخاب ہندوستان کی قسمت کے لئے ایک فیصلہ کن حیثیت رکھتے تھے، ضلع مظفر نگر و سہارنپور وغیرہ کے حلقۂ انتخاب سے کانگریس کے مقابلہ میں مسلم لیگ کی طرف سے لیاقت علی خان مرحوم کھڑے تھے، اس حلقہ میں جمعیت علماء ہند کا سب سے زیادہ اثر تھا، اس لئے مسلم لیگ کی کامیابی سب کو مشکل نظر آرہی تھی، اور سہارنپور کے عوام کا مطالبہ تھا کہ اس حلقہ میں حضرت مفتی محمد شفیع صاحب کے فتوے کے بغیر کام نہیں چلے گا، چنانچہ مسلم لیگی زعماء نے حضرت مفتی صاحب کا فتویٰ حاصل کیا اور اسے

شائع کراکر بڑے بڑے پوسٹروں کی شکل میں پورے حلقۂ انتخاب میں چسپاں کیا گیا، جس کا عنوان جلی حروف میں تحریر تھا کہ "کانگریس کی حمایت کفر کی حمایت ہے"۔ حضرت مفتی صاحب کے اس فتویٰ نے انتخاب کی فضاء کو یکسر بدل کے رکھ دیا، اور مسلم لیگ کی جو شکست یقینی نظر آرہی تھی کامیابی میں تبدیل ہوگئی، اور یہ حقیقت ہے کہ اگر حضرت مفتی اعظم کا فتویٰ شائع نہ ہوتا تو مسلم لیگ کی شکست بالکل یقینی تھی، اس کا اعتراف خود لیاقت علی خان مرحوم نے ان الفاظ میں کیا کہ:۔

"حضرت مفتی محمد شفیع صاحب کے فتوے کی بدولت ہمیں کامیابی حاصل ہوئی ہے، ان کا فتویٰ شائع ہوتے ہی ہوا کا رُخ بدل گیا" (ماہنامہ الرشید لاہور، ذیقعدہ ۱۳۹۶ھ)

سرحد اور سلہٹ کے علاقے پاکستان کے لئے ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتے تھے، چنانچہ قائد اعظم محمد علی جناح نے علامہ شبیر احمد صاحب عثمانیؒ، شیخ الحدیث مولانا ظفر احمد صاحب عثمانیؒ اور مفتی اعظم مولانا مفتی محمد شفیع صاحب دیوبندیؒ کے سامنے ۱۱ر جون ۱۹۴۷ء کو اس بات کا اظہار کیا کہ یہ دونوں علاقے ہر قیمت پر پاکستان میں شامل ہونے چاہئیں، ان تینوں بزرگوں نے وعدہ فرمایا کہ وہ سرحد وسلہٹ کے علاقوں کا دورہ کریں گے، اور مسلم لیگ کی کامیابی کی سر توڑ کوشش کریں گے،

اس کے بعد علامہ عثمانیؒ اور حضرت مفتی صاحبؒ نے سرحد کا محاذ سنبھال لیا، اور مولانا ظفر احمد عثمانیؒ اور مولانا اطہر علی صاحبؒ وغیرہ نے سلہٹ کا دورہ کیا، ان علاقوں میں جہاں پر فضا مسلم لیگ کے بالکل خلاف تھی ان بزرگوں کے دوروں نے یکدم بدل ڈالی، اور مسلم لیگ کے لئے راہ ہموار کی، حضرت مفتی اعظمؒ نے علامہ شبیر احمد عثمانیؒ کی معیت میں صوبہ سرحد کا تاریخی دورہ کیا، اسی دورہ کی وجہ سے سرحد کے عوام نے پاکستان کے حق میں ووٹ ڈالا، اگر شیخ الاسلام علامہ عثمانیؒ اور حضرت مفتی اعظمؒ اس موقع پر دورہ نہ کرتے تو اس ریفرنڈم میں پاکستان کی کامیابی چنداں آسان نہ تھی،

صوبہ سرحد میں جب ریفرنڈم کا وقت قریب آیا تو کانگریسی لیڈروں، سرحدی گاندھی اور اُن کے ہم نوا ؤں نے اپنی پوری قوت صوبہ سرحد میں لگادی، اور پختونستان کا نیا اسٹنٹ شروع کیا، تو وہاں کی فضا اس قدر خراب کر دی کہ وہاں کے عوام مسلم لیگ اور پاکستان کو انگریزوں کا ایک جال سمجھنے لگے، اس خطرناک اثر کو زائل کرنے کے لئے علامہ عثمانیؒ اور حضرت مفتی صاحبؒ نے سخت گرمی کے زمانہ میں گاؤں گاؤں کا دورہ کیا، مختلف علاقوں میں پاکستان کے قیام کی حمایت میں تقریریں کیں، اور پوری فضا کو بدل کر پاکستان کے حق میں کر دیا،

سیاسی مبصرین کی رائے یہ ہے کہ اس نازک وقت میں شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی رح اور مفتی اعظم مولانا محمد شفیع صاحب دیوبندیؒ سرحد کا دورہ نہ کرتے تو ریفرنڈم میں پاکستان کی کامیابی ناممکن تھی، اس بات کا اندازہ خود قائد اعظم محمد علی جناح کے ان الفاظ سے لگایا جاسکتا ہے کہ جب سرحد ریفرنڈم میں مسلم لیگ کو کامیابی حاصل ہوئی، اور علامہ شبیر احمد عثمانی رح، مولانا ظفر احمد عثمانی رح اور مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ نے اس کامیابی پر قائد اعظم کو مبارکباد دی تو انھوں نے جواب میں فرمایا کہ:۔

آپ مبارک باد کے مستحق آپ حضرات ہیں، یہ ساری کامیابی آپ حضرات علماء کی بدولت ہوئی ہے ۔

(حصول پاکستان، مؤلفہ پروفیسر احمد سعید تھانوی ایم اے)

حضرت مفتی اعظم رحمۃ اللہ علیہ نے دو مرتبہ قائد اعظم محمد علی جناح سے ملاقات کی پہلی مرتبہ ۱۹۳۸ء میں جب حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہٗ نے ایک وفد مولانا ظفر احمد عثمانی رح، ——— مولانا شبیر علی تھانوی رح اور مولانا مفتی محمد شفیع پر مشتمل قائد اعظم کے خیالات کی اصلاح کے لئے بھیجا تھا، دوسری مرتبہ ۹ جون ۱۹۴۷ء کو دہلی میں ملاقات ہوئی جب کہ ہندوستان کی اسمبلی کے مسلم ممبران کا ایک اہم تاریخی اجلاس منعقد ہوا، اس اجلاس میں شرکت کے لئے علامہ شبیر احمد عثمانی رح، مولانا ظفر احمد عثمانی رح اور حضرت مفتی صاحبؒ کو خاص طور پر مدعو کیا گیا تھا، اسی اجتماع میں پاکستان کو قبول کرنے کا فیصلہ کیا گیا، اس کانفرنس سے فراغت کے بعد ۱۱ جون ۱۹۴۷ء کو علامہ شبیر احمد عثمانی رح، مولانا ظفر احمد عثمانی رح اور حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رح نے قائد اعظم کی قیامگاہ پر ان سے تیسری ملاقات کی، اور دوسرے مسائل کے علاوہ پاکستان میں نظام اسلام کے نفاذ پر زور دیا، جس پر قائد اعظم نے فرمایا کہ:۔

"جب پاکستان میں مسلمانوں کی اکثریت ہوگی تو وہاں اسلامی دستور کے سوا اور کونسا دستور ہو سکتا ہے؟ میں نے کبھی قوم سے غداری نہیں کی، اور میں پھر اعلان کرتا ہوں کہ پاکستان کا نظام حیات اسلامی ہوگا، اور اس کا دستور قرآن و سنت کے موافق ہوگا"

(تعمیر پاکستان و علماء ربانی، مؤلفہ منشی عبدالرحمن خاں ملتانی)

غرضیکہ تحریک پاکستان میں اگر ایک طرف قائد اعظم اور دوسرے مسلم لیگی زعماء کی خدمات ہیں تو دوسری طرف طبقۂ علماء میں سے شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی رح، مفتی اعظم مولانا مفتی محمد شفیع دیوبندیؒ

اور شیخ الحدیث مولانا ظفر احمد عثمانی رحمہ اور ان کے رفقاء کی بھی اتنی ہی خدمات ہیں، اس لئے پاکستان کو دونوں طبقوں کی مشترکہ کوششوں کا ثمرہ خیال کرنا چاہیئے، حضرت مفتی اعظم رحمۃ اللہ علیہ، اور دوسرے بزرگوں نے پاکستان کے لئے یہ جد وجہد اور یہ تگ ودو محض اس مقصد کے لئے کی تھی کہ اس خطۂ زمین میں پاکستانی مسلمان قرآن وسنت کے قوانین نافذ کریں گے، اور اپنی تہذیب، اپنی ثقافت' اپنے علوم وفنون اور اپنی زبان اردو کو فروغ دینے کے لئے کسی کے تابع اور محتاج نہیں رہیں گے،

⊙

جناب مفتی عبدالرحمٰن خان صاحب

مفتیٔ اعظم اور دستوری جدوجہد

کسی تحریک کی کامیابی یا ناکامی کا دار و مدار اس تحریک کے بانی کی نیت پر ہوتا ہے۔ اگر وہ مخلص ہے، نیک نیت اور بے غرض ہے تو حق تعالیٰ اپنے بندگانِ خاص یعنی اہل اللہ کو اسکی تائید و حمایت پر مامور کر دیتے ہیں جن کی تائید و حمایت انہیں جلد اپنی منزلِ مقصود تک پہونچا دیتی ہے اگر کسی تحریک کا قائد خود غرض، مطلب پرست اور بدنہاد ہو، تو وہ یونہی بھٹکتا رہتا ہے اور گوہرِ مقصود تک نہیں پہنچ سکتا۔ گذشتہ نصف صدی میں آزادیٔ ہند کی جتنی تحریکیں اٹھیں تحریکِ پاکستان کے سوا تقریباً سب ناکام رہیں، تحریکِ پاکستان محض اس وجہ سے کامیاب ہوئی کہ اس کا بانی بے لوث، بے غرض اور نیک نیت تھا۔ اور دنیا میں ایک مثالی اسلامی سلطنت قائم کرانا چاہتا تھا۔ اسے قطعاً ہوسِ اقتدار اور حبِّ جاہ و مال نہ تھی۔ اسلئے اس مقلب القلوب نے اپنے خاص بندوں کو ان کی تائید و حمایت کی توفیق بخشی اور وہ گوشہ نشین علماء حق جو پبلسٹی یا شہرت کے دلدادہ نہ تھے قائدِ اعظم کی امداد و اعانت کے لئے میدانِ عمل میں نکل آئے اور انھوں نے عوام و خواص کو جہادِ پاکستان کے لئے تیار کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی جسکا یہ نتیجہ نکلا کہ قائدِ اعظم حصولِ پاکستان میں کامیاب ہو گئے۔ تاسیسِ پاکستان کے وقت یہ قائدِ اعظم کا حق تھا کہ وہ پاکستان کی پرچم کشائی کرتے مگر یہ جنگِ پاکستان، چونکہ انھوں نے علماءِ حق کی تائید و حمایت سے جیتی تھی اس لئے انھوں نے علماءِ حق کی خدماتِ پاکستان کے اعتراف کے طور پر، پاکستان کی پرچم کشائی کا شرف، مغربی پاکستان میں مولانا شبیر احمد عثمانی کو اور مشرقی پاکستان میں مولانا ظفر احمد عثمانی کو بخشا۔

اہل اللہ کے اس طائفہ میں جو شروع سے قائدِ اعظم کے شریکِ حال رہا۔ ایک مولانا مفتی محمد شفیع دیوبندی بھی تھے۔ اور قیامِ پاکستان کے بعد مفتیٔ اعظم پاکستان ٹھہرے۔ وہ خانقاہ نشینوں میں شمار ہوتے تھے اور گوشہ عافیت میں بیٹھ کر درس و تدریس اور تبلیغ و فتوای کی خدمات سر انجام دیتے رہتے تھے اور سیاست سے تقریباً الگ تھلگ رہتے تھے۔ لیکن تحریکِ پاکستان کی اہمیت انھیں کشاں کشاں میدانِ سیاست میں لے آئی — درس و تدریس کا شغل ترک کر دیا، صدر مفتی کے عہدہ جلیلہ سے مستعفی ہو گئے اور علانیہ قائدِ اعظم کی تائید و حمایت

شروع کردی، جس سے ہوا کا رخ بدل گیا جس کی اطلاع مجھے قائداعظم کے روحانی مربی نے اپنے گرامی نامہ مؤرخہ ۲۶ جنوری ۱۹۴۶ء میں بالفاظ ذیل دی :-

"الیکشن کے متعلق آپ کی آواز خاص حلقوں میں پہونچا دی ہے۔ حضرت مولانا شبیر احمد صاحب مدظلہ، حضرت مولانا ظفر احمد عثمانی، حضرت مولانا قاری محمد طاہر دیوبندی، حضرت مولانا محمد شفیع مفتی دیوبند اور بیسیوں علماء کرام (لاہور) تشریف لاتے ہیں اور مسلم لیگ کی بڑی شد و مد سے حمایت کرتے ہیں۔ ان بزرگوں کی آمد سے ہوا کا رخ بدل رہا ہے۔ قائداعظم جب اب کے لاہور آئیں گے تو ان کی خدمت اُس امر کے متعلق کر دوں گا۔" (انداز سخن صـ۶۶)

حضرت مفتی صاحب نے صرف تقریر ہی تک ہی خود کو محدود نہ رکھا بلکہ مسلم لیگ کی حمایت و تائید میں اپنے قلم حقیقت رقم کو بھی مصروف رکھا۔ بعض اونچے درجے کے رہنماؤں نے ۱۹۴۰ء میں رام گڑھ کانگریس کی صدارت کرتے ہوئے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ :-

"مسٹر گاندھی کی لیڈرشپ (قیادت و امامت) پر ایمان کامل (کامیابی کی تین شرطوں میں سے ایک اہم شرط ہے۔"

ان حالات نے مسلمانوں کو علماء حق سے یہ سوال کرنے پر مجبور کر دیا تھا کہ :-

۱ :- ایسے حالات میں جب کہ کانگریس میں ہندوؤں کا غلبہ ہے اور مسلمانوں کی اکثریت کو کسی بھی حال میں غلبہ پانے کی توقع نہیں، مسلمانوں کا بلا شرط اس میں داخل ہو کر حصول آزادی کے لئے کوشش کرنا اور ان سے مدد لینا جائز ہے یا نہیں؟

۲ :- بحالات بالا مسلم لیگ کی حمایت و شرکت اور اس کے زیر علم آزادی کی کوشش جائز ہے یا نہیں؟

۳ :- مسلم لیگ کا مطالبۂ پاکستان یعنی مسلم اکثریت کے صوبوں میں ان کی آزاد و خود مختار حکومت کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

یہ اور اسی نوعیت کے دیگر سوالات ملک کے گوشہ گوشہ سے آرہے تھے، کیونکہ ان کی حیثیت اصولی بھی اور ملکی و ملی سیاسی مسائل کے لئے بنیادی حیثیت رکھتے تھے۔ مجلس دعوۃ الحق بمبئی کے مذکورہ بالا استصواب کا جواب باصواب حضرت مولانا مفتی محمد شفیعؒ نے ایک مفصل اور طویل فتوٰی کی شکل میں لکھا۔ ۱۹۴۳ء میں آپ نے اس تاریخی فتوٰی میں قرآن و حدیث اور ائمہ سلف کے اجتہاد و تفقہ کی روشنی میں مذکورہ بالا سوالات کا تفصیلی جائزہ دیتے ہوئے لکھا ہے کہ :-

"اگر ہندوستان کا ایک مرکز ہے تو ہندو اکثریت کے سبب پورے ہندوستان کی پر ہندوؤں

کی حکومت ہوگی. گو اس میں بڑی جد و جہد کے بعد، کسی حد تک مسلمانوں کے حقوق کا تحفظ بھی کر لیا جائے (جس کی حالات موجودہ و سابقہ کی بناء پر کوئی توقع نہیں) یہ امر مسلّم ہے کہ اپنے اختیار سے اپنے اوپر غیر مسلم حکومت مسلط کرنے کا مطالبہ کرنا، اس کو قبول کرنا کسی طرح جائز نہیں ہو سکتا اور دو مرکز مسلم و غیر مسلم ہو جانے کی صورت میں مسلم مرکز میں حکومت مسلمانوں کی ہوگی جس کے سبب اپنی حدود میں اسلامی احکام کے موافق دستور اور نظام جاری کرنے پر قدرت حاصل ہوگی. نیز یہ باقتدار حکومت دوسرے صوبوں میں مسلمانوں کے حقوق کی پوری حفاظت اور نگرانی کر سکے گی. جو مسلمانوں کی اقلیت زدہ منتشر قوت کے ذریعہ کسی حال متصور نہیں۔

لہٰذا مسلمانوں کے لئے دو مطالبے ضروری ہیں. ایک اپنے لئے مستقل مرکز کا، جس کو پاکستان سے تعبیر کیا جاتا ہے. دوسرے مسلم اقلیتوں کے صوبوں میں مسلمانوں کی حفاظت کا غیر مبہم الفاظ میں مکمل معاہدہ جس کی نگرانی اسلامی مرکز کے فرائض و اختیارات میں داخل ہے۔"

مفتی صاحب کا یہ تاریخی فتویٰ پاکستان کی خشتِ اول کی حیثیت رکھتا ہے. کیونکہ اسی کی بنیاد پر مسلمان جوق در جوق مسلم لیگ کے جھنڈے تلے جمع ہونے شروع ہو گئے. اس فتویٰ کی مشاہیر علماء نے جن الفاظ میں تصدیق و توثیق کی، ان سے حضرت مفتی صاحب کی سیاسی بالغ نظری اور تبحرِ علمی کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے. شیخ الاسلام حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی رحمہ نے لکھا ہے کہ:۔

"میں نے اس فتویٰ کا بالاستیعاب مطالعہ کیا. ماشاءاللہ مسئلہ کو بالکل صاف کر دیا گیا ہے. اہلِ علم و نظر کے لئے کوئی گنجائش نہیں چھوڑی سب اطراف و جوانب واضح ہو کر سامنے آ گئے ہیں حق تعالیٰ مفتی صاحب کو جزائے خیر دے۔"

شیخ الحدیث حضرت مولانا ظفر احمد عثمانی نے لکھا ہے کہ:۔

"مولانا مفتی محمد شفیع صاحب مدظلہ کو اللہ تعالیٰ جزائے خیر عطا فرمائے، سیاسیات حاضرہ کا شرعی حکم اچھی طرح واضح فرما دیا. امید ہے کہ اس کے بعد مسائل حاضرہ میں کسی اور فتویٰ کی حاجت باقی نہ رہیگی۔"

ان کے علاوہ اس تاریخی اور طویل فتوٰی پر حضرت مولانا سید سلیمان ندوی رح مولانا ظفیل احمد تھانوی اور حضرت مولانا خیر محمد جالندھری وغیرہ کی تصدیقات بھی ثبت ہیں جسے کثیر تعداد میں ایک کتابچہ کی شکل میں شائع کیا گیا اور اخبارات میں چھپا۔

اربابِ مسلم لیگ کو بالعموم اور حضرت قائداعظم کو بالخصوص مجدد الملت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کو بغرض تبلیغ جو وفود بھیجتے تھے. ان میں دربار اشرفیہ کے نمائندہ کی حیثیت سے بھی حضرت مفتی صاحب شریک

ہے۔ قائداعظم کے نام دربارِ اشرفیہ سے جو تبلیغی خطوط جاری ہوتے رہے، ان کی نقول حضرت مفتی صاحب نے بھی اپنے پاس محفوظ رکھیں، چونکہ یہ طائفہ عام سیاسی لیڈروں کی طرح اپنی سرگرمیوں کی پبلسٹی کے منافی سمجھتا تھا، اس لئے وہ منظر عام پر نہ آسکیں۔ ان حضرات کی ان تبلیغی مساعی جمیلہ کا راز جب حضرت قائداعظم کے روحانی مربی نے اس ناچیز پر ظاہر کیا جن کی زیرِ تربیت یہ ناچیز بھی تھا، تو اس روز سے ان کی اجازت سے میں نے تبلیغی وفود میں شامل علماءِ کرام سے رابطہ قائم کر کے، ان کی تفصیل وخط وکتابت حاصل کرنے کی کوشش شروع کر دی، اس ضمن میں میں نے اپنے خصوصی کرم فرما حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب کو بھی عریضہ لکھا، تو انھوں نے جواب دیا:۔

"جناح صاحب کے خطوط کو تلاش کیا۔ بعض ملے مگر وہ بھی پنسل سے نقل کئے ہوئے ہیں، پڑھنا مشکل ہے اس لئے بہتر یہ ہے کہ اس بارہ میں مولانا شبیر علی صاحب کو تھانہ بھون خط لکھ دیں اور ان سے اس مکاتبت کی اشاعت میں مشورہ بھی لے لیں تو مناسب ہے یا نہیں؟ اگر وہ مناسب سمجھیں گے تو ان کو نقل کر کے بھیج دیں گے۔" (انداز سخن صـ۱۴۷)

حضرت مفتی صاحبؒ کی نشاندہی پر راقم الحروف نے فی الفور حضرت مولانا شبیر علی تھانوی سے رابطہ قائم کیا تو انھوں نے کہا کہ:۔

"قائدِ اعظم کے خطوط میرے پاس ہیں مگر کاتب یا مکتوب الیہ کی اجازت کے بغیر شائع کرنا مناسب نہیں۔"

بہرحال اس تگ ودو میں راقم جو کچھ حاصل کر سکا اس کی تفصیلات میں اپنی تصنیفات "تعمیرِ پاکستان" اور علماءِ ربانی" "سیرتِ اشرف" "معمارانِ پاکستان" اور کردارِ قائداعظم میں پیش کر چکا ہوں۔

مفتی صاحبؒ نے ۱۹۴۳ء میں جو تاریخی فتوای دیا اس کی بنا پر جہادِ پاکستان نے زور پکڑا۔ ہندوؤں نے تحریک پاکستان کو ناکام بنانے کے لئے اپنے تمام وسائل میدان میں جھونک دیئے اور یہ پروپیگنڈا زور پکڑ گیا کہ مسلم لیگ انگریزوں کے کاسہ لیس اور بے دین امراء کی نمائندہ ہے جسے علماءِ حق کی تائید حاصل نہیں۔ اس پروپیگنڈا سے مسلم لیگی حلقوں میں ایک کھلبلی سی مچ گئی کیونکہ پاکستان کے نام پر لڑے جانے والے الیکشن سر پر آ رہے تھے۔ ہندوؤں کے مذکورہ بالا پروپیگنڈا کی بنا پر ارباب مسلم لیگ کو اس بات کا شدید احساس ہوا کہ علماءِ ربانی کی تائید وحمایت کے بغیر یہ انتخابات جیتنے ممکن نہیں۔ حالات کی نزاکت اور قائدین مسلم لیگ کے تقاضا پر حضرت مولانا مفتی محمد شفیع نے ملک کے مقتدر علماءِ کرام علامہ شبیر احمد عثمانی، مولانا ظفر احمد عثمانی، مولانا محمد طاہر قاسمی، مولانا محمد ابراہیم سیالکوٹی، ابوالبرکات مولانا عنایات احمد، مولانا عبدالرؤف دانا پوری، مولانا آزاد سبحانی، مولانا غلام مرشد خطیب جامع شاہی کو کلکتہ میں جمع کر کے مسلم لیگ کی تائید وحمایت کے لئے جمعیت علماءِ اسلام کی تشکیل کی، اور ایک قرار داد

کے ذریعہ مسلم ووٹروں سے اپیل کی کہ مسلم لیگ کے نمائندہ کے سوا کسی دوسری جماعت کے نمائندہ کو ووٹ دینا

"اتحادِ ملت، مفادِ ملت، استقلالِ اسلام اور مستقل قوم کے مقاصد کے خلاف ہے کیوں کہ
پاکستان کے سوال کا فیصلہ بڑی حد تک ان انتخابات کے نتائج پر موقوف ہے"

اتنے میں لیاقت کاظمی الیکشن سر پر آگیا، ہندوؤں نے نوابزادہ لیاقت علی خاں کو ہرانے کے لئے بڑی چالیں چلیں، مسلمان ووٹروں کو خریدنے کے لئے   ہر لوں نے اپنی تجوریوں کے منہ کھول دیئے ... دوسری طرف نوابزادہ صاحب کے مقابلہ میں جمیعت العلماء اسلام کے نائب صدر مولانا ظفر احمد عثمانی کے ایک عزیز محمد احمد کاظمی کو لا کھڑا کیا تاکہ ارباب جمعیت اپنی عزیز داری کی وجہ سے کاظمی صاحب کی مخالفت نہ کر سکیں۔ اس چال نے مسلم لیگ کو بہت بڑی آزمائش میں ڈال دیا۔ جب کانگرسی نمائندہ محمد احمد کاظمی کی جمیعت العلماء ہند نے تائید شروع کر دی —

——————— تو اب سب لیگیوں کی نظریں پھر دیوبند کی طرف اٹھیں۔ نوابزادہ لیاقت علی خاں نے سردار امیر اعظم کو (جو بعد میں پاکستان کے وزیر مملکت بنے) ایک خط دے کر علامہ شبیر احمد عثمانی اور مولانا ظفر احمد عثمانی کے پاس بھیجا اور انھیں لکھا کہ اگر آپ اس وقت دورہ پر نہ نکلیں گے تو مسلم لیگ کی کامیابی دشوار ہے جس پر مولانا ظفر احمد عثمانی کو اپنے ایک قریبی رشتہ دار کے مقابلہ میں مسلم لیگ کی امداد کے لئے بھیج دیا گیا۔

مسلم لیگ کو یہ پہلا معرکہ اس مقام پر لڑنا تھا جو سارے کا سارا علماء کے زیر اثر تھا ———————

——————— مولانا ظفر احمد عثمانی اگرچہ سردار امیر اعظم خاں کے ہمراہ سہارنپور، مظفر نگر، ڈیرہ دون، اور بلند شہر کی خاک چھانتے پھرتے تھے مگر ہوا کا رخ صحیح نہیں ہو رہا تھا۔ خورجہ بلند شہر اور ہاپوڑ میں مسلم لیگ کا کوئی نام لیوا نہ تھا۔ علی گڑھ کے پروفیسر حلیم اور پروفیسر عمر کی رپوٹ پر فیصلہ ہوا کہ یہاں کے لوگ شرعی فتویٰ کے بغیر اپنی رائے نہ بدلیں گے اور دیوبند کے فتویٰ کے بغیر یہاں کام نہیں چلے گا۔ لہٰذا وہاں سے فی الفور فتویٰ منگایا جائے مگر وہاں جانے کی کسی کو ہمت نہ پڑ تی تھی۔ بالآخر خواجہ اشکار حسین کو دیوبند بھیجا گیا اور وہ بڑی رد و کد کے بعد وہاں سے ایک فتوای لائے اور اسے پوسٹروں کے ذریعہ شائع کیا گیا مگر اس کا کوئی اثر نہ ہوا لوگوں نے مطالبہ کیا کہ جب تک صدر مفتی دیوبند مولانا محمد شفیع کا فتویٰ نہیں آئے گا ہم نوابزادہ صاحب کو ہرگز ووٹ نہ دیں گے چنانچہ خواجہ صاحب دوبارہ دیوبند گئے اور حضرت مفتی صاحب کا فتوای لے آئے جس سے نوابزادہ صاحب نے اطمینان کا سانس لیا۔ ہوا کا رخ بدل گیا اور نوابزادہ صاحب تین ہزار ووٹوں کی کثرت سے انتخاب جیت گئے علماء ربانی کی مدد سے بالعموم اور حضرت مفتی صاحب کے فتوای سے بالخصوص مسلم لیگ نے یوپی میں کانگرس کو پہلی شکست دی

سنہ ۱۹۴۷ء میں جب حکومت برطانیہ نے ہندوستان سے کوچ کرنے کا فیصلہ کیا تو نئی صورت حال پر غور کرنے کے لئے ۹ جون سنہ ۱۹۴۷ء کو دہلی میں مشترک ہندوستان کی اسمبلی کے مسلم ارکان کا ایک اہم اجتماع ہوا جس میں شرکت کے لئے علامہ شبیر احمد عثمانی اور مولانا مفتی محمد شفیع کو خاص طور پر مدعو کیا گیا جن کی بدولت مسلم لیگ نے انتخابات جیتے تھے۔ وہاں پورے غور و خوض کے بعد پاکستان قبول کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ جس سے تاریخ ہند میں ایک نئے باب کا اضافہ ہوا۔ جس سے عیاں ہے کہ مفتی صاحب تعمیر پاکستان میں ایک بنیادی پتھر کی حیثیت رکھتے تھے۔ ان ہر دو حضرات کو حضرت قائد اعظم کے ایماء پر مدعو کیا گیا تھا جو دل سے ان کا احترام کرتے تھے۔

پاکستان کی جنگ جیتنے کے بعد ۱۱ جون سنہ ۱۹۴۷ء کو مولانا شبیر احمد عثمانی اور مولانا مفتی محمد شفیع صاحب جب قائد اعظم کو مبارک باد دینے ان کی کوٹھی پر پہونچے اور انہیں مبارک باد دی۔ تو قائد اعظم نے بڑی اعلیٰ ظرفی اور کشادہ دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے فرمایا:-

"مولانا یہ مبارک باد آپ کو ہے کہ آپ ہی کی کوششوں سے یہ کامیابی ہوئی ہے۔"

(تعمیر پاکستان و علماء ربانی ص۱۵۴)

اور اس کے ساتھ ہی قائد اعظم نے فرمایا کہ مجھے اس وقت بڑا فکر سلہٹ اور سرحد کے ریفرنڈم کا ہے۔ اگر پاکستان اس ریفرنڈم میں ناکام رہا تو یہ بہت بڑا نقصان ہوگا۔ جس پر ان حضرات نے فرمایا:-

"کیا آپ چاہتے ہیں کہ اس ریفرنڈم میں پاکستان کامیاب ہو جائے؟"

اس پر قائد اعظم آبدیدہ ہو گئے اور فرمایا:-

"سرحد پاکستان کی ریڑھ کی ہڈی ہے اور سلہٹ کا علاقہ بھی مشرقی پاکستان کے لئے ایسا ہی ہے۔ میں دل سے چاہتا ہوں کہ پاکستان اس ریفرنڈم میں کامیاب ہو۔" (بحوالہ صدر ص۱۵۵)

چنانچہ اس کے بعد ساری دنیا نے دیکھا کہ کانگریسیوں، سرخ پوشوں اور خان برادران (جنھوں نے ہندوؤں کے رشتے ناطے کر رکھے تھے) کے گڑھ میں مولانا شبیر احمد عثمانی اور مولانا مفتی محمد شفیع نے کایا پلٹ کر رکھ دی۔ مولانا ظفر احمد عثمانی نے سلہٹ میں کانگریسیوں کے سارے منصوبے خاک میں ملا دیئے۔ اسطرح دونوں صوبوں کے ریفرنڈم جیت کر ان حضرات نے قائد اعظم کی دلی آرزو پوری کر دی۔ اور اس کے لئے جب انہیں مبارک باد کہنے گئے تو قائد اعظم نے ان کی خدمات پاکستان کا ان الفاظ میں اعتراف کیا:-

"اس مبارک باد کے آپ مستحق ہیں، میں خول سیاستدان سہی لیکن آپ نے بروقت مدد کر کے مذہب کی روح لوگوں میں پھونک دی۔" (تجلیات عثمانی ص۶۹۶)

پاکستان بننے کے بعد دستور سازی کی مہم میں بھی مولانا شبیر احمد عثمانی رہ اور مولانا مفتی محمد شفیع پیش پیش رہے۔ قرارداد

مقاصد بھی انہی حضرات کا نتیجۂ فکر تھی، علامہ شبیر احمد عثمانی کے انتقال کے بعد تمام تر بوجھ حضرت مفتی صاحب کے کندھوں پر آپڑا، علامہ سید سلیمان ندوی کی وفات کے بعد دستوری سرگرمیوں میں اور اضافہ ہوگیا کیونکہ دستور سازی کے ہر مرحلہ میں آپ کو شریک ہونا پڑا اور اس کے ساتھ ہی انھیں اسلام دشمن اور اسلام طبقہ کی تخریبی کارروائیوں کا بھی مقابلہ کرنا پڑا۔ جو مفتی صاحب کی دستوری سفارشات کے خوف گمراہ کن پروپیگنڈا کر رہا تھا، اور عوام میں ان کے خلاف بدگمانی پھیلا رہا تھا جس میں بعض مقرب بارگاہ ارباب اقتدار بھی شامل تھے، اور اسلامی دستور کی تدوین میں کی راہ میں سنگ راہ بنے ہوئے تھے میں نے اس بے بنیاد پروپیگنڈا کی تردید کے لئے جب مفتی اعظم پاکستان کو لکھا تو انھوں نے عام سیاسی لیڈروں کی طرح کوئی مجمل اخباری بیان داغنے کی بجائے مجھے لکھا کہ:۔

"گرامی نامہ نے مسرور فرمایا، میرے خیال میں جہاں تک دیانۃً ہمیں کرنا ضروری تھا وہ ہم نے کر لیا ہے کیونکہ میں یہ سمجھے ہوئے ہوں کہ ہمارے ذمہ اصل کام تو یہ تھا کہ دستور ساز اسمبلی کے لئے اپنے علم و فہم کے مطابق صحیح اسلامی اصول پیش کر دیں اور دوسرا کام حکومت کے غلط رویہ نے یہ بھی ہمارے ذمہ لگا دیا کہ وہ ہمارے ذریعہ عوام کو مغالطہ نہ دے سکے۔

سو اول امر کے متعلق جتنا حصہ مرتب ہوا، اس پر ہم نے بلا لومۃ لائم اپنی بصیرت کے موافق چیزیں پیش کر دیں، دوسرا کام ایک متفقہ بیان سے اور میں نے اپنے بیان سے کر دیا اب اگر کسی شخص کو خود ہم ہی پر بدگمانی ہو کہ ہم نے غلط اصول پیش کئے ہیں، تو اپنی صفائی پیش کرنا، میں تو غیرت کے خلاف سمجھتا ہوں جن کو ایسی بدگمانی ہو وہ ہماری بات نہ مانیں" (انداز سخن ص<u>۱۵۱</u>)

اس پر میں نے ان کی خدمت میں دوسری تجویز یہ بھیجی کہ سرکاری حلقے دستوری سفارشات کے سلسلہ میں آپ کے خلاف جو زہر پھیلا رہے ہیں، اس کی تردید میں آپ اپنی سفارشات شائع فرما دیں، تاکہ لوگ خود ہی اندازہ لگالیں کہ کون حق بجانب ہے۔ اس کے جواب میں حضرت مفتی صاحب نے تحریر فرمایا کہ:۔

"اپنی سفارشات کی اشاعت کا سوال سو اس کا مطالبہ حکومت سے ہی ہو سکتا ہے ہم اگر ایسا کریں، تو جب تک ہم نے اس ذمہ داری کو اپنے سر رکھنا صحیح سمجھا ہوا ہے۔ اور اس کا انجام سامنے ہے ہیں ہمارے لئے ایسا کرنا قطعاً مناسب نہیں بلکہ ہم اس کو اصل مقصد کے لئے مضر سمجھتے ہیں۔ مزید تفصیل لکھنے سے قاصر ہوں" (بحوالہ صدر)

ابھی یہ معاندانہ و متعصبانہ پروپیگنڈا شروع تھا کہ ایک اور شوشہ یہ چھوڑ دیا گیا کہ:۔

۱:۔ اسلام کا سرے سے کوئی دستور مملکت ہی نہیں۔

۲:۔ اس کی عملی شکل کہیں بھی نظر نہیں آتی۔

۳:۔ اسلام کے مبینہ اصولوں پر تمام علماء متفق نہیں ہیں۔

اس چیلنج کا جواب ہر فرقہ کے ۳۱ علماء کرام نے ۱۹۵۱ء میں کراچی میں جمع ہوکر متفقہ طور پر اسلامی مملکت کے بنیادی اصول، مرتب کرکے شائع کر دیا۔ ان بنیادی اصولوں کی تیاری کے سلسلہ میں حضرت مفتی صاحب کو سب سے زیادہ کاوش کرنی پڑی اس کے بعد مسٹر پرویز نے اعلان کر دیا کہ

"قرآن میں دستورِ مملکت کے متعلق ایک لفظ بھی موجود نہیں"

اس چیلنج کا جواب بھی مفتی اعظم پاکستان کو لکھنا پڑا جو "دستورِ قرآنی" کے نام سے شائع ہوا اس میں اُنھوں نے حکومت کے اغراض و مقاصد، طرزِ حکومت، فرائضِ حکومت، اوصافِ صدرِ مملکت کے متعلق ۸۰ دستوری دفعات قرآن کریم سے بالاجمال پیش کرکے ثابت کر دیا کہ جس دستورِ اسلامی کا مطالبہ مسلمانانِ پاکستان کی طرف سے کیا جا رہا ہے وہ کتاب اللہ میں موجود ہے، علماء و فقہاء کے اجتہادات و قیاسات پر مبنی نہیں۔

دستوری جدوجہد کے سلسلہ میں حضرت مفتی صاحب کو کتنی پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا، اس کا اندازہ میرے نام ان کے گرامی نامہ مورخہ ۲۱ نومبر ۱۹۵۵ء کے مندرجہ ذیل اقتباس سے بآسانی لگایا جا سکتا ہے۔ آپ لکھتے ہیں کہ:۔

"اتنا تو آپ کو معلوم ہو ہی گیا ہوگا کہ یہاں پھر از سرِ نو دستور کا مسئلہ اسمبلی پارٹیوں میں زیرِ بحث ہے۔ میرے جس کام کے متعلق آپ تحریر فرماتے ہیں، اسی کام میں شب و روز اس طرح لگا ہوا ہوں کہ عرض کرنا مشکل ہے اخبارات میں اپنی کارروائیوں کو اچھالنے کی عادت بھی نہیں، اور مصلحت بھی نہیں، بحمداللہ دستور بنانے والی ہر پارٹی کے ہر ممبر اور اس کے نظریات کے واقف ہونے، اس سے ملکر سمجھنے سمجھانے کا سلسلہ جاری ہے بہت ہی مایوسی کے بعد اب کچھ امید کی جھلک نظر آنے لگی ہے۔

اُدھر ہر رات میں یہاں جلسے ہو رہے ہیں ہم نے ان جلسوں کو دستوری کام کا ذریعہ سمجھ کر اپنی شرکت بھی ضروری سمجھی، فتوئی، درس دارالعلوم کے مستقل مشاغل تو دائمی ہیں، ان میں کمی کرنے کی گنجائش نہیں آپ ایک روز میرے حالات کو دیکھ لیتے تو حیرت کرتے کہ اس بڑھاپے میں کس طرح یہ سب کام کر رہا ہوں دستوری مہم کے ساتھ مصارف ہیں کہ عرض کرنا دشوار ہے، پلے اوپر کہاں تک برداشت کروں جو کوئی ایسا آدمی نظر آتا ہے، اس کو دستوری مہم پر خرچ کرنے کا مشورہ دیتا ہوں۔ (انداز بیان ص ۱۵۲)

پاکستان میں اسلامی آئین مرتب اور نافذ کرانے میں مفتی اعظم پاکستان نے جو جنگ وہ آخر وقت تک جاری رکھی، اس کی تفصیل کے لئے ایک دفتر درکار ہے۔ ایک طرف تو حضرت مفتی صاحب اور ان کے رفقاء کار مولانا ظفر احمد عثمانی، مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا مفتی محمد حسن، مولانا ابوالحسنات، اور مولانا داؤد غزنوی وغیرہ دستوری مہم میں سرگرم تھے اور دوسری طرف ملک کی نامور شخصیات قائداعظم کی تاریخی کامیابی اور تعمیر پاکستان کو اپنی کارستانی ظاہر کرنے کے

لئے کہ بیں لکھ رہے تھے اور بیان دے رہے تھے۔ میں نے جب ان رہنماؤں کی سیاسی چوری اور سینہ زوری کی طرف حضرت مفتی صاحب کی توجہ مبذول کرائی تو انھوں نے ۱۹ اگست ۱۹۵۵ء کے خط میں پہلے تو مجھے یہ تحریر فرمایا کہ :-

"اب چونکہ اپنی جماعت کا کوئی نظم نہیں، دوسرے لوگ کیے کرائے کام پر قابض ہو کر اصل کام کرنیوالوں کو نظر انداز کرنا چاہتے ہیں، اس نظر انداز کرنے میں اگر کسی شخص کا نقصان بھی ہوتا تو قابل التفات نہ تھا۔ یہاں تو علماء کی پوری جماعت کو کالعدم اور بیکار ثابت کیا جانے لگا ہے۔" (انداز سخن صـ۱۵۳)

اس کے بعد ۲۰ ستمبر ۱۹۵۵ء کے خط میں یہ تحریر فرمایا :-

"صرف ایک مصلحت ضروری ہے کہ پاکستان بنانے والے تو اکثر رخصت ہوگئے، اور ہوتے جاتے ہیں، اب ہر جماعت اور ہر لیڈر اپنے آپ کو ہی بانی پاکستان ثابت کرنے کی فکر میں رہتا ہے ہمارے بزرگوں کا نام کوئی بھی لینے کے لئے تیار نہیں۔ اس لئے اگر یہ چیزیں انضباط میں آگئیں تو مناسب ہے کہ امر واقعی کا اظہار ہو کر جماعت کے لئے مفید ہوں گی۔" (ایضاً صـ۱۵۴)

میں جب بھی ان سے تقاضا کرتا کہ مسلم لیگ اور دستور سازی کے سلسلہ میں آپ نے جو کچھ کیا ہے اُسے آنے والی نسل کی آگاہی کے لئے ضبط تحریر میں لانا شد ضروری ہے تو یہی لکھ دیتے کہ :-

"بہت شرمندہ ہوں کہ آپ کے کئی خطوط کا جواب نہ دے سکا، لیکن یہ حقیقت ہے کہ اس لئے دوستوں سے اپنے قصور کا اعتراف کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔"

کبھی یہ لکھ کر بھیج دیتے کہ :-

"حیا مانع ہے کہ اپنی حقیر خدمات کو بزرگوں کے کارنامے کیسا تھ ذکر کروں کہیں ان کے کارناموں کی بے وقعتی کا سبب نہ بن جائے۔ تاہم تعمیل حکم کے لئے کچھ لکھ رہا ہوں، اگر پسند آئے درج فرمائیں ورنہ جی تو یہی چاہتا ہے کہ بزرگوں کے احوال کے ساتھ مجھ جیسے نااہل ان کا ذکر کرنا مناسب نہیں۔"

یہ عجز و انکسار اور بزرگوں کا ادب و احترام بہت کم میں دیکھنے میں آیا ہے۔ میں بھی آسانی سے پیچھا چھوڑنے والا نہ تھا۔ میں آپ سے کچھ نہ کچھ لکھنے کا بدستور تقاضا کرتا رہا، آخر آپ اس بنا پر کچھ لکھنے کے لئے آمادہ ہوگئے کہ :-

"میری ہی تو کیا حیثیت! اور میری خدمات کی کیا حیثیت! لیکن میں نے اس کام کو اس غرض سے ضروری سمجھ کر اختیار کیا ہے کہ اس زمانے میں اسکی سخت ضرورت ہے کہ یہ بتلایا جایا کہ بنائے پاکستان میں کن بزرگوں اور خدام نے کام کیا ہے، میں اسکو بھی دستوری مہم کی ایک کڑی سمجھ رہا ہوں اسلئے ان حالات میں جتنا وقت ملتا ہے لکھتا ہوں اور اسی فکر میں لگا ہوا ہوں کہ کسطرح جلد سے جلد اس کو مکمل کر کے ارسال خدمت کروں۔"

افسوس کہ آپ نے اس سلسلہ میں جو کچھ لکھا وہ مجھ تک نہ پہونچ سکا اور نہ اب تک شائع ہوا۔

علامہ خالد محمود صاحب
برمنگھم، انگلینڈ

ایک خاموش مجاہد

شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن کے دور آخر کے متوسلین میں مولانا مفتی محمد شفیع صاحب ایک ممتاز مقام رکھتے تھے۔ آپ علماء دیوبند کے اس طبقہ سے تھے جنہوں نے حدیث کی تکمیل تو حضرت مولانا السید انور شاہ کشمیریؒ سے کی لیکن حضرت شیخ الہند کی علمی اور روحانی سرپرستی کا زمانہ بھی پایا اور آپ سے بقدر ہمت او رحالات استفادہ بھی کیا شیخ الحدیث مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ اور حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحب دامت برکاتہم بھی اسی طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں حضرت مفتی صاحبؒ کی پیدائش ۱۸۹۷ عیسوی میں ہوئی آپ حضرت شیخ الہندؒ کی وفات کے وقت   برس کے تھے۔

دارالعلوم دیوبند کی علمی شہرت ان دنوں عروج پر تھی ایک طرف مولانا انور شاہ صاحبؒ کا درس حدیث امام طحاویؒ، علامہ ذہبی، حافظ عسقلانی اور علامہ عینی کی یاد دلاتا تھا تو دوسری طرف مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کے درس سے امام غزالی علامہ رازی شاہ ولی اللہ اور مولانا نانوتویؒ کی یاد تازہ ہوتی تھی ان اسلاف کے علوم ان حضرات کے درس و بیان اور قلم و زبان سے اس شوکت علمی سے پھیلتے کہ دارالعلوم دیوبند پورے برصغیر پاک و ہند کے لیے ایک بقعہ نور اور روشنی کا مینار بن چکا تھا عالم اسلام میں اس کے چرچے تھے اور مصر کے فضلاء کے لیے دارالعلوم کی حاضری ایک سعادت اور بہترین علمی یاد تھی علمی شباب کے اسی ماحول میں مفتی محمد شفیع صاحبؒ نے علمی آنکھیں کھولیں اور دیکھتے دیکھتے اساتذہ کے سامنے ہی بلند پایہ مسند تدریس پر فائز ہو گئے اور پھر ان کے فیض علمی سے پورے برصغیر پاک و ہند کی فضا جگمگا اٹھی ان دنوں آریہ سماج کی تحریک زوروں پر تھی جگہ جگہ مسلمانوں اور آریوں میں مناظرے ہو رہے تھے حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ

نے آپ کو کئی جگہ آریوں کے مقابلہ میں بھیجا آپ نے حقانیت اسلام پر کامیاب مناظرے کئے اور آریوں پر فتح حاصل کی۔

فقہ وادب کے ساتھ خاص مناسبت: براعت فنون کے ساتھ آپ کو تمام علوم اسلامی میں وسعت نظر حاصل تھی لیکن ممتاز ذکاوت اور ذہانت نے آپ کو فقہ کا شیدائی بنا دیا تھا جزئیات کے ساتھ کلیات پر پوری دسترس تھی اور اصول فقہ آپ کا مزاج علمی بن چکے تھے۔

یہ عجیب بات ہے کہ فقہ اور ادب کا قدیم الایام سے چولی اور دامن کا ساتھ رہا ہے امام محمدؒ (۱۸۹ھ) اپنے وقت میں فقہ کے امام تھے تو لغت و ادب میں بھی وہ سیبویہ کے اقران میں سے تھے اور ان کا قول لغت میں حجت سمجھا جاتا تھا۔ علامہ برہان الدین المرغینانی صاحب ھدایہ (۵۹۳ھ) فقہ و ادب دونوں میں بارع اور ممتاز مقام رکھتے تھے اس دور آخیر میں حضرت مولانا اعزاز علیؒ ادب اور فقہ دونوں کے شیخ تھے تو حضرت مفتی محمد شفیع صاحبؒ بھی فقہ وادب میں گویا اپنے وقت کے امام تھے راقم الحروف نے کئی دفعہ حضرت علامہ مولانا سید سلیمان ندویؒ سے حضرت مفتی صاحب کے ادبی کمال کی تعریف سنی ندوۃ العلماء لکھنؤ دینی علوم کے ساتھ اپنے ادبی اور تاریخی ذوق میں پورے ہندوستان میں ممتاز ہے۔ حضرت علامہ سید سلیمان ندویؒ اس درسگاہ کے آفتاب سمجھے جاتے تھے ان کی زبان سے حضرت مفتی صاحبؒ کی براعت ادبی کو خراج تحسین حقیقت کا ایک بہت بڑا اعتراف ہے۔

ایک عرصہ گذرتا ہے کہ لاہور میں عالمی شہرت کے دانشوروں کی جو علوم اسلامی سے دلچسپی رکھتے ہیں ایک عظیم مجلس مذاکرہ منعقد ہوئی تھی اس میں یورپ، امریکہ، افریقہ مشرق وسطیٰ اور پاک و ہند کے کثیر تعداد علماء مستشرقین اور ماہرین قانون جمع تھے اس مذاکرہ میں ذریعہ زبان انگریزی تھی یا عربی اور انہی میں سے مقرر کو اظہار خیال کرنا ہوتا تھا یہ موقع علماء پاکستان کے لیے بہت اہم تھا اور اس میں پاکستان کی بھی عزت کا سوال منطوی تھا اس موقع پر حضرت مفتی محمد شفیع صاحب، حضرت مولانا محمد یوسف صاحب بنوریؒ اور مولانا شمس الحق افغانی ہی وہ بزرگ تھے جنہوں نے علماء مصر و شام اور مستشرقین امریکہ و یورپ کے سامنے اسلام کے قانونی ابواب اور قانون میں اجتہادی پہلوؤں پر عربی میں تقریریں کیں اور سوالات کے جوابات دیئے باہر کے علماء و فضلاء پر ان علماء پاکستان نے گہرے نقوش چھوڑے حضرت مفتی صاحبؒ اس مذاکرے میں اپنے پورے ادبی ذوق سے فقہی مسائل پر رطب اللسان تھے۔

رب العزت جن ارباب علم کو فقہ اور ادب میں بر اعتنا عطا فرماتے ہیں انہیں قرآن پاک کی عربیت اور ادب سے پھر ایک خاص مناسبت مل جاتی ہے۔ علامہ زمخشری اور علامہ آلوسی کی مثالیں آپ کے سامنے ہیں فقہ اور ادب کے کمال سے تفسیر قرآن کا شوق اور مسائل و معارف کا ذوق اور بڑھتا ہے اسی ذوق اور ضرورت نے حضرت مفتی صاحبؒ سے معارف القرآن جیسی مبسوط تفسیر لکھوائی اور اسی مناسبت علمی سے آپ نے اپنے شیخ حکیم الامت حضرت تھانویؒ کے ارشاد سے قرآن کریم کی آیات احکام کی دو منزلوں کی عربی تفسیر لکھی تفسیر معارف القرآن کا تفسیری مواد تو زیادہ تر حضرت تھانویؒ اور علامہ عثمانیؒ کا فیضان ہے لیکن معارف و مسائل جو اس تفسیر کی جان ہیں حضرت مفتی صاحبؒ کے اپنے ادبی اور فقہی ذوق کی شہادت ہیں۔

<u>آل عثمانؓ کا فیض علمی</u>:- اللہ تعالیٰ نے امیر المؤمنین امام المتقین سیدنا حضرت عثمان ذوالنورین رضی اللہ عنہ سے قرآن کریم کی جو خدمت لی وہ کسی سے پوشیدہ نہیں جامع آیات القرآن کی اولاد امجاد میں بھی یہ فیض خصوصی طور پر چلا آرہا ہے اور تاریخ میں اس کے بہت شواہد ہیں اسی دور آخر کو لیجیے شیخ الہندؒ نے ترجمہ و حواشی کا بیڑہ اٹھایا تو شیخ الاسلام مولانا شبیر احمدؒ نے ان کی تکمیل کی اور یہ دونوں حضرات آل عثمان میں سے تھے پھر حضرت مفتی محمد شفیع صاحبؒ نے عصر حاضر کے تقاضوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے تفسیر معارف القرآن آٹھ ضخیم جلدوں میں تحریر فرمائی یہ بھی آل عثمان کا فیضان تھا آیات احکام کی تفسیر میں بھی زیادہ حصہ آل عثمان کا رہا ہے جو مولانا ظفر احمد عثمانی اور مفتی محمد شفیع صاحبؒ کی خدمات تھیں۔

<u>سیاسی نقطہ نظر</u>:- آپ ابتداء میں حضرت شیخ الہندؒ سے بیعت تھے ان کے بعد آپ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے حلقہ ارادت میں داخل ہوئے اور سلوک کی منازل طے کر کے حضرت تھانویؒ سے خلافت بھی پائی اس وابستگی سے آپ کے سیاسی ذہن پر حضرت تھانویؒ کی چھاپ تھی، حضرت تھانویؒ مسلمانوں کی علیحدہ سیاسی تنظیم کے حامی اور مسلم لیگ کے ہمنوا تھے، مسلم لیگ کے جلسوں میں حکیم الامت مولانا اشرف علی زندہ باد کے نعرے لگتے اور پورے ملک میں حضرت تھانویؒ کے اس موقف کی شہرت تھی اور مسلم لیگ کے لیے آپ کا نام ایک بڑی قوت بن چکا تھا۔

حضرت تھانویؒ کی وفات کے بعد حضرت مفتی صاحبؒ سیاسی امور میں زیادہ تر خاموش اور دارالعلوم کی علمی خدمت میں مصروف رہے شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ جیسے اکابر مسلم لیگ کے خلاف تھے حضرت مفتی صاحبؒ ان اکابر کے احترام میں خاموش تھے لیکن آپ کی سیاسی رائے مسلم لیگ

کے حق میں تھی شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانیؒ جمعیت علماء ہند سے مستعفی ہوئے اور نظریہ پاکستان کی حمایت کی تو حضرت مفتی صاحبؒ کو ان کی قیادت میں سیاسی کام کرنے کا موقع مل گیا۔ حضرت مفتی صاحبؒ میں احترام اکابر کا جذبہ انتہا پر تھا حضرت مدنیؒ کے موقف کے خلاف رائے رکھنی آپ کے احترام کے خلاف تھی حضرت عثمانیؒ آگے آئے تو یہ سب ہم پایہ بزرگ تھے اور ایک دوسرے کے برابر کام کر سکتے تھے حضرت مفتی صاحبؒ حضرت عثمانیؒ کے زیر قیادت تحریک پاکستان میں آگے نکلے اور ایسے نکلے کہ پھر پاکستان کے ہی ہو کر رہ گئے۔

انجمن حزب الاحناف ہند لاہور کا فتویٰ:۔ ان دنوں انجمن حزب الاحناف ہند لاہور کے مولانا ابوالبرکات سید احمد نے مسلم لیگ کے بارے میں فتویٰ دیا تھا۔

" لیگ کی حمایت کرنا اور اس میں چندے دینا اس کا ممبر بننا اس کی اشاعت و تبلیغ کرنا منافقین و مرتدین کی جماعت کو فروغ دینا اور دین اسلام کے ساتھ دشمنی کرنا ہے لیگی لیڈروں کے افعال و اقوال سے ان کی گمراہی مہر نیمروز سے زائد روشن ہے مرتد تھانوی کو لیگیوں کی تقریروں میں شیخ الاسلام اور حکیم الامت کہا جاتا ہے اشرف علی زندہ باد کے نعرے لگائے جاتے ہیں۔

ابوالبرکات سید احمد غفرلہٗ (مہر)

ناظم دار العلوم انجمن حزب الاحناف ہند لاہور

مولانا احمد رضا خاں کے پیر خانہ سجادہ عالیہ غوثیہ برکاتیہ مارہرہ شریف کا فتویٰ اس سے بھی زیادہ سخت تھا اولاد رسول محمد میاں قادری برکاتی مارہروی لکھتے ہیں۔

" کیا کوئی سچا ایماندار مسلمان کسی کتے کو اور وہ بھی دوزخیوں کے کتے کو اپنا قائد اعظم سب سے بڑا پیشوا اور سردار بنانا پسند کرے گا حاشا و کلا ہرگز نہیں ایسوں کی قیادت و سیادت اور رہنمائی کا نتیجہ اس کے سوا کیا ہوگا۔

اذا کان الغراب دلیل قوم سیہدیہم طریق الہالکین

(ترجمہ) جب کوا کسی قوم کا رہنما ہو تو وہ انہیں ہلاکت کی طرف ہی لے جائے گا۔

مسلم لیگ کی زریں بخیہ دری ص۶

شائع شدہ از دفتر خانقاہ مارہرہ ۱۹۲۹ء

حضرت مفتی صاحبؒ ان غلط فتووں سے گہری تشویش میں تھے مفتی کی حیثیت سے لوگوں نے آپ کی طرف رجوع کیا مولانا ابوالبرکات کے فتوے کے بارے میں پنجاب سے سینکڑوں خطوط حضرت مفتی صاحبؒ کے پاس گئے آپ نے ان تمام فتووں کو یکسر غلط ٹھہرایا اور مسلم لیگ کی علی الاعلان حمایت کی اس سے ہندوستان اور پنجاب کے بریلویوں کا زور ٹوٹ گیا اور مسلمان بڑی واضح اکثریت میں مسلم لیگ کی حمایت میں اٹھ کھڑے ہوئے بریلوی عوام اپنے علماء کو چھوڑ گئے اور تحریک پاکستان مسلمانوں کی بہت بھاری اکثریت سے کامیاب ہوئی۔

پاکستان بننے کے بعد علماء دیوبند ہی پاکستان کی خدمت میں پیش پیش تھے قائد اعظم اور زعماء مسلم لیگ کو اعتراف تھا کہ تحریک پاکستان کو دینی زاویہ سے علماء دیوبند نے ہی کامیابی سے ہمکنار کیا ہے چنانچہ پاکستان کی پہلی دستور ساز اسمبلی میں شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانی ہی دینی سربراہ اور پاکستان کا آفتاب علم و عرفان تھے آپ نے پاکستان میں نظام اسلامی کی تاسیس کے لیے قرارداد مقاصد منظور کرائی پاکستان میں جب بھی نظام شریعت نافذ ہوا تو وہ اسی اجمال کی تفصیل ہوگی۔

دستور ساز اسمبلی کی دینی رہنمائی کے لیے اسلامی مشاورتی بورڈ قائم ہوا تو اس کے پانچ ممبروں میں سے چار علماء دیوبند سے عقیدت رکھنے والے تھے یہ حضرات مولانا سید سلیمان ندوی خلیفہ حضرت تھانویؒ، مولانا مفتی محمد شفیع صاحب دیوبندی، ڈاکٹر حمید اللہ صاحب سابق پروفیسر عثمانیہ یونیورسٹی اور پروفیسر عبدالخالق صاحب تھے پانچویں سوار مجتہد جعفر حسین تھے یہ بورڈ ۱۹۴۹ء سے ۱۹۵۴ء تک کام کرتا رہا اس کے ساتھ ۱۹۵۰ء میں لاء کمیشن بھی قائم ہوگیا تھا۔ اس میں بھی جسٹس شیدلو جسٹس محمد ماہرین قانون کے ساتھ حضرت علامہ سید سلیمان ندوی اور مفتی محمد شفیع صاحب شامل تھے یہ صورت حال بتاتی ہے کہ پاکستان کی تعمیر میں علماء دیوبند کا کتنا عظیم حصہ ہے۔

<u>جمعیت علماء اسلام کی قیادت</u>:- مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ نے قانونی اور دستوری ذمہ داریوں کے ساتھ ساتھ اپنی قومی اور جماعتی ذمہ داریوں کو بھی برابر سنبھالے رکھا شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانیؒ نے جمعیت علماء ہند سے علیحدہ ہونے کے بعد جمعیت علمائے اسلام کے نام سے علماء کی ایک تنظیم قائم کی تھی تحریک پاکستان میں ان علماء نے بہت کام کیا تھا اور پاکستان میں اس جماعت کا ایک بڑا مقام تھا مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کی وفات کے بعد حضرت علامہ سید سلیمان ندویؒ اس کے سربراہ تھے ۱۹۵۳ء میں آپ بھی اپنے خالق

سے جا ملے اور جمعیت علماء اسلام کی ذمہ داریاں مولانا ظفر احمد عثمانی مولانا مفتی محمد حسن صاحب اور مفتی محمد شفیع صاحبؒ
پر آگئیں مولانا ظفر احمد صاحب دارالعلوم اسلامیہ ٹنڈوالہ یار میں زیادہ تر پابند تھے حضرت مفتی محمد حسن صاحب
معذور تھے اب یہ ذمہ داری حضرت مفتی محمد شفیع صاحب مرحوم کی تھی کہ جمعیت میں از سر نو روح پھونکیں آپ نے
اپنی عظیم علمی ذمہ داریوں کے باوجود جمعیت کی تنظیم کے لیے دور دراز کے سفر کئے مختلف صوبوں میں وہاں کے بااثر
علماء سے ملاقاتیں کیں اور انہیں جماعتی ذمہ داریوں پر متوجہ فرمایا ہر جگہ مفتی صاحب کا شاندار استقبال ہوا۔
راقم الحروف ان دنوں میرے کالج سیالکوٹ میں کام کرتا تھا حضرت مفتی صاحب سیالکوٹ تشریف لائے
وہاں آپ کی ہمشیرہ بھی مقیم تھیں دارالعلوم الشہابیہ میں حضرت مفتی صاحب کو شاندار عصرانہ دیا گیا جس میں ضلع
کے نمائندہ سیاسی زعماء جید علماء اور ممتاز وکلاء شریک ہوئے حضرت مفتی صاحبؒ مرحوم نے ملکی حالات پر تبصرہ
کرتے ہوئے جمعیت کی ضرورت اور تنظیم پر بڑے دردمندانہ انداز میں تقریر فرمائی پاکستان کے طول و عرض
میں ان تقاریر کا خاصا اثر رہا اور قریب تھا کہ جمعیت علماء اسلام پھر ایک عظیم قوت بن جائے مگر اپنے ہی حلقے
کے بعض حضرات مفتی صاحبؒ کو ناکام کرنے پر تل گئے اور حضرت مفتی صاحب کو بار بار دل برداشتہ ہونا پڑا۔

میں اگر سوختہ ساماں ہوں تو یہ روز سیاہ خود دکھایا ہے مرے گھر کے چراغاں نے مجھے

جب کشتی زیادہ آگے نہ چل سکی تو حضرت مفتی صاحبؒ نے اپنی توجہ زیادہ تر علمی کاموں کی طرف مبذول
کر لی اب جمعیت علماء اسلام کے نام سے شیخ التفسیر حضرت مولانا احمد علی علیہ الرحمۃ اور جمعیت کی از سر نو تنظیم کی
جنرل ایوب کا مارشل لاء لگ چکا تھا اور غیر اسلامی عائلی قوانین نافذ ہو چکے تھے علماء حق پھر اظہار حق کے لیے
اٹھے اور حضرت لاہوریؒ کی قیادت میں اہل حق کا شیرازہ پھر بندھ گیا اب تک یہ جماعت ملک کی ایک
فعال جماعت کی حیثیت سے ملکی سطح پر کام کر رہی ہے۔

حضرت مدنیؒ کا احترام:۔ جمعیت علماء ہند سے پورے سیاسی اختلاف کے باوجود آپ اکابر جمعیت
علماء ہند کی دیانت و عظمت کے پوری طرح معترف تھے آپ کے نزدیک یہ دو نظریوں کا تضاد تھا دونوں میں
کا ٹکراؤ نہ تھا ہر فریق پوری دیانت سے مسلمانانِ ہند کی بہتری کا طالب تھا لیکن یہ بات مختلف فیہ تھی کہ
مسلمانوں کی بہتری آزادی وطن کے کس فارمولے میں ہے آپ علیحدہ مسلم سٹیٹ کے قائل تھے اور اس کے
لیے آپ نے جدوجہد بھی کی لیکن حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ کے احترام میں آپ نے کوئی فرق نہ آنے دیا
آپ اپنے کراچی کے قیام کے دوران بھی حضرت مدنیؒ کا اسی طرح اکرام و احترام کرتے جیسے قیام دیوبند کے

دوران کرتے تھے الدرالمنضود فی اسانید شیخ الهند محمود کے آخر میں آپنے حضرت مدنیؒ کے اسانید بھی نقل کئے ہیں اور اپنی پوری عقیدت کا اظہار کیا ہے۔ مسلم لیگ کی حمایت میں کام کرنے والے علماء میں حضرت مدنی کا یہ احترام حضرت مفتی صاحب مرحوم کی سلامت روی کی روشن مثال ہے۔

مولانا عزیز الرحمٰن صاحب سواتی
استاذ دارالعلوم کراچی

دارالعلوم کراچی اور اُس کی خدمات

حضرت مفتی اعظم کا صدقۂ جاریہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نحمدہ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم

فقیہ العصر، محدث وقت، مفتی اعظم، مفسر قرآن، داعی دین، ماحی فتن، بانی دارالعلوم جناب حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو خالق تعالیٰ نے ایک جامع صفات اور ہمہ گیر شخصیت بنایا تھا، آپ کی زندگی کے شب و روز میں دینی ضرورت کا کوئی اہم مسئلہ خواہ وہ علمی نوعیت کا ہو یا اس کا مسلمانوں کے دینی اور اجتماعی مفاد سے تعلق ہو، ایسا نہیں رہا جس میں اللہ تعالیٰ نے آپ سے کام نہ لیا ہو۔

حضرتؒ کی ذات جیسی ہمہ جہت، کثیر الفوائد، جامع اور بابرکت ذات تھی، اس کی مثالیں خال خال ملتی ہیں۔ ؎ ایں سعادت بزور بازو نیست

البلاغ کے پیش نظر نمبر میں حضرت کی زندگی کے متعدد پہلوؤں کو حروف و نقوش میں منعکس کرنے کی کوشش کی گئی ہے جو حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی کا ایک جامع خلاصہ ہے۔

زیر قلم مضمون میں حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے ایک خاص کارنامہ کا تعارف پیش خدمت ہے جس کو آپ نے اپنی عمر کے معتدبہ حصہ سے پروان چڑھایا اور سیراب کیا، جس کے ذرات میں آپ کے اخلاص کی خوشبو بسی ہوئی ہے اور جو اپنے ماضی، حال اور مستقبل میں، ایک منفرد شان کا حامل ہے یہ کارنامہ "دارالعلوم کراچی" کی تاسیس ہے۔

دارالعلوم کراچی کا تعارف کرنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ برصغیر میں دینی تعلیم کے

سرچشموں، دارالعلوم، مدارس اور مکاتب کا پس منظر بھی اختصار کے ساتھ ذکر کیا جائے۔

برصغیر پر انگریزی استعمار کے تسلط سے پہلے دینی تعلیم انفرادی کوششوں اور سرکاری سرپرستی دونوں صورتوں میں جاری رہی۔ البتہ یہ پوری اسلامی تاریخ کا روشن باب ہے کہ ہر زمانے کے علمائے راسخین نے اپنے طور پر اس شرعی فریضہ کو اپنے ذاتی مجاہدات سے بہت حسن و خوبی کے ساتھ انجام دیا۔ اس نصب العین میں نہ انھوں نے کسی کے دست تعاون کا انتظار کیا، نہ اس کی درخواست کی۔ اور زمانہ شاہد ہے کہ دین کی نشر و اشاعت کا زیادہ مؤثر کام اسی طریقہ سے انجام پایا۔ اس لئے کہ یہ مخلصانہ طرز تھا جس میں صرف تبلیغ دین اور اجر و ثواب کا بیش قیمت جذبہ کارفرما ہوا کرتا تھا۔ ایسے علماء میں سے ہر شخص انفرادی طور پر ایک مستقل درسگاہ کی حیثیت رکھتا تھا۔ عہد رسالت سے لے کر آج تک مسلم آبادی میں، بلکہ بعض سرخ و تاریک علاقوں تک میں بھی علماء اس طریقے پر کاربند ہیں۔ تاہم ہر زمانے کی اسلامی حکومتوں نے بھی اس فریضہ سے غفلت نہیں برتی۔ مسلم فرمانرواؤں نے اپنے اپنے مزاج کے مطابق اس کو اہمیت دی۔ چنانچہ مؤرخ مقریزی کے بقول شاہ محمد تغلق کے زمانے میں صرف دہلی (آج کل کا نہیں، صدیوں پہلے کا چھوٹا دہلی) میں ایک ہزار مذہبی اسلامی مدارس قائم تھے۔

پھر وہ دور آیا، جب مسلمان عیش پرستی اور طوائف الملوکی کے مہلک مرض میں مبتلا ہو گئے تو یہ مسلمانوں کی پستی اور زوال کا آغاز تھا۔

عیسائی اقوام یوں تو روز اول ہی سے اسلام اور مسلمانوں کے خلاف برسر پیکار رہی تھیں اور انھوں نے مسلمانوں کو بحیثیت قوم کے مٹانے کے لئے کوئی دقیقہ نہیں چھوڑا تھا۔ لیکن ان کے حرب و ضرب اور توپ و تفنگ کا کوئی حربہ مسلمانوں کے تشخص کو کمزور نہ کر سکا تھا۔ انھوں نے صلیبی جنگوں کی شکل میں مسلمانوں کے خلاف آگ اور خون کی زبردست بھٹیاں بھی دہکائیں اور ان جنگوں میں تمام نصرانی طاقتوں کی متحدہ قوت بھی جھونک دی گئی لیکن ایسے معرکے مسلمانوں میں ہمیشہ نشأۃ ثانیہ اور نئی تازگی کا ذریعہ ثابت ہوتے رہے۔ یہاں تک کہ اب عیسائیوں نے مسلمانوں کے خلاف ایک نیا ہتھیار بھینچا۔ گذشتہ ناکام تجربات اور پیہم خساروں کے بعد طویل غور و فکر اور منصوبہ بندی کے بعد انھوں نے مسلمانوں کے استیصال کے لئے نیا میدان اور نیا محرکہ منتخب کیا۔

سب سے پہلے انہوں نے عسکری قوت کے بجائے سیاسی سازش کے ذریعہ مسلمانوں کی اجتماعی طاقت کو تار تار کرنے کا منصوبہ بنایا۔ مسلمانوں میں قومیت اور عصبیت کا پرچار کیا۔ ہر علاقے کی مسلم آبادی کو اپنی زبان اور اپنے علاقہ پر ناز کرنے کی ترغیب دلائی۔ دوسروں کو ان کے مقابلہ میں پست اور حقیر بتایا اور اس طرح آپس میں کینہ اور عداوت کے بیج بو دیئے۔ مسلمان آپس میں ایک دوسرے کے خلاف برسرپیکار ہوگئے۔ ان کی طاقت وقوت دشمن کے بجائے اپنے ہی گھر کو اجاڑنے لگی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اسلام کا تشخص رکھنے والی مسلم قوم جو اب تک مشرق ومغرب کے دور دراز مسافتوں میں منتشر ہونے کے باوجود ایک خدا، ایک رسول اور ایک قرآن پر ایمان رکھنے کی وجہ سے مضبوط طاقت تھی اب لسانی اور علاقائی بنیادوں پر عربی، ترکی، مصری، ایرانی اور ہندی وغیرہ ٹکڑیوں میں بٹ گئی۔

انگریزی استعمار کا یہ حربہ بلاشبہ کامیاب رہا۔ اب عیسائی اقوام کے لئے ان چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں پر عسکری تسلط قائم کرنا بھی آسان ہوگیا۔ اپنے دینی تشخص کو چھوڑ کر مسلمان اللہ تعالیٰ کی نصرت سے محروم ہوگئے اور لسانی وعلاقائی بت ان کی آزادی کی حفاظت نہ کر سکے اور یوں مسلمان بحیثیت مسلم قوم منتشر اور تار تار ہوگئے۔

اس سیاسی سازش کے نتیجے میں جب کافرانہ استعمار قائم ہوگیا، تو اب ایک دوسرا ہتھیار استعمال کیا جانے لگا۔ پہلے ہتھیار سے مسلم قومیت فنا کر دی گئی تھی اور اس ہتھیار سے مسلم فرد کو نشانہ بنایا گیا۔ مسلمان فرد پر مغربی ثقافت وتعلیم کے ذریعہ حملہ کیا گیا جس کا ہدف یہ تھا کہ مسلمان فرد اپنے دین، اپنے عقیدے، اپنی معاشرتی اقدار، اپنی مذہبی روایات اور اپنے اخلاق سے دور ہٹتا چلا جائے اور مغربی فرد کی طرح خدا بیزار، اخلاق باختہ، دنیا پرست اور کمانے کی عقل مشین اور کمپیوٹر بن کر رہ جائے۔ وہ اگر شکل وصورت سے ہندی ہو تو اس کی زندگی کا عیسائی اس نام کی عکاسی نہ کرتا ہو۔

پہلی کامیابی کے نتیجے میں جو سیاسی اور عسکری بالادستی حاصل ہوگئی تھی۔ اس کے بعد یہ دوسرا مقصد حاصل کرنا چنداں مشکل نہیں رہ گیا تھا۔ جبکہ اس راستہ کی بڑی مؤثر رکاوٹ علماء کو بھی پوری قوت سے راستے سے ہٹا دیا گیا تھا۔ علماء یا تو قتل کر دیئے گئے تھے یا کال کوٹھڑیوں

اور زندانوں میں تھے ، یا روپوش و مہاجر تھے اور اب مسلمانوں میں من حیث القوم عسکری یا فکری و ثقافتی مدافعت کی کوئی سکت باقی نہیں رہی تھی۔

برصغیر پر انگریزی تسلط کے اوائل میں مسلمانوں کی طرف سے مختلف علاقوں اور زمانوں میں آزادی کی مسلح تحریکیں اٹھتی رہیں، سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ کی مہم، ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی ، قبائلی علاقہ جات کی تحریکیں اور آخر میں شیخ الہند مولانا محمود الحسن رحمۃ اللہ علیہ کی تحریک، جو ریشمی رومال کی تحریک کہلاتی ہے، سب اسی سلسلے کی کڑیاں تھیں، لیکن خامئ اعمال سے ان میں سے کوئی بھی تحریک اپنے آخری مقصد تک نہ پہنچ سکی اور انگریزی استبداد کا پنجہ مستحکم تر ہوتا چلا گیا۔

اس مسلح کوشش میں ناکام ہونے کے بعد علماء نے اپنی محنت و کاوش کا رُخ دوسری طرف پھیر دیا۔ اب انہیں مسلمانوں کے دین اور نظریے کی فکر دامن گیر ہوئی اور اسلامی علوم خطرے میں نظر آئے۔

انگریز جو اپنے ساتھ اپنا کلیسا اور اپنی تعلیم و ثقافت لے کر آیا تھا ایک طرف اس نے ناخواندہ مسلمانوں پر ارتداد پھیلانے کے لئے کلیسا کے ذریعہ مشنری یلغار کر دی، اور دوسری طرف مکمل ذہنی اور فکری تبدیلی کے لئے اپنے مزاج کے اسکول و کالج قائم کر دئے۔ دلیل یہ دی گئی کہ ہم اپنے ہندوستانی باشندوں کو ان جدید علمی تحقیقات سے باخبر کرنا چاہتے ہیں جو مغرب میں ہوئی ہیں، ان علوم کے بارے میں یہاں کے باشندگان کو شروع میں یہی بتایا گیا کہ اس تعلیم کے ذریعہ انہیں نئے علوم اور انگریزی زبان و ادب سکھانا ہے۔ یہ تعلیم ان کے مستقبل میں ان کی ترقی کا واحد زینہ ہے اور معاشی خوشحالی کا بھی واحد راستہ۔ ظاہر ہے کہ یہ مقصد بظاہر برا نہ تھا، اور اگر مسلمان حکومتیں اپنے طرز و مزاج کے مطابق خود ان علوم کی تعلیم کا انتظام کرتیں تو نتائج برے نہ ہوتے لیکن در حقیقت حکومت کا مقصد پس پردہ اس ذہنیت کی ترویج تھی جو مادیت اور دین بیزاری کی بنیاد پر تعمیر ہوئی ہو اور جو ہمیشہ کے لئے فکری اور عملی طور پر مغرب کی غلام بن کر رہ جاتی۔ چنانچہ لارڈ میکالے کا یہ مشہور جملہ برصغیر میں تعلیم کی انگریزی پالیسی کا واضح ترجمان ہے۔

"ہماری تعلیم کا مقصد ایسے نوجوان تیار کرنا ہے جو رنگ و نسل کے لحاظ سے ہندوستانی ہوں اور دل و دماغ کے لحاظ سے انگلستانی ہوں۔"

بلاشبہ اس تعلیم سے مسلمانوں کو کچھ مادی فوائد ضرور حاصل ہوئے۔ لیکن ان فوائد کے مقابلے میں وہ نقصان بہت زیادہ بڑھا ہوا تھا جو ان کے ذہن و فکر کو بگاڑ کر انہیں پہنچایا گیا۔ مسلمان گھرانوں کے بچوں میں دین و عقیدے سے بے رغبتی، اپنی اقدار و روایات سے بے اعتنائی۔ بدیسی قوم کی مرعوبیت اور تشکیک زدہ ذہنیت کے جراثیم پیدا ہو گئے۔ ظاہر ہے یہ مستقبل کے لئے اس علاقہ میں اسلام اور اسلامی علوم کے لئے ایک زبردست فتنہ تھا، جبکہ مسلمانوں میں اپنے تشخص کے دفاع کے لئے نہ کوئی تنظیم تھی نہ کوئی ادارہ۔

ایسے وقت میں یہ علماء ہی تھے۔ ماندہ و درماندہ علماء جنہوں نے ناپید وسائل اور بے سروسامانی کے عالم میں اپنی انفرادی کوششوں سے دین اور علوم دینیہ کے تحفظ کا بیڑا اٹھایا۔ قناعت و کفایت ان کا سرمایہ تھا، کسی درخت کا سایہ یا کسی مسجد یا جھونپڑی کا چھپر ان کا مدرسہ، کسی دردمند مسلمان نے اپنا بچہ ان کے پاس بھیج دیا تو "کلاس" لگ گئی۔ ان مبارک و مسعود ہستیوں نے اپنے معاش کی نہیں، قوم کے معاد کی فکر کی۔ انہوں نے تجارت و ملازمت کے بجائے آخرت کا بازار لگایا جہاں قربانی، فاقہ کشی، جفاجوئی اور صبر و استقامت کے نقد سرمایہ سے جنت اور رضائے الٰہی کا حصول پیش نظر تھا۔ یوں دین اور علوم دینیہ کی حفاظت کے لئے دیوبند میں ایک مدرسہ کی داغ بیل ڈال دی گئی۔ مدرسہ ایک استاذ اور ایک شاگرد سے شروع ہوا۔ ایک مسجد کے درخت کے سایہ میں اس کا افتتاح ہوا اور یہی مدرسہ کچھ عرصہ بعد "دارالعلوم دیوبند" کے نام سے دین اور علوم دینیہ کی حفاظت کی وہ زبردست چھاؤنی بنا کہ اسی کی برکت سے آج برصغیر میں شعائر اسلام زندہ ہیں۔ دینی علوم محفوظ ہیں اور مسلمانوں کے دل خدا اور خدا کے رسول کی محبت سے دھڑکتے ہیں۔ دارالعلوم دیوبند ہی کی برکت سے برصغیر کا نقشہ ان دیگر مسلم علاقوں سے بہت مختلف ہے جہاں انگریزی استعمار نے جب پنجہ جمایا اور پھر نکالا تو اپنے ساتھ مسلمانوں کی دینی خصوصیات بھی لے گیا۔

برصغیر کے مسلمانوں پر اللہ کا عظیم انعام تھا کہ انہیں دارالعلوم دیوبند کی شکل میں وہ زبردست علمی اور دینی طاقت حاصل ہوگی جس نے انہیں نہ صرف دین کی صراط مستقیم پر قائم رکھا بلکہ اس علاقہ کے بہت سے اجتماعی مسائل میں بھی مسلمانوں کی رہنمائی کی۔ دارالعلوم دیوبند کی طرز پر دوسرے

علاقوں میں بھی ایسے ہی قابل قدر ادارے وجود میں آگئے، جن میں مظاہر العلوم سہارنپور، مدرسہ امینیہ دہلی، جامعہ اسلامیہ ڈابھیل وغیرہ سرفہرست ہیں۔

پاکستان بننے کے بعد یہ امید تھی کہ اس اسلامی مملکت میں اب ہر شعبہ اسلامی رنگ اختیار کرلے گا۔ یہاں کی سیاست، معیشت، معاشرت اور تعلیم سب کچھ دینی اقدار کے عکاس ہوں گے۔ بالخصوص تعلیم کا معاملہ اتنا اہم تھا کہ اس میں فوری تبدیلی کی ضرورت تھی اور ایک نوزائدہ اسلامی مملکت کی اہم ترجیحات میں سے یہ بات ہونی چاہیے تھی کہ تعلیم کے معاملہ میں دینی اور دنیاوی کی تفریق مٹادی جاتی۔ یہاں کے ادارے ابتداء ہی سے عصری فنون کے ساتھ دینی علوم کی بھی تعلیم دیتے۔ اس طرح ہر بچے کا ذہن اپنے دین سے روشناس ہوجاتا اور اعلیٰ تعلیم میں بھی میڈیکل اور انجینئرنگ کی طرح علوم شرعیہ کی اعلیٰ تعلیم کا انتظام ہوتا۔ یہ حقیقی اور مناسب تعلیم اس قوم کی سب سے پہلی ضرورت تھی جس سے قوم کے نونہالوں میں اپنے فرائض کا احساس، اپنے دین کا تحفظ اور اپنی ملت سے محبت کے جذبات پیدا ہوتے لیکن ملک کے کالج اور یونیورسٹیاں، پاکستان بننے کے بعد بھی انگریزی استعمار کے ڈگر پر چلتے رہے۔

ظاہر ہے کہ یہ صورت حال ملک کے دینی مستقبل کے لئے مایوس کن تھی چنانچہ یہاں بھی دین اور مسلمانوں کا درد رکھنے والے اہل اللہ اٹھے اور علم و دین کے تحفظ کے لئے اپنی سعی شروع کردی۔ مسلمانوں کے بڑے بڑے علمی مراکز ہندوستان میں رہ گئے تھے اور پاکستان کے حصے میں آنے والا یہ علاقہ اس لحاظ سے بنجر تھا۔ چنانچہ یہاں کی ضرورت پوری کرنے کے لئے ملک بھر میں چھوٹے چھوٹے مدرسے وجود میں آگئے۔

دار العلوم کراچی کی تاسیس

کراچی جو اس وقت پاکستان کا دارالحکومت تھا اور وسیع آبادی کا شہر۔ یہاں کے لئے ایک شایان شان دینی ادارے کی ضرورت تھی۔ یہ خیال شیخ الاسلام حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی کے دل میں پیدا ہوا اور انہوں نے اپنے رفقاء کی معیت میں اس مقصد کے لئے تگ و دو شروع کردی ان رفقاء میں حضرت اقدس مفتی محمد شفیع صاحبؒ کو اولیت کا مقام حاصل تھا۔ اس سلسلے میں خاص

پیش رفت بھی ہوئی لیکن تقدیر کا فیصلہ حائل ہوگیا۔ شیخ الاسلام رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی نے وفا نہ کی اور وقتی طور پر اس غرض کے لئے جو ابتدائی اقدامات کئے گئے تھے اور کچھ کامیابی حاصل ہوگئی تھی، سب ضائع ہوگئیں۔

شیخ الاسلام کے بعد اس مقصد کو بروئے کار لانے کے لئے تمام تر ذمہ داری حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ پر آگئی اور انھوں نے توکلاً علی اللہ دارالعلوم کی بنیاد ڈال دی۔

حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اس "افتتاح" کا ذکر اس طرح کیا ہے۔

"احقر نے چند مخلصین کی معاونت سے کراچی میں علوم اسلامیہ عربیہ کے لیے ایک مدرسہ کی کوشش شروع کی، کافی کوششوں کے بعد محلہ نانک واڑہ کراچی میں ایک مختصر خستہ عمارت اس کام کے لئے مل سکی جس کی مرمت وغیرہ پر تقریباً چار ہزار روپے کا خرچ تھا۔

اس وقت ہمارے مدرسہ کے لئے نہ کوئی فنڈ تھا، نہ کوئی مدرس، نہ قابل ذکر جماعت طلباء۔ چند طالب علم متفرق کتابیں پڑھنے والے آیا کرتے تھے۔ ہم کیا اور ہمارے ارادے کیا محض اللہ تعالیٰ ہی کا فضل ہے کہ اس نے دل میں ارادہ اور اس کے پیچھے کچھ تدبیر اور پھر ایسی خاموشی و کس مپرسی کی حالت میں مدرسہ کا افتتاح کر دینے کی توفیق عطا فرمائی اور بنام خدا تعالیٰ ۱۱ر شوال ۱۳۷۰ھ مطابق جون ۱۹۵۱ء کو اس مدرسہ کا افتتاح ہوگیا۔ چند طلباء کو لے کر بلا انتظار کسی فنڈ و چندہ کے محض توکلاً علی اللہ کام شروع کر دیا گیا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے امداد فرما کر ہماری توقعات سے بہت زیادہ سرعت کے ساتھ اس کو بڑھایا۔"

نانک واڑہ میں جو بوسیدہ اور تنگ و تاریک عمارت دارالعلوم کو ملی تھی اس میں حضرت مفتی صاحب قدس سرہٗ نے اپنے رفقاء حضرت مولانا نور احمد صاحب وغیرہ کے ساتھ بنفس نفیس اپنے دست مبارک سے عمارت کی صفائی میں بھی حصہ لیا اور صبر، سادگی، تواضع، اخلاص اور للہیت کے سرمائے سے خیر کا یہ چشمہ جاری فرما دیا۔

ایسے علمائے ربانی کے پاس ان جیسے مواقع میں سیم و زر کی پونجی نہیں ہوتی لیکن اپنے

رب پر توکل کا عظیم سرمایہ ہوتا ہے۔ اسی سرمایہ سے ان کی مشکلات حل ہوتی ہیں اور ان کے قدم آگے بڑھتے ہیں۔ چنانچہ دارالعلوم کے قیام کے دوسرے ہی سال اس میں پورا درس نظامی شروع ہوچکا تھا۔ مختلف تعلیمی شعبہ جات میں پانچ سو طلبہ نے داخلہ لیا جن میں سے سوا سو ایسے تھے جن کے جملہ ضروریات کی کفالت دارالعلوم کے ذمہ تھی۔ عربی زبان سکھانے کے لئے شہر کے مختلف علاقوں میں ڈائرکٹ میتھڈ کے طریقے پر سترہ مراکز کھولے گئے جن میں ہر مرکز میں ساٹھ ستر افراد کا اوسط تھا جو شہر کے مختلف طبقات سے تعلق رکھتے تھے۔ دارالافتاء کا باقاعدہ شعبہ کھولا گیا۔ دارالعلوم کی ضرورت کے لئے ایک کتب خانہ کی بنیاد ڈال دی گئی جس میں دوسرے سال تک چار ہزار کتابیں جمع ہوگئی تھیں۔ مطبخ جو بنائے دارالعلوم کے وقت ہی قائم کردیا گیا تھا اس کو زیادہ بہتر انداز میں منظم کیا گیا۔ دینی امور کے نشر و اشاعت کی بھی ابتدا کردی گئی مجالس کا باقاعدہ شعبہ قائم ہوگیا تجوید کا درجہ کھولا گیا غرض یہ کہ مقاصد دارالعلوم کے سلسلہ میں عملی بنیادیں وجود میں آگئیں۔

شوال ۷۱ھ کو دارالعلوم کی بنیاد پڑی اور اب ۹۹ھ میں دارالعلوم اپنی عمر کی انتیسویں[۲۹] منزل میں ہے۔ ۷۱ھ کا دارالعلوم جو ایک شکستہ عمارت میں چند طلبا سے شروع ہوا تھا آج ایک بہت بڑے دینی مرکز اور عظیم الشان درسگاہ ہونے کی حیثیت سے پورے پاکستان میں منفرد مقام رکھتا ہے اور محترم حافظ نذر احمد صاحب نے مغربی پاکستان کے دینی مدارس کا جو سروے کرکے "جائزہ مدارس عربیہ" کے نام سے شائع کیا اس میں دارالعلوم کو پاکستان کا سب سے بڑا دینی مدرسہ قرار دیا ہے۔ اس وقت دارالعلوم اپنے بانی سرپرست سے محروم ہے۔ لیکن اخلاص کا یہ پودا جس ذات کے توکل پر لگا، پروان چڑھا اسی ذات کے توکل پر اپنے برگ و ثمر کے ساتھ روزافزوں ترقی پر ہے — اور حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے نسبی و علمی جانشین حضرتؒ ہی کے اسلوب پر اپنی انتھک کوششوں کے ذریعہ اس کو آگے بڑھا رہے ہیں۔

آئندہ سطور میں ہم دارالعلوم کی موجودہ ہیئت کا تفصیلی تعارف پیش کریں گے اور حسب ضرورت بنائے دارالعلوم کے وقت سے لے کر گذشتہ اختتامی سال شعبان ۱۳۹۸ھ تک کے تفصیلی اعداد و شمار بھی پیش کریں گے۔

اس وقت دارالعلوم کے انتظامی اور تعلیمی شعبہ جات کا خاکہ اس طرح ہے۔

۱۔ مجلس منتظمہ
۲۔ تعلیمات
۳۔ تحفیظ و تجوید القرآن
۴۔ مکاتب تعلیم القرآن
۵۔ مدرسہ ابتدائیہ
۶۔ دار الافتاء
۷۔ دار التصنیف
۸۔ "البلاغ"
۹۔ کتب خانہ (وقف)
۱۰۔ مکتبہ دار العلوم
۱۱۔ دار التربیت
۱۲۔ دار الطلبۃ
۱۳۔ مسجد
۱۴۔ تعمیرات
۱۵۔ ترقیات
۱۶۔ استقبالیہ
۱۷۔ مطبخ
۱۸۔ محاسبی

۱۔ مجلس منتظمہ

مجلس منتظمہ دار العلوم کا سب سے بڑا با اختیار دستوری ادارہ ہے۔ اس مجلس کو دار العلوم کے سرمایہ، املاک، نظم و نسق اور انتظام و انصرام کے تمام اختیارات حاصل ہیں۔ اس مجلس میں بشمول عہدیداران ارکان کی تعداد تیرہ ہے اور جلسوں کا نصاب پانچ

۱۔ صدر : حضرت ڈاکٹر عبدالحی صاحب خلیفہ مجاز حضرت حکیم الامتؒ۔
۲۔ مہتمم : محمد رفیع صاحب عثمانی استاذ حدیث دار العلوم کراچی۔
۳۔ نائب مہتمم : مولانا محمد تقی صاحب عثمانی " " "
رکن اسلامی مشاورتی کونسل پاکستان
۴۔ خازن : حکیم محمد سعید صاحب چیئرمین ہمدرد (وقف) فاؤنڈیشن پاکستان۔
مشیر حیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر برائے امور صحت۔
۵۔ سکریٹری : مولانا قاری رعایت اللہ صاحب استاذ حدیث دار العلوم کراچی۔

۶	رکن	مولانا مفتی عبد الحکیم صاحب استاذ حدیث جامعہ اشرفیہ سکھر
۷	"	جناب ظفر احمد صاحب تھانوی ریٹائرڈ سپرنٹنڈنٹ انجینئر دشپنگ،
۸	"	جناب الحاج فرید الدین صاحب مالک پائنیر آرمز۔ کراچی۔
۹	"	جناب الحاج ابراہیم احمد باوانی۔ ڈائرکٹر باوانی ٹیکسٹائل ملز۔ کراچی۔
۱۰	"	جناب الحاج سیٹھ سلیمان صاحب۔ مالک تاج ریسٹورنٹ۔ بندر روڈ کراچی
۱۱	"	جناب الحاج ظفر احمد صاحب انصاری۔ ایم۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی۔ آنرز بی۔ اے ایل ایل بی، سابق رکن نیشنل اسمبلی۔ پاکستان
۱۲	"	جناب الحاج شجاعت علی صاحب صدیقی، سابق ڈپٹی اکاؤنٹنٹ جنرل پاکستان
۱۳	"	جناب الحاج محمد ابراہیم صاحب۔ ایم۔ ای۔ دادابھائی۔
۱۴		

۲۔ تعلیمات

دارالعلوم کی تاسیس چونکہ دینی تعلیمات کے تحفظ اور فروغ کے لئے ہوئی ہے اس لئے یہ شعبہ دارالعلوم کا سب سے زیادہ اہم اور وسیع ترین شعبہ ہے۔ اس وقت یہ شعبہ درج ذیل ضمنی اور مستقل شعبہ جات سے عبارت ہے جو اس وقت دارالعلوم میں پورے اہتمام سے جاری ہیں۔

۱۔ درس نظامی
۲۔ تحفیظ و تجوید القرآن
۳۔ تخصص فی الفقہ والافتاء
۴۔ مکاتب تعلیم القرآن
۵۔ مدرسۃ البنات
۶۔ مدرسہ ابتدائیہ (پرائمری اسکول)
۷۔ ترتیب ترجمہ قرآن مجید
۸۔ درس ترجمہ قرآن مجید

(۱) درسِ نظامی درسِ نظامی جو دینی علوم و فنون کے تحفظ کا سب سے مؤثر ذریعہ ہے، اس کی تعلیم و تدریس "تعلیمات" میں دارالعلوم کا سب سے اہم اور بنیادی عنصر ہے۔

۱۱ شوال ۱۳۷۰ھ کو جب دارالعلوم کا افتتاح ہوا تو درسِ نظامی میں داخلہ لینے والے چند طلبہ تھے اور اساتذہ صرف تین تھے۔ پہلے سال سوائے دورہ حدیث کے تمام درجات کی تعلیم شروع ہوگئی تھی اور دوسرے سال سے دورہ حدیث بھی شروع ہوگیا تھا۔

مدرسہ کے افتتاح کے لئے ابتدائی کوششوں کے نتیجے میں کراچی شہر کے محلہ نانک واڑہ میں ایک خستہ عمارت حاصل کرلی گئی تھی۔ اس عمارت کو ضروری مرمت و اصلاح کے بعد قدرے قابل بنا دیا گیا تھا اور اس میں اقامت گاہ، دفتر، درسگاہیں، مسجد اور مطبخ کے ابتدائی انتظامات نہایت قلت و تنگی کے ساتھ کر لئے گئے تھے۔ لیکن ابتدائی دو تین سال میں جب طلبہ کا رجوع بڑھا اور ضروریات میں وسعت پیدا ہوگئی تو دارالعلوم کے وسیع تر مقاصد کے لئے کشادہ جگہ کی ضرورت شدت سے محسوس ہونے لگی اور کافی تگ و دو کے بعد شہر سے دور، خالص صحرائی زمین میں دارالعلوم کیلئے بڑا قطعہ مل گیا۔ یہ قطعہ جناب حاجی عبداللطیف ابراہیم باوانی صاحب مرحوم کی معرفت جناب حاجی ابراہیم علوا بھائی مرحوم (مقیم جنوبی افریقہ) نے مع دو منزلہ عمارت اور دوسرے سامان، دارالعلوم کے لئے لوجہ اللہ وقف کردیا اور جناب حاجی عبداللطیف صاحب باوانی مرحوم نے اپنی ذاتی مساعی سے دارالعلوم کی ضروریات کیلئے پندرہ پندرہ کمروں پر مشتمل تین بڑے بڑے بلاک بھی بنوا دیئے۔ اس قطعہ زمین کے آس پاس سوائے شرافی گوٹھ کے، جو ایک مختصر سی بستی تھی، کوئی آبادی نہیں تھی۔

۱۵ شعبان ۱۳۷۶ھ کو درسِ نظامی اور اس سے ملحقہ دفاتر، کتب خانہ اور مطبخ اب یہاں منتقل کردیئے گئے، یہ نئی جگہ تنگ تو نہیں تھی البتہ ہر طرح کی شہری سہولتوں سے محروم، آس پاس سڑکیں تھیں نہ بجلی و گیس کا انتظام تھا، چاروں طرف پھیلی ہوئی جھاڑیاں اور جگہ جگہ مٹی کے بڑے بڑے تودے کھڑے تھے۔ لیکن یہ بے برگ و ثمر جگہ، جو اپنے اندر کوئی ظاہری رعنائی نہیں رکھتا تھا، حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی شخصیت اور اخلاص کی وجہ سے یہاں سے علم کی وہ خوشبو مہکی جس نے دور دراز علاقوں اور ملکوں کے طلبہ کو اپنے دامن میں سمیٹ لیا، پاکستان (مشرقی پاکستان)، ایران، افغانستان، برما، افریقہ، ملائشیا، انڈونیشیا، تھائی لینڈ، سعودی عربیہ وغیرہ ممالک کے طلبہ نے حصولِ علم کے لئے دارالعلوم کا رخ کیا اور وہ دارالعلوم جو ایک شکستہ عمارت میں چند

طلبہ سے شروع ہوا تھا آج اپنے پورے ظاہری اور باطنی حسن سے آراستہ ہے۔

گذشتہ اٹھائیس سال کے عرصہ میں درس نظامی کے مختلف درجات میں چار ہزار اٹھ سو تہتر (۴۸۷۳) طلبہ نے دارالعلوم میں داخلہ لیا اور چار سو تئیس (۴۲۳) طلبہ یہاں سے مستند عالم دین بن کر فارغ ہوئے، یہ علماء اپنے اپنے علاقوں میں اہم دینی خدمات انجام دے رہے ہیں اور بحمداللہ دارالعلوم کا فیض ملک اور بیرون ملک پھیلتا جا رہا ہے۔

ان علماء میں مشہور حضرات یہ ہیں

۱۔ مولانا محمد رفیع صاحب عثمانی ۲۔ مولانا محمد تقی صاحب عثمانی۔

آپ دونوں کا تعلق طلباء کی اس جماعت سے ہے جن سے دارالعلوم کا افتتاح ہوا شروع سے آخر تک تمام علوم و فنون کی تحصیل دارالعلوم ہی میں کی اور اب دارالعلوم کی پہلی پیداوار مقاصد دارالعلوم کی تکمیل کے امین ہے۔ درس و تدریس، تصنیف و تالیف، افتاء و تشریع اور دارالعلوم کے تحفظ و ترقی کی تمام تر ذمہ داریاں آپ دونوں کی طرف راجع ہیں۔ تفصیلی تذکرہ، تلامذہ حضرت مفتی صاحب رحمہ اللہ کے مضمون میں ملاحظہ فرما لیا جائے۔

۳۔ مولانا عبدالرشید صاحب ربانی، ہیڈ فورڈ، ناظم جمعیت علماء یوکے۔

۴۔ مولانا بشیر احمد صاحب کشمیری مفتی و قاضی حکومت آزاد کشمیر تحصیل باغ۔

۵۔ مولانا افتخار احمد صاحب اعظمی ناظم جامعہ حمادیہ ڈرگ کالونی۔ کراچی۔

۶۔ مولانا مولی بخش صاحب مدرس مدرسہ عربیہ پنجگور، بلوچستان۔

۷۔ مولانا محمد صدیق صاحب مہتمم مدرسہ اسلامیہ خضدار۔ بلوچستان۔

۸۔ مولانا عبدالرشید صاحب چترالی خطیب مسجد ایرفورس اسٹیشن ملیر۔ کراچی

۹۔ مولانا سیف اللہ اکرم صاحب خطیب مسجد باغبانپورہ۔ لاہور

۱۰۔ مولانا سید عبداللہ صاحب مہتمم جامعہ اسلامیہ سیوران ایران

۱۱۔ مولانا محمد لقا صاحب افغانی مدرس مدرسہ عربیہ قندھار افغانستان۔

۱۲۔ مولانا محمد عبداللہ صاحب مہتمم مدرسہ محی العلوم، اراکان، برما۔

۱۳۔ مولانا محب اللہ صاحب صدر مدرس مدرسہ صالحیہ، اراکان، برما۔

۱۴۔ مولانا عبدالاول صاحب مہتمم مدرسہ اسلامیہ، اراکان، برما۔

۱۵۔ مولانا عبدالقدیر صاحب مدرس مدرسہ عربیہ، بدخشان، افغانستان۔

۱۶۔ مولانا احمداللہ صاحب مفتی چاٹگام، بنگلہ دیش

۱۷۔ مولانا محمد مدثر صاحب، سوات، سرحد۔

۱۸۔ مولانا عبدالغفار صاحب مدرس مدرسہ مدینۃ العلوم، ناظم آباد، کراچی۔

۱۹۔ مولانا عطاءاللہ صاحب مہتمم مدرسہ عطاءالعلوم، بہاولپور۔

۲۰۔ مولانا محمد اسمٰعیل صاحب ناظم مدرسہ رحمانیہ، لی مارکیٹ، کراچی۔

دارالعلوم کے فاضلین کی ایک جماعت اس وقت جامعہ ریاض اور جامعہ مدینہ میں اعلیٰ تعلیم کے حصول میں مشغول ہے۔ ایک جماعت ان جامعات سے اعلیٰ تعلیم کی ڈگری لے کر فارغ ہوئی ہے اور افریقہ و ایشیا کے مختلف ممالک میں دینی خدمات انجام دے رہی ہے۔ خود دارالعلوم میں فارغین دارالعلوم میں سے تقریباً ۸۰ حضرات یہاں کے مختلف تعلیمی اور انتظامی شعبہ جات سے منسلک ہیں جن میں سے ۱۲ درس نظامی کے ہیں۔

احقر بھی طلبا کے دارالعلوم کی اس جماعت سے تعلق رکھتا ہے جو اپنی صغر سنی میں اس چشمۂ فیض پر آئے اور یہیں سے اپنی طالب علمانہ زندگی کا آغاز کیا۔ استفادے کے لئے توجہ ہر قابل شرط ہے۔ لیکن حضرۃ الشیخ مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی کیمیا اثر مجالست، مشفقانہ تربیت اور اپنے گرامی قدر اساتذہ کی عنایات و توجہات احقر کے لئے قابل صد تشکر ہیں۔

اس وقت درس نظامی میں اساتذہ کی تعداد ۴۰ ہے۔ تدریس کے لئے سوا درسگاہیں ہیں درس نظامی کی تعلیم کا انتظام رکھنے کیلئے ایک الگ دفتر ہے، دفتری عملے کے علاوہ ناظم تعلیمات کی امداد کے لئے دو معاون اساتذہ بھی ہیں جو تقسیم کار کے مطابق مختلف درجات میں تعلیم کی نگرانی کرتے ہیں۔

درس نظامی میں مروجہ علوم و فنون کی تعلیم کے علاوہ عربی انشا بھی بطور مضمون داخل نصاب ہے اور تین سال سے مصری استاذ کی خدمات بھی دارالعلوم کو حاصل ہیں۔ بعض ناگزیر عصری فنون بھی داخل درس ہیں اور انگریزی کی تعلیم بحیثیت زبان بھی پیش نظر ہے۔

درسِ نظامی کا تعلیمی سال ۱۰ شوال کو شروع ہوتا ہے اور ۱۵ شعبان پر سالانہ امتحان کے بعد ختم ہو جاتا ہے۔ سال میں تین امتحانات ہوتے ہیں۔ سہ ماہی صفر میں، ششماہی جمادی الاولیٰ میں اور سالانہ شعبان میں۔ ۱۵ شعبان سے ۱۰ شوال تک اس شعبہ میں تعطیل رہتی ہے۔

درسِ نظامی کے مستحق طلبہ کی کفالت مدرسہ کرتا ہے۔ طعام و قیام کے تمام لوازمات کے علاوہ معقول ماہانہ وظیفہ بھی دیا جاتا ہے، موسم کے لحاظ سے کپڑے، لحاف وغیرہ مہیا کئے جاتے ہیں اور سال کے دوران پڑھنے کے لئے کتابیں بھی کتب خانہ سے جاری کی جاتی ہیں۔

ابتدائی پرائمری استعداد رکھنے والے طالب علم کے لئے درسِ نظامی کا نصاب آٹھ سال کا ہے جس کے بعد درسِ نظامی کے فاضل کو مدرسہ کی طرف سے سند دی جاتی ہے۔ یہ سند بعض اسلامی ممالک کی یونیورسٹیوں میں منظور شدہ ہے۔

ب۔ **تحفیظ و تجوید القرآن** حفظ اور ناظرہ کی تعلیم کے سلسلے یہ دار العلوم کا نسبتاً زیادہ قدیم شعبہ ہے۔ یہ شعبہ دار العلوم کے افتتاح سے پہلے قائم ہو گیا تھا۔

حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ پاکستان میں ابتداءً دستور سازی کے سلسلے میں مدد کرنے کے لئے پاکستان تشریف لائے تھے، پھر یہاں کے حالات و ضروریات نے آپ کو مستقل قیام پر مجبور کر دیا۔ آپ چونکہ مقتدر اور معتمد علیہ علمی حیثیت رکھتے تھے اس لئے آپ جہاں بھی ہوتے عوام اور علماء کا آپ کی طرف، خصوصاً فتاویٰ کے سلسلے میں رجوع ہوتا۔ پاکستان تشریف لانے کے بعد بھی یہی ہوا لیکن ہجوم کار اور کثرتِ فتاویٰ کی وجہ سے مسجد باب الاسلام کراچی میں ایک کمرہ بنوایا گیا اور "دار الافتاء و امداد العلوم" کے نام سے باقاعدہ شعبہ قائم کر دیا گیا جس میں آپ نے شروع میں مولانا نور احمد صاحب مدظلہم کو اپنا معاون رکھا، امداد العلوم کے ضمن میں ایک مکتب بھی قائم کر دیا گیا اور اس طرح حفظ و ناظرہ کی تعلیم شروع ہو گئی، بعد میں اس مکتب کو درجہ فارسی تک وسعت دے دی گئی۔

پھر نانک واڑہ کی عمارت میں یہ شعبہ منتقل ہوا اور جب عربی درجات کی تعلیم کورنگی کی نئی عمارت میں منتقل ہو گئی تو یہاں بھی مقامی آبادی اور باہر سے آنے والے طلبہ کے لئے حفظ و ناظرہ کا انتظام ناگزیر ہو گیا۔ اب نانک واڑے کی عمارت حفظ و ناظرہ کی تعلیم کے لئے مختص ہے۔ کافی عرصہ

تک یہ شعبہ فن قرأت کے مشہور بزرگ جن کی بالادستی اس فن میں مسلم ہے حضرت قاری فتح محمد صاحب دامت برکاتہم کی نگرانی میں کام کرتا رہا اور اسی طرح اس شعبہ نے ظاہری اور معنوی لحاظ سے بہت ترقی کی۔ اس شعبہ کو بحمداللہ مخلص قراء کی رفاقت حاصل ہے اور اب تک اس شعبہ سے تقریباً ۸۰۰ بچے ناظرہ پڑھ کر فارغ ہوئے اور ۵۲۵ بچوں کو حفظ کی تکمیل کی سعادت حاصل ہوئی۔ فالحمدللہ علی ذالک۔

نانک واڑہ میں حفظ و ناظرہ کا کام قدیم مرمت شدہ عمارت میں جاری ہے اور کورنگی میں اب تک یہ کام ایک تنگ اور ناقص عمارت میں جاری تھا، گذشتہ سال ۱۳۹۰ھ سے یہ درجہ بھی عمدہ درسگاہوں میں منتقل ہوگیا، جو بعض اہل خیر کے تعاون سے بہت نفاست سے تیار ہوئی ہیں، لیکن یہ درسگاہیں اب بھی ناکافی ہیں اور مزید کے لئے کوشش جاری ہے۔

اس وقت اس شعبہ میں ۲۴۰ بچے پڑھ رہے ہیں جن میں ۱۰۰ بچے حفظ میں مشغول ہیں، سات اساتذۂ قرأت یہ خدمات انجام دے رہے ہیں۔

ج۔ تخصص فی الفقہ والافتاء اچھی استعداد رکھنے والے فارغ التحصیل علماء جو فقہ اور فتویٰ نویسی میں خصوصی تربیت حاصل کرنے کی خواہش رکھتے ہیں ان کے لئے یہ شعبہ اسی غرض کے لئے قائم ہے، یوں تو دارالعلوم کے دور اول ہی میں یہ کام شروع ہوگیا تھا اور مختلف حضرات حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں رہ کر تربیت حاصل کرتے تھے، لیکن ۱۳۸۹ھ سے اس شعبہ کو بہتر انداز میں منظم کیا گیا، "تخصص فی الفقہ والافتاء" کا مخصوص نصاب ہے جس کی مدت دو سال ہے، ہر سال میں سات پرچے رکھے گئے ہیں جو فقہ، اصول فقہ، تاریخ فقہ، فتویٰ، اصول فتویٰ، تمرین افتاء اور مقالہ نویسی وغیرہ پر مشتمل ہیں۔

اس درجہ میں صرف ان طلبہ کو داخلہ دیا جاتا ہے جو کسی مستند دینی درسگاہ سے اعلیٰ درجہ میں کامیاب ہوئے ہوں اور دارالعلوم کے معیاری امتحان داخلہ میں بھی اچھے نمبروں سے کامیاب ہو جائیں۔

اس درجہ میں طلبہ کو معقول وظیفہ دیا جاتا ہے، یہ طلبہ ماہر اساتذہ کی نگرانی میں تربیت حاصل کرتے ہیں اور دارالتصنیف کے وسیع اور قیمتی ذخیرہ کتب سے استفادہ کرتے ہیں، اس دو سالہ

تربیت کے بعد ان کو استخراجِ مسائل کا اچھا خاصہ ملکہ حاصل ہو جاتا ہے اور وہ اپنے اپنے علاقوں کی ضروریات پوری کرتے ہیں، اس سال اس درجہ میں نو افراد زیرِ تربیت ہیں۔ اس درجے سے متعلق مزید تفصیلات مولانا صبا ردانش صاحب کے مضمون "حضرت مفتی اعظم کی فقہی خدمات" میں موجود ہیں۔

د۔ مکاتب تعلیم القرآن قیام دارالعلوم کے بعد سے یہ کوشش تھی کہ قرآنی تعلیم کو پورے شہر میں عام کردیا جائے، دور دراز محلوں میں رہنے والے بچوں کے لئے یہ ممکن نہیں ہوتا کہ وہ دارالعلوم کورنگی یا نانک واڑہ کے درجات ناظرہ وحفظ سے فائدہ اٹھا سکیں، اخیر میں اس مقصد کے لئے شہر کے ایک دو محلوں میں مکتب کھولے گئے لیکن وسائل کی کمی سے یہ کام زیادہ نہیں پھیل سکا۔ حالانکہ قرآنی تعلیم کا فروغ دارالعلوم کا بنیادی مقصد ہے اور والدین کا شرعی فریضہ ہے کہ وہ بچے کو کلام الٰہی کی تعلیم کم از کم ناظرہ کی حد تک تو ضرور دلائیں۔ حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب قدس سرہ جب انگریز کی اسارت مالٹا سے واپس آئے تو آپ نے اس وقت مسلمانوں کے تنزل کے دو بڑے اسباب کی نشاندہی فرمائی تھی

۱۔ قرآن کریم سے غفلت اور ۲۔ آپس کی فرقہ بندی

اللہ تعالیٰ نے ارباب دارالعلوم کے اس فکر کو قبول کیا اور اس سلسلے میں کچھ وسائل مہیا ہو گئے، چنانچہ ۱۳۸۹ھ میں بحمداللہ محلہ جاتی مکاتب قرآنیہ کا باقاعدہ سلسلہ شروع ہوگیا۔

اس وقت شہر کے مختلف محلوں میں ۲۲ مکاتب قائم ہیں، جن میں ۲۸ مدرسین خدمات انجام دے رہے ہیں۔ اس سال ان مکاتب سے ۱۶۹۲ بچے فائدہ اٹھا رہے ہیں جن میں ۴۵ بچے حفظ کے بھی ہیں۔ مکاتب کے بچوں کو ناظرہ و تجوید کے علاوہ دین کے مبادی احکام اور اوراد و اذکار بھی یاد کرائے جاتے ہیں۔

مکتب کی مصلحت کے لئے طریقہ کار یہ وضع کیا گیا ہے کہ اس کی تعلیمی نگرانی دارالعلوم کے ذمہ ہے۔ ہر مکتب کے مصارف میں سے دو تہائی دارالعلوم برداشت کرتا ہے اور ایک تہائی حصہ محلہ کمیٹی کے ذمہ ہوتا ہے۔ دارالعلوم کی طرف سے ان مکاتب کی مسلسل دیکھ بھال کے لئے ایک مستقل قاری بحیثیت مفتش (انسپکٹر) مقرر ہیں جو امتحانات کا انتظام کرتے ہیں۔

اور رپورٹیں تیار کرتے ہیں بعض مساجد میں ایسے مکاتب پہلے سے محلے والوں کی طرف سے قائم ہیں جب وہ الحاق کے لئے دارالعلوم کو درخواست دے دیتے ہیں تو متعلقہ شرائط کے بعد ایسے مکتب کا الحاق کر لیا جاتا ہے۔

اللہ کا شکر ہے کہ یہ ایک مفید سلسلہ ہے اور اب تک ان مکاتب سے مختلف محلوں کے تقریباً پندرہ ہزار بچے فائدہ اٹھا چکے ہیں۔

ک- مدرسۃ البنات حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی یہ خواہش تھی کہ بچیوں اور خواتین کے لئے بھی دینی تعلیم کا مناسب انتظام کیا جائے۔ لیکن اس غرض کو بروئے کار لانے کے لئے وسائل کے علاوہ اچھی عصری اور دینی تربیت یافتہ خواتین اساتذہ کی نایابی رکاوٹ بنی رہی۔ اس ضمن میں دارالعلوم کورنگی کے احاطہ میں ایک حافظ و معلم کی نگرانی میں ایک عمدہ مکان میں پردے کی پوری رعایت کے ساتھ مکتب کی شکل میں ابتدائی کام شروع ہو گیا ہے جس میں بچیوں کو ناظرہ اور تجوید کی تعلیم دی جاتی ہے۔ اس قسم کا کام مکاتب قرآنیہ کے ضمن میں بھی جاری ہے۔

د- مدرسہ ابتدائیہ (پرائمری اسکول) دارالعلوم میں تعلیم کے دوسرے شعبہ جات کی طرح یہ بات بھی شروع ہی سے پیش نظر تھی کہ ابتدائی تعلیم کا ایسا مؤثر انتظام کیا جائے جس میں وافر دینی معلومات کے ساتھ عصری تقاضے بھی پورے ہوں۔ دارالعلوم دیوبند میں اس مقصد کے لئے درجہ فارسی و ریاضی کے نام سے ایک شعبہ قائم تھا جس میں مبتدی بچوں کو ناظرہ قرآن کے ساتھ ساتھ دینیات اور اس درجہ میں بچے اہم عمومی معلومات سے آراستہ ہو جاتے تھے، فارسی زبان، حساب، جغرافیہ، اقلیدس (جیومیٹری)، مساحت (سروے)، اردو مضمون نگاری جیسے ضروری مضامین اس شعبہ میں پڑھائے جاتے تھے، یہاں سے نکلنے والا بچہ اس وقت کے مڈل سے اچھی استعداد پیدا کر لیتا تھا، وہ خواندہ فرد کہلاتا جس کے بعد وہ سرکاری ملازمت کا بھی اہل ہوتا اور اچھی استعداد حاصل ہونے کے بعد وہ اعلیٰ دینی یا انگریزی تعلیم میں بھی تیز رفتاری سے چلنے کی صلاحیت پیدا کر لیتا۔ یہ شعبہ ظاہر ہے کہ اُس وقت کے حالات کے مطابق کھولا گیا تھا اب جدید دور میں یہ ضرورت میٹرک کی شکل میں حاصل ہوتی ہے لیکن صرف عصری معلومات کی حد تک۔

دارالعلوم نے اپنے محدود وسائل کے دائرے میں اس مقصد کے لئے کوشش شروع کر دی۔ سب سے اہم بات دینی مزاج رکھنے والے، تربیت یافتہ اساتذہ کا حصول تھا، اللہ کے نام پر ناساعد حالات کے باوجود ۱۰ رشوال ۱۳۹۴ھ کو حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اس شعبہ کا افتتاح فرمادیا، شروع میں صرف تین درجات کھولے گئے۔

ابتدائی تجربہ سے گزرنے کے بعد اب اس میں پانچ سال تک کی تعلیم جاری ہے، ابتدا میں عمارت بھی ناقص تھی۔ اب اس شعبہ کے لئے عمارت بھی بعض اہل خیر کے تعاون سے شاندار بن گئی ہے۔ یہ شعبہ بحمداللہ مفید خدمات انجام دے رہا ہے اور درج ذیل خصوصیات کا حامل ہے۔

۱۔ مروجہ سرکاری نصاب کے ساتھ اس شعبہ میں ناظرہ قرآن اور دین کی بنیادی معلومات و احکام پر بھی ترجیحی توجہ دی جاتی ہے تاکہ بچے کا ذہن شروع ہی سے دینی رنگ میں رنگ جائے اور اس پختگی کی وجہ سے وہ مستقبل میں کسی ذہنی و فکری لغزش میں مبتلا نہ ہو، چنانچہ پانچویں سے فارغ ہونے والا بچہ سرکاری نصاب کے علاوہ پورا قرآن کریم تجوید و ناظرہ کے ساتھ پڑھ چکا ہوتا ہے، ۳۰ واں پارہ اس کو حفظ کرا دیا جاتا ہے، ضروری مسائل و احکام، عقائد، سیرت، اور ابتدائی فارسی اس نصاب کے لازمی اجزاء ہیں۔

۲۔ یہاں کے اساتذہ دینی جذبے سے دینی ماحول میں تربیت دیتے ہیں، سوائے جمعہ کے اور کسی دن کی تعطیل نہیں ہوتی، ملک کی سیاسی بے چینی یا ہنگامہ آرائی دارالعلوم کے مدرسہ ابتدائیہ پر اثر انداز نہیں ہوتی اور تعلیم کا کام یکسوئی سے جاری رہتا ہے۔

۳۔ شروع میں اس مدرسہ کو محکمہ تعلیم کراچی سے منظور کرا لیا گیا تھا ان دنوں اس کا امتحان بھی بورڈ لیتا تھا اور نتیجہ سو فی صد ہوتا، لیکن آئے دن بدلنے والی سیاسی حکومتوں اور ان کی نامناسب پالیسی کی وجہ سے تعلیم کی مصلحت کے لئے یہ الحاق واپس لے لیا گیا، یہاں سے فارغ ہونے والا بچہ، جو سرکاری اسکول میں پڑھنے والے بچے سے بہت عمدہ صلاحیت کا حامل ہوتا ہے یا تو دارالعلوم کے اعلیٰ عربی تعلیم سے منسلک ہو جاتا ہے یا انٹرویو کی بنیاد پر سرکاری اسکول میں داخلہ لیتا ہے، یہاں پانچویں کا بچہ سرکاری اسکول میں ساتویں کے بچے سے زیادہ ذہنی اور علمی پیش رفت رکھتا ہے۔

۴۔ شروع میں یہ مدرسہ پچاس بچوں سے شروع ہوا تھا اور اب اس میں تقریباً تین سو بچے مختلف کلاسوں میں پڑھتے ہیں، بعض کلاسوں میں بچوں کی کثرت کی وجہ سے دو دو فریق (سیکشن) ہیں، تعلیم کی کوئی فیس نہیں لی جاتی، اچھے نمبروں میں کامیاب ہونے والے بچوں کو انعامات دیئے جاتے ہیں اور بچوں کی تربیت کے لئے ان کے جلسے بھی کرائے جاتے ہیں۔

۵۔ اس شعبہ کو پرائمری سے ہائی اسکول اور کالج کی سطح تک بھی لیجانے کا ارادہ ہے لیکن ظاہر ہے کہ اس مقصد کے لئے معتد بہ وسائل اور مناسب سٹاف ضروری ہے جو اس وقت دستیاب نہیں ہیں۔ تاہم موجودہ سطح میں بچوں کی تعداد تیزی سے بڑھ رہی ہے اور موجودہ شاندار عمارت جو خاصی کشادہ تعمیر کی گئی ہے اب تنگ ہو رہی ہے، جیسے ہی وسائل میسر آجائیں گے اس عمارت میں توسیع کا کام شروع کر دیا جائے گا۔

۶۔ اس سال سے بچوں کے لئے مخصوص یونیفارم تجویز کیا گیا ہے جو سادہ، پروقار اور قومی و دینی مزاج سے ہم آہنگ ہے، اساتذہ کے لئے دینی وضع قطع ضروری ہے تاکہ تعلیم کے ساتھ اعمال و اخلاق کی بھی بہتر ماحول میں اصلاح ہو سکے۔ اس شعبہ کا الگ ناظم ہے، اس وقت اس میں نو اساتذہ تعلیم دے رہے ہیں۔

اب تک مدرسہ ابتدائیہ میں ۴۶۷ بچوں نے مختلف کلاسوں میں داخلہ لیا ہے اور ۱۵۸ بچے یہاں سے فارغ ہو چکے ہیں، ان بچوں کی تعلیم و تربیت کے پورے مرحلے میں یہ مقاصد پیش نظر ہیں۔

(الف) ایسے بچے اگر درس نظامی میں آئیں تو ابتدائی استعداد اور معلومات عامہ سے بہرہ ور ہوں، اور درس نظامی کا فاضل بننے کے بعد وہ بنیادی معلومات سے بے خبر نہ ہوں۔

(ب) اگر یہ بچے مزید تعلیم کے لئے سرکاری سکولوں اور پھر کالجوں میں داخلہ لیں تو وافر دینی معلومات رکھنے کی وجہ سے متبادل ماحول سے متاثر نہ ہوں۔

(ج) اس کے ذریعہ سرکاری دفاتر میں کچھ خدا ترس لوگ پہنچ جائیں اور ملک و قوم کی خدمت کا فرض دیانت و امانت کے ساتھ ادا کریں۔

مدرسہ ابتدائیہ کا پورا طریقۂ کار، نصاب، نظام وغیرہ کتابی شکل میں چھپا ہوا ہے تاکہ اگر دوسرے

حضرات اس تجربہ سے فائدہ اٹھانا چاہیں توان کے لیے آسانی ہو۔

ز۔ تربیت ترجمہ قرآن مجید

دو سال سے دارالعلوم میں یہ ایک نیا تعلیمی تربیتی پروگرام شروع کیا گیا ہے، یہ پروگرام بنیادی طور پر فارغ التحصیل ائمہ مساجد کے لئے ہے، لیکن بعض دوسرے حضرات بھی اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ اس میں عربی کی متوسط استعداد رکھنے والے حضرات داخلہ لیتے ہیں اور تین ماہر اساتذہ حدیث حضرت مولانا سبحان محمود صاحب، حضرت مولانا شمس الحق صاحب اور حضرت مولانا غلام محمد صاحب انہیں ترجمہ قرآن مجید کی تعلیم کی اس طرح تربیت دیتے ہیں کہ ایک یا دو سال کی مدت میں فہم قرآن کے ساتھ انہیں عوام الناس کو براہ راست ترجمہ قرآن پڑھانے کا مناسب سلیقہ آ جائے۔

اس شعبہ میں داخلہ لینے والے طلبہ کو معقول وظیفہ دیا جاتا ہے ان طلبہ میں سے بعض وہ ہیں جو باہر سے آتے ہیں اور بعض اقامتی طلبہ بھی ہیں۔ اس سال اس درجہ میں سات افراد زیر تعلیم ہیں اور سال گزشتہ پانچ طلبہ فارغ ہو چکے ہیں۔

ح۔ درس ترجمہ قرآن مجید

شعبہ تربیت ترجمہ سے فارغ ہونے والے حضرات کو دارالعلوم کی طرف سے مختلف مقامات اور مساجد اور تعلیم البالغان کے مراکز میں ترجمہ قرآن پڑھانے کے لئے مامور کیا جاتا ہے، اس خدمت کا انہیں دارالعلوم کی طرف سے معاوضہ ملتا ہے، بالغ حضرات کے لئے یہ سلسلہ بہت مفید ثابت ہو رہا ہے۔

تعلیمات سے متعلق یہ آٹھ شعبے اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے مفید اور ہمہ گیر خدمات میں مشغول ہیں، مستقبل کے منصوبوں میں انہیں زیادہ جامع اور وسیع تر بنانے کے علاوہ مندرجہ ذیل دو شعبے پیش نظر ہیں۔

۱۔ مدرسہ ابتدائیہ (پرائمری اسکول) کو پہلے مرحلے کے طور پر ہائی سکول کی سطح تک اور پھر کالج تک بڑھانا۔

۲۔ تخصص فی الفقہ والحقوق (فقہ اسلامی اور جدید قانون کی پوسٹ گریجویٹ ٹریننگ کے لئے ایک اکیڈمی کا قیام جس میں علماء کو جدید قانون اور وکلاء کو فقہ اسلامی کی اعلیٰ تعلیم دی جائے تاکہ یہ حضرات مستقبل کے لئے عدالتوں کی رہنمائی کا اہم کام کر سکیں۔ واللہ المستعان وھو الموفق —

۳۔تحفیظ وتجوید القرآن ، ۴۔مکاتب تعلیم القرآن ، ۵۔مدرسا ابتدائیہ
انتظامی مصلحت کے لئے ان تینوں کو الگ الگ شعبہ بنایا گیا ہے گذشتہ صفحات میں
ان کا تفصیلی تعارف پیش کیا جا چکا ہے۔

۶۔دارالافتاء

حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ قیام پاکستان کے ایک سال بعد ۱۹۴۸ء میں کراچی تشریف
لے آئے تھے، دارالعلوم دیوبند میں آپ ادب اور حدیث کی شہرت یافتہ مقبول تدریس کے بعد
دارالافتاء سے منسلک ہو گئے تھے اور وقت کے اکابر علماء کی خدمت میں اس فن میں ید طولیٰ
حاصل کیا، علمبردفقہی صلاحیت کی بناء پر آپ کو صدر مفتی بنایا گیا تھا۔ پندرہ سال کی مدت میں تقریباً
پچاس ہزار فتاویٰ آپ کے قلم سے نکلے جن میں سے کچھ فتاویٰ دارالعلوم کے نام سے شائع
ہو چکے ہیں۔

اس مقبول شہرت اور صلاحیت کی بناء پر آپ جہاں بھی ہوتے سوالات کا تانتا بندھا رہتا
پاکستان میں جیسے ہی آپ کی آمد کی شہرت ہوئی آپ کی طرف کثرت سے عوام اور خواص کا رجوع
ہونے لگا اور یہ کام آپ انفرادی طور پر باوجود ہجوم مشاغل کے نہایت نظم و ضبط کے ساتھ انجام
دینے لگے، لیکن جب اس سلسلہ میں اور زیادہ اضافہ ہوا تو لوگوں کی آسانی کی خاطر اس مقصد
کے لئے دارالافتاء امداد العلوم کے نام سے مسجد باب الاسلام آرام باغ میں ایک کمرہ بنوا لیا
گیا ان دنوں آپ کا قیام برنس روڈ میں تھا، اس [illegible] مولانا نور احمد صاحب کو آپ
نے بطور معاون اپنے ساتھ رکھا بعد میں جب [illegible] دارالعلوم کے انتظامات کے
سلسلے میں زیادہ مشغول ہو گئے تو مولانا مظہر [illegible] صاحب کو یہ کام سونپا گیا اور جب نانک واڑہ کی
عمارت مل گئی تو دارالافتاء کا شعبہ یہاں باقاعدہ قائم کیا گیا اور ضروری کتب فراہم کی گئیں اب یہ سب
کام آپ کی ذاتی نگرانی میں ہوا کرتا تھا۔ دارالافتاء دارالعلوم کا ایسا شعبہ ہے جس سے دور دراز کے
لوگ، علماء اور عوام سب فائدہ اٹھاتے ہیں، حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی شخصیت کی بناء پر بیرون پاک
کے علاوہ دور دراز کے اسلامی، افریقی اور یورپی ممالک سے بھی اس دارالافتاء کی طرف سوالات

کثرت سے آنے لگے، جب تعلیمات کے شعبے کورنگی کی عمارت میں منتقل ہوگئے تو یہاں بھی دارالافتاء کا شعبہ قائم کردیا گیا اور ناظم آباد کا شعبہ بھی جاری رہا۔

اب کافی عرصہ سے دارالافتاء دارالعلوم کورنگی کو مرکزی حیثیت حاصل ہے، اب تک اس دارالافتاء سے محتاط اندازے کے مطابق ایک لاکھ سے زائد فتاویٰ صادر ہوچکے ہیں تحریری شکل کے علاوہ زبانی اور ٹیلیفون پر بھی یہ سلسلہ ہمیشہ سے جاری رہا۔ شروع میں ان فتاویٰ کو نقل کرنے کا اہتمام نہیں تھا، خال خال کوئی فتویٰ درج رجسٹر ہوجاتا۔ لیکن اب کچھ عرصہ سے اس کا اہتمام کیا گیا ہے، اس وقت سے لے کر اب تک (۱۸ رجمادی الثانی ۱۴۰۹ھ شام ۳ بجے) فتویٰ کا سیریل نمبر ۲۵۱۲۳۹ ہے اور ۴۷واں رجسٹر زیر تکمیل ہے۔

یہ ایک اہم علمی ذخیرہ ہے اس ذخیرہ کو منضبط اور مبوب کرکے شائع کرنے کا ارادہ ہے۔ وما ذالک علی اللہ بعزیز۔

۷۔ دارالتصنیف

یہ شعبہ دارالعلوم کا اہم تحقیقی شعبہ ہے جس کے تحت عصرِ حاضر کے پیدا کردہ مسائل اور دیگر وقیع علمی موضوعات پر تحقیق و تصنیف کا کام جاری رہتا ہے۔ یہ شعبہ مولانا محمد تقی صاحب عثمانی کی خصوصی نگرانی اور ہدایات کے تحت کام کرتا ہے، اب تک بہت سی کتابیں اس شعبے سے شائع ہوچکی ہیں اور باقی اہم کتابوں پر کام جاری ہے، "البلاغ" اور "مکتبہ دارالعلوم" کے شعبہ جات بھی اسی شعبہ کے تحت قائم ہیں اور "کتب خانہ دارالعلوم" وقف بھی اسی کا ذیلی ادارہ ہے۔

یہ شعبہ اساتذہ دارالعلوم کے علاوہ دوسرے مصنفین و مترجمین کی خدمات بھی حاصل کرتا ہے، اس شعبہ کے پاس کتابوں کا وقیع علمی ذخیرہ ہے تاہم بہت سی کتابوں کی ضرورت محسوس کی جا رہی ہے۔ اس وقت یہ شعبہ متعدد دفاتر میں پھیلا ہوا ہے، کام کو سمیٹنے کے لئے دارالتصنیف کی مستقل عمارت کا کام شروع کردیا گیا ہے جس پر تقریباً چار لاکھ روپے کی لاگت آئے گی۔ اس عمارت کی تکمیل کے بعد دارالتصنیف کا کام زیادہ منظم اور منضبط ہوجائیگا۔

تحقیق و تکمیل کے بعد اس شعبہ کی تصنیفات مکتبہ دارالعلوم کے حوالہ کردی جاتی ہیں،

یہ مکتبہ ان کی کتابت وطباعت اور نشر واشاعت کا اہتمام کرتا ہے۔ ایسی مطبوعات کا تذکرہ ہم مکتبہ دارالعلوم کے ذیل میں کریں گے۔

اس وقت دارالتصنیف میں جو علمی کام زیر تکمیل ہیں ان میں سے چند مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔ فتح الملہم تکملہ فتح الملہم جو حضرت علامہ شبیر احمد صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کی ناتمام شرح مسلم کی تکمیل ہے۔ مولانا محمد تقی عثمانی نے یہ کام حضرتؒ کی حیات ہی میں شروع کر دیا تھا، اس کا ایک معتدبہ حصہ مکمل ہو چکا ہے اور رفتہ رفتہ آگے بڑھ رہا ہے۔

۲۔ اعلاء السنن کی تحقیق وتعلیق۔ اس کی ایک جلد شائع ہو چکی ہے۔ باقی جلدیں زیر تکمیل ہیں۔

۳۔ معارف القرآن کا انگریزی ترجمہ جس کا سوا پارہ مکمل ہو چکا ہے۔

۴۔ المعجم الصغیر للطبرانی رحؒ کی تبویب اور تخریج وتعلیق جو دارالعلوم کے ایک فاضل استاذ مولانا محمد اسحاق جہلمی انجام دے رہے ہیں۔

۵۔ اعجاز عیسوی مؤلفہ مولانا رحمت اللہ صاحب کیرانویؒ کی تحریر جدید اور شرح وتحقیق جو مولانا محمد تقی عثمانی اور مولانا حسین احمد نجیب مشترک طور پر کر رہے ہیں۔

۶۔ امام ابوبکر الخلالؒ کی کتاب "الامر بالمعروف والنھی عن المنکر" کا اردو ترجمہ جو مولانا محمد عبدالمعز ذاکر فاضل دارالعلوم نے کیا ہے۔

۷۔ حضرت مفتی اعظمؒ کے عربی رسالے "کشف العناء عن وصف الغناء" کا اردو ترجمہ جو موسیقی کی شرعی حیثیت پر ہے اور یہ ترجمہ بھی مولانا موصوف نے کیا ہے۔

۸۔ حضرت مفتی اعظمؒ کے اصلاحی مضامین کا مجموعہ جسے راقم الحروف مرتب کر رہا ہے۔

۹۔ عبدالقادر عودہ شہید مرحوم کی معروف کتاب "التشریع الجنائی الاسلامی" کا اردو ترجمہ جس کا آغاز مولانا محمد عبدالمعز ذاکر نے کر دیا ہے۔

۸۔ ماہنامہ البلاغ کراچی

بناء دارالعلوم کے بعد سے یہ ضرورت محسوس کی جا رہی تھی کہ خالص علمی اور تدریسی مساعی کے علاوہ عام خواندہ مسلمانوں سے رابطہ کا کوئی مسلسل ذریعہ اختیار کیا جائے، دین کی دعوت اور

اخلاق و اعمال کی اصلاح کے لئے دوسرے وسائل بھی اختیار کئے جائیں اور الحاد و مادیت کے عصری فتنوں کا تعاقب کیا جائے، اس مقصد کے لئے کتب و رسائل کی اشاعت کا سلسلہ تو شروع ہی سے جاری تھا لیکن یہ طریقہ اس غرض کے لئے ناکافی تھا اس لئے یہ طے کر لیا گیا کہ دارالعلوم کی طرف سے ایک باوقار علمی، دینی اور اصلاحی ترگن جاری کیا جائے، دوسرے شعبہ جات کی طرح یہاں بھی وسائل مفقود تھے، لیکن حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی متوکلانہ ذات نے یہاں بھی اسی توکل کے سرمایہ پر اعتماد کیا اور محرم ۱۳۸۷ھ میں البلاغ کا پہلا شمارہ آ گیا۔

اس کے افتتاحیہ میں حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا،

"نشر و اشاعت کا دور اپنے عروج پر ہے، ہر باطل اپنی رنگینیوں کے ساتھ اسی کے ذریعہ پروان چڑھ رہا ہے، مادیت کا طوفان، نظر فریب طباعت اور رنگا رنگ دل کش تصویروں کے ذریعہ نظروں سے دماغوں پر اور دماغوں سے دلوں پر چھا گیا ہے، معاش اور معاشیات ہی سب کا مبلغ علم اور معراج ترقی ہو کر رہ گئی ہے معاد اور انجام نہ صرف نظروں سے اوجھل ہوتا جاتا ہے بلکہ اس کے حروف و نقوش کہیں نظر آتے ہیں تو رجعت پسندی اور قدامت کے حسین نشتروں سے اسے چھیل کر صاف کر دینا سب سے بڑی خدمت خلق سمجھا جاتا ہے اہل حق اور اہل حق گوشہ گیر ہیں نہ ان کو وہ اسباب و آلات میسر ہیں کہ ان رنگینیوں کے حسین لباس میں ظاہر ہو سکیں۔ اور یہ صورت کچھ ان کی تدر و قامت کے لئے زیب بھی نہیں دیتی۔ دین و آخرت کے مضامین پر کوئی مقالہ، رسالہ لکھا جائے تو اس کی حیثیت نقاروں میں طوطی کی صدا سے زیادہ کیا ہو سکتی ہے۔ مگر ایں ہمہ یہ انبیاء کا دین ہے، اہل عزم و ہمت کی شریعت ہے جو کبھی ان طوفانوں سے نہیں گھبرائے، باطل کی آندھیوں میں وہ اپنا راستہ بنا تے ہی چلے گئے۔"

اور یوں ظلمت و باطل کا مقابلہ کرنے کے لئے ایک دیا روشن ہوا جو حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی سرپرستی اور مولانا محمد تقی صاحب مدظلہم کی ادارت میں۔

اس وقت سے لے کر اب تک اللہ کے فضل و کرم سے البلاغ پوری استقامت و مسلسل

جرأت اور حکیمانہ اسلوب کے ساتھ اپنا فرض انجام دے رہا ہے، دل نشین دعوت دین، حکیمانہ تنقید اور دین کے خلاف اٹھنے والے فتنوں کا بے لاگ تعاقب اس کی اہم خصوصیات ہیں، البلاغ کسی کا دل نہیں دکھاتا، وہ دورِ حاضر کی دل آزار صحافت کو تخریب سمجھتا ہے، البتہ حق بات کہنے اور تحقیق کی کسوٹی پر پرکھنے میں مداہنت کا بھی روادار نہیں۔

اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ جدید وقدیم دینی اور علمی حلقوں میں البلاغ کو مقبولیت حاصل ہے اور اس نے ملکی سطح پر بھی اہم اجتماعی مسائل میں اپنا بھرپور کردار ادا کیا ہے۔

برصغیر کے ممتاز اہلِ قلم نے اس ماہنامہ کو خراجِ تحسین پیش کیا ہے اور اس کی علمی و دینی خدمات کو سراہا ہے، اس کے ادارئیے علمی اور ادبی دنیا میں ممتاز مقام حاصل کر چکے ہیں۔ نمونہ کے لئے ہندوستان کے معروف اہلِ قلم اور کہنہ مشق صحافی مولانا عبدالماجد دریا آبادی مرحوم کا ایک جملہ پیش خدمت ہے جنہوں نے اپنے اخبار "صدق جدید" کے متعدد شماروں میں البلاغ کو پاکستان کا بہترین ماہنامہ قرار دیا ہے۔

> "حضرت تھانویؒ کے علمی جانشین اس وقت دو ہیں ...... ان میں سے ایک صاحب سرپرستی ماہنامہ "البلاغ" کراچی کی کر رہے ہیں اور رسالہ وقت کی بہترین دینی خدمت انجام دے رہا ہے اور ایک بہت بڑی بات پرچے کا اعتدال، اس کی میانہ روی اور اس کی غایت احتیاط ہے۔"

"البلاغ" چونکہ خالص دعوتی اور اصلاحی ہدف کے لئے جاری کیا گیا ہے اسلئے اس کی آمدنی، اخراجات سے ہمیشہ کم رہتی ہے اور رسالہ ہمیشہ خسارے کا شکار رہتا ہے، حالانکہ اس کے دفتری لوازمات بہت سادہ اور باکفایت ہیں، یہ خسارہ کبھی کوئی صاحبِ خیر پورا کرتا ہے اور کبھی دارالعلوم کے تبلیغی فنڈ سے اس کو امداد مل جاتی ہے۔ وسائل کی وجہ سے البلاغ کی اشاعت میں تقدیم وتاخیر ہوتی رہتی ہے لیکن ناغہ نہیں ہوتا، اللھم لک الحمد۔

۹- کتب خانہ (وقف)

مدرسہ اور کتب خانہ لازم وملزوم ہے اس لئے جب دارالعلوم کا افتتاح ہوا تو افتتاح سے

پہلے کچھ ضروری ورسی وغیر درسی کتب کا انتظام کر لیا گیا تھا، یہ کتابیں شروع میں چند سو تھیں اور پھر ان کی تعداد میں تیزی سے اضافہ ہوتا چلا گیا۔ اب اللہ کا شکر ہے یہ کتب خانہ اپنے اندر کتب کا معتد بہ ذخیرہ رکھتا ہے، ان کتابوں کی تعداد اس وقت بیس ہزار سے متجاوز ہے، یہ سب کتابیں وقف ہیں جن سے پڑھنے والے فائدہ اٹھاتے ہیں اور پھر واپس کر دیتے ہیں۔ اس کتب خانہ میں بعض نہایت نایاب کتب اور مخطوطات بھی ہیں جن کی تعداد پچاس کے قریب ہے اور بعض ایسی قیمتی کتابیں بھی ہیں جن کی قیمت ہزاروں تک پہنچتی ہے۔

یہ کتابیں تفسیر، حدیث، فقہ، علوم عربیہ، تاریخ، مذاہب وادیان، ادب اور بعض عصری علوم سے متعلق ہیں، زیادہ تر کتابیں عربی میں ہیں، فارسی، اردو اور انگریزی زبانوں کی کتابیں بھی کتب خانہ میں موجود ہیں۔

لیکن دارالعلوم جیسے مقتدر علمی، تحقیق اور اشاعتی ادارہ کے لیے یہ تعداد قطعاً ناکافی ہے۔ حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اس میں اضافہ کے لئے کوشش شروع فرمادی تھی، لیکن اس ضمن میں بڑی مشکل شایان شان عمارت کی غیر موجودگی تھی، یہ کتابیں اس وقت ایک پرانی بوسیدہ عمارت میں جمع ہیں جو اہم اور قیمتی کتابوں کے لئے قطعاً ناموزوں ہے نہ اس میں مزید کتابوں کی گنجائش ہے۔

حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے شایان شان عمارت کے لئے جو فنی لحاظ سے بھی منفرد ہو اور جس میں دو لاکھ کتابوں کی گنجائش ہو ماہر انجینئروں سے شاندار نقشہ بنوایا تھا اور اپنے آخری وقت میں اس عمارت کا سنگ بنیاد رکھ دیا تھا، آپ کو اس عمارت سے بہت دلچسپی تھی اور جلد سے جلد اس کی تکمیل کی تمنا۔ لیکن آپ کی زندگی کا چراغ گل ہو گیا اور یہ کام آپ کی زندگی میں اپنی ابتدائی بنیاد سے آگے نہ بڑھ سکا۔

اس وقت کے لحاظ سے اس عمارت پر خرچ کا اندازہ اٹھارہ لاکھ روپیہ تھا، لیکن حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے یہاں بھی مادی سرمایہ کے بجائے توکل کا سرمایہ استعمال کیا اور جو تھوڑی سی رقم اس مد میں وصول ہو گئی تھی اس سے بنیاد رکھنے کا کام لیا گیا۔

حضرت کے وصال کے بعد حضرت کے جانشینوں نے حضرت کی اس تمنا کو جلد سے جلد پورا

کرنے کی کوششیں شروع کردی، اللہ کے فضل وکرم سے غیب سے سامان پیدا ہوتے چلے گئے اور اس وقت اس عمارت کا تقریباً نصف کام مکمل ہوگیا ہے۔ دو چھتیں مکمل ہوچکی ہیں، تیسری چھت، فنشنگ، کھڑکی، دروازے اور کتابوں کے لئے الماریاں باقی ہیں، جو تقریباً دس لاکھ روپے کے خرچ کا کام ہے، جیسے جیسے عطیات وصول ہوتے ہیں اسی لحاظ سے کام آگے بڑھتا ہے۔

انشاء اللہ تکمیل کے بعد یہ عمارت اپنی مثال آپ ہوگی اور اس وقت اللہ تعالیٰ کتابوں کی بھی صورت پیدا فرمائیں گے۔ وما ذالک علیہ بعزیز۔

یہ کتب خانہ دار التصنیف سے ملحق ہے، لیکن انتظامی ضرورت کے لئے اس کو مستقل شعبہ بنایا گیا ہے۔

۱۰۔ مکتبہ دارالعلوم

یہ شعبہ دار التصنیف کا ملحق اور خود کفیل شعبہ ہے، نشر واشاعت اور کتابت وطباعت کا سارا انتظام اسی شعبہ کے ذمہ ہے۔ یہ مکتبہ حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا صدقہ جاریہ ہے اور علمی، تبلیغی، تحقیقی کتابوں کی نشر واشاعت کا اہم فریضہ انجام دے رہا ہے۔

قیام پاکستان سے پہلے حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے بعض احباب کی شرکت سے دیوبند میں ایک ادارہ بنام "کتب خانہ اشرفیہ" قائم کر رکھا تھا جس کی غرض وغایت حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی کتابوں کو شائع کرنا اور زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچانا تھا۔ یہ کتابیں مناسب قیمت پر فروخت کی جاتی تھیں اور ان کی آمدنی اسی میں لگتی رہتی تھی، ہجرت پاکستان کے بعد بمشکل تمام کچھ نقصان اٹھا کر یہ کتب خانہ پاکستان منتقل ہوسکا، دار العلوم سے وقتی ضرورت کے چھوٹے بڑے رسائل وقتاً فوقتاً شروع ہی سے شائع ہوتے رہے لیکن اس کی شدید ضرورت تھی کہ وسیع پیمانہ پر تحقیقی واصلاحی کتابیں شائع کرنے کے لئے مضبوط اور باقاعدہ بنیاد قائم ہو جائے ۱۳۸۵ھ میں حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے یہ پورا کتب خانہ دار العلوم کے لئے وقف فرمادیا۔ وقف کے وقت اس میں تجارتی نرخ کے لحاظ سے تینتیس ہزار تین سو دس روپے تیس پیسے ۳۰/۳۳۳۱۰ کی کتابیں موجود تھیں۔ کتب خانہ اشرف العلوم نے دیگر قابل قدر مطبوعات کے علاوہ امداد الفتاویٰ

کو مکمل ترتیب و تبویب کے ساتھ شائع کیا۔ اس سے پہلے امداد الفتاویٰ چار جلدوں اور سات تتمات پر مشتمل تھا، یہ فتاویٰ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی عمر بھر کا گرانقدر علمی ذخیرہ تھا، حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے خود اس کی ترتیب و تبویب فرمائی اور چھ مکمل جلدوں کی شکل میں اسے کتب خانۂ اشرف العلوم سے شائع فرمادیا۔

«مکتبہ دارالعلوم» کے نام سے دارالعلوم کے لئے وقف کرتے وقت حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے ایک وقف نامہ تحریر فرمایا جس میں اس کے مقاصد اور طریقۂ کار کی تفصیلات تحریر فرمائیں — جن میں سے چند یہ ہیں۔

۱- آئندہ اس کا نام «مکتبہ دارالعلوم» ہوگا۔

۲- اس مکتبہ سے ایسی کتابیں طبع کی جائیں جن کا مقصد شعائرِ دین کا تحفظ و احیاء اور قرآن و سنت کے خلاف مغالطوں کا ازالہ ہو۔

۳- وقت کے تقاضے کے مطابق کتابوں کی اشاعت کو ضروری سمجھا جائے اور متعلقہ طبقوں میں پہنچانے کا اہتمام کیا جائے۔

۴- یہ کتابیں قیمتہً فروخت کی جائیں اور آمدنی اسی مکتبہ کے لئے جمع رکھی جائے۔

تینتیس ہزار روپے سے شروع ہونے والا یہ مکتبہ اب بحمداللہ ساڑھے تین لاکھ روپے کی مالیت تک پہنچ گیا ہے اس وقت اس میں کتابوں کا ذخیرہ تقریباً پچاس ہزار کتابیں ہیں جو مختلف موضوعات سے متعلق اردو، عربی، فارسی اور انگریزی میں لکھی گئی ہیں۔

یہ مکتبہ اس وقت تک چھیالیس (۴۶) کتابیں طبع کر چکا ہے جن میں سے بعض یہ ہیں۔

۱- امداد الفتاویٰ مکمل اردو ۶ جلد، از حکیم الامت رح۔

۲- احکام القرآن عربی ۳ جلد، از حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ

۳- امداد الاحکام اردو ۱ جلد، از مولانا ظفر احمد عثمانی رح

۴- اعلاء السنن عربی جلد اول " " " "

تحقیق و تعلیق مولانا محمد تقی صاحب عثمانی۔ (نفیس عربی ٹائپ)

۵- علوم القرآن اردو از مولانا محمد تقی صاحب

۶۔ عصرِ حاضر میں اسلام کیسے نافذ ہو از مولانا محمد تقی صاحب

۷۔ بائبل سے قرآن تک اردو ۳ جلد ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

۸۔ آنسر ٹو ماڈرن ازم انگریزی ترجمہ (الانتباہات المفیدہ، از حکیم الامتؒ)

۹۔ علاماتِ قیامت اور نزولِ مسیح اردو از مولانا محمد رفیع صاحب عثمانی

۱۰۔ جواہر الفقہ اردو از حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ

مستقبل میں مکتبہ کے عزائم میں معارف القرآن کی ۸ جلدوں کا انگریزی ترجمہ، امداد الاحکام کی باقی جلدیں اور اعلاء السنن کی بقیہ سترہ جلدوں کی اشاعت ہے اور دار التصنیف سے وقتاً فوقتاً نکلنے والی تالیفات ۔ اللہ تعالیٰ نے اسباب مہیا فرما دیئے تو ایک پریس بھی تاکہ طباعت کا کام نسبتاً زیادہ خود کفالت کے ساتھ ہو سکے ۔

۱۱۔ دار التربیۃ للاطفال

بچوں کی اپنی الگ نفسیات ہوتی ہے ۔ تیزی سے پروان چڑھتے ہوئے جسم و ذہن میں جو بات شروع ہی سے ڈال دی جائے وہ پتھر کی لکیر بن کر نقش ہو جاتی ہے ۔ گھروں کا ماحول عموماً دینی مزاج کا نہیں ہوتا اور سکولوں میں تعلیم ڈھنگ کی نہیں ہوتی اور تربیت تو کجا ۔ نتیجہ یہ ہے کہ آج ہمارے تعلیمی اداروں سے نکلنے والے گریجویٹ لبادہ اوقات نہ اپنے دین کی ابجد سے واقف ہوتے ہیں اور نہ وہ اخلاقی تربیت رکھتے ہیں، حالانکہ انہی کو آگے چل کر ملک کی باگ ڈور سنبھالنی ہوتی ہے ۔

دوسری طرف دینی مدارس میں عام طور پر وہ بچے آتے ہیں جو دینی علوم و فنون ہی کی تحصیل کو اپنی زندگی کا مقصد بنا لیتے ہیں، ان بچوں میں معتد بہ تعداد غریب گھرانوں کی ہوتی ہے اور مدارس جو عوام کے چندوں سے چلتے ہیں ان طلبہ کو صرف بنیادی ضروریات فراہم کر پاتے ہیں ان کی گھریلو آسائش کا اپنے محدود وسائل کی وجہ سے کما حقہ انتظام نہیں کر سکتے ۔

ان دو متغایر نظاموں کے بین بین ایک ایسے ادارے کی ضرورت تھی جہاں بچے تعلیم کے ساتھ دینی و اخلاقی تربیت بھی پائیں، ان کے کھیل تفریح کا بھی سامان ہو اور اس ادارے میں ان کی دلچسپیوں اور آرام و آسائش کا بھی پورا لحاظ رکھا گیا ہو تاکہ وہ بچپن ہی میں اپنا دینی شعور قبول

کریں جس سے ان کا مستقبل محفوظ ہو اور وہ اس مناسب ماحول میں کسی گھٹن کے بھی شکار نہ ہوں بعض خوشحال والدین یہ چاہتے ہیں کہ ان کے بچے نیک ماحول میں تربیت پائیں اس مقصد کے لئے وہ خرچ کرنے سے بھی دریغ نہیں کرتے۔

دارالعلوم کے منتظمین کو اس ضرورت کا شروع ہی سے احساس تھا لیکن اس کے لئے ابتدائی وسائل میسر نہیں تھے، سب سے بڑی رکاوٹ مناسب عمارت کی غیر موجودگی تھی لیکن یکم صفر ۱۳۸۵ھ کو ایک مختصر عمارت میں اللہ کے نام پر "دارالتربیت" کے نام سے ادارہ قائم کر دیا گیا۔ بعد میں نسبتاً زیادہ وسیع عمارت مہیا ہو گئی جس میں دو بڑے ہال، دو اتالیق کے کمرے سٹور، ایک ملاقات کا کمرہ، لان اور بچوں کے لئے جھولے وغیرہ ہیں، اس عمارت میں پچاس بچوں کی رہائش کا انتظام ہے، ہر بچے کو نواڑ کی ایک مسہری اور چھوٹی سی الماری بھی ملی ہوئی ہے۔

یہ ادارہ خود کفیل ہے۔ بچوں سے ماہانہ ۷۰/- روپے فیس لی جاتی ہے جس سے ان کے طعام ناشتہ، جیب خرچ، اور صوبائی ابتدائی طبی امداد و تفریح کے مصارف پورے کئے جاتے ہیں، دوسرے مصارف کے لئے دارالعلوم کی طرف سے امداد دی جاتی ہے۔

یہاں رہنے والے بچے دارالعلوم کے تین تعلیمی اداروں میں سے کسی ایک سے منسلک ہوتے ہیں، مدرسہ ابتدائیہ، درجہ حفظ اور درس نظامی، اس ادارے میں صرف سات سال سے لے کر چودہ سال تک عمر کے بچے داخل کئے جاتے ہیں، ان بچوں کی مسلسل تعلیمی نگرانی کے علاوہ ان کی اخلاقی اور دینی تربیت کا خاص خیال رکھا جاتا ہے، یہ بچے پانچ وقت نماز باجماعت ادا کرتے ہیں، ان کا اپنا نظام الاوقات ہوتا ہے جس کی رعایت سے یہ نہایت نظم و ضبط سے دن بھر کے کاموں میں مشغول رہتے ہیں، ان کے کھیل اور تفریح کے لئے بھی وقت مقرر ہوتا ہے، مہینے میں ایک دن چھٹی کا ہوتا ہے جس میں یہ بچے اپنے گھر چلے جاتے ہیں۔

اس طرح بحمداللہ یہ ادارہ بچوں میں دین و اخلاق اور نظم و ضبط کا شعور پیدا کرنے کا مؤثر ذریعہ ہے، اس شعبہ کی طرف لوگوں کا رجوع بہت ہے لیکن محدود انتظام کی وجہ سے انہیں واپس جانا پڑتا ہے، ارادہ کیا گیا ہے کہ اس مقصد کے لئے وسیع عمارت تعمیر کی جائے جس میں کم از کم دو سو بستروں کا انتظام ہو، جس پر تقریباً پانچ لاکھ روپے کا تخمینہ ہے، جیسے ہی وسائل مہیا ہو جائیں گے

انشاءاللہ اس منصوبہ پر کام شروع کردیا جائے گا۔
دارالتربیت کا پورا دستور العمل ایک کتابچہ کی شکل میں چھپا ہوا ہے جس میں اس کا تفصیلی تعارف طریقۂ کار اور داخلے کے قواعد وضوابط درج ہیں۔

۱۲- دارالطلبۃ

دارالعلوم کی تاسیس کے بعد ابتدائی پانچ سال تک نانک واڑہ کی مختصر عمارت ہر شکل کا مرجع بنی ہوئی تھی، مدرسہ کے دوسرے بہت سے مقاصد کی طرح طلبہ کی رہائش کا انتظام بھی شش و پنج اسی عمارت میں کردیا گیا تھا، پھر اللہ تعالیٰ نے وسعت عطا فرمائی اور کورنگی کا رقبہ حاصل ہوگیا اور یہاں طلبہ کی رہائش کے لئے بفضلہ تعالیٰ مناسب انتظام ہوگیا۔

کورنگی میں طلبہ کی رہائش کا انتظام مختلف ترقی کے مراحل سے گذرنے کے بعد اب بہت بہتر ہوگیا ہے، اس میں طلبہ کی آرام و راحت کے تمام وسائل مہیا ہیں اور رہائش کی ترتیب میں ان کی اخلاقی اور تعلیمی بہبت کو بھی پورے اہتمام کے ساتھ پیش نظر رکھا گیا ہے۔ اس کی اہم خصوصیات یہ ہیں۔

۱- طلبہ کی اس اقامت گاہ کا نام دارالطلبہ ہے۔ اور یہ تین بڑے بڑے بلاکوں پر مشتمل ہے۔

۲- دارالطلبہ ۱ میں ایسے طلبہ کو رکھا جاتا ہے جن کی عمر کی حد، دارالتربیت کے معیار سے متجاوز ہوجاتی ہے یعنی ۱۵ سے ۱۹ سال تک کے بچوں کو۔ اور دارالطلبہ ۲ و ۳ بالغ طلبہ کے لئے مختص ہیں۔

۳- دارالطلبہ کے تینوں حصوں میں چالیس کمرے اور دو بڑے بڑے ہال ہیں، ہر بلاک میں خوب وسعت کے ساتھ عمدہ غسل خانے اور فلش کے بیت الخلاء ہیں، طلبہ کے کمروں کے سامنے ہی برآمدے میں گیس کے چولہے نصب ہیں جنہیں طلبہ اپنی ضرورت کے لئے ہر وقت استعمال کرسکتے ہیں، کپڑے اور برتن دھونے اور وضو کے لئے موزوں جگہیں بنائی گئی ہیں، ہر دارالطلبہ میں پختہ صحن اور دونوں طرف شاندار باغیچے (دلان) ہیں، تمام کمروں میں پنکھے لگے ہوئے ہیں۔

۴۔ دارالطلبہ کے نظم وضبط اور طلبہ کی خبر گیری و تربیت کے لئے تین قیم ہیں جو ان کے علاج ودوا کا انتظام کرتے ہیں اور عادات واخلاق کی نگرانی کرتے ہیں۔

۵۔ یہ دارالطلبہ دارالعلوم کے تعمیری احاطے کا ایک حصہ ہے اس لئے مسجد اور درسگاہ اور مطبخ کے قریب واقع ہے، ہر دارالطلبہ کے ساتھ ملحقہ کھیل کا میدان بھی ہے جس میں طلبہ عصر سے مغرب تک اپنے اپنے پسند کے کھیل کھیلتے ہیں۔

۶۔ دارالطلبہ میں رہائش کے لئے ہدایات مقرر ہیں جن کی پابندی اخلاقی تعلیمی اور انتظامی مصلحت کے لئے طلبہ پر لازم ہے۔

دارالطلبہ کے یہ تینوں بلاک اب طلبہ کی رہائش کے لئے ناکافی ہوتے جارہے ہیں اور اس میں اضافہ کرنے کا ارادہ کیا گیا ہے۔ اس کا نقشہ مکمل ہوگیا ہے اور کچھ عرصہ میں ان شاء اللہ بنیادوں کا کام شروع کردیا جائے گا تکمیل کے اسباب اللہ تعالیٰ میسر فرمادیں گے۔

۱۳۔ مسجد

دارالعلوم کی مسجد تعمیری احاطے کے عین سامنے وسط میں واقع ہے، اپنی سادگی، وقار و حسن میں منفرد۔ اپنی تعمیر کے وقت یہ مسجد اس ایریا کی سب سے بڑی مسجد تھی لیکن اب جبکہ چاروں طرف کا علاقہ نہ صرف یہ کہ آباد ہوگیا ہے بلکہ گنجان ہوتا جارہا ہے۔ یہ مسجد باہر سے نماز کے لئے آنے والوں کی وجہ سے تنگ محسوس ہونے لگی ہے، بالخصوص جمعہ کے دن تو بیرون مسجد سڑکوں تک صفیں آجاتی ہیں۔

اس لئے اس کو اپنی موجودہ وسعت سے ڈھائی گنا کرنے کا فیصلہ کیا گیا ہے اور اس کا نقشہ زیر تکمیل ہے۔ توسیع پر تقریباً چار لاکھ روپے کی لاگت کا تخمینہ ہے۔ اس توسیع کے بعد ان شاء اللہ تنگی کا احساس نہیں ہوگا۔ دارالعلوم کی دوسری مسجد وہ ہے جو دارالعلوم کی قدیم عمارت نانک واڑہ میں زیر تعمیر ہے اس کی دو منزلیں مکمل ہوچکی ہیں۔ یہ مختصر لیکن خوبصورت مسجد ہے۔

۱۴۔ تعمیرات

تعمیرات کا شعبہ دارالعلوم کے انتظامی شعبہ جات میں بہت زیادہ اہمیت کا حامل ہے، اس لئے

کردار العلوم کے دوسرے تمام شعبہ جات اپنی کارکردگی کے لئے اس شعبے کے محتاج ہیں نیز مصارف کے لحاظ سے بھی یہ بھاری اور صبر آزما شعبہ ہے۔

یہ شعبہ دار العلوم کے تمام قدیم تعمیرات کی اصلاح و ترمیم اور جدید منصوبوں کی پلاننگ، تعمیر اور تکمیل کے سارے فرائض انجام دیتا ہے۔

تعمیرات کے علاوہ پانی، بجلی اور گیس کی سپلائی بھی اس شعبہ کا فریضہ ہے

دار العلوم کورنگی ۵۶ ایکڑ رقبہ کا ایک وسیع خطہ ہے جو ۲۲۵۰ طویل اور ۱۵۰۱ فٹ عریض چاردیواری میں محصور ہے۔ اس میں سے تقریباً ۲۵ ایکڑ تعمیری رقبہ ہے۔ اس رقبہ پر ایک مسجد اور سکنا ہوں کے دو بلاک، دار الطلبہ کے تین بلاک، دفاتر کا ایک بلاک، مطبخ، مدرسہ ابتدائیہ، دار التربیت، کتب خانہ قدیم، ایک بڑا کنواں، ایک زمین دوز ٹینک، ایک ٹنکی، بولمیری وال سات بڑے بڑے شیڈ (جو فیکٹریوں کو کرایہ پر دیئے گئے ہیں) اور اساتذہ کے تقریباً بیس مکانات تعمیر ہو گئے ہیں۔

اس پورے رقبے میں پانی، بجلی اور گیس کی لائنیں دور دور تک پھیلی ہوئی ہیں۔

جاری منصوبوں میں کتب خانہ کی عظیم الشان عمارت، دار القرآن کی توسیع، مسجد کا توسیعی منصوبہ دار الطلبہ کی توسیع، مطبخ سے ملحق مطعم کا بڑا ہال اور اندرون احاطہ لانوں کی پلاننگ، دار التصنیف کی عمارت وغیرہ زیر تعمیر ہیں۔

جبکہ دار العلوم کو اپنے وسیع تر تعلیمی اور انتظامی مقاصد کے لئے درج ذیل اہم عمارتوں کی بھی شدید ضرورت ہے۔

۱۔ ہال برائے تقریبات (آڈیٹوریم) جس پر تقریباً چودہ لاکھ روپے کی لاگت کا تخمینہ ہے اور اس کا نقشہ تیار ہو چکا ہے۔

۲۔ دار الطلبہ کے لئے مستقل بلاک۔

۳۔ دار التربیت کے لئے ایک وسیع عمارت جس میں بچوں کی تفریح کے لئے باغیچہ اور کھیل کے سامان کے علاوہ دو سوئمنگ پولوں کا انتظام ہو۔

۴۔ اندرون احاطہ سڑکوں کی پختہ تعمیر

۵۔ مدرسہ ابتدائیہ کی توسیع اور ہائی اسکول کی ضرورت کے لئے مناسب عمارت۔

۶۔ موزوں مہمان دار الضیافۃ، جس میں ہر سطح کے مہمانوں کے قیام کے لئے مناسب آرام و راحت کا انتظام ہو، اس کا نقشہ تیار ہو چکا ہے۔

۷۔ اساتذہ اور ملازمین کے لئے مزید مکانات کی تعمیر۔

۸۔ موجودہ عمارتوں میں سے بعض میں اضافہ، ترمیم اور مرمت وغیرہ۔

۹۔ اندرون شہر نانک واڑے کی عمارت جو قدیم اور بوسیدہ عمارت ہے، ابھی تک اصلاح و مرمت کے سہارے اس میں دفاتر اور مدرسہ حفظ کا کام جاری ہے، اس جگہ شاندار بلڈنگ تعمیر ہو سکتی ہے جو دار العلوم کے بہت سے مقاصد کے حق میں خود کفیل ہو جائے گی۔ لیکن یہ کافی بھاری اخراجات کا منصوبہ ہے۔

ان تعمیری منصوبہ جات پر محتاط اندازے کے مطابق تقریباً پچھتر لاکھ روپے کا تخمینہ ہے۔ ضعیف بندہ کیا اور اس کے وسائل کیا، ارادے اور منصوبے بھی کوئی حقیقت نہیں رکھتے ـــــ لیکن دین کا یہ پودا جس رب کریم کی رضا جوئی اور اس کے کلمہ کو بلند کرنے کی نیت سے لگایا گیا ہے، اس کے ہر نشیب و فراز اور برگ و بار کے لئے واحد سہارا اسی کی ذات ہے، اب تک کا یہ سارا حیرت انگیز کام اسی کے توکل اور توفیق سے جاری ہوا، پروان چڑھا اور پھیل گیا، آئندہ بھی وہ اسے زیادہ بارآور بنانے کی صورتیں پیدا فرمائے گا کہ کام اور اسباب سب اسی کی قدرت میں ہیں۔ حسبنا و نعم الوکیل۔

۱۵۔ ترقیات

یہ شعبہ پہلے "تعمیرات" میں شامل تھا اور جب اس کا کام وسیع ہو گیا تو اسے مستقل شکل دے دی گئی۔ اس شعبے کے اہم فرائض دو ہیں۔

۱۔ اوقاف کا انتظام ـ دار العلوم کی زرعی اور رہائشی اراضی کی دیکھ بھال، اصلاح و مرمت قانونی چارہ جوئی، کرایہ داری کے معاملات، بلدیاتی اداروں سے مراجعت اور زراعت وغیرہ سے تعلق رکھنے والے امور یہ شعبہ سرانجام دیتا ہے۔ دار العلوم جس نے اپنے بانی کی للہیت، اخلاص

بزرگی اور علم و معرفت کی وجہ سے عوام میں بھی شہرت و مقبولیت کا مقام حاصل کر لیا ہے اور جس کی بہتر کارکردگی اور دینی و علمی خدمت پر لوگوں کو بحمداللہ اعتماد ہے۔ یہ لوگ اپنے دائمی اجر و ثواب کے لئے اپنی زمین و جائداد صدقہ جاریہ کے طور پر دارالعلوم کے لئے وقف کرتے رہتے ہیں، کراچی شہر اور مضافات میں ایسے متعدد مکانات دارالعلوم کے نام وقف کئے گئے ہیں، شعبہ ترقیات ایسے اوقاف کا نہ صرف تحفظ اور دیکھ بھال کرتا ہے بلکہ اسے وقف کرنے والوں کے حق میں زیادہ نفع بخش بنانے کی صورتیں بھی تجویز کرتا ہے، اب ان صدقات جاریہ کو تسلسل میں تبدیل کرنے کی یہ صورت اختیار کرلی گئی ہے کہ ان کی آمدنی وقتی مصارف میں استعمال کرنے کے بجائے، ایسے منصوبوں میں لگائی جاتی ہیں جو خود قائم رہنے والے ہوں، چنانچہ "کتب خانہ" کی تعمیر میں اس مد کی بھی رقم خرچ کی گئی۔

۲- باغبانی و شجرکاری - آج سے دس پندرہ سال پہلے دارالعلوم کورنگی کے وسیع احاطے میں کافی تعداد میں درخت لگائے گئے تھے، ان درختوں میں ناریل کی کثرت تھی، اب ان میں سے بہت سے درخت تناور ہو گئے ہیں اور ان پر پھل لگتا ہے، یہ پھل "ترقیات" کے ذریعہ طلبہ میں تقسیم ہوتا ہے اور فروخت بھی ہوتا ہے، تاہم گذشتہ تین سالوں میں شجرکاری کی طرف زیادہ توجہ دی گئی ہے اور کئی سو نئے پودے لگائے گئے ہیں، جن میں ناریل، آم، جامن اور پام کی تعداد زیادہ ہے۔ درختوں کے علاوہ اندرون احاطہ لانوں کے لئے بھی شاندار منصوبہ بندی کی گئی ہے سبز گھاس کے پلاٹ اور پھلواری کی خوبصورت کیاریاں زیر تکمیل ہیں، انشاء اللہ کچھ عرصے کے بعد علم کا یہ باغ حسن ظاہر اور رعنائی کا بھی شاندار گلستان ہوگا، جہاں ایک طرف قال اللہ و قال الرسول کی روح افزا صدائیں اور علم و فضل کی خوشبو ہوگی، اور دوسری طرف سبزہ و گل کے حسین مناظر سے نظروں کی تازگی کا سامان ہوگا۔

۱۶- استقبالیہ

استقبالیہ صبح سے شام تک دارالعلوم میں آنے والوں کے لئے چشم براہ رہتا ہے، یہ شعبہ درج ذیل فرائض انجام دیتا ہے۔

ا : ڈاک وتار کی ترسیل . ب : ٹیلیفون کی پیغام رسانی

ج : مہمانوں کی ضیافت د : متعلقہ شعبے میں آنے والوں کی رہنمائی

ا : دارالعلوم میں اندرون ملک اور بیرون ملک سے کثیر تعداد میں خطوط، اخبارات ورسائل اور دیگر پیغامات آتے رہتے ہیں۔ ان میں زیادہ تعداد فتاویٰ کی ہوتی ہے، یہ شعبہ ایسے تمام خطوط وصول کرتا اور متعلقہ شعبہ کے حوالہ کردیتا ہے، نیز دارالعلوم سے بھی روزانہ اسی طرح کے خطوط صادر کئے جاتے ہیں۔ ڈاک کی آمدورفت میں آسانی کے پیش نظر شروع ہی سے دارالعلوم کے لئے خصوصی طور پر سب پوسٹ آفس منظور کرالیا گیا تھا جو دارالعلوم ہی کی زمین میں واقع ہے اس لحاظ سے دارالعلوم کا پتہ بھی بہت آسان ہے۔ دارالعلوم کراچی ۱۴

ب : دارالعلوم کورنگی اور نانک واڑہ میں ٹیلیفون کی تین لائنیں ہیں، کورنگی میں اندرونی رابطے کے لئے ایکسٹینشن نظام بھی ہے۔ ان ٹیلیفونوں کے ذریعے دارالعلوم جیسے مرکزی دینی ادارے کا رابطہ ملک اور بیرون ملک کے علمی مراکز سے قائم رہتا ہے۔

ج : دارالعلوم میں وقتاً فوقتاً مہمانوں کی آمدورفت جاری رہتی ہے۔ ملک اور بیرون ملک کے بڑے بڑے علماء، سیاسی زعماء، وزراء اور مختلف طبقات سے تعلق رکھنے والے عوام۔ دارالعلوم اپنی وسعت کے مطابق ایسے معزز مہمانوں کی خاطر تواضع کرتا ہے۔

د : باہر سے دارالعلوم میں آنے والے حضرات سب سے پہلے استقبالیہ سے رجوع کرتے ہیں یہاں سے متعلقہ شعبے یا فرد کی طرف ان کی رہنمائی کی جاتی ہے۔ "استقبالیہ" دارالعلوم میں آنے والے عطیات وصدقات بھی وصول کرتا ہے اور شعبہ محاسبی میں منتقل کردیتا ہے۔

۱۷ - مطبخ

دارالعلوم میں نادار طلباء کے طعام کا انتظام دارالعلوم ہی کی طرف سے ہے اس لئے یہ مطبخ دارالعلوم کے روز اول ہی سے قائم ہے۔ نانک واڑے میں یہ مطبخ شکستہ اور تنگ کوٹھری میں تھا۔ کورنگی میں اس مقصد کے لئے ایک عارضی عمارت بنی تھی لیکن مطبخ کی ضروریات کے لئے یہ عمارت قطعاً کافی نہیں تھی۔ -

اب تقریباً آٹھ سال سے مطبخ کی وسیع اور شاندار عمارت بنوائی گئی ہے جو چھ وسیع کمروں اور بڑے احاطہ پر مشتمل ہے، ان کمروں میں اشیائے خورد و نوش کا ذخیرہ کرنے اور مطبخ سے متعلق دیگر ضروریات کا معقول انتظام ہے۔

مطبخ سے دوپہر و شام کے طعام کی طرح طلبہ کو ناشتہ بھی ملتا ہے۔ ایک وقت میں تقریباً ساڑھے تین سو افراد کا کھانا تیار ہوتا ہے۔ طلبہ کو اجتماعی طور پر کھانا کھلانے کا انتظام ہے۔ اس وقت مطبخ کے دو کمرے بطور مطعم کے استعمال ہوتے ہیں اور مناسب مطعم کے لئے ایک بڑا ہال زیر تعمیر ہے۔

۱۸۔ محاسبی

شعبہ محاسبی دارالعلوم کا اہم شعبہ ہے، اس کا صدر دفتر شہر کی قدیم عمارت نانکواڑے میں واقع ہے اور کورنگی میں اس کا ذیلی دفتر کام کرتا ہے۔

دارالعلوم مستند اور قواعد و ضوابط کے تحت رجسٹرڈ ادارہ ہے، حکومت پاکستان کے ریونیو بورڈ نے بھی دارالعلوم کی امداد و عطیات کو انکم ٹیکس سے مستثنیٰ قرار دیا ہے۔

اس شعبے کے ذریعے دارالعلوم کی یومیہ آمد و رفت کی ایک ایک پائی کا حساب رکھا جاتا ہے زکوٰۃ، صدقات وخیرات اور عمومی عطیات کو مختلف مدات کی شکل میں محفوظ کیا جاتا ہے اور ہر مد کو متعلقہ شرعی مصرف میں خرچ کرنے کا اہتمام کیا جاتا ہے، آمد و رفت کے تمام حسابات رجسٹرڈ آڈیٹر کے ذریعے آڈٹ ہوتے ہیں اور ہر سال کی آڈٹ رپورٹ تیار ہوتی ہے۔

دارالعلوم کے تمام مصارف میں کفایت وقناعت کا حتی الامکان خیال رکھا جاتا ہے اور بحمداللہ یہاں کے بڑے بڑے کام کفایت شعاری کے ساتھ انجام پذیر ہوتے ہیں، دارالعلوم کی آمدنی کا نہ کوئی مسلسل اور یقینی ذریعہ ہے اور نہ دارالعلوم کی ضروریات کے لئے اپیلوں اور اشتہارات کا رسمی طریقہ اختیار کیا جاتا ہے، بانی دارالعلوم نے اس درسگاہ علم کو توکل ہی کی بنیادوں پر اٹھایا ہے، وہ اس بات کو کبھی برداشت نہیں کرتے تھے کہ اس دینی ادارے کی ضروریات کے لئے اپیل اور اعلان کا ایسا اسلوب اور طریقہ اختیار کیا جائے جو دینی وقار، تعفف اور خودداری

کے منافی ہو، لیکن اس کے باوجود بفضلہ تعالیٰ دارالعلوم قدم بقدم اپنے مقاصد کی طرف رواں دواں رہا۔ اس رب کریم کے فضل و کرم کا اندازہ کیجئے کہ کس طرح اللہ تعالیٰ نے لوگوں کے دل دارالعلوم کی اعانت کی طرف پھیر دیئے۔

دارالعلوم کا پہلا مالی سال جو ۱۱ شوال سنہ ۷۰ھ سے شروع ہوا اور ۱۵ شعبان سنہ ۷۱ھ پر ختم ہوا آڈٹ رپورٹ کے مطابق اس کی آمدنی اور مصارف کا میزان اس طرح تھا۔

آمدنی ۳۰،۱۲۲/۲

مصارف ۲۶۰۲۴/۴

جبکہ گذشتہ مالی سال ۱۷ شعبان سنہ ۹۷ھ تا ۱۵ شعبان سنہ ۹۸ھ کا گوشوارہ یوں ہے۔

آمدنی ۱۳،۹۸،۹۳۲/۱۰

مصارف ۱۲،۸۶،۳۹۶/۲۳

دارالعلوم کو زیادہ تر آمدنی زکوٰۃ و صدقات کے مد میں ہوتی ہے اور کچھ حصہ عطیات کی شکل میں وصول ہوتا ہے۔ زکوٰۃ و صدقات کی آمدنی کو مخصوص شرعی طریق کے مطابق نادار و مستحق طلبہ پر خرچ کیا جاتا ہے، جبکہ عطیات کی آمدنی سے اساتذہ و ملازمین کی تنخواہیں ادا کی جاتی ہیں اور تعمیراتی کام جاری رہتے ہیں۔

تعمیر کی ضرورت کیلئے یومیہ ملازمین کے علاوہ دارالعلوم کے مختلف تعلیمی اور انتظامی شعبہ جات میں تقریباً ۱۲۰ مستقل ملازمین ہیں، سب حضرات کفایت و قناعت کے ساتھ کم تنخواہوں پر دینی کاموں میں مشغول رہتے ہیں، یہاں نہ اونچی تنخواہیں ہیں اور نہ زندگی کے دوسرے سامانِ آسائش لیکن رضائے الٰہی کی تمنا اور اجر و ثواب کی امید وہ عظیم اجرت ہے جو اس کارواں کے پیشِ نظر ہے، کسی کی زبان و قلم سے نکلے ہوئے دو چار کلمات یا اللہ کے راستے میں اٹھے ہوئے کچھ قدم قبول ہو جائیں تو اس دنیا کے تمام خزائن اس کے مقابلے میں ہیچ ہیں۔ دین کے قافلے اپنے سالار کے نقشِ قدم پر چلنے کی کوشش کرتے ہیں جہاں ایک ایک مہینے تک خشک کھجوریں غذا بنتی ہیں اور کبھی اس سے بھی آگے پیٹ پر بندھے ہوئے پتھر "طاقت و توانائی" پہنچاتے ہیں۔

ہمارے حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے بھی۔ جو دارالعلوم کے بانی بھی تھے، اور ہمہ وقتی کارکن بھی۔

اس قناعت وکفایت پر عمل کیا اور عبرت کی مثال قائم فرمائی۔ [illegible]ھ میں آپ ناظم دارالعلوم کے نام ایک تحریر میں لکھتے ہیں:

"دارالعلوم کراچی کے ابتدائی پانچ سال تک احقر نے اپنی دلی خواہش کے مطابق دارالعلوم سے کچھ نہیں لیا۔ ۷۴ھ کے آخر میں مجلس منتظمہ دارالعلوم نے میرے لئے پانچ سو روپے ماہوار کا وظیفہ دارالعلوم سے لینا طے کیا تھا۔ میں نے اس وقت بھی عرض کیا تھا کہ اس وقت بضرورت اس کو قبول کرتا ہوں اور ہو سکا تو پھر اس کی واپسی کی فکر کروں گا، اس خیال کے ماتحت کچھ عرصے کے بعد تین ہزار پانچ سو روپے دارالعلوم میں واپس جمع کرا دیئے۔

شوال ۷۷ھ سے میں نے اپنی ضروریات میں کچھ اختصار کیا، اور پانچ سو کے بجائے تین سو روپے لینا شروع کیا، دو صد روپے ماہوار اس نیت سے دارالعلوم میں چھوڑ دیئے کہ دارالعلوم میں آنے والے مہمانوں کی مہمانی، چائے وغیرہ میری اس رقم سے ہوا کرے، اس کام پر دارالعلوم سے خرچ مجھے طبعاً پسند نہیں تھا۔ اسی عرصے میں دو چیزوں کی ضرورت مزید محسوس کر رہا تھا اور فکر میں تھا کہ کسی وقت پر اپنا بقیہ وظیفہ بھی بند کر کے اس کام میں لگا دوں۔

۱۔ مدرسین و ملازمین دارالعلوم کو وقتی ضروریات کے لئے قرض لینا پڑتا ہے یہ قرض دارالعلوم کی رقم سے شرعاً درست نہیں، اس لئے چاہتا تھا کہ اس کے لئے جداگانہ فنڈ جمع ہو جائے اور اسی میں سے قرض دیا جایا کرے۔

۲۔ وقتی مسائل و معاملات کے متعلق اسلامی معلومات کا مختصر لٹریچر مہیا کر کے ضرورت کے مواقع پر پہنچایا۔ اس وقت اللہ کا شکر ہے کہ اس نے اپنے فضل سے مجھے موقع نصیب فرمایا کہ اپنا بقیہ وظیفہ تین سو روپے ماہوار بھی امور مذکورہ کے لئے دارالعلوم کو دے دوں، اس لئے [illegible]ھ کے شروع سے میرا کوئی وظیفہ دارالعلوم سے جاری نہ کیا جائے، بلکہ (۱) پہلے تین ہزار روپے کی رقم قرضہ فنڈ کے لئے جمع کر لی جائے اور (۲) اس کے بعد یہ تین سو روپیہ ماہوار تبلیغ اور نشر و اشاعت کے کاموں میں صرف کئے جائیں۔ تقبل اللہ منا ورزقنا حسنات الدنیا والآخرۃ"

حضرتؒ کے بعد

حضرت رحمۃ اللہ علیہ کا لگایا ہوا یہ پودا جس کی جڑیں آپ کی حیات ہی میں پھیل گئی تھیں، کسے تصور تھا کہ آپ کے بعد بھی یہ اسی آب و تاب کے ساتھ قائم رہے گا، لیکن حضرت رحمۃ اللہ علیہ کو اللہ تعالیٰ نے جو بصیرت عطا فرمائی تھی اور اپنے کو عابر سبیل سمجھنے کا جو تصور آپ کو مستحضر تھا اس کی وجہ سے آپ نے اپنی حیات ہی میں دارالعلوم کے مستقبل اور اسکی بقاء و استحکام کیلئے کام شروع کر دیا تھا اس مقصد کیلئے آپ نے حضرات اساتذہ اور متعلقین دارالعلوم کی تربیت کے علاوہ خصوصیت سے حضرت مولانا محمد رفیع صاحب اور حضرت مولانا محمد تقی صاحب جو اپنے علم و عمل میں اپنے والد کے خلف صالح ہیں۔ کی تربیت شروع فرما دی تھی۔ ان دونوں حضرات نے اپنے والد بزرگوار کی زندگی ہی میں ان کا بہت سا بوجھ ہلکا کر دیا تھا اور دارالعلوم کے بارے میں حضرت کے مزاج و مذاق کو سمجھ گئے تھے، اس کے باوجود اگرچہ مجلس منتظمہ کے ارکان اور بہت سے احباب نے آپ سے بار بار فرمائش کی کہ اپنے بعد کے لئے کسی کو متعین فرما دیں جو دارالعلوم کی ذمہ داری سنبھال سکے، شروع میں آپ کو خود اس ضرورت کا احساس ہوا اور اس بارے میں سوچنے لگے۔ لیکن صاحبزادوں کو انتظامی ذمہ داری سونپنا طبعاً انہیں پسند نہ تھا، چنانچہ ایک عرصہ تک اس تردد میں رہے لیکن پھر ایک روز آپ نے فرمایا کہ "میں خواہ مخواہ اس فکر کو اپنے سر کیوں لوں کہ میرے بعد کون اس ذمہ داری کو سنبھالے، یہ اللہ تعالیٰ کا کام ہے، وہی اس کا انتظام فرمائیں گے، اب مجھے اس پر شرح صدر ہو گیا ہے کہ میں اپنے بعد کے لئے کسی کو نامزد نہ کروں، بلکہ مجلس شوریٰ جس کو بھی منتخب کر لے، انشاء اللہ اسی میں بہتری ہوگی، مسنون طریقہ بھی یہی ہے اور اب مجھے اس بارے میں کوئی تردد نہیں۔" چنانچہ اس معاملے میں بھی اللہ تعالیٰ نے آپ کو اتباع سنت اور توکل کی توفیق عطا فرمائی اور آپ نے کسی کو نامزد نہیں فرمایا اور بالآخر جب حضرتؒ کی وفات کے بعد مجلس منتظمہ کا پہلا اجلاس ہوا تو اس میں حضرتؒ کی جگہ باتفاق رائے عارف باللہ حضرت ڈاکٹر عبدالحی صاحب عارفی مدظلہم کو صدر منتخب کیا گیا، چنانچہ بفضلہ تعالیٰ اب دارالعلوم کو حضرت مدظلہم کی سرپرستی کا شرف حاصل ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم ہے کہ اب حکیم الامت حضرت تھانوی قدس سرہ کے وہ دوسرے ممتاز خلیفہ مجاز دارالعلوم کراچی کے سربراہ ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے اس دور میں حضرت حکیم الامتؒ کے علوم و معارف کی نشر و اشاعت کی توفیق خاص مرحمت فرمائی ہے۔ ساتھ ہی مجلس منتظمہ

نے یہ محسوس کیا کہ حضرت مولانا مفتی محمد رفیع صاحب عثمانی چونکہ بفضلہٖ تعالیٰ دارالعلوم کے بارے میں حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی تربیت کے اثر سے دارالعلوم کے بارے میں آپ کے مزاج و مذاق سے پوری طرح باخبر ہیں اس لئے "مہتمم" کی ذمہ داری آپ کو سونپی جائے اور مولانا محمد تقی عثمانی صاحب "نائب مہتمم" کی حیثیت میں آپ کی امداد کریں، چنانچہ یہ دونوں حضرات حضرت ڈاکٹر صاحب مدظلہم کی نگرانی و سرپرستی میں مصروف عمل ہیں۔

جب حضرت کا وصال ہوا جو پورے عالمِ اسلام اور بالخصوص دارالعلوم کے لئے عظیم سانحہ تھا، تو بظاہر حالات دارالعلوم کو بھی اس صدمے سے متاثر ہونا چاہیے تھا لیکن حضرتؒ کے اس حکیمانہ طرزِ عمل اور آپ کے مقامِ ولایت کی برکت و کرامت سے بفضلہٖ تعالیٰ دارالعلوم آپ ہی کے قائم کردہ راستہ پر گامزن ہے۔ ظاہر ہے کہ جو عظیم خلا پیدا ہوگیا ہے اسے پُر کرنا تو ممکن نہیں لیکن یہ انہی کے اخلاص، دعاؤں اور تربیت کا ثمرہ ہے کہ دارالعلوم کے نظام میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ بلکہ مستقبل میں دارالعلوم کے لئے حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے پیش نظر جو بہت سے ارادے تھے، حضرتؒ کے جانشینوں نے انہیں روبعمل لانے کے لئے خود فراموشی کے جذبے سے کام شروع کردیا اور آج بحمداللہ بہت سے وہ تعلیمی اور اشاعتی کام شروع ہو چکے ہیں جو حضرتؒ کے ذہن میں تھے، چنانچہ گذشتہ دو سالوں میں حضرتؒ کی خواہش کے مطابق دو نئے شعبے قائم ہوئے ایک "مدرسۃ البنات" دوسرا "تربیت ترجمۂ قرآن مجید" اس کے علاوہ "مکاتب تعلیم القرآن" میں توسیع کی گئی، جدید کتب خانے کی عظیم الشان تعمیر شروع ہوئی اور نصف تک پہنچ گئی، درجہ حفظ کی نئی عمارت تعمیر ہوئی اور مطعم کی تعمیر جاری ہے۔ دارالطلبہ اور مسجد میں اضافہ کرنے کے لئے کام شروع ہوگیا متعدد کتابیں تصنیف ہوکر شائع ہوئیں اور بحمداللہ حضرتؒ کے یہ دونوں جانشین جو بذاتِ خود حضرتؒ کا صدقہ جاریہ ہیں اپنے والہانہ جذبے سے دارالعلوم کو آگے بڑھانے میں مشغول ہیں وفقهما الله لما يحبه ويرضاه۔

یہ تھا دارالعلوم کے شعبہ جات کا مختصر تعارف، وہ دارالعلوم جو اپنے قیام کے وقت سے دین اور علوم دینیہ کی نشر و اشاعت اور دعوت و تبلیغ میں سرگرم ہے۔ اور جس کا ہر آنے والا وقت توفیق خداوندی کا نیا پیغام لے کر آتا ہے۔

علماء اور دینی مدارس کی اس بھاری مشکل کو کم ہی لوگ سمجھتے ہوں گے کہ ان اداروں کی تعلیمی تدریسی

وریز دعوتی فرائض کے علاوہ ان اداروں کے سرپرستوں کو۔ جو علماء ہی ہوتے ہیں۔ ان کے دفتری اور مالیاتی امور کا بھی انتظام کرنا پڑتا ہے، مؤخرالذکر انتظام علماء کے لئے نہایت صبر آزما اور کٹھن ہوتا ہے اور اس انتظام کی وجہ سے ان کی تعلیمی اور دعوتی افادیت محدود ہو جاتی ہے، ہونا یہ چاہیے تھا کہ یہ کام دیندار اہلِ خیر کے ہاتھوں میں ہوتا، اس طرح علماء ان اداروں کے لئے مادی وسائل کے حصول میں اُلجھنے اور ان کے انتظام میں مصروف ہونے کے بجائے یکسوئی اور دلجمعی سے تعلیم و دعوت کی طرف متوجہ رہتے۔

لیکن دین کے لئے فکرمند ہونے کا یہ جذبہ شروع ہی سے ان بوریہ نشینوں ہی کے حصے میں آیا ہے، عزم و ہمت کے ان مشکل اور صبر آزما مراحل سے وہی لوگ گزرتے ہیں جنہیں حق تعالیٰ اس راہِ جہاد کے لئے چن لیتا ہے، ایسے ہی مردانِ خدامست کے کارنامے صدقاتِ جاریہ بنتے ہیں۔ دارالعلوم بھی انہیں صدقاتِ جاریہ میں سے ایک ہے جس کے لئے اس کے بانیؒ نے پسینہ بہایا، خون خشک کیا، سرد و گرم حالات سہے اور جس کی اٹھان میں ان کے دل کی دھڑکنیں شامل ہیں۔

اللهم تقبل منه واجعل ثوابه رضاك واتح لهذه الدار واهلها أن يبلّغوا كلمتك ويذودوا عن دينك وصلّ اللّهمّ على من بعثته الى الناس كافة يتلوا عليهم آياتك ويزكّيهم ويعلّمهم الكتٰب والحكمة. منك السداد ولك الحمد ولا حول ولا قوة الا بك.

○

یقین کیجئے کہ عبادات کا جو طریقہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ نے اختیار نہیں کیا وہ دیکھنے میں کتنا ہی دلکش اور بہتر نظر آئے وہ اللہ اور اس کے رسولؐ کے نزدیک اچھا نہیں۔ (حضرت مفتی اعظمؒ: "سنت و بدعت" صفحہ)

○

حضرت زکی کیفی

دارالعلوم کراچی

یہ کون سا جہاں ہے، کہاں پر میں آ گیا؟ دل پر سرور و کیف کا عالم سا چھا گیا
دُنیا کے شور و شر کا یہاں نام بھی نہیں لب پر حدیثِ گردشِ ایّام بھی نہیں
دل میں یہاں ہوا و ہوس کا گذر نہیں جنّت نما ضرور ہے، جنّت اگر نہیں
مستی فضا پہ دل پہ عجب بے خودی سی ہے محسوس ہو رہا ہے، یہ دُنیا نئی سی ہے
یہ رفعتیں یہ اوج و بلندی خیال کی سُنتا ہوں بازگشت اذانِ بلالؓ کی

کیف و سرور و نور کا ہر سو ہجوم ہے
یہ درس گاہِ دین ہے، دارالعلوم ہے

امداد کی دُعائے سحر کا اثر ہے یہ چشم و چراغ دیدۂ اہلِ خبر ہے یہ
یہ ولولہ ہے سیّد احمد شہیدؒ کا اس میں جھلک رہا ہے تفقہ رشید کا
"نورِ محمدی" کے ہیں انوار ہر طرف قاسم کے علم و زُہد کے آثار ہر طرف
علم و عمل میں ربط ہے اور بے مثال ہے یعقوب کی نگاہ کا حُسن و جمال ہے
آیت ہے ایک رحمتِ پروردگار کی یہ شیخ مُراد عابدِ شب زندہ دار کی
دُنیا و دیں کا اس میں مُرتب نظام ہے یہ اشرفِ زمانہ کا فیضانِ عام ہے
پیکر ہے شیخِ ہند کے فکر و شعور کا پرتو ہے ایک حضرتِ انور کے نُور کا
شکرِ خدا کہ پاک زمیں پر نصیب کی یہ زندہ یادگار عزیز اور حبیب کی
پاکیزگی ہے سیّد اصغر خمیر میں شبیر کے علوم ہیں اس کے ضمیر میں
آسودہ رُوح ہو گئی تسکین مل گئی تعبیرِ خوابِ حضرتِ یٰسین مل گئی

بے شک یہ اک نشان ہے شانِ رفیع کا
یہ نخلِ آرزو ہے محمد شفیع کا

دارالعلوم نام عمارات کا نہیں
دارالعلوم نام جمادات کا نہیں

نقش و نگار و منبر و محراب بھی نہیں
یہ سبزہ زار و گلشنِ شاداب بھی نہیں

یہ درس گاہ و گنبد و مینار بھی نہیں
دارالعلوم ، یہ در و دیوار بھی نہیں

دارالعلوم منطقِ یُونانیاں نہیں
دارالعلوم . عقل کی حیرانیاں نہیں

دارالعلوم ، نام نہیں قیل و قال کا
یہ فلسفہ کا نام ، نہ بحث و جدال کا

زورِ بیاں ، و شورِ خطابت نہیں نہیں
علمِ عروض و حُسنِ بلاغت نہیں نہیں

دارالعلوم رُوح کی پاکیزگی کا نام
قلب و نظر کی ، رُوح کی آسودگی کا نام

دارالعلوم ، نفس کا ہر آن احتساب
معروف پر عمل ہے یہ منکر سے اجتناب

دارالعلوم نام ہے حُسنِ حیات کا
دارالعلوم نام ہے فکرِ نجات کا

یہ اُسوۂ رسُولؐ پہ چلنے کا نام ہے
خوفِ خُدا سے دل کے پگھلنے کا نام ہے

دارالعلوم . گلشنِ توحید کی بہار
دارالعلوم حُسنِ حقیقت کا جلوہ زار

دارالعلوم ، دیدۂ بینائے آب و گل
دارالعلوم مَنظرِ اسرار اہلِ دل

دارالعلوم ، میکدۂ بادہ کہن
دارالعلوم صبح کی پیغامبر کرن

دارالعلوم ، جذبۂ بیتاب کی نمو
دارالعلوم بحرِ نبوت کی آب جو

دارالعلوم ، راہِ محبت کا راہبر
دارالعلوم ، اہلِ بصیرت کی رہگذر

دارالعلوم ، صبحِ سعادت کا آفتاب
دارالعلوم ، رحمت و برکت کا ایک باب

دارالعلوم ، اہلِ محبت کا کارروان
دارالعلوم ، منزلِ محبُوب کا نشان

دارالعلوم ، چشمۂ انوارِ علم و فن
دارالعلوم ، عشق کا دریائے موجزن

دارالعلوم ، عزمِ ارادے کا اک جہاں
دارالعلوم ، جُہدِ مسلسل کی داستاں

یہ حضرتِ شفیع کی ہمت کا شاہکار
یہ حضرتِ شفیع کی عظمت کا اشتہار

یہ حضرتِ شفیع کے انفاس کی مہک
یہ حضرتِ شفیع کے جلووں کی اِک جھلک

یہ حضرتِ شفیع کے پیغام کا امیں
یہ حضرتِ شفیع کے خوابوں کی سرزمیں

یہ حضرتِ شفیع کے سینے کا سوز و ساز　　یہ حضرتِ شفیع کا محبوب دلنواز
یہ حضرتِ شفیع کے جذبات کا چمن　　یہ اُن کے علم و زُہد و تفقہ کا بانکپن

دیکھا اُسے تو ظلمتِ غم دُور ہو گئی
دُنیائے دل نشاط سے معمور ہو گئی

اوہام کے جو دل پہ جو بادل وہ چھٹ گئے　　قلب و نظر سے یاس کے پردے سے ہٹ گئے
دیکھا اُسے تو دیدہ و دل جھومنے لگے　　آنکھوں میں کچھ نقوشِ حسیں گھومنے لگے
دُنیائے آب و رنگ نگاہوں سے گر گئی　　آنکھوں میں اک حسین سی تصویر پھر گئی
صدیاں سمٹ کے آ گئیں بزمِ خیال میں　　ماضی کا حُسن دیکھ لیا اس کے حال میں
انوارِ بندگی کے جھلکتے ہُوئے ملے　　پیشانیوں میں سجدے چمکتے ہوئے ملے
علم و عمل کی انجمن آرائیاں ملیں　　نظروں میں وسعتیں ملیں، گہرائیاں ملیں
دریا سبک خرام ملے چال ڈھال میں　　کلیاں چٹک رہی ہیں یہاں بول چال میں
اظہارِ سادگی کا ہر اک خد و خال سے　　واقف ہیں عصرِ نو کے فریبِ جمال سے
فخر و غرور و عجب و حسد کا گذر نہیں　　ہونا تو چاہیے تھا یہاں بھی۔ مگر نہیں!
احسان و عدل و زُہد و تواضع عجیب ہے　　ہر شخص کو یہ فکر، قیامت قریب ہے
ملتی ہے اہلِ دل کو طریقت کی راہ بھی　　یہ مرکزِ علُوم بھی ہے، خانقاہ بھی
ہر سمت ذکر و فکر، قیام و قعوُد ہے　　دل میں خدا کی یاد، لبوں پر دُرود ہے
معمور دل اُمید سے ہے اس کو دیکھ کر　　ظلمت کدہ میں شب کے یہ ہے مژدہ سحر

دیکھا اُسے تو نغموں سے آہیں بدل گئیں
میرے لبوں پہ آ کے دُعائیں مچل گئیں

یارب، لطافتِ دلِ جامی ملے اسے　　ختم الرسلؐ کا عشق دوامی ملے اسے
ہر قول و فعلِ جانِ حرم سامنے رہے　　ابنِ عمرؓ کا نقشِ قدم سامنے رہے
دُنیا یہ رنگ دیکھ لے سمع و قبول کا　　ہر حال میں ہو سامنے اُسوہ رسُولؐ کا
رازیؔ کی فکر بھی یہاں دانش فروز ہو　　اس کی رگوں میں عارفِ رُومیؔ کا سوز ہو

سائنس کے رموز سے یہ باخبر بھی ہو ۔۔۔ اور اس کے ساتھ قدرتِ حق پہ نظر بھی ہو
حامل ہو یہ علومِ قدیم و جدید کا ۔۔۔ قرآن سے بیاں ہو، نزولِ حدید کا
یوں گتھیاں سلجھتی رہیں اقتصاد کی ۔۔۔ اللہ کا کرم ہو اساسِ عماد کی
دنیا سے استوار ہو بنیاد دین کی ۔۔۔ تعمیل اس طرح سے ہو شرعِ متین کی
حنبل کی استقامتِ حق اس کی شان ہو ۔۔۔ اس کی ہر ایک بات صداقت نشان ہو
احساسِ کمتری ہو نہ اظہارِ برتری ۔۔۔ اس کے غنا کی شان ہو فقرِ ابوذری
تقلیدِ بوحنیفہؒ عالی مقام ہو ۔۔۔ جب تک یہاں پہ بحثِ حلال و حرام ہو
ذوقِ امام مالکِ عالی نسب ملے ۔۔۔ عشقِ رسولِ پاکؐ بحُسنِ ادب ملے
ناز و نیازِ عشقِ فسوں ساز بخش دے ۔۔۔ مولا، اسے اویسؓ کے انداز بخش دے
خالدؓ کی اس کو سختیِ کردار بھی ملے ۔۔۔ اخلاص و دردِ رومیؒ و عطارؒ بھی ملے

اس کے بدن کو روحِ بلالیؓ نصیب ہو
دل کو گدازِ قلبِ غزالیؒ نصیب ہو

○

حبِ مال اور حبِ جاہ، یہ دونوں قلب کی ایسی بیماریاں ہیں جن کے باعث انسان کی دنیاوی زندگی اور اخروی زندگی اجیرن ہو جاتی ہے اور غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ انسانی تاریخ میں اب تک جتنی انسانیت سوز لڑائیاں لڑی گئیں، اور جو فساد برپا ہوئے ان میں سے اکثر و بیشتر کو انہی دو بیماریوں نے جنم دیا تھا۔

(حضرت مفتی اعظمؒ، "معارف القرآن" صـ ۱۶۲ ج ۱)

باقیہ اسٹور

ایس، ای ۶۰، بلاک جی، الحیدری، نارتھ ناظم آباد کراچی ۳۳

○

حضرت مولانا سبحان محمود صاحب
ناظم دار العلوم، کراچی

بانئ دار العلوم کراچی اور دینی مدارس کے بارے میں آپ کا مذاق

۱۳۴۰ھ میں جبکہ راقم الحروف مدرسہ مظاہر العلوم سہارنپور میں زیر تعلیم تھا۔ ایک دن طلبہ میں خبر مشہور ہوئی کہ علامہ شبیر احمد صاحب عثمانی شہر میں تشریف لائے ہوئے ہیں اور فلاں جگہ قیام فرمایا ہے۔ شوقِ زیارت اور علامہ عثمانی سے عقیدت مندی نے حاضر خدمت ہونے پر مجبور کر دیا چنانچہ راقم الحروف مولانا محمود جینہ صاحب (حال مفتی و شیخ الحدیث دار العلوم ٹنڈو الہ یار) کے ساتھ زیارت کے لئے حاضر ہوا ہم جامع مسجد کے بازار سے گزر رہے تھے کہ اچانک ایک نورانی چہرہ والے نیک صورت بزرگ سامنے سے آتے ہوتے نظر آئے۔ پست قد، کھچڑی داڑھی، رخسار پر ایک مسّا، سر پر عمامہ، شیروانی زیب تن، اس پر شال اور ہاتھ میں عصا تھا۔ رفتار پُر وقار، ہونٹ ذکر اللہ میں مشغول، نظر نیچی اور مجسم سادگی کا نمونہ تھے مولانا محمود جینہ صاحب نے دیکھتے ہی فرمایا کہ مفتی محمد شفیع صاحب آ رہے ہیں۔ ہم نے آگے بڑھ کر نیاز مندانہ طریقہ پر سلام و مصافحہ کیا۔ حضرتؒ نے نہایت شفقت سے خیریت دریافت کی اور حضرت ہی سے معلوم ہوا کہ علامہ عثمانی صاحب سہارنپور سے جا چکے ہیں۔

علامہ عثمانیؒ کی زیارت نہ ہونے کا جو قلق ہم کو طبعاً ہونا چاہیے تھا ہمیں اندازہ ہوا کہ وہ نہیں ہے اور کیسے ہوتا جبکہ علامہؒ کے سچے جانشین اور شاگرد رشید سے شرفِ ملاقات حاصل ہو گیا۔

یہ تھی راقم الحروف کی حضرت مفتی صاحب نور اللہ مرقدہٗ سے پہلی مختصر سی ملاقات۔ لیکن اس مختصر سی ملاقات نے بڑے دیرپا نقوش احقر کے قلب و ذہن میں چھوڑ دیئے اور غیر شعوری طور پر حضرتؒ سے ایک خاص انس اور مناسبت محسوس ہونے لگی۔

اس زیارت سے پہلے حضرتؒ کی بعض تصانیف اور فتاویٰ احقر کی نظر سے گذرے تھے، نیز اس وقت مسلم لیگ اور کانگریس کی کشمکش سے متعلق بھی آپ کے جو خیالات و رجحانات مدلل طریقہ سے اخبارات وغیرہ میں شائع ہو رہے تھے، دیکھنے میں آتے تھے۔ آپ کا سراپا دیکھ کر حیرت ہوئی کہ یہ مختصر جثہ اور یہ غزیر علم۔

پھر ملک تقسیم ہوا اور راقم الحروف بھی پاکستان کے مختلف شہروں میں رہنے کے بعد ۱۳۶۹ھ میں کراچی میں آکر مقیم ہو گیا۔ حضرتؒ کی زیارت اس زمانہ میں جلسوں اور وعظ و تقریر کی مجلسوں میں ہو جاتی لیکن قریب جانے کا کوئی موقعہ نہ آسکا۔

۱۳۷۱ھ میں جبکہ راقم الحروف علامہ سید سلیمان ندویؒ کی زیر سرپرستی ایک مکتب سے مستعفی ہوا تو بعض احباب کی نشاندہی پر حضرتؒ کے قائم کردہ دارالعلوم سے تعلق قائم کرنے کا ارادہ کیا۔ یہ دارالعلوم کی تاسیس کا بالکل ابتدائی دور ہے۔ شاید بیس پچیس دن پہلے نانک واڑہ کی عمارت میں مدرسہ شروع کیا گیا تھا۔ اس موقعہ پر حضرتؒ کی خدمت میں حاضری ہوئی۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو وہ قوت حافظہ عطا فرمائی تھی کہ دیکھتے ہی برجستہ فرمایا کہ آپ کو کہیں دیکھا ہے۔ احقر نے سہارنپور کی ملاقات کا ذکر کیا تو آپ کو بھی یاد آگیا۔ پھر فرمایا کہ آپ کی درخواست دیکھی۔ بڑا انس محسوس ہوا۔ مزید کسی تحقیق کی ضرورت نہیں ہے۔ بس اللہ کے نام پر فلاں تاریخ سے کام شروع کر دیجئے۔

بیچئے اب ضابطہ کا تعلق بھی اللہ نے مرحمت فرما دیا۔ راقم الحروف نے کبھی اپنے آپ کو اس قابل نہیں . . . . سمجھا تھا۔ یہ محض اللہ کا فضل و کرم اور حضرتؒ کی انتہائی شفقت تھی کہ نا کارہ کو قبول فرمالیا اور تعلیم و تدریس کی خدمات سپرد فرمادیں۔

ضابطہ کے اس تعلق کے بعد حضرتؒ کو قریب سے دیکھنے کا اللہ نے موقعہ عطا فرما دیا۔ یہ تعلق . . . افسر و ماتحت کا تعلق نہ تھا بلکہ باپ اور بیٹے کا تھا۔ حضرتؒ اس نا کارہ کے ساتھ آخر تک اپنی اولاد کی طرح معاملہ فرماتے رہے۔ وفات سے چند ماہ پہلے ایک موقعہ پر خود اس کا اظہار احقر کے سامنے کر دیا مگر یا کہ "میں آپ کے لئے وہ سوچتا ہوں جو رفیق آنفی کے لئے سوچا کرتا ہوں"۔

حضرتؒ کے زیر سایہ احقر کے تقریباً ۲۵ سال گزرے۔ یعنی ربع صدی۔ اپنی بدنصیبی کہ کچھ حاصل نہ کر سکا اور یہ حضرتؒ کی شفقت و خیر خواہی کہ سب کچھ عطا کرنے پر تیار۔ اب افسوس ہوتا

ہے کہ کس قدر قیمتی وقت، اور کس طرح اس کو ضائع کر دیا۔

اس ربع صدی میں کیا کچھ دیکھا۔ مجھ جیسا بے بضاعت اور ناکارہ انسان اس کی حقیقت تک کہاں پہنچ سکتا ہے اور کیا سمجھ سکتا ہے۔ اس کے باوجود یادوں کا ایک طویل سلسلہ ہے۔ واقعات کا ایک نہ ختم ہونے والا تسلسل ہے اور آپ کے عادات و اطوار، اخلاق و کردار، اور سیرت و گفتار کے بے شمار قابل تقلید نمونے ہیں جو ذہن میں محفوظ ہیں۔

ایک شیخ طریقت، فقیہ النفس اور متبحر عالم کی زندگی کے ہر گوشہ کا احاطہ کر لینا ہر ایک کے بس کی بات نہیں، پھر مجھ جیسے ناکارہ سے یہ کیسے ممکن ہے۔ البتہ آپ کی بعض ایسی خصوصیات کا ذکر کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے جو ہمارے لئے بالخصوص طلبۂ، علمآ اور اہل مدارس کے لئے قابل تقلید ہیں۔ وان میں ظاہری و باطنی برکات اور کامیابیاں اپنی آنکھوں سے دیکھی ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہم کو ان پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

اللہ تعالیٰ نے حضرت مفتی صاحبؒ کو بہت سے اوصاف و کمالات سے نوازا تھا ان میں جو سب سے زیادہ ممتاز وصف تھا وہ حضرتؒ کا "مسلک اعتدال" تھا۔ اللہ تعالیٰ نے مشائخ دیوبند اور ہمارے تمام بزرگوں کو یہ کمال عطا فرمایا ہے۔ لیکن حضرت تھانوی قدس سرہٗ کا اس میں ایک خاص مقام تھا جو حضرتؒ کے تمام خلفآ اور منتسبین میں بھی نمایاں طور پر معلوم ہوتا ہے۔ حضرت مفتی صاحبؒ ہر معاملہ میں اعتدال پر رہتے، خواہ سیاسی ... معاملات ہوں یا شرعی و فقہی، اجتماعی ہوں یا انفرادی، اقارب سے ہوں یا اجانب سے، معیشت سے متعلق ہوں یا معاشرت سے، ہر حال میں، اعتدال پر رہنا آپ کا خصوصی امتیاز تھا۔ آپ نے جب سیاست کی وادئ پرخار میں قدم رکھا اور مسلم لیگ اور کانگریس کی باہمی کشمکش میں آپ نے مسلم لیگ کی حمایت فرمائی تو مخالفین کی پگڑیاں اچھالنے اور ٹانگیں کھینچنے سے ہمیشہ گریز کیا۔ اپنی رائے اور مسلک کو دلائل کی قوت کے ساتھ ظاہر کرنا اور مخالف رائے کا مدلل جواب دینا آپ کا کام تھا۔ اس سے آگے بڑھ کر شخصیات اور ذاتیات کو درمیان میں لاکر بات کرنے سے ہمیشہ گریز فرمایا۔ اسی وجہ سے آپ کی بات کو لوگ وقعت دیتے اور غیر محسوس طریقہ سے ہم نوائی پر اپنے آپ کو مجبور پاتے۔ علامہ عثمانی رح کی وفات کے بعد ایک موقعہ پر آپ کو جمعیۃ علمائے اسلام کا قائم مقام صدر منتخب کیا گیا۔ اس کی تنظیم کے سلسلے میں آپ نے ملک کے دونوں بازوؤں کا تفصیلی دورہ فرمایا۔ باہمی آویزش اس وقت بھی شباب پر تھی۔

لیکن اللہ تعالیٰ نے آپ کی زبان وقلم کو اہلِ علم اور مسلمانوں کی آبروریزی سے محفوظ رکھا۔
۱۹۷۰ء کے انتخابات کے موقعہ پر پھر آپ نے دینی ضرورت کے پیشِ نظر مرکزی جمعیت کی خدمت کے لئے اپنے تمام وسائل کو وقف کردیا۔ اس موقعہ پر راقم الحروف نے ایک دن عرض کیا کہ حضرت والا! دونوں طرف علمائے کرام ہیں۔ ہم بڑی الجھن میں مبتلا ہیں کیا کریں؟ فرمایا کہ حضرات علمائے کرام کی شان میں وہ معاملہ رکھو جو مشاجراتِ صحابہؓ میں اہلِ حق کا ہے۔ اس کے بعد جس کو حق سمجھتے ہو اس کی حمایت کرو۔ یہ ہے اعتدال جو آج کل عنقا ہورہا ہے۔ نہ اپنا نقطہ نظر قبول کرنے کا حکم دیا اور نہ کسی کی شان کے خلاف کچھ کہنے کی اجازت دی۔

شرعی معاملات میں بھی حد درجہ اعتدال ملحوظ رہتا۔ سینکڑوں بار بعض مسائل کو اخبارات میں شائع کرانے کی ضرورت پیش آئی۔ اس میں بھی اپنا نقطۂ نظر دلائل سے ثابت کرکے کسی پر ذاتی حملہ کئے بغیر پیش فرما دیتے۔ احقر نے نہ کبھی دیکھا نہ سنا کہ حضرتؒ نے مناظرانہ یا مجادلانہ روش اختیار کرکے کسی بحث کو طول دیا ہو یا جواب اور جواب الجواب کا سلسلہ چلایا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ ملک اور بیرونِ ملک کے جمہور مسلمان بلکہ اربابِ فتویٰ اور علماء بھی آپ کے فتوے پر اعتماد کرتے اور اہلِ علم تو بڑے پیچیدہ مسائل میں آپ سے رجوع کیا کرتے۔ البتہ اگر کہیں دینی ضرورت کا تقاضا ہوتا کہ مخالف کو مسکت جوابات دے کر حق بات تسلیم کرائی جائے، تو بحث ومناظرہ سے بھی دریغ نہ فرماتے۔ اللہ تعالیٰ نے اس میدان میں بھی حضرتؒ کو غالب رکھا۔ زمانۂ شباب میں آپ نے فرقِ باطلہ سے بارہا مناظرے کئے جس کے قصے کبھی ہم خدام کو بھی سنایا کرتے ۔۔۔ آپ کو جب پاکستان کی پہلی دستور ساز اسمبلی میں قانونِ اسلامی کی تدوین کے سلسلہ میں تعلیماتِ اسلامی بورڈ کا رکن بنایا گیا تو بڑے بڑے جغادریوں سے پالا پڑا جن میں وکلاء بھی تھے اور جج صاحبان بھی، مغرب زدہ بھی تھے ۔۔۔ اور اسلام سے بیزار بھی۔ ان سب کو دلائل و براہین اور مناظرانہ ابحاث سے نہ صرف خاموش کیا، بلکہ ان میں بہت سوں کو راہِ راست پر لگادیا۔ خود فرمایا کرتے تھے کہ اس موقعہ پر ہمیں سب سے زیادہ شرح جامی کی قیل وقال سے فائدہ ہوا۔ کیونکہ دستور کے ایک ایک لفظ پر بحث ہوتی اور الفاظِ دستور کے انتخاب میں بڑی قیل وقال کرنا پڑتی۔
آپ کو حکومت کے مختلف محکموں میں بحیثیت رکن رہنے کا اتفاق ہوا ہے کبھی زکوٰۃ کمیٹی میں تو کبھی نصابِ تعلیم کی کمیٹی میں۔ ان تمام مواقع پر آپ حق بات کو تسلیم کرا لیتے تھے۔

دارالعلوم کے انتظامی معاملات میں بھی آپ اعتدال پہ جمے رہتے۔ ہمیشہ دوسرے کی بات کو کھلے دل سے سے سنتے اور ایسا معتدل فیصلہ فرمایا کرتے تھے کہ ہر شخص دل سے قبول کرتا۔ اسی وجہ سے آپ کو ضوابط بہت کم نافذ کرنا پڑتے۔ فرمایا کرتے تھے کہ جو برکت رابطہ میں ہے ضابطہ میں نہیں۔ اسی لئے میں ہمیشہ رابطہ کو پیشِ نظر رکھتا ہوں۔ دارالعلوم کو دیکھتے ہی دیکھتے اللہ تعالیٰ نے جو اس قدر عروج عطا فرمایا اس میں آپ کے اخلاص وللہیت کو بڑا دخل تو تھا ہی، ساتھ ہی آپ کے اعتدال کا بھی یہ ثمرہ تھا۔ دارالعلوم کی پوری تاریخ اسی وصف سے معمور ہے۔

آپ کو علم دین اور اہل علم کی عزت کا تحفظ ہر حال میں ملحوظ رہتا۔ آپ سے تو خیر ایسا کوئی فعل... صادر ہونا تقریباً ناممکن تھا جس سے ادنیٰ سی بدنامی کا بھی اندیشہ ہو۔ آپ اپنے متعلقین کے لئے بھی یہی پسند فرماتے اور اس کی طرف توجہ دلاتے رہتے اور تمام علماء سے بھی اسی روش پر چلنے اور جمے رہنے کی تمنا فرماتے۔ چنانچہ اپنے منسلکین کو قابل اصلاح باتوں پر تنبیہ خود تو فرماتے لیکن دوسروں سے ذرا سی بات سننا گوارا نہ کرتے۔

دارالعلوم نانکواڑہ میں جگہ کی تنگی کے سبب طلبہ کی اقامت . . . . . درسگاہوں میں رہتی تھی ایک سائبان ڈال کر عارضی مسجد بھی بنالی گئی تھی۔ اس میں بھی طلبہ بیٹھتے، بیٹھتے گرمی کے زمانے میں بعض اوقات طلبہ صرف بنیان اور لنگی پہن لیتے۔ باہر سے آنے والے کسی شخص نے . . . . حضرتؒ سے شکایت کی کہ آپ کے طلبہ آنے والوں کا لحاظ بھی نہیں کرتے اور ان کے سامنے بھی اسی ہیئت سے پھرتے رہتے ہیں۔ حضرتؒ نے جواب دیا کہ یہ تو طلبہ کا گھر ہے اور اپنے گھر میں آدمی ہر طرح رہ سکتا ہے۔ اگر آپ کو یہ ناگوار گزرتا ہے تو طلبہ کے لئے کسی وسیع جگہ کا انتظام کر دیجئے۔ وہ صاحب تو یہ جواب سن کر چلے گئے پھر حضرتؒ نے طلبہ کو جمع کر کے سمجھایا کہ اس وقت مجبوری ہے، جگہ تنگ ہے پھر بھی آپ لوگ ایسے رہنے کی کوشش کیجئے کہ عام لوگ اہل علم کو ذلیل نہ سمجھیں۔

علامہ عثمانیؒ کے مزار کے نزدیک دارالعلوم کے نام پر ایک وسیع قطعہ اراضی الاٹ ہوا تھا جس پر آج کل اسلامیہ کالج قائم ہے۔ الاٹمنٹ کے تمام مراحل سے گزرنے اور قبضہ ملنے کے بعد سنگ بنیاد رکھنے کے لئے حضرت نے جلسے کا اہتمام کیا۔ بڑے بڑے علماء و مشائخ کو بلایا گیا اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اللہ والوں کا ایک بے نظیر اجتماع اس بہانے سے کراچی میں ہوگیا۔ لیکن عین موقعہ پر بعض حضرات کی جانب

سے اس جگہ تاسیسِ دارالعلوم کے خلاف ناخوشگوار انداز میں احتجاج کیا گیا۔ اس موقعہ پر قانون اور ۔ ۔ ۔ ۔ حکومت کی پوری طاقت حضرتؒ کے ساتھ تھی۔ بلکہ حضرتؒ کو پیش کش کی گئی کہ اپنا کام شروع کریں حکومت اس فتنہ کا ہر قیمت پر سرکچل دے گی لیکن آپ محض اس خیال سے کہ اس میں اہلِ علم کی ۔ ۔ ۔ جگ ہنسائی اور بدنامی ہے اتنے قیمتی قطعہ سے دست بردار ہو گئے۔

آپ نے اسی خیال کے پیش نظر دارالعلوم کے لئے چندہ وصول کرنے والا سفیر کبھی کسی عالم یا حافظ کو مقرر نہیں کیا۔ فرمایا کرتے تھے کہ اہل علم کی تذلیل و تحقیر میں ایک طرف تو علماء کی دنیوی رسوائی ہے اور دوسری طرف ذلیل سمجھنے والے کے دین و ایمان کے لئے بھی بڑا خطرہ ہے بعض اوقات علماء کی تذلیل کفر تک پہنچا دیتی ہے اور پتہ بھی نہیں چلتا اور اس سے بھی بڑا خطرہ یہ ہے کہ اگر وہ عالم اللہ والا بھی ہے تو ذلیل سمجھنے والے پر دنیا میں بھی عذاب کا اندیشہ ہے، آخرت کا معاملہ اللہ جانے"۔ اس طرح آپ نے علماء کی عزت کے تحفظ کے ساتھ عام مسلمانوں کے دین و ایمان کو بھی محفوظ کر دیا۔

اسی طرح آپ اپنی ذات، اپنے متوسلین، دارالعلوم اور عام علماء کے حق میں حد درجہ خودداری پر عمل فرماتے کبھی اشارۃً یا کنایۃً ایسی بات ظاہر نہ فرماتے جس سے خودداری کے مجروح ہونے کا اندیشہ ہو۔ ایک مرتبہ راقم الحروف سے فرمایا کہ کراچی آنے کے بعد کوئی ذریعہ معاش نہیں تھا سختی اور تنگی کا وقت تھا۔ چھوٹے چھوٹے بچے ساتھ تھے۔ نیا شہر تھا اور نئے آدمی۔ ایسے موقعہ پر بھی اللہ تعالیٰ نے قرض کے لئے ہاتھ پھیلانے سے مجھے محفوظ رکھا۔ پھر غیب سے ایسا انتظام فرما دیا کہ عزت اور سہولت کے ساتھ گزر بسر ہونے لگی"۔ دارالعلوم کے لئے بھی کبھی ایسی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ امداد قبول نہ فرمائی جو خودداری کے خلاف یا دینی ضرر پر مشتمل ہو۔ بارہا حکومت وقت نے دارالعلوم کو امداد کی ۔ ۔ ۔ ۔ پیش کش کی مگر آپ نے اس وجہ سے کہ نصاب و نظام میں تبدیلی کا خطرہ پیدا ہو جائے گا جس میں دینی ضرر اور ان مدارس کے قیام کا مقصود فوت ہونے کا قوی اندیشہ ہے، نہایت لطیف انداز سے اس کو قبول کرنے سے معذوری کا اظہار فرما دیا۔ فرمایا کرتے تھے دارالعلوم دیوبند کے اصول اساسی میں حضرت نانوتویؒ نے حکومت سے دارالعلوم کے لئے امداد قبول نہ کرنے کی وصیت فرمائی ہے انشاء اللہ ہم بھی اس پر عمل کرتے رہیں گے۔ فرماتے تھے کہ غریب کے روپے دو روپے میں جو برکت ہے وہ حکومت کے کروڑوں میں نہیں اور فرماتے تھے کہ غریب چندہ دے کر ممنونِ احسان ہوتا ہے کہ یہ چندہ قبول کر لیا گیا اور سرمایہ دار چندہ دے کر دوسرے پر احسان جتاتا ہے۔

متعدد بار اپنا ایک قصہ سنایا کہ جب پاکستان غیر ملکی رفاہی معاہدوں میں شریک ہوگیا اور ایک غیر مسلم حکومت سے روابط زیادہ ہوگئے تو اسی زمانہ میں حکومت امریکہ کے ایک بہت بڑے بااختیار افسر نے میرے پاس آمد و رفت شروع کی۔ میں ان کی آمد کا اصل مقصود سمجھ نہیں سکا لیکن بحیثیت مہمان میں نے ان کے احترام میں بھی کوتاہی نہیں کی۔ متعدد بار میرے مکان پر آنے کے بعد ایک مرتبہ انہوں نے اپنے بنگلہ پر میری چائے کی دعوت کی اور واضح کر دیا کہ گھر میں پکائی ہوئی کوئی چیز نہ ہوگی۔ صرف چائے اور پھل پیش کئے جائیں گے۔ میں نے یہ دعوت رد و کد کے بعد قبول کر لی۔ چائے کے بعد گفتگو کا سلسلہ چلا۔ اچانک میزبان نے اپنی گفتگو کا موضوع دارالعلوم کو بنا لیا۔ اس وقت کورنگی میں دارالعلوم کی تعمیر جاری تھی اور کثیر رقم کی اس میں ضرورت تھی انہوں نے معلومات حاصل کرنے کے بعد اپنی حکومت کی جانب سے اتنی بڑی رقم کی پیش کش کی جس سے دارالعلوم کے تمام تعمیری منصوبے پایۂ تکمیل تک پہنچ جاتے۔ فرمایا کہ یہ سن کر مجھے پسینہ آگیا۔ مگر میں نے یہ کہہ کر کہ حکومت کی امدادیں مشروط ہوتے ہیں اور ہم شرائط کے ساتھ کوئی امداد نہیں لیتے۔ ان سے عذر کر دیا۔ انہوں نے برجستہ کہا کہ یہ تمام امداد غیر مشروط ہوگی۔ یہ سن کر پھر مجھے پسینہ آگیا اور اللہ سے دعا کی اس فتنہ سے بچا! اللہ تعالیٰ نے جواب ذہن میں ڈالا اور میں نے کہا کہ ہم اپنی حکومت سے بھی امداد نہیں لیتے اور ہمارے لئے یہ بڑی اعتراض کی بات ہوگی کہ کسی غیر ملکی حکومت سے امداد لیں۔ یہ سن کر وہ خاموش ہوگئے۔ الکیا یوس ہوگئے۔ اس کے بعد نہ وہ خود آئے نہ کوئی رابطہ قائم کیا۔ اس پر تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا کہ ان لوگوں کے باخبر ہونے، اپنے مشن سے غافل نہ ہونے اور کام کرنے کے صحیح طریقے اختیار کرنے میں نظیر نہیں۔

حاجی محی الدین صاحب جو نہایت وضعدار بزرگوں میں سے ہیں اور حضرت مفتی صاحبؒ سے خاص تعلق رکھنے والے ہیں راوی ہیں کہ ایک مرتبہ حضرتؒ کے ساتھ سفر عمرہ میں ساتھ رہنے کی سعادت حاصل ہوئی۔ میرے ساتھ میرے دو نوجوان بچے بھی تھے۔ جہاز میں حضرتؒ کی سیٹ اوپر اور ہماری نیچے تھی مگر آپ ہی کہ معمولی معمولی کام کے لئے اوپر سے خود نیچے اتر کر آتے لیکن کسی سے کسی ادنیٰ کام کو بھی نہیں فرمایا۔ ہم نے عرض کیا کہ حضرت یہ بچے ہیں۔ آپ کا کام کرنے میں خوش ہوتے تو نہایت انکساری سے فرمایا کہ یہ خود مسافر ہیں ان کو زحمت دینا مناسب نہیں۔

آپ علماء کے لئے کسی ایسے کام یا مشغلہ کو پسند نہ فرماتے جس میں ان کی سبکی ہو ہمیشہ نصیحت فرمائے کہ رزق کا کفیل اللہ تعالیٰ ہے۔ اپنے آپ کو یا دین کو رسوا کر کے رزق حاصل کرنا دونوں جہان میں خسارے کا سبب

ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ رزق حلال کے اسباب کی حوصلہ افزائی فرماتے بلکہ ہر ممکن مدد بھی فرماتے۔

آپ کا طریقہ یہ تھا کہ ہر کام باہمی مشورہ سے کرتے۔ اس کا اس قدر اہتمام تھا کہ اپنے ذاتی اور خانگی امور میں بھی مشورہ کے بغیر کوئی قدم نہ اٹھاتے۔ دارالعلوم کے تمام معاملات باہمی مشورہ سے طے ہوتے اگر کوئی اہم معاملہ نہ ہوتا تو ذمہ دار شعبہ سے مشورہ فرما لیتے۔ ورنہ تمام حضرات کو مشورہ میں شریک فرماتے اور نہایت کھلے دل سے ہر ایک کی رائے نہ صرف سنتے بلکہ تقاضا کر کے ہر شخص سے اس کی رائے معلوم فرماتے۔ پھر ان آراء کو نہایت وقعت کی نظر سے دیکھتے۔ اگر کسی کی رائے میں کوئی سقم ہوتا تو اس کو مدلل ظاہر فرما دیتے اور نہایت تنقیح و تحقیق کے بعد اللہ پر بھروسہ کر کے فیصلہ فرما دیتے۔ فرمایا کرتے تھے کہ مشورہ میں بڑی برکت ہے۔ اسی وجہ سے صاحب وحی کو بھی مشورہ کا حکم دیا گیا۔ حالانکہ وہ اس کے محتاج نہیں تھے اور فرماتے کہ حضرت تھانوی قدس سرہٗ فرمایا کرتے تھے کہ اگر ضابطہ کے بڑے نہ رہیں تو برابر والوں سے اور وہ بھی نہ رہیں تو اپنے چھوٹوں سے مشورہ کر لینا چاہیے۔ ساتھ ہی یہ فرماتے کہ مشورہ دینے والا یہ نہ سمجھے کہ اس کی رائے پر عمل کیا جائے۔ کیونکہ مشورہ کا مقصود صرف اتنا ہے کہ مختلف آراء میں جو مناسب اور مفید ہو اس کو اختیار کر لیا جائے۔ عام طور پر مشورہ دینے والا یہی سمجھتا ہے جب اس کی رائے کے خلاف کیا جاتا ہے تو شکوہ و شکایت کرنے لگتا ہے۔ اس ناکارہ کے چونکہ عرصہ دراز تک حضرتؒ کے زیر سرپرستی دارالعلوم کے انتظام کی ذمہ داری سپرد رہی اس لئے قدم قدم پر اس کا مشاہدہ ہوتا رہا اور مشورہ کی خیر و برکت کھلی آنکھوں دیکھنے میں آتی رہی۔ بوقت ضرورت دیگر اہل مدارس سے بھی مشورہ کرنے میں دریغ نہ فرماتے اور مسئلہ کا فیصلہ کثرت رائے سے نہ فرماتے بلکہ قوت دلیل سے فرماتے۔

غالباً ۱۹۵۶ء میں جب برطانیہ اور فرانس نے مصر پر حملہ کیا تو پورے ملک میں سامراجی طاقتوں کے خلاف جذبات مشتعل ہو گئے۔ احتجاج اور مظاہروں کا سلسلہ شروع ہوا۔ اس موقعہ پر مدارس عربیہ کے طلبہ و اساتذہ نے بھی مظاہروں کی صورت میں اپنے جذبات کا اظہار کرنا چاہا۔ حضرتؒ کو یہ صورت معلوم ہوئی تو دارالعلوم اور مدرسہ عربیہ نیو ٹاؤن کے اساتذہ کو مشورہ کے لئے جمع فرما لیا۔ راقم الحروف باوجودیکہ کم عمر اور درجات ابتدائیہ کا استاذ تھا اس مشورہ میں شریک ہوا اور باہمی مشورہ کے بعد مناسب فیصلہ کر دیا گیا۔

حضرتؒ کو اپنے اساتذہ اور مشائخ سے بے انتہا عقیدت اور محبت تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ

ان کی عظمت، عقیدت اور محبت آپ کے رگ و پے میں سرایت کئے ہوئے تھی۔ جب ان میں سے کسی کا ذکر فرماتے تو ایک وجد کی سی کیفیت آپ پر طاری ہو جاتی۔ بخصوصاً مشائخ دیوبند سے تو ایسی عقیدت تھی کہ ان کے واقعات و ملفوظات تک حفظ تھے۔ کوئی بھی صورت حال سامنے آتی تو ان بزرگوں کا کوئی واقعہ یا ملفوظ اس کے مناسب ضرور بیان فرماتے پھر اسی کی روشنی میں اپنے اور اپنے متوسلین کے لئے راہ عمل متعین فرماتے۔ گویا آپ ان مشائخ کی چلتی پھرتی۔ ۔ ۔ تاریخ تھے کہ ان کا ذکر آپ کی نوک زبان پر رہتا۔ بالخصوص حضرت گنگوہی، مولانا نانوتوی، مولانا محمد یعقوب صاحب، حضرت شیخ الہند، حضرت تھانوی، امام العصر حضرت انور شاہ کشمیری، مولانا سید اصغر حسین صاحب اور مولانا اعزاز علی صاحب رحمہم اللہ کے واقعات و ملفوظات بکثرت اپنی مجالس میں ذکر فرماتے اور فرماتے کہ ان بزرگوں کے واقعات وحالات ہی انسان کی اصلاح کے لئے نسخۂ کیمیا ہیں۔ پھر حضرت تھانویؒ کا ایک ارشاد نقل فرماتے کہ "ہم تو آدمی نہ بن سکے لیکن ہم نے ایسے آدمیوں کو دیکھا ہے کہ ان کے بعد ہمیں کوئی دھوکہ نہیں دے سکتا۔" فرماتے کہ میرا بھی یہی حال ہے۔ بزرگوں کے واقعات ذکر کر کے عموماً یہ مصرع پڑھا کرتے تھے

ایک محفل تھی فرشتوں کی جو برخاست ہوئی

فرمایا کہ مولانا محمد یعقوب صاحبؒ دارالعلوم دیوبند میں قرن اول کے صدر مدرس تھے۔ مادر زاد ولی، خدا رسیدہ اور صاحب کشف و کرامات بزرگ، علم و فضل اور اخلاص و تقویٰ میں نہایت کامل، قطب زمان اور حضرت گنگوہیؒ کے استاذ زادہ تھے۔ ان کی خدمت میں چونکہ حاجت مند مسلمان بکثرت آیا کرتے تھے۔ اس لئے ان کو درسگاہ پہنچنے میں کچھ تاخیر ہو جایا کرتی تھی۔ مہتمم صاحبؒ نے حضرت گنگوہیؒ کو جو دارالعلوم کے سرپرست تھے اس صورت حال سے آگاہ کیا۔ چنانچہ حضرت گنگوہیؒ دیوبند تشریف لائے اور مولانا محمد یعقوبؒ صاحب سے فرمایا کہ یہ نہ سمجھنا کہ میں بڑا عالم اور اللہ والا ہوں، کوئی مواخذہ نہ ہوگا۔ طلبہ کا حق ضائع کرتے ہو قیامت میں کیا جواب دو گے۔ مولانا نے اس فہمائش کو سنا اور اپنی اصلاح کر لی، حضرت گنگوہیؒ نے حقوق کے معاملہ میں اتنی برگزیدہ ہستی کی بھی رعایت نہیں فرمائی، ادھر مدرسہ والوں کو سمجھایا کہ تم لوگ مولانا کے مرتبہ کو کیا پہچان سکتے ہو۔ اگر مولانا دارالعلوم کا صرف ایک چکر لگا کر ہی چلے جایا کریں تو خدا کی قسم یہ بھی کافی ہے۔ فرمایا کرتے کہ میرے والد محترمؒ نے دارالعلوم دیوبند کا وہ دور دیکھا ہے جب صدر مدرس سے لے کر دربان اور چپراسی تک صاحب نسبت

ولی تھے۔ دن میں درس قرآن و حدیث ہوتا اور رات کو ہر کمرہ سے ذکر اللہ کی آوازیں آیا کرتیں۔ اب مدارس میں یہ چیز کہاں باقی رہی۔ فالی اللہ المشتکی۔

آپ نے بار بار یہ واقعہ بھی سنایا کہ شاہ رفیع الدین صاحب دیوبندیؒ جو دار العلوم کے قرن اول میں مہتمم تھے۔ اگرچہ بظاہر علوم مروجہ سے ناآشنا تھے لیکن بڑے پایہ کے بزرگ اور ولی تھے انہوں نے دیکھا کہ بعض اساتذہ کچھ تاخیر سے مدرسہ آتے ہیں تو ایک دن مدرسہ کے دروازہ میں چارپائی ڈال کر بیٹھ گئے اور جو دیر سے آتا اس کو سلام کر لیتے۔ بس ایک دن میں سب کی اصلاح ہو گئی۔ پھر بھی ایک استاذ دیر سے آتے رہے تو ان سے شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ یقیناً آپ کو گھر میں کام ہوتا ہو گا۔ ادھر طلبہ کا حرج ہوتا ہے۔ میں ایک بے کار آدمی ہوں گھر کے کام مجھے بتا دیں میں کر دوں گا آپ طلبہ کے نفع کو مدنظر رکھیں۔ بس اتنی سی بات سے ان کی بھی اصلاح ہو گئی۔ اس پر حضرت مفتی صاحبؒ نے فرمایا کہ رابطہ سے جتنی مؤثر اصلاح ہوتی ہے ضابطہ سے نہیں ہوتی۔

وفات سے کچھ عرصہ پہلے حضرت مولانا بنوریؒ اپنے بعض رفقاء کے ساتھ آپ کی عیادت کے لئے تشریف لاتے۔ سلسلہ گفتگو ان مشائخ کے ذکر تک پہنچا۔ بالخصوص حضرت انور شاہ کشمیریؒ کے حالات و واقعات ایک دوسرے کو سنانے جانے لگے۔ احقر بھی اس مجلس میں حاضر تھا۔ حضرت مفتی صاحبؒ نے ایک عجیب واقعہ حضرت شاہ صاحب کا سنایا۔ فرمایا کہ جب مقدمۂ بہاولپور میں علمائے دیوبند تشریف لائے جن کے سرخیل حضرت شاہ صاحب اور علامہ عثمانی رحمہما اللہ تھے تو عدالتی کارروائی سے فراغت کے بعد خیال ہوا کہ مسلمانانِ بہاولپور کے دلوں سے علمائے دیوبند کے اس بغض و نفرت کو دور کرنا چاہیے جو بعض عاقبت نااندیش لوگوں نے ان کے ۔ ۔ ۔ ۔ دلوں میں راسخ کر رکھا ہے۔ چنانچہ غور و خوض کے بعد تجویز ہوا کہ ان علماء کا ایک جلوس شہر کے تمام ۔ ۔ ۔ راستوں اور بازاروں سے گزرنا چاہیے۔ حضرت شاہ صاحبؒ کے سامنے یہ تجویز رکھی گئی تو فرمایا کہ اگر اس کام میں دین کا کوئی فائدہ ہے تو مجھے کوئی عذر نہیں۔ چنانچہ شہر میں اعلان ہو گیا کہ علمائے دیوبند فلاں فلاں راستہ سے گزریں گے۔ وقت مقررہ پر حضرت شاہ صاحبؒ کی سرکردگی میں ان حضرات کا جلوس چلا۔ راستہ کے دونوں طرف عام لوگ کھڑے تھے۔ ان نورانی چہروں کو دیکھ کر آوازیں آنے لگیں کہ یہ چہرے تو اللہ والوں کے ہیں۔ اگر یہی دیوبندیت ہے تو ہم بھی اس کو اختیار کرتے ہیں۔ فرمایا کہ بس ایک جلوس سے شہر کی فضا ۔ ۔ ۔ میں انقلاب

آگیا اور وہ نفرت وبغض، عقیدت ومحبت میں بدل گئے۔ یہ ہوتی ہے اللہ والوں کی شان اپنانچہ حدیث میں بھی اللہ والوں کی پہچان یہی بتائی گئی ہے کہ ان کے چہرے دیکھ کر اللہ یاد آجائے۔ واللہ اعلم

اپنے اساتذہ سے حضرت کی عقیدت کا حال راقم الحروف نے بھی دیکھا ہے غالباً ۱۳۸۰ھ میں حضرت کے استاذ مولانا رسول خاں صاحبؒ دارالعلوم میں تشریف لائے۔ حضرت ان کے سامنے بچھے جا رہے تھے۔ چہرہ سے اس قدر مسرت عیاں تھی جو ہم نے پہلے کبھی نہیں دیکھی۔ مسجد میں طلبہ واساتذہ کا اجتماع ہوا۔ حضرت نے اپنے استاذ کا تعارف کراتے ہوئے فرمایا کہ آپ میرے استاذ محترم ہیں۔ اور اس وقت صرف دو استاذ میرے حیات ہیں۔ ایک آپ کی ذات گرامی اور دوسرے حضرت مولانا محمد ابراہیم صاحب بلیاوی۔ پھر آپ نے مولانا کی رفعت شان اور علمی مقام بیان کر کے فرمایا کہ میں استاذ محترم کے فضائل ومناقب میں سے ہزارواں حصہ بھی آپ کے سامنے بیان نہیں کر سکا۔ اس کے بعد مولانا کا بیان ہوا جو خالص علمی دلائل، منطقی براہین اور نازک و دقیق مسائل کلامیہ وصوفیہ پر مشتمل تھا۔ مولانا نے علوم وفنون کے پیچیدہ اور دقیق مسائل کو نہایت سہل انداز میں بیان فرمایا۔ حضرتؒ کا چہرہ اس بیان کے دوران خوشی سے چمک رہا تھا۔ فراغت کے بعد صرف اتنا فرمایا کہ دیکھی آپ حضرات نے میرے استاذ کے علم کی جھلک! آپ کو اپنے اساتذہ سے عشق کی حد تک لگاؤ تھا اور بڑے عقیدت واحترام سے ان کا نام لیتے تھے۔ فرمایا کرتے کہ کوئی علم وفن خصوصاً علم دین اساتذہ کے احترام وادب کے بغیر حاصل نہیں ہوتا۔ حضرت تھانویؒ کا ایک ملفوظ اس سلسلہ میں سنایا کرتے کہ بارہا حضرت تھانویؒ نے فرمایا کہ میں نے تحصیل علم میں نہ تو محنت زیادہ کی اور نہ بہت سی کتابیں میرے مطالعہ میں رہیں۔ بس اتنا اہتمام کیا کہ اپنے کسی بھی استاذ کو ایک لمحہ کے لئے بھی اپنے آپ سے ناراض نہیں ہونے دیا۔ یہ سب اسی کی برکت ہے کہ اللہ نے دین اور علم دین کی خدمت کی توفیق عطا فرمائی ہے۔ اکثر اکبر مرحوم کا یہ شعر پڑھتے ؎

نہ کتابوں سے نہ کالج سے نہ زر سے پیدا

علم ہوتا ہے بزرگوں کی نظر سے پیدا

حضرت مفتی صاحبؒ کا معاملہ دوسرے بزرگوں کے ساتھ بھی ایسا ہی عظمت واحترام کا تھا اگرچہ وہ ضابطہ میں آپ کے استاذ یا شیخ نہ ہوں، بلکہ بعض ہم عصروں کے ساتھ ایسا ہی معاملہ فرماتے تھے۔ حضرت سید سلیمان صاحب ندویؒ، حضرت مولانا ظفر احمد صاحب تھانویؒ، حضرت مولانا عبدالرحمٰن

صاحب کاملپوری، حضرت مولانا مفتی محمد حسن صاحب امرتسریؒ، حضرت مولانا شبیر علی صاحب تھانویؒ حضرت مولانا عبدالغفور صاحب مدنیؒ، شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحب کاندھلوی دامت فیوضہم اور عارف باللہ سیدی حضرت ڈاکٹر عبدالحیٔ صاحب اطال اللہ بقاء وغیرہ کے ساتھ ہم نے آپ کو ایسا معاملہ کرتے دیکھا جیسا اساتذہ و مشائخ کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ ان حضرات کی خدمت میں جانے کا اہتمام یا ان کو دارالعلوم میں بلانے کی درخواست حضرتؒ کا معمول تھا۔ حالانکہ ان میں سے اکثر آپ کے پیر بھائی اور بعض تو عمر میں چھوٹے تھے اور حضرت تھانویؒ کی حیات میں ان سے بے تکلفانہ مراسم تھے۔

۱۳۷۱ھ میں دارالعلوم میں ایک مختصر سا جلسہ ہوا۔ حضرت مولانا مفتی محمد حسن صاحبؒ اور علامہ سید سلیمان صاحب ندویؒ بھی تشریف لائے تھے۔ فراغت کے بعد جلسہ گاہ میں ہی کسی مسئلہ کی تحقیق میں حضرت سید صاحبؒ نے شامی طلب کر کے مطالعہ شروع فرما دیا۔ حضرت مفتی صاحبؒ ان کے سامنے اس طرح دوزانو بیٹھے تھے جیسے شاگرد استاذ کے سامنے۔ ایک صاحب نے حضرت مفتی صاحب کو دوسری طرف بلانا چاہا تو حضرت نے سید صاحب کی طرف اشارہ کیا جس کا انداز یہ تھا کہ سید صاحب کی اجازت کے بغیر میں کیسے اٹھ جاؤں۔ اسی طرح ۷۲، ۱۳۷۳ھ میں استاذ محترم محدث کامل فقیہ اعظم حضرت مولانا عبدالرحمن صاحبؒ کاملپوری دارالعلوم میں تشریف لائے تو حضرت مفتی صاحبؒ ان کے ساتھ بھی شاگردوں جیسا معاملہ فرما رہے تھے۔

اپنے عمر بھر کے بے تکلف ساتھیوں کے ساتھ بھی بے تکلفی کے ساتھ عظمت و احترام کا معاملہ فرماتے تھے۔ حضرت مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلویؒ اور حضرت مولانا محمد طیب صاحب دامت برکاتہم جب بھی کراچی تشریف لاتے تو دارالعلوم میں ضرور قدم رنجہ فرماتے، اس وقت حضرت مفتی صاحبؒ کی حالت قابل دید ہوتی اور ان حضرات کے ساتھ آپ کی مجلس عجیب و غریب معلوم ہوتی۔ دارالعلوم اور تھانہ بھون کی تاریخ کھل جاتی یا مسائل حاضرہ پر عالمانہ تبصرہ ہوتا یا معارف و لطائف کا دفتر کھل جاتا۔ اکثر و بیشتر ہم خدام بھی اس مجلس کی رونق اور برکات سے مستفید ہوتے۔

حضرتؒ کا معاملہ اپنے تلامذہ و اصاغر کے ساتھ شفقت و خیر خواہی اور عزت و توقیر کا تھا۔ ان کی خوشی میں پوری طرح شریک ہونا اور رنج و غم کی حالت میں تسلی دینا بلکہ ڈھارس بندھانا حتیٰ کہ اگر اپنی قدرت میں ہے تو ان کے رنج و غم کو بانٹ لینا آپ کی خصوصیات میں سے تھا۔ آپ کسی کی تکلیف دیکھ کر بے چین ہو جاتے۔ ایسا معلوم ہوتا کہ یہ تکلیف خود آپ کی ذات کو پہنچی ہے۔ پھر اس کے ازالہ کی ہر ممکن تدبیر فرماتے

اگرچہ خود زیر بار ہونا پڑے۔ کسی کی خوشی میں بے انتہا مسرت کا اظہار فرماتے اور دامے درمے خود بھی اس میں شرکت فرماتے۔ آپ کے منسلکین میں سے ہر شخص آپ کے رویہ سے یہ سمجھتا تھا کہ سب سے زیادہ توجہ اور نظر عنایت مجھ پر ہے۔ بالخصوص چھوٹے بچوں کے ساتھ نہایت شفقت اور محبت کا برتاؤ فرماتے ان کی پسندیدہ چیزیں جمع کر کے حفاظت سے رکھتے۔ ان کے اول جلول کام بڑی محبت سے انجام دیتے اور ان کی بے ربط ٹیڑھی بات کو خواہ کیسے ہی اہم کام میں مشغول ہوں اس کو چھوڑ کر پوری توجہ سے سنتے۔ ایک مرتبہ راقم الحروف کے مکان پر تشریف لائے۔ احقر کا چھوٹا بچہ بھی اس کمرہ میں آگیا اور خاموش کھڑا ہوگیا۔ احقر نے سلام نہ کرنے پر اس کی سرزنش کی۔ حضرت نے فوراً فرمایا کہ جس کو اللہ نے غیر مکلف رکھا ہے۔ آپ اس کو مکلف بنا رہے ہیں، چھوڑیئے! پھر اپنی بات میں مشغول ہوگئے۔

حضرتؒ نے اپنی عمر کے آخری حصہ میں دارالعلوم کو اپنی تمام تر توجہات کا مرکز بنا لیا تھا مکمل طور پر دارالعلوم کی ہر شعبہ کی نگرانی آپ کے پاس تھی۔ جب تک شہر میں دارالعلوم رہا تو نگرانی بھی قدرے آسان تھی لیکن جب کورنگی منتقل ہوئے تو جہاں دور تک کوئی مضافاتی آبادی بھی نہیں تھی اور نہ آمد و رفت اور دیگر ضروریات کی سہولتیں تو ہمہ وقتی نگرانی بہت مشکل ہوگئی۔ اس لئے آپ نے شہر اور اس کی تمام سہولتوں، راحتوں اور آسائشوں کو چھوڑا اور جنگل میں دارالعلوم میں مستقل قیام فرمالیا۔

یہاں منتقل ہو کر حضرتؒ نے دارالعلوم کی ظاہری و باطنی اصلاح و ترقی میں اپنے آپ کو وقف فرمادیا کبھی تفسیر کا درس دیا کبھی فقہ و فتویٰ کا، کبھی صحیح بخاری کا اور کبھی موطأ امام مالکؒ کا۔ جب تک طاقت رہی آپ صحیح بخاری کا درس دیتے رہے۔ چاروں طرف سے آنے والے بے شمار فتاویٰ کا جواب اور دینی ضرورت کے مطابق کسی نہ کسی تصنیف میں مشغولیت روزانہ کا معمول تھا۔ خود فرمایا کرتے کہ اس بڑھاپے میں میں روزانہ اٹھارہ گھنٹے کام کیا کرتا ہوں۔ یہ حضرتؒ کے اخلاص وللہیت کا ثمرہ تھا کہ دارالعلوم صف اول کی درسگاہوں میں شمار ہونے لگا۔ ایک طرف آپ نے تعمیرات کی طرف توجہ دی اور دوسری طرف اساتذہ وطلبہ کی اصلاح و تربیت کا پروگرام شروع فرمایا جو حالات کے اعتبار سے مختلف انواع کا ہوتا تھا۔ طلبہ میں ہفتہ وار وعظ و نصیحت کا سلسلہ شروع فرمایا جس کا بہت اہتمام فرماتے اور طلبہ کو بہت قیمتی نصیحتیں فرماتے۔ اساتذہ کے لئے آپ نے ہفتہ وار مجلس کا انتظام فرمایا جس میں تمام اساتذہ کرام تشریف لاتے اور حضرتؒ ان کو ان کے مرتبہ کا لحاظ رکھ کر وعظ و نصیحت فرماتے۔ بعد میں آپ نے مجلس اساتذہ میں بزرگوں کے حالات و سوانح کا سلسلہ شروع

فرمایا کبھی "ارواحِ ثلاثہ" کی مجلس میں خواندگی ہوتی اور دورانِ خواندگی آپ مزید تشریحات ، قابلِ قدر نصائح اور چلتے چلتے دوسرے واقعات بیان فرماتے کبھی "مجالس حکیم الامت" پڑھی جاتی اور کبھی کوئی دوسری مناسب کتاب ۔ آخر میں جب حضرت شیخ الحدیث مدظلہم کی "یادِ ایام" (آپ بیتی) طبع ہوکر آنے لگی تو اس کو پڑھا جانے لگا۔ اس کی خواندگی مکمل نہ ہوئی تھی کہ حضرت کا وصال ہوگیا ۔ اساتذہ کی ان مجالس اور طلبہ کے لیے وعظ و نصیحت کے سلسلہ سے دارالعلوم کی فضا بدل گئی ۔ عام طور پر اساتذہ کرام میں حساس ذمہ داری ، مقصد کے تعین اور اخلاص و تقویٰ کے آثار نظر آنے لگے ۔ باہمی یکجہتی اور انس و محبت کی فضا پیدا ہوگئی اور ہر قسم کی جتھہ بندی سے فضا پاک نظر آنے لگی ۔

ایک مرتبہ مولانا بنوریؒ نے احقر کے سامنے فرمایا کہ "حضرت مفتی صاحب کو رجال کار بڑے اچھے ملے ہیں" ۔ دوسری طرف طلبہ میں لگن ، علم و عمل میں کوشش ، اساتذہ کا احترام اور درسگاہ سے وفاداری کے آثار ظاہر ہونے لگے ۔ آپ نے اگرچہ اپنے آپ کو دارالعلوم کی خدمت کے لئے وقف فرما دیا تھا لیکن کبھی دارالعلوم سے تنخواہ نہیں لی ۔ ایک مرتبہ مجلس شوریٰ کی منظوری کے بعد چند ماہ تنخواہ وصول کی تھی جس کو فوراً ہی واپس کردیا ۔ اس کے باوجود آپ نے دارالعلوم سے کوئی ایسی منفعت حاصل نہیں کی جو آپ کے لئے خاص ہو ۔ بجلی اور گیس وغیرہ استعمال کرنے کی قیمت بھی بڑی پابندی سے ادا فرمایا کرتے تھے اور اگر دارالعلوم کا ٹیلیفون یا کار ذاتی استعمال میں لاتے تو اس کا پورا حساب ادا فرماتے ۔

ایک مرتبہ شاہ فیصل مرحوم کراچی تشریف لائے ۔ حضرت مفتی صاحبؒ بعض اساتذہ کرام کو ساتھ لے کر جن میں راقم الحروف بھی تھا ، ملاقات کے لئے تشریف لے گئے ۔ سعودی سفارت خانہ میں ملاقات ہوئی ۔ حضرت نے دارالعلوم کی طرف سے ایک سپاسنامہ پیش کیا ۔ شاہ فیصل مرحوم نے کچھ عرصہ کے بعد پانچ ہزار روپے کی رقم بطور انعام آپ کو بھیجی ۔ آپ نے وصول فرما کر فیصلہ فرمایا کہ چونکہ دارالعلوم کی وجہ سے یہ رقم ملی ہے اس لئے اس کو دارالعلوم میں ہی لگانا چاہیے اور آپ نے اس رقم سے طلبہ کے لئے ایک کمرہ تعمیر کرا دیا ۔ حالانکہ وہ رقم آپ کو ذاتی طور پر دی گئی تھی ۔ ان تمام تر مخلصانہ خدمات کے باوجود فرمایا کرتے کہ میں نے اپنی آخری عمر کے نہایت قیمتی پچیس سال دارالعلوم میں خرچ کئے ۔ معلوم نہیں کہ آخرت میں کیا معاملہ ہوگا ۔ اسی طرح بارہا فرمایا کہ "مجھے دارالعلوم کے لئے کسی بڑے محقق کی ضرورت نہیں ، مجھے تو اللہ والے چاہییں ، خواہ محقق بالکل نہ ہو" ۔

آپ طلبہ اور اساتذہ کے ساتھ خیر خواہی اور نصیحت کا تعلق رکھتے تھے۔ ضابطہ پر بدرجۂ مجبوری عمل فرماتے اسی کا نتیجہ تھا کہ ہر شخص آپ کا حکم دل وجان سے مانتا اگرچہ بظاہر نقصان ہو رہا ہو۔ رواداری کا یہ عالم تھا کہ کسی کو دارالعلوم سے علیحدہ کرنے کے لئے کبھی کوئی سخت قدم نہ اٹھایا، نہ کوئی ضابطہ چلایا۔ بلکہ اکثر و بیشتر یہ مشاہدہ میں آیا کہ جب کسی کا وجود حضرتؒ کی نظر میں دارالعلوم کے لئے ضرر رساں ہونے کا اندیشہ ہوتا تو وہ شخص خود ہی استعفیٰ دے کر چلا جاتا۔ بارہا اس کا مشاہدہ ہوا ہے۔

حضرتؒ دارالعلوم کی خدمت کے لئے لوگوں کے انتخاب میں بہت تحقیق فرماتے۔ خود بھی استخارے کرتے اور متعلقہ منتظمین سے بھی کرواتے۔ باہمی مشورے ہوتے اور جب آپ کا دل مطمئن ہو جاتا تو اللہ پر بھروسہ کر کے دارالعلوم کی خدمت میں لگا دیتے۔ لیکن اس کے بعد بھی مسلسل اس کی نگرانی فرماتے اور فرمایا کرتے کہ کسی ذمہ دار کی ذمہ داری صرف اسی پر ختم نہیں ہو جاتی کہ وہ کسی اہل، صالح اور دیانت دار آدمی کا انتخاب کر کے فارغ ہو جائے بلکہ اس کے ساتھ ساتھ اس کی ذمہ داری میں اس کی پوری نگرانی بھی داخل ہے۔ اس پر فاروق اعظمؓ کا ذکر فرماتے کہ ایک مرتبہ انہوں نے اہلِ شوریٰ حضرات صحابہؓ سے دریافت کیا کہ میں نیک متقی اور دیانت دار لوگوں کا انتخاب کر کے اللہ کے نزدیک بری ہو جاؤں گا یا میرے اوپر ان کے کاموں کی نگرانی بھی ہے۔ اس پر حضرات صحابہؓ نے عرض کیا کہ صرف انتخاب سے بری الذمہ نہ ہوں گے بلکہ آپ پر ان کے کاموں کی نگرانی بھی لازم ہے۔

آپ طلبہ اور اہل علم کو حالات حاضرہ سے پوری طرح باخبر رہنے کی تاکید فرمایا کرتے تھے۔ جب بھی حالات کوئی نیا رخ اختیار کرتے یا کوئی نئی ایجاد سامنے آتی تو آپ اس کی صحیح حقیقت معلوم کرنے کی پوری کوشش کرتے اور جب تک صحیح حقیقت کا آپ کو علم نہ ہو جاتا اس وقت تک اس کا حکم شرعی ظاہر نہ فرماتے۔ آپ کا وہ زمانہ جو تقسیم ملک کے بعد کراچی میں گزرا بکثرت حالات کی تبدیلی اور سائنسی ایجادات کا زمانہ تھا۔ ان کا حکم شرعی معلوم کرنے کے لیے پہلے ان کی حقیقت کا علم ضروری تھا اس لئے آپ ماہرین فن کی طرف رجوع فرما کر ان سے ہر شے کی اصلیت معلوم کرتے پھر حکم شرعی بتاتے۔ فرمایا کرتے تھے کہ حضرات فقہاء نے من لم یعرف عرف زمانہ فھو جاھل (یعنی جو اپنے زمانہ کے رسم و رواج وغیرہ سے واقف نہ ہو وہ فقیہ نہیں ہو سکتا) بالکل صحیح فرمایا ہے۔

طلبہ اور اساتذہ کو بار بار نصیحت فرماتے تھے کہ آپ کو ملکی سیاست کا علم ہونا ضروری ہے۔ البتہ جب

تک علمی مشغلہ میں مصروف ہیں اس وقت تک عملی سیاست میں قطعاً حصہ نہیں اور نہ کسی دوسری تنظیم کے رکن بنیں۔ کیونکہ اس سے تحصیل علم میں خلل واقع ہوگا۔ مدارس کو بھی ہر قسم کی عملی سیاست سے کنارہ کش رہنا چاہیے ورنہ رجال کار ان سے پیدا نہ ہوں گے بڑے افسوس سے فرماتے کہ جب سے دارالعلوم دیوبند نے عملی سیاست میں حصہ لینا شروع کیا اس وقت سے وہاں مشہور ہستیاں پیدا ہونا بند ہوگئیں۔ مدارس عربیہ کے بانجھ ہو جانے کا ایک سبب آپ کی نظر میں عملی سیاست میں حصہ لینا تھا۔ فرمایا کرتے کہ اگر کسی کی رائے میں عملی سیاست میں داخل ہونا ضروری ہو تو اس کو پہلے مدرسہ سے قطع تعلق کر لینا چاہیے اپھر جو چاہے کرے اسی طرح اپنی مثال دیتے کہ جب میں نے عملاً سیاست میں قدم رکھنے کا ارادہ کیا تو پہلے دارالعلوم دیوبند سے مستعفی ہوگیا۔ فرماتے کہ اگر دین کا مطالبہ یہ ہو کہ عملاً سیاست میں حصہ لیا جائے تو ہم پہلے مدرسہ کو تالا لگائیں گے، پھر سب سیاست میں شریک ہوں گے۔ کیونکہ مدرسہ بذاتِ خود مقصود نہیں بلکہ دین مقصود ہے۔

زفرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم
کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجاست

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ہمیں دین کا صحیح فہم اور اسکی تبلیغ و اشاعت کی توفیق عطا فرمائے۔

○

"معلوم نہیں کہ روشن خیالی اور تاریک خیالی کا معیار ان حضرات کے نزدیک کیا ہے جس کی وجہ سے ان ہزاروں علمائے ہندوستان و غیر ہندوستان کو روشن خیالی میں داخل ہونے کی اجازت نہیں دی جاتی جن کا قصور صرف اتنا ہے کہ وہ احکام شرعیہ میں جسارت و دلیری سے کام لے کر دین کو اپنی خواہشات کا تابع نہیں بناتے اور متقدمین اسلام کو اپنے سے زیادہ اعلم بالقرآن و الحدیث سمجھ کر ان کی رائے کو اپنی رائے سے مقدم جانتے ہیں۔

اور اگر فی الواقع وہ اسی جرم کی سزا میں روشن خیالی سے محروم ہیں تو یہ محرومی ان کے لیے باعث فخر ہے، انھیں ایسی روشن خیالی کی ضرورت نہیں، ان کی تاریک خیالی پر ایسی ہزاروں روشنیاں قربان کی جاسکتی ہیں"

(حضرت مفتی اعظمؒ : آلات جدیدہ۔ ص ۹۵)

شیخ رحیم الدین دکنی
فاضل دار العلوم کراچی

ہمارے حضرتؒ اور طلبا دین

مفتی اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی ذاتِ گرامی گوناگوں محاسن کی حامل تھی۔ اور زندگی کے ہر شعبہ میں آپ کو امتیازی کمالات اور اعلیٰ خصائل من جانب اللہ وافر مقدار میں ودلیعت فرمائے گئے تھے۔ آپ کی ذاتِ گرامی علم وعمل کا مہر عالم تاب تھی اور آپؒ علم واخلاق اور روحانیت کی ایک مرکزی شخصیت تھے۔ آپ کی ذاتِ گرامی بلا امتیاز عوام و خواص کا مرجع ماب تھی نصف صدی سے زائد کی دینی، مذہبی اور قومی وسیاسی تاریخ حضرتؒ سے وابستہ ہے۔ آپؒ کی تعلیمی وتصنیفی اور ارشاد وہدایات کی زرین خدمات اظہر من الشمس ہیں۔ آپؒ ایثار وقربانی کے مجسم پیکر اور اخلاقِ عظیم کے مظہر تھے۔ جامعیت علم وتقویٰ، عزم وعمل آپ کی زندگی کا طرۂ امتیاز تھا۔ حضرت مفتی صاحبؒ اسلاف کے صحیح جانشین اور یادگار تھے۔ ملنے والوں سے آپ کا معاملہ حسن سلوک کا تھا اور ہر شخص سے خواہ وہ کسی بھی مذہب وملت اور مسلک سے تعلق رکھنے والا ہو، اس سے اخلاق ومحبت اور خلوص سے پیش آتے تھے۔ اگر یہ کہا جائے کہ حضرت مفتی صاحبؒ اس دور کی عظیم المرتبت اور مقبول ترین ہستی تھی اور فی زمانہ علومِ اسلامیہ اور کمالاتِ انسانیہ میں اپنی نظیر آپ تھے تو ذرہ برابر مبالغہ نہ ہوگا۔

جو لوگ حضرت مفتی صاحبؒ کے شاگرد نہیں ہیں اور ان کو حضرتؒ کی علمی مجالس میں حاضری کم نصیب ہوئی ہے یا بالکل نہیں ہوئی وہ علوم وفنون میں حضرتؒ کے بلند مقام سے کم آشنا ہیں۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ حضرت مفتی صاحبؒ ایک ایسے گہرے سمندر کی طرح

تھے، جس کی تہہ میں ہزاروں انمول موتی بکھرے پڑے ہیں۔ مگر اس کی سطح قطعاً ہموار اور پرسکون ہو۔ اہل نظر جانتے ہیں کہ یہ مقام بلند علم و عمل کے کس درجہ تک پہنچنے کے بعد نصیب ہوتا ہے۔ مگر جب کسی مسئلہ پر آپ لب کشائی فرماتے تو یہ معلوم ہوتا کہ القائے ربانی ہو رہا ہے اور آپ اس مسئلہ کے ایک ایک جزء پر اس قدر سیر حاصل بحث فرماتے کہ پھر اس مسئلہ میں کوئی شک و شبہ باقی نہ رہتا۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو یہ ملکہ دیا تھا کہ مخاطب کے دل میں اپنی بات اس طرح راسخ کر دیتے تھے کہ اسے قبول کئے سوا کوئی راستہ نظر نہ آتا تھا۔

راقم الحروف ان خوش نصیبوں میں سے ہے جس کو عموماً سات سال تک حضرتؒ کی ان مجالس میں بیٹھنے کا شرف حاصل رہا ہے کہ جن میں آپؒ شہر سے آتے ہوئے حضرات سے خطاب فرمایا کرتے تھے بفضلہٖ الحمد اور خصوصیت کے ساتھ ان مجالس میں خاص طور پر حاضر رہا جن میں آپؒ افتتاح بخاری شریف یا اختتام بخاری شریف یا طلبہ کی ہفتہ واری مجلس میں طلبہ سے خطاب فرمایا کرتے تھے۔

آج میں اپنے استاد محترم حضرت مولانا مفتی محمد تقی صاحب عثمانی مدظلہ العالی جو کہ میرے صرف استاد ہی نہیں ، بلکہ مربی بھی ہیں اور حضرت والا کی ذات ہی آج کل میرے لئے مرجع و مآب بنی ہوئی ہے۔ میں نے حضرت والا میں ایک استاد کی شفقت ، ایک باپ کی مہربانی ، ایک دوست کی محبت اور ایک مرشد و مربی کی نگرانی پائی ہے۔ تو آج میں ان ہی کے حکم کی بجا آوری میں حضرت مفتی صاحبؒ کی وہ خاص خاص نصیحتیں جمع کر رہا ہوں جو حضرت طلبہ سے وقتاً فوقتاً کیا کرتے تھے :

حضرت مفتی صاحبؒ تعلیمی سال کے شروع میں اور افتتاح تعلیم کے موقع پر سورہ توبہ کی آیت" فلولا نفر من کل فرقۃ منهم طائفة لیتفقهوا فی الدین ولینذروا قومهم اذا رجعوا الیهم لعلهم یحذرون" تلاوت فرمایا کرتے تھے اور فرمایا کرتے تھے کہ اس آیت شریفہ میں طالبعلم دین کا اجمالی نصاب بھی بتلایا گیا ہے اور حصولِ علم کے بعد عالم کے فرائض بھی اس میں بتلائے گئے ہیں۔ حضرت مفتی صاحبؒ اس آیت کے ترجمہ کے بعد فرماتے تھے کہ اس طائفہ اور گروہ کے مصداق آپ حضرات ہیں آپ حضرات نے حصولِ علم دین کے لئے عزیزوں اور رشتہ داروں کو چھوڑا ہے اور اپنے گھر بار کو خیر باد کہا ہے اور ایک طویل سفر اختیار کر کے یہاں

آئے ہیں تو آپ کا یہاں آنا بہت ہی مبارک ہے اور آپ ہی جیسے لوگوں کے متعلق قرآن و سنت میں بڑے مناقب بیان کئے گئے ہیں۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ جو شخص علم دین کے حصول کے لئے گھر سے نکلتا ہے تو اس کی حفاظت اور سلامتی کے لئے چرند اور پرند تک دعا کرتے ہیں اور ایک دوسری روایت میں آتا ہے کہ فرشتے ان کے پیروں کے نیچے اپنے پر بچھا دیتے ہیں اور ان کا پر بچھانا ان کی عزت و تعظیم کے لئے ہوتا ہے۔

حضرت مفتی صاحبؒ فرمایا کرتے تھے کہ آپ حضرات اس حدیث کو سن کر بہت خوش ہوتے ہیں اور واقعی خوش ہونا بھی چاہیے لیکن میرے عزیزو! یہ بات اچھی طرح سمجھ لو اور گرہ میں باندھ لو کہ یہ سعادتیں اور خوشخبریاں اس وقت ہیں، جبکہ ہم واقعی طالب علم کا مصداق بن جائیں۔ صرف مدرسہ میں داخلہ لے لینے سے ہم اس کے مصداق نہیں بن جاتے بلکہ اس کے لئے کچھ شرائط ہیں اگر تم نے ان شرائط کو مدنظر اور ملحوظِ خاطر رکھا تو واقعی تم اس خوشخبری کے مصداق بن جاؤ گے۔

سب سے پہلی شرط یہ ہے کہ جس مقصد کے حصول کی خاطر اتنی تکالیف اور مصائب برداشت کی ہیں، اس کام میں مکمل توجہ کے ساتھ لگ جاؤ اور اسی مقصد کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لو۔ اپنے تمام اوقات کو اسی میں خرچ کرو اور اس کے لئے تین باتوں کا التزام لازمی اور ضروری ہے۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ آپ تمام کے تمام مطالعہ کی عادت ڈالیں یعنی جو سبق کل آئندہ درسگاہ میں ہو گا اس کا آپ خود بخود مطالعہ کریں۔ اور مطالعہ کے لئے میں ان شرائط کی قید نہیں لگاتا جو شرح تہذیب کے مقدمے میں لکھی گئی ہیں۔ مثلاً یہ کہ ہر ہر لفظ کے متعلق غور کرو کہ یہ معرب ہے یا مبنی، مرفوع ہے، منصوب ہے یا مجرور۔ اگر ان میں سے کوئی ہے تو کیوں۔ ترکیب میں کیا واقع ہو رہا ہے۔ آیا فاعل ہے یا مفعول، ممیز ہے یا تمیز۔ اس طرح کی کئی قیود اس میں لکھی ہیں۔ مگر میں کہتا ہوں کہ اگر آج کا طالب علم اس طرح کا مطالعہ کرنا شروع کر دے تو ایک کتاب کا بھی مطالعہ نہیں کر سکتا۔ اس لئے میں وہی بات آپ سے کہوں گا جو ہمارے حضرت تھانوی قدس اللہ سرہٗ فرمایا کرتے تھے یعنی یہ کہ مطالعہ میں صرف مجہولات کو معلومات سے ممتاز کر لے۔ اور اگر چاہے تو مجہولات پر پنسل سے نشان لگا دے اور کل جب درس گاہ میں جائے تو اس مقام کو غور سے سنے اور سمجھنے کی کوشش کرے اور اپنے نہ سمجھنے کی وجہ سمجھے کہ کیا بات تھی

جس کی وجہ سے میں یہ مقام نہ سمجھ سکا۔ جب پہلے سے طالب علم کو یہ معلوم ہوگا کہ میں نے مطالعہ میں یہ مقام نہیں سمجھا ہے تو پھر خود بھی کان لگا کر غور سے سنے گا۔ اس طرح وہ بات ان شاء اللہ سمجھ میں آجائے گی۔

حضرتؒ فرمایا کرتے تھے دوسری شرط یہ ہے کہ سبق میں برابر روزانہ حاضر ہو اور حتی الامکان کوشش کرے کہ سبق میں بالکل ناغہ نہ ہو۔ حضرتؒ فرمایا کرتے تھے کہ ایک دن سبق میں ناغہ کا اثر چالیس دن تک رہے گا۔ اس لئے ضروری ہے کہ اسباق میں حاضری کا اہتمام کیا جائے حضرت اس موقع پر فرمایا کرتے تھے کہ اپنی مثال دینا اچھی بات نہیں۔ مگر آپ حضرات کو سمجھانے کے لئے عرض کرتا ہوں کہ میں سبق میں ہر حالت میں حاضر ہوا کرتا تھا۔ ایک دفعہ سبق میں جبکہ گرمی کا زمانہ تھا گرم چادر اوڑھ کر حاضر ہوا کیونکہ مجھے سخت بخار تھا۔ استاد صاحبؒ نے حاضری لی اور مجھے بلا کر دیکھا اور کہا بھئی تم کو تو سخت بخار ہے۔ چاہئیے تھا کہ تم گھر پر آرام کرتے۔ میں نے عرض کیا حضرت سبق کا ناغہ کرنے کو جی نہیں چاہتا۔ تو عزیزو! اس طرح سبق میں حاضری کا اہتمام کرنا چاہیے۔ اس سے تم خود اپنے اسباق میں فرق محسوس کرنے لگو گے۔

حضرت مفتی صاحبؒ فرمایا کرتے تھے کہ تیسری شرط یہ ہے کہ ہر سبق کو پڑھنے کے بعد ایک دفعہ اس کا تکرار کر لیا جائے۔ حضرت مفتی صاحبؒ فرماتے تھے کہ حضرت تھانوی قدس اللہ سرہٗ فرمایا کرتے تھے کہ اگر کوئی طالب علم اس طرح تعلیم میں لگا رہے تو میں اس کی استعداد کی ضمانت دیتا ہوں کہ وہ ان شاء اللہ تعالیٰ تعلیمی میدان میں اچھا اور قابل طالب علم ثابت ہوگا۔ حضرت مفتی صاحبؒ فرمایا کرتے تھے کہ یہ کس قدر آسان طریقہ ہے کہ ہر طالب علم اس پر عمل پیرا ہو سکتا ہے اور اپنی تعلیمی استعداد اچھی بنا سکتا ہے۔ آج کل اتنی بڑی افتاد پڑی ہے کہ کوئی لائق اور فاضل بہت ہی کم پیدا ہوتا ہے۔ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ وہ طالب علمی کے زمانہ میں ان شرائط کا اہتمام نہیں کرتے جن کا حضرت تھانویؒ نے مشورہ دیا ہے۔

حضرت فرمایا کرتے تھے کہ اس تمام طریقے کو اگر طالب علم اپنالے جو کہ اوپر ذکر کئے گئے ہیں، اس سے علم بمعنی "دانستن" تو حاصل ہو جائے گا اور وہ عرف میں اور اصطلاح میں عالم اور مولانا کہلائے گا۔ مگر حقیقی عالم اور مولانا بننے کے لئے اس کے آگے اور کچھ کام کرنے میں جب

تم وہ کام کروگے تو واقعی مولانا اور طالب علم کہلاؤ گے۔ تب ہی تم ان خوش خبریوں کے مصداق بنو گے، جو حدیث میں آئے ہیں۔

حضرتؒ فرمایا کرتے تھے کہ قرآن عظیم میں یہ بات بتلائی گئی ہے کہ جو طائفہ علم دین حاصل کرنے کے نام پر جمع ہوا ہے اس کا کام یہ ہے کہ دین میں سمجھ بوجھ پیدا کرے۔ اور سمجھ بوجھ اس کو کہا جائے گا جب کہ اس علم کے ساتھ عمل بھی ہو۔ جس علم کے ساتھ عمل نہ ہو وہ دین کی سمجھ بوجھ نہیں کہلاتی۔ ایسا علم تو شیطان کو بھی ہے، ابوجہل اور ابولہب کو بھی تھا شیطان، حضور سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو جانتا ہے اور اللہ اور اللہ کی توحید کو بھی۔ لیکن ان تمام چیزوں کو جاننے کے باوجود بھی مجبور کرتا ہے اور قریب قریب یہی حال ہے ابولہب اور ابوجہل کا۔

حضرت فرمایا کرتے تھے کہ تفقہ فی الدین اس کا نام نہیں کہ کسی چیز کو جان لے کہ یہ چیز حلال ہے اور یہ حرام ہے یہ جائز ہے اور یہ ناجائز۔ مکروہ ہے یا مستحب۔ اتنا جان لینے کا نام علم نہیں ہے اصل تفقہ دین کی سمجھ بوجھ کا نام ہے، جس کے پیچھے عمل ہونا چاہیے۔ جس علم کے ساتھ عمل نہ ہو یا اور علم پر عمل مرتب نہ ہوا، وہ علم کہلانے کا مستحق نہیں۔ تفقہ فی الدین کا لفظ قرآن حکیم میں اس لئے اختیار کیا گیا ہے کہ علم کے ساتھ ساتھ اور اس کے پیچھے پیچھے عمل کرتے۔ حضرتؒ مزید فرمایا کرتے تھے کہ آپ کو یہ محسوس ہو کہ اگر ہم نے ہدایہ پڑھی، قدوری پڑھی، کنز پڑھی۔ ان میں معاملات کا باب پڑھا کہ فلاں جائز ہے فلاں ناجائز ہے۔ یہ حرام ہے یہ مکروہ ہے اور یہ مستحب ہے۔ اگر ہم بازار میں جاکر اپنے ان اسباق پر عمل نہیں کرتے تو ہمارا تمام کا تمام لکھا پڑھا بیکار ہے۔ اب تو ہمارا حال یہ ہے کہ کتاب مدرسہ میں پڑھائی جاتی ہے۔ آگے مدرسہ کے باہر اس کتاب کا کوئی اثر ہمارے وجود میں نہیں ہوتا معاملات کرنے کے لئے چلیں تو ہمیں کوئی فکر نہیں ہوتی کہ ہم سچ بول رہے ہیں یا جھوٹ بول رہے ہیں۔ جو جی چاہتا ہے کہہ دیتے ہیں اور کچھ فکر نہیں کرتے کہ آیا ہم غلط کر رہے ہیں یا صحیح کر رہے ہیں۔ غرض یہ کہ جس علم کے ساتھ معاملات اگر پڑھیں تو عزیزو! آپ کے معاملات کی درستگی ہونی چاہیے۔ محاسبہ کرو اپنے معاملات کا۔ آداب اور اخلاق پڑھیں قرآن و حدیث سارا بھرا پڑا ہے۔ سارے قرآن و حدیث میں اسی کی تعلیم دی گئی ہے کہ جو کچھ بھی پڑھا ہے اس کا اثر آپ کے اعمال پر ہونا چاہیے۔ آپ کے چہرہ آپ کے معاملات اور عادات

سے معلوم ہو کہ واقعی یہ اللہ والے ہیں، آپ کے معاملات اس طرح واضح اور صاف ہونے چاہیں کہ آپ کو دیکھ کر لوگ اپنی اصلاح شروع کر دیں۔

حضرت مزید فرمایا کرتے تھے کہ آٹھ برس جو آپ اس دارالعلوم میں رہ کر کچھ سیکھیں گے۔ ان سب کا حاصل یہی دین کی سمجھ بوجھ پیدا کرنا ہے اور سمجھ بوجھ پیدا کرنے کا مطلب اور مفہوم یہ ہے کہ علم کے ساتھ عمل ہو۔ آپ کے اعمال میں، آپ کی چال ڈھال میں اور آپ کی حرکت و سکون میں اپنے علم کا اثر ہو۔ یہ تفقہ فی الدین ہے۔ گویا زندگی کے ہر شعبہ حیات میں انسان یہ غور و خوض کرنا شروع کر دے کہ مجھے اس وقت اس معاملے میں کس طرح سے کام کرنا چاہیے کہ جس سے اللہ تعالیٰ بھی راضی ہو اور میرا بھی کام ہو جائے۔ جب انسان کو یہ فکر لاحق ہو جاتی ہے تو پھر وہ ہر کام کو صحیح صحیح طریقے پر انجام دینا شروع کر دیتا ہے اور تمام علم کا یہی مقصود ہے کہ انسان کا عمل ٹھیک ہو جائے۔

حضرت مفتی صاحبؒ فرمایا کرتے تھے کہ جب علم اور تفقہ فی الدین حاصل ہو جائے تو سمجھو کہ تم اب واقعی اس بشارت اور خوش خبری کے مستحق ہو جو کہ قرآن و حدیث میں آتی ہیں۔ حضرت مفتی صاحبؒ ابتداء کے سال میں طلباء سے فرمایا کرتے تھے کہ عزیزو! جس مقصد کے لئے تم آئے ہو وہ بہت ہی نیک اور بڑا با مقصد ہے۔ تم شروع سال ہی سے اپنی نیت کو درست کرو، اپنی نیت یہ رکھو کہ ہم جو کچھ پڑھ لکھ رہے ہیں، اس طرح رضائے خداوندی حاصل کرنا ہے۔ اگر اس مقصد کو مدنظر رکھ کر تم نے تعلیم کی ابتداء کی تو انشاء اللہ تعالیٰ تم کو پڑھنے کا پورا پورا ثواب ملے گا۔ اگر خدانخواستہ یہ علم پڑھنے سے کوئی اور ارادہ ہے، مثلاً یہ کہ لوگ تمہاری عزت کریں، تمہیں مفتی صاحب کہیں اور تمہارے ہاتھوں اور قدموں کو بوسہ دیں۔ اگر یہ نیت ہے تو فوراً توبہ کرو اور اپنی نیت کو فوراً صحیح کرو۔ کیونکہ حدیث شریف میں آتا ہے "اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَّاتِ"۔ یعنی اعمال کا دار و مدار نیتوں پر ہے۔ اگر نیت اچھی ہے تو ثواب ملے گا اور اگر نیت بری ہوئی تو پھر ثواب کی جگہ گناہ ہوگا۔ حضرتؒ فرمایا کرتے تھے کہ شروع سال میں نیت درست کر لینی چاہیے اور پھر وقتاً فوقتاً نیت کی درستگی کرتے رہنا چاہیے۔ اگر خدانخواستہ درمیان میں کوئی نیت خراب ہو تو پھر فوراً توبہ کر لے۔ اس سے انشاء اللہ تعالیٰ پورا پورا ثواب ملے گا۔

حضرت مفتی صاحبؒ طلبا کو صرف تعلیم ہی کے متعلق نصیحتیں نہیں کرتے تھے بلکہ زندگی کے ہر شعبہ سے متعلق اہم اہم باتیں بتلایا کرتے تھے۔ آپؒ طلبا میں دینی بیداری پیدا کرنا چاہتے تھے۔ آپ یہ نہیں چاہتے تھے کہ طلبا صرف بسم اللہ کی گنبد ہی میں رہیں بلکہ آپؒ یہ چاہتے کہ طلبا علم کے ساتھ ساتھ سیاسی اور معاشرتی طور پر بھی کامل طریقے پر ید طولیٰ رکھتے ہوں۔ اسی مقصد کے لئے آپ اپنی مجالس میں طلبا کو حالات حاضرہ سے روشناس کروایا کرتے تھے اور اس وقت کے سیاسی حالات بھی بیان فرمایا کرتے تھے۔ ان دنوں ملک میں جبکہ سوشلزم اور اسلامی سوشلزم کے نعرے لگ رہے تھے اور پورا ملک ایک سیاسی اکھاڑہ بن چکا تھا۔ اس وقت حضرت مفتی صاحبؒ نے طلبا سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا، عزیزو! میں تم کو نصیحت کرتا ہوں کہ تم طالب علمی کے زمانے میں عملی سیاست میں بالکل حصہ نہ لو، بلکہ اس سے اجتناب کیا کرو۔ کیونکہ تعلیم اور عملی سیاست ایک جگہ جمع نہیں ہوسکتیں۔ کیونکہ عملی سیاست میں آنے کے بعد پھر تعلیمی نقصان لازمی طور پر واقع ہوگا۔

حضرت مفتی صاحبؒ خود طلبہ کو علمی طور پر حالات حاضرہ سے باخبر رہنے کی تاکید فرمایا کرتے تھے۔ خود طلبہ کو اس دور کے حالات بتلایا کرتے تھے اور یہ فرمایا کرتے تھے کہ ہر طالب علم کو اتنا ضرور معلوم ہونا چاہیئے کہ ملک میں کون کون سی سیاسی پارٹیاں کام کر رہی ہیں، ان کے کیا خیالات ہیں اور کس طرح وہ میدان سیاست میں کام کر رہی ہیں۔ چونکہ اس زمانہ میں سوشلزم اور اسلامی سوشلزم کا نعرہ بہت لگ رہا تھا۔ حضرت نے اس کے بارے میں طلبا سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ سوشلزم اور کمیونیزم یہ دونوں نظام کسی بھی طرح سے فطری نہیں بلکہ غیر فطری ہیں۔ ان میں انسان بالکل ایک بے بس پرندہ کے مانند بن کر رہ جاتا ہے کہ نہ مرضی سے کھا پی سکتا ہے اور نہ مرضی سے اڑ سکتا ہے۔ اسی طرح آپؒ سرمایہ دارانہ نظام پر بھی بھرپور تنقید فرمایا کرتے تھے اور یہ فرمایا کرتے تھے کہ سرمایہ دارانہ نظام کے ظلم سے بچانے کے لئے سوشلزم میدان میں آیا لیکن دونوں نظام افراط و تفریط کا شکار ہوگئے۔ حضرتؒ فرمایا کرتے تھے ان دونوں نظاموں کے درمیان ایک معتدل نظام ہے جو کہ اسلامی نظام ہے۔ اسلامی نظام میں دولت مند کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ وہ مزدور کو اپنا بھائی سمجھیں اور ان کے ساتھ بھلائی کا معاملہ کریں، ان کو اپنے کام میں شریک کار سمجھیں اور اپنے پاس دولت ہے اس کو

ایک انعام خداوندی سمجھیں اور یہ سمجھیں کہ خدا نے یہ تقسیم کار رکھا ہے کہ کوئی محنت کرتا ہے، کوئی محنت کرتا ہے اور کوئی نگرانی۔ دولت مند کو مزدور پر کوئی برتری اور بزرگی اس وجہ سے حاصل نہیں ہے کہ وہ دولت مند ہے۔ حضرت مفتی صاحبؒ تدبیر فرمایا کرتے تھے کہ اسلام نے دولت مندوں کے ساتھ ساتھ مزدوروں کو یہ حکم دیا ہے کہ وہ اپنے فرائض کو تن دہی، مستعدی اور دل جمعی سے انجام دیں اور سرمایہ دار اور دولت مند کے نقصان کو اپنا نقصان سمجھیں۔ اس طرح اسلام نے مزدور اور دولت مندوں کو گلے ملایا ہے۔ اور ہر ایک کو ایک دوسرے کا معین و مددگار قرار دیا ہے حضرت مفتی صاحبؒ نے اسی طرح ہر مسئلہ کے متعلق طلبا کو آگاہ کیا کرتے تھے اور یہ چاہتے تھے کہ طلبا صرف اپنی درسی کتابوں تک محدود ہو کر نہ رہیں، بلکہ آپ طلبہ کو ہمیشہ مشورہ دیا کرتے تھے کہ اپنی درسی کتب کے علاوہ ہر موضوع پر کتابیں پڑھی جائیں اور اگر اس میں کوئی غلط بات لکھی ہوتی ہے تو اس کی تردید کریں۔

حضرت مفتی صاحبؒ طلبہ سے دار العلوم کے نصاب تعلیم کے متعلق فرمایا کرتے تھے کہ عزیزو! ہم نے دار العلوم میں جو نصاب رائج کر رکھا ہے وہ بہت ہی سوچ سمجھ کر رائج کیا ہے۔ یہ نصاب تعلیم اگرچہ ہم نے دیوبند سے ورثہ میں پایا ہے، جو کہ اس وقت کے مخصوص حالات کو مدنظر رکھ کر جاری کیا گیا تھا۔ مگر اس نصاب میں یہ خصوصیت ہے کہ اگر اس کو سمجھ کر پڑھ لیا جائے تو طالب علم میں اتنی استعداد اور صلاحیت پیدا ہو جائے گی کہ وہ ہر کتاب اور ہر فن کو پڑھ کر سمجھ سکے گا اور غلط باتوں کا جواب دے سکے گا۔ حضرتؒ فرمایا کرتے تھے کہ ہمارے پاس نصاب میں جو ایک ایک کتاب ہے وہ کئی کئی مضامین پر حاوی ہے۔ مثلاً ہم فلسفہ قدیم کی کتاب میبذی پڑھاتے ہیں۔ اگرچہ یہ فلسفہ قدیم کی کتاب ہے مگر اس کو پڑھ کر فلسفہ رائجہ کی تردید کی جا سکتی ہے اور اس کتاب میں کئی مضامین سموئے ہوئے ہیں مثلاً اس میں خلا سے بحث کی گئی اور مابعد الخلا سے بھی۔ کرۂ ارضی سے اس میں بحث کی گئی ہے تو اس کے ساتھ ساتھ کرۂ ہوائی سے بھی۔ معدنیات پر بھی اس میں بحث کی گئی ہے تو اس کے ساتھ فلکیات پر بھی۔ تو گویا اس طرح یہ ایک کتاب کئی مضامین پر حاوی ہے۔ بس ضرورت اس بات کی ہے کہ طلبا اپنے اندر استعداد اور قابلیت پیدا کریں اور ان چیزوں کو سمجھ کر پڑھیں تو وہ ان مختلف علوم کے ماہروں سے اچھی خاصی بحث مباحثہ کر سکتے ہیں۔

حضرتؒ فرمایا کرتے تھے کہ میں پاکستان اگر تعلیمی بورڈ کا رکن بنا اور بورڈ آف اسلامی دستور کا رکن بھی۔ میں نے دارالعلوم دیوبند میں کورس سے دستور کی کتابیں پڑھی تھیں۔ کوئی کتاب بھی تو نہیں پڑھی۔ لیکن اپنی درسی کتب جو بھی پڑھیں تھیں الحمدللہ وہ بہت محنت اور غور و خوض کے ساتھ پڑھیں تھیں۔ بس پھر کیا تھا۔ میں نے قانون کی کتابیں منگائیں اور ان کا مطالعہ شروع کر دیا۔ الحمدللہ مجھے ذرہ برابر کوئی تکلیف محسوس نہیں ہوئی۔ ایک موقع ایسا بھی آیا کہ میں بورڈ کے اجلاس میں تقریر کر رہا تھا کہ ایک صاحب جو کہ نو تعلیم یافتہ تھے، وہ درمیان میں کچھ بولے جا رہے تھے اور ان کا انداز بھی تمسخرانہ سا تھا۔ میں نے فوراً ان کو ٹوک دیا اور کہا دیکھیئے آپ کی جیب میں چند ٹکڑے کاغذ کے پڑے ہوئے ہیں جو کہ آپ کو آپ کے سیکریٹری صاحب نے تیار کر کے دیئے ہیں۔ میں جس موضوع پر بول رہا ہوں اس کو میں خود دیکھ بھال کر آیا ہوں اور صرف اس کو نہیں بلکہ دنیا کے اکثر ملکوں کے قانون کا مطالعہ کر کے آیا ہوں۔

اسی طرح کی مثالیں اور تمثیلیں دے کر حضرتؒ یہ چاہتے تھے کہ طلباء میں مطالعہ کا جذبہ پیدا ہو اور وہ کتابوں کی طرف مراجعت کریں۔ اسی مقصد کے لئے حضرتؒ مفتی صاحب نے ایک دارالمطالعہ قائم فرمایا تھا کہ طلباء اس میں بیٹھ کر مطالعہ کر سکیں۔

حضرت مفتی صاحبؒ دل سے یہ بات چاہتے تھے کہ طلباء ہر لحاظ سے کامل اور اکمل ہوں۔ ان میں کسی قسم کا کوئی نقص اور عیب نہ رہے۔ اس لئے حضرتؒ طلباء کے ہر قول و فعل پر کڑی نگرانی کیا کرتے تھے۔ حضرتؒ فرمایا کرتے تھے کہ ہمارے طلباء میں یہ بڑی کوتاہی ہے کہ ان کی تحریر کمزور ہوتی ہے اور وہ خوش خط بھی نہیں لکھ سکتے۔ حضرتؒ فرمایا کرتے تھے کہ اگر مضمون کتنا ہی اچھا کیوں نہ ہو لیکن اگر خط اچھا نہیں ہے تو کوئی مضمون نہیں پڑھ سکتا اور نہ ہی کوئی ایسے مضمون کو پڑھے گا۔ یہی وجہ تھی کہ حضرتؒ نے دارالعلوم کے ابتدائی درجات میں ایک گھنٹہ مستقل طور پر خوش خطی کے لئے مخصوص کر دیا تھا۔ حضرتؒ نے اس میں مزید ترقی کے لئے ایک قدم آگے بڑھایا تھا اور ایک کاتب کو مستقل اس کام پر لگا رکھا تھا کہ وہ طلباء کو کتابت سکھائیں۔ حضرت مفتی صاحبؒ خود بھی ایک اچھے کاتب تھے۔ آپ کی تحریرات کی زیارت کا بندہ کو شرف حاصل ہے۔ مفتی صاحبؒ آج کل کے عام

کاتبوں سے بہت ہی اچھا لکھا کرتے تھے۔

حضرت مفتی صاحبؒ طلبہ کو نصیحت کیا کرتے تھے کہ وہ تقریر کرنے کی مشق کیا کریں۔ اس کے لئے حضرتؒ نے دارالعلوم میں کئی تقریری انجمنوں کے قائم کرنے کی اجازت دے رکھی تھی۔ حضرتؒ فرمایا کرتے تھے کہ مولویوں کے لئے ضروری ہے کہ ان کو تقریر کرنی آتی ہو۔ حضرت مفتی صاحبؒ فرمایا کرتے تھے کہ ایک اچھا واعظ اور مقرر بننے کے لئے ضروری ہے کہ ہر واعظ قرآن حکیم کی اس آیت کو ملحوظ رکھے۔ " ادع الی سبیل ربك بالحکمة والموعظة الحسنة وجادلهم بالتی هی احسن " (سورہ نحل)

حضرت مفتی صاحبؒ فرمایا کرتے تھے کہ اگر تم یہ چاہتے ہو کہ لوگ بدعتوں کو چھوڑ دیں اور صرف سنت طریقے کو اپنائیں تو اس کا طریقہ یہ ہے کہ صرف اس معاملہ اور کام میں یہ بیان کر دو کہ اس میں سنت یہ ہے اور اگر اس سنت پر عمل کیا گیا تو یہ اچھائیاں ہیں اور اگر خدانخواستہ اس سنت کو ترک کر دیا گیا تو پھر یہ خرابیاں ہیں۔ اگر تم نے اس طریقے کو اپنا لیا تو انشاءاللہ تم دیکھو گے کہ کچھ ہی عرصے میں لوگوں کی زندگی کے اندر ایک انقلاب پیدا ہو جائے گا اور وہاں جو بدعت رائج تھی وہ رفتہ رفتہ اپنی موت آپ مر جائے گی اور اس کی جگہ سنت جاری ہو جائے گی۔ حضرت مفتی صاحبؒ مزید فرمایا کرتے تھے کہ میں نے اس چیز کا تجربہ کیا ہے اور اسی تجربہ کی بنیاد پر کہہ رہا ہوں میں نے تقریباً بارہ سال تک باب الاسلام کی مسجد میں اور   بیلہ کی مسجد میں اس کا تجربہ کیا ہے اور الحمدللہ اس کا بہت ہی عمدہ نتیجہ سامنے آیا ہے۔

حضرت مفتی صاحبؒ طلبہ سے فرمایا کرتے تھے کہ عصر کی نماز کے بعد کھیل وغیرہ یا ہلکی ورزش کا اہتمام کیا جائے۔ اگر یہ نہ ہو سکے تو چہل قدمی ہی کی جائے۔ اس سے انشاءاللہ صحت اچھی رہے گی اور پڑھائی وغیرہ میں دل لگے گا اور انسان دلجمعی کے ساتھ رات کے وقت مطالعہ کر سکے گا یہاں حضرتؒ اس مقام پر یہ بات زور دے کر فرمایا کرتے تھے کہ چہل قدمی کے لئے بازار یا مارکیٹ یا پارکوں کا اہتمام نہ کرنا چاہیے کیونکہ اس میں بہت بڑی خرابی ہے۔ اول یہ کہ بازار وغیرہ جا کر انسان خواہ مخواہ کے گناہوں کا مرتکب ہو جاتا ہے اور بازاروں اور پارکوں وغیرہ کے دل مردہ ہو جاتا ہے۔ اس لئے اہل علم کو ایسے مقامات پر خواہ مخواہ جانا مناسب نہیں۔ ہاں بقدر ضرورت اگر کسی کام

سے جلنے تو چاہیئے کہ فوراً لوٹ آئے۔ حضرتؒ مزید فرمایا کرتے تھے کہ ہمارے طلبہ کے لئے شکر کا موقع ہے کہ ان کے لئے اللہ تعالیٰ نے ایک بہت بڑا میدان دارالعلوم کے احاطہ میں میسر کردیا ہے کہ اگر اس میں آدمی چہل قدمی عصر کی نماز کے بعد شروع کردے تو مغرب ہو جائے گی اگر احاطہ میں چہل قدمی ختم نہ ہوگی۔ اس کے ساتھ ساتھ دارالعلوم کے پیچھے کی جانب ایک بڑا جنگل ہے طلبہ کو چاہیئے کہ اس میں نکل جائیں اور تازہ اور ٹھنڈی ہوا کھائیں، اس سے ذہن کو فرحت حاصل ہوگی اور پھرتی اور چالاکی بھی۔ حضرتؒ مزید فرمایا کرتے تھے کہ ہمارے حضرت تھانوی قدس اللہ سرہٗ کا معمول تھا کہ عصر کی نماز کے بعد جنگل کی طرف نکل جاتے اور وہاں چہل قدمی کے ساتھ ساتھ معمولی ورزش بھی کرتے تھے۔

حضرت مفتی صاحبؒ طلبا کو عبادات و عمل کی طرف دعوت دیتے ہوئے بڑے دکھ اور دل سوزی سے فرمایا کرتے تھے کہ عزیزو! ایک عرصہ سے مدارس عربیہ کی حالت خراب سے خراب تر ہوتی جارہی ہے سب سے پہلے مدارس میں روحانیت کی کمی واقع ہونی شروع ہوئی۔ مگر تعلیمی استعداد پھر بھی اچھی تھی۔ مگر اب یہ انتہا ہوگئی ہے کہ عادات اور اعمال کے ساتھ ساتھ تعلیمی استعداد بھی گرتی جارہی ہے اور اب مدارس بالکل بانجھ ہوگئے ہیں کہ اب بہت ہی کم اللہ والے علماء فارغ التحصیل ہوکر نکلتے ہیں۔

حضرتؒ فرمایا کرتے تھے کہ میرے والد ماجد قدس اللہ سرہٗ فرمایا کرتے تھے کہ میں نے دارالعلوم دیوبند کا وہ زمانہ دیکھا ہے جبکہ مدرسہ کے مہتمم سے لے کر دربان اور چپراسی تک ہر ایک صاحب نسبت ولی اللہ ہوا کرتا تھا اور رفتہ رفتہ وہاں پر بھی تغیر پیدا ہونے لگا

حضرت مفتی صاحبؒ اس موقع پر حضرت علیؓ کا ایک مقولہ سنایا کرتے تھے۔ هتف العلم بالعمل فان جاء والا ارتحل۔ جس کا ترجمہ یہ ہے کہ علم اور عمل دونوں بھائی بھائی ہیں۔ جب ان میں سے ایک بھائی علم آجاتا ہے تو وہ اپنے دوسرے بھائی عمل کو بلاتا ہے کہ میں یہاں آگیا ہوں تم بھی آجاؤ۔ اگر وہ بھائی عمل آگیا تو علم بھی رہ جاتا ہے اور اگر خدانخواستہ وہ بھائی نہ آئے تو علم بھی چلا جاتا ہے۔ یہ مقولہ سنا کر حضرتؒ فرمایا کرتے تھے کہ اگر تم چاہتے ہو کہ تمہارا علم ہمیشہ باقی اور تازہ رہے اور اس میں دن رات اضافہ ہو تو تم کو چاہیئے کہ اپنے اندر عمل پیدا

کرنے کی کوشش کرو۔ حدیث نبوی میں جس علم کے سیکھنے میں فضائل بیان کئے گئے ہیں وہ وہ علم ہے جس کے ساتھ عمل ملحق ہو۔ اگر ایسا نہیں ہے تو پھر تم دنیا والوں کی نظر میں علماء کے زمرہ میں داخل ہو جاؤ گے مگر عنداللہ عالم شمار نہ ہوں گے۔ حضرت ایسے موقع پر یہ شعر بڑے سوز سے پڑھا کرتے تھے۔ ؎

علم مولا، ہو جسے ہے مولوی
جیسے رشد مولوی و معنوی

مطلب یہ ہے کہ حقیقت اور نفس الامر میں مولوی اور عالم وہ ہے جسے علم مولیٰ ہو کہ کون سا کام میرے حق میں بہتر ہے اور کون سا مضر۔ اگر علم حاصل کرنے کے بعد یہ بات حاصل نہیں ہوتی تو وہ مولوی نہیں۔

حضرتؒ مزید فرمایا کرتے تھے کہ زمانہ طالب علمی ہی سے عمل کی طرف متوجہ ہونا چاہیے، اس سے علم میں نور پیدا ہوتا ہے۔ حضرت مفتی صاحبؒ طلبہ کو ہمیشہ مشورہ دیا کرتے تھے کہ فارغ التحصیل ہونے کے بعد کسی پیر کامل اور شیخ کامل کی صحبت اختیار کی جائے اور اسے اپنی اصلاح باطن کروائیں۔

حضرت مفتی صاحبؒ کی نصیحتیں جو اب جمع کی گئی ہیں، ان کے مطالعہ سے آپ حضرات نے بخوبی اندازہ لگایا ہوگا کہ حضرتؒ طلبا کو کیسا دیکھنا چاہتے تھے

○

مولانا رشید اشرف صاحب
اُستاذ دار العلوم کراچی

حضرتؒ کے معروف تلامذہ اور اُن کی خدمات

نوٹ :۔ مشاہیر تلامذہ کا تذکرہ قلمبند کرتے وقت کوئی خاص ترتیب ملحوظ نہیں رکھی گئی بلکہ کیف ما اتفق شخصیات کا تذکرہ کیا گیا ہے

فقیہ العصر عالم بے بدل استاذ العلماء حضرت مفتی اعظم پاکستان نور اللہ مرقدہٗ نے ۱۳۳۲ھ میں برصغیر کی عظیم دینی درس گاہ دارالعلوم دیوبند سے فراغت حاصل کی اور پھر اپنے مادرِ علمی میں درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا جو تاحیات جاری رہا آپ کو صرف دارالعلوم دیوبند میں ایک ربع صدی تک درس دینے کا شرف حاصل رہا دارالعلوم سے مستعفی ہونے کے بعد آپ کو کچھ عرصہ اپنے استاذ شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی قدس سرہٗ کی جگہ جامعہ اسلامیہ ڈابھیل میں درسِ بخاری دینے کی بھی سعادت حاصل ہوئی۔ پاکستان تشریف لانے کے بعد ابتداً مسجد چیک لاسٹریان درس دینا شروع کیا پھر دارالعلوم کراچی کے قیام کے بعد آپ اس عظیم دینی درس گاہ میں درسِ حدیث وفقہ دیتے رہے اور یہ سلسلہ زندگی کے آخری لمحات تک قائم رہا۔ آپ کے درس اور اندازِ تدریس کو ہر جگہ ہر طبقہ میں بیحد پسند کیا گیا، آپ کے درس کی بے پناہ مقبولیت کا تھوڑا سا اندازہ آپ کے اس مکتوب سے بھی لگایا جا سکتا ہے۔ جو مورخہ ۴ رذی الحجہ، ۱۳۵۰ھ میں آپ نے اپنے شیخ حکیم الامت حضرت تھانوی کی خدمت میں ارسال کیا، خط کا مضمون لفظ بلفظ نقل کیا جاتا ہے۔

" یہ ناکارہ ہجوم مشاغل وافکار میں تو مبتلا رہتا ہی ہے، چند روز سے کچھ طلباء اصرار کر رہے تھے کر ترجمۂ قرآن مجید بعد مغرب پڑھا دیا کرو۔ میں نے یہ سمجھا کر دنیاوی مشاغل کا اتنا بوجھ اٹھا آ جوں اور وقت اپنی فضولیات میں ضائع ہو جاتا ہے یہ کام ہو جاوے تو اچھا ہے نیز فرمائش کرنے والے طلبا کی تعداد مختصر سمجھ کر محنت بھی زیادہ نہ سمجھتا تھا مگر اتفاق یہ ہوا کہ خبر سنکر طلباء کا ہجوم بہت بڑھ گیا، اپنی مسجد میں شروع کیا تھا وہ تنگ ہو گئی تو

جامع مسجد میں منتقل ہونا پڑا، وہاں اہل شہر میں بھی چرچا ہوا تو شہر کے بھی کچھ لوگ آنے لگے، اب ایک بہت بڑا مجمع تقریباً تین سو آدمیوں کا ہو جاتا ہے، بلا قصد کے یہ صورت ہو گئی اور بظاہر مفید ہی معلوم ہوتی ہے مگر اپنی ہمت و طاقت کے اعتبار سے نبھانا مشکل نظر آتا ہے اگرچہ اس وقت تک بالکل ظاہر حالات سے الحمد للہ کوئی زیادہ ضعف اور تکان معلوم نہیں ہوتا، بیان القرآن وغیرہ مطالعہ میں ہے اور جو کچھ کلمات حضرت سے سنے ہوئے یاد ہیں انہی سے بفضلہٖ تعالیٰ کام چلتا ہے۔

حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے جواباً تحریر فرمایا:

"بہت خوشی ہوئی خدمت کلام (کلام اللہ) سے بھی اور اس سے بھی کہ مدعیان استغنا حاجت لے کر دروازہ پر آ گئے" (انتہی)

آپ کے درس کی اسی مقبولیت کی بنا پر بے شمار تشنگان علم آپ کے علوم سے فیضیاب اور بہرہ ور ہوئے، آپ کے صرف ان تلامذہ کی تعداد جنھیں آپ سے بلا واسطہ فیضیاب ہونے کا موقع ملا۔ ۔ ۔ ۔ ۲ ہزار سے کسی صورت کم نہ ہوگی (اس وقت ہند و پاک کے علاوہ سعودیہ عربیہ، متحدہ عرب امارت، بنگلہ دیش، برما، ایران، افغانستان، انڈونیشیا، ملایا اور ترکی میں آپ کے شاگرد علماء کی ایک بہت بڑی تعداد موجود ہے جن میں سے ہر ایک اپنے اپنے مقام پر خدمت دین کا اہم فریضہ انجام دے رہا ہے) آپ کے تلامذہ کی کثرت تعداد کا کسی قدر اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ اس وقت برصغیر کے نوّے فیصد دینی مدارس کے اکثر اساتذہ و علماء بلا واسطہ یا بالواسطہ آپ کے شاگرد ہیں۔ آپ کے تلامذہ میں اپنے وقت کے ممتاز اور جید علماء جلیل القدر مفسرین و محدثین، ماہر فن اور یگانہ روزگار مفتیین و فقہاء اعلیٰ درجہ کے مصنفین و مؤرخین اور بہترین خطباء و مبلغین کی بھی ایک کثیر تعداد شامل ہے یہ اللہ پاک کی نعمت عظمیٰ اور بہت بڑی دین ہے۔

این سعادت بزور بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

ذیل میں ہم آپ کے چند ان معروف تلامذہ کا مختصر تعارف پیش کریں گے جو اپنے علم و فضل تقویٰ و طہارت اور تصنیفی و تالیفی یا دوسری دینی خدمات کی بنا پر اپنے وقت کے بڑے بڑے علماء و فضلاء کے درمیان ممتاز حیثیت کے حامل رہے ہیں۔

چونکہ حضرت مفتی صاحبؒ کی درسی زندگی کا بیشتر حصہ دارالعلوم دیوبند اور دارالعلوم کراچی میں گزرا

اس لیے ہم نے آپ کے تلامذہ کو دو طبقوں پر تقسیم کیا ہے۔ تلامذۂ دارالعلوم دیوبند اور غیر تلامذۂ دارالعلوم کیونکہ تلامذۂ دارالعلوم دیوبند: آپ کے بیشتر ممتاز تلامذہ کا تعلق دارالعلوم دیوبند سے ہے جن میں سے ہر ایک چمکتے آفتاب چمکتے ماہتاب ہیں۔

تلامذۂ دارالعلوم دیوبند

(۱) شیخ الحدیث علامہ محمد یوسف بنوریؒ

بانیٔ جامعۃ العلوم الاسلامیہ نیو ٹاؤن کراچی

شیخ الحدیث علامہ محمد یوسف بنوریؒ بانی جامعۃ العلوم الاسلامیہ نیو ٹاؤن کراچی، آپ کی ذات گرامی کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ حضرتؒ کے مشاہیر تلامذہ کے تذکرے کا آغاز ہم تبرکاً شیخ الحدیث حضرت علامہ سید محمد یوسف بنوری صاحب قدس سرہٗ سے کرتے ہیں۔ حضرت بنوری قدس سرہٗ نے دارالعلوم کراچی کے متعدد جلسوں اور مجلسوں میں بیان فرمایا کہ حضرت مفتی صاحب قدس سرہٗ میرے استاذ تھے اور میں نے مقامات حریری آپ سے پڑھی ہے۔ لیکن حضرت مفتی صاحب نے ہمیشہ حضرت شاہ صاحب کے تلمذ کی نسبت سے آپ کے ساتھ ہم سبق اور ہم رتبہ اصحاب کا سا معاملہ فرمایا۔ تاہم چونکہ نفس الامری طور پر آپ نے حضرت مفتی صاحبؒ سے پڑھا ہے۔ اس لیے اس عنوان کے تحت بھی سرفہرست آپ ہی کا نام آتا ہے

آپ حضرت علامہ کشمیریؒ کے خاص الخاص محبوب شاگرد، ان کے علوم کے امین اور حضرت حکیم الامت تھانوی قدس سرہٗ کے مجاز صحبت تھے، ان کے علاوہ آپ بیک وقت مجلس تحفظ ختم نبوت کے امیر، اسلامی نظریاتی کونسل کے اہم ترین رکن، رکین، پاکستان کے وفاق المدارس العربیہ کے امیر اور مدرسہ عربیہ اسلامیہ نیو ٹاؤن کراچی کے بانی شیخ الحدیث اور مہتمم اعلیٰ تھے۔ علم حدیث میں اپنے شیخ حضرت علامہ کشمیری کی یادگار تھے ـــــــ آپ کی عربی و فارسی ادب کی مہارت بے مثال تھی، خصوصاً عربی زبان آپ مادری زبان کی طرح بے تکلف اور بے تکان بولتے تھے، عربی تحریر اور انشاء پردازی میں بھی آپ کی مہارت قابل رشک اور بے نظیر تھی، آپ عربی و فارسی میں شعر و شاعری کا بھی بلند ذوق رکھتے تھے، آپ کا کلام ہمیشہ بڑا

وقیع ہوا تھا ، باوجود تلمیذ ہونے کے حضرت مفتی صاحبؒ آپ کے علمی کمالات کی بناء پر آپ کا بے حد اکرام فرماتے تھے، آپ کو بھی حضرت مفتی صاحبؒ سے بیحد عقیدت اور قلبی تعلق تھا، حضرت مفتی صاحبؒ کی وفات کے بعد تعزیت کے لیے جب آپ دارالعلوم کراچی تشریف لائے تو پھوٹ پھوٹ کر رو رہے تھے۔ اور بار بار فرماتے تھے ۔ اب ہم مشوروں کے لیے کس کے پاس جائیں گے ، اب ہم مشوروں کے لیے کس کے پاس جائیں گے ۔ اس مختصر تذکرہ میں آپ کے فضائل و مناقب کا احاطہ ممکن نہیں

(۲) حضرت مولانا مسیح اللہ خان صاحب مدظلہ خلیفہ ارشد حضرت حکیم الامت تھانویؒ وصدر مدرس مدرسہ مفتاح العلوم جلال آباد بھارت

آپ حضرت مفتی صاحبؒ کے تلمیذ رشید ہونے کے ساتھ حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہٗ کے مخصوص اور اکابر خلفاء میں سے ہیں، حضرت تھانویؒ نے اپنی علالت کے زمانہ میں گیارہ مخصوص خلفاء کے اسماء شائع فرمائے تھے اور تحریر فرمایا تھا کہ ان اپنے چند مجازین کا نام لکھتا ہوں جن کی طرز تعلیم پر مجھے اعتماد ہے ان گیارہ مخصوصین میں آپ کا اسم گرامی بھی شامل تھا ۔ آپ کا نسب شریف یہ ہے مسیح اللہ خان بن محمد سعید خان بن جیون خان بن شہباز خان بن عمر یز خان بن صفات خان ۔

۱۳۲۹ھ یا ۱۳۳۰ھ میں علی گڑھ میں آپ کی ولادت ہوئی ۔ اسکول میں چھ جماعتیں پاس کرنے کے بعد دینی تعلیم کی طرف متوجہ ہوئے اور ۱۳۵۱ھ میں دارالعلوم دیوبند سے فراغت حاصل کی ، اور جلال آباد ضلع مظفر نگر میں مدرسہ مفتاح العلوم کی بنیاد ڈالی اور وہاں تدریسی خدمات انجام دینے لگے جو غالباً اب تک جاری ہیں ، اس مدرسہ کا شمار آجکل بھارت کے معیاری دینی مدارس میں ہوتا ہے ۔ فراغت کے صرف دو ماہ بعد حضرت تھانویؒ نے خلافت سے سرفراز فرمایا ۔

حضرت حکیم الامت تھانویؒ سے بچپن ہی سے عقیدت تھی کیونکہ حضرت تھانویؒ کی تصانیف شروع ہی سے زیر مطالعہ تھیں اور ان کا آپکے اوپر بہت گہرا اثر تھا ، دارالعلوم دیوبند تشریف لانے کے بعد آپ نے حضرت تھانویؒ سے اصلاحی تعلق قائم فرمایا ، اور باقاعدہ خط وکتابت شروع کردی اور کچھ عرصہ بعد بیعت ہوگئے ، رمضان المبارک کا زمانہ آپ پابندی سے تھانہ بھون میں گزارتے تھے ۔ فراغت کے بعد ۱۳۵۱ھ میں آپ حسب معمول رمضان المبارک گزارنے تھانہ بھون تشریف لے گئے وہاں سے واپسی پر حضرت تھانوی قدس سرہٗ کی خدمت میں خط ارسال کیا جس کے جواب میں ۲۵ شوال ۱۳۵۱ھ میں حضرت

حکیم الامتؒ نے آپ کو خلافت سے نوازا۔ حضرت تھانویؒ کو آپ پر جو خصوصی اعتماد تھا اس کا کس قدر اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ ایک مرتبہ حضرت حکیم الامت قدس سرہٗ نے فرمایا کہ میرے جی میں ایک بات ہے اسے میں کیوں نہ کہہ دوں میں سب کے سامنے صاف صاف کہتا ہوں کہ مولوی مسیح اللہ صاحب سے مجھے محبت ہے۔ اسی طرح ایک مرتبہ کسی سائل کے دریافت کرنے پر آپ نے فرمایا کہ عیسٰی (مولانا محمد عیسٰی صاحب خلیفۂ حضرت تھانویؒ) اور مسیح دونوں بڑھ گئے ہیں۔ اسی طرح آپ کو بھی اپنے شیخ ورہبر سے بیحد تعلق اور عقیدت تھی آپ غایت احترام و ادب کی وجہ سے حضرت تھانوی قدس سرہٗ کے سامنے بہت کم تکلم فرماتے تھے۔ ایک مرتبہ حضرت خواجہ عزیزالحسن مجذوبؒ نے آپ سے فرمایا کہ آپ (حضرت کے سامنے) بولا کریں یہ میں نہیں کہہ رہا (بلکہ) حضرت نے فرمایا ہے کہ ان سے کہہ دو کہ مجھ سے بے تکلف ہوں فرمایا بولا کریں یاس سے بھی حضرت تھانوی قدس سرہٗ کا آپ سے خصوصی تعلق ظاہر ہوتا ہے۔ حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنیؒ قدس سرہٗ بھی آپ کا بیحد احترام فرماتے تھے اور آپ کو دیکھ کر کھڑے ہو جاتے تھے۔ ایک مرتبہ حضرت مدنیؒ جلال آباد کے ایک جلسہ میں تشریف لائے لوگوں نے بیعت کی درخواست کی تو انکار فرما دیا پھر جب لوگوں نے بیحد اصرار کیا اور بعض حضرات نے سفارش بھی فرمائی تو بھی حضرت مدنی قدس سرہٗ نے سختی سے منع فرما دیا اور فرمایا کہ میں کہہ چکا ہوں کہ میں بیعت نہیں کروں گا۔ یہاں مولانا مسیح اللہ صاحب موجود ہیں ان کے ہوتے ہوئے بیعت نہیں کروں گا۔

ہندوپاک کے علاوہ افریقہ وغیرہ میں بھی آپ سے اصلاحی تعلق قائم کرنے والوں کا سلسلہ ماشاءاللہ بہت وسیع ہے۔

حضرت مولانا سلیم اللہ خان صاحب بانی و شیخ الحدیث جامعہ فاروقیہ کراچی بھی آپ کے شاگرد اور مرید ہیں۔ آپ متعدد کتب و رسائل کے مولف ہیں جن میں سے بیشتر کتب تصوف سے متعلق ہیں۔

۱۔ شریعت و تصوف (دو جلد) ۲۔ ذکر النبی صلی اللہ علیہ وسلم ۳۔ اصول تبلیغ ۴۔ مواعظ ۵۔ ذکر الہی ۶۔ اخلاص ۷۔ الحج ۸۔ ختم البخاری ۹۔ ملفوظات ۱۰۔ التوحید الحقیقی ۱۱۔ حفظ المسلم ۱۲۔ فضیلت طہارت ۱۳۔ فضیلت علم ۱۴۔ تعلیمات اسلام۔

(۳) شیخ الحدیث مولانا عبدالحق صاحب مدظلہم بانی و مہتمم دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک پشاور و سابق رکن قومی اسمبلی پاکستان

آپ بھی حضرت مفتی صاحبؒ کے ممتاز تلامذہ میں سے ہیں، اس وقت پاکستان کے گنے چنے ممتاز علماء میں آپ کا شمار ہے جو درحقیقت محتاج تعارف نہیں۔ سالہا سال سے درس حدیث دے رہے ہیں اور آپ کی طرف طلبا کا بے پناہ رجوع ہے۔ پاکستان کی قومی اسمبلی کے رکن بھی رہ چکے ہیں۔ اعلیٰ پائے کے خطیب ہیں آپ کو حضرت مفتی صاحبؒ سے دیوبند میں مقامات پڑھنے کا شرف حاصل ہوا ہے آپ حضرت مفتی صاحبؒ کے تبحر علمی اور فقہی وادبی مہارت کے بیحد قائل ہیں۔"

۱۹۱۴ء میں پشاور تحصیل نوشہرہ قصبہ اکوڑہ خٹک میں آپ کی ولادت ہوئی آپ کے والد ماجد الحاج محمد معروف گل صاحب نے وقت کے معروف علماء سے ابتدائی تعلیم دلائی، پھر تکمیل کے لیے ۱۳۴۷ھ میں آپ دارالعلوم دیوبند تشریف لے گئے اور ۱۳۵۱ھ میں فارغ التحصیل ہو کر وطن تشریف لائے اور گھر پر ہی درس وتدریس کا سلسلہ شروع کیا جو تقریباً دس سال جاری رہا۔ ۱۳۶۲ھ میں اپنے استاذ و شیخ مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کی خواہش پر دارالعلوم دیوبند میں تدریسی خدمات انجام دینے لگے، ۱۳۶۶ھ میں رمضان کی تعطیلات میں جب آپ گھر تشریف لائے تو تقسیم ہند کی وجہ سے واپس تشریف نہ لیجا سکے، قیام پاکستان کے بعد بھی دارالعلوم کی طرف سے آپ کو بلانے کی مسلسل کوششیں ہوتی رہیں، لیکن مشیت ایزدی کو یہ منظور نہ تھا، ذی قعدہ ۱۳۶۶ھ مطابق ۱۹۴۷ء میں آپ نے اپنے وطن مالوف اکوڑہ خٹک میں "دارالعلوم حقانیہ" کی بنیاد ڈالی تاکہ پاکستان میں علوم دینیہ کی اشاعت ہو سکے، اب یہ پاکستان کی معیاری دینی درس گاہ ہے جو وفاق المدارس العربیہ کے ساتھ ملحق ہے، اس میں ملک اور بیرون ملک کے بے شمار طلبہ زیور علم سے آراستہ ہوتے ہیں۔ اب تک دارالعلوم ہذا سے تقریباً دو ہزار طلبا سند فراغ حاصل کر چکے ہیں۔

اس ادارہ سے تقریباً تیرہ سال سے ایک دینی وعلمی ماہنامہ "الحق" جاری ہے جو دور حاضر کے فتنوں کی سرکوبی اور دینی اقدار کی اشاعت کا اہم فریضہ جاری رکھے ہوئے ہے آپ کے باصلاحیت فرزند رشید مولانا سمیع الحق صاحب قاسمی فاضل حقانیہ اس کے مدیر اعلیٰ ہیں، ۱۹۷۰ء کے انتخابات میں جمعیۃ علماء اسلام کے ٹکٹ پر آپ پاکستان کی قومی اسمبلی کے ممبر منتخب ہوئے، اسمبلی میں آپ نے اہم اور مثبت کردار ادا کیا، اور اسلامی نظام کے قیام کی سر توڑ کوششیں کرتے رہے، جس کی تفصیل جناب مولانا سمیع الحق صاحب کی مرتب کردہ کتاب "قومی اسمبلی میں اسلام کا معرکہ" میں مذکور ہے۔

ابتداءً آپ حضرت حاجی صاحب ترنگزئی مرحوم سے بیعت ہوئے ان کی وفات کے بعد

آپ نے شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنیؒ سے اصلاحی تعلق قائم کیا اور خوب کسب فیض کیا۔ آپ کے درس بخاری و ترمذی جو ہر سال قلمبند ہوتے ہیں زیر ترتیب ہیں۔ آپ کے مواعظ کا مجموعہ "مواعظ حق" کے نام سے شائع کیا جا چکا ہے اس کی صرف پہلی جلد منظر عام پر آئی ہے۔ جو تقریباً سات سو صفحات پر مشتمل ہے، اس کے علاوہ آپ کے علمی مضامین ماہنامہ "الحق" میں پابندی سے شائع ہوتے رہتے ہیں۔

(۴) شیخ القراء حضرت مولانا قاری فتح محمد بن محمد اسمٰعیل صاحب ادام اللہ بقاءہ

آپ کی ذات بڑے قاری صاحب کے لقب سے معروف عام و خاص ہے، آپ بلاشبہ عالم اسلام کے بہترین اور علوم قرأۃ و تجوید کے سب سے ممتاز عالم ہیں۔ ان فنون میں آپ کو ایسی مہارت اور ملکہ حاصل ہے جس کی نظیر سلف و خلف میں بہت کم ملتی ہے ساتھ ہی آپ بے مثال اور قابل رشک حافظہ کے مالک ہیں، آپ کا حافظہ منکرین حدیث کے خلاف حجت اور برھان قاطع کی حیثیت رکھتا ہے آپ کو دیوبند میں حضرت مفتی صاحبؒ سے موطا امام مالک پڑھنے کا شرف حاصل ہوا۔

ار یا ۱۲ ذیقعدہ ۱۳۲۲ھ میں پانی پت ضلع کرنال میں آپ کی ولادت ہوئی ابھی ڈیڑھ سال ہی کے تھے کہ قضائے الٰہی سے نابینا ہو گئے، پانچ سال کی عمر میں ایک استانی امۃ اللہ مرحوم کے ہاں قرآن کریم شروع کیا، ستائیس پارے حفظ کرنے کے بعد بعض وجوہات کی بنا پر مدرسہ اشرفیہ چلے آئے اور قاری شیر محمد خان سے حفظ کی تکمیل کرنے کے بعد دوبارہ تجوید کے ساتھ قرآن حکیم پڑھا، اس کے بعد اپنے مشفق استاذ کے زیر سایہ اسی مدرسہ میں تدریس شروع کی ساتھ ہی مدرسہ "گنبداں" میں فارسی عربی کی تعلیم حاصل کرنے جاتے نیز سید القراء مولانا ابو محمد محی الاسلام سے تجوید و قرأت کی بھی تعلیم حاصل کرتے۔

۱۳۴۶ھ میں سید القراء سے سند اور اجازت حاصل کی پھر تکمیل علوم کے لیے دارالعلوم دیوبند تشریف لے گئے، امتحان داخلہ حضرت مفتی صاحبؒ نے لیا، آپ کو اب تک امتحان داخلہ کے وقت حضرت مفتی صاحب کے سوالات اور اپنے جوابات بخوبی یاد ہیں۔ ۱۳۴۷ھ میں دورۂ حدیث پڑھ کر سند فراغ حاصل کی، وطن واپس آ کر دوبارہ اپنے استاذ قاری شیر محمد خان صاحب کی معیت میں تدریس شروع کی، اسی مدرسہ میں تقریباً پچیس سال تک آپ قرآن پاک کی خدمت انجام دیتے رہے ۱۳۶۵ھ

میں حج کی سعادت حاصل ہوئی، مدینہ منورہ میں شیخ القراء حافظ حسن الشاعر سے ملاقات ہوئی وہ آپ کی علمی قابلیت اور زبردست حافظے سے بیحد متاثر ہوئے بعد میں ۱۳۸۴ھ میں آپ پاکستان تشریف لے آئے، اور عرصہ دراز تک دارالعلوم کراچی کے شعبۂ حفظ و تجوید کے سرپرست اور صدر مدرس رہے، اب چند سالوں سے آپ مدینہ منورہ ہجرت کر کے وہیں قیام پذیر ہیں۔

شروع میں حضرت تھانویؒ سے بیعت ہوئے ان کے بعد مفتی محمد حسن صاحب امرتسری خلیفۂ حضرت تھانویؒ و بانی جامعہ اشرفیہ لاہور سے بیعت ہوئے اور خلافت سے نوازے گئے۔ آج کل بہت سے طالبانِ حق آپ سے مستفیض ہو رہے ہیں۔

آپ کی قوت حافظہ انتہائی مضبوط اور حیران کن ہے جس کا تھوڑا سا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ آپ کو قصیدۂ شاطبیہ کے ۱۱۷۳، طیبہ کے ۱۰۰۰، الفوائد المعتبرہ کے ۵۰۰، قصیدۂ رائیہ کے ۲۹۸، ناظمۃ الزھر کے ۲۹۷، درّہ کے ۲۴۵، مقدمہ جزریہ کے ۱۰۷، اور تحفہ کے ۶۱ اکسٹھ اشعار بالکل حفظ اور ازبر ہیں ان کے علاوہ بے شمار دعائیہ حمدیہ اور نعتیہ نظمیں اور احادیث کا ایک بڑا ذخیرہ حفظ ہے نیز قراآت عشرہ مع طرق اس قدر پختہ یاد ہیں کہ تحقیقاً ترتیلاً تدویراً حدراً ہر طرح ہر جگہ سے ہر حالت میں اور ہر مجلس میں بلا تکلف پڑھ سکتے ہیں ہند و پاک کے ممتاز قراء آپ کے شاگرد ہیں قاری رحیم بخش پانی پتی جو خود تجوید و علم قراءت کی بے شمار کتب کے مؤلف ہیں آپ کے شاگرد اور عقیدتمندوں میں داخل ہیں۔

آپ انتہائی متقی قائم اللیل اور صائم النہار بزرگ ہیں قرآن پاک کی خدمت کرنے کا جو بلند اور عظیم جذبہ قادر مطلق نے آپ کو عطا فرمایا ہے وہ شاذ و نادر ہی کسی کو نصیب ہوتا ہے، چنانچہ علم تجوید و قراءت میں آپ کی بہترین علمی تصانیف ہیں۔

۱ عنایات رحمانی جو حرز الامانی یعنی شاطبیہ کی شرح ہے اور بڑے سائز کی تین ضخیم جلدوں میں ہے اس پر حضرت مفتی صاحبؒ کے علاوہ علامہ سید سلیمان ندویؒ، مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ مفتی محمد حسن امرتسریؒ مولانا خیر محمد صاحب جالندھری جیسے اجلّہ علماء کی تقاریظ موجود ہیں ۲ شرح درّہ مکمل ۳ ترجمہ درۃ المضیۃ ۴ ترجمہ جزریہ ۵ مفتاح الکمال شرح تحفۃ الاطفال ۶ سہل المورد شرح قصیدہ رائیہ ۷ تسہیل القواعد ۸ عمدۃ المبانی فی اصلاح عدۃ من ابیات حرز الامانی ۹ کاشف العسر شرح ناظمۃ الزہر مختصر کر

دورِ حاضر میں آپ بلاشبہ آیۃ من آیات اللہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ متعنا اللہ بطول حیاتہ۔

(۵) مولانا محمد سرفراز خاں صاحب صفدر

شیخ الحدیث و صدر مدرس نصرۃ العلوم گوجرانوالہ

آپ بھی پاکستان کے مایۂ ناز علماء میں سے ہیں صاحب تصانیف کثیرہ ہیں۔ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ کے صدر مدرس اور شیخ الحدیث ہیں حضرت مفتی صاحبؒ سے شرف تلمذ کی سعادت آپ کو بھی حاصل ہوئی آپ نے حضرت مفتی صاحبؒ سے طحاوی شریف پڑھی۔

آپ ۱۹۱۴ء میں علاقہ کونش تحصیل مانسہرہ ہزارہ میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد محترم کا اسم گرامی نور احمد خان بن گل احمد خان ہے ابتدائی تعلیم اپنے علاقہ میں حاصل کی، بعد ازاں سیالکوٹ اور ملتان کے علماء سے استفادہ کیا تکمیل کے لیے دارالعلوم دیوبند کا رخ کیا اور ۱۳۶۱ھ میں مطابق ۱۹۴۱ء میں فارغ التحصیل ہوئے فراغت کے بعد جامع گوجرانوالہ میں خطیب و مدرس مقرر ہوئے پھر ۱۳۷۴ھ میں مدرسہ نصرۃ العلوم میں آپ کا تقرر ہوا۔ اب سالہا سال سے دورہ حدیث کے مختلف اسباق پڑھانے کی سعادت حاصل ہے ۱۳۴۲ھ سے گورنمنٹ ٹریننگ سکول گوجرانوالہ میں درس قرآن بھی دے رہے ہیں، ملک کی اہم تبلیغی کانفرنسوں میں آپ خطاب کرتے ہیں۔

آپ کو حضرت مفتی صاحبؒ سے بیحد تعلق اور عقیدت تھی اپنے اکثر معاملات آپ ان کے مشورہ سے طے فرماتے تھے۔ خود حضرت مفتی صاحب قدس سرہٗ کو بھی آپ سے قلبی تعلق تھا جس کا اظہار اس خط و کتابت سے ہوتا ہے جو آپ حضرات کے درمیان ہوتی رہتی تھی، آپ (مولانا سرفراز خان صاحب صفدر مدظلہم) کا ایک مکتوب نقل کیا جاتا ہے۔ جو آپ نے حضرت مفتی صاحبؒ کی خدمت میں ارسال کیا۔

الی محترم المقام الاستاذ المکرم دامت برکاتہم، وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ، مزاج سامی۔ آپ کا شفقت نامہ موصول ہوا، یاد آوری کرم فرمائی اور ذرہ نوازی کا تہ دل سے صد شکریہ، مجھے کراچی سے حضرت والا کے حوالہ سے تقریباً تین سال پہلے ایک حکم نامہ موصول ہوا تھا۔ کہ حضرت مفتی صاحب فرماتے ہیں کہ مولوی احمد رضا خان صاحب کے ترجمہ اور مفتی نعیم الدین صاحب کی تفسیر پر علمی تنقید ضروری ہے تاکہ یہ فرض کفایہ بھی ادا ہو جائے اور جماعتی صورت میں ہم اس فریضہ کے مقروض نہ رہیں راقم جسمانی اور روحانی علالتوں میں مبتلا ہونے کے علاوہ بے انتہا مصروف رہتا ہے۔ مگر باایں ہمہ اپنے مہربان استاذ کے حکم کو بجا لانا اپنی نجات

اخروی کا ذریعہ سمجھا اور تو کلا علی اللہ سرسری طور پر تنقید کر دی مقدمہ میں اجمالاً جس بزرگ ہستی کا بلا نام لیے ذکر ہے اس سے آپ ہی کی ذات گرامی مراد ہے اور کتاب طبع ہوتے ہی میں نے جناب ناظم صاحب سے کہا تھا کہ ۲ نسخے البلاغ کراچی کے پتے پر ارسال کر دیں تاکہ حضرت دام مجدہم رسالہ میں اس کے بارے میں کچھ فرما دیں، رسالہ البلاغ میں تو اس کا تبصرہ آگیا ہے لیکن آپ کے گرامی نامہ سے معلوم ہوا کہ وہ کتاب آپ نے ابھی تک ملاحظہ نہیں فرمائی لہذا اب ۲ نسخے مزید ارسالِ خدمت ہیں، اپنے مفید مشوروں سے نوازیں، تاکہ طبع دوئم میں اصلاح کر لی جائے نیز ”تسکین الصدور فی تحقیق احوال الموتیٰ فی البرزخ والقبور“ بھی طبع ہو چکی ہے، جس میں عذاب قبر، اعادہ روح فی القبر، حیات انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام عند القبر، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا سماع، عرض اعمال کی بحث اور توسل اور سماع موتیٰ کے مسائل باحوالہ مبسوط طور پر درج ہیں، یہ کتاب مولانا خیر محمد صاحب مولانا مفتی محمود صاحب اور مولانا مفتی عبداللہ ملتانی صاحب مولانا مفتی عبداللہ صاحب ساہیوال، مولانا محمد علی جالندھری صاحب ساہیوال، مولانا محمد علی صاحب جالندھری مولانا غلام غوث ہزاروی صاحب مولانا قاضی مظہر حسین صاحب مولانا نذیر اللہ صاحب مولانا مفتی محمد اسحاق صاحب خیر المدارس نے اوّل سے آخر تک سُنی، اور سب نے بہت پسند فرمائی، اور بعض مفید مشورے بھی دیے، اور یہ سب کچھ کتاب کے مقدمہ میں درج ہیں اور بلا کسی شخص یا جماعت کا نام لیے اصولی طور پر حسب توفیق اپنے اکابر کے مسلک کو خوب اُجاگر کیا گیا ہے، اس کتاب کو بنظر عمیق ملاحظہ فرما کر اپنی زریں رائے سے آگاہ فرمائیں اس کتاب کی لاہور میں جلد بندی ہو رہی ہے امید ہے جمعہ تک آ جائے گی جمعہ یا ہفتہ کے دن ۲ نسخے ”تسکین الصدور“ کے اور دو نسخے ”تنقید متین“ کے ہدیۃً ارسالِ خدمت ہوں گے امید ہے کہ اولین فرصت میں ان کے بارے میں اپنی رائے مبارک اور خصوصاً ”تسکین الصدور“ سے متعلق جلدی ہی ارسال فرمائیں گے تاکہ طبع کرا کر کتاب کے ساتھ ہی شائع ہو سکے، نیک دعاؤں میں یاد فرمائیں والسلام

احقر الناس خاکپائے اکابر ابوالزاہد محمد سرفراز خطیب جامع مسجد گکھڑ ۹ جمادی الاولیٰ ۱۳۸۸ھ مطابق ۵ اگست ۱۹۶۸ء

حضرت مفتی صاحبؒ نے جو جواب تحریر فرمایا بہت سے فوائد پر مشتمل ہونے کی بناء پر تبرکاً اسے بھی جوں کا توں نقل کیا جاتا ہے۔

عزیزم محترم مولانا سرفراز صاحب زادکم اللہ تعالیٰ علماً وعملاً وانجح مساعیکم للدین،

السلام وعلیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

گرامی نامہ میں آپ نے جو رشتۂ تلمذ کا ذکر کیا ماشاء اللہ آپ کے علمی کمالات کے سامنے اس کا تصور
بھی مجھے نہیں ہو سکتا اور ضعفِ سن اور غلبہ نسیان کا خدا بھلا کرے انہوں نے اس سب کو بھلا ہی دیا ہے
بہرحال آپ کی سابقہ تصانیف کو اجمالاً دیکھا تھا اور رسالہ کتب تنقید متین اور تسکین الصدور کو کسی قدر
تفصیلاً دیکھنے کی نوبت آئی جوں جوں دیکھتا جاتا تھا دل سے دعائیں نکلتی تھیں کہ ماشاء اللہ تحقیق کا حق بھی
پورا ادا کر دیا اور دوسروں پر تنقید کا انداز بھی بہت اچھا اور متین ہے، آجکل کے انشاء پردازوں یا واعظوں
کی زبان اختیار نہیں کی جس میں الزام تراشی اور فقرے کسنے کا جذبہ اصلاح کے جذبے کو دبا دیتا اور بے اثر
بنا دیتا ہے، اللہ تعالیٰ آپ کے علم و عمل اور اخلاص میں ترقیات لاانتہا ہی عطا فرمائیں۔

ہیچکس می رود کہ زیبا می رود، یہ ناکارہ تو پہلے بھی ناکارہ ہی تھا اور اب تو ضعفِ سن اور ہجوم افکار نے
کسی کام کا نہیں چھوڑا اپنے چند رسائل جدیدہ بھیج رہا ہوں، دعاؤں میں کبھی احقر کو بھی یاد فرمایا کریں تو مناسب
ہو۔ باقی ایک ضروری بات یاد آئی کہ آج کل کے نئے پیش آنے والے مسائل مشینی دور نے پیدا کر دیئے ہیں
اسی طرح کچھ اور مسائل جو عوامی اور عمومی ضرورت اختیار کر چکے ہیں ان کے متعلق احقر کی پرانی تجویز دیوبند کے
زمانہ سے یہ تھی کہ ایسے مسائل میں انفرادی فتووں سے اجتناب کیا جائے اجتماعی صورت سے کسی نتیجہ پر پہنچ کر
جواب لکھے جائیں اگر باوجود بحث و تمحیص کے آپس میں اختلاف بھی رہے تو اس اختلاف کو بھی مستقل صورت
میں ان فتووں میں واضح کر دیا جائے اور دیوبند میں تو اللہ کے فضل سے اپنے اساتذہ موجود تھے اور سب کے
بزرگ حضرت تھانویؒ قدس سرہٗ موجود تھے۔ احقر نے کسی ایسے مسئلہ میں ان حضرات سے استصواب کے بغیر
قلم نہیں اٹھایا۔ پاکستان میں یہ میدان بالکل خالی نظر آیا جس سے کمر ٹوٹ رہی ہے مگر تاہم ضروری کام چھوڑے
نہیں جا سکتے اس لیے بڑے پیمانہ پر علماء کی رائے جمع کرنے کی ہمت و فرصت نہ تھی، کراچی شہر میں علماء
اہل فتویٰ کی ایک مجلس ہم نے مقرر کر لی ہے جس میں مولانا محمد یوسف بنوریؒ نیو ٹاؤن سے مولانا مفتی رشید احمد
مدرسہ اشرف المدارس سے اور ان کے دوسرے رفقاء اپنے دارالعلوم کے چند اہل علم ماہ بماہ جمع ہو کر ایسے مسائل
پر کچھ بحث و تمحیص کر کے کچھ لکھتے ہیں اس سلسلہ میں اس وقت تک مسائل پر مختلف رسالوں کی صورت
میں تیار ہو چکے ہیں اب ان کی اشاعت اس مقصد کے لیے کرنے کا ارادہ ہے کہ اپنے ملک اور بیرون

ملک علماء کے پاس بھیجے جائیں۔ ان حضرات کی آراء حاصل ہو جائیں تو ان کو شامل کر کے کر اشاعت کی جائے۔ رسائل یہ ہیں:۔

(۱) تداوی بالجزاء الانسان (۲) بیمہ زندگی (۳) پرائیویٹ فنڈ۔ (۴) بلاسود کی بنکاری۔ ۵۔ مشینی ذبیحہ۔ ۶۔ مواقیت حج وغیرہ۔

ماشاء اللہ آپ کی وسعت نظر اور تحقیق کے پیش نظر دل تو چاہتا ہے کہ اس مجلس ہی میں آپکی شرکت ہوتی تو بہتر تھا، مگر بُعد بعید کی وجہ سے یہ نہ ہو سکا۔ اب یہ رسائل آپ کے پاس بھیجوں گا خود ملکر کے ساتھ دیکھ کر اپنی رائے ثبت فرمائیں، طباعت میں ظاہر ہے کافی مدت لگے گی اس لیے یہ بھی ارادہ ہے کہ درمیان میں پھر کبھی لاہور وغیرہ کا سفر ہوا تو مسودات ساتھ لاؤں اور آپ کو دیکھنے کے لیے دوں،

واللہ الموفق والمعین۔ محمد شفیع ۷ جمادی الثانی ۱۳۸۸ھ۔

آپ متعدد مفید علمی کتب و رسائل کے مؤلف ہیں مختلف رسائل میں آپ کے مضامین پابندی سے شائع ہوتے ہیں آپ کی چند تالیفات بطور خاص قابلِ ذکر ہیں۔

۱۔ احسن الکلام ۲ حصے، ۲۔ تسکین الصدور فی تحقیق احوال الموتیٰ فی البرزخ والقبور۔ ۳۔ تنقید متین۔ ۴۔ مقام امام ابوحنیفہ۔ ۵۔ عیسائیت کا پس منظر۔ ۶۔ انکار حدیث کے نتائج۔ ۷۔ الکلام الحاوی علی الطحاوی۔ ۸۔ طائفہ منصورہ۔ ۹۔ بانی دارالعلوم دیوبند۔ ۱۰۔ درود شریف پڑھنے کا شرعی طریقہ۔ ۱۱۔ مرزائی کا جنازہ اور مسلمان۔ ۱۲۔ راہ ہدایت۔ ۱۳۔ مسئلہ قربانی۔ ۱۴۔ گلدستۂ توحید، ۱۵۔ تحقیق دعا بعد نماز جنازہ۔ ۱۶۔ چالیس دعائیں۔ ۱۷۔ راہ سنت۔ ۱۸۔ چراغ کی روشنی در مسئلہ معراج۔ ۱۹۔ صرف ایک اسلام۔ ۲۰۔ آنکھوں کی ٹھنڈک۔ ۲۱۔ آئینۂ محمدی ۲۲۔ نماز مسنون مع اذکار و ادعیہ ۲۳۔ حکم الذکر بالجہر ۲۴۔ عمدۃ الاثاث در مسئلہ طلاق ثلاثہ۔ ۲۵۔ مسئلہ حیاۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم۔ ۲۶۔ عبارات اکابر۔ ۲۷۔ علم غیب وغیرہا۔

(۶) خطیب پاکستان مولانا احتشام الحق تھانوی مدظلہم

بانی و مہتمم دارالعلوم الاسلامیہ ٹنڈو الہ یار

آپ کی ذات کسی تعارف کی محتاج نہیں، آپ پاکستان کے ممتاز عالم دین شہرۂ آفاق خطیب دارالعلوم الاسلامیہ ٹنڈو الہ یار کے بانی و مہتمم اور علامہ ظفر احمد عثمانیؒ خلیفۂ حضرت تھانویؒ کے مجاز بیعت ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے آپ کو حسن صورت اور حسن بیان کا جو ملکہ عطا فرمایا ہے بہت کم لوگوں کو نصیب ہوتا ہے
آپ تقریر کی طرح تحریر کا بھی اچھا ملکہ رکھتے ہیں۔ عرصہ دراز سے قرآن حکیم کی تفسیر زیر تالیف ہے جو سالہا سال سے
پاکستان کے سب سے زیادہ کثیر الاشاعت اخبار روزنامہ جنگ میں بالاقساط پابندی سے شائع ہو رہی ہے۔
آئین پاکستان کو قرآن سنت کے سانچے میں ڈھالنے کے لیے جب بھی کوئی کوشش کی گئی آپ اس
میں پیش پیش رہے۔ ۱۹۵۱ء میں کراچی میں آپ کی مساعی سے پاکستان تمام دینی مکاتب فکر کے مختلف الخیال علماء کا اجلاس
منعقد ہوا جس میں تمام علماء نے متفقہ طور پر اسلامی مملکت کے راہنما بنیادی اصول مرتب کر کے اتحاد و اتفاق
کی ایک مثال قائم کی۔ آپ مدت مدید تک مرکزی جمعیت علماء اسلام کے ناظم اعلیٰ اور قائد رہے۔ نومبر ۱۹۵۲ء
میں ڈھاکہ میں آپ کی صدارت میں ایک عظیم الشان کانفرنس منعقد کی گئی جس میں ہزاروں علماء لاکھوں افراد نے
شرکت کی، اور حکومت کو صاف الفاظ میں بتا دیا کہ کوئی ایسا دستور قبول نہیں کیا جائے گا جو اسلام کے نام
پر بنایا گیا ہو مگر اس کی روح سے خالی ہو غرض یہ کہ پاکستان میں دستور اسلامی کے نفاذ کے سلسلہ میں جتنی
کوششیں ہوئیں دوسرے علماء کرام کے شانہ بشانہ آپ نے بھی اس میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ اس مختصر مضمون میں
تفصیلات کی گنجائش نہیں۔

(۷) مولانا سعید احمد صاحب اکبر آبادی

مدیر اعلیٰ ماہنامہ "برہان" (بھارت)

آپ ممتاز فضلاء دار العلوم میں سے ہیں۔ حضرت کشمیریؒ سے شرف تلمذ آپ کو بھی حاصل ہے۔ علی گڑھ
مسلم یونیورسٹی میں سنی دینیات کے شعبے کے انچارج ہیں۔ ماہنامہ برہان کے مدیر اعلیٰ ہیں، دار العلوم اور ادارہ
مجلس معارف القرآن (اکاڈمی قرآن عظیم) کی مجلس شوریٰ کے اہم رکن ہیں، دار العلوم سے فراغت کے بعد
ایم۔ اے کیا، دلی یونیورسٹی میں پروفیسر رہے، پھر مدرسہ عالیہ کلکتہ کے پرنسپل رہے۔ اس وقت آپ بھارت کی
ممتاز شخصیتوں میں سے ہیں اور بین الاقوامی حیثیت کے مالک ہیں، حجاز مقدس اور دوسرے ممالک کے سفر کئے،
اپنی قابلیت سے ادبی اور علمی حلقوں کو متاثر کیا۔ حضرت قاری محمد طیب صاحب مدظلہم کی معیت میں مصر کی
عالمی موتمر میں آپ نے شرکت کی جہاں آپ کے خطاب کو اہمیت کے ساتھ سنا گیا۔
آپ اچھے ادیب اور بہترین مقرر ہیں۔ بے شمار کتب کے مؤلف و مصنف ہیں۔ جن میں سے نبرا
الرق فی الاسلام (دو جلد) بہت اہم اور قابل قدر تالیف ہے۔

(۸) مولانا محمد انوار الحسن شیرکوٹی

سابق صدر شعبہ فارسی اسلامیہ کالج فیصل آباد (لائلپور)

آپ ذی استعداد عالم کتب کثیرہ کے مصنف اور عربی اردو فارسی کے بلند پایہ شاعر تھے۔ مکمل نام و نسب یہ ہے انوارالحسن بن احمد حسن بن محمد حسن بن محمد داؤد بن شیخ محمد مدنی۔

۱۹۰۶ء میں شیرکوٹ ضلع بجنور میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم کے بعد شوال ۱۳۲۹ھ مطابق ۱۹۲۰ء کو دارالعلوم دیوبند میں داخلہ لیا اور مسلسل آٹھ سال تعلیم حاصل کرنے کے بعد دستار فضیلت حاصل کی، دیوبند میں حضرت کشمیریؒ علامہ شبیر احمد عثمانی مولانا مفتی عزیزالرحمٰن صاحب، مولانا سید اصغر حسین صاحبؒ مولانا مرتضیٰ حسن چاندپوری مولانا محمد رسول خاں صاحب ہزاروی، مولانا محمد ابراہیم بلیاویؒ مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ اور مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلویؒ جیسے اجلہ علماء و کبار اساتذہ سے شرف تلمذ حاصل کیا، درس نظامی سے فراغت کے بعد مولوی فاضل، منشی فاضل، ادیب فاضل اور بی۔ اے کے امتحانات پاس کئے اور او ٹی، کی سند حاصل کی، اسی عرصہ میں مختلف کالجوں اور اسکولوں میں لیکچرار رہے ستمبر ۱۹۴۸ء میں گورنمنٹ کالج لاہور میں ایم اے اردو کلاس میں داخلہ لیا۔ ۱۹۵۰ء میں پنجاب یونیورسٹی سے ایم اے کی ڈگری حاصل کی، ۲۲ ستمبر ۱۹۵۲ء میں اسلامیہ کالج لائلپور میں بحیثیت مدرس عربی و فارسی آپ کا تقرر ہوا، کچھ عرصے بعد آپ شعبہ فارسی کے صدر بنا دیئے گئے۔

۴ مئی ۱۹۶۶ء کو اس منصب سے سبکدوش ہوئے۔

چار پانچ اکتوبر ۱۹۶۹ء کی درمیانی شب آپ پر اچانک بلڈ پریشر کا حملہ ہوا چند منٹ بعد ایک ہچکی آئی کر دس منٹ پر اس دنیائے رنگ و بو کو خیرباد کہہ کر خالق حقیقی سے جا ملے۔

آپ عربی اردو اور فارسی کے بلند پایہ با ذوق شاعر تھے آپ کا کلام بہت بلند ہوتا تھا بطور نمونہ چند اشعار تحریر کئے جاتے ہیں۔

۔ یاصاحبی اعرض عن الاشرار	عشق دائماً ابداً مع الاخیار
وحلاوۃ الخلق العظیم حلاوۃ	ماذقتها فی اطیب الاثمار
ولنعم نور جبین مرء صالح	یهب الالٰه لمن من الاطهار

نہ لے حساب کہ میں لائق حساب نہیں — کرم کی مجھ پہ نظر ہو کہ شرمسار ہوں میں

بغیر پرسش اعمال بخش دے مجھ کو — کہ سر سے پاؤں تلک سخت داغدار ہوں میں

خدا ہی خیر کرے روز حشر لطفے انور — جہاں میں سب سے زیادہ گناہگار ہوں میں

شعر و شاعری کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے آپ کو تصنیفی ملکہ بھی عطا فرمایا تھا، چنانچہ کئی عمدہ کتب کے آپ مصنف و مؤلف ہیں۔

۱۔ سیرت پیغمبر اعظم صلی اللہ علیہ وسلم۔ ۲۔ تجلیات عثمانی بڑے سائز کے ۱۲۰ صفحات پر مشتمل علامہ شبیر احمد عثمانی کی علمی سوانح ہے۔ ۳۔ حیات عثمانی۔ ۴۔ انوار عثمانی، علامہ عثمانی کے علمی مذہبی سیاسی اور نجی خطوط کا مجموعہ ہے۔ ۵۔ خطبات عثمانی، نظریۂ پاکستان سے متعلق علامہ عثمانی کے نایاب خطبات کا مجموعہ ہے۔ ۶۔ حیات امداد، حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی قدس سرہٗ کی سوانح ہے۔ ۷۔ انوار قاسمی ۶۰۰ چھ سو صفحات حضرت مولانا قاسم نانوتویؒ کی سوانح ہے۔ ۸۔ انوار النجوم حضرت نانوتویؒ کے فارسی مکتوبات کا ترجمہ ہے۔ ۹۔ قاسم العلوم حضرت نانوتویؒ کے فارسی اردو مکتوبات کا ایک دوسرا مجموعہ ہے۔ ۱۰۔ سیرت یعقوب و مملوک، دارالعلوم دیوبند کے سب سے پہلے صدر مدرس مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتویؒ اور ان کے والد استاذ العلماء مولانا مملوک علی صاحب کے حالات زندگی پر مشتمل ہے۔ ۱۱۔ یادگار ذوالفقار، حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ کے والد بزرگوار مولانا ذوالفقار علی کی علمی سوانح ہے۔

۱۲۔ انوار الشہادۃ، یہ امام ابو اسحاق اسفرائینی کی کتاب، نور العینین فی مشہد الحسین کا اردو ترجمہ ہے۔ ۱۳۔ روح رمضان، وغیرہ۔ رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃ واسعۃ۔

(۹) مولانا سید حسن صاحب رحمہ اللہ

مجاز صحبت حضرت حکیم الامت تھانویؒ وسابق استاذ دارالعلوم دیوبند

آپ مفتی صاحب کے ہونہار تلمیذ اور بھانجے بھی ہیں، ۱۳۲۴ھ میں دیوبند میں پیدا ہوئے تعلیم آخر دارالعلوم دیوبند کے ممتاز علماء و فضلاء سے تعلیم حاصل کر کے دستار فضیلت حاصل کی آپ کے والد محترم مولانا نبیہ حسن صاحب جن کا شمار دارالعلوم دیوبند کے ممتاز قدیم اساتذہ میں ہوتا تھا آپ کی نوعمری ہی میں وفات پا گئے اور گھر کی تمام ذمہ داریاں آپ کے ناتواں کندھوں پر آپڑیں لیکن ناموافق حالات میں بھی آپ نے اپنا تعلیمی سلسلہ جاری رکھا۔ فراغت کے بعد ۱۳۵۷ھ میں مادر علمی ہی میں بحیثیت مدرس فارسی آپ کا

تقرر ہوا، تیرہ سال بعد ۱۳۰۲ھ میں درجات عربی کے اسباق آپکے سپرد کئے گئے، آپ تاحیات یہ خدمت انجام دیتے رہے، اس طرح اپنے والد محترم کی طرح دارالعلوم دیوبند میں تقریباً پچیس سال تک درس دینے کی سعادت آپ کو حاصل ہوئی، زمانہ طالب علمی ہی میں حضرت مفتی صاحبؒ کے ذریعہ حضرت حکیم الامت تھانوی قدس سرہٗ سے تعلق قائم ہوا۔ بعد میں یہ تعلق اس قدر قوی ہوا کہ حضرت کے مجاز صحبت بننے کا شرف حاصل ہوا، آپنے ہر مجلس ہر نشست اور درس و وعظ میں اپنے شیخ کامل کے علمی و روحانی فیوض و برکات کو طالبان حق تک پہنچانا اپنا مقصد حیات بنا رکھا تھا اسی تعلق کا نتیجہ تھا کہ حضرت تھانویؒ بھی آپ پر بے حد شفقت فرماتے تھے اور آپ کو "بیٹا" کہہ کر پکارتے تھے، ۲۲ جمادی الاولیٰ ۱۳۸۱ھ تقریباً ۷۴ سال کی عمر میں دار فانی سے کوچ فرما گئے، آپ کی تالیفات میں سے صرف "المصباح المنیر فی ایضاح نحومیر" ہی کا علم ہو سکا، یہ علم نحو کی مشہور کتاب نحومیر کی اردو شرح ہے۔ نہایت مفید ہونے کے ساتھ اہم نکات پر مشتمل ہے؛

(۱۰) حضرت مولانا مفتی رشید احمد صاحب لدھیانوی
بانی و مہتمم اشرف المدارس کراچی

آپ پاکستان کے ممتاز عالم دین، مفتی، حضرت شاہ عبدالغنی پھولپوریؒ کے مجاز بیعت اور اشرف المدارس کراچی کے بانی و مہتمم ہیں، آپ کی ولادت ۲ر صفر ۱۳۴۱ھ مطابق ۲۶ ستمبر ۱۹۲۲ء بروز سہ شنبہ ضلع ملتان خانیوال کے ایک گاؤں "کوٹ اشرف" میں ہوئی، آپ کا تاریخی نام "مسعود اختر" ہے۔ یہ نام پندرہ سال کی عمر میں آپ نے خود تجویز فرمایا، آپ کے والد محترم مولانا محمد سلیم صاحب مدظلہٗ کا وطن اصلی "لدھیانہ" ہے، اسی نسبت سے آپ کو بھی "لدھیانوی" کہا جاتا ہے۔

پنجاب و سندھ میں تعلیم حاصل کی خاص طور سے اپنے بڑے بھائی مولانا خلیل صاحب اور بہنوئی مولانا محمد محمود صاحب سے استفادہ کیا، ۱۳۵۹ھ میں معقولات کی مشہور درس گاہ "انھی" میں مولانا ولی اللہ صاحب سے فنون کی اعلیٰ کتب پڑھیں، شوال ۱۳۶۰ھ میں دورۂ حدیث پڑھنے کے لیے دارالعلوم دیوبند تشریف لے گئے، اور ۱۳۶۱ھ میں فراغت حاصل کی، اور حضرت مدنیؒ شیخ الادبؒ مولانا بلیاویؒ، حضرت مفتی صاحبؒ، مولانا کاندھلویؒ، مولانا عبدالحق نافعؒ، مولانا ظہور احمد صاحب اور مفتی ریاض الدین صاحب رحمہم اللہ سے شرف تلمذ حاصل کیا، حضرت مفتی صاحبؒ سے آپ نے طحاوی شریف پڑھی، دیوبند میں آپ نے ہر فن

اساتذہ سے "بنوٹ" کا فن بھی سیکھا،

فراغت کے بعد ۱۳۶۲ھ میں مدرسہ مدینۃ العلوم بھینڈو حیدرآباد سندھ میں بحیثیت مدرس درجہ علیا آپکا تقرر ہوا بعد میں آپ اسی مدرسہ میں شیخ الحدیث، صدر مدرس اور مفتی بھی رہے ۔ ۱۳۷۰ھ تا ۱۳۷۶ھ مدرسہ ٹنڈو اللہ یار میں شیخ الحدیث اور مفتی رہے، پھر شوال ۱۳۷۶ھ تا ۱۳۸۲ھ دار العلوم کراچی میں بخاری شریف سمیت دورۂ حدیث کی دوسری کتب پڑھانے کا شرف حاصل رہا۔ رمضان ۱۳۸۲ھ میں اپنے شیخ اور حضرت تھانویؒ کے خلیفۂ خاص حضرت شاہ عبد الغنی رحمہ اللہ کے مشورہ سے ناظم آباد کراچی میں "اشرف المدارس" کی بنیاد ڈالی، اور آجکل بھی وہیں خدمات انجام دے رہے ہیں۔ اس مدرسہ میں فارغ التحصیل ذی استعداد طلبا کو فتاوٰی کی مشق کرائی جاتی ہے اور ملک اور بیرون ملک سے آنے والے فتاوٰی کے جوابات روانہ کئے جاتے ہیں، آپ کو دار العلوم کراچی اور دوسرے دینی مدارس میں تقریباً بیس مرتبہ بخاری شریف پڑھانے کی سعادت حاصل ہوئی۔

آپ متعدد علمی کتب و رسائل کے مؤلف ہیں خاص طور سے چند تصنیفات اہم ہیں۔

۱۔ احسن الفتاوٰی، یہ آپ کے فتاوٰی کا مجموعہ ہے کئی ضخیم جلدوں پر مشتمل ہے ۔ ۲۔ ارشاد القاری الی صحیح البخاری، یہ آپ کے دروس بخاری کی تقاریر کا مجموعہ ہے ۔ ۳۔ تسہیل المیراث ۔ ۴۔ معجم العلوم والکتب والمصنفین ۵۔ ارشاد السبیل الی انوار التنزیل ۔ ۶۔ التحریر الفرید فی ترکیب کلمۃ التوحید ۔ ۷۔ فضائل جہاد، ان کے علاوہ بھی آپ مختلف کتب و رسائل کے مؤلف ہیں، آپ کی مفصل سوانح عمری "تذکرۃ الرشید" کے نام سے زیر ترتیب ہے۔

(۱۱) مولانا مفتی سیاح الدین صاحب مدظلہم

رکن اسلامی نظریاتی کونسل

آپ کا پورا نام سیاح الدین بن محمد سعد گل ہے۔ آپ ذی استعداد و باصلاحیت عالم و مفتی ہونے کے ساتھ اسلامی نظریاتی کونسل پاکستان کے رکن اور مدرسہ عربیہ اشاعت العلوم فیصل آباد کے صدر مدرس اور استاذ حدیث ہیں۔ ۸ شوال ۱۳۳۴ھ مطابق جولائی ۱۹۱۶ء کو پشاور کے قصبہ زیارت کاکا صاحب تحصیل نوشہرہ میں پیدا ہوئے۔ درس نظامی کی تقریباً نصف تعلیم اپنے وقت کے ممتاز علماء و فضلاء سے اپنے وطن میں حاصل کی، ۱ شوال ۱۳۵۲ھ کو دار العلوم دیوبند پہنچے، چار سال بعد ۱۳۵۶ھ میں فراغت حاصل کی۔ آپ نے حضرت مفتی صاحب قدس سرہٗ سے ابو داؤد جلد ثانی اور موطا امام مالک پڑھ کر شرف تلمذ حاصل کیا۔ حضرت مفتی صاحب

قدس سرہٗ کے علاوہ آپ کے اساتذہ میں مذکورہ ابتدائی طلاب داخل ہیں شیخ الاسلام حضرت مدنیؒ، شیخ الادبؒ،
مولانا بلیاویؒ، مولانا سید اصغر حسین صاحبؒ، مولانا قاری محمد طیب صاحب، مولانا عبدالسلام صاحب خلیفہ
حضرت تھانویؒ، مولانا محمد نافع صاحبؒ، مولانا قیاس گل صاحب، مولانا سعد اللہ صاحب اور علامہ شمس الحق
صاحب افغانی، وغیرہم۔

دورۂ حدیث میں ۱۸۵ طلباء کی جماعت میں امتحان سہ ماہی، ششماہی، اور سالانہ امتحان میں اول آگئے۔
سالانہ امتحان میں آپ کا اوسط ۵۲ سے زائد تھا اور کسی کتاب میں ۵۲ سے کم نمبر نہ تھے یہ ایک ریکارڈ ہے
جو غالباً اب تک باقی ہے، حضرت مدنیؒ سے "نول الجمود" مکمل اور دوسری عمدہ کتب انعام میں ملیں۔

فراغت کے بعد جولائی ۱۹۳۸ء تا ۱۹۴۲ء شکر درہ ضلع کوہاٹ کے ایک مدرسہ میں مدرس رہے پھر
مولانا محمد احمد بگویؒ امیر جمعیت حزب الانصار کی دعوت پر دارالعلوم عزیزیہ بھیرہ ضلع سرگودھا آگئے،
جہاں ۳۰ نومبر ۱۹۴۶ء تک درجۂ علیا کے مدرس، مفتی اور رسالہ "شمس الاسلام" کے مدیر رہے، اسی دوران ۱۳۶۲ھ
مطابق مارچ ۱۹۴۳ء میں دارالعلوم دیوبند میں نظریاتی بحران پیدا ہوا اور علامہ عثمانیؒ مفتی اعظم پاکستان اور دوسرے
اجلّ اساتذہ نے مدرسہ سے علیحدگی اختیار کی تو مادر علمی میں اساتذہ کی فوری ضرورت پیش آئی، حضرت قاری
محمد طیب صاحب مدظلہم کی دعوت پر مدرسہ ہٰذا سے عارضی چھٹی لے کر دارالعلوم دیوبند پہنچے، اور آخر سال تک
تقریباً چھ ماہ درجہ علیا کی کتب پڑھانے کی سعادت آپ کو حاصل رہی، چونکہ عارضی تقرر تھا اس لیے اختتام
سال پر آپ دوبارہ بھیرہ واپس آگئے، یکم دسمبر ۱۹۴۶ء کو مدرسہ اشاعت العلوم فیصل آباد (لائلپور) میں
بحیثیت مدرس و مفتی آپ کا تقرر ہوا۔ یہاں پہنچ کر شیخ الادبؒ کو آپ نے اپنے یہاں آنے کی اطلاع دی تو
شیخ الادب نے جواباً تحریر فرمایا "اہل علم ثوابت ہوتے ہیں سیار نہیں خیر آپ اب یہاں آگئے ہیں تو مستقل

جم کر رہیئے" آپ نے اپنے استاذ محترم کی نصیحت پر عمل کیا چنانچہ اب تک یہیں خدمات انجام دے رہے
ہیں، اس مدرسہ میں ابتداء تا آخر بخاری و ترمذی سمیت آپ کو ہر چھوٹی بڑی کتاب پڑھانے کا موقعہ ملا، ۱۹۷۷ء
میں عبوری حکومت نے آپ کو "اسلامی نظریاتی کونسل" کا رکن نامزد کیا جس میں آپ تمام تدوین قانون اسلامی کی
خدمات انجام دے رہے ہیں۔ آپ ایک اچھے ادیب بھی ہیں، مختلف علمی رسائل و ماہناموں میں آپ کے علمی
ادبی، اور تاریخی مضامین شائع ہوتے رہتے ہیں، آپ کے فتاویٰ کو فقہی ترتیب پر مرتب کر کے شائع کیا جا رہا ہے
آپ "صولۃ الغزاۃ علی الروافض الغلاۃ" اور "تذکرۂ شیخ رحمکاریؒ" کتب کے مؤلف بھی ہیں۔

(۱۲) مولانا سید بادشاہ گل صاحب مدظلہم

شیخ الحدیث و مہتمم جامعہ اسلامیہ اکوڑہ خٹک پشاور

آپ فاضل دیوبند صوبۂ سرحد کے ممتاز معروف اور مستند عالم ہیں۔

ملہ صفر ۱۳۳۲ھ مطابق ۱۹۱۴ء بروز جمعہ اکوڑہ خٹک میں آپ کی ولادت ہوئی، ابتدائی تعلیم اپنے والد مولانا سید مہربان علی شاہ بن سید حبیب شاہ بخاری سے حاصل کی، پھر مختلف علماء سے استفادہ کرنے کے بعد مولانا عبدالمنان صاحب فاضل دیوبند سے فنون کی تمام کتب پڑھیں بعدازاں ۱۳۵۶ھ میں دیوبند پہنچے اور ۱۳۵۷ھ میں بخاری و ترمذی حضرت مدنیؒ سے مسلم شریف مولانا بلیاویؒ سے، ابوداؤد حضرت میاں صاحب سے، مؤطا امام مالک مفتی اعظم پاکستان سے اور طحاوی شریف علامہ شمس الحق افغانی سے پڑھ کر سندِ فراغ، حاصل کی، آپ کے والد اکوڑہ کی مسجد میں درس دیا کرتے تھے، فراغت کے بعد جب آپ وطن تشریف لائے تو آپ نے اس کو ایک باقاعدہ مدرسہ کی شکل دی اور اپنی زمین پر "مدرسہ اسلامیہ" کی بنیاد رکھی، آج یہ پاکستان کی معروف دینی درسگاہ ہے جہاں آپ شیخ الحدیث ہیں، آپ اولاً اپنے والد صاحب سے بیعت ہوئے۔ انہوں نے آپ کو سلسلۂ قادریہ نقشبندیہ میں خلافت دی، ان کی وفات کے بعد شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنیؒ قدس سرہٗ سے تجدید بیعت کی اور خوب کسب فیض کیا،

آپ مضبوط علمی استعداد کے ساتھ عمدہ ذوق تصنیف کے مالک اور متعدد کتب کے مصنف و مؤلف ہیں ا۔فیوضات حسینیہ۔ ۲۔ دعوۃ الحق۔ ۳۔ زیارۃ القبور۔ ۴۔ کتاب الوسیلۃ۔ ۵۔ اعفاء اللحیٰ من سنن النبی المصطفیٰ۔ ۶۔ تفسیر قرآن حکیم (پشتو)۔ ۷۔ درس البخاری (پشتو)۔ ۸۔ قواعد ترجمۃ القرآن۔ ۹۔ وضاحۃ النحو شرح ھدایۃ النحو۔ ۱۰۔ شرح ایساغوجی۔ ۱۱۔ کافیہ کی مکمل ترکیب۔ ۱۲۔ زاد الذاکرین۔ ۱۳۔ ارشاد السالک الی کلام المالک۔ ۱۴۔ حمد المتعال علی تراجم صحیح البخاری (عربی) ان کے علاوہ آپ جامع ترمذی کی بھی شرح لکھ رہے ہیں جس کے تین سو سے زائد صفحات ہو چکے ہیں۔

(۱۳) مولانا لطافت الرحمٰن صاحب سواتی

انچارج فقہ و قانون جامعہ اسلامیہ بہاولپور

آپ ممتاز عالم دین، اونچے درجے کے مصنف و مؤلف، اور باذوق ادیب ہونے کے ساتھ بہترین شاعر

بھی ہیں، نیز جامعہ اسلامیہ بہاولپور کے انچارج فقہ و قانون ہیں، ولادت ۱۹۲۸ء میں ضلع سوات میں ہوئی ابتدائی تعلیم اپنے والد مولانا قاضی فضل مولیٰ صاحب اور مولانا مفتاح الدین صاحب سے حاصل کی، ۱۳۵۱ھ میں دارالعلوم دیوبند میں داخلہ لیا اور ۱۳۵۸ھ میں شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی قدس سرہٗ سے دورۂ حدیث پڑھ کر سند فراغ حاصل کی۔ امتیازی نمبرات سے کامیابی پر حضرت مدنیؒ سے ایک گھڑی اور بہت سی کتب انعام میں حاصل کیں۔ فراغت کے بعد مختلف مدارس میں تدریس کی، کچھ عرصہ دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک پشاور میں بھی استاذ رہے، ۱۳۵۲ھ میں پنجاب یونیورسٹی سے مولوی فاضل کا امتحان پاس کیا، ۲۹ اپریل ۱۹۶۷ء میں جامعہ اسلامیہ بہاولپور میں تدریس پر مامور ہوئے، اور آجکل بھی یہیں انچارج فقہ و قانون کی حیثیت سے خدمات انجام دے رہے ہیں، مولانا محمد موسیٰ صاحب استاذ حدیث جامعہ اشرفیہ جو متعدد اعلیٰ کتب کے مصنف ہیں آپ کے تلمیذ خاص ہیں آپ ایک اچھے شاعر بھی ہیں عربی ادب میں بیحد مہارت رکھتے ہیں آپ کا عربی کلام نہایت وقیع ہوتا ہے، بطور نمونہ چند اشعار تحریر ہیں۔ جو آپ نے حضرت بنوریؒ کی وفات پر کہے۔

؎ بفینا بالقضاء من القدیر — الٰہ الخلق علّام خبیر

بفوت العالم النحریر مولیً — ادیب فاضل حبر کبیر

بموت الشیخ یوسف من ٭ بنور — نظیف البشرہ الصافی الضمیر

فوا اسفاً بیوسف فات منّا — وحمل للثراء علی السریر

وان شئنا بکاء دم علیہ — بکیناہ علی خطب کبیر

شاعری کے ساتھ تصنیف و تالیف کا بھی اعلیٰ ملکہ آپ کو حاصل ہے، چند تالیفات یہ ہیں۔

۱۔ ترجمہ فتاویٰ رشیدیہ (پشتو) ۲۔ اشرف المقال فی مسئلہ رویۃ الهلال ۳۔ درس التوحید ۴۔ رجال التوحید ۵۔ منظوم کلام وغیرہ ان کے علاوہ پاکستان کے بیشتر دینی و علمی ماہناموں میں آپ کے وقیع مضامین شائع ہوتے رہتے ہیں۔

(۱۴۱) مولانا سید نور الحسن بخاری

فاضل دیوبند

آپ فاضل دیوبند متعدد علمی تاریخی اور ادبی کتب کے مصنف و مؤلف تنظیم اہل سنت کے ممتاز رکن اور پاکستان کے ممتاز علماء میں سے ہیں، آپ جہاں ایک آتش نوا خطیب ہیں وہاں ایک بہترین ادیب

شاعر اور صحافی بھی ہیں، پورا نام سید نور الحسن بخاری ابن حضرت سید شاہ محمد شاہ، وطن اصلی ڈیرہ غازیخان پنجاب ہے، تاریخ ولادت ۱۰ر جنوری ۱۹۱۱ء ہے، انگریزی تعلیم حاصل کرنے کے بعد سکول ماسٹر ہوئے۔

۱۹۲۸ء میں لاہور میں ایک جلسہ میں حضرت کشمیریؒ، شیخ الاسلام حضرت مدنیؒ سے شرف ملاقات نصیب ہوا، بزرگوں سے تعلقات کی ابتداء ہوئی، پھر یہ تعلق اس قدر قوی ہوا کہ قاری محمد طیب صاحب مدظلہم مہتمم دارالعلوم دیوبند اور مولانا سید معظم علی شاہ صاحب کو دولت خانہ پر ایک تبلیغی جلسہ میں شرکت کی دعوت دی جسے شرف قبولیت بخشا گیا، یہ امر تعلقات کی مزید پختگی اور دارالعلوم دیوبند کی طرف توجہ کا سبب بنا، چنانچہ ۱۳۵۵ھ میں ملازمت سے رخصت لے کر دارالعلوم دیوبند پہنچے، حضرت قاری محمد طیب صاحب مدظلہم نے آپکی ابتدائی تعلیم کے لیے ممتاز طلباء دارالعلوم کو مقرر فرمایا، آپ نے بہت جلد ابتدائی تعلیم مکمل کرلی، موقوف علیہ میں مشکوٰۃ شریف میں اول آئے، ۱۳۵۷ھ کے دورہ حدیث میں شریک ہو گئے، صحیح بخاری اور ترمذی شیخ الاسلام حضرت مدنیؒ سے صحیح مسلم مولانا بلیاویؒ سے اور ابوداؤد شریف حضرت مفتی صاحبؒ سے پڑھ کر دستار فضیلت حاصل کی۔

فراغت کے بعد ۱۹۴۵ء میں تنظیم اہل سنت کی تشکیل عمل میں آئی اس وقت سے آج تک اس کے تبلیغی کاموں میں آپ بھی سرگرم عمل ہیں، حضرت مفتی صاحبؒ کو آپ سے بے حد تعلق تھا، ایک دفعہ آپ کراچی تشریف لائے تو حضرت مفتی صاحبؒ نے دارالعلوم میں تقریر کی دعوت دی اور خود باوجود علالت و نقاہت کے پوری تقریر میں تشریف فرما رہے، آپ کو بھی ہمیشہ حضرت مفتی صاحبؒ سے قلبی تعلق اور عقیدت رہی، اب بھی آپ حضرت مفتی صاحبؒ کے تبحر علمی کے بے حد قائل اور تفہیم و انداز تدریس کے عاشق ہیں، ہمارے ایک سوال کے جواب میں آپ تحریر فرماتے ہیں "آپ ان کے انداز تدریس کے متعلق دریافت فرماتے ہیں میں حیران ہوں کہ اس کا کیا جواب عرض کروں، اگر آپ کر سکیں تو ۵۸ھ کو واپس لوٹا لائیں پھر دارالعلوم کا دارالحدیث ہو اس میں حضرت مفتی صاحب علیہ الرحمۃ ابوداؤد کا سبق پڑھاتے علوم و معارف کے دریا بہائے ہوں اور میں آپ سے عرض کر سکوں کہ دیکھ لیجئے یہ ہے ہمارے اکابر کا انداز تدریس"

تصنیف و تالیف کا ذوق اور شغل اپنے اکابر سے ورثہ میں ملا، چنانچہ آپ دو درجن سے زائد علمی ادبی اور تاریخی کتب کے مؤلف ہیں، چند کے اسماء خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

۱۔ الاصحاب فی الکتاب ۰ ۳۰ ۱۹۵ء میں جب آپ سیفٹی ایکٹ کے تحت پابند سلاسل کر دیے گئے۔ تو لاہور اور منٹگمری جیل کی آہنی سلاخوں کے پیچھے آپ نے یہ کتاب تالیف فرمائی جو چھ سو سے زائد صفحات پر مشتمل ہے۔ ۲۔ سیرت امام مظلوم سیدنا عثمانؓ۔ ۳۔ شہادت امام مظلوم۔ ۴۔ توحید اور شرک کی حقیقت۔ ۵۔ حضرت امیر معاویہؓ۔ ۶۔ عادلانہ دفاع۔ ۷۔ نبی و صدیق۔ ۸۔ بشریت النبی وغیرہ۔ آج کل آپ ملتان میں مقیم ہیں۔ متعنا اللہ بفیوضہ ۔

(۱۵) مولانا قاری عبدالعزیز شوقی انبالوی

سابق صدر مدرس دارالعلوم الاسلامیہ، لاہور

آپ فاضل دیوبند فاضل پنجاب یونیورسٹی، علم تجوید و قراءۃ کے ماہر اردو عربی فارسی کے اصلی ادیب ہونے کے ساتھ ساتھ شاعر بھی تھے، انبالہ میں ولادت ہوئی، قرآن حکیم حفظ کرنے کے بعد ابتدائی تعلیم و تربیت خانقاہ امدادیہ تھانہ بھون میں ہوئی، اس کے بعد درس نظامی کی متوسط کتب مظاہر العلوم سہارنپور میں پڑھیں، اس کے بعد تکمیل کے لیے دارالعلوم دیوبند تشریف لے گئے جہاں دوسرے اساتذہ کرام سے فیضیاب ہونے کے ساتھ قاری حفظ الرحمٰن صاحب سے فن تجوید و قراءۃ کی تعلیم بھی حاصل کی، حضرت مفتی حسن قدس سرہ کے علاوہ آپ کے اساتذہ میں شیخ الاسلام حضرت مدنیؒ، حضرت میاں صاحبؒ، مولانا اسعد اللہ صاحب قاری محمد طیب صاحب مدظلہم اور علامہ افغانی خاص طور سے قابل ذکر ہیں آپ دارالعلوم کی عظیم الشان مسجد میں امامت کے فرائض بھی انجام دیتے رہے، حضرت تھانویؒ کے مخصوص مریدین میں سے تھے تقسیم کے بعد پاکستان تشریف لائے اور ریڈیو پاکستان راولپنڈی سے منسلک ہو گئے، اس کے بعد آپ لاہور آ گئے اور مسلم مسجد لوہاری گیٹ میں شیخ التجوید مقرر ہوئے۔ اسی دوران سہ روزہ (دعوت) کے ایڈیٹر بھی رہے، بعد ازاں دارالعلوم اسلامیہ لاہور کے صدر مدرس مقرر ہوئے، جہاں تقریباً پندرہ سال تک خدمات انجام دیں ۷ شعبان ۱۳۹۱ھ مطابق ستمبر ۱۹۷۱ء بروز جمعرات صبح سوا گیارہ بجے آپ دار فانی سے رحلت فرما گئے۔ آخری عمر میں گلے کے سرطان میں مبتلا رہے۔ تغمدہ اللہ بغفرانہ ۔

(۱۶) مولانا قاضی مقدار الدین صاحب شاکر پشاوری

خطیب شہری مسجد پشاور (صدر)

آپ کا مکمل نام مقدار الدین ابن انصار الدین ہے، ۱۹۲۲ء میں نوشہرہ پشاور میں پیدا ہوئے ابتدائی تعلیم اپنے نانا قاضی عصمت اللہ صاحب اور مولانا سعد اللہ صاحب سے حاصل کی، ۲۸ شوال ۵۹ھ میں دارالعلوم دیوبند میں داخلہ لیا اور چھ سال بعد ۱۹۴۲ء میں حضرت مدنی سے دورۂ حدیث پڑھ کر دستار فضیلت حاصل ۱۹۴۴ء میں پنجاب یونیورسٹی سے مولوی فاضل کا امتحان پاس کیا تعلیم سے فراغت کے بعد ندوۃ المصنفین دہلی میں کام کیا پھر انجمن خادمانِ اسلام جالندھر کے قائم کردہ ایک کالج اور چار ہائی سکولوں کے ناظم تعلیمات رہے۔ تقسیم ملک کے بعد سے پشاور میں ناصر خان کی مسجد پھوڑ گراں میں امام اور سنہری مسجد صدر کے خطیب ہیں۔ پشاور کی مختلف مساجد میں آپ کا درس قرآن بھی ہوتا ہے۔ آپ ایک اچھے شاعر ہیں، خاص طور سے قطعات تاریخ لکھنے میں ماہر ہیں حضرت تھانویؒ کے مریدین میں سے ہیں، تصنیفی ذوق بھی رکھتے ہیں۔ آپ کی چند تالیفات یہ ہیں۔

۱۔ کامل المذہب " جو " الکامل للمبرد " کی اُردو شرح ہے اور تین سو صفحات پر مشتمل ہے۔ اس پر علامہ عثمانی اور شیخ الادب کی تقریظات موجود ہیں، علامہ عثمانیؒ نے اپنے تقریظ کی آخر میں تحریر فرمایا ہے " الکامل داخل فی نصاب المدارس الھندیۃ وطلّابھا الھندیّون کانوا کثیر الاحتیاج إلی ترجمتہ بالھندیّہ وشرح غوامضہ فتکفّل بھذا اخونا العزیز مولوی مقدار الدین ووفی حقّہ " یعنی " الکامل ہندوستان کے عربی مدارس میں داخل نصاب ہے اور ہندوستانی طلباء کو اس کے اردو ترجمے اور مشکل الفاظ کی شرح کی ضرورت تھی، جسے ہمارے عزیز بھائی مولوی مقدار الدین نے اپنے ذمہ لیا اور اس کا حق ادا کر دیا؛ اور شیخ الادبؒ نے اپنی تقریظ کی آخر میں " لم أرَ لہ شبیہ ولا نظیرہ " کے الفاظ لکھ کر اس کتاب کی اہمیت اور قیمت بڑھا دی۔ ۲۔ برہان الاسلام، جو میٹرک کے طلباء کے لیے لکھی گئی۔ ۳۔ ہماری اُردو " بلئے جماعت ششم جسے بورڈ نے منظور کیا۔ ۴۔ قاعدہ تسہیل الفرقان۔ ۵۔ سفرنامہ حجاز ۱۹۶۰ء میں جب آپ کو حج کی سعادت نصیب ہوئی اس وقت آپ نے یہ کتاب لکھی، ان کے علاوہ آپ نے مولوی احمد صاحب کی دو کتابیں " جنت کی کنجی " اور " دوزخ کا کھٹکا " کی تخریج بھی کی ہے۔

(۱۷) مولانا عبدالحمید صاحب سواتی

بانی و مہتمم نصرۃ العلوم گوجرانوالہ

آپ ذی استعداد عالم دین بہترین مصنف، فاضل دیوبند، فاضل دار المبلغین لکھنو، نظامیہ طبیہ کالج حیدرآباد دکن بھارت کے مستند مدرسہ نصرۃ العلوم کے بانی و مہتمم اور مولانا سرفراز خان صاحب صفدر کے رفیق درس ہیں۔
۱۹۴۰-۴۱ء میں دار العلوم دیوبند میں دورۂ حدیث پڑھا، حضرت مدنیؒ، مولانا بلیاویؒ، شیخ الادب وغیرہم جیسے کبار اساتذہ سے شرف تلمذ حاصل کیا، اسی سال حضرت مفتی صاحبؒ سے طحاوی شریف پڑھ کر شرف تلمذ حاصل کیا، ۱۳۷۲ھ مطابق ۱۹۵۲ء فاروق گنج گوجرانوالہ میں مدرسہ عربیہ نصرۃ العلوم کی بنیاد ڈالی، جہاں اول تا آخر درس نظامی کی مکمل تعلیم دیجاتی ہے۔
متعدد کتب و رسائل آپ کے قلم سے نکلے ہیں جن میں سے چند لطور خاص قابل ذکر ہیں ۱۔ تراجم شرح فقہ اکبر ۲۔ الطاف القدس ۳۔ فیوضات حسینی وغیرہ اُن کے علاوہ متعدد کتب پر آپ نے جو تحقیقی کام انجام دیا ہے اُس نے تمام علمی حلقوں سے زبردست خراج تحسین وصول کیا ہے۔

(۱۸) مولانا قاضی عبدالکریم صاحب کلاچوی

صدر مدرس نجم المدارس کلاچی ڈیرہ اسمٰعیل خاں

۱۳۳۹ھ مطابق ۱۹۲۱ء بمقام کلاچی ڈیرہ اسماعیل خان آپ کی ولادت ہوئی آپ کے والد کا اسم گرامی قاضی نجم الدین تھا، قرآن مجید حفظ کرنے اور پرائمری کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد درس نظامی کی ابتدائی تعلیم حاصل کی پھر سراج العلوم سرگودھا اور خیر المدارس جالندھر میں درس نظامی کی موقوف علیہ کی تعلیم مکمل کی اور ۱۳۵۷ھ میں دار العلوم دیوبند میں دورۂ حدیث میں داخلہ لیا اور ۱۳۵۸ھ میں فارغ التحصیل ہوئے۔ بعد ازیں انجمن اسلامیہ فورٹ سنڈیمن بلوچستان کی جامع مسجد میں خطابت کی اور مدرسہ عربیہ میں تدریسی خدمات انجام دیں، وہاں سے مستعفی ہونے کے بعد مطلع العلوم کوئٹہ میں بطور صدر مدرس آپ کا تقرر ہوا جہاں آپ ایک سال تک رہے،
۱۹۴۱ء کو آپ کے والد قاضی نجم الدین صاحب نے مدرسہ عربیہ نجم المدارس کی بنیاد ڈالی جس کو آپ نے بے حد ترقی دی آجکل یہ مدرسہ وفاق المدارس العربیہ میں شامل ہے، آپ وہاں اہتمام کی ذمہ داری کے ساتھ کتب حدیث کا درس بھی دیتے ہیں، آپ حضرت مدنیؒ کے مریدین میں سے ہیں، اللہ تعالیٰ نے آپ کو علمی مہارت کے ساتھ تقریر و تحریر کا ملکہ بھی عطا فرمایا ہے چنانچہ آپ متعدد کتب و رسائل کے مؤلف ہیں۔ مثلاً ۱۔ نجم الاسلام ۲۔ التعلیقات علی المشکوٰۃ ۳۔ النجم الزاہر ۴۔ روح نماز، ۵۔ برگ سبز ۶۔ محبوب خدا کا پیام، وغیرہم نیز آپ کے علمی مضامین پاکستان کے معروف دینی ماہناموں یعنی "بینات" کراچی "الحق" پشاور "الصدیق" ملتان

اور خدام الدین لاہور میں بکثرت شائع ہوتے رہتے ہیں۔

(۱۹) حضرت مولانا قاری رعایت اللہ صاحب شاہجہانپوری مدظلہم

استاذ حدیث دار العلوم کراچی

قوی الاستعداد عالم علوم، قراءۃ و تجوید کے ماہر اور اعلیٰ درجہ کے مدرسین میں سے ہیں، آپ کی تفہیم پیش سے مشکل سے مشکل مسئلے کو اپنے عام فہم انداز تدریس سے سہل کر دیتے ہیں۔ نہایت پُر مزاح اور شگفتہ طبیعت کے مالک ہیں، یہی وجہ ہے کہ طلباء بے چینی اور اشتیاق کے ساتھ درس کا انتظار کرتے رہتے ہیں۔

آپ نے حضرت مفتی صاحبؒ سے دیو بند میں بخاری شریف پڑھی، فراغت کے بعد مختلف مدارس میں تدریسی خدمات انجام دیں۔ کچھ عرصے مدرسہ مظہر العلوم کھڈہ کراچی میں بھی استاذ رہے۔ دار العلوم کراچی کے قیام کے دو ایک سال بعد دار العلوم تشریف لائے ابتداءً متوسط درجات کے اسباق آپ کے سپرد کئے گئے، کچھ ہی عرصہ بعد درجۂ علیا کے مدرسین میں شامل کئے گئے۔ اب سالہا سال سے مدرسہ ہذا میں ابو داؤد شریف کا درس دے رہے ہیں، آپ ایک طویل عرصے تک دار العلوم کے ناظم اعلیٰ بھی رہے، آج کل دار العلوم کی مجلس شوریٰ کے سیکرٹری ہیں، دار العلوم کے بیشتر اساتذہ آپ کے تلمیذ ہیں۔ "تحقیق التراویح" آپ ہی کی تالیف ہے جو اپنے موضوع پر ایک بہترین کتاب ہے۔

(۲۰) مولانا عبد الرحمٰن مردانی

سابق شیخ الحدیث دار العلوم تعلیم القرآن پنڈی

۱۹۱۲ء میں آپ مینئی تحصیل صوابی ضلع مردان میں مولوی سید امیر ابن سربلند کے ہاں پیدا ہوئے۔ دورۂ حدیث کی تکمیل ۱۳۵۸ھ مطابق ۱۹۳۹ء میں دار العلوم دیوبند میں حضرت مدنیؒ سے کی، فراغت کے بعد ہند و پاک کے مختلف مدارس میں درس دیتے رہے، آخری زمانے میں دار العلوم تعلیم القرآن پنڈی میں شیخ الحدیث رہے، ۵ مارچ ۱۹۷۵ء میں دار فانی سے رحلت فرما گئے۔ تصانیف۔

۱۔ جواہر الاصول فی اصول الحدیث (عربی)۔ ۲۔ الکوثر الجاری علی ریاض البخاری حصہ اول۔ ۳۔ رسالہ فیضان الباری۔

(۲۱) مولانا غلام محمد صاحب دامت برکاتہم

استاذ تفسیر و حدیث دار العلوم کراچی

آپ ذی استعداد عالم ذہن بہترین خطیب اور دارالعلوم کراچی کے کبار اساتذہ میں سے ہیں۔ حدیث وتفسیر سے خاص لگاؤ رکھتے ہیں۔ ۱۹۱۹ء میں جالندھر سلالہ بھارت میں پیدا ہوئے، آپ کے والد کا اسم گرامی میاں جمال الدین تھا، اپنے علاقہ میں اسکول کی آٹھ جماعتیں پاس کیں اور فارسی عربی کی ابتدائی کتب پڑھیں ایک مرتبہ قاری محمد طیب صاحب مدظلہم کی عالمانہ تقریر سنی تو دیوبند جانے کا شوق ہوا۔ علم کی کشش بے شمار تشنگان کی طرح آپ کو بھی دیوبند کھینچ لائی ۱۹۴۳ء کو دارالعلوم دیوبند میں داخلہ لیا اور ۱۹۴۶ء میں فراغت حاصل کی، حضرت مفتی صاحبؒ سے آپ نے خارجی اوقات میں بخاری شریف کا کچھ حصہ اور کلید مثنوی وغیرہ پڑھ کر زانوئے تلمذ طے کیا۔ پاکستان بننے کے بعد ۱۹۴۸ء میں جامعہ اشرفیہ لاہور میں بحیثیت مدرس عربی آپکا تقرر ہوا۔ یہاں تقریباً چھ سال تک آپ نے تدریسی فرائض انجام دیئے۔ اس کے بعد چند سال لائلپور میں خطابت کی پھر چھ سات سال ڈسکہ سیالکوٹ میں مدرسہ مدنیہ میں استاذ عربی رہے۔ یہاں آپ کو دورہ کے اسباق پڑھانے کی بھی سعادت حاصل ہوئی، ۱۹۶۵ء سے آپ دارالعلوم کراچی میں تدریسی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ بیچ میں صحت کی خرابی کی بناء پر دو تین سال پنجاب میں گذارنے کے بعد دوبارہ دارالعلوم آگئے آجکل موقوف علیہ، دورہ حدیث، اور دورہ تفسیر کے مختلف اسباق آپ کے سپرد ہیں، مولانا شمس الحق صاحب جلال آبادی استاذ حدیث دارالعلوم کراچی جو معقولات اور فنون میں خصوصی مہارت اور ملکہ رکھتے ہیں۔ آپ کے خاص شاگرد ہیں آپ کا اصلاحی تعلق شیخ الاسلام حضرت مدنیؒ سے قائم رہا اور بیعت کا شرف حاصل ہوا۔

(۲۲) مولانا حافظ نذیر احمد صاحب

شیخ الحدیث وصدر مدرس دارالعلوم ربانیہ

آپ ذی استعداد عالم دین ہیں، علم تفسیر وحدیث کا خاص ذوق رکھتے ہیں۔ دیندار علمی گھرانہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ ۱۳۳۹ھ میں تحصیل ٹوبہ ٹیک میں پیدا ہوئے تحصیل علم کے لیے مختلف مدارس پہنچے خاص طور سے جامعہ رشیدیہ جالندھر اور خیر المدارس جالندھر میں تعلیم حاصل کی۔ فراغت سے قبل آخری دو سال دارالعلوم دیوبند میں تعلیم حاصل کی، اور ۱۳۶۲ھ کے دورۂ حدیث میں حضرت مفتی صاحبؒ سے شرف تلمذ حاصل ہوا۔ یہ حضرت مفتی صاحب کا دیوبند کا آخری سال تھا، آپ کے اساتذہ میں شیخ الادب مولانا بلیاویؒ، مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلویؒ مفتی ریاض الدین صاحب مولانا فخر الحسن صاحب فتح پوری، مولانا نافع گل صاحب وغیرہم جیسے کبار اساتذہ شامل ہیں۔ حضرت مدنیؒ سے شرف تلمذ حاصل نہ ہوسکا چونکہ وہ اسیر قید فرنگ تھے ۱۳۶۲ھ تقریباً ۳۶ سال سے

تدریسی خدمات انجام دے رہے ہیں، ابتداء تا آخر مکمل درس نظامی پڑھانے کی سعادت آپ کو حاصل ہوئی ۔ دس سال سے شیخ الحدیث ہیں، آنکھوں سے معذوری کے باوجود قومی و ملی خدمات میں حتی الوسع حصہ لیتے رہتے ہیں۔

(۲۳) مولانا مفتی عبدالحکیم صاحب سکھروی

خلیفۂ ارشد حضرت مفتی صاحبؒ

آپ سندھ کے ممتاز عالم اور فاضل دیوبند ہیں، متعدد اصلاحی کتب و رسائل کے مؤلف و مصنف ہیں، حضرت مفتی صاحبؒ کے تلمیذ و مرید بھی ہیں اور خلیفہ بھی۔ اس وقت مدرسہ اشرفیہ سکھر کے مفتی اور صدر مدرس ہیں۔ تفصیلی حالات دستیاب نہ ہو سکے، آپ کی قابل ذکر تصانیف یہ ہیں: ۱۔ کیا مذاہب ہے؟ ۲۔ شان رسالت صلی اللہ علیہ وسلم ۳۔ علیکم بسنتی۔ ۴۔ آخری منزل۔ ۵۔ دین کی باتیں۔ ۶۔ دعا مانگنے کی فضیلت۔ ۷۔ مقبرہ ... ۸۔ ... ۹۔ رمضان المبارک ۹۔ رحمت کے خاص مستحق انسان۔ ۱۰۔ نصیحت برائے آخرت۔ ۱۱۔ جنت کے پھول اور دوزخ کے کھنٹے۔ ۱۲۔ مکہ مکرمہ ۱۳۔ مکہ مدینہ، اس کتاب پر آپ کے شیخ حضرت مفتی صاحبؒ کی تقریظ ثبت ہے، جس میں حضرت مفتی صاحبؒ تحریر فرماتے ہیں: بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ الحمد للہ وکفیٰ وسلام علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ۔ محترم مولانا عبدالحکیم صاحب کا تازہ رسالہ "مکہ مدینہ" مختلف مقامات سے پڑھوا کر سنا، ماشاء اللہ اختصار کے ساتھ بہت نافع و مفید اور عوام کے لیے بہت آسانی سے ضروری احکام حج و زیارت معلوم کرنے کا سامان ہے، اللہ تعالیٰ نے موصوف کو افادۂ خلق کے لیے موفق بنایا ہے، امید ہے کہ رسالہ بھی بہت نافع ہوگا۔ واللہ المستعان وعلیہ التکلان۔

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ ۱۱ر شعبان ۱۳۹۵ھ دارالعلوم کراچی۔

(۲۴) مولانا مفتی محمد عبدالمتین صاحب کشمیری

سابق مفتی و قاضی آزاد کشمیر

آپ ۲۰ر اپریل ۲۲ء میں تحصیل باغ پونچھ آزاد کشمیر میں پیدا ہوئے، مختلف مدارس میں کبار اساتذہ سے تعلیم حاصل کرنے کے بعد ۱۹۴۱۔۴۲ء کے دورۂ حدیث میں دارالعلوم دیوبند میں شریک ہوئے، حضرت مفتی صاحبؒ سے طحاوی شریف پڑھی، حضرت مفتی شیخ الادب، مولانا بلیاوی، مولانا عبدالحق نافع، مفتی ریاض الدینؒ، اور مولانا ادریس صاحب کاندھلویؒ سے بھی شرف تلمذ حاصل ہوا، مختلف مقامات پر تدریس و خطابت کے فرائض

انجام دینے کے بعد ایک عرصہ تک ضلع پونچھ کے مفتی اور قاضی رہے۔ آج کل ایک مدرسہ آپ کی نگرانی میں چل رہا ہے جہاں حفظ و تجوید کی تعلیم دی جاتی ہے۔

آپ حضرت مفتی صاحبؒ کے تفقہ انداز تفہیم و تدریس سے بےحد متاثر ہیں چنانچہ تحریر فرماتے ہیں: درس طحاوی شریف میں اپنے فقہ دانی اور عبارت آمیز سے جو بیان ہوتا تھا اس سے ایسا شرح صدر ہوتا تھا جس کا بیان قلم و زبان سے نہیں بلکہ مشاہدہ اور سماع سے تعلق رکھتا ہے:

(۲۵) مولانا مفتی عبداللطیف صاحب

مفتی و صدر مدرس دارالعلوم سرحد پشاور

آپ ۱۳۲۹ھ میں پشاور میں پیدا ہوئے اسم گرامی اور نسب یہ ہے، عبداللطیف بن الحاج گل امیر بن سیف میر بن نواب فتح (من قوم اعوان)۔ دورۂ حدیث کو چھوڑ کر اوّل تا آخر دارالعلوم رفیع الاسلام، پشاور میں تعلیم حاصل کی اور خاص طور سے مولانا سید محمد الزیب شاہ صاحب سے استفادہ کیا۔ شوال ۱۳۵۶ھ میں دورۂ حدیث پڑھنے کی نیت سے دارالعلوم پہنچے، امتحان داخلہ حضرت مفتی صاحبؒ نے لیا، بخاری و ترمذی جلد اوّل حضرت مدنیؒ سے ترمذی جلد ثانی شیخ الادب والفقہ سے پڑھی ابوداؤد کا کچھ حصہ حضرت میاں صاحبؒ نے پڑھایا اور ان کی کمزوری کے باعث اس کی تکمیل حضرت مفتی صاحبؒ نے کرائی۔ نیز موطا امام مالک بھی آپ نے حضرت مفتی صاحب ہی سے پڑھی۔ آپ کو دیوبند کی سند کے علاوہ حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنیؒ کی خاص سند بھی حاصل ہے

آپ آج کل دارالعلوم سرحد پشاور کے صدر مدرس اور مفتی ہیں۔

اپنی بے بضاعتی کم علمی اور وقت کی کمی کی بناء پر تلامذۂ دیوبند میں سے صرف ان چند جلیل القدر علماء کے حالات مبارکہ کو احاطہ تحریر میں لانے کے بعد بقیہ مشاہیر تلامذہ کے صرف اسماء تحریر کرنے پر اکتفا کیا جا رہا ہے ورنہ آپ کے صرف کبار تلامذہ کے مختصر تعارف کے لیے دفتر کے دفتر ناکافی ہیں چہ جائیکہ ان تمام کے تفصیلی حالات تحریر کئے جائیں۔

دامانِ نگہ تنگ و گلِ حسنِ تو بسیار
گلچینِ بہارِ تو ز داماں گلہ دارد

(۱) مولانا عبدالصمد صاحب صارم صاحب تصانیف کثیرہ۔

(۲) مولانا صدیق احمد صاحب صدر نظام اسلام پارٹی و شیخ الحدیث جامعہ اسلامیہ پٹیا چاٹگام بنگلہ دیش۔

(۳) مولانا مصلح الدین صاحب کشور گنج ضلع میمن سنگھ بنگلہ دیش،

(۴) مولانا عبدالقدوس صاحب صدر شعبہ عربی پشاور یونیورسٹی۔

(۵) مولانا مفتی محی الدین صاحب خلیفۂ حضرت مفتی صاحبؒ و استاذ حدیث مدرسہ اشرف العلوم ڈھاکہ بنگلہ دیش۔

(۶) قاضی زین العابدین صاحب میرٹھی مؤلف بیان اللسان،

(۷) مولانا امیر الزمان صاحب کشمیری مہتمم مدرسہ عربیہ قاسم العلوم نعمان پورہ باغ پونچھ آزاد کشمیر۔

(۸) مولانا عرض محمد صاحبؒ بانی مدرسہ مطلع العلوم بروری روڈ کوئٹہ بلوچستان۔

(۹) مولانا محمد یوسف صاحب مہتمم و شیخ الحدیث دارالعلوم پلندری آزاد کشمیر۔

(۱۰) مولانا معین الاسلام صاحب ہاٹ ہزاری۔

(۱۱) مولانا محمد اکبر صاحب باغ پونچھ

(۱۲) مولانا مشاہد علی صاحب بنگلہ دیش۔

یہ وہ حضرات علماء ہیں جن میں سے ہر ایک شخصیت اپنے اپنے مقام پر کامل اور علم و فضل اور تقویٰ میں خلق خدا کی مقتدا ہے۔ ع

وہ دریا کیسا ہوگا جس کے یہ قطرے سمندر ہیں

تلامذہ دارالعلوم کراچی

حضرت مفتی صاحبؒ سے دارالعلوم کراچی میں شرف تلمذ حاصل کرنے والوں کی تعداد بھی بہت کثیر ہے۔ قیام دارالعلوم سے حضرت رحمہ اللہ کے وصال تک کے بیشتر فضلائے دارالعلوم کو آپ سے بلاواسطہ کسب فیض کا موقع ملا ہے۔ لیکن ہم ان فضلاء میں سے صرف ان چند کبار علماء کا تذکرہ کریں گے جو اپنے تبحر علمی، درسی، تصنیفی اور دوسری دینی و ملکی خدمات کی بناء پر ممتاز علماء پاکستان میں شمار کئے جاتے ہیں۔

(۱) حضرت مولانا سبحان محمود صاحب مدظلہم
شیخ التفسیر والحدیث دارالعلوم کراچی۔

آپ حضرت مفتی صاحبؒ کے معتمد علیہ تلامذہ میں سے ہیں، اعلیٰ درجے کے مدرس اور قابل رشک حافظے کے مالک ہیں، اعلیٰ علمی استعداد کے ساتھ تفسیر حدیث اور فتاویٰ نویسی میں خاص امتیاز رکھتے ہیں، آٹھ دس سال سے دارالعلوم میں درس بخاری دے رہے ہیں۔ دورۂ تفسیر کا بھی ایک سبق آپ کے سپرد ہے۔ ایک طویل عرصہ سے دارالعلوم کورنگی کے ناظم ہیں۔

آپ کی ولادت ۱۳۴۵ھ میں ہوئی، ۱۳۵۵ھ میں حفظ قرآن سے فراغت حاصل کی، ۱۳۵۷ھ میں فارسی کی تعلیم مکمل کرکے درس نظامی کی کتب شروع کیں، ۱۳۶۴ھ میں مدرسہ مظاہر العلوم میں ہدایہ اولین میں داخلہ لیا اور یہیں موقوف علیہ بھی پڑھا، دورے کے سال ۱۳۶۶ھ میں ملک تقسیم ہوا اور اسلامی جمہوریہ پاکستان وجود میں آیا تاہم ان حالات کی وجہ سے پاکستان ہجرت کی، ۱۳۶۸ھ میں خیر المدارس ملتان میں مولانا خیر محمد صاحبؒ مولانا عبدالرحمان صاحب مفتی عبداللہ صاحب اور مولانا عبدالشکور صاحبؒ سے دورہ حدیث پڑھ کر فراغت حاصل کی، ۱۳۷۰ھ میں علامہ سید سلیمان ندوی کے ایک مدرسے میں بحیثیت صدر مدرس تقرر ہوا لیکن کچھ عرصے کے بعد آپ استعفیٰ دے کر ذیقعدہ ۱۳۷۱ھ میں دارالعلوم کراچی میں بحیثیت استاذ عربی تشریف لائے اس وقت دارالعلوم قائم ہوئے صرف ایک سال ہی گزرا تھا یہیں آپ نے حضرت مفتی صاحبؒ سے درمختار شرح عقود رسم المفتی پڑھی، دیگر علوم و فنون میں بھی استفادہ کیا۔ آپ کو مولانا عبدالرحمان صاحب کاملپوری اور شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب سہارنپوری مدظلہم سے کتب حدیث کی اجازت حاصل ہے، مولانا محمد رفیع صاحب مہتمم دارالعلوم اور مولانا محمد تقی صاحب و دیگر اساتذۂ دارالعلوم آپ کے شاگرد ہیں۔

(۲) حضرت مولانا مفتی محمد رفیع صاحب عثمانی

مہتمم و استاذ حدیث دارالعلوم کراچی

آپ حضرت مفتی صاحب نور اللہ مرقدہٗ کے قابل فرزند رشید دارالعلوم کراچی کے مہتمم، استاذ حدیث مفتی اور خطیب ہیں، متعدد مفید علمی کتب و رسائل کے مؤلف و مصنف ہیں، دارالعلوم کراچی کے ممتاز ترین فضلاء میں سے ہیں، فتاویٰ نویسی میں خاص مہارت اور امتیاز رکھتے ہیں اور اس میں حضرت مفتی صاحبؒ کے جانشین ہیں۔

شب جمعہ ۱/۲ یا ۲/۳ جمادی الاولیٰ ۱۳۵۵ھ میں بمقام دیوبند آپ کی ولادت ہوئی خوبی قسمت سے حضرت حکیم الامت تھانویؒ نے ایک مجمع میں آپ کا نام "محمد رفیع" تجویز فرمایا، "زبدہ خلائق محمد رفیع"

حسن اتفاق سے حضرت مفتی صاحبؒ کا سجع "برزۂ قیامت محمد شفیع" ہے دونوں مجمعوں کا وزن اور قافیہ برابر ہونے کی بناء پر شعر مکمل ہوگیا جو آپ کے حق میں فال نیک ہے۔

برزۂ قیامت محمد شفیع زجملہ غلاماں محمد رفیع

حضرت مفتی صاحبؒ سے قاعدہ بغدادی پڑھ کر پانچ سال کی عمر میں دارالعلوم دیوبند کے شعبۂ حفظ میں داخل ہوئے، پندرہ پارے حفظ کئے تھے کہ پاکستان آنا ہوگیا چنانچہ حفظ کی تکمیل کراچی میں ہوئی، ختم قرآن مفتی اعظم فلسطین الحاج امین الحسینیؒ نے کرایا، پھر دارالعلوم کراچی میں اردو فارسی کی ابتدائی تعلیم کے بعد ۱۳۷۰ھ مطابق ۱۹۵۱ء میں درس نظامی کی تعلیم کا باقاعدہ آغاز ہوا اور اپنے وقت کے ممتاز علماء و محدثین سے کسب علم کرنے کے بعد ۱۳۷۹ھ مطابق ۱۹۵۹ء میں فراغت حاصل کی، از زمانہ طالب علمی ہی میں ۱۹۵۸ء میں پنجاب یونیورسٹی سے مولوی عالم کا امتحان بھی پاس کیا، آپ کو حضرت مفتی صاحبؒ سے مندرجہ ذیل کتب درساً پڑھنے کی سعادت حاصل ہوئی، مثلاً: امام مالکؒ، شمائل ترمذی، رد مختار، شرح عقود رسم المفتی، نیز فراغت کے بعد حضرت مفتی صاحبؒ سے فتاویٰ نویسی کی مشق بھی کی اور آپ کی نگرانی میں ہزار سے زائد فتاویٰ تحریر فرمائے۔

آپ کو حضرت مفتی صاحب کے علاوہ علامہ ظفر احمد عثمانیؒ، مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلویؒ، شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب سہارنپوری، قاری محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند اور شیخ محمد حسن بن المشاط المالکی دامت برکاتہم جیسے اجلۂ علماء و محدثین سے بھی اجازت روایت حدیث حاصل ہے۔ دارالعلوم میں حضرت مفتی صاحبؒ کے علاوہ آپ کو ذیل کے ممتاز علماء سے کسب فیض کا موقع ملا: مولانا مفتی رشید احمد صاحب لدھیانوی بانی و مہتمم اشرف المدارس کراچی، مولانا سلیم اللہ خاں صاحب بانی و مہتمم جامعہ فاروقیہ کراچی، مولانا محمد اکبر علی صاحبؒ سابق استاذ حدیث و تفسیر دارالعلوم کراچی، و مظاہر العلوم سہارنپور، مولانا سبحان محمود صاحب شیخ الحدیث و ناظم دارالعلوم کورنگی، مولانا شمس الحق صاحب استاذ حدیث و نگران تعلیمات دارالعلوم کراچی۔ ۱۳۹۲ھ میں آپ کو نائب مفتی نامزد کیا گیا اور ۱۳۹۳ھ میں حضرت مفتی صاحبؒ نے آپ کو باقاعدہ سند افتاء عطا فرمائی۔ درس نظامی سے فراغت کے بعد آپ نے دارالعلوم ہی میں تدریسی سلسلہ بھی شروع کر دیا تھا، اب تقریباً دس سال سے آپ کو دورۂ حدیث کے اسباق پڑھانے کی سعادت حاصل ہے۔ اور اب بفضلہ تعالیٰ آپ کے تلامذہ بھی استاذ الاساتذہ ہو چکے ہیں۔

رجمادی الاولیٰ ۱۳۹۵ھ میں آپ نائب مفتی کے ساتھ دارالعلوم

کراچی کے نائب صدر نامزد کئے گئے ۔ اور اب حضرت مفتی صاحبؒ قدس سرہٗ کی وفات کے بعد سے دارالعلوم کراچی کے اہتمام کی تمام ذمہ داریاں آپ کے سپرد ہیں اور آپ ان ذمہ داریوں کو بطریق احسن حضرت مفتی صاحب قدس سرہٗ کے مزاج و مذاق کے مطابق انجام دے رہے ہیں اس سلسلہ میں حضرت کے نقوش قدم کو آپ نے اپنے لیے مشعل راہ بنا رکھا ہے ۔ واللہ الموفق والمعین ۔

یہ سب حضرت حکیم الامت تھانویؒ کے خلیفہ خاص عارف باللہ حضرت ڈاکٹر عبدالحی صاحب دامت برکاتہم العالیہ کی نیک صحبتوں اور مجالس کا فیض ہے کہ آپ نے اُن کا دامن تھام رکھا ہے ۔ آپ تقریباً آٹھ سال قبل حضرت مفتی صاحبؒ کے حکم سے اُن سے بیعت ہوئے ، جب سے باقاعدہ ان کی خدمت میں حاضری ہو رہی ہے اللہ پاک اس سلسلہ کو قائم و دائم رکھے ۔

آپ کی خوش نصیبی ہے آپ کو سفر و حضر میں بکثرت حضرت مفتی صاحبؒ کی خدمت میں رہنے اور طویل عرصے تک استفادہ کرنے کا موقعہ ملا ، افریقہ کے سفر اور رابطۂ عالم اسلامی کی کانفرنسوں میں حضرتؒ نے آپ کو اپنا رفیق سفر بنایا اگرچہ تدریس و افتاء اور اہتمام کی ذمہ داریوں کی بنا پر تصنیف و تالیف کی طرف توجہ دینے کا آپ کو بہت کم وقت مل سکا ۔ لیکن آپ کے علمی و تحقیقی ذوق نے اس کے باوجود مندرجہ ذیل گرانقدر تصانیف جملہ مصروفیات کے باوجود لکھوالیں ۔

۱ ۔ ترجمہ علم الصیغہ اردو ، ترجمہ کے علاوہ متعلقہ ضروری حواشی بھی ساتھ ہیں ، اس میں آپ نے علم صرف سے متعلق ایک بصیرت افروز مقدمہ بھی تحریر فرمایا ہے ۔ ۲ ۔ علامات قیامت اور نزول مسیح ۔ ۳ ۔ احکام زکوٰۃ ۴ ۔ پراویڈنٹ فنڈ پر سود اور زکوٰۃ کے مسائل ۔ ۵ ۔ حاشیہ شرح عقود رسم المفتی ۔ ۶ ۔ حاشیہ تسہیل الوصول (نامکمل) ۷ ۔ سوانح حضرت مفتی اعظمؒ جو امداد المفتیین کے ساتھ شائع ہو رہی ہے ۔ ۸ ۔ سوشلزم کا منظر و پس منظر ۹ ۔ پالیسی پینشن فنڈ پر سود اور زکوٰۃ کے مسائل ۔ ۱۰ ۔ اسلامی قانون میں طبی رپورٹ کی عدالتی حیثیت ۔ ۱۱ ۔ فقہ ، فتوی اور تصوف اپنے موضوع پر غالباً پہلی تالیف ہے ، ۱۲ ۔ تحریر و کتابت عہد رسالت میں ۱۳ ۔ فقہ میں اجماع کا مقام ۔ ۱۴ ۔ رفیق حج ۔ البلاغ میں بھی آپ کے مضامین اور اہم فتاوٰی بکثرت شائع ہوتے رہتے ہیں ۔

(۳) مولانا محمد تقی صاحب عثمانی دام اقبالہم

رکن اسلامی نظریاتی کونسل ، مدیر ماہنامہ البلاغ ، استاذ حدیث دارالعلوم کراچی

آپ حضرت مفتی صاحبؒ کے سب سے چھوٹے مایہ ناز فرزند اور ان کے علوم کے امین ہیں ، غیر معمولی ذہانت و

فطانت کے مالک ہیں، تحریر و تقریر کا اچھا ملکہ رکھنے کے ساتھ ساتھ بہترین ادیب اور شاعر بھی ہیں اس وقت پاکستان کی اسلامی نظریاتی کونسل کے ممتاز رکن، ماہنامہ البلاغ کے مدیر اعلیٰ، دارالعلوم کراچی کے نائب مہتمم استاذ حدیث، شعبہ تصنیف و تالیف کے نگران اعلیٰ، اور جامعۃ الملک عبدالعزیز مکہ مکرمہ کے زیر اہتمام ہونے والی پہلی عالمی اسلامی تعلیمی کانفرنس کے رکن ہیں۔

۵ شوال المکرم ۱۳۶۲ھ مطابق اکتوبر ۱۹۴۳ء بمقام دیوبند ضلع سہارنپور یو۔پی آپ کی ولادت ہوئی۔ دارالعلوم کراچی پاکستان میں اردو اور فارسی کی ابتدائی تعلیم کے بعد ۱۳۷۲ھ میں اسی دینی درس گاہ میں درس نظامی کی تعلیم کا آغاز کیا اور ہر درجہ میں امتیازی نمبرات سے کامیابی حاصل کرکے ۱۳۷۹ھ مطابق ۱۹۵۹ء میں فراغت حاصل کی، دورۂ حدیث میں دارالعلوم کراچی میں اول آکر امتیازی نمبرات سے کامیابی حاصل کی۔ اور ایک ریکارڈ قائم کیا جو اب تک باقی ہے، آپ کو حضرت مفتی صاحبؒ سے مؤطا امام مالک، شمائل ترمذی درمختار، شرح عقود رسم المفتی پڑھنے کی سعادت حاصل ہوئی، نیز دورۂ حدیث سے فراغت کے بعد فتاویٰ نویسی کی مشق بھی آپ نے حضرت مفتی صاحبؒ ہی سے کی اور ان کی زیر نگرانی سینکڑوں فتاویٰ تحریر فرمائے، فراغت سے ایک سال قبل ۱۹۵۸ء میں پنجاب یونیورسٹی سے فاضل عربی کا امتحان بھی امتیازی نمبرات سے پاس کیا۔

فراغت کے بعد درجۂ تخصص میں فتاویٰ کی مشق کے ساتھ تدریسی سلسلہ بھی شروع کیا جو تا حال جاری ہے عرصۂ دراز سے دورۂ حدیث کے مختلف اسباق آپ کے سپرد ہیں۔ ۱۹۶۴ء میں آپ نے کراچی یونیورسٹی سے بی۔ اے کا امتحان پاس کیا۔

محرم ۱۳۸۶ھ میں جب دارالعلوم کراچی کے ترجمان کی حیثیت سے حضرت مفتی صاحبؒ کی نگرانی میں ماہنامہ البلاغ کا اجراء عمل میں آیا تو آپ کو اس علمی ماہنامہ کا مدیر اعلیٰ مقرر کیا گیا۔ یہ ادارت بھی تا حال جاری ہے ۱۹۶۷ء میں کراچی یونیورسٹی سے ایل ایل بی کے امتحان میں امتیازی نمبرات سے کامیابی حاصل کرکے دوسری پوزیشن حاصل کی ۱۹۷۰ء میں پنجاب یونیورسٹی سے ایم۔ اے عربی کا امتحان پاس کیا اور فرسٹ پوزیشن حاصل کی۔ نومبر ۱۹۷۶ء میں آپ دارالعلوم کراچی کے نائب مہتمم مقرر کئے گئے، ستمبر ۱۹۷۷ء میں عبوری حکومت نے آپ کو پاکستان کی اسلامی نظریاتی کونسل کا رکن نامزد کیا جس میں آپ تدوین قانون اسلامی کی اہم خدمت انجام دے رہے ہیں۔ حضرت مفتی صاحبؒ کے حکم سے تقریباً آٹھ سال قبل حضرت تھانویؒ کے خلیفۂ خاص عارف باللہ حضرت ڈاکٹر عبدالحی صاحب دامت برکاتہم سے بیعت ہوئے ان سے کسب فیض کا سلسلہ جاری و ساری ہے خدا

اس کو قائم و دائم رکھے۔

آپ کو تقریر کے ساتھ تحریر میں بھی زبردست ملکہ حاصل ہے۔ اکثر دور حاضر کے ان جدید مسائل پر لکھتے ہیں جن پر بہت کم لکھا گیا ہے، آپ کی تحریریں انتہائی سادہ و شگفتہ اور قدیم و جدید طرز تحریر کا حسین امتزاج ہیں چند قابلِ قدر اور اہم تصانیف یہ ہے۔

۱۔ بائیبل سے قرآن تک " یہ مولانا رحمت اللہ صاحب کیرانوی کی شہرۂ آفاق کتاب "اظہار الحق" کا اردو ترجمہ اور اس کی شرح و تحقیق ہے۔ اس کے مترجم مولانا اکبر علی صاحبؒ سابق استاذ حدیث دارالعلوم کراچی ہیں اور اس کی شرح و تحقیق کی عظیم خدمت موصوف نے انجام دی اور اس کتاب پر ایک تحقیقی طویل مقدمہ بھی تحریر فرمایا جو تقریباً ڈھائی سو صفحات پر مشتمل ہے اور " عیسائیت کیا ہے " کے نام سے مستقل کتاب کی صورت میں شائع ہو چکا ہے ۲۔ علوم القرآن اور اصول تفسیر "آپ نے حضرت مفتی صاحبؒ کے حکم سے "معارف القرآن" کا ایک مقدمہ لکھنا شروع کیا جس نے طویل ہو کر "علوم القرآن" کی حیثیت اختیار کر لی یہ کتاب پانچ سو سے زائد صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کتاب کے پیش لفظ میں حضرت مفتی صاحبؒ تحریر فرماتے ہیں "میں اگرچہ ضعف و بصارت کے سبب اس (کتاب) کو خود نہ دیکھ سکا مگر اس کے بہت سے مباحث کو پڑھوا کر سنا تو میری مسرت کی حد نہ رہی جس پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا کیونکہ یہ (کتاب) ماشاء اللہ ایسی ہے کہ اگر میں خود بھی اپنی تندرستی کے زمانہ میں لکھتا تو ایسی نہ لکھ سکتا تھا ......"

مؤلف نے اس کتاب کو حضرت مفتی صاحبؒ کے نام نامی کے ساتھ منسوب کیا ہے۔ انتساب کو مفتی اعظم نمبر کی مناسبت سے نقل کیا جاتا ہے۔

انتساب

اپنے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب مدظلہم کی خدمت میں جن کی ذات میں احقر کے لیے ایک مثالی بلکہ بے مثال باپ ایک ہمہ جہت استاذ، اور ایک باریک بین مربی و شیخ کی شفقتیں جمع ہیں اور روئے زمین پر احقر کی محبت ہی نہیں عقیدت کا بھی ان سے بڑا مرکز کوئی نہیں حفظہ اللہ تعالیٰ۔
یہ حقیر کاوش ان کی پیشگی اجازت کے بغیر ان کے نام نامی سے منسوب کر کے عرض گزار ہوں کہ

اگر سیاہ دلم داغ لالہ زار تو ام
وگر کشادہ جبینم گل بہار تو ام

(محمد تقی عثمانی)

۳ - عصرِ حاضر میں اسلام کیسے نافذ ہو؟ یہ ماہنامہ البلاغ میں ذکر و فکر کے عنوان سے چھپنے والے اور بعض دوسرے علمی مضامین کا مجموعہ ہے، جس نے ایک ضخیم مربوط کتاب کی شکل اختیار کر لی۔ ۴ - حضرت معاویہؓ اور تاریخی حقائق، یہ کتاب حضرت معاویہؓ پر اعتراضات کا تحقیقی جائزہ لینے کے لیے لکھی گئی جس میں مودودی صاحب کی کتاب "خلافت و ملوکیت" پر فاضلانہ تبصرہ کیا گیا ہے یہ کتاب تمام علمی طبقوں سے خراج تحسین حاصل کر چکی ہے ابتداءً قسط وار البلاغ میں شائع ہوئی، حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد یوسف بنوریؒ نے آپ کے مضامین پر خاص طور سے اس کتاب پر پسندیدگی کا اظہار کرتے ہوئے اپنی تصنیف "معارف السنن" کا ایک سیٹ بطور انعام عطا فرمایا، جس کی پہلی جلد پر اپنے قلم مبارک سے تحریر فرمایا،

"اقدم هذا الكتاب باجزاءه الستة المطبوعة الى اخي في الله الاستاذ الذكي والعالم الذكي الشاب النقي "محمد تقي" اعجابا بنبوغه في كتابات مجلة الشهرية "البلاغ" خصوصاً في رده على كتاب "خلافت وملوكيت" رداً بليغاً ناجعاً حفظه الله ووفقه الله ووفقه لامثال امثالها وهو الموفق،

كتبه محمد يوسف البنوري

۲۶ / ۳ / ۹۱ ھ

۵ - تقلید کی شرعی حیثیت۔ ۶ - ضبط ولادت عقلی و شرعی حیثیت سے۔ ۷ - ہمارے عائلی مسائل ۸ - اعلاء السنن کی تحقیق و تعلیق جس کی پہلی جلد مکمل ہو چکی ہے۔ اس کتاب کی تقریظ کے آخر میں علامہ زاہد الکوثری مصریؒ کے مایۂ ناز شاگرد شیخ عبدالفتاح ابو غدہ تحریر فرماتے ہیں۔

"ولقد من الله تعالى بتحقيق هذه الامنية الغالية الكريمة وطبع هذا الكتاب الحديثي الفقهي العجاب مدينة كراتشي من باكستان متوجا بخدمة علمية ممتازة من العلامة المحقق المحدث الفقيه الاديب فضيلة الشيخ "محمد تقي" العثماني نجل سماحة شيخنا المفتي الاكبر مولانا محمد شفيع مد ظله العالي في عافية وسرور فقام ذلك النجل الوارث الالمعي بتحقيق هذا الكتاب والتعليق عليه بما يتكفل غاياته ومقاصده ويتمم فرائده وفوائده في ذوق علمي رفيع وتنسيق فني طباعي بديع، مع أبهى حلة من جمال الطباعة الحديثة الراقية لجلد المجلد الاول منه تحفة علمية رائعة

نقلني فيها جذمات المحقق التودعي، بقلعة باكستان؛ فاستحق بهذا الصنيع العلمي الرائع شكر طلبة العلم والعلماء، والله المسئول ان يتم على يديه اخراج هذا الكتاب الموسوعي النافع الكبير ليكون ثقلاً صعبياً في زاخر حسناته انشاء الله الخ

• كتبه الفقير اليه تعالى

عبد الفتاح ابو غدة، الرياض كلية الشريعة،

۹۲/۲/۳ھ

(۹) فتح المنعم اكمال فتح الملهم شرح صحیح مسلم :- یہ علامہ شبیر احمد عثمانیؒ کی صحیح مسلم کی مشہور شرح فتح الملہمؒ کی تکمیل کے لیے زیر تالیف ہے اس کی بھی تقریباً ایک جلد مکمل ہو چکی ہے۔ نیز دائرہ معارف اسلامیہ، پنجاب یونیورسٹی کے لیے آپنے بہت سے تحقیقی مقالے تحریر فرمائے نیز ماہنامہ البلاغ کے علاوہ بہت سے علمی ماہناموں اور رسائل و اخبارات میں آپکے وقیع مضامین شائع ہوتے رہتے ہیں۔

(۴) مولانا سید عزیز الرحمٰن صاحب سواتی

استاذ دارالعلوم کراچی

آپ دارالعلوم کراچی کے ممتاز اور باصلاحیت فضلاء میں سے ہیں مضبوط علمی استعداد اور تفہیم کی اچھی صلاحیت رکھتے ہیں اس وقت دارالعلوم کراچی کے درجات علیا اور وسطیٰ کے استاذ ہیں، آپکے بڑے بھائی مولانا عبدالرحمٰن صاحب سرحد کے ممتاز عالم اور وہاں کی بااثر شخصیت ہیں۔

۲۴ ذیقعدہ ۱۳۶۲ھ کی شب بوقت عشاء آپ کی ولادت ہوئی، آپ نسباً سید ہیں، آپ کے جد اعلیٰ ہمدان سے پیر بابا (بونیر) کے ساتھ دعوت و تبلیغ کی نیت سے سرحد تشریف لائے اور پھر سوات

علیه هذا اللقب لقبت به محقق هذا الكتاب حفظ الله تعالى ورعاه وهو في مقتبل الشباب من نحو خمسة عشر عاماً في رحلتي الاولى لباكستان عام ۱۳۸۲ھ وقد رأيت فيه النبوغ المتوثب والذهن الوقاد والعلم الغزير والالمعية الفياضية مع الروح الشفافة والفصاحة العربية النادرة في خطبه وارتجالاته زاده الله من فضله وتوفيقه ونفع به العباد والبلاد واكرمني بصالح دعواته ۹ ۱۲ (عبد الفتاح ابو غدة)

کے علاقہ میں آباد ہوگئے۔ قرآن کریم اپنی والدہ محترمہ سے پڑھا۔ فارسی کی ابتدائی تعلیم اپنے والد مولانا عبدالمنان صاحب سے حاصل کی اور پرائمری کی تعلیم قصبہ کے اساتذہ سے حاصل کی، پھر علم دین کی کشش اور حضرت مفتی صاحبؒ کی شہرت آپ کو دارالعلوم کراچی کھینچ لائی، چنانچہ ۱۰ شوال ۱۳۷۸ھ میں آپ نے داخلہ لے کر درس نظامی کی ابتدائی تعلیم کا آغاز کیا اور ممتاز علماء و محدثین سے آخر تک تعلیم حاصل کرکے ۱۳۸۹ھ میں فراغت حاصل کی، امتیازی نمبرات سے کامیاب ہوئے اور پورے مدرسہ میں اول آکر حضرت مفتی صاحبؒ سے گرانقدر کتب انعام میں حاصل کیں۔

آپ نے حضرت مفتی صاحبؒ سے بخاری شریف اور مؤطا امام مالک کا کچھ حصہ اور تفسیر کے چند اسباق درساً پڑھے، فارغ التحصیل ہوکر درجہ تخصص فی الفقہ والافتاء میں دو سال لگائے جہاں حضرت مفتی صاحب کی نگرانی میں فتاویٰ نویسی میں مناسبت حاصل کی۔ تخصص کے سال ہی میں درس نظامی کے ابتدائی تین سال کے دوران متفرق اسباق آپ کے سپرد کئے گئے۔ تخصص سے فراغت کے بعد آپ کو باقاعدہ منصب تدریس پر فائز کیا گیا اسی سال ۱۴ رجب ۱۳۹۰ھ مطابق ۱۸ ستمبر ۱۹۷۰ء بروز جمعہ حضرت مفتی صاحبؒ نے آپ کی خاندانی شرافت علمی صلاحیت اور حسن اخلاق و عادات کی بناء پر آپ کا عقد نکاح اپنی نواسی سے منظور فرماکر آپ کو اپنے خاندان میں شامل فرمایا۔ اس خصوصیت کے لحاظ سے موصوف تمام فضلائے دارالعلوم میں منفرد ہیں، آپ کو حضرت مفتی صاحبؒ نے سند اجازت و اجازت حدیث بھی عطا فرمائی، آج کل درجہ علیا اور وسطیٰ کے مندرجہ ذیل اسباق آپ کے سپرد ہیں، مؤطا امام مالکؒ، مؤطا امام محمدؒ، توضیح، ہدایہ ثالث، ہدایہ ثانی، دیوان متنبی، سبعہ معلقہ، شرح تہذیب نورالانوار وغیرہ

(۵) مولانا مفتی بشیر احمد صاحب کشمیری

قاضی باغ پونچھ آزاد کشمیر و سابق استاذ دارالعلوم کراچی

آپ بھی دارالعلوم کراچی کے ممتاز فضلاء میں شمار کئے جاتے ہیں، علوم دینیہ کے ساتھ انگریزی علوم میں بھی اچھی مہارت رکھتے ہیں۔ دارالعلوم کراچی میں استاذ رہ چکے ہیں اس وقت آزاد کشمیر "باغ" کے قاضی اور مدرسہ تعلیم القرآن میں استاذ ہیں:۔ اگست ۱۹۴۲ء میں موضع کفل گڑھ باغ آزاد کشمیر میں آپ کی ولادت ہوئی، آپ کشمیر کے مشہور عالم امیر شریعت مولانا مفتی محمد عبداللہ صاحبؒ کے صاحبزادے ہیں۔ والدہ محترمہ ابتدائے سن ہی میں رخصت ہوگئیں، سوتیلی والدہ محترمہ نے اچھی تربیت کی، ابتدائی دینی اور سکول کی چوتھی جماعت تک کی تعلیم آپ نے انہی سے حاصل کی۔ پھر اسکول میں داخل ہوئے، ۵۸ء کے اواخر

میں ہائی سکول باغ سے میٹرک کا امتحان پاس کیا، ۵۹ء کے وسط میں اپنے بہنوئی مولانا امیرالزماں صاحب مہتمم مدرسہ عربیہ قاسم العلوم پونچھ کے ہمراہ آزاد کشمیر کی دینی درس گاہ پلندری آگئے جہاں نحو و صرف اور منطق کی ابتدائی اور درس نظامی کی متوسط تعلیم حاصل کی۔ حضرت مفتی صاحبؒ اور دارالعلوم کی شہرت سن کر ۱۳۸۴ھ میں دارالعلوم کراچی تشریف لائے، اور ۱۳۸۹ھ میں دورۂ حدیث سے فراغت حاصل کی۔ امتیازی نمبرات سے کامیابی پر حضرت مفتی صاحبؒ سے بہت سی کتب انعام میں حاصل کیں۔

آپ نے حضرت مفتی صاحبؒ سے بخاری شریف جلد اول کا کچھ حصہ، شامی اور تفسیر کے چند اسباق درساً پڑھے، دورۂ حدیث سے فراغت کے بعد درجۂ تخصص فی الفقہ والافتاء میں داخلہ لیا ساتھ ہی تدریس کے لیے چند اسباق بھی آپکے سپرد کئے گئے، تخصص میں حضرت مفتی صاحبؒ کی نگرانی میں فتاویٰ نویسی کی مشق شروع کی، ۱۳۹۰ھ میں اس درجہ سے فارغ ہو کر باقاعدہ تدریس شروع کی، ۱۳۹۱ھ میں آپ کو آزاد کشمیر باغ کے مفتی اور عہدۂ قضا کی پیش کش ہوئی۔ جسے آپنے اپنے حضرت مفتی صاحبؒ اور اپنے دیگر اساتذہ کے مشورے سے منظور فرمالیا، چنانچہ ۹۱ھ میں آپ کشمیر واپس آگئے، آجکل بھی کشمیر ہی میں اپنے فرائض منصبی انجام دے رہے ہیں، مختلف رسائل میں آپ کے مضامین وقتاً فوقتاً شائع ہوتے رہتے ہیں آج کل "اسلام اور تعزیرات" کے نام سے ایک کتاب زیر تالیف ہے۔

(۶) مولانا عبدالرؤف صاحب

خلیفہ حضرت مفتی صاحبؒ و معین مفتی معین مدرس دارالعلوم کراچی

آپ حضرت مفتی صاحبؒ کے غالباً سب سے کم سن اور نوجوان خلیفہ ہیں، دارالعلوم کراچی میں معین مدرس اور معین مفتی ہیں، آپ نے حضرت مفتی صاحبؒ سے فقہ ظاہر کے ساتھ فقہ باطن میں بھی کسب فیض کیا، حسن اتفاق ہے کہ آپ کے والد مولانا عبدالحکیم صاحب سکھروی مدظلہم بھی حضرت مفتی صاحبؒ کے تلمیذ اور خلیفۂ خاص ہیں۔

آپ کا وطن اصلی سکھر ہے وہیں آپ کی ولادت ہوئی، قرآن حکیم اپنی والدہ محترمہ و مکرمہ سے پڑھا پھر اسلامیہ پرائمری سکول میں چار جماعتیں پاس کیں، اور درس نظامی کی تعلیم کی غرض سے مدرسہ اشرفیہ سکھر میں داخل ہوئے، جہاں ابتداء سے موقوف علیہ تک کی تعلیم مکمل کی، اس مدرسہ میں اپنے والد مکرم کے علاوہ

خاص طور سے شیخ الحدیث مولانا ضیاء الحق صاحب سے استفادہ کیا، ۱۳۷۹ھ میں دورۂ حدیث کی تکمیل کے لیے دارالعلوم کراچی تشریف لائے، ۱۳۸۰ھ میں فراغت حاصل کی۔ حضرت مفتی صاحبؒ سے آپ کو بخاری شریف جلد اوّل کا کچھ حصہ پڑھنے کی سعادت حاصل ہوئی، نیز حضرت نے آپ کو تمام کُتبِ صحاح وغیرہ کی اوّل و آخر عبارت پڑھوا کر یا خود پڑھ کر اپنی تمام اسانید کے ساتھ اجازتِ روایت حدیث مرحمت فرمائی، فراغت کے بعد آپ نے حضرت مفتی صاحبؒ کی نگرانی میں دو سال تخصص فی الفقہ والافتاء میں لگا کر فتاویٰ نویسی کی مشق کی اور چند اسباق بھی تدریس کے لیے آپ کے سپرد کیے گئے۔ دریں اثناء ۱۳۹۰ھ میں آپ نے حضرت مفتی صاحبؒ سے اصلاحی تعلق بھی قائم کیا اور بیعت ہوئے، تخصص سے فراغت کے بعد بحیثیت معین مدرس و معین مفتی آپ کا تقرر ہوا، یہ خدمت تا حال جاری ہے۔

۸ رمضان ۱۳۹۴ھ میں حضرت مفتی صاحب قدس سرۂ العزیز نے آپ کو اپنے پیڈ پر تحریر کردہ مکتوب میں بیعت و تلقین کی اجازت مرحمت فرمائی۔ حضرتؒ کا مکتوب ہو بہو نقل کیا جاتا ہے۔

عزیزم محترم مولوی عبدالرؤف صاحب!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آج بے ساختہ قلب پر وارد ہوا کہ میں آپ کو بیعت و تلقین کی اجازت دیدوں اس کا اظہار اپنے والد صاحب اور اپنے دوستوں سے بھی کر دیں اور اس کام کو اپنی اصلاح کی نیت سے جاری کریں، والسلام،

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ، ۸ رمضان ۱۳۹۴ھ

اجازت بیعت و تلقین کے علاوہ افتاء و روایت حدیث کی بھی تحریری اجازت اور سند آپ کو حضرت مفتی صاحبؒ سے حاصل ہے۔ ماشاء اللہ آپ کے اوپر حضرت مفتی صاحبؒ کے فیضِ صحبت کا بے حد اثر ہے۔ طلباء کی اصلاح اور اخلاق کی درستگی کی طرف آپ خاص طور سے توجہ دیتے ہیں اور ان کے اعمال و افعال کی نگرانی رکھتے ہیں۔ دارالعلوم میں ہفتے میں دو مرتبہ دوشنبہ اور پنجشنبہ کی شام کو بعد عصر آپ کی اصلاحی مجلس پابندی کے ساتھ ہوتی ہے، جس میں تلامذہ اور طلباء کے علاوہ شہر سے آنے والے معزز حضرات بھی شریک ہو کر کسبِ فیض کرتے ہیں، البلاغ میں آپ کے علمی مضامین اور اہم فتاویٰ شائع ہوتے رہتے ہیں۔ حال ہی میں "رسائل غسل" کے نام سے آپ کی پہلی تالیف شائع ہوئی ہے۔

بیشتر تلامذہ دارالعلوم کراچی کے حالات اور ان کی خدمات وقت کی کمی کی بنا پر رقم نہ کی جاسکیں، چند ایک کے صرف اسماء تحریر کرنے پر اکتفا کیا جاتا ہے:

(۱) مولانا محمد اسحاق صاحب ایرانی سابق استاذ دارالعلوم کراچی و فاضل مدینہ یونیورسٹی۔

(۲) مولانا افتخار احمد صاحب اعظم گڑھی استاذ جامعہ حمادیہ کراچی۔

(۳) مولانا محمد اسحاق صاحب جہلمی استاذ دارالعلوم کراچی

(۴) مولانا محمد حسن صاحب سابق استاد دارالعلوم کراچی، ایران

(۵) مولانا عبدالقیوم صاحب گلگتی، ریاض، سعودی عربیہ

(۶) مولانا عبداللہ صاحب برما۔ حال معین مفتی و معین مدرس دارالعلوم کراچی

(۷) مولانا حبیب اللہ صاحب

(۸) مولانا لطف الحق بن عبدالحق صاحب افغانستان۔

(۹) مولانا عبدالصمد بن فرمان علی صاحب، چمپارن، بھارت

(۱۰) مولانا عبدالرشید صاحب جہلمی، پنجاب۔

(۱۱) مولانا محمد آفتاب عالم صاحب، مکہ مکرمہ، سعودیہ عربیہ۔ آپ حضرت مولانا بدر عالم صاحبؒ کے فرزند رشید ہیں۔ آپ نے جیکب لائنز کراچی میں حضرت مفتی صاحب قدس سرہ سے ھدایہ آخرین پڑھی، آپ حضرت مفتی صاحبؒ کی تفہیم اور فقہی مہارت سے بےحد متاثر ہیں۔ تفصیلی حالات دستیاب نہ ہوسکے۔

جامع کمالات فقیہ ملت حضرت مفتی صاحب قدس سرہٗ کی حیات طیبہ کا ایک ایک گوشہ اس قدر حسین اور سبق آموز ہے کہ اس پر جتنا کچھ لکھا جائے کم ہے، اس مضمون میں آپ کے تمام تلامذہ کا احاطہ مقصود ہے نہ ممکن، اس لیے انہی چند جلیل القدر تلامذہ کے ذکر پر اکتفاء کیا جاتا ہے، یہ وہ ممتاز علماء اور صلحا ہیں جن کی حیات طیبہ ہمارے لیے مشعل راہ ہے۔

حضرتؒ سے مفارقت کا غم ایسا نہیں جو جلد بھلایا جاسکے۔ ایک طویل عرصہ کے باوجود یہ زخم تازہ ہے حضرتؒ کی حسین، دلآویز، شفقت نورانی صورت ہر وقت دل و دماغ کے پردہ پر چھائی رہتی ہے۔

تیری یاد کی خلش ہو تیرے ذکر کی تپش ہو　　میرے اشک ہائے غم کو کوئی چاہیئے بہانہ

○

اصلاح و ارشاد
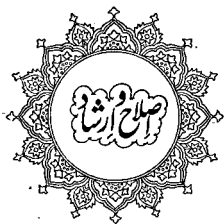
"غور کرنا چاہیے کہ دنیا کے تمام معاملات
میں ہمارے جھگڑے چلتے ہی رہتے ہیں کم
از کم اللہ کے گھر اور عبادتِ نماز ہی کو ہر طرح
کے جھگڑے فساد سے محفوظ رکھنا چاہیئے۔"

(حضرت مفتی اعظمؒ : سنت و بدعت ص ۵۸)

مولانا مفتی عبدالحکیم صاحب
مدرسہ اشرفیہ سکھر

حضرت مفتیٔ اعظمؒ کا اندازِ تربیت

اور حضرات تو قبلہ حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے فضائل علمی و عملی بیان کریں گے اگرچہ وہ قسمت
اوپر ہوں گے مگر میں تو حضرت قبلہ علیہ الرحمۃ کی تربیت السالکین کا ہلکا سا نقشہ آپ بیتی میں دکھانا چاہتا ہوں جو انبار
میں سے مثل ذرہ کے ہے۔

احقر نے ۱۳۵۲ھ میں ایک سال مظاہر العلوم سہارنپور میں رہ کر دارالعلوم دیوبند میں داخلہ لیا اور اسباق
شروع ہو گئے۔ میرا مزاج تنہائی پسند تھا مگر ساتھ ہی صحبت بزرگاں کا چسکہ بھی لگا ہوا تھا دارالعلوم بزرگانِ دین
کا مکمل گہوارہ تھا۔ کسی بات کی کوئی کمی نہ تھی، اپنی اپنی طبیعت کا رجحان ہوتا ہے صحبت میں بیٹھ جانے کے لیے
میری طبیعت نے قبلہ مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ ہی کو منتخب کیا۔ حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ دارالافتاء
میں تشریف لاتے اور بڑے سکون و وقار کے ساتھ افتاء کا کام کیا کرتے تھے۔ جب موقعہ ملتا میں حضرت والا
کی خدمت میں کبھی کسی مسئلہ کو معلوم کرنے کے بہانے کبھی ویسے ہی حاضری ہوتی اور بڑا سکون معلوم ہوتا تھا طبیعت
کا رنگ نکھر آتا تھا۔ مولانا مسعود احمد صاحب نائب مفتی تھے۔ فتاویٰ کے نقول کے رجسٹر پڑھنے کی اجازت ہو گئی
بڑی عجیب علمی کیفیت محسوس ہوتی تھی، رفتہ رفتہ قبلہ حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے فضائل معلوم ہونے
لگے یہ بھی معلوم ہوا کہ حضرت نے دارالعلوم کے کتب خانے کی۔ کل یا اکثر کتابوں کا مطالعہ کیا ہوا ہے۔ شوق
ہوا کہ دارالعلوم کا کتب خانہ دیکھیں گے اوقات معلوم کئے اور کتب خانے میں گئے تو اپنی عمر میں اتنا بڑا
کتب خانہ دیکھنا نصیب ہوا سب طرف گھوم کر اندازہ لگایا شاید ایک لاکھ کتابیں تو ہوں گی۔ اس سے
حضرت قبلہ مفتی صاحب کی علمی کاوش اور لگن معلوم ہوئی۔ اور خود بھی اسی وقت سے مطالعہ کا شوق پیدا
ہوا اسی طرح طالب علمی کے زمانے کے حضرت کے اعلیٰ نمبروں میں کامیابی کی باتیں کانوں میں پڑتی رہیں اور

اعتقاد میں ترقی ہوتی رہی۔ پھر خارج وقت میں حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے دارالعلوم کی مسجد میں قرآن کریم کا ترجمہ پڑھنا شروع کیا تو بندہ نے بھی اس میں شمولیت کی۔ ترجمہ کیا تھا بے بہا علمی ذخائر ہوتے تھے بالخصوص مرزا قادیانی کے رد میں عجیب عجیب نکتے ارشاد فرما دیتے تھے۔ دورۂ حدیث میں ابوداؤد شریف عموماً حضرت مولانا سید اصغر حسین قدس سرہٗ العزیز کے پاس ہوتی تھی۔ ہماری ابوداؤد بھی ان کے پاس ہی تھی ابتداء کے چند اسباق پڑھائے تھے کہ ان کی طبیعت ناساز ہوگئی تو حضرت میاں صاحبؒ نے اپنی جگہ قبلہ حضرت مفتی صاحب علیہ الرحمہ ہی کو منتخب فرمایا ان کی جگہ ابوداؤد بندہ نے حضرت قبلہ مفتی صاحب ہی سے پڑھی۔

حضرت قبلہ میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ استاذ الاساتذہ تھے ان کی جامع مگر بہت مختصر تقریر ہوتی تھی مگر حضرت قبلہ مفتی صاحب ہر حدیث کی بڑی تحقیق کے ساتھ پوری تفصیل فرمایا کرتے تھے اس وقت سے ان کی احادیث اور ان کے ماتحت مسائل فقہیہ کی بحث سے علمی تبحر آشکارا ہوا۔

ایک روز دیوان صاحب کی حویلی کے پاس بازار سے دولت خانے کو جاتے ہوئے زیارت ہوئی اس وقت حضرت قبلہ مفتی صاحبؒ گھوڑے پر سوار تھے حجامت بنوائی ہوئی تھی سیاہ عمامہ باندھا ہوا تھا چہرہ اس قدر نورانی معلوم ہو رہا تھا کہ کہہ نہیں سکتا دل نے تقاضا کیا کہ بس ان ہی سے بیعت ہونا ہے مگر طالب علمی کا زمانہ تھا یہ معلوم تھا کہ حضرت حکیم الامت تھانویؒ رحمۃ اللہ علیہ کے یہاں طالب علمی میں بیعت نہیں کیا کرتے پھر دولت خانہ پر حاضری ہونے لگی اس وقت المفتی رسالہ کا اجرا ہو رہا تھا حضرت اس میں لگے رہتے تھے جب پڑھ پڑھا کر ہم گھر آگئے اور وطن مالوف ریاڑی کے مدرسہ ریاض العلوم میں معلمی کی ملازمت ملی تو اصلاح کا معاملہ سامنے آیا وہاں مولانا عبدالمجید صاحب بچھرایونی رحمۃ اللہ علیہ موجود تھے اور حضرت حکیم الامت علیہ الرحمہ کے مخصوص خلفاء میں سے تھے ان کی صحبت میں اثر بھی بہت تھا مگر میرے دل کی تمنا یہ تھی کہ کسی مفتی سے بیعت ہونا چاہیئے تاکہ مسائل کی ضرورت پڑے تو دوسری جگہ جانا نہ پڑے۔

بہشتی ثمر کو دیکھ کر ایک عریضہ حضرت مولانا محمد عیسٰی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو لکھا انہوں نے روزانہ تسبیح بتلائی دوسرا خط لکھا تو اس کے جواب میں ان کے وصال کی خبر لکھی ہوئی آئی انا للہ وانا الیہ راجعون پھر تیسرا خط قبلہ حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں اصلاحی خط و کتابت کے لیے لکھا حضرت نے ازراہ شفقت ان الفاظ میں جواب لکھا جب تک کسی دوسرے مصلح سے مناسبت نہ ہو بندہ اس خدمت کے لیے حاضر ہے اس کے بعد اصلاحی خطوط کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ اور مناسبت تامہ اللہ تعالیٰ نے عطا فرما

وہی یہ حال ہوگیا تھا کہ عریضہ لکھ کر ڈاک میں ڈالا اور خود بخود تسلی و سکینہ قلب میں آجاتا تھا کہ کوئی اشکال ہوتا یا تردد اور پریشانی ہوتی جواب آنے سے پہلے ہی دل میں تشفی آجاتی تھی یہ حضرت والا کی توجہ اور دعا کا اثر تھا پھر جواب پڑھ کر تو تسلی ہوجاتی اگرچہ یہ تھا حد تو یہ ہے کہ اشکال کا جواب خط آنے سے قبل ہی دل میں آجاتا تھا۔ آخری زمانہ ہجرت کے قریب جب ہندوؤں نے قتل و غارت شروع کر رکھی تھی تو ہمارے وطن پر بھی ان کی دعا پڑھا کرتی تھی وہ ایک خوف کا وقت تھا میں نے حضرت قبلہ مفتی صاحبؒ کو واقعات ظلم اس پر خوف طبعی ظاہر کیا تو مجھے یاد ہے اس کے جواب میں حضرت قبلہ مفتی صاحبؒ نے یہ آیت لکھی تھی۔ وَهَلْ تَرَبَّصُونَ بِنَا إِلَّا إِحْدَى الْحُسْنَيَيْنِ وَنَحْنُ نَتَرَبَّصُ بِكُمْ أَنْ يُصِيبَكُمُ اللَّهُ بِعَذَابٍ مِنْ عِنْدِهِ أَوْ بِأَيْدِينَا فَتَرَبَّصُوا إِنَّا مَعَكُمْ مُتَرَبِّصُونَ اور نہیں انتظار کرتے ہو تم ہمارے ساتھ مگر دو بھلائیوں میں سے ایک کا اور ہم انتظار کرتے ہیں تمہارے لیے کہ اللہ تعالیٰ اپنے پاس سے تم کو عذاب پہنچادے یا ہمارے ہاتھوں سے پس تم منتظر رہو ہم تمہارے ساتھ انتظار کرنے والے ہیں۔

اس وقت مجھے یاد نہیں تھا کہ احدی الحسنیین کیا ہے تفسیر دیکھی کہ یا شہادت یا فتح ان دو میں سے کسی ایک کا انتظار کرتے رہو اس سے کتنی تسلی ہوئی ہے کیا عرض کروں پھر خوف باقی ہی نہ رہا یہ آیت ایسے موقع پر جاکر لگی کہ دل باغ باغ ہوگیا۔

ہم لوگ اکتوبر ۱۹۴۷ء میں پاکستان آگئے تھے اور حضرت مفتی صاحبؒ دیوبند ہی تھے احقر نے عریضہ ارسال کیا اور حضرت والا کا جواب آیا جس میں تردد ظاہر فرمایا کہ ابھی پاکستان آنے نہ آنے میں متردد ہوں احقر نے عرض کیا کہ وہاں پر تو علماء کرام بہت ہیں یہاں پاکستان میں آپ کی ضرورت ہے اس پر حضرت والا کا جواب اثبات میں آیا۔ کچھ روز بعد معلوم ہوا کہ پاکستان تشریف لے آئے ہیں میں حیدرآباد سندھ میں تھا اور کوئی دھندہ نہیں تھا پہلے لوگوں کی پھاندی لاکر وہ بیچیں پھر سوتا آل گیا تو گنڈیاں بیچنی شروع کیں اور حضرت والا کو عریضہ لکھا کہ میں یہاں گنڈیاں بیچ رہا ہوں اس پر حضرت والا نے بہت مسرت کا اظہار فرمایا اور لکھا کہ ہر ٹوپی کو ایسا ہی ہونا چاہیے ایک ہی ڈگر پر نہ پڑا رہے جیسا موقع آئے کام میں لگا رہے۔

فرمایا مجھے یہ آپ کی بات بہت پسند آئی اور پھر آئندہ جب زیارت ہوتی اس کو ظاہر کرکے دوسرے لوگوں سے بھی فرماتے بلکہ ایک مرتبہ تحریر فرمایا تھا کہ مجھے اس کے وظائف کی تو معلوم نہیں کیا کرتا ہے ہم نے تو اسے گنڈیریاں بیچنے سے خوش ہوکر خلافت دی ہے۔

میں پہلی مرتبہ حج کو جانے لگا تو پاکستان چوک میں رہتے تھے وہیں پاکستان کی پہلی ملاقات ہوئی اور نصائح فرمائے اور اس سفر میں حزب الاعظم اور دلائل الخیرات کا ورد رکھنے کے لیے ہدایت فرمائی۔

ایک مرتبہ بشیری کا مدرسہ دیکھنے کے لیے تشریف لائے وہاں سے سکھر تشریف لائے میں حلوائی کی دوکان پر کام کر رہا تھا گاڑی کا وقت قریب تھا مجھے ساتھ لیا اور روہڑی چلنے کے لیے کہا اس وقت دریائے سندھ میں کشتی کے ذریعہ دوسرے کنارے پر جایا کرتے تھے۔ کشتی میں بیٹھ گئے تو آپ نے یہ فرمایا کہ تم کو صرف ایک کام بتلاتے ہیں وہ یہ کہ دین کی جتنی تبلیغ ہو سکے کرو میں نے اقرار کر لیا پھر میں نے عرض کیا کہ حضرت وساوس بہت آتے ہیں فرمانے لگے میلے کپڑوں میں زیادہ وساوس آتے ہیں صاف ستھرے کپڑے پہننے میں کم آتے ہیں اس وقت میں حلوائی کے کام کی وجہ سے میلے کپڑے پہنے ہوتے تھا اور واقعی یہ بات سامنے آئی اور اس کی قدر ہوئی۔

روہڑی سے سٹیشن پر جا رہے تھے ایک شخص ساتھ ساتھ چلنے لگا اس نے حضرت سے کہا تم کیا کام کرتے ہو فرمایا جس کام کی آج کل کوئی قدر و قیمت نہیں وہ نہیں سمجھا پھر اس نے پوچھا تو فرمایا مفت میں کچھ کاغذ کالے کر لیتا ہوں اور کیا کام ہے۔ اسٹیشن آیا سامان آپ کا میرے پاس تھا میں نے پلیٹ فارم نہیں لیا تھا پس یہ میں نے عرض کیا تو سامان لے کر خود ہی ریل گاڑی میں جا کر سوار ہو گئے مشکل کی بات تھی۔ تواضع تو حضرت سے از حد پکی تھی ہر کام میں تواضع کے مظہر اتم تھے۔ اللھم افض علینا۔ جب تک دکان حلوائی کی رہی حاضری نصیب نہ ہوئی دکان ختم کرنے کے بعد چالیس دن کے لیے آستانہ پر حاضری ہوئی لسبیلہ کی کوٹھی پر تشریف فرما تھے چند روز کوٹھی میں ہی قیام رہا ہر نشست و برخاست پر تربیت والی نظر ہونے لگی اذان سے قبل آہستہ سے تشریف لاتے کہ تہجد کے لیے اٹھا ہے یا نہیں پھر میں مسجد میں چلا جاتا تو بستر آکر دیکھتے کہ لپیٹ کر گیا ہے یا ویسے ہی بوریہ رکھ چھوڑ گیا ہے کبھی مسجد میں جوتہ مبارک دہلیز میں چھوڑ جاتے کہ یہ اٹھا کر رکھتا ہے یا نہیں دکاندار سے سامان خریدتے تب اندازہ فرماتے۔

ایک دفعہ بس میں ساتھ بیٹھے ادب سکھانے کے لیے فرمایا تم میری جگہ بیٹھ جاؤ میں نے عرض کیا نہیں آپ بیٹھ جائیں جلدی سے ٹکٹ میرا بھی لے لیا یہ ادب سکھانا تھا کہ میں نے سستی سے کام لیا۔ وہاں مجلس ہوتی تھی اس کے لیے فرمایا کہ لوگ آئیں گے دریاں بچھاؤ دیکھنا چاہتے تھے کہ اسے عام کام کرتے ہوئے عار تو نہیں آتی، یہ بھی تربیت۔ مسجد سے آتے ہوئے سڑک پر ایک روڑا پڑا ہوا تھا تو اسے ٹھوکر سے ایک جانب کر دیا تاکہ آتے جاتے کو ٹھوکر نہ لگے اور حدیث پر عمل کرنا آ جائے۔ قرآن مجید کی تلاوت اس انداز سے فرماتے

کہ قلاوت کے تمام آداب آجائیں کیونکہ دیکھنے سے جو علم حاصل ہوتا ہے وہ پڑھنے میں کہاں ہے۔

الغرض ان کی ہر حرکت و سکون میں کوئی نہ کوئی اصلاحی بات مخفی ہوتی تھی اور کمال یہ کہ زبان سے نہیں فرماتے تھے عمل سے خود بخود ذہن میں آجاتا تھا کہ یہ فلاں حدیث پر عمل ہوا ہے یا فلاں فقہ کی جزئی پر عمل ہو رہا ہے اور پوری طرح ذہن میں القا ہوتا تھا جیسا کہ بتاتے جا رہے ہوں۔

شہر سے دارالعلوم کراچی جاتے وقت میں کلام پاک لے کر تلاوت فرماتے یہ بھی تعلیم تھی کہ اتنی دیر فضولیات نظر میں لانے کی بجائے وقت کو کام میں لگائیں راستہ بھی طے ہو جائے قلاوت بھی ہو جائے نہ کرنے کا ڈر نہ کھٹکا ڈرائیور چلا رہا ہے معمول بھی پورا ہو رہا ہے اور یہ بھی معلوم ہو گیا کہ معمولات کے لیے خاص جگہ مقرر نہیں ہوتی وقت مقررہ پر جہاں ہو پورا کر لیا جائے۔

ایک دفعہ میں کوٹھی میں اکیلا بیٹھا ہوا تھا تشریف لائے تھوڑی سی دیر میں اندر سے ایک ملا آئی اور کچھ دیر میرے سامنے کھڑی رہی ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ حکم دیکر اس کو لایا گیا ہے تاکہ یہ دیکھیں کہ اسے نگاہ کا مس تو نہیں ہے۔ کبھی کھانا کھلاتے ہوئے آداب طعام کی کمی بیشی ملاحظہ فرماتے میری نماز میں ضرور کمی تھی تو مسجد میں میرے سامنے جہاں سے میری نگاہ پڑے نماز پڑھنے لگے اور نہایت ہی سکون اور خشوع و خضوع اور ظاہری احکام الٰہی کے مطابق نماز پڑھ رہے تھے اور میرے دل میں یہ آ رہا تھا کہ حضرت مجھے نماز پڑھنے کا طریقہ سکھلا رہے ہیں۔ یعنی یہ کمال تھا کہ جو آپ عمل سے بتلانا چاہتے تھے وہ دل میں اتر جاتا تھا جیسے کہتے ہیں آنکھوں آنکھوں میں اشارے ہو گئے۔

ایک مرتبہ فرمایا کہ اسم ذات پڑھو اور گنتی کرو چوبیس گھنٹے میں کتنی بار ہوتا ہے۔ میں نے سنا ہوا تھا کہ کسی بزرگ کا طریقہ تھا کہ امتحان لیتے تھے اگر چوبیس گھنٹے میں سوا لاکھ کر لیا تو اسے کامیاب سمجھتے تھے میں نے بھی کیا مگر ۹۶ ہزار بار ہوا۔ ایک روز تمام دن ادھر اُدھر کام پر لگائے رکھا اور عشاء کا وقت ہو گیا تب فرمانے لگے کہ آج تم نے کھانا نہیں کھایا یہ کہہ کر بھی گھر تشریف لے گئے یہ امتحان لینا تھا کہ غصہ بے صبری کیسی ہے جب دیکھ لیا تو پھر گھر بلا کر شفقت کے ساتھ چارپائی پر بٹھا کر کھانا کھلایا اور خود ٹہلتے ہوئے سب ہمارے انداز ملاحظہ فرماتے رہے۔ کبھی خادم سے اس طرح کراتے کہ ان کو کھدنے کے لیے کہدواد تیلدی میں دیکر دو اور جو کیفیت ہو وہ بتلاؤ ایک دفعہ تاوی سپرد کیے کہ ان کے جوابات لکھو میں نے ان کو لاابالی پن سے دفتر ہی میں ایک طرف رکھ دیا حضرت والا نے ان کو کسی سے لے کر چھپا دیا۔ اب میں حیران ہوا، ارشاد فرمایا

امانت ہوتی ہے اس کی امانت کی طرح حفاظت ضروری ہے۔ ایک طالب علم کو سبق کے لیے لگاؤ زیادہ پیچھے پڑا رہنا یہ بھی امتحانی تھا کہ دق ہو کر یہ کیا کرتا ہے اور طالب علم سے کس رُخ سے بات کرتا ہے۔

حضرت قاری فتح محمد صاحب مدظلہٗ العالی کے پیچھے ایک قرآن پاک تمام رات صبح صادق تک سننے کا کئی بار اتفاق ہوا۔ مگر میں فجر کی نماز کے بعد سو جاتا تھا یہ سب احوال معلوم کر کے فرمایا کہ اشراق سے پہلے سونا نہ چاہیے یعنی یہ مجاہدہ ہے مجاہدہ کرا کر دیکھنا تھا میں نے ایسا ہی کیا۔

ایک مرتبہ مسجد جاتے ہوئے حضرت سفیان ثوریؒ کا مقولہ نقل فرمایا ضیعوہ اصحابہ اپنی طرف اشارہ فرمایا حقیقت یہ ہے کہ ہم نے حضرت کو سمجھا ہی نہیں کہاں تک لکھیں کہ کس کس طرح ہماری ہر حرکت کی نگاہ رکھی اور تربیت فرمائی جزاہم اللہ احسن الجزاء

اس کے ساتھ ساتھ حضرت مفتی صاحبؒ کی مجالس طیبہ کی ادنیٰ سی سیر کرانے کے لیے ایک مجلس کے فیوضات عرض خدمت کرتا ہوں۔

ارشاد فرمایا۔ حج کے دوران مزدلفہ سے واپسی کے وقت منا میں ایک ہی دن میں چار کام کرنے افضل ہیں، رمی جمرہ عقبہ۔ قربانی۔ سر منڈانا۔ طواف زیارت کرنا۔ یہ چاروں کا پہلے دن کرنا افضل تو ہے لیکن اُسے یوں کر لیا جائے تو اس میں سہولت ہے اور مکروہ بھی نہیں ہے۔ ہر خلاف افضل کے لیے کراہت لازم نہیں مثلاً دسویں تاریخ کو رمی کرے گیارہویں تاریخ کو فجر کے بعد قربانی کر آئے۔ پھر حلق کرا لے، پھر طواف زیارت کر آئے اور اس سے پہلے یا پیچھے گیارہویں، تاریخ کو رمی بھی کرے۔ آسانی کے ساتھ یہ تمام افعال حج ادا ہو سکتے ہیں اسی طرح عرفات میں اپنی جگہ دعا و اذکار میں لگنا ہے۔ گو جبل رحمت کی تختی میں جانا افضل ہے مگر آنے جانے میں دعائیں مانگنا پڑھنا پڑھانا رہ جاتا ہے یا کمی رہ جاتی ہے۔

ارشاد فرمایا۔ جب صفا مروہ کی سعی کرتے تو عربی کی مناجات مقبول میں لے لیتا اور اُردو کی اہلیہ کو دیدیتا تھا وہ اسے پڑھتی رہتیں اور چونکہ سعی اب خلاصہ ہو گیا ہے۔ اہلیہ سے کہتا کہ تم کو دوڑنا نہیں ہے اس لیے تم الگ چلتی رہو میں الگ چلوں گا کیونکہ کہ مردوں کو دوڑنا پڑتا ہے۔ پھر آتے جاتے دکھلائی دیتے ہیں۔ کوئی دقت نہیں ہوتی۔

ارشاد:۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے حج کے بارے میں چند وعظ ہیں۔ الحج المبرور۔ الحج والنحج ان کو دیکھ لینا چاہیئے۔

ارشاد:۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا تھا کہ وہاں تو خالی زنبیل لے جائے اور بھری ہوئی آئے وہاں کا تو

یہ معاملہ ہے۔ میں نے عرض کیا (حضرت مفتی صاحبؒ) کسی مسکین کے پاس زنبیل ہی نہ ہو تو کیا کرے فرمایا
فرمایا وہاں زنبیل بھی ملتی ہے۔ طلب کرے۔

ارشاد:- ایک صاحب پان کی ڈبیہ پالش کی ہوئی لائے تو حضرت والا علیہ الرحمۃ نے فرمایا کیا پالش
کی اُجرت دیدی ہے؟ لانے والے نے عرض کیا حضرت وہ جاننے والا تھا اس لیے اس نے نہیں لی اس پر
حضرت نے فرمایا یہ جاننے کا حق صرف ایک جانب ہی ہے یا دونوں طرف ہے تم بھی کبھی جاننے کا حق ادا
کرتے ہو یا یہی پڑتا ہے۔ کبھی آنے دو آنے کی کوئی چیز تم بھی تو دے دیا کرو کہ یہ میرا جاننے والا ہے۔

ارشاد:- سلطان الاذکار کا مطلب یہ ہے کہ ہر وقت ذکر ہوتا ہے کوئی وقت ذکر سے خالی نہ ہو پھر
پاس انفاس کے متعلق فرمایا کہ استاذی المکرم حضرت شاہ انور شاہ کشمیریؒ نے یوں بتلایا تھا کہ جب سانس اندر
جائے تو اَللّٰہ کہے جب وہی سانس باہر آئے تو ھُو کہے۔ بس اسی طرح کرتا ہے کوئی سانس خالی نہ ہے۔ مشق ہو
جانے کے بعد خود بخود نکلنے لگتا ہے اور یہ قاعدہ ہے کہ اول مشقت ہوتی ہے پھر عادت ہو جاتی ہے مگر
عادت ہو جانے کے بعد بھی ثواب برابر ملتا رہتا ہے۔ کیونکہ اختیار سے اُسے شروع کیا تھا۔ ہاں بلا اختیار و ارادہ
جو کام ہو جائے اس کا ثواب نہیں ملتا کیوں کہ حدیث میں ہے۔ انما الاعمال بالنیات

ارشاد:- دعائے استخارہ پڑھنے کا مطلب اللہ تعالیٰ سے دعائے خیر کرنا ہے اور دعائے خیر
کرنے کے بعد جو بھی ہو اس پر ندامت نہیں ہوتی۔ باقی اس کا مطلب اللہ تعالیٰ سے مشورہ کرنا نہیں ہے
کیونکہ مشورہ تو دوستوں سے ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ سے تو دعا ہوتی ہے اور دعائے استخارہ پڑھنا سنت
ہے۔ اس کو پڑھنے کے بعد سات دن کے اندر اندر ایک طرف رجحان پیدا ہو جاتا ہے بس اسی میں خیر تصور
کرے باقی خواب کوئی حجت نہیں بلکہ یہ آپ کا رجحان بھی کوئی حجت نہیں کہ ایسا کرنا ضروری ہو گیا۔ اگر ظاہر
میں خرابی معلوم ہو رہی ہو تو استخارہ کے رجحان کو ترک کر سکتے ہیں اور یہ جو لوگ دوسروں سے کراتے پھرتے
ہیں یہ کچھ نہیں ہے۔ عملیات ہیں لوگوں نے بنا رکھے ہیں۔ نفل پڑھو اور ایک وا ایک نستعین
کی تکرار کرو گردن بائیں طرف یا دائیں طرف پھر جائے گی اگر دائیں طرف پھرے تو یہ کام کرو بائیں طرف کو ہو جائے
تو یہ کام نہ کرو یہ غلط ثابت ہو چکی ہیں۔ دوسروں سے کرانا اگرچہ گناہ نہیں مگر سنت غرہ کرتا ہے۔ اس کے
بعد فرمایا میں تو ایک چھوٹا سا استخارہ پڑھ لیتا ہوں، نماز کے بعد یا سوتے وقت اور یہ بھی حدیث شریف
میں آیا ہے وہ یہ ہے اَللّٰھُمَّ خِرْ لِیْ وَاخْتَرْ لِیْ۔ یہ گیارہ مرتبہ پڑھ لیا کریں۔

ارشاد:- ایک شخص نے دریافت کیا میں نے ایک مکان تجارت کی نیت سے تیار کرایا ہے تو اس کی

زکوٰۃ کی ادائیگی کے لیے قیمت کا کیسے اندازہ لگایا جائے فرمایا کہ ہر تجارتی چیز کی قیمت لگنے کا یہ اصول ہے کہ جس روز زکوٰۃ نکالنی ہے اس روز یہ دیکھے کہ یہ چیز بآسانی کتنے میں بک سکتی ہے۔ بازار میں یہ کتنے کی بکے گی وہ قیمت لگائی جائے۔

جو مکان استعمال کے لیے بنائے خواہ خریدے یا کرایہ دار کو بسائے اس پر زکوٰۃ نہیں ہے۔ ہاں جو تجارت اور فروختگی کے لیے لیا ہے اس کی قیمت پر زکوٰۃ ہے۔

ارشاد :۔ اس راہ سلوک میں اصل وظائف نہیں ہیں بلکہ تہذیب اخلاق ہے۔ پہلے آدمیت آجائے تو بہت جلد وصل ہوجاتا ہے۔ جب تک آدمی رگڑے نہ کھائے آدمی نہیں بنتا اور رگڑے لگتے ہیں شیخ کی خدمت میں رہ کر اس کی خدمت اور اس کے کام دھندے کرنے میں کیونکہ کام دھندا کرنے اٹھنے بیٹھنے میں اس کی غلطیاں معلوم ہوتی ہیں پھر ان پر تنبیہ کی جاتی ہے۔ نہ یہاں برکت ہے نہ علم غیب یہاں تو حرکت کی ضرورت ہے۔

ارشاد :۔ میں حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں گیا اور مایوسانہ انداز میں کہا کہ لوگ تو بڑے بڑے مجاہدے کرتے ہیں میرے پاس مشاغل بہت ہیں اور کمزور آدمی ہوں اور جی بھی چاہتا ہے کہ جو سلوک دوسرے طے کر رہے ہیں میں بھی طے کروں تاکہ مجھے بھی حاصل ہوجائے اس پر حضرت نے فرمایا یہ ضعیف کو بھی حاصل ہوجاتا ہے مایوسی کی کوئی بات نہیں ہر ایک کے لیے الگ الگ راستے ہیں کیوں کہ ایک طریقہ تو ہے نہیں بلکہ طرق الوصول الی اللہ بعدد الانفاس ہیں یہ سن کر ہمت ہوئی اور پھر مجھے معمولی سا پڑھنے کو بتلایا کہ اس کے پڑھنے میں دیر بھی نہیں لگتی اس کے بعد کئی مرتبہ دریافت کیا کہ کچھ اور بتلادیں فرمایا وہی کافی ہے۔ مگر دوسروں کو ذکر کرتے دیکھتا تو شوق بڑھتا اور کرنے لگ گیا۔ ورنہ وہی تھوڑا کافی ہوجاتا۔

ارشاد :۔ شیخ سے مناسبت پیدا کرنی چاہیئے تب جاکر کچھ حاصل ہوتا ہے اور مناسبت اس طرح پیدا ہوتی ہے کہ شیخ کی عادات و اخلاق دیکھ کر ویسی ہی اپنی عادت بنانے کی کوشش کرے۔ اور سارے سلوک کا خلاصہ سنت کی پیروی کرنا ہے اور کچھ نہیں۔

اس کے بعد حضرت مولانا عبدالقدوس صاحب گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے صاحبزادے ابوسعیدؒ کا واقعہ ذکر کیا کہ ابتداء میں حضرت کے یہاں فاقہ ہوا کرتا تھا۔ بھوک میں جب صاحبزادے عرض کرتے تو فرماتے کہ گھبراؤ نہیں دیگ چڑھ رہی ہے وہ عرض کرتے کہاں ہے؟ فرماتے جنت میں ایسی حالت میں بھی جب سلطان عالمگیرؒ نے چودہ گاؤں کی دستاویز بھیجی کہ یہ خانقاہ کے گزارے کے لیے ہے۔ جب قاصد لے کر

آیا تو اسے پھاڑ کر پھینک دیا اور حمام میں ڈال دیا اتنا استغنا تھا اس کے بعد فتوحات ہوئیں تو صاحبزادے شہزادے ہو گئے اور سلطان نظام الدین صاحب سے ہدایت لینے گئے تو صاحبزادے کو خوب رگڑے دیے تب جاکر خلافت عطا کی۔

ارشاد :- حضرت سلطان الاولیاء محبوب الٰہی علیہ الرحمۃ کے یہاں دو آدمی مرید ہونے کو آئے تو حوض پر آکر بیٹھے اس وقت حضرت سلطان جیؒ قریب ہی ٹہل رہے تھے ان دونوں آنے والوں نے گفتگو کی اور کہا کہ یہ حوض تو ہمارے حوض سے بڑا معلوم ہوتا ہے حضرتؒ نے سن لیا جب وہ حاضر خدمت ہو کے تو فرمایا جاؤ پہلے اپنا حوض ناپ کر آؤ۔ وہ ایک ماہ کی راہ چل کر آئے تھے آخر وہ گئے اور بلا ضرورت کلام کرنے کی سزا بھگتی اور اسی میں ان کی صفائی قلب ہو گئی۔

ارشاد :- ایک شخص حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں آیا اور عرض کیا کہ میں چشتیہ خاندان میں مرید ہو جاؤں یا نقشبندیہ سلسلے میں ہوں۔ آپ نے اس کی طبعیت کی مناسبت معلوم کرنے کے لیے کہا کہ اگر تم کو ایک جنگل دیدیا جائے کہ اسے بونا ہے تو کیسے کرو گے اس نے کہا تھوڑا تھوڑا صاف کر کے بوتا جاؤں گا باقی اور صاف کرتا رہوں گا اسی طرح آخر تک کر دوں گا۔ حاجی صاحبؒ نے فرمایا تم نقشبندیہ میں چلے جاؤ کیوں کہ ان کے یہاں پہلے ذکر بتلاتے ہیں بعد میں قلب کی صفائی کرتے ہیں اور ذکر کی برکت سے صفائی ہو جاتی ہے۔ اور چشتیہ پہلے قلب کی صفائی کرتے ہیں پھر ذکر بتلاتے ہیں کہ کھیت پہلے صاف ہو جائے پھر خوب کھیتی اُگے گی۔

ارشاد فرمایا :- اصل دین کی فکر ہے کہ مسلمان کس کس غلطی میں مبتلا ہیں۔ ان کو تبلیغ کرنا۔ اور یہ دھن ہو جائے کہ دین کس طرح پھیلے ورنہ کرسی مدرسی سے کیا ہوتا ہے یہ بھی ایک دھندا ہے۔

ارشاد فرمایا :- فتوے میں یہ دیکھنا ہوتا ہے کہ عام لوگوں کو نفع پہنچے اور ان کو ضرر سے بچایا جائے۔

ارشاد :- حضرت مولانا منفعت علی صاحب فرماتے تھے کہ یہ نماز اور لباس، ڈاڑھی یہ تو لوگوں کی وجہ سے ہے کہ کہیں بدنام نہ کریں۔ یہ بتاؤ اللہ واسطے کیا کرتے ہو۔

ارشاد :- تبلیغ دین محشی و امام غزالیؒ تو اس لیے پڑھوائی تھی کہ تم اپنے عیوب تلاش کرو خالی مطالعہ مقصود نہیں۔

ارشاد :- مسلمان جن غلطیوں میں مبتلا ہیں ان کو بیان کرے اور ان کو صحیح طریقہ بتلائے اور جو

تمابعیت آئیں ان پر صبر کرے۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے میں سید الصابرین ہوں واقعی لوگوں کی باحتیاطی سے بے حد اذیت ہوتی تھی مگر آپ ان کی مصلحت دینی کی وجہ سے آگاہ فرماتے تھے۔

ارشاد :۔ اعمال کی دو قسمیں ہیں ایک تو ظاہری اعمال ان کو فقہ کہتے ہیں دوسرے باطنی اعمال ان کو تصوف کہتے ہیں سو جس طرح ظاہری میں فرائض واجبات پر عمل کرنا ضروری ہے اور محرمات سے اجتناب لازم ہے اسی طرح باطنی اعمال میں جن کو فضائل اعمال کہتے ہیں ان میں بھی فرائض واجبات ہیں ان پر عمل کرنا ضروری اور رذائل سے اجتناب لازم ہے بلکہ باطنی اعمال تو ظاہری اعمال کے لیے بمنزلہ جڑ اور بنیاد کے ہیں اس لیے ان باطنی اعمال کی اصلاح زیادہ قابل توجہ ہے۔

فضائل یہ ہیں۔ صبر، شکر، توحید۔ صدق۔ توکل، محبت، شجاعت، سخاوت، غضب، مراقبہ، محاسبہ وغیرہ
(رذائل مثلاً :۔ حسد۔ ریا۔ کبر، حقد، بغض، کینہ، حرص، عجب، شہرت، نخوت، رعونت ——— آفات لسان وغیرہ)

فرمایا :۔ ولی کی پہچان کثرت ذکر۔ دوام طاعت، اور کسی شیخ کامل کی خدمت میں کچھ عرصہ رہ کر امراض باطنی کا علاج سیکھا ہو ہے اور ایسے شخص کو مصلح کہتے ہیں۔

فرمایا :۔ اپنے عیوب پہچاننے کے چار طریقے ہیں (۱) رہبر کامل مل جائے جو اپنی بصیرت خداداد سے اپنی فراست سے پہچان لے (۲) ایسے احباب مل جائیں جو خلوص کے ساتھ نگاہ رکھیں اور عیوب نفس پر آگاہ کریں۔ (۳) دشمن جو برائیاں چھانٹے اور کہے تو اپنے اندر غور کرتا رہے کیوں کہ دشمن چھانٹ چھانٹ کر ڈھونڈ ڈھونڈ کر عیب نکالا کرتا ہے۔ (۴) دوسروں کے جو عیب دیکھے تو اپنے اندر خوب غور کرے کہ یہ عیب خود میرے اندر تو نہیں ہے۔

حضرت فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت سلمان فارسی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے کہا ہوا تھا کہ مجھے میرے عیوب کی اطلاع دے دیا کرو اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے تو رہبر کامل نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سپرد کیا ہوا تھا المیت فی ید الغسال کی طرح رہتے تھے نیز صحابہ کرام آپس میں اپنے متعلق پوچھ گچھ رکھتے تھے۔

فرمایا :۔ وَكُونُوا مَعَ الصَّادِقِينَ کے امر سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ صادقین ہر زمانے میں موجود رہیں گے کوئی زمانہ ان سے خالی نہ ہوگا ورنہ یہ جو امر الہٰی ہے کہ سچوں کے ساتھ ہو جاؤ اس پر حرف آئے گا کہ جب صادقین تھیں ہیں تو کس کے ساتھ ہو جائیں سو جب تک کونوا کا امر ہے صادقین کا وجود بھی ضروری ہے۔ دمن جتد دید

فرمایا :۔ اعتکاف کی حالت میں حاجت طبعی یا شرعی کے لیے مسجد سے باہر چلا جائے اور بیت الخلاء جائے وضو کرنے کے غسل کرنا آئے تو جائز ہے مگر بلا وجہ دیر نہ لگائے۔ البتہ مسجد سے غسل جمعہ یا ٹھنڈک حاصل کرنے کے لیے نکلنا جائز نہیں ہے کیونکہ یہ خروج بغیر حاجۃ الطبیعہ والشرعیہ ہوا ہے اور پہلا خروج اجازت شرعیہ سے ہوا ہے۔

فرمایا :۔ صحابہ کرام کا معمول شب قدر میں نوافل پڑھنے اور ان میں طویل قیام و رکوع و سجود کرنے کا تھا۔ بہتر یہ ہے کہ تراویح پڑھنے کے بعد قدرے استراحت کرے آخری رات کو بیدار ہو کر عبادت کرے یعنی زیادہ حصہ اول رات کی بجائے آخری شب میں گذارے۔

فرمایا :۔ مذاہب اربعہ معلوم کرنے ہوں تو اس بارے میں امام شعرانی کی میزان معتبر کتاب ہے البدایہ والنہایہ میں مذاہب اربعہ کے حوالے نقل کئے ہیں۔

فرمایا :۔ مفتی کو چاہیئے کہ عوام الناس کو قواعد کلیہ نہ بتائے بلکہ جو اس نے سوال کیا ہے اس جزیہ کا جواب دیدے اور جواب میں تشقیق نہ کرے کہ شقیں نکالے اگر ایسا ہو تو یہ جواب ہے ایسا ہو تو یہ جواب ہے۔ اگر ایسا ہی ہے تو سوال کی وضاحت کرالے۔

فرمایا :۔ نماز کی ادائیگی کی ظاہری و باطنی اصلاح کیجے اور کچھ نہ کچھ انفاق بھی کیا کرے حضرت مولانا تھانوی رح اپنی کمائی کا ایک تہائی خیرات کر دیا کرتے تھے اور حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ اپنی کمائی کا ایک خمس خیرات کرتے تھے (یعنی پانچواں حصہ)

حضرت مولانا سید اصغر حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو دیکھا ان کے پاس تین چپاتیاں آتی تھیں ان میں ڈیڑھ چپاتی خود تناول فرماتے ایک چپاتی خیرات کر دیتے اور آدھی کسی کو ہدیہ کر دیتے تھے اور کھانے کے ریزے جو دستر خوان پر گرتے وہ پرندوں یا چیونٹیوں کو ڈلوا دیتے تھے اس لیے عالم کو انفاق فرض کے ساتھ کچھ انفاق نفل بھی کرنا چاہیئے۔

فرمایا :۔ مدرس لمبی چوڑی تقریر کر کے سمجھتا ہے کہ میں نے سبق کا حق ادا کر دیا کتاب سمجھا دی اور میرا حق ادا ہو گیا اسی طرح طالب علم سمجھتے ہیں کہ اب امتحان میں پاس ہو جاویں گے یا مدرس بن جائیں گے۔ یہ کافی نہیں ہے زیادہ ضروری یہ امر ہے کہ مدرس اور طالب علم جو کچھ پڑھتے پڑھاتے جائیں اس پر عمل بھی کرتے جائیں اگر عمل کر لیا تو واقعی کتاب کا حق ادا کر لیا اس لیے عمل کرنے اور کروانے کی نیت سے پڑھنا پڑھانا چاہیئے۔

فرمایا۔ خشوع ظاہری سکون کو اور خضوع باطنی سکون کو کہتے ہیں نماز کے اندر خشوع اور خضوع دونوں ہونے چاہئیں۔

فرمایا:۔ وساوس کا ایک درجہ تو غیر اختیاری ہے اس کی تو فکر نہ کریں مگر ایک درجہ اختیاری ہے۔ مثلاً یہ کہ اوّل ہی سے طہارت کا پورا خیال کر لیا جائے پھر وضو باقاعدہ سنت طریقے سے کیا جائے وضو اور نماز کے درمیان میں کوئی دنیوی کام یا بات چیت نہ کی جائے اسی طرح نماز شروع کرنے کے متصل کوئی کام ایسا کر رہا ہے یا خیالات میں لگا ہوا ہے تو اُسے ختم کرے تاکہ اس کام کے خیالات نماز میں نہ ستائیں۔ جب نماز کے لیے کھڑا ہو تو ایک ساعت یہ سوچے کہ میں اللہ تعالیٰ کے سامنے کھڑا ہوا ہوں اب حق تعالیٰ سے ہم کلامی ہوگی میں نماز ادا کر رہا ہوں مجھے دھیان کرنے کی ضرورت ہے پھر اللہ سے دونوں ہاتھ اٹھائے اور نیت کرے کہ میں اللہ تعالیٰ کے روبرو فلاں نماز پڑھتا ہوں اور تکبیر کہتا ہوا ہاتھ باندھ لے۔

حضرت مولانا تھانوی ؒ نے ایک نسخہ لاکھ روپے کا بتلا دیا ہے اور فرمایا تھا جو اُسے کرے گا اسے وساوس معفو ہوں گے۔ پہلے لوگ تو اس حضورِ قلبی کے حصول کے لیے چلہ کشی کیا کرتے تھے مگر میں صرف اتنا کہتا ہوں کہ جو الفاظ پڑھتے جاؤ ان الفاظ کی طرف اپنا دھیان رکھو یا ان کے معنی سوچتے جاؤ اس فکر سے پڑھو گے تو ذکر۔

فرمایا۔ بعض اصحاب حال لوگوں کی حکایات پڑھی کہ ان کے کھیت میں اتفاق سے دوسرے کا بیل چلا آیا تو فکر دامنگیر ہوئی کہ ضرور اس بیل کے پیروں میں مٹی لگی ہوگی اور وہ دوسرے کے کھیت کی تھی میرے کھیت میں جھڑ کر گر گئی ہوگی اور بیل مالک کی بغیر اجازت گھس آیا ہے اب اس مٹی پر میں بیج ڈالوں گا تو دوسروں کی مٹی میں اُگے گا تو یہ گندم میرے لیے جائز ہوں گے یا ناجائز۔

اس کے بعد فرمایا کہ ایک دقیق تقویٰ ہوتا ہے اور دوسرا سداً للذرائع ہوتا ہے یہ دقیق تقویٰ متقدمین صوفیا میں پایا جاتا ہے ان ہی کی ایسی حکایات منقول ہیں۔ سداً للذرائع کا مطلب یہ ہے کہ بعض مرتبہ وہ چیز مباح ہوتی ہے مگر اُسے مباح چیز کو اس لیے ترک کرا دیتے ہیں کہ یہ معصیت یا نفس کی حیلہ سازی کا ذریعہ نہ بن جائے اس پر حضرت تھانوی ؒ کا ایک ملفوظ نقل فرمایا کہ ایک مرتبہ حضرت کے پاس ایک لفافہ ایسا آیا کہ اس پر ٹکٹ تھا مگر ڈاک خانے کی مہر لگنا رہ گئی تھی اُسے اتار کر فرمایا کہ اب اس کا کیا کیا جائے۔ دوبارہ اس کا استعمال تو جائز نہیں کیونکہ یہ ایک بار استعمال ہو چکا ہے۔ اس کا کام پورا ہو گیا، لہٰذا اُسے چاک کر دیا جائے۔ اس کے بعد فرمایا کہ مجھے اس کا استعمال جائز تھا کیوں کہ میں حکومت کو اتنا ٹیکس دے چکا ہوں اس

میں محسوب کر سکتا ہوں مگر اس لیے محسوب نہیں کیا کہ کہیں نفس کو حیلہ نہ مل جائے کہ ہر معصیت میں بھی یہی حیلہ چلانے لگے گا یہ سداً للذرائع کیا گیا ہے۔

اس کے بعد ایک واقعہ نقل فرمایا حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے خنزیر سے کہا حالاں کہ ان کی شریعت میں بھی یہ جانور ناپاک ہے فرمایا اِذْھَبْ، الخناذیر بسلام لے خنزیر وسلامتی کے ساتھ بھاگ جاؤ اس پر کسی نے ان سے عرض کیا کہ خنزیروں کے ساتھ یہ لیسلام کا لفظ کیسا ہے! حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ یہ اس لیے ہے کہ زبان کو بُرا کہنے کی عادت نہ پڑ جائے اس لیے بُرے الفاظ بولنا ہی نہ چاہیئے سدًا للذرائع

ملفوظ:۔ ایک تو برکت کی تشریح حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے کی ہے وہ یہ کہ آمدنی اپنی ہی ذات پر خرچ ہو دوسروں پر نہ لگے جیسے ڈاکٹر۔ وکیل وغیرہ برکت والی کمائی ان پر خرچ ہونے سے بچی رہتی ہے حلال کمائی کی برکت سے اللہ تعالیٰ ایسی آفتوں سے اُسے بچائے رکھتے ہیں۔

دوسرا مطلب یہ ہے کہ رات دن میں اس شخص کے کام بسہولت ہو جاتے ہیں یا تو خرچ ہی نہ ہوا یا دوسروں کی بنسبت کم خرچ میں کام ہو گیا مثلاً دوسروں کا دس روپے میں کام ہوا اس کا وہی کام چار روپے میں ہو گیا یا دوسرے نے سو روپے خیرات کئے جس سے کام بن گیا برکت والے نے دس روپے خیرات کئے اور کام بن گیا یا وقت کی بچت ہو جاتی ہے۔ غیر برکت والا کام بہت دیر سے ہوتا ہے اور برکت والا کام جلدی ہو جاتا ہے یہ سب برکت ہونے کا سبب ہے یا اُسے برکت کہیں گے۔

ارشاد:۔ شیخ سے مناسبت کا مقصد یہ ہے کہ اُسے یوں سمجھے کہ دنیا میں میری اصلاح کے لیے ان سے بہتر اور کوئی نہیں ہے۔ اگر شیخ سے کوئی خطا سرزد ہو جائے تب بھی محبت زائل نہ ہو شیخ کے قول و فعل سے دل میں کوئی اعتراض پیدا نہ ہو حتیٰ کہ اس سے کوئی معصیت سرزد ہو جائے تب بھی انقباض نہ آئے کہ یہ بھی انسان ہے اور معصوم نہیں ہے۔ بشریت سے ایسا ہو گیا ضرور رجوع کر لیا ہوگا۔ بالکل باپ کی طرح کہ باپ سے غلطی بھی ہو جائے تو بیٹے کے دل میں اس کا باپ ہونا نہیں نکلتا بلکہ اس کی بات بناتا ہے اور شیخ کی خدمت میں لگا رہے بغیر خدمت کے مناسبت پیدا نہیں ہوتی اور خدمت کرتے کرتے دل سے دعا نکلتی ہے بس اُسے ہی نظر کرتے ہیں۔ اس دعا سے کام بن جاتا ہے۔ صحابہ کرام ہمہ وقت خدمت میں لگے رہتے تھے، اشارے پر کام کرتے تھے، جان دیتے تھے۔ محبت میں سرشار تھے اس قسم کا برتاؤ اپنے شیخ سے رکھے کہ وہ نائب رسول ہے، اس کی راحت کا خیال رکھے اور اُسے تکلیف سے بچانے کا خیال رکھے

اس پر حضرت ابوالعالیہ رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے مرید غلام بھیک کی حکایت سنائی کہ کسی بات پر ابوالعالیہ رہ غلام بھیک سے ناراض ہوگئے اور باہر نکال دیا۔ غلام بھیک رات دن خدمت کیا کرتے مگر وہاں تو اللہ واسطے کی محبت تھی، برسات آئی مکان کچا تھا ٹپکنے لگا بیوی نے کہا کہ ایک تو کام کا آدمی تھا اسے نکال باہر کیا ہم پر مصیبت اُتری ہے۔ حضرت بولے میں نے نکالا ہے تم نے تو نہیں نکالا اس پر بیوی نے غلام بھیک کو بلایا کہ چھت ٹھیک کر دیے وہ فوراً آئے اور چھت کوٹ رہے تھے حضرت ابوالعالیہ رہ کو یہ ادا پسند آئی اور آدمی سے کہ ان کو آواز دی کہ دن بھر کام کرتے ہوئے ہوگیا کھانے کی آواز سن کر غلام بھیک چھت پر سے کود پڑے اتنی خوشی ہوئی کہ سیڑھی سے اترنا بھی دیر سمجھا وہیں سے کود پڑے یہ لگاؤ ہو تب کام چلتا ہے۔

○

○ ○

" ظاہر ہے کہ منزل مقصود تک پہنچنے کے لیے محض راستہ جان لینا تو کافی نہیں، جب تک ہمت کر کے قدم نہ اٹھائے اور راستہ پر نہ چلے اور ہمت کا نسخہ بجز اہل ہمت اور اطاعت کے اور کچھ نہیں ورنہ سب کچھ جاننے کے بعد بھی حالت یہ ہوتی ہے کہ ؎

جانتا ہوں ثواب طاعت و زہد

پر طبیعت ادھر نہیں آتی

عمل کی ہمت و توفیق کسی کتاب کے پڑھنے یا سمجھنے سے پیدا نہیں ہوتی، اس کی صرف ایک ہی تدبیر ہے کہ اللہ والوں کی صحبت اور ان سے ہمت کی تربیت حاصل کرنا اسی کا نام تزکیہ ہے، قرآن کریم نے تزکیہ کو مقاصد رسالت میں ایک مستقل مقصد قرار دے کر تعلیمات اسلام کی نمایاں خصوصیت کو بتلایا ہے "

(حضرت مفتی اعظمؒ، معارف القرآن، ص ۲۸۴ ج ۸)

○ ○

○

مولانا عبدالرؤف صاحب
معین مفتی دار العلوم کراچی

میرے حضرتؒ

پہلی حاضری:- ۱۳۸۶ھ میں احقر مدرسہ اشرفیہ سکھر میں شرح وقایہ اولین مولانا احمد اللہ خاں صاحب مظاہری سہارنپوری مدظلہم العالی سے پڑھا کرتا تھا۔ وسط سال میں کراچی میں حسن قرأت کے ایک جلسہ میں مدرسہ اشرفیہ سے ہمارے استاذ قاری ابوالحسن صاحب مدظلہ اور ان کے بعض شاگرد تشریف لیجا رہے تھے، جن میں بعض طلباء احقر کے ہم درس بھی تھے۔ اور ان دنوں ہماری جماعت مختصر ہی تھی تقریباً صرف نو، دس افراد شریک درس تھے ــــ احقر نے اس وقت تک کراچی نہیں دیکھی تھی۔ صرف نام ہی نام سنا تھا اور اس کی تعریفیں سنی تھیں اس لیے اس کے دیکھنے کا شوق تھا اور اس کے بارے میں عجیب تصور ذہن میں تھا کہ خدا جانے کیسا دلفریب اور خوبصورت شہر ہوگا اور کیسی کیسی عمارتیں ہوں گی، اسٹیشن کتنا آراستہ ہوگا۔ بہرحال پوری جماعت حسن قرأت کے جلسہ میں شرکت کرنے اور کراچی کی سیاحت کے لیے تیار ہوگئی، احقر بھی ان کے ہمراہ تیار ہوگیا اور حضرت والد ماجد مدظلہم سے اجازت لے لی اور سفر پر روانہ ہوئے۔

کراچی کینٹ اسٹیشن پر جب اترے اسٹیشن کی سادگی دیکھکر سخت حیرت ہوئی کہ یہ کراچی کا اسٹیشن ہے! پھر جب اس سے نکلے تو ٹرام انتہائی بوسیدہ حالت میں دیکھی اور پھر کچھ دور تک جھونپڑیوں اور خستہ حال دکانیں دیکھ کر تصورات کی پوری عمارت منہدم ہوگئی اور پھر اس کے بعد الحمدللہ کبھی کسی شہر کے دیکھنے کا شوق پیدا نہ ہوا۔ الغرض دار العلوم کورنگی کراچی حاضری ہوئی یہاں ایک متعلم مولوی اسلام الدین صاحب شکارپوری دارالطلباؐ میں رہا کرتے تھے جو حضرت والد ماجد مدظلہم کے شاگرد تھے اور احقر سے محبت کرتے تھے ان کے کمرہ میں قیام ہوا اور ظہر کی نماز کے بعد انہی کی راہنمائی میں مسجد دار العلوم کے شمالی دروازہ سے جس سے حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے نکلنے کا عام معمول تھا۔ جو درسگاہوں کے درمیان سے ہوتا ہوا دارالافتاء اور وہاں سے حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ

کے مکان کی طرف چلا جاتا ہے، اس راستہ پر مسجد سے نکلنے کے بعد ملاقات ہوئی احقر نے سلام کیا اور اپنا مختصر تعارف کرایا، چونکہ حضرت والد ماجد مدظلہم کا حضرت رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت کا تعلق عرصہ سے قائم تھا اس لیے حضرت رحمۃ اللہ علیہ جلد ہی پہچان گئے اور خیریت دریافت فرماتے رہے پھر تعلیم کے بارے میں دریافت فرمایا احقر نے شرح وقایہ اور اس کے ساتھ کی دیگر کتب عرض کیں سنکر فرمایا کہ بھائی آدھے مولوی تو بن گئے یہ جملہ حضرت نے کچھ ایسے پیار بھرے اور شفقت بھرے انداز سے فرمایا کہ آج تک یہ ذہن میں محفوظ ہے۔ بعد کی باتیں کیا ہوئیں کچھ یاد نہیں۔ پھر حضرت والا موجودہ دار الافتاء میں تشریف لاتے یہ عمارت بالکل نئی نئی بنی تھی لہذا اس میں الماریاں لگ رہی تھیں، کام دیکھ کر حضرت گھر تشریف لے گئے جو دار الافتاء کے پیچھے ہے اور احقر واپس آگیا یہ احقر کی سب سے پہلی ملاقات ہوئی۔

<u>دوسری حاضری</u>:۔ اس کے بعد پھر سکھر میں کسی اہم اجتماع میں حضرت تشریف لائے اور جمعہ کی نماز سے پہلے قدیم جامع مسجد میں حضرت کا خطاب ہوا، وہاں زیارت ہوئی بیان یاد نہیں البتہ حضرت والد ماجد مدظلہ نے وہ بیان قلمبند فرما لیا تھا جو البلاغ نمبر میں غالباً ان کے مضمون کا جز بن گیا پھر اسی موقعہ پر یا غالباً کسی دوسرے موقعہ حضرت والا سکھر تشریف لائے ہوئے تھے تو حضرت والد ماجد مدظلہم حضرت کو ہمارے گھر لائے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ حضرت گھوڑا گاڑی میں تشریف لاتے تھے گلی سے باہر گاڑی رکی اور حضرت گاڑی پر سے اُترے اور اس وقت حضرت سفید لباس میں ملبوس نورانی چہرہ اور عجیب پر انوار شخصیت معلوم ہو رہے تھے، گھر تشریف لائے اور دسترخوان بچھایا گیا، جاپانی پھل اس زمانے میں شروع ہی ہوا تھا اور ہم نے نام ہی نام سنا تھا دیکھا بھی نہ تھا، غالباً سب سے پہلے ہمارے گھر حضرت ہی کے لیے یہ پھل آیا حضرت والاؒ نے پسند فرمایا مزید کچھ باتیں فرمائیں جو یاد نہیں مگر احقر برابر حاضر خدمت رہا اس کے بعد پھر ایک طویل عرصہ تک کوئی ملاقات نہ ہوئی یہاں تک کہ احقر موقوف علیہ میں پہنچ گیا اور شعبان میں فراغت کے بعد دورۂ حدیث دار العلوم کورنگی میں طے ہوا۔

<u>دورِ سعید</u>:۔ چنانچہ شوال ۱۳۸۹ھ میں حاضر ہوا اور دورہ حدیث کے امتحان داخلہ سے فارغ ہو کر حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر ہوا اس وقت حضرت والا حضرت مولانا محمد رفیع صاحب مدظلہ کے موجودہ مکان کے صحن میں تشریف فرما تھے سردیوں کا موسم تھا دھوپ میں چارپائی پر آرام فرما تھے اور طبیعت علیل تھی گھر سے باہر نہیں آتے تھے اور آجکل بعض استقبالیہ میں جو صوفے بچھے ہیں وہ اس وقت حضرت کی چارپائی کے

کے اردگرد تکیے ہوئے تھے جن پر اساتذہ کرام، منتظمین اور تخصص کے طلباء آکر بیٹھا کرتے اور حضرت سے مستفید ہوتے، حضرت نے میرے داخلہ اور قیام وطعام کے متعلق دریافت فرمایا احقر نے عرض کیا کہ سب انتظام ہوگیا۔ اس کے بعد حضرت کی خدمت میں حاضری ہوتی رہتی، احقر حضرت کی مجلس میں پابندی سے حاضر ہوتا جو اتوار کو عصر کی نماز کے بعد ہوتی تھی، اور جمعہ کے روز بھی عصر کے بعد ہوتی اور جب صحت ٹھیک ہوتی تو روزانہ بھی عصر کے بعد مجلس ہوا کرتی اور یہ سب مجلسیں موسم کی تبدیلی سے کبھی دارالافتاء میں اور کبھی دارالافتاء کے باہر چبوترے پر ہوتیں، حضرت رحمۃ اللہ علیہ نماز عصر کے بعد اوّل گھر تشریف لیجاتے جہاں عصر کے بعد چائے نوش فرمانے کا معمول تھا اس سے فارغ ہوکر تشریف لاتے اتنے میں یہاں معتقدین اور مستفیدین جمع ہوجاتے اور جب تشریف لاتے تو اچھا خاصا اجتماع ہوچکا ہوتا اور حضرت والا ایک چوکی جس پر گدّہ اور گاؤ تکیہ لگا ہوتا جلوہ افروز ہوتے صحت کے زمانہ میں کبھی ملفوظات عالیہ ارشاد ہوتے اور کبھی کسی خاص موضوع پر بیان فرماتے جو انتہائی مفید اور بے شمار علوم ومعارف پر مبنی ہوتا اور مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ کے اس شعر کا عملی مشاہدہ ہوتا ہے

بینی اندر خود علوم انبیاء — بے کتاب وبے معید واوستا

افسوس ہے کہ احقر اپنی تحریر کی سست رفتاری کی وجہ سے ملفوظات ومواعظ تحریر نہ کرسکا، چند ایک ملفوظ جو اتفاقاً لکھ لیے تھے اور جو باتیں زبانی سن کر یاد رہیں اور جو ہم باتیں حضرت میں نمایاں طور پر پائیں وہ اپنی ناقص بساط کے مطابق تحریر کرتا ہوں شاید کسی کی فلاح کا ذریعہ بن جائیں اور حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے درجات بلند ہوں ناظرین کرام ان میں کہیں غلطی محسوس کریں تو وہ احقر کی کوتاہی سمجھیں اور جو کچھ درست ومفید پائیں وہ حضرت کی طرف منسوب کریں۔ واللہ الموفق والمعین۔

<u>ارشادات</u>: ایک بار ارشاد فرمایا۔ شیخ عبدالقادر جیلانیؒ چالیس سال تک رحمت باری تعالیٰ کے موضوع پر وعظ فرماتے رہے اس کے بعد خیال آیا کہ کہیں لوگ رحمت باری تعالیٰ کو سن سنکر اعمال صالحہ کرنے سے نہ رک جائیں، چنانچہ ایک روز شیخ نے خوف باری تعالیٰ کے موضوع پر واعظ فرمایا جس کا لوگوں پہ اتنا اثر ہوا کہ جلسہ میں سے چار پانچ آدمی فوت ہوگئے، کہ شیخ پر عتاب ہوا کہ کیا میری رحمت چالیس سال میں ختم ہوگئی؟

ایک بار ارشاد فرمایا: امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کے درس میں پانچ صد پگڑیاں شمار کی جاتی تھیں مراد اس سے علماء ہوتے تھے، اس زمانہ میں طلباء پگڑی نہیں باندھا کرتے تھے، بلکہ پگڑی پورا عالم ہی باندھا کرتا تھا، غور کرو طلباء اور عوام کی کتنی کثرت ہوگی۔

شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کے واقعۂ بالا کے تحت حضرت والا نے یہ بھی فرمایا کہ مبتدی کو امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب احیاء العلوم کے کتاب الخوف کا مطالعہ نہ کرنا چاہیئے کیونکہ یہ امام نے اس حالت میں لکھی ہے جب کہ ان پر خوف کا غلبہ تھا، اس کے پڑھنے سے بعض دفعہ انسان خدا کی رحمت سے مایوس ہو کر خیال کرنے لگتا ہے کہ میری مغفرت بھی ہوگی یا نہ ہوگی۔

عورتوں کے پردہ کا مطلب :- ایک بار ارشاد فرمایا۔ لوگ عورتوں کے پردہ کا مطلب غلط سمجھتے ہیں اور یہ جانتے ہیں کہ بس انہیں تو چار دیواری میں بند رہنا چاہیئے اور اسی کو پردہ کا صحیح مفہوم سمجھتے ہیں۔ بلکہ جس طرح ہمارا دل ہے اور خواہشات ہیں اسی طرح ان کی بھی خواہشات ہیں ان کا بھی خیال رکھنا چاہیئے اور ان کو اتنی راحت پہنچانی چاہیئے کہ وہ اپنے آپ کو قیدی محسوس نہ کریں اور ان کو پردہ میں شرعی حدود کا خیال رکھتے ہوئے تمام تفریحات کرا دینی چاہیئیں اور اتنی کرا دیں کہ وہ خیال کرنے لگیں کہ بے پردہ ہونے کی صورت میں بھی اتنی تفریحات نہیں کر سکتیں جتنی ہم نے پردہ میں کر لیں چنانچہ یہ بھی فرمایا کہ میں نے اپنی اہلیہ کو تمام تفریحی مقامات پردہ ہی میں دکھا دیئے اور وہاں لے گیا، حتیٰ کہ انھوں نے خود کہہ دیا کہ یہاں تو سب خرافات ہی خرافات ہیں، گھر ہی میں رہنا بہتر ہے۔ ایسا کرنا اپنی وسعت کے مطابق بہتر ہے۔

ذکر کی بنیاد :- ارشاد فرمایا۔ ذکر کی بنیاد یہ ہے کہ ذکر خوب توجہ سے کرے اور انسان کا دل ہر وقت اللہ کی طرف متوجہ رہے۔ اور یہ دولت کثرتِ ذکر اور صحبتِ اولیاء سے حاصل ہوتی ہے۔

مصلحت بینی :- ارشاد فرمایا۔ لوگ مصلحت بینی میں بہت افراط میں مبتلا ہیں، حتیٰ کہ اچھے خاصے دیندار، سمجھدار لوگ بھی مبتلا ہیں اور کہتے ہیں کہ بھئی کیا کریں حالات نے ایسا مجبور کیا کرنا ہی پڑا۔ ایسا ہرگز نہیں ہے، بلکہ مصلحت بینی دفع مضرت تک تو جائز ہے۔ جلب منفعت کے لیے جائز نہیں۔

دہلی کے حکیم عبدالمجید دہلوی کی حذاقت کا حیرت ناک واقعہ

ایک بار حضرتؒ نے دہلی کے مشہور حکیم، حکیم عبدالمجید دہلوی کی حذاقت کا واقعہ اس طرح بیان فرمایا کہ، حکیم عبدالمجید دہلوی دہلی کے مشہور حکیم تھے اور ان کے متعلق بہت عجیب و غریب واقعات منسوب تھے اور کرامات سے معلوم ہوتے تھے بہت شاہانہ ٹھاٹھ سے رہتے اور بڑے بڑے امراء کو کان پکڑ کر نکلوا دیتے، ان کے سامنے کسی کو بولنے کی مجال تک نہ ہوتی، پھر بھی امراء ان کی خدمت ہی میں آتے اور منت و عاجزی کرتے،

فن ایسی چیز ہے کہ اگر آ جائے اور حاصل ہو جائے تو پھر اچھے اچھے آدمی عاجزی کرتے ہیں۔

اور آدمی بڑے راحت اور آرام سے زندگی بسر کرتا ہے۔ چنانچہ حکیم صاحب کا نبض دیکھنے کا بھی طریقہ عجیب تھا نبض پر صرف ایک انگلی رکھتے اور اپنے شاگردوں کو فوراً مخصوص اشارہ فرما دیتے۔ شاگرد بھی اتنے حاذق اور اتنی تربیت یافتہ تھے کہ استاد کے اشاروں اور اندازوں کو خوب جانتے تھے، وہ اشارہ فرماتے شاگرد نسخہ لکھ دیتے،

واقعہ کی ابتداء: ایک دفعہ ایک انگریز دہلی آیا جو ڈاکٹر بھی تھا آپ کی شہرت سن کر بطور امتحان حاضر خدمت ہوا اور مریضوں کی صف میں بیٹھ گیا، حکیم صاحب اپنے مخصوص طریقہ کے مطابق لوگوں کی نبض پر ایک انگلی رکھتے اور اشارہ سا کر کے آگے بڑھ جاتے حتیٰ کہ اس انگریز ڈاکٹر کی نبض بھی دیکھی اور اشارہ کر دیا، شاگردوں نے فوراً نسخہ لکھ دیا، اس انگریز ڈاکٹر سے ضبط نہ ہو سکا اور کہا کہ کیا ماجرہ ہے؟ مجھے تو کوئی مرض نہیں آپ نے یہ نسخہ کیسے تجویز کر دیا۔

حکیم صاحب نے پہلے خوب ڈانٹا کہ تمہیں اس سے کیا مطلب؟ علاج کرانا ہے تو کراؤ ورنہ دفع ہو جاؤ جب اس نے اپنا تعارف کرایا اور کہا کہ میں ڈاکٹر ہوں تب آپ نے فرمایا اچھا اب میں بتاتا ہوں چنانچہ پڑھے لکھے لوگوں کو بتا دیا کرتے تھے، اور کہا کہ تم کو آج سے بیس سال پہلے ایک خطرناک مرض لاحق ہوا تھا اور تم متعدد علاج کرانے کے بعد صحت یاب ہوئے اور بمشکل جان بچی تھی۔ اب پھر اُسی مرض کے اثرات اندر ہی اندر پیدا ہو رہے ہیں لیکن ابھی ظہور نہیں ہوا، لیکن پندرہ روز کے بعد ان کا ظہور ہونا شروع ہو گا، میں نے اس کے لیے یہ نسخہ تجویز کیا ہے،

ڈاکٹر نے آزمائش کے طور پر نسخہ استعمال نہ کیا اور پندرہ روز کا انتظار کیا۔ چنانچہ پندرہ روز کے بعد اسی مرض کے اثرات ظاہر ہونے لگے اور تکلیف ناقابل برداشت ہوئی تو وہ سخت پریشان ہوا اور حکیم صاحب کی خدمت میں دوڑا ہوا آیا اور صورتحال سے آگاہ کیا اور اس مرض کا کوئی نسخہ طلب کیا آپ نے انکار فرما دیا۔ بلکہ یہ بتا دیا کہ تمہارے اس مرض کا اب کوئی علاج نہیں اور تم اتنے دن زندہ رہ کر فلاں دن مر جاؤ گے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

صحبتِ شیخ: فرمایا آدمی جب تک شیخ کی صحبت میں نہ رہے اور اس کی سختی برداشت نہ کرے، (بلکہ اس زمانہ میں تو لوگ نرمی بھی برداشت نہیں کرتے) فائدہ نہیں ہوتا۔

حضرت سے سُنے ہوئے اشعار: حضرت رحمۃ اللہ علیہ اپنے بیان میں موقع بموقع اُردو، فارسی اور عربی

کے اشعار بھی پڑھا کرتے تھے اور ایسے برمحل پڑھتے کہ سن کر روح پھڑک اٹھتی اور (ان من الشعر حکمۃ وادکاقول) کا پورا مظہر ہو تا سامعین جھوم جاتے اور قلوب پر شدید اثر ہوتا۔ شاہ ظفر کے یہ اشعار حضرت والا سے بارہا سنے تھے۔

تھے جو اپنے عیوب سے بے خبر
رہے دیکھتے اوروں کے عیب وہنر
پڑی اپنے عیوب پہ جو نظر
تو جہاں میں کوئی بُرا نہ رہا

ظفر آدمی نہ اسکو جانیئے گا
ہو وہ کتنا ہی صاحب فہم وذکا
جسے عیش میں یاد خدا نہ رہی
جسے طیش میں خوفِ خدا نہ رہا

حضرت کا عجیب شعر:۔ ایک بار حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا شروع میں میری طبیعت میں شوخی تھی چنانچہ مضامین بھی اسی انداز کے لکھا کرتا اور بعض دفعہ شوخ طبع سے کچھ اشعار بھی اسی انداز کے نکل جاتے یہ ایک شعر بھی اسی زمانہ کا ہے (جو غلام احمد قادیانی کے متعلق ہے) ؎

تم ابوذر بھی ہو، خالد بھی ہو سلمان بھی ہو
صرف اتنا تو بتاؤ کہ مسلمان بھی ہو

حضرت کے عطا فرمودہ اشعار:۔ ایک مرتبہ احقر حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوا۔ حضرت والا کچھ قدیم خطوط و اوراق پھاڑ کر کنڈی میں ڈال رہے تھے اسی اثنا میں ان اوراق میں سے ایک قدیم ورق آپ نے لے کر درمیان سے تھوڑا سا پھاڑا پھر رہنے دیا اور احقر کو عنایت فرمایا اور فرمایا کہ میں اسے پھاڑنا چاہتا تھا مگر خیال آیا کہ آپ کو دیدوں شاید آپکے کام آجائے احقر نے بصد شکر انہیں لے لیا واپس آکر کاغذ کھول کر دیکھا تو حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے مبارک قلم سے درج ذیل اشعار اس میں تحریر تھے انہیں پڑھ کر احقر کی روح پھڑک اٹھی اور عجب کیفیت طاری ہوا آج بھی جب انہیں پڑھتا ہوں تو عجب روحانی سرور

پاتا ہوں ؎

تیرے دیکھنے کی جو آس ہے، یہی زندگی کی اساس ہے

میں ہزار تجھ سے بعید ہوں یہ عجب کہ تو مجھ پاس ہے

تیری ذات پاک ہے لازوال تیری سب صفات ہیں بے مثال

تو بعید وہم و خیال ہے تو ورائے عقل و قیاس ہے

کسی انجمن میں قرار ملا نہ کسی چمن میں بہار ملی

کہوں کس سے حالت زار دل کہ وہ ہر جگہ پہ اداس ہے

ترا کچھ پتہ بھی جو پا گیا وہ تمام جہان پہ چھا گیا

مجھے اب کسی سے امید ہے نہ کسی کے خوف و ہراس ہے

ایک شعر :- ایک مرتبہ دوران تقریر یہ شعر پڑھا ؎

ذکر اتنا کیا تیرا ہم نے

قابل ذکر ہوگئے ہم بھی

حضرت کی شان تواضع :- حدیث شریف میں ہے من تواضع للہ رفعہ اللہ (او کما قال) یعنی جو شخص اللہ تعالیٰ کے لیے تواضع کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کو بلند کر دیتے ہیں، اس حدیث میں تواضع اور اس کا ثمرہ بیان کیا گیا ہے۔ تواضع کا حاصل یہ ہے کہ بالقصد اپنے آپ کو سب سے کمتر سمجھے اور دوسروں کو فی الحال یا فی المآل اپنے سے بہتر سمجھے، اس کا ثمرہ یہ ہے اللہ تعالیٰ ایسے شخص کو بلند مرتبہ اور اونچا مقام عطا فرمائیں گے

یہ وصف حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی ذات اقدس میں علی وجہ الکمال موجود تھا، حضرت والا اپنے کو ایسا مٹائے اور فنا کئے ہوئے تھے کہ بالکل لاشیٔ محض سمجھتے تھے، ہیئت، وضع قطع، چال ڈھال قول و فعل اور تقریر و تحریر سب سے یہ وصف نمایاں ہوتا تھا۔

چارپائی پر بیٹھنا گوارہ نہ فرماتے :- آخر عمر میں اکثر چارپائی پہ آرام فرما ہوتے اور اکثر اسی پر بیٹھ کر عوام سے خطاب کر مستفید فرماتے لیکن جمعرات کو اساتذہ کی خصوصی اصلاحی مجلس ہوتی اس میں باوجود ضعف و نقاہت اور سخت علالت کے چارپائی سے نیچے فرش پر تشریف فرما ہوتے اور چارپائی پر بیٹھنے سے حیاء فرماتے حالانکہ تقریباً تمام اساتذہ ان کے شاگرد یا شاگردوں کے شاگرد ہوتے اور پھر بار بار فرماتے کہ مجھے آپ حضرات

کے سامنے اوپر بیٹھتے ہوئے شرم آتی ہے۔ تمام اساتذہ کرام اوپر ہی آرام فرمانے پر اصرار شدید فرماتے مگر حضرت اس کو گوارہ نہ فرماتے حتیٰ کہ سب حضرات کے نیچے بیٹھنے سے دلگیر ہوتے، اگر بہت حالت خراب ہوتی اور نیچے آنے کی سکت نہ ہوتی تو چارپائی پر تشریف رکھتے ہوئے بار بار عذر فرماتے رہتے ان اساتذہ کے ساتھ بڑے ہی احترام سے پیش آتے۔ اور اتوار کو جو مجلسِ عام ہوتی اس میں بھی حضرت چارپائی پر بیٹھنے کا عذر بار بار فرماتے کہ میں اپنی علالت اور ضعف کی وجہ سے لاچار ہوں ورنہ آپ حضرات سے بلند ہو کر بیٹھنے کو دل بالکل گوارا نہیں کرتا اور کئی بار تو یہاں تک فرماتے ہوئے سُنا کہ میں آپ سب حضرات کو اپنے سے بہتر سمجھتا ہوں اور آپ حضرات کو آنے سے نفع ہو یا نہ ہو مگر میں باطن میں ضرور نفع محسوس کرتا ہوں چنانچہ حضرت اس اجتماع کی بیحد قدر فرماتے اور کبھی ناغہ نہ ہونے دیتے اگر بولنے کی طاقت نہ ہوتی تو خاموش بیٹھے رہتے مگر مجلس ضرور ہوتی سب لوگ کچھ دیر کے لیے حاضر ہوتے اور دعا کر کے اور مصافحہ کر کے جاتے اور حضرت والا کبھی فرماتے کہ نفع باطنی کے لیے بولنا ضروری نہیں بغیر بولے بھی (یقیناً) نفع ہوتا ہے۔

<u>چوکی پہ بیٹھنے کی وضاحت</u>:۔ صحت کے زمانہ میں مجلس عام کے وقت ایک چوکی پر تشریف فرما ہوتے اس کے بارے میں بھی حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے مجلس ہی میں فرمایا کہ آپ حضرات سے اوپر ہو کر بیٹھنے کو طبیعت گوارا نہیں کرتی لیکن نیچے بیٹھنے میں دوسروں کو دیکھنے اور سننے میں تکلیف ہوگی اس لیے اس پر بیٹھ جاتا ہوں۔

جب کوئی بزرگ شہر سے یا کراچی کے علاوہ کسی دوسرے شہر یا ملک سے تشریف لاتے تو حضرت رحمۃ اللہ علیہ بہت ہی عاجزی کے ساتھ ملتے اور دیر تک انتہائی متواضعانہ گفتگو فرماتے اور یہاں تک فرماتے حضرت میں اس قابل کہاں؟ کوئی میری ملاقات کو آئے، آپ نے مجھ پر بڑا ہی کرم فرمایا۔ میں خود ہی حاضر ہوتا مگر ضعف و علالت کی وجہ سے حاضر نہ ہو سکا اللہ اللہ کیا ٹھکانہ ہے تواضع کا۔

<u>بچوں پر شفقت</u>:۔ تواضع کا غلبہ اس قدر تھا کہ اتنی عظیم شخصیت ہونے کے باوجود چھوٹوں اور بچوں سے انتہائی شفقت فرماتے اور بڑی محبت فرماتے، گھر کے بعض بچے ڈاک کے ٹکٹ جمع کرنے کے شوقین ہوتے تو حضرت والا آنے والے خطوط سے وہ ٹکٹ محفوظ رکھتے اور ان کو عطا فرما کر انہیں خوش کرتے اور ان سے بھی شفقت بھری گفتگو فرماتے۔

احقر حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے پوتوں کے ہم عمر تھا احقر کے ساتھ بھی بیٹوں اور پوتوں کی طرح

بے انتہا شفقت فرماتے، ایک موقعہ پر اپنے صاحبزادگان سے بیان کر فرمایا کہ یہ یعنی (احقر) میرے بیٹے ہی کی طرح ہے اور احقر اکثر نماز فجر کے بعد گھر جاتے ہوئے راستہ میں ملتا تو راستہ میں بڑی محبت سے مزاج پوچھتے اور اکثر یہ جملے ارشاد فرماتے "ملا اسکھر یا ملا مسکین کیا حال ہے" یہ جملے ایسی شفقت و محبت بھرے انداز میں فرماتے کہ احقر کی روح اور رگ رگ وجد کر اٹھتی اور آج تک ان جملوں کی شیرینی قلب میں محسوس ہوتی ہے آہ!! اب یہ جملے سننے کے لیے کان بے قرار ہیں مگر کوئی کہنے والا نہیں !!

حضرت کی شان تواضع یہ ہے کہ ایک روز فرمانے لگے کہ بھئی آپ لفظ "ملا" سے دلگیر تو نہیں ہوتے یہ لفظ تو بڑے بڑے علماء کے لیے استعمال ہوتا تھا۔ احقر نے عرض کیا حضرت اس جملہ سے دلگیر ہونا کیسا ؟ میں تو اس کو اپنے لیے بڑی سعادت سمجھتا ہوں اس پر بہت خوش ہوئے۔ بعض مرتبہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی احقر پر اتنی شفقتیں ہوتیں کہ والدین کی شفقتیں بھول جاتا اور بے انتہا سکون اور عافیت محسوس ہوتی الحمد للہ۔

<u>ڈاکو کا واقعہ</u> :- ایک مرتبہ حضرت نے فرمایا یہ واقعہ (جو بھی آ رہا ہے) میں نے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ سے سنا اور حضرت تھانوی فرماتے ہیں کہ میں نے یہ واقعہ حضرت گنگوہی سے سنا، واقعہ یہ ہے ایک ڈاکو تھا ساری زندگی ڈاکہ زنی میں گذری جب بوڑھا ہو گیا جسم میں طاقت نہ رہی، اعصاب کمزور ہو گئے اور ڈاکہ ڈالنے سے عاجز ہو گیا تو فاقوں کو نوبت پہنچنے لگی اور گذر بسر کی کوئی صورت نہ رہی، آخر اس نے اپنے دوستوں سے مشورہ کیا کہ اب کیا کرنا چاہیئے، دوستوں نے مشورہ دیا کہ پیر بن جاؤ سبز رنگ کا تہبند، سبز رنگ کا چوغا اور موٹے موٹے منکوں کی تسبیح اور ایک لمبا عصا لے کر کسی گاؤں کے باہر بیٹھ جاؤ اور یاد خدا میں مشغول رہو اور تصوف کی ایک دو کتاب مطالعہ میں رکھو اور جھاڑ پھونک شروع کرو، پھر دیکھو کیسی موج ہوتی ہے پہننے کو کپڑے کھانے کو طرح طرح کے کھانے، خدمت کے لیے ہر وقت خادم موجود ہوں گے اور زندگی راحت سے گذرے گی کچھ کرنا نہ پڑے گا۔

اس نے ایسا ہی کیا اور پیر بن کر کسی بستی کے باہر درخت کے نیچے بیٹھ گیا۔ چند روز تک لوگوں نے کوئی توجہ نہ دی، مگر اس کے مستقل قیام اور شغل عبادت نے ان کے ذہنوں میں ان کے بزرگ اور خدا رسیدہ ہونے کا خیال جما دیا، بستی میں کسی کا بچہ بیمار ہوا، دم کے لیے اس کے پاس آئے اور دم کرنے کی درخواست کی اس نے دم کر دیا اور تعویز لکھ دیا، بچہ تندرست ہو گیا، بچہ کا تندرست ہونا تھا کہ پوری بستی میں اس کی بزرگی و قبولیت کی شہرت ہو گئی اور لوگ اپنی مشکلات میں دعائیں کرانے کیلئے حاضر ہونے لگے، نذرانے آنے لگے اور چند ہی روز میں اچھا خاصا کام چل گیا، دکان جم گئی،

کھانے پینے کی کمی نہ رہی، خدمت گار عقیدتمند ہر وقت حاضر باش رہنے لگے اور زندگی بڑے آرام سے گزرنے لگی جب اس کی آخر زندگی کی شہرت دور، دور ہوئی تو کچھ مخلص لوگ بھی اللہ کا نام اور اس کا راستہ دریافت کرنے حاضر ہوئے اور بیعت ہو گئے اور خلوص سے اللہ کی اطاعت کرنے لگے اور یہ ڈاکو پیر ان کے اشکالات اور احوال کی اصلاح تصوف کی کتابوں کے ذریعہ کرتا رہا یہاں تک یہ سب اپنے وقت کے کامل ولی ہو گئے، اور مراقبہ کے ذریعہ ہر ایک کا مقام معلوم کرنے کے قابل ہو گئے ایک روز ان سب نے سوچا اپنے حضرت کا مقام معلوم کرنا چاہیئے وہ کس مرتبہ پر ہیں چنانچہ یہ سب کے سب مراقبہ میں بیٹھے اور دیر تک اپنے شیخ کا مقام دریافت کرتے رہے مگر سر توڑ کوشش کے باوجود ان کے مقام تک رسائی نہ ہو سکی، آخر مراقبہ سے نکلے اور سب اپنی اس حرکت پر نادم ہوئے اور کہنے لگے ہم سے سخت گستاخی ہوئی ہم اس قابل کہاں کہ حضرت کا مقام معلوم کریں حضرت کا مقام اتنا بلند ہے ہم میں اس کے معلوم کرنے کی استعداد ہی نہیں، چل کر حضرت سے معافی مانگنی چاہیئے ورنہ کہیں ایسا نہ ہو ہماری اس گستاخی سے یہ عطا شدہ دولت ہی چھن جائے ۔

چنانچہ خلوت میں یہ سب اپنے شیخ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور گستاخی ذکر کرکے معافی چاہنے لگے، ڈاکو کی توبہ صادق کا وقت آچکا تھا فوراً اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور ٹپ ٹپ نیچے گرنے لگے اور اس نے کہا کہ تم لوگ میرا مقام کہیں اعلیٰ علیین میں تلاش کرتے ہوں گے، میرا مقام تو کہیں اسفل السافلین میں ڈھونڈتے تو ملتا، میں تو ڈاکو ہوں ساری زندگی ڈاکہ زنی میں گزری جب بوڑھا ہو گیا اور ڈاکہ ڈالنا بس میں نہ رہا تو زندگی گذارنے کے لیے یہ مصنوعی پیر بننے کا ڈھونگ رچایا اللہ تعالیٰ نے آپ لوگوں کو آپ کے خلوص کی بدولت نواز دیا ورنہ میری حقیقت اس سے زیادہ نہیں جو بیان کی اور یہ کہہ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا اور کہا میں آج صدق دل سے تمہارے سامنے اللہ سے توبہ کرتا ہوں آپ حضرات بھی میرے لیے دعا کریں اللہ پاک مجھے معاف کر دے اور میری توبہ قبول فرمائے، مریدوں نے جب اپنے شیخ کا یہ حال سُنا رنج وغم سے ان کی چیخیں نکل گئیں اور وہ بھی سب رونے لگے اور دل سے اپنے شیخ کے لیے نہایت مضطربانہ دعا کرنے لگے ۔ اللہ پاک نے ان کی دعاؤں کی برکت اور شیخ کی خالص توبہ سے شیخ کو اسی وقت اولیاء کاملین کی صف میں داخل فرما دیا ۔

حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے یہ واقعہ سُنا کر فرمایا ہمارے یہ اکابر اپنے کو اسی طرح ہیچ در ہیچ اور کسی قابل سمجھتے ہی نہ تھے حالانکہ سب کچھ تھے علم وعمل کے آفتاب و ماہتاب تھے مگر اپنے کو بالکل مٹائے ہوئے

تھے۔ احقر عرض کرتا ہے کہ حضرت والاؒ کا خود بھی یہی حال تھا، آپ سے زیادہ متواضع آج تک کسی کو نہ دیکھا آپ پر ڈاکٹر عبدالحی صاحب مدظلہم العالی کا یہ ارشاد بالکل صادق آتا ہے کہ "وہ تو امیر المتواضعین تھے" چنانچہ کمال تواضع کا ثمرہ اللہ نے دنیا ہی میں ظاہر فرمایا کہ پاک و ہند کی ممتاز ترین شخصیت ہی نہیں بلکہ دنیا بھر کے لیے اللہ تعالیٰ نے حضرت کو ایک عالمی شخصیت بنایا تھا۔ اللہ پاک حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ کی بال بال مغفرت فرماتے اور کروٹ کروٹ جنت نصیب فرما کر بے انتہا درجات بلند فرمائے۔ آمین۔

<u>شانِ خوش روئی</u> :۔ حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ کی ذاتِ اقدس میں ایک وصفِ عظیم طلاقتِ وجہ یعنی خوش روئی سے ملنا تھا، احقر نے اسے حضرت کی ذاتِ گرامی میں علی وجہ الکمال پایا جو عین سنت کے مطابق ہے الحمد للہ ثم الحمد للہ اس نالائق کو پانچ چھ سال خدمت میں حاضری کا شرف حاصل ہوا اس میں سینکڑوں مرتبہ خلوت وجلوت، صحت وضعف اور مختلف حالات میں بار بار ملاقات کا موقع ملا ان ملاقاتوں میں احقر کو ایک ملاقات بھی ایسی یاد نہیں جس میں احقر ملا ہو اور حضرت مسکرا کر نہ بولے ہوں جب کبھی ملا ہمیشہ مسکرا کر بات فرماتے، یہ حال عین سنت کے مطابق ہے اور بہت ہی رفیع حالت ہے۔ حضرت کے علاوہ اور کسی میں اس درجہ کا یہ کمال آج کے علماء میں بہت ہی کم دیکھا بالخصوص امراء تو اس دولت سے محروم ہی ہیں الا ماشاء اللہ وجہ یہ ہے کہ یہ وصف بھی تواضع سے پیدا ہوتا ہے آج کل چونکہ تواضع مفقود ہے نہ علماء میں ہے نہ صلحاء میں نہ صوفیاء میں ہے نہ امراء میں نہ طلباء میں اور نہ عام لوگوں میں سب جگہ کبر ہی کبر کار فرما ہے اس لیے آثارِ کبر نمایاں ہیں اور آثارِ تواضع مفقود۔

طلباء سے محبت اور ان کی اصلاح کی فکر

حضرت والاؒ طلباء سے بیحد محبت فرماتے تھے، جس کا اظہار مختلف انداز سے ہوتا رہتا سب سے زیادہ اس کا اظہار اس وقت فرمایا جب جناح ہسپتال کے شعبۂ امراضِ قلب میں داخل تھے حضرت ہسپتالوں میں جانے کو بالکل ناپسند فرماتے تھے، اول ناخواستہ تشریف لے جاتے اور جلد گھر آنے کی کوشش کرتے، پہلی مرتبہ جب دل کا دورہ پڑا اور جناح ہسپتال میں داخل ہوئے اور وہاں آپ کو تقریباً ایک ماہ رہنا پڑا اس عرصہ میں حضرت والا کے صاحبزادگان، دیگر اہل خانہ و اہل خاندان اور مدرسہ کے اساتذہ اور تلامذہ نے جو خدمات انجام دیں وہ قابلِ رشک ہیں ایک روز آنسو بہاتے ہوئے فرمانے لگے، میں یہاں کہاں آپڑا ؟ میری برادری طلباء ہیں انہیں میں میں نے آنکھیں کھولیں، انہیں میں پلا بڑھا، جوان ہوا اور انہیں میں مرنا چاہتا ہوں، اللہ اللہ طلباء سے کس قدر

محبت تھی، چنانچہ ہمیشہ ان کی اصلاح کی فکر رہتی، نمازِ فجر میں طلباء کی صفیں ملاحظہ فرماتے اگر کم ہوتیں تو اسی روز یا کسی روز طلباء کو جمع فرما کر وعظ فرماتے اور بہت ہی دلسوزی سے انہیں سمجھاتے جس کا اثر یہ ہوتا کہ دوسرے روز ہی صفیں پوری ہو جاتیں اور آخر میں تو طلباء کی اصلاح کے لیے باقاعدہ ہفتہ میں ایک روز مقرر فرما لیا تھا شبِ اتوار میں مغرب سے عشاء تک طلباء سے خطاب فرماتے اور ضعف و علالت کے باوجود حتی الامکان اس کا پورا اہتمام فرماتے اور ہر کام میں حضرت کا یہی معمول تھا کہ جب کوئی کام شروع فرماتے تو اس کو ہمیشہ پابندی سے نباہتے اور حتی الوسع اس کو ناغہ نہ فرماتے۔

حضرت کا بیان بہت پُرلطف، پُرکیف اور پُراثر ہوتا، علمی، عملی، ادبی، تاریخی، فقہی اور قرآن و حدیث کی تشریحات پر مبنی ہوتا، اور حضرت اپنی جہاں دانی کے عجیب و غریب واقعات سناتے کبھی لطائف سُنا کر ہنساتے اور کبھی ایسے عبرتناک واقعات سُناتے کہ مجلس پر سناٹا چھا جاتا اور اہل مجلس پر بیحد اثر ہوتا، متعدد بار کئی ہفتوں تک آیت فلولا نفر من کل فرقۃ طائفۃ لیتفقھوا فی الدین ولینذروا قومھم اذا رجعوا الیھم لعلھم یحذرون ۝ پر بیان فرمایا جس میں طلباء کا پورا نصابِ زندگی بڑی شرح و تفصیل سے بتلایا اور سمجھایا، جس کی کچھ تفصیلات معارف القرآن میں آیت بالا کے ذیل میں معارف و مسائل کے تحت آگئی ہیں اور اس کی ایک مجلس البلاغ میں شائع بھی ہوئی ہے جو ٹیپ کر لی گئی تھی بہرحال اب اس کی تفصیلات کا یہاں موقع نہیں صرف چند باتیں عرض کرتا ہوں۔

<u>خلاصۂ زندگی</u>:۔ ایک مرتبہ طلباء سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا میں اپنی اسی سالہ زندگی کا نچوڑ اور حاصل آپ کو بتلاتا ہوں اس کو توجہ سے سنو! یہ خلاصہ ساری دنیا دیکھ کر اور دنیا داروں اور دینداروں کا تجربہ کر کے، اور زندگی کے تمام اتار چڑھاؤ دیکھ کر بیان کر رہا ہوں وہ یہ ہے کہ آپ جس کام میں لگے ہیں (یعنی تعلیم و تعلّم) اگر یہ خلوص کے ساتھ محض حق تعالیٰ شانہٗ کی رضا کے لیے ہے تب تو یہ ایسا عظیم الشان کام ہے کہ دنیا کا کوئی کام اس کے برابر نہیں یہ سب سے بہتر اور افضل ہے اور اگر خدانخواستہ مقصود اس سے رضائے الٰہی نہیں، دنیا کمانا پیشِ نظر ہے جیسا کہ آج کل یہ کام صرف ایک پیشہ بن کر رہ گیا ہے تو میرے عزیزو پھر دنیا میں اس سے بدتر کوئی کام نہیں العیاذ باللہ

<u>لوگوں کی چار قسمیں</u>:۔ ایک بار طلباء سے خطاب فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے کہ انسانوں کی چار قسمیں ہیں، ۱۔ جن کے نہ دل میں دنیا اور نہ ہاتھوں میں دنیا ایسے بہت سے انبیاء علیہم السلام

اور اولیاء اللہ ہوئے ہیں ۔ ۲۔ وہ جن کے دل میں دنیا نہیں مگر ہاتھوں میں دنیا ہی اس طرح کے بعض انبیاء جیسے حضرت سلیمان علیہ السلام اور بہت سے اولیاء اللہ ہیں جیسے حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کہ ان کے شاہانہ انداز کا یہ حال تھا کہ روزانہ ایک نیا جوڑا بدلتے اور پھر کبھی دوبارہ وہ بدن پر نہیں آتا تھا۔
۳۔ وہ جنکے دل میں دنیا اور ہاتھوں میں بھی دنیا اکثر مالدار ایسے ہی ہیں ۔ ۴۔ وہ جن کے دل میں تو دنیا ہے مگر ہاتھ دنیا سے خالی ہیں ۔ ان چاروں میں سب سے خسارہ والا چوتھے نمبر والا شخص ہے جس کے ہاتھ دنیا سے خالی اور دل دنیا اور حب دنیا سے لبریز ہے یہ شخص انتہائی قابل رحم مسکین اور حقیقی مفلس ہے ۔ اگر ہماری نیت تحصیل علم دین سے معاذ اللہ حق تعالیٰ کی رضا نہیں بلکہ دنیا کمانا مقصود ہے جیسا کہ عام رواج ہے کہ اس لیے پڑھتے ہیں کہ پڑھ کر کہیں مدرس ہو جائیں گے ، امام و خطیب بن جائیں گے تو ایسا شخص خسر الدنیا والآخرۃ کا مصداق ہے کیونکہ دنیا تو اس راستہ میں کبھی ہوئی نہیں ہاں آخرۃ حاصل ہوا کرتی ہے وہ اس غریب نے حاصل نہ کی کیونکہ نیت ہی نہ تھی اس لئے دونوں جہان میں ذلت و رسوائی اس کا مقدر ہوئی اور دونوں جہان برباد ہوتے ، لہٰذا محض حق تعالیٰ کی رضا کے لیے پڑھو اور اس پر عمل کرو۔

اصلاح خلق :۔ یوں تو حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ کی ساری زندگی مخلوق خدا کی اصلاح و تبلیغ میں گذری ہے ایک طرف ملکی اور غیر ملکی کانفرنسوں میں شرکت ہے تو دوسری طرف تحریری میدان میں بے شمار علمی ، عملی اور اسلامی تصنیفات و تالیفات موجود ہیں اور چھوٹے بڑے پمفلٹ اور رسالے ہیں کہیں رؤسا و مملکت کو اصلاحی خطوط لکھے جا رہے ہیں ، اکرم از کم ایوب خاں سے لے کر بھٹو تک تو احقر کو معلوم ہے کہ ان تمام ہی کو کبھی زبانی اور کبھی تحریری سمجھایا اور اللہ کے احکامات کی تعمیل کی طرف بلایا ، اور حسب موقع راہنمائی فرماتے رہے اور اخبارات میں بھی شرعی مسائل اور حکام کی غلط روش پر بیانات جاری ہوتے اور لوگوں کے ذہنوں میں پیدا شدہ اشکالات دور کئے جاتے ۔

اتوار کی مجلس :۔ صحت کے زمانہ میں مسجد دارالعلوم میں نماز جمعہ سے پہلے خطاب عام فرماتے جو نہایت مؤثر ہوتا اور آخرت کی فکر پیدا کرنے والا ہوتا اور ہفتہ میں اتوار کو بھی ایک مجلس ہوتی جو شروع میں عصر سے مغرب تک ہوتی تھی بعد میں گیارہ سے بارہ بجے تک ہوتی تھی جس میں شہر اور اطراف شہر سے اور دور دراز سے لوگ ذوق و شوق سے شریک ہوتے جس میں وہ حضرات بھی ہوتے جن کو حضرت سے بیعت و اصلاح کا تعلق ہوتا اور عام حضرات بھی ، مجلس کی اثر انگیزی کا صحیح نقشہ کھینچنے کے لیے حقیقت یہ ہے

کہ احقر کے پاس وہ الفاظ نہیں جن سے اس کو بیان کیا جاسکے ۔ حضرت کے بیان کا اتنا اثر ہوتا کہ آنکھیں ڈبڈبا آتیں ، کچھ منہ کو آنے لگتا اور لوگوں کی چیخیں نکل جاتیں ، ہفتہ بھر کے قلوب کا زنگ دُور ہو جاتا ۔ آخرت سامنے محسوس ہونے لگتی ، دنیا کی محبت کافور ہو جاتی ، ذکر کے لیے دل تڑپ جاتا ، اتباعِ سنّت کی فکر ہونے لگتی اور مجلس میں شریک ہونے والے ہر شخص کے دل میں اس وقت تقریباً یہی جذبہ ہوتا کہ میں کسی طرح حضرت کے بیان کے مطابق ڈھل جاؤں ، یہ سب حضرت کے خلوص ، للّٰہیت اور اصلاحِ خلق کی جو تڑپ آپ کے قلب میں تھی اس کا اثر تھا ۔

آخر عمر میں بار بار فرمایا کرتے کہ اب مجھ سے کچھ نہیں ہوتا ، بیکاری میں ایک ایک منٹ کہ گراں معلوم ہوتا ہے اور وقت گذارے نہیں گذرتا ، ساری زندگی تو مشغولی میں گذری اب فرصت میں وقت گذارنا بہت دشوار اور بہت بھاری معلوم ہوتا ہے حالانکہ اس وقت بھی آپ اتنے متفرق کام انجام دیتے تھے کہ آج وہ تمام کام آٹھ افراد بھی مل کر پوری طرح انجام نہیں دیتے ، حضرت کا تن تنہا ان کو انجام دینا کرامت ہی معلوم ہوتا ہے ۔ انہی ایام علالت میں حضرتؒ نے اپنی مشہور زمانہ تفسیر معارف القرآن جو آٹھ ضخیم جلدوں میں ہے تصنیف فرمائی جس میں تقریباً تین سال کا عرصہ لگا ۔ اتنا عظیم الشان کام اس قلیل مدّت میں اور ایام علالت میں مکمل کر لینا حضرت کی کرامت ہے ، ورنہ ایسے مشکل ترین کام کے لیے برسہا برس کی ضرورت ہوتی ہے ۔ ان ایام میں باطنی تربیت پانے والوں پر خاص توجہ فرماتے اور جو ذرا بھی اصلاح کی فکر کرتا اور طالبِ اصلاح ہوتے حضرت سخت علالت کے باوجود قبول فرما لیتے اور کبھی کبھی تواضعاً فرماتے اب میں کسی کام کا تو رہا نہیں ایسے ہی قبول کر لیتا ہوں شاید کسی خدا کے بندے کو نفع پہنچ جائے ۔

<u>نماز فجر کے بعد دس منٹ کی مجلس</u> ،۔ نوجوانوں کی درخواستِ اصلاح بڑی خوشی سے قبول فرماتے اور خاص توجہ فرماتے حتیٰ کہ وفات سے ایک دو سال قبل طالبین کو یہاں تک اجازتِ استفادہ عطا فرما دی کہ وہ نماز فجر کے متصل حضرت کی خدمت میں آجایا کریں اور دس منٹ خاموش بیٹھ کر واپس چلے جایا کریں ، احقر کو بھی کئی بار اس حاضری کا موقع ملا ۔ اللہ اللہ حضرت کے کمرہ میں عجیب سماں ہوتا طالبین خاموش سر جھکائے حضرت کے سامنے ہوتے اور حضرت ہاتھ میں تسبیح لیے ان کے سامنے چارپائی پر تشریف فرما ہوتے اور ذکر میں مشغول رہتے ، کمرہ میں مکمل خاموشی ہوتی کبھی کبھی حضرت کی زبان مبارک سے ذکر کا کوئی جملہ قدرے بلند ہو جاتا جس سے اس پرکیف فضا میں عجیب لہر دوڑ جاتی دل زندگی محسوس کرتے اور روح پھڑک اٹھتی احقر نے اکثر یہ جملہ

سُنا ہے۔ سبحان اللہ وبحمدہ سبحان اللہ العظیم اور کبھی کوئی طالب اپنا کوئی باطنی اشکال پیش کرتا (جس کی اجازت تھی) تو حضرت والا اس کو اس طرح حل فرماتے کہ قلوب پوری طرح مطمئن ہو جاتے اور کبھی حضرت کا یہ بیان مفصل ہو جاتا اور تصوف کے جواہرات لٹتے نظر آتے اور دس منٹ کی مجلس میں دل کی عجیب حالت ہوتی۔ حالت میں تغیر بالکل صاف محسوس ہوتا اور حضرت والا ایسے گئے جیسے انوار تجلیات میں ڈوبے ہوئے ہیں، آہ، حضرت کی وہ بات پوری ہو کر رہی جو کبھی کبھی طلباء سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا کرتے تھے کہ عزیزو میری باتیں سن لو ان پر عمل کرو۔ میرے بعد پھر ایسی باتیں سنانے والا نہ ملے گا۔ واقعۃً اب ایسی مجلس جو بیک وقت قرآن و حدیث فقہ و افتاء، تاریخ و ادب، شعر و نثر اور روح تصوف اور بے شمار تجربات پر مشتمل ہوتی کہیں نظر نہیں آتی۔

خود بخود اشکالات کا حل ہو جانا :- آپ کی مجلس میں ہر شخص یہ سمجھتا کہ میرے دل کی بات کہی جا رہی ہے۔ احقر کا خود یہ حال تھا جب تک دار العلوم میں حضرت کی خدمت میں رہا کوئی باطنی اشکال ہی پیش نہ آیا اور کبھی کوئی پیش بھی آیا تو خدمتِ اقدس میں حاضری پر ہی خود بخود حل ہو گیا بہت کم کبھی پوچھنے کی ضرورت پیش آئی البتہ جب چھٹیوں میں گھر جاتا تو بکثرت اشکالات پیش آتے چنانچہ احقر کے اکثر اصلاحی خطوط وہی ہیں جو کراچی سے باہر رہنے کی صورت میں لکھے گئے کراچی میں رہنے کے زمانہ کے خطوط بہت ہی کم ہیں۔

حضرت کا انداز تربیت :- اب حضرت کی انداز تربیت کا ہلکا سا نمونہ پیش کرتا ہوں۔

بیماری میں آہ آہ کرنا :- حال - جب میری طبیعت خراب ہوتی ہے تو ہائے ہائے کرنے کو دل چاہتا ہے اور اندر سے طبعاً یہ آواز نکلتی ہے کیا یہ بے صبری تو نہیں ہے؟

اصلاح :- نہیں اقتضاء حال ہے۔

حال :- کبھی یہ ڈر لگتا ہے کہ دوسروں کو اس سے تکلیف ہو گی، مگر مجھے اسی میں راحت محسوس ہوتی ہے۔

اصلاح :- جب دوسرے کی تکلیف کا اندیشہ ہو تو ان سے علیحدہ رہنے کا اہتمام کر لیں۔

لوگوں کا مولوی، قاری اور مفتی کہنا :- حال - مجھے لوگ قاری، مولوی، مفتی کہتے ہیں اس وقت میں ان کو کیا جواب دوں؟ اور دل کو کیا سمجھاؤں؟

اصلاح :- کچھ جواب دینے کی ضرورت ہی کیا ہے جو کام ہو کر دو۔ دل کو یہ سمجھاؤ کہ میرے مولا کا فضل و کرم ہے۔

کہ مجھ جیسے نادان بے عمل کے متعلق لوگوں کے دل میں اتنی عظمت و محبت پیدا فرمادی اور استغفار بھی کرتے رہو عُجب سے بچنے کی دعا بھی

نالائق کا اقتداء کی امامت کرنا ۔ حال ۔ نماز پڑھانے میں کبھی یہ خیال ہوتا ہے کہ پیچھے اچھے نیک نیک لوگ ہوتے ہیں، میں ان کی نماز برباد کرتا ہوں کیونکہ مجھے نماز میں کامل حضور ہوتا ہی نہیں ، بلکہ اولاً تصحیح الفاظ اور ثانیاً خوش الحانی کی طرف دھیان رہتا ہے اور اس طرف کہ نماز میں کوئی غلطی نہ ہو جائے ۔ اللہ جل شانہٗ کی طرف دھیان بہت کم ہوتا ہے ۔

اصلاح ۔ یہ خیال محمود ہے مگر موجب ترکِ امامت نہیں بلکہ موجب احتیاط فی الامامت ہے ۔

عامیانہ حالت پسند ہونا ۔ حال ۔ میرا دل چاہتا ہے کہ جس طرح پہلے عام لوگوں کی طرح رہتا تھا اب بھی اسی طرح رہوں ، نماز وغیرہ پڑھانے میں ایک قسم کا امتیاز معلوم ہوتا ہے ۔ جو پسند نہیں ۔

اصلاح ۔ اگر اس امتیاز کو اپنا کمال نہ سمجھیں ، نعمت حق باوجود اپنے گناہوں اور فسادِ عمل کے سمجھیں تو مضائقہ نہیں ۔

دورانِ ذکر خیالات کا آنا ۔ حال ۔ نوافل اور تسبیحات پڑھتے ہوئے یہ خیال بہت ستاتا ہے کہ فلاں دیکھ رہا ہے ، حالانکہ میں شروع میں صرف رضائے الٰہی کے لیے پڑھتا ہوں اس کی نیت کرلیتا ہوں پھر جب اس قسم کا خیال آتا ہے پریشانی ہوتی ہے ۔ پھر وہی خیال کرلیتا ہوں کہ میں اللہ کے لیے پڑھ رہا ہوں جب کوئی نیا آدمی سامنے آتا ہے اس وقت یہ خیال بہت زیادہ ستاتا ہے ۔

اصلاح ۔ یوں ہی چلتے رہیئے جب ایسا خیال آئے دوسری طرف دھیان لگائیں آہستہ آہستہ انشاء اللہ اعتدال ہو جائے گا ۔

معارف القرآن کی تکمیل پر اظہارِ مسرت ۔ حال ۔ ایک طالبعلم کے خط کے ذریعہ تفسیر معارف القرآن کے مکمل ہو جانے کی اطلاع ملی بہت ہی خوشی ہوئی ہے فللہ الحمد ۔

اصلاح ۔ تفسیر کیا اور کیسی ہے یہ تو حق تعالیٰ کی قبول پر منحصر ہے مگر مرض و ضعف کے ساتھ اس پر محنت قوت ضرور خرچ کی ہے ۔ وہ بھی اللہ ہی کی توفیق سے ہوئی مجھے اس کی تکمیل سے بہت بڑی مسرت ہے دعا کریں حق تعالیٰ قبول فرمالیں ۔

گانا بجانا سننے سے بچنا مشکل ہے ۔ حال ۔ آج کل بھائی صاحب کی دکان پر ہوں جو ڈھری میں ہے

یہاں سحری کے وقت لاؤڈ سپیکر کی پوری آواز پر ریکارڈ چلائے جاتے ہیں جن کی آواز بہت ہی تیز ہوتی ہے اکثر قوالی نظمیں ہوتی ہیں ممکن ہے گانے بھی ہوتے ہوں بہرحال ریکارڈنگ کی آواز سے بچنا بہت مشکل ہو رہا ہے بعض میں عورتوں کی آواز بھی ہوتی ہے، چونکہ آواز بہت تیز ہوتی ہے اس لیے ذہن دوسری طرف متوجہ نہیں ہوتا، بار بار کوشش کے ذہن کچھ دیر کے لیے دوسری طرف ہوتا ہے پھر اسی طرف منتقل ہو جاتا ہے بہت سخت پریشانی ہے کیا کروں؟ دکان پر رہنا بھی ضروری ہے۔

اصلاح:۔ بس جس قدر اختیار میں ہو ترک التفات سے کام لیں غیر اختیاری کی فکر نہ کریں۔

گندہ ماحول میں مجبوراً رہنے میں کیا کریں۔ حال:۔ یہاں کے حال سے بہت گھبرا گیا ہوں ہر طرف گناہ ہی گناہ معلوم ہوتے ہیں تمام معمولات زندگی بدل گئے ہیں، آپ کی برکت سے اوراد و نوافل کے معمولات پورے ادا ہو جاتے ہیں، ترقی کی امید خواب خیال بن گئی ہے۔ والد صاحب سے بھی کہنے کی ہمت نہیں ہوتی کہ ابھی وہ دورۂ قلب کے مرض سے صحت مند ہوئے ہیں اور مجھے معلوم ہے کہ وہ دوسرا کوئی انتظام کر نہ سکیں گے۔ ایسی صورت میں کیا کروں؟ اور اس ماحول سے کس طرح نکلوں۔

اصلاح:۔ عزیزم السلام علیکم ورحمۃ اللہ ان حالات میں بجز صبر کے کوئی چارہ نہیں، والد صاحب سے کچھ نہ کہیے، باقی ماندہ مدت بھی اب پوری ہونے والی ہے۔

چونکہ بر سخت بہ بند و بستہ باش

ریڈیو پر عورت کی خبریں سننا۔ حال:۔ ریڈیو پر بعض مرتبہ عورت خبریں نشر کرتی ہے تو کیا ایسی صورت میں خبریں نہیں سننا چاہیئے؟ کیونکہ غیر محرم کی آواز ہے۔

اصلاح:۔ ضرورت کے وقت مضائقہ نہیں جب کہ اپنے نفس میں کوئی شر محسوس نہ ہو۔

دلائل الخیرات کے متعلق حضرتؒ کا مذاق۔ حال:۔ احقر کو حضرت والد ماجد مدظلہم العالی نے دلائل الخیرات کی اجازت گذشتہ رمضان میں دی تھی مگر اس کو پڑھنے میں تردد پیش آتا ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا ملفوظ کسی جگہ پڑھا تھا اچھی طرح یاد ہے جس میں فرمایا تھا کہ میرے نزدیک بجائے دلائل الخیرات کی منزل پڑھنے کے اتنی دیر ماثورہ درود شریف پڑھنا بہتر ہے۔ آپ کا اس سلسلہ میں کیا طرز عمل ہے؟

اصلاح:۔ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا ارشاد صحیح ہے حضرت کا یہی مذاق تھا۔ میرا بھی یہی معمول ہے

حضرت سے دلائل الخیرات کی اجازت :۔ حال۔ اگر حضرت والا مناسب جانیں تو دلائل الخیرات کی اجازت بھی مرحمت فرمائیں۔

اصلاح :۔ اجازت کی ضرورت ہی کیا ہے اگر دل چاہتا ہے پڑھا کریں اس میں اتنی بات ضرور ہے کہ والہانہ انداز میں درود شریف ہیں جس سے حب رسول میں ترقی کی اُمید ہے اس نیت سے پڑھا کریں تو حرج نہیں البتہ اس کے مقدمہ میں جو حدیث لکھی ہے وہ موضوع ہے اس کا اعتقاد نہ رکھیں۔

رمضان میں تلاوت کلام پاک :۔ حال۔ رمضان المبارک میں دل چاہتا ہے کہ کلام پاک کی خوب تلاوت کروں مگر تین چار سپارے پڑھ کر طبیعت اچاٹ ہو جاتی ہے، پھر بعد میں مزید تلاوت کا موقعہ بھی نہیں ملتا۔

اصلاح :۔ کوشش کریں مزید موقع ملنے کی، پھر بھی نہ ملے تو حرج نہیں۔

گناہوں کا علم نہ ہونا :۔ حال۔ جب میں اپنے اعمال کا جائزہ لیتا ہوں تو گناہ نظر نہیں آتے جس کی وجہ سے قلب میں ہر وقت خوف سا لگا رہتا ہے کہ بے حسی کا یہ عالم ہے کہ گناہوں کا ادراک بھی نہیں ہوا، اس قدر غفلت ہے کہ اپنے معاصی ہی کا علم نہیں۔

اصلاح :۔ اجمالی علم اور اس پر ندامت کافی ہے تفصیلی یاد رکھنا ضروری نہیں۔

چچی تائی سے پردہ :۔ حال۔ ہمارے یہاں آئی چچی وغیرہ سے پردہ نہیں کرایا جاتا بلکہ یونہی سامنے آجاتی ہیں بچپن سے جو عادت بنی ہوئی ہے اسی کے مطابق ملتے جاتا ہوں، ان سے پردہ کرنے کے متعلق کہنے کی ہمت نہیں ہوتی اور جاتے ہوئے مسئلہ کی رو سے طبیعت بھی رکتی ہے، اکثر تو نیچی نظر کر لیتا ہوں، لیکن ان پر نظر پڑتی ضرور ہے اگر نہ جاؤں تو بھی مشکل، ایسی حالت میں کیا طرز عمل اختیار کروں؟ میرے تمام دوست بھی اس میں پریشان ہیں بعض نے منع بھی کیا تو فساد شروع ہو گیا ممکن ہے ان کی سختی کا نتیجہ ہو بہرحال حضرت والا رہنمائی فرمائیں۔

اصلاح :۔ ان حالات میں نیچی نظر رکھ کر ملنے، بات کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔

جماعت چھوٹ جانا :۔ حال۔ عرض خدمت یہ ہے کہ احقر کی جب کبھی جماعت چھوٹ جاتی ہے تو دو خیال کثرت سے آکر شرمندہ اور پریشان کرتے ہیں ایک تو یہ کہ لوگ کیا کہیں گے کہ حضرت کا اجازت یافتہ ہو کر یہ حرکت اور یہ کوتاہی دوسرے اپنے جن شاگردوں کو اور متعلقین کو نماز باجماعت کی اکثر تلقین کرتا رہتا ہوں ان کا خیال کہ وہ کیا کہیں گے کہ ہمیں تو کہتا ہے، خود کا عمل کیسا ہے، بہت شرمندگی ہوتی

ہے اور دونوں خیالات ہر وقت برائیوں اور کوتاہیوں سے روکتے رہتے ہیں اور اعمال کی اصلاح کا بنتے رہتے ہیں مگر خدائے پاک کی ناراضگی اور نافرمانی کا ڈر مستحضر نہیں رہتا حضرت والا اصلاح فرمادیں۔

اصلاح :- جو چیز بھی اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری کا ذریعہ بن جائے وہ بھی غنیمت ہے۔ اگرچہ اصل چیز یہی ہے کہ جس کام سے رُکنا ہو اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کا استحضار کر کے رکنا چاہیئے۔ لیکن اگر یہ بالفعل حاصل نہیں تو جو اسباب بھی معصیت سے بچنے کا ذریعہ بنیں ان کو غنیمت سمجھیں۔

حضرتؒ کا دوسروں کو ایذا سے بچانے کا اہتمام کامل

یہ وصف بھی حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ میں بدرجۂ کمال موجود تھا جو ایک مؤمن کامل کے لیے ازبس ضروری ہے ہر نشست و برخاست، قول و فعل میں حضرتؒ کو اس کے اہتمام کا ملکۂ راسخہ حاصل تھا گویا یہ چیز حضرتؒ کی عادت ثانیہ بن گئی تھی۔ حضرتؒ اپنے انتہائی کم درجہ کے خادموں کے ساتھ بھی اُسی طرح اس کا اہتمام فرماتے جو بڑوں کے ساتھ فرماتے ______ چنانچہ احقر کو الحمد للہ بار ہا حضرتؒ کی خدمت کا موقع ملا کبھی حضرت خود خدمت کے لیے طلب فرماتے اور کبھی احقر خود عرض کر دیتا۔ اس طلب فرمانے عرض کرنے کے جواب میں ایک بار بھی احقر کو یاد نہیں کہ حضرت نے یہ الفاظ نہ فرماتے ہوں کہ اگر فرصت ہو یا موقعہ ہو یا کسی کام میں حرج نہ ہو تو کیجیے۔ جب خود طلب فرماتے تو یہ الفاظ یا ان جیسے الفاظ کا ضروری اہتمام فرماتے اگر احقر کو کوئی کام درپیش ہوتا تو عرض کرنے پر عذر، بڑی خوشدلی سے قبول فرمالیتے اور المسلم من سلم المسلمون من لسانہ ویدہ کا خوب مظاہرہ ہوتا۔ اب ذیل میں حضرت کا مبارک خط جو ایک واقعہ سے متعلق ہے۔ پیش کرتا ہوں جس سے دوسروں کو ایذا سے بچانے کے وصف کی ایک جھلک دکھانا مقصود ہے، اور صاحب بصیرت آدمی کے لیے اس خط میں بے شمار نصیحت کے درس موجود ہیں۔

واقعہ سنیئے :- حضرت والد ماجد مدظلہم سخت علیل ہو گئے تھے، ڈاکٹری علاج مکمل ہو چکا تھا مگر صحت سنبھالے نہ سنبھلتی تھی بالآخر ایک دوست ایک عامل کو لے کر آئے اس خیال سے ممکن ہے سحر ہو تو اس کا علاج ہو سکے اس عامل نے سحر ہی بتایا اور اس لے حیرتناک انداز سے علاج کیا اور ایک جزیرہ سے قدیم قبروں کے درمیان سے ایک پتلہ نکالا اور پھر سحر کا اثر کیا اس کے بعد حضرت والد صاحب کو بحمد اللہ صحت ہو گئی گو ابھی تک یہ یقین نہیں کہ ڈاکٹری علاج صحت کا ذریعہ بنا یا اس عمل کا علاج۔ صحت کے بعد حضرت والد ماجد مدظلہم نے اس عامل کے علاج کی پوری تفصیل حضرت والا

رحمۃ اللہ علیہ کو تحریر فرمائی حضرت والا نے حالات پڑھ کر فرمایا کہ ان حالات سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ کوئی اچھا عامل ہے۔ اور فرمایا میرے گھر میں آٹھ سال سے سخت علیل اور صاحب فراش ہیں، ممکن ہے ان پر بھی سحر وغیرہ ہو اگر ان عامل صاحب کا یہاں دارالعلوم میں بھیجنے کا انتظام آسانی ہو سکے تو کیا ہی اچھا ہو آمد و خرچ اور نذرانہ ہمارے ذمہ ہوگا، چنانچہ حضرت والد صاحب نے اپنے دو مخلص احباب کے ذریعہ ان عامل صاحب کو دارالعلوم کراچی حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں بھیجا حضرت بیحد خوش اور ممنون ہوئے مگر یہاں اس عامل کا بھانڈہ پھوٹ گیا اور معلوم ہوا کہ پتہ نکالنے کا عمل یہ سب ہاتھ کی صفائی کا کھیل ہے، اس سے بڑھ کر کچھ نہیں، اس لیے مریضہ کو کچھ بھی اثر نہ ہوا مرض جوں کا توں رہا۔

اب حضرت والا رحمۃ اللہ بجائے براہ راست حضرت والد ماجد مدظلہ کو خط لکھنے کے احقر کے پاس خط لکھا پہلی رعایت یہ فرمائی تاکہ انہیں تکلیف نہ ہو دوسری یہ کہ تاکہ میں کہ اپنے والد صاحب سے صاف صاف نہ کہتا بلکہ مجملاً کہتا تیسرے ان لانے والے احباب کو اصل صورت حال سے آگاہ کر دینا تاکہ وہ اس عامل کی شہرت کا ذریعہ نہ بنیں الّٰلہ اللہ کس کس کا کس طرح خیال رکھا جا رہا ہے اب خط ملاحظہ فرمایئے۔

سبق آموز خط: والد صاحب نے میری اہلیہ کے علاج کے لیے عامل صاحب کو حیکب آباد سے بلا کر حاجی نظام الدین وغیرہ کے ساتھ یہاں بھیجنے کا اہتمام کیا اللہ ان کو جزاء خیر دے، ان کی محبت قابل قدر ہے ان کے لیے دل سے دعا نکلی۔

- لیکن جو عامل صاحب یہاں آئے تھے یہاں تو انہوں نے کھلے طور پر دھوکہ سے کام کیا ایک مٹی کا پتلا جس میں سوئیاں گھسی ہوئی تھیں ان کے ساتھ تھا اپنا ہاتھ رنگ کی طرف پھینکا پھینکتے ہوئے محمد رفیع سلمہ نے بالکل واضح طور پر دیکھا، انہوں نے یہ بتلایا کہ یہ مؤکل نے لا کر ڈالا ہے، پھر سوئیاں نکالیں عمل پڑھا۔ مگر مریضہ پر آج تک کوئی اثر نہیں ہوا، میں نے حاجی نظام الدین صاحب اور محمد یعقوب صاحب سے اس کے اظہار کا ارادہ کیا تھا مگر اتفاقاً وہ الگ نہ ملے، میں نے یہ سب کچھ جاننے کے باوجود عامل صاحب کا نذرانہ دیدیا۔ اب اس کے لکھنے کا مقصد صرف حاجی نظام الدین اور یعقوب صاحب

کو آگاہ کرنا ہے کہ وہ دوسرے لوگوں میں اس کا پرچا کرنے کا سبب نہ بنیں تو بہتر ہے، اس کا اظہار ان مدتوں سے مناسب وقت میں کر دیں، والد صاحب سے زیادہ کچھ کہنے کی ضرورت نہیں انہیں رنج ہوگا مگر اجمالی طور پر کچھ بتلا دیں کہ دھوکہ میں نہ رہیں۔ والسلام

آخری ملاقات اور اہم ترین نصیحت

احقر ۱۷ رمضان المبارک ۱۳۹۶ھ کو صبح کے وقت تقریباً تنہا دو بجے کے درمیان حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت اقدس میں سکھر جانے کے لیے الوداعی ملاقات کی غرض سے حاضر ہوا اور حضرت رحمۃ اللہ علیہ سے کچھ نصیحت فرمانے کے لیے بھی عرض کیا حضرت نے فرمایا:۔

راقب اللہ تجدہ تجاھک — ہر وقت اللہ پاک جل مجدہ کی طرف دھیان رکھو اس کو اپنے سامنے پاؤ گے۔

آج کی تاریخ ہی میں حضرت بابا نجم الحسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا وصال ہوا جو حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے مجازین صحبت میں سے تھے، بڑے بابرکت اور جاہ جلال والے بزرگ تھے، حضرت والا پر ان کی وفات کا بیحد اثر تھا، فرمایا ان کی موت اپنی موت معلوم ہوتی ہے انا للہ وانا الیہ راجعون۔ نیز حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ موت تو آنے ہی والی ہے۔ عمر بھی ختم ہے، تمام چیزیں جواب دے رہی ہیں، رمضان شریف کی موت مبارک موت ہے، مگر میرا دل یہ چاہتا ہے کہ میری موت سے اوپر نیچے والوں میں سے کسی کو کوئی تکلیف نہ ہو، رمضان میں محبین اور عزیزوں کو آنے جانے میں تکلیف ہوگی اور دعاء کرتا ہوں کہ بے وقت، بے موقعہ موت نہ ہو کہ دوسروں کو تکلیف ہوگی۔

اللہ اکبر! کیا ٹھکانا ہے حضرت رحمۃ اللہ علیہ کا لوگوں کو اپنی ایذاء سے بچانے کا کہ زندگی میں تو اس کا اہتمام تھا ہی مرنے میں بھی اس کا خیال رہا اور تمنا فرمائی جسے اللہ پاک نے حرف بحرف پورا فرمایا اور رمضان المبارک بھی گذرے عید بھی تمام خوشیوں اور مسرتوں کے ساتھ آئی اور چلی گئی اور سب حضرات مطمئن ہو کر اپنے اپنے ٹھکانوں کو پہنچ گئے اور جب حضرت تمام امور دینی اور دنیوی سے فارغ ہو گئے تو بالآخر اس شمع ہدایت اور نور ہدایت کا یہ آفتاب و ماہتاب ۱۰ اور ۱۱ شوال کی درمیانی شب میں ہمیشہ کے لیے افق آخرت میں غروب ہو گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

اللہ تعالیٰ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کو بلند سے بلند درجات نصیب فرمائے اپنی رضائے کاملہ اور مغفرت کاملہ سے مالا مال فرمائے، اور حضرت کے ان علمی، عملی، ظاہری اور باطنی کمالات سے کچھ حصہ ہمیں بھی عطا فرمائے آمین ثم آمین۔

مولانا محمد عاشق الٰہی بلند شہری
مدینہ منورہ

حضرؒت کے بعض ملفوظات

ایک مرتبہ ارشاد فرمایا کہ کان میں شور و غل کی آواز آنا بھی ایک عذاب ہے اور بہت بڑی تکلیف ہے دیکھو حدیث شریف میں ہے کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ خدیجہ کو اس کے رب کی طرف سے اور میری طرف سے سلام فرما دیجئے اور جنت میں ان کے لیے ایک ایسے گھر کی خوشخبری دیجئے جو موتی کا ہوگا اور جس میں نہ شور و شغب ہوگا نہ کوئی تھکان ہوگی لے معلوم ہوا کہ شور و غل کی آواز سے محفوظ رہنا ایک بہت بڑی نعمت ہے۔

بارہا فرمایا کہ جب معدہ کمزور ہو جاتا ہے (یعنی بڑھاپے میں) تو دانت بھی اکھڑ جاتے ہیں اس میں اللہ جل شانہٗ کی بہت بڑی حکمت ہے کہ جو شخص بے تکا کھانے اور چبانے کا شوقین ہو اور اپنے اختیار سے معدہ پر رحم نہ کرے تو دانتوں کی وجہ سے مجبور ہو کر تھوڑا کھائے اور نرم غذا استعمال کرے اور اسطرح معدہ ظلم و زیادتی سے محفوظ ہے۔

اکثر فرماتے تھے کہ میں مدرسین میں محققین تلاش نہیں کرتا جو شخص کتاب اچھی طرح سمجھا دے اسی سے کام چلا لیتا ہوں آدمی مدرس ہو مُفَہِّم ہو۔ صالح ہو مفسد دہو، بس یہ کافی ہے اگر محقق ہوا اور مفسد

لہ اخرجہ الشیخان کما فی المشکوٰۃ ۵۷۳ ۔

سلہ اس بات کو اکثر حضرتؒ ان الفاظ میں فرمایا کرتے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو دو چکیاں عطا فرمائی ہیں ایک پیٹ میں یعنی معدہ، اور دوسری منہ میں یعنی دانت، اور یہ اللہ تعالیٰ کی رحمت ہے کہ جب بڑھاپے میں اندر کی چکی خراب ہوتی ہے تو باہر کی چکی کو بھی ناکارہ کر دیا جاتا ہے۔ (مدیر)

ہوا تو مدرسہ اور طلبہ کا علم وعمل سب تباہ ہو جائے گا۔

اکثر حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا ارشاد نقل فرمایا کرتے تھے کہ انھوں نے ہم کو خطاب کر کے فرمایا کہ آدمی تو نہ تم ہو نہ ہم ہیں البتہ اتنا فرق ہے کہ ہم نے آدمی دیکھے ہیں (یعنی اہل اللہ کو پایا ہے) اور تم نے آدمی دیکھے بھی نہیں، اگر ہم کو کوئی بیل بہکانا چاہے اور کہے کہ میں آدمی ہوں تو اس کے بہکانے میں ہم نہیں آسکتے، تم لوگ دھوکہ کھا سکتے ہو۔

بارہا ارشاد فرمایا کہ دارالعلوم دیوبند کا ایک وہ زمانہ تھا کہ مہتمم سے لے کر دربان اور چپراسی تک ہر شخص صاحب نسبت تھا۔

فرمایا شاہ رفیع الدین صاحبؒ مہتمم اول دارالعلوم دیوبند عالم نہیں تھے مگر ان کا علماء سے کام لینے کا طریقہ عجیب تھا، جب دیکھا کہ اساتذہ دیر سے مدرسہ آتے ہیں مدرسہ کے دروازہ پر چارپائی بچھا کر ہاتھ میں تسبیح لے کر بیٹھ جاتے، ایک دو دن جو اساتذہ کا ادھر سے گذر ہوا تو شرما جاتے اور وقت پر آنا شروع کر دیتے تھے، اگر کسی مدرس نے اس طرح بھی وقت پر آنا شروع نہ کیا تو اس سے تنہائی میں فرماتے کہ مولانا آپ مشغول آدمی گھر بار کی مشغولیتوں میں اور سودا سلف لانے میں دیر ہو جاتی ہے جس سے طلبہ کا حرج ہوتا ہے اور میں بالکل بیکار رہوں آپ بازار کا کام مجھے بتادیا کریں یہ خدمت میں کر دیا کروں گا جس سے آپ کا وقت بچ جائے گا۔ اس کے بعد کسی کو دیر سے آنے کی جرأت نہ ہوتی تھی۔

فرمایا لیکن حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ (دارالعلوم دیوبند کے اولین شیخ الحدیث) کا دیر سے آنا برابر جاری رہا ان کی مشغولیتیں خانگی تو نہ تھیں بلکہ تعویذ لینے والے اور مریدین آجاتے تھے جس سے دیر ہو جاتی تھی، جب کسی طرح قابو نہ پایا تو حضرت امام ربانی قدس سرہٗ کو گنگوہ لکھا، حضرت گنگوہی قدس سرہٗ نے مولانا محمد یعقوب صاحب کو تنہائی میں خوب ڈانٹا اور فرمایا کہ قیامت میں اس وقت کی پوچھ ہوگی جو آپنے مدرسہ میں دیا ہے یہ جو لوگ گھیر لیتے ہیں ان کو مدرسہ کے وقت کے علاوہ دوسرا وقت دیں اور بزرگی کے گھمنڈ میں نہ رہیں اور مہتمم صاحب نے فرمایا کہ آپ اس شخص کی دیر سے آنے کی شکایت کرتے ہیں اگر یہ شخص مدرسہ میں ذرا سی دیر کو آکر یوں ہی ذرا سا گھوم پھر کر چلا جائے اور اس کو ہزار روپئے تنخواہ دی جائے تب بھی کم ہے گی (اس زمانہ میں غالباً ۱۵۔ ۲۰ روپئے تنخواہ ہوتی تھی)

فرمایا جب ہم نے ہوش سنبھالا تو حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ دارالعلوم دیوبند میں سب سے بڑے تھے، یہ سادگی کا زمانہ تھا بڑے بڑے القاب استعمال نہیں ہوتے تھے. حضرت شیخ الہندؒ کو ہم سب ہی لوگ بڑے مولوی صاحب کہتے تھے، شیخ الہند کا لقب مالٹا سے واپس ہونے کے بعد حضرتؒ کے نام کے ساتھ مشہور ہوا.

حضرت مفتی صاحبؒ شیخ الہند قدس سرہٗ کی سادگی اور بے نفسی کے کئی قصے سنایا کرتے تھے. جن میں سے ایک واقعہ یہ سنایا کرتے کہ دیوبند اور اس کے آس پاس کے شہروں اور قصبوں کے رواج کے مطابق سردی کے زمانہ میں مسجد میں گھاس بچھائی تھی اس گھاس کو کہتے ہیں اور سردی میں گرم رہتی ہے، دیوبند کے ایک تالاب کے کنارہ پر یہ گھاس بہت ہی کھڑی تھی. حضرت شیخ الہند قدس سرہ نے بعض طلباء سے فرمایا کہ چلیں تالاب پر غسل کریں گے وہاں پہنچکر حضرتؒ نے غسل کرتے ہوئے بہت سی گھاس کاٹ لی اور جگہ جگہ گٹھریاں بنا کر رکھ دیں پھر ایک گٹھڑی اٹھا کر سر پر رکھ کر یہ کہتے ہوئے چل دیئے کہ میں تو اپنا حصہ لے چلا، اس کا مطلب دوسرے حضرات بھی سمجھ گئے اور سب نے ایک ایک گٹھا اٹھایا اور مسجد تک پہونچا دیا. یہ حضرت شیخ الہند کے محلہ کی مسجد کا واقعہ ہے.

ایک مرتبہ ارشاد فرمایا کہ میں نے فارغ ہونے کے بعد مدرسی کے ابتدائی عہد میں ایک رسالہ آداب المساجد کے نام سے لکھا تھا اور سبق کے ایک ساتھی جو بہت ذی استعداد تھے وہ دارالعلوم سے فارغ ہو کر اور کسی جگہ تدریس میں مشغول ہو گئے انہوں نے مؤطا کے کچھ حصہ کی بہت محقق شرح لکھی جب مجھ سے ملنے آئے تو میرا رسالہ دیکھ کر بہت بے تکلفی کی وجہ سے کہنے لگے کہ "تو نے کیا ذرا سی کتبیہ لکھی ہے اور وہ بھی اردو میں ہے، دیکھ میں نے یہ مؤطا کا شرح لکھا ہے" میں نے کہا کہ میری کتاب انشاء اللہ بہت مفید ہوگی اور اس سے بہت نفع پہنچے گا اور تیری تصنیف یونہی دھری رہ جائے گی (چنانچہ ایسا ہی ہوا مفتی صاحب کا رسالہ ہزار ہا ہزار کی تعداد میں بارہا ہند و پاک میں چھپتا رہا ہے اور ان صاحب کے شرح کا کہیں وجود نہیں بات یہ ہے کہ جہاں تصنیف سے علمی شان ظاہر کرنا مقصود ہوتا ہے اوّل تو وہ کتاب پوری ہی نہیں ہوتی اور اگر پوری ہو بھی جائے تو مقبولیت کی شان اُسے نہیں ملتی)

حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کبھی کبھی پند و نصیحت کے لیے دارالعلوم کی مسجد میں اساتذہ و تلامذہ

---

[1] یہ واقعہ حضرتؒ نے اپنے ہم سبق مولانا مغیث الدین صاحبؒ سے سنا تھا اور انکو براہ راست مولانا معین الدین صاحبؒ نے سنایا (مرتب)

کو خطاب فرمایا کرتے تھے بارہا نماز میں مسبوق ہو جانے پر تنبیہ فرماتے تھے اور جو لوگ وضو کر کے باتوں میں یا منہ پونچھنے میں مشغول رہ جاتے اور یہ سمجھتے کہ رکوع سے پہلے پہلے مل جائیں گے ان سے فرماتے تھے کہ جیسے ہی آؤ امام کے ساتھ نماز میں مل جاؤ جتنی نماز نکل جائے گی اُس کا ثواب کم ہو جائے گا اور اس سلسلہ حضرت ابو ہریرہؓ کا ارشاد مؤطا امام مالک سے نقل فرماتے تھے کہ ومن فاته قراءة ام القرآن فقد فاته خیر کثیر (یعنی جس سے سورۂ فاتحہ کی قرأت چھوٹ گئی تو اُس سے بہت زیادہ خیر فوت ہو گئی)۔

شروع سال میں بخاری شریف کا افتتاح فرماتے تھے اور یہی مدرسہ کے تعلیمی سال کا آغاز ہوتا تھا اس موقع پر اساتذہ اور تلامذہ کو بہت ہی نصیحتیں فرماتے تھے عموماً اس تقریر میں یہ مضمون بھی ہوتا تھا کہ میں مدرسین کرام کی داروگیر نہیں کرتا ہوں ان کی دیانت پر چھوڑتا ہوں، مجھے یہ اچھا نہیں لگتا کہ اہل علم کا محاسبہ کروں اور وقت کی کمی پر تنخواہ وضع کروں[1]، البتہ ان حضرات سے گذارش کرتا ہوں کہ بطور خود پورا وقت دینے کا اہتمام کریں جس طرح خرید فروخت میں تطفیف قابل مواخذہ ہے اسی طرح دیگر معاملات اجارہ واستجارہ وغیرہ میں تطفیف جرم ہے، تنخواہ پوری لیں اور وقت کم دیں یا کام پورا نہ کریں یہ بھی اذا اکتالوا علی الناس یستوفون واذا کالوھم او وزنوھم یخسرون میں شامل ہے اس سلسلہ میں مؤطا کی یہ عبارت بھی نقل فرمایا کرتے تھے یقال لکل شیئ وفاء و تطفیف[2]۔

بخاری شریف کے ختم پر بھی کچھ باتیں ارشاد فرمایا کرتے تھے ان میں سے ایک بات یہ فرماتے کہ آج آپ نے اپنے پورے سال کی محنت کا نتیجہ دیکھنا ہے، اور سال بھر جو کچھ پیسی اس کے بارے میں غور کرنا ہے کہ حاصل کیا ہوا اور اس موقع پر حضرت مولانا انور شاہ صاحب کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کا ارشاد جعجعة ولا طحن نقل فرمایا کرتے تھے یعنی چکی تو چلائی اب یہ دیکھو کہ آٹا بھی ہے یا نہیں، فرماتے تھے کہ سال بھر کی محنت سے چند آدمی تیار ہوتے ہیں لیکن ان کو جو سند دی جائے گی دنیا میں اس کی رو سے پہلے

---

[1] آخر میں حضرتؒ نے دارالعلوم میں تنخواہ وضع کرنے کا ضابطہ بھی بنا دیا تھا، لیکن اس طرح کہ ہر مدرس اپنی تاخیر کی مقدار خود ہی تحریر کر کے دیا کرے، اس کے مطابق تنخواہ وضع کرائے۔ چنانچہ اب اسی پر عمل ہوتا ہے۔ (مدیر)

[2] یہ عبارت اوائل مؤطا مالک میں موجود ہے۔

کی بھی قیمت نہیں اس کے علاوہ کالج و یونیورسٹی میں کوئی ملازمت نہیں مل سکتی اور درحقیقت ہمارے مدرسوں سے فارغ ہونے والوں کو چاہیئے بھی یہی کہ مدرسوں ہی میں زندگیاں گذاریں، دوسری طرف نظر اٹھا کر نہ دیکھیں۔ اللہ کے یہاں علوم قرآن وعلوم حدیث کی قدر ہے بس ہمیں وہی چاہیئے۔ اہل دنیا کی ملازمت کی ہمیں ضرورت ہی کیا۔

یہ بھی ارشاد فرمایا کرتے تھے کہ میں نے اپنی عمر کا اکثر حصہ علم دین کے طلباء میں گذارا ہے اور اب آخر عمر میں مدرسہ کھولا ہے اور اس کے باوجود کہ علماء اور طلباء بہت کچھ بدل گئے ہیں (اس موقعہ پر ان کی بے عملی کا تذکرہ فرماتے تھے) پھر بھی کوئی دوسری جماعت ایسی نہیں پاتا جس کو ان پر ترجیح دوں، اور ان کو چھوڑ کر ان کے ساتھ رہوں۔

بارہا ارشاد فرمایا کہ ایک بار حضرت تھانوی قدس سرہ نے مجھ سے دریافت فرمایا کہ مولوی وصی اللہ کو جانتے ہو (حضرت تھانوی کے مشہور خلیفہ جن سے ہندوستان میں بہت فیض پہنچا اور سفر حج میں بحری جہاز میں وفات پائی) اس سوال کے جواب میں میری زبان سے یہ شعر نکل گیا ؎

ما و مجنوں ہم سبق بودیم در دیوان عشق
او بصحرا رفت و ما در کوچہ ہا رسوا شدیم

فرمایا کرتے تھے کہ حضرت تھانوی قدس سرہ کے سامنے شعر پڑھنے کی ہمت نہیں ہوتی تھی مگر اس موقعہ پر یہ شعر بے ساختہ زبان سے نکل گیا۔

اس پر حضرت تھانوی قدس سرہ نے فرمایا کہ "میاں یوں ہی ہوتا ہے کسی کو صحرا دیا جاتا ہے اور کسی کو سہرا دیا جاتا ہے"۔

(یعنی کسی عاشق کو صحرا نوردی ملتی ہے اور کسی کو نوشہ بنایا جاتا ہے، محبوب حقیقی کسی کو جذب و کیف اور مستی عطا فرماتا ہے اور کسی کو ہوش وگوش عطا فرماتا ہے اور شریعت وطریقت کی خدمت کا سہرا اس کے سر باندھتا ہے۔

ایک صاحب تشریف لائے جو اکثر آیا کرتے تھے اس مرتبہ ان کا ایک بیٹا یا بھتیجا وغیرہ بھی ساتھ تھا اس کا تعارف کرتے ہوئے کہ یہ ڈبل ایم اے ہیں اور فلاں بنک میں اونچے عہدہ پر ہیں یہ سن کر حضرت مفتی صاحب کو بہت ناگوار ہوئی اور بنک کی ملازمت کو جو انہوں نے بطور کمال

اور ترقی کے ذکر فرمایا اس پر بہت ملامت فرمائی ایک تو حرام ملازمت پھر اس پر سے اس پر فخر؟ سر اسر جہالت کی بات ہے۔

فرمایا کہ میں نے آٹھ سال ماہنامہ المفتی نکالا، مضامین لکھنے سے لے کر ڈاک میں ڈالنے تک سارا کام خود ہی کرتا تھا اور کوئی مددگار یا ملازم نہ تھا، خود کوزہ اور خود گل کوزہ کا مصداق تھا۔ ساتھ ہی دارالاشاعت کے نام سے ایک تجارتی کتب خانہ بھی جاری کیا تھا، بسلسلۂ خریداری کتب اکثر دہلی جانا ہوتا تھا، دہلی میں ایک مرتبہ حافظ عبدالغنی صاحب مرحوم سے ملاقات ہوئی جو حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے کتب خانہ میں شریک تھے اس کا نام کتب خانہ رحیمیہ تھا جو پہلے سنہری مسجد دہلی کے نزدیک تھا پھر اردو بازار دہلی میں چلا گیا، حافظ صاحب موصوف کو جب یہ علم ہوا کہ میں تاجر کتب ہوں تو فرمایا، میاں تم کس کام میں لگے کتابوں کی تجارت پتھر کا اپھارہے اس کے لیے عمر نوح اور صبر ایوبؑ چاہیئے۔ (مطلب یہ تھا کہ کتابوں کی نئی دکان چلانے کے لیے عرصۂ دراز تک صبر کرنا پڑتا ہے خصوصاً جب کہ نئے مصنف کی کتابیں شائع کرنا ہو تو مصنف اور اس کی کتابوں کی شہرت ہونے تک بڑے صبر آزما دن کاٹنے پڑتے ہیں)

دارالعلوم کراچی کے زیر انتظام جناب الحاج محمد یوسف صاحب سیٹھی مرحوم کے تعاون سے مکاتب قرآنیہ جاری ہیں، حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ان کا انتظام احقر کے سپرد کر رکھا تھا۔ مدرسین کی بے عنوانیوں پر کبھی طبعی طور پر بہت زیادہ ناگواری ہو جاتی تھی اور سخت سرزنش کے بعد بعض مدرسین کو معزول کرنا پڑتا تھا، اس سلسلہ میں ایک دن تنہائی میں احقر سے فرمایا کہ علیحدہ کرو اور ساتھ ہی سخت کلامی سے بھی پیش آؤ یہ ٹھیک نہیں، اس میں دو سختیاں جمع ہو جاتی ہیں کام کرنے کا اصول یہ ہے کہ جس کے ساتھ معاملہ سخت کرنا ہو (مثلاً معزول کرنا ہو) اس کے ساتھ گفتگو میں نرمی برتی جائے اور جس کے ساتھ معاملہ نرم کرنا ہو (مثلاً عارضی ملازمت کے بعد مستقل کرنا یا تنخواہ بڑھانا ہو) اس کے ساتھ بوقت ضرورت اور بقدر ضرورت زبانی سرزنش اور زجر و توبیخ روا ہو سکتی ہے۔

ایک مرتبہ ارشاد فرمایا کہ اللہ جل شانہٗ نے اصحابِ کہف کے سلانے کا ذکر فرماتے ہوئے یہ فرمایا ہے کہ فَضَرَبۡنَا عَلٰۤی اٰذَانِهِمۡ فِی الۡکَهۡفِ سِنِیۡنَ عَدَدًا ؕ

(سو ہم نے اس غار میں ان کے کانوں پر سالہا سال تک نیند کا پردہ ڈال دیا) اس پر فرمایا آنکھوں

کا ذکر نہیں فرمایا بلکہ کانوں کا ذکر ہے اور وجہ اس کی یہ ہے کہ آنکھیں بند ہو جانے پر سو جانا ضروری نہیں ہے یہ کر بیدار ہوتے ہوتے بھی بند ہو جاتی ہیں اور ان کے اوپر پلکوں کا پردہ موجود ہے جو انسان کے اختیار میں ہے چاہے بند کرے چاہے کھولے، لیکن گہری نیند وہی ہوتی ہے جو کانوں پر بھی پردہ ڈال دیتی ہے پاس بیٹھنے والے کچھ ہی باتیں کرتے رہیں سونے والا انہیں سن پاتا، اور جب جگانا ہو تو آواز دیکر جگاتے ہیں اور بلند آواز سے خود ہی آنکھ کھل جاتی ہے پس معلوم ہوا کہ گہری نیند کا تعلق آنکھوں سے تو ہے ہی مگر زیادہ تعلق کانوں سے ہے، جب سننا بند ہو جائے تو کچھ کر سننے والا واقفی ہوگیا۔ اللہ جل شانہٗ نے کانوں پر پردہ نہیں رکھا ہے اگر کانوں پر پردہ ہوتا اور انسان سوتے وقت اس کو ڈال لیا کرتا تو اس کو جگانے میں بڑی دشواری ہوتی، سوتے وقت کانوں میں بس نیند کا پردہ ہوتا ہے جو آواز دینے سے ختم ہو جاتا ہے[1]۔

دارالعلوم کے ایک عربی مدرس نے جو حافظ بھی تھے رمضان المبارک میں ایک جگہ قرآن مجید سنایا اور ختم کے دن تقریر کے لیے حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو لے گئے یہ صاحب جلدی ختم کرنے اور تیزی سے پڑھنے کی وجہ سے شل دیگر قراء کے سورۂ فاتحہ میں نَسْتَعِیْنُ اهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ پڑھتے تھے یعنی نٓ کے پیش کو ہمزہ وصل حذف کرکے صاد سے ملا دیتے تھے، حضرت کو اس سے ناگواری ہوتی اور دارالعلوم میں آکر مکروہ لہجہ میں اس پر تنبیہ فرمائی اور فرمایا کہ یہ وصل ذوقِ سلیم پر بار ہے اس سے بہت تکلیف ہوئی (مطلب یہ تھا کہ ہمزۂ وصل حذف کرکے وصل کر دینا گو قواعد وصل کے مطابق صحیح ہو گیا لیکن چونکہ اِھْدِنَا سے نئی بات شروع ہے اس لیے وصل کرنا معنوی اعتبار سے مناسب نہیں ہے اسی لیے علمائے کرام نے اوقاف نے نَسْتَعِیْنُ پر ط کی علامت لگائی ہے)

فرمایا کرتے تھے کہ حضرت مولانا حسین احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی تجویز اور تحریک پر میں نے دارالعلوم دیوبند میں حدیث کے اسباق شروع کئے تھے۔

اور یہ بھی فرمایا کہ حضرت مولانا حسین احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے سیاسی اختلافات کے باوجود

---

[1] اس ملفوظ کی مناسبت سے احقر کو اپنے استاذ مولانا الحاج محمد اسعد اللہ صاحب رامپوری مدظلہم ناظم جامعہ مظاہر علوم سہارنپور کا ایک ملفوظ یاد آگیا آپ نے فرمایا کہ سننا کانوں سے نہیں ہوتا بلکہ آنکھوں سے ہوتا ہے اور اس سے یہ جملہ ارشاد فرمایا کہ الاُذُنُ فِی الْعَیْنَیْنِ مطلب یہ کہا ہے کہ تقریر کرنے والے کی طرف آنکھیں متوجہ رہتی ہیں اگر آنکھوں کی توجہ ہٹ جائے تو کان صحیح اور پوری بات نہیں سنتے۔

یگانگت میں فرق نہیں آیا۔ اس سلسلہ کا ایک واقعہ ذکر فرماتے تھے اور وہ یہ کہ حضرت مدنی قدس سرہ چمڑے کے علاوہ دوسرے موزے پہنتے تھے جو موٹے تھے اور ان پر مسح کرتے تھے میں ان پر مسح جائز نہیں سمجھتا تھا۔ حضرت مدنی کو میرا اختلاف معلوم ہوا تو فرمایا میں دارالافتاء میں آؤں گا فقہاء کی تصریحات دیکھ کر فیصلہ ہوگا، دوسرے دن آپ دارالافتاء میں تشریف لائے اور کتب فقہ سے اپنی تائید میں روایات اور عبارات نکالیں لیکن میری تشفی نہ ہوئی حضرت اپنی رائے پر قائم ہے اور میں اپنی رائے پر، ان ہی ایام میں کسی مکان پر اساتذہ کا عصر بعد اجتماع ہوا مغرب کا وقت قریب ہوا تو حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ نے موزوں پر مسح فرمایا، اور ساتھ ہی احقر سے فرمایا کہ مفتی صاحب تو اس مسح کو جائز نہیں کہینگے، میں نے بے تکلفی سے عرض کیا، جی ہاں اور آپ کے پیچھے اس وقت نماز نہیں پڑھوں گا، حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ نے بہت متانت اور بے تکلفی سے فرمایا کہ آپ کے پیچھے تو ہماری نماز ہوجائے گی لہٰذا آپ امام بن جائیں ہم سب مقتدی ہوجائیں گے چنانچہ ایسا ہی ہوا اپنے امامت کی اور حضرت نے دیگر رفقاء کے ساتھ اقتداء فرمائی۔

یہ بھی فرماتے کہ حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ سے لوگوں نے جلسے کرنا اور اسٹیج پر آنا اور الیکشن کے لیے دورے کرنا تو سیکھ لیا۔ لیکن ان کے اندر جو باطنی کمالات تھے ان کے حاصل کرنے کی طرف توجہ نہ کی۔

فرمایا دارالعلوم دیوبند میں جب میں مفتی مقرر ہوا تو ہر سوال کے جواب کے لیے تمام موجودہ کتب دیکھتا تھا اور بڑی محنت سے سات سال کام کرنے کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ یہ کام میرے بس کا نہیں ہے اس کی دشوار گذار گھاٹیوں سے گذرنا بہت سخت کام ہے، یہ پریشانی اپنے مرشد و مربی حضرت حکیم الامت قدس سرہٗ کی خدمت میں عرض کی تو حضرت قدس سرہٗ نے ہمت بندھائی اور تسلی دے کر فرمایا کہ لگے رہو اللہ مدد فرمائے گا۔

فرمایا لوگ سمجھتے ہیں کہ فارغ التحصیل مولوی ہونا اور مفتی ہونا ایک ہی بات ہے اور کچھ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ فقہ کی کتابوں سے جزئیات نکال لینے سے مفتی ہوجاتا ہے حالانکہ مفتی ہونا ایک مخصوص ذوق اور مزاج کا نام ہے جو برسوں کی محنت کے بعد بطور عطیۂ وہبی کے عطا ہوتا ہے، مفتی کا کام اتنا سا نہیں ہے کہ صرف جزئیہ دیکھ جواب لکھ دے، اس پر لازم ہے کہ سوال کو دیکھے، سائل کو پرکھے، جن

حالات میں سائل دریافت کر رہا ہے ان کا پس و پیش دیکھئے عرف و عادت کے تغیر پر نظر کیجے انقلابات احوال سے جوابات بدل جایا کرتے ہیں۔ اس کو ذہن میں رکھے پھر ہر سوال کا جواب بھی ضروری نہیں ہوتا اور اگر جواب دیا ہی جاتے تو تحریری جواب دینا لازم نہیں ہوتا۔

دار العلوم کراچی اور دیگر اداروں سے فارغ شدہ بعض طلبہ مشق افتاء کے لیے درجہ تخصص میں داخلہ لیتے تھے دو سال کا نصاب ان کے لیے تجویز کیا گیا تھا، دو سال کے بعد وہ سند مانگتے تھے۔ حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ دل سے سند دینے پر راضی نہ تھے ان کا دل چاہتا تھا کہ دس پانچ سال افتاء کا کام کریں گرم نرم سہتے رہیں اکابر کے فتاویٰ پر عبور حاصل کریں، تب سند دی جائے۔ بلکہ اس قدر کام لیں گے تو خود ہی سند کے طالب نہ ہوں گے۔ کیونکہ جیسے جیسے کام کریں گے اپنے عجز اور قلت علم کا احساس بیدار ہوتا جائے گا۔ پھر بھی طلبہ کے اصرار پر سند دے دیتے تھے جس میں خاص طور سے یہ بات تحریر کرتے تھے کہ فلاں بن فلاں نے مطالعۂ کتب کیا اور افتاء کی مشق کی مگر مفتی ہونا بہت کٹھن کام ہے اگر کسی ماہر مفتی کی نگرانی میں اس نے چند سال کام کیا تو امید ہے کہ اس سلسلہ میں کسی قدر کچھ لائق ہو جائے گا۔

فرماتے تھے کہ میرا اصل فن تو فقہ و فتاویٰ ہی رہا ہے جس پر محنت کی اور زندگی کھپائی لیکن اللہ جل شانہ کا فضل و کرم ہوا کہ اس نے زندگی کے آخر سالوں میں دل کی بیماری کے زمانہ میں تفسیر کی بھی خدمت لے لی اور معارف القرآن لکھا دی۔

فرماتے تھے ہم تفسیر لکھنے کے اہل نہیں ہیں، اکابر نے جو کچھ لکھا ہے اسی کو اپنے الفاظ میں اور نئے طرز کے قالب میں پیش کر دیا ہے۔

بھٹو حکومت نے بریلوی مکتب فکر کے ایک مفتی صاحب کو گرفتار کر لیا تھا، اسی زمانہ میں کسی سائل نے دار العلوم کراچی میں ایک استفتاء بھیجا یہاں سے جو جواب دیا گیا اس کو اس نے شائع کر دیا اس جواب میں مفتی موصوف کے جواب کے کچھ حصہ کی موافقت تھی۔ دار العلوم کے اس شائع شدہ جواب کو بنیاد بنا کر بریلوی حضرات نے کوشش کر کے اپنے مفتی صاحب کو چھڑا لیا جس پر بعض لوگ دار العلوم کراچی کے دار الافتاء میں کام کرنے والے فتویٰ نویس مولوی صاحب کو ملامت کرنے لگے کہ تمہارے فتوے سے بریلوی مفتی چھوٹ گیا گویا اچھا نہ ہوا حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ کیثیت امت کے سوچا کرتے تھے آپ کو ان لوگوں کی ملامت کا پتہ چلا تو فرمایا کہ اچھا ہوا ہمارے

دارالافتاء کے فتوے کی وجہ سے فلاں مفتی صاحب رہا ہو گئے کیونکہ حکومت نے ان کو اس لیے گرفتار نہیں کیا تھا کہ وہ بریلوی مفتی ہیں بلکہ اس لیے گرفتار کیا تھا کہ وہ مفتی ہیں اور ان کا فتوے حکومت کے منشاء کے خلاف پڑ گیا تھا، اگر آج ان کو گرفتار کیا ہے تو کل کو ہماری باری بھی آسکتی ہے

ایک مرتبہ ہرپیز کی تکلیف تھی (پوری ٹانگ میں بہت سخت درد تھا جس کی معیاد بائیس دن تھی یہ دن بہت صبر آزما گذرے) فرمایا کہ اللہ جل شانہٗ کی یہ عادت ہے کہ مرض شدید ہوتا ہے تو مدید نہیں ہوتا اور مدید ہوتا ہے تو شدید نہیں ہوتا، لیکن اس مرض میں شدت بھی ہے اور امتداد بھی، اسی مرض کے ایام میں احقر ایک دن عیادت کے لیے حاضر ہوا، دریافت فرمایا کہ میرے لیے تیمم کرنے کی گنجائش ہے یا نہیں؟ درد میں اس قدر شدت تھی کہ تیمم کی گنجائش دینے کو دل چاہتا تھا لیکن کتب فقہ میں یہ لکھا ہے کہ جس کے خدمت گذار موجود ہوں جو وضو کرا سکتے ہوں اور نماز میں اٹھا بٹھا سکتے ہوں اس کو تیمم جائز نہیں اور اس کی نماز بھی بیٹھ کر درست نہیں (بشرطیکہ مرض کے لیے پانی مضر نہ ہو اور کھڑے ہو کر نماز پڑھنے سے دوران سر وغیرہ کی تکلیف نہ ہو، بس وضو خود کرنا اور خود کھڑے ہونا مشکل ہو) احقر نے خاموشی اختیار کی اور اسی طرح بیٹھے بیٹھے خاموش اٹھ کر چلا آیا، حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے میری خاموشی سے فائدہ اٹھایا یعنی وضو کر کے نماز پڑھی اور یہ سمجھ لیا کہ تیمم کی گنجائش نہیں ہے، میں ایک دو دن کے بعد حاضر خدمت ہوا تو فرمایا بھئی میں نے وضو کر لیا تھا (دوسرا کوئی شخص ہوتا تو خاموشی کے دوسرے معنی لیتا)

فرمایا کرتے تھے کہ دارالعلوم دیوبند کے ایک استاد جو دیوبند ہی کے باشندہ تھے بڑی تنخواہ پر بہار کے ایک مدرسہ میں چلے گئے جب جا رہے تھے تو ان کو احباب نے بہت سمجھایا مگر وہ نہ مانے اور یہ فرماتے تھے کہ مدرسہ میں بہت تھوڑا سا وقت دینا ہوگا (کیونکہ سرکاری مدرسہ ہے) اور تنخواہ زیادہ ہوگی گذارہ خوب فارغ البالی کے ساتھ ہوگا اور تصنیف و تالیف کا اور خارج مدرسہ مفت تعلیم کا خوب موقع ملے گا۔ احباب کہتے تھے کہ یہ نفس کا دھوکہ ہے ایسا نہ ہو سکے گا چنانچہ ایسا ہی ہوا علمی خدمت تو موصوف کچھ نہ کر سکے البتہ بہار کے متوطن ہو گئے اور کچھ جائداد خریدی اور بس، دینی مدرسوں میں کم تنخواہ پر کام کرتے رہنا چاہیئے اسی میں عالم کے لیے دین و دنیا کی خیر ہے۔

فرمایا اہلِ عرب کا یہ طریقہ ہے کہ جب کچھ شمار کراتے ہیں تو آٹھویں نمبر پر ضرور واو لے آتے ہیں

اس کا نام واو ثمانیہ ہے سورۂ کہف میں جو رَّابِعُهُمْ كَلْبُهُمْ اور سَادِسُهُمْ كَلْبُهُمْ و
واو نہیں ہے اور وَثَامِنُهُمْ كَلْبُهُمْ میں واو ہے اس میں یہی نکتہ ہے اور اس کی نظیر
میں سورۂ توبہ کی آیت اَلتَّائِبُوْنَ الْعَابِدُوْنَ الآیۃ ذکر فرماتے تھے اس میں آٹھویں جگہ
وَالنَّاهُوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ پر واو ہے اس سے پہلے کسی جگہ واو نہیں ہے، اسی طرح سورۂ تحریم
کی آیت عَسٰی رَبُّهٗ اِنْ طَلَّقَكُنَّ الآیۃ میں آٹھویں جگہ وَاَبْكَارًا پر واو ہے اس سے پہلے واو نہیں ہے۔

فرمایا کرتے تھے کہ آجکل لوگوں میں فکر آخرت نہیں ہے جو کام کرنا طے کر چکے ہیں اس کو ضرور کریں
گے نہ فتویٰ معلوم کرکے باز آتے ہیں نہ خود مسئلہ جان کر گناہ چھوڑتے ہیں اس لیے مسائل مجتہد فیہا میں مفتی
حضرات متعدد اقوال میں سے جواز کے پہلو پر فتویٰ دیں تو عوام کے حق میں بہتر ہے کیونکہ جواز معلوم کرکے
عمل کریں گے تو گناہگار نہ ہوں گے اور دین سے اپنا لگاؤ سمجھیں گے اور اگر ان کو ناجائز کا فتویٰ دیدیا
تب بھی وہی کریں گے جو طے کر چکے ہیں البتہ اس صورت میں گناہ جانتے ہوئے شریعت کے باغی
ہوکر عمل کریں گے جو ان کے دین و ایمان کے لیے نہایت مضر ہوگا، (یہ بات اُن ہی مسائل امور سے
متعلق ہے جن کے بارے میں کتاب و سنت میں کوئی نص نہیں ہے جو قرآن و حدیث کے بیان کردہ
اصول کے اعتبار سے ممنوع نہیں ہیں اور جو مجمع علیہ ہی نہ ہوں)

اکابر دیوبند کے کمالات کا ذکر فرما کر ارشاد فرمایا کرتے تھے کہ میں نے ایک مصرع کہا ہے جس
کا مصرع ثانی اب تک کوئی نہ کر سکا۔

ع ایک مجلس تھی فرشتوں کی جو برخاست ہوئی

حضرت مفتی صاحبؒ کے صاحبزادے مولوی محمد ذکی مرحوم نے دوسرا مصرع کہا تھا مگر حضرت کے
نزدیک خاطر خواہ جوڑ نہ لگا۔ آخر تک اپنے مصرع کو خود ہی فرماتے رہے اور خود بھی غالباً کوئی جوڑ نہ لگایا۔
واللہ اعلم۔

○

"قومی نوجوان جس طرح ملک و ملت کی مادی طاقت ہیں، اسی طرح نوجوان طلباء اس کی اخلاقی
اور روحانی طاقت بن سکتے ہیں جو مادی طاقت سے کہیں زیادہ کامیاب اور ناقابلِ تسخیر طاقت ہے"۔
— (مفتی اعظمؒ: طلباء کے نام، ص ۹)

حکیم امداداللہ احمد زکی۔ایم اے

مُرشدي وسَندي

۲۹ نومبر ۱۹۴۸ء کی صبح ساڑھے چھ بجے بندرگاہ کیماڑی پر احقر نے پہلا قدم رکھا اور اسی دن شام عصر اور مغرب کے درمیان بہ ہزار دقت "کنگس کورٹ" کا پتہ لگا کر فلیٹ نمبر آٹھ پر آواز دی۔ دروازہ کھلا مسکراتا چہرہ نظر آیا۔ احقر نے سلام کیا۔ فرمایا "تشریف لائیے"۔ کمرہ میں بٹھایا۔ اندر تشریف لے گئے اور خود ہی دو پیالیاں اٹھائے ہوئے ۔ چائے احقر کے سامنے رکھی فرمایا "لیجئے"۔

"تشریف لائیے" اور "لیجئے" کے دو مختصر ترین جملوں نے احقر کے دل و دماغ پر عجیب اثر ڈالا۔ عرض کیا "حیدرآباد دکن سے آج ہی وارد پاکستان ہوا ہوں"۔ یہ کہہ کر ایک چٹھی شیروانی کی جیب سے نکال کر خدمت میں پیش کی حضرت والا نے کھول کر پڑھا اور سوال کیا "میر صاحب کیسے ہیں؟" جواباً عرض کیا "الحمد للہ اہل و عیال کے ساتھ اچھے ہیں اور سلام فرمایا ہے"۔

یہ تھی حضرت مفتی صاحب قدس سرہ سے احقر کی پہلی ملاقات: حیدرآباد دکن کے سقوط کے بعد عام مسلمانوں نے پاکستان ہجرت شروع کر دی تھی۔ احقر کی والدہ رحمۃ اللہ علیہا نے بھی اپنے تین لڑکوں اور احقر کی اہلیہ کے ساتھ ستمبر ۱۹۴۸ء ہی میں بنگلور اور بمبئی کے راستے ہجرت کر لی تھی۔ وطن میں احقر تنہا رہ گیا تھا تاکہ بے سروسامانی میں نکلے ہوئے پورے خاندان کا اثاثہ بیت "ٹھکانے" لگا کر خود بھی ہجرت کر جائے۔ ۱۹ نومبر ۱۹۴۹ء کو بعد نماز عصر حضرت مولانا میر امام الدین صاحب نور اللہ مرقدہ سے (جو اس وقت حیات تھے) جو حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے اولین خلیفہ مجاز تھے ——— اور احقر کے ہم محلہ و شفیق تھے۔ رخصتی ملاقات کے لیے ان کے دولت کدہ پر حاضر ہوا۔ حضرت ممدوح نے ایک مختصر سا خط حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے نام اسی وقت لکھا اور احقر کے حوالے کر کے فرمایا "وہاں جا کر حضرت سے ضرور مل لیں اور یہ خط دے دیں، انشاء اللہ

کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔ اسی ہدایت پر وہ تعارفی خطبے کر احقر نے حضرت مفتی صاحب قدس سرہ سے ملاقات کی تھی۔

احقر کے والد حضرت حافظ حمید اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ چونکہ حضرت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہٗ سے بیعت تھے، اس لیے تھانہ بھون کے خلافت سے مزین مجازین اور عقیدتمندوں کا گھر میں رات دن چرچا رہتا ہی تھا۔ حضرت مفتی صاحب نور اللہ مرقدہٗ کے اسم گرامی سے کان آشنا تھے۔ حضرت پیر صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی صحبتوں نے مزید تعارف بخش دیا تھا، بزرگوں سے سنا ہی تھا کہ حضرت مفتی صاحب "پیدائشی ولی" اور آسمان تھانہ بھون کے بڑے ہی پراعتماد درخشاں ستارہ تھے۔

اگرچہ حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی ذات کچھ زیادہ ظاہری رُعب داب نہ رکھتی تھی لیکن عالمانہ وقار اور اللہ کے سچے بندہ کی مکمل اور پُر نور تصویر تھے۔ پہلی ہی زیارت پر احقر نے حضرت سے عجیب اُنس محبت اور شفقت محسوس کر لی تھی اور قلب کو ایسا اطمینان حاصل ہوگیا تھا کہ بیان نہیں کیا جاسکتا۔ اور جب روزانہ کی حاضریاں شروع ہوئیں تو پھر تعلقات وجذب وانجذاب کا یہ عالم تھا کہ چوبیس گھنٹوں میں اٹھارہ اٹھارہ گھنٹے حضرت ہی کے ساتھ گزرنے لگے۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ جب حضرت مجلس تعلیمات اسلامی کی معروفیت کے علاوہ اور کوئی پابند معروفیت نہ رکھتے تھے اور ملاقاتیوں کی تعداد بھی نسبتاً کم ہی تھی۔ حضرت کا قیام اول وکٹوریہ روڈ پر واقع ایک چار پانچ منزلہ عمارت موسوم کنگس کورٹ (KINGS COURT) کی تیسری منزل (سیکنڈ فلور) کے آٹھ نمبر فلیٹ میں تھا۔ یہ فلیٹ نہایت ہی مختصر تھا اور جہاں تک احقر کو یاد ہے اس پوری عمارت میں کوئی ہم مزاج مکین نہ تھا۔ اسی لیے حضرت دوسرا مکان حاصل کرنے کی تگ و دو میں تھے۔ فلیٹ کی زندگی سے قطعی ناآشنا ایک عالم دین کے لیے ایسے ماحول میں رہائش اختیار کرنا دشوار ترین امر تھا۔ اس عمارت کے مکینوں کا یہ حال تھا کہ حضرت سے ملنا بھی گوارا نہ کرتے تھے، یہ مرض آج کے دور میں مسلمانوں کے اندر بھی عام ہے کہ وہ کبھی اپنے پڑوسیوں سے تعارف اور مانوس ہونے کی کوشش نہیں کرتے جو سراسر اسلامی اخلاق کے منافی ہے، لیکن احقر نے دیکھا کہ ان پڑوسیوں کے حقوق کی ادائیگی میں کسی قسم کی کوئی کوتاہی حضرت نور اللہ مرقدہٗ کی طرف سے کبھی نہیں ہوتی۔ اکثر حضرت نے فرمایا کہ اس جگہ اور تکلیفوں کے علاوہ ایک بڑی تکلیف یہ ہے کہ کوئی مسجد قریب نہیں ہے۔ ایک مسلمان کے لیے مسجد کی نعمت کا احساس احقر کو حضرت کی

بیتابی اور تڑپ سے اس وقت ہُوا جب کسی مسجد میں نماز ادا کرتے اور حضرت بڑی حسرت سے فرماتے "کاش میرا مکان یہاں ہوتا" اُن دنوں کراچی میں خال خال مسجدیں نظر آتی تھیں سو کٹوریہ روڈ ہی پر حضرت ممدوح کی رہائش گاہ کنگس کورٹ کے قریب دصدر کی جانب) کچھ مسلمانوں نے دو سڑکوں کے ملاپ پر لکڑی کا ایک کیبن (CABIN) لگا رکھا تھا اور اسی میں بہ مشکل تمام چند مسلمان مل کر باجماعت نماز ادا کر لیا کرتے تھے۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اکثر اس جگہ نماز ادا فرمائی۔ یہاں کے پابند مصلی حضرت سے واقف نہیں تھے اور حضرت ایک عام مسلمان کی طرح ایک صاحب کی امامت میں نماز ادا فرمایا کرتے جو بس یونہی سی قرآت سے نماز پڑھاتے جو اغلاط سے پُر ہوتی، لیکن کبھی حضرت نے آگے بڑھنے کی کوشش نہ فرمائی بلکہ احقر کی درخواست پر بھی سکوت اختیار کرنے کا اشارہ فرماتے۔ حضرت کا یہ عمل بھی ہمارے لیے بڑا ہی رہنما ہے۔ خصوصاً ان علماء حضرات کے لیے جو امامت میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کیا کرتے ہیں اور وقت سے پہلے ہی مصلیٰ امامت کے اطراف طواف شروع کر دیتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ان لوگوں پر اس مقام کی ذمہ داری کھل گئی ہی نہیں سکی ورنہ ان کا عالم کچھ اور ہی ہوتا۔ اس زمانہ میں سارے شہر کے اندر نئی آبادی پیر الٰہی بخش کالونی ہی کی تھی جو اس وقت اپنے ابتدائی مراحل سے گزر رہی تھی۔ اس کالونی میں صرف ایک منزلہ مکان تعمیر ہو رہے تھے۔ اس کے کرتا دھرتا میجر حسن (مرحوم) تھے اور جن حضرات کو ان صاحب سے سابقہ پڑا ہے وہ اس بات پر گواہ ہیں کہ پیر الٰہی بخش کالونی میں مکان کے لیے معلومات حاصل کرنے، پیسے داخل کرنے یا کسی اور معاملہ میں میجر حسن سے ملاقات کرنا جُوئے شیر لانے سے زیادہ مشکل کام تھا۔ ان صاحب کا دربار رات کے بارہ اور ایک بجے کے بعد شروع ہوتا تھا۔ لوگ بانگ مغرب ہی ان کی رہائش گاہ موسومہ عالی کالونی (قائداعظمؒ کے مقبرہ اور جیکب لائن کے درمیان) پر جمع ہو جاتے اور انتظار در انتظار میں تھک کر اکثر تو واپس بھی ہو جاتے تھے۔ حضرت قدس سرہٗ نے بھی اس کالونی میں مکان خریدنے کا قصد فرمایا تھا چونکہ حضرت اکثر معاملات میں احقر ہی کو اپنا نمائندہ نامزد فرمایا کرتے تھے۔ یہاں کی کارروائی کے لیے بھی ارشاد احقر ہی سے ہُوا۔ کئی دنوں کی تگ و دو کے بعد رقم داخل کرنے میں کامیابی حاصل ہُوئی اور ایک پلاٹ کا نمبر مل گیا۔ لیکن یہ پلاٹ کہاں تھا؟ اور اس کا محل وقوع کیسا تھا؟ اس کو دیکھنے کی تمنا نے حضرت والا کو بے چین کر دیا تھا۔ دن بھر کی اپنی تمام مصروفیتوں کے

باوجودیکہ مردِ خدا میجر حسن سے ملاقات کے لیے کئی کئی دن تک رات میں بڑی دیر تک انتظار فرمایا کرتا۔ کراچی کی ایک مشہور شخصیت جو اس زمانہ میں بھی اپنی سیاسی چالبازیوں اور چاپلوسی میں بے مثال تھی میجر حسن کو گھیرے رہتی تھی۔ حضرت والا کو بھی ان صاحب نے بہت دنوں تک دھوکے دیئے لیکن پلاٹ کا محل وقوع نہ دکھلایا۔ آخر مجبور ہو کر حضرت نے احقر ہی کے ساتھ قریشی بس سروس کے ذریعہ جو جمشید روڈ نمبر دو ہی تک چلتی تھی۔ پیر کالونی کا ایک دن قصد فرمایا بس سے اتر کر اس وقت کے اس ویران علاقہ میں پیدل چل کر پیر الٰہی بخش کالونی پہنچے جہاں میجر حسن کے نمائندہ قاضی صاحبؒ سے جو بہت ہی شریف اور دیندار آدمی تھے، ملاقات ہوئی۔ موصوف نے اولاً اپنے دفتر میں نقشہ کے ذریعہ کالونی کا خاکہ سمجھایا اور اس کے بعد اچھے پلاٹوں کی نشاندہی کر کے پلاٹ بدل لینے کی سفارش کی۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ ان کے اخلاق اور کردار کی بڑی تعریف فرماتے تھے اور وہ خود بھی حضرت کے بڑے ہی معتقد ہو گئے تھے۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کو اس معمولی کام کے سلسلہ میں کتنی تکلیفیں خود انہوں نے پہنچائیں لیکن کبھی حضرت کے چہرہ سے بھی ناگواری ظاہر نہیں ہوئی۔ ان تکلیف دہ ہستیوں سے بھی حضرت ایسے ملتے تھے کہ عمر، علم، تجربہ، تقویٰ اور حیثیت کا لحاظ کیے بغیر پیچھے جاتے تھے۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی ایک خاص بات یہ تھی کہ مخالفین و معاندین کے ساتھ بھی حسن سلوک کا اعلیٰ ترین نمونہ پیش فرماتے تھے۔

حضرت علامہ شبیر احمد عثمانی قدس اللہ سرہٗ العزیز کے سامنے بھی احقر نے دیکھا کہ حضرت مفتی صاحب نور اللہ مرقدہٗ اتنی دبی آواز میں گفتگو فرماتے کہ بعض وقت قریب بیٹھے ہوئے دوسروں کو صاف سنائی بھی نہ دیتا تھا۔ بزرگوں کے ادب، اُن کی خدمت، ان کی زیارت میں حدود کی رعایت، ان کی عظمت و وقار کا تحفظ یہ ساری باتیں حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے عمل سے احقر نے متعدد بار دربارِ عثمانی میں دیکھیں۔ حضرت علامہ عثمانی قدس سرہٗ کی جوتیاں سیدھی کرنا، ان کے اشاروں پر امور کا بطریقِ احسن انجام دینا مفتی صاحب کا خاص وصف تھا۔ مزاج شناسی کا یہ عالم تھا کہ حضرت عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کے رازدار اور خاص معتمد حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ ہی تھے۔ مملکت کے اہم ترین امور پر اظہارِ خیال اور مشورے دینے میں کوئی جھجک یا کسی کی رُو رعایت تو جانتے ہی نہ تھے۔ ہمیشہ ڈنکے کی چوٹ حق بات کا اظہار آپ کے کردار میں شامل تھا۔ اس تمام اعتماد اور

اعلیٰ منصب مشیر عثمانی ہونے کے باوجود حضرت مفتی صاحب قدس سرہ میں کسی نے احساس برتری جیسے اثرات کو محسوس نہیں کیا۔ اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ جس خانقاہ سے وابستگی رکھتے تھے اس کی خاصیت یہی تھی۔ نہ صرف آپ کا کردار یہ تھا بلکہ بعض حضرات کے بارے میں خود حضرت مفتی صاحب کو یہ معلوم تھا کہ وہ علامہ عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کے سامنے حضرت کی شکایات سے بھی نہیں چوکتے تھے، لیکن آفرین ہے اس صبر و تحمل اور اعلیٰ ظرفی پر کہ یہ سب کچھ دیکھنے اور سننے کے باوجود کبھی رنجش کا اظہار نہیں فرمایا اور ان صاحب سے بھی تادم مرگ اچھے سلوک اور محبت میں کوئی کمی نہیں کی۔

حضرت رحمۃ اللہ کو جہاں اپنی رہائش کے لیے فکر تھی وہیں اس سے کئی گنا زیادہ فکر دارالعلوم کے قیام کی تھی۔ ناسازگار ماحول، حکومت وقت کی سرد مہری، اپنوں کی عنایات، معاندین کی مخالفتوں اور دیگر ناگفتہ بہ حالات کے باوجود حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے قیام دارالعلوم کی فکر اور کوشش کو ایک لمحہ کے لیے بھی دل سے دُور نہیں کیا۔ کام کرنے والے ساتھیوں کا کال تھا اس کے باوصف بڑی دوڑ دھوپ کے بعد جمشید روڈ (حالیہ بہادر یار جنگ روڈ) پر زمین کا ایک بڑا قطعہ حضرت علامہ عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کے مزار سے متصل حاصل کیا، چند مخلصین کے تعاون سے دارالعلوم کی عمارات کا نقشہ تیار کروایا اس کے سنگِ بنیاد رکھنے کی مبارک رسم کے لیے ایک عالی شان تقریب کا اہتمام بھی کر لیا۔ تمام اسلامی ممالک کے معزز سفرائے کرام کو مدعو کر لیا لیکن قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ غیروں نے مخالفت میں ریشہ دوانیاں شروع کردیں۔ اپنے کرم فرماؤں نے محض ذیلک خالی فائدے کی خاطر ایسی نیک وسعید کوششوں میں رخنے ڈالنے کی ٹھان لی۔ بڑے بڑے جہازی سائز کے پوسٹر اور دستی اشتہار مخالفت میں شائع کیے گئے شخصی حملے، بیہودہ اور ہر قسم کے الزامات اور بے سروپا اتہامات کا طوفان اٹھایا گیا۔ اخباروں میں بیان بازی اور حضرت مفتی صاحب کی ذات پر رکیک حملے بھی کیے گئے اور یہ سب کچھ ایک دو دن نہیں بلکہ مسلسل سوچی سمجھی اسکیم کے تحت منظم طریقہ پر یہ مہم ہر سمت سے عرصہ تک جاری رہی۔ اور یہ سب کچھ اپنوں نے کیا کہ جس پر غیر بھی انگشت بدنداں رہ گئے۔ ان ساری مخالفتوں کے باوجود مفتی محمد شفیع کی نازک و ناتواں مخنی ذات اللہ تعالیٰ کے بھروسے اپنے قدم منزل کی طرف بڑھاتی ہی رہی۔ جو تو دارالعلوم کی زمین پر شاندار شامیانے لگے۔ جلسوں کے انتظامات تکمیل کو پہنچے۔ وہ نیک ساعت بھی آپہنچی کہ سارے معزز مقامی مہمانان اور

سفرائے ممالک اسلامیہ جلسہ گاہ میں رونق افروز ہوگئے۔ افتتاحِ جلسہ کا وقت قریب سے قریب تر آگیا کہ یکایک یہ خبر ملی کہ سنگِ بُنیاد کی تنصیب کی رسم ادا کرنے کی راہ میں بعض سنگدلوں نے عاقبت نااندیشی سے رکاوٹوں کی چٹانیں کھڑی کردی ہیں۔ نہ صرف یہ بلکہ حضرت علامہ عثمانی قدس سرہٗ کی اہلیہ محترمہ کو برقع میں گھر سے باہر لاکر سنگِ بُنیاد کی جگہ بٹھادیا گیا تھا۔ اور ان کی زبان سے کہلوایا گیا کہ اس زمین پر مفتی محمد شفیع کا دارالعلوم نہیں بنے گا۔ یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح سارے جلسہ گاہ میں پھیل گئی ہر شخص متعجب تھا کہ یہ کیونکر ہوا کہ ایک عالم بے بدل کی پردہ نشین حیادار بیوہ میدان میں آکر بیٹھ گئیں؟ ان ناہنجار کوشش کرنے والے اور اپنی عاقبت سے غفلت برتنے والے اپنے کید وفتنہ میں کامیاب ہوگئے تھے۔ ایسے وقت پر حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ پر کیا گزری ہوگی۔ اس کا اندازہ لگانا کسی کے بس کی بات نہیں ہے۔ احقر اس بات کا چشم دید گواہ ہے کہ حضرت کے چہرہ مبارک پر پسینہ تھا۔ پریشانی کے عالم میں کبھی ادھر جاتے اور کبھی اُدھر اور کوشش یہ تھی کہ کسی طرح اماں جان گھر میں چلی جائیں۔ دارالعلوم کے بننے یا نہ بننے کا سوال بھی ثانوی حیثیت اختیار کرگیا تھا بس فکر تھی تو اماں جان کی تھی۔ حضرت والا اگر چاہتے تو ایک اشارہ سے ان بدکردار حضرات کو ان کے کیفرِ کردار تک پہنچا سکتے تھے اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں تمام زندگی وہ عزّت اور مقام عطا فرمایا تھا کہ حکومت کے کارندوں سے لے کر عوامی ذی اثر حضرات بلکہ اسلامی ممالک کے سفرائے عظام سب ہی علم کے اس پیکر کے خلوص، تقویٰ اور اللہ کے عطا کردہ مقام کے قائل تھے اور آپ کی خاطر اس مختصر سے فسادی ٹولہ کا خاتمہ کرنا ان کے نزدیک کوئی بڑی بات نہ تھی۔ لیکن حضرت مفتی صاحب نے زندگی کی کسی منزل میں بھی ان ذرائع پر نظر نہیں کی بلکہ ان کی نظر اس پر تھی کہ یہ بُرے لوگ ٹھیک ہوجائیں۔

جن حضرات نے اس مرحلہ پر حضرت مفتی صاحب کو دیکھا ہے وہ شاہد ہیں کہ کس قدر صبر سکون اور تحمل کا مظاہرہ حضرت نے کیا۔ سب کچھ قربان کردیا۔ مہمانوں کی رسوائی، انتظامات کی تباہی، دارالعلوم کی بُنیاد پڑنے سے پہلے ہی بیخ کنی، اماں جان کی بدنامی، جگ ہنسائی، اپنوں کی عیّاریاں اور الزامات کی بوچھاڑ کو صرف اللہ کے لیے برداشت کرلیا اور اس یقین کے ساتھ کہ پروردگارِ عالم نے اسی میں بھلائی رکھی ہے۔ انسانی کوششوں کی انتہا تک پہنچنا تو حضرت کے اختیار میں تھا لیکن اس کی تکمیل ان کے بس میں نہ تھی۔ یہ کام جس کا تھا اسی کے سپرد کرکے انا للہ وانا الیہ راجعون کا

ورد زبان پر جاری کر لیا، آپ کے چہرہ سے اس وقت یہ خوب عیاں تھا کہ کسی غیبی رہنما نے یہ بشارت دے دی تھی کہ بد دل نہ ہو عنقریب یہ فتنہ اُٹھانے والے اپنی منزل کو پہنچیں گے اور تم اپنی منزل ہماری امداد سے پالو گے، اور ہُوا بھی یہی — احقر آج بھی جب اس یوم الفتن کا تصور کرتا ہے تو حضرت قدس سرہٗ کا مسکراتا پُرعزم ویقین چہرہ نظروں کے سامنے آجاتا ہے۔ ان معاندین نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ جس زمین کو دارالعلوم سے محفوظ رکھا وہ آج کس عالم میں ہے؟ اور جس کو دنیا کی نظروں میں بزعم خود ذلیل وخوار کرنا چاہا، آج خداوند عالم نے اس کو کیا مقام عطا فرما دیا ہے۔ اور یہ کہ خود یہ حضرت دنیا کے پیچھے کیسے ذلیل ورسوا ہو رہے ہیں اور کاسۂ گدائی لے کر کس طرح دنیا داروں کے آگے سربسجود ہیں اور ان کی ٹھوکروں میں روندے جارہے ہیں۔ ساری دنیا اس پر گواہ ہے۔ اس سارے حادثہ میں حضرت مفتی صاحب نور اللہ مرقدہٗ کے جذبۂ خدمت علم، عزم، لگن، للہیت، توکل، تکلیفوں پر صبر، الزامات پر تحمل، دشمنوں سے بھی محبت اور خلوص جلوہ نما ہے اور کس فراخدلی سے ایسے آستین کے سانپوں کو بھی عفو ودرگزر سے نوازدیا۔

اللّٰھم اھدھم صراطك المستقیم

حضرت کے اسی جذبۂ خلوص کے نتیجہ میں اللہ عزوجل نے اس زمین کے ٹکڑے کے عوض اپنے فضل وکرم سے دارالعلوم کے لیے ایسی بڑی زمین عطا فرمادی کہ آج کسی دینی ادارہ کی قسمت میں اتنا بڑا احاطہ نہیں ہے۔ اس پر مستزاد یہ کہ اس کی بے مثال قیمتی عمارتیں، اس کے عالی مقام مخلص اساتذۂ کرام اس کے فاضلین، اس کے طلبہ اور دیگر مخلص کارکن، ان معاندین کے لیے کھلا چیلنج ہیں۔ کاش ان بے سمجھوں کو اب بھی عقل آجاتی اور اس دُنیا میں کچھ تلافی مافات کر لیتے۔

کورنگی میں جو زمین پروردگارِ عالم نے دارالعلوم کے لیے عطا کی وہ افتادہ تھی، شہر سے میلوں دُور خصوصاً اس دور میں جبکہ نہ تو آبادی زیادہ پھیلی تھی اور نہ ذرائع آمدورفت تھے۔ ان تمام صعوبتوں کے باوجود "شرافی گوٹھ" کی اس زمین پر عمارت کی تعمیر کی نگرانی حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ خود بنفس نفیس فرمایا کرتے تھے۔ شہر سے صبح سویرے بعد ناشتہ چلتے اور دن بھر اسی زمین پر گزارتے۔ اس وقت اس ساری زمین پر صرف ایک مختصر سی عمارت تھی جس میں آج کل دارالعلوم کی لائبریری اور تحفیظ القرآن کا عارضی انتظام ہے۔ اسی عمارت کی

بالائی منزل پر دارالعلوم کے نقشے بنتے، انجنیئر صاحب سے مشورے ہوتے اور تصور ہی تصور میں دارالعلوم کی شکل و شباہت کا منظر دیکھتے تھے۔ اس وقت اس جگہ نہ تو بجلی تھی اور نہ پانی کا کوئی خاص اہتمام۔ ہر طرف سے ہواؤں کے جھکڑ چلتے، ریت کے طوفان اُٹھتے، گرمی کی تپش ہوتی اور ایسی حالت میں ایک دو دن نہیں مہینوں حضرت والا تشریف لے جاتے اور نگرانی فرماتے رہے۔ رفتہ رفتہ اس غیر آباد زمین پر اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے مسجد، دارالافتاء، دارالحدیث، دارالطلبا، دارالتربیت اور ان کے علاوہ رہائشی مکانات کی عالی شان عمارتیں قائم ہوگئیں اور بفضلہ تعالیٰ ابھی یہ سلسلہ چل رہا ہے۔ فللّٰہ الحمد۔ یہ سب کچھ حضرت قدس سرہٗ ہی کی کرامت ہے کہ جو کام حکومتوں کے ماہرین منصوبہ بندی اور لامتناہی ذرائع سے مدتوں میں ممکن نہیں ہوتا، اس کو اللہ کے اس ضعیف العمر باعزم و ہمت بندے نے تن تنہا کسی متوقع ذرائع کے بغیر بہت ہی قلیل عرصہ میں انجام دے دیا۔ اور علوم دینیہ کا ایسا لہلہاتا سرسبز و شاداب باغ بنا دیا کہ جس کے ثمرات سے نہ صرف پاکستان بلکہ سارا عالم استفادہ کر رہا ہے اور انشاء اللہ العزیز تا قیامت فیوض یزدانی کا یہ چشمہ سارے عالم کو سیراب کرتا رہے گا۔

ان تاریخی مختصر ترین جھلکیوں کے بعد اور چند واقعات پیش کیے جا رہے ہیں جو حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی بزرگی، بردباری، ذرہ نوازی، رعایت شخصی اور مربیانہ خصوصیات پر روشنی ڈالیں گے۔ اس میں شک نہیں کہ ان میں کے اکثر واقعات نجی اور شخصی نوعیت کے ہیں لیکن امید ہے کہ ہر درجہ کے انسان کے لیے کردار سازی کا سامان ضرور رکھتے ہوں گے۔

ایک دفعہ ہم کسی کام کے سلسلہ میں صبح سے بڑی دیر تک گھومتے رہے۔ کوئی گیارہ بجے کے قریب فریر روڈ (حالیہ شاہراہ لیاقت) پر جب نظامی دواخانہ کے قریب پہنچے تو حضرت نے مجھ سے فرمایا "اچھا آپ جائیں۔ اب آپ کا دفتر یہاں سے قریب ہے"۔ سلام کے بعد دونوں جدا ہوتے۔ چند ہی قدم کا فاصلہ ہوا تھا کہ حضرت نے مجھے آواز دی۔ میں بھی حضرت کو صدر کی جانب جاتے دیکھ ہی رہا تھا جلدی جلدی آگے بڑھا۔ حضرت بھی میری جانب تشریف لا رہے تھے۔ حضرت نے اپنی جیب سے کچھ رقم نکالی اور میرے ہاتھ میں تھما دی اور فرمایا اسکو قبول کر لیجئے۔ اسکے بعد اپنی منزل کی جانب روانہ ہوگئے۔ اس واقعہ کا پس منظر یہ تھا کہ صبح سے تمام سفر کے دوران بس کے ٹکٹ میں نے ہی لیے تھے۔ حضرت میری مالی حالت سے واقف تھے۔ اس وقت تو اس خیال سے کہ منع کرنے پر اس کا دل دکھے گا، خاموش رہے لیکن اختتام سفر پر کافی رقم سے نواز کر عمر بھر کے لیے دل پر نقش کر دیا۔ خدمت کا موقع بھی دیا اور پھر اپنے کرم سے

←

سرفراز بھی فرما دیا۔ اس عمل سے حضرت کی چھوٹوں پر شفقت دل دہی اور مالی اعانت کا طریق احسن جھلکتا ہے۔ ایک دفعہ عرض کیا کہ حضرت مرکزی حکومت اپنے ملازمین کو آمدورفت کی سہولت کی خاطر سائیکل خریدنے کے لیے ایک سو بیس روپے قرض دیتی ہے اور بارہ مساوی ماہانہ قسطوں میں واپس لیتی ہے۔ لیکن اس کی قباحت یہ ہے کہ اس قرض کا سود بھی دینا پڑتا ہے۔ رقم کی ضرورت بھی شدید ہے۔ اب حضرت کا جو بھی حکم ہو۔ یہ سُن کر حضرت اُٹھے اور اندر جا کر ایک سو بیس روپے لا کر میرے ہاتھ پر رکھ دیے اور فرمایا کہ دس روپے ماہانہ قسط سے لوٹا دینا۔

اسی قرض کے دوران ایک قسط کے وقت تنگدستی ایسی ہوگئی کہ دس روپے کی گنجائش نہیں تھی۔ لیکن شرمندگی سے بچنے اور وعدہ کو پُورا کرنے کی خاطر بہ ہزار وقت خدمت میں حاضر ہو کر قسط پیش کر دی اور جب حضرت نے قبول فرمایا تو پھر آہستہ سے اپنی حالت بھی بیان کر دی۔ حضرت نے مُسکراتے ہُوئے روپے واپس فرما دیے اور خوش ہو کر فرمایا "آپ نے بالکل صحیح طریقہ اختیار کیا۔ آدمی کو چاہیے کہ وعدہ پُورا کرے اور بعد میں اپنی حاجت کا اظہار کر دے لیکن ایسا کبھی نہ کرے کہ قسط ہی غائب کر دے۔"

اس برتاؤ کے ذریعہ بھی حضرت نے ہمدردی، اعانت، گناہ کبیرہ سے نجات دلانے اور اچھے عمل کی تعریف کے ذریعہ اپنی مربیانہ اور مشفقانہ صفت کا نمونہ سامنے رکھ دیا۔ جو ایک شیخ کامل ہی کا حصہ ہے۔

احقر نے اس وقت جب حضرت جیکب وئن کے سرکاری مکانوں میں قیام فرما تھے عرض کیا کہ حضرت بعد نماز فجر حیدرآباد کالونی کی مسجد میں تفسیر بیان فرما دیا کیجئے۔ اس درخواست کو فوراً کشادہ دلی کے ساتھ بڑی مسرت سے قبول فرمایا اور ارشاد فرمایا کہ فجر کی جماعت سے پہلے آپ آکر مجھے لے جایا کریں۔ اس کرم فرمائی پر احقر کو بڑی مسرت ہوئی اور اسی دن مسجد میں اعلان کر دیا۔ دوسرے دن سے روزانہ صبح سواری لے کر حاضر ہوتا۔ حضرت تفسیر بیان فرماتے اور پھر واپس چھوڑ دیا کرتا۔ یہ سلسلہ کافی عرصہ چلتا رہا۔ مصلیوں کی تعداد دن بدن فجر کی نماز میں بڑھتی گئی اور حضرت کے اسلوب بیان اور تفہیم سے کافی استفادہ ہوتا رہا۔ لیکن ایک دن بیان کے دوران حضرت کے بالکل رُوبرو ایک صاحب بیٹھے خراٹے بھرتے سو رہے تھے۔ حضرت نے اس وقت تو کچھ نہیں فرمایا لیکن واپسی کے وقت راستہ میں احقر سے ارشاد فرمایا کہ کل سے میں نہیں آؤں

گا۔ جہاں قدر نہ ہو وہاں اللہ تعالیٰ کا کلام جبراً سنانا وقار کے خلاف ہے۔ اور بافادہ سے خالی۔

ایک دفعہ نشست عام کے بعد مجھ سے فرمایا کہ "میں بھی شہر چل رہا ہوں، آپ بھی ساتھ ہی چلیں"۔ چنانچہ ہم (میرے علاوہ اُس وقت حضرت کے ساتھ غالباً بھائی سید محمود حسن صاحب اور کوئی اور صاحب بھی تھے جس کا نام اس وقت یاد نہیں ہے۔ کار میں شہر چل رہے تھے) روانہ ہوگئے۔ راستہ میں انگریزی اخبار ڈان کے اس وقت کے ایڈیٹر جناب الطاف حسین کے گھر رُکے۔ ہم تو کار ہی میں بیٹھے رہے، لیکن حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ اندر تنہا تشریف لے گئے۔ بڑی دیر کے بعد واپس تشریف لائے۔ فرمایا "الطاف حسین نے یاد کیا تھا۔ بیمار ہیں حالت نازک ہے اللہ رحم فرمائے"۔ اور پھر ارشاد ہوا "بڑے عجز و انکسار کے ساتھ تمام گناہوں سے توبہ کی اور مجھ سے دُعا کروائی۔ دیر تک بہ اصرار مجھے روکے رکھا اور اب بادلِ نخواستہ اجازت دی"۔ اُس وقت کی بقیہ گفتگو حافظہ میں اب محفوظ نہیں ہے۔ غالباً یہ بھی ارشاد فرمایا کہ "بڑی اچھی توبہ کی۔ پاک صاف ہوگیا۔ نیک آدمی ہے"۔ دوسرے ہی دن ہم نے سنا کہ الطاف حسین صاحب کا اسی رات انتقال ہوگیا۔

حضرت مفتی صاحب نوراللہ مرقدہٗ کو احقر سے بڑا خاص لگاؤ اور اُنس تھا اور اس تعلق اور شفقت خاص کا احساس احقر کو بھی اکثر اوقات ہوجاتا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی عنایت خاص سے عطا فرمائی تھی حضرت علامہ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کے وصال کے بعد احقر نے حضرت ممدوح ہی سے تجدید بیعت کا شرف حاصل کیا تھا۔ دل ایسا کھنچا جاتا تھا کہ حضرت کی کوئی تقریر ایسی نہ ہوتی جس میں احقر حاضر نہ ہوتا حتیٰ کہ ریڈیو پاکستان کی تفسیر کے دنوں میں نشرگاہ کے پھاٹک پر بھی احقر انتظار کرتا رہتا۔ جن دنوں مسجد باب الاسلام (آرام باغ) میں حضرت کی تفسیر قرآن مجید کا سلسلہ جاری تھا وہاں بھی احقر کو حاضری کی سعادت نصیب ہوتی رہی حضرت اکثر و بیشتر اپنے ساتھ رکھتے۔ پاکستان ایمپلائز کوآپریٹیو سوسائٹی (المعروف بہ پی ای ایچ ایس سوسائٹی) میں سائنس ماڈل اسکول سے ملحق ایک مسجد کی تعمیر کے لیے جب بنیاد کھودی جارہی تھی تو حضرت مفتی صاحب (قدس سرہٗ) ہی کو خیر و برکت کی خاطر زحمت دی گئی تھی۔ حضرت نے حسبِ معمول احقر کو بھی ساتھ چلنے کا حکم دیا۔ مسجد کی جگہ پہنچ کر حضرت والا نے اولاً

کدال سے زمین کھودی اور پھر اپنے دستِ مبارک سے کدال احقر کے حوالہ کی اور کھدائی کا حکم دیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ برطانیہ نے نہر سویز (ملک مصر) پر حملہ کیا تھا۔

ایک مرتبہ احقر شدید انقباضی حالت میں مبتلا ہو گیا۔ حالت کی شدت نے حضرت کی خدمت میں حاضری سے باز رکھا تھا۔ پریشانی زیادہ تھی لیکن پھر بھی بار بار حضرت والا ہی کا خیال آتا تھا کہ حاضر ہو کر علاج کی درخواست کی جائے لیکن جیسے جیسے غیر حاضری کے دن طویل ہوتے جا رہے تھے۔ حجاب حاضری میں حائل ہوتا جا رہا تھا۔ آخر اللہ تعالیٰ نے مدد فرمائی اور ایک اتوار کو ہمت کر کے دارالعلوم نانکواڑہ کی مسجد میں حاضر ہو گیا۔ شرم کی وجہ سے رُوبرو بیٹھنے کی ہمت تو نہ ہوئی اس لیے ایک ستون کی اوٹ میں بیٹھ گیا۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے دل میں اس وقت کی تقریر کے لیے احقر کی حالت ہی کو القا فرمایا۔ چنانچہ حضرت نے اس دن ساری تقریر انقباض ہی کے عنوان پر فرمائی۔ تقریر ہو رہی تھی اور ادھر احقر کا قلب کروٹیں بدل رہا تھا۔ رفتہ رفتہ انقباض رخصت ہو گیا اور قلب کے اندر وہ فرحت و انبساط پیدا ہوا کہ بیان نہیں کیا جا سکتا۔ حضرت کی اس کرامت ہی نے احقر کو ایک نقصانِ عظیم سے بچا لیا۔ تقریر کے بعد حاضر ہوا تو آگے بڑھ کر سینہ سے لگا لیا اور غیر حاضری کی وجہ تو نہ پوچھی کہ احقر کو حجاب ہو گا۔ صرف خیریت دریافت فرماتے رہے اور اپنے ساتھ کر لیا۔

حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے جب احقر پر ایک بڑی ذمہ داری عائد کر دی تو بڑی گھبراہٹ اور پریشانی ہوئی۔ خود ہی اصلاح کے قابل بھلا کسی اور کی کیا اصلاح کر سکتا تھا۔ اس خیال میں غلطاں تھا کہ یکایک حضرت کی مدحت میں چند اشعار موزوں ہو گئے۔ اس خوف سے کہ افراط و تفریط میں دامن ملوث نہ ہو۔ حضرت کی خدمت میں وہ اشعار پیش کر دیے۔ ان دنوں حضرت کی طبیعت کچھ زیادہ ہی خراب تھی۔ مجلس عام میں اپنے احباب سے گفتگو بھی حسبِ معمول نہ فرما سکتے تھے اس لیے کافی عرصہ تک وہ اشعار نظرِ کرم سے محروم ہی رہے حتیٰ کہ احقر نے ایک دو مرتبہ یاددہانی کرائی۔ فرمایا "پڑھ تو نہیں سکتا کسی سے سُن لوں گا"۔ چنانچہ آئندہ حاضری میں احقر کو قریب بلا کر فرمایا "میں نے بھی ایسے ہی موقع پر اپنے شیخ (قدس سرہٗ) کے لیے اشعار کہے تھے اور پیش کر دیے تھے۔" یہ سُن کر احقر کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی کہ غیر شعوری طور پر سنتِ شیخ میں اشعار

کے اوراس پر مستزاد یہ کہ دربار عالی میں مقبول بھی ہوگئے۔ فالحمد للہ علیٰ ذالک۔ حضرت کے وصال سے چند ہی دن قبل یہی اشعار رسالہ الحق خٹک میں شائع ہوکر آگئے۔ بھائی محمد تقی عثمانی زید مجدہٗ نے فرمایا کہ جب الحق مذکورہ کا شمارہ حضرت کی نظر سے گزرا تو حضرت نے ان اشعار کو رسالہ سے الگ کر کے اپنے خاص بستہ میں رکھ لیا۔ وصال کے بعد جو اشیاء بستے سے برآمد ہوئیں۔ احقر کے وہ اشعار بھی اس میں شامل تھے۔

حضرت ہمیشہ ہی ہشاش بشاش رہتے اور جب کبھی اور جس کسی سے ملتے چہرۂ مبارک مسکراتا ہوا ہوتا۔ لیکن سب سے زیادہ خوش حضرت والا کو احقر نے اس وقت دیکھا جبکہ حضرت کے چھوٹے صاحبزادہ بھائی محمد تقی عثمانی زید مجدہٗ نے دارالعلوم کراچی کے پہلے سالانہ جلسہ منعقدہ نانکواڑہ میں تمام اسلامی ممالک کے سفراء کرام کے سامنے عربی میں تقریر کی تھی۔ یہ واقعہ غالباً آج سے ۲۶ سال پہلے کا ہے۔ احقر حضرت کے قریب نماز مغرب کے انتظار میں کھڑا تھا اور حضرت اس خوشی میں جھوم رہے تھے۔ احقر نے تقریباً ۲۹ سال خدمت عالی میں گزارے لیکن ایسا خوش کسی اور موقع پر نہیں دیکھا۔

اللہ تبارک و تعالیٰ حضرت قدس سرہٗ کے مزار مبارک پر اپنی رحمتوں اور انوار کی مسلسل اور کثیر بارش فرمائیں اور منتسبین کو اتباع کی توفیق سے نوازیں۔ آمین برحمتہ وہو ارحم الراحمین۔

○

ایک زمانہ دراز سے مسلمانوں کی دین اور علوم دینیہ سے عام غفلت کے نتیجے میں سب ہی علوم دینیہ سے مسلمانوں کی اکثریت بے بہرہ ہوتی چلی گئی خصوصیت سے آخر الذکر علم جس کا تعلق اعمال باطنہ کی اصلاح سے ہے وہ تو ایسا متروک ہوا کہ عوام تو عوام علماء کی ایک بڑی تعداد بھی اس سے بے تعلق ہوگی۔ صرف اعمال ظاہرہ کی پابندی میں دین کو منحصر سمجھ لیا گیا۔ صدق و اخلاص، توحید و توکل، صبر و شکر، قناعت و زہد، تقویٰ کے الفاظ صرف زبانوں پر رہ گئے۔ حب جاہ، حب مال، نخوت، غرور، غیظ و غضب، کینہ و حسد جیسے محرمات اور مہلک امراض سے نجات حاصل کرنے کی فکر بھی دلوں سے محو ہوگئی۔

(مفتی اعظم نے دل کی دنیا، البلاغ صفر ۱۳۹۷ھ)

جناب قاری فیوض الرحمٰن صاحب
ایم اے، ایم او ایل

حضرتؒ کی اولاد اور خلفاء

اولاد:۔ اولاد میں آپ کے پانچ فرزند۔ مولانا محمد زکی کیفی مرحوم، مولانا محمد رضی، مولانا محمد ولی رازی ایم اے مولانا مفتی محمد رفیع مہتمم دارالعلوم کراچی اور مولانا محمد تقی عثمانی ایم اے ایل ایل بی استاذ دارالعلوم کراچی و مدیر ماہنامہ "البلاغ" اور چار صاحبزادیاں ہیں۔ سب سے بڑی صاحبزادی محترمہ نعیمہ خاتون مرحومہ، ۲۷ سال کی عمر میں وفات پاگئی تھیں جن کا مرثیہ حضرت نے کہا ہے اور وہ "کشکول" میں شائع بھی ہو چکا ہے۔ ان کے علاوہ محترمہ عتیقہ خاتون صاحبہ اور محترمہ حسیبہ خاتون صاحبہ کراچی میں اور محترمہ رقیبہ خاتون صاحبہ لاہور میں مقیم ہیں۔

مولانا محمد زکی کیفیؔ

۱۳۴۴ـــــ ۱۳۹۵ھ

آپ ۲۲ ذی الحجہ ۱۳۴۴ھ کو دیوبند میں پیدا ہوئے۔ آپ حضرت مفتی محمد شفیعؒ کے بڑے فرزند تھے۔ نام محمد زکی حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ کا تجویز فرمودہ ہے تاریخی نام "سعید اختر" ۱۳۴۵ھ ہے جس میں آٹھ دن حذف کرنے پڑتے ہیں، کیفیؔ تخلص تھا۔ بچپن ہی سے ذہانت و ذکاوت اور حاضر جوابی میں مشہور تھے۔ ایک مرتبہ اپنے والد اور دادا صاحب کے ساتھ دہلی جانا ہوا، فتح پوری کی مسجد میں نماز کے لیے گئے، وہاں سے واپسی میں آپ نے اپنے والد صاحب کے جوتے اٹھالیے مگر دادا صاحب کے جوتے نہیں اٹھائے، دادا صاحب نے ازراہ تفنن پوچھا "کیوں بھائی یہ کیا؟ تم نے میرے جوتے کیوں نہیں اٹھائے؟" آپ نے اپنے والد صاحب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے برجستہ جواب دیا

• آپ کے جوتے یہ اُٹھائیں گے "

ابتدائی تعلیم دارالعلوم دیوبند میں شروع کی، اور فارسی و ریاضی کی تکمیل کے بعد درسِ نظامی شروع کیا مگر بعض حالات کی بنا پر چوتھے سال کے بعد درسِ نظامی کی تعلیم جاری نہ رکھ سکے، اس کے باوجود بزرگوں کی صحبت اور وسیع مطالعہ نے آپ کو علم و عمل کی وہ دولت نصیب فرمائی جو بسا اوقات اچھے اچھے فضلاء میں نظر نہیں آتی، کتاب سے آپ کو عشق تھا اور نئی کتاب کو دیکھ کر اسے پڑھے بغیر چھوڑ دینا آپ کے لیے ممکن ہی نہ تھا خاص طور سے تاریخ و تصوف پر آپ کا مطالعہ قابلِ رشک تھا۔

شاعری:۔ شعر و سخن کا بچپن ہی سے شوق تھا، ۱۹۲۵ء سے باقاعدہ شعر کہنے لگے تھے اور نو مشقی کے اس دور میں بھی اس انداز کے شعر کہتے تھے۔

ع تیرے نثار، مشقِ ستم میں کمی نہ کر لٹنے تو داغ ہوں کہ گلستاں کہیں جسے
آلامِ روزگار سے اکتا گیا ہے دل وہ درد دے کہ درد کا درماں کہیں جسے

ع ہم ہیں قتیل اک بتِ نازک خیال کے آلامِ روزگار ذرا دیکھ بھال کے
نظامِ عالم ہے یونہی قائم یہی ادائے فلک رہی ہے جہاں پہ گل ہیں فنا پہ مائل، وہیں کلی بھی چٹک رہی ہے

خواب میں کہی گئی ایک غزل کا ایک شعر یوں ہے:۔

اُف تصور کی تیرے رعنائی تجھ سے بھی کچھ زسوا حسیں نکلا

جگر مراد آبادی سے آپ کے بڑے اچھے تعلقات تھے، انہیں جب پہلی بار اپنی غزل کا یہ مطلع سنایا کہ ع

ہم ہیں قتیل اک بتِ نازک خیال کے آلامِ روزگار ذرا دیکھ بھال کے

تو جگر مرحوم چونک اُٹھے، بڑی داد دی اور ساتھ ہی مشورہ دیا کہ مشقِ سخن ضرور جاری رکھیں۔ اس کے بعد آپ کے ذوقِ شعر گوئی نے بڑی ترقی کی، ملک کے تمام نامور شعراء آپ کی غزلوں کے نہایت مداح تھے۔ آپ بلاشبہ اپنے فکر و فن کے لحاظ سے دورِ حاضر کے گنے چنے شعراء میں سے تھے۔ آپ نے اُردو شاعری کو بہت کچھ دیا اور اس میدان میں پامال راہوں سے ہٹ کر نئے نئے راستے تلاش کئے۔ اس کے باوجود عوامی مشاعروں میں شریک ہونے سے کتراتے البتہ شعر و سخن کی مخصوص نشستوں میں بکثرت شریک ہوتے تھے۔

آپ نے فارسی اور اُردو شاعری کا انتہائی وسیع مطالعہ کیا تھا، فارسی اور اُردو کے بلا مبالغہ ہزار ہا

اشعار یاد تھے اور جب سنانے پہ آتے تو گھنٹوں سناتے رہتے تھے۔ فارسی میں حافظ اور سعدی کے علاوہ نظیری اور عرفی کے بڑے مداح تھے۔ اُردو کے قدیم شعراء میں داغ، میر اور غالب سے اور زمانۂ بعد کے شعراء میں فانی، حسرت، اصغر، جگر اور اقبال سے بہت متاثر تھے۔

آپ کی شاعری کا اصل میدان غزل تھا لیکن متعدد نظمیں بھی آپ نے بڑے معرکے کی کہی ہیں۔ ان میں "دارالعلوم کراچی" پر آپ کی نظم ایک شاہکار ہے۔ اس کے علاوہ ۱۹۶۵ء اور ۱۹۷۰ء کے جہادِ پاکستان کے موقع پر آپ نے درجنوں ولولہ انگیز نظمیں کہی ہیں۔ وصال سے تقریباً ڈیڑھ سال پہلے غزل کہنی چھوڑ دی تھی اور مسلسل نعتیں کہہ رہے تھے۔ آپ کی تمنا تھی کہ اب یہ شاعری نعت کے لیے مخصوص ہو جائے۔ اس کا اظہار آپ کے اس شعر سے ہوتا ہے۔

یہ ربِّ محمد سے دعا ہے مری کیفی ہو نعتِ محمد مرے اشعار کی دنیا

روزنامہ وفاق لاہور میں ایک قطعہ حالاتِ حاضرہ پر لکھنے کا بھی معمول تھا۔

آپ کا مکمل مجموعۂ کلام "کیفیات" کے نام سے ادارہ اسلامیات، انارکلی لاہور پیش کر رہا ہے جو احسان دانش، ماہر القادری اور مولانا محمد تقی عثمانی کے پیش لفظ اور تعارفی مقالے سے مزین ہے۔

بیعت کا تعلق: بچپن ہی سے حضرت والد صاحبؒ کے ساتھ حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ کی خدمت میں حاضری کی سعادت حاصل تھی، اسی دوران میں حضرت تھانویؒ کے دستِ مبارک پہ بیعت ہوئے اور اصلاح کرواتے رہے۔ حکیم الامت حضرت تھانویؒ سے "پند نامہ عطار" پڑھنے کی سعادت بھی آپ کے حصہ میں آئی۔ حضرت تھانویؒ کی تعلیم و تربیت کا اثر تھا کہ آپ ہمیشہ اپنی نقل و حرکت میں اس بات کا خاص اہتمام کرتے تھے کہ اس سے کسی دوسرے کو کوئی تکلیف نہ پہنچے۔ معاش کے لیے تجارتی کتب خانہ، ادارہ اسلامیات، انارکلی لاہور کے نام سے قائم ہے۔ اس سے کئی طلبہ اور مستحقین کے وظیفے مقرر کر رکھے تھے۔

حج: پہلا حج کوئی ۲۵ سال کی عمر میں کیا اور دوسرا حج کر کے واپس آئے ہی تھے کہ پچاس سال سترہ دن کی عمر پا کر عاشورہ محرم ۱۳۹۵ھ بروز جمعرات واصل بحق ہوئے اور بعد از نماز جمعہ نماز جنازہ ادا کی گئی۔

چند شعر بطور نمونہ:

~ ہم ہیں کیفی ایک ابرِ نوبہار جس طرف گذرے گہر برسا گئے

— فرصتِ خندہ بسی تھی کتنی ... پھول ہنسنے کے سوا کیا کرتے
عجب کیا! شانِ رحمت ڈھانپ لے میرے گناہوں کو ... خطا کی ہے، اگر تیری عطا کو دیکھ کر کی ہے
— یہ دنیا کھیل ہے اور کھیل بھی ہے چند لمحوں کا ... نظر جو کچھ بھی آتا ہے اُسے خواب گراں سمجھو
— وہ آشنا اگر ہے تو عالم ہے آشنا ... وہ آشنا نہیں، تو کوئی آشنا نہیں
چھین لے مجھ سے نظارئہ جلوئہ خوش رنگ دوست ... میں کوئی محفل نہ دیکھوں اب تیری محفل کے بعد
— سنا ہے ڈوبنا شبنم کا رفتا شمع کا بجھنا ... ہزاروں مرحلے ہیں صبح کے ہنگام سے پہلے

تاریخ وفات :۔ از مولانا محمد احمد تھانوی :۔

— انتقالِ پُر ملال جناب مولوی محمد زکی کیفیؔ (۱۹۷۵ء)
— جناب مولانا مولوی محمد زکی کیفیؔ عثمانی دیوبندی (۱۹۷۵ء)

اولاد :۔ آپ کے تین فرزند اور اتنی ہی دختران ہیں اور سب بحمد اللہ صوم وصلوٰۃ کے پابند اور دینی ماحول کے پروردہ ہیں۔ بڑے فرزند مولوی محمود اشرف حافظ، قاری اور جامعہ اشرفیہ سے فارغ التحصیل عالم ہیں اور دار العلوم کراچی میں ایک سال فتویٰ کی تربیت حاصل کر چکے ہیں اور اب قریباً تین سال سے مدینہ طیبہ کے جامعہ اسلامیہ میں زیر تعلیم ہیں۔ دوسرے مسعود اشرف انٹر کام کر چکے ہیں۔ سعید نوجوان ہیں اور اپنے والد کے صحیح معنیٰ میں دست و بازو بنے ہیں۔ تیسرے فرزند سعود اشرف میٹرک کے بعد سال دوم میں زیر تعلیم ہیں۔ ذہانت و فطانت میں اپنے والد کی یادگار ہیں۔

حضرت احسان دانش کا تبصرہ :۔ یہ مفتی محمد شفیع کے بڑے صاحبزادے تھے، مفتی صاحب کے دوسرے بچوں کی طرح یہ بھی زیورِ علم سے آراستہ تھے۔ لاہور میں ادارہ اسلامیات کے مالک و مہتمم تھے جو دینی کتابوں کا بڑا ادارہ ہے۔ کیفیؔ نہایت اچھے اور نغز گو شاعر تھے۔ غزل اور نظم دونوں پہ انہیں عبور تھا اور دونوں میں یکساں رفتار۔ گذشتہ تین چار سال سے ان کا کلام ایسا شستہ اور منجھا ہوا آ رہا تھا کہ بعض اوقات سب حیران رہ جاتے تھے کہ زکی صاحب نے بڑی ترقی کر لی ہے۔ جہاں تک غزل گوئی کا سوال ہے وہ اس رفتار سے چل رہے تھے کہ اگر زندگی وفا کرتی تو اس دور کے بڑے شاعر ہوتے مگر شاید قدرت کو منظور نہ تھا۔ چنانچہ زیادہ عرصہ نہیں گذرا کہ "چٹ پٹ" ہو گئے اور ہم سب دیکھتے کے دیکھتے رہ گئے۔ اب ادارہ اسلامیات کو ان کے بیٹے سنبھالے ہوئے ہیں۔ خدا انہیں کامیاب کرے اور صحت عطا فرمائے

آمین ؎ ۱

مولانا محمد رضی عثمانی

آپ کی ولادت ۱۳۵۰ھ کو دیوبند میں ہوئی جس دن آپ کی پیدائش ہوئی اس دن آپ کے والد ماجد حضرت مفتی صاحبؒ جب درس دے رہے تھے تو اس میں " وَاجْعَلْهُ رَبِّ رَضِيًّا " دیکھ کر نام محمد رضی ذہن میں آیا، پھر مادہ تاریخی " رَبِّ وَاجْعَلْهُ رَبِّ رَضِيًّا ۔ قرار پایا، خود لکھتے ہیں :۔

" گھر میں جب آنکھ کھولی تو اس وقت احقر کے دادا حضرت مولانا محمد یٰسین صاحبؒ اور مشائخ میں حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ اور حضرت مولانا سید اصغر حسین صاحبؒ کا خصوصاً اور تمام علمائے دیوبند کا عموماً تذکرہ کانوں میں پڑ رہا اور خدا اور اس کے رسول ؐ کا نام ہر وقت رہتا تھا۔ بس گھر میں ہر وقت یہی چرچے تھے۔ بچپن میں جب بھی رات کو آنکھ کھلی حضرت والد صاحب کو ذکر و مناجات اور تہجد میں مشغول پایا ۔"

ابتدائی قرآن مجید کی تعلیم محلہ کے مکتب میں اور پھر دارالعلوم دیوبند میں ہوئی۔ مگر تکمیل نہ کر سکے، ۱۹۴۷ء میں پاکستان بنا اور ۱۹۴۸ء میں آپ والد صاحب کے ہمراہ کراچی آ گئے، یہاں والد صاحب نے آپ کو پڑھانا شروع کیا مگر ان دنوں حضرت مفتی صاحب اسلامی نظام کے سلسلہ میں علامہ شبیر احمد عثمانی کی معیت میں اس قدر مصروف تھے کہ آپ کی تعلیم مکمل نہ کرا سکے۔ ایسے ماحول میں ناچار ہو کر دینی کتب کی نشر و اشاعت کی طرف مائل ہوئے اور ادارہ دارالاشاعت کراچی وجود میں آیا جس کے زیر اہتمام اب تک تقریباً دو سو چھوٹی بڑی کتابوں کی اشاعت ہو چکی ہے۔

نومبر ۱۹۵۴ء میں آپ کی شادی ہوئی۔ اس وقت ایک فرزند اور دو بچیاں ہیں۔

محمد ولی رازی ایم اے

۱۱ شوال ۱۳۵۳ھ / جنوری ۱۹۳۵ء کو دیوبند ضلع سہارنپور میں پیدا ہوئے۔ نام حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ کا تجویز فرمودہ ہے، گھٹی مولانا میاں اصغر حسینؒ نے دی، تاریخی نام صغیر احمد ہے۔

؎ ۱ احسان دانش : اکابر دیوبند : الرشید (دارالعلوم دیوبند نمبر) : لاہور : ۱۹۷۶ء ص ۵۰۹ ۔

ابتدائی تعلیم کے لیے دارالعلوم دیوبند کے شعبہ قرآن مجید میں داخلہ لیا، پہلے حافظ محمد کامل سے ناظرہ قرآن مجید پڑھا۔ پھر انہی سے ۲۱ واں پارہ حفظ کر رہے تھے کہ حضرت والد مولانا مفتی محمد شفیعؒ کے ساتھ پاکستان آ گئے، پاکستان میں آ کر قاری وقار اللہ پانی پتی مدرس جامع جیکب لائنز کراچی سے تکمیل کی۔ ایک محراب میں حضرت مفتی صاحبؒ کے ارشاد پر ۲۲ پارے سُناتے اور حضرت موصوف خود سُنتے تھے۔ مولانا حافظ نور احمد صاحب سے فارسی کی چند ابتدائی کتابیں پڑھیں، پھر اپنے والد گرامی سے گلستان سعدی اور بوستان سعدی پڑھیں۔ اسی دوران اُردو شاعری سے لگاؤ ہوا اور جمعرات کو گھر پہ ہی مجلس سخن بجانی ذکی کیفی مصرعہ طرح دیتے اور آپ مکمل کرتے تھے۔

۱۹۵۲ء میں پنجاب یونیورسٹی سے "منشی فاضل" کا امتحان اعلیٰ سیکنڈ ڈویژن میں پاس کیا، ۱۹۵۴ء میں میٹرک صرف انگریزی کا امتحان پاس کیا۔ ۱۹۵۶ء میں پریس میں شرکت کی۔ کچھ عرصہ بیمار رہے، ۱۹۵۸ء میں شادی ہوئی۔ اس موقع پر بعض عزیزوں نے ٹیپ پر بھائی ذکی کیفی صاحب مرحوم کا لکھا ہوا سہرا پڑھنا شروع کیا کہ "جشن طرب مناؤ کہ شادی ولی کی ہے"۔ حضرت مفتی صاحبؒ نے اس پر فی البدیہہ سہرا اُسی مجلس میں کہا اور اس مجلس کو مجلس ذکر بنا دیا "شرعی خوشی مناؤ کہ شادی ولی کی ہے"۔ اسی سال گورنمنٹ ہائی سکول جہانگیر روڈ کراچی میں اورینٹل ٹیچر کی حیثیت سے تقرر ہوا۔

۱۹۶۰ء میں جامعہ پنجاب سے انٹر (انگریزی) اور ۱۹۶۳ء میں بی۔ اے کیا۔ ۱۹۶۴ء میں ریڈیو پاکستان کی دعوت پر مذہبی نشریات کے شعبہ کے انچارج کی حیثیت سے ملازمت اختیار کر لی۔ ۱۹۶۶ء میں کراچی یونیورسٹی سے اسلامک سٹڈیز کا امتحان فرسٹ کلاس فرسٹ پاس کیا۔ ۱۹۶۸ء تک ریڈیو پاکستان سے متعلق رہے۔ مختلف موضوعات پر ۱۵۰ کے قریب آپ کی تقاریر نشر ہوئیں۔

۱۹۶۸ء کے اواخر میں قائد ملت کالج میں بحیثیت لیکچرر اسلامک سٹڈیز آپ کا تقرر ہوا، ۱۹۷۰ء تک تدریس کا یہ سلسلہ جاری رہا۔

۴ جنوری ۱۹۷۱ء کو گرامر سکول کراچی میں اُردو اور اسلامیات کے لیکچرر چلے آ رہے ہیں۔ تصانیف میں قرآن مجید کے عنوانات کا ایک انڈکس ۱۷۵ صفحات میں آپ نے تیار کیا، بی اے اسلامیات کا نصاب لکھا جو "قومی تعلیم" (سالنامہ) میں شائع ہوا اور دلچسپی سے پڑھا گیا۔ "قادیانیت عدالت میں" تالیف علماء و زعمائے اسلام۔ انگریزی ترجمہ آپ کے قلم سے ہے۔ قیمت ۱۸/- روپے۔

صوفیانہ مسلک :۔ حضرت مولانا عبدالغنی پھولپوری سے آپ کو والد صاحب نے بیعت کرایا تھا، ان کے زیر تربیت رہے، ان کے بعد حضرت ڈاکٹر عبدالحی صاحب سے تعلق رہا، پھر ۱۹۷۶ء میں باقاعدہ ان سے بیعت ہو گئے۔

اولاد میں آپ کے ایک فرزند فرید اشرف (ولادت ۱۹۶۰ء)، اور دو بچیاں حفصہ بانو زیر بیں۔

حضرت کے دو چھوٹے صاحبزادے مولانا محمد رفیع عثمانی اور مولانا محمد تقی عثمانی ہیں۔ البلاغ کے قارئین آپ سے بخوبی واقف ہیں، اس لیے تفصیلی تعارف کی ضرورت نہیں، اس کے علاوہ حضرت مفتی اعظم کے تلامذہ پر مولانا رشید اشرف عثمانی صاحب کا جو مقالہ اس نمبر میں شامل ہے۔ اس میں بھی آپ کا تذکرہ نسبتہً تفصیل کے ساتھ آگیا ہے اس لیے اعادے کی ضرورت نہیں۔

آپ کے خلفاء :۔ جن حضرات نے آپ سے سلوک کی تکمیل کر کے خلافت حاصل کی ان کی فہرست از راہِ مصلحت آپ نے خود شائع فرما دی تھی، ان کے اسمائے گرامی درج ذیل ہیں :۔

۱ ۔ میر امام الدین صاحب مرحوم، حیدر آباد دکن۔

۲ ۔ مولوی محمود حسن مدراسی

۳ ۔ مولوی سید محمود حسن صاحب، ۳ مکتبۂ اشرفیہ متصل جامع مسجد اظہر گوہر روڈ وحید آباد کراچی ۱۸

۴ ۔ مولوی عبدالحکیم صاحب مدرس و مفتی مدرسہ اشرفیہ کوئنز روڈ سکھر۔

۵ ۔ مولوی محمد طفیل صاحب مقیم ہیلپرز کالونی (لائلپور)، فیصل آباد۔

۶ ۔ مولوی عبدالرؤف صاحب معین مدرس و معین مفتی دارالعلوم کراچی نمبر ۱۴

۷ ۔ حکیم امداد اللہ صاحب ۲۱۲ حیدر آباد کالونی بہار یار جنگ روڈ کراچی نمبر ۵

۸ ۔ شاہ سلیمان صاحب ۲۹۹ فرمان آباد ۳۶ بی لائنز کراچی نمبر ۳

۹ ۔ حاجی غلام قادر صاحب، حال ساحد عملیات مستشفیٰ عنیزہ سعودی عرب۔

۱۰ ۔ حاجی محمد عثمان صاحب میمن، لیاقت آباد ۱۸۸ کراچی نمبر ۱۹

ربیع الثانی ۱۳۹۵ھ کو مزید تین حضرات کو اجازت دی گئی جو پہلے سے دوسرے بزرگوں کے زیر تعلیم تھے۔

۱۱ ۔ مولوی محمد وجیہہ صاحب مفتی و مدرس دارالعلوم الاسلامیہ، ٹنڈو الہ یار، ضلع حیدر آباد سندھ۔

۱۲۔ مولوی عبدالشکور صاحب ترمذی مدرس و مہتمم مدرسہ حقانیہ ساہیوال ضلع سرگودھا۔
۱۳۔ ماسٹر محمد اقبال صاحب قریشی، متصل ڈاک خانہ ہارون آباد ضلع بہاولنگر۔

وفات سے چند روز پہلے آپ نے مدرسہ اشرف العلوم ڈھاکہ کے مولانا مفتی محی الدین صاحب کے نام کا بھی اضافہ فرمایا جن کا پتہ حسب ذیل ہے:۔

۱۴۔ مولانا مفتی محی الدین صاحب ۳۱/۳۲ بڑا کٹرہ لین، پوسٹ چوک بازار ڈھاکہ۔

مولانا میر امام الدین ھاشمی حیدرآبادی

۱۸۹۱ ——— ۱۹۵۶ء

مولانا حکیم امداد اللہ احمد ذکی لکھتے ہیں:۔

• حضرت کا اسم گرامی میر امام الدین تھا۔ ھاشمی خاندان سے تھے۔ آبائی وطن تعلقہ اوسہ ضلع عثمان آباد تھا۔ باقاعدہ عالم تو نہ تھے لیکن اُردو، عربی اور فارسی میں ماہرانہ قابلیت تھی، ریاست حیدرآباد دکن کے محکمہ امور مذہبی میں محاسب (اکاونٹنٹ) کے اہم عہدہ پر فائز رہے اور وہیں سے ۵۵ سال کی عمر میں وظیفہ حسن خدمت (پنشن) پر علیحدہ ہوئے۔ دفتر کی سختی سے پابندی کرتے اور کبھی بلا وجہ رخصت نہ لیتے تھے۔ بچوں کو بھی اکثر پابندیٔ وقت اور خواہ مخواہ چھٹی نہ کرنے کی سختی سے تاکید فرماتے تھے۔ زوجہ اولیٰ سے ساری نرینہ اولاد تھی البتہ ان کے انتقال کے بعد اپنے ایک دوست کی بیوہ سے عقد ثانی کر لیا تھا جس سے اللہ تعالیٰ نے ایک صاحبزادی عطا فرمائی تھی۔ ماشاء اللہ سارے لڑکے زیور علم سے آراستہ ہیں۔ بڑے لڑکے مولوی سید احتشام الدین ہاشمی نے دیوبند سے فراغت کے بعد محکمہ تعلیم سے رشتہ جوڑ لیا تھا اور ایک سرکاری مدرسہ میں مدرس تھے۔ اب ان کا انتقال ہو چکا ہے۔ ان سے چھوٹے سید علیم الدین ھاشمی بھی علوم شرعیہ سے آراستہ ہیں، اور حکومت آصفیہ کے محکمہ صدر محاسبی میں ملازم تھے اور اب حکومت ہند کے محکمہ آڈٹ سے الحاق رکھتے ہیں، حضرت مفتی محمد شفیع صاحب کے مرید ہیں اور حضرت مفتی صاحب کی اجازت سے مولانا ابرار الحق سے تعلق قائم کیا اور ان کے مجاز ہیں۔ ان سے چھوٹے میر بہاء الدین سلیم ہاشمی بھی محکمہ تعلیم سے وابستہ ہیں اور حضرت مفتی صاحب کے مرید ہیں۔ دوسرے صاحبزادگان بھی دیندار متقی ہیں، سب برسرِ روزگار ہیں۔

حضرت امام الدین صاحب اوقات کے بڑے پابند تھے۔ ہر سال بڑی پابندی سے حضرت

مولانا اشرف علی تھانویؒ کی خدمت میں تھانہ بھون حاضر ہوتے۔ ہر سال رمضان المبارک کے آخری عشرہ میں اپنے گھر کے سامنے کی مسجد میں اعتکاف کرتے۔ اس مسجد میں روزانہ بعد نمازِ عصر درس و تدریس کا سلسلہ جاری رکھا تھا۔

عشاء کی نماز کے بعد گھر پر تفسیر القرآن کا سلسلہ جاری تھا۔ لوگوں سے خوشدلی سے ملتے۔ بات نہایت اچھے طریقے سے مخاطب کی فہم کے مطابق کرتے، کبھی خفا ہوتے، لڑتے جھگڑتے یا ناراض ہوتے نہیں دیکھا گیا۔ ہر جمعہ کو شہر کی بڑی مسجد "مکہ مسجد" میں نمازِ جمعہ ادا کرتے۔ تبلیغ و ارشاد میں خاص ملکہ تھا گفتگو میں مٹھاس اور تعلق میں خلوص تھا۔ ایک نوجوان غیر مسلم کے ساتھ ایسا طرزِ عمل اختیار کیا کہ وہ مسلمان ہوگیا اس کا نام محمد عالم رکھا، اس سے بڑی محبت اور شفقت کا برتاؤ فرماتے تھے۔ آخر ان کے اس عمل نے اور اس نومسلم کے اصرار سے اس کے غیر مسلم والد نے بھی بڑی عمر میں کفر سے توبہ کی اور حضرت ہی کے حکم پر اس نومسلم معمر شخص کو احقر نے نمازِ عصر پڑھائی۔ قدرت خدا کی کہ وہی عصر کی نماز اس کی پہلی اور آخری نماز بن گئی۔ مغرب سے پہلے اس کا انتقال ہوگیا اور اس طرح حضرت میر صاحب کی مخلصانہ سعی سے ایک کافر مسلمان ہو کر دوزخ کی آگ سے بچ گیا۔

۱۹۴۸ء میں جب احقر نے ہجرت کی نیت سے آخری ملاقات کی تو حضرت میر صاحب نے ایک خط اپنے شیخ حضرت مفتی صاحب کے نام دے کر فرمایا کہ ان سے مل لینا۔ انشاء اللہ تکلیف نہیں ہوگی۔ اسی ایک مختصر خط نے احقر کی زندگی کو بڑا اعزاز بخشا اور حضرت مفتی صاحب کی خدمت میں اس وقت سے آخر دم تک مسلسل حاضر ہوتا رہا۔

حضرت میر صاحب کا وہیں تقریباً ۶۵ سال کی عمر میں ۱۹۵۶ء میں انتقال ہوا۔ اور محلہ کے قریب ہی ریلوے پٹری کے اس پار قبرستان میں دفن کئے گئے۔

صوفیانہ مسلک : حضرت میر صاحب کا تعلق حضرت تھانویؒ کے بعد حضرت مفتی محمد شفیعؒ سے تھا اور حضرت مفتی صاحب کے اوّل ترین خلیفہ رشد و ہدایت بننے کا شرف حاصل کیا۔

حلیہ : دراز قد، فربہ جسم، گھنی ڈاڑھی، گندمی رنگ، مسکراتا چوڑا چہرہ، کشادہ دہن یہ تھا ان کا حلیہ [1]

مولانا عبدالحکیم سکھروی

خلیفہ مجاز مولانا مفتی محمد شفیع

---

[1] حکیم امداد اللہ احمد زکی : مکتوب : ۲۶/۱/۱۹۹۲ء ص ۲۰۔

آپ اصلاً ریواڑی ضلع گوڑ گانوہ مشرقی پنجاب کے رہنے والے ہیں اور علمی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں آپ کے والد مولانا عبدالعزیز بھی عالم تھے اور نانا بھی بڑے جید عالم اور ندوۃ العلماء لکھنؤ کے رکن تھے۔

۱۵ محرم ۱۳۲۲ھ کو پیدا ہوئے۔ مڈل تک اسکول کی تعلیم ریواڑی میں حاصل کی، نانا صاحب کی تربیت میں رہے اور ساتھ ساتھ نانا صاحب کے شاگردوں سے عربی کی تحصیل بھی جاری رہی، شرح جامی تک کی کتب پڑھ لینے کے بعد مظاہر العلوم سہارنپور میں داخلہ لیا، وہاں ایک سال پڑھ کر اگلے سال دارالعلوم دیوبند میں داخلہ لیا اور فنون کی مختلف کتابوں کی تکمیل کے بعد دورۂ حدیث حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ سے پڑھ کر سند الفراغ حاصل کی۔

تدریسی خدمات :۔ فراغت کے بعد وطن میں تدریس کا سلسلہ جاری رکھا اور مختلف علوم وفنون کی کتابیں زیر درس رہیں، ساتھ ہی کچھ تجارت کا مشغلہ بھی جاری رہا مگر اس سے تدریس میں کوئی فرق نہیں آیا۔ قیام پاکستان کے بعد پاکستان آگئے اور سکھر میں قیام کیا، یہاں بھی درس وتدریس و وعظ وتبلیغ کرتے رہے پھر مدرسہ اشرفیہ سکھر میں تدریس پہ مامور ہوئے اور تمام درسی کتابیں پڑھانے کا موقع ملا۔ آج کل کتب حدیث پڑھا رہے ہیں۔ افتاء کا سلسلہ بھی جاری ہے۔

صوفیانہ مسلک :۔ پہلی بیعت حضرت مولانا محمد عیسیٰؒ کے ہاتھ پہ ہوئی، ان سے اصلاح کا سلسلہ قائم رہا، پھر ان کے وصال کے بعد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ سے رجوع کیا اور آخر میں حضرت مفتی صاحبؒ نے آپ کو بیعت کرنے کی اجازت عطا فرمائی۔ آپ روحانی سلسلہ کو بھی خوب آگے بڑھا رہے ہیں۔ آپ کے فرزند مولوی عبدالرؤف بھی حضرت مفتی صاحبؒ کے خلفاء میں سے ہیں۔

تصانیف :۔ آپ کے مضامین ماہنامہ "البلاغ" میں چھپتے رہتے ہیں، ان کے علاوہ آپ کی چند مستقل تصانیف بھی ہیں، ان کے نام یہ ہیں۔

۱۔ علیکم بسُنّتی۔ ۲۔ شانِ رسالت۔ ۳۔ دین کی باتیں حصہ اول و دوم۔ ۴۔ جنت کے پھول اور دوزخ کے کانٹے۔ ۵۔ کیا خدا ہے؟ ۶۔ مکہ مدینہ۔ ۷۔ اعتکاف۔ ۸۔ آخری منزل کے احکام۔ ۹۔ مفید دعائیں۔ ۱۰۔ نصیحت برائے آخرت۔ ۱۱۔ رمضان المبارک۔ ۱۲۔ رحمت کے خاص مستحق انسان۔ ۱۳۔ قصیدہ بردہ کی اردو شرح، حرمین شریفین کی حاضری میں تحریر کی تھی۔ طبع ہونیوالی ہے۔

مولانا حکیم امداد اللہ احمد ذکی ایم۔اے

۲۱۲ حیدر آباد کالونی، بہادر یار جنگ روڈ کراچی ۵

آپ بیڑ صوبہ اورنگ آباد ریاست حیدر آباد دکن کے رہنے والے ہیں آپ ایک علمی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ آپ کے والد مولانا حافظ حمید اللہ صاحب (م ۱۹۴۴ء) حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے مرید اور دیندار بزرگ تھے آپ ۳ فروری ۱۹۲۲ء میں اپنے شہر بیڑ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گھر پہ حاصل کی۔ اورنگ آباد کالج سے سند حاصل کی۔ ۱۹۴۴ء میں نظامیہ طبی کالج حیدر آباد دکن سے "طبیب مستند" کا امتحان امتیاز سے پاس کیا اور آصف جاہ سابع کے ہاتھ سے انعامی کتابیں اور تمغہ حاصل کیا۔ پھر کراچی یونیورسٹی سے "معارف اسلامی" میں ایم۔اے کیا ہے۔

ملازمت و مطب:۔ ۱۹۴۴ء سے گھر پہ مطب جاری ہے۔

۱۹۴۹ء میں سرکاری ملازمت (محکمہ تحفظ نباتات وفاقی حکومت پاکستان) میں آگئے اور اب تک اسی جگہ کام کر رہے ہیں۔

شعر و شاعری:۔ بچپن ہی سے شعر و شاعری کی طرف مائل ہیں، اور اچھے شعر کہہ لیتے ہیں۔ آپ کے قصائد ملک کے موقر رسائل و مجلات میں اکثر چھپتے رہتے ہیں۔ نعت کے دو نمونے اس تذکرہ کے آخر میں مطالعہ کئے جا سکتے ہیں۔

اعزازی تدریس:۔ اپنے محلہ میں ۱۹۵۲ء میں "مدرسۃ القرآن" قائم کیا جس میں اولاً حضرت مولانا سید سلیمان ندوی اور بعدہٗ مولانا حکیم سید عبد الجبار کی نگرانی میں کام کرتے رہے۔ اب تک بچوں کو حسبۃً للہ قرآن مجید اور فقہ کی تعلیم دے رہے ہیں۔

صوفیانہ مسلک:۔ ۱۹۴۲ء میں آپ علامہ سید سلیمان ندوی کے ہاتھ پہ بیعت ہوئے اور ان سے اصلاح کرواتے رہے۔ ان سے "مجاز صحبت" بنائے گئے، ان کے وصال کے بعد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب سے دل کا تعلق جوڑا اور آخر میں ان کی طرف سے آپ کو بیعت کرنے کی اجازت عطا ہوئی۔ حضرت مفتی صاحبؒ نے آپ کو چند تبرکات سے بھی نوازا۔

اولاد:۔ ۱۹۴۷ء میں آپ کی شادی ہوئی۔ اس وقت چھ لڑکیاں اور ایک لڑکا ہے۔ ماشاء اللہ سبھی

صوم وصلوٰۃ کے پابند ہیں اور اللہ اللہ کرنے والے ہیں۔ آپ کے فرزند قرآن مجید کے دس پاروں کے حافظ ہیں اور ابھی پڑھ رہے ہیں۔

صوفی محمد اقبال قریشی ہارون آبادی

آپ ستمبر ۱۹۴۵ء کو جالنہ ضلع اورنگ آباد حیدرآباد دکن میں پیدا ہوئے۔ والد صاحب قریشی اور ہاشمی اور والدہ صاحبہ صدیقی خاندان سے تھیں۔ آپ کے والد صاحب نے ۱۹۵۱ء میں پاکستان کی طرف ہجرت کی اور آپ والدہ صاحبہ کے ساتھ ۱۹۵۴ء میں پاکستان آئے۔ والدہ چھ ماہ بعد ہی انتقال کر گئیں اور کوٹلہ شجاع آباد علاقہ اوچ شریف بہاولپور میں دفن ہوئیں کیونکہ آپ کے والد صاحب بسلسلۂ ملازمت ان دنوں وہاں تھے اور والد صاحب نے ۱۰ اکتوبر ۱۹۷۰ء کو اس جہان فانی کو چھوڑا۔

آپ نے باقاعدہ کسی دینی مدرسہ میں تعلیم حاصل نہیں کی۔ آپ جس علاقہ میں مقیم ہیں۔ وہاں کے اکثر لوگ اگرچہ حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے ساتھ اصلاحی تعلق نہیں رکھتے۔ مگر آپ کو اللہ تعالیٰ نے اس طرف مائل کر دیا اور اس کی صورت یہ ہوئی کہ آپ نے الابقاء کراچی سے جاری کرایا۔ اس میں حضرت تھانویؒ کے مواعظ اور ملفوظات پڑھ کر دل کی دنیا ہی بدل گئی۔ حضرت تھانویؒ کی کئی ایک تصانیف زیر مطالعہ رہیں۔

صوفیانہ مسلک: ۱۳ مئی ۱۹۶۹ء کو آپ حضرت مولانا خیر محمد صاحب کے دست حق پرست پر بیعت ہوئے، ان کے وصال کے بعد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ کی طرف رجوع کیا، ۱۰ ربیع الثانی ۱۳۹۲ھ کو بیعت عثمانی میں داخل فرمایا اور یکم مئی ۱۹۷۵ء کو لاہور میں دست بدست بیعت کی توفیق ملی۔ ۲۷ ربیع الثانی ۱۳۹۵ھ چاروں سلسلوں میں بیعت و تلقین کی اجازت عطا فرمائی اب آپ اس سلسلہ کو آگے بڑھا رہے ہیں۔

تصنیفی خدمات: آپ کے مضامین ملک کے موقر مجلات میں اکثر شائع ہوتے رہتے ہیں۔ ان کے علاوہ کئی ایک مستقل تصانیف بھی ہیں جو حسب ذیل ہیں۔

۱۔ معارف نانوتویؒ:۔ اس میں حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کی مختصر سوانح کے ساتھ ان کے معارف و حکم کا بیان ہے جو حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے مواعظ، ملفوظات اور

تصانیف سے جمع کئے گئے ہیں۔ دارالاشاعت کراچی نمبرا سے شائع ہوئی ہے۔

۲۔ معارف گنگوہی :۔ قطب عالم حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کے حکیمانہ ارشادات و فرمودات کا انمول ذخیرہ ہے۔ دوسری بار اضافہ کے ساتھ ادارہ اسلامیات انارکلی لاہور سے طبع ہوئی۔

۳۔ معارف امدادیہ :۔ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکیؒ کے کلمات حکمت اور عارفانہ ارشادات کا ایک ضخیم تذکرہ جو مکتبہ رشیدیہ شاہ عالم مارکیٹ لاہور سے شائع ہونے والی ہے۔

۴۔ جواہرات یعقوبی :۔ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی ابن مولانا مملوک علی کے عارفانہ و عالمانہ ارشادات کا مجموعہ۔ حصہ اول و دوم۔

۵۔ اشرف البیان۔ حضرت تھانویؒ کے ملفوظات کا مجموعہ۔ ۶۔ اشرف الکلام۔ ۷۔ معارف گنجینۂ اشرفیہ ۸۔ جواہر الحسن۔ ۹۔ اشرف اللطائف۔ ۱۰۔ اشرف الامثال۔ ۱۱۔ اشرف الآداب۔ ۱۲۔ تذکرہ حسنؒ، ۱۳۔ احکام الازدواج۔ ۱۴۔ معارف شیخ الہند۔ ۱۵۔ معارف تھانویؒ۔ ۱۶۔ معارف گنج مراد آبادی ان کے علاوہ چند اور کتب بھی زیر ترتیب ہیں۔

مجلس صیانۃ المسلمین ہارون آباد اور ادارہ تالیفات اشرفیہ آپ کی سرپرستی میں چل رہے ہیں۔

اولاد میں چار بچیاں اور ایک بچہ ہے۔

مولانا سید محمود حسن صاحب

آپ نے اپنے جو حالات خود اپنے قلم سے مرتب کرکے بھیجے ہیں وہ تمام تر نہایت مفید ہیں لہٰذا انہی کے الفاظ میں نقل کئے جاتے ہیں۔

ولادت و وطن :۔ یہ ناکارہ یکم محرم الحرام ۱۳۲۶ھ کو اپنے وطن سنبھل ضلع مراد آباد (یو۔ پی) میں پیدا ہوا۔ چونکہ والد ماجد مولانا محمد ابراہیم صاحب رحمۃ اللہ علیہ اس وقت دارالعلوم دیوبند میں دورۂ حدیث میں شریک تھے اس لیے انہوں نے اپنے استاذ محترم شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن صاحب نور اللہ مرقدہ کے نام پر اس ناکارہ کا نام بھی محمود حسن رکھا۔

تعلیم :۔ والد ماجد ایک متبحر عالم اور متواضع بزرگ تھے۔ نصف صدی سے زیادہ درس و تدریس میں گزاری۔ علوم دینیہ کے علاوہ عربی ادب میں بھی کامل دستگاہ رکھتے تھے۔ وضع اپنے اکابر و اساتذہ

کی طرح بالکل سادہ تھی۔ قناعت کا یہ عالم تھا کہ اپنے وطن ہی میں بہت معمولی تنخواہ پر تدریسی خدمات انجام دیتے رہے لیکن کبھی زیادہ اور پرکشش مشاہرہ پر باہر جانا پسند نہ فرمایا۔

ان کی ابتداء ہی سے دلی خواہش تھی کہ میں حفظ قرآن کے بعد عربی تعلیم حاصل کروں، چنانچہ دونوں قسم کی تعلیم انہوں نے شروع بھی کرائی، لیکن کچھ ایسے حالات پیش آتے رہے کہ حفظ قرآن کا سلسلہ تو کچھ روز کے بعد ہی منقطع ہوگیا اور باقاعدہ اور مسلسل عربی تعلیم بھی زیادہ دنوں تک جاری نہ رہ سکی اس کے بعد خاندان کے بعض دوسرے لڑکوں کی طرح اُردو اسکول میں داخل ہوگیا۔ ۱۹۲۴ء میں ورنا کیولر فائنل (اُردو) کا امتحان پاس کیا۔ انگریزی تعلیم ہمارے خاندان میں شجر ممنوعہ تھی، لیکن چونکہ اس امتحان میں احقر اپنے ضلع میں فرسٹ پوزیشن میں کامیاب ہوا تھا اس لیے ہائی سکول تک انگریزی تعلیم حاصل کرنے کے لیے سرکاری طور پر وظیفہ مقرر ہوگیا۔ اس لیے انگریزی تعلیم شروع کرنا پڑی۔ ایف۔ اے کے دوسرے سال میں تھا کہ قانونگو ٹریننگ اسکول کے مقابلہ کے امتحان میں شریک ہوا اور کامیاب ہوگیا، اور ایک سال تک ہردوئی (یو۔ پی) میں تعلیم حاصل کی۔

الہ آباد سے عربی میں "مولوی"، فارسی میں "منشی" اور "کامل" اور اُردو میں "اعلیٰ قابلیت" کے امتحانات پاس کئے۔ پھر ملازمت کے دوران ایف۔ اے۔ کا امتحان پاس کیا۔ ملازمت کی وجہ سے بی۔ اے۔ کے امتحان میں شرکت نہ کر سکا۔ ملازمت سے پہلے بھی اور ملازمت کے دوران بھی جب موقع ملا والد صاحبؒ سے درسِ نظامی کی کتابیں پڑھتا رہا۔ چنانچہ "مولوی" کا امتحان دورانِ ملازمت ہی پاس کیا۔ ملازمت سے قبل اُن سے تفسیر جلالین شریف، مشکوٰۃ شریف اور ہدایہ پڑھ رہا تھا کہ مظفر نگر کے ضلع میں احقر کا تقرر ہوگیا اور یہ سلسلہ منقطع ہوگیا۔

مئی ۱۹۴۸ء میں احقر ہجرت کر کے پاکستان آیا۔ یہاں آ کر تین امتحانات عربی کے عربک کالج کراچی سے اور پانچ امتحانات اکاؤنٹ کے پاس کئے۔ والد ماجدؒ اکتوبر ۱۹۵۲ء میں ہجرت کر کے پاکستان تشریف لائے تو خیال تھا کہ ان سے درسیات کی تکمیل کر لوں گا لیکن ع: ما در چہ خیالیم و فلک در چہ خیال۔ کراچی پہنچنے کے چند گھنٹے کے بعد ہی اُن کا انتقال ہوگیا۔ (اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ طرحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃً واسعۃً۔) اور احقر کی یہ تمنا دل کی دل ہی میں رہ گئی۔

ملازمت : ۱۰ اپریل ۱۹۳۴ء میں احقر یو۔ پی۔ کے محکمہ مال میں بحیثیت سپروائزر قانونگو ملازم ہوا۔

اور چودہ سال سے زیادہ وہاں ملازمت کی۔ اگست ۱۹۴۸ء میں کراچی پورٹ ٹرسٹ میں ملازم ہوا۔ اور ستمبر ۱۹۶۸ء میں آفس سپرنٹنڈنٹ کے عہدہ سے سبکدوش ہوکر پنشن لی۔

بیعت:- خاندان کے اکثر افراد مرشدی و سندی حضرت حکیم الامت مجدد الملت تھانوی نور اللہ مرقدہٗ کے معتقد اور بعض مشرف بہ بیعت بھی تھے ، ان سے حضرت والا کے حالات اور کمالات سُن کر غائبانہ محبت و عقیدت تو بچپن ہی سے ہوگئی تھی ، پھر جب سنِ شعور کو پہنچا اور حضرتؒ کی تصانیف۔ بہشتی زیور ، تعلیم الدین ، جزاء الاعمال ، فروع الایمان ، اصلاح الرسوم ، وغیرہ کے مطالعہ کی ، جو گھر میں موجود تھیں ، سعادت نصیب ہوئی تو محبت اور عقیدت میں اور اضافہ ہوتا رہا۔ بالآخر سلسلۂ مراسلت شروع ہوا۔ اور حضرت کی خدمت میں پہلا عریضہ ۲۲ مارچ ۱۹۳۳ء کو ارسال کیا۔ دوسرا عریضہ ۲۵ مارچ کو لکھا اور اس میں بیعت فرمالینے کی درخواست کی اور عرض کیا کہ

"ہرچند صرف تعلیم بھی اصلاحِ حال اور حصولِ رضائے الٰہی کے لیے کافی ہے لیکن حصولِ بیعت حصولِ برکت کا باعث ہے اور جانبین کے تعلقات میں مزید استحکام کا موجب ہے۔"

ارشاد فرمایا کہ

"بعض اوقات مزید کشیدگی کا موجب بھی ہوجاتا ہے اس لیے تعجیل نامناسب نہیں۔"

تیسرے عریضہ میں ، جو ۱۹ اپریل ۱۹۳۳ء کو تحریر کیا گیا تھا ، احقر نے عرض کیا کہ

"حصولِ بیعت کی خواہش میرے دل میں صرف اس وجہ سے پیدا ہوئی تھی کہ میں نے حضرت والا ہی کی کسی تصنیف میں یہ دیکھا تھا کہ بیعت متعارفہ کے بغیر بھی اگرچہ تعلیم و عمل کا حصول ممکن ہے لیکن بیعت کرنے میں بالطبع یہ خاصیت ہے کہ شیخ کو توجہ زیادہ ہو جاتی ہے اور مُرید کو پاس فرماں برداری زیادہ ہوجاتا ہے۔"

ارشاد فرمایا کہ

"اکثر یا کلیاً؟ اور کیا اس کے لیے اور کوئی شرط نہیں ہو سکتی جو ابھی آپ میں متحقق نہیں۔"

اسی عریضہ میں "تکلف کے" "بے معنی الفاظ" اور "باریک لکھنے" پر ارشاد فرمایا کہ

"تکلف کے بے معنی الفاظ" اور "باریک لکھنے سے مجھ کو تکلیف اور کدورت ہوئی۔"

احقر نے چوتھے عریضہ میں اپنی غلطی کا اعتراف و اقرار کرکے معافی چاہی تو ارشاد فرمایا کہ

"آپ کے انقیاد محض سے بہت مسرت ہوئی اور دل سے دعا نکلی۔"

اس کے بعد عرصہ دراز تک بیعت کے متعلق عرض کرنے کی جرأت نہ ہوئی۔
احقر کے ۱۲ جولائی ۱۹۳۸ء کے عریضہ کے جواب میں ارشاد فرمایا کہ

"خدمتِ تربیت کی مجھ میں قوت نہیں رہی، معافی چاہتا ہوں۔"

اعلان ملاحظہ ہو۔

جب زیادتِ سن، ضعفِ شدید، وغیرہ کی وجہ سے حضرتؒ نے خود بھی محسوس کیا اور ڈاکٹروں اور طبیبوں نے بھی مشورہ دیا اور سخت تاکید کی کہ کام کرنا بالکل چھوڑ دیا جائے تو حضرت نے ڈاک کا تحریر فرمانا بھی ترک فرما دیا۔ لیکن طالبین کی سہولت کے لیے ایک مطبوعہ اعلان کے ذریعہ اُن کو ہدایت فرمائی کہ وہ اعلان میں درج شدہ گیارہ مجازین میں سے جن کے طرزِ تعلیم پر حضرتؒ کو اعتماد تھا اور جن سے جواب جلد مل جانے کی غالب توقع تھی، کسی سے اپنی تربیت متعلق کر لیں۔ اس لیے احقر نے حضرت مولانا محمد عیسٰی صاحبؒ الٰہ آبادی سے اصلاحی تعلق قائم کر لیا اور اس امر کی اطلاع دینے کے بعد حضرت سے بیعت کی درخواست کی تو ارشاد فرمایا کہ

"اول تعلیم کا سلسلہ اُن سے جاری کر کے پھر درخواست کا مضائقہ نہیں۔"

بالآخر احقر کے ۱۵ اگست ۱۹۳۸ء کے عریضہ کے جواب میں حضرتؒ نے اس ناکارہ کو شرفِ بیعت سے مشرف فرما لیا۔

حضرتؒ کی خدمت میں آخری خط ۲۱ جون ۱۹۴۳ء کو لکھا تھا۔

تربیت و اصلاح کا تعلق: جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے، بیعت ہونے سے قبل ہی حضرت مولانا محمد عیسٰی صاحبؒ سے اصلاح کا تعلق قائم ہو چکا تھا۔ ان کے انتقال کے بعد حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ سے اور ان کے انتقال کے بعد حضرت مولانا مفتی محمد حسن صاحبؒ سے اور ان کے انتقال کے بعد آخر میں مفتی اعظم پاکستان حضرت مولانا محمد شفیع صاحبؒ دیوبندیؒ سے تربیت و اصلاح کا تعلق قائم ہوا جو تقریباً پندرہ سال تک رہا۔

۱۹۵۹ء میں حضرت مفتی صاحبؒ نے اتوار کی ہفتہ وار مجلس کا سلسلہ شروع فرمایا، احقر بھی پابندی کے ساتھ حاضر ہوتا رہا۔ اور یہ سعادت آخری مجلس تک، جو انتقال سے تقریباً دو دن قبل ۴ اکتوبر ۱۹۷۶ء کو ہوئی تھی، حاصل ہوتی رہی۔

۱۹۶۱ء میں حضرت مولانا مفتی محمد حسن صاحب کے انتقال کے بعد احقر نے حضرت مفتی صاحبؒ کی خدمت بابرکت میں ۵ ربیع الثانی ۱۳۸۱ھ (۵ اکتوبر ۱۹۶۱ء) کو بذریعہ عریضہ اصلاحی تعلق منظور فرمانے کی درخواست کی تو حضرت مفتی صاحبؒ نے ۲ جمادی الاول ۱۳۸۱ھ کو ارشاد فرمایا کہ

"عزیزم۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ حالات کا پورا نقشہ سامنے آگیا۔ آپ سے قلبی اُنس تو خود بخود محسوس ہوتا رہا ہے، آج اس کا سبب بھی معلوم ہوگیا۔ سلسلۂ اصلاح کے متعلق بے تکلف بات یہ ہے کہ مجھے چونکہ اس کام کے لیے وقت نہیں ملتا، دارالعلوم کے کام، فتویٰ کا مستقل کام پھر ملک بھر کے ہنگاموں میں غیر اختیاری طور پر کچھ نہ کچھ حصہ لینے کی مجبوری۔ اس لیے مجھ ناکارہ سے شاید آپ کی پوری خدمت نہ ہوسکے۔ بہتر ہو کہ آپ کسی دوسرے بزرگ کو اس کام کے لیے تجویز کریں۔ میں بھی دعا کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کامیاب فرمائیں۔ اگر کسی بزرگ کا پتہ آپ چاہیں تو میں بھی بتلادوں گا۔ اصل یہ ہے کہ اس طریق میں مدارِ کار یکسوئی پر ہے۔ وہ ہجوم مشاغل میں میسر نہیں۔ دعا فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ اب بقیۂ عمر کو ہجوم افکار سے محفوظ فرما کر خالص اپنے ذکر و فکر میں لگالیں۔"

جواباً عرض کیا گیا کہ

"احقر کو حضرت کی مصروفیت و مشغولیت کا پورا پورا اندازہ اور احساس ہے اس کے باوجود جو درخواست پیش کی گئی اس کا سبب یہ تھا کہ احقر کو جس قدر عقیدت حضرت سے ہے اتنی کسی دوسرے بزرگ سے نہیں۔ پھر تقریباً دو سال سے حضرت کی ہفتہ وار مجلس میں حاضری کے بعد یہ اندازہ ہوا کہ طبعی مناسبت بھی حضرت ہی سے سب سے زیادہ ہے۔ علاوہ ازیں جس بزرگ سے تربیت و اصلاح کا تعلق ہو ان سے معتدبہ انتفاع و استفادہ کے لیے ان کی خدمت میں زیادہ سے زیادہ حاضری ضروری ہے اور یہ بات اُن بزرگوں سے تعلق قائم کرنے میں، جو کراچی سے باہر تشریف رکھتے ہیں، ممکن نہیں۔ مقامی بزرگوں میں ڈاکٹر عبدالحئی صاحب میرے عزیز ہیں اور حضرت مولانا عبدالغنی صاحب مدظلہ سے عدمِ استقلالِ قیام اور ضعف و زیادتِ سن کے پیش نظر

اس قسم کی درخواست کرنا مناسب نہیں معلوم ہوتا۔ اس لیے نہایت ادب کے ساتھ
التماس ہے کہ براہ کرم حضرت ہی اس تعلق کو منظور فرمالیں۔ ان معروضات کے بعد
اگر حضرت اس ناچیز کی درخواست منظور نہ فرمائیں تو جو حکم ہوگا اس کی تعمیل کی جائیگی۔"

اس کے جواب میں ۲۱ رجب ۸۱ھ کو ارشاد فرمایا کہ

"اللہ تعالیٰ کے نام پر تعلقِ اصلاح منظور کرتا ہوں، اپنے حالات لکھئے اور یہ کہ اس
سلسلہ میں اب تک کیا کیا ہے۔"

اجازت:- ۵ رجب ۱۳۸۲ھ کو حضرت مفتی صاحب نور اللہ مرقدہٗ نے اس ناکارہ کو بیعت و تلقین
کی اجازت عطا فرمائی۔

تالیفات:- اس ناکارہ کو مطالعۂ کتب کا شوق تو بچپن ہی سے تھا لیکن تصنیف و تالیف کی نوبت
کبھی نہ آئی تھی۔ ۱۹۶۱ء میں کراچی پورٹ ٹرسٹ میں، جہاں احقر ملازم تھا ایک سہ ماہی رسالہ
"صدق" جاری ہوا۔ اس سلسلہ میں احقر سے بھی کچھ لکھنے کی فرمائش کی گئی۔ اپنی نااہلی کا عذر پیش کیا
وہ قبول نہ ہوا مجبوراً ایک مضمون بعنوانِ "صحتِ معیار کی ضرورت اور اہمیت" لکھ کر رسالہ میں
اشاعت کے لیے دینا پڑا۔

تقسیم ہند سے پہلے ایک مرتبہ احقر کے دل میں یہ خیال آیا تھا کہ اُن اوامر اور نواہی کا جو اہم تر
ہیں ایک چارٹ تیار کروں اور اس کو اپنی نشست گاہ میں کسی نمایاں جگہ پر آویزاں کردوں تاکہ
روزانہ ورنہ کم از کم ہفتہ میں ایک بار تو ضرور ہی اس آئینہ میں اپنی صورت دیکھتا اور اپنے اعمال کا جائزہ
لیتا رہوں۔ لیکن قلتِ فرصت اور کثرتِ مشاغل کی بنا پر اس خواہش کی وہاں تکمیل نہ ہوسکی۔ اس
موقع پر مناسب معلوم ہوا کہ اپنے اس پرانے خیال کو عملی جامہ پہناؤں۔ چنانچہ ایک مضمون بعنوانِ "آئینۂ شریعت"
لکھنا شروع کیا جو "صدق" کی چودہ قسطوں میں شائع ہوا۔ ایک اور مضمون جس کا عنوان تھا "قلب میں سوز
نہیں، روح میں احساس نہیں" "صدق" میں چار قسطوں میں شائع ہوا۔ اس مضمون میں یورپ اور امریکہ کی
جنسی آزادی، آوارگی، فحاشی اور عریانی کے سبق آموز اور عبرتناک حالات و واقعات تحریر کرنے کے بعد
ان حضرات پر اور بالخصوص بعض اہل علم پر جو اپنی اولاد کو اعلیٰ تعلیم کے لیے وہاں بھیجتے ہیں، اظہار افسوس کیا گیا تھا۔
آخر میں جو مضمون "صدق" میں شائع ہوا اس کا عنوان "الفاظ کی تحقیق و تصحیح" تھا۔ یہ مضمون ناتمام رہا اور اس

کی صرف چند قسطیں شائع ہو سکیں۔

مندرجہ بالا مضامین کے علاوہ احقر کی حسب ذیل تالیفات اب تک کتابی شکل میں شائع ہو چکی ہیں:

۱۔ اشرف النصاب :- اس کتاب میں اُردو زبان میں دینیات کا ایک جامع نصاب درج کیا گیا ہے، جو حکیم الامت، مجدد الملت، حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہ العزیز کے مجوزہ نصاب دینیات سے ماخوذ اور دیگر تالیفات اشرفیہ پر مشتمل ہے۔ اکابر علماء نے اس نصاب کی تصدیق و توثیق فرمائی ہے۔ نصاب دینیات کے علاوہ اس کتاب میں حسب ذیل مضامین بھی شامل ہیں:

۱۔ مقدمہ:- اس میں بقدر ضرورت علم دین حاصل کرنے کی ضرورت، اور اہمیت، اس کی تحصیل کا ادنیٰ اور اعلیٰ درجہ، اس نصاب کی خصوصیت وجامعیت، اس کی ترویج کے مناسب طریقے، حیات انسانی کا مقصد اور اس کی تحصیل و تکمیل میں افسوسناک غفلت وغیرہ کا بیان ہے۔) ۲۔ آیات قرآنیہ اور احادیث نبویہ سے علم دین کی فضیلت کا ثبوت۔ ۳۔ مواعظ اشرفیہ سے علم و خشیت وغیرہ سے متعلق نادر اقتباسات۔ ۴۔ نصاب تصوف مجوزہ حضرت حکیم الامت نور اللہ مرقدہ۔ ۵۔ تربیت و اصلاح باطن سے متعلق حضرت حکیم الامتؒ کے چند جامع و نافع او صول مُتّبع کی شان رکھنے والے مکتوبات و ارشادات جن میں سارا فن سلوک آگیا ہے اور جن میں سالکین کے لیے پورا دستور العمل موجود ہے۔ اور آخر میں

۶۔ حضرت حکیم الامتؒ کے چند نادر ملفوظات جو آب زر سے لکھنے اور حرز جاں بنا لینے کے قابل ہیں۔

حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ اس رسالہ کے متعلق اپنی رائے کا اظہار فرماتے ہوئے احقر کے نام ایک والا نامہ میں ارشاد فرماتے ہیں کہ

> "آپ نے حضرتؒ کی چند ہدایات سے اخذ کر کے جو نصاب مرتب کیا ہے تو یہ بلاشبہ ایسا ہے کہ اگر اس کو پڑھ لیا جائے تو دین کی تمام ضروریات میں کافی بصیرت پیدا ہو سکتی ہے اور میرے نزدیک یہ نصاب بالکل کافی و وافی ہے۔ مگر وقت کی اصل ضرورت اس کی ترویج کی کوشش ہے کہ ہر گھر میں یہ نصاب رائج ہو ——— ضرورت اس کی ہے کہ کوئی جماعت یا کچھ افراد اس کے لیے اپنا وقت خرچ کریں اور اپنے مقدور کے مطابق مسلمانوں کے گھروں میں اس نصاب کے پڑھانے کا سلسلہ جاری کرائیں۔

واللہ الموفق والمعین ؛

۲۔ آئینہ اسلام :۔ اس رسالہ میں اسلام کے اوامر و نواہی کا (یعنی جن کاموں کے کرنے کا مسلمانوں کو حکم دیا گیا ہے اور جن کاموں سے ان کو منع کیا گیا ہے) بیان ہے۔ یہ مضمون پہلے کراچی پورٹ ٹرسٹ کے سہ ماہی رسالہ صدق میں شائع شدہ مؤلف رسالہ ہذا کے ایک طویل مضمون "آئینہ شریعت" کے آخر میں بطور خلاصہ تحریر کیا گیا ہے۔ اس کے بعد ماہنامہ البلاغ کراچی بابت ماہ جمادی الثانی ۱۳۹۰ھ میں حذف و اضافہ کے بعد مستقل مضمون کی شکل میں شائع ہوا۔ پھر یہی مضمون بعینہٖ ماہنامہ "فاران" لندن بابت ربیع الثانی ۱۳۹۱ھ میں شائع ہوا اور آخر میں کتابی شکل میں اس کا پہلا ایڈیشن دسمبر ۱۹۷۱ء میں اور دوسرا ایڈیشن فروری ۱۹۷۲ء میں شائع ہوا۔

۳۔ اعتکاف ۔ فضائل و مسائل :۔ اس کتاب میں اعتکاف کے فضائل و مسائل، اقسام و مقاصد، شرائط، مستحبات، مباحات، مفسدات، اور مکروہات کا مفصل بیان ہے۔ آخر میں امداد الفتاویٰ، فتاویٰ دارالعلوم دیوبند اور احسن الفتاویٰ سے اعتکاف کے متعلق فتاویٰ اور دوسرے ممتاز علماء کے غیر مطبوعہ فتاویٰ بطور ضمیمہ شامل کئے گئے ہیں۔ اکابر کی رائے میں اردو زبان میں اعتکاف کے فضائل و مسائل پر اس جیسا جامع، مفصل اور مستند کوئی دوسرا رسالہ نہیں۔

۴۔ اموات کی تجہیز و تکفین اور ایصال ثواب کا مسنون طریقہ :۔

اس کتاب میں احکام میت (یعنی عالم نزع، غسل، تجہیز و تکفین، تدفین، نماز جنازہ، زیارت قبور ایصال ثواب کا مسنون طریقہ اور ان امور کے متعلق ضروری مسائل) کا بیان بہت تفصیل کے ساتھ کیا گیا ہے۔ کتاب کے شروع میں ایک نہایت مفید مقدمہ ہے جس میں مروجہ رسوم و بدعات کے مفاسد اور کچھ ایسے ضروری اصول و قواعد بیان کئے گئے ہیں جن کو سمجھ کر ذہن نشین کر لینے سے انشاء اللہ تعالیٰ رسوم و بدعات کی برائیوں کو سمجھنے اور ان کا حکم معلوم کرنے میں آسانی ہوگی اور بعض شکوک و شبہات اور اشکالات بھی رفع ہو جائیں گے۔

۵۔ حضرت حکیم الامت تھانویؒ اکابر اور معاصرین کی نظر میں :۔

اس کتاب میں مرشدی و سندی حضرت حکیم الامت، مجدد الملت کے فضائل و اوصاف، علمی و عملی کمالات اور تجدیدی خدمات کے بارے میں ان کے اکابر اور معاصرین (مسترشدین)، متوسلین، معتقدین، مخالفین، اخبارات، جرائد کی رائے کا خلاصہ درج کیا گیا ہے۔

اپنے ایک عریضہ میں احقر نے رسالہ کی تکمیل کتابت وغیرہ کے لئے دعا کی درخواست کی تو حضرت مفتی صاحب نے ۲۹ ربیع الثانی ۱۳۹۹ھ کو تحریر فرمایا کہ

"امید ہے کہ بڑا مفید کام ہوگا ——— دل سے دعا اور تمنا ہے کہ میری زندگی میں تیار ہو کر سامنے آجائے" افسوس کہ بعض ناگزیر وجوہ کی بنا پر طباعت میں تاخیر ہونے کی وجہ سے حضرت مفتی صاحب کے وصال کے قریب دن کتاب پریس سے نکلی۔

شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحب مدظلہ العالی احقر کے نام ایک والانامہ میں مدینہ طیبہ سے اس کتاب کے متعلق تحریر فرماتے ہیں کہ :

"——— (کتاب) سننے کے بعد بہت ہی طبیعت خوش ہوئی۔ واقعی آپ نے کوزہ میں دریا کو بند کر دیا، اور مسترشدین کے اقوال میں بھی "پدرمن سلطان بود" کا منظر نہیں رکھا، بلکہ حضرت نور اللہ مرقدہٗ کے ارشادات و معمولات اختصار سے بہت کثرت سے آگئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو بہت ہی جزائے خیر عطا فرمائے بہت ہی جی خوش ہوا اور بے اختیار جی چاہا کہ اس کے کچھ نسخے خرید کر اپنے ہندی دوستوں کے پاس ہدیہ میں بھیجوں لہٰذا پچاس نسخے مفتی شاہد صاحب کے پاس مدرسہ نیو ٹاؤن کے پاس پہنچا دیں اور ان ہی سے قیمت لے لیں"

حق سبحانہٗ و تعالیٰ کا جس قدر بھی شکر ادا کروں کم ہے کہ اس نے مرشدی و سندی حضرت حکیم الامت مجدد الملت نور اللہ مرقدہٗ و برّد اللہ مضجعہٗ سے بیعت اور ان سے اور ان کے چار ممتاز خلفاء سے چالیس سال سے زیادہ طویل مدت تک تربیت و اصلاح کا تعلق قائم کرنے کی سعادت نصیب فرمائی لیکن اس محرومی کا کیا علاج کہ سکندر آب حیواں تک رسائی پا جانے کے بعد بھی پیاسا ہی واپس آجائے ؂

مولانا عبدالشکور ترمذی مدظلہم

احقر نے آپ سے بھی اپنے حالات لکھنے کی درخواست کی تھی۔ آپ نے جو مکتوب جواب میں بھیجا وہ بعینہٖ پیش خدمت ہے۔

مکرمی! السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ۔

عنایت نامہ ملا اپنے حالات کیا لکھوں! کیا میں اور کیا میرے حالات۔ وجودک ذنب لایقاس به ذنب، جس کو فنا کا سبق پڑھایا گیا ہو وہ اپنے وجود ہی کو گناہ سمجھتا ہے حالات کا کیا ذکر!

البتہ اپنے نسبی اور روحانی بزرگوں اور اکابر کا مختصر حال عرض کرتا ہوں۔ اس کے ضمن میں اس ناکارہ آوارہ کے بھی کچھ حالات آجائیں گے یہ بھی اول تو آپ کی طلب کی بنا پر تطییب قلب مسلم کی نیت سے گوارہ کیا جا رہا ہے دوسرے یہ طمع بھی ہے کہ ان مقبولین کے ذکر کے ساتھ اس ناکارہ کا نام بھی آئے گا۔ تو ان کی برکت سے کام بن جائے گا ورنہ صحیح بات یہی ہے کہ اپنی زندگی کے ۵۵ سال کی طرف جب نظر کرتا ہوں تو سوائے حسرت اور ندامت کے کچھ اور نہیں پاتا اس لیے سلسلہ اشرفیہ کی طرف اس ناکارہ کے انتساب سے سلسلہ کے لیے تو سوائے بدنامی کے اور کچھ حاصل نہیں ہے مگر اپنے لیے اس کو ذریعہ سعادت اور وسیلہ نجات تصور کرتا ہوں ورنہ صحیح بات یہی ہے کہ من آنم کہ من دانم کہنے کا حق بھی اس ناکارہ کو نہیں پہنچتا کہ اس سے بھی ایک گونہ معرفت نفس کا دعوے اور پھر حسب ارشاد من عرف نفسہ فقد عرف ربہ۔ معرفت رب کا دعوے مترشح ہوتا ہے اور ظاہر ہے کہ فنا کے سبق کے ساتھ دعوے کا کوئی جوڑ نہیں۔

ولادت:- اس ناکارہ کی ولادت اپنی ننھیال موضع اٹرون ریاست پٹیالہ میں ۱۱ رجب المرجب ۱۳۴۲ھ کو ہوئی عبدالشکور نام رکھا گیا بعد میں تاریخی نام مرغوب الٰہی نکالا گیا۔

وطن:- اصل وطن ضلع کرنال کی تحصیل کیتھل کا قصبہ گمتھلہ گڈھو تھا۔ حضرت والد ماجد کا نام نامی اور اسم گرامی مولانا مفتی سید عبدالکریم صاحب گمتھلوی ہے۔ دادا مرحوم کا نام جناب حکیم محمد غوث صاحب ہے آپ دہلی کے سند یافتہ اپنے علاقہ کے حاذق اور مشہور طبیب تھے فارسی میں بڑا ذوق حاصل تھا اور دہلی کے مشہور نقشبندی خاندان میں شاہ ابوالخیر صاحب سے بیعت تھے احقر کے پڑدادا مولانا شاہ عبداللہ صاحب حضرت شاہ احمد سعید صاحب مجددی نقشبندی دہلوی کے خلیفہ مجاز اور صاحب نسبت اور صاحب علم بزرگ تھے۔ حضرت موصوف کو علم باطن کے ساتھ ظاہر علوم میں بڑی دستگاہ حاصل تھی تفسیر حقانی کے مصنف مولانا عبدالحق صاحب ہمارے بڑے دادا مرحوم کے تلامذہ میں سے تھے۔ ہمارے خاندانی بزرگوں میں سے علاقہ پنجاب سے مولانا عبداللہ شاہ مرحوم ہی نے گمتھلہ گڈھو میں سکونت اختیار فرمائی تھی اصل آباؤ اجداد ضلع سرگودھا کے ہی رہنے والے تھے۔ سلطان محمد تغلق کے زمانہ میں

ترمذ سے جو سادات کا قافلہ ہندوستان میں آیا تھا اس میں ہمارے آباؤ اجداد بھی شامل تھے اسی نسبت سکونت کے اظہار کے لیے گمتھلہ کے کاغذات سرکاری میں ہمارے اجداد کے نام کے ساتھ سید ترمذی لکھا ہوا ہے۔ اور احقر نے بھی حضرت والد صاحبؒ کے مشورہ سے ترمذی کو اپنے نام کے ساتھ جزء بنالیا ہے۔

حضرت والد ماجد زمانہ حال کے چوٹی کے مشہور و معروف اکابر علماء میں سے تھے۔ آپ کا صاحب تصنیف و تالیف ہونے کے علاوہ حضرت حکیم الامت تھانوی قدس سرہٗ کے خاص صحبت یافتہ اور دربار اشرفی کے حاضر باش قابل اعتماد اہل فتویٰ لوگوں میں شمار ہوتا ہے۔ حضرت حکیم الامت تھانوی اور شیخ المحدثین حضرت مولانا خلیل احمد صاحب قدس سرہٗ دونوں کے زیر سایہ رہکر علوم باطنی اور ظاہری کی تکمیل کی سعادت والد مرحوم کو حاصل ہوئی اور حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ کے تلمیذ خاص مولانا عبد العلی صاحب سے مدرسہ عبد الرب دہلی میں حدیث کا استفادہ کیا تھا۔ حضرت والد ماجد حضرت حکیم الامت تھانویؒ سے بیعت تھے اور اپنے پیر و مرشد کے زیر سرپرستی تدریسی تالیفی اور فتویٰ نویسی وغیرہ کی مختلف خدمات عرصہ دراز تک انجام دیتے رہے۔ بہشتی گوہر بیان القرآن اور حیلہ ناجزہ کی نظر ثانی اور تالیف میں حضرت حکیم الامت کے شریک کار رہے ہیں۔ اس لیے اس ناکارہ نے بھی جب ہوش سنبھالا اور آنکھیں کھولیں تو خانقاہ امدادیہ تھانہ بھون ضلع مظفر نگر کا مقدس ماحول سامنے تھا جہاں ہر چہار طرف دیانت و تقویٰ کے مجسمے اور طہارت و صفائی کے پتلے نظر آتے تھے جدھر دیکھو دین کی چلتی پھرتی تصویریں نظر آتی تھیں۔

خانقاہ میں تعلیم و تربیت : اس ناکارہ کی ابتدائی تعلیم اور معمولی نوشت خانقاہ کے مدرسہ امداد العلوم میں ہی ہوئی تھی۔ پہلے خلیفہ اعجاز احمد صاحب مرحوم سے ناظرہ قرآن پڑھا اور اس کے ساتھ ہی ماسٹر عبد القادر صاحب بنگالی سے اردو املا اور حساب کی تعلیم حاصل کی اور حضرت مولانا سراج احمد صاحب امروہیؒ سے خانقاہ کا نصاب بہشتی زیور وغیرہ پڑھا اس کے بعد ۱۲ سال کی عمر میں قرآن شریف حفظ کرنا شروع کیا جو بحمد اللہ اڑھائی سال میں پورا ہوگیا اس طرح ۱۴ سال کی عمر میں مذکورہ ابتدائی تعلیم خانقاہ تھانہ بھون میں حاصل کرنے کا موقع اس ناکارہ کو عطا فرمایا گیا۔

حضرت والد ماجد خانقاہ کے جس مکان میں قیام پذیر تھے اس مکان کی دیوار حضرت حکیم الامت تھانویؒ کے بڑے مکان کے ساتھ مشترک تھی اور جس میں ایک چھوٹا دروازہ آمد و رفت کے لیے کھلا ہوا تھا اس لیے اس ناکارہ کی حضرت تھانویؒ کے مکان میں ہر وقت آمد و رفت تھی اور بچوں کی طرح آنا جانا

تھا۔ حضرت حکیم الامت تھانویؒ کی عنایات اور شفقت چونکہ حضرت والد ماجدؒ پر بے انتہا مبذول تھیں اس وجہ سے ہم نا اہلوں پر بھی بے سبب عنایات کا نزول رہتا تھا اس ضمن میں چند واقعات قابل ذکر ہیں، جن کو بھلایا نہیں جا سکتا۔ جب حضرت والد ماجدؒ دوسرے سفر حج سے واپسی پر تھانہ بھون حاضر ہوئے تو یہ ناکارہ سفر حج میں بھی ساتھ تھا اور ملاقات کے لیے بھی حضرت والد ماجد کے ساتھ تھانہ بھون میں حاضر ہوا تھا خوب یاد ہے کہ گرمی کا زمانہ تھا ظہر کے وضو کے لیے حضرت حکیم الامت لوٹا اٹھائے ہوئے اپنی سہ دری سے خانقاہ کے کنوئیں کی طرف تشریف لا رہے تھے اور بدن مبارک پر کرتا نہیں تھا ادھر سے ہم دونوں باپ بیٹا سہ دری کی طرف جا رہے تھے درمیان میں ملاقات ہو گئی حضرت والد صاحب نے معانقہ فرمایا اس ناکارہ نے بھی سلام عرض کر کے مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھایا تو حضرت نے یہ فرما کر کہ تم نے کیا خطا کی! اس ناپاک کو بھی اپنی طرف کھینچ کر اپنے سینہ سے لگا لیا رحمۃ اللہ رحمۃ واسعۃ (جب یہ ناکارہ) حضرت حکیم الامت کی وفات سے تقریباً اڑھائی ماہ پہلے غالباً جمادی الاولیٰ ۶۲ ۱۳ھ پانی پت سے بغرض ملاقات تھانہ بھون حاضر ہوا۔ اس سفر میں اتفاقاً جلسہ سہارنپور سے حضرت والد صاحب اور چچا عبدالرحیم مرحوم کا ساتھ ہو گیا تھا۔ تو حضرت حکیم الامت تھانویؒ نے ملتے ہی حضرت والد ماجد سے دریافت فرمایا کہ عبدالشکور کہاں ہے والد صاحب نے عرض کیا کہ وہ خانقاہ میں ہے تو فرمایا کہ کیا اس کی شادی ہو گئی عرض کیا نہیں فرمایا کہ کیا کہیں نسبت ہو گئی ہے عرض کیا کہ ہاں اس کے چچا کے ہاں نسبت ہو چکی ہے فرمایا چچا کہاں ہے عرض کیا وہ بھی خانقاہ میں ہیں فرمایا پھر نکاح میں کیا دیر ہے چنانچہ شام کی مجلس میں حضرت والا قدس سرہٗ نے نکاح پڑھا دیا ان دنوں مفتی جمیل احمد صاحب کے مکان میں مجلس ہوا کرتی تھی بوجہ ضعف حضرتؒ خانقاہ تشریف نہیں لایا کرتے تھے۔

ایک مرتبہ حضرت حکیم الامت عشاء کے لیے وضو فرما رہے تھے اور گرمی کے موسم میں ہم کئی بچے حضرت کو دستی پنکھا جھلا کرتے تھے اب ہماری اس پر ضد بن گئی کہ وضو کے بعد حضرت کا لوٹا کون اٹھا کر اس کی مقررہ جگہ پر رکھے اس ناکارہ نے جلدی کی اور لوٹا اٹھانا چاہا مگر فوراً ہی محسوس ہو گیا کہ ابھی ایک پاؤں دھلنے سے رہ گیا ہے حضرت نے بھی جاہلانہ خدمت کو محسوس فرما لیا اس پر حضرت نے خوب ڈانٹا اور تنبیہ فرمائی جو ساری عمر کے لیے سبق بن گیا۔

ایک مرتبہ حضرت تھانوی ظہر کا وضو فرما رہے تھے اس ناکارہ کا گزر حضرت کے پاس حوض کی پٹڑی پر ہوا تو آواز دے کر فرمایا کہ جاؤ دیکھو مولوی شبیر علی اپنے کمرے میں ہیں یہ احقر گیا وہ تھے نہیں مگر اس ناکارہ کی غفلت سے اس طرح کہا گیا کہ حضرت سمجھے کہ وہ موجود ہیں اس پر خوب تنبیہ فرمائی کہ کلام میں احتیاط ضروری ہے جب دوسرا آدمی بات کو سمجھا نہیں تو کلام مفید کیسے ہوا اور اس سے مخاطب کو پریشانی اور ایذا بھی ہوتی ہے حضرت تھانویؒ کے یہاں ایذاء مسلم سے بچانے کا بڑا اہتمام تھا۔

اگلے روز پھر اس پر عمل کرایا گیا جب اس نا اہل نے پوری بات اچھی طرح کی تو حضرت نے مسرت سے فرمایا "ہاں یوں بولا کرتے ہیں" حضرت کے ان الفاظ کی لذت یاد آنے پر آج تک دماغ میں محسوس ہوتی ہے۔

سفر حجاز :- پندرہ سال کی عمر میں فارسی کی کتابیں حضرت والد صاحب مرحوم سے پڑھ لیں تھیں کہ حضرت والد صاحب کو ۱۳۵۶ھ میں اہل وعیال دوسری مرتبہ سفر حج کا موقع میسر آیا یہ ناکارہ بھی ہمراہ رہا آٹھ ماہ مدرسہ علوم شرعیہ مدینہ منورہ میں والد صاحب مدرس حدیث وفقہ رہے یہ ناکارہ بھی مدرسہ میں تعلیم حاصل کرتا رہا۔ وہاں والد صاحب مرحوم سے ابتدائی عربی کتب اور قاری اسعد وغیرہ سے مشق قرآن اور تجوید کی مختصر کتابیں پڑھیں رمضان المبارک میں شیخ القراء حسن صاحب مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں مقدمہ الجزریہ کا درس دیا کرتے تھے اس ناکارہ کو اس میں بھی شرکت کی سعادت حاصل رہی دوسرے حج کے بعد حجاز سے واپسی ہوئی والحمد للہ علی ذالك۔

عربی تعلیم :- عربی تعلیم کی ابتدا تو مدینہ منورہ ہی میں ہو چکی تھی وہاں سے واپسی پر قصبہ راجپورہ ریاست پٹیالہ کے عربی مدرسہ میں (جو کہ حضرت والد صاحب کے زیر اہتمام چل رہا تھا) مولانا سمیع اللہ خان صاحب مدظلہ علیگڑھی فاضل دیوبند سے عربی کتابیں صرف تمام اور نحو ہدایۃ النحو تک فقہ میں منیۃ المصلی اور نور الایضاح تک منطق میں صغریٰ تیسیر المنطق ادب میں مفید الطالبین اور روضۃ الادب نفحۃ العرب اور مولانا مشتاق احمد تھانوی کے بعض رسائل صرف نحو عربی کے بھی پڑھے۔ پھر انبالہ چھاؤنی کے مدرسہ معین الاسلام میں مولانا محمد متین صاحب خطیب مدظلہ اور حضرت مولانا محمد معین صاحب مرحوم سے کتب عربیہ متوسط قدوری کنز کافیہ شرح جامی شرح تہذیب اصول الشاشی نور الانوار نفحۃ

الیمین پڑھیں۔

سبعہ قرات:۔ اس کے ساتھ سبعہ قرات کی عربی کتاب شاطبیہ والدصاحب سے اس طرح پڑھی کہ ہر ہفتہ جمعہ کے دن اس کا سبق ہوتا تھا اکثر حضرت والدصاحبؒ شاہ آباد سے یا ایبوڑہ سے انبالہ چھاؤنی تشریف لے آیا کرتے تھے ورنہ ہم شاہ آباد چلے جایا کرتے حافظ محمد سلیمان صاحب بھی سبق میں شامل تھے۔ بعد ازاں شیخ القراء مولانا قاری محی الاسلام صاحب کی خدمت میں پانی پت حاضری ہوئی اور حضرت موصوف کو بطریق جمع الجمع پورا قرآن پاک سبعہ میں سنایا۔ اور سبعہ میں نقل بھی کیا نیز شاطبیہ بھی دوبارہ سنائی۔ اس کے بعد حضرت قاری فتح محمد صاحب مدظلہٗ (حال مقیم مکہ مکرمہ) سے درۃ المفیدہ قرأۃ ثلاثہ میں پڑھی اور شاطبیہ کا بعض حصہ اور مقدمہ جزریہ پورا سنایا اس کے بعد بزمانہ قیام دارالعلوم دیوبند جناب قاری حفظ الرحمٰن صاحب تلمیذ خاص حضرت قاری عبدالرحمٰن صاحب الٰہ آبادی سے بھی مشق کی اور طیبۃ النشر فی قراۃ العشر کا بعض حصہ پڑھا۔

تکمیل علوم:۔ پانی پت سے فراغت کے بعد والدصاحب مرحوم نے شاہ آباد ضلع کرنال مدرسہ حقانیہ میں اپنے پاس بلالیا اور حسامی شرح وقایہ، ہدایہ اولین قطبی وغیرہ کتب خود پڑھائی شوال ۱۳۶۱ھ میں مظاہر العلوم سہارنپور میں داخلہ لیا مگر آب و ہوا مرطوب ہونے کی وجہ سے بقرعید کے بعد والدصاحب مرحوم کے پاس فقیروالی ضلع بہاولنگر مدرسہ قاسم العلوم میں چلا گیا حضرت والدصاحب مرحوم نے اسی سال مدرسہ قاسم العلوم فقیروالی میں دورۂ حدیث کا افتتاح فرمایا تھا اور مولانا ظہور احمد صاحبؒ دارالعلوم دیوبند کے استاذ بھی تشریف لائے تھے۔ احقر کا جلالین شریف کا سبق تو حضرت والدصاحب مرحوم کے پاس رہا باقی ہدایہ اخیرین مشکوٰۃ شریف اور منطق وغیرہ کے سب اسباق مولانا ظہور احمد کے پاس ہوتے۔ سالانہ امتحانات کے لیے حضرت مولانا محمد شریف صاحب کشمیری مدظلہٗ دیوبند سے تشریف لائے۔ بحمد اللہ اچھے نمبروں پر کامیاب ہوا۔

شوال ۶۲ ۱۳ھ میں دارالعلوم دیوبند میں داخلہ لیا مطول وغیرہ علم معانی میں اور عقائد اور منطق فلسفہ وغیرہ کی کتابیں حضرت مولانا عبدالحق صاحب (حال اکوڑہ خٹک) مولانا فخر الحسن صاحب حال مدرس حدیث دیوبند مولانا محمد جلیل صاحبؒ سے پڑھ کر اگلے سال دورہ حدیث شریف میں شامل ہو گیا۔

ترمذی شریف حضرت شیخ العرب والعجم مولانا حسین احمد صاحب مدنیؒ نے شروع کرادی تھی مگر پھر تین ماہ کی رخصت پر تشریف لے گئے تو حضرت مدنی کی جگہ تقریباً تین ماہ حضرت مولانا فخرالدین صاحب مراد آبادی سہ ماہی امتحان تک ترمذی شریف اور بخاری شریف کا درس دیتے رہے اس عرصہ میں ترمذی شریف کی کتاب الصلوٰۃ اور بخاری شریف کی کتاب العلم ختم ہوگئی تھی حضرت مدنی نے واپس تشریف لاکر ترمذی شریف جلد اول اور بخاری شریف ہر دو جلد کی تکمیل فرمائی ترمذی شریف کی جلد ثانی اور شمائل ترمذی حضرت شیخ الادب والفقہ مولانا اعزاز علی صاحبؒ نے پڑھائی مسلم شریف ابوداؤد شریف نسائی شریف طحاوی شریف موطا امام مالک علی الترتیب حضرت مولانا بشیر احمد صاحب گلاوٹھیؒ حضرت مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ حضرت مولانا فخرالحسن صاحب مدظلہ استاذ الحدیث دیوبند حضرت مولانا عبدالحق صاحب اکوڑہ خٹک مدظلہ حضرت مولانا عبدالخالق وزیر العلماء کبیروالا ضلع ملتان اور ابن ماجہ و موطا امام محمد دیگر اساتذہ سے پڑھیں امتحان سالانہ میں حسب ذیل نمبر حاصل کئے ۔

بخاری شریف ۵۰ ۔ مسلم شریف ۵۲ ۔ ابوداؤد شریف ۴۱ ۔ ترمذی شریف ۴۶ ۔ شمائل ترمذی ۵۰ ۔ نسائی شریف ۴۱ ابن ماجہ شریف ۴۷ ۔ طحاوی شریف ۴۲ ۔ موطا امام مالک ۴۷ ۔ موطا امام محمد ۵۰ ۔

تربیت باطنی اور سلوک :- حضرت حکیم الامت تھانویؒ کے مدرسہ خانقاہ میں تعلیم سے زیادہ تربیت اخلاق پہ زور دیا جاتا تھا اور بات بات پر روک ٹوک کی جاتی تھی ۔ اس لیئے بچپن سے ہی اس سے واسطہ رہا اور عملی طور پر صغر سنی سے تربیت کا موقع ملتا رہا اگرچہ اپنی ناقص استعداد کی وجہ سے کچھ حاصل نہیں کر سکا ۔ زمانہ طالب علمی میں اگرچہ حضرت قدس سرہٗ عام طور پر بیعت نہیں فرمایا کرتے تھے مگر بیعت کا جو مقصد تزکیہ اخلاق ہے وہ باحسن وجوہ تعلیم کے ساتھ ہی حسب استعداد حاصل ہوتا رہتا تھا ۔ مگر اس ناکارہ کو بڑی اماں مرحومہ یعنی بڑی پیرانی صاحبہ کی سفارش پر بیعت میں شرکت کی اجازت چھوٹی عمر میں مرحمت فرمادی گئی تھی اور بیعت تبرک کا یہ شرف بھی حاصل ہوگیا تھا ۔

چودہ سال کی عمر تک تو حضرت قدس سرہٗ کے زیر سایہ پابندی کے ساتھ خانقاہ کے مدرسہ

میں رہنے اور تعلیم حاصل کرنے کی سعادت حاصل رہی اور حضرت قدس سرہٗ کی مجلس مبارک میں بیٹھنے اور ملفوظات سننے کا مسلسل موقع میسر آتا رہا۔ حضرتؒ کا ایک وعظ بڑے گھر میں ایک چھوٹے گھر میں ایک حضرت کی بھتیجی صاحبہ کے گھر اور ایک وعظ خانقاہ میں سُننا یاد ہے یہ سب وعظ صبح کے وقت اشراق کے بعد ہوتے تھے۔ اس کے بعد اکثر و بیشتر دربار اشرفی میں حاضری اور صحبت کا شرف حاصل ہوتا رہا جب حضرت حکیم الامت قدس سرہٗ کی وفات ہوئی تو یہ احقر ۱۲ سال کی عمر کو پہنچ چکا تھا۔ اس بحر شریعت اور خضر طریقت کے زیر سایہ رہنے اور زمانۂ دراز تک مسلسل مصاحبت و مجالست کی دولت و نعمت کے حصول کے باوجود افسوس ہے کہ اس ناکارہ کی مثال وہی ہوگئی کہ بارہ برس دلی میں رہے اور بھاڑ ہی جھونکا واقعی جب اپنی استعداد ہی ناقص ہو اور پھر عمل کی جگہ صفر ہو تو مرشد کامل اور خضر طریق کی صحبت سے بھی کچھ ہاتھ نہیں آتا صحیح ہے یہ ناکارہ بھی ؎

تہی دستان قسمت را چہ سود از رہبر کامل　　　کہ خضر از آب حیواں تشنہ می آرد سکندر را

کا مصداق بن کر رہ گیا البتہ حسب بشارت حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم ھم القوم الذین لا یشقی جلیسھم! اس پر اللہ تعالیٰ کا ہزار ہزار شکر کرتا ہوں کہ حق تعالیٰ نے قطب دوراں مجدد زماں حکیم الامت کے جلیس ہونے کی دولت سے نوازا اور صحبت مجلس میں باریابی سے مشرف و معزز فرمایا امید ہے کہ خواجہ عزیز الحسن صاحبؒ سے میخانہ کا محروم بھی محروم نہیں ہے۔ انشاء اللہ محرومی نہیں رہے گی۔ وما ذالک علی اللہ بعزیز۔

حضرت حکیم الامت تھانوی کی وفات کا زمانہ میرا زیادہ تر تحصیل علم میں مشغولی کا زمانہ تھا گو تربیت کا باضابطہ تعلق حضرت مولانا مفتی محمد حسن صاحبؒ سے قائم کر لیا تھا مگر تعلیمی مشغولیت کی وجہ سے حضرت مفتی محمد حسن صاحبؒ سے خصوصی تربیت کا موقع نہیں ملا اگرچہ والد مرحوم کی تربیت و نگرانی بحمد اللہ حاصل تھی۔ حضرت مفتی محمد حسن صاحب چونکہ فنا فی الشیخ تھے۔ اسلئے تجدید بیعت کی احقر کی درخواست پر تحریر فرمایا کہ تم کو بیعت کی ضرورت نہیں، البتہ اصلاحی تعلق کی اجازت دے دی اس سلسلہ میں بعض خطوط ارسال کرنے کی نوبت آئی اور ایک مرتبہ لاہور حاضری پر بکمال شفقت دوازدہ تسبیح معمول مشائخ کی تعلیم بھی دی بحمد اللہ اس پر عمل کی توفیق ہوتی رہی۔ حضرت مفتی محمد حسن صاحب کے وصال کے بعد حضرت مولانا ظفر احمد عثمانی کے مشورہ سے

حضرت مولانا شاہ عبدالغنی صاحب پھولپوری ناظم آباد کراچی کی خدمت بابرکت میں پہلے بذریعہ عریضہ تجدید بیعت کی اور اصلاحی تعلق کی درخواست کی تو جواب میں تحریر فرمایا گیا "عزیزم سلمکم اللہ تعالیٰ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ ۔ آپ کے والد صاحب سے میرے خصوصی تعلقات تھے اصلاح کے لیے حالات لکھا کریں اور گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے حق تعالیٰ کی ذات حیّ اور قیوم اپنے بندوں کو ہر حال میں سنبھالنے کے لیے کافی ووافی ہے" اور خط کے ذریعہ تجدید بیعت بھی فرمالی ۔ پھر ایک ہفتہ کے لیے کراچی طلب فرمایا اور بڑی شفقت اور عنایت کا برتاؤ فرمایا اس دوران قیام میں حضرت پھولپوری کے دست مبارک پر تجدید بیعت کا شرف بھی حاصل ہوا ۔ ایک دن کھانے کے بعد احقر نے کہلوایا کہ اپنے کھانے کا انتظام خود کروں گا تو حضرت پھولپوری نے فرمایا کہ ان کے والد صاحب سے میرے بہت گہرے تعلقات تھے اس لیے ان کو کہہ دیا جائے کھانا میرے ساتھ ہی کھایا کریں چنانچہ ازراہ نوازش دونوں وقت کھانا میں اپنے ساتھ شریک فرماتے پھر تربیتی خطوط کا سلسلہ شروع ہوگیا حقیقت یہ ہے جس قدر منضبط طریقہ پر حضرت پھولپوری سے تربیت واصلاح کرانے اور تربیتی خطوط لکھنے اور اصلاح حاصل کرنے کا موقع میسر آیا ایسا موقع پھر کسی شیخ سے نصیب نہیں ہوا فللہ الحمد ۔ ان خطوط اصلاحیہ میں سے حضرت پھولپوری نے اپنے رسالہ اصل الوصول کے آخر میں کوئی ۱۲ خطوط شائع بھی کرا دیے تھے دوسرے خطوط شائع نہیں ہوئے مگر محفوظ ہیں ۔ حضرت پھولپوری ازراہ عنایت عریضوں کے جواب میں دعا بھی فرماتے اور ہمت افزائی اور بامراد ہونے کی بشارت بھی دیتے اور سلامت فہم کی خوشخبری سے بھی نوازتے ایک عریضہ کے جواب میں ارشاد فرمایا کہ "الحمدللہ کہ آپ کے اندر فہم سلیم ہے" یہ ناکارہ ہمیشہ ہمت افزاء کلمات کو اپنے لیے باعث سعادت اور نیک فال سمجھتا رہا ۔

حضرت پھولپوری کے وصال کے بعد حضرت مولانا خیر محمد صاحب کے مشورہ سے حضرت مولانا ظفر احمد صاحب تھانوی کی طرف رجوع کیا حضرت تھانوی نے استخارہ کرنے کا حکم فرمایا استخارہ کے بعد آپ نے حضرت مولانا خیر محمد صاحب کو شیخ صحبت تجویز فرما کر اپنے سے اصلاحی تعلق کی اجازت دیدی بحمداللہ اصلاحی خط وکتابت کا یہ سلسلہ جاری رہا حضرت مولانا عثمانی کے بلانے پر ایک ہفتہ کے لیے ٹنڈو آدم آکر یار بھی حاضری کا شرف حاصل ہوا اس وقت درس حدیث

بخاری شریف میں بھی شرکت کا موقع میسر آتا رہا اور حضرت مولانا عثمانی رح کی عنایات اور الطاف سے بیحد ممنون و مشرف ہوا حضرت مولانا مرحوم نے اس ناکارہ کو باوجود نااہلیت کے اجازت بیعت سے بھی مشرف و معزز فرمایا۔ اس دن کی مغرب کے بعد جس روز صبح کو واپسی کا ارادہ تھا حضرت مولانا مرحوم نے فرمایا کہ اپنے وارد قلبی اور حضرات مشائخ کے ارشادات کی روشنی میں آپ کو بیعت لینے کی اجازت دیتا ہوں۔ اس وقت تو ہیبت کی عجیب کیفیت طاری تھی کہ زبان سے کچھ عرض نہیں کر سکا واپس آکر سراپا سوال سے طویل عریضہ اس خدمت سے معذرت کا لکھا حضرت مولانا مرحوم نے معذرت تو قبول نہیں فرمائی مگر اختیار دے دیا کہ دل چاہے تو طالب کو بیعت کر لیا جائے احقر نے اس اختیار سے ہی فائدہ اٹھالیا اور کسی کو بیعت نہیں کیا

حضرت مولانا مرحوم کی عنایتوں کا کہاں تک تذکرہ کروں اس کے لیے تو مفصل مضمون اور ایک بڑا دفتر درکار ہے بس دعا ہے کہ حضرت مولانا مرحوم کے حسن ظن کے موافق مسلمانوں کی دینی خدمت کرنے کی توفیق ہوتی رہے۔

میرے سب سے بڑے محسن اور عظیم مربی مفتی اعظم حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب قدس سرہٗ تھے حضرت مفتی صاحب کی آمد و رفت تھانہ بھون میں کثرت سے رہتی تھی مہینہ مہینہ قیام بھی مع اہل خانہ کے ہو جاتا تھا اس لیے بچپن سے ہی حضرت مفتی صاحبؒ سے محبت اور تعلق تھا، میرے والد صاحب مرحوم کے ساتھ حضرت مفتی صاحبؒ کو اخوت و مودت کا جو تعلق تھا اس کو الفاظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا حضرت مفتی صاحبؒ نے اس ناکارہ کے ساتھ جو ہمیشہ اپنی اولاد کی طرح حسن سلوک رکھا اور مشفقانہ برتاؤ فرمایا اس کی تمام تر بنا ہی اسی حق اخوت کی ادائیگی تھی۔

ایک والا نامہ میں حضرت مفتی صاحب ارقام فرماتے ہیں۔ السلام علیکم و رحمۃ اللہ۔

عنایت نامہ پہونچا یہ حقیقت ہے کہ اخی فی اللہ مولانا عبدالکریم صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے جو تعلق تھا اس کا گہرا اثر آپ کے لیے اپنے قلب میں پاتا ہوں اور اسی لیے آپ سے عموماً ایسی بے تکلف گفتگو کر لیتا ہوں جیسی اپنی اولاد سے اس کی فکر نہیں ہوتی کہ خفا ہو جائیں گے۔ دعا کہ اللہ تعالیٰ آپ کے علم و عمل میں ترقیاں لامتناہی عطا فرما دیں۔ دوسرے والا نامہ مرقومہ ۱۰ صفر ۱۳۹۴ھ میں ارشاد ہے

السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ آپ کی یادآوری اور والد مرحوم کے تعلق کی وجہ سے احقر ناکارہ سے قلبی تعلق کی بڑی قدر ہوئی کیونکہ یہ کچھ صرف اللہ ہی کے لیے ہو سکتا ہے عزیزم یقین کرو کہ مجھے بھی آپ سے ایسی ہی محبت ہے جیسی اپنی اولاد سے ہوتی ہے مگر امراض اور سقوط قویٰ سے مجبور ہو گیا کہ خط لکھ کر دریافت خیریت کے بھی قابل نہ رہا نگاہ جواب دے رہی داہنا ہاتھ بیکار ہوتا جا رہا ہے بمشکل سے کچھ حروف لکھتا ہوں۔ اگر کوئی ایسی صورت ممکن ہو کہ آپ اپنے مدرسہ کا انتظام کسی اور کے سپرد کر کے دارالعلوم میں آسکیں تو آخر عمر میں میرے لیے بڑی تقویت ہو گی مگر آنا اہل وعیال کے ساتھ ہو کر بے فکری سے رہ سکیں اس کا کوئی امکان ہو تو دیکھیں والسلام۔

پھر ۲۹؍۳؍۷۶ھ کے والا نامہ میں مکرر اسی خواہش کا اظہار ان الفاظ میں فرمایا گیا ، میرا وقت آخری ہے دل چاہتا ہے کہ اگر آپ کے لیے حالات سازگار ہوں تو میری زندگی میں آپ یہاں آجائیں ، حضرت مفتی صاحبؒ کے تعلق خاطر اور اس ناکارہ سے محبت و لگاؤ کا اندازہ کرنے کے لیے یہ تحریر کافی ہے مگر اس کو شومئ قسمت اور حرماں نصیبی کے سوا اور کیا نام دیا جائے کہ حضرت مفتی صاحبؒ کے حسب منشاء عمل کرنے سے قاصر رہا ایک مربی بزرگ اور مثل والد ایسے اصرار کے ساتھ بلائیں اور اپنی جسمانی معذوریوں اور ضعف کا واسطہ دے کر اس کی طرف رغبت دلائیں پھر یہ کس قدر سنگدلی تھی کہ اس پر عمل نہیں کیا گیا آج اس کو سوچتا ہوں تو حسرت کے ساتھ ندامت میں غرق ہو جاتا ہوں رحمۃ اللہ رحمۃ واسعۃ وغفرلہٗ مغفرۃ ظاہرۃ وباطنۃ دل پر پتھر رکھ کر جب حاضری سے معذرت کا عریضہ لکھا تو پھر بھی جواب میں کسی تلخی بے رخی یا سرزنش کی بجائے اسی سابقہ تعلق و محبت کا اعادہ فرمایا گیا فرماتے ہیں " آپ کے خط سے حالات معلوم ہوئے یقین فرماویں کہ مجھے ہمیشہ سے آپ کے ساتھ وہی تعلق رہا ہے جو اپنی اولاد کے ساتھ ہونا چاہیئے۔

میرے محب محترم مفتی عبدالکریم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا تعلق میرے ساتھ ایسی ہی اخوت کا تھا۔ اب رہا مدرسہ کا معاملہ وہ ظاہر ہے کہ بغیر کسی انتظام کے اس کو نہیں چھوڑا جا سکتا فالخیر فیما وقع انشاء اللہ ولعل اللہ یحدث بعد ذالک امرا والسلام ، آخر میں آیت مبارکہ لکھ کر اظہار فرما دیا کہ سابق خیال اپنی جگہ قلب مبارک میں بدستور قائم ہے اور تمنا ہے کہ اس کے لیے اللہ تعالیٰ کوئی صورت پیدا فرما دیں۔ چنانچہ اس کے بعد جب آخری سفر میں لاہور تشریف

لائے اور احقر مع اہل وعیال زیارت کے لیے لاہور حاضر ہوا تو ملاقات کرتے ہی فرمایا کہ ہم نے تو آپ کو کراچی بلایا تھا آپ نے ساہی وال ہی میں پہنچے گاڑ لیے۔ اس نافہم اور ناکارہ کی سمجھ میں تو اب تک بھی نہیں آیا کہ حضرت اس ناکارہ اور نااہل سے کیا کام لینا چاہتے تھے اور یہ نااہل دارالعلوم کے کس کام کے اہل سمجھا گیا تھا اپنا وجدان تو یہی ہے کہ اپنے اور اپنے اور ذمہ دار مدرسہ کے کسی کام کی بھی اہلیت اور صلاحیت اپنے اندر نہیں ہے اگر جانا ہوجاتا تو یہ حضرت مفتی صاحب کے تصرف اور کرامت کا ظہور ہی ہوتا کہ یہ ظلوم وجہول دارالعلوم کی مشین میں کسی پرزے کی جگہ فٹ ہوجاتا اور اس کے مناسب کوئی کام اس سے بن آتا ورنہ خود میں تو اتنی بھی ہمت نہیں ہوئی کہ حضرت مفتی صاحبؒ دریافت ہی کر لیتا کہ میرے سپرد کیا خدمت ہوگی کہ اس سوال میں بھی ایک گونہ اپنی اہلیت وقابلیت کا دعویٰ ہی ہوتا بات کچھ نہیں تھی نہ کوئی اہلیت تھی نہ کوئی قابلیت بس حضرت مفتی صاحبؒ کے قلب مبارک میں اپنی اولاد کی طرح ناکارہ کے ساتھ بے حد شفقت ومحبت کا جذبہ موجزن تھا اس جذبہ سے حضرت والا بے اندازہ لطف وکرم سے پیش آتے تھے اور معمولی معمولی دینی خدمات پر حسن ظن کا اظہار فرما کر ہمت افزائی فرماتے رہتے تھے۔

حضرت مفتی صاحبؒ کی طرف سے اس طرح کا ایک عطیہ بغیر استحقاق کے اپنی پوری نااہلیت کے باوجود اجازت بیعت عطا فرمانے کا ہے۔ لاہور کے آخری سفر میں بوقت حاضری تجدید بیعت کا شرف حاصل ہوگیا تھا اور تربیتی خطوط برائے ملاحظہ ارسال کرنے کے لیے فرمایا تھا مگر حضرت مفتی صاحبؒ کے ضعف کے پیش نظر احقر نے اپنا مختصر حال متعلقہ تربیت لکھ کر بھیجا اس پر حضرت مفتی صاحبؒ نے ارشاد فرمایا۔ بس اس مختصر سے بھی وہ مقصد حاصل ہوگیا جو خط وکتابت کے دیکھنے سے حاصل ہوتا کچھ دنوں کے بعد ایک لفافہ حسب ذیل مضمون کا آیا جس پر ۲۷ ربیع الثانی ۱۳۹۵ھ کی تاریخ درج ہے۔

" عزیز محترم مولوی عبدالشکور صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ ۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔
اس وقت بے ساختہ یہ قلب میں وارد ہوا کہ بنام خدا تعالیٰ آپ کو بیعت و تلقین کی اجازت دے دی جائے، آپ اپنی اصلاح کی نیت سے اصلاح خلق کی خدمت شروع کریں تربیت السالک تعلیم الدین التکشف التشرف وغیرہ

کتب کو مطالعہ میں رکھیں اللہ تعالیٰ آپ کی مدد فرمائے۔

احقر نے اس کرامت نامہ کے بعد بہت مفصل عریضہ اپنی نااہلی اور آوارگی اور تاثر کے اظہار کے لئے ارسال کیا، اس کا ایک فقرہ یہ ہے۔ "یہ ناچیز اس بار امانت وخدمت کا متحمل نہیں ہے اور بزرگوں کی طرف سے یہ بوجھ ڈالا جا رہا ہے۔ یہ خدا کی شان اور محض فضل و احسان ہے اس حیثیت سے کہ یہ عطیہ خداوندی ہے دو رکعت نماز شکرانہ کے طور پر ادا کرنے کی توفیق میسر آگئی" اور حضرت مفتی صاحبؒ قدس سرہ نے ارقام فرمایا۔ "جو حالات پیش آئے وہی متوقع تھے اور اس میں خیر ہے انشاء اللہ" حضرت مفتی صاحبؒ ہمیشہ اپنی شفقت بزرگانہ سے اس ذرہ ناچیز کو سرفراز فرماتے رہے اور روحانی تربیت وعطیات کے ساتھ مادی اور مالی تعاون سے بھی نوازتے رہے۔ ایک کرامت نامہ میں ارقام فرمایا۔ "امداد الفتاویٰ جلد پنجم تیار ہوا تو آپ یاد آئے اس کا پیکٹ ڈاک سے روانہ کرنے کے لیے بنالیا تمام پتہ یاد تھا لکھ لیا مگر یہ ذہن میں نہیں رہا کہ ضلع سرگودھا ہے یا لائلپور اس شبہ کی وجہ سے پارسل یوں ہی پڑا رہا۔ اب بحمد اللہ آخری جلد یعنی ششم انشاء اللہ اسی ہفتہ میں تیار ہو جائے گی اس لیے دونوں جلدیں ساتھ روانہ کردوں گا۔ والسلام" اس نوع کا آخری عطیہ اپنی دو کتابیں "میرے والد ماجد" اور "جواہر الفقہ" ہر دو جلد بذریعہ ڈاک ارسال فرمانا یاد ہیں حضرت مفتی صاحبؒ کی عنایات کا کیا حال عرض کروں وہ اس ناکارہ کے لیے سراپا عنایات و کرم بنے ہوئے تھے اور ان کے الطاف ہمیشہ اس نالائق پر مبذول رہتے تھے

علمی خدمات:۔ دارالعلوم سے سند فراغت حاصل کرنے کے بعد اس ناکارہ نے کچھ عرصہ راجپورہ ریاست پٹیالہ کے مدرسہ میں تدریس کا کام کیا اس کے بعد مدرسہ حقانیہ شاہ آباد ضلع کرنال میں مدرس ہوگیا کنز شرح جامی وغیرہ تک کتابیں پڑھائی تقسیم ملک کے بعد یکم فروری ۱۹۴۸ء سے ساہیوال ضلع سرگودھا میں قیام ہے۔ یہاں حسب استطاعت تعلیم اور وعظ ونصیحت کا کام کرتا رہا قصبہ کی قدیم جامع مسجد میں مدرسہ قاسمیہ کے نام سے ایک مدرسہ قائم کیا مگر ۱۹۵۳ء کی تحریک ختم نبوت کے سلسلہ میں جیل میں ۳،۴ ماہ رہنے کی وجہ سے مدرسہ بند ہوگیا

تصنیفات:۔ تصنیف وتالیف بھی نسبتہً ایک پائدار دینی خدمت کا ذریعہ ہے اور مستقل علمی شعبہ ہے۔ ٹنڈوالہ یار کی حاضری سے قبل اس کی طرف چنداں توجہ نہیں تھی۔ بس دو تین

مختصر مضمون الصدیق ملتان میں شائع ہوئے تھے۔ سب سے پہلا مستقل رسالہ کی شکل میں مواد جمع کرنے کی خدمت پر حضرت مولانا ظفر احمد صاحب قدس سرہٗ نے ہی مامور فرمایا اور اس شعبہ کی طرف متوجہ کیا اس کے بعد تو حضرت والا کے فیض و توجہ کا اس قدر اثر ہوا کہ احقر کے قلم سے مختلف موضوعات پر مختصر و مفصل اتنی تعداد میں مضامین ظہور میں آئے کہ اس پر حیرانی اور تعجب ہوتا ہے کہ اس بے بضاعت اور ناکارہ کو تصنیف و تالیف کے شعبہ میں اس قدر خدمت کیلیے میسر آگئی یہ مولانا عثمانی کی کرامت ہی ہے کہ اب تک چھوٹے بڑے ۳۴ مضامین لکھے جا چکے ہیں ان میں سے تقریباً ۲۵ طبع ہو چکے ہیں باقی غیر مطبوعہ مواوات کی شکل میں ہیں ان سب کی ایک فہرست منسلک ہے یہ محض حضرت مولانا عثمانی نور اللہ مرقدہٗ کا فیض علمی اور ہمت افزائی کا نتیجہ ہے غرضیکہ یہ ناکارہ ان اکابر سلسلۂ اشرفیہ کے ساتھ وابستگی اور تعلق کو اپنے حق میں بڑی خوش نصیبی اور ذریعہ سعادت سمجھتا ہے اور دین کی جو کچھ تھوڑی بہت سمجھ اور علم و عمل کی نعمت اور دولت حاصل ہے وہ ان ہی حضرات کے ساتھ نسبت کا فیض ہے اب اس دعاء پر اس حکایت لذیذ کو ختم کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ ہم سب کو محض اپنے فضل و کرم سے اپنے ایسے ہی مقبول برگزیدہ اور مقرب بندوں سے وابستہ رہنے اور ان حضرات سے نسبت و تعلق کے طفیل میں صحیح مسلک اہل سنّت والجماعت کی اتباع اور خدمت کی توفیق مرحمت فرمائیں اور آخرت میں شفیع المذنبین حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت اور اپنی رضا کی دولت سے سرفراز فرمائیں آمین ثم آمین برحمتک یا ارحم الراحمین۔

مطبوعہ:۔ ۱۔ ہدایت الحیران۔ ۲۔ فضائل و مسائل رمضان۔ ۳۔ عقاید علماء دیوبند۔ ۴۔ ابوالاعلیٰ مودودی کے نظریات پر تحقیقی نظر۔ ۵۔ السعی المشکور فی احکام العاشورہ۔ ۶۔ خلاصۃ الارشاد فی مسئلۃ الاستمداد المعروف بہ فیض روحانی از اولیاء ربانی۔ ۷۔ فضائل جہاد۔ ماہنامہ الحق اکوڑہ خٹک میں شائع شدہ مضامین۔ ۸۔ اسلام میں ارتداد کی سزا۔ شعبان و رمضان ۱۳۹۳ھ۔ ۹۔ مقام رسول کریم رمضان یا ذوالحجہ ۹۱ھ و محرم ۹۲ھ۔ ۱۰۔ ضبط تحقیق اور اس کے نتائج۔ جمادی الاول و جمادی الثانی ۱۳۹۴ھ۔ ۱۱۔ اسلام میں معاشی مسئلہ کا اخلاقی حل۔ ج اور ج ۲ ۱۳۸۹ھ۔ ماہنامہ البلاغ دار العلوم کراچی ۱۴۰۱ میں شائع شدہ مضامین۔ ۱۲۔ سرمایہ داری اشتراکیت اسلام شعبان رمضان ۸۹ھ۔

۱۳۔ والد ماجد حضرت مولانا مفتی عبد الکریم صاحبؒ کے حالات ج ۱ و ۲ ۹۲ھ۔ ماہنامہ الرشید ساہیوال میں شائع شدہ۔ ۱۴۔ عشر و خراج کے احکام محرم و صفر ۱۳۹۴ھ۔ ۱۵۔ احکام صدقہ فطر و عید الفطر شوال المکرم ۱۳۹۴ھ ۔ ہفت روزہ خدام الدین لاہور میں شائع شدہ۔ ۱۶۔ اسلام میں جہاد کا مقصد اور اس کا مقام۔ ۱۷۔ فضائل جہاد مختصر۔ ترجمان اسلام میں شائع شدہ۔ ۱۸۔ حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتوی کے حالات، مرتد کی سزا اسلام میں۔ ۱۹۔ مسئلہ عصمت انبیاء۔ ہفت روزہ الجمعیۃ راولپنڈی میں شائع شدہ۔ ۲۰۔ رویت ہلال کمیٹی کی شرعی حیثیت احکام ذوالحجہ ۔ ہفت روزہ صوت الاسلام لاہور میں شائع شدہ مضامین۔ ۲۱۔ مولانا ظفر احمد عثمانی امیر اعلیٰ مرکزی جمعیت علماء اسلام کی سیاسی خدمات۔ ۲۲۔ پاکستان کی دستور سازی میں مرکزی جمعیت علماء اسلام کے راہنماؤں کی خدمات۔ ۲۳۔ فتویٰ کی حقیقت اور اس کی شرعی حیثیت ۔ ماہنامہ الصدیق ملتان میں شائع شدہ مضامین۔ ۲۴۔ اتباع سنت اور صوفیاء کرام۔ ۲۵۔ علم اور علماء کی عزت اسلاف کی نظر میں۔

غیر مطبوعہ ۔ اشرف البیان فی علوم القرآن۔ ۲۷۔ تتمہ البیان فی ترجمۃ القرآن۔ ۲۸۔ حیات اور سماع۔ ۲۹۔ تاریخ مدارس عربیہ۔ ۳۰۔ تذکیۃ الصدور فی ثبات سماع انبیاء علیہم السلام فی القبور۔ ۳۱۔ تحقیق الجمعۃ فی القریٰ۔ ۳۲۔ العقیدۃ المرضیہ فی حیات البرزخیہ۔ ۳۳۔ مرزائیوں کے متعلق ججوں کے فیصلے۔ ۳۴۔ کتاب خلافت معاویہ و یزید کے نظریات پر تبصرہ۔ ۳۵۔ ترمذی شریف کی تقریر۔ ۳۶۔ ارشاد العباد فی عید المیلاد۔ ۳۷۔ تسہیل الارشاد فی مسئلۃ الاستمداد۔ ۳۸۔ خدمت دین کے دو شعبے خلافت ظاہرہ و باطنہ۔ ۳۹۔ للفقراء کی تفسیر۔ ۴۰۔ تذکرۂ ظفر مطبوعہ۔ ۴۱۔ اسلام میں جہاد اور علم دین کا مقام ——— ۴۲۔ اقامت البرہان کا جواب ۴۳۔ فتاویٰ امداد السائل۔

مولانا عبد الرؤف سکھروی کا تفصیلی تذکرہ مولانا رشید اشرف صاحب کے مقالہ حضرتؒ کے معروف تلامذہ اور ان کی خدمات میں آگیا ہے اس لئے اعادہ کی ضرورت نہیں۔

○

نقوش و تاثرات

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

صِبْغَةَ اللّٰهِ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً وَّنَحْنُ لَهٗ عٰبِدُوْنَ

ہم نے اختیار کیا اللہ کا رنگ اور کس کا رنگ ہے اللہ سے بہتر۔
ہم اس کی عبادت کرنے والے ہیں۔

جہانتک رنگ کا تعلق ہے وہ کبھی ہلکا ہوتا ہے اور کبھی گہرا۔ اور کبھی یہ رنگ حالات زمانہ سے ہلکے اور پھیکے پڑ جاتے ہیں۔

حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ پر اللہ کا یہ رنگ ایسا چڑھا ہوا تھا کہ مرورِ زمانہ سے ہلکا اور پھیکا نہ پڑا۔ حضرت مفتی صاحبؒ پر اللہ کا رنگ چڑھانے والی شخصیت شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن صاحب نور اللہ مرقدہٗ اور حکیم الامت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ کی تھی یہی وجہ ہے کہ حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ نے کبھی بھی دینی وقار کو مجروح نہ ہونے دیا۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیشہ ان کی مدد فرمائی ہے۔ دارالعلوم کراچی کیلئے ان کی مساعی جمیلہ دین کو غالب لانے والوں کیلئے عمدہ مثال ہے۔

مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب
صدر آل انڈیا مجلس مشاورت
و ناظم ندوۃ المصنفین، دہلی

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ

میری نظر میں

میں ورلڈ ریلیجس اینڈ پیس کانفرنس کی تیاری کمیٹی میں شرکت کے لیے ماسکو گیا ہوا تھا، ۹ اکتوبر کو وہاں سے واپس آیا۔ "آل انڈیا ریڈیو" کے نمائندہ سے اس اندوہناک سانحہ کی اطلاع ہوئی۔ ریڈیو کے نمائندے کو میرے دہلی میں نہ ہونے کی خبر نہیں تھی۔ اس نے ریڈیو پاکستان سے یہ خبر سنی تو اس پر میرے تاثرات معلوم کرنے کے لیے آیا تھا۔ قدرتی طور پر اس سانحہ کی اطلاع سے سخت صدمہ ہوا۔ اور میں نے اسی وقت آل انڈیا ریڈیو کے نمائندہ کو ایک مختصر سا بیان لکھ دیا تھا جو نشر ہو چکا ہے۔

حضرت مولانا مفتی محمد شفیعؒ سے میرے دو رشتے ہیں۔ ایک خاندانی رشتہ دوسرا روحانی اور علمی رشتہ۔ مرحوم کے حقیقی بھانجے مولوی سید حسن صاحب مرحوم کے گھر میں میری حقیقی بھانجی ہیں، اور اس تعلق کی وجہ سے خاندانی اعتبار سے ہم ایک دوسرے کے بہت قریب تھے۔

مفتی صاحب مجھ سے کئی سال پہلے دارالعلوم سے فارغ ہوئے تھے۔ یاد آتا ہے کہ ان کے والد ماجد مولانا محمد یاسین صاحب مرحوم کے یہاں میں متوسط کتابیں پڑھتا تھا اور وہ درجہ فارسی سے فارغ ہو رہے تھے۔ اس وقت سے آخر تک زندگی کے مختلف مرحلوں میں ہم ایک دوسرے کے ساتھ رہے۔ میں پورے یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ مرحوم طالب علمی کے اس دور میں بھی غیر معمولی طور پر کم آمیز سنجیدہ اور نیک تھے۔ ان کی پاک نفسی اور نیکی کی شہرت اسی وقت سے تھی۔ طالب علمی کا پورا دور انہوں نے بڑی نیک نامی سے گذارا۔ فراغت کے بعد دارالعلوم ہی سے منسلک ہو گئے اور ان کا شمار جلد ہی دارالعلوم کے ممتاز اساتذہ میں ہونے لگا۔ ادب اور فقہ میں خاص طور پر ان کی شہرت تھی۔ درس و تدریس کے ساتھ ان کو شروع ہی سے تصنیف و تالیف سے بھی شغف تھا۔

حضرت مولانا میاں سید اصغر حسینؒ (میاں صاحبؒ) کے ساتھ مل کر کتابوں کی نشر و اشاعت اور تجارت بھی کرتے تھے تحریک خلافت کے شباب کے زمانہ میں "مہر خر کی فضیلت" پر ایک چھوٹا سا رسالہ لکھا جو بہت مقبول ہوا۔ اور بھی چھوٹے چھوٹے رسالے لکھے اور حضورؐ کی سیرت پر ایک نہایت نفیس مختصر کتاب "سیرت خاتم الانبیاءؐ" کے نام سے تالیف کی۔ علماء کے طبقہ میں ان کی شگفتہ نگاری شروع ہی سے مشہور تھی۔ پھر ایک دور آیا کہ دار العلوم دیوبند کی مسند افتاءؒ پر جلوہ افروز ہوئے۔ اسی زمانہ میں والد مرحوم حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمان صاحب قدس سرہٗ کے فتاویٰ کی ترتیب کا کام نہایت محنت اور سلیقہ سے انجام دیا اور عزیز الفتاویٰ کے نام سے خود ہی اس کی اشاعت کا انتظام کیا۔ شروع میں حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت ہوئے اور غالباً ان سے تبرکاً بخاری شریف کے کچھ سبق بھی پڑھے۔ پھر حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ سے تجدید بیعت کی اور ان کے مجاز خاص ہوئے۔ مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کو مفتی صاحب کے علم اور خاص طور سے تفقہ پر بہت اعتماد تھا۔ مجھے خوب یاد ہے کہ عورتوں کے حقوق اور بعض مسائل سے متعلق مولانا تھانویؒ نے جو تاریخی کتاب "الحیلۃ الناجزۃ" مرتب کرائی تھی اس کے مرتب مفتی صاحب مرحوم ہی تھے۔ صورت یہ پیش آئی تھی کہ کسی نے مولانا تھانویؒ کو بتلایا کہ عورتوں میں ارتداد کا فتنہ پھیل رہا ہے کیونکہ فقہ حنفی کی رو سے میاں بیوی میں جو اپنا دین چھوڑ دے تو اس کا نکاح فسخ ہو جاتا ہے۔ آزاد اور سرکش عورتیں اس سے فائدہ اٹھا رہی ہیں۔ ارتداد کے بہانہ سے نکاح کے بندھن کو توڑ دیتی ہیں۔ حضرت مولانا نے یہ بات سنی تو ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور فوراً ہی اس وقت کے اکابر کو تھانہ بھون جمع کرنے کا اہتمام کیا۔ اس مسئلہ پر اور عورتوں سے متعلق دوسرے اہم مسائل پر اس اجتماع میں غور ہوا اور یہ اہم خدمت مفتی صاحب مرحوم کے سپرد کی گئی۔ مفتی صاحب نے بڑی قابلیت اور دیدہ وری سے یہ خدمت انجام دی اور "الحیلۃ الناجزۃ للحلیلۃ العاجزۃ" کے نام سے کتاب مرتب کی جس میں ان تمام مسائل پر سیر حاصل بحث کی گئی۔

تقسیم ملک کے نتیجہ میں مفتی صاحب پاکستان تشریف لے گئے اور ہم جماعت کے ممتاز عالم دین کے فیض صحبت سے محروم ہو گئے۔ پاکستان پہنچ کر مفتی صاحب نے نہ صرف دار العلوم دیوبند کی شاندار روایات کو قائم رکھا بلکہ ان کو اور چار چاند لگائے۔ اس میں کوئی شک نہیں مرحوم کا شمار

اس وقت کے اکابر علماء دیوبند میں تھا۔ ان کی علمی اور دینی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ کراچی کا دارالعلوم ان کی زندہ جاوید یادگار ہے۔ قدیم علماء میں تحریر کی ایسی شگفتگی اور روانی کم دیکھی گئی ہے جو مفتی صاحب میں تھی۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے کام میں بڑی برکت عطا فرمائی۔ ہر کام بڑی محنت اور تندہی سے جم کر کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ بہت سی دوسری اہم مصروفیتوں کے ساتھ تصنیف و تالیف کی خدمت بھی اعلیٰ پیمانہ پر انجام دے رہے تھے۔ سینکڑوں کتابوں کے علاوہ ان کا عظیم الشان کارنامہ تفسیر "معارف القرآن" ہے، جو آٹھ ضخیم جلدوں میں ہے۔

مفتی صاحب کی ایک غیر معمولی اور اہم خصوصیت یہ بھی تھی کہ وقت کے تمام جدید مسائل پر غور و فکر کرتے تھے اور اپنی صوابدید کے مطابق ان کا حل نکالتے تھے۔ تحقیق کی راہ میں جب کبھی کسی مسئلہ سے رجوع کرنے کی ضرورت پیش آتی تھی اُسے تکلف رجوع کر لیتے تھے اور اس سے ان کی بصیرت اور وسعت علم کا اندازہ ہوتا ہے۔ تقسیم ملک کے بعد ایک ہی مرتبہ ہندوستان تشریف لائے تھے اس وقت دہلی بھی تشریف لانا ہوا تھا۔ وہی محبت و شفقت وہی خلوص۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ پہلے کی طرح دارالعلوم دیوبند کی فضا میں یکجا ہیں۔ تواضع انکساری فروتنی، صلہ رحمی اور زندہ جبینی مفتی صاحب کی نمایاں اخلاقی خصوصیات تھیں۔ پچھلے سال عزیزم مولوی خورشید حسن سلمہٗ پاکستان گئے اور مفتی صاحب کو میرے مرض نقرس کی تفصیل بتلائی تو مرحوم نے جواب میں شدید علالت کے باوجود محبت و شفقت سے لبریز اپنے قلم سے خط تحریر فرمایا، جس کو یہاں پر بطور یادگار درج کرتا ہوں۔

مکرم و محترم مولانا عتیق الرحمان صاحب دام مجدہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ!

آپ کو معلوم ہے کہ احقر تقریباً پینتیس ۳۵ سال سے درد نقرس کا مریض ہے طرح طرح کے علاج معالجہ ہوتے رہے۔ گولی "ارگا پائیرین" کی موافق آئی۔ جس سے درد بہت جلد رفع ہو جاتا تھا۔ مگر روزانہ تین گولی ہر غذا کے بعد استعمال کرتا تھا۔ لیکن کبھی ایسا اتفاق ہوا کہ ایک دو روز میں درد نہ گیا تو اس گولی کی کثرت سے گردہ پر برا اثر پڑتا تھا اور دل پر بھی یہی کیفیت میرے تجربہ میں آتی۔ لیکن چند سال پہلے قلب کے ماہر ڈاکٹر نے اس درد کی ایک گولی میرے لیے تجویز کی جو ہمیشہ زیر استعمال اور

فوری اثر کے لیے بہت خوب ہے۔ دل پر گردہ پر بھی اس کا کوئی خلاف اثر نہیں ہوتا
اس گولی کا نام ہے "پروفین" اپنے معالج ڈاکٹروں سے مشورہ کر کے اگر مناسب
سمجھیں تو اس کو استعمال کریں۔ والسلام"
بندہ محمد شفیع - ۱۵ رجب ۹۶ھ

اس خط سے چند روز قبل یہ خط تحریر فرمایا تھا۔ تبرکاً اس کو بھی نقل کرتا ہوں۔

مکرم ومحترم مولانا مفتی عتیق الرحمان صاحب دام مجدکم

"السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

عنایت نامہ سے خیریت معلوم ہو کر اطمینان ہوا۔ شاید آپ کو معلوم ہوا ہو۔ میں رمضان
میں عمرہ کے بعد کراچی واپس آیا۔ دوبارہ دل کا دورہ سخت پڑا۔ بقا ہر زندگی سے مایوسی
تھی مگر قدرت کا کرشمہ ہے۔ زندہ ہوں اور اگرچہ خود نہیں لکھ سکتا دوسروں سے خط
لکھوا رہا ہوں۔ الحمد للہ علی کل حال۔

ضعف بے حد ہے۔ نماز کھڑے ہو کر پڑھنا بھی مشکل ہے۔ میرے لیے حسن
خاتمہ کی دعا فرماویں۔ آپ کے ادھر تشریف لانے کے ارادے سے مسرت ہے۔ مگر
معلوم نہیں میں اس وقت کس حال میں ہوں گا۔ ویزا کے سلسلہ میں حکیم محمد سعید صاحب
نے کچھ کوشش کی ہے۔ امید ہے کہ انشاءاللہ تعالے اب رکاوٹ دور ہے گی۔ والسلام"

بندہ محمد شفیع

مفتی صاحب آج دنیا میں نہیں ہیں۔ لیکن ان کی خدمات ہمیشہ یاد رہیں گی۔ وہ پاکستان میں
علماءِ دیوبند کی آبرو تھے۔ حکومت کے معاملات میں دخیل ہونے کے باوجود انھوں نے اپنی عظمت اور
وقار کو قائم رکھا۔ مفتی صاحب کی نیک نیتی کا ایک کھلا ہوا ثمرہ یہ ہے کہ ان کی اولاد نے ان کے تمام علمی اور
اصلاحی کاموں کو قابلیت اور سلیقہ سے سنبھال لیا ہے۔ ان کی تمام ہی اولاد ماشاءاللہ ذی علم ہے اور صحیح
راستہ پر قائم ہیں۔

عزیزم مولوی محمد تقی عثمانی کی قلم کی روانی کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ یہ عرصۂ دراز سے مفتی صاحب
کی نگرانی میں اہم علمی کام کر رہے تھے۔ ۱۹۷۰ء میں جب میں پاکستان گیا تھا تو مفتی صاحب نے بڑے اہتمام
سے دارالعلوم میں دعوت دی تھی جس میں اور بھی بہت سے احباب شریک تھے۔ اس وقت متعدد

کتابوں کے علاوہ جو مفتی صاحب نے بطور تحفہ عنایت فرمائی تھیں، ایک کتاب " بائبل سے قرآن تک "
دی تھی۔ یہ کتاب تین ضخیم جلدوں میں ہے اور مولوی محمد تقی عثمانی کی علمی اور تحقیقی کاوش پر شاہد عدل ہے۔
ہمارے خاندان میں نوجوانوں میں دو لکھنے والے عجیب و غریب ہوئے ہیں۔ ایک میاں عامر عثمانی مرحوم
دوسرے مولوی محمد تقی عثمانی۔ ان دونوں کے قلم کی جولانیاں قابل دید ہیں۔ مولوی محمد تقی میں یہ خصوصیت
بھی آگئی کہ وہ مفتی صاحب جیسے فاضل وقت اور مقدس بزرگ کی صحبت سے فیضیاب ہوتے ہیں
مولوی محمد رفیع صاحب دارالعلوم میں مفتی اور استاد حدیث ہیں۔ وہ بھی متعدد کتب کے مصنف اور بالغ نظر
عالم ہیں اور مولوی محمد ذکی مرحوم کے بڑے لڑکے یعنی مفتی صاحب کے پوتے مولوی محمود اشرف جامعہ اشرفیہ
لاہور میں استاذ ہیں۔ اس مختصر مضمون کا مقصد صرف یہ ہے کہ اس اچھے کام میں میری بھی شرکت ہوجائے۔
مفتی صاحب اور ان کی خصوصیات و کمالات میں بڑے بڑے مضمون لکھے گئے ہیں اور لکھے جائیں گے
لیکن مجھ جیسے بے فرصت اور کوتاہ قلم کے لیے اتنی ہی شرکت کافی ہے۔

○

اسلام میں تمام عبادات نماز، روزہ، ذکر اللہ، تلاوت قرآن وغیرہ سب کیلئے کچھ آداب و شرائط
اور حدود و قیود ہیں جن کی رعایت کے ساتھ یہ عبادات ادا کی جائیں تو بہت بڑا ثواب اور فلاح
دنیا و آخرت ہے اور ان حدود و قیود سے ہٹ کر کوئی دوسری صورت اختیار کی جائے تو ثواب
کے بجائے عذاب اور گناہ ہے۔ (حضرت مفتی اعظم: سنت و بدعت ص۱۹)

دنیا کے مسلمات اور علوم متعارفہ میں سے ہے کہ کوئی چیز خواہ کتنی ہی محبوب اور بہتر ہو،
جب حد سے تجاوز کرتی ہے تو مضر اور آفت ہوجاتی ہے پانی اور ہوا انسان کے لیے
مدار حیات ہیں لیکن حد اعتدال سے زائد ہوجاتی ہیں تو یہی چیزیں مہلک ہوجاتی ہیں۔
(حضرت مفتی اعظم: اسلام اور نسبی امتیازات، جواہر الفقہ ص۴۳)

○

حضرت ماسٹر محمد شریف صاحب مدظلہم
خلیفہ مجاز حکیم الامت حضرت تھانوی۔ ملتان

حضرت مفتی صاحبؒ کے چند واقعات اور خطوط

عزیزم محمد تقی سلمکم اللہ تعالیٰ

اسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،

نوازش نامہ ملا۔ اس نالائق میں اتنی استعداد کہاں کہ مفتی اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ کی کچھ شان بیان کرسکے۔ صرف چند واقعات جو مجھے خود پیش آئے لکھتا ہوں۔ اس سے حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی شان تو کیا بیان ہوگی۔ البتہ آپکے ارشاد کی تعمیل ہو جائے گی اور میرے لیے یہی بہت بڑی سعادت ہے۔ کوئی بات نامناسب ہو تو اسے حذف فرمادیں۔ حضرت مفتی صاحبؒ کا تذکرہ مسلمان کے لیے آسانی اور سکونِ قلب کا باعث ہے۔

۱۔ ایک دن عصر کی نماز کے بعد یہ ناکارہ اور مفتی محمد شفیع صاحبؒ خانقاہ امدادیہ کے دروازے سے اکٹھے نیچے اترے۔ میں نے عرض کیا مفتی صاحب میں دیر سے قضا نمازیں پڑھ رہا ہوں۔ اور اپنے اندازے سے سب ادا کر چکا ہوں۔ لیکن اب احتیاطاً پڑھتے جارہا ہوں کہ خدا معلوم قبول بھی ہوئیں یا نہیں یا شاید کچھ ذمہ باقی ہوں۔ حضرت مفتی صاحبؒ نے فرمایا۔

• فضول حرکت ہے۔ اس طرح تو ساری عمر اسی قصہ میں رہو گے۔ جب اپنی طرف سے پوری پڑھ چکے ہو تو اب اللہ تعالیٰ کے کرم پر بھروسہ کرو۔

حضرت کے اس ارشاد سے فی الفور دل ہلکا ہوگیا اور اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کی دولت مل گئی۔ ورنہ پتہ نہیں کب تک اس قصہ میں سرگرداں رہتا۔

۲۔ میرا خط بنام حضرت مفتی صاحبؒ بمقام دیوبند۔

سوال :۔ میں سکول میں ملازم ہوں۔ افسران کا حکم یہ ہے کہ رخصت پر جانے سے کم از کم ایک ہفتہ پہلے

عرضی دی جائے صرف بیماری کی صورت میں فوراً رخصت پر جا سکتے ہیں ۔ بعض اوقات دفعۃً کوئی ضرورت پیش آجاتی ہے ۔ اگر بیماری کا بہانہ نہ بنایا جاوے تو رخصت پر جانے کی اجازت نہیں ملتی ۔ تو کیا ایسی مجبوری کے وقت بیماری کا بہانہ بنا کر رخصت حاصل کرنا جائز ہے یا نہیں ۔

جواب حضرت مفتی صاحبؒ نمبر ۵ الجواب

اسی طرح بیماری کے بہانہ سے رخصت اتفاقیہ حاصل کرنا جائز نہیں کہ کذب اور خداع ہے اور اگر کہیں شدید نقصان وغیرہ کا اندیشہ قوی ہو اور ایسا کر لیا تو استغفار کر لیا جاوے ۔ اور بہتر صورت یہ ہے کہ ایسے وقت توریہ کر لیا جاوے یعنی ایسے الفاظ استعمال کرے جو صریح کذب نہ ہوں واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم ۔

کتبہ احقر محمد شفیع غفرلہ

خادم دارالافتاء دارالعلوم دیوبند

۵ ذوالقعدہ ۵۲ ھ

۳ ۔ حضرت مفتی صاحبؒ کی عجیب شفقت و دلسوزی ۔

میں لاہور میں اپنے داماد ڈاکٹر احسان کے مکان پر سخت بیمار تھا ۔ عزیزم مولانا محمد تقی صاحب میری عیادت کے لیے لاہور تشریف لے گئے ۔ واپس کراچی پہنچ کر حضرت مفتی صاحب سے میری بیماری کا تذکرہ کیا ۔ حضرت مفتی صاحب نے بیماری اور نگاہ کی کمزوری کے باوجود خود دستِ مبارک سے مجھے خط لکھا ۔

نقل خط حضرت مفتی صاحبؒ بنام احقر

برادرم محترم ماسٹر محمد شریف صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ ۔ محمد تقی سلمہٗ سے آپ کی شدید علالت کی خبر سن کر دل بے چین تھا ۔ مگر اب بے چینی کے اظہار کے لیے قلم اور نگاہ بھی نہیں رہی ۔ بس دعا ہی پر اکتفا کرتا ہوں ۔ اب آپ کا خط بتوسط اقبال صاحب قریشی مختلف مراحل سے گذرتا ہوا ملا ۔ اسوقت مختصر جواب لکھنے کی ہمت کر رہا ہوں ۔ نگاہ نہیں صرف انکل سے حروف لکھتا ہوں ۔ آپ کی فی الجملہ شفایابی سے بڑی مسرت ہوئی ۔ اللہ تعالیٰ شفاء کامل عاجل مستمر عطا فرماوے اور دین کی خدمت مقبولہ آپ کے ہاتھوں پوری ہوں ۔ یہ ناکارہ عمر کے آخری ایام بیماری میں گذار رہا ہے ۔ حسنِ خاتمہ کی دعا فرمادیا کریں ، تو بڑا کرم ہوگا ۔ والسلام

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

۲۶/۲/۹۶ھ جمعہ

۴ ۔ مسلمانوں میں تفرق سے حضرت مفتی صاحبؒ کا دل بہت دکھتا تھا ۔

حضرت مفتی صاحبؒ کا یہ بھی واقعی بڑا کمال تھا کہ صحیح مسلک سے ذرہ بھر نہ ہٹے اور کسی کی دل آزاری تک بھی نہ کی ۔ ایسا کرنا بڑا مشکل کام ہے پل صراط کی طرح نازک معلوم ہوتا ہے ۔ حضرت مفتی صاحبؒ حق بات ایسے پیارے عنوان سے فرماتے تھے کہ مسلک میں اختلاف رکھنے والے کو بھی ناگوار نہ ہوتا تھا ۔ حق پرستی کا یہ عالم تھا کہ اگر کوئی مخالف بھی ایسی بات کہتا کہ شرعاً معمولی بھی گنجائش ہوتی تو قبول فرمالیتے ۔ ہمیشہ فرمایا کرتے تھے کہ اکابر دیوبند میں مختلف شہروں کے نام سے جو تفرق پیدا ہوگیا ہے دینی مقاصد کی بہتری کا تقاضا یہ ہے کہ اسے حتی الامکان مٹایا جائے ۔ مذاق سلیم کو مثبت انداز میں پھیلانے کی کوشش کرنی چاہیئے ۔ کسی مسلک کا نام لیے بغیر بات یوں کہنی چاہیئے کہ ہمارے اکابر کا طرز یہ تھا ۔ ان کا مزاج و مذاق یہ تھا ۔ اور اسی کو ہمیں اختیار کرنا چاہیئے ۔ فرمایا کرتے تحزب سے پرہیز کرتے ہوئے دوسرے مزاج و مذاق کے حضرات میں گھلا ملا جائے اور مناسب مواقع پر انہیں اکابر کے صحیح مذاق کی دعوت دی جائے صرف اس حیثیت سے کہ وہ دین کی ایسی تعبیر ہے جسے ہمارے اکابر نے اوفق بالسنۃ سمجھ کر اختیار کیا ہے ۔ اور قدماء واکابر اسی مزاج کے حامل تھے ۔ اس طرح امید ہے کہ ان شاء اللہ تعالیٰ رفتہ رفتہ ناخوشگوار تفرق ختم ہوگا اور مل جل کر خدمت دین کا جذبہ بیدار ہوگا ۔

۵ ۔ حضرت مفتی صاحبؒ کی تواضع ۔

حاجی شیر محمد صاحب اور یہ ناچیز تھانہ بھون گئے ۔ حضرت مفتی صاحب بھی تشریف لائے ہوئے تھے ایک دن حوض پر قریب قریب وضو کر رہے تھے ۔ حضرت مفتی صاحب کو زکام تھا ۔ اور ناک کی فروسی آلائش بدن مبارک پر کہیں لگی ہوئی تھی ۔ حاجی شیر محمد صاحب نے عرض کیا ۔ مفتی صاحب یہ جگہ صاف فرمالیں ۔

حضرت مفتی صاحب نے فوراً فرمایا ۔ " یہ میری حقیقت ہے "

۶ ۔ حضرت مفتی صاحب کے دل میں مدرسہ خیر المدارس کی فکر ۔

حضرت مفتی صاحب کا خط بنام احقر

مکرم و محترم حاجی محمد شریف صاحب سلمہٗ ۔

السلام علیکم ورحمۃ اللہ ۔ جلسہ شوریٰ پر حاضری سے تو قاصر رہا مگر دل ادھر لگا رہا ۔ دعائیں کرتا رہا مگر جلسہ گزرنے کے بعد کسی نے کچھ خبر نہ دی کیا ہوا کیونکر ہوا ۔ بہت دنوں کے بعد عبدالمجید صاحب نے جلسہ شوریٰ کی ضابطہ کی کارروائی بھیجی

اس سے پہلے بھی اُس کا پس منظر معلوم ہوا۔ آج آپ کے عنایت نامہ سے کچھ حالات کا علم ہوا۔ دل سے دعا کرتا ہوں حق تعالیٰ خیر المدارس میں خیر ہی کو غالب فرمائیں اور ابنائے خیر اور احباب خیر کو ہمیشہ خیر کی طرف رہنمائی اور اسی پر ثابت قدم رکھیں۔ والسلام۔

بندہ محمد شفیع - ۲ر رمضان ۹۱ھ

۷ - میرے سوال کے جواب میں حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا بینکوں کے سود کے متعلق فتویٰ۔

الجواب

بینکوں کا سود مطلقاً حرام ہے۔ جو بینک خالص غیر مسلموں یہود نصاریٰ وغیرہ کے ہوں ان سے سود لینے کا مسئلہ ائمہ میں زیر اختلاف ہے۔ بعض حضرات اجازت دیتے ہیں مگر اس کے لیے بھی کچھ شرائط ہیں اس لیے اس سے بچنا ہی بہتر ہے۔ اور اپنے روپیہ کی حفاظت کے لیے بنک میں جمع کرائیں تو اس کی صورت کرنٹ اکاونٹ میں ہو سکتی ہے۔ ان کو لکھوا دیا جائے کہ ہماری رقم پر سود نہ لگایا جائے۔ صاف صورت صرف یہی ہے اور غریب لوگوں کو دینے کے لیے خود کو گناہ میں مبتلا کرنا کوئی عقل کا کام نہیں۔

بندہ محمد شفیع دارالعلوم کراچی نمبر ۱۴

۲۳/۹/۹۲ھ

⊙

جس وقت بدعات و منکرات دنیا میں پھیل جائیں اس وقت کے اہل علم کے لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ ان کو اس وقت اپنے علم کا اظہار کرنا چاہیے اور جو ایسا نہ کرے اس پر سخت وعید فرمائی ہے۔ چنانچہ ہر زمانہ اہر دور کے علماء نے اپنے اپنے زمانہ میں فتنوں کے طوفان میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحیح طریقہ کو روشن کیا اور بدعات و محدثات کی تلبیس کو دور کیا۔

(حضرت مفتی اعظم، "مقدمہ سنت و بدعت" صہ ۲)

⊙

شیخ القرآن حضرت مولانا غلام اللہ خان صاحب مدظلہم
دارالعلوم تعلیم القرآن، راولپنڈی

ترجمان حکیم الامۃ تھانوی رحمۃ اللہ علیہ

ان چند سالوں میں موت کے سخت آہنی ہاتھ نے اسلام کے ایسے اساطین کو گرایا اور اسلام کے ایسے سپوتوں کو ابدی نیند سُلایا ہے۔ کہ ان جگر پاش و جگر سوز اور دلسوز و دلدوز واقعات نے میری کمر کی ہڈی کو خمیدہ کر دیا ہے۔ اور میری مثال کچھ اس طرح کی ہو کے رہ گئی ہے۔ کہ جیسا کہ کسی پنچھی کو سارے کا سارا ڈار تن تنہا چھوڑ کر داغ مفارقت دے گیا۔ اور وہ اس لق و دق صحرا میں خلوت کے ساتھ ہی مصالحت کر کے اپنا دل بہلا رہا ہو۔ لیکن اس کے قلبی اضطراب و اضطرار کے حالات و آثار جوں کے توں قائم ہوں۔ جامع المعقول والمنقول حضرت مولانا رسول خان صاحبؒ کی وفات کا حادثۂ فاجعہ دل و دماغ کے لیے نہایت پریشان کن ثابت ہوا۔ پھر حضرت مفتی اعظم مولانا محمد شفیعؒ کی وفات نے تو ایسے صدمہ سے دوچار کیا۔ کہ بندہ مرغ بسمل کی طرح تڑپ کے رہ گیا۔ ابھی ان کی جدائی کا ملال و اضمحلال باقی تھا۔ کہ علوم شرعیہ کے بحر ذخار حضرت مولانا محمد یوسف بنوریؒ اپنے مالک حقیقی سے جا ملے۔ اور ہمیں ہجوم غم و الم میں چھوڑ کر جنت کی ابدی و دلفریب بہاروں اور نظاروں میں کھو گئے

سہ
فقیرانہ آئے صدا کر چلے
میاں خوش رہو ہم دعا کر چلے
جو تجھ بن نہ جینے کو کہتے تھے ہم
وہی آج وعدہ وفا کر چلے

حضرت مفتی اعظمؒ گو ہماری نظروں سے اوجھل اور ہمیں تا زیست داغ مفارقت کا صدمہ جانکاہ پہنچا کر

اپنے مالکِ حقیقی کی آغوشِ رحمت میں جا پہنچے ہیں۔ لیکن جسمِ عنصری سے روح کے انفکاک کے بعد جس حقیقی منزلِ مقصود کو انہوں نے پالیا ہے۔ اس پر دنیا کی کئی زندگیاں قربان کی جاسکتی ہیں کیونکہ ایک حقیقی مخلص مومن کی منزلِ مراد وصالِ الٰہی اور دیدارِ الٰہی ہے۔ اور ہمیں اللہ تعالیٰ کی بے پایاں اور ناپیداکنار رحمتوں سے کامل اُمید ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو فردوس بریں کی ابدالآباد اور پُربہار نعمتوں سے مالامال فرمادیا ہوگا۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ان اللہ لایضیع اجر المحسنین • (اللہ تعالیٰ نیکوکاروں کی محنت کو ضائع نہیں فرماتے) اللہ تعالیٰ جہاں اپنے مقبول بندوں کی محنت کو رائیگاں نہیں فرماتے۔ وہاں اللہ تعالیٰ کا یہ بھی ارشاد ہے •الا ان اولیاء اللہ لا خوف علیھم ولا ھم یحزنون۔ الذین اٰمنوا وکانوا یتقون، خبردار: بتحقیق اللہ کے دوستوں کو کوئی خوف وحزن نہیں۔ جنہوں نے ایمان لایا اور تقویٰ اختیار کیا۔ پھر ایسے مومنین، متقین اور محسنین کو کن عظیم المرتبت ہستیوں کی معیت ورفاقت نصیب ہوگی۔ قرآن مجید نے ہمیں اس کا بھی صاف پتہ دے دیا۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے۔

• من یطع اللہ والرسول فاولئك مع الذین انعم اللہ علیھم من النبیین والصدیقین والشھداء والصالحین وحسن اولئك رفیقا؛

جن لوگوں نے اللہ جل شانہٗ اور رسول ؐ کی اطاعت کی۔ ان کو منعم علیہم ہستیوں، انبیاء علیہم السلام، صدیقین، شہداء اور صالحین کی معیت نصیب ہوگی۔ اور وہ بہترین رفاقت میں ہوں گے۔

جس عظیم شخصیت نے اپنی ساری زندگی دینِ اسلام کے لیے وقف کی ہو۔ توحید وسنت کو اپنی زندگی کا اوڑھنا بچھونا بنایا ہو۔ اسلام کی تحقیق وریسرچ میں اکنافِ عالم کے قلوب واذہان پر سکہ بٹھایا ہو۔ اپنی اجتہادی واستنباطی کاوشوں سے فقاہت وتفقاہت کا ایک روشن باب سجایا ہو۔ زہد وتقویٰ سے اپنا ایک انفرادی رنگ ڈھنگ دکھایا ہو۔ شریعت کے ایک ایک نقش کو پوری آب وتاب سے چمکایا ہو۔ اور الحاد وزندقہ کے متوالوں کے ہر نقش کو دلائل وبراہین کی ریگ مار سے حرفِ غلط کی طرح مٹایا ہو۔ قرآن وحدیث کی خدمت کو اپنی زندگی کا مشن بنایا ہو۔ ایک مصنف ومؤلف کی حیثیت سے اسلام کے ہر گوشے کی ترجمانی کی ہو۔ کیا ایسی شخصیت کے بارے میں مومن ومتقی نہ ہونے کا شک کیا جاسکتا ہے؟ ہرگز نہیں۔ جب حقیقت یہ ہے تو ہمیں خالقِ کائنات کی رحمتِ کاملہ سے بھی کامل اُمید ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ حضرت مرحوم کے ساتھ وہی معاملہ اور برتاؤ فرمائیں گے جس کا اس ذاتِ اقدس نے متقین ومنین کے ساتھ وعدہ فرمایا ہے۔

ے لوگ کہتے ہیں کہ منظر مرگیا ۔ اور منظر در حقیقت گھر گیا ۔

آج کل جہلاء و سفہاء نے ولایت کا معیار صرف جبہ و دستار اور ریاء تک ہی محدود و محصور کر لیا ہے ۔ اور عوام الناس کی اس مفلوج ذہنی اور جہالت پژوہی کا نتیجہ ہے۔ کہ دین کے ایسے جعلی و نرگس بیوپاریوں کی کمی نہیں رہی۔ جو محبت و عقیدت کے پردے میں شرک و بدعت کا ارتکاب کرتے ہیں۔ تقدس و تورع کی بجائے بدعملی و بدکرداری کا روپ دھارتے ہیں۔ تجرد و رہبانیت کا لبادہ اوڑھ کر مکر و فریب اور دجل و تلبیس کا حربہ استعمال کر کے کئی عصمتوں کے آبگینے توڑ کر ان کی عزت و عفت کو پیوند خاک کرتے ہیں۔ لیکن ولایت کے جس معیار کو قرآن و حدیث نے بتایا۔ بزرگانِ دین اور سلفِ صالحین نے اپنایا۔ اس سے سراسر پہلوتہی اور صرف نظر کی جاتی ہے۔ قرآن مجید نے ایمان باللہ اور تقویٰ کو ولایت کا معیار بتایا ہے۔ اور جاہلوں نے جادۂ شریعت سے ہٹ کر احکام الٰہی کی مٹی پلید کرنے کو ولایت کا نام دیا۔ حالانکہ عقائد کی کتابوں میں اس بات کی تصریح موجود ہے کہ

" لو رأیت شخصاً یطیر فی الهواء و یمشی علی الماء و یاکل النار و یترك سنة من سنن رسول الله صلی الله علیه وسلم فهو لیس بولی بل هو ساحر کذاب؟ " ۔

" اگر تو ایک ایسے شخص کو دیکھے۔ کہ جو ہوا میں اڑتا ہے۔ پانی میں چلتا ہے اور آگ کھاتا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ حضرت رسول اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی کسی چھوٹی سی چھوٹی سنت کو حقارت کی نظر سے چھوڑ دیتا ہے۔ وہ ولی نہیں بلکہ جادوگر اور پرلے درجے کا جھوٹا ہے ۔

حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی نے اپنے مواعظ میں سرتاج الاولیاء حضرت جنید بغدادی ؒ کا ایک واقعہ نقل فرمایا ہے۔ جس کا حاصل و لب لباب یہ ہے۔ کہ ایک شخص حضرت جنید بغدادی ؒ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کرنے لگا۔ کہ مسلمانوں میں ایک ایسا فرقہ جنم لے رہا ہے جن کا نعرہ یہ ہے ۔ " نحن وصلنا فلا حاجة لنا الی الصلوٰة والصیام "

" ہم پہنچے ہوئے ہیں۔ لہذا ہمیں نماز، روزہ کی ضرورت نہیں "

حضرت جنید ؒ کا چہرۂ انور مارے غصہ کے انار کی طرح سرخ ہو گیا۔ اور سراپا جلال بن کر فرمایا

" صدقوا فی الوصول لکن الی سقر "

" یہ بے دین لوگ وصول کی بات تو ٹھیک کرتے ہیں۔ لیکن نہ یہ خدا کو پہنچے ہیں اور نہ جنت میں، بلکہ جہنم میں پہنچ گئے ہیں؟ اور فرمایا ۔

"واللہ لو عشت الف سنة ۔ ما ترکت أورادی"

"خدا کی قسم اگر میں ہزار سال کی زندگی بھی پاؤں ۔ تو نماز روزہ چھوڑنا تو درکنار اپنے اوراد و وظائف کو بھی ترک نہ کروں گا۔

سبحان اللہ یہ ہے اولیاء کرام کی شان ۔ کہ جادۂ شریعت سے ایک سیکنڈ کے لیے ہٹنا اپنی موت سمجھتے ہیں حضرت شیخ سعدیؒ نے اسی حقیقت کو اس شعر میں سمویا ہے ۔

خلاف پیغمبر کسے رہ گزید
کہ ہرگز بمنزل نہ خواہد رسید

عربی کا یہ جملہ زبان زد عام ہے "موت العالِم موت العالَم" ایک عالم باعمل کی موت پورے عالم کی موت ہے ۔ لیکن اس کا احساس صرف انہیں حضرات کو ہو سکتا ہے ۔ جو شریعت و طریقت کے اسرار و رموز سے پوری طرح واقف ہیں ، لیکن اس بارے میں ان جاہلوں کا احساس محض مُرلی بجانے کے مترادف ہے ۔ جو شریعت و طریقت میں دن رات تضاد و منافات ثابت کرنے میں مصروف عمل ہیں ۔ حقیقت یہ ہے ۔ کہ حضرت مفتئ اعظم نے اپنی نوکِ قلم سے لطیف تصنیفات و تالیفات میں ان ہرزہ سرائیوں اور ژاژ خائیوں کی دھجیاں بکھیری ہیں ۔ اور اپنے مخصوص زورِ استدلال سے اس بات کو روز روشن کی طرح واضح کر کے دکھایا ہے کہ شریعت و طریقت میں کوئی منافات نہیں ۔ بلکہ شریعت و طریقت آپس میں لازم و ملزوم ہیں یا دوسرے الفاظ میں ان دونوں حقیقتوں کا چولی دامن کا ساتھ ہے ۔ اگر شریعت مومن کی طرز زندگی ہے ۔ تو معرفت و طریقت مومن کے لیے مقصودِ زندگی ہے ۔ اگر شریعت مقدمہ ہے تو طریقت اس کا تتمہ ہے ۔ اگر شریعت مومن کے مقصود فکر کی ابتدا ہے ۔ تو طریقت اس مقصود و مطلوب کی انتہا ہے ۔ اگر شریعت منبع ہے ۔ تو طریقت اسکا چشمۂ صافی ہے ۔

بمصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
گر باو نرسیدی تمام بولہبی است

حضرت مفتئ اعظمؒ کی وفات کا المیہ ان اہل علم حضرات کے لیے احساس زیاں کی ایک اور راہ دکھا گیا ہے ۔ جو سرورِ کائنات حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد سے واقف ہیں کہ خدائے بزرگ و برتر علم کو دنیا سے اس طرح نہ اٹھائیں گے ۔ کہ صحف و کتب سے اس علم کو محو کر دیا جائے گا ۔ بلکہ دنیا سے علم کا اٹھنا بایں صورت ہوگا ۔ کہ یکے بعد دیگرے علوم شریعت کے وارثین علماء کرام اس دنیا سے رحلت فرماتے

چلے جائیں گے اور ان کے بعد ان کے ایسے جانشین آئیں گے۔ جو ضلوا فاضلوا۔ خود بھی گمراہ ہوں گے اور دوسروں کو بھی گمراہ کریں گے۔ اگر حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان سچ ہے۔ اور یقیناً سچ ہے۔ تو شرح صدر سے یہ بات کہی جا سکتی ہے۔ کہ حضرت مفتیؒ مرحوم کی وفات سے علم و عرفان کا ایک پورا باب اٹھ گیا ہے۔ اور ملت اسلامیہ کے لیے یہ کسی عظیم ترین المیہ و حادثہ سے کم نہیں۔ مجھے تو جب بھی اس کا تصور یا خیال بھی آیا ہے تو دل ڈوبنے اور بیٹھنے لگتا ہے۔

بیٹھے بیٹھے امڈنے لگتا ہے
دل کو کیا ہو گیا خدا جانے

اس احساس کی تلخی اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ جب ایک اہل علم حضرت حسن بصریؒ کی اس روایت کی طرف نظر اٹھاتا ہے۔ جو سنن دارمی میں منقول ہے اور الفاظ یہ ہیں۔

"عن الحسن قال كانوا يقولون موت العالم ثلمة في الاسلام لا يسدها شئ ما اختلف الليل والنهار۔"

حضرت حسن بصریؒ فرماتے ہیں کہ ہمارے اکابرین فرمایا کرتے تھے۔ کہ عالم کی موت اسلام میں ایک ایسی دراڑ ہے۔ جس کو قیامت تک کوئی چیز بند نہیں کر سکتی۔

فما كان قيس هلكه هلك واحد
ولكنه بنيان قوم تهدما

حضرت مفتی صاحبؒ مرحوم کا ظاہری و جسمانی ڈھانچہ ایک نحیف و نزار انسان کا سا تھا۔ پھر طبیعت میں اس قدر سادگی، فروتنی، عاجزی اور انکساری تھی۔ کہ کوئی شخص پہلی نظر میں ان کو دیکھنے سے یہ گمان بھی نہیں کر سکتا تھا کہ یہ وہ عظیم شخصیت ہے۔ کہ جس کو پاکستان میں مفتی اعظمؒ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اور یہی اہل اللہ کا شیوہ و طریقہ ہے۔ ان کے سامنے دنیا کی شان و شوکت، ظاہری ٹھاٹھ باٹھ، دنیوی ساز و سامان کی آرائش و زیبائش ترفہ و تنعم کی بود و باش اور کبر و نخوت کی نشست و برخاست پرکاہ کی حیثیت بھی نہیں رکھتی۔ وہ ہمیشہ والآخرة خیر و ابقیٰ کے فارمولے کو اپنی عملی زندگی میں دہراتے رہتے تھے اور دنیا کی بے ثباتی اور ناپائیداری پر ہمیشہ نظر رکھتے ہیں۔

اسی کشمکش میں گزریں میری زندگی کی راتیں
کبھی سوز و ساز رومیؒ کبھی پیچ و تاب رازیؒ

حضرت مفتی اعظمؒ کی سراپا علمی زندگی کا ایک عظیم شاہکار ان کی تفسیر "معارف القرآن" ہے جو سادہ، سلیس مگر عام فہم اور دلنشیں پیرایہ میں لکھی گئی ہے۔ جس میں حضرت مفتیؒ مرحوم نے قرآن مجید کے معانی ومطالب اور مفاہیم کو نہایت اچھوتے اور سمجھے ہوئے انداز میں پیش کیا ہے۔ اس تفسیر میں جہاں خواص بآسانی استفادہ کرسکتے ہیں۔ وہاں عوام کے لیے بھی یہ علمی شاہکار رشد و ہدایت کا ایک روشن مینار ہے۔ اس تفسیر کا ایک انفرادی پہلو یہ بھی ہے کہ اس میں فقہی مسائل اور احکام کا بھی خاطر خواہ ذخیرہ آگیا ہے۔ جس سے مسلک حنفیہ کی بڑھ چڑھ کر ترجمانی کی گئی ہے۔ مسلک حنفی کے دلدادہ حضرات کے لیے یہ چیز نعمت عظمیٰ سے کم نہیں۔

ادھر جہاں بعض غیر مقلدین نے محض ہٹ دھرمی اور تعصب کی آگ میں جل کر اسلامی فقہ کے عظیم ماہرین ائمہ کرام کو مطعون کرکے ان نفوسِ قدسیہ کی تحقیر و تذلیل کی ناکام کوشش کی ہے۔ وہاں تجدید سبائیت کے اجارہ داروں نے ایک نئی تکنیک سے حضرات صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کی دیانت، وامانت، شرافت ونجابت اور عدالت وثقاہت کو مجروح کرکے اپنے خبث باطنی کا اظہار کیا ہے اور مسلمانوں کی ایک پوری جماعت کو رفض وشیعیت کے نئے روپ میں گمراہ کرنے کی سعی نامراد کی ہے۔ یہ حالات دیکھ کر حضرت مفتی اعظمؒ کی ایمانی رگِ غیرت وحمیت کو بھی جنبش ہوئی اور عدالت صحابہؓ کے موضوع پر ایک مستقل تصنیف فرما کر اعداء صحابہؓ کے تمام ناپاک ونجس عزائم کو خاک میں ملا دیا۔ پھر ان کے صحیح جانشین حضرت تقی عثمانی سلمہ اللہ تعالیٰ نے تو اپنے "البلاغ" کے قسط وار مضامین سے حضرات صحابہؓ کی وکالت کا حق ادا کرکے سبائیت کے ٹھیکیداروں کی لٹیا ہی ڈبو کے رکھ دی اور جن اعداء صحابہؓ کو اپنے تفکر وتدبر پر ناز تھا وہ نائیں نائیں فش ہو کے رہ گئے۔ ؎

گر خدا خواہد کہ پردہ کس درد

میلش اندر طعنۂ پاکاں زند

برٹش گورنمنٹ کے خود کاشتہ پودے نے قادیان میں اپنی جعلی نبوت کا ڈھونگ وسوانگ رچا کر حضرت خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کے ختم نبوت کے تاج کو سبوتاژ کرنے کی کوشش کی۔ حضرت مفتی اعظمؒ نے "ختم نبوت" کے موضوع پر ایک مفصل ومبسوط کتاب لکھ کر مسلمانوں کے ہاتھ میں سینکڑوں دلائل وبراہین سے بھرپور ایک ایسی جامع ومانع دستاویز تھما دی کہ جس سے رہنمائی حاصل کرکے ہر مسلمان پاکستانی قصر مرزائیت کے پرخچے اڑا سکتا ہے اور آقائے نامدار صلی اللہ علیہ وسلم کی غلامی اور ان کی ختم نبوت کی صحیح ترجمانی کا حق ادا کر سکتا ہے۔ ؎

نماز اچھی، روزہ اچھا، حج اچھا، زکوٰۃ اچھی
مگر میں باوجود اس کے مسلماں ہو نہیں سکتا
نہ جب تک کٹ مروں میں خواجۂ یثرب کی عزت پر
خدا شاہد ہے کامل میرا ایماں ہو نہیں سکتا

میرے نزدیک حضرت مفتی اعظمؒ خاموش سیاست پر یقین رکھتے تھے۔ بھارت سے برٹش گورنمنٹ کے انخلاء کے بعد حضرت مرحوم نے دیانتداری سے مسلم لیگ کی حمایت کو اسلام کی خدمت سمجھا۔ اور پاکستان جیسی عظیم اسلامی اسٹیٹ کے قیام کے لیے انہوں نے شیخ الاسلام حضرت شبیر احمد عثمانیؒ کی قیادت میں عظیم خدمات سرانجام دیں۔ پھر پاکستان پہنچنے کے بعد آپ نے کراچی میں ۷۵ ایکڑ زمین میں دارالعلوم جیسے عظیم دینی ادارے کی داغ بیل ڈالی۔ اور ساری زندگی اس دینی ادارے کی ترقی میں صرف فرما دی۔ اور کتاب و سنت کی تدریسی و تصنیفی لحاظ سے بھرپور خدمت فرماتے ہے۔ لیکن سیاست سے اس خاموشی کے دور میں۔ جب بھی کسی غلط کار لیڈر یا سیاست دان نے اسلام کے خلاف یاوہ گوئی کی۔ مفتی اعظمؒ نے اسی وقت اس کی ہرزہ سرائی اور اسلام دشمنی کی قلعی کھول کر عوام کے سامنے اس کو بے نقاب کر دیا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ کہ خان ایوب خان نے راولپنڈی میں جب اسلامی کانفرنس کا اہتمام و انصرام کیا۔ تو اس کانفرنس میں خان صاحب کے وزیر خاص شہاب الدین نے کچھ ایسے خیالات و افکار کا اظہار کیا۔ جو اسلام کش اور الحاد پرور تھے۔ حضرت مفتی اعظمؒ نے فوراً اٹھ کر اس وزیر بے تدبیر کی ملحدانہ روش کی سختی سے تردید کی۔ دوسرے مشاہیر علمائے کرام نے بھی حضرت مفتی اعظمؒ کی تائید کی اور اس طرح اسلام کے نام پر اسلام کے خلاف ایک خطرناک منصوبہ کی بیخ کنی ہو گئی۔

آئین جواں مرداں حق گوئی و بیباکی
اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

سردار عبدالرب نشتر مرحوم نے اپنے دور اقتدار میں اسلامی قوانین کی تدوین کے لیے حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ اور حضرت مفتی اعظمؒ کو دعوت دی۔ دونوں حضرات راولپنڈی میں تشریف لائے۔ لیکن نشتر صاحب کے پُرزور تقاضا کے باوجود کسی سرکاری بلڈنگ میں رہنا گوارا نہ کیا اور دونوں حضرات نے صاف صاف الفاظ میں کہا کر ہمیں خدا کے گھر کے قریب ویڑہ میں جو راحت نصیب ہوتی ہے۔ وہ سرکاری عمارت میں نہیں ہوتی۔ چنانچہ سارے دن کی مصروفیات کار کے بعد اسلام کی یہ دونوں عظیم ہستیاں مسجد کے قریب گھرے پر تشریف لاتیں

اور میرے پاس ہی رات کو آرام فرماتیں۔ فقیری میں بادشاہی کا نمونہ اس سے بڑھ کر کیا ہوسکتا ہے۔ کہ سردار عبدالرب نشتر بذات خود دونوں کو کار میں بٹھا کر میرے پاس چھوڑ جاتے تھے۔ بندہ ہیچمدان ان دونوں حضرات کی ذرہ نوازی اور شفقت و رأفت کے اس بار احسان سے کبھی عہدہ برآ نہیں ہوسکتا۔ میری دعا ہے۔ کہ اللہ تعالی حضرت مفتی مرحوم کو جنت الفردوس میں جگہ دے اور تقاضائے بشریت جو ان سے زلات ہوئے۔ ان سے اپنی رحمت کاملہ سے درگذر فرمائے۔

یارب وہ ہستیاں اب کس دیس بستیاں ہیں
کہ جن کے دیکھنے کو آنکھیں ترستیاں ہیں

مولانا لطافت الرحمن سواتی

مرثیہ فارسی

مفتیِ اعظم امامِ رشد و عرفان باوقار — جامعِ علم و عمل علامہ دہرِ کبیر
حاملِ نورِ ہدایت صاحبِ علم الیقین — دُرِ یکتا در صدف در زہد و تقوی بے نظیر
از بلادِ ہند در دیوبند زاد و فیض یافت — نزدِ استاذانِ عالی شان در دنیا شہیر
فنِ تفسیر و حدیث و فقہ و فتوائے ہر یہ — در وجودش خلط بودہ مثل آرد با خمیر
از زبانش آنکہ از الفاظ می آمد پدید — بود مروارید، و تحریرات او بدرِ منیر
وانکہ تصنیفات از خورد و کلاں بسیار کرد — بے مثال و بے مثال و شامل علمے خطیر
من چو در دیوبند در درسِ مطول نزد او — بودم و دانستہ بودم شان ایں مردِ فقیر
بعد ازاں چو در کراچی آمد و ماوی گرفت — گشت آں درویش در دنیا و دیں ہر دو امیر
منتِ عظمیٰ بملت بود از ربِ جلیل — آں نحیف الجسم انسان منبعِ خیرِ کثیر
اے خدا سیراب کن قبرش بباران کرم — بود مردِ صالح و پرہیزگار و بس بصیر

نیز آں مردانِ حق آگہ کبارِ دیوبند
باد ہر یک در جوارِ رحمتِ حق جا پذیر

جناب ڈاکٹر تنزیل الرحمٰن صاحب
پی ایچ ڈی، ایڈووکیٹ سپریم کورٹ

آہ فقیہِ ملت

مفتی صاحب قبلہ سے میری پہلی ملاقات غالباً ۱۹۵۰ء میں ہوئی۔ جب کہ میں زکوٰۃ کے سلسلہ میں ایک فتویٰ حاصل کرنے کی غرض سے اُن کی خدمت میں حاضر ہوا تھا۔ اس وقت مفتی صاحب جیکب لائنز میں زِتعمیر شدہ دو کمروں کے ایک مختصر سے کوارٹر میں رہائش پذیر تھے۔ نرم رُو، مسکراتا چہرہ، گندمی رنگ، منحنی جسم، پستہ قد، سادہ لباس اور وضع قطع سے بالکل ایک عام آدمی۔ یہ تھے مفتی محمد شفیعؒ جو بعد میں مفتی اعظم پاکستان کہلائے اور واقعی وہ اس اعزاز و تکریم کے بجا طور پر مستحق بھی تھے۔

۱۹۶۴ء میں جب میں نے فقہ اسلامی کی تدوین جدید کے کام کا آغاز کیا تو اس سلسلہ میں میری درخواست پر محترم مولانا محمد ادریس صاحب میرٹھی (استاذ الحدیث، مدرسہ عربیہ نیو ٹاؤن) جن سے میں اُس وقت فقہ پڑھ رہا تھا مجھے مفتی صاحب موصوف کی خدمت میں لے گئے۔ میں نے تدوین فقہ اسلامی کے منصوبہ کی تفصیلات بتلاتے ہوئے پہلی ہی ملاقات میں مفتی صاحب سے عرض کر دیا کہ ادارہ تحقیقاتِ اسلامی کے ساتھ میرا اعزازی تعلق ہے یہ سن کر انہوں نے ڈاکٹر فضل الرحمٰن، ڈائریکٹر ادارہ تحقیقاتِ اسلامی کے باطل نظریات کا ذکر چھیڑ دیا اور ادارہ تحقیقاتِ اسلامی کے زیر اہتمام تدوینِ فقہ اسلامی کے باب میں اپنے خدشات کا ذکر فرمایا، لیکن میں نے مفتی صاحب کی خدمت میں عرض کیا کہ ڈاکٹر فضل الرحمٰن سے میرا یہ قول و قرار ہو چکا ہے کہ وہ میرے کام میں مداخلت نہیں کریں گے (اور یہ واقعہ بھی ہے کہ ڈاکٹر صاحب موصوف نے سوائے طلاق الثلاث کے موضوع کے میرے تحقیقی کام اور نتائج فکر میں کبھی کسی قسم کی کوئی مداخلت نہیں کی اور طلاق الثلاث کے مسئلہ پر بھی جب میں اپنی رائے بدلنے پر کسی طرح آمادہ و تیار نہیں ہوا۔ تو انہوں نے دیباچہ میں اپنا اختلافی نوٹ لکھا مگر میری تحریر میں سے ایک شوشہ بھی نہیں بدلا گیا) مفتی صاحب قبلہ یہ سنکر خاموش ہو گئے اور میں نے ان کی خدمت میں زیر ترتیب مجموعہ قوانین اسلام، جلد اول کے ابتدائی چند ابواب پیش کئے۔ اور اصلاح کی درخواست کی مفتی صاحب نے

کچھ ردو کد کے ساتھ فائل رکھ لیا۔ لیکن تقریباً دو ماہ بعد مجھے مفتی صاحب کی طرف سے ایک رسمی خط (مع فائل) موصول ہوا۔ مفتی صاحب نے علالت و مصروفیت کے سبب میرے مسودہ پر نظر ثانی کرنے سے معذوری ظاہر کی تھی۔ مجھے مفتی صاحب کا خط پڑھ کر ملال ہوا مگر میں خاموش رہا۔

۱۹۶۵ء میں جب مجموعہ قوانین اسلام کی جلد اول مکمل ہوگئی تو میں فون پر وقت لے کر مفتی صاحب کی خدمت میں دوبارہ حاضر ہوا اور جلد اول ان کی خدمت میں پیش کر کے عرض کیا کہ از راہ کرم اس جلد کو ملاحظہ فرمالیں اور جو کچھ غلط اور نادرست ہو بلا جھجک اور بلا کسی مصلحت کے تصحیح فرمادیں۔ اس وقت دارالعلوم کے بعض دوسرے اساتذہ بھی دفتر میں تشریف فرما تھے۔ شاید کوئی میٹنگ ہونے والی تھی۔ تھوڑی سی بحث گفتگو کے بعد مفتی صاحب نے بالآخر فرمایا کہ میں تمہاری کتاب کے مطالعہ میں اپنے وقت کو ضائع کرنا نہیں چاہتا۔ اگر میں کمپنیوں کے قانون پر کوئی کتاب لکھوں تو ظاہر ہے کہ تم اس کو پڑھ کر اپنا وقت ضائع کرنا پسند نہیں کرو گے۔! میں نے جواباً عرض کیا کہ نہیں، میں آپ کی کتاب کو ضرور پڑھوں گا اور یہ دیکھنے کی کوشش کروں گا کہ آپ نے اسلامی نقطہ نظر سے کمپنیوں کے قانون کے بارے میں کیا لکھا ہے؟ کچھ دیر اسی طرح کی رد و قدح ہوتی رہی۔ بالآخر مفتی صاحب نے صاف صاف فرمایا کہ میں تم کو اس کام کا اہل نہیں سمجھتا۔ یہ کام (اس وقت موجود علماء حضرات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا) ان لوگوں کا ہے جنھوں نے اپنی زندگیاں اس کام میں صرف کر دی ہیں۔ میں نے مؤدبانہ عرض کیا کہ آپ کا یہ دعویٰ بلا دلیل ہے۔ اگر ان حضرات نے اسلامی قانون پر کوئی کام کیا ہو تو سامنے لایا جائے۔ یا یوں کیا جائے کہ میں ایک موضوع منتخب کرتا ہوں، اس پر ان حضرات سے بھی لکھوایا جائے اور میں بھی لکھتا ہوں اور مقابلہ کر لیا جائے کہ کون بہتر لکھتا ہے؟ اس قسم کی گفتگو کا جو نتیجہ ہونا چاہیے تھا، وہ ہوا اور میں مفتی صاحب کے یہاں سے سخت ناامید و دل برداشتہ ہو کر اٹھ آیا۔

اُدھر مولانا محمد یوسف بنوری نے بھی دستِ تعاون کھینچ لیا تھا، غرض کراچی کے ان دو معتبر علماء میں سے کوئی میرے کام میں تعاون پر آمادہ و تیار نہ تھا۔ اور یہ عدم تعاون ڈاکٹر فضل الرحمن ڈائریکٹر ادارہ تحقیقاتِ اسلامی کے بارے میں ان حضرات کے خیالات کے شدید ردِ عمل کا نتیجہ تھا۔

میں نے اس صورت حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے ایک فیصلہ کیا کہ میں مزید مقدمے لینے کم کر دوں گا۔ اور اپنا زیادہ سے زیادہ وقت حدیث و فقہ کے مطالعہ اور اسلامی قانون کی تدوینِ جدید پر صرف کر دوں گا۔ اللہ کو مجھ جیسے نااہل شخص سے کام لینا تھا۔ خوش قسمتی سے حضرت مولانا محمد عتیق صاحب سابق محدث مدرسہ عالیہ

رامپور و شیخ الحدیث مدرسہ عربیہ امدادیہ مراد آباد (جہاں میں نے ابتدائی تعلیم حاصل کی تھی) مراد آباد سے ترک سکونت فرما کر کراچی تشریف لے آئے تھے۔ میں نے اُن سے حدیث و فقہ کی باقاعدہ تحصیل شروع کر دی۔ یہ سلسلہ تقریباً ڈھائی سال تک پابندی کے ساتھ جاری رہا۔ اُدھر میں نے ڈاکٹر فضل الرحمٰن کے سامنے ساری صورت حال پیش کرتے ہوئے کہا کہ ادارہ میں کوئی مستند عالم دین منتخب فرمائیں جن کی مدد سے میں اپنی مشکلات حل کر سکوں، اور میری کتاب کے ایسے اجزاء جن کے بارے میں مجھے کچھ تردد ہو، ان کو اشاعت سے قبل دکھا لیے جائیں۔ ادارہ میں ایسے صرف ایک صاحب تھے جن کی فقہ و حدیث پر اچھی نظر تھی۔ اور وہ تھے مفتی امجد العلی سابق شیخ الحدیث مدرسہ مطلع العلوم رامپور، جو اگرچہ ادارہ میں سب سے چھوٹی یعنی انرنسٹی گیٹر کی اسامی پر مقرر تھے لیکن اپنے علم و تفقہ کی بناء پر ریڈر کی اسامی کے مستحق تھے (یہ صورت حال انگریزوں سے ملے ہوئے ہمارے ملک کے موجودہ تعلیمی نظام اور اس نقطۂ نظر کی غمازی کرتی ہے جو ہمارے علمی و تحقیقی ادارے بھی علم دین اور اس کے حاملین کے ساتھ روا رکھتے ہیں، بہرکیف یہ اللہ کی خاموش مدد تھی کہ اس نے میرے دل میں مفتی امجد العلی صاحب کی عزت و محبت اور مفتی امجد العلی صاحب کے دل میں میرے لیے گنجائش پیدا فرما دی۔ میں اپنی مشکلات اُن کے سامنے بیان کر دیا کرتا اور وہ حتی المقدور میری مدد فرمایا کرتے۔

۱۹۶۷ء میں مجموعۂ قوانین اسلام کی دوسری جلد بھی چھپ کر آ گئی۔ میں نے سُنا کہ مفتی محمد شفیع صاحبؒ نے ایک جگہ دعوت میں (جہاں کچھ اسلامی قانون کی باتیں بھی ہوئی تھیں) میرا تذکرہ کیا کہ ڈھائی سال پہلے آئے تھے اور خفا ہو کر چلے گئے۔ جب ایک شریک دعوت نے مجھ سے اس کا تذکرہ کیا تو مجھے اندازہ ہوا کہ مفتی صاحب کے دل میں بھی اس واقعہ کی کسک موجود ہے۔ خیال آیا کہ مجھے اُن سے پھر ملنا چاہیئے لیکن تنہا جانے کی ہمت نہ پڑتی تھی۔ چنانچہ ایک اتوار کو مولانا مفتی ولی حسن صاحب (صدر دارالافتاء مدرسہ عربیہ نیو ٹاؤن) کو اپنے ساتھ لے کر مفتی صاحب قبلہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ مفتی صاحب روایتی تواضع کے ساتھ پیش آئے، کھڑے ہو کر ملے (یہ شاید مفتی ولی حسن صاحب کا اکرام تھا) چند منٹ رسمی خیریت معلوم کرنے کے بعد میں نے سلسلہ کلام کا آغاز کیا اور مفتی صاحب قبلہ سے عرض کیا کہ ڈھائی سال پہلے کے واقعہ کے بعد، میرا نفس آپ کے پاس آنے میں مانع تھا، لیکن چند روز ہوئے کہ فلاں جگہ دعوت میں آپ نے میرا تذکرہ فرمایا۔ اس سے مجھے یہ خیال ہوا کہ آپ کے ذہن میں بھی اس واقعہ کی کسک موجود ہے۔ لہٰذا میں نے سوچا کہ مجھے ایک موقع آپ کو اور دینا چاہیئے۔ ہو سکتا ہے کہ اس وقت آپ نے جو کچھ فرمایا وہ کسی وقتی احساس، غلط فہمی یا بدگمانی کا نتیجہ ہو۔ فرمانے لگے کہ اس روز میں نے اپنی عادت کے خلاف تمہارے ساتھ سخت باتیں کیں۔ میں نے مفتی صاحب سے عرض کیا کہ میں ایک بار پھر مجموعۂ قوانین اسلام کی جلد اوّل و

دوم پیش کرتا ہوں۔ اور درخواست کرتا ہوں کہ آپ ازراہِ کرم ان کا مطالعہ فرمائیں اور اس میں جو خامی یا غلطی ہو اس کی نشاندہی فرمائیں۔ مفتی صاحب قبلہ نے دونوں جلدیں رکھ لیں اور فرمایا کہ بشرطِ فرصت دیکھوں گا اور اس سلسلہ میں کوئی تقاضا یا یاد دہانی نہ ہونی چاہیے۔ میں نے عرض کیا، ٹھیک ہے۔ آپ ان کو چھ ماہ میں دیکھیں، سال بھر میں دیکھیں۔ میں خاموشی کے ساتھ انتظار کروں گا۔

لیکن چار ہی ماہ بعد ایک جمعہ کی صبح کو مفتی صاحب قبلہ نے غریب خانہ پہ فون کیا اور فرمایا کہ پہلے میں نے تمہارے دفتر فون کیا تو معلوم ہوا کہ تم جمعہ کی صبح کو دفتر نہیں آتے، لہٰذا اب گھر پہ فون کیا ہے۔ فرمایا کہ میں نے تمہاری جلد اول ساری پڑھ لی ہے اور دوسری جلد کا بھی بیشتر حصہ پڑھ لیا ہے۔ پڑھ کر جی خوش ہوا جس کام کا خواب میں پچاس سال سے دیکھ رہا ہوں، تمہارے کام میں اس کی تعبیر نظر آئی۔ اللہ تمہیں جزائے خیر عطا فرمائے۔ لیکن کچھ باتیں ایسی ہیں جو میں زبانی کہنا چاہتا ہوں۔ تمہارا گھر ناظم آباد میں کس جگہ ہے۔ میں جمعہ کو پہنچ جاتا ہوں۔ مفتی صاحب کے کلماتِ تحسین سن کر مجھے جو بے پایاں خوشی حاصل ہوئی، اس کو میں الفاظ میں بیان نہیں کر سکتا۔ میں نے مفتی صاحب کا بہت بہت شکریہ ادا کرتے ہوئے عرض کیا کہ میں خود حاضرِ خدمت ہوں گا چنانچہ اگلی جمعی کا دن طے ہو گیا اور میں صبح دس بجے دفتر دارالعلوم پہنچ گیا۔ مفتی صاحب خلافِ معمول مجھے دفتر سے اٹھا کر اندر گھر میں لے گئے اور ایک کمرہ میں علیحدہ بیٹھ کر ہر دو جلد کے بعض مندرجات پر گفتگو فرمائی، چند امور پہ توجہ دلائی اور آئندہ کام کے لیے ہدایات دیں نصیحتیں فرمائیں، دوپہر کا کھانا ساتھ کھلایا اور نمازِ ظہر کے بعد رخصت کیا۔ مفتی صاحب قبلہ کے ساتھ میری یہ طویل ترین صحبت تھی جو تقریباً ساڑھے پانچ گھنٹے جاری رہی۔

پھر میں نے ملاقات کی غرض سے چار چھ مہینے میں ایک آدھ بار ان کی خدمت میں حاضر ہوتا رہا کبھی کبھی عام مجلس کے دوران بھی پہنچ جاتا۔ مجلس کے اختتام پر محبت کے ساتھ میرا نام لے کر بلاتے اور اپنے پاس بٹھلاتے اور کام کے بارے میں پوچھتا کبھی نہ بھولتے۔ اور کبھی مجلس کے انعقاد سے پہلے پہنچ جاتا تو اپنے قریب بٹھاتے۔

۱۹۷۰ء میں حضرت مولانا محمد یوسف بنوریؒ اور مدرسہ عربیہ نیوٹاؤن کے چند علمائے کرام کی معیت میں فریضۂ حج کی ادائیگی کی سعادت نصیب ہوئی۔ مدینہ منورہ میں قیام کے دوران مفتی صاحب قبلہ بہت یاد آئے اور یہ خیال آیا کہ مفتی صاحب قبلہ کی شان میں مجھ سے بڑی گستاخیاں سرزد ہوئی ہیں۔ مجھے ان کی خدمت میں طلبِ معافی کا ایک خط لکھنا چاہیے لیکن مدینہ کے قیام میں میرا جی لکھنے پڑھنے کو بالکل نہ چاہتا تھا، سوائے کلام اللہ پڑھنے کے۔ غرض مفتی صاحب کو خط نہ لکھ سکا۔ لیکن حج سے واپس آکر میں نے چاہا کہ مفتی صاحب کی خدمت میں حاضر ہو کر

معافی مانگوں تو معلوم ہوا کہ مفتی صاحب عمرہ کے لیے تشریف لے گئے ہیں۔ میں ان کی واپسی کے بارے میں برابر دریافت کرتا رہا۔ اور مجھے جونہی مفتی صاحب کی واپسی کا علم ہوا، ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ مفتی صاحب انتہائی خوشدلی کے ساتھ ملے اور فرمایا کہ ہم نے آپ کو یاد کیا، اور بہت اچھی جگہ یاد کیا۔ مدینہ منورہ میں۔ مفتی صاحب کے اس فرمانے سے میرے دل کی جو کیفیت ہوئی وہ بیان نہیں کر سکتا۔ میں نے روتے ہوئے عرض کیا کہ میں نے بھی آپ کو مدینہ منورہ میں یاد کیا تھا۔ اور اب اسی کے نتیجہ میں حاضر ہوا ہوں اور درخواست ہے کہ میں نے آپ کی بہت سی غیبتیں کی ہیں، مجھے للہ معاف کر دیجیے۔ مفتی صاحب فرمانے لگے کہ تم نے میری جو غیبتیں کی ہیں یا جو آئندہ کرو، وہ سب معاف، پھر فرمایا کہ ایک شخص نے ایک خط (شاید حضرت مولانا محمد اصغر حسین دیوبندی یا حضرت مولانا محمد اشرف علی تھانوی رحمہما اللہ تعالیٰ میں سے کسی ایک کا نام لیا، اس وقت مجھے صحیح یاد نہیں کس کا؟) حضرت کو لکھا کہ میں نے آپ کی بہت غیبتیں کی ہیں، معاف کر دیجیے۔ حضرت نے لکھا کہ معاف تو ہم کر دیں گے مگر پہلے یہ بتاؤ کہ کون کون سی غیبتیں کی ہیں، ہو سکتا ہے کہ وہ برائیاں ہم میں موجود ہوں۔ مفتی صاحب نے مجھے مسکراتے ہوئے فرمایا کہ کسی وقت فرصت سے آپ بھی بتائیں گے کہ آپ نے ہماری کون کون سی غیبتیں کی ہیں۔

۱۹۷۰ء کے بعد سے حضرت مفتی صاحب سے تعلقات کا سلسلہ راست نہج میں شروع ہوا اور میری حاضری تقریباً مہینہ میں ایک بار ہونے لگی۔ غالباً ۱۹۷۱ء میں مجموعہ قوانین اسلام کے مسودات جلد چہارم و پنجم لے کر خدمت میں حاضر ہوا، اور مفتی صاحب قبلہ سے اس کام کی مقبولیت کی دعا کی درخواست کی۔ مفتی صاحب نے بہ کمال شفقت میری مرتبہ جلدوں کو لے کر باری باری اپنے سر مبارک پر رکھا اور دعا پڑھی اور پھر گود میں رکھ کر ورق گردانی کرتے رہے اور دعا پڑھتے رہے۔ ایک جگہ مفتی مصر الشیخ محمد عبدہ مرحوم کے نام پر نظر پڑی تو فرمایا کہ ان کی تحریریں ذرا احتیاط سے نقل کیا کرو۔

پھر ایک واقعہ ارشاد فرمایا کہ علامہ علاء الدین حصکفی (متوفی ۱۰۸۸ھ) اپنی کتاب "الدر المختار" کو لے کر روضۂ نبویؐ پر حاضر ہوئے اور ورق گردانی کرتے رہے اور دعا مانگتے رہے۔ میں نے جب معارف القرآن کی پہلی جلد مکمل کی تو مدینہ منورہ میں حاضری ہوئی۔ روضۂ اقدس پر حاضر ہوا۔ معارف القرآن کی جلد اول میرے ساتھ تھی مگر مجھے اسے کھول کر ورق گردانی کرنے کی جرأت نہیں ہوئی، البتہ معارف القرآن کی جلد اول بغل میں تھی اور میں روضۂ اقدس پر اس کی مقبولیت کی دعا مانگتا رہا۔ اور شاید یہ اسی دعا کی قبولیت کا اثر ہے کہ اس وقت برصغیر ہند و پاک میں لکھی جانے والی تمام اُردو تفاسیر میں سب سے زیادہ مقبول تفسیر حضرت مفتی صاحب کی ہے جس کے نئے نئے ایڈیشنوں کی طباعت مطبع میں مسلسل جاری رہتی ہے۔

۱۹۷۲ء کے نصف آخر میں میں نے مفتی صاحب سے عرض کیا کہ میں نے یہ طے کیا تھا کہ میں مجموعۂ قوانین اسلام کی جلد چہارم کا پیش لفظ مولانا محمد یوسف بنوری سے لکھواؤں گا، اور جلد پنجم کا آپ سے۔ الحمد للہ کہ جلد چہارم کا پیش لفظ

مولانا بنوری صاحب نے لکھ دیا۔ اب آپ سے درخواست ہے کہ جلد پنجم کا پیش لفظ آپ تحریر فرما دیں۔ مگر اس سلسلہ میں ایک گذارش ہے وہ یہ کہ میں ایسے پیش لفظ کو پسند نہیں کرتا جس میں لکھا ہو کہ کتاب کے تفصیلی مطالعہ کا موقع نہ مل سکا، جستہ جستہ دیکھا..... میں نے مفتی صاحب قبلہ سے عرض کیا کہ مولانا غلام محمد صاحب کی تصنیف تذکرہ سلیمان (سید سلیمان ندوی) میں میں نے ایک واقعہ پڑھا تھا کہ سید صاحب کی خدمت میں کسی شخص نے اپنی ایک کتاب بھیجی اور تقریظ لکھنے کی درخواست کی۔ سید صاحب نے جواباً لکھا کہ تقریظ بھی ایک قسم کی شہادت ہے اور شہادت بلا علم جائز نہیں، شہادت کے لیے کتاب کا مطالعہ شرط ہے جس کے لیے نہ طاقت ہے اور نہ وقت، لہٰذا کتاب واپس۔ چنانچہ میں نے مفتی صاحب کی خدمت میں عرض کیا کہ میں یہ چاہتا ہوں کہ آپ اس کتاب کے مکمل مطالعہ کے بعد پیش لفظ تحریر فرمائیں۔ مفتی صاحب نے فرمایا کہ تمہاری کتاب کا مسودہ ٹائپ شدہ ہے۔ میری آنکھیں اس کی عادی نہیں ہیں۔ اب اس کی صورت یہ ہے کہ میں تقی میاں (مولانا محمد تقی عثمانی) سے کہوں کہ وہ میرے ساتھ بیٹھیں اور مجھے سنائیں۔ میں نے عرض کیا کہ اگر آپ اجازت دیں تو میں ہفتہ کے دن (اس زمانہ میں ہفتہ کے دن ہائی کورٹ میں کام نہ ہوتا تھا) حاضر ہو جایا کروں اور آپ کے سامنے کتاب خوانی کر لوں۔ فرمایا یہ ٹھیک رہے گا۔ چنانچہ میں ہر ہفتہ حاضر ہوتا۔ مفتی صاحب گرمیوں میں اپنی نشست گاہ میں اور جاڑوں میں گھر کے صحن میں بان کی چارپائی ڈلوا کر بیٹھ جاتے اور میں [illegible] سامنے تذکرۂ زمین اسلام، جلد پنجم کے مسودہ کو انہیں سناتا۔ یہ سلسلہ تقریباً ۶ ماہ تک جاری رہا اور کتاب کا ایک معتد بہ حصہ سننے کے بعد مجھ سے فرمایا کہ اب تھوڑا سا حصہ جو باقی رہ گیا ہے اس کے خاص خاص مضامین سنا دو۔ میں نے حکم کی تعمیل کی۔ مفتی صاحب کی فقہ دانی کا شعور و اندازہ تو پہلے سے تھا لیکن اس مسلسل نشست یا بہ الفاظ دیگر صحبت میں اس امر کا عین الیقین حاصل ہوا کہ برصغیر ہند و پاک میں مفتی صاحب حقیقتاً فقہ کے سب سے بڑے عالم ہیں (ہند و پاکستان کی بات میں نے اس لیے کہی کہ اسی حد تک میرا علم و اندازہ ہے۔ عالم اسلام کا مجھے اندازہ نہیں)۔ لیکن مجھ سے ایک صاحب نے مولانا محمد یوسف بنوری کی وفات کے بعد ان کا یہ قول نقل کیا کہ مولانا بنوری صاحب نے ایک مرتبہ فرمایا تھا کہ فقہ میں مفتی صاحب کا پورے عالم اسلام میں کوئی ہمسر نہیں۔

اس کتاب خوانی کے دوران دو ایک مسائل پر میری تحریر پر مفتی صاحب شدید سخت برہم ہوئے۔ ان کا چہرہ سرخ ہو گیا، آواز میں بھی تیزی آگئی۔ مفتی صاحب نے مجھے ان مسائل میں صحیح شرعی نقطۂ نظر سے آگاہ فرمایا۔ بعد میں جب میں ان مباحث کے بعض پیراگرافوں کو دوبارہ مرتب کر کے لے گیا تو وہ مطمئن ہو گئے اور ایک دفعہ تو بہت خوشی کا اظہار کیا اور فرمایا ماشاء اللہ! تم میں فقہ کا ملکہ پیدا ہو گیا ہے۔ میں نے مفتی صاحب سے عرض کیا کہ پہلے آپ نے فرمایا تھا

کہ میں اس کام کا اہل نہیں ہوں، اور میں اس وقت ناراض ہوا تھا لیکن اب میں کہتا ہوں کہ میں اس کام کا اہل نہیں ہوں۔ لیکن ایک جذبۂ بے اختیار شوق ہے جو مجھ سے کام کرا رہا ہے ورنہ حقیقت یہی ہے کہ میں اس کام کا صحیح معنی میں اہل نہیں ہوں۔ فرمایا، نہیں، تم اس کام کے اہل ہو۔ تمہارا یہ احساس ہی اہلیت کا ثبوت ہے۔

مفتی صاحبؒ نے علالت کے بعد سے شام کی ہفتہ وار مجلس ترک کر کے صرف دوپہر کو ساڑھے گیارہ بجے سے بارہ بجے تک کا وقت ملاقات کے لیے مقرر فرمایا ہوا تھا۔ میں پہلے پہل اسی وقت جاتا مگر اس ملاقات سے تسکین نہ ہوتی۔ مفتی صاحبؒ سے خود یہ بات عرض کرنے کی جرأت نہ ہوتی۔ میں نے ایک خط عزیزم مولوی محمد تقی عثمانی کو لکھا کہ حضرت سے اگر کچھ اور وقت مل جائے تو بڑا ممنون ہوں گا۔ محمد تقی عثمانی صاحب نے مجھے کہا کہ والد صاحب نے فرمایا کہ جمعہ کے علاوہ کسی بھی دن دس بجے تشریف لے آیا کریں البتہ اگر آنے سے پہلے فون کر لیا کریں تو اچھا ہے۔ اس خط میں ایک بات ایسی تھی جو حضرتؒ کی عظمت پر گواہی دیتی تھی۔ اس خط میں ایسا انکسار تھا کہ میں حیران رہ گیا۔ والد صاحب فرماتے ہیں کہ آپ کی تشریف آوری سے خود انہیں مسرت ہوگی، فائدہ حاصل ہوگا۔ اللہ اللہ کیا انداز ہے بڑوں کے طالب میں ہوں، وہ مطلوب ہیں، مگر خود کو طالب بتاتے ہیں۔ ان کا مقام آسمان سے اونچا، وہ ہمالیہ پہاڑ میں راستہ کا کنکر، مگر وہ عزت بخشتے ہیں کہ طالب کو سینہ سے لگا کر احساسِ یگانگت پیدا کرتے ہیں۔

اس کے بعد سے میں نے اپنا یہ معمول بنا لیا کہ ہفتہ کی صبح کو دس بجے مفتی صاحب کی خدمت میں پہنچ جاتا۔ اور بالعموم بارہ بجے تک حاضر رہتا۔ اس دوران میں مفتی صاحبؒ ڈاک بھی سنتے، زبانی جوابات بتلاتے اور مجھ سے بھی ہمکلام رہتے۔ میں نے دیکھا کہ سب سے زیادہ توجہ ان کی اس پر مبذول ہوتی کہ استفتاء کے جوابات بلا تاخیر دیے جائیں۔ اور درحقیقت انہیں فتویٰ نویسی سے عشق تھا۔ جس ذوق و شوق سے وہ فتوے والا خط سنتے اور جوابات کی ہدایت فرماتے اس سے اس کا بخوبی اندازہ ہوتا۔ آخری چند سالوں میں اگرچہ فتویٰ نویسی کا کام مولانا محمد عاشق الٰہی بلند شہری صاحب اور مولانا محمد رفیع عثمانی صاحب کے سپرد کیا ہوا تھا مگر اہم فتوے خود املا کراتے یا اپنے ہاتھ سے لکھتے۔ مجھ سے اپنے تصنیفی، تالیفی کام کے سلسلہ میں ایک مرتبہ ارشاد فرمایا کہ اس ناکارہ نے دو لاکھ صفحے تو ضرور کالے کیے ہوں گے۔

مولانا محمد یوسف بنوریؒ بعض اوقات مجھے وکالت ترک کرنے کی تلقین فرمایا کرتے تھے کہ وکالت چھوڑ کر اپنا پورا وقت تصنیف و تالیف کے کام میں صرف کرو۔ ایک دن میں نے یہ پروگرام بنایا کہ صبح ۸ بجے مولانا بنوریؒ کے ہاں جا کر پھر وہیں سے مفتی صاحبؒ کے پاس چلا جاؤں گا۔ مولانا بنوریؒ صاحب نے اس روز بھی وہ تذکرہ چھیڑا اور میرے اخراجات وغیرہ معلوم کیے۔ میں وہاں سے اٹھ کر جب مفتی صاحب کی خدمت میں پہنچا تو چونکہ بات

بالکل تازہ تھی، اس لئے میں نے مفتی صاحب سے مولانا بنوریؒ کی گفتگو کا تذکرہ کیا۔ مفتی صاحبؒ نے فرمایا کہ مولانا محمد اشرف علی تھانویؒ نے ایک رسالہ "مناصب الحرام" کے بارے میں لکھا ہے۔ مل جائے تو پڑھ لینا۔ ویسے بھائی! وکالت کے پیشے سے نفرت کرنے کی ضرورت نہیں اور نہ اس سے دل برداشتہ ہونے کی بلکہ اگر کوئی غریب آئے جو تمہاری فیس نہ دے سکے تو اس کی مدد کرنا کار ثواب ہے۔ کیونکہ آج کل تو ایسا گورکھ دھندا ہے کہ بغیر وکیل کے کام ہی نہیں چلتا۔ البتہ مقدمہ لیتے وقت سچ اور جھوٹ، حق و ناحق کے درمیان امتیاز کر لیا کرو۔ دو فریقوں میں سے ایک فریق سچا ہو گا۔ دعا کیا کرو کہ سچا فریق تمہارے پاس آئے۔ پھر اس کی مدد کرو، خواہ فیس ہی کیوں نہ لو، مگر نیت کا ثواب ملے گا کہ ایک مظلوم کی مدد کر رہے ہو۔ پھر فرمایا، اگر کوئی لغزش ہو جایا کرے تو اللہ سے استغفار کر لیا کرو، اور نعم البدل کی دعا مانگتے رہو۔ جب اللہ چاہیں گے کوئی اور بہتر ذریعہ معاش پیدا فرما دیں گے لیکن معاش کے متبادل انتظام کے بغیر پیشۂ وکالت ترک کرنے کی ضرورت نہیں کہ تنگی میں مبتلا ہو جاؤ۔ الحمد للہ حضرت کی تقریر سے دل پر جو گھبراہٹ طاری تھی، وہ دور ہو گئی۔ ایک دن فرمایا کہ ضرورت کے بقدر کمایا کرو۔ اگر خرچ پانچ پیسے ہے تو سات کمانے کی فکر مت کرنا۔ اس چھوٹے سے فقرہ میں مسلمانوں کی زندگی کے لیے بیش بہا نصیحت ہے۔ زندگی کی آدھی دوڑ کم ہو جاتی ہے۔

مفتی صاحبؒ کا شمار حکیم الامت حضرت مولانا محمد اشرف علی تھانویؒ کے اجل خلفاء میں ہوتا تھا۔ ان کی صحبت میں بیٹھ کر سب سے بڑا فائدہ یہ ہوتا تھا کہ اللہ یاد آتا تھا، اور دنیا کی محبت میں کمی محسوس ہوتی تھی۔ بزرگوں نے اہل اللہ کی نشانی بھی یہی بتائی ہے۔ میں نے ایک دن مفتی صاحب سے تنہائی میں عرض کیا کہ مجھے اپنے حلقۂ ارادت میں داخل فرما لیجئے۔ ایک دو باتیں پوچھ کر فرمایا، اچھی طرح سوچ لیجئے اگر دل کہے تو اگلے ہفتہ آ جائیے۔ اتفاقِ وقت کہ مفتی صاحب پر دل کا دورہ پڑا اور وہ ہسپتال تشریف لے گئے۔ میں عیادت کے لیے گیا۔ فرمانے لگے کہ معارف القرآن کا کچھ تھوڑا سا حصہ رہ گیا ہے، کاش مکمل ہو جاتا، مگر خیر اللہ کی مرضی۔ مفتی صاحب ٹھیک ہو گئے۔ معارف القرآن مکمل ہو گئی پھر دل کا دورہ پڑا، فرمانے لگے، اب دل میں کوئی حسرت باقی نہیں۔ معارف القرآن بھی مکمل ہو گئی۔ اب جب اللہ کا حکم آئے، تیار بیٹھے ہیں۔

اللہ کے فضل و کرم سے طبیعت پھر ٹھیک ہو گئی اور ہسپتال سے گھر آ گئے۔ کبھی کبھی بیماری کے دوران مجھے انتہائی محبت سے "تنزیل بھائی" کہا کرتے تھے۔ ایک دن موقع دیکھ کر میں نے اپنی سابقہ خواہش کا اظہار کیا، فرمانے لگے تم میں صلاحیت بہت ہے، مگر لوہے کے چنے ہیں۔ محنت بہت ہے، وکالت چھوڑنے کے لیے تیار رہنا ہو گا، یہ دوسری بات ہے

کہیں نہ چھڑاؤں۔ میں نے کہا وکالت چھوڑنے کو تیار ہوں، جب آپ فرمائیں گے چھوڑ دوں گا۔ غرض اچھی طرح جانچ پرکھ کر دیکھ لیا، پھر فرمایا کہ پرسوں آنا، میں پرسوں گیا، کمرہ بند کروا کر چارپائی سے پائنتی کی جانب کھسک کر میرے نزدیک ہوئے اور فرمایا اس راستہ کا پہلا قدم توبہ ہے۔ تمام چھوٹے بڑے گناہوں سے توبہ، پھر تھوڑی دیر تک توبہ کے طریقہ پر روشنی ڈالی۔ دوسرا قدم حقوق العباد کی ادائی۔ جس کا حق تمہیں یاد آتا جائے ادا کرتے جاؤ۔ اپنے چھوٹے بڑے گناہوں کا استغفار کرو اور ان کی معافی اللہ تعالیٰ سے مانگو، پھر مراقبۂ موت کی تلقین فرمائی۔ نماز باجماعت، تلاوت کلام پاک اور سحر خیزی کی ہدایت اور کچھ ذکر کی تاکید کی، اور فرمایا لغو کام اور لغویات سے ہمیشہ بچو اور لغو کام یا بات وہ ہے جس سے نہ دین کو کوئی فائدہ ہو نہ دنیا کا اور محض فضول وقت برباد ہو۔

حضرت مفتی صاحب کی طبیعت میں بڑی تواضع اور سادگی تھی۔ اس طرح رہتے جس طرح ایک عام آدمی رہتا ہے۔ دراصل یہ بھی اُن کے "مومن کامل" ہونے کی نشانی تھی، جس کا پہچاننا ہر کس و ناکس کا کام نہ تھا، خود میں ایک طویل عرصہ تک حضرت کے مقام علمی و روحانی سے بے خبر رہا، اور جب کچھ پہچانا (حالانکہ جیسا پہچاننا چاہیے تھا، وہ نہیں پہچان سکا) تو وہ اپنی زندگی کے آخری مرحلہ میں تھے۔ عوارض میں مبتلا ہونے کے سبب اپنے متوسلین پر توجہ نہ دے سکتے تھے۔

حضرت مفتی صاحب کی زندگی میں سنت نبوی ایسی رچ بس گئی تھی کہ عادت ثانیہ بن گئی تھی، نفس میں مرضیات الٰہیہ سے محبت اور نامرضیات سے نفرت راسخ ہو چکی تھی۔ اعمال حسنہ اور افعال محمودہ بے تکلف صادر ہوتے تھے۔ زندگی کی ہر حالت حرکت و سکون میں وہی بات بالطبع مطلوب و مرغوب تھی جو اللہ اور اس کے رسول کی پسند اور مرضی کے مطابق ہو۔ ان کو حضور دائم کی کیفیت حاصل تھی۔ کوئی وقت ذکر اللہ سے خالی نہ تھا۔ قلب ہر وقت مشغول الی اللہ رہتا تھا، حضرت کو ہمہ وقت باطنی مقام شہود حاصل تھا۔ ظاہری افعال کے دوران بھی باطنی اعمال جاری رہتے۔ اور کسی کو خبر تک نہ ہوتی وہ اپنے واعظ و ارشاد اور تربیت و سلوک میں "موعظۃ الحسنۃ" اور "جادلہم بالتی ھی احسن" کے قائل تھے اور الحمدللہ زندگی بھر اس طریق پر کاربند رہے۔

حضرت مفتی صاحب قبلہ "دین" میں مداہنت کے قائل نہ تھے۔ منافقت، الحمدللہ ان کو چھو کر نہ گئی تھی۔ اپنی رائے میں مستقیم اور ثابت قدم رہتے اور اس کے اظہار میں کبھی کوئی باک نہ ہوتا سبے جھجک ارشاد فرماتے مگر کہنے کا انداز عام طور پر ایسا سادہ پُراثر اور شفقت لیے ہوئے ہوتا کہ سامع کو ناگوار نہ گزرتا، اور چونکہ ذاتی غرض البتہ نہ ہوتی، لہٰذا جب کسی معاملہ کی مخالف صورت سامنے آتی تو انہیں اپنی رائے تبدیل کرنے میں کوئی چیز مانع نہ ہوتی

خود میرے معاملہ میں جب انہیں اس بات کا میری تحریروں کے ذریعہ بھی ثبوت فراہم ہوگیا کہ میں ڈاکٹر فضل الرحمٰن کے گروہ کا آدمی نہیں ہوں اور اسلام میں "تحقیقات" کے نام پر "تحریفات" کا مرتکب نہیں ہوا تو انہوں نے نہ صرف اپنے سابقہ رویّے کی تلافی کی بلکہ بزرگانہ شفقت اور عالمانہ رہ نمائی سے نوازا۔ میرے کانوں میں آج تک حضرت مفتی صاحب کا وہ جملہ گونجتا ہے جو انہوں نے ایک صاحب سے میری جانب اشارہ کرتے ہوئے میرے متعلق فرمایا تھا کہ "پہلے ان سے مخالفت تھی، پھر دوستی ہوگئی اور اب محبت ہے۔" دراصل یہ مفتی صاحب ہی کا کرم و احسان ہے کہ انہوں نے مجھے محبت کے قابل سمجھا، . . . . . . میں پہلے آپ کو علامہ سمجھتا تھا بہت بڑا فقیہہ، مفتی صاحب کے رویّہ کا شاکی، ان کی تحریروں کا نکتہ چیں اور ناقد۔ مگر اللہ تعالیٰ نے، جو مقلب القلوب ہے، جب دل پلٹا تو ایسا کہ مفتی صاحب کے قدموں کی خاک سر پہ ڈالوں تو فخر سمجھوں۔

مفتی صاحبؒ کی خصوصی مجلسوں کے زیرِ اثر دل میں گداز، آنکھوں میں نمی، دنیا طلبی میں کمی، عاقبت کا خیال، کم علمی کا احساس اور بے عملی کا ادراک پیدا ہوا۔ مفتی صاحب کا یہ روحانی تصرف و اعجاز تھا کہ جب میں کورنگی انڈسٹریل ایریا والی سڑک پہ گاڑی موڑتا تو مفتی صاحب کا یہ خیال بندھ جاتا، جیسے کوئی اپنے محبوب کے پاس جا رہا ہو۔ ایک عجیب سرخوشی کی کیفیت ہوتی، زبان بے اختیار لاالٰہ اللہ کا ورد کرنے لگتی، اور جب دارالعلوم پہنچ کر مفتی صاحبؒ کے روئے زیبا پر نظر پڑتی اور وہ چارپائی پہ بیٹھے بیٹھے مسکرا کر اپنے ہاتھ مصافحہ کے لئے بڑھاتے تو میں اکثر اوقات اپنی نمناک آنکھیں اُن کے ہاتھوں پہ رکھ دیتا اور اس وقت دل کا کیا حال ہوتا یہ بیان نہیں ہو سکتا۔

مفتی صاحب بہت بڑے آدمی تھے۔ عالمِ باعمل، فقیہہ بے بدل، صوفی باصفا، زاہد بے ریا اور نہ جانے کیا کیا تھے۔ افسوس یہ ہے کہ میں مفتی صاحبؒ سے کچھ حاصل نہ کر سکا۔ سوائے ان کی یاد کے، کوئی سرمایہ اپنے پاس نہیں اور شاید موجودہ حالات میں یہ سرمایہ بھی بہت بڑا ہے حقیقت یہ ہے کہ مفتی صاحب کے ساتھ گذارے ہوئے لمحات میری علمی و روحانی زندگی کا سب سے قیمتی سرمایہ ہیں۔

⊙

جناب ڈاکٹر محمد حمیداللہ صاحب
پیرس

مولانا مفتی محمد شفیع عثمانی اعلی اللہ مقامہ

میں اسے اپنی بدقسمتی سمجھتا ہوں کہ فاضل گراں مایہ، فخر عصر محمد شفیع عثمانی مرحوم اعلی اللہ مقامہ سے زیادہ استفادے کا موقع نہ پاسکا۔ حیدرآباد دکن میں ولادت اور بے وطنی سے قبل کی تقریباً ساری عمر وہیں گزرنے کے باعث اگر مرحوم سے ملاقات بالکل ہی نہ ہوتی تو بھی باعث حیرت نہ ہوتا لیکن خوش قسمتی سمجھتا ہوں کہ خدا نے اس کا موقع دیا۔ پاریس میں قیام پذیر تھا کہ یکایک آب و دانہ ۱۹۴۹ء میں کشاں کشاں کراچی لے گیا۔ وہاں پورا ایک سال رہنا ہوا۔ مجلسِ دستور ساز میں ایک مشاورتی (دفتی) مجلسِ تعلیماتِ اسلامی قائم کی گئی تو مقامی علماء میں سے حضرت مفتی محمد شفیع منتخب ہوئے اور اس سے بہتر کوئی انتخاب ہو نہیں سکتا تھا۔ ذمہ دارانِ اعلیٰ مقام نے نہ معلوم کس غلط فہمی میں اس ناکارے کو بھی اس میں داخل کیا۔ اس طرح مرحوم سے ملاقات کی صورت ہوگئی۔

اپنی سرکاری مصروفیت سے مجھے یہاں بحث نہیں تعطیلات کو چھوڑ کر حضرت مفتی صاحب سے ہر روز ہی ملاقات ہوتی رہی۔ وقتاً فوقتاً علمی مسائل پر تبادلۂ خیال بھی ناگزیر تھا۔ ان کے تعمقِ علمی اور وسعتِ نظری کو آدمی دور سے تحریروں کو پڑھ کر بھی جان سکتا اور سراہ سکتا تھا، جو چیزیں دُور سے نہیں بلکہ صرف قریبی اور طویل تماس ہی پر نظر آسکتی ہیں ان میں اولاً تواضع کی اسلامی صفت ہے۔ کیوں نہ ہو شاخ بے ثمر سر اٹھائے اکڑتی رہتی ہے تو میوہ دار شاخ کا سر روز افزوں جھکتا ہی جاتا ہے، عالم میں انانیت، غرور اور تکبر کی جگہ تواضع ہو تو اس کی عزت گھٹتی نہیں بڑھ ہی جاتی ہے۔

دوسری صفت جس سے میں ہمیشہ متاثر ہوتا رہا وہ ان کی وسعتِ قلبی تھی کہ چھوٹوں سے بھی کچھ سیکھنے میں کبھی خفیف ترین تذبذب نہ ہو، وہ بڑے فقیہ اور مستند مفتی تھے، ایک دن میں نے اصول فقہ پر کچھ سطحی خیالات ظاہر کرنے کے بعد ذکر کیا یہ علم قانون میں مسلمانوں کی بہت بڑی جدت تھی جس کا نہ یونانیوں اور رومیوں کو کبھی خیال آیا،

اور نہ ہندیوں، چینیوں، مصریوں، بابلیوں کو)، جب یہ عرض کیا کہ کاش کراچی میں کوئی دیوبند ثانی، کوئی بلند معیار کا علمی مدرسہ بن جاتے تو میں بھی آں محترم کے کلاس میں حاضر ہوا کروں کسے یقین آئے گا کہ مفتی صاحبؒ نے جواب دیا کہ اصول فقہ پر تمہارے درس میں میں بھی شریک ہوا کروں گا۔ (ابھی دارالعلوم بنا نہ تھا)۔ ایسے ادارے کی ضرورت سے مرحوم بھی پورے متفق تھے لیکن کشمکش و پیچ اس پر تھا کہ آیا طلبہ ملیں گے بھی۔ میں نے عرض کیا کہ دیوبند جیسے ایثار طلب اور ترک دنیا کرلینے والے مدرسے میں جانے والے لوگ ہمالیہ تلے کے برعظم میں کم نہ تھے۔ مہاجرین میں ایسے لوگ کم نہیں دیکایک مولانا کا چہرہ دمکنے لگا اور فرمایا: ٹھیک کہتے ہو۔ غالباً اس لمحے ہی سے وہ فیصلہ کر چکے اور عزم بالجزم فرما چکے تھے کہ جیسے ہی مجلس دستور سازی سے سبکدوشی ہو، تدریس اور علم دین کی خدمت کے لیے اپنے کو وقف کر دیں۔

ان میں ایک اور صفت بھی دیکھی جو نادر ہے وہ یہ کہ ہر نئی چیز کو بدعت اور قابلِ نظر اندازی قرار دے لینے کی جگہ اس کو سمجھنے کی کوشش فرماتے تھے تاکہ فیصلہ کریں تو واقفیت کے ساتھ۔ یاد ہے کہ ایک دن گفتگو ہوئی کہ انکم ٹیکس کی شرح میں درجہ بندی کیوں ہوتی ہے؟ میں نے عرض کیا، فرض کیجیے کہ میرے گھر میں ایک بیوی اور دو بچے ہیں اور ختم سال پر حولان حول والے دو سو پیسے ہیں۔ میں پانچ روپے زکات میں دینے پر مکلف ہوں؟ اور فرض کیجیے کہ آپ کے مکان میں بھی ایک بیوی اور دو بچے ہیں اور نقد اندوختہ دو کروڑ کا ہے، اس لیے آپکو پانچ لاکھ زکات دینی ہوگی، کہا، ہاں تو پھر؟ میں نے گفتگو کو جاری رکھتے ہوئے بتایا کہ محکمۂ فائنس والے کہتے ہیں کہ ہم دونوں کی ضرورتوں کے مساوی ہونے کے باوجود میرے پاس (۱۹۵) روپے اور آپکے پاس ایک کروڑ پچانوے لاکھ روپے رہیں گے، جو خلاف عدل و انصاف ہے، اس لیے اگر مجھے زکات معاف نہ بھی کی جائے تو آپ سے ذرا زیادہ شرح سے رقم لینی چاہیئے! یکایک چہرہ سنجیدہ، اور ذہن غور و فکر میں غرق ہو گیا، زبان سے صرف ایک لفظ نکلا، واقعی غور طلب چیز ہے۔ پھر سوچ میں مشغول ہو گئے۔ یہ تو ظاہر ہے کہ نہیں، نہ وہ زکات کی شرح بدلنے کے قائل ہو سکتے تھے۔ لیکن ضرائب میں بتدریجی شرح کے استعمال کو انہوں نے فوراً رد بالکل نہ کیا۔

نے فوراً انہیں ٹوک دیا اور کہا، نہیں جی، اس کے معنی قائل کے ہیں اور اس کے بہ کثرت شواہد موجود ہیں۔ مرحوم کو ضروریاتِ زمانہ کا کامل احساس تھا۔ اس لیے اقتصادی مسائل پر احادیث وغیرہ سے ہمیشہ شغف رکھتے تھے، جب بنی النضیر کو عہد نبوی میں مدینے سے نکالا گیا تو انہیں یہ حق بھی دیا گیا تھا کہ مسلمانوں پر ان کے جو قرض ہیں وہ بھی واپس حاصل کر سکیں، ان میں سے بعض طویل مدت کے لیے دیئے گئے تھے میں نے شرح السیر الکبیر للسرخسی رح

سے رسول اکرم کا یہ ارشاد رکھا یا :- "ضَعُوْا وَتَعَجَّلُوا" (مقدار گھٹاؤ اور قبل از وقت قرضہ واپس حاصل کر لو) فوراً عبارت اور حوالے کو اپنی یادداشت کی کاپی میں نوٹ فرما لیا۔

مرحوم علمی خدمت کے لیے سلفِ صالح کی روایات پر عامل تھے یعنی کوئی نجی ذریعۂ روزگار ہو تاکہ فراغبالی سے علمی خدمت بے مزد و بلا معاوضہ کر سکیں اور آزادی بھی برقرار رہے کہ پیسے کی خاطر اربابِ حکومت کے لیے ضمیر فروشی کی کبھی ضرورت نہ رہے اور سرکاری ملازمت ہو بھی تو اسے ہر لمحہ لات مار سکیں۔ چنانچہ بچوں کو اعلیٰ دینی تعلیم دلانے کے بعد تجارت و اشاعتِ کتب میں لگا یا تھا۔ ایک دن خود مصر ہوئے کہ مجھ سے خواہش فرمائی کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیاسی زندگی" مرتب کر کے اشاعت کے لیے پیش کروں، غالباً یہ کئی بار چھپی ہے۔ اگرچہ حالات نے ناشر کو موقع نہ دیا کہ مؤلف نے ترمیم و اضافہ شدہ جو نسخہ بھیجا تھا اس کی اساس پر مکرر کتابت و طباعت عمل میں آئے۔ لَعَلَّ اللّٰهَ يُحْدِثُ بَعْدَ ذَالِكَ أَمْرًا۔

جب مجھے فرانس واپس ہونا تھا تو روانگی سے ایک یا دو دن قبل مرحوم نے زحمت فرمائی اور خداداد کالونی کی میری قیام گاہ پر تشریف لا کر میری سرفرازی فرمائی اور دیر تک تاسف کرتے رہے اور اس طرح وداع فرمایا گویا کسی عزیز قریب سے محروم ہو رہے ہیں۔ کوئی پچیس طویل سالوں کے وقفے کے بعد جب مجھے مکرر کراچی سے گذرنے کا موقع ملا اور سلام کے لیے خدمت میں حاضر ہوا تو باوجود علالت کے جوش جذبات سے کھڑے ہو گئے اور گلے لگا لیا۔ اس کے بعد وہ جلد ہی اللہ کو پیارے ہو گئے۔

مرحوم و مغفور نہ صرف بڑے عالم تھے بلکہ اچھے ادیب بھی تھے۔ ایک تو ان کی کتاب "معارف القرآن" ہے جو اچھی عصری تفسیر ہے۔ اسی طرح ان کا مختصر مضمون "اسلامی ذبیحہ" معلومات کا گنجینہ ہے اور طعام اہل الکتاب کے متعلق بہت سی غلط فہمیوں کو دور کرتا ہے۔ "اسلام کا نظام اراضی" بھی ایک بہت مفید تالیف ہے۔ ان کے علاوہ بھی مرحوم کی بہ کثرت مطبوعہ اور شاید بعض اشاعت طلب) تصنیفیں ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ ان کے چند گراں مایہ مقالوں کا عربی ترجمہ ہو کر عرب ممالک کے علمی رسالوں میں شائع ہو تو مرحوم کی قدر و قیمت سے ایک وسیع تر حلقہ واقف ہو سکے گا۔ ان کی تفسیر کا انگریزی ترجمہ شروع ہوا ہے لیکن عربی ترجمے پر بھی توجہ ہو تو نامناسب نہ ہوگا۔ ساری دنیا کے مسلمانوں کی مشترکہ علمی زبان اور خاص کر دینی علم کا ماخذ عربی زبان ہی ہے۔ امہات المومنین کی زبان ہونے کے باعث وہ سارے اگلے پچھلے مسلمانوں کی مادری زبان بھی ہے۔

خدا مرحوم کو اعلائے علیین میں جگہ دے، پس ماندوں کو صبر کی توفیق اور ہم سب کو ان کی علمی میراث سے استفادے کا موقع عطا فرمائے۔

جناب ڈاکٹر اشتیاق حسین صاحب قریشی
سابق وزیر تعلیم حکومت پاکستان
و سابق شیخ الجامعہ کراچی یونیورسٹی

عالمِ بالغ نظر

مجھے سب سے پہلے حضرت مولانا مفتی محمد شفیع قدس سرہ العزیز کی خدمت میں اُس وقت نیاز حاصل ہوا۔ جب حکومتِ پاکستان نے بعض شرعی امور پر حضرات علماء کرام سے مشورے شروع کئے۔ اگرچہ اس سے قبل میں حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی مرحوم و مغفور سے اُن کے تبحر علمی کی تعریف سُن چکا تھا۔ میں نے خود بہت جلد محسوس کر لیا کہ مفتی صاحب کمال سرعت کے ساتھ نفس معاملہ پر احاطہ فرما لیتے تھے اور کمال متانت و تدبر کے ساتھ اظہار خیال فرماتے تھے۔ یہ امر مسلّم تھا کہ حضرت مفتی صاحب کو اسلامی فقہ پر پوری دسترس حاصل تھی اس لیے یہ امر متوقع تھا کہ ان کے انداز فکر میں وہی منطقی اصابت اور طریق استدلال میں وہی قطعیت ہوگی جو ہمارے فقہائے کبار کی نہایت ممیز خصوصیت تھی۔ شرعی امور میں نصوص سے استخراج احکام کے معاملہ میں نہایت دقت نظر اور ادراک بالغ کی ضرورت ہے اور اس کے ساتھ ساتھ مصالح وقتی کو بھی پیش نظر رکھنا ضروری ہو چکا ہے۔ شریعت یقیناً بعض اعتبار سے شمشیر قاطع کی حیثیت رکھتی ہے اور کسی لغزش فکر یا شعوری یا غیر شعوری کج بحثی کی روادار نہیں ہوتی، لیکن یہ خیال درست نہ ہوگا کہ وہ مصالح وقتی سے لاتعلق رہتی ہے اگر ایسا ہوتا تو پھر شریعت عزاولشرار تباہ کار کے ہاتھوں میں آلہ کار بن جاتی۔ حقیقت یہ ہے کہ احکام و مصالح میں مطابقت ہمارے مفتیان کرام کا ہمیشہ معمول رہا۔ میں اُس زمانہ میں کافی عرصہ تک حکومت کی ذمہ داریوں میں شریک رہا اور مجھے ان خطرات کا پوری طرح اندازہ تھا جو مملکت پاکستان کو درپیش تھے۔ ان میں خارجی و داخلی عوامل دونوں بروئے کار ہے۔ حضرت مولانا صاحب مغفور و مرحوم بھی ان خطرات سے کما حقہٗ واقف تھے اور یہ نہیں چاہتے تھے کہ کسی کو یہ موقع ملے کہ پاکستان کو کمزور کرے اس کے ساتھ ساتھ وہ اس حقیقت سے بھی آگاہ تھے کہ شریعت کا اتباع اور اس کی متواتر پاسداری

فی الحقیقت پاکستان کے استحکام اور اس کی خوش حالی و ترقی کی ضامن ہو سکتی ہے۔ یہی سبب تھا کہ مولانا کی رائے ہر اعتبار سے صائب ہوتی تھی اور اس کی اصابت ہر شخص کو تسلیم کرنی پڑتی تھی۔

حضرت مولانا نہایت خاموشی کے ساتھ اسلام کی سربلندی کے لیے متواتر کوشاں رہتے تھے۔ اُن کی نظر پاکستان کی اسلامی درس گاہوں اور علماء پر اچھی طرح محیط تھی اور وہ یقیناً اس المیہ سے واقف تھے کہ پاکستان میں کوئی ایسا ادارہ نہ تھا جو اس اسلامی مملکت میں علماء کے تعداد میں روز افزوں کمی کو پورا کر سکے۔ وہ تمام مشاہیر علماء جو پاکستان میں جمع ہو گئے تھے آہستہ آہستہ کم ہوتے جاتے تھے بعض تو ان میں سے عمر رسیدہ ہوتے جاتے تھے اور بعض یوں بھی چند در چند الجھنوں کی وجہ سے درس و تدریس سے کنارہ کش ہو گئے تھے۔ یہ ظاہر تھا کہ اگر اس بڑھتے ہوئے خلاء کو پر کرنے کی کوشش نہ کی گئی تو ایک دن متبحر علماء کا فقدان ہو جائے گا۔ چنانچہ جیسا نظر آ رہا جاتا ہے ہمارے صف اول کے علماء ہی داغ مفارقت دیتے جاتے ہیں۔

موت سے کس کو رستگاری ہے آج وہ کل ہماری باری ہے

اور اب تو حالت یہ ہو گئی ہے کہ بعض اہم مضامین پڑھانے والے بھی مشکل سے میسر آتے ہیں۔ یہ امور حضرت مفتی صاحب مرحوم کے پیش نظر تھے اور وہ اچھی طرح آگاہ تھے کہ پاکستان کی دینی درس گاہوں میں تعلیم کے صحیح معیار کو قائم رکھنا نہایت ضروری ہے۔ چنانچہ ان کی دوربین نگاہوں نے اس آنے والے المیہ کو پہلے ہی دیکھ لیا اور تمام کاموں سے علیٰحدہ ہو کر انہوں نے ایک دار العلوم کی کراچی میں بنیاد رکھی۔ ابتداء میں اسی سلسلہ میں مشکلات پیش آئیں جو اچھوں اچھوں کے لیے انتہائی ہمت شکن ثابت ہو سکتی تھیں، لیکن مولانا کے عزم میں کبھی اضمحلال پیدا نہ ہوا اور ان کے پائے ثبات کو کبھی لغزش نہیں ہوئی۔ ابتداءً انہیں دار العلوم کے لیے جو جگہ میسر آئی وہ ہر طرح ان کے لیے ناکافی تھی، لیکن مولانا برابر اپنی مساعی کو تیز کرتے رہے حتیٰ کہ وہ دار العلوم کی موجودہ عمارت میں منتقل ہو سکے اور اس اہم درس گاہ کی توسیع ممکن ہو سکی۔ یہ وہ خیر جاریہ ہے جو ہمیشہ حضرت مفتی صاحب کے نامہ اعمال میں روش اضافہ کرتی رہیگی۔

میں اپنے عجز علم کے باعث اس کا اہل نہیں ہوں کہ حضرت مفتی صاحب کی علمی قابلیت کے متعلق بحث کر سکوں اس لیے کہ ایسی بحث تحسین ناشناس کے زمرہ میں شامل ہو گی۔ البتہ "البلاغ" میں مولانا کی جو تحریریں شائع ہوتی رہیں۔ اُن سے میں نے برابر استفادہ کیا اور ان پر غور کرنے سے محسوس ہوا کہ مصنف علیہ الرحمۃ کا علم مستحکم اور عمیق تھا اگرچہ فقہ مولانا کے تخصص کا صحیح میدان تھا لیکن تفسیر میں بھی ان کی عظمت دلنشیں ہوتی رہی۔

طبعاً مولانا نہایت مرنجان و مرنج تھے۔ ہمارا یہ دستور ہو گیا ہے کہ فقہ کے سلسلہ میں جو اختلافات پیدا ہوتے

ہیں وہ ذاتی مداوتوں اور فرقہ سازی پر منتج ہوتے ہیں۔ لیکن مولانا مسالک کے اختلافات میں نہیں پھنستے تھے اور جس رائے کا بھی اظہار فرماتے تھے وہ مثبت اور نفس مضمون سے متعلق اور معروضی ہوتی تھی۔ ایسا نہیں ہوتا تھا کہ اختلافات کرنے والوں پر طعن و تشنیع تو در کنار اعتراضات کو بھی اپنے بیان میں جگہ دیتے اور حقیقت یہ ہے کہ علم کی پہنائی میں اس کے لیے کوئی جگہ ہوتی بھی نہیں ہے۔

مجھے خود امریکہ سے واپسی پر اور خصوصاً جامعہ کراچی میں معارف اسلامیہ کے شعبہ کو قائم کرنے کے سلسلہ میں اکثر حضرت مفتی صاحب علیہ الرحمۃ سے مشورہ کی ضرورت پیش آئی لیکن مولانا نے اپنی انتہائی مصروفیات کے باوجود کبھی تحمل سے کام نہیں لیا اور جامعہ کی ذمہ داریوں سے فراغت کے بعد بھی بعض مسائل کے سلسلہ میں مولانا سے گفتگو کے لیے اُن کی خدمت میں حاضری کا موقعہ ملا۔ حضرت مولانا نے نہایت فراغ دلی سے میرے معروضات کو سنا لیکن وہ کسی ایسی کوشش میں جو دارالعلوم سے ان کی توجہ کو ذرا بھی ہٹا سکتی شرکت کے لیے آمادہ نہیں ہوئے آخری زمانہ میں قلب کے موذی مرض نے مولانا کو صاحب فراش کر دیا لیکن ان کی سعی پیہم میں کبھی فرق نہ آیا۔

سچی بات یہ ہے کہ ایسے باکمال اور مخلص افراد کی جو جگہ خالی ہوتی ہے وہ ہمارے معاشرے میں پھر پر ہوتی نظر نہیں آتی۔

⊙

یہ تو سمجھ لیا جاتے کہ بے عمل یا فاسق کے لئے دوسروں کو وعظ و نصیحت کرنا جائز نہیں اور جو شخص کسی گناہ میں مبتلا ہو وہ دوسروں کو اس گناہ سے باز رکھنے کی تلقین نہ کرے، کیونکہ کوئی اچھا عمل الگ نیکی ہے، اور اس اچھے عمل کی تبلیغ دوسری مستقل نیکی ہے، اور ظاہر ہے کہ ایک نیکی کو چھوڑنے سے یہ ضروری نہیں ہوتا کہ دوسری نیکی بھی چھوڑ دی جائے، جیسے ایک شخص نماز نہیں پڑھتا تو اس کے لیے یہ لازم نہیں کہ روزہ بھی ترک کر دے۔

(حضرت مفتی اعظم رح، معارف القرآن ص۱۹۱، ج۱)

○

مولانا محمد عبدالقدوس قاسمی صاحب
استاذ اعزازی دانشگاہ پنجاب

اُستاذِ محترم مفتیٔ عصر

استاذ محترم و مکرم فقیہ العصر و فقیہ الدھر حضرت مولانا مفتی محمد شفیع رحمہ اللہ تعالیٰ و نور مرقدہٗ کی ذات گرامی سے تعارف ان دنوں حاصل ہوا جبکہ راقم الحروف ۱۳۴۸ھ (۱۹۳۰ء) میں اپنی علمی تشنگی کی سیرابی کے لیے دارالعلوم کے مجمع البحار سے قطرات وغرف حاصل کرنے دیوبند پہونچا۔ اس وقت امتحان لیا کر کبار اساتذہ کے بعد دوسرے اساتذہ میں حضرت مولانا محمد شفیع صاحب کا اسمِ گرامی علمیت اور ذکاوت کی بنا پر نمایاں ہے۔ کبار اساتذہ میں حضرت شیخ الاسلام مدنیؒ اور حضرت میاں صاحبؒ (میاں اصغر حسینؒ) کے علاوہ حضرت مولانا رسول خان صاحبؒ، حضرت مولانا محمد ابراہیم صاحبؒ، حضرت مولانا اعزاز علی صاحبؒ اور حضرت مولانا عبدالسمیع صاحبؒ کے اسمائے گرامی شامل تھے۔ میرے اسباق اس سال حضرت مولانا عبدالسمیع صاحب مرحوم مولانا مفتی ریاض الدین صاحب مرحوم اور حضرت مولانا اختر حسین صاحب سے متعلق تھے۔

دوسرے سال (۱۳۴۹ھ) حضرت مولانا محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ سے تلمذ کا شرف حاصل ہوا اور مقامات حریری کا سبق ان سے متعلق ہوا۔ جس انہماک، وقار اور توازن کے ساتھ حضرت مفتی صاحب نے درس دینا شروع کیا، اس سے راقم الحروف خصوصاً اور طلبا عموماً محظوظ ہوئے۔ توازن کا لفظ میں نے اس لیے استعمال کیا کہ مقامات حریری کا درس دینے والے میں نے تین طرز کے دیکھے۔ ایک طرز یہ تھا کہ صرف کتاب کے مشکل الفاظ کا ترجمہ ہو جاتا تھا اور فعل ثلاثی مجرد ہو تو اس کا باب اور مصدر بتایا گیا یا مزید کا باب بتایا گیا۔ بقیہ مباحث بالکل نہیں چھیڑے گئے۔ دوسرا طرز یہ تھا کہ (ہم طالب علموں کے خیال میں) لغت کی کوئی کتاب مثلاً المنجد کو زیر نظر رکھا گیا اور کسی مادہ کے جتنے معانی زبان پر آئے، تمام دہرا دیے۔ اس طرح غیر مستعمل غریب اور غیر مفید معانی کی بھی بھرمار ہو گئی۔ اساتذۂ فن مثلاً شیخ الادب حضرت مولانا اعزاز علی صاحب

مرحوم اور حضرت مفتی صاحب مرحوم کا طرز یہ تھا کہ پہلے لفظ کے وہ معانی بیان کر دیے جو حریری کے سیاق عبارت میں مقصود تھے اور ساتھ ہی قرآن کریم اور احادیث نبوی سے ان کا استشہاد ہو سکا تو کر دیا پھر دوسرے چند ایسے معانی بھی بیان کر دیے، جن کی ضرورت عربی کے مطالعہ کرنے والوں کو پیش آتی رہتی ہے۔

ہمارا یہ سبق تقریباً تین مہینے جاری رہا ہوگا کہ حضرت مفتی صاحبؒ کو تدریس کے شعبہ سے منتقل ہو کر دارالافتا کا نظم و نسق سنبھالنا پڑا اس سے پہلے اطراف سے جو استفتا آتے تھے، ان کا جواب ہمیشہ اختصار کے ساتھ دیا جاتا تھا۔ اطراف سے یہ مطالبہ شروع ہوا کہ کبھی ضرورت ہو تو جواب میں بسط بھی ہونا چاہیے۔ اس وقت دارالافتا کا نظم و نسق ایسے حضرات کے ہاتھ میں تھا جو بسط کے قائل ہی نہ تھے۔ چنانچہ دارالعلوم کی مجلس شوریٰ نے یہ فیصلہ کیا کہ افتا کا مسند حضرت مولانا محمد شفیعؒ کے حوالہ کیا جائے، جو صاحب قلم بھی تھے اور صاحب بہت بھی۔ اس طرح راقم الحروف حضرت مفتی صاحب مرحوم کے تلمذ سے اس وقت محروم ہوگیا۔ پھر دورہ حدیث کے سال ان سے سُنن ابوداؤد کے چند اسباق پڑھے، جو انہوں نے حضرت میاں اصغر حسینؒ کی رخصت کے زمانہ میں نیابۃً پڑھائے تھے۔

حضرت مفتی صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کو قدرت نے قلم پر جو قدرت بخشی تھی اس سے اس وقت کے اکابر خوب واقف تھے۔

ایک واقعہ عرض کرتا ہوں جس سے اس وقت آپ کی قلمی مقدرت کا اندازہ ہو سکے گا۔

دارالعلوم سے منتسب جو فاضل باہر کے علمی اور سیاسی میدانوں میں مصروف خدمت تھے، ان کو دارالعلوم سے محبت تھی اور وہ چاہتے تھے کہ دارالعلوم اور مسلک دارالعلوم سے منتسب اکابر کو اور دارالعلوم کو جو وقار اور تسلط دینی اور مذہبی حلقوں میں حاصل ہے اس کا دائرہ اثر بڑھتا رہے۔ ان حضرات کو یہ محسوس ہوتا تھا کہ گو کتاب و سنت، فقہ و عقائد اور عربیت وغیرہ دینی علوم کے فہم پر دارالعلوم کے متخرجین کی گرفت مضبوط ہے اور اس علمی میدان میں کسی اور گوشہ سے ان کی ہمسری کا ادعا خود فریبی ہے، تاہم یہ کمی ضرور ہے کہ دارالعلوم کے متخرجین نے دینی سرمایہ کو اردو کے عصری مؤثر انداز میں پیش کرنے کی طرف توجہ نہیں دی۔ اس لیے اس میدان میں دارالعلوم نے ہی اپنا مقام حاصل نہیں کیا اور اس طرف توجہ دینے کی بڑی ضرورت ہے۔ چنانچہ اس احساس کی بنا پر بعد میں ندوۃ المصنفین کی بنیاد پڑی اور دوسری کوششیں بھی اس طرز کی شروع ہوئیں، حضرت مفتی صاحبؒ کی

قلمی مہارت بھی ایسے اصحاب کے پیش نظر تھی۔ دارالافتا کی طرف ان کی تبدیلی اس قلمی مہارت کی قدرتی
کا نتیجہ تھا۔

ایک دفعہ رئیس الاحرار مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی دیوبند تشریف لائے اور طلبا کی درخواست
پر دارالعلوم کی مسجد میں تقریر فرمائی۔ دیگر نصائح کے ساتھ اس امر پر خاص زور دیا کہ قلم کی مشق بڑھائی جائے۔ اور
دارالعلوم سے سند فراغ حاصل کرنے والوں کو تدریس، افتا اور تبلیغ کے ساتھ تحریر پر بھی دسترس حاصل کرنا
ضروری ہے۔ فرمایا کہ دارالعلوم کے اربابِ انتظام سے بھی یہ درخواست کروں گا کہ وہ طلبا میں اردو لکھنے
کی استعداد پیدا کرنے کی طرف توجہ دیں۔ پھر حضرت مفتی صاحب مرحوم کی کتاب "داؤد جزالسیر" کی خوب
تعریف کرتے ہوئے فرمایا کہ مدرس اور بھی ہوں گے دارالعلوم کو چاہیے کہ حضرت مفتی صاحبؒ کو تحریر
کے میدان کی طرف متوجہ فرمادیں، اور ان جیسے اصحاب کے ذریعہ اردو کے مستند دینی سرمائے کو بڑھائیں
حضرت مفتی صاحب افتا کے منصب پر فائز ہوئے تو ان کی تصنیفی مہارت نے بھی ایک اہم
مفید سلسلہ ایجاد کر دیا۔ دارالعلوم میں جو استفتا (اس وقت) پچھلے ساٹھ سالوں سے آتے رہے تھے،
وہ مع جوابات رجسٹروں میں درج تھے اور جو استفتا مزید آتے رہے وہ بھی حسبِ معمول درج ہوتے
رہے۔ حضرت مفتی صاحبؒ نے فتاویٰ کی اشاعت کا اہتمام فرمایا۔ المفتی کے نام سے ایک رسالہ
جاری کیا، جس کے دو حصے ہوا کرتے تھے۔ پہلا حصہ عزیز الفتاویٰ، جس میں پرانے رجسٹروں سے حضرت
مولانا مفتی عزیز الرحمن مرحوم کے فتاویٰ مبوّب ہو کر شائع ہونے لگے۔ اور دوسرا حصہ امداد المفتین تھا، جس
میں حضرت مفتی صاحب کے اپنے دور کے فتاویٰ ہوتے تھے۔ المفتی کی یہ خدمات بار آور ہوئیں اور حضرت
مفتی صاحب کے قلم سے فتاویٰ دارالعلوم کی جو ضخیم جلدیں اس وقت اہلِ افتا کے پیش نظر رہتی ہیں
ان کی تخم کاری اسی زمانہ میں ہو گئی تھی۔

تدریس، تصنیف، افتا اور نشر و اشاعت کی یہ تمام مہارتیں حضرت مفتی صاحب مرحوم کے ساتھ
پاکستان منتقل ہوئیں۔ تدریس کا شعبہ اس وقت دارالعلوم کراچی اور اس کے موقر اساتذہ کی شکل میں
ہمارے سامنے ہے۔ افتا کی حالت یہ ہے کہ پاکستان میں مفتی اعظم رحمۃ اللہ علیہ فتویٰ کے لیے مرجع
علما و مفتین تھے اور جیسے پرانے دور میں عظیم شخصیتوں کے بارے میں کہا جاتا تھا۔ ہم بھی یہ کہنے پر مجبور
ہیں کہ انتہت الیہ مشیخۃ الفتویٰ فی عصرہ اور سر دست اس پہ یہ اضافہ کرنے پر بھی مجبور ہیں، کہ

دانشمندِ یونانیہ تصنیف اور نشر و اشاعت کے کمال پر آپ کی مؤلفات اور ادارۃ المعارف کراچی کی مطبوعات شہادت دے رہی ہیں۔

حضرت مولانا بنوریؒ کو ہمیشہ یہ فکر دامن گیر رہتا تھا کہ دینی ضرورتوں کے لیے پڑھے لکھے طبقہ کے پاس اہلِ حق اور اہلِ سُنّت والجماعت کی تحریر کردہ کتابیں ہونا چاہئیں۔ تفسیر کے میدان میں اگرچہ اکابر نے بہت اچھی خدمات پیش کی تھیں اور خصوصاً تفسیر بیان القرآن اور حواشی مولانا عثمانی دونوں اپنی اپنی خصوصیات کے ساتھ لاجواب ہیں۔ تاہم ایک عصری تفسیر کی ضرورت پھر بھی محسوس ہوتی تھی۔ جب حضرت مفتی صاحبؒ کی تفسیر معارف القرآن مکمل ہوگئی تو حضرت بنوریؒ سے راقم الحروف نے یہ سنا کہ الحمدللہ یہ ضرورت مکمل پوری ہوگئی۔

"المفتی" کی جگہ "البلاغ" نے حاصل کرلی اور ممکن ہے کسی قدر زیادہ مقبول ہوگیا ہو۔ تاہم میرا خیال ہے کہ "المفتی" کا خلا ابھی پورا نہیں ہوا۔ اور اگر البلاغ ہی میں بعض اہم مسائل پر فقیہانہ مضامین کا سلسلہ شروع کردیا جائے اور حضرت مفتی صاحبؒ کی تصانیف میں بعض مسائل پر جو تحقیقات ہیں ان کی تلخیص کی اشاعت بھی شروع کردی جائے تو "المفتی" کی یاد تازہ ہوجائے گی۔

حضرت مفتی صاحبؒ کی خدمت میں راقم الحروف کی حاضری گاہے گاہے ہوجاتی تھی۔ پشاور سے کراچی کا سفر مجھے کم درپیش آتا تھا اور حضرت مفتی صاحبؒ نے بھی بہت کم اس طرف قدم رنجہ فرمایا۔ تاہم راقم الحروف جب بھی دو چار دن کے لیے کراچی گیا۔ حضرت مفتی صاحبؒ کی خدمت میں ضرور حاضر ہوا۔ دو دفعہ حضرت مولانا بنوریؒ نے میری خواہش کی یہ قدر کی کہ حضرت مفتی صاحبؒ کو اپنی آمد کی اطلاع دے کر خود اپنے ساتھ لے گئے اور دو دفعہ میرے لیے صرف سواری کا انتظام فرمایا دو تین دفعہ ان کے علاوہ بھی حاضری ہوئی۔ ایک ملاقات (جو غالباً آخری ملاقات تھی) کے دوران اکابر سے متعلق کچھ دلچسپ تذکرے دونوں بزرگوں نے فرمائے۔ اسی مجلس کی یادداشت راقم الحروف نے قلم بند کی تھی بطور تبرک ذیل میں درج کی جارہی ہے

۸ محرم ۱۳۹۲ھ (۱۳ جنوری ۱۹۷۱ء) کو یہ احقر حضرت مولانا بنوریؒ کا مہمان تھا۔ احقر نے خواہش ظاہر کی کہ حضرت مفتی صاحبؒ کے ہاں حاضری دینا ہے۔ حضرت بنوریؒ نے فرمایا کہ ہم بھی چلے جائیں گے۔ دارالعلوم کو فون کے ذریعہ اطلاع دی گئی۔ پھر سواری کا انتظام فرمایا چنانچہ

مولانا بنوریؒ اور ان کے صاحبزادہ مولانا محمد بنوری صاحب، مولانا مفتی ولی حسن، مولانا احمد الرحمٰن اور جناب لغاری صاحب کے صاحبزادہ کی رفاقت میں راقم الحروف حضرت مفتی صاحبؒ کی زیارت سے مشرف ہوا۔ (میرے برادر اصغر مولانا عبدالسبوح نے دارالعلوم دیوبند میں حضرت مفتی صاحب کے ساتھ خاص ربط رکھا تھا اور دارالاشاعت کی بعض کتابوں کی طباعت کے سلسلے میں حضرت مفتی صاحب نے ان سے کام بھی لیا تھا۔ اس لیے حضرت مفتی صاحب کو میرا نام سن کر ان کا خیال آجاتا تھا۔ یہ تذکرہ انہوں نے اس وقت فرمایا۔)

حضرت مفتی صاحب ان دنوں طویل بیماری کے بعد ذرا افاقہ یاب ہوئے تھے۔ صاحبزادہ مرحوم کی وفات کا صدمہ بھی سہار چکے تھے، تاہم نقاہت کافی تھی۔ لیکن چونکہ طبعاً ہشاش بشاش اور علم و اہل علم کے قدردان تھے اس لیے حضرت بنوریؒ کی ملاقات سے بہت مسرور ہوئے اور خوب کھل کے گفتگو فرمائی۔ مجلس جامع المتفرقات ہوئی ہے۔ اس مجلس میں دونوں مرحوم بزرگوں نے اپنے بزرگوں کے کچھ حالات بھی سنائے۔ مثلاً

۱۔ حضرت مولانا بنوریؒ نے حضرۃ الشیخ (شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب مدظلہم وعم فیضہم) سے متعلق جناب عبدالحفیظ صاحب کا مراقبہ بیان فرمایا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرۃ الشیخ کے بارے میں فرمایا "امام عصرہ و برکتہ دہرہ والمنبی البیار"

۲۔ حضرت مولانا بنوریؒ نے یہ واقعہ بیان فرمایا کہ اسمبلی بلڈنگ میں حضرت کشمیریؒ (شیخ الحدیث مولانا انور شاہؒ) کی دعوت تھی۔ ڈاکٹر اقبال مرحوم بھی مدعو تھے۔ شاہ صاحب نے ڈاکٹر صاحب کو مخاطب کرکے فرمایا: "ڈاکٹر صاحب! یہ جو ہوائی جہاز کے ذریعہ سے تسخیر کائنات ہو رہی ہے (یہ لفظ تھے یا ان کے مسائل) یہ پیغمبروں کو بغیر اسباب کرائی گئی تھی، اور اشارہ تھا کہ امت ان امور کی طرف اسباب کا ذریعہ پہنچے گی۔ (راقم الحروف کا خیال ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے مندرجہ ذیل شعر حضرت شاہ صاحبؒ کے اس ارشاد سے خیال اخذ کرکے منظوم کیا ہے۔

عیاں ہوا ہے یہ معراج مصطفیٰؐ سے مجھے
کہ عالم بشریت کی زد میں ہے گردوں

۳۔ حضرت مفتی صاحب رحمہ اللہ نے مندرجہ ذیل واقعات بیان فرمائے:

ایک دفعہ حضرت شاہ صاحب کشمیریؒ، حضرت مولانا عثمانیؒ، مولانا مرتضیٰ حسن صاحب، تین دوسرے نوجوان علماء اور حضرت مفتی صاحب خود بطور جماعت و وفد دیوبند سے روانہ ہوئے۔ اس وفد نے

مانسہرہ تک دورہ کیا۔ مختلف مقامات پر قادیانیت کے خلاف تقریریں کیں، چیلنج دیئے اور مجالس منعقد کیں۔
لاہور میں چند حضرات نے ایک مجلس کے انعقاد کا انتظام کیا۔ اس مجلس میں مولانا ظفر علی خاں اور عبدالمجید سالک بھی تھے۔ سالک صاحب نے سُود کو جائز قرار دینے کی اہمیت جتا کر کچھ سوالات کے جواب چاہے۔ فقہ کی طرف سے مولانا شبیر احمد عثمانیؒ جواب دیتے رہے اور کافی دیر تک سائل سے بحث کرتے رہے۔ آخر میں حضرت شاہ صاحب نے مہر سکوت توڑ کر فرمایا "سالک صاحب! آپ ہیں سالک اور میں ہوں مجذوب اگر آپ جہنم میں جانا چاہیں تو بے شک جائیے۔ خدا کی جہنم وسیع و عریض ہے۔ لیکن اگر آپ ہمیں پل بنا کر وہاں پہنچنا چاہیں، تو ہم آپ کی ٹانگ پکڑیں گے اور اپنے اوپر سے گذر کر وہاں پہونچنے آپ کو نہیں دیں گے۔"

۴۔ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی دارالعلوم دیوبند میں (مدرس تھے) وقت سے ذرا دیر میں آتے تھے۔ مولانا رفیع الدینؒ مہتمم دارالعلوم نے اس وقت کے سرپرست حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ سے ان کی شکایت فرمائی۔ حضرت گنگوہیؒ دیوبند تشریف لائے اور حضرت مولانا محمد یعقوبؒ کو ذرا سختی سے ٹوکا کہ "تمہاری جواب طلبی (اللہ تعالیٰ کے ہاں) ہوگی۔ پھر مولانا رفیع الدینؒ سے تنہائی میں فرمایا کہ "میں نے تمہاری شکایت پر انہیں ٹوکا تو ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اگر اس سے دوگنی تنخواہ پر وہ مدرسہ کا ایک چکر بھی لگا یا کریں تو کافی ہے۔

۵۔ ایک دفعہ حضرت مولانا محمد یعقوبؒ ناراض ہو کر دارالعلوم سے چلے گئے اور پیران کلیر شریف پہنچے۔ سو وہاں مراقبہ میں دیکھا کہ حضرت صابر صاحب غصہ میں فرما رہے ہیں کہ "کیوں آئے فوراً واپس جاؤ۔" چنانچہ مولانا محمد یعقوب صاحب واپس گئے۔ حضرت گنگوہیؒ نے ان سے فرمایا کہ ہم پر آنے کا کوئی احسان نہیں۔ بڑوں کے بھیجے ہوئے ہو (یعنی ان کو کشفاً اس مراقبہ کا حال معلوم ہو گیا تھا)

ثم انقضت تلک السنون واہلہا   فکأنہا وکأنہم احلام

(راقم الحروف پر حضرت مفتی صاحبؒ کی عظمت اور خدمت کا یہ اثر ہے کہ ہر صبح اپنے چند دوسرے بزرگوں کے ساتھ ان کے لیے خصوصی دعا کرتا ہے۔)

مولانا لطافت الرحمٰن صاحب سواتی
بہاولپور

کچھ شگفتہ تذکرے

مفتی اعظم رحمۃ اللہ علیہ سلف کرام کا نمونہ اور علم و عمل کا مجسمہ تھے۔ محدث و مفسر فقیہ و متکلم ہونے کے علاوہ تمام معقولات و منقولات میں حاذق و ماہر تھے میں نے ان کے دارالعلوم دیوبند کا وہ دور دیکھا ہے جس میں ان کے پاس زندگی کے ظاہری مادی اسباب و ذرائع کی قلت کیا بلکہ فقدان تھا جس کا نقشہ حضرۃ المرحوم نے خود ہی اس فارسی مصراع کے تحریر فرمانے سے کھینچا ہے کہ ؎

خود کوزہ و خود کوزہ گر و خود گل کوزہ (بحوالہ مقدمہ اردو بقلم مرحوم)

لیکن اس وقت بھی علوم و معارف، تقوٰی و طہارت، فقاہت و نقاہت، علوم عربیہ اور معقولات کی مہارت کی حیثیت سے اس جوہر گرانمایہ کی ذات نمایاں خصوصیات اور امتیازات کی حامل تھی ؎

فی المہد ینطق عن سعادۃ جدہ - اثر النجابۃ ساطع البرہان

ان ایام میں میں بھی شرکا مطول میں تھا جو ان کے پاس زیر درس تھی۔ مجھے خوب یاد ہے کہ فصاحت و بلاغت کی بحث میں مرحوم استاذ سے امام ثعلب سے دونوں کی متعدد تعریفات کو نقل فرمایا جن میں سے بعض پر میں اپنی طالب علمانہ منتشانہ عادت کے تحت کافی دیر تک مراجعت کرتا رہا اور وہ خوش ہو کر جواب دیتے رہے میری اس طرح کی مراجعتوں سے موصوف کے خاص طور پر خوش ہونے کا پس منظر یہ بھی تھا کہ میرے ایک دوسرے استاذ محترم مولانا مفتاح الدین صاحب مرحوم (جو رہ سوات) مرحوم کے ہم درس، ہم سبق، ہم اساتذہ رہ چکے تھے میں نے مرحوم دوم سے مرحوم اول کا ذکر کیا تھا جس پر ان کو یاد بھی فرماتے تھے اور اس وجہ سے میرے ساتھ خصوصی شفقت و عنایت بھی کرتے تھے۔ اس وقت ان کے مشترک اساتذہ میں سے امام المحدثین حضرت انور شاہ کشمیری، شارح صحیح

مسلم علامہ شبیر احمد صاحب عثمانی، امام العلوم العربیہ مولانا اعزاز علی صاحب، مفتی اعظم مولانا عزیز الرحمٰن صاحب امام المعقولات مولانا غلام رسول صاحب وغیرہم رحمۃ اللہ علیہم تھے۔ اور اس وقت کے طلبہ اور تلامذہ میں بھی محمد شفیع، مفتاح الدین، محمد ادریس، مشیۃ اللہ، میرک شاہ وغیرہ مرحومین اور شمس الحق، محمد طیب وغیرہ موجودین تھے جو لبعد میں جاکر خود بھی حضرات اور کبار علما بنے ہیں اور ان سے اپنے اسلاف کے زریں کارناموں کا تسلسل بحمد اللہ جاری ہے اور ہم اہل حق بجا طور پر یہ کہہ سکتے ہیں کہ ؏

ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

مجھے یہ بھی یاد ہے کہ مرحوم نے دیوبند کی جامع مسجد میں بعد صلوٰۃ المغرب درس قرآن دینا منظور فرمایا تھا۔ کافی طلبہ شریک ہوتے تھے۔ درس کا آغاز سورۂ نبأ سے طے ہوا۔ کلا سیعلمون ثم کلا سیعلمون اور الم نجعل الارض مہاداً۔ الآیات کی بابت فرمایا کہ یہ دونوں اسی ایک ہی سوال کے جواب ہیں۔ مگر پہلا جواب حاکمانہ ہے اور دوسرا جواب حکیمانہ ہے۔ چنانچہ مرحوم کا یہ علمی تجزیہ و تعبیر اب بھی باعث لطف و قرار ہے۔ رحمہ اللہ رحمۃً واسعۃً و آواہ فی مأوی سنن و کرم۔ اسی طرح کسی اور کتاب کے درس میں مرحوم کا ایک نہایت بلند اور ہمہ گیر علمی بیان کردہ نکتہ اب بھی میری یاد میں ہے اور مرحوم کا حوالہ دے کر درس میں طلبۂ درس کو وہ بات سمجھا کر لطف اندوز ہوتا ہوں۔ وہ نکتہ یہ بیان فرمایا تھا کہ تمام علوم و مسائل میں صغریات کا فیصلہ دربجہ اصغر کے جزوی ہونے کے، ہم خود اپنی صوابدید اور احساس و ادراک سے کرتے ہیں۔ البتہ مسائل کے کبریات کو متعلقہ علوم سے حاصل کرتے ہیں اور پھر صغریٰ اور کبریٰ کو ملانے سے نتیجہ برآمد ہوتا ہے۔ مثلاً علم فقہ کے مسائل طہارت میں دیکھا جائے کہ کسی پانی کے متعلق یہ فیصلہ کرنا کہ "ہذا الماء مستعمل" تو ہمارا کام ہے آگے یہ کبریٰ بے شک فقہ سے لے لیتے ہیں کہ "وکل ماء مستعمل حکمہ کذا۔ فہذا الماء حکمہ کذا۔ یا مثلاً علم بلاغت میں یہ فیصلہ کرنا کہ "ہذا الکلام ملقی مع المنکر" تو ہمارا کام ہے آگے یہ کبریٰ علم معانی سے حاصل کرتے ہیں کہ "وکل کلام مع المنکر یجب توکیدہ۔ فہذا الکلام یجب توکیدہ۔ خیر یہ تو میں نے "مشتے نمونہ از خروارے" کے طور پر چند باتوں کا ذکر کر کے یہی کچھ کیا کہ ؏

منے شرمسارم کہ پائے ملخ را۔ سوئے بارگاہ سلیمان فرستم۔

ورنہ اس مرد کامل عالم باعمل، اسوۃ الاسلاف، قدوۃ الاخلاق کے اوصاف و خصائص کا احصاء ممکن نہیں ہے۔ ہ

لا یدرک الواصف المطری خصائصہ ۔ وان یک سابقاً فی کل ما وصفا

پھر مرحوم کی اس علمی درویشی کے باوصف اس مردِ خدا کو اللہ تعالیٰ نے ہر طرح کا مادی دنیاوی آرام وراحت اور رغد عیش کا سامان فراہم فرمایا۔ وہ نیک اور قابل اولاد عطا فرمائی جو کلی طور پر نہ سہی جزوی لحاظ سے والد مرحوم کے بعض کمالات و مزایا کی حامل ہیں جن کی بابت قاری محمد طیب طال بقاءہ و مد ظلہ نے خوب فرمایا ہے کہ "مگر اس شدید غم میں پھر بھی وجہ تسلی یہ ہے کہ انہوں نے اپنے ترکہ میں جہاں ایک بڑا علم چھوڑا جو ان کی کثیر تصانیف میں محفوظ ہے وہیں الحمد للہ قابل اولاد بھی چھوڑی ہے جس سے بھرپور توقع ہے کہ ان کے آثار اور الباقیات الصالحات کو من وعن باقی رکھیں گے۔ بالخصوص عزیزی تقی سلمہ سے ہماری امیدیں زیادہ وابستہ ہیں"۔ (بحوالہ البلاغ ماہ نومبر و دسمبر ۱۹۷۶ء) ونعم ما قالہ البوصیری رحمہ

ما احسن الدین والدنیا اذا اجتمعا ۔ واقبح الکفر والافلاس بالرجل

لیکن بایں ہمہ مجھے مرحوم کا نیک اور بلند احساس بھی یاد ہے جبکہ ایک بار میں ان کے کتب خانے والے کمرہ میں ان کے ساتھ موجود تھا اور گھر سے ریڈیو بجنے کی آواز آ رہی تھی تو مرحوم نے کافی دردناک احساس کا اظہار کرکے فرمایا کہ مولانا! اس ساز و سامان کو دیکھ کر شرمندہ ہوں مگر کیا کر سکتا ہوں وقت اور حالات میں ان چیزوں سے مفر ممکن نہیں ہے۔ مرحوم کے قرب الٰہی اور خلوص و للہیت اور طہارت قلب کی ایک دلیل یہ بھی تھی کہ اپنے تمام تر علمی عظمت و وقار اور ہر طرح کی عزت و افتخار اور مخدوم الکل استاذ الکل ہونے کے باوجود نہایت متواضع اور خاکسار طبیعت کے مالک تھے۔ خدام اور شاگردوں سے گفتگو یا برتاؤ میں کسی قسم کی برتری اور اپنے بڑے ہونے کا احساس دلانے کا موقع نہیں دیتے تھے۔ ایکبار مجھے مرحوم کے گھر کے قریب محلہ والی مسجد میں ان کے ہمراہ ظہر کی نماز میں آنا جانا پڑا اور دونوں حالوں میں جب میں نے جوتے کو سعادت و برکت جان کر اٹھایا تو انکار فرماتے رہے غرض یہ کہ مرحوم کے افتادِ طبع کی یہ فروتنی بھی عظمت و رفعت کا شاہد عدل تھی سہ

فروتنی ست دلیلِ رسیدگانِ خدا ۔ سوار چونکہ بمنزل رسد پیادہ شود

میری یادوں میں ایک واقعہ وہ بھی ہے جو ان کی نیک نیتی، مقبولیت عند اللہ اور اپنے طلبہ و علماء حق کے ساتھ روحانی مخلصانہ ربط و تعلق اور علمی تقویٰ و تزکیہ کی ایک کھلی نشانی ہے۔ واقعہ یہ تھا کہ استاذ مرحوم نے مجھے کراچی دار العلوم کے لئے بغرض تدریس بلایا تھا اور خط و کتابت سے معاملہ طے ہونے کے بعد آخری خط

میں تحریر فرمایا کہ آپ فوراً چلے آئیں کیونکہ آپ کی وجہ سے ہم نے ایک اور صاحب کو آنے سے منع کر دیا ہے جبکہ اس سے بات طے ہو گئی تھی۔ چنانچہ میں تعمیل حکم کے لیے تیار ہو رہا تھا اور اچانک مرحوم کا تار ملا کہ آپ سر دست تشریف نہ لائیں، آپ کے نام مفصل خط روانہ کیا گیا ہے۔ خیر میں نے وہ تیاری تو منسوخ کر دی لیکن اس اچنبھی سبب معلوم ہونے کے لئے بے تاب تھا جس کو خود ہی مرحوم نے بعد کی ایک ملاقات میں بیان فرما کر کہا کہ "مولانا! مجھے بتایا گیا تھا کہ آپ مولانا حسین احمد صاحب مدنیؒ کی توہین کرتے ہیں اس لئے میں نے آپ کو یہاں آنے سے روک دیا کیونکہ میں حضرت مدنیؒ کی توہین برداشت کر سکتا ہوں۔

دراصل میرے ایک محترم دوست نے مرحوم کو اس اُکذوبہ کا یقین دلایا تھا حالانکہ اپنے اساتذہ اور اکابر میں میری عقیدت حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ سے اتنی ہے کہ جب ان کا نام نامی اور اسم گرامی زبان پر آتا ہے یا کان میں پڑ جاتا ہے تو میں سمجھتا ہوں کہ میرا ایمان تازہ ہو گیا اور پورے بدن میں خوشی اور انبساط کی ایک لہر دوڑ نے لگتی ہے۔ بہر حال یہ تو جملہ معترضہ تھا۔ اصل واقعہ بیان کرنے سے میرا مقصد یہ ہے کہ سیاسی لحاظ سے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ کا اختلاف اور حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی حضرت تھانویؒ کے ساتھ ہر طرح کی وابستگی اور سب سے بڑھ کر بظاہر بڑی بات یہ کہ حضرت مدنیؒ کے دورِ صدارت میں حضرت مفتی صاحبؒ کو دار العلوم کی ملازمت میں کافی حد تک شکایات کا ہونا بھی ایک ناقابل انکار حقیقت ہے مگر قوت ایمانی اور علمی ربط و تعلق اور ایک جسم کے اکابر کا روحانی پاس خاطر کا یہ حال ہے کہ لطافت الرحمان پر حضرت مدنی کی توہین کے افترا و اتہام نے ان کو ان کے ایک معاملاتی طے کردہ فیصلہ کو منسوخ کرنے پر مجبور کر دیا۔

میں حضرت الاستاذ المرحوم قدس سرہٗ العزیز کے بے حد و کمالات میں اس کمال سے زیادہ متاثر ہوں کہ عظیم تر فقیہ و محدث، مفسر و متکلم، ادیب اریب، مفتی و مدرس ہونے کے علاوہ ان کے امتیازات میں ان کا اپنے ہم درس قاری محمد طیب صاحب طال بقاءہ کی طرح مجوّد قاری ہونا بھی تھا۔ نیز جہاں وہ علوم عربیہ ادبیہ کے امام تھے وہاں سلیس اور صحیح و فصیح عربی میں تحریر و تقریر بھی ان کا امتیازی کارنامہ تھا اور اگرچہ یہ صحیح ہے کہ ہمارے اکابر دیوبند بالعموم دیگر علوم سے وابستہ ہوتے ہوئے بھی عربی ادب اور عربی زبان میں تحریر و تقریر پر کامل دسترس کے حامل ہوا کرتے ہیں لیکن حضرت مفتی صاحب مرحوم اس بارہ میں بھی یگانہ روزگار

تھے اور وہی غالب والا معاملہ تھا۔ ؎

ہیں اور بھی دنیا میں سخن ور بہت اچھے - کہتے ہیں کہ غالب کا ہے انداز بیاں اور

میں ان کے انداز سخن میں کوئی عربی تصنیفات، تحریر و تقریر اور معاملات کا کوئی اقتباس نہیں ذکر کرتا ہوں بلکہ ذیل میں ان کے ایک خط بنام شیخ محمد ابراہیم مملکت سعودیہ سے تھوڑا سا نمونہ کلام پیش کرتا ہوں جس میں عربی جدید اور قدیم کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ختم ہے گویا ؎

ففی کل لفظ منہ روض من المنی　　وفی کل سطر منہ عقد من الدر

نمونہ کلام کا متن یہ ہے۔

ثم انہ لایخفی علی بصیر بحال المسلمین الیوم ما اصاب بہ شباب الامۃ والناشئین فی مختلف البلاد الاسلامیۃ من الوان الانحراف عن الاسلام والالحاد فی الدین والاستہانۃ بالشریعۃ واحکامہا حتی لقد ظہرت ہذہ الامراض فی قلب الازہر فی مصر وامتدت الی بلد اللہ الحرام ولا یرتاب ذو فکر ان ہذا امر لم یکن ولید المصادفۃ والاعتباط وانما ہو امر تقوم علیہ المؤسسات الاجنبیۃ والالحادیۃ فی بلاد الاسلام وغیرہا — (بحوالہ العرب ۱۰ صفر و محرم ۱۳۹۴ھ)

رہا مرحوم کے مرض وفات کے حالات، نماز جنازہ پر امام احمد ابن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کی طرح نماز جنازہ کی طرح مخلوق خدا کے بے پناہ ہجوم خاص طور پر قاری محمد طیب کا خواب وغیرہ وغیرہ تو ان تمام باتوں کیلئے مرحوم کے صاحبزادہ مولانا محمد ولی صاحب رازی کا بیان کافی شافی ہے۔ میں تو صرف یہی کہوں گا کہ جہاں بعض لوگوں کی زندگی بوجہ کسی مرغوبیت یا کمال یا آسودگی و خوشحالی کے قابل غبطہ ہوتی ہے وہاں ہمارے اکابر کی وفات پر بھی زیادہ تر رشک و غبطہ ہونا چاہیے جس کو دیکھ کر ہر باحس اور باذوق مسلمان کا جی چاہتا ہے کہ اس کی موت بھی اسی طرح واقع ہو مگر ؎

ایں سعادت بزور بازو نیست　　تا نہ بخشد خدائے بخشندہ۔

غرض یہ کہ حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی حیات و ممات مضمون حدیث اور شیخ سعدی رح کی اس وصیت کے عین مطابق تھی۔ شیخ صاحب کی وصیت یہ ہے ؎ آنچناں زی کہ وقت مردن تو۔ خلق گریہ کناں و تو خنداں

ہذا ما روت سطیرہ من کلمات الحزن والملال بوفات الاستاذ المکرم المفتی الاعظم الشیخ محمد شفیع علی اللہ درجتہ فی علیین وآواہ فی جوار رحمتہ وعنایتہ

O -

مولانا محمد حسین الخطیب
ناظم دارالعلوم ناگن اڑہ، کراچی

با اُصول زندگی

مفتی اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب نور اللہ مرقدہٗ اگرچہ اس کے محتاج نہیں ہیں کہ ان کی بلند و بالا شخصیت کسی تعارف کی محتاج ہو مگر ماہنامہ البلاغ کراچی جو حضرت رحمۃ اللہ علیہ کا لگایا ہوا ایک ایسا پودا ہے جو چمنستانِ دارالعلوم کراچی میں انشاء اللہ ہمیشہ ہمیشہ اپنی پُر بہار زندگی سے قارئین کرام کو قرآن و سنت اور اس کے ماننے والوں سے روشناس کراتا رہے گا۔ البلاغ نے حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی وفات پر اگرچہ ایک مبسوط نمبر شائع کیا تھا مگر دوبارہ ایک ضخیم نمبر شائع کرتے وقت مجھ سے بھی کچھ لکھنے کو کہا گیا ہے میں اپنی ضعیفی اور پیرانہ سالی کی اُس منزل تک پہنچا ہوا ہوں جہاں یادداشت بھی انسان کا ساتھ نہیں دیتی اس کے باوجود "نذرانہ عقیدت" کے طور پر کچھ لکھ رہا ہوں ؎ گر قبول اُفتد زہے عز و شرف ۔

حضرت قبلہؒ دیوبند جیسی عظیم بستی کے اُن چند درخشاں ستاروں میں شمار ہوتے ہیں جنہیں انگلیوں پہ گنا جاتا ہے شیوخ کی وہاں ایک بڑی برادری تھی جس میں دو خاندان صدیقی اور عثمانی ممتاز حیثیت رکھتے تھے اور محلہ بڑے بھائیاں میں آپ کا خاندان آباد تھا یہ محلہ بستی کے اُس آخری حصہ میں واقع تھا جس کے ملحق غیر مسلم برادری کا علاقہ شروع ہوتا تھا۔ حضرت کے والد ماجد حضرت مولانا محمد یٰسین صاحب مرحوم دارالعلوم کراچی کے ایک اعلیٰ درجے کے جگت اُستاد تھے کم از کم ایک دو نسل کے علماء نے اُن سے فارسی کی تدریس حاصل کی تھی وہ انتہائی سادہ زندگی گزارنے والے اور اہل باطن لوگوں میں شمار ہوتے تھے رُشد و ہدایت میں اُن کا خصوصی تعلق حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے تھا۔ دیوبند میں اگرچہ حضرت گنگوہیؒ سے تعلق رکھنے والے کئی حضرات موجود تھے مگر مولانا محمد یٰسین صاحب اور حافظ انوار الحق صاحب ۔ عرف حافظ کلّو حضرت گنگوہیؒ کے عشاق میں شمار ہوتے تھے اور مجذوبانہ درجے پر پہنچے ہوئے تھے ۔

یہ حسن اتفاق ہے کہ میرا تمام خاندان اگرچہ محلہ دلیوان میں آباد تھا جو شیخ زادوں کا ایک مضبوط قلعہ تھا مگر میرے دادا حاجی عبدالمومن صاحب مرحوم نے اپنی زندگی میں جو علیحدہ مکان بنالیا تھا، وہ بڑے بھائیوں کے محلے سے ملا ہوا تھا اور حضرت مفتی صاحب کے والد ماجد جس مسجد کے ایک حجرے میں اشغال واذکار کا وقت گذارتے تھے اس کا نام مسجد آدینہ عرف دینی مسجد تھا جو شاہی دور کی جامع مسجد تھی مسجد کے مغربی حصے میں دیوار سے ملحق ہمارا مکان تھا حضرت مفتی صاحب کے والد ماجد ذکر بالجہر کیا کرتے تھے اور وہ آواز ہمارے کمرے کی دیوار سے ٹکرا کر ہمارے کانوں تک پہنچتی تھی جس سے قلب پر چوٹ پڑ کر اثر بھی ہوتا تھا، اس کے علاوہ مولانا محمد یسین صاحب مرحوم اس قدر با اصول انسان تھے کہ ہمارے گھر والے جب مولانا مرحوم گلی سے گزرتے یا حجرے میں پہنچتے تو میری والدہ محترمہ فرمایا کرتی تھیں کہ اب یہ ٹائم ہوا ہے۔ میرے چچا مولانا محمد منعم صاحب مرحوم میرے ماموں مولانا محمد مسلم صاحب عثمانی مرحوم حضرت مفتی صاحب کے لنگوٹیا یار تھے جس کے دیکھنے کے کئی موقعے میری نظر سے گزر چکے تھے مگر میں نے قریب سے اس پورے خاندان کو اس وقت دیکھا جب فارسی کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے تیرہ سال کی عمر میں حفظ قرآن مجید کے بعد داخل ہوا تو حساب وکتاب مفتی صاحب مرحوم کے چچا مولانا منظور احمد صاحب مرحوم کے پاس اور فارسی کتب مفتی صاحب کے والد حضرت مولانا محمد یسین صاحب مرحوم کے پاس پڑھنے لگا تو چند روز کے بعد ہی مفتی صاحب کے والد نے مجھے اپنے گھر پر بچیوں کو قرآن پاک پڑھانے پر لگا دیا مدرسے کے فارغ اوقات میں مجھے یہ خدمت بھی انجام دینی پڑی تو ان کی گھریلو زندگی کا سامنا ہوا۔ اس زمانہ میں مجھے اندازہ ہوا کہ حضرت مولانا محمد یسین صاحب مرحوم چونکہ خود با اصول زندگی بسر فرماتے تھے تو انہوں نے گھر والوں کو بھی اس کا عادی بنا دیا تھا۔

مگر اس با اصول زندگی کی باقاعدہ تربیت اپنے اکلوتے فرزند ارجمند حضرت مفتی محمد شفیع صاحبؒ کو دی ۔ مسجد میں ساتھ لیجانا گھر پر ان سے کام کرانا تعلیم کے اوقات میں ساتھ لیجانا اور لانا۔ محنت ومشقت کا انہیں عادی بنانا خشیتِ الٰہی کے ساتھ ساتھ ذکرِ الٰہی کی حلاوت سے روشناس کرانا وغیرہ ایسے امور تھے جن کی وجہ سے یہ با اصول زندگی ہی حضرت مفتی صاحبؒ کی شخصیت کو دن بدن اجاگر کر رہی تھی مفتی صاحب کے والد بزرگوار خود بھی بعض کتابیں چھپوا کر فروخت کرتے تھے مگر جب مفتی صاحب کو یہ کام باقاعدہ کرایا تو میں نے دیکھا کہ کتابیں دہلی سے یا سہارنپور اور مطبع قاسمی دیوبند سے چھپوا کر لانا انہیں ترتیب سے الماریوں میں لگانا پھر ڈاک کا جواب دینا اور خود اپنے ہاتھ سے بنڈل تیار کر کے ڈاک خانہ میں لیجانا انہیں وی پی کرنا یہ تمام کام حضرت مفتی صاحبؒ

خود تنہا انجام دیتے تھے مفتی صاحبؒ کی محنت کا ثمرہ ترقی کر کے اُس مقام پر پہنچ گیا کہ گھر کے علاوہ دارالعلوم دیوبند کے احاطے میں وہ کمرہ بالائی نزد مسجد مدرسہ جس میں اُستاذ الاساتذہ شیخ الظاہر والباطن حضرت مولانا سید اصغر حسین رحمۃ اللہ علیہ دن میں اوقات فاضلہ کبھی کبھی گزارتے تھے اس میں بھی یہ مکتبہ قائم ہوگیا جس کی وجہ سے طلبہ اور اساتذہ کو حصول کتب میں آسانی ہوگئی۔ چونکہ حضرت مفتی صاحبؒ قولاً و فعلاً، امام ابوحنیفہؒ کے مقلد تھے یہی وجہ ہے کہ درس و تدریس کے علاوہ تجارت کے لیے وقت نکال لیا تھا اسی طرح سے مفتی صاحب مرحوم نے اپنے بچوں کو بھی کتب فروشی پر لگا دیا۔ جو آج بھی بڑے پیمانے پر پاکستان میں یہ کام کراچی اور لاہور میں انجام دے رہے ہیں۔ لیکن یہ سب کچھ بااصول زندگی گزارنے کا نتیجہ ہے۔ اسی اصول پسندی نے حضرت مفتی صاحبؒ کو علمی دنیا میں وہ بلند مقام عطا فرمایا جو آج سب کے سامنے ہے۔

حضرت مفتی صاحبؒ نے تدریس میں حضرت مولانا انور شاہ صاحبؒ اور مولانا اعزاز علی صاحبؒ سے خود کو وابستہ رکھا کبھی تلون مزاجی اپنا کر مختلف استادوں کی محفلوں میں نہ گئے باطنی تربیت کے لیے اگرچہ ۱۹۲۱ء عیسوی میں شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن رحمۃ اللہ علیہ سے تعلق قائم کیا۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ اُسی دن میرے برادر نسبتی مولانا قاری محمد طیب صاحب نے بھی شیخ الہندؒ سے مفتی صاحب کے ساتھ بیعت کی اور چند منٹ کے بعد میرے ختم و حفظ قرآن مجید کی رسم آمین حضرت شیخ الہندؒ نے ادا فرما کر میرے سر پر دست شفقت پھیرا اور دعا فرمائی کہ الٰہ العالمین مولوی محمد مبینؒ نے حفظ قرآن کرا دیا ہے مگر قرآن حکیم کی خدمت آپ اس سے لینے کی اسے توفیق بخشیں گے۔ حضرت شیخ الہند چند ماہ حیات رہے اور بعد میں ان دونوں دوستوں نے (مفتی صاحب اور مولانا محمد طیب صاحب) حکیم الامت مولانا اشرف علی صاحبؒ سے روحانی تربیت کا باقاعدہ اور سالہاسال خدمت میں رہ کر کام انجام دیا مفتی صاحبؒ کی اصول پسندی ہی وہ نمایاں خوبی تھی جس نے خانقاہ امدادیہ اشرفیہ تھانہ بھون میں انہیں اُس مقام تک پہنچا دیا جسے دیکھ کر دوسرے خانقاہی پسند علماء رشک کرتے تھے۔ فتویٰ نویسی کی طرف جب حضرت مفتی صاحب مرحوم کو توجہ ہوئی تو دارالعلوم دیوبند کے دارالافتاء میں عہدۂ مفتی پر حضرت مولانا عزیز الرحمٰن عثمانی مرحوم کام کر رہے تھے اور مفتی مسعود احمد صاحب نیابت کر رہے تھے۔ اور وہ علماء دیوبند میں علوم شریعت و طریقت کے بلند مقام پر فائز تھے سلسلۂ مجددیہ سے بھی انہیں نسبت حاصل تھی بڑے دبلے پتلے جسم کے ساتھ بڑا اعلیٰ و بلند دماغ رکھتے تھے فتاویٰ کا جواب ہندوستان بھر میں اُن سے بہتر دینے والا کوئی نہ تھا اُن کی موجودگی میں دوسرا نمبر حضرت مفتی کفایت اللہ

دہلویؒ کا شمار ہوتا ہے اتنا بلند مقام رکھنے والے مفتی اعظمؒ نے جب حضرت مفتی محمد شفیع صاحبؒ پر نظر ڈالی تو
اُن میں شریعت وطریقت کے جوہر چمکتے نظر آئے، برس ہا برس سے مفتی مسعود احمد مرحوم دیوبندی جن کا
خاندان حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن سے تعلق رکھتا تھا دار الافتاء میں کام کر رہے تھے مگر چند ہی برس میں
حضرت مفتی محمد شفیع صاحب نائب مفتی اور حضرت مفتی عزیز الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے وصال کے بعد
مفتی بنا دیے گئے اور پاکستان بننے کے بعد یہ جگہ خالی ہوئی تو یکے بعد دیگرے ہندوستان کے چیدہ چیدہ
علماء نے مفتی کے عہدہ پہ کام کیا مگر صحیح بات یہ ہے کہ ان دو بزرگوں کے بعد وہ جگہ پُر نہ ہو سکی۔ تحریک پاکستان
کے عروج کا زمانہ تھا کہ حضرت مفتی محمد شفیع صاحب مرحوم نے اس تحریک پر ایک جامع و مبسوط رسالہ تحریر
فرمایا جس نے ہندوستان کے مسلمانوں میں زندگی کی اسلامی لہر دوڑا دی اور پھر جب نوابزادہ لیاقت علی خاں مرحوم
بمقابلہ مولوی محمد احمد کاظمی مرحوم اسمبلی کی سیٹ پہ ہمارے ہی علاقوں سہارنپور، مظفر نگر، میرٹھ سے کھڑے ہوئے
تو حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور مہتمم دار العلوم دیوبند حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب مدظلہ نے
مسلم لیگ کی تائید میں ایک مشترکہ بیان کے ذریعے تحریک پاکستان کی حمایت کی جس کے نتیجے میں قائد ت
مرحوم کامیاب ہوئے اس نازک وقت میں دار العلوم دیوبند سے مسلم لیگ کی حمایت حاصل کرنا مشکل تھا۔ پھر حضرتؒ
نے کل ہند مرکزی جمعیت علماء اسلام کانفرنس منعقدہ بمبئی کے موقعہ پر جمعیت علماء اسلام کی رکنیت بھی قبول فرما
لی یہ پہلا موقعہ تھا کہ حضرتؒ نے سیاست کی خار دار وادی میں قدم رکھا اور میدان سیاست میں بھی بہترین
کام انجام دیا مگر یہ اقدام شیخ الاسلام حضرت علامہ شبیر احمد صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کی ہمراہی کی وجہ سے نہ
تھا بلکہ اسلامی اور ملکی مفاد کا جو تقاضا تھا اور جس کی اعانت حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ رحمۃ اللہ علیہ
فرما رہے تھے اُس نے ایسا کرنے پر مجبور کیا مگر میں اسے اصول پسندی سے تعبیر کرتا ہوں۔

حضرت مفتی صاحب مرحوم ایک با اصول انسان تھے ان کا یہ قیمتی اور گراں بہا جوہر گھر کی زندگی سے
لے کر بیرونی زندگی تک نمایاں ہو کر روز افزوں ترقی کرتا نظر آتا ہے اسی اصول پسندی نے مجھے حضرت کا ہمیشہ
گرویدہ بنائے رکھا۔ دار العلوم دیوبند سے تعلق خانقاہ تھانہ بھون سے وابستگی، کتابوں کی تجارت سے لگاؤ
پھر جمعیۃ علماء اسلام کے ساتھ لگاؤ، اور آخر میں پاکستان کے لیے اور اسلامی نظریات و افکار کو آئینی زندگی
میں پھلتا پھولتا دیکھنے کے لیے تعلیمات اسلامی بورڈ سے تعلق کے بعد کراچی میں دار العلوم دیوبند کے طرز پر
ایک دینی درسگاہ دار العلوم کراچی قائم کرنے تک ہر جگہ حضرتؒ کی اصول زندگی کار فرما نظر آتی ہے حضرتؒ

کی طبیعت میں اگرچہ محبت و مروت پائی جاتی تھی مگر یہ اس وقت تک کام آتی تھی جب تک اصولوں کو قربان نہ کیا جائے۔ فتویٰ نویسی میں بھی اس کا پوری طرح سے خیال رکھتے تھے اور اس کا بھی خیال رکھتے تھے کہ جدید امور پر نظر بھی ہو اور نئی نسل کو اس طرح سے سمجھایا جائے کہ اسلامی اصول بھی مجروح نہ ہوں اور جدید اذہان بھی اُسے قبول کر لیں۔ الحمدللہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ اس میں کامیاب و کامران رہے۔ اسی با اصول زندگی گذارنے کا یہ نتیجہ تھا کہ بہت سے لوگ پاکستان میں مختلف لبادے اوڑھ کر جائز و ناجائز مراعات حاصل کرنے کے لیے صاحبانِ اقتدار کی چوکھٹ پر آئے دن سر بسجود ہوتے رہتے مگر حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا ہر دور کے لوگوں نے صمیم قلب کے ساتھ احترام کیا اور ان کی دینی بصیرت کا کھلے بندوں اعتراف کیا۔

یہ اعتراف نہ صرف حضرت کی زندگی میں کیا گیا۔ بلکہ آج بھی عالم اسلام کے دین پسند طبقوں میں کیا جاتا ہے پاکستان میں ایسی بلند و بالا شخصیات بھی ہیں جن کے افکار و خیالات پر حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے دینی نقطہ نظر سے تنقید فرمائی جسے انہوں نے پسند نہ کرتے ہوئے کچھ بحثوں میں الجھانے کی کوشش کی مگر حضرت رحمۃ اللہ علیہ جس موقف کو قیامت تک رہنے والا دین الٰہی حق سمجھتے تھے اس پر قائم رہے۔ آج بھی حضرتؒ کی تصانیف اس بات کی شاہد ہیں۔

مختصر یہ ہے کہ ایک با اصول انسان جس طرح زندگی گذارتے ہوئے خدا کے سامنے سرخرو ہونے کی کوشش کرتا ہے حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اس کوشش میں کوئی دقیقہ نہیں چھوڑا حضرتؒ کی زندگی کے اصول بلاشبہ قرآن و سنت کی روشنی میں تفقہ فی الدین کے حامل تھے۔ اور یہ تفقہ فی الدین حضرت کی تحریروں اور ملفوظات میں نمایاں نظر آتا ہے۔ اور لوگوں کے اذہان و قلوب میں جاگزیں ہوتا نظر آتا ہے حضرت مفتی صاحبؒ اپنے عزیز و اقربا کی خاموش اعانت بھی فرمایا کرتے تھے اور اس سلسلے میں بھارت تک خبر گیری فرمایا کرتے تھے اور یہ سلسلہ غربا و مساکین اور بیواؤں تک پھیل گیا تھا۔ حضرتؒ اپنے ساتھ کام کرنے والوں پر مکمل اعتماد کے ساتھ بڑی گہری نظر سے اُن کی نگرانی بھی فرمایا کرتے تھے۔ حضرتؒ کو کبھی بھی جاہ و جلال کی خواہش نہیں ہوئی اس کے باوجود حق تعالیٰ نے بمصداق آیت الٰہی قُلْ اِنْ کُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰہَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْکُمُ اللّٰہُ۔ آپ کو جو اعزاز و مرتبہ عطا فرمایا وہ سب پر روشن ہے۔ ؎

خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہمیں بھی آپ کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق بخشیں۔ آمین۔

نمونۂ اسلاف

عَمّت فواضلہ فعمّ مُصابہ ۔۔۔ فالناس فیہ کلّھم ماجور
فالناس مأتمھم علیہ واحد ۔۔۔ فی کل دارٍ رنّۃٌ وزفیرٌ
عجبًا لاربع اذرُعٍ فی خمسۃٍ ۔۔۔ فی جوفھا جبلٌ اشمّ کبیر

حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو سفرِ آخرت پر روانہ ہوئے دوسال سے زیادہ کا عرصہ گذر چکا ہے مگر اس صدمۂ جانکاہ کی ٹیسیں دل ودماغ میں اب تک محسوس ہوتی رہتی ہیں اور معلوم نہیں کہ یہ کیفیت کب تک برقرار رہے گی۔ کون ہے جو دنیا میں پیدا ہوا اور کون ہے جسے یہاں سے جانا نہیں مگر اللہ کے کچھ مخصوص بندے ایسے ہوا کرتے ہیں، جن کی زندگی کے نقوش گہرے اور انمٹ ہوتے ہیں۔ ان کے دنیا سے چلے جانے کے بعد بھی ان کے نقوش واثرات سے ان کی زندگی کا شبہ ہوتا رہتا ہے۔

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

چنانچہ بہت روز تک تو عقل اور طبیعت کی کشمکش جاری رہی اور حضرت مفتی صاحب کی رحلت پر حواس کی عینی شہادت کے باوجود طبیعت آپ کے لئے انتقال اور وفات جیسے الفاظ کے استعمال سے نامانوس اور متوحش رہی۔ رہ رہ کر یہی خیال آتا کہ آپ ہم میں موجود ہیں اور بسا اوقات جب آپ کے کمرۂ ملاقات کی طرف سے گذر ہوتا تو خیال گذرتا کہ ابھی آپ سے ملاقات کا وقت نہیں ہوا اس لئے دروازہ بند ہے اور اگر کبھی دروازہ کھلا نظر پڑتا تو بے ساختہ ادھر قدم اٹھنے

لگتے۔ وقت گذرتا گیا اور رفتہ رفتہ عقل و شعور کے ساتھ طبیعت و قلب بھی آپ کی وفات اور جدائی کی تلخ حقیقت سے مانوس ہوتے چلے گئے ؎

وَلَخَيْرُ حَظِّكَ فِي الْمُصِيبَةِ أَنْ
يَلْقَاكَ عِنْدَ نُزُولِهَا الصَّبْرُ

حضرت مفتی اعظم رحمۃ اللہ علیہ کی عظیم شخصیت اس قدر جامع، مکمل، ہمہ گیر اور متنوع صفات فاضلہ کی حامل تھی کہ اس کے جمیع جوانب و اطراف کا استیعاب تو کجا اس کے بعض پہلوؤں پر بھی کما حقہٗ روشنی ڈالنا کسی ایک شخص کے بس کا کام نہیں۔ آپ کی ذات اور آپ کی حیات مبارکہ مکمل ایک قرن تھی جس کا ایک سرا اگر آج ہمارے سامنے سے گذرا ہے تو دوسرا سرا وہ ہے جو شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن صاحبؒ، ذہبی وقت حضرت علامہ انور شاہ کشمیری اور مجدد الملت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمہم اللہ تعالیٰ جیسے اکابر کے سامنے ابھرا تھا۔ آپ کی وفات سے برصغیر کے اکابر علماء و مشائخ اور ان کے عظیم کارناموں کی تاریخ کا ورق پلٹ گیا ہے جس کے آپ امین اور عینی شاہد تھے۔

بلاشبہ اس بات کی شدید ضرورت تھی کہ آپ کی وفات کے بعد باخبر اہل علم و قلم کے تعاون سے آپ کے عظیم علمی، عملی، تحقیقی اور اصلاحی کارناموں اور آپ کی زندگی کے دیگر گوشہ ہائے خدمت کو تاریخی شکل میں مرتب کر لیا جائے کہ یہ ہمارے ماضی کی شاندار یادداشت اور مستقبل میں آنے والی نسلوں کے لئے مشعل ہدایت ثابت ہوگی۔ اللہ تعالیٰ جزائے خیر دے مدیر البلاغ کو کہ انہوں نے باوجود اپنی گوناگوں مصروفیات کے اس عظیم کام کا بیڑا اٹھایا اور اندرون ملک و بیرون ملک حضرت مفتی صاحبؒ کے متعلقین و متوسلین اور دیگر مشاہیر اہل قلم کو اس کار سعید میں تعاون کی دعوت دی۔ مدیر البلاغ کی فرمائش اور اپنے دلی تقاضہ کی بناء پر بطور حصول سعادت احقر نے بھی چند سطریں سپرد قلم کردی ہیں جن میں نہ تو عظیم المرتبت، فقیہ ملت، شیخ طریقت حضرت مفتی اعظمؒ کی سوانح حیات کو سمونا ممکن ہے اور نہ ہی آپ کی زندگی کے علمی، عملی، تحقیقی یا اصلاحی کسی ایک ہی زاویۂ خدمت کو تمام نکھارنا آسان ہے۔ بس یہ عقیدت و عظمت اور محبت و اخلاص کے اس لطیف رشتہ کی چند منتشر یادیں اور غیر مربوط باتیں ہیں جن کی بساط میری زندگی کے اس بائیس ۲۲ سالہ عرصہ سے زیادہ پر پھیلی ہوئی ہے جو حضرت مفتی صاحب کی حیات میں دار العلوم کراچی سے بندہ کی وابستگی کی مدت ہے اور یہ یادیں

میری زندگی کا ایک قیمتی سرمایہ ہیں۔

حضرت مفتی صاحب کی سب سے پہلی زیارت ۱۹۵۲ء میں لاہور میں مجھے اس وقت حاصل ہوئی جب میں جامعہ اشرفیہ لاہور میں زیر تعلیم تھا۔ اس سے قبل آپ کے علمی، عملی، تحقیقی کمالات اور ملکی و ملی خدمات کا تذکرہ صرف سنا تھا جس سے غائبانہ طور پر قلب میں عقیدت و عظمت اور زیارت کا شوق پیدا ہوا۔ آپ کا اور حضرت مولانا مفتی محمد حسن صاحب امرتسری رحمۃ اللہ علیہ بانی جامعہ اشرفیہ لاہور کا تعلق خاطر اور باہمی روابط کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں تھی۔ خانقاہ اشرفیہ کے رشتہ سے ان حضرات میں گہری یکجہتی اور ہم آہنگی تھی۔ ملاقات کے وقت ان حضرات کی آپس کی اخلاص و محبت میں ڈوبی ہوئی سادہ اور بے تکلف گفتگو کے مناظر بڑے لذیذ اور عجیب ہوا کرتے تھے۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ ہر ایک دوسرے کے لئے بچھا جا رہا ہے اور دل و جان فرشِ راہ کر رہا ہے۔ گفتگو میں علمی مسائل و تحقیقات کا تذکرہ بھی ہوتا اور اکابر کے واقعات و لطائف بھی۔ اپنے ذاتی اور نجی مسائل پر مشورہ بھی ہوتا اور ملکی و ملی حالات پر تبصرہ بھی۔ غرض باہمی تعلق و اعتماد کے وہ متاثر کن مناظر سامنے آیا کرتے تھے جنہیں . . . . . . دیکھنے کے لئے آج نگاہیں ترستی ہیں۔ جامعہ اشرفیہ لاہور کے سالانہ جلسہ میں کراچی سے لاہور آنے اور وعظ فرمانے کا تو آپ کا معمول تھا ہی اس کے علاوہ بھی درمیانِ سال اگر آپ کا کبھی لاہور آنا ہوتا تو یہ ممکن نہیں تھا کہ حضرت مفتی محمد حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور اپنے رفیقِ قدیم استاذی حضرت مولانا ادریس صاحب کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ سے ملاقات کے لئے آپ جامعہ اشرفیہ میں تشریف نہ لائیں اور جامعہ میں آپ کا طلبا کے سامنے خطاب نہ ہو۔

۱۹۵۲ء میں ایسے ہی ایک موقعہ پر جب آپ کراچی سے لاہور تشریف لائے اور جامعہ میں آپ کا وعظ ہوا تو بندہ کو پہلی بار آپ کی زیارت، مصافحہ اور وعظ سننے کی سعادت نصیب ہوئی۔ اس روز آپ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث "نعمتان مغبون فیھما کثیر من الناس الصحۃ والفراغ" پڑھ کر طلبا کو خطاب فرمایا اور حدیث میں مذکور اللہ تعالیٰ کی دو عظیم نعمتوں صحت و فراغت کی قدر و منزلت اور اہمیت کو نہایت وضاحت و تفصیل سے ذکر کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس وقت تو اس حدیث کا مفہوم اور وعظ کی افادیت شاید اتنی سمجھ میں نہ آئی ہو جتنی آج ۲۰ سال گذرنے کے بعد علی وجہ البصیرت سمجھ میں آرہی ہے جبکہ صحت وقت معتاد سے قبل انحطاط پذیر

ہے اور فرصت و فراغت علائق و عوائق کی نذر ہو کر مفقود ہوتی جا رہی ہے، شاید حضرت مفتی صاحبؒ کا وہ وعظ آج ہی کے دن کے لئے پیشگی تذکیر تھی۔

تُبَيّن عقاب الامور اذا مضت
وتقبل اشباہاً علیک صدورہا

اس کے بعد بھی گاہ بگاہ حضرت مفتی صاحبؒ کی لاہور تشریف آوری پر زیارت ہوتی رہی اور ہر بار کچھ نہ کچھ پند و نصائح سننے کا موقعہ ملتا رہا حتی کہ ۱۳۷۴ھ میں جب کہ بندہ دورۂ حدیث شریف میں تھا اور جامعہ میں اس سال پہلی بار سالانہ تحریری امتحان کے تجربہ کی ناکامی کے بعد دوبارہ حسب سابق تقریری امتحان لیا جانا طے ہوا تو سالانہ امتحان کے لئے مشاہیر علما کو دعوت دی گئی جن میں حضرت میرک شاہ صاحب اور اچھو والے استاذ حضرت مولانا محمد صاحب بھی شامل تھے۔ حسن اتفاق سے ان ایام میں حضرت مفتی اعظم رحمۃ اللہ علیہ بھی کراچی سے لاہور آئے ہوئے تھے۔ مہتمم صاحب نے آپ کو بھی امتحان لینے کی دعوت دی اور بخاری شریف کا امتحان آپ کے سپرد کیا۔ آپ کا طریقۂ امتحان نہایت عجیب و منفرد اور اس وقت ہمارے لئے حیران کن تھا۔ آپ نے نہ طلبا کی قوت حافظہ کا امتحان لیا اور نہ فقہی مباحث و اختلافات اور اصولی و کلامی موشگافیوں سے زیادہ تعرض فرمایا بلکہ طلبا کو مہلت دے کر اس بات کا ٹھیک اندازہ لگایا کہ انہیں حدیث کے الفاظ و معانی کے صحیح فہم کے ساتھ ساتھ مزاج حدیث اور مقاصد حدیث کا کس قدر رشد حاصل ہوا اور اس سے کتنی مناسبت پیدا ہوئی۔ آپ کا امتحان دراصل طالب علم کی کتابی استعداد اور قوت مطالعہ کا امتحان ہوا کرتا تھا اس طرح آپ کے یہاں کسی طالبعلم کی کامیابی و ناکامی اور معیار کے اعلیٰ و ادنیٰ ہونے کا مدار بھی دیگر ممتحنین کے معتاد طریقہ سے مختلف تھا۔ ہمارے ایک رفیق جماعت مولانا محمد یعقوب صاحب جو فراغت تحصیل کے بعد سے ماشاء اللہ اب تک جامعہ ہی میں مدرس ہیں، ان سے دوران امتحان حضرت مفتی صاحبؒ نے کوئی بات دریافت فرمائی انہوں نے اپنی طبعی نیکی اور روایتی سادگی کے ساتھ بے تکلف کہا کہ حضرت مجھے یہ بات معلوم نہیں تو آپ بہت خوش ہوئے اور فرمایا کہ میں تمہاری اس بات پر ایک نمبر تمہیں زیادہ دیتا ہوں۔ چونکہ تم نے ایسی بات کہی جو اہل علم کے کہنے کی ہے مگر عام طور پر وہ نہیں کہتے اور باوجود کسی بات کے نہ جاننے کے اس کے بارے میں اپنا عالم ہونا ظاہر کرتے ہیں۔ حالانکہ اپنے جہل کا اعتراف بھی علم کا ایک حصہ ہے اور پھر امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا مقولہ سنایا کرتے فرمایا کرتے تھے "علموا اصحابکم قول لا ادری" اپنے

ساتھیوں کو لا ادری میں نہیں جانتا، کہنا بھی سکھاؤ۔

بخاری شریف جلد اول میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حلیہ شریفہ کی حدیث میں ایک لفظ ازھر اللون آیا تمام جماعت سے اس لفظ کے معنی دریافت فرمائے لیکن کسی نے دل لگتی بات نہ کہی آخر میں احقر سے دریافت فرمایا۔ میں نے اس کا ترجمہ کھلے ہوئے رنگ والے" کیا تو آپ بہت خوش ہوئے اور اسے مکرر ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ ہاں اس کے یہ معنی ہیں اور پھر پچاس نمبر دیئے۔ اگلے سال شعبان میں سالانہ جلسہ کے موقعہ پر سالہائے گزشتہ کے فارغ التحصیل طلبا کی دستار بندی کا جامعہ کی طرف سے اہتمام کیا گیا جس میں دیگر علماء کے علاوہ حضرت مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی رح اور حضرت مفتی اعظم رح بھی شریک ہوئے۔ فارغ شدہ طلبا کے سروں پر ان ہی دونوں بزرگوں نے اپنے ہاتھوں سے دستار بندی فرمائی بعض طلبا کو یہ سعادت حضرت مولانا عثمانی رح سے حاصل ہوئی اور بعض کو حضرت مفتی صاحب رح سے۔ الحمد للہ بندہ کو اپنا حصہ سعادت حضرت مفتی صاحب رح کے ہاتھوں میسر آیا۔ شاید یہ تکوینی اشارہ تھا کہ مستقبل میں خدمت دین کی راہ میں بھی مبارک ہاتھ میرے راہنما اور سرپرست ہوں گے چنانچہ بلا ظن و وہم من جانب اللہ ایسے اسباب پیدا ہوتے چلے گئے کہ فراغت کے تیسرے سال بندہ کا دارالعلوم کراچی سے تدریسی تعلق قائم ہو گیا اور اس طرح قریب رہ کر حضرت مفتی صاحب رح کی ذات گرامی اور آپ کی دینی خدمات اور عظیم خصوصیات کے مشاہدہ کا اللہ تعالیٰ نے موقع عطا فرمایا۔

آپ کے روحانی اور باطنی کمالات کا تو مجھ جیسا ناکارہ کیا اندازہ لگا سکتا تھا اور اس سے کیا بہرہ ور ہوتا میں تو اپنی بے بضاعتی اور محرومی کے باعث اس طویل مدت حاضری میں آپ کے علوم ظاہری اور کمالات حسی سے بھی کچھ استفادہ نہ کر سکا۔ البتہ حضرت مفتی صاحب رح کو اللہ تعالیٰ نے کچھ ایسی پرکشش خصوصیات عطا فرمائی تھیں جو دوسری جگہ خال خال ہی نظر پڑتی ہیں۔ ان خصوصیات کے سامنے بڑے سے بڑا علمی کمال بھی ہیچ ہے۔ شب و روز ان کا مشاہدہ ہوتا رہا اور دل و دماغ شعوری و غیر شعوری طور پر ان کا اثر لئے بغیر نہ رہا۔ اللہ کے بہت سے بندے ہیں جن کی زندگی میں انہی باتوں سے خوشگوار انقلاب آیا اور ان کا رنگ بدل کر کچھ سے کچھ ہو گیا۔

ان خصوصیات میں سے ایک بہت ممتاز اور نمایاں خصوصیت جس کا ہر شخص مشاہدہ کرتا اور متاثر ہوئے بغیر نہ رہتا آپ کی طبعی سادگی اور بے تکلف زندگی تھی۔ نہ پہننے اوڑھنے اور

کھانے پینے میں کوئی تکلف تھا اور نہ رہن سہن میں کوئی کرّ و فر، پہلی بار آپ سے ملنے والا شخص آپ کی سادگی اور تواضع و انکساری دیکھ کر دنگ رہ جاتا کہ اس نے جو کچھ دیکھا وہ مفتی اعظم کی اس خیالی صورت اور وضع قطع کے بالکل خلاف ہے جو وہ اپنے ذہن میں بسا کر لایا تھا۔ نہ یہاں جبّہ و دستار کا اہتمام تھا اور نہ گفتار و کردار میں کوئی تصنع و تکلف۔ ہر ایک کی ملاقات کے لئے دروازہ کھلا تھا۔ امیر و غریب کا کوئی امتیاز نہیں۔ سیدھی سادی گفتگو اور اخلاص و خیر خواہی میں ڈوبے ہوئے کلمات نصیحت۔ ہر آنے جانے والے سے خندہ پیشانی اور عاجزی سے پیش آنا، مسکرا کر بات کرنا، دوسرے کی بات کو پوری توجہ اور ہمدردی سے سننا، اگر کوئی حاجت مند ہے تو اس کی ضرورت کو پورا کرنے کی فکر کرنا، اس قدر علمی ثقاہت و فقاہت اور جلالت شان کے باوجود ہر بات سے فروتنی و انکساری کا ظہور، یہ وہ اوصاف و اخلاق تھے جو ہر ملنے والے کے قلب پر براہ راست اثر انداز ہوتے اور آپ کی برتری اور عظمت شان کا دل و دماغ پر گہرا نقش چھوڑتے۔ دنیا داروں کا تو کیا گلہ آج اکثر اہل دین اور بڑے بڑے علماء کے یہاں بھی ان محاسن کا فقدان ہے۔

حضرت مفتی صاحبؒ کی ایک عظیم خصوصیت جس کا قدم قدم پر مشاہدہ ہوتا اور اس کے فوائد و برکات کھلی آنکھوں نظر آتے وہ آپ کا طبعی اور مزاجی اعتدال تھا۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو ہر معاملہ میں خواہ وہ دین کا ہو یا دنیا کا، عبادات سے متعلق ہو یا معاملات سے، اپنا ہو یا غیروں کا ایسا حسن اعتدال اور رائے و عمل کی ایسی میانہ روش عطا فرمائی تھی کہ آج اس کی نظیر ڈھونڈنے سے بھی بمشکل ہاتھ آئے گی حتیٰ کہ کسی کی بڑی سے بڑی غلطی پر تنبیہ اور ناراضگی کے وقت یا کسی کے مستحسن عمل پر تحسین و ستائش کے موقعہ پر بھی پورا پورا اعتدال پیش نظر رہتا اور کسی حال افراط و تفریط کا معاملہ نہ فرماتے اگر کبھی کسی کمال یا خوبی پر کسی کی تعریف فرماتے تو ساتھ ہی اس کی کسی لغزش اور کوتاہی کی نشاندہی فرما کر اس کی اصلاح بھی کر دیتے اور اگر کسی سے اس کی غلطی پر مواخذہ فرماتے تو اس کے کسی پسندیدہ عمل کا ذکر کر کے اس کی تعریف و توصیف بھی فرما دیتے۔ نہ اس کو اتنا بڑھاتے کہ غرورِ نفس اور گھمنڈ میں مبتلا ہو جائے اور نہ اتنا گراتے کہ مایوسی اور بیزاری کی حد تک پہنچ جائے۔ ایک بار حقیر سے فرمایا کہ کسی سے بات کرتے وقت یہ دیکھنا چاہیے کہ اس کو کس چیز کی کتنی ضرورت ہے اسی کے مطابق وہ چیز گفتگو میں ڈالنی چاہیے محض اپنی طبیعت سے مغلوب ہو کر حد سے تجاوز نہ کرنا چاہیے۔

بسا اوقات دیکھنے میں آیا کہ کسی شخص کو اس کی کسی غلطی پر سخت سست فرمایا اور بقدر ضرورت تنبیہ کرنے کے بعد اگلے ہی لمحہ اس سے خندہ پیشانی اور مسکراہٹ کے ساتھ گفتگو فرمانے لگے مخاطب کی اصلاح کے ساتھ ساتھ اپنے نفس و طبیعت پر اس قدر غلبہ و اختیار اللہ کے صرف انہی بندوں کا خاصہ ہے جنہیں اپنے نفسانی جذبات اور عزت نفس سے زیادہ اللہ کی رضا محبوب و مطلوب ہوا کرتی ہے۔

حضرت مفتی صاحبؒ کا یہ وصف اعتدال آپ کی تقریر یا تحریر یا فتاویٰ اور تصانیف ہر ایک چیز میں نمایاں طور پر نظر آتا ہے۔ آپ کی کسی تحریر یا فتویٰ پر بڑے سے بڑا معاند بھی انگلی ٹیک کر یہ ثابت نہیں کر سکتا کہ آپ نے اس میں غلو سے کام لیا ہے۔ آپ کی تحریر و تقریر نہایت محتاط اور افراط و تفریط اور غیر ضروری مواد سے بالکل مبرا اور پاک ہوا کرتی تھی۔

ایک بار فرمایا کہ میں کوئی تحریر لکھتے وقت یہ بات پیشِ نظر رکھتا ہوں کہ ہو سکتا ہے کہ آگے چل کر کوئی اس کو شائع کر دے اس لئے اس کے عواقب پر پہلے ہی غور کر لیتا ہوں۔ امت مسلمہ کے مجموعی مصالح، ان کی دینی اور اخلاقی ضروریات، ان میں پیدا ہو کے والے مفاسد اور روزبروز ابھرنے والے فتن پر آپ کی گہری نظر رہتی اور ضرورت کے مطابق۔ تحریر و تقریر کے ساتھ کوئی مختصر یا مفصل تصنیف بھی فرما کر امت کی رہنمائی فرماتے رہتے۔ الفاظ و عبارت کی انتہائی موزونیت و اعتدال اور دل میں اتر جانے والی جچی تلی تعبیرات کے ساتھ ساتھ اُمّت مسلمہ کی دینی ضرورت کی تکمیل اور ان کی اصلاح و نصیحت کا پہلو ہمیشہ پیش نظر رہتا اور جو بات امّت کے لئے مفید و نافع اور موجب عبرت و نصیحت خیال فرماتے اس کو فوراً شائع کرا دیتے۔ اس میں زیادہ بسط و تفصیل اور استقصا و استیعاب کی فکر نہ فرماتے۔ چنانچہ آپ کے بعض رسائل ایسے بھی ہیں جو صرف کسی ایک ہی عبرت آموز واقعہ یا ولولہ انگیز نصیحت پر مشتمل ہیں۔ اگرچہ ان میں بظاہر اختصار ہے مگر وہ اپنی نافعیت اور عبرت آموزی کے لحاظ سے لمبی لمبی تصانیف پر بھاری ہیں۔

حضرت مفتی صاحبؒ کو اللہ تعالیٰ نے دین حنیف کی خدمت و رہنمائی کے لئے موفّق و منتخب فرمایا تھا اس لئے اس کی ترجمانی کا سلیقہ بھی ایسا حسین آپ کو عطا ہوا کہ شاید و باید واضح اور پروقار تعبیر، سنجیدہ اور متین اسلوب، ٹھوس اور مضبوط استدلال، نازک سے نازک موضوع کی کمال حزم و احتیاط اور لطیف ترین رعایتوں کے ساتھ بھرپور تحقیق آپ کی تصانیف کی نمایاں خصوصیات

ہیں۔ حضرت مفتی صاحبؒ کی مشہور اور لذیذ و عجیب تصنیف "مقام صحابہؓ" جب شائع ہو کر آئی تو میں گیا وہ کتاب اپنے ایک دوست کو جو اعلیٰ تعلیم یافتہ اور بڑے درجہ کے سرکاری افسر ہیں، پڑھنے کے لئے دی۔ مجھے معلوم تھا کہ ان کا ذہن دربارہ مشاجرات صحابہؓ کے بارے میں متوازن نہیں ہے مگر کتابیں پڑھنے کا ان کو ذوق و شوق ہے۔ انہوں نے اس کتاب کو توجہ سے پڑھا اور کہنے لگے کہ اس موضوع پر میں نے کئی کتابیں پڑھی ہیں اور مولانا مودودی صاحب کی کتاب بھی پڑھی ہے مگر ان سے مسئلہ سلجھانے کے اور الجھتا چلا گیا اور ذہنی خلش بڑھتی گئی۔ ایک طرف حضرات صحابہؓ کی عظمت شان کا احساس اور دوسری طرف ربط و یابس محض تاریخی روایات کی روشنی میں مشاجرات صحابہؓ کی تحقیق کے اثرات۔ کشمکش میں مبتلا تھا اور کسی بات پر دل نہیں جمتا تھا مگر مفتی صاحب کی کتاب مقام صحابہؓ پڑھ کر دل کا بوجھ اتر گیا اور یوں معلوم ہوا جیسے آنکھوں کے آگے سے پردہ ہٹ گیا ہو۔ حضرات صحابہؓ کا صحیح مقام، ان کی عظمت شان اور ان کے بارے میں حق و انصاف کی رائے کا صحیح اندازہ مجھے اس کتاب کے پڑھنے سے ہوا اور اب الحمد للہ دل مطمئن ہو گیا ہے۔

حضرت مفتی صاحبؒ کو اللہ تعالیٰ نے مزاج و طبیعت کی سلامتی و اعتدال اور انصاف و حق گوئی کا جو جوہر خاص عطا فرمایا تھا وہ آپ کے فتاویٰ میں بھی نمایاں طور پر نظر آتا ہے۔ مسئلہ خواہ کتنا ہی جذباتی ہو، سائل نے کتنی ہی اشتعال انگیز تحریر لکھی ہو اور عنوان و تعبیر کتنی ہی دل آویز اختیار کی ہو مگر ان تمام باتوں سے صرف نظر کر کے حدود شریعت کی پوری رعایت کے ساتھ معتدل انداز میں تحقیقی جواب دینا آپ کا امتیازی وصف تھا۔ گویا یوں معلوم ہوتا تھا کہ حق جل شانہ کا حکم ولا یجرمنکم شنآن قوم علیٰ ان لا تعدلوا اعدلوا ھو اقرب للتقویٰ۔ ہر وقت آپ کے پیش نظر رہتا ہے۔

۱۹۶۲ء میں جب پرویز کے ملحدانہ عقائد و نظریات کی بنیاد پر ملک اور بیرون ملک کے سینکڑوں علمائے متفقہ طور پر اس کے کفر کا فتویٰ دیا اور وہ چھپ کر شائع ہوا تو اس موقع پر پرویز نے حضرت مفتی صاحب سے اس فتویٰ کے سلسلہ میں خط و کتابت کی اور اس بات کا الزام لگایا کہ میری تحریروں سے قطع برید کر کے غلط طور پر ان عقائد و نظریات کی میری طرف نسبت کر دی گئی جن پر اس فتویٰ کا مدار ہے۔ اس کے جواب میں حضرت مفتی صاحب نے پرویز صاحب کو لکھا کہ "اگر آپ کسی ایسے اقتباس کی نشان دہی کریں، جو آپ کی طرف غلط منسوب کیا گیا ہے یا اقتباس ایسا ناقص اور ادھورا ہے کہ سیاق و سباق

سے ہٹ کر بالکل مختلف مفہوم پیدا کرتا ہے تو اس پر یقیناً غور کیا جائے گا اور اس کے نتیجہ میں اگر نفس فتویٰ پر کوئی اثر پڑتا ہے تو اس امر کی اشاعت بھی ضرور کی جائے گی یہ تھی خدا ترسی انسانی علم اور منصب افتاء کے حقوق کی رعایت، نہ جذبات سے مغلوبیت نہ مخالف سے ضد و عناد اور نہ اپنی کہی ہوئی بات کی پچ کر اس کو عزت نفس کا مسئلہ بنا لیا جائے۔

مگر حضرت مفتی صاحب کی اس مخلصانہ پیش کش کے باوجود پرویز صاحب ایسا کوئی حوالہ پیش نہ کر سکے جس میں بقول ان کے کوئی قطع و برید کی گئی ہو اور وہ پیش بھی کس طرح کر سکتے تھے جبکہ یہ فتویٰ سنی سنائی باتوں پر نہیں بلکہ ان کی کتابوں کے ہزار ہا صفحات کی چھان بین اور ایک ایک عبارت کے مفہوم میں غور و خوض کے بعد ان کی واضح تصریحات سے معلوم ہونے والے ملحدانہ عقائد اور گمراہ کن نظریات کی بنیاد پر مرتب کیا گیا تھا اور ملک و بیرون ملک کے سینکڑوں محققین علماء نے اس کے کفر و دجل پر مہر تصدیق ثبت کر دی تھی۔ ومن یضلل اللہ فلا ھادی لہ۔

حضرت مفتی صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے شروع ہی سے جن اساتذہ و مشائخ کی صحبت نصیب فرمائی تھی اور جن کے زیر سایہ اور زیر تربیت رہ کر آپ نے ظاہری و باطنی علوم و کمالات حاصل کئے تھے ان سب کے انفرادی اور مجموعی مزاج کا تقاضہ وہی رسوخ علم، سلامتی فکر، اصابت رائے اور اعتدال پسندی تھی جو حضرت مفتی صاحبؒ کے یہاں ہر چیز میں نمایاں نظر آتی ہے۔

فتویٰ نویسی کی ابتدائی تربیت آپ نے اپنے جلیل القدر استاذ مفتی اعظم ہند حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحب سے حاصل کی جو اس وقت دارالعلوم دیوبند کے صدر مفتی تھے اور عمر عزیز کے آخری لمحات تک اسی مقدس خدمت میں مشغول رہے اور سنا ہے کہ موت کے وقت بھی ایک فتویٰ ہاتھ میں تھا جو روح نکلنے کے بعد سینہ پر گر گیا۔ حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحبؒ کو افتاء میں جو خصوصی کمال اور ملکہ تامہ اللہ تعالیٰ نے عطا فرمایا تھا اس کی صحیح نیابت اور جانشینی کا حق اللہ تعالیٰ نے حضرت مفتی اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے ہاتھوں ادا کرایا۔ دارالعلوم دیوبند میں مسند افتاء پر باقاعدہ فائز ہونے کے بعد ۱۳۴۹ھ سے لے کر ۱۳۶۲ھ تک کی تیرہ سالہ مدت وابستگی میں آپ کے قلم سے تقریباً چالیس ہزار فتاویٰ صادر ہوئے جن میں سے ایک بہت مختصر سی تعداد امداد المفتیین کے نام سے فتاویٰ دارالعلوم دیوبند کا جزو بن کر شائع ہوئی اور باقی ذخیرہ غیر مطبوعہ رجسٹروں میں محفوظ ہے۔ اس

کے علاوہ پاکستان میں تشریف لانے کے بعد صرف ۱۳۷۱ھ سے ۱۳۸۰ھ تک کی آٹھ سالہ مدت میں دارالعلوم کراچی کے دارالافتا سے آپ نے ستر ہزار نو سو بارہ فتاوی تحریر فرمائے۔ اس کے بعد سفرِ آخرت کے دن تک کے تحریری اور زبانی فتووں کی تعداد اس کے علاوہ ہے۔

آپ کے ان عظیم الشان فتاوی میں صرف مستفتی کے سوال کا جواب ہی نہیں ملتا۔ قدم قدم پر علم و تحقیق اور فقاہت کے وہ جواہر پارے ہاتھ آتے ہیں جو آپ کی شبانہ روز عرق ریز محنت و جستجو اور سینکڑوں کتب کی ورق گردانی کا حاصل و خلاصہ ہیں جنہیں آپ نے امت کی دینی تسکین و طمانیت کے لئے سائل کے جواب میں ارزاں کر دیا ہے۔ بہت سے فتاوی تو ایسے ہیں جن کے مفصل و مبسوط جواب نے مستقل رسالہ کی صورت اختیار کر لی اور وہ مستقل طور پر بھی شائع ہو چکے ہیں۔ یہ وہ فیض اور صدقہ جاریہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے آپ کی ذاتِ گرامی کے لئے مقدر فرما دیا تھا اور زمانہ کی ہزار نیرنگیوں کے باوجود تادمِ واپسیں اس کا سلسلہ برقرار رہا۔ ایک بار آپ نے فرمایا کہ دینی خدمت کے میرے سامنے اور بھی طریقے اور راستے تھے لیکن میں نے فتوی کی خدمت کو اپنا مقصدِ زندگی سوچ سمجھ کر بنایا اس لئے کہ اس کا نفع نقد ہے اور دوسرے طریقوں میں ایسا نہیں۔ فرمایا کہ اگر کوئی شخص صرف تصنیف و تالیف کو اپنا مقصدِ زندگی بنا لے اور کتابیں لکھا کرے تو اس کا نفع مصنف کو اسی وقت حاصل ہوگا جب کوئی اس کی کتاب کو پڑھے گا اور اس پر عمل کرے گا اور معلوم نہیں کہ ایسا ہوگا بھی یا نہیں

حضرت مفتی صاحبؒ پر اللہ تعالیٰ کی بے شمار کرم نوازیاں تھیں۔ ان میں سے ایک خاص نوازش یہ تھی کہ آپ کو حق سبحانہٗ تعالیٰ نے شانِ محبوبیت عطا فرمائی تھی۔ آپ کے اساتذہ و مشائخ اکابر و اصاغر تلامذہ اور معاصرین و مریدین سب ہی آپ سے محبت رکھتے اور تعظیم و تکریم کا معاملہ کرتے تھے حتی کہ آپ سے نظریاتی اختلاف رکھنے والے اہلِ علم بھی آپ کا نام عزت و احترام سے لیتے اور آپ کے محاسن و کمالات کی تعریف کرتے۔ مجھے کئی ایسے آدمی ملے جن کی حضرت مفتی صاحب سے کبھی بالمشافہ ملاقات نہیں ہوئی۔ انہوں نے صرف آپ کی تحریرات پڑھیں یا نام سنا یا کسی سے آپ کے اوصاف و خصائل کا تذکرہ سنا وہ بھی جب حضرت مفتی صاحب کا ذکر کرتے تو معلوم ہوتا کہ ان کے دلوں پر آپ کی عظمت و محبت اور علمی وجاہت و ثقاہت کی گہری چھاپ موجود ہے ؎

ویثنی علیک لسان من لم تولہ
خیراً لانک بالثناء جدیر

اللہ تعالیٰ کی سنت ہے کہ وہ جب اپنے کسی بندے کو محبوب رکھتے ہیں تو اس کی محبت وعظمت دوسرے بندوں کے دلوں میں ڈال دیتے ہیں سو درحقیقت یہ اس علم وعمل، تقویٰ وطہارت اور اخلاص وسادگی کی محبت وعقیدت ہے جو حضرت مفتی صاحبؒ کی ذات گرامی کا نمایاں جوہر تھا اور جس کا عوام وخواص سب ہی اعتراف کرتے ہیں۔

حضرت مفتی صاحبؒ جس گھرانے میں پیدا ہوئے اور جس ماحول میں ہوش سنبھالا وہاں شروع ہی سے علم وعمل کا چرچا، بزرگوں کے واقعات، اللہ ورسول کا ذکر اور تقویٰ وطہارت کی باتیں آپ کے کانوں میں پڑیں۔

آپ کے والد ماجد حضرت مولانا محمد یٰسین صاحبؒ، قطب الارشاد حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے مرید خاص اور ان سے والہانہ عقیدت رکھنے والے بزرگ تھے۔ ان کی زبانی خوف خدا، فکر آخرت اور حضرت گنگوہیؒ کی تعلیم وتربیت کے تذکرے صبح وشام سننے میں آتے رہے اور آپ کا نوخیز شستہ ذہن وقلب گھر کے پاکیزہ ماحول کے رنگ میں رنگتا چلا گیا۔ عبادات کا ذوق واہتمام، منکرات ولایعنی امور سے اجتناب، علم کا شوق، نیکی کی رغبت امزاج اور طبیعت ثانیہ بن گئی۔ جب تحصیل علم کا مرحلہ آیا، تو قسمت سے اللہ تعالیٰ نے اساتذہ بھی ایسے میسر فرما دیئے جو ایک طرف آسمان علم وفضل کے آفتاب وماہتاب تھے تو دوسری طرف میدان تقویٰ وورع اور زہد وریاضت کے شہسوار وعلمبردار، ذہبی وقت علامہ انور شاہ صاحب کشمیری، فقیہ امت حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحب، جنید عصر حضرت مولانا میاں اصغر حسین صاحب، رازی زماں حضرت مولانا رسول خاں صاحب، شیخ الاسلام حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی اور شیخ الفقہ والادب حضرت مولانا اعزاز علی صاحب رحمہم اللہ تعالیٰ اجمعین جیسے اساطین علم کی علمی، عملی اور روحانی واخلاقی تربیت کیا کچھ کم تھی کہ مقدر نے اور یاوری کی اور اصلاح باطن وتزکیہ نفس کے مزید شوق نے کشاں کشاں آپ کو مجدد ملت حضرت مولانا اشرف علی صاحب قدس سرہٗ کی خدمت میں پہنچا دیا۔

حضرت تھانویؒ کی غایت شفقت، کمال توجہ اور خصوصی نظر عنایات نے رسوخ علم وعمل اور ذوق تحقیق وتدقیق کے ساتھ ساتھ ساز دل اور سوز دروں کی لذت سے بھی آشنا کر دیا اور پھر اس کا ایسا چسکہ لگا کہ اپنے شیخ کی حسب اجازت، مادر علمی دارالعلوم دیوبند سے ضابطہ کا تعلق منقطع کر کے خانقاہ اشرفیہ ہی کے ہو رہے اور پھر اکثر وبیشتر وقت دیوبند کی بجائے تھانہ بھون ہی میں گذرنے لگا۔

اس صدی میں اللہ تعالیٰ نے حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہٗ کی ذات کو تشریح
دین اور احیا سنت کے لئے منتخب فرما لیا تھا۔ آپ کی تنہا ذات سے اللہ تعالیٰ نے دین کا وہ عظیم الشان
کام لیا جو بڑی بڑی جماعتیں اور انجمنیں مل کر بھی انجام نہیں دے سکتی تھیں۔ آپ کی ذات شریعت و
طریقت کا حسین امتزاج اور علوم ظاہر و باطن کا مجمع البحرین تھی۔ شریعت مطہرہ کے حقیقی خطوط و خدو
کی نشان دہی اور ان کا تحفظ، دین و شریعت کے نام پر ابھرنے والے منکرات و بدعات کا انسداد و ازالہ
مفاسد امت کی اصلاح، غوامض شریعت کا بیان اور ان کی لطیف توجیہات، نوازل اور حوادث
مسائل کی بلند پایہ تحقیقات اور شریعت حقہ کی روشنی میں ان کا قابل عمل حل، جدید اذہان میں کھٹکنے
والے شبہات کے اصل سبب و منشا کا تعین اور ان کا شافی جواب، اطراف عالم سے آنے والے
ہزارہا مسائل و فتاویٰ کی فقیہانہ تحقیقات، زبان گہر بار سے نکلنے والے بے شمار کلمات حکمت اور
علمی، عملی، اخلاقی، اصلاحی موضوعات پر سینکڑوں ایسے عجیب و غریب الہامی مواعظ جن میں
سے ہر ایک مستقل تصنیف کے درجہ میں ہے۔ یہ سب آپ کی عظیم الشان مجددانہ خدمات کا ایک
رخ ہے جس کا تعلق ظاہر شریعت سے ہے۔ اس کے علاوہ آپ کی وہ خدمات جلیلہ جو آپ نے
طریقت و سلوک اور تصوف کے میدان میں انجام دیں۔ اس صدی کا ایسا منفرد اور منفرد کارنامہ ہے
جو بلا شبہ ایک مجدد ہی انجام دے سکتا ہے۔ کسی دوسرے کے بس کا کام نہیں۔

آپ نے اس آخری دور میں جس طرح منکرات و بدعات اور رسوم باطلہ کے غبار سے دھندلائے
ہوئے شریعت کے خط و خال کو نکھار کر امت کے سامنے پیش فرمایا اور دین کے نام پر پیدا ہونے
والے ہر فساد و بگاڑ کے راستوں کی نشان دہی کی۔ اسی طرح آپ نے تصوف و سلوک کی اصلی حقیقت
پر پڑے ہوئے رسوم کہنہ کے دبیز پردوں کو چاک کر کے احیا طریقت اور تجدید تصوف کا عظیم الشان
کارنامہ انجام دیا۔ تصوف اور سلوک کے نام سے جو رسوم جاہلیت اور منکرات و خرافات امت
میں نفوذ کرتی جا رہی تھیں ان پر آپ نے قدغن لگائی اور طریقت و تصوف کا جو مفہوم اہل دجل
و تلبیس اور نام نہاد صوفیوں نے مشہور کر رکھا تھا اس کا طلسم توڑ کر اصل حقیقت سے امت کو
روشناس کرایا۔ تصوف کی وہ دقیق اور غامض اصطلاحات جن کا سمجھنا بھی عام طور پر لوگوں کے لئے
آسان نہیں تھا چہ جائے کہ ان کی حقیقت تک رسائی حاصل کر کے ان پر ہر کوئی عمل کی ہمت کرتا

آپ نے سیدھی سادی زبان میں ان کا عام فہم مفہوم بیان کرکے واضح کردیا کہ تصوف کوئی ایسی متاع مخصوص نہیں جس پر کسی ایک گروہ کی اجارہ داری ہو یا کوئی ایسا راز سربستہ نہیں جس کا سمجھنا سمجھانا اور اس پر عمل کرنا ناممکن ہو اسینکڑوں عوام وخواص کے تزکیۂ نفوس اور اصلاح باطن کی عملی تربیت ومشق کا فیض جو آپ کی آخیر حیات تک خانقاہ اشرفیہ سے جاری رہا اس سے جاہل صوفیوں کے اس دعوی کو بھی یکسر باطل کردیا کہ شریعت وطریقت دو جدا جدا چیزیں ہیں اور طریقت کی راہ پر چلنے والے کے لئے ظاہر شریعت کی پابندی لازمی نہیں۔ یہ ایک ایسا فریب اور دھوکہ ہے جس میں بعض اچھے خاصے اہل علم وفہم بھی مبتلا پائے جاتے ہیں۔ ان کی نظر میں تصوف کا مفہوم صرف یہ ہے کہ آدمی چند خود ساختہ دل پسند رسوم کو اپنا کر دین وشریعت سے بالکل بے گانہ وآزاد ہو جاتے۔ لبادۂ تصوف اوڑھ کر حرص و ہوی اور نفس پرستی کے لئے جو دل چاہے کرتا پھرے۔ اپنے کو احکام شریعت سے بھی مستثنیٰ سمجھے اور خوف خدا وفکر آخرت سے بھی بے نیاز یہ وہ جاہلانہ اور کاروباری قسم کا تصوف ہے جس کی اونچی اونچی دکانیں آج بھی جابجا سجی ہوئی نظر آتی ہیں اور اس کی گرم بازاری کا تمام تر سہرا ان جاہل اور بے عقل لوگوں کے سر ہے جن کے یہاں ان پیشہ ور نام نہاد صوفیوں کی من گھڑت رسوم ہی سارے دین کا خلاصہ اور ان کی عیارانہ شعبدہ بازیاں بڑی کرامات شمار ہوتی ہیں اور انہی بیہودہ خرافات کے سہارے یہ لوگ تقرب الٰہی اور حصول جنت کے خواب دیکھتے ہیں۔ حضرت تھانویؒ نے اس مکروفریب کا پردہ چاک کرکے روز روشن کی طرح واضح کردیا کہ طریقت وتصوف شریعت سے علیحدہ کوئی چیز نہیں بلکہ احکام شریعت کی تمرین اور عملی صورت ہی کا نام تصوف ہے جو تصوف حدود شریعت سے خارج یا احکام شریعت کے منافی ومعارض ہو وہ تصوف نہیں بلکہ شیطانی دجل وتلبیس ہے۔ ظاہر شریعت کی پابندی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سُنّت کی اتباع حقیقی تصوف کی جان اور اس کی اصل پہچان ہے۔

طریقت وسلوک اور تقوی وطہارت کا مفہوم جبکہ عام طور پر چند اوراد وظائف اور تسبیحات و مراقبات میں منحصر سمجھ لیا گیا تھا، جس کے بعد نہ دیگر حقوق اللہ کے اہتمام کی ضرورت محسوس ہوتی تھی اور نہ حقوق العباد کی پرواہ، آداب معاشرت، اخلاق ومعاملات کا تو دین سے کوئی تعلق ہی نہیں سمجھا جاتا تھا جس کی کوئی فکر ہو۔ اس وقت حضرت تھانویؒ کے یہاں اس کے برعکس حقوق ومعاملات اور

اخلاق وآداب پر زیادہ توجہ دی جاتی تھی کہ عوام تو کیا اکثر اہلِ علم اور بیشتر حضرات صوفیا کے یہاں بھی یہ چیزیں شریعت منسوخہ کی مانند بن چکی تھیں۔ مگر اس کے ساتھ ذکر و تسبیح اور دیگر معمولات وظائف سے بھی ذرا غفلت گوارا نہ تھی کہ اصلاحِ باطن اور تزکیہ روح و نفس کے لئے ذکر اللہ سے بڑھ کر دوسری کوئی چیز مؤثر نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ فیض یافتگان تھانہ بھون میں آج بھی معمولات کا نظم و ضبط، ادائیگی حقوق کا اہتمام اور صفائی معاملات کا التزام ان کا طرۂ امتیاز ہے جو شریعت و طریقت کی اصل روح اور تقویٰ کا حاصل ہے۔

وہ گروہِ بادہ نوشانِ معرفت جس نے برسوں خانقاہ تھانہ بھون میں حاضر رہ کر جرعہ کشی کی اور جو شریعت ظاہرہ میں کمالِ حذاقت کے ساتھ ساتھ اسرارِ طریقت و رموزِ معرفت کی عقدہ کشائی میں لگا رہا اس گروہ کا ایک رکن رکین اور فرد ممتاز حضرت مفتی اعظم کی ذاتِ گرامی تھی جو نہ صرف یہ کر برسہا برس خانقاہ تھانہ بھون سے منسلک رہے بلکہ علمی، فقہی اور تحقیقاتی کاموں میں حضرت تھانویؒ کے معتمد خاص اور دست و بازو بنے رہے۔ آپ کو حضرت تھانویؒ کی خصوصی شفقت و عنایات اور تعلق خاطر سے حصہ وافر بھی اللہ تعالیٰ نے عطا فرمایا تھا جس کی برکات یہ تھیں کہ آپ کی پوری زندگی علم و عمل، تقویٰ و ورع، حسن اخلاق و معاملات اور زہد و قناعت کا نمونہ بنی رہی اور آپ کی زندگی کے ہر ایک پہلو میں خانقاہی تعلیم و تربیت کا رنگ نمایاں طور پر جھلکتا نظر آتا رہا۔

آپ اپنے دینی، دنیوی تمام کاموں میں حضرت تھانویؒ کی ہدایات و ارشادات کو مشعل راہ بناتے اور اپنے متعلقین و متوسلین اور رفقاء و احباب کو بھی اس کے مطابق عمل کرنے کی ترغیب دیتے اور جب کسی زیر غور مسئلہ میں حضرت تھانویؒ کی رائے، مشورہ یا نصیحت سامنے آجاتی تو بلا تامل اس کو اختیار فرما لیتے اور اس پر قلب منشرح ہو جاتا۔ حقیقت یہ ہے کہ حضرت تھانویؒ کو اللہ تعالیٰ نے حکیم الامت بنایا تھا۔ آپ نے اپنی بصیرت ایمانی، نورِ علم، نورِ تقویٰ اور تجربات مدینہ کی روشنی میں ایسے جامع اصول مقرر فرمائے جن کی نافعیت وافادیت قدم قدم پر کھلی آنکھوں نظر آتی ہے۔ فرحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃً واسعۃً۔

حضرت مفتی صاحب رحمہ اللہ علیہ حضرت تھانوی قدس سرہٗ کے اجل خلفاء میں سے تھے۔ آپ کی مجالس وعظ و نصیحت بڑی پر درد اور پر تاثیر ہوا کرتی تھیں۔ ان میں جہاں عالمانہ حقائق، عارفانہ نکات اور ہمدردی و خیر خواہی میں ڈوبے ہوئے کلمات نصیحت سیدھے سادے انداز میں ہوتے [illegible] کی طرح

بکھیرے جاتے رہیں ایک بہت بڑا خزینہ ان کلمات حکمت اور ارشادات و ملفوظات کا بھی ہوتا جو آپ نے اپنے اساتذہ و مشائخ اور دیگر اکابر اہل علم سے سنے تھے اور سینہ بسینہ منتقل ہوتے چلے آرہے تھے ان میں زیادہ تر حصہ ان ملفوظات و واقعات کا تھا جو حضرت تھانویؒ کے واسطے سے آپ کو پہنچے تھے۔ علم و حکمت کا یہ عظیم الشان ذخیرہ اب نہ کتابوں سے حاصل ہو سکتا ہے اور نہ ذاتی محنت و ریاضت سے۔ یہ اکابر اساتذہ و شیوخ کی زندگی کا انمول جوہر و خلاصہ اور ان کے وسیع علمی، عملی تجربات کا نچوڑ تھا جو ان حضرات کی طویل صحبتوں کی برکت سے بے مول آپ کے ہاتھ آیا۔ افسوس ہے کہ آج اس سرمایہ کا امین و محافظ بھی ہم میں نہ رہا اور آپ کی حیات میں اس کو کما حقہ محفوظ کرنے کی بھی کسی نے کوشش نہ کی ؎

واۓ ناکامی متاع کارواں جاتا رہا

کارواں کے دل سے احساس زیاں جاتا رہا

یوں تو حضرت مفتی صاحبؒ کے اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے بے شمار باقیات صالحات اور صدقات جاریہ آپ کے بعد دنیا میں موجود ہیں، جن کا فیض انشاء اللہ تعالیٰ قیامت تک جاری رہے گا۔ مگر ان میں ایک عظیم الشان صدقہ جاریہ اور سرچشمہ طاہرہ، کتاب و سنت اور علوم شریعت مطہرہ کی عظیم الشان درسگاہ دارالعلوم کراچی ہے جو آپ کی علمی خواہشات اور دینی و روحانی تمناؤں کا محور رہی ہے۔

• قیام پاکستان سے آٹھ ماہ بعد ۱۹۴۸ء میں

جب مفتی اعظم رحمۃ اللہ علیہ مستقل قیام کی نیت سے پاکستان پہنچے اور اپنی سکونت کے لئے شہر کراچی کو منتخب فرمایا تو آپ کے سامنے بھی یہی دو مسئلے سب سے اہم تھے۔ ایک پاکستان میں اسلامی نظام کا جلد از جلد نفاذ اور دوسرے علوم اسلامیہ کی معیاری اور مرکزی درسگاہ کا قیام۔ جہاں تک پاکستان میں اسلامی نظام کے لئے آپ کی انتھک مخلصانہ محنتوں اور کوششوں کا تعلق ہے اس کے بارے میں اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ اگر اس وقت کے ارباب حکومت اسلامی نظام کے حق میں مخلص ہوتے تو بلاشبہ آپ کی ان کوششوں کے نتیجہ میں اسی وقت اسلامی نظام پاکستان میں قائم ہو چکا ہوتا۔ اس کے بعد اسلامی نظام کے لئے نہ ویسا سازگار ماحول دیکھنے میں آیا اور نہ ویسی جد و جہد اور جذبہ ایثار و قربانی نصیب ہوا۔ گو اللہ تعالیٰ ہر وقت ہر چیز پر قادر ہیں۔ لعل اللہ یحدث بعد ذالک امرا

دوسری اہم چیز جو اس وقت حضرت مفتی صاحبؒ کے پیش نظر تھی وہ کراچی شہر میں ایک مرکزی دینی درسگاہ کا قیام تھا۔ دوسرے شہروں میں اگرچہ چھوٹے بڑے متعدد مدارس دینیہ قائم ہو چکے تھے

مگر ملک کا سب سے بڑا شہر اور مرکزی مقام ہنوز کسی قابل ذکر معیاری درسگاہ سے خالی تھا۔ نئی جگہ، نیا ماحول، بے سروسامانی کا عالم اس حال میں شوال ۱۳۷۰ھ میں حضرت مفتی اعظم ؒ نے کراچی شہر کے محلہ نانک واڑہ کی ایک مختصر سی عمارت میں اللہ کے نام پر دارالعلوم کراچی کی بنیاد ڈالی اور اپنے شب و روز اس کی ظاہری و معنوی ترقی کے لئے وقف فرما دیئے۔ ادھر دارالعلوم کا انتظام و انصرام ادھر اسلامی نظام کے لئے عملی جدوجہد، ملکی سیاست میں علماء کی نمائندگی اسلامی دستوری خاکہ تیار کرنے کے لئے اسلامی مشاورتی بورڈ کے رکن ہونے کی حیثیت سے اس کے فرائض منصبی کی ادائیگی، اندرون ملک اور بیرون ملک سے آنے والے سینکڑوں فتاویٰ کے جوابات اور اس کے ساتھ ساتھ دارالعلوم میں خود درس حدیث کی پابندی، غرض اسی قسم کی متعدد اور متنوع اہم ذمہ داریاں بے وقت اپنے اوپر لے کر آپ اس کام کے لئے وقف ہو گئے جس کے لئے اللہ تعالیٰ نے آپ کو شروع ہی سے منتخب فرما لیا تھا اور جس کی تکمیل کے لئے آپ وطن مالوف سے ہجرت کر کے پاکستان پہنچے تھے۔

جس زمانہ میں شہر سے بارہ میل دور دارالعلوم تک پہنچنا ایک صبر آزما مسئلہ تھا۔ ناپختہ اور دشوار گذار راستہ، تکلیف دہ سفر۔ حضرت مفتی صاحب ؒ اس وقت اپنی گوناں گوں مصروفیات کے باوجود سفر کی مشقتیں جھیلتے ہوئے دارالعلوم تشریف لاتے اور بنفس نفیس یہاں کے مسائل کا جائزہ لیتے اور تمام امور کی نگرانی فرماتے۔ گاہ بگاہ شب میں بھی یہیں قیام فرماتے۔ کچھ عرصہ تک تو دارالعلوم کی نگرانی کے لئے آپ کی شہر سے آمدورفت کا سلسلہ جاری رہا۔ اس کے بعد آپ نے اپنی شہر کی آرام دہ رہائش گاہ کو چھوڑ کر مستقل طور پر دارالعلوم کورنگی میں سکونت اختیار فرمائی تاکہ دارالعلوم کے تعلیمی اور انتظامی امور کی طرف ہر وقت توجہ اور نگرانی آسان ہو۔ حضرت مفتی صاحب کے یہاں قیام سے اس ماحول میں خاص قسم کی برکات محسوس ہونے لگیں۔ ہر شخص اپنے اندر طلب علم و خدمت دین کی نئی لگن اور جوش و ولولہ محسوس کرتا۔ کسی بھی دشواری یا پریشانی کے وقت حضرت مفتی صاحب کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنی مشکل کا حل اور دل کا سکون و اطمینان حاصل کر لیتا۔ ؎

اے لقائے تو جواب ہر سوال
مشکل از تو حل شود بے قیل و قال

حضرت مفتی صاحب ؒ کی زندگی کا سب سے بڑا اور اہم مقصد علم دین کی خدمت اور قرآن و حدیث

کی تعلیم وتدریس اور نشر واشاعت تھا، اور اسی مقصد کی تکمیل کے لئے آپ نے دار العلوم کراچی کی تاسیس فرمائی۔ اس لئے تمام امنگوں اور دلچسپیوں کا محور یہی دار العلوم اور دار العلوم کے اساتذہ و متعلقین ہی بن کر رہ گئے تھے۔ آپ فرمایا کرتے تھے کہ میں نے اپنی عمر کا وہ حصہ دار العلوم میں لگایا ہے جو میری زندگی کا سب سے قیمتی زمانہ ہے اور یہ سب کچھ اس لئے کیا گیا ہے کہ یہاں سے کچھ اللہ کا نام لینے والے اور اس کا دین پھیلانے والے پیدا ہوں۔ چنانچہ دار العلوم کے اساتذہ، طلباء، ملازمین اور متعلقین ہر ایک فرد کے ساتھ آپ کا معاملہ نہایت ہمدردی و خیر خواہی اور پدرانہ شفقت و رحمت کا تھا کبھی کسی کے ساتھ نرا ضابطہ کا معاملہ نہ فرماتے بلکہ ہمیشہ مروت اور رابطہ کا تعلق ضابطہ پر غالب رہتا۔ بڑی سے بڑی غلطی اور کوتاہی پر عفو و درگذر اور نصیحت و رواداری سے کام لیتے۔ یہی وجہ تھی کہ ہر شخص کا دل آپ کی محبت اور عظمت و احترام سے لبریز تھا۔

ایام صحت میں حضرت مفتی صاحب کا معمول تھا کہ ہفتہ میں ایک بار طلبا کو جمع کر کے ان سے خطاب فرماتے۔ یہ معمول عرصہ دراز تک پابندی سے جاری رہا۔ اس خطاب میں طلباء اور اہل علم سے متعلق مضامین کا بیان ہوتا، طلبا کے لئے پند و نصائح ہوتیں جن سے ان میں علم و عمل کا جوش و ولولہ اور نئی لگن پیدا ہو جاتی۔ اسی طرح ہر پنج شنبہ کو حضرات اساتذہ کے لئے خصوصی مجلس ہوتی، جس میں علمی مذاکرہ ہوتا اور اکابر کے ملفوظات و واقعات بیان ہوتے، اس کے علاوہ ہر اتوار کو عام مجلس ہوتی جس میں مقامی لوگ اور شہر سے آنے والے حضرات شرکت کرتے اور آپ کے ملفوظات سے مستفید ہوتے۔ یہ آپ کا ایسا فیض جاری تھا جس کا نفع اور انوار و برکات ہر دل و دماغ محسوس کرتا۔

آپ پر تین مرتبہ عارضہ قلب کا شدید حملہ ہوا۔ پہلی دو بار آپ چند روز ہسپتال میں رہ کر رو بصحت ہو کر تشریف لے آئے۔ اس عرصہ میں بھی انتہائی ضعف و نقاہت اور معالجین کی پابندی کے باوجود آپ کے اکثر معمولات جاری رہے۔ آپ پر اللہ تعالیٰ کا یہ خاص فضل و کرم تھا کہ آپ کو اپنے پھیلے ہوئے منتشر اور متنوع کاموں کو سمیٹنے اور ان کو ٹھکانے لگانے کی اللہ تعالیٰ نے خوب مہلت عطا فرمائی اور بیماری کے پے در پے جھٹکوں نے بجائے رفتار عمل سست کرنے کے مزید تیز رفتاری پیدا کر دی۔ حتی کہ جوانی اور صحت و توانائی کے زمانہ کا لکھا ہوا ایک ایک مسودہ، کاغذ، پرزہ اور خطوط و مقالات سب کو ایک ایک کر کے آپ نے کھنگال ڈالا اور ان کی طباعت و اشاعت اور ترتیب و تدوین کا جو کام کرنا تھا اس کا سب

انتظام کر دیا۔ اپنے مال، جائیداد اور ورثاء و متعلقین کے بارے میں جو کچھ کہنا سننا اور نصیحت وصیت کرنی تھی سب کر دی۔ غرض کرا چنے۔ ایک ایک کام کو نہایت اطمینان و تسلی سے نمٹا کر سفرِ آخرت کیلئے بالکل تیار ہو کر بیٹھ رہے۔ احقر کبھی کبھی سوچا کرتا تھا کہ حضرت مفتی صاحبؒ کا حال اس شخص کا سا ہے جو اپنی پوری زندگی کے اعمال و اقوال کا شروع سے آخر تک کئی کئی بار تفصیلی جائزہ لے کر پورا رختِ سفر باندھے اپنے خالقِ کریم کے شوقِ ملاقات میں تو لگائے قاصد کے انتظار میں بیٹھا ہو۔ یہ حال اللہ کے ان مخصوص بندوں کا ہوا کرتا ہے جنہوں نے اپنی دنیا سے زیادہ آخرت کو سنوارنے میں وقت گذارا ہو۔ مگر اس کے باوجود اللہ کے یہ بندے اپنے مقصدِ زندگی سے کسی لمحہ غافل نہیں ہوتے اور ہزار عوارض و عوائق کے باوجود آخر دم تک اس کام میں مشغول رہتے ہیں جس کے لئے وہ پیدا ہوئے۔ حضرت مفتی صاحبؒ کا حال بھی یہی تھا۔ باوجود طویل علالت ضعفِ جسمانی اور ضعفِ بصارت لاحق ہونے کے آپ کبھی اپنے کو علمی مشاغل سے فارغ نہ رکھتے اور کم و بیش یہ سلسلہ جاری رہتا۔ ایک بار فرمایا کہ نظر کام نہیں کرتی۔ چشمہ لگوایا، اس سے الجھن ہوتی ہے اور بے کار رہا نہیں جاتا۔ اس لئے تحریری کاموں میں دوسروں کی مدد لینا پڑتی ہے۔ آخر ایام میں فتاویٰ اور خطوط کے جوابات دوسروں ہی سے املا کراتے اور خود دستخط فرما دیتے۔

ضعف و نقاہت اور قلب کی شکایت کا سلسلہ کم و بیش چل رہا تھا۔ ۱۰ر شوال ۱۳۹۶ھ بروز منگل ساڑھے دس بجے کے قریب احقر ملاقات کے لئے حاضر ہوا تو آپ دیوار کے سہارے تکیہ سے ٹیک لگائے نیم دراز حالت میں اپنے کمرہ میں تشریف فرما تھے۔ طبیعت میں نشاط اور چہرہ پر بشاشت تھی۔ میں سلام و مصافحہ اور خیریت دریافت کرنے کے بعد سامنے کرسی پر بیٹھ گیا۔ فرمایا کہ الحمدللہ طبیعت ٹھیک ہے۔ مگر آج اجابت نہیں ہوئی جس کی وجہ سے ثقل ہے۔ اس وقت احقر کے علاوہ وہاں کوئی اور موجود نہیں تھا۔ دارالعلوم کے تعلیمی سال کا آغاز تھا اور اگلے روز سے دارالعلوم کا داخلہ شروع ہونے والا تھا۔ احقر نے اس سلسلہ میں بعض امور کا ذکر کیا تو کافی تفصیل سے اس پر گفتگو فرمائی اور کچھ نصیحتیں فرمائیں۔ دارالعلوم کے دارالافتاء میں کام کرنے کے لئے احقر نے بعض افراد کی نشاندہی کی تو بہت دیر تک اس کے بارے میں گفتگو فرماتے رہے اور بعض امور کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لئے بھی فرمایا۔ میرے اہل خانہ کی خیریت اور بچوں کی تعداد دریافت فرمائی۔ احقر نے عرض کیا کہ حضرت ابھی چار بیٹے

قبل ایک بچی اور پیدا ہوئی ہے۔ اس کے لئے کوئی نام تجویز فرما دیں تو فرمایا کہ آپ کے ذہن میں کچھ نام ہوں تو بتائیں، ان میں سے کوئی تجویز کر دوں گا۔ احقر نے میمونہ اور حفصہ وغیرہ نام ذکر کئے تو سنتے ہی فرمایا کہ میمونہ نام رکھو۔ چنانچہ الحمدللہ بچی کا یہی نام رکھا گیا۔ اللہ تعالیٰ اس نام اور نامزد کرنے والے کی برکت سے اس بچی کو یمن و سعادت کی دولت نصیب فرمائیں۔

ابھی احقر سے حضرت گفتگو فرما ہی رہے تھے کہ دارالعلوم کے ایک اور استاذ مولانا نعمت اللہ صاحب بھی آ گئے۔ حضرت نے ان کو چند فتاویٰ کے جوابات املا کرائے جس میں آپ کی زندگی کا وہ آخری فتویٰ بھی شامل تھا جو مرض الوفات کے شروع ہونے سے تقریباً چالیس منٹ پہلے لکھوایا گیا اور اس کے بعد علم و فقاہت کا یہ دروازہ ہمیشہ کے لئے بند ہو گیا۔ مولانا نعمت اللہ صاحب فارغ ہو کر چلے گئے۔ بندہ بعد میں بھی کچھ دیر بیٹھا رہا۔ اس روز احقر کی حضرت سے یہ طویل ترین ملاقات تھی جو تقریباً ڈھائی گھنٹے تک رہی ورنہ عموماً بندہ گھنٹہ آدھ گھنٹہ بیٹھ کر واپس آ جایا کرتا تھا۔ اس وقت حضرت کی طبیعت میں انشراح تھا۔ آپ بھی گفتگو فرماتے رہے اور میں بھی بیٹھا رہا۔ کیا معلوم تھا کہ آج آپ سے یہ آخری ملاقات ہے اس لئے طویل ہو رہی ہے اور اس کے بعد آپ کے کلمات سننے کو کان ہمیشہ کے لئے ترس جائیں گے۔ شاید یہ میرے لئے سعادت کی بات ہو کہ اساتذہ دارالعلوم میں سے علاوہ صاحبزادگان کے احقر وہ شخص ہے جسے آپ کے آخری لمحات زندگی میں بھی گفتگو و ملاقات اور آخری مصافحہ کا شرف حاصل ہوا اور اس کے بعد ہمیشہ کے لئے یہ سلسلہ منقطع ہو گیا۔

احقر نے کچھ عرصہ سے یہ معمول بنا رکھا تھا کہ حضرت سے ملاقات کے بعد جب واپس آتا تو مصافحہ ضرور کر لیتا۔ اور دل میں یہ کھٹکا رہتا کہ کہیں یہ مصافحہ آخری نہ ہو۔ چنانچہ اس روز بھی احقر ایک بجے کے قریب حسبِ عادت آپ سے مصافحہ کر کے کمرہ سے باہر نکلا اور اس روز کا یہ مصافحہ واقعی آخری مصافحہ ثابت ہوا۔ اس کے بعد کے حالات حضرتؒ کے صاحبزادے جناب محمد ولی رازی صاحب نے اپنے مضمون میں مفصل بیان فرما دیئے ہیں اس لئے یہاں ان کے اعادے کی ضرورت نہیں۔

حضرت مفتی صاحبؒ کے مکمل کوائف اور سوانح تو کوئی مؤرخ لکھے گا یا پھر اللہ کو منظور ہوا تو صاحبزادگان میں سے کوئی اس کا حق ادا کرے گا۔ یہ تو آپ کی حیات و وفات سے متعلق چند جھلکیاں تھیں جو اس ناکارہ نے ان سطور میں پیش کر دی ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان حضرات اکابر کی محبت و عظمت کے ساتھ ان کے علم و عمل اور رشد و تقویٰ سے بھی ہمیں حصہ وافر عطا فرمائیں۔ اللھم آمین یا رب العالمین

والصلوٰۃ والسلام علیٰ سید المرسلین وآلہ واصحابہ واتباعہ اجمعین۔

محمد رضی عثمانی

بھیّا جی!

نحمدہ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم

اپنے گھر میں جب آنکھ کھولی تو حضرت والد صاحبؒ کے لئے اپنے سب بڑے اور چھوٹے بہن بھائیوں کو "بھیا جی" ہی کہتے سنا اور دیکھا، اس لئے احقر کی زبان پر بھی بچپن سے ہی اپنے والد ماجدؒ کے لئے یہی لفظ بھیا جی چڑھا ہوا تھا اور ہم سب بہن بھائی اپنے والد صاحب قبلہ مرحوم کو بھیا جی ہی کہتے تھے۔ یہ لفظ بہت سے لوگوں کو کچھ عجیب سا بھی معلوم ہوتا تھا اور بعض دفعہ ہمارے دوست احباب بھی ہم سے معلوم کیا کرتے تھے کہ تم اپنے والد کو بھیا جی کیوں کہتے ہو؟ بچپن میں ہمیں خود بھی اس کی وجہ معلوم نہیں تھی، لیکن جب ذرا بڑے ہو کر ہوش سنبھالا تب معلوم ہوا کہ ہم اپنے والد کو بھیا جی کیوں کہتے ہیں۔

دراصل آج سے تقریباً چالیس پینتالیس سال پہلے ہمارے سابقہ اصل وطن دیوبند وغیرہ کے شریف گھرانوں میں یہ عام دستور تھا کہ جب تک گھر میں دادا، دادی وغیرہ حیات ہوتے تو لفظ اباّ، ابو یا اباجان وغیرہ صرف انہی کو کہا جاتا تھا اور بچوں کے والدین اپنے بزرگوں کی موجودگی میں اپنے لئے یہ لفظ استعمال کرانا بزرگوں کی بے ادبی خیال کیا کرتے تھے۔ چنانچہ ہم سب بہن بھائی اپنے دادا جان حضرت مولانا محمد یٰسین صاحب نور اللہ مرقدہٗ کو "ابّا" کہا کرتے تھے۔ ہم سب بہن بھائیوں میں صرف برادر عزیز مولوی محمد تقی عثمانی سلمہٗ کی زبان پر والد صاحب کے لئے لفظ ابا چڑھا ہوا تھا اور وہ بھی اس لئے کہ ان کی پیدائش قبلہ دادا جان کے انتقال کے بعد ہوئی تھی، چنانچہ وہ شروع سے

ہی والد صاحبؒ کو ابا کہتے تھے، یہ ہے لفظ "بھیا جی" کی وجہ تسمیہ!

حضرت قبلہ والد ماجدؒ کے متعلق صحیح معنیٰ میں کچھ لکھنا تو اہل علم وفضل کا کام ہے اور وہ ماشاء اللہ لکھ بھی رہے ہیں اور لکھنے کا حق بھی ادا کریں گے یہ احقر سراپا تقصیر ایک خالص دنیا دار اور علم وعمل دونوں سے تہی دست جس کو قلم پکڑنے کی بھی لیاقت نہیں وہ والد صاحب مرحوم ومغفور کے متعلق کیا اور کیسے لکھے لیکن احقر کے سب سے چھوٹے دلیکن علم وفضل اور عمل میں سب سے بڑے) اور عزیز ترین بھائی مولوی محمد تقی عثمانی مدیر البلاغ نے احقر سے کہا کہ البلاغ کے مفتی اعظم نمبر کے لئے میں بھی کچھ لکھوں دل احقر کا بھی چاہتا تھا کہ کچھ نہ کچھ لکھا جائے لیکن اپنی نا اہلی اور لکھنے کی عادت نہ ہونے کی وجہ سے ان کی بات کو ٹالتا گیا اور وہ مہینوں سے مسلسل اصرار کرتے رہے، آخر جب نمبر کتابت کے بالکل آخر مراحل میں پہونچ گئی تو اس وقت دل میں داعیہ پیدا ہوا کہ اگر لکھنا نہیں آتا تو کیا ہے، جو کچھ بن پڑے لکھو۔

بھیا جی کا عنوان پہلے ہی سے ذہن میں تھا، چنانچہ اسی عنوان کے تحت بنام خدا تعالیٰ یہ چند سطور لکھنے بیٹھ گیا ہوں لیکن یہ کوئی مسلسل مضمون نہیں ہے اور کوئی مضمون لکھنے کی لیاقت بھی مجھ میں نہیں ہے۔ البتہ یہ ارادہ کیا ہے کہ سفر وحضر میں حضرت والد صاحبؒ کے سایۂ شفقت ورحمت میں بچپن سے اب تک گذرے ہوئے جو واقعات ذہن میں آئیں گے وہ قلم بند کرتا جاؤں گا۔

اللہ تعالیٰ کی ان نعمتوں کا اور احسانات کا شکر ادا نہیں کیا جا سکتا جو اس نے ہم گنہ گاروں پر دن رات میں بارش کی طرح برسا رکھے ہیں، اور شکر تو آدمی جب کرے جب نعمتوں کا استحضار ہو یہاں وہی مفقود ہے۔ لیکن سب سے بڑی نعمت جو ہمیں حاصل ہوئی وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ نے ایک دین دار ذی علم اور مسلمان گھرانے میں پیدا فرمایا۔

بچپن کی کچھ یادیں

گھر میں جب کچھ ہوش سنبھالا تو احقر کو ایسا یاد پڑتا ہے کہ احقر کی عمر چار پانچ سال کی ہوگی۔ اس وقت احقر کے دادا جان حضرت مولانا محمد یٰسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ حیات تھے اور ہمارے بھیا جی یعنی حضرت والد ماجدؒ کا جو سراپا ذہن میں ابھرتا ہے وہ کچھ اس طرح ہے۔

سرخ وسفید رنگ، متناسب اعضاء، میانہ قد، حسین اور دلکش چہرہ، سیاہ گھنی ڈاڑھی

باوقار شخصیت کے جوان رہنا۔

بھیّاجی کی اولاد

احقر جس وقت کا یہ ذکر کر رہا ہے اس وقت بھیاجی کی ماشاء اللہ ۱۱ اولاد تھیں سات احقر سے بڑی لڑکیاں اور چار لڑکے۔ لڑکوں میں سب سے بڑے مولوی محمد زکی (مرحوم)، دوسرا نمبر احقر محمد رضی کا، تیسرا نمبر محمد ولی رازی، چوتھا نمبر مولوی محمد رفیع عثمانی کا تھا۔ پھر ۱۳۶۲ھ میں مولوی محمد تقی عثمانی پیدا ہوئے اس طرح ہم بعد میں کل نو بہن بھائی تھے۔

افسوس کہ ہماری سب سے بڑی بہن نعیمہ خاتون کراچی میں ۲۹ شعبان ۱۳۷۵ھ کو ۳۹ سال کی عمر میں انتقال فرما گئیں اور ہمارے سب سے بڑے بھائی جان مولوی محمد زکی صاحب (مرحوم) کا انتقال لاہور میں ۱۹۷۴ء میں ہو چکا ہے۔

بھیّاجی کی مصروفیات

اپنے بہن بھائیوں کی یہ مختصر سی تفصیل اس لئے ذکر کر دی گئی کہ آگے مختلف جگہوں پر ان کا تذکرہ آئے گا۔ اس زمانہ کے کچھ زیادہ واقعات تو یاد نہیں لیکن اتنا اچھی طرح یاد ہے کہ اس وقت یعنی آج سے تقریباً پینتالیس سال پہلے بھیاجی کو انتہائی مصروف دیکھا۔ رات کو سردی ہو یا گرمی جب بھی آنکھ کھلتی، آپ کو عبادت الٰہی، تہجد اور ذکر اللہ میں مشغول پایا۔ صبح فجر اور اس کے بعد بھی یہ سلسلہ رہتا۔ اس کے بعد ناشتہ سے فارغ ہوتے ہی دارالعلوم تشریف لے جاتے۔ دوپہر کو گھر واپس آکر ڈاک دیکھتے (روزانہ کی ڈاک میں اس وقت بھی کم و بیش پندرہ بیس خطوط ہوا کرتے) ڈاک کے بعد دوپہر کا کھانا پھر نماز ظہر ادا کرنے کے لئے اپنے محلہ کی مسجد تشریف لے جاتے پھر کچھ دیر قیلولہ فرماتے اور اسی دوپہر میں اپنے قائم کردہ کتب خانہ و دارالاشاعت کے کام انجام دیتے اور دارالاشاعت ہی سے ایک ماہنامہ المفتی جاری تھا جو عرصہ دراز تک جاری رہا۔ اس کے بھی جملہ امور کا بار بھیاجی ہی کے کاندھوں پر تھا اور کوئی ان کاموں میں ہاتھ بٹانے والا نہیں تھا۔ شام کو پھر دارالعلوم تشریف لے جاتے اور عصر کے وقت تشریف لاتے۔

آج سے تقریباً چالیس سال قبل بھیاجی دارالعلوم میں میں صدر مفتی کی حیثیت سے اپنے فرائض انجام دیتے تھے اور ساتھ ہی صبح کو ایک یا دو گھنٹہ دارالحدیث میں درس حدیث بھی دیا کرتے تھے اس وقت والد صاحب کے اصل کاموں کا تو علم نہیں تھا، البتہ اتنا یاد ہے کہ احقر بھی دارالعلوم میں درجۂ قرآن میں قاعدہ یا کوئی سیپارہ ناظرہ پڑھتا تھا۔ اور اس وقت کسی نہ کسی بہانے اکثر والد صاحب کے پاس دارالافتاء میں حاضر ہو جاتا تھا اور احقر کو یہ جان کر اور دوسرے لوگوں سے سنکر بہت فخر اور مسرت ہوا کرتی تھی کہ ہمارے والد صاحبؒ دارالافتاء کے صدر مفتی ہیں اور اس دارالحدیث میں درس دیتے ہیں جہاں اس وقت کے اکابرین یعنی حضرت شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی اور حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنیؒ اور حضرت مولانا سید اصغر حسین صاحبؒ اور مولانا اعزاز علی صاحب جیسی شخصیات درس دیتی ہیں۔

ہمیں اس وقت صدر مفتی اور دارالحدیث میں درس وغیرہ کی اہمیت کا کچھ علم نہ تھا بس لوگوں سے سننے سے اتنا اندازہ ہم نے کر لیا تھا کہ بھیاجیؒ مدرسہ کے بڑے لوگوں میں ہیں اور ہمارے فخر و خوشی کے لئے اتنا ہی کافی تھا۔ ہمیں اس سے کوئی بحث نہیں تھی کہ بھیاجی بڑے لوگوں کی صف میں کیسے شامل ہوئے اور اس مقام تک پہونچنے کے لئے انہوں نے کتنے پاپڑ بیلے؟

شام کو بزرگوں کی زیارت

بھیاجی مرحوم و مغفور اپنی شب و روز کی بے انتہا علمی اور دوسری مصروفیات کے باوجود عصر سے مغرب تک کا وقت ہمیشہ اپنے اہل و عیال اور بزرگوں کی صحبت کے لئے فارغ کر دیا کرتے تھے کبھی بزرگ کے یہاں جانا ہوتا تو احقر کے بڑے بھائی مولوی محمد زکی مرحوم کو یا احقر کو یا ہم دونوں کو ساتھ لے کر یا تو حضرت میاں صاحب یعنی حضرت مولانا سید اصغر حسین صاحبؒ کی زیارت کو تشریف لے جایا کرتے یا کسی اور بزرگ کی۔

لیکن احقر کو زیادہ تر والد صاحبؒ کے ساتھ حضرت میاں صاحبؒ کے ہاں جانا یاد ہے۔ شاید اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو کہ حضرت میاں صاحبؒ بچوں کی بہت آؤ بھگت فرماتے تھے، ان کا معمول تھا کہ ہم جب بھی جاتے تو ہمیں بسکٹ، بادام، اخروٹ وغیرہ ضرور کھلاتے اور ہر بچہ کو ایک ایک

ازنقد بھی عطا فرماتے (یہ یاد رہے کہ اس وقت ایک آنہ میں اتنی چیزیں خریدی جاسکتی تھیں کہ آج پانچ یا دس روپیہ میں بھی ممکن نہیں۔) پھر میاں صاحب کے ہاں سے واپسی پر بھیاجی بھی بازار سے ہم لوگوں کو چیزیں دلوایا کرتے تھے۔

باغ کی سیر

اکثر ایسا ہوتا کہ شام کے وقت بھیاجی سب بھائیوں کو ساتھ لے کر اپنے باغ میں جو سہارنپور کی سڑک پر مکان سے تقریباً ایک میل کے فاصلہ پر تھا اور بھیاجی نے بڑے شوق سے خود اپنے ہاتھوں سے لگایا تھا اور جس میں انواع واقسام کے پھل اور پھولوں کے پودے لگائے گئے تھے اور جو اب بھی دیوبند میں موجود ہے۔ وہاں لے جاتے اور راستے میں ہم سب کی دوڑ کراتے اور بعض دفعہ خود بھی دوڑ میں ہمارے ساتھ شریک ہو جاتے اور جو آگے نکلتا اس کو انعام ملتا اور جو پیچھے رہ جاتا اس کی ہمت بڑھائی جاتی۔ اس طرح ہنستے کھیلتے ہم لوگ اپنے باغ میں پہنچ جایا کرتے۔

ہم بچے تو کھیل کود میں یا پھل وغیرہ کھانے میں مصروف ہو جاتے اور بھیاجی ایک ایک درخت کی خود دیکھ بھال کرتے۔ باغ کے مالی کو ہدایات دیتے اور مغرب کی نماز باغ کے بالکل وسط میں ایک پختہ گول چبوترہ پر باجماعت پڑھتے۔ یہ چبوترہ خاص نماز کے لئے ہی تعمیر کرایا گیا تھا اور یہاں سے چار روشیں نکالی گئی تھیں۔ ایک روش تالاب تک گئی تھی اور دوسری روش اس پختہ مکان تک گئی تھی جو ایک کمرے اور ایک صحن پر مشتمل تھا اور صحن میں بیٹھنے کے لئے دونوں طرف سیمنٹ کی کرسیاں بنوائی گئی تھیں۔ تیسری روش اس کنویں تک گئی تھی جو بھیاجی نے ہی پختہ تعمیر کرایا تھا اور چوتھی روش مین سڑک پر ختم ہوتی تھی۔ ہر روش کے دونوں طرف مختلف قسم کے پھولوں [illegible]

ؔ۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ اس باغ پر پہلا پھل ۱۹۴۸ء میں آیا اور اسی سال اس عزیز باغ اور وطن کو چھوڑ کر پاکستان ہجرت کرنا پڑی۔ اسی طرح بھیاجی نے ہجرت سے چند سال قبل ہی اپنا جدید مکان بڑی محنت اور شوق سے بنایا تھا، وہ بھی چھوڑنا پڑا۔ پاکستان آنے کے بعد اکثر فرمایا کرتے کہ اپنی ان چیزوں کے چھوڑنے کا بالکل صدمہ نہیں، خدا کا شکر ہے۔

کے درخت بڑے تناسب اور خوبصورتی سے لگائے گئے تھے اور ان چاروں روشوں کے درمیان چار قطعات تھے جن میں مختلف اقسام کے قلمی آم، امرود، جامن، پپیتہ اور کیلے وغیرہ کے درخت لگائے گئے تھے۔ واپسی پر یہ بھی معمول تھا کہ دیوبند کے قدیم قبرستان جس میں اکابرین کے مزار تھے وہاں فاتحہ پڑھ کر واپس ہوتے۔

تھانہ بھون کے سفر

دارالعلوم دیوبند میں سالانہ امتحانات کے بعد شعبان میں تعطیل ہوتی۔ بھیا جی اکثر تھانہ بھون میں اپنے مربی و مرشد حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ کی خدمت میں رہ کر رمضان شریف گزارا کرتے تھے۔ کئی بار اپنے ساتھ اپنے سب اہل و عیال کو بھی ساتھ لے کر گئے۔ اس طرح کے دو تین سفر جن میں ہم بھی والد صاحب کے ساتھ گئے حافظہ میں محفوظ ہیں۔ تھانہ بھون میں ایک بار تو حضرت تھانویؒ نے اپنے مکان کے بالائی حصہ میں ہم لوگوں کو قیام کرایا اور ایک بار حضرتؒ کے مکان سے متصل ایک بڑا مکان کرایہ پر لے کر والد صاحبؒ نے رمضان شریف میں اپنے سب بچوں کے ساتھ قیام فرمایا۔

انہی سفروں میں دو تین بار حکیم الامت حضرت تھانوی قدس سرہٗ کی زیارت کا شرف بھی احقر کو حاصل ہوا لیکن زیادہ تفصیل یاد نہیں۔

اولاد کو سفر میں ساتھ لے جانے کا معمول

بھیا جی تقریباً ہر سفر میں اپنے کسی لڑکے یا کسی بے تکلف عزیز کو ساتھ لے جایا کرتے تھے ساتھ جانے والا یہ سوچ کر ساتھ جاتا کہ سفر میں بھیا جی کی خدمت کریں گے اور ان کو آرام پہونچائیں گے لیکن معاملہ اکثر الٹا ہی ہوتا کیونکہ بھیا جی سفر میں اپنے رفیق کا اس قدر خیال رکھتے کہ کچھ حد نہیں اور اس طرح خود ہی اپنے رفیق کی خدمت کرتے رہتے جس سے ساتھ جانے والا رفیق شرمندہ ہو کر رہ جاتا تھا۔

تقسیم ہند سے قبل بھیا جی کے ساتھ سفر کرنے کے مواقع سب سے زیادہ احقر کے بڑے

بھائی جان مرحوم کو ملے اور انہوں نے حضرت والد صاحبؒ کی خدمت کا حق بھی خوب ادا کیا۔ اور دوسرے نمبر پر احقر کو بھیا جی کے ساتھ سفر کا موقع میسر آیا۔ اور تقسیم ہند کے بعد پاکستان میں احقر کو کم اور برادران عزیز مولانا محمد رفیع عثمانی اور مولانا محمد تقی عثمانی کو بہت زیادہ موقع آپ کے ساتھ سفر کے ملے۔ احقر نے یوں تو آپ کے ساتھ دہلی، علیگڑھ، سہارنپور، بہاولپور، انبالہ وغیرہ کے متعدد سفر کئے لیکن چند بڑے سفر جن میں احقر کو آپ کی ہمراہی کی سعادت حاصل ہوئی، ان کا کچھ ذکر پیش خدمت ہے۔

ڈابھیل، سورت، بمبئی کا سفر

سب سے پہلے بڑا سفر جو بھیا جی کے ساتھ احقر نے کیا وہ ڈابھیل ضلع سورت کے مشہور مدرسہ کے لئے تھا۔ غالباً ۱۹۴۴ء تھا کہ مدرسہ عربیہ ڈابھیل کے مہتمم مولانا محمد اسماعیل گارڈی دیوبند آتے اور انہوں نے بتایا کہ مدرسہ میں دورۂ حدیث کی کتابیں ختم کرانے کے لئے اس وقت کوئی عالم موجود نہیں ہیں۔ اس لئے آپ وہاں تشریف لے چلیں ورنہ طلبا کا یہ سال خراب ہو جائے گا۔ ان کے اصرار پر دو ماہ کے لئے والد صاحبؒ نے ڈابھیل جانے اور بخاری شریف ختم کرانے کا وعدہ فرما لیا تھا۔ اس وقت احقر کی عمر دس گیارہ سال کی ہوگی۔ اس سفر میں والد صاحبؒ احقر کو اپنے ساتھ لے گئے۔ ہمارے ڈابھیل پہونچنے کے چند یوم بعد حضرت مولانا شمس الحق افغانی صاحب مدظلہٗ بھی ڈابھیل پہونچے، ان کو بھی اسی طرح مولانا اسماعیل گارڈی نے دعوت دی تھی۔ مولانا افغانی کو احقر نے پہلی بار اسی وقت دیکھا تھا۔

ڈابھیل قیام کے دوران حضرت والد صاحب تو شب و روز درس و تدریس میں مشغول رہتے اور احقر کو اتنا یاد ہے کہ احقر ان دنوں قرآن پاک ناظرہ پڑھتا تھا اور وہیں درجہ قرآن میں داخلہ لیا تھا۔ مدرسہ سے چھٹی کے بعد احقر اکثر خاموش خاموش رہتا تھا، نہ کھانے میں دل تھا اور نہ کسی اور کام میں اور اس کی اصل وجہ یہ تھی کہ آج کے مولانا محمد تقی عثمانی مدیر البلاغ اس وقت دو یا اڑھائی سال کے تھے اور احقر کو ان سے اس قدر محبت اور تعلق خاطر تھا کہ دیوبند میں ایک گھنٹہ بھی ان سے علیحدہ رہنا شاق گذرتا تھا، چنانچہ ڈابھیل میں بھی ہر وقت بس وہی یاد آتے رہتے اور جب کچھ اور بس نہ چلتا تو مدرسہ کے در و دیوار پر ان کا نام لکھتا رہتا تھا۔ غرض احقر کا دل

وہاں نہیں لگا اور اسی طرح زمانہ قیام پورا ہوا۔ بھیاجی مجھ پر ترس کھا کر پہلے تو راندیر ضلع سورت لے گئے، جہاں آپ کے بہت ہی شفیق بزرگ حضرت مولانا سید اصغر حسینؒ دیوبندی کا مرقد مبارک بھی ہے کیونکہ حضرت میاں صاحبؒ نے وہیں انتقال فرمایا تھا۔ اس چھوٹے سے قصبے میں کئی اسلامی مدارس اور والد صاحبؒ کے دوست احباب بھی بہت تھے، خصوصاً مولانا احمد اشرف صاحبؒ راندیری آج بھی وہاں اپنے مدرسے کے ذریعے فیض پھیلا رہے ہیں۔ ان حضرات سے ملاقاتیں ہوئیں۔ اس قصبے کی مساجد کو دیکھ کر تو حیرت ہو گئی، کیونکہ اس قدر خوبصورت اور آراستہ و پیراستہ مسجدیں احقر نے پھر کبھی نہیں دیکھیں۔ بھیاجی بھی فرماتے تھے کہ ایسی مسجدیں کہیں اور نظر سے نہیں گذریں۔ یہاں چند روز قیام کے بعد آپ احقر کو لے کر بمبئی کے لئے روانہ ہو گئے۔ ہاں یاد آیا کہ آپ نے احقر کی دلجمعی اور دلچسپی کے لئے ڈابھیل سے آپ نے ایک ایسے شاگرد کو بھی ساتھ لے لیا تھا جو بمبئی وغیرہ سے خوب اچھی طرح واقف تھے۔

بمبئی پہونچے، اسٹیشن پر لینے کے لئے بہت سے لوگ پہنچ گئے تھے۔ وہاں پر متعدد لوگوں کے ہاں قیام رہا، خصوصاً حکیم اجمیری یعنی حکیم مسعود صاحب گنگوہی جن کا وہاں شاندار اور بڑا کامیاب مطب تھا۔ والد صاحبؒ خود تو اکثر لوگوں میں گھرے رہتے اور احقر کو وہ ان ساتھ لئے ہوئے "رفیق" کے ہمراہ روزانہ کسی نہ کسی مشہور مقام کی تفریح کے لئے بھیج دیتے۔ دو تین جگہ بھیاجی خود بھی مجھے اپنے ساتھ لے کر گئے۔

لاہور و پنجاب کا سفر

غالباً ۱۹۴۶ء میں جس وقت تحریک پاکستان پورے زور شور سے چل رہی تھی تقسیم ہند سے تقریباً ایک سال یا چند ماہ پہلے پاکستان کی حمایت میں جمعیۃ العلمائے اسلام کی ایک عظیم الشان کانفرنس لاہور میں منعقد ہوئی تھی، جس میں دیوبند سے شیخ الاسلام حضرت علامہ شبیر احمد عثمانی صاحبؒ والد صاحبؒ اور دوسرے بہت سے حضرات بھی شرکت کے لئے لاہور تشریف لے گئے۔ آپ کے ساتھ احقر بھی ساتھ لگ گیا تھا۔ لاہور میں یہ ایسا عظیم الشان اجتماع تھا کہ احقر نے اپنی زندگی میں اتنا بڑا اجتماع پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ غالباً اس میدان میں جلسے منعقد ہوئے جہاں اس وقت

مینار پاکستان بنا ہوا ہے۔ ان جلسوں میں حضرت علامہ شبیر احمد عثمانیؒ، والد صاحب اور دوسرے رہنماؤں کی بڑی ولولہ انگیز اور یادگار تقریریں ہوئیں جنہوں نے وہاں پاکستان کے حق میں فضا کو سازگار بنا دیا۔ لاہور سے واپسی پر امرتسر تشریف لے گئے اور وہاں رات کو مسجد نور میں حضرت مولانا مفتی محمد حسن صاحبؒ خلیفۂ خاص حضرت تھانویؒ کے ہاں قیام ہوا۔ حضرت مفتی محمد حسن صاحبؒ کی سب سے پہلے احقر نے وہاں زیارت کی۔ والد صاحبؒ نے وہاں بھی خطاب فرمایا۔ وہاں سے روانہ ہو کر جالندھر پہنچے۔ وہاں حضرت تھانویؒ کے ایک دوسرے خلیفہ حضرت مولانا خیر محمد صاحبؒ کے ہاں قیام ہوا۔ احقر نے ان بزرگ کی بھی پہلی زیارت اس سفر میں کی۔ جالندھر سے اگلے روز روانہ ہو کر لدھیانہ اور پھر وہاں سے انبالہ گئے۔ ان سب مقامات پر متعدد بڑے بڑے جلسوں میں پاکستان کے حق میں آپ کی تقریریں ہوئیں۔

اس پورے سفر میں والد صاحبؒ تو پاکستانی مشن کے لئے کام کر رہے تھے اور ہمیں جلسوں میں شرکت کے علاوہ مختلف شہروں کی سیر و سیاحت کے خوب مواقع مل رہے تھے۔ تقسیم ہندوستان سے قبل پاکستان کی تحریک پورے عروج پر تھی اور بچے بچے کی زبان پر ایک ہی نعرہ تھا کہ بن کے رہے گا پاکستان، لے کے رہیں گے پاکستان۔

خدا کا شکر ہے کہ ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے ۱۹۴۷ء میں دنیا کی سب سے بڑی اسلامی مملکت پاکستان کے نام سے نمودار ہو چکی تھی۔ لیکن اسی کے ساتھ ساتھ ہندوستان میں مسلمانوں کے قتل عام کا ایسا بازار گرم ہوا کہ الامان والحفیظ۔ جن لوگوں نے تقسیم سے قبل پاکستان کی حمایت میں کچھ بھی حصہ لیا تھا ان پر عرصۂ حیات تنگ کر دیا گیا اور طرح طرح سے پریشان کیا جانے لگا تو لاکھوں مسلمانوں کی پاکستان کی طرف ہجرت کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

جب عام لوگوں پر یہ ستم ڈھائے جا رہے تھے تو والد صاحبؒ نے تو پاکستان بننے سے قبل باقاعدہ بہت سرگرم حصہ لیا تھا اور ان کے کئی فتوے لاکھوں کی تعداد میں بڑے بڑے پوسٹروں کی شکل میں اور کتابچوں کی صورت میں شائع ہو چکے تھے۔ اسی فتوے کی وجہ سے ضلع مظفر نگر کی سیٹ سے پاکستان کے پہلے وزیر اعظم خان لیاقت علی خان کی کامیابی میں زبردست مدد ملی تھی۔

ظاہر ہے بھیا جی کو کیوں بخشا جاتا؟ ان کو بھی طرح طرح کی دھمکیاں ملنی شروع ہو گئیں،

ادھر بھیا جی کو طبعاً بھی ہندوؤں کے غلبہ میں رہنا پسند نہ آیا اس لئے پاکستان کی طرف ہجرت کے متعلق غور کر ہی رہے تھے کہ ادھر شیخ الاسلام حضرت علامہ شبیر احمد صاحب عثمانی جو تقسیم سے قبل ہی پاکستان پہنچ گئے تھے اور جنہوں نے پہلی دستور ساز اسمبلی میں پاکستان کا پرچم لہرانے کی رسم ادا کی تھی، ان کا شدید تقاضہ ہوا کہ تم پاکستان آجاؤ، اب یہاں اسلامی آئین وقانون کی تدوین کا عظیم الشان کام کرنا ہے۔ ان اسباب کی وجہ سے بھیا جی نے اپنے اور علمی اور عزیز وطن سب کو وہیں چھوڑ کر پاکستان کی طرف ہجرت کا قصد فرمالیا۔

دیوبند سے پاکستان کو ہجرت

چنانچہ یکم مئی ۱۹۴۸ء کو دیوبند سے بذریعہ ریل گاڑی دہلی پہونچے اور ایک رات قیام کے بعد وہاں سے براستہ جودھپور، کھوکھراپار، حیدرآباد سندھ مختلف جگہ قیام کرتے ہوئے کراچی پہونچے۔ یہ سفر بھی ایک یادگار تاریخی اور دلچسپ سفر تھا۔ دلوں میں اپنے عزیز ترین وطن کو ہمیشہ کے لئے چھوڑنے کا کسی کو افسوس نہ تھا بلکہ پاکستان کی محبت اور اس کی خدمت کا جذبہ ہر شخص کے دل میں موجزن تھا۔ ریل گاڑی جوں جوں قطع راہ کر رہی تھی دلوں کی دھڑکنیں تیز معلوم ہوتی تھیں اور پاکستان کی محبت کا جذبہ بڑھتا جا رہا تھا۔ بھیا جی سے لے کر ہم سب چھوٹے بڑوں کا یہی حال تھا اور پاکستان کی سرحد کو دیکھنے کے لئے آنکھیں بے چین تھیں کہ خدا خدا کر کے باڑمیر کا اسٹیشن آیا یہ ہندوستان کا آخری بڑا اسٹیشن تھا۔ اس کے بعد پاکستان کی سرحد شروع ہونے والی تھی۔ اس اسٹیشن پر مہاجرین کی سخت تلاشی لی جاتی تھی، چنانچہ ہمارے سامان کی بھی تلاشی ہوئی اور بہت سا قیمتی سامان ضبط کرلیا گیا۔ اس مرحلہ سے فارغ ہوتے تو ریل چلی اور چلتی گئی۔ آخر شور ہوا کہ پاکستانی سرحد بس اب شروع ہوا چاہتی ہے، نظریں بے قراری سے اپنی منزل مراد کو تلاش کرتی رہیں بالآخر معلوم ہوا کہ اب ہم غلامی کی سرزمین پر نہیں بلکہ آزاد ملک کی سرزمین پر سفر کر رہے ہیں۔ غرض پروگرام کے مطابق مختلف جگہ قیام کرتے ہوئے چند روز میں کراچی پہنچ گئے۔

کراچی پہونچنے کے بعد عام لوگوں، لیڈروں اور حکام میں بھی تعمیر پاکستان اور اس نوزائیدہ اسلامی مملکت کی تعمیر و ترقی میں حصہ لینے کا قابل قدر جذبہ ہر جگہ دیکھنے میں آتا تھا اور اسی جذبہ

لگن اور محنت کا نتیجہ تھا کہ یہ بے سروسامان مملکت مختصر سے ہی عرصہ میں ایک عظیم اور طاقت ور ملک بننے کی راہ پر گامزن ہوگئی تھی۔ لیکن ہماری شامتِ اعمال کہ یہ ملک قائد اعظم، قائد ملت اور شیخ الاسلام علامہ عثمانی رح وغیرہ جیسے مخلص اور دیانت دار قائدین سے جلد ہی محروم ہوگیا اور بعد میں آنے والے نام نہاد رہنماؤں نے عوام کے اس عظیم جذبہ کو فنا کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی، اور آج بھی جو کچھ ہو رہا ہے یہ سب کچھ ایسے ہی نام نہاد لیڈروں اور رہنماؤں کی وجہ سے ہے۔

بھیا جی جب کراچی پہونچے تو ان کے ساتھ کثیر عیال تھی اور اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی یار و مددگار نہ تھا اور نہ کوئی ذریعہ معاش، بھیا جی پر وہ زمانہ بہت سخت گزرا اور گھر کے مصارف بھی قرض وغیرہ سے پورے فرماتے رہے، لیکن خودداری کا یہ عالم کہ کسی اور سے تو کیا کہتے، اپنے گھر والوں اور علامہ شبیر احمد عثمانیؒ سے بھی کبھی اس کا ذکر نہ فرمایا ورنہ تو وہ ایسا وقت تھا کہ سامان سے بھرے ہوئے بنگلے اور زمین، جائیداد وغیرہ کا میں لوگ دھڑا دھڑ الاٹ کرا رہے تھے اور قبضے کر رہے تھے۔ اگر بھیا جی چاہتے تو وہ بھی ایسا کر سکتے تھے لیکن آفرین ہے اس بندۂ خدامست پر کہ ایسے ذرائع سے ایک حبہ بھی حاصل کرنے کو عار سمجھا۔

پاکستان میں اس وقت تک نہ تو کوئی دینی مدرسہ تھا اور نہ کوئی دینی تعلیم کا معقول انتظام اس لئے اس وقت کے حالات کے پیشِ نظر احقر کو اپنی دینی تعلیم کو خیرباد کہنا پڑا اور یہ خیال ہوا کہ ذریعہ معاش کے لئے احقر کوئی تجارت شروع کرے کیونکہ اس وقت بھیا جی کی اولاد میں احقر ہی سب سے بڑا تھا (احقر کے بڑے بھائی ابھی دیوبند ہی میں تھے، وہ بعد میں پاکستان آئے اور انہوں نے اپنے قیام کے لئے لاہور کو پسند کیا۔)

اب یہ مشورہ ہوا کہ کیا کاروبار کیا جائے؟ احقر کا کپڑے وغیرہ کی تجارت کرنے کا خیال ہوا تو بھیا جی نے فرمایا کہ بیٹا نہ تو ہمارے پاس اتنا سرمایہ ہے اور نہ مجھے یہ پسند ہے کہ تم کوئی اس قسم کی تجارت کرو۔ اور فرمایا کہ بیٹا ہمارے خاندان کا مزاج محض تجارتی نہیں، بلکہ علمی ہے۔ ہم خود اور ہمارے باپ دادا کا تعلق ہمیشہ علمی کاموں سے رہا ہے، اس لئے تم اگر کوئی کام کرنا ہی چاہتے ہو تو علم ہی کی نشر و اشاعت کا کام کرو اور نیت بھی اشاعت دین کی رکھو تو انشاء اللہ تعالیٰ تمہیں باعزت روزی بھی مل جائے گی اور علم و اہل علم سے بھی تعلق قائم رہیگا اور اشاعت

دین کی وجہ سے ثواب بھی انشاء اللہ ضرور ملے گا۔

دار الاشاعت کا قیام

بنام عدار دار الاشاعت کے نام سے بڑا دارہ حضرت مولانا سید اصغر حسینؒ اور والد صاحبؒ نے
دیوبند میں قائم کیا تھا اسی نام سے کراچی میں عیدگاہ کے قریب ایک جگہ کرنہایت قلیل سرمایہ سے کام
شروع کردیا۔ دکان کا افتتاح آپ نے ۱۹۵۰ء میں حضرت علامہ سید سلیمان ندویؒ سے کرایا۔ سرمائے،
وسائل اور تجربہ کی کمی کی وجہ سے یہ کام ایک مدت تک نہایت سست رفتاری سے جاری رہا۔ لیکن بالآخر
بھیاجی کی دعاؤں اور توجہ سے کام میں ترقی ہوتی گئی اور اب ان سطور کی تحریر کے وقت اللہ تعالیٰ نے
با فراغت عزت کی روزی بھی عنایت فرما رکھی ہے اور علم دین کی اشاعت کا سلسلہ بھی جاری ہے اور
اب تک کم و بیش دو ڈھائی سو چھوٹی بڑی کتابیں تقریباً ہر اسلامی موضوع پر احقر کے اس ادارہ سے شائع
ہو چکی ہیں۔ گو شروع میں یہ کام احقر نے بادل نخواستہ محض تعمیل حکم کی وجہ سے شروع کیا تھا لیکن بھیاجی
کے اس قیمتی مشورہ کی حقیقت اب معلوم ہوئی کہ انہوں نے دوسری قسم کے کاروباری دھندوں سے بچا کر
کس قدر احسان عظیم اس احقر پر کیا اور کسی نہ کسی حد تک علم سے وابستہ کردیا۔ یہ محض اللہ تعالیٰ کا فضل
اور بھیاجی کی دعاؤں کا نتیجہ ہے کسی نے سچ کہا ہے ؎

قلندر ہرچہ گوید دیدہ گوید

حجاز مقدس کے تین سفر

احقر کے پہلے سفر حج کا انتظام غیب سے اس طرح ہوا کہ بھیاجی اس وقت یعنی ۱۹۶۳ء میں
اپنے لسبیلہ میں بنائے ہوئے مکان میں قیام فرما تھے اور ہم سب بھائی بھی بھیاجی کے ساتھ ہی
رہتے تھے۔ رمضان شریف شروع ہوئے تو مولوی محمد رفیع عثمانی محلہ کی مسجد نعمان میں حسب معمول
تراویح میں قرآن پاک سنایا کرتے تھے۔ بھیاجی اور ہم چاروں بھائی بھی ساتھ ہی تراویح کے لئے جایا
کرتے اور بعد تراویح ساتھ ہی واپس آیا کرتے۔ دن میں تو آپ روزہ اور دوسرے مشاغل کی وجہ سے
مصروف رہتے لیکن تراویح کے بعد بھیاجی کی طبیعت میں از حد انشراح ہوتا تھا چنانچہ تراویح کے

بعد سب گھر والے جمع ہوتے اور بزرگوں کے واقعات اور لطائف و ظرائف شروع ہو جاتے اور ساتھ ہی کسی ٹھنڈے یا گرم مشروب کا دور بھی چلتا۔

چنانچہ ایک شب ایسا ہی اجتماع تھا باتوں باتوں میں بھیاجی نے فرمایا کہ اس سال حج کے لئے جانے کو دل چاہتا ہے اور ارادہ بھی ہے۔ اگر خدا کرے پورا ہو جائے۔ اس پر احقر نے بغیر پہلے سے کسی خیال کے عرض کیا کہ "بھیاجی! میرا بھی بہت دل چاہتا ہے کہ حج کروں"۔ والد صاحبؒ نے فوراً فرمایا کہ "میاں دل تو ہر مسلمان کا چاہتا ہے۔ یہ بتاؤ اس کے لئے اپنی طرف سے کچھ انتظام بھی کیا ہے یا بس خالی خولی تمنا ہے؟"

ظاہر ہے کہ احقر کا نہ تو پہلے سے کوئی ارادہ تھا اور نہ کوئی انتظام۔ بس یونہی برسبیل تذکرہ کہہ دیا تھا۔ اس پر احقر نے عرض کیا کہ "انتظام تو کچھ نہیں ہے"۔ بھیاجی نے فرمایا کہ "بس تو پھر تم نے غلط کہا کہ تمہارا دل چاہتا ہے۔ اگر دل چاہتا تو کچھ فکر کرتے اور سفر خرچ کا کچھ انتظام کرتے"۔ احقر نے عرض کیا کہ "آمدنی قلیل ہے"۔ فرمایا کہ "اگر نیت صحیح ہو اور حج کی نیت سے دو چار آنے روز بھی علیحدہ کرتے رہو تو گھر بیٹھے حج کا ثواب بھی ملتا رہے گا اور ثابت قدم رہے تو انشاء اللہ تعالیٰ نصرت حق بھی شامل ہوگی"۔

بس اس دن سے احقر نے یہ بات گرہ میں باندھ لی اور اپنی آمدنی میں سے ایک قلیل حصہ حج کی نیت سے جمع کرنا شروع کر دیا۔ دن گذرتے گئے۔ آخر ذیقعدہ میں بھیاجی، والدہ ماجدہ اور احقر کے بہنوئی مولانا نور احمد صاحب کا انٹرنیشنل پاسپورٹ سے حج کا پروگرام طے ہو گیا۔ اس وقت بھیاجی نے احقر سے فرمایا کہ کہو بھئی حج پر چلوگے کچھ انتظام ہے؟ احقر نے عرض کیا کہ اس مد میں کچھ معمولی رقم تو جمع ہے لیکن ابھی مزید کافی رقم کی ضرورت ہے اور پاسپورٹ بھی تیار نہیں ہے۔ والد صاحب نے فرمایا کہ "یہ بتاؤ کہ ارادہ بھی ہے یا نہیں؟ اس وقت تک احقر ارادہ کر چکا تھا اس لئے عرض کیا کہ "ارادہ تو پکا ہے"۔ فرمایا کہ "رقم کا بندوبست تو انشاء اللہ ہو جائے گا۔ پاسپورٹ بنوانے کی اور دوسری دفتری کارروائیاں فوراً شروع کر دو کیونکہ اب حج میں صرف دس بارہ روز باقی ہیں۔

اللہ کا نام لے کر گھر سے نکلا اور اسی دن پاسپورٹ کے لئے درخواست دے دی اور بھیاجی کی دعاؤں کے طفیل اگلے دن پاسپورٹ مل گیا اور دوسری کارروائیاں بھی تقریباً مکمل ہو گئیں اب

پہلی یا دوسری ذی الحجہ کو ٹکٹ کی رقم جمع کرنی تھی۔ کچھ رقم تو تھی لیکن مزید اڑھائی ہزار روپیہ درکار تھے اور روانگی میں صرف ۳۶ گھنٹے باقی تھے۔ باقی رقم کے لئے بھیا جی سے کہنے کا ارادہ تھا کہ آپ ہی بندوبست فرماویں۔

دوکان کے انتظامات کے لئے دوکان پر پہونچا تو اللہ کا فضل اور بھیا جی کی دعائیں اور توجہ کا نتیجہ سامنے آگیا یعنی بالکل غیر متوقع طور پر ایسی جگہ سے ٹھیک اتنی ہی رقم کا انتظام ہوگیا جتنی ضرورت تھی۔ یہ رقم عرصہ سے ڈوبی ہوئی تھی اور اس وقت اس کے ملنے کا وہم وگمان بھی نہ تھا۔ اس واقعہ سے اس بات کا مشاہدہ ہوگیا کہ اگر صحیح نیت سے آدمی کسی بڑے سے بڑے کام کا آغاز کرے تو اللہ تعالیٰ کی مدد ضرور شامل حال ہوتی ہے

پھر دوسری مرتبہ ۱۹۶۸ء میں بھی والدین کا حج پر جانے کا اچانک پروگرام بنا اور بھیا جی نے احقر کو اپنے ساتھ چلنے کی دعوت دی اور یہ دوسرا حج بھی والدین کے سایۂ شفقت میں اللہ تعالیٰ نے کرادیا۔ اور تیسری مرتبہ ۱۹۷۰ء میں عمرہ کا سفر بھی بھیا جی کے ساتھ ہی ہوا۔

احقر پر اللہ تعالیٰ کا اتنا بڑا فضل وکرم ہے کہ جس کا شکر ادا نہیں کیا جاسکتا کہ حجاز مقدس کے اب تک تین سفر احقر نے کئے جس میں دو حج کے سفروں میں والد صاحبؒ اور والدہ ماجدہ مدظلہا کی معیت حاصل ہوئی اور عمرہ میں صرف والد ماجدؒ کی۔ غرض تینوں مقدس سفر اللہ تعالیٰ نے والدین کے زیر سرپرستی کرائے۔ اللہ تعالیٰ اس سیاہ کار کے ان تینوں سفروں کو قبول فرمائے اور پھر زیارت حرمین شریفین کرائے۔ افسوس کہ اب بھیا جی کا عظیم سایہ ہمارے سروں پر نہیں ہے لیکن امید ہے کہ ان کی دعاؤں کی برکت سے اللہ تعالیٰ پھر اپنا فضل فرمائیں گے اور اپنے گھر بلائیں گے۔

ان سفروں میں بھیا جی کی کیا کیا کرامات، کمالات اور برکتیں مشاہدہ میں آئیں ان کے بیان کے لئے ایک دفتر چاہیے اور یہ صفحات اس کے متحمل نہیں ہیں اس لئے یہ ذکر یہیں ختم کرتا ہوں۔

مشرقی پاکستان کا سفر

۱۹۶۳ء کے حج کے دو تین ماہ کے بعد ۲۶ اکتوبر ۱۹۶۳ء میں بھیا جی نے اپنے دوست احباب اور شاگردوں کے شدید اصرار پر ڈھاکہ، سلہٹ، چاٹگام اور دوسرے چند مقامات کے سفر کا ارادہ

فرمایا تو احقر نے عرض کیا کہ احقر نے اب تک اپنے ملک کا یہ حصہ نہیں دیکھا اس لئے احقر آپ کے ساتھ چلے گا۔ والد صاحب نے منظور فرما کر اس سفر میں بھی احقر کو اپنی رفاقت کا موقعہ عنایت فرمایا۔

۲۶ اکتوبر ۱۹۶۳ء کو پی آئی اے کے ذریعہ تقریباً عصر سے کچھ قبل کراچی سے روانہ ہو گئے۔ بھیاجی کا ایک معمول ہمیشہ رہا کہ سفر چھوٹا ہو یا بڑا، ہوائی سفر ہو یا بحری ریل کا ہو یا موٹر کا وہ ہمیشہ اپنے ساتھ جمع شدہ ڈاک اور زیر تکمیل مسودات اپنے ساتھ رکھتے اور جیسے ہی سفر میں کچھ سکون ہوتا، بھیاجی اپنا ہینڈ بیگ نکالتے اور خطوط کے جوابات یا مسودات تحریر کرنا شروع کر دیتے اور اس میں اس قدر انہماک ہوتا کہ اکثر یہ کام سفر کے ختم پر یا نمازوں اور کھانے کے اوقات میں ہی بند ہوتا تھا۔

یہ عجیب ملکہ بھیاجی کو حاصل تھا کہ ہر قسم کے سفر میں اسی تیزی اور روانی کے ساتھ لکھتے چلے جاتے جیسے دوران قیام میں۔ مجال ہے کہ کہیں تحریر میں فرق آجائے اور پھر یہ خطوط کے جواب کوئی عام معمولی خطوط کے جواب نہ ہوتے تھے، بلکہ تمام تر علمی اور فقہی تحقیقات پر مشتمل ہوتے تھے، انہی خطوط کے ذریعہ کہیں فقہی گتھیاں سلجھائی جا رہی ہیں اور کہیں اصلاح باطن اور تزکیۂ نفس کا درس دیا جا رہا ہے۔ غرض یہ ساری تحریریں اسی انداز کی حامل ہوتی تھیں۔ خدائے علیم وخبیر ہی کو علم ہے کہ بھیاجی نے اپنی زندگی کے تمام سفروں میں کتنی تصانیف مکمل کی ہیں؟ اور فتاوی تو یقیناً ہزاروں کی تعداد میں تحریر فرمائے ہوں گے۔ اس طریقۂ تصنیف اور دار الافتاء کی کوئی نظیر احقر نے تو اپنی آنکھوں سے دیکھی نہیں۔

ہاں تو میں یہ عرض کر رہا تھا کہ ہم عصر سے قبل کراچی سے ڈھاکہ کے لئے روانہ ہوئے تو والد صاحبؒ نے حسب معمول جہاز میں اپنا کام شروع کر دیا۔ ناشتہ اور نماز عصر سے فارغ ہو کر پھر کام میں لگ گئے۔ احقر کو والد صاحب کے اس کام سے کوئی غرض نہ تھی اور جہاز کی کھڑکی سے فضا اور زمین کے نظاروں میں گم تھا۔ جہاز کا کپتان مختلف شہروں پر سے گذرتے وقت بتاتا کہ اب جہاز فلاں جگہ سے گذر رہا ہے۔ اس وقت بھیاجی احقر کی تفریح طبع کے لئے مجھ سے فرماتے کہ ادھر دیکھو اور اس شہر سے متعلق کچھ مشہور باتیں بھی بتاتے۔ اسی طرح غروب آفتاب سے قبل کپتان نے بتایا کہ اب ہمارا جہاز الٰہ آباد سے گذر رہا ہے تو والد صاحبؒ فوراً احقر کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا کہ ذرا غور سے دیکھو شاید جہاز سے تربینی نظر آئے۔ یہ یہاں کی مشہور اور قابل دید جگہ ہے۔ احقر نے تربینی کا نام پہلی مرتبہ والد صاحب سے سن کر دریافت کیا کہ یہ تربینی کیا چیز ہے؟

بھیا جی مسکرائے اور فرمایا کہ واہ بھائی تمہیں اس کی بھی خبر نہیں۔ پھر فرمایا کہ یہاں تین دریا
آکر ملتے ہیں اس لئے تربینی کہلاتی ہے اور اکبر الہ آبادی نے اسی کے متعلق تو کہا ہے کہ ؎

اک تربینی ہے دو آنکھیں مری
اب الہ آباد بھی پنجاب ہے

الہ آباد اور اکبر الہ آبادی کے تعلق سے صاف معلوم ہو رہا تھا کہ اس وقت والد صاحبؒ کی طبیعت کچھ
شعر و شاعری کی طرف منتقل ہو گئی ہے۔ چنانچہ غروب آفتاب سے کچھ ہی قبل ایک سادہ کاغذ پر اپنا
ایک بالکل تازہ کہا ہوا شعر لکھ کر احقر کی طرف بڑھا دیا ؎

کچھ صبح زندگی کا اجالا سا ہو گیا
بالیں پہ آج کون سر شام آگیا

غرض اسی طرح سفر کرتے ہوئے عشاء کے قریب ڈھاکہ ایئر پورٹ پر اترے تو دیکھا کہ ہزاروں
انسانوں کا ایک جم غفیر "مفتی اعظم پاکستان زندہ باد" کے نعرے لگا رہا تھا حالانکہ اس سفر کے متعلق
نہ کسی اخبار میں تشہیر ہوئی تھی اور نہ کسی اور ذریعہ سے۔ بس والد صاحبؒ نے ڈھاکہ اور سلہٹ کے
چند دوستوں کو خط اور تار کے ذریعہ اپنی آمد کی اطلاع کی تھی۔ بعد میں معلوم ہوا کہ یہ لوگ صرف ڈھاکہ کے
ہی نہیں ہیں بلکہ کوئی سلہٹ سے آیا ہے اور کوئی دوسرے دور دراز مقام سے مفتی اعظمؒ کی ایک جھلک دیکھنے
کے جذبے میں یہاں پہنچ گیا ہے۔

ان لوگوں سے ملتے ملاتے بمشکل ایئر پورٹ سے نکل کر بھیا جی کے ایک خاص بے تکلف شاگرد
مولانا مفتی محی الدین کے ہمراہ ان کے مدرسہ میں پہنچے۔ یہیں پر رات کو قیام کرنا تھا۔ یہاں بھی رات کے
وقت اس قدر ہجوم جمع ہو گیا کہ سب سے مصافحہ کرانا بھی مشکل ہو گیا۔ چنانچہ مفتی محی الدین صاحب
نے اس ہجوم اور والد صاحب کی تکان کو دیکھ کر بڑی ہی مشکل سے اس وعدہ پر کہ صبح کو
حضرت مفتی اعظم مدظلہم سے سب کو مصافحہ کرنے کا موقع دیا جائے گا، اس ہجوم سے چھٹکارا دلایا۔
رات آرام سے گذری لیکن صبح فجر کے بعد سے جو لوگوں کا تانتا بندھا تو وہ کسی طرح ختم ہی
نہ ہونے پاتا تھا۔ ڈھاکہ کے اطراف و جوانب اور دور دراز مقامات سے لوگ جوق در جوق گرتے پڑتے
والد صاحبؒ کو ایک نظر دیکھنے اور مصافحہ کرنے کی تمنا لئے چلے آتے تھے یہ سب لوگ ڈھاکہ اور

اس کے اطراف کے مشہور علماء اور والد صاحب کے تلامذہ اوران کے تلامذہ تھے۔

اسی طرح ڈھاکہ میں ایک دن رات گذرے اگلے دن صبح ڈھاکہ سے سلہٹ کے لئے ایک ڈکوٹا جہاز میں روانہ ہوئے، تو ساتھ میں متعدد لوگ بھی شریک سفر ہوگئے جو سلہٹ سے والد صاحبؒ کو لینے کے لئے ہی ڈھاکہ آئے تھے۔ یہاں سے سلہٹ تک کا تقریباً نصف گھنٹے کا سفر انتہائی پر لطف گذرا کیونکہ یہاں کے قدرتی مناظر اور زمین کی شادابی قابل دید تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ قدرت نے پوری زمین پر سبز مخمل کا فرش بچھا دیا ہے۔

سلہٹ میں یوں تو والد صاحبؒ کے بے شمار شاگرد اور احباب تھے لیکن مولوی مجدالدین صاحب بھیاجی کے ایک بہت ہی مخلص اور بے تکلف دوست تھے جو سلہٹ کے ایک بڑے رئیس اور چائے کے متعدد باغ کے مالک تھے۔ بھیاجی جب بھی سلہٹ آتے تو ان کے پاس ہی ٹھہرتے تھے اس وقت جب ہم لوگ سلہٹ پہنچے تو اس سے کچھ قبل مولوی مجدالدین صاحب کا انتقال ہوچکا تھا اور ایئر پورٹ پران کے صاحبزادے محی السنہ جو بڑے متین کم گو اور باوقار انسان ہیں موجود تھے انہی کے ہمراہ ان کی کوٹھی پر پہونچے اور وہیں قیام رہا۔ والد صاحبؒ وہاں اکثر مجدالدین صاحب اور ان کے پرخلوص تعلق کا ذکر فرماتے رہے۔

یہاں بھی ہر وقت لوگوں کا ویسا ہی ہجوم رہنے لگا، جیسا ڈھاکہ میں دیکھا تھا اور ہر وقت بھیاجی لوگوں کے ہجوم میں گھرے رہتے اور اپنی بے پایاں شفقت سے ہر شخص کے ساتھ کچھ نہ کچھ گفتگو کر کے ان کی مراد پوری فرماتے۔

سلہٹ شہر چھوٹی چھوٹی خوبصورت شاداب پہاڑیوں کا ایک صاف ستھرا پرسکون اور چائے کے باغات کا شہر ہے۔ یہاں کے لوگ بھی بہت مہذب، متین، تعلیم یافتہ اور خوبصورت ہیں سلہٹ میں بھیاجی نے تقریباً آٹھ دس دن ٹھہرنے کا پروگرام بنایا تھا پھر وہاں سے چاٹگام، میمن سنگھ وغیرہ جانے کا ارادہ تھا۔ لیکن افسوس کہ دو تین دن کے بعد ہی والد صاحبؒ علیل ہوگئے۔ یہ عارضہ قلب کا جیسا دورہ تھا جس کی وجہ سے بلڈ پریشر بہت گر گیا اور بہت زیادہ کمزوری ہوگئی۔ وہاں کے مشہور ڈاکٹروں کو دکھایا اور ان کا علاج کیا گیا لیکن کوئی افاقہ کی صورت نظر نہ آئی۔

والد صاحبؒ، احقر اور میزبان سب پریشان ہوگئے۔ بھیاجی نے احقر سے فرمایا کہ محی السنہ صاحب

سے کہ جس قدر جلد ممکن ہو کراچی واپسی کا انتظام کرو۔ اس بیماری اور نقاہت کو دیکھ کر احقر نے بھی یہی مناسب سمجھا کہ جلد سے جلد والد صاحب کو کراچی پہونچا یا جائے۔

لیکن سوء اتفاق کہ بارش اور فضائی خرابی کے باعث سلہٹ سے ڈھاکہ کی پروازیں منسوخ ہو گئیں۔ ریل کے ذریعہ جانے کو ڈاکٹروں نے منع کیا۔ غرض اسی انتظار میں چند روز بادل ناخواستہ قیام کرنا پڑا۔ والد صاحب کی حالت دن بدن خراب ہوتی جارہی تھی۔ ایک دن جب ذرا افاقہ ہوا تو والد صاحبؒ نے دو تازہ شعر لکھ کر احقر کو دیئے، جو اسی زمین اور قافیہ میں تھے جس میں ایک شعر جہاز کے سفر کے دوران کہا تھا ؎

لب پر دم اخیر ترا نام آگیا
رکتا ہوا یہ سانس بہت کام آگیا
بیمار عشق لے کے ترا نام سوگیا
مدت کے بعد قرار کو آرام آگیا

یہ اشعار اپنی جگہ پر لطف سہی لیکن جن حالات میں یہ شعر بھیاجی نے احقر کو سنائے احقر اور پریشان ہوگیا اور کراچی واپسی کے لئے کوشش تیز کردی۔ دو روز بعد خدا خدا کرکے پروازیں شروع ہوئیں اور ہم پہلے ہی جہاز سے سلہٹ سے روانہ ہوگئے، اب جہاز بادلوں کے اندر تیر رہا تھا۔ چند منٹ کے بعد ہی اچانک ہوائی جہاز نے ایک کروٹ لی اور بادلوں کا سینہ چیر کر نیچے آیا تو نظروں کے نیچے ڈھاکہ ائیر پورٹ نظر آرہا تھا۔

ڈھاکہ میں پھر ایک روز قیام کرکے دوسرے دن کراچی واپس پہنچ گئے اور خدا کا شکر ہے کہ اپنے وطن اصلی پر پہنچتے ہی بھیاجی کی طبیعت سنبھلتی چلی گئی۔ صحت یابی کے بعد اکثر احقر سے فرماتے کہ بھائی تمہیں مشرقی پاکستان دکھانے لے گئے تھے لیکن افسوس کہ میری علالت کی وجہ سے تم پوری سیر نہ کرسکے۔ حالانکہ اس مختصر قیام میں بھی والد صاحب نے احقر کی دلداری کے لئے دونوں شہروں کی سیر کرانے کے خوب مواقع عطا فرمائے اور سب سے بڑی دولت یہ ملی کہ چند روز آپ کی خدمت کا موقع نصیب ہوا۔

بھیاجی اپنے والدین کے ساتھ: بھیاجی اپنے والدین کی ایک لائق اور قابل رشک

فرمانبردار اولاد تھے اور ہمیشہ اپنے والدین کی خدمت کر کے ان کی دلی دعائیں لیتے رہے۔ فرمایا کرتے تھے کہ بھائی ہمیں آج دین و دنیا کی جتنی دولتیں حاصل ہیں وہ محض ہمارے والدین کی دعاؤں کا نتیجہ ہیں اور اسی کے ساتھ فرماتے کہ میں نے اپنی زندگی میں ماں باپ کی خدمت کر کے دعائیں لینے والا کوئی شخص محروم نہیں دیکھا۔ اس کا اجر آخرت میں تو ملتا ہی ہے اور دنیا میں بھی اللہ تعالیٰ اس کا صلہ ضرور دیتا ہے۔

ہمارے دادا جان تو احقر کے بالکل بچپن میں ہی انتقال فرما گئے تھے ان کے ساتھ تو والد صاحبؒ کا طرزِ عمل احقر کو یاد نہیں ہے لیکن والد صاحبؒ ایک واقعہ کا ذکر ہمیشہ اپنی زندگی کے آخری دنوں تک اکثر سنایا کرتے تھے کہ میرے والد ماجد مولانا یٰسین صاحبؒ نے ایک دن اپنی بیماری میں احقر کو بلایا اور فرمایا کہ شفیع مرنے کے بعد اپنے والدین کو بھول تو سب ہی جایا کرتے ہیں۔ لیکن تم جلدی نہ بھولنا۔ بھیاجی فرماتے تھے کہ اپنے والد کے یہ جملے آج بھی اسی طرح یاد ہیں جیسے آج ہی سنے ہیں اور خدا کا شکر ہے کہ ان کے انتقال کے بعد سے آج تک کوئی دن ایسا نہیں گذرتا کہ ان کو ایصالِ ثواب نہ کرتا ہوں۔ اس سے اندازہ لگا لیجئے کہ کیسے وہ کہنے والے باپ تھے اور اس پر عمل کرنے والی کیسی عظیم اولاد تھی۔ البتہ دادی اماں یعنی بھیاجی کی والدہ نے ماشاء اللہ اچھی طویل عمر پائی اور ان کا انتقال اس وقت ہوا جب ہم سب بہن بھائی شادی شدہ اور بیوی بچوں والے ہو چکے تھے اور والد صاحب اپنی بے انتہا مصروفیت کے باوجود دادی جان کی خدمت کے لئے ہر وقت مستعد و تیار رہتے تھے گھر میں داخل ہوتے تو سب سے پہلے اپنی والدہ کی خدمت میں حاضری دیتے اور ان کی ہر طرح کی ضروریات کا اس قدر خیال رکھتے کہ ان کے کاموں کو خود اپنے ہاتھ سے اس طرح انجام دیتے کہ آج ہم اور اس زمانہ کی اولاد اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔

بھیاجی اپنے اہل و اولاد کے ساتھ

بھیاجی کی شخصیت جہاں باوقار اور بارعب لیکن انتہائی محبوب شخصیت تھی وہاں آپ اپنے اہل و اولاد کے ساتھ اس قدر بے تکلف بھی تھے کہ ہر شخص ان سے پوری بے تکلفی سے بات کرتا اور والد صاحب پوری توجہ سے بات سن کر انتہائی بے تکلفی سے جامع و مانع جواب عنایت فرماتے اور ہمارے مسائل حل فرماتے۔ بھیاجی کو اپنی اولاد سے بہت تعلق تھا۔ اکثر فرمایا کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ کے فضل سے دنیا

کے مال واسباب سے کبھی محبت نہیں ہوئی لیکن اولاد میری سب سے بڑی کمزوری ہے۔ اپنے اسی تعلق کی وجہ سے کسی اولاد کا جدا ہونا بھیاجی پر بہت شاق گذرتا تھا اور سب اولاد تو ہمیشہ ساتھ ہی رہی لیکن ہمارے سب سے بڑے بھائی جان مولوی محمد زکی کیفی اپنے کاروبار کی وجہ سے پاکستان آنے کے بعد لاہور میں قیام پذیر ہوگئے تھے اور ایک بہن رقیہ خاتون جو بہنوں میں سب سے چھوٹی لیکن احقر سے صرف ایک یا ڈیڑھ سال بڑی ہیں (جنہوں نے مفتی اعظم نمبر میں شریک اپنے مضمون میں احقر کی جلد پیدائش کو اپنی شیر خوارگی میں احقر کی شرکت کی وجہ سے احقر کو عجلت پسند بھائی قرار دیا ہے) ان کی شادی ۱۹۵۳ء میں لاہور میں ہوئی جس کی وجہ سے بھیاجی کی یہ دو اولاد لاہور میں قیام پذیر تھیں۔ ان دونوں کی جدائی کا خیال بھیاجی کو بہت تھا اور ہر خوشی اور اجتماع جس میں وہ شریک نہ ہوتے ان کا ذکر ضرور کرتے۔ اتفاق سے ان دونوں سے والد صاحب کو بہت خصوصی تعلق اور محبت تھی

بھیاجی کے ساتھ عصر سے مغرب تک کی نشست

عصر سے مغرب تک کا وقت بھیاجی ہمیشہ اپنے گھر والوں کے لئے خالی رکھتے اور اکثر سب گھر والے اس وقت اس طرح والد صاحب کے گرد جمع ہو جاتے جیسے شمع کے گرد پروانے۔ یہ ایک بہت پرلطف مجلس ہوتی جس میں گھر کا ہر فرد حصہ لیتا۔ اور مختلف موضوعات پر دلچسپ اور سبق آموز باتیں ہوا کرتیں ہم لوگ آپس میں ہنسی مذاق بھی کرتے اور بھیاجی ہماری باتوں سے لطف اندوز ہوتے ابتداء میں بھیاجی۔ نرسیسیلہ چوک کے قریب جو اپنا واحد سکونتی مکان بنوایا تھا ہم سب اسی میں قیام پذیر تھے۔ بھیاجی۔ دارالعلوم کے کاموں کی نگرانی اور دیکھ بھال کے لئے تقریباً روزانہ ہی کورنگی تشریف لے جاتے۔ پھر دارالعلوم کے کام روز بروز بڑھتے گئے اور یہاں رہے بغیر دیکھ بھال مشکل ہوگئی تو پھر مستقل طور پر دارالعلوم کورنگی میں ہی مقیم ہوگئے۔ والدہ ماجدہ اور مولوی محمد رفیع اور مولوی محمد تقی بھی حضرت والد صاحب کے ساتھ وہیں مقیم ہوگئے۔ اب سیسیلہ میں صرف احقر محمد رضی اور مجھ سے چھوٹے بھائی محمد ولی رازی ہم دو بھائی یہاں مقیم رہے۔

والد صاحب کے کورنگی جانے سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دنیا ہی سنسان ہوگئی۔ لیکن رفتہ رفتہ علیحدہ رہنے کی عادت پڑی۔ ادھر والد صاحب بھی ہم لوگوں کی تنہائی اور اپنے سے

جدائی کو بہت محسوس فرماتے تھے۔ اب کورنگی سے تقریباً روزانہ ورنہ دوسرے دن شہر آتے تو کبھی بغیر ہم لوگوں کے پاس تشریف لائے واپس نہ ہوتے اور عموماً ہم لوگوں کے لئے کوئی نہ کوئی چیز لے کر آتے اور اگر شہر آنا نہ ہوتا تو ان میں ایک بار ٹیلیفون سے ضرور خیریت دریافت فرماتے۔ احقر یا احقر کے اہل وعیال میں کوئی بیمار ہو جاتا تو بے چین ہو جاتے اور اکثر خود تشریف لا کر کسی حکیم یا ڈاکٹر کو دکھانے لے جاتے۔

کئی بار ایسا ہوا کہ احقر کو کوئی بیماری ہو گئی تو پریشان ہو گئے اور والدہ ماجدہ مدظلہا کو لیکر لسبیلہ میں احقر کے یہاں کئی کئی دن قیام فرمایا اور خود حکیم اور ڈاکٹروں کے پاس لے جاتے اور اپنے ہاتھوں سے دوائیں کھلاتے اور اس وقت تک بے چین رہتے جب تک سہی آرام نہ آتا۔

ایک بار میری بڑی لڑکی اسماء بانو کو سخت قسم کا ٹائیفائیڈ ہو گیا جس کی وجہ سے والد صاحب اس قدر بے چین ہوئے کہ تقریباً ایک ہفتہ احقر کے یہاں آکر خود اپنی نگرانی میں علاج معالجہ کرایا اور خود تکلیفیں جھیلیں لیکن نہیں تسلی ہی فرماتے رہتے۔ میری اہلیہ اور چھوٹی لڑکی سلمیٰ بانو اور میرے لڑکے خلیل اشرف کا اس قدر خیال فرماتے کہ کوئی اپنی اولاد سے بھی اتنا نہیں کرتا۔

اتوار کا دن

احقر نے شہر میں اپنی کاروباری مصروفیات کی وجہ سے یہ معمول بنایا تھا کہ اتوار کی تعطیل میں اکثر تو اپنی بیوی بچوں کے ساتھ ورنہ تنہا شام کو ٹھیک عصر کی اذان کے وقت دارالعلوم پہنچ جاتا اور عصر کی نماز وہاں مسجد میں ادا کرتے ہی حضرت والد صاحب کی خدمت میں حاضر ہو جاتا۔

بھیا جی کو ہمیشہ اس دن اور اس وقت اپنا منتظر پاتا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دروازہ پر احقر کے انتظار میں آنکھیں لگائے بیٹھے ہیں۔ احقر کو دیکھتے ہی ایسی خوشی کا اظہار فرماتے کہ جیسے بہت لمبے سفر سے آیا ہوں۔ اکثر فرماتے کہ ڈاکٹر، حکیم تقویت قلب کے لئے دوائیں اور غذائیں بتاتے ہیں، بھائی میری تقویت تو اولاد کو خوش دیکھنے میں ہے، ان کو دیکھ لیتا ہوں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گھی پی لیا ہے اور یہ بالکل حقیقت تھی اور بعد عصر اگر حاضری میں کسی وجہ سے کوئی معمولی تاخیر بھی ہو جاتی تو گھڑی دیکھتے رہتے اور اگر معمول سے کچھ زیادہ وقت گذر جاتا تو لسبیلہ ٹیلیفون

کر کے دریافت فرماتے کہ بھئی ابھی تک نہیں پہونچے، کس وقت وہاں سے چلے تھے؟ کیا بات ہے؟ کس سواری سے آرہے ہیں اور جب پہنچ جاتا تو خوشی میں ڈوبی ہوئی ہلکی سی خفگی سے فرماتے بندۂ خدا کہاں رہ گئے تھے۔ ہم تو انتظار کرتے کرتے پریشان ہو گئے۔

اپنی زندگی کے آخری بیماریوں کے سالوں میں جب والد صاحب کا شہر آنا تقریباً ترک ہی ہو گیا تھا تو اتوار کے دن کا انتظار ایک دن پہلے ہی سے شروع ہو جاتا اور اتوار کے دن صبح سے گھر میں ذکر فرمایا کرتے کہ آج رضی آئے گا، اور شام کو احقر کی حاضری تک گھڑی دیکھ کر حساب لگاتے رہتے کہ اب چلے ہوں گے، اب راستہ میں ہوں گے اور اب پہونچنے والے ہوں گے۔ احقر کو والد صاحب کے اس انتظار و اہتمام کا علم تھا اس لئے احقر بھی اپنی پوری کوشش کرتا کہ ان کے اندازے کے مطابق وہاں پہنچ جائے لیکن اگر کبھی ذرا بھی دیر ہوتی تو وہی حال ہوتا جو اوپر ذکر کر چکا ہوں۔

۱۹۷۴ء میں میری بڑی لڑکی اسماء بانو کی شادی ٹھہری تو احقر کو اپنی اولاد کی پہلی شادی کرنے اور ناتجربہ کاری کی وجہ سے کچھ پریشان دیکھا تو اپنی علالت اور انتہائی کمزوری کے باوجود ہر طرح کے کاموں اور شادی کی تیاری کے تمام مراحل میں اپنی پوری توجہ سے شریک رہے اور ایک ایک کام اور انتظام کے متعلق معلوم فرماتے اور مشورے عنایت فرماتے رہے۔ جب شادی کا وقت قریب آیا تو احقر کی درخواست پر تین روز کے لئے احقر کے مکان بسبیلہ میں آکر قیام فرمایا اور تمام مراحل کی تکمیل تک شب و روز تمام کام اپنی نگرانی میں مکمل فرمائے۔

اور یہ معاملہ صرف احقر ہی کے ساتھ نہ تھا بلکہ اپنی پوری اولاد اور ان کی اولاد کے ساتھ بھی بھیا جی کا اسی قسم کا معاملہ تھا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے کاموں اور اوقات میں ایسی برکت عطا فرمادی تھی کہ اپنی بے شمار مصروفیات کے باوجود اس قسم کے کاموں کے لئے بافراغت وقت نکال لیا کرتے تھے احقر اور ہم سب بہن بھائی شادی شدہ اور بیوی بچوں والے اور پوتے پوتی اور نواسہ نواسی والے ہو چکے تھے لیکن بھیا جی کے سارے معاملات ہم لوگوں کے ساتھ ایسے تھے کہ جیسے ہم بالکل بچے ہوں۔ (جیسا کہ ناظرین نے کچھ اندازہ بھی کر لیا ہوگا۔) اور ان کے اس معاملہ کی وجہ سے ان کی حیات تک ہم لوگ بھی اپنے آپ کو بچہ ہی سمجھتے رہے اور بچوں ہی کے جیسے ناز نخرے کرتے رہے اور

وہ بھی بچوں کی طرح ہمارے ناز نخرے خوشی خوشی برداشت فرماتے رہے۔ لیکن ان کے انتقال کے بعد اچانک ایسا معلوم ہوا کہ ہم بچپن سے ایک دم بڑھاپے میں پہنچ گئے۔ تب پتہ چلا کہ انہوں نے ہمارے کون کون سے غم اور ہمارے کتنے بوجھ اٹھا رکھے تھے۔

اتوار کی تعطیل میں اکثر ہم سب بہن بھائی اور ان کے بیوی بچے دارالعلوم میں جمع ہوتے اور کبھی لاہور سے بڑے بھائی جان اور ہمشیرہ بھی آئے ہوئے ہوتے تو بھیاجی اور ہم سب چھوٹے بڑوں کی خوشی کی کوئی حد نہ رہتی۔ ہر روز روزِ عید اور ہر شب شبِ برات کا سماں بندھ جاتا خصوصاً عصر کے بعد کی مجلس تو انتہائی پُرلطف گزرتی اور پھر بعد مغرب بھی یہ سلسلہ چلتا! ایسے موقعوں پر تو بھیاجی ہی کسی اور کام میں لگتے اور نہ ہم ہی ان کو چھوڑتے۔

بعد عشاء سب لوگ مل کر کھانا کھاتے۔ بھیاجی ایک ایک فرد کا کھانے میں خود خیال رکھتے لیکن جب سے آپ علیل ہو گئے تھے تو رات کا کھانا برائے نام اور پرہیزی رہ گیا تھا اس لئے والد صاحب کے ساتھ کھانے میں شرکت نہ ہوتی اور ہم سب بھائی بہن علیحدہ جمع ہو کر کھانا کھاتے اور اس وقت دنیا جہاں کی باتوں اور لطائف و ظرائف میں بہت وقت خراب کرتے۔

والد صاحب دور سے اپنے کمرے میں لیٹے لیٹے ہماری باتوں سے محظوظ بھی ہوتے رہتے اور جب ہم باتوں میں حد سے زیادہ دیر کر دیتے تو ہمیں سمجھاتے کہ وقت کی قدر کرو۔ خاص طور سے عشاء کے بعد کی محفل آرائی سے منع فرماتے کہ اس سے صبح کی نماز خطرے میں پڑ جائے گی۔ احقر سے خاص طور پر فرماتے کہ بھائی تمہیں شہر جانا ہے زیادہ تاخیر نہ کرو۔ چونکہ والد صاحبؒ کو ہماری اس عادت کی خبر تھی اس لئے جب ہم لوگ کھانے کے لئے والد صاحب سے رخصت ہوتے تو بڑی حسرت سے فرماتے کہ اچھا بھائی جاؤ (جیسا کہ زبانِ حال سے کہہ رہے ہوں کہ بس اب ہم سے تو گئے) اور کبھی واقعی ایسا ہوتا بھی کہ ہم فارغ ہو کر آتے تو بھیاجی سونے کے لئے لیٹ چکے ہوتے۔ اور اگر کبھی جاگتے ہوتے تو پھر والد صاحب کے ساتھ باتوں میں مصروف ہو جاتے اور والد صاحب کا قیمتی وقت خراب کرتے۔ کھانے میں اتنا وقت خرچ کرنے پر آپ نے نہ جانے کتنی بار ہمیں سمجھایا اور بار بار فرماتے کہ مجھے دیکھو کر کھانے میں میرے پانچ منٹ سے زیادہ خرچ نہیں ہوتے اور اب خیال ہوتا ہے کہ وہ قیمتی وقت کس طرح ضائع کیا۔ غرض، بھیاجی نے ساری اولاد کو اپنے آپ سے

کچھ اتنا مانوس کیا ہوا تھا۔ اور ان کی مجلس میں کچھ ایسی کشش ہوتی تھی کہ وہاں سے اٹھنے کو دل نہ چاہتا تھا۔
احقر کو اکثر رات کے گیارہ ساڑھے گیارہ وہیں بج جاتے۔ گھڑی دیکھ کر خود ہی یاد دلاتے
کہ بھائی تمہیں شہر جانا ہے پھر سواری نہیں ملے گی جلدی کرو تب احقر بادل نخواستہ وہاں سے اٹھتا اور رات
کو بارہ ایک بجے سے پہلے شاید ہی کبھی واپس پہنچا ہوں۔
روانگی کے وقت فرماتے کہ گھر جا کر ٹیلیفون کر دینا تاکہ اطمینان ہو جائے ورنہ پریشانی رہتی ہے
ہم سب بہن بھائیوں کے بچپن کے کچھ دلچسپ واقعات بھی والد صاحب کو یاد تھے اور اکثر ایسے دلچسپ
اجتماع کے موقع پر کبھی کسی کو اور کبھی کسی کو چھیڑا کرتے تھے کہ ان بھائی تمہارا واقعہ کیا ہوا تھا؟ وہ واقعے
چونکہ بچپن کی شرارتوں کے دلچسپ واقعات ہوتے تھے اس لئے سب ہنس ہنس کر ہنسی سے لوٹ پوٹ
ہو جایا کرتے تھے اور ابا جی بھی خوب لطف لیتے اور مسکراتے رہتے لیکن اس قسم کی کوئی مجلس شاید
ہی کبھی کسی بزرگ کے ذکر سے خالی ہو ورنہ اگر کبھی باتوں میں دیر ہو جاتی تو فرماتے کہ مجلس کا خاتمہ اللہ کے
ذکر پر کرو ورنہ حدیث کی رو سے مجلس وبال بن جاتے

اس طرح کے اجتماع تو اکثر ہوا ہی کرتے تھے البتہ عید یا بقرعید پر خاص طور پر والد صاحب دارالعلوم
میں اپنی سب اولاد کو جمع فرما کر عید کی خوشیوں کو دوبالا فرمایا کرتے تھے۔ سب کے لئے خصوصی کھانا
اپنے اہتمام سے پکواتے اور جب سب جمع ہو جاتے تو اس کا انتظار فرماتے رہتے کہ سب جمع
ہو کر کب عیدی کا مطالبہ کرتے ہیں؟ اگر ہمارے مطالبے میں کچھ تاخیر ہوتی تو بات خود ہی چھیڑتے اور فرماتے
کہ بھائی کیا عیدی نہیں لو گے؟ یہ سنتے ہی سب والد صاحب کے گرد جمع ہو جاتے۔ والد صاحب کی نیت
پہلے ہی سے گزشتہ سال سے زیادہ عیدی دینے کی ہوتی تھی۔ فرماتے کہ اب تم کو گھر گرانی کا زمانہ ہے
ہم زیادہ عیدی لیں گے۔ بس یہیں تو بات ہاتھ لگ جاتی اور ہم مطالبہ شروع کر دیتے اگر کوئی کہتا دگنی
کوئی کہتا نہیں تین گنی عیدی لیں گے۔ غرض نہایت فرحت وانس اور خوشی و مسرت کے ساتھ عیدیاں تقسیم
فرماتے اور ہر سال عیدی کے موقع پر آخر میں سب کو بٹھا کر گرانقدر نصیحتیں فرمایا کرتے تھے۔ یہ ضرور
فرماتے کہ بھائی یہ عیدی تو تم لے لو لیکن آئندہ سال خبر نہیں ہم کہاں ہوں گے؟
عید کے علاوہ سال کے دوران بھی کبھی کبھی آپ اپنی تمام اولاد کو کھانے پر جمع فرماتے اور
خاندان میں جو برائیاں دیکھتے ان پر ایک ایک کر کے تنبیہ فرمایا کرتے تھے۔ اسی دعوت کو آپ

اکثر ظرافت سے "کان پکڑنے کی دعوت" کہا کرتے تھے، اور جب ایسے اجتماع کو زیادہ دن گذر جاتے تو فرمایا کرتے "بہت دن سے تمہاری کان پکڑنے والی دعوت نہیں ہوئی" اسی طرح سالہا سال سے یہ معمول چل رہا تھا کہ شوال ۱۳۹۶ھ آپہونچا اور اس سال بھی حسب معمول اپنی پوری اولاد کو جمع کرنے کا اہتمام فرمایا۔ چنانچہ صبح سے سب لوگ پہونچنا شروع ہوگئے۔ احقر کا معمول ہمیشہ وقت پر پہونچنے کا تھا اس روز اتفاق سے احقر کو بعض ضروری کاموں کی وجہ سے کچھ تاخیر سے پہونچا، دیکھ کر بظاہر خوشی کا اظہار فرماتے ہوئے فرمایا کہ بھائی جس سے سب سے پہلے آنے کی توقع تھی وہی سب سے آخر میں آیا۔ بہت دیر کر دی۔ احقر نے معذرت پیش کی لیکن احقر نے بھیا جی کو دیکھ کر اندازہ کیا کہ طبیعت کچھ مضمحل ہے اور خوشی و نشاط کی وہ کیفیت نہیں ہے جو ہمیشہ ہوا کرتی تھی لیکن پھر بھی جب سب جمع ہو گئے تو والدہ ماجدہ کے قریب آکر بیٹھ گئے اور ہم سب لوگ عیدی کا مطالبہ کرنے لگے تو دریافت فرمایا کہ بھائی اس سال عیدی کا کیا نرخ ہوگا؟ سب نے عرض کیا کہ پچھلے سال اپنی ہر اولاد کو ۲۵/- روپے عنایت فرمائے تھے اس سال تو اور زیادہ ہونی چاہیے چنانچہ اس سال ہم سب بہن بھائیوں کو تیس تیس روپیہ عیدی عطا فرمائی اور فرمایا کہ گذشتہ کئی سالوں سے آخری عیدی سمجھ کر دیتا ہوں غالب گمان یہ ہے کہ یہ آخری عیدی ہے عیدی سے فراغت کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے وقت زبان مبارک پر جو آخری کلمات جاری تھے وہ سنائے اور فرمایا کہ بس اس وقت یہ مختصر لیکن نہایت جامع نصیحت میں بھی تم کو کرتا ہوں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے کلمات مبارک کا مفہوم یہ ہے،

"نماز کا خیال رکھو۔ نماز کا خیال رکھو اور اپنے ماتحتوں کے معاملے میں اللہ سے ڈرو"

اس وقت سوائے خدا ئے تعالیٰ کے کسے معلوم تھا کہ بھیا جی کے ساتھ یہ ہماری آخری عید ہے لیکن قضا و قدر کا آخری فیصلہ ہو چکا تھا اور یہی عید والد صاحب کے ساتھ آخری عید ثابت ہوئی کیونکہ اس کے ٹھیک نو دن بعد یعنی گیارہ شوال ۱۳۹۶ھ کی شب کو علم و فضل کا یہ آفتاب جہاں تاب غروب ہوگیا اور اپنے مالک حقیقی سے جا ملا۔ اللہ اکبر کیسے عظیم باپ کی شکل میں اللہ تعالیٰ نے گھر بیٹھے کیسی دولت نصیب کر رکھی تھی جس کی ہم نے قدر نہ پہچانی۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہم سب بہن بھائیوں کو ان کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے آمین

محترمہ رقیبہ عفت صاحبہ

میرے والد ماجد

اور اُن کی گھریلو زندگی

محترمہ رقیبہ عفت صاحبہ حضرت مفتی اعظم رحمۃ اللہ علیہ کی صاحبزادی ہیں۔ ہم نے ان سے درخواست کی تھی کہ صاحبزادیوں کے ساتھ حضرتؒ کے طرزِ عمل سے متعلق جو واقعات آپ کے پاس امانت ہیں ان کو قارئین البلاغ تک پہنچائیں۔ چنانچہ زیرِ نظر مضمون اسی فرمائش کی تکمیل ہے۔

میرے والد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ، ان کی زندگی، علم و فضل، زہد و تقویٰ پر تو اہلِ علم و بصیرت و اہلِ قلم ہی لکھ سکتے ہیں۔ مجھ جیسی جاہل ہستی کو یہ ادراک کہاں؟ مجھے تو حضرتؒ کی گھریلو زندگی یعنی گھر والوں اور خاص طور پر لڑکیوں کے ساتھ والد صاحبؒ کا طرزِ عمل کیا تھا، اس کے متعلق کچھ عرض کرنا ہے۔ یوں تو والد صاحبؒ کے ساتھ گذرے ہوئے لمحے لمحے کی یاد دل پر تازہ رہتی ہے علاوہ ان کی کون سی بات ایسی ہے کہ جس کو نہ لکھا جائے۔ ان کے ہر عمل اور ہر بات میں جو حکمتیں ہوتی تھیں لکھنے بیٹھو تو صفحے کے صفحے ختم ہو جائیں۔ لیکن میں چند یادیں بطور نمونہ پیش کروں گی۔ کیونکہ مضمون نگاری کی نہ مجھے عادت ہے اور نہ اہلیت۔ میں ایک بے علم اور جاہل ہستی ہوں اور پہلی مرتبہ لکھنے کا اتفاق ہے۔ اس لیے قارئین سے بھی التماس ہے کہ ان سیدھی سادی باتوں کو مضمون نگاری کے پیمانے سے نہ نا پیں۔ یہ ایک بیٹی کی اپنے باپ سے دائمی جدائی پر سینے سے اٹھتا ہوا ایک دھواں ہے جو الفاظ کی صورت اختیار کر رہا ہے اور اس کے اظہار میں دو فائدے نظر آ رہے ہیں۔ ایک تو یہ کہ ایک دردمند دل کا غبار کچھ ہلکا ہو جائے گا، دوسرے یہ کہ یہ واقعات کسی مسلمان کے لیے مشعلِ راہ ثابت ہوں۔

یوں تو والد صاحب کی محبت اور تعلق ساری اولاد کے ساتھ یکساں تھا، لیکن لڑکیوں سے والد صاحبؒ کو خاص شفقت تھی۔ ہمیشہ بڑی نرمی اور محبت سے بات کرتے۔ ہماری چھوٹی چھوٹی خواہشات بشرطیکہ

جائز ہوں، بڑی خوشی سے پوری کرنے کی کوشش فرماتے کبھی تُرش روئی یا غصہ سے بات نہیں کی۔ ہم سب بہنوں کے پیارے سے نام رکھے ہوئے تھے، اکثر انہیں ناموں سے مخاطب فرماتے آج تک اس لہجے کی مٹھاس اور حلاوت کانوں میں محفوظ ہے۔ اگر کسی بات پر فہمائش کی ضرورت محسوس کرتے تو انداز بیان نہایت نرم اور ناصحانہ ہوتا۔ پتہ بھی نہ چلتا کہ ہم پر ڈانٹ پڑ رہی ہے اور گوشمالی بھی خوب خوب ہو جاتی تھی۔ والد صاحب کی زندگی تقویٰ و پرہیزگاری کا نمونہ تھی۔ حقوق العباد کا اس قدر اہتمام والد صاحب کے سوا کہیں دیکھنے میں نہ آیا۔ اگر ہمارے آرام کا وقت ہوتا اور والد صاحب کو کوئی کام پیش آجاتا تو خود ہی اپنے ہاتھ سے کر لیتے تھے، ہم سے کبھی نہ کہتے۔ بعد میں معلوم ہوتا تو شرمندگی ہوتی۔

میری دو بہنیں کراچی رہتی ہیں۔ میری شادی لاہور ہوئی ہے اور میں یہیں مقیم ہوں۔ کراچی اور لاہور کی دوری کے باوجود مجھے کبھی یہ احساس نہیں ہونے دیا کہ میں ان سے دور ہوں۔ مسلسل خط و کتابت جاری رہتی۔ کتنے ہی مصروف ہوں خط و کتابت میں فرق نہ آتا۔ بہت ہی زیادہ مصروف ہوں تو خط مختصر ضرور ہو جاتا۔ میرے بچوں اور گھر والوں کے سب حالات سے باخبر رہتے۔ بچوں کی تعلیم اور دوسرے امور سب والد صاحب کے مشورے ہی سے طے پاتے تھے۔ اگر مجھے کراچی بلانے کو دل چاہتا، تو اپنے داماد ...... کو خط لکھتے اور اس قدر رعایتیں ہوتیں کہ ملنے کو دل چاہتا ہے مگر آپ کی تکلیف کا خیال دامن گیر ہے۔ اگر سہولت ہو اور گھر کے حالات اجازت دیں تو کچھ دن کے لیے بھیج دیں" اور پھر جتنے دن کا وعدہ فرماتے اسی پر بھیجنے کی کوشش فرماتے۔ اور فرماتے تھے کہ تعلقات اسی صورت خوش گوار رہ سکتے ہیں کہ طرفین ایک دوسرے کے احساسات کا خیال کریں۔ میں سمجھتی ہوں کہ والد صاحب کو مجھ سے زیادہ محبت تھی لیکن یہ بات نہیں ہے۔ تعلقات کی یہی نوعیت دوسری بہنوں کے ساتھ بھی تھی۔ ان سے اگر سوال کیا جائے تو ان کا جواب بھی یہی ہو گا۔

میں ابھی ایک سال ہی کی تھی کہ میرے ایک محبت پسند بھائی دنیا میں آ وارد ہوتے اور میری شیر خواری کے جملہ حقوق اپنے نام محفوظ کرا لیے۔ والدہ کے لیے دو چھوٹے چھوٹے بچوں کو سنبھالنا آسان نہ تھا۔ اس لیے میری پرورش کی کچھ ذمہ داریاں والد صاحب نے خود سنبھال لیں۔ رات کو والد صاحب کے پاس سوتی۔ آدھی رات کو اٹھ کر دودھ پینے کی عادت تھی۔ میرے دودھ اور پانی کے مخصوص برتن تھے۔ اگر کسی اور برتن میں کھانے پینے کو دیا جاتا تو ہرگز نہ لیتی۔ اس لیے والد صاحب

میرے لیے سیدہ برتن اور دودھ کا جملہ سامان اپنے سرہانے رکھ کر سوتے تھے۔ میں آدھی رات کو اٹھتی دودھ طلب کرنے کی ایک خاص لَے تھی، اس سے میں ان کو جگاتی تھی۔ ابا جان خود ہی اٹھتے۔ والدہ صاحبہ کو اس لیے نہیں اٹھاتے تھے کہ دن بھر بچوں کے ساتھ تھکی ہوئی ہیں۔ خود ہی اٹھتے اور دودھ بنا کر مجھے پلاتے اور جب میں اپنی تمام ضروریات سے فارغ ہو جاتی تو تھپک تھپک کر سلا بھی دیتے تھے۔ وہ عادت راسخ ہوگئی اور عرصہ تک رات کو اٹھ کر دودھ پینے کا معمول رہا۔ یہاں تک کہ پہلے سرہانے رکھے ہوئے برتن اور رات کو اٹھنے کا دھندلا سا منظر ابھی تک ذہن میں محفوظ ہے۔ ابا جان بچپن کی ان باتوں کا اکثر ذکر کرتے رہتے تھے اور فرماتے تھے "تیرا وہ دودھ مانگنے کا گیت ابھی تک کانوں میں گونجتا ہے"۔ اور پھر اسی انداز میں میرے سامنے وہ الفاظ دہراتے۔ ابا جان ہنس کر یہ باتیں تو بتاتے مگر اس کے لیے انہوں نے کتنی مشقتیں اٹھائی ہوں گی اس کا کبھی ذکر نہیں کیا۔ اس وقت اپنے اتنے عظیم باپ کے لیے میرے جذبات کیا ہوتے ہیں ان کا اظہار الفاظ میں نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ جب سے ہم نے ہوش سنبھالا ہی دیکھا کہ رات کو بارہ ایک بجے جب تھکن سے چور ہو جاتے تو ہاتھ سے قلم رکھتے۔ کاغذات کا پلندہ سرہانے رکھ کر سوتے۔ ہم تو والد صاحب کو رات کو جاگتا ہی چھوڑ کر سو جاتے اور صبح والد صاحب کی تسبیح و تہلیل پر ہی آنکھ کھلتی تھی۔ آرام کے ان چند گھنٹوں میں جو شخص نیند سے اٹھ کر کسی بچے کو پانی کسی کو دودھ اور بیمار کو دوا پلاتا رہا ہو اس نے ایک رات میں کیا آرام کیا ہوگا؟۔ دراصل اللہ تعالیٰ کے محبوب بندوں کو اپنے فرائض اور حقوق کی لگن اپنے آرام و راحت پر مقدم رکھتی ہے۔ اسی لیے ایک خدائی قوت اور برکت ان کے ہم رکاب ہوتی ہے۔ اسی کے سہارے تھوڑے وقت میں ایسے محیر العقول کارنامے انجام پاتے ہیں۔ والد صاحب فرماتے تھے کہ "بندہ اللہ تعالیٰ کا تابعدار ہو جاتے تو دنیا کی ہر شے اس کی تابعدار ہو جاتی ہے"۔

ابا جان کی عادت تھی کہ متعلقین میں سے جو بھی بیمار ہو جاتے تو اپنے سارے کام چھوڑ کر اس کی طرف متوجہ ہو جاتے تھے۔ اس کی دل جوئی اور آرام میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کرتے۔ بیمار کی مدارات دیکھ کر اس پر رشک آنے لگتا اور اس توجہ کے حصول میں بیمار ہونے کو دل چاہتا۔ میری اکثر عادت تھی کہ گھر میں والدہ صاحبہ سے کسی غلطی پر ڈانٹ پڑتی یا بہن بھائیوں سے ان بن ہو جاتی تو چادر لپیٹ کر ایسی جگہ لیٹ جاتی کہ آتے ہی والد صاحب کی نظر پڑے۔ ابا جان آتے ہی گھر والوں سے باز پرس کرتے

کہ کس نے میری بیٹی کو ستایا ہے۔ اتنی بات پر تمام غم و غصہ کافور ہو جاتا اور والد صاحب کوئی نہ کوئی چیز کھانے پینے کی ہاتھ میں تھما دیتے کیونکہ ان کی پرانی عادت تھی کہ جب بھی گھر میں داخل ہوتے کھانے کی کوئی نہ کوئی چیز ضرور لے کر آتے خواہ وہ چھوٹی سے چھوٹی ہی کیوں نہ ہو۔ ایسے وقت میں حصہ کچھ زیادہ ہی مل جاتا۔

ایک روز میرے سر میں درد تھا۔ عصر کا وقت تھا۔ والد صاحب کے گھر میں آنے کا شدت سے انتظار کر رہی تھی۔ کیونکہ درد کا مزہ تو ابا جان کی موجودگی میں ہی ہوتا ہے۔ خیر وہ آ گئے۔ درد سر معلوم ہوا تو ڈھارس تسلی دی اور فرمانے لگے کہ "اس وقت میاں صاحب (حضرت مولانا سید میاں اصغر حسینؒ) کے یہاں جا رہا ہوں۔ چلو تمہیں بھی لے چلتا ہوں۔ ان سے دعا پڑھوا دوں گا"۔ میں والد صاحب کے ہمراہ مولانا کی خدمت میں پہنچی۔ والد صاحب نے فرمایا "یہ میری چھوٹی بچی ہے۔ اس کے سر میں اکثر درد رہتا ہے حضرت! اس کے سر پر ہاتھ رکھ دیں اور دعا بھی فرما دیں"۔ حضرت نے بڑی محبت اور شفقت سے اپنے پاس بٹھایا اور چلتے وقت الماری سے نکال کر بادام ڈھیر کر دیے۔ میں لے کر گھر آ گئی۔ اب تو مزے آ گئے۔ اکثر درد سر کی شکایت رہنے لگی اور اصرار یہ کہ میاں صاحبؒ سے دعا پڑھوائی جائے۔ آخر والد صاحب تاڑ گئے اور انہوں نے ہمیں بازار سے بادام منگوا دیے اور پھر جب بادام مل گئے تو درد سر پھر کہاں؟

یہ میری شادی کے بعد کا واقعہ ہے کہ ایک دفعہ والدہ صاحبہ سخت بیمار ہو گئیں۔ ہسپتال میں داخل کروانا پڑا۔ میں اس وقت کراچی ہی تھی اور والدہ صاحبہ کے پاس ہسپتال میں رہتی تھی۔ میری بچی تین چار سال کی تھی، جو میری عدم موجودگی میں اپنے دوسرے بہن بھائیوں اور نانا، ماموں وغیرہ کے پاس گھر میں تھی۔ شام کو جب والد صاحب ملنے کے لیے تشریف لاتے تو اس کو ساتھ لاتے اور کوئی نہ کوئی کھانے پینے کی چیز ضرور ساتھ لاتے۔ ایک روز طبیعت کی خرابی کی وجہ سے خود تشریف نہ لا سکے۔ میرے چھوٹے بھائی محمد تقی بچی کو لے کر آئے اور ایک لفافہ میرے ہاتھ میں دیا۔ دیکھا تو اس میں بسکٹ اور ٹافیاں وغیرہ تھیں میرے پوچھنے پر انہوں نے بتایا کہ یہ ابا نے دی ہیں اور کہا ہے کہ چپکے سے رقیہ کو دے دینا۔ اس کے پاس بچی جاتی ہے اس کو یہ چیزیں دیں گی تو بچی خوش ہو جائے گی اور اس کی بھی خواہش ہوگی کہ بچی کو کچھ دیا جائے۔ اس محبت، شفقت اور موقعہ شناسی کی کوئی انتہا ہے۔ اللہ کے نیک بندوں کو یہی فکر رہتی ہے کہ نیکی اور ایثار کا کوئی موقعہ ہاتھ سے نہ جانے پائے۔

اسی طرح ایک اور واقعہ ذہن میں آیا کہ ۱۹۴۸ء میں والد صاحبؒ ترک وطن کر کے اور اپنے عمر بھر

کا ماثر ہندوستان میں چھوڑ کر پاکستان تشریف لائے اور کراچی میں مستقل سکونت اختیار کی۔ ہم سب چھوٹے چھوٹے بچے ساتھ تھے۔ ذریعہ معاش کوئی مستقل نہ تھا، رہائش، کاروبار ہر قسم کی پریشانیوں سے دوچار تھے لیکن ہم بچوں کو کبھی یہ احساس نہ ہونے دیا کہ وہ پریشان ہیں۔ گھر میں تشریف لاتے تو ہمیشہ ہنستے اور مسکراتے۔ ہمارے تین بڑے بہن بھائی اور سب عزیز و اقارب انڈیا میں رہ گئے تھے۔ اس لیے والدہ صاحبہ اور ہم وطن اور اہل وطن کی یاد میں کبھی کبھی افسردہ ہو جاتے تھے تو والد صاحب اس کو محسوس کرتے اور ہمیں سیر و تفریح کرانے کے لیے لے جاتے اور غالباً یہ بھی سوچتے ہوں گے کہ ایک بڑے شہر میں بچے آئے ہیں۔ یہاں کی سیر اور قابل دید مقامات دکھانا ان کا حق ہے تو ہمیں ہر دوسرے تیسرے دن مختلف مقامات پر لے جاتے۔ ایک روز اسی طرح ہم سب چڑیا گھر گئے اس زمانے میں چڑیا گھر کا ایک خاص دن عورتوں کے لیے مخصوص ہوتا تھا۔ اس میں کوئی مرد اندر نہیں آسکتا تھا۔ والد صاحب ہمیں دروازے پر چھوڑ کر گھر واپس آ گئے کہ بعد مغرب تم کو آ کر لے جائیں گے حسب وعدہ ایک بھائی ہمیں لینے کے لیے آیا۔ ابا جان گھر پر ہی رہ گئے تھے گاڑی تلاش کرنے اور گھر واپس پہنچنے میں عشا کا وقت ہو گیا اور ہمیں یہ فکر کہ ابھی گھر پہنچ کر کھانا پکانے کا بندوبست کرنا ہے۔ گھر پہنچے تو والد صاحب کو باورچی خانے میں مصروف پایا۔ دیکھ کر فرمانے لگے "بھئی تم لوگ تھک گئے ہو گے۔ اس حالت میں تمہیں کھانا پکانے کی فکر ہوتی۔ اس لیے میں نے تمہارے لیے کھچڑی پکا دی ہے۔ پہلی مرتبہ پکائی ہے۔ دیکھو ٹھیک ہو گئی کہ نہیں۔ دال اور چاول تلاش کرنے میں دیر ہو گئی ورنہ پہلے ہی فارغ ہو جاتا" ہم سب لوگ شرمندہ اور حیران ہو کر رہ گئے اس شفقت و محبت کی کوئی حد ہے۔ ان کی اپنی علمی مصروفیات حیرت انگیز تھیں۔ ان کی جگہ کوئی اور ہوتا تو اسے اپنے گھر والوں کی ضروریات بھی پوری کرنے کی فرصت نہ ہوتی۔ چہ جائیکہ چھوٹی چھوٹی باتوں پر ادراں سے عہدہ برآ ہونے کی فکر۔ یہ صرف خدا کا انعام اور والد صاحب کی خداداد صلاحیتیں تھیں۔ سوچو تو حیرت کے سوا کچھ نہیں ملتا۔

والد صاحب کی مشغولیات حیرت انگیز تھیں۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اتنے کاموں کے انبار کس طرح سمیٹ لیتے ہیں۔ ان تمام مصروفیات کے باوجود دن بھر میں ایک وقت گھر والوں کے لیے ضرور نکال لیتے تھے۔ اور وہ وقت عصر سے مغرب تک کا وقفہ ہوتا تھا۔ اس وقت وہ زنان خانے میں

تشریف رکھتے تھے۔ ہم سب بہنیں بھائی، والدہ صاحبہ، بھاوجیں قریب آکر بیٹھ جاتے تھے اور یہ مجلس بڑی بے تکلف مجلس ہوتی۔ والد صاحب بھی ہر ایک کی طرف متوجہ ہوتے۔ بچوں کے لیے اکثر مٹھائی اور ٹافیاں لے کر بیٹھتے تھے۔ اس لیے بچوں کا بھی مجمع لگا رہتا۔ یہ وقت ہم سب کے لیے ایک پر بہار وقت ہوتا۔ پہلے ہی اس وقت کا انتظار شروع کر دیتے تھے۔ عجیب بات ہے۔ باپ کا تصور لوگوں کے دلوں میں ''باادب با ملاحظہ'' قسم کا ہوتا ہے۔ بات کرتے ہوئے بھی ڈرتے ہیں، جھجکتے ہیں۔ اباجان کے حسن سلوک کی بدولت ہمارے جذبات ایسے نہ ہوتے تھے۔ والد صاحب قریب ہوتے تو معلوم ہوتا کہ کسی بے تکلف مُربّی، دوست اور غم گسار کے سائے میں ہیں۔ اور دنیا کے ہر غم سے آزاد ہیں۔ والد صاحب کی قربت اور تسلی بخش کلمات دنیا کے تمام دکھوں کا مداوا تھے میرے عزیز بھائی مولوی محمد رفیع اور مولوی محمد تقی جو آخر دم تک والد صاحب کے ساتھ رہے۔ جن کی خدمت گزاری اور والدین کی رضا جوئی ہم سب بہن بھائیوں کے لیے قابل رشک تھی۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں علم دین بھی عطا فرمایا اور والدین کی امنگوں پر پورا اترنے کا جذبہ اور صلاحیتیں بھی عطا فرمائی تھیں۔ ان کا بھی یہی عالم تھا کہ دن بھر میں یہی وقت اپنی تعلیمی و تدریسی کاموں سے فرصت کا ملتا تھا نوجوان تھے، کھیل کود، سیر و تفریح اور اس قسم کی اور دلچسپیاں ہو سکتی تھیں۔ لیکن انہوں نے بھی باہر کی ہر تفریح پر عصر کے بعد کی اس مجلس کو ترجیح دی۔ یہ نہیں کہ کوئی پابندی تھی۔ بلکہ خود والد صاحب نے کئی مرتبہ فرمایا کہ تم لوگ کہیں گھومنے پھرنے چلے جایا کرو۔ دن بھر کاموں میں لگے رہتے ہو کوئی وقت سیر و تفریح کا رکھو۔ باوجود ان تمام باتوں کے نہ جانے اس وجود میں کیا مقناطیس تھی کہ سب بہن بھائی انہی کے گرد جمع رہتے۔ باہر کی کوئی تفریح انہیں ترغیب نہ دیتی۔ اس وقت والد صاحب کے قریب پہنچ کر جو خوشی میسر ہوتی تھی وہ دنیا کے کسی گوشہ میں نہیں۔ بظاہر وہ مجلس دنیا کی باتوں سے معمور ہوتی تھی بہن بھائیوں کی چھیڑ چھاڑ، پُرلطف باتیں، والد صاحب کے ہنستے ہنسانے والی حکایتیں اور مغرب کی اذان پر جب یہ مجلس برخاست ہوتی تو معلوم ہوتا کہ یہ صرف تفریحی اجتماع نہ تھا۔ بلکہ ہر بات ایک نصیحت تھی، ایک درس تھا جو ان چھوٹی چھوٹی باتوں میں ہم تک پہنچا معاملات حسن سلوک، اور حقوق العباد کی ایک واضح تعلیم تھی۔ کاش! ان تعلیمات کی ہمیں قدر ہوتی اور ان پر عمل کر کے کچھ حاصل کر لیتے۔

اُم عطیہ عثمانی

وہ والدِ شفیق......!

یہ حضرتؒ کی سب سے بڑی صاحبزادی کے تأثرات ہیں، یہ مختصر مگر جامع و مفید واقعات انشاء اللہ ہر شخص کے لیے سبق آموز ہوں گے —— (ادارہ)

یہ ناکارہ اس قابل کہاں کہ اپنے شفیق حضرت والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ جیسی جامع کمالات شخصیت کے بارے میں کچھ تحریر کر سکے اور آپ کے علمی و عملی محاسن کو بیان کر سکے، لیکن برادر عزیز مولوی محمد تقی سلمہ کی خواہش اور اصرار پر حضرت والد ماجد سے متعلق چند واقعات جو اس وقت یاد آگئے بغیر کسی ترتیب کے پیش خدمت ہیں۔ یہ چند قصے حضرت والد ماجدؒ کی عظیم شخصیت کے ایک حد تک آئینہ دار بھی ہیں اور سبق آموز بھی، اس لئے امید ہے کہ قارئین کی دلچسپی سے خالی نہ ہوں گے۔

محبت و شفقت

آپ محبت و شفقت کا عظیم پیکر تھے جب بھی یہ ناکارہ حاضرِ خدمت ہوتی کھل اٹھتے اور خواہ کیسے ہی کام میں مشغول ہوتے جب تک کچھ دیر کے لئے اپنے آپ کو فارغ کر کے تفصیلی باتیں نہ فرما لیتے چین نہ آتا۔ یہ تو پہلی ملاقات کا معمول تھا اس کے بعد ایک یا دو دن جب تک در دولت پر میرا رہنا ہوتا وقفے وقفے سے بات چیت کی غرض سے مجلسیں قائم فرماتے۔ ان مجالس کے مزے اور چاشنی کا پوچھنا کیا، گفتگو کے موضوعات مختلف ہوتے، کبھی خانگی، کبھی بیرونی اور کبھی مدرسے کے امور پر بات چیت ہوتی، حالانکہ یہ ناکارہ کبھی اس لائق نہ ہو سکی کہ آپ کے کسی کام میں ہاتھ بٹا سکے، لیکن

اس کے باوجود گفتگو اس انداز میں فرماتے جیسے میں ان کے اکثر کاموں میں شریک رہی ہوں۔ کبھی مزاحیہ انداز میں فرماتے کہ تجھ سے ہوتا تو خاک نہیں مگر میرے کاموں میں تجھے دلچسپی ہے اور مجھے بھی تجھ سے باتیں کر کے سکون محسوس ہوتا ہے اس لئے سنانے کا شوق اور انتظار بھی رہتا ہے۔

ایام صحت ہوں یا ایام مرض والد ماجدؒ کی خدمت کا شرف اکثر تو میرے دونوں چھوٹے برادران عزیز سلمہا اللہ ہی کے حصے میں آتا لیکن علالت کے دنوں میں اگر کبھی اتفاق سے یہ ناکارہ آپ کی خدمت میں موجود ہوتی تو آپ کی یہی خواہش ہوتی تھی کہ میں آپ سے قریب سے قریب تر رہ سکوں۔ ایک مرتبہ دل کے دورہ کے وقت قریب بیٹھنے کا اشارہ فرمایا تو یہ ناکارہ ایک ہاتھ آپ کے سینے پر اور دوسرا پیٹھ پر رکھ کر بیٹھ رہی۔ کچھ دیر بعد ذرا افاقہ ہوا تو فرمایا کہ بچپن میں ماں کے پاس بیٹھنے سے جیسا سکون ملتا ہے بڑھاپے میں ویسا ہی سکون اولاد کے پاس بیٹھنے سے محسوس ہوتا ہے۔ کسی سے اپنی ذاتی خدمت لینے میں آپ حیا فرماتے اور کوشش یہی ہوتی کہ وہ کام خود ہی انجام دے لیں اور کسی کو تکلیف نہ دینی پڑے۔ ایک مرتبہ قریب جانے پر معلوم ہوا کہ بدن میں سخت درد ہے۔ میں نے عرض کیا کہ "بدن دبا دوں؟" فرمایا: "نہیں تو تو خود ہی کمزور ہے"۔ میں نے کہا "اتنی کمزور تو نہیں ہوں" اور یہ کہہ کر بدن دبانا شروع کر دیا۔ اسی دوران میں فرمانے لگے کہ "دونوں بہویں ماشاء اللہ اتنی سعید ہیں کہ وقت سے پہلے ہی میرا اور تمہاری والدہ کا کام کر دیتی ہیں لیکن بدن دبانے کا کام میں ان سے نہیں لینا چاہتا ان کے سامنے کبھی کسی سے نہیں کہتا کہ شاید وہ خود ہی بدن دبانے کے لئے کہیں اور مجھے انکار کرنا پڑے۔

لڑائی جھگڑے سے نفرت

آپ کو لڑائی جھگڑے سے شدید نفرت تھی۔ جھگڑے کی بنیاد کو رفع کرنے کے لئے آپ بخوشی اپنے حق کو چھوڑنے پر راضی ہو جاتے تھے۔ آپ کی حیات مبارکہ کے بے شمار واقعات اسی کی حکایت کرتے ہیں۔ ایک واقعہ یاد آیا ایک مرتبہ جب دیوبند میں آپ نے اپنا ذاتی مکان تعمیر کرنے کی غرض سے کچھ زمین خریدی اور قیمت کی ادائیگی کے بعد جب تعمیر کا کام شروع فرمایا تو چند پڑوسی آ گئے اور کہنے لگے کہ اس میں اتنی زمین ہماری ہے اس لئے کہ اس میں ہمارے پرنالے گرتے ہیں جب کہ سرکاری طور

پڑان کو اس کا کوئی حق حاصل نہ تھا اور زمین مکمل طور پر والد ماجدؒ کی ملکیت تھی لیکن آپ نے جھگڑے سے بچنے کے لئے اپنی ہی زمین کا وہ حصہ چھوڑ کر تعمیر شروع کرائی جس کی وجہ سے مکان میں خاصی تنگی محسوس ہونے لگی لیکن آپ نے جھگڑے کے مقابلے میں مکان کی تنگی کو برداشت کرنا پسند فرمایا پھر کچھ دن بعد وہی لوگ دوبارہ آئے اور کہنے لگے کہ اگر آپ چاہیں تو یہ زمینیں خرید لیں۔ اس موقع پر آپ نے قیمت ادا کر کے زمین کو واپس لیا اور مکان میں شامل فرمایا۔

نماز باجماعت کا اہتمام

آپ نماز باجماعت کا بے حد اہتمام فرماتے اور دوسروں کو بھی اس کا پابند دیکھنا پسند کرتے۔ آخر عمر میں ضعف و علالت کے باوجود اکثر نماز فجر باجماعت مسجد میں ادا فرماتے۔ جماعت کی پابندی کا یہ اہتمام آپ کو بچپن ہی سے تھا اور یہ ہمارے دادا ابا رحمۃ اللہ علیہ کی تربیت کا اثر تھا۔

مجھے یاد ہے کہ دیوبند میں جب میری عمر تقریباً دس بارہ سال کی تھی ایک دن فجر کی نماز کے وقت سخت آندھی، موسلا دھار بارش اور گرج چمک کی بناء پر والد صاحبؒ مسجد تشریف نہ لے جا سکے اور نماز گھر میں ہی ادا فرمائی۔ ادھر دادا اباؒ جو مسجد کے عاشق اور نماز باجماعت کے شیدائی تھے اسی حالت میں پائنچے چڑھا کر مسجد کی جانب روانہ ہوگئے اور والد ماجدؒ کو بارش کی وجہ سے ان کے جانے کا پتا نہ چل سکا۔ دادا ابا جب مسجد پہنچے تو دیکھا کہ بجز مؤذن کے کوئی دوسرا شخص موجود نہیں۔ خیر! مؤذن کے ساتھ دو آدمیوں کی جماعت ہوئی اور بعد نماز جب دادا اباؒ گھر لوٹنے لگے تو سب محلے والوں کو ان کے گھروں سے اٹھا کر ساتھ لیتے ہوئے سخت غصے میں گھر پہنچے اور والد صاحبؒ کو بلایا اور پھر سب کے سامنے اس قدر ڈانٹا کہ والد صاحب اور سب محلے والے دم بخود رہ گئے اور فرمایا "افسوس ہے کہ مجھے اپنی زندگی میں ایسا دن دیکھنا پڑا جس کی مجھ کو تم سے توقع نہ تھی۔ آج اگر میں نہ پہنچتا تو مسجد ویران ہو جاتی اور جماعت نہ ہوتی۔ میرے بعد تو تم اس مسجد کو ویران ہی کر دو گے۔ مجھے افسوس تو سب پر ہے لیکن سب سے زیادہ غصہ اپنے اس بیٹے پر ہے، اور بھی نہ جانے کیا کیا کہا۔ دادا اباؒ کو دنیا میں والد صاحب سے زیادہ کوئی عزیز نہ تھا مگر ترک جماعت پر اس قدر گرفت فرمائی اور وہ بھی تمام محلہ والوں اور چھوٹی اولاد کے سامنے! یہ حضرت والد صاحبؒ کی انتہائی سعادتمندی تھی کہ انہوں نے ذرا بھی ناگواری

کا اظہار نہیں فرمایا بلکہ ندامت اور شرمندگی کا اظہار کرتے ہوئے سب کے سامنے معافی چاہی، بعد میں فرمایا کرتے تھے کہ اگر اُس دن اتنی ڈانٹ نہ پڑتی تو عمر بھر احساس نہ ہوتا کہ مجھ سے کوئی غلطی بھی سرزد ہوئی تھی۔

اس واقعہ کا سبق آموز پہلو یہ ہے کہ یہ واقعہ اس وقت پیش آیا جب بارش اور طوفان کی بناء پر ترک جماعت کا عذر شرعی موجود تھا۔ اس کے باوجود آپ نے اس ترک جماعت کو اپنا قصور سمجھ کر ندامت و شرمندگی کے ساتھ معافی چاہی۔

عاجزی اور انکساری

حضرت والد ماجدؒ کو اللہ تعالیٰ نے جو مقام بلند عطا فرمایا تھا وہ کسی کی نظروں سے پوشیدہ نہیں مگر اس کے باوجود آپ کا یہ حال تھا کہ عام سے عام آدمی کے مقابلے میں اپنے آپ کو نہایت کمتر تصور فرماتے تھے۔ ایک واقعہ یاد آیا، ایک مرتبہ جب میں سبیلہ حاضر خدمت ہوئی (اس زمانے میں حضرت والد ماجدؒ کا مستقل قیام سبیلہ ہی میں تھا) تو کسی بات پر مجھ سے ناراض ہو گئے اور خفگی بڑھتی گئی۔ اس ناکارہ کی سمجھ میں نہ آرہا تھا کہ وجہ ناراضی کیا ہے۔ آپ کو راضی کرنے کی کوشش بھی کی لیکن خفگی برقرار رہی جس کی وجہ سے میں بہت غمگین تھی اور کسی کام میں جی نہ لگ رہا تھا۔ اچانک میرے منہ سے نکلا کہ مجھے تو اب تک بھی سمجھ میں نہیں آیا کہ آپ کی ناراضگی کی وجہ کیا ہے۔ پھر شام کو میں نانک واڑہ میں اپنی قیام گاہ پر واپس آگئی۔ آپ کی ناراضگی کا خیال دل کو بے چین کئے ہوئے تھا اور کسی کل چین نہ ملتا تھا۔ دوسرے دن شام کے وقت پیغام ملا کہ والد مشفقؒ نے یاد فرمایا ہے۔ امید و بیم کی ملی جلی کیفیت کے ساتھ سبیلہ پہنچی۔ دیکھتے ہی مسکراہٹ کے ساتھ سینے سے لگا لیا۔ اس وقت نماز مغرب قریب تھی، اس لئے فرمایا کہ نماز کے بعد بات کروں گا۔ پھر بعد نماز تنہائی میں لے جا کر فرمایا۔ تُو تو کل چلی گئی اور میں رات بھر نہ سو سکا۔ وہ ایک جملہ جو تو آخر میں کہہ گئی تھی، اس کو سوچتا رہا اور آخر میں شرح صدر اسی پر ہوا کہ میری ناراضگی صحیح نہ تھی۔ اس وقت میں نے تجھے اسی لئے بلوایا ہے کہ معافی مانگ لوں۔ آپ کی بات سن کر میری آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے اور زبان سے کچھ نہ کہہ سکی تو فرمایا یہ حقوق العباد کا معاملہ ہے، اس میں بڑے چھوٹے کی کوئی قید نہیں اس لئے جب تک زبان

سے معاف نہ کرے گی، مجھے سکون نہ ملے گا تو میں نے کہا کہ ماں باپ کے لئے تو یہ شرط نہیں۔

پیر و مُرشد کا ادب و احترام

ہمارے بچپن میں حضرت والد ماجدؒ کا معمول تھا کہ رمضان کی چھٹی ہم سب گھر والوں کو ساتھ لے کر تھانہ بھون میں گذارتے تھے اور قیام حضرت حکیم الامت تھانوی قدس سرہٗ کے زنانہ مکان کی اوپر والی منزل میں ہوتا تھا۔ والد صاحبؒ جب گھر تشریف لاتے تو اتنی آہستہ چلتے کہ ہلکی سی آہٹ بھی محسوس نہ ہوتی اور اگر یہ معلوم ہو جاتا کہ حضرت والا گھر میں نیچے تشریف فرما ہیں تو رعب و ہیبت اور اس فکر سے کہ اوپر کے شور و غل کی آواز حضرت والا کے آرام میں مخل نہ ہو۔ چہرے کا رنگ بدل جاتا اور چہرے پر زردی چھا جاتی۔ اس وقت میں اگرچہ کمسن تھی مگر چہرہ دیکھ کر آپ کی اس کیفیت کو محسوس کر لیتی تھی۔ ایک دفعہ ہم سب بہن بھائی مل کر چھت پر کھیل رہے تھے کہ والد صاحبؒ تشریف لائے اور ہمیں دیکھ کر دور سے انگلی سے خاموش رہنے کا اشارہ فرمایا اور پھر قریب آکر مجھے مخاطب کر کے فرمایا تجھے تو چاہیے تھا کہ ان سب کو منع کرتی، نہ کہ خود ہی کھیل میں شریک ہو گئی۔ پھر فرمایا

والد ماجدؒ کے طفیل ناکارہ کی حضرت تھانویؒ سے بیعت

اب تم حضرت سے جا کر کہو کہ مجھے بیعت کر لیجئے۔ یہ سن کر مجھے بہت تعجب ہوا اور عرض کیا کہ بچے تھوڑی بیعت ہوتے ہیں؟ فرمایا کہ ہاں بچے بھی بیعت ہوتے ہیں۔ بس تم جا کر کہہ دینا۔ میں حضرت تھانویؒ کے رعب و ہیبت کی بناء پر مجھ میں بیعت کی درخواست کرنے کی ہمت نہ تھی، اس لئے سنی ان سنی کرنے کی کوشش کرتی رہی اور یہ سوچ کر کہ والد ماجدؒ کچھ دیر کے بعد بھول جائیں گے۔ آپ کے ارشاد کی تعمیل نہ کی۔ دوسرے دن جب والد صاحبؒ حسب معمول بعد ظہر خانقاہ سے گھر تشریف لاتے تو دوبارہ وہی سوال کیا۔ اب تو میں ڈانٹ کے ڈر سے گھبرا گئی اور مجھے احساس ہوا کہ اب تو یہ کام کرنا ہی پڑے گا تو میں نے ذرا سنجیدہ ہو کر کہا آپ ہی حضرت سے فرما دیجئے، مجھے خود کہنے کی ہمت نہیں فرمایا نہیں! میرا کہنا مناسب نہیں۔ بس تم ایسا کرنا کہ کل ظہر

پیرانی صاحبہ (مدظلہا) سے جاکر کہنا کہ آپ میری حضرت سے سفارش کردیں کہ وہ مجھے بیعت فرمالیں، چنانچہ میں نے حکم کی تعمیل کی اور حضرت کے سامنے بڑی پیرانی صاحبہ نے میرا تعارف کرا کر بیعت کرنے کی سفارش کی۔ حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ نے میری درخواست کو منظور کرتے ہوئے فرمایا یہ گڑیوں کا کھیل تو نہیں سمجھو گی اور غالباً یہ بھی فرمایا کہ بڑے ہو کر کسی اور کی مرید تو نہیں ہو جاؤ گی۔ میں نے عرض کیا کہ نہیں۔ چنانچہ حضرت والا نے اس ناکارہ کو رومال کے ذریعے باقاعدہ شرف بیعت سے نوازا اور اس طرح کھیل کھیل میں حضرت والا ماجد کے طفیل اللہ تعالیٰ نے کم سنی میں یہ دولت عطا فرمائی جس کو ذکر کرتے ہوئے بھی دل ڈرتا ہے کہ کہاں یہ نالائق اور کہاں اتنی عظیم اور مقدس نسبت۔ اللہ پاک ان بزرگوں کے طفیل اس سیاہ کارہ کی بھی مغفرت فرمائیے۔ آمین ۔

اولاد کی اصلاح کی فکر

حضرت والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ کی گھریلو اور نجی مجلسیں جہاں دلچسپی کا پہلو لئے ہوئے ہوتی تھیں وہاں انتہائی سبق آموز اور اصلاحی بھی ہوتی تھیں۔ آپ کا معمول تھا کہ خوشی یا غم کے موقع پر اپنی ساری اولاد کو جمع فرماتے۔ پھر ایک خصوصی مجلس میں وعظ و نصیحت فرماتے، بلکہ بعض اوقات اسی وعظ و نصیحت کے لئے سب کو جمع فرماتے۔ اکثر لباس، پردہ، شرم و حیا، نماز اور حقوق العباد وغیرہ سے متعلق وعظ فرماتے۔ عید کے موقع پر جب تمام اولاد آپ کی خدمت میں حاضر ہوتی تو آپ کی خواہش اور کوشش یہی ہوتی کہ کچھ نہ کچھ نصیحت آمیز باتیں اولاد کے کانوں میں پڑ جائیں۔ چنانچہ وفات سے دس روز قبل عید الفطر کی دعوت کے موقع پر بھی سب کو جمع فرمایا اور ہر بچے اور بڑے سے پُرمذاق باتیں کر کے اسے خوش کیا۔ اس کے بعد ارشاد فرمایا دیکھو بھئی آج کی دعوت اور عیدی مفت میں نہیں ملے گی، بلکہ اس کی کچھ قیمت ادا کرنی پڑے گی۔ لہٰذا تم سب اپنی ماں کے پاس جمع ہو جاؤ مجھے کچھ باتیں کرنی ہیں۔ چنانچہ جب ہم سب والدہ ماجدہ (مدظلہا) کے کمرے میں جمع ہو گئے تو خود بھی وہاں تشریف لے آئے اور پھر ایک مختصر اور جامع بیان فرمایا جس کا انداز پچھلے اجتماعات سے یکسر مختلف اور اس قدر پُر اثر تھا کہ بیشتر آنکھیں اشک بار ہو گئیں ۔

فرمایا اے میری اولاد اور اولاد کی اولاد! میری چند باتیں غور سے سن لو میں اس

سے قبل بھی مختلف عنوانات سے تم سب کو نصیحت کر چکا ہوں اور خدا گواہ ہے کہ میں نے وہ تمام باتیں تم تک پہنچا دیں جن کا اللہ تعالیٰ نے تم کو مکلف بنایا ہے۔ اس لئے میں اپنا فرض ادا کر چکا ہوں اور اس مرتبہ کے بعد شاید میں تم کو نصیحت نہ کر سکوں۔ اب تمہاری اپنی ذمہ داری ہے، جس کا دل چاہے میری ان باتوں کو یاد رکھے اور ان پر عمل پیرا ہو اور جس کا دل چاہے بھلا دے۔ ہر ایک کو اپنا حساب دینا ہے یاد رکھو انبیاء کی اولاد کے لئے بھی جب ان کا عمل صحیح نہ ہوا، نسبت کافی نہ ہو سکی، پھر کسی اور کا تو ذکر ہی کیا۔"

پھر آخر میں فرمایا۔ اب تین باتوں پر اپنے اس بیان کو ختم کرتا ہوں۔

۱۔ گناہ خواہ کتنا ہی چھوٹا ہو اس کو ہلکا نہ سمجھو۔

۲۔ نیک عمل جو کچھ کرو اس کو زیادہ نہ سمجھو۔

۳۔ نماز پنجگانہ کا اتنا اہتمام کرو کہ دنیا کے سب کاموں پر غالب آ جائے۔ مرد جماعت کے پڑھنے کی اور عورتیں گھروں میں وقتِ اول میں اس فریضہ سے فارغ ہونے کی کوشش کریں اور عادت ڈالیں۔

نصیحت و موعظت کی اس مبارک مجلس کے اختتام پر آپ نے دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے اور سب نے مل کر دعا کی۔ کسی کے دور دور گمان میں نہ تھا کہ یہ آخری مجلس ثابت ہو گی اور اس کے بعد اپنے شفیق والد ماجدؒ سے کلماتِ حکمت سننے کا موقعہ نہ مل سکے گا۔ خدائے پاک ہم سب کو اور پوری امت کو ان کی حکیمانہ نصیحتوں پر عمل کرنے کی توفیق بخشے۔ آمین۔

وما توفیقی الا باللہ علیہ توکلت والیہ انیب

○

اسلام کی اصل دعوت حقیقت میں ایک اصلی اور صحیح متحدہ قومیت ہے جو وطنی اور لسانی بنیادوں پر نہیں بلکہ اصول صحیحہ اور عقائد حقہ پر مبنی ہو جس میں خدا اور اس کے رسولوں کی مخالفت کا گذر نہ ہو۔

(حضرت مفتی اعظمؒ : "ایمان اور کفر" ص ۱۲)

محمد فخر عالم صدیقی

مینارۂ عظمت

میرے مقدس ماموں

حضرت مفتیِ اعظم رحمۃ اللہ علیہ کی پہلو دار شخصیت کے بارہ میں مجھ ایسا بے علم و بے ہنر اور بے بصیرت کیسے لب کشائی کرے جبکہ یہ دراصل علماء و محققین کا کام ہے۔ ان کی علمی و عملی عظمت کا اندازہ کرنے کی صلاحیت تو مجھ میں نہیں، البتہ یہ بات شاید قارئین کے لئے موجب فائدہ ہو کہ مجھ جیسے کم سواد نے اس مینارۂ عظمت کو کس طرح دیکھا؟ اور مجھ جیسے انسان کی سطح پر ان کی عظمتوں کا رنگ کیسا تھا؟

ذیل کے چند واقعات جن میں سے اکثر کا تعلق احقر کی ذات سے ہے ہدیۂ قارئین ہیں کہ کیسے حضرت اپنی خانگی زندگی میں حقوق العباد اور دوسروں کی دلداری اور دلسوزی کا اہتمام فرماتے تھے اور خود حضرت اپنے آپ کو کس قدر ہیچمداں تصور کرتے تھے۔

مفتیِ اعظمؒ خود اپنی نظر میں

یہ کوئی اٹھارہ بیس سال پہلے کی بات ہے۔ حضرتؒ اپنے لسبیلہ کے مکان میں رہائش پذیر ہیں۔ ایک دن اچانک دل میں تکلیف شروع ہوئی جو لمحہ بہ لمحہ بڑھتی چلی گئی۔ ہم سب تیمار دار اور خود حضرتؒ ہر آنے والے سانس کو غنیمت سمجھ رہے ہیں۔ حضرتؒ سمیت ہر شخص پر مایوسی کا عالم طاری ہے۔ ایسی کیفیت میں ہم جیسا کوئی سیہ کار ہوتا تو نہ جانے کتنے دنیاوی بکھیڑوں میں ذہن الجھا ہوتا، اور موت کے ڈر سے خائف و لرزاں ہوتا مگر معارف القرآن جیسی عظیم الشان و الہامی تفسیر کا مصنف، سینکڑوں فقہی اور دینی کتابوں کا مؤلف نہ جانے کتنے علماء کا رہنما اور کتنے بزرگان دین کا نجیب ستارہ، سند فتویٰ عادیہ

بدل خود کو تہی دست سمجھ رہا ہے اور زار و قطار رو رہا ہے ۔ اس بات پر نہیں کہ دنیا کا کوئی غم ہے، بلکہ اس بات پر کہ میں نے اپنی عمر یونہی گنوا دی، اخروی زندگی میں نجات کے لئے کوئی کام نہیں کیا۔ سب حاضرین بیک زبان دل داری کر رہے ہیں کہ حضرت! آپ تو ایک آفتاب عالم تاب ہیں کہ جس کی ضیاء پاشیوں سے ایک عالم منور ہے، جس نے لاکھوں افراد کو راہ حق دکھائی ہے، آپ نے فلاں فلاں کتب تصنیف کی ہیں جو یقیناً قبول حق بھی ہیں، حضرتؒ روتے ہوئے فرما رہے ہیں کہ "کچھ نہیں کیا محض صفحے کالے کئے ہیں، آخرت کے لئے میرے پاس کچھ نہیں، وہاں خالی ہاتھ جا رہا ہوں"۔ تمام موجود اولاد سے ملتجیانہ فرما رہے ہیں، کہ میں نے حتی المقدور تم لوگوں کی آسائش کے سامان فراہم کئے، میرا تم پر صرف یہ حق ہے کہ ہر روز ایک بار سورۂ فاتحہ اور تین بار سورۂ اخلاص پڑھ کر مجھے بخش دیا کرو، تاکہ میری اخروی زندگی آسان ہو!

مینارۂ عظمت مُفتیِ اعظمؒ

یہ واقعہ میری اہلیہ کی علالت سے متعلق ہے کہ اب سے پندرہ سال قبل جبکہ احقر لسبیلہ پر کاروبار کرتا تھا اور ماشاءاللہ کاروبار بھی زوروں پر تھا۔ ان ہی دنوں اہلیہ بیمار ہو گئیں، کئی طبیبوں اور ڈاکٹروں کو دکھایا، خاطر خواہ فائدہ نہ ہونے پر ایک مشہور معالج کو دکھانا طے پایا۔ احقر کی زندگی بھر کا معمول ہے کہ حتی الوسع کسی کو تکلیف دینے سے گریز کرتا ہے جبکہ حضرت علیہ الرحمۃ کا معاملہ جدا تھا، تاہم احقر دیکھتا تھا کہ اس ایک آنار کو سینکڑوں بیمار آئے دن اپنی اغراض کے تحت گھیرے رہتے تھے، لہٰذا حضرتؒ کو بھی شاذ و نادر ہی کبھی کسی بات کے لئے زحمت دیتا اور وہ بھی ایسے معاملات میں کہ جب مجبور ہو جائیں۔ ورنہ الحمدللہ مجھے فخر ہے کہ میں نے کبھی حضرتؒ کو نہ مالی طور پر تکلیف دی نہ کاروباری اغراض کے تحت، نہ کسی جائیداد الجنسی یا پرمٹ وغیرہ کے حصول میں! لہٰذا حضرت بھی کبھی احقر کی کسی درخواست کو رد نہ فرماتے۔ جن معالج سے اہلیہ کا علاج کرانے کا ارادہ ہوا ان کے ضوابط اس قدر سخت تھے کہ میری تنہائی، کاروباری مصروفیات اور خانگی مشغولیتیں اس کی متحمل نہیں تھیں کہ ہفتہ میں ایک بار مریض کو دکھانے کے لئے دن بھر دکان بند کی جائے۔ یہ طبیب حضرتؒ کے معتقدین میں ہیں۔ احقر نے عرض کی کہ ان کے نام ایک خط لکھ دیں کہ وہ مجھے اپنے ضوابط سے آزاد کرتے ہوئے، جب میں

مریض کو لے کر پہنچوں بلا لیا کریں اور جلد فراغت کر دیا کریں۔ چنانچہ حضرت نے بطیب خاطر اس درخواست کو منظور فرمایا اور خط لکھ دیا اور اس خط کی وجہ سے الحمد للہ مجھے مطلوبہ سہولت حاصل ہو گئی۔ ٹھیک سال سوا سال بعد پھر اہلیہ کو ایک اور بیماری میں ان ہی طبیب کو دکھانے کا خیال ہوا۔ حضرتؒ اس وقت کوئنگی میں مقیم تھے احقر بسلسلہ پر۔ چنانچہ دارالعلوم حاضر ہوا، دارالعلوم میں اس دن کسی جلسہ کا اہتمام تھا اور کچھ مہمان آئے ہوئے تھے۔ جلسہ وغیرہ سے فراغت کے بعد جب حضرتؒ تھکے ماندے گھر میں تشریف لائے تو ہم کو "تن پر پڑھے نہ لکھے نام محمد فاضل" کی مثال بالکل صادق آتی ہے جلد گھر پہنچنے کے چکر میں تھے، اس وقت حضرتؒ کی تکان کو نظر انداز کر کے حضرتؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اس وقت حضرتؒ خادم کی کسی بات پر چیں بجبیں تھے کہ ہم نے بھی آؤ دیکھا نہ تاؤ ..... عین اسی وقت اپنا سوال داغ دیا۔ حضرت نے خشمگیں نگاہوں سے مجھے گھورا اور غالباً پہلی بار غصہ سے میری درخواست کو رد کرتے ہوئے فرمایا کہ ...... میں نے کوئی تمہارا ٹھیکہ لے رکھا ہے کہ جب چاہو خط لکھتا پھروں۔ جس ماحول اور جس کیفیت میں یہ سوال داغا گیا تھا وہ یقیناً اسی جواب کا مستحق تھا جو ہمیں ملا۔ بلکہ اگر کچھ اور بھی سخت سست کہا جاتا تو وہ بھی بے جا نہ ہوتا۔ لیکن ہم ٹھہرے دیوبند کے محلہ خانقاہ کے اونچی ناک والے ایک تنک مزاج شیخ زادے ... لہٰذا حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی یہ برحق فہمائش گراں گذر گئی اور اسی وقت اسی حالت میں بغیر کچھ بولے (کہ اتنی ہمت بہرحال نہیں تھی کہ زبان کھولتے، یا خدانخواستہ کوئی گستاخی کرتے) اٹھ کر گھر کے لئے کوچ فرمالیا ...... اس جگہ پر اور کوئی ہوتا بلکہ ہم خود بھی ہوتے اور ہمارا کوئی خورد ہم سے ایسی گستاخی کی بات کرتا تو ہم پلٹ کر بھی کبھی اس طرف نہ دیکھتے بلکہ کہتے کہ خس کم جہاں پاک۔ لیکن میرے ماموں ..... واقعی عظیم تھے ...... اتنے بلند تھے کہ ان کی عظمت کے آگے سر جھکانا ہی پڑتا ہے ان کی شفقت، ان کی بے پایاں عنایت ملاحظہ کیجئے کہ اس واقعہ کے تیسرے دن، جبکہ احقر اس واقعہ کو بھول بھی چکا تھا کہ خود بسلسلہ احقر کے گھر پر تشریف لائے اور اپنے روایتی تبسم کے ساتھ ایک لفافہ (جس میں طبیب صاحب کے نام خط تھا) تھماتے ہوئے گویا ہوئے ...... "مجھے معلوم تھا خنقیا (خانقاہ کی مناسبت سے) ناراض ہو کر گیا ہے اور اب سلسلہ میں کوئی بات نہیں کرے گا، نہ آئے گا ... لہٰذا میں خود ہی خط لے آیا ہوں ..." اور اس کے بعد حضرت والا نے بہت

نرمی سے سمجھایا کہ اس وقت کے حالات کے پیشِ نظر تمہیں ایک دم اپنی بات نہ کہنی چاہیے تھی۔ آج بھی جب یہ واقعہ اور حضرتؒ کی یہ شفقت یاد آتی ہے، اپنی نالائقی پر افسوس ہوتا ہے کہ ہم نے کس کس طرح حضرتؒ کو ستایا ہے۔ ع

خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

انوکھا اصولِ سفارش

میرے ماموں کا یہ معمول تھا کہ ان کے پاس کوئی بھی کسی بھی غرض سے آیا تو حضرتؒ خواہ بیمار ہی کیوں نہ ہوں حتی المقدور آنے والے کی مدد کرتے اور اگر بس میں نہ ہوتا تو خود میں نے بارہا دیکھا ہے کہ گھنٹوں اس بات پر متاسف رہتے کہ بیچارہ اتنی دور سے آیا تھا . . . . . افسوس میں اس کا کام نہ کر سکا۔ جب غیروں کے ساتھ یہ حسن سلوک تھا تو اپنے تو ظاہر ہے کہ اور قریب ہیں، ان کی بات کیسے نظر انداز کرتے مگر اس سلسلہ میں بھی ایک عجیب تجربہ ہوا کہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی وسعتِ نظر کہاں تک پہنچتی تھی اور وہ اس معاملے میں بھی کتنے با اصول تھے۔

یہ حضرت مفتی صاحب علیہ الرحمۃ کی تربیت، فیضانِ صحبت اور شفقت و سرپرستی ہی کا نتیجہ تھا کہ جب احقر کے پاس ضروریات زندگی سے فاضل اتنی رقم جمع ہو گئی کہ جو فرضیت حج کا باعث بنی تو الحمدللہ حضرت کی دعاؤں کے طفیل مجھے اس کی فکر دامن گیر ہو گئی کہ فرض کی ادائیگی کی جائے . . . . چنانچہ اس وقت کے مروجہ قوانین کے تحت دو سال تک مسلسل حج کی درخواست دی اس وقت ہوتا یہ تھا کہ حج کے لئے بارہ پندرہ ہزار خوش نصیبوں کو متحدہ پاکستان (مشرقی و مغربی) سے بذریعہ قرعہ اندازی چنا جاتا جبکہ درخواستیں لاکھوں افراد کی موصول ہوتیں۔ چنانچہ بہت کم خوش نصیب ایسے ہوتے کہ جن کو گوہرِ مراد حاصل ہوتا۔ دو سال تک درخواست دینے اور قرعہ اندازی میں ناکام ہونے کے بعد جب تیسرے سال حج کی درخواستیں طلب کی گئیں تو احقر حضرتؒ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ مجھے معلوم تھا کہ حضرتؒ مرکزی حج کمیٹی کے رکن ہیں اور ہر سال دس افراد حضرت کی ذاتی سفارش پر بلا قرعہ اندازی حج کے لئے جا سکتے ہیں۔ چنانچہ بہت امید کے ساتھ حضرتؒ سے عرض کیا کہ حضرتؒ دو سال سے درخواست دے رہا ہوں۔ زندگی اور پیسہ کا بھروسہ نہیں کہ کب ختم ہو جائیں اور فرض گردن پر

رہ جائے۔ لہٰذا احقر کے لئے کوشش فرما دیجئے . . . . . میری زندگی کا غالباً یہ واحد واقعہ تھا کہ حضرتؒ نے میری درخواست کو بظاہر بغیر کسی وجہ کے رد فرما دیا۔ میں بہت حیران ہوا۔ خدشہ گذرا کہ حضرتؒ کی کسی بات پر ناراض تو نہیں کہ ہم ایسے نالائق ان کو بات بات پر اذیتیں پہنچاتے رہتے تھے، ڈرتے ڈرتے اپنے خدشہ کا اظہار کیا۔ حضرتؒ نے اپنے روایتی تبسم اور مشفقانہ لہجے کے ساتھ فرمایا کہ نہیں بیٹا! میں بالکل ناراض نہیں بلکہ مجھے تمہارے جذبہ اور شوق و فکر سے خوشی ہے۔ لیکن بیٹے . . . . . حج کے لئے سفارش کے معاملے میں میرا ایک اصول ہے اور یہ اصول میں کسی بھی قریب سے قریب تر شخص کے لئے کسی بھی قیمت پر توڑنے کے لئے تیار نہیں۔ احقر کو مزید تعجب ہوا کہ آخر وہ کیسا اصول ہے . . . میرے دوبارہ استفسار پر فرمایا کہ بیٹا میں اس معاملہ میں ایسے بوڑھے اور عمر رسیدہ افراد کی سفارش کرتا ہوں کہ جن کے بارہ میں میرا دل اندر سے گواہی دے دیتا ہے کہ یہ شخص آئندہ سال حج کی درخواست دینے کے لئے زندہ نہیں رہے گا۔ تمہاری ماشاء اللہ ابھی بہت زندگی پڑی ہے اور میں بھی انشاء اللہ خوب کماتے ہو لہٰذا تم مایوس نہ ہو اور درخواست دیتے رہو . . . . . . یہ تھا حضرتؒ کا زریں اصولِ سفارش . . . یہ بات سن کر احقر کا دل صاف ہو گیا اور پھر اصرار نہ کیا۔ البتہ اس سلسلہ میں دعا کی درخواست کی جو قبول کر لی گئی اور یقیناً یہ حضرتؒ کی دعاؤں ہی کی برکت تھی کہ اسی سال اللہ تعالیٰ نے قرعہ اندازی میں کامیاب خوش نصیبوں میں احقر کو بھی شامل کر لیا اور اس طرح احقر ناکارہ حج کی دولتِ عظمیٰ سے سرفراز ہوا۔

امانت کا اہتمام

اس حج کے دوران ہمارے خاندان کے ایک بزرگ سید ریاض الحسن رمزی صاحب (جو مبارک پور ضلع رحیم یار خاں میں رہتے ہیں اور کئی مربع زمین اور باغات کے مالک ہیں) مکہ معظمہ میں حضرتؒ کا ایک خط لے کر احقر کے پاس پہنچے کہ ان ضعیف بزرگ کی خدمت کرو۔ حتی الوسع حضرتؒ کے حکم کی تعمیل کی گئی اور بات آئی گئی ہو گئی۔ حج سے واپسی کے بعد جب آموں کا موسم آیا تو رمزی صاحب نے حسبِ معمول حضرتؒ کی خدمت میں بذریعہ ریل اپنے باغ کے بہترین آم بھیجے اور بلٹی ڈاک سے بھیج دی۔ لطیفہ ان آموں کے ساتھ یہ ہوا کہ آم کی پیٹی تو لانڈھی اسٹیشن پر پہلے پہنچ گئی لیکن محکمۂ ڈاک کی "تیز گامی" اور "مستعدی" کی وجہ سے بلٹی کا رجسٹرڈ لفافہ حضرتؒ کو نہ مل پایا۔ ایک دن لانڈھی ریلوے اسٹیشن کے

اسٹیشن ماسٹر نے فون کر کے حضرتؒ کو بتایا کہ حضرت آپ کے نام آموں کی ایک پیٹی دو روز سے آئی پڑی ہے اور آم سڑنے لگے ہیں، اس کو منگوا لیجئے۔ صبح دس بجے یہ فون آیا، بارہ بجے کی ڈاک سے حضرت کو بلٹی بھی مل گئی۔ چنانچہ آم منگوائے گئے۔ بلٹی کے ساتھ خط میں رمزی صاحب نے لکھا تھا کہ ان آموں کا ایک چوتھائی میرے عرفانی بھائی فخر عالم کو پہنچا دیں۔ آم آئے اور پیٹی کھولی گئی تو پتہ چلا کہ تقریباً سارے کے سارے آم سڑ گئے ہیں اور محض چند دانے (اور وہ بھی داغدار) ایسے نکلے کہ جنہیں فوری طور پر کھایا جاسکتا تھا۔ جون کے مہینہ کی اس تپتی دوپہر میں جبکہ لُو کے تھپیڑے ہم جیسے نوجوانوں کو کمروں کے اندر اور پنکھوں کے نیچے سلا رہے تھے، ٹھیک ۲½ بجے دوپہر لسبیلہ میں میرے گھر پہ دستک ہوئی، کمرے سے باہر نکل کر دروازہ کھولا تو دیکھا کہ حضرتؒ کھڑے ہیں ...... ! اور کاغذ کا ایک چھوٹا سا تھیلا ہاتھ میں ہے۔ یہ تھیلا احقر کو دیتے ہوئے فرمایا کہ بھائی! آج تمہارے ان آموں نے بہت ستایا۔ ریاض الحسن نے بھیجے ہیں اور پھر سارا قصہ سنایا۔ میں انتہائی حیرانی سے حضرتؒ کو دیکھ رہا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں کن کن اوصاف حمیدہ سے نوازا ہے اور پشیمانی سے گڑا جا رہا تھا کہ اس گرم ترین دوپہر میں اس فقیہ اعظمؒ نے ایک امانت کو اس کے حقدار تک پہنچانے میں کس قدر صعوبت اٹھائی۔ یہ چار آم جو دانے سے خالی نہیں تھے اگر حضرت ہی نوش فرما لیتے اور مجھے صرف ٹیلیفون سے یا مابعد کسی ملاقات پر بتا دیتے تو میرے نزدیک کوئی حرج کی بات نہیں تھی، مگر یہاں تو مربی، مصلح اور مبلغ کا معاملہ تھا۔ وہ یہ کیسے گوارا کر سکتے تھے؟ حالانکہ میں نے یہ بات کہی بھی اور جب حضرت نے فرمایا کہ بھئی! امانت کے معاملہ میں بہت احتیاط کی ضرورت ہے تو احقر نے عرض کی کہ حضرت! پھر ایسا ہی تھا تو آپ کسی اور شخص کے ہاتھ بھیج دیتے۔ کتنے باریک بین تھے ہمارے حضرتؒ کہ جواب ملا ...... یہ گلے سڑے آم ایسے ہی بھیج دیتا ...... لانے والا نہ جانے بات صحیح پہنچاتا یا نہیں ہرچند کہ تمہارا دل صاف ہے لیکن شیطان تمہیں یہ سمجھا سکتا تھا کہ (نعوذ باللہ) ماموں اچھے آم خود کھا گیا اور گلے سڑے مجھے بھیج دیئے۔ حضرتؒ رحمۃ اللہ علیہ کی کن کن باتوں پہ سر دھنا جائے۔ عقل حیران ہے۔ امانت کے معاملے میں اور معاملات کی صفائی کے لئے کیسی بہتر تعلیم دی۔

روزمرہ واقعات میں حضرتؒ کی دلچسپی

حضرت رحمۃ اللہ علیہ صرف غم و مسرت یا عید بقرعید کے مواقع پر ہی نہیں بلکہ اپنے اہل خاندان

کی بہت سی معمولی تبدیلیوں اور روز مرہ واقعات میں کس قدر دلچسپی لیتے تھے اور کیسے ان مواقع پر خوشی یا غم کے اظہار کے لئے خود بنفس نفیس تشریف لے جاتے اس کا اندازہ اس واقعہ سے ہوگا کہ ۱۹۷۰ء کے اواخر میں احقر نے ریفریجریٹر خریدا، کورنگی آکر حضرت کو اطلاع دی۔ حضرتؒ سن کر بہت خوش ہوئے اور فرمایا کہ آکر دیکھوں گا۔ انہی دنوں حضرت علیل ہوگئے اور کوئی مہینہ بیس دن شہر آنا نہ ہوا، اسی اثناء میں احقر نے نقل مکانی کی اور عزیز آباد میں اپنے گھر میں جا بسا۔ ۔ ۔ یہ اطلاع بھی حضرت کو دی گئی۔ کچھ دن بعد ایک روز دوپہر کے وقت حضرتؒ بغیر اطلاع کے اچانک میرے مکان پر تشریف لائے۔ گھر کے ایک ایک کمرہ میں جا کر دیکھا۔ گھر کی تزئین و ترتیب (SETTING) پر اہلیہ کی ہمت افزائی کی، میری درخواست پر اس مکان پر شربت نوش فرمایا۔ ریفریجریٹر کو بشوق ملاحظہ فرمایا، اس پر دعا پڑھی۔ غرضیکہ ایک ایک بات پر اور ان کی جزئیات پر تبصرہ فرمایا اور پھر ظہر کی نماز کے لئے محلہ کی مسجد (ایک مینارہ مسجد) احقر کے ہمراہ تشریف لے گئے۔

استاذ زادہ کا احترام

ہمارے محلہ کے ضعیف امام صاحب نے جب مسجد میں حضرتؒ کو دیکھا تو مصلیٰ امامت حضرت کو پیش کیا، حضرتؒ نے انکار فرمایا تو امام صاحب نے اصرار کے ساتھ یہ بھی بتایا کہ میں آپ کے استاد ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کا لڑکا ہوں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ حضرتؒ نے امام صاحب کے والد سے زمانہ تعلیم میں کوئی چھوٹی سی کتاب پڑھی تھی۔ استاذ کا نام سن کر حضرتؒ ان سے بغل گیر ہوگئے اور بہت تکریم فرمائی اور پھر زندگی بھر احقر کے ذریعہ ان امام صاحب کی خدمت میں نقد یا جنس کی شکل میں ہدیہ بھیجنے کا اہتمام فرماتے رہے۔ نماز ظہر کے مقابلہ مسجد میں

ایک عجیب و غریب واقعہ یا حضرتؒ کی کرامت

ایک جنازہ آیا۔ امام صاحب نے حضرتؒ سے اس جنازہ کے نماز کی امامت کی بھی درخواست کی جسے حضرت نے قبول فرما لیا اور نماز جنازہ بھی پڑھا دی۔ نماز کے بعد جب جنازہ کے ہمراہ آنے والوں کو معلوم ہوا کہ نماز جنازہ مفتی محمد شفیع صاحب نے پڑھائی ہے تو ان میں سے ایک ضعیف

بزرگ آگے بڑھے، حضرتؒ سے مصافحہ کیا اور بتایا کہ مرحوم جن کی نماز آپ نے پڑھائی ہے آپ سے بہت عقیدت رکھتے تھے، دو تین سال سے صاحب فراش تھے، جب تک ان کے ہاتھ پاؤں چلتے رہے وہ ہر اتوار کو آپ کی مجلس میں جاتے رہے اور مرحوم جو میرے بھائی تھے انھوں نے (ایک نوجوان کی طرف اشارہ کرکے) اپنے اس لڑکے کو وصیت کی تھی کہ میری نماز جنازہ حضرت مفتی صاحب سے پڑھوانا . . . . آج کل کے اس نوتعلیم یافتہ جوان نے ان کی وصیت کو نظر انداز کردیا مگر یہ قدرت کا کرشمہ ہی ہے کہ اس نے آج اچانک یہاں آپ کو بھیج دیا اور اس طرح مرحوم کی آرزو من جانب اللہ پوری ہوئی۔ یہ واقعہ سن کر حاضرین حیران ہوگئے اور میں سوچنے لگا کہ آج اللہ تعالیٰ نے حضرتؒ کو میرے گھر پر بھیج کر اس مختصر سے وقت میں حضرتؒ سے کتنے لوگوں کے حقوق اور آرزوئیں پوری کرائیں۔

حقیقت یہ ہے کہ میرے ماموں جان کی یہی باتیں ان کی عظمت کی اور ربّانی کی نشاندہی کرتی ہیں خداوند کریم ہمیں بھی حضرت مفتی صاحب نوراللہ مرقدہٗ کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائیں اور ہمیں بھی دوسروں کے کام آنے کی توفیق بخشیں۔ آمین ؎

مجھے اے خالق نطق و زباں خاموش کردینا
میرے لب پہ جس دن درد انساں کی پکار آئے

○

تزکیۂ اخلاق اور باطنی طہارت ایک ایسا کام ہے جس کو عام اقوام اور سوسائٹیوں نے سرے سے نظر انداز کر رکھا ہے، انسانی لیاقت و استعداد کا معیار اس کی تعلیمی ڈگریاں سمجھی جاتی ہیں، انہیں ڈگریوں کے وزن کے ساتھ انسانوں کا وزن گھٹتا بڑھتا ہے، اسلام نے تعلیم کے ساتھ تزکیہ کا ضمیمہ لگا کر تعلیم کے اصل مقصد کو پورا کر دکھایا۔

(مفتی اعظمؒ، معارف القرآن ص ۲۸۲ ج ۱)

مولانا عبدالقادر صاحب
دار العلوم کبیر والا

باتیں اُن کی یاد رہیں گی

مولانا عبدالقادر صاحب

حق تعالےٰ کا یہ خصوصی انعام ہے کہ جب ہوش سنبھالا تو اہل حق سے اپنا تعلق پایا علماء دیوبند سے محبت بچپن سے رہی، جوں جوں وقت گزرتا رہا، اس میں اضافہ ہوتا رہا، اہل زیغ و ضلال کی صحبت اور عقیدت سے حق تعالیٰ نے ابتداء ہی سے محفوظ و مصئون فرمایا۔ ان اکابر سے خصوصاً والہانہ تعلق رہا جو مخزن علم ہونے کے ساتھ عمل صالح اور تقویٰ کے میدان میں آگے تھے اور علم نبوت کے ساتھ ساتھ ان کو نور نبوت بھی حاصل تھا انہیں میں سے ایک حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمتہ اللہ علیہ کی شخصیت، بھی تھی، طالب علمی کے زمانہ میں ان کی بعض کتابوں سے منتفع ہوا۔ البلاغ کو اپنے نام جاری کرا کے اس کے مندرجات میں سے بالخصوص حضرت مفتی صاحب، کی تحریروں سے دل و دماغ متاثر ہوا۔ مجھے یاد ہے کہ طالب علمی کے زمانہ میں میرے ساتھ ایک طالب علم رہتے تھے، جو سمجھ دار تھے، مگر بعض سیاسی اُمور کی وجہ سے حضرت مفتی صاحب کے کچھ زیادہ معتقد نہ تھے۔ بلکہ حضرت ؒ سے ایک گونہ انکو اعراض اور عدم عقیدت سی ہوگئی تھی، ایک دفعہ انہوں نے حضرت مفتی صاحبؒ کی کوئی کتاب پڑھی اور کہنے لگے کہ مفتی صاحب کی تحریر میں اثر بہت ہے۔ میرا دل اُن کی فلاں کتاب پڑھ کر بہت متاثر ہوا، میں نے کہا، باوجود بے تعلق ہونے کے آپ کی یہ گرویدگی مصنف کے اخلاص اور للّٰہیت کی دلیل ہے، از دل خیزد بر دل ریزد والی بات ہے۔

یہ تو وہم وگمان نہ تھا کہ مجھے حضرت مفتی صاحبؒ کے مدرسہ میں پڑھانے کی سعادت نصیب ہوگی اور کافی عرصہ حضرت کی صحبت اور انفاسِ طیبہ سے مستفید ہونے کا موقع میسر آئے گا۔ مگر حق تعالیٰ نے اس کے اسباب اس طرح مہیا فرمائے کہ شوال ۱۳۸۹ھ میں جب میں دارالعلوم کبیر والہ سے فارغ ہوا تو میرے مربی واستاذ مولانا محمد سرور صاحب مدظلہم کے توسط سے میرا تقرر حضرت مفتی صاحبؒ کے مدرسہ دارالعلوم میں ہوگیا۔

فتویٰ میں احتیاط اور مفتیوں کو نصیحت

میں تدریس کے دوران تھوڑا بہت فتویٰ نویسی کا کام بھی کرتا تھا۔

جب کسی فتوے میں کوئی بات قابلِ اصلاح ہوتی تو بندہ کے پاس کسی طالب علم کے ذریعے پیغام بھیجتے کہ اسباق سے فراغت کے بعد مجھ سے مل لیں۔ میں فارغ ہو کر حاضر ہوتا تو تفہیم فرما دیتے۔ ایک دفعہ نصیحت فرمائی کہ مفتی کو ہمیشہ اس امر کا خصوصی طور پر خیال رکھنا چاہئے کہ اس کے فتوے سے کوئی فتنہ نہ کھڑا ہو جائے نہایت سوچ سمجھ کر لکھنا چاہئے، کتب کے طرف مراجعت کے ساتھ ساتھ موقع اور محل کو بھی ملحوظ رکھنا چاہئے۔ فقہاء رحمہم اللہ نے فرمایا ہے من لم یعرف اھل زمانہ فھو جاھل۔

ایک دفعہ فرمایا کہ مفتی کو فتوے دیتے وقت عوام الناس کی سہولت کو پیش نظر رکھنا چاہئے اور تاحدِ امکان ان کے لئے گنجائش اور وسعت پیدا کرنی چاہئے۔ لیکن اپنے ذاتی عمل میں احتیاط کو ملحوظ رکھنا چاہئے۔ اس پر یہ واقعہ سنایا کہ حضرت تھانوی رہ کے زمانہ میں یہ مسئلہ چل نکلا کہ ولایت سے جو کپڑا آتا ہے اس میں چمک پیدا کرنے کے لئے چربی استعمال کی جاتی ہے اور وہ چربی یقیناً مردار کی ہوتی ہے۔ لہٰذا وہاں سے درآمد ہونے والے کپڑے ناپاک ہیں اور ان میں بغیر دھوئے نماز پڑھنا ناجائز ہے۔ حضرت تھانوی رہ سے بھی اس بارہ میں استفسار کیا گیا تو چونکہ یہ امر یقینی نہ تھا اس لئے آپ نے عوام الناس کی سہولت کے پیش نظر یہ فتوے دیا کہ

کپڑے پاک ہیں۔ اور بغیر دھوئے ان میں نماز پڑھنا جائز ہے مگر اپنے عمل میں احتیاط کو ملحوظ رکھا۔ جب کبھی غیر ملکی کپڑا خرید لے اور پہننے کا اتفاق ہوا تو پہلے اس کو دھلوالیا اور پھر پہنا۔

ایک دفعہ یہ بھی نصیحت فرمائی کہ مفتی کو چاہئیے کہ جن مسائل کا تعلق اپنی ذات سے ہو ان مسائل میں دوسرے علماء سے استفسار کرے اپنے نفس پر اعتماد نہ کرے کیونکہ نفس کے کید خفی کا اندیشہ ہے۔ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کو حق تعالیٰ نے فقہ میں غیر معمولی مہارت عطا فرمائی تھی۔ مگر اس کے باوجود اپنے ذاتی مسائل کے بارے میں فتوے دوسری جگہ دیوبند، سہارنپور سے منگواتے تھے۔ کئی دفعہ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے ذاتی مسائل میں مجھ سے استفتاء کیا میں نے جواب لکھا حضرت نے جواب پر خوشی اور اطمینان کا اظہار فرمایا۔

اوقات کی قدر

حضرت مفتی صاحب رحمہ کو اوقات کی پابندی کا بہت اہتمام تھا۔ وقت کی بڑی قدر کرتے تھے۔ یہ چیز آپ کو اپنے شیخ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ سے حاصل ہوئی تھی۔ ایک دفعہ فرمایا کہ حق تعالیٰ نے ہمارے اکابر خصوصاً حضرت تھانوی رحمہ اللہ سے جو دین کا اس قدر کام لیا تو اس کا حقیقی سبب تو فضل خداوندی ہے۔ مگر ظاہری سبب یہ ہے کہ حضرت تھانوی رحمہ اوقات کی بہت قدر کرتے تھے ایک منٹ بھی ضائع نہیں فرماتے تھے۔ بسا اوقات گھڑی کو ہاتھ میں پکڑے رہتے اور اس پر نظر رہتی، ایک ایک منٹ کا حساب لگاتے اور اس کو ضائع ہونے سے بچاتے۔ ہر کام کے لئے وقت مقرر تھا۔ اور ہر کام اپنے وقت پر انجام دیتے تھے۔

عید الاضحیٰ کا دن تھا جس کو عام لوگ حتیٰ کہ اہل علم بھی چھٹی اور آرام کا دن سمجھتے ہیں اور اپنے کام کو ہاتھ بھی نہیں لگاتے، شام کے وقت چند نوجوان اہل علم دار العلوم کے اساتذہ حضرت کے پاس جمع تھے۔ حضرت نے ہر ایک سے استفسار فرمایا کہ آج تم نے کیا کیا علمی کام سر انجام دیا ہے؟

تقریباً سب کا جواب یہی تھا کہ آج تو کام کرنے کا موقع ہی نہیں ملا، گہما گہمی میں ہی

وقت گزر گیا۔ حضرت رہ نے فرمایا کہ تم نوجوانوں کے لئے کہتا ہوں کہ میں بوڑھے نے آج بھی معارف القرآن کے دس ورق (فیما اظن) لکھے ہیں۔

مدرسے کے اساتذہ کے حقوق کا خیال

حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو اپنے مدرسہ کے اساتذۂ کرام کا بڑا احترام تھا ان کی راحت رسانی کی بہت فکر کرتے۔ چنانچہ جب میں دارالعلوم کراچی میں تھا تو ایک خطیر رقم خرچ کرکے مدرسین کے لئے سوئی گیس کا انتظام کیا۔ حضرت کو اس بات کا اہتمام رہتا تھا کہ مدرسہ کے اساتذہ اپنے اکابر کے طرز پر ہوں، مخلص ہوں، دین کی نشر و اشاعت ان کا مقصود ہو۔

ایک دفعہ فرمایا کہ میری زیادہ تر خواہش رہتی ہے کہ مدرسہ میں چند اللہ والے جمع ہو جائیں اگرچہ وہ زیادہ محقق نہ ہوں۔ جس مدرس کا مقصود تنخواہ لینا ہو اس کو حضرت اپنی اصطلاح میں پیشہ ور مولوی فرمایا کرتے تھے۔ ایک دفعہ ماہ رمضان المبارک میں زیارت کے لئے میں حاضر ہوا تو فرمایا کہ ہم نے مدرسین کا مشاہرہ کافی بڑھا دیا ہے اگر آپ بھی یہاں ہوتے تو آپ کا مشاہرہ بھی کافی بڑھ جاتا۔ میں نے عرض کیا کہ اپنی مجبوریوں کی وجہ سے یہاں نہیں رہ سکا۔

پھر فرمایا کہ میری رائے یہ ہے کہ مدرسین کا مشاہرہ حتی الوسع زیادہ ہو تاکہ وہ اپنی معاش سے مطمئن ہو کر کام کریں۔ اگر مشاہرہ کم ہو تو مدرسین کہیں امامت خطابت، ٹیوشن وغیرہ تلاش کرتے ہیں۔ پھر ایک معروف مدرسے کے متعلق افسوس کرتے ہوئے فرمایا کہ فلاں مدرسہ میں باوجود وسعت کے مدرسین کی تنخواہیں کم ہیں اور مدرسین پریشان رہتے ہیں۔

ایک دفعہ حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ایک صاحب ثروت دوست نے افریقہ سے ایک بڑی رقم دارالعلوم کے اساتذہ کے لئے بطور ہدیہ بھیجی۔ حضرت مفتی صاحب رہ نے ہر مدرس کو علیحدہ علیحدہ بلا کر اس کے منصب اور اس کی ضرورت کو ملحوظ رکھتے ہوئے رقم عطا فرمائی۔ مجھے اور دارالعلوم کے ایک مدرس کو اکٹھے بلایا اور ہم میں سے ہر ایک کو دو صد روپیہ عنایت کیا۔ اور یہ وضاحت بھی فرمائی۔

کہ یہ رقم افریقہ سے آپ لوگوں کے لئے آئی ہے ۔ اور معطی نے یہ تاکید کی ہے یہ رقم دارالعلوم کے اساتذہ کو ہدیۃً دی جائے کسی اور مد میں اس کو خرچ نہ کیا جائے۔

مدرسین کو نصیحت اور مدرسہ کے حقوق کا خیال

حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ دوران سال میں بعض اوقات تمام مدرسین کو جمع کرتے، بالخصوص اسباق شروع ہونے سے پہلے ان کو نصیحت فرماتے۔ فرض منصبی کا احساس دلاتے۔ اخلاص کی تلقین کرتے۔

ایک دفعہ فرمایا کہ بعض مدرسین مدرسہ سے تنخواہ تو پوری وصول کر لیتے ہیں مگر مدرسہ کی طرف سے جو کام ان کے ذمہ ہوتا ہے اس کو پورا نہیں کرتے۔ کبھی سبق میں دیر سے پہنچتے ہیں۔ کبھی بلا وجہ سبق کا ناغہ کر دیتے ہیں۔ کبھی سبق میں بے ضرورت اور بے فائدہ باتیں کرتے ہیں۔ جس سے سبق کی کمیت اور کیفیت کا نقصان ہو جاتا ہے یہ سب باتیں امانت و دیانت کے خلاف ہیں۔ خیانت اور تطفیف میں داخل ہیں۔

ایک دفعہ جب کہ بعض مدرسین نے کتابوں کو مقام درس تک نہ پہنچایا تو حضرت رحمۃ اللہ علیہ کو بہت افسوس ہوا اور ناراضگی کا اظہار کرتے رہے اور اس کے سدباب کے لئے مقام درس متعین کر کے کتاب کی سالانہ مقدار کو سال کے مہینوں پر تقسیم کرا دیا۔ اور ہر ماہ کی مقدار متعین کرا دی۔ اور مدرسین پر ایک بڑے استاذ کو نگران مقرر کر دیا جن کے ذمہ یہ کام بھی تھا کہ وہ ہر ماہ کے بعد جانچ کریں کہ مدرسین نے ماہانہ مقدار کو پورا کیا یا نہیں؟

مدرسین کو جب جمع فرماتے تو نصیحتوں کے ساتھ ساتھ چائے سے بھی مدرسین کی تواضع کرتے۔ اسی قسم کی ایک مجلس میں مدرسین کو امانت و دیانت کی تلقین فرمائی۔ اور خیانت سے ڈرایا۔ اور اس مناسبت سے سیدنا حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کا قصہ سنایا۔ کہ آپ نے سیدنا حضرت ابو عبیدہ بن جراح رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو شام کا امیر مقرر فرمایا، ایک دفعہ آپ شام تشریف لے گئے اور دل میں خیال پیدا ہوا کہ ابو عبیدہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ یہاں کے امیر ہیں شاید آپ نے مال و منال او

زیب و زینت کا سامان جمع کر رکھا ہو تو اس امر کی تحقیق کے لئے آپ نے یہ تجویز اختیار فرمائی۔ کہ آپ نے سیدنا حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ تعالےٰ عنہ سے فرمایا کہ میرا دل چاہتا ہے کہ میں اپنے بھائی سیدنا حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ تعالےٰ عنہ کے گھر چلوں اور وہاں کچھ دیر آرام کروں۔ تو حضرت ابوعبیدہ رضہ نے عرض کیا خوشی سے تشریف لے چلیں۔

چنانچہ آپ ان کے گھر تشریف لے گئے۔ اور گھر میں داخل ہونے کے بعد گھر میں متجسسانہ نگاہ ڈالی مگر ان کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب کہ انہوں نے دیکھا کہ اتنے بڑے حاکم اور امیر کے گھر میں کسی قسم کا سامان موجود نہیں۔ صرف زمین پر بچھا ہوا معمولی سا بچھونا ہے۔ جس پر وہ آرام کرتے تھے۔ اور ایک پیالہ جس میں وہ کھانا کھاتے تھے۔ ان کی اس حالت کو دیکھ کر سیدنا حضرت عمر رضی اللہ تعالےٰ عنہ پر رقت طاری ہوئی۔ کہ ان کے گھر میں زیب و زینت کا سامان تو بجائے خود رہا ضرورت کا سامان بھی نہیں ہے۔ پھر آپ نے سیدنا حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ تعالےٰ عنہ کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ آپ کے متعلق حضور صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کا یہ فرمان حرف بحرف صحیح نکلا کہ امین ھٰذہ الامۃ ابوعبیدہ بن الجراح۔ جب حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے یہ واقعہ سنایا تو حضرت اور مدرسین پر بھی رقت طاری ہوگئی۔ اور بعض آبدیدہ ہوگئے۔

ایک دفعہ آپ نے مدرسین کے لئے اس ضابطہ کا اعلان کیا کہ اگر کوئی مدرس کسی مجبوری کی وجہ سے دیر سے پہنچے۔ تو زیادہ سے زیادہ دس منٹ کی تاخیر معاف ہے۔ اس سے زیادہ تاخیر چھٹی میں محسوب ہوگی۔ حضرت رہ نے ایک دفعہ جب کہ میں حضرت کے پاس اکیلا تھا اپنا واقعہ سنایا کہ دارالعلوم دیوبند کی ملازمت کے آخری سالوں میں بعض عوارض کی وجہ سے امور مفوضہ کے ادا کرنے کے لئے پورا وقت نہ دے سکتا تھا کچھ کوتاہی ہو جاتی تھی اور تنخواہ بھی مجھے پوری مل جاتی تھی۔ مگر مجھے اس کا شدت سے احساس تھا۔ جب میں دارالعلوم سے علیحدہ ہوا تو مجھے

بڑی فکر ہوئی کہ مدرسہ کا حق میرے ذمہ ہے اس کے ادا کرنے کی کیا صورت ہو اس وقت میرے پاس زائد سرمایہ بھی نہ تھا جو مدرسہ میں داخل کر دیتا۔ ہاں ایک ذاتی کتب خانہ کافی مالیت کا تھا۔ وہ میں نے مدرسہ میں داخل کر دیا اور مدرسہ کے حق سے سبکدوش ہوا اور اس کی مجھے بڑی خوشی ہوئی۔

انتہی کلامہ۔ اہل اللہ چونکہ اپنے نفس سے بدگمان رہتے ہیں اس لیے آپ نے اپنی معمولی کوتاہی کو بڑی کوتاہی سمجھا اور بالآخر اس کا تدارک بھی کر کے چھوڑا۔ اہل درس و تدریس کو اس واقعہ سے سبق حاصل کرنا چاہئے۔

مفتی صاحب کی اصلاحی مجلس حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ جہاں علم و فقہ کے میدان میں سباق الغایات تھے وہاں طریقت اور تصوف میں بھی حق تعالیٰ نے ان کو اونچا مقام عطا فرمایا تھا۔ تب ہی تو مجدد الملت حضرت تھانوی رح نے آپ کو اپنا خلیفہ بنایا۔ اور خلق خدا کی اصلاح کے لئے آپ کو بیعت و تلقین کی اجازت دی بلکہ مامور فرمایا۔ چنانچہ آپ اسی اصلاح خلق کے جذبہ سے اتوار کے دن ایک مجلس منعقد فرماتے تھے۔ اس زمانہ میں حکومت کی طرف سے اتوار کی چھٹی ہوا کرتی تھی اور اتوار کا دن بھی اسی مصلحت سے تجویز کیا گیا تاکہ سرکاری ملازمین بھی اس مجلس میں حاضر ہو سکیں۔ کبھی کبھی مختصر طور پر جمعہ کے دن بھی یہ مجلس ہو جاتی تھی۔ اتوار کی مجلس میں مختلف مقامات سے لوگ حاضر ہو کر اپنی روحانی پیاس بجھاتے۔ حضرت مفتی صاحب رح کے نصائح اور ملفوظات سے بہرہ ور ہوتے۔ اس مجلس میں زیادہ تر ارشادات اصلاح باطن کے متعلق ہوتے۔ خوف خدا اور فکر آخرت کا بیان ہوتا اتباع سنت کی تلقین ہوتی۔ حقوق العباد کے ادا کرنے کی تاکید ہوتی۔

حاضرین مجلس حضرت رح کے ارشادات سے بہت متاثر ہوتے۔ عزم و ہمت میں قوت پیدا ہو جاتی۔ خصوصاً جب خوف خدا اور فکر آخرت کے متعلق بیان کرتے تو مجلس پر خوف کی کیفیت طاری ہو جاتی۔ اور بعض کی چیخیں تک نکل جاتیں۔ یہ مجلس بہت پر کیف اور پر انوار ہوتی۔ افسوس کہ اب ہم اس مجلس سے محروم ہیں۔ اور اب تو ایسی

مجالس بہت کم رہ گئیں ۔ جو شاذ و نادر رہ گئیں وہ غنیمت کبریٰ ہیں ان کی قدر پہچاننی چاہئے
اپنی اس مجلس کے متعلق ایک دفعہ فرمایا کہ بغیر سخت مجبوری کے میں اس کا ناغہ نہیں کرتا ۔
حاضرین کو تو خدا جانے نفع ہوتا ہے یا نہیں مگر میں اپنے اندر تو فائدہ محسوس کرتا ہوں ۔
اور وجہ اس کی یہ ہے کہ جو لوگ آتے ہیں ان کا مقصود دین کا نفع حاصل کرنا ہوتا ہے
اس لئے وہ مخلص ہوتے ہیں ۔ اور چند مخلصین کے مل بیٹھنے کی برکت سے حق تعالےٰ
مجھ کو بھی نفع پہنچاتے ہیں ۔ اور انشاء اللہ العزیز مجھے توقع ہے کہ آنے والوں کو بھی
نفع ہوتا ہوگا ۔ اور واقعہ بھی یہی ہے کہ جو لوگ باقاعدہ اس مجلس میں آتے ، ان کی حالت
روز بروز بدلتی چلی جاتی ۔ ایسے بہت سے افراد دیکھے گئے جن کی دینی حالت اچھی
نہیں تھی ۔ انگریزی وضع قطع ، انگریزی لباس میں ملبوس تھے شکل وصورت بھی اسلام
کے خلاف تھی ۔ مگر جب باقاعدہ حضرت ؒ کی مجلس میں آنے لگے تو بغیر اس کے کہ
حضرت ان کے افعال پر نکیر کرتے یا خصوصی خطاب سے تنبیہ کرتے خود بخود ان کی حالت
درست ہوتی چلی گئی ۔ وضع قطع شکل وصورت درست ہوگئی ۔ لباس و معاشرت
شریعت کے مطابق ہوگئی ۔ جو حضرات باقاعدہ اس مجلس میں آتے رہے اور اپنی
اصلاح کا اہتمام رکھا ۔ اور اپنے اخلاق و اعمال کو درست کیا ، ان میں سے جن کو حضرت
نے اصلاح خلق کا اہل سمجھا ان کو بیعت و تلقین کی اجازت دی ۔

ایک دفعہ فرمایا کہ میں اپنی علمی مصروفیتوں کی وجہ سے توسیع سلسلہ کی طرف توجہ نہیں
کرسکا جو کچھ تھوڑا بہت ہو رہا ہے حق تعالےٰ قبول فرمالے ۔ حضرت مفتی صاحب ؒ
اپنے شیخ کی طرح بیعت کرنے میں تعجیل نہیں فرماتے تھے ۔ آپ کی نظر صورت بیعت
سے زیادہ حقیقت بیعت پر تھی ۔ درحقیقت بیعت اعتقاد و انقیاد شیخ ہے ۔

ایک دفعہ جب حضرت اپنی مجلس میں تشریف رکھتے تھے ۔ ایک شخص حاضر ہوئے
اور کہنے لگے حضرت ! مجھے بیعت فرمالیں ۔ حضرت نے کچھ انکار کیا تو کہنے لگے کہ
مجھے حضور اکرم صلی اللہ تعالےٰ علیہ وبارک وسلم کی زیارت نصیب ہوئی اور آپ نے
مجھے فرمایا کہ مفتی محمد شفیع سے بیعت ہو جاؤ ۔ آپ نے فرمایا بیعت صرف ہاتھ

میں ہاتھ دینے کا نام نہیں، آپ مجلس میں آتے رہیں، اور میری باتیں سنتے رہیں۔ اگر آپ کو فائدہ محسوس ہونے لگا اور باہمی مناسبت ہوگئی تو مجھے بیعت کرنے سے انکار نہ ہوگا۔

حضرت مفتی صاحبؒ کی تقریر

حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ ایک معروف ترین علمی شخصیت تھے ان کو خطابت و تقریر سے زیادہ شغف اور لگاؤ نہ تھا مگر اس کے باوجود آپ ایک اچھے خطیب اور مقرر بھی تھے۔ مگر آپ کی تقریر ظاہری شوکت سے زیادہ معنویت کی حامل ہوتی تھی۔ ایک دفعہ خود فرمایا کہ جب اد بیان مقرر نہیں ہوں، مگر بالکل گونگا بھی نہیں ہوں جب آپ کی صحت و قوت اچھی تھی تو ہفتہ کے دوران میں مغرب کے بعد ایک دفعہ مدرسہ کے طالب علموں کے سامنے بیان فرماتے۔ عموماً سوموار کی شب مغرب کے بعد حضرت ؒ کے بیان کا اعلان کر دیا جاتا۔ نماز کے بعد طلبہ مسجد میں بیٹھ جاتے۔ اور بعض اساتذہ بھی شریک ہوتے۔ مجھے بھی ان بیانات کے سننے کی سعادت نصیب ہوئی۔ وہ تقریریں بڑی عالمانہ اور محققانہ ہوتی تھیں۔ اور حضرت نہایت دل سوزی اور خیرخواہی کے جذبہ سے بیان فرماتے۔ طالب علموں کو دینی وعلمی ذوق عطا کرنے کی کوشش فرماتے۔ حضرت ؒ کو اس بات کی بڑی لگن تھی کہ نوجوان طلباء وعلماء میں اکابر جیسا دینی وعلمی ذوق پیدا ہو۔ کئی دفعہ فرمایا کہ حرف شناس عالم تو پیدا ہو رہے ہیں مگر اکابر جیسا دینی ذوق اور علمی مزاج رکھنے والے اور ان کے طرز فکر کے امین بہت کم پیدا ہوتے ہیں۔

حضرت ؒ جب کسی تقریر یا مجلس میں اپنے اکابر کے علمی وعملی کمالات بیان فرماتے تو مردہ دلوں میں جان آجاتی۔ اور کاہل اور سست آدمی بھی مستعد اور مستیقظ ہونے لگتا اور اکابر کا گرویدہ ہو جاتا۔ اسی دینی ذوق کے بارے میں ایک دفعہ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا مقولہ نقل فرمایا کہ۔ بعض لوگ میرے پاس ملفوظات سننے آتے ہیں حالانکہ وہ طبع ہو چکے ہیں دور رہ کر بھی پڑھے جا سکتے ہیں۔ اور

بعض تحقیقات سننے آتے ہیں ۔ تو وہ بھی کتابوں میں موجود ہیں ۔ میں اپنے متعلق تو نہیں کہتا ۔ البتہ بزرگوں کے متعلق کہتا ہوں کہ ان سے حاصل کرنے کی چیز دینی ذوق ہے ۔ یہ ذوق بہت بڑی چیز ہے ۔ آج کل اس کی بہت کمی ہے ۔ اسی ذوق کے متعلق فرمایا کہ ہم ایک دفعہ الحیلۃ الناجزۃ کی تصنیف کے لئے مجنون کی بیوی کا حکم تلاش کر رہے تھے ۔ اس کے متعلق ایک خاص جزیہ کی تلاش تھی بہت کتب چھان ماریں مگر وہ مسئلہ نہ ملا ۔ آخر درمختار کے متن میں صاف صاف مل گیا۔ حضرت تھانوی قدس سرہ کو دکھایا حضرت بھی بہت متعجب ہوئے کہ صاف صاف مل گیا مگر فرمایا کہ بات دل کو لگتی نہیں ۔ دوسرا نسخہ دیکھو ۔ دوسرا نسخہ دیکھا گیا تو بجائے مجنون کے مجبوب کا لفظ تھا ۔ اس موقع میں حضرت رح کے علمی ذوق نے کام دیا ۔ اور ایک زبردست لغزش سے حفاظت ہوگئی۔

حضرت مفتی صاحب کا استغناء حضرت مفتی صاحب نور اللہ مرقدہ جہاں خوش اخلاق ، متواضع اور نرم خو تھے وہاں اللہ تعالیٰ نے ان کو استغناء کی صفت سے بھی نوازا تھا جو ایک فقیہ کے لئے از روئے حدیث ضروری صفت ہے ۔

نعم الرجل الفقیہ ان احتیج الیہ نفع وان استغنی عنہ اغنی نفسہ ۔ الحدیث ۔

خود فرماتے تھے کہ میں امراء اور دولت مندوں سے مستغنی رہتا ہوں ۔ اگر وہ مدرسہ کی امداد کرتے ہیں تو اس میں مجھ پر ان کا کوئی احسان نہیں خود اپنی ذات پر احسان کرتے ہیں ۔ اس لئے کوئی بڑے سے بڑا دولت مند اور امیر ہو میں اس کی خوشامد نہیں کرتا ۔

فرمایا ایک دفعہ ایک نہایت متمول شخص نے مجھ سے کہا کہ میرے پاس سولہ ہزار روپیہ زکوٰۃ کا ہے میں کس کام میں لگاؤں ؟ میں نے اس کو زکوٰۃ کے مصارف بتا دیئے مگر ایک خفیف سا اشارہ بھی اس طرف نہ کیا کہ ہمارا دینی مدرسہ بھی ہے

جس کے طلبہ پر زکوٰۃ کی رقم خرچ ہوتی ہے۔

مدرسہ کے چندہ کے سلسلہ میں بھی حضرتؒ کی رائے یہ تھی کہ مدرسہ کی ضروریات کی اہل خیر کو عمومی اطلاع دے دی جایا کرے۔ یا ان مخصوص حضرات کو اطلاع کردی جائے جو ایسے مواقع خیر کے منتظر رہتے ہیں۔ مگر چندہ کرنے کا کوئی ایسا طریقہ اختیار نہ کیا جائے جس سے اہل علم کی بے وقعتی ہو۔

فرمایا کہ جب میں تقسیم کے بعد کراچی منتقل ہوا تو توکلاً علی اللہ نانک واڑہ میں مدرسہ کھولا مگر اسباب بالکل نہ تھے۔ میں نے طلبہ کو کہہ دیا تھا کہ پڑھانے کے لئے تو ہم حاضر ہیں مگر تمہارے قیام وطعام اور دیگر مصارف ہمارے پاس نہیں۔ جب اہل خیر کو اس کی اطلاع ہوئی تو صرف تین آدمیوں نے کہا کہ آپ اخراجات کی فکر نہ کریں وہ ہمارے ذمہ رہے۔ چنانچہ ایک سال کا خرچ چھتیس ۳۶ ہزار روپیہ صرف ان تین آدمیوں نے دے دیا۔

ایک دفعہ ماہ رمضان المبارک میں برادرم مولانا محمد رفیع صاحب نے حضرتؒ کی خدمت میں عرض کیا کہ مسجد دارالعلوم کے لئے دریاں نہیں ہیں۔ اگر رائے عالی ہو تو جمعہ کے اجتماع میں اپیل کروں؟ فرمایا بھائی مناسب نہیں معلوم ہوتا۔ جتنا خرچ دریوں پر ہو آدھا میں دے دوں گا اور آدھا کہیں اور سے ہو جائے گا چندہ کی اپیل نہ کریں۔ چنانچہ مولانا اپنے خیال سے رک گئے۔

اسی استغنا کا اثر تھا کہ حضرتؒ نے اپنے مدرسہ میں یہ ضابطہ بنا رکھا تھا کہ جو شخص طالب علموں کی دعوت کرے وہ طعام وغیرہ مدرسہ میں بھیج دے طالب علم دعوت کھانے کے لئے کہیں نہیں جائیں گے۔ کیوں کہ آج کل ایسا کرنے سے ایک تو طلبہ میں طمع پیدا ہوتی ہے۔ دوسرے عوام بے وقعتی کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔

ایک دفعہ فرمایا کہ میرے مدرسہ میں بڑے لائق وفائق مدرس پڑھاتے رہے اور بعض بغیر کسی وجہ کے مدرسہ کو چھوڑ کر چلے گئے۔ بعض اوقات یہ خیال ہوتا کہ شاید ان کے جانے سے مدرسہ کی تعلیم کا نقصان ہو لہٰذا ان کی منت سماجت کروں مگر

میں نے ایسا نہیں کیا بلکہ کچھ کہہ سن کر دیکھ لیا جب نہ مانے تو اصرار نہیں کیا۔ اور ان کو رخصت کر دیا۔ بحمد اللہ کوئی نقصان بھی مدرسہ کا ان کے جانے سے نہ ہوا۔ فرمایا کہ میں حق تعالیٰ سے ایک دعا کیا کرتا ہوں اور اس کے برکات بھی محسوس کرتا ہوں وہ دعا یہ ہے۔ اَللّٰهُمَّ اَغْنِنِيْ عَمَّنْ اَغْنَيْتَهٗ عَنِّيْ مِنْ خَلْقِكَ ۔

حضرت مفتی صاحب کے بعض وظائف فوائد اور لطائف

ایک استخارہ حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے فرمایا کہ مولانا داؤد غزنوی ؒ نے حضرت مفتی محمد حسن صاحب ؒ خلیفہ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے سامنے بیان کیا کہ امام ابن تیمیہ ؒ ایک استخارہ اپنے معمول میں رکھتے تھے۔ اور وہ یہ تھا کہ صبح کی نماز کے بعد مندرجہ ذیل دعا چالیس مرتبہ پڑھ لیتے۔

یاحی یا قیوم لا الہ الا انت برحمتك استغيث اصلح لی شأنی کلہ ولا تکلنی الی نفسی طرفة عين۔

مفتی محمد شفیع صاحب ؒ نے فرمایا کہ میں نے بھی اس استخارہ کو اپنا معمول بنا لیا ہے۔ حق تعالیٰ کا فضل ہے کہ جو الٹا سیدھا کام کرتا ہوں درست ہو جاتا ہے۔

دو وظیفے[۲] حضرت مفتی صاحب ؒ نے فرمایا کہ شاہ عبد الغنی صاحب پھولپوری ؒ نے سنہ ۱۳۰ھ میں مجھے دو وظیفے بتلائے تھے وہ اب تک میرے عمل میں ہیں۔ ایک وظیفہ تو وسعت رزق کے لئے ہے اور وہ وظیفہ اصل میں حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا معمول تھا۔ وہ یہ ہے کہ صبح کی نماز کے بعد ستر مرتبہ یہ آیت پڑھی جائے۔

اَللّٰهُ لَطِيْفٌ بِعِبَادِهٖ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَهُوَ الْقَوِيُّ الْعَزِيْزُ ۔

(اول آخر درود شریف) اس وظیفہ کی برکت ہے کہ بحمد اللہ کبھی مالی تنگی پیش

نہیں آئی۔

دوسرا وظیفہ حل مشکلات کے لئے ہے حَسْبُنَا اللّٰہُ وَنِعْمَ الْوَکِیْلُ تین سو اکتالیس[۳۴۱] مرتبہ۔

حضرت مفتی صاحبؒ کی ایک نصیحت

ایک دفعہ میں حضرت کے پاس موجود تھا تو حضرت ؒ نے مجھے نصیحت فرمائی کہ آپ احیاء العلوم دیکھا کریں۔ بالخصوص ربع مہلکات کا ضرور مطالعہ کریں۔ اور حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے مواعظ وملفوظات کو بھی دیکھا کریں۔ ان کے پڑھنے میں بہت نفع ہے۔ کیوں کہ یہ حضرات ابناء آخرت میں سے تھے ان کے کلام پڑھنے والے کو بھی آخرت کی فکر ہو جاتی ہے۔

حضرت تھانویؒ کی حضرت مفتی صاحبؒ کو نصیحت

اکابر نے خود بھی اس امر کا اہتمام فرمایا اور دوسروں کو بھی تاکید فرمائی ہے کہ قلب کو فضول خیالات سے خالی رکھا جائے بلکہ ضروری باتیں بھی قلب میں بقدر ضرورت آنی چاہئیں۔ کیوں کہ اصل شئے قلب میں سمانے کی ذکر اللہ ہے۔ اسی بارہ میں حضرت مفتی صاحب ؒ نے اپنے شیخ کا واقعہ نقل کیا کہ ایک دفعہ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ خانقاہ سے گھر تشریف لے جارہے تھے۔ میں بھی ساتھ تھا۔ راستہ میں چلتے چلتے ٹھہر گئے۔ جیب سے کاغذ پنسل نکالا اور کچھ لکھ کر جیب میں ڈال لیا۔ پھر میری طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا مولوی محمد شفیع تم بھی سمجھے میں نے عرض کیا نہیں حضرت!

فرمایا ایک ضروری بات یاد آگئی تھی۔ اگر اس کو میں اپنی یادداشت میں نہ لکھ لیتا تو قلب میں بار بار کھٹکتی رہتی اور اس کو یاد کرنے کی فکر رہتی، قلب فارغ نہ رہتا میں نے قلب کا بوجھ کاغذ پر ڈال کر قلب کو فارغ کر لیا ہے۔ تاکہ جب کبھی ذکر کی توفیق ہو تو قلب ذکر کے لئے فارغ اور مستعد ہو۔ اور مجھے قلب کو فارغ رکھنے کا بڑا اہتمام ہے۔

علماء وطلباء کو نصیحت ایک دفعہ طلبہ کو اخلاص کی تلقین کرتے ہوئے فرمایا کہ تم اللہ کی رضا کے لئے پڑھو، پڑھاؤ۔ تمہاری دنیوی ضروریات بھی انشاء اللہ پوری ہوتی رہیں گی۔ پھر فرمایا میری پچپن سال کی عمر ہے اور اس وقت عمر اتنی ہی تھی، میں بقسم کہتا ہوں کہ میں نے ایک عالم بھی ایسا نہیں دیکھا کہ جس نے اللہ کے لئے پڑھا اور پڑھایا ہو اور اللہ نے اس کو عزت و راحت کی زندگی عطا نہ کی ہو۔ اگر عالم ہو کر کوئی رسوا ہوا تو اپنی بدعملی سے ہوا۔

مولوی کی تعریف ایک دفعہ فرمایا کہ مولوی کی تعریف حمد باری (جو فارسی کا ایک چھوٹا سا رسالہ ہے) کے ایک شعر میں کردی گئی ہے۔ وہ شعر یہ ہے ؎

علم موئے ہو جسے ہے مولوی جیسے حضرت مولوی معنوی

پھر فرمایا کہ یہ تعریف ایک اور اعتبار سے ہے۔ میرے خیال میں مولوی وہ ہے جس میں اس قدر استعداد ہو کہ ہدایہ کے چاروں جلدوں میں جو جگہ اس کو بتلائی جائے اس کو حل کرکے سمجھا اور پڑھا سکے۔

قانون اور فضل کا فرق ایک دفعہ مجلس میں یہ مضمون بیان فرما رہے تھے کہ حق تعالیٰ کا قانون تو یہ ہے کہ جو مسلمان گناہوں میں مبتلا رہا ہو آخرت میں اس کو سزا ملے گی۔ اور سزا بھگت کر جنت میں جائے گا۔ لیکن اگر حق تعالیٰ اپنے فضل سے کسی کو سزا نہ دیں اور ابتداءً ہی جنت میں داخل فرما دیں تو ان سے پوچھنے والا کوئی نہیں۔ یہ محض ان کا فضل ہوگا۔ قانون نہیں ہوگا۔ مسلمان کو چاہئے کہ فضل کے بھروسہ پر گناہوں میں مبتلا نہ رہے۔ بلکہ قانون کا خوف کر کے گناہوں کو چھوڑ دے۔ پھر اعدتوانو ن اور فضل میں فرق بتلاتے ہوئے ایک قصہ بیان فرمایا کہ ۔

ایک بادشاہ نے اپنے ایک وزیر کو کہا کہ تم نے ہمیں کبھی اپنا گھر نہیں دکھایا حالانکہ ہمیں تمہارا گھر دیکھنے کا اور تمہارے چھوٹے بچے دیکھنے کا شوق ہے۔ وزیر نے عرض کیا کہ میرا گھر کیا ہے وہ آپ ہی کا گھر ہے جب دل چاہے تشریف لے چلیں

یہ سن کر بادشاہ نے آنے کا ایک دن مقرر کر دیا۔ وزیر نے اپنے گھر کو خوب مزین کیا اور اپنے بچوں کو بار بار سمجھا دیا کہ جب بادشاہ سلامت آئیں، وہ تمہیں دیکھنا چاہتے ہیں، تم نہایت باادب ہو کر ان کے سامنے بیٹھنا۔ کسی قسم کی بات نہ کرنا شاید تمہاری زبان سے کوئی بے ادبی کی بات نکل جائے۔ مگر بچے کو جتنا کھایا جائے پھر بھی وہ بچہ ہی ہوتا ہے۔

جب بادشاہ آیا اور ان بچوں کو اس کے سامنے پیش کیا گیا تو بادشاہ ان کو دیکھ کر بڑا خوش ہوا۔ اور ان میں سے ایک بچے کو چھیڑا، جیسا کہ بچوں چھیڑا کرتے ہیں۔ اس بچے نے بادشاہ کو ایک غلیظ سی گالی دے دی۔ وزیر کے اوسان خطا ہو گئے کہ اب میری بھی خیر نہیں۔ جلدی سے بھاگا ہوا گھر سے تلوار لے آیا اور اس سے بچے کو بہت ڈرایا دھمکایا۔ اور بادشاہ کے سامنے یہ ظاہر کیا کہ میں اس کو تلوار سے مارنا چاہتا ہوں۔ مگر بادشاہ نے کہا کہ یہ تو چھوٹا بچہ ہے۔ اس کی گالی پر مجھے کوئی ناراضگی نہیں۔ بلکہ میں اس گالی کے عوض میں اپنی حکومت کی جانب سے اس کا وظیفہ مقرر کرتا ہوں۔ جب تک یہ زندہ رہے وظیفہ اس کو ملتا رہے گا۔ اور اس وظیفہ کا نام وظیفۂ دشنام رکھا گیا۔ اور وہ اس کو پوری زندگی ملتا رہا۔ جو کافی مقدار میں تھا۔ یہ قصہ سنا کر مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا۔ گالی کے عوض میں وظیفہ ملا کرے یہ قانون نہیں بلکہ محض فضل ہے۔

بیگم بازار کا قصہ ایک دفعہ اس حدیث شریف کے متعلق بیان فرما رہے تھے۔ مانحل والد ولدہ من نحل افضل من ادب حسن۔ الحدیث۔ (یعنی کسی والد نے اپنی اولاد کو اچھے ادب سے بڑھ کر کوئی تحفہ نہیں دیا۔)

فرمایا کہ آج کل لوگ اس کی تو بہت فکر کرتے ہیں کہ اولاد کو کھانے کمانے کے قابل بنا دیں۔ یا ان کے لئے کوئی جائیداد چھوڑ جائیں۔ مگر اس کا خیال بہت کم لوگوں کو ہے کہ اولاد کے اخلاق و اعمال کو درست کریں۔ بری صحبت اور برے

اخلاق سے ان کو بچائیں۔ علم و تہذیب سکھائے بغیر لاکھوں روپے کی جائیداد ان کے لئے چھوڑ جانے کا کچھ فائدہ نہیں۔ والدین کے بعد چند دنوں میں اس کو اڑا دیتے ہیں۔ اس پر ایک قصہ سنایا کہ۔

قریب زمانہ میں ڈھاکہ میں ایک بڑے نواب صاحب تھے ان کی اولاد میں صرف ایک لڑکی تھی جس کے ساتھ ان کو بہت محبت تھی۔ چونکہ بہت پیاری اور لاڈلی تھی اس لئے اس کو تعلیم نہ دے سکے اور نہ کچھ تہذیب سکھائی۔ مرنے سے پہلے اس لڑکی کے لئے یہ انتظام کیا کہ اس کے نام پر ایک لاکھ روپیہ بنک میں داخل کرا دیا۔ اور دوسرا انتظام یہ کیا کہ ڈھاکہ میں بازار بنوایا اور وہ سب اس لڑکی کے ملک کر دیا۔ تاکہ جب رقم ختم ہو جائے تو بازار کی دوکانوں کے کرایہ سے آمدنی ہوتی رہے۔ مگر چونکہ علم و ادب سے عاری تھی اس لئے والد کے مرنے کے بعد جائیداد کو اڑانا شروع کیا۔ اور فضول کاموں میں خرچ کرنے لگی۔ اگر کبھی قیمتی تھان کپڑے کا منگوایا اس کے پھاڑنے کے وقت جو آواز پیدا ہوئی وہ اس کو پسند آگئی۔ تو اس قسم کے کئی تھان منگوا لئے اور پھڑوا کر لطف اٹھایا۔

کسی تالاب کی سیر کو گئی اور اس کا پانی صاف شفاف تھا اس میں اس نے چاندی کا روپیہ یا سونے کی اشرفی ڈالی تاکہ صاف پانی میں اس کی حرکت کو دیکھے اور لطف اندوز ہو۔ ایک کے ڈالنے سے اس کو لطف آیا تو کئی اشرفیاں اور روپے منگوا کر تالاب میں ڈال کر لذت حاصل کی۔ اسطرح کے اسراف میں جائیداد کب تک تاب لاسکتی۔ پہلے بنک کا روپیہ ختم ہوا۔ پھر بازار کو بیچنا شروع کر دیا۔ آخر نوبت بایں جا رسید کہ سب جائیداد کو بیچ کر بالکل کنگال ہو گئی اور بھیک مانگنا شروع کیا اور اسی حالت میں مر گئی۔ اور ڈھاکہ میں اب تک اس کے والد کا بنوایا ہوا بازار بیگم بازار کے نام سے مشہور ہے۔ واللہ اعلم۔

حضرت مفتی صاحبؒ اور مزاح | اپنے احباب اور متعلقین کا دل خوش کرنے کے لئے مزاح کرنا سنت سے ثابت ہے۔

حضرت مفتی صاحب رہ بھی حسب موقع اپنے متعلقین سے مسنون مزاح فرمالیا کرتے تھے اور اس قسم کے لطائف اور قصے بھی سنا لیتے۔ اپنا ایک قصہ سنایا کہ مولانا محمد انور شاہ صاحب رہ کے پاس حدیث پاک کا سبق ہو رہا تھا۔ حضرت کسی روایت کے ایک جزء کی تضعیف فرما رہے تھے۔ میں نے عرض کیا یہ تو ثقہ کی زیادتی ہے اور محدثین کے ہاں مقبول ہوتی ہے۔

آپ نے جواب دیا کہ ہمیشہ مقبول نہیں ہوتی بلکہ بعض اسباب قادحہ کی وجہ سے ضعیف بھی ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد سبق میں جب ایسی زیادتی آجاتی جو محدثین کے ہاں مقبول نہ ہوتی تو حضرت شاہ صاحب رہ میری طرف اشارہ کر کے مزاحاً فرماتے ثقہ کی زیادتی والا کہاں بیٹھا ہے۔

ایک دفعہ مزاحاً یہ لطیفہ سنایا کہ ایک شخص نے دوسرے شخص کے خلاف حاکم کے پاس نالش کی اور کہا کہ فلاں آدمی نے مجھ پر ظلم اور زیادتی کی ہے میری داد رسی کی جائے۔ حاکم ظریف الطبع تھا اس نے مدعی کو کہا کہ تم ٹھگنے آدمی ہو۔ اور ٹھگنا آدمی چالاکی اور مکاری میں زیادہ ماہر ہوتا ہے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ کوئی تم پر ظلم کرے مدعی نے جواب دیا کہ آپ نے درست فرمایا مگر جس پر میرا دعویٰ ہے وہ مجھ سے بھی زیادہ ٹھگنا ہے۔ حاکم یہ سن کر ہنس پڑا اور مقدمہ درج کر لیا۔

امام اعمش رہ کا لطیفہ امام اعمش رہ حدیث کے بڑے امام ہیں۔ ان کا نام سلیمان بن مہران ہے۔ عربی میں اعمش چندھے کو کہتے ہیں چونکہ ان کی آنکھوں میں تکلیف رہتی تھی اس لئے ان کو اعمش کہا جاتا ہے۔ حضرت مفتی صاحب نے ان کا لطیفہ سنایا کہ۔

امام اعمش رہ ظریف الطبع تھے۔ ایک دفعہ وہ بیمار ہو گئے۔ ایک آدمی ان کی عیادت کے لئے آیا۔ امام نے اس کو اپنے پاس بلوالیا۔ وہ آدمی ایسا جم کر بیٹھ گیا کہ اٹھنے کا نام بھی نہ لیا۔ کچھ دیر تو امام رہ نے کلفت برداشت کی مگر جب دیکھا کہ یہ اٹھتا ہی نہیں تو تکیہ سے سر اٹھایا اور سیدھے ہو کر بیٹھ گئے۔ اور اس شخص کو فرمایا ان مریض

قد صح فاذھب (یعنی جس مریض کی عیادت کے لئے تم آئے تھے وہ تندرست ہوگیا ہے اب جاؤ) ۔

امام اعمش رہ کا ایک اور واقعہ سنایا کہ ان کا ایک شاگرد اعرج یعنی لنگڑا تھا۔ جب استاذ کبھی اپنے کام سے بازار وغیرہ جاتے تو وہ بھی ساتھ ہولیتا دونوں کے مل کر چلنے سے عجب صورت بن جاتی کہ استاذ اعمش اور شاگرد اعرج ۔ یہ ہیئت دیکھ کر بعض لوگ ہنس پڑتے تھے ۔ ایک دن امام اعمش نے اپنے اس شاگرد کو فرمایا کہ جب میں لوگوں کے مجامع میں جاؤں تو بہتر ہے کہ آپ میرے ساتھ نہ چلا کریں۔ کیونکہ لوگ خواہ مخواہ ہنستے ہیں ۔ شاگرد نے کہا مالنا نوجر ویعصون یعنی ہمارا کیا نقصان ہے ان کو گناہ ہوتا ہے اور ہمیں ثواب ملتا ہے ۔ امام رہ نے فرمایا کہ نسلم ویسلمون خیر مما نوجر و یعصون یعنی ہم ان کے مذاق اور استہزاء سے بچ جائیں اور وہ گناہ سے بچ جائیں ۔ یہ اس سے بہتر ہے کہ ہمیں ثواب ہو اور وہ گنہگار ہوں۔

چند دیہاتیوں کے لطائف

حضرت مفتی صاحب رہ نے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا قصہ سنایا کہ ۔ ایک دفعہ حضرت کچھ لکھنے میں مشغول تھے کہ ایک دیہاتی بہت بڑا تربوز سر پر رکھے ہوئے حضرت رہ کے بالکل قریب آکر کھڑا ہوگیا ۔ نہ سلام کیا نہ اجازت مانگی ۔ حضرت رہ نے آنکھ اٹھائی تو دیکھا کہ ایک لمبا تڑنگا قوی ہیکل انسان کھڑا ہے ۔ تربوز سر پر ہے ۔ حضرت رہ نازک مزاج تو تھے ہی اس کی حرکت پر بہت غصہ آیا ۔ پوچھا کیسے آئے ہو ؟ کہا کہ تھارے (تمہارے) لئے تربوز لایا ہوں ۔ حضرت رہ کسی طرح پھر لکھنے میں مشغول ہوئے تو کچھ دیر کے بعد وہ دیہاتی بولا کہ تربوز کہاں رکھوں ۔ حضرت رہ نے غصہ میں فرمایا میرے سر پر رکھ دے ۔ اس نے سادگی سے آپ کے سر پر رکھ دیا ۔ حضرت کو ہنسی آگئی ۔ غصہ فرو ہوا اور تربوز بھی قبول کرلیا ۔

بانی تبلیغی جماعت حضرت مولانا محمد الیاس صاحب نور اللہ مرقدہ کا قصہ سنایا کہ ایک گنوار نے ان کی دعوت کرکے اپنے گھر لے جانا چاہا ۔ اور بتلایا کہ میرا گھر ،

نیز یہ (نزدیک) ہے۔ حضرت مولانا رحمہ نے دل شکنی کے خوف سے قبول کر لیا۔
وہ دیہاتی آپ کو لے کر چلا۔ جب کافی سفر طے کر لیا تو آپ نے پوچھا کہ ابھی تمہارا
گھر نہیں آیا۔ کہنے لگا نزدیک ہے۔ پھر کافی سفر کرکے پوچھا کہ ابھی نہیں آیا۔ کہا
نزدیک ہے۔ پھر کچھ سفر کرنے کے بعد یہی سوال کیا۔ تو اس نے کہا کہ حضرت میرا گھر
وہ دیکھئے غصہ میں فرمایا کم بخت دیکھے تو آسمان بھی۔

اسی ضمن میں ایک دیہاتی صحابی کا قصہ سنایا کہ جب صحابۂ کرام رضی اللہ تعالےٰ عنہم
کو حضور صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم سے سوالات کرنے سے منع کیا گیا۔ تو صحابۂ کرام تمنا
کرتے کہ کوئی گنوار آجائے اور سوال کرے۔ اسی دوران سیدنا حضرت عمر رضی اللہ عنہ
کو ایک ضروری سوال کی حاجت ہوئی تو آپ نے ایک دیہاتی کو تیار کیا اور اس کو سوال
سمجھا دیا۔ اور فرمایا کہ تم حضور اکرم صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کے پاس چل کر یہ سوال کرو۔
میں تمہیں یہ چادر جو پہنے ہوئے ہوں دے دوں گا۔

چنانچہ وہ دیہاتی گئے اور سوال پیش کر دیا۔ آپ نے جواب دیا جس کو حضرت
عمر اور دیگر صحابہ کرام علیہم الرضوان نے سن لیا۔ سوال و جواب سے فراغت ہوئی تو وہ
دیہاتی صبر نہ کر سکا۔ اور مجلس میں ہی سیدنا حضرت عمر رضہ سے کہنے لگا کہ اب تو چادر
دے دو۔ چنانچہ حسب وعدہ آپ نے وہ چادر دے دی اور اس نے اسی مجلس میں سر
پر لپیٹ لی۔ سبحان اللہ کیا سادگی تھی۔

اخلاص کی برکت فرمایا کہ امام مالک رحمہ نے حدیث میں ایک کتاب لکھی جس کا نام
مؤطا رکھا۔ یہ کتاب بہت مقبول و مشہور ہوئی۔ اسی شہرت کی بنا
پر دوسرے علماء نے اس فن میں جو کتابیں لکھیں ان کا نام بھی اسی کے نام پر مؤطا رکھا۔
امام مالک رہ کو لوگوں نے کہا کہ آپ کی کتاب کے نام پر کافی کتابیں تصنیف ہو گئیں
آپ نے فرمایا کہ ما کان للہ نعمو یبقی یعنی ان کتابوں میں سے جو
اللہ کے لئے لکھی گئی ہوں گی۔ وہ باقی رہیں گی باقی معدوم ہو جائیں گی۔
دنیا جانتی ہے کہ امام مالک رہ کا مؤطا اب تک باقی ہے۔ اور اتنی شہرت کسی

بقیہ: "باتیں ان کی یاد رہیں گی" ۱۱۹۱ پر

مولانا مفتی بشیر احمد صاحب کشمیری
قاضی و مفتی باغ ضلع پونچھ آزاد کشمیر

یادگار صُحبتیں

دار العلوم دیوبند نے جن یگانۂ روزگار شخصیات کو پیدا کیا ہے انکی مثال آج دنیا کی کسی اور درسگاہ میں ملنی مشکل ہے۔ علم و ورع، زہد و قناعت، صبر و استقامت، تدبر و تفکر، فہم و فراست، جود و سخا وغیرہ جیسی صفات عالیہ سننے میں تو کثرت آتی ہیں مگر اس دور میں اگر ان کا صحیح مصداق تلاش کیا جائے تو حضرت نانوتویؒ کے "باغ سدا بہار" کے فیضیافتہ ہی نظر آئیں گے جنھوں نے اپنے علم و عرفان کے چراغ ایسے روشن کئے کہ چار دانگ عالم میں ان کے انمٹ اثرات پائے جاتے ہیں **اَللّٰهُمَّ زِدْ فَزِدْ**۔ اسی قافلہ رشد و ہدایت کی ایک ممتاز شخصیت بزم اشرف کے درخشاں ستارے نام کے محمد شفیع مگر مسند کے مفتیٔ اعظم پاکستان بھی ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی قبر مبارک کو بقعۂ نور بنائے (آمین)، وہ صرف بزم اشرف کا خلاصہ ہی نہ تھے بلکہ صحیح معنی میں اکابرین دیوبند کے مزاج و مذاق کے آمین اور انکی علمی، روحانی اور اخلاقی اقدار کے نگہبان تھے آپ کی ذات الفاظ کے تنگ دائرہ میں سما نہیں سکتی آپ کی سچی تصویر اس سے زیادہ حسین ہے جس کو ان جملوں میں فریم کیا جا رہا ہے۔ تقریباً ١٣٦٣ھ کی بات ہے کہ احقر نے دار العلوم کراچی میں ہدایہ آخرین وغیرہ کتب کے درجہ میں داخلہ لیا ہر جمعہ کی شام کو حضرت قدس سرہ کی ایک مجلس ذکر ہوا کرتی تھی جس میں طلبہ کے علاوہ اور شہری بھی حاضر ہوتے تھے۔ پھر ہفتہ کے دن مغرب کے بعد طلباء کے لئے مسجد میں ایک خصوصی مجلس ذکر ہوا کرتی تھی اس میں صرف طلباء کو ان کی ذمہ داریوں سے آگاہ فرمایا کرتے تھے ذہنیت سازی کی اس اہتمام کے ساتھ محنت دار العلوم کی ایک امتیازی صفت تھی شروع شروع میں احقر کو انہی مجالس کی حد تک آپؒ کا قرب نصیب ہو سکا البتہ جب دورۂ حدیث میں پہونچا تو حدیث کی ام الکتب بخاری شریف حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے پاس تھی غالباً اس سال کے بعد بیماریوں کے ہجوم کی وجہ سے آپؒ باقاعدگی سے نہیں پڑھا سکے تھے تو اس وقت سے حضرتؒ کا قرب بڑھا اور درجۂ تخصص اور دوران تدریس کے زمانے میں حضرت والا کے قدموں میں بیٹھنے کا کافی موقع نصیب ہوا۔ **فللّٰه الحمد**

سب سے پہلی مجلس جو طلباء سے متعلق تھی، میں جب حاضر ہوا تو اس دن میری طبیعت خراب تھی دل میں سوچا کہ اب مجلس میں تھوڑی دیر بیٹھ جاتا ہوں مگر کل اسباق میں چھٹی کر دوں گا میرا یہ خیال ابھی دل میں پیچ و تاب کھا ہی رہا تھا کہ حضرتؒ

نے اپنی تقریر کو رواں رکھتے ہوئے فرمایا کہ طلبا کو اپنی ذمہ داریوں کا احساس نہیں ہے اور اس دور میں سہل پسندی اور کاہلی سے کام لے کر اپنی عمر کے قیمتی حصّے کو برباد کر رہے ہیں۔ یاد رکھو! ایک ایک لمحہ آپ کا بڑا قیمتی ہے اس کو یوں ہی نہ گذارو۔ پھر اپنے طالب علمی کے زمانے کا ایک واقعہ بیان فرمایا کہ "ایک دفعہ بیمار ہو گیا مگر میں نے سوچا کہ اگر لیٹ کر پڑھنا پڑے تو بھی سبق کا ناغہ نہ کروں گا چنانچہ جب درسگاہ میں پہونچا تو شیخ الادب حضرت مولانا اعزاز علی صاحب مرحوم نے جب میری حالت کو دیکھا تو کہا کہ اس حالت میں آپ کیوں آئے ہیں آرام کریں تو استاد کی اجازت سے بلکہ حکم سے میں نے آرام کیا، حضرت نے یہ واقعہ بیان فرما کر میرے چھٹی کے ارادے کو منسوخ کر دیا پھر اس مجلس میں آخر تک بیٹھا رہا اور دوسرے دن کا سبق بھی بدستور قائم رہا سچ ہے کہ اولیاء اللہ کی صحبت کا ایک لمحہ بھی کیمیا وی اثر رکھتا ہے یہ گویا میرے لئے پہلی ہدایت تھی کہ جو وقت کی پابندی کرتی ہے۔ اسی طرح کا اپنا ایک اور واقعہ بیان فرمایا کہ "مجھے اسباق کے مطالعہ اور تکرار کی وجہ سے درسگاہ میں دیر ہو جاتی تھی اور رات کا کافی حصّہ گذر جانے کے بعد اپنے گھر جاتا جو دارالعلوم دیوبند کے متصل ہی تھا والدہ محترمہ میرے لئے کھانا رکھ دیتی مگر سردیوں کی وجہ سے سالن جم جاتا جس کو گرم کرنے کے لئے ان کو میری آمد کا انتظار کرنا پڑتا بعض دفعہ یوں بھی ہوتا کہ تکرار کرتے کرتے وہیں نیند آجاتی حتیٰ کہ صبح کی آذان سن کر اٹھتا۔ ایک دن میں نے والدہ صاحبہ کو اس بات پر راضی کر لیا کہ میرے لئے ایک جگہ کھانا رکھ کر لیٹ جایا کریں میں آکر کھا لوں گا اس کے بعد سے ایسا ہی ہوا مگر سردیوں میں عموماً سالن جم جاتا اور کھانا سرد ہو جاتا مگر اسی طرح کھا کر سو جاتا"

درحقیقت اللہ تعالیٰ نے آپ کے وجود سے دین کا عظیم الشان کام لینا تھا اس لئے آپ کو بچپن ہی سے انتہائی حساس اور اوقات کے انضباط کا خوگر بنایا تھا۔ پھر جب حضرت حکیم الامت مجدد الملت مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ سے تعلق بڑھا تو جہاں آپ نے ظاہری اور باطنی کمالات میں ترقی کی وہاں آپ پر حضرت تھانوی کی مخصوص صفت یعنی اوقات کی پابندی کا بھی خوب رنگ چڑھا۔ یوں تو آپ کے تعلقات بہت وسیع تھے بڑوں سے بھی تھے اور چھوٹوں سے بھی، ارباب سیاست ہوں یا اصحاب علم و عرفان ہوں سب ہی آپ کے حلقۂ ارادت میں شامل تھے پھر درس و تدریس اور تصنیف و تالیف اور افتاء کی ذمہ داریوں کے علاوہ دارالعلوم کا انتظام و انصرام کی مصروفیات مزید تھیں، مگر ہر ایک ذمہ داری کو بطریق احسن پورا فرماتے۔ ایک دن دارالافتاء میں آنے میں چند منٹ دیر ہو گئی تو بڑے افسوس سے فرمایا "گو میں دارالعلوم سے اس کام کی تنخواہ تو نہیں لیتا تاہم وقت پر مجھے حاضر ضرور ہونا چاہیئے اسلئے کہ لوگوں کو میں نے عرفاً و عادتاً یہ بتلا دیا ہے کہ میں فلاں وقت میں دارالافتاء میں ہوتا ہوں وہاں مسائل معلوم کریں اگر دیر ہو جائے تو لوگوں کو تنگی ہوگی" حقوق العباد کی ادائیگی کا خیال آپ کی طبیعت ثانیہ بن چکا تھا حتیٰ کہ ماہِ رمضان شریف میں بیماری کا شدید حملہ ہوا تو اس دوران معلوم ہوا کہ آپ نے

اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ میری موت رمضان المبارک کے مہینہ میں واقع نہ ہو اس لئے کہ روزہ کی حالت میں لوگوں کو کفن و دفن اور نماز پڑھنے کے اہتمام میں تکلیف ہوگی'' چنانچہ آپؒ کی یہ دعا قبول ہوئی ایک مجلس میں آپ نے فرمایا کہ لوگ حج کے دوران حجر اسود کو چومنے کے جوش میں دوسروں کو دھکے مار کر اور دھینگا مشتی کرکے چوم لیتے ہیں حالانکہ چومنے کی شرط ایک شرط بھی ہے یعنی یہ کہ '' من غیر ان یوذی مسلماً '' یعنی کسی مسلمان کو تکلیف دیئے بغیر چومے۔ مگر لوگ اس شرط کی پرواہ نہیں کرتے اور دوسروں کو ایذا رسانی کرکے بجائے ثواب کے گناہ کے مرتکب ہوتے ہیں آپ کی اسطرح کی شرعی احتیاطیں زندگی کے ہر شعبہ میں نمایاں نظر آتی تھیں۔

حضرت رحمۃ اللہ علیہ دین اور علماء کے وقار اور انکی عزت و احترام کا خیال بہت زیادہ رکھتے تھے دارالعلوم میں جو اساتذہ مقیم تھے ایک دفعہ بازار سے انکی ضروریات زندگی لانے کے لئے ایک چپراسی مقرر کیا جو ہر صبح ہر ایک استاد کے مکان پر حاضر ہوتا اور انکی مطلوبہ اشیاء بازار سے لاکر پیش کرتا۔ آپؒ نے فرمایا کہ اس سے میرا ایک مقصد تو یہ ہے کہ اساتذہ خود تکلیف سے بچ جائیں گے اور دوسرا یہ کہ علماء کا بازاروں میں گھومنا دینی وقار کو کم کرتا ہے بوجہ مجبوری جانا منع نہیں ہے مگر جب سلامتی کی راہ نکل سکتی ہے تو اس کو بروئے کار لانا چاہیئے اس لئے میں نے چپراسی کی یہ ڈیوٹی لگائی ہے۔

آپؒ نے جب دارالعلوم کو ظاہری اور معنوی اعتبار سے وسعت دینی چاہی تو اس کے لئے عروس البلاد کراچی کے وسط میں بھی زمین مل سکتی تھی مگر اس کے حصول میں جب کچھ رکاوٹ محسوس کی تو اس میں الجھنا پسند نہیں فرمایا شہر سے دور کنارے میں غیر آباد اور کانٹے دار جھاڑیوں کے درمیان جہاں دور دور تک انسانی آبادی آس وقت نظر نہ آتی تھی متوکلاً علی اللہ دینی شمع کو روشن کیا آپ کے بعض مخلصین کو شہری زمین چھوڑنے پر کچھ دکھ بھی ہوا مگر سہ قلندر ہرچہ گوید دیدہ گوید، '' اتقوا لفراسة المومن فانه ینظر بنور الله '' آپ کی مومنانہ فراست اور حکیمانہ بصیرت، دینی اسرار و رموز کو بہتر جانتی تھی اسلئے اسی جگہ کو منتخب فرمایا جہاں کی موجودہ خیرکن ظاہری و باطنی ترقی کو دیکھ کر سابقہ حالت کا تصور کرنا بھی ممکن نہیں رہا۔ دارالعلوم کی نہ کوئی جاگیر ہے نہ کوئی سعیر ہے مگر مستقل ذرائع آمدن نہ ہونے کے باوجود کم و بیش دو ڈھائی لاکھ روپیہ سالانہ بجٹ محض آپؒ کے خلوص للہیت اور خدا کی ذات پر مکمل بھروسہ کا آئینہ دار ہے۔ فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں کے دور میں وزیر اوقاف مسٹر مسعود جوان دینی مدارس دینیہ کو قومی تحویل میں لینے کے لئے مدارس میں جایا کرتے تھے دارالعلوم میں بھی آئے۔ حضرت مفتی صاحبؒ مرحوم نے بات چیت کے دوران فرمایا کہ دارالعلوم کا ظاہری حسن و جمال کہیں آپ کو دھوکہ میں نہ ڈال دے آپ کو یقین آئے یا نہ آئے مگر حقیقت یہ ہے کہ جو چیز آپ کو مطلوب ہے (یعنی مستقل آمدنی کی) اس کا یہاں وجود ہی نہیں ہے اگر اعتبار نہ آئے تو حکومت اپنی تحویل میں لے کر دیکھ لے مگر یاد رکھئے کہ جب لوگوں کو یہ معلوم ہو جائیگا کہ دارالعلوم پر حکومت کا قبضہ ہے تو اسکی

آمدنی ختم ہو جائے گی بجائے سیلنے کے لینے پڑیں گے اسپر اس نے معذرت کی اور ساتھ اصرار کیا کہ حکومت دارالعلوم کو کچھ گرانٹ دینا چاہتی ہے اسکو قبول کیجئے مگر آپؒ نے اسکو قبول نہ کیا وہ مسلسل اصرار کرتا رہا یہاں تک کہ اس نے کہا اچھا اتنا تو قبول کیجئے کہ مخصوص طلباء کے وظائف ہم دیں گے انکی فہرست عنایت کیجئے مگر اسبات کو بھی قبول نہیں کیا۔ یہ سب آپ کی دینی غیرت وحمیت کی ادنیٰ سی جھلک کہ لیسے نوابوں، سیٹھوں اور کرسی نشینوں کی جیبوں پر آپ کی نظر نہ تھی جو دین کو نقصان پہنچانے کے لئے یا مولوی کو حقیر سمجھتے ہوئے انکی امداد کریں۔ ایک دفعہ کاغذ تقریباً نایاب ہو گیا ایک آدمی نے کہا کہ آپ کسی آدمی کو بھیجیں میں کاغذ دوں گا۔ جب آدمی اس کے پاس گیا تو اس نے کچھ بے توجہی برتی اور کہا کل آیئے۔ حضرتؒ کو جب اس کا علم ہوا تو آپ نے دوسرے دن آدمی نہ بھیجا ادھر اس آدمی کو اپنی غلطی محسوس ہوئی تو کاغذ کا بنڈل لیکر حضرتؒ کے پاس حاضر ہوا مگر آپؒ کو اس کے طرزِ عمل سے معلوم ہو چکا تھا کہ اس میں خلوص نہیں ہے اس لئے اس کا کاغذ قبول نہیں کیا۔ رمضان شریف میں دور دراز سے مدارس کے منتظمین حضرات آپ کے پاس آتے رہتے تھے جن میں سے اکثر و بیشتر آپ سے کسی سیٹھ کے نام چندہ دینے کے لئے سفارشی خط لکھنے کا مطالبہ کرتے یہ بات آپ پر بہت ناگوار گذرتی تھی کیونکہ آپ دارالعلوم کے لئے اسطرح سے چندہ کی اپیل نہ کرتے تھے مگر بعضوں کو بادلِ نخواستہ خط لکھ دیتے تھے آپ فرماتے تھے کہ سیٹھ تو ہم کو دیندار سمجھ کر تعلق رکھے اور ہم اسکو مالدار سمجھ کر تعلق رکھیں تو اس کا حاصل یہی ہوگا سیٹھ کو دین سے محبت ہو گی اور ہم کو دنیا سے یہ نفع کا سودا نہیں ہے۔ ہمارا کام یہ ہے کہ دین کی خدمت اس طرح کریں کہ اس کا وقار مجروح نہ ہو اور وقار کھو کر دین کی خدمت کا کیا فائدہ ہو آپ کا اپنا معاملہ تو اس سے بے نیازی کا تھا کہ ایک مرتبہ فرمایا کہ ہمارا ایک سیٹھ نے پوچھا کہ میرا کوئی وارث نہیں ہے میں زندگی میں اپنا مال تقسیم کرنا چاہتا ہوں اس کے لئے بہترین جگہ کونسی ہے؟ تو میں نے متعدد دینی مدارس اس کو بتلائے تو پاس بیٹھنے والے ایک شخص نے تعجب سے کہا کہ آپ کا بھی تو اپنا مدرسہ ہے اس کا نام کیوں نہیں لیا تو میں نے کہا کہ اگر اسکو یہاں کچھ دینا ہوا تو خود دے دیگا مگر میری دینی حمیت یہ گوارہ نہیں کرتی کہ وہ مجھ سے مسئلہ پوچھے اور میں اس کو اپنے مدرسے میں دینے کے لئے کہوں اس میں بھی ایک طرح کا حظِ نفس پایا جاتا ہے، سبحان اللہ! یہ عالی مقام ہر شخص کا نہیں ہے

این سعادت بزورِ بازو نیست ؎
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

دارالعلوم کے تین چار صد طلباء اور ساٹھ ستر عملہ کے افراد کے مصارف کے مہیا کرنے کی جنکی ظاہری ذمہ داری ہو اس کا یہ طرزِ عمل دینی عز و جاہ اور خودداری کی واضح نشانی ہے حدیث کا یہ جملہ عام طور پر یاد دلاتے تھے یاتیتھا وھی راغمۃ یعنی دنیا کے حصول میں پھنسنے کے بجائے دین پر صحیح طور پر عمل کیا جائے تو دنیا بھی ملتی ہے بلکہ ذلیل ہو کر حاضر ہوتی ہے امام غزالیؒ کے حوالے سے فرماتے تھے کہ انھوں نے لوگوں کی تقسیم اسطرح کی ہے۔

ایک قسم ان لوگوں کی ہے جن کے دل میں دنیا ہے مگر ہاتھوں میں نہیں ہے۔ دوسری قسم میں وہ لوگ ہیں جن کے ہاتھوں میں دنیا ہے مگر دل میں نہیں ہے۔ تیسری قسم ان کی ہے جن کے نہ دل میں دنیا ہے اور نہ ہاتھ میں۔ اسپر افسوس فرماتے تھے کہ ہم علمار کا طبقہ ۱۲ سال تک دینی علوم حاصل کرنے میں لگاتے ہیں دنیا کا کوئی فن ہمارے پاس نہیں ہوتا جس سے دنیا آئے البتہ دین آنا چاہیے تھا کیونکہ اسپر ہم نے کافی عرصہ لگایا تھا مگر اس کا بھی فقدان ہے اس لئے ایسا نہ ہو کر ہمارا شمار پہلی قسم کے لوگوں میں ہو جائے اس لئے ہمارے قلوب دنیا کی محبت سے خالی نہیں ہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ حضرت مفتیٔ اعظم صاحبؒ مرحوم ایک بلند کردار، پاکیزہ سیرت، شریعت کے مزاج شناس ہوسلے میں اسلاف کا عملی نمونہ تھے آپؒ کی زندگی کے ماہ و سال اس پہلی رنگ و بو کے مختلف پہلوسے ہو کر گذرے۔ فقیہہ حدیث تفسیر کی مسانید تو آپ کے لئے مختص ہی تھیں مگر سیاسی پہلو کی پیچدار گھاٹیوں کو بھی اسطرح روندا کر سلامت روی اور متوازن فکر و تدبر کے گہرے نقوش چھوڑے، درحقیقت یہ وہ جگہ ہے جہاں اخلاقی اقدار کو پرکھا جاتا ہے اور اعتدال کی راہوں کو دیکھا جاتا ہے آپ کے اختلافات علمی نوعیت کے بھی تھے اور سیاسی نوعیت کے بھی مگر جس بات کو حق سمجھا اس کے اظہار میں کبھی لیس و پیش سے کام نہیں لیا۔ وہ حق بات برملا کہتے مگر شرعی حدود و قیود کے اندر، ان کو بیماری سے تو نفرت تھی مگر بیمار سے محبت، راہِ اعتدال کو ہر حالت میں قائم رکھتے اس صفت میں آپؒ « دریتیم » کی حیثیت رکھتے تھے آپؒ فرمایا کرتے تھے ہم لوگوں نے "کلمہ حق کہنا" کا جملہ تو حرف یاد کر رکھا تھا مگر اس بات کو ہم بھول جاتے ہیں کہ کلمہ حق کیا ہے؟ اور اس کو دوسرے تک پہنچانے کا طریقہ کیا ہے؟ قرآنِ حکیم کا ارشاد ہے یاایّها الذین اٰمنوا قولوا قولاً سدیداً، اے ایمان والو درست قول کہو، قول سدید یعنی سچی اور حق بات میں تین چیزوں کا لحاظ ضروری ہے (۱) بات حق ہو جھوٹ نہ ہو (۲) حق کے لئے ہو (۳) اور حق کے طریقے سے ہو۔ ان امور کی رعایت کے ساتھ جو بات کہی جائے گی اس کا انشاء اللہ ضرور اثر ہوگا مگر ہمارے ہاں جو اختلافات ہیں ان کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ہم ان امور کا لحاظ نہیں کرتے۔ اسی طرح کے موضوع پر کلام کرتے ہوئے آپ نے ایک عمدہ جملہ فرمایا یعنی یہ کہ سچی بات سختی کے ساتھ کہی جائے مگر نرمی کے ساتھ، سختی اور نرمی کے الفاظ میں شدید تعارض ہے مگر اس کو ایک مثال کے ساتھ سلجھا دیا۔ اسکی مثال ریشم کی ڈوری ہے جو نرم اتنی ہے کہ اس کو جہاں گرہ دینا چاہو گرہ لگ جائے گی ذرا بھر بھی نہیں سرکے گی مگر سخت اتنی ہے کہ اس کے ساتھ اگر بھینس باندھ دو تو اسکو ہلنے نہیں دے گی (پھانسی دینے کے لئے غالباً اسی ڈوری کا استعمال کرتے ہیں) اسی طرح حق بات کہنے سے کترانا تو غلط ہے البتہ اس کے ابلاغ میں لب و لہجہ نرم اور قابل قبول ہونا ضروری ہے ہمارے اختلاف و افتراق کی خلیج جو دن بدن وسیع ہو رہی ہے وہ اسی طرح کے حکیمانہ اور پیغمبرانہ طریقہ دعوت سے سمٹ سکتی ہے۔ مگر ان نزاکتوں پہ عموماً پابندی نہیں رہی اور زبان و بیان پہ دھیان نہیں رہا حضرت رحمہ اللہ اسطرح کے ذکر کے موقع پہ شعر

بھی پڑھا کرتے تھے جس کا مفہوم یہ تھا کہ

کہو ایک جب سلو دو　　اسلئے کہ حق نے زبان دی ایک اور کان دیئے دو

غرضیکہ حضرت قدس سرہٗ تربیت میں حکیم اور معاشرت میں شفیق تھے اور اتباع سنت اور سلف صالحین کے پابند تھے وہ آئے بھی اور چلے بھی گئے مگر ان کے کارنامے نمایاں اور تابناک ہیں جو جہالت وضلالت میں پھنسے ہوئے بندوں کو جادۂ حق کی رہنمائی کرتے رہیں گے۔ یہ الگ بات ہے کہ آپ کی مسند آپ کے ساتھ ہی رخصت ہوگی۔ ایسا پیر طریقت، شیخ کامل، شعر

بر کفے جام شریعت بر کفے سندان عشق
ہر ہوسناکے نداند جام سندان باختن

کے مصداق فقیہ النفس ابوحنیفہ عصر کا ملنا مشکل ہے۔ زمانہ دراز تک یہ مساکین آپ کی جدائی پر آنسوں بہاتی رہیں گی۔ مگر　　اشکوالی اللہ ہ الی الناس اننی

اری الارض تبقی والاخلاء تذھب

(میں اللہ ہی سے شکایت کرتا ہوں نہ کہ لوگوں سے اس لئے کہ میں دیکھتا ہوں کہ زمین باقی رہیگی اور دوست رخصت ہوتے رہیں گے)

الٰہی فرقت مخدوم میں کیونکر بسر ہوگی
نہ صدمہ دل سے اٹھتا ہے نہ دل صدمہ سے اٹھتا ہے

البتہ اس بات سے ڈھارس بندھ جاتی ہے جب کہ ان کی اولاد میں حضرت مولانا محمد رفیع صاحب اور حضرت مولانا محمد تقی صاحب مدظلہما پر نظر پڑتی ہے جو آپ کے صحیح معنی میں جانشین ہیں اللہ تعالیٰ ان کے علم وعمل میں مزید ترقی کرے آمین ثم آمین۔

○

بقیہ (باتیں ان کی یاد رہیں گی)

مؤطا کو حاصل نہیں ہوئی۔ اور مؤطا نام کی بعض کتابیں ایسی ہیں جن کو کوئی جانتا بھی نہیں ہے۔

یہ چند واقعات اور چند باتیں تھیں جو حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ تعالےٰ علیہ سے سنی ہوئی تھیں۔ بغیر کسی ربط کے ان کو جمع کر دیا ہے امید ہے کہ انشاء اللہ العزیز نافع ہوں گی۔ حق تعالےٰ حضرت مفتی صاحب رح کے درجات بلند فرماتے اور ان کے فیوض وبرکات کا حصہ ہمیں بھی عطا فرماتے۔ آمین ثم آمین۔

جناب اعجاز احمد خان سنگھانوی
ایم اے، عربی، اسلامیات، تاریخ اسلام

بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

حضرت حکیم الامت مجدد الملت مولانا شاہ اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی شخصیت جامع کمالات تھی۔ میں ابھی بچپن کا غیر شعوری دور گزار رہا تھا کہ حضرت تھانویؒ کی مشہور زمانہ کتاب بہشتی زیور کو دیکھنے کا شرف حاصل ہوا اور حضرت مولانا تھانویؒ کے نام سے بھی واقفیت حاصل ہوئی جب ذرا شعور بیدار ہوا تو اصلاح الرسوم ہاتھ لگی۔ بغیر سمجھے بوجھے پوری کتاب پڑھ گیا حضرت حکیم الامت کے مواعظ کا مطالعہ شروع کیا اور رفتہ رفتہ دیگر تصانیف تک باریابی ہوئی۔ انہی کتابوں کے مطالعہ کے دوران مفتی اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب قدس سرہٗ سے واقفیت حاصل ہوئی۔ اور اسی دوران حضرت کی کتاب سیرۃ خاتم الانبیاء کا مطالعہ کیا۔ اسی کتاب کے شروع کے صفحات میں حضرت حکیم الامت تھانویؒ کی اس تقریظ کو پڑھنے سے حضرت مفتی صاحبؒ کی عظمت اور آپ کے کمالات کا اندازہ ہوا۔

حضرت مجلس کے دوران بزرگان دین کے واقعات، ملفوظات اور افادات نقل فرماتے۔ بزرگان دین کے علاوہ اکابر دیوبند کے عجیب و غریب اور علم و عمل کی طرف راغب کرنے والے واقعات نقل فرماتے جن سے عمل کا جذبہ پیدا ہوتا۔ یہ واقعات اکثر دیکھے ہوئے تھے بعض اکابر سے سنے ہوئے بھی۔ کیسا ہی پیچیدہ مسئلہ آجاتا حضرت اس کے بارے میں کسی نہ کسی بزرگ کا قصہ یا قول نقل فرما دیتے۔ ایک مرتبہ استاذی حضرت مولانا شمس الحق صاحب استاذ تفسیر و حدیث دارالعلوم کراچی سے فرمایا کہ دارالعلوم میں بڑا مکان خالی ہوا ہے۔ آپ قدیم مکان سے بڑے مکان میں منتقل ہو

جائیں ،حضرت استاذی نے عرض کیا کہ :

حضرت! قدیم مکان میں کچھ ایسی آسانیاں ہیں جو بڑے مکان میں مشکل سے حاصل ہوں گی اور میرا ارادہ تو قدیم مکان ہی میں قیام کا ہے۔ حضرت موصوف نے فوراً حضرت حکیم الامت تھانویؒ کا مقولہ نقل فرمادیا کہ حضرت کا ارشاد ہے کہ :

"مکان وسیع ہو ، رفیع ہو یا نہ ہو"

لہٰذا میرا یہ خیال ہے کہ آپ بڑے مکان میں منتقل ہو جائیں۔ چنانچہ حضرت مولانا دوسرے مکان میں منتقل ہو گئے۔ یہ واقعہ میں نے استاذی مولانا شمس الحق خاں صاحب سے خود سنا ہے۔

ایک مرتبہ مجلس کے دوران تقدیر و تدبیر کی حکمتوں کا بیان فرما رہے تھے ۔ اثناء بیان میں اپنا واقعہ سنایا کہ میں نے دیوبند سے حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کو اطلاع دی کہ فلاں گاڑی سے میں تھانہ بھون پہنچوں گا۔ اتفاق سے دیوبند والی گاڑی لیٹ ہوگئی اور سہانپور دیر سے پہنچی۔ تھانہ بھون والی گاڑی چلی گئی مفتی صاحب جب سہانپور پہنچے تو معلوم ہوا کہ تھانہ بھون کی گاڑی اپنے وقت پر روانہ ہو گئی ہے۔ حضرت نے فرمایا کہ میں نے دیکھا کہ اب بھاگ دوڑ سب بیکار ہے۔ سکون سے اسٹیشن کی مسجد میں جا کر لیٹ گیا کہ شام کی گاڑی سے چلا جاؤں گا لیکن ایک ہندو بھی تھا ، اسے گاڑی سے کسی ضروری کام سے جانا تھا اسے جب یہ معلوم ہوا کہ گاڑی نکل گئی ہے تو غصہ میں لائن پر بیٹھ گیا سر پر دھوپ ، گرمی کا موسم ، پسینہ میں شرابور شام تک وہیں بیٹھا رہا کہ گاڑی کیوں گئی۔

یہ واقعہ بیان کر کے فرمایا کہ :

میں نے دیکھا تو اللہ کا شکر ادا کیا کہ یہ تقدیر کا قائل نہیں ہے ورنہ اتنا پریشان نہ ہوتا۔ میں تقدیر کا قائل تھا جہاں تک تدبیر کام کر سکتی تھی میں نے کوشش کی لیکن غیر اختیاری امور میں مجبور تھا میں آرام سے اللہ کی مشیت پر خوش اور وہ اپنی تدبیر کی ناکامی پر پریشان تھا۔ لہٰذا دونوں شام کی گاڑی سے روانہ ہوئے۔

آپ کو حضرت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہٗ سے بیعت و استرشاد اور ان کی صحبت کے اثر سے اللہ تعالیٰ نے نام و نمود اور شہرت پسندی سے بے نیاز کر دیا تھا۔

ایک مرتبہ مدرسہ اشرفیہ سکھر کے ارباب حل و عقد کی طرف سے حضرت مفتی صاحبؒ اور مولانا

احتشام الحق صاحب تھانوی مدظلہ کو وعظ کی دعوت دی گئی۔ آپ یہ سمجھتے تھے کہ مولانا احتشام الحق صاحب کے ہوتے ہوئے ان کی کوئی ضرورت نہیں ہے لیکن مدعوئین کا اصرار تھا حضرت نے فرمایا کہ:

آپ حضرات کیوں مخمل میں ٹاٹ کا پیوند لگوانا چاہتے ہیں ؟ مولانا احتشام الحق صاحب کی تقریر کی موجودگی میں میری کیا ضرورت ہے۔

اہل درخواست حضرات نے عرض کیا کہ:

"حضرت مولانا احتشام الحق صاحب مدظلہ کو وعظ کے لیے اور آپ کو برکت کے لیے لے جانا چاہتے ہیں۔"

حضرت نے فرمایا کہ:

"ٹھیک ہے اگر تم ایسا سمجھتے ہو تو میں حاضر ہوں۔"

حضرت مفتی صاحبؒ شگفتہ مزاج اور ہنس مکھ تھے۔ ہر آنے والے کا استقبال شگفتہ چہرے سے کرتے۔ آپ کی طبیعت میں چڑچڑاپن بالکل نہیں تھا، کبھی کبھی مجلس میں شگفتہ لطیفے بھی سنایا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ فرمایا کہ قیام پاکستان کے ابتدائی ایام میں جب پاکستان آیا تو کراچی میں ایک مکان عارضی طور پر رہائش کے لیے ملا۔ اس میں سابقہ مکین کا کچھ سامان تھا جس میں کچھ بوتلیں رکھی تھیں۔ میں ان کی بڑی حفاظت کرتا تھا کہ کسی کی امانت ہے ان کو نقصان نہ پہنچے۔ ایک دن ایک صاحب ملنے آئے اور انہوں نے بوتلوں کے بارے میں پوچھا کہ یہ بوتلیں کیسی ہیں۔ میں نے جواب دیا کہ یہ امانت ہیں۔ ایک شخص مجھ سے قبل اس مکان میں مقیم تھا، وہ چھوڑ گیا ہے جب آئے گا اپنی امانت لے جائے گا۔ ان صاحب نے بتایا کہ یہ شراب کی بوتلیں ہیں، حضرت نے انہیں ضائع کر دیا۔ اس قصے کو بیان کر کے ہنس کر فرمایا کہ:

"کوئی اور ہوتا تو کہہ دیتا کہ مفتی کے یہاں شراب موجود تھی۔"

معمولات پر دوام و استمرار اور ان کے اوقات کی پابندی سنت سے ثابت اور بزرگان سلف کی عادت رہی ہے۔ درحقیقت نظام اوقات کی پابندی بڑی برکت کی چیز ہے۔ اس سے کام بہت ہو جاتا ہے اور انسان کو کوئی تکان بھی محسوس نہیں کرتا۔ حضرت مفتی صاحبؒ کی زندگی کے اوقات مقرر تھے، آپ دارالعلوم دیوبند میں طلبہ کو سبق پڑھاتے، فتاوے لکھتے، کتابیں تالیف و تصنیف فرماتے۔ "المفتی" نامی ماہوار رسالہ نکالتے، اس کے مضامین کی تصحیح، کتابت کا پڑھنا اور تصحیح کرنا، پروف ریڈنگ کرنا اور

ان رسائل کا مختلف پتوں پر بھیجنا اور اس کے ساتھ ہی تجارتی کتب خانہ چلانا۔ ان سب ذمہ داریوں کے ساتھ ہی ساتھ گھر کی دیکھ بھال کرتے اور بزرگوں کی خدمت میں حاضری دیتے۔ آج کل کے لوگ جو اپنا بیشتر وقت فضول باتوں اور لایعنی کاموں میں صرف کرتے ہیں، کچھ کام نہیں کر سکتے۔ مفتی صاحبؒ اپنے معمولات پر سختی سے کاربند تھے۔

حضرت بہت نرم دل، متحمل مزاج اور جود و سخا کے پیکر تھے۔ مولوی جمیل صاحب برنی مرحوم نے اپنا واقعہ نقل کیا کہ میں حضرت کی خدمت میں حاضر ہُوا میرے گھر میں کھانے پکانے کو کچھ نہ تھا۔ دل میں خیال آیا کہ حضرت سے مانگ لوں گا لیکن مجلس میں شرم کی وجہ سے کچھ کہہ نہ سکا۔ مجلس ختم ہوئی تو حضرت نے اندر کے کمرے میں بلوایا اور سو روپے مرحمت فرمائے اور ارشاد فرمایا کہ:

"جس مد میں چاہو خرچ کر لو یہ تمہارے لیے ہیں"

قیام پاکستان کے بعد مفتی صاحب ایک فلیٹ میں بالائی منزل پر قیام پذیر تھے۔ لازمی طور پر پانچ وقت نماز کے لیے اوپر سے نیچے اُترتے اور نیچے سے اُوپر چڑھتے۔ یہ روزانہ کا مشغلہ تھا۔ ایک دن سٹیٹ بنک کے سب سے پہلے گورنر زاہد حسین صاحب جو مفتی صاحب کے دوست تھے آئے اور نیچے سے اشارہ کیا کہ آپ نیچے تشریف لے آئیں۔ حضرت نے بھی اسی طرح اُوپر سے اشارہ فرمایا کہ ——— اُوپر آ جاؤ۔ مرحوم نے دل پر ہاتھ رکھا کہ دل کا مریض ہوں اُوپر چڑھنے کی ممانعت ہے۔ حضرت نیچے اُترے اور فرمایا کہ:

"ہمیں بھی قیام پاکستان سے پہلے سے دل کا مرض ہے لیکن ہم تو دو پیسے کی دوا استعمال کر لیتے ہیں جس سے الحمد للہ افاقہ ہو جاتا ہے اور آپ کئی ہزار خرچ کرنے پر بھی اُوپر نہیں چڑھ سکتے اور ہمارا تو پانچ وقت نماز کے لیے اُترنا چڑھنا ضروری ہے۔"

حضرت مفتی صاحبؒ نے اکابر علماء حق کی صحبت اٹھائی تھی۔ ان میں ایک سے ایک بڑھ چڑھ کر عارف باللہ تھا۔ ان میں حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ، مفتی عزیز الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت میاں سید اصغر حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہٗ کی صحبت نے آپ کی شخصیت کو کندن بنا دیا تھا۔ آپ کی زندگی کے ہر کام میں اعتدال تھا۔ اگر آپ کسی پر ناراض ہوتے یا کسی سے خوش ہوتے تو اس کی حد مقرر تھی۔ تنبیہ کے موقع پر اتنے ہی الفاظ منہ سے نکلتے جو غلطی

کے لیے ضروری ہوتے ۔اسی طرح کسی کی مدح وتعریف کے لیے بھی اتنے ہی الفاظ استعمال فرماتے تھے جن کی ضرورت ہوتی تھی۔ ایسا کبھی نہ ہوتا کہ کسی بھی موقع پر حد اعتدال سے تجاوز ہو جائے۔

ایک مرتبہ استاذی المحترم مولانا شمس الحق خان صاحب حاضر خدمت ہوئے۔ حضرت بستر پر لیٹے ہوئے تھے۔ مولانا موصوف نے دریافت فرمایا کہ حضرت کیا حال ہے۔ فرمایا کہ الحمد للہ ٹھیک ہے۔ پھر فرمایا کہ:

"آج ہم اپنا مرثیہ پڑھ کر لیٹے ہیں"

ہوا یہ کہ شدید بیماری کے دوران کسی غلط فہمی کی وجہ سے حضرت کی وفات کی خبر مشہور ہو گئی اور کسی اہل فن نے حضرت مفتی صاحب پر مرثیہ بھی اپنے رسالے میں چھاپ دیا تھا اور وہ دارالعلوم کے پتے پر جب موصول ہوا تو مفتی صاحب نے بھی پڑھ لیا۔ اس کے بعد فرمایا کہ:

"ہمیں یہ بھی معلوم ہو گیا کہ مرنے کے بعد ہمیں لوگ کیا کہیں گے"

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین وصلی اللہ تعالیٰ علی خیر خلقہ محمد وآلہ واصحابہ اجمعین

○

عقل کی بات تو یہ ہے کہ انسان کو نہ قدامت پسند ہونا چاہیے نہ جدت پسند بلکہ حقیقت پسند ہونا چاہیے جو چیزیں پرانی اچھی ہیں ان کو اختیار کرے جو چیزیں نئی اچھی اور نافع و مفید ہیں ان کو اختیار کرے۔

(حضرت مفتی اعظم "مساجد کی نئی شکلیں اور ان کے مفاسد" جواہر الفقہ ص۳۲۴ ج۲)

○

مکاتیب

"شہد کی مکھی کا مسدس گھر دیکھئے تو معلوم ہوتا ہے کہ کسی نے پرکار لے کر اس کے اضلاع کو ٹھیک کیا ہے، مکڑی کے کاتے ہوئے باریک تار اور اس کے بنے ہوئے جالے کو دیکھئے تو مانچسٹر اور لنکاشائر کی مشینیں ان کے مقابلے میں فیل نظر آتی ہیں"

(حضرت مفتی اعظمؒ، آلات جدیدہ ص ۱۷)

منجانب

دیوان ٹیکسٹائل ملز

معاصر علماء کے مکاتیب

حضرۃ مولانا مفتی محمد شفیع صاحب قدس سرہ کے نام

"حضرت مفتی صاحب قدس سرہ کو اللہ تعالیٰ نے اپنے معاصرین میں بھی محبوبیت کا مقام عطا فرمایا تھا، آپ کے پاس ان حضرات کے بہت سے مکاتیب کا ذخیرہ محفوظ تھا، اگر اس پورے ذخیرے کو شائع کیا جائے تو ایک ضخیم کتاب بن سکتی ہے لیکن یہاں ہم نے ان مکاتیب کا انتخاب کیا ہے جو عام قارئین کے لیے بھی دلچسپی یا فائدے کے حامل ہیں۔ اُمید ہے کہ مکاتیب کے اس گلدستے کو قدر کی نگاہ سے دیکھا جائے گا، اس لیے کہ یہ ان حضرات کی تحریریں ہیں جو علم و عمل کے اعتبار سے اپنے عہد کے عطر کی حیثیت رکھتے تھے، ان مکاتیب سے حضرت مفتی اعظمؒ کے ساتھ دوسرے اہل علم و فضل کے تعلقات پر بھی روشنی پڑتی ہے (م ت ع)

مکاتیب حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب مدظلہ

مخدوم برادران زیدت معالیہم

سلام مسنون نیاز مقرون۔ گرامی نامہ مع رسالہ موقرہ متعلقہ مکبر الصوت پہنچ کر سرمایۂ مسرت و عزت ہُوا عرصۂ دراز کے بعد اس نصف ملاقات سے غیر معمولی مسرت ہُوئی اور وکُنّا کَندَمانی جَذیمَۃ کا منظر آنکھوں کے سامنے آگیا[1] خصوصیت سے وہ وقت بھی دل میں بجلی کی طرح گھوم گیا جب کہ ایک بھائی دُوسرے بھائی سے بشرف تلمذ

---

[1] یہ متمم بن نویرہ کے قطعے کی طرف اشارہ ہے جو اس نے اپنے بھائی مالک بن نویرہ کے بارے میں کہا تھا کہ ؎

آرزو کر رہا تھا کہ اگر بھائیوں میں کچھ اختلاف ہے تو گھر ہرگز نہ چھوڑا جائے۔ وکان امر اللہ قدراً مقدوراً۔
رسالہ مکبر الصوت کی تدوین و ترتیب سے غیر معمولی مسرت ہوئی۔ جی چاہتا تھا اس مسئلہ کی تنقیح اور توضیح ہوجائے۔ فقہی مسائل کے سلسلہ میں آپ کو اللہ تعالیٰ نے مفتاح للخیر بنایا ہے۔ اس مسئلہ میں بھی آپ ہی کا ہاتھ اور قلم موزوں اور معتبر تھا۔ میں انشاء اللہ ترسوں جمعرات کے دن اکابر اساتذہ کو جمع کر کے یہ مسودہ سناؤں گا، اور ان حضرات کی آراء قلمبند کرانے کی کوشش کروں گا۔ یہ عریضہ بطور رسید کے ارسال ہے تاکہ انتظار جواب کی زحمت نہ ہو نیز معتبر نائی[1] کے ہوتے ہوئے عریضہ بلا واسطہ سپرد ڈاک نہیں کیا اور تنقیح مسئلہ انشاء اللہ مفصل عریضہ دوبارہ ارسال ہوگا۔

دارالعلوم کے قیام کا علم ہو چکا تھا، اس سے غیر معمولی مسرت تھی۔ میں نے سنتے ہی کہا تھا کہ صحیح معنی میں دارالعلوم آج قائم ہوا ہے اور اگر حضرت مولانا شبیر احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ خود قائم فرماتے تو وہ یہی دارالعلوم ہوتا۔ بڑی بات یہ ہے کہ یہ دارالعلوم نہایت سادگی سے بلا احتشام قائم ہوا۔ اگر اس میں تزک و احتشام کا دخل ہو جاتا تو پھر اس کا انجام بھی دست و گریبانی کی شکل میں نمایاں ہوتا۔ یہ آپ کی نیت کی برکت تھی کہ یہ از خود دارالعلوم بن گیا اور اس نظر سے اللہ تعالیٰ نے اسے بچایا کہ وہ دارالعلوم سے مکتب بنتا۔ آپ دعا نہیں کرتے ورنہ جی چاہتا تھا کہ ایسے دارالعلوم کی زیارت کی جاتی اور قلمی کے بجائے لسانی تبریک و تہنیت عمل میں آتی۔ خدا کرے کہ باحسن احوال اس کا وقت آئے۔

میری طرف سے بچوں کو دعا گھر میں سلام، والدہ صاحبہ سے بعد سلام استدعاء دعا، یہاں بحمداللہ ہمہ وجوہ خیریت ہے۔ والسلام

محمد طیب از دیوبند ۷، ذیقعدہ ۱۳۶۸ھ

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ)

وکنا کندمانی جذیمۃ حقبۃ — من الدھر حتی قیل لن یتصدعا

فلما تفرقنا کأنی و مالکا — لطول اجتماع لم نبت لیلۃ معا

یعنی میں اور مالک زمانہ دراز تک جذیمہ بادشاہ کے مصاحبوں کی طرح رہے ہیں، یہاں تک کہ لوگ کہنے لگے تھے کہ یہ دونوں کبھی جدا نہ ہونگے لیکن جب ہم جدا ہوئے تو ایسے جدا ہوئے کہ یوں معلوم ہوتا ہے جیسے ہم نے کبھی ایک رات بھی ساتھ نہیں گزاری تھی ۱۲ تقی

[1] نائی دیوبند کے محاورے میں پیغام رساں کو بھی کہتے ہیں ۱۲ م ت ع

مخدوم برادران زید معالیہم

سلام مسنون نیاز مقرون۔ گرامی نامہ نے مشرف فرمایا۔ میں بمبئی گیا ہوا تھا واپسی پر والا نامہ سے مشرف ہوا۔ آتے ہی لکھنؤ کا سفر پیش آ گیا، کل وہاں سے واپسی ہوئی ہے آج کلکٹر صاحب ضلع سہارنپور دارالعلوم میں آرہے ہیں، ان کو چائے پر مدعو کر دیا ہے اس لیے جواب والا نامہ میں تاخیر ہوئی۔ تکفیر شیعہ کے بارہ میں جیسا کہ آپ نے تحریر فرمایا ہے تمام جماعت کا مسلک یہی ہے کہ علی الاطلاق فرقہ شیعہ کی تکفیر یہاں سے کبھی نہیں کی گئی بلکہ صرف انہی شیعوں کی تکفیر کی گئی ہے جو قطعیات اور ضروریات دین کے منکر ہیں۔ میں نے آپ کے تحریر فرمانے پر دارالافتا میں جا کر فتویٰ تلاش کیا تو ۱۹ صفر ۱۳۶۲ھ میں مولانا ریاض الدین صاحب کا فتویٰ رجسٹر میں درج نکلا مگر اس میں پورے فرقہ کی تکفیر نہیں ہے بلکہ منکر صحابیت صدیق اکبر قاذف صدیقہ رضی اللہ عنہا قائل تحریف قرآن کی تکفیر کی گئی ہے اسی فتویٰ پر آپ کے اور تمام اساتذہ دارالعلوم کے دستخط ہیں۔ لکھنؤ جاتے ہوئے میں نے قصد کیا کہ دارالمبلغین میں بھی تحقیق کروں، چنانچہ کی گئی، وہاں کوئی مخطوط فتویٰ تو ملا نہیں، مطبوعہ فتویٰ ملا، اس میں مولانا ریاض الدین صاحب کے دستخط سے بعینہ وہی عبارت مطبوعہ ہے جو یہاں دارالافتا میں ۱۹ صفر ۱۳۶۲ھ والے فتویٰ میں درج ہے جس سے واضح ہے کہ یہاں کے اکابر نے جماعتی حیثیت سے فرقہ شیعہ کی علی الاطلاق تکفیر نہیں کی، صرف منکرین ضروریات دین کی تکفیر کی ہے۔ ممکن ہے کہ عدالت میں یہی مطبوعہ فتویٰ [illegible] گیا ہو۔[1]

یہاں بحمداللہ خیریت ہے آپ حضرات کی یاد دلوں سے گئی نہیں ہے اور نہ جانے والی ہے، بلاشبہ یہی حال ادھر بھی ہے۔ وکان امر اللہ قدرا مقدورا۔ ہم سب دعا کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان دونوں حکومتوں میں اعتماد باہمی پیدا فرمانے اور تمام مشکل اور پیچیدہ مسائل حل ہو جائیں اور دونوں جگہ کی پبلک ایک دوسرے سے مل سکے

---

[1] مسئلہ قادیانیت کے متعلق منیر کمیشن کے سامنے جن علماء کی شہادتیں لی گئیں ان میں احقر بھی شامل تھا، عدالت میں قادیانیوں کی طرف سے یہ سوال پیش کیا گیا کہ علماء دیوبند سب شیعوں کو بھی کافر کہتے ہیں، میں نے انکار کیا کہ یہ دیوبند کا مسلک ہرگز نہیں کہ مطلقاً شیعوں کو کافر کہا جائے۔ فریق مخالف نے ایک مطبوعہ فتویٰ پیش کیا جس میں بظاہر کسی قید کے بغیر شیعوں کو کافر کہا تھا۔ میں نے پھر بھی کہا کہ میں اس کو دیوبند کا فتویٰ ماننے کے لیے تیار نہیں جب تک اس پر دیوبند کی تصدیق نہ ہو۔ پھر واپس آکر اس کی تحقیق کے لیے مہتمم صاحب کو خط لکھا جس کے جواب میں مسئلہ خط آیا۔ ۱۲ محمد شفیع

آمدورفت اب بھی جاری ہے۔ خدا کرے کہ اس میں مزید سہولتیں ہو جائیں۔ آپ بھی ارادہ فرمائیں کل میاں محسن صاحب فاروقی کے ساتھ مولوی ظہور احمد صاحب نے میری بھی دعوت کی تھی، آپ ہی کے مکان سے متصل منشی بشیر احمد صاحب مرحوم کے مکان میں کھانا کھلایا، مکان دیکھ کر مکینوں کی یاد تازہ ہو گئی اور دیر تک اس تصور میں استغراق رہا۔ اور وگنا گنداہا ہ جذبیۃ کا منظر آنکھوں کے سامنے پھر آ رہا۔ امید ہے کہ آپ کا مزاج بعافیت ہوگا خلیفہ جی سے جب ملاقات ہو تو سلام فرما دیں۔ گھر میں سب کو سلام و دعا۔ والسلام

محمد طیب از دیوبند ۱۹ ۲/۴

فتویٰ جو یہاں دارالافتاء سے گیا ہے ارسال ہے جس میں صرف منکر قطعیات کی تکفیر کی گئی ہے، اگر کسی جگہ علی الاطلاق تکفیر شیعہ کی گئی ہو تو وہ کوئی شخصی فتویٰ ہوگا جماعت دیوبند کی ترجمانی نہ ہوگی اور ضرور ہے کہ جماعت کے نہ کسی بڑے عالم نے اس پر استدراک کیا ہو گا اور اس کی تصحیح کر دی ہوگی۔ محمد طیب

دستور قرآنی سے استفادہ کیا، آپ نے تو دریاؤں کو کوزہ میں بند کر دیا ہے اور سمندر کی تہ میں سے ذخائر نکال کر پیش کیے ہیں اللہ تعالیٰ جزائے خیر اور اجر جزیل عطا فرمائے، آمین

نقل مطابق اصل (۲۲۳) مورخہ ۱۹ صفر ۴۲ھ آمدہ بنام مولوی عبدالسلام ساکن لکھنؤ متعلم دارالعلوم دیوبند

سوال

شیعہ اثنا عشری مسلمان ہیں یا کافر اور ان کے ساتھ مناکحت جائز اور ان کا ذبیحہ حلال ہے یا نہیں ان کا چندہ مسجد میں لینا اور ان کی نماز جنازہ پڑھنا جائز ہے یا نہیں۔

الجواب

شیعوں کا فرقہ جو حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کی صحابیت کا منکر، حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی قذف کریں تہمت نعوذ باللہ لگائیں کافر ہے۔ قال العلامۃ الشامی او کان ینکر صحبۃ الصدیق او یقذف السیدۃ الصدیقۃ رضی اللہ عنہ فہو کافر لمخالفتہ القواطع المعلومۃ من الدین بالضرورۃ۔ جو کلام اللہ کی تحریف کا قائل ہو وہ مرتد ہے کافر ہے۔ اہل کتاب بھی نہیں۔ ان سے مناکحت اور تعلقات رکھنا حرام ہیں حق تعالیٰ کا ارشاد ہے لا تجد قوما یؤمنون باللہ والیوم الآخر یوادون من

حاد اللہ ورسولہ ولو کانوا آباءہم او ابناءہم او اخوانہم او عشیرتہم۔
شادی اور غمی جنازہ کی شرکت ہرگز نہ کی جاوے ایسے عقیدہ کے شیعہ کافر ہی نہیں بلکہ اکفر فقط

(نوٹ) یہ فتویٰ حضرت مفتی ریاض الدین صاحب کے زمانہ کا ہے۔ رجسٹر نقل فتاویٰ پر کسی مفتی کے دستخط نہیں نقل مطابق اصل ہے۔

یہ وہی فتویٰ ہے جس پر مولانا ریاض الدین صاحب مرحوم، مولانا مرتضیٰ حسن صاحب مرحوم مولانا اعزاز علی صاحب، مولانا مفتی مہدی حسن صاحب، قاضی مسعود احمد صاحب، مولانا محمد شفیع صاحب، مولانا [illegible] صاحب، مولانا عبدالسمیع صاحب، مولانا حسین احمد صاحبؒ، مولانا شبیر احمد صاحبؒ، مولانا سید اصغر حسین صاحبؒ احقر خاکسار محمد طیب، مولانا محمد ابراہیم صاحب وغیرہ حضرات کے دستخط ثبت ہیں۔

محمد طیب ۱۹/۱/۶۲

برادر محترم، زید فضلکم

بعد سلام مسنون نیازمقرون، گرامی نامہ یا بے تکلفی نامہ شرف صدور لایا، میں نے القاب میں انتہائی بے تکلفی کر دی ہے، میرا اور آپ کا تعلق اول اس دور کا ہے جب کہ یہ تکلفات اور ان کے عنوانات پوری طرح تیار بھی نہ ہوئے تھے، اس لیے ان کی عادت ابھی پڑی ہی نہیں ہے۔ خدائے تعالیٰ اسی بے تکلفی میں دن پورے فرما دیں، بہرحال اب بھی خوشی بے تکلف خطاب و کتابت ہی سے ہوتی ہے، امید ہے کہ اس رنگ کو قائم رکھا جائیگا۔

دستور کے سلسلہ میں جدوجہد جہاد فی سبیل اللہ ہے، حق تعالیٰ فتح و نصرت عطا فرمائے آمین آپ ہی حضرات سے اس کی توقع ہوتی ہے کہ کچھ کام بنا تو بن جائے گا۔

"کئے جاؤ کوشش میرے دوستو" "والامر بید اللہ الکریم"

مدرسہ کے لیے اوسع جگہ کے ملنے سے بہت زیادہ خوشی و مسرت ہوئی، الحمد للہ کہ جیسا کام اونچا اٹھایا ہوا ہے ویسے ہی اس کے وسائل فراہم ہو جائیں گے۔

مطلب کی بات یہ ہے کہ کیا واپسی "دیوبند" کی طرف سے نہیں ہو سکتی[1]؟ اگر یہ ممکن ہے تو اس سے

---

[1] یہ خط حضرت مفتی صاحب کے سفر ڈھاکہ کے دوران وہیں کے پتے پر بھیجا گیا تھا۔ (م ت ع)

دریغ نہ کیا جائے۔ سب کی خواہش و فرمائش ہے۔ "وطن مستعار" کو دیکھ لینا بہرحال حظ عظیم ہے۔ گو اب مستعار بھی نہیں ہے۔ تاہم ہے تو اسی نسبت کے ساتھ، ابھی تک جانے والوں کو "کراچوی" کوئی نہیں پکارتا۔ "دیوبندی" ہی کہا جاتا ہے، اس لیے اس کی طرف ضرور توجہ کی جائے۔

حضرت مولانا اطہر علی صاحب کی خدمت میں سلام مسنون واستدعائے دعا۔ "باریسال" سے دعوت نامہ آیا تھا، مگر وہ تاریخیں گھری ہوئی تھیں۔ مجبوراً انکار لکھا ورنہ شاید وہیں ملاقات ہو جاتی۔ پرسانِ حال حضرات کی خدمت میں سلام مسنون۔ والسلام

محمد طیب۔ از دیوبند ۶ جمادی الثانی ۷۵ھ

○

مخدومی واخی مولانا محمد شفیع صاحب زیدت فضائلہم

سلام مسنون نیاز مقرون۔ والا نامہ بمبئی میں دستی طور پر محترم اسمٰعیل شریف صاحب نے جن کا اصلاحی تعلق آں محترم سے تھا لا کر مشرف فرمایا۔ تعمیل ارشاد کرتے ہوئے ان سے عرض کر دیا ہے کہ باوجود اپنی نااہلیت کے جو خدمت بن پڑے گی اس سے انشاء اللہ دریغ نہ ہوگا۔

سفر حج سے ۱۶ اگست ۵۸ء کو دیوبند پہنچا۔ ۴ اگست کو جدہ سے محمدی میں بمبئی کے لیے روانگی ہوئی۔ راستہ میں امپائر جہاز جاتا ہوا نظر پڑا، کیا خبر تھی کہ اس میں علم و فضل کا ایک بڑا بوجھ لدا ہوا جا رہا ہے، عموماً جہاز ہم جیسے کاہل نابہی کو اٹھا کر لے جاتے ہیں، راحلہ تو کسی کسی میں ہوتا ہے۔ دیوبند پہنچ کر معلوم ہوا کہ آپ اس سے بقصد عمرۃ شریف گئے۔ حق تعالیٰ مبارک فرمائے، اسے سن کر جی تو چاہتا ہے کہ حاضر ہو کر تبریک تہنیت کی جائے مگر راہ مسدود۔ خلیفہ جی سے بچوں سے گھر میں سب کو سلام فرماویں۔ میاں سالم اور ام سالم جو ہمراہ حج میں تھے سلام عرض کرتے ہیں۔ یہاں بحمد اللہ ہمہ وجوہ خیریت ہے۔ والسلام

محمد طیب از دیوبند ۱۰ ربیع ۷۸ھ

○

حضرت المحترم زیدت مکارمہم
السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

گرامی نامہ نے ممنون یاد آوری فرمایا، عرصہ کے بعد خیریت مزاج سامی کی اطلاع موجب مسرت و

طمانیت ہوئی۔ مولوی سید حسن صاحب[1] مرحوم کا حادثہ ایسا اچانک اور فجارۃً ہوا کہ جیسے کوئی سامنے سے دبوچ لے جاتا ہے اس لیے اس سے تاثر عام ہوا۔ پورا دارالعلوم اور پورا شہر متاثر تھا اور کئی دن تک سب غمزدہ محسوس ہوتے تھے، مرحوم تیز طبع، متقی، عالم اور ہمہ وقت علم ہی میں منہمک رہتے تھے۔ طلبہ ان کے گرویدہ تھے ان کے انتقال کی اچانک خبر پر طلبہ ان کے گھر کی طرف اس طرح بے تحاشا دوڑ رہے تھے جیسے بچہ ماں کی طرف دوڑتا ہے، دارالعلوم ایک اچھے قابل مدرس سے اور شہر ایک پاکیزہ خصلت شہری سے محروم ہوگیا۔ خاندان والوں پر تو جو اثر ہوگا وہ ظاہر ہے۔ میں ہمشیرہ صاحبہ کے پاس گیا، گھر میں بلالیا۔ روتی رہیں، میں تسلی دیتا رہا، مگر جوان صالح بیٹے کی موت اور وہ بھی نعتۃً کوئی سہل مصیبت نہ تھی۔ تاہم وہ صابر رہیں اللہ تعالیٰ ان کے مراتب بلند فرمائے میں جب مرحوم کے حادثہ کی خبر سنتے ہی ان کے گھر پہنچا، ان کی چارپائی کے قریب ان کی والدہ رضائی اوڑھے ششدر و حیران گھونگھٹ نکالے بیٹھی ہوئی تھیں بالکل اس طرح نظر آئیں جیسے مولانا حبیب حسن صاحب مرحوم کے انتقال کے وقت میں نے انھیں اس طرح دیکھا تھا۔ دل پاش پاش ہوگیا کہ ان کا ضعیف دل اس عظیم کوہ گراں کس طرح تحمل کریں گی مگر بہرحال اولاد آدم ہرچہ آید بگذرد۔ اللہ تعالیٰ ان کے دوسرے بیٹوں اور اولاد کو زندہ سلامت رکھے اور ان کے قلب کی تسلی کا سہارا بنائے۔

مرحوم کی وفات سے اگلے ہی دن احقر نے بچوں کے وظیفے کی رقم اتنی جاری کردی جتنی کہ ایک محرر کی تنخواہ ہوتی ہے تاکہ کسی نہ کسی حد تک سہارا لگ جائے اور بچے پڑھ لیں۔ اللہ تعالیٰ ان کا حامی و مددگار ہے۔

میاں سالم سلمہ سے آپ کی خیریت معلوم ہوکر خوشی و مسرت ہوئی، اس دور فتن میں آپ جیسی امانت الٰہی کی حامل یادگاریں لباً غنیمت ہیں اللہ تعالیٰ آپ کے انفاس سے مخلوق خدا کو مستفید فرمائیں۔ دعا کی درخواست ہے۔ گھر میں سب کو سلام مسنون، بچوں کو دعا۔ والسلام

محمد طیب از دیوبند ۵ ہجری

○

حضرت المحترم زید مجدکم السامی

سلام مسنون نیاز مقرون۔ گرامی نامہ نے شرف فرمایا۔ عرصہ دراز کے بعد عافیت مزاج معلوم ہوکر خوشی

---

[1] حضرت مولانا سید حسن صاحب استاذ حدیث و تفسیر دارالعلوم دیوبند مراد ہیں جو حضرت مفتی عتیق کے خواہرزادے تھے (م ع)

ہوئی، عمر کی جس منزل سے ہم لوگ گذر رہے ہیں اس میں ہر ایک کو دوسرے کی دستگیری اور توجہ و دعا کی ضرورت ہے۔ حق تعالیٰ آپ جیسے بافیض حضرات کو تا دیر زندہ و سلامت رکھے اور مسلمانوں کو آپ حضرات کے فیوض سے متمتع فرمائے۔ آمین۔ رسائل مرسلہ موصول ہو گئے۔ احقر نے کل ہی اکابر اساتذہ کو جمع کر کے گرامی نامہ سُنایا اور سب کے مشورہ سے رسالۂ متعلقہ حضرت مفتی صاحب کی خدمت میں بھیج کر لکھا ہے کہ اپنی رائے مفصل اور مدلل لکھ کر دار الاہتمام میں بھیج دیں تاکہ جماعت میں پیش کر دیا جائے[1] اور جو بھی طے ہو جماعتی مشورہ سے طے ہو جس طرح کہ اس مسئلہ کی ابتدائی منزل میں بھی جماعتی رائے ہی کی صورت اختیار کی گئی تھی۔ دار الافتاء سے تحریر آنے پر مسئلہ پر اجتماعی حیثیت سے غور و فکر کے بعد جو بات طے ہوگی اس سے ان شاء اللہ مطلع کروں گا۔ امید ہے کہ مزاج گرامی بعافیت ہوگا۔ احقر بھی بعافیت ہے، دعا کا محتاج اور خواستگار ہوں۔ بچوں کو دعا۔ گھر میں سب کو درجہ بدرجہ سلام مسنون۔ والسلام

محمد طیب از دیوبند ۲۰ ربیع الاول ۱۳۹۲ھ

○

حضرت المحترم زید مجدکم السامی

سلام مسنون نیاز مقرون۔ گرامی نامہ مع ہدایائے علمیہ صادر ہو کر موجب صد مسرت و ابتہاج ہُوا۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو افادہ اور اصلاح کی عظیم توفیق عطا فرمائی ہے جس پر رشک آتا ہے۔ ماشاء اللہ تمام تالیفات نہایت مفید اور مقتضائے حال کے مطابق تعبیر کی اعلیٰ بلاغت لیے ہوئے ہوتی ہیں۔ چند رسائل سے بالخصوص جو آئین و قوانین دین کے سلسلہ کے ہیں مستفید ہُوا، یہ آپ ہی کا حصہ تھا جو اللہ تعالیٰ نے عطا فرمایا۔

لاہور سے روانگی کے وقت مجھے بھی نہ ملنے کا افسوس رہا۔ وقت کم تھا اور میں گھرا ہُوا تھا کہ اپنے بس میں نہ تھا۔ بلا کیل کے لوگ جہاں چاہتے لے جاتے تھے وہ دن اور وہ رات ایاب و ذہاب ہی میں گذر گئے، دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ باحسن احوال زیارت نصیب فرمائے۔ آمین

یہ معلوم ہُوا تھا کہ عربیت کی سہل ترین تعلیم کے لیے آں محترم نے کوئی نصاب یا کچھ کتب مرتب فرمائی ہیں۔ یہاں چونکہ عربیت کے نطق و املا کی تربیت کا مسئلہ درپیش ہے اس لیے آپ کی کتب کی ضرورت

---

[1] رسالہ "الحیلۃ الناجزۃ" کے بعض مقامات پر کچھ اضافے حضرت مفتی اعظمؒ نے تجویز فرمائے تھے، یہ انہی اضافات کا مسودہ تھا

ہے تاکہ اس مسئلہ میں صحیح رہنمائی اور تشفی بھی ہو جائے۔

عزیزان کو سلام مسنون۔ مولوی ذکی سلمہٗ کی طبیعت اب کیسی ہے؟ گھر میں سب کو درجہ بدرجہ سلام و دعا۔
خلیفہ جی سے ملاقات ہو تو میرا بہت بہت سلام فرما دیا جاوے۔ والسلام

محمد طیب از دیوبند ۲۳ ۲/۹۳ ھ

○

مخدوم برادران زید مجدکم السامی

سلام مسنون نیاز مقرون۔ گرامی نامہ نے مشرف فرمایا۔ میں اس دوران میں کئی طوفانی سفروں میں چلا گیا اور جس کتاب کا ہدیہ ارسال فرمایا گیا ہے وہ ابھی تک پہنچی نہیں اس لیے قصداً ابھی جواب کو اس کے وصول ہونے پر معلق کر رکھا تھا۔ مگر وہ ابھی تک نہیں ملی اس لیے ارسالِ عریضہ میں مزید تاخیر مناسب نہیں سمجھی یاد فرمائی اور علمی ہدیہ سے عزت افزائی کا شکر گذار رہوں۔ حق تعالیٰ آپ کے افادات میں اور اضافہ فرمائے۔ بڑی نفع بخش تصنیف کا ذخیرہ اللہ نے آپ کے ہاتھوں جمع فرما دیا۔

وقف کرنال کے سلسلہ میں ایک رقم کا مقدمہ عرصہ سے چل رہا ہے۔ اس کا تفصیلی واقعہ استفتاء میں درج ہے۔ دار العلوم سے اس کے بارے میں فتویٰ لکھا گیا، سنا گیا ہے کہ اس بارہ میں آپ سے بھی استفتاء کیا جائے گا اس لیے دار العلوم کا فتویٰ اور استفتاء دونوں ارسال ہیں جو فتویٰ آپ صادر فرمادیں اس سے بندہ کو بھی مطلع فرمادیں۔ خدا کرے کہ یہ رقم جو یہاں کی غلطی سے پاکستان چلی گئی واپس مل جائے تو اس کے حصہ داروں کے رکے ہوئے کام چل جائیں گے۔

یہاں بحمد اللہ بہمہ وجوہ خیریت ہے۔ بچوں کو دعا۔ خلیفہ جی سے ملاقات ہو تو ان سے اور مولوی نواب سے سلام مسنون۔ والسلام

محمد طیب از دیوبند ۱۳ ۴/۹۴ ھ

○

حضرت المحترم زید مجدکم

سلام مسنون نیاز مقرون۔ گرامی نامہ نے ممنون یاد آوری فرمایا اور ہدیہ وقف و دو نسخے نظام اراضی موصول ہو گئے۔ ان شاء اللہ ان علمی جواہر پاروں سے مستفید ہوں گا۔ اللہ تعالیٰ نے آپ سے بہت بڑا کام لیا ہے

اور نہایت ہی مفید البینات سے امت کو مستفید ہونے کے مواقع عنایت فرمائے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب مسلمانوں کی طرف سے آپ کو جزائے خیر عطا فرمائے اور اس کا بہترین صلہ دُنیا و آخرت میں مرحمت فرمائے۔ عزیز تقی سلمہ کے خط سے علالت مزاج کا حال معلوم ہو کر تفکر اور تاسف ہُوا۔ اللہ تعالیٰ صحت کاملہ عطا فرمائے اور تادیر آپ کے فیوض سے ہم سب کو متمتع فرمائے۔ آمین۔ عزیز سلمہ سے فرما دیں کہ صحت و عافیت کی اطلاع ایک کارڈ سے کر دیں میں پرسوں ہی بہار وغیرہ کے سفر سے واپس ہُوا ہوں اور پرسوں کو بمبئی کا سفر ہے۔ دارالعلوم میں ایک شعبہ دارالقرآن کے نام سے کھولا گیا ہے جو درحقیقت تصنیفی شعبہ ہے اور قرآنی روشنی مختلف اندازوں سے پیش کرنے نیز اپنے بزرگوں کے علوم کو تسہیل کے ساتھ شائع کرنے کے لیے قائم کیا گیا ہے۔ عرصہ سے یہ میری تمنا تھی کئی برس تک مجلس شوریٰ میں پیش کرتا رہا۔ اب آکر اسے قائم کر دیا گیا ہے دو لاکھ کے سرمایہ سے اس کا کام شروع کیا جا رہا ہے۔ دعا فرما دیں کہ حق تعالیٰ اسے اشاعت علم و دین کا ذریعہ بنائے۔ اس کی مشاورتی مجلس کا اجلاس بمبئی میں ہو رہا ہے کیونکہ بعض بڑے معاونین بمبئی ہی کے ہیں، ان کی خواہش ہے اس ادارہ کا پہلا اجلاس ان کے دولت خانہ پر ہو۔

یہاں بحمد اللہ خیریت ہے دعاؤں کے ہم لوگ ہر وقت محتاج ہیں، بچوں کو دعا، گھر میں سب کو سلام مسنون، خلیفہ جی سے ملاقات ہو تو خصوصی سلام، معلوم وہ سب سے زیادہ مجھے کیوں یاد آتے رہتے ہیں سالم سلمہ بھی انشاء اللہ ستمبر کی ۲۴ تک پہنچے گا اسے ہدایت کر دی ہے کہ آپ کی زیارت سے مشرف ہو اور اپنے لیے دعا کرائے۔ امید ہے کہ اب طبیعت بحال ہوگی۔ والسلام

ایک نسخہ موقوفہ کی رسید ہمرشتہ ہے — محمد طیب از دیوبند یکم ۵/۸۴ھ

○

محترم برادر آں: سید محمد کرم السامی

سلام مسنون نیاز مقرون۔ گرامی نامہ ۱۹ ۵/۸۴ھ کو صادر ہُوا تھا۔ میں انہی تاریخوں کے لگ بھگ درد گردہ میں مُبتلا ہُوا بمبئی جا رہا تھا، دہلی میں یہ دورہ پڑا وہیں سے دیوبند واپسی ہُوئی، غنیمت ہُوا کہ ریل میں یہ قصہ پیش نہیں آیا۔ تقریباً ایک ہفتہ ابتلاء رہا اور ضعف غیر معمولی ہو گیا۔ ایک ماہ بمبئی کے احباب نے اصرار کیا کہ تبدیلی آب و ہوا و علاج کے لیے یہاں کچھ قیام و آرام کیا جائے۔ اس لیے ۱۲ اکتوبر ۶۴ء کو بمبئی روانگی ہُوئی وہاں ۲۵ دن قیام رہا اور الحمد للہ اس سفر کا اثر طبیعت پر بہت اچھا رہا۔ آدھی بیماری اور ضعف تو تبدیلی

آب وہوا ہی سے ختم ہوگئی اور بقیہ آدھی ڈاکٹر جال پٹیل کے علاج سے جو صدر جمہوریہ ہند کے مخصوص ڈاکٹر ہیں اور علاج کرنے میں حقیقتاً بے نظیر ہیں۔ دوا کے تیسرے ہی دن عوارض ختم ہوگئے اور طبیعت بحال ہو کر اصلی حالت پر آگئی، ابھی پانچ چھ دن ہی ہوئے کہ دیوبند پہنچا ہوں۔ یہ چند در چند وجوہات جوابی عریضہ ارسال کرنے میں تاخیر کا سبب ہوئیں۔

اس سے مسرت بھی ہوئی اور دل بھی بڑھ گیا کہ "مسلک علماء دیوبند" کو مجموعی حیثیت سے آپ نے پسند فرمایا۔ منتظر ہوں کہ اصلاحی نوٹ کب تک پہنچتے ہیں، ان نوٹوں کے بعد ہی مقالہ کی قیمت قائم ہوگی۔

دارالعلوم کا دستورِ اساسی جو آجکل رائج ہے ارسالِ خدمت گرامی کیا جا چکا ہے۔ ملاحظہ سے گذرا ہوگا الحمدللہ کہ دارالعلوم شرافی ایک عظیم سایہ دار درخت بن گیا ہے جس کے زیر سایہ طالبانِ دین دینی زندگی آسائش کے ساتھ بسر کر رہے ہیں، یہ آپ کے اخلاص وحُسنِ نیت کے ثمرات صالحہ ہیں اور ایسے جانشینانِ اکابر سے اس کے سوا اور توقع بھی کس چیز کی کی جاتی۔ الحمدللہ کہ یہ سب امور توقع کے مطابق ہی ظہور پذیر ہو رہے ہیں۔

یہاں بحمداللہ خیریت ہے۔ اس دوران میں اسلم سلمہٗ نے خدمت گرامی میں حاضر ہو کر اپنے خورد اور وظائف ادا کئے بہت خوشی ہوئی کہ اس نے بیان کیا کہ مجھے آپ کی (میری) اور حضرت مفتی صاحب کی پدرانہ شفقت میں کوئی فرق محسوس نہیں ہوا۔ خوشخبری یہ ہے کہ ۵ نومبر ۱۹۶۴ء کو اسلم سلمہٗ کے لڑکا پیدا ہوا ہے نام احمد اشرف رکھا گیا ہے۔ اس کی درازیٔ عمر اور خوش بختی کے لیے دعا فرما دیں، میری طرف سے سب صاحبزادوں کو دعا، گھر میں سب سے سلام مسنون۔ امید ہے کہ مزاج گرامی بعافیت ہوگا۔ والسلام

محمد طیب از دیوبند ۳ ہجری ھ

○

حضرت محترم زید مجدکم السامی

سلام مسنون نیاز مقرون۔ یہ عریضہ ایک خاص ضرورت سے ارسالِ خدمت کر رہا ہوں، کلکتہ سے کچھ قادیانی حج کے بہانہ سے حجاز جا رہے ہیں، اندیشہ ہے کہ وہ اس عظیم اجتماع کے موقع پر اپنے عقائدِ فاسدہ اور خیالاتِ باطلہ سے لوگوں کو متاثر کرنے کی سعی کریں گے۔ اس لیے بروقت اس کے انسداد کی ضرورت ہے۔ دارالعلوم دیوبند کی جانب سے ردِّ قادیانیت میں ایک عربی پمفلٹ تیار کرا کر حجاز بھجوا رہا ہوں لیکن اس وقت آپ کی مؤثر تصانیف ختم النبوۃ فی القرآن، ختم النبوۃ فی الحدیث اور ختم النبوۃ فی الآثار کے وہاں بھیجنے کی بڑی سخت ضرورت ہے۔ یہ کتابیں

یہاں طبع نہیں ہیں اس لیے آپ کو یہ زحمت دے رہا ہوں، آپ یہ کتابیں رابطہ عالم اسلامی یا وہاں کے اخبارات ورسائل کو یا جن کو آپ مناسب سمجھیں بھیج دیں اور اگر یہ ممکن ہو کہ براہِ راست حکومت حجاز کو اس سلسلہ میں متوجہ کیا جائے تو پھر ضرور۔ دلائی جائے تاکہ حکومت حجاز ان کا داخلہ ہی روک دے اور اگر یہ ممکن نہ ہو تو اس کے مؤثر انسداد کی جو کارروائی مناسب ہو وہ کی جائے۔

بہرحال اس سلسلہ میں آپ جو کچھ کرسکتے ہوں اس کو ضرور عمل میں لائیں تاکہ یہ فتنۂ عظیم حجاز کی مقدس سرزمین میں جڑ نہ پکڑ سکے۔

امید ہے کہ مزاج گرامی بعافیت ہوگا۔ والسلام

سب گھر والوں کو درجہ بدرجہ سلام و دُعا۔ محمد طیب

یہاں بحمداللہ بہمہ وجوہ خیریت ہے۔ مہتمم دارالعلوم دیوبند

۲/۱۱/۸۴ھ

○

حضرت المحترم زیدت مکارمہم

سلام مسنون نیاز مقرون۔ الحمدللہ بعافیت رہ کر مستدعی خیریت مزاج سامی ہوں، عرصہ ہوا خیریت نامعلوم ہے۔ امسال حق تعالیٰ نے حاضری بیت اللہ شریف کی توفیق بخشی۔ نگاہیں آپ کو ڈھونڈھتی رہیں کیونکہ اس سے پہلے اکثر ایسا ہوا کہ حرم شریف میں ملاقات ہوتی رہی۔ ۱۳۸۲ھ میں مصر سے واپسی پر حاضری ہوئی تو مدینہ یونیورسٹی کے نائب رجسٹرار الشیخ محمد عبودی خود احقر کی قیام گاہ پر تشریف لائے اور یونیورسٹی آنے کی دعوت دی، خطاب کی فرمائش کی چنانچہ احقر حاضر ہوا وہاں کے ذمہ داروں نے حُسنِ اخلاق کے ساتھ پذیرائی فرمائی۔ شیخ ابن باز بہت ہی مہربانی وعنایت سے پیش آئے۔ خطاب ہوا اور اس سے یونیورسٹی نے اثر لیا۔ امسال حاضری ہوئی تو پھر یونیورسٹی سے کاریں آئیں اور ہمیں لے گئیں، شیخ عبودی نے اپنے گھر خصوصی دعوت کی۔ امسال طلبہ کی خواہش پر طلبہ کے سامنے خطاب ہوا۔ اس سارے تین سالہ سلسلہ میں میرے لیے جو چیز انتہائی مسرت کا باعث ہوئی وہ یہ کہ آپ نے ان ذمہ داروں کو جامعہ دیوبند سے وابستہ فرمادیا اور شیخ ابن باز نے آپ سے اجازت حدیث حاصل کی۔ یہ خبر پورے دارالعلوم کے لیے خوشی ومسرت کا باعث ہوئی ہے۔ اس کی صورت حال کیا ہوئی، اسکی تفصیلات پر مطلع ہونے کو جی چاہتا ہے جو مزید خوشی اور مسرت کا باعث ہوگا اور جماعت کے لیے فخر کا سبب

بنے گا۔ گھر میں سب کو سلام مسنون، بچوں کو دُعا، حق تعالیٰ زیارت کا کوئی موقعہ باحسن احوال نصیب فرمائے جسکی تڑپ دل میں ہے۔ خلیفہ جی کو بہت بہت سلام مسنون اور مزاج پرسی۔ حاضرینِ وقت کو سلام نیاز اور استدعا رِ دعا اُمید ہے کہ مزاج گرامی بعافیت ہوگا۔ یہاں بحمداللہ بہمہ وجوہ خیریت ہے۔ میں پرسوں ہی سفرِ حج سے دیوبند پہنچا ہوں۔ لوگوں کی آمد و رفت اور ہجوم کی وجہ سے ارسالِ عریضہ کا موقع مذکورہ خوشی و مسرت ظاہر کرنے کیلئے جس طرح بن پڑا نکالا۔ حق تعالیٰ آپ جیسے حضرات کو بایں افادہ و فیض رسانی قائم رکھے اور مسلمانوں کو آپ کی ذات سے دینی فائدے حاصل ہوں۔ آمین۔ والسلام

محمد طیب از دیوبند ۲ ربیع‌الثانی ۸۹ھ

○

محذوم برادران زید مجدکم السامی

سلام مسنون نیاز مقرون۔ گرامی نامہ عدن سے چلا ہُوا ۲ اکتوبر ۱۹۶۲ء کو باعث شرف ہُوا۔ اس گرامی نامہ سے بوجوہ مسرت بے غایت حاصل ہوئی۔ اولاً آں محترم کا افریقہ پہنچ کر علمی اور دینی افادہ فرمانا اور وہاں کے لوگوں کو علم و اخلاق سے بہرہ انتہائی خوشی کا باعث ہُوا۔ الحمدللہ کہ اکابر کے علوم و کمالات آپ کے ذریعہ دُور دُور تک پہنچے۔ وذالك فضل الله۔ دوسرے برخوردار محمد رفیع سلمہٗ کی قابلیت اور مقبولیت انتہائی خوشی کا باعث ہوئی۔ حق تعالیٰ اُنکے علم و عمل اور عمر میں برکت عطا فرمائے اور یوماً فیوماً درجات عالیہ نصیب فرمائے اور اس کے ذریعہ آپ کی آنکھیں ٹھنڈی رکھے۔ آمین۔ تیسرے اس وجہ سے کہ مجھ جیسے کم علم بلکہ بے علم اور ناکارہ کی غلطیوں کی پردہ پوشی آپ نے فرمائی۔ اللہ تعالیٰ آپ کے مراتب بلند فرمائے۔ چوتھے آپ کے مستغنیانہ طرزِ عمل سے جو اہلِ علم کی حقیقی شان ہے اور جس کا قدرتی اثر مخاطبوں پر پڑنا لازمی ہے۔ حق تعالیٰ نے ان کی اصلاح فرمائی اور آپکے درجات بلند فرمائے۔

میری طرف سے برخوردار محمد رفیع سلمہٗ کو بہت بہت دُعا اور سب بچوں کو دُعا، گھر میں سب کو سلام میاں سالم و اسلم سلمہما سلام عرض کرتے ہیں۔ اعظم سلمہٗ آجکل علیگڑھ ہے۔ میں خود بھی آج ایک طویل سفر پر جا رہا ہوں۔ دُعا کا محتاج اور ملتجی ہوں آپ جنات عدن سے فردوس بریں میں جا رہے ہیں۔ خدا کرے کہ ہم جیسے ناکارہ دعاؤں میں یاد رہے ہوں۔ یہ عریضہ کراچی ہی کے پتہ سے بھیج رہا ہوں۔

میں مصر سے واپسی پر عدن اترا تھا، مگر کوئی شناسا وہاں نہیں تھا اور ہوگا تو میرے علم میں نہ تھا۔

اس لیے ہوٹل میں ٹھہرے تھے صرف دو شب قیام تھا۔ عدن میں یہ یوسف پارک کون ہیں؛ ایک یوسف پارک تو ڈربن میں تھے شاید وہ تو نہ ہوں گے۔ ان کا اگر پتہ معلوم ہو جائے تو احتیاطاً اسے درج کر لیا جائے گا غیر ملک کے سفر میں ایسی نوبتیں آتی ہیں ممکن ہے کہ کسی وقت ضرورت اور نوبت آئے تو ان سے ملاقات ہو سکے گی۔ اس لیے ان کا پتہ لکھ دیا جائے بلکہ انھیں تعارفی خط بھی اگر لکھ دیا جائے تو بہتر ہو اور سب سے زیادہ بہتر یہ ہو گا کہ آپ کے خط پہنچنے پر خود ان کا میرے نام خط آجائے جس میں براہ راست وہ اپنا تعارف کرا دیں۔ امید ہے کہ اب مزاج سامی بعافیت ہو گا۔ حق تعالیٰ باحسن احوال ملاقات نصیب فرمائے۔ ہمارا قصہ وکتا کندہ مانی جبتہ کا سا ہو گیا ہے۔ والخیر فیما وقع وفیما یقع انشاء اللہ تعالیٰ پرسان حال حضرات کی خدمات میں سلام مسنون۔ خلیفہ جی سے ملنا ہوا تو سلام فرما دیں۔ والسلام

محمد طیب از دیوبند ۲۲ ربیع الثانی ۸۲ھ

○

حضرت المحترم اخی مکرم زید مجدکم

سلام مسنون نیاز مقرون۔ مزاج گرامی۔ گرامی نامہ باعث شرف ہوا۔ مسائل کے سلسلہ میں جو تحریر فرمایا وہ بہت ہی مناسب اور بر وقت بات ہے۔ ان دن میں دارالافتاء کو لکھا سب نے اسے پسند کیا مگر وہاں کے حضرات نے یہ تحریر فرمایا کہ اس کی شکل کیا ہو جس پر میں نے لکھا کہ فی الحال دو کام کر لیے جاویں۔ ایک مسائل کے عنوانات مشخص کر کے ان کی فہرست بنالی جاوے۔ دوسرے ان حضرات علماء کی ایک فہرست بنالی جاوے جس سے استشارہ کیا جاوے گا۔ اس پر آج دونوں فہرستیں موصول ہوئی ہیں۔ اصولاً میں نے یہ عرض کیا تھا کہ عموماً نئے ذہن کے علماء حالات سے مرعوب ہو کر انھیں اصل بنا لیتے ہیں اور مسائل کو تابع حالانکہ برعکس ہونا چاہیے کہ مسلک اور مسائل اصل رہیں اور پھر امکانی حد تک اور تا بحد تحفظ مسلک حالات کی رعایت ہو ساتھ ہی ایک ہے وقتی حالات کے تحت مسئلہ کی صورت تبدیل اور ایک ہے مسئلہ اپنی جگہ قائم رکھتے ہوئے کسی خاص صورت یا خاص احوال کے تحت استثنائی صورت دیا جانا، پہلی صورت کسی طرح جائز ہو گی دوسری میں گنجائش ہو گی۔ مگر استثناء خود کوئی قانون نہیں ہوتا کہ اسے اصول اور کلی شکل دی جائے۔ بہرحال ان اصول کو سامنے رکھ کر مسائل کی تشریح ہونی چاہیے۔ اب جو شکل بھی حضرات مفتیان کرام تجویز فرمادیں گے اسی کی اطلاع دوں گا اور ساتھ ہی بندہ بھی انشاء اللہ مسائل؟

اس وقت سردی شدید نے قلم چل نہیں رہا ہے نہ کشش صحیح آرہی ہے نہ منجمد ذہن ہی کچھ چل رہا ہے اس لیے فی الحال اسی پر قناعت کرنے پر مجبور ہوں۔ بچوں کو دعاء گھر میں سب کو سلام مسنون، عید مبارک۔ آپ حضرات نے عید میں پہل کی، ہندوستان میں کم ہی جگہ ہے کہ ۲۹ کا چاند ہوا ہو، عامۃً عید جمعہ کی ہوئی سب کو عید کی مبارکباد پہنچا دی جائے۔

میں آج حیدرآباد بنگلور اور مدراس کے سفر پر جارہا ہوں چونکہ کھانسی نزلہ اور کچھ بخار کی کیفیت ہے مگر وعدے میں نہ جانے سے سب کو مایوسی ہوگی اس لیے سفر کیا جارہا ہے، دعاء کا خواستگار ہوں۔ والسلام

محمد طیب از دیوبند ۲ پنجشنبہ

○

اخی الکرم حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب مفتی پاکستان زید فضلہم

سلام مسنون نیاز مقرون مزاج گرامی۔ نو کتابیں مرسلہ آں محترم موصول ہوئیں، اوّل تو دارالعلوم کے لیے ہدیہ اور وہ بھی خالص علمی اور اس پر بھی دینیات اور اسلامیات کے سلسلے کی باعث صد مسرۃ و خوشی ہوئی حق تعالیٰ آں محترم کے فیضان کو ابدی بنائے، مزاج کے بارہ میں کیا پوچھوں، اپنے اوپر قیاس کرتا ہوں بڑھاپا تو عرصہ سے آیا ہوا ہے اب اپنے پورے آثار کے ساتھ نمایاں ہے، دعاء حسن خاتمہ فرمادیں، اب پھر کچھ راستے کھلنے کی اُمید ہوگئی ہے، دل چاہتا ہے کہ کم از کم ایک بار دوستوں اور عزیزوں کی زیارت میسر ہوجائے زیادہ ہو تو مزید فضل خداوندی ہوگا۔ دارالعلوم میں بحمداللہ بہمہ وجوہ خیر و عافیت ہے، آج کل تعطیل ہے اور احاطے خالی ہیں، دارالعلوم کے حق میں دُعاء کی استدعا کی زیادہ ضرورت ہے۔ آپ حضرات اجزاء دارالعلوم ہیں، جزء اپنے کل کو کیسے بھول سکتا ہے، علمی ہدایا کا پہنچتے رہنا اس کا شاہد عدل ہے۔

برخورداران سلیم کو دعائیں۔ سالم اسلم سلام مسنون عرض کرتے ہیں، اعظم سلمہ علیگڑھ یونیورسٹی میں پروفیسر ہوگیا۔ دینی حالت مستقیم الحمدللہ مستقیم ہے، اس کے لیے خصوصیت سے دُعاء استقامت فرمادیں۔ پُرسان حال حضرات کی خدمات میں سلام مسنون، پہلے خصوصیت سے خلیفہ جی کا ذکر آتا تھا وہ اللہ کو پیارے ہوگئے۔ اب جو بھی پُرسان حال سامنے ہو، بشرط یاد سلام و استدعاء دُعاء فرمادیں۔ والسلام

محمد طیب از دیوبند

۲۹ ش ۹۴ھ

مکاتیب حضرت مولانا ظفر احمد عثمانی صاحب رحمۃ اللہ علیہ

مکرمی المحترم! دام فضلکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ،

* دستور قرآنی کا بغور مطالعہ کیا، بحمد اللہ آیات واحادیث سے استدلال صحیح پایا، جزاک اللہ تعالیٰ خیر الجزا میں نے حسب ارشاد بعض دفعات کا بھی اضافہ کر دیا ہے اور بعض مقامات پر آیات واحادیث بھی بڑھا دی ہیں جو جو دفعات مذکورہ رسالہ کی مزید تائید میں ہیں یا مزید دفعات کو مفید ہیں مناسب سمجھیں تو آئندہ ایڈیشن میں ان کا اضافہ کر دیا جائے اس کے ساتھ میں اپنا خطبہ[عہ] بھی بھیج رہا ہوں، آپ کا رسالہ علم وحکمت پر مشتمل ہے اور میرا خطبہ زجر وتوبیخ پر دونوں کو ملا کر مولانا محمد یعقوبؒ کا یہ شعر صادق آگیا ؎

الوعظ ینفع لوبا العلم والحکم — والسیف ابلغ وعاظ علی القمم

والسلام، ظفر احمد عفی عنہ از ڈھاکہ ۱۸ محرم ۱۳۷۳ھ ۲۸ ستمبر ۵۳ء

(اضافہ کردہ احادیث)

ابوبکرۃ عصمنی اللہ بشئ سمعتہ من النبی صلی اللہ علیہ وسلم لما ھلک کسریٰ قال من استخلفوا؛ قالوا ابنتہ فقال لن یفلح قوم ولّوا امرھم امرأۃ فلما قدمت عائشۃ یعنی البصرۃ ذکرت قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم فعصمنی اللہ بہ" للترمذی والنسائی وللبخاری لقد نفعنی اللہ بکلمۃ سمعتہا من النبی صلی اللہ علیہ وسلم ایام الجمل بعد ما کدت ان الحق باصحاب الجمل فاقاتل معھم بنحوہ

ابوھریرۃ، رفعۃ اذا کان امراءکم خیارکم واغنیاءکم سمحاءکم وامورکم شوریٰ بینکم فظھر الارض خیرلکم من بطنہا واذا کانت امراءکم شرارکم واغنیاءکم بخلائکم وامورکم الی نساءکم فبطن الارض خیرلکم من ظھرھا للترمذی (الاحادیث کلہا جمع الفوائد

عہ یہ خطبہ اردو اور انگریزی دونوں میں چھپ گیا ہے اور ممبران اسمبلی کو بھیج دیا گیا ہے۔

باب الخلافۃ و الامارۃ) نوٹ : اس سے عورتوں کو اسمبلی اور مجلس شوریٰ میں شریک کرنا ممنوع ہو گیا اور یہ جو بعض احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی وقت حضرت ام سلمہؓ وغیرہ سے مشورہ کیا یا صحابہ نے امہات المومنین سے مشورہ کیا تو وہ مشورہ امور سیاست میں نہ تھا بلکہ مسائل شرعیہ میں تھا جو متعلق عبادات کے ہے اور کبھی کسی سمجھدار عورت سے امور سیاسیہ میں مشورہ کرنے کا بھی مضائقہ نہیں مگر اس کو باضابطہ مشیر یا وزیر یا سفیر بنانا خلاف سیاست اسلام ہے اور فتنوں کا دروازہ ہے۔

ابو سعید رفعہ ، احب الناس الی اللہ یوم القیٰمۃ وادناھم منہ مجلساً ، امام عادل و ابغض الناس الی اللہ ابعدھم منہ مجلساً ، امام جائر للترمذی . نوٹ : معلوم ہوا کہ حکومت عدل اعلیٰ درجہ کی عبادت ہے اور حکومت ظلم بدترین معصیت ہے۔

ابو داؤد . قال لہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یا اباذر انک ضعیف وانھا (ای العمل للامارۃ) امانۃ وانھا یوم القیٰمۃ خزی وندامۃ الامن اخذھا بحقھا وادی الذی علیہ لمسلم نوٹ : اس سے معلوم ہوا کہ حکومت اور اس کا ہر منصب امانت ہے۔

عبد الرحمٰن بن سمرۃ رفعہ یا عبد الرحمٰن لا تسأل الامارۃ فانک او تیتھا عن مسئلۃ وکلت الیھا وان اعطیتھا من غیر مسئلۃ اعنت علیھا للستۃ الا مالکا۔

ابو موسیٰ رفعہ قال انا واللہ لا نولی ھذا العمل احدا سألہ او احدا حرص علیہ للشیخین و ابی داؤد والنسائی . نوٹ : اس سے موجودہ الیکشن کی صورت کا عدم جواز ظاہر ہے . جریر قال لہ ذو عمرو (الحمیری من ملوک الیمن) یا جریر ان لک کرامۃ و انی مخبرک خبرا ، انکم معشر العرب لن تزالوا بخیر ما کنتم اذا ھلک امیر تأمرتم فی آخر فاذا کانت بالسیف کانوا ملوکا یغضبون غضب الملوک ویرضون رضی الملوک (للبخاری) نوٹ : معلوم ہوا کہ انتخاب آزادانہ ہونا چاہیے اس میں کسی قسم کا دباؤ نہ ہونا چاہیے . ورنہ جمہوریت نہ ہوگی ملوکیت ہوگی۔

جبیر بن نفیر وغیرہ رفعوہ ، اذا ابتغی الامیر الریبۃ فی الناس افسدھم لابی داؤد ریبہ سے مراد وہ طرز عمل ہے جس سے ہر شخص امیر کی طرف سے غیر مطمئن ہو . آجکل اسی طرز عمل کو پالیسی یا ڈپلومیسی کہتے ہیں . سیاست اسلام اس سے منع کرتی ہے . حکومت کو ایسا طرز عمل اختیار کرنا چاہیے جس

سے ہر شخص مطمئن ہو کہ میرے ساتھ عدل و انصاف کے خلاف کچھ نہ ہوگا۔ سیفٹی ایکٹ کو ہم اس بیرمیں داخل سمجھتے ہیں جس سے حضورؐ نے منع فرمایا ہے کیونکہ اس سے ہر شخص غیر مطمئن ہے۔

ابن عمر رفعه. اذا تبايعتم بالعينة ولخذتم اذا ناب البقر و رضيتم بالزرع وتركتم الجهاد سلط الله عليكم ذلا لا ينزعه عنكم حتى ترجعوا الى دينكم

لابی داؤد۔

نوٹ: سیاست اسلام کا ثمرہ اگر یہ کہ جذبۂ جہاد کم نہ ہونے پائے تو جبھی ہو سکتا ہے جبکہ دستور و قانون موافق شریعت ہو ورنہ جذبۂ جہاد باقی نہ رہے گا صرف جذبۂ جنگ ہوگا جیسا کفار میں ہوتا ہے اور یہ شریعت کا مقصد نہیں، جذبۂ جہاد دفع فساد و منکرات کا نام ہے۔ جذبۂ جنگ اپنی رفعت قومی و وطنی کی بقا کا نام ہے۔

معاوية رفعة لا تقدس امة لا يقضى فيها بالحق ويأخذ الضعيف حقه من القوى غير متعتع (للكبير) اس سے معلوم ہوا کہ عدل و انصاف مفت ہونا چاہیئے تاکہ مظلوم ظالم سے اپنا حق بے تکلف لے سکے۔

○

(۲) ۱۱ ربیع ۲ - ۱۳۷۶ھ

مکرمی المحترم! السلام علیکم و رحمۃ اللہ

طالب خیر بحمد اللہ مع الخیر ہے مگر درون سے اضطرابی حالت میں ہوں، آپ کے سامنے آیات و احادیث کا پیش کرنا لقمان کو حکمت سکھلانا ہے مگر دردِ دل مجبور کر رہا ہے کہ کچھ کہوں، تبلیغ کی ضرورت مجھ سے زیادہ آپ بھی جانتے ہیں، حضرت حکیم الامت قدس سرہٗ نے تفہیم المسلمین میں جس طرح اس پر زور دیا ہے، وہ بھی آپ پر روشن ہے۔ تبلیغ کی فکر اور دھن میں لگ جانا لازم اور ضروری اور بہت ضروری ہے۔

ایک عرصہ سے میں متفکر ہوں اور حسب فرصت و ہمت صیانۃ المسلمین کے طریقہ پر کام بھی کر رہا ہوں جو طریقہ نظام الدین دہلی سے مولانا الیاس صاحب مرحوم کی جماعت چلا رہی ہے بلا شبہ اس سے بھی عوام میں دین کی عظمت بڑھ رہی ہے مگر اس آئندہ کی فکر ضروری ہے اگر صحیح فکر نہ کی گئی تو آئندہ قوی تر نقصانات کا اندیشہ ہے اور قیامت میں علماء سے بھی مواخذہ کا خطرہ ہے۔

ممکن ہے جناب کو مجھ سے زیادہ اس کا احساس ہو مگر اقدام میں کچھ لیت و پیش ہو رہا ہو اس لیے عرض ہے کہ اس وقت مضبوط مؤثر اور بے ضرر اقدام کی ضرورت ہے کیونکہ

(۱) سیاسیات کے جھگڑوں سے میدان صاف ہو چکا ہے (۲) تبلیغی جد و جہد کے لیے راستہ ہموار ہے (۳) قوم کا معاملہ ایک یا چند شخصیتوں کے ہاتھوں میں سمٹ کر آ گیا ہے (۴) فوجی ذہنیت پیچھے ہٹنا نہیں جانتی۔ اگر خدانخواستہ اس وقت کسی غلط چیز کی بنیاد پڑ گئی جیسا کہ صحیح رہبری کے نہ ہونے کی صورت میں قوی اندیشہ ہے تو پھر تلافی دشوار ہو گی (۵) ابھی تک بنیادیں خالی ہیں، صحیح رہبری کی سخت ضرورت ہے (۶) اگرچہ صحیح طلب موجود نہ ہو مگر رہبری کے محتاج ضرور ہیں اور تبلیغ سے نفع کی امید قوی ہے (۷) مسلمان دین سے بیزار اور علماء سے متنفر نہیں ہیں مگر ان کو متنفر بنانے کی کوشش کی جا رہی ہے اس لیے ضرورت ہے کہ اس وقت کوئی خدا کا بندہ کھڑا ہو اور درد دل کے ساتھ اللہ جل شانہ پر بھروسہ کر کے کھڑا ہو تو نصرت الٰہی ضرور اس کی ہو گی۔

جواب کا منتظر ہوں تاکہ جلد از جلد اس کام کی ابتدا کی جا سکے۔ والسلام

ناچیز ظفر احمد عثمانی عفا عنہ

○

(۳)

۷ صفر ۱۳۸۵ھ

بعد الحمد والصلوٰۃ۔ بندہ نے "اسلام کا نظام اراضی" مؤلفہ حضرت مولانا محمد شفیع صاحب مدظلہ اول سے آخر تک دیکھا۔ ماشاء اللہ نظام اراضی کے باب میں بہترین کتاب ہے جس میں کتب فقہ اور تاریخ سے اسلامی نظام کو بخوبی واضح کیا گیا ہے جس سے اسلام کے عدل و انصاف اور فاتحین اسلام کے اعلیٰ کردار پر روشنی پڑتی ہے اس باب میں اردو زبان میں یہ پہلی کتاب ہے اللہ تعالیٰ حضرت مؤلف سلمہ کو جزائے خیر عطا فرمائیں اور ان کے فیوض علمی و عملی تا دیر سلامت رکھیں۔ امید ہے کہ مسلمانوں کا ہر طبقہ اس سے مستفید ہونے کی کوشش کرے گا۔

ظفر احمد عثمانی

○

(۴)

مکرمی! السلام علیکم ورحمۃ اللہ
کیا آپ نے مجھے رات یاد کیا تھا؟ مغرب کی نماز میں آپ کی طرف بہت کشش ہوئی اور نماز کے بعد دیر تک آپ کی صورت سامنے رہی، اس کشش سے قلب کو بہت سکون واطمینان وانشراح وبرد حاصل ہُوا بارک اللہ فیکم وفی انفاسکم وفیوضکم وبرکاتکم. آمین

ظفر احمد عثمانی عفا عنہ ۹ ذیقعدہ ۱۳۸۸ھ

مکرمی! السلام علیکم ورحمۃ اللہ
اسی بدھ جمعرات گذشتہ کو میں مولانا رومیؒ کا اس شعر کا مصداق بنا ؎

بردل سالک ہزاراں غم بود گر زباغ دل خلالے کم بود

تو مولانا ہی کے اس شعر پر عمل کیا ؎

غم چو بینی زود استغفار کن غم بامر خالق آمد کار کن

تو شب جمعہ میں بحالت سجدہ بحمد اللہ بسط نصیب ہُوا اور پہلے سے بھی زیادہ انبساط ہُوا۔ حضرت حکیم الامۃؒ کا ارشاد ہے کہ اگر کوئی پریشانی پیش آئے اور شیخ پاس نہ ہو یا وفات پاگئے ہوں تو اہل سلسلہ سے مشورہ کیا جائے اور دعا طلب کی جائے اس لیے میں آپ سے دعا کی درخواست کرتا ہوں، میرا دل کہتا ہے کہ آپ کی دعا سے بہت فائدہ ہوگا نیز یہ بھی مشورہ دیجئے کہ حج کی درخواست کے لیے یہ قید ہے کہ جو حج کر چکے ہیں وہ درخواست نہ دیں اور میں اس ربیع الاول ۱۳۸۸ھ میں اسی سال کی عمر میں داخل ہو گیا ہوں اب خیال یہ ہے کہ بقیہ ایام حیات حرمین شریفین میں گزاروں جس کے لیے پہلے حرمین جاکر اقامہ حاصل کرنا اور مکان کا انتظام کرنا ضروری ہے پھر اہل وعیال کو بلاوں یا خود آکر لے جاؤں اس کی کیا صورت ہو۔ آخر میں پھر دعا کی درخواست ہے۔ بارک اللہ فیکم وجعل اللہ آخرتکم خیرا من الاولیٰ۔ والسلام

ظفر احمد عثمانی ۱۲ ربیع ۲ ۱۳۸۸ھ

○

عزیزم مولوی محمد تقی سلمہ۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ
آپ کا عزیز نامہ ملا۔ کوشش کروں گا کہ آپ کے سوالنامہ کا جواب لکھ دوں مگر سفر کے مہینہ

میں مجھے آب چشم کی شکایت ہوگئی تھی، اب وہ شکایت تو نہیں رہی مگر اب تک بینائی اپنے حال پر نہیں آئی، دوا ہو رہی ہے اور تدریجاً بینائی بڑھ رہی ہے اس لیے زیادہ لکھنے پڑھنے سے احتیاط کر رہا ہوں، دعا کرتے رہیں

والسلام　　　　　　　　ظفر احمد عفا عنہ

(۵)

مکرمی المحترم مولانا مفتی محمد شفیع صاحب دام مجدکم

السلام علیکم و رحمۃ اللہ

گرامی نامہ کا جواب اسی دن لکھ دیا تھا تعطیل ڈاکخانہ کی وجہ سے دیر میں ملا ہوگا، آج دوسرا گرامی نامہ موصول ہوا، جواباً عرض ہے (۱) انجاء الوطن کی طباعت جدیدہ کے لیے جو رقم انھوں نے طلب فرمائی ہے اس کے بارے میں لکھ دیا تھا کہ علی منظر نقوی کے پاس قریباً چار ہزار روپیہ میرا ہے جو اعلاء السنن حصہ اول کی طباعت کے لیے مسودہ کے ساتھ مجھ سے وہ لے گئے ہیں مگر اب روپوش ہیں، اگر اس سے رقم وصول ہوگئی تو ارسال خدمت کر دوں گا اور اعلاء السنن حصہ اول کا مسودہ بھی کہ آپ ہی اس کو طبع کرا دیں اور اس رقم سے جزواً جزواً اعلاء السنن کو ٹائپ میں چھپواتے رہیں، دعا کیجیے کہ نقوی صاحب سے رقم وصول ہو جائے اور مسودہ بھی، میرے آدمیوں کو تو وہ ملتے ہی نہیں، آپ کے خادموں میں کوئی پتہ لگائے اور پتہ سے اطلاع دے دے تو اپنے آدمیوں کو ان کے پیچھے لگا دوں، اقبال احمد صاحب ایڈووکیٹ نے بھی وعدہ کیا تھا کہ پتہ لگا کر ان کو باقاعدہ نوٹس دیں گے، اگر وہ ڈھاکہ سے آ گئے ہیں تو ان پر بھی تقاضا کیا جائے۔

(۲) انجاء الوطن کا دوسرا حصہ نہ تالیف ہوا نہ طبع ہوا، بس ذہن میں ہے کہ اگر موقع ملا تو صرف بار تک پہنچا دوں گا مگر کتاب الانساب للسمعانی یہاں میرے پاس نہیں اس میں حنفیہ کا تذکرہ ہر نسبت میں مل جاتا ہے۔

(۳) انہاء السکن حصہ ثانی میں نے عبدالفتاح صاحب کو بھیج دیا ہے مگر یہ لکھنا بھول گیا کہ کتابت کی غلطیاں رہ گئی ہیں وہ خود اپنی فراست سے ان کو صحیح کر دیں، غلط نامہ بھی نہیں بنا۔

(۴) انجاء الوطن کے ڈھائی سو نسخوں کی اندازاً کیا قیمت ہوگی اس کے بعد ہی کچھ کہہ سکتا ہوں۔ انجاء الوطن عن الازدراء بامام الزمن حضرت حکیم الامتؒ کا تجویز کردہ ہے، اس کے قریب عبدالفتاح صاحب کا نام ہے وہی رکھ دیا جائے یعنی احسن البیان فی الدفاع عن ابی حنیفۃ النعمان پہلے خط کے جواب پر آپ کی

رائے کیا رہی ؛ اور اس خط میں جو باتیں جواب طلب ہیں، ان کے بارے میں جو رائے ہو اطلاع دیں۔ والسلام

ظفر احمد عثمانی ۸ شوال ۱۳۹۰ھ

○

مکرمی المحترم ! مولانا مفتی محمد شفیع صاحب دام فیضہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ

اسی ماہ میں ایک خواب دیکھا ہے جس کی تعبیر سے مطلع فرمائیں، میں نے دیکھا کہ حضرت حکیم الامت قدس سرہ اپنی جگہ سہ دری میں تشریف فرما ہیں بندہ بھی حاضر خدمت ہوا تو فرمایا الحمد للہ میرا خادم آگیا، میں حضرت سے مل کر اپنی جگہ اسی حجرہ میں گیا جہاں بیٹھا کرتا تھا اور تصنیف و تالیف کے کام میں لگ گیا، پھر حضرت سے عرض کیا کہ مظاہر علوم سہارنپور والے طلبہ کا امتحان لینے کو بلا رہے ہیں، اجازت ہو تو میں سہارنپور جاکر طلبہ کا امتحان لے لوں، اجازت مل گئی اور میں مظاہر علوم سہارنپور میں پہنچ گیا پھر یاد نہیں کہ امتحان لیا یا نہیں آنکھ کھل گئی، بے تکلف جو بات ذہن میں آجائے اس سے اطلاع دیں، میرے ذہن میں جو کچھ آیا اس کے بعد میں اطلاع دوں گا۔ والسلام

ظفر احمد عثمانی عفا اللہ عنہ ۲۵ ذی الحجہ ۱۳۹۰ھ

○

مکرمی المحترم ! السلام علیکم ورحمۃ اللہ

میں کراچی ڈیڑھ مہینہ رہا، گھر میں چھوٹی اہلیہ کو اورسل کا مرض ہو گیا تھا، اب بحمد اللہ بالکل اچھی ہیں اسی زمانے میں آپ مرض دل میں مبتلا ہو کر اسپتال کی تیسری منزل پر تھے جہاں میرا جانا مشکل تھا، پیام و سلام پہنچاتا رہا، جب میں وہاں سے روانہ ہوا معلوم ہوا آپ گھر پر تشریف لے آئے ہیں مگر ملنے کا وقت نہ تھا، اب طبیعت کیسی ہے روزانہ سورۂ برأت کی آخری دو آیتیں لقد جاءکم رسول من انفسکم رب العرش العظیم تک صبح و شام ایک بار اور بہتر ہے کہ تین بار پڑھتے رہیں اور آیت کریمہ لا الٰہ الا انت سبحٰنک انی کنت من الظٰلمین روزانہ چالیس بار پڑھتے رہیں، عمر دراز اور صحت و عافیت رہے گی، آپ کی حیات طویلہ مسلمانوں کے لیے ضروری ہے، قوت قلب کے لیے شغل پاس انفاس بہترین چیز ہے، اوپر کے سانس میں اللہ نیچے کے سانس میں ھُو کا تصور کیا جائے اور اتنی مشق ہو جائے کہ سانس

اس کے بغیر نہ آئے، شاید آپ نے یہ شغل نہیں کیا۔

اب ایک خواب سنیے اس کی تعبیر سے مشرف فرمائیں۔ میں نے دیکھا تھانہ بھون میں ہوں اور خانقاہ میں ہوں وہاں خواجہ صاحب مولوی شبیر علی صاحب مولانا محمد عیسیٰ صاحب حکیم محمد مصطفیٰ صاحب بھی ہیں ان کا ہونا یاد ہے اور بہت سے ذاکرین وشاغلین بھی ہیں، ہم چاروں پانچوں حضرت کی سہ دری میں ہیں حضرت کی جگہ خالی ہے میں نے کہا اگر آپ حضرات اجازت دیں تو میں حضرت کی جگہ بیٹھ جاؤں، اس وقت وہ ڈسک بھی وہاں رکھا ہے جو حضرت کے سامنے رہتا تھا اور آجکل میرے پاس ہے، خواب میں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ تھانہ بھون دارالاسلام میں آگیا ہے، ان بزرگوں میں سے خواجہ صاحب بولے کہ آپ حضرت کی جگہ بیٹھ جائیں چنانچہ میں بیٹھ گیا اور لکھنا شروع کیا، پہلا مضمون جو لکھا ہے وہ یہ تھا کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ حضرت سلمہ بن الاکوع صحابی کو حکم دیتے ہیں کہ بعد رمضان شملہ پہنچ جائیں وہاں حملۂ کفار کا خطرہ ہے، خواب میں ایسا معلوم ہوا کہ شملہ بھی پاکستان میں ہے اور یہ مہینہ رمضان کا ہے۔ ۱۸ تاریخ رمضان کی تھی، اس پر ان بزرگوں میں کوئی صاحب بولے کہ رمضان میں شملہ سمجھوتہ ہوا ہے اور رمضان ہی میں شملہ پر جہاد کا حکم ہو رہا ہے۔ والسلام مع الاکرام

ظفر احمد عثمانی عفا اللہ عنہ

مکاتیب حضرت مولانا مفتی محمد حسن صاحب جامعہ اشرفیہ لاہور

بخدمت شریف حضرت مخدومی ومخدوم العلماء دام ظلکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ

والا نامہ نے مشرف فرمایا۔ دارالعلوم کے افتتاح کی شرکت کا وعدہ جس وقت کیا تھا اس وقت طاقت سفر کی تھی، اب طبیعت بہت کمزور ہو چکی ہے۔ کل حوائج چارپائی پر ادا کرتا ہوں۔ باقی جلسہ پر تشریف لا کر ملاحظہ فرماویں گے اگر آپ کی دعا رکرامت سے سفر کی طاقت ہو جاوے تو دل وجان سے حاضر ہوں گا۔

نیز جو تاریخ افتتاح کی جناب نے لکھی ہے۔ جامعہ اشرفیہ کے بعد خیرالمدارس کے جلسہ کی تاریخ ہے۔ مولانا خیر محمد صاحب نے جناب کو ملتان دعوت دے دی اور سنا ہے کہ آپ نے منظور بھی فرما لیا ہے۔ قاری طیب صاحب قبلہ کی بھی کوشش ہو رہی ہے کہ پاکستان تشریف لاویں اور افتتاح میں بھی ہوں۔

مولانا محمد ادریس صاحب و مولانا خیر محمد صاحب کا ہونا بھی باعث برکت ہوگا میری حاضری ضرور ہوگی بدنی یا رُوحانی۔

برخوردار محمد زکی سے ملاقات ہی ہو گئی، وہ بھی عریضہ پیش کریں گے۔ والسلام

محمد حسن

○

بخدمت شریف مخدومی و مخدوم الکل السلام علیکم ورحمۃ اللہ

مدرسہ کا جلسہ ۱۵ مارچ کو ہے۔ ہو سکے تو قبل تشریف لادیں۔ بہت سے امور قابل مشورہ ہیں فتنہ کا ذریعہ علماء ہیں۔ الا ماشاء اللہ

زندگی تلخ ہو گئی ہے، فکر آخرت جو اصلی دولت ہے اس کی طرف تو توجہ بھی نہیں، احقر کے ضعف کا کوئی کنارہ نہیں۔ والسلام

محمد حسن

○

مخدومی و مخدوم العلماء السلام علیکم ورحمۃ اللہ

صاحبزادی صاحبہ کے انتقال کی خبر بدت سے سُن کر صدمہ ہوا۔ آپ کی علالت کی خبر برخوردار حافظ عبدالرحمٰن سے سُنی۔ حق تعالیٰ صحت کاملہ عطا فرماویں اور مصائب میں صبر جمیل عطا فرماویں۔ احقر پر فالج کا اثر کافی باقی ہے۔ حوائج ضروریہ فرش پر ہی کر رہا ہوں۔

برخوردار محمد زکی سے ملاقات نہیں ہوئی۔ دُعا کی درخواست ختم کر رہا ہوں۔

محمد حسن

○

بخدمت شریف حضرت مخدومی و مخدوم العلماء و الصلحاء کثر اللہ امثالکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ

جناب والا کے رسائل دستور اسلامی کے متعلق اور اشتہار و خطوط شریفہ مسلسل پہنچ کر موجب شاد ہوئے حق تعالیٰ نے آنجناب کو خدمت دین ہی کے لیے پیدا فرمایا ہے اور آپ سے کام لے رہے ہیں۔ ذالک من فضل اللہ

اور آپ کی قدرت میں ان کا ترک نہیں۔ لاکھ لاکھ
مرتبہ شکر کریں تو بھی شکر ادا نہ ہوگا یہ بھی درجہ استحضار میں ہوگا کہ کام مطلوب ہے ثمرہ چونکہ غیر اختیاری ہے،
مطلوب نہیں، اس واسطے اس کا قلق بھی حد اعتدال سے زائد نہ ہوگا اور جو ثمرہ اصلی مطلوب ہے، رضاء حق
اس کا تخلف ناممکن ہے اور یہی دولت ہے جس پر دنیا بھی لاکھ مرتبہ نثار ہے۔ حق تعالیٰ آپ کی اعانت بیش از بیش
فرماویں اور ہر فتنہ سے محفوظ فرماویں۔ مولانا داؤد غزنوی اور علامہ آپ کی خدمت میں پہنچ گئے ہوں گے۔ برخوردار
سعادت آثار محمد تقی سلمہ یہ احقر سے شرح تہذیب اور شرح جامی کے کچھ سبق پڑھتا رہا۔ کل غالباً دیوبند چلا گیا ہوگا۔
برخوردار محمد ذکی سلمہ بھی ملتے رہتے ہیں۔ تقی سے معلوم ہوا کہ اب ہمشیرہ کی طبیعت اچھی ہے۔ بخار اتر
گیا ضعف باقی ہے۔ احقر کے خط کے کچھ اجزا یقیناً راحکمت آموختن کی مثال کو تازہ کرتا ہے اور معافی کی
طلب کرتا ہوں بوجہ غایت مجبوری کے قدموں میں نہیں پہنچ سکا۔

احقر محمد حسن ۲۵، نومبر

(۰)

بخدمت شریف مخدومی ومحترمی دام مجدکم السامی آمین

السلام علیکم ورحمۃ اللہ

والانامہ نے مشرف فرمایا۔ بہت دنوں سے ارادہ کر رہا تھا کہ خدمت اقدس میں عریضہ لکھوں خصوصاً مولانا
خیر محمد صاحب کی واپسی کراچی سے حال معلوم کر کے بہت مسرت ہوا۔ اب تین ضرورتیں پیش ہیں۔ جمعیت کی
تنظیم اور دستور کے متعلق پر کچھ غور و فکر اور اجتماع اور دار العلوم کراچی کی بنیاد کا مبارک آغاز۔ احقر تو کسی کام
کا نہیں اور اس کا احباب کو بھی علم ہے۔ ہاں دعا کے لیے لیاقت کی ضرورت نہیں اور اس کے لیے خاص سفر کی
ضرورت بھی نہیں۔ آپ کا دل شاید احقر کی ملاقات کو اتنا نہیں چاہتا ہے جتنا اس عاجز کا لیکن جہت سفر کی
بالکل نہیں پر یہی کوشش بھی ہے کہ حسب الحکم قدموں میں پہنچوں۔ یہ اس وقت کا حال اور اس وقت میں اگر
کوئی سماوی مانع نہ ہوا تو یہی کوشش ہے کہ حاضر خدمت ہوں۔

مولانا اطہر علی کا گرامی نامہ بھی ارسال ہے مجھ کو ان کا پتہ نہیں۔ آپ ان کو جواب ارشاد فرماویں دستور
کے متعلق اجتماع اگر اسی وقت ہو جائے تو زیادہ بہتر ہوگا۔ مولانا داؤد غزنوی نے آپ سے فون پر مشورہ کیا ہوگا
آپ ان سے اس اجتماع کے متعلق طے فرما کر عمل فرماویں۔ باقی بوقت تلاقی ان شاء اللہ۔ محمد حسن

بخدمت شریف مخدومی ومحترمی دام فیوضہم وعافکم آمین

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ؛

برخوردار سعادت آثار محمد ذکی سلمہ اللہ سے آپ کی بیماری کا سن کر ہوش وحواس معطل ہے اس کا تصور بھی کرنا ہی موت ہے کہ اس الحاد کے زمانہ میں خدانخواستہ آپ اور آپ کے امثال غائب ہو جائیں تو پھر کیا ہوگا دل سے دعا اور بار بار دعا ہے کہ حق تعالیٰ آپ کو سلامت باکرامت ہم پر سایہ افگن فرما دیں۔

آپ کا مضمون مولانا ظفر احمد صاحب کے متعلق برخوردار محمد ذکی کے قلم سے لکھوا کر احقر نے اپنے دستخط کر کے برخوردار مذکور کے حوالہ کیا کہ ہوائی جہاز بذریعہ رجسٹری ڈھاکہ روانہ کریں۔ مولوی داؤد صاحب غزنوی اور مولوی احمد علی صاحب کو بھی عرض کر دیا۔ ۲۰ شوال ملتان جمعیۃ اسلام پنجاب مشورہ کر کے دو نمائندے کراچی روانہ کر دے گی۔ آپ مولانا ظفر احمد صاحب اور اطہر علی صاحب کو خود بھی لکھیں اور ان کی مالی مدد بھی۔

محمد حسن

مکاتیب شیخ الحدیث حضرت مولانا زکریا صاحب مدظلہم

مکرم ومحترم حضرت الحاج مفتی محمد شفیع صاحب مدفیوضکم بعد سلام مسنون

عزیزی الحاج اختر علی سلمہ کی معرفت گرامی نامہ پہنچ کر موجب منت ہوا اور حیلۂ ناجزہ بھی پہنچ گئی جس کی مجھے بہت تلاش تھی مگر اب تک کوئی کام کا آدمی نہ ملا سید علوی مالکی کا تو انتقال ہو گیا، ان کے صاحبزادے ان کے قائم مقام ہیں مگر تقریریں تو بہت زوردار اور سبق اپنے والد سے بھی زیادہ جوش وخروش سے پڑھاتے ہیں مگر ابھی تک ان مسائل میں ان سے بات کرنے کو ہمت نہ پڑی، آپ کے خط سے اور بھی طبیعت سرد ہو گئی۔ جناب نے گرامی نامہ میں تراجم بخاری جلد دوم کے ساتھ بذل المجہود جلد اول لکھی اور رسید میں اوجز المسالک جلد اول ہے۔ میرے خیال میں اس وقت تو رسید کی ہی عبارت صحیح ہے بذل تو بہت دنوں پہلے بھیجی تھی مگر میرا کاتب یوں کہتا ہے کہ خط کی عبارت صحیح ہے کہ سہارنپور سے تو بذل جلد اول ہی روانہ ہوئی تھی اوجز جلد اول تو رائے ونڈ سے پہنچی ہو گی ورنہ پہنچ جائے گی۔ اس ناکارہ کے طواف تو میرے دوستوں کے رہین منت ہیں۔ نہیں تو دو سال سے زمین پر پاؤں بھی نہیں رکھ سکتا۔ ایک مکی عزیز نے کرسی پر طواف کی اجازت لے رکھی ہے اور میرے دوست اللہ تعالیٰ

انھیں بہت ہی جزائے خیر دے مجھے کھینچے کھینچے پھرتے ہیں۔
جناب نے اس گرامی نامہ میں جیدۂ ناجزہ کے متعلق جو تحریر فرمایا، مدینہ پاک کے سفر میں تو اس پر غور کرنے کا وقت نہیں ملے گا اس لیے کہ بغیر اعوان کے میں اب بالکل ہی معطل ہو چکا ہوں، سہارنپور بشرط زندگی واپسی پر وہاں کے احباب کی مدد سے غور کر سکوں گا۔ اگرچہ وہاں بھی بچے ہی رہ گئے ہیں۔ آپ نے اپنے امراض کے متعلق جو گرامی نامہ میں تحریر فرمایا یہ ناکارہ ان سب چیزوں میں کچھ آگے ہی ہے، دعاؤں کا بہت ہی محتاج ہے آپ کے لیے، آپ کے دارالعلوم کے لیے، صاحبزادگان کے لیے دل سے دعا کرتا ہوں۔ ابھی مسجد شریف میں حاضر ہو رہا ہوں۔ انشاء اللہ جناب کی طرف سے خاص طور سے صلوٰۃ و سلام پیش کروں گا۔ اگرچہ پہلے بھی عرض کر رہا ہوں۔ فقط والسلام

حضرت اقدس شیخ الحدیث مدفیوضہم
بقلم حبیب اللہ ۳، جون ۱۹۷۳ء

○

مکرم و محترم جناب الحاج مفتی محمد شفیع صاحب مدفیوضکم بعد سلام مسنون
آپ کی صحت و عافیت کا شدت سے انتظار رہتا ہے، آپ کی صحت کاملہ اور قوت تامہ کے لیے یہ ناکارہ خود بھی دعا کرتا ہے اور احباب سے بھی کراتا رہتا ہے۔ دہلی کے واسطہ سے دو پیکٹ مرسلہ سامی ایک پر مدرسہ کا پتہ لکھا ہوا تھا دوسرے پر دارالعلوم کا۔ مدرسہ کا نسخہ تو مدرسہ میں داخل کر کے مدرسہ کی رسید اس عریضہ کے ساتھ ارسال ہے۔ دارالعلوم کا پیکٹ الحاج مفتی محمود حسن صاحب مفتی دارالعلوم کے ہاتھ بھیج دیا تھا اور یہ کہلا دیا تھا کہ رسید آپ براہ راست بھیج دیں یا میرے پاس بھیج دیں تو میں مفتی صاحب کی خدمت میں بھیج دوں مگر ابھی تک تو آئی نہیں، اگر آگئی تو انشاء اللہ بھیج دوں گا۔ مظاہر کی رسید ارسال ہے۔ یہ ناکارہ حجاز سے واپسی کے بعد سے خود بھی صاحب فراش ہے۔ مدینہ پاک میں گرنے کی وجہ سے پاؤں کی ہڈی میں جو ضرب آئی تھی وہ تو بحمد اللہ جلد ہی اچھی ہو گئی تھی مگر اس کے بعد سے سہارنپور آکر چھ ماہ تک مسلسل پلاسٹر بندھے رہنے کی وجہ سے پاؤں میں جمود ہو گیا جس کی وجہ سے زمین پر پاؤں رکھنا مشکل ہو گیا۔ چار آدمی قدمچہ پر کرسی کی طرح بٹھا دیتے ہیں اور اٹھا لیتے ہیں، دو سال سے زمین پر پاؤں نہیں رکھا گیا۔ صاحبزادگان کی خدمات میں سلام مسنون۔ یہ ناکارہ ان کے لیے اور آپ کے لیے اور آپ کے مدرسہ کے لیے دل سے دعا کرتا ہے اللہ تعالیٰ

ہر نوع کے مکارہ سے محفوظ فرما کر ہر نوع کی ترقیات سے نوازے۔ مولانا اکبر علی صاحب کی خدمت میں سلام مسنون

فقط والسلام

حضرت اقدس شیخ الحدیث مدفیوضہم
بقلم حبیب اللہ ۱۵، محرم ۱۳۹۳ھ

○

مکرم و محترم حضرت مفتی صاحب زادت معالیکم بعد سلام مسنون

اسی وقت جناب کا گرامی نامہ جو کسی شخص نے عنیزہ سے بھیجا، پہنچ کر موجب منت ہوا۔ ثمر مدینہ اور تسبیح کے پہنچ جانے سے مسرت ہوئی، دستی چیزیں جو بھیجی جاتی ہیں وہ اکثر راستہ میں گم ہو جاتی ہیں اس لیے رسید کا انتظار رہتا ہے۔ آپ نے اس ہدیہ پر استعجاب فرمایا۔ اس میں کوئی تصنع یا توریہ نہیں کہ مجھے اپنے اکابر اور اکابر سے تعلق رکھنے والوں کا خیال بہت اہتمام سے آتا ہے، آپ کے لیے دعا صحت اور تا دیر فیوض و برکات کے ساتھ بقاء کے ساتھ روضۂ اقدس پر صلوٰۃ و سلام بھی پیش کرتا رہتا ہوں کہ اکابر تو چلے گئے اب یادگار یں آپ ہی دو چار حضرات باقی ہیں، آپ نے اپنے ضعف کے متعلق جو تحریر فرمایا اس میں تو یہ ناکارہ آپ کے ساتھ ہی ساتھ چل رہا ہے بلکہ ٹانگوں کی معذوری نے تو آپ سے آگے ہی بڑھا رکھا ہے۔ دعاؤں کا یہ ناکارہ آپ سے زیادہ محتاج ہے۔ آپ بیتی کے متعلق بہت سے اکابر اور خصوصی احباب کے خطوط پسندیدگی کے آئے، مگر ہمیشہ تعجب ہی ہوا کہ یہ تو کوئی مستقل تالیف نہیں تھی مگر اللہ جل شانہ نے اکابر کے قلوب میں اس کی وقعت ڈال رکھی ہے، آپ نے تحریر فرمایا کہ اس میں تیرا خط مظاہر علوم کے مدرسین کے متعلق بہت پسند آیا، مجھے تو یاد نہیں تھا، ایک صاحب نے بتایا کہ تو نے اکابر کے معمولات اس میں لکھے ہیں بہت ہی اچھا کیا کہ آپ نے مدرسین کو سُنایا۔ میری رائے یہ ہے کہ اکابر کے معمولات کانوں میں تو ضرور پڑتے ہیں اگرچہ عمل ان پر نہ ہو سکے میں نے تو آپ بیتی آپ کی خدمت میں نہیں بھجوائی، طابع نے خود بھجوائی ہوگی، میں نے تو مولانا عبدالماجد دریابادی وغیرہ کو مانگنے پر بھی انکار کر دیا تھا کہ یہ آپ حضرات کے کام کی نہیں یہ تو بچوں کے واسطے ہے۔ البتہ عربی کی میری کوئی کتاب چھپتی ہے تو میں اس کا بڑا اہتمام کرتا ہوں کہ آپ کے مدرسہ میں ضرور وقف ہو جائے۔ تقریباً ایک ماہ ہوا ایک حاجی کی معرفت بذل المجہود محشیٰ مطبوعہ ٹائپ۔ آپ کے مدرسہ کے لیے بھیج رکھی ہے۔ گرامی نامہ سے معلوم ہوا کہ اب تک نہیں پہنچی۔ آج بھی واسطہ کو یاد دہانی کا خط لکھ رہا ہوں، آپ بھی کسی طالب علم کے ذریعہ سے مولوی یحییٰ مدنی متعلم مدرسہ مولانا بنوری سے دریافت کرلیں کہ وہ کتاب اب تک کیوں نہیں پہنچی؟ تو زیادہ

اچھا ہے۔ صاحبزادگان کی خدمت میں سلام مسنون کے بعد یہ ناچیز ان کے لیے بھی دعا کرتا ہے۔ فقط والسلام

حضرت شیخ الحدیث مدفیوضہم
بقلم حبیب اللہ مدینہ منورہ، مارچ ۱۹۷۳ء

○

مکرم و محترم حضرت مفتی صاحب زادت معالیکم بعد سلام مسنون

آج ۲۴، مارچ کو عصر کے بعد کی مجلس میں ایک صاحب نے آپ کا ہدیہ سنیہ مجالس حکیم الامت مرحمت فرمایا جو فرطِ شوق میں اسی مجلس میں سنانا بھی شروع کر دیا۔ میرا سہارنپور کا دستور تو کئی سال سے یہ ہو گیا کہ عصر کے بعد کی مجلس میں اکابر کے حالات ملفوظات بہت اہتمام سے سنا کرتا ہوں، انفاس عیسیٰ، تربیت السالک وغیرہ حضرت حکیم الامت کے اور حضرت مولانا وصی اللہ صاحب کے متعدد رسائل اسی مجلس میں سنے گئے اس لیے کہ عوام کا مجمع بہت ہو جاتا ہے۔ میرا جی چاہتا ہے کہ اکابر کے حالات ان کے کانوں تک پہنچ جائیں مگر مدینہ پاک کے اسفار میں یہ تسلسل باقی نہیں رہتا جس کا بہت ہی قلق بھی ہوتا ہے اور اس کی اصل وجہ یہ ہوتی ہے کہ ہندوستان میں تو ہم وہابی ہیں اور حجاز میں بدعتی۔ ہمارے اکابر کے ملفوظات میں کوئی مضمون، کوئی ملفوظ نجدیوں کے اصول کے خلاف آجاتا ہے تو اس کا چرچہ شروع ہو جاتا ہے۔ بار بار کے سفروں میں کئی مرتبہ یہ سلسلہ شروع ہوا اور جب کسی چیز کا میں نے یہ سنا کہ فلاں چیز پر مجالس میں گفتگو شروع ہو گئی تو چھوڑ دیا۔ آج بھی بسم اللہ تو کر دی خدا کرے پوری ہو جائے۔ میری نگاہ میں تو میرے اکابر کے ارشادات، ملفوظات اور افعال سنت کی عملی تربیت ہوتی ہے اور گلدستے کے مختلف پھولوں کی طرح سے ہر پھول کی رنگ و بو الگ ہونے سے اور بھی لطف آتا ہے مگر ساری دنیا کا ذوق تو یکساں نہیں۔ آپ کے ابتدائی مضمون سے پرانے دور کی یادگاریں بھی ساری نگاہوں کے سامنے پھر گئیں اور سہارنپوری، دیوبندی، رائپوری اکابر کا یکجائی اجتماع بھی جو بہت ہی پُرلطف ہوتا تھا خوب یاد آیا۔ اور چونکہ سننے والوں میں بھی ہندو پاک کا مجمع تھا اس لیے انھیں بھی لطف آیا ہی ہوگا اللہ تعالیٰ آپ کے فیوض و برکات سے لوگوں کو زیادہ سے زیادہ متمتع فرمائے۔ آپ کے لیے آپ کے مدرسہ کے لیے پڑھنے پڑھانے والوں کے لیے بھی دل سے دعا کرتا ہوں اور روضۂ اقدس پر بھی صلوٰۃ و سلام پیش کرتا رہتا ہوں۔ ایک ضروری امر یہ ہے کہ بذل المجہود مختشی ٹائپ پر طبع ہو کر ۲۰ جلدوں میں پوری ہو گئی جس کا ایک نسخہ میں نے آپ کے مدرسہ کے لیے بھی وقف کرا کر بھیجا تھا مگر اب تک اس کے پہنچنے کا کوئی حال معلوم نہ ہوا، اگر اب بھی نہ پہنچا ہو تو دوسرا پرچہ

اسی لفافہ میں بھائی یحییٰ کراچوی ثم المدنی جو آجکل مولانا بنوری کے مدرسہ میں کچھ پڑھ رہے ہیں کسی طالب علم کے ہاتھ ان کے پاس بھیج دیجئے۔ صاحبزادگان سے بھی سلام مسنون کہہ دیجیے، یہ تو علم ہوگیا ہوگا کہ ہمارے یکم رمضان جمعہ کے دن عزیز ہارون کا انتقال ہوگیا۔

دعا مغفرت اور ایصالِ ثواب کی درخواست ہے۔ فقط والسلام

حضرت شیخ الحدیث صاحب

بقلم حبیب اللہ ۲۴، مارچ ۱۹۷۴ء

○

مکرم و محترم مد فیوضکم

بعد سلام مسنون! اسی وقت گرامی نامہ مؤرخہ ۷، ربیع الثانی، ۲۲ ربیع الثانی کو ملا۔ ۲۴، اپریل کو اس ناکارہ کی آنکھ کا آپریشن ہُوا، ابھی تک پٹی نہیں کھلی اور ڈاک سے بھی ممنوع ہوں مگر احباب سے یہ ضرور معلوم کر لیتا ہوں کہ کس کس کا خط ہے۔ سہارنپور، دہلی وغیرہ تو پندرہ دن ہوئے یہ لکھ دیا تھا کہ ایک ماہ تک میرے خط کا انتظار نہ کریں۔ دوسرے لوگ میری خیریت اعزہ احباب کو لکھتے رہتے ہیں، ڈاک میں آپ کا اسم گرامی سن کر بے اختیار جی چاہا کہ اس کو سن لوں اور مختصر جواب بھی لکھوا دوں۔ اگرچہ ڈاک کی طرف سے ممانعت سخت ہے، حادثۂ فاجعہ کے بعد آپ کے ضعف و امراض کی وجہ سے طبیعت تو بہت بے چین رہی اور متعدد خطوط بھی جناب کی خدمت میں اس وقت لکھوائے گئے گرامی نامہ سے ان کا پہنچنا معلوم ہو کر موجبِ طمانیت ہُوا۔ اس میں نہ تو ریہ ہے نہ مبالغہ کہ حادثہ کی خبر سننے کے بعد کی صحت اور قوت برداشت کے لیے بہت اہتمام سے دعا بے اختیار نکلتی رہی گرامی نامہ سے افاقہ کا حال معلوم ہو کر بہت مسرت ہوئی، اللہ تعالیٰ ہی اپنے فضل و کرم سے صحت و قوت کے ساتھ تا دیر ذاتِ گرامی زندہ سلامت رکھے البتہ گرامی نامہ سے اہلیہ محترمہ کی شدتِ علالت موجبِ فکر ہوئی اللہ تعالیٰ ان کو بھی صحت عاجلہ کاملہ مستمرہ عطا فرمائے، جناب کا لاہور تشریف نہ لے جانا بھی جتنا موجبِ قلق ہے ظاہر ہے اور جانا اس سے زیادہ مشکل، صاحبزادگان کی خدمت میں سلام مسنون کے بعد ان کے لیے بھی دل سے دعا کرتا ہوں۔ فقط والسلام

حضرت شیخ الحدیث مدظلہم

بقلم حبیب اللہ ۱۴ مئی ۱۹۷۴ء

مکاتیب حضرت مولانا مفتی عبدالکریم گمتھلوی[1] صاحب رحمۃ اللہ علیہ

میرے مکرم دوست السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ جگہ جگہ یاد آتے رہتے ہیں اور ناچیز دعا میں شامل کرتا رہتا ہوں کاش کہ آپ میرے ساتھ ہوتے، علاوہ رفاقتِ سفر کے مناسک میں بھی آپ رہنمائی فرماتے گو آپ نے غنیہ عطا فرمائی مگر وہ آپ کی پوری قائم مقامی نہیں کرسکتی، جب وہ ہم سے نہیں بولتی تو مجبوری ہوجاتی ہے، آپ سے وہ اچھی طرح بولتی اور آپ کو ہم بولنے پر مجبور کرتے خوب لطف رہتا، حق تعالیٰ یہ دولت نصیب فرمائے۔

خدا کا شکر ہے کہ مناسکِ حج تقریباً ختم ہوچکے صرف آج کی رمی باقی ہے جس کا وقت عنقریب آرہا ہے خط یہاں اس واسطے لکھا ہے کہ بعض لوگ جانے والے ہیں ان کی معرفت روانہ کرنے کا خیال ہے۔

جس طرح ہوا شُتم پشتم افعال حج ادا کر رہے ہیں۔ خدا تعالیٰ اپنی رحمت سے قبول فرمالے، آپ بھی دعا فرماویں سخت محتاج ہوں، اس در پر آکر بھی ناکام رہا تو پھر کہاں ٹھکانا ہے۔

جناب مولوی صاحب کی خدمتِ اقدس میں سلام مسنون عرض کرنے کے بعد دعا کی درخواست ہے اور حضرت میاں صاحب کی خدمتِ اقدس میں بھی، سب بچوں کو دعا پیار۔ غالباً توقع ہے کہ کم از کم ایک ماہ قیام کے بعد مدینہ منورہ کو روانگی ہوگی ممکن ہے کہ دو ماہ قیام ہوجائے بہر حال دعا میں یاد رکھیں اور مدرسہ صولتیہ کے پتہ پر اپنی خیریت سے مع متعلقین جلد مطلع کریں باقی خیریت ہے بحمداللہ صحت بہت اچھی ہے یہ مبارک سفر موافق آگیا والحمدللہ علی ذلک حمداً کثیراً۔

احقر عبدالکریم عفی عنہ وارد حال بازار منیٰ

مؤرخہ ۱۲، ذوالحجہ ۱۳۵۳ھ یوم دوشنبہ

---

[1] حضرت مولانا مفتی عبدالکریم گمتھلوی رحمۃ اللہ علیہ حضرت تھانویؒ کے اکابر متوسلین میں سے تھے اور عرصۂ دراز تک تھانہ بھون میں فتویٰ کی خدمت انجام دیتے رہے۔ "الحیلۃ الناجزۃ" کی تصنیف میں حضرت تھانویؒ نے جن دو حضرات سے خصوصی مدد لی، ان میں حضرت والد صاحبؒ کے علاوہ آپ بھی شامل تھے، حضرت والد صاحبؒ سے آپ کے بہت بے تکلفانہ تعلقات تھے جن کی جھلک ان خطوط میں ملتی ہے۔ تقی

مولانا المکرم! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کو تو احقر کا عریضہ عین انتظار میں مل گیا اور اس کی تصدیق بھی منشی سید حسن صاحب کے ذریعہ ہو گئی لیکن احقر کو جناب کا نوازش نامہ اس وقت ملا جب کہ انتظار ختم ہو کر مایوسی ہو چکی تھی اور ہم بدظن ہو گئے تھے۔ جس ڈاک میں بھی وطن وغیرہ خط لکھتا تھا اس میں ایک خط خدمت سامی میں بھی روانہ کر دیتا تھا لیکن جب کسی کا جواب نہ آیا اور یکم صفر کی ڈاک میں آپ کو فہرست سے خارج تصور کر لیا گیا تو ۲ صفر کو ایک مزیدار خط پہنچ ہی گیا جس شب کی آپ نے شکایت لکھی ہے اسی شب آپ کو ایک خط لکھا پھر غالباً راستہ میں کراچی یا کامران سے لکھا پھر منزلِ مقصود پر پہنچ کر ۲۶ یا ۲۷ ذیقعدہ کو لکھا مگر تماشا ہے کہ ان میں سے آپ کسی کی رسید نہیں دیتے۔ حضرت بازار بنا کے خط کا جواب تحریر فرماتے ہیں، خیر! غنیمت ہے بھاگتے چور کی لنگوٹی ہی سہی۔

مدینہ طیبہ اگر آپ نے مولانا سید احمد صاحب کی معرفت خط بھیجا ہے تب تو مجھے انشاء اللہ تعالیٰ مل جائے گا کیونکہ مولانا موصوف کو ایک خط لکھ دیا تھا کہ احقر کچھ روز بعد حاضر ہوگا۔ اگر میرا کوئی خط آوے تو رکھ لیجیے آپ کا قصیدہ پڑھا، بڑے استاد نکلے، نہ بر دیکھا نہ بحر، نہ سردی چکھی نہ گرمی، مزے سے گھر بیٹھے زیارت حرمین کا ثواب لوٹ لیا، آخر ہو نہ بقول مولانا مرتضیٰ حسن صاحب پھر الخ

واقعی یہاں کی حاضری بڑی دولت بے بہا، اس پر جس قدر بھی رشک کیا جائے کم ہے مگر دعا فرمایئے کہ جس طرح اپنی رحمت سے حاضری کی توفیق بخشی ہے اسی طرح اس کو قبول بھی فرما لیا جاوے، زیادہ افسوس تو اس کا ہے کہ کچھ کرنا دھرنا نہ تھا تو کم از کم طلب تو ہوتی مگر طلب تک نہیں، تو کیا انجام ہوگا؟ حق تعالیٰ رحم فرماوے۔ ایک روز باب کعبہ کے سامنے باب النبیؐ و باب العباس کی درمیانی کیاری میں بیٹھے بیٹھے عرض کر رہا تھا

مفلسانیم آمدہ در کوئے تو — شیئاً للہ از جمال روئے تو
دست بکشا جانب زنبیل ما — آفریں بر دست و بر بازوئے تو

مگر خیال آیا کہ زنبیل کہاں ہے؟ یہ تو کسی طالب کی درخواست ہے۔ یہاں تو اول زنبیل کا سوال چاہیے۔ آپ نے سہارنپور کا واقعہ جو تحریر فرمایا ہے کہ اس شب وہیں ہوتے ہوئے ملاقات نہ ہوئی تو تا زیر لب آمد و جنبیدن نگذارند کا مزا آگیا ہم اس سے بڑھ کر سنا دیں، بیت اللہ شریف میں داخلہ کا بہت شوق ہے لیکن رشوت کی پیخ مانع ہوئی ہے۔ سنا کرتے تھے کہ ۱۰ محرم کو عام داخلہ ہوتی ہے مگر معلوم ہوا کہ اب وہ بھی

موقوف ہوگئی اتفاق سے ایک روز رات کو عربی ۴ بجے اچانک نظر پڑی کہ زینہ لگا ہُوا ہے دوڑ کر پہنچا تو معلوم ہُوا ابھی عورتیں ہیں جب وہ باہر آجاویں تب مردوں کو اجازت ملے گی یہاں تک تو غنیمت تھا امیدواروں میں کھڑا ہوگیا عورتیں نکل آئیں تو مرد زینہ پر چڑھے لیکن صدا آئی ارجعوا ارجعوا حرم بی بی اس پر بھی صبر کیا واپس آ گئے کہ باقیات صالحات کو بھی آجانے دو لیکن ان کے آنے پر جو حکم سنایا گیا۔ باب سکوک تو نہ پوچھیے کیا گرمی مجمع پر سکتہ کا عالم تھا ادھر تو یہ حالت ادھر اخوات چلا رہے ہیں کہ زینہ کھینچو اول تو شنا ہی مشکل سے پھر قہر درویش برجان درویش اس کو پیٹھے تو جان کسی میں نہ تھی جو وہ کھسکے مگر جوں توں کر کے کھینچنا ہی پڑا یہاں بات ختم نہیں ہوئی آگے سُنیے۔ جب زینہ پہنچ چکا تو شیبی صاحب سے ایک افسر نے کہا اس پر اس نے دروازہ دوبارہ کھول دیا اور معمولی سیڑھی لگائی گئی جان میں جان آگئی۔ بہت سے لوگ پہنچ گئے لیکن ہماری باری قریب آئی، تو اتفاق سے سیڑھی گر گئی۔ کمند ٹوٹنے کا شعر اب پڑھ لیجئے آخر کار ہر چند کوشش کی۔ شیبی صاحب نے اجازت ہی نہ دی آپ نے الخیر فیما وقع پڑھ کر اطمینان حاصل کیا ہم نے شعر ذیل پڑھ کر اضطراب بڑھایا۔

دیدار می‌نمائی و پرہیز می‌کنی   بازار خویش و آتش ما تیز می‌کنی

آپ نے قصیدہ کے متعلق جو لکھا ہے کہ آپ کے تخلیہ سے نہیں ڈرتا اس لیے یہ اشعار بھیجتا ہوں مگر کسی دوسرے ادیب کو دکھلا کر رسوا نہ کریں۔ اس حکم کی خلاف ورزی ضرور کرتا مگر کسی سے واقفیت ہی نہیں آپ کا مقصد حاصل ہوگیا مجبوراً تعمیل ارشاد کرتا ہوں باقی رہا تصویب و تخلیہ تو جو کچھ کبھی کبھار ایک آدھ لفظ پر جناب کی توجہ منعطف کرا دیتا تھا وہ در اصل آپ کا ہی فیض ہوتا تھا جس کا حلقہ اثر اب معلوم ہُوا کہ محدود ہے۔ یہاں تک اس کی رسائی نہیں لہٰذا کچھ عرض نہیں کر سکتا اور خطا آپ ہی کی ثابت ہوئی۔

دُعا میں جو آپ کو شامل رکھا اس کے متعلق درخواست تو مجھے یاد بھی نہ رہی تھی آپ کی عنایت نے خود یاد دہانی کی اور اتفاق سے وہ اجزاء دعا میں شامل ہو گئے تھے جو آپ نے لکھے ہیں۔ الحمد للہ علیٰ ہذا التوافق۔ تاہم آپ کی درخواست کو دیکھ کر مزید خیال ہُوا اور اسی وقت حرم شریف میں حاضر ہو کر ایک طواف خاص ان دعاؤں ہی کی غرض سے کیا۔ حق تعالیٰ قبول فرما دے۔

مولوی صاحب کے لیے صحت و قوت اور عافیت دارین کی دعا بھی کرتا رہتا ہُوں اور قاضی صاحب کا بھی دُعاگو ہُوں ہر دو حضرات کی خدمت میں میرا سلام عرض کر دیں نیز دعائے خیر کی درخواست ہے۔ علیٰ ہذا حضرت میاں صاحب سے اور بچوں کو دُعا پیار۔ اب واپسی اور مدینہ منورہ کی سُنیے۔ آپ جو محرم کو میری

واپسی کے متعلق صبح شام کا انتظار کر رہے تھے اس وقت غالباً آپ کو میری رفتار یاد نہ رہی ہوگی، حق تعالیٰ شانہٗ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ حج کے ساتھ مزید قیام کی دولت بھی عطا فرمائی۔ اب غالباً ۲۱، ۲۲ صفر کو روانگی ہوجائے گی، آج خبر مل گئی ہے کہ کوشانی ختم ہوگیا اب لاری کا کرایہ ساڑھے تین گنی اور دوریال ہوگیا اونٹ کا کرایہ اب تک محقق طور پر معلوم نہ ہوسکا ۲۰ روپے ۴۴ روپے فی کس کی روایات ہیں آج کل میں انشاء اللہ تحقیق ہونے پر کرایہ داخل کردیا جاوے گا۔ اونٹ پر جانے کا ارادہ ہے پانچ سات روز انتظام میں لگ جاویں گے اور ممکن ہے کہ ۲۵ تک قیام ہوجاوے ایسا ہُوا تو قیام کے پُورے تین ماہ ہوجاویں گے اب بحذف کسر اڑھائی ماہ ہوچکے ہیں وہاں حاضر ہوکر آپ کا اور والدہ محمد زکی کا سلام عرض کردوں گا اور اگر موقع لگا تو انشاء اللہ آپ کا قصیدہ مواجہ مبارکہ میں پڑھ دوں گا ربیع الثانی کے ختم تک مدینہ منورہ حاضر رہ کر اوائل جمادی الاول میں واپسی کا عزم ہے امید ہے کہ انشاء اللہ ختم جمادی الاول تک ملاقات ہوجاوے گی والامر بید اللہ سبحانہ۔ جب آپ نے تین ورق لکھے تو ہم کیوں نہ لکھیں۔

اب انتظام مصارف کا مسئلہ باقی رہا سو اول آپ یہ تبلایئے کہ   تک ضرورت ہوا اور ان کا رفیق سے مل سکنا آپ کو کس طرح معلوم ہُوا یہ کشف نہیں تو کیا ہے جب آپ کو پہلا خط لکھا اس وقت تک کوئی ظاہری انتظام نہ ہُوا تھا جس کی اطلاع دیتا ویسے ہی ارادہ کرلیا تھا اور انتظام کی دعا مانگ رہا تھا حضرت اقدس کی خدمت بابرکت میں بھی دعا کے واسطے لکھ دیا تھا شروع محرم میں ایک رنگونی صاحب نے سو روپیہ ہدیۃً عنایت کیا اور دریافت پر معلوم ہُوا کہ مولانا ظفر احمد صاحب نے ان کو اس کا اشارہ لکھا ہے جزاہما اللہ تعالیٰ اس کے بعد جو تخمینہ کیا تو وہ یا کچھ کم کی اور ضرورت رہی تھی اس کی دعا کرتا رہا اور یہ بھی کہ اسی ماہ میں برکت ہوجاوے کچھ کفایت کرلوں گا اسی خیال میں تھا کہ قرض لوں یا کفایت اختیار کروں کہ آپ کا خط آگیا اب مولوی عبدالرحمٰن صاحب بخاری سے تعارف نہیں اس لیے ان سے کہتے ہوئے حجاب ہُوا اور مولانا شفیع الدین صاحب سے عرض کرتے ہوئے بھی شرم آئی۔ سوچ رہا تھا کہ کیا کروں کہ رفقاء میں سے ایک صاحب نے از خود کہا کہ اگر آپ کو کچھ خرچ کی ضرورت ہو تو   روپے تک میرے پاس بالکل زائد ہیں بے تکلف کہہ دیجئے غنیمت سمجھا اور لے لیے آپ کو بھی دعا دی اور انھیں بھی اور یہ رقم ان کو واپسی پر دینا ہے لیکن اگر آپ کو انتظام میں اسی وقت زیادہ سہولت معلوم ہوتی ہو تو خلیفہ صاحب کے پاس جمع کردیں وہ وکیل بالقبض ہیں موکل نہیں   آپ سے لے لینا ہے تو بڑا ظلم آپ کے ذمہ بہت مصارف ہیں خیال آیا کہ صرف   لے لوں اور کچھ کفایت

کروں مگر آپ کی اور ان صاحب کی موافقت سے گمان ہوا کہ یہ تعیین غیب سے معلوم ہوتی ہے۔ ادھر اپنی کفایت شعاری کا حال معلوم ہے اس واسطے لے لیے۔ حق تعالیٰ شانہٗ آپ کو جزائے خیر عطا فرماویں دُنیا میں بھی آخرت میں بھی اب بظاہر خرچ بہت کافی ہوگیا ہے ولله الحمد علی ذلک مگر حال میں برکت کی اور امداد خداوندی کی حاجت ہے۔ دعا کیجئے کہ برکت اور مدد شامل حال رہے نیز مقصود اصلی رضا و جنت حاصل ہونے کی دعا بھی فرمایا کریں فقط والسلام مع الاکرام اور صحت احقر کی تکمیل حج تک تو اچھی رہی اس کے بعد کچھ روز نزلہ بخار کی شکایت رہی جس کا یہاں عام طور پر اہل شہر پر بھی اثر تھا بعد ازاں مسافرین کو عموماً جو دستوں کی شکایت ہو جایا کرتی ہیں وہ ہوئی اور خوب ہوئی۔ سخت کمزور ہوگیا تھا اب بفضلہ تعالیٰ تقریباً طبیعت بالکل صاف ہے ضعف بھی بڑی حد تک جاتا رہا صحت و قوت متقضی کی دعا کرتے رہیں جیسا کہ خلیفۃ المسلمین کیا کرتے ہیں اور یہ بھی دعا فرمائیے کہ بار قرض سے جلد سبکدوشی حاصل ہو۔ لوگ تو سبکدوش ہو کر حج کو آیا کرتے ہیں میں قرض میں اضافہ کر کے آیا۔ اگر آپ حضرات کی دعا رہی تو واپسی پر جلد سبکدوش ہو جانا بعید نہیں باقی رہا قرض انکار کا سواس کے متعلق الساقط لایعود کی تصریح کتب فقہ میں موجود ہے ملاحظہ فرمالیں اور جدید قرض بدون سفارت کے ہوا ہیں اور ہم آپ کو سفیر بناتے نہیں کیونکہ آپ مسافر نہیں بنے غالباً سب اجزاء کا جواب ہو گیا اور آج ڈاک جا رہی ہے لہٰذا ختم کردم والحمد لله الذی بنعمته تتم الصالحات۔

احقر عبد الکریم گمتھلوی عفی عنہ

از مکہ مکرمہ مورخہ ۸ صفر ۱۳۵۴ھ یوم سہ شنبہ

نوٹ: اگر ربیع الاول کے ختم تک خط بھیجا جاوے تو مجھ کو مدینہ منورہ میں انشاء اللہ مل جائے گا۔

نوٹ: جب آپ نے گراں قدر عطیہ مرحمت فرمایا ہے دو کو بھی وصول کرنا ضروری ہوا براہ عنایت جالندھر کے خط پر ٹکٹ لگا کر اور مدینہ منورہ کے لفافے پر۔ کے ٹکٹ لگانے کے بعد حضرت والد کی خدمت کا جو لفافہ رکھا ہے اس پر ڈیڑھ کا ٹکٹ لگا کر ڈاک میں چھوڑ دیں۔

مکاتیب مولانا عبد الباری ندویؒ

۱۱ رجب ۱۳۵۴ھ　　　　شبستان ہارڈنگ، لکھنؤ ۲۱ اکتوبر ۳۵ء

حضرت مخدومی و مقتدیٰ مدظلکم العالی

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ آپ جیسے بزرگ ومخدوم میزبان کو اس خورد و خام جیسے ناشکرے مہمان سے پہلے کیوں کبھی سابقہ پڑا ہوگا، کہ کہاں کہ جو بھاگا تو پھر مڑ کر نہ دیکھا! کرنے کو تو ایک کیا بہت سے عذر پیش کیے جاسکتے ہیں لیکن اب سب بعد از وقت بلکہ "بدتر از گناہ" ہوں گے اس لیے بزرگانہ ومخدومانہ درگذر ہی کے دامن میں پناہ چاہتا ہوں۔

واپسی میں دیوبند اور مظاہر العلوم میں کھڑی کھڑی حاضری کے علاوہ تھانہ بھون میں پورے دو دن حاضری رہی، خیال تھا کہ "مے بھی ہے نے بھی ساغر بھی ہے" لیکن جب ساقی ہی نہیں تو پھر کیا ہوگا تاہم میرے لیے تو وہ الحمد للہ قریب قریب اسی طرح کہف انس وعافیت اور باعث کیف وسرور رہا جس طرح "ساقی" کے "دور ساغر" میں "آخر کس مسکین کا امکان ہے"۔ مجلس کے وقت ملفوظات پڑھ لیتا اور صبح وعصر کے بعد قبر مبارک کی زیارت، وہاں بھی حیات مبارکہ کا سا انس وہیبت کا بلا خُلاء عالم ملتا۔ بارک اللہ فی برکاتہ حیاً ومیتاً ورفع درجاتہ!

اس نیم حاضری میں تو ضرور بڑا تصور رہا لیکن دیگر امور سے بے فکر نہیں رہا۔ مولانا دین محمد میاں سلمہ کو خط ہفتوں ہوتے ہیں تفصیلات کے ساتھ لکھ چکا۔ خیال تھا آپ کے اور مولانا بنوری سلمہ کے دار العلوم کو مسئلہ تجدید کا ایک ایک سیٹ روانہ ہوجائے گا مگر بعض حصے مجلد نہ تھے ان کی جلد بندی میں بھی دیر لگی اور سب سے زیادہ دیر علی گڑھ سے "مذہب کے آہنی قلعہ" (مذہب وعقلیات) کے آنے میں ہوئی۔ الحمد للہ کل یہ مرحلہ بھی ختم ہوا اور آج ہی نیم زیارت کی سعادت حاصل کر رہا ہوں۔

آپ کی خدمت میں تو مسئلہ تجدید کی ہر کتاب اشاعت کے بعد ہی پیش ہوتی رہی گو نظر وقبول سے استفادہ سے آج تک محرومی رہی اب یہ سیٹ خاص طور پر مدرسہ کے لیے ہے، وقف کی ملکیت ہے اور شرط یہ ہے کہ مدیر ایسے افراد وادارات کا ہو جہاں پڑھنے پڑھانے جانے کی توقع ہو۔ اس بذام کا نام تو اس سلسلہ میں برائے نام ہی ہے ورنہ اس کے پڑھنے پڑھانے کا نام بھی کس منہ سے لیا جاسکتا البتہ جس کے علوم وتعلیمات کی

ف اس کی طباعت کا بھی آپ نے کچھ خیال ظاہر فرمایا تھا۔ احقر کی طرف سے بمسرت اجازت ہے۔ جدید اور انگریزی طبقہ تک زیادہ کام کی اور مولویوں کے لیے "دفع" کے بجائے حد کہ محاذ اور بڑا کامیاب حربہ بلکہ "ایٹم بم" ہے۔ خیال آتا ہے کہ کبھی اس کے کچھ نسخے موسیٰ میاں وصدیق صاحب وغیرہ کو بھی بھجوائے تھے۔

جو ہر کشی کا یہ سلسلہ ہے، اس کی نیت تو بلا خوف لومۃ لائم عرض کیا کرتا ہوں کہ اس عہد میں اس کی تفہیم دین تک پہنچے بغیر خالی مدرسوں میں عمر بھر پڑھنے پڑھانے سے بھی فہم دین پیدا ہوتے نہیں دیکھی۔ غالباً آں محترم کو بھی اس سے زیادہ اختلاف نہ ہوگا تو طلبہ و اساتذہ سب ہی کو بواسطہ و بلا واسطہ حضرت علیہ الرحمۃ کی چیزوں تک پہنچاتے رہیں ورنہ "کالائے بد" کا معاملہ فرمائیں۔

اس سلسلہ میں خاص زحمت ذرا العجلت ازراہ شفقت قبول فرمائیں سلسلہ کی آخری کتاب تجدید سیاسیات بحمداللہ شروع ہے، معاشیات و سیاسیات کے نام و نمود سے بڑھ کر اس دور میں دین کے حق میں بلکہ دین کی پوری تاریخ میں کوئی فتنہ معلوم نہیں حتیٰ کہ اشتراکی معاشیات و سیاسیات تک آتے آتے لا مذہبی خود ایک مذہب بن گئی ہے اور سیاست و معیشت کے لادینی زندگی کا سارا مسئلہ بن جانے سے ہمارے اچھے اچھے مخلص دینی اہل قلم تک اتنے مرعوب و متاثر ہوگئے کہ دین بھی گویا توحید و آخرت کی طرح معاشیات و سیاسیات اور اس کے لیے حکومت طلبی کی کوئی مستقل دعوت لے کر آیا ہے۔ اس بات تک بھی اس دور میں نظر وقت کے "حکیم و مجدد ملت" ہی کی گئی کہ بذات خود حکومت و سیاست سرے سے کوئی دینی مقصود و مطلوب ہی نہیں محض کسی وقتی مصلحت سے بعض انبیاء کے ساتھ جمع فرما دی گئی[1] ورنہ ظاہر ہے کہ قریب قریب سارے ہی انبیاء بلا حکومت و سلطنت رہے اور حکومت الٰہیہ کے قیام کی دعوت کا تو ایک لفظ بھی کسی نبی کی زبان پر پوری انبیاء کی تاریخ میں نہیں آیا۔ خود قرآن مجید (میں) "استیذان و تفسح فی المجلس" کے سے بظاہر معمولی معمولی معاشرتی اوامر و نواہی تک کھلے کھلے موجود ہیں لیکن قرآن و حدیث میں کہیں بھی ایک حرف براہ راست حکومت طلبی کے امر کا صاف و صریح نہیں ملتا بچہ بھی اتمام حجت کے لیے ایک طالبعلمانہ استفتا پہلے نجی طور پر بعض اکابر و مشاہیر اہل علم اور سب سے اول آپ کی خدمت میں ارسال ہے اور سب سے پہلے آپ ہی کے جواب باصواب کا منتظر رہوں گا۔ جواب مدلل و مختصر بھی فتوے کے انگ کا درکار ہے۔ سوالات کی اصل اپنے پاس رکھ لی ہے جوابات صرف غیروں کے حوالہ سے عطا فرما دیں۔

امید (ہے) کہ مزاج مبارک بعافیت ہوگا اور سب خیریت ہوگی بندہ بلڈ پریشر کے نام سے آجکل کچھ نیم فرلش ہے اور دین و دنیا کی سلامتی و عافیت کے ساتھ دعائے صحت کا طالب۔

---

[1] ملاحظہ ہو خاتمۃ السوانح صـ۱

محب محترم شجاعت علی صاحب صدیقی زید مسدوقہ کی خدمت میں بوقت ملاقات سلام رسانی فرمائیں؛ ہاشل کی جس تجویز کی آپ دونوں حضرات نے نظری تائید صدقی صدر فرمائی تھی، فرمائیں کہ دو ماہ کی مدت میں صورت کہاں تک پہنچی ؛

مذہب وعقلیات کے بھی دو نسخے حاضر ہیں اس کا ایک نسخہ اور سلسلۂ تجدید کا) دوسرا سیٹ مولانا نور کی سلمہ کے مدرسہ کے لیے ہے۔ ان کا پتہ ٹھیک معلوم نہیں۔ اگر آپ بے تکلف ان کا پہنچا سکیں تو کرم مزید ورنہ مجھی غلام محمد صاحب سلمہ کو لکھ دوں پہنچا دیں گے خود آپ کا پتہ بھی سقط کے سوا یاد نہیں رہا۔ گو آپ کا غائبانام ہی کافی ہوگا تاہم احتیاطاً" دارالاشاعت مولوی مسافر خانہ" بھی لکھ دیا ہے وہاں بھی ہدایت فرمادیں کہ ملنے پر آپ کی خدمت (میں) آجائے۔ والسلام مع الاکرام

دُعا جو و دُعا گو احقر العباد

عبدالباری

○

بسم اللہ

ہارڈنگ روڈ لکھنو ۱۹ ۴۸ء

مخدوم و محترم ادام اللہ فیوضکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ والانامہ انتظار ختم کرکے مایوسی کے بعد مشرف فرما ہوا۔ ایسی صورت میں مصروفیت وخیریت کا دوسطری کارڈ بھی کافی تھا۔ دوسرے ہی کے قلم کا سہی۔" قرار داد مقاصد کی طرف جن الفاظ سے اشارہ فرمایا گیا ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ کو بھی الحمد للہ اس کار عظیم میں اجر عظیم کے حصول کا موقع حق تعالیٰ نے عطا فرمایا، الحمد للہ ثم الحمد للہ بڑا کام ہوا اور حق یہ ہے کہ بڑی ہمت کی ساری دُنیا کے سامنے گویا اک کُنانے کی ہمت تھی، انشاء اللہ اس کی راہ میں سعی کرنے والوں کے لیے بڑے درجات ہیں؛ " لادینی" عہد حاضر میں جہاد نفس سے بھی بڑھ کر جہاد تھا ہوا یہ دینی حکومت کا جہاد بحث تھا۔

اب اصل کام اس کا نباہ ہے، جس کے لیے مسلمانوں میں وہاں کے ایسے" عام وتمام انقلاب" کی حاجت ہے کہ راعی و رعایا سب اس امانت کے تحمل ہوں اور خدانخواستہ ہماری کمزوریوں کی بدولت جگ ہنسائی اور ہماری نالائقیوں کی بدولت دین کی اور بدنامی نہ ہو۔ اعاذنا اللہ۔ اپنا حال تو (یہ) ہے کہ جب سے اخباروں

میں یہ خبر پڑھی بے ساختہ "اللّٰھم انصر من نصر دین محمد صلی اللہ علیہ وسلّم واجعلنا منھم" قلب وزبان پر جاری ہے
تڑپ بڑھ گئی ہے۔ دعا فرمائیں کہ خون لگا کر ہی شہیدوں میں شرکت کی کچھ سعادت نصیب ہو جائے۔ کیا
عرض کروں اب تو اور بھی حضرت علیہ الرحمۃ کی تعلیمات و تجدیدات کے پھیلانے اور ان کے مطابق کام کرنے
کی ضرورت (اس نالائق و ناکارہ کی فہم میں) اشد سے اشد ہو گئی ہے۔ اس سلسلہ میں سالہا سال کی ناقص
فہم و فکر کا جو کچھ حاصل تھا وہ چاروں کتابوں کے سلسلہ میں اور جامع المجددین اور تجدید تعلیم و تبلیغ کے مقدمہ
میں عرض کر دیا ہے نیز تجدید تعلیم و تبلیغ کے مقدمہ میں "انقلاب عام و تام" کے عنوان سے حضرت ہی کی اصلاحات
کی روشنی میں ایک تجویز بھی خاکہ پیش کر دیا ہے جو لاہور حضرت امرتسری مدظلہم العالی کی خدمت میں بغرض
اصلاح بھیج بھی چکا ہوں اور حضرت ہی کے ذریعہ معلوم ہوا کہ ۱۴ مارچ کو جناب بھی وہاں تشریف لا رہے ہیں
اس لیے حضرت ہی کے عریضہ میں یہ بھی عرض کر دیا تھا کہ آپ کی خدمت میں بھی بغرض اصلاح پیش کر دیا جائے[1]
بلکہ موقع و فرصت ہو تو آپ تجدید تعلیم و تبلیغ کے اجزا بھی ضرور ملاحظہ فرمالیں جو معارف اور الفرقان میں
شائع ہو چکے ہیں اور حضرت امرتسری کی خدمت میں حاضری کے وقت حاضر کر آیا تھا۔ ان چیزوں کے ملاحظہ کے
بعد اپنی رائے و اصلاح سے ضرور مستفید فرمائیں۔

احقر کو تو یہ یقین ہے کہ اگر حضرت کی کتابیں ہی مناسب اسالیب سے شائع ہو کر کثرت سے پڑھی
پڑھائی جائیں تو بھی انشاء اللہ لوگوں میں دینی بیداری ضرور پیدا ہو گی اور کسی نظم و نظام کے تحت کام ہو سکے
تو سبحان اللہ میاں صاحب کی دعوت پر جو حاضری ہوتی تھی اسی لائحہ میں وہ ماشاء اللہ دینی و دنیاوی خوبیوں
کے یوں تو ایسے جامع ہیں کہ مسلمانوں میں اب ایسی مثالیں نادر ہیں لیکن دینی کاموں کو بھی دینی و صحیح اصول
کرنے سے اس درجہ ہم بعید و بیگانہ ہو چکے ہیں کہ اہل دین و فہیم لوگوں کو بھی اس طرف لانا دشوار ہو گیا ہے۔
اس لیے ایک تڑپ رہ رہ کر یہ ہو رہی ہے کہ خود حضرت علیہ الرحمۃ کے حضرت امرتسری اور جناب کے
سے حضرات جو وہاں جمع ہو گئے ہیں وہی کسی موقع سے جمع ہو کر کسی نظم و نظام پر غور فرما کر توکلا علی اللہ حسب
استطاعت کام شروع فرما دیتے۔ مولانا شبیر علی صاحب کی خدمت میں بھی کچھ اسی جنون کو ان کی روانگی سے

---

[1] آپ کے پتہ سے ایک کارڈ ان کی خدمت میں لکھا ہے۔ تشریف فرما ہوں تو سلام قبول فرمائیں۔ واپسی کی
نیت کب تک ہے؟

قبل حاضر ہوکر پیش کرنا چاہتا تھا مگر روانگی سے ایک دن قبل ہی والدہ مدظلہا کو گر کر ایسی شدید چوٹ آئی کہ اب تک فروکش ہیں یہاں سے حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے سلسلے کے کچھ اور جوان سال و جوان ہمت بھی تیار ہیں

اگر آپ "انقلاب عام و تام" کی معروضہ تجاویز ملاحظہ فرمائیں تو احقر کے نزدیک مقدم کام یہ ہے۔ کہ پہلے کسی مقام پر چار پانچ حضرات بیٹھ کر ایک ایسے مدرسہ کے عنوان سے آغاز کر دیں کہ جہاں سے کام کے آدمی (تعلیم و تربیت کے لحاظ سے) آگے پیدا بھی ہوں اور اس وقت جو کچھ صلاحیت والے مل سکیں ان کو چند ماہ میں ضروری تربیت کے ساتھ کام میں لگایا بھی جا سکے اور جہاں تک ہو سکے وہی مدرسہ حضرت علیہ الرحمۃ کی کتابوں کی حفاظت و اشاعت کا بھی مرکز ہو اور آپ وہیں تشریف فرما ہوں اور اگر اس میں کوئی مجبوری ہو تو پھر اس خدمت کا مرکز وہ ہو جہاں آپ ہوں اور حضرت کی تصانیف کے سلسلے میں جو جو خدمات آپ نے تحریر فرمائی ہیں سب اپنی اپنی جگہ ضروری ہیں۔ بیان القرآن کے حسب طرز سے ضروری مضامین کے تحشیہ کی صورت سے اشاعت کا آپ نے خیال ظاہر فرمایا ہے اس کے سوا کیا عرض کروں کہ توارد نے احقر کے خیال کی اور تقویت فرمائی، خود تو مستقلاً اس خدمت سے بعض عذرات ہیں جن کو سماعت کے بعد آپ بھی امید ہے قبول فرمالیں گے لیکن انشاء اللہ اس مدرسہ ہی میں جو حضرات جمع ہوں گے انھیں میں سے کسی نہ کسی میں اس کی اہلیت ہوگی اور شرکت و اعانت کی سعادت حاصل کروں گا۔ حضرت کی تمام تصانیف کو کسی ایک جگہ کم از کم جمع بھی کرنا ضروری ہے اور جا بجا ضروری ضروری اصلاحی کتابوں کے چھوٹے چھوٹے دار المطالعے کثرت سے قائم کرنا کرانا یہ حضرت کی تعلیمات و اصلاحات کے افادہ و استفادہ کی تعمیم کے لیے ضروری ہے۔

اپنے ان خیالات کو جن کو بہت سے لوگ خبط خیال کرتے ہیں دور سے کہاں تک عرض کروں بس کچھ اندازہ "انقلاب عام و تام" سے فرمائیں اور بہت کچھ اگر آپ حضرات نے امامت قبول فرمائی تو اقتدار کے وقت عرض کروں گا۔ جناب کی شفقت کے باوجود مصروفیت کا حال سُن کر طبیعت طویل مراسلت میں تقدم و تاخر کرتی ہے۔ امید ہے کہ انشاء اللہ اس عریضہ اور "انقلاب عام و تام" کے ملاحظہ کے بعد طویل مراسلت کی زیادہ ضرورت نہ رہے گی۔ احقر تو خود (اپنے ضعف طبیعت کی وجہ سے) بالعموم کارڈ ہی سے کام لے لیتا ہے کہ اس میں گنجائش ہی محدود ہوتی ہے۔ والسلام مع الاکرام

احقر العباد دعا کا طالب

عبد الباری غفرلہ

بسم اللہ

شبستان ۔ ۲۰ اگست ۱۹۶۱ء

حضرت مخدومی و محترمی متعنا اللہ بطول بقاکم مع الصحۃ والعافیۃ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ ۔ گرامی نامہ نے مشرف فرمایا تھا جب سے آں مخدوم کے شفاءِ کامل و عاجل کے لیے دُعا کی توفیق میں تو الحمد للہ اپنی جیسی اور زیادتی ہو گئی ۔ امید ہے کہ اب مزاج مبارک زیادہ بہتر ہو گا ۔ اور ضعف میں زیادہ کمی ہو گی ۔ یہ ناکارہ تو اب اپنی صحت کے متعلق یہی کہتا ہے کہ سن و سال کے دیکھتے الحمد للہ شکر ہی شکر کا حال ہے اور گرتا پڑتا چلا ہی جا رہا ہوں ادھر البتہ طبیعت کچھ زیادہ مضمحل ہو گئی تھی اور کچھ زیادہ لیٹ بھی گیا تھا اور آں محترم کے کرم نامہ کے جواب میں تاخیر کی ایک وجہ یہ بھی ہوئی ۔

جی ہاں ! طرفین کے رسائل و کتب ہی کیا بند نہیں ہر طرف آزادی ہی آزادی ہے احقر کو تو حضرت اقدس حکیم الامت علیہ الرحمۃ کا یہ قول اکثر یاد آیا کرتا ہے اور سُنایا بھی کرتا ہوں کہ جب آزادی ملے گی تب حال معلوم ہو گا ۔ (او کما قال)

معارف القرآن کا کتنا حصہ پورا ہو چکا ہے ؟ اللہ تعالیٰ تکمیل فرمائیں مجھ کو تو کچھ ایسا خیال آتا ہے کہ غالباً حضرتؒ کی حیات ہی کے زمانہ سے احکام القرآن تحریر فرما رہے تھے اور حضرت سے جب احقر کی حاضری میں آپ بھی تشریف فرما ہوتے تو اس سلسلے میں کچھ استفادہ و استشارہ بھی ہوا رہتا میری یاد تو اب قابل اطمینان نہیں ممکن ہے کوئی اور چیز رہی ہو ۔

معارف القرآن کا اگر کوئی حصہ طبع ہو چکا ہو یا زیر طبع ہو یا زیر تبییض تو کم از کم سورۂ فاتحہ کے علاوہ تعوذ کی " وبالآخرۃ ہم یوقنون " کی آیات سے خصوصی استفادہ کا محتاج ہوں یاد نہیں گزشتہ عریضہ میں صرف متقین کے لغوی معنی کی نسبت عرض کیا تھا یا کچھ یہ بھی کہ اس کم علم بلکہ بے علم کے نزدیک تو " بالآخرۃ ہم یوقنون " تک سب ہی لغوی معنی میں ہیں مثلاً صلوٰۃ کے لغوی معنی دعا یا طلب اور مانگ ۔ اگر یہ مانگ ہی صحیح معنی میں پیدا ہو جائے اور اس کی راہ میں انفاق وغیرہ کسی چیز سے دریغ نہ ہو تو انشاء اللہ ہدایت یابی یقینی کیا بلکہ " الذین جاهدوا فینا لنهدینهم سبلنا " کے جیسے مؤکد وعدہ کے ساتھ موجود اور یقینی ہی ہے خود اپنے تجربہ میں بعض غیر مسلموں تک کی ایسی مثالیں آئی ہیں جو انشاء اللہ ملاحظہ سے گزریں گی ۔ البتہ یہ عجیب بات

ہے کہ خود اپنے حضرت اور حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہما کی جو سند ملی ہے وہ "لتستقین" کے متعلق اور یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ جس اشکال کی بنا پر "تستقین" کے معنی لغوی تقوی لیا گیا ہے اسی طرح "بالآخرۃ ہم یوقنون" تک سب کے معنی لغوی ہی کیوں نہ ہوں اور گو خود آں محترم نے تعوذ کے متعلق اور ابتدا ہی میں اس سے اعتنا نہ کرکے حضرات مفسرین کی جو توجیہ فرمائی ہے اس کے باوجود معارف القرآن کے جو اوراق روانہ فرمائے گئے ہیں اس میں سورۂ فاتحہ کی تفسیر ہی میں تعوذ کا ایک مستقل عنوان موجود ہے اور اپنی بے علمی کے لیے وہی سند کافی ہے۔ والانامہ محفوظ ہے انشاء اللہ اسی کے حوالہ سے فائدہ اٹھاؤں گا اور اگر کچھ حصہ طبع ہو چکا ہو تو کیا کہنا۔

جس استفسار کے متعلق زحمت دی تھی الحمد للہ دیوبند کا بھی وہی فتوی ملا وہاں کے تازہ المناک واقعہ کی اطلاع تو ضرور پہنچی ہوگی بس انا للہ وانا الیہ راجعون کے سوا کیا عرض کیا جائے وہاں کا حال تو کچھ زیادہ معلوم نہیں لیکن یہاں کی دینی درسگاہوں میں بھی اب دنیوی درسگاہوں کی نقالی اساتذہ وطلبہ سبھی میں احساس کمتری کے ساتھ روز افزوں ہے، باقی ان درسگاہوں کے فارغ التحصیل جواب بھی تمام ممالک اسلامیہ میں ہزاروں کی تعداد میں ہیں، معلوم نہیں کہ ان میں سے دو چار فیصد بھی نبوت کی نیابت کا کام "وما اجری الاعلی رب العلمین" کے تقاضوں کے ساتھ خصوصاً عوام میں پہنچ کر جواب بھی الحمد للہ بدعات وخرافات میں جو کچھ بھی مبتلا ہوں لیکن نئی تعلیم والے نام کے مسلمانوں کی طرح دین بیزاری سے بہت دور ہیں، ان میں کام کرکے اور ان کو صحیح معنی میں مسلمان بناکر اگر جمہور امت یا اس کی معتدبہ اکثریت بھی معتدبہ معنی میں صحیح مسلمان ہو جائے تو پھر انشاء اللہ سارے کام مع اپنے اسباب کے مسبب الاسباب کی رحمت ونصرت سے پورے ہو کر رہیں گے لیکن اب تو ہم اپنے دینی کاموں میں بھی آئے دن جماعت سازیاں وغیرہ کے رائج الوقت طریقوں ہی میں گرفتار ہیں یہ سراپا بے علم و بے عمل جماعت سازی کے ہیضہ کو "واعتصموا بحبل اللہ جمیعاً ولا تفرقوا" کے خلاف عین تفرق سازی کہا کرتا ہے۔

لیجئے دل کی کچھ نہ کچھ بھڑاس آں مخدوم کے سامنے بھی نکال ہی لی۔ بس نمازوں میں اگر کچھ توجہ کی توفیق مل جاتی ہے تو "اھدنا الصراط المستقیم صراط الذین انعمت علیھم غیر المغضوب علیھم ولا الضالین" کی دعا کی ضرورت تو خود ہم نام کے مسلمانوں میں معلوم ہوتی ہے۔ دراز نفسی کا عفو خواہ اور دعا کا ملتجی ومحتاج۔ والسلام مع الاکرام

اں حضرت مخدوم مدظلہا کی خیریت تو پوچھنا رہ ہی گیا، دعا کی توفیق آں مخدوم کے ساتھ انکے

لیے بھی ملتی رہی خدا کرے بہتر ہوں۔

احقر العباد عبدالباری غفرلہٗ

O

باسمہٖ تعالیٰ

۱۵ر۲ر۷۰ء شبستان ہارڈنگ روڈ لکھنؤ

حضرت مخدومی و محترمی بارک اللہ فی برکاتکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ ! مدت کی غیر حاضری کے بعد آج یہ نیم زیارت کی سعادت پھر حاصل کر رہا ہوں وہ بھی "سلام روستائی بے غرض نیست" کہ اسی کچھ غرض نے صورت پیدا کر دی جس کی نوعیت ایک ریٹائرڈ سیشن جج کے ملفوف تازہ خط سے واضح ہو گئی۔ باقی اس دوران میں اس اسیر بستر کی اسیری میں بھی غیر معمولی زیادتی رہی۔ مہینوں کے بعد اب کچھ بستر سے اُترنے لگا ہوں وہ بھی محلہ کے مسجد کے بجائے فرلانگ ڈیڑھ فرلانگ دور ایک مسجد میں ذرا الحمد للہ جماعت و امامت کا اہتمام بہتر ہے اور جماعت کثیر بھی ہوتی ہے، پھر بھی وہاں اکثر رکشہ پر جانا پڑتا ہے اب ادھر اس قابل بھی نہ رہا۔ پرسوں مدت کے بعد خدا خدا کر کے پھر اس قابل ہوا اور یہ عریضہ ایک محترم دوست کے صاحبزادے اور اس مسجد کے امام طاہر اطہر ہی سے لکھا رہا ہوں جو جناب مستقلاً یہ تکلیف گوارا کرتے تھے ان کا اب ٹھکانہ نہیں اور کاتب ہذا بھی طالب علم ہیں قلیل الفرصت۔ یہ اس واسطے عرض کر دیا کہ صحت کی اور ضعیفی کی معذوریوں کے علاوہ ایک بہت بڑی معذوری خود نہ لکھ سکنے کی بھی رہی ہے۔

بہرحال یہ احقر کا حال تھا، امید ہے کہ آں محترم مع اہل و عیال بعافیت ہوں گے۔ مجھ کو تو الحمد للہ آپ کی صحت و عافیت کے لیے اپنی جیسی دُعا کی روزانہ توفیق ملتی ہے آپ کو بھی یاد آجائے تو کبھی کبھی ایمان پر خاتمہ اور مغفرت کا خصوصاً ملتجی ہوں۔

آمدم بر سر مطلب یہ مطلب تو آپ کو ملفوف خط ہی سے کچھ معلوم ہو جائے گا اور ندوہ کے مفتی صاحب کے جواب سے تو کوئی راہ نظر نہ آئی، انھوں نے ایک صورت روائی مسجد کی لکھی جس سے یہ مشکل حل نہیں ہوتی مسجد میں بے نمازیوں کے تو وہاں پہلے ہی سے سینکڑوں پڑی ہیں، خصوصاً نئے انقلاب کے بعد دوسری طرف مجھ کو اندیشہ یہ ہے کہ مسجد تو بن نہ سکے گی اور اگر کوئی دوسری صورت نہ نکلی تو ۲۰۰۰، خدا جانے کیا ہو یہ بھی شاید آں محترم کو یاد ہو کہ جب کراچی پر آپ ہی کا مہمان ہونے کی سعادت حاصل تھی تو ہمارے ماشاء اللہ

اسم باسمیٰ شجاعت علی' جب ملنے کے لیے تشریف لائے تو پہلی ملاقات ہی میں آپ کے سامنے ہی غالباً اس مسلم ہاسٹل کی تجویز کا ذکر آیا تھا اور بڑی آمادگی ظاہر فرمائی تھی، اپنے یہاں کچھ بڑے تاجروں اور سرمایہ داروں کا اجتماع بھی کیا تھا ایک کھانے پر مگر پھر ہمارے وہ محترم دوست بھی صرف ایک اخبار ہی نکال کر رہ گئے، کاش یہ اخبار کسی مسلم ہاسٹل میں بیٹھ کر نکالتے تو اس کے جدید تعلیم کے طلبہ دیکھتے کہ اعلیٰ جدید تعلیم یافتہ اور اعلیٰ عہدیدار بھی ماشاء اللہ کیسے اعلیٰ مسلمان بھی ہو سکتے ہیں۔ میرا اس مسلم ہاسٹل کی تجویز کے متعلق ہمیشہ یہی خیال رہا کہ اسکے نگران یا ناظم جو بھی کیجیے اسی تعلیم کے دیندار لوگ ہوں تاکہ طلبہ اپنی آنکھوں سے دیکھتے رہیں کہ جدید تعلیم اعلیٰ سے اعلیٰ اور اعلیٰ سے اعلیٰ دُنیا کی عزت و ملازمت کے ساتھ بھی اسلامیت میں کوئی فرق نہیں آتا۔ یہ ہمارے غازی الدین صاحب سلمہٗ جن کا خط ملفوف ہے وہ بھی اسی قسم کے اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں اور رہنے والے جوار لکھنؤ ہی کے ہیں، میرے کہنے سے اس ہاسٹل کے لیے وہ اپنی خدمات بڑی خوش دلی سے پیش کرنے کے لیے تیار رہے بلکہ سال بھر خود مجھ سے زیادہ دوڑ کرتے رہے مگر نتیجہ صفر۔ ہمارے اندر ایسے خاموش ٹھوس کاموں کی صلاحیت اور بھی مفقود ہے۔ یہیں لکھنؤ میں ہمارے علی میاں سلمہم جیسے با اثر کی موجودگی میں بھی یہ کام ان سے نہ نکل سکا۔

اب ہمارے غازی صفت میاں غازی الدین حیدرآباد واپس جا کر وہاں وقف بورڈ کے سیکرٹری ہو گئے ہیں تو اب ان کو ایک موقع خود ہاتھ آیا اور ایک لاکھ بہتر ہزار کی یہ رقم بالکل ان کے ہاتھ میں ہے مگر مسجد کے وقف کا مسئلہ حائل ہے شاید آں محترم کا مسلم تفقہ کوئی مخلص نکال سکے۔ یہ زحمت بالخصوص اسی لیے ہے۔

جس طرح میرے دین مہر کا مسئلہ میاں کے منقیوں کے اختلاف سے ناحل ہی رہا اور بالآخر آپ ہی کی طرف رجوع کرنے سے قابلِ اطمینان حل نصیب ہوا تھا۔ دُعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کے لیے بھی آپ ہی کی کرامت و تفقہ سے کوئی راہ نکال دیں۔

ہمارے ممدوح شجاعت علی صاحب سے تو آں مخدوم کی ملاقات ہوتی ہی ہوگی، خیال آجائے تو سلام رسانی اور درخواست دعا فرمائیں۔

خوب یاد آیا جس طرح جدید تعلیم والوں کی دینی تعلیم و تربیت کا سب سے آسان نسخہ یہ مسلم ہاسٹل کی تجویز ہے اسی طرح ہمارے عوام کی اسلامی تعلیم و تربیت کی ذمہ داری ہمارے دینی دارالعلوموں کے فارغ التحصیل علماء پر ہے کہ نبوت کی نیابت انھیں کے اُوپر عائد ہے نظام صلاح و اصلاح ہمارے ایک دوسرے محترم مخدوم مولانا بنوری سلمہم نے اس کے لیے خود ہی بڑی بیتابی سے خود اپنے مدرسہ سے اس کی

ابتدار کا ارادہ فرمایا تھا۔ احقر کو تین دن اپنے مدرسہ میں اسی غرض سے گرفتار بھی رکھا ہے لیکن پھر کچھ خبر نہ لی نہ دی۔ آں مخدوم نے بھی نظام صلاح و اصلاح کو پسند بہت فرمایا تھا اور غالباً تحریر فرمایا تھا کہ باوجود فرمائش ہونیکے اس کو زچوا کر سنتے رہے۔ ہمارے عوام میں مشینریوں کی طرح سے چاٹنے کی ابتدائی خدمت کا حق اگر ہمارے ان فارغ التحصیل نام کے علمانے ادا نہ کیا تو جدید تعلیم والے تو اسلام کے ہاتھ سے نکلتے ہی جارہے ہیں۔ عوام کو بھی خصوصاً اس کمیونزم یا اس کے بچہ شتر سوشلزم کے جنگل سے باہر رہنا ناممکن ہی ہوگا، جیسا کہ آپ اپنے ہی یہاں مشرقی پاکستان میں دیکھ بھی رہے ہیں بہرحال یہ تو سب ایک ناکارہ علمارہ علماء ہر طرح نام کے مسلمان کے دل کی ٹیس ہے جو موقعہ پا کر نکل گئی۔ وفقنا اللہ لما یحب ویرضیٰ۔

والسلام مع الاکرام   احقر الانام

عبد الباری غفرلہٗ

مکاتیب از مولانا عبد الماجد دریابادی صاحبؒ

بسم اللہ

دریاباد ۲۱ اپریل ۱۹۴۳ء

مکرم و محترم۔ وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

پہلے رسالہ نے مشرف فرمایا پھر مکتوب گرامی نے۔ قطع تعلق[1] کی خبر پڑھ کر پہلے تو اکبر کا شعر یاد آیا ؎

اُٹھا تو یہ ولولہ تھا دل میں کہ صرف یادِ خدا کریں گے
معاً مگر یہ خیال آیا ملی نہ روٹی تو کیا کریں گے

مگر فوراً ہی جواب بھی ربِّ اکبر کی زبان سے مل گیا یجعل لہ مخرجًا و یرزقہ من حیث لایحتسب اسباب کا تجربہ بہت روز ہو چکا اب قطع اسباب کا بھی تجربہ ہو جائے گا۔

جن منزلوں سے دیوبند اس وقت گزر رہا ہے۔ ان کے لحاظ سے تو آپ کا چلے آنا ہی بہتر ہوا۔ تھانہ بھون کو تو میں آپ کے حق میں دار الہجرۃ سمجھوں گا۔

---

[1] دار العلوم دیوبند سے حضرت والد صاحبؒ کا استعفا مراد ہے۔

میری خودغرضی بھی اسی کو چاہتی ہے کہ آپ حضرت مولانا سے قریب ہی رہیں۔ کبھی کبھی حضرت کی خیریت
آپ کے ذریعہ سے ہی ملتی رہے گی۔ وصّل مرحوم کے بعد سے کوئی ایسا شخص میرے لیے رہا نہیں۔ خود مولانا کو
اب محض دریافت خیریت کے لیے تکلیف دیتے اچھا نہیں معلوم ہوتا۔

اصح الاقاویل کا ذکر صدق میں کردیا جائے گا اور یہ ریڈیو والا مضمون تو انشاء اللہ بعد میں ہی شائع ہو
گا، گنجائش نکلنے پر۔ والسلام

محتاج دعا
عبدالماجد

⊙

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اخبار صدق

دریاباد ضلع بارہ بنکی — مورخہ ۱۸؍ دسمبر ۱۹۵۳ء

مخدوم و مکرم، السلام علیکم و رحمۃ اللہ

آپ کو بارہا لکھنے کو جی چاہا۔ ہر بار کوئی نہ کوئی عذر پیش آگیا۔ نوبت آج جاکر آرہی ہے۔ پتہ اب بھی
صحیح نہیں معلوم۔ اندازہ سے لکھ رہا ہوں۔

آلہ مکبر الصوت پر آپ کا جامع و مانع رسالہ پہنچ گیا۔ جزاک اللہ۔ انشاء اللہ گنجائش نکلنے پر ضرور اس کا
ذکرِ خیر صدق میں آئے گا۔ اس سے قبل آپ کا وہ رسالہ اسلامی آئین و مملکت پر بھی موصول ہوگیا تھا۔ ماشاء اللہ
سنجیدہ، مدلل شافی تھا۔ اس کا تذکرہ بھی اب تک صدق پر قرض ہے۔

ڈان کے کارٹون کے معاملہ میں آپ کی سلامت روی سے بڑا دل خوش ہوا۔ اس پر صدق میں نوٹ
بھی دے دیا تھا۔ "تکفیر نہیں تفہیم" کے عنوان سے۔ دوسرے علماء بھی آپ کی سی محتاط روش اختیار کرلیں تو
مولوی صاحبان کا طبقہ بڑی بدنامی سے بچ جائے۔

سید صاحبؒ کا واقعہ بھی ہم سب لوگوں کے لیے سخت ہوا، اپنے رنگ میں ایک فرد ہستی تھی،
جیسے دوسری فرد ہستی مولانا شبیر احمدؒ کی تھی۔ والسلام

دعاگو و دعاخواہ
عبدالماجد

بسم اللہ

صدقِ جدید

مؤرخہ .... ۱۹۶۱ء   دریا باد ضلع بارہ بنکی

مخدوم و مکرم السلام علیکم ورحمۃ اللہ

مدت دراز کے بعد "بینات" کے واسطہ سے زیارت ہوئی۔ جزاک اللہ و بارک اللہ اتفاق سے ایک نمبر "بینات" کا وصول نہ ہو سکا۔ آپ کے مقالہ "جہاد" کو من و عن پڑھنا چاہتا تھا وہ بات حاصل نہ ہو سکی۔ اگر پورا مقالہ کتابی صورت میں عنایت ہو جائے تو بہت خوب ہو۔

آپ ہی کے شہر کے "نگار" کا فروری نمبر پہنچا۔ کوئی بزرگ رحمت اللہ طارق نامی ہیں، ان کے قلم سے مسئلہ تصویر نمبر پر نظر سے گزرا۔ بڑا ہی تکلیف دہ صبر آزما ہے اپنے کسی شاگرد کو لکھ دیجئے کہ اس کا نمبر ابھی مہیا کر کے وہیں کے کسی رسالے یا خود نگار ہی میں شائع کرائیں۔ ایک مخصوص ٹکڑا ہے (یعنی آنحضور کا قبل عقد بی بی عائشہ کو خواب میں دیکھنے) کا جواب صدق کے آئندہ نمبر میں دے رہا ہوں۔

کتاب حکیم الامت کی طبع ثانی میری اجازت سے مولوی رئیس احمد جعفری ندوی لاہور میں کرا رہے ہیں۔ ہمارے ہاں کی مجلس تحقیقات شرعیہ اپنی بساط بھر خاصہ کام کر رہی ہے۔ نئے نئے فقہی مسائل حل طلب خصوصاً سائنسی ترقیوں کی بنا پر کثرت سے پیدا ہو گئے ہیں۔ والسلام

دُعاگو و دُعاخواہ

عبدالماجد

مکاتیب مولانا شبیر علی صاحب نور اللہ مرقدہ

برادر مہربان زاد الطافکم وسلکم اللہ تعالیٰ وعافاکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

محبت نامہ پہنچا اور عین انتظار میں پہنچا۔ سوچ یہ رہا تھا کہ کوئی عمدہ سا شعر یاد آجائے جس میں کسی اللہ کے بندہ نے بہت ہی جل کر کسی کی غفلت شعاری کی شکایت کی ہو تو صرف وہ آپ کو لکھ دُوں بہت شعر یاد آئے، کتابیں دیکھیں مگر افسوس ہے کہ کوئی بھی ایسا نہ نکلا جو میرے قلب مضطر کی ترجمانی کرتا۔ مجبور تھا اور پریشان کہ کل کی ڈاک سے والا نامہ کہوں، عنایت نامہ کہوں، راحت نامہ لکھ دُوں، پہنچ گیا، لفافہ دیکھا، فرحت سے یا غایت اضطرار سے آنسو آگئے۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ اگر بچہ گر جاوے اور کوئی اس کا پرسانِ حال نہ ہو تو وہ اُٹھ کر چپکا چل دیتا ہے اور جو کوئی پُوچھ لے کہ چوٹ تو نہیں لگی تو بس ڈھئے دے دیتا ہے اس وقت میرے پاس نواب جمشید علی خاں صاحب تشریف رکھتے تھے انھوں نے دیکھ لیا کہ اس کے ہاتھ کانپ رہے ہیں اور آنکھوں میں آنسو ہیں پوچھ بیٹھے کہ مولوی صاحب خیریت تو ہے۔ بس کیا تھا، آنسو مچل گئے اور جو ہونا تھا ہُوا ان کی تسلی کی اور خود کانپتے ہوئے ہاتھوں اور لرزتے ہوئے دل سے عنایت نامہ کو کھولا، پڑھا اور بار بار پڑھا خیریت معلوم کر کے اللہ کا شکر ادا کیا حالات معلوم کر کے کسی سے متفکر اور کسی سے خوش ہُوا، اس وقت رات کا ایک بجا ہے۔ خیال تھا کہ جواب صبح کو لکھوں گا مگر نیند کس کو آتی تھی۔ گھر میں سے اُٹھ کر آیا ہُوں کوٹھی میں بیٹھا یہ سطریں لکھ رہا ہُوں، میں آپ حضرات کی وجہ سے خصوصاً اور وہاں کے حالات کی وجہ سے عموماً جس قدر متفکر و پریشان رہتا ہُوں اس کو میرا مالک ہی جانتا ہے بس اس سے اندازہ کر لیجئے کہ میں جولائی ۴۷ء میں دہلی گیا تھا تو اسٹیشن پر ویسے ہی تک پر کھڑا ہوگیا اور وزن کیا تو میرا وزن تین من دس سیر تھا اور اب دسمبر ۴۸ء میں ایک روز تولا تو وزن دو من نو سیر ہُوا۔ طبیب کو نبض دکھلائی کہ یہ کمی جو ہوئی ہے اس کی وجہ سے قوتِ اصلیہ تو کم نہیں ہوئی، اس نے کہا کہ اصلیہ اور فضلیہ دونوں ہی کم ہوگئیں، قلب اور دماغ پر بہت اثر ہے اور آپ کے سوا اور حضرات تو اپنی خیریت سے بھی اطلاع نہیں دیتے وہ اسی انتظار میں رہتے ہیں کہ اس کا خط آئے تو جواب لکھیں، میں ایک ہُوں جو بھی خط لکھے گا اس کو ایک خط لکھنا ہوگا اور میں لکھوں تو کتنے خط لکھوں میں کسی کی شکایت نہیں کر رہا ہوں اپنی بولیشہ کا ذکر کر رہا ہُوں یقیناً لوگ اس کو باؤلا پن ہی کہیں گے اور ہے بھی یہی مگر کیا کروں دل سے مجبور ہوں۔

میری حاضری کا حال نہ پُوچھیے، میں جب وقت حاضری کا اور کاموں سے فراغت کا نکالتا ہُوں، تو اس وقت تو کوئی نہ کوئی لم لگ جاتی ہے اور اس وقت کے گزر جانے کے بعد پھر چاروں طرف سے کام پھر گھیر لیتے ہیں۔ دسمبر میں حاضری کا قصد تھا باوجود اپنی بیماری کے قصد کر لیا تھا سب نے کہا بھی کہ تم

سانس وغیرہ کے ہمیشہ کے مریض ہو اور اس وقت خاص طور پر طبیعت علیل ہے لیکن میں نے قصد کرلیا تھا، لیکن اجازت ملنے پر دیر ہوگئی۔ مجھے اجازت مل گئی لیکن مولوی ظہور صاحب کو اب تک بھی نہیں ملی تنہا سفر کی ہمت نہ تھی، مجبوراً ان کا انتظار کر رہا ہوں اور اب کاموں نے اس قدر احاطہ کیا ہوا ہے کہ نہ معلوم ان سے کب چھٹکارا ہو، اندازہ ہے کہ غالباً فروری میں حاضر ہوں گا۔ عواقب امور کی خبر تو یقیناً خدا کو ہی ہے مگر آپ کے ساتھ تو بال بچے سب تھے اور یہاں ماشاءاللہ برخوردار محمد زکی ہر کام کو سنبھالنے والے موجود تھے۔ میں تو تین ماہ کا قصد کر کے بھی بے فکر ہو کر وہاں نہیں آسکتا اور خبر اللہ کو ہی ہے۔

ہاں ایک بات عرض کرتا ہوں جس کی اطلاع آپ کسی کو نہ کریں اور وہ یہ کہ وہاں حاضری کے وقت میں چاہتا ہوں کہ میرے قیام کا انتظام آپ کی معرفت ہو تو وہ سادہ اور پُرسکون ہوگا، اگر کسی اور کی معرفت ہُوا تو اس میں تکلفات زیادہ ہوں گے سکون نہ ہوگا بلکہ ان کی معرفت ہونے میں پھر خطرہ ہے کہ ہنگامہ نہ ہو جائے کراچی میں میرا قیام زیادہ سے زیادہ ایک ہفتہ رہ سکتا ہے پھر جس قصد سے میں آ رہا ہوں، اس کے لیے مجھے آگے جانا ہے بجز اعزہ کے کہ وہاں تو مجبوری ہے اور کسی بڑے چھوٹے کی دعوتوں سے بھی میرا خیال عذر کر دینے کا ہی ہے اور میرا عذر صاف ہے کہ میری یہاں کی مصالح کے خلاف ہے اگر آپ کی طبیعت پر بار نہ ہو اور جب آپ کا ذاتی مکان بھی نہیں ہے تو آپ خاموشی سے میرے قیام کے لیے دو جگہوں میں سے ایک جگہ تجویز فرما دیں ۱۔ کوئی ہوٹل جہاں مجھ پر زیادہ بار بھی نہ پڑے اور آرام بھی مل جائے ۲۔ کسی مسجد یا مدرسہ کا حجرہ جہاں ہوٹل سے بھی زیادہ سکون کی امید ہے مسافر ہوں گا اور مقصد سفر کوئی ذاتی نہیں بلکہ بظاہر دینی ہے اس لیے وہاں قیام میں کوئی حرج بھی نہیں۔ رہا کھانے کا انتظام اس کی نسبت اتنی دور بیٹھ کر میں کوئی رائے نہیں لکھ سکتا۔ میں خاموش وقت گزارنا چاہتا ہوں اور خاموشی سے جس کام کے لیے آرہا ہوں اس کو انجام دینا چاہتا ہوں لہٰذا براہِ مہربانی آپ ذرا تفصیل سے مطلع فرما دیں کہ اس بارہ میں آپ میری کس حد تک امداد فرما سکیں گے۔ یہاں تک خط لکھا تھا کہ میاں منظر سامنے آگئے میں نے ان سے پوچھا کہ تم سب کے گھر دیکھ کر آئے ہو اور ہوٹل وغیرہ بھی دیکھے ہیں بتاؤ میرے لیے کہاں جگہ ہے میں نے مفتی صاحب کو ایسا لکھا ہے انھوں نے کہا اگر مفتی صاحب کے انتظام میں آپ کا قیام ہو تو مفتی صاحب کے مکان پر ایسے کمرے ہیں کہ جہاں ان کو بھی کوئی تکلیف نہ ہوگی اور آپ کو بھی نہ ہوگی، مفتی صاحب ہی کا فلیٹ ایسا ہے جس میں ایسی جگہ ہے۔ میں نے کہا کہ مفتی صاحب کا کتب خانہ بھی تمہارے آنے کے بعد کچھ پہنچا

ہے اور والدہ صاحبہ محترمہ اور بہو سلمہا بھی پہنچے ہیں اور خط سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض دیگر عزیز بھی مفتی صاحب کے پہنچے ہیں، اس پر انھوں نے کہا کہ اگر وہاں ان وجوہ سے قیام نہ ہوسکا تو اسٹیشن کے قریب ہی ایک ہوٹل ہے۔ نگار اس کا نام ہے۔ مفتی صاحب کے مکان تک پہنچنے میں چار پانچ پیسے لگیں گے وہ بہتر ہے۔

اب میں اس کو آپ پر چھوڑتا ہوں کہ جس طرح میں نے بے تکلف سب کچھ لکھ دیا ہے آپ بھی بالکل تکلف نہ فرماویں۔ میری طبیعت سے اور مجھ سے آپ واقف ہیں کہ میں خود آتو ہوں اور مجبور آتو خاصیت ہونا تو لازمی آ ہے اس لیے جہاں مناسب ہو میرا انتظام فرمادیں مگر اس کی کسی کو بھی اطلاع نہ ہو جب آؤں گا میں صرف آپ کو آمد کی تاریخ سے اطلاع دُوں گا۔ پس آپ تنہا اسٹیشن پر تکلیف فرماویں تاکہ مجھے معلوم ہو جائے کہ کہاں انتظام ہے اور اس کا راستہ وغیرہ دیکھ لُوں، یہ تو نہیں کہہ سکتا ہنگامہ سے حضرتؒ کی طرح جی گھبراتا ہے۔ بس اللہ تعالیٰ حضرتؒ کا اتباع صوری ہی نصیب فرمادے۔

آپ نے تو خیالات واوہام سے اپنی تحریر کو تعبیر فرمایا ہے اب اس تحریر کو فضول ہی کا اس ہی کا عنوان دیا جاسکتا ہے سب کو علی قدر مراتب سلام و دُعا۔ والسلام

احقر شبیر علی عفی عنہ

۱۸ر جنوری ۴۹ء

احقر شبیر علی عفی عنہ ۲۵ر محرم ۷۰ھ ۶ نومبر ۵۰ء

برادر مہربان جناب مفتی صاحب زاد مجدکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ۔

والا نامہ صادر ہُوا تھا اور اسی روز عریضہ لکھا تھا لہٰذا اسی میں رسید خط عرض کر دی تھی، آپ نے اپنے عنایت نامہ کے ۲ میں یہ بھی تحریر فرمایا ہے کہ اوّل تو حقیقی پاکستان سے اس نام کے پاکستان کے لیے کسی کو دعوت دینا سمجھ میں نہ آتا تھا پھر یہاں کے حالات بھی اہل دین کے لیے کچھ قابل اطمینان نہیں۔ اس کے متعلق یہ عرض ہے کہ کیا اس چودہویں صدی میں ہم کو دین کی اشاعت اور اس پر عمل کرنے سے مایوس ہو جانا چاہیئے اور اب وہی احادیث قابل عمل رہ گئی ہیں جن میں آخر زمانہ میں عزلت اور گوشہ نشینی کو حفاظت ایمان کے لیے ضروری فرما دیا گیا ہے یا مرے پاکستان کو حقیقی پاکستان نہ بنا سکنے میں کچھ ہماری ہی کوتاہیوں کو دخل ہے

اگر واقعی یہی حالت ہے تو پھر میں ہی آکر کیا کروں گا، گوشۂ تنہائی کے لیے یہاں سے بڑھ کر اور کہاں جگہ ملے گی اور اگر اس میں اپنی ہی کچھ کوتاہی ہے تو اس کی اصلاح ضروری ہے آپ کی نسبت تو یہ عرض نہیں کیا جا سکتا مگر میں دیکھتا ہوں کہ میرا نفس قرآن و حدیث میں بھی اپنی خواہش کے مطابق احکام تلاش کر لیتا ہے اور حالات کو ان ہی پر منطبق کرنے کی کوشش کرتا ہے، مجھے اپنی کم علمی اور جہل پر تین سال سے بہت افسوس ہو رہا ہے بس سے پہلے جو کام تھا اس کو سب حضرات باحسن وجوہ کر رہے ہیں اور میرا جہل میری ذات کے لیے مضر تھا۔ عام مسلمانوں کو اس سے کوئی ضرر نہ تھا، اب حالات بدلے، کام بدلا، ضرورتیں بدلیں اور کام کے حضرات نے اب بھی اپنا وہی طرز رکھا، میں اگر اس طرز کو جاری کرنا چاہوں تو نہ قوت تقریر نہ قوت تحریر، اس جہل کی حالت میں نہ کسی کو سمجھا سکوں نہ بتلا سکوں ادھر نفس و شیطان نے مریض ہونے کا بہانہ بنا کر اپنا معذور اور مجبور ہونا بھی بتلا رکھا ہے خیال یہ ہوتا ہے کہ اگر جہل نہ ہوتا تو شاید اس بہانہ کی مقاومت بھی آسان ہوتی مگر سب مل ملا کر اپنے کو مجبور اور معذور سمجھ رکھا ہے اور زبانی عرض معروض سے کچھ ہوتا نہیں ہر تبلیغ عملی ہی کارگر ہوتی ہے جو کام کا طریقہ میرے ذہن میں ہے اس کو جب تک کر کے نہ دکھلاؤں اس پر کون عمل کرے گا، میں اپنی رائے میں بہت پختہ ہوتا تھا، مگر ان تین سال میں جس قدر تلون میرے مزاج میں آگیا ہے شاید پہلے کسی متلون مزاج میں بھی نہ ہو اسی لیے آج میں نے لکھا ہے کہ وہاں حاضر ہو کر ہی کیا کروں گا۔ اب جو کچھ میں سمجھے ہوئے ہوں اس کو بغرض استصواب پیش کرتا ہوں اس پر غور فرما کر مجھے بتائیے کہ میرا یہ خیال غلط یا صحیح ہے اگر غلط ہے تو کالائے بد ریش خاوند اور اگر صحیح ہے تو اس کی کیا صورت ہو اور اگر میں باوجود اس جہل کے آ بھی گیا تو کیا فائدہ ہوگا، اگر کوئی صورت نہ ہوئی تو پھر میں اپنے بچوں کے لیے کوئی ذریعہ معاش تلاش کرنے آؤں گا اور اسی میں آ کر لگ جاؤں گا اور میری نیت صحیح ہو گی تو یہ بھی دین ہی ہے اور تبلیغ وغیرہ کی جو نیت ہے اس سے مایوس ہو جاؤں گا۔ میرا خیال یہ ہے کہ غدر سے پہلے دہلی میں جو ٹوٹی پھوٹی بہت ہی کمزور اور بیکار سلطنت مسلمانوں کی موجود تھی اور اس کے اہل حل و عقد بھی دینی نقطہ نظر سے خاصے بے عمل بلکہ بد عمل تھے، شرابوں کے دور چلتے تھے اور شاید آپ کو معلوم ہو یا نہ ہو ان حضرات کے اثرات سے ہی قصبات و دیہات کے امراء میں رنڈیوں کو ملازم رکھنا داخل فیشن اور امارت کی نشانی بن گیا تھا، کون سا فسق و فجور تھا جو اس زمانہ میں رائج نہ تھا اور اس سے اہل دول بچے ہوئے تھے لیکن باوجود اس کے اس وقت کے وہ حضرات جن کے زہد و تقویٰ کی جوتیوں کی گرد کو بھی آج کوئی نہیں پہنچ سکتا ہے ایسا ہی تھے اور امور سلطنت یعنی جس سے سلطنت کی بقا ہو اس سے غافل نہ تھے یہاں تک کہ بقول حضرتؒ ملا دو یا زیادہ بہت بڑے عالم

اور حضرت شاہ اہل اللہ یا حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کے شاگرد تھے (یہ شاہ صاحبان کے نام میں اختلاف میرا نسیان ہے) اور بہت بڑے صاحب نسبت تھے اور جب انھوں نے دیکھا کہ اکبر بے دینی بلکہ کفر کی طرف مائل ہے اور خطرہ ہے کہ اس کے حواریین اس کو ہندو نہ بنا دیں تو انھوں نے محض تبلیغ کی غرض سے اپنا یہ طرز اختیار کیا تھا، ساری عمر مسخرہ بن کر رہے اور دنیا کے ڈھول ڈھپکے کھائے مگر الگ نہ ہوئے، آخر میں ہمارے اسلاف کی مثال ہے کہ غدر میں اسی کمزوری و فسق و فجور والوں کی سلطنت کی حمایت میں تلوار لے کر کھڑے ہوئے، جان دی، گھر اور وطن چھوڑا جیل بھگتی، غرض اسی کی حمایت میں سب کچھ کیا اور ہر کام کے لیے تیار تھے ــــــ اگر ہماری طرح وہ بھی گوشہ نشین ہوتے تو ایک دم سے تلوار لے کر میدان میں کس طرح آجاتے معلوم ہوا کہ انھوں نے فنونِ حرب سیکھ رکھے تھے جب ہی تو میدان میں آئے، اس کے بعد چونکہ دشمن قوی تھا غالب آیا اور سلطنت مسلمانوں کی ختم ہو گئی تو ان ہی حضرات نے جو تلوار لیے میدان میں کھڑے تھے قلم ہاتھ میں لیا اور صرف تبلیغ لسانی اور گوشہ نشینی پر اکتفا کیا اور اسی انتظار میں عمریں گزار دیں کہ کوئی وقت آوے اور پھر میدان میں آ دیں، آپ بڑے ابا کے حالات سے مجھ سے زیادہ واقف ہیں کہ ان کو کس قدر تمنا تھی جہاد کی ' حضرت شیخ الہندؒ اور بڑے ابا میں اختلاف رائے صرف وقت آجانے یا نہ آنے کا تھا ورنہ اصل کام میں میرے نزدیک بڑے ابا کو بھی اختلاف نہ تھا کہ اگر کوئی وقت ایسا آجائے تو پھر بھی گوشہ نشین اور یکسو ہی رہو، غرض انہی اہل علم حضرات نے مسلمانوں کو مسلمان رکھا اور انگریز کے اثر سے جتنا بچا سکے بچایا، ہم سب نے ان حضرات کا وہ دورِ عَلَم تو دیکھا نہیں محض قصہ کی طرح سُنا ہے اور دورِ قلم دیکھا ہے، شنیدہ کے بود مانند دیدہ، لہٰذا غالباً ہمیں وہ طرز آتا ہی نہیں اور اب جب کہ حالات بدل گئے اور نام کا پاکستان بن گیا تب بھی ہمارا طرز وہی ہے، جو انگریزوں کے زمانہ میں تھا کہ یا تو گوشہ نشین اور بے تعلق ہو گئے یا سرکاری مولوی بن گئے ــــــ یا پھر صرف تعلیم کتب میں مشغول ہو گئے وہ سپاہیانہ زندگی جو اُن حضرات کی تھی انگریز نے ہم سے سلب کر لی تھی، اور ہم آج تک اسی میں ہیں، اسلامی سلطنت کا بقا بھی اور اس کے لیے سعی بھی خالص دین ہے اور اس میں دینی احکام کا اجرا بھی خالص دین ہے مگر بقا سے بقا مقدم ہے، اگر بقا ہو گا تو اجرا بھی ہو سکے گا۔ ہم بقا کے لیے تو کوشش کرتے ہیں اور وہ بھی پوری اور اچھے طرز سے نہیں لیکن بقا کے لیے شاید دوسروں ہی کا فریضہ سمجھ رکھا ہے، دین کی اشاعت کی ایک یہ بھی صورت تھی کہ جو کام فساق و فجار کر رہے ہیں ان کو علماء سیکھتے اور ضرورت کہیں سفیر کی ہوتی تو کوئی مولوی صاحب جاتے کسی اور کام کی ضرورت ہوتی تو مولوی صاحب ملتے،

مولوی صاحب سے مُراد دیندار لوگ، جب ان کاموں کو جو بقاء سلطنت کے لیے ضروری ہیں دیندار طبقہ سنبھال لیتا تو دین کے شیوع میں کیا دیر تھی مگر ہم نے یُوں سمجھ لیا ہے کہ کام تو دوسرے کریں اور بُرا بھلا ہم کہے جاویں۔ (یہ میں خاص آپ کو نہیں کہہ رہا ہوں بلکہ عام حالت عرض کر رہا ہوں) غرض سلطنت کے بقاء کے لیے جو امور آجکل ضروری ہیں دیندار طبقہ اس میں مہارت حاصل کرتا اور اُن کاموں کو سنبھالتا جاتا تو ایک دن حقیقی پاکستان سامنے آتا، گوشہ نشینی ان حالات میں میری سمجھ سے باہر ہے ہم لوگ اگر جدید تعلیم یافتہ طبقہ سے ملتے ہیں تو بجائے ان کو متاثر کرنے سے ان سے خود متاثر ہو جاتے ہیں اور بجائے اس کے کہ قناعت صبر، توکل، ایثار، استغنا وغیرہ اخلاقِ اسلامی کا نمونہ بن کر دکھاتے اور اس طرح عملی تبلیغ ہوتی، ہم نے دیکھا کہ ان کے یہاں چائے کی دعوت کس طرح ہوتی ہے تو ہم نے بھی وہی طریقہ اختیار کیا، برتن ایسے ہوتے ہیں تو ان کے جمع کرنے کی فکر ہو گئی، کپڑے عمدہ اور بڑھیا پہنے، یُوں سمجھ لیا کہ اگر کپڑے ایسے نہ ہوں گے تو دُنیا دار ذلیل سمجھیں گے جس سے دین کی ذلت ہوگی وغیرہ وغیرہ تو جب ہمارا جو دیندار کہلاتے ہیں اخلاقی حال یہ ہو تو ہم دُوسروں کو کیا کہیں اور اگر ہمارے اندر یہ اخلاق پیدا ہو جاویں اور ہم ان پر عمل کرنے لگیں تو پھر کہنے کی ضرورت ہی نہ رہے، دنیا کی اصلاح ہو جائے اور ایک فرد کی اصلاح یا عمل سے اُتنا ہی فائدہ بھی ہوتا ہے اگر طبقہ علماء من حیث الجماعۃ عمل کرے تو سب پر اثر ہو اور جب ہم اپنی جماعت کی بھی اصلاح نہ کر سکیں تو دُوسروں کو کیا کہیں اور تبلیغ کے لیے کہنا بھی پڑتا ہی ہے مگر عمل کے بعد کہنے کی چنداں ضرورت نہیں رہتی، غرض اس ساری بکواس سے یہ ہے کہ علماء اور دیندار طبقہ کو وہ کام جن کو آج بے دین لوگ کر رہے ہیں سیکھنا چاہئیں اور پھر علماء مناصب سے الگ رہیں اور دیندار لوگ مناصب پر فائز کرتے رہیں یہ کام جلدی تو نہ ہوگا مگر میرے خیال میں اس طریقہ سے نتائج بہتر نکلیں گے مجھے وہ وقت ہر وقت یاد رہتا ہے جب ایک مرتبہ میں حضرتؒ کی خدمت میں حاضر تھا اور اسی قسم کی گفتگو ہو رہی تھی تو حضرتؒ نے فرمایا کہ میاں شبیر ہوا کا رُخ بتا رہا ہے کہ لیگ والے اپنے مقاصد میں کامیاب ہو جاویں گے اور اُمید ہے کہ سلطنت الگ قائم ہو جائے اور اس کے کرتا دھرتا علماء نہ ہوں گے بلکہ یہی ہوں گے جن کو آج ہم فاسق و فاجر کہتے ہیں لہٰذا کوشش اس کی کرو کہ یہ فاسق فاجر ہی دیندار بن جاویں تاکہ سلطنت دینداروں کے ہاتھ آوے تو چشم ما روشن دل ما شاد۔ ہم کو اپنی سلطنت کی فکر کرنا اور سیاست میں دخل دینا فضول ہے بس تبلیغ سے ان کو دیندار بنانے کی فکر کرو اور اسی کے بعد سے قائدِ اعظم مرحوم کے پاس بھیجنے کا سلسلہ جاری ہُوا تھا۔ آج بھی میرا وہی خیال ہے اور میں چاہتا ہوں کہ جن حضرات کو اللہ نے قدرت تحریر و تقریر دی

ہے وہ اس کام میں لگیں اور جب حالات بدل گئے تو آپ طرز کو بھی بدلیں، اللہ نے جو نعمت عطا کی ہے کہ پاکستان بنوا دیا اس کا حق ادا کریں، انگریزی سلطنت کے زمانہ میں ہمارے اسلاف نے جو طرز مجبوری کو اختیار کرلیا تھا، اس کو ترک کرکے اصل طرز مجاہدانہ اختیار کریں۔

اب اسی بحواس میں اگر کوئی بات صحیح ہو تو اس پر عمل کریں اور جو غلط ہو اس کی اصلاح فرما دیں سب غلط ہو تب بھی اصلاح فرما دیں۔

الحمدللہ اب ہم سب تندرست ہیں اور حرم میں جاکر تو گویا جوان ہو جاتے ہیں مگر چونکہ یہاں نہ تو کوئی دنیا کا کام ہے نہ کوئی دینی مشغلہ جس میں لگا رہوں اور زبان نہ جاننے سے اور بھی مجبوری ہے اس لیے خیال کیا تھا کہ وہیں چلا جاؤں مگر آپ کی تحریر سے وہاں بھی مایوسی ہے، رہا یہ کہ میں آجاؤں گا تو تیر مار لوں گا۔ یہ غلط ہے میں بھی ان حالات میں وہاں گیا تو بیکار ہی رہوں گا، پھر میں بچوں کے روزگار کے لیے آیا تو آجاؤں گا غالباً میری درخواست پہنچ گئی ہوگی نہ پہنچی ہو تو بھی مطلع فرما دیں۔

سب کی طرف سے سب کو سلام و دعا۔ والسلام

احقر شبیر علی

○

برادر مہربان جناب مفتی صاحب زاد مجدکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ

عنایت نامہ جس روز عید کی کشمکش جاری تھی پہنچا، قاضی صاحب اور ایک پیر صاحب اور ایک مولوی صاحب نے بےضابطہ شہادت لے کر دن کے آٹھ بجے فتویٰ دے دیا لیکن اکثر لوگوں نے ان کے فتوے پر روزہ نہ کھولا اور غیر مطمئن رہے، جب مجھے اطلاع ہوئی تو میں ان شاہدوں کی تلاش میں خود نکلا اور بارہ بجے تک دھوپ میں پیدل خود پھرا۔ بارہ بجے شاہد ملے ان سے شہادت ضابطہ میں لی تب روزہ افطار کیا، میرے افطار پر ایک جم غفیر نے وہیں اور پھر شہر میں افطار ہوا، عید بدھ کو ہوئی۔

آپ نے شمس الائمہ سرخسی کا قول جو نقل فرمایا ہے لعدیہ کہ چونکہ کتاب القاضی الی القاضی خود خلاف قیاس بضرورت جاری کی گئی ہے اس لیے دوسری چیز کو اس پر قیاس نہیں کیا جاسکتا، بالکل صحیح اور درست ہے، علی الراس والعین لیکن جس طرح ان حضرات نے زمانہ کی ضرورت کو محسوس کیا اور جن چیزوں پر قیاس کرکے

یا جن دلائل کی بنا پر انھوں نے کتاب القاضی کو جاری کیا اور تسلیم کیا، اب بھی ضرورت کا لحاظ کرتے ہوئے اور ان چیزوں پر قیاس کر کے ہوئے جن پر کتاب القاضی قیاس کر کے جاری کی گئی ہے (نہ کہ کتاب القاضی پر قیاس کر کے) یا ان دلائل کی وجہ سے جن سے کتاب القاضی کو جائز کیا گیا ہے اب بھی اس زمانہ کی دوسری چیزوں کو جائز کیا جا سکتا ہے۔ رہا آپ کا وہ عذر جو ایسے موقعہ پر آپ پیش کیا کرتے ہیں کہ ہم اس درجہ کے نہیں ہیں اسلیے ہماری ہمت نہیں پڑتی میرے نزدیک ہمیشہ ناقابل سماعت رہا ہے۔ کیونکہ اول تو مقولہ "کبرنی سوت الکبر" میرے پیش نظر رہتا ہے، اس کے علاوہ یہ چیز آپ کے لیے میں سمجھتا ہوں کہ آپ کسی قابل نہ سہی مگر الحمدللہ ان حضرات کو آپ نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے اور ان کی ہدایات پر ان کی ماتحتی میں رہ کر کام کر چکے ہیں جو ہر طرح قابل اور ہماری نظر میں مجتہد عصر تھے، اگر ہم چاہیں تو تھوڑی سی کوشش اور غور و فکر کے بعد ان کے نقش قدم پر چل سکتے ہیں کیونکہ عملی نمونہ ہمارے سامنے گذر چکا ہے یہ چیز آپ مجھ سے زیادہ جانتے ہیں کہ محض علم اور علم صحبت شیخ میں کس قدر فرق ہے۔ اگر چہ ہم جیسے تو بارہ برس کے بعد بھی بھاڑ ہی جھونک رہے ہیں مگر کیوں ناشکری کروں، الحمدللہ جو کام انھوں نے مجھ سے لیا ہے اس کو میں انشاءاللہ اوروں سے اچھا کر سکتا ہوں تو جو کام آپ سے لیا ہے اس کو بھی میں سمجھتا ہوں کہ آپ اگر کرنا چاہیں تو اوروں سے انشاءاللہ اچھا کریں گے اور یہ میری یا آپ کی قابلیت نہ ہو گی بلکہ ان ہی کا فیض ہو گا، لہذا باوجود اپنی نااہلی کے ہم کو یہ دیکھنا ہے کہ وقت کیا ہے اور ضرورت کیا ہے؛ اس ساری تحریر سے میرا مقصود خدانخواستہ یہ نہیں ہے کہ آپ ہمت کر کے شریعت کے خلاف حکم کر دیں۔ مقصد یہ ہے کہ شریعت میں گنجائش نکلتی ہو اور صرف ہمت نہ پڑتی ہو تو میں ہمت بندھانا چاہتا ہوں۔

ایک امر یہ قابل لحاظ ہے کہ اس وقت ایسا موقعہ ہے کہ جو شرائط آپ لگا دیں گے ان شرائط کا انتظام ممکن ہے اور ہمارے بعد نہ معلوم کیا صورت پیش آوے اور اس وقت کے کوئی مفتی بلا شرط اور بلا قید ہی حکم دے دیں تو شاید اصل حکم ہی میں خرابیاں رہ جائیں اس کی صورت میرے ذہن میں یہ ہے کہ اول آپ خوب غور کر کے جن ضرورتوں کا لحاظ کر کے اور جن چیزوں پر قیاس کر کے کتاب القاضی کو جاری کیا گیا ہے، اگر یہی ان چیزوں پر قیاس کیا جا سکے اور ضرورت بھی شرعی ہو جائے تو خاص حضرات سے تھوڑا سا چندہ کر کیا جائے جو حضرات ذیل کے سفر خرچ اور قیام و طعام کے لیے کافی ہو۔ قیام ہوٹل میں کرایا جائے، اور حضرات ذیل کو مدعو کر لیا جائے۔

مولوی اشفاق الرحمٰن صاحب مفتی ٹنڈوالہ یار، مولوی عبداللہ صاحب مفتی خیر المدارس ملتان، مفتی صاحب جامعہ اشرفیہ لاہور جو وہاں فتوے کا کام کرتے ہیں، مولوی خیر محمد صاحب ملتان، مولوی ظفر احمد ڈھاکہ۔ اگر اُن کے اخراجات کا چندہ متحمل ہو، مفتی صاحب داد خان کراچی ——— اگر آپ کا جی چاہے اور کسی درجہ میں زبانی گفتگو کے وقت ضرورت ہو تو مفتی اعظم یعنی احقر الناس کو بھی طلب فرما لیا جائے۔ ان کے علاوہ اور جن صاحب فتویٰ کو جی چاہے اور ضرورت ہو بُلا لیا جائے۔ جب یہ حضرات کثرت سے یا متفقہ کوئی فیصلہ فرمالیں تو ایک فتویٰ مرتب کیا جائے اور اس کو عربی میں بھی لکھا جائے۔ عربی کا فتویٰ جامع ازہر اور کوثری صاحب اور جن ممالک کے مفتیوں کے پاس مناسب ہو ارسال کر دیا جائے۔

دوسرا مسئلہ زکوٰۃ کا معلوم ہوا ؟ ذہن ہو گیا۔ جزاکم اللہ ......

میرا خیال حاضری کا تھا مگر نشتر صاحب طویل دورہ پر تشریف لے گئے ان سے ملاقات کے علاوہ فی الحال کوئی کام نہ تھا، اس لیے ارادہ ملتوی کر دیا۔ سب کی طرف سے سب کو سلام

احقر شبیر علی عفی عنہ از حیدرآباد سندھ

۳۰، جون ۱۳۸۲ھ

○

متع اللہ المسلمین بطول حیاتہ آمین

بگرامی خدمت مخدوم و محترم فقیہ العصر مولانا مفتی محمد شفیع صاحب

بعد تحیۂ مسنونہ و ہدیۂ دعوات محبانہ و غائبانہ ...... آنکہ گرامی نامہ صادر ہوا، علالت کا حال معلوم کر کے صدمہ ہوا، اسی وقت ہاتھ اُٹھا کر آنمحترم کی صحت و عافیت و طول بقا کے لیے دعا کی، اللہ تعالیٰ آنمحترم کو کمال صحت و عافیت کے ساتھ اسلام اور علم دین کی خدمت کے لیے سلمان فارسی اور نغوی اور بھیمی کی عمر عطا فرمائے، آمین ثم آمین۔

واقعہ مسطورہ کا اس ناچیز کو بالکل علم نہیں، اس ناچیز کا مسلک تو یہ ہے کہ ہر کہ خواہد گو بیا و گو برو بلکہ اچھا یہ ہے کہ ان سے دور ہی رہے اور ایسا بھاگے کہ پلٹ کر بھی نہ دیکھے، آنمحترم بھی اپنے خاطر عاطر کو اس خیال مکدر سے یکسو فرمالیں۔ وقال تعالیٰ واذا سمعوا اللغو اعرضوا عنہ وقالوا لنا اعمالنا و لکم اعمالکم سلام علیکم لا نبتغی الجاھلین ۔ انک لا تھدی من احببت۔ الآیۃ۔

امرِ مذکور کا انتظام ہماری طاقت بشریہ سے باہر ہے ولا تکلف الا نفسک بلکہ ناممکن معلوم ہوتا ہے نہ کسی پر زور ہے اور نہ کوئی سننے کے لیے تیار ہے نہ یہ نہ وہ اور فَذَكِّرْ کا امر اِنْ نَّفَعَتِ الذِّكْرٰى کے ساتھ مقید ہے کما صرح به الدوانی فی آخر شرح العقائد الجلالی۔ البتہ آنمحترم کا والا نامہ مولانا عبیداللہ صاحب کو دکھلا کر ان سے کہوں گا کہ اس کا جواب تحریر فرما دیں والسلام

سب اہلِ بیت کو بہت بہت سلام و دعا رفلاحِ دارین آنمحترم کی بزرگانہ اور محبانہ اور غائبانہ دعوات صالحات کا مستدعی اور امیدوار ہوں۔ والسلام

محبکم الداعی

محمد ادریس کان اللہ لہ یوم سہ شنبہ ۸ رجب ۸۳ھ

مکاتیب حضرت مولانا اطہر علی صاحب نور اللہ مرقدہٗ

مورخہ ۲۹ شعبان المعظم

از ناکارہ آوارہ اطہر طہر اللہ قلبہ عما سواہ وسلط علیہ العشق حتیٰ لا یری مولای غیرک، کائن بمکانی ویرحم اللہ عبدا قال اٰمینا۔

بخدمت جامع کمالات علمیہ و عملیہ حضرت مفتی صاحب متعنا اللہ تعالیٰ بفیوضہم الظاہرۃ والباطنۃ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

والا نامہ سے مشرف ہوا اپنی سیاہ کاری پر آنحضرت کی شفقت و عنایت سے ندامت کے ساتھ شکر گزار ہوا۔ حضرت اس ناکارہ کو آنجناب کے کمالات کے کروڑواں حصہ بھی حاصل نہیں۔ باوجود اس کے بارہا معافی کی درخواست سے گزر جاتا ہے۔ میں تو تا زیست عالیہ عنایات و ہدایات کا شکر ادا کرنے سے عاجز ہوں اپنے تو ورطۂ ہلاکت کا نکالا بے حد کرم و احسان فرمایا یہ تو میرا دل ہی جانتا ہے۔ متواتر چار مہینے کی غم و فکر کہ حقوق العباد سے کیسی سبکدوشی ہو۔ راہ بتلا کر ہموم و غموم کا پہاڑ سر سے ہٹا دیا۔ اگر ضعف پیری اور بیماری دامنگیر نہ ہوتی تو اس خوشی سے جوانی آجاتی۔ فجزاک اللہ عنا وعن امۃ محمد اجمعین۔

حضور غلبہ تواضع سے معافی کے الفاظ سے دست بستہ معافی چاہتا ہوں ضرورت ہے چند روز صحبت اکسیر صفت میں قیام کرنے کی، دعا فرماویں کہ غیب سے زادِ راہ فراہم ہو اور حاضری نصیب ہو۔ کبھی خادم سے

ناظم ادارۃ المعارف کا پرچہ پہنچا دیں اور تاکید فرمادیں کہ کتابیں جلد سے جلد روانہ کریں۔ ان کتابوں کے ساتھ آنحضرت کا تبصرہ عائلی قانون پر اور مولوی محمد تقی صاحب نے ضبط تولید میں جو رسالہ لکھا وہ بھی ایک ساتھ روانہ کردیں۔ رمضان شریف کے روزے رکھنے کی توفیق، قیام لیل کی توفیق اور معاصی سے اجتناب کی خصوصی دعا کی درخواست ہے۔ ۱۵ رشعبان سے بیماری دامنگیر ہے، بخار، کھانسی، بلغم اس پر بے احتیاطی یہ کہ سلہٹ دس روز رہا۔ درگاہ شریف، بندر بازار جامع مسجد دوسرے مقامات پر مجبوراً وعظ کرنا پڑا۔ رات سے بواسیر کا خون جاری ہے، اس سے باہر نکلنے سے تکلیف، حضور دعا فرمادیں کہ جمیع امراض جسمانی و روحانی سے نجات کلی ہو، باایمان موت ہو، مغفرت و رحمت ہو، عذاب سے کل نجات ہو۔

بندہ اطہر

○

مخدومنا المخدوم حضرت مفتی صاحب متعنا اللہ والمسلمین بطول حیاتکم
مورخہ ۳ رمضان المبارک۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

امید ہے کہ جناب کا مزاج بخیر ہوگا۔ جب سے علالت طبع کی خبر معلوم ہوئی، دل ہمیشہ بے قرار رہتا ہے، حضرت والا یوں تو استاد بھائی اور خواجہ طاش ہونے کی حیثیت سے میں ہمیشہ آپ سے محبت اور دوستی رکھنے پر فخر محسوس کرتا ہی رہتا ہوں لیکن اب تو آپ کی ذات ایک نادر روزگار رفیقہ ہونے کی حیثیت سے دُنیائے اسلام کی قابل فخر شخصیت ہو چکی ہیں جس سے صرف آپ کے نسلی اور علمی رشتہ داری تعلق نہیں ہیں بلکہ پاکستان اور عالم اسلام کے سارے مسلمان متعلق ہیں چنانچہ جامعہ امدادیہ کے حالیہ سالانہ اجلاس ششم کی تقریب میں جو حضرت والا کو صدارت کے لیے احقر کی طرف سے تکلیف دی گئی تھی، اس سے مقصد جہاں یہ تھا کہ احقر کو اپنے ایک خواجہ طاش سے مل کر قلبی اطمینان و سکون میسر ہو وہاں یہ بھی منشا تھا کہ ہمارے علاقے کے لوگ جامعہ امدادیہ کی بدولت آپ جیسی عظیم المرتبت مغتنم ہستی کی زیارت سے مشرف ہوں لیکن مشیت ایزدی یہی ظاہر ہوئی کہ فی الحال زیارت سے سب محروم رہے اور یہ ایسی راہ ہے جس میں کوئی حائل نہیں ہوسکتا۔ وما تشاؤن الا ان یشاء اللہ۔

حضرت والا کے خطوط کراچی و ڈھاکہ سے ہمارے حوصلے بہت بلند ہو چکے تھے اور ہم نے منعقدہ اجلاس ششم کے لیے سنین ماضیہ کے مقابلے میں زیادہ منادی کرائی تھی مگر غنیمت تھی سلہٹ کے ٹیلیفون اور خطوط نے

ہمارے دلوں ہی کو پارہ پارہ کر دیا اور دل کی شکستگی کا یہ عالم ہے کہ اب تک سکون نصیب نہیں۔ دُعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو تا دیر قائم رکھے اور آپ کی ذات سے عالمِ اسلام اور بالخصوص پاکستان زیادہ سے زیادہ فیضیاب ہو۔
براہِ کرم اس امر کا التزام فرمایا جائے کہ عزیزم تقی سلمہ جناب کی حالت سے ہر دو چار یوم کے بعد احقر کو مطلع کرتے رہیں۔
جامعہ امدادیہ کشورگنج کے صدر مدرس مولانا سید عبدالاحد قاسمی صاحب (جن کا تقرر اسی سال صدر مدرسی کے عہدے پر عمل میں لایا گیا ہے) جو جناب کے قدیم تلمیذ رشید ہیں غالباً انھوں نے ڈھاکہ میں جناب کی خدمت میں اپنی کچھ مترجمہ و مصنفہ کتابیں پیش کی تھیں۔ اگر تکلیف نہ ہو تو عزیزی تقی سلمہ سے ان کی تصنیفی کارگزاریوں پر اپنی طرف سے ایک مختصر تقریظی نوٹ لکھوا کر روانہ کر دیں۔
میں اپنے اس عریضے کو اس دعا پر ختم کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ آپ کی حیات دراز کرے اور مسلمانوں کو عموماً اور اہلِ علم کو خصوصاً آپ سے مستفیض ہونے کا موقع نصیب کرے۔ آمین

آپ کا مخلص بھائی

بندہ کی صحت ایسی گری کہ معمولات تک ترک ہو گئے۔ دُعائے صحت فرماویں۔ میاں انور شاہ سلمہ نے محراب سُنانا شروع کیا، یاد کچا ہے دعا فرماویں کہ اچھی طرح سُنا کر ختم کر سکے۔ مجبوری کو قاسمی صاحب سے لکھوایا۔ معاف فرماویں۔

اطہر علی

○

حضرت مفتی صاحب السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ
مختصر حال زار، ۱۸ دسمبر گرفتاری ہوئی۔ لاٹھی اور بینٹ سے سر کو سخت زخمی کیا، بیہوش ہو گیا۔ ۵ گھنٹہ تک خون کا فوارہ جاری رہا۔ ۷، ۸ سیر خون نکلا، ناک پر ہاتھ رکھ کر دیکھا سانس ختم۔ اس حال میں کیسا بچ گیا۔ خدا کی قدرت کا کرشمہ ہے۔ سترہ مہینہ سے جیل خانہ میں ہوں اس جانگاہ جیل خانہ اختلاج قلب بار ہا دورہ پڑا۔ ۱۶ اپریل سے آٹھ روز معدہ خون جاری۔ اختلاج کا دورہ پڑا۔ بحالت جاں طلب بیرونی ہسپتال بھیجا گیا۔ اب دورہ تو نہ گر بدن میں خون نہیں، بشکل صرف فرض کھڑا ہو کر پڑھتا ہوں، چلنے کی طاقت نہیں پھر آج ڈسچارج کر دیا نہ ہوئی۔ دعا فرمائیں کہ صحت قوت عطا ہو موت بالایمان نجات

عن العذاب نصیب ہو، رہائی کے لیے کوشش ہو رہی ہے کامیابی کی دُعا فرمائیں۔
بنوری صاحب، انصاری صاحب، تھانوی صاحبان ڈاکٹر عبدالحی صاحب حضرت کے صاحبزادگان اور دیگر خلفات تھانوی قدس سرہٗ وصالحان ومدرسین وطلبہ سے بعد سلام مسنون دعا کی بالحاح زاری درخواست

محمد اطہر

○

مکاتیب حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب الہ آبادیؒ خلیفہ حکیم الامۃ حضرۃ تھانویؒ

بشرف ملاحظہ عالی جناب مفتی صاحب دام مجدکم وبرکاتکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کا والانامہ پاکر میں نہیں کہہ سکتا کہ کتنی خوشی ہُوئی جزاکم اللہ تعالیٰ۔ جناب نے جو تحریر فرمایا ہے، بالکل صحیح ہے میں بھی یہی سمجھتا ہوں۔ پھونک پھونک کر قدم رکھتا ہوں اور برابر خائف رہتا ہوں جناب والا کے لیے دعا کرتا ہوں اور برابر یاد رکھتا ہوں اور یاد رکھوں گا۔ انشاء اللہ تعالیٰ

آپ سے مزید دعاؤں کی درخواست کرتا ہوں۔ والسلام

وصی اللہ عفی عنہ

۱۰ رجب ۱۳۶۳ھ - ۲۴ بخشی بازار۔ الہ آباد ۳

○

محبی دام عنایتکم وفضلکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

محبت نامہ بتوسط شرافت حسین سلمہٗ ملا بڑی مسرت ہوئی، آپ کے لیے دل سے دعا کرتا ہوں، اب وہاں رہے ہی کون سوا آپ کے۔ اللہ تعالیٰ آپ کی عمر اور کام میں برکت عطا فرماویں اور عامۃ مسلمین کو آپ کے فیض سے مستفیض فرماویں۔

مجھے اطباء نے معتدل مقام میں رہنے کا مشورہ دیا ہے اس لیے بمبئی میں چونکہ میرے عزیز موجود تھے چنانچہ یہاں ہی آگیا اور الحمد للہ کہ نفع ہُوا لہٰذا ہر سردی گرمی میں اب یہیں رہنے کا خیال ہے یہاں کے

قیام میں الحمدللہ مجھے تو نفع ہوا ہے، یہاں کے لوگوں کو بھی بہت نفع ہوا، پڑا طبقہ بھی متوجہ ہیں، لوگ بات سُن رہے ہیں اور حضرتؒ کی تصانیف کی جانب بھی توجہ بڑھ رہی ہے، صحت یوں تو اچھی ہے مگر دُعا کیجئے کہ اللہ تعالیٰ مزید صحت وعافیت فرمائے اور اپنے دینِ متین کا کچھ کام لے لے۔

آپ نے خلوت کی تمنا کرائی ہے کیا کیجئے گا۔ اس اژدہام میں وہ تو ملنی مشکل ہے اس خلوت در انجمن ہی سے کام لیجئے۔ آپ کے لیے دعا کرتا ہوں اور اپنے لیے طالب دعا ہوں۔ السلام خیر ختام

آپ سے ملاقات کو بہت جی چاہتا ہے، مگر کیا کروں۔

وصی اللہ غفرلہٗ

۲۵ دسمبر ۱۹۶۲ء

مکتوب حضرت مولانا عبدالرشید محمود انصاری صاحب (حفید حضرت گنگوہیؒ)

از احقر عبدالرشید محمود انصاری گنگوہ

بخدمت محترم استادی الافخم زاد مجدکم السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،

گرامی نامہ عزت افزا ہوا تکلیف فرمائی پر بے حد مشکور ہوں حق تعالیٰ جزائے خیر مرحمت فرماویں۔ اس کے ساتھ ہی جناب کی کلفت سے بھی بے حد اذیت ہوئی، مضمون اس قدر مجمل ہے کہ کچھ سمجھ نہیں سکا کہ تازہ مولم واقعات کیا پیش آئے تفصیلی علم سے قبل کچھ عرض کرنا مناسب تو ہے نہیں اور نہ اپنی خورد لنہ حیثیت اور سطحی فہم اس کی اجازت دیتا ہے کہ رائے کے درجہ میں بھی کوئی جسارت کی جاسکے تاہم ناعرض کیے بغیر صبر نہیں کہ دارالعلوم سے انقطاع کرنے میں عجلت نہ فرمائی جائے خود ارباب مدرسہ اگر اس کے خواہشمند ہوں تو قطعی طور پر عزتِ نفس اور بقائے خودداری کے پیش نظر یکسو ہو جانا ہی انسب ہے، ورنہ آفات وآلام کا تحمل عین شیوۂ اکابر ہے۔ دارالعلوم کا انتساب قمیص عثمانی ہے اس کو از خود نہ اتاریے گا، یہ دُنیا ہے اور دُنیا خلافِ طبع امور سے ہی دوچار ہونے کا نام ہے، کیا عجب ہے کہ آج کا یہ عسر کسی خوش آئند یسر کا پیش خیمہ ہو، حضرت تھانوی مدظلہ العالی اپنی تحریرات میں یہ شعر اکثر فرمایا کرتے ہیں ؎

لہ یہ مکتوب اس وقت کا ہے جب ۱۳۶۲ھ میں حضرت مفتی صاحبؒ نے دارالعلوم دیوبند سے استعفا دینے کا ارادہ کیا تھا۔

باغباں گر چند روزے صحبتِ گل بایدش
بر جفائے خارِ ہجراں صبرِ بلبل بایدش

میرے لیے تو المناک حالات میں اس شعر کا مراقبہ اکثر باعث سکون ہوتا ہے، میں نے سُنا کہ حضرت گنگوہیؒ کے زمانے میں سہارنپور کے لوگوں نے مظاہر العلوم میں ایک ہنگامہ برپا کیا، حضرت سہارنپوری اس قدر برداشتہ خاطر ہوئے کہ علیحدگی کے لیے تیار ہوگئے مگر حضرت گنگوہیؒ کا مشورہ برابر بہ اخلاص استقامت رہا، حتٰی کہ حق تعالیٰ نے اس استقامت کے فوق الکرامۃ ہونے کا مشاہدہ کرا دیا۔ میری حقیر رائے ہے کہ اس میں جلدی نہ کی جائے اور خصوصاً . . . . . کی رائے و مشورہ اور ایما پر اپنی کسی عمل اور تخیل کی بنا ہرگز نہ قائم فرمائیں! اس سے علیحدہ ہوکر بعد میں تفکر پر بھی یہی رائے ہو، بہت اچھا، مگر واللہ دار العلوم سے جناب کی جدائی میرے لیے اس قدر المناک ہے کہ جب سے خط ملا ہے برابر سوزیانہ ذہنی کشمکش میں مبتلا ہوں، حق تعالیٰ آپ کا ہمیشہ محافظ ہو، کہ میرے مشفق اساتذہ میں جناب کی ذاتِ گرامی اور اس کی خصوصیات مجھ کو کبھی فراموش نہ ہوں گی۔ کاش کہ تفصیلی حالات معلوم ہو سکتے۔

اس امر میں حضرت تھانوی مدظلہم العالی سے استصواب ضرور فرمائیے گا اور حضرت کی رائے کے بغیر کوئی تحرک مناسب نہیں معلوم ہوتا[1]، کلفت قلبی کی بنا پر یہ چند کلمات عرض کرنے کی جرأت کی ورنہ اپنی حالت کے استحضار سے غفلت نہیں، طرز نازیبا پر باادب، اعتذار پیش آتا ہوں۔

صد آداب والسلام

○

مکتوب حضرت مولانا محمد منظور نعمانی صاحبؒ

مخدومی معظمی حضرت مفتی صاحب دامت فیوضکم وبرکاتکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،

خدا کرے، ضعف پیری وفطری کے باوجود مزاج سامی ہر طرح بعافیت ہو، تقریباً ڈیڑھ سال سے رہائشی مکان "الفرقان" کے دفتر سے الگ اور کچھ فاصلے پر ہے۔ کئی کئی ہفتہ دفتر کی طرف گذر بھی نہیں ہوتا

---

[1] چنانچہ حضرت مفتی صاحبؒ نے حضرت تھانویؒ کے ایما پر ہی استعفا دیا تھا (م ت ع)

مولوی عتیق الرحمٰن سلمہٗ بھی خاصی مدت سے ضعفِ اعصاب کی غیر معمولی کیفیت کی وجہ سے الفرقان اور اس کے دفتر سے غیر متعلق ہیں جو لوگ دفتر کا کام دیکھتے ہیں وہ اس کا اہتمام نہیں کرتے کہ آنیوالے اخبارات و رسائل مجھے پہنچا دیں، اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ میں خود اب مطالعہ کا اہتمام نہیں کرتا چند روز ہوئے "البلاغ" کے دو شمارے (محرم و صفر) دفتر والوں نے مجھے پہنچائے۔

چونکہ مدت سے (ستشہ سے) "البلاغ" نظر سے نہیں گزرا تھا۔ اس لیے شوق سے کھول کر دیکھنا شروع کیا، صفر کے شمارے کا افتتاحیہ پڑھا (بظاہر) انتہائی خوش نصیب مرحوم صاحبزادہ مولوی محمد زکی صاحب کے حادثۂ رحلت پر عزیز مکرم مولوی محمد تقی صاحب نے جو لکھا اور جس طرح لکھا ہے اس سے دل بہت ہی متاثر ہوا اور اس کے خاتمہ میں حضرت کے جو مکتوب موعظت و تعزیت میں اس کے مطالعہ سے بحمداللہ بڑا نفع ہوا اور بڑا علم ملا۔

صفر کے شمارے کے اس افتتاحیہ سے حضرت کے ضعف و علالت کا حال بھی معلوم ہوا اللہ تعالیٰ صحت و عافیت سے نوازیں۔ خاصانِ خدا پر جو تکالیف وارد ہوتی ہیں وہ بھی اُن کے رب کریم کی خاص عنایات ہوتی ہیں، کاش حاضری آسان ہوتی تو زیارت و عیادت اور استدعاءِ دعاء کی نیت سے سفر کرتا۔

حضرت! میرا حال یہ ہے کہ جن اکابر کو پایا سب کی شفقتیں اور عنایتیں نصیب ہوئیں لیکن خود جو کرنا چاہیئے تھا چونکہ وہ نہیں کیا، اس لیے محرومی ہی رہی، اصلاحِ حال اور حُسنِ خاتمہ کے لیے دُعاء کا طالب و سائل ہوں اور اپنی سعادت سمجھ کر اکابر و محسنین کے لیے بھی دُعاء کرتا ہوں۔

برادر عزیز و مکرم مولانا محمد تقی صاحب سلام مسنون قبول کریں۔ اللہ تعالیٰ ان کو ان نعمتوں کے شکر کی توفیق دے جن سے وہ نوازے گئے ہیں اور نظرِ بد سے حفاظت فرمائے، حضرت میاں صاحبؒ سے متعلق مرحوم مولانا محمد زکی صاحب کا مضمون بڑا ہی پیارا معلوم ہُوا، الفرقان کے ایک دو شمارے غالباً پہنچے ہوں گے۔ والسلام

محمد منظور نعمانی

مکتوب حضرت مولانا سید سلیمان صاحب ندوی ؒ

محب مکرم دامت مکارمکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، مدت کے بعد مکرمت نامہ نے سعادت بخشی، آپ حضرات کی یادآوری اور دعوت کے لیے سراپا سپاس گذار، جواب ایک ہفتہ کی تاخیر سے دے رہا ہوں، سمجھ میں نہیں آتا کہ حقائق کو کس طرح پیش کروں، قصد مصمم تھا کہ ادائے فریضۂ حج کے بعد حاضری ہوجائے، اُس وقت تک ادھر سے ادھر جانا آسان تھا، اب واپسی کے بعد دیکھا کہ دُنیا بدل گئی، اب ایک تنکا اپنی جگہ سے نہیں ہل سکتا۔ ؎ بات پریاں زبان کٹتی ہے۔ ہوشیاری اور احتیاط سے ذات بدل گئی من ھٰھنا الیٰ ھنا۔ تحویل میرے بس کی بات نہیں، عُمر بھی ضعیف، عقل دنیا بھی ضعیف، سعی اعضا بھی ضعیف، ایک امید ہے کہ ؎ مردے از غیب بروں آید وکارے بکند، وہ مردِ غیب بھی آپ کے ہاں ہیں، وُہ آ سکیں تو کچھ کرسکیں۔

تاہم آئندہ ماہ اپنی لڑکی کے دیکھنے کے لیے آنا چاہتا ہوں لیکن آپ میرا انتظار کیے بغیر اپنا کام شروع کر دیجئے اور سمجھ لیں کہ میں نہیں ہُوں

غالبؔ خستہ کے بغیر کون سے کام بند ہیں
روئیے زار زار کیوں، کیجئے ہائے ہائے کیوں

والسلام "س"

○

مکتوب حضرت مولانا بدرِ عالم صاحب میرٹھی ؒ

الفاضل المحترم جناب مفتی محمد شفیع صاحب دام مجدہم السامی

السلام علیکم ورحمۃ اللہ

مزاج شریف! اس اثنا میں سلسلۂ مراسلت گو قائم نہ رہ سکا مگر الحمد للہ کہ سب کوائف ایک دُوسرے کو پہنچتے رہے ہوں گے، ترجمان السنۃ کی تیسری جلد کے لیے آپ کے رسالہ نزول عیسیٰؑ کے ترجمہ کی ضرورت تھی اس میں بہت سی حدیثیں ترجمہ کی محتاج ہیں اور اس سے زیادہ شرح کی محتاج ہیں،

اس دورِ الحاد میں اسی طرح اس کو عوام کے ہاتھوں میں دے دینا مناسب معلوم نہیں ہُوا، میں نے ترجمہ منگا یا تھا مگر اس کی بجائے اصل رسالہ عربی کا پہنچا ہے۔ اگر ترجمہ فرمادیا ہے تو حاجی صاحب دام مجدہم کے یہاں ایک نسخہ پہنچا دیں ورنہ بندہ کو مطلع فرمائیں تاکہ پھر اس کو مناسب انتخاب اور ترتیب و تہذیب کے ساتھ ترجمان السنۃ میں درج کرسکوں یعنی ایک ایک سلسلہ کی حدیثیں ایک طرف ہو جائیں اور اس پر اس فتنہ کے استیصال کے مناسب علیٰحدہ علیٰحدہ عنوانات لگا دیئے جائیں، اس جلد میں امام مہدی کے متعلق بھی کچھ لکھنے کا خیال ہے۔ ابن خلدون نے اس کا انکار کیا ہے اور اس کا ردّ بھی لکھا گیا ہے۔ ازالۃ الوہم المکنون من کلام ابن خلدون، اگر یہ رسالہ موجود ہو تو وہ بھی ضرور ارسال فرمائیں بہت ممنون ہُوں گا، آپ کی مصروفیتوں میں اگر کبھی یاد آجاؤں تو دعاءِ خیر میں شامل فرمالیں (اگر کسی کے پاس اپنے ایک سال کے کھانے، پینے اور لباس و مسکن کے لیے روپیہ ہو تو کیا اس پر بھی زکوٰۃ واجب ہے یا وہ حوائج اصلیہ میں داخل ہے۔)

○

مکتوب حضرت جناب مولانا داؤد غزنوی صاحبؒ

مخدوم مکرم حضرت مفتی صاحب دام ظلکم العالی

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

گرامی نامہ جناب کا موصول ہُوا، آپ نے علماء اور مشائخ کی جس زبُوں حالی کا ذکر کیا ہے وہ ایک واضح اور روشن حقیقت ہے، اس گروہ میں نظم و نسق پیدا کرنا اور ملتِ اسلامیہ کے وسیع تر مفاد کے لیے تیار کرنا مسیحائی سے کم نہیں ہے۔ اگر آپ کے یدِ بیضا یا دمِ مسیحائی سے یہ مُردہ قوم زندہ ہو جائے تو ہماری تمام مصیبتیں ختم ہو سکتی ہیں آپ اپنی مساعی جمیلہ کو جاری رکھیں نہ صرف "معذرۃً الی ربکم" کے خیال سے بلکہ "و لعلہم یتقون" کی اُمید سے انشاء اللہ آپ کا اجر ضائع نہیں ہوگا اور کیا بعید ہے کہ آپ کے اخلاص کی برکت سے اللہ تعالیٰ ان نااُمیدیوں کی شب دیجور سے صبحِ اُمید روشن کر دے" وما ذالک علی اللہ بعزیز"۔

آپ کے ارشاد کی تعمیل میں ضرور حاضر ہوتا مگر میری بیماری ترقی پذیر ہے، اب درد کی تکلیف بڑھ گئی ہے ذراسی حرکت سے سینہ میں درد شروع ہو جاتا ہے اور یہ حالت میرے لیے بڑی تکلیف دہ

ہوتی ہے، اس وقت سوائے اس کے خاموش اور نہایت سکون کے ساتھ بیٹھ جاؤں اور کوئی تدبیر یا دوا
کارگر نہیں ہوتی، ایسی حالت میں سفر کرنا میرے لیے بے حد مشکل ہے، اس لیے کراچی حاضر ہونے سے
قاصر ہوں۔

مولانا احمد علی صاحب المحترم کی خدمت میں آپ کا گرامی نامہ بھیج دیا تھا، ابھی ان کا جواب آیا ہے
کہ وہ ۲۵ جولائی کی صبح کو میل سے کراچی پہنچیں گے۔ انشاء اللہ تعالیٰ، مولانا احمد علی صاحب جو فیصلہ فرمائیں
گے میری تائید انشاء اللہ انھیں حاصل ہوگی، آپ مطمئن رہیں، میرے ذاتی خیالات اور رجحانات آپ کو معلوم
ہیں، میری دلی تمنا ہے کہ علماء کی جماعت حق کی حمایت، کلمۃ الحق کے اعلان اور باطل کے اثر کو زائل
کرنے کے لیے متحد اور منظم ہو اور اہل باطل منظم ہو کر اسلام کی شکل بگاڑنے، الحاد کو اسلام کا نام دیکر
عوام میں پھیلانے کی جو سعی نامسعود کر رہے ہیں، اس کے مٹانے کے لیے علماء فرقہ بندیوں کی سطح
سے بالا ہو کر پورے اخلاص کے ساتھ کام کریں۔ ایسی حالت میں مجھے وہ ایک ادنیٰ خادم کی حیثیت
سے اگر شریک کرلیں گے تو ان کے ہمرکاب ہو کر چلنے کو اپنی سعادت سمجھوں گا۔

تمام احباب کی خدمت میں سلام مسنون عرض کردیں، والسلام

آپ کی دعاؤں کا محتاج

داؤد غزنوی ۲۲/۷

مکاتیب مولانا محمد اسعد اللہ صاحب مظاہر علوم سہارنپور

مورخہ ۶ رجب المرجب ۱۳۷۴ھ مطابق ۱۱ مارچ ۱۹۵۵ء

مخدوم و محترم زید مجدکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

نامہ گرامی نے مشرف فرمایا، جلسہ کے سلسلہ میں یاد فرمائی جناب کی اخلاص مندانہ توجہات اور
دیرینہ کرم فرمائیوں کی آئینہ دار ہے جس کے لیے بصمیم قلب ممنون و سپاس گذار ہوں۔

دارالعلوم کراچی کو ایک مرکزی ادارہ بنانے کا تخیل اور اس کے لیے جناب کی یہ سعی جمیل ایک
مبارک اقدام ہے جس کے لیے جناب اور جناب کے رفقاء مستحق تہنیت و ستائش ہیں، یہ امر مزید

مسرت کا باعث ہے کہ اس کو محلِ وقوع بھی بہت موزوں دستیاب ہوگیا ہے جسکے دامن میں شیخ الاسلام حضرت علامہ مولانا شبیر احمد صاحب عثمانیؒ اور حضرت الحاج مولانا سید سلیمان صاحب ندویؒ جیسی گرامی شخصیتیں مدفون اور ابدی خواب سے ہمکنار ہیں۔

مَیں بخلوصِ قلب دُعا گو ہُوں کہ اللہ تعالیٰ اس دارالعلوم کو روز افزوں ترقیات سے بہرہ مند کرے اور اس کے جملہ کارکنوں، ہمدردوں اور تعلق رکھنے والوں میں اخلاص وللّٰہیت سے کام کرنے کی توفیق اُرزانی فرمائے۔ جناب کی مستجاب دعاؤں کا محتاج وطالب ہُوں اور جناب کی رفعتِ درجات کے لیے دست بدُعا ہوں۔ فقط

محمد اسعد اللہ بقلم خود، ناظم مظاہر علوم سہارنپور

از مظاہر علوم سہارنپور ۱۲ر محرم الحرام ۱۳۷۶ھ ۲۰ر اگست ۱۹۵۶ء

مخدوم ومحترم حضرت مفتی صاحب دامت برکاتہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

اس وقت مدرسہ کے سلسلہ میں جناب کو ایک تکلیف دے رہا ہُوں۔ معلوم ہُوا ہے کہ "فتاویٰ دارالعلوم دیوبند" اور "امداد الفتاویٰ" ہر دو کتب جناب کے کامل وخصوصی ملاحظہ کے بعد نئی ترتیب اور اضافات کے ساتھ حال ہی میں جناب کے کتب خانہ سے شائع ہوئی ہے۔ مَیں بادب ان دونوں کتابوں کا ایک ایک نسخہ بلاقیمت کتب خانہ کی جانب سے مدرسہ میں دیئے جانے کے لیے گذارش کروں گا بشرطیکہ بسہولت ممکن ہو اور کسی قسم کی گرانی نہ ہو نیز ہر دو کتب کے مزید ایک ایک نسخہ کے لیے عرض ہے کہ وہ قیمتہً روانہ کردیا جائے۔

گویا مذکورہ کتب کے دو دو نسخوں میں سے ہر کتاب کا ایک نسخہ جناب کی جانب سے ہوگا اور ایک نسخہ مدرسہ خرید کر رہا ہے۔ اُمید ہے کہ جواب باصواب مرحمت فرما کر ممنون فرمائیں گے۔ قیمت وہاں ہی جناب کی خدمت میں پہنچ جائے گی ہمارا وہاں حساب ہے۔

مخلصانہ درخواست ہے کہ اس ناکارہ کو اپنی مقبول دُعاؤں کے فراموش نہ فرمائیں مولانا نُور احمد صاحب سلام مسنون قبول فرمائیں، مولوی سبحان محمود صاحب مولانا زیارت گل صاحب وغیرہ بھی ارشد اللہ کو سلام و دُعا

محمد اسعد اللہ

بڑے صاحبزادے کے نام

سبق آموز مکاتیب

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

زیرِ نظر خطوط حضرت مفتی محمد شفیع صاحبؒ کے ان لاتعداد مکتوبات کی ایک جھلک ہیں جو حضرت مفتی صاحبؒ نے اپنے سب سے بڑے اور سعادت مند فرزند حضرت مولانا محمد زکی کیفی صاحبؒ کو مختلف مواقع پر تحریر فرمائے تھے۔ یہ نادر مکاتیب حضرت مولانا زکی کیفی نے حضرت مفتی صاحبؒ سے خصوصی تعلق اور عشق کی بنا پر فائلوں کی صورت میں محفوظ کر رکھے تھے۔ چنانچہ حضرت مفتی صاحب کا تحریر فرمودہ شاذ ہی کوئی خط ایسا ہوگا، جو ان فائلوں میں موجود نہ ہو۔ بلکہ بعض ایسے خطوط بھی فائلوں میں موجود ہیں، جو کہ دوسرے حضرات کے نام تحریر کردہ ہیں۔

یہ گنجِ گراں مایہ صرف اس لحاظ سے ہی منفرد نہیں کہ یہ ایک عظیم باپ اور فرمانبردار بیٹے کے خصوصی عشق کا ترجمان ہے بلکہ یہ ایک شیخِ کامل اور سالک کے تعلق کو بھی واضح کرتا ہے اس میں صرف پند و نصائح کے جواہر ہی نہیں بلکہ شعر و سخن اور ادبی چاشنی کے موتی بھی جا بجا ٹنکے ہوئے ملتے ہیں۔ تقریباً چھبیس سال پر مشتمل ان مکاتیب میں مکمل خاندانی روداد کے ساتھ ساتھ پاکستان کی مذہبی اور سیاسی تحریکوں کی مکمل تاریخ بھی موجود ہے۔ پیش آنے والے تمام واقعات کا حضرت مفتی صاحب ذکر فرماتے ہیں، خواہ ان کا تعلق آپ کی نجی زندگی سے ہو یا معاشرتی زندگی سے یا ملکی مسائل سے۔

ان تمام باتوں کی وجہ سے یہ بہت ضروری تھا کہ مکاتیب کے وہ حصے جو کسی بھی وجہ سے عام لوگوں کے لئے فائدہ مند ہوں شائع کئے جائیں۔ لیکن یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں کہ یہ طے کرنا کتنا کٹھن ہوگا کہ کون سی

عبارات لے لی جائیں اور کون سی چھوڑ دی جائیں۔ ع

داماں نگہ تنگ و گل حسن تو بسیار

ان مکاتیب کی جملہ خصوصیات تو قارئین خود ہی ملاحظہ فرمائیں گے، تاہم چند ایک خصوصیات درج ذیل ہیں۔

۱۔ بے تکلفی اور سادگی۔

۲۔ مضمون انتہائی واضح اور ٹھوس۔

۳۔ معاملات کی صفائی پر غیر معمولی توجہ (خطوط کا ایک بڑا حصہ معاملات کے حساب پر مشتمل ہے)

۴۔ دینی رنگ ہر خط میں جھلکتا ہے۔

۵۔ حق تعالیٰ پر غیر معمولی توکل اور بھروسا، بیشتر خطوط میں الخیر فیما وقع انشاء اللہ تعالیٰ کی تکرار۔

۶۔ گاہے بگاہے مزاح کا عنصر، تقریباً ہر خط میں ادب کی چاشنی۔

۷۔ ۱۹۴۸ء سے لے کر ۱۹۶۴ء تک کے خطوط میں والد صاحبؒ کی کراچی سے دوری اور فراق وجلائی پر اظہار ملال۔ بیشتر خطوط میں غیر معمولی محبت کا اظہار۔

خطوط کسی شخص کی زندگی کے آئینہ دار ہوتے ہیں۔ خصوصاً جبکہ وہ خالصتاً نجی نوعیت کے ہوں اور ایک جذباتی رشتہ کے سبب لکھے گئے ہوں اور کاتب کے ذہن میں ان خطوط کے منظر عام پر آنے کا تصور تک نہ ہو۔

اب جب کہ کاتب اور مکتوب الیہ دونوں حق تعالیٰ سے جا ملے ہیں۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو آخرت کے اعلیٰ مدارج عطا فرمائیں۔ آمین۔

★

ادارہ اسلامیات کے افتتاح کے موقع پر یہ خط تحریر فرمایا۔ ہجری تاریخ مٹی ہوئی ہے مگر عیسوی تاریخ ۱۴۔ جنوری ۱۹۴۹ء واضح پڑھی جاتی ہے۔

برخوردار عزیز محمد زکی سلمہٗ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ کئی روز تمہیں گئے ہوئے ہو گئے ہیں۔ میں بھی کوئی خط نہ لکھ سکا۔ کچھ مشاغل ایسے ہی رہے۔ تمہارے خط کا تو اتنی جلدی انتظار بھی مشکل تھا۔ مگر الحمد للہ آج اس وقت

بات کے نو بجے تمہارا تار دکان کے افتتاح کا مل گیا۔ خیریت معلوم ہو کر نیز دکان کا افتتاح سن کر بڑی مسرت ہوئی۔ دل سے دعا نکلی کہ اللہ تعالیٰ اس کو بے فکری اور اطمینان کا ذریعہ بنا دیں اور اس اطمینان کو فکر آخرت اور عمل صالح کا ذریعہ بنا دیں۔ برخوردار سارے کاموں سے مقدم سمجھ کر نماز کا اہتمام ہمیشہ رکھو۔ اس میں کبھی غفلت نہ ہونے پائے۔ . . . . . . تفصیل احوال سے مطلع کریں۔ کام کا فکر دل و دماغ پر بالکل نہ رکھیں۔ جتنا ہو جاوے بآسانی اس پر قناعت کریں۔ (۱۹۔جنوری ۱۹۴۹ء)

★

از ڈھاکہ۔ ۲۹ جنوری ۴۹ء یکشنبہ

برخوردار عزیز محمد زکی سلمہٗ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ۔ میں بعونہٖ تعالیٰ کل ۲ بجے شب کو گھر سے ہوائی اڈے پر پہونچا۔ ۵ بجے جہاز اڑا۔ الحمد للہ کسی قسم کا اثر قلب و دماغ پر نہیں ہوا۔ کھڑے ہو کر صبح کی نماز اسی میں پڑھی۔ ۹ بجے دہلی اترے۔ ؎

گردوں کے ستم دیکھیے ، اچھا ہوا گھر دیکھا
دیکھا تو نہ جاتا تھا ناچار مگر . . . . دیکھا

۱۱ بجے وہاں سے جہاز چلا۔ ۳ بجے ڈھاکہ بخیریت پہنچ گئے۔ فالحمد للہ علیٰ ذالک۔ اپنے اعضا کے منتشر ہونے اور پھر کسی معاشی ذریعہ اور جائے قرار نہ ہونے سے قلب اکثر مشوش رہتا ہے۔ مگر ؎

رسید مژدہ کہ ایام غم نخواہد ماند
چناں نماند و چنیں نیز ہم نخواہد ماند

★

۲۹ رجب ۱۳۶۸ھ یکشنبہ

برخوردار عزیز محمد زکی سلمہٗ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ . . . . . . یہ ساری فکریں وہ ہیں جو اصلی کام کے علاوہ ہیں۔ اصلی کام جس کو مقصد زندگی بنایا ہوا ہے اور قدم قدم پر اس میں روڑے اٹکے ہوتے نظر آتے ہیں۔ دن بھران کے لئے دوڑتے ہیں۔ کہیں مساجد کا معاملہ در پیش ہے۔ کہیں مدرسہ کا کہیں قانون کی تدوین کا، کہیں اشتراکیت کے مقابلہ کی طیاری کا، کہیں کشمیر کا۔ ان ہجوم افکار میں نظریں کسی غمگسار کو تلاش کرتی ہیں۔ وہ چاروں طرف نظر نہیں آتا اور تمہیں اپنے سے جدا کرنے پر پچھتاتا ہوں۔ لیکن پھر تمہاری اور تمہارے بہن

بھائیوں کی آئندہ زندگی کا خیال کرکے عقلاً اوس کو بھی برداشت کرتا ہوں۔ اس وقت ایک شعر یاد آیا! جس نے دل کچھ ٹھنڈا کر دیا ؎

جو نظر آتے ہیں نہیں اپنے ۔۔۔ ہے جو اپنا نظر نہیں آتا

★

خط سے تمہاری پریشانی اور دردِ شقیقہ کی تکلیف معلوم کرکے دل بے چین ہو گیا۔ برخوردار! انسان پر ہر طرح کے اوقات آتے ہیں۔ جب عمر بھر راحت کے لیل و نہار ہم نے گذارے ہیں تو چند روز کی تلخی کا بھی انصاف تو یہ ہے کہ لذت و خوشی کی طرح خیر مقدم کرنا چاہیے۔ پریشان و مشوش ہونا کسی طرح قرین دانش مندی نہیں۔ ع

حیف باشد دل دانا کہ مشوش باشد

ولنعم ما قال الحافظ الشیرازی ؎

رسید مژدہ کہ ایام غم نخواہد ماند
چناں نماند چنیں نیز ہم نخواہد ماند

میں اگرچہ آجکل تم سے زیادہ افکار میں مبتلا ہوں مگر بحمد اللہ کوئی ایسی پریشانی نہیں جو برداشت نہ ہو۔ آج کل افکار کے ساتھ کاموں کا اس قدر ہجوم ہے کہ الاماں الحفیظ۔ صبح سے رات کے بارہ بجے تک ایک منٹ کی مہلت نہیں۔ ۱۹ مارچ ۴۹ء۔ چہار شنبہ

دوشنبہ ۱۳ مارچ ۴۹ء۔

نورِ نظر لخت جگر محمود کی سلمہٗ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ ہمارا بھی عجیب حال ہے کہ نہ کسی ارادہ کو قرار ہے نہ کسی تجویز کو۔ ہر وقت یوں معلوم ہوتا ہے کہ ایک پرکاہ کی طرح میدان میں پڑے ہوتے ہیں۔ ہوا جس طرف چاہتی ہے لے جاتی ہے۔ ؎ ذرہ ذرہ دہر کا پابستۂ تقدیر ہے
زندگی کے خواب کی حالی یہی تعبیر ہے

پختہ عزم کر رکھا تھا کہ کل دوشنبہ کی شام کو یہاں سے روانہ ہونا ہے۔۔۔۔ آج صبح تمہارا تار ملا اور ساتھ ہی کچھ ایسی چیزیں سامنے آئیں کہ میرا اس وقت سفر ناممکن ہو گیا۔۔۔۔

ایک اہم خوشخبری تو تم نے اخبارات اور ریڈیو پر سن لی ہوگی کہ گیارہ مہینے سے ہم جس کام کے پیچھے لگے ہوئے تھے اور درحقیقت جس غرض کے لئے ترکِ وطن اور ترکِ اعزا کی تکلیف برداشت کی اللہ تعالیٰ کے فضل سے اوس کی بنیاد ہمارے موافق پڑگئی ہے اور قرارداد مقاصد جو دستور پاکستان کی لائن اور سمت متعین کرنے کے لئے زیر بحث لائی گئی تھی اوس میں مسلسل ایک ماہ کی شدید مخالفتوں اور رکاوٹوں کے بعد بحمد اللہ ایسی کامیابی ہوئی کہ ہمارا ریزولیوشن بعینہٖ بلاکسی ترمیم کے پاس ہوگیا جس میں یہ طے ہوگیا کہ پاکستان کا دستور قرآن و سنت کی بنیادوں پر بنایا جاتے گا۔ اب دوسرا مرحلہ اوس کمیٹی کا تھا جو یہ دستور بنائے گی۔ اس کے پچیس ارکان تو اسمبلی کے اندر سے تجویز ہوگئے اور اون کو یہ اختیار دے دیا گیا کہ دس آدمی باہر سے منتخب کرلیں۔ اس سلسلہ میں ہم سب کی اور مولانا (علامہ عثمانیؒ) کی کوشش یہ ہے کہ جتنا بھی ہوسکے، ان دس میں علما کی تعداد زیادہ آ سکے۔

✱

۵ دسمبر ۱۹۴۹ء کو قبلہ والد صاحب نے حضرت مفتی صاحبؒ کی خدمت میں ایک خط تحریر کیا جس کا جواب اسی خط کے حاشیہ پر حضرت مفتی صاحبؒ نے اپنے دست مبارک سے تحریر فرمایا۔ یہ دونوں خط بھی جو ہر صاحبِ بصیرت کے لئے سرمۂ نظر کی حیثیت رکھتے ہیں درج ذیل ہیں۔ اولاً والد صاحب کا خط اور پھر حضرت مفتی صاحب کا جواب

۵ دسمبر ۴۹ء

مخدوم و مکرم مربی معظم جناب والد صاحب دامت برکاتہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ دو تین ماہ سے دل میں یہ داعیہ برابر پیدا ہو رہا ہے کہ اگرچہ میری ہستی سراپا جرم و گناہ ہے لیکن اگر کسی بزرگ سے اصلاحی تعلق پیدا ہو جاوے تو شاید حق تعالیٰ اپنے فضل و رحمت سے کچھ گناہوں سے بچنے کی توفیق عطا فرمادیں۔ اس عرصہ میں بہت سے حضرات اہل اللہ سے تعلق پیدا کرنے کا خیال ہوا لیکن دل کو کسی ایک سے بھی مناسبت معلوم نہ ہوئی۔ حضرت مولانا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ دامت برکاتہم سے بھی اصلاحی تعلق پیدا کرنا چاہا لیکن میری بدقسمتی کہ مجھے ان سے ذرا مناسبت نہیں ہے اور بار بار دل اس پر ہی جما کہ آپ سے ہی التجا کروں کہ میری حالت زار پہ نظر فرما کر دستگیری فرمائیں۔ بخصوصاً ایک خواب جو تین چار ماہ ہوئے میں نے دیکھا تھا اس کا خیال آکر تو دل پھر یہی چاہتا ہے کہ آپ ہی دستگیری فرمائیں۔ وہ خواب یہ تھا کہ دیکھا کہ ایک کچی عمارت کی خانقاہ

ہے جس میں کچھ طلباء پڑھ رہے ہیں۔ یہ مقام ایک ٹیلہ پر واقع ہے۔ پھر دیکھا کہ حضرت میاں صاحب قدس سرہٗ مدرسہ میں تشریف لائے ہیں۔ میں ٹیلے کے نیچے کے حصہ میں ہوں اور میاں صاحب بلندی پر۔ میاں صاحب نے اپنا ہاتھ بڑھایا اور میں نے پکڑ لیا تو میاں صاحب نے مجھے بھی اوپر کی جانب کھینچ لیا اور فرمایا کہ آج کھانا ہمارے ساتھ مل کر کھاؤ۔ میں ساتھ چلا۔ مولانا ایک درسگاہ میں تشریف لے گئے اور فرمایا تھوڑی دیر انتظار کرو۔ ایک مولوی صاحب کا انتظار ہے جو حدیث کا سبق پڑھا رہے ہیں ان کو ساتھ لے جا کر کھانا کھائیں گے۔ اس اثناء میں آپ تشریف لے آئے۔ مجھے فرمایا کہ میرے ساتھ چلو۔ میں نے عرض کیا کہ میاں صاحب نے کھانے کے لئے فرمایا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ میاں صاحب کو کیوں تکلیف دیتے ہو۔ چلو۔ میاں صاحب نے بھی اعتراض فرمایا۔ یہ خواب میں نے آپ سے ایک روز بیان بھی کیا تھا جس کی تعبیر بھی آپ نے عنایت فرمائی تھی۔ اس لئے گذارش ہے کہ برائے کرم مجھے اصلاحی تعلق پیدا کرنے کی اجازت مرحمت فرما کر ممنون فرمائیں۔ والسلام

(مخصوص بوالد صاحب دامت برکاتھم) ناکارہ غلام زکی

حضرت مفتی صاحبؒ نے اس خط کے حاشیہ پر جواب تحریر فرمایا جو یہ ہے۔

برخوردار عزیز وفقہ اللہ تعالیٰ لما یحبہ ویرضاہ

تمہارے اس خط سے جس قدر مسرت تمہارے بوڑھے باپ کو ہوئی اس کا بیان نہیں کر سکتا۔ کہ دل کی تمنا پوری ہوئی، اللہ تعالیٰ نے تمہیں اس کا دھیان عطا فرمایا۔ برخوردار عزیز حقیقت یہ ہے کہ آخرت اور دین تو اپنی جگہ ہیں۔ دنیا میں انسانیت بھی بغیر اصلاح اخلاق کے نہیں آتی اور عادۃ اللہ یونہی جاری ہے کہ کوئی کام آدمی بغیر استاذ کے نہیں سیکھتا۔ اس کام میں بھی اس لئے مرشد کی ضرورت ہے، لیکن اپنی اولاد کے معاملہ میں عموماً ایسی صورتیں پیش آکر لغو طریق ہو جاتی ہیں کہ اولاد کو باپ پر ناز ہوتا ہے اور اس طریق میں سراسر نیاز درکار ہے۔ اسی لئے حضرت اقدسؒ اپنے عزیزوں کو بیعت سے انکار فرما دیتے تھے لیکن اگر تمہارا دل اسی پر جما ہے تو اس کے بھی نظائر موجود ہیں۔ حضرت شاہ عبدالقدوس گنگوہیؒ اور حضرت مجدد الف ثانیؒ کے صاحبزادے سب اپنے والد ہی کے ارشاد میں کمال کو پہونچے ہیں۔ بہر حال در کار خیر حاجت استخارہ نیست۔ اللہ تعالیٰ کے نام پر کام شروع کرو۔ اس وقت شاید تمہارے مشاغل کچھ زیادہ ہوں گے اس لئے اول اتنا سا مختصر کام کرو کہ قصد السبیل کو خوب غور سے پڑھ کر اس کے مضامین

اپنے ذہن میں مستحضر کر لو اور پھر مجھے اس کی اطلاع دو، آگے دوسرا کام بتلاؤں گا۔ والسلام۔
(محمد شفیع عفی عنہ۔ ۲۰ صفر ۲۹ھ)

اس کے بعد کئی خطوط ایسے ہیں جن میں اصل خط والد صاحب کا لکھا ہوا ہے اور مختلف مقامات پر نشان لگا کر حاشیہ پر حضرت مفتی صاحبؒ نے جواب تحریر فرمایا ہے۔ ان خطوط میں بھی نصیحتوں کے گراں قدر موتی اور سلوک کی مجرب تدابیر درج ہیں اس لئے یہ خطوط بجنسہٖ نقل کئے جاتے ہیں۔

مخدوم و مکرم مربی معظم جناب والد صاحب دامت برکاتہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، گرامی نامہ موصول ہوا حسب الارشاد قصد السبیل کا مطالعہ کیا، جس کو دیکھ کر میں یہ سمجھا کہ اصلاح کا مقصد اصلی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے احکام امر و نہی کی پابندی کرنا ہے اور رضائے الٰہی کی رضا کے حصول کی کوشش کرنا ہے۔

جواب: اس پابندی اور کوشش کا طریقہ تمہارے ذہن میں کیا ہے۔ کیا خود بخود کر سکتے ہو۔

مکتوب: میں اللہ تعالیٰ سے عہد کرتا ہوں کہ انشاء اللہ حتی الوسع گناہوں سے بچنے کی کوشش کروں گا۔

جواب: اللہ تعالیٰ اس عہد پر مستقیم رکھیں۔ آمین۔

مکتوب: اللہ تعالیٰ استقامت عطا فرمائیں۔ آمین۔ آپ سے بھی دعا کی درخواست ہے۔

جواب: دل سے دعا ہے۔

مکتوب: الحمد للہ نماز پوری پابندی کے ساتھ پڑھتا ہوں۔

جواب: بہت خوشی ہوئی۔ اللہ تعالیٰ مزید توفیق اور استقامت عطا فرماویں۔

مکتوب: لیکن جماعت کی پابندی نصیب نہیں ہوتی۔

جواب: جہاں تک ممکن ہو کوشش اس کی بھی جاری رکھو۔ صبح اور عشاء میں تو دکان کا بہانہ بھی نہیں۔ اور دوسرے اوقات میں بھی اپنے ملازم یا کسی پڑوسی کو شامل کر کے دکان پر ہی جماعت کر لیا کرو۔ جماعت اکثر ائمہ کے نزدیک واجب ہے۔

مکتوب: جس کی وجہ جواز دل نے یہ نکال رکھی ہے کہ دکان کا حرج ہوگا۔ اللہ تعالیٰ نماز با جماعت کی توفیق عطا فرمائیں۔ روزانہ صبح کو ڈیڑھ پارہ قرآن مجید کا اور ایک منزل مناجات مقبول کی پڑھتا ہوں۔ اب جو ارشاد ہوگا انشاء اللہ اس پر چلنے کی کوشش کرونگا۔ والسلام۔ ناکارہ غلام زکی ۱۹ دسمبر ۴۹ء

جواب : ابھی اتنا ہی معمول کافی ہے۔ صرف ایک کام اور کرلو کہ چلتے پھرتے کوئی ذکر خواہ لاالٰہ الا اللہ یا صرف اللہ اللہ جو طبیعت کو زیادہ مرغوب ہو زبان پر جاری رکھو۔ والسلام۔

محمد شفیع ۔ یکم ربیع الاول ۹۶ء ۱۳ھ

مخدوم و مکرم مربی معظم جناب والد صاحب دامت برکاتہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ ، گرامی نامہ وصول ہوا آپ نے معلوم فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رضا میں خود سمجھ حاصل کرنے کی کوشش کرسکتا ہوں یا نہیں۔ اس کے متعلق عرض ہے کہ کوئی فن بھی خواہ کسی قسم کا ہو بغیر استاد کی دستگیری اور اس کے حکم کی تعمیل کئے بغیر حاصل نہیں ہو سکتا۔

جواب : السلام علیکم ورحمۃ اللہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ٹھیک ہے۔

مکتوب : آپ جو ہدایات عطا فرمائیں گے میں انشاء اللہ العزیز حتی الوسع ان پر کاربند ہونے کی کوشش کروں گا۔ اللہ تعالیٰ کے فضل و رحمت سے امید ہے کہ وہ آپ کی نظر کرم کی بدولت گناہوں سے بچنے کی توفیق عطا فرمائیں گے۔

جواب : مگر معلم کی طرف سے ہدایات ظاہر ہے کہ اس کے علم پر موقوف ہے اور اس کا علم آپ کی اطلاع پر ۔ ۔ ۔ اب سارے طریق کا خلاصہ ہوگیا۔ اطلاع اور اتباع یعنی اپنے کسی حال کو معلم و مربی سے مخفی نہ رکھنا۔ اس کو اطلاع دینا اور پھر جو ہدایات کی جاوے اس کا اتباع کرنا۔ اس کو خوب سمجھ کر پلے باندھ لو۔

مکتوب : نماز باجماعت کا التزام اب انشاء اللہ کروں گا۔

جواب : در کار خیر حاجت ہیچ استخارہ نیست۔ جتنا ہو سکے فوراً شروع کردو۔ باقی کے لئے کوشش میں لگو۔

مکتوب : کل قریب کے دکانداروں سے بھی کہہ دیا ہے کہ اب نماز باجماعت دکان پر ہی پڑھا کریں گے عشاء کی نماز مسجد میں پڑھنے کی کوشش کر رہا ہوں اور آپ سے بھی التجا ہے کہ میرے لئے خصوصی دعا فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ نماز باجماعت کی توفیق عطا فرمائیں۔

جواب : دل و جان سے دعا ہے۔ اللہ تعالیٰ قبول فرمائیں۔

مکتوب : صبح کو آنکھ دیر سے کھلتی ہے۔ اگرچہ الحمد للہ اول وقت میں نماز پڑھتا ہوں لیکن جماعت

نصیب نہیں ہوتی۔

جواب : الارم لگا کر رکھو۔ رات کو دیر سے سونے کی عادت چھوڑ دو۔ الارم کام نہ دے تو بدرسہ میں کسی آدمی کو خواہ اجرت دے کر اس پر مقرر کر دو کہ اذان کے بعد جگا دیا کرے۔

مکتوب : اس سے قبل خود بخود استغفار کی کثرت اور درود شریف پڑھتا رہتا تھا۔ اب فرمائیں کہ لاالہ الا اللہ کا ورد کروں یا سابقہ ہی۔ والسلام۔ محتاج دعا ذکی ۳۱ دسمبر ۴۹ء

جواب : بالفعل معمولات حسب ذیل رکھیں۔

صبح کو کچھ مقدار مناسب تلاوتِ قرآن، اس کے بعد ایک منزل مناجات مقبول اور نماز کے بعد سبحان اللہ ۳۳ مرتبہ، الحمد للہ ۳۳ مرتبہ، اللہ اکبر ۳۴ مرتبہ۔ اللہ لاالہ الا اللہ وحدہٗ لا شریک لہٗ، لہ الملک ولہ الحمد بیدہ الامر یحیی ویمیت وہو علی کل شیٔ قدیر ایک مرتبہ اور صبح کی نماز سے پہلے یا بعد قبل از تلاوت سبحان اللہ سو مرتبہ۔ الحمد للہ سو مرتبہ، اللہ اکبر سو مرتبہ استغفار سو مرتبہ، درود شریف سو مرتبہ، اور رات کو بعد مغرب یا بعد عشاء یعنی یہ تسبیحات اسی طرح سو سو مرتبہ باقی تین نمازوں میں ۳۳-۳۳ مرتبہ۔ اگر اس کی پابندی ہوگئی تو پھر کچھ اور دیکھا جاوے گا۔

ٹیلیفون لگنے کی مبارکباد سب گھر والوں کی طرف سے قبول کریں۔ اللہ تعالیٰ اس کو ایسا مبارک فرمائیں کہ دین و دنیا میں ترقی ہو۔ والسلام محمد شفیع عفی عنہ ۱۳ ربیع الاول ۶۹ھ

★

شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی رح کے سانحہ وفات پر والد صاحبؒ نے ایک تعزیتی مکتوب حضرت مفتی صاحبؒ کے نام تحریر فرمایا جس کے جواب میں حضرت مفتی صاحبؒ کا کارڈ پر تحریر فرمودہ جواب موصول ہوا۔ جس میں اس سانحہ کی کچھ تفصیل درج ہے۔

"حضرت مولاناؒ کا حادثہ بالکل ناگہانی ہوا۔ رات کو دس بجے تک کوئی شکایت نہیں تھی۔ آخر شب قدرے حرارت ہوئی۔ صبح کو سینے میں کچھ معمولی سی خلش محسوس ہو رہی تھی۔ ۸ بجے کے بعد حسب عادت چائے پی۔ اس کے پینے کے بعد طبیعت بگڑی۔ ایک دست اور قے ہوئی اور ۹ بجے سے نبض گرنا

سلہ۔ کاغذ دریدہ ہے۔ عبارت کٹی ہوئی ہے۔ غالباً "موقوف ہے" ہوگا۔

شروع ہوگئی۔ طاقت کے انجکشن برابر دیئے جارہے تھے مگر نبض نابھری۔ گیارہ بجے اس عالم فانی کو خیرباد کہا۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔ ۲ بجے ملتان سے گورنر جنرل نے جو اس وقت دورہ پر ملتان گئے تھے، ٹیلیفون میں اس حادثہ کی خبر کے ساتھ یہ استفسار کیا کہ فوراً بتلائیں کہ نعش دہاں لائی جائے یا یہیں دفن کیا جائے۔ جواب گھر والوں کی طرف سے لانے کے متعلق دیا گیا۔ اسی وقت فوراً ایک گھنٹہ بعد گاڑی بہاولپور سے چلنے والی تھی۔ بڑی جلدی انتظام کر کے اوس میں سوار کردیا گیا۔ اگلے روز صبح نو بجے جنازہ یہاں پہونچ گیا۔ انتظامات سب حکومت نے کئے۔ ایک عالم تھا جو دریا کی موج کی طرح زیارت کے لئے امڈا آتا تھا۔ جنازہ گھر سے میدانِ نماز تک بشکل ایک گھنٹہ میں پہونچا۔ شرکا جماعت نماز میرے اندازے میں تو دو لاکھ سے زائد تھے۔ نماز جنازہ کے لئے مجھ پر اصرار کیا گیا، میں نے پڑھائی۔ یہ خلاصہ ہے ہمارے افسانہ زندگی کا۔ ابقاللہ ؎

۲۰ صفر ۶۹ ہجری

اس کے بعد اگلے خط میں اپنے استاذ علامہ حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی رحمۃ کے اسی حادثۂ وفات اور اس کے بعد پیش آنے والے بعض واقعات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے تحریر فرمایا:

★

" برخوردار عزیز! اس وقت حوادث تو ایسے پیہم پڑے کہ یہ محسوس ہوتا تھا کہ کمر ٹوٹ گئی اور اب شاید کسی کام کے قابل نہ رہوں گا۔ لیکن اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم کا شکر ادا نہیں ہو سکتا کہ چند روز کے بعد ہی یہ کیفیت رفع فرمادی۔ کام کو آگے چلانے اور بڑھانے کی فکر ضرور ہے مگر اس درجہ میں نہیں کہ روگ لگ جائے۔ ایک بڑا احسان اللہ تعالیٰ کا یہ ہے کہ اوس نے کسی جانشینی کی ہوس میں مبتلا نہیں فرمایا اور صحیح تر یہ ہے کہ اوس کی اہلیت بھی نہیں۔ عوام میں روشناس ہونا میرے حالات کے لحاظ سے کچھ اچھا معلوم نہیں ہوتا، جو طرز عمر بھر رہا اب اوس کو چھوڑ کر ہنگامہ آرائی کروں یہ کسی طرح مناسب نہیں۔

(۴ ۳/۶۹ھ مطابق ۲۵ ۱۲/۴۹ء)

یہ سفر جو حال میں میں نے طے کیا اپنی عمر کا سب سے بڑا اور سب سے عجیب تر سفر تھا۔ سفر سے واپسی کے بعد جو خوشی ہوا کرتی ہے۔ تمہاری جدائی نے اس کو کالعدم کردیا۔ بنگال کی مخصوص مٹھائی کچھ لایا تھا۔ مگر تمہارے والدین کے حلق میں اوس کی تلخی اب تک موجود ہے۔ بھیجنے کی چیز نہ تھی۔

(تاریخ نامعلوم لیکن خط کے سارے مضمون سے اندازہ ہوتا ہے کہ ۴۹ء کے آخر میں لکھا گیا۔)

★

غالباً جنوری ۵۰ء کے ابتدائی دنوں میں حضرت علامہ عثمانیؒ کے سانحہ اور اس کے بعد پیش آنے والے بعض افسوسناک واقعات کی جانب اشارہ کرتے ہوئے تحریر فرمایا:

"مولانا کے حادثہ کا اثر مجھ پر کچھ غیر معمولی ہے۔ لوگوں کو تو اول صدمہ کے وقت زیادہ اثر ہوتا ہے جو رفتہ رفتہ گھٹتا ہے۔ مجھ پر معاملہ برعکس ہو رہا ہے۔ آئندہ اپنی زندگی کا نقشہ بالکل بدلتا نظر آ رہا ہے پاکستان میں اور خصوصاً کراچی میں کچھ قدر پہچاننے والے صرف وہی ایک تھے جو آج زیر خاک ہو رہے ہیں۔ اب بالکل منقطع اور یکسو رہ کر زندگی گذارنا بھی آسان نہیں اور ناقدر شناس لوگوں کے پیچھے پیچھے لگنا بھی عمر بھر کی عادت کے خلاف ہے۔ ادھر اہل باطل اپنی اپنی منظم طاقتوں کے ساتھ میدان میں نکل آئے ہیں۔ یہ تو گھریلو زندگی کا نقشہ ہے۔ دوسری طرف جو ذمہ داری کا بار عظیم دستور سازی کے سلسلہ میں پڑ گیا ہے اوس میں ایسے لوگوں سے معاملہ بلکہ مقابلہ ہے جو مولوی کے نام سے چڑتے اور ان کے سایہ سے گھبراتے ہیں۔ اقتدار سارا ان کے ہاتھ میں ہے۔ تعداد اون کی ہے، قوت اون کی ہے۔ ہمارے بورڈ کی حیثیت رکن اسمبلی کی نہیں۔ جو بات کو کم از کم اصل با اختیار مجلس میں کہہ تو دیں۔ نیچے کی ذیلی کمیٹیوں سے واسطہ ہے۔ کوئی راستہ سمجھ میں نہیں آتا کہ اس بار گراں سے کس طرح عہدہ برآ ہوں گے۔" (جنوری ۵۰ء)

★

"شہادۃ الاقوام کا بلاک دیکھا، بہت پسند آیا۔ مگر ایک بات بالکل دل کو نہیں لگی۔ حضرتؒ کا نام صرف حکیم الامت اشرف علی تھانوی۔ میری زبان تو قادر نہیں کہ اس طرح پڑھ سکوں۔ کم از کم مولانا کا لفظ درمیان میں، بلاک، کٹوا کر اضافہ ضرور کر دیں۔ دوسرے لوگ تو پیچھے اعتراض کریں گے۔ خود مجھے سخت گراں معلوم ہوتا ہے۔" (۴۔ ربیع الثانی ۶۹ھ ۲۲، جنوری ۵۰ء)

★

۵۔ اگست ۵۰ء

برخوردار عزیز سلمہ اللہ تعالیٰ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، تمہیں رخصت کیا کیا کہ صبر کو قرار کو رخصت کر دیا۔ کوئی شاعری

نہیں۔ در و دیوار سے وحشت ہونے لگی۔ خواجہ صاحب کا یہ شعر مصداق حال بن گیا۔ ~

وہ کب کے آئے بھی اور گئے بھی نظر میں اب تک سمارہے ہیں
یہ چل رہے ہیں وہ پھر رہے ہیں یہ آرہے ہیں وہ جارہے ہیں

تم کو گئے کو کہاں سے ردی کا کاغذ اٹھا لیا۔ مگر اس کاغذ پر کسی دوسرے کو خط نہیں لکھا جاسکتا تھا اور یوں ہی ضائع کردینا کفرانِ نعمت تھا۔ اس لئے بے تکلف تحریر استعمال کرلیا گیا۔ والسلام

★

۹۔ اگست ۱۹۵۰ء کو اپنے بھانجے زاہد حسین صاحب کو کارڈ تحریر فرمایا جس میں ان کے بعض امور پر اظہارِ مسرت کرتے ہوئے مزید تحریر فرمایا: دیکھو نماز کی پابندی میں سستی نہ کرنا اور جھوٹ بولنے کے پاس نہ جانا خواہ سچ بولنے میں تمہارا کتنا ہی نقصان اور تکلیف ہو۔ اس کو پلے باندھ لو پھر دیکھنا کہ تم کہاں سے کہاں پہونچتے ہو۔

۱۰ ستمبر ۱۹۵۰ء

برخوردار بسعادت اطوار سلمہ اللہ تعالیٰ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ تمہارا خط پہنچا۔ حالات معلوم ہوئے۔ الحمدللہ ہم سب بعافیت ہیں۔ چوری کا جو اثر تم پر ہوا وہ ایک ناگزیر چیز تھی۔ مگر یہاں تو تمہیں معلوم ہے کہ دیوانے بستے ہیں ~

نہ شادی داد سامانے، نہ غم آورد نقصانے
بہ پیشِ ہمت ما ہر چہ آمد بود مہمانے

اللہ تعالیٰ کا بڑا فضل وکرم ہے کہ صرف ایک روز قلب پر غیر معمولی اثر رہتے کے بعد اب بھول بھلیاں ہوگئی اور اللہ تعالیٰ نے ضروری کام بھی پورے فرما دیئے۔ قرض کی ادائیگی بھی انشاءاللہ وہی فرمائیں گے۔

درج ذیل خط بقرعید کے موقع پر حضرت مفتی صاحبؒ نے تحریر فرمایا تھا۔

برخوردار سعادت اطوار سلمہ اللہ تعالیٰ واصلح بالکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ .... پچھلے ہفتہ بڑی غفلت ہوئی کہ میں ہجوم کار کے سبب کوئی خط نہ لکھ سکا اور اتفاقاً کسی اور نے بھی نہ لکھا جس سے تمہیں پریشانی ہوئی۔ حقیقت یہی

ہے کہ دو سطریں لکھ دیتے میں کسی کام کا حرج ہے نہ کوئی مشغلہ ایسا حائل ہے۔ بعض اوقات غفلت ہو جاتی ہے۔ برخوردار سلمہٗ تمہاری محبت تو قدیم سے سب سے زیادہ تھی۔ تمہاری سعادت مندی کا نقش تمہارے نیک اطوار اور اطاعت شعاری اور والدین کی محبت سے اوس پر مزید ہو گیا۔ میرے ہر بُن مو سے تمہارے لئے دعا نکلتی ہے۔ اللہ تعالیٰ قبول فرمائیں اور انشاء اللہ تعالیٰ تمہارے حق میں ضرور قبول ہوں گی۔ تمہارے مکان کی تکلیف سے دل و دماغ پریشان رہتا ہے لیکن حکام کے پاس جانا اور لوگوں سے سفارشیں لکھوانا یقین کرو اس سے زیادہ تکلیف دہ ہے خصوصاً جب کہ یہ بھی معلوم و متعین ہے کہ اوس کا نتیجہ کچھ زیادہ نہیں۔ سردار عبدالرب نشتر صاحب کو مولانا سے خط لکھوانے کی درخواست کرنے کی بھی مجھے اب تک ہمت نہیں ہوئی . . . . اپنی ناکارگی اور طبیعت کے بن مالس ہونے سے میں خود عاجز ہوں، رہیلہ توکل کا کر رکھا ہے مگر اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم ہے کہ وہ انھیں حالات میں ہماری سب حاجتیں پوری فرما دیتے ہیں۔ اونھیں سے اب بھی بڑی امید ہے کہ کوئی اچھی صورت پیدا فرما دیں گے . . . . بکرے کی رقم تیس روپیہ تمہارے پاس بھیجتا ہوں۔ وہاں قربانی کر کے اپنے احباب کو اور کچھ غربا اور مساکین کو گوشت تقسیم کر دیں۔ خود بھی کھا سکتے ہیں۔ قربانی میں حسین آدم صاحب مقیم افریقہ کی طرف سے بعد قربانی یہ دعا پڑھ لیں۔ اللّٰھم تقبلہ من فلان کما تقبلت من خلیلك ابراھیم و حبیبك محمد صلی اللہ علیہ وسلم۔ دعا یاد نہ رہے تو صرف اتنا زبان سے کہہ دیں کہ یہ قربانی فلاں کی طرف سے قبول فرما۔ (تاریخ درج نہیں ہے)

دوشنبہ (تاریخ درج نہیں) از کراچی

برخوردار سعادت اطوار محمد زکی سلمہٗ

السلام علیکم و رحمۃ اللہ۔ بوقت رخصت اپنے قلبی تاثر کے چند جملے کہہ کر پچھتایا کہ تم پر اثر ہوا اور تمہاری غمگین صورت برابر آنکھوں میں پھر رہی ہے۔ راستہ بھر دل سے دعائیں نکلیں۔ خدا کرے کہ سب قبول ہوں اور تمہاری سعادت مندی کے ثمرات صالحہ تمہیں دین و دنیا میں حاصل ہوں . . . . بارہ بجے شب سوار ہوئے۔ تھیلا اسٹیشن پر ہی رہ گیا۔ توشہ دان تم سے بھی گیا اور ہم سے بھی۔ فالحمد للہ

★

ایک پرچہ جس پر "ضروری" تحریر ہے۔ غالباً کسی خط کے ہمراہ ارسال کیا گیا تھا، جواب معلوم

نہیں کون سا ہے ؛ بہرحال اس پرچہ پر منجملہ بعض اہم باتوں کے یہ بھی تحریر ہے : ایک آسان طریقہ استخارہ کا حضرت والا کی کتاب طرائف جلد دوم ص۲۱ پر لکھا ہے۔ اس میں کوئی مشقت نہیں وہ آپ بھی کر لیں۔ طریقہ یہ ہے کہ کسی دن میں گیارہ سو مرتبہ اسم الرحیم پڑھ لیں۔ پھر ۱۱ر کی مٹھائی بچوں کو تقسیم کر کے اولیاء اللہ کو ثواب پہنچا دیں۔ اس طرح آپ عامل ہو گئے۔ اب جب کبھی کسی معاملہ کو معلوم کرنا ہو تو ایک پرچہ پر لفظ الرحیم لکھ کر تکیہ کے نیچے رکھ کر سو جائیں۔ خواب میں معاملہ کے متعلق بشارت ہوتی ہے۔ والسلام (تاریخ نامعلوم)

★

۱۲ ۱۳۸ھ   برخوردار عزیز مولوی محمد زکی سلمہٗ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ۔ آپ کے خطوط پہونچے۔ میں آج کل دستور کے ہنگاموں میں ہر وقت مشغول ہوں۔ ادھر حدیث پڑھانے والے استاد نہ ہونے کے سبب بخاری شریف کا سبق خود شروع کرا دیا ہے جو صحت و طاقت سے باہر نظر آتا ہے۔ قادیانی مسئلہ اور علماء کے بیانات کے سلسلہ میں بھی سہروردی سے مل کر کام کرنا ضروری ہو رہا ہے۔ ادھر لار کمیشن نے بھی اسی وقت آکر عقیدہ ڈالا ہے۔ اس کا کچھ کام اب تک ہوا نہیں۔ ہجوم کار سے دل و دماغ ماؤف ہیں۔ اللہ تعالیٰ امداد فرماویں۔

۲۴ اکتوبر ۵۳ء   برخوردار عزیز محمد زکی سلمہ اللہ تعالیٰ والحجۃ فی مقاصدہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ۔ رجسٹری لفافہ ملا۔ . . . . تمہارے قرضوں کی طرف سے ہر وقت دل بے چین ہے اور تمہارے فکر سے ہر وقت فکر لگی ہوتی ہے۔ حقیقۃً قرضوں کا بار بہت ہی سخت چیز ہے۔ اللہ تعالیٰ جلد ہی اس سے سبکدوش فرماویں۔

یاد آپ بعد مغرب یا عشاء چودہ سو چودہ مرتبہ پڑھ کر یہ دعا پڑھ لیا کریں۔

"یا وھاب ھب لی من نعمۃ الدنیا والآخرۃ انک انت الوھاب" بہت مجرب ہے۔ والسلام

★

۱۹ ۱۲ھ   برخوردار عزیز محمد زکی سلمہٗ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ۔ تمہارا مفصل خط پہنچا۔ اللہ مالک ہے . . . . . لار کمیشن کا قضیہ تو تریاق از عراق سے بھی دور کا ہے۔ اس پر کسی کام کا مدار رکھنا یا امید باندھنا شیخ چلی والی

بات ہے۔ ہاں کوشش اس میں کر رہا ہوں۔ چودھری محمد علی وزیر خزانہ سے دوسری بار بھی ملاقات کرچکا ہوں .... صاحب سے دوسری ملاقات اگلے ہفتہ میں انشاءاللہ ہوگی۔ مگر ابھی تک معاملہ خود ان کے دماغوں میں آ رہا ہے۔ پھر وہ عمل کی حد تک کب پہونچے گا۔ ساٹھ برس کے بڑھے کو اس کا انتظار خودفریبی کے سوا کچھ نہیں۔

★

مورخہ ۹ جنوری ۱۹۵۴ء

برخوردار سعید محمد زکی اسعدہ اللہ تعالٰی ووفقہ لما یحب ویرضٰی

السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ تحقیقاتی عدالت کے سلسلہ میں کئی روز سے حضرت مفتی صاحبؒ[1] کو عریضہ لکھنے کی فکر میں تھا، فرصت ملتی نہیں، ادھر حضرت موصوف کی علالت وضعف کی وجہ سے کوئی طویل خط ان کو لکھنا مناسب معلوم نہیں ہوتا۔ آج وقت نکال کر آپ کو لکھتا ہوں۔ یہ خط حضرت کو بھی سنا دیں اور مولانا داؤد غزنوی کو بھی نیز جماعت احرار کے جو ذمہ دار آدمی مقدمہ کی پیروی کر رہے ہوں ان کو بھی۔

صورت یہ ہے کہ اب جبکہ عدالت نے بحث کے دس نکات مقرر کر دیئے ہیں تو وہ انھی سوالات جو میں جواب لکھنے کے لئے ساتھ ہی لایا تھا اور اس کا کچھ کام کر بھی چکا ہوں لیکن ہر اب اس کا موقع نکل گیا۔ اب تو ضرورت اس کی ہے کہ جو سوالات اب عدالت نے قائم کر دیئے ہیں ان کے جوابات بہت صاف اور سلجھے ہوئے اور تمام مسلمان جماعتوں کے متفق ہوں۔ تحقیق سے یہ معلوم ہوا ہے کہ عدالت ان سوالات کا جواب بھی علماء کی طرف سے نہیں چاہتی، بلکہ ان سوالات پر وکیلوں کی زبانی بحث چاہتی ہے پہلی مرتبہ علماء کے نام پر جو رسوا کن متضاد اور غلط چیزیں منظر عام پر آئیں اور ان کا کوئی تدارک نہ ہو سکا۔ اب یہ دوسرا غلط طریقہ ہے جس کے اثرات نہایت خطرناک ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ قادیانیوں کی طرف سے جو وکلاء پیش ہوں گے وہ تو ان سوالات وجوابات کے پورے ماہر ہوں گے۔ ان کے یہاں تو یہی چند مسائل جن پر اسلام وایمان کا دارومدار ہے اور بچہ سے لے کر بوڑھے تک سب کو رٹایا جاتا ہے۔

ہمارے ہاں حال یہ ہے کہ وکلاء بیچارے تو ان کو کیا سمجھیں؛ بعض اہل علم کو بھی ان مسائل کی پوری معلومات نہیں ہوتی۔ اب اگر ہماری طرف سے وکلاء نے بحث کی تو وہ جیسی بحث کریں گے ہمیں پہلے معلوم ہے کہ نہایت لغو ونا کارہ ہوگی۔ اول تو جو مسائل کبھی ان کی نظر سے نہیں گزرے

---

[1] حضرت مفتی محمد حسن صاحبؒ

نصوصاً علمی مسائل اوس کو اگر وہ آج پورے طور سے محنت کے ساتھ مطالعہ کر کے قابو میں لانا بھی چاہیں تو تقریباً ناممکن ہے۔ پھر ہمارے وکلاء میں ایسا کون ہے جو سارے کام چھوڑ کر اسی دفتر کو چاٹنے . . . . . . ۔اب ضرورت اس امر کی ہے کہ مجلس عمل اور مجلس احرار بھی صورت حال پر غور کرے اگر وہ بھی تحریری بیان دینے کو پسند کریں اور وکلاء کی بحث جیسا کہ میرے خیال میں مضر ہے اوس کو رد کریں تو ان دونوں جماعتوں کی طرف سے بھی ایک درخواست دی جائے جس کا ایک جزو تو یہی ہو کہ ان مسائل پر وکلاء کے بجائے خود ذمہ دار جماعتوں کو تحریری بیان دینے کا حق دیا جاتے اور ہر فریق کے جواب پر دوسرے فریق کو ایک مرتبہ تنقید کا اور دوسری طرف سے ایک مرتبہ جواب تنقید کا موقع دیا جائے۔ایک اور امر جو میرے خیال میں اور ضروری ہے وہ یہ ہے کہ تمام سوالات جو اب عدالت نے قائم کئے ہیں ان میں قادیانیوں کے کفر واسلام یا کفر و اسلام کی حقیقت کا کوئی سوال نہیں رکھا، حالانکہ اصل بنیادی سوال یہی تھا اور تحقیقاتی عدالت کے فرائض منصبی سے اون سوالات عشرہ کا درحقیقت اتنا تعلق نہیں جتنا کفر و اسلام کے مسئلہ کا تعلق ہے اس لئے ہماری درخواست کا ایک جزء یہ بھی ہونا چاہیے کہ تحقیقاتی عدالت اگر اپنے فرائض صحیح طور پر ادا کرنا چاہتی ہے تو اس سوال کا بھی ضرور اضافہ کریں . . . . مگر ان حضرات کی رائے مجھ سے مختلف ہو تو مجھی نہ کوئی شکایت نہ افسوس بلکہ یہ سب حضرات جو کچھ راہ عمل طے کریں گے اگر ہو سکا تو اس کا اتباع کروں گا ورنہ اس دلدل سے بالکل علیحدہ ہو جاؤں گا۔ والسلام

★

مؤرخہ ۱۴ر فروری ۵۴ء برخوردار عزیز محمد زکی سلمہٗ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ . . . . (خط لکھنے کا) سبب یہ تھا کہ حضرت مفتی صاحب مدظلہٗ سے احقر نے وعدہ کیا تھا کہ پردے کی وراثت کے متعلق راستہ میں مضمون لکھ کر کراچی پہونچتے ہی بھیج دوں گا۔ چنانچہ اس کی تعمیل کی اور دہلی اسٹیشن سے لکھنا شروع کیا ٹنڈو آدم پر مضمون ختم کر کے مکمل کر رہا تھا۔ کراچی پہونچتے پر ارادہ تھا کہ اپنی رسید کے خط کے ساتھ ہی اس کو بھیجوں گا لیکن ہوا یہ کہ یہاں پہونچنے پر مجھے خیال آیا کہ منکرین حدیث نے یہ مسئلہ اٹھایا ہے ان کے اس پر کئی رسالے نکل چکے ہیں۔ اون کو دیکھ کر شبہات کا ازالہ ضروری ہے اسی روز تلاش کر کے ان

کے سب رسائل جمع کئے تو یہ معلوم ہوا کہ وہ لوگ دو تین رسالے تو پہلے اس مسئلہ پر لکھ چکے ہیں اور حال میں پنجاب اسمبلی کے اسی بل کے متعلق بھی ایک مستقل رسالہ چھاپ کر شائع کر چکے ہیں اس رسالہ میں پورے اسلام اور اسلامی قانون کو ملّا کا مذہب کہہ کر بری طرح رد کیا ہے اور یہ رسالہ ۳۰ جنوری سے پہلے پنجاب اسمبلی کو بھیجا جا چکا ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ دیکھ کر ایک طرف تو یہ رنج ہوا کہ اہل باطل کتنے چست ہیں کہ تاریخ سے پہلے ایک کتاب لکھ کر چھپوا کر بھیج دی۔ دوسری طرف یہ رنج ہوا کہ ہم مدعیانِ حق کتنے غافل ہیں کہ تاریخ گذرنے کے بعد ہمارے یہاں اس کا تذکرہ شروع ہوا۔ پھر یہ رسالہ دیکھا اور کلفت ہوئی کہ لکھنے والے نے اس مسئلہ کے پورے مواد قرآن و حدیث پر اپنے زعم میں کافی تحقیق و تدقیق سے پھر اس کے بیان کرنے میں انتہائی تلبیس سے کام لیا ہے معمولی استعداد کے اہل علم کو جواب دینا بھی مشکل ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ والسلام

★

مندرجہ ذیل خط حضرت مفتی صاحب کے خط کی نقل ہے جو کہ حضرت والد صاحبؒ نے مندرج ذیل نوٹ کے ساتھ نقل کر کے محفوظ رکھا ہے۔

"نقل خط والد صاحب بنام ——— بیگم ذوالفقار ——— صاحب مرحوم معرفت اخبار خاتون لاہور"

نوٹ: ان محترمہ کا ایک طویل خط لڑکیوں کے مغربی تہذیب میں بہہ جانے پر غم و غصہ کے ملے جلے جذبات کے ساتھ آیا تھا اور ان کی سعی تھی کہ والد صاحب اس آزادی کی روک تھام کے لئے عملی قدم اٹھائیں۔

جواب: محترمہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ صاحبہ! السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ افسوس ہے کہ جناب کے گرامی نامہ کا جواب اپنے مختلف سفروں اور مشاغل کی وجہ سے غیر معمولی تاخیر کے ساتھ لکھ رہا ہوں۔ اچھا ہوا کہ آپ نے اپنا پورا تعارف کرا دیا۔ آپ کا گرامی نامہ میرے لئے ایک تازیانہ ہے لیکن میں چاہتا ہوں کہ کچھ اپنا حال بھی آپ کے پیش نظر کر دوں۔

میں نے اپنی عمر کے تریپن سال دارالعلوم دیوبند میں گزارے ہیں۔ کام، درس اور فتویٰ کا رہا ہے۔ اس بسم اللہ کے گنبد میں ایک ٹھوس قسم کا کام شب و روز کی شدید محنت کے ساتھ انجام دیتا رہا اور پوری لیاقت و قوت سب دہیں صرف ہو چکی۔ اس تدریس کی خدمت اور وہ بھی شب و روز، چالیس سال میں بوڑھا بنا دیتی ہے۔ مجھ پر تو تریپن سال گذر چکے تھے۔ باہر کی دنیا سے تقریباً ناواقف تھا پاکستان بنا۔ ہجرت کرنے پر دشمنوں نے مجبور نہیں کیا، بلکہ دل کے داعیہ اور چند بزرگوں کے ارشاد نے یہاں

لاڈالا۔ پاکستان بنانے میں بھی تین سال تقریباً پورے ملک کے گوشہ گوشہ میں پھرتا ہوا تھا۔ میں عین اس وقت جبکہ لیگ کے جھنڈے تلے لوگوں کو جمع کر رہا تھا اس وقت بھی اس خود فریبی میں مبتلا نہ تھا کہ یہ جھنڈا احیاء اسلام اور اقامتِ دین کا کام دے گا۔ مگر ہندوستان کی سیاست کا منطقی نتیجہ یہی تھا کہ مقصد کی دو منزلیں کی جائیں۔ مقصد کی پہلی منزل مسلم لیگ کے جھنڈے تلے حاصل کی جاسکتی تھی۔ اس لئے مقصد کی دو قسطیں کر رکھی تھیں۔ ایک یہ کہ کوئی زمین مسلمانوں کو مل جائے جس میں ان کی تجویز پر غیروں کا کوئی قدغن لگا ہوا نہ ہو۔ دوسرے اس زمین کو ہموار کرنا اور اس میں وہ پودے اگانے جو احیائے اسلام اور اقامتِ شعائر اسلام کی خدمت انجام دیں۔ اللہ تعالیٰ نے محض اپنے فضل سے پہلی قسط ہمیں عطا فرمادی اور دوسرے قسط کے حصول کی دشواری چونکہ میرے سامنے پہلے سے تھی اور یہ بھی سامنے تھا کہ آج جن لوگوں کو ووٹ دلوا رہا ہوں کل وہ الگ کیمپ میں ہوں گے اور احیائے اسلام کا مقصد رکھنے والے علیحدہ کیمپ میں۔ اس لئے یہاں کے حالات سے عرصہ تک تو میں دلگیر بھی نہیں ہوا، کیونکہ وہ متوقع پہلے سے تھے۔ البتہ تین سال کے بعد بھی جب کوئی قدم آگے نہ بڑھا تو پریشانی شروع ہوئی۔ یہاں تک کہ اب ساتویں سال میں ہم یہ دیکھ رہے ہیں کہ آگے بڑھنے کی بجائے ہم دین کی اس سطح سے بھی بہت نیچے اور دور جا پڑے ہیں جس پر انگریز کے دور میں تھے۔ اس سے ایک سالخوردہ ضعیف پر کیا اثر ہوگا، اس کا اندازہ آپ سے دشوار نہیں۔ حالات ایسے ہیں کہ دین کے جس شعبہ پر نظر ڈالی جاتی ہماری تباہی کا منظر سامنے آتا ہے اور یہ خیال ہوتا ہے کہ بس اسی کے پیچھے لگ کر اپنی عمر اس میں ختم کر دی جائے۔ ؎

زفرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم
کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا ایں جاست

لیکن پھر کوئی دوسرا شعبہ اس سے زیادہ ابتر نظر آتا ہے اور اس کے اثرات پہلے سے زیادہ دور رس نظر آتے ہیں تو ادھر توجہ کی جاتی ہے۔ وہ بھی یہی چاہتا ہے کہ دل و دماغ کی باقی قوت اور پورا وقت اس میں صرف کر دیا جائے۔ ؎

یک من دخیلِ آرزو دل بچہ مدعا دھم
تن ہمہ داغ داغ شد پنبہ کجا کجا نہم!

الغرض اس وقت میری رہی سہی طاقت وقوت اور بقیہ عمر کے لمحات چار طرف اس طرح بٹے ہوئے ہیں کہ نہ کوئی کام پورا ہوتا ہے نہ کسی کام کو چھوڑنے کی ہمت ہوتی ہے ؎

من قماشِ فروشِ دل صد پارہ خویشم
گفتے بردہ از دل گذرد ہر کہ زپیشم

مشاغل کی پوری تفصیلات لکھنا آپ کے اور اپنے وقت کی اضاعت ہے۔ آپ نے گرامی نامہ میں جس کام کی طرف توجہ دلائی یہ تو ظاہر ہے کہ یہ مقصد ایسا نہ تھا کہ اس کی طرف دھیان نہ ہو یا اس کی ضرورت کا احساس نہ ہو لیکن وہی نشستِ حال اور رفقاء کار کی کم یابی بلکہ نایابی سدِ راہ بنی رہی۔ ۔۔۔۔۔ اس کی روک تھام کا صحیح اور آسان راستہ بجز اس کے نظر نہیں آتا کہ دین دار عفت شعار پردہ دار خواتین ہی کی کوئی اجتماعی ہیئت اس طوفان کا مقابلہ کرے مگر اس کا سامان کہاں۔ یہاں تو مردوں کے کام میں رفیق نہیں ملتے، عورتوں کی کوئی اجتماعی ہیئت بناتے ہوئے ڈر لگتا ہے کہ کہیں یہ بھی وبالِ جان نہ بن جائے ۔۔۔۔۔۔۔۔ ایسی کوئی اجتماعی ہیئت بنانا ظاہر ہے کہ میرے بس کی تو بات نہیں۔ آپ ہی کوئی قدم اٹھائیں تو اللہ تعالیٰ کے فضل سے امید کامیابی ضرور بلکہ یقینی ہے۔ مجھ سے اس کی کوئی خدمت ہو سکے تو اس کو اپنی سعادت سمجھ کر قبول کروں گا ۔۔۔۔۔ اپنے عزائم سے مجھے بھی مطلع فرمائیں تو عنایت ہوگی۔ والسلام

★

از مسجد باب الاسلام ۲۴ رمضان ۹۴ھ۔

برخوردار عزیز محمد زکی سلمہٗ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ تم شاید یہ سن کر تعجب کرو کہ میں اس وقت مسجد باب الاسلام میں معتکف ہوں، اتنے بکھیڑوں میں الجھا ہوا تھا کہ بظاہر اس کی کوئی امید نہ تھی مگر ع

درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا

ایک روز افکار وہموم کا ایسا ہجوم قلب ودماغ پر ہوا کہ زبردستی خواجہ صاحب کا شعر زبان ہو گیا ؎

فکرِ ایں و آں نے جب مجھ کو پریشاں کر دیا
میں نے سر نذرِ جنونِ فتنہ ساماں کر دیا

الحمدللہ بڑی عافیت وسکون سے وقت پورا ہو رہا ہے۔ تمہارے مقاصد کے لئے دعا کرتا رہتا ہوں۔ پچھلے تمہارے خط سے ماشاءاللہ چار پانچ پارے قرآن شریف کی تلاوت روزانہ کا معمول معلوم ہوکر بے حد مسرت ہوئی۔ اللہ تعالیٰ استقامت عطا فرماویں ان چند روز میں کچھ کر لینا چاہیے۔ سارا سال غفلتوں میں گزرتا ہے۔

کراچی ۱۵ جولائی ۵۵ء

★

برخوردار عزیز محمد زکی سلمہٗ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ۔ کئی روز انتظار کے بعد آج تمہارا لفافہ پہنچا ٹیلیفون کی مختصر گفتگو کے بعد میرا ابھی یہی حال رہا کہ خط لکھنا چاہتا تھا مگر ہجوم کار سے آج تک نہ لکھ سکا۔۔۔۔۔ ہجوم افکار و مشاغل تو پہلے ہی کم نہ تھا۔ ریڈیو کا ہفتہ وار پروگرام بھی ایک مستقل کام بن گیا کیونکہ اس کو پہلے لکھنا پڑتا ہے پھر یہ اندازہ کرنا کہ پندرہ منٹ میں آجائے گا یا نہیں، اس لحاظ سے کمی بیشی کر کے دوبارہ صاف کرنا، ریڈیو میں بھیجنا پھر جمعہ کو پہنچ کر درس دینا۔ ریڈیو کی طرف سے ۲۵ روپیہ فی پروگرام یعنی یکصد روپیہ ماہوار کا لفافہ آیا تھا۔ میں نے یہ لکھ کر واپس کر دیا کہ میں اس خدمت کا کوئی معاوضہ نہیں لوں گا۔ تم نے خط میں اس کا کوئی تذکرہ نہیں کیا۔ کیا تمہیں سننے کا اتفاق نہیں ہوا، نہ اپنی کوئی رائے لکھی کہ طرز مناسب ہے یا کچھ بدلنے کی ضرورت ہے۔

★

نظر کا جو شبہ آپ نے لکھا ہے، اس کے لئے ایک علاج لکھتا ہوں وہ پابندی سے کر لیا جائے

آیت: وان یکاد الذین کفروا لیزلقونك بابصارهم لما سمعوا الذکر ویقولون انه لمجنون وما هو الا ذکر للعالمین

اس آیت کو ہر نماز کے بعد ہاتھوں پر دم کر کے سارے بدن پر پھیر لیا کریں اور گیارہ مرتبہ پڑھ کر پانی پر دم کر لیں اور اس کو سات دن پیا کریں۔

★

(مندرجہ ذیل خط حضرت مولانا مفتی محمد حسن صاحبؒ کے نام ہے جو کہ والد صاحبؒ نے محفوظ کر لیا تھا)

۱۵ دسمبر ۵۵ء

مخدومنا المحترم حضرت مفتی صاحب دامت برکاتہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ ۔ ناکارہ خادم ہجوم افکار ومشاغل سے دن رات پریشان ہے ہیں قابل بھی نہیں کہ حالات کی اطلاع دے سکے ۔ اللہ تعالیٰ کا فضل عظیم ہے کہ ایک معمولی سی حرکت جو جمعیۃ کی طرف سے شروع کی گئی دستوری ہفتہ کا اعلان ہوا ۔ کچھ اخباری بیانات اور پمفلٹ شائع ہوتے تو امید سے زیادہ کامیابی کے آثار نظر آتے ۔ ہماری سوئی ہوئی جماعت جاگ اٹھی اور بحمد اللہ پورے مغربی پاکستان کے بہت سے شہروں سے جلسوں، قراردادوں کی اطلاعات اور تاروں اور خطوط کے ڈھیر لگ گئے ۔ ممبران اسمبلی پر اس کا خاصا اثر ہے ۔ اس وقت اپنی بھی کچھ ہمت بڑھی کہ ہم اپنی جماعت کو مردہ افسردہ سمجھتے ہیں مگر حقیقت یہ نہیں ۔ اگر ذرا بھی جماعت کو سنبھالا جاتے تو ان شاء اللہ تعالیٰ بہت جلد وہ ایک مستحکم منظم جماعت بن سکتی ہے اس وقت ضرورت اس کی ہے کہ کم از کم مغربی پاکستان کے پورے شہروں کا دورہ کیا جائے اس دورہ کے لئے اصل ضرورت حضرت صدر محترم کے خود تکلیف فرمانے کی تھی مگر آپ کی معذوری معلوم ہیں لئے جناب کی طرف سے ہم نے خود ایک حکم نامہ تصنیف کیا اور یہاں کے بے شمار مشاغل اور شب وروز کی مشغولی کے باوجود سولہ سترہ دن اس کام کے لئے نکالے کہ کراچی سے پشاور تک بڑے بڑے شہروں کا دورہ کر کے دستوری مہم کو تیز کیا جائے اور اسی کے ضمن میں جمعیت کی تنظیم وتشکیل مستحکم ہوتی چلی جائے ۔

حضرت کو معلوم ہے کہ ان تمام کاموں میں ہماری سب سے بڑی رکاوٹ پیسہ کی ہے ورنہ یہ کام اس سے بہت پہلے کر لینے کا تھا اس وقت اللہ کے نام پر ہیں لگے اور مولانا متین صاحب نے اس دورہ کا پروگرام بنا لیا اس کی کوشش جاری ہے کہ اس کے لئے مصارف کا کچھ انتظام ہو جائے ۔ دعا فرمائیں حق تعالیٰ کامیابی عطا فرمائیں ۔ کچھ لوگوں نے وعدہ تو کیا ہوا ہے ۔ اگر اللہ تعالیٰ کو منظور ہے تو اس پروگرام کے ماتحت ۱۸ دسمبر ۵۵ء روز یکشنبہ یہاں سے روانہ ہو کر بہاولپور، ملتان، منٹگمری وغیرہ ہوتے ہوئے ان شاء اللہ ۲۲ دسمبر روز چہارشنبہ لاہور میں حاضر خدمت ہوں گے ۔ حضرت نے ایک ناکارہ کو اس کام میں پھنسا دیا ہے تو اب دعا سے پوری دستگیری فرمائی جائے ۔ سفر کا پروگرام اور حضرت کی جانب سے تصنیف کردہ خط کی پوری کاپی بغرض ملاحظہ مرسل ہے ۔

اگر حضرت کی اجازت ہو تو یہی تصنیف کردہ خط کا مضمون حضرت کی طرف سے اخبارات کو بھی دے دیا جائے ۔ میں نے کل رات بذریعہ ٹیلیفون حضرت سے استفسار کرنے کا قصد کیا تھا مگر ٹیلیفون کی

کال نہ مل سکی۔ والسلام۔ محتاج دعا بندہ محمد شفیع عفی عنہ

★

از میمن سنگھ ۲۰ر جنوری ۵۶ء بروز شنبہ

برخوردار مولوی محمد زکی سلمہٗ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ۔ دو روز کشور گنج قیام کے بعد آج میمن سنگھ پہونچا ہوں۔ ظہر کے بعد یہاں جلسۂ عام ہے۔ کل انشاء اللہ کمرلا جانا ہوگا۔ پرسوں وہاں جلسہ سے فارغ ہوکر ڈھاکہ جانا ہے۔ پروگرام جواب تک متعین ہوچکا ہے، اس کی ایک کاپی بھیجتا ہوں۔ بحمداللہ بعافیت ہوں۔ کل سے قلب پر تمہاری تجارتی کمزوری کا زیادہ احساس ہو رہا ہے۔ برابر دعا کر رہا ہوں۔ اللہ تعالیٰ سے امیدوار ہوں کہ جلد فتح یاب ہوگا۔

برخوردار محمود اشرف دن بھر یاد آتے رہتے ہیں۔ مولانا احمد علی صاحب کے بچے سامنے آکر ان کی یاد دلاتے رہتے ہیں . . . . . گھر کا کوئی حال کئی روز سے معلوم نہیں ہوا۔ خدا کرے سب بخیریت ہوں۔ مقدمات کی آفت بھی جاری ہے۔ اسی عرصہ میں ان کی تاریخیں ہیں اور خرچ ہے۔ واللہ اعلم کیا گذرے گی۔

فالی اللہ المشتکی وعلیہ التکلان . . . . . . والسلام

★

جمعرات ۲ر فروری ۵۶ء از چاٹگام

برخوردار عزیز محمد زکی سلمہٗ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ پچھلے دنوں ڈھاکہ میں تم سے فون پر بات ہونے کے بعد آج تک کچھ حال معلوم نہ ہوسکا۔ میں نے کمرلا میں بھی چاٹگام میں ٹرنک کال کرنا چاہا۔ مگر اوقات کے اختلاف سے کال ملنے کا موقع نہ ملا۔ خدا کرے آپ سب بعافیت ہوں۔ الحمدللہ اس سفر میں بھی طبیعت اچھی ہے کوئی تکلیف نہیں ہوئی۔ پچھلے پروگرام کی کاپی بھیجی تھی۔ اس میں کچھ تبدیلی ہوئی ہے۔ اب یہ ہے کل شام چاٹگام میں جلسہ عام ہوا۔ آج دس بجے ہزاری میں جلسہ ہے اور پھر شام کو چاٹگام واپس آکر یہاں سیرت کا جلسہ ہے اور عشاء کے بعد یہاں سے کمرلا کو روانگی ہے۔ ۳ر فروری جمعہ کمرلا میں پڑھ کر بروڑا جانا ہے۔ وہاں جلسہ ۴ر کو نواکھالی۔ ۵ر کو فینی۔ ۶ر کو برہمن باڑہ اور ۷ر کو ڈھاکہ

پہنچنا ہے۔ ۸ر کو سلہٹ کی روانگی، ۱۰ر کو وہاں سے ڈھاکہ واپسی، ۱۱ر کو سراج گنج میں جلسہ ہے۔ یا تو ۱۲ر کو کراچی واپسی ہو گئی یا پھر ۱۳ر، ۱۴ر کو دوبارہ چاٹگام کے علاقہ میں جانا ہوگا۔ تو ۱۵ر، ۱۶ر تک واپسی ہو سکے گی۔ اپنے حالات کی اطلاع ڈھاکہ کے پتہ پر دیں۔ ...... آپ اس سفر میں برابر یاد آتے رہے۔ اس طرز کا سفر کبھی کیا ہی نہیں۔ چاٹگام خصوصاً بڑا پر فضا اچھا شہر ہے۔ مناظر بھی دلکش ہیں۔ [illegible] گھنٹے فرصت کے مل گئے تو مشہور مقامات کی سیر کو گئے۔ آپ یاد آتے رہے۔ خدا کرے سکو بعافیت ہو۔ دکان کا حال معلوم نہیں دعا کر رہا ہوں اللہ تعالیٰ فراخی عطا فرمائیں۔ فاقوض امری الی اللہ۔ حضرت مفتی صاحب کا بھی حال معلوم نہ ہو سکا۔ ان کی خدمت میں احقر کا سلام اور درخواست دعا عرض کر دیں۔ والسلام۔

★

از نواب شاہ سندھ [illegible] نومبر ۵۶ء

برخوردار عزیز محمد زکی سلمہٗ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ مصر کے لئے طبی مشن بھیجنے کا انتظام الحمدللہ مختصر پیمانہ پر ہی سہی مکمل ہو گیا ہے۔ ...... دار العلوم کا جلسہ اور مستقل انتظام ان ہنگامی ایام میں کہ پورے پاکستان کا دل و دماغ مصر کی طرف لگا ہوا ہے خود بھی آج کل اس مہم کے سوا دوسرے کاموں میں لگنا ممکن نہیں۔ اس لئے غور و مشورہ کے بعد یہی مناسب سمجھا گیا کہ اس کو ابھی اور دو تین ماہ مؤخر کیا جائے ...... میں نے امسال حرمین میں یہ ارادہ کیا تھا کہ آئندہ سیاسی کاموں سے یکسو ہو جاؤں گا۔ دعا بھی کی کہ یا اللہ، جس میں خیر ہو اس کی توفیق عطا فرما۔ کوشش یہ تھی کہ جمعیت سے مستعفی ہو جاؤں لیکن بجائے سبکدوشی کے ان نئے ہنگاموں نے اور مبتلا کر دیا۔ اللہ تعالیٰ انجام بہتر فرما دیں۔ حضرت مفتی صاحب کو بھی خط سنا کر دعا کی درخواست کریں۔ والسلام

بندہ محمد شفیع عفی عنہ

★

بہرحال حضرت مفتی صاحب[1] سے خصوصی دعا کے لئے میری جملہ پریشانیوں کا ذکر کر کے تاکید کر دیں اور کرتے رہیں۔ خط سے معلوم ہوا کہ تمہاری آمد و رفت مفتی صاحب کے پاس کم ہو گئی ہے۔ مجبوریاں معلوم

[1] حضرت مفتی محمد حسن صاحب نور اللہ مرقدہٗ

ہونے کے باوجود میری رائے یہ ہے کہ چاہے پانچ منٹ ہی کے لئے ہو مفتی صاحب کو روزانہ سلام ضرور کر آیا کرو۔ . . . . . . محمد ولی سلمہٗ کے ہاتھ ایک صدوپیہ ایسے وقت پہونچے کہ میں سخت پریشان تھا۔ . . . . . . دل سے دعائیں نکلی۔ اللہ تعالیٰ تمہارے علم وعمل اور عمر ومال میں برکت عطا فرادیں

(۲۲ر جنوری ، ۵۷ء بعد عشاء)

۲۵ فروری ، ۵۷ء کو دوپہر کے کھانے میں حضرت مفتی صاحبؒ کے گلے میں ایک ہڈی پھنس گئی۔ شدید تکلیف کے عالم میں ہسپتال لے جایا گیا، جہاں مختلف تدابیر کے باوجود وہ خارج نہ ہوئی بالآخر رات کے وقت مجبوراً بے ہوش کر کے آپریشن کیا گیا اور ڈیڑھ انچ کی یہ نوکیلی ہڈی نکالی گئی۔ اس پورے واقعہ کی ساری تفصیل مولانا محمد تقی عثمانی مدظلہ نے یکم مارچ ، ۱۹۵۷ء کو تین صفحوں میں لکھ کر بھیجی۔ حاشیہ پر حضرت مفتی صاحبؒ کے دست مبارک سے مختصر نوٹ بھی درج ہے، جس پر ۲ ، مارچ کی تاریخ درج ہے . . . . . . مولانا تقی صاحب کے خط کے آخر میں درج ہے "آپریشن سے پہلے ایک عجیب واقعہ پیش آیا کہ ڈاکٹر عبدالحئی صاحب کے ساتھ ایک وکیل صاحب تھے جو صاحب کشف ، میں بیٹھے ہوئے تھے دیگر تمام لوگ دوسری جگہ تھے۔ وکیل صاحب اچانک چونکے اور ڈاکٹر صاحب سے کہنے لگے کہ حضرت تھانویؒ تشریف لائے تھے اور حضرت مفتی صاحب کو کچھ درس دے رہے تھے اور پھر یکایک چلے گئے۔

اس واقعہ پر حضرت والد صاحب کو پہلی سی گھبراہٹ نہ رہی تھی (یکم مارچ ، ۱۹۵۷ء)

★

۲۰ر صفر ۷۸ھ ، ۷ر ستمبر ۵۸ء

برخوردار عزیز محمد زکی سلمہٗ

السلام علیکم - ورحمۃ اللہ - تمہارا لفافہ پہونچا - تمہاری صحت کی خبر سے بے حد مسرت ہوئی اور اوس سے زیادہ اس کی مسرت ہوئی کہ نماز با جماعت کا التزام کر لیا۔ میں نے ملتزم پر یہ دعا کی تھی - اللہ تعالیٰ نے نقد قبولیت دکھلا دی - ایک شہر میں چھوٹی چھوٹی مسجدوں میں جمعہ کرنا اچھا تو نہیں لیکن تمہارے لئے مناسب سمجھتا ہوں کہ تمہیں نماز پڑھانے ، خطبہ دینے اور کچھ تقریر کرنے کی عادت ہو جائے۔ خطبہ کے ترجمہ کے ساتھ کہیں اوس کی مزید تشریح میں کوئی واقعہ سلف واکابر کا یاد آجائے تو وہ بھی بیان کر دیا کرو۔ . . . . . . ایک خبر جس کو سن کر پہلے سنتے تو تمہیں فکر ہوئی مگر اب بحمد اللہ

عافیت ہے۔ چار روز سے مجھے داہنے پاؤں میں نقرس کا درد ہوا اور سخت ہوا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔
بحمد اللہ آج صبح سے مرض میں نمایاں خفت ہو گئی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ والسلام

★

۱۲ ۵ ۱۴۰۱ھ ۲۰ ۱۲ ۸۰ء

برخوردار عزیز محمد زکی سلمہٗ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ۔ کئی روز سے تمہارا خط نہ آنے سے فکر لگی ہوئی تھی۔ ۔ ۔ ۔
بحمد اللہ آج تمہارا خط ملا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ تمہاری پریشانیوں کا اندازہ تو پہلے ہی تھا اب خط سے اور تفصیل معلوم ہوئی۔ فکر نہ کرو اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے کوئی راستہ نکالیں گے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ان رقوم کی ادائیگی کا بظاہر کوئی سامان نظر نہیں آتا۔ مگر ان سب چیزوں کے باوجود اپنے قلب و دماغ کو مشوش کرنا قرین عقل نہیں۔ اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے رہو وہی کوئی صورت پیدا فرمائیں گے۔ ایک وظیفہ بھی لکھتا ہوں۔ اس کو تمہاری والدہ بھی تمہارے لئے اور اپنے لئے کل سے پڑھنا شروع کریں گی اور ہو سکے تو تم خود بھی پڑھ لیا کرو۔ حکیم عبدالوہاب صاحب نابینا سے والد صاحب کو یہ مجرب نسخہ ملا تھا جس کا نام ان کی بیاض میں کیمیائی درویشاں لکھا ہے۔ تمہیں میری طرف سے اجازت ہے دوسروں کو بھی اجازت دے سکتے ہو۔ وظیفہ یہ ہے کہ اول تین مرتبہ درود شریف پڑھیں آخر میں سو مرتبہ یہ دعا پڑھیں "یا وھاب ھب لی من نعمۃ الدنیا والآخرۃ انک انت الوھاب" اس کے بعد تین مرتبہ درود شریف پڑھ کر وظیفہ ختم کریں۔ بہتر یہ ہے کہ روزانہ ایک مقررہ وقت پر بعد نماز عشاء پڑھ لیا کریں۔

معمولات روزمرہ دیکھ کر تو بڑی خوشی ہوئی۔ اللہ تعالیٰ استقامت عطا فرما دیں۔ لیکن اگر قلب و دماغ پر ان معمولات کی وجہ سے کچھ بھی تکان ہو تو تخفیف کر دیں۔

پریشانی کی حالت میں تعلق مع اللہ اور انابت بہت بڑی نعمت ہے لیکن اس کے حصول کے لئے پریشانی کو طلب کرنا یا اس کی خواہش کرنا خلاف سنت اور ایک قسم کی ناشکری ہے۔ انسان کو چاہیے کہ عافیت ہی طلب کرے۔ عافیت میں بھی جب اللہ تعالیٰ کے انعام کا استحضار کرے تو ان شاء اللہ شکر یا انابت حاصل ہو جائے گی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ایک کام اور کر لیں کہ کچھ دنوں کے لئے پابندی کے ساتھ حضرت مفتی

صاحب مدظلہٗ کی خدمت میں جانے کا کوئی وقت مقرر کر کے ان کے پاس بیٹھا کریں اور اپنی اس حالت کا اور میرے اس مشورہ کا بھی ان سے تذکرہ کر دیں۔ یہ علاج انشاء اللہ تعالیٰ سب علاجوں سے زیادہ مؤثر ہوگا۔

○

۱۵ فروری ۶۰ء برخوردار عزیز محمود زکی سلمہٗ

السلام علیکم و رحمۃ اللہ۔ کئی روز کے بعد خط لکھ رہا ہوں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا نہیں ہو سکتا کہ اس نے ہم جیسے گنہگاروں کو یہ سعادت عطا فرمائی کہ کل تمہارے دونوں بھائی ماشاء اللہ مکمل مولوی بن کر گھر آ گئے۔ کل ہی میں بھی گھر آیا ہوں۔ اس وقت میری خوشی غیر معمولی ہے مگر تمہاری اور رقیہ کی غیر حاضری نے اس کو آدھا کر رکھا ہے۔ میرا تو یہ دل چاہتا تھا کہ اس کا ولیمہ ایسا کروں، جیسا لوگ شادیوں میں کیا کرتے ہیں، مگر تمہارے بغیر اس کی تکمیل ناممکن ہے۔

★

۲۵ [illegible] ھ ۲۳ [illegible] ء برخوردار عزیز محمود زکی سلمہٗ

السلام علیکم و رحمۃ اللہ۔ تمہارا کارڈ، پھر لفافہ، پھر منی آرڈر وصول ہوئے ۔ ۔ ۔ ۔ بھائیوں کی تکمیل علوم پر جس قدر مسرت کا اظہار تمہاری طرف سے ہوا وہ بھی تمہاری ہی خصوصیت ہے اور اسی کی امید تھی۔ اللہ تعالیٰ اس تکمیل کو ان کے لئے اور ہم سب کے لئے صلاح و فلاح دارین کا ذریعہ بنائیں۔ البتہ یکصد روپیہ جو تم نے بھیجے یہ تمہاری موجودہ حیثیت سے زیادہ ہیں۔ خصوصاً جب کہ قرضوں کا بار عظیم ہے۔ دل چاہا کہ اس میں تخفیف کروں لیکن پھر تمہاری دل شکنی کا خوف اور اس نعمت کبریٰ کی حیثیت کے پیش نظر پورا ہی رکھ لیا۔ دونوں بھائی بے حد مسرور ہیں۔ والدہ دعا دیتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اب دوسری نسل میں مشرف حسین وغیرہ کو اور پھر محمود مسعود سلمہا کو یہ دولت نصیب فرما دیں۔

○

۱۷ محرم ۸۰ھ / ۱۲ جولائی ۶۰ء برخوردار عزیز محمود زکی سلمہ اللہ تعالیٰ

السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہٗ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ شرائی آنے کا اثر صحت پر بحمد اللہ اچھا ہی معلوم ہوتا ہے، مگر کام بڑھ گیا۔ ایک تو وہ مستقل کام بڑھا جس کے لئے شہر چھوڑ کر آیا ہوں، تقریباً تین گھنٹے روزانہ

فتوٰی سکھانے پر صرف ہوتے ہیں اور مدرسہ کے انتظامی شعبوں کی دیکھ بھال پر بھی کم از کم گھنٹہ روزانہ صرف ہوتا ہے۔ اس پر مزید یہ ہے کہ تقریباً تین روز ہفتہ میں لازماً شہر کا جانا رہتا ہے۔ اس کے علاوہ بھی کوئی ضرورت پیش آتی ہے تو جانا پڑتا ہے۔

۲۴ ؍ ۵؍ ۱۹۷۰ء　　　　برخوردار عزیز محمد زکی سلمہٗ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ .... گذشتہ ماہ میں آمدنی کی کمی اور تنگی سے دل دکھا۔ برخوردار اس میں اللہ جل شانہٗ کی بڑی حکمت و مصلحت اور ہمارے لئے عافیت ہے کہ فراخی کے ساتھ کبھی کبھی تنگی بھی ہوتی رہے۔ یہ دماغی صحت کا انجکشن ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ جلد وسعت بعافیت عطا فرماویں .... اپنے معمولات کے متعلق جو کچھ لکھا ہے قابل مسرت و شکر ہے۔ سب سے زیادہ اہم چیز نماز کو ادا وقت میں پڑھنا ہے۔ صبح کے لئے کوئی ایسا انتظام کریں کہ اذان کے بعد کوئی جگا دیا کرے اور رات کو سویرے سونے کا اہتمام کریں۔ انشاء اللہ چند روز میں عادت ہو جائے گی۔ ابھی معمولات صرف وہی جاری رکھیں جو جاری ہیں۔ صرف اتنا اضافہ کریں کہ ہر معمول کو دھیان کے ساتھ ادا کریں۔ جاڑے کی راتیں طویل آجائیں گی تو پھر کچھ معمول میں مجھ سے پوچھ کر اضافہ کر لینا۔

۱۰ ؍ صفر ۹۰ھ　　　　برخوردار عزیز محمد زکی سلمہٗ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ .... یہ معلوم کر کے بڑی تشویش ہو گئی کہ معدہ کی نئی بیماری وہاں بھی چل پڑی ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ سب کو اور تمام مسلمانوں کو اپنے حفظ و امان میں رکھیں۔ اس زمانہ میں رات کو سونے سے پہلے سورۃ تغابن پڑھ کر سویا کریں اور بھی سب عزیزوں کو بلکہ عام لوگوں کو بتلا دیجئے۔ وبائی امراض کے لئے مجرب ہے۔

(مندرجہ ذیل خط کی تاریخ درج نہیں ہے لیکن ۲۱ اگست ۷۰ء مطابق ۲۲ صفر ۹۰ھ کے بعد کا تحریر فرمودہ ہے)

برخوردار عزیز محمد زکی و شفقت علی صاحب سلمہم اللہ تعالیٰ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ .... گھر پہنچ کر آمین کیشن کا دوسرا خط ملا جس میں ۷ ستمبر کو پہنچے

کے بجائے وقت ملاقات ۱۱ بجے کردیا تھا۔ فوراً ہی انصاری صاحب سے ملاقات کی۔ محمد رفیع کو شرافی سے بلایا۔ مولانا متین صاحب کو ساتھ لے جانے کے لئے تیار کیا۔ بحمداللہ وقت پر پہنچ گیا۔ مجھ سے پہلے فخرالدین ولی بھائی کراچی کے مشہور تاجر کا بیان ہو رہا تھا۔ مجھے پندرہ منٹ کی تاخیر ہوئی۔ اندر گیا تو کمیشن کے سب حضرات موجود تھے۔ ابتداء میں میرے پاکستان آنے سے متعلق کچھ سوال شروع کیا، جس کا جواب دیا۔ مگر ساتھ ہی دوسروں نے کہا کہ اس سوال کی ضرورت نہیں۔ دستور کے متعلق جو سوال کرتا ہے وہ کر لیجئے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ سوال کئے گئے اول یہ کہ آپ نے سوال نامہ کا کوئی جواب دیا ہے۔ میں نے بتلایا کہ "علماء" کے جواب میں میرا بھی جواب ہے۔ پھر کہا کہ آپ پارلیمانی طرز حکومت پسند کرتے ہیں یا صدارتی۔ میں نے جواب دیا کہ میرے نزدیک طرز حکومت صرف دو نہیں، بلکہ تین ہیں۔ ایک تیسرا طرز اماراتی ہے۔ ہمارے نزدیک اگرچہ اصل مسنون طرز اماراتی ہے مگر صدارتی اور پارلیمانی کو بھی ناجائز نہیں سمجھتے۔ تینوں کو جائز سمجھنے کے باوجود ہم نے اپنے جواب میں پارلیمانی طرز کو اس لئے ترجیح دی کہ انگریز کے دور حکومت سے لے کر اب تک اسی طرز کا تجربہ پوری قوم کو ہوتا رہا۔ اس میں آنکھ کھولی۔ اس کا چلانا ہمارے لئے بہ نسبت دوسرے طرز ہائے حکومت کے آسان بھی ہوگا اور اختلافات بھی کم سے کم ہوں گے۔

★

مندرجہ ذیل خط کی تاریخ درج نہیں

برخوردار عزیز محمد زکی سلمہٗ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ۔ عین انتظار میں مفصل خط ملا۔ خواب کی بشارت سے بے حد مسرت ہوئی۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کے لئے مبارک فرمائیں۔ اپنی حالت کے پیش نظر تعجب و حیرت ہے مگر کرم حق تعالیٰ کے پیش نظر کچھ بعید نہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ خواب کی تعبیر ظاہر ہے۔ حضرت اقدس ہی واسطہ ہیں سرور دو عالم تک پہنچنے کا۔ ان کی خدمت ہی دینی خدمات ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا عطیہ سر پر ہونا بہت ہی بڑی نعمت ہے۔ پرانا ہونا اور پیوند زدہ ہونا اس کی تصدیق ہے کہ وہ حضور ہی کا ہے کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ملبوسات کا عام حال یہی تھا۔

★

یہ خط مشرقی پاکستان کے سفر کے موقع پر لکھا گیا

جمعہ ۹ رشعبان ۱۳۸۰ھ ، ۲۷ر جنوری ۱۹۶۱ء

برخوردار عزیز محمود کی سلمہ اللہ تعالٰی وعافاہ ووفقہ لما یحب ویرضٰی

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ آج صبح ٹھیک سات بجے کراچی سے پرواز کی۔ اس وقت راستہ کا اکثر حصہ طے ہوچکا ہے۔ تیرہ ہزار فٹ کی بلندی سے یہ سطور لکھ رہا ہوں، جہاں پہنچ کر دنیا بہت مختصر نظر آرہی ہے۔ جے پور کا جیسا بڑا شہر آیا تو ایک ہتھیلی کی لکیروں سے زیادہ نہ تھا۔ اجمیر شریف اور دہلی پھر کلکتہ ، بڑے بڑے شہروں کی دس دس منزلہ عمارتیں بچوں کے کھلونے معلوم ہورہے تھے۔

یہ اس سطح زمین سے صرف ڈھائی میل بلند ہوکر دیکھنے کا نتیجہ تھا۔ اس سے ذرا اور بلند ہوجائیں تو دنیا کی ساری بستیاں ریگستان کے ذرات سے زیادہ حیثیت نہ رکھیں

پھر اگر اسراء کے مسافر صلی اللہ علیہ وسلم نے ساری دنیا کو مچھر کے پر سے بھی کم کردیا تو کسی کو تعجب کیوں ہو۔ کنویں کا مینڈک اپنے اسی گڑھے کو سمندر جانتا ہے، کچھ اوپر آئے تو حقیقت کا پتہ چلے۔ بیچارہ مچھر دنیا کے جغرافیہ اور اس کی تاریخ کو کیا سمجھے جس کی ابتداء اور انتہا چند روز کی ہے ۔

پشہ کے داند کہ عالم از کیست
در بہاراں زاد و مرگش در دیست

آج کا سب سے بڑا ہوشیار عقلمند انسان جس کو یہ دعوٰی ہے کہ اس کی عقل نے ہوا اور فضا کو مسخر کرلیا۔ اس کا یہ دعوٰی صحیح ہے یا یہ عمل تسخیر کسی اور مخفی قدرت کا ہے جس کو آنکھیں نہیں دیکھ رہیں اور اس نے اپنے کرم سے اپنی پیدا کی ہوئی قوتوں کو اس کے کام میں لگا کر رکھا ہے جس سے اس کو یہ دھوکہ ہوجاتا ہے کہ یہ عمل تسخیر اس کی اپنی عقل وفہم کا نتیجہ ہے۔ اس بحث کا یہ موقع نہیں ، مگر یہ حیرت ضرور ہے کہ جس کے سامنے اللہ تعالٰی کی مخفی قدرت وطاقت کے ایسے ایسے کھلے مظاہر آتے وہ ہی سب سے زیادہ اس کی طرف سے غافل ہے اور اس مچھر کے پر سے کم حقیقت رکھنی والی دنیا میں الجھا ہوا ہے۔

ہماری جان ومال اور سب کچھ قربان ہوں اس نبی امی صلی اللہ علیہ وسلم پر جس نے اس دنیا کی پوری حقیقت کو نہ صرف خود سمجھا بلکہ بڑے بڑے فلاسفروں سے لے کر عرب کے ان پڑھ بدوؤں تک سب کو سمجھا دیا۔ فصلی اللہ علیہ وعلٰی آلہ واصحابہ اجمعین میں جس وقت ہوائی جہاز پر سوار ہوتے ہوئے حسب عادت حدیث کی بتلائی ہوئی دعاء "سبحان الذی سخرلنا ھذا" پڑھنے لگا تو خیال آیا کہ یہ تو

چوپایوں جانوروں پر سوار ہونے کے وقت کی دعا ہے۔ ریل اور جہاز جو برق و بھاپ کی قوتوں سے چلنے والے ہیں اوس کو اس سے کیا مناسبت۔ مگر ساتھ ہی دل نے کہا کہ ایسا نہیں گھوڑے اور اونٹ کی سواری میں تو انسان کی کوششوں کا کچھ قریبی دخل بھی ہے۔ برق اور بھاپ کو اللہ تعالیٰ کے پیدا کئے ہوئے مواد سے حاصل کرنا پھر اوس پر قابو پانے کا عمل تسخیر اس سے زیادہ حیرت انگیز ہے۔ یہاں تو اس کے سوا چارہ ہی نہیں کہ اوس کو خالص حق تعالیٰ کی قدرت کاملہ اور حکمت بالغہ کا کرشمہ کہا جائے۔ اور تو حقیقت سامنے آکر بار بار یہ کلمات دبے اختیار نکلنے لگے۔ وما کنا له مقرنین۔ یعنی ان چیزوں کی تسخیر ہمارے قبضہ میں نہیں۔

★

۸ رمضان ۱۴۰۰ھ جمعہ   برخوردار عزیز محمد زکی سلمہٗ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ کارڈ پہونچا۔ اس سے پہلے مولانا داؤد غزنوی سے رمضان کے پہلے روزہ کی کشمکش معلوم ہو چکی تھی۔ اس میں شبہ نہیں کہ ریڈیو نشریات اس وقت تک اس قابل نہیں ہیں جن پر فرائض اسلامیہ کا مدار رکھا جا سکے۔ اس لیے میرے نزدیک فتویٰ وہی صحیح تھا جو وہاں مفتی صاحب نے جاری فرمایا۔ ہاں دو چار جگہوں کے ٹیلیفون ثقہ لوگوں کی آواز پہچان کر مل جاتے تو ہلال رمضان میں اس پر عمل ہو سکتا تھا۔ مجھے مولانا داؤد غزنوی نے فون کیا تو میں گھر میں ملا نہیں .... جن علماء نے عوام کو روزہ نہ رکھنے کا فتویٰ دیا۔ اگر انھوں نے خود روزہ رکھ لیا تو اس میں مضائقہ نہیں۔ امام ابو یوسفؒ سے ایسا ہی منقول ہے کہ لوگوں کو روزہ نہ رکھنے کا اعلان کیا اور خود یوم الشک میں روزہ رکھا۔ مگر آج کل عوام احکام و مسائل سے نابلد ہونے کے سبب علماء سے بدگمان ہو جاتے ہیں اس لئے اولیٰ یہی تھا کہ وہ بھی نہ رکھتے۔ بہرحال ایک روزہ کی قضا تمیں کرنا چاہیے۔

★

۲ شوال جمعہ ۱۳۸۰ھ   برخوردار عزیز محمد زکی سلمہٗ اللہ تعالیٰ ورضی عنہ وارضاہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ خط پہنچا۔ حالات معلوم ہو کر اطمینان ہوا۔ فللہ الحمد۔ عید کے موقع پر جو صورت یہاں پیش آئی بالکل غیر متوقع اور خالص اللہ تعالیٰ کا فضل تھا۔ یہاں کے انتظامی اداروں نے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ موسمیات کی پیش گوئی پر پہلے ہی عید منانے کا تہیہ کیا ہوا تھا۔ ۲۹ تاریخ کے

دن ہی میں بہت سی جگہ احکام بھیج دیئے گئے تھے ۔رات کو قدرتی چیز پیش آئی کہ مطلع تقریباً صاف ہونے کے باوجود چاند نظر نہ آیا ، مگر وہ حضرات تہیہ کر چکے تھے ۔ ریڈیو پر چاند کا اعلان کر کے عید کے انتظامات شروع کر دیئے ۔ عام مسلمانوں کا ہجوم علما کی طرف ہوا ۔ انہوں نے اپنی اپنی جگہ شرعی قاعدہ کے موافق یہ بتلایا کہ تراویح پڑھو اور کل روزہ رکھو۔ مگر علما ۔ کی آواز کو بائیس لاکھ شہریوں تک کون پہنچاتے اور کیسے پہنچاتے اس کا کوئی وہم و گمان بھی نہ ہو سکتا تھا ۔ نیز بہت ممکن تھا کہ علما کی مختلف جماعتوں میں رائیں مختلف ہو جاتیں مگر خدا ساز سامان یہ ہوا کہ میں نے اپنی جگہ یہ فتویٰ دیا ۔ مولوی احتشام الحق صاحب نے اپنی جگہ ، مولوی عبدالحامد بدایونی اور ان کی پارٹی نے اپنی جگہ ، اہل حدیث نے اپنی جگہ ، شیعوں نے اپنی جگہ ۔ اس وقت میرا ٹیلیفون غالباً قصداً کر کے کاٹ دیا تھا اور بھی بعض علما ، کا ایسا ہی ہوا کہ باہمی رابطہ قائم نہ ہو سکے ۔

مگر ان سب باتوں کے باوجود علما کی آواز قدرت نے دور دور پہونچا دی اور شہر کی عام مساجد میں تراویح ہونے لگی ۔ اس وقت انتظامی والوں نے پھر سائرن بجا دیا ، جس سے عام لوگوں کو یہ دھوکہ ہوا کہ شاید علما کے پاس کوئی شہادت آگئی ، اس لئے سائرن ہوا ۔ بہت سی مساجد میں سائرن سن کر تراویح چھوڑ دی گئی ۔ مگر لوگ مطمئن نہ تھے ۔ سینکڑوں کے جتھے میرے مکان پر آرہے تھے ۔ . . . . . . معتکف بھی سائرن کی آواز پر اعتکاف چھوڑ کر نکل آئے لیکن جب علما کی طرف سے پھر یہ معلوم ہوا کہ سائرن غلط طور پر بجایا گیا ہے ، علما کا وہی فیصلہ ہے تو لوگ بڑے بے چین تھے ۔ ہمارے سامنے اس وقت یہ مشکل تھی کہ سائرن کے مغالطہ کا علاج ہمارے بس میں نہیں ۔ لاؤڈ اسپیکر پر اعلان بھی نہیں کیا جا سکتا اور کوئی ذریعہ نہیں ۔ اس بے بسی کے عالم میں ہم نے ہر آنے والے کو یہ کہنا شروع کیا کہ کل کا روزہ فرض ہے ۔ مگر اس حکم کا لوگوں تک پہونچانا ہمارے بس میں نہیں ۔ آپ لوگ اپنی اپنی طاقت کے مطابق شہر بھر میں اس خبر کو پھیلا دیجئے ۔ میرا فون خراب تھا ۔ دارالعلوم کے دو فون پر آدمی بٹھا دیئے تھے ، جنہوں نے ہزاروں آدمیوں کو یہ خبر پہونچائی ۔ مگر پھر بھی بائیس لاکھ کو پہونچانے کا کوئی راستہ نہ تھا ۔ اس لئے میں مجبور ہو کر نکلا کہ شاید جیکب لائن میں مجمع ہو تو خبر پھیلانے کی تاکید کی جائے ۔ آٹھ نو سال بعد وفعتاً وہاں پہونچ گیا ۔ وہاں تقریباً پانچ چھ ہزار کا مجمع مسجد میں لگا ہوا فیصلہ کا منتظر تھا ۔ میرے پہونچتے ہی سب کو جمع کر کے فیصلہ سنا دیا اور بتلا دیا کہ ہماری قدرت

یہیں تک تھی کہ آپ کو بتلا دیں۔ اب پورے شہر میں اس کا پہونچانا آپ کی ذمہ داری ہے۔

اس وقت بھی مجھے کوئی امید نہ تھی کہ اس کا اثر اتنا ہوگا۔ مگر اس وقت واقعی مسلمانوں کا جذبہ دیدنی دیکھنے کے قابل تھا۔ ہمارے اس فیصلہ کا بڑے جوش سے خیر مقدم کیا اور سب نکل کھڑے ہوتے اپنی اپنی گاڑیوں میں چارطرف گشت کرنے لگے۔ کچھ پیدل، کچھ سائیکلوں پر، کچھ لوگوں نے بسوں پر چڑھ کر چکر لگایا۔ کچھ ٹولیاں سحری کے وقت جگانے پھریں یہاں تک کہ بحمداللہ شہر کا کوئی گوشہ باقی نہ رہا، جہاں کے مسلمانوں کو مسئلہ معلوم نہ ہوگیا اور سبھی نے اس میں کھلے دل سے علماء کا فیصلہ مانا۔

★

۱۰ر شوال ۸۰ھ　　　　برخوردار عزیز محمد زکی سلمہٗ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ . . . . رمضان المبارک کے ختم پر خیال تھا کہ اب ذرا آرام کریں گے مگر جوالِ عید اپنے ساتھ ایسا ہنگامہ لایا کہ آج ایک ہفتہ ہوگیا، اس کی بحث و فکر سے نجات نہیں ملی۔ ادھر دارالعلوم کا سال شروع ہے۔ اس کے اہم کاموں میں ایک اہم کام تمہارے دونوں بھائیوں کے معاملہ کا فیصلہ تھا جس کے لئے رمضان بھر دعا بھی کرتا رہا اور غور بھی۔ منکر یہ تھی کہ اب ان کو کام میں لگانا ہے۔ اپنے دارالعلوم میں لگانے کی صورت میں موضع تہمت ہے . . . .
. . اور دوسری جگہ کراچی سے باہر بھیجنے میں میری نگرانی اور معیت فوت ہوتی ہے۔ شہر میں کہیں یہیں اس کی کوئی صورت نہیں ہے۔ بہت غور و بحث اور مشوروں کے بعد بنام خدا تعالیٰ یہ فیصلہ کیا کہ اس سال میں محمد تقی سلمہٗ کو تین سبق پڑھانے کے لئے دیئے جائیں اور باقی تین گھنٹے انگریزی زبان میٹرک تک سیکھنے کے لئے رکھیں جائیں اور کوئی تقرر ملازمت یا مدرسی پر نہ ہو۔ تعلیمی وظیفہ جیسے پہلے سے تھا اب بھی رہے۔ محمد رفیع کے متعلق کام تو پورے درس کا لگایا گیا مگر بحیثیت ملازمت کے لگانے پر دل کا انشراح نہ ہوا۔ اس لئے بنام خدا تعالیٰ سردست ان کو بھی بلا تنخواہ رکھا ہے اور تعلیمی وظیفہ ہی کی کوئی صورت رہے گی . . . . اس مشورہ اور غور میں تم بار بار یاد آتے رہے کیونکہ میرا قلب و دماغ اس کی فکر میں پریشان رہا۔ خیر دعا کرو کہ اللہ تعالیٰ موجودہ صورت کو مبارک بنادیں اور محمد رفیع کے لئے کوئی اچھی معاشی صورت پیدا فرمادیں۔

تاریخ درج نہیں   برخوردار عزیز محمد زکی سلمہٗ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ۔ رسید کا خط مل گیا۔ بعافیت وراحت پہونچنے پر اللہ تعالے کا شکر ادا کیا۔ تمہارے چند روزہ قیام کے دن پورے گھر کے لئے موسم بہار تھا اور گھر والوں کی بہار کے لئے تو کچھ اور بھی صورتیں ہوا کرتی ہیں۔ میرے لئے تو صرف یہی بہار ہوتی ہے کہ تم سامنے ہو۔ اللہ تعالے اپنی رحمت سے بعافیت سلامت رکھیں اور جلد بعافیت ملائیں۔

★

۹ ربیع الاول ۱۳۸۱ھ، یکم ستمبر ۶۱ء

برخوردار مولوی عزیز محمد زکی سلمہٗ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ۔ تین ماہ کی شدید تکلیفوں کے بعد والدہ محترمہ نے بالآخر ۲ ربیع الاول ۱۳۸۱ھ، ۱۶ اگست ۶۱ء شب چار شنبہ میں ۴ بجے عمر کی آخری منزل طے کر لی۔ والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ کی وفات سے پچیس سال ۴ دن بعد آج سرسٹھ سال کی عمر میں آغوش مادر سے جدائی ہوئی۔ میں نے اگرچہ ان کی علالت کے سبب دو ماہ سے کہیں آنا جانا تقریباً بند کیا ہوا تھا۔ مگر گھر پر آنے والوں کے سلسلہ اور فتوؤں کی خدمات نے پھر بھی مجھے ان کی خدمت میں حاضری کا اتنا موقع نہ دیا جس کی وہ خواہش مند تھیں اور اس کا غیر معمولی قلق وافسوس اپنے دل میں محسوس کرتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ میری تقصیرات معاف فرمائیں۔ اللہ تعالیٰ نے مجھ پر بڑا انعام فرمایا کہ طویل زمانہ اون کی زیارت وخدمت سے شرف ہونے کا ملا۔ مگر جیسی خدمت کرنا چاہیے تھی اس میں قصور کی حسرت رہ گئی . . . . میرا حال اس وقت کچھ ایسا ہے کہ تین روز سے گھر میں تعزیت کے لئے آنے والے مردوزن کا ہجوم ہے ؎

ایک ہنگامہ پہ موقوف ہے گھر کی رونق

کا منظر بنا ہوا ہے مگر میں اپنے آپ کو تنہا محسوس کرتا ہوں۔ ہر وقت دل چاہتا ہے کہ ان کی قبر پر حاضر رہوں۔ کل صبح گیا تھا آج جانا نہ ہو سکے گا۔ بہرحال اب تو تقصیرات کا کفارہ بھی دعائے مغفرت وایصال ثواب ہے۔ آپ بھی خصوصی طور سے الحاح وزاری کے ساتھ مغفرت کی دعا کرو۔ جو ایصال ثواب ممکن ہو وہ بھی کرو۔

★

(مندرجہ ذیل خط عمرہ کے سفر کے موقع پر تحریر کیا گیا)

یوم الجمعہ ۴ محرم ۸۲ھ ۸ جون ۶۲ء

برخورداران عزیز محمد زکی و شفقت و رقیہ سلمہم اللہ تعالیٰ

السلام علیکم و رحمۃ اللہ۔ اس وقت ہمارا جہاز اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے ساحل جدہ کے قریب پہنچا ہوا ہے۔ .... اللہ تعالیٰ کے شکر و انعام کا کون احاطہ کر سکتا ہے اور کوئی کیا شکر کر سکتا ہے کہ اس نے دریا کی پیٹھ پر وہ آرام و راحت کے سامان عطا فرماتے جو لاکھوں انسانوں کو اپنے گھروں میں نصیب نہیں۔ ہر چیز بے فکری سے رغبت کے مطابق میسر ہے اور سب سے بڑی بات یہ کہ بحمداللہ تندرستی قائم ہے۔

سہ شنبہ ۲۲ محرم ۸۲ھ ۲۶ جون ۶۲ء۔ ۹ از مکہ مکرمہ

برخوردار عزیز محمد زکی و شفقت و رقیہ سلمہم اللہ تعالیٰ

السلام علیکم و رحمۃ اللہ۔ آپ کے خطوط بحمداللہ سبھی مل گئے .... اللہ تعالیٰ کے کس کس انعام کا شکر ادا کیا جائے کہ اوس نے ہم جیسے گندے بندوں کو اپنے حرمین میں جگہ عطا فرمائی پھر جگہ بھی نہیں۔ اوس میں عیش و راحت کا سب سامان بھی۔ گرمی کی شدت کو اس کی قدرت نے معتدل بنا دیا۔ دس روز مدینہ طیبہ کا قیام بعافیت و راحت نصیب ہوئے .... مدینہ طیبہ کا موسم ماشاءاللہ ایسا معتدل پایا کہ ذرا تکلیف نہیں۔ پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مہمانی نے یہ صورت پیدا فرما دی کہ مسلسل بریونڈ دعوتیں ہوتی رہیں۔ .... خلاصہ یہ کہ آپ سب لوگوں کی دعاؤں سے خدا تعالیٰ نے اس پورے سفر کو نہایت راحت و آرام کے ساتھ طے فرمایا۔ بس اب تو ارض مقدس میں گنے چنے گھنٹے باقی ہیں۔ اللہ تعالیٰ پھر مشرف فرمائیں۔

★

۲۵ ۸۳ھ / ۱۲ ۲ ۶۲ء (مولانا محمد رفیع عثمانی مدظلہم کے ہاں بچی تولد ہونے پر لکھا گیا)

.... اس بچی کے لئے اور رقیہ کے بچے کے لئے تعویذ بھی آج بھیج دیئے ہیں۔ جو بچی رقیہ سلمہا کی گذر گئی اس کا نام توحیدہ بھی رہے تو اچھا ہے کہ اس کے ذریعے تمہاری بہن ام حبیبہ

ہو جاتے گی۔ البتہ لڑکے کا نام عارف بھی مجھے پسند آیا۔ نومولود پوتی کا نام یہاں سب نے عائشہ یا میمونہ پسند کیا ہے۔ اب دیکھیں تم کیا کہتے ہو۔ مٹھائی کوئی ایسی سستی نہیں کہ یوں ہی مل جائے۔ کوئی اچھا سا تاریخی نام نکالو، پھر من بھر کے مٹھائی کھاؤ۔

★

(تاریخ درج نہیں، اندازاً ۳۰ رمضان المبارک ۸۲ھ کا تحریر فرمودہ ہے)

برخوردار عزیز محمد ذکی سلمہٗ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ۔ بحمد اللہ حق تعالیٰ نے عید کو اضطراب واختلاف سے بچالیا۔ گورنر صاحب کی طرف سے تو کوئی جواب نہ آیا۔ کراچی کے ڈپٹی کمشنر سے ملاقات کر کے اتنا انتظام کیا تھا کہ اگر ریڈیو پر غیر محتاط اعلان ہوگا تو ہم اس کا اعتبار نہ کریں گے اور نہ لوگوں کو کرنے دیں گے۔ حسب استطاعت اعلان کریں گے۔

تمہاری تقریر ۱۲ مارچ والی بڑی کوشش سے سنی۔ آواز صاف نہ تھی، مگر کچھ کچھ سمجھ میں آ ہی گیا۔ شب قدر کو غیر متعین رکھنے کی جو توجیہات آپ نے بیان فرمائیں، خوب تھیں۔ مگر سیدھی بات یہی ہے کہ ایسی عظیم الشان رات کی نعمت کسی قدر امتحان ہی کے ساتھ ہونی چاہیے تھی، تاکہ لوگ بے قدری نہ کریں، اس لئے متعین کرنے کے بعد پانچ راتوں میں دائر کر دیا۔

میری مرسلہ عیدی میں سے تم نے اور بہوتے جو دو دو روپیہ رکھ لئے یہ تمہارے امتحان میں کامیابی کی دلیل ہے۔ میں نے منی آرڈر میں قصداً یہ لفظ لکھا ہے کہ بچوں کی عیدی ہے۔ تمہارا یہ امتحان کرنا تھا کہ اس کے معنی تم کیا سمجھتے ہو۔ اپنے بچے یا میرے بچے، بہرحال خوش فہمی مبارک ہو۔ یہ خط عید کی رات میں لکھا ہے۔ اللہ تعالیٰ تم سب کو عید مبارک فرمائیں اور دین ودنیا کی صلاح وفلاح اور فوز وکامیابی عطا فرمادیں۔

★

کراچی ۵ شوال ۸۲ھ — برخوردار عزیز سلمہ اللہ تعالیٰ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ لفافہ موصول ہوا۔ خیریت معلوم ہو کر اطمینان ہوا...... عید کارڈ کو میں ایک فضول حرکت اور مسلمانوں کے لاکھوں روپیہ کی اضاعت سمجھتا ہوں اور یہ خرابی مزید برآں

کر فیروں کی نقالی ہے۔ اس پر اللہ کا شکر ادا کرو کہ تمہاری طبیعت ہی ایسی بنا دی کہ اس طرف دل رجوع نہیں ہوا۔ آخر مجھے بھی کبھی دیکھا ہے کہ اس کا اہتمام کیا ہو۔

★

۲ر شعبان ۔ جمعرات ۸۳ھ — برخوردار عزیز محمد زکی سلمہٗ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ .... کل شہر گیا تو تمہاری شاعر پارٹی کے کچھ نوجوان وہاں ملے۔ اتنا تو اندازہ ہوا کہ جانتے پہچانتے ہیں۔ مگر نام کسی کا یاد نہیں۔ ان میں سے ایک صاحب نے کہا کہ ۱۱ر دسمبر کو کراچی میں مشاعرہ ہو رہا ہے۔ اس کی دعوت زکی میاں کو بھیجی گئی ہے، وہ ضرور آدیں گے اور اس میں نہ آویں تو جمعہ کے روز میرے یہاں شادی ہے اس میں تو ضرور آدیں گے ...... یہ معلوم ہے کہ اس قوم کا وصف قرآن حکیم میں یقولون ما لا یفعلون مذکور ہے۔ مگر اس خبر سے خواہ مخواہ دل تو خوش ہو ہی گیا۔ شاید اللہ تعالیٰ حقیقت بھی کر دیں۔ والسلام

★

(مندرجہ ذیل خط حج کے سفر کے موقع کا تحریر فرمودہ ہے۔)

از فضائے آسمانی ۲۹ ہزار فٹ طیارہ پی۔ آئی۔ اے

۲۔ ذوالحجہ ۸۳ھ۔ بارہ بجے چہارشنبہ۔ برخورداران عزیز محمد رضی، محمد ولی، محمد رفیع، محمد تقی سلمہم اللہ تعالیٰ۔

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ۔ حق تعالیٰ جل شانہٗ کی رحمت و قدرت کے مناظر ہی سامنے ہیں۔ ایک ناکارہ گناہگار بندہ رب العزت کے دربار کی حاضری کی آٹھویں مرتبہ جرأت کر رہا ہے۔ عمر کی سترویں منزل ۲۹۰۰۰ ہزار فٹ کی بلندی۔ راحت و آرام کی حد نہیں۔ جہاز کے پائلٹ اور سب کارکن معلوم ہوتا ہے کہ پرانے دوست عزیز ہیں۔ رفقائے سفر میں بہت سے تو حقیقتہً پرانے دوست جمع ہیں اور جو نئے بھی ہیں لباس کی وحدت بلکہ کی وحدت تلبیہ کی وحدت نے سب کو حقیقی بھائی بنا رکھا ہے۔ تلبیہ کی آوازیں ذرا کم تھیں۔ ایک مولوی صاحب کو کہا کہ جاؤ پورے جہاز میں لبیک پکارو۔ وہ پھر گئے تو جہاز تلبیہ سے گونجنے لگا۔ پھر عملۂ جہاز کی خواہش ہوئی کہ میں کچھ احکام حج یہاں کے لاؤڈ سپیکر پر بیان کر دوں۔ اللہ تعالیٰ نے یہ موقع بھی عطا فرمایا۔ لاؤڈ سپیکر پر مختصر احکام حج بیان کر دیئے۔ ہفتہ واری درس قرآن سے لوگ آواز سے آشنا پہلے سے تھے۔ اب تو اور بھی ہجوم ہو گیا۔ بارہ بجے کھانا آگیا اس سے فارغ ہو کر بعض دوستوں سے کچھ علمی مذاکرہ ہو رہا ہے ..... یہ خط سب عزیزوں کو سنا کر محمد زکی کو لاہور بھیج دیں۔ والسلام

غیر مطبوعہ افادات

"عیش پرستی اور اس کے لیے طرح طرح کی ایجادات کو سرمایہ فضل و کمال سمجھنا اس شخص کا کام ہے جو حقیقی فضل و کمال سے محروم ہو کیونکہ انسان کی سعادت و فضیلت صرف اس میں ہے کہ اپنے مالک کے حق کو پہچانے۔ اس کی یاد اور اطاعت و عبادت میں اپنے اوقات مشغول رکھے، دنیاوی سامان صرف اس قدر جمع کرے جس کے بغیر کام نہیں چلتا۔"

(حضرت مفتی اعظمؒ۔ آلات جدیدہ ص ۱۷)

منجانب

جے بی سعید الکوپ والے

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ
مفتیٔ اعظم پاکستان

حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ

——— ایک غیر مطبوعہ انٹرویو

ریڈیو پاکستان کو انٹرویو دیا گیا
بابت حالات سیّدی حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ
یکم صفر ۱۳۹۶ھ ۲ فروری ۱۹۷۶ء

سوال: آپ نے حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحبؒ کی زیارت کی ہے ہم چاہتے ہیں کہ آپ سے اُن کے کچھ چشم دید حالات سُنیں۔ یہ فرمایئے کہ آپ کی ابتدائی زیارت وملاقات کب اور کس طرح ہُوئی؟

مَیں اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت اور اپنی خوش نصیبی سمجھتا ہوں کہ اُس نے مجھے یہ دولت عطا فرمائی کہ بچپن ہی سے حضرت شیخ الہندؒ کی عظمت و محبت دل میں پیوست کر دی تھی پھر چوبیس سال کی عُمر تک مختلف حالات میں حضرت کی خدمت و صحبت میسّر رہی ؎

نازم بچشم خود کہ جمال تو دیدہ است
افتم بپائے خود کہ بکویت رسیدہ است

سب سے پہلے ہی بچپن کے غیر شعوری دَور میں ہم دیوبند کے ایک مکان کے متعلق سُنا کرتے تھے کہ یہ بڑے مولوی صاحب کا مکان ہے پھر حضرت والد ماجد کے ساتھ اس مکان میں حاضری نصیب ہُوئی اور بڑے بڑے عُلماء صُلحا کا مجمع دیکھا جو حضرت شیخ الہندؒ کے گرد معتقدانہ انداز میں جمع ہے اس وقت معلوم ہُوا کہ وہ بڑے مولوی صاحب یہی ہیں۔

پھر میری عمر کے سولہویں سال یعنی ۱۳۳۱ھ میں جبکہ میں نے درس نظامی کی باقاعدہ تعلیم دارالعلوم میں شروع کی۔ کافیہ، قدوری وغیرہ پڑھتا تھا۔ اس وقت حضرت شیخ الہندؒ دارالعلوم کے صدر مدرس ہونے کے ساتھ تعلیمات کے ناظم بھی تھے میرے اسباق کی تجویز و ترتیب حضرت ہی کے ایماء سے ہوئی۔

میں اپنے درجۂ تعلیم کے اعتبار سے اس قابل نہ تھا کہ حضرت کے علمی فیوض سے استفادہ کر سکوں مگر عظمت و عقیدت کی بنا پر درس بخاری شریف کے شروع اور ختم پر دارالعلوم کے تمام ہی اساتذہ اور طلباء اس درس میں تبرکاً حاضر ہوتے تھے۔ مجھے بھی کئی سال یہ سعادت نصیب ہوئی، بچپن کا حافظہ تھا آج تک بھی حضرت کے بعض ارشادات یاد ہیں۔

حضرتؒ کی عادت رمضان المبارک میں یہ تھی کہ تمام شب تراویح میں قرآن سنتے تھے۔ حافظ کفایت اللہ صاحب میرٹھی جو بڑے جید حافظ قاری اور عالم تھے ان کو تمام رات قرآن سنانے کے لیے رمضان میں بلا لیا جاتا تھا۔

اس تمام شب کی تراویح میں اللہ تعالیٰ نے دو سال مجھے بھی حاضری نصیب فرمائی۔ حضرت کے مقام بلند کو میں طفل مکتب کیا پہچانتا مگر یہ مجھے بھی محسوس ہوتا تھا کہ حضرت کی نماز عام لوگوں کی طرح نہیں، وہ جب نماز میں کھڑے ہوتے ہیں تو ایک خشک لکڑی کی طرح بے حس و حرکت نظر آتے ہیں۔ جفاکشی کا یہ عالم تھا کہ ہم بچے اور جوان تھک کر پاؤں بدلنے لگتے تھے مگر حضرتؒ کو ذرا حرکت نہ ہوتی تھی۔

پابندی کا یہ عالم کہ حافظ کفایت اللہ موصوف نے مجھے بتلایا کہ ایک روز شام ہی سے حضرت کے سینہ میں درد تھا۔ میں عشاء کے بعد یہ سمجھ کر بے فکر تھا کہ آج تراویح میں قرآن سنانا نہیں ہوگا۔ لیکن جب تراویح کا وقت آیا تو حضرتؒ نے سینہ پر ایک صافہ لپیٹا اور وضو کر کے تراویح کے لیے تیار ہو گئے اور مجھے حسب دستور قرآن سنانے کا ارشاد فرمایا اور پھر پوری رات کھڑے ہو کر قرآن کریم سننے کا وظیفہ پورا فرمایا۔

میرے والد ماجد حضرت شیخ الہندؒ کے شاگرد تھے وہ فرماتے تھے کہ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کی وفات کے بعد ایک سال تو حضرت شیخ الہندؒ پر اس طرح کا صدمہ طاری رہا کہ پڑھنا پڑھانا

چھوڑ کر خلوت میں رہتے تھے۔ پھر حضرت مولانا رفیع الدین صاحب مہتمم دار العلوم کے بار بار فرمانے پر سلسلہ درس و تدریس کا شروع کیا اسی زمانہ میں حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی قدس سرہٗ کی خدمت میں حاضری ہوئی اور ذکر و شغل اور تصوف و سلوک کے مقامات طے کرنے کا جذبہ قوی ہوا۔ دار العلوم کے اسباق میں کمی کوتاہی حضرت گنگوہیؒ کو گوارا نہ تھی اور حضرت شیخ الہندؒ کا دلی جذبہ یہ تھا کہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر گنگوہ ہی پڑے رہیں، مگر شیخ کی تعلیم کے مطابق عمل اس طرح کیا کہ ہر ہفتہ جمعرات کے روز دار العلوم کے اسباق ختم کر کے پاپیادہ گنگوہ کے لیے روانہ ہوتے، تقریباً پچیس میل کی دشوار گذار مسافت پیدل طے کر کے رات کو کسی وقت گنگوہ پہنچتے، جمعہ کی رات پھر جمعہ کا دن حضرت گنگوہیؒ کی خدمت میں گذارتے اور جمعہ کے روز عصر کی نماز پڑھ کر واپس دیوبند کے لیے چلتے، رات کے کسی حصے میں دیوبند پہنچتے اور ہفتہ کی صبح کو حسب معمول اسباق پڑھاتے تھے۔

عادات و اخلاق اور طرز زندگی

اکابر دار العلوم دیوبند کی بہت بڑی اور اہم خصوصیت یہ تھی کہ یہ حضرات علم و فضل میں یگانۂ روزگار اور عبادت و ریاضت اور روحانی کمالات میں بے مثال ہونے کے باوجود تواضع اور بے نفسی میں اپنی مثال آپ ہی تھے اور اس خاص وصف میں بانیٔ دار العلوم حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ اور ان کے شاگرد رشید حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحبؒ دوسرے سب حضرات سے زیادہ ممتاز تھے ان کے کمالات کو تو اکابر علماء اور باکمال ہی کچھ جان سکتے تھے۔ احقر نے اپنے بچپن سے ۲۴ سال کی عمر تک جو کچھ بچشم خود دیکھا یا اپنے قریبی بزرگوں سے سنا میری گفتگو صرف اسی دائرہ میں ہے۔

میری عمر پندرہ سولہ سال کی ہوگی، کہ دار العلوم کی قدیم عمارت نودرہ کے عقب میں ایک عظیم الشان دار الحدیث تعمیر کرنے کی تجویز ہوئی اس کے لیے بڑی گہری بنیادیں نودرہ کی عمارت سے متصل کھودی گئیں، اتفاق وقت سے دیوبند میں بڑی تیز بارش ہوئی اور کافی دیر تک رہی یہ زمین کچھ نشیب میں بھی بارش کے پانی سے ساری بنیادیں لبریز ہو گئیں۔ دار العلوم کی قدیم عمارت کو خطرہ لاحق ہو گیا، فائر بریگیڈ انجنوں کا زمانہ نہیں تھا اور ہوتا بھی تو ایک قصبہ میں کہاں۔ حضرت شیخ الہندؒ کو اس صورت حال کی اطلاع ملی تو اپنے گھر میں جتنی بالٹیاں اور ایسے برتن تھے جن سے پانی نکالا جا سکے سب جمع کر کے حضرت کے مکان پر جو طالب علم اور دوسرے مریدین جمع رہتے تھے ان کو ساتھ لے کر ان پانی سے بھری ہوئی گہری بنیادوں

پر پہنچے اور بدست خود بالٹی سے پانی نکال کر باہر پھینکنا شروع کیا۔ شیخ الہندؒ کے اس معاملہ کی خبر پورے دارالعلوم میں بجلی کی طرح پھیل گئی پھر کیا پوچھنا ہر مدرس اور ہر طالب علم اور ہر آنے جانے والا اپنے اپنے برتن لے کر اس جگہ پہنچ گئے اور بنیادوں کا پانی نکالنا شروع کیا۔ احقر بھی اپنی قوت وحیثیت کے مطابق اس میں شریک تھا ئیں نے دیکھا کہ چند گھنٹوں میں یہ سارا پانی بنیادوں سے نکل کر کیچڑ رہ گیا تو اس کو بھی بالٹیوں سے صاف کیا گیا۔ اس کے بعد ایک قریبی تالاب پر تشریف لے گئے اور طلبا سے کہا کہ اس میں غسل کریں گے۔ حضرتؒ اول عمر سے سپاہیانہ زندگی رکھتے تھے، پانی میں تیراکی کی بڑی مشق تھی، حضرت کے ساتھ دوسرے طلبا بھی جو تیرنا جانتے تھے وہ درمیان میں پہنچ گئے، مجھ جیسے آدمی جو تیرنے والے نہ تھے کنارے پر کھڑے ہو کر نہانے لگے۔ یہ واقعہ تو احقر نے خود دیکھا اور سیر وشکار میں طلبا کے ساتھ بے تکلف دوڑنا بھاگنا، تالابوں میں تیرنا یہ عام معمولِ زندگی تھا جس کے بہت سے واقعات دوستوں اور بزرگوں سے سُنے ہیں۔ دیکھنے والے یہ نہ پہچان سکتے تھے کہ ان میں کون استاد ہے کون شاگرد۔

مولانا قاری محمد طیب صاحب موجودہ مہتمم دارالعلوم دامت برکاتہم کے خسر مولانا محمود صاحب رامپوری کے رئیس گھرانے کے فرد تھے، یہ خاندان حضرت گنگوہیؒ اور بزرگان دیوبند سے وابستہ تھا جب مولانا محمود صاحب کو تحصیل علم کے لیے دیوبند بھیجا گیا تو ان کا قیام حضرت مفتی اعظم مولانا عزیز الرحمن صاحبؒ کی مسجد کے ایک حجرہ میں ہوا۔ دارالعلوم سے حضرت شیخ الہندؒ کے مکان کو جانے والے راستہ پر دارالعلوم کے قریب ہی یہ مسجد واقع تھی، حسب عادت حضرت شیخ الہندؒ دارالعلوم سے سبق پڑھا کر اپنے مکان کو تشریف لے جا رہے تھے کہ اس مسجد کے دروازہ پر مولانا محمود صاحب رامپوری کو کھڑا دیکھا، حال پوچھا تو معلوم ہوا کہ اسی مسجد کے ایک حجرہ میں قیام ہے، حجرہ کے اندر جا کر دیکھا تو زمین پر بستر بچھا ہوا تھا خیال آیا کہ یہ رئیس زادہ ہیں فرش پر سونے کی عادت نہ ہوگی۔ ان سے کچھ نہیں کہا اور اپنے گھر سے ایک چارپائی خود اُٹھا راستے کی گلی کوچے اور بازار طے کرتے ہوئے اس مسجد کے قریب پہنچے تو دیکھا، مولانا محمود صاحب مذکور دروازہ سے نکل رہے ہیں۔ اب یہ خیال دامنگیر ہوا کہ مجھے بوجھ لاتے ہوئے دیکھ کر ان کو سخت شرمندگی ہوگی تو اپنے بزرگانہ فعل کو یہ کہہ کر ٹالا کر لو میاں محمود صاحب اپنی چارپائی اٹھاؤ میں بھی شیخ زادہ ہوں کسی کا نوکر نہیں یہ کہتے ہوئے واپس تشریف لے آئے۔

میرے ایک دوست مولانا مغیث الدین صاحب ضلع بجنور کے باشندے جو دارالعلوم میں اکثر اسباق میں میرے ہم سبق رہے تھے مگر درمیان میں کچھ عرصہ کے لیے دارالعلوم کو چھوڑ کر مدرسہ معینیہ

اجمیر شریف میں مولانا معین الدین صاحب اجمیریؒ سے معقولات منطق فلسفہ پڑھنے کے لئے گئے تھے کیونکہ معقولات کے درس میں اس مدرسہ کی اور مولانا معین الدین صاحب کی بڑی شہرت تھی۔ ان کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ مولانا معین الدین صاحب کا ارادہ یہ ہوا کہ ذرا علماءِ دیوبند سے ملاقات کر کے دیکھیں کہ وہ کس پائے کے عالم ہیں اور کس انداز کے لوگ ہیں۔ دارالعلوم کے صدر مدرس حضرت شیخ الہندؒ تھے ان کا نام نامی سنے ہوئے تھے۔ ان کی ملاقات کے لئے دیوبند کا سفر کیا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ جس میں اکابر کے ناموں کے ساتھ لمبے چوڑے القاب نہ تھے۔ حضرت شیخ الہندؒ پورے دیوبند میں صرف بڑے مولوی صاحب کے لقب سے معروف تھے۔ مولانا معین الدین صاحب نے اسٹیشن پر اتر کر ایک تانگہ والے سے پوچھا کہ تم مولانا محمود الحسن کا مکان جانتے ہو۔ تانگہ والے نے جواب دیا کہ دیوبند میں ایک بڑے مولوی صاحب ہیں ان کا مکان جانتا ہوں، مگر ان کا نام مجھے معلوم نہیں مولانا نے فرمایا کہ بس وہیں لے چلو۔ تانگہ والے نے ان کو بڑے مولانا صاحب کے مکان پر پہنچا کر چھوڑ دیا۔ یہ اندر داخل ہوئے دیکھا کہ ایک صاحب پستہ قد تہمد باندھے ہوئے صرف بنیان پہنے ہوئے، چھوٹی سی دو پلی ٹوپی سر پر پہنے ہوئے مکان کے صحن میں کھڑے ہیں۔ مولانا نے سمجھا کہ یہ کوئی مولانا محمود الحسن صاحب کے خادم ہیں۔ اپنا سامان ان کے حوالے کیا اور کہا کہ سامان رکھواؤ اور مولانا کو اطلاع دے دو کہ مولانا معین الدین صاحب اجمیری ملاقات کے لئے آئے ہیں۔ حضرت مولاناؒ کو ان کی ناواقفیت سے خدمت کا خوب موقع ہاتھ آیا۔ سامان اٹھا کر مکان کے اندر رکھا اور پنکھے کے نیچے جو چھپرے آرام کرنے کی چار پائی تھی اس پر مولانا کو بٹھلایا بجلی کا زمانہ نہیں تھا، فرشی پنکھا تھا، جو ہاتھ سے کھینچا جاتا تھا۔ گرمی کی دوپہر تھی حضرتؒ نے پنکھا کھینچنا شروع کیا۔ مولانا معین الدین نے فرمایا کہ میاں مولانا کو اطلاع کردو میں ان کی ملاقات کے لیے آیا ہوں۔ حضرت نے فرمایا کہ ابھی اطلاع ہو جائے گی۔ آپ گرمی میں آئے ہیں، ذرا آرام کر لیں۔ پھر گھر میں تشریف لے گئے وہاں سے ٹھنڈا شربت لے کر آئے۔ مولانا نے پھر فرمایا کہ مولانا سے ملاقات کب ہوگی۔ حضرتؒ نے فرمایا وہ بھی ہو جائے گی، آپ شربت نوش فرمائیں۔ پھر کچھ دیر گزر جانے کے بعد گھر تشریف لے گئے اور کھانا لا کر رکھا اب تو مولانا معین الدین صاحب نے ذرا غصہ کے لہجے میں فرمایا کہ آپ کھانا بھی لے آئے

لیکن مولانا سے ملاقات نہیں ہوئی۔ میری واپسی کا وقت قریب آرہا ہے، اس وقت حضرت مولانا شیخ الہند قدس اللہ سرہ العزیز نے فرمایا کہ مولانا تو یہاں کوئی نہیں رہتے اور بندۂ محمود تو میرا ہی نام ہے، یہ سن کر مولانا معین الدین صاحب حیران رہ گئے کہ اب کیا کریں اور بڑی شرمندگی کے ساتھ کہنے لگے کہ آپ نے پہلے کیوں نہ ظاہر فرما دیا۔ حضرتؒ نے فرمایا کہ آپ دربار اجمیر سے تشریف لائے ہیں۔ اگر میں ظاہر کر دیتا تو مجھے یہ خدمت کی سعادت کیسے ملتی۔

مولانا معین الدین صاحب حیرت میں رہ گئے اس معاملہ کا جو اثر ہونا چاہیے تھا وہی ہوا اور واپسی کا ارادہ ملتوی کر کے کئی روز قیام فرمایا اور عمر بھر اس مجلس سے متاثر رہے۔

یہ واقعہ مجھے میرے ہم سبق مولانا مغیث الدین صاحب نے دار العلوم کی طالب علمی کے زمانے میں سنایا تھا۔ اس کے بعد زمانہ دراز گذر گیا۔ مولانا موصوف مختلف مقامات میں درس تدریس کی خدمت کرنے کے بعد مدینہ طیبہ ہجرت کر گئے۔ احقر دار العلوم میں خدمت درس تدریس میں مشغول رہا۔ عرصہ دراز کے بعد جب ایک مرتبہ مدینہ طیبہ کی حاضری نصیب ہوئی، تو مولانا مغیث الدین صاحب سے وہاں ملاقات نصیب ہوئی۔ احقر نے پھر تصدیق و توثیق کے لئے ان سے یہ واقعہ سنا کہ کہیں میرا حافظہ خطا نہ کرے، انھوں نے حرم نبوی میں یہ واقعہ سنایا۔

اس طرح کے واقعات حضرت شیخ الہندؒ کی زندگی میں بے شمار ہیں

سوال: آزادی ہندوستان کے لئے جہاد اور تحریک ریشمی رومال کے متعلق آپ کی معلومات کیا ہیں؟

جواب: جہاد اسلام کے شعائر میں سے ایک شعار اور فرائض میں سے ایک فرض ہے جو شخص اسلام کے رنگ میں صحیح طور پر رنگا ہوا اس میں شوق جہاد ایک لازمی امر ہے۔ ہندوستان میں صدیوں سے قائم رہنے والی اسلامی سلطنت پر انگریزوں کا غاصبانہ قبضہ ہر مسلمان کو ہمیشہ ہی بے چین رکھتا تھا۔ خصوصاً جن مسلمانوں نے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے وقت انگریزوں کے لرزہ خیز مظالم دیکھے یا سنے ہیں ان کے دلوں میں انگریزوں سے نفرت ان کے خلاف جہاد کا جذبہ پیدا ہونا ایک فطری امر تھا۔ حضرت شیخ الہندؒ کی ۱۸۵۱ء میں ولادت ہوئی۔ غدر ۵۷ء میں چھ سال کی عمر تھی اس کے کچھ واقعات خود دیکھے کچھ اپنے بڑوں سے سنے جو زبان زد ر زد تک سب مسلمانوں

کی زبان پر تھے۔ پھر جن دو بزرگوں کی خدمت وصحبت میں رہ کر علم وفضل اور کمالات ظاہری وباطنی حاصل کئے وہ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی اور حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی قدس سرہٗ ہیں جنہوں نے ۵۷ء کے جہادِ آزادی میں باقاعدہ انگریزی فوجوں سے جنگ کی اور تھانہ بھون، شاملی وغیرہ کو فتح کرلیا تھا۔ ان بزرگوں کی صحبت وخدمت کے اثر سے حضرت شیخ الہندؒ کی زندگی ابتداً ہی سے سپاہیانہ تھی۔ شکار کا مشغلہ، تیر کے کی مشق، پیدل چلنے کی عادت آپ کی معروف تھی۔

بیسویں صدی کے شروع میں اس زمانے کی دُوَلِ عظمیٰ انگریز، فرانس اور روس تھے انہوں نے متفقہ سازش سے باہمی طے کیا ہوا تھا کہ یورپ کے خطہ ترکوں کی اسلامی سلطنت ناقابلِ برداشت ہے۔ اس کو ختم کرنے کے لئے ان کی متفقہ سازش سے ترکی رعایا میں بغاوتوں کا سلسلہ قائم کیا گیا۔ الجزائر اور مراکش ترکوں کے قبضہ سے نکال لئے گئے۔ مقدونیہ میں بغاوت کھڑی کرکے اس کو باہم تقسیم کرنے کا پروگرام سامنے آیا۔ پھر ۱۹۱۲ء میں جنگ طرابلس وبلقان پیش آئی جو ۱۹۱۴ء کی جنگ عظیم کا مقدمہ ثابت ہوئی۔ میری عمر اس وقت سترہ سال کی ہوگی اور دارالعلوم میں متوسط کتابیں شرح وقایہ، مقامات حریری وغیرہ پڑھتا تھا اور اپنے والد ماجد کے ساتھ بکثرت حضرت شیخ الہندؒ کی مجلس میں حاضر بھی ہوتا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اس نوعمری ہی کے زمانہ میں حضرت کی عظمت ومحبت میرے دل میں پیوست کردی تھی۔ میں دارالعلوم سے چھٹی کے اوقات بکثرت حضرت کی خدمت میں گذارتا تھا۔

اس زمانہ میں میں نے حضرتؒ کی مجلس کو کچھ بدلا ہوا پایا۔ اکثر اوقات اخبارات کی خبریں سننے اور خلافت آلِ عثمان ترکوں کے خلاف دولِ یورپ کے مظالم کو بڑی دل سوزی سے پڑھا جاتا اور انگریزوں کے خلاف جذباتِ نفرت ہر بات میں محسوس ہوتے تھے۔ یہ زمانہ جنگ بلقان کا تھا۔ اس میں ترکوں پر سخت مظالم کئے جارہے تھے۔ ہندوستان کے مسلمانوں میں اضطراب بڑھتا جا رہا تھا۔ انگریز حکومت کی طرف سے اتنی اجازت ملی کہ زخمیوں کی امداد کے لئے روپیہ یا ضروریات بھیج سکتے ہیں۔ حضرت شیخ الہندؒ نے دارالعلوم دیوبند میں پندرہ روز کی تعطیل کراکر سب مدرسین وطلبا کو ملک کے مختلف حصوں میں چندہ جمع کرنے کے لئے بھیجا۔ اس میں احقر نے بھی چند طلبا کے ساتھ دیہات کا دورہ کرکے چندہ جمع کیا تھا۔

اس زمانہ میں میں نے یہ بھی دیکھا کہ ملک کے بڑے بڑے علماء اور لیڈر حضرت کی خدمت میں حاضر ہوتے اور ان سے طویل طویل مجلسوں میں مشورے ہوتے۔ حضرت شیخ الہندؒ کی اصل تحریک جہاد کا راز تو بڑے بڑے حاضرین مجلس کو بھی معلوم نہ تھا۔ میں طفل مکتب صرف اتنا ہی محسوس کر سکتا تھا کہ آج کل حضرتؒ پر جذبہ جہاد غالب ہے، رات دن کا شغلہ یہی بنا ہوا ہے۔ مگر اس کے ساتھ ہی دارالعلوم میں درس حدیث کا سلسلہ بھی برابر جاری تھا۔

۱۳۳۳ھ میں میری تعلیم اس حد پر پہونچی ہوئی تھی کہ اگلے سال ۱۳۳۴ھ میں مجھے دورہ حدیث حضرت شیخ الہندؒ کی خدمت میں پڑھنے کا موقع تھا۔ مگر ماہ جمادی الثانیہ ۱۳۳۳ھ اچانک یہ خبریں کان میں پڑنے لگیں کہ حضرت قدس سرہٗ حج کے لئے تشریف لے جانے والے ہیں اور بالآخر ۲۹ شوال ۱۳۳۳ھ کو دیوبند سے اس سفر کے لئے روانگی ہوئی۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے لوگوں کا اضطراب محسوس کر کے عین روانگی کے روز ۲۹ شوال ۱۳۳۳ھ کو ظہر کے بعد اپنی قدیم درس گاہ نودرہ میں سب طلباء، مدرسین و منتظمین دارالعلوم کو جمع فرما کر ظاہر فرمایا کہ میں حج کے لئے جا رہا ہوں۔ یہ کہنا تو مشکل ہے کہ کب تک واپسی ہوگی لیکن جلد واپسی کی کوشش کروں گا اور اپنے بعد کے لئے دارالعلوم کے انتظامات سے متعلق باتیں فرمائی اور ہر طبقہ کے لوگوں کو اون کے مناسب نصائح فرما کر جلسہ کو دعاء پر ختم کیا۔ پھر رات کو عشاء کے بعد اپنے گھر سے رخصت ہو کر آخر میں دارالعلوم میں پہونچ کر وہاں سے رخصت ہوئے اس وقت چونکہ جنگ یوروپ شروع ہو گئی تھی، آپ کے اس سفر کے متعلق لوگ اپنے اپنے قیاس سے مختلف باتیں کر رہے تھے۔ کوئی کہتا تھا کہ حضرت انگریزی حکومت سے تنگ آکر ہجرت کے خیال سے جا رہے ہیں۔ بعض حضرات اس سفر کو بھی جہاد کی ضرورت کا سفر قرار دیتے تھے۔ حضرتؒ کے اصل راز سے واقف بہت کم حضرات تھے۔ اور انہوں نے اس راز کو مالٹا جیل سے رہائی کے بعد بھی انگریزی حکومت کے قیام کے زمانے تک کھولنا مناسب نہیں سمجھا کہ اوس سے بہت سے مسلمانوں کو تکلیف پہونچ سکتی تھی۔ اس دور میں حضرت شیخ الہند کے حالات پر مشتمل متعدد کتابیں اسیر مالٹا اور حیات شیخ الہند وغیرہ لکھی گئیں مگر ان میں حضرت کا اصل راز ظاہر نہیں کیا گیا۔ انگریزی اقتدار کے ختم ہونے اور ہندوستان کے آزاد ہونے کے بعد حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدنیؒ نے اپنی کتاب خود نوشت سوانح نقش حیات میں اس کو کچھ کھولا ہے جس کا حاصل یہ ہے۔

جنگ طرابلس و بلقان کے وقت سے حضرت شیخ الہند کو یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ اب انگریز،

فرانس، روس کی یہ سازش بروئے کار آنے والی ہے کہ ترکی خلافت وسلطنت کے ٹکڑے کرکے باہم تقسیم کر لیا جائے۔ اس تصور نے حضرت میں وہ بے پناہ جذبہ جہاد پیدا کر دیا تھا جس کے آگے کسی رکاوٹ کی پروا نہ رہی تھی اور یہ وہ وقت تھا جبکہ انگریزی عملداری میں اون کے خلاف کوئی آواز اٹھانا یا آزادی کا لفظ زبان پر لانا اپنی موت کو دعوت دینا تھا۔ مگر حضرت شیخ الہندؒ نے اللہ پر بھروسہ کرکے انگریزوں سے ہندوستان کو آزاد کرانے کی تحریک شروع کی۔ دارالعلوم میں چالیس پچاس سال کے درس حدیث نے ہندوستان اور بیرون ہند میں حضرتؒ کے ہزاروں شاگرد پیدا کر دیے تھے۔ اسی وقت حضرتؒ نے اس کی ضرورت محسوس فرمائی کہ سرحد کے آزاد قبائل یاغستان کو اس تحریک کا مرکز بنایا جائے مگر آزاد قبائل میں باہمی جنگ وجدال اور خانگی اختلافات بے حد تھے اس لئے ضروری سمجھا گیا کہ پہلے ان کے آپس میں مصالحت اور جذبہ جہاد کے تحت باہمی اتحاد پیدا کیا جائے۔ اس کے لئے باشندگان سرحد میں سے حضرتؒ نے اپنے مخصوص شاگردوں کو آمادہ کرکے اصلاح حال اور باہمی اتحاد اور جذبہ جہاد پیدا کرنے کے لئے مامور فرمایا جن میں مولانا سیف الرحمن صاحب، مولانا فضل ربی، مولانا فضل محمود، مولانا محمد اکبر صاحب کے نام سر فہرست ہیں۔ ان حضرات نے گاؤں گاؤں اور قبیلہ قبیلہ میں پھر کر زمین ہموار کی اور ایک عرصہ بفضلہ تعالیٰ کامیابی حاصل ہوئی اور انھیں مقاصد کے لئے بار بار حاجی ترنگ زئی صاحب سے بھی کہا گیا کہ وہ اپنے وطن کو چھوڑ دیں اور انگریزی حدود سے باہر جا کر جہاد کے لئے کوشش کریں۔ اون کو کچھ مجبوریاں درپیش تھیں۔ اسی عرصہ میں جنگ عظیم چھڑ گئی اور کچھ عرصہ کے بعد ترک بھی مجبور ہو گئے کہ جنگ کا اعلان کر دیں۔ ترکوں کے دو جنگی جہاز جو اونھوں نے اپنی قوم کو بھوکا رکھ کر کروڑوں خرچ کرکے انگلستان میں بنوائے تھے، انگریزوں نے ان کو ضبط کر لیا اور ترکوں پر آٹھ یا نو محاذوں سے حملے شروع کر دیئے گئے۔

حضرت شیخ الہندؒ نے ان حالات سے حاجی ترنگ زئی صاحب کو مطلع کیا اور ضروری قرار دیا کہ وہ یاغستان چلے جائیں۔ اسی طرح یاغستان اور اس کے کارکنوں کو بھی لکھا گیا۔ حاجی ترنگ زئی وہاں پہونچے۔ مجاہدین کا اجتماع زبردست ہو چکا تھا۔ مجاہدین جو قدیم یعنی حضرت سید احمد صاحب شہید کی جماعت بھی ان میں شامل ہو گئی تھی۔ بالآخر کچھ عرصہ کے بعد جنگ چھڑ گئی اور مجاہدین کو غیر متوقع کامیابی حاصل ہونے لگی اور انگریزوں کو بے حد جانی ومالی نقصان اٹھا کر سرحد پر واپس لوٹنا پڑا۔ مگر اب انگریزوں نے اطراف ملک سے اپنی قوت سرحد پر زیادہ جمع کر دی اور عوام میں یہ پروپیگنڈا

شروع کیا کہ یہ جہاد نہیں ہے۔ جہاد بغیر بادشاہ کے نہیں ہوتا اور پھر پانی کی طرح روپیہ خرچ کر کے لوگوں کو اپنا ہم نوا بنا لیا اور مسلمانوں میں پھوٹ ڈالنے کی مسلسل کوششیں کابل تک پہونچاتی۔ امیر کابل حبیب اللہ صاحب کو اس جہاد میں شرکت سے روکنے کے لئے ان کو سبز باغ دکھائے گئے۔

دوسری طرف مجاہدین یاغستان رسد اور کارتوسوں کی کمی کی وجہ سے پریشان تھے۔ ان کا یہ پیغام حضرت شیخ الہندؒ کی خدمت میں پہونچا کر ہمارے پاس بہادر آدمیوں کی کمی نہیں۔ مگر اسلحہ اور رسد کے بغیر ہم بالکل بے دست و پا ہیں۔ روٹیاں ختم ہو جانے کے بعد مجاہدین کو اپنے گھر جانا پڑتا ہے اور مورچہ خالی ہو جاتا ہے۔ اسی طرح کارتوس ختم ہو جانے پر مجاہد بے ہتھیار رہ جاتا ہے اگر کارتوس اور رسد کا سامان پورا ہو تو ہم توپوں مشین گنوں اور ٹینکوں کا بخوبی مقابلہ کر سکتے ہیں اس لئے جلد از جلد کسی حکومت کو ہماری پشت پناہی اور امداد کے لئے تیار کیجئے۔ اس پر حضرت شیخ الہندؒ نے یہ طے کیا کہ اس کام کے لئے مولانا عبید اللہ سندھی کو کابل بھیجیں اور خود استنبول پہونچیں۔

مولانا عبید اللہ صاحب کو رفیق خاص ہونے کے باوجود کوئی راز نہیں بتلایا گیا بلکہ ان کو صرف یہ فرمایا کہ وہ کابل چلے جائیں۔ کابل پہونچنے پر ان کو معلوم ہوا کہ ان کے پہونچنے کی اطلاع وہاں پہلے پہونچ چکی ہے۔ یہی وہ اطلاع تھی جو ریشمی رومال کے اندر خاص انداز سے لکھ کر پہنچائی گئی تھی۔ حضرت شیخ الہند کے ایک رازدار نے ان کی رہنمائی کی اور امیر حبیب اللہ سے ملاقات کرائی۔

ادھر حضرت شیخ الہندؒ کے متعلق ہندوستان میں اور سرحد یاغستان میں سی آئی ڈی کی اطلاعات بہت زیادہ خطرناک تھیں، اس لئے بڑی نگرانی ہو رہی تھی۔

شیخ الہندؒ کی تحریک کے چند مرکزوں میں سے ایک مرکز دہلی بھی تھا۔ یہاں ڈاکٹر انصاری مرحوم نے یہ حالات دیکھ کر حضرتؒ پر زور دیا کہ وہ جلد سے جلد انگریزی عمل داری سے نکل جائیں۔ اس پر حضرتؒ نے حجاز مقدس کا ارادہ فرمالیا۔ انتہائی اخفا کے باوجود قصد سفر کی تمام ملک میں شہرت ہو گئی اور جوق جوق مشتاقان زیارت کے دیوبند آنے لگے۔ بالآخر ۲۹ شوال ۱۳۳۳ھ کو عشاء کے بعد پہلے اپنے گھر سے رخصت ہوئے۔ پھر حضرت نانوتویؒ کی اہلیہ محترمہ مہتمم دارالعلوم حضرت مولانا حافظ احمد صاحب کی والدہ اس وقت حیات تھیں، ان کی خدمت میں حاضر ہو کر رخصت طلب کی انھوں نے واپسی کا وعدہ لے کر رخصت کیا۔ پھر دارالعلوم میں تشریف لا کر دعا کر کے اسٹیشن کی طرف

روانہ ہوئے۔ وہاں تک ایک بڑی جماعت ساتھ تھی۔ حضرت کے اس سفر سے آپ کے خاص متعلقین ہی نہیں، بلکہ عام مسلمان غمگین اور بےچین تھے۔ میں اپنے بچپن کے باوجود اتنا متاثر تھا کہ اپنے غم سے بھرا ہوا ایک خط بمبئی کے پتہ پر حضرت کے نام روانہ کیا، جس کا جواب ایک کارڈ پر خود حضرت شیخ الہند کے قلم کا لکھا ہوا مجھے ملا جو آج تک محفوظ ہے، اس میں حضرت نے بہت تسلی کے الفاظ تحریر فرمائے تھے۔

سی آئی ڈی کی رپورٹیں اگرچہ حضرت کے سخت خلاف چل رہی تھیں مگر انگریزی حکومت اگرچہ حضرت کے اس سفر کو ایک سیاسی سفر قرار دے چکی تھی اور اُن کو یہ اندازہ تھا کہ وہ حجاز جا کر ترکی لیڈروں سے ملاقات کریں گے۔ مگر پورے ملک میں حضرت کی تحریک سے ایک آزادی کی لہر پیدا ہو چکی تھی اور ہر جگہ کے مسلمان ہر وقت پروانہ وار حضرت کے گرد رہتے تھے۔ اس لئے مسلمانوں کے ہیجان سے بچنے کے لئے حکومت نے یہاں کوئی اقدام آپ کے خلاف نہیں کیا۔ لیکن جہاز کی روانگی کے بعد حکومت کے احکام جہاز کے افسروں کے نام پہونچے کہ حضرت اور ان کے رفقاء کو گرفتار کر لیا جائے۔ اتفاق وقت یہ احکام جہاز والوں کو اس وقت پہونچے جبکہ حضرت مع اپنے رفقا کے ساحل جدہ پر اتر کر قرنطینہ کے لئے ایک مقام پر ٹھہرے ہوئے تھے۔ یہاں انگریزی افسروں کا بس نہیں چل سکتا تھا اس طرح اللہ تعالیٰ نے سلامت و عافیت کے ساتھ ارض مقدس میں پہونچا دیا۔

مکہ مکرمہ میں حاجی عبدالجبار صاحب سے ملاقات

مکہ مکرمہ میں بہت سے ہندوستانی حضرات مقیم تھے ان میں حاجی علی خاں مرحوم کا خاندان وہاں کے بڑے تاجروں میں تھا۔ حکام سلطنت اور عوام سب کے معتمد مانے جاتے تھے۔ اس خاندان کے لوگوں میں اوس وقت حافظ عبدالجبار صاحب تجربہ کار معتمد اور فہیم آدمی تھے۔ حضرت شیخ الہندؒ نے ان سے ملاقات کی اور اپنی تحریک جہاد کا کچھ راز ان پر کھولا اور یہ فرمائش کی کہ غالب پاشا ترکی گورنر حجاز سے میری ملاقات کا انتظام کردیں۔

انہوں نے ایک ہندوستانی معاملہ فہم نوجوان کو جو ترکی اسکول میں تعلیم حاصل کرنے کے سبب عربی اور ترکی زبان سے خوب واقف تھے اُن کو حضرت کے ساتھ بھیج دیا۔ وہ گئے اور غالب

پاشاسے ملاقات کرادی اور حضرت شیخ الہندؒ نے جو باتیں ان کے سامنے پیش کیں اون کا ترجمہ کرکے غالب پاشا کو سنایا۔ غالب پاشا نے اس کو بڑے غور و توجہ سے سنا اور فرمایا کہ آپ کل کو اسی وقت تشریف لے آئیں، میں اوس وقت جواب دوں گا۔ حضرت واپس آ گئے۔ غالب پاشا نے ہندوستان کے معزز اور معتمد تاجروں سے حضرت شیخ الہندؒ کے متعلق تحقیق کی کہ مولانا محمود حسن صاحب کی حیثیت ہندوستان میں کیا ہے۔ لوگوں نے حضرت کی علمی و عملی حیثیت، شہرت اور قبولیت کی بہت اونچی شان بتلائی۔ اگلے دن جب حضرت ملاقات کے لئے تشریف لے گئے تو غالب پاشا بہت زیادہ اعزاز و اکرام کے ساتھ ملے اور جو کچھ حضرتؒ نے کہا اوس کو قبول کیا۔ دیر تک تحریک جہاد اور جشن آزادی کے متعلق باتیں ہوتی رہیں۔

پھر حضرتؒ نے فرمایا کہ میں انور پاشا سے ملنا چاہتا ہوں۔ غالب پاشا نے کہا کہ آپ کو اون سے ملنے کی ضرورت نہیں۔ میں جو کچھ کہتا ہوں وہ انور پاشا ہی کا کہنا ہے۔ مگر حضرتؒ نے بعض مصالح کے پیش نظر انور پاشا سے ملنے پر اصرار کیا تو غالب پاشا نے ایک تحریر اپنی طرف سے تمام ہندوستانی مسلمانوں کے نام بحیثیت گورنر حجاز لکھ دی اور دوسری تحریر گورنر مدینہ منورہ بصری پاشا کو لکھی کہ یہ معتمد شخص ہیں، ان کا احترام کرو اور ان کو انور پاشا کے پاس استنبول پہونچا دو اور ایک تحریر انور پاشا کے نام لکھ دی کہ یہ معتمد شخص ہیں، ان کے مطالبات پورے کیجئے۔ پھر تحریک آزادی کے متعلق حضرتؒ کو ہدایات دیں کہ آپ تمام ہندوستان کو آزادی کامل کے مطالبہ پر آمادہ کریں ہم ہر قسم کی امداد کرنے کا وعدہ کرتے ہیں۔

حضرت شیخ الہندؒ نے فرمایا کہ اس کام کی کوشش میری جماعت ہندوستان میں کر رہی ہے اور اب اپنے بعض رفقا کو ہدایت دے کر بھیجتا ہوں۔ مگر خود جانے سے اس لئے معذور ہوں کہ بعض انگریز مجھ کو نہایت خطرناک نظر سے دیکھتے ہیں۔ میں اگر ہندوستان جاؤں تو راستہ ہی میں گرفتار کر لیا جاؤں گا، کوئی کام نہیں کر سکوں گا۔ اس لئے میرا ارادہ اپنے متعلق یہ ہے کہ میں بالفعل ہندوستانی مغربی سرحد یا غستان چلا جاؤں وہاں میری تحریک کے لوگ کام کر رہے ہیں میں ان میں مل کر کام کروں۔

اس کے بعد غالب پاشا طائف کو اور حضرت شیخ الہند مدینہ طیبہ کو روانہ ہو گئے۔ مدینہ طیبہ

میں حضرت شیخ الہندؒ کے شاگرد رشید حضرت مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ موجود تھے اور اس وقت تک ان کا سیاسیات سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ شب و روز علمی خدمات حرم محترم میں درس حدیث وغیرہ کے ذریعہ جاری تھیں۔

حضرت شیخ الہند مدینہ طیبہ پہونچے تو حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوری جو اس وقت بہ نیت مدینہ منورہ میں تشریف رکھتے تھے اون کی معیت میں مولانا حسین احمد مدنیؒ کو اپنی تحریک اور اپنے ارادہ سے مطلع کیا۔ حضرت مولانا خلیل احمد صاحب نے تائید فرمائی اور مولانا مدنی اس کام میں شرکت کے لئے کھڑے ہو گئے۔ اسی وقت سے مولانا حسین احمد مدنیؒ کی سیاسیات کا آغاز ہوا۔

گورنر مدینہ سے ملاقات

اس کے بعد حضرت شیخ الہندؒ گورنر حجاز کا خط لے کر گورنر مدینہ سے ملے، جس میں لکھا تھا کہ ان کو انور پاشا سے ملانے کے لئے استنبول بھیج دو۔ گورنر مدینہ نے کہا کہ آپ سفر کی تیاری کر لیں۔ میں حسب منشا استنبول بھیج دوں گا۔

انور پاشا اور جمال پاشا کی مدینہ منورہ میں آمد

اتفاقاً اسی عرصہ میں گورنر مدینہ کے پاس تار پہونچا کہ انور پاشا اور جمال پاشا دونوں وزیران جنگ دورہ کرتے ہوئے شام بذریعہ ریل مدینہ منورہ پہونچ رہے ہیں۔ اس وقت تک حجاز شام ریلوے جاری تھی حضرتؒ نے موقع غنیمت جانی درخواست تیار کی حکومت مدینہ اور عوام استقبال کی تیاری میں لگ گئے۔ انور پاشا نے حکومت مدینہ اور عوام استقبال کی تیاری میں لگ گئے۔ انور پاشا نے سرور دو عالم کے دربار میں حاضری کے لئے جمعہ کا دن تجویز کیا تھا

اسی روز دونوں وزیر اسپیشل ٹرین سے صبح نو بجے کے قریب مدینہ منورہ پہونچ گئے۔ اہل شہر، حکومت اور فوج کی طرف سے جلوس کا انتظام کیا گیا تھا۔ جلوس کی روانگی کے وقت سواری کے لئے فٹن پیش کی گئی تو انور پاشا نے انکار کر دیا کہ ہم غلامانہ طریق سے بارگاہ نبوت میں حاضر ہونا چاہتے ہیں۔ اسلئے پیدل چلیں گے۔ جلوس میں شہر کے علماء، صلحاء اور مسجد نبوی کے خدام کو

خصوصیت کے ساتھ جگہ دی گئی تھی۔ انور پاشا اور جمال پاشا ادب سے ہاتھ باندھے ہوئے نیچی نظریں کئے ہوئے چل رہے تھے۔ تمام جلوس کے دائیں بائیں مسلح فوجیوں کی قطار تھی۔

حضرت شیخ الہندؒ کے رفیق خاص حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ تاک میں تھے کہ موقع ملے تو انور پاشا کے پاس پہونچ جائیں اور درخواست پیش کر دیں۔ چنانچہ وہ قطار کو چیر پاس پہونچے اور عرضی پیش کر دی۔ جس میں شیخ الہندؒ نے تنہائی میں ملاقات کی درخواست کی تھی۔ مولانا یہ عرضی دے کر واپس آئے تو معلوم ہوا کہ عرضی پر غور کیا گیا اور کچھ معزز مقامی حضرات کی سعی سے خرب کے بعد کا وقت تنہائی میں ملاقات کا دیا گیا۔ چنانچہ حضرت شیخ الہند اور مولانا خلیل احمد صاحب ملاقات پر پہونچے۔ ایک تنہا اور بند کمرے میں ملاقات ہوئی۔ غالب پاشا گورنر مکہ مکرمہ کا خط ان کو دے دیا گیا۔

انور پاشا نے بھی غالب پاشا کی طرح حضرت شیخ سے فرمایا کہ آپ اس کی پوری کوشش کریں کہ ہندوستان کے لوگ مکمل آزادی کے کسی وقتی رعایت وغیرہ پر راضی نہ ہو جائیں ہم ہندوستان والوں کی پوری امداد کے لئے تیار ہیں اور آپ کی خواہش کے موافق اہل ہند کے نام ہم ایک تحریر بھی وعدہ امداد کی دے دیں گے۔ حضرت نے فرمایا کہ یہ تحریر صرف ترکی زبان میں نہ ہونی چاہیے بلکہ عربی اور فارسی میں بھی ہونی چاہیے تاکہ اہل ہندوستان سمجھ سکیں۔ انھوں نے اس کو قبول کر لیا۔ مگر مدینہ طیبہ میں ان کا قیام بہت مختصر تھا، اس لئے یہ وعدہ کیا کہ ہم دمشق (شام) جاکر یہ تحریر مکمل کر کے بھیج دیں گے۔

اس کے بعد حضرت شیخ الہندؒ نے انور پاشا سے یہ درخواست کی کہ مجھ کو بالا بالا افغانستان پہونچا دیا جائے کیونکہ ہندوستان کے راستہ سے میرے لئے اپنے مرکز تحریک جہاد یاغستان پہونچنا ممکن نہیں۔ انھوں نے اس سے معذوری ظاہر کی اور کہا کہ روس نے اپنی فوجیں ایران میں داخل کر کے افغانستان کا راستہ کاٹ دیا ہے۔ اس وقت یا تو آپ جدہ کے راستہ سے اپنے وطن واپس جائیں اور اگر وہاں خطرہ ہے تو حجاز یا ترکی عملداری میں کہیں قیام فرمائیں۔

چند گھنٹہ کے بعد یہ دونوں حضرات شام کی طرف واپس روانہ ہو گئے اور تین دن بعد حسب وعدہ تینوں زبانوں میں تحریریں مرتب شدہ دونوں وزیروں کے دستخط کے ساتھ حضرت

شیخ الہند کے پاس پہونچ گئیں، جن میں ہندوستانی مسلمانوں کے مطالبۂ آزادی کا استحسان اور ان کی ساتھ ہمدردی اور امداد و اعانت کا وعدہ تھا۔ اور ہر اوس شخص کو جو ترکی رعیت یا ملازم ہو حکم تھا کہ وہ مولانا محمود حسن صاحب شیخ الہند پر اعتماد کرے اور اون کی اعانت میں حصہ لے۔

تحریرات و وثائق کا ہندوستان پہنچانا: چونکہ حضرت شیخ الہندؒ کو یہ دھن لگی ہوئی تھی کہ کسی طرح اپنے مرکز تحریک یاغستان میں پہونچ جائیں۔ ترکی کے ذمہ دار وزیروں کے ذریعہ کرلے کے باوجود مایوس نہیں تھے اس لئے یہ ضروری سمجھا کہ ان کاغذات کی فوٹو کاپیاں کرا کر ہندوستان کے مراکز تحریک میں ذمہ داران کو بھیج دیا جائے۔

اوس وقت انگریزی حکومت اس طرف سے جانے والوں پر کڑی نظر اور سخت تفتیش کرتی تھی تحریرات کے پکڑے جانے کا خطرہ تھا اس لئے ایک کپڑے رکھنے والا صندوق لکڑی کا بنوایا گیا اور اوس کے تختہ کو اندر سے کھود کر اوس میں یہ کاغذات رکھ کر اس طرح بند کر دیا گیا کہ وہ بالکل ایک تختہ سمجھا جاتا تھا صندوق کے اندر کچھ کپڑے اپنے گھر والوں کے لئے رکھ دیئے۔

حضرت شیخ الہندؒ کے کچھ رفقاء تو پہلے واپس ہندوستان روانہ ہو چکے تھے مولانا ہادی حسن رئیس خان جہانپور اور حاجی شاہ بخش صاحب سندھی جو حیدرآباد سندھ کے باشندے اور حضرت شیخ الہندؒ کی تحریک جہاد کے ممبر تھے اب ان کے جانے کا وقت تھا، یہ صندوق ان کے سپرد کر دیا گیا اور سمجھا دیا گیا کہ اپنے مکان پر پہونچ کر یہ کاغذات نکال لیں اور حاجی نور بخش رئیس ضلع مظفر نگر کو دے دیں کہ وہ ان کی فوٹو کاپیاں کرا کر تمام مراکز تحریک میں پہونچا دیں۔

ادھر حضرت شیخ الہندؒ اپنے اس ارادہ پر جمے ہوئے تھے کہ کسی طرح اپنے مرکز تحریک یاغستان تک پہونچ جائیں۔ افغانستان کے راستہ سے مایوسی ہو چکی تھی تو قصد یہ فرمایا کہ بحری جہاز سے ہندوستان جائیں مگر بمبئی کے بجائے بلوچستان کے کسی ساحل پر اتر جائیں۔ لیکن اس سفر سے پہلے غالب پاشا سے ملاقات ضروری تھی اس کے لئے پہلے مکہ مکرمہ پہونچے اور پھر طائف غالب پاشا کے پاس گئے مگر اسی عرصہ میں شریف مکہ نے بغاوت کر دی اور حضرت شیخ الہند طائف میں محصور ہو گئے، جہاں سے ۱۰ رشوال کو مکہ معظمہ پہونچنے کا موقع ملا۔

ادھر مولانا ہادی حسن صاحب وہ صندوق لے کر ہندوستان روانہ ہو چکے تھے۔ جہاز کے بمبئی پہونچنے پر حکومت کی طرف سے تلاشی و تفتیش کا بڑا اہتمام تھا مگر مولانا ہادی حسن صاحب نے یہ صندوق اپنے کسی معتمد دوست کے سپرد کر دیا۔ اونھوں نے عام مسافروں کے سامان کے ساتھ اوس کو نکال کر فوراً اشٹیشن لے گئے اور بذریعہ پارسل چلتا کر دیا۔ پولیس اور سی آئی ڈی کو اس کی ہوا بھی نہ لگی۔ ادھر پولیس نے مولانا ہادی حسن اور حضرت مولانا خلیل احمد صاحب کو حراست میں لے کر بہت سخت تلاشی لی مگر الحمد للہ کوئی مشتبہ چیز نہیں نکلی۔ پھر ان سب کو پولیس کی حراست میں نینی تال پہونچا دیا گیا۔ وہاں رکھ کر حضرت مولانا خلیل احمد صاحبؒ کو تو کچھ پوچھ گچھ کے بعد چھوڑ دیا مگر مولانا ہادی حسن صاحب کو روک لیا گیا۔ ان پر ہر طرح کی سختی کی گئی اور لالچ دیا کہ کسی طرح یہ شیخ الہند کا راز ظاہر کر دیں مگر پولیس اس میں ناکام ہوئی۔ ایک ڈیڑھ ماہ کے بعد ان کو بھی چھوڑ دیا۔ وہ صندوق جو پارسل سے بھیجا گیا تھا، خان جہانپور پہونچ چکا تھا اور جن لوگوں کے پاس پہونچا تھا اون کو کسی طرح یہ معلوم ہو گیا تھا کہ اس میں کوئی راز کی چیز ہے۔ اونھوں نے صندوق کو توڑا تو ایک تختہ کے اندر سے یہ تینوں کاغذات برآمد ہوئے انھوں نے ان کو محفوظ کر لیا۔

دوسری طرف حکومتِ ہند کو کسی طرح اتنا پتہ لگ گیا کہ خان جہانپور میں ایک صندوق کے اندر کچھ کاغذات بھیجے گئے ہیں۔ پولیس نے اوسی وقت مکان کا محاصرہ کر کے چھاپہ مارا۔ مکان کے اندر مولانا محمد نبی صاحب ان کاغذات کو کھولے ہوئے نقل کر رہے تھے کہ پولیس کے اچانک چھاپہ کی اطلاع ملی تو فوراً لپیٹ کر اس کو اپنی صدری کی جیب میں رکھ لیا اور صدری ایک کھونٹی پر لٹکا دی۔ اتنا ہو نے پایا تھا کہ پولیس نے عورتوں کو ایک کمرہ میں الگ بند کر دیا اور پورے مکان کی سخت تلاشی صبح دس بجے سے چار بجے تک جاری رہی۔ کپڑوں کے صندوق کا ایک ایک تختہ الگ کر کے دیکھا گیا مگر کوئی چیز برآمد نہ ہوئی کیونکہ یہ وہ صندوق ہی نہ تھا جس میں یہ کاغذات رازدارانہ انداز میں آئے تھے۔ پولیس نے گھر کی ہر چیز کی تلاشی لی مگر وہ صدری جس کی جیب میں یہ کاغذات تھے، اون کے سامنے کھونٹی پر لٹکی رہی۔ اس کی طرف کسی کی توجہ نہیں ہوئی۔ پھر ان کاغذات کو حاجی نور بخش صاحب ایک فوٹو گرافر کے یہاں لے گئے تو پولیس کو پھر اطلاع ملی۔ پولیس نے فوٹو گرافر کے مکان پر چھاپہ مارا۔ کاغذات وہاں موجود تھے

مگر وہاں بھی اللہ تعالیٰ نے حفاظت فرمائی، پولیس کو ہاتھ نہ آئے۔

حالات کا پانسہ پلٹنا، تحریکِ جہاد کی ناکامی اور شیخ الہندؒ کی گرفتاری

ایک طرف تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ انتظامات ہو رہے تھے کہ انگریزی پولیس کو کوئی دستاویزی ثبوت ہاتھ نہ آیا۔ مگر دوسری طرف حالات نے پانسہ پلٹا۔ یا تو ترکی اور جرمنی مل کر وعل یورپ کے مقابلہ میں ہر محاذ پر فتح حاصل کر رہے تھے اور یا اچانک یہ صورت پیش آئی کہ امریکہ انگریزوں کا حلیف ہو گیا اور اس کی بے شمار تازہ دم فوجیں اور بے شمار اسلحہ انگریزوں اور فرانس وغیرہ کی مدد پر آ گئے۔

اور دوسری طرف انگریز اس سازش میں کامیاب ہو گئے جس کے لئے اون کے جاسوس مدت دراز سے عرب ملکوں میں کام کر رہے تھے اور اون کو اسلام کے بجائے وطنی قومیت کا زہر پلا کر ترکوں سے متنفر کر رہے تھے اور اون کے بالمقابل بغاوت پر آمادہ کر رہے ہیں۔ اس وقت اس کا ظہور اس طرح ہوا کہ مکہ مکرمہ میں شریف نے بغاوت کا اعلان کر کے تقریباً اپنا قبضہ جما لیا اور سوریا، فلسطین، عراق وغیرہ عرب عوام ترکوں کو قتل و غارت کرنے لگے اور عرب سپاہی ترکی فوج میں سے بھاگنے لگے تو طبعی طور پر ہر جگہ ناکامی ہی ناکامی ہونے لگی۔ خدا کا ملک ہے جس کو چاہتا ہے دیتا ہے جس سے چاہتا ہے چھین لیتا ہے۔

حضرت شیخ الہندؒ ۱۰ شوال ۱۳۳۴ھ کو مکہ معظمہ پہونچ کر حج کے انتظار میں مقیم ہو گئے اور حج کے بعد یہ طے کیا کہ جلد سے جلد یہاں سے نکل جائیں۔ کیونکہ مکہ مکرمہ پر شریف مکہ کا قبضہ ہے اور وہ انگریزوں کے ساتھ دوستانہ تعلق رکھتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ ہمیں گرفتار کر کے انگریزوں کے حوالہ کر دے۔ مگر چونکہ پورے رفقاء کے ساتھ سفر کرنا آسان نہیں تھا اس لئے کچھ روانگی میں تاخیر ہوئی اور دوسری طرف شریف مکہ نے اپنے ہم خیال لوگوں سے ترکوں کے خلاف ایک فتویٰ مرتب کرایا جس میں ترکوں کو کافر قرار دیا اور ان کی حکومت و سلطنت کی اطاعت کو ناجائز لکھا۔ اس کے سرنامہ کا عنوان تھا "فتویٰ علماء مدرسین حرم مکہ"۔ اس فتویٰ پر معلوم نہیں کسی دھوکہ فریب سے یا ڈرا دھمکا کر ان علماء سے دستخط کرا لئے گئے

تھے جو حرم مکہ میں درس دیتے تھے۔

ہندوستان سے آنے والے بعض لوگ جو انگریز حکومت کے کارندے تھے انہوں نے شریف مکہ سے کہا کہ آپ نے جن علماء کے دستخط کرائے ہیں، انہیں ملک میں کوئی نہیں پہچانتا۔ اگر اس پر شیخ ہندی مولانا محمود الحسن صاحب کے دستخط ہو جائیں تو ترکوں کے خلاف ایک مؤثر حربہ ہوگا۔ شریف مکہ نے اپنے ایک معتمد کے ہاتھ یہ فتویٰ دستخط کرانے کے لئے حضرت شیخ الہندؒ کی خدمت میں بھیجا۔

حضرت شیخ الہندؒ نے یہ فتویٰ دیکھا تو فرمایا کہ اس کا عنوان اور مضمون دونوں ایسے ہیں کہ اس پر میرے دستخط صحیح نہیں ہو سکتے کیونکہ اس کا عنوان ہے "فتویٰ علماء مدرسین حرم" میں نہ علماء حرم میں سے ہوں اور نہ کبھی حرم میں درس دیا ہے۔ میں ایک ہندی مسافر ہوں، اس پر میرے دستخط کا کیا موقع ہے۔ یہ کہہ کر فتویٰ بلا دستخط واپس کر دیا۔ شریف مکہ کو اس کی اطلاع ہوئی تو سخت غیظ و غضب کے عالم میں جدہ جا کر انگریزوں کے نمائندے سے ملا۔ انگریز نمائندے نے شریف مکہ کو سمجھایا کہ یہ ہندوستانی رعیت میں سے ہیں۔ آپ ان کو ہمارے حوالے کر دیں۔ چنانچہ شریف مکہ نے جدہ ہی سے حضرت شیخ الہندؒ اور ان کے سب رفقاء کی گرفتاری کے احکام بھیج دیئے۔

مکہ مکرمہ میں جب یہ احکام پہنچے تو معززین مکہ نے ان احکام کے منسوخ کرانے کے لئے جدوجہد کی، جو ناکام رہی اور حضرت شیخ الہندؒ مع اپنے رفقاء کے گرفتار کر کے جدہ روانہ کر دیئے گئے۔ ۲۴ر صفر ۱۳۳۵ھ کو پولیس کی زیر حراست جدہ پہنچے اور تقریباً ایک مہینہ زیر حراست رکھے گئے۔ پھر ۹ر ربیع الاول ۱۳۳۵ھ کو خدیوی جہاز سے اسی طرح زیر حراست سویز بھیج دیئے گئے۔ اس وقت اپنی تحریک کی ناکامی، جان کا خوف اور ایذاؤں کے خطرے سبھی کچھ سامنے تھے مگر گرفتاری کے وقت حضرت شیخ الہندؒ اطمینان کے ساتھ یہ فرما رہے تھے کہ "الحمد للہ بمصیبتے گرفتارم نہ بمعصیتے" یعنی اللہ کا شکر ہے کہ میری گرفتاری مصیبت ضرور ہے لیکن اللہ کی کسی نافرمانی میں نہیں۔

یہ تھا حضرت شیخ الہندؒ کا مقام بلند جس کو سمجھنا بھی ہر ایک کا کام نہیں۔

گرفتاری کے بعد حضرت شیخ الہندؒ مع اپنے رفقا کے اول جیزہ کی سیاسی جیل بھیج دیئے گئے۔ یہاں بیانات لینے کا سلسلہ شروع ہوا۔ بیان لینے والا انگریز تھا اور نہایت سلیس اور صاف اردو بولتا تھا اسکے پاس بڑی بڑی کتابیں اور فائلیں تھیں، جن میں سی آئی۔ ڈی کے بیانات اور رپورٹیں مندرج تھیں۔

بیانات کے بعد ۲۴ ربیع الثانی ۱۳۳۵ھ مطابق ۱۶ فروری ۱۹۱۷ء ان سب حضرات کو مالٹا روانہ کر دیا گیا۔ مالٹا جیل میں اس مقدس گروہ کا قیام تین سال دو مہینہ رہا۔

میں نے حضرتؒ کے بعض رفقا سے سنا ہے کہ مالٹا جیل کے زمانہ میں ایک روز حضرت شیخ الہندؒ کو مغموم دیکھ کر ایک رفیق نے سوال کیا کہ کیا گھر یاد آ رہا ہے؟ اور جیل کی تکلیف سے پریشانی ہے تو حضرت شیخ الہند قدس اللہ سرہٗ نے فرمایا کہ میاں! "گھر کی کیا یاد اور جیل کا کیا غم، غم تو اس کا ہے کہ جو عمل ہم نے کیا ہے، جس کے نتیجہ میں ہم جیل بھگت رہے ہیں، وہ اللہ کے نزدیک مقبول بھی ہے یا نہیں"۔

یہ تھا حضرت شیخ الہندؒ کا مقام بلند کہ خالص اللہ کی راہ میں ساری قربانیاں دینے کے باوجود اپنے نفس پر مطمئن نہیں تھے۔

آخر کار اس جیل سے رہائی کا وقت آیا اور تین برس سات ماہ کے بعد اس مقدس گروہ کو بحری جہاز میں سوار کر کے ۲۰ رمضان المبارک ۱۳۳۸ھ مطابق ۸ جون ۱۹۲۰ء بمبئی پہنچا دیا گیا۔ جہاز عدن ٹھہرا تھا۔ وہاں سے مختلف مقامات دہلی، بمبئی، دیوبند اپنی آمد کے تار بھیج دیئے گئے تھے اس لئے بمبئی بندرگاہ پر استقبال کے لئے ایک عظیم الشان مجمع موجود تھا۔ بمبئی میں خلافت کمیٹی کی طرف سے استقبال کی خصوصی تیاریاں کی گئیں تھیں۔ حکومت ہند کی خواہش یہ تھی کہ حضرت شیخ الہندؒ اب سیاسیات سے بالکل الگ ہو جائیں اور بمبئی کی خلافت کمیٹی اور دوسرے سیاسی لوگوں سے ملے بغیر سیدھے دیوبند تشریف لے جائیں اور اس کام کے لئے حضرتؒ کے بعض مخلصین کو واسطہ بنایا گیا مگر حضرتؒ نے ان سے عذر کر دیا اور بمبئی میں خلافت کمیٹی کی جانب سے استقبالیہ جلسے میں شرکت فرمائی۔

بمبئی سے روانہ ہونے کے بعد راستہ کے ہر اسٹیشن پر استقبال کرنے والوں کا بے پناہ

ہجوم ہوتا تھا کہ حضرتؒ تک پہنچنا اور حضرتؒ کی زیارت کرنا دشوار تھا۔

دہلی، غازی آباد، میرٹھ شہر، میرٹھ چھاؤنی، امظفر نگر، دیوبند وغیرہ میں یہ حالت تھی کہ باہر لے جانے یا عوام کو زیارت کرانے کے لئے لوگوں کو سروں پر اٹھانا پڑتا تھا۔

دیوبند پہونچ کر حضرت شیخ الہندؒ اپنے گھر جانے سے پہلے دارالعلوم پہونچے دارالعلوم کے دارالمشورہ میں تشریف لے گئے۔ بے پناہ ہجوم کی وجہ سے دارالمشورہ کا دروازہ بند کردیا گیا۔ میں اوس وقت دارالعلوم میں ابتدائی درجہ کا مدرس تھا کسی طرح دارالمشورہ کے اندر پہونچ گیا۔ حضرتؒ نے وہاں پہونچ کر وضو کیا اور دو رکعت نماز ادا کی۔ پھر دارالعلوم کے مہتمم اور سب مدرسین و متعلقین سے ملاقات فرمائی۔ یہ ملاقات چونکہ عرصۂ دراز کی جدائی کے بعد ہوئی تھی، اس کا رنگ دیکھنے کے قابل تھا۔

ہمارے مذکورہ بیان میں انتہائی اختصار کے باوجود یہ بات پوری طرح واضح ہوگئی کہ حضرت شیخ الہندؒ کی اصل تحریک کیا تھی۔ وہ ایک خالص اسلامی انقلاب کے لئے جہاد تھا۔ صرف ہندوؤں اور مسلمانوں کی متحدہ قومیت کی مشترک حکومت مقصد ہوتا تو اس کے لئے افغان، کابل، استنبول کے روابط کی کیا ضرورت تھی۔

مالٹا جیل سے رہائی کے بعد تقدیری اسباب سے حضرت شیخ الہندؒ کی تحریک ناکام ہوگئی۔ تو اب یہی غنیمت سمجھا گیا کہ پورے عالم کو تباہ و برباد کرنے والے انگریزوں کو کوئی تو ہزیمت کرکے ہندوستان ان کے قبضہ سے نکلے۔ اس کے لئے جو ہندو مسلمانوں کی مشترک کوششیں ہندوستان میں ہو رہی تھیں اوس کو ہی غنیمت سمجھا گیا اور رہائی کے بعد ایک سال چھ ماہ کی مدت جو آپ کو ہندوستان میں رہنے کی ملی، اوس کو انھیں کوششوں میں صرف کیا۔

سوال: کیا حضرت شیخ الہندؒ کے علمی اور عملی امتیازات کے متعلق آپ کچھ فرمائیں گے؟

جواب: حضرت شیخ الہندؒ کے سفر حجاز کے وقت جس کی انتہا مالٹا کی قید پر ہوئی، احقر کی عمر کا اٹھارواں سال تھا اور تعلیم متوسط کتابوں تک تھی۔ حضرت سے بلاواسطہ علمی استفادہ کا کوئی موقع نہ تھا۔ اس لئے میں طفل مکتب حضرتؒ کی علمی، عملی خصوصیات و امتیازات کے متعلق کیا کہہ سکتا ہوں۔

بقیہ: اشرف دیو صفحہ نمبر ۱۳۲۹ پر

شبِ قدر

حضرتؒ کی آخری نشری تقریر

"حضرتؒ" کی وفات سے تقریباً ایک ماہ قبل ریڈیو پاکستان سے فرمائش کی گئی کہ شب قدر کے بارے میں ایک تقریر ریڈیو سے نشر فرمائیں۔ احقر نے ریڈیو کے حضرات سے عذر کیا کہ حضرتؒ علیل ہیں اور تقریر میں بار ہوگا۔ لیکن جب انہوں نے براہ راست اصرار کیا تو حضرتؒ نے قبول فرما لیا اور خود اپنے دستِ مبارک سے بستر علالت پر ہی یہ تقریر لکھی اور بستر ہی سے ریکارڈ کرائی۔ کسے معلوم تھا کہ یہ حضرتؒ کی نہ صرف آخری نشری تقریر ہے، بلکہ اس کے بعد کوئی مضمون آپ کے قلم سے نہیں نکلا۔ اس تقریر کے ریڈیو سے نشر ہونے کل تیرہ دن بعد حضرتؒ اپنے مالک حقیقی سے جا ملے۔ (م ت ع)

اللہ تعالیٰ جل شانہٗ نے حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی اس آخری امت کو بڑی رحمتوں اور نعمتوں سے نوازا ہے۔ دوسری ساری امتوں کے مقابلہ میں اس امت کو کچھ خصوصی امتیازات عطا فرمائے ہیں۔

انہیں امتیازی فضائل میں سے شب قدر بھی ہے جو سال بھر میں ایک مرتبہ آتی ہے اور صرف اس رات کو عبادات میں مشغول کر دینے والوں کو ایک ہزار مہینے کی خالص عبادت سے بھی زیادہ ثواب ملتا ہے۔ قرآن کریم کا ارشاد ہے لیلة القدر خیر من الف شهر (یعنی ایک شب قدر بہتر ہے ایک ہزار مہینے سے) قرآن کریم نے اس رات کی عبادت کو ایک ہزار مہینے کی عبادت کے برابر نہیں، بلکہ اس سے بھی زیادہ بہتر فرمایا ہے اور اس میں زیادت کی کوئی حد مقرر

نہیں فرمائی کہ کتنا زیادہ۔ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے کیا بعید ہے کہ وہ اس کو ایک ہزار سال کے برابر بنا دیں۔ امت مرحومہ پر اس خاص امتیازی انعام کی ایک وجہ حدیث شریف میں یہ آئی ہے کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پچھلی امتوں کی کچھ طویل طویل عمریں بطور وحی دکھلائی گئیں جو تاریخی روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ سینکڑوں سال کی ہوتی تھیں۔ اس کے بالمقابل یہ بھی معلوم ہوا کہ آپ کی امت کی عمریں ان کے مقابل بہت کم ہیں۔ جیسا کہ ایک حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ میری امت کی عمریں ساٹھ اور ستر کے درمیان ہوں گی۔ اس واقعہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب مبارک پر یہ اثر کیا کہ اس حساب سے تو میری امت اعمال صالحہ اور عبادات میں سب سے کم رہ جائے گی۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کے قلب مبارک سے اس غم کو دور کرنے کے لئے لیلۃ القدر کی آیت نازل فرما کر بتلا دیا کہ آپ فکر نہ کریں۔ اس امت کے عمل کی قیمت بہت بڑھا دی گئی ہے کہ صرف ایک رات میں ایک ہزار مہینہ کی عبادت سے زیادہ ثواب حاصل کر سکتے ہیں۔ تاکہ دوسری امتوں سے پیچھے نہ رہ جائے۔ یہ حدیث مؤطا میں امام مالکؒ نے اور ترغیب و ترہیب میں حافظ منذریؒ نے نقل کی ہے۔

شب قدر کو شب قدر کہنے کی وجہ یہ ہے کہ تمام مخلوقات کی عمریں اور رزق اور بھلے برے مختلف قسم کے حالات جو روز ازل سے لوح محفوظ میں لکھے ہوئے ہیں۔ اس رات میں اس سال کا پورا بجٹ اور سب کی مقداریں فرشتوں کے حوالہ کر دی جاتی ہیں کہ کس کی کتنی عمر ہوگی، کتنا رزق ملے گا، وہ کیسے کیسے حالات سے گذرے گا۔ سورہ دخان کی آیت میں حق تعالیٰ نے اس رات کو لیلہ مبارکہ کے نام سے ارشاد فرمایا ہے اور اس کے ساتھ یہ بھی ارشاد ہے فیھا یفرق کل امر حکیم امرا من عندنا یعنی اس رات میں طے کر دیا جائے گا ہر کام حکمت والا ہماری طرف سے۔ اس رات کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ نزول قرآن اس رات میں ہوا اور درمنثور کی ایک روایت میں ہے کہ اسی رات میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو آسمان پر اٹھایا گیا۔ سنن بیہقی میں حضرت انسؓ کے واسطے سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد منقول ہے کہ شب قدر میں جبریل امین فرشتوں کے ایک گروہ کے ساتھ زمین پر اترتے ہیں۔ اور جس شخص کو ذکر و عبادات میں مشغول دیکھتے ہیں اس کے لئے رحمت کی دعا کرتے ہیں۔

صحیح بخاری میں حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا من قام لیلۃ القدر ایمانا و احتسابا غفر لہ ما تقدم من ذنبہ۔ (یعنی جس شخص نے قیام کیا

شب قدر میں ایمان کے ساتھ، خالص ثواب کی نیت سے کہ کوئی دنیوی غرض نہیں، اس کے سب پچھلے گناہ معاف ہو گئے۔ قیام کرنے سے مراد کسی عبادت میں لگنا ہے، جس میں نماز پڑھنا بھی داخل ہے اور ذکر و تلاوت وغیرہ بھی۔

گناہوں کی معافی کے متعلق شریعت کا اصل ضابطہ یہ ہے کہ صغیرہ گناہ، تو نفلی عبادات اور دوسری عبادات اور دوسری نیکیوں کے ذریعہ بھی خود بخود معاف ہو جاتے ہیں مگر کبیرہ گناہ بغیر توبہ کے معاف نہیں ہوتے اس حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صغیرہ کی معافی کی قید نہیں لگائی بلکہ عام رکھا ہے۔ اس میں اشارہ اس طرف ہے کہ اول تو مومن سے گناہ کبیرہ میں مبتلا ہونا بہت بعید ہے اور اگر ہو بھی گیا تو مومن کو اس وقت تک چین نہیں آتا جب تک توبہ نہ کرلے اور فرض کرو کہ پہلے غفلت ہی ہوتی رہی اب جبکہ شب قدر میں وہ اللہ کے سامنے کھڑا ہے اور اس سے اپنی مغفرت کی دعا اور دوسری مرادیں مانگ رہا ہے تو یقیناً اس کو اپنے پچھلے کئے ہوئے گناہوں پر ندامت و شرمندگی بھی ہوگی اور آئندہ ان سے بچے رہنے کا پختہ ارادہ بھی کرے گا۔ اسی کا نام توبہ ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ شب قدر کی عبادت کے لئے پچھلے گناہوں سے توبہ لازم و ملزوم ہیں۔

ایک حدیث میں ہے کہ حضرت صدیقہ عائشہؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا کہ اگر مجھے معلوم ہو جائے کہ آج شب قدر ہے تو میں کیا دعا مانگوں۔ آپ نے فرمایا کہ یہ دعا کرو: اللھم انک عفو تحب العفو فاعف عنی۔ یعنی اے میرے معبود آپ بہت معاف کرنے والے ہیں اور معاف کرنے کو پسند کرتے ہیں۔ میرے بھی گناہوں کو معاف فرما۔ اس حدیث میں شب قدر کی سب سے بڑی عبادت توبہ ہی کو قرار دیا ہے اس لئے ہر مسلمان پر لازم ہے کہ اس مبارک رات میں اپنے سب پچھلے گناہوں سے توبہ کرے اور معافی مانگنے کا پورا اہتمام کرے۔

خلاصہ یہ ہے کہ شب قدر اس امت کے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے امتیازی انعام ہے کہ ایک رات کی عبادت کا ثواب ایک ہزار مہینے کے برابر نہیں بلکہ اس سے بھی زیادہ کر دیا ہے۔ ایک ہزار مہینے کے تراسی برس چار ماہ ہوتے ہیں۔ پھر اس میں رحمت کے فرشتوں کا نزول اور عبادت گزار کے لئے رحمت کی دعائیں بھی ہیں اور تمام گناہوں سے مغفرت کا وعدہ بھی اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے منادی بھی ہوتی ہے کہ ہم سے جو دعا مانگی جائے گی قبول کریں گے۔

یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص شب قدر کی برکات سے محروم رہا وہ ہر بھلائی سے محروم رہا اور اس بھلائی سے صرف وہی شخص محروم ہوگا جو بڑا ہی بدنصیب ہو۔ یہ روایت ابن ماجہ نے حضرت انسؓ سے نقل کی ہے۔

اب ایک سوال باقی رہ گیا کہ مبارک رات کون سی رات ہے۔ اس کے متعلق اتنی بات تو خود قرآن کریم نے متعین کردی ہے کہ یہ رات ماہ رمضان کی کوئی رات ہوگی۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حدیث میں اس کی مزید توضیح وتعیین بذریعہ وحی الٰہی اس طرح فرمائی ہے کہ مشکوٰۃ میں بحوالہ بخاری شریف حضرت صدیقہ عائشہؓ کی حدیث ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ شب قدر کو رمضان المبارک کے آخری عشرہ کی طاق راتوں میں تلاش کرو۔ یعنی اکیسں، تئیس، پچیس، ستائیس، انتیس ان راتوں میں سے کوئی رات شب قدر ہوگی۔ اور بعض روایات میں ستائیسویں شب کے متعلق مزید رجحان ثابت ہوتا ہے۔ یہ بات یاد رکھنا چاہیے کہ اسلامی احکام میں اکیسویں شب وہ کہلائے گی جو ۲۰ تاریخ کے بعد اور ۲۱ تاریخ سے پہلے آئے۔ اسی طرح ۲۳، ۲۵ وغیرہ کو سمجھئے اللہ تعالیٰ کے احکام کی حکمتوں کو پورا کون دریافت کرسکتا ہے۔ یہاں بالتصریح کسی ایک رات کو متعین کرکے نہ بتلانے اور عشرہ اخیرہ رمضان کی پانچ طاق راتوں میں دائر کردیتے میں ایک حکمت یہ بھی ہے کہ انسان کے شوق عبادت اور فکر آخرت کی آزمائش ہو کہ شب قدر کی برکات حاصل کرنے کے لئے ان پانچوں راتوں میں بیدار رہ کر عبادت کی کوشش کرے۔ غور کیجئے کہ سرکاری اور نجی ملازمتوں میں کتنی ملازمتیں ایسی ہیں کہ ان میں ملازم کو پوری رات بیدار رہنا پڑتا ہے۔ ہوائی جہازوں کے پائلٹ، ریلوں کے چلانے والے، رات کی شفٹوں میں کام کرنے والے، ملوں اور کارخانوں کے مزدور فانی فوائد اور چند ٹکوں کی خاطر کتنی راتیں جاگ کر گذارتے ہیں۔ اگر اللہ کے نیک بندے سال بھر میں صرف پانچ راتیں اتنی بڑی نعمت کے لئے جاگیں کہ تراسی سال چار ماہ کی عبادت کا ثواب ملے گا۔ فرشتوں کی دعائیں ملیں گی، سب پچھلے گناہوں کی مغفرت حاصل ہوگی، دین و دنیا کی سب مرادیں حاصل ہوں گی تو کیا مشکل کام ہے۔ اور قربان جائیے حق تعالیٰ کے فضل و انعام کے کہ ان راتوں میں بھی تمام رات جاگنا شرط نہیں، کچھ سو بھی رہے تو اس مقصد میں خلل نہیں آتا۔

اور حضرت سعید بن مسیبؓ کی روایت تو یہ ہے کہ جو شخص اسی رات میں عشاء کی نماز جماعت سے

پڑھے پھر صبح کی نماز جماعت سے پڑھ لی وہ بھی لیلۃ القدر کی برکات سے محروم نہیں رہتا۔ پھر رات غروب آفتاب کے بعد سے شروع ہو جاتی ہے۔ جو لوگ بیمار یا بہت کمزور یا کم ہمت ہوں اور مغرب کے بعد سے ہی عبادت میں لگ جائیں۔ عشاء کی نماز جماعت سے پڑھیں تو وہ بھی شب قدر کی خیر و برکت سے محروم نہیں ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو ان راتوں میں جاگنے اور عبادت کرنے کی توفیق عطا فرما دیں۔

یہ بات سب مسلمانوں کو یاد رکھنی چاہیے کہ ایسی خاص راتوں میں اپنے اور اپنے متعلقین کے لئے دعا تو سبھی کریں گے ضرورت اس کی ہے کہ پورے ملک پاکستان بلکہ عالم اسلام کے سب مسلمانوں کے لئے دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ ان کو تمام ظاہری اور باطنی فتنوں اور سب پریشانیوں سے محفوظ رکھیں وآخر دعوانا الحمد للہ رب العالمین۔

محمد شفیع ۲۰ رمضان ۱۳۹۶ھ

بقیہ : انٹرویو

البتہ یہ میں نے خود دیکھا کہ اطرافِ ملک اور بیرونِ ملک سے حضرت کے درس کی شہرت سن کر طالبانِ علم ا دیوبند آتے تھے اور صرف طلباء ہی نہیں بلکہ بڑے بڑے علماء بھی استفادہ کے لئے آتے تھے، جس سے معلوم ہوتا تھا کہ آپ ایک یکتائی روزگار عالم ہیں پھر حضرت کے شاگردوں میں ایسے اکابر علماء کا ایک طویل سلسلہ ہے، جن کا علم و فضل پوری دنیا میں معروف و مشہور ہے۔

حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ۔

حکیم الامت سیدی حضرت مولانا اشرف علی تھانوی۔

حجۃ الاسلام سیدی حضرت مولانا محمد انور شاہ کشمیری۔

حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب۔

شیخ الاسلام حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی جیسے آفتاب و ماہتاب آپ کے شاگرد ہیں۔ جن سے دنیا میں رشد و ہدایت کی نہریں جاری ہوئیں۔

ہم جیسے ناقص الاستعداد حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ اسلام علمی اور عملی مقام بلند کو ان کے شاگردوں ہی کے ذریعہ پہچان سکتے ہیں۔

حضرتؒ کا سفرنامہ شام

مکاتیب کے آئینے میں

"حضرت مفتی اعظمؒ نے ۱۹۵۶ء میں مؤتمر عالم اسلامی کی دعوت پر شام، اردن اور لبنان کا سفر کیا تھا۔ اس وقت کے چند خطوط جو آپ نے گھر والوں کو لکھے ذیل میں پیش خدمت ہیں۔

برخوردار عزیز محمد زکی سلمہٗ،

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ۔ بندہ عاجز بعون اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ ۱۵ ذیقعدہ ۷۵ھ مطابق ۱۵ جون ۵۶ء کی شام کو بعد العشاء تقریباً ۱۰ بجے کراچی کے شہر سے ایروڈروم پر گیا۔ تمہارے سب بھائی اور عزیز ہوائی اڈہ پر ساتھ تھے۔ نظریں تمہیں اس مجمع میں ڈھونڈتی تھیں۔ خصوصاً اس مرتبہ تمہاری ٹیلیفون کی گفتگو اور خطوط سے میرے اس سفر کا خاص اثر ظاہر ہو رہا تھا اس لئے بھی تعلق خاطر رہا۔ بالآخر طیارہ بجائے ۱۲ بجے کے ایک بجے یہاں سے روانہ ہوا اور ۵ بجے بحرین میں اترا۔ یہاں چائے پی اور نماز صبح ادا کی۔ ۷ بجے پھر جہاز بیروت کے لئے روانہ ہوا۔ بحرین تک کا سفر کچھ نیا نہ تھا۔ پہلے بھی جدہ جاتے ہوئے یہ راستہ طے کیا تھا۔ مگر اس مرتبہ بحرین میں وہ گرمی محسوس نہیں ہوئی جو پچھلی مرتبہ میں ہوا کرتی تھی۔ بحرین کے بعد جہاز نے شمال مغرب کا راستہ اختیار کیا۔ کچھ دیر دریا پر اڑتا رہا، اس کے بعد صحرا پر سفر ہوتا رہا۔ کہیں دور دور بستی کے آثار نہ تھے۔ حدود شام میں داخل ہونے کے بعد کچھ سبزی اور بستیاں نظر آئیں۔ گیارہ بجے طیارہ بیروت اترا۔ یہاں پاکستانی لیگیشن کے افسر جعفری صاحب مع اپنے عملہ کے اور کچھ لبنانی حکومت کے آفیسر اور کچھ دمشق سے استقبال آنے والے حضرات موجود تھے۔ ایک گھنٹہ تقریباً یہاں کے مطار (ہوائی اڈہ) پر قیام رہا۔ پھر اس کے متصل بیروت میں ایک جماعت عبادالرحمٰن کے نام سے قائم ہے۔ اس کے رکن حوری صاحب

کے مکان پر ایک گھنٹہ قیام رہا۔ یہاں کپڑے بدلے۔ ہماری گھڑی کے اعتبار سے اس وقت ایک بجا تھا مگر یہاں کا وقت ۲ گھنٹے آگے ہے۔ اس لئے اپنی گھڑی یہاں کے مطابق کر کے گیارہ پر کردی۔ یہاں کے ۲ بجے بیروت سے دمشق کے لئے موٹر پر روانہ ہوئے۔ لبنان اور سوریہ کی سرحد سے استقبال کرنے والے اور کچھ مؤتمر کے اجلاس میں جانے والے حضرات سے ملاقاتیں شروع ہوئیں۔ ایک بجے کے قریب موٹر شہر دمشق کے قریب پہنچا۔ جہاں ایک طرف جبل قاسیون صنوبر کے درختوں سے چھپا ہوا اور جگہ جگہ چشموں اور نہروں سے بھرا ہوا اور دوسری طرف اسی طرح کا ایک دوسرا پہاڑ ہے۔ اس مقام کو یہاں ربوہ کہا جاتا ہے اور مشہور یہ ہے کہ قرآن کریم میں جو آیا ہے جس ربوۃ ذات قرار ومعین وہ یہی جگہ ہے۔ اس کے قریب ایک مقام غوطہ کے نام سے ہے یہ بھی باغات اور درختوں سے چھپا ہوا۔ نہروں اور چشموں سے بھرا ہوا ایک پہاڑ ہے جس پر مقامات حریری میں ایک مقامہ لکھا گیا ہے۔ شہر بیروت سے لے کر یہاں تک راستہ میں بھی ایسے ہی دلکش مناظر ہیں۔ تمام راستہ میں پہاڑوں کے عجیب وغریب مناظر ہیں۔ عام طور پر صنوبر کے درخت ہیں جن کا پھل چلغوزہ ہے۔ ہم ربوہ پر پہنچے تو مؤتمر کے ذمہ دار حضرات مولانا سعید رمضان معروف الدوالیبی جو پہلے یہاں کے وزیر اعظم تھے اور بعض دوسرے وزراء اور علمائے کرام کی بڑی جماعت جن میں شیخ امجد زاوی وغیرہ پہلے سے معروف تھے استقبال کے لئے تشریف لائے۔ ان کے ساتھ شہر دمشق میں داخل ہوئے۔ سمیر ہوٹل میں منجانب مؤتمر قیام کا انتظام تھا اس میں مقیم ہو گئے۔ یہاں کے ہوٹل نہایت شاندار، بارونق اور پرفضا ہیں۔ کراچی کا بڑے سے بڑا ہوٹل اس کے مقابلہ میں کچھ نہیں۔ کراچی کی زینت تکلفات مصنوعی کا نتیجہ ہیں اور یہاں کے شہر کی زینت قدرتی بھی ہے اور عمارات بھی شاندار مثل کراچی کے ہیں۔ یہاں کے کھانے اور پھل بھی نہایت بہتر ہیں، جواب سے پہلے کہیں نہیں پائے۔ کھانوں کی قسمیں اکثر اپنے بلاد سے ملتی جلتی ہیں۔

مؤتمر کا اجلاس ۱۱ ذی قعدہ سہ شنبہ کی صبح سے شروع ہو چکا تھا۔ ہم ظہر کے وقت پہنچے۔ کھانے پر چند حضرات نے بطور شکریہ تقریریں کیں جن میں یہاں کے وزیر عدل مصطفیٰ زرقا کی تقریر اہم تھی۔ انڈونیشیا کے نمائندے ڈاکٹر ناصر جو پہلے وہاں وزیر اعظم بھی رہے ہیں، انہوں نے عربی میں جوابی تقریر اپنے ایک نمائندہ سے کرائی۔ کھانے سے فارغ ہو کر کچھ آرام کے لئے وقت ملا۔ مگر ہمیں دوشنبہ کا تمام دن ویزا اور ایکسچینج کے چکر میں اس طرح گذرا تھا کہ ایک منٹ کی مہلت نہ ملی۔ پھر رات کے ایک بجے تک

ایروڈرم پر طیارہ کے انتظار میں گذری۔ صبح سے پہلے طیارہ بحرین اتر گیا۔ اسلئے رات میں بھی کچھ آرام نہ ملا۔ تھا۔ اس وقت بدن تو تکان سے چور چور ہو چکا تھا۔ مگر نیند اس وقت بھی نہ آئی۔ ۵ بجے شام سے مؤتمر کا اجلاس ہوا اس میں شریک ہوتے۔ سات بجے تک یہ اجلاس رہا۔ نماز مغرب سے فارغ ہو کر ۸ بجے سے دوسرا اجلاس یہاں کی یونیورسٹی میں تھا۔ اس اجلاس میں ہر ملک کے نمائندہ کی مختصر تقریروں کا سلسلہ چلا جو رات کے بارہ بجے تک رہا۔ اس وقت نیند کا یہ عالم کہ کرسی سے گرا جاتا تھا۔ مگر یہاں بیٹھنے پر مجبور رہتا۔ بارہ بجے اجلاس ختم کر کے کھانے اور پھر نماز عشا سے فارغ ہوتے ہوتے دو بج گئے۔ اس وقت سونے کا موقع ملا۔ یہ سب تعب ہوا لیکن الحمدللہ صحت پر کوئی ناگوار اثر نہیں ہوا۔ صبح کو ناشتہ کے بعد آٹھ بجے سے مؤتمر کا اجلاس شروع ہو کر بارہ بجے تک چلا۔ پھر کھانے پر اجتماع ہوا۔ یہاں عرب کا یہ رواج عام ہے کہ کھانا بھی ایک مستقل جلسہ ہوتا ہے۔ کھانے کے بعد مختلف لوگوں کی تقریریں ہوتی ہیں۔ آج اس موقعہ پر میری بھی ایک مختصر عربی میں تقریر ہوئی۔ پھر شام کے ۵ بجے سے رات تک یہی سلسلہ اجلاس کا چلا۔ ۱۰ر ذیقعدہ ۰۵ھ ۹ ۲۱ر جون ۵۲ء کو پھر شام ۸ بجے سے ۱۱ بجے تک اجلاس رہا۔

میں آخر اجلاس سے اٹھ کر مدینہ طیبہ کے لئے ٹکٹ حاصل کرنے کے واسطے سید عبدالحمید الخطیب صاحب کو ساتھ لے کر خطوط سعودیہ میں چلا گیا تھا۔ ہنوز ٹکٹ کا انتظام نہ ہوا۔ پھر خطیب صاحب کے ساتھ ان کے اپنے مکان پر جو ربوہ میں نیا بنایا ہے، حاضر ہوا۔ مکان کے اندر سے نہر چل رہی ہے جابجا فوارے لگے ہوئے ہیں۔ اس کے بعد دوپہر کا کھانا جمعیۃ غرا کی طرف سے یہاں کے ایک تفریحی ہوٹل منتزہ الفردوس میں تھا۔ یہ ہوٹل ایسا ہے جیسا کراچی میں بیچ لگژری ہوٹل ہے۔ مگر اس کی قدرتی رعنائی اور دلفریب باغات ہیں منظر سے بیچ لگژری کو کوئی مناسبت نہیں۔ اسی ربوہ کے پہاڑ پر واقع ہے۔ باغات ہی باغات ہیں۔ چشمے اور نہریں ہیں اور جابجا فوارے ہیں۔ اس دعوت میں حکومت سوریہ کے وزیر اعظم بھی شریک تھے۔ کھانے سے فارغ ہو کر ظہر کی نماز ادا کی۔ پھر آرام کیا شام کے ۵ بجے سے پھر اجلاس تھا جو ۸½ پر ختم ہوا۔ نو بجے صدر اسمبلی کی طرف سے اوریا ہوٹل میں دعوت تھی۔ شاہی طرح کی مہمانی رہی۔ گیارہ بجے فراغت ہوئی۔ آج جمعہ کا روز ہے۔ مؤتمر میں آئے ہوئے علما اطراف میں سے ایک متقی عالم عبدالفتاح غدہ حلب کے رہنے والے ہیں۔ یہ آج صبح

تشریف لائے۔ ان کی ساتھ دمشق کی مشرقی جانب میں جو اکابر کے مزارات ہیں ان کی زیارت کے لئے جانا ہوا۔ ان میں سے ایک حضرت بلال حبشی رضی اللہ عنہ کا مزار ہے۔ دوسرے اوس بن ثقفی صحابی کا، ابن قیم علامہ شامی اور صاحب در المختار علامہ علاؤ الدین کے مزارات بھی ایک ہی جگہ ہیں، ان کی زیارت نصیب ہوئی۔ ابھی ابھی وہاں سے آکر یہ خط لکھا ہے۔ اب جلسے میں جانے کی طیاری ہے اپنی تجویز یہ ہے کہ ۳۰ جون کو یہاں کا اجلاس ختم کر کے بیت المقدس اور دوسرے مقامات مقدسہ کی طرف جانا ہے۔ یہاں سے تقریباً ۴ جولائی تک واپسی ہوگی۔ فکر یہ ہے کہ ۴ یا ۵ جولائی تک کے لئے مدینہ کا ٹکٹ مل جائے۔ مگر ہنوز کوئی انتظام نہیں ہوا۔ ۵ جولائی کو جہاز جانے والا ہے۔ خدا کرے اس میں انتظام ہو جائے۔ مکہ معظمہ میں عبدالرزاق معلم کو اور ان کی معرفت عزیز شفقت علی کو خط لکھ دیا ہے کہ وہ بھی ۵ جولائی مدینہ طیبہ پہنچ جائیں۔ یہ اپنی تجویز ہے آگے جو اللہ تعالیٰ کو منظور ہے میں نے اس خط میں گویا اس وقت تک سفرنامہ لکھ دیا ہے۔ اس کی ایک نقل فوراً کراچی بھیج دیں کیونکہ سب کو علیحدہ علیحدہ تفصیلات لکھنا مشکل ہے۔ اور رفیع سلمہ کو تقاضہ لکھیں کہ یہ خط محفوظ رکھیں۔ والسلام

"محمد شفیع"

یوم الجمعہ ۲۰ ذیقعدہ ۸۵ھ، ۳۰ جون ۵۹ء

برخورداران عزیز محمد رضی و ولی و رفیع و تقی و مولوی نور احمد و شریف حسین جملہ عزیزان

السلام علیکم و رحمۃ اللہ۔ یہاں پہونچ کر اگلے ہی روز ایک مفصل خط تمہارے نام لکھا تھا۔ اور آج ایک مفصل سفرنامہ محمد زکی سلمہ کے نام لاہور کے لئے لکھا ہے جس میں آج قبل الجمعہ تک کی تفصیلات درج ہیں۔ یہ خط لاہور سے محمد زکی تمہارے پاس بھی بھیجیں گے۔ آج یہ معلوم ہوا کہ دمشق سے کراچی جانے والی ڈاک شنبہ اور شنبہ اور سہ شنبہ کو نکلتی ہے۔ اس لئے غالباً میرا پہلا خط بھی ابھی تک یہیں ڈاک میں پڑا ہوگا۔ کل انشاء اللہ روانہ ہوگا اس لئے مناسب معلوم ہوا کہ آج دوسرا خط لکھ دوں۔ سہ شنبہ سے صبح جمعہ تک کا سفرنامہ کو محمد زکی سلمہ کے خط میں لکھ چکا ہوں۔ وہاں سے پہونچے گا۔ جی چاہے تو محفوظ رکھیں۔ اخبارات میں شائع نہ کریں بجز اس مختصر خبر کے جو آخر خط میں لکھوں گا۔

آج صبح مؤتمر کا اجلاس جمعہ کی وجہ سے ۱۰ بجے بند کر دیا گیا۔ یہاں جمعہ بارہ بجے ہوتا ہے۔ ساڑھے گیارہ بجے جامع اموی میں پہلے پہل حاضری ہوئی جس کو جامع دمشق بھی کہا جاتا ہے یہ اصل میں تعمیر اسلام سے پہلے کی ہے۔ کوئی عبادت گاہ کسی امت کی پہلے سے تھی حضرت داؤد علیہ السلام

کے بعض آثار یہاں بتلائے جاتے ہیں۔ حضرت زکریا علیہ السلام کا مزار مسجد کے اندر ہے۔ مسجد کے شمال میں شہدائے کربلا کے سر مدفون ہیں۔ اس مسجد کی تعمیر زمانہ اسلام میں ولید ابن عبدالملک کی طرف منسوب ہے۔ اس کو جامع کی شکل شاید اسی وقت دی گئی اور اسوقت سے تقریباً آج تک خلفا و ملوک کا گہوارہ رہی۔ اس کے عظیم الشان منبران لوگوں کی ایک یادگار ہے۔ جمعہ کا خطبہ سید رضان نے دیا۔ نماز جمعہ کے بعد مراکش، الجزائر کے لوگوں نے تقریریں کیں۔ یہاں سے فارغ ہوکر جلسہ گاہ میں پہونچے۔ یہیں کھانے کا انتظام تھا۔ کھانے سے فراغت کے بعد جلسہ شروع ہوا۔ ایک گھنٹہ کے بعد نیند کے غلبہ کی وجہ سے میں جلسہ چھوڑ کر آرام گاہ پہونچ گیا۔ عصر تک آرام کیا۔ بعد عصر پھر جلسہ میں حاضر ہوا۔ مغرب تک اجلاس رہا۔ بعد مغرب سید عبدالحمید خطیب سابق سفیر سعودی پاکستان کے مکان پر دعوت تھی وہاں گئے۔ خطیب صاحب نے یہ نیا مکان ربوہ کے ایک ایسے پر فضا مقام پر بنایا ہے کہ دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ نہر بردہ ان کے مکان کے نیچے سے گذرتی ہے اور اس نہر کی شاخیں گھر کے کمروں کے نیچے سے مکان کے اندر ایک آبشار کی صورت میں لائی گئی ہیں۔ پانی اتنا سرد ہے کہ عشا کا وضو اس پانی سے کرنا دشوار ہوگیا۔ سردی کی وجہ سے چادر کی ضرورت محسوس ہونے لگی۔ کھانے سے فراغت کے بعد خطیب صاحب نے ایک خطبہ دیا۔ گیارہ بجے شب واپس آکر آرام کیا۔ اس وقت صبح کے ساڑھے آٹھ بجے ہیں۔ جلسہ میں جانا ہے چونکہ آج پاکستان کو جا رہی ہے۔ اس لئے یہ خط جلدی میں پورا کر رہا ہوں۔ آج اجلاس مؤتمر ختم ہو جائے گا اور کل انشاءاللہ دمشق سے فلسطین بیت المقدس کی طرف جائیں گے۔

تحقیق کرنے پر یہ معلوم ہوا کہ یہاں سے مدینہ کا ٹکٹ نہیں ملتا بلکہ صرف جدہ کا ملتا ہے۔ اس لئے شاید ہمیں یہ کرنا پڑے کہ ۵ تاریخ جولائی کو یہاں سے جدہ پہنچیں۔ وہاں سے مدینہ آئیں۔ برخوردار شفقت کے رہتے اگر یہ خط مل جائے تو ان کو بتلا دیں کہ مدینہ طیبہ جانے سے پہلے حجاج منزل جدہ میں حکیم نعیم صاحب سے ہمارے متعلق دریافت کرلیں کہ یہاں آگئے ہیں یا نہیں۔ بہت ممکن ہے کہ ہم سب جدہ میں جمع ہو جائیں اور وہاں سے مدینہ طیبہ کا سفر بھی ساتھ ہو۔ بلکہ مناسب یہ ہے کہ مدینہ طیبہ جانے کے لئے جدہ میں وہ بھی اپنا قیام حجاج منزل میں رکھیں۔ ہم بھی اگر سیدھے جدہ پہونچے تو حجاج منزل ہی میں اتر کر مدینہ طیبہ جانے کا انتظام کریں گے۔

میں یہ تفصیلی خطوط آپ سب اور خصوصاً والدہ صاحبہ اور تمہاری والدہ کے اطمینان کے لئے لکھتا ہوں اور یہ کہ سفرنامہ بھی محفوظ ہو جاتے۔

یہاں کے پھل اور کھانے بھی اتنی اقسام و اجناس کے ہیں کہ شمار مشکل ہے۔ جو پھل اور کھانے ہماری طرف معروف ہیں وہ بھی یہاں نہایت نفیس اور بہتر ہیں۔ اس کو جنۃ الارض کہا جائے تو مبالغہ نہیں۔ اس خط میں جتنا جزء سفرنامہ ہے اس کو نقل کر کے محمد زکی سلمہٗ کے پاس بھی بھیج دیں تو بہتر ہے۔ والسلام

بندہ محمد شفیع عفی عنہ یوم خمیس ۳۱ رجون ۵۶ء

محمد شفیع من عمان (الاردن) صبحۃ یوم الاثنین ۲ رجولائی ۵۶ء

عزیز محترم مولوی نور احمد صاحب و محمد رضی احمد رفیع المولی محمد تقی سلمہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ۔ صبح یوم السبت ۳۱ رجولائی تک کے حالات لکھ چکا ہوں۔ یوم السبت ۳۰ رجولائی کو ۱۲ بجے تک مؤتمر کا اجلاس رہا۔ اس کے بعد وزیر اعظم سوریہ کی طرف سے ایک ہوٹل میں دعوت تھی۔ وہاں ۲۔ بجے تک دعوت کا سلسلہ رہا۔ وزیر اعظم نے شرکاء مؤتمر کا خاص احترام کیا۔ یہاں کے کھانوں کے تکلفات کراچی سے زیادہ نظر آئے۔ ۲ بجے واپس آ کر تھوڑے سے آرام کے بعد پھر جلسہ میں شرکت کی جو عصر تک چلا۔ عصر کے بعد صدر مملکت کی طرف سے چائے کی دعوت تھی، وہاں گئے۔ صدر مملکت نے وزیر اعظم سے بھی زیادہ اصحاب مؤتمر کا احترام کیا۔ مغرب کی نماز وہیں ادا کی۔ صدر مملکت نے ایک بہترین تقریر کی، جس میں مؤتمر کے مقاصد کی بڑی حمایت تھی اور اسلامی مقاصد پر بہت مؤثر تقریر کی۔ پھر سب کے ساتھ نماز مغرب ادا کی۔ جوابی تقریر ڈاکٹر ناصر انڈونیشیا نے کی۔ بعد مغرب چائے کے نام سے ایک خاص طرح کا کھانا تھا۔ میں نے گرانی طبع کی وجہ سے کھانے میں شرکت نہیں کی۔ اس دعوت سے واپسی کے بعد پھر مؤتمر کا بقیہ اجلاس تھا جو نو بجے شب تک چلا۔ اس کے بعد جامع ونگیز جو ایک عظیم الشان جامع مسجد ہے مگر فرانس نے جنگ میں شہید کر دی تھی۔ اب ہنوز تعمیر جاری ہے۔ اس میں جلسہ عام منعقد ہوا۔ میں گیارہ بجے تک اس میں شرکت کر کے مستقر پر واپس آگیا۔ یہ جلسہ رات کے دو بجے تک چلا۔ میں آ کر سو گیا۔ صبح کی قرارداد یہ تھی کہ استاذ عبد الفتاح ابو غدہ حلبی کے ساتھ مفتی ابو الیسر مفتی سوریا کے مکان پر جانا تھا۔ یہ علامہ ابن عابدین شامی کے پوتے ہیں۔ علامہ ذی علم آدمی ہیں۔ ان سے اوس وقت ملاقات کا پروگرام تھا۔ مگر رات کو دیر تک جاگنے کے سبب ابو غدہ زر کے ٹیلیفون پر بتلایا کہ اس کام

کے لئے دوسرا وقت مقرر کریں گے۔ اب آگے پروگرام قدس کے لئے روانگی کا تھا۔ ۱۰ بجے دمشق سے قدس کے لئے ریل چلتی ہے، اس پر سوار ہونا تھا حکومت سوریہ نے اصحاب مؤتمر کے اعزاز میں یہ ریل کا پورا سفر آمد و رفت اپنے مصارف پر رکھا۔ اسٹیشن پر وزیر مواصلات اور دوسرے وزراء کو بھیجا۔ ہمیں پہونچنے میں تاخیر ہوئی تو آدھا گھنٹہ ریل کو لیٹ کیا اور احترام کے ساتھ ہمیں رخصت کیا۔ دمشق سے گاڑی روانہ ہوکر چھوٹے اسٹیشنوں سے گذرتی ہوئی ایک مقام پر پہونچی جس کو یہاں کے لوگ درعاء بولتے ہیں۔ تحقیق سے معلوم ہوا کہ یہ وہ مقام ہے جس کا ذکر حدیث میں بین اذرعات و بصریٰ کے نام سے آیا ہے۔ پھر تھی یہاں سے فاصلہ پر ایک دوسرا مقام ہے جہاں تک رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے عم محترم ابوطالب کے ساتھ زمانہ طفولیت میں تشریف لاکر واپس ہوئے تھے۔ درعا کے مقام پر اخوان المسلمین کے لوگوں کا خاصا اجتماع تھا۔ یہ لوگ بڑے اخلاص کے ساتھ فوری اطلاع ملنے پر شہر سے دوڑتے ہوئے ریل پر پہونچے۔ ملاقات ہوئی۔ یہاں سے رخصت ہوکر دوسرا بڑا اسٹیشن زرقا کا آیا۔ یہ ایک بڑا شہر ہے نہر زرقا کے اوپر واقع ہے۔ نہایت سرسبز و شاداب ہے۔ حدیث و تاریخ عین الزرقاء کا جو ذکر آتا ہے وہ غالباً یہی جگہ ہے۔ یہاں بھی اخوان کی ایک بڑی جماعت استقبال و ملاقات کے لئے آئی تھی۔ یہاں کے پہاڑوں سے فاسفورس نکل رہا ہے اور بہت بڑی مقدار میں روزانہ نکالا جاتا ہے۔ امریکہ ہی ان چیزوں کا ٹھیکہ دار ہے وہ لے جاتا ہے۔ زرقا سے آگے ایک اسٹیشن صبیحہ کا آیا۔ اس کے بعد عمان کا اسٹیشن آگیا۔ یہ نیا شہر بسایا گیا ہے۔ قدیم بستی مختصر تھی آج کل مملکت اردن کا دارالحکومت یہی ہے تقریباً ۹ بجے عمان پہونچکر یہاں پیلس ہوٹل میں قیام کیا۔ کھانے کے بعد آرام کیا۔ رات آرام سے گذاری۔ اس وقت ۸ بجے صبح کو رئیس مملکت اردن کے پاس جانے کی طیاری ہے۔ اونکی ملاقات کے بعد قدس کو روانگی بذریعہ موٹر ہوگی۔ ہم اپنا سامان درست کرکے رئیس مملکت کے یہاں جانے کے لیے طیار بیٹھے ہیں۔ اس فرصت میں یہ خط لکھ رہا ہوں۔ آج انشاءاللہ تعالیٰ ظہر کی نماز مسجد اقصیٰ میں پڑھیں گے اور اس کے بعد قدس کے دوسرے مقامات کی زیارت کرکے عصر کے بعد مقام خلیل الرحمٰن جائیں گے، جہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا مزار ہے اور اسکے بعد بیت اللحم مولد عیسیٰ علیہ السلام اور بحر لوط اور موسیٰ نبی مقامات کی زیارت کرکے فلسطین کے اس حصہ کو دیکھنے جائیں گے جہاں یہودیوں کا تغلب ہے۔ کل صبح ان تمام مقامات مقدسہ کی زیارت سے فارغ ہوکر نظام الاوقات کے مطابق کام ہوسکا تو انشاءاللہ دمشق کل شام

تک واپس چلے جائیں گے۔ایک روز دمشق میں قیام اور وہاں کی سیر اور بزرگوں سے ملاقات کے بعد انشاء اللہ تعالےٰ مدینہ طیبہ کو روانگی ہوگی۔

میں اپنے سفر کے مختصر حالات مسلسل لکھ رہا ہوں۔کوئی کسی کے نام اور کچھ کسی کے نام۔ مناسب یہ ہے کہ ان سب کو یکجا جمع کر لیا جائے۔آپ بھی یہ خط پڑھ کر محمد رفیع کو حوالہ کر دیں کہ پچھلے خطوط کے ساتھ محفوظ رکھے۔

میری طبیعت بحمداللہ اس وقت بالکل اچھی ہے اور ہر طرح راحت و آرام سے سفر ہو رہا ہے۔والدہ صاحبہ اور اپنی والدہ کا پورا اطمینان کر دیں۔والسلام "محمد شفیع"

۶۸۲

بندہ محمد شفیع از دمشق سوریہ

یوم الجمعہ ۲ ذیقعدہ ۷۵ھ، ۱۰ جولائی ۵۶ء

عزیزان محترمان سلمہم اللہ تعالیٰ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔میں اب تک آپ لوگوں کو اپنا مکمل سفرنامہ لکھتا رہا ہوں۔آخری خط عمان سے روانہ کیا تھا اتوار کا روز و شب عمان میں گذار کر دوشنبہ ۲ جولائی کی صبح کو ہم سب قدس کے لئے ٹیکسیوں پر روانہ ہوئے۔عمان تک تو سفر ریل کا تھا اور اس کا انتظام حکومت سوریہ نے کیا تھا۔عمان اردن کا دارالحکومت ہے۔ان لوگوں نے بھی اعضاء موتمر کا خاص اکرام کیا۔صبح آٹھ بجے بارہ ٹیکسیوں پر ہمارا قافلہ روانہ ہوا۔اردن کا علاقہ بھی سوریہ کی طرح نہایت سرسبز و شاداب پہاڑیوں سے گھرا ہوا ہے۔ہر طرف نہریں ہیں۔انجیر اور زیتون کے درختوں کی کثرت ہے۔تربوز نہایت اچھا ہوتا ہے۔خوبانیاں جن کو یہاں مشمش کہتے ہیں کراچی سے بڑی اور نہایت شیریں ہیں۔آلوچے بھی وہاں سے زیادہ شاداب اور شیریں ہے اور بھی مختلف قسم کے عمدہ پھل پائے جاتے ہیں۔دمشق اور اردن میں یہ چیزیں مشترک ہیں۔عمان سے روانہ ہو کر پہلے راستے میں ایک قصبہ صویلحیہ آیا۔چھوٹا سا قصبہ ہے اگر قدیم زمانہ کا معلوم ہوتا ہے۔اس کے بعد ایک بڑا شہر جو عمان کی طرح پورے پہاڑ پر نیچے سے اوپر ایک چادر کی طرح پھیلا ہوا ہے سامنے آیا۔اس کا نام سلط ہے۔یہ ترکوں کے زمانہ میں اس علاقہ کا دارالحکومت تھا۔جنگ عظیم ۱ اور ترکی خلافت کے زوال کے بعد جب ولایت شام کو چار حصوں میں تقسیم کر کے لبنان، سوریہ، اردن، فلسطین میں تقسیم کر دیا گیا اور پھر اردن کی حکومت

کو اس کی انگریز نوازی کے صلہ میں ایک چھوٹا حصہ مسجد اقصیٰ اور شہر قدس کا ایک جوڑ دیکر حکومت اردن کو دیا اور باقی شہر قدس اور فلسطین یہودیوں کے حوالہ کیا۔ اوس وقت سے اس کا دارالحکومت عمان ہوا۔ سلطنتی قیام نہیں ہوا۔ اس سے آگے بڑھے تو ہمارے سیارات کچھ پیچھے رہ گئے تھے ایک نہر کے کنارے سڑک پر ہوٹل تھا وہاں ٹھہر کر رفقا کا انتظار کیا۔ مختلف پھل خریدے اور کھائے۔ بہت ہی بہت شیریں تھے۔

یہاں سے آگے بڑھے تو ایک ایسی وادی سے گذر ہوا جس کا نام وادی شعیب تھا۔ حضرت شعیب علیہ السلام کی طرف منسوب ہے۔ یہ وادی کافی دور تک چلی۔ اس کے بعد نہر اردن آئی جس کے مشرق میں حکومت اردن کا علاقہ ہے اور اسی کی وجہ سے اوسکو شرق الاردن کہتے ہیں۔ نہر اردن وہی نہر ہے جس کا قرآن کریم میں جالوت وطالوت کے قصہ میں ذکر ہے۔ ان اللہ مبتلیکم ۔ نہر پار کرکے فلسطین کے اوس حصہ میں داخل ہوئے جو اب حکومت اردن کے تحت ہے۔ اس کا بڑا حصہ خشک پہاڑوں اور ریگستان سے گھرا ہوا ہے۔ اس میں سب سے پہلے شہر اریحا آیا جو دنیا کے قدیم ترین شہروں میں سے ہے۔ تورات وانجیل میں اس کا تذکرہ ہے۔ اس وقت بھی خاصا آباد ہے اس کے قریب مہاجرین فلسطین کی نوآبادی ہے۔

آج جمعہ کا دن ہے اور ہم مدینہ طیبہ کو جانے کو تیار بیٹھے ہیں۔ تھوڑی سی فرصت میں یہاں تک لکھ سکا تھا کہ اب ہوائی اڈہ پر جانے کا مطالبہ پہنچ گیا۔ اس لئے خط کو یہیں ختم کرکے مطار پر جا رہا ہوں۔ نو بجے ہیں۔ غالباً ایک بجے تک انشاءاللہ تعالیٰ مدینہ طیبہ پہونچ جائیں گے آپ سب کی خیریت اور حالات کا سخت انتظار ہے۔ انشاءاللہ مدینہ طیبہ پہونچ کر معلومات ہوں گی۔ والسلام

والدہ صاحبہ اور سب عزیزوں کو سلام و دعا۔ بندہ محمد شفیع عفی عنہ

مرتبہ: قاری فیوض الرحمٰن صاحب ایم اے

حضرتؒ کے نادر عربی قصائد

حضرت مفتئ اعظم قدس سرہٗ کے بیشتر عربی قصائد آپ کی عربی کتاب "نفحات" میں شائع ہوچکے ہیں، ذہن میں یہ تھا کہ اس کتاب میں حضرتؒ کا تمام تر عربی کلام آگیا ہے، لیکن ہمارے برادر محترم مولانا قاری فیوض الرحمٰن صاحب مدظلہم نے بڑی محنت و کاوش کر کے ماہنامہ "القاسم" اور ماہنامہ "المفتی" دیوبند کے قدیم فائلوں سے حضرتؒ کے وہ عربی قصائد جمع فرمائے ہیں جو "نفحات" میں شامل نہیں ہوسکے، یہ قصائد اہل ذوق کے لئے نادر تحفہ ہیں، اور خود حضرتؒ کی تازہ بیاض میں بھی محفوظ نہ رہے تھے، محترم مولانا قاری فیوض الرحمٰن صاحب ان قصائد کی دریافت پر ہم سب کے شکریہ کے مستحق ہیں، ذیل میں یہ قصائد ماہنامہ "القاسم" اور ماہنامہ "المفتی" کے ادارتی نوٹس کے ساتھ پیش خدمت ہیں:-

مرثیہ حضرت مولانا غلام رسول صاحب ہزارویؒ

"ذیل کی نظم مولوی محمد شفیع صاحب معین المدرسین دارالعلوم دیوبند نے بغرض اشاعت دفتر میں بھیجی ہے، اس میں بھی حضرت استاذ مولانا غلام رسول صاحب قدس سرہٗ کی وفات کا تذکرہ کیا ہے، ہم اس کو نہایت خوشی سے درج کرتے ہیں، اور امید کرتے ہیں کہ عربی علم ادب سے تعلق رکھنے والے حضرات جس طرح کہ مولانا غلام رسول صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے اوصاف سے واقف ہوں گے اسی طرح یہ بھی معلوم کرسکیں گے کہ علماء عربی علم ادب سے ناواقف نہیں ہوتے ہیں۔"

محمد اعزاز علی غفرلہٗ

هذا ما أنشدت في مرثية من ثوى بالتراب بعد ما فات الاقران والاتراب
الفاضل اليلمعي والكامل اللوذعي أستاذ أساتذة الهند مولانا وشيخنا المولوي

غلام رسول الملب الله ثراه وجعل الجنه مثواه، المدرس فی دار العلوم بدیوبند وقد توفی لتسع عشر مضین من محرم الحرام سنة ١٣٣٦ھ،

أَعُلْمًا نرى أم نرى انقلابًا ... فحيّر ناظرنا والّلبابا
نرى انقلب الدهر ظهرًا لبطن ... ولايتزايد الّا اضطرابا
فما للرياض رياض العلوم ... معطّلةً خاويات خرابا
كأنّ العنادل عُش القماری ... قد اعتاضت اليوم نسل غرابا
فانصت سجع الحمام ونغمُ ... العنادل واعتاض عنه النعابا
وما للعلوم وذیها نری فی ... جميعهم قلقًا واضطرابا
فما للشيوخ يضجّون ضجًّا ... وما للشباب فشقوا الثيابا
ومالی أرانی حزينًا عميدًا ... كئيبًا تری فی جفونی الربابا
اذا هاتفٌ صاح بی وهو ينعی ... كريم السجايا رضيًّا خطابا
نعی باسق الخلق حُرًّا كريمًا ... ملاذ الغريب اذا الشرّ نابا
حليمًا صفوحًا الزلات أحسبا ... به والعدى اذ عراه سبابا
غُلامَ الرَّسُولِ وَمَوْلَى الأنام ... رضی الفعال واحسن دابا
تَرَى صدره مرجعًا للعلوم ... يرى بعضها فيهم وصابا
أبيًّا زكيًّا جليلًا نبيلًا؟ ... اذا رتّه تلق فيه عجابا
قد اختار لله فی بدء ربعا ... نه هجرًا وطانه واغترابا
فيا من تغيب عنّا فأضحی ... صفیُّ النعيم علينا عذابا
وعُدنا حياری نقاسی الهموما ... مشوقين فی طلعة مُذْ غابا
نری شدّة الموت فی طيب عيش ... فما لذّ نوم ولا الطعم طابا
نبتْ كلُّ دارٍ بنا واجتوينا ... الأراضی من سهلها والصعابا
ويا من طلبنا منيلك فيضًا ... فأتعبنا كلّ تعبٍ طلابا
إلى من نلوذ إذا الجهل أبدی ... لنا ناجذيه وأحرق نابا
إلى من نلوذ إذا مغلقاتُ ... الفنون تُعيِّي لعقول جوابا
فهل راجعٌ أنت بعد أفول ... وهل رافعٌ عنك ذاك الحجابا

وَأَنَّ الرُّجُوعَ لِمَنْ قَدْ حَوَتْهُ ... اللُّحُودُ إِذَا الْجِسْمُ سَاوَى التُّرَابَا
فَيَا قَمَرًا كَيْفَ غِبْتَ لَيْلًا ... كَزَيْنِ الْبُدُورِ دُنُوَّهَا الْإِقْتِرَابَا
لِعَشْرٍ مَضَيْنَ وَسَبْعٍ آتِيَيْنَ ... عَلَيْهَا إِذَا الصُّبْحُ أَضْحَى قِرَابَا
وَلَمَّا الْتَمَسْتُ مِنَ الطَّبْعِ عَامَ ... الْوَفَاةِ وَقَلْبِي مِنَ الْحُزْنِ ذَابَا
أَجَابَ لَنَا وَنِعِمًّا أَجَابَا ... أَتَبْكُونَهُ وَهُوَ خَيْرٌ ثَوَابَا
إِلٰهِي وَيَا مَنْ إِلَيْكَ الْإِيَابُ ... عَدَ أَنْتُمْ إِنَّ عَلَيْكَ الْحِسَابَا
أَفِضْ مِنْ شَآبِيبِ فَضْلٍ عَمِيمٍ ... عَلَى الْقَبْرِ وَاجْعَلْهُ رَوْضًا رَبَابَا[1]

وانا العبد الضعیف المدعو بمحمد شفیع الدیوبندی
المتعلم بدار العلوم ، ۲۰ رصفر ۱۳۳۷ھ

رَاطِبُ الْعَرَبِ
یعنی قَصِیدَۃٌ نَعتِیَّہ

"یہ چند اشعار ہیں جو شوال ۱۳۵۳ھ میں حضرت مولانا محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند و مولانا عبدالکریم صاحب مفتی خانقاہ امدادیہ تھانہ بھون کے سفر حجاز کے لئے روانہ ہونے کے وقت بے ساختہ زبان پر آگئے تھے، ورنہ تقریباً سات برس ہوگئے ہیں کہ نظم و شعر کا سلسلہ متروک ہے، اور طبیعت کو اس سے مناسبت بھی نہیں رہی، ادبی ذوق کے لحاظ سے تو اہلِ علم کے سامنے پیش کرنے کے قابل نہیں، لیکن ذوقِ محبت کا حکم نرالا ہے" وہ بعض اوقات تلخ کو شیریں بنا دیتا ہے ؎

تفرد بالأحكام في اهله الهوىٰ

بندہ محمد شفیع غفرلہٗ

---

[1] مولانا محمد شفیع : مرثیہ عربی : التقریظ والتطنیب)، القاسم : دارالعلوم دیوبند، ربیع الاول ۱۳۳۷ھ ص ۴، و ربیع الثانی ۱۳۳۷ھ، ص ۱و۲،

بسم الله الرحمن الرحيم

يا واقفاً لوداعٍ وهو مختارُ ... ماذا وقوفك والأحباب قد ساروا
مالي أراك قرير العين جامدها ... وليس يبكيك أطلالٌ وآثارُ
ألا يحفك طبلٌ للرحيل ولا ... يهيج شوقك أذكارٌ وتذكارُ
ألا يهمك أن الركب مرتحلٌ ... وحملت لجميع الصحب أكوارُ
فطيبٌ في عشى طاب مسراهُ ... لطيبة ملأها للحق أنوارُ
وذاك سيد عبد الكريم غدا ... تلقاء مكة لا تلويه أفكارُ
مالي أرى برفاق الهند مضطرباً ... وللرفاق الى البطحاء تسيارُ
كيف التذذت بنوم بعد ما رحلوا ... وكيف ألهاك سمرٌ ثم سمارُ
هلا استهجت غداة البين منهجمٌ ... وكيف أو تلك فينا بعدهم دارُ
يا صاحبي وقوفاً بالذي سبقت ... له عهودكم لا منكم عارُ
هل تبلغان سلاماً من قريح جوى ... ودعتماه قريباً وهو مختارُ
تحيةً وسلاماً بالذي سعدت ... به السماء فأقمارٌ وأبحارُ
تحيةً وسلاماً بالذي سعدت ... به العوالم بدوٌ ثم أمصارُ
تحيةً وسلاماً بالذي سعدت ... به الدهور وأزمانٌ وأعصارُ
تحيةً وسلاماً بالذي شهدت ... به البرية أخيارٌ وأشرارُ
تحيةً وسلاماً بالذي شهدت ... به الوحوش فأشجارٌ وأحجارُ
تحيةً وسلاماً بالذي خضعت ... لحكمه الريح ثم الماء والنارُ
تحيةً وسلاماً بالذي انصدعت ... لما أشار لصدر البدر أعشارُ
تحيةً وسلاماً بالذي انفجرت ... من بين إصبعه للناس أنهارُ
تحيةً وسلاماً بالذي برقت ... من نور طلعته الميمون أبصارُ
تحيةً وسلاماً بالذي حشرت ... في ظل رايته رسلٌ وأبرارُ
أتقى البرية لله وأورعهم ... فقوله لبيان الحق معيارُ
نفسي الفداء لأمي أتى فغدا ... يعلم الناس ما في حله حاروا

حازَ العُلومَ وَلَمْ تَجمَعْهُ مَدرَسَةٌ ... وَلَا شُيُوخٌ وَلَا صُحُفٌ وأَسفَارُ

وَانْتَ لِحكمَتِه صُمُّ العُلومِ وَمَا ... أعيَى العُقُولَ وَتَاهَتْ فيهِ أنظَارُ

فَانْثَتْ عَليهِ عُلومُ الأوّلينَ وَ مَا ... تَحَيَّرَتْ فِيهِ أَعلَامٌ وأَحبَارُ

أَتَى بِفَصْلِ خِطَابٍ مِنه فَانكَشَفَتْ ... مِنْ مُعضَلَاتِ عُلُومِ اللهِ أَسْتَارُ

أَتَى فَمَعَ اذَا انّا مُصَسَّمَـةٌ ... وجُلِيَتْ لِعُيُونِ العُمْيِ أبصَارُ

هَيْنُ الخَلَائِقِ لَينُ القَولِ مُنبَسِطٌ ... عِندَ الشَّدَائِدِ والمَكرُوهِ صَبَّارُ

ملوُ الحزينِ مُحَيَّاهُ وَمَطلَعُهُ ... غَوثُ الوَرىٰ لِكَسِيرِ القَلْبِ جَبَّارُ

غَوثُ الأَنَامِ وَمَأوَاهُمْ وَمَلجَاهُمْ ... طُرًّا وَشِيمَتُهُ جُودٌ وإيثَارُ

غَيثٌ أُغِيثُوا بِه من بعد ما قنطوا ... وَدِيمَةٌ مِن عَطَاءِ اللهِ مِدرَارُ

نَفسِي الفِدَاءُ لِقَبرٍ حلّه كَرَمٌ ... نَفسِي الفِدَاءُ لِبَيتٍ فِيهِ أَقمَارُ[1]

ثُمَّ السَّلَامُ عَلىٰ أَصحَابِه وعَلىٰ ... آلٍ كِرَامٍ لِدِينِ اللهِ أَنصَارُ

حُبُّ النَّبِيِّ سَجَايَاهُمْ وَسِيمَاهُمْ ... مِنَ السُّجُودِ عَلَى الأَجبَاهِ آثَارُ

طَوَوا بُطُونَهُمْ جُوعًا وهم معه ... فِي كُلِّ نَائِبَةِ الأرجاءِ حُصَّارُ

رَمَوا بِأَنفُسِهِم لا البَحرُ يَمنَعُهُمْ ... مِنَ المَضَاءِ وَلَا طَودٌ وَلَا غَارُ

لا الحَرُّ يَمنَعُهُمْ لا البَردُ يَردَعُهُم ... عن السَّبِيلِ وَلَا سَهْلٌ وأَوعَارُ

حُفَّاظُ بَيضَتِه رُوَّادُ رَوضَتِه ... أعلامه رجعالى الاسلام نُظَّارُ

أَزكَى السَّلَامُ عَلَيهِم دَائِمًا أَبَدًا ... مَا قَامَ قَائِمَةٌ أَودَارَ دَوَّارُ

عِدَادَ مَا اشْتَمَلَتهُ الأكمُ مِن حَبٍّ ... وَمَا حَوَتهُ مِنَ القَطرَاتِ أَمطَارُ

عِدَادَ أشواط من بالبيت طاف و من ... سَعَى وَمَا رُمِيَتْ بِالجَمْرِ أَحجَارُ

عداد تلبية النُّسَّاك مَا وَقَفُوا ... لدى الجِمَارِ وَمَا طَافُوا وَمَا زَارُوا[2]

بنده محمد شفیع غفرلہٗ ۳ ربیع الاول ۱۳۵۴ھ

---

[1] روضۂ اقدس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حضرت صدیق اکبرؓ اور فاروق اعظمؓ بھی مدفون ہیں، اُن کی طرف اشارہ ہے،

[2] مولانا محمد شفیع: قصیدۂ نعتیہ المفتی دیوبند، ربیع الاول ۱۳۵۴ھ، ص ۱، ۲، ۳، ۴،

دارالعلوم دیوبند میں

دارالتحریر شاہی دولت افغانستان کے رکنِ اعظم جناب مولانا مبشر اللہ صاحب دامت افضالہم کا درود مسعود ممدوح الصدر ایک فاضل ادیب اور عالم متقی ہیں، اور سلطنتِ افغانستان میں اعلیٰ مرتبہ اور وجاہت رکھتے ہیں، ۱۲ رمحرم ۱۳۵۵ھ کو آپ دارالعلوم دیوبند میں تشریف لائے، دو روز قیام فرماکر دارالعلوم کے ہر شعبہ کا معائنہ کیا، اور اس قدر محظوظ ہوئے کہ ہر مجلس میں بار بار اس کا اظہار فرمایا، آپ کی تشریف آوری پر ایک جلسہ علماء و طلبۂ دارالعلوم کا منعقد ہوا، اس میں طلبۂ دارالعلوم نے خیر مقدم کی بہت سی عربی، فارسی اردو نظمیں سنائیں، احقر نے بھی بہت عجلت کے وقت میں چند اشعار لکھ لئے تھے، جو اگرچہ ادبیت سے خالی ہیں، مگر طلبہ کے لئے دلچسپی سے خالی نہیں، اس لئے بلاترجمہ شائع کئے جاتے ہیں:-

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

وأهلاً بدار العلوم طاب مغناها　　　ملاء العوالم طيباً طيب رياها

وأهلاً بدار العلوم الدين حلّ بها　　　من حلّ من شرفات المجد أقصاها

وأهلاً بدار عاليك ألمّ بها　　　ملكٌ همام فأسناها وأسماها

باهت به دار تحرير لسلطنة　　　من الأفاغنة العليا بقصواها

مبشر الله بشرى الخلق مقدمه　　　اذا أقام بأرض بالبشر أهـا

قوموا الضيفكم شكراً بحق فمن　　　لم يشكر الناس لما يشكر الله

ماشان شان أمير حلها كرما　　　في الله مقدمها لله ما تاها

دار من اول يوم أسست لهدى　　　على التقى وعلى التكلان مبناها

لله قاسم خيرات رشيد هدى　　　عين الحجاز لارض الهند ساقاها

لروضة من رياض الجنتين غدا　　　من طيب طيبة والبطحاء رياها

لقد وردت بماء یثرب منبعه — من ماء یثرب أبقى الله سقیاها
فأنت ضیف ضیوف الله فی شرف — وذاك من نعم مولاك اولاها
فالحمد قبل له والحمد بعد له — والحق ان کلنا نحمد الله
هو الحقیق لانواع الثناء له — جل المحامد اولها وأخراها
انی وجدت مکان القول ذا سعة — لولا مخافة ما فی الشعر أخشاها
فالابتهال باخلاص لمن عاء له — أولی الخصال بطلاب احراها
لله دولة أفغان بقیة ما — حوته ملة اسلام بدا اماها
حبا الرحمٰن رعیا لا مرتها — بعد الحسد ها نبا لأعداها
یحمی الاله حماها عن شرور عدی — ودائما لمدی الأیام أبقاها
یاحبی لها ولفوز المسلمین بها — ظل الاله الامیر الظاهر شاها
ولذکر الله ان المنتدی نزه — علی الجلیس اذا لم یذکر الله
علیك باسم رسول الله ملتزما — أزکی الصلوٰة علیه ثم أنماها

یارب صل وسلم دائما أبدا
علی حبیبك مولی الخلق أزلاها

العبد الضعیف محمد شفیع الدیوبندی
المدرس بدار العلوم الدیوبندیة
۱۳ محرم ۱۳۵۵ھ [1]

---

[1] مولانا مفتی محمد شفیع، المفتی دیوبند، ماہ محرم الحرام ۱۳۵۵ھ ص۲ ،

إنّ المليك نظام الملك كوكبةٌ ... تسعد السعود لبيت العزّ والشرف

ظلّ الإله على وجه البسيط دُرّى ... وباسطُ العدل ماحى الجور والأسف

وقائمٌ بصريح الحق فى وسطٍ ... من الجوانب فى عدلٍ ومُنتصف

ودُرّة التاج للأملاك قاطبةً ... فريدة الشأن فرد الوصف فى الصدف

أحيى المعالم حقًّا بعد ما درست ... وطهّر الأرض من ميلٍ ومن جنف

ومكّن الدين فوق الارض مُنبسطًا ... والشرعَ مِنْ طرفٍ منها الى طرف

ومهّد العلم فى ايام دولته ... وشنّف السمعَ من ذكراه بالطُرف

كان العالم قد ثُلّت فعمّرها ... وصانها عن عوادى الدهر والتلف

كانت مكارمُهُ من قبل شاملةً ... دار العلوم على عهدٍ من السّلف

وانها الكنوز الصبح ساطعةٌ ... فى ديوبندَ بلا فخرٍ ولا صلف

أضحى البسيطة منها فى سنا قمرٍ ... تمحو الظلام كضوء الشمس من غسف

تهزّ من عطفه عرفانُ رتبتها ... وخصّها بمزيد الفضل والتحف

فالعدل شاكرُهُ والفضل ذاكرُهُ ... وسائرُ الناس من داعٍ ومعترف

وعمّهم فيضه كالغيث منهمرًا ... بالجود من سلفٍ منهم الى خلف

فدام بالملك والعزّ العزيز كما ... دامت رعيّتهُ فى روضة الأنف

وقائمًا بحدود الشرع مجتهدًا ... بالفضل والعدل ثمّ العطف واللطف

وكان فى ظله الممسوط عامرةً ... بلادُهُ أبدًا فى الريف من شظف

؛ الترشيد؛

مرثیہ

۲۵ ربیع الاول ۱۳۵۷ھ، شب چہار شنبہ مولانا عتیق احمد صاحب صدیقی مدیر الانصار، القاسم و سلطان العلوم کے وصال پر درج ذیل مرثیہ لکھا:-

نُعِيتُ بخَيرِ الأصدِقاءِ عَتِيقِ   ومن مُخلِصِ الخُلّانِ خَيرِ رفيقِ

خَلِيلِي وحِبّي مُشفِقِي وشَفِيقِي   وأخلَصُ وُدًّا من أخِي وشَقِيقِي

خَلِيقٍ من الخُلُقِ العَظِيمِ بِوَافِرٍ   حَرِيٍّ بأخلاقِ الكِرامِ خَلِيقِ

سَلِيمِ ذَوَاتِ الصَّدرِ طَلقِ جَبِينِهِ   وصَاحِبِ فِكرٍ صَائبٍ وعَمِيقِ

مديرٍ بسلطانِ العلومِ كؤُسَها   لهائمِ تسنيمٍ ومخمورِ رحيقِ

لقد عاش مَرضِيَّ الخِصالِ حَمِيدَها   على منهجِ صدقِ السَّواءِ أنيقِ

فَوَدَّعَ في شَرخِ الشَّبابِ مودِّعًا   لَظى حسراتٍ عند كلِّ صديقِ

بَكَتْ شجوَها شُمُّ الصَّفا لرحيلِهِ   فكيف بقلبٍ هائمٍ ورقيقِ

وما نحنُ إلّا هالكٌ وابنُ هالكٍ   وذُو نَسَبٍ في الهالكينَ عريقِ

ومن أمعنَ الدنيا قليلًا تكشّفت   له عن عدوٍّ في ثيابِ صديقِ

ونَعيُ قرينِ المرءِ نعيٌ لنفسِهِ   وحالُ قرينٍ عبرةٌ لفريقِ

فيا ربِّ فاجعلْ مِن لَدُنكَ مُتاعًا   رفيقَ طريقٍ في طريقٍ سحيقِ

رجاءَ إعتاقِ العتيقِ من اللَّظى   وعفوِ جليلِ الذنبِ مثلِ دقيقِ

وأنتَ كريمٌ لا تُخيِّبُ راجيًا   وتَسمَعُ مِن بُعدِ البعيدِ سَحِيقِ

وأنتَ رجائي عندَ كلِّ مصيبةٍ   وأنتَ غِياثي عندَ كلِّ مضيقِ[2]

---

[1] یہ اور اس کے بعد والے شعر دونوں ابونواس کے ہیں،

[2] مولانا محمد شفیع، المفتی، دارالعلوم دیوبند، جمادی الاول ۱۳۵۷ھ، ص ۲، ۳،

مرثیه

هذه ابیات رثیتُ بها طود العلم وجود العلم حلو الشمائل رضی الخصائل الشیخ البارع الزاهد العارف مولانا السید احمد قدس سرہٗ المهاجر المدنی المؤسس للمدرسة الشرعیة ودار الصناع وأمثالها بمدینة الرسول صلی الله علیه وسلم وقد توفی رحمه الله لاثنی عشرة خلون من شوال المکرم سنة ثمانی وخمسین بعد ثلاث مأة والف من الهجرة ۱۳۵۸ھ،

بسم الله الرحمن الرحیم

أیّ الخطوب من الأیام أبکیه — والدهر ذو إحن لا یأتلی فیه
کتمتُ دائی حتی عیل مُصطبری — ولیس منکتماً ما الله مُبدِیه
جرتْ بسرّی اقلام الجفون علی — صفیحة الوجه والاحزانُ تُملیه
یا حسرةً لِعشیات الحِمیٰ سلفتْ — فی روض طیبة قد طابت ضواحیه
یا حسرةً لِعشیات الحِمیٰ سلفتْ — فی ظل صفوة خلق الله راعیه
یا حسرةً لِعشیات الحِمیٰ سلفتْ — فی دار أحمد لسمیٍّ یسدّ انیه
جمّ الفضائل قد طابت شمائله — عمّ الفواضل مُخزی من یُضاهیه
جود العلوم طود العلم مُحتشدٌ — ماضی العزائم جادٍ فی مرامیه
دارٌ ملاذ غریب لا ملاذ لهٗ — مغناهُ غنیةُ من آکدت مساعیه
حِصن الأرامل للإیتام مُلتحدٌ — یُؤوی الغریب یُدنیه فیکفیه

واحرّ قلباهُ من بريّته وصلت ❊ من المدينة تُنميهِ وتبكيه
نعت سليم دواهي القلب مُتّئِدًا ❊ رحب الجنان خزِيٌّ من يجاريه
من للأرامل والأيتام بعدهم ❊ من للغريب يُسلّي أو يداريه
من للمكارم والأخلاق قد يتمت ❊ والعلم والحلم قد هدّت مبانيه
لله خدمته في الله هجرته ❊ الله ربّي يجزيه فيجزيه
ممن يحصن لذكر الله رؤيته ❊ ومن لمرتبه قلت بواكيه
قضى الحياة إلى أن مات ملتزمًا ❊ دار الرسول مقيمًا في حواشيه
كفاك جار رسول الله مأثرة ❊ جوار أفضل خلق الله داعيه
حفظ الجوار لقد كانت سجيته ❊ والله ما كان في الجيران مُخزيه
كنت المضيف لأضياف الرسول إذا ❊ حطّت رواحلهم يومًا بناديه
قد حدثتك بنات الدهر واعظة ❊ ما فيه مُزدجرٌ من بعد تنبيه
كم قد عبرت على ما فيه معتبرٌ ❊ لهوًا وأنت من الغفلات في تيه
لا يزدهيني من دهري زخارفه ❊ نار زكت حسبي أن أبكي لماضيه

عذرًا النظم شفيع تائه كئب
لا غرو فيه إن اختلّت قوافيه

الاحقر الافقر محمد شفیع دیوبندی
الخادم لدار العلوم الدیوبندیۃ عفا اللہ عنہ
۲۳ شوال ۱۳۵۸ھ [1]

---

[1] مولانا محمد شفیع — القاسم، دارالعلوم دیوبند: ذیقعدہ ۱۳۵۸ھ، ص ۳،۴۔

حصہ نظم
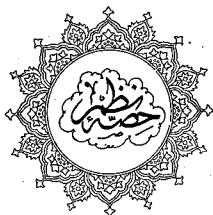
قطعۂ تاریخ وفات

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ

— رئیس امروہوی —

فقیہ و شارح قرآن و مفتیٔ اعظم — وہ جس کی ذات میں تھیں جلوہ گر تمام صفات
وہ "البلاغ" کا داعی وہ دعوتِ تبلیغ — رئیس آئینۂ علم و فضل جس کی ذات
یہ ذکر تھا کہ کہوں کوئی مصرع تاریخ — یہ فکر تھی کہ لکھوں سال اختتامِ حیات
تو اِک تجلّیٔ غیبی نے دی صدا کہ لکھو
"تجلیات محمد شفیع" سالِ وفات
۱۳۹۶ھ

قطعۂ تاریخ

— جناب ولی رازی صاحب —

اللہ کے قابو میں ہے موت و حیات بشر
تاریخ رحلت کے لیے یوں غیب سے آئی خبر
رخصت ہوئے مفتی شفیعؒ تو ہو گئے بے پا و سر
فقہ و نظر، خلق و ورع، قول و عمل، علم و بصر
۱۰۰ ۹۰۰ ۳۰ ۲۰۰ ۶ ۴۰ ۳۰ ۹۰
۱۳۹۶ھ

نوٹ: آخری مصرعے کے ہر لفظ سے پہلے اور آخری حرف (سر اور پاؤں) کو نکال کر صرف درمیانی حروف کے اعداد شمار کیے جائیں تو تاریخ وفات برآمد ہوتی ہے۔

۱۳۵۲ ·

قطعۂ تاریخ وفات

یَاحَلِیْمُ یَاغَفُوْرُ

۱۳ ——— ھ ——— ۹۶

مُفتیٔ اعظمؒ قبلہ کی آرام گاہ

۱۹ ——— ۶ ——— ۷۶

"تاریخ وصال دلآویز" "زیورِ کمال مُفتی مُحمد شفیع" "تین شوال و عہد سن تیرہ سو چھیانوے ہجری"

۱۹ ——— ۶ ——— ۷۶ ۱۳ ——— ھ ——— ۹۶ ۱۳ ——— ھ ——— ۹۶

نُوْرُهُمْ يَسْعٰى بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَبِاَيْمَانِهِمْ + وَ + اُولٰئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ
سورۃ التحریم - ۶۶ سورۃ البقرہ - ۲

۱۳ ——— ھ ——— ۹۶

اُٹھی ہے ارضِ پاک سے وہ پاک شخصیت — اسے پاک بے نیاز وہ جنت مقام ہو
وہ پاک دل وہ پاک نفس فاضل اجل — بزمِ جناں میں اس کے لیے اہتمام ہو
وہ رُوحِ علم مفتیٔ اعظم فقیہِ دہر — اس رُوحِ علم و فکر پہ رحمت مُدام ہو
روزِ جزا ہو جب تو محمد شفیع ہوں — تحریر اس کا خلد نشینوں میں نام ہو
غلماں ہوں ان کے واسطے جنت میں منتظر — حُوروں کے بھی لبوں پہ صدائے سلام ہو
اُن کا ہی ایک مصرعہ ہے ان کی اجل کا سال — اِک لفظ "سرِ بسجدہ" کا گر اہتمام ہو

مصرعہ صباؔ یہ اُن کا ہے کیا بولتا ہُوا
"دوزخ کی آنچ مجھ پہ الٰہی حرام ہو[۱]"

۱۳ ——— ھ ——— ۹۶

(جنابِ صباؔ متھراوی)

---

[۱] یہ حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ ہی کی آخری نعت کا مصرعہ ہے۔ مدیر

جناب حکیم امداد اللہ احمد ذکی

حضرۃ مفتی اعظم

مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ

کیا بتائیں آپ کا کیا ہے مقام ۔۔۔ آپ کا فردوس میں ہے اب قیام
ذکر لب پر آپ کا ہے صبح و شام ۔۔۔ آپ شمع محفل خیر الانام

جی رہے ہیں لے کے ہم نام آپ کا
ہے ہمارے ہاتھ میں جام آپ کا

جو نہ تھا کچھ آپ سے ذی شان بنا ۔۔۔ جو نہ تھا انسان وہ انسان بنا
دشمن دیں صاحب ایمان بنا ۔۔۔ آدمی آئینہ قرآں بنا

آپ ہی کے فیض سے عظمت ملی
زندگی کو رفعت و شوکت ملی

آپ سے روشن روایات قدیم ۔۔۔ آپ کا کوچہ صراط مستقیم
آپ کی محفل کا ہر انساں فہیم ۔۔۔ آپ کو حق سے ملا رتبہ عظیم

دین کا روشن ستارہ آپ تھے
وحدت حق کا نظارہ آپ تھے

تھے ہزاروں آپ کے حلقہ بگوش ۔۔۔ آپ کے خادم ہوئے جنت بدوش
سن رہے تھے آپ آواز سروش ۔۔۔ جز خیال مصطفےٰ کچھ تھا نہ ہوش

ہاتھ میں توحید کا پیمانہ تھا
دل رسول پاکؐ کا کاشانہ تھا

آپ کا دل مرکز نور یقین ۔۔۔ صدق کی تنویر سے روشن جبین
ہر ادا تھی شرح آیات مبین ۔۔۔ بدر کامل آپ کے سب ہم نشین

آپ سے جو بھی ملا کامل ہوا
حاملِ تقدیسِ آدم دل ہوا

قدر کے قابل تھے سارے اتقیا ۔۔۔ دین کا تھا آپ سے روشن دیا
آپ بھی تھے شمعِ بزمِ مصطفا ۔۔۔ تھا بزرگانِ سلف سے سلسلہ

اب کہاں پائیں گے ہم شانِ وقیع
خلد میں ہیں حضرتِ مفتی شفیع

اپنی قسمت پر نہ کیوں ہو اس کو ناز ۔۔۔ دولتِ دیں سے نہ کیوں ہو سرفراز
کیوں نہ دل اس کا بنے وحدت کا ساز ۔۔۔ منکشف اس پر نہ کیوں ہوں دیں کے راز

کیوں نہ تابندہ ہو اس کی زندگی
آپ کے در کا گدا ہے یہ ذکی

قطعہ تاریخ وفات

جناب مسلم غازی

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ

شیخِ طریقت، مفتیِ اعظم پہنچا بارگہِ حق میں ۔۔۔ جس نے پلائی دنیا بھر کو مے عرفان کے ساغر کی
دیں کے مسائل سرِ الٰہی معلومات کی زینت تھے ۔۔۔ رحمتِ حق کے ساتھ تھی ہر دم ان پہ نظر پیغمبر کی

راستہ اُن کا دیکھ رہے تھے کب سے شفیعِ روزِ جزا
حُوریں بھی تھیں دید کی پیاسی کب سے شفیعِ برتر کی

میکدہ داور کی نظریں کب سے انکی سمت رہیں ۔۔۔ ساغرِ ہستی پی کر اُن کو پیاس تھی جامِ کوثر کی
محفلِ ہستی چھوڑ کے حضرت، انجمنِ جنت میں گئے ۔۔۔ جیسے ہمارے سینوں میں ہو دل کی جگہ سِل پتھر کی

تم سے کوئی سالِ رحلت اُن کا اگر دریافت کرے
کہہ دو غازی موت العالم موت ہے یہ دنیا بھر کی

۱۳۹۶ھ

جناب فضل کریم فضلی انصاری

گلہائے عقیدت

بیادِ عالمِ باعمل مُفتیِ اعظم حضرت مولانا محمد شفیع نوراللہ مرقدہٗ

عالمِ دیں، بے بدل یکتائے دوراں اُٹھ گیا
وائے قسمت سایۂ انوارِ یزداں اُٹھ گیا

علمِ تفسیر و فقہ، درسِ حدیثِ مصطفےٰ
کاروانِ علم کا وہ میرِ ساماں اُٹھ گیا

سچ اگر پوچھو تو وہ اک علم کی معراج تھی
ہادیٔ اربابِ ذوق پختہ کاراں اُٹھ گیا

علم و حلم و جُود و تقویٰ تھا مدارِ زندگی
وہ نگارِ نورِ افزا ماہِ کنعاں اُٹھ گیا

سُنّتِ نبویؐ رہا ہو عُمر بھر جس کا عمل
آج وہ منجملۂ پرہیزگاراں اُٹھ گیا

اُٹھ گیا جو تھا نمونہ اُسوۂ اسلاف کا
باعثِ فخر و نشاطِ دینداراں اُٹھ گیا

عُمر بھر جو مُنکراتِ دین سے بچتا رہا
سالکِ راہِ طریقت پاک داماں اُٹھ گیا

اشرفؒ و انورؒ و صغرؒ جس کو کرتے تھے پیار
نکتہ دان و نکتہ سنج صد ہزاراں اُٹھ گیا

پیکرِ خلق مجسّم، بات تھی شیریں مقال
ہر عمل راحت فزائے بزمِ انساں اُٹھ گیا

ڈھونڈتی پھرتی ہیں جس موتی کو نظریں ہر طرف
وہ درِ نایاب اور لعلِ بدخشاں اُٹھ گیا

مسئلے مشکل سے مشکل جس سے ہو جاتے تھے حل
وہ فقیہہ و عالمِ دیں نُورِ یزداں اُٹھ گیا

آج لو وہ بھی چراغِ قوم و ملت گُل ہُوا
روشنی پاتی تھی جس سے بزمِ عرفاں اُٹھ گیا

علمِ دیں والوں سے پُوچھو ان کی قدر و منزلت
جن کے رُوح و قلب کا وہ جانِ جاناں اُٹھ گیا

آ گئی فصلِ خزاں کیوں علم کے گلزار میں
کیا چمن سے ایک دم رنگِ بہاراں اُٹھ گیا

درد مندوں کا مداوا بے کسوں کا غمگسار
اور مسکینوں کے غم کا ہائے درماں اُٹھ گیا

تھی نظر اللہ پر اُن کی بوقتِ واپسیں
محوِ ذکرِ ربِّ اکبر شاد و شاداں اُٹھ گیا

فضلؔی اب تو صبر کر ، ہے صبر کرنے کا مقام
اب تری باری ہے وہ دُنیا سے مہماں اُٹھ گیا

مولانا مفتی جمیل احمد صاحب تھانوی

مرثیہ و تاریخِ وفات

اِک شیخِ وقت و ہادیِ عالم نہیں رہے — شرع و طریقِ عشق کے سنگم نہیں رہے
کوچوں سے دہریت کے ہے اب زخم زخم دین — رکھتے تھے ایسے وقت جو مرہم نہیں رہے
تقوٰی و زہد و معرفتِ حق کے مقتدا — میدانِ علم و فضل کے رستم نہیں رہے
ٹوٹی کمر ہر ایک کی اس سانحے کے بعد — ہر کام کے کسی میں وہ دَم خم نہیں رہے
افتاء و درس و وعظ، تصانیف و نظم و نثر — بے مثل کار ہائے منظم نہیں رہے
چودہ سو سالہ نظریئے اسلام کے جو آج — یورپ زدوں کے دل میں مسلّم نہیں رہے
تفسیر میں نکالے ہیں چُن چُن کے اُن کے خار — شبہات اور شکوک کے یہ سم نہیں رہے
اِصلاح و تربیت کا رہا تھانوی طریق — اُف عصر کے یہ شیخِ معظم نہیں رہے
دینی کُتب کی اشاعت کا اِک نظام — دُنیا و دین جو دونوں سے تھے مدغم نہیں رہے
اِک مختصر سے جُثّہ سے اتنے بڑے یہ کام — ہاں ہاں وہ خانقاہ میں کچھ کم نہیں رہے
دو پیر بھائی آپ کے جو شیخِ عصر تھے — ہائے نجم و اطہر ہمدم نہیں رہے
تاریخِ ارتحال ہے ہر اک کی "نوبتِ شیخ" — تینوں کے فیضِ عام تھے اک دم نہیں رہے

ہوش و حواس باختہ کیوں ہوں نہ اہلِ دین
وہ باکمال مفتیٔ اعظم نہیں رہے

رہے	نہیں	اعظم	مفتیٔ	باکمال	وہ
۲۱۵	۱۱۵	۱۰۱۱	۵۳۰	۹۴	۱۱

۱۹۷۶ء

تاریخِ وفات مع سجع جناب مفتی محمد شفیع صاحبؒ

زما رفت آں مفتیٔ اعظم ما — بدنیا وقیع و بعقبیٰ رفیع
بتاریخ و سجعش ندائے دل آمد — برائے خدا یا محمد شفیع

شفیع	محمد	خدا یا	برائے
۲۹۰	۹۲	۹۲۱	۲۱۳

۱۳۹۶ھ

"غم کی کہانی"

بیادِ مفتیٔ اعظم حضرت مولانا محمد شفیع صاحب دیوبندی نور اللہ مرقدہ و مضجعہ

گلشن میں جو وہ رونقِ گلزار نہیں ہے — ہے کون سا گل باغ میں جو خار نہیں ہے
آندھی جو چلی، لُٹ گیا وہ گلشنِ شاداب — اب اس کی کوئی چیز مزے دار نہیں ہے
تاریکیٔ محفل سے خجل ہے شبِ مظلم — محفل میں جو وہ نور کا مینار نہیں ہے
اِک درد ہے، اِک رنج ہے، اِک غم ہے دلوں میں — کوئی نہیں اِس غم کا جو بیمار نہیں ہے
فرطِ غمِ ہجراں میں ہیں ہم مضطر و ناشاد — افسوس ہمارا کوئی غم خوار نہیں ہے
الفاظ نہیں "غم کی کہانی" جو سُنا دوں — اِک درد ہے پر طاقتِ اظہار نہیں ہے
مغموم نہ اب صرف رفیع اور تقی ہیں — کوئی نہیں اس غم سے جو دوچار نہیں ہے
رخصت ہُوا وہ شفقت و ایثار کا پیکر — مِلتا کہیں وہ شفقت و ایثار نہیں ہے
اے حضرتِ مفتی شفیع و شہِ افتا — اب فقہ و فتاوٰی کا وُہ دربار نہیں ہے
وہ فخرِ گلستانِ رشید احمدؒ و قاسمؒ — وہ حضرتِ مکی کا وفادار نہیں ہے
محمود کی وہ آنکھ کا تارہ ہُوا غائب — شبیر کا وُہ صاحبِ اسرار نہیں ہے
اشرف علی و انور و اصغر کا دُلارا — وہ حضرتِ یٰسین کا دلدار نہیں ہے
تفسیر کے میدان میں وہ سابقِ غایات — تصنیف میں وہ فارسِ مضمار نہیں ہے
افسوس یہ افسوس کہ دُنیائے ادب میں — وہ شاہِ سخن، شاعرِ خوددار نہیں ہے
ہاتف نے کہی مجھ سے یہ تاریخِ وفات اب — مخدومِ وطن، قافلہ سالار نہیں ہے

آئے شوقؔ نہ لب پر ہو کوئی حرفِ شکایت
اس راہ میں کچھ شکوہ سزاوار نہیں ہے

(محمد جنید شوقؔ چاٹگامی فاضل تخصص جامعہ اسلامیہ بنوری ٹاؤن کراچی)

حضرت مولانا محمد موسیٰ روحانی بازی

رثاء الشیخ

ذیل میں ہم حضرت مولانا محمد موسیٰ صاحب روحانی بازی استاذ حدیث جامعہ اشرفیہ لاہور کا وہ قصیدہ پیش کر رہے ہیں جو انھوں نے حضرت مفتی اعظمؒ کی وفات پر کہا، یہ قصیدہ اظہار جذبات کے علاوہ ادبی حیثیت سے بھی بلند پایہ ہے اور عربی ادب کے طلبار کے لیے موجب دلچسپی ہوگا (ادارہ)

هلمّوا یراعا مع کواریس واسرعوا — لاملی حدیث البین والبین مجزعٌ

حدیثی۔ اخلائی۔ حدیث مماتکم — وهذا حدیث ذو شجون مروّعٌ

یدیر ید الدنیا الحمام علی الوریٰ — ولم یُنج منه الخلق حصن و مدفعٌ

فیاخاطب الدنیا وطالبها احذرن — ویاجیرة الموتیٰ اما آن ان تعوا

الا انما الدنیا متاع یغرنا — تفرّوت شملا بعد ما یتجمّعٌ

فخذ للنایا۔ لا ابالک۔ اهبة — الم تدر ان الموت مالیس یدفعٌ

غفلنا ولیس الموت عنا بغافل — یُغیر ولا یُبقی ولا هو یُخدعٌ

الا کل ما تبنی: لغیرك تبتنی — وما تجمع الدنیا۔ لغیرک تجمعٌ

فطوبیٰ لمن یبنی لعقباه دائما — ویجمع للاخریٰ و لله یهجعٌ

یحب التعید الخیر والخیر منجد — ویبغی الشقی الشرّ یصرعٌ

مضی البارع المرجو للعلم والعلیٰ — ومن لم یزل یفتی الانام ویخلعٌ

ومات امام موته موت عالم — قلوب الوریٰ من موته تتصدّعٌ

لبیب نجیب من نجیب وکامل — حکیم طبیب القلب ازکیٰ واورعٌ

تقی زکت القلب حیّا ومیتا — تقی رفیع وهو للفقه ارفعٌ

الا ابكوا امير المومنين تفقها ... ومن حاز وحدا ما يحوز المطلع
ليبك المعالى والنهى مفتى الورى ... ليبك الورى من كان بالحق يصدع
فنعوا الى دار العلوم غمامها ... وماوى الى قوم حيارى تنجعوا
ونعوا الى تلك المروءة كنزها ... وبدرا الى الدنيا لها كان يلمع
ونعوا الى اهل العلوم امامهم ... حديثا وتفسيرا و فقها يوزع
اشيخ الورى. شوقى اليكم مضاعف ... مقيم بقلبى ليت شوقى ينفع
اشيخ الورى. حتى متى الشوق لاعج ... يقلقل دمعى وهو فى القلب يخبع
فيبكيك افلاك وبدر وانجم ... وارض بها قد كنت تبكى و تخضع
وطير على بان و قمر بأيكها ... وانس وجن ثم نون وضفدع
ويبكيك بحر رائق و بدائع ... وعين الفتاوى اصبحت وهى تدمع
ومغن وامداد الفتاوى. هداية ... معارف قرآن. منار و منبع
ويبكيك مبسوط. محيط و جامع ... كذا سير ثم الزيادات تجزع
نافع وحاوٍ منية شرح حلية ... ودر و رد كلها متوجع
وان امرأ لم يبك فيك مفجعا ... ولم يعتبر من موتكم لمبتدع
وكنت لاهل العلم قوت قلوبهم ... وعرفا شذيا ذا عوارف تتبع
و روح المعانى والبيان ومغنيا ... وغاية تحقيق اذا ما تفرع
وصدرك مشكوة المصابيح لم تزل ... اشعة لمعات لــه تتشعشع
وما زلت تبنى منزلا بعد منزل ... من العلم. لهفى. اليوم امست تضعضع
رياض المعانى بعد ريك تصوحت ... و دار العلى و العلم و الفقه بلقع
اجل الرزايا ان يموت مفتر ... فقيه ومن للناس ماوى ومرجع
فمن للحيارى فى الصحارى يدلهم ... طريق الهدى كيلا يخافوا ويفزعوا
ومن لزيادات ومبسوط سرخسى ... يزيد هما شرحا و بسطا ويرقع
ومن لذوى الألباب والعلم بعدكم ... يقودهم هديا وعلما ويقنع

ومن لو فود فی نوازل اعضلت عليهم يحل المعضلات ويدفعُ
ومن لذوی علم اذا ما تخالفوا وانت لهم مأوی و رأيك مكتعُ
ومن لسفيه ملحد متسنق بعلم أربا وهو بالدين يرنعُ
فيحمی حمی الاسلام عن شبهاتهم وانت لدين الله حام هميسعُ
تنافح عن دين النبی مجاهدًا بنور علوم الله والرشد انفعُ
وكان لباكستان و الهند مفخرًا وقد خلتا من مفخر هو اوسعُ
واقسمت ما فی العصر مثل له وهل رأيت شبيه البدر اذ هو يسطعُ
فصيح بليغ اذ يفوه تروق له كلاما كعقد الدر نظما و مصقعُ
ونجم سماء بل سماء لأنجم يصوغ قلوبًا كالنجوم ويصنعُ
ونور رياض العلم بل نور نورها وزين بساتين المعالی ومفرعُ
وغيث سحاب غاث بل سحابهٔ يدر بأمطار العلوم ويهمعُ
ومن ذا الذی لم يستفد من علومه ولكن قليل فی الوری المتضرعُ
ومن ذا الذی لم يجن أثمار فيضه ولم يقتبس قبسا و نورا يشعشعُ
سنشكر ما دام اللسان يطيعنا معارفه نترٰی تروی وتشبعُ
تهنأت الدنيا بافتائه الذی اضاءت له الآفاق كالشمس تطلعُ
الاماثل ابن العابدين بفقهه وجاری ابن همام بما كان يجمعُ
وساجل اسلافنا كبارًا بعلمه علی رأسه تاج العلوم المرصّعُ
أيا شمس فقه ـ إذ طلعت بأفقه تهلل نورًا بعد ما كاد ينزعُ
سرير الفتاوی اعتز اذ صرت مفتيا بدار علوم ـ يا شفيع المشفعُ
وتخت الفتاوی اهتز يختال عزة لما حله حبر فقيهٌ و بلتعُ
اراد بك الرحمٰن خيرا ومن يرد به ذا يفقهه ففی الخير يسرعُ
وكنت لاهل العلم قلبا وايديا وعينًا واذن الخير والخير يسمعُ
زرعت العلی طوبی لما قد زرعتهٔ وليس لمرء غير ما كان يزرعُ

رثاء الشیخ الاجل مولانا المفتی محمد شفیع

نور الله مرقدهٗ

نعیٌ اتانا لم یطق انسان — حملا ولا الاذهان والآذانُ

انشق منه قلوب ارباب الهدیٰ — والصّٰلحین ولکل مرءٍ شانُ

احتار ارباب العلوم ذووالحجیٰ — طار النهیٰ واختلت الاذهانُ

وعیون بحر سیبتها اعین — لم یستطع کفّالها الاعیانُ

سکبا فسکبا لیس یصفو جامد — والاحتکار بمذخر نقصانُ

اذ "فوت شیخ" "فوت فضل" عندنا — لم یبق خیر آه . والفیضانُ

ما فوت شخص فوته بل فاتنا — ورع و تقوی النفس والاحسانُ

ومعارف و معالم و مناقب — لم یخل من فیض عظیم آن

تبکی لہ دار العلوم واهلها — والارض والابواب والجدرانُ

وسماءها وفضاءها و دروسها — ومساند التدریس والکانُ

ولدار الافتاء النیاحة بعده — بل فی صیاح بعد وباکتانُ

فی علوم النقل والعقل احتذی — حذو الذین هم الحقائق صانوا

من للزنادقة الّذین تجاسروا — تحریف ما أعطاهم القرآنُ

مفتون فی دور العلوم جمیعها — لکن یتامیٰ کلهم حیرانُ

لغوائص الافتاء ممن حلها — ومن الغوائل فیه کیف یصان

من للمغالق . . . نتاحاتها — من للخفایا عنده اعلانُ

من کان فی احکامه متنبطا — ومسهلا ماجاء الفرقانُ

ومحرفون من الاوربا انشئوا — فینا و کل محرف فتانُ

قالوا لما خالوه : هذا دینکم! — فکأنّ دینًا واحدًا ادیانُ

شقوا العصاء اذ فرقوا فی دیننا — حذرا فکل منهم الشیطانُ

قد ضل ثم اضل قوما مسلمًا — قد کاد یخشی الکفر والکفرانْ
والکالحق اذا یصل عشرۃً — زعم الوصول وأن له الاذعانْ
فالیك ربی الشکی من کیدھم — فامنن علینا فیہ یامنانْ
کان الشفیع محمد فی دارنا — شفعاء فی الجنات یا رحمٰنْ

ان رمت تاریخ اللقاء بربہ
قل "حباہ الاکرام والرضوانْ"

۱۰۸۸ ۲ ۲۹۳ ۹

۱۳۹۲ ھ

حضرت مولانا فضل محمد صاحب سواتی

فی رثاء

شیخنا زبدۃ العلماء المحققین المفتی الاعظم مولانا وسیدنا محمد شفیع

قدس اللہ روحہ ونور مضجعہ ورمسہ

الشمس والقمر المنیر اذا تلا — والبرق والنجم نصیبی اذا ھویٰ
متریخ شعری والثریا جدیھا — والقطب والجوزاء فی وسط الدجیٰ
وطلوعھا وغروبھا ورجوعھا — وشروقھا ورواحھا ثم الضحیٰ
وغدوھا وعشیھا و اصیلھا — واللیل فی حلل الظلام اذا سجیٰ
کلٌ تنادینا باعلیٰ صوتھا — انا خلقنا للفناء و للعنا
نجم الھدیٰ ورّاث علم نبوۃٍ — غربوا وغابوا فی جلامید الثریٰ
فالام تھوی فی عمایا غفلۃ — اولست تدری ان موتك قد دنیٰ
والام فی نھج الفناك تقتفی — والیٰ متی لاترعوی والیٰ متیٰ
لاد اربعد الموت یسکنھا فتی — الا التی بعد الممات لہ بنیٰ

ومن سمعت بوقع رزء هائل فتّت به الاكباد وانصدع الحشیٰ
وا غبرت الخضراء وانکدرت بنا تاهت من الأھوال الباب الوریٰ
فهوی منار العلم والتقویٰ معًا فتزلزل الاکوان من فرط الشجیٰ
فخر العلیٰ طود الهدیٰ علم التقیٰ جمّ المناقب کهف ارباب الحجیٰ
یا وحشۃ الاسلام یوم وفاته یاغربۃ للمسلمین اذا انقضیٰ
من للسیاسۃ والسیادۃ اذ بدت اسد عظام فی میادین العدیٰ
او للفتاویٰ والمعارف اذ عرت بالدین مشکلۃ و معضلۃ العمیٰ
او لدغۃ اولسعۃ او لفحۃ او خطفۃ او غارۃ بید الهویٰ
او حیرۃ او وحشۃ او آفۃ او نزغۃ السطوات من اهل الغویٰ
من للتقی وللرفیع وللرضی ومن الشفیع لهم اذا ناب الاذیٰ
مشحونۃ بدم سفائن اجفن تجری ببحر العبرات من الجویٰ
لاغرو ان دفنوہ تحت حفیرۃ بین الجنادل فی الکریخچ والفلا
فعلومه وفیوضه و عیونه الباقیات الصالحات بلامرا
وصفاته وسماته وصلاته ایاته المبقات من فوق الذریٰ
اقواله افعاله احواله لدلائل الخیرات فی افق العلیٰ
دارالعلوم وکل تصنیفاته من فیضه الجاری علی اهل النهیٰ
بالله قل لی کیف یفنیٰ عالم؟ حیّ له عمل علی صفح الدنیٰ
صبرًا علیکم ثم صبرًا یا تقی ویا رفیع وذاك منکم یرتجیٰ
فالموت آت کل حیّ لایدا فع بالسیوف وبالجیوش وبالقنا
یا رب فاغفره ونوّر قبره امطر علیه من شآبیب الرضیٰ
وحباه روضات الجنان بفضله وسقاه مختوم الرحیق وما صفا
حیّاه عن وجه البشارۃ قائلًا
یا ضیفنا اهلًا وسهلًا مرحبا

مرثية مولانا المفتى محمد شفيع الديوبندى

انشاها الاحوج الى فيض ربه الجزيل محمد عبد الجليل (القشوى)

هم وكرب مشخص الابصار   والدمع فى الخدين نهر جار

واغبر وجه الارض من وقع النوى   واسحنفر الافلاك بالامطار

تبكى ملائكة السّموٰت العلى   واسود عين الشمس فى الاقطار

يبكون من فقدان مخدوم الورى   شيخ الشيوخ و مجمع الاخيار

استاذنا المفتى الشفيع وشيخنا   كالشمس يجلو حين نصف نهار

تلميذ أنورشاه حجة عصره   استاذ اهل الهند فى الآثار

قد كان فى دار العلوم مدرسا   فى ديوبند وكاشف الاسرار

يفتى الانام رواية و دراية   بفقاهة وشهامة و وقار

للسلمين ابوحنيفة عصره   للتقين حماء خير الدار

فى الفقه يعقوب وفى التفسير كشاف امام الوقت فى الاخبار

فى المنطق الرازى وفى الحكم الغزا   لى والتصوف مرشد الامصار

فى الصرف والنحو المبرد والخليل وفى المعانى جاحظ الاعصار

قوام ليل بالتهجد خاشعا   مستغفر الرحمٰن بالاسحار

دفن الامام فدفنه بحقيقة   دفن التقى والعلم والاحبار

القوم بعد ابى تقى ذاهب   والقلب مضطرب من الافكار

يامن يرتجى عند كل مصيبة   وقى بنيه الصبر فى الاخطار

وارحمهم يارب كان ابوهم   من صالحى العلماء فى الاذكار

فجزاه رب العرش خيرا وارتضا   ه برحمة وكرامة وجوار

ويدوم نضرة رمسه وبهائه

بسحائب الغفران من غفار

مولانا رضاء الحق مردانی
استاذ جامعہ اسلامیہ بنوری ٹاؤن

رثاء

الارض غبری والفضاء قتام   یبکی لفقد حبیبهم اقوام
اغرورقت عبرات عینی عن بکی   فالقلب احزن والهجوع حرام
نور تزیل عن سواد عیوننا   وله بباحات القلوب مقام
بکت السموات العلی بفراقه   وتزلزلت لوفاته الاعلام
ظن الخلود سفاهة وجهالة   ومصیرنا قبر ونحن نیام
مفتی شفیع للعارف خازن   بعلومه الکبری اکب فئام
قد صنف الکتب الجلیلة کلها   فی الفقه فرد فی العلوم امام
کم کان من فتوی فذلل صعبه   عن درکه تتقصر الافهام
اتت المشاکل خضعا لیراعه   ولتقطع رأس المشرکین حسام
اروی الانام بعلمه وفیوضه   وسقی البرایا حین کان اوام
شمس یضئ سناه ارضا کلها   علامة بدر الوری فهام
نفع الانام بعلمه وبلاغه   وله المعارف والعلوم عظام
عز الفؤاد بذکره وبطیبه   ان الخلائق ما لهن دوام
فارقتنا وترکتنا فی ظلمة   قد کنت بدرا اذ تکون ظلام
ازعجت یا کنز الوری اسس الهوی   وقطعتها فکانك الضرغام
یا من تروی من مناهل اشرف   فالناس بعد وفاتك الایتام
یا من حویت من الشمائل خیرها   شمس المعارف فی الوری قمقام
وارحمه رب الخلق واغفر حوبه   نضره فی یوم یکون قیام
فاغفر له اللهم وافسح قبره   ما دارت الافلاك والایام

ثم الصلوٰة علی النبی محمد
وعلی الصحابة کلهم وسلام

مولانا لطافت الرحمٰن سواتی بہاولپور

مرثیۂ عربی

أَلا قد فات استاذٌ جلیلٌ   فقیه الوقت علّامٌ نبیلٌ
امامٌ عالمٌ برٌّ تقیٌّ   فذ العلماء لیس له مثیلٌ
حوٰی علمًا و رشدًا ثم تقوٰی   و اوصافًا لها ذکرٌ جمیلٌ
و هذا الفائت المفتی محمّد   شفیع العالم الحبر الدّلیلٌ
یدٌ طولیٰ له فی کل فن   وصدرٌ واسع قلب صقیلٌ
وکان بقیة السلف الاعاظم   ترحّل مثل ما عمّ الرحیلٌ
وکان ولاده فی دیوبند   ویشفی للعطاش هنا غلیلٌ
وربّاه الائمة فی فنون   وارشده الافاضل والفحولٌ
فانوّرشه بدیوبند واشرق   علی فی تان بون له کفیلٌ
باصلاح و ارشاد فطوبیٰ   له قد کان للعلیا یمیلٌ
وقد رزق الذکاء و نور فهم   فحظّ نال له حظّ جزیلٌ
وفی دیوبند درّس مذ مدید   وها هو بحر علم لا المسیلٌ
وجاء الیٰ کراتشی بعد ذالک   یریه یشوع ما قال الرسولٌ
اقام هناک مدرسة کبیرة   وآثار المکارم لا تزولٌ
ففسّر ثم حدّث ثم افتیٰ   و ذلک من مزایاه قلیلٌ
فاحصلوا الجمیع وذکر کلّ   من الآثار امر مستحیلٌ
ولما تمّ اکثر ما اراد   تحمّل ما هو الحمل الثقیلٌ
فاهل العلم ایتامٌ بکاة   و ورد الموت لیس له سبیلٌ
وانّ له بقایا صالحات   تدوم مدی رحیٰ دهر یجولٌ

فتفسير المعارف والفتاوى　　وتصنيفاته الاخرى تطول

وفى لاشدى لـه دار العلم　　لتلك الدوحة الظل الظليل

وابقى بعده ولدا جليلا　　تقيا ليس يعدله عديل

وحق ابنه ما مات ميت　　ينوب منا به خلف جليل

وان لطاف الرحمن يرقى

فقيدا لا يكون لـه بديل

بقيه صـ١٣٦

غرست بساتين المعالى فاينعت　　وفى الحشر تجنيها وربك ميونع

لك القلم الجوال فيما كتبته　　وعقلك فعال لما كنت تزمع

فعلمك انوار وفتواك انجم　　وفعالك مزن ثم قولك اضوع

وموتك مشهود ومحياك شاهد　　على قدرة البارى لانك ابدع

ومحياك مكشوف وموتك كاشف　　لنكتة ان الخلق للقدر خضع

فلله ما اولاك مولاك حالة　　كفاك بها فخرا ـ أيا متلقع

قسمتا ما بين الثريا الى الثرى　　فيوضك تجرى فهى كالروض تمرع

وقلبى لما غبت طار نحوكم　　واعجب شيئ طائر وهو اوقع

فهل زمن ولى بكم عائد بكم　　وهل زورة الانوار والعلم ترجع

اتاك . إلهى ـ ترجمات لديننا　　غريبا فهب ما كان يرجو ويطمع

وروحا وريحانا وراحا وراحة　　وقصرا وتسنيما بعدن يتقنع

وكان نقى القلب فاقبل شهادتى　　على انه بر كريم وطيع

أشيخ الشيوخ . ذهب فوالله لم تمت　　وهل مات من دوما معاليه تشمع

فتاواك ما دام السبر . تفيدنا　　وما دم يشد والعندليب ويسجع

سقى قبرك الوسمى ما ذرت رق

وما هب فى الأيك النسيم المزعزع

دار العلوم کراچی میں طلباء کا دار الاقامہ

سہ منزلہ کتب خانے کی زیر تعمیر عمارت

دارالتفسیر والحدیث
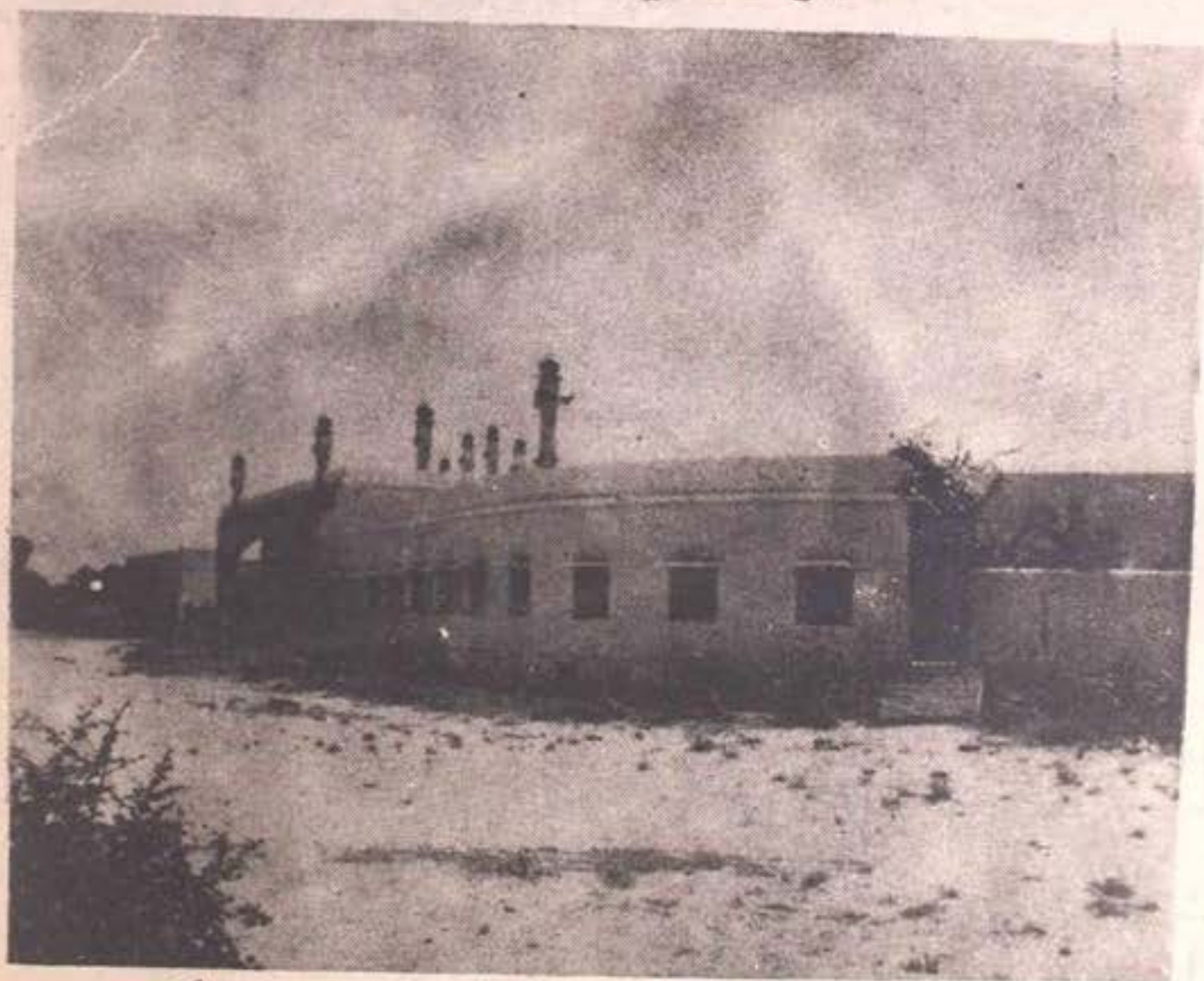
پندرہ سے بیس سال تک کے طلباء کا دارالاقامہ اور مسجد کی پشت

شعبۂ تجوید القرآن ودینیات (مدرسۂ ابتدائیہ) کا عقبی حصہ

دار التربیت (پندرہ سال تک کے بچوں کا ہوسٹل)
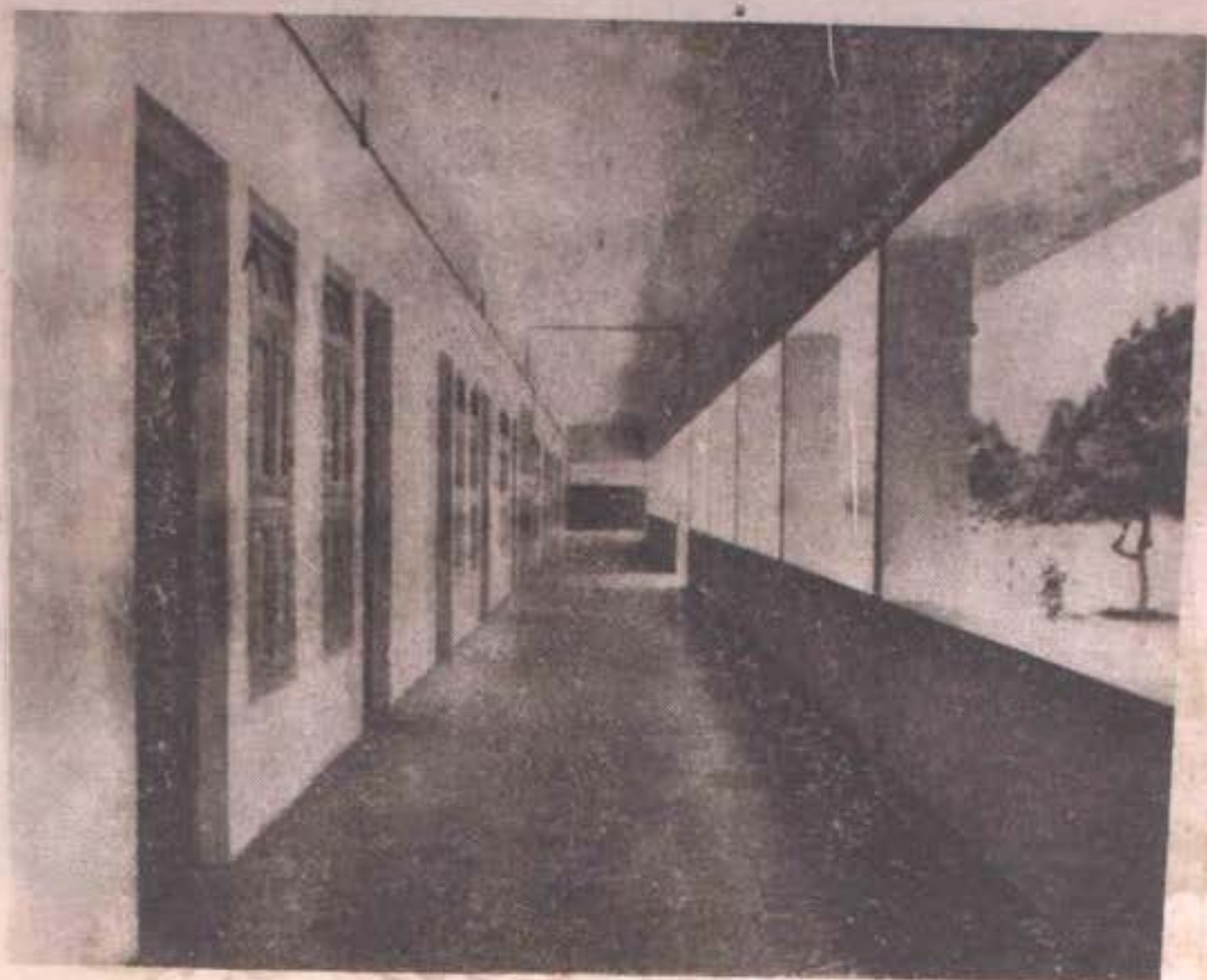
مدرسۂ ابتدائیہ کا برآمدہ

مطبخ